هٰذا بیانٌ للناس وھدًی وموعظۃٌ للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جلد اول

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام

جلد اوّل

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ	۵
۲	مقدمہ	۱۳
۳	الفاتحہ	۴۳
۴	البقرہ	۴۶
۵	آل عمران	۲۲۸
۶	النساء	۳۱۶
۷	المائدہ	۴۳۴
۸	الانعام	۵۲۰
۹	فہرست موضوعات	۶۰۹

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست نقشہ جات

(تمام نقشہ جات جلد کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت اور ان کے تبلیغی مشن کے مراکز	۱۰۸
۲	نقشہ مقامات حج	۱۵۶
۳	نقشہ جنگ احد	۲۸۴
۴	بنی اسرائیل کی صحرانوردی	۴۶۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

قرآنِ مجید کے ترجمہ وتفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت وسعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مَصرف نہیں ہے۔ اِس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین ومفسّرین کے کام میں رہ گئی ہو، یا طالبینِ قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو پچھلے تراجم وتفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔

اِن صفحات میں ترجمانی وتفہیمِ قرآن کی جو سعی کی گئی ہے، وہ دراصل اسی بُنیاد پر ہے۔ میں ایک مدّت سے محسُوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں رُوحِ قرآن تک پہنچنے اور اس کتابِ پاک کے حقیقی مدّعا سے رُوشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے، وہ مترجمین ومفسّرین کی قابلِ قدر مساعی کے باوجود ہُنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ مَیں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بُجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت مَیں بھی کر سکتا ہوں۔ انھی دونوں احساسات نے مجھے اُس کوشش پر مجبور کیا جس کے ثمرات ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لیے فہمِ قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہو گی۔

اِس کام میں میرے پیشِ نظر علما اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں، اور نہ اُن لوگوں کی ضروریات

Maktaba Tul Ishaat.com

ہیں جو عربی زبان اور علومِ دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآنِ مجید کا گہرا تحقیقی مُطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بُجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں، جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علومِ قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اُنھی کی ضروریات کو میں نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے اُن تفسیری مَباحث کو مَیں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علمِ تفسیر میں بڑی اہمیّت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد مَیں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہُوم و مدّعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے، اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اُس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ نیز دَورانِ مطالعہ میں جہاں جہاں اسے اُلجھنیں پیش آ سکتی ہوں وہ صاف کر دی جائیں اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اُسے بروقت مل جائے۔ یہ میری کوشش ہے۔ اب اس امر کا فیصلہ عام ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ مَیں اس میں کہاں تک کامیاب ہُوا ہوں۔ بہرحال یہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو، یا کسی سوال کا جواب نہ ملے، یا مدّعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو اس سے مجھے مُطّلَع کیا جائے، تاکہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔ علمائے کرام سے بھی مَیں گزارش کرتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں۔

چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلّق بھی:

مَیں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مَیں پابندیِ لفظ کے ساتھ قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ترجمۂ قرآن کا تعلّق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدّد بزرگ بہترین طریقے پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ، اور اُردُو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدّین صاحب، مولانا محمُود حَسَن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور حافظ فتح محمد صاحب جالندھری کے تراجم اُن اغراض کو بخوبی پورا کر دیتے ہیں جن کے لیے ایک لفظی ترجمہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمے سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں۔ اُنھی کو میں نے ترجمانی کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآنِ مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسُوس ہوتی ہے، وہ روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان، اور تاثیرِ کلام کا فُقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی رُوح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسُوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اُترتی چلی جارہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تأثّر رُونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز وتُند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصّہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اِس چھلنی کے اُوپر ہی سے اُڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصّہ ہے، اس کے ادب کا حصّہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔ جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی۔ جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادُو اثر کلام جو سُنے گا وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اُسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے، تو اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متأثّر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعُموم بَین السُّطُور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دُوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیونکہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دُوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے، اُس طرح وہ ترجمۂ قرآن کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کرسکتا ہے، کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعے کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائبل کے ترجمے کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور اُوپر نیچے نمبروار لکھ کر اُسے پڑھیے۔ آپ کو خود محسُوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی اِن جدا جدا فقروں کے پڑھنے سے نہیں پڑتا۔

ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثّر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جُوں کا تُوں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآنِ مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں حسبِ موقع وضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جاتی تھی اور آپؐ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سُناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرتاً بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہے کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے۔ مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ ’’لوگ ایسا کہتے ہیں‘‘، بلکہ مقرّر آمدِ سُخن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شُبہے کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلّق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ ربطِ کلام

ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسُوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلّق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلّق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، اُن کے درمیان کوئی خَلا محسُوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلّم اور مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرّر اپنے زورِ کلام میں موقع و محل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہِ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلّم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمایندگی کرنے لگتا ہے، اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حُسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آکر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسُوس کرتا ہے، اور یہ احساس اُتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآنِ عَرَبی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اُس کو دُور کرنے کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعے سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دُوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریر کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دُور ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں، جیسا کہ ابھی مَیں اشارتاً عرض کر چکا ہوں، قرآنِ مجید کی ہر سُورت دراصل ایک تقریر تھی جو دعوتِ اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوتی تھی۔ اس کا ایک خاص پَس منظر ہوتا تھا۔ کچھ مخصُوص حالات اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پُورا کرنے کے لیے وہ اُترتی تھی۔ اپنے اُس پَس منظر اور اپنی اُس شانِ نزُول کے ساتھ قرآن کی اِن سُورتوں کا تعلّق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرّد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا، اور بعض باتوں کو اُلٹا سمجھ جائے گا، اور قرآن کا پورا مدّعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں۔ قرآنِ عربی کے معاملے میں اس مشکل کو دُور کرنے

Maktaba Tul Ishaat.com

کے لیے تفسیر سے مدد لینی پڑتی ہے، کیونکہ اصل قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دُوسری زبان میں ہم اتنی آزادی برت سکتے ہیں کہ قرآن کی ترجمانی کرتے وقت کلام کو کسی نہ کسی حد تک اس کے پَس منظر اور اس کے حالاتِ نُزُول کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں، تاکہ ناظر کے لیے وہ پُوری طرح بامعنیٰ ہو سکے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن اگرچہ عربِ مُبِین میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصُوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لُغوی معنیٰ سے ہٹا کر ایک خاص معنیٰ میں استعمال کیا ہے، اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہُومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیِ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کیے جاتے ہیں، ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے، اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی اُلجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک لفظ کفر کو لیجیے جو قرآن کی اصطلاح میں اصل عربی لُغت اور ہمارے فقہا و متکلّمین کی اصطلاح دونوں سے مختلف معنیٰ رکھتا ہے، اور پھر خود قرآن میں بھی ہر جگہ ایک ہی معنیٰ میں استعمال نہیں ہُوا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمّل غیر ایمانی حالت ہے۔ کہیں یہ مجرّد انکار کے معنیٰ میں آیا ہے۔ کہیں اس سے محض ناشکری اور احسان فراموشی مراد لی گئی ہے۔ کہیں مُقتضیاتِ ایمان میں سے کسی کو پورا نہ کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مختلف مواقع پر اگر ہم ہر جگہ کفر کا ترجمہ کفر ہی کرتے چلے جائیں، یا اور کسی لفظ کا التزام کرلیں، تو بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہوگا لیکن ناظرین کہیں مطلب سے محرُوم رہ جائیں گے، کہیں کسی غلط فہمی کے شکار ہوں گے، اور کہیں خَلجان میں پڑ جائیں گے۔

لفظی ترجمے کے طریقے میں کسَر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے مَیں نے ''ترجمانی'' کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اُردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہُوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتّی الامکان صحّت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دُوں۔ اُسلوبِ بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عَربِی مُبِین کی ترجمانی اُردوئے مُبِین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے

سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلامِ الٰہی کا مطلب و مدّعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی، جہاں تک بس چلے، ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہرحال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطالب کی جسارت کی جائے، لیکن معاملہ کلامِ الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجایش دیتی ہے، اس سے تجاوُز نہ ہونے پائے۔

پھر چونکہ قرآن کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ارشادات کا پَس منظر بھی آدمی کے سامنے ہو، اور یہ چیز ترجمانی میں پُوری طرح نمایاں نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر سُورہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے، جس میں اپنی حد تک پُوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سُورہ کس زمانے میں نازل ہوئی، اُس وقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلے میں تھی، کیا اس کی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اُس وقت درپیش تھے۔ نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعۂ آیات کی کوئی الگ شانِ نُزُول ہے، وہاں میں نے اُسے حاشیے میں بیان کر دیا ہے۔

حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجّہ قرآن سے ہٹا کر کسی دُوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے حاشیے بھی میں نے لکھے ہیں، دو ہی قسم کے مقامات پر لکھے ہیں۔ ایک وہ جہاں مجھے محسُوس ہُوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا، یا اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو گا، یا وہ کسی شبہے میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ ہُوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گزر جائے گا اور قرآن کے ارشاد کی اصل رُوح اس پر واضح نہ ہو گی۔

جو لوگ اس کتاب سے پُورا فائدہ اُٹھانا چاہیں، اُن کو میں مشورہ دُوں گا کہ پہلے ہر سُورت کے دیباچے کو بغور پڑھ لیا کریں، اور جب تک وہ سُورت ان کے زیرِ مُطالعہ رہے، وقتاً فوقتاً اس کے دیباچے پر نظر ڈالتے رہیں۔ پھر روزانہ قرآنِ مجید کا جتنا حصّہ وہ معمولاً پڑھتے ہوں، اس کی ایک ایک آیت کا لفظی ترجمہ پہلے پڑھ لیں۔ اس غرض کے لیے فارسی، اُردو، انگریزی تراجم میں سے جس کو وہ چاہیں منتخب

Maktaba Tul Ishaat.com

کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تفہیم القرآن کی ترجمانی کو حواشی کی طرف توجّہ کیے بغیر مسلسل ایک عبارت کے طور پر پڑھیں، تاکہ قرآن کے اس حصے کا پورا مضمون بیک وقت ان کے سامنے آ جائے۔ پھر ایک ایک آیت کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے حواشی کا مطالعہ کریں۔ اس طرح پڑھنے سے مجھے توقّع ہے کہ ایک عام ناظر کو قرآنِ مجید کی عالمانہ واقفیّت نہ سہی، عامیانہ واقفیّت اِن شاء اللہ بخوبی حاصل ہو جائے گی۔

اِس کتاب کو مَیں نے مُحرّم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲ء) میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدّت تک اس کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سُورۂ یوسفؑ کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہوگئی۔ اس کے بعد پے دَر پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی مُیسّر آ سکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا، اسی کو نظرِ ثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صُورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا سُوءِ اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے، وہ پُوری ہو اور یہ کتاب قرآنِ مجید کے فہم میں بندگانِ خدا کے لیے واقعی کچھ مددگار ثابت ہو سکے، وَمَا تَوْفِيقِيٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

نیو سنٹرل جیل -- ملتان　　　　ابُوالاعلیٰ

۱۷ ذی القعدہ ۱۳۶۸ھ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقدّمہ

اِن گزارشوں کے عنوان میں لفظ ''مقدّمہ'' دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدّمہ لکھ رہا ہوں۔ یہ قرآن کا نہیں، تفہیم القرآن کا مقدّمہ ہے، اور اس کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر دو مقصد ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک عام ناظر اُن باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کو ابتدا ہی میں سمجھ لینے سے فہمِ قرآن کی راہ آسان ہو جاتی ہے، ورنہ یہ باتیں دَورانِ مطالعہ میں بار بار کھٹکتی ہیں اور بسا اوقات محض اِن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں تک معانیِ قرآن کی سطح ہی پر گھومتا رہتا ہے، گہرائی میں اُترنے کا راستہ اُسے نہیں ملتا۔

دوم یہ کہ اُن سوالات کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے جو قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت بالعموم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہُوا کرتے ہیں۔ مَیں اس مقدّمے میں صرف اُن سوالات کا جواب دُوں گا جو خود میرے ذہن میں اوّل اوّل پیدا ہوئے تھے، یا جن سے بعد میں مجھ کو سابقہ پیش آیا۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سوالات بھی جواب طلب باقی رہ گئے ہوں تو ان سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اُن کا جواب اِن شاء اللہ آیندہ اشاعت کے موقع پر اس مقدّمے میں بڑھا دیا جائے گا۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعیّن موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ”کتاب“ ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعیُّن ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فُصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی، اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلّق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مُطالَعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دُوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اَخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخوِیف، بشارت، تسلّی، دلائل، شواہد، تاریخی قصّے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دُوسرے کے بعد آ رہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دُہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دُوسرا اور دُوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آ جاتا ہے۔ مخاطَب اور مُتکلّم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سَمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ و مابعد الطبیعیات ہیں تو مَنطِق و فلسفہ کی زبان میں نہیں۔ انسان اور موجوداتِ عالَم کا ذکر ہے تو عُلُومِ طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدُّن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو عُلُومِ عمران کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اُصُولِ قانون کا بیان ہے تو مُقنِّنوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف۔ اَخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اَخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جُدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصوُّر کے خلاف پا کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اُسے یوں محسُوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مُرتّب، غیر مَربُوط، مُنتَشِر کلام ہے جو اوّل سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شَذرات پر مشتمل ہے، مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے، اور مُوافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنیٰ کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شُکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقے سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی ”نظریۂ شَذرات“ کو قبول کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنیٰ آفرینیوں کی آماج گاہ

بن جاتی ہے جو قائل کے منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدّعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصُوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلّق رکھتے ہوں، وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں، ان میں یہ چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اُس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دُوسری کتابوں میں انھیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیّت لے کر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدّعا اور مرکزی مضمون کا سُراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اُسے کچھ اجنبی سا محسُوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پَس منظر بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں، ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی رُوح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نِکات و فوائد پر قناعت کر لینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شُبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انھیں بکھرے ہُوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کُھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نُورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاق عبارت میں بالکل بے جوڑ محسُوس ہوتی ہیں، متعدّد مقامات پر تعبیرات اور اُسلوبِ بیان کی ناواقفیت انھیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اَور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پَس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اِس کے نُزُول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا

Maktaba Tul Ishaat.com

موضوعِ گفتگو کیا ہے؟ اس کی ساری بحث کس مُدّعا کے لیے ہے؟ کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النّوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرزِ اِستدلال اور کیا طرزِ بیان اس نے اپنے مُدّعا کے لیے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی دُوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدَبُّر کی راہیں کشادہ ہوسکتی ہیں۔ جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اُس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان مبادی سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کرتا ہے کہ وہ ”مذہب کے موضوع پر ایک کتاب“ پڑھنے چلا ہے۔ ”مذہب کا موضوع“ اور ”کتاب“، ان دونوں کا تصوّر اس کے ذہن میں وہی ہوتا ہے جو بالعُموم ”مذہب“ اور ”کتاب“ کے متعلّق ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر جب وہاں اسے اپنے ذہنی تصوّر سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کرسکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث بَین السُّطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی ”تصنیف“ دُنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمھارے ذہن کا وہ ”کتابی“ سانچا جو اَب تک کی کُتُب بینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا بلکہ اُلٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خُصُوصیات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

١- خداوندِ عالَم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مَملکت کے

اس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تَصَرُّف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجُملہ ایک طرح کی خود اختیاری (autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲- اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالَم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمھارا اور تمام جہان کا مالک، معبُود اور حاکم مَیں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دُوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمھیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے، دراصل تمھارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے، جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمھارے لیے صحیح رَوِیّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبُود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دَارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شُعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رَوِیّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رَوِیّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں اَبَدی راحت و مَسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دُوسرے کسی رَوِیّے پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دُنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالَمِ آخرت میں جب آؤ گے تو اَبَدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳- یہ فہمایش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نَوع کے اوّلین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پُوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انھیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اُن کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا، اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیعِ خدا (مُسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رَوِیّوں کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے غفلت سے اس کو گُم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مَسخ بھی کر ڈالا۔ انھوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادّی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انھوں نے خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اَوہام اور نظریّوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انھوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے عادلانہ اُصولِ اَخلاق و تمدُّن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصُّبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴- خدا نے جو محدُود خود اختیاری انسان کو دی تھی، اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رَوِیّے کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مُہلت اِس نَوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی، اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اِس بغاوت کے رُونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اُس نے اپنے ذمّے لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اُس کی مُہلتِ عمل کے دَوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اِس خود عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمایندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علمِ حقیقت بخشا۔ انھیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا۔ اور انھیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اُسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵- یہ پیغمبر مختلف قوموں اور مُلکوں میں اُٹھتے رہے۔ ہزار ہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رَوِیّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پَیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدُّن کے وہ اَزَلی و اَبَدی اُصُول جو آغاز

ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اِس دین اور اِس ہدایت کی طرف اپنے اَبنائے نَوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی اُمّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اِس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جِدّو جُہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اِس مشن کو پُوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی، اور جنھوں نے اُسے قبول کر کے اُمّتِ مُسلِمہ کی حیثیت اختیار کی، وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان میں سے بعض اُمّتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مَسخ کر دیا۔

۶- آخرکار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاؑ آتے رہے تھے۔ اُن کے مُخاطَب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاؑ کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِنو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں، اُنھیں ایک ایسی اُمّت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دُوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جِدّو جُہد کرے ــــــ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مُدّعا کیا ہے۔

اُس کا موضوع انسان ہے اِس اِعتبار سے کہ بلحاظِ حقیقتِ نفس الامری اُس کی فلاح اور اُس کا خُسران کس چیز میں ہے۔

اُس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دُنیوی زندگی کے متعلق جو نظریّات قائم کیے ہیں، اور اُن نظریّات کی بنا پر

Maktaba Tul Ishaat.com

جو رَوِیّے اختیار کر لیے ہیں، وہ سب حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کُن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رَوِیّہ دُرست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم ’’صحیح رَوِیّہ‘‘ کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

اُس کا مُدّعا انسان کو اُس صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اُس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گُم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

اِن تین بنیادی اُمور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدّعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النّوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جُڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط ومنسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین وآسمان کی ساخت پر، انسان کی خِلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد و اَخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطّبیعی اُمور و مسائل کی تشریح کرتا ہے، اور بہت سی دُوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفس الامری کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دُور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلافِ حقیقت رَوِیّے کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے، اور اُس رَوِیّے کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اُس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مُدّعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رُجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ ’’دعوت‘‘ کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرزِ بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح

نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اِس کی کیفیّتِ نُزول کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیّت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اِسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اِسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رَوِیّہ زندگی کی طرف بُلائیں۔ نیز یہ اِس نوعیّت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنّفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلّق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اُسلُوب۔ دراصل اِس کی نوعیّت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہرِ مکّہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اُسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں:

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کِس طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات، اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردوپیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رَوِیّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اُصولِ اَخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح وسعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے، جن کی زبان نہایت شُستہ، نہایت شیریں، نہایت پُر اثر اور مُخاطَب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر ونشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنُّم کی وجہ سے ان کی طرف متوجّہ ہوں، اور زبانیں ان کے حُسنِ تناسُب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر اُنھیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مَقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالم گیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل وشواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مُخاطَب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انھی کی تاریخ، انھی کی روایات، انھی کے روز مرّہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور انھی کی اعتقادی واَخلاقی اور اجتماعی

Maktaba Tul Ishaat.com

خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا، اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ردِّعمل تین صورتوں میں ظاہر ہُوا:

(۱) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے اُمّتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) ایک کثیر تعداد جہالت یا خودغرضی یا آبائی طریقے کی محبّت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہوگئی۔

(۳) مکّے اور قریش کی حُدُود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اس دعوت کا دُوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اِس تحریک اور پُرانی جاہلیّت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کشمکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حِصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیّت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تُل گئے۔ اُنھوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھُوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شُبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام النّاس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اِسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم ڈھائے، ان کا مَعاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حَبَش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبُور ہوئے، اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدّت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِپیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ جو لوگ پُرانی جاہلیّت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نَوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے، وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اِتنے نیک،

اتنے راست باز اور اتنے پاکیزہ اَخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دنیا اُس دعوت کی برتری محسُوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انھیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اس طویل اور شدید کش مکش کے دَوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز وتُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ اُن خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو اُن کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شُعُور پیدا کیا گیا، انھیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیِ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انھیں صبر وثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جِدّوجُہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ اُن میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دُوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب وروز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خود مختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے بَیِّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شُبہے کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دُوسروں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیّت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل وخرَد کی دنیا میں اس کے لیے ٹھیرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنّم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، ان کے بُرے اَخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رُسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انھیں ملامت کی گئی، اور اَخلاق وتمدُّن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اُصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جِدّوجُہد اور مُزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا ـــــــ یہ ہے قرآنِ مجید کی مکّی سورتوں کا پَس منظر۔

مکّے میں اس تحریک کو اپنا کام کرتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ گیا جہاں اس کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ عرب کے تمام حصّوں سے اپنے پیروؤں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کر لے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بیشتر متّبعینِ اسلام ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ اِس طرح یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ اُمّتِ مُسلِمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بِنا ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ پُرانی جاہلیّت کے عَلَم برداروں سے مسلّح مقابلہ شروع ہُوا۔ پچھلے انبیاؑ کی اُمّتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود اُمّتِ مُسلِمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گُھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور دس سال کی شدید کش مکش سے گزر کر آخرکار یہ تحریک کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوگیا اور عالم گیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کُھل گئے۔ اِس مرحلے کی بھی مختلف منزلیں تھیں اور ہر منزل میں اِس تحریک کی مخصوص ضرورتیں تھیں۔ اِن ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی مُعَلِّمانہ درس و تعلیم کا، اور کبھی مُصلِحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور مَدَنیّتِ صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شُعبوں کو کن اُصول وضوابط پر قائم کیا جائے، مُنافِقین سے کیا سلوک ہو، ذِمّی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہلِ کتاب سے تعلّقات کی کیا نوعیت رہے، برسرِ جنگ دشمنوں اور مُعاہِد قوموں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، اور مُنظّم اہلِ ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوندِ عالَم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح تیار کرے۔ اِن تقریروں میں ایک طرف مسلمانوں کی تعلیم و

تربیت کی جاتی تھی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی جاتی تھی، ان کو راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُبھارا جاتا تھا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا، اور انھیں اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دُوسری طرف اُن لوگوں کو جو دائرۂ ایمان سے باہر تھے، اہلِ کتاب، منافقین، کُفّار و مُشرکین، سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ان پر حُجت تمام کر دی جائے۔

یہ ہے قرآنِ مجید کی مَدَنی سورتوں کا پَس منظر۔

اِس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید ایک دعوت کے ساتھ اُترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تیئس سال کی مدّت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی، ان کی مختلفُ النّوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصّے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہوسکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مَقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصّے نازل ہوئے، وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے، بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے، اس لیے ان کا اُسلُوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اُسلُوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات، ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دُنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اُٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم اُبھارنا، دشمنوں کو دوست، اور منکروں کو مُعترف بنانا، مخالفین کی حُجت مُنقطع کرنا اور ان کی اَخلاقی طاقت کا اِستیصال کر دینا، غرض اُسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک

Maktaba Tul Ishaat.com

دعوت کے عَلَم بردار اور ایک تحریک کے رہنما کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں، اُن کا طرزِ خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسبِ حال ہوتا ہے، اُن میں کالج کے لیکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی اس قدر تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اُس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے، بلکہ اُسی مرحلے کی باتوں کا اِعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صَرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اِعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جاتا رہے تو کان انھیں سُنتے سُنتے تھک جاتے ہیں اور طبیعتیں اکتانے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انھیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اُسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے، تاکہ نہایت خوش گوار طریقے سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی بُنیاد جن عقائد اور اصولوں پر ہو، اُنھیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، بلکہ ان کا اِعادہ بہرحال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سُورتیں نازل ہوئی ہیں، ان سب میں بالعُموم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور اس کی بازپُرس اور جزا و سزا، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکُّل اور اسی قسم کے دُوسرے بُنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے، کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غفلت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بُنیادی تصوّرات اگر ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو اسلام کی یہ تحریک اپنی صحیح رُوح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اِسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی

ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مُرتّب کر دیا جس کے ساتھ وہ نازل ہُوا تھا۔

اُوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تیئس سال تک قرآن کا نُزُول اُس ترتیب سے ہوتا رہا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا اِرتقا ہُوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دعوت کی تکمیل کے بعد ان نازل شدہ اجزا کے لیے وہ ترتیب کسی طرح دُرست نہ ہوسکتی تھی جو صرف ارتقائے دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اب تو اُن کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صُورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ ابتدا میں اُس کے مُخاطب اوّل وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے، اس لیے اُس وقت بالکل نقطۂ آغاز سے تعلیم و تلقین شروع کی گئی۔ مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اس کے مُخاطَبِ اوّل وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لا کر ایک اُمّت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبرؐ نے نظریّے اور عمل، دونوں حیثیتوں سے مکمّل کر کے ان کے حوالے کیا تھا۔ اب لامحالہ مُقدّم چیز یہ ہوگئی کہ پہلے یہ لوگ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے، اور اُن فتنوں سے جو پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمّتوں میں رُونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف ہو لیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

علاوہ بریں قرآنِ مجید جس طرز کی کتاب ہے، اسے اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اس پر خود ہی یہ حقیقت مُنکشِف ہو جائے گی کہ ایک ایک طرح کے مضامین کو ایک ایک جگہ جمع کرنا اِس کتاب کے مزاج ہی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے مزاج کا تو تقاضا یہی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے سامنے مَدَنی مرحلے کی باتیں مکّی دَور والی تعلیم کے درمیان، اور مکّی مرحلے کی باتیں مَدَنی دَور والی تقریروں کے درمیان، اور ابتدا کی گفتگوئیں آخر کی تلقینات کے بیچ میں، اور آخری دَور کی ہدایات آغازِ کار کی تعلیمات کے پہلو میں بار بار آتی چلی جائیں، تاکہ اسلام کا پورا منظر اور جامع نقشہ اس کی نگاہ میں رہے اور کسی وقت بھی وہ یک رُخا نہ ہونے پائے۔

پھر اگر قرآن کو اس کی نُزُولی ترتیب پر مُرتّب کیا بھی جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لیے صرف اُسی صُورت میں بامعنیٰ ہوسکتی تھی جب کہ قرآن کے ساتھ اس کی پُوری تاریخِ نُزُول اور اس کے ایک ایک جُز کی کیفیتِ نُزُول و شانِ نُزُول لکھ کر لگا دی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہ بات اُس

Maktaba Tul Ishaat.com

مقصد کے خلاف تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا یہ مجموعہ مُرتّب اور محفوظ کرایا تھا۔ وہاں تو پیشِ نظر چیز ہی یہ تھی کہ خالص کلامِ الٰہی بغیر کسی دُوسرے کلام کی آمیزش یا شُمُول کے، اپنی مختصر صُورت میں مُرتّب ہو، جسے بچّے، جوان، بُوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہر حالت میں پڑھیں، اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اُس کا خدا اُس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد فوت ہو جاتا اگر اس مجمُوعۂ کلامِ الٰہی کے ساتھ ایک لمبی چوڑی تاریخ بھی لگی ہوئی ہوتی اور اس کی تلاوت بھی لازم کر دی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، وہ اس کتاب کے مقصد ومُدّعا سے صرف نابلد ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ یہ کتاب محض علمِ تاریخ اور فلسفۂ عمران کے طَلَبہ ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ترتیبِ قرآن کے سلسلے میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہُوئی نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قرآن کو اس طرح مُرتّب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سُورت نازل ہوتی تو آپؐ اُسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بُلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلم بند کرانے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ یہ سُورت فُلاں سُورہ کے بعد اور فُلاں سُورہ سے پہلے رکھی جائے۔ اسی طرح اگر قرآن کا کوئی ایسا حصّہ نازل ہوتا جس کو مستقل سُورت بنانا پیشِ نظر نہ ہوتا، تو آپؐ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اسے فُلاں سُورہ میں فُلاں مقام پر درج کیا جائے۔ پھر اسی ترتیب سے آپؐ خود بھی نماز میں اور دُوسرے مواقع پر قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق صحابۂ کرامؓ بھی اس کو یاد کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک ثابت شُدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید کا نُزُول جس روز مکمّل ہُوا اُسی روز اس کی ترتیب بھی مکمّل ہو گئی۔ جو اُس کا نازِل کرنے والا تھا، وہی اس کا مُرتّب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا، اُسی کے ہاتھوں اسے مُرتّب بھی کرا دیا گیا۔ کسی دُوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔

چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمانوں پر فرض تھی[1]، اور تلاوتِ قرآن کو نماز کا ایک ضروری جُز قرار دیا گیا تھا، اس لیے نزولِ قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا اور جیسے جیسے قرآن اُترتا گیا، مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف کھجور کے اُن پتّوں اور ہڈّی اور جھلّی کے اُن ٹکڑوں ہی پر نہ تھا جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے کاتبوں سے اس کو قلم بند کرایا کرتے تھے، بلکہ وہ اُترتے ہی بیسیوں، پھر سیکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان ہی نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ کا بھی ردّ و بدل کر سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں اِرتداد کا طوفان اُٹھا اور اس کے فرو کرنے کے لیے صحابۂ کرامؓ کو سخت خوں ریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، تو ان معرکوں میں ایسے صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی جن کو پُورا قرآن حفظ تھا۔ اِس سے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہُوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعے پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں ہے، بلکہ الواحِ قلب کے ساتھ ساتھ صفحاتِ قرطاس پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کی ضرورت انھوں نے حضرت ابوبکرؓ پر واضح کی اور انھوں نے کچھ تأمُّل کے بعد اس سے اتفاق کر کے حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری کو، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب (سیکرٹری) رہ چکے تھے، اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ تمام لکھے ہوئے اجزا فراہم کر لیے جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں، دُوسری طرف صحابۂ کرامؓ میں سے بھی جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصّہ لکھا ہوا ملے، وہ ان سے لے لیا جائے[2]، اور پھر حُفّاظِ قرآن سے بھی مدد لی جائے، اور ان تینوں ذرائع کی مُتّفِقہ شہادت پر، کامل صحّت کا اطمینان کرنے کے بعد، قرآن کا ایک ایک لفظ مُصحَف میں ثبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآنِ مجید کا ایک مُستند نسخہ تیار کر کے اُمّ المومنین حضرت حَفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رکھوا دیا گیا

---

[1] واضح رہے کہ پنج وقتہ نماز تو بِعثَت کے کئی سال بعد فرض ہوئی، لیکن نماز بجائے خود اوّل روز ہی سے فرض تھی۔ اسلام کی کوئی ساعت کبھی ایسی نہیں گزری ہے جس میں نماز فرض نہ ہو۔

[2] معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعدِد صحابہؓ نے قرآن کو یا اس کے مختلف اجزا کو اپنے پاس قلم بند کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرات عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عَمرو بن عاص، سالم مَولیٰ حُذَیفہ، زید بن ثابت، مُعاذ بن جَبَل، اُبَیّ بن کَعب اور ابو زید قیس بن السَّکن رضی اللہ عنہم کے ناموں کی تصریح ملتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اور لوگوں کو عام اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کرے اور جو چاہے اِس سے مقابلہ کر کے اپنے نسخے کی تصحیح کر لے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں ویسے ہی فرق پائے جاتے تھے جیسے ہمارے مُلک میں شہر شہر کی بولی اور ضلع ضلع کی بولی میں فرق ہے، حالانکہ زبان سب کی وہی ایک اُردو یا پنجابی یا بنگالی وغیرہ ہے۔ قرآنِ مجید اگرچہ نازل اُس زبان میں ہُوا تھا جو مکّے میں قریش کے لوگ بولتے تھے، لیکن ابتداءً اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ دُوسرے علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق اسے پڑھ لیا کریں، کیونکہ اس طرح معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، صرف عبارت اُن کے لیے ملائم ہو جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر دُنیا کے ایک بڑے حصّے کو فتح کر لیا، اور دُوسری قوموں کے لوگ بھی دائرۂ اسلام میں آنے لگے، اور بڑے پیمانے پر عرب و عجم کے اِختلاط سے عربی زبان متاثّر ہونے لگی، تو یہ اندیشہ پیدا ہُوا کہ اگر اب بھی دُوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کسی دُوسرے شخص کو غیر مانوس طریقے پر کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے سُنے گا اور یہ سمجھ کر اس سے لڑ پڑے گا کہ وہ دانستہ کلامِ الٰہی میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ کہ یہ لفظی اختلافات رفتہ رفتہ واقعی تحریفات کا دروازہ کھول دیں گے۔ یا یہ کہ عرب و عجم کے اختلاط سے جن لوگوں کی زبان بگڑے گی، وہ اپنی بگڑی ہوئی زبان کے مطابق قرآن میں تصرّف کر کے اس کے حُسنِ کلام کو بگاڑ دیں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام مَمالکِ اسلامیہ میں صرف اُس معیاری نسخہ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، اور باقی تمام دُوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مَصاحِف کی اشاعت ممنُوع قرار دے دی جائے۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ٹھیک ٹھیک اُسی مُصحَفِ صدّیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام دیار و امصار میں بھجوائی تھیں۔ اِس وقت بھی دُنیا میں متعدِّد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ کسی کو اگر قرآن کی محفوظیّت میں ذرّہ برابر بھی شک ہو تو وہ اپنا اطمینان اس

طرح کر سکتا ہے کہ مغربی افریقا میں کسی کتاب فروش سے قرآن کا ایک نسخہ خریدے، اور جاوا میں کسی حافظ سے زبانی قرآن سُن کر اس کا مقابلہ کرے، اور پھر دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں حضرت عثمانؓ کے وقت سے لے کر آج تک مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے جو مَصاحِف رکھے ہیں ان سے اس کا تقابُل کر لے۔ اگر کسی حرف یا شوشے کا فرق وہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ دُنیا کو اس سب سے بڑے تاریخی انکشاف سے ضرور مُطّلع کرے۔ کوئی شک نواز قرآن کے مُنزّل مِنَ اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے، یہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یہ تو ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی دُوسری چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس قدر قطعی الثُّبوت ہو۔ اگر کوئی شخص اس کی صحت میں شک کرتا ہے تو وہ پھر اس میں بھی شک کر سکتا ہے کہ رومن امپائر نامی کوئی سلطنت دُنیا میں رہ چکی ہے، اور کبھی مغل ہندوستان پر حکومت کر چکے ہیں، اور ''نپولین'' نام کا کوئی شخص بھی دنیا میں پایا گیا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حقائق پر شکوک کا اظہار کرنا علم کا نہیں، جہالت کا ثبوت ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف دُنیا میں بے شمار انسان بے شمار مقاصد لے کر رُجوع کرتے ہیں۔ ان سب کی ضروریات اور اغراض کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی مشورہ دینا آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طالبوں کے اس ہُجوم میں مجھ کو صرف ان لوگوں سے دلچسپی ہے جو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ یہ کتاب انسان کے مسائلِ زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں یہاں طریقِ مطالعۂ قرآن کے بارے میں کچھ مشورے دُوں گا اور کچھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کروں گا جو بالعُموم انسان کو اس معاملے میں پیش آتی ہیں۔

کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہر حال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اوّلیں کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصوُّرات اور نظریات سے، اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کر لے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کُھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں، وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں، قرآن کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ یہ طریقِ مطالعہ کسی کتاب کو پڑھنے

Maktaba Tul Ishaat.com

کے لیے بھی صحیح نہیں ہے، مگر خُصُوصیّت کے ساتھ قرآن تو اس طرز کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے مَعانی کے دروازے کھولتا ہی نہیں۔

پھر جو شخص محض سرسری سی واقفیت بہم پہنچانا چاہتا ہو، اُس کے لیے تو شاید ایک دفعہ پڑھ لینا کافی ہو جائے، لیکن جو اس کی گہرائیوں میں اُترنا چاہے اس کے لیے دو چار دفعہ کا پڑھنا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کو بار بار پڑھنا چاہیے، ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنا چاہیے، اور ایک طالبِ علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہیے، تاکہ ضروری نِکات نوٹ کرتا جائے۔ اِس طرح جو لوگ پڑھنے پر آمادہ ہوں، اُن کو کم از کم دو مرتبہ پُورے قرآن کو صرف اس غرض کے لیے پڑھنا چاہیے کہ ان کے سامنے بحیثیتِ مجموعی وہ پُورا نظامِ فکر و عمل آجائے جسے یہ کتاب پیش کرنا چاہتی ہے۔ اِس ابتدائی مطالعے کے دَوران میں وہ قرآن کے پُورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ یہ کتاب کیا بُنیادی تصوُّرات پیش کرتی ہے اور پھر ان تصوُّرات پر کس قسم کا نظامِ زندگی تعمیر کرتی ہے۔ اِس اثنا میں اگر کسی مَقام پر کوئی سوال ذہن میں کھٹکے تو اس پر وہیں اُسی وقت کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں بلکہ اسے نوٹ کر لیں اور صبر کے ساتھ آگے مطالعہ جاری رکھیں۔ اغلب یہ ہے کہ آگے کہیں نہ کہیں انھیں اس کا جواب مِل جائے گا۔ اگر جواب مِل جائے تو اپنے سُؤال کے ساتھ اسے نوٹ کر لیں۔ لیکن اگر پہلے مطالعے کے دَوران میں انھیں اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملے تو صبر کے ساتھ دُوسری بار پڑھیں۔ مَیں اپنے تجَربے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ دُوسری بار کے غائر مطالعے میں شاذ و نادر ہی کوئی سوال جوابِ طلب باقی رہ جاتا ہے۔

اِس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کر لینے کے بعد تفصیلی مطالعے کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ناظر کو تعلیماتِ قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ مثلاً وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسانیّت کا کون سا نمونہ ہے جسے قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور کس نمونے کے انسان اس کے نزدیک مبغوض و مردُود ہیں۔ اس مضمُون کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لانے کے لیے اس کو چاہیے کہ اپنی کاپی پر ایک طرف ''پسندیدہ انسان'' اور دُوسری طرف ''ناپسندیدہ انسان'' کی خُصُوصیات آمنے سامنے نوٹ کرتا چلا جائے۔ یا مثلاً وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فلاح و نجات کا مدار کن اُمُور پر ہے، اور کیا چیزیں ہیں جن کو وہ انسان کے لیے نقصان اور ہلاکت اور بربادی کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس مضمون کو بھی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ

جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کاپی پر ’’مُوجباتِ فلاح‘‘ اور ’’مُوجباتِ خُسران‘‘ کے دو عنوانات ایک دُوسرے کے مقابل قائم کر لے اور مطالعۂ قرآن کے دَوران میں روزانہ دونوں قسم کی چیزوں کو نوٹ کرتا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس عقائد، اَخلاق، حُقوق، فرائض، معاشرت، تمدُّن، معیشت، سیاست، قانون، نظمِ جماعت، صلح، جنگ، اور دُوسرے مسائلِ زندگی میں سے ایک ایک کے متعلّق قرآن کی ہدایات کو آدمی نوٹ کرتا چلا جائے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ ان میں سے ہر ہر شعبے کی مجموعی شکل کیا بنتی ہے اور پھر ان سب کو ملا کر جوڑ دینے سے پُورا نقشۂ زندگی کس قسم کا بنتا ہے۔

پھر جب آدمی کسی خاص مسئلۂ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے کہ قرآن کا نقطۂ نظر اس کے متعلّق کیا ہے، تو اس کے لیے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اس مسئلے کے متعلّق قدیم و جدید لٹریچر کا گہرا مطالعہ کر کے واضح طور پر یہ معلوم کر لے کہ اس مسئلے کے بُنیادی نِکات کیا ہیں، انسان نے اب تک اس پر کیا سوچا اور سمجھا ہے، کیا اُمُور اس میں تصفیہ طلب ہیں، اور کہاں جا کر انسانی فکر کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اس کے بعد انھی تصفیہ طلب مسائل کو نگاہ میں رکھ کر آدمی کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح جب آدمی کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسی ایسی آیتوں میں اپنے سوالات کا جواب ملتا ہے جنھیں وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوتا ہے اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہاں یہ مضمون بھی چھپا ہُوا ہے۔

لیکن فہمِ قرآن کی اِن ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی رُوح سے پُوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریّات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصوُّرِ مذہب کے مطابق ایک نِری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رُمُوز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدِّمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھِری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے عَلَم برداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک

Maktaba Tul Ishaat.com

سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پُکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گُسل کش مکش کے دَوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نِزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیّت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہُوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پُوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت اِلَی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُس طرح قدم اُٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجرِبات آپ کو پیش آئیں گے جو نُزُولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکّے اور حَبَش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحُد سے لے کر حُنَین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابُوجَہل اور ابُولَہَب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہُود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقینِ اوّلین سے لے کر مُؤَلَّفَۃُ القُلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اَور ہی قسم کا ''سُلوک'' ہے، جس کو میں ''سُلُوکِ قرآنی'' کہتا ہوں۔ اِس سُلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اور نَحو اور معانی اور بیان کے کچھ نِکات سالک کی نگاہ سے چھُپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بُخل برت جائے۔

پھر اسی کُلیّے کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اَخلاقی تعلیمات، اس کی مَعاشی اور تمدّنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصُول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے

ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی رَوِش کے خلاف چل رہے ہوں۔

قرآن کے اس دعوے سے ہر کہ و مہ واقف ہے کہ وہ تمام نَوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا رُوئے سُخَن زیادہ تر اپنے زمانۂ نزُول کے اہلِ عرب کی طرف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بنی آدم اور عامّۃ النّاس کو بھی پکارتا ہے، لیکن اکثر باتیں وہ ایسی کہتا ہے جو عرب کے مذاق، عرب ہی کے ماحول، عرب ہی کی تاریخ، اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلّق رکھتی ہیں۔ اِن چیزوں کو دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ جو چیز عام انسانوں کی ہدایت کے لیے اُتاری گئی تھی اس میں وقتی اور مقامی اور قومی عُنصُر اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ چیز اصل میں تو اپنے ہم عصر اہلِ عرب ہی کی اصلاح کے لیے تھی، لیکن بعد میں زبردستی کھینچ تان کر اسے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے کتابِ ہدایت قرار دے دیا گیا۔

جو شخص یہ اعتراض محض اعتراض کی خاطر نہیں اُٹھاتا، بلکہ فی الواقع اسے سمجھنا چاہتا ہے، اُسے مَیں مشورہ دُوں گا کہ وہ پہلے خود قرآن کو پڑھ کر ذرا اُن مقامات پر نشان لگائے جہاں اُس نے کوئی ایسا عقیدہ، یا خیال، یا تصوُّر پیش کیا ہو، یا کوئی ایسا اَخلاقی اُصُول، یا عملی قاعدہ و ضابطہ بیان کیا ہو جو صرف عرب ہی کے لیے مخصُوص ہو، اور جس کو وقت اور زمانے اور مقام نے فی الواقع محدُود کر رکھا ہو۔ محض یہ بات کہ وہ ایک خاص مقام اور زمانے کے لوگوں کو خطاب کر کے ان کے مُشرکانہ عقائد اور رُسُوم کی تردید کرتا ہے، اور انھی کے گردوپیش کی چیزوں کو موادِ اِستِدلال کے طور پر لے کر توحید کے دلائل قائم کرتا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی دعوت اور اس کا اپیل بھی وقتی اور مقامی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شرک کی تردید میں جو کچھ وہ کہتا ہے کیا وہ دُنیا کے ہر شرک پر اُسی طرح چسپاں نہیں ہوتا جس طرح مُشرکینِ عرب کے شرک پر چسپاں ہوتا تھا؟ کیا انھی دلائل کو ہم ہر زمانے اور ہر ملک کے مشرکین کی اصلاحِ خیال کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟ اور کیا اثباتِ توحید کے لیے قرآن کے طرزِ اِستِدلال کو تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ کام میں نہیں لایا جا سکتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک عالَم گیر تعلیم کو صرف اس بنا پر وقتی و مقامی قرار دیا جائے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص قوم کو

Maktaba Tul Ishaat.com

خطاب کر کے وہ پیش کی گئی تھی۔ دُنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظامِ زندگی اور کوئی مذہبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کی ساری باتیں از اوّل تا آخر تجریدی (abstract) طرزِ بیان میں پیش کی گئی ہوں اور کسی متعیّن حالت یا صُورت پر اس کو چسپاں کر کے اُن کی توضیح نہ کی گئی ہو۔ ایسی مکمّل تجرید اوّل تو ممکن نہیں ہے، اور ممکن ہو بھی تو جو چیز اِس طریقے پر پیش کی جائے گی وہ صرف صفحۂ کاغذ ہی پر رہ جائے گی، انسانوں کی زندگی میں اس کا جذب ہو کر ایک عملی نظام میں تبدیل ہونا محال ہے۔

پھر کسی فکری و اَخلاقی اور تمدّنی تحریک کو اگر بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانا مقصُود ہو، تو اس کے لیے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مفید بھی نہیں ہے، کہ شروع سے اس کو بالکل ہی بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت اس کا صحیح عملی طریقہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن افکار اور نظریّات اور اُصُولوں پر وہ تحریک انسانی زندگی کے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے، انھیں پُوری قوّت کے ساتھ خود اُس مُلک میں پیش کیا جائے جہاں سے اس کی دعوت اُٹھی ہو، اُن لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے جن کی زبان اور مزاج اور عادات و خصائل سے اس تحریک کے داعی بخوبی واقف ہوں، اور پھر اپنے ہی ملک میں ان اُصُولوں کو عملاً برت کر اور ان پر ایک کامیاب نظامِ زندگی چلا کر دُنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا جائے۔ تبھی دُوسری قومیں اس کی طرف توجّہ کریں گی اور ان کے ذہین آدمی خود آگے بڑھ کر اسے سمجھنے اور اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا محض یہ بات کہ کسی نظامِ فکر و عمل کو ابتداءً ایک ہی قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور اِستِدلال کا سارا زور اسی کو سمجھانے اور مطمئن کرنے پر صَرف کر دیا گیا تھا، اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نظامِ فکر و عمل محض قومی ہے۔ فی الواقع جو خُصُوصیّات ایک قومی نظام کو ایک بین الاقوامی نظام سے اور ایک وقتی نظام کو ایک اَبَدی نظام سے مُمیّز کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قومی نظام یا تو ایک قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حُقوق کا مدّعی ہوتا ہے، یا اپنے اندر کچھ ایسے اُصُول اور نظریّات رکھتا ہے جو دُوسری اقوام میں نہیں چل سکتے۔ اس کے برعکس جو نظام بین الاقوامی ہوتا ہے، وہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ اور برابر کے حُقوق دینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور اُس کے اُصُولوں میں بھی عالَم گیریّت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقتی نظام لازمی طور پر اپنی بُنیاد کچھ ایسے اُصُولوں پر رکھتا ہے جو زمانے کی چند پلٹیوں کے بعد صریحاً ناقابلِ عمل ہو جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک

ابدی نظام کے اُصول تمام بدلتے ہوئے حالات پر منطبق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان خُصُوصیّات کو نگاہ میں رکھ کر کوئی شخص خود قرآن کو پڑھے اور اُن چیزوں کو ذرا متعیّن کرنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر واقعی یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ قرآن کا پیش کردہ نظام وقتی اور قومی ہے۔

قرآن کے متعلّق یہ بات بھی ایک عام ناظر کے کان میں پڑی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ایک مفصّل ہدایت نامہ اور ایک کتابِ آئین ہے۔ مگر جب وہ اسے پڑھتا ہے تو اس میں معاشرت اور تمدُّن اور سیاست اور معیشت وغیرہ کے تفصیلی احکام وضوابط اس کو نہیں ملتے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے متعلق بھی، جن پر قرآن بار بار اِس قدر زور دیتا ہے، اس نے کوئی ایسا ضابطہ تجویز نہیں کیا ہے جس میں تمام ضروری احکام کی تفصیل درج ہو۔ یہ چیز بھی آدمی کے ذہن میں خَلجان پیدا کرتی ہے کہ آخر یہ کس معنٰی میں ہدایت نامہ ہے۔

اس معاملے میں ساری اُلجھن صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہ سے حقیقت کا ایک پہلو بالکل اوجھل رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اگر اصل اسکیم یہ ہو کہ بس ایک نقشۂ تعمیر لوگوں کو دے دیا جائے اور لوگ اس کے مطابق خود عمارت بنا لیں، تو اس صورت میں بلاشبہ تعمیر کے ایک ایک جُز کی تفصیل ہم کو ملنی چاہیے۔ لیکن جب تعمیری ہدایات کے ساتھ ایک انجینیر بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دے، تو پھر انجینیر اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو نظر انداز کر کے صرف نقشے ہی میں تمام جُزئیات کی تفصیل تلاش کرنا، اور پھر اسے نہ پا کر نقشے کی ناتمامی کا شکوہ کرنا غلط ہے۔ قرآن جُزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اُصول اور کُلّیّات کی کتاب ہے۔ اُس کا اصل کام یہ ہے کہ نظامِ اسلامی کی فکری اور اَخلاقی بنیادوں کو پُوری وضاحت کے ساتھ نہ صرف پیش کرے بلکہ عقلی استدلال اور جذباتی اپیل، دونوں کے ذریعے سے خوب مستحکم بھی کر دے۔ اب رہی اسلامی زندگی کی عملی صُورت، تو اس معاملے میں وہ انسان کی رہنمائی اس طریقے سے نہیں کرتا کہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلّق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتائے، بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حُدُودِ اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے، جو اس بات کا تعیّن کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اِن شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر

Maktaba Tul Ishaat.com

ہونی چاہیے۔ اِن ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صُورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ اُنھیں مامور ہی اِس لیے کیا گیا تھا کہ دُنیا کو اُس انفرادی سیرت و کردار اور اُس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھادیں جو قرآن کے دیے ہوئے اُصُولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

ایک اور سوال جو بالعُموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن اُن لوگوں کی انتہائی مذمّت کرتا ہے جو کتابُ اللہ کے آ جانے کے بعد تفرِقے اور اختلاف میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اور دُوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر و تفسیر میں صرف مُتأخرین ہی نہیں، ائمہ اور تابعین اور خود صحابہؓ تک کے درمیان اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی احکامی آیت ایسی نہ ملے گی جس کی ایک تفسیر بالکل مُتَّفَق عَلَیۃ ہو۔ کیا یہ سب لوگ اُس مذمّت کے مِصداق ہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ کون سا تفرِقہ و اختلاف ہے جس سے قرآن منع کرتا ہے؟

یہ ایک نہایت وسیع الاطراف مسئلہ ہے جس پر مفصّل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں قرآن کے ایک عامی طالبِ علم کی اُلجھن دُور کرنے کے لیے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ قرآن اُس صحّت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظامِ جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمّت اُس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاعِ باہمی تک نوبت پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دُوسرے سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی رُوح ہے۔ وہ ہر اُس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل و فکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہوسکتی ہے جو ذہین انسانوں سے نہیں بلکہ لکڑی کے کُندوں سے مُرکّب ہو۔ رہا دُوسری قسم کا اختلاف، تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اُٹھایا اُس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رُونما ہونا صحّت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اور اس کے نتائج کبھی کسی اُمّت کے حق میں بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

ان دونوں قسم کے اختلافات کا فرق واضح طور پر یوں سمجھیے کہ:

ایک صُورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسُولؐ کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنّت کو مانا جائے، اور پھر دو عالم کسی جُزوی مسئلے کی تحقیق میں، یا دو قاضی کسی مقدّمے کے فیصلے میں ایک دُوسرے سے اختلاف کریں، مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو، اور اس میں اپنی رائے کو مدارِ دین بنائے اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کر دیں، اور یہ بات رائے عام پر، یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظامِ جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صُورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بُنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے، یا یہ کہ کوئی عالم یا صُوفی یا مُفتی یا مُتکلّم یا لیڈر کسی ایسے مسئلے میں جس کو خدا اور رسُول نے دین کا بُنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا، ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو دین کا بُنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اس سے اختلاف کرے اس کو خارج از دین و ملّت قرار دے، اور اپنے حامیوں کا ایک جتّھا بنا کر کہے کہ اصل اُمّتِ مُسلِمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنّمی ہیں، اور ہانک پُکار کر کہے کہ مُسلِم ہے تو بس اس جتّھے میں آ جا ورنہ تو مُسلِم ہی نہیں ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے، اُس سے اس کی مراد یہ دُوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف، تو اس کی متعدّد مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آ چکی تھیں، اور آپؐ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا، بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اس لیے کہ وہ اختلاف تو اس بات کا پتا دیتا ہے کہ جماعت میں غور و فکر اور تحقیق و تجسُّس اور فہم و تَفَقُّہ کی صلاحیّتیں موجود ہیں، اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اس کے احکام سے دلچسپی ہے، اور ان کی ذہانتیں اپنے مسائلِ زندگی کا حل دین کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں، اور جماعت بحیثیتِ مجموعی اِس زرّین قاعدے پر عامل ہے کہ اُصُول میں متفق رہ کر اپنی وحدت برقرار رکھے اور پھر اپنے اہلِ علم و فکر کو صحیح حُدُود کے اندر تحقیق و اجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللّٰہ ، علیہ توکلت والیہ انیب

اس مُقدّمے میں تمام اُن مسائل کا اِستِقصا کرنا میرے پیشِ نظر نہیں ہے جو مطالعۂ قرآن کے دَوران میں ایک ناظِر کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوالات کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی آیت یا سُورت کے سامنے آنے پر ذہن کو کھٹکتا ہے، اور اس کا جواب تفہیمُ القرآن میں برسرِ موقع دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے سوالات کو چھوڑ کر مَیں نے یہاں صرف اُن جامع مسائل سے بحث کی ہے جو بحیثیتِ مجموعی پُورے قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرینِ کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدّمے کو دیکھ کر ہی اس کے تِشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کر دیں، بلکہ پُوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں، یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مُطّلَع فرمائیں۔

تفہیم القرآن

الفاتحہ ــــــــ (۱)

و

البقرہ ــــــــ (۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الفاتحہ

نام اِس کا نام "الفاتحہ" اِس کے مضمون کی مناسبت سے ہے۔ "فاتحہ" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون، یا کتاب، یا کسی شے کا افتتاح ہو۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ نام "دیباچہ" اور آغازِ کلام کا ہم معنیٰ ہے۔

زمانۂ نزول یہ نبوّتِ محمدیؐ کے بالکل ابتدائی زمانے کی سُورت ہے۔ بلکہ معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمّل سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ یہی ہے۔ اِس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سُورۂ عَلَق، سُورۂ مُزّمّل اور سورۂ مُدّثّر وغیرہ میں شامل ہیں۔

مضمون دراصل یہ سُورہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہراُس انسان کو سکھائی ہے جو اس کی کتاب کا مُطالَعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوندِ عالَم سے یہ دعا کرو۔

انسان فطرتاً دُعا اُسی چیز کی کیا کرتا ہے جس کی طلب اور خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے، اور اُسی صورت میں کرتا ہے جب کہ اُسے یہ احساس ہو کہ اس کی مطلوب چیز اُس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دُعا کر رہا ہے۔ پس قرآن کی ابتدا میں اِس دُعا کی تعلیم دے کر گویا انسان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو راہِ راست کی جستجو کے لیے پڑھے، طالبِ حق کی سی ذہنیت لے کر پڑھے، اور یہ جان لے کہ علم کا سرچشمہ خداوندِ عالَم ہے، اس لیے اُسی سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔

اِس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مُقدّمے کا سا نہیں بلکہ دُعا اور جوابِ دُعا کا سا ہے۔ سُورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اُس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔

(المنزل)

رکوعاتها ۱ — آیاتها ۷

سُوۡرَةُ الۡفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم[1] ہے۔

تعریف اللہ ہی کے لیے[2] ہے جو تمام کائنات کا رب[3] ہے، رحمٰن اور رحیم[4] ہے،

۱ – اِسلام جو تہذیب انسان کو سکھاتا ہے، اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کی ابتدا خدا کے نام سے کرے۔ اِس قاعدے کی پابندی اگر شعور اور خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس سے لازماً تین فائدے حاصل ہوں گے: ایک یہ کہ آدمی بہت سے بُرے کاموں سے بچ جائے گا، کیونکہ خدا کا نام لینے کی عادت اُسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر خدا کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟ دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح اور نیک کاموں کی ابتدا کرتے ہوئے خدا کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سَمت اختیار کر لے گی اور وہ ہمیشہ صحیح ترین نقطے سے اپنی حرکت کا آغاز کرے گا۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ خدا کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو خدا کی تائید اور توفیق اس کے شاملِ حال ہوگی، اس کی سعی میں برکت ڈالی جائے گی اور شیطان کی فساد انگیزیوں سے اُس کو بچایا جائے گا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ بھی بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔

۲ – جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سُورۂ فاتحہ اصل میں تو ایک دُعا ہے، لیکن دُعا کی ابتدا اس ہستی کی تعریف سے کی جا رہی ہے جس سے ہم دُعا مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دُعا جب مانگو تو مہذب طریقے سے مانگو۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ منہ کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کر دیا۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دُعا کر رہے ہو، پہلے اُس کی خوبی کا، اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں، دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو، قطعِ نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دُوسرے، یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رَطب اللّسان ہوں۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ "تعریف اللہ ہی" کے لیے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے، اور وہ حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں، جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے، اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات

Maktaba Tul Ishaat.com

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ۭ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ۭ

روزِ جزا کا مالک[5] ہے۔

ہم تیری ہی[6] عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں[7]۔

ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عَطِیّہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند اور شکر گزار، نیاز مند اور خدمت گار بنیں، تو وہ خالقِ کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال۔

۳ – ربّ کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے: (۱) مالک اور آقا۔ (۲) مُربّی، پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا۔ (۳) فرمانروا، حاکم، مدبّر اور منتظم۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے۔

۴ – انسان کا خاصّہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغے کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے، اور اگر ایک مبالغے کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا، تو پھر وہ اسی معنیٰ کا ایک اَور لفظ بولتا ہے، تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغے میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغے کا صیغہ ہے۔ لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حد وحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغے کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں "سخی" کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر "داتا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب "گورے" کو کافی نہیں پاتے تو اس پر "چِٹّے" کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازیِ قد کے ذکر میں جب "لمبا" کہنے سے تسلّی نہیں ہوتی تو اس کے بعد "تڑنگا" بھی کہتے ہیں۔

۵ – یعنی اُس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامۂ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صِلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن اور رحیم کہنے کے بعد مالکِ روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ بڑا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ مُنصف بھی ہے، اور منصف بھی ایسا بااختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا، نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی رُبُوبیّت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبّت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور بُرائی بالکلیّہ اُسی کے اختیار میں ہے۔

۶ – عبادت کا لفظ بھی عربی زبان میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) پُوجا اور پرستش۔ (۲) اطاعت اور

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ

ع ۱

ہمیں سیدھا راستہ دکھا[8]، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا[9]، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں[10]۔ ع

فرماں برداری۔ (۳) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنی بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیع فرمان بھی اور بندہ و غلام بھی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تیرے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے۔ اِن تینوں معنوں میں سے کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبُود نہیں ہے۔

۷ – یعنی تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تُو ہی ہے، اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے، اس لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رُجوع کرتے ہیں، تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی یہ درخواست لے کر تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

۸ – یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو، جس میں غلط بینی اور غلط کاری اور بد انجامی کا خطرہ نہ ہو، جس پر چل کر ہم سچّی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں —— یہ ہے وہ درخواست جو قرآن کا مُطالعَہ شروع کرتے ہوئے بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس کی گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بھلیّاں میں حقیقتِ نفس الامری کیا ہے، اَخلاق کے ان مختلف نظریّات میں صحیح نظامِ اَخلاق کون سا ہے، زندگی کی اِن بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی سیدھی اور صاف شاہراہ کون سی ہے۔

۹ – یہ اُس سیدھے راستے کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا، وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔

۱۰ – یعنی ’’انعام‘‘ پانے والوں سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بظاہر عارضی طور پر تیری دُنیوی نعمتوں سے سرفراز تو ہوتے ہیں مگر دراصل وہ تیرے غضب کے مستحق ہُوا کرتے ہیں اور اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سلبی تشریح سے یہ بات خود کھل جاتی ہے کہ ’’انعام‘‘ سے ہماری مراد حقیقی اور پائدار انعامات ہیں جو راست روی اور خدا کی خوشنودی کے نتیجے میں ملا کرتے ہیں، نہ کہ وہ عارضی اور نمایشی انعامات جو پہلے بھی فرعونوں اور نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو ملے ہوئے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

البقرہ

نام اور وجہ تسمیہ اِس سورت کا نام ”بقرہ“ اِس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآنِ مجید کی ہر سورت میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مال دار ہے، مگر بہر حال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سُورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سُورت کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ”وہ سورت جس میں گائے کا ذکر آیا ہے۔“

زمانۂ نزول اِس سُورت کا بیشتر حصّہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مَدَنی زندگی کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوا ہے، اور کمتر حصّہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبتِ مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ حتّٰی کہ سُود کی مُمانعت کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں، وہ بھی اس میں شامل ہیں، حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانے میں اُتری تھیں۔ سورت کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے، وہ ہجرت سے پہلے مکّے میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اِسی سورت میں ضم کر دیا گیا ہے۔

شانِ نزول اِس سورت کو سمجھنے کے لیے پہلے اِس کا تاریخی پَس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکّے میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکینِ عرب سے تھا، جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینے سے بالکل متّصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے اُن کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اُصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دور ہٹا دیا تھا[۱]۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے تورات میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رُسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے تورات میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود تورات کو اُنھوں نے انسانی کلام کے اندر خلط مَلط

---

۱ اس وقت حضرت موسیٰ کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ نے ۱۲۷۲ قبلِ مسیح میں وفات پائی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ بعدِ مسیح میں منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معناً محفوظ تھا، اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی رُوح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیّت کا محض ایک بے جان ڈھانچا باقی تھا جس کو وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علما اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اَخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی، اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی مَحبّت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، مُوشگافیوں اور فرقہ بندیوں، اُستُخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام ''مسلم'' تک بُھول گئے تھے، محض ''یہُودی'' بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وِراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں، چنانچہ سُورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رُکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اَخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خُصوصیّات کے مقابلے میں حقیقی دین کے اُصُول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی اُمّت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دین داری کے مقابلے میں حقیقی دین داری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اُصُول کیا ہیں، اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیّت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ کے میں تو معاملہ صرف اُصُولِ دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تَربیَت تک محدُود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بُنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدُّن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اُصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظامِ زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورت کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انھی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسبِ ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کش مکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے۔ مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینے میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے اور اُنھوں نے ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم کر لی تو صورتِ حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دُوسری طرف تمام عرب اس کا اِستیصال کر دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ اب اِس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ اوّلاً، وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً، وہ مخالفین کا برسرِ باطل ہونا اس طرح ثابت و مُبرہَن کردے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً، بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مُزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقروفاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھِر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، بلکہ پورے صبروثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً، وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلّح مزاحمت کا مسلّح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادّی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً، ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمایش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تأمّل نہ ہو ___ اللہ تعالیٰ نے اِس سورت میں ان پانچوں اُمور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلے میں ایک نیا عُنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا، اور یہ منافقین کا عُنصر تھا۔ اگرچہ نِفاق کے ابتدائی آثار مکے کے آخری زمانے میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہاں صرف اس قسم کے منافق پائے جاتے تھے جو اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے، لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی اور اپنے دُنیوی تعلقات کا انقطاع اور اُن مصائب وشدائد کو بھی برداشت کرلیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہوجاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قِسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ برپا کرنے کے لیے جماعتِ مسلمین میں داخل ہوجاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اسلامی جماعت کے دائرہ اقتدار میں گھِر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفینِ اسلام سے بھی ربط رکھیں، تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے مُتمتّع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردّد تھے۔ انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا۔ مگر چونکہ ان کے قبیلے یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہوچکے تھے، اس لیے یہ بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امرِ حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہوچکے تھے، مگر جاہلیت کے طریقے اور اَوہام اور رسمیں چھوڑنے اور اَخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔

سورۂ بقرہ کے نُزول کے وقت ان مختلف اقسام کے منافقین کے ظہور کی محض ابتدا تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں۔ بعد میں جتنی جتنی اِن کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں، اُسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

الجزء ۱

ركوعاتها ۴۰ — سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ — اٰياتها ۲۸۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى

معانقة ۱

الف، لام، میم[۱]۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں[۲]۔ ہدایت ہے

۱ – یہ حُرُوفِ مُقَطَّعات قرآنِ مجید کی بعض سُورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، اُس دَور کے اسالیبِ بیان میں اِس طرح کے حُرُوفِ مُقَطَّعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعرا دونوں اِس اُسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلامِ جاہلیّت کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اِس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مُقَطَّعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعُموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنیٰ حُرُوف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی رِوایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنیٰ پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اُسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسّرین کے لیے ان کے معانی متعیّن کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حُرُوف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنیٰ نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی نَقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

۲ – اس کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ ’’بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔‘‘ مگر ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جتنی کتابیں اُمورِ مابعد الطبیعت اور حقائقِ ماورائے اِدراک سے بحث کرتی ہیں، وہ سب قیاس و گمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے، خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سراسر علمِ حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے، اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دُوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

اُن پرہیزگار لوگوں کے[۳] لیے جو غیب پر ایمان لاتے[۴] ہیں، نماز قائم کرتے ہیں[۵]، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶]، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن)

۳- یعنی یہ کتاب ہے تو سراسر ہدایت و رہنمائی، مگر اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ آدمی "پرہیزگار" ہو۔ بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو۔ بُرائی سے بچنا چاہتا ہو۔ بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ رہے وہ لوگ، جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں، جنھیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو، یا جدھر خواہشِ نفس دھکیل دے، یا جدھر قدم اُٹھ جائیں، اسی طرف چل پڑتے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے۔

۴- یہ قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دوسری شرط ہے۔ "غیب" سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آتیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنت، دوزخ وغیرہ۔ ان حقیقتوں کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ نبیؐ ان کی خبر دے رہا ہے، ایمان بالغیب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار ہو، صرف وہی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ رہا وہ شخص جو ماننے کے لیے دیکھنے اور چکھنے اور سُونگھنے کی شرط لگائے، اور جو کہے کہ میں کسی ایسی چیز کو نہیں مان سکتا جو ناپی اور تولی نہ جاسکتی ہو، تو وہ اس کتاب سے ہدایت نہیں پا سکتا۔

۵- یہ تیسری شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صرف مان کر بیٹھ جانے والے ہوں وہ قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایمان لانے کے بعد فوراً ہی عملی اطاعت کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اور عملی اطاعت کی اوّلین علامت اور دائمی علامت نماز ہے۔ ایمان لانے پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرتے کہ مُؤذِّن نماز کے لیے پکارتا ہے اور اسی وقت فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیے بھی تیار ہے یا نہیں۔ پھر یہ مُؤذِّن روز پانچ وقت پکارتا رہتا ہے، اور جب بھی انسان اس کی پکار پر لبیک نہ کہے، اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ مدعیِ ایمان اطاعت سے خارج ہو گیا ہے۔ پس ترکِ نماز دراصل ترکِ اطاعت ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جو شخص کسی کی ہدایت پر کاربند ہونے کے لیے تیار ہی نہ ہو، اُس کے لیے ہدایت دینا اور نہ دینا یکساں ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی بستی میں ایک ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو، لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کے ادا کرنے کا نظم نہ ہو، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں،[۷] اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔[۸] ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

نماز قائم کی جا رہی ہے۔

۶- یہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے چوتھی شرط ہے کہ آدمی تنگ دل نہ ہو، زر پرست نہ ہو، اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حُقوق مقرر کیے جائیں اُنھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہو، جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کرے۔

۷- یہ پانچویں شرط ہے کہ آدمی اُن تمام کتابوں کو برحق تسلیم کرے جو وحی کے ذریعے سے خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیا پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں۔ اس شرط کی بنا پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ اُن سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس ضرورت ہی کے قائل نہ ہوں کہ انسان کو خدا کی طرف سے ہدایت ملنی چاہیے، یا اس ضرورت کے تو قائل ہوں مگر اس کے لیے وحی و رسالت کی طرف رُجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے ہوں اور خود کچھ نظریّات قائم کر کے انھی کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں، یا آسمانی کتابوں کے بھی قائل ہوں، مگر صرف اُس کتاب یا اُن کتابوں پر ایمان لائیں جنھیں ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں، رہیں اُسی سرچشمے سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات، تو وہ اُن کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسے سب لوگوں کو الگ کر کے قرآن اپنا چشمۂ فیض صرف اُن لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج بھی مانتے ہوں، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ خدا کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے ذریعے سے ہی خلق تک پہنچتی ہے، اور پھر وہ کسی نسلی و قومی تعصّب میں بھی مُبتلا نہ ہوں بلکہ خالص حق کے پرستار ہوں، اس لیے حق جہاں جہاں جس شکل میں بھی آیا ہے، اس کے آگے سر جھکا دیں۔

۸- یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ ”آخرت“ ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اِس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۲) یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام اَبدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳) یہ کہ اس عالَم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ
تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى
سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ ع
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ

جن لوگوں نے (اِن باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا[9]، اُن کے لیے یکساں ہے، خواہ تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مُہر لگا دی[10] ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں ؏

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ

---

(۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنّت میں جائیں گے، اور جو لوگ بد ٹھیریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوش حالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھیرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اِس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو، وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو، تو وہ اس راستے پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔

۹ – یعنی وہ چھ کی چھ شرطیں، جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، پوری نہ کیں، اور ان سب کو، یا اِن میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۰ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مُہر لگا دی تھی، اِس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اُنھوں نے اُن بنیادی اُمور کو رَدّ کر دیا جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستے کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا، تو اللہ نے اُن کے دِلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی۔ اِس مُہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اُس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رَدّ کر دیتا ہے، تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سمت میں چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقے کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے

وقف لازم

بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ
اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ؕ﴿۹﴾ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ
مَرَضًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ ۬ۙ بِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا قِیۡلَ
لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾
اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا

مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔[11] ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا،[12] اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں، اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی اُن سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ـــــ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انھیں شعور نہیں ہے۔ اور جب

کہ فی الواقع اس کے دل پر مُہر لگی ہوئی ہے۔

۱۱- یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مُبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ رَوش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں ایک منافق چند روز کے لیے تو لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے مگر ہمیشہ اس کا دھوکا نہیں چل سکتا۔ آخرِ کار اس کی منافقت کا راز فاش ہو کر رہتا ہے، اور پھر معاشرے میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ رہی آخرت، تو وہاں ایمان کا زبانی دعویٰ کوئی قیمت نہیں رکھتا اگر عمل اس کے خلاف ہو۔

۱۲- بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ منافقین کو ان کے نِفاق کی سزا فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منافق لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان[۱۳] لاؤ، تو انھوں نے یہی جواب دیا: "کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں[۱۴]؟" ـــــ خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اور جب علیٰحدگی میں اپنے شیطانوں[۱۵] سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں ـــــ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ اِن کی رسّی دراز کیے جاتا ہے، اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔

۱۳ – یعنی جس طرح تمھاری قوم کے دوسرے لوگ سچّائی اور خلوص کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمان داری کے ساتھ سچّے دل سے قبول کرو۔

۱۴ – وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مَشقّتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام مُلک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقل مندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے، بلکہ ہر معاملے میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

۱۵ – شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرّد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جِنّ، دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطینِ جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مَقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مُراد ہیں اور کہاں جِن۔ اِس مقام پر شیاطین کا لفظ اُن بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي
اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ
وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ

یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ اِن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا، تو اللہ نے اِن کا نورِ بصارت سَلب کر لیا اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں[16] آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں[17]، یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سُن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں اُنگلیاں

۱۶- مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے، ان پر تو ساری حقیقتیں روشن ہوگئیں، مگر یہ منافق، جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے، ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ ''اللہ نے نورِ بصارت سلب کر لیا'' کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب اُنھوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرما دی۔

۱۷- حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ
وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ ع

ٹھونسے لیتے ہیں، اور اللہ اِن منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔[۱۸] چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی اِن کی بصارت اُچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دُور چل لیتے ہیں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں[۱۹] ——— اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سَلب کر لیتا،[۲۰] یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

۱۸ – یعنی کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر وہ اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے اس غلط فہمی میں تو ڈال سکتے ہیں کہ ہلاکت سے بچ جائیں گے مگر فی الواقع اس طرح وہ بچ نہیں سکتے، کیونکہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان پر محیط ہے۔

۱۹ – پہلی مثال اُن منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مَصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ اور یہ دُوسری مثال اُن کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضُعفِ ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے، مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مُراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مُجاہدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلے میں اہلِ جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان منافقین کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں، اور جب مشکلات کے دَل بادل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصّباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے، تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۲۰ – یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نورِ بصارت اس نے بالکل سَلب کر لیا، اسی طرح اللہ ان کو بھی حق کے لیے اندھا بہرا بنا سکتا تھا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہو، اسے اُتنا بھی نہ دیکھنے سُننے دے۔ جس قدر حق دیکھنے اور حق سُننے کے لیے یہ تیار تھے، اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ
رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا

لوگو![21] بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع[22] اِسی صورت سے ہوسکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دُوسروں کو اللہ کا مدِ مقابل[23] نہ ٹھیراؤ۔

اور اگر تمھیں اِس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو

۲۱ – اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی پر اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کے بعد اب تمام نوعِ انسانی کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بُلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

۲۲ – یعنی دنیا میں غلط بینی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے بچنے کی توقع۔

۲۳ – یعنی جب تم خود بھی اِس بات کے قائل ہو اور تمھیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں، تو پھر تمھاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہوسکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل ٹھیرانے سے مُراد یہ ہے کہ بندگی و عبادت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رویّہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ عبادت کی وہ اقسام کون کون سی ہیں جنھیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور جن میں دوسروں کو شریک ٹھیرانا وہ "شرک" ہے، جسے روکنے کے لیے قرآن آیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا
بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا

بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔[۲۴] لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اُس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر،[۲۵] جو مہیا کی گئی ہے منکرینِ حق کے لیے۔

اور اے پیغمبرؐ! جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں، انھیں خوش خبری دے دو کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔[۲۶] ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی،[۲۷] اور وہ وہاں

۲۴ – اِس سے پہلے مکّے میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اِس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینے پہنچ کر پھر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ یونُس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہُود، آیت ۱۳۔ بنی اسرائیل، آیت ۸۸۔ الطُّور، آیات ۳۳، ۳۴)

۲۵ – اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ بنو گے، بلکہ تمھارے وہ بُت بھی وہاں تمھارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا معبُود و مسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

۲۶ – یعنی نرالے اور اجنبی پھل نہ ہوں گے، جن سے وہ نامانوس ہوں۔ شکل میں اُنھی پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے جن سے وہ دُنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وہ ان سے بدرجہا زیادہ بڑھے ہوئے ہوں گے۔ دیکھنے میں مثلاً آم اور انار

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ
وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ
یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ

وقف لازم

ہمیشہ رہیں گے۔

ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں[۲۸] دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انھی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انھیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے[۲۹]۔ اور گمراہی میں وہ انھی کو مبتلا کرتا ہے، جو

اور سنترے ہی ہوں گے۔ اہلِ جنّت ہر پھل کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ آم ہے اور یہ انار ہے اور یہ سنترا۔ مگر مزے میں دُنیا کے آموں اور اناروں اور سنتروں کو ان سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔

۲۷ – عربی متن میں اَزْوَاجٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں "جوڑے"۔ اور یہ لفظ شوہر اور بیوی، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شوہر کے لیے بیوی "زوج" ہے اور بیوی کے لیے شوہر "زوج"۔ مگر وہاں یہ ازواج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے۔ اگر دُنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے، تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دُوسری نیک بیوی دے دی جائے گی۔ اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد، تو وہاں وہ اِس بُرے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی اور کوئی نیک مرد اس کا شریکِ زندگی بنا دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں کوئی شوہر اور بیوی دونوں نیک ہیں، تو وہاں ان کا یہی رشتہ اَبدی و سرمدی ہو جائے گا۔

۲۸ – یہاں ایک اعتراض کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر توضیحِ مدعا کے لیے مکڑی، مکھی، مچھر وغیرہ کی جو تمثیلیں دی گئی ہیں، اُن پر مخالفین کو اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلامِ الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں۔

۲۹ – یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے، اُن کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں

Maktaba-Tul-Ishaat.com

اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ
مِیْثَاقِهٖ ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ
فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ
وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ

فاسق ہیں[30]، اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[31]، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں[32]، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں[33]۔ حقیقت میں یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویّہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان سَلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر

اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اَور زیادہ دُور چلے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں، ان کو انھی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔

۳۰- فاسق: نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

۳۱- بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایات جاری کرتا ہے، ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے، جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔ ''مضبوط باندھ لینے کے بعد'' سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدمؑ کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۲ میں اس عہد و اقرار پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۲- یعنی جن روابط کے قیام اور استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے، اور جنھیں دُرست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس مختصر سے جملے میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدّن و اَخلاق کی پوری دنیا پر، جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات تک پھیلی ہوئی ہے، صرف یہی ایک جملہ

اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ
جَمِیۡعًا ٭ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ
ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ ع وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ

اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے، جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر اوپر کی طرف توجّہ فرمائی اور سات آسمان[۳۴] اُستوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے[۳۵] ع

پھر ذرا[۳۶] اس وقت کا تصوّر کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں[۳۷] سے کہا تھا کہ ”میں

حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مُراد محض تعلّقاتِ انسانی کا انقطاع ہی نہیں ہے، بلکہ تعلّقات کی صحیح اور جائز صُورتوں کے سوا جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی، وہ سب اسی ذیل میں آجائیں گی، کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطعِ روابط کا ہے، یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظامِ اَخلاق وتمدُّن کی بربادی۔

۳۳- ان تین جُملوں میں فِسق اور فاسق کی مکمل تعریف بیان کر دی گئی ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق اور انسان اور انسان کے تعلق کو کاٹنے یا بگاڑنے کا لازمی نتیجہ فساد ہے، اور جو اس فساد کو برپا کرتا ہے، وہی فاسق ہے۔

۳۴- سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعیُّن مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان، یا بالفاظِ دیگر، ماورائے زمین کے متعلق اپنے مُشاہَدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصوّرات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن میں سے کسی تصوّر کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعیّن کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مُجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

۳۵- اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر مُتنَبِّہ فرمایا گیا ہے: ایک، یہ کہ تم اس خدا کے مقابلے میں کفر وبغاوت کا رَوِیّہ اختیار کرنے کی جُراَت کیسے کرتے ہو جو تمھاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمھاری کوئی حرکت چُھپی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے، اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو، اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کہیں سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو، تو آخر اُس سے رُوگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

۳۶- اُوپر کے رُکوع میں بندگیِ رب کی دعوت اِس بُنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمھارا خالق ہے، پروردگار ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

زمین میں ایک خلیفہ[۳۸] بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے[۳۹] گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح

اُسی کے قبضۂ قدرت میں تمھاری زندگی و موت ہے، اور جس کائنات میں تم رہتے ہو، اس کا مالک و مدبر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمھارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بُنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دُنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمھارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے، تو بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دُوسرا ذریعہ انسان کو میسّر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ اُن نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس و تخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۷ - مَلَک کے اصل معنٰی عربی میں "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرّد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخّص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں، جن سے اللہ اپنی اِس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یُوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

۳۸ - خلیفہ: وہ جو کسی کی مِلک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

۳۹ - یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ اِستِفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔

وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ
اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا

اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔[40]" فرمایا: "میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں[41] جانتے۔" اس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے[42]، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: "اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا)، تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" انھوں نے عرض کیا:

وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیرِ تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سُپرد کیے جانے والے ہیں، مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنتِ کائنات کے اس نظام میں کسی بااختیار مخلوق کی گنجایش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں، تو سلطنت کے جس حصّے میں بھی ایسا کیا جائے گا، وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

۴۰ – اس فقرے سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں، مرضیِ مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدامِ ادب کر رہے ہیں، اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذُو مَعْنَیَین ہے۔ اس کے معنٰی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنٰی ہیں: ایک، تقدس کا اظہار و بیان۔ دُوسرے، پاک کرنا)۔

۴۱ – یہ فرشتوں کے دوسرے شبہے کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت مَیں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ کافی نہیں ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔ اسی لیے زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کیے جائیں۔

۴۲ – انسان کے علم کی صُورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیا کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیا پر مشتمل ہیں۔ آدمؑ کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیا کا علم دینا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ
الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ
بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذۡ
قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى

''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے[۴۳]۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔'' پھر اللہ نے آدمؑ سے کہا: ''تم انھیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔'' جب اس نے ان کو اُن سب کے نام بتا دیے[۴۴]، تو اللہ نے فرمایا: ''میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اُسے بھی میں جانتا ہوں۔''

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ، تو سب جھک گئے[۴۵]، مگر ابلیس[۴۶] نے انکار کیا۔

۴۳ – ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں، وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں، مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دُوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اُس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے، وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے۔

۴۴ – یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہے کا جواب تھا۔ گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا کہ میں آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمھیں ہوا، وہ اس معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ دُوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

۴۵ – اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں،

وَاسْتَكْبَرَ ۚ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا

وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔[٤٧]

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس

ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مسخّر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط، جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو، جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں، استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیّت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو، وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لیے جائے، دونوں صُورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اِذن دے رہے ہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اِس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرماں روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صُوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے، تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں، ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرماں روا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے، اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے، تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتّٰی کہ جس وقت فرماں روا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے، تو وہی ماتحت و خُدّام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں کُشاں کُشاں دارُالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا، اُس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخّر ہو جانے ہی کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۴۶ – اِبْلِيْس: بلفظی ترجمہ "انتہائی مایوس"۔ اِصطلاحاً یہ اُس جِنّ کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مطیع و مُسخّر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو "الشَّیْطٰن" بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شیطان اور ابلیس بھی محض کسی مجرّد قوت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ بھی انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخّص ہستی ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ

درخت کا رُخ نہ کرنا،[۴۸] ورنہ ظالموں[۴۹] میں شمار ہو گے۔" آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت

چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جِنوں میں سے تھا، جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

۴۷- اِن الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا، بلکہ جِنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی، اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وہ کافروں میں سے تھا" اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جِنّوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعُموم "شیاطین" کا لفظ اِنھی جِنّوں اور ان کی ذُرّیّت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو، وہاں یہی شیاطینِ جن مراد ہوتے ہیں۔

۴۸- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرُّر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے، ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رُجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چُن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کون سا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیّت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم وحوّا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیّت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مَقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمھارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق ومناسب مَقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے، تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے، اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اِس فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اسی طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمھیں فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۹- ظالم کا لفظ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بُنیادی حقوق تلف کرتا ہے: اوّلاً، خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔ ثانیاً، اُن تمام چیزوں کے حُقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔

عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا، جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[۵۰] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی،[۵۱] جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور

اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیا جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے، تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً، خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے، تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انھی وُجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۵۰ — یعنی انسان کا دشمن شیطان، اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے، مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے، ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

۵۱ — یعنی آدمؑ کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں، تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دُعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

توبہ کے اصل معنی رُجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا، طریقِ بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ
هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾

رحم فرمانے والا ہے۔[52]

ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔[53] پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا،

۵۲ – قرآن اِس نظریّے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں، اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خودساختہ گمراہ کُن نظریّات میں سے ایک بڑا گمراہ کُن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہ گارانہ زندگی میں مبتلا ہو گیا، اُس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے، اور اگر اپنی غلطی پر مُتنبّہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آیندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے، تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی اُمید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمھیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمھاری بھلائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس بُرائی پر تمھیں سزا ملتی ہے، وہ بھی بُرائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مُترتّب ہو کر ہی رہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے، اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچّی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رَد کر دیتا ہے، اُسے اس بنا پر رَد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی، مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اُس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکابِ جُرم کی خواہش موجود ہو۔ اور اپنی رحمت سے معافی اُس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹّے سے کٹّے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و نا امیدی کا کوئی موقع نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کی رَوِش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

۵۳ – اِس فقرے کا دوبارہ اعادہ معنیٰ خیز ہے۔ اُوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اِس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھوڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ! خدا کو اپنا اِکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انھیں نبوّت سے بھی سرفراز کیا، تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع

اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات[54] کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں[55] گے۔'' ع

جنت سے نکلنے کا حکم پھر دُہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصُود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مُقتضا نہ تھا کہ آدمؑ کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارُالعذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اُتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنّت اُن کی اصلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم اُن کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اُتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے اُن کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، جس کا ذکر اُوپر حاشیہ ۴۸ میں کیا جا چکا ہے۔

۵۴ - اٰیات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنیٰ اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستُور ہے۔ کہیں اُن معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمایندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مُصنّف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں —— ہر جگہ عبارت کے سیاق وسَباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ''آیت'' کا لفظ کس معنیٰ میں آیا ہے۔

۵۵ - یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رُکوع میں اللہ کے ''عہد'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے، بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگُونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامُور ہے کہ اُس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اُس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صُورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ اِن دو صُورتوں کے ماسوا ہر صُورت غلط ہے، بلکہ غلط ہی نہیں، سراسر بغاوت بھی ہے، جس کی سزا جہنّم کے سوا اور کچھ نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ

اے بنی اسرائیل![۵۶] ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی،

قرآنِ مجید میں آدمؑ کی پیدایش اور نوعِ انسانی کی ابتدا کا یہ قصہ سات مقامات پر آیا ہے، جن میں سے پہلا مقام یہ ہے اور باقی مقامات حسبِ ذیل ہیں: الاعراف، رکوع ۲- الحجر، رکوع ۳- بنی اسرائیل، رکوع ۷- الکہف، رکوع ۷- طٰہٰ، رکوع ۷-صٓ، رکوع ۵- بائبل کی کتاب پیدایش، باب اوّل، دوم وسوم میں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے، لیکن دونوں کا مقابلہ کرنے سے ہر صاحبِ نظر انسان محسوس کرسکتا ہے کہ دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے۔ (بقیہ حاشیہ مُلاحظہ ہو صفحہ ۲۲۶ پر)۔

۵۶- اسرائیل کے معنٰی ہیں: عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا، جو اُن کو اللہ تعالٰی کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ انھی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ پچھلے چار رُکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اِس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے، جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکینِ عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسبِ ذیل باتوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

اوّلاً، اِس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر وصلاح کا عُنصر موجود ہے، انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اُس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بتایا جارہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبیؐ وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمھارے انبیاؑ اور تمھارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بُلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو کیا کرتے، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمھاری تاریخ اور تمھاری قوم کی موجودہ اَخلاقی و دینی حالت خود تمھارے بگاڑ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمھاری اپنی چیز ہے۔ لہٰذا جانتے بُوجھتے حق کی مُخالفت نہ کرو، بلکہ اسے قبول کرلو۔ جو کام تمھارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اُٹھے ہیں، ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حُجّت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اَخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمھارے انبیاؑ لے کر آئے تھے۔ اُصولِ دین میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ جو ہدایت تمھیں دی گئی تھی، اس کی پیروی کرنے میں، اور جو رہنمائی کا منصب تمھیں دیا گیا تھا، اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت

وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اُسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں، اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

میں ایسے واقعات سے اِستشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکّاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جا رہی ہے، جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے، جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اِس طرح اِتمامِ حُجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عُنصر تھا، اس کی آنکھیں کُھل گئیں، دوسری طرف مدینے کے عوام پر اور بالعُموم مشرکینِ عرب پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا، وہ ختم ہو گیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ وہ اُس جراُت کے ساتھ کبھی مقابلے میں کھڑے نہ ہو سکے جس کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رُکوعوں میں نوعِ انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا، اسی کے سلسلے میں ایک خاص قوم کی معیّن مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالَم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایتِ الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رُونما ہو سکتے ہیں، وہ سب اس قوم کی عبرت ناک سرگزشت میں نظر آ جاتے ہیں۔

رابعاً، اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاؑ کے پیرو گر گئے۔ یہُودیوں کی اَخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں، تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخرِ کار پچھلی اُمتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے، حتّٰی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گُھسے ہیں، تو تم بھی اسی میں گُھسو گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! کیا یہُود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اور کون؟ نبیِ اکرمؐ کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپؐ یہ جانتے تھے کہ انبیاؑ کی اُمتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ
بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور مَیں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اُس کتاب کی تائید میں ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[۵۷] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپانے کی کوشش کرو۔[۵۸]

۵۷ – تھوڑی قیمت سے مُراد وہ دُنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رَد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہرحال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے، کیونکہ حق یقیناً اس سے گراں تر چیز ہے۔

۵۸ – اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اہلِ عرب بالعُموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شُہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رُعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علما اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رُعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اُسی طرح شدّت کے ساتھ متاثّر تھے جس طرح ایک اَن پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدّن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخُّص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثّر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی، تو قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہلِ کتاب یہودیوں سے جا کر پُوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوّت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں، اِن کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکّے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہُودی علما کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علما نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، غلط ہے، یا انبیاؑ اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۵۹]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں، ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ صبر اور نماز سے[۶۰] مدد لو،

کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اُصول، جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں، ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کُھلی کُھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف، اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں، اور طرح طرح کے اُلجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے، تاکہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رَوِیّہ تھا، جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چُھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط مَلط کر کے دُنیا کو دھوکا نہ دو۔

۵۹ – نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاؑ کی طرح انبیائے بنی اسرائیل نے بھی اس کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر یہُودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نمازِ با جماعت کا نظام ان کے ہاں تقریباً بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ قوم کی اکثریت انفرادی نماز کی بھی تارک ہو چکی تھی، اور زکوٰۃ دینے کے بجائے یہ لوگ سُود کھانے لگے تھے۔

۶۰ – یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دُشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دُشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صَبْر کے لُغوی معنیٰ روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مُراد ارادے کی وہ مضبوطی، عَزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم
مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا ع ۵
نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾
وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں بردار بندوں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[61] ع

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اُس نعمت کو، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔[62] اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔[63]

پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ اس اَخلاقی صِفَت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کے لیے نماز کی پابندی کرو۔

۶۱ – یعنی جو شخص خدا کا فرماں بردار نہ ہو اور آخرت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، اس کے لیے تو نماز کی پابندی ایک ایسی مصیبت ہے جسے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جو برضا ورغبت خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر چکا ہو اور جسے یہ خیال ہو کہ کبھی مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا بھی ہے، اس کے لیے نماز ادا کرنا نہیں، بلکہ نماز کا چھوڑنا مشکل ہے۔

۶۲ – یہ اُس دَور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دُنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علمِ حق تھا اور جسے اقوامِ عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا، تاکہ وہ بندگیِ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے۔

۶۳ – بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آگئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاؑ کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیا، صُلَحا اور زُہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو اُنھی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا

وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ
یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ
رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾ وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ
فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً
ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوۡنَا

یاد کرو[۶۴] وہ وقت، جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۶۵] کی غلامی سے نجات بخشی ــــ انھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی[۶۶]۔

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گزروا دیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا[۶۷]، تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود[۶۸] بنا بیٹھے۔ اُس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی، مگر اس پر بھی ہم نے تمھیں معاف

کیسے پا سکتا ہے۔ اِنھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکّر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی اِن غلط فہمیوں کو دُور کیا گیا ہے۔

۶۴ – یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں، جنھیں اس قوم کا بچّہ بچّہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعے کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تاریخی بیان میں دراصل یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک طرف یہ اور یہ احسانات ہیں جو خدا نے تم پر کیے، اور دُوسری طرف یہ اور یہ کرتوت ہیں جو ان احسانات کے جواب میں تم کرتے رہے۔

۶۵ – "اٰلِ فِرْعَوْنَ" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فَرَاعِنَہ اور مصر کا حکمراں طبقہ دونوں شامل ہیں۔

۶۶ – آزمائش اس امر کی کہ اس بھٹّی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نِری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقے پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے بنتے ہو یا نہیں۔

۶۷ – مصر سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے، تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَنۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى
الۡكِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰى
لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ
فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ
بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۴﴾

کردیا کہ شاید اب تم شکرگزار بنو۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اُس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فُرقان[۶۹] عطا کی، تاکہ تم اس کے ذریعے سے سیدھا راستہ پاسکو۔

یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا، تو اُس) نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اُوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو،[۷۰] اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے۔" اُس وقت تمھارے خالق نے تمھاری توبہ قبول کر لی، کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چالیس شب و روز کے لیے کوہِ طور پر طلب فرمایا، تاکہ وہاں اس قوم کے لیے، جو اَب آزاد ہو چکی تھی، قوانینِ شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا کی جائیں۔ (ملاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۲۴ تا ۳۱)

۶۸ – گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے مِن جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا۔ (بچھڑے کی پرستش کا یہ واقعہ بائبل کتابِ خُروج، باب ۳۲ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے)۔

۶۹ – فُرقان: وہ چیز جس کے ذریعے سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اُردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔ یہاں فُرقان سے مُراد دین کا وہ علم اور فہم ہے، جس سے آدمی حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔

۷۰ – یعنی اپنے اُن آدمیوں کو قتل کرو جنھوں نے گوسالے کو معبُود بنایا اور اس کی پرستش کی۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ
الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ
الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا

یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم تمھارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمھارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔[۷۱]

ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا،[۷۲] مَن و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[۷۳] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں، انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا، وہ ہم پر ظلم نہ تھا،

۷۱ — یہ اشارہ جس واقعے کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرار داد پر جب حضرت موسیٰ طُور پر تشریف لے گئے تھے، تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستّر نمایندے بھی لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فُرقان عطا کی، تو آپ نے اسے ان نمایندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمھارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انھیں سزا دی گئی۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ:

> ”اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا، جو آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اُس نے بنی اسرائیل کے شُرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سو انھوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا اور پیا۔“ (خُروج، باب ۲۴، آیت ۱۰-۱۱)

لُطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا کہ مجھے اپنا جلال دکھا دے، تو اُس نے فرمایا کہ تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ (دیکھو: خُروج، باب ۳۳، آیت ۱۸-۲۳)

۷۲ — یعنی جزیرہ نمائے سینا میں، جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسّر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل کر آئے تھے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ "یہ بستی[۷۴]، جو تمھارے سامنے ہے، اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار، جس طرح چاہو، مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا: حِطَّةٌ حِطَّةٌ[۷۵]، ہم تمھاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔"

اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اُس زمانے میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدّت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا، تو یہ قوم دُھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔

۷۳ – مَنّ اور سَلْویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں اُن لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ مَنّ دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی، جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی۔ اور سَلْویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انھی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اُٹھانی پڑی، حالانکہ آج کسی نہایت متمدّن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں، تو اُن کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (مَنّ اور سَلْویٰ کی تفصیلی کیفیت کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۱۶۔ گنتی، باب ۱۱، آیت ۷-۹ و ۳۱، ۳۲ و یشوع، باب ۵- آیت ۱۲)

۷۴ – یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے مُراد کون سی بستی ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے، وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہو گا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے مُراد شِطّیم ہو، جو یَریحُو کے بالمقابل دریائے اُرْدُن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں، جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے۔ (گنتی - باب ۲۵، آیت ۱-۸)

۷۵ – یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اَکڑتے ہوئے نہ گُھسنا، بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتحِ مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حِطَّةٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۵۹ وَ اِذِ
اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا
وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۶۰ وَ
اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ

مگر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخرکار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی اُن نافرمانیوں کی، جو وہ کر رہے تھے۔[۷۵]

یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ[۷۶] نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اُس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰؑ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گیہوں، لہسن،

عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔

۷۶ – وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیّاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لیے الگ چشمہ نکال دیا تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ
هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔" تو موسیٰؑ نے کہا: "کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟[۷۷] اچھا، کسی شہری آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو، وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلّت و خواری اور پستی و بدحالی اُن پر مسلّط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اِس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے[۷۸] اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے۔[۷۹] یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حُدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔ ع

۷۷ – یہ مطلب نہیں ہے کہ مَنّ و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مَشقّت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لیے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرا نَوَردی تم سے کرائی جا رہی ہے، اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دَہن کی لذّت اتنی مرغوب ہے کہ اُس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدّت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: گنتی، باب ۱۱، آیت ۴-۹)

۷۸ – آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً، ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات یا خواہشات کے خلاف پائی، اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے، پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

۷۹ – بنی اسرائیل نے اپنے اِس جُرم کو اپنی تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائیبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت سلیمانؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولتِ یہودیہ اور سامریہ کی دولتِ اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے

اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دِمَشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرماں روا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲-تواریخ، باب ۱۶، آیت ۷-۱۰)

(۲) حضرت الیاس (اِیلیّاہ Elliah) علیہ السّلام نے جب بَعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور ازسرِنَو توحید کی دعوت کا صُور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اَخی اَب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھوکر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا، حتّٰی کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دُعا حضرت الیاسؑ نے مانگی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔" (۱-سلاطین، باب ۱۹، آیت ۱۰)

(۳) ایک اور نبی حضرت مِیکایاہ کو اسی اَخی اَب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (۱-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۲۶-۲۷)

(۴) پھر جب یہُودیہ کی ریاست میں عَلانِیَہ بُت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریاہ نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہِ یہُوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکلِ سلیمانی میں "مَقدِس" اور "قربان گاہ" کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲-تواریخ، باب ۲۴، آیت ۲۱)

(۵) اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست اَشُوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان تُلا کھڑا تھا، تو "یرمیاہ" نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اُٹھے اور کُوچے کُوچے انھوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمھارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیے گئے، رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے، تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں، اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدّار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ، باب ۱۵، آیت ۱۰- باب ۱۸، آیت ۲۰-۲۳- باب ۲۰، آیت ۱-۱۸- باب ۳۶ تا باب ۴۰)

(۶) ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے بُرے انجام سے خبردار کیا، تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوّت کرو۔ (عاموس، باب ۷، آیت ۱۰-۱۳)

(۷) حضرت یحییٰ (یُوحَنّا) علیہ السّلام نے جب ان بد اخلاقیوں کے خلاف آواز اُٹھائی جو یہودیہ کے فرماں روا ہیرودیس کے دربار میں کُھلّم کُھلّا ہو رہی تھیں، تو پہلے وہ قید کیے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مَرقس، باب ۶، آیت ۱۷-۲۹)

(۸) آخر میں حضرت عیسیٰؑ پر بنی اسرائیل کے علما اور سردارانِ قوم کا غصہ بھڑکا، کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان و راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدّمہ تیار کیا گیا، رومی

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

یقین جانو کہ نبیِ عربیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔[80]

عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطُس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمھاری خاطر یسُوع اور برابا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پُورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے اور یسُوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متّی، باب ۲۷۔ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی داستانِ جرائم کا ایک نہایت شرم ناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فُسّاق وفُجّار کو سرداری وسربراہ کاری کے لیے اور اپنے صُلَحا واَبرار کو جیل اور دار کے لیے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لیے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا؟

۸۰ – سلسلۂ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصُود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہُودیوں کے اِس زعم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دُوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہرحال نجات اس کے لیے مقدّر ہے، اور باقی تمام انسان، جو ان کے گروہ سے باہر ہیں، وہ صرف جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا، وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہوگا نہ کہ تمھاری مردُم شماری کے رجسٹروں پر۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ
اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ ۚ فَجَعَلْنٰهَا

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے طُور کو تم پر اُٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا اور کہا تھا[81] کہ ”جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکو گے۔“ مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا، ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے اُن لوگوں کا قصّہ تو معلوم ہی ہے جنھوں نے سَبْت[82] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دُھتکار پھٹکار پڑے[83]۔ اس طرح ہم نے

---

۸۱ – اس واقعے کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں یہ ایک مشہور و معرُوف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۳۲)

۸۲ – سَبْت، یعنی ہفتے کا دن۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتے کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں۔ اس روز کسی قسم کا دُنیوی کام، حتّٰی کہ کھانا پکانے کا کام بھی نہ خود کریں، نہ اپنے خادموں سے لیں۔ اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حُرمت کو توڑے، وہ واجب القتل ہے۔ (مُلاحظہ ہو: خُروج، باب ۳۱، آیت ۱۲-۱۷) لیکن جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و دینی انحطاط کا دَور آیا تو وہ علی الاعلان سَبْت کی

Maktaba Tul Ishaat.com

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَإِذْ
قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۖ قَالُوْٓا
أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۖ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۖ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ

اُن کے انجام کو اُس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے: کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے: اچھا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰؑ نے کہا: اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے: اپنے رب سے یہ اور پُوچھ دو کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا: وہ فرماتا ہے

بے حُرمتی کرنے لگے، حتّٰی کہ اُن کے شہروں میں کُھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی۔

۸۳- اس واقعے کی تفصیل آگے سورۂ اعراف، رُکوع ۲۱ میں آتی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنٰی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہوگئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اَخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہوگئے ہوں گے۔

اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع وَاِذْ
قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ج

زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے، جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے: اپنے رب سے صاف صاف پُوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا، تو ہم اس کا پتا پا لیں گے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اُٹھے کہ ہاں، اب تم نے ٹھیک پتا بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔[۸۴] ع

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے کھول کر رکھ دے گا۔

۸۴ – چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں، اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پُوری طرح ایمان اُترا ہوا نہ تھا، اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے، اتنے ہی گِھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِکار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر، جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائبل میں بھی اس واقعے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ
الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اُس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو، اس طرح اللہ مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔[۸۵] ـــــ مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخرکار تمھارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پُھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمھارے کرتُوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

کی طرف اشارہ ہے، مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ (مُلاحظہ ہو: گنتی، باب ۱۹، آیت ۱-۱۰)

۸۵- اِس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتا بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی ”لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ“، اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مُفسّرین نے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اُوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک، یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دُوسرے، یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبُودیّت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبُود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی، تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، نہ کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا مفید ثابت ہو۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

اے مسلمانو! اب کیا اِن لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟[۸۶] حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سُنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف[۸۷] کی۔

۸۶ – یہ خطاب مدینے کے اُن نَومسلموں سے ہے جو قریب کے زمانے ہی میں نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوّت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ سب انھوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انھوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دُنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں، اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دُنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سن کر آپؐ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جُوق در جُوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمتِ ایمان میسر ہوئی ہے، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش نو مسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تو منافقین اور مخالفینِ اسلام اس سے یہ اِستدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مُشتَبَہ ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہلِ کتاب کے علما اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بُوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ اِس بنا پر بنی اسرائیل کی تاریخی سرگزشت بیان کرنے کے بعد اب ان سادہ دل مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق رِوایات یہ کچھ رہی ہیں، ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو، ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی، تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کی جن آیات کو سُن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں۔ دینِ حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دَوڑے چلے آئیں گے۔

۸۷ – ''ایک گروہ'' سے مُراد ان کے علما اور حاملینِ شریعت ہیں۔ ''کلام اللہ'' سے مراد تورات، زَبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاؑ کے ذریعے سے پہنچیں۔ ''تحریف'' کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنٰی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنٰی پہنا دینا، جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیّر و تبدّل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں — علمائے بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلامِ الٰہی میں کی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ
قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ
وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَ
النصف إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ق

(محمدؐ رسول اللہ پر) ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں، اور جب آپس میں ایک دُوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے وقوف ہو گئے ہو؟ اِن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلے میں انھیں حُجّت میں پیش کریں؟[88] —— اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چُھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے؟ —— ان میں ایک دُوسرا گروہ اُمّیوں کا ہے، جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بُنیاد اُمیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔[89] پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوِشتہ لکھتے ہیں،

۸۸ - یعنی وہ آپس میں ایک دُوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کُتُبِ آسمانی میں جو پیشین گوئیاں اِس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدّس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ رَوِش پر گرفت ہو سکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمھارے رب کے سامنے ان کو تمھارے خلاف حجّت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دُنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چُھپا لے گئے، تو آخرت میں ان پر مقدّمہ نہ چل سکے گا۔ اِسی لیے بعد کے جُملۂ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

۸۹ - یہ ان کے عوام کا حال تھا۔ علمِ کتاب سے کورے تھے۔ کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اُصُول بتائے ہیں، اَخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح و خُسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور

ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ
فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ
قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ

پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔[۹۰] ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجبِ ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھُونے والی نہیں اِلّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔[۹۱] اِن سے پوچھو: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے، جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کرسکتا؟ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمّے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ اُس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمھیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھُوئے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکّر میں پڑا رہے گا،

جھوٹی توقّعات پر جی رہے تھے۔

۹۰ – یہ اُن کے علما کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے مَعانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اَوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خَلط مَلط کردیا، اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مُفسِّر کی تاویل، ہر مُتکلِّم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعۂ کُتُبِ مقدّسہ (بائبل) میں جگہ پالی، اللہ کا قول (word of God) بن کر رہ گیا۔ اُس پر ایمان لانا فرض ہوگیا اور اس سے پھرنے کے معنٰی دین سے پھر جانے کے ہوگئے۔

۹۱ – یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے، جس میں ان کے عامی اور عالم سب مُبتلا تھے۔ وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا
خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ ع وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا ۹ ع ۱۱ ۹
تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى
وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ
مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ
وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ
وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ

وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہی جنّتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع

یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو

سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں، لہٰذا جہنّم کی آگ ہم پر حرام ہے، اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی، تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنّت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ
عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَّأْتُوْكُمْ أُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ
مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰٓى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ

قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیے کا لین دین کرتے ہو، حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دُوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟[۹۲] پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو—— یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دُنیا کی زندگی خرید لی ہے،

۹۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینے کے اطراف کے یہودی قبائل نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں (اَوس اور خزرج) سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ دُوسرے قبیلے سے برسرِ جنگ ہوتا، تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بُوجھتے کتاب اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلے کے اسیرانِ جنگ دُوسرے یہودی قبیلے کے ہاتھ آتے تھے، تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیے کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے اِستدلال کیا جاتا تھا۔ گویا وہ کتاب اللہ کی اِس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا
تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

لہٰذا نہ اِن کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انھیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع

ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، آخر کار عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی۔[۹۳] پھر یہ تمھارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جُھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا!—— وہ کہتے ہیں: ہمارے دل محفوظ ہیں۔[۹۴] نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں—— اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟

کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے، مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

۹۳ – ''رُوحِ پاک'' سے مراد علمِ وحی بھی ہے، اور جبریلؑ بھی جو وحی کا علم رکھتے تھے، اور خود حضرت مسیحؑ کی اپنی پاکیزہ رُوح بھی، جس کو اللہ نے قُدسی صفات بنایا تھا۔ ''روشن نشانیوں'' سے مُراد وہ کُھلی کُھلی علامات ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالبِ حق انسان یہ جان سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

۹۴ – یعنی ہم اپنے عقیدہ و خیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو، ہمارے دلوں پر تمھاری بات کا اثر نہ ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو تمام ایسے ہٹ دھرم لوگ کہا کرتے ہیں جن کے دل و دماغ پر جاہلانہ تعصّب کا تسلّط ہوتا ہے۔ وہ اسے عقیدے کی مضبوطی کا نام دے کر ایک خوبی شمار کرتے ہیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ
كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِينَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح ونُصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔[۹۵] خدا کی لعنت ان مُنکرین پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلّی حاصل کرتے ہیں[۹۶] کہ جو ہدایت اللہ نے

اپنے موروثی عقائد وافکار پر جم جانے کا فیصلہ کرلے، خواہ ان کا غلط ہونا کیسے ہی قوی دلائل سے ثابت کر دیا جائے۔

۹۵- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جس کی بِعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاؑ نے کی تھیں۔ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عُروج کا دَور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بِعثتِ محمدیؐ سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی اُمّید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیۂ کلام یہی تھا کہ ”اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کرلے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔“ اہلِ مدینہ یہ باتیں سُنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو، پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی، جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گِن رہے تھے، اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”وہ اس کو پہچان بھی گئے“، تو اس کے متعدِّد ثبوت اُسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُمّ المؤمنین حضرت صَفِیّہؓ کی ہے، جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دُوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے، تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم! ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ۚ
فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ‌ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا
قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا
وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ‌ۗ وَهُوَ الۡحَـقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ‌ؕ قُلۡ فَلِمَ
تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدۡ

نازل کی ہے، اس کو قبول کرنے سے صرف اِس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا، نوازدیا[۹۷]! لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلّت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں: ''ہم تو صرف اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں (یعنی نسلِ اسرائیل میں) اُتری ہے۔'' اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے اور اُس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا، ان سے کہو: اگر تم اُس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی، تو اس سے پہلے اللہ کے اُن پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے، اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(ابنِ ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید)

۹۶ - اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ''کیسی بُری چیز ہے، جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔'' یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ

تمھارے پاس موسیٰؑ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اُس میثاق کو یاد کرو، جو طُور کو تمھارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں، ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سُن لیا، مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہُوا تھا۔ کہو: اگر تم مومن ہو، تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بُری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو،[98] اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو— یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے

---

۹۷ – یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دُوسری قوم میں پیدا ہوا، جسے وہ اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے، تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا، جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا، نواز دیا، تو وہ بگڑ بیٹھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ
بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

معانقۃ ۲ ع

(کہ یہ وہاں جانے کی تمنّا نہ کریں)، اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے[۹۹]، حتّٰی کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے، حالانکہ لمبی عمر بہرحال اُسے عذاب سے تو دُور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں، اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔ ع

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو[۱۰۰]، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریلؑ نے اللہ ہی کے اِذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے[۱۰۱]، جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے[۱۰۲] اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے[۱۰۳]۔

۹۸ – یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے اُن کی دُنیا پرستی پر۔ جن لوگوں کو واقعی دارِ آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے، وہ دُنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

۹۹ – اصل میں عَلٰی حَیٰوۃٍ کا لفظ ارشاد ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: کسی نہ کسی طرح کی زندگی۔ یعنی انھیں محض زندگی کی حرص ہے، خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزّت اور شرافت کی ہو یا ذلّت اور کمینہ پن کی۔

۱۰۰ – یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں ہی کو بُرا نہ کہتے تھے، بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریلؑ کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ رحمت کا نہیں، عذاب کا فرشتہ ہے۔

۱۰۱ – یعنی اس بنا پر تمھاری گالیاں جبریلؑ پر نہیں بلکہ خداوندِ برتر کی ذات پر پڑتی ہیں۔

۱۰۲ – مطلب یہ ہے کہ یہ گالیاں تم اسی لیے تو دیتے ہو کہ جبریلؑ یہ قرآن لے کر آیا ہے، اور حال یہ ہے کہ یہ قرآن سراسر تورات کی تائید میں ہے۔ لہٰذا تمھاری گالیوں میں تورات بھی حصّے دار ہوئی۔

۱۰۳ – اِس میں لطیف اشارہ ہے اس مضمون کی طرف کہ نادانو! اصل میں تمھاری ساری ناراضی ہدایت اور راہِ راست

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ
اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا
يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَ
اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

(اگر جبریل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے، تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوںؑ اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کے دشمن ہیں، اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں۔ اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انھوں نے کوئی عہد کیا، تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اُسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں، جو سچّے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسُول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی، تو اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پسِ پُشت ڈالا، گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین، سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے[۱۰۴] تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا،

کے خلاف ہے۔ تم لڑ رہے ہو اُس صحیح رہنمائی کے خلاف، جسے اگر سیدھی طرح مان لو تو تمھارے ہی لیے کامیابی کی بشارت ہو۔

۱۰۴ – شیاطین سے مراد شیاطینِ جِنّ اور شیاطینِ اِنس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

کُفر کے مُرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادُوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابِل میں دو فرشتوں، ہارُوت و مارُوت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے، تو پہلے صاف طور پر مُتنبّہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمایش ہیں، تو کُفر میں مُبتلا نہ ہو۔"[105] پھر بھی

جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و مادّی انحطاط کا دَور آیا اور غلامی، جہالت، نَکبت و افلاس اور ذلّت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اُولُوا العزمی باقی نہ چھوڑی، تو ان کی توجُّہات جادو ٹونے اور طِلَسمات و "عملیات" اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مَشقّت اور جِدّوجُہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمانؑ کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نُقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مُترقّبہ سمجھ کر اِن چیزوں پر ٹوٹ پڑے، اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیِ حق کی آواز انھوں نے سُن کر دی۔

۱۰۵ - اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پُوری قوم بابِل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمایش کے لیے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لُوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انھوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دُوسری طرف وہ اِتمامِ حُجّت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو، ہم تمھارے لیے آزمایش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نُقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کار پرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گردو پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آ کر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں، تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جُرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جُدائی ڈال دیں۔[۱۰۶] ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انھیں معلوم ہوتا!

۱۰۶- مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کر لے۔ یہ اَخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا، جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اَخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

اِزدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدّن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی دُرستی پر پورے انسانی تمدّن کی دُرستی کا، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدّن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مُفسِد ہے جو اُس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اُس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جُدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سُن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے، انھیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اَخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ

اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا، وہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ کاش اُنھیں خبر ہوتی! ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ۱۰۷ رَاعِنَا نہ کہا کرو، بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو، ۱۰۸

۱۰۷ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رُکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو اسلام اور اسلامی جماعت کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، اُن شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور اُن خاص خاص نِکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی، تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی مُوشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری اِن سیدھے اور سچّے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے اور خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر پُرفریب مکّارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیّت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

۱۰۸ – یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے، تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذُو معنیٰ الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپؐ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدّد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذُومعنیٰ لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو بھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے، تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا، جس کے معنیٰ تھے: ''سُن، تو بہرا ہو جائے۔'' اور خود عربی میں اس کے ایک معنیٰ صاحبِ رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو، تو ہم تمھاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لچکا دے کر رَاعِیْنَا بھی بنا لیا جاتا تھا، جس کے معنیٰ ''اے ہمارے چرواہے'' کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ ''توجہ سے بات کو سنو''، یعنی یہودیوں کو تو بار بار

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔[109] کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی

یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبیؐ کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دَوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہییں، تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

۱۰۹ – یہ ایک خاص شبہے کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے، تو اُن کے بعض احکام کی جگہ اس میں دُوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہوسکتے ہیں؟ پھر تمھارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصّے کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں، بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے مِن جانبِ اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کردوں اور جس چیز کو چاہوں، حافظوں سے محو کردوں۔ مگر جس چیز کو مَیں منسوخ یا محو کرتا ہوں، اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں، یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید

Maktaba Tul Ishaat.com

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا
نَصِیْرٍ ۝١٠٧ اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
السَّبِیْلِ ۝١٠٨ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ
لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟

پھر کیا تم اپنے رسولؐ سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے جا چکے ہیں؟[۱۱۰] حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا، وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو،[۱۱۱] یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے مطمئن رہو کہ اللہ (تعالیٰ)

اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔

• ۱۱۰ – یہودی مُوشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبیؐ سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مُتنبِّہ فرما رہا ہے کہ اس معاملے میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسلمانوں کو بار بار مُتنبِّہ فرمایا کرتے تھے کہ قِیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمّتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا، ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے، اس کی پیروی کرو اور جن اُمور سے منع کیا جاتا ہے، ان سے رُک جاؤ،

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَ مَا
تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا
تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ
ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ
کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰی ٭ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ فَلَہٗۤ
اَجۡرُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ۪ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ اُن کی تمنائیں ہیں[۱۱۲]۔ ان سے کہو: اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خُصوصیّت ہے، نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں ع

دُوراز کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صَرف کرو۔

۱۱۱ – یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازُن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحثیں اور مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ فضولیات میں اپنی قوتیں صَرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے، نہ کہ وہ۔

۱۱۲ – یعنی دراصل یہ ہیں تو محض ان کے دل کی خواہشیں اور آرزوئیں، مگر وہ انھیں بیان اس طرح کر رہے ہیں کہ گویا فی الواقع یہی کچھ ہونے والا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى
لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ
يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں: یہودیوں کے پاس کچھ نہیں ـــــ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں ـــــ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں، جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔[۱۱۳] یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے روز کر دے گا۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے در پے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں، اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں۔[۱۱۴] ان کے لیے تو دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں

۱۱۳- یعنی مشرکینِ عرب۔

۱۱۴- یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اس قسم کے ظالم لوگوں کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے مُتَوَلّی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے مُتَوَلّی رہیں، تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی، تو انھیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے ـــــ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکّہ کے اِس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے اُن لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے، بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا۔

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحَانَهُ ۖ
بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ
فَيَكُونُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَا

عذابِ عظیم۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔[۱۱۵] اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۱۱۶]

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی مِلک ہیں، سب کے سب اس کے مطیعِ فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں

---

۱۱۵ – یعنی اللہ نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ وہ تمام سمتوں اور مقاموں کا مالک ہے، مگر خود کسی سمت یا کسی مقام میں مُقیّد نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس طرف رہتا ہے۔ اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سمت کو کیوں بدل دیا۔

۱۱۶ – یعنی اللہ تعالیٰ محدود، تنگ دل، تنگ نظر اور تنگ دست نہیں ہے، جیسا کہ تم لوگوں نے اپنے اوپر قیاس کر کے اسے سمجھ رکھا ہے، بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویۂ نظر اور دائرۂ فیض بھی وسیع، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں، کس وقت، کس نیت سے اس کو یاد کر رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ
تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

آتی؟[۱۱۷] ایسی ہی باتیں اِن سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ اِن سب (اگلے پچھلے گمراہوں) کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔[۱۱۸] یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔[۱۱۹] (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہوگی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔[۱۲۰] اب جو لوگ جہنّم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں، ان کی طرف سے تم ذمّہ دار و جواب دِہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔[۱۲۱] صاف کہہ دو

---

۱۱۷ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ خدا، یا تو خود ہمارے سامنے آکر کہے کہ یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے احکام ہیں، تم لوگ ان کی پیروی کرو، یا پھر ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھائی جائے، جس سے ہمیں یقین آجائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خدا کی طرف سے ہے۔

۱۱۸ – یعنی آج کے گمراہوں نے کوئی اعتراض اور کوئی مُطالبہ ایسا نہیں گھڑا ہے، جو ان سے پہلے کے گمراہ پیش نہ کر چکے ہوں۔ قدیم زمانے سے آج تک گمراہی کا ایک ہی مزاج ہے اور وہ بار بار ایک ہی قسم کے شبہات اور اعتراضات اور سوالات دُہراتی رہتی ہے۔

۱۱۹ – یہ بات کہ خدا خود آکر ہم سے بات کیوں نہیں کرتا، اس قدر مُہمَل تھی کہ اس کا جواب دینے کی حاجت نہ تھی۔ جواب صرف اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہمیں نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ اور جواب یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار موجود ہیں، مگر جو ماننا چاہتا ہی نہ ہو، اسے آخر کون سی نشانی دکھائی جا سکتی ہے۔

۱۲۰ – یعنی دُوسری نشانیوں کا کیا ذکر، نمایاں ترین نشانی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شخصیّت ہے۔ آپؐ کے نبوت سے پہلے کے حالات، اور اُس قوم اور ملک کے حالات جس میں آپؐ پیدا ہوئے، اور وہ حالات جن میں آپؐ نے پرورش پائی اور ۴۰ برس زندگی بسر کی، اور پھر وہ عظیم الشان کارنامہ جو نبی ہونے کے بعد آپؐ نے انجام دیا، یہ سب کچھ

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰىؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

وقف منزل

ع ۱۴ ۱۴

کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آ چکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچّے دل سے ایمان لاتے ہیں۔[۱۲۲] اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویّہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ع

ایک ایسی روشن نشانی ہے جس کے بعد کسی اور نشانی کی حاجت نہیں رہتی۔

۱۲۱ – مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ناراضی کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ وہ سچّے طالبِ حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے۔ وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اُصول و احکام کو اپنے تخیّلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اُس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جو فروشی کیوں نہ کی، جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے۔ لہٰذا انھیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کر لو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد واعمال کی اُنھی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں، اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

۱۲۲ – یہ اہلِ کتاب کے صالح عُنصر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رُو سے حق ہے، اُسے حق مان لیتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ
شَيْــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا، اور یہ کہ میں نے تمھیں دُنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اور ڈرو اُس دن سے، جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی، اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔[۱۲۳]

۱۲۳- یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل اُمور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

(۱) حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اُردُن میں اپنے بھتیجے حضرت لُوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو، اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک، حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دُوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثّر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انھی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے، حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسُفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیا علیہم السلام پیدا ہوئے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا، اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُن کی تبلیغ سے جن دُوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا، انھوں نے یا تو اپنی انفرادیّت ہی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اِن کے متّبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزّل کا دَور آیا، تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دُنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت

کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام دُرست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دُنیا میں اُس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی، جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا، جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیا پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سُپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی، جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المَقدِس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المَقدِس ہی دعوت اِلی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(۴) پچھلے دس رُکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن کی تاریخی فردِ قرار دادِ جُرم اور ان کی وہ موجودہ حالت، جو نُزولِ قرآن کے وقت تھی، بے کم و کاست پیش کر دی ہے اور ان کو بتا دیا ہے کہ تم ہماری اُس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے ہو جو ہم نے تمھیں دی تھی۔ تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصبِ امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا، بلکہ خود بھی حق اور راستی سے پھر گئے، اور اب ایک نہایت قلیل عُنصرِ صالح کے سوا تمھاری پوری اُمّت میں کوئی صلاحیّت باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) اس کے بعد اب انھیں بتایا جا رہا ہے کہ امامت ابراہیمؑ کے نُطفے کی میراث نہیں ہے، بلکہ یہ اس سچّی اطاعت و فرماں برداری کا پھل ہے، جس میں ہمارے اُس بندے نے اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا، اور اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے طریقے پر خود چلیں اور دُنیا کو اس طریقے پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقے سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیّت پُوری طرح کھو چکے ہو، لہٰذا تمھیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

(۶) ساتھ ہی اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جو غیر اسرائیلی قومیں موسٰی اور عیسٰی علیہما السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں، وہ بھی ابراہیمی طریقے سے ہٹی ہوئی ہیں۔ نیز مشرکینِ عرب بھی، جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں، محض نسل و نسب کے فخر کو لیے بیٹھے ہیں۔ ورنہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے طریقے سے اب ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا مستحق نہیں ہے۔

(۷) پھر یہ بات ارشاد ہوتی ہے کہ اب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دُوسری شاخ، بنی اسماعیلؑ میں وہ رسولؐ پیدا کیا ہے، جس کے لیے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دُعا کی تھی۔ اس کا طریقہ وہی ہے، جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور دُوسرے تمام انبیاؑ کا تھا۔ وہ اور اس کے پیرو تمام ان پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو دنیا میں خدا کی طرف سے آئے ہیں، اور اسی راستے کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں جس کی طرف سارے انبیاؑ دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔

(۸) تبدیلیِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ
جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا[۱۲۴] اور وہ اُن سب میں پُورا اُتر گیا، تو اس نے کہا: ”میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“ ابراہیمؑ نے عرض کیا: ”اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟“ اس نے جواب دیا: ”میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں[۱۲۵] ہے۔“

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ

جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المَقدِس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المَقدِس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کر دیے گئے، تو بیت المَقدِس کی مرکزیّت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ اب وہ مقام دینِ الٰہی کا مرکز ہے، جہاں سے اِس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتدا میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی مقام تھا، اس لیے اہلِ کتاب اور مشرکین، کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہنچتا ہے۔ ہٹ دھرمی کی بات دُوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کیے چلے جائیں۔

(۹) اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور کعبے کی مرکزیّت کا اعلان کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے اُنیسویں رکوع سے آخر سورۂ بقرہ تک مسلسل اس اُمّت کو وہ ہدایات دی ہیں، جن پر اسے عمل پیرا ہونا چاہیے۔

۱۲۴- قرآن میں مختلف مقامات پر اُن تمام سخت آزمایشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے، جن سے گزر کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انھیں بنی نوعِ انسان کا امام و رہنما بنایا جائے۔ جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا، اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں، جن سے انسان محبّت کرتا ہے، اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں، جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا، جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

۱۲۵- یعنی یہ وعدہ تمھاری اولاد کے صرف اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو۔ ان میں سے جو ظالم ہوں گے، اُن کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسمٰعیل

اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ
لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ
رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ
اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾

ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔[١٢٦]

اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دُعا کی: "اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنادے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔" جواب میں اس کے رب نے فرمایا: "اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں گا،[١٢٧] مگر آخرکار اُسے عذابِ جہنّم کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔"

اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں۔

١٢٦- پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اُسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دُوسرے کو مالک، معبُود، حاجت روا اور فریاد رَس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکینِ قریش کے جُرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وِراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے اُلٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مُستثنیٰ ہو گئے ہیں، اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مُستثنیٰ ہیں۔

١٢٧- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصبِ امامت کے متعلق پوچھا تھا، تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمھاری اولاد کے صرف مومن و صالح لوگوں کے لیے ہے، ظالم اس سے مُستثنیٰ ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا
وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵
وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اُٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: ”اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تُو سب کی سُننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تُو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب! ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اُٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے[۱۲۸]۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے[۱۲۹]۔“ ع

اب کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟

رزق کے لیے دُعا کرنے لگے، تو سابق فرمان کو پیشِ نظر رکھ کر اُنھوں نے صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لیے دُعا کی، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انھیں بتایا کہ امامتِ صالحہ اور چیز ہے اور رزقِ دُنیا دُوسری چیز۔ امامتِ صالحہ صرف مومنینِ صالحین کو ملے گی، مگر رزقِ دُنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزقِ دُنیا فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو، تو وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور وہی خدا کی طرف سے پیشوائی کا مستحق بھی ہے۔

۱۲۸ – زندگی سنوارنے میں خیالات، اَخلاق، عادات، معاشرت، تمدّن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى
بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ
يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا
نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

ابراہیمؑ تو وہ شخص ہے، جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چُن لیا تھا، اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا: ''مُسلم ہو جا''[۱۳۰]، تو اس نے فوراً کہا: ''میں مالکِ کائنات کا ''مسلم'' ہو گیا۔'' اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیّت یعقوبؑ[۱۳۱] اپنی اولاد کو کر گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ''میرے بچّو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین[۱۳۲] پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔'' پھر کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پُوچھا: ''بچّو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟'' ان سب نے جواب دیا: ''ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے، جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے

۱۲۹- اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا جواب ہے۔

۱۳۰- مُسْلِم: وہ جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سُپرد کر دے اور اُس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے، جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے اور اس طرزِ عمل کا نام ''اسلام'' ہے اور یہی تمام انبیاؑ کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے۔

۱۳۱- حضرت یعقوبؑ کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل براہِ راست انھی کی اولاد تھے۔

۱۳۲- دین، یعنی طریقِ زندگی، نظامِ حیات، وہ آئین جس پر انسان دُنیا میں اپنے پُورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا
كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ
قَالُوۡا كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا

خدا مانا ہے اور ہم اُسی کے مسلم ہیں۔[۱۳۳]"

وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر گئے۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۱۳۴]

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ اِن سے کہو: "نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں

کی بنا رکھے۔

۱۳۳ – بائبل میں حضرت یعقوبؑ کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے، مگر حیرت ہے کہ اس وصیّت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمُود میں جو مفصّل وصیت درج ہے، اس کا مضمون قرآن کے بیان سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں حضرت یعقوبؑ کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں:

> "خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا، وہ تمھیں اُسی طرح تمام آفات سے بچائے گا، جس طرح تمھارے آبا و اجداد کو بچاتا رہا ہے...... اپنے بچوں کو خدا سے محبّت کرنے اور اس کے احکام بجالانے کی تعلیم دینا، تاکہ ان کی مُہلتِ زندگی دراز ہو، کیوں کہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے، جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں۔" جواب میں اُن کے لڑکوں نے کہا: "جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے، ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو!" تب یعقوبؑ نے کہا: "اگر تم خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے، تو خدا ضرور تمھارے ساتھ رہے گا۔"

۱۳۴ – یعنی اگرچہ تم اُن کی اولاد سہی، مگر حقیقت میں تمھیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُن کا نام لینے کا تمھیں کیا حق ہے جب کہ تم اُن کے طریقے سے پھر گئے۔ اللہ کے ہاں تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمھارے باپ دادا کیا کرتے تھے، بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تم خود کیا کرتے رہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "جو کچھ اُنھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے"، یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں، قرآن اپنی زبان میں اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔

كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ
اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

میں سے نہ تھا۔[۱۳۵] مسلمانو! کہو کہ: ”ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق

ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا بُرا نتیجہ رکھتا ہے، جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیّت اسی نتیجے کی ہے، اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے ”کسب“ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۳۵ – اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے:

ایک، یہ کہ یہُودیّت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ ”یہُودیت“ اپنے اِس نام اور اپنی مذہبی خُصُوصیات اور رُسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبلِ مسیحؑ میں پیدا ہوئی۔ اور ”عیسائیت“ جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے، وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے، تو حضرت ابراہیمؑ اور دُوسرے انبیاؑ اور نیک لوگ، جو اِن مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ”یہُودیّت“ اور ”عیسائیت“ نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دُوسرے، یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دُوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیّات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہوگئی ہیں، جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫

نہیں کرتے[۱۳۶] اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منہ پھیریں، تو کُھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمھاری حمایت کے لیے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔[۱۳۷] اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟

۱۳۶ – پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہیں کرتے کہ فُلاں حق پر تھا اور فُلاں حق پر نہ تھا، یا یہ کہ ہم فُلاں کو مانتے ہیں اور فُلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں، سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے آئے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنٰی میں حق پرست ہے، اُس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اُس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں، جسے وہ مانتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دراصل اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں پایا ہے، جسے حضرت موسیٰؑ، یا عیسیٰؑ، یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا، بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اُن کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصُّب اور آبا و اجداد کی اندھی تقلید ہے، نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی۔

۱۳۷ – اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ "ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا"، دوسرے، یہ کہ "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔" مسیحیّت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص اُن کے مذہب میں داخل ہوتا، اُسے غسل دیتے تھے اور اس غُسل کے معنٰی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دُھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کر لی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اِصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اِصطباغ نہ صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اُن کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں، بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے: اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ
رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ
مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ
وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ
ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً

اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔"

اے نبیؐ! ان سے کہو: "کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔[۱۳۸] ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، تمھارے اعمال تمھارے لیے، اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔[۱۳۹] یا پھر کیا تمھارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو: "تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟"[۱۴۰] اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمّے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور

۱۳۸- یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے اور اسی کی فرماں برداری ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے بھی، تو وہ ہمارے لیے ہے، نہ کہ تمھارے لیے، کیونکہ اللہ کے سوا دُوسروں کو بندگی کا مستحق تم ٹھیرا رہے ہو نہ کہ ہم۔

"اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ" کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا تمھارا جھگڑا ہمارے ساتھ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ہے؟" اِس صُورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر واقعی تمھارا یہ جھگڑا نفسانی نہیں ہے، بلکہ خدا واسطے کا ہے، تو یہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

۱۳۹- یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دُوسروں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو، تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس کا انجام خود دیکھ لو گے۔ ہم تمھیں زبردستی اس سے روکنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہم نے اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے۔ اگر تم تسلیم کر لو کہ ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے، تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جائے۔

۱۴۰- یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے اُن جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر

Maktaba Tul Ishaat.com

عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

الجزء ۲

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ
كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

وہ اُسے چھپائے؟ تمھاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے[۱۴۱] ـــــ وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر چکے۔ اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے۔ تم سے اُن کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔'' ع

نادان لوگ ضرور کہیں گے: اِنھیں کیا ہُوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، اس سے یکایک پھر گئے؟[۱۴۲] اے نبیؐ! ان سے کہو: ''مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے''[۱۴۳]۔ اور اِسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک ''اُمتِ وَسَط'' بنایا ہے

انبیاؑ سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

۱۴۱ – یہ خطاب اُن کے علما سے ہے، جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاؑ کے مدّتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، صُوفیہ اور متکلّمین نے وضع کیے، اُنھی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علما سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیا علیہم السّلام آخر تمھارے اِن فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاؑ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔

۱۴۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المَقدِس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم آیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔[۱۴۴]

۱۴۳ – یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اُن کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سَمت اور مَقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سَمت میں مُقیّد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ کسی سَمت کو قبلہ بنانے کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی طرف ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے، وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لیے عالمگیر حقیقتوں کے اِدراک کی راہ کُھل جاتی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

۱۴۴ – یہ اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ ”اسی طرح“ کا اشارہ دونوں طرف ہے: اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ ”اُمّتِ وَسَط“ قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سَمت سے دُوسری سَمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المَقدِس سے کعبے کی طرف سَمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

”اُمّتِ وَسَط“ کا لفظ اس قدر وسیع معنویّت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں ”اُمّتِ وَسَط“ اس لیے بنایا گیا ہے کہ ”تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو“، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اُس وقت رسولؐ ہمارے ذمہ دار نمایندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مَقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا، وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مَقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے، وہیں ذمّہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا
عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْؕ

پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے[۱۴۵]۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہُوا، جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمھارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا،

عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اِسی طرح اِس اُمّت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتّٰی کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنٰی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتّٰی کہ اگر وہ اِس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اُسی طرح دُنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسولؐ کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دَور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، اُن سب کے لیے ائمۂ شر اور شیاطینِ اِنس و جنّ کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے۔

۱۴۵ – یعنی اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیّت کے تعصُّبات اور خاک و خون کی غلامی میں مبتلا ہیں، اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المَقدِس کو قبلہ بنانا ان کی اِس قوم پرستی کے بُت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔ دُوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دُوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اُس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسولؐ انھیں بُلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بُت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المَقدِس کو قبلہ مقرر کیا، تاکہ جو لوگ عَربیّت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا، تاکہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں۔

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ
فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ

یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔

یہ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو، ہم اُسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجدِ حرام کی طرف رُخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔[۱۴۶]

اِس طرح صرف وہ لوگ رسولؐ کے ساتھ رہ گئے، جو کسی بت کے پرستار نہ تھے، محض خدا کے پرستار تھے۔

۱۴۶- یہ ہے وہ اصل حکم، جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم رجب یا شعبان ۲ ہجری میں نازل ہوا۔ ابنِ سعد کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بِشرؓ بن بَراء بن مَعرُور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپؐ اور آپؐ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المَقدِس سے کعبے کے رُخ پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام مُنادی کی گئی۔ بَراءؓ بن عازِب کہتے ہیں کہ ایک جگہ مُنادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رُکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مُڑ گئے۔ اَنسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سَلِمہ میں یہ اطلاع دُوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: ”خبردار رہو! قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔“ سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رُخ بدل دیا۔

خیال رہے کہ بیت المَقدِس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نمازِ باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہو گا اور مقتدیوں کو صرف رُخ ہی نہ بدلنا پڑا ہو گا، بلکہ کچھ نہ کچھ انھیں بھی چل کر اپنی صفیں دُرست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض رِوایات میں یہی تفصیل مذکور بھی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”ہم تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں“ اور یہ کہ ”ہم اسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو“، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِس کے منتظر تھے۔ آپؐ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دَور ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ بیت المَقدِس کی مرکزیّت بھی رخصت ہوئی۔ اب اصل مرکزِ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ
مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وقف لازم

یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویلِ قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہلِ کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمھارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمھارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دُوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو یقیناً تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔[۱۴۷]

مسجد حرام کے معنی ہیں: حُرمت اور عزّت والی مسجد۔ اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے، جس کے وسط میں خانۂ کعبہ واقع ہے۔

کعبے کی طرف رُخ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہ دُنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبے کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت، ہر شخص کے لیے، ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبے کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ کعبے کی سیدھ میں۔ قرآن کی رُو سے ہم اس بات کے لیے ضرور مُکلّف ہیں کہ حتیٰ الامکان صحیح سَمتِ کعبہ کی تحقیق کریں، مگر اس بات پر مُکلّف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سَمت معلوم کرلیں۔ جس سَمت کے متعلق ہمیں امکانی تحقیق سے ظنِ غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سَمتِ کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے۔ اور اگر کہیں آدمی کے لیے سَمتِ قبلہ کی تحقیق مشکل ہو، یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلے کی طرف اپنی سَمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو، یا جس طرف رخ کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دورانِ نماز میں صحیح سَمتِ قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سَمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے، تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیے۔

۱۴۷ – مطلب یہ ہے کہ قبلے کے متعلق جو حُجّت و بحث یہ لوگ کرتے ہیں، اُس کا فیصلہ نہ تو اس طرح ہوسکتا ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ
هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ
بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

وقف منزل ۔ ع ۱۷ ۔ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں،[۱۴۸] مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ ع

ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے، جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔[۱۴۹] جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تمھیں پا لے گا۔ اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

دلیل سے انھیں مطمئن کر دیا جائے، کیونکہ یہ تعصّب اور ہٹ دھرمی میں مُبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اُس قبلے کو چھوڑ نہیں سکتے، جسے یہ اپنی گروہ بندی کے تعصّبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلے کو اختیار کر لو، کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے، جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اسے اختیار کر لینے سے قبلے کا جھگڑا چُک جائے۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں۔ ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی گروہ کو راضی کر سکو گے۔ دُوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھارا یہ کام ہے ہی نہیں کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اُصول پر مُصالحت کیا کرو۔ تمھارا کام تو یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمھیں دیا ہے، سب سے بے پروا ہو کر صرف اُسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے، تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کرو گے اور اُس نعمت کی ناشکری کرو گے، جو دنیا کا امام بنا کر ہم نے تمھیں بخشی ہے۔

۱۴۸ – یہ عرب کا محاورہ ہے۔ جس چیز کو آدمی یقینی طَور پر جانتا ہو اور اُس کے متعلق کسی قسم کا شک و اشتباہ نہ رکھتا ہو، اُسے یُوں کہتے ہیں کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتا ہے، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔ یعنی جس طرح اُسے اپنے بچوں کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح وہ بلا کسی شک کے یقینی طور پر اس چیز کو بھی جانتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علما حقیقت میں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کعبے کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا اور اس کے برعکس بیت المقدس

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ
حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَ

تمھارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں سے اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمھارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے، اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمھارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حُجّت نہ ملے[۱۵۰] ــــ ہاں جو ظالم ہیں، اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی۔ تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو ــــ اور

اُس کے ۱۳ سو برس بعد حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور اُنھی کے زمانے میں قبلہ قرار پایا۔ اس تاریخی واقعے میں ان کے لیے ذرّہ برابر کسی اشتباہ کی گنجایش نہ تھی۔

۱۴۹ – پہلے فقرے اور دُوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، جسے سامع خود تھوڑے سے غور و فکر سے بھر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز جسے پڑھنی ہوگی، اسے بہر حال کسی نہ کسی سَمت کی طرف تو رُخ کرنا ہی ہوگا۔ مگر اصل چیز وہ رُخ نہیں ہے، جس طرف تم مڑتے ہو، بلکہ اصل چیز وہ بھلائیاں ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے تم نماز پڑھتے ہو۔ لہٰذا سَمت اور مقام کی بحث میں پڑنے کے بجائے تمھیں فکر بھلائیوں کے حُصُول ہی کی ہونی چاہیے۔

۱۵۰ – یعنی ہمارے اس حکم کی پُوری پابندی کرو۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سَمت کے سوا کسی دُوسری سَمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے۔ ورنہ تمھارے دُشمنوں کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ کیا خوب اُمّتِ وَسَط ہے، کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں، جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

لِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ
رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ معانقة ۳
فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾ ع يٰٓأَيُّهَا ۱۸ ع ۵ ۲
الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اس لیے کہ مَیں تم پر اپنی نعمت پُوری کر دوں[۱۵۱] اور اس توقع پر[۱۵۲] کہ میرے اس حکم کی پَیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح (تمھیں اِس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو تمھیں میری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ ع
اے لوگو[۱۵۳] جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے

۱۵۱- نعمت سے مُراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے، جو بنی اسرائیل سے سَلب کر کے اس اُمّت کو دی گئی تھی۔ دُنیا میں ایک اُمّت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے اَمرِ تشریعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سُپرد کی جائے۔ یہ منصب جس اُمّت کو دیا گیا، حقیقت میں اُس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمھاری سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمھیں اس لیے بھی ہمارے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کرو گے، تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔

۱۵۲- یعنی اس حکم کی پَیروی کرتے ہوئے یہ اُمید رکھو۔ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ کسی نوکر سے یہ کہہ دینا کہ ہماری طرف سے فُلاں عنایت و مہربانی کے اُمیدوار رہو، اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ ملازم اپنے گھر شادیانے بجوا دے اور اسے مبارک بادیاں دی جانے لگیں۔

۱۵۳- منصبِ امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس اُمّت کو ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں۔ مگر تمام دُوسری

Maktaba Tul Ishaat.com

الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ
الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا

ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مُبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ

باتوں سے پہلے انھیں جس بات پر مُتنبِّہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر آپ حضرات لِٹائے جا رہے ہوں۔ یہ تو ایک عظیم الشّان اور پُرخطر خدمت ہے، جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمایشوں میں ڈالے جاؤ گے، طرح طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔ اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھے چلے جاؤ گے، تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔

۱۵۴- یعنی اس بھاری خدمت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے، وہ تمھیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی: ایک، یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پرورش کرو۔ دوسرے، یہ کہ نماز کے عمل سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ آگے چل کر مختلف مقامات پر اس امر کی تشریحات ملیں گی کہ صبر بہت سے اہم ترین اَخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے۔ اور حقیقت میں یہ وہ کلیدِ کامیابی ہے، جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آگے چل کر نماز کے متعلق بھی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ وہ کس کس طرح افرادِ مومنین اور جماعتِ مومنین کو اس کارِ عظیم کے لیے تیار کرتی ہے۔

۱۵۵- موت کا لفظ اور اس کا تصوُّر انسان کے ذہن پر ایک ہمّت شکن اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شُہدا فی سبیل اللہ کو مُردہ کہا جائے، کیونکہ اس سے جماعت کے لوگوں میں جذبۂ جہاد و قتال اور رُوحِ جاں فروشی کے سرد پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے بجائے ہدایت کی گئی کہ اہلِ ایمان اپنے ذہن میں یہ تصور جمائے رکھیں کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے، وہ حقیقت میں حیاتِ جاوداں پاتا ہے۔ یہ تصوّر مطابقِ واقعہ بھی ہے اور اس سے رُوحِ شجاعت بھی تازہ ہوتی اور تازہ رہتی ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ
الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ
اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ

"ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"[۱۵۶]، انھیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔

یقیناً صفا اور مَروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عُمرہ کرے[۱۵۷]، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے[۱۵۸] اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا

۱۵۶ – کہنے سے مُراد صرف زبان سے یہ الفاظ کہنا نہیں ہے، بلکہ دل سے اس بات کا قائل ہونا ہے کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں"، اس لیے اللہ کی راہ میں ہماری جو چیز بھی قربان ہوئی، وہ گویا ٹھیک اپنے مَصرَف میں صَرف ہوئی، جس کی چیز تھی اسی کے کام آ گئی۔ اور یہ کہ "اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹنا ہے"، یعنی بہرحال ہمیشہ اس دُنیا میں رہنا نہیں ہے۔ آخرکار، دیر یا سویر، جانا خدا ہی کے پاس ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس کی راہ میں جان لڑا کر اس کے حُضور حاضر ہوں۔ یہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم اپنے نفس کی پرورش میں لگے رہیں اور اسی حالت میں، اپنی موت ہی کے وقت پر کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہو جائیں۔

۱۵۷ – ذُوالحِجّہ کی مقرر تاریخوں میں کعبے کی جو زیارت کی جاتی ہے، اس کا نام حج ہے اور ان تاریخوں کے ماسوا دُوسرے کسی زمانے میں جو زیارت کی جائے وہ عُمرہ ہے۔

۱۵۸ – صَفَا اور مَروَہ مسجدِ حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان دوڑنا من جملہ اُن مَناسک کے تھا، جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکہ اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مُشرکانہ جاہلیّت پھیل گئی، تو صفا پر "اِساف" اور مَروہ پر "نائلہ" کے اِستھان بنا لیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہلِ عرب تک پہنچی، تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مَروہ کی سَعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے، اور یہ کہ اس سَعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ

Maktaba Tul Ishaat.com

خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ
مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ
لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللّٰعِنُوْنَ ۙ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

کام کرے[159] گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآنحالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں[160]۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے بیان کرنے لگیں، اُن کو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصّفا والمَرْوَہ کے بارے میں کراہت موجود تھی، کیونکہ وہ مَناۃ کے معتقد تھے اور اِساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ اِنھی وُجوہ سے ضروری ہوا کہ مسجدِ حرام کو قبلہ مقرر کرنے کے موقع پر اُن غلط فہمیوں کو دُور کر دیا جائے جو صَفا و مَرْوَہ کے بارے میں پائی جاتی تھیں، اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ ان دونوں مَقامات کے درمیان سعی کرنا حج کے اصلی مَنَاسِک میں سے ہے، اور یہ کہ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے، نہ کہ اہلِ جاہلیّت کی من گھڑت۔

۱۵۹ – یعنی بہتر تو یہ ہے کہ یہ کام دلی رغبت کے ساتھ کرو، ورنہ حکم بجالانے کے لیے تو کرنا ہی ہوگا۔

۱۶۰ – علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربّیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا اور عامۂ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں، تو علما نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اُس ضلالت اور بدعت کو، جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے یا اپنے سکوت سے اُلٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ اسی سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جا رہی ہے۔ دُنیا کی

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ

جن لوگوں نے کفر کا رویّہ[161] اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا

ہدایت کا کام جس اُمت کے سپرد کیا جائے، اُس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے، نہ یہ کہ بخیل کے مال کی طرح اسے چھپا رکھے۔

۱۶۱- "کفر" کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں: ماننا، قبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں: نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رُو سے کفر کے رویّے کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبُود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک اور معبُود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اُس کی ہدایات کو واحد منبعِ علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اُصولاً اس بات کو بھی تسلیم کر لے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انھیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصُّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اَخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں، اُن کو، یا اُن میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریّے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے، مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے، اور دنیوی زندگی میں اپنے رویّے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویّے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کُفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شُکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اُس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے مُحسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی

Maktaba Tul Ishaat.com

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

میں تخفیف ہو گی اور نہ انھیں پھر کوئی دُوسری مُہلت دی جائے گی۔

تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، اُس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ ع (اِس حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں، اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دُوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اِسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔[۱۶۲]

عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اُس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اُس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۶۲- یعنی اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے، اور ضد یا تعصّب سے آزاد ہو کر سوچے، تو یہ آثار جو اس کے مُشاہدے میں آرہے ہیں، اس نتیجے پر پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مُطلق حکیم کے زیرِ فرمان ہے، تمام اختیار و اقتدار بالکل اُسی ایک کے ہاتھ میں ہے، کسی دُوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا مشارکت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کُھلے کُھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دُوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّمقابل بناتے ہیں[۱۶۳] اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے ــــ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں[۱۶۴] ــــ کاش! جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انھیں سُوجھنے والا ہے وہ

کے لیے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجایش نہیں، لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالَم کا خدا ہے، اس کے سوا کوئی دُوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ خدائی اور اُلوہیت میں اس کا کوئی حصّہ ہو۔

۱۶۳ - یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حُقوق ہیں، وہ سب یا اُن میں سے بعض حقوق یہ لوگ اُن دُوسرے بناوٹی معبُودوں کو ادا کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلۂ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کُشائی، فریاد رسی، دُعائیں سننا اور غیب و شہادت کی ہر چیز سے واقف ہونا، یہ سب اللہ کی مخصُوص صفات ہیں۔ اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اُسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں، اُسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جُھکائیں، اُسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رُجوع کریں، اُسی کو مدد کے لیے پکاریں، اُسی پر بھروسا کریں، اُسی سے اُمیدیں وابستہ کریں اور اُسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اِسی طرح مالک المُلک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیّت کے لیے حلال و حرام کے حُدود مقرر کرے، ان کے فرائض و حقوق مُعیّن کرے، ان کو امر و نہی کے احکام دے، اور انھیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح، کن کاموں میں، کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں، اس کے حکم کو منبعِ قانون مانیں، اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں، اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کُن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کریں۔ جو شخص خدا کی اِن صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اُس کے ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دُوسرے کو دیتا ہے، وہ دراصل اُسے خدا کا مدِّمقابل اور ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ اِن صفات میں سے کسی صِفت کا مدّعی ہو اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھی دراصل خدا کا مدِّمقابل اور ہمسر بنتا ہے، خواہ زبان سے خدائی کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

۱۶۴ - یعنی ایمان کا اِقتضا یہ ہے کہ آدمی کے لیے اللہ کی رضا ہر دُوسرے کی رضا پر مقدّم ہو اور کسی چیز کی

Maktaba Tul Ishaat.com

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا
مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

آج ہی ان ظالموں کو سُوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما، جن کی دُنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پا کر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دُنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔[۱۶۵] یُوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دُنیا میں کر رہے ہیں، ان کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے ؏

محبّت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کر لے کہ وہ اللہ کی محبّت پر اسے قربان نہ کر سکتا ہو۔

۱۶۵ – یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور اُن کے نادان پیروؤں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مُبتلا ہو کر پچھلی اُمّتیں بھٹک گئیں، اس سے مسلمان ہوشیار رہیں، اور رہبروں میں امتیاز کرنا سیکھیں، اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ
وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔[۱۶۶] وہ تمھارا کُھلا دشمن ہے، تمھیں بدی اور فُحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔[۱۶۷]

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔[۱۶۸] اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے اِن کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا

۱۶۶- یعنی کھانے پینے کے معاملے میں اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالو جو توہّمات اور جاہلانہ رسموں کی بنا پر لگی ہوئی ہیں۔

۱۶۷- یعنی ان وہمی رسموں اور پابندیوں کے متعلق یہ خیال کہ یہ سب مذہبی اُمور ہیں جو خدا کی طرف سے تعلیم کیے گئے ہیں، دراصل شیطانی اِغوا کا کرشمہ ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔

۱۶۸- یعنی ان پابندیوں کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور کوئی حُجّت اس کے سوا نہیں ہے کہ باپ دادا سے

Maktaba Tul Ishaat.com

دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ یٰۤاَیُّهَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا
لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ

کچھ نہیں سُنتے۔[۱۶۹] یہ بہرے ہیں، گُونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں اُنھیں بے تکلّف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔[۱۷۰] اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو

یُوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ کسی طریقے کی پیروی کے لیے یہ حُجّت بالکل کافی ہے۔

۱۶۹- اس تمثیل کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت اُن بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلّے اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سمجھے بُوجھے ان کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں۔ اور دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے جو فقط آواز سُنتے ہیں، مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا اُن سے کیا کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال فرمائے ہیں کہ یہ دونوں پہلو ان کے تحت آ جاتے ہیں۔

۱۷۰- یعنی اگر تم ایمان لا کر صرف خدائی قانون کے پیرو بن چکے ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو پھر وہ ساری چُھوت چھات، اور زمانۂ جاہلیّت کی وہ ساری بندشیں اور پابندیاں توڑ ڈالو جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، ربّیوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے اور تمھارے باپ دادا نے قائم کی تھیں۔ جو کچھ خدا نے حرام کیا ہے اس سے تو ضرور بچو، مگر جن چیزوں کو خدا نے حلال کیا ہے، انھیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو۔ اسی مضمون کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الخ یعنی جس نے وہی نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اسی قبلے کی طرف رُخ کیا جس کی طرف ہم رُخ کرتے ہیں اور ہمارے ذبیحے کو کھایا، وہ مسلمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے اور قبلے کی طرف رُخ کرنے کے باوجود ایک شخص اس وقت تک اسلام میں پوری طرح جذب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ دے اور اُن توہّمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جائے جو اہلِ جاہلیّت نے قائم کر رکھی تھیں۔ کیونکہ اُس کا اُن پابندیوں پر قائم رہنا اِس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک اُس کی رگ و پے میں جاہلیّت کا زہر موجود ہے۔

الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ

وہ یہ ہے کہ مُردار نہ کھاؤ، خُون سے اور سُؤر کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔[۱۷۱] ہاں جو شخص مجبُوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱۷۲]

حق یہ ہے کہ جو لوگ اُن احکام کو چُھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دُنیوی فائدوں پر انھیں بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔[۱۷۳]

---

۱۷۱ – اس کا اطلاق اُس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور اُس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور ہو یا غلّہ یا اور کوئی کھانے کی چیز، دراصل اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ ہی نے وہ چیز ہم کو عطا کی ہے۔ لہٰذا اعترافِ نعمت یا صدقہ، یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے۔ اس کے سوا کسی دُوسرے کا نام لینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اس کو بھی مُنعم سمجھتے ہیں۔

۱۷۲ – اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے: ایک، یہ کہ واقعی مجبُوری کی حالت ہو۔ مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے، یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے، یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے۔

۱۷۳ – مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط تو ہُمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی شریعتیں بن گئی ہیں، ان سب کی ذمہ داری ان علما پر ہے جن کے پاس کتابِ الٰہی کا علم تھا مگر انھوں نے عامۂ خلائق تک

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا ركوع
وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا، نہ اُنھیں پاکیزہ ٹھیرائے گا،[۱۷۴] اور اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مُول لے لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنّم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! یہ سب کچھ اس وجہ سے ہُوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دُور نکل گئے۔ع

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف،[۱۷۵] بلکہ نیکی یہ ہے

اس علم کو نہ پہنچایا۔ پھر جب لوگوں میں جہالت کی وجہ سے غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ بلکہ ان میں سے بہتوں نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے۔

۱۷۴- یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور ان غلط فہمیوں کا رد ہے جو اُنھوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں کہ ان کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں، اور جو اُن کا دامن گرفتہ ہو جائے گا، اس کی سفارش کر کے وہ اللہ کے ہاں اُسے بخشوا لیں گے۔ جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم انھیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے اور نہ انھیں پاکیزہ قرار دیں گے۔

۱۷۵- مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطورِ تمثیل بیان کیا گیا ہے، دراصل مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے

مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى
وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِۚ
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا
عٰهَدُوۡاۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡاؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰىؕ

کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبّت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے قتل کے مقدّموں میں قِصَاص[۱۷۶] کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف ضابطے کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دینا اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے، جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔

۱۷۶- قِصَاص، یعنی خُون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے، جو اُس نے دُوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو، اُسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اُس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے، وہی اُس کے ساتھ کیا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ

آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اِس جُرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قِصاص[۱۷۷] لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو،[۱۷۸] تو معروف طریقے[۱۷۹] کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔

۱۷۷- جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان، یا قبیلے، یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سیکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دُوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہو، تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے، یا اُس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول اُن کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص، اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا، تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی۔ موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذّب سمجھا جاتا ہے، اُن کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہمارے کان سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اُڑائے گئے۔ ایک ''مہذّب'' قوم نے اسی بیسویں صدی میں اپنے ایک فرد (سرلی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دُوسری طرف ان نام نہاد مہذّب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم قوم سے ہو، تو ان کے جج قِصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں، جن کے سدِّباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

۱۷۸- ''بھائی'' کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سِفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور دُوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی۔ لہٰذا اگر اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصے کو پی جاو، تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے۔۔۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ
يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ

یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے[۱۸۰]، اس کے لیے دردناک سزا ہے۔۔۔ عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قِصاص میں زندگی ہے[۱۸۱]۔ اُمید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے

کردیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہوگا۔

۱۷۹ – ''مَعْرُوْف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اُٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ عمل ہے۔ رواجِ عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عُرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

۱۸۰ – مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کرلینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

۱۸۱ – یہ ایک دُوسری جاہلیّت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہلِ جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دُوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دُنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مُخاطب کرکے تنبیہ کرتا ہے کہ قِصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ
بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا
فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲ ۶

وصیّت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔[۱۸۲] پھر جنھوں نے وصیّت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیّت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

محترم ٹھیراتی ہے، وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

۱۸۲ – یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا، جب کہ وِراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصّے بذریعۂ وصیّت مقرر کر جائے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیمِ وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا (جو آگے سورۂ نساء میں آنے والا ہے)، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ وصیّت اور احکامِ میراث کی توضیح میں حسبِ ذیل دو قاعدے بیان فرمائے:

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیّت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتے داروں کے حصّے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں، ان کے حصوں میں نہ تو وصیّت کے ذریعے سے کوئی کمی یا بیشی کی جا سکتی ہے، نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصّے کے علاوہ کوئی چیز بذریعۂ وصیّت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیّت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصّے کی حد تک کی جا سکتی ہے۔

اِن دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے اُن غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے، جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا[۱۸۳] ہوگی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے[۱۸۴]، تو یہ اُسی کے لیے بہتر ہے۔

خاندان میں مدد کے مستحق ہوں، یا جنھیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیّت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا، یہاں تک کہ بالعُموم وصیّت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآنِ مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے، جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے، تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں، جو میراث کے بارے میں لوگوں کو اُلجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً اُن پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔

۱۸۳ – اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیّت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دُوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دُودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں اُن سے چھوٹ گئے ہیں۔

۱۸۴ – یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے، یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ
كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ

لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ ۱۸۵

رمضان وہ مہینا ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اُس کو لازم ہے کہ اِس پُورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دُوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ ۱۸۶

---

۱۸۵ – یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق ۲ ہجری میں جنگِ بَدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبتِ مضمون کی وجہ سے اسی سلسلۂ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

۱۸۶ – سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ سفر میں جایا کرتے تھے، اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا، اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دُوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرتؐ نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: روزے سے ہے۔ فرمایا: یہ نیکی نہیں ہے۔ جنگ کے موقع پر تو آپ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے، تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے۔ پہلی مرتبہ جنگِ بَدر میں اور آخری مرتبہ فتحِ مکہ کے موقع پر، اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیے۔ ابنِ عمرؓ کا بیان ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ انه یوم قتال فافطروا۔ دُوسری رِوایات میں یہ الفاظ ہیں کہ انکم قد دنوتم من عدوکم فافطروا اقویٰ لکم۔ یعنی دشمن سے مقابلہ درپیش ہے، روزے چھوڑ دو، تاکہ تمھیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمھیں بتایا جارہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔[۱۸۷]

عام سفر کے معاملے میں یہ بات کہ کتنی مَسافت کے سفر پر روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، حضوؐر کے کسی ارشاد سے واضح نہیں ہوتی اور صحابۂ کرامؓ کا عمل اس باب میں مختلف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جس مَسافت پر عرفِ عام میں سفر کا اِطلاق ہوتا ہے اور جس میں مسافرانہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے، وہ افطار کے لیے کافی ہے۔

یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ جس روز آدمی سفر کی ابتدا کر رہا ہو، اُس دن کا روزہ افطار کر لینے کا اُسے اختیار ہے۔ چاہے تو گھر سے کھانا کھا کر چلے، اور چاہے تو گھر سے نکلتے ہی کھا لے۔ دونوں عمل صحابہؓ سے ثابت ہیں۔

یہ امر کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہو، تو کیا لوگ مقیم ہونے کے باوجود جہاد کی خاطر روزہ چھوڑ سکتے ہیں، علما کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علما اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر علامہ ابنِ تَیمِیّہؒ نے نہایت قوی دلائل کے ساتھ فتویٰ دیا تھا کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے۔

۱۸۷- یعنی اللہ نے صرف رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ رمضان میں کسی عذرِ شرعی کی بنا پر روزے نہ رکھ سکیں، اُن کے لیے دُوسرے دنوں میں اُس کی قضا کر لینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے، تاکہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقوٰی کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا ہے. بلکہ اُنھیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالٰی کا شکریہ بھی ٹھیرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اُس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی [illegible] کی شکرگزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے، تو وہ [illegible] ہے کہ وہ اپنے [illegible] تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالٰی کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ [illegible] مقصد کے [illegible] ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نُزولِ قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے، اور صرف اَخلاقی تربِیَت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اِس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکرگزاری ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ
يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى
نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ

اور اے نبیؐ! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اُس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔[۱۸۸] یہ بات تم انھیں سنا دو، شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔[۱۸۹]

تمھارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں، اور تم اُن کے لیے۔[۱۹۰] اللہ کو معلوم ہو گیا کہ

۱۸۸- یعنی اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے ہو، لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دُور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے، مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے، میں اُسے بھی سُن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں، فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ اور رب قرار دے رکھا ہے، اُن کے پاس تو تمھیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمھاری شنوائی کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں کائناتِ بے پایاں کا فرماں روائے مُطلق، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے اور وسیلے اور سفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے دَر پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمھیں دے رہا ہوں، اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو، میری طرف رُجوع کرو، مجھ پر بھروسا کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آ جاؤ۔

۱۸۹- یعنی تمھارے ذریعے سے یہ حقیقتِ حال معلوم کر کے اُن کی آنکھیں کُھل جائیں اور وہ اس صحیح رَوِیّے کی طرف آ جائیں، جس میں ان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ
بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى
يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠

تم لوگ چُپکے چُپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اُس نے تمھارا قصُور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمھارے لیے جائز کر دیا ہے، اُسے حاصل کرو۔[191] نیز راتوں کو کھاؤ پیو[192] یہاں تک کہ تم کو سیاہیِ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔[193]

۱۹۰ – یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا، بلکہ دونوں کا باہمی تعلق و اتّصال بالکل غیر مُنفک ہوتا ہے، اسی طرح تمھارا اور تمھاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔

۱۹۱ – ابتدا میں اگرچہ اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرے، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہ گارانہ ذہنیت اُن کے اندر پرورش پاتی رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمھارے لیے جائز ہے۔ لہٰذا اب اسے بُرا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو، بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قلب وضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

۱۹۲ – اس بارے میں بھی لوگ ابتداءً غلط فہمی میں تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد سے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے، اور کوئی یہ سمجھتا تھا کہ رات کو جب تک آدمی جاگ رہا ہو، کھا پی سکتا ہے۔ جہاں سو گیا، پھر دوبارہ اُٹھ کر وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ یہ احکام لوگوں نے خود اپنے ذہن میں سمجھ رکھے تھے اور اس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اِس آیت میں انھی غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ اس میں روزے کی حد طُلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک مقرر کر دی گئی اور غروبِ آفتاب سے طُلوعِ فجر تک رات بھر کھانے پینے اور مباشرت کرنے کے لیے آزادی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کا قاعدہ مقرر فرما دیا، تاکہ طُلوعِ فجر سے عین پہلے آدمی اچھی طرح کھا پی لے۔

۱۹۳ – اسلام نے اپنی عبادات کے لیے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے جس سے دُنیا میں ہر وقت ہر مرتبۂ تمدّن کے لوگ ہر جگہ اوقات کی تعیین کر سکیں۔ وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے اُن آثار کے لحاظ سے وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ

تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔[۱۹۴] اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو، تو بیویوں

مقرر کرتا ہے جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر نادان لوگ اس طریقِ توقیت پر عمُوماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قُطبین کے قریب، جہاں رات اور دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں، اوقات کی یہ تعیین کیسے چل سکے گی۔ حالانکہ یہ اعتراض دراصل علمِ جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اُس معنٰی میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن، جس معنٰی میں ہم خطِ اِستوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کے لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات کا دَور ہو یا دن کا، بہرحال صبح و شام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ اُفُق پر نمایاں ہوتے ہیں اور اُنھی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا، تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی اُفُق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دُوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لیے تعیینِ اوقات کا کام دیتے ہیں، اسی طرح نماز اور سَحَر و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔

۱۹۴ – رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہیں تمھارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا غروبِ آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ سَحَر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصّے میں اُفُق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اُوپر بڑھنے لگے، تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اور جب دن کے آخری حصّے میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت آجاتا ہے۔ آج کل لوگ سَحَری اور افطار، دونوں کے معاملے میں شدّتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدُّد برتنے لگے ہیں۔ مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سَحَر میں سیاہیِ شب سے سپیدۂ سَحَر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجایش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طُلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کھُلی ہو تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً چھوڑ نہ دے، بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔ اسی طرح افطار کے وقت میں بھی غروبِ آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار کرتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورج ڈوبتے ہی بلال رضی اللہ عنہ کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔ بلال رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! ابھی تو دن چمک رہا ہے۔ آپؐ فرماتے کہ جب رات کی سیاہی مشرق سے اُٹھنے لگے، تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا
تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

سے مباشرت نہ کرو۔[۱۹۵] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔[۱۹۶] اِس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط رویّے سے بچیں گے۔ اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے

۱۹۵– معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں رہے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص کر دے۔ اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے، مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

۱۹۶– یہ نہیں فرمایا کہ ان حدوں سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مَقام سے مَعصیَت کی حد شروع ہوتی ہے، عین اسی مَقام کے آخری کناروں پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اس میں ہے کہ آدمی سرحد سے دُور ہی رہے، تاکہ بُھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اُس حدیث میں بیان ہوا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لِکل ملِكٍ حِمًی وان حمی اللّٰه محارمه۔ فمن رتع حول الحمٰی یوشك ان یقع فیه۔ عربی زبان میں حِمٰی اُس چراگاہ کو کہتے ہیں، جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ اس استعارے کو استعمال کرتے ہوئے حضورؐ فرماتے ہیں کہ ”ہر بادشاہ کی ایک حِمٰی ہوتی ہے اور اللہ کی حِمٰی اس کی وہ حدیں ہیں، جن سے اس نے حرام وحلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ جو جانور حِمٰی کے گرد ہی چَرتا رہے گا، ہوسکتا ہے کہ ایک روز وہ حِمٰی کے اندر داخل ہو جائے۔“ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی رُوح سے ناواقف ہیں، ہمیشہ اجازت کی آخری حدوں تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علما و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انھیں بتایا کرتے ہیں، تاکہ وہ اُس باریک خطِ امتیاز ہی پر گھومتے رہیں، جہاں اطاعت اور معصیت کے درمیان محض بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بکثرت لوگ معصیت، اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہو رہے ہیں، کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور ان کے کنارے پہنچ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ
لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ط وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ

ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دُوسروں کے مال کا کوئی حصّہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔[۱۹۷] ؏

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلّق پُوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔[۱۹۸] نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں

۱۹۷ – اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور دُوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم خود جانتے ہو کہ مال دُوسرے شخص کا ہے، تو محض اس لیے کہ اس کے پاس اپنی ملکیّت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یا اس بنا پر کہ کسی اینچ پینچ سے تم اس کو کھا سکتے ہو، اس کا مُقدّمہ عدالت میں نہ لے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ حاکم عدالت رُودادِ مقدّمہ کے لحاظ سے وہ مال تم کو دِلوا دے۔ مگر حاکم کا ایسا فیصلہ دراصل غلط بنائی ہوئی رُوداد سے دھوکا کھا جانے کا نتیجہ ہوگا۔ اس لیے عدالت سے اس کی ملکیت کا حق حاصل کر لینے کے باوجود حقیقت میں تم اس کے جائز مالک نہ بن جاؤ گے۔ عنداللہ وہ تمھارے لیے حرام ہی رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما انا بشر وانتم تختصمون الی ولعل بعضکم یکون الحن بحجته من بعض، فاقضی له علی نحو ما اسمع منه ، فمن قضیت له بشیء من حق اخیه، فانما اقضی له قطعة من النار۔ یعنی میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک مقدّمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سُن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی، تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔

۱۹۸ – چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے، جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اَوہام و تخیّلات اور رسوم دُنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی و بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب

ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰیۚ وَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا ۖ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ
الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[۱۹۹]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں،[۲۰۰] مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی

باتیں دُوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہّم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انھی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمھارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے، جو آسمان پر نمودار ہو کر دُنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدّنی اور مَعاشی زندگی میں اس کی اہمیّت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے چار مہینے حج اور عمرے سے وابستہ تھے۔ اِن مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

۱۹۹ – من جملہ ان توہّم پرستانہ رسموں کے، جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار کُود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے، بلکہ تمام اَوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنیٰ رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں، جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۰۰ – یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمھارا راستہ روکتے ہیں، اور اس بنا پر تمھارے دُشمن بن گئے ہیں کہ تم خدا کی ہدایت کے مطابق نظامِ زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہو، اور اس اصلاحی کام کی مزاحمت میں جبر و ظلم کی طاقتیں استعمال کر رہے ہیں، ان سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے جب تک مسلمان کمزور اور منتشر تھے، ان کو صرف تبلیغ کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم و ستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب مدینے میں ان کی چھوٹی سی شہری ریاست بن جانے کے بعد پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس دعوتِ اصلاح کی راہ میں مسلّح مزاحمت کرتے ہیں، ان کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۲۰۱] ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔[۲۰۲] اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چُوکیں، تو تم بھی بے تکلّف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۲۰۳]

بعد ہی جنگِ بَدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

۲۰۱ – یعنی تمھاری جنگ نہ تو اپنی مادّی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھاؤ، جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیّت کے طریقے استعمال کرو۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دُوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال ”حد سے گزرنے“ کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی مُمانعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے، جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اُسی حد تک کیا جائے، جتنی اس کی ضرورت ہو۔

۲۰۲ – یہاں فتنے کا لفظ اُسی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے، جس میں انگریزی کا لفظ (persecution) استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات ونظریّات کی جگہ کچھ دُوسرے خیالات ونظریّات کو حق پا کر قبول کرلیا ہے اور وہ تنقید وتبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ بلاشبہ انسانی خون بہانا بہت بُرا فعل ہے، لیکن جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری اِستبداد دُوسروں پر مسلّط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بجبر روکے اور اصلاح وتغیُّر کی جائز ومعقول کوششوں کا مقابلہ دلائل سے کرنے کے بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے، تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت بُرائی

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔[۲۰۴] پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔[۲۰۵]

کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزورِ شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے۔

۲۰۳ – یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو، اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گناہ گار کو بھی معاف کر دیتا ہے، جب کہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آ جائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلقوا باخلاق اللّٰہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو۔ جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے، بس اُسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے، اور جب وہ اپنا رویّہ چھوڑ دے، تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اٹھے۔

۲۰۴ – یہاں فتنہ کا لفظ اُوپر کے معنٰی سے ذرا مختلف معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ''دین'' کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنٰی ''اطاعت'' کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اُس کے احکام و قوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مَطمحِ نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔

۲۰۵ – باز آ جانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں، بلکہ فتنے سے باز آ جانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریّے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے، رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمائش اور نصیحت کریں گے، مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اُسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیراز خدا کسی کا بندہ بنائے۔ اس فتنے کو دفع کرنے کے لیے حسبِ موقع اور حسبِ امکان، تبلیغ اور شمشیر، دونوں سے کام لیا جائے گا اور مومن اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا، جب تک کفار اپنے اس فتنے سے باز نہ آ جائیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اگر وہ باز آ جائیں، تو ''ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں''، تو اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حُرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا[۲۰۶]۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس کی حُدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

کہ جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم ہو جائے، تو عام لوگوں کو تو معاف کر دیا جائے گا، لیکن ایسے لوگوں کو سزا دینے میں اہلِ حق بالکل حق بجانب ہوں گے، جنھوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں نظامِ حق کا راستہ روکنے کے لیے ظلم و ستم کی حد کر دی ہو، اگرچہ اس معاملے میں بھی مومنینِ صالحین کو زیب یہی دیتا ہے کہ عَفو و درگزر سے کام لیں اور فتح یاب ہو کر ظالموں سے انتقام نہ لیں۔ مگر جن کے جرائم کی فہرست بہت ہی زیادہ سیاہ ہو، اُن کو سزا دینا بالکل جائز ہے اور اس اجازت سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فائدہ اٹھایا ہے، جن سے بڑھ کر عَفو و درگزر کسی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ جنگِ بَدر کے قیدیوں میں سے عُقبَہ بن ابی مُعَیط اور نَضر بن حارث کا قتل اور فتحِ مکہ کے بعد آپؐ کا ۱۷ آدمیوں کو عَفوِ عام سے مُستثنیٰ فرمانا اور پھر ان میں سے چار کو سزائے موت دینا اسی اجازت پر مبنی تھا۔

۲۰۶ – اہلِ عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجّہ اور مُحرّم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینا عُمرے کے لیے خاص کیا گیا تھا، اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت گری ممنوع تھی، تاکہ زائرینِ کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اِس بنا پر اِن مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا، یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں، تو مسلمان بھی کریں اور اگر وہ اس حُرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کر گزریں، تو پھر مسلمان بھی ماہِ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

اس اجازت کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے پیش آ گئی تھی کہ اہلِ عرب نے جنگ و جَدَل اور لُوٹ مار کی خاطر نَسی کا قاعدہ بنا رکھا تھا، جس کی رُو سے وہ اگر کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کرنے کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تھے، تو کسی حرام مہینے میں اُس پر چھاپا مار دیتے اور پھر اس مہینے کی جگہ کسی دُوسرے حلال مہینے کو حرام کر کے گویا اس حرمت کا بدلہ پورا کر دیتے تھے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کفار اپنے نَسی کے حیلے کو کام میں لا کر کسی حرام مہینے میں جنگی کارروائی کر بیٹھیں، تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ اسی سوال کا جواب اس

وَ اَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛۚ
وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ ع
وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ‌ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ‌ ۚ
وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ ‌ؕ

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔[۲۰۷] احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔[۲۰۸]

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عُمرے کی نیت کرو، تو اُسے پُورا کرو، اور اگر کہیں گھِر جاؤ تو جو قربانی میسّر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو،[۲۰۹] اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔[۲۱۰]

آیت میں دیا گیا ہے۔

۲۰۷ – اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی و جُہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنا مال خرچ نہ کرو گے اور اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے، تو یہ تمھارے لیے دنیا میں بھی موجبِ ہلاکت ہوگا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تم کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہو گے اور آخرت میں تم سے سخت باز پرس ہوگی۔

۲۰۸ – احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے، جس کے معنٰی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سُپرد جو خدمت ہو، اُسے بس کر دے۔ اور دُوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پُوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صَرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے، جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دُوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے، جس کے لیے محبّت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

۲۰۹ – یعنی اگر راستے میں کوئی ایسا سبب پیش آجائے، جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے، تو اُونٹ، گائے، بکری میں سے جو جانور بھی میسّر ہو، اللہ کے لیے قربان کر دو۔

۲۱۰ – اس امر میں اختلاف ہے کہ قربانی کے اپنی جگہ پہنچ جانے سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حَنَفِیَّہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے، یعنی اگر آدمی راستے میں رُک جانے پر مجبُور ہو، تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے، تاکہ اس کی طرف سے حُدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھِر گیا ہو،

Maktaba Tul Ishaat.com

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ
اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي
الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ
ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ

مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر مُنڈوائے، تو اُسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے[۲۱۱]۔ پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے[۲۱۲] (اور تم حج سے پہلے مکّے پہنچ جاؤ)، تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھائے، وہ حسبِ مقدور قربانی دے، اور اگر قربانی میسّر نہ ہو، تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اِس طرح پُورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے، جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں[۲۱۳]۔

وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

سر مُونڈنے سے مراد حجامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک قربانی نہ کر لو، حجامت نہ کراؤ۔

۲۱۱- حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے، یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۱۲- یعنی وہ سبب دور ہو جائے، جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستے میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کی وجہ زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُوپر کی آیت میں ''گھِر جانے'' اور اس کے بالمقابل یہاں ''امن نصیب ہو جانے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح ''گھِر جانے'' کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دُوسرے تمام موانع شامل ہیں، اسی طرح ''امن نصیب ہو جانے'' کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دُور ہو جانے پر حاوی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ
مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَ
لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ
وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

اللہ کے اِن احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ع

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص اِن مقرر مہینوں میں حج کی نیّت کرے، اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دَوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل[۲۱۴]، کوئی بد عملی[۲۱۵]، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات[۲۱۶] سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے[۲۱۷] پرہیز کرو۔

---

۲۱۳ – عربِ جاہلیّت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عُمرہ دونوں ادا کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عُمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اُڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عُمرہ اور حج دونوں کر لیں۔ البتہ جو لوگ مکے کے آس پاس میقاتوں کی حُدود کے اندر رہتے ہوں، انھیں اس رعایت سے مُستثنیٰ کر دیا، کیونکہ ان کے لیے عُمرے کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھانے سے مُراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے اِحرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے، جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں۔ پھر جب حج کے دن آئیں، تو از سرِ نو احرام باندھ لے۔

۲۱۴ – احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلقِ زن و شو ممنوع ہے، بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے، جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

۲۱۵ – تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں، لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

۲۱۶ – حتّٰی کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

۲۱۷ – جاہلیّت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دُنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔[۲۱۸] پھر جب عرفات سے چلو، تو مَشْعَرِ حرام (مُزدَلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمھیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔[۲۱۹] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی

اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اَخلاق دُرست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے، وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمایش کرتا ہے، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا اور خلق، دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہو گا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا، جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق دُرست ہوں، تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہو گی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔

۲۱۸ – یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصوّر تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ مَعاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ مَعاش ایک دُنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دَوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جِدّوجُہد کرتا ہے، تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے، اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

۲۱۹ – یعنی جاہلیت کے زمانے میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دُوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی، ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے، اس کے مطابق خالصتاً اللہ تعالیٰ کی

النَّاسُ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾
فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ
اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا
وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ

پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو،[۲۲۰] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی[۲۲۱] بڑھ کر۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) اُن میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ

عبادت کرو۔

۲۲۰ – حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانے سے عرب کا معروف طریقۂ حج یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو مِنٰی سے عَرَفات جاتے تھے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مُزدَلِفَہ میں ٹھیرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برَہمنیّت قائم ہوگئی، تو انھوں نے کہا: ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عَرَفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مُزدَلِفَہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خُزَاعہ اور بنی کِنَانہ اور اُن دُوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا، جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرِ کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے، اُن کی شان بھی عام عربوں سے اُونچی ہوگئی اور انھوں نے بھی عَرَفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بُت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتے دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطابِ عام اُن سب کی طرف ہے، جو آیندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اَور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں، اُنھی کے ساتھ جاؤ، اُنھی کے ساتھ ٹھیرو، اُنھی کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیّت کے فخر و غرور کی بنا پر سنتِ ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو، اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

۲۲۱ – اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر مِنٰی میں جلسے کرتے تھے، جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ النصف
سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ
تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ
لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصّہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چُکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمھیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہوگیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں[۲۲۲]۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں ـــــ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمھاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے، جس کی باتیں دُنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں،

فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے، اب اُسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔ اِس ذکر سے مراد زمانۂ قیامِ منیٰ کا ذکر ہے۔

۲۲۲- یعنی ایامِ تشریق میں منیٰ سے مکّے کی طرف واپسی خواہ ۱۲ ذی الحجہ کو ہو یا تیرھویں تاریخ کو، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیّت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، ان میں خدا کے ساتھ تمھارے تعلق کا کیا حال رہا۔ خدا کا ذکر کرتے رہے یا میلوں ٹھیلوں میں لگے رہے۔

وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴ وَ اِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ
النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ
اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ
وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي

اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے[۲۲۳]، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے[۲۲۴]۔ جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے[۲۲۵]، تو زمین میں اُس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے ــــ حالاں کہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ــــ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اُس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنّم ہی کافی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ دُوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے، جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم پُورے کے پُورے اسلام میں

۲۲۳- یعنی کہتا ہے: خدا شاہد ہے کہ میں محض طالبِ خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، یا لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہوں۔

۲۲۴- ’’اَلَدُّ الْخِصَامِ‘‘ کے معنی ہیں: ’’وہ دشمن جو تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا ہو‘‘ یعنی جو حق کی مُخالفت میں ہر ممکن حربے سے کام لے۔ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی اور کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال کو بھی استعمال کرنے میں تأمّل نہ کرے۔

۲۲۵- ’’اِذَا تَوَلّٰی‘‘ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے، اور دوسرا مطلب

Maktaba Tul Ishaat.com

السِّلۡمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ
مُّبِيۡنٌ ۝۲۰۸ فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ
فَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۰۹ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ
يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ ؕ

آ جاؤ[۲۲۶] اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمھارے پاس آ چکی ہیں، اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی، تو خُوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے[۲۲۷]۔ (اِن ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں، تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پَرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے[۲۲۸]؟ ــــــ

یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ مزے مزے کی دل لُبھانے والی باتیں بنا کر ''جب وہ پلٹتا ہے''، تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

۲۲۶- یعنی کسی اِستثنا اور تحفّظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریات، تمھارے عُلوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات، اور تمھاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابعِ اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے بعض حِصّوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حِصّوں کو اس کی پیروی سے مُستثنیٰ کر لو۔

۲۲۷- یعنی وہ زبردست طاقت بھی رکھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے مجرموں کو سزا کس طرح دے۔

۲۲۸- یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ان سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمایش صرف اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں، اور ماننے کے بعد اتنی اَخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کی بِعْثَت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتّٰی کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اَخلاقی قوت کی آزمایش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے۔ کیونکہ اس کے بعد تو آزمایش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اُس وقت کا انتظار نہ کرو، جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آ جائیں گے، کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جُھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اُسی وقت تک ہے، جب تک حقیقت

ع ۲۵ ۱۴

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۲۱۰ ؏ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ
مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۲۱۱ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ

وقف لازم

آخرکار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں ؏

بنی اسرائیل سے پُوچھو: کیسی کُھلی کُھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دِکھائی ہیں (اور پھر یہ بھی انھی سے پُوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔[۲۲۹]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت کے روز

تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانش مندی کا، اور محض فہمایش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آ جائے اور تم بچشمِ سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکّن ہے، اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہُوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے، تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کوئی کٹّے سے کٹّا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مُہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کُشائی کی وہ ساعت نہیں آتی۔ جب وہ ساعت آ گئی، تو پھر نہ مُہلت ہے نہ آزمایش، بلکہ وہ فیصلے کا وقت ہے۔

۲۲۹- اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وُجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت ایک جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامان عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے، یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے، جس کو کتاب اور نبوت کی مشعل دے کر دُنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا، اور پھر اس نے دُنیا پرستی، نِفاق اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد

Maktaba Tul Ishaat.com

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ
مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ

پرہیزگار لوگ ہی اُن کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دُنیا کا رزق، تو اللہ کو اختیار ہے، جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رُونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج رَوی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور اُن کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رُونما ہو گئے تھے، اُن کا فیصلہ کرے ـــــ (اور ان اختلافات کے رُونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں،) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ اُنھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۳۰] ـــــ

امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے، اس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے، تو وہ یہی قوم ہے۔

۲۳۰- ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بُنیاد پر ''مذہب'' کی تاریخ مرتب کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا، اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدّت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمّت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ
وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ
حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ

پس جو لوگ انبیاؑ پر ایمان لے آئے، انھیں اللہ نے اپنے اِذن سے اُس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

پھر کیا[۲۳۱] تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنّت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتّٰی کہ وقت کا رسول اور اس کے

حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دُوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اسی خرابی کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاؑ اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بِنا ڈالے اور اپنی ایک نئی اُمّت بنا لے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انھیں پھر سے ایک اُمّت بنا دیں۔

۲۳۱- اُوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان ایک پُوری داستان کی داستان ہے، جسے ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ آیت خود اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور قرآن کی مکّی سورتوں میں (جو سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھیں) یہ داستان تفصیل کے ساتھ بیان بھی ہو چکی ہے۔ انبیاؑ جب کبھی دُنیا میں آئے، انھیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلے میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جِدّوجُہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ اٰمَنَّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس "اٰمَنَّا" کا قدرتی تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ
شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ

ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ـــــ اُس وقت اُنھیں تسلّی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پُوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے ـــــ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ؏

لوگ پُوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر

اسے قائم کرنے کی کوشش کرے، اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو، اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔

صَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ‌ۚ وَالۡفِتۡنَةُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ‌ؕ وَ

راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔[۲۳۲]

۲۳۲ – یہ بات ایک واقعے سے متعلق ہے۔ رجب ۲ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ نخلہ کی طرف بھیجا تھا (جو مکّے اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) اور اس کو ہدایت فرمادی تھی کہ قریش کی نقل و حرکت اور اُن کے آیندہ ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ جنگ کی کوئی اجازت آپؐ نے نہیں دی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو راستے میں قریش کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ ملا اور اس پر انھوں نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو اُن کے مال سمیت گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی، جب کہ رجب ختم اور شعبان شروع ہو رہا تھا اور یہ امر مُشتَبَہ تھا کہ آیا حملہ رجب (یعنی ماہِ حرام) ہی میں ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن قریش نے، اور ان سے دَرپردہ ملے ہوئے یہودیوں اور منافقینِ مدینہ نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعے کو خوب شہرت دی اور سخت اعتراضات شروع کر دیے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر، اور حال یہ ہے کہ ماہِ حرام تک میں خوں ریزی سے نہیں چُوکتے۔ اِنھی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہ حرام میں لڑنا بڑی بُری حرکت ہے، مگر اس پر اعتراض کرنا اُن لوگوں کے منہ کو تو زیب نہیں دیتا، جنھوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے سیکڑوں بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے، پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جَلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے، پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجدِ حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجدِ حرام کسی کی مملوکہ جائداد نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو اُس کی زیارت سے روکا گیا ہو۔ اب جن ظالموں کا نامۂ اعمال اِن کرتُوتوں سے سیاہ ہے، ان کا کیا منہ ہے کہ ایک معمولی سی سرحدی جھڑپ پر اس قدر زور شور کے اعتراضات کریں، حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے، وہ نبی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مالِ غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو آپؐ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپؐ نے ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت میں سے بیت المال کا حصّہ لینے سے بھی اِنکار فرما دیا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ ان کی یہ لُوٹ ناجائز ہے۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کو سخت ملامت کی تھی، اور مدینے میں کوئی ایسا نہ تھا، جس نے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ
اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ
فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ

وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتّٰی کہ اگر اُن کا بس چلے، تو تمھیں اِس دین سے پھیر لے جائیں۔ (اور یہ خُوب سمجھ لو) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔[۲۳۳] بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے،[۲۳۴] وہ

انھیں اس پر داد دی ہو۔

۲۳۳ – مسلمانوں میں سے بعض سادہ لوح لوگ، جن کے ذہن پر نیکی اور صُلح پسندی کا ایک غلط تصوّر مسلّط تھا، کفّارِ مکّہ اور یہودیوں کے مذکورۂ بالا اعتراضات سے متأثّر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم اپنی ان باتوں سے یہ اُمید نہ رکھو کہ تمھارے اور ان کے درمیان صفائی ہو جائے گی۔ اُن کے اعتراضات صفائی کی غرض سے ہیں ہی نہیں۔ وہ تو دراصل کیچڑ اُچھالنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بات کھل رہی ہے کہ تم اِس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دُنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اَڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو، تمھارے اور ان کے درمیان صفائی کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اور ایسے دُشمنوں کو تم معمولی دُشمن بھی نہ سمجھو۔ جو تم سے مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے، وہ کم تر درجے کا دشمن ہے۔ مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے، وہ تمھارا بدترین دشمن ہے۔ کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دُنیا ہی خراب کرتا ہے، لیکن یہ دُوسرا تمھیں آخرت کے اَبدی عذاب میں دھکیل دینے پر تُلا ہوا ہے۔

۲۳۴ – جہاد کے معنٰی ہیں: کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صَرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنٰی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو قِتال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جِدّوجُہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے، جو ہر وقت اپنے مقصد کی دُھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے

يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ
الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ

رحمتِ الٰہی کے جائز اُمّیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پوچھتے ہیں: شراب اور جُوے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔[۲۳۵]

پُوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دُنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پُوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرزِ عمل میں ان کے لیے

تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دَوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام اِمکانی وسائل اُس کو فروغ دینے میں صَرف کر دے، اور ہر اُس مزاحمت کا پُوری قوّت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتّٰی کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے ”جہاد“۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

۲۳۵ – یہ شراب اور جُوئے کے متعلق پہلا حکم ہے، جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ
مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ
مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ

بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے[۲۳۶]۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔ آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے،

تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ پھر شراب اور جُوئے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ نساء، آیت ۴۳ و سورۂ مائدہ، آیت ۹۰)

۲۳۶ – اس آیت کے نُزول سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حُقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آچکے تھے اور یہاں تک فرما دیا گیا تھا کہ ”یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو“ اور یہ کہ ”جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔“ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ، جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے، اس قدر خوف زدہ ہوگئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا، اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملے کی صحیح صورت کیا ہے۔

وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى
الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ؏ (۲۲۱) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ
فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ

اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بُلاتے ہیں[۲۳۷] اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنّت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے، اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔؏

پُوچھتے ہیں: حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو: وہ ایک گندگی کی حالت[۲۳۸] ہے۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔[۲۳۹]

۲۳۷- یہ ہے علّت و مصلحت اُس حکم کی جو مشرکین کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اُوپر بیان ہوا تھا۔عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ایک گہرا تمدّنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی تعلق ہو،تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آیندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرزِ زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی، بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متأثر ہو جائے گی، اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے اِزدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایک ایسی معجون مرکّب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی، جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں، مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو، وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متأثر ہو جائے۔اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے، تب بھی اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اَخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

۲۳۸- اصل میں اَذًی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی گندگی کے بھی ہیں اور بیماری کے بھی۔حیض صرف ایک گندگی ہی نہیں ہے، بلکہ طبّی حیثیت سے وہ ایک ایسی حالت ہے، جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ فَاۡتُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
التَّوَّابِيۡنَ وَيُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّـكُمۡ
فَاۡتُوۡا حَرۡثَكُمۡ اَنّٰى شِئۡتُمۡ وَقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔[۲۴۰] اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو، اپنی کھیتی میں جاؤ،[۲۴۱] مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[۲۴۲] اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔

ہوتی ہے۔

۲۳۹ - قرآنِ مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ''الگ رہو'' اور ''قریب نہ جاؤ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہنود اور بعض دُوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلّقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

۲۴۰ - یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں ہے، بلکہ وہ فطری حکم مراد ہے، جو انسان اور حیوان سب کی جِبلّت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر مُتنفّس بالطبع واقف ہے۔

۲۴۱ - یعنی فطرت اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیر گاہ نہیں بنایا ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا، بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

۲۴۲ - جامع الفاظ ہیں، جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیّت ہے۔ ایک، یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو، تاکہ تمھارے دُنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دُوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دُوسرے، یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو، اس کو دین، اَخلاق اور آدمیّت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرے میں اس بات پر بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ
عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾
لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ

خُوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبیؐ! جو تمھاری ہدایات کو مان لیں انھیں فلاح وسعادت کا مُژدہ سُنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو، جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔[۲۴۳] اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو، اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا،[۲۴۴] مگر جو قسمیں تم سچّے دل سے کھاتے ہو، اُن کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مُہلت ہے۔[۲۴۵]

کوتاہی کی، تو اللہ تم سے باز پُرس کرے گا۔

۲۴۳- احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اِس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے، اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفّارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفّارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا، یا تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، آیت ۸۹)

۲۴۴- یعنی بطور تکیۂ کلام کے بلا ارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں، ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے اور نہ ان پر مواخذہ ہوگا۔

۲۴۵- اِصطلاحِ شرع میں اس کو اِیلا کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے۔ بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دُوسرے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ

اگر انھوں نے رُجوع کر لیا، تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے[۲۴۶]۔ اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو[۲۴۷] تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۲۴۸]۔

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اپنے آپ کو

کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ اِزدِواج میں تو بندھے رہیں، مگر عملاً ایک دُوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدّت مقرر کر دی کہ یا تو اس دَوران میں اپنے تعلّقات درست کر لو، ورنہ اِزدِواج کا رشتہ منقطع کر دو، تاکہ دونوں ایک دُوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں، اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

آیت میں چونکہ "قسم کھا لینے" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے فُقہائے حَنَفِیّہ اور شافعیّہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلقِ زن و شو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو، صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدّت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدّت ہے۔ ایک قول امام احمدؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ (بِدایۃ المجتہد، جلد دوم، ص ۸۸، طبع مصر، ۱۳۳۹ھ)

حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ اور حسن بصریؒ کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے، جو بگاڑ کی وجہ سے ہو۔ رہا کسی مَصلَحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا، جبکہ تعلّقات خوش گوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہا کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلا ہے اور اسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضا مندی سے۔

۲۴۶ - بعض فقہا نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدّت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلقِ زن و شو قائم کر لیں تو ان پر قسم توڑنے کا کفّارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ قسم توڑنے کا کفّارہ دینا ہوگا۔ غفورٌ رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارے سے تمھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفارے کو قبول کر لے گا اور ترکِ تعلق کے دَوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دُوسرے پر کی ہو، اسے معاف کر دیا جائے گا۔

۲۴۷ - حضرات عثمانؓ، ابنِ مسعودؓ، زیدؓ بن ثابت وغیرہم کے نزدیک رُجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ اس مدّت کا گزر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اس لیے مدّت گزرتے ہی طلاق خود بخود

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ

روکے رکھیں اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رِحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو، اُسے چھپائیں۔ اُنھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے، اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلّقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں، تو وہ اِس عدّت کے دوران میں اُنھیں پھر اپنی زوجیّت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں۔[۲۴۹]

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مَردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مَردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ

واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاقِ بائن ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاہیں، تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ سے بھی ایک قول اسی معنیٰ میں منقول ہے اور فقہائے حَنفِیَہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔

سعید بن مُسَیَّبؒ، مکحولؒ، زُہریؒ وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد خود بخود طلاق ہو جائے گی، مگر ان کے نزدیک وہ ایک طلاقِ رَجعی ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہوگا، اور رجوع نہ کرے تو عدّت گزر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں، تو نکاح کر سکیں گے۔

بخلاف اس کے حضرت عائشہؓ، ابوالدَّرداءؓ اور اکثر فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت کی طرف رُجوع کرے یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور ابنِ عمرؓ کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالکؒ و شافعیؒ نے اسی کو قبول کیا ہے۔

۲۴۸ – یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے، تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمھاری زیادتی سے ناواقف نہیں ہے۔

۲۴۹ – اس آیت کے حکم میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے، اس وقت تک طلاقِ بائن نہ ہوگی اور شوہر کو رُجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرات

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۲۸ ۷ ۱۴

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۗ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔ ع

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔ ۲۵۰

اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اُس میں سے

ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشْعَریؓ، ابنِ مسعودؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حَنفِیّہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اِس کے، دُوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حقِ رُجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہؓ، ابنِ عمرؓ اور زیدؓ بن ثابت کی ہے اور فقہائے شافعیّہ و مالکیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اُس صورت سے متعلق ہے، جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صُورت میں شوہر کو حقِ رُجوع نہیں ہے۔

۲۵۰ – اس مختصر سی آیت میں ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی کی، جو عربِ جاہلیّت میں رائج تھی، اصلاح کی گئی ہے۔ عرب میں قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حدّ وحساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا، اُس کو وہ بار بار طلاق دے کر رُجوع کرتا رہتا تھا، تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ بس ہی سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اَور سے نکاح ہی کر سکے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت اسی ظلم کا دروازہ بند کرتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے ایک مرد ایک رشتۂ نکاح میں اپنی بیوی پر حد سے حد دو ہی مرتبہ طلاقِ رَجْعی کا حق استعمال کر سکتا ہے۔ جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رُجوع کر چکا ہو، وہ اپنی عمر میں جب کبھی اس کو تیسری بار طلاق دے گا، عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طُہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا ہو، جب کہ عورت ایامِ ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں ہے، بلکہ ایام سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے، تو دوسرے طُہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دے دے، ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اِس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ عدّت گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر عدّت گزر بھی جائے، تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اِس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں

شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ
اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ

کچھ واپس لے لو۔[۲۵۱] البتہ یہ صُورت مُستثنٰی ہے کہ زوجین کو اللہ کے حُدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حُدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیٰحدگی حاصل کر لے۔[۲۵۲] یہ اللہ کے مقرر کردہ حُدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ حُدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں۔

پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لیے

دے ڈالی جائیں، جیسا کہ آج کل جُہلا کا عام طریقہ ہے، تو یہ شریعت کی رُو سے سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مَذمّت فرمائی ہے، اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا، آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ تاہم گناہ ہونے کے باوجود، ائمّۂ اربعہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور طلاقِ مُغلّظ ہو جاتی ہے۔

۲۵۱ – یعنی مَہر اور وہ زیور اور کپڑے وغیرہ، جو شوہر اپنی بیوی کو دے چکا ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی واپس مانگنے کا اسے حق نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی اسلام کے اَخلاقی اصولوں کی ضد ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو، جسے وہ دوسرے شخص کو ہِبہ یا ہدیہ و تحفہ کے طور پر دے چکا ہو، واپس مانگے۔ اس ذلیل حرکت کو حدیث میں اُس کتّے کے فعل سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اپنی ہی قے کو خود چاٹ لے۔ مگر خُصُوصیّت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بہت ہی شرم ناک ہے کہ وہ طلاق دے کر رُخصت کرتے وقت اپنی بیوی سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہے جو اس نے کبھی اسے خود دیا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ اَخلاق سکھائے ہیں کہ آدمی جس عورت کو طلاق دے، اُسے رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کرے۔ جیسا کہ آگے آیت ۲۴۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۵۲ – شریعت کی اصطلاح میں اسے "خُلع" کہتے ہیں، یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی معاملہ طے ہو جائے، تو جو کچھ طے ہوا ہو،

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ

حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ اس کا نکاح کسی دُوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔[۲۵۳] تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حُدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لیے ایک دُوسرے کی طرف رُجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے، جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عِدّت پوری ہونے کو آجائے، تو یا بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رُخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور

وہی نافذ ہوگا۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے، تو عدالت صرف اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اُس مرد سے اس حد تک مُتنفِّر ہو چکی ہے کہ اُس کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے، تجویز کرے، اور اس فدیے کو قبول کر کے شوہر کو اسے طلاق دینا ہوگا۔ بالعُموم فقہا نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ جو مال شوہر نے اس عورت کو دیا ہو، اس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ اسے دلوایا جائے۔

خُلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے، وہ رَجعی نہیں ہے، بلکہ بائنہ ہے۔ چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو گویا خریدا ہے، اس لیے شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اس طلاق سے رجوع کر سکے۔ البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر ایک دُوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں، تو ایسا کرنا ان کے لیے بالکل جائز ہے۔

جُمہور کے نزدیک خُلع کی عدّت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ مگر ابو داؤد، تِرمِذی اور ابنِ ماجہ وغیرہ میں متعدِّد روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدّت ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ایک مُقدّمے کا فیصلہ کیا۔ (ابنِ کثیر، جلد اوّل، ص ۲۷۶)

۲۵۳ - احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مُطلّقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ
هُزُوًا ؗ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

الثلثۃ

جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرے گا۔[۲۵۴] اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بُھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے، اس کا احترام ملحوظ رکھو۔[۲۵۵] اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ ع

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عِدّت پُوری کر لیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر

فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا، بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ حضرت علی اور ابنِ مسعود اور ابوہُریرہ اور عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی مُتّفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

۲۵۴ – یعنی ایسا کرنا دُرست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گزرنے سے پہلے محض اس لیے رُجوع کر لے کہ اسے پھر ستانے اور دِق کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رُجوع کرتے ہو تو اس نیّت سے کرو کہ اب حُسنِ سلوک سے رہنا ہے۔ ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقے سے رُخصت کر دو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ نمبر ۲۵۰)

۲۵۵ – یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کر دو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے کر دُنیا کی رہنمائی کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم "اُمّتِ وَسَط" بنائے گئے ہو۔ تمھیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمھارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے رُوحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اُٹھاؤ اور دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ
اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى
الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ
نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ

راضی ہوں۔[۲۵۶] تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمھارے لیے شایستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پُوری مدّتِ رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچّوں کو کامل دو سال دُودھ پلائیں۔[۲۵۷] اِس صُورت میں بچّے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اِس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے

۲۵۶ – یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو اور زمانۂ عدّت کے اندر اس سے رُجوع نہ کیا ہو، پھر عدت گزر جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو عورت کے رشتے داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت عدّت کے بعد اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو، تو اُس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے، اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

۲۵۷ – یہ اُس صورت کا حکم ہے، جب کہ زوجین ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہوں، خواہ طلاق کے

لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ
تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾
وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

تنگ کیا جائے کہ بچّہ اس کا ہے ـــــ دُودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچّے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے [۲۵۸] ـــــ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دُودھ چھڑانا چاہیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دُودھ پلوانے کا ہو، تو اِس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

تم میں سے جو لوگ مر جائیں، اُن کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن روکے رکھیں [۲۵۹]۔ پھر جب ان کی عِدّت پُوری ہو جائے، تو

ذریعے سے یا خُلع یا فسخ اور تفریق کے ذریعے سے، اور عورت کی گود میں دُودھ پیتا بچّہ ہو۔

۲۵۸ - یعنی اگر باپ مر جائے، تو جو اس کی جگہ بچّے کا ولی ہو، اُسے یہ حق ادا کرنا ہوگا۔

۲۵۹ - یہ عدّتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خَلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مُستثنٰی ہے۔ اس کی عِدّتِ وفات وضعِ حمل تک ہے، خواہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہو جائے، یا اِس میں کئی مہینے صَرف ہوں۔

”اپنے آپ کو روکے رکھیں“ سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس مدّت میں نکاح نہ کریں، بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ
بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ
تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

انھیں اختیار ہے، اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں، کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمّے داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانۂ عِدّت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو، خواہ دل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے، تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اُس وقت تک نہ کرو، جب تک کہ عدت پُوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

زینت سے بھی روکے رکھنا ہے۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر یہ احکام ملتے ہیں کہ زمانۂ عِدّت میں عورت کو رنگین کپڑے اور زیور پہننے سے، مہندی اور سُرمہ اور خوشبو اور خضاب لگانے سے، اور بالوں کی آرایش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں۔ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، زیدؓ بن ثابت، ابنِ مسعودؓ، اُمِّ سَلَمہؓ، سعید بن مُسَیّبؒ، ابراہیم نَخَعی، محمد بن سیرین اور ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ زمانۂ عدّت میں عورت کو اُسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہو۔ دن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جاسکتی ہے، مگر قیام اس کا اُسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اِس کے برعکس حضرت عائشہؓ، ابنِ عباسؓ، حضرت علیؓ، جابر بن عبداللہؓ، عطاء، طاؤس، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہل الظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدّت کا زمانہ جہاں

ع

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۳۵ لَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا
لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ
وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۳۶ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ
يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ

لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بُردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔ؑ

تم پر کچھ گناہ نہیں، اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے[۲۶۰]۔ خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدِرت کے مطابق معروف طریقے سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو، لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو، تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اَور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد، جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے، نرمی سے کام لے (اور پُورا مہر دے دے)، اور تم (یعنی مرد)

چاہے گزار سکتی ہے اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے۔

۲۶۰- اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہر حال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مقدِرت اس کی تلافی کرو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ
وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی ٭ وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ

نرمی سے کام لو، تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بُھولو۔[۲۶۱] تمھارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت[۲۶۲] رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع[۲۶۳] ہو۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو، جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو

۲۶۱- یعنی انسانی تعلّقات کی بہتری و خوش گواری کے لیے لوگوں کا باہم فیّاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اَڑا رہے، تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہوسکتی۔

۲۶۲- قوانینِ تمدّن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے اور اُسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہ نکلے۔

۲۶۳- اصل میں لفظ ”صَلٰوۃِ الْوُسْطٰی“ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد بعض مفسّرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشا۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا اِستنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی نماز کو صلوٰۃِ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملے نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپؐ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپؐ نے فرمایا کہ ”خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھر دے، انھوں نے ہماری صلوٰۃِ وسطیٰ فوت کرادی۔“ اِس سے یہ سمجھا گیا کہ آپؐ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطیٰ فرمایا ہے، حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجے کی نماز ہم سے فوت کرادی، ناوقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خُشوع وخُضوع اور اطمینان وسکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وُسطیٰ کے معنیٰ بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ
فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

خواہ پیدل ہو، خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو۔ اور جب امن میسّر آ جائے، تو اللہ کو اُس طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم میں سے[۲۶۴] جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیّت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں، تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں، اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اِسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متّقی لوگوں پر۔ اِس طرح اللہ اپنے احکام تمھیں صاف صاف بتاتا ہے۔

بھی ہوسکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ ’’اللہ کے آگے فرماں بردار بندوں کی طرح کھڑے ہو‘‘، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

۲۶۴ - سلسلۂ تقریر اُوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمّے اور ضمیمے کے طور پر ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۳۱ ۱۵

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ قف
ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا

اُمید ہے کہ تم سمجھ بُوجھ کر کام کرو گے۔ ع

تم نے[۲۶۵] اُن لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا: مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔[۲۶۶] حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ـــــ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ

۲۶۵ - یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جس میں مسلمانوں کو راہِ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انھیں اُن کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت مکّے سے نکالے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینے میں پناہ گزیں تھے، اور کفّار کے مظالم سے تنگ آ کر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انھیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا، تو اب ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے، جیسا کہ چھبیسویں رُکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اِس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے اُنھیں عبرت دلائی گئی ہے۔

۲۶۶ - یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خُروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰؑ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کر لو، تو انھوں نے بُزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا، یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہو گئی اور دُوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اُٹھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملے کو موت اور دوبارہ زندگی

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ
وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْۤ
اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ

وقف لازم

اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حَسَن[۲۶۷] دے تاکہ اللہ اُسے کئی گُنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اُسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰؑ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ اُنھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔[۲۶۸] نبی نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا

کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

۲۶۷- "قرضِ حَسَن" کا لفظی ترجمہ "اچھا قرض" ہے، اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گُنا زیادہ دُوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حَسَن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صَرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

۲۶۸- یہ تقریباً ایک ہزار برس قبلِ مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عَمالِقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے، مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص اُن کا سربراہِ کار ہو، جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اُس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آ چکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق اُن کے

Maktaba Tul Ishaat.com

ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی، وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں، بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔
اس سلسلے میں بائبل کی کتاب سموئیل اوّل میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

”سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا...... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے: دیکھ، تُو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تُو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے، جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے...... یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دُعا کی، اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، تو اس کو مان، کیوں کہ انھوں نے تیری نہیں، بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں...... اور سموئیل نے ان لوگوں کو، جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سُنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا، اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دَوڑیں گے، اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا، اور بعض سے ہل جُتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا، اور تمھاری بیٹیوں کو لے کر گندھن اور باورچن اور نان پُز بنائے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو، جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصّہ لے کر اپنے خواجوں اور خادموں کو دے گا، اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا، اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصّہ لے گا۔ سو، تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اُس دن اس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چُنا ہوگا، فریاد کرو گے، پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے: نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں، جو ہمارے اُوپر ہو، تا کہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے...... خداوند نے سموئیل کو فرمایا: تو اُن کی بات مان اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔“ (باب ۷، آیت ۱۵ تا باب ۸، آیت ۲۲)

”پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا...... جب تم نے دیکھا کہ بنی عمّون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا، تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے، حالانکہ خداوند تمھارا خدا تمھارا بادشاہ تھا۔ سو اَب اس بادشاہ کو دیکھو، جسے تم نے چُن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو، خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی، جو تم پر سلطنت کرتا ہے، خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو، تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو، بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو، تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا، جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا...... اور تم جان لو گے اور دیکھ بھی لو گے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے

عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِيَارِنَا وَاَبۡنَآٮِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَكُمۡ

حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جُدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا، تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

اُن کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالُوت[۲۶۹] کو تمھارے لیے بادشاہ

سے کتنی بڑی شرارت کی...... اب رہا میں، سو خدا نہ کرے کہ تمھارے لیے دعا کرنے سے باز آکر خداوند کا گناہ گار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ، جو اچھی اور سیدھی ہے، تم کو بتاؤں گا۔'' (باب ۱۲، آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتابِ سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآنِ مجید میں اس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبے کی مذمّت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصّے کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے، اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بُزدل ہوگئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیّت آگئی تھی اور ان کے اندر اَخلاقی اِنضباط کی کتنی کمی تھی، جس کے سبب سے آخرکار وہ گر گئے۔ اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔

۲۶۹ – بائبل میں اِس کا نام ساؤل لکھا ہے۔ یہ قبیلہ بِن یمین کا ایک ۳۰ سالہ نوجوان تھا۔ ''بنی اسرائیل میں اُس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔'' اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اُسے اپنے گھر لائے، تیل کی کُپّی لے کر اس کے سر پر اُنڈیلی اور اُسے چوما اور کہا کہ ''خداوند نے تجھے مسح کیا، تاکہ تُو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔'' اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماعِ عام کرکے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۱-سموئیل، باب ۹ و ۱۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ
اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ
اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ
وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ
لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ

مقرر کیا ہے۔ یہ سُن کر وہ بولے: ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اُس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا: ”اللہ نے تمھارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا مُلک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اُس کے علم میں ہے۔“ اس کے ساتھ ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ”خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا، جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اور جس کو اس وقت فرشتے

یہ بنی اسرائیل میں دُوسرا شخص تھا، جس کو خدا کے حکم سے ”مسح“ کر کے پیشوائی کے منصب پر مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے حضرت ہارونؑ سردار کاہن (chief priest) کی حیثیت سے مسح کیے گئے تھے، اِس کے بعد تیسرے ممسوح یا مسیح حضرت داؤد علیہ السّلام ہوئے، اور چوتھے مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام۔ لیکن طالُوت کے متعلق ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں نہیں ہے کہ وہ نبوّت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہی کے لیے نامزد کیا جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے نبی تسلیم کیا جائے۔

ع ۳۲ ۱۶

الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ

سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو، تو یہ تمھارے لیے بہت بڑی نشانی ہے ۲۷۰؏

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا، تو اُس نے کہا: "ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمھاری آزمایش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے

۲۷۰- بائبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اُس سے اصل واقعے کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً "عہد کا صندوق" کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فلستی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا، وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ آخر کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملے کی طرف قرآن اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ "اس صندوق میں تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے"، تو بائبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو پوری قوم کی ہمّت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آ گئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اِس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمّتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

"آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرّکات" جو اس صندوق میں رکھے ہُوئے تھے، ان سے مراد پتھر کی وہ تختیاں ہیں، جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا، جسے حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سُپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں مَنّ بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا، تاکہ آیندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اُس احسان کو یاد کریں، جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا۔ اور غالباً حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا، جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

جو اس سے پیاس نہ بُجھائے، ہاں ایک آدھ چُلّو کوئی پی لے، تو پی لے۔" مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔[۲۷۱]

پھر جب طالُوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو اُنھوں نے طالُوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالُوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[۲۷۲] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔" اور جب وہ جالُوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے، تو انھوں نے دُعا کی: "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا

۲۷۱ - ممکن ہے اس سے مراد دریائے اُردُن ہو یا کوئی اور ندی یا نالا۔ طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر اس کے پار اُترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اَخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے، اس لیے اس نے کار آمد اور ناکارہ لوگوں کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ آزمایش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں، اُن پر کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ اُس دشمن کے مقابلے میں پامردی دکھائیں گے، جس سے پہلے ہی وہ شکست کھا چکے ہیں۔

۲۷۲ - غالبًا یہ کہنے والے وہی لوگ ہوں گے، جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مُظاہرہ کر دیا تھا۔

صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ
الۡكٰفِرِيۡنَ ؕ‏ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ قف وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ
وَاٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ
وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ
الۡاَرۡضُ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۵۱﴾

فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔" آخرکار اللہ کے اذن سے اُنھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ [۲۷۳] نے جالُوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا، اس کو علم دیا ـــــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا [۲۷۴]، لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اِس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

۲۷۳ – داؤد علیہ السّلام اس وقت ایک کم سِن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے، جب کہ فِلِستیوں کی فوج کا گراں ڈِیل پہلوان جالوت (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مُبارزَت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤدؑ یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعے نے اُنھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخرکار وہی اسرائیلیوں کے فرماں روا ہوئے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سموئیل اوّل، باب ۱۷ و ۱۸)

۲۷۴ – یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حدِ خاص تک تو زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے، مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو کسی دُوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک پارٹی ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی، تو یقیناً ملکِ خدا میں

Maktaba Tul Ishaat.com

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

الجزء ۳ وقف لازم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ

اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع

ع ۴۵ / ۳۳

یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سُنا رہے ہیں اور تم یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو، جو رسُول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دُوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا، تو ممکن نہ تھا کہ اِن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ آپس میں لڑتے۔ مگر (اللہ کی مشیّت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے) انھوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں، اللہ چاہتا، تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۲۷۵] ع

فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

۲۷۵ - مطلب یہ ہے کہ رسُولوں کے ذریعے سے علم حاصل ہو جانے کے بعد جو اختلافات لوگوں کے درمیان رُونما ہوئے اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک جو نوبتیں پہنچیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ معاذ اللہ! خدا بے بس تھا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ۬

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو[۲۷۶] قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں، جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔[۲۷۷]

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔[۲۷۸]

اور اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر وہ چاہتا، تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاؑ کی دعوت سے سرتابی کرسکتا اور کُفر و بغاوت کی راہ چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کرسکتا۔ مگر اس کی مَشیّت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لے اور انھیں ایک خاص رَوِش پر چلنے کے لیے مجبور کردے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انھیں زمین پر پیدا کیا تھا، اس لیے اس نے ان کو اعتقاد و عمل کی راہوں میں اِنتخاب کی آزادی عطا کی اور انبیاؑ کو لوگوں پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا کہ زبردستی انھیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں، بلکہ اس لیے بھیجا کہ دلائل اور بَیِّنات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوئے، وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی، اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کرلیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا، مگر معاذ اللہ! اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

۲۷۶ - مراد راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے، انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

۲۷۷ - یہاں کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مُراد یا تو وہ لوگ ہیں، جو خدا کے حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو اس کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں۔ یا وہ لوگ، جو اُس دن پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں، جس کے آنے کا خوف دلایا گیا ہے۔ یا پھر وہ لوگ جو اس خیالِ خام میں مُبتلا ہوں کہ آخرت میں انھیں کسی نہ کسی طرح نجات خرید لینے کا اور دوستی و سفارش سے کام نکال لے جانے کا موقع حاصل ہو ہی جائے گا۔

۲۷۸ - یعنی نادان لوگوں نے اپنی جگہ چاہے کتنے ہی خدا اور معبود بنا رکھے ہوں، مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلا شرکتِ غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے، جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں، بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے

Maktaba-Tul-Ishaat.com

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

وہ نہ سوتا ہے، اور نہ اُسے اُونگھ لگتی ہے۔[۲۷۹] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے۔[۲۸۰] کون ہے جو اُس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟[۲۸۱] جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ اِدراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے۔[۲۸۲]

زندہ ہے اور جس کے بل بُوتے ہی پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اُس کا شریک ہے، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ شریک ٹھیرا کر زمین یا آسمان میں جہاں بھی کسی اَور کو معبُود (الٰہ) بنایا جا رہا ہے، ایک جھوٹ گھڑا جا رہا ہے اور حقیقت کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔

۲۷۹ – یہ اُن لوگوں کے خیالات کی تردید ہے، جو خداوندِ عالَم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں، جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً بائبل کا یہ بیان کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ (کتابِ خُروج، باب ۲۰، آیت ۱۱)

۲۸۰ – یعنی وہ زمین و آسمان کا اور ہر اُس چیز کا مالک ہے، جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی مِلکیّت میں، اس کی تدبیر میں اور اُس کی پادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں۔ اس کے بعد کائنات میں جس دُوسری ہستی کا بھی تم تصوّر کر سکتے ہو، وہ بہر حال اِس کائنات کی ایک فرد ہی ہوگی، اور جو اس کائنات کا فرد ہے، وہ اللہ کا مملوک اور غلام ہے، نہ کہ اُس کا شریک اور ہمسر۔

۲۸۱ – یہ اُن مشرکین کے خیالات کا اِبطال ہے، جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دُوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر اَڑ بیٹھیں، وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرّب ترین فرشتہ اُس پادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جُرأت نہیں رکھتا۔

۲۸۲ – اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ اُوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ

اُس کی حکومت ۲۸۳ آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔ ۲۸۴

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ ۲۸۵ صحیح بات غلط خیالات سے

حاکمیّت اور اس کے مُطلق اختیارات کا تصوُّر پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دُوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے، جب کہ کسی دُوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مَصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جِنّ یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جُز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالَم درہم برہم ہو جائے۔ نظامِ عالَم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں، جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔

۲۸۳ – اصل میں لفظ ”کُرسی“ استعمال ہوا ہے، جسے بالعُموم حکومت و اقتدار کے لیے اِستعارے کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں بھی اکثر کرسی کا لفظ بول کر حاکمانہ اختیارات مُراد لیتے ہیں۔

۲۸۴ – یہ آیت ”آیت الکرسی“ کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمّل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اِسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔

اِس مَقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں خداوندِ عالَم کی ذات و صفات کا ذکر کس مناسبت سے آیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مرتبہ پھر اُس تقریر پر نگاہ ڈال لیجیے، جو رکوع ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُکسایا گیا ہے اور اُن کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر نہیں، بلکہ ایمان، صبر و ضبط اور پختگیِ عزم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت وابستہ ہے، اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دُنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ انسانوں کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرتا رہتا ہے، ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو غلبہ و اقتدار کا دائمی پٹا مل جاتا، تو دُوسروں کے لیے جینا دشوار ہو جاتا۔ پھر اس شبہے کو دفع کیا گیا ہے، جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر کھٹکتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر اختلافات کو مٹانے اور نزاعات کا سدِّباب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی

Maktaba Tul Ishaat.com

الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ
فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَ اللّٰہُ
سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ

الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت[۲۸۶] کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے

آمد کے باوجود نہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اُس نے اِن خرابیوں کو دُور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ اِس کے جواب میں بتا دیا گیا کہ اختلافات کو بجبر روک دینا اور نوعِ انسانی کو ایک خاص راستے پر بزور چلانا اللہ کی مشیّت ہی میں نہ تھا، ورنہ انسان کی کیا مجال تھی کہ اُس کی مشیّت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اُس اصل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا گیا جس سے تقریر کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہرحال حقیقتِ نفسُ الامری، جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے، یہ ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبُور کیا جائے۔ جو اُسے مان لے گا، وہ خود ہی فائدے میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا، وہ آپ نقصان اُٹھائے گا۔

۲۸۵ - یہاں ”دین“ سے مراد اللہ کے متعلق وہ عقیدہ ہے جو اُوپر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے، اور وہ پورا نظامِ زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”اسلام“ کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جو کسی کے سر جبرا منڈھی جا سکے۔

۲۸۶ - ”طاغوت“ لُغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اِصطلاح میں طاغوت سے مُراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اُصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اِس کا نام فِسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اُصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اَور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے مُلک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے، اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ع ۳۴/۲
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ

روشنی میں نکال لاتا ہے۔[287] اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت[288] ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ؏

کیا[289] تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟[290]

طاغوت کا منکر نہ ہو۔

۲۸۷ – تاریکیوں سے مُراد جہالت کی تاریکیاں ہیں، جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح وسعادت کی راہ سے دُور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صَرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مُراد علمِ حق ہے، جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علٰی وجہ البصیرت ایک صحیح راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

۲۸۸ – ''طاغوت'' یہاں طَوَاغِیت کے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چُنگل میں نہیں پھنستا، بلکہ بہت سے طَوَاغِیت اس پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے، جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دُوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات وخواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے۔ اور بے شمار طاغوت باہر کی دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی اور بچے، اَعِزّہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکّر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

۲۸۹ – اُوپر دعوٰی کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اُسے تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے، اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ

جھگڑا اِس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔[۲۹۱] جب ابراہیمؑ نے کہا کہ ''میرا رب وہ ہے، جس کے اختیار میں زندگی اور

جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہو گیا۔ مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی، اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں، جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا، سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چُھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مُشاہدہ کرا دیا۔

۲۹۰– اس شخص سے مُراد نُمرود ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جس واقعے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں نہیں ہے۔ مگر تلمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دار (chief officer of the state) کا منصب رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کُھلّم کُھلّا شرک کی مُخالَفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گُھس کر بُتوں کو توڑ ڈالا، تو اُن کے باپ نے خود ان کا مُقدّمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا اور پھر وہ گفتگو ہوئی، جو یہاں بیان کی گئی ہے۔

۲۹۱– یعنی اس جھگڑنے میں جو بات مابہ النّزاع تھی، وہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور یہ نزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اُس جھگڑنے والے شخص، یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ اِن دو فقروں میں جھگڑے کی نوعیّت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے:

(۱) قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیّت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدایگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اُسی کو رب اور تنہا اُسی کو خدا اور معبُود نہیں مانتے۔

(۲) خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (supernatural) خدائی، جو سلسلۂ اسباب پر حکمراں ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رُجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنّوں اور سیّاروں اور دُوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں، ان سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجا لاتے ہیں، اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدّنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیّت)، جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو، اور جسے دُنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مُطلَق اختیارات حاصل ہوں۔ اِس دوسری قسم کی خدائی کو دُنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے، یا اس کے ساتھ، شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے

يُمِيتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ
بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ

موت ہے، تو اُس نے جواب دیا: "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" ابراہیمؑ نے کہا: "اچھا، اللہ سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔" یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا، ۲۹۲

اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اِسی دُوسرے معنٰی میں خدائی کے مدّعی ہوئے ہیں، اور اسے مستحکم کرنے کے لیے اُنھوں نے بالعُموم پہلے معنٰی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہے ہیں۔

(۳) نمرود کا دعوائے خدائی بھی اِسی دُوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبّر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسبابِ عالَم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اِس ملکِ عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مُطلَق مَیں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دِہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدّار ہے، جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے، یا میرے سوا کسی اَور کو رب تسلیم کرے۔

(۴) ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبُود اور رب مانتا ہوں، اور اس کے سوا سب کی خدائی اور رُبوبیّت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہُوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبُودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زَد پڑتی ہے، اُسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جُرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

۲۹۲ – اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دُوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈِھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دُوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈِھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیمؑ نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی، اس کو تسلیم کر لینے کے معنٰی اپنی مُطلَق العِنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے، جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کُھل جاتی۔

تلمُود کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیے گئے۔ دس روز تک وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى
قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ
لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ
مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اُس شخص کو دیکھو، جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا، جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی[۲۹۳]۔ اُس نے کہا: ”یہ آبادی، جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا[۲۹۴]؟“ اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سَو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا: ”بتاؤ، کتنی مدّت پڑے رہے ہو؟“ اُس نے کہا: ”ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔“ فرمایا: ”تم پر سَو برس اِسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیّر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے

جیل میں رہے۔ پھر بادشاہ کی کونسل نے اُن کو زندہ جلانے کا فیصلہ کیا اور ان کے آگ میں پھینکے جانے کا وہ واقعہ پیش آیا، جو سورہ انبیاء، رکوع ۵، العنکبوت، رکوع ۲، ۳، اور الصافّات، رکوع ۴ میں بیان ہوا ہے۔

۲۹۳۔ یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدّعا، جس کے لیے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا، اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کی تعیین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ، نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

۲۹۴۔ اس سوال کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے یا انھیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عَینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاؑ کو کرایا جاتا رہا ہے۔

إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ
كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ
أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ
أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۚ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۚ قَالَ بَلَىٰ
وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۚ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ
فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ
ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾ ع ۳۵ ع ۳

گدھے کو بھی دیکھو (کہ اِس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)۔ اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں[۲۹۵]۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اُٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہوگئی، تو اس نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ "میرے مالک! مجھے دکھا دے، تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اُس نے عرض کیا: "ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اِطمینان درکار ہے[۲۹۶]۔" فرمایا: "اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جُز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے[۲۹۷]۔" ع

۲۹۵ – ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دُنیا سو برس پہلے مُردہ سمجھ چکی تھی، خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

۲۹۶ – یعنی وہ اطمینان، جو مشاہدۂ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ

جولوگ[۲۹۸] اپنے مال اللہ کی راہ میں صَرف کرتے ہیں[۲۹۹]، اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے

۲۹۷ – اس واقعے اور اُوپر کے واقعے کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔لیکن انبیاعلیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے، اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے، تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہلِ ایمان کو اِس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے، اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے۔لیکن انبیاؑ کو جو خدمت اللہ نے سُپرد کی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دُنیا کو دینی تھی۔اُن کو دُنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ تو قیاسات دوڑاتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں۔تمھارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں۔اِسی لیے انبیاؑ کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان و زمین کے نظامِ حکومت (ملکوت) کا مُشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو جنت اور دوزخ آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بَعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصبِ نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں۔نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادت کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت اُنھی کے ساتھ مخصوص ہے۔(مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ نمبر ۳۳۰ و ۳۳۴)

۲۹۸ – اب پھر سلسلۂ کلام اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے، جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔اس تقریر کی ابتدا میں اہلِ ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو، اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر کوئی گروہ جب تک کہ اُس کا مَعاشی نقطۂ نظر بالکل ہی تبدیل نہ ہو جائے، اس بات پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض سے بالاتر ہو کر محض ایک اعلیٰ درجے کے اَخلاقی مقصد کی خاطر اپنا مال بے دریغ صَرف کرنے لگے۔ مادّہ پرست لوگ، جو پَیسا کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہوں اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع ونقصان کی میزان ہی پر جمی رہتی ہو، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصدِ عالیہ کے لیے کچھ کرسکیں۔وہ بظاہر اَخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں، تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادّی منافع کا حساب لگالیتے ہیں۔اِس ذہنیّت کے ساتھ اُس دین کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دُنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلِمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دُوسری ہی قسم کے اَخلاقیات درکار ہیں۔اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کُشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طلَبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نَشو ونَما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رُکوعوں تک اسی ذہنیّت کی تخلیق کے لیے ہدایات

حَبَّةٍ اَنۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ
يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا
مَنًّا وَّلَآ اَذًى‌ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ

ایک دانہ بویا جائے اوراس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اِسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔[300] جولوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔[301] ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے

دی گئی ہیں۔

۲۹۹– مال کا خرچ خواہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو، یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے میں، یا اپنے اَعِزّہ و اقربا کی خبرگیری میں، یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہِ عام کے کاموں میں، یا اشاعتِ دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہرحال اگر وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو اور خالص خدا کی رضا کے لیے ہو تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

۳۰۰– یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا، اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ جو خدا ایک دانے میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں، اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمھاری خیرات کو بھی اسی طرح نشوونما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گنا ہو کر تمھاری طرف پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمھارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو، وہ نہ دے سکے۔ دوسرے، یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبے سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمھارا اجر مارا جائے۔

۳۰۱– یعنی نہ تو اُن کے لیے اس بات کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت

Maktaba Tul Ishaat.com

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

بہتر ہے، جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اُس کی صفت ہے۔[۳۰۲] اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دِکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔[۳۰۳] اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔[۳۰۴]

آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۳۰۲- اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تمھاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے۔ دُوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بُردبار ہے، اس لیے اُسے پسند بھی وہی لوگ ہیں، جو چھچھورے اور کم ظرف نہ ہوں، بلکہ فراخ حوصلہ اور بُردبار ہوں۔ جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمھارے قصوروں کے باوجود تمھیں بار بار بخشتا ہے، وہ ایسے لوگوں کو کیونکر پسند کر سکتا ہے، جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں، تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہم کلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا، جو اپنے عطیّے پر احسان جتاتا ہو۔

۳۰۳- اس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اُس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

۳۰۴- اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اُس نیت اور اُس جذبے کی خرابی ہے، جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے، جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ

ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے[۳۰۵]۔ بخلاف اِس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی سطحِ مُرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اُس کے لیے کافی ہو جائے[۳۰۶]۔ تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو،

کھیتی نشوونما پائے۔ لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اُوپر ہی اُوپر ہو، اور اس اُوپری تہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو، تو بارش مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مُضِر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے، مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے، اَور کچھ نہیں۔

۳۰۵۔ یہاں ”کافر“ کا لفظ ناشکرے اور منکرِ نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خَلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے، تو اس کے ساتھ اذیّت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اُسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

۳۰۶۔ ”زور کی بارش“ سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجے کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ
الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ
اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ
الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ؏ ۲۶۶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ
طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ وَلَا

نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہُوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جُھلس جائے، جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں[۳۰۷]؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔ ؏

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لیے نکالا ہے، اُس میں سے بہتر حصّہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں

اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے، جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدّت نہ ہو۔

۳۰۷- یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے، جب کہ تم اُس سے فائدہ اُٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سرِ نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ رہا ہو، تو یہ بات تم کیسے پسند کر رہے ہو کہ دُنیا میں مدّت العمر کام کرنے کے بعد آخرت کی زندگی میں تم اِس طرح قدم رکھو کہ وہاں پہنچ کر یکایک تمھیں معلوم ہو کہ تمھارا پورا کارنامۂ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دُنیا کے لیے کمایا تھا، وہ دُنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اُس کے پھل کھا سکو۔ وہاں تمھیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ از سرِ نو اب آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے، اِسی دُنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دُنیا ہی کی دُھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دُنیوی فائدے تلاش کرنے ہی میں کھپاتے رہے، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمھاری حالت بعینہٖ اُس بُڈھے کی طرح حسرت ناک ہو گی، جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالَمِ پیری میں اُس وقت جل گیا، جب کہ نہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے اور نہ اُس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ
اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾
اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ۖۙ
يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

دینے کے لیے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے، تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔[۳۰۸] شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرم ناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی اُمید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت ملی، اُسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔[۳۰۹] اِن باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں، جو دانش مند ہیں۔

۳۰۸- ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجے کی صفات سے مُتَّصف ہو، وہ بُرے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیّاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اَخلاق لوگوں سے محبّت کرے۔

۳۰۹- حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوّتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصُود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی، وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا، بلکہ اُس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں یہ بڑی ہوشیاری اور عقل مندی ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے، اُن کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے۔ حکمت و دانائی اُن کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے، اُسے اپنی متوسّط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دُنیا کی اس چند روزہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ
فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ
وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اُس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔[۳۱۰] اگر اپنے صدقات عَلانِیَہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چُھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔[۳۱۱] تمھاری بہت سی بُرائیاں اِس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔[۳۱۲] اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو بہر حال اُس کی خبر ہے۔

زندگی میں دُوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو، لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پُوری زندگی نہیں، بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جُز ہے۔ اس چھوٹے سے جُز کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے، وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ عقل مند دراصل وہی ہے، جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر تھوڑے سرمایے ہی سے اُس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوش حالی کا بندوبست کر لیا۔

۳۱۰- خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں آدمی کی نیّت اور اس کے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر نذر مانی ہوگی، وہ اس کا اجر پائیں گے، اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دُوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی، اُن کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اُوپر لازم کر لے، جو اس کے ذمّے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا مُوجبِ عذاب ہے۔

۳۱۱- جو صدقہ فرض ہو، اس کو عَلانِیَہ دینا افضل ہے، اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو، اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اُصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا عَلانِیَہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چُھپا کر کرنا اَولیٰ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمّے داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پُورا پُورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔[۳۱۳]

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گِھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ مَعاش کے لیے زمین میں کوئی دَوڑ دُھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر

۳۱۲ – یعنی چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اَخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اَوصافِ حمیدہ خوب نشو و نما پاتے ہیں، اس کی بُری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اس کو اللہ کے ہاں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں، انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

۳۱۳ – ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہلِ حاجت کی مدد کرنے میں تأمّل کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلۡحَافًا ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ۝۲۷۳ اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ
اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝۲۷۴
اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ

کچھ مانگیں۔ اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا[۳۱۴]۔ع

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سُود[۳۱۵] کھاتے ہیں، اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے،

غلط فہمی دُور کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اُتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سُبک دوش ہو چکے۔ اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دُنیوی مال و متاع سے اُن کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامّل نہ کرو کہ اُنھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے، اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

۳۱۴- اِس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صَرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی مَعاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جِدّ و جُہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا، جو تاریخ میں اصحابِ صُفَّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے، جو اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ ہمہ وقت حضوؐر کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ حضوؐر جس مہم پر چاہتے، انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا، اس وقت یہ مدینے ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا اِنفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

۳۱۵- اصل میں لفظ ’’رِبٰوا‘‘ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی عربی میں زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اِصطلاحاً اہلِ عرب اِس لفظ کو اُس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ اِسی کو ہماری زبان میں سُود کہتے ہیں۔ نُزولِ قرآن کے وقت سُودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنھیں اہلِ عرب ’’رِبٰوا‘‘ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کے ہاتھ کوئی

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ وقف لازم

جسے شیطان نے چھُو کر باؤلا کر دیا ہو۔[۳۱۶] اور اس حالت میں اُن کے مُبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''تجارت بھی تو آخر سُود ہی جیسی چیز ہے''،[۳۱۷] حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔[۳۱۸]

چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدّت مقرر کر دیتا۔ اگر وہ مدّت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی، تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدّت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہو گی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدّت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدّت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی، تو مزید مُہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اِسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

۳۱۶- اہلِ عرب دیوانے آدمی کو ''مجنُون'' (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے، تو یوں کہتے کہ اسے جنّ لگ گیا ہے۔ اسی محاورے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سُود خوار کو اُس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے، اسی طرح سُود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جُنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سُود خواری سے کس کس طرح انسانی محبّت، اخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کُن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اِس دُنیا میں ہے۔ اور چونکہ آخرت میں انسان اُسی حالت میں اُٹھایا جائے گا جس حالت پر اُس نے دُنیا میں جان دی ہے، اِس لیے سُود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اُٹھے گا۔

۳۱۷- یعنی ان کے نظریّے کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے، اس کی نوعیّت اور سُود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے، اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں اِستدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع جائز ہے، تو قرض پر دیے ہوئے روپے کا منافع کیوں ناجائز ہو۔ اِسی طرح کے دلائل موجودہ زمانے کے سُود خوار بھی سُود کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا، اسے وہ قرض پر دُوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی بہر حال اس سے فائدہ ہی اُٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اُٹھا رہا ہے، اس میں سے ایک حصّہ وہ قرض دینے والے کو نہ ادا کرے؟ مگر یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں، خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت

Maktaba Tul Ishaat.com

کے یا زراعت کے، اور خواہ انھیں آدمی صرف اپنی محنت سے کرتا ہو، یا اپنے سرمایے اور محنت ہر دو سے، اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقرر منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دُنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار قرار پائے؟ غیر نفع بخش اغراض کے لیے قرض لینے والے کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجیے، اور شرح کی کمی بیشی کے مسئلے سے بھی قطعِ نظر کر لیجیے۔ معاملہ اُسی قرض کا سہی جو نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے لیا جائے، اور شرح بھی تھوڑی ہی سہی۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں، اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بارآور ہونا موقوف ہے، ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل اُنھی کے سر ہو، مگر جس نے صرف اپنا روپیا انھیں قرض دے دیا ہو، وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وُصول کرتا چلا جائے! یہ آخر کس عقل، کس مَنْطِق، کس اُصولِ انصاف اور کس اُصولِ مَعاشیات کی رُو سے درست ہے؟ اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانے کو بیس سال کے لیے ایک رقم قرض دے اور آج ہی یہ طے کر لے کہ آیندہ ۲۰ سال تک وہ برابر ۵ فی صد سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہو گا، حالانکہ وہ کارخانہ جو مال تیار کرتا ہے اس کے متعلق کسی کو بھی نہیں معلوم کہ مارکیٹ میں اس کی قیمتوں کے اندر آیندہ بیس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہو گا؟ اور یہ کس طرح دُرست ہے کہ ایک قوم کے سارے ہی طبقے ایک لڑائی میں خطرات اور نقصانات اور قربانیاں برداشت کریں، مگر ساری قوم کے اندر سے صرف ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو جو اپنے دیے ہوئے جنگی قرض پر اپنی ہی قوم سے لڑائی کے ایک صدی بعد تک سُود وُصول کرتا رہے؟

۳۱۸- تجارت اور سُود کا اُصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی مَعاشی اور اَخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مُشتری کے درمیان منافع کا مُساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اُٹھاتا ہے جو اُس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اُجرت لیتا ہے، جس کو اس نے مُشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صَرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے، سُودی لین دین میں مَنافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سُود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے، جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلے میں سُود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے، جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے، تب تو ظاہر ہے کہ مُہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت، یا زراعت، یا صَنعت وحِرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے، تب بھی مُہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے، اُسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دُوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعیّن فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مُشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ جو کچھ لیتا ہے، ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سُود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کا

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آیندہ کے لیے وہ سُودخواری سے باز آجائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔[۳۱۹] اور جو اِس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ

منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اُٹھاتا ہے، اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائلِ معیشت، حتّٰی کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کرلے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مُشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صَرف نہیں ہوتی، بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ مالکِ جائداد کو واپس دے دی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایے کو صَرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صَرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صَرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سُودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت ومشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریکِ غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اِصطلاحی ”شریک“ کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسُب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلالحاظِ نفع ونقصان اور بلالحاظِ تناسُبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

اِن وجوہ سے تجارت کی مَعاشی حیثیت اور سُود کی مَعاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدُّن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سُود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سُود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بُخل، خودغرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے، اور ہمدردی وامدادِ باہمی کی رُوح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سُود مَعاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسانی کے لیے تباہ کُن ہے۔

۳۱۹– یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کھالیا، اسے اللہ معاف کر دے گا، بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”جو کھا چکا سو کھا چکا“ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا، اسے

Maktaba Tul Ishaat.com

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ

ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سُود کا مَٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نَشْوونَما دیتا ہے۳۲۰۔ اور اللہ

معاف کر دیا گیا، بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سُود پہلے کھایا جا چکا ہے، اسے واپس دینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدّمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ مگر اَخلاقی حیثیت سے اُس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سُودی کاروبار سے سمیٹا ہو۔ اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہو گا اور اس کا مَعاشی و اخلاقی نقطۂ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہو گا، تو وہ خود اپنی اس دولت کو، جو حرام ذرائع سے آئی تھی، اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حق داروں کا پتا چلایا جا سکتا ہے، جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا مال انھیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصّۂ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے، اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اُٹھاتا رہے، تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے۔

۳۲۰- اِس آیت میں ایک ایسی صداقت بیان کی گئی ہے، جو اَخلاقی و رُوحانی حیثیت سے بھی سراسر حق ہے اور مَعاشی وتمدّنی حیثیت سے بھی۔ اگرچہ بظاہر سُود سے دولت بڑھتی نظر آتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سُود اخلاقی و رُوحانی اور مَعاشی وتمدّنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزُّل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس صدقات سے (جن میں قرضِ حَسَن بھی شامل ہے) اخلاق و رُوحانیت اور تمدُّن و معیشت، ہر چیز کو نَشْوونَما نصیب ہوتا ہے۔

اخلاقی و رُوحانی حیثیت سے دیکھیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سُود دراصل خود غَرضی، بُخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ اِنھی صفات کو انسان میں نَشْوونَما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات نتیجہ ہیں فیّاضی، ہمدردی، فراخ دِلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا، اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ کون ہے جو اخلاقی صفات کے ان دونوں مجموعوں میں سے پہلے مجموعے کو بدترین اور دُوسرے کو بہترین نہ مانتا ہو؟

تمدّنی حیثیت سے دیکھیے، تو بادنیٰ تأمّل یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آجائے گی کہ جس سوسائٹی میں افراد ایک دُوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مال دار طبقوں کا مفاد عامّۃ النّاس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی مَحبّت کے بجائے باہمی بُغض وحسد اور بے دردی و بے تعلقی نَشْوونَما پائے گی۔ اس کے اجزا ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لیے مددگار ہو جائیں، تو ایسی سوسائٹی کے اجزا کا باہم متصادم

ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائٹی کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دُوسرے کے ساتھ فیّاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دُوسرے کی حاجت کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں باوسیلہ لوگ بے وسیلہ لوگوں سے ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسی سوسائٹی میں آپس کی محبّت، خیر خواہی اور دلچسپی نَشو وَنَما پائے گی۔ اس کے اجزا ایک دُوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پُشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادُم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلی قسم کی سوسائٹی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

اب مَعاشی حیثیت سے دیکھیے۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سُودی قرض کی دو قسمیں ہیں: ایک، وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبُور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا، وہ قرض جو تجارت اور صنعت وحَرفت اور زراعت وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض کو تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس پر سُود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کُن ہے۔ دُنیا کا کوئی مُلک ایسا نہیں ہے جس میں مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشتکاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون نہ چوس رہے ہوں۔ سُود کی وجہ سے اس قسم کا قرض ادا کرنا ان لوگوں کے لیے سخت مشکل، بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی کئی گنا سُود دے چکنے پر بھی اصل رقم جُوں کی تُوں باقی رہتی ہے۔ محنت پیشہ آدمی کی آمدنی کا بیشتر حصّہ مہاجن لے جاتا ہے اور اس غریب کی اپنی کمائی میں سے اس کے پاس اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کافی روپیا نہیں بچتا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ اپنے کام سے کارکنوں کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی محنت کا پھل دُوسرا لے اُڑے تو وہ کبھی دل لگا کر محنت نہیں کر سکتے۔ پھر سودی قرض کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ہر وقت کی فکر اور پریشانی اس قدر گُھلا دیتی ہے، اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے لیے صحیح غذا اور علاج اس قدر مشکل ہو جاتا ہے، کہ ان کی صحّتیں کبھی دُرست نہیں رہ سکتیں۔ اس طرح سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں آدمیوں کا خون چُوس چُوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم کی پیدائشِ دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے، اور مآلِ کار میں خود وہ خون چُوسنے والے افراد بھی اس کے نقصانات سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ ان کی اس خود غرضی سے غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کی بدولت مال دار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اُٹھتا اور گُھٹتا رہتا ہے، اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مال داروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا ہے۔

رہا دُوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے، تو اس پر ایک مقرر شرحِ سُود کے عائد ہونے سے جو بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں، ان میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

(۱) جو کام رائج الوقت شرحِ سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے ملک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیا نہیں ملتا اور ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے، جو

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ

کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲۱] ہاں، جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

بازار کی شرحِ سُود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں، چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔

(۲) جن کاموں کے لیے سُود پر سرمایہ ملتا ہے، خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع ایک مقرر میعاد، مثلاً پانچ، چھ یا دس فی صد تک یا اس سے اُوپر اُوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا۔ اِس کی ضمانت ہونا تو درکنار، کسی کاروبار میں سرے سے اِسی بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا، نقصان کبھی نہ ہوگا۔ لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایے کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقرر شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو، نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع اور وہ بھی ایک مقرر شرحِ منافع کی ضمانت پر روپیا دیتا ہے، اس وجہ سے کاروبار کی بھلائی اور بُرائی سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ انتہائی خود غرضی کے ساتھ صرف اپنے منافع پر نگاہ رکھتا ہے، اور جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کَساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے، تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیا کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اِس طرح کبھی تو محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کَساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے، اور کبھی اگر دُوسرے اسباب سے کَساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کُن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

سُود کے یہ تین نقصانات تو ایسے صریح ہیں کہ کوئی شخص جو علم المعیشت سے تھوڑا سا مَس بھی رکھتا ہو، ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ مانے بغیر کیا چارہ ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی رُو سے سود مَعاشی دولت کو بڑھاتا نہیں بلکہ گھٹاتا ہے۔

اب ایک نظر صدقات کے مَعاشی اثرات و نتائج کو بھی دیکھ لیجیے۔ اگر سوسائٹی کے خوشحال افراد کا طریقِ کار یہ ہو کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات خریدیں، پھر جو روپیا ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ بچے، اسے غریبوں میں بانٹ دیں، تاکہ وہ بھی اپنی ضروریات خرید سکیں، پھر اس پر بھی جو روپیا بچ جائے، اسے یا تو کاروباری لوگوں کو بلا سُود قرض دیں، یا شرکت کے اُصول پر ان کے ساتھ نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں، یا حکومت کے پاس جمع کر دیں کہ وہ اجتماعی خدمات کے لیے ان کو استعمال کرے، تو ہر شخص تھوڑے سے غور و فکر ہی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تجارت اور صنعت اور زراعت، ہر چیز کو بے انتہا فروغ حاصل ہوگا۔ اُس کے عام افراد کی خوش حالی

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اُن کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔[۳۲۲]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ[۳۲۳] ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو

کا معیار بلند ہوتا چلا جائے گا اور اس میں بحیثیتِ مجموعی دولت کی پیداوار اُس سوسائٹی کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہوگی جس کے اندر سُود کا رواج ہو۔

۳۲۱- ظاہر ہے کہ سُود پر روپیا وہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصّہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصّہ، جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے دراصل اللہ کا فضل ہے۔ اور اللہ کے فضل کا صحیح شکر یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے، اسی طرح بندہ بھی اللہ کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصّہ پا رہے ہیں، ان کے قلیل حصّے میں سے بھی وہ اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جُز اپنی طرف کھینچ لے، تو حقیقت میں وہ ناشکرا بھی ہے اور ظالم، جفاکار اور بدعمل بھی۔

۳۲۲- اس رُکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے، جو خدا اور خَلق دونوں کے حُقوق سے بے پروا ہو کر روپیا گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں منہمک ہو۔ دُوسرا کردار ایک خدا پرست، فیّاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے، جو خدا اور خَلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوتِ بازو سے کما کر خود کھائے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے۔ دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی، اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم و اندوہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ
كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى
اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع

ع ۳۸ ۸ ۲

اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمھارا قرض دار تنگ دست ہو، تو ہاتھ کھُلنے تک اُسے مہلت دو، اور جو صدقہ کر دو، تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔[۳۲۴] اُس دن کی رُسوائی و مصیبت سے بچو، جب کہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے، وہاں ہر شخص کو اُس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہو گا۔ ع

کُلفت و مصیبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ کو دُوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دُنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے۔

۳۲۳- یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اِس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سُود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا، مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نُزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے، ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عُمّال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی، تو معاہدے میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے، تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمھارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابنِ عباسؓ، حسن بصریؒ، ابنِ سیرینؒ اور ربیع بن اَنسؒ کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالاسلام میں سُود کھائے، اسے توبہ پر مجبور کیا جائے، اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دُوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے۔ جب تک وہ سُود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے، اسے نہ چھوڑا جائے۔

۳۲۴- اسی آیت سے شریعت میں یہ حکم نکالا گیا ہے کہ جو شخص ادائے قرض سے عاجز ہو گیا ہو، اسلامی عدالت اس کے قرض خواہوں کو مجبور کرے گی کہ اُسے مہلت دیں، اور بعض حالات میں وہ پورا قرض یا قرض کا ایک حصہ معاف بھی کرانے کی مجاز ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے کاروبار میں گھاٹا آ گیا اور اس پر قرضوں کا بار بہت چڑھ گیا۔ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے اس بھائی کی مدد کرو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کو مالی امداد دی۔ مگر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ
كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین[۳۲۵] کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔[۳۲۶] فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا)، اور اُسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہُوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔

قرضے پھر بھی صاف نہ ہو سکے۔ تب آپؐ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو کچھ حاضر ہے، بس وہی لے کر اسے چھوڑ دو، اس سے زیادہ تمھیں نہیں دلوایا جا سکتا۔ فقہانے تصریح کی ہے کہ ایک شخص کے رہنے کا مکان، کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور وہ آلات جن سے وہ اپنی روزی کماتا ہو، کسی حالت میں قُرق نہیں کیے جا سکتے۔

۳۲۵- اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملے میں مدت کی تعیین ہونی چاہیے۔

۳۲۶- عُموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قراردادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرا لینی چاہیے، تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں، جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں، مگر ان کی فریاد سُنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخُلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دُوسرا، وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ تیسرا، وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا

پھر اپنے مَردوں میں[۳۲۷] سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بُھول جائے، تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں، جن کی گواہی تمھارے درمیان مقبول ہو۔[۳۲۸] گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے، تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو

دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

۳۲۷- یعنی مسلمان مردوں میں سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں گواہ بنانا اختیاری فعل ہو، وہاں مسلمان صرف مسلمانوں ہی کو اپنا گواہ بنائیں۔ البتہ ذمّیوں کے گواہ ذمّی بھی ہو سکتے ہیں۔

۳۲۸- مطلب یہ ہے کہ ہر کس وناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو اپنے اَخلاق ودیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ
وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ
كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

کوئی حرج نہیں[۳۲۹]، مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے[۳۳۰]۔ ایسا کرو گے، تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریقِ عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے، تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو[۳۳۱]۔

۳۲۹- مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روز مرّہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملۂ بیع کا تحریر میں آجانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں ہے۔ اِسی طرح ہمسایہ تاجر ایک دوسرے سے رات دن جو لین دین کرتے رہتے ہیں، اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضایقہ نہیں۔

۳۳۰- اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، اور یہ بھی کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

۳۳۱- یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے، اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملۂ رہن کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو، صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیا لے لے۔ لیکن قرآنِ مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اِس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ
اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۚ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ع ۳۹
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اگر تم میں سے کوئی شخص دُوسرے پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے، تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔ اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔[۳۳۲] جو شہادت چھُپاتا ہے، اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔ اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ع

آسمانوں[۳۳۳] اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔[۳۳۴] تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھُپاؤ

واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضے میں شے مَرہُونہ سے فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے، تو دراصل سُود کھاتا ہے۔ قرض پر براہِ راست سُود لینے اور رَہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اُصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ دراصل اُس چارے کا معاوضہ ہے جو مُرتہِن اس جانور کو کھلاتا ہے۔

۳۳۲- شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر ’’شہادت چھُپانے‘‘ کا اطلاق ہوتا ہے۔

۳۳۳- یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس لیے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا، اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اُصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دینِ اسلام کی اساس قائم ہے۔ تقابُل کے لیے اس سورہ کے پہلے رکوع کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔

۳۳۴- یہ دین کی اوّلین بنیاد ہے۔ اللہ تعالٰی کا مالکِ زمین و آسمان ہونا اور اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں، اللہ ہی کی مِلک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جُھکا دے۔

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَآءُ ۖ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۖ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔[۳۳۵] پھر اُسے اختیار ہے، جسے چاہے، معاف کر دے اور جسے چاہے، سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۳۳۶]

رسولؐ اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اِس رسولؐ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ”ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سُنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔“[۳۳۷]

۳۳۵- اس فقرے میں مزید دو باتیں ارشاد ہوئیں: ایک، یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمّہ دار اور جواب دِہ ہے۔ دُوسرے، یہ کہ جس پادشاہِ زمین و آسمان کے سامنے انسان جواب دِہ ہے، وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے، حتّٰی کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۳۳۶- یہ اللہ کے اختیارِ مطلق کا بیان ہے۔ اُس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اُس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبُور ہو، بلکہ وہ مالکِ مختار ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے کے کُلّی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

۳۳۷- اس آیت میں تفصیلات سے قطعِ نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے: اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اور اس کی کتابوں کو ماننا۔ اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)۔ اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخرِ کار ہمیں اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا
مَا اكۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ
رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ

اللہ کسی متنفس پر اُس کی مَقدِرَت سے بڑھ کر ذمّہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ۳۳۸ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔ ۳۳۹ (ایمان لانے والو! تم یوں دُعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بُھول چُوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر

حضور میں حاضر ہونا ہے۔ یہ پانچ اُمور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اِن عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے، اسے وہ بسر وچشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حُسنِ عمل پر غرّہ نہ کرے، بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

۳۳۸- یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مَقدِرَت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پُرس کرے کہ تو نے فُلاں کام کیوں نہ کیا۔ یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اس کی مَقدِرَت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مؤاخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مَقدِرَت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔

۳۳۹- یہ اللہ کے قانونِ مجازات کا دوسرا قاعدۂ کُلیّہ ہے۔ ہر آدمی انعام اُسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دُوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامے میں لکھے جائیں۔ اور ایک دُوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالم اوّل کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا برا، جو کچھ بھی پھل ہوگا، اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہرحال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس برائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو، اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔ مُکافاتِ عمل کوئی قابلِ انتقال چیز نہیں ہے۔

مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ
عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

ڈالے تھے۔[۳۴۰] پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔[۳۴۱] ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔[۳۴۲] ع

۳۴۰- یعنی ہمارے پیش رووں کو تیری راہ میں جو آزمایشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں سے وہ گزرے، جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، اُن سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنّت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے، اُسے سخت آزمایشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور جب آزمایشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے۔ لیکن بہرحال مومن کو اللہ سے دُعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ اس کے لیے حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔

۳۴۱- یعنی مشکلات کا اتنا ہی بار ہم پر ڈال، جسے ہم سہار لے جائیں۔ آزمایشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پُورے اُتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوتِ برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہِ حق سے ڈگمگا جائیں۔

۳۴۲- اس دُعا کی پوری رُوح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، جبکہ مکّے میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ سرزمینِ عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی سرزمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے، تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکینِ قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں، بلکہ انھیں اس دُعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے، جو محض حق پرستی کے جرم میں اُن لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں

Maktaba Tul Ishaat.com

دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے، جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں کسی دُنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف اِن حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے، اور دُوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے، جن سے یہ دُعا لبریز ہے۔ اس تقابل ہی سے صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی اَخلاقی و رُوحانی تربیّت دی جا رہی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ۵۵)

آدم علیہ السّلام کی تخلیق کے وقت اللہ اور فرشتوں کی گفتگو کا ذکر تلمُود میں بھی آیا ہے، مگر وہ بھی اس معنوی رُوح سے خالی ہے جو قرآن کے بیان کردہ قصّے میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ لطیفہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب فرشتوں نے اللہ سے پوچھا: ''انسانوں کو آخر کیوں پیدا کیا جا رہا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ''تاکہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔'' بدلوگوں کا ذکر اللہ نے نہیں کیا۔ ورنہ فرشتے انسان کی تخلیق کی منظوری نہ دیتے۔

Talmudic Miscellany, Paul Isaac Hershon - LONDON 1880, P 294-95

تفہیم القرآن

آلِ عمران

(۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

آلِ عمران

نام اس سورت میں ایک مقام پر ''آلِ عمران'' کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اور اجزائے مضمون اِس میں چار تقریریں شامل ہیں:

پہلی تقریر آغازِ سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے، اور وہ غالبًا جنگِ بَدر کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوئی ہے۔

دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَۙ (اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ۹ھ میں وفدِ نَجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی۔

تیسری تقریر ساتویں رُکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے، اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے مُتّصل ہی معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختمِ سورت تک جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی ہے۔

خطاب اور مَباحِث اِن مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے، وہ مقصد و مُدّعا اور مرکزی مضمون کی یکسانی ہے۔ سورت کا خطاب خُصُوصیّت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)۔ دُوسرے، وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

پہلے گروہ کو اُسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۂ بَقَرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ اُن کی اعتقادی گمراہیوں اور اَخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بُلا رہا ہے، جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاؑ دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرت اللہ کے مطابق ایک ہی دینِ حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستے سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں، وہ خود اُن کتابوں کی رُو سے بھی صحیح نہیں ہیں، جن کو تم کُتُبِ آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔

دُوسرے گروہ کو، جو اَب بہترین اُمّت ہونے کی حیثیت سے حق کا عَلَم بردار اور دُنیا کی اصلاح کا

ذمّہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بَقرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلی اُمتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے بچیں۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہلِ کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر بھی متوجّہ کیا گیا ہے، جن کا ظہور جنگِ اُحد کے سلسلے میں ہوا تھا۔

اس طرح یہ سورت نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزا میں مسلسل و مربوط ہے، بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمّہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مقام بَقرہ سے متّصل ہی ہے۔

شانِ نزول سورت کا تاریخی پَس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمایشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت مُتنَبِّہ کر دیا گیا تھا، وہ پوری شدّت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں۔ جنگِ بَدر میں اگرچہ اہلِ ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی، لیکن یہ جنگ گویا بھِڑوں کے چھتّے میں پتھر مارنے کی ہم معنیٰ تھی۔ اس اوّلین مسلّح مقابلے نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا، جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینے کی یہ چھوٹی سی بستی، جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے، صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینے کی مَعاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اوّل تو ایک چھوٹے سے قصبے میں، جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آ جانے ہی سے مَعاشی توازُن بگڑ چکا تھا۔ اس پر مزید مصیبت اس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہوگئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو مُعاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرّہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بَدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کُھلّم کُھلّا قریش اور دُوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دِلا دِلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نَضِیر کے سردار کَعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کے ہمسایگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے، اُن کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اُٹھا دیا۔ آخرِ کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بَدر کے چند مہینے بعد

Maktaba Tul Ishaat.com

بنی قَینُقاع پر، جو اِن یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور اُنھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دُوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مدینے کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپؐ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرامؓ اس زمانے میں بالعُموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شب خون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابۂ کرامؓ گھبرا کر آپؐ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکّے سے تین ہزار کا لشکرِ جرّار مدینے پر حملہ آور ہو گیا اور اُحُد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی، جو جنگِ اُحُد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینے سے نکلے تھے۔ مگر راستے میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینے کی طرف پلٹ گئے۔ اور جو سات سو آدمی آپؐ کے ساتھ رہ گئے تھے، ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی، جس نے دَورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دُشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحُد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصّہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصّہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قُدرَتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اَخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی، جس کی اَخلاقی تربِیَت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دُوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس جنگ کی پوری سرگُزَشت پر ایک مفصّل تبصرہ کیا جائے، اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں، ان میں سے ایک ایک کی نشان دِہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے، جو دُنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

آیاتہا ۲۰۰
سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ
رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾

ا، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔[۱]

اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے،[۲]

۱- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۷۸۔

۲- عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پُرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں، اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اُلجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن اُن سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کے اندر مندرج ہے، اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیلِ اربعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بِعثَت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دَوران میں اُن پر نازل ہوئے۔ اُن میں سے دس احکام تو وہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کَندہ کر کے انھیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں، اور ایک نقل بنی لاوِی کے حوالے کی تھی، تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المَقدِس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی اور بنی اسرائیل اس کو "توریت" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے اُن کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکلِ سلیمانی کی مَرَمّت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سَجّادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خِلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عُجوبے کی طرح اسے شاہی مُنشی کو دیا اور شاہی مُنشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا، جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

(ملاحظہ ہو: ۲-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۸ تا ۱۳) یہی وجہ ہے کہ جب بُخْتِ نَصَّر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے، جو اُن کے ہاں طاقِ نِسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عَزرا کاہن (عُزَیْر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کُھچے لوگ بابِل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المَقْدِس تعمیر ہوا، تو عَزرا نے اپنی قوم کے چند دُوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مُرتّب کی، جو اَب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب، یعنی خُروج، اَحبار، گنتی اور اِستِثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت ہی میں تاریخِ نُزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دی گئی ہیں، جو عَزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں۔ پس دراصل اب تورات اُن منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرتِ موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں صرف اِس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اِس تاریخی بیان کے دَوران میں جہاں کہیں سیرتِ موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے یہ فرمایا، یا موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند تمھارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جُز شروع ہوتا ہے، اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے، وہاں وہ جُز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنّف نے تفسیر وتشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصّہ ہے، یا شرح وتفسیر۔ تاہم جو لوگ کُتُبِ آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں، وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری وتشریحی اضافے ملحق کر دیے گئے ہیں۔

قرآن اِنھی منتشر اجزا کو ''تورات'' کہتا ہے، اور اِنھی کی وہ تصدیق کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض بعض مقامات پر جُزوی احکام میں اختلاف ہے، اُصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرِمُو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح انجیل دراصل نام ہے اُن الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیتِ نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیّبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتّب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کر لیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدّت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے، تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کر دیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنّفین تک زبانی رِوایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج مَتّی، مَرقُس، لُوقا اور یُوحنّا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیحؑ کے وہ ارشادات ہیں، جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنّفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو مُمیّز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیحؑ نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔ قرآن اِنھی اجزا کے مجموعے کو

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۵﴾ هُوَ
الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں، ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[۳]۔ وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے[۴]۔ اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔

''انجیل'' کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتّب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے، تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا، اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصّبانہ غور و تأمّل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔

۳ – یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو، وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اسی کتاب میں انسان کو میسر آ سکتا ہے، جو اس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

۴ – اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک، یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے، نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے، نہ تم خود جان سکتے ہو۔ لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جس نے تمھارے اِستقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دُنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا، حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو، تو وہ یہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ

اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بُنیاد ہیں[۵] اور دوسری متشابہات۔[۶]

۵- مُحکَم پکّی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ ''آیاتِ مُحکَمات'' سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنٰی ومدّعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات ''کتاب کی اصل بنیاد ہیں''، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے، اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ اُنھی میں اسلام کی طرف دُنیا کو دعوت دی گئی ہے، اُنھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، اُنھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ اُنھی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، اُنھی میں عقائد، عبادات، اَخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رُجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بُجھانے کے لیے آیاتِ مُحکَمات ہی اصل مَرجَع ہیں، اور فطرتاً اُنھی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر اُنھی سے فائدہ اُٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۶- متشابہات، یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجایش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا، جب تک کائنات کی حقیقت، اور اس کے آغاز و انجام، اور اس میں انسان کی حیثیت، اور ایسے ہی دُوسرے بنیادی اُمور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماورا ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں، نہ آ سکتی ہیں، جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا، نہ چھُوا، نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو اُنھی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں، جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں، جو اصل حقیقت سے قریب تر مُشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں، جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

لیکن اِس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے، یا اس کا ایک دُھندلا سا تصوّر پیدا کر دے۔ ایسی آیات کے مفہُوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی، اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا، حتّٰی کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دُور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالبِ حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے، وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ
ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اللّٰهُ ‌ؔ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖۙ كُلٌّ مِّنۡ وقف منزل وقف لازم
عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ
قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَيۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً ۚ
اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوۡمٍ

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا اُن پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔" اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ "پروردگار! جب تُو ہمیں سیدھے رستے پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مُبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے

دُھندلے تصوّر پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صَرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بُوالفضول یا فتنہ جُو ہوتے ہیں، اُن کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

۷- یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم جانتے ہی نہیں، تو ان پر ایمان کیسے لے آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معقول آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیاتِ محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے، تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادھا مفہوم اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے، اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے، وہاں کھوج لگانے اور مُوشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مُجمل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع
لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝٩ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝١٠ لا كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١١ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ
اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝١٢ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ
الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ

آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ تُو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔'' ع

جن لوگوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا ہے[8]، انھیں اللہ کے مقابلے میں نہ اُن کا مال کچھ کام دے گا، نہ اولاد۔ وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا، جیسا فرعون کے ساتھیوں اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس اے محمدؐ! جن لوگوں نے تمھاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اُن سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت، جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمھارے لیے اُن دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دُوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشمِ سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ

۸- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورہ بقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔

مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡىَ الۡعَيۡنِ‌ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ
اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ
حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ
الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ

مومن گروہ سے دوچند ہے[۹]۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے، مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے[۱۰]۔

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس — عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے،

---

۹ – اگرچہ حقیقی فرق سہ چند تھا، لیکن سرسری نگاہ سے دیکھنے والا بھی یہ محسوس کیے بغیر تو نہیں رہ سکتا تھا کہ کفار کا لشکر مسلمانوں سے دوگنا ہے۔

۱۰ – جنگِ بدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانے ہی میں پیش آچکا تھا، اس لیے اس کے مشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے، اس سے دونوں کا اخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیزگاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجے کا اخلاقی اِنضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں کی جا رہی تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کفار کی کثیر التعداد اور بہتر اسلحہ رکھنے والی فوج کے مقابلے میں جس طرح کامیاب ہوئے، اس سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سروسامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پُھولے ہوئے تھے، ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلّاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینے کے کاشتکاروں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کے ذریعے سے قریش جیسے قبیلے کو شکست دلوا سکتا ہے، جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَاۚ وَاللّٰهُ
عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلۡ اَؤُنَبِّئُكُمۡ بِخَيۡرٍ مِّنۡ ذٰلِكُمۡؕ
لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَاَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضۡوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِۚ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ
اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِۚ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيۡنَ

مویشی اور زرعی زمینیں ـــــ بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں[11] گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویّے پر گہری نظر رکھتا[12] ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ”مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔“ یہ لوگ صبر کرنے والے[13] ہیں،

۱۱ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۷۔

۱۲ – یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے اور نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اُس کے انعام کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

۱۳ – یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں۔ کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتے، کسی ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں، جبکہ بظاہر اُس کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۶۰)

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
بِالْاَسْحَارِ ۝١٧ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١٨ ۭ
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ

راست باز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے[۱۴]، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے[۱۵]۔ وہ انصاف پہ قائم ہے۔ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام[۱۶] ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے، جنھیں کتاب

۱۴ - یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ـــــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ـــــ کہ پورے عالَم وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے، جو خدائی کی صفات سے متّصف ہو، خدائی کے اقتدار کی مالک ہو، اور خدائی کے حُقوق کی مستحق ہو۔

۱۵ - اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے، کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلِ کار ہیں اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے، جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رُجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے، ان سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ مُتّفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مُدبّر ہے۔

۱۶ - یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و دُرست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سُپرد کردے اور اس کی بندگی بجا لانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے، بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو ہدایت

Maktaba Tul Ishaat.com

اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ
وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ
حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

دی گئی تھی، اُن کے اِس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دُوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا[۱۷] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کردے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو ان سے کہو: ”میں نے اور میرے پیرووں نے تو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔“ پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھو: ”کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟“[۱۸] اگر کی

بھیجی ہے، ہر کمی وبیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ”اسلام“ ہے، اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیّت کے لیے اِس اسلام کے سوا کسی دُوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریّت سے لے کر شرک و بُت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حق دار سمجھ سکتا ہے، مگر فرماں روائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

۱۷ – مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دُنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانے میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا، اور جو کتاب بھی دُنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی وبیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اُصول اور احکام میں ردّوبدل کر ڈالا۔

۱۸ – دُوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ ”مَیں اور میرے پیرو تو اس ٹھیٹ اسلام کے قائل ہو چکے ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو۔“

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ

تو وہ راہِ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔ ع

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلقِ خدا میں سے عدل وراستی کا حکم دینے کے لیے اُٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سُنا دو۔[19] یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے،[20] اور ان کا مددگار کوئی نہیں[21] ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے، اُن کا حال کیا ہے؟

۱۹ – یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں، انھیں بتا دو کہ تمھارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔

۲۰ – یعنی انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صَرف کی ہیں جس کا نتیجہ دُنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔

۲۱ – یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو ان کی اس غلط سعی وعمل کو بُھل بنا سکے، یا کم از کم بدانجامی ہی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسا رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی، ان میں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بُلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[۲۲]، تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز[۲۳]۔“ اُن کے خود ساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دے دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔

فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

۲۲ – یعنی ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اس کی رُو سے حق ثابت ہو، اسے حق، اور جو اس کی رُو سے باطل ثابت ہو، اسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد تورات و انجیل ہے اور ”کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ پانے والوں“ سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

۲۳ – یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہر حال جنت ہماری ہے۔ ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فُلاں کی اولاد اور فلاں کی اُمّت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھُو جائے۔ اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنّت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا
يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

کہو! خدایا! مُلک کے مالک! تُو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزّت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جان دار کو۔ اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔[۲۴]

مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔

قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کُھلّم کُھلا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

۲۴ – جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتُوت دیکھتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں، دوسری طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور پھر ان کو اُس فقر و فاقہ اور اُن مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ ۳ھ اور اس کے لگ بھگ زمانے میں مُبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز اِستفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی اِستفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایے میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا
مِنۡهُمۡ تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفۡسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ
الۡمَصِيۡرُ ﴿۲۸﴾ قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ يَعۡلَمۡهُ
اللّٰهُ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۹﴾ يَوۡمَ تَجِدُ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَيۡرٍ

جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ[۲۵]۔ مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے[۲۶]۔ اے نبیؐ! لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہر حال اسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے، جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر

۲۵ – یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم وستم کا خوف ہو، تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا اُنھی میں کا ایک آدمی ہے۔ یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رَوِیّے کا اظہار کر سکتا ہے، حتّٰی کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

۲۶ – یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمھاری دُنیا بگاڑ سکتے ہیں، مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تَقِیَّہ کرنا پڑے، تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو۔ لیکن خبردار! کفر اور کفار کی کوئی ایسی خدمت تمھارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفار کے غالب آ جانے کا امکان ہو۔ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو، یا اہلِ ایمان کی جماعت کو، یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی، تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہر حال اسی کے پاس ہے۔

مُّحۡضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَيۡنَهَا وَبَيۡنَهٗۤ معانقة
اَمَدًاۢ بَعِيۡدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفۡسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ
بِالۡعِبَادِ ۝٣٠ ع قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ ع ۴۰/۳
وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝٣١ قُلۡ اَطِيۡعُوا
اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝٣٢

پائے گا خواہ اُس نے بھلائی کی ہو یا بُرائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دُور ہوتا! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے[27]۔ ع

اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ ”اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبّت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“ اُن سے کہو کہ ”اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو“ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبّت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں[28]۔

۲۷- یعنی یہ اس کی انتہائی خیر خواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر مُتنبِّہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

۲۸- یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خُصوصاً جنگِ بدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے، اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نُزول کا زمانہ جنگِ بدر کے بعد اور جنگِ اُحد سے پہلے کا ہے، یعنی ۳ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی رِوایت سے عُموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن اوّل تو اس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی، دُوسرے مُقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی

Maktaba Tul-Ishaat.com

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا

اللہ[۲۹] نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[۳۰] کو تمام دُنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے، جو ایک دُوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۳۱]۔ (وہ اُس وقت سُن رہا تھا) جب عمران کی عورت[۳۲] کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر

تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

۲۹ – یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے نزول کا زمانہ ۹ ہجری ہے، جب کہ نَجْران کی عیسائی جُمہوریّت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نَجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں، اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا، جو ان کے تمدّنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اُسْقُف (بِشَپ) تھا، جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ مُلک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اِسی سلسلے میں نَجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذِمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا، تا کہ اس کے ذریعے سے وفدِ نَجران کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔

۳۰ – عمران حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے والد کا نام تھا، جسے بائبل میں "عَمرام" لکھا ہے۔

۳۱ – مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور اُلُوہیّت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غَلَطی رفع ہو جائے، تو اسلامِ صحیح و خالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جائے۔ اسی لیے اس خطبے کی تمہید یوں اُٹھائی گئی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دُوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی بھی خدا نہ تھا، ان کی خُصُوصیّت

فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ
وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما۔ تو سُننے اور جاننے والا ہے۔"[۳۳] پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے ـــــ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی ـــــ اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔[۳۴] خیر، میں نے اس کا نام مریمؑ رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آیندہ نسل کو شیطانِ مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا، اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اُٹھایا۔ اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

بس یہ تھی کہ خدا نے اپنے دین کی تبلیغ اور دُنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

۳۳- اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے، تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریمؑ کے والد تھے، جن کا نام شاید عمران ہوگا۔ (مسیحی رِوایات میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام یوآخیم Ioachim لکھا ہے) اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے، تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں، کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ رِوایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ اور حضرت مریمؑ کی والدہ آپس میں رشتے کی بہنیں تھیں تو پھر "عمران کی عورت" کے معنٰی قبیلۂ عمران کی عورت ہی دُرست ہوں گے، کیونکہ انجیلِ لُوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ حضرت ہارُونؑ کی اولاد سے تھیں۔ (لوقا ۱:۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ
مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ
رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

زکریّاؑ[۳۵] جب کبھی اس کے پاس محرابؑ[۳۶] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پُوچھتا: مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی: اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریّا نے اپنے رب کو پکارا: ”پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تُو ہی دُعا سننے والا ہے۔“[۳۷]

۳۳- یعنی تُو اپنے بندوں کی دُعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

۳۴- یعنی لڑکا اُن بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدّنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، لٰہذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

۳۵- اب اس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریمؑ سِنّ رُشد کو پہنچ گئیں اور بیت المَقدِس کی عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ حضرت زکریّاؑ، جن کی تربیّت میں وہ دی گئی تھیں، غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے پُرانے عہدنامے میں آیا ہے۔

۳۶- لفظِ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعُموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صَوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متّصل سطحِ زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدّام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریمؑ معتکف رہتی تھیں۔

۳۷- حضرت زکریّاؑ اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرتاً ان کے دل میں یہ تمنّا پیدا ہوئی کہ کاش! اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت سے

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا
وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۳۹ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ
بَلَغَنِىَ الۡكِبَرُ وَامۡرَاَتِىۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفۡعَلُ مَا
يَشَآءُ ۝۴۰ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّىۡۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ

جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰ[۳۸] کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[۳۹] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہو گی۔ کمال درجے کا ضابط ہو گا۔ نبوّت سے سرفراز ہو گا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔" زکریاؑ نے کہا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا، میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" جواب ملا: "ایسا ہی ہو گا[۴۰]، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا: "مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے۔"[۴۱] کہا: "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارے

اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے، انھیں یہ اُمید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی ان کو اولاد دے سکتا ہے۔

۳۸- بائبل میں ان کا نام "یُوحنّا بپتسمہ دینے والا" (John the Baptist) لکھا ہے۔ ان کے حالات کے لیے مُلاحظہ ہو: متّی باب ۳ و ۱۱ و ۱۴۔ مَرقُس باب ۱ و ۶۔ لُوقا باب ۱ و ۳۔

۳۹- اللہ کے "فرمان" سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی، اس لیے ان کو قرآنِ مجید میں "كَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔

۴۰- یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

۴۱- یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیرِ فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اِطّلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ
اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ
اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

ع ۱۱/۴

کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کرسکو گے)۔ اِس دَوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔"[۴۲] ع

پھر وہ وقت آیا جب مریمؑ سے فرشتوں نے آکر کہا: "اے مریمؑ! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چُن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابعِ فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حُضور جھکنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو بھی جُھک جا۔"

اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے[۴۳] تھے، اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے

۴۲ – اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اِس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ تمہید میں حضرت یحیٰی علیہ السّلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السّلام کی ولادت معجزانہ طریقے سے ہوئی تھی، اُسی طرح اُن سے چھ ہی مہینے پہلے اُسی خاندان میں حضرت یحیٰیؑ کی پیدایش بھی ایک دُوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔ اِس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحیٰیؑ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیحؑ محض اپنی غیر معمولی پیدایش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ
بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى
الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ
لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ

جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ ہوگا، دُنیا اور آخرت میں معزّز ہوگا، اللہ کے مقرّب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔'' یہ سُن کر[۴۴] مریم بولی: ''پروردگار! میرے ہاں بچّہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔'' جواب ملا: ''ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے

۴۳- یعنی قُرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اس قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان کو خدا کے کام کے لیے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اور وہ چونکہ لڑکی تھیں اس لیے یہ ایک نازک مسئلہ بن گیا تھا کہ ہیکل کے مجاوروں میں سے کس کی سرپرستی میں وہ رہیں۔

۴۴- یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچّہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کَذٰلِكَ (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریّاؑ کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اِسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو صِنفی مُواصلت کے بغیر بچّہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اِسی صورت سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں اُسی معروف فطری طریقے سے بچّہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش فی الواقع اُسی طرح ہوئی ہوتی، تو یہ سارا بیان قطعی مُہمَل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رُکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنیٰ قرار پاتے ہیں جو ولادتِ مسیحؑ کے باب میں قرآن کے دُوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۴۷﴾
وَيُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ﴿۴۸﴾ ۚ
وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ
رَّبِّكُمۡ ۙ اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـــَٔةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ
فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ

پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا:) "اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرّر کرے گا۔"

(اور جب وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا:) "میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسّمہ بناتا ہوں اور اس میں پھُونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھّا کرتا ہوں

بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ سب کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اس کے ہاں بچّہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فُلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نُطفے سے عیسٰیؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دوٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فُلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی، جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اِتّصال سے ہوئی تھی، وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدّعا کی اُتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا
تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ

اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔[45] اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے۔[46]

---

۴۵ – یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے۔ بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

۴۶ – یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدّعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بِنا ڈالتا اور اپنے اِن کمالات کے زور پر تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دُوسرے انبیاؑ نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اَناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً مَتّی کی رِوایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:

> ''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔'' (۵:۱۷)

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ احکام دین میں اوّلین حکم کون سا ہے؟ جواب میں آپؑ نے فرمایا:

> ''خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبّت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبّت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاؑ کے صحیفوں کا مدار ہے۔'' (مَتّی ۲۲:۳۷-۴۰)

پھر حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں:

> ''فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔'' (مَتّی ۲۳:۲-۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ
بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۵۰ اِنَّ اللّٰهَ
رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۵۱

اور اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔[۴۷] دیکھو، میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔[۴۸]"

---

۴۷ – یعنی تمھارے جُہلا کے توہُّمات، تمھارے فقیہوں کی قانونی مُوشگافیوں، تمھارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشدُّدات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ وتسلُّط کی بدولت تمھارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قیُود کا اضافہ ہوگیا ہے، مَیں ان کو منسوخ کروں گا اور تمھارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں گا جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

۴۸ – اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیا علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کے بھی بنیادی نِکات یہی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ، جس کے مقابلے میں بندگی کا رَوِیّہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اَخلاق و تمدُّن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اُس مُقتدرِ اعلیٰ کے نمایندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حِلّت وحُرمت اور جواز وعَدَمِ جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون وضابطہ صرف اللہ کا ہو، دُوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے انبیاؑ کے مِشن میں یک سَرِمُو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد ونوعیّت کے اعتبار سے فرق کیا ہے اُنھوں نے سخت غَلَطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیّت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے، اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دُوسروں کو مالک الملک کے ساتھ

شریک ٹھیرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے، اور اصل مالک کی خالص بندگی واطاعت اور پرستاری ووفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح اُوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیحؑ صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے، ان کے اِس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

''تُو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر۔'' (مَتّی ۴:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امرِ شرعی کی اُسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امرِ تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

''تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔'' (مَتّی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدِد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہلِ شہر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر مَتّی، مَرقُس اور لُوقا تینوں کی مُتَّفَقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔'' اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا: ''ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔'' (لُوقا ۱۳:۲۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: ''مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔'' اس پر یہودی علما ناراض ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چُپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''اگر یہ چُپ رہیں گے تو پتھر چِلّا اُٹھیں گے۔'' (لُوقا ۱۹:۳۸-۴۰) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

''اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا۔

میرا جُوا اپنے اوپر اُٹھا لو...... میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔'' (مَتّی ۱۱:۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، مَتّی اور مَرقُس کی اُس روایت سے صاف طور پر مُتَرشّح ہوتی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علما نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں؟ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا: تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یَسعیاہ نبیؑ کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ ''یہ اُمّت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر اِن کے دل مجھ سے دُور ہیں...... کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔'' تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزّت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے، وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمھارے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ

جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا: ”کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟“ حواریوں[۴۹] نے جواب دیا: ”ہم اللہ کے مددگار[۵۰] ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔ مالک! جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی،

کام آسکتی تھیں، انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متّی ۱۵: ۳-۹۔ مَرقُس ۷: ۵-۱۳)

۴۹ – ”حواری“ کا لفظ قریب قریب وہی معنٰی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ”انصار“ کا مفہوم ہے۔ بائبل میں بالعموم حواریوں کے بجائے ”شاگردوں“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مَقامات پر انھیں رسول بھی کہا گیا ہے۔ مگر رسول اِس معنٰی میں کہ مسیح علیہ السّلام ان کو تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے، نہ اِس معنٰی میں کہ خدا نے ان کو رُسول مقرر کیا تھا۔

۵۰ – دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآنِ مجید میں اکثر مَقامات پر ”اللہ کی مدد کرنے“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے۔ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اُس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے۔ اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں، اُن کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے۔ اور یہ وہ بلند سے بلند مَقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے۔ مگر تبلیغِ دین اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شَرف حاصل ہوتا ہے، جو اس دنیا میں رُوحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ
خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ

ع ۱۳ | ۱۳ — النّصفُ

ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔“

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ جواب میں اللہ نے بھی اپنی خُفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ع (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اُس نے کہا کہ ”اے عیسیٰؑ! اب میں تجھے واپس لے لوں[51] گا اور

۵۱ - اصل میں لفظ ”مُتَوَفِّيْكَ“ استعمال ہُوا ہے۔ تَوَفّی کے اصل معنٰی لینے اور وُصول کرنے کے ہیں۔ ”رُوح قبض کرنا“ اس لفظ کا مجازی استعمال ہے، نہ کہ اصل لُغوی معنٰی۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (to recall) کے معنٰی میں مستعمل ہوا ہے، یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بُلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمایشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاؑ کو قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجّت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السّلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا، جن کے ساتھ مامور مِنَ اللہ ہونے کی ایسی کُھلی کُھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق وصداقت سے انتہا درجے کا عِناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلے میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا، اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت ردّ کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰؑ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقّاصہ کی فرمایش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علما و فقہا نے سازش کر کے حضرت عیسیٰؑ کو رُومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمایش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بُلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلّت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیح کی تردید واصلاح کے لیے ہے۔ اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے:

(۱) حضرت مسیحؑ کی اعجازی ولادت

(۲) ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ

تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے اُن سے (یعنی اُن کی معیّت سے اور اُن کے گندے ماحول میں اُن کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دُوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالا دست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے۔[۵۲]

(۳) اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا، جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیحؑ کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریقِ پیدایش ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیحؑ خدا تھا یا خدائی میں کچھ بھی حصّہ رکھتا تھا۔

دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود مسیحؑ کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے، مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اُس نے اللہ کے اِذن سے کیے تھے، بااختیارِ خود کچھ بھی نہیں کیا، اس لیے ان میں سے بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے تم یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ بھی حق بجانب ہو کہ مسیحؑ کا خدائی میں کوئی حصہ تھا۔

اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی رِوایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی، تب تو ان کے عقیدۂ اُلوہیّتِ مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم اللہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو، وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فُلاں مقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا، اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیحؑ سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ”ایلی ایلی لما شبقتنی“ کہا تھا، اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو، وہ مسیحؑ نہ تھا، مسیحؑ کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا۔

اس کے بعد جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیحؑ کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سُلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

۵۲ - انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں، جن کو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے اُسے رد کر دیا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاَحۡكُمُ بَیۡنَكُمۡ فِیۡمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ
تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا
شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾
وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ
وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡكَ مِنَ
الۡاٰیٰتِ وَ الذِّكۡرِ الۡحَكِیۡمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ
كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ﴿۵۹﴾

پھر تم سب کو آخرکار میرے پاس آنا ہے، اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رَوِیَّہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دے دیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبّت نہیں کرتا۔“

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سُنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔[۵۳]

۵۳- یعنی اگر محض اعجازی پیدائش ہی کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا بنانے کے لیے کافی دلیل ہو، تب تو پھر تمھیں آدمؑ کے متعلق بدرجۂ اولیٰ ایسا عقیدہ تجویز کرنا چاہیے تھا، کیونکہ مسیحؑ تو صرف بے باپ ہی کے پیدا ہوئے تھے، مگر آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ
حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا
وَ اَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جارہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔[۵۴]

یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ! اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچّوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دُعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو"۔[۵۵]

---

۵۴ – یہاں تک کی تقریر میں جو بُنیادی نکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، اُن کا خلاصہ علی الترتیب حسبِ ذیل ہے:

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ ہے کہ مسیحؑ کی اُلوہیت کا اعتقاد تمھارے اندر جن وُجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا مِلکیّت میں اس کا شریک تھا۔

دُوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے، وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِمُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیحؑ کے حواری کرتے تھے۔

۵۵ – فیصلے کی یہ صُورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفدِ نجران جان بُوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اُوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ
اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾ ع قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ

ع ۶ ۱۴

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اِس شرط پر مقابلے میں آنے سے) منہ موڑیں تو (اُن کا مفسد ہونا صاف کُھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔ع

کہو:[56] "اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان

مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کُتُبِ مقدّسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپؐ کی تعلیم اور آپؐ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپؐ کی نبوّت کے قائل بھی ہو گئے تھے، یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کُھل گئی کہ نجرانی مسیحیّت کے پیشوا اور پادری، جن کے تقدّس کا سکّہ دُور دُور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

۵۶- یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ بَدر اور جنگِ اُحد کے درمیانی دَور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سُورت سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربطِ کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسّرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفدِ نَجران والی تقریر ہی کے سلسلے کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے، اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مُخاطب یہُودی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ
تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ
بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ
عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

یکساں ہے۔[57] یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے" ـــــ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ توراۃ اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟[58] ـــــ تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے،

۵۷- یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے اپنے انبیاؑ سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمہاری اپنی کُتُبِ مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

۵۸- یعنی تمہاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال توراۃ اور انجیل کے نُزُول کے بعد پیدا ہوئی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے، وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا۔ پھر اگر حضرت

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا
وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ
اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

تم نہیں جانتے۔ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مُسلِمِ یکسو[59] تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔" ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبیؐ اور اس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ صرف اُنھی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شُعور نہیں ہے۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟[60]

ابراہیمؑ راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے، تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیّت ونصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۳۵ و ۱۴۱)

۵۹ – اصل میں لفظ حَنِیف استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک خاص راستے پر چلے۔ اسی مفہوم کو ہم نے "مسلم یک سُو" سے ادا کیا ہے۔

۶۰ – دوسرا ترجمہ اس فقرے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "تم خود گواہی دیتے ہو۔" دونوں صُورتوں میں نفسِ معنٰی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم وتربیت کے حیرت انگیز

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ
وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ع وَقَالَتۡ طَّآٮِٕفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ ع ۸ ۱۵
اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ
وَاكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۷۲﴾ ۚ وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ
تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنۡ يُّؤۡتٰٓى اَحَدٌ
مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ اَوۡ يُحَآجُّوۡكُمۡ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ

اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مُشتَبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بُوجھتے حق کو چُھپاتے ہو؟ ع

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبیؐ کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔[61] نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ ”اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دُوسروں کو تمھارے رب کے حُضور پیش کرنے کے لیے تمھارے خلاف قوی حجّت مل جائے۔“ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ

اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاؑ کے احوال اور کُتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو، اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) یہ جان چکے تھے کہ حضورؐ وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیائے سابقین نے کیا تھا، حتّٰی کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپؐ کی صداقت اور آپؐ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو، ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾
وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا
دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي

"فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر ہے[۶۲] اور سب کچھ جانتا ہے،[۶۳] اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اہلِ کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا، اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسا کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "اُمّیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں

۶۱ – یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا، تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں، پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں، تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے۔

۶۲ – اصل میں لفظ "وَاسِع" استعمال ہوا ہے، جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دُوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بُخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیّل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیّت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۱۶)

Maktaba Tul-Ishaat.com

الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠

ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔[۶۴]" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے باز پُرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پُورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا،[۶۵]

۶۳ – یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

۶۴ – یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا، بلکہ اُن کے ہاں کی مذہبی تعلیم بھی یہی کچھ تھی، اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔ بائبل قرض اور سُود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے۔ (اِستثنا ۱۵: ۱-۳، ۲۳: ۲۰) تَلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کردے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گردوپیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ رِبّی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدّمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جِتوا سکتا ہو تو اُس کے مطابق جِتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر اُمّیوں کے قانون کے تحت جِتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جِتوائے اور کہے کہ یہ تمھارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کرسکتا ہو، کرے۔ رِبّی شمُوایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ (تالمودِک مسّلینی، پال آئزک ہرشوں، لندن ۱۸۸۰ء، صفحات ۳۷-۲۱۰-۲۲۱)

۶۵ – سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اَخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ
بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ
لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا

بلکہ اُن کے لیے تو سخت درد ناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی[۶۶]، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بُوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچّے

کے روز بس یہی اللہ کے مقرّب بندے ہوں گے، انھی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے، وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائے گا، حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

۶۶۔ اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہلِ کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ مثلاً بعض لوگ جو نبیؐ کی بَشَریّت کے منکر ہیں، آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَآ کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبیؐ! کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ ع وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ
مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا

ع ۸ ۱۲

رَبّانی[۶۷] بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟[۶۸] ع

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ”آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہُوا آئے جو

۶۷ – یہودیوں کے ہاں جو علما مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی اُمور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکامِ دین کا اجرا کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ رَبّانی استعمال کیا جاتا تھا، جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ (ان کے رَبّانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے)۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (divine) بھی ”رَبّانی“ کا ہی ہم معنٰی ہے۔

۶۸ – یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دُنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رُو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبُود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدۂ کُلِّیَہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کُن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ

پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔[۶۹]" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پُوچھا: "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمّہ داری اُٹھاتے ہو؟" اُنھوں نے کہا: "ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔" اللہ نے فرمایا: "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔[۷۰]"

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دینُ اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟

---

۶۹ – مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ــــــ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو، وہ لامحالہ اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ــــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مُخالفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اُٹھایا جائے، اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمّت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتا نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی اُمّت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

۷۰ – اس ارشاد سے مقصود اہلِ کتاب کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اُس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاءؑ سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى
اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ
دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں[۷۱] اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبیؐ! کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اُن تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں، اور اُن ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دُوسرے پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے[۷۲] اور ہم اللہ کے تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں۔" اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

۷۱ – یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کون سا طریقۂ زندگی تلاش کر رہے ہو؟

۷۲ – یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، کسی کو جھوٹا کہیں اور کسی کو سچّا۔ ہم تعصّب اور حمیّتِ جاہلیّہ سے پاک ہیں۔ دُنیا میں جہاں، جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسُول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آ چکی ہیں۔[۷۳] اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اِسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں مُہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اِس کے بعد توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۷۴] مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی

---

۷۳ – یہاں پھر اُسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علما جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپؐ نبیِ برحق ہیں، اور جو تعلیم آپؐ لائے ہیں، وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا، وہ محض تعصّب، ضد اور دُشمنیِ حق کی اُس پُرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آ رہے تھے۔

۷۴ – یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی، بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستے سے روکنے کی کوشش

Maktaba Tul Ishaat.com

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا
وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ
افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾ ع

الجزء ۴

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ۗ

قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکّے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو، جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی اُن میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے رُوئے زمین بھر کر بھی سونا فدیے میں دے تو اُسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ ع

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو،[۷۵]

میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور بدترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں، تاکہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔

۷۵- اس سے مقصود اُن کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو وہ ”نیکی“ کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصوّر بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارُث سے ”تشرُّع“ کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی، اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اُتار لے، اور ان کے علما کی قانونی مُوشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا تھا، اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی وفرُوعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اس تشرُّع کی اُوپری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے ”دین دار“ لوگ تنگ دلی، حرص، بُخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عُیُوب چھُپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اُنھیں بتایا جا رہا ہے کہ ”نیک انسان“ ہونے کا مقام اُن چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر وصلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل رُوح خدا کی محبت ہے، ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آ جائے کہ وہ اسے خدا کی محبّت پر قربان نہ کر سکتا ہو، بس وہی بُت ہے، اور جب تک اُس بُت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس رُوح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرُّع کی حیثیت محض اُس چمک دار روغن کی سی ہے جو گھُن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ
حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ
مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ
اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ
بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۹۴﴾ قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ قف

اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدیؐ میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں[۷۶]، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل[۷۷] نے خود اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو: اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت ـــــ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ کہو: اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے،

۷۶- قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علمائے یہود کوئی اُصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ اساسِ دین جن اُمور پر ہے، اُن میں انبیائے سابقین کی تعلیمات اور نبی عَرَبیؐ کی تعلیم میں یک سرِ مُو فرق نہ تھا) تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاؑ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی ہیں۔ اسی اعتراض کا یہاں جواب دیا جا رہا ہے۔

۷۷- ''اسرائیل'' سے مراد اگر بنی اسرائیل لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نُزولِ تورات سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انھیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی مؤخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعد والی آیت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اُونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حُرمت کا جو حکم بائبل میں لکھا ہے، وہ اصل تورات کا حکم نہیں ہے بلکہ یہودی علما نے بعد میں اسے داخلِ کتاب کر دیا ہے۔ (مفصل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۱۲۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۶﴾ فِيۡهِ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ

تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔[۷۸]

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔[۷۹] اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھُلی ہُوئی نشانیاں ہیں،[۸۰] ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو

۷۸ – مطلب یہ ہے کہ اِن فقہی جزئیات میں کہاں جا پھنسے ہو۔ دین کی جڑ تو اللہ واحد کی بندگی ہے جسے تم نے چھوڑ دیا اور شرک کی آلائشوں میں مُبتلا ہو گئے۔ اب بحث کرتے ہو فقہی مسائل میں، حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل ملّتِ ابراہیمی سے ہٹ جانے کے بعد انحطاط کی طویل صدیوں میں تمھارے علما کی مُوشگافیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۷۹ – یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المَقدِس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاؑ کا قبلہ بیت المَقدِس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مُصِر رہے۔ لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بیت المَقدِس کے متعلق خود بائیبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمانؑ نے اس کو تعمیر کیا۔ (۱-سلاطین، باب ۶، آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانے میں وہ قبلۂ اہلِ توحید قرار دیا گیا۔ (کتابِ مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰) برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور مُتَّفَق عَلَیہ رِوایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبہ کی اوّلیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجایش نہیں۔

۸۰ – یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لَق و دَق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیّت کے سبب سے سارا ملکِ عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں بتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطرافِ کعبہ ہی کا ایک خِطّہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا۔ بلکہ اسی کعبہ کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسّر آ جاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی

دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ
اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ
وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا
وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اِس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔[۸۱] لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

کہو: اے اہلِ کتاب! تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! یہ تمھاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمھاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

سب دیکھ چکے تھے کہ اَبْرَہَہ نے جب کعبہ کی تخریب کے لیے مکّہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہرِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعے سے اُس وقت عرب کا بچّہ بچّہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد اِن آیات کے نُزول کے وقت موجود تھے۔

۸۱ – جاہلیّت کے تاریک دَور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دُشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ
وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۰۱ ع يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۰۲ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠

ع ۱۰ / ۱۱

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم نے اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمھیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمھارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سُنائی جا رہی ہیں اور تمھارے درمیان اس کا رسولؐ موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔[۸۲] سب مل کر اللہ کی رسّی[۸۳] کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

۸۲ – یعنی مرتے دَم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہو۔

۸۳ – اللہ کی رسّی سے مراد اس کا دین ہے، اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے، اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو ”مضبوط پکڑنے“ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیّت ”دین“ کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجّہات اور دلچسپیاں جُزئیات و فُروع کی طرف منعطف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ واختلاف رُونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیا علیہم السّلام کی اُمّتوں کو ان کے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ
النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ

اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دُوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔[84] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔[85]

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا

اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

۸۴ – یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں، اور شب و روز کے کُشت و خون، جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمتِ اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں، اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینے کے لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اَوس اور خَزرج کے وہ قبیلے، جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے، اور یہ دونوں قبیلے مکے سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبّت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔

۸۵ – یعنی اگر تم آنکھیں رکھتے ہو تو ان علامتوں کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا تمھاری فلاح اِس دین کو مضبوط تھامنے میں ہے، یا اسے چھوڑ کر پھر اُسی حالت کی طرف پلٹ جانے میں جس کے اندر تم پہلے مبتلا تھے؟ آیا تمھارا اصلی خیر خواہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہے، یا وہ یہودی اور مشرک اور منافق لوگ جو تم کو حالتِ سابقہ کی طرف پلٹا لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

Maktaba Tul Ishaat.com

بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴
وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۵ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ
تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۱۰۶ وَ اَمَّا
الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۷ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ

حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کُھلی کُھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔[۸۶] جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے جب کہ کچھ لوگ سُرخ رُو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہوگا (ان سے کہا جائے گا کہ) نعمتِ ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رَوِیّہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اِس کفرانِ نعمت کے صلے میں عذاب کا مزا چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سُنا رہے ہیں

۸۶ – یہ اشارہ اُن اُمّتوں کی طرف ہے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں سے دینِ حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدّت گزر جانے کے بعد اساسِ دین کو چھوڑ دیا اور غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے، پھر فضول ولایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ اُنھیں اُس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سُپرد کیا تھا، اور نہ عقیدہ و اَخلاق کے اُن بنیادی اُصُولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح وسعادت کا مدار ہے۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ

ع ۱۱ ۸

کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔[۸۷] زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ع

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔[۸۸] تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب[۸۹] ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ

۸۷ – یعنی چونکہ اللہ دُنیا والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ ان کو سیدھا راستہ بھی بتا رہا ہے اور اِس بات سے بھی انھیں قبل از وقت آگاہ کیے دیتا ہے کہ آخرِ کار وہ کن اُمور پر اُن سے باز پرس کرنے والا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ کج روی اختیار کریں اور اپنے غلط طرزِ عمل سے باز نہ آئیں، وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کریں گے۔

۸۸ – یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ بقرہ کے سترھویں رُکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبیِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں، اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اَخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمھارے سُپرد کیا گیا ہے اور تمھیں لازم ہے کہ اپنی ذمّہ داریوں کو سمجھو اور اُن غلطیوں سے بچو جو تمھارے پیش رو کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۲۳ و ۱۴۴)

۸۹ – یہاں اہلِ کتاب سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ
وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا
يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ

ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں، مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے اِن پر ذلّت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اَور بات ہے۔[۹۰] یہ اللہ کے غضب میں گِھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

مگر سارے اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں،

---

۹۰ – یعنی دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب بھی ہوا ہے تو وہ ان کے اپنے بل بُوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی حمایت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی، اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے اپنے طور پر انھیں اپنی حمایت میں لے لیا۔ اسی طرح بسا اوقات انھیں دُنیا میں کہیں زور پکڑنے کا موقع بھی مل گیا ہے، لیکن وہ بھی اپنے زورِ بازو سے نہیں بلکہ محض ”بپائے مردی ہمسایہ“۔

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا
يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا
يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ
حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ

راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دُنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اُس کی مثال اُس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے[91]۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا،

۹۱- اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہَوا سے مراد وہ اُوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صَرف کرتے ہیں۔ اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطۂ خداوندی کی پیروی کا فُقدان ہے، جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١١٧﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا

درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دُوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے میں نہیں چُوکتے۔[۹۲] تمھیں جس چیز سے

اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہَوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہَوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مَزرعۂ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے، مگر جب اس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے، اور اُس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرُّف کر رہا ہے، اور یہ مملکت بھی اللہ ہی کی ہے جس کے اندر رہ کر انسان کام کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا، یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے، اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرُّف کرتے ہوئے اس کے قانون وضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کے یہ تمام تصرُّفات از سرتا پا جُرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا، وہ تو اس کا مستحق ہے کہ اِن تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدّمہ قائم کیا جائے۔ اُس کی خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نوکر اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اس کا خزانہ کھولے اور جہاں جہاں اپنی دانست میں مناسب سمجھے، خرچ کر ڈالے۔

۹۲- مدینے کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے، ان کے ساتھ اَوس اور خَزرج کے لوگوں کی قدیم زمانے سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی اِن قبیلوں کے افراد اُن کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اَوس اور خَزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پُرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی مَحبّت وخلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبی عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مشن سے جو عداوت ہوگئی تھی، اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ مَحبّت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے، مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے، اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ وفساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک

مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ
صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ
وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا
بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ

نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بُغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلّق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم ان سے محبّت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبّت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کُتُبِ آسمانی کو مانتے ہو۔[۹۳] جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمھارے رسول اور تمھاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جُدا ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف ان کے غیظ وغضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ـــــ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چُھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ـــــ تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اسی منافقانہ رَوِش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

۹۳ – یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اِس کے کہ تمھیں اُن سے ہوتی، اُن کو تم سے ہے۔ تم تو

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۲

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۱۲۰﴾ وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ
اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے ؏

(اے[94] پیغمبرؐ! مسلمانوں کے سامنے اُس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (اُحُد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بجا مامور کر رہے تھے۔

قرآن کے ساتھ تورات کو بھی مانتے ہو، اس لیے اُن کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ شکایت اگر ہو سکتی تھی تو تمھیں اُن سے ہو سکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے۔

۹۴ – یہاں سے چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں جنگِ اُحُد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُوپر کے خطبے کو ختم کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوا تھا کہ ''ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔'' اب چونکہ اُحُد کے میدان میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو خدا ترسی کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں اُنھیں ان کمزوریوں پر مُتنبّہ کیا گیا ہے، مندرجہ بالا فقرے کے بعد ہی متصلاً درج کیا گیا۔

اس خطبے کا اندازِ بیان یہ ہے کہ جنگِ اُحُد کے سلسلے میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند نپے تُلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

شوّال ۳ھ کی ابتدا میں کفارِ قریش تقریباً ۳ ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر حملہ آور ہوئے۔ تعداد کی کثرت کے علاوہ ان کے پاس ساز و سامان بھی مسلمانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، اور پھر وہ جنگِ بَدر کے انتقام کا شدید جوش بھی رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تجربہ کار صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مدینے میں محصور ہو کر مُدافعت کی جائے۔ مگر چند نوجوانوں نے، جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بَدر کی جنگ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آخر کار اُن کے اصرار سے مجبور ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکلنے ہی کا فیصلہ فرما لیا۔ ایک ہزار آدمی آپؐ کے ساتھ نکلے، مگر مقامِ شَوط پر پہنچ کر عبداللہ ابنِ اُبَیّ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عین وقت پر اس کی اس حرکت سے مسلمانوں کے لشکر میں اچھا خاصا اضطراب پھیل گیا، حتّٰی کہ بنو سَلَمہ اور بنو حارِثہ کے لوگ تو ایسے دل شکستہ ہوئے کہ انھوں نے بھی پلٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر اُولُوالعزم صحابہؓ کی کوششوں سے یہ اضطراب رفع ہو گیا۔ اِن باقی ماندہ سات سو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اُحُد کی پہاڑی کے دامن میں (مدینہ سے تقریباً چار میل کے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢١﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ

اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔

یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بُزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے[95]، حالانکہ

فاصلے پر) اپنی فوج کو اس طرح صف آرا کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے۔ پہلو میں صرف ایک دَرّہ ایسا تھا جس سے اچانک حملے کا خطرہ ہوسکتا تھا۔ وہاں آپؐ نے عبداللہؓ بن جُبَیر کے زیرِ قیادت پچاس تیرانداز بٹھا دیے اور ان کو تاکید کر دی کہ "کسی کو ہمارے قریب نہ پھٹکنے دینا، کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا، اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچے لیے جاتے ہیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا۔" اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداءً مسلمانوں کا پلّا بھاری رہا، یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے مسلمان مالِ غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کو لُوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر جن تیراندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جو دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے اور غنیمت لُٹ رہی ہے، تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہؓ بن جُبَیر نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر بہتیرا روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے، جو اس وقت لشکرِ کفار کے رسالے کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر پہلو کے دَرّے سے حملہ کر دیا۔ عبداللہؓ بن جُبَیر نے، جن کے ساتھ صرف چند ہی آدمی رہ گئے تھے، اس حملے کو روکنا چاہا مگر مُدافَعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دُوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسا ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصّہ پراگندہ ہو کر بھاگ نکلا۔ تاہم چند بہادر سپاہی ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمّت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپؐ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ لیکن عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک مُعَمّا ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے کفارِ مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر پراگندہ ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا مشکل تھا۔ اگر کفار اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ
نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ؕ بَلٰٓى ۙ اِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا ربع
بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگِ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، اُمید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: ''کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اُتار کر تمھاری مدد کرے؟'' [۹۶] ــــ بے شک، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمھارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمھیں اس لیے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے

۹۵ – یہ اشارہ ہے بنوسَلَمہ اور بنو حارثہ کی طرف، جن کی ہمتیں عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کے بعد پست ہو گئی تھیں۔

۹۶ – مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہو گئے ہیں، تو ان کے دل ٹوٹنے لگے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ
یَكْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآىٕبِیْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ
شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ
لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ
یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ

جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔ (اور یہ مدد وہ تمھیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبرؐ!) فیصلے کے اختیارات میں تمھارا کوئی حصّہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۹۷ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سُود کھانا چھوڑ دو۹۸ اور اللہ سے ڈرو،

۹۷- نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو آپؐ کے منہ سے کفار کے حق میں بددُعا نکل گئی اور آپؐ نے فرمایا کہ "وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔" یہ آیات اسی کے جواب میں ارشاد ہوئی ہیں۔

۹۸- اُحُد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لُوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیمِ مُطلَق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سُود خواری سے باز آؤ، جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے، اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾
وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوْٓا
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي
السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ
النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا

اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیّا کی گئی ہے اور اللہ اور رسُول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دَوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دُوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ___ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں[۹۹] ___ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فُحش کام

چلی جاتی ہے۔

۹۹ - سُود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے، اس کے اندر سُود خواری کی وجہ سے دو قسم کے اَخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں: سُود لینے والوں میں حرص و طمع، بُخل اور خود غرضی۔ اور سُود دینے والوں میں نفرت، غصّہ اور بُغض و حسد۔ اُحُد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سُود خواری سے فریقین میں جو اَخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں، ان کے بالکل برعکس اِنفاق فی سبیل اللہ سے یہ دُوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں، اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دُوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ کہ پہلی قسم کے اوصاف سے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۳۲۰)

فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا
لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ قف وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا
فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِيْنَ ۭ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ
لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ

ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اُوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ـــــ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ـــــ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ تم سے پہلے بہت سے دَور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات) کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اِس وقت اگر

Maktaba Tul Ishaat.com

يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ
الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ
يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ

تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔[۱۰۰]
یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ
وقت اس لیے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچّے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو
چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں[۱۰۱] ـــــ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں
ہیں ـــــ اور وہ اِس آزمائش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی
کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنّت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے
یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی
خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنّائیں کر رہے تھے! مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب

۱۰۰ – اشارہ ہے جنگِ بدر کی طرف۔ اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اُس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمت نہ ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمت ہارو۔

۱۰۱ – اصل الفاظ ہیں: وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا، یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزّت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دُوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور منافقین کے اُس مخلوط گروہ میں سے، جس پر تم اِس وقت مشتمل ہو، اُن لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہیں، یعنی اُس منصبِ جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمّتِ مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

ع

اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع وَمَا مُحَمَّدٌ
اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ
قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا
كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمھارے سامنے آ گئی اور تم نے اُسے آنکھوں دیکھ لیا۔[102] ع

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[103] یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

کوئی ذی رُوح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔[104]

۱۰۲- اشارہ ہے شہادت کے اُن تمنائیوں کی طرف جن کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔

۱۰۳- جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر صحابہؓ کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ اس حالت میں منافقین نے (جو مسلمانوں کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے) کہنا شروع کیا کہ چلو عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس چلیں، تاکہ وہ ہمارے لیے ابوسُفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دینِ آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انھی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمھاری "حق پرستی" محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمھارا اسلام ایسا سُست بنیاد ہے کہ محمدؐ کے دُنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے، تو اللہ کے دین کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔

۱۰۴- اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمھارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ
الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ
نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ

جو شخص ثوابِ دُنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت[105] کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے[106] والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مِل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ

لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مُہلت بھی تمھیں حاصل ہے، اس میں تمھاری سعی و جُہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

۱۰۵ – ثواب کے معنٰی ہیں نتیجۂ عمل۔ ثوابِ دُنیا سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو انسان کو اُس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اِسی دُنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اَخلاق کے معاملے میں فیصلہ کُن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں آدمی جو دَوڑ دھوپ کر رہا ہے، اس میں آیا وہ دُنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔

۱۰۶ – ”شکر کرنے والوں“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اِس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اُس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انھیں دُنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالَم کی خبر دی، اور انھیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دُوسرے عالَم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعتِ نظر اور یہ دُور بینی و عاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دُنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں بار آور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے، اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسے پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہر حال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مُبتلا رہیں، جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں، ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں، اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی اُمید نہ ہو، یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اُن میں آخرت کے نتائجِ خیر کی اُمید پر اپنا وقت، اپنے مال اور اپنی قوتیں

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾
وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا
وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

ع ۱۵ ۶

دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے[۱۰۷]۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دُعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“ آخرکار اللہ نے ان کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اُن لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو اُلٹا پھیر لے جائیں[۱۰۸] گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔

صَرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اُس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔

۱۰۷ – یعنی اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور زور آوری دیکھ کر انھوں نے باطل پرستوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔

۱۰۸ – یعنی جس کفر کی حالت سے تم نکل کر آئے ہو، اُسی میں یہ تمھیں پھر واپس لے جائیں گے۔ منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں۔ ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے۔ آج فتح ہے تو کل

Maktaba Tul Ishaat.com

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى
اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ
اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا

(اُن کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمھارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رُعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کے ساتھ اُن کو خدائی میں شریک ٹھیرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہے اور بہت ہی بُری ہے وہ قیام گاہ جو اُن ظالموں کو نصیب ہوگی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبّت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے ــــ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے ــــ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی

شکست۔ خدا کی جس حمایت و نصرت کا انھوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے، وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

عَنۡكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا
تَلۡوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡٓ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ
بِغَمٍّ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ
بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً

تمھیں معاف ہی کر دیا[۱۰۹] کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جارہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا، اور رسولؐ تمھارے پیچھے تم کو پکار[۱۱۰] رہا تھا۔ اُس وقت تمھاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمھیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے[۱۱۱] تاکہ آیندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کردی

۱۰۹– یعنی تم نے غلطی تو ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تمھیں معاف نہ کر دیتا تو اس وقت تمھارا اِستیصال ہو جاتا۔ یہ اللہ کا فضل تھا اور اس کی تائید و حمایت تھی جس کی بدولت تمھارے دشمن تم پر قابو پالینے کے بعد ہوش گم کر بیٹھے اور بلاوجہ خود پسپا ہو کر چلے گئے۔

۱۱۰– جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی، تو کچھ لوگ مدینے کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحُد پر چڑھ گئے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی، مگر اللہ کا رسُول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا: اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔

۱۱۱– رنج ہزیمت کا، رنج اس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینے کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ

Maktaba Tul Ishaat.com

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ
يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ
اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ

کہ وہ اُونگھنے لگے۔[۱۱۲] مگر ایک دوسرا گروہ، جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ''اِس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصّہ ہے''؟ ان سے کہو: ''(کسی کا کوئی حصّہ نہیں) اِس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔'' دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھُپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ ''اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصّہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔'' ان سے کہہ دو کہ ''اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہُوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نِکل آتے۔'' اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ

ہے، شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبے میں آ گھُسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے۔

۱۱۲ – یہ ایک عجیب تجربہ تھا جو اس وقت لشکرِ اسلام کے بعض لوگوں کو پیش آیا۔ حضرت ابوطلحہؓ جو اس جنگ میں شریک تھے، خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اُونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھُوٹی پڑتی تھیں۔

صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ
اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ
عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی
الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا
قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَ

اُسے آزما لے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثے سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[۱۱۳]، ورنہ دراصل مارنے اور جِلانے والا تو

۱۱۳- یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قضائے الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ اپنی تدبیروں ہی پر موقوف سمجھتے ہیں، ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش! یوں ہوتا تو یہ ہو جاتا۔

Maktaba-Tul-Ishaat.com

يُمِيتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ
مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿١٥٧﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ
فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ اِنْ
يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ

اللہ ہی ہے اور تمھاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصے میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خُو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قُصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دُعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد

فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ
بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ
لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰہِ کَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰہِ وَمَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۶۲﴾ ہُمۡ دَرَجٰتٌ

کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچّے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے[114] ـــــــ اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر مُتنفّس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا ـــــــ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اُس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گِھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنّم ہو جو بدترین ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک

۱۱۴– جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عَقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ دُشمن کا لشکر لُوٹا جا رہا ہے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انھی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لُوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقع پر محروم رہ جائیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اُن لوگوں کو بُلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عُذرات پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم۔ ”اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصّہ نہیں دیں گے۔“ اس آیت کا اشارہ اسی معاملے کی طرف ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری فوج کا کمانڈر خود اللہ کا نبی تھا اور سارے معاملات اس کے ہاتھوں میں تھے، تو تمھارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کیسے ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں تمھارا مفاد محفوظ نہ ہو گا۔ کیا خدا کے پیغمبر سے یہ توقع رکھتے ہو کہ جو مال اس کی نگرانی میں ہو، وہ دیانت، امانت اور انصاف کے سوا

Maktaba Tul Ishaat.com

عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا
عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ
وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ النصف
اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ

دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔
درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انھیں سُناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔
اور یہ تمھارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟[115] حالانکہ (جنگِ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے۔[116]

کسی اور طریقے سے بھی تقسیم ہو سکتا ہے؟

۱۱۵ – اکابر صحابہؓ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے، مگر عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسولؐ ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے، تو کسی حال میں کفار ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب اُحد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے حیران ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ ہم اللہ کے دین کی خاطر لڑنے گئے، اس کا وعدۂ نصرت ہمارے ساتھ تھا، اُس کا رسول خود میدانِ جنگ میں موجود تھا، اور پھر بھی ہم شکست کھا گئے؟ اور شکست بھی اُن سے جو اللہ کے دین کو مٹانے آئے تھے؟ یہ آیات اِسی حیرانی کو دُور کرنے کے لیے ارشاد ہوئی ہیں۔

۱۱۶ – جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ۷۰ آدمی شہید ہوئے۔ بخلاف اس کے جنگِ بدر میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ۷۰ آدمی گرفتار ہو کر آئے تھے۔

قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۶۵﴾
وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيَعۡلَمَ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا ۖۚ وَقِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا
قَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا
لَّا تَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ
يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ

اے نبیؐ! اِن سے کہو: یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے،[۱۱۷] اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۱۱۸] جو نقصان لڑائی کے دن تمھیں پہنچا وہ اللہ کے اِذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا، آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔[۱۱۹] یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے

---

۱۱۷ – یعنی یہ تمھاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا، پھر کیوں پُوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟

۱۱۸ – یعنی اللہ اگر تمھیں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو شکست دلوانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

۱۱۹ – عبداللہ بن اُبَیّ جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستے سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہیں ہو گی، اس لیے ہم جا رہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝١٦٧ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ
اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٦٨ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝١٦٩
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ
بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
وقف لازم عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝١٧٠ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
ع ۱۷ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٧١ ج ع

خُوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو: اگر تم اپنے اس قول میں سچّے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے اُسے ٹال کر دکھا دینا۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہُوئے ہیں انھیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں،[۱۲۰] اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُس پر خوش و خُرّم ہیں،[۱۲۱] اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ع

۱۲۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۵۵۔

۱۲۱ – مُسندِ احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مروی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لے کر

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ مع
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ
وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسُول کی پُکار پر لبّیک کہا[۱۲۲] اُن میں جواشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ اور وہ جن[۱۲۳] سے لوگوں نے کہا کہ "تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو"، تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخرکار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا

دُنیا سے جاتا ہے، اُسے اللہ کے ہاں اس قدر پُرلطف اور پُرکیف زندگی میسّر آتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی تمنا نہیں کرتا۔ مگر شہید اس سے مُستثنیٰ ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اُس لذت، اُس سُرور اور اُس نشے سے لُطف اندوز ہو جو راہِ خدا میں جان دیتے وقت حاصل ہوتا ہے۔

۱۲۲ – جنگِ اُحُد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دُور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھیر کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینے پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمّت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگِ اُحُد کے دوسرے ہی دن آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا، مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے، جو مدینے سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انھی فدا کاروں کی طرف ہے۔

۱۲۳ – یہ چند آیات جنگِ اُحُد کے ایک سال بعد نازل ہوئی تھیں، مگر چونکہ ان کا تعلق اُحُد ہی کے سلسلہ

Maktaba Tul Ishaat.com

لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ
وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ
يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ

ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آیندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔[۱۲۴]

(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ

واقعات سے تھا، اس لیے ان کو بھی اس خطبے میں شامل کر دیا گیا۔

۱۲۴ – اُحد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آیندہ سال بدر میں ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا۔ مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا، کیونکہ اُس سال مکے میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلے پر نہ آنے کی ذمہ داری انھی پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخر کار اللہ کے رسولؐ نے بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵ سو فدا کار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپؐ انھی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیّت لے کر چلا مگر دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آیندہ سال آئیں گے۔ چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دوران میں آپؐ کے ساتھیوں نے

اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۷۶
اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۷۷ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا
نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۷۸ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ
عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰي يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ

اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں، وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں، اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔[۱۲۵] وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مُطّلع کر دے۔[۱۲۶] غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسُولوں میں سے جس کو چاہتا ہے

ایک تجارتی قافلے سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اُٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہوگئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

۱۲۵ – یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہلِ ایمان اور منافق، سب خلط ملط رہیں۔

۱۲۶ – یعنی مومن و منافق کی تمیز نمایاں کرنے کے لیے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کرتا کہ غیب سے مسلمانوں کو

Maktaba Tul Ishaat.com

رُسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ
تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ
ع ۱۸ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع لَقَدْ
وقف لازم سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ

منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (اُمورِ غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں، وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۲۷] اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع

اللہ نے اُن لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[۱۲۸]۔ ان کی

دلوں کا حال بتا دے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں منافق، بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربے سے مومن اور منافق کا حال کُھل جائے گا۔

۱۲۷ – یعنی زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے، وہ دراصل اللہ کی مِلک ہے اور اس پر مخلوق کا قبضہ و تصرّف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہرحال بے دخل ہونا ہے اور آخرِ کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانے والا ہے۔ لہٰذا عقل مند ہے وہ جو اس عارضی قبضے کے دوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے۔ اور سخت بے وقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ
ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ
اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ
النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے، اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلے کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذابِ جہنّم کا مزا چکھو، یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں: "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسُول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے"، اُن سے کہو: "تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن رسُولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟"[۱۲۹]

---

۱۲۸ – یہ یہودیوں کا قول تھا۔ قرآنِ مجید میں جب یہ آیت آئی کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، "کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے"، تو اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہنا شروع کیا کہ جی ہاں، اللہ میاں مفلس ہو گئے ہیں، اب وہ بندوں سے قرض مانگ رہے ہیں۔

۱۲۹ – بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔ (قضاۃ ۶: ۲۰–۲۱ و ۱۳: ۱۹–۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائبل میں آتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝١٨٤ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا
تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ
الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝١٨٥
لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

اب اے محمدؐ! اگر یہ لوگ تمھیں جھُٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جاچکے ہیں جو کُھلی کُھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔ آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پُورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنّت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دُنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔[۱۳۰]

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آ کر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب

کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آ کر اُسے کھا لیتی تھی۔ (اَحبار ۹: ۲۴۔ ۲۔ تواریخ ۷: ۱-۲) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوّت کی کوئی ضروری علامت ہے، یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو، وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیائے بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاسؑ (ایلیّاہ تِشبی) کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بَعل کے پُجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمعِ عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلقِ کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاسؑ کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بَعل پرست مَلِکہ حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی، اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی مَلِکہ کی خاطر اُن کے قتل کے درپے ہوا اور ان کو مجبوراً مُلک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ (۱-سلاطین، باب ۱۸ و ۱۹)

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ
اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ

اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سُنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو[۱۳۱] تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اِن اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں[۱۳۲] ہوگا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پسِ پُشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر

اسی بنا پر ارشاد ہُوا ہے کہ حق کے دشمنو! تم کس مُنہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا، انھی کے قتل سے تم کب باز رہے۔

۱۳۰ – یعنی اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں، انھی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور اُنھی پر حق و باطل اور فلاح وخُسران کے فیصلے کا مدار رکھے تو درحقیقت وہ سخت دھوکے میں مُبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیّت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردودِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلے کے نتائج اُن آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ اَبدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں۔ اور اصل اعتبار اُنھی نتائج کا ہے۔

۱۳۱ – یعنی اُن کے طعن وتشنیع، اُن کے الزامات، اُن کے بے ہُودہ طرزِ کلام اور اُن کی جھوٹی نشرو اشاعت کے مقابلے میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اُتر آؤ جو صداقت وانصاف، وقار و تہذیب اور اَخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں۔

۱۳۲ – یعنی انھیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کے سُپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمتِ عُظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔

یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائبل میں آتا ہے۔ خُصوصاً کتابِ اِستثنا میں حضرت موسیٰؑ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے، اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں، اُنھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ
لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع
إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف اُنھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں[۱۳۳]۔ حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ زمین اور آسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ؑ

زمین[۱۳۴] اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں

اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آیندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے، ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا۔ (۶: ۴-۹) پھر اپنی آخری وصیت میں انھوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہِ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام ان پر کَندہ کر دینا۔ (۲۷: ۲-۴) نیز بنی لاوی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عیدِ خیام کے موقع پر قوم کے مَردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پُوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰؑ کے سات سو برس بعد ہیکلِ سلیمانی کے سجادہ نشین، اور یروشلم کے یہودی فرماں روا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲-سلاطین ۲۲: ۸-۱۳)

۱۳۳ – مثلاً وہ اپنی تعریف میں یہ سُننا چاہتے ہیں کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دین دار اور پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامیِ شرعِ متین ہیں، مُصلح و مُزکی ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔ یا اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پِٹوانا چاہتے ہیں کہ فُلاں صاحب بڑے ایثار پیشہ اور مخلص اور دیانت دار رہنما ہیں اور انھوں نے ملّت کی بڑی خدمت کی ہے، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

۱۳۴ – یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس کا ربط اُوپر کی قریبی آیات میں نہیں بلکہ پوری سورت میں تلاش کرنا چاہیے۔

لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾
رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ
اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ

اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔[۱۳۵] (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں:) "پروردگار! یہ سب کچھ تُو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تُو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔[۱۳۶] پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، تُو نے جسے دوزخ میں ڈالا، اسے درحقیقت بڑی ذلّت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سُنا جو ایمان کی طرف بُلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی،[۱۳۷] پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو بُرائیاں

اس کو سمجھنے کے لیے خُصوصیت کے ساتھ سُورت کی تمہید کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۳۵ – یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو، اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

۱۳۶ – جب وہ نظامِ کائنات کا بغور مُشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کُھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حِس پیدا کی ہو، جسے تصرّف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو، اُس سے اُس کی حیاتِ دنیا کے اعمال پر بازپُرس نہ ہو، اور اسے نیکی

Maktaba Tul Ishaat.com

عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

ہم میں ہیں انھیں دُور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تُو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں، اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رُسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔[۱۳۸]"

جواب میں ان کے رب نے فرمایا: "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دُوسرے کے ہم جنس ہو۔[۱۳۹] لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے، اُن کے سب قصور میں

پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظامِ کائنات پر غور وفکر کرنے سے اُنھیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

۱۳۷ – اِسی طرح یہی مشاہدہ اُن کو اس بات پر بھی مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز وانجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔

۱۳۸ – یعنی انھیں اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردُّد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنا دے اور ہمارے ساتھ انھیں پورا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پر ایمان لا کر کُفّار کی تضحیک اور طعن وتشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں، قیامت میں بھی اِن کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو اور وہ ہم پر پھبتی کسیں کہ ایمان لا کر بھی اِن کا بھلا نہ ہوا۔

عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ
الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِى
الۡبِلَادِؕ‏ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ ثُمَّ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ؕ وَبِئۡسَ
الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ
تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ
اللّٰهِ‌ؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ
الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَمَاۤ

معاف کر دُوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے ہاں، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے[۱۴۰]۔"

اے نبیؐ! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لُطف ہے، پھر یہ سب جہنّم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور

۱۳۹ – یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اُونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اُصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

۱۴۰ – روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰؑ عصا اور یدِ بیضا لائے

Maktaba Tul Ishaat.com

أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا
وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع

اُس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جُھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چُکانے میں دیر نہیں لگاتا۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ[۱۴۱]، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ ؏

تھے۔ عیسیٰؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے۔ دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے۔ آپ فرمائیں کہ آپ کیا لائے ہیں؟ اس پر آپ نے اس رُکوع کے آغاز سے یہاں تک کی آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا: میں تو یہ لایا ہوں۔

۱۴۱ – اصل عربی متن میں صَابِرُوْا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، یہ کہ کفار اپنے کفر پر جو مضبوطی دکھا رہے ہیں اور اس کو سربلند رکھنے کے لیے جو زحمتیں اُٹھا رہے ہیں، تم ان کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔ دُوسرے، یہ کہ ان کے مقابلے میں ایک دُوسرے سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔

تفہیم القرآن

النسآء

(۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

النِّسَآء

زمانۂ نُزُول اور اجزائے مضمون یہ سُورہ متعدّد خُطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ہجری کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعیُّن کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حُقوق کے متعلق ہدایات جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینے کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شُہدا کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انھوں نے چھوڑے ہیں، اُن کے مفاد کا تحفُّظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں گی۔

روایات میں صلوٰۃِ خوف (عین حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر ہمیں غزوۂ ذات الرّقاع میں ملتا ہے جو ۴ ہجری میں ہوا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانے میں وہ خطبہ نازل ہوا ہو گا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ (رکوع ۱۵)

مدینہ سے بنی نَضِیر کا اخراج ربیع الاوّل ۴ ہجری میں ہوا، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہو گا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ ”ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔“

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کی اجازت غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمّم کا ذکر ہے اسی سے متّصل عہد کا سمجھنا چاہیے۔ (رکوع ۷)

شانِ نُزُول اور مَباحِث اِس طرح بحیثیتِ مجموعی سورت کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانے کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے، تاکہ سُورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد

لی جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو کام تھا، اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک اُس نئی مُنظّم اسلامی سوسائٹی کا نشوونما جس کی بِنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینۂ طیّبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر اَخلاق، تمدّن، معاشرت، معیشت اور تدبیرِ مملکت کے نئے اُصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دوسرے، اُس کش مکش کا مقابلہ جو مشرکینِ عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالفِ اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدّت سے جاری تھی۔ تیسرے، اسلام کی دعوت کو اِن مزاحم طاقتوں کے عَلَی الرَّغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخّر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انھی تین شعبوں سے متعلّق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے اِن خُطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح دُرست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اُصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلّقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حُقوق معیّن کیے گئے۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ مَعاشی معاملات کی دُرستی کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بِنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرزِ عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم وضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلّق ہدایات دی گئیں۔ اہلِ کتاب کے اَخلاقی و مذہبی رَوِیّے پر تبصرہ کرکے مسلمانوں کو مُتنبِّہ کیا گیا کہ اپنی اِن پیش رَو اُمّتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرزِ عمل پر تنقید کرکے سچّی ایمان داری کے مقتضیات واضح کیے گئے، اور ایمان و نِفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کرکے رکھ دیا گیا۔

مخالفِ اصلاح طاقتوں سے جو کش مکش برپا تھی اُس نے جنگِ اُحُد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُحُد کی شکست نے اطراف ونواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمّتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گِھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُرجوش خطبوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے اُبھارا، اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انھیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینے میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے

Maktaba Tul Ishaat.com

تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے، اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کرلیں، اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سریّوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہوسکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو، دونوں کے بجائے تیمم کرلیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو، وہاں صلوٰۃِ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے، ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کُن تھا۔ اِس مسئلے میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور دوسری طرف اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا، تاکہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آجائیں۔

یہودیوں میں سے بنی نَضِیر کا رَوِیّہ خُصُوصیّت کے ساتھ نہایت مُعانِدانہ ہوگیا تھا اور وہ مُعاہدات کی صریح خلاف ورزی کرکے کھُلَم کھُلّا دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے۔ ان کی اس رَوِش پر سخت گرفت کی گئی اور انھیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کردی گئی۔ اس کے بعد ہی مدینے سے اُن کا اخراج عمل میں آیا۔

منافقین کے مختلف گروہ مختلف طرزِ عمل رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرکے ہر طبقے کے منافقوں کے متعلّق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا چاہیے۔

غیر جانب دار معاہد قبائل کے ساتھ جو رَوِیّہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا، اس کو بھی واضح کیا گیا۔

سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کریکٹر بے داغ ہو، کیونکہ اس کش مکش میں یہ مٹھی بھر جماعت اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاقِ فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کمزوری بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سُورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیّت کے مقابلے میں اسلام جس اَخلاقی و تمدّنی اصلاح کی طرف دنیا کو بُلا رہا تھا، اس کی توضیح کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تصوّرات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سُورہ میں تنقید کرکے ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

آیاتہا ۱۷۶ رکوعاتہا ۲۴

سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ
وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ
رَقِیْبًا ﴿۱﴾ وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دُنیا میں پھیلا دیے۔[۱] اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دُوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلّقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

یتیموں کے مال اُن کو واپس دو،[۲] اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو،[۳]

۱۔ چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حُقوق بیان کرنے ہیں اور خُصوصیّت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں، اس لیے تمہید اس طرح اُٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی، اور دُوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

”تم کو ایک جان سے پیدا کیا“، یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدمؑ تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی۔

”اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا“، اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حوّا کو پیدا کیا گیا (تلمود میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوّا کو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا)۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے، اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مُجمل رہنے دیا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ
النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا

اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ اُن کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو

جائے جس طرح اللہ نے اسے مُجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعیّن کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔

۲ - یعنی جب تک وہ بچے ہیں، اُن کے مال اُنھی کے مفاد پر خرچ کرو، اور جب بڑے ہو جائیں تو جو اُن کا حق ہے وہ انھیں واپس کردو۔

۳ - جامع فقرہ ہے، جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل لو۔

۴ - اس کے تین مفہوم اہلِ تفسیر نے بیان کیے ہیں:

(۱) حضرت عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیّت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں، اُن کے مال اور اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کرلیتے تھے اور پھر اُن پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمھیں پسند آئیں، اُن کے ساتھ نکاح کرلو۔ اسی سورت میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

(۲) ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگرد عِکرِمہؒ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کرلیتا تھا۔ اور جب اس کثرتِ اِزدِواج سے مَصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبُور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حُقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کردی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جُبَیر اور قَتادہ اور بعض دوسرے مفسّرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، اہلِ جاہلیّت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے

فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ ۳

پھر ایک ہی بیوی کرو[۵]، یا اُن عورتوں کو زوجیّت میں لاؤ جو تمھارے قبضے میں آئی ہیں[۶]، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

تصوُّر سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر اُن کے ساتھ ظلم و جَور سے پیش آتے تھے۔ اِس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اوّل تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے مُتحمِل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو اُن عورتوں سے نکاح کرلو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں۔

۵- اس بات پر فقہائے اُمّت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رُو سے تعدُّدِ ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غَیلان جب اسلام لایا تو اس کی نو ۹ بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص (نوفل بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعدُّدِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پُوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ اللہ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ حکومتِ اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو اُن کی داد رسی کریں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیّت زدہ رائے سے مغلوب و مَرعُوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعدّدِ ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطۂ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا، مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدُّدِ ازواج کا فی نفسہٖ ایک برائی ہونا بجائے خود ناقابلِ تسلیم ہے، کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدُّنی اور اَخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حِصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں، جس کے نقصانات تمدّن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدّدِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اِسی لیے قرآن نے اُن لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعدُّدِ ازواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے، اُن کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مذمّت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ حق انھیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا
فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

اور عورتوں کے مَہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مَہر کا کوئی حصّہ تمھیں معاف کر دیں تو اُسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔[۷]

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔[۸]

کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کو جائز ٹھیرایا ہے اور اشارتاً و کنایتاً بھی اس کی مذمّت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب ''سُنّت کی آئینی حیثیت''، ص ۳۰۷ تا ۳۱۶)

۶ – لونڈیاں مراد ہیں، یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو، جیسا کہ رکوع ۴ میں آگے آتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمھیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا تمھارے لیے مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رُجوع کرو، کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمّہ داریوں کا بار نسبتاً کم پڑے گا۔ (آگے حاشیہ ۴۴ میں لونڈیوں کے متعلّق احکام کی مزید تفصیل ملے گی)۔

۷ – حضرت عمرؓ اور قاضی شُریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پُورا مَہر یا اس کا کوئی حصّہ معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کے ادا کرنے پر مجبُور کیا جائے گا، کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مَہر یا اس کا کوئی حصّہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: ''حُقوق الزّوجین'' عنوان ''مہر'')

۸ – یہ آیت وسیع معنٰی کی حامل ہے۔ اس میں اُمّت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعۂ قیامِ زندگی ہے، بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرّف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدّن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حُقوقِ مِلکیّت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں، اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جا سکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلّق ہے، وہ تو ضرور پوری ہونی چاہییں، لیکن جہاں تک حقوقِ مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلّق ہے، اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ
رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا
وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں[9]۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیّت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو[10]۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِّ انصاف سے تجاوز کر کے اِس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو، وہ پرہیزگاری سے کام لے

استعمال اخلاق وتمدّن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مُضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے، وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرّف کے اہل نہ ہوں، یا جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے۔

۹ – یعنی جب وہ سنِ بُلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ ان کا عقلی نشوونما کیسا ہے اور ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمّہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے۔

۱۰ – مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دوسرے رُشد، یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیّت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمّت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سنِ بُلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولیِ یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابویُوسُف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالے کیے جانے کے لیے بہرحال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً مؤخّر الذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ اس معاملے میں قاضیِ شرع کی طرف رُجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ
اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۞۶
لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ
لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۞۷ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جو غریب ہو، وہ معروف طریقے سے کھائے[11]۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مَردوں کے لیے اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت[12]، اور یہ حصّہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو

۱۱- یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانب دار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے، چوری چُھپے نہ لے، بلکہ عَلانیہ متعیّن کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

۱۲- اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ میراث صرف مَردوں ہی کا حصّہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے، یہ کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتّٰی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصّوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصّہ خرید لے۔ تیسرے، اس آیت سے یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و املاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی، یا کسی اور صنفِ مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ مرا ہو۔ پانچویں، اِس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ
خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا
قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا
اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ ع ۱۲
يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ

اور اُن کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔[۱۳]

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچّوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں[۱۴] گے۔ ع

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ:
مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے۔[۱۵]

۱۳ – خطاب میّت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبے کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں، ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں ازرُوئے شرع اُن کا حصّہ نہیں ہے تو نہ سہی، وُسعتِ قلب سے کام لے کر ترکے میں سے اُن کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعُموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

۱۴ – حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ اُحُد کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچیّوں کو لیے ہوئے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحُد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ
اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ

اگر (میّت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔[۱۶]

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ ملنا چاہیے۔[۱۷]

اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصّہ دیا جائے۔[۱۸]

اور اگر میّت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصّے کی حق دار ہوگی۔[۱۹]

اب بھلا ان بچّیوں سے کون نکاح کرے گا" اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

۱۵ - میراث کے معاملے میں یہ اوّلین اُصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصّہ عورت سے دوگُنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ مَعاشی ذمّہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی مَعاشی ذمہ داریوں کے بارے سُبکدوش رکھا ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصّہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

۱۶ - یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کُل ترکے کا $\frac{2}{3}$ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی $\frac{1}{3}$ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میّت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کُل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اُسے ملے گا۔

۱۷ - یعنی میت کے صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں بہرحال میت کے والدین میں سے ہر ایک $\frac{1}{6}$ کا

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَآ اَوۡ دَيۡنٍ‌ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا

یہ سب حصّے اُس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیّت جو میّت نے کی ہو پُوری کر دی جائے اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے[20]۔

تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف

حق دار ہوگا۔ خواہ میّت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی۔ رہے باقی ۲/۳، تو ان میں دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۸ – ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی ۲/۳ باپ کو ملے گا۔ ورنہ ۲/۳ میں باپ اور دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۹ – بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ۱/۳ کے بجائے ۱/۶ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے حصّے میں سے جو ۱/۶ لیا گیا ہے، وہ باپ کے حصّے میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس صُورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میّت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصّہ نہیں پہنچتا۔

۲۰ – وصیّت کا ذکر قرض پر مقدّم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیّت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیّت پر مقدّم ہے۔ یعنی اگر میّت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میّت کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیّت پوری کی جائے گی، اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیّت کے متعلق سُورۂ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۸۲ میں ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی کو اپنے کُل مال کے ۱/۳ حصّے کی حد تک وصیّت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیّت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو، اس کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی سے حصّہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیّت کے ذریعے سے حصّہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صَرف کرنے کے لیے وصیّت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کُل ملکیّت میں سے ۲/۳ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے، جس میں سے شریعت کے

Maktaba Tul Ishaat.com

حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ

اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے[21]۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصّہ تمھیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صُورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصّہ تمھارا ہے جب کہ وصیّت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں اُن کا حصّہ آٹھواں[22] ہو گا، بعد اس کے کہ جو وصیّت تم نے کی ہو وہ پُوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

نامزد کردہ وارثوں کو مقرّرہ حصّہ ملے گا۔ اور $\frac{1}{3}$ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملے میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے، تقسیم کرنے کی وصیّت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیّت میں ظلم کرے، یا بالفاظِ دیگر، اپنے اختیارِ تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حُقوق متاثّر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارۂ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضا مندی سے اس کی اصلاح کر لیں، یا قاضیِ شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیّت کو دُرست کر دے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو میرا رسالہ ”یتیم پوتے کی وراثت“)

۲۱ – یہ جواب ہے اُن سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

۲۲ – یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ $\frac{1}{8}$ کی، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں $\frac{1}{4}$ کی حصّہ دار ہوں گی، اور یہ $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{8}$ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو، تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کُل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے[۲۳]، جب کہ وصیّت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میّت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو[۲۴]۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا

۲۳- باقی ۵/۶ یا ۲/۳ جو بچتے ہیں، ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصہ ملے گا، ورنہ اس پُوری باقی ماندہ ملکیّت کے متعلق اس شخص کو وصیّت کرنے کا حق ہوگا۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مُراد اَخیافی بھائی اور بہن ہیں، یعنی جو میّت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میّت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اِسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہُوا ہے۔

۲۴- وصیّت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حُقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حق داروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اُوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضِرار کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہلِ جنّت کے سے کام کرتا رہتا ہے، مگر مرتے وقت وصیّت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتابِ زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اُسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ ضِرار اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کَلالہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں، اس میں عُموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

حَلِيْمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ
حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾ ع

ع ۲ ۱۳

اور نرم خُو ہے۔[۲۵]

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اُسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسُولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رُسوا کُن سزا ہے۔[۲۵ الف] ع

نسبتاً دُور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کر دے۔

۲۵ – یہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا۔ دوسرے، یہ کہ اللہ نے جو حصّے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں، کیونکہ بندوں کی مَصلَحت جس چیز میں ہے، اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفتِ حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے، بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے، تاکہ وہ مَشقّت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

۲۵، الف – یہ ایک بڑی خوف ناک آیت ہے جس میں اُن لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں، یا اُن دُوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے معاملے میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں، وہ خدا کے خلاف کُھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا۔ کہیں

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ
حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾
وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں، اُن دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۲۶]

صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیرایا گیا۔ کہیں سرے سے تقسیمِ میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ”مشترک خاندانی جائداد“ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مَردوں کا حصّہ برابر کر دیا گیا۔ اور اب ان پُرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہلِ مغرب کی تقلید میں ”وفات ٹیکس“ (death duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ میّت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصّہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے! حالانکہ اسلامی اُصول پر اگر میّت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیائے متروکہ (unclaimed properties) کی طرح داخلِ بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصّہ پا سکتی ہے جب کہ مرنے والا اپنی وصیّت میں اس کے لیے کوئی حصہ مقرر کر جائے۔

۲۶ – ان دونوں آیتوں میں زِنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تاحکمِ ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیّت دی جائے، یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سُست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ
عَلِيمًا حَكِيمًا ۝١٧ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ
السَّيِّـَٔاتِ ۚ حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْـَٰٔنَ

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قُبولیت کا حق انھی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجّہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔

متعلّق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سُورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہلِ عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانونِ تعزیرات بنا کر دفعتًا ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خُوگر بنانے کے لیے پہلے زِنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زِنا، قَذف اور سَرقہ کی حدیں مقرر کیں، اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصّل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

مفسر سُدّی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لیے ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں۔ اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون و اَخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور اُنھی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلامِ شاہانہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۝۱۸ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ
كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ

اور اسی طرح توبہ اُن کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے[۲۷]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو[۲۸]۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اُس مہر کا کچھ حصّہ اُڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوّت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلّق پر کیا سزا دی جائے تو صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سُورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔

۲۷- توبہ کے معنٰی پلٹنے اور رُجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ ایک غلام، جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا، اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنٰی رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی، وہ از سرِ نَو اس کی طرف مُنعطف ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف اُن بندوں کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں، اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے، اس کا دروازہ کُھلا پائیں گے کہ ؎

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مگر توبہ اُن کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اُس وقت جب کہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو، معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ یقبل توبۃ العبد ما لم یُغرغِر۔ ”اللہ بندے کی توبہ بس اُسی وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ آثارِ موت شروع نہ ہوں۔“ کیونکہ امتحان کی مہلت جب پُوری ہوگئی اور کتابِ زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کون سا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دُوسری زندگی کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَّآ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ۚ وَ عَاشِرُوۡہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ
فَاِنۡ کَرِہۡتُمُوۡہُنَّ فَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ یَجۡعَلَ اللّٰہُ
فِیۡہِ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ

ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے [۲۹])۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اُسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو [۳۰]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دُوسری بیوی لے آنے کا ارادہ

سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اُس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

۲۸ – اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میّت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ عورت کا شوہر جب مرگیا تو وہ آزاد ہے۔ عدّت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کرلے۔

۲۹ – مال اڑانے کے لیے نہیں بلکہ بدچلنی کی سزا دینے کے لیے۔

۳۰ – یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے، تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتّی الامکان اسے صبر و تحمّل سے کام لینا چاہیے۔ بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوب صورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اِزدِواجی زندگی میں حُسنِ صورت سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہیں۔ اگر اُسے اپنی اُن خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسااوقات اِزدِواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے، تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی بُرائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اِزدِواجی تعلّق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق، یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے، مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ

زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْــًٔـا ؕ
اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ
اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱
وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ

ہی کر لو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اُسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لُطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں[۳۱]؟

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا[۳۲]۔

آپؐ نے فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ ایسے مَردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔

۳۱- پختہ عہد سے مراد نکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمانِ وفا ہے، جس کے استحکام پر بھروسا کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۵۱)

۳۲- تمدّنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیّت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعُموم قرآنِ مجید میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ ''جو ہو چکا سو ہو چکا''۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانے میں جو غلطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو، ان پر گرفت نہیں کی جائے گی، بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو اور جو غلط کام ہیں انھیں چھوڑ دو۔ دوسرے، یہ کہ زمانۂ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھیرایا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم و رواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعدم، اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز، اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے، ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حقِ وراثت ساقط کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۴ ۱۴

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ
عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ

درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے[۳۳] ع
تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں[۳۴]، بیٹیاں[۳۵]، بہنیں[۳۶]، پھوپھیاں، خالائیں،

حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں، انھیں بھی کالعدم ٹھیرا دیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کمائی ہو اس سے واپس لی جائے گی یا مالِ حرام ٹھیرائی جائے گی۔

۳۳- اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جُرم ہے اور قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔ ابوداؤد، نسائی اور مُسندِ احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی ہے۔ اور ابنِ ماجہ نے ابنِ عباسؓ سے جو روایت نقل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ قاعدۂ کُلیّہ ارشاد فرمایا تھا کہ من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ۔ ''جو شخص مُحَرّمات میں سے کسی کے ساتھ زِنا کرے اُسے قتل کر دو''۔ فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے مُحَرّمات میں سے کسی کے ساتھ زِنا کیا ہو تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی، اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

۳۴- ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی، دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سَلَف میں سے بعض اس کی حُرمت کے قائل نہیں ہیں، اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جس عورت کو باپ نے شہوت سے ہاتھ لگایا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سَلَف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے، اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات بادنیٰ تأمّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو، ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملے میں اُن قانونی مُوشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیرِ نکاح اور قبلِ نکاح اور بعدِ نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی

وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ

بھتیجیاں، بھانجیاں[۳۷]، اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دُودھ پلایا ہو، اور تمھاری دُودھ شریک بہنیں[۳۸]، اور تمھاری بیویوں کی مائیں[۳۹]، اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے

زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے، یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من نظر الی فرج امرأۃ حرمت علیه امها و ابنتها۔ ”جس شخص نے کسی عورت کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالی ہو، اُس کی ماں اور بیٹی دونوں اُس پر حرام ہیں۔“ اور لا ینظر اللہ الی رجل نظر الی فرج امرأۃ و ابنتها۔ ”خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالے۔“ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہو جاتا ہے۔

۳۵- بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلّقات کے نتیجے میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرح مُحَرّمات میں سے ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ محرّمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت یہ تصوّر بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلّق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اسی کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے، اس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہو۔

۳۶- سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔

۳۷- اِن سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن، خواہ سگی ہو خواہ سوتیلی، یا باپ شریک، بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن، خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک، ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

۳۸- اس امر پر اُمت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دُودھ پیا ہو، اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے، اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حُرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ

تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے[۴۰]___اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمھارا تعلّقِ زن وشو ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہُوا ہو اور) تعلّقِ زن وشو نہ ہُوا ہو تو (انھیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے___اور تمھارے اُن بیٹوں کی بیویاں

اتنی ہی مقدار میں اگر بچّہ کسی کا دودھ پی لے تو حُرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمدؒ کے نزدیک تین مرتبہ پینے سے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے یہ حُرمت ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس باب میں فقہا کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اعتبار صرف اُس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جب کہ بچے کا دودھ چھُڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خواری ہی پر اس کے تغذیے کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چھُٹائی کے بعد اگر کسی بچّے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اُس نے پانی پی لیا۔ یہ رائے اُمِّ سَلَمہؓ اور ابنِ عباسؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اس معنٰی میں آئی ہے۔ زُہری، حَسَن بصری، قَتادہ، عِکْرِمہ اور اَوزاعی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

(۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دُودھ پیا گیا ہو، صرف اسی سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہوگی۔ یہ حضرت عمرؓ، ابنِ مسعودؓ، ابو ہریرہؓ اور ابنِ عمرؓ کا قول ہے اور فقہا میں سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد، اور سُفیان ثَوری رحمہم اللہ نے اسے قبول کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی حد کے قائل ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ دو سال سے اگر مہینا دو مہینا زائد عمر بھی ہو تو اس میں دُودھ پینے کا وہی حکم ہے۔

(۳) امام ابو حنیفہؒ اور امام زُفَرؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر پینے سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

(۴) خواہ کسی عمر میں دُودھ پیے، حُرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اس معاملے میں اصل اعتبار دُودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو اس کا وہی حکم ہے جو شیر خوار بچے کا ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عائشہؓ کی۔ اور حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر روایت اسی کی تائید میں منقول ہے۔ اور فقہا میں سے عُروہ بن زُبیر، عطا، لَیث بن سعد اور ابنِ حَزم رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۳۹- اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہُوا ہو، اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ

الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ﴿۲۳﴾

الجزء ۵

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

جو تمھاری صُلب سے ہوں[41]۔ اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو،[42] مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے[43]۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دُوسرے کے نکاح میں ہوں (مُحصنات)۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمھارے ہاتھ آئیں[44]۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔ اِن کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمھارے لیے

جب تک کسی عورت سے خلوت نہ ہوئی ہو، اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

۴۰ – ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتے کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے اُمّت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہرحال حرام ہے، خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

۴۱ – یہ قید اس غرض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی نے بیٹا بنا لیا ہو، اس کی بیوہ یا مُطلّقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اُس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صُلب سے ہو۔ اور بیٹے ہی کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے۔

۴۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس معاملے میں یہ اُصول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہرحال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔

۴۳ – یعنی جاہلیت کے زمانے میں جو ظلم تم لوگ کرتے رہے ہو کہ دو دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کر لیتے تھے، اس پر باز پُرس نہ ہو گی، بشرطیکہ اب اس سے باز رہو۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ ۳۲) اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ جس شخص نے حالتِ کفر میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر رکھا ہو، اُسے اسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہو گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۴ – یعنی جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے کافر شوہر دارالحرب میں موجود ہوں، وہ حرام نہیں ہیں، کیونکہ دارالحرب سے دارالاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی مِلکِ یمین میں وہ ہوں وہ ان سے تمتُّع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا، اور امام مالکؒ و شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

لونڈیوں سے تمتُّع کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، لہٰذا حسبِ ذیل مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے:

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں، ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فِدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ اُن مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں، اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اُس عورت ہی سے تمتُّع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی مِلک میں دی گئی ہو۔

(۲) جو عورت اس طرح کسی کی مِلک میں دی جائے، اس کے ساتھ بھی اس وقت تک مباشرت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایّامِ ماہواری نہ آ جائیں اور یہ اطمینان نہ ہو لے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے بھی مباشرت ناجائز ہے۔

(۳) جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتُّع کے معاملے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصّے میں وہ آئیں، وہ ان سے تمتُّع کر سکتے ہیں۔

(۴) جو عورت جس شخص کے حصّے میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتُّع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اسی شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی مِلک میں وہ عورت ہے۔ اُس اولاد کے قانونی حُقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صُلبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی اور مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی۔

(۵) جو عورت اس طرح کسی شخص کی مِلک میں آئی ہو، اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۶) جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے، اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مال دار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنا لیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملے میں عَدَمِ تعیُّن کی وجہ جنگی حالات کا عَدَمِ تعیُّن ہے۔

(۷) مِلکیّت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو ازرُوئے قانون

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصارِ نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لُطف تم ان سے اُٹھاؤ، اس کے بدلے اُن کے مَہر بطور فرض کے ادا کرو، البتہ مَہر کی قرار داد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ علیم اور دانا ہے۔ اور جو شخص تم میں سے اتنی مَقدِرَت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (مُحْصَنات) سے نکاح کر سکے، اسے چاہیے کہ تمھاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمھارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خُوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ[۴۵] ہو،

کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کیے ہوں۔

(۸) حکومت کی طرف سے حقوقِ ملکیّت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا، وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتُّع میں کراہت محسوس کرے۔

(۹) اسیرانِ جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیّت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی کے نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حق دار نہیں رہتا۔

(۱۰) اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اجازت دے دے اور محض کچھ وقت کے لیے انھیں فوج میں تقسیم کر دے تو یہ اسلامی قانون کی رُو سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زِنا میں کوئی فرق نہیں ہے، اور زِنا اسلامی قانون میں جُرم ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو ہماری کتاب ''تفہیمات'' حصۂ دوم، اور ''رسائل و مسائل'' حصۂ اول)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ

لہٰذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقے سے اُن کے مہر ادا کردو، تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ (مُحْصَنات) ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھُپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (مُحْصَنات) کے لیے مقرر[۴۶] ہے۔ یہ سہولت[۴۷] تم میں سے اُن لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بندِ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر

۴۵ – یعنی معاشرت میں لوگوں کے درمیان جو فرقِ مَراتب ہے وہ محض ایک اعتباری چیز ہے، ورنہ دراصل سب مسلمان یکساں ہیں، اور اگر کوئی حقیقی وجہِ امتیاز ان کے درمیان ہے تو وہ ایمان ہے جو محض اُونچے گھرانوں ہی کا حصّہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان و اخلاق میں ایک خاندانی عورت سے بہتر ہو۔

۴۶ – سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور اُن دُوسرے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رَجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہوسکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔“ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰت (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ”شادی شدہ عورتیں“ جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے ”خاندانی عورتیں“ جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیتِ زیرِ بحث میں مُحْصَنٰت کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنٰی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنٰی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے مُحْصَنٰت کا لفظ پہلے معنٰی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو

ع

تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع يُرِيْدُ اللّٰهُ
لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ

تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنھی طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمھاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔[۴۸] ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ

مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک، خاندان کی حفاظت، جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی مُحْصَنہ ہوتی ہے۔ دوسری، شوہر کی حفاظت، جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے، مُحْصَنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اَدھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہُوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی، وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی، نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے، وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے، جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ مُحْصَنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں، کیونکہ وہ دُہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقے سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہنِ رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

۴۷- یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت لے کر نکاح کر لینے کی سہولت۔

۴۸- سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں، اور اس سورۃ کے نُزول سے پہلے سورۂ بقرہ میں مسائلِ تمدّن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں، ان سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

Maktaba Tul Ishaat.com

يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

توجہ کرنا چاہتا ہے، مگر جو لوگ خود اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دُور نکل[۴۹] جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جا رہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدّن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے ہر دَور کے انبیاؑ اور اُن کے صالح پیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیّت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہے۔

۴۹- یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جُہلا اور نواحِ مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدّن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصّبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصّہ۔ بیوہ عورت کا سُسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدّت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ مُتَبنّٰی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے مُتَبنّٰی کی بیوہ اور مُطلّقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رُسُوم کے پرستار چیخ چیخ اُٹھتے تھے۔ مدّتوں اِن احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں اُن کی رُو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اُس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اُس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف یہودی تھے جنھوں نے صدیوں کی مُوشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انھوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنھیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اَوہام تھے جن کو انھوں نے قانونِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علما اور عوام، دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سُن کر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دُوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضا مندی سے[۵۰]۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو[۵۱]۔

ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہا کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اَوہام و خُرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایّامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہُوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چُھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینے کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورۂ بقرہ، رکوع ۲۸ کے آغاز میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایّامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلّقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے، اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں، اسے پاک قرار دے گا۔

۵۰- ”باطل طریقوں“ سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلافِ حق ہوں اور شرعاً و اَخلاقاً ناجائز ہوں۔ ”لین دین“ سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفاد و منافع کا تبادلہ ہونا چاہیے، جس طرح تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ ”آپس کی رضامندی“ سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب و دغا سے۔ رشوت اور سُود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جُوے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر درحقیقت جُوے میں حصّہ لینے والا ہر شخص اس غلط اُمید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جَعل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جَعل و فریب نہیں ہے۔ اگر فریقِ ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے جَعل یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

۵۱- یہ فقرہ پچھلے فقرے کا تتمّہ بھی ہو سکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمّہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظامِ تمدّن

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا
فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا
كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ

یقین مانو کہ اللہ تمھارے اُوپر مہربان[۵۲] ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا، اُس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے، تو تمھاری چھوٹی موٹی بُرائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کر دیں[۵۳] گے اور تم کو عزّت

خراب ہوتا ہے اور اس کے بُرے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت آدمی سخت سزا کا مُستوجِب بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، یہ کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ دوسرے، یہ کہ خودکُشی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال کیے ہیں اور ترتیبِ کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں حق ہیں۔

۵۲ - یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا خیر خواہ ہے، تمھاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ تم کو ایسے کاموں سے منع کر رہا ہے جن میں تمھاری اپنی بربادی ہے۔

۵۳ - یعنی ہم تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پکڑ کر اپنے بندوں کو سزا دیں۔ اگر تمھارا نامۂ اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور تم پر فردِ جرم لگائی ہی نہ جائے گی۔ البتہ اگر بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مقدّمہ تم پر قائم کیا جائے گا، اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آجائیں گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اُصولی فرق کیا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور سنّت میں غور کیا ہے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصّواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں:

(۱) کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلف کیا گیا ہے، یا والدین ہوں، یا دوسرے انسان، یا خود اپنا نفس۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو "ظلم" بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔

(۲) اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں اِستکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے، اور عمداً اُن کاموں کو نہ کرے جن کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ

مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ
وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٣٢﴾

کی جگہ داخل کریں گے۔

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنّا نہ کرو۔ جو کچھ مَردوں نے کمایا ہے اُس کے مطابق ان کا حِصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصّہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔[۵۴]

نافرمانی جس قدر زیادہ ڈِھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیّت اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی، اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فِسق'' اور ''معصیت'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) اُن روابط کو توڑنا اور اُن تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور دُرستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے، خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں، یا بندے اور بندے کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملے میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زِنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجیے۔ یہ فعل فی نفسہٖ نظامِ تمدّن کو خراب کرنے والا ہے، اس لیے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے، مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ بُرا ہے۔ مُحرّمات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اَشنع ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے سے اَشدّ ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صُورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انھی وُجوہ سے ہے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں مامونیت کی توقع جس قدر زیادہ ہے، جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحقِ احترام ہے، اور جہاں اس رابطے کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجبِ فساد ہے، وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فُجور'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

۵۴ – اس آیت میں ایک بڑی اہم اَخلاقی ہدایت دی گئی ہے، جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ
اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع

اور ہم نے ہر اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، تو ان کا حصّہ انھیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں[۵۵] ہے۔ ع

انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوب صورت ہے اور کوئی بدصُورت۔ کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بد آواز۔ کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوّت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدّن کی ساری گوناگونی قائم ہے اور یہ عین مُقتضائے حکمت ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حُدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک نوعیّت کا فساد رُونما ہوتا ہے، اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں ایک دوسری نوعیّت کا فساد برپا ہوتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلے میں بڑھا ہوا دیکھے، بے چین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اُسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا، اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنّا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دُعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمھارے لیے مناسب سمجھے گا، عطا فرما دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ ''مَردوں نے جو کچھ کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ''، اس کا مطلب جہاں تک مَیں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ مَردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی بُرائی یا بھلائی کمائے گا، اسی کے مطابق، یا بالفاظِ دیگر، اسی کی جنس سے اللہ کے ہاں حصہ پائے گا۔

۵۵ – اہلِ عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کی میراث کے حق دار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا تھا، وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔ اس آیت میں جاہلیت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اُسی قاعدے کے مطابق

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ

مرد عورتوں پر قوّام[56] ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت[57] دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شِعار ہوتی ہیں اور مَردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حُقوق کی حفاظت کرتی ہیں[58]۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیٰحدہ رہو اور مارو[59]،

رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، اُن کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

۵۶ – قوّام یا قیّم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد، یا ادارے، یا نظام کے معاملات کو دُرست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیّا کرنے کا ذمّہ دار ہو۔

۵۷ – یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اُردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنیٰ میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعًا بعض ایسی خُصوصیّات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیّت رکھتا ہے، اور عورت فطرتًا ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔

۵۸ – حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمھارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمھارے پیچھے تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔'' یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اَقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر خدا کی مَعصیت کا حکم دے، یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے، تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اس کی اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اس صُورت میں اگر وہ نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہ ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ۝۳۴ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا
حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ۝۳۵

پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلّقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں[۶۰] اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان مُوافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔[۶۱]

۵۹ – یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نُشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد، تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے، اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو، وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے، بادِلِ ناخواستہ دی ہے، اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر دُرست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔

۶۰ – دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے، بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

۶۱ – اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے، وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیے کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے، تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایے سے، پہلو کے ساتھی[۶۲] اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو

ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں، اور اگر مقدّمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہا میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیے کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو، اس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خُلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حنفی اور شافعی علما کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو مُوافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حَسَن بصریؒ اور قتادہؒ اور بعض دوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباسؓ، سعید بن جُبیر، ابراہیم نَخَعیؒ، شَعْبِیؒ، محمد بن سِیرِینؒ، اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے ان کو حاکمانہ اختیارات دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عَقیلؓ بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنتِ عُتبہ بن ربیعہ کا مقدّمہ جب حضرت عثمانؓ کی عدالت میں پیش ہوا تو انھوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابنِ عباسؓ کو، اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو پنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدّمے میں حضرت علیؓ نے حَکَم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جُدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطورِ خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے۔ البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انھیں اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ
وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ

تمھارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پِندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دُوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُسے چھُپاتے ہیں[۶۳]۔ ایسے کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

۶۲ – متن میں "اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ" فرمایا گیا ہے، جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دَوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسائگی بھی ہر مہذّب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتّی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔

۶۳ – اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے، نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصّہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انّ اللّٰہ اذا انعم نعمۃ علیٰ عبد احبّ ان یظھر اثرھا علیہ، اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، اور اس کی داد و دہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً
يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ
يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ

خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہُوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسّر آئی۔ آخر اِن لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھُپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔[۶۴] اُس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسُولؐ کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

۶۴۔ یعنی ہر دَور کا پیغمبر اپنے دَور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق، جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی، اُسے میں نے اِن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر یہی شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دَور کے لوگوں پر دیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دور آپؐ کی بِعثَت کے وقت سے قیامت تک ہے۔ (آلِ عمران، حاشیہ ۶۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۶

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝۴۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ

وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب[۶۵] نہ جاؤ۔ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے[۶۶] ہو۔ اور اسی طرح جنابت[۶۷] کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کر لو، اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے[۶۸] ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم

۶۵ – یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۂ بقرہ (آیت ۲۱۹) میں گزرا۔ اُس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے، حتّٰی کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً ۴ ہجری کی ابتدا میں یہ دُوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی مُمانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آ جائے۔ اس کے کچھ مدّت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۂ مائدہ، آیت ۹۰، ۹۱ میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سُکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیا کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشے کی حالت میں نماز پڑھنا دُہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

۶۶ – اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اُونگھ جاتا ہو تو اُسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عَرَبی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدُّد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن میں حتّٰی تفقھوا یا حتّٰی تفھموا ما تقولون نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ فرمایا ہے۔ یعنی نماز میں آدمی کو اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا تو ہو نماز پڑھنے، اور شروع کر دے کوئی غزل۔

مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لَمس کیا ہو[۶۹]، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو[۷۰]، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

---

۶۷ – جنابت کے اصل معنی دُوری اور بے گانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں جنابت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضائے شہوت سے یا خواب میں مادّہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

۶۸ – فقہا اور مفسّرین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے، اِلّا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبداللہؓ بن مسعود، انسؓ بن مالک، حَسَن بصریؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے۔ یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ رہا مسجد کا معاملہ، تو اِس گروہ کی رائے میں جُنُبی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت علیؓ، ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ اِس مسئلے کو حدیث سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس رِوایت کی بنیاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت پر رکھتا ہے۔

۶۹ – اس امر میں اختلاف ہے کہ لَمس یعنی چھُونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ، اُبَیؓ ابنِ کعب، سعید بن جُبیرؒ، حسن بصریؒ اور متعدّد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے، اور اسی رائے کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام سُفیان ثَوریؒ نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہ ابنِ عمرؓ کی رائے ہے اور بعض رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ابنِ خَطّاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ لگانا ہے، اور اسی رائے کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام مالکؒ کی رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ساقط ہو جائے گا اور نماز کے لیے انھیں نیا وضو کرنا ہو گا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے مَس ہو جائے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جنھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے؟[۷۱] وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کردو۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے

۷۰ – حکم کی تفصیلی صورت یہ ہے کہ اگر آدمی بے وضو ہے یا اُسے غسل کی حاجت ہے اور پانی نہیں ملتا تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے، تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمُّم کی اجازت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تیمُّم کے معنیٰ قصد کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے، یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

تیمّم کے طریقے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لیا جائے، پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر کہنیوں تک ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر فقہا کا یہی مذہب ہے، اور صحابہؓ و تابعینؒ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حَسن بصریؒ، شَعبیؒ اور سالم بن عبداللہؒ وغیرہم اس کے قائل تھے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر بھی پھیر لیا جائے اور اسی کو کلائی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے۔ کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عطاء اور مَکحُول اور اَوزاعی اور احمد ابنِ حنبل رحمہم اللہ کا مذہب ہے، اور عُموماً حضرات اہلِ حدیث اسی کے قائل ہیں۔

تیمّم کے لیے ضروری نہیں کہ زمین ہی پر ہاتھ مارا جائے۔ اس غرض کے لیے ہر گرد آلود چیز اور ہر وہ چیز جو خشک اجزائے ارضی پر مشتمل ہو، کافی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر مُنہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حِس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدّت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہر حال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا، اور اس کے ذہن سے قابلِ نماز ہونے کی حالت اور قابلِ نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

۷۱ – علمائے اہلِ کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ”انھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے“۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو انھوں نے کتاب الٰہی کا ایک حصّہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس موجود

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۖ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿٤٥﴾ مِنَ الَّذِيْنَ
هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ
عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي
الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا

اور تمھاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں[۷۲] اُن میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو اُن کے محل سے پھیر دیتے ہیں[۷۳]، اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں: سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا[۷۴] اور اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ[۷۵] اور رَاعِنَا[۷۶]۔ حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، اور اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ

تھا، اس کی رُوح اور اس کے مقصد و مدّعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جُزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دین داری کے جوہر سے خالی تھے، اگرچہ علمائے دین اور پیشوایانِ مِلّت کہے جاتے تھے۔

۷۲ – یہ نہیں فرمایا کہ ”یہودی ہیں“ بلکہ یہ فرمایا کہ ”یہودی بن گئے ہیں“، کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے، جس طرح ہر نبی کی اُمّت اصل میں مسلمان ہوتی ہے، مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

۷۳ – اس کے تین مطلب ہیں: ایک، یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردّ و بدل کرتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اپنی تاویلات سے آیاتِ کتاب کے معنٰی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پَیروؤں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سُنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے روایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں، تاکہ انھیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلّق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔

۷۴ – یعنی جب انھیں خدا کے احکام سُنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں: سَمِعْنَا (ہم نے سُن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں: عَصَیْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا)۔ یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفّظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَیْنَا بن جاتا ہے۔

۷۵ – یعنی دورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: اِسْمَعْ (سُنیے)

Maktaba Tul Ishaat.com

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا
نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا
فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ
وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ
يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ

انھی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اے وہ لوگو جنھیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اُس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی۔[۷۷] اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں، یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا،[۷۸] اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا،[۷۹] اس کے ماسوا دُوسرے جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔[۸۰] اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا، اُس نے تو

اور پھر ساتھ ہی غَیْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذُو معنٰی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جا سکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کوئی کچھ سُنائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ۔

۷۶ – اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۰۸۔

۷۷ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، حاشیہ ۲۔

۷۸ – ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ
بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ
یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۰﴾ ع اَلَمۡ تَرَ
اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ

بہت ہی بڑا جھُوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگیِ نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انھیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھُوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چُوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لیے یہی ایک گناہ کافی ہے ع

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جِبْت[۸۱]

۷۹- یہ اس لیے فرمایا کہ اہلِ کتاب اگرچہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کی پیروی کے مدعی تھے، مگر شرک میں مبتلا ہوگئے تھے۔

۸۰- اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے، باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک، جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، حتّٰی کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا وقت اُن جُزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انھیں کوئی مضایقہ نظر آتا تھا۔

۸۱- جِبْت کے اصل معنٰی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور مُہورت اور تمام دوسری وہمی و خیالی باتوں کو "جِبْت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: النیاقة والطرق والطیر من الجبت۔ یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ
يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ
الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ
النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ

اور طاغوت[۸۲] کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں[۸۳]۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں اُن کا کوئی حصّہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دُوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی تک نہ دیتے[۸۴]۔ پھر کیا یہ دُوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا[۸۵]؟ اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ

نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جِبت" کے قبیل سے ہیں۔ پس "جِبت" کا مفہوم وہی ہے جسے ہم اُردو زبان میں اوہام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں superstitions کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

۸۲ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۸۶ و ۲۸۸۔

۸۳ – علمائے یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان کو وہ مشرکینِ عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں، حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں، اور دوسری طرف صریح بُت پرستی ہے جس کی مذمّت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔

۸۴ – یعنی کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصّہ ان کے قبضے میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی، کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصّہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انھیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ بُخل سے کام لے رہے ہیں۔

اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾
فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ
نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا
لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ ع
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ

کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور مُلکِ عظیم بخش دیا،[۸۶] مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا،[۸۷] اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے اُن کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے

---

۸۵ – یعنی یہ اپنی نااہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی آس خود لگائے بیٹھے تھے، اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمّیوں میں ایک عظیم الشان نبیؐ کے ظہور سے وہ روحانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سربلندی ہے، تو اب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں۔

۸۶ – "ملکِ عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوامِ عالم پر قائدانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

۸۷ – یاد رہے کہ یہاں جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ آخر جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہو اور یہ بنی اسماعیل بھی ابراہیمؑ ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیمؑ سے دُنیا

Maktaba Tul Ishaat.com

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ
لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ وَ اِذَا
حَكَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
نِعِمَّا یَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سُپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو،[۸۸] اللہ تم کو نہایت عُمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے۔

کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا، وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف اُن لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمھارے پاس بھیجی تھی، مگر تمھاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسماعیل کو دی ہے اور یہ اُن کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

۸۸- یعنی تم اُن بُرائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے (positions of trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نا اہل، کم ظرف، بداَخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سُپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اُٹھانے کی صلاحیّت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی رُوح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلّف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چُھری پھیرنے میں انھیں ذرا تأمّل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اُس زمانے میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي
الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف[89] پھیر دو

صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بُتوں کو پُوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبے کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہلِ کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلے میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو، انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو، عدل کے ساتھ کرو۔

۸۹– یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اُصول مستقل طور پر قائم کر دیے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے، اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محور، خدا کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قُبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِّ مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ ”خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔“

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذّات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لیے مُطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقے سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعتِ خدا رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے، اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ۔ ”جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔“ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

(۳) مذکورۂ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے، وہ اُن "اُولی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اُولی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہِ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علما ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا مُلکی انتظام کرنے والے حُکّام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی اُمور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلّوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غَرَض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا دُرست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو، اور خدا اور رسولؐ کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرطیں ہیں، اور یہ نہ صرف آیتِ مذکورۂ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل احادیث مُلاحظہ ہوں:

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاری و مسلم)

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اُولی الامر کی بات سنے اور مانے، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سُننا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔

لا طاعة فی معصیة، انما الطاعة فی المعروف۔ (بخاری و مسلم)

خدا اور رسولؐ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کرہ فقد سلم ولٰکن من رضی وتابع فقالوا افلا نقاتلھم؟ قال لا ما صلّوا۔ (مسلم)

حضورؐ نے فرمایا: تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو مُنکَر۔ تو جس نے ان کے مُنکَرات پر اظہارِ ناراضی کیا، وہ بَری الذّمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا، وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا: پھر جب ایسے حکّام کا دَور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا و رسول سے باہر ہو گئے ہیں، اور پھر ان کے خلاف جِدّوجُہد کرنا دُرست ہوگا۔

شِرَار ائمّتکم الّذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم قلنا یا رسول اللّٰہ افلا ننابذھم عند ذٰلك؟ قال لا ما اقاموا

حضورؐ نے فرمایا: تمھارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمھارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے لیے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم اُن کے مقابلے پر نہ اٹھیں؟ فرمایا: نہیں، جب تک وہ

فیکم الصّلٰوۃ، لا ما اقاموا فیکم الصّلٰوۃ۔ (مسلم)	تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں، جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اُوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اُوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابندِ نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظامِ حکومت چل رہا ہو، وہ کم از کم اِقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اُصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے اُلٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور رِوایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مِن جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحًا عندکم من اللّٰہ فیہ برھان، یعنی یہ کہ ”ہم اپنے سرداروں اور حُکّام سے نِزاع نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کُھلا کُھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حُضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔“ (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیتِ زیرِ بحث میں ایک مستقل اور قطعی اُصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے، یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلے میں بھی نِزاع واقع ہوگی، اس میں فیصلے کے لیے قرآن اور سنّت کی طرف رُجوع کیا جائے گا، اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ و سنّت رسول اللہؐ کو سند اور مَرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیّت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے مُمیّز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے، وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائلِ زندگی کے فیصلے کے لیے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہؐ کی طرف کیسے رجوع کیا جا سکتا ہے، جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اُصولِ دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیّز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ کافر مُطلَق آزادی کا مدّعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتّع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملے میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اِسی صورت میں آزادیِ عمل برتتا ہے، اور اُس کی یہ آزادیِ عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملے میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۠ ﴿٥٩﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ
اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا

ع ۸ ۵

اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔[90] ع

اے نبیؐ! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انھیں طاغوت سے

طرف سے آزادیِ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

۹۰ – قرآنِ مجید چونکہ محض کتابِ آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتابِ تعلیم و تلقین اور صحیفۂ وعظ و ارشاد بھی ہے، اس لیے پہلے فقرے میں جو قانونی اُصول بیان کیے گئے تھے، اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مَصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ مذکورۂ بالا چاروں اُصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اُصولوں سے انحراف، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دوسرے، یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی دُرست ہوسکتی ہے۔ یہ نصیحت ٹھیک اُس تقریر کے خاتمے پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقے سے مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تمھاری پیش رَو اُمّت دین کے اِن بنیادی اُصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان نہ ہوں، اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب و سنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے، تو وہ اُن خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔

بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖۗ

کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا[۹۱]۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسُولؐ کی طرف، تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں[۹۲]۔ پھر اُس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں[۹۳]

۹۱- یہاں صریح طور پر "طاغوت" سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لٰہذا یہ آیت اس معنیٰ میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت "طاغوت" کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جُھکنا عین منافقت ہے۔

۹۲- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مُقدّمے میں انھیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے تھے، مگر جس مُقدّمے میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپؐ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر، ورنہ ہر اس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اُس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انھیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

۹۳- غالبًا اس سے مراد یہ ہے کہ جب اُن کی اِس منافقانہ حرکت کا مسلمانوں کو علم ہو جاتا ہے اور انھیں خوف ہوتا ہے کہ اب بازپُرس ہوگی اور سزا ملے گی، اُس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے لگتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ
فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا
رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیّت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح مُوافقت ہو جائے ــــــ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔ (انھیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ اِذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔[۹۴] اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمھارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے نہیں، اے محمدؐ! تمھارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اِختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی

---

۹۴ - یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انھی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ
وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ
تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾
وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

تنگی نہ محسُوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں[95]۔ اگر ہم نے انھیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے[96]۔ حالانکہ جو نصیحت انھیں کی جاتی ہے، اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب[97] ہوتا، اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انھیں سیدھا راستہ دکھا دیتے[98]۔ جو اللہ اور رسُولؐ کی اطاعت

۹۵۔ اس آیت کا حکم صرف حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقے پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپؐ نے عمل کیا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کُن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقے کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔

۹۶۔ یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کے بجائے کفر و نافرمانی کی راہ لیں گے۔

۹۷۔ یعنی اگر یہ لوگ شک اور تذبذب اور تردُّد چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ رسول کی اطاعت و پیروی پر قائم ہو جاتے اور ڈانواں ڈول نہ رہتے تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہو جاتی۔ ان کے خیالات، اَخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہو جاتے اور یہ اُن برکات سے بہرہ ور ہوتے جو ایک شاہراہِ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہُوا کرتی ہیں۔ جو شخص تذبذب اور تردُّد کی حالت میں مبتلا ہو، کبھی اِس راستے پر

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ
رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع

کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑ اور صدّیقین اور شہدا اور صالحین [99]۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسّر آئیں [100]۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے ؏

چلے اور کبھی اُس راستے پر، اور اطمینان کسی راستے کے بھی صحیح ہونے پر اسے حاصل نہ ہو، اس کی ساری زندگی نقش برآب کی طرح بسر ہوتی ہے اور سعیِ لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

۹۸ - یعنی جب وہ شک چھوڑ کر ایمان و یقین کے ساتھ رسول کی اطاعت کا فیصلہ کر لیتے تو اللہ کے فضل سے ان کے سامنے سعی و عمل کا سیدھا راستہ بالکل روشن ہو جاتا اور انھیں صاف نظر آ جاتا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف اٹھے۔

۹۹ - صدّیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راست باز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجے پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے، اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی سُتھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر، کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شَہید کے اصل معنیٰ گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرزِ عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا، اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راست باز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں، اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تأمّل تسلیم کر لیا جائے۔

صَالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رَوِیّہ رکھتا ہو۔

۱۰۰ - یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لیے میسّر آئیں اور جس کا انجام

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ
انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾
وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو[۱۰۱]، پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں، تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چُراتا ہے[۱۰۲]، اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں اِن لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے ـــــ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمھارے اور اس کے درمیان محبّت کا

آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مُردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے، ورنہ درحقیقت بدسیرت اور بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دُنیا ہی میں ایک عذابِ الیم ہے، کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انھی کے ساتھ اُس انجام سے دوچار ہو جو اُن کے لیے مقدّر ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

۱۰۱ – واضح رہے کہ یہ خطبہ اُس زمانے میں نازل ہوا تھا جب اُحُد کی شکست کی وجہ سے اطراف ونواح کے قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ فُلاں قبیلے کے تیور بگڑ رہے ہیں، فُلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فُلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ پے در پے غداریاں کی جارہی تھیں۔ ان کے مبلّغین کو فریب سے دعوت دی جاتی تھی اور قتل کر دیا جاتا تھا۔ مدینے کے حُدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے ایک زبردست سعی وجُہد اور سخت جاں فشانی کی ضرورت تھی، تا کہ اِن خطرات کے ہجوم سے اسلام کی یہ تحریک مِٹ نہ جائے۔

۱۰۲ – ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ خود تو جی چُراتا ہی ہے، دوسروں کی بھی ہمتیں پست کرتا ہے اور ان کو جہاد سے روکنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ بھی اُسی کی طرح بیٹھ رہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾
فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ
لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

تو کوئی تعلّق تھا ہی نہیں ـــــ کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ (ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں،[۱۰۳] پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا، اُسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مَردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔[۱۰۴]

۱۰۳ – یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا دُنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیشِ نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو، جو اللہ اور آخرت پر کامل اعتماد رکھتے ہوں، اور دنیا میں اپنی کامیابی وخوش حالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دُنیوی مفاد اس اُمید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دُنیوی مفاد ہی کی ہو، تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔

۱۰۴ – اشارہ ہے اُن مظلوم بچّوں، عورتوں اور مَردوں کی طرف جو مکّے میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے۔ یہ غریب طرح طرح سے

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ
اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ
لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ
كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔[۱۰۵] پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔[۱۰۶] ع

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔[۱۰۷] کہتے ہیں: خدایا! یہ ہم پر لڑائی

تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے تھے اور دُعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انھیں اس ظلم سے بچائے۔

۱۰۵ – یہ اللہ کا دوٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو، یہ اہلِ ایمان کا کام ہے، اور جو واقعی مومن ہے، وہ اس کام سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو، یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔

۱۰۶ – یعنی بظاہر شیطان اور اس کے ساتھی بڑی تیاریوں سے اُٹھتے ہیں اور بڑی زبردست چالیں چلتے ہیں، لیکن اہلِ ایمان کو نہ اُن کی تیاریوں سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور نہ ان کی چالوں سے۔ آخرِ کار ان کا انجام ناکامی ہے۔

۱۰۷ – اس آیت کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ
الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۚ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ
فَتِيۡلًا ﴿۷۷﴾ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ
فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ
مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ

کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مُہلت دی؟ ان سے کہو: دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے، اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمّہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔[108] رہی موت، تو جہاں بھی تم ہو وہ بہر حال تمھیں آ کر رہے گی، خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔

اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ

ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے۔ بار بار کہتے تھے کہ صاحب! ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے، ہمیں ستایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں، آخر ہم کب تک صبر کریں، ہمیں مقابلے کی اجازت دی جائے۔ اُس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو اور نماز و زکوٰۃ سے ابھی اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہو، تو یہ صبر و برداشت کا حکم ان پر شاق گزرتا تھا۔ مگر اب جو لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو انھی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور جنگ کے خطرات دیکھ دیکھ کر سہا جا رہا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تک مطالبہ نماز اور زکوٰۃ اور ایسے ہی بے خطر کاموں کا تھا اور جانیں لڑانے کا کوئی سوال درمیان میں نہ آیا تھا، یہ لوگ پکّے دین دار تھے۔ مگر اب جو حق کی خاطر جان جوکھوں کا کام شروع ہوا تو ان پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لُوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت نیام سے نکلی پڑتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اُس وقت انھیں خوں ریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز و زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اب جو خدا کے لیے تلوار اُٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے،

مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ
لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ
فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ ۭ

تمھاری بدولت ہے[۱۰۹]۔ کہو: سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمدؐ! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسُول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہرحال ہم نے تمھیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۱۱۰]۔

خدا کی خاطر لڑنے میں بُزدل بن جاتے ہیں۔ وہ دستِ شمشیرزن جو نفس اور شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا، اب خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

یہ تینوں مفہوم مختلف قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں اور آیت کے الفاظ ایسے جامع ہیں کہ تینوں پر یکساں دلالت کرتے ہیں۔

۱۰۸ – یعنی اگر تم خدا کے دین کی خدمت بجا لاؤ اور اس کی راہ میں جانفشانی دکھاؤ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ہاں تمھارا اجر ضائع ہو جائے۔

۱۰۹ – یعنی جب فتح وظفر اور کامیابی و سُرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور بُھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر یہ فضل نبیؐ ہی کے ذریعے سے فرمایا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے پڑنے لگتے ہیں، تو سارا الزام نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بری الذّمہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ؗ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ
غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ
الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا
كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ
وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

وہ مُنہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیعِ فرمان ہیں۔ مگر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہوکر تمھاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو، وہی بھروسے کے لیے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اَور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔[۱۱۱]

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سُن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اُسے رسولؐ اور اپنی جماعت کے ذمّہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو

ہونا چاہتے ہیں۔

۱۱۰ – یعنی اپنے عمل کے یہ خود ذمّہ دار ہیں۔ ان کے اعمال کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی۔ تمھارے سُپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام و ہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ تمھارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انھیں زبردستی راہِ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اُس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمھارے ذریعے سے پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔

۱۱۱ – منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی جس روش پر اُوپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے اس کی بڑی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ انھیں قرآن کے منجانبِ اللہ ہونے میں شک تھا۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ رسولؐ پر واقعی وحی اُترتی ہے اور

یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ
لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ لَا
تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّكُفَّ
بَاۡسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّاَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ﴿۸۴﴾
مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا ۚ

اِن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرسکیں[۱۱۲]۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمھاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

پس اے نبیؐ! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اَور کے لیے ذمّہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہلِ ایمان کو لڑنے کے لیے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ جو بھلائی کی سِفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ

یہ جو کچھ ہدایات آ رہی ہیں، براہِ راست خدا ہی کے پاس سے آ رہی ہیں۔ اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر، مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اوّل سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جُز دوسرے جُز سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلیِ رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، جس میں متکلّم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں، اور جس پر کبھی نظرِ ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۱۱۲ - وہ چونکہ ہنگامے کا موقع تھا، اس لیے ہر طرف افواہیں اُڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد مبالغہ آمیز اطلاعیں آتیں اور ان سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کو چھپانے کے لیے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انھیں سُن کر غفلت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے، جن کے لیے اسلام اور جاہلیّت کا یہ معرکہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا، جنھیں کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقِيۡتًا ۝۸۵ وَاِذَا حُيِّيۡتُمۡ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوۡا
بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ
النصف حَسِيۡبًا ۝۸۶ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ
ع ۱۱ ۸ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ۝۸۷ ع

پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا،[113] اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمھیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح،[114] اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچّی بات اور کس کی ہوسکتی ہے۔[115] ع

خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمّہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کوئی بھنک پڑ جاتی، اسے لے کر جگہ جگہ پھونکتے پھرتے تھے۔ انھی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے اور انھیں سختی کے ساتھ مُتنبّہ فرمایا گیا ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو اُن کو پہنچے، اسے ذمّہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

۱۱۳- یعنی یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے کے لیے لوگوں کو اُبھارے اور اس کا اجر پائے، اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور انھیں اِعلائے کلمۃ اللہ کی سعی و جُہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صَرف کرے، اور اس کی سزا کا مستحق بنے۔

۱۱۴- اُس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خُلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انھیں ہدایت کی گئی کہ جو تمھارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے، اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمھارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے، جو دنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھا ہو، دُرُشت مزاجی، تُرش رُوئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اُس مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اُٹھا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ

پھر یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں،[۱۱۶] حالانکہ جو بُرائیاں اُنھوں نے کمائی ہیں، اُن کی بدولت اللہ انھیں اُلٹا پھیر چکا ہے[۱۱۷]۔

۱۱۵ – یعنی کافر اور مشرک اور مُلحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اُس کا خدائے واحد اور خدائے مُطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدل نہیں سکتی۔ پھر ایک دن وہ سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھا دے گا۔ اس کی قدرت کے احاطے سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالتا پھرے اور کج خُلقی و تُرش کلامی کو زخم دل کا مرہم بنائے۔

یہ تو اس آیت کا تعلق اُوپر کی آیت سے ہے۔ لیکن یہی آیت اس پورے سلسلۂ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلتا رہے اور جس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صَرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے، آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

۱۱۶ – یہاں ان منافق مسلمانوں کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصّوں میں اسلام تو قبول کر چکے تھے، مگر ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے بدستور اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے بستے تھے، اور کم و بیش ان تمام کارروائیوں میں عملاً حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ سخت پیچیدہ تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، آخر یہ ہیں تو مسلمان ہی۔ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں اسی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس موقع پر ایک بات کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نہ صرف اس مقام کو، بلکہ قرآنِ مجید کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے میں آدمی ٹھوکر کھائے گا جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایک چھوٹا سا خطہ عرب کی سرزمین میں ایسا بہم پہنچ گیا جہاں ایک مومن کے لیے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن تھا، تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں، جس جس علاقے اور جس جس قبیلے میں اہلِ ایمان کفار سے دبے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے، وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ کے دارالاسلام میں آ جائیں۔ اُس وقت جو لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لیے اُٹھ کر نہ آئے کہ انھیں اپنے گھر بار، اَعِزّہ و اقربا اور اپنے مفادات اسلام کی بہ نسبت عزیز تر تھے، وہ سب منافق قرار دیے گئے۔ اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ
سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪
وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ

کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستے سے ہٹا دیا اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آجائیں، اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو[118] اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے

جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے، ان کو "مُسْتَضْعَفِیْن" میں شمار کیا گیا، جیسا کہ آگے رُکوع ۱۴ میں آ رہا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ دار الکفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ دار الاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوتِ عام ہو، یا کم از کم اس نے ان کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہوں۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کر رہے ہوں، اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں۔ لیکن اگر دار الاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو اور نہ اس نے اپنے دروازے ہی مہاجرین کے لیے کھلے رکھے ہوں، تو اس صورت میں صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنا دے گا، بلکہ وہ منافق صرف اُس وقت کہلائے گا جب کہ فی الواقع کوئی منافقانہ کام کرے۔

۱۱۷ – یعنی جس دو رنگی اور مَصلحت پرستی اور ترجیحِ دنیا بر آخرت کا اکتساب انھوں نے کیا ہے، اس کی بدولت اللہ نے انھیں اسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انھوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی کی تو ضرور تھی، مگر اس سرحد میں آنے اور ٹھیرنے کے لیے یکسو ہو جانے کی ضرورت تھی، ہر اُس مفاد کو قربان کر دینے کی ضرورت تھی جو اسلام و ایمان کے مفاد سے ٹکراتا ہو، اور آخرت پر ایسے یقین کی ضرورت تھی جس کی بنا پر آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی دُنیا کو قربان کر سکتا ہو۔ یہ ان کو گوارا نہ ہُوا،

اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ
صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ
شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ
یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ
سَبِیۡلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّاۡمَنُوۡکُمۡ
وَ یَاۡمَنُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ کُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَی الۡفِتۡنَۃِ اُرۡکِسُوۡا فِیۡہَا ۚ
فَاِنۡ لَّمۡ یَعۡتَزِلُوۡکُمۡ وَ یُلۡقُوۡۤا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ وَ یَکُفُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ
فَخُذُوۡہُمۡ وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ ؕ وَ اُولٰٓئِکُمۡ

جا ملیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے[119]۔ اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلّط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمھیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنے کا موقع پائیں گے اس میں کُود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمھارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمھارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں، تو جہاں وہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو، ان پر

اس لیے جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں اُدھر ہی واپس چلے گئے۔ اب ان کے معاملے میں اختلاف کا کون سا موقع باقی ہے؟

۱۱۸- یہ حکم اُن منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف مُعاندانہ کارروائیوں میں عملاً حصّہ لیں۔

۱۱۹- یہ اِستثنا اس حکم سے نہیں ہے کہ "انھیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے"، بلکہ اس حکم سے ہے کہ "انھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ

ہاتھ اُٹھانے کے لیے ہم نے تمھیں کھلی حُجّت دے دی ہے ؏

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دُوسرے مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ اُس سے چُوک ہو جائے۔[۱۲۰] اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے[۱۲۱] اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے،[۱۲۲] اِلّا یہ کہ وہ خوں بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفّارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

پکڑا اور مارا جائے"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے حُدود میں جا پناہ لیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہو، تو اس کے علاقے میں ان کا تعاقب نہیں کیا جائے گا اور نہ یہی جائز ہوگا کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان غیر جانب دار ملک میں کسی واجب القتل منافق کو پائے اور اسے مار ڈالے۔ احترام دراصل منافق کے خون کا نہیں بلکہ معاہدے کا ہے۔

۱۲۰ – یہاں اُن منافق مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کے قتل کی اوپر اجازت دی گئی ہے، بلکہ اُن مسلمانوں کا ذکر ہے جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر دار الحرب یا دار الکفر میں بھی ہوں تو دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں میں اُن کی شرکت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اُس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حقیقی مجبُوریوں کی بنا پر دشمنِ اسلام قبیلوں کے درمیان ٹھیرے ہوئے تھے۔ اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آجاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلے پر حملہ کرتے اور وہاں نادانستگی میں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا ہے جب کہ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔

۱۲۱ – چونکہ مقتول مومن تھا اس لیے اس کے قتل کا کفارہ ایک مومن غلام کی آزادی قرار دیا گیا۔

۱۲۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوں بہا کی مقدار سو اُونٹ، یا دو سو گائیں، یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خوں بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انھی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے معیّن کی جائے گی۔ مثلاً نبیؐ کے زمانے میں نقد خوں بہا دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا ۸ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے

وَ اِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ‌ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۹۲﴾

اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمھارا مُعاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔[۱۲۳] پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔[۱۲۴] یہ اِس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے[۱۲۵] اور اللہ علیم و دانا ہے۔

فرمایا کہ اُونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے، لہٰذا اب سونے کے سکّے میں ایک ہزار دینار، یا چاندی کے سکّے میں ۱۲ ہزار درہم خوں بہا دلوایا جائے گا۔ مگر واضح رہے کہ خوں بہا کی یہ مقدار جو مقرر کی گئی ہے، قتلِ عمد کی صورت کے لیے نہیں ہے بلکہ قتلِ خطا کی صورت کے لیے ہے۔

۱۲۳ – اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دار الاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو خوں بہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔

اگر وہ دار الحرب کا باشندہ ہو تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا خوں بہا کچھ نہیں ہے۔

اگر وہ کسی ایسے دار الکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ خوں بہا بھی دینا ہوگا، لیکن خوں بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اُس مُعاہَد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں از رُوئے مُعاہدہ دی جانی چاہیے۔

۱۲۴ – یعنی روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو از سرِ نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

۱۲۵ – یعنی یہ ”جُرمانہ“ نہیں بلکہ ”توبہ“ اور ”کفّارہ“ ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی، بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حُقوق کے ذریعے سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے، اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے، تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آیندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادے سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لُغوی معنیٰ ہیں: ”چھپانے والی چیز“۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا ”کفّارہ“ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بُوجھ کر قتل کرے تو اُس کی جزا جہنّم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمھاری طرف سلام سے تقدیم کرے، اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے[۱۲۶]۔ اگر تم دُنیوی فائدہ

نیکی اُس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

۱۲۶ – ابتدائے اسلام میں ”السّلام علیکم“ کا لفظ مسلمانوں کے لیے شِعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنٰی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شِعار (password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوجِ مخالف کے آدمیوں سے مُمیّز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شِعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اُس زمانے میں اس شعار کی اہمیّت اس وجہ سے اَور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نو مسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آ جاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے ”السّلام علیکم“ یا ”لا الٰہ الا اللہ“ پکارتا تھا، مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اس کے متعلق تمھیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي
الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ
دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لیے بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا[۱۲۷]، لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ

حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہوسکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے۔ اور بہرحال تمہارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

۱۲۷ – یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے، اور تمہارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا

Maktaba Tul Ishaat.com

الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے،[۱۲۸] اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ع

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے[۱۲۹] ان کی رُوحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔

بلند کرنے اُٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں، ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

۱۲۸- یہاں اُن بیٹھنے والوں کا ذکر نہیں ہے جن کو جہاد پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ بہانے کر کے بیٹھ رہیں، یا نَفیرِ عام ہو اور جہاد فرضِ عین ہو جائے پھر بھی وہ جنگ پر جانے سے جی چُرائیں۔ بلکہ یہاں ذکر اُن بیٹھنے والوں کا ہے جو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صورت میں میدانِ جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں۔ پہلی دو صورتوں میں جہاد کے لیے نہ نکلنے والا صرف منافق ہی ہوسکتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی بھلائی کا وعدہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ وہ کسی حقیقی معذوری کا شکار ہو۔ بخلاف اس کے یہ آخری صورت ایسی ہے جس میں اسلامی جماعت کو پوری فوجی طاقت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ محض اس کا ایک حصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر امام کی طرف سے اپیل کی جائے کہ کون سرباز ہیں جو فُلاں مہم کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، تو جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ افضل ہیں بہ نسبت اُن کے جو دوسرے کاموں میں لگے رہیں، خواہ وہ دوسرے کام بھی بجائے خود مفید ہی ہوں۔

۱۲۹- مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبُوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے، درآں حالے کہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا، کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلے میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا، وہ کوئی واقعی مجبُوری نہ تھی، بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انھوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۶)

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا
يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ
بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۧ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۴

فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟[۱۳۰] یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجایش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستے ہی میں اسے موت آ جائے، اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔[۱۳۱] ع

۱۳۰ – یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانونِ شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

۱۳۱ – یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو، اس کے لیے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے: ایک، یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدّوجُہد کرتا رہے، جس طرح انبیا علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ

اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو[۱۳۲] (خصوصاً)

کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکامِ کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح، یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اس وقت کے حالات میں اہلِ عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا۔ جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر و دارالحرب تھا اور صرف مدینہ واطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے، مسلمانوں کے لیے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

۱۳۲ – زمانۂ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ اور حالتِ جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو، ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رُخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو۔ سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رُکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارے ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو خون لگا ہوا ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر ایسی پرخطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً موخر کی جائے جیسے جنگِ خندق کے موقع پر ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا تو التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنے کا التزام آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نفل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے، حتّٰی کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علما ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حنفیہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر منزل کرے اور اطمینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

جس سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ۔ ابن عمرؓ، ابنِ مسعودؓ اور عطاؒ کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے، اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے، رہی سفر کی نوعیّت، تو وہ بجائے خود ثواب یا عتاب کی مستحق ہو سکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض ائمہ نے "مضایقہ نہیں" (فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ) کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے۔ آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اُٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعیؒ نے اختیار کی ہے، اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترکِ قصر کو ترکِ اَولیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک رِوایت میں امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے قصر نہ کیا ہو۔ اسی کی تائید میں ابنِ عباسؓ اور دوسرے متعدّد صحابہؓ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جب حج کے موقع پر مِنٰی میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکّے میں شادی کر لی ہے، اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں مُتأہّل ہُوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں دُرست ہیں، لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت بین السفر و الحضر بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرودگاہ پر حسبِ موقع کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جا سکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اسی حالت کے متعلّق فرمایا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی۔ رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ "مضایقہ نہیں اگر قصر کرو" تو ان کی نظیر سورۂ بقرہ رکوع ۱۹ میں گزر چکی ہے جہاں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسکِ حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصود لوگوں کے اِس اندیشے کو دُور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا، یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

مقدارِ سفر جس میں قصر کیا جا سکتا ہے، ظاہریّہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالکؒ کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔ ابنِ عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت اَنسؓ ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام اَوزاعیؒ اور امام زُہریؒ حضرت عمرؓ کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حَسَن بصری دو دن،

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَكُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ اِنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ
كَانُوۡا لَـكُمۡ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا ﴿۱۰۱﴾ وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ

جب کہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے[۱۳۳]، کیونکہ وہ کھلم کھلا تمھاری دشمنی پر تُلے ہوئے ہیں۔
اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے

اور امام ابویوسفؒ دو دن سے زیادہ کی مسافت میں قصر جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اُونٹ کی سواری سے تین دن صَرف ہوں (یعنی تقریباً ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل) اس میں قصر کیا جاسکتا ہے۔ یہی رائے ابنِ عمر، ابنِ مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی ہے۔

اثنائے سفر میں دَورانِ قیام جس میں قصر کیا جاسکتا ہے، مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جہاں آدمی نے چار دن ٹھیرنے کا ارادہ کرلیا ہو، وہاں پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جہاں چار دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ہو، وہاں قصر جائز نہیں۔ امام اَوزاعیؒ ۱۳ دن اور امام ابوحنیفہؒ ۱۵ دن یا اس سے زیادہ کی نیتِ قیام پر پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ آدمی مجبوراً رُکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری دُور ہوتے ہی وطن واپس ہوجائے گا تو تمام علما کا اتفاق ہے کہ ایسی جگہ بلاتعیُّنِ مدّتِ قصر کیا جاتا رہے گا۔ صحابۂ کرامؓ سے بکثرت مثالیں ایسی منقول ہیں کہ انھوں نے ایسے حالات میں دو دو سال مسلسل قصر کیا ہے۔ امام احمد ابنِ حنبلؒ اسی پر قیاس کرکے قیدی کو بھی اس کے پُورے زمانۂ قید میں قصر کی اجازت دیتے ہیں۔

۱۳۳ – ظاہریوں اور خارجیوں نے اس فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ قصر صرف حالتِ جنگ کے لیے ہے اور حالتِ امن کے سفر میں قصر کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن حدیث میں مستند روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہی شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو حضورؐ نے فرمایا: صدقة تصدق اللّٰه بها علیکم فاقبلوا صدقته۔ ’’یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمھیں بخشا ہے، لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو۔‘‘ یہ بات قریب قریب تواتُر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں کے سفر میں قصر فرمایا ہے۔ ابنِ عباسؓ تصریح کرتے ہیں کہ ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم خرج من المدینة الٰی مکة لا یخاف الا ربّ العٰلمین فصلی رکعتین۔ ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت ربّ العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، مگر آپؐ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔‘‘ اسی بنا پر میں نے ترجمے میں خُصوصاً کا لفظ قوسین میں بڑھا دیا ہے۔

الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ قف
فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ص وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى
لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ج
وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ

کھڑے[۱۳۴] ہو تو چاہیے کہ ان[۱۳۵] میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے، آ کر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنّا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہے[۱۳۶]، کیوں کہ کفّار اِس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو

۱۳۴ – امام ابویوسفؒ اور حسن بن زیادؒ نے ان الفاظ سے یہ گمان کیا ہے کہ صلوٰۃِ خوف صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لیے مخصوص تھی۔ لیکن قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے صلوٰۃِ خوف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بکثرت جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے کہ انھوں نے حضورؐ کے بعد بھی صلوٰۃِ خوف پڑھی ہے اور اس باب میں کسی صحابی کا اختلاف مروی نہیں ہے۔

۱۳۵ – صلوٰۃِ خوف کا یہ حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکۂ قتال گرم نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ عملاً جنگ ہو رہی ہو تو اس صورت میں حَنَفِیَہ کے نزدیک نماز مؤخر کر دی جائے گی۔ امام مالکؒ اور امام ثوریؒ کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی سی زد و خورد بھی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں نہیں پڑھیں اور پھر موقع پا کر علی الترتیب انھیں ادا کیا، حالانکہ غزوۂ خندق سے پہلے صلوٰۃِ خوف کا حکم آ چکا تھا۔

۱۳۶ – صلوٰۃِ خوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک جنگی حالات پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے اور امامِ وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقے کی اجازت جنگی صورتِ حال دے اسی کو اختیار کرے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصّہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصّہ دشمن کے مقابلے پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصّہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصّہ آ کر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔ اس طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن
كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا
أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا

وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضایقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے[۱۳۷]۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے

امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک ایک رکعت۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے، پھر دُوسرا حصہ آ کر ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھے، پھر دونوں حصے باری باری سے آ کر اپنی چھُوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطورِ خود ادا کرلیں۔ اس طرح دونوں حصّوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہوگی، اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہّد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا حصہ تیسری رکعت میں آ کر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطورِ خود ایک رکعت مع تشہّد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرا حصہ آ کر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اُٹھ کر پڑھ لیں۔ اس صورت میں امام کو دوسری رکعت میں طویل قیام کرنا ہوگا۔

پہلی صورت کو ابنِ عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ اور مجاہدؒ نے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریقے کو عبداللہؓ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور حَنفِیّہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقے کو حسن بصریؒ نے ابوبکرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور چوتھے طریقے کو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اور اس کا ماخذ سہل بن ابی حَثمہ کی روایت ہے۔

اِن کے علاوہ صلوٰۃِ خوف کے اور بھی طریقے ہیں جن کی تفصیل مبسُوطات میں مل سکتی ہے۔

۱۳۷ – یعنی یہ احتیاط جس کا حکم تمھیں دیا جا رہا ہے، محض دُنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے، ورنہ دراصل فتح و شکست کا مدار تمھاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے۔ اس لیے ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کرتے ہوئے تمھیں اس امر کا یقین رکھنا

وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ
الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي
ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا
تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا
ع ۱۵ / ۱۳ حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

اس گروہ[۱۳۸] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اُس چیز کے اُمیدوار ہو جس کے وہ اُمیدوار نہیں ہیں۔[۱۳۹] اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ ع

اے نبی![۱۴۰] ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے، تاکہ جو راہِ راست اللہ نے

چاہیے کہ جو لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بُجھانے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ انھیں رسوا کرے گا۔

۱۳۸ – یعنی گروہ کفّار جو اُس وقت اسلام کی دعوت اور نظامِ اسلامی کے قیام کی راہ میں مانع و مزاحم بن کر کھڑا ہوا تھا۔

۱۳۹ – یعنی تعجب کا مقام ہے اگر اہلِ ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں جتنی کفار باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں، حالانکہ اُن کے سامنے صرف دنیا اور اس کے ناپائیدار فائدے ہیں اور اس کے برعکس اہلِ ایمان ربّ السماوات والارض کی خوشنودی و تقرّب اور اس کے اَبدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

۱۴۰ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملے سے بحث کی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طُعمہ یا بشیر بن اُبیرق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زِرہ چُرا لی۔ اور جب اس کا تجسس شروع ہوا تو مالِ مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِستغاثہ کیا اور طُعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔ مگر طُعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اُس یہودی پر الزام تھوپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی براءت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طُعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ۝۱۰۵ۙ
وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۱۰۶ۚ وَلَا
تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ۝۱۰۷ۙۚ یَّسْتَخْفُوْنَ

تمھیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو، اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں[۱۴۱]، تم اُن کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات

رہے اور کہا کہ یہ یہودی خبیث، جو حق کا انکار اور اللہ کے رسولؐ سے کفر کرنے والا ہے، اِس کی بات کا کیا اعتبار، بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے، کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدّمے کی ظاہری رُوداد سے متأثّر ہو کر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مُستغیث کو بھی بنی اُبَیرِق پر الزام عائد کرنے پر تنبیہ فرماتے۔ اتنے میں وحی آئی اور معاملے کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپؐ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی ہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط رُوداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن اُس وقت، جب کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کش مکش برپا تھی، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رُودادِ مقدّمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے، تو اسلام کے مخالفوں کو آپؐ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت اور خود دعوتِ اسلامی کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے، یہاں تو وہی جتھا بندی اور عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدّمے میں مداخلت فرمائی۔

اِن رکوعوں میں ایک طرف اُن مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنھوں نے محض خاندان اور قبیلے کی عصبیّت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملے میں کسی تعصّب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسرِ باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسرِ حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

۱۴۱ – جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے، وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطورِ امانت ہیں ان پر بے جا تصرف کر کے وہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا

مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ قف
فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ
وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ
اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا
فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾
وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ

چھُپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھُپا سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھُپ کر اُس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ اِن کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے اِن مجرموں کی طرف سے دُنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کرلیا، مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون اِن کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے، تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو بُرائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اُسی کے لیے وبال ہوگی، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا، اُس نے تو

ساتھ دیں۔ اور اپنے ضمیر کو، جسے اللہ نے اس کے اَخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِراہ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست بُرد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے، تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۸ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ
وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا
يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ
اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ
نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ
بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ

بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ع

اے نبیؐ! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالاں کہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمھارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل[۱۴۲] کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمھیں معلوم نہ تھا، اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے، اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور

---

۱۴۲ – یعنی اگر وہ غلط رُوداد پیش کر کے تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انھی کا تھا، تمھارا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵ ع اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۱۱۶ اِنْ يَّدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۱۱۷ۙ

اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالے کہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا[۱۴۳] اور اسے جہنّم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ع

اللہ کے ہاں[۱۴۴] بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہوسکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا، وہ تو گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں۔ وہ اُس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں[۱۴۵]

جو شخص حاکم کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے، وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا، حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ حاکم کے فیصلے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۹۷)

۱۴۳ – جب مذکورۂ بالا مقدّمے میں وحیِ الٰہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خائن مسلمان کے خلاف، اور اُس بے گناہ یہودی کے حق میں، فیصلہ صادر فرما دیا تو اس منافق پر جاہلیّت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کُھلّم کُھلّا مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۴ – اس رکوع میں اُوپر کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی جاہلیّت کے طیش میں آکر یہ شخص جس راہ کی طرف گیا ہے وہ کیسی راہ ہے، اور صالحین کے گروہ سے الگ ہو کر جن لوگوں کا ساتھ اس نے اختیار کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

۱۴۵ – شیطان کو اس معنی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسمِ پرستش ادا کرتا ہو اور اس کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم
لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ ؕ يَعِدُهُمْ

جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں) جس نے اللہ سے کہا تھا کہ ''میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصّہ لے کر رہوں گا [۱۴۶]، میں انھیں بہکاؤں گا، میں انھیں آرزوؤں میں اُلجھاؤں گا، میں انھیں حکم دُوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے [۱۴۷]، اور میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردّوبدل کریں گے [۱۴۸]۔'' اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنالیا، وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ اِن لوگوں سے وعدے کرتا ہے

الوہیت کا درجہ دیتا ہو۔ البتہ اُسے معبُود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور جدھر جدھر وہ چلاتا ہے اُدھر چلتا ہے، گویا کہ یہ اُس کا بندہ ہے اور وہ اِس کا خدا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چُون وچُرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی ''عبادت'' ہے، اور جو شخص اس طرح کی اطاعت کرتا ہے، وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔

۱۴۶ – یعنی اُن کے اوقات میں، ان کی محنتوں اور کوششوں میں، ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں، ان کے مال اور ان کی اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور ان کو فریب دے کر ایسا پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک مُعتدبہٖ حصہ میری راہ میں صَرف کریں گے۔

۱۴۷ – اہلِ عرب کے توہّمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اُونٹنی پانچ یا دس بچے جَن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اُونٹ کے نُطفے سے دس بچے ہو جاتے، اُسے بھی دیوتا کے نام پر پُن کر دیا جاتا تھا اور کان چیرنا اس بات کی علامت تھا کہ یہ پُن کیا ہوا جانور ہے۔

۱۴۸ – خدائی ساخت میں ردّوبدل کرنے کا مطلب اشیا کی پیدائشی بناوٹ میں ردّوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے کہ تہذیب تو نام ہی ان تصرُّفات

وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۖ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۖ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا

اور انھیں اُمیدیں دلاتا ہے[۱۴۹]، مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنّم ہے، جس سے خلاصی کی کوئی صُورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، تو انھیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچّا ہوگا۔

انجامِ کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی بُرائی کرے گا

کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے۔ دراصل اس جگہ جس ردّوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا نہیں کیا ہے، اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیا کی فطرت کے خلاف کرتا ہے، اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے، اس آیت کی رُو سے شیطان کی گمراہ کُن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عملِ قومِ لوط، ضبطِ ولادت، رَہبانیت، برہمچرج، مَردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مَردوں کو خواجہ سَرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سُپرد کی ہیں اور انھیں تمدُّن کے اُن شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں، دراصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالقِ کائنات کے ٹھیرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔

۱۴۹ – شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور اُمیدوں کے بل پر چلتا ہے۔ وہ انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جب کسی غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو اس کے آگے ایک سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لُطف و لذّت اور کامیابیوں کی اُمید، کسی کو قومی سربلندیوں کی توقع، کسی کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک

Maktaba Tul Ishaat.com

يُجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ
اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ ع ۱۸ ۱۱ ۱۵

اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریقِ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویّہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے[۱۵۰] اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے[۱۵۱]ع

لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں[۱۵۲]۔ کہو، اللہ تمھیں اُن کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے،

پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسا کہ نہ خدا ہے نہ آخرت، بس مر کر مٹی ہو جانا ہے، کسی کو یہ تسلّی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلو گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے، اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

۱۵۰- یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور خود سری و خود مختاری سے باز آ جانا اس لیے بہترین طریقہ ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رویّہ یہی ہے کہ اس کی بندگی و اطاعت پر راضی ہو جائے اور سرکشی چھوڑ دے۔

وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ

اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سُنائے جارہے ہیں[153] یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلّق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے[154] اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو)[155]، اور وہ احکام جو اُن بچّوں کے متعلّق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔[156] اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے

۱۵۱- یعنی اگر انسان اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا، اللہ کی قدرت اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

۱۵۲- اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملے میں لوگ کیا پُوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے، اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

۱۵۳- یہ اصل اِستفتا کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اِسی سورت کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلّق بالخصوص اور یتیم بچّوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفّظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطورِ خود چھیڑ دیا گیا۔

۱۵۴- اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ''اگر یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں...... '' (سورۂ نساء، آیت ۳)

۱۵۵- تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو'' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''تم ان سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے''۔ حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی، وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مال دار ہونے کے ساتھ خوب صورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصُورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے، تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا
نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ
وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا

وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

[157] جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بد سلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔[158] نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں،[159] لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو

کرنے والا ہو۔

۱۵۶ – اشارہ ہے اُن احکام کی طرف جو اِسی سُورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں یتیموں کے حقوق کے متعلق ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۵۷ – یہاں سے اصل اِستفتا کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہو گئیں: ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مُساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلّقِ زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے، اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبّت رکھے؟ جسمانی تعلّق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے، وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کر لے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہو گا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۱۵۸ – یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مُصالحت کر کے ایک عورت اُسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصّہ گزار چکی ہے۔

۱۵۹ – عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ

فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا أَنْ
تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ

یقین رکھو کہ اللہ تمھارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔[۱۶۰] بیویوں کے درمیان پُورا پُورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اِس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پُورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اَدھر لٹکتا چھوڑ دو۔[۱۶۱] اگر تم اپنا طرزِ عمل دُرست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ

جو عورت دل سے اُتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو، اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حُقوق نا قابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۱۶۰ – یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبۂ فیّاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعُموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اس کی رفیقِ زندگی رہی ہے، اور اس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

۱۶۱ – مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مُساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوب صورت ہے اور دوسری بدصورت، ایک جوان ہے اور دُوسری سِن رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوُت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہوسکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبّت و رغبت اور جسمانی تعلّق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مُساوات رکھی جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اُس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو، تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلّق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے، لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلّق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدُّدِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ "تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے" تو

Maktaba Tul Ishaat.com

غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الۡاَرۡضِ ؕ وَلَقَدۡ وَصَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ
اِيَّاكُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيۡدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاۡتِ بِاٰخَرِيۡنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنۡ

چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۱۶۲]۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دُوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمھاری جگہ دُوسروں کو لے آئے، اور وہ اِس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص

یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ "لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو"، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

۱۶۲ – یعنی اگر حتّی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملے میں صادر ہوں گی، انھیں اللہ معاف فرما دے گا۔

كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿١٣٤﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

محض ثوابِ دُنیا کا طالب ہو، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دُنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔[۱۶۳] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار[۱۶۴] اور خدا واسطے کے گواہ بنو،[۱۶۵] اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر

۱۶۳ – بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد، اور بالخصوص تمدّن و معاشرت کے اُن پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اِس قسم کے چند پُر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو اُن احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اُوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حُسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے، لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں:

ایک یہ کہ تم کبھی اِس بُھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمھارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمھاری اور اس کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالکِ زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمھیں اور تمھاری طرح پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمّتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمھاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی تمام اُمّتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمھاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سر بلند کر دے گا اور تمھارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمھارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ قف
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچّائی سے پہلو بچایا، تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان[۱۶۶] لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل

فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دُنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر اَبدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو، تو خدا یہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمھارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمھاری کھیتی کو اَبد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے، مگر یہ تمھارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلے کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دُنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمھارے حصے میں آئیں۔

آخر میں فرمایا اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی شاہِ بے خبر کی طرح اندھا دُھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پُوری باخبری کے ساتھ اپنی اِس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے ان بخششوں کی اُمید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

۱۶۴ - یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے عَلَم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

۱۶۵ - یعنی تمھاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رُو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا
كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾ ۭ

کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا[۱۶۷] وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دُور نکل گیا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے[۱۶۸]، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی اُن کو راہِ راست دکھائے گا۔

خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمھارے مدِّنظر نہ ہو۔

۱۶۶ — ایمان لانے والوں سے کہنا کہ "ایمان لاؤ" بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہاں لفظ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اُسے سچے دل سے مانے۔ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جُہد کے مَصرف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنٰی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

۱۶۷ — کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرے یہ کہ زبان سے تو مانے مگر دل سے نہ مانے، یا اپنے رویّے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعوٰی کر رہا ہے، فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنٰی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر مُتنبّہ کرنا ہے کہ اسلام کے اِن اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی اِن دونوں اقسام میں سے جس قسم کا برتاؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دُوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۱۶۸ — اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھی، مسلمان ہو گئے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۨ ۝۱۳۸ الَّذِيْنَ
يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝۱۳۹ؕ وَقَدْ
نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا
وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ

اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مُژدہ سُنا دو کہ اُن کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزّت کی طلب میں اُن کے پاس جاتے ہیں؟[169] حالانکہ عزّت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اِس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دُوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انھی کی طرح ہو۔[170] یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور

جب دُوسری لہر اُٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبُودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پُوجا کرنے کے لیے بے تکلّف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے، اور اپنی قوت اس سعی و جُہد میں صَرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلے میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے، جس کا وبال بھی مجرّد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

۱۶۹ – ”عزّت“ کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزّت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنٰی میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزّت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزّت ”ناقابلِ ہتک حرمت“ کا ہم معنٰی ہے۔

وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ
لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ؑ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا

ع ۲۰ ۱۷

کافروں کو جہنّم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلّا بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟[۱۷۱] بس اللہ ہی تمھارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ؏

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کَسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی

۱۷۰ – یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسولؐ کا مذاق اُڑاتے ہوئے سنتا ہے، تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ (جس حکم کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، وہ سورۂ انعام آیت ۶۸ میں بیان ہوا ہے)۔

۱۷۱ – ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں، اُن کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۂ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر

Maktaba Tul Ishaat.com

قَلِيۡلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى
هٰٓؤُلَاۤءِ ‌ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

یاد کرتے ہیں۔[۱۷۲] کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پُورے اِس طرف ہیں نہ پُورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو، اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔[۱۷۳]

ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں، ان کی خاطر یہ کفّار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقے سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی "متعصّب مسلمان" نہیں ہیں، نام کا تعلّق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمھارے ساتھ ہیں، فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی مُوافقت تمھارے ساتھ ہے، اور کفر و اسلام کی کش مکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمھارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

۱۷۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عُذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدمِ دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں، اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نمازِ باجماعت سے غیر حاضر رہنا اُس زمانے میں اِس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جا سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچّے اہلِ ایمان سے ممیّز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ سچّے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

۱۷۳- یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسولؐ کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچّائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اُسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملے کو رزق کی مثال سے سمجھیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے، اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا
مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنّم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو اُن میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں

مگر اللہ ہر شخص کو رزق اُس راستے سے دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستے سے طلب کرے اور اُسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے، اُسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تُلا ہُوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے، اس کو خدا کے اِذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے، اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزقِ حلال لکھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا۔ رہی یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، تو اس کا انحصار سراسر آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچّائی کا طالب ہے اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے، تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا، اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ
بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں[۱۷۴]، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو[۱۷۵] اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے[۱۷۶] اور سب کے حال سے واقف ہے۔

۱۷۴- اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اُسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

۱۷۵- شُکر کے اصل معنیٰ اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رَویّہ اختیار نہ کرو، بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمھیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلے میں صحیح احسان مندانہ رَویّہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔ انھی تین چیزوں کے مجموعے کا نام شکر ہے۔ اور اس شُکر کا اقتضا یہ ہے کہ اوّلاً آدمی احسان کو اُسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصّہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً، آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبّت اور وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو اور اُس کے مخالفوں سے محبّت و اخلاص اور وفاداری کا ذرّہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً، وہ اپنے محسن کا مطیع و فرماں بردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشا کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۱۷۶- اصل میں لفظ ”شَاکِر“ استعمال ہوا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے ”قدر دان“ کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنیٰ ”اعترافِ خدمت“ یا قدر دانی کے ہوں گے، اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے معنیٰ میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے،

الجزء ۶

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ (مظلوم ہونے کی صُورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔[۱۷۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوںؑ سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسُولوںؑ کے

کسی کی خدمات صِلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیّاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں، اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

۱۷۷- اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجے کی اَخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بُت پرست، سب کے سب اُس وقت ہر ممکن طریقے سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اِس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصّے کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اُٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمھارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو، اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اُسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا عَلانیہ، ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور بُرائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اَخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو، اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بُردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصُوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر

Maktaba Tul Ishaat.com

وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع

درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں[۱۷۸] اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیّا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی ـــــ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں، اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں، اُن کو ہم ضرور اُن کے اجر عطا کریں گے،[۱۷۹] اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے[۱۸۰] ع

ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

۱۷۸ – یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوںؑ کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوںؑ کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرّہ برابر شک کی گنجایش نہیں۔

۱۷۹ – یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبُود اور مالک تسلیم کرلیں، اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسُولوںؑ کی پیروی قبول کریں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجے کا عملِ صالح کریں گے اسی درجے کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی لاشریک الٰہیّت ورُبوبیّت ہی تسلیم نہ کی، یا جنھوں نے خدا کے نمایندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو ردّ کرنے کا باغیانہ طرزِ عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

۱۸۰ – یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا، بلکہ ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر سے کام لے گا۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ
سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى

یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر اُن پر نازل کراؤ [۱۸۱] تو اِس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو اِنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اِسی سرکشی کی وجہ سے یکایک اِن پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ [۱۸۲] پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھُلی کھُلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ [۱۸۳] اس پر بھی ہم نے اِن سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰؑ کو

---

۱۸۱ – مدینے کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو، یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اُوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آ جائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

۱۸۲ – یہاں کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے، اِس لیے اُن کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ سورۂ بقرہ، آیت ۵۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۷۱)

۱۸۳ – کھُلی کھُلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مُشاہدے میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سلطنتِ مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا، وہ کوئی گائے کا بچّہ نہ تھا بلکہ اللہ ربّ العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھُکی تو اپنے مُحسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مُورت ہی کے آگے جھُکی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا
لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ
وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ
وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ

صریح فرمان عطا کیا اور اِن لوگوں پر طُور کو اُٹھا کر اِن سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد[۱۸۴] لیا۔ ہم نے اِن کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہوں[۱۸۵]۔ ہم نے اِن سے کہا کہ سَبْت کا قانون نہ توڑو اور اس پر اِن سے پختہ عہد[۱۸۶] لیا۔ آخرکار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جُھٹلایا، اور متعدّد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں[۱۸۷] ــــ حالانکہ[۱۸۸] درحقیقت اِن کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اِن کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان

۱۸۴ - صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہِ طور کے دامن میں بنی اسرائیل کے نمایندوں سے لیا گیا تھا۔ سورۂ بقرہ، آیت ۶۳ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف، آیت ۱۷۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

۱۸۵ - بقرہ، آیت ۵۸، ۵۹ و حاشیہ ۷۵۔

۱۸۶ - بقرہ، آیت ۶۵ و حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

۱۸۷ - یہودیوں کے اس قول کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جُہلا کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصّبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں، ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم اُن سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمھاری کسی

اِلَّا قَلِيۡلًا ۝۱۵۵ وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ۝۱۵۶

لاتے ہیں ـــــــ پھر[189] اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریمؑ پر سخت بہتان لگایا،[190]

بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں، وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۹۴)۔

۱۸۸ - یہ جملۂ معترضہ ہے۔

۱۸۹ - یہ فقرہ اصل سلسلۂ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۰ - حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدایش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مُشتبہ نہ تھا، بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے، اُسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی اخلاقی جُرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آگئے، تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچّے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمھیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّيۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِيَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِيۡ نَبِيًّا۔ ”میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے“ (سورۂ مریم، رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس شبہے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیحؑ کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سنِ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زِنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسٰیؑ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، اُن کے علما و فقہا کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اُس اخلاقی زوال پر مُتنبّہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پُرخطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ! زانیہ ہیں اور عیسٰی ابنِ مریم وَلَدُ الزِّنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہے کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بُوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے، کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسٰی ابنِ مریمؑ، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے[۱۹۱] ــــــ حالانکہ فی الواقع انھوں[۱۹۲] نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔[۱۹۳] اور جن لوگوں نے

راستہ روکنا تھا، نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

۱۹۱ – یعنی جرأتِ مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخر یہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اُوپر ہم نے گہوارے کے واقعے کا جو حوالہ دیا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السّلام کی نبوّت میں شک کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرتِ موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آلِ عمران رکوع ۵ میں گزر چکا ہے)، ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مُشتبہ ہو چکا تھا کہ آنجناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اِس جرم کا ارتکاب اُس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اُسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو اُن کی بُرائیوں پر انھیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تَلْمُود میں لکھا ہے کہ بُخْتِ نَصَّر نے جب بیت المَقْدِس فتح کیا تو وہ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یُہودیوں سے پوچھا: "یہ کیسا نشان ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "یہاں زَکَریّاہ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری بُرائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔" بائبل میں یَرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بداخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یَرمیاہؑ نے ان کو مُتنبِّہ کیا کہ اِن اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کلدانیوں) سے ملا ہوا ہے اور قوم کا غدار ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعۂ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہیرودیس (والیِ ریاستِ یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا
اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ

اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے[۱۹۴]۔ انھوں نے مسیحؑ کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف

اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے، اور پھر والیِ ریاست کی معشوقہ کے مطالبے پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زعم میں مسیحؑ کو سُولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو: ''ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے''۔

۱۹۲- یہ پھر جملۂ معترضہ ہے۔

۱۹۳- یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اُٹھا لیے گئے تھے اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن اور بائبل کے بیانات کا متقابل مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پِیلاطُس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سُنا چکا اور جب یہودیوں نے مسیحؑ جیسے پاک نفس انسان کے مقابلے میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مُہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اُٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا، وہ آپ کی ذاتِ مقدس نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا، جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جُرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلّت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا، اس کو وہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مُشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے، اس لیے مجرّد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس شبہے کی نوعیّت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو صلیب دی ہے، درآں حالے کہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

۱۹۴- اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک مُتّفَق عَلَیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں، جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مُشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلّت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیحؑ ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اُتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَيۡهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا

اُٹھا لیا،[195] اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا

صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اُٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیحؑ کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر اُلوہیّت کی رُوح جو اس میں تھی وہ اُٹھا لی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اُٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

۱۹۵ – یہ اس معاملے کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جَزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُٹھا لینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ اُن کو جسم و رُوح کے ساتھ کُرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی رُوح اٹھائی گئی۔ اس لیے قرآن کی بُنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جا سکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے اندازِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اُٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو، بہرحال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کے جسم و رُوح سمیت اُٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور اُن اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ اُلوہیّتِ مسیحؑ کا قائل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ وہی ”رفع“ (ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اِس واقعے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتابِ مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویّت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السّلام کا اُٹھایا جانا ویسا ہی اُٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دُنیا سے اُٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض دَرجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریسؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ ”یقیناً انھوں نے مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔“

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ ﴿١٥٩﴾

جو اُس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا[۱۹۶] اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا،[۱۹۷]

اللہ نے اُٹھا لیا، تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔ یہ تو صرف کسی ایسے واقعے کے بعد ہی موزوں و مناسب ہوسکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہُور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّیْكَ کا لفظ استعمال کیا ہے (آیت ۵۵)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ ۵۱ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنیٰ میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ رُوح، اور قبضِ رُوح و جسم، دونوں پر دلالت کرسکتا ہے۔ لہٰذا یہ اُن قرائن کو ساقط کردینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیحؑ کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ تَوَفّی کا لفظ قبضِ روح و جسم پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبضِ رُوح و جسم کا واقعہ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنیٰ پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پُوچھنا محض ایک بے معنیٰ بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لُغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفعِ جسمانی کے عقیدے کی صاف تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرائن میں ایک اور قرینے کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدے کو اُلٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل المعنیین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفعِ جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد، یعنی اُلوہیّتِ مسیحؑ کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ پھر رفعِ جسمانی کے اس عقیدے کو مزید تقویت اُن کثیر التعداد احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السّلام کے دوبارہ دُنیا میں آنے اور دجّال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سُورۂ احزاب کے ضمیمے میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کا مرنے کے بعد دوبارہ اس دُنیا میں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، یا زندہ کہیں خدا کی کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا؟

۱۹۶ - اِس فقرے کے دو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنیٰ وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیحؑ پر ایمان نہ لے آئے"۔ اہلِ کتاب سے مراد یہودی ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیحؑ کی طبعی موت جب واقع ہوگی، اس وقت جتنے اہلِ کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہلِ کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیحؑ کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیحؑ پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہوسکتا۔ دونوں معنیٰ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ
لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا
وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ

غرض[۱۹۸] اِن یہودی بن جانے والوں کے اِسی ظالمانہ رَوِیّے کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں[۱۹۹]، اور سُود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا[۲۰۰]، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں[۲۰۱]،

متعدّد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسّرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

۱۹۷ – یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اور اُس پیغام کے ساتھ، جو آپ لائے تھے، جو معاملہ کیا ہے اس پر آپ خداوند تعالیٰ کی عدالت میں گواہی دیں گے۔ اس گواہی کی کچھ تفصیل آگے سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں آنے والی ہے۔

۱۹۸ – جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۱۹۹ – یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ دُنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اُٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بُلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے، اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآں حالے کہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاؑ کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ اِن نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کُھلّم کُھلّا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم وارادہ پر تعمیر کیا گیا، اس کے مُوجد و مُختَرِع اور بانی و سربراہ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانۂ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا استون فرائڈ کا فلسفہ ہے، اور لُطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔

۲۰۰ – توراۃ میں بالفاظِ صریح یہ حکم موجود ہے کہ:

”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو، جو تیرے پاس رہتا ہو، قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اُس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایے کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سُورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا، کیونکہ فقط وہی ایک اُس کا اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے،

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ
فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ

اور جو لوگ اِن میں سے کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۰۲]۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی[۲۰۳]۔ اِس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی

پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا؟ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اُس کی سنوں گا، کیونکہ میں مہربان ہوں۔“ (خُروج، باب ۲۲: ۲۵-۲۷)

اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر توراۃ میں سُود کی حُرمت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی توراۃ کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سُود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۲۰۱ – غالبًا یہ اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو آگے سورۂ انعام آیت ۱۴۶ میں آنے والا ہے۔ یعنی یہ کہ بنی اسرائیل پر تمام وہ جانور حرام کر دیے گئے جن کے ناخن ہوتے ہیں، اور ان پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اشارہ اُن دُوسری پابندیوں اور سختیوں کی طرف بھی ہو جو یہودی فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ کسی گروہ کے لیے دائرۂ زندگی کو تنگ کر دیا جانا فی الواقع اس کے حق میں ایک طرح کی سزا ہی ہے۔ (مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حاشیہ ۱۲۲)

۲۰۲ – یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم ہیں، ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرت ناک سزا ان کو ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی کسی دُوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزّت کا ٹھکانا میسّر نہیں۔ دنیا میں تتر بتّر کر دیے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دَور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خِطّے میں ذلّت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں، اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں، مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دُنیا میں لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کی سزا دی گئی ہے، تاکہ قیامت تک دُنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلے میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت، تو ان شاءاللہ وہاں کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا۔ (اس موقع پر جو شبہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست کے قیام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسے رفع کرنے

Maktaba Tul Ishaat.com

الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
ع ۲۲ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۧ ﴿۱۶۲﴾ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ
اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ
وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ
وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ ۚ

پابندی کرنے والے اور اللہ اور روزِ آخر پر سچّا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ ؏

اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔[۲۰۴] ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سُلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔[۲۰۵]

کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۲)۔

۲۰۳ – یعنی ان میں سے جو لوگ کُتُبِ آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصّب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے، ان کی روش کافر و ظالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاؑ نے دی تھی، اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے، اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲۰۴ – اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل اُن کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاؑ کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

وحی کے معنیٰ ہیں: اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

۲۰۵ – موجودہ بائبل میں زَبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے، وہ ساری کی ساری زبورِ داؤدؑ نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنّفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ

ہم نے اُن رسُولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اِس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسُولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰؑ سے اِس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔[۲۰۶] یہ سارے رسُول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے،[۲۰۷] تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی

تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں، ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اِسی طرح بائبل میں امثالِ سلیمانؑ کے نام سے جو کتاب موجود ہے، اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں، مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصّہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوبؑ کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے، لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود، اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایّوبؑ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتدا میں حضرت ایوبؑ کے جس صبرِ عظیم کی تعریف کی گئی ہے، اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتّٰی کہ ان کے ہم نشین انھیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیائے بنی اسرائیل کے ۱۷ صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصّہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً یَسعیاہ، یَرمیاہ، حِزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی کی رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اَخلاقی تعلیم، ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں پُرزور اِستدلال، اور ان کی بنی اسرائیل کے اَخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیحؑ کی تقریریں اور قرآنِ مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔

۲۰۶ – دُوسرے انبیا علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آرہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سُن رہے ہیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اُس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورۂ طٰہٰ میں نقل کی گئی

Maktaba Tul Ishaat.com

الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ
اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ
يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

حجّت نہ رہے[۲۰۸] اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اُس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور اِس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں، اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اِس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دُوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں، وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔ اِس طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اُتر آئے، اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کوئی راستہ بجز جہنّم کے راستے کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ہے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰؑ کی اِس خُصوصیّت کا ذکر اِسی طرح کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ”اور جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے بات کرتا ہے، ویسے ہی خداوند رُوبرو ہو کر موسیٰؑ سے باتیں کرتا تھا۔“ (خروج ۳۳:۱۱)

۲۰۷- یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رَوِیّے کو اس کے مطابق دُرست کر لیں، انھیں فلاح و سعادت کی خوش خبری سُنا دیں، اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں، ان کو اِس غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

۲۰۸- یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اِتمامِ حجّت کرنا چاہتا تھا، تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اُس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ

لوگو! یہ رسول تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے، ایمان لے آؤ، تمھارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[۲۰۹] اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔[۲۱۰]

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو[۲۱۱] اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسٰی ابنِ مریمؑ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان[۲۱۲] تھا جو اللہ نے مریمؑ کی طرف بھیجا

آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے، جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انھوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انھیں آگاہ نہ کیا۔

۲۰۹ – یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، نقصان جو کچھ ہو گا تمھارا اپنا ہو گا۔

۲۱۰ – یعنی تمھارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

۲۱۱ – یہاں اہلِ کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غُلُوّ کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے گزر جانا۔ یہودیوں کا جرم یہ تھا کہ وہ مسیحؑ کے انکار اور مخالفت میں حد سے گزر گئے، اور عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کی عقیدت اور محبت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ ۡ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا

اور ایک رُوح تھی اللہ کی طرف سے[۲۱۳] (جس نے مریمؑ کے رِحم میں بچّے کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان[۲۱۴] لاؤ اور نہ کہو کہ ''تین'' ہیں[۲۱۵]۔ باز آجاؤ،

حد سے گزر گئے۔

۲۱۲ – اصل میں لفظ ''کلمہ'' استعمال ہوا ہے۔ مریمؑ کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السّلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نُطفے سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدایش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یُونانی فلسفے سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو ''کلام'' یا ''نُطق'' (logos) کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام و نُطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفتِ کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السّلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کی اُلوہیّت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصوّر نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی اَزلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

۲۱۳ – یہاں خود مسیحؑ کو رُوۡحٌ مِّنۡهُ (خدا کی طرف سے ایک رُوح) کہا گیا ہے، اور سُورۂ بَقَرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیحؑ کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی، اور از سرتا پا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غُلُو کیا، رُوۡحٌ مِّنَ اللّٰهِ کو عین روح اللہ قرار دے لیا، اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غُلُوّ تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیلِ مَتّی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ ''فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجّار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابنِ داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے۔'' (باب ۱، آیت ۲۰)

۲۱۴ – یعنی اللہ کو واحد الٰہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو، جن میں سے ایک رسول مسیحؑ بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امرِ حق ہے جسے ایک سچے پَیروِ مسیحؑ کو ماننا چاہیے۔

۲۱۵ – یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو، خواہ وہ کسی شکل میں تمھارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں، ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم

خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ وقف لازم
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٧١﴾ ع

یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔[216] زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی مِلک ہیں،[217] اور ان کی کفالت وخبرگیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔[218] ع

کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصلِ دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظُہور کیا اور رُوح اللہ نے اس میں حُلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کو بھی خداوند عالم کی اُلوہیّت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کرلیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابلِ حل چیستان بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علما اِسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اِسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زور صَرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیحؑ نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غُلوّ نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غُلوّ سے باز آجائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کا تخیُّل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو الٰہِ واحد تسلیم کرلیں، اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں، نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیّت۔

۲۱۶ – یہ عیسائیوں کے چوتھے غُلُوّ کی تردید ہے۔ بائبل کے عہدِ جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلّق کو باپ اور اولاد کے تعلّق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیحؑ ہی کی کوئی خصوصیّت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانے سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پُرانے عہد نامہ میں موجود ہیں۔ مسیحؑ نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیحؑ کو خدا کا اِکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب وغریب نظریّہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیحؑ خدا کا مظہر ہے، اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جَسدی ظُہور ہے، اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اِکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفّارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ
الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

مسیحؑ نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبُّر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لا کر نیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اپنے اجر پُورے پُورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے اُن کو اللہ دردناک سزا دے گا، اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسا رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آگئی ہے

کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیّلات کا آفریدہ ہے اور اُس غُلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متأثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیحؑ خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کی تردید

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ
وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾ یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ
اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ
وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ

اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے، ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

لوگ تم سے[۲۱۹] کلالہ[۲۲۰] کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن[۲۲۱] ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو

کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

۲۱۷ – یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلق ہے۔

۲۱۸ – یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

۲۱۹ – یہ آیت اِس سورہ کے نُزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی، اور سُورۂ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سُورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو اُن آیات کے سلسلے میں شامل نہیں کیا گیا جو احکامِ میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے ضمیمے کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

۲۲۰ – کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کَلالہ وہ شخص ہے جو لا ولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لاوَلَد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ آخر وقت تک اس معاملے میں متردّد رہے۔ لیکن عامۂ فقہا نے حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَ
إِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٧٦﴾ ع ۲۴

بھائی اس کا وارث ہوگا۔[222] اگر میّت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی،[223] اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دُہرا حصّہ ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے، تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہاں کَلالہ کی بہن کو نصف ترکے کا وارث قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اگر کَلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

۲۲۱ – یہاں اُن بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہورہا ہے جو میّت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں، یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبے میں اس معنٰی کی تصریح کی تھی اور صحابہؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مُجمع علیہ مسئلہ ہے۔

۲۲۲ – یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحبِ فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحبِ فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصّہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

۲۲۳ – یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔

تفہیم القرآن

المائدہ

(۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

المائدہ

نام اِس سورہ کا نام پندرھویں رُکوع کی آیت هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کے لفظ ’’مائدہ‘‘ سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی بیشتر سورتوں کے ناموں کی طرح اس نام کو بھی سورت کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ محض دوسری سورتوں سے ممیّز کرنے کے لیے اسے علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورت کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلحِ حُدَیبیہ کے بعد ۶ ہجری کے اواخر یا ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ ۶ ہجری کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکّہ تشریف لے گئے۔ مگر کفّارِ قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپؐ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی رَدّ و کَد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آیندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارتِ کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں، تاکہ آیندہ سال عُمرے کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے، اور دوسری طرف انھیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عُمرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں، اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبُوضات سے گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انھیں زیارتِ کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ یہی تقریب ہے اُس تمہیدی تقریر کی جس سے اس سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلے کو چھیڑا گیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودھویں رُکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مضامین اس سورہ میں ہم کو ملتے ہیں، وہ بھی سب کے سب اسی دَور کے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی خطبے پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہُوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اِس سُورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

شانِ نُزُول سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نُزول سے اِس سورہ کے نُزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیُّر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ اُحُد کے صدمے نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُرخطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آ گیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دوسری طرف حُدودِ شام تک، تیسری طرف ساحلِ بحرِ احمر تک، اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اُحُد میں جو زخم مسلمانوں نے کھایا تھا وہ ان کی ہمتیں توڑنے کے بجائے ان کے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر کر اُٹھے اور تین سال کی مدت میں انھوں نے نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان کی مسلسل جِدّوجُہد اور سرفروشیوں کا ثمرہ یہ تھا کہ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔ مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت مُنڈلاتا رہتا تھا، اس کا ہمیشہ کے لیے اِستیصال ہو گیا اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی یہ تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حُدُود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرۂ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اُصُول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اَخلاق، معاشرت، تمدُّن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیّز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نمازِ باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانینِ دیوانی و فوجداری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پُرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام، اور زِنا و قَذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نِشَست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دُنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدُّن بن چکا ہے، پھر کبھی ان میں آملیں گے۔

صُلحِ حُدَیبیَہ سے پہلے تک مسلمانوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ کفارِ قریش کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک مسلسل کشمکش میں اُلجھے ہوئے تھے اور انھیں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کی مُہلت نہ ملتی تھی۔ اس رکاوٹ کو حُدَیْبِیَہ کی ظاہری شکست اور حقیقی فتح نے دُور کر دیا۔ اس سے ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی ریاست کے حُدُود میں امن میسر آ گیا، بلکہ اتنی مُہلت بھی مل گئی کہ گردو پیش کے علاقوں میں اسلام کی دعوت کو لے کر پھیل جائیں۔ چنانچہ اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، رُوم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے پھیل گئے۔

مَباحِث یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ حسبِ ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدّنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اِس سلسلے میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے گئے، شعائر اللہ کے احترام اور زائرینِ کعبہ سے عَدَمِ تعرّض کا حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کے قطعی حُدُود قائم کیے گئے اور دَورِ جاہلیّت کی خود ساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معیّن کی گئیں، شراب اور جُوئے کو قطعی حرام کر دیا گیا، قسم توڑنے کا کفّارہ مقرر کیا گیا، اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت۔ اب چونکہ مسلمان ایک حکمراں گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی، جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دَور خاتمے پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمایش کے دَور میں وہ قدم رکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رَو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انھوں نے کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو توڑ کر اُس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کے پابند رہیں، اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئی تھیں۔ اس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رَویّے پر مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے اور انھیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز چونکہ صُلحِ حُدَیبِیَہ کی وجہ سے عرب اور متصل مَمالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا، اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غَلَطیاں بتائی گئی ہیں اور انھیں نبی عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمسایہ مَمالک میں سے جو قومیں بُت پرست اور مجوسی تھیں، ان کو براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ اُن کی ہدایت کے لیے وہ خطبات کافی تھے جو اُن کے ہم مسلک مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے مکہ میں نازل ہو چکے تھے۔

۱۲۰ آیاتھا

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

۱۶ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

المنزل ۲

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔[1] تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے[2] سوائے اُن کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو،[3]

۱ - یعنی اُن حُدود اور قیود کی پابندی کرو جو اس سُورہ میں تم پر عائد کی جارہی ہیں، اور جو بالعُموم خدا کی شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔ اس مختصر سے تمہیدی جملے کے بعد ہی اُن بندشوں کا بیان شروع ہوجاتا ہے جن کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

۲ - ”اَنعام“ (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اُونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ اور ”بہیمہ“ کا اِطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ اَنعام تمھارے لیے حلال کیے گئے، تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنھیں عَرَبی میں ”انعام“ کہتے ہیں۔ لیکن حکم اِن الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ”مویشی کی قسم کے چرندہ چوپائے تم پر حلال کیے گئے۔“ اس سے حکم وسیع ہوجاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آجاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں۔ یعنی جو کُچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں، اور دُوسری حیوانی خُصوصیّات میں اَنعامِ عرب سے مُماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارتاً یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وہ چوپایے جو مویشیوں کے برعکس کُچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے اُن پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے کھاتے ہیں یا مُردار خور ہوتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر۔ دوسرے متعدد صحابہؓ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔

۳ - ”احرام“ اُس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں، جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اُتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد ہوتا ہے اور ایک چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہوجاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں، مثلاً حجامت، خوشبو کا

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ

بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔[۴]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حُرمت نہ کرو[۵] ــــــ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹّے پڑے ہوئے ہوں،

استعمال، ہر قسم کی زینت و آرایش اور قضائے شہوت وغیرہ۔ انھی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جان دار کو ہلاک نہ کیا جائے، نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتا دیا جائے۔

۴ – یعنی اللہ حاکمِ مُطلَق ہے، اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بندوں کو اُس کے احکام میں چُون و چَرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مَصلحت پر مبنی ہیں، لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مَصلحت سمجھتا ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے، اور اِسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دُوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے، وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اُصول قائم کرتا ہے کہ اشیا کی حُرمت و حِلّت کے لیے مالک کی اجازت و عَدَمِ اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔

۵ – ہر وہ چیز جو کسی مسلک، یا عقیدے، یا طرزِ فکر و عمل، یا کسی نظام کی نمایندگی کرتی ہو وہ اس کا ”شِعار“ کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکّے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیّت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زنّار اور مندر برَہمنیّت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے۔ سواستیکا آریا نسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے اِن شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شِعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دُشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلّق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنٰی ہے۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ

نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۶۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو۷——اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصّہ

''شعائر اللہ'' سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمایندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں، مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پسِ منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیّل کی آلودگی سے انھیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جُز رکھتا ہے، تو اس جُز کی حد تک مسلمان اس سے مُوافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پُورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دُوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکینِ عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکّے پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصّے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبے کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انھیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں اُن پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصّہ باقی ہے، وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

۶ — ''شعائر اللہ'' کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا، کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصُود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

۷ — احرام بھی مِن جُملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شِعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا
عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا
ربع اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۲ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ
وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ
وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ قف

تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔[8] نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں، ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مُردار،[9] خُون، سُور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو،[10] وہ جو گلا گھُٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو ـــــ سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا[11] ـــــ

۸ – چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبے کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانۂ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں اِس ارادے سے باز رکھا۔

۹ – یعنی وہ جانور جو طبعی موت مر گیا ہو۔

۱۰ – یعنی جس کو ذبح کرتے وقت خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، یا جس کو ذبح کرنے سے پہلے یہ نیت کی گئی ہو کہ یہ فُلاں بزرگ یا فُلاں دیوی یا دیوتا کی نذر ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۱)

۱۱ – یعنی جو جانور مذکورۂ بالا حوادث میں سے کسی حادثے کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثارِ زندگی اس میں پائے جاتے ہوں، اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو اُسے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ''ذبح'' اور ''ذکاۃ'' اسلام کے اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصّہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ

اور وہ جو کسی آستانے[12] پر ذبح کیا گیا ہو۔[13] نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔[14]

گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خُون کا بیشتر حصّہ جسم کے اندر ہی رک کر رہ جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ برعکس اِس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلّق دیر تک باقی رہتا ہے، جس کی وجہ سے رگ رگ کا خُون کھنچ کر باہر آ جاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خُون کے متعلّق ابھی اوپر ہی یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے، لہٰذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جُدا ہو جائے۔

۱۲ – اصل میں لفظ ”نُصُب“ استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مُورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا اِستھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے، یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

۱۳ – اِس مقام پر یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کی جو قیُود شریعت کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں، اُن کی اصل بنیاد اُن اشیا کے طبّی فوائد یا نقصانات نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے اَخلاقی فوائد و نقصانات ہوتے ہیں۔ جہاں تک طبیعی اُمور کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادّی اشیا میں سے کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالح بہم پہنچانے والی ہیں اور کیا چیزیں تغذیے کے لیے غیر مفید یا نقصان دِہ ہیں۔ شریعت اِن اُمور میں اس کی رہنمائی کی ذمّہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمّے لیا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا کو حرام کیا ہوتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہی ہیں کہ قرآن و حدیث میں اُس کا، یا اُن دوسرے مُفرَدات و مُرکّبات کا، جو انسان کے لیے سخت مہلک ہیں، سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملے میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے، وہ دراصل اُس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے، اور کون سی غذائیں طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں، اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتقادی و نظری حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے، اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسّر ہی نہیں ہیں، اور اسی بنا پر انسان نے اکثر اِن اُمور میں غلطیاں کی ہیں، اس لیے شریعت صرف اِنھی اُمور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے، انھیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا بُرا اثر پڑتا ہے، یا وہ طہارت کے خلاف ہیں، یا ان کا تعلّق کسی فاسد عقیدے سے ہے۔ برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کی حِلّت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِن بُرائیوں میں سے کوئی بُرائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیا کی حُرمت کے وجوہ کیوں نہ سمجھائے، تاکہ ہمیں بصیرت حاصل ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے وجوہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات کہ خُون، یا سُور کے گوشت، یا مُردار کے کھانے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رُونما ہوتی ہیں، کس قدر اور کس طرح ہوتی ہیں، اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے، کیونکہ اَخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض اُن کے بُرے اثرات کو بیان کر بھی دیا جاتا تو شبہ کرنے والا تقریباً اُسی مَقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کی صحّت وعَدَمِ صحّت کو آخر کس چیز سے جانچتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حرام وحلال کے حُدُود کی پابندی کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے۔ جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب، اللہ کی کتاب ہے اور رسول، اللہ کا رسول ہے، اور اللہ علیم وحکیم ہے، وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کی پابندی کرے گا، خواہ ان کی مَصلَحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطے میں آگئی ہیں، صرف انھی سے پرہیز کرے، اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہو سکا ہے، ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنا رہے۔

۱۴- اس آیت میں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے، اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے:

(۱) مشرکانہ فال گیری، جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پُوچھا جاتا ہے، یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے، یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ نے اِس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہُبَل دیوتا کے بُت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے اِستھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کُندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتا پُوچھنا ہو، یا خون کے مقدّمے کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو، اس کے لیے ہُبَل کے پانسا دار (صاحب القِداح) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہُبَل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسادار اِن تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا، اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا، اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہُبَل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

(۲) توہُّم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل وفکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی وخیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلۂ علمِ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رَمل، نُجوم، جَفَر، مختلف قسم کے شگون اور نچھتر، اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جُوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حُقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فُلاں شخص کا نام نکل آیا ہے، لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیا اُس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک مُعَمّے کے بہت سے حل صحیح ہیں، مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اُس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ مُعَمّا کے صندوق میں بند ہے۔

اِن تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قُرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حُقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے،

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ

یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے پُوری مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو[15]۔ آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیُود تم پر عائد کر دی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو)[16]۔ البتّہ جو شخص

اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے، اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قُرعہ اندازی پر فیصلے کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں دُرست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قُرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعُموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جب کہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپؐ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔

۱۵- ”آج“ سے مراد کوئی خاص دن اور تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ دَور یا زمانہ مراد ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ ہماری زبان میں بھی آج کا لفظ زمانۂ حال کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

”کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے“، یعنی اب تمھارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع و مزاحم رہے ہیں، اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اِسے مٹا سکیں گے اور تمھیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔ ”لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو“، یعنی اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دراندازی و مزاحمت کا خطرہ تمھارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی۔ اب تمھیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمھارے پاس کوئی ایسا عذر نہ ہوگا جس کی بنا پر تمھارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے۔ اب شریعتِ الٰہی کی خلاف ورزی کے معنٰی یہ نہیں ہوں گے کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو، بلکہ اس کے صاف معنٰی یہ ہوں گے کہ تم خدا کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَہُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ

بُھوک سے مجبُور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھا لے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو، تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[17]

لوگ پُوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے۔ کہو تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔[18]

۱۶- دین کو مکمل کر دینے سے مُراد اُس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمّل نظامِ تہذیب و تمدّن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جُملہ مسائل کا جواب اُصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے مُراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچّا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو، اس لیے میں نے اسے درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمھیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی کا جُوا تمھاری گردنوں پر باقی نہیں رہا۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو، اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبوری تمھیں لاحق نہیں رہی ہے۔ ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ سکوت اختیار فرماتا ہے، مگر اندازِ کلام سے خود بخود یہ بات نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کیے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حُدُود پر قائم رہنے میں تمھاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حَجّۃُ الوداع کے موقع پر ۱۰ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ واقع ہوئی ہے، وہ صُلحِ حُدَیبیہ سے مُتّصل زمانہ (۶ ھ) کا ہے، اور سیاقِ عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدا میں یہ سلسلۂ کلام اِن فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انھیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ میرا قیاس یہ ہے، وَالعِلمُ عِندَاللہ، کہ ابتداءً یہ آیت اِسی سیاقِ کلام میں نازل ہوئی تھی، اس لیے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے۔ بعد میں جب تمام عرب مسخّر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبیؐ پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

۱۷- مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۲۔

۱۸- اس جواب میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ مذہبی طرزِ خیال کے لوگ اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دُنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں، جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر وہمی پن اور قانونیت کا تسلّط ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۖ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ

اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو ــــ جن کو خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو ــــ وہ جس جانور کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو،[19] البتہ اس پر اللہ کا نام

ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنوع تو نہیں۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پُوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انھیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے، تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل اُلٹ گیا۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے، بجز اس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اُصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے، بجز اُس کے جس کی حُرمت کی تصریح کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دُنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حِلّت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دُنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حُرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مُستثنیٰ کر کے ساری دُنیا اس کے لیے حلال ہوگئی۔

حلال کے لیے "پاک" کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس اِباحت کی دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیا کے "پاک" ہونے کا تعیُّن کس طرح ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اُصولِ شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں، یا جن چیزوں سے ذوقِ سلیم کراہت کرے، یا جنھیں مہذّب انسان نے بالعُموم اپنے فطری احساسِ نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

۱۹- شکاری جانوروں سے مراد کُتّے، چیتے، باز، شِکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سدھائے ہوئے جانور کی خُصُوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس کا شکار کرتا ہے اُسے عام درندوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال۔

اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے، خواہ وہ درندہ ہو یا پرندہ، شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہوگا کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا۔ یہی مسلک امام شافعیؒ کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا حتّٰی کہ اگر ایک تہائی حصّہ بھی وہ کھا لے تو بقیّہ دو تہائی حلال ہے، اور اس معاملے میں درندے اور پرندے کے درمیان کچھ فرق نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيۡهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۝۴ اَلۡيَوۡمَ اُحِلَّ لَـكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حِلٌّ لَّـكُمۡ ۖ وَطَعَامُكُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۖ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ

لےلو[20] اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو، اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے[21]۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں

یہ مسلک امام مالکؒ کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھا لیا ہو تو وہ حرام ہوگا، لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے، لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شکاری پرندے کا شکار سرے سے جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ اسے تعلیم سے یہ بات نہیں سکھائی جا سکتی کہ شکار کو خود نہ کھائے بلکہ مالک کے لیے پکڑ رکھے۔

۲۰ – یعنی شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عَدِیؓ بن حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا میں کُتّے کے ذریعے سے شکار کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ ”اگر اس کو چھوڑتے ہوئے تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو نہ کھاؤ، کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا۔“ پھر انھوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کُتّا چھوڑوں اور بعد میں دیکھوں کہ کوئی اور کُتّا وہاں موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا: ”اس شکار کو نہ کھاؤ۔ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کُتّے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کُتّے پر۔“

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے ہوئے خدا کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر شکار زندہ ملے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا، کیونکہ ابتداءً شکاری جانور کو اس پر چھوڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جا چکا تھا۔ یہی حکم تیر کا بھی ہے۔

۲۱ – اہلِ کتاب کے کھانے میں اُن کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے اُن کا اور اُن کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم اُن کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ ”تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر پاکی وطہارت کے اُن قوانین کی پابندی

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ
وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ
حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ ع

یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی،[۲۲] بشرطیکہ تم اُن کے مَہر ادا کر کے نکاح میں اُن کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی رَوِش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا۔[۲۳] ع

نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر اُن کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اَور کا نام لیں، تو اُسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اِسی طرح اگر اُن کے دسترخوان پر شراب، یا سُور، یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اہلِ کتاب کے سوا دُوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہلِ کتاب ہی کا جائز ہے، جب کہ انھوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہلِ کتاب، تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

۲۲ – اِس سے مُراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نکاح کی اجازت صرف انھی کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ وہ مُحصنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابنِ عباسؓ کا خیال ہے کہ یہاں اہلِ کتاب سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔ رہے دار الحرب اور دار الکفر کے یہود و نصاریٰ، تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا دُرست نہیں۔ حنفیّہ اس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیرونی مَمالک کے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں ہے مگر مکرُوہ ضرور ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن المُسیّبؒ اور حسَن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے، لٰہذا ذِمّی اور غیر ذمّی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر مُحصنات کے مفہوم میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد پاک دامن عِصمت مآب عورتیں ہیں، اور اس بنا پر وہ اہلِ کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حسنؒ، شَعبیؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ کی ہے اور حنفیّہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، یعنی اس سے مراد اہلِ کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں۔

۲۳ – اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے بعد یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى
الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ
مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لیے اُٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔[24] اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔[25] اگر بیمار ہو، یا سفر کی حالت میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے، تو پاک مٹی سے کام لو، بس اُس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔[26] اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ

کہ جو شخص اِس اجازت سے فائدہ اُٹھائے، وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مُبتلا ہو کر یا اس کے عقائد اور اعمال سے مُتاثّر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا اَخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

۲۴ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کُلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور کان چونکہ سر کا ایک حصّہ ہیں، اس لیے سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصّوں کا مسح بھی شامل ہے۔ نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں، تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو، وہ خود پہلے پاک ہو جائیں۔

۲۵ – جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادۂ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں غُسل واجب ہے۔ اس حالت میں غُسل کے بغیر نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حواشی ۶۷، ۶۸ و ۶۹)۔

لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦ وَ
اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ
قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ
اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٨ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے[۲۷]، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے[۲۸] اس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھُولو جو اُس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمھارا یہ قول کہ "ہم نے سُنا اور اطاعت قبول کی"۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو[۲۹]۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پُوری طرح باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں،

۲۶– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۶۹ و ۷۰۔

۲۷– جس طرح پاکیزگیِ نفس ایک نعمت ہے، اسی طرح پاکیزگیِ جسم بھی ایک نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جب کہ نفس و جسم دونوں کی طہارت و پاکیزگی کے لیے پُوری ہدایت اسے مل جائے۔

۲۸– یعنی یہ نعمت کہ زندگی کی شاہراہِ مستقیم تمھارے لیے روشن کر دی اور دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے منصب پر تمھیں سرفراز کیا۔

۲۹– مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۶۴ و ۱۶۵۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٩ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝١٠ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ
يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝١١ ع

اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انھیں بڑا اجر ملے گا۔ رہے وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھٹلائیں، تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جب کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا، مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اُٹھنے سے روک دیے۔[30] اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ع

۳۰- اشارہ ہے اس واقعے کی طرف جسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رِوایت کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاص خاص صحابہؓ کو کھانے کی دعوت پر بُلایا تھا اور خفیہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے۔ لیکن عین وقت پر اللہ کے فضل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا اور آپؐ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ چونکہ یہاں سے خطاب کا رُخ بنی اسرائیل کی طرف پھر رہا ہے، اس لیے تمہید کے طور پر اس واقعے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کے دو مقاصد ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رَو اہلِ کتاب چل رہے تھے۔ چنانچہ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل سے اور مسیح علیہ السلام کی اُمّت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہوئے، اُسی طرح تم بھی اُسے توڑ دو اور گمراہ ہو جاؤ۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں کو اُن کی غلطیوں پر مُتنبِّہ کیا جائے اور انھیں دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ
وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب[۳۱] مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ ”میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی، اور زکوٰۃ دی، اور میرے رسولوں کو مانا، اور ان کی مدد کی،[۳۲] اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے،[۳۳] تو یقین رکھو کہ میں تمھاری بُرائیاں تم سے زائل کر دوں[۳۴] گا

۳۱- نقیب کے معنی نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلے سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انھیں بے دینی و بداخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ بائبل کی کتاب گنتی میں بارہ ”سرداروں“ کا ذکر موجود ہے، مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ ”نقیب“ سے قرآن میں بیان کی گئی ہے، بائبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائبل انھیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگرانِ کار کی قرار دیتا ہے۔

۳۲- یعنی جو رسول بھی میری طرف سے آئیں، ان کی دعوت پر اگر تم لبیک کہتے اور ان کی مدد کرتے رہے۔

۳۳- یعنی خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس ایک ایک پائی کو، جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گُنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کو ”قرض“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ ”اچھا قرض“ ہو، یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے، اور خلوص و حُسنِ نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

۳۴- کسی سے اُس کی بُرائیاں زائل کر دینے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ راہِ راست کو اختیار کرنے اور خدا کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا نفس بہت سی بُرائیوں سے، اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیتِ مجموعی کمال کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ بُرائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مؤاخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا، کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اِصلاح قبول کر لی ہو، اس کی جُزوی اور ضمنی بُرائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا

اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اُس نے سَواءُ السَّبِیل[۳۵] گُم کر دی۔" پھر یہ اُن کا

۳۵- یعنی اس نے "سَواءُ السَّبِیل" کو پا کر پھر کھو دیا اور وہ تباہی کے راستوں میں بھٹک نکلا۔ "سَواءُ السَّبِیل" کا ترجمہ "توسُّط و اعتدال کی شاہراہ" کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے پُورا مفہُوم ادا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں اصل لفظ ہی کو جُوں کا تُوں لے لیا ہے۔

اِس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالَمِ اصغر ہے، جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رُجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے، وہ بھی بے حد وحساب پیچیدہ تعلّقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدّن وتہذیب کے نَشو ونُما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدُّن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پُورے عرصۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات ورُجحانات میں توازُن قائم رہے، اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسُب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے، اور مادّی اشیا کو بھی شخصی اور تمدّنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلّط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اِس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازُن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حُدُود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ اُن کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر وہی عمل رُونما

ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہالے جاتا ہے، جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اِس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں، خطِ مُنحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سَمت سے چلتے ہیں اور غلط سَمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سَمت کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔

اِن بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ، اس کے تمام جذبات و رُجحانات کے ساتھ، اس کی رُوح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ، اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی و بامُرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے، اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اُس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف خدا رہنمائی کر سکتا ہے، اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اِس راہِ راست کی طرف انسان کی رہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سَوَاءَ السبیل اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دُنیا کی اِس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا، وہ یہاں راست رَو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے، اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا، وہ یہاں غلط بیں، غلط رَو اور غلط کار ہے، اور آخرت میں لامحالہ اُسے دوزخ میں جانا ہے، کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ کی طرف جاتے ہیں۔

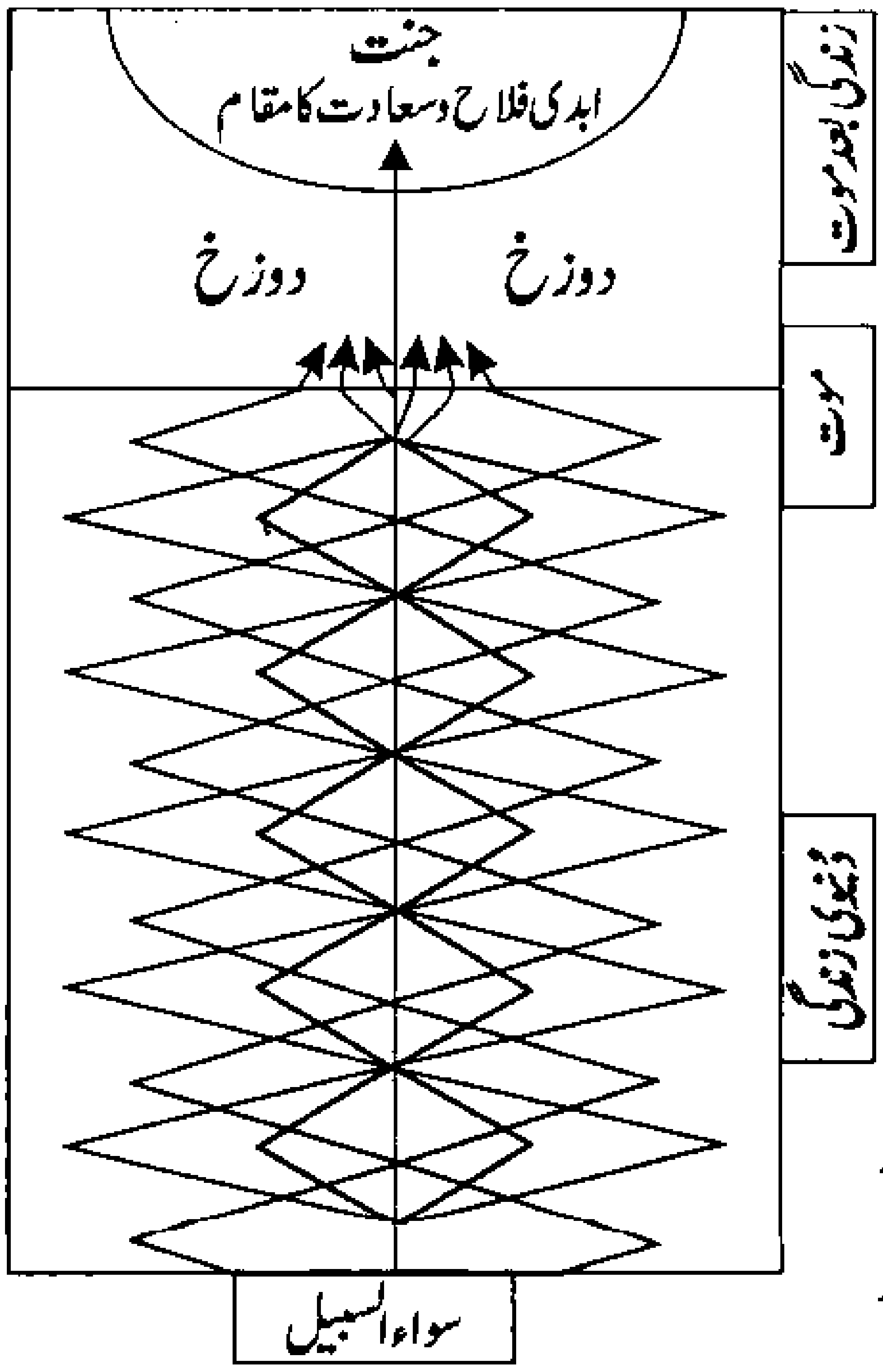

موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے درپے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکّے کھاتی چلی جا رہی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ ’’جَدَلی عمل‘‘ (dialectical process) انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقا کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (thesis) اُسے ایک رُخ پر بہا لے جائے، پھر

Maktaba Tul Ishaat.com

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا
بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انھیں دی گئی تھی، اُس کا بڑا حصّہ بُھول چکے ہیں، اور آئے دن تمھیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ (پس جب یہ اِس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں، وہ ان سے عین متوقع ہیں)

اِس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (antithesis) اُسے دُوسری انتہا کی طرف کھینچے، اور پھر دونوں کے امتزاج (synthesis) سے ارتقائے حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقا کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اُس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سَوَاءَ السَّبِیل سے بہت دُور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دُوسری حقیقتیں، جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی، اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سَمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جُوں جُوں سَوَاءَ السَّبِیل قریب آتی ہے، ان متصادم دعووں کے درمیان مُصالَحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں۔ لیکن جب وہاں نہ سَوَاءَ السَّبِیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھیرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے زور میں اُسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں ایک دوسری بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر اِن کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سَوَاءَ السَّبِیل کو دیکھ لیا ہوتا، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لیے ارتقا کا صحیح راستہ یہی سَوَاءَ السَّبِیل ہے، نہ کہ خطِ مُنحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ
الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا
مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا
مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ

لٰہٰذا انھیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اِسی طرح ہم نے اُن لوگوں سے بھی پُختہ عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم "نصارٰی"[۳٦] ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصّہ اُنھوں نے فراموش کر دیا، آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور آپس کے بُغض وعناد کا بیج بو دیا، اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمھارے پاس آگیا ہے جو کتابِ الٰہی کی بہت سی اُن باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے، اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔[۳۷]

۳٦- لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصارٰی" کا لفظ "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السّلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے، اور اس کی بِنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حَواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مصنّفین کو بالعموم محض ظاہری مُشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیّت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا، اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا، انھی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصارٰی" ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔ (اس مسئلے کی مزید تشریح کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو، جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے[۳۸] اور اپنے اذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ مسیحؑ ابنِ مریم ہی خدا ہے[۳۹]۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ

صفحہ ۵۱۷ پر ضمیمے میں الگ نوٹ درج ہے)۔

۳۷- یعنی تمھاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے، اور بعض سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔

۳۸- ''سلامتی'' سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے، اُسے فکر و عمل کے ہر چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔

۳۹- عیسائیوں نے ابتداءً مسیحؑ کی شخصیّت کو انسانیّت اور اُلوہیّت کا مُرکّب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے لیے مسیحؑ کی حقیقت ایک مُعمّا بن کر رہ گئی، جسے اُن کے علما نے لفّاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی، اُتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ اُن میں سے جس کے ذہن پر اِس مُرکّب شخصیّت کے جُزوِ انسانی نے غلبہ کیا، اس نے مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جُزوِ اُلوہیّت کا اثر زیادہ غالب ہوا، اس نے مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظُہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے مسیحؑ کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی، انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صَرف کر دیا جن سے مسیحؑ کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے، خدا اور مسیحؑ الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ (ملاحظہ ہو: سُورۂ نساء، حاشیہ ۲۱۲، ۲۱۳ و ۲۱۵)

فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ
وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ
مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اگر خدا مسیحؑ ابنِ مریم اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اُس کو اِس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور اُن سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے[۴۰] اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

یہُود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پُوچھو: پھر وہ تمھارے گناہوں پر تمھیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔

۴۰- اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیحؑ کی اعجازی پیدائش اور ان کے اَخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ مسیحؑ ہی خدا ہے، وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیحؑ تو اللہ کے بے شمار عجائبِ تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چُندھیا گئیں۔ اگر اِن لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ پس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ وَ اِلَیْهِ
الْمَصِیْرُ ﴿۱۸﴾ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ
عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ
وَّ لَا نَذِیْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ﴿۱۹﴾ ع وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ ع ۳ ۸
عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ

زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی مِلک ہیں، اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمھارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمھیں دے رہا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدّت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو! اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آ گیا ــــــ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۴۱] ع

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اُس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اُس نے تم میں نبی پیدا کیے، تم کو فرماں روا بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہ دیا تھا[۴۲]۔ اے برادرانِ قوم! اس مقدّس سرزمین میں داخل ہو جاؤ

۴۱ــ اِس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ ولطیف ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا پہلے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر تھا، اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر ونذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو کہ اللہ قادر وتوانا ہے۔ ہر سزا جو وہ تمھیں دینا چاہے بلا مُزاحمت دے سکتا ہے۔

۴۲ــ یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس عظمتِ گزشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کسی

الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِیْنَ ۲۱ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖۗ وَ اِنَّا لَنْ
نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا
دٰخِلُوْنَ ۲۲ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا

جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے،[۴۳] پیچھے نہ ہٹو، ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔"[۴۴] اُنھوں نے جواب دیا: "اے موسیٰؑ! وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔" اُن ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے[۴۵] جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ

زمانے میں اُن کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اُن کی قوم میں پیدا ہوئے، اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور اُن کے بعد مصر میں اُن کو بڑا اقتدار نصیب ہُوا۔ مدّتِ دراز تک یہی اس زمانے کی مہذّب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے اور انھی کا سکّہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عمُوماً لوگ بنی اسرائیل کے عُروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں، لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عُروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا، جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

۴۳ – اِس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مَسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کرلو۔

۴۴ – حضرت موسیٰؑ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جب کہ مصر سے نکلنے کے تقریباً دو سال بعد آپ اپنی قوم کو لیے ہوئے دشتِ فاران میں خیمہ زن تھے۔ یہ بیابان جزیرہ نمائے سینا میں عرب کی شِمالی اور فلسطین کی جُنوبی سرحد سے متصل واقع ہے۔

۴۵ – قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو لوگ جبّاروں سے ڈر رہے تھے، اُن کے درمیان سے دو شخص بول اُٹھے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ خدا سے ڈرنے والے تھے، ان میں سے دو شخصوں نے یہ بات کہی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَى
اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا
لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ
وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ

”اِن جبّاروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گُھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسا رکھو اگر تم مومن ہو۔“ لیکن اُنھوں نے پھر یہی کہا کہ ”اے موسیٰؑ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس پر موسیٰؑ نے کہا: ”اے میرے رب! میرے اختیار میں کوئی نہیں، مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں اِن نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔“ اللہ نے جواب دیا: ”اچھا تو وہ مُلک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے،[۴٦]

۴٦- اِس قصّے کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی، اِستثنا اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشتِ فاران سے بنی اسرائیل کے ۱۲ سرداروں کو فلسطین کا دَورہ کرنے کے لیے بھیجا، تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دَورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انھوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دُودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، ”لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں...... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں...... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد آور ہیں، اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبّار ہیں اور جبّاروں کی نسل سے ہیں، اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹِڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔“ یہ بیان سُن کر سارا مجمع چیخ اُٹھا کہ ”اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اِس بیابان ہی میں مرتے! خداوند! کیوں ہم کو اُس مُلک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لُوٹ کا مال ٹھیریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہو گا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔“ پھر وہ آپس میں کہنے لگے

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ ع وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ
ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وقف لازم
وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا
يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٧﴾ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ

اِن نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔[47]؏

اور ذرا انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصّہ بھی بے کم و کاست سُنا دو۔ جب اُن دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دُوسرے کی نہ کی گئی۔ اُس نے کہا: ”مَیں تجھے مار ڈالوں گا۔“ اس نے جواب دیا: ”اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔[48] اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے

کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اِس پر اُن بارہ سرداروں میں سے، جو فلسطین کے دَورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار، یُوشَع اور کالِب اُٹھے اور انھوں نے اِس بُزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالِب نے کہا: ”چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرُّف کریں۔“ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا: ”اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا...... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو...... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو ان کا خوف نہ کرو۔“ مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ ”انھیں سنگسار کر دو۔“ آخر کار اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یُوشَع اور کالِب کے سوا اس قوم کے بالغ مَردوں میں سے کوئی بھی اُس سرزمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ قوم چالیس برس تک بے خانماں پھرتی رہے گی، یہاں تک کہ جب ان میں سے ٢٠ برس سے لے کر اُوپر کی عمر تک کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اُٹھے گی، تب انھیں فلسطین فتح کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلۂ خداوندی کے مطابق بنی اسرائیل کو دشتِ فاران سے شرقِ اُردُن تک پہنچتے پہنچتے پورے ٣٨ برس لگ گئے۔ اِس دَوران میں وہ سب لوگ مرکھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے۔ شرقِ اُردُن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یُوشَع بن نُون کے عہدِ خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کرسکیں۔

۴٧ - یہاں اس واقعے کا حوالہ دینے کی غرض سلسلۂ بیان پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ قصے کے پیرایے میں دراصل بنی اسرائیل کو یہ جتانا مقصود ہے کہ موسیٰؑ کے زمانے میں نافرمانی، انحراف اور پست ہمّتی سے کام لے کر جو سزا تم نے پائی تھی، اب اس سے بہت زیادہ سخت سزا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کر کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ۚ فَطَوَّعَتْ
لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾

ہاتھ اُٹھائے گا تو مَیں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا،[۴۹] مَیں اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تُو ہی سمیٹ لے[۵۰] اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔'' آخرکار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

پاؤ گے۔

۴۸- یعنی تیری قربانی اگر قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قصُور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، لہٰذا میری جان لینے کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

۴۹- اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مُدافعت نہ کروں گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا۔ تو میرے قتل کی تدبیر میں لگنا چاہے تو تجھے اختیار ہے، لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تو میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ کوشش نہ کروں گا کہ پہلے مَیں ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملے کی مُدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہُوا ہے، تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اُس کی طرف سے ہو، نہ کہ میری طرف سے۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السّلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔

۵۰- یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قتل کی سعی میں ہم دونوں گناہ گار ہوں، میں اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دونوں کا گناہ تنہا تیرے ہی حصّے میں آ جائے، تیرے اپنے قاتلانہ اقدام کا گناہ بھی، اور اس نقصان کا گناہ بھی جو اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہاتھ سے تجھے پہنچ جائے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ
سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا
معانقۃ ۵ الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿٣١﴾ ۚۛ مِنْ
اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھُپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: ”افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھُپانے کی تدبیر نکال لیتا۔[۵۱]“ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔[۵۲]
اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا[۵۳] کہ ”جس نے کسی انسان کو خون کے

۵۱ – اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے سے آدمؑ کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر مُتنبّہ کیا، اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجّہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوّے سے پیچھے کیوں رہ گیا، بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ کہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

۵۲ – یہاں اس واقعے کا ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کو ان کی اُس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہؓ کو قتل کرنے کے لیے کی تھی (ملاحظہ ہو اِسی سورت کا حاشیہ ۳۰)۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے اِن اُمّیوں کو قبولیّت کا درجہ عطا فرمایا اور اُن پُرانے اہلِ کتاب کو رد کر دیا، سراسر اس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف تقویٰ تھا اور دوسری طرف تقویٰ نہ تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جنھیں رد کیا گیا تھا، اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اُس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ رَد کیے گئے تھے، ان پر ٹھیک اُسی جاہلیّت کا دَورہ پڑ گیا جس میں آدمؑ کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا، اور اُسی کی طرح وہ ان لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے جنھیں خدا نے قُبولیّت عطا فرمائی تھی۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ ایسی جاہلانہ حرکتوں سے وہ خدا کے مقبول نہ ہو سکتے تھے، بلکہ یہ کرتوت انھیں اور زیادہ مردود بنا دینے والے تھے۔

۵۳ – یعنی چونکہ بنی اسرائیل کے اندر اُنھی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدمؑ کے اس ظالم بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتلِ نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے

Maktaba Tul Ishaat.com

نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًاؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا
فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًاؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ٘
ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا
جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ

بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔[54]" مگر اُن کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسُول پے در پے ان کے پاس کھُلی کھُلی ہدایات لے کر آئے، پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دَو کرتے پھرتے

تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائبل پائی جاتی ہے وہ فرمانِ خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ البتہ تَلْمُود میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، کتاب اللہ کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کیا، اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔" اسی طرح تَلْمُود میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ قتل کے مقدّمات میں بنی اسرائیل کے قاضی گواہوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے کہ "جو شخص ایک انسان کی جان ہلاک کرتا ہے، وہ ایسی باز پُرس کا مستحق ہے کہ گویا اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو قتل کیا ہے۔"

۵۴ – مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفّظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے، وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے، وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔

فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ
وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ
خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

ہیں کہ فساد برپا کریں،[۵۵] اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سُولی پر چڑھائے جائیں، یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔[۵۶] یہ ذلّت و رسوائی تو اُن کے لیے دُنیا میں ہے اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ —— تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

---

۵۵ – زمین سے مراد یہاں وہ مُلک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمّہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے مُلک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی کے لیے اس نے اپنا رسول بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اُس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں، نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو اُلٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے، دراصل وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرے ”بادشاہ کے خلاف لڑائی“ (waging war against the king) کا مجرم قرار دیا گیا، چاہے اس کی کارروائی مُلک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دست رس سے کتنا ہی دُور ہو۔

۵۶ – یہ مختلف سزائیں بر سبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں، تاکہ قاضی یا امامِ وقت اپنے اجتہاد سے ہر مُجرم کو اس کے جرم کی نوعیّت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اُلٹنے کی کوشش کرنا بدترین جُرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۸

اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۴﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِهٖ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۵﴾

اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۵۷] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اُس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو[۵۸] اور اس کی راہ میں جِدّ و جُہد کرو،[۵۹] شاید کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو جائے۔

۵۷ – یعنی اگر وہ سعیِ فساد سے باز آ گئے ہوں، اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا اُلٹنے کی کوشش چھوڑ چکے ہوں، اور اُن کا بعد کا طرزِ عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند، مطیعِ قانون، اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں، اور اس کے بعد اُن کے سابق جرائم کا پتا چلے، تو اُن سزاؤں میں سے کوئی سزا اُن کو نہ دی جائے گی جو اُوپر بیان ہوئی ہیں۔ البتہ آدمیوں کے حُقوق پر اگر کوئی دست درازی انھوں نے کی تھی تو اس کی ذمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی انسان کو انھوں نے قتل کیا تھا، یا کسی کا مال لیا تھا، یا کوئی اور جُرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا، تو اسی جرم کے بارے میں فوجداری مقدّمہ ان پر قائم کیا جائے گا، لیکن بغاوت اور غدّاری اور خدا و رسول کے خلاف مُحارَبہ کا کوئی مقدّمہ نہ چلایا جائے گا۔

۵۸ – یعنی ہر اُس ذریعے کے طالب اور جویاں رہو جس سے تم اللہ کا تقرّب حاصل کر سکو اور اس کی رضا کو پہنچ سکو۔

۵۹ – اصل میں لفظ جَاھِدُوْا استعمال فرمایا گیا ہے، جس کا مفہوم محض ’’جِدّو جُہد‘‘ سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلے کا مُقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں، جو تم کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پُوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمھیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام اِمکانی طاقتوں سے کشمکش اور جِدّو جُہد کرو۔ اسی جد و جہد پر تمھاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمھارے تقرب کا انحصار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندۂ مومن کو ہر محاذ پر چَو مُکھی لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف ابلیسِ لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے۔ دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں۔ تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدّنی اور مَعاشی تعلّقات میں بندھا ہوا ہے۔ چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں اور بندگیِ حق کے بجائے بندگیِ باطل پر انسان کو مجبُور کرتے ہیں۔ ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں۔ بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا اور تقربِ خداوندی کے مقام تک اس کے عُروج کا انحصار بالکُلیّہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصتاً اس کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اِس کے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ
مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا

خُوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا ہے، اگر اُن کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اَور اس کے ساتھ، اور وہ چاہیں کہ اسے فدیے میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انھیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں، مگر نہ نکل سکیں گے اور انھیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو،[٦٠] یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے

ممکن نہیں ہے کہ وہ اِن تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو، ہر وقت ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رُکاوٹوں کو پامال کرتا ہُوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔

٦٠ – دونوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک ہاتھ۔ اور اُمّت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ پہلی چوری پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ لا قطع علی خائنٍ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سَرقے کا اطلاق خیانت وغیرہ پر نہیں ہوتا، بلکہ صرف اِس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ایک ڈھال کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بروایتِ عبداللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایتِ ابنِ عمرؓ تین درہم، بروایتِ انسؓ بن مالک ۵ دِرہم، اور بروایتِ حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔ اسی اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصابِ سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سرقے کا نصاب دس درہم ہے، اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک چوتھائی دینار۔ (اُس زمانے کے درہم میں تین ماشہ $1\frac{1}{5}$ رتی چاندی ہوتی تھی، اور ایک چوتھائی دینار ۳ دِرہم کے برابر تھا)۔

Maktaba Tul Ishaat.com

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ
ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظرِ عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی،[61] اللہ بہت درگزر کرنے والا

پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ لا قطع فی ثمرة ولا کثر (پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا)۔ لا قطع فی طعام (کھانے کی چوری میں قطعِ ید نہیں ہے)۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ لم یکن قطع السارق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الشیء التافہ (حقیر چیزوں کی چوری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا)۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا فیصلہ ہے اور صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے کہ لا قطع فی الطّیر (پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے)۔ نیز سیّدنا عُمر و علی رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اور اس معاملے میں بھی صحابۂ کرامؓ میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ اِن مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمۂ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطعِ ید کے حکم سے مستثنٰی قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلّہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطعِ ید کی سزا نہیں ہے۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی وہ قطعِ ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنٰی قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ اِن چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

٦١ – اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کر لے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کر کے اللہ کا صالح بندہ بن جائے، وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا، اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھو دے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا، تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی، اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اِسی لیے قرآنِ مجید چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظامِ تمدّن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رُجوع اِلی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں مذکور ہے کہ ایک چور کا ہاتھ جب آپؐ کے حکم کے مطابق کاٹا جا چکا تو آپؐ نے اُسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا: قل استغفر اللہ

رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ

اور رحم فرمانے والا ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اے پیغمبرؐ! تمھارے لیے باعثِ رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں۔[٦٢]

واتوب الیہ، ''کہہ، میں خدا سے معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔'' اُس نے آپؐ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے۔ پھر آپؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ ''خدایا! اسے معاف فرما دے۔''

٦٢ – یعنی جن کی ذہانتیں اور سرگرمیاں ساری کی ساری اس کوشش میں صَرف ہو رہی ہیں کہ جاہلیّت کی جو حالت پہلے سے چلی آ رہی ہے وہی برقرار رہے اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اُس بگاڑ کو دُرست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی رکیک سے رکیک چالیں چل رہے تھے۔ جان بُوجھ کر حق نِگل رہے تھے۔ نہایت بے باکی و جسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اُس پاک انسان کے کام کو شکست دینے کی کوشش کر رہے تھے جو کامل بے غرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بنا پر عام انسانوں کی اور خود اُن کی فلاح و بہبود کے لیے شب و روز محنت کر رہا تھا۔ اُن کی اِن حرکات کو دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کُڑھتا تھا، اور یہ کُڑھنا بالکل فطری امر تھا۔ جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ محض اپنی جہالت اور خود غرضی و تنگ نظری کی بنا پر اس کی خیر خواہانہ مساعی کو روکنے کے لیے گھٹیا درجے کی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں تو فطرتاً اُس کا دل دُکھتا ہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ نہیں ہے کہ اِن حرکات پر جو فطری رنج آپؐ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ منشا دراصل یہ ہے کہ اس سے آپؐ دل شکستہ نہ ہوں، ہمّت نہ ہاریں، صبر کے ساتھ بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کیے چلے جائیں۔ رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انھوں نے اپنے اندر پرورش کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز اِن کی اس روش میں خلافِ توقع نہیں ہے۔

Maktaba-Tul-Ishaat.com

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ
الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ
يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ
اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ

مع ۳ الوقف علی الاول اجوز ١٢

خواہ وہ اُن میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل اُن کے ایمان نہیں لائے، یا اُن میں سے ہوں جو یہودی بن گئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لیے کان لگاتے ہیں[٦٣]، اور دُوسرے لوگوں کی خاطر، جو تمھارے پاس کبھی نہیں آئے، سُن گُن لیتے پھرتے ہیں[٦٤]، کتاب اللہ کے الفاظ کو اُن کا صحیح محل متعیّن ہونے کے باوجود اصل معنیٰ سے پھیرتے ہیں[٦٥]، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو[٦٦]۔ جسے اللہ ہی نے فتنے میں

٦٣ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ لوگ چونکہ خواہشات کے بندے بن گئے ہیں، اس لیے سچّائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جھُوٹ ہی انھیں پسند آتا ہے اور اسی کو یہ جی لگا کر سُنتے ہیں، کیونکہ ان کے نفس کی پیاس اُسی سے بُجھتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں یہ جھُوٹ کی غرض سے آکر بیٹھتے ہیں، تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور جو باتیں سُنیں، اُن کو اُلٹے معنیٰ پہنا کر یا ان کے ساتھ اپنی طرف سے غلط باتوں کی آمیزش کر کے آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے لوگوں میں پھیلائیں۔

٦٤ – اس کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں اس لیے گشت لگاتے پھرتے ہیں کہ کوئی راز کی بات کان میں پڑے تو اسے آپؐ کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے مواد فراہم کرتے پھرتے ہیں، تاکہ اُن لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہِ راست تعلّقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

٦٥ – یعنی تورات کے جو احکام ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں، ان کے اندر جان بُوجھ کر ردّ و بدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنیٰ بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں۔

٦٦ – یعنی جاہل عوام سے کہتے ہیں کہ جو حکم ہم بتا رہے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی حکم تمھیں بتائیں تو اسے قبول کرنا ورنہ رد کر دینا۔

فِتۡنَتَهٗ فَلَنۡ تَمۡلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَمۡ
يُرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يُّطَهِّرَ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ ۖۚ وَّلَهُمۡ
فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ اَكّٰلُوۡنَ
لِلسُّحۡتِ ؕ فَاِنۡ جَآءُوۡكَ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ ۚ

ڈالنے کا ارادہ کرلیا ہو، اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لیے تم کچھ نہیں کرسکتے[۶۷]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا[۶۸]، ان کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھوٹ سُننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں[۶۹]، لہٰذا اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدّمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو، ورنہ انکار کردو۔

---

۶۷ - اللہ کی طرف سے کسی کے فتنے میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ کسی قسم کے بُرے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے، اس کے سامنے پے درپے ایسے مواقع لاتا ہے جن میں اس کی سخت آزمایش ہوتی ہے۔ اگر وہ شخص ابھی بُرائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمایشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں موجود ہوتی ہیں وہ اُبھر آتی ہیں۔ لیکن اگر وہ بُرائی کی طرف پُوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی سے اندر ہی اندر شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمایش کے موقع پر وہ اور زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی بگڑتے ہوئے انسان کو بچالینا اس کے کسی خیر خواہ کے بس میں نہیں ہوتا۔ اور اس فتنے میں صرف افراد ہی نہیں ڈالے جاتے بلکہ قومیں بھی ڈالی جاتی ہیں۔

۶۸ - اس لیے کہ انھوں نے خود پاک ہونا نہ چاہا۔ جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے، اُسے پاکیزگی سے محروم کرنا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ اللہ پاک کرنا اُسی کو نہیں چاہتا جو خود پاک ہونا نہیں چاہتا۔

۶۹ - یہاں خاص طور پر اُن کے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھوٹی شہادتیں لے کر اور جھوٹی روداد یں سُن کر اُن لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی یا جن کے ساتھ ان کے ناجائز مفاد وابستہ ہوتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾
وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ
ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

انکار کر دو تو یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو، کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔۷۰ ـــــ اور یہ تمھیں کیسے حَکَم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہُوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟۷۱ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ع

۷۰ ـ یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلّقات مُعاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رُو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور ان کے مقدّمات کے فیصلے انھی کے قوانین کے مطابق اُن کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپؐ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدّمات لانے کے لیے وہ ازرُوئے قانون مجبور نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا نہ چاہتے تھے، اُن کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس اُمید پر آجاتے تھے کہ شاید آپؐ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہاں خاص طور پر جس مقدّمے کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزّز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلّق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (اِستثنا، باب ۲۲، آیت ۲۳ - ۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدّمے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کرلیا جائے، اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدّمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا: تمھارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا: کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپؐ نے ان کے علما کو قسم دے کر اُن سے پوچھا: کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابنِ صوریا، جو خود یہودیوں کے بیان

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی، جو مُسلم تھے، اُسی کے مطابق اِن یہودی بن جانے والوں[٧٢] کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے، اور اِسی طرح ربّانی اور اَحبار[٧٣] بھی (اسی پر فیصلے کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمّہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر

کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپؐ نے اُس سے مُخاطَب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طُور پر تمھیں شریعت عطا کی، کیا واقعی تورات میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”اگر آپؐ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے، مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حُکّام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔“ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

٧١ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کی بد دیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ ”مذہبی لوگ“ جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دین داری اور اپنے علمِ کتاب کا سِکّہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدّعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدّمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدّت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے، دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے، جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے، اور جسے معاذ اللہ! جھوٹا مدّعیِ نبوت کہتے ہیں، اس کے پاس صرف اس اُمید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔

٧٢ – یہاں ضمناً اس حقیقت پر بھی مُتنبّہ کر دیا گیا کہ انبیاؑ سب کے سب ”مسلم“ تھے، بخلاف اس کے یہ یہودی ”اِسلام“ سے ہٹ کر اور فرقہ بندی میں مبتلا ہو کر صرف ”یہودی“ بن کر رہ گئے تھے۔

٧٣ – ربّانی: عُلما۔ اَحبار: فُقہا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ
الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ
قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ

گواہ تھے۔ پس (اے گروہِ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔[۷۴] پھر جو قِصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفّارہ[۷۵] ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں

---

۷۴ – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: تورات کی کتابِ خُروج، باب ۲۱، آیت ۲۳-۲۵۔

۷۵ – یعنی جو شخص صدقہ کی نیت سے قِصاص معاف کر دے اس کے حق میں یہ نیکی اس کے بہت سے گناہوں کا کفّارہ ہو جائے گی۔ اسی معنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ من جرح فی جسدہ جراحۃ فتصدق بھا کفر عنہ ذنوبہ بمثل ما تصدق بہ– یعنی جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا، تو جس درجے کی

هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى
وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ؕ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اُس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

۷۶ – یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے انبیاؑ کا دین تھا، مسیحؑ کا دین بھی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیحؑ خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی (ملاحظہ ہو: متی، باب ۵، آیت ۱۷-۱۸)۔ قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاؑ دنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاؑ کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاؑ کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کو فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثے کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی، بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدق تھی۔

۷۷ – یہاں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے: اولاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا

پھر اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور ”الکتاب“ میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے[۷۸] والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے[۷۹]۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق

ازحکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو، وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے دَرَجات و مراتب میں فرق ہے، اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکمِ الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے، وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکمِ الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملّت تو نہیں ہے، مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فِسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اِسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکمِ الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے، وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے، اس کی زندگی میں ایمان و اسلام اور کفر و ظلم و فسق کی آمیزش ٹھیک اسی تناسُب کے ساتھ ہے جس تناسُب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے ان آیات کو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر کلامِ الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجایش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حُذَیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو، وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حُذَیفہؓ نے فرمایا: نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلّا واللّٰہ لتسلکن طریقھم قدر الشراك۔ ”کتنے اچھے بھائی ہیں تمھارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب اُن کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم! تم انھی کے طریقے پر قدم بقدم چلو گے۔“

۷۸ – یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ ”پچھلی کتابوں“ میں سے جو کچھ اپنی اصلی اور صحیح صورت پر باقی ہے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ”پچھلی کتابوں“ کے بجائے ”الکتاب“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں۔

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ

تمھارے پاس آیا ہے، اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ـــــ ہم[80] نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرّر کی۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اُس نے یہ اِس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے،

ایک ہی ان کا مصنّف ہے، ایک ہی ان کا مدّعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے، اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے، جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں، مؤیِّد ہیں، تردید کرنے والی نہیں، تصدیق کرنے والی ہیں، بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ''الکتاب'' کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

۷۹ – اصل میں لفظ ''مُھَیْمِنْ'' استعمال ہوا ہے۔ عربی میں ھیمن یھیمن ھیمنۃ کے معنٰی مُحافَظت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ ھیمن الرجل الشیٔ، یعنی آدمی نے فُلاں چیز کی حفاظت و نگہبانی کی۔ ھیمن الطائر علی فراخہٖ، یعنی پرندے نے اپنے چُوزے کو اپنے پَروں میں لے کر محفوظ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا: انی داعٍ فھیمنوا، یعنی میں دعا کرتا ہوں، تم تائید میں آمین کہو۔ اسی سے لفظ ھمیان ہے، جسے اُردو میں ہمیانی کہتے ہیں، یعنی وہ تھیلی جس میں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو ''الکِتٰب'' پر مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کُتُبِ آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے، اس معنٰی میں کہ اب ان کی تعلیماتِ برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کا مؤیِّد ہے، اس معنٰی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے، قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے، اس معنٰی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے، قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام۔

۸۰ – یہ ایک جملۂ معترضہ ہے، جس سے مقصود ایک سوال کی توضیح کرنا ہے جو اُوپر کے سلسلۂ تقریر کو سُنتے ہوئے مخاطب کے ذہن میں اُلجھن پیدا کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام انبیاؑ اور تمام کتابوں کا دین ایک ہے، اور یہ سب ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے آئے ہیں، تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ عبادت کی صُورتوں میں، حرام اور حلال کی قُیود میں اور قوانینِ تمدّن و معاشرت کے فُروع میں مختلف انبیاؑ اور

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸ۙ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ

اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو[81] ــــ پس[82] اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق

کُتُبِ آسمانی کی شریعتوں کے درمیان تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے؟

۸۱ – یہ مذکورۂ بالا سوال کا پُورا جواب ہے۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے:

(۱) محض اختلافِ شرائع کو اس بات کی دلیل قرار دینا غلط ہے کہ یہ شریعتیں مختلف مآخذ سے ماخوذ اور مختلف سرچشموں سے نکلی ہوئی ہیں۔ دراصل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف قوموں کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے مقرر فرمائے۔

(۲) بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک اُمت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاؑ کی شریعتوں کے درمیان رکھا، اُس کے اندر دوسری بہت سی مَصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مَصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقے سے لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگ اصل دین اور اس کی رُوح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں، اور دین میں اِن ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں، اور کسی تعصّب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو، جس صُورت میں بھی وہ آئے گا، پہچان لیں گے اور قُبول کر لیں گے۔ اُن کو اللہ کے بھیجے ہوئے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تأمّل نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے جو لوگ رُوحِ دین سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، اور جنھوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصّب اختیار کر لیا ہے، وہ ہر اُس ہدایت کو رَدّ کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔

(۳) تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو پانا ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکم خدا ہو، اُس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں، ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے فُروق پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اُس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو۔

(۴) جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصّب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی اُپج سے خود پیدا کر لیے ہیں، ان کا آخری فیصلہ نہ مجلسِ مناظرہ میں ہو سکتا ہے، نہ میدانِ جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جب کہ حقیقت بے نقاب

بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ
يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا
فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ
وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ
يَبۡغُوۡنَ‌ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾ ع

اِن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اُس ہدایت سے ذرّہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اِن کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کرلیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیّت[۸۳] کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ع

کردی جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں وہ عمریں کھپا کر دُنیا سے آئے ہیں اُن کی تہ میں ”حق“ کا جوہر کتنا تھا اور باطل کے حاشیے کس قدر۔

۸۲ – یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر چل پڑتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۸۳ – جاہلیّت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے، کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیّت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانۂ قبلِ اسلام کو جاہلیّت کا دَور اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں علم کے بغیر محض وہم، یا قیاس و گمان، یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرزِ عمل جہاں جس دَور میں بھی انسان اختیار کریں، اسے بہر حال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ محض ایک جُزوی علم ہے اور کسی معنیٰ میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظامِ زندگی اِس جُزوی علم کے ساتھ ظُنون و اَوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کر کے بنا لیے گئے ہیں، وہ بھی اُسی طرح ”جاہلیّت“ کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اِس

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ
وقف غفران بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ
تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دُوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نِفاق کی بیماری ہے، وہ انُھی میں دَوڑ دُھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں: "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکّر میں نہ پھنس جائیں[٨٤]۔" مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمھیں فیصلہ کُن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات

تعریف میں آتے تھے۔

٨٤ – اُس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کشمکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیرووں کی سرفروشیوں کے سبب سے ایک طاقت بن چکا تھا، لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا، ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا۔ اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے، وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھنا چاہتے تھے، تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ علاوہ بریں اُس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی مَعاشی قوت سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارا بیشتر انھی کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز و شاداب خطّے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سُود خواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا مَعاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلّقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کشمکش میں ہمہ تن منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرِ پیکار ہے، تو یہ فعل سیاسی اور مَعاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔

عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ؕ
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ
اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ الربع
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِی
اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ

ظاہر کرے[۸۵] گا تو یہ لوگ اپنے اِس نفاق پر، جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہوں گے۔ اور اُس وقت اہلِ ایمان کہیں گے: "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں؟" ——— ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامُراد ہو کر رہے[۸۶]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اَور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہو گا، جو مومنوں پر نرم اور کفّار پر سخت ہوں[۸۷] گے، جو اللہ کی راہ میں جِدّوجُہد کریں گے اور

۸۵ – یعنی فیصلہ کُن فتح سے کم تر درجے کی کوئی ایسی چیز جس سے عُموماً لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ ہار جیت کا آخری فیصلہ اسلام ہی کے حق میں ہو گا۔

۸۶ – یعنی جو کچھ انھوں نے اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے، قوانینِ اسلام کی اطاعت کی، یہ سب کچھ اس بنا پر ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا اور وہ سب سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو کر نہ رہ گئے تھے، بلکہ اپنی دنیا کی خاطر انھوں نے اپنے آپ کو خدا اور اس کے باغیوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹ رکھا تھا۔

۸۷ – "مومنوں پر نرم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے۔ اُس کی ذہانت، اس کی ہوشیاری، اُس کی قابلیّت، اُس کا رُسوخ و اثر، اُس کا مال، اُس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ
وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔[۸۸] یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنالے، اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔ع

مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خُو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔

''کفّار پر سخت'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پختگی، دین داری کے خُلوص، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمان کی فراست کی وجہ سے مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے۔ وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارا نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے، ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بِک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا۔

۸۸ – یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اُس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اس دین کی رُو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اُسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہو گا۔ کسی کی مُخالَفت، کسی کی طعن وتشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروانہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنٰی اپنے آپ کو دنیا بھر میں نکّو بنا لینے کے ہوں، تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچّے دل سے حق جانتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿٥٨﴾
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دُوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لیے مُنادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں[89]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے[90]۔ اِن سے کہو: ”اے اہلِ کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اُس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟“ پھر کہو: ”کیا میں اُن لوگوں کی نشان دہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟

۸۹- یعنی اذان کی آواز سن کر اُس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر کے لیے اس کے الفاظ بدلتے اور مسخ کرتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔

۹۰- یعنی ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی خفیف حرکات ان سے سرزد نہ ہوتیں۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کرسکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے مُنادی کرے تو اس کا مذاق اُڑایا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ
الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ
سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا
بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا
يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ
الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾
لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ

وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ٹُوٹا، جن میں سے بندر اور سُؤر بنائے گئے، جنھوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا درجہ اَور بھی زیادہ بُرا ہے اور وہ سَوَاءُ السَّبِیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں[91]۔''

جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چُھپائے ہوئے ہیں۔تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دَوڑ دُھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بُری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ کیوں اِن کے علما اور مشائخ انھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام

۹۱- لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف، جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بارہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مُبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں، حتّٰی کہ وہ تنزّل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انھیں نصیب ہوئی۔ پس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمھاری بے حیائی اور مجرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فِسق و فُجور اور انتہائی اَخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لاکر سچّی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝٦٣ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ وقف لازم
بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا
مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَ

کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی بُرا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔
یہودی کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[۹۲]۔۔۔۔ باندھے گئے ان کے ہاتھ[۹۳]، اور لعنت پڑی اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں[۹۴]۔۔۔۔ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں اُلٹے اضافے کا موجب بن گیا ہے[۹۵]، اور (اس کی پاداش میں)

۹۲– عَرَبی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اُس کا ہاتھ رُکا ہوا ہے۔ پس یہودیوں کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلّت و نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انھیں نظر نہ آتا تھا، اس لیے بالعُموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بے ہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ! خدا تو بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک ہی محدود نہیں، دوسری قوموں کے جُہلا کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

۹۳– یعنی بخل میں یہ خود مُبتلا ہیں۔ دُنیا میں اپنے بخل اور اپنی تنگ دِلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۹۴– یعنی اس قسم کی گستاخیاں اور طعن آمیز باتیں کر کے یہ چاہیں کہ خدا ان پر مہربان ہو جائے اور عنایات کی بارش کرنے لگے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ ان باتوں کا الٹا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی نظرِ عنایت سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ
اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي
الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ
الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ
جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں، مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اگر (اِس سرکشی کے بجائے) یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم اِن کی بُرائیاں اِن سے دُور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنّتوں میں پہنچاتے۔ کاش انھوں نے تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو اِن کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے

اور زیادہ محروم اور اس کی رحمت سے اَور زیادہ دُور ہوتے جاتے ہیں۔

۹۵ - یعنی بجائے اس کے کہ اس کلام کو سُن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے، اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر مُتنَبِّہ ہوکر ان کی تلافی کرتے، اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے، اُن پر اس کا اُلٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں آ کر انھوں نے حق و صداقت کی مُخالفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے بُھولے ہوئے سبق کو سُن کر خود راہِ راست پر آنا تو درکنار، اُن کی اُلٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں، تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے نہ سُننے پائے۔

اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۚ﴿۶۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ ع ۱۳
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا
التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

اُبلتا۔[۹۶] اگرچہ اِن میں کچھ لوگ راست رَو بھی ہیں، لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔ ع

اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمھارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔[۹۷]"

۹۶- بائبل کی کتاب اَحبار (باب ۲۶) اور اِستِثنا (باب ۲۸) میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انھوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اگر تم احکامِ الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے، اور اگر کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہُجوم کریں گی۔ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر قرآن کے اِس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔

۹۷- تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انھیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اِس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مقدّسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنّفین نے بطورِ خود لکھی ہیں۔ اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا، یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبّع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا
وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا
وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اَور زیادہ بڑھا دے گا[۹۸]۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اِجارہ کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مَقام ہے نہ رنج کا[۹۹]۔

تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دَراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غَلَطی سے، یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور اسی طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اُسی تعلیم پر قائم رہتے جو اِن کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے، تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رَو گروہ پائے جاتے اور انھیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوتا، بلکہ وہ اُسی راستے کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آرہے تھے، آپؐ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔

۹۸- یعنی یہ بات سُن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آکر اور زیادہ شدید مُخالفت شروع کر دیں گے۔

۹۹- دیکھو سورۂ بقرہ، آیت ۶۲- و حاشیہ ۸۰۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ
رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ
فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ
صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ
قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور اُن کی طرف بہت سے رسُول بھیجے، مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول اُن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو اُنھوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا، اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رُونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے اُنھیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ اُن کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیحؑ نے کہا تھا کہ ”اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو، جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔“ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ
اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا
يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾
مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ
كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اِن باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اُس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
مسیح ابنِ مریمؑ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول تھا، اُس سے پہلے اَور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں۔[۱۰۰]

---

۱۰۰ – اِن چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلُوہیّتِ مسیحؑ کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا، تو ان علامات سے بالکل غیر مُشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو اُن تمام حُدُود سے محدود اور ان تمام قُیُود سے مقیّد اور ان تمام صفات سے متّصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا، حتّٰی کہ جسے شیطان کے ذریعے سے آزمایش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ وہ

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا
نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۷۶ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا
تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ
ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۝۷۷ ع

ع ۱۰ / ۱۳

اِن سے کہو: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمھارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غُلُوّ نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیّلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور ''سَوَاءُ السَّبِیل'' سے بھٹک گئے[۱۰۱]۔ ع

خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک وسہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیحؑ کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے مُتَّصِف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس تاریخی مسیحؑ کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالَمِ واقعہ میں ظاہر ہوا تھا، بلکہ انھوں نے خود اپنے وہم وگمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا ہے۔

۱۰۱ – اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف، جن کے تخیّلات سے متاثّر ہو کر عیسائی اُس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے، وہ بڑی حد تک اُس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مُشاہَدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی ورہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیحؑ کی عقیدت اور تعظیم میں غُلُوّ کر کے، اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اَوہام اور فلسفوں سے متاثّر ہو کر، اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیحؑ کی اصل تعلیمات سے دُور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ مُلاحظہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں ''یسُوع مسیح'' (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

''پہلی تین انجیلوں (متّی، مرقس، لُوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اِن انجیلوں کے لکھنے والے یسُوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلّق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود مَتّی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو ''مسیح'' تسلیم کرنے کے بعد ''الگ ایک طرف لے جا کر اُسے ملامت کی'' (مَتّی ۲۲:۱۶)۔ لُوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسُوع کے دو شاگرد اِمّاؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ ''وہ خدا اور ساری اُمّت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا'' (لُوقا ۱۹:۲۴)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ ''مَرقُس'' کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسُوع کے لیے لفظ ''خداوند'' (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسُوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ مَتّی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسُوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں، جیسا کہ اس واقعے کے شایانِ شان ہے، مگر مَرقُس کی ''فِدیہ'' والی عبارت (مَرقُس ۱۰: ۴۵) اور آخری فَسَح کے موقع پر چند الفاظ کو مُستثنٰی کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعے کو وہ معنٰی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتّٰی کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ یسُوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفّارے سے کوئی تعلّق تھا۔''

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

''یہ بات کہ یسُوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، اناجیل کی متعدّد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ''مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے، کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو'' (لُوقا ۱۳: ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر ''ابنِ آدم'' کے نام سے کرتا ہے...... یسُوع کہیں اپنے آپ کو ''ابن اللہ'' نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلّق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالبًا ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسُوح سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً ''بیٹے'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلّق کو بیان کرنے کے لیے بھی ''باپ'' کا لفظ اسی اِطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے...... اِس تعلّق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دَور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اِس خاص گہرے تعلّق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجرِبے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعے نے اسے یہ سمجھنے پر مجبُور کر دیا کہ اس معاملے میں وہ اکیلا ہے۔''

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

’’عیدِ پنتکُست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ ’’ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا‘‘ یسُوع کو اُس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے...... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسُوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشو و نما کے مدارج سے گزرا۔ اُس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اُس نے دُکھ اُٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے...... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اُس پورے تصوّر کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعے کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں، ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیحؑ جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیّت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیّت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیحؑ کو قادرِ مُطلَق سمجھنے کی گنجایش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اِس قسم کے الفاظ سے کہ ’’یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں ٹل سکتی‘‘، اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانے سے پہلے مکمّل نہ ہوئی تھی جب کہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیحؑ کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اِس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیحؑ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔‘‘

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

’’وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعلِ رفع کے ذریعے سے یسُوع پورے اختیارات کے ساتھ ’’ابن اللہ‘‘ کے مرتبے پر علانیہ فائز کیا گیا...... یہ ’’ابن اللہ‘‘ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی اِبنیّت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسُوع کو ’’خدا کا اپنا بیٹا‘‘ کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اِس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیحؑ کے لیے ’’خداوند‘‘ کا خطاب اصل مذہبی معنٰی میں

Maktaba Tul Ishaat.com

استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدّم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنیٰ میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مُدّعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ ’’خداوندِ یسُوع مسیح‘‘ کی طرف بہت سے وہ تصوّرات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کُتُبِ مقدسہ میں خداوند یَہُوَہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مُساوی قرار دیا اور اُسے مُطلَق معنیٰ میں خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔ تاہم متعدّدِ حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اُس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔‘‘

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون ’’مسیحیّت‘‘ (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

’’عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچا یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے، اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صُورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور رُوح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسُوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہُوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیّت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اَخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اَقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلّق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا، وہ اُس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خُصوصیّات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔‘‘

اسی سلسلے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک اور مضمون ’’تاریخِ کلیسا‘‘ (church history) کی یہ عبارت بھی قابلِ مُلاحظہ ہے:

’’تیسری صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے مسیح کو عام طور پر ’’کلام‘‘ کا جَسَدی ظُہور تو مان لیا گیا تھا، تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی اُلوہیّت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلے پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے اُلوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتّب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدّت تک جھگڑا چلتا رہا، لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے

فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی اُلوہیّت کے ساتھ رُوح کی اُلوہیّت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلِمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیحؑ کا جو تصوّر قائم کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جُزوِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ ”بیٹے کی اُلوہیّت مسیحؑ کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی“ ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا، جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدّتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیحؑ کی شخصیّت میں اُلوہیّت اور انسانیّت کے درمیان کیا تعلّق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیحؑ کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیُّر و تبدُّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیّتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیحؑ بیک وقت دو مختلف مشیّتوں کا حامل ہے...... اِسی دَوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلے پر بھی خاص توجّہ کی اور یہ سوال مدّتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملے میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخرکار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں...... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہُبُوطِ آدمؑ کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کر لے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں اِستمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے۔ اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسُّط سے حاصل رہ سکتی ہے۔“

مسیحی علما کے اِن بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا، وہ عقیدت اور محبّت کا غُلُوّ تھا۔ اسی غُلُوّ کی بنا پر مسیح علیہ السّلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفے کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کی طرف رُجوع کیے بغیر محض مَنطِق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو مُتنبّہ فرمایا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۞ كَانُوْا لَا
يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۞ تَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ
اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۞ وَلَوْ
كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اُن پر داؤدؑ اور عیسٰیؑ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، اُنھوں نے ایک دُوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا[۱۰۲]، بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا۔ آج تم اُن میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کفّار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت بُرا انجام ہے جس کی تیاری اُن کے نفسوں نے اُن کے لیے کی ہے، اللہ اُن پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مُبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے[۱۰۳]۔

۱۰۲- ہر قوم کا بگاڑ ابتداءً چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام ان بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیتِ مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملے میں تساہُل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انھیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے، تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پُوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخرِ کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کی موجب ہوئی۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی زبان سے جو لعنت بنی اسرائیل پر کی گئی، اس کے لیے مُلاحظہ ہو: زبور، ۱۰ و ۵۰

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ الجزء ۷

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا

مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدّنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سُنتے ہیں جو رسُول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں کہ "پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ

اور متّی، ۲۳۔

۱۰۳- مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں، انھیں فطرتاً مشرکین کے مقابلے میں اُن لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں، مگر بہرحال انھی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہوں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کُھلّم کُھلّا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ

ع ۱۱

مان لیں، جب کہ ہم اِس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" اُن کے اِس قول کی وجہ سے اللہ نے اُن کو ایسی جنّتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رَوِیّہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انھیں جھٹلایا، وہ جہنّم کے مستحق ہیں ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو[۱۰۴] اور

منکرینِ نبوّت کے ساتھ ہیں، اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔

۱۰۴- اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ خود حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا، اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو قانونِ الٰہی کے بجائے قانونِ نفس کے پیرو قرار پاؤ گے۔ دوسری بات یہ کہ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور اِشراقی مُتصوّفین کی طرح رَہبانیّت اور قطعِ لذّات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس و جسم کے حُقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذّتوں سے محروم کرنا، اور دنیا کے سامانِ زیست سے تعلق توڑنا، بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرّب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحابۂ کرامؓ میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جن کے اندر یہ ذہنیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض صحابیوں نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے، راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے، گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے، عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تمھارے نفس کے

لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا
يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

حد سے تجاوز نہ کرو،[۱۰۵] اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال وطیّب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اُسے کھاؤ پیو اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم لوگ جو مُہمَل قسمیں کھالیتے ہو اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بُوجھ کر کھاتے ہو

بھی تم پر حُقوق ہیں۔ روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ مجھے دیکھو، میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی۔ پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔'' پھر فرمایا: ''یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند اور دنیا کی لذتوں کو اپنے اُوپر حرام کرلیا ہے؟ میں نے تو تمھیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری وعُزلَت نشینی ہے۔ ضبطِ نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے، رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے اُوپر سختی کی، اور جب انھوں نے خود اپنے اُوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انھی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔'' اسی سلسلے میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں، تو آپؐ نے بُلا کر اُن کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ، کعب بن سُور الاَزدی کو اُن کے مقدّمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا، اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں، مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

۱۰۵- ''حد سے تجاوز کرنا'' وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اِس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کے حُدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔ اللہ کو یہ تینوں

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ
ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اُن پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفّارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اَوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچّوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفّارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔[۱۰۶] اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔[۱۰۷] اس طرح اللہ اپنے احکام تمھارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

باتیں ناپسند ہیں۔

۱۰۶۔ چونکہ بعض لوگوں نے حلال چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر لینے کی قسم کھا رکھی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلے میں قسم کا حکم بھی بیان فرما دیا کہ اگر کسی شخص کی زبان سے بلاارادہ قسم کا لفظ نکل گیا ہے تو اس کی پابندی کرنے کی ویسے ہی ضرورت نہیں، کیونکہ ایسی قسم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، اور اگر جان بُوجھ کر کسی نے قسم کھائی ہے تو وہ اُسے توڑ دے اور کفّارہ ادا کر دے، کیونکہ جس نے کسی معصیت کی قسم کھائی ہو، اسے اپنی قسم پر قائم نہ رہنا چاہیے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۴۳ و ۲۴۴۔ نیز کفّارہ کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۲۵)

۱۰۷۔ قسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں: ایک یہ کہ قسم کو صحیح مَصرَف میں استعمال کیا جائے، فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے، ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اُسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے۔ تیسرے یہ کہ جب کسی صحیح معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے، اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفّارہ ادا کیا جائے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جُوا اور یہ آستانے اور پانسے[۱۰۸]، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب[۱۰۹] ہوگی۔

۱۰۸- آستانوں اور پانسوں کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، حاشیہ ۱۲ و ۱۴۔ اِسی سلسلے میں جُوئے کی تشریح بھی حاشیہ ۱۴ میں مل جائے گی۔ اگرچہ پانسے (اَزلام) اپنی نوعیت کے اعتبار سے مَیْسِر (جُوئے) ہی کی ایک قسم ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عربی زبان میں اَزلام فال گیری اور قرعہ اندازی کی اُس صورت کو کہتے ہیں جو مشرکانہ عقائد اور وہمیّات سے آلودہ ہو۔ اور مَیْسِر کا اطلاق اُن کھیلوں اور اُن کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقی اُمور کو کمائی اور قسمت آزمائی اور تقسیم اموال و اشیا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

۱۰۹- اِس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں: ایک، شراب۔ دوسرے، قِمار بازی۔ تیسرے، وہ مقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا خدا کے سوا کسی اَور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔ چوتھے، پانسے۔ مؤخّر الذکر تین چیزوں کی ضروری تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ شراب کے متعلّق احکام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

شراب کی حُرمت کے سلسلے میں اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے، جو سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ اور سورۂ نساء آیت ۴۳ میں گزر چکے ہیں۔ اب اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں لوگوں کو مُتنبّہ فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حُرمت کا حکم آ جائے، لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدّت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے اعلان کرایا کہ اب جن کے پاس شراب ہے، وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینے کی گلیوں میں شراب بہا دی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”جس نے یہ چیز حرام کی ہے اُس نے اِسے تحفتاً دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔“ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم شراب کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں؟ آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ ”نہیں، اسے بہا دو۔“ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر استعمال کی تو اجازت ہے؟ فرمایا: ”نہیں، وہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے۔“ ایک اَور صاحب نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے، اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا: مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

مانیں گے۔ فرمایا: ”اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔“

ابنِ عمرؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَعن اللہ الخمر و شاربھا وساقیھا و بائعھا ومُبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ۔ ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب[1] پر، اور اس کے پینے[2] والے پر اور پلانے[3] والے پر، اور بیچنے[4] والے پر، اور خرید[5]نے والے پر، اور کشید[6] کرنے والے پر، اور کشید[7] کرانے والے پر، اور ڈھو[8] کر لے جانے والے پر، اور اس شخص[9] پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ ابتداءً آپؐ نے اُن برتنوں تک کے استعمال کو منع فرما دیا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حُرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا تب آپؐ نے برتنوں پر سے یہ قید اُٹھا دی۔

خَمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور مجازاً گیہوں، جَو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی یہ لفظ بولتے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حُرمت کے اس حکم کو تمام اُن چیزوں پر عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کے یہ واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ ”ہر نشہ آور چیز خَمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“ کل شرابٍ اسکر فھو حرام۔ ”ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔“ وانا انھی عن کل مسکرٍ۔ ”اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ الخمر ما خامر العقل۔ ”خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔“

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بھی بیان فرمایا کہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ ”جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔“ اور ما اسکر الفرق منہ فملء الکف منہ حرام۔ ”جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہو، اس کا ایک چُلّو پینا بھی حرام ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی۔ جو شخص اِس جُرم میں گرفتار ہو کر آتا تھا، اُسے جُوتے، لات، مُکّے، بل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سَنٹے مارے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ۴۰ ضربیں آپؐ کے زمانے میں اس جُرم پر لگائی گئی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ۴۰ کوڑے مارے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ابتداءً ۴۰ کوڑوں ہی کی سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جُرم سے باز نہیں آتے تو انھوں نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ، اور ایک رِوایت کے بموجب امام شافعیؒ بھی، شراب کی حد قرار دیتے ہیں۔ مگر امام احمد ابن حَنبلؒ اور ایک دوسری رِوایت کے مطابق امام شافعیؒ ۴۰ کوڑوں کے قائل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

شریعت کی رُو سے یہ بات حکومتِ اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزور قوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی ثَقِیف کے ایک شخص رُوَیْشِد نامی کی دکان اس بنا پر جلوا دی گئی کہ وہ

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عُدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمّہ داری تھی۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی، بشرطیکہ وہ آیندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رُکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اُسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویّہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تمھیں اُس شکار کے ذریعے سے سخت آزمایش میں ڈالے گا

خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پُورا گاؤں حضرت عمرؓ کے حکم سے اِس قصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کی کشید اور فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ

جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے، پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اُس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو،[۱۱۰] اور اگر تم میں سے کوئی جان بُوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو، اسی کے ہم پلّا ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے، اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اِس گناہ کے کفّارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے،[۱۱۱] تاکہ وہ اپنے کیے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا

۱۱۰- شکار خواہ آدمی خود کرے، یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور پر مدد دے، دونوں باتیں حالتِ احرام میں منع ہیں۔ نیز اگر مُحرِم کی خاطر شکار مارا گیا ہو تب بھی اس کا کھانا مُحرِم کے لیے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا ہو اور پھر وہ اس میں سے مُحرِم کو بھی تُحفتاً کچھ دے دے تو اس کے کھانے میں کچھ مضایقہ نہیں۔ اس حکمِ عام سے مُوذی جانور مستثنٰی ہیں۔ سانپ، بچھّو، باؤلا کتّا اور ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں حالتِ احرام میں مارے جاسکتے ہیں۔

۱۱۱- اِن اُمور کا فیصلہ بھی دو عادل آدمی ہی کریں گے کہ کس جانور کے مارنے پر آدمی کتنے مسکینوں کو کھلائے، یا کتنے روزے رکھے۔

فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ
صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ
عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا
لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا[۱۱۲]، جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار، جب تک تم اِحرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنا دیا)[۱۱۳]، تا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے

۱۱۲– چونکہ سمندر کے سفر میں بسا اوقات زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور غذا کی فراہمی کے لیے، بجز اس کے کہ آبی جانوروں کا شکار کیا جائے، اور کوئی تدبیر ممکن نہیں ہوتی، اس لیے بحری شکار حلال کر دیا گیا۔

۱۱۳– عرب میں کعبے کی حیثیت محض ایک مقدّس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی، بلکہ اپنی مرکزیّت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی مَعاشی وتمدّنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عُمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدّنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی مَعاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ
الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا یَسْتَوِی
الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا

اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[114] خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسُول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمّہ داری ہے، آگے تمھارے کُھلے اور چُھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں، خواہ ناپاک کی بہتات تمھیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو،[115] پس اے لوگو

دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل وحرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹّے پڑے ہوتے، انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت نہ ہوتی۔

۱۱۴– یعنی اگر تم اس انتظام پر غور کرو تو تمھیں خود اپنے ملک کی تمدّنی ومعاشی زندگی ہی میں اس امر کی ایک بیّن شہادت مل جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور اُن کی ضروریات کا کیسا مکمّل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک ایک حکم کے ذریعے سے انسانی زندگی کے کتنے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سیکڑوں برس جو محمدؐ عَرَبی کے ظُہور سے پہلے گزرے ہیں، ان میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے، مگر اللہ تمھاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اُس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیّت قائم کر کے تمھارے لیے وہ انتظام کر دیا تھا جس کی بدولت تمھاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمھیں یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ نے جو احکام تمھیں دیے ہیں، اُن کی پابندی میں تمھاری اپنی بھلائی ہے اور ان میں تمھارے لیے وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔

۱۱۵– یہ آیت قدروقیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے، جو ظاہر میں انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بیں نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں، کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہوں تو وہ ناپاک ہیں، اور پانچ روپے اگر خدا کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ پاک ہیں، اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو، بہرحال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں

ع ۱۴/۳

اللّٰہَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ
یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾

جو عقل رکھتے ہو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہو گی ؏

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پُوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں ناگوار ہوں[۱۱۶]، لیکن اگر تم انھیں ایسے وقت پُوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

ہوسکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلے میں پاک پانی کا ایک چُلّو زیادہ وزنی ہے۔ لٰہذا ایک سچّے دانش مند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو، اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شان دار ہو۔

۱۱۶ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگ عجیب عجیب قسم کے فضول سوالات کیا کرتے تھے، جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت ہوتی تھی اور نہ دُنیا ہی کے کسی معاملے میں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک صاحب بھرے مجمع میں آپؐ سے پوچھ بیٹھے کہ ''میرا اصلی باپ کون ہے؟'' اسی طرح بعض لوگ احکام شرع میں غیر ضروری پُوچھ گچھ کیا کرتے تھے، اور خواہ مخواہ پُوچھ پُوچھ کر ایسی چیزوں کا تعیُّن کرانا چاہتے تھے جنھیں شارع نے مَصلحتاً غیر معیّن رکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں مُجملاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے حکم سُنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ''کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے؟'' آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: ''تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے۔ پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے۔'' ایسے ہی لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ان اعظم المسلمین فی المسلمین جرما من سأل عن شئ لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسألتہ۔ ''مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلّق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔'' ایک دُوسری حدیث میں ہے: ان

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ

تم سے پہلے ایک گروہ نے اِسی قسم کے سوالات کیے تھے، پھر وہ لوگ اُنھی باتوں کی وجہ سے کفر میں مُبتلا ہو گئے۔[117]

اللہ نے نہ کوئی بَحِیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبَہ اور نہ وَصِیلہ اور نہ حام۔[118] مگر

اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحدّ حُدُودًا فلا تعتدُوْھَا وسَکتَ عَنْ اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ ’’اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حُدُود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلّق خاموشی اختیار کی ہے، بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔‘‘ ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبّہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مُجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی، یا جو احکام بر سبیلِ اِجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعیُّنات کا ذکر نہیں کیا ہے، ان میں اِجمال اور عدَمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی، تفصیلات بتانی چاہیے تھیں مگر نہ بتائیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان اُمور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعیُّنات اور تقیُّدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، اِستنباط سے کسی نہ کسی طرح مُجمَل کو مُفصَّل، مُطلَق کو مُقیَّد، غیر معیّن کو معیّن بنا کر ہی چھوڑتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ مابعد الطبیعی اُمور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی، ایمان لانے والے کے لیے اتنے ہی زیادہ اُلجھن کے مواقع بڑھیں گے، اور احکام میں جتنی قُیود زیادہ ہوں گی، پیروی کرنے والے کے لیے خلاف ورزیِ حکم کے امکانات بھی اسی قدر زیادہ ہوں گے۔

۱۱۷– یعنی پہلے انھوں نے خود ہی عقائد اور احکام میں مُوشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلّق سوال کر کر کے تفصیلات اور قُیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا، پھر خود ہی اُس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے ـــــ اِس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود، مسلمانوں نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

۱۱۸– جس طرح ہمارے مُلک میں گائے، بیل اور بکرے خدا کے نام پر یا کسی بُت یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انھیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اُٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے،

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیّات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبرؐ کی طرف، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انھیں خبر ہی نہ ہو؟

اسی طرح زمانۂ جاہلیّت میں اہلِ عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کرکے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بَحِیرہ اُس اُونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچّہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دُودھ پیا جاتا، نہ اُسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اُون اُتارا جاتا۔ اُسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چَرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیے۔

سائبہ اُس اُونٹ یا اُونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مَنّت کے پورا ہونے، یا کسی بیماری سے شفا پانے، یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطورِ شکرانہ کے پُن کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اُونٹنی نے دس مرتبہ بچّے دیے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وَصِیلہ: اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا، اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وَصِیلہ تھا۔

حام: اگر کسی اُونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بُوڑھے اُونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اُونٹ کے نُطفے سے دس بچّے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دُوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔[119] اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیّت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمھاری جماعت میں سے دو صاحبِ عدل[120] آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر مسلموں ہی میں سے

۱۱۹- یعنی بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا بُرائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے فکر اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کر رہا ہے، اور راست روی و راست بازی کے مُقتضیات پورے کر رہا ہے، جن میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی شخص کی گمراہی و کج روی اس کے لیے نقصان دِہ نہیں ہوسکتی۔

اِس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں: ”لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ بُرائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں، تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم! تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے

الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ
ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ
اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ
اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا
وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى

دو گواہ لے لیے جائیں۔[۱۲۱] پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں)، اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔" لیکن اگر پتا چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مُبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لیے اہل تر ہوں، ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہماری شہادت اُن کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے۔" اس طریقے سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے

لوگوں کو مسلّط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمھارے نیک لوگ خدا سے دُعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

۱۲۰ – یعنی دین دار، راست باز اور قابلِ اعتماد مسلمان۔

۱۲۱ – اِس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو شاہد بنانا صرف اُس حالت میں دُرست ہے جب کہ کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے میسّر نہ آسکے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ۱۰۸ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ
قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۱۰۹ اِذْ قَالَ اللّٰهُ
يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ
اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَ

کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دُوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے۔ اللہ سے ڈرو اور سُنو، اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ ع

جس روز[۱۲۲] اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پُوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب[۱۲۳] دیا گیا، تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں[۱۲۴]، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ پھر تصوّر کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے[۱۲۵] گا کہ "اے مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ! یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، میں نے رُوحِ پاک سے تیری مدد کی، تُو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی،

۱۲۲ – مراد ہے قیامت کا دن۔

۱۲۳ – یعنی اسلام کی طرف جو دعوت تم نے دُنیا کو دی تھی اس کا کیا جواب دنیا نے تمھیں دیا۔

۱۲۴ – یعنی ہم تو صرف اُس محدود ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں ملتا ہُوا محسوس ہُوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا ردّعمل کہاں کس صُورت میں کتنا ہُوا، تو اس کا صحیح علم آپ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

۱۲۵ – ابتدائی سوال تمام رسولوں سے بحیثیتِ مجموعی ہو گا۔ پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بتصریح ارشاد ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا، وہ یہاں بطورِ خاص نقل کیا جا رہا ہے۔

اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ
تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ
طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ
الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ
بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تُو میرے حکم سے مٹی کا پُتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تُو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تُو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا،[۱۲۶] پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، تو میں نے ہی تجھے اُن سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب اُنھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"[۱۲۷] —— (حواریوں کے سلسلے میں)[۱۲۸] یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب

---

۱۲۶ – یعنی حالتِ موت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لاتا تھا۔

۱۲۷ – یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اُس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بُوتے پر پیدا کر لیتا —— ضمناً یہاں یہ بھی بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔

۱۲۸ – چونکہ حواریوں کا ذکر آ گیا تھا اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعے کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا، جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیحؑ سے براہِ راست جن

Maktaba Tul Ishaat.com

الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا
اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا
وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ ثلث
عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا
لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابنِ مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اُتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰ نے کہا: اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ اُنھوں نے کہا: ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے دُعا کی: ”خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تُو بہترین

جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیحؑ کو ایک انسان اور محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریکِ خدا یا فرزندِ خدا ہونے کا تصوّر نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیحؑ نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملۂ معترضہ کا کون سا موقع ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملۂ معترضہ اُس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہوگی، بلکہ اُس کی اس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر یہاں کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ موجودہ زندگی میں عیسائیوں کو اُس سے سبق ملے اور وہ راہِ راست پر آئیں۔ لہٰذا اس گفتگو کے سلسلے میں حواریوں کے اس واقعے کا ذکر بطور ایک جملۂ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے۔

الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ
مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١١٥﴾ ع وَ
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ
اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ

ع ۱۵/۷ ۵

رازق ہے۔“ اللہ نے جواب دیا: ”مَیں اُس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں[129] مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا، اسے میں ایسی سزا دوں گا جو دُنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی“ ؏ ——— غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ ”اے عیسٰیؑ ابن مریمؑ! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟“[130] تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ ”سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ

۱۲۹ – قرآن اس باب میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اُتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعے سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو، اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔

۱۳۰ – عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیحؑ اور رُوح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیحؑ کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیّت یا قدّوسیّت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیُّل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علمائے دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریمؑ کے لیے ”اُمّ اللہ“ یا ”مادرِ خدا“ کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیّتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیحؑ کی واحد ذات میں دو مستقل جُداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دُنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر اِفسُوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی، اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریمؑ کے لیے ”مادرِ خدا“ کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا، وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتّٰی کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریمؑ اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور رُوح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہوگئے۔ ان کے مجسّمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۗ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۗ تَعْلَمُ مَا
فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝١١٦
مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝١١٧ اِنْ

وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر

کے جملہ مَراسم ادا کیے جاتے تھے، انھی سے دُعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کُشا اور بے کسوں کی پُشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ ''مادرِ خدا'' کی حمایت وسر پرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جَسٹِینَین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریمؑ کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریمؑ سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہِرَقل نے اپنے جھنڈے پر ''مادرِ خدا'' کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدّت سے آواز اُٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ
عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔“ تب اللہ فرمائے گا: ”یہ وہ دن ہے جس میں سچّوں کو اُن کی سچّائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ع

ضمیمہ

(نوٹ بسلسلہ حاشیہ ۳۶)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیرووں کا نام کبھی ”عیسائی“ یا ”مسیحی“ نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی، جسے حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیا لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملّت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: کتابِ اعمال ۳:۱-۱۰، ۱۴:۱، ۱۵:۱ و ۵، ۲۱:۲۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسٰیؑ کے پیروؤں میں سے پولوس (سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ بس مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری طرف یہودی علما نے پیروانِ مسیحؑ کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عامّۂ بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیحؑ اپنے لیے کبھی ''شاگرد'' کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کبھی اپنے رفقا کا ذکر ''بھائیوں'' (اِخْوَان)، ''ایمان داروں'' (مُؤْمِنِیْن)، ''جو ایمان لائے'' (الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا)، اور ''مُقدّسوں'' کے الفاظ سے کرتے تھے (کتابِ اعمال ۲:۴۴، ۴:۳۲، ۹:۲۶، ۱۱:۲۹، ۱۳:۵۲، ۱۵:۱ و ۲۳۔ رومیوں ۱۵:۲۵۔ کُلسّیوں ۱:۲)۔ بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی ''گلیلی'' کہتے تھے اور کبھی ''ناصریوں کا بدعتی فرقہ'' کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴:۵۔ لُوقا ۱۳:۲)۔ یہ نام دھرنے کی کوشش انھوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیحؑ کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

اس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (Christian) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا، جب کہ سینٹ پال اور بَرنَباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغِ عام شروع کی (اعمال ۱۱:۲۶)۔ یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیحؑ اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمھیں مسیحؑ کی طرف نسبت دے کر ''مسیحی'' کہا جاتا ہے تو تمھیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱۔ پطرس ۴:۱۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انھیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخرکار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل ایک بُرا لقب تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔

قرآنِ مجید نے اسی لیے مسیحؑ کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے، بلکہ انھیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنھیں عیسٰی ابنِ مریمؑ نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللہِ، ''کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے''، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللہِ، ''ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں''۔ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا!

تفہیم القرآن

الانعام

(۶)

Maktaba Tul Ishaat.com

الاَنْعام

نام اِس سُورہ کے رکوع ۱۶ و ۱۷ میں بعض اَنعام (مویشیوں) کی حُرمت اور بعض کی حِلّت کے متعلق اہلِ عرب کے توہُّمات کی تردید کی گئی ہے۔ اِسی مناسبت سے اس کا نام ''الاَنعام'' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ پُوری سورہ مکّہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کی چچا زاد بہن اَسماءؓ بنتِ یزید کہتی ہیں کہ ''جب یہ سورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی تھی، اس وقت آپؐ اُونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اُونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔'' روایات میں اس کی بھی تصریح ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات کو آپؐ نے اسے قلم بند کرا دیا۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکّی دَور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہوگی۔ حضرت اَسماءؓ بنتِ یزید کی روایت بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوفہ انصار میں سے تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائیں۔ اگر قبولِ اسلام سے پہلے محض بربنائے عقیدت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپؐ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے اہلِ یَثرِب کے ساتھ آپؐ کے تعلّقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

شانِ نزول زمانۂ نزول متعین ہو جانے کے بعد ہم بآسانی اس پَس منظر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے۔ اس وقت اللہ کے رسول کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم وستم سے عاجز آ کر ملک چھوڑ چکی تھی اور حَبَش میں مقیم تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وحمایت کے لیے نہ ابوطالب باقی رہے تھے اور نہ حضرت خدیجہؓ، اس لیے ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر آپؐ شدید مزاحمتوں کے مقابلے میں تبلیغ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آپؐ کی تبلیغ کے اثر سے مکّہ میں اور گردونواح کے قبائل میں بھی صالح افراد پے در پے اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، لیکن قوم بحیثیتِ مجموعی ردّ و انکار پر تُلی ہوئی تھی۔ جہاں کوئی شخص اسلام کی طرف ادنیٰ میلان بھی ظاہر کرتا تھا، اسے طعن و ملامت، جسمانی اذیّت اور مَعاشی و معاشرتی مقاطعے کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں صرف ایک ہلکی سی شعاع یثرب کی طرف سے نمودار ہوئی تھی جہاں سے اَوس اور خَزرَج کے بااثر لوگ آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور جہاں کسی اندرونی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس حقیر سی ابتدا میں مستقبل کے جو امکانات پوشیدہ تھے، انھیں کوئی ظاہر بیں آنکھ

نہ دیکھ سکتی تھی۔ بظاہر دیکھنے والوں کو جو کچھ نظر آتا تھا، وہ بس یہ تھا کہ اسلام ایک کمزور سی تحریک ہے جس کی پُشت پر کوئی مادّی طاقت نہیں، جس کا داعی اپنے خاندان کی ضعیف سی حمایت کے سوا کوئی زور نہیں رکھتا، اور جسے قبول کرنے والے چند مُٹھی بھر بے بس اور منتشر افراد اپنی قوم کے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر اس طرح سوسائٹی سے نکال پھینکے گئے ہیں جیسے پتّے اپنے درخت سے جھڑ کر زمین پر پھیل جائیں۔

مَباحِث اِن حالات میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے اور اس کے مضامین کو سات بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شرک کا اِبطال اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت،

(۲) عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے،

(۳) جاہلیّت کے اُن توہُّمات کی تردید جن میں لوگ مبتلا تھے،

(۴) اُن بڑے بڑے اُصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا تھا،

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب،

(۶) طویل جِدّوجُہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس پر تسلّی،

(۷) منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت و سرشاری اور نادانستہ خودکُشی پر نصیحت، تنبیہ اور تہدید۔

لیکن خطبے کا انداز یہ نہیں ہے کہ ایک ایک عنوان پر الگ الگ یکجا گفتگو کی گئی ہو۔ بلکہ خطبہ ایک دریا کی سی روانی کے ساتھ چلتا جاتا ہے اور اس کے دوران میں یہ عنوانات مختلف طریقوں سے بار بار چِھڑتے ہیں اور ہر بار ایک نئے انداز سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

مکّی زندگی کے اَدوار یہاں چونکہ پہلی مرتبہ ناظرین کے سامنے ایک مفصّل مکّی سورہ آرہی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم مکّی سورتوں کے تاریخی پَس منظر کی ایک جامع تشریح کر دیں، تاکہ آئندہ تمام مکی سورتوں کو، اور ان کی تفسیر کے سلسلے میں ہمارے اشارات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

جہاں تک مَدنی سورتوں کا تعلّق ہے، ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانۂ نزول معلوم ہے یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی تو بکثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے۔ لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصّل ذرائع معلومات موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نُزول اور موقعِ نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو۔ کیونکہ اُس زمانے کی تاریخ اس قدر جُزئی تفصیلات کے ساتھ مُرتّب نہیں ہوئی ہے جیسی کہ مدنی دَور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکّی سورتوں کے معاملے میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر اُن اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور اندازِ بیان میں، اور اپنے پَس منظر کی طرف اُن کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس

Maktaba Tul Ishaat.com

نوعیّت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعیّن نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحّت کے ساتھ جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکّی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دُوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابُل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورت کس دَور سے تعلّق رکھتی ہے۔

اس طرزِ تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہم کو چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے:

پہلا دَور، آغازِ بِعثت سے لے کر اعلانِ نبوّت تک، تقریباً ۳ سال، جس میں دعوت خفیہ طریقے سے خاص خاص آدمیوں کو دی جا رہی تھی اور عام اہلِ مکہ کو اس کا علم نہ تھا۔

دوسرا دَور، اعلانِ نبوّت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ (persecution) کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی، پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تضحیک، استہزا، الزامات، سَبّ وشَتم، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھا بندی تک نوبت پہنچی، اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں شروع ہو گئیں جو نسبتاً زیادہ غریب، کمزور اور بے یار و مددگار تھے۔

تیسرا دَور، آغازِ فتنہ (۵ نبویؐ) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات (۱۰ نبویؐ) تک، تقریباً پانچ چھ سال۔ اس میں مخالفت انتہائی شدّت اختیار کرتی چلی گئی، بہت سے مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر حَبَش کی طرف ہجرت کر گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا مَعاشی ومعاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور آپؐ اپنے حامیوں اور ساتھیوں سمیت شِعبِ ابی طالب میں محصور کر دیے گئے۔

چوتھا دَور، ۱۰ نبویؐ سے لے کر ۱۳ نبویؐ تک، تقریباً ۳ سال۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی ومصیبت کا زمانہ تھا۔ مکہ میں آپؐ کے لیے زندگی دُوبھر کر دی گئی تھی، طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی، حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلے سے آپؐ اپیل کرتے رہے کہ وہ آپؐ کی دعوت قبول کرے اور آپؐ کا ساتھ دے، مگر ہر طرف سے کورا جواب ہی ملتا رہا۔ اور ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورے کرتے رہے کہ آپؐ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ آخرِ کار اللہ کے فضل سے انصار کے دل اسلام کے لیے کُھل گئے اور ان کی دعوت پر آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ان میں سے ہر دَور میں قرآنِ مجید کی جو سورتیں نازل ہوئی ہیں، وہ اپنے مضامین اور اندازِ بیان میں دوسرے دَور کی سورتوں سے مختلف ہیں۔ اُن میں بکثرت مَقامات پر ایسے اشارات بھی پائے جاتے ہیں جن سے پَس منظر کے حالات اور واقعات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ ہر دَور کی خُصوصیات کا اثر اُس دَور کے نازل شدہ کلام میں بہت بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ انھی علامات پر اعتماد کر کے ہم آیندہ ہر مکّی سورہ کے دیباچے میں یہ بتائیں گے کہ وہ مکہ کے کس دَور میں نازل ہوئی ہے۔

---

۱۶۵ آیاتھا سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ ۲۰ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَ النُّوْرَ ؕ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، دُوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھیرا رہے ہیں۔[1] وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا،[2] پھر تمھارے لیے زندگی کی ایک مدّت مقرر کر دی، اور ایک دُوسری مدّت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے[3] شدہ ہے۔

۱ - یاد رہے کہ مُخاطَب وہ مشرکینِ عرب ہیں جو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہُبَل یا عُزّیٰ یا کسی اَور دیوی یا دیوتا کے ہیں۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانو! جب تم خود یہ مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردشِ لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو یہ دوسرے کون ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے سجدے کرتے ہو، نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، دعائیں مانگتے ہو اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہو۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ فاتحہ حاشیہ ۲، سورۂ بقرہ حاشیہ ۱۶۳)

روشنی کے مقابلے میں تاریکیوں کو بصیغۂ جمع بیان کیا گیا، کیونکہ تاریکی نام ہے عَدَمِ نور کا، اور عَدَمِ نور کے بے شمار مدارج ہیں۔ اس لیے نور واحد ہے اور تاریکیاں بہت ہیں۔

۲ - انسانی جسم کے تمام اجزا زمین سے حاصل ہوتے ہیں، کوئی ایک ذرّہ بھی اس میں غیر ارضی نہیں ہے، اس لیے فرمایا کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

۳ - یعنی قیامت کی گھڑی، جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور حساب دینے کے لیے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ﴿۲﴾ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الۡاَرۡضِ ؕ
يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۳﴾ وَمَا تَاۡتِيۡهِمۡ
مِّنۡ اٰيَةٍ مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ﴿۴﴾ فَقَدۡ
كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا
بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۵﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ
مَّكَّنّٰهُمۡ فِي الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّكُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ
عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا ۪ وَّجَعَلۡنَا الۡاَنۡهٰرَ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ

مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔ وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمھارے کُھلے اور چُھپے سب حال جانتا ہے اور جو بُرائی یا بھلائی تم کماتے ہو، اس سے خوب واقف ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انھوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ اچھّا، جس چیز کا وہ اب تک مذاق اُڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلّق کچھ خبریں انھیں پہنچیں گی۔[۴] کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دَور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمھیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں،

۴ – اشارہ ہے ہجرت اور اُن کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے در پے حاصل ہونے والی تھیں۔ جس وقت یہ اشارہ فرمایا گیا تھا، اُس وقت نہ کفّار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں انھیں پہنچنے والی ہیں، اور نہ مسلمانوں ہی کے ذہن میں اس کا کوئی تصوّر تھا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی آیندہ کے امکانات سے بے خبر تھے۔

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ
عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸
وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ

(مگر جب انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دُوسرے دَور کی قوموں کو اُٹھایا۔

اے پیغمبرؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چُھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا۔[5] اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انھیں کوئی مُہلت نہ دی جاتی۔[6] اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اُتارتے اور اس طرح انھیں اُسی شبہے میں مبتلا کر دیتے جس میں

۵- یعنی جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبرؐ ہے، اس کی بات مانو، ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض و سما کسی کو پیغمبرؐ مقرر کرے اور پھر اس طرح اُسے بے یار و مددگار، پتھر کھانے اور گالیاں سننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اَرْدَلی میں رہنا چاہیے تھا، تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا، اس کا رُعب بٹھاتا، اس کی ماموریت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

۶- یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمھیں ملی ہوئی ہے، یہ اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مُہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اُس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی

Maktaba Tul Ishaat.com

مَّا يَلۡبِسُوۡنَ ۝۹ وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَحَاقَ
بِالَّذِيۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۱۰ ع
قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ انْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۱ قُلْ لِّمَنۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ

اب یہ مُبتلا ہیں[7]۔

اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی بہت سے رسُولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اُڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلّط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ع اِن سے کہو: ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہُوا ہے[8]۔

ان سے پُوچھو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ــــ کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے[9]،

رہ جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمھارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے، اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل وفکر کے صحیح استعمال سے اس کا اِدراک کرتے ہو یا نہیں، اور اِدراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق دُرست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرطِ لازم ہے، اور تمھاری دُنیوی زندگی، جو دراصل مہلتِ امتحان ہے، اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لٰہذا تمھارے مطالبے کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمھارے امتحان کی مدّت ختم نہیں کرنا چاہتا۔ (مُلاحَظہ ہو: سورۂ بَقرہ حاشیہ ۲۲۸)

۷ – یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ فرشتے کے آنے کی پہلی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا۔ لیکن اُوپر بتا دیا گیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آئے تو اس کے مامورمن اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامورمن اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔

۸ – یعنی گزری ہوئی قوموں کے آثارِ قدیمہ اور ان کے تاریخی افسانے شہادت دیں گے کہ صداقت وحقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئیں۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اُوپر لازم کرلیا ہے (اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمھیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)، قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا، یہ بالکل ایک غیر مُشتبہ حقیقت ہے، مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مُبتلا کرلیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔

رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ کہو: اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اُس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے؟[۱۰] کہو: مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے آگے سرِتسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے)

۹- یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو، زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں۔ سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھیر گیا۔ مُخاطب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے، لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں، اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انھیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے مشرکانہ عقیدے کے خلاف اِستدلال کرے گا۔ اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔ تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو کہ سب کچھ اللہ کا ہے۔

۱۰- اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا خدا بنا رکھا ہے، وہ سب اپنے ان بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحبِ قبر کی شانِ معبودیت قائم نہیں ہوسکتی جب تک

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٤﴾ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ
رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ مَّن يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ
رَحِمَهُۥ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهُۥٓ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِۦ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ
الْخَبِيرُ ﴿١٨﴾ قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللَّهُ ۖ شَهِيدٌۢ
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم

تُو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اُس دن جو سزا سے بچ گیا، اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ان سے پُوچھو: کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ —— کہو: میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ ہے[11]، اور یہ قرآن میری طرف بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے، تاکہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے،

اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربارِ خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پُجاری اس کا مجسّمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کو تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوندِ عالَم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بَل بُوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں، بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

۱۱ – یعنی اس بات پر گواہ ہے کہ میں اس کی طرف سے مامور ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔

بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ
قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ وقف لازم
اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع وَ
مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

ع ۱۰ وقف لازم

سب کو متنبّہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دُوسرے خدا بھی ہیں؟[۱۲] کہو: میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں[۱۳] دے سکتا۔ کہو: خدا تو وہی ایک ہے اور میں اُس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مُبتلا ہو۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس بات کو اس طرح غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔[۱۴] مگر جنھوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے، وہ اِسے نہیں مانتے ؏ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹا بہتان لگائے،[۱۵] یا اللہ کی نشانیوں کو جھُٹلائے؟[۱۶] یقیناً

۱۲- کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے علم ہونا ضروری ہے جس کی بِنا پر آدمی یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ پس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمھیں یہ علم ہے کہ اس جہانِ ہست و بُود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما حاکم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو؟

۱۳- یعنی اگر تم علم کے بغیر محض جھُوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو، میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔

۱۴- یعنی کُتُبِ آسمانی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ جس طرح کسی کا بچہ بہت سے بچّوں میں ملا جُلا کھڑا ہو تو وہ الگ پہچان لے گا کہ اس کا بچہ کون سا ہے، اسی طرح جو شخص کتابِ الٰہی کا علم رکھتا ہو، وہ اُلوہیّت کے متعلّق لوگوں کے بے شمار مختلف عقیدوں اور نظریّوں کے درمیان بلا کسی شک و اِشتباہ کے یہ پہچان لیتا ہے کہ ان میں سے امرِ حق کون سا ہے۔

۱۵- یعنی یہ دعوٰی کرے کہ خدا کے ساتھ دُوسری بہت سی ہستیاں بھی خدائی میں شریک ہیں، خدائی صفات سے متّصف ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں، اور اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیّت کا رویّہ اختیار کرے۔ نیز یہ بھی اللہ پر بہتان ہے کہ کوئی یہ کہے کہ خدا نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنا مُقرّبِ خاص قرار دیا ہے اور اُسی نے یہ حکم

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢١﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ
لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٢٢﴾
ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا
مُشْرِكِيْنَ ﴿٢٣﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا

ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے، تو وہ اِس کے سوا کوئی فتنہ نہ اُٹھا سکیں گے کہ (یہ جھوٹا بیان دیں کہ) اے ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو، اُس وقت یہ کس طرح اپنے اُوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے، اور وہاں اُن کے سارے بناوٹی معبُود گم ہو جائیں گے۔

ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمھاری بات سُنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے

دیا ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ اِس پر راضی ہے کہ ان کی طرف خدائی صفات منسوب کی جائیں اور ان سے وہ معاملہ کیا جائے جو بندے کو اپنے خدا کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۱۶- اللہ کی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں بھی ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ بھی جو پیغمبروں کی سیرت اور ان کے کارناموں میں ظاہر ہوئیں، اور وہ بھی جو کُتُبِ آسمانی میں پیش کی گئیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، یعنی یہ کہ موجوداتِ عالم میں خدا صرف ایک ہے، باقی سب بندے ہیں۔ اب جو شخص ان تمام نشانیوں کے مقابلے میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم، کسی مُشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر، مجرّد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر، دوسروں کو اُلوہیّت کی صفات سے متّصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھیراتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ حقیقت و صداقت پر ظلم کر رہا ہے، اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریّے کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے۔

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ
يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے[۱۷])۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لاکر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کرلیا ہے وہ (ساری باتیں سُننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستانِ پارینہ کے سوا کچھ نہیں[۱۸]۔

۱۷ – یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قانونِ فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے، کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں، وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن وارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرینِ حق کا سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعیِ حق کی کسی بات کا ان کے دل میں نہ اُترنا اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصُّب اور جمود کا فطری نتیجہ ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اُتر آتا ہے اور بے تعصُّبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رَویّہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا، اس کے دل کے دروازے ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقتِ واقعہ کا اظہار فرماتا ہے۔

۱۸ – نادان لوگوں کا عُموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی، یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریّہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے۔ حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانے سے ایک ہی امرِ حق کو پیش کرتے آئے ہیں، اور آیندہ بھی جو اس منبعِ علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دُہرائے گا۔ البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی وابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کی اُپج سے کچھ نظریّات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرۂ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُهْلِكُوْنَ إِلَّآ
أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا
يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾
بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوْٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا
الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۖ

وہ اس امرِ حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش! تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انھوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہوگی،[19] ورنہ اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انھیں منع کیا گیا ہے، وہ تو ہیں ہی جھوٹے (اس لیے اپنی اس خواہش کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لیں گے)۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔

۱۹ – یعنی ان کا یہ قول درحقیقت عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلیِ رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدۂ حق کا نتیجہ ہوگا، جس کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی کٹّے سے کٹّا کافر بھی انکار کی جراُت نہیں کر سکتا۔

قَالَ اَلَیۡسَ هٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ
بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۚ﴿۳۰﴾ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی ع
اِذَا جَآءَتۡهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً قَالُوۡا یٰحَسۡرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡهَا ۙ
وَهُمۡ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَهُمۡ عَلٰی ظُهُوۡرِهِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ ﴿۳۱﴾
وَمَا الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الۡاٰخِرَةُ

اس وقت ان کا رب ان سے پُوچھے گا: ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے: ”ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے۔“ وہ فرمائے گا: ”اچھا! تو اب اپنے انکارِ حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔“ع

نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے: ”افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔“ اور ان کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا بُرا بوجھ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں۔ دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے[20]، حقیقت میں آخرت ہی کا مقام

۲۰- اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل سنجیدہ کاروبار کی طرف واپس ہو جائے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں اور ان غلط فہمیوں میں پھنس کر لوگ حقیقتِ نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے، اس کی حیثیت حقیقت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں ہوتی جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے۔ حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے، قید کیا جاتا ہے اور اس کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ
الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى

اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں، پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لو گے؟

اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمھیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں[۲۱]۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسُول جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور اُن اذیّتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں نے

ایسے ہی تماشے اس دُنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں، حالاں کہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام ونشان تک موجود نہیں۔ کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے، حالاں کہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رزّاق بنا ہوا ہے، حالاں کہ بیچارہ خود اپنے رزق کے لیے کسی اَور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزت اور ذلّت دینے والا، نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گردوپیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے، حالاں کہ بندگی کی ذلّت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا جھٹکا اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انھی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلے جا رہے ہیں، موت کی ساعت آتے ہی یکلخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اُس عالَم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابقِ حقیقت ہوگا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ لایا ہے جو میزانِ حق میں کسی وزن اور کسی قدر وقیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

۲۱ – واقعہ یہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپؐ کی قوم کے سب لوگ آپؐ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپؐ کی راست بازی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو جھٹلایا اُس وقت جب کہ آپؐ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دُوسرے دَور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپؐ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپؐ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ دنیا کے کسی معاملے میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے جتنی آپؐ کی تکذیب کی، وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ
وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ
اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی
السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی

صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں[۲۲] ہے، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سُرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو[۲۳]۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا،

سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: انا لا نکذبك ولکن نکذب ما جئت به۔ ''ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔'' جنگِ بَدر کے موقع پر اَخنس بن شَرِیق نے تخلیے میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمھارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم سچّا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ اس نے جواب دیا کہ ''خدا کی قسم محمدؐ ایک سچّا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لِوا اور سقایت اور حجابت اور نبوّت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصّے میں آ جائے تو بتاؤ، باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟'' اسی بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو تسلّی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمھاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمّل و بُردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔

۲۲- یعنی اللہ نے حق اور باطل کی کش مکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے، اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمایشوں کی بھٹّی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا، اپنی راست بازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکّل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دَور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اِسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاقِ فاضلہ و سیرتِ صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نُصرت ٹھیک اپنے وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

۲۳- نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدّتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِينَ ﴿٣٥﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ؕ

وقف غفران النّبیﷺ

لہٰذا نادان مت[۲۴] بنو۔ دعوتِ حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سُننے والے ہیں،

نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش! کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے اِن لوگوں کا کفر ٹُوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کرلیں۔ آپؐ کی اِسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں، اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیّتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو، اُسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمُود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا، اور تمھیں گمان ہے کہ اس جمُود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمھارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھُس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے اُمّید نہ رکھو کہ ہم تمھاری یہ خواہش پوری کریں گے، کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۴ – یعنی اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رَو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلے میں جِدّ وجُہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارے سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقے پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں، وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اُس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوّق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعے میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اُصولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جِدّ وجُہد کر کے فطری ارتقا کی راہ سے اقامتِ دینِ حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلے پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے، وہ مدد بھی انھیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدّنِ فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیّتِ صالحہ تعمیر کر دے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا، کیونکہ یہ اللہ کی اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمّہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، اسے تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں، طاعت وعِصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مُہلت عطا کی ہے، اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلے کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

وقف غفران

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ
لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا
طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى
الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ

رہے مُردے[۲۵]، تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اُٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری؟ کہو: اللہ نشانی اتارنے کی پُوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مُبتلا ہیں[۲۶]۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہَوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوِشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں[۲۷]۔ اللہ جسے چاہتا ہے

۲۵- سُننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر زندہ ہیں، جنھوں نے اپنی عقل وفکر کو معطّل نہیں کر دیا ہے، اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازوں پر تعصب اور جمود کے قفل نہیں چڑھا دیے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مُردہ وہ لوگ ہیں جو لکیر کے فقیر بنے اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں اور اس لکیر سے ہٹ کر کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ صریح حق ہی کیوں نہ ہو۔

۲۶- نشانی سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں، بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے، جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے

Maktaba Tul Ishaat.com

يُضۡلِلۡهُ ؕ وَمَنۡ يَّشَاۡ يَجۡعَلۡهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۳۹﴾ قُلۡ

بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔[۲۸] ان سے کہو:

نہیں سمجھتے۔

۲۷ – مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں محض تماش بنی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبیؐ جس چیز کی طرف بُلا رہا ہے وہ امرِحق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے گردوپیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہَوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک اس کے مناسبِ حال بنائی گئی ہے۔ کس طرح اس کی جِبِلّت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حُدود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی، اُسی مَقام پر جہاں وہ ہے، خبرگیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جارہی ہے۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جارہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطے کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدایش، تناسُل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اِسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبرؑ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رَویّے کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائبِ قدرت کے کرشمے دکھا کر تمھارا دل بہلایا جائے۔

۲۸ – خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعے کی توفیق نہ بخشی جائے، اور ایک متعصّب غیر حقیقت پسند طالبِ علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہمیوں میں اُلجھانے والی چیزیں اسے حق سے دُور اور دُور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالبِ حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور اَنفُس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انھیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانیات (Zoology)، نباتات (Botany)، حیاتیات (Biology)، ارضیات (Geology)، فلکیات (Astronomy)، عضویات (Physiology)، علم التشریح (Anatomy) اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاریخ، آثارِ قدیمہ اور عُلومِ اجتماع (Social Sciences) کی تحقیق کرتے ہیں اور

اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اَور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔[۲۹] ع

ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ مگر چونکہ وہ مطالعے کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر دُنیا اور اس کے فوائد و مَنافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدے کے دَوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی، بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انھیں اُلٹی دہریت، الحاد، مادہ پرستی اور نیچریّت ہی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہِ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

۲۹ – گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے جو خود منکرینِ حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آ جاتی ہے، یا موت اپنی بھیانک صُورت کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، اُس وقت ایک خدا کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اُسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبُودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ کٹّے سے کٹّا دہریہ تک خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے، جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے گئے ہوں، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ابو جہل کے بیٹے عِکرِمہ کو اِسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکّہ معظّمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ
بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسُول بھیجے اور اُن قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جُھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو، جو انھیں کی گئی تھی، بُھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں، جو انھیں عطا کی گئی تھیں، خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنھوں نے

ہو گیا تو عِکْرِمَہ جِدّہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حَبَش کی راہ لی۔ راستے میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اوّل اوّل تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا، مگر جب طوفان کی شدّت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت عِکْرِمَہ کی آنکھیں کُھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو۔ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عِکْرِمَہ کی زندگی میں فیصلہ کُن لمحہ تھا۔ انھوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف

ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ
اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ
غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ
يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً
اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ
الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

ظلم کیا تھا، اور تعریف ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

اے محمدؐ! ان سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمھاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں پر مُہر کر دے[30] تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمھیں واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو، کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چُرا جاتے ہیں۔ کہو: کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا علانیہ تم پر عذاب آجائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟ ہم جو رسُول بھیجتے ہیں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔ پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں، وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔

مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی۔

۳۰- یہاں دلوں پر مُہر کرنے سے مراد سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب کر لینا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو: ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔[۳۱]“ پھر ان سے پوچھو: ”کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟[۳۲] کیا تم غور نہیں کرتے؟“ ع

۳۱– نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصوّر رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے، اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں، وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے، وہ حکم دے اور زمین سے خزانے اُبلنے لگیں، اس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں، وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیّتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہوا جسے بھوک اور پیاس لگے، جس کو نیند آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا پھرے، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اسی قسم کے تصوّرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی ذہنیّت پر مسلّط تھے۔ وہ جب آپؐ سے پیغمبری کا دعویٰ سُنتے تھے تو آپؐ کی صداقت جانچنے کے لیے آپؐ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارقِ عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپؐ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ انھی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۳۲– مطلب یہ ہے کہ میں جن حقیقتوں کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربے میں آئی ہیں، مجھے وحی کے ذریعے سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے۔ بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو، وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمھارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے، نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں، یا میں عالم الغیب ہوں، یا انسانی کمزوریوں سے مُبرّا ہوں۔

وَ اَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰی رَبِّهِمۡ لَیۡسَ لَهُمۡ
مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ
یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَیۡكَ
مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ

اور اے محمدؐ! تم اس (علمِ وحی) کے ذریعے سے اُن لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو ان کا حامی و مددگار ہو، یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے مُتنبّہ ہوکر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں[۳۳]۔ اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پُکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں، انھیں اپنے سے دُور نہ پھینکو[۳۴]۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔

۳۳- مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انھیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، ان پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اور اسی طرح ان لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس بے بنیاد بھروسے پر جی رہے ہیں کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کر گزریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہوگا، کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، یا فلاں ہماری سفارش کردے گا، یا فلاں ہمارے لیے کفّارہ بن چکا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم اپنا رُوئے سُخن ان لوگوں کی طرف رکھو جو خدا کے سامنے حاضری کا بھی اندیشہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ جھوٹے بھروسوں پر پُھولے ہوئے بھی نہ ہوں۔ اس نصیحت کا اثر صرف ایسے ہی لوگوں پر ہوسکتا ہے اور انھی کے دُرست ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۳۴- قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مُنجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپؐ کے گردوپیش ہماری قوم کے غلام، مَوالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزز لوگ ملے ہیں، بِلال، عَمّار، صُہَیب اور خَبّاب۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو برگزیدہ کیا جاسکتا تھا! پھر وہ ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ ان میں سے جس جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ
سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اس پر بھی اگر تم انھیں دُور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔[35] دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے،[36] تاکہ وہ اِنھیں دیکھ کر کہیں: ”کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟“ ـــــ ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو اِن سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو: ”تم پر سلامتی ہے۔ تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اُسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔[37]“

فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا، آج وہ بھی اس ”برگزیدہ گروہ“ میں شامل ہے۔ انھی باتوں کا جواب یہاں دیا جا رہا ہے۔

۳۵ – یعنی ہر شخص اپنے عیب و صواب کا ذمّہ دار آپ ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جواب دہی کے لیے تم کھڑے نہ ہو گے اور نہ تمھاری جواب دہی کے لیے ان میں سے کوئی کھڑا ہو گا۔ تمھارے حصّے کی کوئی نیکی یہ تم سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصّے کی کوئی بدی تم پر ڈال نہیں سکتے۔ پھر جب یہ محض طالبِ حق بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تو آخر تم کیوں انھیں اپنے سے دُور پھینکو۔

۳۶ – یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں، سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر ہم نے دولت اور عزّت کا گھمنڈ رکھنے والے لوگوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

۳۷ – جو لوگ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان میں بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جن سے

ع ۵ ۱۲

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٥٥﴾ قُلْ
اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ
اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾
قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِىْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ

اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔[۳۸] ع

اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دُوسروں کو پکارتے ہو، اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو: میں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہوگیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ کہو: میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو،[۳۹] فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین

زمانۂ جاہلیّت میں بڑے بڑے گناہ ہو چکے تھے۔ اب اسلام قبول کرنے کے بعد اگرچہ ان کی زندگیاں بالکل بدل گئی تھیں، لیکن مخالفینِ اسلام اُن کو سابق زندگی کے عُیُوب اور افعال کے طعنے دیتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اہلِ ایمان کو تسلّی دو۔ انھیں بتاؤ کہ جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے، اس کے پچھلے قصوروں پر گرفت کرنے کا طریقہ اللہ کے ہاں نہیں ہے۔

۳۸- ”اس طرح“ کا اشارہ اُس پورے سلسلۂ تقریر کی طرف ہے جو چوتھے رُکوع کی اِس آیت سے شروع ہوا تھا: ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری۔“ مطلب یہ ہے کہ ایسی صاف اور صریح دلیلوں اور نشانیوں کے بعد بھی جو لوگ اپنے کفر و انکار پر اصرار ہی کیے چلے جائیں، ان کا مجرم ہونا بالکل غیر مُشتبہ طور پر ثابت ہوا جاتا ہے، اور یہ حقیقت بالکل آئینے کی طرح نمایاں ہوئی جاتی ہے کہ دراصل یہ لوگ ضلالت پسندی کی بنا پر یہ راہ چل رہے ہیں، نہ اس بنا پر کہ راہِ حق کے دلائل واضح نہیں ہیں، یا یہ کہ کچھ دلیلیں ان کی اس گمراہی کے حق میں بھی موجود ہیں۔

۳۹- اشارہ ہے عذابِ الٰہی کی طرف۔ مخالفین کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہو اور ہم

Maktaba Tul Ishaat.com

الْفٰصِلِيْنَ ۞۵۷ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ
بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۞۵۸ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ
الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ
مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ
لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞۵۹ وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ
وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ
مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞۶۰ ع ۱۳

فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو: اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیے۔ اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ وہی ہے جو رات کو تمھاری رُوحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دُوسرے روز وہ تمھیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے، تاکہ زندگی کی مقرر مدّت پوری ہو۔ آخرکار اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ع

کُھلّم کُھلّا تم کو جھٹلا رہے ہیں تو کیوں نہیں خدا کا عذاب ہم پر ٹوٹ پڑتا؟ تمھارے مامون من اللہ ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ اِدھر کوئی تمھاری تکذیب یا توہین کرتا اور اُدھر فوراً زمین دھنستی اور وہ اس میں سما جاتا، یا بجلی گرتی اور وہ بھسم ہو جاتا۔ یہ کیا ہے کہ خدا کا فرستادہ اور اس پر ایمان لانے والے تو مصیبتوں پر مصیبتیں اور ذلّتوں پر ذلّتیں سہ رہے ہیں اور ان کو گالیاں دینے اور پتھر مارنے والے چین کیے جاتے ہیں؟

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝۶۱ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى
اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝۶۲
قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۶۳ قُلِ اللّٰهُ
يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝۶۴

اپنے بندوں پر وہ پُوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے[۴۰]، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے، پھر سب کے سب اللہ، اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! فیصلے کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

اے محمدؐ! ان سے پوچھو: صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمھیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چُپکے چُپکے دُعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تُو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ —— کہو: اللہ تمھیں اُس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے، پھر تم دُوسروں کو اُس کا شریک ٹھیراتے ہو[۴۱]۔

۴۰- یعنی ایسے فرشتے جو تمھاری ایک ایک جنبش اور ایک ایک بات پر نگاہ رکھتے ہیں اور تمھاری ہر ہر حرکت کا ریکارڈ محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

۴۱- یعنی یہ حقیقت کہ تنہا اللہ ہی قادرِ مُطلق ہے، اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمھاری بھلائی اور بُرائی کا مختارِ کُل ہے، اور اسی کے ہاتھ میں تمھاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے، اِس کی شہادت تو تمھارے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سر رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت تم بے اختیار اُسی کی طرف

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ
تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ
بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ۝٦٥ وَكَذَّبَ
بِهٖ قَوۡمُكَ وَهُوَ الۡحَقُّ ؕ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ؕ ۝٦٦ لِكُلِّ نَبَاٍ

کہو: وہ اِس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اُوپر سے نازل کر دے، یا تمھارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے، یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں[۴۲]۔ تمھاری قوم اُس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں[۴۳]، ہر خبر کے

رُجوع کرتے ہو۔ لیکن اس کُھلی علامت کے ہوتے ہوئے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل و حجّت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے۔ پلتے ہو اس کے رزق پر اور اَن داتا بناتے ہو دوسروں کو۔ مدد پاتے ہو اس کے فضل و کرم سے اور حامی و ناصر ٹھیراتے ہو دوسروں کو۔ غلام ہو اس کے اور بندگی بجالاتے ہو دوسروں کی۔ مشکل کشائی کرتا ہے وہ، بُرے وقت پر گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے، اور جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو تمھارے مشکل کُشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں کے نام کی۔

۴۲- جو لوگ عذابِ الٰہی کو اپنے سے دُور پا کر حق دشمنی میں جرأت پر جرأت دکھا رہے تھے، انھیں متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ہوا کا ایک طوفان تمھیں اچانک برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمھاری بستیوں کو پیوندِ خاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔ قبیلوں اور قوموں اور ملکوں کی عداوتوں کے میگزین میں ایک چنگاری وہ تباہی پھیلا سکتی ہے کہ سال ہا سال تک خوں ریزی و بدامنی سے نجات نہ ملے۔ پس اگر عذاب نہیں آ رہا ہے تو یہ تمھارے لیے غفلت و مدہوشی کی پینک نہ بن جائے کہ مطمئن ہو کر صحیح و غلط کا امتیاز کیے بغیر اندھوں کی طرح زندگی کے راستے پر چلتے رہو۔ غنیمت سمجھو کہ اللہ تمھیں مہلت دے رہا ہے اور وہ نشانیاں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے جن سے تم حق کو پہچان کر صحیح راستہ اختیار کر سکو۔

۴۳- یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمھیں دکھاؤں اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو

مُّسۡتَقَرٌّ ۫ وَّسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ
اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ‌ ؕ وَ اِمَّا
يُنۡسِيَنَّكَ الشَّيۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرٰى مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۶۸﴾
وَمَا عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّلٰـكِنۡ ذِكۡرٰى
لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾ وَذَرِ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَعِبًا وَّلَهۡوًا

ظُہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا۔

اور اے محمدؐ! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دُوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمھیں بُھلاوے میں ڈال دے[۴۴] تو جس وقت تمھیں اس غلطی کا احساس ہو جائے، اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمّہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا اُن کا فرض ہے، شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں[۴۵]۔ چھوڑو اُن لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے

وہ بزور تمھاری سمجھ میں اُتار دوں۔ اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں۔ میرا کام صرف حق اور باطل کو ممیّز کر کے تمھارے سامنے پیش کر دینا ہے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس بُرے انجام سے میں تمھیں ڈراتا ہوں، وہ اپنے وقت پر خود تمھارے سامنے آ جائے گا۔

۴۴ – یعنی اگر کسی وقت ہماری یہ ہدایت تمھیں یاد نہ رہے اور تم بُھولے سے ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہ جاؤ۔

۴۵ – مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں، ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انھیں قائل کر کے ہی چھوڑیں گے، اور ان کے ہر لغو و مُہمل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے، اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنھیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہیں انھیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَذَكِّرۡ بِهٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا
كَسَبَتۡ ‌ۖ لَيۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ ‌ۚ وَاِنۡ تَعۡدِلۡ
كُلَّ عَدۡلٍ لَّا يُؤۡخَذۡ مِنۡهَا ‌ؕ اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا كَسَبُوۡا ‌ۚ
لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ ۞ ۷۰ قُلۡ
اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى
اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسۡتَهۡوَتۡهُ الشَّيٰطِيۡنُ فِى
الۡاَرۡضِ حَيۡرَانَ ۖ لَهٗۤ اَصۡحٰبٌ يَّدۡعُوۡنَهٗۤ اِلَى الۡهُدَى ائۡتِنَا ‌ؕ

ع ۸ / ۱۲

اور جنھیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں، مگر یہ قرآن سُنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتُوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے، اور گرفتار بھی اِس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لیے نہ ہو، اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیے میں دے کر چھُوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے، ان کو تو اپنے انکارِ حق کے معاوضے میں کھولتا ہُوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے پُوچھو: کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پُکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اُس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگردان پھر رہا ہو، درآں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ اِدھر آ، یہ سیدھی راہ موجود ہے؟

پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اُتر آئیں تو اہلِ حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کُشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انھیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو

قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۷۱﴾
وَاَنۡ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوۡهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ
هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ

کہو: حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے[46]۔ اور جس دن وہ کہے گا کہ

اُن لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیے جو خود طالبِ حق ہوں۔

۴۶ – قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے یا حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ ارشاد بہت وسیع معانی پر مشتمل ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایشور جی کی لیلا نہیں ہے۔ یہ کسی بچے کا کھلونا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے وہ اس سے کھیلتا رہے اور پھر یونہی اُسے توڑ پھوڑ کر پھینک دے۔ دراصل یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے، ایک مقصدِ عظیم اس کے اندر کار فرما ہے، اور اس کا ایک دَور گزر جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ خالق اُس پُورے کام کا حساب لے جو اُس دَور میں انجام پایا ہو، اور اسی دَور کے نتائج پر دوسرے دَور کی بنیاد رکھے۔ یہی بات ہے جو دوسرے مقامات پر یوں بیان کی گئی ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ ''اے ہمارے رب! تُو نے یہ سب کچھ فضول پیدا نہیں کیا ہے۔'' اور وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ۔ ''ہم نے آسمان و زمین اور ان چیزوں کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔'' اور اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ ''تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟''

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سارا نظامِ کائنات حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ عدل اور حکمت اور راستی کے قوانین پر اس کی ہر چیز مبنی ہے۔ باطل کے لیے فی الحقیقت اس نظام میں جڑ پکڑنے اور بار آور ہونے کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ اللہ باطل پرستوں کو موقع دے دے کہ وہ اگر اپنے جھوٹ اور ظلم اور ناراستی کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اپنی کوشش کر دیکھیں۔ لیکن آخر کار زمین باطل کے ہر بیج کو اُگل کر پھینک دے گی اور آخری فردِ حساب میں ہر باطل پرست دیکھ لے گا کہ جو کوششیں اس نے اس شجرِ خبیث کی کاشت اور آبیاری میں صرف کیں وہ سب ضائع ہو گئیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي
الصُّوْرِ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿٧٣﴾
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ

حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے۔ اور جس روز صُور پھونکا[47] جائے گا، اس روز پادشاہی اُسی کی ہو[48] گی، وہ غیب اور شہادت[49] ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔
ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: "کیا تُو بتوں کو خدا بناتا ہے[50]؟ میں تو

تیسرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس ساری کائنات کو بر بنائے حق پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حق کی بنا پر ہی وہ اس پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس کا حکم یہاں اس لیے چلتا ہے کہ وہی اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔ دوسروں کا حکم اگر بظاہر چلتا نظر بھی آتا ہو تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ، فی الحقیقت نہ ان کا حکم چلتا ہے، نہ چل سکتا ہے، کیونکہ کائنات کی کسی چیز پر بھی ان کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنا حکم چلائیں۔

۴۷ – صُور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہوگی، اس کی تفصیل ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قرآن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہُوا ہے، وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے ایک مرتبہ صُور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر نہ معلوم کتنی مدّت بعد، جسے اللہ ہی جانتا ہے، دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور تمام اوّلین و آخرین از سرِ نو زندہ ہو کر اپنے آپ کو میدانِ حشر میں پائیں گے۔ پہلے صُور پر سارا نظامِ کائنات دَرہم بَرہم ہوگا اور دوسرے صُور پر ایک دوسرا نظام نئی صورت اور نئے قوانین کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔

۴۸ – یہ مطلب نہیں ہے کہ آج پادشاہی اس کی نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس روز جب پردہ اُٹھایا جائے گا اور حقیقت بالکل سامنے آ جائے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب جو با اختیار نظر آتے تھے، یا سمجھے جاتے تھے، بالکل بے اختیار ہیں اور پادشاہی کے سارے اختیارات اسی ایک خدا کے لیے ہیں جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

۴۹ – غیب: وہ سب کچھ جو مخلوقات سے پوشیدہ ہے۔

شہادت: وہ سب کچھ جو مخلوقات کے لیے ظاہر و معلوم ہے۔

۵۰ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کا ذکر اس امر کی تائید اور شہادت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے شرک کا انکار کیا ہے اور سب مصنوعی خداؤں سے منہ موڑ کر صرف ایک مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے، اسی طرح کل یہی کچھ ابراہیم علیہ السلام بھی کر چکے ہیں۔

اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔‘‘ ابراہیمؑ کو ہم اِسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے[۵۱] تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو[۵۲] جائے۔

اور جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں سے ان کی جاہل قوم جھگڑ رہی ہے، اسی طرح کل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ان کی قوم یہی جھگڑا کر چکی ہے۔ اور کل جو جواب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو دیا تھا، آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروؤں کی طرف سے ان کی قوم کو بھی وہی جواب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس راستے پر ہیں جو نوحؑ اور ابراہیمؑ اور نسلِ ابراہیمی کے تمام انبیاؑ کا راستہ رہا ہے۔ اب جو لوگ ان کی پیروی سے انکار کر رہے ہیں، انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ انبیاؑ کے طریقے سے ہٹ کر ضلالت کی راہ پر جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ عرب کے لوگ بالعُموم حضرت ابراہیمؑ کو اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے تھے۔ خُصوصاً قریش کے تو فخر و ناز کی ساری بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے تعمیر کردہ خانۂ خدا کے خادم ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے عقیدۂ توحید کا اور شرک سے اُن کے انکار اور مشرک قوم سے اُن کی نزاع کا ذکر کرنے کے معنٰی یہ تھے کہ قریش کا سارا سرمایۂ فخر و ناز اور کفارِ عرب کا اپنے مشرکانہ دین پر سارا اطمینان ان سے چھین لیا جائے، اور اُن پر ثابت کر دیا جائے کہ آج مسلمان اُس مقام پر ہیں جس پر حضرت ابراہیم تھے، اور تمھاری حیثیت وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے لڑنے والی جاہل قوم کی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے معتقدوں اور قادری النسب پیرزادوں کے سامنے حضرتِ شیخ کی اصل تعلیمات اور ان کی زندگی کے واقعات پیش کر کے یہ ثابت کر دے کہ جن بزرگ کے تم نام لیوا ہو، تمھارا اپنا طریقہ ان کے بالکل خلاف ہے اور تم نے آج انھی گمراہ لوگوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن کے خلاف تمھارے مُقتدا تمام عمر جہاد کرتے رہے۔

۵۱ – یعنی جس طرح تم لوگوں کے سامنے آثارِ کائنات نمایاں ہیں اور اللہ کی نشانیاں تمھیں دکھائی جا رہی ہیں، اُسی طرح ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ مگر تم لوگ انھیں دیکھنے پر بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے اور ابراہیمؑ نے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہی سورج اور چاند اور تارے جو تمھارے سامنے طُلوع و غروب ہوتے ہیں اور روزانہ تم کو جیسا گمراہ طلوع ہوتے وقت پاتے ہیں ویسا ہی غروب ہوتے وقت چھوڑ جاتے ہیں، انھی کو اُس آنکھوں والے انسان نے بھی دیکھا تھا اور انھی نشانات سے وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔

۵۲ – اس مقام کو اور قرآن کے اُن دوسرے مقامات کو جہاں حضرت ابراہیمؑ سے اُن کی قوم کی نزاع کا ذکر آیا

Maktaba Tul Ishaat.com

ہے، اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے مذہبی وتمدّنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جدید اثری تحقیقات کے سلسلے میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، بلکہ دَورِ ابراہیمی میں اُس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham", London, 1935) میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں، ان کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیمؑ کے ظُہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی، اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی وتجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلّقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مُقام تھا اس کے حُدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت وتجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادّہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسایش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدّمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دُعائیں زیادہ تر درازیِ عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہُوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی:

(۱) عَمیلو: یہ اُونچے طبقے کے لوگ تھے جن میں پُجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مِشکینو: یہ تُجّار، اہلِ صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اَردو: یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقہ، یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے، اور ان کی جان ومال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تَلمُود میں ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقے کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدے دار تھا۔ (دیکھو سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۹۰)

اُر کے کَتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربُّ البَلَد، مہادیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبُودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا ربُّ البَلَد ’’نَنّار‘‘ (چاند دیوتا) تھا، اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام ’’قَمرِینہ‘‘ بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اُس کا ربُّ البَلَد ’’شماش‘‘ (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیّاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے،

اور لوگ اپنی مختلف فُروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بُتوں کی شکل میں بنالی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انھی کے آگے بجا لائے جاتے تھے۔

نَنّار کا بُت اُر میں سب سے اُونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ''نَنّار'' کی بیوی ''نن گل'' کا مَعبَد تھا۔ نَنّار کے مَعبَد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پُجارن جا کر اس کی دُلھن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (religious prostitutes) کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزّز خیال کی جاتی تھی جو ''خدا'' کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو ''راہِ خدا'' میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پُجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

نَنّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ مُلک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تُجّار سب ہر قسم کے غلّے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے، جنھیں وصول کرنے کے لیے مندر میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پُجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر مُلک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پُجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے ''خدا'' کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیّت بھی نَنّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نَنّار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبُودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں حکمران تھا، اس کے بانیِ اوّل کا نام اُرنَمُّو تھا، جس نے ۲۳۰۰ برس قبلِ مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حُدُودِ مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لُبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُسی سے اس خاندان کو ''نَمُّو'' کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو نَنّار کے بُت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لَرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخرِ کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابِل نے زور پکڑا اور لَرسہ اور اُر دونوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے نَنّار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا، کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعیُّن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے اَدوار میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ قبلِ مسیح میں بابِل کے بادشاہ حَمورابی (بائبل کے اَمرافِیل) نے جو قوانین مرتب کیے تھے، وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی تدوین میں مشکوٰۃِ نبوّت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ
لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝۷۶ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ
الضَّآلِّيْنَ ۝۷۷ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ
فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۷۸ اِنِّيْ

چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا: یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا: ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا: یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا: یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھا: ”اے برادرانِ قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو[۵۳]۔ میں نے تو

ان قوانین کا مُفصّل کتبہ ۱۹۰۲ بعدِ مسیح میں ایک فرانسیسی مفتش آثارِ قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C.H.W. John نے ۱۹۰۳ بعدِ مسیح میں (The Oldest Code of Law) کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اُصول اور فُروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری مَعاشی، تمدّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے، اس کا اثر صرف بُتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیّت، پُجاریوں اور اُونچے طبقوں کی معاشرتی، مَعاشی اور سیاسی حیثیت، اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اُس کی زد میں آئی جاتی تھی۔ اُن کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اُوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سرِ نَو توحید اللہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اِسی لیے ابراہیم علیہ السّلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پُجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۵۳ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اُس ابتدائی تفکّر کی کیفیّت بیان کی گئی ہے جو منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے

پہلے اُن کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان، جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکتی تھی، کس طرح آثارِ کائنات کا مشاہدہ کر کے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح اِستدلال کر کے امرِ حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُوپر قومِ ابراہیمؑ کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند، سورج اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور و فکر کیا اور آخرِ کار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جن جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی رُبُوبیّت کا شائبہ تک نہیں ہے، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا ہے۔

اس قصّے کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر چاند دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا، اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ غور و فکر تو انھوں نے سِنِ رُشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصّہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا؟ گویا اس خاص واقعے سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مُستبعَد ہے۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصہ تصنیف کریں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں سِنِ رُشد کو پہنچنے تک وہ چاند، تاروں اور سورج کے مُشاہَدے سے محروم رکھے گئے تھے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجّہ ہو گیا کہ اشیا آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانونِ جذب و کشش کے اِستِنباط تک پہنچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعے سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہو گی اور بارہا دیکھی ہو گی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مُشاہَدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روز مرّہ کے ایسے سیکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متأثر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اُسی چیز کو دیکھ کر یکا یک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَ
قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ
شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ

یکسُو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہوسکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہُوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟[۵۴] اور آخر میں تمھارے

طرف کام کرنے لگتی ہیں۔ یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن اُلجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرّہ ہی کے مُشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گُتھی کا وہ سِرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری اُلجھنیں سُلجھتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں۔ سورج اور چاند اور تارے سب ہی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اُس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحیدِ الٰہی کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظامِ زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے، اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آ کر کشودِ کار کے لیے کلید بن گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے ہی سے ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر ہی سہی، وہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سَمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو

اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ
بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا وقف لازم
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع ۱۵

ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ، اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انھی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔[۵۵]" ع

ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہُوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب اِن میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو دراصل یہ اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا، وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔

۵۴- اصل میں لفظ تَذَكُّر استعمال ہوا ہے، جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بُھلاوے میں پڑا ہُوا ہو، وہ چونک کر اُس چیز کو یاد کرلے جس سے وہ غافل تھا۔ اسی لیے ہم نے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، تمھارا اصلی و حقیقی رب اس سے بے خبر نہیں ہے، اس کا علم ساری چیزوں پر وسیع ہے، پھر کیا اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی تمھیں ہوش نہ آئے گا؟

۵۵- یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ وہ قوم اللہ فاطر السماوات والارض کی ہستی کی منکر نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جُرم اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور خداوندانہ حُقوق میں شریک قرار دینا تھا۔ اوّل تو حضرت ابراہیمؑ خود ہی فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرتے ہو۔ دوسرے جس طرح آپ ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ اندازِ بیان صرف اُنھی لوگوں کے مقابلے میں اختیار کیا جاسکتا ہے جو اللہ کے نفسِ وجود سے منکر نہ ہوں۔ لہٰذا اُن مفسّرین کی رائے درست نہیں ہے جنھوں نے اس مقام پر اور حضرت ابراہیمؑ کے سلسلے میں دوسرے مقامات پر قرآن کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ
نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ

یہ تھی ہماری وہ حجّت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی۔ (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اُسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا)۔

بیانات کی تفسیر اس مفروضہ پر کی ہے کہ قومِ ابراہیمؑ اللہ کی منکر یا اس سے ناواقف تھی اور صرف اپنے معبُودوں ہی کو خدائی کا بالکُلّیہ مالک سمجھتی تھی۔

آخری آیت میں یہ جو فقرہ ہے کہ ”جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا“، اس میں لفظ ظلم سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس سے مراد معصیت ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرما دی کہ دراصل یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کو مانیں اور اپنے اس ماننے کو کسی مشرکانہ عقیدہ و عمل سے آلودہ نہ کریں، امن صرف اُنھی کے لیے ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ واقعہ جو حضرت ابراہیمؑ کی عظیم الشان پیغمبرانہ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے، بائبل میں کوئی جگہ نہیں پا سکا ہے۔ البتہ تلمُود میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں قرآن سے مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی جُستجوئے حقیقت کو سورج سے شروع کر کے تاروں تک اور پھر خدا تک لے جاتی ہے۔ دوسرے اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب سورج کو هٰذَا رَبِّيْ کہا تو ساتھ ہی اس کی پرستش بھی کر ڈالی، اور اسی طرح

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ
وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ
وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ
اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ

ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ، الیسعؑ، اور یونسؑ اور لُوطؑ کو (راستہ دکھایا)۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دُنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آبا واجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لیے چُن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے

چاند کو بھی انھوں نے هٰذَا رَبِّيْ کہہ کر اس کی پرستش کی۔

۵۶ – یعنی جس شرک میں تم لوگ مُبتلا ہو، اگر کہیں وہ بھی اسی میں مُبتلا ہوئے ہوتے تو یہ مرتبے ہرگز نہ پا سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص کامیاب ڈاکا زنی کر کے فاتح کی حیثیت سے دُنیا میں شہرت پا لیتا، یا زر پرستی میں کمال پیدا کر کے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا، یا کسی اور صورت سے دُنیا کے بدکاروں میں نامور بدکار بن جاتا۔ لیکن یہ امامِ ہدایت اور امام المتقین ہونے کا شرف اور یہ دُنیا بھر کے لیے خیر و صلاح کا سرچشمہ ہونے کا مقام تو کوئی بھی نہ پا سکتا اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتا۔

۵۷ – یہاں انبیا علیہم السلام کو تین چیزیں عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے: ایک کتاب، یعنی اللہ کا ہدایت نامہ۔ دوسرے حُکم، یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم، اور اس کے اُصولوں کو معاملاتِ زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت، اور مسائلِ حیات

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكَلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
ع ۱۰ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ
حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى

کچھ اَور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں[58]۔ اے محمدؐ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، اُنھی کے راستے پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔ع

ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے[59]۔ ان سے پوچھو: پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور

میں فیصلہ کُن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیّت۔ تیسرے نبوت، یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔

۵۸ – مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر و مشرک لوگ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کر دیں، ہم نے اہلِ ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو اس نعمت کی قدر کرنے والا ہے۔

۵۹ – پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کی جوابی تقریر سے صاف مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے، اس لیے قدرتی طور پر کفّارِ قریش اور دوسرے مشرکینِ عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رُجوع کرتے تھے اور ان سے پُوچھتے تھے کہ تم بھی اہلِ کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ کیا واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے، اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرگرم مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو، جسے مخالفینِ اسلام نے حجت بنا رکھا تھا، نقل کر کے اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچّی باتوں کو ردّ کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی اپنی مسلّمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو ردّ کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے

لِلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ‌ؕ قُلِ اللّٰهُ ‌ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا ‌ؕ

ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھُپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمھیں حاصل تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو، آخر اُس کا نازل کرنے والا کون تھا؟[۶۰] ـــــ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ، پھر اُنھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔ (اُسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اِس مرکز (یعنی مکّہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبّہ کرو۔

تھے کہ حضورؐ کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گزرتے تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علمِ حق اور ہدایت نامۂ زندگی نازل نہیں کیا ہے، وہ یا تو بشر پر نُزولِ وحی کو ناممکن سمجھتا ہے اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے، یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرُّف کے اختیارات تو دے دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ اسے دنیا میں اندھا دُھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔

۶۰ - یہ جواب چونکہ یہودیوں کو دیا جا رہا ہے اس لیے موسٰی علیہ السلام پر تورات کے نزول کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ خود اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ تسلیم کرنا کہ حضرت موسٰیؑ پر تورات نازل ہوئی تھی، ان کے اس قول کی آپ سے آپ تردید کر دیتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ نیز اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُوْنَ ۝٩٢ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ
اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں، وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں[61]۔ اور اُس شخص سے بڑا ظالم اَور کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، دراں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکراتِ موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے

---

۶۱ – پہلی دلیل اس بات کے ثبوت میں تھی کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور عملاً ہُوا بھی ہے۔ اب یہ دوسری دلیل اس بات کے ثبوت میں ہے کہ یہ کلام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اُصول پیش کیے گئے ہیں۔ عقائدِ صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاقِ فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے، اور پھر یہ جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فُحش اور دوسری اُن بُرائیوں سے، جن کا انبار تم لوگوں نے کُتُبِ مُقدّسہ کے مجموعے میں بھر رکھا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے، یہ کتاب اُن سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اُسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو اُن میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اُسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نُزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجامِ بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا ہے جن کی نظر حیاتِ دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رُونما ہوا ہے، اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ

بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ
الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ
اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى
مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ
تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ
فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ

ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ”لاؤ، نکالو اپنی جان، آج تمھیں اُن باتوں کی پاداش میں ذِلّت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اُس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔“ (اور اللہ فرمائے گا:) ”لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمھیں دُنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہم تمھارے ساتھ تمھارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلّق تم سمجھتے تھے کہ تمھارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصّہ ہے، تمھارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زُعم رکھتے تھے۔“ ع

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے[۶۲]۔ وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو

انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کیا یہ خُصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو، جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟

۶۲ – یعنی زمین کی تہوں میں بیج کو پھاڑ کر اس سے درخت کی کونپل نکالنے والا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ
الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ
لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

زندہ سے خارج کرتا ہے۔[۶۳] یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اُسی نے رات کو سُکون کا وقت بنایا ہے۔ اُسی نے چاند اور سُورج کے طُلوع و غروب کا حساب مقرّر کیا ہے۔ یہ سب اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔[۶۴] اور وہی ہے جس نے ایک مُتنفّس سے تم کو پیدا کیا،[۶۵] پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں۔[۶۶]

---

۶۳ – زندہ کو مُردہ سے نکالنے کا مطلب بے جان مادّے سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرنا ہے، اور مُردہ کو زندہ سے خارج کرنے کا مطلب جان دار اجسام میں سے بے جان مادّوں کو خارج کرنا ہے۔

۶۴ – یعنی اِس حقیقت کی نشانیاں کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی دوسرا نہ خدائی کی صفات رکھتا ہے، نہ خدائی کے اختیارات میں حصّہ دار ہے، اور نہ خدائی کے حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے۔ مگر ان نشانیوں اور علامتوں سے حقیقت تک پہنچنا جاہلوں کے بس کی بات نہیں، اس دولت سے بہرہ ور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو علمی طریق پر آثارِ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ
كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا
مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ
مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جُھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دُوسرے سے ملتے جُلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خُصوصیّات جُدا جُدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ اِس پر بھی لوگوں نے جنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا،[۶۷]

---

۶۵ – یعنی نسلِ انسانی کی ابتدا ایک تنفّس سے کی۔

۶۶ – یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق، اور اس کے اندر مرد و زن کی تفریق، اور تناسُل کے ذریعے سے اس کی افزایش، اور رحمِ مادر میں انسانی بچّے کا نُطفہ قرار پا جانے کے بعد سے زمین میں اس کے سونپے جانے تک اس کی زندگی کے مختلف اطوار پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بے شمار کُھلی کُھلی نشانیاں آدمی کے سامنے آئیں گی جن سے وہ اُس حقیقت کو پہچان سکتا ہے جو اُوپر بیان ہوئی ہے۔ مگر ان نشانیوں سے یہ معرفت حاصل کرنا انھی لوگوں کا کام ہے جو سمجھ بُوجھ سے کام لیں۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے، جو صرف اپنی خواہشات سے اور انھیں پُورا کرنے کی تدبیروں ہی سے غرض رکھتے ہیں، اِن نشانیوں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

۶۷ – یعنی اپنے وہم وگمان سے یہ ٹھیرا لیا کہ کائنات کے انتظام میں اور انسان کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں اللہ کے ساتھ دُوسری پوشیدہ ہستیاں بھی شریک ہیں، کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی روئیدگی کا، کوئی دولت کی دیوی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ خَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يَصِفُوْنَ ۟ؑ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ
فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ
وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳ قَدْ جَآءَكُمْ
بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ

ع ۱۲ / ۱۸

حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بُوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں،[۶۸]
حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں ؏ وہ تو آسمانوں اور زمین کا
مُوجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ کوئی اس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔
اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب، کوئی خدا اس
کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس
کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔

دیکھو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں، اب
جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اُٹھائے گا، مَیں

ہے تو کوئی بیماری کی، وغیر ذالكَ مِنَ الخرافات۔ اِس قسم کے لَغو اعتقادات دُنیا کی تمام مشرک قوموں میں ارواح
اور شیاطین اور راکشسوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلّق پائے جاتے رہے ہیں۔

۶۸ – جُہلائے عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اِسی طرح دُنیا کی دُوسری مشرک قوموں نے بھی خدا
سے سلسلۂ نسب چلایا ہے اور پھر دیوتاؤں اور دیویوں کی ایک پُوری نسل اپنے واہمہ سے پیدا کر دی ہے۔

مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ
وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ

تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔[۶۹]

اِس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں، تم کسی سے پڑھ آئے ہو، اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں۔[۷۰] اے محمدؐ! اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے،

۶۹۔ یہ فقرہ اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہے مگر نبیؐ کی طرف سے ادا ہو رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں جس طرح مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں کہ کبھی نبیؐ سے خطاب ہوتا ہے، کبھی اہلِ ایمان سے، کبھی اہلِ کتاب سے، کبھی کُفّار و مُشرکین سے، کبھی قریش کے لوگوں سے، کبھی اہلِ عرب سے اور کبھی عام انسانوں سے، حالانکہ اصل غرض پوری نوعِ انسانی کی ہدایت ہے، اسی طرح مُتکلّم بھی بار بار بدلتے ہیں کہ کہیں متکلّم خدا ہوتا ہے، کہیں وحی لانے والا فرشتہ، کہیں فرشتوں کا گروہ، کہیں نبیؐ، اور کہیں اہلِ ایمان، حالانکہ ان سب صُورتوں میں کلام وہی ایک خدا کا کلام ہوتا ہے۔

''میں تم پر پاسباں نہیں ہوں'' یعنی میرا کام بس اتنا ہی ہے کہ اس روشنی کو تمھارے سامنے پیش کر دوں۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمھارا اپنا کام ہے۔ میرے سُپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنھوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انھیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔

۷۰۔ یہ وہی بات ہے جو سُورۂ بقرہ رُکوع ۳ میں فرمائی گئی ہے کہ مچھر اور مکڑی وغیرہ چیزوں کی تمثیلیں سُن کر حق کے طالب تو اس صداقت کو پا لیتے ہیں جو ان تمثیلوں کے پیرایے میں بیان ہوئی ہے، مگر جن پر انکار کا تعصّب مسلّط ہے، وہ طنز سے کہتے ہیں کہ بھلا اللہ کے کلام میں ان حقیر چیزوں کے ذکر کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اُسی مضمون کو یہاں ایک دُوسرے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ یہ کلام لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا ہے، جس سے کھوٹے اور کھرے انسان ممیّز ہو جاتے ہیں۔ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو اس کلام کو سُن کر یا پڑھ کر اس کے مقصد و مدّعا پر غور کرتے ہیں اور جو حکمت و نصیحت کی باتیں اس میں فرمائی گئی ہیں ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک دوسری طرح کے انسانوں کا حال یہ ہے کہ اسے سُننے اور پڑھنے کے بعد ان کا ذہن مغزِ کلام کی طرف متوجّہ ہونے کے بجائے اس ٹٹول میں لگ جاتا ہے کہ آخر یہ اُمّی انسان یہ مضامین لایا کہاں سے ہے، اور چونکہ مخالفانہ تعصّب پہلے سے ان کے دل پر قبضہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے ایک خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صُورتیں وہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں اور انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کر لی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ
مَآ اَشۡرَكُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ۚ وَمَآ اَنۡتَ
عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ
فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًاۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ

کیونکہ اُس ایک رب کے سوا کوئی اَور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیّت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کرسکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔[۷۱] اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پُکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔[۷۲] ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوش نما

۷۱ - مطلب یہ ہے کہ تمھیں داعی اور مبلّغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اِس روشنی کو پیش کرو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمھاری ذمّہ داری وجواب دِہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمھارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انھیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اُس کی آزمایش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمھارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمھیں دکھادی گئی ہے اُس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دُوسروں کو اُس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انھیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو، خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصِرّ ہیں، اس کی طرف جانے کے لیے انھیں چھوڑ دو۔

عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝١٠٨ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ
لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا
جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠٩ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ

بنا دیا ہے،[۷۳] پھر انھیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی[۷۴] ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔[۷۵]" اور تمھیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔[۷۶] ہم اُسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ

۷۲ ۔ یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووٴں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواوٴں اور معبُودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دُور پھینک دے گی۔

۷۳ ۔ یہاں پھر اُس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم اپنے حواشی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ جو اُمور قوانینِ فطرت کے تحت رُونما ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنا فعل قرار دیتا ہے، کیونکہ وہی ان قوانین کا مقرر کرنے والا ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت رُونما ہوتا ہے وہ اسی کے امر سے رُونما ہوتا ہے۔ جس بات کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا ہے، اسی کو اگر ہم انسان بیان کریں تو اس طرح کہیں گے کہ فطرتاً ایسا ہی ہُوا کرتا ہے۔

۷۴ ۔ نشانی سے مراد کوئی ایسا صریح محسوس معجزہ ہے جسے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپؐ کے مامور من اللہ ہونے کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

۷۵ ۔ یعنی نشانیوں کے پیش کرنے اور بنا لانے کی قدرت مجھے حاصل نہیں ہے، ان کا اختیار تو اللہ کو ہے، چاہے دکھائے اور نہ چاہے نہ دکھائے۔

۷۶ ۔ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے جو بے تاب ہو ہو کر تمنّا کرتے تھے اور کبھی کبھی زبان سے بھی اس خواہش کا

Maktaba Tul Ishaat.com

يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۳

الجزء ۸

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا

شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے[۷۷]۔ ہم انھیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑے دیتے ہیں ۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے، اِلّا یہ کہ مشیّتِ الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں[۷۸]، مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جِنّوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے، جو ایک دُوسرے پر خوش آیند

اظہار کر دیتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے اُن کے گمراہ بھائی راہِ راست پر آ جائیں۔ ان کی اسی تمنا اور خواہش کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ آخر تمھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ ان لوگوں کا ایمان لانا کسی نشانی کے ظہور پر موقوف نہیں ہے۔

۷۷- یعنی ان کے اندر وہی ذہنیت کام کیے جا رہی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پہلی مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سُن کر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر میں ابھی تک کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا ہے۔ وہی عقل کا پھیر اور نظر کا بھینگا پن جو انھیں اُس وقت صحیح سمجھنے اور صحیح دیکھنے سے روک رہا تھا، آج بھی ان پر اسی طرح مُسلّط ہے۔

۷۸- یعنی یہ لوگ اپنے اختیار و انتخاب سے تو حق کو باطل کے مقابلے میں ترجیح دے کر قبول کرنے والے ہیں نہیں۔ اب اِن کے حق پرست بننے کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ عملِ تخلیق و تکوین سے جس طرح تمام بے اختیار مخلوقات کو حق پرست پیدا کیا گیا ہے اسی طرح انھیں بھی بے اختیار کر کے جِبلّی و پیدایشی حق پرست بنا ڈالا جائے۔ مگر یہ اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تمھارا یہ توقع کرنا فضول ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنی تکوینی مداخلت سے ان کو مومن بنائے گا۔

زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ
وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصۡغٰۤى اِلَيۡهِ اَفۡـِٕدَةُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ

باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر اِلقا کرتے رہے ہیں۔[۷۹] اگر تمھارے رب کی مشیّت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔[۸۰] پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انھیں اسی لیے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے

۷۹ – یعنی آج اگر شیاطینِ جِنّ و اِنس متفق ہو کر تمھارے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمھارے ہی ساتھ پیش آ رہی ہو۔ ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے لیے اُٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔

’’خوش آیند باتوں‘‘ سے مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعیِ حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں۔ پھر ان سب باتوں کو بحیثیتِ مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفینِ حق استعمال کرتے ہیں، وہ نہ صرف دُوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

۸۰ – یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی مَشِیّت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے، جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیّت اور اس کے اذن کے تحت رُونما ہونا لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دُنیا میں کوئی واقعہ کبھی صُدُور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صُدُور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اس کے صُدُور کی گنجایش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیّت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متّقی انسان کا ایمان و تقویٰ بھی مشیّتِ الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مَشِیّت کے تحت رُونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دُوسری قسم کے واقعات کو اُس کی رضا اور اس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔ اگرچہ آخرِکار کسی خیرِ عظیم ہی کے لیے فرمانروائے کائنات کی مشیّت کام کر رہی ہے، لیکن اُس خیرِ عظیم کے ظُہور کا راستہ نُور و ظلمت، خیر و شر اور صلاح و فساد کی مختلف قوتوں کے ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی بزرگ تر مَصلحتوں کی بنا پر وہ طاعت

Maktaba Tul Ishaat.com

بِالۡاٰخِرَةِ وَلِيَرۡضَوۡهُ وَلِيَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾
اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ

اُن کے دل اِس (خوشنما دھوکے) کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور اُن بُرائیوں کا اِکتساب کریں جن کا اِکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں ـــــ پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پُوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف

اور معصیت، ابراہیمیّت اور نمرُودیت، مُوسویت اور فرعونیّت، آدمیت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے۔ جو چاہے اِس کارگاہِ عالَم میں اپنے لیے خیر کا کام پسند کر لے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مصلحتیں اجازت دیتی ہیں، اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اس کے بندے اپنی آزادیِ انتخاب سے فائدہ اُٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دُشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیّت کا بار بار حوالہ دیتا ہے، اس سے مقصود دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو، یہ سمجھانا ہے کہ تمھارے کام کی نوعیّت فرشتوں کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکامِ الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بلکہ تمھارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلے میں اللہ کے پسند کردہ طریقے کو غالب کرنے کے لیے جِدّو جُہد کرنا ہے۔ اللہ اپنی مشیّت کے تحت اُن لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنھوں نے اپنی سعی و جُہد کے لیے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے، اور اسی طرح وہ تم کو بھی، جنھوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا ہے، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید و نصرت تمھارے ہی ساتھ ہے، کیونکہ تم اُس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے، لیکن تمھیں یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اُن لوگوں کو ایمان لانے پر مجبُور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے، یا ان شیاطینِ جنّ و اِنس کو زبردستی تمھارے راستے سے ہٹا دے گا جنھوں نے اپنے دل و دماغ کو اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کے لیے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمھیں باطل پرستوں کے مقابلے میں سخت کش مکش اور جِدّو جُہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہوگا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمھاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظُہور کا امکان نہ ہوتا۔

مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ
رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ
رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ
الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۱۵﴾ وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ
سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

کتاب نازل کر دی ہے[۸۱]؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمھارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو[۸۲]۔ تمھارے رب کی بات سچّائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔

اور اے محمدؐ! اگر تم اُن لوگوں کی اکثریّت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں[۸۳]۔

۸۱ – اس فقرے میں متکلّم نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خطاب مسلمانوں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے اپنی کتاب میں صاف صاف یہ تمام حقیقتیں بیان کر دی ہیں اور یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ فوق الفطری مداخلت کے بغیر حق پرستوں کو فطری طریقوں ہی سے غلبۂ حق کی جِدّوجُہد کرنی ہوگی، تو کیا اب مَیں اللہ کے سوا کوئی اور ایسا صاحبِ امر تلاش کروں جو اللہ کے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور ایسا کوئی معجزہ بھیجے جس سے یہ لوگ ایمان لانے پر مجبُور ہو جائیں؟

۸۲ – یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو واقعات کی توجیہ میں آج گھڑی گئی ہو۔ تمام وہ لوگ جو کُتُبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنھیں انبیا علیہم السلام کے مشن سے واقفیت حاصل ہے، اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے ٹھیک ٹھیک امرِ حق ہے اور وہ اَزَلی و اَبَدی حقیقت ہے جس میں کبھی فرق نہیں آیا ہے۔

۸۳ – یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں، علم کے بجائے قیاس وگمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیّلات، فلسفے، اُصولِ زندگی اور قوانینِ عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے، نہ کہ وہ جس کو

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ يَّضِلُّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ
بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ بِاٰيٰتِهٖ
مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ وَقَدۡ
فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ ؕ

درحقیقت تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کے راستے سے ہٹا ہُوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اُس کا گوشت کھاؤ۔[۸۴] آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے، اُن کی تفصیل وہ تمھیں بتا چکا ہے۔[۸۵]

لوگوں نے بطورِ خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہٰذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دُنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں، بلکہ اسے پُوری ثابت قدمی کے ساتھ اُس راہ پر چلنا چاہیے جو اللہ نے بتائی ہے، چاہے اس راستے پر چلنے کے لیے وہ دُنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔

۸۴ – مِن جملہ ان غلط طریقوں کے جو اکثر اہلِ زمین نے بطورِ خود قیاس و گمان سے تجویز کر لیے اور جنھیں مذہبی حُدُود و قُیُود کی حیثیت حاصل ہوگئی، ایک وہ پابندیاں بھی ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں میں مختلف قوموں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ بعض چیزوں کو لوگوں نے آپ ہی آپ حلال قرار دے لیا ہے، حالانکہ اللہ کی نظر میں وہ حرام ہیں۔ اور بعض چیزوں کو انھوں نے خود حرام ٹھیرا لیا ہے، حالانکہ اللہ نے انھیں حلال کیا ہے۔ خُصُوصیّت کے ساتھ سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مُصِرّ تھے اور آج بھی دُنیا کے بعض گروہ مُصِرّ ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک ناجائز ہے اور اللہ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ بالکل جائز ہے۔ اسی کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو اُن تمام اَوہام اور تعصّبات کو چھوڑ دو جو کفّار و مشرکین میں پائے جاتے ہیں، اُن سب پابندیوں کو توڑ دو جو خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر لوگوں نے خود عائد کر رکھی ہیں، حرام صرف اسی چیز کو سمجھو جسے خدا نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھیراؤ جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔

۸۵ – مُلاحظہ ہو سورۂ نحل، آیت ۱۱۵۔ اس اشارے سے ضمناً یہ بھی متحقق ہُوا کہ سورۂ نحل اس سُورہ سے پہلے نازل

وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا
يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ
لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴

بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کُن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمھارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات اِلقا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں[۸۶]۔ لیکن اگر تم نے اُن کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو[۸۷]۔ ع

ہو چکی تھی۔

۸۶ – حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ علمائے یہود جُہلائے عرب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے لیے جو سوالات سکھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ”آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام ہو اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو جائے۔“ یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اس ٹیڑھی ذہنیت کا جو ان نام نہاد اہلِ کتاب میں پائی جاتی تھی۔ وہ اس قسم کے سوالات گھڑ گھڑ کر پیش کرتے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں شُبہات ڈالیں اور انھیں حق سے لڑنے کے لیے ہتھیار فراہم کر دیں۔

۸۷ – یعنی ایک طرف اللہ کی خداوندی کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سے پھرے ہوئے لوگوں کے احکام پر چلنا اور ان کے مقرر کیے ہوئے طریقوں کی پابندی کرنا، شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی سراسر اللہ کی اطاعت میں بسر ہو۔ اللہ کے ساتھ اگر دُوسروں کو اعتقاداً مستقل بالذّات مُطاع مان لیا جائے تو یہ اعتقادی شرک ہے، اور اگر عملاً ایسے

Maktaba Tul Ishaat.com

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي
النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا

کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی[۸۸] اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہُوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟[۸۹] کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نُما بنا دیے گئے ہیں،[۹۰] اور اسی طرح ہم نے

لوگوں کی اطاعت کی جائے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود امر و نہی کے مختار بن گئے ہوں تو یہ عملی شرک ہے۔

۸۸ – یہاں موت سے مُراد جہالت و بے شُعوری کی حالت ہے، اور زندگی سے مُراد علم و اِدراک اور حقیقت شناسی کی حالت۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہِ راست کیا ہے، وہ طبیعیات کے نقطۂ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسّر نہیں ہے۔ وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شُعور حاصل ہے۔

۸۹ – یعنی تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ جس انسان کو انسانیت کا شُعور نصیب ہو چکا ہے اور جو علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو صاف دیکھ رہا ہے، وہ اُن بے شُعور لوگوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرے گا جو نادانی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

۹۰ – یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، جنھیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں ہی پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پُھول نظر آتے ہیں۔ انھیں ہر بدکاری میں مزا آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں، اور ہر فساد انگیز تجرِبے کے بعد اُس سے بڑھ کر دُوسرے فساد انگیز تجرِبے کے لیے وہ اِس اُمّید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دَہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعل بدخشاں ہاتھ آ جائے گا۔

فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا ؕ وَ مَا
یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ
اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ
اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا كَانُوْا
یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ
لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا
حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ

وقف لازم / وقف منزل

ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسُولوں کو دی گئی ہے۔"[91] اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکّاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلّت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا اِرادہ کرتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے،[92] اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اِسلام کا تصوّر کرتے ہی) اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اِس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی اُن

---

۹۱ – یعنی ہم رسُولوں کے اِس بیان پر ایمان نہیں لائیں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور خدا کا پیغام لایا، بلکہ ہم صرف اسی وقت ایمان لا سکتے ہیں جب کہ فرشتہ خود ہمارے پاس آئے اور براہِ راست ہم سے کہے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ
اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا

لوگوں پر مسلّط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے، حالانکہ یہ راستہ تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات اُن لوگوں کے لیے واضح کر دیے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس سلامتی کا گھر[93] ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے، اُس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا۔

جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا، اس روز وہ جِنّوں[94] سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ ''اے گروہِ جن! تم نے تو نوعِ انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا''۔ انسانوں میں سے جو اُن کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے: ''پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے کو خوب استعمال کیا ہے[95]، اور اب ہم اُس وقت پر آ پہنچے ہیں جو تُو نے ہمارے لیے مقرر کر دیا تھا''۔ اللہ فرمائے گا: ''اچھا اب آگ تمھارا ٹھکانا ہے، اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔'' اُس سے بچیں گے صرف وہی

کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔

۹۲- سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پُوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردُّد کو دُور کر دینا ہے۔

۹۳- ''سلامتی کا گھر'' یعنی جنّت جہاں انسان ہر آفت سے محفوظ اور ہر خرابی سے مامون ہو گا۔

۹۴- یہاں جِنّوں سے مُراد شیاطینِ جن ہیں۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ
بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ
وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا
وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ

جنھیں اللہ بچانا چاہے گا، بے شک تمھارا رب دانا اور علیم [۹۶] ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دُوسرے کا ساتھی بنائیں گے اُس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دُنیا میں ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے [۹۷]۔ (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہِ جن و اِنس! کیا تمھارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اِس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟" وہ کہیں گے: "ہاں، ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں [۹۸]۔" آج دُنیا کی زندگی نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، مگر اُس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ

۹۵- یعنی ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے سے ناجائز فائدے اُٹھائے ہیں، ہر ایک دُوسرے کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی خواہشات پوری کرتا رہا ہے۔

۹۶- یعنی اگرچہ اللہ کو اختیار ہے کہ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، مگر یہ سزا اور معافی بلاوجہِ معقول، مجرّد خواہش کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگی۔ خدا معاف اسی مجرم کو کرے گا جس کے متعلّق وہ جانتا ہے کہ وہ خود اپنے جُرم کا ذمّہ دار نہیں ہے اور جس کے متعلّق اس کی حکمت یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے سزا نہ دی جانی چاہیے۔

۹۷- یعنی جس طرح وہ دنیا میں گناہ سمیٹنے اور بُرائیوں کا اکتساب کرنے میں ایک دُوسرے کے شریک تھے، اسی طرح آخرت کی سزا پانے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوں گے۔

۹۸- یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسُول پر رسُول آتے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ ہمارا اپنا قصور تھا کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝١٣٠ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ
وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝١٣١ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝١٣٢ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ

کافر تھے۔[99] (یہ شہادت اُن سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمھارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔[100]

ہر شخص کا درجہ اُس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمھارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمھارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔[101] اگر وہ چاہے تو

۹۹ – یعنی بے خبر اور ناواقف نہ تھے بلکہ کافر تھے۔ وہ خود تسلیم کریں گے کہ حق ہم تک پہنچا تھا مگر ہم نے خود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۰۰ – یعنی اللہ اپنے بندوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ اس کے مقابلے میں یہ احتجاج کر سکیں کہ آپ نے ہمیں حقیقت سے تو آگاہ کیا نہیں، اور نہ ہم کو صحیح راستہ بتانے کا کوئی انتظام فرمایا، مگر جب ناواقفیت کی بنا پر ہم غلط راہ پر چل پڑے تو اب آپ ہمیں پکڑتے ہیں۔ اِسی حجّت کو قطع کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں، تاکہ جنّ و اِنس کو صاف صاف خبردار کر دیا جائے۔ اب اگر لوگ غلط راستوں پر چلتے ہیں اور اللہ ان کو سزا دیتا ہے تو اس کا الزام خود ان پر ہے نہ کہ اللہ پر۔

۱۰۱ – ”تمھارا رب بے نیاز ہے“ یعنی اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی نہیں ہے، اس کا کوئی مفاد تم سے وابستہ نہیں ہے کہ تمھاری نافرمانی سے اس کا کچھ بگڑ جاتا ہو، یا تمھاری فرماں برداری سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہو۔ تم سب مل کر سخت نافرمان بن جاؤ تو اس کی بادشاہی میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے، اور سب کے سب مل کر اس کے مطیع فرمان اور عبادت گزار بن جاؤ تو اس کے ملک میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تمھاری سلامیوں کا محتاج ہے اور نہ تمھاری نذر و نیاز کا۔ اپنے بے شمار خزانے تم پر لُٹا رہا ہے بغیر اس کے کہ ان کے بدلے میں اپنے لیے تم سے کچھ چاہے۔

”مہربانی اس کا شیوہ ہے۔“ یہاں موقع و محل کے لحاظ سے اس فقرے کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ تمھارا رب تم کو راہِ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقتِ نفس الامری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ راست روی میں تمھارا اپنا فائدہ اور غلط روی میں تمھارا اپنا نقصان ہے۔ لہٰذا یہ سراسر

يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

تم لوگوں کو لے جائے اور تمھاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے، جس طرح اُس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اُٹھایا ہے۔ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ یقیناً آنے والی ہے[102] اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور مَیں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں[103]، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ انجامِ کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمھیں اُس صحیح طرزِ عمل کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکتے ہو، اور اس غلط طرزِ عمل سے روکتا ہے جس کی بدولت تم پست مراتب کی طرف تنزّل کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمھارا رب سخت گیر نہیں ہے، تم کو سزا دینے میں اُسے کوئی لُطف نہیں آتا ہے، وہ تمھیں پکڑنے اور مارنے پر تُلا ہُوا نہیں ہے کہ ذرا تم سے قصور سرزد ہو اور وہ تمھاری خبر لے ڈالے۔ درحقیقت وہ اپنی تمام مخلوقات پر نہایت مہربان ہے، غایت درجے کے رحم و کرم کے ساتھ خدائی کر رہا ہے، اور یہی اس کا معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اسی لیے وہ تمھارے قصُور پر قصُور معاف کرتا چلا جاتا ہے۔ تم نافرمانیاں کرتے ہو، گناہ کرتے ہو، جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، اس کے رزق سے پَل کر بھی اس کے احکام سے منہ موڑتے ہو، مگر وہ حِلم اور عفو ہی سے کام لیے جاتا ہے اور تمھیں سنبھلنے اور سمجھنے اور اپنی اصلاح کر لینے کے لیے مُہلت پر مُہلت دیے جاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ سخت گیر ہوتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تمھیں دنیا سے رخصت کر دیتا اور تمھاری جگہ کسی دُوسری قوم کو اُٹھا کھڑا کرتا، یا سارے انسانوں کو ختم کر کے کوئی اور مخلوق پیدا کر دیتا۔

۱۰۲ – یعنی قیامت، جس کے بعد تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے سامنے آخری فیصلے کے لیے پیش ہوں گے۔

۱۰۳ – یعنی اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے اور اپنی غلط روی سے باز نہیں آتے تو جس راہ پر تم چل رہے ہو چلے جاؤ، اور مجھے اپنی راہ چلنے کے لیے چھوڑ دو، انجامِ کار جو کچھ ہو گا وہ تمھارے سامنے بھی آ جائے گا اور میرے سامنے بھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا

اِن لوگوں[۱۰۴] نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصّہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں: یہ اللہ کے لیے ہے، بزَعمِ خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے[۱۰۵]۔ پھر جو حصّہ ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو

۱۰۴- اُوپر کا سلسلۂ تقریر اس بات پر تمام ہُوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیّت پر اصرار ہی کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم اپنے طریقے پر عمل کرتے رہو اور مَیں اپنے طریقے پر عمل کروں گا، قیامت ایک دن ضرور آنی ہے، اس وقت تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوتا ہے، بہر حال یہ خوب سمجھ لو کہ وہاں ظالموں کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔ اس کے بعد اب اُس جاہلیّت کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر وہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ تمھارا وہ "ظلم" کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کسی فلاح کی اُمّید نہیں کر سکتے۔

۱۰۵- اِس بات کے وہ خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اگاتا ہے۔ نیز اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جِنّات، اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سَلَف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصّے نکالتے تھے۔ ایک حصّہ اللہ کے نام کا، اس شکریے میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انھیں بخشے۔ اور دُوسرا حصّہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سر پرست معبُودوں کی نذر و نیاز کا، تاکہ اُن کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ان کے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کیے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں، ان میں یہ دُوسروں کی نذر و نیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو، جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے تم پر کیا ہے، دُوسروں کی مداخلت اور ان کے توسُّط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریے کے استحقاق میں انھیں اُس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ پھر اشارتاً دُوسری گرفت اس بات پر بھی فرمائی ہے کہ یہ اللہ کا حصّہ جو انھوں نے مقرر کیا ہے، یہ بھی بزَعمِ خود کر لیا ہے، اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں، آپ ہی جو حصّہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دُوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک و مختار خود اللہ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصّہ اس کے شکریے کے لیے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حق دار ہیں۔ پس درحقیقت اس خود مختارانہ طریقے سے جو حصّہ یہ لوگ اپنے زَعمِ باطل میں خدا

يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔[۱۰۶] کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو

کے لیے نکالتے ہیں اور فقرا و مساکین وغیرہ پر خیرات کرتے ہیں وہ بھی کوئی نیکی نہیں ہے۔ خدا کے ہاں اس کے مقبول ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

۱۰۶ – یہ لطیف طنز ہے اُن کی اس حرکت پر کہ وہ خدا کے نام سے جو حصّہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صُورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصّہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انھیں اپنے ان شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلّے یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے، ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گرتا، یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اُسے انھی کے حصّے میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا، اگر اس میں سے پانی اُس حصّے کی طرف پھُوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّے میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صُورت پیش آتی تو خدا کے حصّے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی تو خدا کا حصّہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بَلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آ جاتی تو وہ خدا کے حصّے سے پُوری کی جاتی تھی، لیکن خدا کے حصے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصے میں سے ایک حبّہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دل فریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے، اس کے حصے میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں، خدا کی طرح غنی نہیں ہیں، اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

اِن توہّمات کی اصل جڑ کیا تھی، اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جُہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لیے نکالتے تھے، وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صَرف کیا جاتا تھا، اور جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے، وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صُورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پُجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان خود غرض مذہبی

Maktaba Tul Ishaat.com

قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ شُرَكَآؤُهُمۡ لِيُرۡدُوۡهُمۡ وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ ؕ

خوشنما بنا دیا ہے[۱۰۷] تاکہ ان کو ہلاکت میں مُبتلا کریں[۱۰۸] اور ان پر ان کے دین کو مُشتبہ بنا دیں۔[۱۰۹]

پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصّے میں کمی ہو جائے تو کچھ مضایقہ نہیں، مگر ”خدا کے پیاروں“ کے حصّے میں کمی نہ ہونی چاہیے، بلکہ حتّی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

۱۰۷ – یہاں ”شریکوں“ کا لفظ ایک دُوسرے معنٰی میں استعمال ہُوا ہے جو اُوپر کے معنٰی سے مختلف ہے۔ اوپر کی آیت میں جنھیں ”شریک“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، وہ ان کے معبود تھے جن کی برکت یا سفارش یا توسُّط کو یہ لوگ نعمت کے حُصُول میں مددگار سمجھتے تھے اور شکرِ نعمت کے استحقاق میں انھیں خدا کے ساتھ حصّہ دار بناتے تھے۔ بخلاف اس کے، اس آیت میں ”شریک“ سے مُراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنھوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنا دیا تھا۔ انھیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح بندوں کے لیے قانون بنانے اور جائز و ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حق دار بھی صرف اللہ ہے۔ لہٰذا جس طرح کسی دُوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنٰی ہے، اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنٰی ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں، خواہ اُن کا مرتکب ان ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کیے ہوئے قانون کو واجب الاطاعت مانتا ہے۔

قتلِ اولاد کی تین صُورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں اور قرآن میں تینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے، یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں، یا کسی دُوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

(۲) بچّوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اُٹھایا جا سکے گا اور ذرائعِ مَعاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

(۳) بچّوں کو اپنے معبُودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

۱۰۸ – یہ ہلاکت کا لفظ نہایت معنٰی خیز ہے۔ اِس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگ دلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے اس میں جوہرِ انسانیت تو درکنار، جوہرِ حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اور نوعی و قومی ہلاکت بھی، کہ قتلِ اولاد کا لازمی نتیجہ نسلوں کا گھٹنا اور آبادی کا کم ہونا ہے، جس سے نوعِ انسانی کو بھی نقصان پہنچتا ہے، اور وہ قوم بھی تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے جو اپنے حامیوں اور اپنے تمدّن

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔[۱۱۰]

کہتے ہیں: یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں، انھیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔[۱۱۱] پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے،[۱۱۲] اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے،[۱۱۳] عنقریب اللہ انھیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔

کے کارکنوں اور اپنی میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی، یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں انھیں ختم کر ڈالتی ہے۔ اور اس سے مراد انجامی ہلاکت بھی ہے کہ جو شخص معصوم بچّوں پر یہ ظلم کرتا ہے، اور جو اپنی انسانیت کو بلکہ اپنی حیوانی فطرت تک کو یوں اُلٹی چھری سے ذبح کرتا ہے، اور جو نوعِ انسانی کے ساتھ اور خود اپنی قوم کے ساتھ یہ دشمنی کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

۱۰۹ – زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں، وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے سیکھا تھا، اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رُسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے، جنھیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جُز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں، یا تاریخ میں، یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کیا چیزیں کس زمانے میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پُورا دین مُشتبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہی کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جز ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا، اور نہ یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رُسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔ اِسی صُورتِ حال کی ترجمانی اس فقرے میں کی گئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى
اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ
اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ
عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا

اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے، یہ ہمارے مَردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں[۱۱۴]۔ یہ باتیں جو انھوں نے گھڑ لی ہیں، ان کا بدلہ اللہ انھیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔

یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھیرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے

۱۱۰ – یعنی اگر اللہ چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کر سکتے تھے، لیکن چونکہ اللہ کی مشیّت یہی تھی کہ جو شخص جس راہ پر جانا چاہتا ہے اسے جانے کا موقع دیا جائے، اسی لیے یہ سب کچھ ہُوا۔ پس اگر یہ لوگ تمھارے سمجھانے سے نہیں مانتے اور ان افترا پردازیوں ہی پر انھیں اصرار ہے، تو جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دو، ان کے پیچھے پڑنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

۱۱۱ – اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلّق یا بعض کھیتیوں کی پیداوار کے متعلّق منت مان لیتے تھے کہ یہ فلاں آستانے یا فلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصُوص ہیں۔ اُس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصّل ضابطہ تھا، جس کی رُو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصُوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہ صرف مشرکانہ افعال میں شمار کرتا ہے، بلکہ اس پہلو پر بھی تنبیہ فرماتا ہے کہ یہ ضابطہ ان کا خود ساختہ ہے۔ یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منّتیں مانتے اور نیازیں کرتے ہیں، اس نے نہ ان منّتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے متعلّق یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ سب کچھ ان خود سر اور باغی بندوں نے اپنے اختیار سے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔

۱۱۲ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص منّتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، یا ان کو کھانے کے وقت

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ
غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ

ع ۱۶/۱۱

اور ہرگز وہ راہِ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔[115] ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان[116] اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اُگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صُورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ

اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔

۱۱۳ – یعنی یہ قاعدے خدا کے مقرر کیے ہوئے نہیں ہیں، مگر وہ ان کی پابندی یہی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں کہ انھیں خدا نے مقرر کیا ہے، اور ایسا سمجھنے کے لیے ان کے پاس خدا کے کسی حکم کی سند نہیں ہے بلکہ صرف یہ سند ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۱۱۴ – اہلِ عرب کے ہاں نذروں اور منّتوں کے جانوروں کے متعلّق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی، اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچّہ پیدا ہو، اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مُردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔

۱۱۵ – یعنی اگرچہ وہ لوگ جنھوں نے یہ رسم و رواج گھڑے تھے تمھارے باپ دادا تھے، تمھارے مذہبی بزرگ تھے، تمھارے پیشوا اور سردار تھے، لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہے، ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتلِ اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو، جنھوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو، جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کر کے خدا کی طرف منسوب کی ہوں، وہ آخر فلاح یاب اور راست رَو کیسے ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہر حال تھے وہ گمراہ، اور اپنی اس گمراہی کا بُرا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے۔

۱۱۶ – اصل میں جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مراد دو طرح کے باغ ہیں: ایک وہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ دُوسرے وہ جن کے درخت خود اپنے تنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری زبان میں باغ کا لفظ صرف دوسری قسم کے باغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم نے جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ کا ترجمہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۙ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَةً وَّ فَرۡشًا ؕ كُلُوۡا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ
مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاۡنِ اثۡنَيۡنِ وَمِنَ الۡمَعۡزِ اثۡنَيۡنِ ؕ
قُلۡ ءٰٓالذَّكَرَيۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَيَيۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَيۡهِ

یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔[117] کھاؤ اُن چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کُھلا دشمن ہے۔[118] یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے محمدؐ! ان سے پُوچھو کہ اللہ نے اُن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچّے جو بھیڑوں

''باغ'' کیا ہے اور جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ کے لیے ''تاکستان'' (یعنی انگوری باغ) کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۱۱۷ – اصل میں لفظ فَرۡش استعمال ہوا ہے۔ جانوروں کو فَرش کہنا یا تو اس رعایت سے ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں اور زمین سے لگے ہوئے چلتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ ان کی کھالوں اور ان کے بالوں سے فرش بنائے جاتے ہیں۔

۱۱۸ – سلسلۂ کلام پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ تین باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک یہ کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں، یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں، کسی دُوسرے کا اس بخشش میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اس لیے بخشش کے شکریے میں بھی کسی کا کوئی حصّہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ جب یہ چیزیں اللہ کی بخشش ہیں تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے قانون کی پیروی ہونی چاہیے۔ کسی دُوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے حُدود مقرر کردے۔ اللہ کے سوا کسی اَور کی مقرر کردہ رسموں کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اَور کے آگے شکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا ہی حد سے گزرنا ہے اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے پینے اور استعمال کرنے ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے پیدا نہیں کیں کہ انھیں خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے۔ اپنے اوہام اور قیاسات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں، وہ

اَمْ حَرَّمَ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ
مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ

اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔[119] اور اسی طرح دو اُونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پُوچھو: اِن کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اُونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟[120] کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمھیں دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسُوب کر کے جھوٹی بات کہے، تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے، اس میں تو مَیں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو

سب منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

۱۱۹ – یعنی گمان و وہم یا آبائی روایات نہ پیش کرو بلکہ علم پیش کرو اگر وہ تمھارے پاس ہو۔

۱۲۰ – یہ سوال اس تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اُن پر خود اپنے ان توہّمات کی غیر معقولیّت واضح ہو جائے۔ یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام، یا مادہ حلال ہو اور نر حرام، یا جانور خود حلال ہو مگر اس کا بچہ حرام، یہ صریحاً ایسی نامعقول بات ہے کہ عقلِ سلیم اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی عقل انسان یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ خدا نے ایسی لغویّات کا حکم دیا ہوگا۔ پھر جس طریقے سے قرآن نے اہلِ عرب کو اُن کے اِن توہّمات کی غیر معقولیّت سمجھانے کی کوشش کی ہے، بعینہٖ اسی طریقے پر دُنیا کی اُن دُوسری قوموں کو بھی اُن کے توہّمات کی لغویّات پر متنبّہ کیا جا سکتا ہے جن کے اندر کھانے پینے کی چیزوں میں حُرمت وحلّت کی غیر معقول پابندیاں اور چھوت چھات

Maktaba Tul Ishaat.com

مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کسی کھانے والے پر حرام ہو، الا یہ کہ وہ مُردار ہو، یا بہایا ہُوا خون ہو، یا سُور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔[۱۲۱] پھر جو شخص مجبُوری کی حالت میں (کوئی چیز اِن میں سے کھالے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حدِ ضرورت سے تجاوُز کرے، تو یقیناً تمھارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

کی قیُود پائی جاتی ہیں۔

۱۲۱ – یہ مضمون سُورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ مائدہ آیت ۳ میں گزر چکا ہے، اور آگے سُورۂ نحل آیت ۱۱۵ میں آنے والا ہے۔

سُورۂ بقرہ کی آیت اور اس آیت میں بظاہر اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہاں محض ''خون'' کہا گیا ہے اور یہاں خون کے ساتھ مَسْفُوْح کی قید لگائی گئی ہے، یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کر کے یا ذبح کر کے نکالا گیا ہو۔ مگر دراصل یہ اختلاف نہیں بلکہ اُس حکم کی تشریح ہے۔ اِسی طرح سُورۂ مائدہ کی آیت میں ان چار چیزوں کے علاوہ چند اور چیزوں کی حُرمت کا بھی ذکر ملتا ہے، یعنی وہ جانور جو گلا گھُٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گِر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ لیکن فی الحقیقت یہ بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک تشریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور اس طور پر ہلاک ہوئے ہوں، وہ بھی مُردار کی تعریف میں آتے ہیں۔

فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا ہر چیز کا کھانا جائز ہے۔ یہی مسلک حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا تھا۔ لیکن متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کے کھانے سے یا تو منع فرمایا ہے یا ان پر کراہت کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے، کچلیوں والے درندے اور پنجوں والے پرندے۔ اس وجہ سے اکثر فقہا تحریم کو ان چار چیزوں تک محدود نہیں مانتے بلکہ دُوسری چیزوں تک اسے وسیع قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد پھر مختلف چیزوں کی حِلّت و حُرمت میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے کو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ حرام قرار دیتے ہیں، لیکن بعض دُوسرے فقہا کہتے ہیں کہ وہ حرام نہیں ہے بلکہ کسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس کی ممانعت فرما دی تھی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی، بجز اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انھیں دی تھی،[۱۲۲] اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

درندہ جانوروں اور شکاری پرندوں اور مُردار خور حیوانات کو حَنَفِیّہ مُطلَقاً حرام قرار دیتے ہیں، مگر امام مالکؒ اور اَوزاعیؒ کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں۔ لَیثؒ کے نزدیک بلّی حلال ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ۔ عِکرِمہ کے نزدیک کوّا اور بجّو دونوں حلال ہیں۔ اسی طرح حَنَفِیّہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں، مگر ابنِ ابی لیلیٰ، امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعتِ الٰہی میں قطعی حُرمت اُن چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان کے سوا دُوسری حیوانی غذاؤں میں مختلف درجوں کی کراہت ہے۔ جن چیزوں کی کراہت صحیح روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ حُرمت کے درجے سے قریب تر ہیں، اور جن چیزوں میں فقہا کے درمیان اختلاف ہُوا ہے ان کی کراہت مشکوک ہے۔ رہی طبعی کراہت جس کی بنا پر بعض اشخاص بعض چیزوں کو کھانا پسند نہیں کرتے، یا طبقاتی کراہت جس کی بنا پر انسانوں کے بعض طبقے بعض چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، یا قومی کراہت جس کی بنا پر بعض قومیں بعض چیزوں سے نفرت کرتی ہیں، تو شریعتِ الٰہی کسی کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ خواہ مخواہ ہر اس چیز کو ضرور ہی کھا جائے جو حرام نہیں کی گئی ہے۔ اور اسی طرح شریعت کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتی کہ وہ اپنی کراہت کو قانون قرار دے اور ان لوگوں پر الزام عائد کرے جو ایسی غذائیں استعمال کرتے ہیں جنھیں وہ ناپسند کرتا ہے۔

۱۲۲ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ”کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو کہ لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو۔“ (آیت ۹۳) پھر سُورۂ نساء میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی بنا پر ”ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔“ (آیت ۱۶۰) اور یہاں ارشاد ہُوا ہے کہ ان کی سرکشیوں کی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

اب اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمھارے رب کا دامنِ رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔[۱۲۳]

یہ مشرک لوگ (تمھاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا

پاداش میں ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھیرا دی۔ اِن تینوں آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محمدؐی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حِلّت وحُرمت کے معاملے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے:

ایک یہ کہ نُزولِ تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السّلام نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی ان چیزوں کی تارک رہی، حتّٰی کہ یہودی فقہا نے ان کو باقاعدہ حرام سمجھ لیا اور ان کی حُرمت تورات میں لکھ لی۔ اِن اشیا میں اُونٹ اور خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائبل میں تورات کے جو اجزا ہم کو ملتے ہیں، اُن میں ان تینوں چیزوں کی حُرمت کا ذکر ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۴-۶۔ اِستِثنا ۱۴: ۷) لیکن قرآنِ مجید میں یہودیوں کو جو چیلنج دیا گیا تھا کہ لاؤ تورات اور دکھاؤ یہ چیزیں کہاں حرام لکھی ہیں، اس سے معلوم ہُوا کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر اس وقت تورات میں یہ احکام موجود ہوتے تو بنی اسرائیل فوراً لا کر پیش کر دیتے۔

دُوسرا فرق اس وجہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انھوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی مُوشگافیوں سے خود حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ ان اشیا میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں، یعنی شُتر مُرغ، قاز، بط وغیرہ۔ دُوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکامِ تورات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۱۶-۱۸۔ اِستِثنا ۱۴: ۱۴-۱۵-۱۶۔ اَحبار ۳: ۱۷ و ۷: ۲۲-۲۳) لیکن سُورۂ نساء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد حرام ہوئی ہیں، اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دُوسری صدی عیسوی کے آخر میں رَبّی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر ان چیزوں کے متعلق یہاں اور سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے حَرَّمْنَا (ہم نے حرام کیا) کا لفظ کیوں استعمال کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدائی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر اور کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے۔ بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں

مَآ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَیۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ
الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰی ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا ؕ قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ
عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَا ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا
تَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىكُمۡ

تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔"[۱۲۴] ایسی ہی باتیں بنا بنا کر اِن سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا، یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو: "کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو: (تمھاری اس حجّت کے مقابلے میں) "حقیقت رس حُجّت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت

کو مسلّط کر دے اور وہ ان پر طیِّبات کو حرام کر دیں۔ پہلی قسم کی تحریم خدا کی طرف سے رحمت کے طور پر ہوتی ہے اور یہ دُوسری قسم کی تحریم اس کی پھٹکار اور سزا کی حیثیت سے ہُوا کرتی ہے۔

۱۲۳ – یعنی اگر تم اب بھی اپنی نافرمانی کی روش سے باز آ جاؤ اور بندگی کے صحیح رَوِیّے کی طرف پلٹ آؤ تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کشادہ پاؤ گے۔ لیکن اگر اپنی اِسی مجرمانہ و باغیانہ روش پر اَڑے رہو گے تو خوب جان لو کہ اس کے غضب سے بھی پھر کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

۱۲۴ – یعنی وہ اپنے جرم اور اپنی غلط کاری کے لیے وہی پُرانا عذر پیش کریں گے جو ہمیشہ سے مجرم اور غلط کار لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیّت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام ٹھیرا رکھا ہے انھیں حرام ٹھیرائیں۔ ورنہ اگر خدا نہ چاہتا کہ ہم ایسا کریں تو کیوں کر ممکن تھا کہ یہ افعال ہم سے صادر ہوتے۔ پس چونکہ ہم اللہ کی مشیّت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں اس لیے دُرست کر رہے ہیں، اس کا الزام اگر ہے تو ہم پر نہیں، اللہ پر ہے۔ اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں ایسا ہی کرنے پر مجبور ہیں، کہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلۡ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِیۡنَ یَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ
اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَلَا تَشۡهَدۡ مَعَهُمۡ ۚ وَلَا

دے دیتا۔[125]

ان سے کہو کہ ”لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے اِن چیزوں کو حرام کیا ہے“۔ پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا،[126] اور ہرگز اُن لوگوں

۱۲۵ – یہ ان کے عذر کا مکمّل جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے:

پہلی بات یہ فرمائی کہ اپنی غلط کاری و گمراہی کے لیے مشیّتِ الٰہی کو معذرت کے طور پر پیش کرنا اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا قدیم شیوہ رہا ہے، اور اس کا انجام یہ ہُوا ہے کہ آخرکار وہ تباہ ہوئے اور حق کے خلاف چلنے کا بُرا نتیجہ انھوں نے دیکھ لیا۔

پھر فرمایا کہ یہ عذر جو تم پیش کر رہے ہو، یہ دراصل علم حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض گمان اور تخمینہ ہے۔ تم نے محض مَشیّت کا لفظ کہیں سے سن لیا اور اس پر قیاسات کی ایک عمارت کھڑی کر لی۔ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مَشیّت کیا ہے۔ تم مشیت کے معنٰی یہ سمجھ رہے ہو کہ چور اگر مشیّتِ الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے، کیونکہ اس نے یہ فعل خدا کی مشیت کے تحت کیا ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کے حق میں خدا کی مشیّت یہ ہے کہ وہ شُکر اور کفر، ہدایت اور ضلالت، طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا، خدا وہی راہ اس کے لیے کھول دے گا، اور پھر غلط یا صحیح، جو کام بھی انسان کرنا چاہے گا، خدا اپنی عالمگیر مَصلَحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جس حد تک مناسب سمجھے گا اسے اس کام کا اذن اور اس کی توفیق بخش دے گا۔ لہٰذا اگر تم نے اور تمھارے باپ دادا نے مشیّتِ الٰہی کے تحت شرک اور تحریم طیّبات کی توفیق پائی تو اس کے یہ معنٰی ہرگز نہیں ہیں کہ تم لوگ اپنے اِن اعمال کے ذمّہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔ اپنے غلط انتخابِ راہ اور اپنے غلط ارادے اور سعی کے ذمہ دار تو تم خود ہی ہو۔

آخر میں ایک ہی فقرے کے اندر کانٹے کی بات بھی فرما دی کہ قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىكُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ۔ یعنی تم اپنی معذرت میں یہ حُجّت پیش کرتے ہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے“، اس سے پُوری بات ادا نہیں ہوتی۔ پوری بات کہنا چاہتے ہو تو یوں کہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا“ بالفاظِ دیگر، تم خود اپنے انتخاب سے راہِ راست اختیار کرنے پر تیار نہیں ہو، بلکہ یہ چاہتے ہو کہ خدا نے جس طرح فرشتوں کو پیدائشی راست رَو بنایا ہے اس طرح تمھیں بھی بنا دے۔ تو بے شک اگر اللہ کی مشیّت انسان کے حق میں یہ ہوتی تو وہ ضرور ایسا کر سکتا تھا، لیکن یہ اس کی مشیّت

تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيۡنَ لَا
يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَ هُمۡ بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ قُلۡ تَعَالَوۡا
اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا

ع ۱۸ ۵

کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سُناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں:[۱۲۷]

(۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو،[۱۲۸]

نہیں ہے، لہٰذا جس گمراہی کو تم نے اپنے لیے خود پسند کیا ہے اللہ بھی تمھیں اسی میں پڑا رہنے دے گا۔

۱۲۶ – یعنی اگر وہ شہادت کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ شہادت اُسی بات کی دینی چاہیے جس کا آدمی کو علم ہو، تو وہ کبھی یہ شہادت دینے کی جُرأت نہ کریں گے کہ کھانے پینے پر یہ قیُود، جو ان کے ہاں رسم کے طور پر رائج ہیں، اور یہ پابندیاں کہ فلاں چیز کو فلاں نہ کھائے اور فلاں چیز کو فلاں کا ہاتھ نہ لگے، یہ سب خدا کی مقرر کردہ ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری کو محسُوس کیے بغیر اتنی ڈِھٹائی پر اُتر آئیں کہ خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تأمّل نہ کریں، تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو۔ کیونکہ اُن سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جا رہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو تم ان کی بات مان لو گے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے، ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ ضوابط خدا ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں تو وہ اپنی رسموں کی حقیقت پر غور کریں گے، اور جب ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں کی پابندی سے باز آ جائیں گے۔

۱۲۷ – یعنی تمھارے رب کی عائد کی ہوئی پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو، بلکہ اصل پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عائد کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائعِ الٰہیہ کی اصل الاُصُول رہی ہیں۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتابِ خُروج، باب ۲۰)

۱۲۸ – یعنی نہ خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراؤ، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو،[۱۲۹]

(۳) اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

(۴) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ،[۱۳۰] خواہ وہ کُھلی ہوں یا چُھپی۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جوہرِ اُلوہیت میں کسی کو حصّہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث، مشرکینِ عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا، اور دوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنسِ آلہہ کے افراد قرار دینا۔ یہ سب شرک فی الذات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات، جیسی کہ وہ خدا کے لیے ہیں، ویسا ہی اُن کو یا اُن میں سے کسی صفت کو کسی دُوسرے کے لیے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں، یا وہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے، یا وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے مُنزّہ اور بالکل بے خطا ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا، حاجت روائی و دستگیری کرنا، محافظت و نگہبانی کرنا، دُعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا۔ نیز حرام وحلال اور جائز وناجائز کی حُدُود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لیے قانون وشرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے۔

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں، وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لیے مانا جائے۔ مثلاً رُکوع وسُجود، دست بستہ قیام، سلامی و آستانہ بوسی، شُکرِ نعمت یا اعترافِ برتری کے لیے نذر و نیاز اور قربانی، قضائے حاجات اور رفعِ مشکلات کے لیے مَنّت، مصائب ومشکلات میں مدد کے لیے پکارا جانا، اور ایسی ہی پرستش وتعظیم وتمجید کی دُوسری تمام صُورتیں اللہ کے مخصُوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح ایسا محبُوب ہونا کہ اس کی محبّت پر دوسری سب محبّتیں قربان کی جائیں، اور ایسا مستحقِ تقویٰ وخَشِیّت ہونا کہ غیب وشہادت میں اس کی ناراضی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے، اور اس کی ہدایت کو صحیح وغلط کا معیار مانا جائے، اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ
وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ
الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

(۵) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ[۱۳۱]۔
یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بُوجھ سے کام لو۔
(۶) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو[۱۳۲]،
یہاں تک کہ وہ اپنے سِنِّ رُشد کو پہنچ جائے،

اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لیے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ اِن حُقوق میں سے جو حق بھی دُوسرے کو دیا جائے گا، وہ اللہ کا شریک ٹھیرے گا، خواہ اس کو خدائی ناموں میں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

۱۲۹ – نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی، خدمت، سب داخل ہیں۔ والدین کے اِس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدّم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

۱۳۰ – اصل میں لفظ ”فَوَاحِشَ“ استعمال ہُوا ہے، جس کا اطلاق اُن تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی بُرائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زِنا، عملِ قومِ لوط، برہنگی، جھوٹی تُہمت، اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فُحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو مِن جملۂ فواحش کہا گیا ہے۔ اِسی طرح دُوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ علانیَہ کیے جائیں نہ چھُپ کر۔

۱۳۱ – یعنی انسانی جان، جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھیرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ ”حق کے ساتھ“ کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صُورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں، اور دو صُورتیں اس پر زائد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صُورتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کسی دُوسرے انسان کے قتلِ عمد کا مجرم ہو اور اس پر قِصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

(۲) دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

(۳) دار الاسلام کے حُدُود میں بد امنی پھیلائے یا اسلامی نظامِ حکومت کو اُلٹنے کی سعی کرے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۗ

(۷) اور ناپ تول میں پُورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمّہ داری کا اُتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے،[۱۳۳]

(۸) اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو،

(۹) اور اللہ کے عہد کو پُورا کرو۔[۱۳۴]

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، یہ ہیں:

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۵) ارتداد اور خُروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

اِن پانچ صُورتوں کے سوا کسی صُورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے، خواہ وہ مومن ہو یا ذمّی یا عام کافر۔

۱۳۲ – یعنی ایسا طریقہ جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم کی خیر خواہی پر مبنی ہو، اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو۔

۱۳۳ – یہ اگرچہ شریعتِ الٰہی کا ایک مستقل اُصُول ہے، لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے، وہ اپنی ذمّہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ بُھول چُوک یا نادانستہ کمی وبیشی ہو جانے پر اس سے باز پُرس نہ ہوگی۔

۱۳۴ – ”اللہ کے عہد“ سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسان کے درمیان اُسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شعوری وارادی ہیں، اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد (natural contract) ہے، جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی ونفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے، اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اُٹھانا، اور اُن مواقعِ زندگی سے متمتع ہونا جو قوانینِ قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرتاً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے۔ اور

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ
مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ
عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۱۰) نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اِسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔[۱۳۵] یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

اِسی طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، ایک باپ کی محنتوں سے بسے ہوئے گھر میں پیدا ہونا، اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صُورتوں میں متمتّع ہونا، علٰی قدرِ مراتب اس کے ذمّے بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے۔ انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا، مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے۔ انسان نے اسے شُعُور و ارادہ کے ساتھ نہیں باندھا، مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رہینِ منّت ہے۔ اسی عہد کی طرف سُورۂ بَقَرہ آیت ۲۷ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو "اللہ کے عہد کو اس کی اُستواری کے بعد توڑتے ہیں، اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔" اور اسی کا ذکر آگے چل کر سُورۂ اعراف آیت ۱۷۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے اَزَل میں آدمؑ کی پیٹھوں سے ان کی ذرّیّت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی تھی کہ کیا مَیں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ ہاں، ہم گواہ ہیں۔

۱۳۵ – اُوپر جس فطری عہد کا ذکر ہُوا، یہ اس عہد کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خود مختاری یا بندگیِ غیر کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اُس عہد کی اوّلین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس نہایت نازک، نہایت وسیع اور نہایت پیچیدہ عہد کی ذمّہ داریوں سے انسان ہرگز عہدہ برآ نہیں ہوسکتا جب تک وہ خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو قبول نہ کرنے کے دو زبردست نقصان ہیں: ایک یہ کہ ہر دُوسرے راستے کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قُرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے۔ دُوسرے یہ کہ اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٤﴾ ع وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ
اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾ لا اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ
الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ
لَغٰفِلِيْنَ ﴿١٥٦﴾ لا اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ

پھر ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی (اور اس لیے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں[۱۳۶] ع اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اِس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی،[۱۳۷] اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم

جن میں بھٹک کر پُوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے، اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بُلوغ و ارتقا کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ انھی دونوں نقصانات کو اس فقرے میں بیان کیا گیا ہے کہ ”دُوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے۔“ (مُلاحظہ ہو: سُورۂ مائدہ، حاشیہ ۳۵)

۱۳۶– رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دِہ سمجھنا اور ذمّہ دارانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمّہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگ اس اعلیٰ درجے کے نظامِ زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمتِ ہدایت اور اس رحمت کے اثرات دیکھ کر یہ محسُوس کر لیں کہ انکارِ آخرت کی غیر ذمّہ دارانہ زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اقرارِ آخرت کی بنیاد پر ذمّہ دارانہ طریقے سے بسر کی جاتی ہے، اور اس طرح یہ مُشاہدہ و مُطالعہ انھیں انکار سے ایمان کی طرف کھینچ لائے۔

اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ
رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ
سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿١٥٧﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ
اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ
اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

ان سے زیادہ راست رَو ثابت ہوتے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔[۱۳۸] جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں اس رُوگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔ کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں، یا تمھارا رب خود آجائے، یا تمھارے رب کی بعض صریح نشانیاں[۱۳۹] نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمھارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو، یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔[۱۴۰] اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

۱۳۷ – یعنی یہود و نصاریٰ کو۔

۱۳۸ – اللہ کی آیات سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے، اور وہ نشانیاں بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آ رہی تھیں، اور وہ آثارِ کائنات بھی جنھیں قرآن اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ
شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمھارا کچھ واسطہ نہیں[۱۴۱]، ان کا معاملہ تو اللہ کے سُپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس[۱] گنا اجر ہے، اور جو بدی لے کر آئے گا

۱۳۹ – یعنی آثارِ قیامت، یا عذاب، یا کوئی اور ایسی نشانی جو حقیقت کی بالکل پردہ کُشائی کر دینے والی ہو اور جس کے ظاہر ہو جانے کے بعد امتحان و آزمایش کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔

۱۴۰ – یعنی ایسی نشانیوں کو دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی کافر اپنے کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اس کا ایمان لانا بے معنی ہے، اور اگر کوئی نافرمان مومن اپنی نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کیش بن جائے تو اس کی اطاعت بھی بے معنی، اس لیے کہ ایمان اور اطاعت کی قدر تو اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردے میں ہے، مُہلت کی رسّی دراز نظر آ رہی ہے، اور دنیا اپنی ساری متاعِ غرور کے ساتھ یہ دھوکا دینے کے لیے موجود ہے کہ کیسا خدا اور کہاں کی آخرت، بس کھاؤ پیو اور مزے کرو۔

۱۴۱ – خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور آپ کے واسطے سے دینِ حق کے تمام پیرو اس کے مُخاطب ہیں۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ ایک خدا کو الٰہ اور رب مانا جائے۔ اللہ کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے آخرت پر ایمان لایا جائے، اور ان وسیع اُصول و کُلّیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو اوّل یوم پیدایش سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے، وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں کے لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اُپج سے، یا خواہشاتِ نفس کے غلبے سے، یا عقیدت کے غُلُوّ سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اَوہام و قیاسات اور فلسفوں سے کمی وبیشی اور ترمیم وتحریف کی۔ اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بنائے۔ جُزئیات میں مُوشگافیاں کیں۔ فُروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنایا۔ اس کے لانے والے انبیا اور اس کے عَلَم بردار بزرگوں میں سے کسی کی عقیدت میں غُلُوّ کیا اور کسی کو بغض ومخالفت کا نشانہ بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے اور ہر مذہب وفرقہ کی پیدایش نوعِ انسانی کو مُتخاصم گروہوں میں تقسیم کرتی

فَلَا يُجۡزٰۤى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلۡ اِنَّنِىۡ
هَدٰٮنِىۡ رَبِّىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۚ دِيۡنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ
حَنِيۡفًا‌ ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَ
نُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَۙ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيۡكَ
لَهٗ‌ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ

اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قُصُور کیا ہے، اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

اے محمدؐ! کہو: میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ [۱۴۲] جسے یکسُو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو: میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت [۱۴۳]، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو: کیا میں اللہ کے سوا

چلی گئی۔ اب جو شخص بھی اصل دینِ حق کا پیرو ہو، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کر لے۔

۱۴۲- ''ابراہیمؑ کا طریقہ''، یہ اس راستے کی نشان دہی کے لیے مزید ایک تعریف ہے۔ اگرچہ اس کو موسیٰؑ کا طریقہ یا عیسیٰؑ کا طریقہ بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حضرت موسیٰؑ کی طرف دنیا نے یہودیت کو اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف مسیحیّت کو منسوب کر رکھا ہے، اس لیے ''ابراہیمؑ کا طریقہ'' فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہودی اور عیسائی، دونوں گروہ برحق تسلیم کرتے ہیں، اور دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ یہودیت اور عیسائیّت کی پیدائش سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ نیز مشرکینِ عرب بھی ان کو راست رَو مانتے تھے اور اپنی جہالت کے باوجود کم از کم اتنی بات انھیں بھی تسلیم تھی کہ کعبہ کی بنا رکھنے والا پاکیزہ انسان خالص خدا پرست تھا نہ کہ بُت پرست۔

۱۴۳- اصل میں لفظ ''نُسُک'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنی قربانی کے بھی ہیں اور اس کا اطلاق عُمومیّت کے ساتھ بندگی و پرستش کی دُوسری تمام صُورتوں پر بھی ہوتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیۡءٍ ؕ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا
عَلَيۡهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ
مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ
جَعَلَـكُمۡ خَلٰٓـئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ
دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖ

کوئی اور رب تلاش کروں حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہے[۱۴۴]؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمّہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا[۱۴۵]، پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے[۱۴۶]۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے

۱۴۴ – یعنی کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے، میرا رب کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے؟ کس طرح یہ بات معقول ہوسکتی ہے کہ ساری کائنات تو اللہ کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو، اور کائنات کا ایک جُز ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اُسی نظام پر عامل ہو، مگر میں اپنی شُعوری و اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں؟ کیا پُوری کائنات کے خلاف میں اکیلا ایک دُوسرے رُخ پر چل پڑوں؟

۱۴۵ – یعنی ہر شخص خود ہی اپنے عمل کا ذمّہ دار ہے، ایک کے عمل کی ذمّہ داری دوسرے پر نہیں ہے۔

۱۴۶ – اس فقرے میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنیٰ میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرُّف کے اختیارات بخشے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدُود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم، اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت میں ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی

وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع

ع ۲۰

اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ ع

خدا نے دیا ہے، اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرّف کیا، کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیت یا ناقابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر زندگی کے دُوسرے مرحلے میں انسان کے درجے کا تعیُّن منحصر ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست موضوعات

الف

(۱) ابراہیم علیہ السلام

— آپ کی بعثت کے وقت قوم ابراہیم کی مذہبی اور تمدنی حالت پر تبصرہ ۵۵۳تا۵۵۹
— آپ پر عالمگیر دعوت کی ذمہ داری اور آپ کی مہاجرت اور تبلیغی مشن کی تفصیلات ۱۰۸تا۱۱۰
— آپ کی نسل کی دو شاخیں ۱۰۸
— آپ کے بعد حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب کی نسل کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، انھیں دنیا کی امامت کا منصب سونپا گیا ۱۰۹
— آپ کا اصل کام جس کے لیے آپ کو منصب دیا گیا ۱۰۹
— خدا تعالیٰ کی آزمائشوں پر پورا اترنا اور راہِ حق میں بے مثال قربانیاں دینا ۱۱۰
— آپ کی اپنی نسل سے ایک مسلم قوم اور اس میں ایک رسول اٹھائے جانے کی دعا ۱۱۲
— مکہ شہر امن و امان اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا گہوارہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ ۱۱۱
— حضرت ابراہیم کو تمام نسل انسانی کا پیشوا بنایا گیا ۱۱۰
— آپ کی نسل میں سے صرف صالح افراد کے متعلق وعدہ کیا گیا ۱۱۰
— حضرت ابراہیم کو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے چنا گیا ۱۱۳
— رسولؐ اللہ کی طرف سے ابراہیمی طریقہ اختیار کرنے کا اعلان
— آپ ہرگز مشرک نہ تھے ۱۱۴-۲۷۴-۶۰۵
— جزا و سزا کے لیے عیسائی یا یہودی ہونا باعث نجات نہیں ہے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ درکار ہے یہودیت و نصرانیت سب بعد کی پیداوار ہیں ۲۰۲-۱۹۷-۱۶۲-۱۱۵-۱۱۴
— آپ کا نمرود سے مباحثہ ۱۹۷تا۱۹۹
— حیات بعد الموت کے عینی مشاہدے کی درخواست ۲۰۱
— آپ سے نسبت کے حق دار لوگ ۲۶۳
— آپ کے طریقے کی پیروی کا حکم ۲۷۴-۴۴۰
— آپ کی اولاد کو ''ملک عظیم'' بخشنے کا مفہوم ۳۶۱
— شرک کے خلاف آپ کی کشمکش ۵۵۲تا۵۶۰
— شرک کے خلاف آپ کا اپنے باپ سے خطاب ۵۵۳
— آپ کا آیاتِ الٰہیہ سے درست استفادہ ۵۵۳-۵۵۶-۵۵۷
— آپ پر قریش کا بے جا فخر و ناز ۵۵۳
— آپ کے ظہور کا زمانہ ۵۵۴
— تلاشِ حقیقت کے لیے آپ کا ابتدائی تفکر ۵۵۶ تا ۵۵۸
— آپ کی دعوتِ توحید کا ہدف ۵۵۶
— قوم کی طرف سے مزاحمت اور آپ کی ثابت قدمی ۵۵۸-۵۵۹
— قومِ ابراہیم وجودِ خداوندی کی منکر نہ تھی ۵۵۹
— آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صالح اولاد کی نعمت ۵۶۰
— دینِ ابراہیمی سے متعلق اہل عرب کے غلط مزعومات ۵۸۷
— آپ کے طریقے کی تعریف ۶۰۵
— فرقہ بندی کا اسلام اور طریقہ ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ۶۰۵-۶۰۴

(۲) ابلیس

— لفظ ابلیس کے معانی اور اس کی حقیقت ۶۵

— انسان کو سجدے سے اس کا انکار ۶۴
— نافرمانوں کی ایک پوری جماعت اس کے ساتھ تھی ۶۶

(۳) آثارِ قدیمہ

— یہ دنیا سیر سپاٹے کی جگہ نہیں بلکہ مقام عبرت ہیں ۵۲۶
— اللہ تعالیٰ چاہے تو منکرین حق کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے ۵۸۳
— ہر بستی کے بڑے گمراہوں کا انجام ۵۷۹-۵۸۰

(۴) اجر

— اجر کے مستحق کام ۱۰۳-۲۱۰
— اجر کے حق دار لوگ ۲۰۳-۲۱۷-۲۵۹-۳۰۲-۳۰۳-۳۹۶-۴۱۲-۴۱۴-۴۲۴-۴۳۰-۴۵۰-
— کسی کا اجر ضائع نہیں کیا جائے گا ۲۰۹-۲۱۷-۳۰۲
— اللہ تعالیٰ نیکی کا اجر اپنی طرف سے بڑھا دیتا ہے ۳۵۳-۴۳۰
— جہاد کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ۳۷۲
— اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کے اجر کا ضامن اللہ تعالیٰ خود ہے ۳۸۷
— انبیائے کرام پر کسی تفریق کے بغیر ایمان لانے والوں کے لیے اجر عظیم ۴۱۴
— انسان کا کوئی اچھا اور برا فعل چھپ نہیں سکتا، مکمل جزا و سزا پائے گا ۱۰۳
— نیکی کے ارادے کا بھی ان کو اجر ملے گا ۳۸۷

(۵) احبار

— احبار اور مشائخ کا کام ہے کہ لوگوں کو گناہ و گمراہی سے اور حرام نہ کھانے کی تلقین کریں ۴۸۴

(۶) احد جنگ (غزوہ)

— نقشہ جنگ احد ۲۸۴
— سورۂ آل عمران سے اس کا تعلق ۲۲۸
— تحریک اسلامی کی تاریخ میں غزوۂ احد کا مقام ۲۲۹-۲۳۰
— معرکہ احد کی تفصیلات ۲۸۴-۲۸۵
— اس موقع پر رسولؐ اللہ کی بددعا اور گرفت ۲۸۷
— دنیا طلبی کا لایا ہوا وبال ۲۹۴
— مسلمانوں کو رنج پر رنج دینے کا مقصود ۲۹۵
— عین حالت جنگ میں مسلمانوں پر غنودگی کا غلبہ ۲۹۶
— نبی کے بارے میں سوء ظن کا نتیجہ ۲۹۹
— شکست کے زیر اثر عام مسلمانوں کی ایک فکری الجھن ۳۰۰
— احد کی آزمائش اور مصیبت کی وجہ اور ذمہ داری ۳۰۱
— جنگ احد کے بعد تقسیم میراث ۳۱۶
— احد کی ہزیمت کا دشمنوں پر ردِ عمل ۳۰۱-۳۱۷
— احد کی ہزیمت کا مسلمانوں پر اثر ۴۳۵
— جنگ احد سے واپسی کے بعد مشرکین کا اظہار تأسف اور مسلمانوں کا سنبھلنا ۳۰۳
— احد سے روانگی کے وقت ابوسفیان کا چیلنج کہ اگلے سال بدر میں پھر ملیں گے لیکن مکہ سے نکل کر بھی پلٹ گیا ۳۰۴

(۷) اِحرام

— احرام کی تشریح ۴۳۷
— احرام کی حالت میں پابندیاں ۱۵۵- ۴۳۷-۵۰۴-۵۰۵
— احرام شعائر اللہ میں سے ہے ۴۳۹
— احرام کی حالت میں شکار کرنے کا کفارہ ۵۰۴
— احرام کی حالت میں سمندر کے شکار کی اجازت ۵۰۵

(۸) احسان

— احسان کا مفہوم ۴۱۲
— اطاعت کا سب سے اونچا مقام ۱۵۳
— دوسروں کی غلط روش سے چشم پوشی کر کے احسان کا رویہ اختیار کرنے کا حکم ۴۵۵-۴۵۴-۵۰۳
— احسان کی دنیوی جزا ۵۶۰

(۹) احکام القرآن

— (تفصیل کے لیے دیکھو ''اصول قانون'')

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ تعالیٰ اپنے احکام نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ انسان یوں ہی نہ بھٹکتا رہے ۴۳۲
— اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام بہت وضاحت سے بیان کر دیے ہیں، بہترین رویہ جواز کی آخری حدود سے دور رہنا ہے ۱۴۷
— شرعی رعایتیں ۱۵۴
— مسافر اور بیمار کے لیے رعایتیں ۳۵۴-۳۵۵
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں ۱۷۵
— احکام خداوندی میں حسن اخلاق کی ترغیب ۱۶۸
— اللہ تعالیٰ کے احکام کو کھیل بنانا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے ۱۷۷
— تعمیل احکام میں وہ نہیں کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے بیان نہ کیا ہو ۵۰۷-۵۰۸
— اللہ تعالیٰ ہی قوانین میں نرمی کرنے والا ہے ۳۵۵
— اہل ایمان کو حکم خداوندی پر کیوں عمل کرنا چاہیے ۱۲۴
— احکام خداوندی پر عمل ہی فلاح کا راستہ ہے ۱۲۵
— احکام خداوندی پر عمل نہ کرنے والوں کی مثال ۱۳۳-۱۳۴
— احکام خداوندی پر عمل نہ کرنے والے خیانت کرتے ہیں ۱۴۵
— اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو ۵۵
— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے ۱۷۴
— احکام القرآن ۱۰۰- ۱۲۱- ۱۲۴- ۱۲۷- ۱۳۲ تا ۱۳۵- ۱۶۷ تا ۱۸۳- ۲۰۹- ۲۱۱- ۲۱۷ تا ۲۲۱- ۲۴۳- ۲۴۴- ۲۷۷- ۲۸۲- ۲۸۷- ۳۱۷ تا ۳۳۱- ۳۳۳- ۳۳۵ تا ۳۴۲- ۳۴۵- ۳۴۸ تا ۳۵۰- ۳۵۴ تا ۳۵۵- ۳۶۲- ۳۶۵ تا ۳۷۱- ۳۷۲- ۳۷۸- ۳۸۰ تا ۳۸۴- ۳۸۸ تا ۳۹۳- ۴۰۱- ۴۰۲- ۴۰۵ تا ۴۰۸- ۴۱۱- ۴۳۱- ۴۳۲- ۴۳۷ تا ۴۴۲- ۴۴۵- ۴۴۶ تا ۴۴۸- ۴۶۵- ۴۶۷- ۴۷۱- ۴۷۲- ۴۷۶- ۴۷۸ تا ۴۸۰- ۴۹۸- ۴۹۹- ۵۰۱- ۵۰۳- ۵۰۵- ۵۱۰ تا ۵۱۲- ۵۷۰- ۵۷۶- ۵۷۷- ۵۹۲- ۵۹۳- ۵۹۸ تا ۶۰۰
— احکام خداوندی کو چھپانے والے اللہ تعالیٰ اور تمام انسانوں کی لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸

(۱۰) آخرت

— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ۸۲-۱۷۳-۴۷۲-
— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ایمان)
— روز جزا و سزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے ۴۴
— عقیدۂ آخرت کی تشریح ۵۱-۶۰-۷۴-۲۴۲
— عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج ۷۴-۲۴۲
— دلائل آخرت ۳۱۱
— دنیا اور آخرت کا موازنہ ۲۳۷-۲۳۸
— فرداً فرداً جواب دہی کی ذمہ داری ۲۲۳-۵۶۵
— تمام اختلافات کا آخری فیصلہ ۲۵۹-۴۷۸-۶۰۶
— آخرت کی کامیابی ہی اصل منزل ہے ۳۰۸
— آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی حقیقت ۳۰۸-۳۷۴-۵۳۳
— دنیا کی کارگزاری کے واضح ہونے کا دن ۴۵۵-۵۱۰-۵۱۶-۵۷۱
— وہاں حقیقت مکمل بے نقاب ہوگی ۵۳۲
— اصل جائے قرار وہی ہے ۵۳۳
— وہاں جواب دہی کی ذمہ داری دوسرے پر نہ ہوگی ۵۴۴
— مکافاتِ عمل قابل انتقال شے نہیں ہے ۵۴۴
— کچھ لوگ سرخرو ہوں گے اور کچھ کا منہ کالا ہوگا ۲۷۴
— اقوال و اعمال کا مکمل ریکارڈ رکھا جا رہا ہے ۱۰۳-۳۰۶-۳۰۷-۵۴۷
— اس دن اچھے لوگوں کے اعمال ضائع نہ ہوں گے ۳۱۲
— آخرت کا محاسبہ اور افرادِ انسانی کے درمیان مساوات ۳۱۳
— دنیوی سزا، اخروی سزا سے نہیں بچاتی ۲۱۴-۴۶۵
— وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہے گی ۳۵۴

— دنیا میں اچھا برا کیے کا پھل پانے کا دن ۲۴۲-۴۰۰
— وہاں کون سے لوگ دیوالیہ ہوں گے ۴۴۷
— وہاں صرف سچائی نافع ہوگی ۵۱۷
— وہاں ظالموں کا حساب متقیوں سے نہیں لیا جائے گا ۴۸۹
— وہاں مجرمین خود اپنے اوپر گواہ ہوں گے ۵۸۱
— وہاں مقدمے میں باقاعدہ اتمام حجت کیا جائے گا ۵۸۲
— نیکی کا اجر دس گنا اور بدی کا بدلہ برابر ملے گا ۶۰۴
— وہاں کسی پر ظلم نہ ہوگا ۲۴۲-۶۰۵
— آخرت جس کا آنا یقینی ہے ۲۴۲
— آخرت پر ایمان لانے میں کیا کیا شامل ہے ۵۱
— خوفِ آخرت کی تلقین ۲۷
— رب سے ملاقات کا خوف رکھنے والوں کی حالت ۷۲
— مرغوبات دنیا کے مقابلے میں آخرت کا انعام ۲۳۸
— جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا اسے ہی ثوابِ آخرت ملے گا ۲۹۲
— آخرت کے ماننے والوں کا عملی رویہ ۶۵۴
— قیامت کے دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے ۲۳۵-۲۳۶
— صرف دنیوی زندگی کی نہیں آخرت کی بھی فکر کرنی چاہیے کیونکہ وہی اصل زندگی ہے ۲۰۶
— ایمان بالآخرت اہم ترین عقیدہ ہے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے ۱۹۰
— آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ۲۰۶
— آخرت کی رسوائی اور مصیبت سے بچنے کا حکم ۳۱۸
— منکرین آخرت خود فریبی میں مبتلا ہیں ۵۲۷-۵۷۴
— انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— اقرارِ آخرت اور انکارِ آخرت کے رویوں کا تقابل ۶۰۲
— انکارِ آخرت ہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے ۵۷۳-۵۷۴
— آخرت میں ایک اور موقع دینے کی درخواست رد کر دی جائے گی ۱۳۲-۵۳۲
— آخرت میں دنیوی اسباب و وسائل کسی کام نہ آئیں گے ۱۳۲
— نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی اور سفارش کام آئے گی ۱۹۳-۴۳۰-۵۵۰
— آخرت کا انجام کسی کی خوش خیالیوں پر موقوف نہیں ہے ۳۹۹
— وہاں ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا ۴۸۹-۵۴۹
— خود ساختہ شریکوں کے بارے میں سوال ۵۳۰
— روز آخرت دنیا میں کمزور ہونے کا بہانہ نہ چلے گا ۳۷۸
— آخرت میں دنیا پرستوں کے جھوٹے بھروسوں کی نفی ۵۳۳-۵۴۳
— وہاں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہوگا جو کسی کی حمایت اور سفارش کر سکے ۵۴۳
— سفارشیوں کا کھو جانا اور دنیوی رابطوں کا ٹوٹ جانا ۵۶۵
— اللہ تعالیٰ کی پیشی پر لوگوں کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا ۴۳۰-۵۰۵-۵۳۰
— تنِ تنہا اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ۵۶۵
— زیادہ سے زیادہ فدیہ دے کر بھی خلاصی نہ ہو سکے گی ۴۶۷
— آخرت کے آنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے ۳۷۸-۳۷۹
— تمام موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۴۵۸-۵۱۰-۶۰۶
— قیامت کا دن اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے ۵۲۳
— جس روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس دن حشر برپا ہو جائے گا ۵۵۲-۵۵۱
— آخرت کا وعدہ ضرور پورا ہوگا ۵۸۳
— اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت دیتا ہے ۵۶۵-۵۶۶
— آخرت کے دن سزا سے بچنا ہی اللہ تعالیٰ کا بڑا رحم اور اصل کامیابی ہے ۵۲۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کے نتائج ۹۰
— آخرت میں کن چیزوں کی باز پرس ہوگی ۱۱۴-۱۱۸-۳۴۶
— آخرت میں شہادت علی الناس کے فریضے کی جواب دہی ۱۱۹
— قوموں پر ان کے انبیائے کرام سے شہادت طلبی ۳۵۳-۵۱۳
— حضرت عیسیٰؑ سے شہادت کی طلبی اور ان کی اپنی قوم کی عاجزانہ شفاعت کی درخواست ۵۱۲ تا ۵۱۷
— آخرت میں گمراہ دنیوی پیشواؤں کی روش اور ان کی پیروی کرنے والوں کی ناکام حسرت ۱۳۲
— دنیا پرستوں کے لیے آخرت میں کامیابی کا کوئی حصہ نہیں ۱۵۷
— ریاکارانہ اعمالِ دنیا روز آخرت میں بے برگ و بار رہیں گے ۲۰۶
— وہاں کن لوگوں کے لیے محرومی ہے ۲۶۶-۲۷۰
— آخرت کی فلاح کا دارومدار کثرتِ رزق پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے ۱۱۱-۱۶۲
— اللہ کی رحمت کے جائز امیدوار کون ہیں؟ ۱۶۶
— مجرمین کی بعد از وقت پشیمانی ۲۴۵
— کفر مزرعۂ آخرت کے لیے تباہ کن ہے ۲۸۲
— آخرت کے لیے دنیوی مفاد کی قربانی ۳۷۲
— آخرت میں شیاطین جن سے خطاب ۵۸۰
— دنیا و آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب کے مستحق ۹۱

(۱۱) اخلاق، اخلاقی تعلیمات

— والدین سے حسن سلوک ۹۰-۱۶۴-۳۵۱-۵۹۸
— یتیموں سے حسن سلوک ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۱۶۷-۱۶۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۵۱-۴۰۱-۵۹۹
— رشتہ داروں اور ہمسایہ سے حسن سلوک ۳۵۱
— علیحدگی کی صورت میں زوجین کو حسن سلوک کی تلقین ۱۷۴
— زوجین کو بھلے طریقے سے زندگی بسر کرنے کی تاکید ۳۳۴-۳۳۵
— اطاعت شعار بیویوں پر خواہ مخواہ دست درازی نہ کی جائے ۳۵۰
— باہمی فیاضانہ برتاؤ کی تلقین ۱۸۱-۱۸۲-۳۴۱
— ''امت وسط'' ہونے کے اخلاقی تقاضوں کی یاددہانی ۱۷۷
— مسلمانوں کو امامت عالم دیتے وقت ہدایات ۱۲۵-۱۲۶
— اخلاق میں احسان اور انفاق کی اہمیت ۱۵۳-۱۶۴
— قرآن ازدواجی زندگی میں استعارہ و کنایہ کی زبان میں حیاداری کی تعلیم دیتا ہے ۱۷۰
— جو شوہر بیوی کو تحفہ وغیرہ دے چکا اسے واپس مانگنے کی ممانعت ۱۷۵
— انفاق کے ساتھ احسان دھرنے کی ممانعت ۲۰۳
— ریا سے بچنے اور خلوص پر کاربند ہونے کی نصیحت ۲۰۴-۲۰۵-۳۵۲
— امانت داری کی تلقین ۲۲۲
— شہادت (گواہی) کو چھپانے کی ممانعت ۲۲۰-۲۲۲
— شہادت کے معتبر ہونے کے لیے اخلاقی سیرت کا لحاظ ۲۲۰
— اخلاق میں ''اپنی اپنی کمائی'' کا اصول ۲۲۴-۲۲۵
— اجتماعی قوت میں اخلاق کی اہمیت ۲۳۷-۲۳۸
— دنیوی مفاد سے نگاہ اونچی رکھنے کی نصیحت ۲۳۸-۲۹۲
— معاف کرنے اور احسان کرنے کا اخلاقی اسلوب اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ۴۱۳-۴۵۵
— تنگ نظر لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ۲۰۷
— اہل حاجت کی آگے بڑھ کر مدد کرنے کی اہمیت ۲۰۹
— بدحالی میں باوقار رہنا ۲۰۹-۲۱۰
— مارے گئے حق کو لوٹانے کا درس ۲۱۴
— دو قسم کے انسانی کرداروں کا تقابل ۲۱۷
— لین دین میں فیاضانہ طرز عمل کی نصیحت ۲۱۸-۲۲۱
— مقروض کے ساتھ نرمی کرنے کی تلقین ۲۱۸
— پڑھے لکھے آدمی کی ذمہ داریاں ۲۱۹

— سودخوری اور انفاق سے دو الگ الگ قسم کی سیرتیں بنتی ہیں ۲۸۸
— غلطی کے بعد فوری ندامت اور اصلاح کی روش ۲۸۹-۳۶۸-۳۹۵
— عزم وہمت ایمان کے لازمی اوصاف ہیں ۲۸۹
— اسلامی اخلاقیات کا فیصلہ کن سوال ۲۹۲
— باطل کے مقابلے میں ثابت قدمی کی تلقین ۲۹۳-۳۹۳-۳۱۴
— حرص اور لالچ کے اخلاقی مفاسد پر تبصرہ ۲۹۴
— اللہ کی راہ میں خرچ پر کنجوسی شرمناک ہے ۲۰۷
— خوشحال فرد کی کنجوسی مکروہ اور سخت ناپسند ہے ۳۰۶-۳۵۲
— اشتعال انگیزی کے جواب میں صبر اور خدا ترسی کا رویہ حوصلہ مندی کی علامت ہے ۳۰۹
— تقسیم وراثت کے وقت وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنا چاہیے ۳۲۴-۳۲۵
— وصیت میں حق تلفی کی ممانعت ۳۲۹
— ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو'' کے تین مفہوم ۳۴۵
— اللہ نے جو فضل کسی کو تم سے زائد دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو ۳۴۷-۳۴۸
— غرور اللہ کو پسند نہیں ہے ۳۵۲
— عدل وامانت کی تاکید ۳۶۲
— اہل ایمان کو ہمیشہ بھلائی کی سفارش کرنی چاہیے ۳۷۷
— باہمی تحیہ وسلام کرنے کی تاکید ۳۷۸
— ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھنے کا فائدہ ۴۳
— نظام اخلاق میں توبہ کی اہمیت ۶۸
— قرآن بھلائیاں پیدا کرنا چاہتا ہے ۹۰-۱۳۷
— وہ برائیاں جن کو قرآن مٹانا چاہتا ہے ۶۰-۹۰
— حج میں اسلامی اخلاق کی تربیت ۱۵۵
— ایسے کاموں کی تعریف چاہنے والوں کی مذمت جو کیے ہی نہیں گئے ۳۱۰
— اگرچہ کسی کا حق نہ بھی ہو تو بھی اسے ضرور کچھ دو ۳۲۵
— کسی بھی شخص سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی جگہ خود کو تصور کرو ۳۲۵
— صدقہ خیرات اور نیک کام کی خفیہ تلقین ۳۹۶
— مظلوم اگر ظالم کے خلاف زبان کھولے تو اس کا حق دار ۴۱۳
— نیکی کے کام میں تعاون اور برائی میں عدم تعاون کرو ۴۴۰
— دوسروں کی غلطی پر چشم پوشی کا رویہ احسان کی روش ہے ۴۵۴-۴۵۵
— بدلے اور قصاص کو صدقہ کرنا گناہوں کا کفارہ ہے ۴۷۴
— اہل ایمان باہم نرم اور کفار کے لیے سخت ہیں ۴۸۲-۴۸۱
— جو شخص اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اسے معاشی و معاشرتی کمزوری کے سبب نظر انداز نہ کرو ۵۴۳-۵۴۴
— کوئی گروہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں، ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا ۲۶۶-۲۶۷
— نیکی اور بھلائی کی طرف سبقت کرو ۱۲۳
— دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے ساتھ طلب کرنی چاہیے ۱۵۷-۱۶۷
— اخلاق کے لیے ایمان بالآخرت کی اہمیت ۱۵۸
— رضائے الٰہی کے لیے جان کی بازی لگا دینے والے کا کردار ۱۵۹
— خدا ہماری کارگزاریوں کو خوب جانتا ہے ۱۶۴
— صدقات سے اخلاقی آلودگیاں دور ہوتی ہیں ۲۰۸
— احکام خداوندی میں حسن اخلاق کی ترغیب کا اہتمام ۱۶۸
— اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اخلاقی بلندی کی ضرورت ہے ۲۰۲-۳۱۸
— مکہ میں مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے خطوط ۲۲۶
— روزہ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے ۱۴۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— حق کے لیے جانی قربانی دینے کا جذبہ ۲۹۸-۳۱۲
— انصاف کے ساتھ گواہی دینے اور انصاف کا علمبردار بننے کا حکم ۴۰۵-۴۰۶-۴۴۹-۴۷۲
— برائی کے جواب میں بھلائی کرنے یا درگزر کرنے کی تلقین ۴۱۳
— راستی پر قائم رہنے والے بنو ۴۴۹
— اللہ پر بھروسہ رکھو اور حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو ۴۵۰-۴۹۹
— نیکی اور بھلائی میں مقابلہ و مسابقت کرو ۴۷۴
— ہر بات انصاف سے کہو ۶۰۰
— ضلالت و گمراہی میں مبتلا انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸
— ضمیر سے خیانت کرنے کی حالت ۱۴۵-۳۹۴
— دھاندلی سے مال حاصل کرنے کی ممانعت ۱۴۷-۳۴۵
— دل کا گناہ آلودہ ہونا ۲۲۲
— غیروں کو رازدار اور رفیق بنانے کی ممانعت ۲۸۲-۳۱۱
— احد کی جنگ میں شکست اخلاقی کمزوریوں کا نتیجہ تھی ۲۹۷
— سوءظن کی ممانعت ۲۹۹
— خیانت کا اخروی انجام ۲۹۹
— اللہ کی رضا چاہنے والے اور اللہ کے غضب میں گھر جانے والے برابر نہیں ۳۰۰
— انصاف میں تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے ۳۹۴
— ناپسندیدہ باتوں کے لیے خفیہ مشاورت کی ممانعت ۳۹۵-۳۹۶
— اپنے گناہ دوسروں کے سر تھوپنے کا اخلاقی اثر ۳۹۵
— نجویٰ کے جائز حدود ۳۹۶
— تنگ دلی سے پرہیز کی تلقین ۴۰۲
— بدگوئی کی ممانعت ۴۱۳
— اسراف سے بچنے کی تلقین ۴۹۹
— شراب اور جوئے کی حرمت ۵۰۱
— فضول سوالات کی ممانعت ۵۰۷-۵۰۸-۵۱۰
— دوسروں کے معبود کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ۵۷۰
— کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو ۵۷۷
— فواحش کے قریب نہ پھٹکو ۵۹۹
— انسانی جان کا احترام کرو ۵۹۹
— ناپ تول پورا رکھنے کا حکم ۶۰۰
— ’’عہد اللہ‘‘ کو پورا کرو ۶۰۰
— ہدیہ یا تحفہ دے کر واپس لینے کو رسولؐ اللہ نے کتے کی اس حرکت سے تشبیہ دی ہے جو قے کر کے چاٹ لیتا ہے ۵۷۱

(۱۲) آدم علیہ السلام

— آدم علیہ السلام ۱۷-۶۱ تا ۶۹
— آپ کے دو بیٹوں کا قصہ ۴۶۱ تا ۴۶۳
— جنت میں ان کا امتحان اور اس کا مقصد ۶۶
— حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ایک خاص درخت کے علاوہ ہر نعمت سے بہرہ ور ہونے کی اجازت دی گئی ۶۵-۶۶
— حضرت آدمؑ و حواؑ کو امتحان کے لیے جنت ہی میں کیوں رکھا گیا؟ ۶۶
— شیطان نے انہیں گمراہ کر کے ممنوع پھل کھلوا دیا ۶۷
— حضرت آدم و حوا کو اللہ تعالیٰ نے توبہ سکھلائی اور ان کی توبہ قبول ہوگئی ۶۷
— حضرت آدم و حوا کو توبہ قبول ہونے پر بھی جنت سے کیوں نکالا گیا ۶۸-۶۷
— حضرت آدم کو جنت سے اخراج پر بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے لیے رنج و غم کا کوئی موقع نہیں ۶۸
— حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ تشبیہ ۲۵۹

(۱۳) اذان

— اذان کا مذاق اڑانے والوں کی مذمت ۴۸۳

(۱۴) آزر

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن ۵۵۴

— اس کی آبادی کی طبقاتی تقسیم ۵۵۴
— ان کا مشرکانہ طرزِ فکر ۵۵۴-۵۵۵
— دورِ ابراہیمی کا شاہی خاندان ۵۵۵

(۱۵) ارتداد

— دنیا و آخرت میں تمام اعمال کو برباد کرنے والا گناہ ۱۶۶
— یہود کا ایمان لانے کے بعد کفر کرنا اور اس کا وبال ۲۷۱
— ایمان کی نعمت پا کر پھر کفر کرنے والوں کا انجام ۲۷۸
— کفر و ایمان کو کھیل بنا لینا ۴۰۷

(۱۶) ازدواجی زندگی

— انسانی تمدن میں ازدواجی زندگی کی اہمیت ۹۹
— ازدواجی زندگی کے آداب ۱۶۹-۱۷۰
— ازدواجی زندگی کو صبر سے نباہنا ۳۴۴
— ازدواجی تعلق کی نوعیت ۱۴۵-۱۶۹
— مہر کے معاملے میں فریقین کو فیاضانہ برتاؤ کا حکم ۱۸۱
— بیوی کا مہر معاف کرنا ۳۲۲
— مہر مارنے کے لیے عورت کو تنگ نہ کیا جائے ۳۳۴
— بیویوں کے نان ونفقہ کے لیے وصیت کرنے کا حکم ۱۸۳
— مرد ہر عورت کے نفقہ کا ذمہ دار ہے ۳۴۹
— تعدد ازدواج کو محدود کیا گیا ہے ۳۲۰ تا ۳۲۲
— تعدد ازدواج کی صورت میں بیویوں میں عدل کرنے کا حکم ۳۲۰-۴۰۲ تا ۴۰۴
— زوجین باہم تنگ دلی سے برتاؤ نہ کریں ۴۰۲
— بیویوں کے درمیان عدل کے برتاؤ کی حد ۴۰۲
— بیویوں کو معلق رکھنے کی ممانعت ۴۰۳
— طلاق بالکل آخری چارۂ کار رہتا ہے ۳۳۴
— زوجین کے لیے مصالحت، جدائی سے زیادہ بہتر ہے ۴۰۲
— زوجین کے اصلاح تعلقات کے لیے ثالثی کا طریقہ ۳۵۰-۳۵۱
— مرد کی قوامیت اسلامی معاشرت میں ۳۴۹
— بہترین بیوی کی صفات اور شوہر کی اطاعت کے حدود ۳۴۹
— عورت کا نشوز اور اس کے آخری حدود ۳۴۹-۳۵۰
— میاں بیوی میں جدائی کے ذمہ دار افراد کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۹۹
— وراثت، نکاح و طلاق اور رضاعت وغیرہ کے معاملات خفیہ نہیں ہونے چاہییں ۱۸۲
— بیوی کی ناگوار اور ناپسندیدہ باتوں سے درگزر کرو ۳۳۴
— میاں بیوی کے بگڑے تعلقات اصلاح کے طریقے ہیں ۳۴۹-۳۵۰
— مرد عورت پر قوام ہے جو بمعنی شرف و عزت نہیں بلکہ فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ہے ۳۴۹
— اگر زوجین الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز کر دے گا ۴۰۴
— میاں بیوی میں ترکِ تعلق کی مدت اور رجوع وغیرہ کے احکام ۱۷۰-۱۷۱
— (نیز دیکھو ’’ایلا‘‘، ’’خلع‘‘، ’’رضاعت‘‘، ’’طلاق‘‘، ’’عورت‘‘، ’’مہر‘‘ اور ’’نکاح‘‘، ’’اسلام کی معاشرتی تعلیمات‘‘)

(۱۷) ازلام (جوا)

— دیکھو ’’جوا‘‘

(۱۸) آزمائش

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’امتحان‘‘)
— راہِ حق میں آزمائش ناگزیر ہے ۱۲۶- ۱۶۳- ۳۰۸-۵۷۴
— آزمائش کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا ۳۴
— انسان کی دنیوی زندگی سراسر آزمائش ہے ۱۶۰- ۱۶۱-۶۰۷
— انسان کی آزمائش کا دارومدار اس کی آزادی اور اختیار پر ہے ۵۷۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— آزمائش کے مختلف طریقے ہیں ۱۲۶-۱۲۷
— دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا بلکہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے ۱۶۳
— مذاہب کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں ۱۹۲-۱۹۳
— نافرمانوں کا پھلنا پھولنا اور اطاعت گزاروں کی آزمائش پر قرآن کا تبصرہ ۲۴۳
— دنیا کی زندگی میں آزمائش اور امتحان کی نوعیت ۵۲۶
— دنیوی زندگی میں حقیقت پر پردہ آزمائش کا سامان ہے ۵۳۲
— مرغوبات دنیا کا وجہ آزمائش ہونا ۲۳۸
— ایمان میں غربا کی سبقت امیر لوگوں کے لیے آزمائش ہے
— اللہ انسان پر ظلم نہیں کرتا، انسان خود کو آزمائش میں ڈالتا ہے ۲۷۹
— اللہ تعالیٰ انسانوں میں نشیب و فراز کی گردش کرتا رہتا ہے ۲۹۰
— آزمائش و ابتلا کی بنیادی وجہ انسان کی اپنی شامت اعمال ہے ۲۹۳
— آزمائش پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مقابلہ کرنا چاہیے ۲۹۵
— آزمائش وابتلا انسان پر اپنی حرکتوں کی وجہ سے آتی ہے ۳۶۷-۴۷۹-۳۷۵-۳۶۷
— انسان پر بھلائی صرف اللہ کی عنایت اور فضل سے آتی ہے اور مصیبت انسان کے اپنے کسب و اعمال کی وجہ سے آتی ہے ۳۷۵
— اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہی مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹
— بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر فوقیت حقیقت میں آزمائش ہے ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ضرور آزماتا ہے تاکہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے ۳۰۵
— آزمائش پر پورا اترنے اور بھلائی میں سبقت لینے کی کوشش کرنی چاہیے ۴۷۷-۴۷۸
— اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی آزمائش کرتا ہے ۷۵
— دنیوی آزمائش داعیانِ حق کو چھانٹنے کا طریقہ ہے ۲۹۰
— آزمائش و ابتلا دلوں کے کھوٹ چھانٹنے کے لیے ضروری ہے ۲۹۷
— جنگ احد کی ہزیمت مومنین اور منافقین کے چھانٹنے کا ذریعہ بنی ۳۰۱
— آزمائش کا مقابلہ صبر وتقویٰ سے کرو ۳۰۸-۳۰۹
— حق و باطل کی کشمکش میں آزمائش کا مقام ۵۳۶
— دنیوی خوش حالی میں آزمائش ۵۴۰
— ہدایت یافتہ کے لیے کوئی بھی آزمائش سخت نہیں ۱۲۰
— ابتلا و آزمائش اور مصیبت کی دعا ۱۲۶-۱۲۷
— آزمائش سے بچاؤ کی دعا ۲۲۵
— آزمائش، جہاد اور دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا ۲۹۳
— آزمائش میں دل شکستہ ہونے کے بجائے صبر کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ صابروں کو پسند کرتا ہے ۲۹۲-۲۹۳
— تحویل قبلہ میں آزمائش ۱۲۰
— آزمائش کے لیے پردۂ غیب کے قائم رہنے کی اہمیت ۱۶۰-۱۶۱-۵۲۵-۵۲۶
— اختلاف شرائع میں انسان کا امتحان ۴۷۷-۴۷۸
— قرآن مجید اپنے مخاطب کے لیے آزمائش بن گیا ۵۶۹
— حالت آزمائش اور ایمان ۶۰۴
— انسان کو ذہانت اور تصرف کا اختیار بھی آزمائش ہے ۵۶۳

(۱۹) اسبابِ ضلالت

— قانون الٰہی کے بجائے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنا گمراہی کا سبب ہے ۴۷۶-۴۷۷
— خواہشات کی پیروی کرنا ۴۷۹-۵۰۹

— علم کے بغیر محض خواہشات نفس کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرنا ۵۷۷
— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام رد کرنے والے بھٹک گئے ۵۸۹
— مذہبی پیشواؤں، سرداروں اور باپ دادا کی اختیار کردہ جاہلی رسومات کی مذمت اور تردید ۵۸۸-۵۸۹
— اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۵۹۰
— ارتداد تمام اعمال کے برباد ہونے کا سبب ہے ۱۶۶-۱۷۱-۲۷۸-۴۰۷
— جہالت وحماقت بھی ضلالت کا سبب ہے ۱۱۲
— اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا، انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— انبیائے کرام کے طریقے سے ہٹ جانا ۵۵۳
— بنی اسرائیل کی گمراہی کی بڑی وجہ ۴۹۷
— تقلید ایک اہم ترین وجہ گمراہی ۱۱۸-۱۳۲-۱۳۳-۵۰۹-۵۸۸-۵۸۹

(۲۰) اسحاق علیہ السلام

— انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— انھیں راہِ راست دکھائی گئی، وہ صالحین میں سے تھے ۵۵۹-۵۶۰

(۲۱) اسلام

— اس کی تشریح ۱۷-۱۱۳-۲۷۰-۳۷۴-۴۰۰-۵۵۱
— اصل دین اسلام تھا، دوسرے مذاہب اس کے مسخ ہونے سے بنے ۱۷-۱۹
— اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ۱۱۳-۲۳۹-۴۴۳-۶۶۶
— تمام انبیائے کرام کا دین اسلام تھا ۲۴۰
— اسلام ہی دین حق ہے ۲۷۰-۴۴۳-۶۶۶
— اسلام کے برحق ہونے کے دلائل ۱۶۲-۱۶۳-۲۳۳-۲۴۰-۲۷۰
— اسلام کے تین بنیادی نکات ۲۵۴-۲۵۵
— اسلامی عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ ۴۲۴
— اسلام کے مقابلے میں جاہلیت کی اصطلاح ۴۷۹
— دین اسلام ابراہیمؑ کا دین ہے اور ہر قسم کی ٹیڑھ سے بالکل پاک ہے ۶۰۵
— اسلام، جاہلیت کے تعصبات کی بیخ کنی کرتا ہے ۱۲۰
— اسلام تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لیے آیا ہے ۱۲۸-۴۳۰-۴۳۱
— اللہ پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہی دعائیں سننے والا ہے ۱۴۴
— اسلام دین فطرت ہے، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— اسلام میں جبر اور اکراہ نہیں ہے ۱۹۵-۱۹۶
— مسلم یک سو ۲۶۳
— قانون اسلامی کی پیروی میں سراسر ہماری ہی بھلائی ہے ۳۶۶
— ایمانیاتِ اسلام کے ارکان ۴۰۷
— ایک مکمل دین اور ایک مکمل نظام ۴۴۳-۴۴۴
— اسلام دنیوی زندگی کو آسان اور سہل کرتا ہے ۴۴۴-۴۴۵
— اسلام ہدایت وراہ نمائی کا منصب ۴۴۹
— اسلام ہی دنیوی کامیابی اور اخروی سرفرازی کا ذریعہ ہے ۴۵۲ تا ۴۵۴
— اسلام ایک نور ہے جو قرآن مجید اور رسالت محمدؐ کے ذریعے سے سلامتی کا راستہ بتاتا ہے ۱۶ تا ۱۹-۴۵۶
— خوفِ آخرت رکھنے والے ہی اسلام سے فیض یاب ہوتے ہیں ۵۴۳
— اسلام ہی اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی کا ذریعہ ہے ۵۵۱
— قرآن کو تمام دنیا والوں کے لیے نصیحت بنایا ۵۶۲
— اسلامی تہذیب کے اصول ۴۳
— قبولِ اسلام کی ابتدائی ظاہری علامات ۱۳۴-۴۴۴
— اِس کی عبادات کے نظامِ اوقات کی سادگی ۱۴۵
— ہمہ تن اسلام کے تحت آ جانے کا مطالبہ ۲۰۲-۲۰۳
— اسلام کے سوا کوئی اور روش عند اللہ قبول نہ ہوگی ۲۷۰
— اسلام کے مخالفین کے اعتراضات کا جواب

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۷۳-۲۷۴
— اسلامی شریعت انسان کی بھلائی کے لیے ہے ۳۴۶
— اسلام کا عقیدہ و مسلک سے آگے بڑھ کر ریاست بن جانا ۴۳۵
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'' اور ''اسلام کی سیاسی تعلیمات'')
— اسلام کو قبول کر لینے کا مطلب ۴۴۴
— شریعت اسلام کے احکام تنگی پیدا کرنے والے نہیں ۴۴۸
— اسلام کا معاشی نقطہ نظر ۲۰۲-۲۰۳
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام کی معاشی تعلیمات'')
— شرائع الٰہیہ میں اصولی پابندیاں ۵۹۷ تا ۵۹۹
— قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت اور حیثیت سے آشنا کروایا ۱۷ تا ۱۹
— اسلام کی معاشرتی تعلیمات ۹۹
— ایمان کا حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جو روشنی کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۶-۱۹۷
— اسلام قبول کرنے والے کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا ۴۳۱
— اہل ایمان کو نصیحت کہ کس طرح اپنے نظام کی خوبیاں برقرار رکھیں ۴۳۶
— وہ مرحلہ جب اسلام ایک مکمل نظام بن کر چھا گیا ۴۴۳
— ہدایت اور رشد کا راستہ واضح کر دیا گیا ۸۰
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات پوشیدہ نہ رکھنے کا عہد لیا گیا تھا ۳۰۹-۳۱۰
— اسلام نے اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کیا ہے ۴۵۵-۴۵۶
— اہل کتاب اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، ایسے لوگوں سے دوستی اور رفاقت رکھنے کی ممانعت ۴۸۳
— اسلام کی دعوت کئی اہل کتاب میں سرکشی کا باعث بن جاتی ہے ۴۸۵
— اسلام کا مستقبل کی کامیابیوں کے بارے میں پیشگی اشارہ ۵۲۴
— اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے ۵۷۹
— اسلامی احکام پر عمل کرنے میں قیل و قال اور بال کی کھال اتارنے کی روش انسان کو راہ راست سے بھٹکا دیتی ہے ۱۰۲
— مسلمانوں کو اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا حکم ۱۱۶-۱۱۷
— اسلام افراد کا مرہون منت نہیں ۴۸۱
— اہل ایمان سے مال و جان کی قربانی کا تقاضا ۲۰۲
— برائی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنے کی مذمت ۴۹۶

(۲۲) اسلام کی سیاسی تعلیمات

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام کی معاشرتی تعلیمات'' اور ''اسلامی معاشرہ'')
— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'')
— اسلامی دستور کی اولین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴
— اللہ تعالیٰ اصل اور اولین مطاع ہے ۳۶۳
— اطاعت رسول اگرچہ مستقل بالذات اطاعت نہیں لیکن اطاعت خداوندی کی واحد عملی صورت ہے ۳۶۳
— اطاعت خدا اور اطاعت رسول کے تحت تیسری اطاعت اولی الامر حضرات کی ہے جو اطاعت خدا اور اطاعت رسول کے پابند ہوں ۳۶۳-۳۶۴
— بنیادی قانون حکم خداوندی اور سنت رسول اللہ ہے ۳۶۳-۳۶۵
— حکمرانی کے لیے حکمت اور علم ۱۹۱
— حکمران، حکمرانی کے زعم میں مبتلا رہتے ہیں ۱۹۸-۱۹۹
— مطلوب حکمران امانت دار اور امانت و دیانت سے فیصلے کرنے والے ۳۶۲-۳۶۳
— قیادت کی نااہلی، بددیانتی اور کم ظرفی بنی اسرائیل کو لے ڈوبی ۳۶۲-۳۶۳
— اچھا حکمران مشاورت سے فیصلہ کرتا اور اللہ پر بھروسا کرتا ہے ۲۹۸
— اختیارات کے حق دار لوگ ۳۷۷

(۲۳) اسلام کی معاشرتی تعلیمات

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اخلاقی تعلیمات''، ''اسلامی نظم جماعت'')
— معاشرتی تعلیمات کی اولین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴
— معاشرتی اور تمدنی احکام میں اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی کا حق نہ مارو بلکہ حق سے زیادہ دو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے ۱۸۳
— اہل ایمان کافروں کو رفیق و دوست نہ بنائیں ۲۴۳-۲۴۴
— یہود سے معاشرتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کیونکہ وہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے ۲۸۲-۲۸۳
— دین اسلام اہل ایمان کو باہم جوڑتا ہے جب کہ وہ پہلے نااتفاقی کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ۲۷۶-۲۷۷
— صبر وشکر اور خوف خدا سے زندگی گزارنے کا پھل ۲۸۳
— رشتہ داری اور قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے رویوں پر نگران ہے ۳۱۹
— تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور حقوق وفرائض میں عین برابر ہیں ۳۱۹
— معاشرے میں فرق مراتب محض ایک اعتباری چیز ہے، حقیقی نہیں ۳۴۱-۳۴۲
— معاشرے میں کسی کی اونچی حیثیت پر حسد نہ کرو ۳۴۷-۳۴۸
— معاشرے میں مختلف طبقات کے حقوق وفرائض ادا کرو اور اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بھی فضل وکرم کی دعا کرتے رہو، اس رویے سے معاشرے میں مکمل امن وسکون رہے گا ۳۵۱-۳۵۲
— معاشی اور معاشرتی برائی پر فخر کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں ہے ۳۵۲
— تحفہ یا ہدیہ واپس لینا اسلام کے اخلاقی اصولوں کی ضد ہے ۱۷۵
— خفیہ عہد و پیمان اور خفیہ معاہدوں کا اسلام قائل نہیں ہے ۱۸۰
— عہد سے پھرنے والا فاسق ہے ۲۶۹
— کفار کے ظلم سے بچنے کے لیے اپنی پہچان چھپانے کی اجازت ہے ۲۴۴
— اسلامی معاشرے میں اولی الامر ہر شخص کو شریک مشورہ رکھتا ہے اور جب عزم کسی فیصلے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر قدم اٹھالیتا ہے ۲۹۸
— کوئی معاشرتی گروہ اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں ہے، کامیابی کا معیار اچھے اعمال ہیں ۲۶۶-۲۶۷
— دعوت حق کے داعین ہدایت کی روشنی میں زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸
— بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس میں ہر دو گروہ کی آزمائش ہے ۶۰۶
— افراد معاشرہ کے معاشی حقوق ملکیت اور حقوق استعمال پر معاشرہ پابندی لگا سکتا ہے ۳۲۲-۳۲۳
— باطل طریقے سے دوسرے کا مال کھانا معاشرے کو ہلاکت میں ڈالتا ہے ۳۴۵-۳۴۶
— افواہیں پھیلانے کی ممانعت ۳۷۶-۳۷۷
— اختیارات حاصل کرنے کے حق دار افراد ۳۷۷
— اہل ایمان خواہ وہ دارالسلام کے ہوں یا دارالحرب کے ہوں ان کے ساتھ نرم رویہ رکھو ۳۸۵
— خفیہ مشوروں میں اکثر وبیشتر بھلائی نہیں ہوتی ۳۹۶
— صدقہ خیرات اور نیکی کے کاموں میں خفیہ تلقین و مشورہ بھلی بات ہے ۳۹۶
— جس محفل میں آیات اللہ کے خلاف کفر بکا جارہا ہو یا ان کا مذاق اڑایا جارہا ہو اس سے فوری الگ ہو جاؤ ۴۰۸-۵۴۹
— نیکی اور بھلائی کے کام میں تعاون کرو ۴۴۰
— عدل وانصاف کے معاملے میں گروہی اختلافات کو الگ رکھو، صرف عدل کرو جو خدا ترسی کے زیادہ قریب ہے ۴۴۹
— چشم پوشی کرکے احسان کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۴۵۴-۴۵۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— بری خبر معاشرے کے ذمہ داران تک پہنچائیں، معاشرے میں نہ پھیلائیں ۳۷۶-۳۷۷
— اہل ایمان باہم نرم اور کفار کے لیے سخت ہیں ۴۸۱-۴۸۲
— اہل ایمان کے رفیق اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں، ایسے رفیق غلبہ اور کامیابی کے ضامن ہیں ۴۸۲
— باہم اصلاح کے کام کو چھوڑنا قابل مذمت ہے ۴۹۶
— دوسروں کے اعمال کی خرابیاں دیکھنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرو ۵۱۰
— جو شخص اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اسے الگ نہ کرو ۵۴۳-۵۴۴
— غلط کار لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے ۵۴۹
— میاں بیوی کا رشتہ ایک لباس کی طرح ہے ۱۴۴-۱۴۵
— عورت اور مرد کے درمیان تعلق کی فطری نوعیت کیا ہے ۱۷۰
— شوہر اور بیوی میں ترک تعلق کی مدت اور رجوع کے احکام ۱۷۰ تا ۱۷۲
— مرجانے پر حقوق وفرائض کا وارثین کی طرف منتقل ہونا ۱۷۸-۱۷۹
— مطلقہ عورت کے نکاح میں رکاوٹ بننے کی ممانعت ۱۷۸
— وراثت اور نکاح وطلاق بعد رضاعت وغیرہ کے معاملات خفیہ نہیں ہونے چاہییں ۱۸۲
— مرد کے لیے بیویوں کی تعداد کو محدود کیا گیا ہے ۳۲۰-۳۲۲-۴۰۳-۴۰۴
— بیوی کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارنے کا حکم ۳۳۴
— منہ بولا رشتہ، دوستی اور عہد و پیمان حق وراثت نہیں، یہ شرعی وارثین کا حق ہے، ہاں ان کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے ۳۴۷-۳۴۸
— زوجین کے بگڑے تعلقات میں اصلاح کا قرآنی طریقہ ۳۵۰-۳۵۱
— ایک اچھا ساتھی فضل خداوندی ہے ۳۷۰
— مرد عورت پر قوام ہے جو بمعنی شرف وعزت نہیں بلکہ فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ہے ۳۴۹
— صالح عورت کی کیا صفات قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ۳۴۹
— زوجین احسن طریقے سے علیحدہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ایک دوسرے سے بے نیاز کردے گا ۴۰۴
— احکام رضاعت ۱۷۸-۱۷۹
— حق تلفی کی ممانعت ۱۸۳
— ادائیگی حقوق ہی تقویٰ کی راہ ہے ۱۸۳
— گمراہی کے کاموں میں عدم تعاون کا حکم ۴۴۰
— نصیحت کا راستہ اختیار کرنے کا حکم ۵۴۹
— قتل انسانی اور قصاص کے احکام ۱۳۷ تا ۱۳۹
— تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے ۱۳۸-۱۳۹
— قتل اولاد کی صورتیں ۵۸۵-۵۸۸
— انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے محترم ٹھیرایا ہے تاہم قرآن وحدیث میں پانچ صورتیں مستثنیٰ ہیں ۵۹۹-۶۰۰
— خودکشی اور قتل انسانی کی ممانعت ۳۴۵-۳۴۶
— ایک انسان کی جان بچانا گویا تمام انسانیت کی جان بچانا ہے ۴۶۴
— اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے والے فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور جلاوطنی ہے ۴۶۴-۴۶۵
— کسی کو معاف کر دینا انسان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یعنی قصاص ایک صدقہ بن جاتا ہے ۴۷۴
— قرض کی ادائیگی سے معذور شخص کے قرض خواہوں کو مہلت دینے یا قرض کا ایک حصہ یا پورا قرض معاف کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے ۲۱۸-۲۱۹
— قرض اور تجارتی معاملات کو تحریر میں لانا چاہیے تاکہ معاملات صاف رہیں ۲۱۹-۲۲۲
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک

یا نادانستہ کمی بیشی کی باز پرس نہ ہوگی ۶۰۰
— دوسرے سے خیانت کرنے والا دراصل اپنے ہی نفس سے خیانت کرتا ہے ۳۹۴
— والدین سے نیک سلوک کرنے کا حکم ۵۹۸-۵۹۹
— اس دنیا کی چیزوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے والا ہی عقل مند ہے ۳۰۶
— کنجوسی کرنے اور دوسروں کو کنجوسی کی تلقین کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے ۳۵۲-۳۵۳
— یتیم کے مال کی حرمت کا حکم ۵۹۹-۶۰۰
— تیموں کا مال ان کے سپرد کرتے ہوئے گواہ لے لو ۳۲۴
— شراب اور جوئے سے معاشرہ میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳
— اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بنانے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۴۰۸-۴۱۱
— مظلوم اگر ظالم کے ظلم پر بدگوئی کرے اور زبان درازی کرے تو یہ اس کا حق ہے ۴۱۳
— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں ۴۸۴
— اللہ کے بعد سب سے مقدم حق والدین کا ہے ۵۹۸-۵۹۹
— انسانی معاشروں اور قوموں کا بگاڑ ۴۹۶
— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم کیا جانا ۶۰۴
— معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— ہدایت کی نعمت پا کر اسے کھونے والی قوم کا انجام ۱۶۱

(۲۴) اسلام کی معاشی تعلیمات

— اہل ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کہ وہ اپنا وقت اور کمائیاں اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۲۰۲
— اللہ کی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف قرض حسن قرار دیتا ہے جس کو کئی گنا کر کے واپس کرے گا ۱۸۴-۱۸۵
— انفاق فی سبیل کی بڑھوتی اور ضائع ہونے کی الگ الگ مثالیں ۲۰۲-۲۰۵
— (مزید دیکھو "معاشی قانون وتعلیمات")
— اسلامی معاشرہ ۱۶۱-۱۷۰-۱۷۱-۳۷۶-۳۷۷-۵۰۳-۵۷۸
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "اسلام کی معاشرتی تعلیمات")

(۲۵) اسلامی ریاست

— دستور کی اولین دفعہ اور تفصیلات ۳۶۳-۳۶۴
— اولوا الامر وہ ہے جو امانت دار ہو اور ایمان داری سے فیصلہ کرے ۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۶
— اولوا الامر افراد کو شریک مشورہ رکھتا ہے ۲۹۸
— اقامت صلوٰۃ اور اسلامی ریاست ۳۶۴-۳۶۵
— امیر ہی کو امام صلوٰۃ ہونا چاہیے ۳۹۱
— اجتہاد کی آزادی ۳۶۵
— قانون اسلام پر عمل کرنے میں سراسر ہماری اپنی بھلائی ہے اور یہ تقاضائے ایمان بھی ہے ۳۶۶
— رسول اللہ کی اطاعت محض زبانی نہیں، عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— باہمی تنازعات میں آخری فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہوگا ۳۶۸-۳۶۹
— قرآن حکیم کے بتائے اصولوں پر فیصلہ کرنے کا حکم ۳۹۳-۳۹۴
— نظام تمدن و معاشرت کو بے لاگ نصیحت کہ کس طرح خوبیاں برقرار رکھے ۴۳۶
— حکومت اور عوام کے نزاع کا حل ۳۶۵
— مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کی وسعت ۴۳۵
— نظام اسلامی سے بغاوت کی سزا ۴۶۵
— اسلامی ریاست عہد اور معاہدہ کا احترام کرتی ہے ۳۸۰-۳۸۲
— شراب کی بندش اسلامی ریاست کے فرائض میں سے ہے ۵۰۲
— ہجرت نہ کرنے والوں کے لیے حکم ۳۷۹-۳۸۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسلامی قانون پر عمل ایمان کا تقاضا ہے ۳۶۶
— مجرمین کے تبادلے کے احکام کی پابندی ۳۸۰-۳۸۲
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام کی سیاسی تعلیمات'')

(۲۶) اسلامی نظام زندگی

— (تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی نظام جماعت''، ''اسلامی ریاست''، ''اسلام کی معاشرتی تعلیمات'' اور ''دعوت حق'')

(۲۷) اسلامی نظام جماعت

— مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرہ'' اور ''دعوت''
— اسلامی نظام جماعت اور اسلامی معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— رسولؐ اللہ انسانوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مبعوث ہوئے ۱۱۲
— مسلم اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور اس راہ میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲
— امارت کے اوصاف ۲۹۸
— مشاورت کی اہمیت ۲۹۸
— نظام سمع و طاعت ۳۶۳-۳۶۴
— افواہیں پھیلانے کی مذمت ۳۵۶

(۲۸) آسمان

— سات آسمانوں کا مطلب ۶۱
— اللہ تعالیٰ ہی نے آسمان کو چھت بنایا ۵۷-۵۶۷
— زمین و آسمان (کائنات) کو برحق پیدا کرنے کا مفہوم ۵۵۱-۵۵۲
— آسمان کے تاروں کو اللہ تعالیٰ نے تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ۵۶۶

(۲۹) اسماعیل علیہ السلام

— اللہ تعالیٰ نے اپنی خدمت کے لیے انھیں چن لیا ۵۶۱
— منصب امامت پر آپ کی اولاد کی تعیناتی ۱۰۹-۱۱۰-۱۱۹-۱۲۵-۱۲۶-۲۷۹

(۳۰) اشہر حرم

— اس کی حقیقت ۱۵۲
— یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مقرر شدہ ہیں ۱۵۲
— واقعۂ نخلہ ۱۶۴-۱۶۵
— اشہر حرم میں جنگ ۱۶۴-۱۶۵
— اشہر حرم کا احترام کیا جائے ۴۳۸

(۳۱) اصحاب السبت

— ان کے بندر بنائے جانے کا واقعہ کیا ہے؟ ۸۳-۸۴

(۳۲) اصحاب صفہ

— مدینہ منورہ میں عاشقان رسول کا ایک ہمہ وقت اور بے لوث گروہ ۲۰۹-۲۱۰

(۳۳) اصطباغ

— عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک جاہلانہ رسم ۱۱۶

(۳۴) اصول فقہ

— شریعت اسلام بے جا پابندیوں سے آزاد کرتی ہے ۱۵۵

(۳۵) اصول قانون

— دستور اسلام کی اوّلین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴
— احکام خداوندی کی بنیاد اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہے ۱۷۳
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام کی مکمل وضاحت کرتا ہے ۱۷۶-۴۳۲-۵۰۰
— اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکمت اللہ تعالیٰ جانتا ہے، انسان نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے ۱۷۸-۱۸۳-۱۸۴-۳۲۷-۳۲۸-۳۴۳
— اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی استطاعت اور ہمت سے زیادہ معاشی بار نہیں ڈالتا ۱۷۸-۱۷۹
— معروف (رائج طریقہ) کی افادیت کو قبول کرتا ہے

۱۸۰
— انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی صوابدید کا اختیار دیتا ہے ۱۸۳-۱۸۴
— حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام میں نرمی ۱۴۳-۴۳۱
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود پر عمل انعامات اور خلاف ورزی ہمیشگی کے عذاب کا باعث ہوگی ۳۳۰-۳۳۱
— جرم کی سزا عورت اور مرد دونوں کو ملے گی، استثنا نہیں ہے ۳۳۱-۳۳۲
— جرم کے تمام شریک واجب سزا ہیں ۳۳۱
— اگر کسی ماضی کے فعل کو آیندہ کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے جو معاملات اس حکم سے پہلے کیے گئے ہیں وہ بھی کالعدم ہو گئے ۳۳۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— قوانین اسلام اس علیم و دانا ہستی کے دیے ہوئے قوانین ہیں جو تمام مصلحتوں اور حقیقتوں کو جانتا ہے اور اس کے دیے ہوئے قوانین سے بہتر قانون کوئی نہیں دے سکتا ۳۲۷-۳۲۸-۳۳۲-۳۴۳
— قوانین الٰہی کی پابندی لازمی ہے ۳۲۹
— اللہ تعالیٰ انسان پر اس کی خود ساختہ اور خود اختیاری پابندیوں کو دور کرتا ہے ۳۴۴
— اللہ تعالیٰ انسان کا خیر خواہ ہے، انسان کی بھلائی چاہتا ہے اور اس پر مہربان ہے ۳۴۶
— اللہ تعالیٰ انسان کے لیے اپنے قوانین میں نرمی کرنے اور خلاف ورزیوں پر بخشنے والا ہے ۳۵۵
— کائنات کے خالق کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۳۵۸
— اللہ تعالیٰ انسان کو بہترین احکام دیتا ہے ۳۶۲
— کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مکمل اور بے لاگ حکم ۳۶۵
— باہمی تنازعات میں آخری فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ہے ۳۶۸-۳۶۹
— رسول کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— سزا دینے سے چھوڑ دینا بہتر ہے کیونکہ ناجائز سزا دینا برا کام ہے ۳۸۴-۳۸۵
— اجتہاد کے لیے اہل ایمان کا حق ۳۶۵
— اجتہاد کی ضرورت اور حدود ۲۱۷-۲۱۸-۳۳۲-۳۳۳-۳۶۵-۵۰۱-۵۰۳
— نیک کام کا ارادہ کرنے کے بعد، عمل سے پہلے موت آ جانے پر بھی اجر ملے گا ۳۸۷
— اصول قانون اور ان میں موجود حکمت ۴۰۵-۴۰۶
— عدل کے علم بردار رہنے کا ہر حالت میں حکم ہے، خواہ اس کی خود انسان کی ذات پر پڑے یا رشتہ داروں پر اور خواہ فریقین امیر ہوں یا غریب ۴۰۵-۴۰۶
— اسلام کے احکام اور بندشوں کی پابندی کا حکم ۴۳۷
— اشیا کی حرمت اور اجازت و عدم اجازت کی اصل بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے اور جو چاہے حکم دے سکتا ہے ۴۳۸
— قرآن کا اصول حلال و حرام ۴۴۵
— کوئی گروہ یا ریاست اہل ایمان سے دستور و قانون کے خلاف سلوک کرے تو جواباً اہل ایمان کو ایسی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے ۴۳۹-۴۴۰
— اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل نہ کرنا ایمان کی روش سے انکار ہے ۴۴۷
— اللہ تعالیٰ کے قوانین انسان کے لیے نعمت ہیں ۴۴۸-۴۴۹
— اللہ تعالیٰ انسان پر زندگی (سخت قوانین و احکام کے ذریعے سے) تنگ نہیں کرتا ۴۴۸-۴۴۹
— قانون سازی میں انسانی مجبوری کہ وہ اپنے لیے قوانین نہیں بنا سکتا کیونکہ معاملے کے تمام پہلو اس کے سامنے نہیں ہوتے ۴۵۲-۴۵۳
— قانون کے نفاذ و اطلاق میں لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے ۴۷۴ تا ۴۷۶
— قانون اسلام کے مطابق فیصلہ کرنے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا حکم ۴۷۹
— قانون اسلام کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں ۴۷۴ تا ۴۷۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— قانون کے استعمال میں زیادتی سے اجتناب کا حکم ۴۹۹
— تعمیل احکام میں وہ باتیں ہرگز نہ کرنی چاہییں جو اللہ تعالٰی نے بیان نہ کی ہوں ۵۰۷-۵۰۸
— اللہ کے نام پر قانون بنانے والے کافر ہیں اور اللہ تعالٰی پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں ۵۰۹
— اللہ کے بنائے ہوئے قانون پر عمل ایمان اور عقل کا تقاضا ہے ۵۰۹
— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ لاگو ہیں ۵۷۶
— شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک واعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ احکام خداوندی میں شکوک وشبہات پیدا کریں ۵۷۷
— پرستش ہی میں شرک نہیں بلکہ خود ساختہ قوانین کی پیروی بھی شرک ہے ۵۸۶
— حلال وحرام کے قانون کی مجبوراً خلاف ورزی کی اجازت ہے جبکہ نافرمانی کا ارادہ نہ ہو ۵۹۲
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم ۶۰۰
— اللہ تعالٰی کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو ۱۵۵
— حدود اللہ کا لحاظ اور احترام کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالٰی ہے ۱۵۲
— اللہ تعالٰی کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں ۱۷۵
— اللہ تعالٰی کے احکام کو کھیل بنانا ظلم ہے ۱۷۷
— وراثت، نکاح و طلاق اور رضاعت وغیرہ کے قوانین میں اسلام نے معروف (رائج طریقہ) کا خیال رکھا ہے ۱۸۰-۱۸۲
— اسلام نے اپنے تمام قوانین تدریجاً نافذ کیے ہیں ۲۱۷-۲۱۸-۳۳۲-۳۳۳-۳۶۵-۵۰۱ تا ۵۰۳
— جرم میں ارادے کی شمولیت ضروری ہے ۵۴۴
— قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والے بچ نہیں سکتے ۳۳۰
— مجرم اگر اپنے پچھلے جرم پر توبہ کرے اور آیندہ کے لیے اصلاح کرلے تو وہ قابل رحم اور قابل معافی ہے ۳۳۱
— حرام قرار پانے والے اقدامات کا ماضی میں ارتکاب ہوا ہو تو اس سلسلے میں شریعت کا حکم ۳۵۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— مسافر اور بیمار کے لیے شریعت میں رعایت ۳۵۴-۳۵۵
— رعایتیں جو اللہ نے دی ہیں انھیں ضرور استعمال کرنا چاہیے ۳۹۰
— احکام وحدود الٰہی توڑتے ہوئے ڈرو کیونکہ اللہ تعالٰی کو حساب لیتے ہوئے دیر نہیں لگتی ۴۴۶
— اللہ کی کتابیں ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئیں انھی کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرو ۴۷۳

(۳۶) اضطرار

— حالت اضطرار میں اکل حرام اور اس کی شرائط ۱۳۵-۴۴۴-۵۷۶-۵۹۲
— شرعی رعایتیں ۳۵۴-۳۵۵-۳۹۰
— احکام کو نرم کرنے کی گنجائش ۱۴۳-۴۳۱
— کسی نئے قانون کے اطلاق ماضی کی شرعی حدود کیا ہیں ۳۳۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— اللہ تعالٰی انسان پر احکام وہدایت کے ذریعے سے زندگی تنگ نہیں کرتا ۴۴۸-۴۴۹
— قانون کے استعمال میں زیادتی کیا ہے ۴۹۹
— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ لاگو ہیں ۵۷۶

(۳۷) اعتکاف

— حالت اعتکاف میں پابندیاں ۱۴۶-۱۴۷

(۳۸) اقامت دین

— اقامت دین کے لیے نماز اور صبر کی اہمیت اور باہمی تعلق ۷۳-۷۴
— اللہ کی مدد کا مفہوم ۲۵۶
— امر بالمعروف اور نہی عن المنکر موجب فلاح ہے ۲۷۸

— اہل ایمان پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری بحیثیت خیر امت ۲۷۹-۴۹۶
— اس کے حدود سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ۵۱۰
— اقامت دین ایمان کا تقاضا ہے ۲۸۱
— اہل کتاب پر اقامت تورات و انجیل کی ذمہ داری ۴۸۶
— ''عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ'' کا منشا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری کی نفی نہیں ہے ۵۱۰
— اقامت دین کے لیے مزاحمت ناگزیر ہے ۴۷۴- ۵۶۸-۵۸۱-۵۸۸

(۳۹) اقامت صلوٰۃ

— (تفصیلات کے لیے دیکھو ''نماز'')

(۴۰) اقسام القرآن

— منصب رسول پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— کس نوعیت کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے؟ ۱۷۱
— قسم توڑنے پر کفارہ کے احکام ۱۷۱
— بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے اجتناب کی قسم کھانا منع ہے ۱۷۱

(۴۱) اقوام

— جو اقوام اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد کھو دیتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سخت سزا پاتی ہیں ۷۰- ۷۴-۸۰-۸۳-۸۶-۱۰۹-۱۶۱-۱۸۷-۴۵۸
— (مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'')

(۴۲) اللہ سبحانہ وتعالیٰ

— ایمان باللہ ۴۲۴
— اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا بیان
— رحمٰن ۴۳-۱۳۰
— رحیم ۴۳- ۶۸- ۷۶- ۱۱۲- ۱۲۱- ۱۲۸- ۱۳۰- ۱۳۵- ۱۵۰- ۱۵۷- ۱۶۷- ۱۷۲- ۲۴۵- ۲۷۱- ۲۸۷- ۳۳۱- ۳۳۹- ۳۴۳- ۳۶۸- ۳۸۶- ۳۸۷- ۳۹۴- ۳۹۵- ۴۰۴- ۴۱۴- ۴۴۴- ۴۶۶- ۴۶۸- ۴۹۰- ۵۰۶- ۵۴۴- ۵۹۲- ۶۰۷-
— رب ۵۷-۸۴
— قدیر ۵۶-۱۰۱-۱۰۳-۱۲۳-۲۰۱-۲۲۲-۲۴۳-۲۴۴-۳۰۱-۳۱۰-۴۰۴-۱۴۳-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۹-۵۱۷-۵۲۸
— علیم ۶۱- ۶۴- ۱۰۵- ۱۱۲- ۱۱۶- ۱۲۸- ۱۴۰- ۱۷۱- ۱۷۲- ۱۷۷- ۱۸۵- ۱۸۸- ۱۹۶- ۲۰۳- ۲۰۷- ۲۲۱- ۲۲۲- ۲۴۶- ۲۶۵- ۲۸۳- ۲۸۵- ۳۲۷- ۳۲۹- ۳۳۲- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۴۷- ۳۵۰- ۳۸۳- ۳۵۹- ۴۱۲- ۴۱۳- ۴۲۷- ۴۳۲- ۴۴۹- ۴۸۲- ۴۹۱- ۵۰۶- ۵۶۰- ۵۶۸-۵۸۱-۵۸۸
— حکیم ۶۴- ۱۱۲- ۱۶۱- ۱۶۸- ۱۷۴- ۱۸۳- ۲۰۱- ۲۳۳- ۲۳۹- ۲۶۱- ۲۸۷- ۳۲۷- ۳۳۲- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۶۱- ۳۸۳- ۳۹۳- ۴۰۴- ۴۲۰- ۴۲۶- ۴۲۷- ۴۶۸- ۵۱۷- ۵۲۸- ۵۵۲-۵۶۰-۵۸۱-۵۸۸
— تواب ۶۲-۷۶-۱۱۲-۳۳۱-۳۶۸
— رب العالمین ۴۳-۴۶۲
— مالک یوم الدین ۴۴
— عظیم ۷۵
— ذوالفضل العظیم ۱۰۱
— واسع ۱۰۵- ۱۸۸- ۲۰۳- ۲۰۷- ۲۶۵- ۴۰۴- ۴۸۲
— سمیع ۱۱۲- ۱۱۶- ۱۴۰- ۱۷۱- ۱۷۲- ۱۸۵- ۱۹۶- ۲۴۶- ۲۸۵- ۳۶۲- ۴۰۵- ۴۱۳- ۴۹۱
— عزیز ۱۱۲- ۱۶۱- ۱۶۸- ۱۷۴- ۱۸۳- ۲۰۱- ۲۳۳- ۲۳۹- ۲۶۱- ۲۸۷- ۳۶۱- ۴۲۰- ۴۲۶-۴۶۸-۵۱۷
— رؤف ۱۲۱-۱۵۹
— شاکر ۱۲۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— غفور ۱۳۵- ۱۵۰- ۱۵۷- ۱۷۶- ۱۷۱- ۱۷۲- ۱۸۱- ۲۴۵- ۲۷۱- ۲۸۷- ۲۹۷- ۳۳۹- ۳۴۳- ۳۵۵- ۳۶۸- ۳۸۷- ۳۹۴- ۳۵۹- ۴۰۴- ۴۱۴- ۴۴۴- ۴۶۶- ۴۶۸- ۴۹۰- ۵۰۶- ۵۰۷- ۵۴۴- ۵۹۲- ۶۰۷

— حلیم ۱۷۱-۱۸۱-۲۰۴-۳۳۰-۵۰۷

— بصیر ۱۷۹-۱۸۲-۲۰۵-۳۶۲-۴۰۵

— خبیر ۱۸۰- ۲۰۸- ۳۰۶- ۵- ۳۵۰- ۳۸۵- ۴۰۶-۵۲۸-۵۵۲-۵۶۸

— الحی ۱۹۳-۲۳۱

— قیوم ۱۹۳-۲۳۱

— العلی ۱۹۵

— عظیم ۱۹۵

— غنی ۲۰۴-۲۰۷-۴۰۴

— حمید ۲۰۷-۴۰۴

— عزیز ذوانتقام ۲۳۳-۵۰۵

— وہاب ۲۳۵

— شدید العقاب ۲۳۶

— بصیر بالعباد ۲۳۸-۲۴۱

— الرؤف بالعباد ۲۴۵

— سمیع الدعا ۲۴۸

— خیر الماکرین ۲۵۷

— ذوالفضل العظیم ۲۶۵-۳۰۴

— محیط ۲۴۸

— لطیف ۵۸۶

— مالک الملک ہے ۲۴۳

— وکیل ۳۰۳-۳۷۶-۴۰۴-۴۲۹-۵۶۸

— حسیب ۳۲۴-۳۷۸

— کبیر ۳۵۰

— علی ۳۵۰

— عفو ۳۵۵-۳۸۷-۴۱۳

— محیط ۴۰۰

— شاکر ۴۱۲

— شدید العقاب ۴۴۰

— سریع الحساب ۴۴۶

— سریع العقاب ۶۰۶

— اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کرو ۴۲۷

— اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی نہایت اہم سیاق وسباق کے حامل اور کہی گئی بات سے متعلقہ ہوتے ہیں ۴۴-۶۱

— اللہ تعالیٰ کی طاقت سے بڑھ کر کوئی طاقت والا نہیں ہے ۲۶۱

— اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے ۵۶-۱۳۲-۴۵۷-۴۶۹

— تمام کائنات کا رب ہے ۴۳-۴۴

— اور کائنات کا واحد فرمانروا ہے ۱۰۲

— اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ۵۷-۶۱

— مشرق ومغرب سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ۱۱۸

— ساری طاقتیں اور اختیارات اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں ۱۳۲

— اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے ۲۶۱

— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں، انسانوں کے اقرار و انکار سے اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۳۸۷

— اللہ تعالیٰ چاہے تو انسانوں کو ایک دوسرے سے بدل ڈالے ۴۰۴-۵۸۳

— اللہ تعالیٰ بس ایک ہی معبود ہے، وہ اس سے بالا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو، کائنات کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے ۴۲۹-۴۳۱

— اللہ تعالیٰ اگر زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کوئی امر مانع نہیں ہے ۴۵۷

— کائنات کی تمام موجودات کا مالک ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۴۲۹- ۴۳۱- ۴۵۸-۵۸۳

— اللہ تعالیٰ کائنات کے تمام حالات سے باخبر ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۵۰۵-۵۰۶

— کائنات کی سلطنت کا مالک ہے، جس کو چاہے معاف کردے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے ۴٦۹

— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا کامل اختیارات رکھتا ہے ۵۲۸

— اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ بدلنے کی طاقت اور اختیار کسی کے پاس نہیں ہے ۵۳۵

— اللہ تعالیٰ اگر انسان کی بینائی اور سماعت چھین لے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لے تو کون ہے جو یہ قوتیں واپس دلوا سکے ۵۴۱

— اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جس کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۵۴٦

— زمین و سمندر میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، درخت سے گرنے والے ہر پتے کا اللہ کو علم ہے ۵۴٦

— اللہ تعالیٰ کو زمین کے تاریک پردوں میں ایک ایک دانے کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی حد نہیں ہے ۵۴٦

— اللہ تعالیٰ بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آ جائے ۵۴۸

— اللہ تعالیٰ نے کائنات کو برحق پیدا کیا، اس کا مفہوم کیا ہے ۵۵۱-۵۵۲

— اللہ تعالیٰ ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرے گا ۵٦۵-۵٦٦

— اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا میں بہت فرق ہے ۵۷۲-۵۷۳

— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے ۵۷۳-۵۷۵

— آخرت کا وعدہ یقیناً پورا ہوگا اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والا کوئی نہیں ہے ۵۸۳

— اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کا کیا مقصد بیان کرتا ہے ۵۳٦-۵۳۷

— اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح دین کیا ہے؟ ۲۳۹-۲۴۰

— اللہ تعالیٰ کا مددگار رہنا ۲۵٦

— اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا بیان ۴۴

— اللہ تعالیٰ نے کن حدود کے اندر انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی دی ہے؟ ۲۵٦

— رضائے الٰہی صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے ۵۷۳-۵۷۵

— اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کا خالق ہے ۵۷

— اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم و ادراک رکھتا ہے کیونکہ وہی تمام علوم کا سرچشمہ ہے ٦۱-۵۴٦-۵۴۷

— اللہ تعالیٰ کائنات کی تمام حقیقتیں جانتا ہے جو ہم سے مخفی ہیں، جو کچھ ہم چھپاتے یا ظاہر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے ٦۴

— جو اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور رسولوں کے دشمن ہیں اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے ۹۷

— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت اور انعامات پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۱۰۱

— اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی خبر گیری اور مدد کرنے والا نہیں ہے ۱۰۲

— اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرنے کا حکم ۱۱٦-۱۱۷

— اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ۱۵۵

— اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی وسیع اور بے حساب ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی ۴۴

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے لیکن ساتھ ساتھ درگزر کرنے والا اور رحم والا بھی ہے ۵۰٦

— اللہ تعالیٰ مہربان و مشفق ہونے کے ساتھ منصف بھی ہے ۴۴

— اللہ تعالیٰ انسان کی کرتوتوں سے بے خبر نہیں، اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو، جو تجاوز کرتا ہے وہ ظالم ہے ۱۷۵

— اللہ تعالیٰ انسان پر بڑا فضل و کرم کرتا ہے لیکن انسان ہی ناشکرا ہے ۱۸۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے رویوں پر گہری نظر رکھتا ہے ۲۲۸
— اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے غضب سے ڈراتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کا خیر خواہ ہے ۱۷-۲۰۷- ۲۴۵- ۳۴۶
— ایسے لوگ اللہ کے پیارے کیونکر ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام کی اطاعت سے انکار کریں ۲۴۵
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ فلاح کا راستہ درست اور صاف صاف نظر آجائے ۲۷۷
— اللہ تعالیٰ کی تخلیقات عبث اور بے مقصد نہیں ہیں، اس حقیقت کو ہوش منداور غور وفکر کرنے والے ہی پاتے ہیں ۳۱۰-۳۱۱
— اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ ۳۵۲
— اللہ تعالیٰ اپنے قوانین میں نرمی کرنے والا اور خلاف ورزیوں پر بخشنے والا ہے ۳۵۵
— کائنات میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۳۵۸
— حقیقت جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا علم کافی ہے ۳۷۰
— روز قیامت کے ظہور میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا طے کردہ وعدہ ہے ۳۷۸-۳۷۹
— اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب میں یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کا ہر فعل اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ادا ہونا چاہیے ۴۰۴
— عزت کی طلب میں غیر مسلموں سے تعلقات رکھنے والے جان رکھیں کہ عزت صرف اللہ کے لیے ہے ۴۰۸
— اللہ تعالیٰ سے دھوکا بازی کرنے والے جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۴۰۹
— انسان اگر شکر گزار بندہ بنے تو اللہ تعالیٰ اسے خواہ مخواہ سزا نہیں دیتا کیونکہ وہ بڑا قدردان اور سب کے حال سے واقف ہے ۴۱۲-۴۱۳
— اللہ تعالیٰ حلیم و بردبار ہے جو مجرمین کو بھی رزق دیتا ہے اور درگزر کرتا ہے حالانکہ وہ سزا دینے کی مکمل قدرت رکھتا ہے ۴۱۳
— اللہ تعالیٰ محاسبہ کرنے میں چشم پوشی اور اعمال صالح کی قدر کرنے میں نہایت فیاض ہے ۴۱۲-۴۱۳
— اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے اس طرح ہم کلامی کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے ۴۲۵
— اللہ تعالیٰ کی قرآن مجید کے برحق ہونے پر گواہی ۴۲۶
— اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی سزا اور پکڑ بہت سخت ہے ۴۲۹-۴۳۰
— اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے احکام وقوانین کے ذریعے سے تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ آسانیاں پیدا کرے اور اپنی نعمت انسان پر مکمل کرے ۴۴۸-۴۴۹
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے ۴۵۱
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کو فتنے میں ڈالنے کا کیا مطلب ہے ۴۷۱
— جو پاک نہیں ہونا چاہتے اللہ تعالیٰ انھیں پاک نہیں کرتا اور جو چاہتے ہیں انھیں ضرور توفیق دیتا ہے ۴۷۱
— اہل ایمان کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بہترین فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے، یہ ہی تقاضائے ایمان ہے ۴۷۹
— جو اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھتا ہے اللہ اسے محبوب رکھتا ہے ۴۸۱
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام کی خلاف ورزی پر بدلہ لے گا کیونکہ وہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے ۵۰۵
— اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۵۱۲
— اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۵۰۹
— اللہ تعالیٰ تمام پوشیدہ حقیقتیں جانتا ہے، وہ جانتا ہے

کہ انسان کے دل میں کیا ہے لیکن انسان نہیں جانتا کہ اللہ کے دل میں کیا ہے ۵۱۶
— اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کے کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے آثار کو جھٹلانے والے اندھے، بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں ۵۳۷
— اللہ تعالیٰ کا دامن رحمت نہایت وسیع ہے ۵۹۴
— اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور رحم و کرم کا شیوہ اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے ۵۴۴-۵۸۲-۵۸۳
— اللہ تعالیٰ ہی امرحق ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ مخالفین حق کو کتنی ڈھیل دینی ہے کیونکہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶
— اللہ تعالیٰ نے تو حق بالکل واضح کر دیا ہے، انسان ضلالت پسندی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے ۵۴۵
— اللہ تعالیٰ اگر راہ نمائی نہ کرے تو انسان گمراہ ہو کر رہے گا ۵۵۹-۵۶۰
— اللہ تعالیٰ کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے اور کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے ۵۷۵
— اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے پر ہے اور کون بھٹکا ہوا ہے ۵۷۶
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ وہ دنیا میں درست طرز عمل اختیار کرتے ہیں ۵۸۰
— اللہ تعالیٰ ایسی قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندوں پر اتمام حجت نہ کی گئی ہو ۵۸۲
— اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاؤ پیو اور ان میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو ۵۸۹-۵۹۰
— اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا، انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے کیا پابندیاں عائد کی ہیں ۵۹۷-۶۰۱
— اللہ تعالیٰ سے کیے گئے اولین اور فطری عہد کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے ۶۰۱-۶۰۲
— اللہ تعالیٰ کی صریح نشانیاں آ جانے کے بعد ایمان لانا اور توبہ کرنا بے اثر ہو جاتا ہے ۶۰۳-۶۰۴
— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ہرگز ظالم نہیں ہے، یہ مصیبتیں اور ابتلا کی کیفیتیں انسان کا اپنا کیا دھرا ہے ۳۰۷
— اللہ تعالیٰ کی طاقت سب سے بالا ہے اور صرف اسی کی حکمت کا نظام اس دنیا میں رائج ہے ۳۶۱

(۴۳) الیاس علیہ السلام

— حضرت الیاس کی مظلومانہ جلاوطنی ۸۱
— ان کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے، اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۴۴) الیسع علیہ السلام

— اللہ تعالیٰ نے دین کی خدمت کے لیے انھیں چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۴۵) امامت

— منصب امامت پر مامور ہونے کے بعد امت محمد کو ضروری ہدایات ۱۲۵-۱۲۶
— امت محمد کی امامت کا اعلان ۱۱۹-۷۹
— اس منصب امامت کے لیے لفظ ''نعمت'' کا استعمال ۱۲۵
— اس منصب کے لیے ''ملک عظیم'' کے لفظ کا استعمال ۳۶۱
— اس منصب کے ساتھ اہل ایمان کو کیا اولین ہدایات دی گئیں ۱۲۵-۱۲۶
— امامت ظالموں کو نہیں مل سکتی ۱۱۰
— امامت صالحہ اور رزق دنیا کے استحقاق میں فرق ۱۱۱
— یہ ابراہیم کے نطفے کی میراث نہیں بلکہ سچی اطاعت و فرمانبرداری کا پھل ہے ۱۰۹
— اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا

Maktaba Tul Ishaat.com

دیتا لیکن اختلاف مذاہب ہی میں انسانوں کے لیے آزمائش ہے ۴۷۷-۴۷۸

— امت محمد اللہ کے پیغمبروں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتی اور صرف اللہ کی مسلم ہے ۱۱۵-۱۱۶

— امت رسول اللہ کو احکام خداوندی پر عمل کرنے کا حکم تاکہ مخالفین کو اس اعتراض کا موقع نہ ملے کہ وہ خود حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں ۱۲۴

— امامت کے منصب سے بنی اسرائیل کی معزولی اور تبدیلی امامت ۱۰۹

— بیت المقدس بنی اسرائیل کو حاصل منصب امامت کی وجہ سے قبلہ تھا، جب امامت بنی اسماعیل کو دے دی گئی تو مکہ معظمہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا ۱۰۹-۱۱۰

— مشرکین مکہ بھی بنی اسرائیل کی طرح حق امامت کے لیے نااہل اور مستثنیٰ کر دیے گئے ۱۱۱

(۴۶) امانت

— امانت میں خیانت کرنے والا اپنی خیانت سمیت قیامت کو حاضر کیا جائے گا ۲۹۹

(۴۷) امتحان (آزمائش)

— دنیا کی زندگی میں آزمائش وامتحان کی کیا نوعیت ہے ۵۲۶

— دنیوی زندگی میں حقیقت پر پردہ ڈال کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کا سامان کیا ہے ۵۳۲

— اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر مختلف معاملات میں فوقیت دی ہے اس حقیقت میں ہر دو کی آزمائش ہے ۶۰۶

— اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے نتھار کر اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور کافروں کی سرکوبی کرتا ہے ۲۹۰

— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے لیکن اللہ کی رضا صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے ۵۷۳-۵۷۵

— انسان کے سامنے حق و باطل کے انتخاب کی آزادی ہے، یہی آزمائش ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتا ہے ۵۷۰تا۵۷۲

— تمام انسانوں کو راہِ راست پر ڈال دینا اللہ کی حکمت کے خلاف تھا، انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے اسے طاعت و عصیان کی آزادی اور تصرف کے اختیارات دے کر اس کی سعی پر جزا و سزا کا ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے ۵۳۶

— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی گمراہی میں مبتلا نہ ہوتا ۵۷۰

— اللہ تعالیٰ ایسی قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندے حقیقت سے واقف نہ ہوں یعنی اتمام حجت نہ کیا گیا ہو ۵۸۲

— اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے پر ظلم کرتے ہیں اور غلط طرز عمل سے باز نہیں آتے ۲۷۹

(۴۸) امت وسط

— امت محمد کسی پیغمبر کی دعوت میں تفریق نہیں کرتی ۱۱۵-۱۱۶

— امت وسط کے اوصاف ۱۱۸-۱۱۹

— اس کی حقیقت ۲۷۰

— اقوام عالم کی صدارت کا منصب ۱۱۹

— دنیا میں بہترین گروہ جس کو انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے منصب پر سرفراز کیا گیا اور امامت عادلہ سپرد کی گئی ۲۷۹

— اس منصب کی پاسداری کرنے کی اہمیت ۱۷۷

(۴۹) امثال القرآن

دیکھو ”قرآنی تمثیلات“

— ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴

— احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے والوں کی مثال بے عقل جانوروں کی سی ہے ۱۳۳-۱۳۴

— انفاق فی سبیل اللہ کی بڑھوتری اور ضائع ہونے کی

الگ الگ مثالیں ۲۰۲-۲۰۵
— انفاق فی سبیل اللہ کے خسران اور بے فائدہ ہونے کی مثال، یہ ظلم نہیں ہوا بلکہ انھوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے ۲۸۱-۲۸۲
— جو شخص حق کی موجودگی میں ضلالت و گمراہی اختیار کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیطان کے ہاتھوں صحرا میں بھٹک رہا ہو اور حیران و پریشان ہو حالانکہ اس کے ساتھی اسے حق کی موجودگی کی اطلاع کر رہے ہیں ۵۵۰
— ہدایت کی مثال زندگی اور حقیقت شناسی جبکہ گمراہی کی مثال مردہ اور جہالت کی ہے ۵۳۵-۵۳۶-۵۷۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ہدیہ یا تحفہ دے کر واپسی کا تقاضا کرنے والے کی مثال کتے کی دی ہے ۱۷۵
— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰

(۵۰) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

— بنی اسرائیل کی گمراہی کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھوں نے برے افعال سے ایک دوسرے کو روکنا چھوڑ دیا ۴۹۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اقامت دین'' اور ''دعوت حق'')

(۵۱) انبیائے کرام

— انبیائے کرام کا دائرۂ کار ۱۲۵
— انبیائے کرام کے تین کام ہیں اور ان کی دعوت سہ رخی ہے ۲۵۴-۴۲۵ تا ۴۲۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ وہی تھا جو سابقہ انبیائے کرام کا تھا ۱۰۹-۲۲۸
— اسلام تمام انبیائے کرام کا دین تھا ۱۱۳-۲۴۳-۲۲۸-۲۴۰-۲۷۰-۴۷۳
— تمام انبیائے کرام کی دعوت ایک ہی تھی جو رب کی طرف سے آئی امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میں تفریق نہیں کرتی اور صرف اللہ تعالیٰ کی مسلم ہے ۱۱۵-۱۱۶
— تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا ضروری ہے ۱۱۵-۱۱۶-۲۲۳-۲۷۰
— انبیائے کرام کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب ۱۱۶
— انبیائے کرام ایک ہی سلسلے کے لوگ تھے ۲۴۶
— ان سب نے ایک ہی قوانین پیش کیے ۳۴۳
— وہ سب اذن الٰہی سے ''مطاع'' بن کر آئے ۳۶۸
— وہ باہم تردید کرنے والے نہیں بلکہ تصدیق کرنے والے تھے ۲۵۳-۴۷۵
— سب کے سب صالح تھے ۵۱۶
— انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی ۵۶۱
— انبیائے کرام معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں ۵۶۰-۵۶۱
— انبیائے کرام کے لیے نادان لوگوں کا باطل تصور کہ انھیں بشری تقاضوں سے ماورا ہونا چاہیے اور عجائب وغرائب ان سے صادر ہونے چاہئیں ۵۴۲
— انبیائے کرام کو ایمان بالشہادۃ سے سرفراز کیا جاتا ہے ۲۰۲
— قرآن میں تمام انبیائے کرام کا تذکرہ نہیں ہے ۴۲۵
— تمام انبیائے کرام ''سواء السبیل'' کو واضح کرتے ہیں ۴۵۳
— اللہ تعالیٰ نے انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی ۵۶۱
— انبیائے کرام پر تلاش حق میں شرک کا الزام اور اس کی بھرپور قرآنی تردید ۲۶۸-۵۶۱
— کوئی نبی خائن نہیں ہو سکتا ۲۹۹
— انبیائے کرام کے لیے کتاب، حکم اور نبوت کے سہ گونہ عطیات ۲۶۷-۵۱۳-۵۶۱
— انبیائے کرام پر نزول وحی کے دلائل ۵۶۴
— انبیائے کرام اس قوم سے اٹھائے جاتے ہیں جس کی دعوت پر وہ معمور ہوتے ہیں ۵۸۱
— ان کی بعثت کی غرض کیا تھی؟ ۱۶۲-۴۲۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— دعوتِ حق کے لیے ان کی جدوجہد ۱۶۳
— ان کے مراتب ۱۹۲
— ان کا کام اور ان کی حیثیت ۲۰۹
— الٰہی ہدایت کے اولین مسلم ۲۲۳
— ان کی ذمہ داری ۲۴۱
— اللہ کی اطاعت کے ساتھ ان کی اطاعت کا مطالبہ ۲۴۵
— وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے بجائے اپنی بندگی کی دعوت نہیں دے سکتے ۲۶۷
— عہد جو انبیائے کرام سے لیا گیا ۲۶۸-۲۶۹
— ان کا اذیتوں پر صبر کرنا ۵۳۴
— ان کی آمد پر نزولِ مصائب کی حکمت ۵۴۰
— حضرت ابراہیم کے بعد یعقوبؑ و اسحاقؑ کی نسل بنی اسرائیل کو دنیا کی امامت سونپی گئی ۱۰۹
— حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی اور نصرانی نہ تھے ۱۱۷
— حضرت آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کا رسالت کے لیے چنا جانا اور سارے زمانے پر انھیں ترجیح دی گئی ۲۴۶
— وہ آخرت میں اپنی اپنی قوموں کی گواہی دیں گے ۳۵۳-۵۱۲
— انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کی باہمی رفاقت ۳۷۵
— انبیائے کرام کی امتوں کا بگاڑ ۱۹-۲۸۷
— ان کی مخالفت کفر ہے ۹۷
— بکثرت انبیائے کرام کو جھٹلایا گیا ۳۰۸-۵۳۴
— ان کی نافرمانی کا اخروی انجام ۳۵۳-۵۲۶
— دعوتِ انبیائے کرام کے اولین مخالف امرا و رؤسا ہوتے ہیں ۵۷۹
— بکثرت انبیائے کرام کا مذاق اڑایا گیا ۵۲۶
— ان کی دعوت سے شیاطین جن و انس کی دشمنی ۵۷۲-۵۷۳
— ان کا نیک کرداروں کے لیے بشیر اور بدکرداروں کے لیے نذیر ہونا ۵۴۱
— ان کے طریقوں سے ہٹ جانا ضلالت و گمراہی ہے ۵۵۳
— حضرات انبیائے کرام کی بعثت تمام بندوں پر اتمام حجت ہے ۴۲۶-۵۸۲
— انبیائے کرام توہمات، قانونی موشگافیوں اور شریعت الٰہیہ میں اضافی حلال و حرام کے بے جا قیود کو درست کرتے ہیں ۲۵۴

(۵۲) انجیل

— خدا کی طرف سے ہدایت دینے والی کتاب ۲۳۱
— انجیل راہ نمائی اور روشنی کا سرچشمہ تھی اور لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۷۵
— قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے؟ ۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی ہے ۴۷۴-۴۷۵
— انجیل میں بھی تورات کی طرح یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون ہی کے مطابق فیصلہ کرو ۴۷۵
— قرآن اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— قرآن مجید حق لے کر آتا ہے اور اپنے سے پہلے آنے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۱-۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کو کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی گئی تھی ۵۱۳
(مزید دیکھو "نبوت")

(۵۴) انسان

— نسل انسانی کی ابتدا اور حضرت آدم کی تخلیق ۶۳-۶۹-۷۰
— اللہ تعالیٰ کو دنیا میں بحیثیت خلیفۃ اللہ اتارا گیا اور اس کی حیثیت اور حقیقت سے آشنا کروا دیا گیا اور درست اور غلط رویوں کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے ۱۷ تا ۱۹

— انسان کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت و بندگی کرنی چاہیے کیونکہ وہ اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے ۶۱ تا ۶۹
— انسان کو خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا گیا ۶۳-۶۴
— انسان نے اپنی زندگی کا آغاز درست سمت میں ہدایت کے ساتھ کیا، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— انسان کا اپنے خدا سے فطری عہد ۶۰۰
— انسان اگر نیک نیتی سے اصلاح کا طالب ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے ۳۵۰
— اس شخص سے بہتر کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا ہو، نیک رویہ اختیار کرے اور یکسو ہو کر حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ اختیار کرے ۴۰۰
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہل ایمان سے لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴
— اللہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدا ایک متنفس سے کی پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور اس کے سونپے جانے کی جگہ ہے ۵۶۶
— کائنات میں انسان کی حیثیت ۱۷-۶۲-۱۹۲-۱۹۳
— انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت ۱۷- ۱۶۰-۲۰۸-۲۹۲-۳۰۹-۵۳۳
— تمام انسان ایک اصل سے ہیں لہٰذا حقوق و فرائض میں برابر ہیں ۳۱۹
— انسان کی تخلیق پر فرشتوں کا اولین اعتراض ۶۳-۶۴
— انسان اور فرشتوں کے علم کا تقابل ۶۴
— انسان کی عقل و خرد اور ہوش مندی سے اپیل ۱۳۹-۱۵۵
— دنیا میں انسان کے لیے صحیح اور غلط رویے اور ان کا انجام ۱۷
— زمین پر انسان کی زندگی کا آغاز جہالت نہیں، علم کی روشنی میں ہوا ۱۷-۶۸-۱۶۲
— اللہ سے انسان کے تعلق کی نوعیت اور انسان کی اصل ۱۷-۶۲-۳۱۹
— انسان کا اصل مذہب اسلام تھا مگر بھٹکنے کے وجوہ ۱۷-۱۸
— انسان کی خلافت پر فرشتوں کا اعتراض ۶۲-۶۴
— انسان کو ودیعت کیے گئے علم اور انسانی خلافت کی حقیقت ۶۴
— انسان کے ازلی گناہگار ہونے کا غلط تصور ۶۸
— انسان کی نجات اور ہلاکت کا مدار کن چیزوں پر ہے؟ ۶۸-۸۲-۱۱۸-۱۶۰
— انسان کا علم دوررس نتائج پر حاوی نہیں، اس کی وجہ سے احکام کے تمام مصالح کو سمجھ نہیں سکتا ۱۶۴
— خدا کی اطاعت میں انسان کا اپنا فائدہ ہے اور حکم عدولی پر اپنا ہی نقصان ہے ۵۸۲
— اللہ تعالیٰ اپنی لامحدود رحمت و کرم کے ساتھ انسان کی طرف متوجہ ہے، وہ علیم و دانا ہے اور اس کے قانون سے بہتر قانون انسان کو کون دے سکتا ہے ۳۴۳
— قوانین خداوندی انسانوں کے لیے نصیحت ہیں جن پر انسان کو ہر دم شکرگزاری کا رویہ اپنانا چاہیے ۴۴۸-۴۴۹
— انسان اپنے لیے قانون نہیں بنا سکتا کیونکہ معاملے کے سارے پہلو اس کے سامنے نہیں ہوتے ۴۵۲-۴۵۳
— شیطان انسان کو درست رویہ اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ کر رہے ہو بالکل ٹھیک ہے ۵۴۰
— شیطان صفت انسان ہمیشہ ہی حق کے مخالف رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— انسان سے اللہ کے تعلق کی نوعیت ۱۷
— اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی ذمہ داری حسب استطاعت ہے ۲۲۴
— انسان کے نفس میں توحید کی شہادت ۵۳۹-۵۴۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کے لیے سامان ہدایت فراہم کرنا اللہ کی مہربانی ہے۵۸۲
— اللہ کے ہاں انسانوں کے مختلف درجات بلحاظ عمل ۵۸۲
— اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرح انسان کو پیدائشی راست رونہیں بنایا ہے۵۹۶
— انسان پر فطرتاً اللہ تعالیٰ کے حقوق عائد ہوتے ہیں ۶۰۰
— انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا نظام ہدایت و ضلالت ۵۳۶تا۵۳۸
— انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اہمیت ۵۹۷-۶۰۱
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ۵۷-۶۰-۶۱-۱۸۴-۲۳۸-۳۴۶-۵۶۳
— انسان کتنا نافرمان ہے کہ اپنے خالق رب سے کفر کرتا ہے جو اسے بے جان سے جاندار بناتا ہے پھر موت دیتا ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۶۰-۶۱
— انسان بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۱۲۳
— انسان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد جب کھو دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سخت سزا پاتا ہے۱۶۱
— اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے فضل و کرم کے ساتھ متوجہ ہے لیکن انسان ہی ناشکرا ہے۱۸۴
— اللہ تعالیٰ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک خاص حد تک غلبہ و اقتدار حاصل کرنے دیتا ہے۱۹۱
— انسانوں کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے عین مطابق ہیں۱۹۲-۱۹۳
— انسان پر ہر دم اللہ تعالیٰ کی نظر ہے ۲۳۸
— اللہ تعالیٰ انسان کو خود سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے ۲۴۵
— اللہ تعالیٰ انسان کا خیر خواہ ہے، انسان کی بھلائی چاہتا ہے اور اس پر مہربان ہے ۳۴۶
— اللہ تعالیٰ چاہے تو انسانوں کو دوسرے گروہوں سے بدل دے کیونکہ وہی کائنات کا واحد مالک و کارساز ہے۴۰۴
— انسان کا ہر فعل اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ادا ہونا چاہیے، یہ ہر کتاب میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات رہی ہیں۴۰۴
— اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو راست رو بنا سکتا تھا لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی، اس نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق بنایا جس کو تصرف کے اختیارات طاعت و عصیان کی مکمل آزادی کے ساتھ دیے اور اس کی دنیوی سعی کے مطابق جزا و سزا کا ایک دن مقرر کیا ۵۳۶
— اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی خوشحالی اور کبھی مصائب سے آزماتا ہے۵۴۰
— مصائب و آلام میں اللہ تعالیٰ کی عاجزی اختیار کرنی چاہیے۵۴۰
— انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کی پاداش میں جب پکڑتا ہے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے ۵۴۰-۵۴۱
— اگر اللہ تعالیٰ انسان کی بینائی، سماعت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لے تو کون انسان کو یہ واپس دلا سکتا ہے۵۴۱
— انسان اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونے کے وعدے پر اپنی جان بچاتا ہے لیکن پھر دوسروں کو شریک کرنے لگ جاتا ہے ۵۴۷-۵۴۸
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرف کے اختیارات دیے اور آزادی و اختیار کے ان اختیارات میں انسان کی آزمائش ہے۵۶۳-۵۷۰
— انسانی مساوات کا اسلامی تصور ۳۱۳
— شریعت میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۳۴۴
— انسان کی اجتماعی زندگی میں فطری نامساوات ۳۴۷-۳۴۸

— انسانی مسائل کی پیچیدگیاں اور انسان کی فطری کمزوریاں ۴۵۲
— انسانی تاریخ کا عدم توازن ۴۵۲
— انسان فطرتاً راہِ راست کا طالب ہے ۴۵۳
— انسانی تاریخ کے متعلق ''جدلی عمل'' کا غلط نظریہ ۴۵۳
— دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ ۶۲ تا ۶۷
— تاریخ انسانی میں پہلا واقعہ قتل ۴۶۲
— انسان کی بقا اور امن کے لیے احترام جان کی اہمیت ۴۶۴
— قتل انسانی اور خودکشی کی ممانعت ۳۴۵-۳۴۶-۴۶۴
— انسان کی زندگی میں حق و باطل کی کشاکش ۴۶۶
— انسانی معاشروں اور قوموں کا بگاڑ ۴۹۶
— انسان کا صحیح معیار قدر و قیمت ۵۰۶
— انسان کی دنیوی زندگی کے متعلق تین اہم حقیقتیں ۶۰۶
— انسان کی تخلیق اور افزائش نسل میں اسباق حقیقت ۵۱۷
— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم ہونا ۶۰۴
— معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— ہدایت و ضلالت کا مکمل انحصار انسان کی اپنی سعی، طلب اور چاہت پر ہے ۲۱۰-۲۱۱
— انسان کا جسم ارضی اجزا پر مشتمل ہے ۵۲۳
— انسان کے لیے دنیا میں قیام کی مدت مقرر ہے ۵۲۳
— اس کا اصل ٹھکانا عالم آخرت میں ہے ۵۲۳-۵۲۴
— انسان اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے جو کچھ بھی کرے گا اسے آخرت میں پائے گا کیونکہ انسان کا اچھا برا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا ۱۰۳
— انسان کو اس حقیقت پر غور و غوض کرنے کی فہمائش کہ اگر اس کی زندگی بھر کی کمائی عین بڑھاپے میں غارت ہو جائے، اس لیے اسے ہر دم آخرت کی فکر کرنی چاہیے ۲۰۶-۲۰۸
— کائنات میں ہر طرف پھیلی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں انسان کو حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ انسان اللہ کو یاد کرنے والا ہو، ہوش مند ہو اور غور و فکر کا مادہ رکھتا ہو ۳۱۰-۳۱۱
— تمام انسانوں کو ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۳۷۹
— ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو کر انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸
— نفس انسان کو تنگ دلی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن انسان اگر احسان اور خدا ترسی کا رویہ اپنائے تو اس کے لیے بہتر ہے ۴۰۲-۴۰۳
— انسان اپنی ضلالت پسندی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے، یہ نہیں کہ اس پر حق و ہدایت واضح نہیں کی گئی ۵۴۵
— ابتدائے آفرینش میں انسان سے لیے گئے فطری عہد کو توڑنے والے سراسر خسارے میں رہیں گے ۶۰
— انسان اور شیطان ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں ۶۷
— انسان کا شیطان کے ہاتھوں میں کھیلنا ۵۸۰
— حق کو رد کر کے انسان اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے ۵۳۲
— پوری نسل انسانی ایک ہی تنفس سے پیدا ہوئی ہے ۵۶۶
— انسان کا علم سے ہٹ کر قیاس آرائیوں میں مبتلا ہونا ۵۷۵ تا ۵۷۷
— انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا گیا ۶۳-۶۴
— انسانی زندگی کو منضبط رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا پابندیاں عائد کی ہیں ۵۹۷-۶۰۱

(۵۴) انصاف

— اللہ تعالیٰ صرف مہربان ہی نہیں، منصف (انصاف پسند) بھی ہے ۴۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ تعالیٰ اپنی بات میں سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے اور کوئی اس کے فرامین کو بدلنے والا نہیں ۵۷۵
— جو شخص اپنے حکمران کو حصول انصاف میں دھوکا دیتا ہے وہ خود اپنے آپ کو غلط فہمی اور دھوکے میں مبتلا کرتا ہے ۳۹۶-۳۹۷
— مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ ہمیشہ جو بھی فیصلہ کرنا ہو انصاف اور عدل کے ساتھ کرو ۳۶۳
— اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید حق کے ساتھ نازل کیا تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے ۳۹۲-۳۹۳
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ۴۷۶-۴۷۷
— انصاف کے ساتھ گواہی دینے، عدل میں گروہی دشمنی کو الگ رکھنے اور صاف ستھرا عدل کرنے کا حکم جو خدا ترسی کے قریب ہے ۴۴۹
— یہودیوں کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور حرام کا مال کھانے والوں میں سے ہیں ۴۷۱
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک اگرچہ معاف ہے ۶۰۰
مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’عدل‘‘

(۵۵) انعام الٰہی

— حقیقی اور ظاہری انعامات کا فرق ۴۵
— اللہ کی نعمت کو شقاوت سے بدلنے کی سزا ۱۶۱
— انبیائے کرام، صدیقین، شہدا اور صالحین کا انعام یافتہ ہونا ۳۷۰
— وہ اطاعت خداوندی اور اطاعت رسول سے مشروط ہے ۳۷۰
— نعمت تمام کرنے کا مفہوم ۴۴۹
— بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ۴۵۸

(۵۶) انفاق فی سبیل اللہ

— نظام دین میں انفاق کی اہمیت، یہ اہل ایمان کی لازمی صفت ہے ۵۰
— انفاق فی سبیل اللہ کے راستے ۱۳۷
— انفاق سے باز رہنا اجتماعی ہلاکت کا موجب ہے ۱۵۳
— اللہ تعالیٰ جو فیاض اور اپنی مخلوق پر بروقت عطا اور بخشش کرتا ہے اور ایسی صفت والوں ہی کو پسند کرتا ہے ۲۰۷
— انفاق کے اوصاف کیا ہیں؟ ۲۰۹-۲۱۰
— فیاض اور زر پرست کرداروں کا تقابل ۲۱۰-۲۱۷
— انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں اور سود خواری کرنے والوں کے کرداروں کا نمونہ ۲۸۷-۲۸۸
— اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق (انفاق فی سبیل اللہ) بھی اس میں ادا کرو ۵۸۹-۵۹۰
— کیا خرچ کیا جائے اور کن مصارف پر کیا جائے؟ ۱۶۴
— بچتوں کے خرچ کرنے کا حکم ۱۶۷
— اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دینے کا مفہوم ۱۸۵-۴۵۱
— اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کا پھلنا پھولنا ۱۸۵-۲۰۲-۲۰۵
— انفاق فی سبیل اللہ آخرت میں ذریعہ نجات ہوگا ۱۹۳
— انفاق فی سبیل اللہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے ۲۰۲-۲۰۳
— انفاق فی سبیل ’’من و اذیٰ‘‘ سے پاک ہونا چاہیے ۲۰۳
— ریاکارانہ انفاق کا انجام بد ۲۰۴-۲۰۶-۳۵۲-۳۵۳
— انفاق فی سبیل اللہ اچھے مال میں سے ہونا چاہیے ۲۰۶
— انفاق فی سبیل اللہ علانیہ بھی کیا جائے اور اخفا کے ساتھ بھی ۲۰۸-۲۱۰
— انفاق برائیوں کے دور کرنے کا ذریعہ ہے ۲۰۸
— انفاق فی سبیل اللہ میں انسان کا اپنا بھلا ہے ۲۰۹
— انفاق کے ذریعے سے غیر مسلموں کی اعانت کا حکم ۲۰۹
— انفاق کے ذریعے سے مالی اعانت کے سب سے

زیادہ مستحق کون لوگ ہیں؟ ۲۱۰
— انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی، روحانی، معاشی اور تمدنی نتائج کا موازنہ ۲۱۴-۲۱۶
— انفاق نیکی کے دروازے کی کنجی ہے ۲۷۲
— انفاق میں عزیز ترین مال خرچ کرنے کا حکم ۲۷۲
— اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی کرنا شرمناک طرز عمل ہے ۲۰۷-۲۰۶
— صدقہ بطور کفارہ ۴۷۴-۵۰۰
— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ و خیرات کرے اور ان کا احسان جتا کر اور دکھ دے کر انھیں ضائع نہ کرے ۲۰۴

(۵۷) اولی الامر

— اللہ ہی مالک الملک ہے ۲۴۳
— اللہ تعالیٰ حکمرانوں کو حکمت اور جن جن چیزوں کا چاہتا ہے علم دیتا ہے ۱۹۱
— اولی الامر ہر ایک شخص کو شریک مشورہ رکھتا ہے اور پھر عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے قدم اٹھالیتا ہے ۲۹۸
— اولی الامر امانت دار ہوں اور امانت و دیانت سے فیصلے کریں ۳۶۲-۳۶۳
— صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کے حامل افراد اس قابل ہیں کہ اختیارات ان کے پاس ہوں ۳۷۷
— قرآن میں بتائے گئے راہِ راست کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرنے کا حکم ۳۹۳-۳۹۴-۳۹۶
— اللہ کی حکومت میں کسی کا حصہ نہیں ہو سکتا ۳۶۰
— دنیوی حکمران اس زعم میں مبتلا ہیں کہ تمدنی معاملات میں فرمانروائی کے مکمل اختیارات رکھتے ہیں ۱۹۸-۱۹۹
— جب انھیں زمین میں اقتدار مل جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ انھیں کچھ نہیں آتا ۱۵۹
— اسلام میں اولی الامر کی اطاعت کا وجوب ۳۶۴-۳۶۵
— اولی الامر کی اصطلاح کا درست مفہوم ۳۶۴
— اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے ۳۶۴
— اس بارے میں احادیث نبوی کی تصریحات ۳۶۴-۳۶۵
— اس حوالے سے علما و مشائخ کی ذمہ داریاں ۴۸۴

(۵۸) اوہام جاہلیت

— اوہام جاہلیت کی اصل جڑ ۵۸۵
— عربوں کے مشرکانہ توہمات کا تجزیہ کرنے کے لیے قرآن کا ایک اہم سوال ۵۹۰-۵۹۱
— حلت و حرمت کے مشرکانہ وہمی تصورات ۵۸۸
— چاند کی حرکات سے شگون لینا ۱۴۸
— حج سے گھروں کو لوٹتے ہوئے گھروں میں داخل ہونے کا غیر معقول طریقہ ۱۴۸-۱۴۹
— قریش ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کرنے کو گناہ تصور کرتے تھے ۱۵۵
— سفر حج میں کسب معاش کو ممنوع اور دنیادارانہ فعل سمجھنا ۱۵۶
— حج کے خاتمے پر مشرکین کا بھرے مجمعوں میں اپنے باپ دادا کے کارنامے بیان کرنا ۱۵۷
— حالت حیض کے متعلق غلط تصورات ۳۴۵
— منہ بولے رشتوں کے لیے میراث میں حصہ ۳۴۸
— ٹونوں، ٹوٹکوں، فال گیریوں اور شگونوں کا رواج ۳۵۹-۴۴۲
— مشرکانہ عقائد کے تحت جانوروں کے کان چیر کر ان کو دیوتاؤں کے نام پر پن کرنا ۳۸۹
— بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام ۵۰۹
— فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا ۵۶۸
— مشرکانہ عقائد اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز کی رسوم ۵۸۴-۵۸۵-۵۸۹
— قتل اولاد ۵۸۵-۵۸۶-۵۸۸

(۵۹) اہل کتاب

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’عیسائی‘‘ اور ’’یہودی‘‘)

Maktaba Tul Ishaat.com

— ان کے صالحین کا رویہ ۱۰۷-۲۸۰-۳۱۳
— ان میں سے قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے دہرا اجر ۳۱۴
— مسلمانوں کے لیے ان کے ذبیح کی حلت ۴۴۶
— مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت ۴۴۶-۴۴۷
— ان پر بعثت محمدیؐ کے ذریعے سے اتمام حجت ۴۵۸
— ان پر اقامت تورات وانجیل کی ذمہ داری ۴۸۶
— قرآن کا دعویٰ کہ اہل کتاب توحید کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں ۵۲۹
— قرآن کا دعویٰ کہ اہل کتاب قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونا خوب جانتے ہیں ۵۷۵
— مذہبی راہ نمائی کے لیے اہل عرب کا اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ۵۶۲
— اہل کتاب کو راہِ راست پر لانے کے لیے قرآن کی کوشش ۷۰-۸۲
— اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد پورا کرنے کی فہمائش ۷۱
— بنی اسرائیل کو کتاب عطا کرتے ہوئے ان سے کیا وعدہ لیا گیا تھا ۸۳
— اہل کتاب سے فہمائش کہ اگر تم رسول اللہ پر ایمان لاتے ہوتو یہ تمہارے لیے ہی بہتر ہوتا ۲۷۹
— تمام اہل کتاب یکساں نہیں ہیں، ان میں سے راہِ راست پر قائم عابد و زاہد بھی موجود ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مصروف رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے صالح اہل کتاب کی قدر کرتا ہے ۲۸۱
— اہل کتاب کے نیک عنصر کے لیے بھی آخرت میں نیک انجام ہے ۳۱۳-۳۱۴-۴۸۸
— اہل کتاب اگر ایمان کا رویہ اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں مہربان ہوجاتا ۴۸۶-۴۸۷
— کاش! اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو قائم کیا ہوتا تو زمین و آسمان سے ان پر رزق اور رحمت کی بارش ہوتی ۴۸۶-۴۸۷
— اہل کتاب میں سے نیک لوگوں کی صفات اور ان کا انجام خیر ۴۹۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور بعد میں مدینہ آمد پر مدینہ کے اہل کتاب کی دینی اور اخلاقی حالت کیسی تھی؟ ۴۶-۴۷
— اہل کتاب میں سے بہت کم لوگ احکام الٰہی میں خیانت کے عیب سے بچے ہوئے ہیں ۴۵۴
— یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ دین اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کریں جس کے لیے وہ سوال و جواب کرتے رہتے تھے ۱۰۳
— اہل کتاب کا زعم کہ نجات انھی کا اجارہ ہے ۱۰۳-۱۰۴
— ان کے مفسد گروہ کا رویہ ۱۰۶
— ان کے علما کی حق پوشی اور فرقہ بندی اور جانتے بوجھتے حق کی مخالفت ۱۱۸- ۱۲۲- ۱۲۳- ۲۴۱- ۲۴۲-۳۵۶-۴۸۴
— آخرت سے متعلق ان کے عقیدے کی خرابی ۲۴۲
— ان کی کج بحثیاں ۲۶۲
— ان کا آیات الٰہی سے انکار ۲۶۳
— دعوتِ اسلامی کے خلاف ان کی چال بازیاں ۲۶۴
— اہل ایمان کو ان سے تکلیف دہ باتیں سنی پڑتی تھیں ۳۰۹
— اہل کتاب کا اللہ کی کتابوں کو پس پشت ڈالنا اور بیچنا ۳۰۹-۳۱۰
— اہل کتاب کی منقبت پسندیاں ۳۱۰
— اہل کتاب کو پاکیزگی اور تقویٰ کا زعم تھا ۳۵۹
— اہل کتاب کی فال گیری اور ٹونے ٹوٹکوں میں دلچسپی ۳۵۹
— اہل کتاب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مضحکہ انگیز مطالبات ۴۱۵
— اہل کتاب کا کھلی نشانیوں کے بعد بھی شرک کرنا ۳۵۸تا۳۶۰-۴۱۵

— اہل کتاب کا دین میں غلو ۴۲۷-۴۹۱

— ان کا اذان کا مذاق اڑانا ۴۸۳

— ان کی اکثریت کا بدعمل ہونا ۴۸۷

— اقامت تورات وانجیل کے بغیر اللہ کے نزدیک ان کا دین داری کا دعویٰ بے معنی ہے ۴۸۶-۴۸۷

— کلام اللہ میں تحریف سے کیا مراد ہے جس کے اہل کتاب مجرم تھے ۸۷

— حاملین کتب اقوام نے جانتے بوجھتے محض ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے کتاب اللہ کے مطلوبہ طرز عمل سے الگ راستہ اختیار کیا ۲۳۹-۲۴۰

— اہل کتاب یاد رکھیں کہ گمراہی کی طرف دوسروں کو مائل کرنے والے اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۲۶۳

— یہودیوں کی اخلاقی حالت کہ پرلے درجے کے بے اعتبار ہیں اور فوراً ہی بدنیت ہو جاتے ہیں ۲۶۵-۲۶۶

— یہودیوں کا کتاب اللہ (تورات) میں تحریف کرنا ۲۶۷

— انبیائے کرام اور ان کے ذریعے سے ان کی امتوں سے لیا گیا فطری عہد کہ ہر آنے والے نبی کی تعلیمات کی تصدیق کریں گے لیکن اہل کتاب اس عہد کے انکاری ہو گئے ۲۶۸-۲۶۹

— ہدایت کی موجودگی میں اہل کتاب عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے گمراہی اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے ۲۷۶

— اہل کتاب میں کچھ تعداد باایمان لوگوں کی ہے لیکن اکثریت نافرمانوں اور فاسقوں کی ہے ۲۸۰

— اہل کتاب اہل ایمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ کچھ ستا لیں گے ۲۸۰

— مدینہ منورہ میں یہودیوں سے معاشرتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کیونکہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کے کسی موقع سے نہیں چوکتے ۲۸۲-۲۸۳

— اہل ایمان اگر صبر، شکر اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزاریں تو اہل کتاب کی کوئی تدبیر ان کے خلاف کارگر نہ ہوگی ۲۸۳

— اہل کتاب مسلمانوں کے سامنے ایمان لانے کا ڈھونگ کرتے ہیں لیکن الگ ہوتے ہی غصے اور جلاپے سے راکھ ہونے لگتے ہیں ۲۸۳

— اہل ایمان کو خوشی ملتی ہے تو اہل کتاب کو ملال ہوتا ہے اور اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو انھیں راحت ملتی ہے ۲۸۳

— اہل کتاب کے دلوں کا بغض ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے لیکن وہ دلوں میں زیادہ بغض چھپائے رکھتے ہیں ۲۸۳

— اہل ایمان اگر اہل کتاب سے محبت رکھیں تب بھی اہل کتاب کبھی محبت نہیں رکھ سکتے ۲۸۳

— اہل کتاب کی خفیہ اور ظاہر طعن و سازش کے ذریعے اہل ایمان کو آزمایا جاتا ہے، ان حالات میں صبر اور خداترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلے کی بات ہے ۳۰۹

— اہل کتاب کے علما کا رویہ ۳۵۶-۳۵۷

— اہل کتاب کے علما اپنی کتابوں کا کچھ علم رکھتے ہیں کیونکہ باقی حصہ انھوں نے تحریفات اور فرقہ بندی میں ضائع کر دیا ہے ۳۵۶-۳۵۷

— اہل کتاب پر ان کی باطل پرستی اور ضلالت پروری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑی ہے اس لیے کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸-۳۶۰

— اہل کتاب کی اصلی گمراہی شرک ہے ۳۵۸ تا ۳۶۰

— اہل کتاب اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کیونکہ اہل ایمان ہدایت کا راستہ پا چکے ہیں ۳۶۰

— اہل کتاب اس قدر تنگ دل ہیں کہ حق کا اعتراف نہیں کرتے، اگر کہیں کائنات کی حکومت میں ان کا حصہ ہوتا تو کسی کو پھوٹی کوڑی نہ دیتے ۳۶۰

— اہل کتاب (بنی اسرائیل) سے ملک عظیم اور دنیا کی راہ نمائی اور امامت کا منصب لے کر اہل ایمان اور اولاد ابراہیم (بنی اسماعیل) کو دے دیا گیا جس پر بنی اسرائیل جل بھن رہے ہیں ۳۶۰-۳۶۱

— اہل کتاب جان لیں کہ انجام کار آرزوؤں اور

Maktaba Tul Ishaat.com

خواہشات پر ہرگز منحصر نہیں ہے ۳۹۹

— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں عیسائی عقیدت و محبت میں اور یہودی انکار و مخالفت میں حد سے گزر گئے، اس کو اللہ تعالیٰ نے دین میں غلو قرار دیا ہے ۴۲۷

— اہل ایمان کو فہمائش کہ جس طرح کا عہد تم سے لیا گیا ہے اسی طرح کا عہد یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی لیا گیا تھا لیکن تم ان کی طرح بدعہد نہ ہونا ۴۵۰

— اہل کتاب اپنے فطری عہد سے پھر گئے، وہ احکام الٰہی کو محض الفاظ کے ہیر پھیر سے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں ۴۵۴

— اہل کتاب تعلیمات خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور ان کی احکام الٰہی میں خیانتوں کا پول آئے دن کھلتا رہتا ہے ۴۵۴

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل کتاب کی حرکات اور خیانتوں سے چشم پوشی کرنے کا حکم ۴۵۵-۴۵۶

— اہل کتاب کی حالت کی حضرت آدمؑ کے قاتل و مقتول بیٹوں کے واقعہ سے مماثلت ۴۶۳

— اہل کتاب میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلانے والے ہیں ۴۶۴

— اہل کتاب کی کتمان حق حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا انجام فاسقوں سے بھی بدتر ہے ۴۸۳

— اہل کتاب کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان قیامت تک دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے، جب کبھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے ۴۸۶

— قرآن حکیم نے اہل کتاب کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دیا ۴۸۸

— رسولؐ اللہ کو اہل کتاب کی انکار اور سرکشی کی روش پر ملال نہ کرنے کی ہدایت کیونکہ دین پر کسی کا اجارہ نہیں ہے ۴۸۸

— جو ایمان لا کر نیک عمل کرے گا خواہ یہودی ہو یا عیسائی، اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸

— اہل کتاب میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل چکے ہیں اور فاسق قرار پائے ہیں ۴۹۷

— اہل کتاب میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلانے والے ہیں ۴۶۴

(۶۰) ایام تشریق (حج)

(تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۶۱) آیت

— لفظ ''آیت'' کے معنی ۶۹

— آیات قرآنی میں صرف کلام کا اسلوب ۵۶۹

— آیات الٰہی کا لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۶۹-۵۳۰-۶۰۳

— آیات کتاب اللہ کی دو قسمیں ۲۳۴-۲۳۵

— آیات الٰہی کی مجموعی شہادت کیا ہے؟ ۳۱۱

— آیت بمعنی کتاب اللہ ۴۲-۸۰

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آیت الٰہی سے استفادہ ۵۵۳

— عقل سے کام لینے والوں کے لیے ہر طرف آیات ہی آیات موجود ہیں ۱۳۰-۳۱۱-۵۳۷-۵۳۸

— آیات الٰہی فلاح تک جانے والے سیدھے راستے کو واضح کرتی ہیں ۲۷۷

— کیسے لوگ آیات الٰہی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۳۱۱

— آیات الٰہی سے صحیح استفادہ صرف سمجھ بوجھ رکھنے والے اہل ایمان ہی کر سکتے ہیں ۵۶۶-۵۶۷

— تنسیخ آیات سے کیا مراد ہے؟ ۱۰۱-۱۰۲

— سب سے بڑی آیت (نشانی) یہ ہے کہ تعلیمات رسول اللہ برحق ہیں ۱۰۶-۱۰۷

— آیت الکرسی جس کو سید آیات القرآن بھی کہا جاتا ہے ۱۹۳ تا ۱۹۶

— اللہ تعالیٰ بار بار مختلف طریقوں سے اپنی آیات (نشانیاں) ظاہر کرتا ہے تاکہ لوگوں کو حقیقت مکمل سمجھ میں آ جائے ۵۴۸

— آیات الٰہی سے انکار کا انجام عذاب ہے ۲۳۳-۲۳۶-۳۶۱-۴۹۸-۵۴۱-۵۶۵

— آیاتِ الٰہی کے خلاف جہاں کفر بکا جا رہا ہو وہاں ایک مسلمان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ ۴۰۸-۵۴۹

— جو لوگ آیاتِ الٰہی سے انکار کرتے ہیں وہی حق کو جھٹلاتے ہیں ۵۲۴

— آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والوں کے پیچھے چلنے کی ممانعت ۵۹۷

— اللہ کی آیات کو کھیل بنانا اصل میں اپنے اوپر ظلم کرنا ہے ۱۷۷

— کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی آیات کو جھٹلانے والے گونگے، بہرے اور تاریکیوں میں گم کردہ ہیں ۵۳۷

— اللہ کی آیات سے منہ موڑنے والوں کو بدترین سزا اور دردناک عذاب مل کر رہے گا ۶۰۳

— اللہ تعالیٰ کی صریح آیات (نشانیاں) آ جانے کے بعد ایمان اور توبہ وغیرہ بے اثر ہو جاتی ہے ۶۰۳-۶۰۴

(۶۲) ایلا

— اس کا بطور شرعی اصطلاح کیا مفہوم ہے؟ ۱۷۱

— اس کے احکام ۱۷۱ تا ۱۷۳

(۶۳) ایوب علیہ السلام

— حضرت ایوب علیہ السلام کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا، وہ صالحین میں تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۶۴) ایمان

— ایمانیات کی تفصیل ۱۲۸-۲۲۳-۲۷۰-۴۰۶

— ایمان باللہ ۵۲-۸۲-۴۲۴-۴۸۸

— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان باللہ ہے ۱۷۳

— ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خیرات کرے اور صدقات کا احسان جتلا کر، دکھ دے کر اسے ضائع نہ کرے ۲۰۴

— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت انسان کو انفاق فی سبیل اللہ کی طرف مائل کرتے ہیں ۳۵۳

— ایمان باللہ کے ساتھ ''کفر بالطاغوت'' کی اہمیت ۱۹۶

— ریا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی ضد ہے ۲۰۴

— ایمان بالآخرت ۵۱-۵۲-۴۲۴-۴۸۸

— ایمان بالآخرت اور ایمان بالقرآن کا لزوم ۵۶۴

— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان بالآخرت ہے ۱۷۳

— ایمان بالقرآن اور ایمان بالکتاب ۵۰-۵۱-۵۸-۴۲۳-۴۸۷-۴۸۸

— ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تعلق ۵۸-۶۰

— احکام کتاب اللہ کو جزوی طور پر ماننے کے رویے کی مذمت ۹۱

— ایمان لانے کا دورخی مفہوم ۴۰۷

— وہ کام جو اہل ایمان کو نہیں کرنے چاہییں ۱۰۰ تا ۱۰۲

— ایمان لانے والوں کا طرزِ فکر ۲۳۵

— تمام انبیائے کرام کی تعلیمات پر ایمان لانے کا مطالبہ ۱۱۵-۲۷۰-۴۱۴

— ایمان کے تقاضے ۵۰ تا ۵۲-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۴-۱۶۶-۱۶۹-۱۷۳-۱۷۸-۲۰۴-۲۲۵-۲۴۴-۲۷۶-۲۷۸-۲۸۷-۲۹۰-۲۹۷-۲۹۹-۳۰۴-۳۴۵-۳۵۱-۳۵۲-۳۶۳-۳۶۶-۳۷۳-۳۸۲-۳۸۴-۴۰۵-۴۱۱-۴۲۳-۴۳۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۶۰-۴۶۶-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۸-۴۸۹-۵۰۱-۵۰۳-۵۷۶

— اہل ایمان کی صفات و علامات ۵۰ تا ۵۲-۱۳۷-۲۳۸-۳۹۷-۴۷۷-۴۸۱-۴۸۲

— ایمان کے ہوتے ہوئے اطمینان قلب کی طلب ۲۰۱

— ایمان کے ساتھ سمع و طاعت لازم ہے ۲۲۳-۳۶۶

— اہل ایمان کافروں کو ہمدم و ہمراز نہ بنائیں ۲۴۳-۴۸۰

— ایمان کے نتائج ۲۸۹-۳۰۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— مومن کا ایمان مخالفتوں سے اور بڑھ جاتا ہے ۳۰۳
— اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا شرطِ ایمان ہے ۳۰۴
— ایمان کی آزمائش ضروری ہے ۳۰۵
— امورِ غیب کی حد تک خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۳۰۶
— مسلمانوں کے مدارج کے لیے حقیقی وجۂ امتیاز ایمان ہے ۳۴۱
— رسول کا جملہ معاملات میں حکم ماننا شرط ہے ۳۶۸
— طاغوت کے لیے لڑنا منافی ایمان ہے، اہل ایمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں ۳۷۳
— جو ایمان لا کر نیک عمل کرے خواہ یہودی ہو یا عیسائی اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— ایمان بالغیب ۵۰
— ایمان لانے کی مدت اس وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں ہے ۵۲۵-۶۰۳
— اقامت صلوٰۃ اہل ایمان کی لازمی صفت ہے ۵۰
— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۸۲
— اہل ایمان صالحین کا انعام ۵۸-۵۹
— ایمان اور تقویٰ کا لزوم ۱۰۰
— ایمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
— ایمان لانے والوں کو شاہد (گواہ) قرار دیا گیا ہے ۲۵۶-۲۵۷
— اہل ایمان اپنے اچھے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مزید اجر عطا فرمائے گا ۴۳۰
— صرف ایمان کافی نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ (عمل صالح) بھلائی کمانا بھی ضروری ہے ۶۰۳
— شکر اور ایمان کا تعلق ۴۱۲
— دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں؟ ۵۳۶
— مومن وہ ہے جو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرے ۴۱۲
— کمزوری کا عذر و بہانہ کر کے ایمان کے تقاضوں کو چھوڑنے والوں کا انجام ۳۸۶
— اہل ایمان کو کن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا؟ ۴۶۶
— ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرنے والوں کا اخروی انجام ۴۴۷
— ایمان محض زبانی دعوے کا نام نہیں ہے ۴۷۰
— اہل ایمان کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اہل ایمان کی حمایت اور مددگاری کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے ۳۵۶-۳۵۷
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہل ایمان سے اللہ تعالیٰ کا لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے اور وہ صرف اللہ ہی پر بھروسا کرتے ہیں ۴۵۱-۴۶۰
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ انھوں نے دنیا میں درست طرزِ عمل اختیار کیا ہے ۵۸۰
— اختیاری ایمان مطلوب و مقصود ہے ۵۳۶-۵۷۴
— دنیا و آخرت میں یہ خوف اور رنج سے بچانے کا وسیلہ ہے ۵۴۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل ایمان سے کس طرز عمل کی ہدایت کی گئی ہے ۵۴۴
— اہل ایمان کے لیے دنیا و آخرت میں حقیقی امن ہے ۵۵۹
— ایمان کو ظلم سے آلودہ کرنے کا مطلب ۵۵۹
— ایمان معرفت حقیقت کی کنجی ہے ۵۶۷
— اہل ایمان سے مطالبات ۴۰۵
— اہل ایمان کو انصاف کا علمبردار ہونا چاہیے ۴۰۵
— ایمان کے ساتھ شرعی بندشوں کی پابندی ضروری ہے ۴۳۷
— ایمان کی پختگی ہی پر حلال و حرام کی پابندی کا انحصار ہے ۴۴۲-۴۹۸
— اللہ تعالیٰ کو کیسے اہل ایمان مطلوب ہیں؟ ۴۸۱
— اہل ایمان کا حلقہ رفاقت ۴۸۲
— ایمان پر کسی فرد یا گروہ کا اجارہ نہیں ہے ۴۸۸
— ایمان کی کھلی پہچان ۴۹۶
— قبولِ ایمان کے لیے صحیح جذبات کی تصویر ۴۹۷

— اہل ایمان پر اصل ذمہ داری ان کی اپنی ذات ہے ۵۱۰

— اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہی ہماری بھلائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری دعائیں سننے والا اور قبول کرنے والا ہے ۱۴۴

— ایمان کا حامی اللہ تعالیٰ ہے جو اہل ایمان کو روشنی اور نور کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۶-۱۹۷

— ایمان لانے والوں کی خصوصیات اور ان کی دعائیں ۲۳۸-۲۳۹-۳۱۱

— عملاً راسخ افراد ہی ایمان لاتے ہیں ۴۲۳

— ایمان لانا انسان کے اپنے مفاد میں ہے کیونکہ انکار سے کائنات کے مالک علیم وحکیم رب تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا ۴۲۷-۴۲۸

— ایمان کی دولت اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۴۸۲

— ایمان لا کر توبہ کرنے والے اور آیندہ نیک اعمال کرنے والوں کے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ معاف کردیتا ہے ۵۴۴

— ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خیرات کرے اور صداقت کا احسان جتلا کر اور دکھ دے کر اس کو ضائع نہ کرے ۲۰۴

— ایمان اور کفر کے درمیان راہ نکالنے والے پکے کافر ہیں ۴۱۴

— اہل ایمان سے کفر کا رویہ اختیار کرنے والے ہی اصل میں خسارے میں ہیں ۱۰۷

— دل میں خدا کا خوف رکھتے ہوئے کفار سے دوستی رکھنے کی اجازت تاکہ ان کے ظلم سے بچا جاسکے ۲۴۴

— منکرین کو معجزوں سے ایمان حاصل نہیں ہوتا ۵۷۱

— کیسے لوگ ایمان سے محروم رہتے ہیں؟ ۵۷۲

— ایمان نہ لانے والوں پر ان کی ناپاکی مسلط ہونا ۵۸۰

— قانون الٰہی سے روگردانی منافی ایمان ہے ۴۷۲

— دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی منافی ایمان ہے ۴۸۳

— کون سے اعمال ایمان کے نہ ہونے کی شہادت دیتے ہیں؟ ۴۸۴

— اہل ایمان کو مشرکین و کفار کی تکلیف دہ طعن وتشنیع کے ذریعے سے آزمایا جاتا ہے، نامساعد حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلہ کی بات ہے ۳۰۹

ب

(٦٥) باطل

— کائنات باطل کے فروغ کے لیے نہیں بنائی گئی ہے ۵۵۱

— باطل کی کشمکش میں حق پرستوں کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزرنا ہوگا، یہی اللہ تعالیٰ کا دستور ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ۵۳۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''آزمائش'')

— دعوتِ حق والوں کو زندہ ضمیر اور عقل وفکر استعمال کرنے والے قرار دیا گیا ہے اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے ۵۳۶-۵۳۷

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''دعوتِ حق'')

(٦٦) بخل

— اللہ تعالیٰ فیاض ہے، اپنی مخلوق پر ہروقت فیاضی اور عطا وبخشش سے متوجہ رہتا ہے اور ایسی ہی صفت والوں کو پسند کرتا ہے ۲۰۷

— فیاضی اور زر پرست کرداروں کا تقابل ۲۱۰-۲۱۷

— سودخواروں کے کردار کا بیان ۲۸۷-۲۸۸

— اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے میں کنجوسی کا طرز عمل نہایت شرمناک ہے ۲۰۷-۳۰۶

(٦٧) بائبل

— بائبل کی حقیقت ۲۳۲

— قرآن مجید اور بائبل کے بیانات میں صریح اختلافات ۷۷-۸۵-۸۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— کلام اللہ میں انسانی آمیزش ۴۲۴
— بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابتدائی تفکر پر کوئی روشنی نہ ڈالنا ۵۶۰
— ابراہیم علیہ السلام سے نمرود کے مباحثے کے بارے میں بائبل خاموش ہے ۱۹۸
— حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ۱۱۴
— سموئیل نبی اور طالوت کی بادشاہت کے بارے میں بائبل کا بیان ۱۸۵ تا ۱۸۷
— تابوتِ سکینہ کے بارے میں بائبل کا بیان ۱۸۹
— ''پہاڑی'' کا وعظ ۲۵۳
— اس میں دعوت عیسوی کے آثار ۲۵۵
— اس میں سوختنی قربانی کا ذکر ۳۰۷-۳۰۸
— بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں کا تذکرہ بائبل میں ۴۵۱
— ''باپ'' کے لفظ کا استعمال بطور استعارہ ۴۲۹

(۶۸) بدر غزوہ (جنگ)

— تحریک اسلامی کی تاریخ میں جنگ بدر کا مقام ۲۲۹
— واقعہ بدر میں دعوت کا سبق ۲۳۶-۲۳۷
— واقعہ بدرِ ثانیہ ۳۰۴
— باطل کے بڑے مجرمین سزا کے حق دار تھے، جنگ بدر کے بعد ۲ قیدیوں کا قتل اور ۱۷ قیدیوں کا عفو عام سے استثنا ۱۵۱-۱۵۲
— اہل ایمان اللہ کی راہ میں حق کے لیے لڑ رہے تھے اور قریش کفر کے لیے لڑ رہے تھے، دونوں کے انجام میں اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں ۲۳۶
— قریش تعداد میں دوگنے ہونے کے باوجود مغلوب ہو گئے، اللہ تعالیٰ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مغلوب کرتا ہے ۲۳۷

(۶۹) برکت

— قرآن مجید ایک برکت والی کتاب ہے ۶۰۲

(۷۰) بسم اللہ

— ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھنے کا فائدہ ۴۳

(۷۱) بنی اسرائیل

— لفظ ''بنی اسرائیل'' کی وجہ تسمیہ ۷۰-۱۰۸-۱۰۹
— دنیا کی قوموں پر ان کی فضیلت کے معنی ۷۴-۱۰۸
— ان پر ابر کا سایہ اور من وسلویٰ کا نزول ۷۷
— ان کے لیے چٹان سے چشمے نکالے گئے ۷۹
— وہ عہد جو بنی اسرائیل سے لیے گئے ۸۳-۹۰-۹۱-۹۵-۳۰۹-۳۱۰-۴۵۱-۴۸۹
— بنی اسرائیل کی عہد شکنیاں ۸۳-۹۰-۹۵-۳۰۹-۴۱۶-۴۵۴-۴۸۹
— ان کے نعمت سے نوازے جانے کا مطلب ۱۰۹
— بنی اسرائیل کو تابوتِ سکینہ کی واپسی کی بشارت ۱۸۸-۱۸۹
— ان کے صالحین کا رویہ ۲۸۰-۲۸۱
— بنی اسرائیل کے لیے ان میں سے بارہ نصیحتوں کا تقرر ۴۵۱
— ان سے اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، ایمان بالرسل، انفاق فی سبیل اللہ اور اقامت دین میں نصرت کا مطالبہ ۷۰-۷۲-۸۰-۸۳-۸۶-۴۵۸
— ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات ۴۵۸
— ان کو ارض مقدس میں داخلے کا حکم کیونکہ ارض مقدس ان کے نام لکھ دی گئی ۴۵۸-۴۵۹
— حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ان کا دور عروج ۴۵۸-۴۵۹
— یوشع بن نون کے عہد میں بنی اسرائیل کا فلسطین کو فتح کرنا ۴۶۱
— سمندر پھاڑ کر ان کے لیے راستہ بنایا گیا ۷۵
— ایک وقت میں بنی اسرائیل کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی گئی اور علم حق سے نوازا گیا ۷۰-۷۴
— بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر بہت بڑا احسان کیا گیا جو ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۶۴ تا ۶۶-۷۵

— بنی اسرائیل کو بچا لیا گیا اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا گیا ۷۵
— بنی اسرائیل کی عبرت کے لیے ان کی تاریخ سے چند اہم واقعات کا ذکر ۷۴ تا ۸۰-۸۳-۸۶
— بنی اسرائیل کا خدا کو دیکھنے کا مطالبہ جس پر انھیں زبردست صاعقے نے آ لیا اور وہ بے جان ہو گرے اللہ نے انھیں دوبارہ زندہ اٹھا دیا کہ شاید وہ شکر گزار ہوں ۷۷
— بنی اسرائیل کو ایک بستی میں امن، حلال رزق اور گناہوں سے درگزر کرنے کے وعدے پر داخل کیا گیا لیکن ظالموں نے اللہ کی بات بدل ڈالی اور عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۷۸
— بنی اسرائیل کی من و سلویٰ کی یکسانی سے تنگ آ جانا اور طرح طرح کی پیداواروں اور کھانوں کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا ۷۹-۸۰
— بنی اسرائیل کو زمین میں فساد پھیلانے کی ممانعت لیکن وہ نہ مانے اور ان کا انجام بد ۷۷ تا ۸۱
— بنی اسرائیل میں سے نبوت ۸۰ تا ۸۲
— بنی اسرائیل انبیا کی قاتل قوم ۸۰ تا ۸۲- ۳۰۸- ۴۱۸-۴۸۹
— بنی اسرائیل پر آیات اللہ کے کفر، قتل انبیائے کرام اور حدودِ شرع توڑنے کی پاداش میں ذلت وخواری اور بدحالی مسلط کر دی گئی ۸۰-۸۲
— بنی اسرائیل پر پہاڑ طور کے اٹھائے جانے کا واقعہ ۸۳-۴۱۵-۴۱۶
— بنی اسرائیل کو ان کی بداعمالیوں پر بندر بنائے جانے کا واقعہ ۸۴-۸۶-۸۸
— جب تورات کے احکام انھیں سنائے گئے تو کہنے لگے اس کے احکام بھاری اور مشکل ہیں ۸۳
— بنی اسرائیل کے لیے سبت کا قانون، اس کی خلاف ورزی اور نتیجتاً عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۸۳-۸۴
— بنی اسرائیل کا انجام بد ہر زمانے کی نسلوں کے لیے عبرت اور متقین کے لیے نصیحت بنا دیا گیا ۸۴
— بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنے کا مذاق اڑانا اور لیت ولعل کرنا لیکن بالآخر مجبوراً ذبح کرنے پر مجبور ہوئے ۸۴-۸۵
— بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی کی مثال کہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر بھی ان کے دل پتھر کے پتھر ہی رہے ۸۶
— ایک طرف بنی اسرائیل اللہ کی طرف سے آنے والے انبیائے کرام پر نازل ہونے والی کتب اور رسالت پر ایمان لانے کے دعوے دار ہیں اور دوسری طرف انبیائے کرام کو قتل کرتے ہیں ۹۴-۴۸۹
— بنی اسرائیل کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسی کتاب اور نبوت پر ایمان لائیں گے جو صرف بنی اسرائیل پر اتری ہوگی ۹۴
— بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر قیام کے دوران میں بچھڑے کو معبود بنا لینا ۷۵-۹۵-۴۱۵
— تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بار بار ذلت کی مار پڑی، وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے پناہ مل گئی وہ اور بات ہے ۲۸۰
— بنی اسرائیل اگر مسلمانوں سے لڑیں گے تو مار ہی کھائیں گے اور ایسے بے بس ہوں گے کہ انھیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی ۲۸۰
— بنی اسرائیل میں گاؤ پرستی کہاں سے آئی ۷۶
— چالیس سال تک بنی اسرائیل کی صحرا نوردی ۴۶۰-۴۶۱
— بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد سے پھر گئے اسی لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے انھیں چھوڑا، وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہو کر رہیں گے اور آخرت میں بھی شدید عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے ۸۶ تا ۸۸
— بنی اسرائیل کے ایک مقتول کا دوبارہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتا بتانا ۸۵-۸۶
— بنی اسرائیل کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے ۸۶
— بنی اسرائیل سے ملک عظیم اور دنیا کی امامت اور

Maktaba Tul Ishaat.com

راہ نمائی کا منصب لے کر اولادِ ابراہیم میں سے بنی اسماعیل کو دے گیا، اس پر بنی اسرائیل حسد کے مارے جل بھن رہے ہیں ۳۶۰-۳۶۱
— قیادت کی نااہلی، بددیانتی اور کم ظرفی بنی اسرائیل کو لے ڈوبی ۳۶۲-۳۶۳
— حضرت موسیٰ قیام طور کے دوران میں بنی اسرائیل کے لیے تختیوں پر تحریر شدہ احکام خداوندی لائے ۴۵-۴۱۶
— بنی اسرائیل اپنی پے در پے نافرمانیوں، عہد شکنیوں، قتل انبیائے کرام اور باپ دادا کے نظریات سے چمٹے رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۴۱۶
— بنی اسرائیل پر دنیا میں ایک عذاب مسلسل کا سلسلہ طاری ہے اور وہ بحیثیت قوم اپنی بدکاریوں پر سزا پاتے ہیں ۷۹-۴۲۳-۴۲۴
— بنی اسرائیل فاسق ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کی حالت پر ترس کھایا جائے ۴۶۱
— بنی اسرائیل اور یہود کے رویے میں حضرت آدم کے قاتل و مقتول بیٹے کے واقعہ کے ساتھ مماثلث ۴۶۳
— بنی اسرائیل میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلاتے ہیں ۴۶۴
— بنی اسرائیل اہل ایمان کے مقابلے میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے ہیں ۴۹۶
— بنی اسرائیل کے بگاڑ کے اسباب ۴-۵-۷۷-۱۵۸-۱۸۷
— بنی اسرائیل کو قرآن کی دعوت اور ان کے رویوں پر تنقید ۷۰
— بنی اسرائیل کے مذہبی اور اخلاقی جرائم ۷۷-۹۲-۳۰۸
— وہ بستی جس میں داخلے پر انھیں سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا ۷۸-۴۱۷-۴۵۴
— بابل کی اسیری کے زمانے میں ان کی حالت زار ۹۸
— بنی اسرائیل کو آخرت کے سخت محاسبے کی یاددہانی ۱۰۸
— دنیا کی قوموں کے لیے ان کا نمونۂ عبرت ہونا ۱۶۱-۱۸۷
— واقعۂ خروج ۱۸۴
— اس کا سموئیل نبی کے سامنے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ ۱۸۵ تا ۱۸۷
— واقعہ نہر میں ان کی بے صبری کی مثال ۱۹۰
— تورات کی تاریخ ۲۳۱-۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مبعوث ہونا اور ان کی دعوت ۲۵۲-۲۵۴
— دعوتِ عیسوی کے خلاف ان کی کافرانہ روش اور خفیہ چالیں ۲۵۶-۲۵۷
— ان کے بعض ماکولات کی خاص حرمت ۲۷۳
— ان کے مغضوب ہونے کا فیصلہ ۲۸۰
— اہل ایمان کو ان کی برائیوں سے بچنے کی تاکید ۳۶۲
— دعوت جہاد پر ان کی بزدلی اور سزا ۴۵۹-۴۶۰
— بنی اسرائیل کے قتل کی حرمت کا فرمان ۴۶۴
— بنی اسرائیل پر حضرت داود اور حضرت عیسیٰ کی زبان سے کیوں لعنت کی گئی؟ ۴۹۷
— اہل ایمان کے مقابلے میں کفار سے ان کا تعلق رفاقت ۴۹۶
— ان کے طرز عمل سے ان کے محروم ایمان ہونے کی شہادت ۴۹۶
— بنی اسرائیل کی اکثریت کا بگاڑ ۴۹۷
— بنی اسرائیل کی پے در پے گمراہیوں پر اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرتا رہا کہ شاید وہ شکر گزار بندے بن جائیں ۷۵-۷۶
— بنی اسرائیل کا تورات کے احکام کو مشکل اور بھاری قرار دے کر حکم عدولی کرنا ۸۳
— بنی اسرائیل کے نام ''ارض مقدس'' لکھا جانا ۴۵۸-۴۵۹

(۷۲) بین الاقوامی قانون

— اسلام قوموں کے درمیان وعدے، عہد اور

معاہدے کا احترام کرتا ہے ۳۸۰ تا ۳۸۲

— اگر کوئی غیر مسلم ریاست اہل ایمان سے دستور کے خلاف سلوک کرتی ہے تو اہل ایمان ہرگز ویسی ہی زیادتی نہ کریں ۴۳۹-۴۴۰

— معاہد اقوام اور محارب اقوام کے افراد کے غیر دانستہ قتل پر الگ الگ کفارہ اور خون بہا مقرر کیا گیا ۳۸۲-۳۸۳

پ

(۷۳) پرہیز گار

(دیکھو "تقویٰ"، "متقی")

(۷۴) پاک

— جسم کا پاک ہونا ایک نعمت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری واجب ہے ۴۴۹

(۷۵) تحریک اسلامی

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کردہ تحریک اسلامی کی راہ نمائی کے لیے قرآن نازل کیا گیا ۲۱ تا ۲۶

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ تحریک اسلامی کے مختلف ادوار ۲۱ تا ۲۶

— ابتلا اور آزمائش کے دور میں اسلام پھیلتا ہے اور قرآن کا اس دور میں ایک مخصوص طرز بیان تھا ۲۲-۲۳

— دعوت اسلامی کے ہر مرحلے پر قرآن نے ایک نئے انداز سے ہدایات وفرامین دیے ۲۱ تا ۲۵

— نظریاتی اور عملی لحاظ سے دعوت اسلامی کی تکمیل کے بعد ہم مسلمان اس بات کے مکلف اور ذمہ دار ہیں کہ دعوت حق جاری رکھیں ۲۷

— قرآن ایک دعوتی اور تحریکی کتاب ہے، اس کے مکمل فہم کے لیے ضروری ہے کہ انسان وہی کام کرے جس کے لیے قرآن آیا تھا ۳۳-۳۴

— دعوت حق کو شروع ہی سے بین الاقوامی کیوں نہیں بنایا گیا ۳۶-۳۷

ت

(۷۶) تابوت سکینہ

— اس کی حقیقت اور بنی اسرائیل کو اس کی واپسی کی بشارت ۱۸۹-۱۸۸

(۷۷) تاریخ

— قومیں جنھیں زمین پر بڑا اقتدار حاصل تھا لیکن اپنے اعمال بد کی وجہ سے نیست و نابود ہوئیں اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو اٹھایا ۵۲۴-۵۲۵

— قرآن کا تاریخ انسانی سے استدلال ۴۱۸-۴۱۹-۵۸۳

— زمین میں چل پھر کر معذب قوموں کا انجام دیکھنے کی فہمائش ۵۲۶

— یہود قتل انبیا جیسے بھیانک تاریخی پس منظر پر فخر کرتے تھے ۴۱۸-۴۱۹

(۷۸) تحویل قبلہ

— بیت المقدس سے خانہ کعبہ کو نماز کے لیے قبلہ بنانے کا حکم ۱۲۴

— بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ۱۱۸-۱۱۹

— رسول اللہ بھی خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیے جانے کے خواہش مند تھے ۱۲۱

— تحویل کعبہ کے حکم پر یہودیوں اور عیسائیوں کے اعتراضات ۱۲۲

— تحویل کعبہ، اللہ کی طرف سے امر حق ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے ۱۲۳

— تحویل کعبہ کا حکم دراصل امت محمد کی سرفرازی اور امامت وپیشوائی کی علامت ہے ۱۲۵

(۷۹) تزکیہ

— اس کا وسیع مفہوم ۱۱۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— اخفا سے نیکی کرنے کے نفس انسانی پر اثرات ۲۰۹
— شہادت کو چھپانے سے دل گناہ آلود ہوتا ہے ۲۲۲

(۸۰) تذکر

— اس کا مفہوم ۵۵۹

(۸۱) تسبیح

— اس کے معانی اور مفہوم ۶۳

(۸۲) تفرقہ واختلاف

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''فرقہ بندی'')
— کسی قسم کا بھی تفرقہ قرآن میں ممنوع ہے ۳۷-۲۷۶
— اجتہادی اختلافات اس کی تعریف میں نہیں آتے ۳۷
— تفرقہ واختلاف کی اصل وجہ ۱۶۲-۱۹۲-۲۳۹
— اس سے بچنے کا واحد طریقہ ۲۷۶
— تفرقہ واختلاف سے بچنے کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت ۲۷۸
— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم ہونا ۶۰۴

(۸۳) تفہیم القرآن

— اس کی خصوصیات ۵-۱۱
— اس کی تاریخ ۱۲
— کن لوگوں کے لیے تحریر کی گئی ۵-۶
— تفہیم القرآن سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے مطالعہ کا طریقہ ۱۱-۱۲
— تفہیم کا مقدمہ لکھنے کا مقصد ۱۳
— تفہیم کے لکھنے میں بنیادی مقصد کیا ہے ۶
— ترجمے کے بجائے ترجمانی کا طریقہ اختیار کرنے کے وجوہ ۶ تا ۱۱
— ترجمانی کے طریقے کی تشریح ۱۰-۱۱
— ترجمانی میں کیا اصول کارفرما رکھے گئے ہیں؟ ۱۰-۱۱
— تحریر اور تقریر کی زبان میں فرق ہے، قرآن کی تقریری زبان کو تحریری زبان میں لایا گیا ہے ۸-۹
— لفظی ترجمہ کے مضرات ۷ تا ۱۱
— قرآن کی ایک مخصوص اصطلاحی زبان ہے، پابندیِ لفظ کے ساتھ کیے گئے تراجم میں اس کا لحاظ کرنا ممکن نہیں ہے ۱۰
— قرآن حکیم کے مختلف زبانوں میں معیاری تراجم ۶
— تفہیم القرآن باقی تفسیروں سے مختلف کیوں ہے ۵
— تفہیم القرآن کے تفسیری حواشی لکھنے میں کیا اصول کارفرما ہے ۱۱
— تفہیم القرآن میں ہر سورت کے آغاز سے پہلے اس کا زمانۂ نزول، تحریک اسلام کی زمینی پوزیشن اور ضروریات کے ساتھ سورت کے مضامین کا ایک خلاصہ دیا گیا ہے ۱۱

(۸۴) تقدیر

— کیا انسان خودمختار ہے؟ ۱۸-۶۴-۶۵
— اذنِ الٰہی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ۹۹
— انسان کو اختلاف کی آزادی اللہ تعالیٰ نے دی ہے ۱۹۲
— ''آیت الکرسی'' میں نظام تقدیر کے متعلق نمایاں اشاروں کی اہمیت ۱۹۵
— تمام تغیرات کے پیچھے خدا کا دست قدرت ہے ۲۴۳
— گردش احوال کے اندر مشیت الٰہی کی مصلحتیں ۲۹۰
— بھلائی اور مصیبت سب کچھ مشیت الٰہی کے تحت ہے ۳۷۵
— اللہ تعالیٰ کا ''فتنے میں ڈالنا'' کا مطلب ۴۷۱
— دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردہ ڈالنا کا مفہوم ۵۳۰-۵۳۱
— اللہ تعالیٰ کا ہدایت دینے اور گمراہی میں اضافہ کرنے کا مطلب ۵۳-۵۹-۴۱۰-۵۳۸
— ہدایت وضلالت کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہونے کا مطلب ۱۶۳-۵۳۸-۵۶۱
— اگر اللہ تعالیٰ کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا ۵۲۸
— اگر اللہ تعالیٰ بھلائی دینا چاہے تو کوئی مانع نہیں ہو سکتا ۵۲۸

— قانونِ فطرت کے تحت ہونے والے تمام حوادث کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے ۵۳۱
— اللہ تعالیٰ کے قوانین کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ۵۳۵
— فیصلے کا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۵۴۵
— خشک وتر سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے ۵۴۶
— ہر بات کے لیے ایک وقت ظہور مقرر ہے ۵۴۶
— کشمکش حق و باطل کا اٹل قانون ۵۳۵
— جانوروں اور پرندوں کے لیے تقدیر کے نوشتے ۵۳۷
— کائنات کا نظام اللہ کے ٹھیرائے ہوئے اندازوں پر چل رہا ہے ۵۶۶
— ہر انسان کے لیے مستقر اور مستودع مقرر ہے ۵۶۶
— اللہ تعالیٰ کی طرف انسانی اعمال کی نسبت کی وجہ ۵۷۱
— اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً ہدایت پر پیدا کر دیا جائے ۵۷۰
— اللہ تعالیٰ کا دلوں اور نگاہوں کو پھیرنا ۵۷۱
— اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا میں فرق ۵۷۳-۵۷۴
— اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بالجبر گمراہی سے روکے اور کوئی بات زبردستی منوائے ۵۸۷-۵۸۸
— جنوں اور انسانوں کو خیر و شر میں انتخاب کی مکمل آزادی ۵۷۴
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبول حق کے لیے ''ضیق صدر'' اور ''شرح صدر'' کی کیفیت ۵۷۹
— مجرمین و مشرکین کا اپنے عزائم میں اللہ کی مشیت کی آڑ لینا اور اللہ کا جواب ۵۹۴-۵۹۵
— انسان جس راہ پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اسی کی توفیق دے دیتا ہے جو اس نے خود اپنے لیے پسند کی ہے ۳۹۷-۴۱۰
— باطل پرستی سے دلوں پر ٹھپا لگ جاتا ہے اور توفیق ہدایت سلب ہو جاتی ہے ۴۱۶
— اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دے یا ذلت دے ۲۴۳
— اللہ تعالیٰ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۲۲۳
— کامیابی اور ناکامی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ۳۷۵
— بھلائی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور مصیبت انسان کے اپنے ہی کسب وعمل کی بدولت آتی ہے ۳۷۵
— جو آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو فطری حقائق سے اندھا بنے گا وہ خود ہی اپنا نقصان کرے گا ۵۶۸
— اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے ۱۱۸
— اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار ہے کہ اپنی بادشاہی جس کو چاہے عطا کرے ۱۸۸
— اللہ تعالیٰ ہرگز ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے پر ظلم کرتا ہے ۲۸۱-۲۸۲
— اپنی گمراہیوں کے لیے تقدیر کو موردِ الزام ٹھیرانا نہایت قابل مذمت ہے ۵۹۴-۵۹۵
— تقدیر کے معاملے میں انسان کی پسند اور ناپسند کبھی حقیقت پسندانہ نہیں ہو سکتی ۱۶۴
— انسان پر اس کی اپنی حرکتوں اور کرتوتوں کی وجہ سے مصیبت اور آلام آتے ہیں ۳۶۷
— اللہ تعالیٰ کس قسم کے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھتا ہے؟ ۵۲-۵۳-۵۶-۲۰۰-۳۰۵
— فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۲۳۷-۲۸۶-۳۹۲
— اللہ تعالیٰ کا نظام رزق رسانی ۴۲۸
— خوفِ موت کا ازالہ ۲۹۱-۳۷۴
— موت کا وقت اور جگہ مقرر اور اٹل ہے ۲۹۶-۲۹۷
— خدا تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اس کی تقدیر سے نہیں بچا جا سکتا ۲۹۷
— اللہ تعالیٰ جس کی مدد پر ہو اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا ۲۹۸
— اہل کفر کو ڈھیل دینے کی غایت و حکمت ۳۰۵
— اللہ تعالیٰ چاہے تو زمین سے ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو لے آئے ۴۰۴
— انبیائے کرام کی آمد پر نزول مصائب اور اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

حکمت ۵۴۰
— شیاطین جن وانس کو انبیائے کرام کا دشمن بنا دیا گیا ۵۷۲
— اکابر مجرمین کا اپنے جال میں خود ہی پھنس جانا ۵۷۹
— ایمان نہ لانے والوں پر ان کی ناپاکی کا مسلط ہو جانا ۵۸۰
— اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے والے ظالم ہدایت سے بے نصیب رہتے ہیں ۵۹۱
— قسمت کا حال پانسوں کے ذریعے سے معلوم کرنے کی کوشش حرام ہے، اس حکم میں لاٹری وغیرہ بھی آ جاتے ہیں ۴۴۱-۴۴۲
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے ۴۵۴
— جس کسی کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد اللہ تعالیٰ کرے تو اس کی ہدایت کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا ۴۷۰-۴۷۱
— یہودیوں کی سازشوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو محفوظ کیا جانا ۴۵۰
— اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے اندر سزا کے طور پر بغض و عداوت ڈال دی ہے ۴۵۵
— یہودیوں کے جرائم کی وجہ سے ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا فیصلہ ۴۷۹-۴۸۰
— یہودیوں کے طغیان وکفر کے وبال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ان میں بغض وعداوت ڈالنا ۴۸۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخالفین سے بچانے والا اللہ تعالیٰ خود تھا ۵۱۳
— آدمی کے لیے اس کا عمل خوش نما بنا دیا جاتا ہے ۵۷۱-۵۷۸-۵۸۶
— ہر آدمی پر نگرانی کرنے والے فرشتے مقرر ہیں ۵۴۷

(۸۵) تقلید

— نظریۂ تقلید کا قرآنی جواب ۱۱۸
— دنیا میں پیشواؤں اور راہ نماؤں کی پیروی کرنے والے پشیمان ہوں گے جب ان سے وہ مکمل لاتعلقی کا اظہار کریں گے ۱۳۲
— تقلید گمراہی وضلالت کی سیڑھی ہے ۱۳۳
— باپ دادا کی اندھی تقلید نہایت اہم سبب ضلالت ہے ۵۰۹
— مذہبی پیشواؤں، سرداروں اور باپ دادا کی اندھی تقلید اور ان کی بنائی ہوئی جاہلی رسوم اور حلال و حرام کی بے مقصد قیود کی تردید اور مذمت ۵۸۸-۵۸۹

(۸۶) تقدیس

— اس کے معنی ۶۳

(۸۷) تقویٰ

— اس کا مفہوم ۵۷
— تقویٰ کا لزوم ۱۰۰
— بر ۴۴۰
— تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ ۸۳-۱۴۷
— تقویٰ کے اخروی نتائج ۲۳۸-۳۱۳
— اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کے لیے تقویٰ کی اہمیت ۲۶۶
— اللہ تعالیٰ متقیوں کی عبادات قبول کرتا ہے ۴۶۱
— تقویٰ سفرِ حج کے لیے بہترین زادِ راہ ہے ۱۵۵
— روزے انسان میں تقویٰ پیدا کرتے ہیں ۱۴۱
— آخرت کی بھلائی کا مدار تقویٰ پر ہے نہ کہ فراوانیِ رزق پر ۱۶۲
— اہل تقویٰ کی خاص صفت صبر ہے ۲۳۸
— فلاح کے لیے تقویٰ لازم ہے ۲۸۸
— چوٹیں کھا کر بھی خدا اور رسول کی پکار پر لبیک کہنا ۳۰۳
— اہل ایمان کو صبر سے کام لینے، باطل کے مقابلے میں پامردی دکھانے اور حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے، یہی فلاح کا راستہ ہے ۳۱۴
— قوانین اسلامی کی کامیابی کے لیے تقویٰ کی اہمیت ۳۱۹
— اللہ تعالیٰ کے قوانین کو توڑنے سے بچنا ۴۴۶
— عدل وانصاف تقویٰ کے قریب ترین ہے ۴۴۹

— اہل کتاب کو بھی اسی طرح تقویٰ کی ہدایت کی گئی تھی ۴۰۴
— ازدواجی زندگی میں تقویٰ کی اہمیت ۴۰۳-۴۰۴
— نیکی کے کام میں تعاون کرو اور گمراہی میں تعاون نہ کرو ۴۴۰
— دنیا ایک کھیل تماشے کے علاوہ کچھ نہیں، متقین نے عقل سے کام لیا ہے اور وہ آخرت ہی کو بہترین مقام جانتے ہیں ۵۳۳-۵۳۴

(۸۸) تقیہ (ایمان کو چھپانا)

— کس حالت میں اور کس حد تک کیا جا سکتا ہے ۲۴۴

(۸۹) تلمود

— اس میں حضرت یعقوبؑ کی وصیت کا مضمون قرآن حکیم سے بالکل متشابہ ہے ۱۱۴
— حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مباحثے کا بیان ۱۹۸ تا ۲۰۰
— جستجوئے حقیقت میں حضرت ابراہیم کا سفر ۵۶۰

(۹۰) توبہ

— توبہ کے معنی اور حقیقت ۶۷-۳۳۳
— نظام اخلاق میں توبہ کی اہمیت ۶۸
— توبہ کے ساتھ اصلاح کی اہمیت ۱۲۸- ۲۷۱- ۳۳۱-۴۱۱-۴۶۸-۵۴۴
— سچی توبہ کے آداب ۲۸۹-۵۴۴
— توبہ کے حدود کیا ہیں، کن کی توبہ قبول ہوتی ہے اور کن کی نہیں؟ ۲۷۱-۳۳۲-۳۳۳
— توبہ کی قابل قبول صورت ۳۳۲-۳۹۵-۵۴۴
— توبہ کے لیے کفارے کی اہمیت ۳۸۳
— بغاوت کے مجرمین کے لیے توبہ کی گنجائش ۴۶۵-۴۶۶
— عدالتی سزا کے باوجود اخروی سزا سے بچنے کے لیے توبہ کی اہمیت ۴۶۸
— اسلام سے قبل کیے گئے گناہوں کی معافی ۵۴۴
— حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ ہی سے کلمات توبہ سیکھ کر توبہ کی جو مقبول ہوئی ۶۷
— قرآن اس نظریے کی پر زور تردید کرتا ہے کہ گناہ اور معصیت کے لازمی نتائج ہیں اور توبہ اور معافی کی کوئی صورت نہیں ۶۸
— مجرم اگر اپنے سابقہ جرم پر صدق دل سے توبہ کر لے اور آیندہ کے لیے اصلاح کر لے تو قابل معافی ہے ۳۳۱
— اپنے کیے پر نادم ہونا اور غلطی سے رجوع کرنا ۳۶۸
— جرم کی سزا میں جرمانہ اور توبہ یا کفارہ میں فرق روا رکھا گیا ہے اسلام عبادت، کار خیر، ادائے حقوق اور شرمساری و ندامت سے جرم کو دھوتا ہے جب کہ جرمانہ کی دفعہ ناگواری اور تلخی کو جنم دیتی ہے ۳۸۳-۳۸۴
— کس قسم کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں؟ ۶۸-۵۴۴
— اگر کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جائے تو یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ رحیم اور درگزر کرنے والا ہے ۳۹۵
— توبہ اس وقت تک مقبول ہے جب تک سزا ہاتھ پکڑ نہ لے ۴۶۵-۴۶۶
— اگر گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً اللہ کو یاد کرو اور گناہوں کی معافی چاہو ۲۸۹

(۹۱) توحید ۶۱-۹۱

— صرف اللہ کے لیے حمد ۴۳
— صرف اللہ ہی کے لیے عبادت ۴۴
— صرف اللہ ہی سے استمداد ۴۵
— توحید کے دلائل ۵۷- ۶۰- ۱۳۰- ۱۳۱- ۵۳۷- ۵۳۹-۵۴۱-۵۴۷-۵۶۶
— آیت الکرسی کا معرفت الٰہی کی کلید ہونا ۱۹۳-۱۹۵
— تنہا ایک ہی معبود (الٰہ) ۲۳۱-۵۶۸-۵۶۹
— ہادی وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو ۲۳۳
— اپنی توحید پر اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے ۲۳۹
— توحید پر فرشتوں اور اہل علم کی شہادت ۲۳۹
— توحید پر آثار کائنات کی شہادت ۱۳۰-۱۳۱-۲۱۰-

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۱۱
— پوری کائنات کو سنبھالنے والا اور اس کا انتظام کرنے والا تنہا اللہ تعالیٰ ہے ۱۹۳-۲۳۱
— پورے تکوینی اختیارات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہونا ۲۴۳
— پوری سیاسی حاکمیت اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے ۲۹۶
— لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۴۲۸
— اللہ تعالیٰ ایک ہی خدا ہے ۴۲۹-۴۳۱-۴۹۰
— اللہ تعالیٰ حکم دینے میں حاکم مطلق ہے ۴۳۸
— حلت و حرمت کے جملہ اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں ۴۳۸-۴۹۸
— ہر طرف سے منہ موڑ کر خدا کی طرف یکسو ہو جانا ۵۵۸
— پوری سلطنت زمین و آسمان کا مالک تنہا اللہ ہے ۴۶۹-۵۲۶
— تورات و انجیل میں توحید ہی کی تعلیم تھی ۴۸۸
— مشرکین عرب بھی وحدت الٰہ کے قائل تھے ۵۲۳
— معاملات کا اللہ کے قانون کے تحت چکانا اس کا تقاضا ہے ۵۷۴-۴۷۵
— اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا ۴۱۲
— ایک ہی خدا آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی ۵۲۴
— محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان توحید ۵۲۷-۶۰۵
— قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اہل کتاب توحید کی صداقت خوب جانتے ہیں ۵۲۹
— توحید کا لازمی تقاضا شرک سے بے زاری ہے ۵۲۹
— فیصلے کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے ۵۴۵-۵۴۷
— سارا نظام کائنات توحید کی اساس پر قائم ہے ۵۵۱
— ساری زمام کار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۵۶۵
— اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم ہے ۵۷۵
— اس کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے ۵۷۵
— اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں پوری زندگی دے ڈالنا عین تقاضائے توحید ہے ۵۷۸
— دعوت ابراہیمی اور اس کی زد ۵۵۶
— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مسلک توحید تھا ۶۰۵
— نمرود کے سامنے حضرت ابراہیم کے دلائل توحید ۱۹۸-۱۹۹
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں، انسانوں کے اقرار و انکار سے اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۳۷۸
— اللہ چاہے تو غلط کار اقوام کو دوسری قوم سے بدل ڈالے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا واحد مالک اور کارساز ہے ۴۰۴
— کائنات میں ہر طرف توحید کی نشانیاں بکھری پڑی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی توفیق دیتا ہے ۵۳۷-۵۳۸
— زمین کے جانوروں اور پرندوں پر غور کرو! کس طرح رب واحد نے ان کی رزق رسانی کا بندوبست کر رکھا ہے ۵۳۶-۵۳۷
— مظاہر کائنات ثابت کرتے ہیں کہ جب خالق و منتظم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو پھر شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہے ۵۲۷-۵۳۷ تا ۵۳۹-۵۴۷-۵۴۸-۵۵۶-۵۶۵-۵۶۷
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا کیونکر ہو سکتا ہے جو تمام کائنات کا خالق اور رب ہے اور اس کی اطاعت پر تمام نظام چل رہا ہے ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ سے براہ راست دعا و استغاثہ کرنا ۱۴۴
— نظریہ توحید پر وفد نجران کو دعوتِ مباہلہ ۲۶۱
— اہل کتاب کو دعوتِ توحید ۲۶۲
— نہ حضرت عیسیٰ کو اور نہ مقرب ترین فرشتوں ہی کو کوئی عار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— حضرت عیسیٰ کی دعوتِ توحید ۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— توحید کے داعین بے خوفی اور اطمینان کے حق دار ہیں جب کہ مشرکین بے اطمینانی اور خوف کے سزاوار ہیں ۵۵۹

— انبیائے کرام ربانی بننے کی دعوت دیتے ہیں وہ اپنی اورفرشتوں کی بندگی کا پرچار نہیں کرتے ۲۶۸
— توحید کا انکار حبط اعمال پر منتج ہوتا ہے ۲۸۲
— اللہ تعالیٰ پاک اور ناپاک کو چھانٹ کر الگ کر دیتا ہے ۳۰۵
— ہر طرف سے منہ موڑ کر خدا کی طرف یکسو ہو جانا ۵۵۸
— صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کرنا کافی ہے ۳۷۶

(۹۲) تورات

— حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی تھی ۴۷۴-۴۷۵
— قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— تورات میں کس کس طرح کی تحریفات ہوئیں ۲۳۱-۲۳۲
— قرآن کس تورات کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۲
— اس میں یہودی علما کے تصرفات و تحریفات ۲۷۳
— اس کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ۳۱۰-۵۶۳
— تورات میں زنا کی سزا رجم تھی ۴۷۲
— تورات ہدایت کا سرچشمہ تھی ۴۷۳-۶۰۲
— اس کی حفاظت کی ذمہ داری ۴۷۳
— انبیائے کرام اس کے قانون کے تحت فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
— قانون قصاص تورات میں موجود تھا ۴۷۴
— یہودی تورات کو واضح مطالب کے بجائے انھیں اصل معانی سے پھیرتے تاکہ ان سے من مانے احکام نکال سکیں ۴۷۰
— تورات ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئی اور علما و فقہا اور انبیائے کرام اس کے احکام کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتے تھے ۴۷۳
— تورات میں بھی انجیل کی طرح یہی حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو ۴۷۵
— یہودی تورات کو پارہ پارہ کر کے رکھتے تھے اور بہت کچھ چھپا جاتے تھے حالانکہ تورات تمام انسانوں کے لیے ہدایت اور روشنی تھی ۵۶۲-۵۶۳
— تورات کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ وہ علم دیتا ہے جس کا پہلے کوئی ذریعہ نہ تھا ۵۶۳
— یہ نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنے والوں پر تکمیل نعمت ہے، سراسر ہدایت و رحمت اور ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے ۶۰۲

(۹۳) توکل

— بھروسا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے ۳۷۶
— اہل ایمان اللہ ہی پر بھروسا کرتے ہیں ۴۶۰
— اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا حکم اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل اور بھروسا کرنا چاہیے ۴۵۰

(۹۴) تیمّم

— اس کا حکم کب آیا؟ ۳۱۶
— اس کا طریقہ اور احکام ۳۵۵-۳۵۶-۴۴۸-۴۴۹
— اس کی حکمت ۳۵۶

ث

(۹۵) ثواب

— کون سے کام ثواب کے مستحق ہیں؟ ۱۰۰
— ثوابِ دنیا اور ثوابِ آخرت ۲۹۲-۲۹۳-۴۰۵
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قانونِ مکافات'' اور ''جزا و سزا'')

ج

(۹۶) جادو

— جادو، ٹونے اور عملیات کی حقیقت اور ان کی مذمت و تردید ۹۶ تا ۹۸

(۹۷) جاہلیت

— اس کا اصطلاحی مفہوم ۴۷۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— عرب جاہلیت ۱۳۸
— موجودہ جاہلیت ۱۳۹
— جاہلی عرب کی رسوم ۱۵۷-۱۵۸
— زمانہ جاہلیت میں حج کے لیے زادِ راہ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا ۱۵۵

(۹۸) جبت

— اس کے اصطلاحی معانی ۳۵۹

(۹۹) حضرت جبریل علیہ السلام

— قرآن مجید لانے والے ۹۶
— ان سے یہودیوں کی عداوت ۹۶
— جو فرشتوں، رسولوں، جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے اللہ ان کافروں کا دشمن ہے ۹۷

(۱۰۰) جزا و سزا

— اللہ تعالیٰ ہی روز جزا و سزا کا مالک ہے ۴۴
— ہر انسان اپنے ہی اعمال کا بدلہ پائے گا ۱۱۷-۳۹۵-۵۴۳
— تمام دنیوی معاملات بالآخر اللہ کے حضور پیش ہوں گے ۱۶۱
— کسی فرد سے دوسرے کے اعمال کے بارے میں استفسار نہ ہوگا ۱۱۷
— قانون جزا و سزا ۲۲۳-۲۲۴
— آخرت میں ہر شخص اپنے اچھے اور برے اعمال کو حاضر پائے گا ۱۰۳-۲۴۵
— جزا و سزا دنیا میں بھی نافذ العمل ہے (قانون مکافات) ۵۲۹-۴۶۵
— کوئی بھی گروہ اللہ کا مقرب نہیں ہے، ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ ملے گا، کسی قسم کی رعایت نہ ہوگی ۲۶۶-۲۶۷
— شکر گزار بندوں کو اللہ تعالیٰ جزا دے گا ۲۹۱
— روز جزا و سزا میں کوئی شک نہیں ہے ۳۱۱-۳۱۳
— اللہ تعالیٰ کا معیار جزا و سزا عورت و مرد، آقا و غلام اور کالے گورے سب کے لیے ایک ہی ہے ۳۱۲-۳۱۳
— اللہ تعالیٰ نیکی کو بڑھوتی اور پھر اپنی طرف سے مزید اجر عطا کرتا ہے ۳۵۳
— اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا، دیگر گناہ جس کے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۳۵۸-۳۵۹
— اپنے کیے پر نادم اور غلطی سے رجوع کرنا ۳۶۸
— انسان اچھے اور برے عمل کے لیے آزاد ہے لیکن جیسا عمل کرے گا ویسی ہی جزا و سزا پائے گا ۳۷۸
— روز جزا و سزا میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا ۱۰۸
— انجام کار کسی کی خواہشات اور آرزوؤں پر منحصر نہیں ہے ۳۹۹
— جزا و سزا کے معاملے میں ذرہ برابر ظلم نہیں ہو گا ۳۵۳-۳۷۴
— جو بھلائی کرے یا برائی، وہ اس کا پھل پائے گا ۳۹۹-۴۰۰
— ضمنی برائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے ۴۵۱
— جیسا عمل کرے گا ویسا اجر پائے گا ۳۷۸
— توبہ و استغفار تب تک قبول ہے جب تک کہ سزا کا وقت نہ آ جائے ۱۳۱-۱۳۲-۴۶۵-۴۶۶
— قانون مکافات کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں بھی بڑی سزا ہے ۲۵۹-۴۶۵
— معاشرے کے غلط کار لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری پرہیزگاروں پر نہیں ہے البتہ نصیحت ان کا فرض ہے ۵۴۹
— تمام لوگوں کا درجہ ان کے اعمال کے لحاظ سے ہے ۵۸۲
— نیکی کا اجر دس گنا اور بدی کا برابر ہے ۶۰۴-۶۰۵
— نافرمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ فراوانی کے ساتھ رزق دیتا ہے لیکن آخرکار وہ بدترین ٹھکانے اور عذاب جہنم کے حق دار ہیں ۱۱۱
— اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں ہے ۱۰۳-۱۱۸-۳۵۳

— اللہ تعالیٰ نہایت شفیق و رحیم ہے وہ انسانوں کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا ۱۲۰-۱۲۱

— کوئی فرد یا گروہ اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں ہے، ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا، کوئی رعایت نہیں ہوگی ۲۶۶-۲۶۷

— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر چلنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ کر دیتا ہے اور دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے اور اپنی راہ پر چلنے والوں کو ثواب عطا کرتا ہے ۳۰۳-۳۰۴

— اللہ تعالیٰ انسانوں کے ہر نیک عمل کی قدر کرنے والی ہستی ہے ۱۲۷-۱۲۸

— انسان جب اپنے غلط اور گمراہ کن رویے کی اصلاح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ رحم کرنے والی ہستی ہے ۱۲۸

— جو قوم اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد اس کو کھو دیتی ہے وہ قوم اللہ تعالیٰ سے سخت سزا پاتی ہے ۱۶۱

— جو مال اللہ کی راہ میں خرچ ہوگا اس کا پورا پورا حساب اور اجر ملے گا ۲۰۹

— اللہ تعالیٰ کے احکام ہدایت کی اطاعت سے انکار کرنا اپنے لیے دائرہ تنگ کرنے کے مترادف ہے ۲۴۰

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا ہے ۲۴۵

— اللہ انسان پر ظلم نہیں کرتا، وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے ۲۸۱-۳۰۷-۳۵۳

— جزا و سزا میں کامیابی ایسے ہی نہیں مل جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ صابرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کو الگ چھانٹ لیتا ہے ۲۹۰

— اللہ تعالیٰ اچھے اور برے ہر طرح کے اعمال پر نظر رکھنے والا ہے ۳۷۸

— انسان کو آخر کار اس حق تعالیٰ کے پاس جانا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۳۷۹

— جہاد میں حصہ لینے کا درجہ اور معاوضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا انعام ہے ۳۸۵-۳۸۶

— اگر کوئی انسان معصیت اور گناہ میں مبتلا ہو جائے اور توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی ذات رحیم ہے ۳۹۵

— انسانوں سے اپنی حرکات چھپائی جا سکتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں ۳۹۴-۳۹۵-۴۰۱-۴۰۲

— انسان اگر اپنا طرز عمل درست رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تو اللہ تعالیٰ چشم پوشی کرنے اور رحم کرنے والا ہے ۴۰۳-۴۰۴

— اللہ تعالیٰ محاسبہ کرنے میں چشم پوشی اور اعمال کی قدر کرنے میں نہایت فیاض ہے ۴۱۲-۴۱۳

— اہل ایمان کے حساب کتاب میں اللہ تعالیٰ نرمی اور درگزر سے کام لے گا ۴۱۴

— ایک وقت سب کو گھیر کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کیا جائے گا ۴۳۰

— اللہ تعالیٰ کی سزا اور پکڑ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی ۴۴۰-۴۴۶

— باپ دادا کے اعمال کسی بھی انسان کو (آخرت میں) فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا سکتے ۱۱۸

— جو جہنم کے حق دار ہیں وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے، نہ کوئی دوسری مہلت دی جائے گی اور نہ ان کی سزا کم ہوگی ۱۲۹-۱۳۰

— آخرت کی زندگی میں دنیا میں واپس بھجوا کر ایک اور موقع دینے کی درخواست رد کر دی جائے گی ۱۳۲

— دنیا میں پیشواؤں اور راہ نماؤں کی اندھی پیروی کرنے والے شرمندہ ہوں گے، کیونکہ وہ ان سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے ۱۳۲

— آخرت میں دنیوی اسباب و وسائل جزا و سزا میں کوئی مدد نہ کر سکیں گے ۱۳۲

— گناہ گار کی معافی کی کیا صورت ہوگی؟ ۱۲۸-۱۳۵

— کسی فعل کو قانوناً جرم اور حرام قرار دینا ۲۱۳

— کفر کی حالت میں جان دینے والا اپنے آپ کو سزا سے نہیں بچا سکتا ۲۷۲

— کج روی اختیار کرنے اور غلط طرز عمل سے باز نہ آنے والے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ۲۷۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— حق تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل کفار کے لیے خوب بارِ گناہ سمیٹنے کا اختیار ہے، خوب ذلیل کرنے والا عذاب ان کا مقدر ہے ۳۰۴-۳۰۵

— اللہ تعالیٰ کے قوانین پر غیر عامل اور ایمان کے منکروں کا تمام کارنامہ زندگی ضائع ہو گیا اور آخرت میں دیوالیہ ہو گئے ۴۴۷

— ایمان اور اس کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کی خطاؤں سے اللہ تعالیٰ درگزر کرتا ہے ۴۵۰

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی نہایت سخت ہے، لیکن ساتھ میں نہایت رحم کرنے والا اور درگزر کرنے والا بھی ہے ۵۰۶

— رسول کا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینا ہے، آگے اللہ تعالیٰ انسان کے چھپے اور ظاہر تمام حالات کو جانتا ہے ۵۰۶-۵۲۴

— جزا و سزا کے دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم کیا اور یہی اصل کامیابی ہے ۵۲۸

— ایمان لا کر توبہ کرنے والوں اور آئندہ نیک چلن اختیار کرنے والوں کے تمام پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے ۵۴۴

— سب انسان ربِ حقیقی کے حضور پیش ہوں گے جس کے پاس تمام اختیارات ہیں ۵۴۷

— ہجرت کرنے والے اور ہجرت پر مجبور کیے جانے والے، اللہ کی راہ کے غازی و شہید ان سب کے لیے اللہ کے پاس گناہوں کی معافی اور بہترین جزا ہے ۳۱۲-۳۱۳

— دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کی چلت پھرت کسی کو دھوکے میں نہ ڈالے، چند روزہ لطف دنیا کے بعد ان کے لیے بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳

— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷

— جس شخص نے اپنا گناہ کسی بے گناہ کے سر ڈال دیا اس نے بہت بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا ۳۹۵-۳۹۶

— ضلالت و گمراہی کے پیروکار جزا و سزا کے دن کوئی سفارشی اور حامی و مددگار نہ پائیں گے ۴۶۷-۵۵۰

— فرقہ بندی کرنے والوں کا اسلام اور طریقہ ابراہیم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہی انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں ۶۰۵-۶۰۶

— عیسائیوں اور یہودیوں پر ایک ایسا وقت ضرور آئے گا جب انھیں ان کی دنیوی کارکردگی سے مکمل آگاہی دی جائے گی ۴۵۵

— اہل کتاب کے نزدیک ان کے لیے روز آخرت صرف نیک انجام ہے ۳۱۳-۳۱۴

— دین میں فرقہ پیدا کرنے والوں سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۶۰۵-۶۰۶

— یہودی یا عیسائی ہونا باعث نجات نہیں بلکہ صرف حضرت ابراہیم کا طریقہ ہی باعث نجات ہے ۱۱۴

— یہ خیال باطل ہے کہ صرف یہودی اور عیسائیوں کا مقدر جنت ہے اور وہ چند روزہ دوزخی زندگی کے بعد جنت میں جائیں گے، صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا ہی اس کا حق دار ہے ۱۰۳-۲۴۲

(۱۰۱) جلاوطنی

— حضرت الیاس علیہ السلام کی مظلومانہ جلاوطنی ۸۱

(۱۰۲) جن

— ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھیرایا گیا ۵۶۷

— انسانوں کی طرح جنوں کو بھی خیر و شر میں انتخاب کی آزادی دی گئی ۵۷۴

— آخرت میں شیاطین جن سے خطاب ۵۸۰

(۱۰۳) جنت

— جنت سلامتی کا گھر ہے ۵۸۰

— جنت کے باسی کون ہوں گے؟ ۵۸-۵۹-۶۶-۹۰-۱۶۳-۲۳۸-۲۸۸-۲۸۹-۳۱۳-۳۶۲-۳۹۹-۴۰۰-۴۵۲-۴۹۸

— جنت کی نعمتوں کی تفصیل ۵۸-۵۹

— جنت میں رشتۂ ازدواج ۵۹

— آدمؑ اور ان کی بیوی کو اولین جنت میں رکھا گیا ۶۵
— جنت کی راہ کڑی آزمائشوں سے ہو کر گزرتی ہے ۲۹۰
— جنت کا حصول اطاعت خدا ورسول پر منحصر ہے ۳۳۰
— اس خیال کی تردید کہ عیسائی اور یہودی جنت میں ہی جائیں گے، ایسا حق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیک عمل کرنے والوں کو حاصل ہے ۱۰۳
— رضائے الٰہی اہل جنت کا سب سے بڑا انعام ہوگا ۲۳۸
— جنت کی طرف سبقت کرو ۲۸۸
— جنت کی ہمیشگی ۵۹
— جنت کے باسیوں میں سے چار اوپر کے مدارج کا ذکر ۳۷۰
— مشرکین کے لیے جنت حرام ہے ۴۸۹

(۱۰۴) جوا (قمار)

— اس کے متعلق قرآن مجید کا اولین حکم ۱۶۷
— اس کی قطعی حرمت ۵۰۱
— اس کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳
— جوا کے ذریعے سے تقسیم اور فال گیری کی ممانعت ۴۴۲
— قمار آمیز کھیلوں اور معاملات کی حرمت ۴۴۲

(۱۰۵) جہاد فی سبیل اللہ، جنگ

— جہاد کا حکم ۱۴۹-۱۵۰-۱۶۴-۲۸۳-۲۸۴
— اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے مردہ نہیں، حقیقت میں زندہ ہیں ۱۲۶
— جہاد کا جواز کیا ہے؟ ۱۴۹ تا ۱۵۱
— مجاہدین کی دعا ۱۹۰-۱۹۱
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والوں کا نیک انجام ۲۹۸-۳۰۲
— جہاد کی تیاری میں اولین حکم صبر، نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے سے اصلاح کا ہے ۳۷۳-۳۷۴
— اسلام میں جہاد کا مقصد بے بس مردوں، عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو ظلم سے نجات دلانا ہے ۳۷۲
— میدانِ جنگ میں صف بستہ، کھڑے، بیٹھے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو ۳۹۲-۳۹۳
— مسلمان اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اس راہ میں کسی کی ملامت اور طعنہ زنی کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲
— مجاہدین کی صفات عالیہ ۳۷۲
— ظلم و زیادتی کے ساتھ جتھا بندی کرنا اور پھر فدیہ کے لیے لین دین کرنا صریحاً حرام ہے ۹۱
— جنگ کا جواز کتنا ہی مضبوط ہو، اللہ سے ڈرتے ہوئے افراط و تفریط اور ظلم و زیادتی سے مکمل پرہیز کیا جائے ۱۵۲
— مجاہدین کے رفیق، اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں، یہی کامیابی اور غلبہ کی ضمانت ہے ۴۸۲
— کن گمراہیوں کے خلاف جہاد واجب ہے اور کن گمراہیوں کی اصلاح تبلیغ اور نصیحت سے کی جائے گی ۱۵۱
— جب نظام باطل کی جگہ نظام حق قائم ہو جائے تو عفو و درگزر کی عمومی پالیسی کے باوجود باطل کے مجرمین سزا پانے کے حق دار ہیں ۱۵۱-۱۵۲
— جہاد کا مطلب قتل و غارت نہیں ہے ۱۵۲
— بارہا ایسے ہوا کہ ایک چھوٹا گروہ صبر کی طاقت کی بنا پر ہر بڑے گروہ پر غالب آ گیا ۱۹۰
— جہاد سب سے بڑی طاقت ایمان اور اس عقیدے سے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے، سے حاصل کرتا ہے ۱۹۰
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدد کے لیے موجود ہے ۲۸۶
— فرشتوں کے ذریعے سے میدانِ جنگ میں اہل ایمان کی مدد کی گئی ہے ۲۸۶
— اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے سے صابرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کو الگ چھانٹ لیتا ہے ۲۹۰
— آزمائش، جہاد اور دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۹۳
— دعوتِ حق کے مخالفین کو اللہ تعالیٰ فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس فتنے کا قلع قمع ہی جہاد کا اولین جواز ہے ۱۵۰
— اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں پر آزمائشیں ہر دور میں آئیں لیکن وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، ایسے صابروں کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ۲۹۲-۲۹۳
— اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا اٹل وعدہ ہے ۲۹۴
— اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ رکھتا ہے اور دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے ۳۰۳-۳۰۴
— اہل ایمان کو فہمائش کہ باطل کے مقابلے میں پامردی دکھائیں، صبر سے کام لیں، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہیں اور اللہ سے ڈرتے رہیں ۳۱۴
— منافقین بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن میدان عمل میں صفر ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳-۳۷۴
— جہاد کے لیے ہر دم تیار رہو، اور پھر موقع کی مناسبت سے الگ الگ یا مجتمع ہو کر نکلو ۳۷۱-۳۷۲
— مجاہد وہ ہیں جو آخرت کے بدلے دنیا فروخت کر دیتے ہیں، وہ شہید ہوں یا غازی قرار پائیں دونوں صورتوں میں ان کے لیے اجر عظیم ہے ۳۷۲
— ایمان لانے والے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ۳۷۳
— مجاہدین کے خلاف شیطان کی چالیں بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً نہایت کمزور ہیں ۳۷۳
— اس رویے کی مذمت کہ جنگ میں کامیابی ملتی ہے تو اس کو اللہ کی طرف سے قرار دیتے ہیں اور خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے شکست ہوتی ہے تو اس کو رسولؐ اللہ کے سر تھوپ دیتے ہیں ۳۷۵-۳۷۶
— جنگ کے دوران میں افواہیں پھیلانے کی ممانعت، کوئی خبر بھی ملے تو ذمہ دارانِ معاشرہ کے گوش گزار کر کے خاموش ہونے کی تلقین ۳۷۶-۳۷۷
— مالِ غنیمت کی محبت کو حدود کے اندر رکھنے کا حکم ۳۸۴-۳۸۵
— جنگ میں قتل دشمن کے حدود، اگر کوئی خود کو مسلم ظاہر کرے تو اس کے قتل کی بہر حال ممانعت ہے ۳۸۴-۳۸۵
— اہل ایمان کو خوش خبری کہ تمھارے مقابل کفار ہر حال میں رسوا ہوں گے اور یہ اللہ کا نور اپنی پھونکوں سے ہرگز بجھا نہیں پائیں گے ۳۹۲-۳۹۳
— اہل ایمان حق کے لیے اتنی تکلیف کیوں نہ اٹھائیں جتنی کفار باطل کے لیے اٹھا رہے ہیں ۳۹۳
— کفار کی ساری سعی بے کار ہے جب کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حق دار ہیں ۳۹۳
— اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر کافروں کے غلبے کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے ۴۰۹
— جنگ احد کے دوسرے مرحلے میں کامیابی کے باوجود قریش کا لشکر بے وجہ پسپا ہو کر واپس ہو گیا ۲۸۴-۲۹۴-۲۹۵
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’قتال فی سبیل اللہ‘‘)

(۱۰۶) جہنم

— دوزخی کون ہیں؟ ۸۹-۹۰
— جہنم کے قیام کی ہمیشگی ۶۹-۹۰-۴۲۶
— جہنم کی آگ سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہوگی ۱۳۲
— جہنم کی آگ جب کھال جلا دے گی تو نئی کھال دے دی جائے گی تاکہ عذاب جاری رہ سکے ۳۶۱
— جہنم کا عذاب تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہوگا ۴۱۴
— جہنم مشرکین کا ٹھکانہ ہے ۴۸۹

چ

(۱۰۷) چاند

— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے

ہے ۱۴۷-۱۴۸

(۱۰۸) حبط اعمال

— ارتداد کا لازمی نتیجہ ۱۶۶
— ریاکارانہ انفاق کا نتیجہ ۲۰۶
— انبیاؑ و مصلحین کے قتل کا نتیجہ ۲۴۱
— کفر کا لازمی نتیجہ ۲۸۱
— حبط اعمال کا سبب کیا ہے؟ ۲۸۲
— ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کا نتیجہ ۴۴۷
— منافقت کا نتیجہ ۴۸۱
— شرک کا نتیجہ ۵۶۱

(۱۰۹) حبل اللہ

— اس کا مفہوم ۲۷۶

(۱۱۰) حج

— حج اور عمرہ کے احکام ۱۵۳-۱۵۴-۱۵۷
— حج اور عمرہ کا فرق ۱۴۷
— نقشہ مقاماتِ حج ۱۵۶
— حج کے سفر میں تقویٰ بہترین زادِراہ ہے ۱۵۵-۱۵۶
— حج اسلامی اخلاقیات کی عملی تربیت ۱۵۵
— ذکرالٰہی کا حکم ۱۵۷
— حج لوگوں پر اللہ کا حق یعنی حقوق اللہ میں سے ہے ۲۷۵
— فرضیت حج کے لیے شرط استطاعت ۲۷۵
— حج اور عمرے کی نیت کو پورا کیا جائے ۱۵۳
— حاجی قربانی سے پہلے بال نہ ترشوائے ۱۵۳
— حج کو جاتے ہوئے ''گھر جانے'' اور ''امن نصیب ہوجانے'' کا مفہوم ۱۵۴
— قربانی میسر نہ ہونے کی صورت میں حاجی روزے رکھے ۱۵۴
— حالت احرام کی پابندیاں ۱۵۵-۴۳۷-۴۳۸
— مشعرِحرام (مزدلفہ) کے آداب ۱۵۶
— مناسک حج میں قریش کی ترمیمات ۱۵۷
— مکہ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ آنا جانا ۱۵۷
— ایام تشریق میں منیٰ سے مکہ کی طرف واپسی میں تقدیم وتاخیر کی رخصت ۱۵۸
— زائرین حج کو کعبہ سے نہ روکا جائے ۴۳۹

(۱۱۱) حدود اللہ

— ان کا لحاظ و احترام کرنے والوں اور ان پر عامل افراد کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے ۱۵۲
— ان کے بارے میں نہایت درجہ احتیاط کی ضرورت ہے ۱۴۷
— ان کی پابندی وہی کر سکتے ہیں جن کو ان کے توڑنے کے انجام بد کا شعور ہو ۱۷۵-۱۷۶
— ''حد سے تجاوز'' نہ کرنے کا مفہوم ۴۹۹

(۱۱۲) حدیبیہ

— وہ حالات جن میں سورۂ مائدہ کا نزول ہوا ۴۳۴
— صلح حدیبیہ کے دوررس مفید اثرات ۴۳۶

(۱۱۳) حدیث

— قرآن کی تشریح حدیث کے ذریعے سے ۱۳۴-۳۰۲

(۱۱۴) حروف مقطعات

— ان کی حقیقت کیا ہے؟ ۴۹

(۱۱۵) حزب اللہ

— کیسے لوگوں پر مشتمل ہے اور آخر کار یہی گروہ غالب آنے والا ہے ۴۸۲

(۱۱۶) حکمت

— شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کا طریقہ ۲۰۷
— اللہ کی ایک نعمت ۱۷۷-۲۰۷-۳۶۱
— تمام انبیا کو دی جاتی ہے ۲۶۸
— حضرت داود علیہ السلام کو عطا کی گئی ۱۹۱
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی ۲۵۲-۵۱۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ۳۹۶
— رسول اللہ اس کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے ہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۰۰-۱۲۵-۱۱۲

(۱۱۷) حکمت تبلیغ

— اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سوال پر آخر جھگڑا کیسا؟ ۱۱۷
— اہل کتاب کو قرآن کی دعوتِ اسلام ۲۴۰
— تبلیغ میں مباہلے کا مقام ۲۶۱
— عقیدۂ توحید پر بلانے کا طریقہ ۲۶۱
— اہل کتاب کو دعوتِ توحید ۲۶۲
— تبلیغ میں ''قول بلیغ'' کی اہمیت ۳۶۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بادشاہوں کو خطوط کے ذریعے سے دعوتِ اسلام دینا ۴۳۶
— اشرار سے علیحدگی ۵۴۹
— مناظروں سے اجتناب ۵۴۹
— طالبین حق پر توجہ ۵۴۹
— تبلیغ کوئی پیشہ ورانہ کام نہیں ہے ۵۶۲
— مبلغ کی دنیوی مفاد سے مکمل بے نیازی ۵۶۲
— داعی و مبلغ کا منصب اور اس کی ذمہ داریوں کی حدود ۵۷۰
— بحث و مباحثہ میں غیر ضروری جوشیلے پن سے بچنے کا حکم ۵۷۱

(۱۱۸) حق

— زمین و آسمان (کائنات) کو حق کے ساتھ پیدا کرنے کا مطلب ۵۵۱
— اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا اور کوئی بات منسوب نہ کرو ۴۲۷
— دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں؟ ۵۳۶
— انسان کی زندگی میں حق و باطل کی کشمکش ۲۶۶-۵۳۵
— تلاش حق کی جستجو میں کامیابی اور حق پالینا بلند ترین مرتبہ پالینے کے مترادف ہے ۵۶۰
— ضمیر اور عقل و استدلال استعمال کرنے والوں کو زندہ، اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے ۵۳۶-۵۳۷
— حق کو رد کر کے انسان اپنی ہی تباہی کا سامان کرتا ہے ۵۳۲
— حق سے فرار اور حق سے نفرت کی ناپاکی کفار پر مسلط کر دی جاتی ہے اور انھیں صاف اور سیدھی راہِ ہدایت نظر نہیں آتی ۵۷۹-۵۸۰

(۱۱۹) حقوق اللہ

— اسلام کا مطلوبہ معیارِ ایمان، اصل میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
— اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہے ۹۰
— ظلم کی راہ اختیار کر کے انسان حقوق النفس اور حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی خلاف ورزی کا بھی مرتکب ہوتا ہے ۶۶-۶۷
— حقوق اللہ کس حد تک ادا کیے جاتے ہیں ۹۰-۹۱
— حقوق اللہ میں مداخلت کرنے کے معنی ۱۳۱
— حج حقوق اللہ میں سے ہے ۲۷۵
— حقوق اللہ، انسان پر فطرتاً عائد ہوتے ہیں ۶۰۰
— حقوق اللہ کی ادائیگی سے گریز کفر ہے ۲۷۵

(۱۲۰) حقوق العباد

— حقوق العباد کے بارے میں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ غالب اقتدار اور حکمت و دانائی رکھنے والا حق تعالیٰ بھی موجود ہے ۱۷۴
— ایمان کا مطلوبہ معیار حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
— انسان ظلم کی راہ اختیار کرتا ہے تو حقوق العباد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے ۶۶
— حقوق العباد کا احترام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحب تقویٰ ہوں ۱۸۳
— والدین ۹۰-۱۶۴-۳۵۱-۵۹۸
— ذی القربیٰ (رشتہ دار) ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱
— حقوق النفس ۶۶-۶۷
— یتامیٰ ۹۰- ۱۳۷- ۱۶۴- ۱۶۷- ۱۹۸- ۳۱۹-

۳۲۰-۳۵۱-۴۰۱-۵۹۹-۶۰۰

— مساکین ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱

— مسافر ۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱

— اہل حاجت ۱۳۷

— ہمسایہ ۳۵۱

— لونڈی غلام ۳۵۱

— احترام ملکیت ۱۴۸

— مالی امداد حاصل کرنے کا حق ۱۶۴

(۱۲۱) حلال وحرام

— کیا کیا حرام ہے؟ ۱۳۴-۱۳۵-۴۴۰

— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنا عین تقاضائے ایمان ہے ۱۳۴

— حلال وحرام کی قیود کا جواز کیا ہے؟ ۱۳۵

— حلال وحرام کی حدود میں زیادتی کیا ہے؟ ۴۹۹

— حلال وطیب اور پاک چیزیں کھانے کا حکم ۱۳۳-۱۳۴

— حرام ماکولات کے بارے میں رخصت کی تین شرائط ۱۳۵

— حلت وحرمت کے مکمل اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں ۴۳۸-۴۹۸

— زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم ۴۴۰-۴۴۱

— کھانے پینے کی چیزوں میں وجوہِ حرمت طبی نہیں بلکہ اخلاقی واعتقادی ہیں ۴۱۱-۴۴۲

— قرآن کا نظریۂ حلت وحرمت ۴۴۴

— صرف اللہ تعالیٰ مختار ہے، حلال چیزوں کو حرام کرنے کی ممانعت ۴۹۸-۴۹۹

— پاک اور ناپاک یکساں نہیں ہیں ۵۰۶

— لوگوں کی خودساختہ حلت وحرمت ہیچ ہے ۵۷۶

— لوگوں کی خودساختہ مذہبی پابندیاں افتراء علی اللہ کی تعریف میں داخل ہیں ۵۸۷-۵۸۸

— اہل عرب کے ہاں حلت وحرمت کے مشرکانہ وتوہم پرستانہ تصورات ۵۸۸

— شرائع الٰہی میں بنیادی حرمت، مردار، خون، سور کے گوشت اور غیر اللہ کے ذبیحوں کی ہے ۵۹۲-۵۹۳

— حلت وحرمت کے بارے میں فقہائے اسلام کے اختلافات ۵۹۲-۵۹۳

— شریعت محمدی اور یہودی فقہ میں احکام حلت وحرمت کا فرق کیوں ہے؟ ۵۹۳

— یہودیوں پر لعنت و پھٹکار کے طور پر خدائی تحریم کی ایک صورت ۵۹۵

— یہودیوں پر ان کی مستقل نافرمانیوں کی وجہ سے سزا کے طور پر کئی حلال چیزیں حرام کردی گئیں ۴۲۲-۴۲۳-۵۹۳-۵۹۴

— بنی اسرائیل کے لیے بعض ماکولات کی خاص حرمت ۲۷۳

— اہل کتاب کی خواتین مسلمانوں کے لیے نکاح کے لیے حلال ہیں ۴۴۶-۴۴۷

— اہل کتاب کے ذبیحے کی حلت ۴۴۶

— کھانے پینے میں حلال وحرام کی پابندیاں اولین تقاضائے ایمان ہے کیونکہ انھی میں لوگوں نے قیاس وگمان کے ذریعے سے احکام خداوندی کی سب سے زیادہ خلاف ورزی کی گئی ۵۷۶

— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ سختی سے لاگو ہیں ۵۷۶-۴۴۴

— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والے بھٹک گئے ہیں اور ہرگز راہِ راست پر نہیں ہیں ۵۸۹

— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کی قیود واجازت کے بجائے خودساختہ قیود واجازت اختیار کرنا شیطان کی پیروی کرنا ہے ۵۹۰-۵۹۱

— سب سے بڑا ظالم شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف حلال وحرام سے متعلق جھوٹی باتیں منسوب کرے اور علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے ۵۹۱

— اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے حلال وطیب رزق کو حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور تقاضائے ایمان کے بھی خلاف ہے ۴۹۹

— چرند چوپایوں کی حلت ۴۳۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— حادثے سے مر جانے والے جانور مردار ہونے کی وجہ سے حرام ہیں ۴۴۰
— ذبح کی اہمیت ۴۴۰-۴۴۱
— اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کی حرمت ۴۴۰-۵۷۶-۵۷۷
— شکار کے قاعدے ۴۴۵
— "حلال" کے ساتھ "پاک" کی قید کا مقصد ۴۴۵
— سمندری شکار کی حلت ۵۰۵
— شراب کی قطعی حرمت کا حکم ۵۰۱-۵۰۲
— ذبح کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی اہمیت ۵۷۶-۵۷۷

(۱۲۲) حمد
— اس کے معنی ۴۳
— اللہ تعالیٰ ہی اس کا مستحق کیوں ہے ۴۳

(۱۲۳) حواری
— اس لفظ کے صحیح معنی ۲۵۶
— حواریوں کا دین اسلام ہی تھا ۲۵۶
— حضرت عیسیٰ پر حواریوں کا ایمان لانا ۵۱۳
— حواریانِ عیسیٰ کا آسمانی خوان کی خواہش کرنا ۵۱۴

(۱۲۴) حضرت حوا علیہا السلام
— آپ کی پیدائش کے بارے میں بائبل کا بیان ۳۱۹

(۱۲۵) حیات بعد الموت
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزے کے طور پر اس کا مظاہرہ ۲۰۰
— حضرت ابراہیم کی درخواست پر چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ۲۰۱
— خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے لیے بشارت ۲۹۸
— شہدائے فی سبیل اللہ کے لیے بہترین زندگی کی بشارت ۳۰۲
— خدا کی پیشی پر سب لوگوں کو گھیر کر لایا جائے گا ۵۲۷
— قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ضرور جمع کرے گا ۵۲۷
— حیات بعد الموت کی مثال رات کو سو کر صبح جاگنے کی سی ہے ۵۴۶
— تمام انسانوں کو از سر نو زندہ کیا جائے گا ۵۸۳

(۱۲۶) حیض
— اس حالت میں عورت سے تعلق کے کیا حدود ہیں ۱۶۹-۱۷۰
(مزید دیکھو "طہارت و پاکیزگی")

(۱۲۷) ختم نبوت
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے ہر نبی سے بعد میں آنے والے ہر نبی کے لیے عہد لیا گیا کہ ان کی دعوت اور تعلیم کو مانا جائے گا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد نہیں لیا گیا، جو ختم نبوت کا ثبوت ہے ۲۶۸-۲۶۹

(۱۲۸) خسران
— کس قسم کے لوگ خسران پاتے ہیں؟ ۶۰-۱۰۷-۵۳۳-۵۸۸
— ایمان لا کر کفر کا رویہ اختیار کرنے والے اصل میں خسارے میں ہیں ۱۰۷
— دعوتِ حق کے حاملین کو مخالفین کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیے، نہیں تو وہ انھیں نامراد اور خسارے میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے ۲۹۳-۲۹۴

(۱۲۹) خطوط نبویؐ
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط بنام ایران، مصر اور روم ۴۳۶

(۱۳۰) خلافت
— خلافت کے معنی ۶۲
— انسانی خلافت سے متعلق تین حقائق ۶۰۶
— قرآن اس نظریے کی واضح تردید کرتا ہے کہ گناہ کے لازمی نتائج ہیں ۶۸

(۱۳۱) خلع

— اصطلاحی مفہوم اور اس کا طریقہ ۱۷۵

— خلع کی صورت میں عدت کی مدت کیا ہے؟ ۱۷۶

(۱۳۲) خمر

(دیکھو "شراب")

(۱۳۳) خون بہا

— خون بہا کے قرآنی احکام کا بیان ۱۳۷ تا ۱۳۹ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "قتل انسانی" اور "قانون اسلامی")

(۱۳۴) خیانت

— امانت میں خیانت کرنے والا اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر کیا جائے گا ۲۹۹

— جو شخص خیانت کا مرتکب ہوتا ہے وہ دراصل اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے ۳۹۴

(۱۳۵) خیر امت

— خیر امت کے اوصاف اور ذمہ داریاں ۲۷۹

— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی گروہ اور امت کی اجارہ داری نہیں ہے ۱۰۱

— انسان بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳

— منصب امامت پر مامور کرنے کے بعد امت مسلمہ کے لیے ضروری ہدایات ۱۲۵

— احکام کتاب اللہ کو دنیوی فائدے کے لیے چھپانے والے جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۳۵۳

د

(۱۳۶) دانش مند

— اہل ایمان ہی سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں جو عین دانش مندی کا تقاضا ہے ۲۳۵

(۱۳۷) داود علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا ۵۵۹-۵۶۰

— آپ صالحین میں سے تھے، انھیں تمام دنیا پر فضیلت عطا کی گئی ۵۵۹-۵۶۰

— قتل جالوت کا واقعہ ۱۹۱

(۱۳۸) دعا

— دعا کی حقیقت، اس کے آداب اور درست طریقہ ۴۲-۴۳

— قرآنی دعائیں ۴۵- ۱۹۰- ۲۲۴- ۲۲۵- ۲۳۵- ۲۳۸- ۲۴۳- ۲۹۳- ۳۱۱- ۳۱۲

— حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی دعا ۱۱۲

— حق تعالیٰ تک اپنی دعا پہنچانے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے ۱۴۴

— حضرت مریم کی والدہ کی دعا ۲۴۷

— حضرت زکریاؑ کی بڑھاپے میں نیک اولاد کے لیے دعا ۲۴۸

— اللہ تعالیٰ سے طلب فضل کی دعا کا حکم ۳۴۷

— خوانِ آسمانی کے لیے حضرت عیسیٰ کی دعا ۵۱۴

— اللہ تعالیٰ کے وعدۂ آخرت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے دعا یہ کرنی چاہیے کہ اس برحق وعدہ کے مصداق بن جائیں ۳۱۱-۳۱۲

— سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے جو قرآن سے فائدے کے طالب ہر انسان کو سکھلائی گئی ہے ۴۲

— اللہ تعالیٰ ہی صرف عبادت کے لائق ہے اور صرف اسی سے مانگنا درست ہے ۴۴-۴۵

— جو لوگ اللہ کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی سنتا ہے ۱۴۴

— آزمائش اور تکلیف میں مبتلا افراد کے لیے دعا ۲۲۵-۲۲۶

— اہل ایمان کی خصوصیات کے حصول کی دعا ۲۳۸-۲۳۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— کچھ مانگنے سے پہلے اپنی خطاؤں اور غلطیوں کی معافی طلب کرنی چاہیے تو پھر دعا بھی مقبول ہوتی ہے۲۹۳
— صراطِ مستقیم پانے اور اس پر قائم رہنے کی دعا ۴۵

(۱۳۹) دعوتِ حق، دعوتِ اسلامی

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں انسانوں کے خیالات، اخلاق، عبادات، معاشرت، تمدن اور سیاست سب کی اصلاح شامل ہے۱۱۲
— باطل کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی حمایت ہی کافی ہے، جو سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۱۱۶
— دعوتِ حق ایک عظیم الشان لیکن پرخطر خدمت ہے ۱۲۵-۱۲۶
— دعوتِ حق کا مقصود ۶۰۵ تا ۶۰۷
— دین کا راستہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے، کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا ۱۶۳
— دعوتِ حق کے مجاہدین کی قرآنی دعا ۱۹۰-۱۹۱
— مومن کی حامی و مددگار ذاتِ خداوندی ہے، جو انھیں ظلمات سے نور کی طرف لاتا ہے، جب کہ کفار کا مددگار طاغوت ہے جو انھیں روشنی سے تاریکی میں لے جاتا ہے ۱۹۷ تا ۲۰۲
— اہلِ ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کہ وہ اپنا وقت، قوتیں اور کمائیاں اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۲۰۲
— دعوتِ حق میں مصروف معاشرتی اور معاشی طور پر کمزور افراد انفاق فی سبیل اللہ کے اولین اور بڑے حق دار ہیں ۲۰۹-۲۱۰
— داعیانِ حق کا کام صرف دعوتِ حق پہنچا دینا ہے، آگے اللہ مالک ہے، وہ بندوں کے معاملات خود دیکھ رہا ہے ۲۴۰-۲۴۱
— دعوتِ حق کے نافرمانوں کا پھلنا پھولنا اور اطاعت گزاروں کی آزمائش، اس فرق پر قرآنی تبصرہ ۲۴۳
— دعوتِ حق کے پیروکاروں کی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ ذات غفور و رحیم ہے ۲۴۵
— اہلِ ایمان میں ہر وقت ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے ۲۷۷
— داعیانِ حق اگر صبر، شکر اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزاریں تو مخالفین کی کوئی تدبیر اور حربہ ان کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے گا ۲۸۳-۳۱۴
— اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے نتھار کر اہلِ ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور اسی ذریعے سے کفار کی سرکوبی کرتا ہے ۲۹۰
— دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا ۲۹۳
— اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا کرو، وہی بھروسے کے لیے کافی ہے، وہ مخالفین کے تمام ہتھکنڈے ناکام کر دے گا ۳۷۶
— دعوتِ حق کا داعی صرف اپنی ذات کا جواب دہ ہوتا ہے، وہ اکیلا ہی ڈٹ جاتا ہے، کیونکہ سخت سزا دینے والا زبردست اس کے ساتھ ہے ۳۷۷
— دعوتِ حق کی پیروی انسان کے اپنے لیے بہتر ہے ۴۲۷-۴۲۸
— خالق کائنات کے وجود کا انکار کرنے سے مالک علیم و حکیم رب تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا ۴۲۷-۴۲۸
— دعوتِ حق تمام انسانوں کے لیے دلیل و برہان، نورِ مبین اور دعوتِ عام ہے ۴۳۰-۴۳۱
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہلِ ایمان سے لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— صراطِ مستقیم اور دنیا بھر کے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کا منصب ایک عہد کے مطابق ہے، اس عہد کے لوازمات جو اہلِ ایمان پر فرض ہیں ۴۴۹
— اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارنے اور اللہ ہی پر توکل اور بھروسا کرنے کی ہدایت، جو اہلِ ایمان کے ساتھ ہے ۴۵۰-۴۵۱
— اللہ سے ڈرنے، اس کے حضور باریابی کا ذریعہ تلاش کرنے اور اللہ کی راہ میں شیطان، اپنے نفس اور باطل نظامِ زندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کا حکم ۴۶۶-۴۶۷
— اہلِ ایمان کو راہِ حق کے خلاف کفار کی سرگرمیوں پر

رنجیدہ نہ ہونے کا حکم، یہی حکم رسول اللہ کو بھی دیا گیا ۴٦۹
— مسلم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور اس راہ میں کسی ملامت اور شرمندگی کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲
— امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حدود کا تعین ۵۱۰
— دوسروں کے عقائد و اعمال کی خرابیاں دیکھنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرو ۵۱۰
— حق و باطل کی کشمکش میں حق پرستوں کو آزمائش کی بھٹی سے گزرنا پڑا اللہ تعالیٰ کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ۲۹۳-۳۰۵-۳۰۸-۳۰۹-۵۳۵
— دعوتِ حق کے لیے صبر اور نماز دو بنیادی ضروریات ہیں ۱۲٦
— جنگ بدر کے مشاہدات و نتائج میں اہل دانش اور عقل مندوں کے لیے سبق ہے ۲۳۷
— متقین اور خوفِ آخرت رکھنے والے افراد ہی اسلام کی دعوت کے اصل مخاطب ہیں اور وہی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں ۵۴۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طالب کو اپنے سے الگ نہ کرو کہ وہ معاشی و معاشرتی طور پر کمزور ہے ۵۴۳-۵۴۴
— ایمان لا کر نیک عمل کرنا ہی اصل معیارِ عزت و شرف ہے، دنیوی دولت و مقام کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۵۴۴
— اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی صحیح اور درست راہ نمائی ہے ۵۵۱
— غیر مسلموں کے معبودوں تک کو برا نہ کہو، مبادا وہ جہالت میں اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱
— رسولؐ اللہ کو داعی، مبلغ اور مظہرِ حق بنایا گیا، وہ کوتوال اور حوالہ دار نہیں ۵۷۰
— اللہ تعالیٰ کی خوشنودی صرف اور صرف حق اور اس کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے ۵۷۳ تا ۵۷۵
— دعوتِ حق کے علم بردار اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نور و ہدایت کے تحت زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ انھوں نے صالح طرزِ عمل اختیار کیا ہے ۵۸۰
— دعوتِ حق کے لیے انبیائے کرام کی جدوجہد ۱٦۳
— مال کو اگر دین کی سربلندی کے لیے خرچ نہ کرو گے اور اپنی ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے تو یہ دنیا و آخرت میں ضلالت و گمراہی اور خسران کا باعث بن جائے گا ۱٦۴
— دعوتِ حق کے مخالفین ظالم ہیں، ان کی زبان کبھی بند نہ ہوگی، لہٰذا اہل ایمان کو ان سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہوگا ۱۳۱
— تعلیمات و ہدایات خداوندی چھپانے والے لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸-۲٦۰-۲٦۱
— دعوتِ حق کے مخالفین کو اللہ تعالیٰ فتنے میں مبتلا کر دیتا ہے، اس فتنے کا قلع قمع ہی جہادِ اسلامی کا اولین جواز ہے ۱۵۰
— جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق کامیاب ہو جائے تو عفو و درگزر کی عمومی پالیسی کے باوجود باطل کے بڑے بڑے داعیان سخت سزا کے مستحق ہیں ۱۵۱-۱۵۲
— اپنی لچھے دار گفتگو کے ذریعے سے اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیرانے والے بدترین دشمن حق ہیں ۱۵۸-۱۵۹
— دعوتِ حق کے مخالفین کے مغلوب ہونے اور بدترین انجام پانے کی پیشین گوئی ۲۳٦
— دعوتِ حق کے مخالفین کو وعید کہ دردناک عذاب ان کا مقدر ہے، ان کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں مقبول نہ ہوں گے ۲۴۱
— دعوتِ حق کے مخالفین سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا اور انھیں کبھی معاف نہ کرے گا ۲۵۹
— اس رویے کی مذمت کہ حق آشکار ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے کتمانِ حق کرنا ۲٦۰-۲٦۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— حاملینِ دعوتِ حق کو مخالفین کی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے، وہ نامراد اور خسران میں مبتلا ہیں ۲۹۳-۲۹۴
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات پھیلانے اور انھیں پوشیدہ نہ رکھنے کا عہد لیا گیا لیکن انھوں نے انھیں پس پشت ڈالا اور تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا ۳۰۹-۳۱۰
— دعوتِ حق کے داعیان مخالفوں کے رویے سے بری الذمہ ہیں ۳۷۵-۳۷۶
— دعوتِ حق کے ساتھ یہودیوں کا ظالمانہ رویہ ۴۲۲-۴۲۳
— جو لوگ دعوتِ حق کا خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت آگے نکل گئے ہیں ۴۲۶
— دعوتِ حق کے خلاف کفر و بغاوت اختیار کرنے والے اور ظلم و ستم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا ۴۲۶
— اللہ تعالیٰ دعوتِ حق کی طرف اٹھنے والے ہاتھ توڑ دیتا ہے ۴۵۰
— اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر سے بچانے والا ہے، وہ کفار کو حق کے مقابلے میں کبھی کامیابی نہ دے گا ۴۸۷
— بنی اسرائیل پر اس لیے لعنت کی گئی کہ انھوں نے برے اعمال سے ایک دوسرے کو روکنا چھوڑ دیا ۴۹۶-۴۹۷
— انبیائے کرام کی دعوت جھٹلانے والوں پر وہی حقیقت مسلط کر دی گئی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۵۲۶
— دعوتِ حق کو ''قصہ پارینہ'' قرار دینا ہر زمانے میں اہل ضلالت کا وتیرہ رہا ہے ۵۳۱
— جو لوگ دعوتِ حق قبول کرنے سے انکاری ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں، وہ لاشعوری طور پر اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں ۵۳۲
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کے انکار پر نہایت رنجیدہ ہوتے تھے، انھیں بتایا گیا کہ یہ تمھارا نہیں تمھارے بھیجنے والے کا انکار کر رہے ہیں، مغضوب قوموں کی تاریخ ان کے انجام پر گواہ ہے ۵۳۴
— انبیائے کرام ہمیشہ سے جھٹلائے جاتے رہے لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی ۵۳۴-۵۳۵
— داعیان حق کی اس خواہش کا جواب کہ اللہ تعالیٰ کی نشانی اور مدد جلدی آ جائے ۵۳۵-۵۳۶
— زندہ ضمیر اور عقل و فکر استعمال کرنے والے زندہ اور تعصب و جمود والے مردہ قرار دیے گئے ہیں ۵۳۶-۵۳۷
— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ دعوتِ حق کے مخالف رہے ہیں، ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— دعوتِ حق کے مخالفین کفار کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں ۵۷۸-۵۷۹
— بڑے بڑے گمراہ مجرمین اس کام پر لگا دیے گئے ہیں کہ مکر و فریب کا جال پھیلائیں، انھیں شعور نہیں، وہ خود اپنے مکر و فریب میں گرفتار ہوں گے ۵۷۹-۵۸۰
— دعوتِ حق کے داعیان ہدایت کے ذریعے سے زندگی پا چکے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رشد و ہدایت کی روشنی اور نور کے ذریعے سے دنیوی زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸

(۱۴۰) دنیا

— دنیا میں کون کامیاب رہا اور کون ناکام؟ ۴۴۷
— ڈارون کے نظریۂ حیاتِ انسانی کی طرح انسان نے ہدایت ارتقائی عمل سے حاصل نہیں کی بلکہ انسانی تاریخ کا آغاز ہدایت پر ہوا ۱۶۲-۱۶۳
— دنیا کے تمام معاملات تو آخر کار اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے ہیں ۱۶۱
— دنیا و آخرت کا موازنہ ۲۳۷-۲۳۸

— دنیا میں عقل مند وہ ہے جس نے دنیا میں ہر دم آخرت کی ہمیشگی کی زندگی کی تیاری کر لی ۲۰۸
— دنیا میں نشیب وفراز اللہ تعالیٰ کی مشیت و رضا سے انسانوں کے درمیان گردش کرتے ہیں ۲۹۰
— نیک وصالح لوگوں کے لیے دنیا میں بھی اجر ہے اور آخرت میں تو ہے ہی ۲۹۳
— دنیا کا سرمایہ نہایت قلیل اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے بہتر ہے ۳۷۴
— دنیوی معاشرے میں کسی کی اونچی حیثیت کی تمنا نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی دعا کرتے رہو، اس سے تمدن اور معاشرے میں سکون رہے گا ۳۴۸-۳۴۷
— دنیا میں اس شخص سے بہتر کس کا طرزِ عمل ہو سکتا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتا رہا اور ابراہیمؑ کے طریقے پر چلتا رہا ۴۰۰
— دنیوی آزمائش میں کامیابی اور پورا اترنے کے لیے نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کرنی چاہیے ۴۷۷-۴۷۸
— ہر انسان کے لیے دنیا میں قیام کی مدت مقرر ہے ۵۲۳
— دنیا کی زندگی میں امتحان اور آزمائش کی کیا نوعیت ہے ۵۲۶
— دنیا کا مال و دولت اور عزت واقتدار سب کچھ یہاں ہی رہ جانے والا ہے ۵۶۵
— ''دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے'' اس حقیقت کا بیان ۵۳۳-۵۳۴
— دنیا کی زندگی میں انسان کو حق و باطل کے انتخاب کی آزادی ہے اور یہ ہی آزمائش ہے کہ کس چیز کا انتخاب کرتا ہے ۵۷۰
— دنیا پرستوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ کہ جسے دنیا میں جتنا دیا گیا اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے ۱۱۱-۱۶۱
— دنیا و آخرت میں ذلت، خواری اور شدید ترین عذاب کن کے لیے ہے ۹۱
— صرف دنیا کا طالب آخرت میں حصہ دار نہیں، لیکن آخرت کا طلب گار دونوں جگہ پاتا ہے ۱۵۷-۱۵۸-۲۹۲
— دنیا کی زندگی کفار کے لیے نہایت دل پسند اور محبوب بنا دی گئی ہے ۱۶۱
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والے کو دنیا و آخرت میں ثواب ملتا ہے ۲۹۳
— دنیا کی زندگی کو کن معنوں میں ظاہر فریب چیز قرار دیا گیا ہے؟ ۳۰۸-۳۰۹
— دنیا میں نافرمانوں کی چلت پھرت کسی کو دھوکے میں نہ ڈالے، یہ محض چند روزہ لطف ہے آخر کار ان کے لیے بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳
— دنیا میں جو چاہے کرتا رہے لیکن آخر کار اسے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۳۷۹-۳۸۰
— محض دنیا ہی کو زندگی جاننے والے اپنے انکارِ حقیقت پر عذاب کے مستحق ہوں گے اور افشائے حقیقت پر اقرار کریں گے ۵۳۳
— دنیا کے فریب زدہ افراد کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم ۵۴۹-۵۵۰

(۱۴۱) دوزخ

— اس سے بچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے ۵۸۱
— کس قسم کے لوگ دوزخ میں جائیں گے؟ ۵۸-۵۹-۶۹-۸۹-۹۰-۱۰۶-۱۴۸-۱۵۹-۱۹۷-۲۱۳-۲۳۶-۲۹۴-۲۹۹-۳۴۶-۳۶۱-۳۹۷-۴۵۰-۴۸۹-۴۹۸
— اس میں ہمیشہ قیام ۶۸-۳۳۰-۵۸۰
— اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ۵۸
— اس کی سزا بڑی ذلت بھری ہے ۳۱۱
— بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳-۳۹۷
— عذاب دوزخ کی تفصیل ۳۶۱
— اس سے خلاصی کی کوئی صورت نہ ہوگی ۳۹۹-۴۶۷
— مشرکین کے بت بھی دوزخ میں جائیں گے ۵۸
— اس کا عذاب مجرمین کی اپنی کمائی کا حاصل ہوگا ۳۰۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— یتیموں کا مال کھانے والوں کا انجام ۳۲۵
— منافق اور کافر اس میں جمع کیے جائیں گے ۴۰۹
— منافقین اس کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے ۴۱۱
— کفر وظلم کرنے والوں کو قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جانا ہے ۴۲۶

(۱۴۲) دیت

(دیکھو ''قانونِ اسلام'')

(۱۴۳) دین

— اللہ تعالیٰ کا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اور انسان کی اولین پیدائش سے یہی ہے ۶۰۴ - ۶۰۵ -
— نوع انسانی کا اصل دین ایک ہی تھا ۱۶۲ - ۲۲۸ - ۶۰۴
— پورا دین اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو؟ ۱۵۱
— دین کی اساس کن باتوں پر ہے؟ ۲۲۲-۵۶۳
— دین کی اولین بنیاد اللہ تعالیٰ کے مالک کائنات ہونے کا شعور ہے ۲۲۲
— دین بمعنی روز جزا ۴۴
— اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ۲۳۹
— دین اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کے مسلک کا نام ہے ۲۶۹
— دین فقہی جزئیات کا نام نہیں، بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے اصول کا نام ہے ۴۷
— اللہ تعالیٰ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مفہوم ۴۱۲
— دین میں غلو کرنے کی ممانعت ۴۲۷ - ۴۲۸
— دین اسلام سے کفار کی مایوسی کا مطلب ۴۴۳
— تکمیلِ دینِ اسلام کا اعلان ۴۴۳ -۴۴۴
— ایک ہی دین کے تحت شریعتوں کا جزوی اختلاف ۴۷۷
— حدودِ دین کے اندر رہتے ہوئے مثبت اختلافات کی تحسین کی گئی ہے ۳۸ - ۳۹
— دین میں موشگافیوں کا نتیجہ کفر ہوتا ہے ۵۰۸
— دین پر مخالفین کی طرف سے ''اساطیر الاولین'' کی پھبتی اور اس کا جواب ۵۳۱
— حق ہر زمانے میں ایک ہی تھا ۵۳۱
— دین کو کھیل تماشا بنانے والے ۵۵۰
— دین میں ''اللہ کی سند'' کی اہمیت ۵۵۹
— ایک دین سے کئی مذہب کیسے بنے؟ ۶۰۴
— دین کا راستہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے ۱۶۳
— ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم جنھوں نے دین کو کھیل بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ۵۴۹ - ۵۵۰

(۱۴۴) ذکر

— اللہ تعالیٰ کی عبادت و ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بھی یاد رکھتا ہے ۱۲۵
— اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، اس کے حضور باریابی کا ذریعہ تلاش کرنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شیطان، اپنے نفس، باطل افراد اور باطل نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کا حکم ۴۶۶ - ۴۶۷
— اللہ تعالیٰ کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے ۱۸۳
— حج کے ساتھ ذکر الٰہی کی اہمیت ۱۵۷
— اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے دو گروہ: (۱) محض دنیا کے طلب گار (۲) دنیا اور آخرت دونوں کو چاہنے والے ۱۵۷

ر

(۱۴۵) رب

— اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے ۴۳-۴۴
— رب کا اصطلاحی مفہوم (مالک، مربی، فرمانروا اور حاکم) ۴۳-۴۴

(۱۴۶) ربانی

— ربانی، احبار، علما اور مشائخ کا کام ہے کہ لوگوں کو گناہ اور گمراہی سے روکیں اور حرام نہ کھانے کی

تلقین کریں ۴۸۴

(۱۴۷) ربا (سود)

— (تفصیلات کے لیے دیکھو 'سود')

(۱۴۸) رحم

— رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہیں اور قرآن مجید میں ان کا استعمال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۴۳-۶۸-۷۶-۱۱۲-۱۲۱-۱۲۸-۱۳۰-۱۳۵-۱۵۰-۱۵۷-۱۶۷-۱۷۲-۲۴۵-۲۷۱-۲۸۷-۳۳۱-۳۳۹-۳۴۳-۳۶۸-۳۸۶-۳۸۷-۳۹۴-۳۹۵-۴۰۴-۴۱۴-۴۴۴-۴۶۶-۴۶۸-۴۹۰-۵۰۶-۵۴۴-۵۹۴-۶۰۷

— اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر اتنی رحمت ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا ۴۴

— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے چنتا ہے ۱۰۱

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے لیکن اس کے ساتھ بہت درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا بھی ہے ۵۰۶

— اللہ تعالیٰ نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے ۵۴۴

— اللہ تعالیٰ کا دامن رحمت نہایت وسیع ہے ۵۹۴

(۱۴۹) رزق

— اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسا کر انسانوں کے لیے ہر طرح کا رزق بہم پہنچایا ۵۷

— رزقِ دنیا مومن و کافر سب کو دیا جاتا ہے ۱۱۲

— رزقِ دنیا کی فراوانی حق امامت کی بنیاد نہیں ہے ۱۱۲

— دنیا کا رزق تقویٰ کے لحاظ سے نہیں دیا جاتا ۱۶۲

— دنیا کے رزق کی کثرت و قلت پر آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار نہیں ہے ۱۶۲

— رزق رسانی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے ۲۴۳-۲۴۸

— صرف حلال وطیب رزق استعمال کرنے کا حکم ۴۹۹

— زرعی اور حیوانی رزق (املاک) کے متعلق تین اہم ہدایات ۵۹۰

— رزق رسانی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے ۵۹۸

(۱۵۰) رسول

— اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو تمام انسانوں میں سے چن کر انتخاب کرتا ہے ۱۱۳-۲۴۶

— انبیائے کرام کی رسالت کا دائرۂ کار ۱۲۵

— رسول کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے ۵۶۰

— یہودی رسولؐ اللہ کی رسالت سے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵

— رسول انسانوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، جن میں خیالات و افکار، اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت اور سیاست سمیت ہر چیز کی اصلاح شامل ہے ۱۱۲-۱۱۶

— رسول کی پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست جانتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے ۲۴۵

(۱۵۱) رشوت

— رشوت کی ممانعت ۱۴۸

— اللہ کی آیات مالی فائدے کے لیے بیچ ڈالنا یہودیوں کی عادت تھی ۷۲

(۱۵۲) رضا

— اللہ تعالیٰ کی رضا اہل جنت کے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا ۲۳۸

— اللہ تعالیٰ کی رضا پر چلنے والا کس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار فرد کی طرح ہوسکتا ہے ۲۹۹

(۱۵۳) رضاعت

— طلاق اور خلع کی صورت میں بچوں کی رضاعت کا معاملہ ۱۷۸

— بالمعاوضہ رضاعت ۱۷۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— یتیم بچوں کی رضاعت ان کے اولیا کی ذمہ داری ہے۱۷۹
— حرمت بر بنائے رضاعت ۲۳۷-۲۳۸

(۱۵۴) رمضان المبارک

— اس مہینے میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی ۱۴۲
— اس مہینے میں روزے رکھنے کا حکم ۱۴۲-۱۴۳
— روزے کے احکام کی تشریح ۱۴۵-۱۴۶-
— روزے انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرتے ہیں ۱۴۱
— روزے کے بارے میں اولین احکام ۱۴۱
— روزے کے اوقات ۱۴۵-۱۴۶
— ماہ رمضان میں رات کے وقت ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ۱۴۵-۱۴۶
— روزے کا اصل مقصد ۱۴۱
— روزے کے احکام میں تدریج ۱۴۱-۱۴۲
— حالت سفر کے لیے روزے کے احکام ۱۴۲
— نزول قرآن حکیم پر اظہار تشکر کا ذریعہ ۱۴۳
— سحری اور افطاری کے اوقات کی حد بندی ۱۴۵
— منطقۂ شمالی وجنوبی میں اس کا نظام اوقات ۱۴۶
— حالت اعتکاف میں بیویوں سے شب باشی کی ممانعت ۱۴۶-۱۴۷
— سحری اور افطاری میں بے جا شدتِ احتیاط ۱۴۶
— روزہ بطور فدیہ (بسلسلہ حج) ۱۵۴
— روزہ بطور کفارہ ۳۸۳-۵۰۰-۵۰۴

(۱۵۵) روح القدس

— اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی گئی ۱۹۲
— ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' کا مطلب ۴۲۸
— اس کے بارے میں عیسائیوں کے غلط تصورات ۴۲۸

(۱۵۶) روزہ

(دیکھو ''رمضان'')

(۱۵۷) رہبانیت

— مذہبی لوگوں کا ایک غلط رجحان ۴۹۸

(۱۵۸) رہن

— رہن بالقبض کا معاملہ ۲۲۱
— شئے مرہونہ سے مالی فائدہ اٹھانا سود ہے ۲۲۲

(۱۵۹) ریا

— ریا خدا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی علامت ہے ۲۰۳-۳۵۳

ز

(۱۶۰) زبور

— اس میں تحریف ہوگئی ہے ۴۲۴

(۱۶۱) زکریا علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے ۵۵۹-۵۶۰
— ان کا مظلومانہ قتل ۸۱

(۱۶۲) زکوٰۃ

— زکوٰۃ ہر زمانے میں شریعت اسلام کا حصہ رہی ۷۲-۷۳-۹۰
— رسولؐ اللہ کی امت کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ۱۰۳

(۱۶۳) زمین

— اللہ تعالیٰ ہی نے زمین کو فرش بنایا ۵۷
— ایک کتاب جس میں اللہ تعالیٰ نے خشک وتر کی تمام معلومات درج کر رکھی ہیں ۵۴۶
— اللہ تعالیٰ کے زمین وآسمان کے برحق پیدا کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ ۵۵۱-۵۵۲
— تاروں کو اللہ تعالیٰ ہی نے صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ۵۶۶
— رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے ۵۲۷

— زمین پر چلنے پھرنے والے تمام جانور اور اڑنے والے پرندے، ان کی تقدیر کے نوشتے مقرر ہیں، انسان کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سمٹے جاتے ہیں ۵۳۷-۵۳۸

— زمین اور سمندر میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اسے زمین کے تاریک پردوں میں ایک ایک دانے کا علم ہے، اسی طرح درخت سے گرنے والے ہر پتے کا علم ہے ۵۴۶

— زمین میں فساد کرنے والے بالآخر خسران میں رہیں گے ۶۰

— زمین پر بسنے والے انسان اکثر حق کی راہ پر نہیں ہوتے کیونکہ وہ محض قیاس اور گمان کی پیروی کرتے ہیں ۵۷۵-۵۷۶

(۱۶۴) زنا

— زنا کے مختلف مدارج معصیت ۳۴۷

— اس جرم کی ابتدائی سزا ۳۳۱-۳۳۲

— زنا کے جرم کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شہادت ۳۳۱

— منکوحہ لونڈی کے ساتھ زنا کی سزا ۳۴۲

(۱۶۵) سائل

— مانگنے والا ۲۰۹

(۱۶۶) سبت

— بنی اسرائیل کے لیے اس کے احکام ۸۳

— سبت کے احکام کی اسرائیلیوں کی طرف سے خلاف ورزیاں اور نتیجتاً عذاب الٰہی کا سزاوار ٹھیرنا ۸۳-۸۴

(۱۶۷) سجدہ

— اللہ کے حکم پر آدم (انسان) کو فرشتوں کا سجدہ ۶۴

(۱۶۸) سحر

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’جادو‘)

(۱۶۹) سرقہ

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’چوری‘)

(۱۷۰) سکراتِ موت

— سکراتِ موت کے عالم میں ظالموں کی حالت ۵۶۴

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’موت‘)

(۱۷۱) سواء السبیل

— اس قرآنی اصطلاح کی مکمل توضیح ۴۵۲ تا ۴۵۴

— یہود کا سواء السبیل سے بھٹک جانا ۴۸۴

— اہل کتاب کا سواء السبیل سے بھٹک جانا ۴۹۱

— اعتدال کی راہ چھوڑنے والے اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں ۴۹۹

(۱۷۲) سلیمان علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا ۵۵۹-۵۶۰

— ان کے بعد بنی اسرائیل کا انتشار ۸۱

— ان پر جادوگری کا جھوٹا الزام ۹۷

— حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف طلسمات اور عملیات منسوب کرنے کی تردید ۹۷-۹۸

(۱۷۳) سلویٰ

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’من وسلویٰ‘)

(۱۷۴) سنت

— نظام دین میں اس کی اہمیت ۳۶-۳۷

— سنت نبوی قیامت تک کے لیے سند ہے ۳۶۹

(۱۷۵) سود

— لفظ ’’ربا‘‘ کی تحقیق ۲۱۰

— اس کی حرمت ۲۱۱-۲۱۷

— اس کا خلاف عقل وانصاف ہونا ۲۱۱-۲۱۲

— تجارت اور سود کا فرق ۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳

— سود خوار کا حشر ۲۱۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— سود کے روحانی، معاشی اور اخلاقی نقصانات ۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۸۸
— سود کا شرعی حکم ۲۱۳
— صدقہ اور سود کا تقابل ۲۱۴
— پچھلے سودی معاملات کی تنسیخ ۲۱۷
— رہن میں سود کی صورت ۲۲۲
— سود کے دوررس مفاسد ۲۸۷
— تورات میں اس کی ممانعت ۴۲۲
— سود خوار کو اللہ تعالیٰ بدعمل اور ناشکرا قرار دیتا ہے اور انھیں سخت ناپسند کرتا ہے ۲۱۶
— سودخواری اور انفاق فی سبیل اللہ سے پیدا ہونے والی خصوصیات کا موازنہ ۲۸۷-۲۸۸
— یہودیوں کے جرائم میں سودخواری اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا شامل ہے ۴۲۲-۴۲۳

ش

(۱۷۶) شراب

— شراب کے بارے میں پہلا حکم ۱۶۷
— اس کے فوائد سے اس کے نقصانات زیادہ ہیں ۱۶۷
— تدریجی امتناع کے تحت دوسرا حکم ۳۵۴
— شراب کی حرمت کا تیسرا اور قطعی حکم ۵۰۱
— شراب نوشی کی سزا ۵۰۲
— شراب نوشی شیطانی کام ہے ۵۰۱-۵۰۳
— اس کے متعلق رسولؐ اللہ کے تفصیلی احکام ۵۰۱-۵۰۲
— شراب انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکتی ہے ۵۰۳
— شراب اور جوئے سے معاشرے میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳

(۱۷۷) شرک

— اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ ۱۸
— شرک کے خلاف قرآن حکیم کے دلائل ۵۷
— شرک کے خلاف عقلی دلائل ۱۳۰-۱۳۱
— شرک اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے ۵۲۹-۵۳۰
— شرک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں (آیات) کو جھٹلانے کے مترادف ہے ۵۲۹-۵۳۰
— شرک ظلم ہے ۵۵۹
— صفاتِ الٰہی اور حقوق اللہ میں دوسروں کو شریک کرنا شرک ہے ۱۳۱
— ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لینا ۱۳۵-۴۴۰
— نظریۂ شرک ایک جھوٹ اور حقیقت کے خلاف اعلان جنگ ہے ۱۹۳-۱۹۴-۳۵۸-۳۵۹
— مشرک معاشرے کا نظام فکر ۱۹۸-۱۹۹
— شرک کا جوہر ۲۵۵
— شرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے ۳۵۹-۳۵۸-۳۹۷
— مشرکانہ عقائد کے تحت جانوروں کے کان چیر کر ان کو دیوتاؤں کے نام پر پُن کرنا ۳۹۸
— مشرکانہ فال گیری ۴۴۲-۵۰۱
— آستانوں کے چڑھاوے ۴۴۱-۵۰۱
— مشرکین کے لیے جنت حرام ہے ۴۸۹
— اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مقرر نہیں کیے ۵۰۸
— شرک کس معنی میں ظلم ہے؟ ۵۳۰-۵۵۹-۵۸۴
— مصیبت کے وقت مشرکین کا ’’شرکا‘‘ کو چھوڑ کر خدائے واحد کے سامنے گڑگڑانا ۵۳۹-۵۴۰-۵۴۷-۵۴۸
— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰
— نظریہ شرک کے خلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد ۵۵۲-۵۵۳
— جو شرک میں ملوث ہوا اس کا کیا کرایا ضائع ہو جاتا ہے ۵۶۱
— دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا مدمقابل ٹھیرانا ۵۷
— مشرکین کا انجام بد ۵۸
— شرک اجتماعی قوت کو کمزور کرتا ہے ۲۹۴
— آخرت میں مشرکین سے باز پرس ۵۳۰

— جنوں کو بھی خدا تعالیٰ کا شریک ٹھیرایا گیا ۵۶۷
— اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنے کا شرک ۵۶۸
— شرک کی بنیاد اوہام پر ہے ۵۶۸
— شیطان کی اطاعت بھی شرک ہے ۵۷۷
— اعتقادی شرک اور عملی شرک ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں شرکا کا حصہ لگانا ۵۸۴-۵۸۵
— اللہ تعالیٰ کے حقوق میں شرک ۵۸۴-۵۸۵
— مشرکانہ خیالات کی بنا پر قتل اولاد ۵۸۵
— غیر الٰہی قانون کو تسلیم کرنا بھی شرک ہے ۵۸۶
— مشرکین کے لیے مشرکانہ اعمال کا خوش نما بن جانا ۵۸۶
— شرک کی چار صورتیں ہیں: (۱) ذات میں شرک، (۲) صفات میں شرک، (۳) اختیارات میں شرک، اور (۴) حقوق اللہ میں شرک ۵۹۷-۵۹۸
— کائنات کے نظام میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۶۰۶
— مشرکین اس حقیقت پر جلتے ہیں کہ اللہ کا فضل و رحمت (نبوت) رسول اللہ ہی کو کیوں مل گیا ۱۰۱
— حضرت ابراہیمؑ ہرگز مشرک نہ تھے ۱۱۴-۱۱۵
— اللہ تعالیٰ ہی وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۱۹۳
— شرک کی کوئی سند نہیں ہے، مشرکین ظالم ہیں اور ان کے لیے نہایت برا ٹھکانہ ہے ۲۹۴
— اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی شرک ہے ۵۵۸ تا ۵۶۰
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں ہو سکتا، انسانوں کا اس حقیقت پر اقرار یا انکار اللہ تعالیٰ کی خدائی پر کوئی فرق نہیں ڈال سکتا ۳۸۷
— مشرکین گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں ۳۹۷
— شرک اصل میں باغی شیطان کی عبادت اور پیروی ہے جس نے انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے ۳۹۷ تا ۳۹۹
— شرک کی معافی نہیں ہے حضرت عیسیٰؑ اور مقرب ترین فرشتے کو اس میں عار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۳۹۷-۴۳۰
— جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر اللہ کی سرپرستی اور مدد پر بھروسا رکھتے ہیں وہ ان میں سے کسی کو مددگار نہ پائیں گے ۴۳۰
— حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ قرار دینے والے کفر کر رہے ہیں ۴۸۹
— حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ دونوں بشر تھے اور الوہیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا ۴۹۱
— اللہ تعالیٰ کے سوا انسان جس کسی کی عبادت و بندگی کرتا ہے وہ نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ۴۸۹
— حضرت عیسیٰؑ میدان حشر میں عیسائیوں کے موجودہ مشرکانہ نظریات کی تردید کریں گے ۵۱۵-۵۱۶
— اللہ تعالیٰ اپنی خدائی میں کسی کا محتاج نہیں ہے، مشرکین کے معبود محتاج ہیں ۵۲۷
— مصیبت میں آیندہ شکر گزار رہنے کے وعدے پر انسان اپنی جان بچاتا ہے لیکن پھر شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے ۵۴۶-۵۴۷
— شرک کی کوئی سند نہیں لیکن مشرکین اللہ سے نہیں ڈرتے پھر جعلی معبودوں سے کیوں ڈرا جائے جن کی حیثیت کی کوئی سند نہیں ہے ۵۵۹
— انبیائے کرام پر تلاش حق میں شرک کا الزام اور قرآن کی تردید ۵۶۱
— انسان کے بناوٹی معبود کسی کام نہ آئیں گے اور ان کا زعم پارہ پارہ ہو جائے گا ۵۶۵
— شرک انسان کے لیے اس کا دین مشتبہ اور مشکوک بنا دیتا ہے ۵۸۶
— شرک اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے گا ۵۸۷-۵۸۸
— شرک، انکار آخرت اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف

Maktaba Tul Ishaat.com

اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں ہے ۶۰۵

(۱۷۸) شریعت

— شریعت کی تفصیلات میں فرق کیوں ہے؟ ۴۷۷-۴۷۸
— وہ بنیادی پابندیاں جو جملہ شرائعِ الٰہیہ میں عائد کی گئی ہیں ۵۹۷تا۵۹۹
— شریعت ان ناروا پابندیوں سے آزاد کرواتی ہے جو انسان نے اپنے اوپر عائد کر لی ہیں ۱۵۵
— اسلامی شریعت کا مطالبہ پورا کا پورا دائرۂ احکام میں آ جانا ہے ۱۶۰
— شریعت جن معاملات میں خاموش ہو ان معاملات میں زیادہ سوال و جواب کرنا منع ہے ۵۰۷-۵۰۸

(۱۷۹) شعائر اللہ

— لفظ ''شعائر'' کی تشریح ۴۳۸-۴۳۹
— صفا و مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں ۱۲۷
— شعائر اللہ کی توہین کا مطلب ۴۳۸
— شعائر اللہ کے احترام کی وجہ ۴۳۹
— احرام بھی شعائر اللہ میں سے ہیں ۴۳۹
— اہل ایمان دوسرے مذاہب کے شعائر کی عزت و تکریم کے پابند ہیں بشرطیکہ ان میں مشرکانہ آلودگی نہ ہو ۴۳۹

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''حج'')

(۱۸۰) شکار

— حالت احرام میں شکار کی حرمت ۴۴۵-۵۰۴-۵۰۵
— حالت احرام میں شکار کے قاعدے ۴۴۵-۴۴۶
— شکاری جانوروں سے مراد کیا ہے؟ ۴۴۵
— حالت احرام میں شکار کرنے کا کفارہ ۵۰۴
— سمندری شکار کی حلت ۵۰۵

(۱۸۱) شکر

— شکر کے رویے کی تشریح ۱۴۳-۴۱۲
— اللہ تعالیٰ کے شاکر ہونے کا مطلب ۴۱۲
— کفران کی ضد شکر کا رویہ ہے ۱۲۹
— شکر اور ایمان کا تعلق ۴۱۲
— جو انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے ۱۲۵
— شکر گزار بندوں کی جزا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے ۲۹۱-۲۹۲
— اللہ تعالیٰ کے بنائے قوانین انسان کے لیے نعمت ہیں جس کے لیے انسان کو شکر گزار ہونا چاہیے ۴۴۸-۴۴۹

(۱۸۲) شفاعت

— مجرمین کے لیے اس کا غیر مفید ہونا ۱۰۸
— اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں کہ کسی کے بارے میں سفارش کر سکے ۱۹۴
— قیامت کے روز مجرمین کی طرف سے کوئی سفارش نہ کر سکے گا ۳۹۵
— آخرت میں خدا تعالیٰ کی بندگی سے گریز کرنے والوں کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا ۴۳۰
— اپنی امت کے لیے حضرت عیسیٰ عاجزانہ اور لطیف شفاعت کریں گے ۵۱۷
— آخرت میں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہوگا کہ کسی کی حمایت اور سفارش کر سکے ۵۴۳
— آخرت میں حمایت، سفارش اور فدیہ کا بے کار ہونا ۵۵۰
— آخرت میں متوقع سفارشیوں کا کھو جانا ۵۶۵
— حساب کے لیے ہر ایک کی حاضری تن تنہا ہوگی ۵۶۵

(۱۸۳) شہادت
بمعنی جانی قربانی

— راہِ خدا میں جان دینے کے معنی ۱۲۶
— اس قربانی کا گراں قدر بدلہ ۲۹۸
— شہدا کے لیے آخری انعامات و مدارج ۳۰۲

— اس قربانی کی غیر معمولی لذت ۳۰۳
— جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو، وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں، ہاں تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے ۱۲۶

بمعنی شہادت حق

— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اس کو چھپا لے ۱۱۷
— شہادتِ حق علی الناس میں امت کا جانشینِ رسول ہونا ۱۱۹
— شہادت حق علی الناس کے وسیع تقاضے ۱۱۹-۱۲۰
— اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ مخلصین کو آزما کر چھانٹتا ہے ۲۹۰

بمعنی گواہی

— گواہی دینے والا (شاہد) ۲۵۷
— شہادت کی ذمہ داری ۱۱۷
— شہادت کا قانون ۲۲۰-۵۱۱
— قانون شہادت میں عورت کی گواہی ۲۲۰
— قانون شہادت میں غیر مسلم کی گواہی ۲۲۰
— شہادت کے معتبر ہونے کے لیے اخلاق وسیرت کا لحاظ ۲۲۰-۵۱۰
— شہادت سے انکار ممنوع ہے ۲۲۰
— کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے ۲۲۱
— شہادت کو چھپانا گناہ ہے ۲۲۲
— معاملات میں شہادت کی اہمیت ۳۲۴
— زنا کی سزا جاری کرنے کے لیے چار گواہوں کی شہادت ۳۳۱
— للہ فی اللہ انصاف کے ساتھ گواہی دینے کا مطالبہ ۴۰۵-۴۰۶
— قرآن حکیم کے لیے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ۴۲۶
— وصیت کے نصاب شہادت ۵۱۰
— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے ۱۱۷
— رسولؐ اللہ پر صحابہ کرام گواہ، صحابہ کرامؓ بعد میں آنے والوں پر گواہ اور ہر گزرنے والی نسل آنے والی نسل پر گواہ ہے ۱۱۹
— تمام انبیائے کرام سے گواہی اور شہادت لی جائے گی کہ ان کی دعوتِ حق پر کیا جواب ان کی قوم کی طرف سے ملا ۵۱۲

(۱۸۴) شہدا

— اللہ کی راہ میں جانیں دینے والوں کی تعریف و توصیف ۳۷۰

(۱۸۵) شیطان

— شیطان لعنت زدہ ہے ۳۹۸
— لفظ شیطان کے معانی ۵۴-۶۵
— سرکش انسانوں کے لیے لفظ شیطان کا استعمال ۵۴
— "الشیطان" سے کیا مراد ہے؟ ۶۵
— شیطان جن کون ہیں؟ ۶۶
— اس کو معبود بنانے کا مفہوم ۳۹۷
— شیاطین کی اطاعت شرک ہے ۵۷۷
— شیطان کا راستہ ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے جو انسان کو بدی اور فحش کی طرف لے جاتا ہے ۱۳۳
— شیطان کی چالیں بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً نہایت کمزور ہوتی ہیں ۳۷۳
— شیطان نے ہی حضرت آدم کو جنت سے نکلوایا ۶۶-۶۷
— انسان کا ازلی دشمن ہے ۶۷=۱۳۳=۱۶۰=۵۹۰
— برائی اور بے حیائی کا داعی ہے ۱۳۳
— شیطان ہی جادو کے موجد ہیں ۹۷
— شیطان کی پیروی نہ کرو ۱۶۰
— وہ انفاق فی سبیل اللہ سے روکنے کے لیے افلاس کا خوف دلاتا ہے ۲۰۷
— شیطان کا چھو کر باؤلا کر دینا ۲۱۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— شیطان بزدلی اور گھبراہٹ پھیلاتا ہے۲۹۷
— اہل ایمان کے دلوں میں دشمنوں کی طاقت وقوت کا رعب ڈالتا ہے۳۰۴
— شیطان کی رفاقت نہایت بری رفاقت ہے۳۵۳
— شیطان کی چالیں نہایت کمزور ہوتی ہیں۳۷۳
— انسان کے بارے میں اس کا چیلنج ۳۹۸
— اس کا سبز باغ دکھانا جب کہ اس کے تمام وعدے فریب ہیں ۳۹۹
— شراب، جوا، آستانے اور پانسے گندے شیطانی کام ہیں۵۰۱-۵۰۲
— شیطان مسلمانوں میں بغض وعداوت ڈالنا چاہتا ہے ۵۰۳
— شیطان کا گمراہی کو خوش نما بنانا ۵۴۰
— وہ انسان کو بھلاوے میں ڈالتا ہے ۵۴۹
— شیاطینِ جن وانس کی دعوتِ انبیا سے دشمنی ۵۷۲
— شیطان کا خوش آیند باتیں القا کرنا اور اس کا مفہوم ۵۷۳
— شیطان کے اپنے ساتھیوں پر شکوک وشبہات اور اعتراضات القا کرنا ۵۷۷
— شیاطین جن سے آخرت میں جواب طلبی اور ان کے لیے دوزخ کی دائمی سزا ۵۸۰
— شیطان کے مکر وفریب سے انسان کا محفوظ رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت وتوفیق کے سبب ہے ورنہ انسان تو گمراہی میں مبتلا ہو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۳۷۷
— حلال وحرام سے متعلق اللہ تعالیٰ کی قیود کے بجائے خود ساختہ قیود اختیار کرنا شیطان کی پیروی کے مترادف ہے۵۹۰-۵۹۱

ص

(۱۸۶) صالحین

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا ۷۰ ۳

(۱۸۷) صبر

— لفظ صبر کے معنی ۷۳-۱۳۷-۲۳۸-۲۹۳
— صبر کی اہمیت ۷۲-۷۳
— "صابروا" کے دو معنی ۳۱۴
— اہل صبر کے لیے اللہ کی نصرت ۱۲۶-۱۹۰-۲۸۶
— باطل کا مقابلہ کرنے میں صبر کی اہمیت ۲۹۳
— آزمائش کے مراحل کے لیے اس کی ضرورت ۳۰۹
— اہل حق کے لیے صبر شرط کامیابی ہے۷۳-۱۲۶-۱۹۰-۲۸۳-۲۹۰-۵۳۵
— دعوت حق کے لیے صبر اور نماز دو بنیادی ضروریات ہیں ۱۲۶
— اہل ایمان کو صبر سے کام لینے، باطل کے مقابلے پر پامردی دکھانے اور حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہنے اور اللہ سے ڈرنے کا حکم تاکہ فلاح پائیں ۳۱۴

(۱۸۸) صِبْغَةَ اللهِ

— اللہ تعالیٰ کا رنگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے سے چڑھتا ہے ۱۱۶

(۱۸۹) صحابہ کرامؓ

— رسولؐ اللہ اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں سے یہ جان چکے تھے کہ حق کیا ہے لیکن جانتے بوجھتے انکار کرتے تھے ۲۶۳-۲۶۴-۲۷۱
— صحابہ کرامؓ پر رسولؐ اللہ، صحابہ کرام بعد میں آنے والوں پر گواہ، اور ہر گزرنے والی نسل بعد میں آنے والی نسل پر گواہ ہے ۱۱۹

(۱۹۰) صدقہ

(دیکھو "انفاق فی سبیل اللہ")

(۱۹۱) صراطِ مستقیم

— اس کا مفہوم ۴۵-۴۵۲ تا ۴۵۴
— اس کے نشانات خوب واضح کر دیے گئے ہیں ۵۸۰
— وہ آیاتِ الٰہی کے ذریعے سے واضح ہوتی ہے ۲۷۷

— صراطِ مستقیم پانے اور اس پر قائم رہنے کی دعا ۴۵
— صراطِ مستقیم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے ذریعے سے بھیجا ہے ۱۰۷
— احکام خداوندی اور احکام رسول اللہؐ پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم کی دولت سے سرفراز فرماتا ہے ۳۶۹-۳۷۰
— صراطِ مستقیم اور ہدایت ایک نعمت ہے، اگر ایک قوم اس کا انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت کسی اور کو سونپ دیتا ہے ۵۶۲
— اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے کہ انسان اپنے فطری عہد کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلے ۴۴۹-۶۰۱
— جو اسلام قبول کر لیں اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جائیں انھیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور انھیں صراطِ مستقیم دکھائے گا ۴۳۱
— اللہ تعالیٰ انسان کو اندھیرے (ضلالت) سے نکال کر روشنی (ہدایت اور نور) کی طرف لے جاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۴۵۶

(۱۹۲) صفا

— اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ۱۲۷

(۱۹۳) صفاتِ الٰہی

— ربوبیت و رزاقی ۴۳-۱۶۲-۲۴۳-۲۴۶-۲۴۸-۲۴۹-۲۶۵-۴۸۵-۵۱۵-۵۲۸-۵۵۱-۶۰۵
— حیات ۱۹۳-۲۳۱
— رحمت ۴۳-۶۷-۱۱۲-۱۴۰-۱۵۰-۱۵۷-۱۷۲-۲۴۵-۲۶۵-۲۷۱-۲۸۷-۲۹۸-۳۳۱-۳۳۹-۳۴۳-۳۴۶-۳۶۸-۳۸۷-۳۹۴-۳۹۵-۴۰۴-۴۴۴-۴۶۶-۴۶۹-۴۹۰-۵۰۶-۵۲۷-۵۴۴-۵۹۲-۶۰۶
— حساب لینا، جزا و سزا دینا اور انتقام لینا ۴۳-۱۳۲-۱۵۵-۱۶۱-۲۲۳-۲۳۳-۲۳۶-۲۴۰-۲۸۷-۴۴۰-۴۴۶-۴۵۵-۴۵۷-۴۶۹-۵۰۵-۵۰۶-۵۴۷-۵۸۲-۶۰۶
— خلق، ایجاد، صورت گری ۱۰۵-۲۳۳-۲۵۲-۳۱۹-۴۵۷-۵۲۳-۵۲۷-۵۵۱-۵۵۸-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۸۹
— علم و خبر ۶۱-۶۴-۸۸-۱۱۶-۱۱۸-۱۲۲-۱۲۴-۱۲۸-۱۴۰-۱۶۴-۱۶۸-۱۷۲-۱۷۷-۱۷۸-۱۸۰-۱۸۵-۱۸۸-۱۹۴-۲۰۳-۲۰۷-۲۰۸-۲۲۱-۲۲۲-۲۳۳-۲۴۴-۲۴۶-۲۶۳-۲۶۵-۲۷۳-۲۷۵-۲۸۵-۲۹۵-۲۹۷-۳۰۶-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۲-۳۴۱-۳۴۳-۳۴۷-۳۵۰-۳۵۴-۳۶۸-۳۷۰-۳۸۳-۳۸۵-۳۹۳-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۶-۴۱۲-۴۱۳-۴۲۷-۴۳۲-۴۴۹-۴۸۲-۴۹۱-۵۰۵-۵۰۶-۵۱۶-۵۲۴-۵۲۷-۵۲۸-۵۴۴-۵۴۶-۵۵۲-۵۵۸-۵۶۰-۵۶۶-۵۶۸-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۸۱-۵۸۸
— توبہ قبول کرنا ۶۷-۷۶-۱۱۲
— نرمی کرنا اور معاف کرنا ۱۴۰-۱۵۰-۱۵۷-۱۷۱-۱۷۲-۱۸۱-۲۰۴-۲۲۳-۲۷۱-۲۸۷-۲۸۹-۲۹۷-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۹-۳۴۳-۳۴۴-۳۵۵-۳۵۸-۳۶۸-۳۸۷-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۷-۴۰۴-۴۱۳-۴۴۴-۴۵۷-۴۶۶-۴۶۸-۴۶۹-۴۹۰-۵۰۶-۵۰۷-۵۴۴-۵۹۲-۶۰۶
— قوت، قدرت، اختیار، احاطہ، غلبہ ۵۶-۶۸-۹۹-۱۰۱-۱۰۳-۱۲۳-۱۳۲-۱۶۰-۱۶۸-۱۷۴-۱۸۳-۱۸۵-۱۸۸-۱۹۲-۲۰۱-۲۰۲-۲۲۳-۲۳۳-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۹-۲۶۱-۲۶۵-۲۸۴-۲۸۶-۲۸۷-۳۰۱-۳۱۰-۳۴۶-۳۶۱-۳۹۵-۴۰۴-۴۱۳-

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۲۰-۴۲۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۸-۴۶۹-
۵۱۷-۵۲۸-۵۳۷-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-
۵۴۸-۵۵۲-۵۵۸-۵۶۶-۵۶۸-۵۸۳
— حاکمیت، اقتدار، پادشاہی ۱۰۲-۱۰۵-۱۱۲-
۱۹۴-۱۹۵-۳۱۰-۳۵۸-۴۳۸-۴۷۹-
۵۱۷-۵۵۲
— کارساز، ولی و مددگار، وکیل ۱۰۲-۳۵۷-
۳۷۶-۴۰۴-۴۲۹-۵۶۸
— حکمت ۶۴-۱۱۲-۱۶۰-۱۶۸-۱۷۴-۱۸۳-
۲۰۲-۲۳۳-۲۳۹-۲۶۱-۲۸۷-۳۲۸-
۳۳۲-۳۴۱-۳۴۳-۳۶۱-۳۸۳-۳۹۳-
۴۰۴-۴۲۰-۴۲۶-۴۲۷-۴۶۸-۵۱۷-
۵۲۸-۵۵۲-۵۶۰-۵۸۱-۵۸۸
— نگراں، بصیر ۱۰۳-۱۷۹-۱۸۲-۲۰۵-۲۳۸-
۲۴۱-۲۹۸-۳۰۰-۳۱۹-۳۴۸-۳۶۲-
۳۷۸-۴۰۵-۴۸۹-۵۱۶
— واسع ۱۰۵-۱۸۸-۲۰۳-۲۰۷-۲۶۵-۴۰۴-
۴۸۲
— سمیع ۱۱۶-۱۴۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۸۵-۲۴۶-
۲۴۸-۳۸۵-۳۶۲-۴۰۵-۴۱۳-۴۹۱-
۵۲۷-۵۷۵
— مالک ۱۱۸-۱۹۴-۲۲۲-۲۴۳-۲۷۹-۲۸۷-
۳۰۶-۳۱۰-۴۰۴-۴۲۷-۴۲۹-۴۵۷-
۴۵۸-۴۶۹-۵۲۶
— شاکر و قدردان ۱۲۸-۴۱۲
— ہادی و مضل ۱۶۳-۲۰۵-۲۰۹-۳۸۰
— فریادرس ۱۴۴
— فیصلہ کرنے والا، حساب لینے والا ۱۵۸-۳۷۸-
۴۰۹
— مدبر، قیوم، منتظم، فعال ۱۹۳-۲۳۱-۲۴۳-
۲۵۷-۲۷۹-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷
— عیوب، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ۱۹۴-
۴۲۹-۵۶۸
— بے نیاز ۲۰۴-۲۰۷-۲۷۵-۴۰۴
— بزرگی، برتری، علو، کبریائی ۱۹۵-۳۵۰-۵۶۸
— تمام خوبیوں کا جامع، لائق ستائش ۴۳-۲۰۷-
۴۰۴-۵۲۳-۵۴۱
— اس کے وعدوں کا اٹل ہونا ۲۳۶-۳۹۹
— مارنے اور جلانے والا ۲۹۷-۵۲۴-۵۳۷-
۵۶۵-۵۸۰-۵۸۲
— انصاف کرنے والا، ظلم سے پاک ۳۰۷-۵۷۴
— لامکانیت، معیت ۳۹۵

(۱۹۵) ضلالت

— اسبابِ ضلالت
(۱) ہر طرف پھیلی ہوئی حق کی نشانیوں کے باوجود معجزوں کا مطالبہ ۱۰۵-۱۰۶
(۲) بے علم ہونا گمراہی کی اوّلین سیڑھی ہے ۱۳۳
(۳) باپ دادا کی اندھی پیروی کرنا ۱۳۳
(۴) شرک میں مبتلا ہونا ۱۳۱-۳۵۸ تا ۳۶۰-
۳۹۷-۵۹۷
(۵) محض اپنے خود ساختہ وقار کی خاطر گناہ پر جمے رہنا ۱۵۹
(۶) انکارِ آخرت ہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے
۵۷۳-۵۷۴-۵۹۷
(۷) محض قیاس اور گمان کی پیروی کرنا ۵۷۵-
۵۷۶
(۸) علم کے بجائے محض قیاس اور گمان کی پیروی کرنا ۵۹۵
(۹) اللہ کی آیات کو جھٹلانا ۵۹۷
— اہلِ ضلالت اللہ کے معتوب ہیں ۴۵
— اللہ تعالیٰ گمراہی میں فاسقین ہی کو مبتلا کرتا ہے ۶۰
— اسلام نے جرم کو ظلم قرار دیا ہے ۴۶۸
— انسان کسی کے ساتھ ظلم کرتا ہے تو اس کے گناہ بھی سمیٹتا ہے ۴۶۲
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کو فتنے میں ڈالنے کا مفہوم کیا ہے؟ ۴۷۱

— قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے لازمی نتائج ہیں ۵۲
— بنی اسرائیل پر حق عین واضح تھا لیکن اپنے نفس کے حسد کی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ راہِ راست کو مشکوک کر دیں ۱۰۳
— شیطان کا راستہ ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے اور انسان کو بدی اور فحش کی طرف لے جاتا ہے ۱۳۳
— ہدایت کے بدلے ضلالت کمانے والے دراصل مغفرت کے بجائے عذاب الٰہی مول لے رہے ہیں ۱۳۶-۱۳۵
— ضلالت کی طرف دوسروں کو مائل کرنے والے دراصل خود اپنے آپ کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۲۶۳ - ۵۷۹-۵۸۰
— بڑے اور چھوٹے گناہوں میں کیا فرق ہے؟ ۳۴۶-۳۴۷
— کون لوگ پکے گمراہ ہیں؟ ۲۷۱-۲۷۲
— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ان کے حساب کتاب سے ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷-۴۵۱
— اللہ تعالیٰ انسان کو گناہوں کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹-۵۵۰
— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام مال کھاتے ہیں ۴۸۴
— ضلالت و گمراہی اختیار کرنے والے خود اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرتے ہیں ۵۲۹
— دعوت حق کو ''پرانی باتیں'' اور ''قصۂ پارینہ'' قرار دینا ہر زمانے میں اہل ضلالت کا طریقہ رہا ہے ۵۳۱
— شیطان انسان کو درست رویہ اختیار نہیں کرنے دیتا اور اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو بالکل درست ہے ۵۴۰
— اللہ تعالیٰ اگر راہ نمائی نہ کرے تو انسان گمراہ ہو کر رہے گا ۵۵۶
— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ ہی حق کے مخالف رہے ہیں اور ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— ضلالت مردہ اور موت کی حالت ہے اور زندگی سے مراد حقیقت شناسی کی حالت ہے ۵۷۸-۵۷۹
— اہل کتاب پر ان کی باطل پرستی کے باعث اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑی ہے اور وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸
— ضلالت و گمراہی کے ساتھ انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸-۳۹۴-۳۹۵
— شیطان کے مکر و فریب سے انسان کا محفوظ رہنا بھی صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت کے سبب ہے ورنہ انسان گمراہی کی طرف میلان رکھتا ہے ۳۷۷
— ہدایت و ضلالت کا مکمل انحصار انسان کی اپنی سعی و طلب اور چاہت پر ہے ۴۱۰-۴۱۱
— ضلالت و گمراہی میں پھنسے ہوئے انسان کو نہ کوئی سفارشی اور حامی و مددگار ملے گا اور نہ وہ فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے ۵۵۰
— جو قرآن کی بصیرت سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا پاسبان نہیں ہے ۵۶۸-۵۶۹
— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی گمراہی اور شرک میں مبتلا نہ ہوتا ۵۷۰
— اللہ تعالیٰ گمراہوں کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیتا ہے ۵۷۱
— کھلی اور چھپی ہر گمراہی اور گناہ سے بچو کیونکہ ہر انسان اپنی ہر کارکردگی کا بدلہ پا کر رہے گا ۵۷۷
— اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت و رشد بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو ضلالت میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا دل تنگ کرتا ہے اور اسلام کا تصور ہی اسے پریشان کر دیتا ہے ۵۷۹-۵۸۰
— اہل ضلالت روز قیامت اقرار کریں گے کہ انھیں دنیا میں راہِ ہدایت دکھائی گئی تھی لیکن ہم نے بات

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں مانی ۵۸۱
— اہل ضلالت کا استدلال کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی ہے کہ ہم گمراہ رہیں، اس کا جواب ۵۹۵
— اللہ تعالیٰ جس انسان کو گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۸۰
— اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی سزا اور پکڑ بہت سخت ہے ۴۴۰
— اگر کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ۳۹۵
— اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت شامل نہ ہو تو انسان گمراہی سے بچ نہیں سکتا ۳۹۶
— جس شخص نے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈال دیا اس نے صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا ۳۹۵-۳۹۶
— راہ راست واضح ہو جانے کے بعد بھی جو باطل کی راہ پر چلے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلائے گا جو خود اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے ۳۹۷
— باطل پرستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دلوں پر ٹھپا لگا دیتا ہے جس کی وجہ سے توفیقِ ہدایت سلب ہو جاتی ہے ۴۱۶
— نیکی کے کام میں تعاون اور گمراہی کے کام میں تعاون نہ کرو ۴۴۰
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴
— ہدایت کی موجودگی اور وضاحت کے بعد ضلالت و گمراہی کا ہرگز کوئی جواز نہیں رہ جاتا ۲۷۶

(۱۹۵) طاغوت

— لفظ طاغوت کے معنی ۳۵۹-۳۶۷
— اس کی مختلف اقسام ۱۹۷
— بندگی کے رویے سے انحراف کا تیسرا مرتبہ ۱۹۶
— اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے طاغوت سے انکار ضروری ہے ۱۹۷-۳۶۷
— معاملات میں طاغوت کی طرف رجوع کرنا منافی ایمان ہے ۳۶۶
— طاغوت کی راہ میں لڑنا کفر ہے ۳۷۳
— مومن کا حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جو اس کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے جبکہ کفار کا مددگار طاغوت ہے جو انھیں روشنیوں سے تاریکی کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۷-۲۰۲
— ایمان اور طاغوت کی کشمکش کی حقیقت پر حضرت ابراہیم اور انسانی تاریخ سے تین مثالیں ۱۹۷-۲۰۲
— طاغوت اور شیطان کی چالیں اگرچہ بظاہر بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن اصل میں نہایت کمزور ہیں ۳۷۳
— یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب وارد ہوا کیونکہ انہوں نے طاغوت کی بندگی اختیار کی ۴۸۴

(۱۹۶) طالوت

— طالوت کا لشکر اور بادشاہت کے لیے اس کا تقرر قرار پایا ۱۸۷ تا ۱۸۹

(۱۹۷) طلاق

— اسلام کا قانونِ نکاح ۱۷۵-۱۷۸
— مطلقہ عورتوں کے لیے عدت کا حکم ۱۷۲-۱۷۳
— رجعت ۱۷۳-۱۷۴
— طلاق کا درست طریقہ ۱۷۴
— طلاق سہ گانہ پر قطعی انقطاع اور علیحدگی ۱۷۶
— سازشی حلالے کی حیثیت ۱۷۶
— علیحدگی کی صورت میں شریفانہ رویے کی تلقین ۱۷۴
— طلاق کو ہرگز ضرر رسانی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ۱۷۶
— علیحدگی کی صورت میں بچوں کی رضاعت کا معاملہ ۱۷۸
— ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دینے کی صورت ۱۸۱
— مطلقہ عورت جب عدت گزار لے تو اپنی مرضی سے دوبارہ نکاح کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے ۱۷۷
— طلاق اور مکمل جدائی سے بہتر ہے کہ زوجین باہمی مصالحت کر لیں ۴۰۲
— اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ

تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دامن نہایت کشادہ ہے۴۰۴
— طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے۳۳۴

(۱۹۸) طور

— بنی اسرائیل پر طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا۸۳
— بنی اسرائیل کو ''فرمان'' دینے کا واقعہ۴۱۶

(۱۹۹) طہارت و پاکیزگی

— حیض کی ماہیت ۱۶۹
— حالت حیض میں مقاربت کی ممانعت ۱۶۹
— حالت حیض کے متعلق مشرکین اور یہود کا طریقہ ۳۴۵
— غسل جنابت ۳۵-۴۴۸
— تیمم ۳۱۶-۳۵۵-۳۵۶-۴۴۸

(۲۰۰) ظلم، ظالم، ظالمین

— قرآنی اصطلاح میں ظلم سے کیا مراد ہے؟ ۶۶
— اللہ تعالیٰ کی مساجد میں عبادت سے روکنا اور ان کو ویران کرنا ظلم ہے۱۰۴
— خدا کے دیے ہوئے علم کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کرنا ظلم ہے۱۲۲
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو ناپسند کرتا ہے ۲۵۹
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ۲۷۱-۴۸۰-۵۹۱
— مظلوم کے لیے بدکلامی کی رخصت ۴۱۳
— جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۴۷۴
— اللہ تعالیٰ پر بہتان لگانے اور آیاتِ الٰہی کو جھلانے والے سب سے بڑھ کر ظالم ہیں ۵۲۹
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ہے ۵۳۰
— آیاتِ الٰہی پر نکتہ چینی کرنے والے ظالم ہیں ۵۴۹
— شرک ظلم ہے ۵۵۹
— ظالمین کا ٹھکانا جہنم ہے۲۹۴-۴۸۹
— اللہ پر بہتان باندھ کر نبوت کا دعویٰ کرنا ظلم ہے ۵۶۴
— ظالموں کی حالت سکراتِ موت کے عالم میں ۵۶۴
— افترا علی اللہ انتہائی ظلم ہے۵۹۱
— ظالم تین بنیادی حقوق تلف کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں ۶۶-۶۷
— بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۹۷
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا ۲۰۰
— یہودی کتمان حق کر کے ظلم کے مرتکب ہوئے ۲۷۱
— ظالم وہ لوگ ہیں جو اپنی گھڑی ہوئی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۲۷۳
— انسان کو قتل کرنے والے ظالم ہیں۴۶۲
— ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۵۸۳
— سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو حلال و حرام اور قوانین سے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرے اور علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے۵۹۱

(۲۰۱) عبادت

— صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے اور صرف اسی سے مانگنا درست ہے۴۴-۴۵
— عبادت بمعنی پرستش، اطاعت اور بندگی ۴۴-۴۵
— عبادت کا وسیع ترین مفہوم ۵۷
— صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ۴۴-۵۷-۱۱۷-۲۶۲-۳۵۱-۴۹۱-۵۶۸
— عبادت بمعنی اطاعت قانون ۱۳۴
— کسی کی بے چون و چرا اطاعت اس کی عبادت ہے ۳۹۸
— یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے عہد لیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۱۱۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف اللہ کی بندگی و عبادت کی طرف تھی۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— عبادت کا مستحق صرف وہی ہے جو نفع ونقصان کا مکمل اختیار رکھتا ہو۴۹۱
— اہل کتاب کو قرآن حکیم کی دعوت کہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبادت کرو۲۶۲
— تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے کی تلقین کیونکہ یہی دنیا وآخرت کی فلاح کا باعث ہو سکتی ہے۵۷تا۶۱
— اللہ تعالیٰ کی عبادت وذکر سے اللہ تعالیٰ بھی بندے کو یاد کرتا ہے۱۲۵
— عبادت کی مقدار نہیں بلکہ اس میں تقویٰ کی مقدار اہم ہے۱۵۸-۱۵۹
— تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۶۰۵
— روزہ محض عبادت ہی نہیں بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے ۱۴۳
— عبادت کے تعین اوقات کے لیے اسلام نے ایک باقاعدہ نظام وضع کیا ہے اور اس معاملے میں بے جا تشدد پسند نہیں کیا۱۴۵-۱۴۶
— صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کی جانی چاہیے کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ مقرر ہوا ہے ۶۱ تا ۶۹
— اللہ تعالیٰ کی خدائی نہایت وسیع ہے اور وہی عبادت کا واحد حق دار ہے۱۰۵
— انسانوں کی عبادت سے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے ۵۸۲-۵۸۳
— جو لوگ مسجدوں میں لوگوں کو عبادت سے روکتے ہیں اور مسجدوں کی ویرانی چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۱۰۴
— طاغوت کی عبادت موجب لعنت ہے۴۸۴
— غیر اللہ کی عبادت قطعاً ممنوع ہے۹۰-۵۴۵
— اللہ تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑنا موجب عذاب ہے۴۳۰
— فرائض کی کھلم کھلا اور علانیہ انجام دہی کو پسند کیا گیا ہے۲۰۸

(۲۰۵) عدت

— بصورتِ وفاتِ شوہر۱۷۹-۱۸۰
— بصورتِ طلاق۱۷۲-۱۷۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’طلاق‘)
— عدت کے احکام۱۷۳-۱۷۴
— عدت گزارنے کے بعد عورت معروف طریقے سے عقد ثانی اور زندگی گزارنے کے لیے مکمل آزاد ہے ۱۸۰

(۲۰۳) عدالت

— قانون کے نفاذ میں لوگوں سے نہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو رشوت وخوف کے ذریعے سے فروخت نہیں کرنا چاہیے۴۷۶
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا حکم۴۷۶-۴۷۷

(۲۰۴) عدل

— اہل ایمان کو عدل وانصاف کی ہدایت۳۶۳
— عدل وانصاف تقویٰ کے قریب تر ہے۴۴۹
— اللہ تعالیٰ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والا اور انصاف کی گواہی دینے والا ہی مسلم ہے۴۴۹
— اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۴۷۲
— قرآن حکیم حق کے ساتھ نازل کیا گیا تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے۳۹۲ تا ۳۹۴
— قاضی کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت ہی درست فیصلے کی طرف لے جاسکتے ہیں۳۹۶
— عدل کے مطابق رسولؐ اللہ کے ایک فیصلے کی مثال جب اللہ تعالیٰ کی مداخلت پر رسولؐ اللہ نے جتھا

بندی اور عصبیت سے ہٹ کر فیصلہ فرمایا ۳۹۳-۳۹۶
— انصاف کی گواہی دینے کا حکم، عدل میں گروہی دشمنی کو الگ رکھ کر فیصلہ کرنے کا حکم جو خدا ترسی کے قریب ہے ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے کی سخت ممانعت ۴۷۶-۴۷۷
— اہل یہود کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور حرام کا مال کھانے والے ہیں ۴۷۱
— ایسے منافقانہ رویے کی مذمت کہ اپنی مرضی کا فیصلہ متوقع ہو تب ہی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے ۳۶۷
— جو شخص حاکم اور منصف کو دھوکا دیتا ہے وہ دراصل خود کو دھوکا دیتا ہے ۳۹۶-۳۹۷

(۲۰۵) عذابِ الٰہی

— کس قسم کے لوگوں کے لیے ہے؟ ۵۲-۷۹-۹۱-۹۴-۱۰۱-۱۰۵-۱۳۰-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۹-۱۵۵-۱۶۱-۲۳۳-۲۳۶-۲۴۱-۲۵۹-۲۶۶-۲۷۸-۳۰۷-۳۳۳-۳۵۲-۴۲۳-۴۹۰-۵۴۱-۵۵۰-۵۷۹
— کسی فدیہ اور رشوت سے ٹل نہیں سکتا ۲۷-۵۵۰
— اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے کا مطلب دنیا و آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب ہے ۸۰-۸۱-۵۴۱
— اگر لوگ ایمان اور شکر کی روش پر چلیں تو اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ عذاب مسلط کرنے والا نہیں ہے ۴۱۲-۴۱۳
— قائم رہنے والا ہمیشگی کا عذاب ۴۶۷
— عذاب الٰہی ایسی چیز ہے جس سے ڈرنا چاہیے ۵۲۸
— دنیا میں عذاب مسلط ہونے سے پہلے مجرمین پر خوشحالی کا دور دورہ ۵۴۰
— عذاب آخرت کی تفصیلات ۴۱۴-۵۵۰
— مجرموں سے عذاب الٰہی کو پھیرا نہیں جا سکتا ۹۴
— جس نے بھی حق کو جھٹلایا وہ خدا کے عذاب کا مزا چکھ کر رہے گا ۵۹۵
— دنیوی سزا آخرت کے عذاب سے نہیں بچا سکتی ۴۶۵
— عذاب دنیا کی مختلف صورتیں ۵۴۸
— عذاب دنیا خبردار کرنے کے بعد نازل کیا جاتا ہے ۵۸۲
— دنیا اور آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب کن کے لیے ہے؟ ۹۱
— قانونِ مکافات کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں بھی ذلت والا عذاب ہے ۴۶۵
— دنیا میں اقوام پر عذاب الٰہی ان کے گناہوں کی پاداش میں ہی آتا ہے ۵۲۵
— زمین میں چل پھر کر مغضوب قوموں کے انجام بد دیکھنے کی فہمائش ۵۲۶
— دنیا میں افراد، معاشروں اور اقوام کے اختلافات اور باہمی جنگ و جدل بھی عذاب الٰہی کی صورتیں ہیں ۵۴۸
— نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور نافرمانوں کو مزید عذاب الٰہی کی وعید دی گئی ہے ۷۸
— عذاب الٰہی کی مختلف صورتیں اور بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا بندر بنایا جانا ۸۴
— عذاب آ جانے کے بعد مہلت اور رجوع کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے ۱۳۱-۱۳۲
— ساری طاقتیں اور اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جو سزا دینے میں بہت سخت ہے ۱۳۲
— اہل ایمان کو چھوڑنے اور کافروں کو رفیق و دوست بنانے والے اللہ تعالیٰ کو سخت عذاب نازل کرنے کے لیے صریح حجت اور جواز فراہم کر رہے ہیں ۴۱۱
— اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی پکڑ اور سزا بہت سخت ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۴۰

— اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹

— اللہ تعالیٰ کائنات کی سلطنت کا مالک ہے، جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۴۶۹

— اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان اس کی مخلوق ہیں اور برابر ہیں، جس کو چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے ۴۵۷

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت درگزر کرنے والی ہستی بھی ہے ۵۰۶

— اللہ تعالیٰ جب پکڑتا ہے تو انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور یہی انجام ظالموں کا مقدر ہے ۵۴۰-۵۴۱

— اللہ تعالیٰ چاہے تو منکرین حق کو عذاب میں تباہ کر کے رکھ دے اور ان کی جگہ دوسری نسل اٹھائے جس طرح ہمیں بھی کسی نسل سے اٹھایا گیا ہے ۵۸۳

— اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام ایک روشن دلیل پر ہوتے ہیں لیکن مخالفین ان دلائل کو جھٹلاتے ہیں عذاب لانا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و فیصلہ ہے کہ کتنی ڈھیل دی جائے، اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶

(۲۰۶) عرب

— اہل عرب کی بعثت نبویؐ کے وقت کیا حالت تھی؟ ۸۸-۱۳۸

— ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی معاشرتی حالت ۲۷۷

— عرب کے توہمات ۳۹۸

— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے تھا لیکن عرب جاہلیت میں اس کو عجیب و غریب معانی پہنائے جاتے تھے ۱۴۷-۱۴۸

— جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا ۱۵۵

— جاہلیت کے قانون طلاق کی اصلاح ۱۷۴-۱۷۵

— جاہلی عرب میں بے مقصد مختلف جانوروں کو بے وجہ اور بے دلیل تقدس کا درجہ دیا جاتا تھا ۵۰۸-۵۰۹

— اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ کھیتوں اور جانوروں میں اللہ کے ساتھ ساتھ خود ساختہ معبودوں کا حصہ مقرر کرنے کی مذمت ۵۸۴-۵۸۵

— اہل عرب کی جاہلی روایات کی تردید اور مذمت ۵۸۷-۵۸۸-۵۹۰-۵۹۱

— عرب معاشرے میں قتل اولاد کی صورتیں، یہ ہولناک کام مشرکین کے معبودوں نے ان کے لیے آسان کر دیا حالانکہ یہ ان کے لیے سراسر ہلاکت ہی ہلاکت تھا ۵۸۵ تا ۵۸۸

— کیا قرآن حکیم صرف عربوں کے لیے ہی آیا تھا؟ ۳۵ تا ۳۷

— یہودیوں کو عربوں پر علمی برتری حاصل تھی ۲۷

— عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور راہ نما مانتے تھے ۵۵۳

— قرآن ایک خیر و برکت والی کتاب ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اہل عرب کو متنبہ کرتی ہے ۵۶۳

— اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب اس بات پر جلتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل (نبوت) صرف رسولؐ اللہ ہی کو کیوں نصیب ہوئی ۱۰۱

(۲۰۷) عرفات

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۲۰۸) عزت

— قرآن کا معیارِ عزت و شرف ۵۴۴-۵۶۰

— ایمان لانا اور نیک عمل کرنا اصل معیارِ عزت و شرف ہے، دنیوی دولت ہرگز نہیں ہے ۵۴۴

— تلاشِ حق میں کامیابی ہی اصل عزت ہے ۵۶۰

— جھوٹی عزت کی طلب میں غیر مسلموں سے تعلقات رکھنے والے یاد رکھیں کہ عزت ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ۴۰۸

(۲۰۹) عکرمہ (بن ابی جہل)

— قبول اسلام کا واقعہ ۵۳۹-۵۴۰

(۲۱۰) عقل وفکر اور علم

— ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴

— عقل منداور دانش منداہل ایمان کی دعا ۲۳۵

— عقل استعمال نہ کرنے والوں کی مذمت ۴۸۳

— عقل وخرد سے قرآن حکیم کی اپیل ۱۳۰ تا ۱۳۳-۵۰۷-۵۴۲

— عقل کا استعمال نہ کیا جائے تو انسان گمراہ ہو جاتا ہے ۵۰۹

— متقین نے عقل سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ دنیا ایک کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور آخرت ہی اصل مقام ومقصود ہے ۵۳۳-۵۳۴

— زندہ ضمیر اور عقل وفکر استعمال کرنے والوں کو زندہ اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے ۵۳۶-۵۳۷

— عقل وفکر والوں کے لیے کائنات میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۵۳۷-۵۳۸

— اللہ تعالیٰ نے درست سمت عین واضح کر دی ہے اور آگے عقل وفکر سے کام لینے کا حکم دیا ہے ۵۹۹

— اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور علم کا سرچشمہ ہے ۶۱-۵۴۶

— انسان کے علم کے حدود کیا ہیں؟ ۶۳

— اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا ہے ۶۳-۶۴

— کائنات کی تمام حقیقتیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور ہم سے مخفی ہیں ۶۴

— انسان اور فرشتوں کے علم کا تقابل ۶۴

— علم سے بے بہرہ لوگ بے بنیاد امیدوں، آرزوؤں اور وہم وگمان کے سہارے چل رہے ہیں ۸۸

— یہودی اہل علم رسولؐ اللہ کی حقانیت جانتے بوجھتے صرف اپنی دکان داری ختم ہونے کے خوف سے حق کو چھپاتے تھے ۸۸-۸۹

— علم کے ہوتے ہوئے جو خواہشات کی پیروی کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی مددگار اور دوست نہیں ملے گا ۱۰۷

— علم رکھتے ہوئے باطل اختیار کرنے والے ظالم ہیں ۱۲۲

— علم کے بغیر کوئی راستہ اختیار کرنا عین گمراہی کا راستہ ہے ۱۳۳

— علم وہی انسان کے بس میں ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت انسان کو دینا چاہے ۱۹۴

— اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق ومدبر ہے، اس حقیقت پر فرشتوں اور اہل علم ودانش کی شہادت بھی ہے ۲۳۹

— حقیقت جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا علم ہی کافی ہے ۳۷۰

— علم میں راسخ افراد ایمان لاتے ہیں ۴۲۳-۴۲۴

— اسلام کی ضد جاہلیت اور بے علمی ہے ۴۷۹

— علمی طریقے پر آثار قیامت کا مشاہدہ کرنے کا حکم ۵۲۷-۵۳۷-۵۵۶-۵۶۴ تا ۵۶۷

— قرآن حکیم کے اصل مخاطب علم کے حامل اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں ۵۶۶

— اللہ تعالیٰ اپنی آیات بار بار مختلف طریقے سے بیان کرتا ہے تاکہ صاحب علم حضرات پر حقیقت روشن ہو جائے ۵۶۹

— علم کے بجائے محض گمان اور قیاس کی پیروی انسان کو گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے ۵۹۵

(۲۱۱) علمائے کرام

— علمائے کرام کے درمیان جائز اور حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلاف کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— علمائے یہود کی اس خوش فہمی کی مذمت کہ ان کے لیے چند روزہ عذاب آخرت ہے پھر جنت ان کا مقدر ہے ۸۹
— علمائے یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۱۲۸
— جو لوگ احکام کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کی خاطر انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن گئے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— علمائے کرام، ربانی، احبار اور مشائخ کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو گناہ و گمراہی سے روکیں اور حرام نہ کھانے کی تلقین کریں ۴۸۴

(۲۱۲) عمران

— اِمْرَاَتُ عِمْرٰنَ کے دو مفہوم ۲۴۷

(۲۱۳) عمرہ

— عمرے اور حج کے احکام ۱۵۳-۱۵۴
— حج اور عمرے کا فرق ۱۲۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۲۱۴) عمل صالح

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم اور ان پر عامل لوگوں کا انعام ۵۸-۵۹-۸۲
— نجات کسی مومن، یہودی، صابی، عیسائی کی اجارہ داری نہیں بلکہ اصل نجات کا راستہ ایمان کے ساتھ عمل صالح میں ہے ۸۲

(۲۱۵) عورت

— معاشرت میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۳-۱۷۷-۱۸۰-۱۸۳-۳۲۵-۳۲۶-۳۳۳-۳۴۸-۳۴۹
— عورتوں کے حقوق ۱۶۹-۱۷۳-۱۸۰
— عورتوں کے اخلاقی فرائض ۱۷۳
— قانون شہادت میں ان کی گواہی ۲۲۰
— عورتوں کے معاشی حقوق ۳۴۴
— بہترین بیوی کی صفات ۳۴۹
— عورت سے شوہر کی اطاعت کا مطالبہ کہاں تک ہے؟ ۳۴۹
— عورت کا حصہ آدھا کیوں؟ ۳۲۵-۳۲۶
— عورتوں پر مردوں کو ایک درجہ حاصل ہے ۱۷۳
— عورت کا حصہ شوہر کے ترکے میں ۳۲۸
— عورت اپنی عدت کی مدت گزارنے کے بعد معروف طریقے سے اپنی آیندہ زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے ۱۸۰-۳۳۳-۳۳۴
— اللہ تعالیٰ کا بے لاگ معیار جزا و سزا عورت و مرد، غلام و آقا اور کالے اور گورے سب کے لیے ایک ہے ۳۱۲-۳۱۳-۳۹۹-۴۰۰
— جرم کی سزا مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی ہے، جنس کی بنا پر کوئی رعایت نہیں ہے ۳۳۱-۳۳۲

(۲۱۶) عہد

— اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد توڑنے کی سزا ۲۶۶-۲۶۷-۴۵۴
— عہد جو انبیائے کرام سے لیا گیا ۹۰-۹۵-۳۰۹-۳۱۰-۴۵۱
— عہد جو بنی اسرائیل سے لیا گیا ۴۱۶
— مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے عہد پر کاربند رہنے کی تاکید ۴۴۹
— سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کا عہد ۴۴۹
— عیسائیوں سے بھی عہد لیا گیا اور انھوں نے بھی عہد شکنی کی ۴۵۵
— اللہ تعالیٰ کے عہد کے تین مفہوم ۶۰۰
— فطری عہد کی توضیح ۶۰۰
— فطری عہد کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلے ۶۰۱
— اسلام خفیہ عہد کا قائل نہیں ہے، جو کچھ طے ہو ظاہر اور صاف ہو ۱۸۰
— عہد سے پھرنے والے فاسق ہیں ۲۶۹
— اسلام وعدے، عہد اور معاہدے کا اس قدر احترام

کرتا ہے کہ اگر کوئی واجب القتل منافق کسی معاہد قوم میں پناہ لے لے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا ۳۸۰ تا ۳۸۲

(۲۱۷) عیسیٰ علیہ السلام

— عقیدۂ الوہیت ۲۵۷-۲۵۸
— انھیں راہ راست دکھائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے، اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— آپ کو ''اللہ کا فرمان'' کیوں کہا گیا؟ ۲۴۹
— معجزانہ پیدائش کی وجہ سے آپ الٰہ نہیں قرار پا سکتے ۲۵۰-۲۵۱-۴۱۷-۴۵۷
— حضرت آدم علیہ السلام سے آپ کی وجہ تشبیہ ۲۵۹
— آپ کے کلمۃ اللہ ہونے اور حضرت مریم پر بھیجے جانے کا مفہوم ۴۲۶-۴۲۷
— ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' یا ''روح من جانب اللہ'' کا مطلب ۴۲۸
— آپ اور آپ کی والدہ اللہ تعالیٰ کی بے اختیار رعیت ہیں ۴۵۷
— آپ اور آپ کی والدہ کی بشریت ۴۹۰
— حضرت عیسیٰ سے نت نئے معجزات کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۵۱۴
— آپ کے خاص معجزات ۲۵۲-۲۵۳
— آپ کا اٹھایا جانا ۲۵۸
— آپ کے قتل ہونے اور صلیب دیے جانے کی تردید ۴۱۸
— واقعہ صلیب سے پہلے آپ کا اٹھایا جانا ۴۱۸=۴۱۹
— واقعہ رفع کی غیر معمولی نوعیت ۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کی صلیب کے واقعے پر یہودیوں اور عیسائیوں میں پائے جانے والے خیالات غلط ہیں اور محض گمان کی پیروی ہیں ۴۱۹=۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا جا سکا بلکہ زبردست طاقت اور حکمت والے نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا ۴۱۸ تا ۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کے ظہور ثانی پر تمام اہل کتاب بھی ان پر ایمان لے آئیں گے ۴۲۰-۴۲۲
— عیسائیوں کے عقیدہ برائے تثلیث کی تردید ۴۲۸-۴۳۰
— حضرت عیسیٰ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتے تھے لیکن لوگوں نے انھیں رب قرار دے دیا ۴۸۹
— حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ یا خود اللہ قرار دینے والے سراسر کفر کر رہے ہیں ۴۸۹
— آپ کے خلاف بنی اسرائیل کی زیادتیاں ۸۱-۴۱۷
— آپ کے فضائل ۹۲
— آپ کی مدد کے لیے روح القدس ۱۹۲
— آپ تورات اور انجیل کی تعلیم دینے آئے تھے ۲۵۲
— آپ تورات کے مصدق تھے ۲۵۳-۴۷۴
— آپ وہی دین لائے جو حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیائے کرام کا دین تھا ۲۵۳
— آپ کی اصل دعوت یہی تھی کہ اللہ کے حکم پر ان کی اطاعت کی جائے ۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— بائبل میں آپ کی دعوت کے آثار ۲۵۵-۲۵۶
— توفی کا مفہوم ۲۵۷-۴۲۱
— اللہ کی طرف سے آپ کو منکرین پر فوقیت دینے کا وعدہ ۲۵۸
— بنی اسرائیل کے کفر پر آپ کا مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ کی عام پکار بلند کرنا ۲۵۶
— آپ کی دعوت وہی تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ۲۶۰
— آپ کی موت سے قبل تمام اہل کتاب کا آپ پر ایمان لانے کا مفہوم ۴۲۱
— آپ کے بارے میں اہل کتاب کا غلو ۴۲۷
— انجیل میں آپ کے اقوال توحید پر مشتمل ہیں ۴۲۸
— آپ کا مقام عبدیت ہے ۴۳۰
— عیسائیوں کا آپ کو خدا قرار دینا ۴۵۶
— آپ کی حیثیت خدا کا رسول ہونے سے زیادہ کچھ نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

تھی ۴۹۰
— شیطان کے ذریعے سے آپ کی آزمائش ۴۹۱
— عیسائیوں کے ایک خیالی عیسیٰ (مسیح) تصنیف کرنے کی داستان ۴۹۱ تا ۴۹۵
— آپ کے سارے معجزات اللہ تعالیٰ کے اذن سے ظاہر ہوئے ۵۱۲-۵۱۳
— حضرت عیسیٰ کی میدان حشر میں شہادت ۵۱۲-۵۱۳
— آپ پر حواریوں کا ایمان لانا ۵۱۳
— آسمانی خوان کے لیے آپ کی دعا ۵۱۴
— آپ پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی جرح ۵۱۵
— آخرت میں آپ کا اپنی صفائی پیش کرنا ۵۱۶
— اپنی امت کے لیے حضرت عیسیٰ کی عاجزانہ لطیف شفاعت ۵۱۷
— حضرت عیسیٰ کو اس حقیقت کے اظہار میں کوئی عار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰

(۲۱۸) عیسائی

— اس لفظ کے مفہوم کی تشریح ۴۸۰
— حضرت عیسیٰ کے اولین پیرو عیسائی نہیں بلکہ مسلم تھے ۲۵۶-۵۱۷
— عیسائیوں کے سامنے قرآن کی تین تصریحات ۲۶۰
— ان سے عہد لیا گیا اور انھوں نے عہد شکنی کی ۴۵۵
— لفظ ''نصاریٰ'' کی تشریح ۴۵۵
— انھیں زعم تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور چہیتے ہیں ۴۵۷
— ان کو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ۴۷۵
— ان کا عقیدۂ تثلیث کفر ہے اور قرآن حکیم الوہیت کے نظریے کی مکمل تردید کرتا ہے ۴۹۰-۴۹۱
— ان کا ایک خیالی مسیح تخلیق کر لینا ۴۹۱ تا ۴۹۵-۵۱۷-۵۱۸
— اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے سلیم الفطرت عنصر کا رویہ ۴۹۷-۴۹۸
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انھیں توحید کی دعوت دی تھی نہ کہ تثلیث کی ۵۱۶
— اہل کتاب یہودی ہوں یا عیسائی یا مشرکین مکہ، سب اس بات سے جلتے ہیں کہ اللہ کا فضل (نبوت) رسول اللہ ہی کو کیوں نصیب ہو گیا ۱۰۱
— یہودی اور عیسائیوں کے اس زعم کی تردید کہ صرف وہی جنت میں جائیں گے، یہ تو اطاعت خداوندی کرنے والوں کا حق ہے ۱۰۳
— عیسائیوں کی اس خام خیالی کی تردید کہ چند روز دوزخ میں گزارنے کے بعد وہ جنت میں بھیج دیے جائیں گے ۲۴۲
— یہودی اور عیسائیوں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینا ۱۰۴
— عیسائی یا یہودی ہونا باعث نجات نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کا طریقہ باعث فلاح ونجات ہے ۱۱۴
— عیسائیوں کی رسم غسل ہدایت ۱۱۶
— عیسائی رب کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہیں حالانکہ وہی سب کا رب ہے اور سب ہی اس کا اقرار کرتے ہیں ۱۱۷
— حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور اولادِ یعقوب کے بہت بعد میں یہودیت اور عیسائیت نے جنم لیا ۱۱۷
— تحویل کعبہ کے حکم پر یہودی اور عیسائی اعتراضات بے جا ہیں کیونکہ عیسائی حضرات کعبہ کی فضیلت کو جانتے ہیں لیکن جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہیں ۱۲۲-۱۲۳
— عیسائیوں کے جھوٹے دعووں اور ان کی غلط فہمیوں کی تردید ۱۳۵-۱۳۶
— عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ کے متعلق الوہیت کا عقیدہ پیدا ہونے کے وجوہ اور اس سلسلے کی غلط فہمیوں کا ازالہ ۲۵۷-۲۵۸
— عیسائی وفد نجران حقیقت کو پا چکا تھا لیکن ہٹ دھرم بن گئے، انھیں اللہ کی طرف سے مباہلہ کی دعوت جس سے وہ بھاگ گئے ۲۶۰-۲۶۱
— عیسائیوں پر باطل پرستی کی وجہ سے لعنت پڑی ہے،

اس لیے کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸
— عیسائی اہل کتاب پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے اس کا کوئی مددگار نہیں ہے ۳۶۰
— اہل کتاب یہودی اور عیسائی اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے ۳۶۰
— عیسائی، یہودی اور اہل کتاب اس قدر تنگ دل اور تنگ نظر ہیں کہ حق کا اعتراف کرنے سے چوکتے ہیں، اگر کہیں کائنات کی حکومت ان کی ہوتی تو کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتے ۳۶۰
— یہودی اور عیسائی حضرت عیسیٰ کے معاملے میں حد سے گزر گئے یہودی انکار و مخالفت میں اور عیسائی عقیدت و محبت میں اس کو اللہ تعالیٰ نے دین میں غلو قرار دیا ہے ۴۲۷
— حضرت عیسیٰ کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''کلمہ'' بھیجنے کا درست مفہوم ۴۲۷
— حضرت عیسیٰ کے ''روح من جانب اللہ'' ہونے کا درست مفہوم کیا ہے؟ ۴۲۸
— عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی تردید ۴۲۸ تا ۴۳۰
— عیسائیوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنا عہد توڑ ڈالا اور تعلیمات خداوندی کا سبق فراموش کر دیا ۴۵۵
— عیسائیوں اور یہودیوں کی بدعہدی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض کا بیج بو دیا ۴۵۵
— حضرت عیسیٰ کی حقیقت کے بارے میں عیسائیوں نے ٹھوکر کھائی اور غلو کیا ۴۵۶
— عیسائی اور یہودی اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہونے کے دعوے دار ہیں جو بالکل غلط ہے، اگر ایسا ہے تو وہ اپنے گناہوں پر سزا کیوں پاتے رہتے ہیں؟ ۴۵۷
— عیسائی جب بھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا ۴۸۶
— عیسائیوں کو تنبیہ کہ تم نے عیسیٰ اور مریم کو خدا بنا ڈالا ہے، اگر اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کر دے تو کیا امر مانع ہے ۵۴۷
— عیسائی یا یہودی جو بھی ایمان لا کر نیک عمل کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ اور خدا قرار دینے والے صریحاً کفر کر رہے ہیں ۴۸۹
— حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ دونوں بشر تھے ۴۹۰
— عیسائی عداوتِ اسلام میں کم تر ہیں، ان میں ایمان اور اسلام اخذ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے ۴۹۷-۴۹۸

(۲۱۹) عیسائیت

— قرآن حکیم عیسائیوں کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے منسوب کرتا ہے ۵۱۸
— عیسائیت حضرت مسیح کے بعد پیدا ہوئی ۱۱۵
— اس کے باطل ہونے پر قرآن کا ایک لطیف استدلال ۱۱۵ تا ۱۱۷
— اس کی بنیادی گمراہی ۲۴۶
— عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کی وجہ سے عیسائیوں کا بنیادی مغالطہ ۲۵۰
— حضرت عیسیٰ کے متعلق عقیدۂ الوہیت پیدا ہونے کے اسباب ۲۵۷
— عیسائیت حضرت ابراہیم کے بہت بعد پیدا ہوئی ۲۶۲
— واقعہ صلیب کے بارے میں عیسائیوں کے اختلافات ۴۱۹
— عقیدۂ تثلیث ۴۲۸-۴۹۰
— کفارے کا عقیدہ اور اس کی تردید ۴۲۹
— مسیحی کلیسا کے عقیدے پر ''ریونڈ جارج ولیم ناکس'' کی بحث ۴۹۴
— مسیحی فلسفے پر ''ریونڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ'' کا تبصرہ ۴۹۱ تا ۴۹۴
— الوہیت مسیح کے عقیدے کا نشو و ارتقا ۴۹۴-۴۹۵
— الوہیت مریم کا عقیدہ، حضرت مریم کو عیسائیوں کا

Maktaba Tul Ishaat.com

''ام اللہ'' قرار دینا ۵۱۵

(۲۲۰) عورت

— عورتوں اور مردوں کے حقوق معروف طریقے پر بالکل ایک جیسے ہیں ۱۷۳-۱۷۴
— عورتوں پر مرد قوام ہیں ۱۷۳-۳۴۹
— قانون شہادت میں مرد اور عورت کی گواہیوں میں فرق ۲۱۹-۲۲۰
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جان (حضرت آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا (حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ) بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے ۳۱۹
— مردوں نے جو کمایا وہ ان کا ہے، عورتوں نے جو کمایا اس کے مطابق ہی ان کا حصہ ہے ۳۴۷
— عورتوں اور مردوں کو تلقین کہ تم میں کسی کو زیادہ دیا گیا ہے اس کی تمنا نہ کرو، اس طرح حسد، رشک، عداوت، مزاحمت اور کشاکش سے بچے رہو گے ۳۴۷-۳۴۸
— صالح عورت کس طرح کی ہوتی ہے؟ ۳۴۹
— معاشرے میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۳ -۱۷۷ -۱۸۰ -۱۸۲ -۳۲۵ -۳۲۶- ۳۳۳-۳۴۸-۳۴۹
— عورتوں کے حقوق ۱۶۹-۱۷۳-۱۸۰
— عورتوں کے اخلاقی فرائض ۱۷۳
— عورتوں کے معاشی حقوق ۳۲۴
— بہترین بیوی کی صفات ۳۴۹
— بیوی (عورت) کی طرف سے شوہر کی اطاعت کے حدود ۳۴۹
— وراثت میں عورتوں کا حصہ آدھا کیوں ہے؟ ۳۲۵- ۳۲۶
— عورت (النساء) نام سے قرآن مجید کی چوتھی سورت ۳۱۶ تا ۴۳۲
— عورت ہو یا مرد، بشرطیکہ ہو مومن، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک عمل کا مکمل بدلہ دیا جائے گا اور ہرگز حق تلفی نہ ہوگی ۴۰۰
— سزا کے نفاذ میں عورت اور مرد بالکل برابر ہیں ۴۶۷
— اولین انسان (حضرت آدمؑ) کی جنت میں ساتھی (حضرت حواؑ) تھیں ۶۵
— شیطان نے آدم و حوا دونوں کو بہکایا، صرف حضرت حواؑ قصوروار نہ تھیں ۶۵-۶۶
— عمران کی عورت یعنی حضرت مریم کی والدہ کا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنا ۲۴۶
— ''لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا'' لیکن رب اعلیٰ نے لڑکی کو بخوشی بطور نذر قبول کیا اور اسے ایک اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا ۲۴۷-۲۴۸
— حضرت مریم جیسی نیک اور صالح لڑکی کی سرپرستی کرتے ہوئے حضرت زکریا کی بڑھاپے میں نیک اولاد کی دعا ۲۴۸-۲۴۹
— حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا، پاکیزگی عطا کی اور تمام جہان کی عورتوں پر فوقیت دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ۲۵۰
— حضرت مریم کو بن باپ کے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو خوش خبری، جنھیں دنیا و آخرت میں معزز اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شمار کیا گیا ۲۵۱-۲۵۲
— حضرت مریم کی بے گناہی اور اخلاقی برتری کی گواہی ۴۱۷- ۴۲۷- ۴۲۸
— جنت میں نیک عورتوں کے زوج صرف نیک مرد ہوں گے ۵۸- ۲۳۸
— عورت اور مرد (زوجین) کا تعلق بالکل غیر منفک، لباس اور باہمی لطف کا ہے ۱۴۴- ۱۴۵
— بیوی (عورت) اگر پسند نہ بھی ہو تو ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں تمھارے لیے بھلائی رکھی ہو ۳۳۴
— محفوظ عورتیں جو اہل ایمان میں سے ہوں یا اہل کتاب میں سے؛ قید نکاح میں اہل ایمان کے لیے حلال ہیں ۴۴۶- ۴۴۷
— مومن عورت کا مشرک مرد اور مومن مرد کا مشرک عورت سے نکاح منع ہے ۱۶۸-۱۶۹

— تعدد ازدواج کو محدود کیا گیا اور عدل کی شرط سے مشروط کیا گیا ہے ۳۲۰-۳۲۱-۴۰۳-۴۰۴
— نکاح ایک پختہ عہد ہے، اس کے اختتام پر عورت کو دیے گئے مال و دولت واپس لینے کی ممانعت ہے؟ ۱۷۴-۱۷۵-۳۳۵
— کن عورتوں سے نکاح کی ممانعت ہے؟ ۳۳۵ تا ۳۳۹
— جس عورت کا شوہر عدل نہیں کرتا وہ عورت حکومت اسلامی کی عدالتوں سے اپنے لیے دادرسی کر سکتی ہے ۳۲۱
— عورتوں کے حق مہر خوش دلی سے ادا کرنے کا حکم، عورت کو حق مہر کا کچھ حصہ معاف کر دینے کا اختیار ہے ۳۲۲-۳۴۱
— عورتوں کے حق مہر میں کتر بیونت کرنا سراسر حرام ہے ۳۳۳ تا ۳۳۵
— عورت کو اگر شوہر سے بے رخی اور بدسلوکی کا خطرہ ہو تو میاں بیوی کچھ حقوق کی کمی بیشی پر آپس میں صلح اور فیصلہ کر لیں ۴۰۲-۴۰۳
— اگر زوجین (عورت اور مرد) کا نباہ نہ ہو سکے تو ان کے پاس فیصلے کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے ۱۷۱-۱۷۲
— مطلقہ عورت کی عدت ۱۷۲-۱۷۳
— طلاق کو دورِ جاہلیت میں عورت کو ایذا دینے کا سب سے بڑا ہتھیار بنا دیا گیا تھا، اسلام نے اس کی اصلاح کی ۱۷۴-۱۷۵
— عورت کو حاصل طلاق کا حق (خلع) ۱۷۵-۱۷۶
— طلاق شدہ عورت کے سابقہ شوہر پر حقوق ۱۷۶-۱۷۷
— طلاق شدہ عورت کو عقد ثانی کا حق حاصل ہے ۱۷۷-۱۷۸
— ازدواجی رشتہ قائم ہونے سے پہلے طلاق پانے والی عورت کے حقوق ۱۸۱-۱۸۲
— شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ عورت کا زبردستی وارث بننے کی ممانعت ۳۳۳
— ازدواجی تعلقات بگڑنے پر عورت اور مرد کے ایک ایک رشتہ دار کو حکم (ثالث) مقرر کرو ۳۵۰
— زوجین اگر حکم اور صلح کی تمام کوششوں کے باوجود الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا ۴۰۴
— بیوہ ہونے والی عورت کی مدت عدت ۱۷۹-۱۸۰
— مرنے والوں کو حکم کہ اپنی بیوی کے لیے وصیت کر جائیں ۱۸۳
— بدکار عورت کی سزا کا اولین حکم، توبہ اور اصلاح پر معافی کا حکم ۳۳۱-۳۳۲
— سرکش عورت (بیوی) سے نمٹنے کا طریقہ ۳۴۹-۳۵۰
— یتیم ہونے والے کمزور بچے اور بچیوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم ۴۰۰ تا ۴۰۲
— ایام حیض میں عورت سے متعلقہ احکام ۱۶۹-۱۷۰
— عورت اپنے جرم پر خود ہی سزاوار ہو گی، کوئی اس کی جگہ سزا نہیں بھگتے گا ۱۳۸
— عورتوں کا بھی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں حق وراثت مردوں کی طرح ہے، خواہ جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، زرعی ہو یا صنعتی ۳۲۴
— عورت کا وراثت میں مرد سے آدھا حصہ ہے کیونکہ خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریاں ہیں اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا گیا ہے ۳۲۵-۳۲۶
— اگر میت کی وارث صرف لڑکیاں ہوں تو وراثت میں ان کا حصہ کس طرح متعین ہو گا؟ ۳۲۶
— ماں کا حصہ وراثت ۳۲۶-۳۲۷
— بیوہ ہونے والی عورت کا اپنے شوہر کے ترکے میں حصہ وراثت ۳۲۸
— اللہ تعالیٰ کا بے لاگ قانون جزا و سزا عورت و مرد کے لیے بالکل ایک ہے، جنس کی بنا پر کوئی رعایت ہرگز نہیں ہے ۳۱۲-۳۱۳-۳۳۱-۳۳۲-۳۹۹-۴۰۰
— مرنے والی عورت کے شوہر کا حصہ وراثت ۳۲۸
— مرنے والی عورت جو بے اولاد بھی ہو اور ماں باپ

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی نہ ہوں اس کی وراثت کی تقسیم کا طریقہ ۳۲۹
— بہنوں اور بھائیوں کا باہمی وراثت کا قانون ۴۳۱-۴۳۲
— عورتوں، بچوں اور بے بس مردوں کی خاطر لڑنے کا حکم جنھیں کمزور پا کر دبا دیا گیا ہے اور وہ حامی و مددگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کرتے ہیں ۳۷۲
— عورتیں، بچے اور کمزور مرد حضرات ہجرت کی عدم پابندی پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور درگزری کے طالب ہیں ۳۸۷
— اہل فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۷۵
— بنی اسرائیل کی اخلاقی گراوٹ کی انتہا کہ وہ تعویذ اور عمل کے ذریعے سے منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے جدا کرواتے تھے ۹۹
— ماؤں (عورت) کے پیٹ میں استقرار حمل سے لے کر حمل کے تمام مراحل میں ضروریات کا مکمل اہتمام ۲۳۳
— لوگوں کے مرغوبات نفس، عورت اور سونا چاندی کے ڈھیر ہیں لیکن یہ سب کچھ دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہے ۲۳۷-۲۳۸
— عورت اپنی عدت کی مدت گزارنے کے بعد معروف طریقے سے اپنی آیندہ زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے ۱۸۰-۳۳۳-۳۳۴

غ

(۲۲۱) غرور

— جو شخص اپنی معاشی اور معاشرتی بڑائی پر مغرور ہو، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے ۳۵۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'')

(۲۲۲) غلامی

— لونڈیوں سے تمتع کی اجازت اور اعتراضات کے جوابات ۳۲۱-۳۲۲-۳۳۹-۳۴۰
— منکوحہ لونڈی کے لیے زنا کی سزا ۳۴۲

(۲۲۳) غیب

— اس کے معنی ۵۰
— ایمان بالغیب کا مطلب ۵۰
— اہل ایمان کی لازمی صفت ہے کہ وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں ۵۰-۵۱
— اللہ تعالیٰ حقائق غیب میں سے جتنا کچھ چاہتا ہے اپنے رسولوں کو بتاتا ہے ۳۰۶
— امور غیب کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول پر اعتماد کرو ۳۰۶
— پردۂ غیب الٹنے پر مہلت اصلاح کا خاتمہ ۵۲۵
— آخرت میں حقیقت بالکل بے نقاب ہوگی ۵۳۲
— رسولؐ اللہ کے عالم الغیب ہونے کی تردید ۵۴۲
— غیب کی کنجیاں صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں ۵۴۶
— مومن و منافق کی تمیز کے لیے غیب سے دلوں کا حال نہیں کھولا جاتا بلکہ آزمائش کے ذریعے سے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے ۳۰۵-۳۰۶

ف

(۲۲۴) فاتحہ

— معانی ۴۲
— قرآن مجید کی پہلی مکمل سورت جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی ۴۲
— سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے جو ہر اس شخص کو سکھلائی گئی ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ۴۲
— سورۂ فاتحہ اور باقی قرآن کا کیا تعلق ہے؟ ۴۲

(۲۲۵) فاسق

— فسق کے معانی ۶۰-۹۷-۱۹۶
— فاسقین کی صفات ۶۰
— اللہ تعالیٰ کی آیات سے فاسق ہی انکار کرتے ہیں ۹۷

— فسق بندگی کے رویے سے انحراف کا پہلا مرتبہ ہے ۱۹۶
— خدا سے عہد کر کے پھر جانا فسق ہے ۲۶۹
— فسق کی چند صورتیں ۴۴۳
— جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں ۴۷۵
— اللہ تعالیٰ فاسقین کو ہدایت نہیں دیتا ۵۱۲
— جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا فسق ہے ۵۷۷
— بنی اسرائیل فاسق ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کی حالت پر رحم کھایا جائے ۴۶۱
— اہل کتاب کا ان کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں فاسقوں سے بھی بدتر انجام ہوگا ۴۸۳

(۲۲۶) فتنہ

— لفظ فتنہ کے معانی ۱۵۰
— فتنہ قتل سے زیادہ سنگین ہے ۱۵۰
— لفظ فتنہ کا استعمال غلبہ باطن کے معنی میں ۱۵۱
— فتنہ خون ریزی سے بدتر ہے ۱۶۵
— فتنہ طرازوں کی متشابہات سے غیر معمولی دلچسپی ۲۳۵
— اللہ تعالیٰ کے ''فتنہ میں ڈالنے'' کا مفہوم ۴۷۱
— مخالفین کے فتنے میں ڈالنے کی کوشش سے ہوشیار رہنے کی تاکید ۴۷۲
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا گویا خود کو فتنے میں ڈالنے کے مترادف ہے ۴۷۹

(۲۲۷) فرشتے

— فرشتے کے معانی ۶۲
— کائنات کے نظام میں فرشتوں کی حیثیت ۶۲-۶۴-۶۵-۹۸
— فرشتوں کے علم کی حقیقت ۶۴
— فرشتے فرائض کی انجام دہی میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتے ۵۴۷
— فرشتے اللہ کی سلطنت کے کارپرداز ہیں اور اپنے مناصب کی انجام دہی کے لیے انسانی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں ۹۸
— انھیں اس بات میں کوئی عار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— انسان کی خلافت پر فرشتوں کے اعتراض کی حقیقت ۶۲
— کیا فرشتے خود خلافت الٰہیہ کے امیدوار تھے؟ ۶۲-۶۳
— آدم کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ۶۴
— فرشتوں کا انسان کو سجدہ کس بات کی علامت تھا؟ ۶۴ تا ۶۶
— فرشتے پیدائشی راست رو ہیں ۵۹۶
— ان کی مخالفت کفر ہے ۹۷
— توحید پر فرشتوں کی شہادت کی اہمیت ۲۳۹
— جو فرشتوں کا دشمن ہے اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے ۹۷
— قرآن مجید کے حق تعالیٰ کی طرف سے مبنی بر علم ہونے پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ہے ۴۲۶
— فرشتوں کا حضرت زکریا کو نماز میں خوشخبری سنانا ۲۴۹
— فرشتوں کا حضرت مریم کو بشارت دینا ۲۵۰-۲۵۱
— فرشتوں کے ذریعے سے میدانِ جنگ میں اہل ایمان کی مدد کی گئی ۲۸۶
— کفر کا رویہ اختیار کرنے والوں اور کفر کی حالت میں جان دینے والوں پر اللہ اور فرشتے لعنت بھیجتے ہیں ۱۲۹
— فرشتوں کا روح قبض کرنے کے لیے آنا ۳۸۶-۵۴۷
— فرشتوں کے علی الاعلان آنے کی دو صورتیں ۵۲۶
— ہر انسان پر نگرانی کرنے والے فرشتے مقرر ہیں ۵۴۷
— فرشتے ظالموں کی جان کس طرح نکالتے ہیں؟ ۵۶۴-۵۶۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— ہاروت اور ماروت نامی فرشتوں کے حوالے سے جادوگری کی تعلیم کی مذمت ۹۸

(۲۲۸) فرعون

— بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم ۷۵
— فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی ۷۵

(۲۲۹) فرقان

— حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا ۷۶
— قرآن کی صفت ۱۴۲
— فرقان بمعنی کسوٹی ۲۳۳

(۲۳۰) فرقہ بندی

(مزید دیکھو ''تفرقہ و اختلاف'')

— فرقہ بندی کو شرک کہا گیا ہے ۶۰۵
— قرآن حکیم جس فرقہ بندی کی مذمت کرتا ہے ۳۸
— حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلاف کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹
— دین اسلام اصل اور بنیادی نکتہ ہے جو اہل ایمان کو جوڑتا ہے، اس سے پہلے اہل ایمان نااتفاقی کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ۲۷۶-۲۷۷
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام اختلافات کی حقیقت کھول دے گا جو انسان نے پیدا کر رکھے ہیں ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ کر دے گا ۱۰۴-۲۵۹
— حضرت ابراہیم کا طریقہ ہی درست تھا، یہ فرقہ بندیاں سب بعد کی پیداوار ہیں ۲۷۴-۲۷۵
— فرقہ بندی کرنے والوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بن گئے، اس چلن کا اسلام اور طریقہ ابراہیم سے کوئی تعلق نہیں ہے ۶۰۴-۶۰۵
— مذہبی موشگافیاں ایک نہایت پرانا حربہ ہے جو یہودِ مدینہ استعمال کرتے تھے اور دین اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے ۱۱۰ تا ۱۰۷
— غیر مسلموں کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت کہ کہیں وہ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱
— مسجد میں عبادت سے روکنا اور ان کی ویرانی کے درپے ہونا ۱۰۴

(۲۳۱) فساد

— حقیقت آشکارا ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی کی بنا پر کتمان حق کرنا مفسدین کی صفت ہے ۲۶۰
— اللہ تعالیٰ کو مفسدین ناپسند ہیں ۴۸۶
— منافقین فساد پھیلانے کے مجرم ہیں ۵۳
— زمین میں فساد پھیلانے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— فساد برپا کرنے سے کیا مراد ہے؟ ۶۰
— فساد پھیلانے والا ایک انسانی کردار ۱۵۹
— زمین کو فساد سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تدابیر ۱۹۱
— بندگی کے رویے میں فساد کے تین مراتب ۱۹۶
— فساد، اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کے معنی میں ۴۶۵

(۲۳۲) فلاح

— فلاح پانے والے لوگ کون ہیں؟ ۴۵-۵۱-۳۱۴
— فلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہے ۲۷۸
— فلاح کے لیے تقویٰ لازم ہے ۲۸۸
— فلاح پانے کے لیے ایمان کے ساتھ تقویٰ اور جہاد کی اہمیت ۴۶۶
— فلاح پانے کے لیے گندے شیطانی کاموں سے بچنا ضروری ہے ۵۰۱
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ہے ۵۳۰-۵۸۳
— احکام خداوندی کی پیروی ہی فلاح کا راستہ ہے ۱۲۵
— اللہ تعالیٰ اپنی بات نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ ہدایت و فلاح کا راستہ صاف نظر آ جائے ۲۷۷
— احکام خداوندی اور احکام رسولؐ اللہ پر عمل کرنے والے ہی کو فلاح کا راستہ اور اجر اور صراطِ مستقیم کی دولت سے سرفرازی نصیب ہوتی ہے ۳۶۹-۳۷۰

(۲۳۳) فواحش

— اس کے معانی کی تشریح ۵۹۹

(۲۳۴) قاضی

— منصف اور قاضی کو حکم کہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں اور حق سے منہ موڑ کر ہرگز لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں ۴۷۶-۴۷۷

(۲۳۵) قانتات

— مسلمان عورت کی تعریف ۳۴۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''عورت'')

(۲۳۶) اصولِ قانونِ اسلام

— جرم میں ارادے کا شامل ہونا بہت ضروری ہے ۵۴۴
— ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی ذمہ دار ہے، یہ ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی ۲۲۴
— جملہ معاملات میں قرآن ہی قانونی مرجع ہے ۴۷۶-۴۷۸-۴۷۹
— جرم میں ارادے کا شامل ہونا ضروری ہے ۵۴۴
— اسلامی قانون کے نفاذ سے قبل کے معاملات کا حکم ۳۳۵
— جرم کی سزا پانے کے بعد بھی توبہ اور اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے ۴۶۸-۴۶۹
— فیصلے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶
— توبہ اور معافی تب تک ہی ہے جب تک سزا کا ہاتھ جکڑ نہ لے ۴۶۵-۴۶۶
— قانون کے نفاذ میں لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، کسی رشوت وخوف کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے ۴۷۶
— احکام کے جواز کی حدود سے دور رہنا ہی بہترین رویہ ہے تاکہ حدود پار کرنے کا خطرہ نہ رہے ۱۴۷
— اس کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں ۴۷۴-۴۷۵
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام میں نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی ہرگز نہیں کرنا چاہتا ۱۴۳
— قانونی اور اخلاقی حیثیات کا فرق ۲۱۳
— کسی بھی شخص سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی جگہ خود کو متصور کرو اور سوچو کہ تم کیا سلوک چاہتے ہو، وہی سلوک اور معاملہ روا رکھو ۳۲۵
— قانون اسلام کا لحاظ اور احترام کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے ۱۵۲
— قانون اسلام کی پیروی میں انسان کی اپنی بھلائی ہے ۳۶۶

ازدواجی تعلقات، قانونِ نکاح

— نکاح ۶۸-۱۸۰-۳۲۰-۳۳۵ تا ۳۳۹-۳۴۱-۴۴۶
— محرمات اور لونڈیاں ۳۳۸-۳۴۱
— ایلا ۱۷۱-۱۷۲
— طلاق ۱۷۲ تا ۱۷۵
— مہر ۱۸۱-۳۲۲-۳۳۳-۳۳۵-۳۴۱-۴۴۷
— عدت ۱۷۳-۱۷۶-۱۷۹
— رجعت ۱۷۴-۱۷۷
— خلع ۱۷۵-۱۷۶-۱۷۸
— عورت کا نفقہ ۳۴۹
— مشرکین سے نکاح کی ممانعت ۱۶۸-۱۶۹
— عورت کو تنگ کر کے حق مہر مارنے کی کوشش کی ممانعت ۳۳۳
— عورت کے ساتھ بھلے طریقے سے ازدواجی زندگی گزارنے کا حکم، ان کی ناگوار اور ناپسندیدہ باتوں سے درگزر کرو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور پہلو سے ان میں تمھارے لیے بھلائی رکھ چھوڑی ہو ۳۳۴
— عورت مرنے والے کی میراث نہیں بلکہ عدت گزارنے کے بعد آزاد ہے ۳۳۳-۳۳۴
— سوتیلی ماؤں سے نکاح کی ممانعت ۳۳۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— نکاح ایک پختہ عہد ہے، اس کی حفاظت اور تحریم کا حکم ہے، اس کو توڑنے کے لیے بہانہ سازی کی ممانعت کی گئی ہے ۳۳۴-۳۳۵

— محرمات کی تفصیل جن سے نکاح نہیں ہوسکتا ۳۳۶ تا ۳۳۹

— سگے اور حقیقی رشتوں کے ساتھ رضاعی رشتوں کا حکم ایک جیسا ہے ۳۳۷

— اسلامی قانون سگے رشتوں کو منہ بولے رشتوں سے الگ رکھتا ہے اور منہ بولی اولاد کو سگی اور حقیقی اولاد کا مقام نہیں دیتا ۳۳۹

— ایسے افراد جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں انھیں مالک کی اجازت سے اس کی لونڈی سے نکاح کر لینے کا حکم، لیکن اگر وہ صبر سے کام لیں تو ان کے حق میں یقیناً بہتر ہے ۳۴۲-۳۴۳

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''ازدواجی زندگی'')

بغاوت

— نظامِ اسلامی سے بغاوت کی سزا ۴۶۵

— خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے کا مفہوم ۴۶۵

— باغیوں کے لیے توبہ کی گنجائش ۴۶۵-۴۶۶

— فساد فی الارض پھیلانے والوں کے قتل کرنے کا حکم ۴۶۴

بین الاقوامی قانون

— بین الاقوامی معاہدات کا ضابطہ ۳۸۱

— اسلام عہد، وعدے اور معاہدے کا اس قدر پابند ہے کہ اگر کوئی واجب القتل آدمی کسی ایسی قوم میں پناہ لے لے جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو تو اس کی جان بخش دی جائے ۳۸۰ تا ۳۸۲

قانونِ جنگ

— جنگ کا حکم ۱۴۹-۳۸۶

— جنگ کا مقصد ۱۵۰-۲۹۰-۳۷۲

— جنگ کے حدود ۱۳۷-۱۵۱-۳۸۰-۳۸۴-۳۸۵

— قصر فی الصلوٰۃ کی اجازت ۳۸۸ تا ۳۹۰

— صلوٰۃ خوف ۳۹۰ تا ۳۹۲

چوری

— چوری کی سزا قطع ید ہے اور اس کی تفصیلات ۴۶۷-۴۶۸

— چوری کی سزا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات ۴۶۸

دستوری مسائل

— ایسے حکمران جو امانت دار ہوں اور ایمان داری سے فیصلہ کریں ۳۶۲-۳۶۳

— اسلامی حکومت کی دستوری بنیادیں ۳۶۳ تا ۳۶۵

— اللہ تعالیٰ حکمرانوں کو حکمت اور جن جن چیزوں میں چاہتا ہے علم دیتا ہے ۱۵۹

— اہل کتاب کا اللہ کی حکومت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۳۶۰

— ایسے حکمرانوں کی مذمت جن کو اگر اقتدار مل جائے تو اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ ان سے کچھ نہیں ہوتا ۱۵۹

قانونِ تعزیرات

— زنا کی ابتدائی سزا ۳۳۱-۳۳۲

— زنا کے لیے نصاب شہادت ۳۳۱

— محرمات سے زنا کا ارتکاب فوجداری جرم بھی ہے اور بے حیائی، ناپسندیدہ اور نہایت برا چلن ہے ۳۳۶

— منکوحہ لونڈیوں کے لیے زنا کی سزا ۳۴۲-۳۴۳

— رجم کی طرف ایک لطیف اشارہ ۳۴۳

— خاندانی عورت اور لونڈی کی سزا میں فرق مراتب ۳۴۲-۳۴۳

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''زنا'')

سود

— سود فوجداری جرم ہے ۲۱۸

(مزید دیکھو ''سود'')

قانون شہادت

— شہادت کا قانون ۲۲۰-۲۲۱

— زنا کے لیے نصابِ شہادت ۲۳۱

— وصیت کے لیے نصاب شہادت ۲۲۰-۵۱۰

— گواہوں کا صاحب عدل ہونا ۵۱۰-۲۲۰

— شہادت کا ضابطہ ۵۱۱

— اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم قابل اعتماد افراد ہی گواہ ہو سکتے ہیں ۲۲۰

— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ طرف سے گواہی ہو اور وہ اس کو چھپائے ۱۱۷-۱۱۸

— گواہی کے لیے بلائے جانے پر انکار نہیں کرنا چاہیے ۲۲۰

— عدل کا علم بردار رہنے کا حکم، خواہ اس کی زد ہماری ذات پر، والدین پر، یا رشتہ داروں پر پڑتی ہو ۴۰۵-۴۰۶

— گواہی سچی ہونی چاہیے، خواہ فریق معاملہ امیر ہو یا غریب ۴۰۵-۴۰۶

— گواہ اگر لگی لپٹی بات کر جائے اور سچ کو چھپا جائے تو یہ جان رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر فعل سے باخبر ہے ۴۰۶

— شہادت کے گواہوں کو پرکھنے کا طریقہ کہ جب ان سے خدا کی قسم لی جاتی ہے، یہی عمل طرفین کے گواہوں سے ہونا چاہیے ۵۱۰ تا ۵۱۲

— شہادت قائم کرنے میں آسانی اور شکوک وشبہات سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے چاہئیں:

(۱) مدت معاہدہ کا تعین ضروری ہے، جو معاہدے کی بنیادی شرط ہے ۲۱۹-۲۲۰

(۲) معاہدہ چھوٹا ہو یا بڑا، معاہدے کی دستاویز لکھنے میں ہرگز تساہل نہیں کرنا چاہیے ۲۲۰

— وصیت پر شہادت اور گواہی کا التزام کرو ۵۱۰-۵۱۱

عدالت وقضا

— عدالتی فیصلے کا دارومدار ظاہری شہادتوں پر ہوگا ۱۴۸

— عدالت کی طرف سے پنچایت کے تقرر کا قانون ۳۵۱

— قضا کا اسلامی طریقہ ۳۹۴

— اسلامی عدالت کو یہودِ مدینہ کے مقدمات سننے یا نہ سننے کا اختیار دیا گیا ۴۷۱

— منصف اور قاضی کو حکم کہ صرف حق وانصاف کا فیصلہ کریں اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہرگز نہ کریں ۴۷۶-۴۷۷

قتل انسان اور قتل اولاد

— ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کا قتل جائز نہیں ہے ۳۸۲

— قتل عمد اور قتل خطا کے الگ الگ احکام اور ان کے لیے الگ الگ ادائیگیِ کفارہ کا طریقہ بتایا گیا ہے ۳۸۲-۳۸۳

— قتل انسانی کی دو جائز وجوہ: (۱) قتل بدل اور (۲) فساد فی الارض کرنے والا ۴۶۳

— ایک انسان کی جان بچانے والے نے گویا پوری انسانیت کی جان بچالی اور ایک انسان کو قتل کرنے والے نے گویا پوری انسانیت کو قتل کر دیا ۴۶۴

— جو لوگ ایمان لائے ان کے لیے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ۱۳۷

— قتل تک کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے ۱۳۸-۱۳۹

— جس نے دارالاسلام میں مسلمان بھائی کا قتل عمد کر ڈالا اس کی سزا ہمیشگی کی جہنم، اللہ تعالیٰ کی لعنت، غضب اور سخت عذاب ہے ۳۸۴

— قاتل مقتول کے گناہوں کو بھی سمیٹ لیتا ہے اور سراسر نقصان میں رہنے والا ہے ۴۶۲

— قتل انسانی میں اصل رکاوٹ اللہ رب العالمین کا خوف اور ڈر ہے ۴۶۲

— انسان جان وجسم کو اللہ تعالیٰ نے محترم ٹھیرایا ہے، اس کو ختم کرنے کی قرآن وحدیث میں صرف پانچ صورتیں بیان کی گئی ہیں ۵۹۹-۶۰۰

— اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے ہرگز قتل نہ کرو ۵۹۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— معاشرے میں قتل اولاد کی مختلف صورتیں، مشرکین کے معبودوں نے یہ ہولناک کام ان کے لیے آسان کر دیا حالانکہ ان کے لیے اس میں سراسر ہلاکت ہے ۵۸۵-۵۸۸

— قتل انسانی کے لیے قصاص کا قانون ۱۳۸-۱۳۹

— دیت (خون بہا) کا قاعدہ ۱۳۸

— مومن کی جان کی حرمت ۳۸۲

— مومن کو سہواً قتل کرنے کا کفارہ اور خون بہا کی مقدار ۳۸۲-۳۸۳

— تورات کا قانون قصاص ۴۷۴

(مزید دیکھو ''قصاص'')

قرض و رہن

— اس کے احکام ۲۱۹ تا ۲۲۲

— تقسیم وراثت سے پہلے ادائے قرض کا حکم ۳۲۷ تا ۳۲۹

— دیوالیہ کا قانون ۲۱۸

(مزید دیکھو ''قانون شہادت'')

وراثت

— پانچ بنیادی احکام وراثت ۳۲۴

— قانون وراثت کی دینی اہمیت ۳۳۰

— شرعی ورثا کے حصوں میں وصیت کے ذریعے سے کمی بیشی نہیں کی جا سکتی ۱۴۰

— حق وراثت بر بنائے قرابت ۳۲۴

— وراثت پورے ترکے میں جاری ہوگی ۳۲۴

— وراثت میں مرد کے ساتھ عورت بھی حق دار ہے ۳۲۴

— اولاد کے حصص ۳۲۵

— والدین کے حصص ۳۲۶

— مرد کا حصہ عورت سے دوگنا کیوں ہے؟ ۳۲۵-۳۲۶

— تقسیم میراث اور وصیت و قرض ۳۲۷ تا ۳۲۹

— بیوی کے ترکے میں شوہر کا حصہ ۳۲۸

— شوہر کے ترکے میں بیوی کا حصہ ۳۲۸

— مروجہ ''وفات ٹیکس'' قانون اسلامی کی روشنی میں ۳۳۱

— منہ بولے رشتوں کو قانون وراثت تسلیم نہیں کرتا ۳۴۸

— کلالہ کی تعریف ۴۳۱

— کلالہ کا حصہ میراث مختلف صورتوں میں ۳۲۹-۴۳۱-۴۳۲

— حضرت عمر فاروقؓ کا کلالہ کے بارے میں تردد ۴۳۱

— تقسیم میراث کے وقت اگر غریب و مسکین رشتہ دار آ جائیں تو انھیں ضرور کچھ دینا چاہیے ۳۲۵

— صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بہرحال میت کے والدین میں سے ہر ایک $\frac{1}{6}$ حصے کا حق دار ہوگا ۳۲۶-۳۲۷

— اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو $\frac{1}{3}$ اور باپ کو $\frac{2}{3}$ حصہ ملے گا ۳۲۷

— بہن بھائیوں کا حصہ بھی میراث میں مقرر کیا گیا ہے ۳۲۶-۳۲۷

— وصیت کرنا کیوں ضروری ہے؟ ۳۲۷

— قرض وصیت پر بہرحال مقدم ہے ۳۲۷

— وصیت کرنے والا اگر زیادتی کرتا ہے تو اس کی اصلاح کا طریقہ موجود ہے ۳۲۸-۳۲۹

— بے اولاد شخص کے ذکر میں ضرر آمیز وصیت کا خاص ذکر کیوں کیا گیا ہے اور وصیت کی ضرر رسانی کیا ہے؟ ۳۲۹-۳۳۰

— قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والے جان رکھیں کہ یہ حصے علم رکھنے والی نرم خو ہستی نے بنائے ہیں جو انسان کے لیے سہولت پیدا کرنا چاہتا ہے ۳۳۰

— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والا ہمیشگی کے ذلت و عذاب کا حق دار ہوگا ۳۳۰-۳۳۱

وصیت

— منہ بولا رشتہ دار، دوست اور عہد و پیمان انسان کو حق

وراثت نہیں دلا سکتے، ہاں ان کے حق میں کل ترکے کے ⅓ تک وصیت کی جا سکتی ہے ۳۴۷-۳۴۸

— وصیت پر گواہی اور شہادت کا التزام کرنا چاہیے ۵۱۰-۵۱۱

— قانون وراثت سے پہلے وصیت کا حکم دیا گیا تھا ۱۳۹

— قانون وراثت کے نزول کے بعد وصیت کے حدود متعین ہو گئے ۱۴۰-۳۲۷

— تقسیم میراث اور وصیت ۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹

(۲۳۷) قانونِ مکافاتِ عمل

— نافرمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ رزق دنیا فراوانی سے دیتا ہے، لیکن آخر کار عذاب جہنم جیسا بدترین ٹھکانا بھی ان کا مقدر ہے ۱۱۱

— قانونِ مکافاتِ عمل دنیا میں بھی روبعمل ہے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچانے والا کوئی مددگار نہیں مل سکتا ۲۵۹

— نیک لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ اجر و ثواب ہے ۲۹۳

— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر چلنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ رکھتا ہے اور ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیتا ہے، اور اپنی راہ پر چلنے والوں کو اجر وثواب بھی عطا کرتا ہے ۳۰۳-۳۰۴

— قانونِ مکافاتِ عمل کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں تو رسوائی ہے ہی، ان کے لیے آخرت میں بھی بڑی سزا ہے ۴۶۵

(۲۳۸) قبلہ

— کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی طرف ہے ۱۱۹

— تحویل قبلہ اور انقلاب امامت ۱۱۹

— تحویل قبلہ میں آزمائش ۱۲۰

— تحویل قبلہ کا اصل حکم ۱۲۱

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحویل قبلہ کا آرزومند ہونا ۱۲۱

— تحویل قبلہ کی تعمیل دوران نماز میں کس طرح کی گئی؟ ۱۲۱-۱۲۲

— قبلہ بننے کے لیے کعبہ کی اولیت ۲۷۴

— مشرق و مغرب سب اللہ تعالیٰ کے ہیں، جس طرف بھی رخ کرو گے اللہ تعالیٰ کا رخ اسی طرف ہے ۱۰۵

— بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب رسالت کی وجہ سے قبلہ تھا لیکن جب امامت بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تو دونوں گروہوں کے امام حضرت ابراہیم کے تعمیر کردہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰

(۲۳۹) قتل، قتل اولاد، قتل انسانی

— دیکھو ''قانون اسلام، قتل، قتل اولاد اور قتل انسانی''

(۲۴۰) قتال فی سبیل اللہ

— اس کا اولین حکم ۱۴۹

— اس کے مقاصد ۱۵۰-۱۵۱-۲۹۰-۳۷۲

— اس کے حدود ۱۵۱-۱۵۲-۳۸۰-۳۸۴-۳۸۵

— یہ لازمۂ ایمان ہے ۳۷۳

— بڑی بڑی باتیں بنانے والے نکمّے ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳

— حکم جہاد پر منافقین کا ذہنی ردِ عمل ۳۷۴

— حکم قتال میں مخفی خیر ۱۶۴

— قتال کے مقابلے میں جہاد کا وسیع مفہوم ۱۶۶-۴۶۶

— بنی اسرائیل کا اس سے جی چرانا اور اس کے نتائج ۱۸۴-۴۵۹

— اللہ کی راہ میں لڑنے اور کفر کے لیے لڑنے میں فرق ۲۳۶

— اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے کا اجر ۳۷۲-۳۸۵

— قتال فی سبیل اللہ میں صبر و استقامت کی اہمیت ۲۹۳

— خون کا بدلہ خون، وہی کیا جائے جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا ۱۳۷

— مقابلے کے لیے تیار رہنے کا حکم ۳۷۱

— یہ ان لوگوں کا کام ہے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو فروخت کر دیں ۳۷۲

— نفیر عام اور فرض کفایہ کا فرق ۳۸۶

— قصر فی الصلوٰۃ کی اجازت ۳۳۸ تا ۳۹۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— صلوٰۃ خوف ۳۹۰ تا ۳۹۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''جنگ جہاد فی سبیل اللہ'')

(۲۴۱) قرآن مجید

— ایمان بالقرآن ۵۰-۵۱
— قرآن کے لفظی ترجمے کے نقائص ۷ تا ۱۱
— قرآن کا اسلوب بیان ۷-۸-۹-۱۴-۲۰-۲۳-۱۱۴-۲۳۴-۲۸۴-۳۳۲
— قرآن انسان کی عقل وفکر سے اپیل کرتا ہے ۱۳۰-۱۳۹-۲۰۶-۳۱۰-۳۱۱-۵۰۷-۵۴۲-۵۶۶
— اس میں بظاہر بے ربطی محسوس ہونے کی وجہ ۹-۱۴-۱۵
— قرآن کو سمجھنے کے لیے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے کی اہمیت ۹
— سورتوں کا نزول کن حالات میں ہوتا ہے؟ ۹-۱۲۰
— قرآن کی مخصوص اصطلاحی زبان ہے، لفظی تراجم میں اس کا لحاظ رکھنا ہرگز ممکن نہیں ہے ۱۰
— قرآن کا عام کتابوں سے فرق اور امتیاز ۱۳-۱۴-۲۰-۲۵
— اس کو سمجھنے میں عام لوگوں کو کس قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں اور ان کی وجوہ ۱۴-۱۵-۱۶
— اس کی آیات میں مصنوعی ربط بنانے کی غلطی ۱۴
— اس کی آیات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے دیکھنے کا نقصان ۱۴
— قرآن کو سمجھنے کے لیے کن چیزوں کا جان لینا ضروری ہے؟ ۱۶-۲۰
— قرآن حکیم کی تاثیر میں پاکیزہ تعلیمات اور عالی قدر مضامین کے علاوہ قرآنی ادب کا بڑا حصہ ہے ۷
— قرآن میں ہر قسم کے مسائل، دلائل، امتیازات و شواہد یکے بعد دیگرے بیان کیے گئے ہیں، بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں ہے ۱۳ تا ۱۶
— قرآن کا مابعد الطبیعی پس منظر ۱۶
— اس کا موضوع اور مرکزی مضمون اور مدعا ۱۹-۲۰
— اس کے نظم، ربط کلام اور کیفیت نزول کی تشریح ۲۰-۵۲۰
— دعوت اسلامی مختلف مراحل میں نازل شدہ سورتوں کی الگ الگ خصوصیات ہیں ۲۰
— قرآن کے اسلوب بیان کی خصوصیات ۲۱-۲۴ تا ۲۶-۵۶۴
— قرآن کے مضامین میں وقتی اور مقامی رنگ اس قدر نمایاں کیوں ہے اور یہ چیزیں اس کے دائمی اور عالمگیر ہدایت ہونے پر قادح نہیں ہیں ۲۱-۳۵ تا ۳۷
— مکی سورتوں کا پس منظر اور ان کی خصوصیات ۲۱ تا ۲۴-۵۲۱
— مدنی سورتوں کا پس منظر اور ان کی خصوصیات ۲۴-۲۵-۵۲۱
— مکی سورتوں کی تقسیم بلحاظ زمانہ ۵۲۱-۵۲۲
— قرآن مجید میں مضامین کی تکرار کیوں ہے؟ ۲۶
— قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف کیوں ہے؟ ۲۶ تا ۲۸
— موجودہ ترتیب کس کی دی ہوئی ہے اور کب دی گئی؟ ۲۶ تا ۲۸
— قرآن میں مختلف الاوقات نازل ہونے والی آیات کی ترتیب کا اصول اور آیات اور سورتوں کی ترتیب اور ناموں کی حکمت ۴۳۱-۴۳۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کی کتابت ۲۸
— اس کو حفظ کرنے کا طریقہ ابتدا سے رائج ہو گیا تھا ۲۸
— قرآن مجید میں تحریف کیوں ناممکن ہے؟ ۲۸
— قرآن حکیم کے ''سات حروف'' پر نازل ہونے کا مطلب ۲۹
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کن کن لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا بصورت تحریر موجود تھے ۲۹-۳۰
— قرآن کے تحریری مجموعے کی ضرورت کا احساس کب اور کیونکر ہوا اور پہلا مستند نسخہ کس طرح تیار کیا

گیا؟ ۲۹-۳۰
— اس کے مطالعے کا درست طریقہ تحقیقی مطالعہ ہے ۳۱ تا ۳۴
— اس کی روح کو پالینا اس کے منشا کے مطابق کام کیے بغیر ممکن نہیں ہے ۳۳
— ''سلوکِ قرآنی'' ۳۴
— اس کے عالمگیر اور ابدی ہدایت ہونے کے دلائل ۳۵
— قرآن مجید کے مفصل ہدایت نامہ ہونے کا مطلب ۳۶
— سنت کے ساتھ اس کا تعلق ۳۶-۳۷
— قرآن مجید تفرقہ و اختلاف سے منع کرتا ہے ۳۷-۳۸
— قرآن میں مکی اور مدنی ادوار کا فرق نہایت واضح ہے ۴۷
— قرآن کے مطابق جائز اور ناجائز اختلاف کے حدود ۴۷
— سب سے پہلی مکمل سورت ۴۲
— نزولِ وحی کی ابتدا کن آیات سے ہوئی ؟ ۴۲
— سورتوں کے نام اور ان کی خصوصیات ۴۶-۴۹-۲۳۰
— قرآن مجید کے نزول کی ابتدا ۴۲۱
— اس کی آیات کی دو بڑی قسمیں: محکمات اور متشابہات ۲۳۴-۲۳۵
— قرآن میں تفسیری اختلافات ۳۸
— قرآن کی ہر سورت ایک تقریر ہے جو دعوت اسلامی کے ہر ہر مرحلے پر حالات اور تقاضوں کے مطابق نازل ہوئی ۹-۱۰
— خیر و برکت والی کتاب ہے ۵۶۳-۶۰۲
— قرآن مجید میں تصریف کلام کا اسلوب ۵۶۹
— قرآن مجید کے بیان میں تفصیل کا ہونا ۵۷۵
— قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے ۸-۹
— قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس حقیقت پر چار باتوں کی شہادت ہے ۵۶۳-۵۶۴
— قرآن کا تاریخ انسانی سے استدلال ۱۰۶-۱۶۲-۲۸۹-۴۲۳-۴۲۴
— قرآن کے مخاطب تمام انسان ہیں ۵۰-۳۱۹-۵۶۲
— قرآن تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لیے آیا ہے ۱۲۸-۲۳۱
— قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کو الگ الگ کرنے والی ہیں ۱۴۲
— قرآن ہمارے لیے ایک نصیحت ہے ۱۴۳
— قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ۵۷-۵۸-۲۳۵
— قرآن کو کلام الٰہی ماننے یا نہ ماننے کے اخروی نتائج ۵۸
— قرآن مجید پر مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۵۹-۱۰۱-۱۴۵-۵۶۹
— کس قسم کے لوگ قرآن سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں اور کون گمراہی اخذ کرتے ہیں؟ ۵۰-۵۹-۲۳۴-۲۳۵
— نوعِ انسانی کو قرآن مجید کی کیا دعوت ہے؟ ۵۷-۶۲
— قرآن کی دعوت وہی ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی تھی ۷۰-۲۳۲-۴۸۷-۴۸۸
— تمام پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۷۲-۹۳-۹۴-۹۶-۲۳۱-۳۵۸-۴۷۶-۵۶۳
— پچھلی کتابوں (تورات اور انجیل) کی تصدیق قرآن کن معنوں میں کرتا ہے؟ ۲۳۱-۲۳۲
— تنسیخ الآیہ سے مراد پچھلی کتابوں کے احکام ہیں، قرآن مجید کی کسی آیت کی تنسیخ نہیں کی گئی ۱۰۱-۱۰۲
— قرآن مجید ہی حق ہے کہ یہ اس خداوند ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہے جو علیم و دانا ہے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت حق کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی ۲۳۳
— قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت کہ اس میں کوئی اختلاف اور تضاد بیانی نہیں ہے ۳۷۶-۳۷۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— قرآن مجید حق کے ساتھ نازل کیا گیا، تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے ۳۹۲ تا ۳۹۴
— قرآن حکیم کی حقانیت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا علم ہے ۴۲۶
— قرآن مجید کے منزل من اللہ (جو علیم ہے) ہونے پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ہے ۴۲۶
— قرآن اور دیگر کتب کے بیان میں فرق اور اختلاف ۸۵-۸۶-۴۵۱-۵۶۰
— قرآن کا بتایا ہوا صراط مستقیم اور سواء السبیل ۴۵۲ تا ۴۵۴
— اسلام ایک نور ہے جو حق تعالیٰ نے کتاب (قرآن) اور نبوت (رسولؐ اللہ) کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کے راستے کی طرف راہ نمائی کے لیے پسند کیا ہے ۴۵۶
— تورات ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئی اور انبیائے کرام اور علما و قضاۃ اس کے احکام کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
— قرآن اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی کو چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کرتا ہے اور کبھی چشم پوشی بھی کر جاتا ہے ۴۵۵-۴۵۶
— قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— قرآن حکیم نے اکثر اہل کتاب کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دیا ۴۸۸
— قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذریعے سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بن کر رہے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا پاسبان نہیں ہے ۵۶۸-۵۶۹
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریلؑ کے ذریعے سے آیا تھا ۹۶
— قرآن مجید کی صفات ۹۶-۹۷-۱۴۲
— اس کے نسخ کا مطلب ۱۰۱
— اس کی اصولی تعلیمات ۱۱۴
— قرآن مجید قانون بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی احساسات کو بھی ابھارتا ہے ۱۳۸-۴۰۵
— قرآن مجید حق لے کر آیا ہے ۲۲۱-۳۹۳-۴۷۶-۵۷۵
— قرآن مجید حق و باطل کی کسوٹی ہے ۲۳۳
— قرآن حکیم سے ہدایت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ ۲۳۵
— قرآن مجید اہل ایمان کے لیے معیار فیصلہ اور سرچشمہ قانون ہے ۳۶۶-۳۹۳-۳۹۴-۴۷۶
— قرآن مجید محض کتاب آئین نہیں بلکہ کتاب ہدایت بھی ہے ۳۶۶
— کتاب مبین ہے اور تضادات سے مکمل پاک ہے ۳۷۶-۴۲۰
— قرآن مجید کا نظریۂ حلت و حرمت ۴۴۴
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن دلیل ۴۳۱-۶۰۳
— اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لانے والی کتاب ۴۵۶
— قرآن مجید سلامتی کے طریقے بتاتا ہے ۴۵۶
— انبیائے کرام کے بارے میں قرآن مجید کی اہم تصریح ۴۲۵-۴۷۵
— آسمانی کتب پر اس کے ''مہیمن'' ہونے کا مطلب ۴۷۷
— قرآن مجید بیک وقت نصیحت اور تنبیہ کا ذریعہ ہے ۵۵۰
— قرآن کے اولین مخاطبین ۵۶۳
— قرآن کو ماننے کے لیے ایمان بالآخرۃ ضروری ہے ۵۶۴
— قرآن مجید اپنے مخاطبین کے لیے آزمائش بن گیا ہے ۵۶۹
— قرآن مجید کے ذریعے سے لوگوں پر اتمام حجت ۶۰۲
— قرآن کے مطالعے کے لیے انسان کا ہر قسم کے تصورات و نظریات سے بالکل خالی الذہن ہونا

ضروری ہے ۳۱
— قرآن مجید کے مفصل ہدایت نامہ اور کتاب آئین ہونے سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ۳۷-۳۸
— قرآن مجید کے ساتھ بعثت نبویؐ کا اہم تعلق ۳۷-۳۸
— قرآن حکیم سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟ ۵۰-۵۱
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت جاری تحریک اسلامی کی راہ نمائی کے لیے نازل کیا گیا ۲۱ تا ۲۶
— قرآن مجید کے نزول کے بعد ہدایت کی غیر موجودگی کا بہانہ بے کار ہو گیا ۲۰۲-۲۰۳
— قرآن کے طرز بیان، ترتیب اور مضامین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وقت اور کیفیت نزول کو بھی سمجھ لیا جائے ۲۰ تا ۲۸
— قرآن حکیم نے عالم گیر صداقتیں بیان کرتے ہوئے دلائل، شواہد اور مثالیں مقامی ماحول سے لی ہیں تا کہ اولین مخاطب مطمئن ہوں ۲۱
— مکہ کے ابتلا و آزمائش کے دور میں قرآن کا ایک مخصوص طرز بیان رہا ۲۲-۲۳
— قرآن حکیم نے دعوتِ اسلامی کے ہر مرحلے کے لیے الگ طرز بیان کے ساتھ ہدایات وفرامین دیے ۲۱ تا ۲۵
— چند اہم بنیادی مضامین کی تکرار کے علاوہ چند وقتی بیانات تحریک اسلامی کے خاص ادوار ہی تک محدود ہیں ۲۶
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا ۲۰-۳۰
— شروع میں اس بات کی اجازت دی گئی کہ عرب اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق پڑھ لیا کریں لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے اس رعایت کو ختم کر دیا ۳۰
— یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے ٹھیک وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ۲۹ تا ۳۱
— قرآن ایک دعوت اور تحریک ہے، قرآن فہمی کی تمام تدبیروں کے باوجود قرآن کی روح سے آشنائی نہیں ہو سکتی جب تک انسان وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن نازل کیا گیا ۳۳-۳۴
— کیا قرآن صرف عربوں کے لیے آیا تھا؟ ۳۵ تا ۳۷
— قرآن جزئیات کی نہیں بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے ۳۷
— قرآن سے فیض لینے کے امیدوار کے لیے سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے ۴۲
— قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر شک کرنے والوں کو فہمائش کہ اس کی سورتوں کے مانند ایک سورت ہی بنا لاؤ ۵۷-۵۸
— قرآن مجید کے فرامین سے انکار کا نتیجہ ۲۳۳
— قرآن مجید مجرمین کی روش کو نمایاں کرتا ہے ۵۴۵
— قرآن کی تفسیر میں اختلافات کی نوعیت ۳۸-۳۹
— قرآن اکثر لوگوں کی سرکشی اور باطل پرستی میں اضافے کا باعث بن جاتا ہے ۴۸۵
— قرآن مجید میں حقیقت کی نشانیاں واضح کر دی گئی ہیں لیکن لوگ پھر بھی الٹے پھرے جاتے ہیں ۴۹۰-۴۹۱
— تلاوت قرآن مجید سے انسان پر طاری ہونے والی کیفیت کا بیان ۴۹۷
— اللہ تعالیٰ کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن ان کی طرف اللہ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے ۵۲۸-۵۲۹
— قرآن کی دعوت کے اصل مخاطب وہ متقی ہیں جو خوف آخرت رکھتے ہوں اور وہی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں ۵۴۳
— کچھ لوگ مقصد و مدعا پر غور وفکر کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی حکمت و نصیحت سے فیض اٹھاتے ہیں، جب کہ کچھ لوگوں پر مخالفانہ تعصب کا دورہ پڑتا ہے ۵۶۹
— قرآن حکیم رب اعلیٰ کی طرف سے ایک روشن

Maktaba Tul Ishaat.com

دلیل، ہدایت اور رحمت بن کر آیا، اس سے منہ موڑنے والا سب سے بڑا ظالم ہے اور وہ بدترین عذاب اور سزا پا کر رہے گا ۶۰۳

(۲۴۲) قرآن کی اخلاقی تعلیمات

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''اخلاق، اخلاقی تعلیمات'')

(۲۴۳) قرآن کی سیاسی تعلیمات

(مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست''، ''اسلام کی سیاسی تعلیمات'')

(۲۴۴) قرآن کی معاشرتی تعلیمات

(مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرہ'' اور ''اسلام کی معاشرتی تعلیمات'')

(۲۴۵) قرآنی اصطلاحات

— فاتحہ ۴۲
— رب ۴۴
— استعانت ۴۵
— عبادت بمعنی پرستش، اطاعت اور بندگی ۴۴ - ۴۵
— تقویٰ، متقی ۵۰
— اقامت صلوٰۃ ۵۰
— فسق ۶۰ - ۱۹۶
— ابلیس ۶۵
— ''کفر'' ایک قرآنی اصطلاح ہے لیکن قرآن میں اس کو کئی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۱۰ - ۵۶ - ۵۷ - ۶۵ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۴۰۷ -
— توبہ ۶۷
— واسع ۲۶۵
— ظلم ۶۶ - ۶۷
— اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دشواری ہو تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے ۷۳ - ۷۴
— انسان اگر بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— ''معروف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے ۱۳۹
— ''احسان'' قرآن کی اہم اصطلاح ہے ۱۹۳ - ۴۱۲
— حکمت ۲۰۷
— طاغوت ۱۹۶ - ۱۹۷
— کسب ۱۱۴
— دین ۱۹۶
— نور ۱۹۷
— ظلمات ۱۹۷
— نذر ۲۰۸
— ثواب ۲۹۲
— شکر ۲۹۲
— توبہ ۳۳۳
— جنت ۳۵۹
— صدیق ۳۷۰
— صالح ۳۷۰
— ایمان کا دورخی مفہوم کیا ہے؟ ۴۰۷
— عزت ۴۰۸
— شکر ۴۱۲
— شاکر (قدردان) ۴۱۲
— کلالہ (اختلاف) ۴۳۱
— انعام ۴۳۷
— شعار ۴۳۸
— نصب ۴۴۱
— نصاریٰ ۴۵۵
— اسلام کی ضد (الٹ) جاہلیت ہے ۴۷۹
— ظلمات اور نور قرآن کی اہم اصطلاحات ہیں ۵۲۳
— فواحش کھلی اور چھپی ہوئیں ۵۹۸ - ۵۹۹

(۲۴۶) قرآنی تمثیلات

— منافقین کے دو گروہوں کی تمثیل ۵۵ - ۵۶
— ہدایت سے بے نیاز لوگوں کے لیے جانوروں اور چرواہے کی مثال ۱۳۳

— انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بیج اور بالوں اور دانوں کی مثال ۲۰۳
— ریا کارانہ انفاق کی مثال ۲۰۴
— مخلصانہ انفاق کی مثال ۲۰۵
— حبط اعمال کی تمثیل ۲۰۶-۲۸۱
— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰
— چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثال پر مخالفین کا اعتراض اور اس کا جواب ۵۹-۶۰-۵۶۹
— ''موت'' سے مراد جہالت اور بے شعوری کی زندگی ہے ۵۸۷
— ''زندگی'' سے مراد نیکی و بدی کے شعور کی حالت ہے ۵۸۷
— ''روشنی'' اور ''تاریکی'' سے ''علم'' اور ''جہالت'' کا مفہوم مراد ہے ۵۸۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مثال ۵۵
— طالبانِ حق امثال القرآن کے ذریعے سے حق پا لیتے ہیں لیکن منکرین حق کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۵۹
— بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی کی مثال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات دیکھ کر ان کے دل پتھر کے پتھر ہی رہے ۸۶
— بنی اسرائیل کے رویوں میں حضرت آدم کے قاتل و مقتول بیٹوں کے ساتھ مماثلت ۴۶۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''امثال القرآن'')

(۲۴۷) قرآنی قصے

— قصہ آدم و ابلیس ۶۱ تا ۶۹-۲۴۶-۴۶۱-۴۶۲
— قصہ بنی اسرائیل ۷۰ تا ۱۱۰- ۱۸۵ تا ۱۹۱- ۲۵۲ تا ۲۵۸-۴۵۱ تا ۴۶۱ تا ۴۶۴-۴۸۹ تا ۴۹۸
— حضرت سلیمان علیہ السلام ۹۷-۹۸-۵۶۰
— حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ۷۵ تا ۹۵-۲۷۰-۵۶۰
— حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۱۰ تا ۱۱۵- ۱۹۷ تا ۲۰۰- ۲۴۶-۲۶۲-۲۶۳-۲۷۰-۵۵۲ تا ۵۶۱
— حضرت نوح علیہ السلام ۲۴۶-۵۶۰
— حضرت مریم علیہا السلام ۲۴۶ تا ۲۵۲- ۴۱۷- ۴۷۴
— حضرت زکریا علیہ السلام ۲۴۹-۵۶۰
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۲۵۱ تا ۲۵۸-۲۷۰-۴۱۸- ۴۱۹- ۴۲۸ تا ۴۳۰- ۴۵۶- ۴۷۴- ۵۱۴ تا ۵۱۸- ۵۶۰
— حضرت اسماعیل علیہ السلام ۱۱۲-۲۷۰-۵۶۱
— حضرت اسحاق علیہ السلام ۲۷۰-۵۶۰
— حضرت یعقوب علیہ السلام ۲۷۰-۵۶۰
— حضرت داود علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت ایوب علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت یوسف علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت ہارون علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت الیاس علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت الیسع علیہ السلام ۵۶۱
— حضرت یونس علیہ السلام ۵۶۱
— حضرت لوط علیہ السلام ۵۶۱

(۲۴۸) قربانی

— اس کے اپنی جگہ پہنچنے کا مفہوم ۱۵۳
— حاجی حضرات قربانی سے پہلے بال نہ ترشوائیں ۱۵۳
— قربانی میسر نہ ہونے کی صورت میں حاجی روزے رکھے ۱۵۴
— وہ قربانی جسے آسمانی آگ کھا جائے ۳۰۷-۳۰۸
— قربانی کے جانور پر دست درازی نہ کی جائے ۴۳۸
— آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا واقعہ ۴۶۱

(۲۴۹) قرض

— مقروض سے فیاضانہ معاملے کی تلقین ۲۱۹
— دیوالیہ کا قانون ۲۱۹
— قرض کے لین دین کے لیے دستاویز لکھنے کی اہمیت ۲۱۹
— مدت کا تعین ضروری ہے ۲۱۹
— روز مرہ کے لین دین میں دستاویز کی ضرورت نہیں ہے ۲۲۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— دستاویز کے بجائے رہن ۲۲۱
— رہن میں سود کی صورت ۲۲۲
— متوفی کے ترکے میں سے قرض کی ادائیگی ۳۲۷-۳۲۸

(۲۵۰) قرعہ اندازی

— مشرکانہ فال گیری ۴۴۲
— قرعہ اندازی کی جائز صورت ۴۴۲-۴۴۳

(۲۵۱) قریش

— ان کے مذہبی اور اخلاقی جرائم ۱۰۴- ۱۱۱- ۱۵۷- ۱۶۵
— مسلمانوں پر ان کی زیادتیاں ۱۰۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا یہ اعتراض کہ ادنیٰ اور کمزور افراد آپ کی دعوت قبول کر رہے ہیں ۵۴۳
— حضرت ابراہیم پر قریش کا بے جا فخر و ناز ۵۵۳
— قریش کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ گئی ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے بلکہ سخت سزا اور عذاب کے مستحق ہیں ۵۲
— جاہلیت کا عرب کیسا تھا؟ ۱۳۸
— مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور قریش کفر و طاغوت کی راہ میں لڑ رہے تھے، قریش کا انجام بد اہل عقل کے لیے نشانی ہے ۲۳۶
— قریش دوگنے ہونے کے باوجود مغلوب ہوئے، اللہ تعالیٰ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مغلوب کرتا ہے ۲۳۷
— قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو عمرے کی اجازت دینے سے انکار اور صلح حدیبیہ ۴۳۴
— قریش کا رسولؐ اللہ پر اعتراض کہ تم قرآن کہیں سے پڑھ اور سیکھ کر آئے ہو ۵۶۹

(۲۵۲) قسم

— قسم توڑنے پر احکام ۱۷۱
— مہمل اور بے معنی قسموں پر کوئی گرفت نہیں لیکن جان بوجھ کر کھائی گئی قسموں پر کفارہ لازم ہے ۴۹۹-۵۵۰
— زیادہ قسمیں کھانا منافقت کی علامت ہے ۳۶۷-۳۶۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کفارات'')

(۲۵۳) قسمت

— قسمت کا حال پانسوں کے ذریعے سے معلوم کرنا حرام ہے، اس حکم میں لاٹری وغیرہ بھی شامل ہیں ۴۴۱-۴۴۲

(۲۵۴) قصاص

— اس کا حکم تورات میں یہودیوں پر بھی نازل کیا گیا ۴۷۴
— جو لوگ ایمان لائے ان کے لیے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے ۱۳۷
— اس کے معانی ۱۳۷
— اس کا جاہلی تصور ۱۳۸
— قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے ۱۳۹
(مزید دیکھو ''قانون اسلام'')

(۲۵۵) قصر

— نماز کے اختصار یعنی قصر کا حکم، زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ کے لیے الگ الگ احکام ۳۸۸ تا ۳۹۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نماز'')

(۲۵۶) قومیت

— اسلام جاہلیت کے تعصبات کی بیخ کنی کرتا ہے ۱۲۰

(۲۵۷) قیاس آرائی

— علم کے بجائے محض گمان اور قیاس آرائی پر چلنے میں گمراہی ہے ۵۹۵

(۲۵۸) قیامت

— اختلافات کے فیصلے کا دن ۱۰۴

— پورے پورے اجر پانے کا دن ۳۰۸
— سارے انسانوں کو جمع کیا جائے گا ۳۷۸- ۵۲۷-۵۸۰
— قیامت کے روز مجرموں کی طرف سے کوئی وکالت نہ کر سکے گا ۳۹۵
— مسلمانوں اور منافقین کے درمیان قیامت ہی کو فیصلہ ہوگا ۴۰۹
— قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اہل کتاب پر گواہی دینا ۴۲۱
— اہل کفر کو قیامت کے دن کوئی فدیہ سزا سے بچا نہ سکے گا ۴۷- ۱۰۸- ۴۶۷
— قیامت ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے ۵۲۷
— قیامت بڑا خوفناک دن ہے ۵۲۸
— جس دن اللہ تعالیٰ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا ۵۵۱-۵۵۲
— صور قیامت پھونکنے کا مفہوم ۵۵۲
— نظام کائنات کا درہم برہم ہو کر از سرنو قائم ہونا ۵۵۲
— قیامت کا واقع ہونا قطعی ہے ۵۸۳
— وقت قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے ۵۲۳
— روز قیامت اللہ تعالیٰ کا شیاطین جنوں سے خطاب ۵۸۰-۵۸۱
— روز قیامت معبودان اور مجرمین اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے اور باہمی اشتراک کا بھی اعتراف کریں گے ۵۸۰-۵۸۱
— روز قیامت اللہ تعالیٰ ہی کو اختیار ہوگا کہ جسے چاہے معاف کردے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگا ۵۸۱

(۲۵۹) کفر، کافر

— کفر بمعنی نافرمانی ۶۵
— کفر کے اصطلاحی معانی ۱۰- ۱۲۹- ۱۳۰- ۴۰۷
— کفر بمعنی انکار حق ۵۶- ۵۷
— کافروں کا انجام بد ۵۸
— کفار کی فرشتوں سے دشمنی ۹۷
— کافروں کے حامی و مددگار طاغوت ہیں ۱۹۷
— منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک ہی جگہ جمع کیا جائے گا ۴۰۸- ۴۰۹
— اللہ تعالیٰ کے نام پر قانون بنانے والے اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور کافر ہیں ۵۰۹
— دعوت حق کے مخالفین کافروں کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں ۵۷۸- ۵۷۹
— کفر کیوں خلاف عقل وفطرت ہے؟ ۶۱
— آیات الٰہی سے کفر کرنے کا مطلب ۸۰
— کتاب الٰہی کے ایک حصے کو ماننا اور ایک سے انکار کر دینا صریح کفر ہے ۹۱
— کفر اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں ۴۹
— کافرانہ عقائد واعمال کی تفصیل ۹۷
— کافرانہ رویے کی مختلف صورتیں ۱۲۹- ۴۰۷- ۴۱۳-۴۱۴
— ''کفر'' کے لفظ کا استعمال بمقابلہ ''شکر'' ۱۲۹
— اہل کفر کے لیے دنیوی زندگی بڑی دلچسپ بنا دی جاتی ہے ۱۶۱
— کفر وایمان میں سمجھوتا نہیں ہو سکتا ۱۶۶
— کفر بندگی سے انحراف کا دوسرا مرتبہ ہے ۱۹۶
— ریا کاری پر کفر کا اطلاق ۲۰۵
— کفر کے اخروی انجام سے مال و اولاد نہیں بچا سکتے ۲۳۶-۲۸۱
— رسول کی اطاعت سے انکار کفر ہے ۲۴۵
— کفر کی روش کا انجام ۲۵۹
— کوئی نبی کفر کا حکم نہیں دے سکتا ۲۶۸
— کفر در کفر کا رویہ ۲۷۱
— حالت کفر میں جان دینے والوں کا انجام ۲۷۲- ۳۳۳
— حقوق اللہ کی ادائیگی سے گریز کفر ہے ۲۷۵
— اہل کفر کی چلت پھرت دین حق کے مقابلے میں کچھ نہیں ۳۰۴- ۳۱۳
— اہل کفر کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۳۰۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— اہل کفر کو ڈھیل دینے کی غرض و غایت ۳۰۵
— کافر و مسلم کا اصولی فرق ۳۶۵
— طاغوت کی راہ میں لڑنا کفار کا کام ہے ۳۷۳
— نظام کفر کے تحت اہل ایمان کے زندگی بسر کرنے کی دوصورتیں ۳۸۷
— اسلام کے لیے بے حمیتی موجب کفر ہے ۴۰۸
— نصاریٰ کا کفر ۴۵۶-۴۸۹
— کفار کو آخرت کے عذاب سے کوئی فدیہ نہیں بچا سکتا ۴۶۷
— ''یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ'' کا مطلب ۴۶۹
— جو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں ۴۷۴
— دین میں موشگافیوں کا نتیجہ کفر ہوتا ہے ۵۰۸
— اہل کفر کی ہٹ دھرمی ۵۲۵
— اہل کفر کے لیے ان کی گمراہی کا خوش نما بن جانا ۵۷۸
— رسول کی اطاعت سے انکار کفر ہے ۲۴۵
— اس روش کا انجام ۲۵۹
— کفر کا رویہ اختیار کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے اور ان کی تمام حرکتوں سے باخبر ہے ۶۱
— کفر کا رویہ اختیار کرنے والے اور کفر کی حالت میں جان دینے والے سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ان پر لعنت ہے ۱۲۹
— اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی کفر ہے ۱۹۶
— کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کا مددگار اور حامی طاغوت ہے جو انھیں روشنیوں سے تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۷
— کفر بعدِ ایمان یعنی ارتداد اور پھر کفر میں بڑھتے ہی جانا، اللہ تعالیٰ ایسوں کا گناہ ہرگز معاف نہیں کرے گا ۴۰۷-۴۰۸
— ایمان اور کفر کے درمیان کوئی راہ نہیں ہے، جو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پکے کافر ہیں ۴۱۴
— کسی نبی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا کفر ہے ۴۱۴
— حق سے فرار اور حق سے نفرت کی ناپاکی کفار پر مسلط کر دی گئی ہے اور انھیں راہ ہدایت نظر نہیں آتی ہے ۵۷۹-۵۸۰

(۲۶۰) کائنات

— اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے، محض تفریحاً پیدا نہیں کیا گیا ۵۵۱-۵۵۲
— کائنات کی تخلیق اور انتظام صرف حق پر مبنی ہے، یہاں عدل، حکمت اور راستی ہر چیز کی بنیاد ہے ۵۵۱-۵۵۲
— اللہ تعالیٰ کائنات کے تمام حالات سے باخبر ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۵۰۵-۵۰۶
— علمی طریق پر آثار کائنات کا مشاہدہ کرنے کا حکم ۵۶۶
— کائنات کی تخلیق اور اس کی ساخت و انتظام پر غور و فکر کرنے کی فہمائش ۳۱۰
— کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور ہرگز عبث، بے مقصد اور فضول نہیں ہے بلکہ عین بامقصد ہے، لیکن اس حقیقت کو اہل عقل، ہوش مند اور عقل و فکر استعمال کرنے والے ہی پا سکتے ہیں ۳۱۰-۳۱۱
— انسان ہوش مند ہو، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتا ہو اور غور و فکر کا مادہ رکھتا ہو تو وہ حقیقت کو پالیتا ہے ۳۱۰-۳۱۱
— اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کو دلائل سے قائل کرنا چاہتا ہے ۵۵۳
— توحید کے دلائل میں مظاہر کائنات کے ذریعے سے ثابت کیا گیا ہے کہ جب خالق و منتظم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو تو عقیدۂ شرک کی کیا بنیاد ہوئی ۵۶۵ تا ۵۶۷
— کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہے ۳۵۸
— کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے ۴۵۷
— کائنات کی تمام موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور

اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے، جو کائنات کی سلطنت کا واحد مالک ہے، جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے ۴۶۹-۴۵۸
— کائنات کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے رحم و کرم کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے، اس لیے نافرمانیوں اور سرکشیوں پر انسان کو فوراً نہیں پکڑتا ۵۲۶-۵۲۷
— اللہ تعالیٰ کی کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی آیات کو جھٹلانے والے بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں ۵۳۷
— کائنات میں ہر طرف توحید کی نشانیاں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کرے اور جس کو چاہے ہدایت نہ دے ۵۳۷-۵۳۸
— رات اور دن، چاند اور سورج کا طلوع و غروب کا حساب مقرر ہے اور یہ سب خدائے عزیز و علیم کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں ۱۴۷-۱۴۸-۵۶۶
— اللہ تعالیٰ کائنات کی ساری حقیقتیں جانتا ہے جو ہم سے مخفی ہیں، جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے ۶۴
— اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے ۴۳
— کائنات کی فرمانروائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ۱۰۲
— مشرق و مغرب سب اللہ تعالیٰ کے ہیں، جس طرف رخ کرو گے اسی طرف حق تعالیٰ ہوگا ۱۰۵-۱۱۸
— کائنات کا عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مطلق حکیم و علیم کے زیر فرمان ہے ۱۳۰
— توحید خداوندی پر آثار قیامت سے دلائل ۱۳۰-۱۳۱
— فرشتوں کی انتہائی معتبر شہادت کے علاوہ اہل علم و دانش کی مشترکہ شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و مدبر کائنات ہے ۲۳۹

(۲۶۱) کبائر

— اس کی تین صورتیں: (۱) ظلم (۲) فسق و معصیت، اور (۳) فجور ۳۴۶-۳۴۷
— کبائر سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا ۳۴۶

(۲۶۲) کتاب، کتب آسمانی

— سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے ۵۰-۵۱-۱۱۵
— کتابوں کو نازل کرنے کی غرض و غایت ۱۶۲-۲۳۱
— جملہ کتب آسمانی کے لیے ''الکتاب'' لفظ کا استعمال ۴۷۶
— قرآن جملہ کتب آسمانی کا مصداق اور محافظ ہے ۲۳۲-۴۷۶
— قرآن مجید حق لے کر آیا ہے اور اپنے سے پہلی کتابوں تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۱-۲۳۲
— کتاب اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری اور اس پر گواہی کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کی روشنی ہی میں فیصلے کیے جائیں ۴۷۳-۴۷۴
— لکھی لکھائی اور معجزانہ طریقے سے موصول ہونے والی کتاب کا مطالبہ اور اس کا جواب ۵۲۵
— کتب الٰہی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مشتبہ طور پر جانتے مانتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور خدائی میں کسی کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے ۵۲۹
— کتاب مبین جس میں حق تعالیٰ نے خشک و تر کی تمام معلومات درج کر رکھی ہیں ۵۴۶
— کتب الٰہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا ۵۶۳
— انسان کا ہر فعل خوف خداوندی کے تحت ہونا چاہیے، کتب الٰہیہ کی ہمیشہ سے یہی تعلیم رہی ہے ۴۰۴
— قرآن مجید نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنے والوں پر تکمیل نعمت ہے، سراسر ہدایت و رحمت اور ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے ۶۰۲
— قرآن مجید کے ساتھ بعثت رسول کی اہمیت ۳۷-۳۸
— قرآن مجید پر ایمان کا تقاضا ہے کہ راست بازی

Maktaba Tul Ishaat.com

سے اس کی پیروی کی جائے اور اسے دستورِ زندگی بنایا جائے ۴۸۷
— قرآن مجید اور سابقہ کتب کی موجودہ حالت میں مختلف امور میں اختلاف بیان ۵۶۰
— بنی اسرائیل کو کتاب عطا کرتے ہوئے کیا وعدہ لیا گیا تھا؟ ۸۳
— تورات وانجیل کی تاریخ ۲۳۱-۲۳۲
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام تورات کی اقامت کے لیے آئے تھے ۲۵۳
— یہودیوں کا کتاب الٰہی میں تحریف کرنا ۲۶۷
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات کو پھیلانے اور پوشیدہ نہ رکھنے کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن انھوں نے ان تعلیمات کو پس پشت ڈالا اور تھوڑی سی قیمت پر اللہ تعالیٰ کی آیات بیچ ڈالیں ۳۰۹-۳۱۰
— انجیل، زبور، قرآن آسمانی کتابیں ہیں ۳۵۸
— زبور حضرت داود پر نازل ہوئی ہے ۴۲۴
— بنی اسرائیل تعلیمات خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن ان کی احکام الٰہی میں کی گئی خیانتوں کا پول کھلتا ہے ۴۵۴
— تورات کو ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کیا گیا تھا اور علما وفقہا اس کے احکام کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
— حضرت عیسیٰ پر نازل کردہ انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی تھی ۴۷۴-۴۷۵
— انجیل ہدایت، راہ نمائی اور نور و روشنی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۷۵
— بنی اسرائیل کا تورات کے احکام کو مشکل اور بھاری قرار دے کر اس کی حکم عدولی کرنا ۸۳
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کو کیا کیا عطا کیا جاتا ہے؟ ۵۶۱

(۲۶۳) کسب

— اس کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۱۴
— قرآن اعمال کو کسب کہتا ہے ۱۱۴
— ہر شخص اپنے کسب کردہ اعمال کا خود ذمہ دار ہے ۶۰۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جزا وسزا'')

(۲۶۴) کعبۃ اللہ

— بیت المقدس سے پہلے کی مرکزی عبادت گاہ ۱۲۴
— اس کی علامات کہ کعبہ ہی مقبول الٰہی ہے ۲۷۵
— عربوں میں اس کا احترام ۲۷۶
— اس کے اثرات عربوں کی اجتماعی زندگی پر ۵۰۵
— معاشی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز تھا ۵۰۵
— بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب امامت کی وجہ سے قبلہ تھا لیکن جب بنی اسرائیل سے امامت لے کر بنی اسماعیل کو دے دی گئی تو مکہ مکرمہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰
— بیت المقدس کے بجائے مکہ مکرمہ میں واقع خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ۱۱۸-۱۱۹
— شروع میں مکہ مکرمہ کی جگہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جانا مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش تھی ۱۲۰

(۲۶۵) کفارہ، کفارات

— قسم توڑنے کا کفارہ ۱۷۱-۵۰۰
— مومن کو سہواً قتل کرنے کا کفارہ ۳۸۲-۳۸۳
— کفارے اور جرمانے میں فرق ۳۸۳
— صدقہ بطور کفارہ ۴۷۴
— حالت احرام میں شکار کر ڈالنے کا کفارہ ۵۰۴
— کفارہ ادا کرنے کا طریقہ ۳۸۲-۳۸۳

(۲۶۶) کفران نعمت

— ''کفر'' بمقابلہ ''شکر'' ۱۲۹
— کنجوسی کفران نعمت ہے ۳۵۲
— کفران نعمت اور اس کی پاداش ۵۲۵
— کفران نعمت کا نتیجہ سلب نعمت ہوتا ہے ۵۶۲

(۲۶۷) کلالہ

— بے اولاد شخص کے ذکر میں ضرر آمیز وصیت کا خاص

ذکر کیوں کیا گیا ہے ۳۲۹-۳۳۰

(۲۶۸) کنجوس

— خود کنجوسی کرنے والا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینے والا اللہ تعالیٰ کے فضل کو چھپاتا ہے، یہ عین کفرانِ نعمت اور اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے ۳۵۲

(۲۶۹) گمان

— علم و یقین کے بجائے گمان اور قیاس آرائی پر چلنا عین گمراہی ہے ۵۹۵

(۲۷۰) گناہ، گمراہی

— جرم اور گناہ کے لیے ارادے کا ہونا ضروری ہے ۵۴۴

— گناہ کو کیا چیز اتنا برا بناتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناقابلِ معافی ہو جاتا ہے ۳۴۶

— گناہ معاف ہو جانے کی وضاحت و تشریح ۲۰۹

— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷

— گمراہ فرد جس کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد حق تعالیٰ کرے تو ایسے لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں رسوائی ہے اور ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا ۳۹۶-۳۹۷

— ضلالت و گمراہی کے خریدار، جو چاہتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنے جیسا گمراہ بنا ڈالیں ۳۵۶

— علم کے مقابلے میں قیاس و لاعلمی پر چلنے میں سراسر گمراہی ہے ۵۹۵

— ضلالت و گمراہی میں پھنسا ہوا انسان نہ کوئی سفارش پائے گا نہ کوئی حامی و مددگار اور نہ فدیہ دے کر چھوٹ سکے گا ۵۵۰

— کھلی اور چھپی گمراہی سے بچو کیونکہ انسان اپنی کارکردگی کا بدلہ پا کر رہے گا ۵۷۷

— حالانکہ حق عین عیاں ہے لیکن اپنے نفس کے حسد کی وجہ سے جانتے بوجھتے راہِ راست کو مشکوک کرنے کے درپے ہیں ۱۰۳

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو 'ضلالت')

ل

(۲۷۱) لعنت

— کس قسم کے لوگ اس کے مستحق ہیں ۹۳- ۱۲۸- ۱۲۹-۲۷۱-۳۵۸-۳۶۰-۳۸۴-۳۹۸-۴۸۴

— باطل پرستی کی وجہ سے یہود پر لعنت ۳۵۸

— جس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو پھر اس کو لعنت سے بچانے والا کوئی مددگار نہیں مل سکتا ۳۶۰

— بنی اسرائیل کے کفر پر حضرت داود اور حضرت عیسیٰ کی لعنت ۴۹۶

— شیطان لعنت زدہ ہے ۳۹۸

— کفر کا رویہ اختیار کرنے اور کفر کی حالت میں جان دینے والوں پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے لعنت ہے ۱۲۹

— مفسد حقیقت آشکارا ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۲۶۰-۲۶۱

— یہود پر باطل پرستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸

(۲۷۲) حضرت لوط علیہ السلام

— حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۲۷۳) لونڈی

— ان سے متعلق احکام ۳۲۱-۳۲۲

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو 'غلامی')

م

(۲۷۴) ماہِ حرام

(تفصیلات کے لیے دیکھو 'شہرِ حرم')

Maktaba Tul Ishaat.com

(۲۷۵) مباہلہ

— عیسائیوں کے وفد نجران کو دعوتِ مباہلہ اور ان کا اس سے گریز کرنا ۲۶۰-۲۶۱

(۲۷۶) متشابہات

— آیاتِ متشابہات کی تعریف ۲۳۴-۲۳۵
— متشابہات سے اہل فتنہ کی غیر معمولی دلچسپی ۲۳۵

(۲۷۷) متقی

— متقی کون ہیں؟ ۱۳۷
— متقین کی صفات ۵۰-۲۸۸-۲۸۹
— دوسروں کو نصیحت کرنا ان کا فرض ہے مگر دوسروں کے حساب کی ذمہ داری ان پر نہیں ۵۴۹
— دنیا کا سرمایہ نہایت قلیل ہے اور آخرت ایک خدا ترس متقی انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے ۳۷۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "تقویٰ")

(۲۷۸) محکمات

— آیاتِ محکمات کی تعریف ۲۳۴
— اہل ایمان دانش مند محکمات اور متشابہات سب پر ایمان لاتے ہیں لیکن ٹیڑھے دلوں والے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ۲۳۴-۲۳۵

(۲۷۹) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

— آپ کی امت کو امت وسط کیوں کہا گیا؟ ۱۱۸-۱۱۹
— آپ کس کام کے لیے تشریف لائے تھے ۱۹-۳۷-۱۰۶
— آپ کی دعوت کا آغاز کس طرح ہوا اور کن کن مراحل سے گزر کر تکمیل تک پہنچا؟ ۲۱-۵۲۲
— کس قسم کے لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کی اور ان کی زندگی پر کیا کیا اثرات پڑے ۲۲
— آپ کی کامیابی کے وجوہ ۲۲
— آپ کی دعوت وہی تھی جو پچھلے انبیائے کرام کی تھی ۷۰-۲۲۸-۵۵۳
— آپ کی نبوت کے دلائل ۱۰۶-۲۶۳
— آپ کا ظہور حضرت ابراہیم کی دعا کی قبولیت تھی ۱۱۲
— آپ پر تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ۱۲۵
— آپ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف ۲۲۳
— آپ کی ذمہ داری رسالت ۲۴۱-۳۷۵-۳۷۷-۴۸۷-۵۰۳-۵۰۶
— آپ کی پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت کا عین تقاضا ہے ۲۴۵
— آپ کی دعوت وہی تھی جو حضرت عیسیٰ کی تھی ۲۶۰
— آپ پر نبوت ختم ہونے کے متعلق ضمنی اشارہ ۲۶۹-۲۷۰
— غزوۂ احد کے موقع پر بددعا کرنے پر تنبیہ ۲۸۷
— سابق رسولوں کی طرح محض ایک رسول ہیں ۲۹۱
— جنگ احد کے موقع پر آپ کی موت کی خبر کا اڑنا ۲۹۱
— آپ کی طرف سے شجاعت و استقامت کا بے مثال مظاہرہ ۲۹۵
— قیادت کے بہترین اوصاف کی جامع ہستی ۲۹۸
— آپ سو فی صد اعتماد کے مستحق ہیں ۲۹۹
— آپ کی بعثت مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے ۳۰۰
— آپ کے کار رسالت کے بنیادی شعبے ۳۰۰
— آپ سے آپ کی امت پر آخرت میں شہادت طلبی ۳۵۳
— آپ کی سنت قیامت تک کے لیے سند ہے ۳۶۹
— آپ پر ایمان لانے کا تقاضا ۳۶۹
— خدا کی اطاعت آپ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ۳۷۵
— آپ کا منصب قضا ۳۹۴
— آپ پر وحی آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ۴۲۴-۴۲۶
— آپ اپنے رب کی طرف سے حق لے کر آئے ۴۲۷
— آپ ان باتوں کو کھولنے والے ہیں جن پر اہل کتاب نے پردہ ڈال رکھا تھا ۴۵۵
— آپ کی بعثت اہل کتاب کے لیے ذریعۂ اتمام حجت ہے ۴۵۸

— آپؐ کو تمام معاملات میں کتاب اللہ کے تحت فیصلہ کرنے کا حکم ۴۷۶
— آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ ۴۸۷
— سورۃ الانعام کے نزول کے وقت آپؐ کی کیفیت ۵۲۰
— مکہ میں آپؐ کی دعوت کے چار بڑے ادوار ۵۲۱-۵۲۲
— آپؐ کا اعلانِ توحید ۵۲۷تا ۵۲۹
— آپؐ کو ذاتی حیثیت سے مخالفین صادق مانتے تھے ۵۳۵
— قرآن آپؐ کے لیے فوق الانسانی اختیارات ہونے کی تردید کرتا ہے ۵۴۲
— قرآن آپؐ کے عالم الغیب ہونے کی تردید کرتا ہے ۵۴۲
— آپؐ وحی الٰہی کی پیروی کرنے والے تھے ۵۴۲
— ایمان لانے والوں کے بارے میں آپؐ کو خاص ہدایات ۵۴۳
— عذاب لانا آپؐ کے اختیار میں نہ تھا اور نہ آپؐ کو لوگوں پر حوالہ دار بنایا گیا تھا ۵۴۵-۵۴۸-۵۶۹
— آپؐ کا ''کام'' وہی تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا ۵۵۲-۶۰۵
— آپؐ کسی اجر کے طالب نہ تھے ۵۶۲
— آپؐ کو سابق انبیائے کرام کے طریقے پر چلنے کی ہدایت ۵۶۲
— آپؐ کو بطور خود معجزات دکھانے کا اختیار نہ تھا ۵۷۱
— آپؐ کی مخالفت کس کس طرح کی گئی اور کن وجوہ سے کی گئی ۲۲
— قریش کا آپؐ کو زیارت کعبہ سے روکنے کا واقعہ ۴۳۴
— راہِ راست اور ہدایت بار بار کھونے والی انسانیت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے راہِ ہدایت کو ازسرنو تازہ کیا گیا اور آپؐ آخری رسول ہیں ۱۹
— رسول اللہؐ ہی مرتب قرآن ہیں، انھوں نے قرآن کو ترتیب نزولی سے کیوں مرتب نہیں کیا؟ ۲۶ تا ۲۸
— نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے رسول اللہؐ نے دعوت اسلامی مکمل کر دی، اب اس کو آگے بڑھانے کے ذمہ دار ہم مسلمان ہیں ۲۷
— رسول اللہ کی نبوت کا قرآن مجید کے ساتھ ایک مکمل تعلق ہے جس کو الگ نہیں کیا جا سکتا ۳۷
— رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت مدینہ کے اہل کتاب کی اخلاقی اور دینی حالت کیا تھی ۴۶-۴۷
— رسول اللہ کو فہمائش کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں، خواہ انھیں خبردار کیا جائے یا نہ کیا جائے ۵۲
— رسول اللہؐ کی ذات پُرصفات ہی اس حقیقت پر سب سے بڑی نشانی ہے کہ تعلیمات محمدیؐ برحق ہیں ۱۰۶-۱۰۷
— رسول اللہؐ بھی خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیے جانے کے خواہش مند تھے ۱۲۱
— رسول اللہ اپنے لوگوں ہی میں مبعوث ہوئے، وہ لوگوں کو اللہ کی آیات سناتے، ان کی زندگیاں سنوارتے، انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے اور وہ باتیں سکھلاتے جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے ۱۲۵-۳۰۰
— رسول اللہؐ کے تربیت یافتہ (صحابہ کرام) وہ گروہ ہے جس کو انسانیت کی اصلاح و ہدایت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ۲۷۹
— رسول اللہ کی بات سننا اور اطاعت کرنا انسان کے لیے نہایت بہتر اور راست طریقہ ہے ۳۵۷-۳۵۸
— رسول اللہؐ کے منصب رسالت پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— رسول اللہؐ کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی چاہیے ۳۶۸
— رسول اللہ تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے اور اس حقیقت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے ۳۷۵
— رسول اللہؐ پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہے، ان پر کتاب

Maktaba Tul Ishaat.com

وحکمت نازل کی گئی اور انھیں وہ باتیں بتلائی گئیں جو انھیں معلوم نہ تھیں ۳۹۶
— رسولؐ اللہ کی نبوت تمام انسانوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل برہان اور نورِ مبین ہے اور صراطِ مستقیم کو بالکل واضح کر دینے والی ہے ۴۳۱
— رسولؐ اللہ اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی کو چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کرتے ہیں ۴۵۵-۴۵۶
— اسلام ایک نور ہے جو حق نما کتاب قرآن اور نورِ نبوت رسول اللہ کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کا راستہ بتاتا، راہ راست کی طرف راہ نمائی کرتا اور ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنیوں کی طرف لے جاتا ہے ۴۵۶
— رسول اللہ کو کفار کی کفر کی راہ میں سرگرمیوں پر رنجیدہ نہ ہونے کا حکم ۴۶۹-۴۸۷
— رسول اللہ کو جو کچھ احکام اور ہدایات ملتی تھیں وہ بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچا دیتے تھے اور یہی حقِ نبوت تھا ۴۸۷-۴۸۸
— رسول اللہ کے ذمے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا ہے، حکم عدولی کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں ۵۰۳-۵۰۶
— رسولؐ اللہ سے فرشتوں کے ظہور کا مطالبہ اور اس کا جواب ۵۲۵-۵۲۶
— رسول اللہ کی خواہش کہ کوئی ایسا معجزہ آ جائے جس سے کفار کے کفر کا زور ٹوٹ جائے، اس کا جواب ۵۳۵تا۵۳۷
— قرآن اور نبوتِ رسول اللہ کی صورت میں بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بن کر رہے گا وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا پاسبان نہیں ۵۶۹-۵۶۸
— مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہودی اور عیسائی سب اس بات سے جلتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت (نبوت) رسولؐ اللہ ہی کو کیوں نصیب ہوگئی ۱۰۱
— آپؐ کے مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۰۶-۱۶۵-۵۲۵-۵۳۱-۵۳۷-۵۶۲
— اہل کتاب رسولؐ اللہ کی نبوت پر ایمان لانے سے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵
— آپؐ کی مخالفت کا نتیجہ عذاب جہنم ہے ۳۹۶-۳۹۷
— لوگوں کے جھٹلانے سے آپؐ کو رنج ہوتا تھا ۵۳۴
— آپؐ کو جھٹلانے والے آپؐ کی ذات کو نہیں بلکہ آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے تھے ۵۳۴
— شرارت پسند لوگوں کا رسول اللہ اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا ۳۴۴-۳۴۵
— آپؐ پر الزام کہ آپؐ قرآن مجید کہیں سے پڑھ اور سیکھ کر آئے ہیں ۵۶۹
— مدینہ کے یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار کر لاؤ جو ہمارے سامنے نازل ہو ۴۱۵

(۲۸۰) مدینہ منورہ

— مدینہ میں وہ مرحلہ جب اسلام ایک مکمل نظام بن کر چھا گیا، کفر مغلوب اور مایوس ہوگیا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ۴۴۳
— اسلام ۶-۷ ہجری تک ایک ناقابل شکست ریاست کا روپ دھار چکا تھا اور اخلاق، معاشرت، معیشت غرض زندگی کے ہر شعبے کے قوانین دیے جا چکے تھے ۴۳۵
— مدنی دور کی سورتوں کی خصوصیات ۴۷
— مدنی دور کے آغاز میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت ۴۸-۸۷-۱۸۴-۲۳۰-۳۷۷-۴۸۰
— مدینہ کے معاشی توازن پر مہاجرین مکہ کی آمد کا کیا اثر پڑا ۲۲۹
— مدینہ منورہ میں رسولؐ اللہ کے کام کے تین شعبے ۳۱۷
— تمام مسلمانوں کو مدینہ میں ہجرت کر کے آنے کا حکم ۳۷۹
— یہودِ مدینہ کی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں

روش ۹۳-۱۰۰-۱۰۷-۲۸۲
— یہود سے معاشرتی تعلق رکھنے کی ممانعت کیونکہ وہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کے کسی موقع سے نہیں چوکتے ۲۸۲-۲۸۳
— قوانین اسلام کے خلاف مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کی ناپاک مہم جوئی ۳۴۴-۳۴۵
— یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب ہمارے سامنے نازل کراؤ ۴۱۵
— مدینہ کے یہودی تورات میں واضح احکام کے باوجود کئی دفعہ مقدمات رسولؐ اللہ کی عدالت میں لے آتے کہ شاید کوئی حسب منشا حکم مل جائے ۴۷۲-۴۷۳
— مدینہ کے یہودیوں کی مشرکین مکہ کی حمایت و رفاقت پر قرآن حکیم نے مذمت اور تنقید کی ہے ۴۹۶-۴۹۷
— بعثت رسولؐ اللہ کے وقت مدینہ کی اخلاقی اور دینی حالت ۴۶-۴۷
— ہجرت کے بعد تحریک اسلامی کو پیش آنے والے مختلف مراحل کی تفصیل ۴۶ تا ۴۸
— مدینہ منورہ میں منافقین کی مختلف اقسام ۴۸
— جنگ احد کی شکست کی وجہ سے مدینہ کی ریاست کو درپیش خطرناک حالات ۳۷۱
— منافقینِ مدینہ رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو منہ پر کہتے تھے کہ وہ مطیع و فرمانبردار ہیں لیکن رات کو اہل ایمان کے خلاف مل کر خفیہ مشورے کرتے تھے ۳۷۶
— رسولؐ اللہ کے ایک فیصلے کی مثال جس میں اللہ تعالیٰ کی مداخلت کی وجہ سے رسول اللہ نے جتھا بندی اور عصبیت سے بالکل ہٹ کر فیصلہ صادر فرمایا ۳۹۳-۳۹۴

(۲۸۱) مذاہب

— مختلف مذاہب کی اصل کے متعلق قرآنی نقطۂ نظر ۱۶۲-۲۳۹
— مختلف مذاہب اسلام میں رد و بدل کر کے بنائے گئے ہیں ۲۴۰
— ایک دین سے الگ الگ مذاہب کیسے بن گئے؟ ۶۰۴
— مذاہب اختلافات سے پیدا ہوئے جبکہ جائز اور حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلافات کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹
— مذہب کے احکام میں مطالبات اور سوال جواب کرنا کفر کی روش ہے اور انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے ۱۰۲
— انسان نے اپنی زندگی کا آغاز درست سمت میں ہدایت کے تحت کیا، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— مختلف مذاہب اور انسانوں کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں اور عین حکمت خداوندی کے مطابق ہیں ۱۹۲-۱۹۳
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام مذہبی اختلافات کی حقیقت کھول دے گا ۱۰۴-۲۵۹-۲۰۶
— کتاب اللہ میں اختلاف پیدا کرنے والے اور ان جھگڑوں میں بہت آگے نکل جانے والے نہایت برے انجام کے خریدار بن بیٹھے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— فرقہ بندیاں کرنے والے کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں ۲۷۸
— فرقہ بندیاں کرنے والوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ ہو گئے ۶۰۴-۶۰۵
— بے علم انسان صرف شیطان کی راہ ہی پر چل سکتا ہے ۱۳۳
— جو لوگ احکام کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کے لیے انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۱۳۵
— دین کی روح خدائے واحد کی بندگی ہے، جوں جوں انسان اس سے دور ہوا مذاہب اور فرقہ بندیاں شروع ہوگئیں ۳۷۴
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات کو پھیلانے اور انھیں پوشیدہ نہ رکھنے کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن انھوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالا اور اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

آیات بیچ ڈالیں ۳۰۹-۳۱۰
— تمام انبیا ایک دوسرے کے دین کی تصدیق و تائید کرتے ہیں تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے ۴۷۷-۴۷۸
— غیر مسلموں کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو کہ کہیں وہ جہالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا نہ کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱

(۲۸۲) مرتد

— اسلام سے پھر کر کفر اختیار کرنے والے کو مرتد کہتے ہیں، اس کے دنیا و آخرت کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں ۱۶۶
— ایمان کے بعد کفر کرنا اور پھر کفر میں بڑھتے جانا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کبھی ہدایت نہ دے گا ۴۰۷-۴۰۸

(۲۸۳) مروہ

— اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے ۱۲۷

(۲۸۴) مریم علیہا السلام

— آپ کی پیدائش ۲۴۷
— عمران کی عورت یعنی حضرت مریم کی والدہ کا آنے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنا ۲۴۶
— اللہ تعالیٰ نے یہ نذر قبول فرمائی ۲۴۶-۲۴۷
— حضرت زکریا کو حضرت مریم کی سرپرستی عطا ہوئی ۲۴۷-۲۴۸
— حضرت مریم کو برگزیدہ کیا گیا، پاکیزگی عطا کی اور تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ۲۵۰
— حضرت مریم کی بے گناہی اور اخلاقی برتری کی گواہی ۴۱۷-۴۲۷-۴۲۸
— ہیکل کے داخلے کے بعد کے حالات ۲۵۰
— فرشتوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی آپ کو بشارت دینا ۲۵۱
— آپ پر بنی اسرائیل کی بہتان طرازی ۴۱۷
— آپ پر "کلمہ" بھیجنے کا مطلب ۴۲۷
— رُوْحٌ مِّنْهُ کا مطلب ۴۲۸
— آپ ایک راست باز خاتون تھیں ۴۹۰
— عیسائیوں میں الوہیت مریم کا عقیدہ ۵۱۵-۵۱۶

(۲۸۵) مزدلفہ

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "حج")

(۲۸۶) مساجد اللہ

— کون لوگ اس کی تولیت کے مستحق ہیں ۱۰۴

(۲۸۷) مسجد حرام

— اس اصطلاح کا مفہوم ۱۲۲
— اس کی حرمت اور حکم جہاد ۱۵۰
— قریش کا اس سے مسلمانوں کو روکنا ۱۶۵
— مسجد حرام سے زائرین کو روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے ۴۴۰

(۲۸۸) مسخ

— اصحاب السبت کا مسخ کیا جانا ۸۳
— یہود کا بندر اور سور بنایا جانا ۴۸۴

(۲۸۹) مسلم

— مسلم کون ہوتا ہے ۱۱۳-۲۶۲
— مسلم ہونے کے تقاضے ۲۵۶
— مرتے دم تک مسلم رہنے کا مطالبہ ۲۷۶
— اس کا رویہ خدا کے سامنے ۴۳۸
— ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی رضا میں محو ہو جانا ۶۰۵
— مسلم یک سو کا مفہوم و معنی ۲۶۳

(۲۹۰) مسیح، مسیحی اور مسیحیت

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو عیسائی، عیسائیت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

(۲۹۱) مشرکین (مشرکین مکہ)

— ان کے جاہلانہ خیالات ۱۳۳
— ان کی جاہلانہ رسوم و رواج ۱۳۳

— ان کی جاہلانہ حجتیں ۱۳۳
— اسلام سے پہلے ان کی حالت ۲۷۷
— یہ وحدتِ خالق کے قائل تھے ۵۲۳
— ان کے لیے ان کے دین کا مشتبہ ہوجانا ۵۸۷
— ان کے حلت وحرمت کے مشرکانہ تصورات ۵۸۸
— مشرک ظالم ہیں ۵۲۹-۵۳۰
— مشرکین میدان حشر میں بھی جھوٹ بولنے کی جسارت کریں گے ۵۳۰
— مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہودی اور عیسائی، وہ سب اس بات پر جلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل (نبوت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں نصیب ہوگیا ہے ۱۰۱
— مشرکین کے بناوٹی معبود روز قیامت ان سے گم ہو جائیں گے ۵۲۰
— مشرکین بے اطمینانی اور ہردم خوف کے حق دار ہیں ۵۵۹
— مشرکین کے تکلیف دہ طعن اور جھوٹی نشر واشاعت کے ذریعے سے اہل ایمان آزمائے جاتے ہیں، ان مشکل حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلے کی بات ہے ۳۰۹
— حضرت ابراہیم کی قوم بھی اللہ کی ہستی کی منکر نہیں تھی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی خدائی صفات اور خدائی حقوق میں شریک قرار دیتی تھی ۵۵۹
— مدینہ کے یہودیوں کی مشرکین مکہ کی حمایت پر قرآن کی مذمت اور تنقید ۴۹۶-۴۹۷
— یہودی مکہ کے مشرکین کو گمراہ کرتے تھے ۵۶۲-۵۶۳
— اسلام اور رسول اللہ کی عداوت میں یہودی اور مشرکین مکہ نہایت سخت ہیں ۴۹۷
(مزید دیکھو ''اوہام جاہلیت'')

(۲۹۲) مشیت الٰہی

— اللہ تعالیٰ کی رضا اور مشیت میں بہت فرق ہے ۵۷۲-۵۷۳
— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے ۵۷۳ تا ۵۷۵
— اللہ تعالیٰ کی مشیت کو انسان اپنی گمراہی اور ضلالت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کرسکتا ۵۹۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'')

(۲۹۳) مصیبت

— مصیبت میں انسان آیندہ شکر گزار رہنے کے وعدے پر اپنی جان بچاتا ہے لیکن آزمائش ٹلنے پر دوسروں کو شریک بنانے لگتا ہے ۵۴۷-۵۴۸

(۲۹۴) معاشی قانون وتعلیمات

— اموال کو نادان لوگوں کے تصرف میں دینا موجب فساد ہے ۳۲۲
— کمائی کے باطل طریقے اور لین دین کے جائز طریقے ۳۴۵
— جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا ۲۱۰
— جو کچھ تمھاری ضروریات سے زائد ہو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو ۱۶۷
— رب کی بخشش اور جنت کے حق دار وہ خدا ترس ہیں جو ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خوش حال ہوں یا بدحال ۲۸۸
— تجارت کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا اور سود کو حرام کیا، ان میں کیا فرق ہے؟ ۲۱۱ تا ۲۱۳
— زر پرست اور فیاض کرداروں کا تقابل ۲۱۰-۲۱۷
— قرض کی ادائیگی میں معذور ومجبور مقروض کے قرض خواہوں کو مہلت دینے، قرض کا ایک حصہ یا مکمل قرض معاف کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے ۲۱۸-۲۱۹
— قرض اور تجارتی معاملات کو تحریروں میں لاکر اس پر شہادتیں قلم بند کرو تاکہ معاملات صاف و شفاف رہیں ۲۱۹
— کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے پر مجبور نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

کیا جائے، اس کا اخلاقی فریضہ یاد دلایا جا سکتا ہے ۲۲۱
— معاشی معاملات میں کھرے اہل کتاب کی توصیف ۲۶۵-۲۶۶
— معاشی حوالے سے یہودیوں کے نیکی کے تصورات کی تردید ۲۷۲
— انفاق فی سبیل اللہ کے خسران اور بے فائدہ ہونے کی مثال، یہ ظلم انھوں نے خود ہی اپنے اوپر کیا ۲۸۱-۲۸۲
— تمام چیزیں اللہ کی ملک ہیں، اس عارضی ملکیت میں انھیں راہِ خدا میں خرچ کرنے والا عقل منداور بخل کرنے والا اپنے حق میں نہایت برا فیصلہ کر رہا ہے ۳۰۶
— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر خرچ کرنے والوں کو اپنے ذمے قرضِ حسن قرار دیتا ہے، اس پر یہودیوں کے اعتراض کا جواب ۳۰۶-۳۰۷
— یتیموں کے مال کے متعلق احکام خداوندی ۳۱۹ تا ۳۲۱
— ہر فردِ معاشرہ کے معاشی حقوق ملکیت اور حقوق استعمال پر حکومت اور معاشرہ پابندی لگا سکتا ہے ۳۲۲-۳۲۳
— یتیموں کو ان کا مال سپرد کرتے ہوئے گواہ بنالو ۳۲۴
— ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت، لین دین ہمیشہ باہمی رضا مندی سے ہونا چاہیے ۳۴۵
— جس معاشرے میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقوں سے کھایا جاتا ہو ایسا معاشرہ خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے ۳۴۵-۳۴۶
— جو شخص اپنی معاشی اور معاشرتی بڑائی پر فخر کرے اللہ تعالیٰ کو ایسا شخص ہرگز پسند نہیں ہے ۳۵۲
— خود کنجوسی کرنے والا اور دوسروں کو کنجوسی کی تلقین کرنے والا اللہ کا فضل و رحمت چھپاتا ہے، یہ فعل اللہ کو سخت ناپسند ہے اور یہ فعل کھلم کھلا کفرانِ نعمت ہے ۳۵۲
— محض لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرنے والے اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں ۳۵۲-۳۵۳
— نفس انسان کو تنگ دلی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن انسان اگر احسان سے پیش آئے اور خدا ترسی سے کام لے تو اس کے لیے بہتر ہے ۴۰۲-۴۰۳
— ہر انسان کا دنیا میں قیام کے دوران میں رزق مقرر کر دیا گیا ہے، اب یہ اس پر منحصر ہے کہ حلال کر کے کھائے یا حرام کر کے کھائے ۴۱۰-۴۱۱
— یہودیوں کے جرائم میں دو بڑے معاشی جرائم تھے: (۱) وہ سود خواری کرتے تھے (۲) اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے تھے ۴۲۲-۴۲۳
— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں ۴۸۴
— قرآن کا معیار قدر و منزلت کم اور زیادہ مقدار کی بنا پر نہیں ہے بلکہ معیار کی بنا پر ہے ۵۰۶-۵۰۷
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال کا بہترین حصہ دینا ہوگا ۱۳۷
— اپنے والدین، رشتہ داروں اور یتیموں پر خرچ کرو، جو تم خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے ۱۶۴
— اسلام کسی بھی شخص پر اس کی معاشی استطاعت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا بلکہ معروف طریقے پر چلنے کا حکم دیتا ہے ۱۷۸-۱۷۹
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی کرنا شرمناک عمل ہے ۲۰۷
— اللہ تعالیٰ جو فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر وقت عطا اور بخشش کرتا ہے ایسی ہی صفات انسانوں میں بھی پسند کرتا ہے ۲۰۷
— معاشی تعلیمات اور انفاق کرنے والوں کے بیان کردہ اوصاف کیا ہیں ۲۰۹-۲۱۰
— انفاق میں علانیہ اور مخفی دونوں طرح کی ادائیگی ہی افضل ہے ۲۰۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلام کی معاشی تعلیمات'')

(۲۹۵) معجزات

— حیات بعد الموت کا معجزے کے طور پر عملی مظاہرہ ۲۰۰
— چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ۲۰۱
— حضرت زکریا علیہ السلام کی بانجھ بیوی کے ہاں اولاد کی پیدائش ۲۴۹
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص معجزات ۲۵۱-۲۵۲
— قبول شدہ قربانی کے گوشت کو معجزانہ طور پر آسمانی آگ کا کھا جانا ۳۰۷-۳۰۸
— رفع عیسیٰ کی غیر معمولی نوعیت ۴۲۰
— معجزات عیسیٰ کی تفصیل ۵۱۳
— سمندر پھاڑ کر بنی اسرائیل کو بچا لیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا گیا ۷۵
— حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر بنی اسرائیل کے لیے چشمے کا عصا کی چوٹ پر جاری ہو جانا ۷۹
— بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا بندر بنایا جانا ۸۴
— اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقتول کا زندہ ہو کر قاتل کی خبر دینا ۸۵-۸۶
— معجزات اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتے ہیں ۵۱۳
— رسول اللہ سے محسوس معجزہ دکھانے کا مطالبہ جب کہ آپ بطور خود معجزات دکھانے پر قادر نہ تھے ۵۳۵-۵۳۷
— مدنیت صالحہ کی تعمیر معجزات کے بل پر نہیں ہو سکتی ۵۳۶
— معجزات دکھانا تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ۵۷۱
— نادان لوگوں کا مطالبہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتا ۱۰۶-۱۵۵
— جن لوگوں کے دلوں پر پردے اور کانوں میں گرانی ڈال دی گئی ہے وہ کوئی بھی معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لائیں گے ۵۳۱
— بنی اسرائیل کی مصر سے جزیرہ نمائے سینا میں مہاجرت پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے مسلسل ابر آلود آسمان اور چالیس سال تک من و سلویٰ کی فراہمی ۷۷-۷۸

(۲۹۶) معروف

— اس کا شرعی اور قانونی مفہوم ۱۳۹
— امر بالمعروف کا فریضہ ۲۷۷
— اسلام معروف (رواج اور رائج طریقہ) کی افادیت کا مکمل اہتمام کرتا ہے ۱۸۰
— بنی اسرائیل پر معروف کی تلقین سے اجتناب کرنے پر انبیائے کرام حضرت داود اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے ۴۹۶

(۲۹۷) مغفرت

— کن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفرت نہیں ہے ۳۵۸-۳۹۷-۴۰۷
— شرک کی معافی نہیں ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ چاہے تو جس گناہ کو بھی چاہے معاف کر سکتا ہے ۳۹۷
— ہدایت کے بدلے ضلالت اور مغفرت کے بدلے عذاب پانے والے کون لوگ ہیں ۱۳۵-۱۳۶

(۲۹۸) مکہ مکرمہ (بیت اللہ)

— مکی دور کی نازل شدہ سورتوں کی خصوصیات ۴۶-۴۷
— مکی دور میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت ۴۷-۲۲۵
— مکہ میں مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے خطوط ۲۲۶
— سب سے پہلی مرکزی عبادت گاہ مکہ میں بنی ۲۷۴
— مکی زندگی میں دعوتِ نبوت کے چار بڑے دور ۵۲۱-۵۲۲
— مکہ میں رسول اللہ کا آخری سال ۵۲۰-۵۲۱
— دعوت اسلامی کے لیے مکہ کی مرکزیت ۵۶۳
— بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب امامت کی وجہ

Maktaba Tul Ishaat.com

سے قبلہ تھا لیکن جب ان سے امامت لے کر بنی اسماعیل کو دی گئی تو مکہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰
— مکہ کو امن و امان اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا گہوارہ حضرت ابراہیم کی دعا کے نتیجے میں بنایا گیا ۱۱۱
— جاہلیت کے تاریک ترین دور میں بھی مکہ اور بیت اللہ کا احترام موجود تھا ۲۷۵
— مکہ کے مشرکین کے گمراہی میں استاد یہود مدینہ تھے ۵۶۲-۵۶۳

(۲۹۹) مناسک

— صفا و مروہ کی سعی مناسک میں سے ہے اور ہرگز زمانۂ شرک کی ایجاد نہیں ہے ۱۲۷

(۳۰۰) منافقین

— منافقین ۵۲ تا ۵۶-۴۰۹-۴۱۰
— منافقین گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں، یہی یہودیوں کا وتیرہ بھی تھا ۴۸۴
— مکہ میں کس قسم کے منافق پائے جاتے تھے ۴۸
— مدینہ منورہ میں منافقین کی مختلف اقسام ۴۸
— واقعہ نخلہ پر منافقین مدینہ کی فتنہ انگیزیاں ۱۶۵
— جنگ احد میں منافقین کی رخنہ اندازیاں ۲۳۰-۲۹۱-۲۹۴
— غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی فتنہ انگیزی ۲۸۴-۲۸۵
— مسلمانوں کے ایمان میں رخنہ اندازیاں ۲۹۳
— معرکہ احد کے بعد اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کے جاہلانہ گمان ۲۹۶
— ان کا نفسیاتی تجزیہ ۳۰۱-۳۰۲-۳۶۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۸۰
— اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے سے اہل ایمان سے منافقین کو الگ کر لیتا ہے ۳۰۵
— احد کے واقعے کے بعد مدینہ میں منافقین کی سرگرمیاں ۳۱۷
— ان سے کیا برتاؤ کیا گیا؟ ۳۱۸
— اسلام کی اصلاحات سے ان کی چڑ ۳۴۴-۳۴۵
— معاملات کے فیصلے کے لیے ان کا قرآن کو چھوڑ کر طاغوت کی طرف رجوع کرنا ۳۶۶-۳۶۷
— ان کا جہاد سے جی چرانا ۳۷۱-۳۷۲
— ان کی طرف سے حکم جہاد پر منفی ردعمل ۳۷۴
— ان کے خفیہ مشورے ۳۷۶
— ان کی انتشار انگیز حرکات ۳۷۶
— ان کے بارے میں دو رائیں رکھنے والے مسلمانوں کی گرفت ۳۷۹
— منافقین مسلمانوں کو بھی اپنے کفر کی چھوت لگانا چاہتے تھے ۳۸۰
— منافقین سے دوستی کی ممانعت ۳۸۰
— ان سے دورانِ جنگ میں معاملہ ۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲
— نبیؐ کے عدالتی فیصلے سے انحراف نفاق ہے ۳۹۷
— ان کا اہل ایمان کے بجائے کافروں کو رفیق بنانا ۴۰۸
— ان کو جہنم میں کافروں کے ساتھ جمع کیا جائے گا ۴۰۹
— ان کی دلچسپ منافقانہ پالیسی ۴۰۹-۴۱۰
— ان کی اللہ تعالیٰ سے فریب کاری ۴۰۹
— ان کی حالت تذبذب ۴۱۰
— منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے ۴۱۱
— دین حق کی مخالفت کرنے والے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل ۴۸۰
— ان کے لیے حبط اعمال کا فیصلہ ۴۸۱
— نفاق آخر کار کھل کر رہتا ہے ۴۸۱
— اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ایمان نہیں لائے ۵۲-۵۳
— منافقین سے جب کہا جاتا ہے کہ فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، درحقیقت وہ مفسد ہیں لیکن انھیں اس کا احساس نہیں ہے ۵۳
— منافقین کو تنبیہ کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور دردناک عذاب تمھارا مقدر ہے ۵۳

— منافقین اہل ایمان سے دھوکا کر رہے ہیں، انھیں شعور نہیں ہے اصل میں وہ خود دھوکے میں ہیں ۵۳
— منافقین کے دلوں میں بیماری ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اور بڑھا دیا ہے ۵۳
— منافقین قسمیں بہت کھاتے ہیں ۳۶۷-۳۶۸
— منافقین بھلائی اور اصلاح بین الناس کے بہت دعوے دار ہوتے ہیں ۳۶۸
— منافقین زبان سے جو کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا اور وہ دلوں کی باتوں کو چھپاتے ہیں ۳۰۱
— منافقین جہاد میں بڑی بڑی باتوں اور دعووں کے حامل ہوتے ہیں لیکن میدان میں صفر ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳-۳۷۴
— منافقین اہل ایمان سے ملتے ہیں تو ایمان کے دعوے دار بنتے ہیں اور اپنے شیطان کے حلقے میں جاتے ہیں تو انھیں کہتے ہیں ہم مسلمانوں سے مذاق کر رہے تھے، ہم تمھارے ساتھ ہیں ۵۴
— منافقین سے جب کہا جاتا ہے کہ صدق دل سے ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں ۵۴
— اللہ تعالیٰ منافقین کی رسی دراز کر رہا ہے اور وہ سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے جا رہے ہیں ۵۴
— منافقین کا نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے سلب کر لیا ہے اور انھیں کچھ نظر نہیں آ رہا ۵۵
— منافقین اندھے، بہرے اور گونگے ہیں اور ہدایت کی طرف کبھی نہیں پلٹیں گے ۵۵
— منافقین نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی لیکن یہ سودا ان کے لیے کبھی نفع بخش نہیں ہوگا ۵۵
— منافقین کے لیے قرآن کی تمثیل ۵۵-۵۶
— منافقین غلط فہمی میں ہیں کہ ہلاکت سے بچ جائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے ۵۶
— جب معاملات سنبھل جاتے ہیں تو منافقین مسلمانوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اگر آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو ٹھٹک کر الگ کھڑے ہو جاتے ہیں ۵۶
— منافقین ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب ہوتے ہیں ۳۰۱
— منافقین کے ایمان پر اگر کوئی آزمائش آ جائے تو ثابت قدم نہیں رہ سکتے ۳۶۹
— منافقین جہاد میں کامیابی ہو تو اسے اللہ کی طرف سے قرار دیتے ہیں لیکن اگر غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے شکست ہو جائے تو اسے رسول اللہ کے سر تھوپ دیتے ہیں ۳۷۵-۳۷۶
— ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافق قرار دیا گیا حالانکہ دارالسلام نے اپنے دروازے ان کے لیے کھلے رکھے تھے ۳۷۹-۳۸۰
— اسلام عہد، وعدے اور معاہدے کا اس قدر احترام کرتا ہے کہ اگر واجب القتل منافق بھی ایسی قوم میں پناہ لے لے جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو احترام معاہدہ میں اس کی جان بخش دی جائے گی ۳۸۰-۳۸۲
— ہر زمانے میں منافقین کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دو متحارب گروہوں کے ساتھ عہد و پیمان کریں گے، جو بھی غالب رہے گا اس کے ساتھ ہو جائیں گے ۴۰۹
— اگر منافقین اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور پچھلے طرز عمل سے تائب ہو جائیں تو ان کے لیے اہل ایمان جیسے درجات ہیں ۴۱۱-۴۱۲
— منافقین ایمان کے دعوے کرتے ہیں لیکن ہیں کفر کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال بہت اچھی طرح جانتا ہے ۴۸۴

(۳۰۱) منکر

— نہی عن المنکر کا فریضہ ۲۷۷
— نہی عن المنکر میں کوتاہی کرنے کا نتیجہ ۴۹۶

(۳۰۲) منکرین حدیث

— منکرین حدیث کے خلاف ایک دلیل ۳۷

(۳۰۳) من وسلویٰ

— بنی اسرائیل کو جزیرہ نمائے سینا میں مصر سے ہجرت

Maktaba Tul Ishaat.com

کے بعد دھوپ سے بچاؤ کے لیے مسلسل آبر آلود آسمان اور چالیس سالہ مہاجرت میں من وسلویٰ کی مسلسل فراہمی ۷۷-۷۸

(۳۰۴) موت

— کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہ مرسکتا ہے اور نہ زندہ ہی رہ سکتا ہے، اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر چھوڑا ہے ۲۹۱
— موت کی جگہ اور وقت مقرر ہے انسان خود چل کر مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پر آ جاتا ہے ۲۹۶-۲۹۷
— موت کا وقت آ جانے پر کوئی اسے ٹال نہیں سکتا ۳۰۲
— موت آ کر رہے گی خواہ کتنے ہی انتظامات اس سے بچنے کے لیے کر لیے جائیں ۳۷۴
— اگر ہم ایک نیک کام کا قصد کر لیں لیکن پورا کرنے سے پہلے موت آ لے تو ہمیں اس نیک کام کا اجر ملے گا، گویا ہم نے وہ نیک کام کر ڈالا ۳۸۷
— موت کو قرآن مصیبت قرار دیتا ہے ۵۱۰
— موت کا وقت مقرر ہے جان نکالنے والے فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بالکل کوتاہی نہیں کرتے ۵۴۷
— اللہ تعالیٰ ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرے گا ۵۶۵-۵۶۶
— جہالت، گمراہی اور ضلالت کی حالت کو مردہ قرار دیا گیا ہے اور حقیقت شناسی کو زندگی قرار دیا گیا ہے ۵۷۸-۵۷۹

(۳۰۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام

— آپ کا زمانہ ۴۶
— گائے کو ذبح کرنے کا حکم، بنی اسرائیل کی بہانہ سازیاں اور بمشکل ہی اس حکم پر عمل کیا ۸۴-۸۵
— چالیس شبانہ روز کے لیے طور پر بلایا جانا ۷۵
— کتاب اور فرقان سے نوازا جانا ۷۶
— چٹان سے چشمے نکالنے کا معجزہ ۷۹
— آپ سے اللہ تعالیٰ کا براہِ راست کلام کرنا ۴۲۵
— بنی اسرائیل سے دشتِ فاران میں آپ کا خطاب ۴۵۹
— حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سامری کا ان کی قوم کو گمراہ کر دینا ۷۶
— حضرت موسیٰ کی اپنی قوم کی طرف واپسی، ان کے شرک پر رنج وغم کا اظہار اور اس گمراہی کے ذمہ داروں کے لیے قتل کی سزا تجویز کرنا ۷۶
— حضرت موسیٰ کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۰۶) مہر

— بے ہاتھ لگائے طلاق کی صورت میں نصف مہر دینا چاہیے ۱۸۱
— بیوی کا مہر معاف کرنے کا اختیار ۳۲۲
— بیوی کو تنگ کر کے مہر میں حق ماری کرنے کی ممانعت ۳۳۳-۳۳۴
— دے کر ہرگز مہر واپس نہ لیا جائے ۳۳۵
— مہر نکاح کے ارکان میں سے ہے ۳۴۱-۳۴۷

(۳۰۷) میثاق

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''عہد'')

(۳۰۸) میدان حشر

— جس دن اللہ تعالیٰ حکم فرمائے گا اس دن حشر برپا ہو جائے گا ۵۵۱-۵۵۲
— میدانِ حشر میں تمام انبیائے کرام سے گواہی اور شہادت لی جائے گی کہ ان کی دعوتِ حق کا ان کو اپنی قوم کی طرف سے کیا جواب ملا ۵۱۲

ن

(۳۰۹) ناپ تول

— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک اور نادانستہ کمی بیشی کی باز پرس نہ ہوگی ۶۰۰

(۳۱۰) نامۂ اعمال

— مجرمین کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ تمھاری کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے ۸۶
— انسان اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے جو کچھ بھی کرتا ہے اسے آخرت میں پائے گا، انسان کا کوئی اچھا یا برا فعل اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا ۱۰۳
— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے رویوں پر گہری نظر رکھتا ہے ۲۳۸
— انسانوں سے اپنی حرکات چھپائی جاسکتی ہیں لیکن حق تعالیٰ جو ہر دم انسان کے ساتھ ہے اس سے کیونکر چھپائی جاسکتی ہیں، وہ رب عزیز انسان کے تمام اعمال پر محیط ہے ۳۹۴-۳۹۵

(۳۱۱) نبوت

— نبوت کیا ہے؟ ۹۷
— اس کی تشریح ۱۸
— اس کی ضرورت کس لیے پیش آئی ۱۸
— تمام انبیا کا دین ایک تھا اور ان کی دعوت بھی ایک ہی تھی ۱۸
— تمام انبیائے کرام کی اطاعت باذن اللہ ۳۶۸
— انبیائے کرام کس کام کے لیے آتے ہیں ۱۸
— آغاز نبوت ۱۶۲
— انبیا کی بعثت کی غرض ۱۶۲
— اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ کر نبوت کا دعویٰ کرنے والے ۵۶۴
— اللہ تعالیٰ خود بہتر جانتا ہے کہ رسالت کے لیے کس کو منتخب کرے ۵۷۹
— انبیائے کرام کی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ الگ بندوبست کرتا ہے ۵۷
— خلیفۃ اللہ (انسان) کو زمین پر اتارتے وقت حق و باطل کی راہیں بالکل واضح کر دی گئیں لیکن انسان ان ہدایات کو بار بار ضائع کرتا رہا، چنانچہ انسانوں ہی میں سے صالح افراد کو نبوت سے سرفراز کر کے اللہ تعالیٰ بار بار اس راہِ ہدایت کی وضاحت کرتا رہا ہے ۱۷ تا ۱۹
— نبوت کا کتاب کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے جس کو الگ نہیں کیا جاسکتا ۳۷-۳۸
— حضرت آدم کو سزا کے طور پر زمین پر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ توبہ قبول کر کے نبوت سے سرفراز فرما کر زمین پر اتارا گیا ۶۸-۶۹
— بنی اسرائیل، انبیا کی قاتل قوم ۸۱
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اور مشرکین اس بات سے جلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل (نبوت) رسول اللہ ہی کو کیوں مل گیا ۱۰۱
— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اسے چنتا ہے ۱۰۱
— پیغمبروں میں تفریق نہ کرنے کا مطلب ۱۱۶
— اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیائے کرام کو ایک دوسرے سے بڑھ کر مرتبہ اور درجہ عطا کیا ہے ۱۹۲
— بشر پہ نزول وحی پر حیرانی ناقابل فہم ہے ۵۶۳
— رسول کا کام دعوت حق پہنچا دینا ہے، آگے اللہ تعالیٰ بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے ۲۴۰-۲۴۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کی خطاؤں سے اللہ تعالیٰ درگزر کرتا ہے ۲۴۵
— تمام انبیا کی دعوت کے ہمیشہ تین بنیادی نکات رہے ہیں ۲۵۴ تا ۲۵۶
— انبیائے کرام اور ان کی امتوں سے لیا گیا عہد کہ ہر آنے والے نبی کی تعلیمات پر لبیک کہیں گے لیکن اہل کتاب اس عہد کی پابندی نہیں کرتے ۲۶۸-۲۶۹
— انبیائے کرام کو کتاب، حکمت اور دانش سے نوازا جاتا ہے ۲۶۸
— تمام انبیائے کرام کے برحق جاننے اور ان کی تعلیمات پر ایمان لانا عین تقاضائے ایمان ہے، اس کے علاوہ کوئی طریقہ قابل قبول نہیں ہے ۲۷۰
— نبی ہمیشہ اپنی قوم ہی میں سے اٹھایا جاتا ہے ۳۰۰
— نبی کا کام (۱) آیاتِ کتاب اللہ پہنچانا (۲) انسانوں کی زندگی کو سنوارنا (۳) کتاب اور دانائی و حکمت

Maktaba Tul Ishaat.com

کی تعلیم دینا ۳۰۰
— رسولؐ اللہ کے منصب پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— رسول کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— جس نے رسولؐ اللہ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور اگر منہ موڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے رسول کو بری الذمہ قرار دیا ۳۷۵-۳۷۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اور حقیقت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے ۳۷۵
— رسولؐ اللہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہے، ان پر کتاب وحکمت نازل کی گئی اور انھیں وہ باتیں بتائی گئیں جو انھیں معلوم نہ تھیں ۳۹۶
— کسی نبی کو ماننا اور کسی کا انکار کھلا کفر ہے ۴۱۴
— مدینہ کے یہودیوں کا رسولؐ اللہ سے مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب ہمارے لیے آسمان سے نازل کراؤ ۴۱۵
— رسول کا منبع ہدایت وہی وحی ہے جو تمام انبیا کا ذریعہ ہدایت رہا ہے ۴۲۴ تا ۴۲۶
— تمام مبعوث شدہ انبیا کا ذکر قرآن میں نہیں ہے ۴۲۵
— تمام انبیائے کرام کو اس حقیقت کے ماننے میں کوئی عار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— اللہ تعالیٰ اپنے انبیا کی طرف اٹھنے والے ہاتھ توڑ دیتا ہے ۴۵۰
— رسولؐ اللہ کی نبوت نے قرآن حکیم کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کا راستہ بتایا، جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر ہدایت اور روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۴۵۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسے وقت میں ہوئی جب کہ بعثت انبیا کا سلسلہ ایک عرصے سے بند تھا، آپ نہایت واضح تعلیمات و ہدایت کے ساتھ بشیر و نذیر بن کر آئے ۴۵۸
— نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام و ہدایات اخذ کرتا ہے انھیں بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دینا ہی حق نبوت ہے ۴۸۷
— حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ دونوں بشر تھے اور ہماری ہی طرح کھانا کھاتے تھے اور الوہیت سے ان دونوں کا کوئی تعلق نہ تھا ۴۹۰
— رسولؐ اللہ کے ذمے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا ہے، حکم عدولی کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں ۵۰۳-۵۰۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات کا مطالبہ ۵۱۴
— رسولؐ اللہ سے فرشتوں کی معیت کا مطالبہ اور اس کا جواب ۵۲۵-۵۲۶
— انبیائے کرام کی دعوت کو جھٹلانے والوں اور ان کا مذاق اڑانے والوں پر وہی حقیقت مسلط کر دی گئی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۵۲۶
— انبیائے کرام ہمیشہ ہی جھٹلائے جاتے رہے لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی ۵۳۴-۵۳۵
— انبیائے کرام نیک کردار لوگوں کے لیے خوش خبری اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے بن کر آتے ہیں نیک کرداروں کے لیے خوف و رنج کا کوئی مقام نہیں اور نافرمانی کرنے والے سزا بھگت کر رہیں گے ۵۴۱
— انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوتے ہیں اگر مخالفین حق اس دلیل کو جھٹلاتے ہیں تو عذاب لانا نبی کے اختیار میں نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و فیصلہ ہے کہ کتنی ڈھیل دینی ہے کیونکہ امر حق اللہ تعالیٰ ہے جو بہترین فیصلہ دینے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶
— نبوت کا منصب اللہ کی دین ہے کسی سعی اور کوشش سے اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا ۵۶۱
— انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا عطا کیا

جاتا ہے۵۶۱
— انبیائے کرام انسانوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے۵۶۲
— رسولؐ اللہ کی نبوت اور قرآن مجید کی صورت میں بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو قبول کرے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو رد کرے گا اپنا ہی نقصان کرے گا۵۶۸-۵۶۹
— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ انبیائے کرام کے مخالف رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— منکرین نبوت کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ مکر و فریب کا جال پھیلائیں، وہ خود اپنے ہی مکر و فریب کے جال میں گرفتار ہوں گے لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۵۷۹-۵۸۰
— روز قیامت گمراہ افراد اس حقیقت کا اقرار کریں گے کہ انھیں انبیائے کرام نے خبردار کیا تھا لیکن ہم ہی نے بات نہ مانی ۵۸۱
— اللہ تعالیٰ اس قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں یعنی اتمام حجت نہ ہو جائے۵۸۲

(۳۱۲) نجران

— وفد نجران کی آمد پر نازل ہونے والی آیات ۲۴۵
— وہاں کی عیسائی جمہوریت کا نظام ۲۴۶
— وفد نجران کی ہٹ دھرمی ۲۶۰
— وفد نجران کا دعوتِ مباہلہ سے گریز ۲۶۱

(۳۱۳) نجوم

— نجوم کا علم سیکھنا اور حال احوال بتانا حرام ہے ۴۴۱-۴۴۲

(۳۱۴) نذر

— اس کی حقیقت ۲۰۸

(۳۱۵) نسی

— جاہلی عرب میں نسی کا قاعدہ اور اس میں بے جا تصرفات ۱۵۲

(۳۱۶) نصاریٰ

— نصاریٰ سے کیا مراد ہے؟ ۴۵۵
— قرآن عیسائیوں کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے منسوب کرتا ہے ۵۱۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’عیسائی، عیسائیت‘‘)

(۳۱۷) نصرتِ الٰہی

— کب آتی ہے؟ ۱۶۴-۵۳۵
— وہ اہل صبر کے لیے ہے ۱۹۰-۲۸۶
— اس کے بل پر قلیل گروہ کثیر گروہ پر غالب آ جاتا ہے ۱۹۰-۲۳۷
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا حامی و مددگار ہے ۱۹۶-۲۸۶-۲۹۴
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے اس کا وعدہ ۲۹۴
— یہ جسے حاصل ہو اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا ۲۹۹
— جو اس سے محروم ہو وہ کہیں سے مدد نہیں پا سکتا ۲۹۹

(۳۱۸) نفاق

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’منافقین‘‘)

(۳۱۹) نفل عبادت

— اسلامی تعلیمات کے مطابق نفل عبادات کو اخفا سے انجام دینا افضل ہے ۲۰۸

(۳۲۰) نکاح

— مشرکین سے نکاح کی ممانعت اور اس کی مصلحت ۱۶۸
— عورت کی عدت گزرنے سے پہلے عقد نکاح کا فیصلہ نہ کیا جائے ۱۸۰
— تعدد ازدواج پر قیود ۳۲۰-۳۲۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— محرمات ۳۳۵ تا ۳۳۹
— زن وشو کا تعلق صرف نکاح کی صورت میں جائز ہے ۳۴۱
— نکاح کے لیے مہر کی شرط ۳۴۱-۳۴۲-۴۴۷
— اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت ۴۴۶-۴۴۷
— اسلام کا قانون نکاح وطلاق ۱۶۸-۱۶۹
— قانونِ نکاح ۱۷۸
— مہر کے معاف کیے جانے کے احکام ۳۲۲
— کیا تعدد ازدواج کا حکم قرآن مجید نے خود ہی منسوخ کردیا ہے؟ ۴۰۳-۴۰۴
— اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے انھیں ایک دوسرے سے بے نیاز کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دامن بہت کشادہ ہے ۴۰۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، ازدواجی تعلقات'')

(۳۲۱) نماز

— ''اقامت صلوٰۃ'' ایک جامع اصطلاح، قرآن مجید اور نظام دین میں اس کی اہمیت ۵۰
— اس کے قائم کرنے کا مطلب ۵۱
— کن لوگوں کے لیے دشوار اور کن لوگوں کے لیے سہل ہے؟ ۷۴
— نماز میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم ۱۲۱-۱۲۴
— ریل یا کشتی میں استقبال قبلہ ۱۲۲
— ''صلوٰۃ وسطیٰ'' کی حقیقت ۱۸۲
— اسلامی نظام زندگی میں نماز کا مقام ۱۸۲
— ہر قسم کے حالات میں ادا کی جائے ۱۸۳
— ''صلوٰۃ خوف'' کا حکم کب آیا؟ ۳۱۶-۳۱۸-۳۹۰ تا ۳۹۲
— تیمم ۳۱۶-۳۵۵-۳۵۶
— قصر نماز ۳۱۸-۳۸۸ تا ۳۹۰
— نماز کے اختصار یعنی قصر کا حکم، زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ کے لیے الگ الگ احکام ہیں ۳۸۸ تا ۳۹۰
— حالت نشہ میں نماز کی ممانعت، نماز ایسی حالت میں پڑھو جب جان سکو کہ کیا پڑھ رہے ہو ۳۵۴
— حالت جنابت میں نماز کی ممانعت ۳۵۴-۳۵۵
— غسل جنابت کے احکام ۴۴۸
— اقامت صلوٰۃ اسلامی حکومت کی نمایاں علامت ہے ۳۶۴-۳۶۵
— جنگی حالات میں نماز میں تاخیر کی رخصت ۳۸۸
— نماز میں پابندیِ اوقات کی اہمیت ۳۹۳
— منافقین کی نماز کا نقشہ ۴۰۹
— دکھاوے کی نماز جو مارے باندھے پڑھی جائے ۴۰۹
— دورِ رسالت میں نماز کا اولین معیارِ کفر وایمان ہونا ۴۱۰
— وضو کی فرضیت اور اس کا طریقہ ۴۴۸
— شراب اور جوئے میں نماز سے غفلت پیدا کرنے کی خاصیت ۵۰۳
— نماز پنج وقتہ تو بعثت رسولؐ اللہ کے کئی سال بعد فرض قرار پائی لیکن اسلام میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جس میں نماز فرض نہ ہو ۲۹
— نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دین اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں ۷۳
— اقامت دین کے لیے نماز اور صبر کی اہمیت اور ان کا باہمی تعلق ۷۳-۷۴-۱۲۶
— نماز بے شک ایک سخت ترین اور مشکل کام ہے لیکن ان فرمانبرداروں کے لیے نہیں جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار رب کی طرف ہی پلٹنا ہے اور اس کے حضور پیش ہونا ہے ۷۴
— نماز میں خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ کا خیال رکھنے کا حکم ۱۸۲-۱۸۳
— نماز انسان کے اندر خوفِ خدا اور احکامِ خداوندی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے ۱۸۲
— نماز اور تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی

شریک نہیں ہے ۶۰۵

(۳۲۲) نمرود

— اس کے دعوائے خدائی کی حقیقت ۱۹۹
— اس کا حضرت ابراہیم سے مباحثہ ۱۹۷ تا ۱۹۹

(۳۲۳) نیند

— نیند کی حالت میں روزانہ انسان کی روح قبض کی جاتی ہے اور پھر اگلے روز کے لیے دوبارہ کاروبارِ عالم میں بھیج دیا جاتا ہے ۵۴۶

(۳۲۴) نوح علیہ السلام

— ان کو راہِ راست دکھائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۲۵) نیکی

— رسمی مظاہر کا نام نیکی نہیں ہے ۱۳۶، ۱۴۸
— نیکی کی حقیقت ۱۳۶-۱۳۷-۱۴۹
— ظاہرداری کا نام ہرگز نیکی نہیں ہے ۲۷۲
— انفاق فی سبیل اللہ نیکی کے دروازے کی کنجی ہے ۲۷۲
— نیکی کی طرف بلانے کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ۲۷۷
— ایمان کے ساتھ جو نیکی کی جائے وہ ضائع نہیں جا سکتی ۲۸۱
— نیکی کے اجر کو اللہ تعالیٰ دوگنا کر دیتا ہے ۳۵۳
— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہو تو آدمی نیکی کرنے میں ریا اور دکھاوا نہیں کرتا ۳۵۳
— نیکی میں ہر ایک سے تعاون کرنا چاہیے ۴۴۰
— حملہ کی مدافعت نہ کرنا نیکی نہیں ہے ۴۶۲
— نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں دس گنا ملتا ہے ۶۰۴
— نیکی کی بنیاد ظاہری نمود و نمائش اور اپنے اوپر بے جا پابندیاں عائد کرنا نہیں بلکہ پرہیزگاری ہی بہترین زادِ راہ ہے ۱۵۶
— دنیوی آزمائش میں کامیابی اور پورا اترنے کے لیے نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی ہوگی ۴۷۷-۴۷۸

و

(۳۲۶) والدین

— والدین سے نیک سلوک کا حکم ۵۹۸
— خدا کے بعد بندوں پر سب سے مقدم حق اللہ تعالیٰ نے والدین کا مقرر کیا ہے ۵۹۸-۵۹۹

(۳۲۷) وحی

— اس کے معنی ۴۲۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں بلکہ تمام انبیائے کرام پر پہلے بھی وحی آتی رہی ہے ۴۲۴
— قرآن مجید کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی آنا ۵۲۸
— ''بشر'' پر نزول وحی سے انکار کے معنی ۵۶۳
— انبیا پر اس کے نزول کے چار دلائل ۵۶۴
— شیاطین کا اپنے ساتھیوں پر وحی کرنا ۵۷۷

(۳۲۸) وراثت

— پانچ بنیادی احکامِ قانونِ وراثت ۳۲۴
— اسلام کے قانون وراثت میں وصیت کرنا فرض ہے ۱۳۹
(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''قانونِ اسلام، قانونِ وراثت'')

(۳۲۹) وسیلہ

— اس کا مفہوم ۴۶۶

(۳۳۰) وصیت

— وصیت کرنا فرض ہے ۱۳۹
— وصیت کے بارے میں اول حکم اور بعد میں دوسرا حکم

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۴۰-۱۳۹
— وصیت کی اہمیت ۳۲۷
— وصیت کو بدلنے والے گناہ گار ہیں، اس میں وصیت کرنے والے کا کوئی قصور نہیں ۱۴۰
— وصیت کی اصلاح کرنے والا گناہ گار نہیں لیکن ایسی اصلاح جو نادانستہ یا قصداً نہ کی جائے ۱۴۰
— وصیت کرنے والا اگر زیادتی کرے تو اس کی اصلاح کا طریقہ موجود ہے ۳۲۸
— وصیت کی ضرر رسانی کیا ہے؟ ۳۲۹
— حضرت یعقوب کی اپنی اولاد کو نصیحت ۱۱۳
— قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والا بچ نہیں سکتا، جو حصے مقرر کیے گئے ہیں وہ عین درست ہے، یہ قانون علم رکھنے والی ہستی نے بنائے ہیں جو نرم خو بھی ہے، لہٰذا انسان کے لیے سہولت پیدا کرتا ہے ۳۳۰
— منہ بولا رشتہ دار، دوستی اور عہد و پیمان کسی کو حق وراثت نہیں دیتے ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے ۳۴۸-۳۴۷
— وصیت پر گواہی اور شہادت کا التزام کرو ۵۱۱-۵۱۰
— اس شہادت کا نصاب کیا ہے؟ ۵۱۱-۵۱۰

(۳۳۱) وضو

— اس کے ارکان اور احکام ۴۴۸
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وضو کی عملی تکمیل ۴۴۸

(۳۳۲) وہم

— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے ہے، اس میں وہم کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۱۴۸-۱۴۷

ھ

(۳۳۳) ہاروت و ماروت

— فرشتوں اور ہاروت و ماروت پر لوگوں کو جادوگری سکھلانے کا الزام ۹۸

(۳۳۴) ہارون علیہ السلام

— ان کو راہِ راست دکھائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۶۰-۵۵۹

(۳۳۵) ہجرت

— مدینہ کے ''دارالاسلام'' میں عام مسلمانوں کو ہجرت کر کے آ جانے کا حکم ۳۱۸
— ہجرت نہ کرنے والوں کے لیے حکم کہ انھیں پکڑ کر قتل کرو اور انھیں ہرگز دوست اور مددگار نہ بناؤ ۳۷۹-۳۸۰
— اس سے باز رہنے والوں پر نفاق کا اطلاق ۳۷۹
— ہجرت کر کے مدینہ نہ آنے والے منافقین کے لیے حکم ۳۸۰
— مدینہ کی ہجرت کے فوراً بعد تحریک اسلامی کو پیش آنے والے مختلف مراحل کی تفصیل ۴۶ تا ۴۸
— ہجرت کرنے والے، ہجرت پر مجبور کیے جانے والے، اللہ کی راہ میں لڑنے والے اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس گناہوں سے معافی اور بہترین جزا ہے ۳۱۳-۳۱۲
— دارالحرب اور دارالکفر میں بیٹھے رہنے والے اور دارالسلام کی طرف ہجرت نہ کرنے والے افراد کے لیے بہت برا انجام مقدر ہے، لیکن کمزور مرد اور عورت اور بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ۳۸۷
— ہجرت کی نیت اور ہمت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی زمین میں بہت گنجائش پائے گا اور ہجرت کے سفر میں موت پانے والے کا درجہ ہجرت کرنے والے کی طرح محفوظ رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ۳۸۷
— دارالکفر کے مسلمانوں پر کن حالات میں ہجرت واجب ہوتی ہے ۳۷۹-۳۷۸
— جہاں قانون الٰہی کے مطابق جینا ممکن نہ ہو، وہاں سے ہجرت کرنے کا مطالبہ ۳۸۷
— "لا هجرة بعد الفتح" کا مفہوم سمجھنے میں ایک غلط

فہمی ۳۸۸

(۳۳۶) ہدایت

— اللہ تعالیٰ کس قسم کے لوگوں کو ہدایت سے محروم کرتا ہے؟ ۵۲- ۵۵- ۵۶- ۲۰۰- ۲۷۰- ۳۹۷- ۴۸۰-۵۱۲-۵۹۱
— انسان کے لیے راہِ راست معلوم ہونے کی صرف دو صورتیں ۶۹
— صرف اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی ہدایت ہے ۱۰۷- ۲۲۳
— انسان بھلائی اور ہدایت کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردے ڈالے جانے کا مفہوم ۵۳۱-۵۴۱
— اللہ تعالیٰ جبراً ہدایت نہیں دیتا ۵۳۵
— دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں اور کون مردہ ضمیر افراد اس سے محروم رہ جاتے ہیں ۵۳۶- ۵۳۷
— انسان کے قبول ہدایت میں شیطان کی رخنہ اندازیاں ۵۴۰
— اس کے حصول کے لیے اپنی ہی بینائی کام دے سکتی ہے ۵۶۸
— اس کے قبول یا رد کرنے میں انسان کا اپنا ہی نفع و نقصان ہے ۵۶۸
— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی شرک و گمراہی میں مبتلا نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہیں کہ لوگوں کو جبری ہدایت دی جائے ۵۷۰
— ہدایت کا انحصار معجزوں پر نہیں ہے ۵۷۲
— اللہ تعالیٰ تکوینی مداخلت کر کے کسی کو مومن نہیں بناتا ۵۷۳-۵۷۴-۵۹۶
— جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اس کے لیے کھول دیتا ہے ۵۷۹
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفۃ اللہ بنا کر زمین پر اتارا اور درست اور غلط راستے واضح کر دیے گئے ۱۷- ۱۸
— انسان نے بار بار فطری ہدایت کو ضائع کیا اور اللہ تعالیٰ انسانوں ہی میں سے صالح افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر اصل ہدایت کو بار بار تازہ کرتا رہا ۱۸- ۱۹
— ہدایت اور صراطِ مستقیم ایک نعمت ہے، اگر ایک قوم اس کا انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت کسی اور کو سونپ دیتا ہے ۵۶۱
— ہدایت الٰہی سے منہ موڑنے کا انجام ۶۱- ۱۰۷
— ہدایت یافتہ ہونے کا معیار یہودیت اور عیسائیت کی من گھڑت مذہبی خصوصیات ہرگز نہیں ہیں ۱۱۵
— ہدایت کا مدار عالم گیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے ۱۱۵
— کون لوگ ہدایت یافتہ ہیں؟ ۱۲۷- ۴۰۴
— ہدایت انبیائے کرام پر ایمان لانے سے ملتی ہے ۱۶۳
— ہدایت اللہ تعالیٰ کی دین میں ہے ۲۶۴- ۵۳۸- ۵۵۶
— راہِ راست پانے کی شرائط ۲۷۶
— گمراہ لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں ۳۵۶
— ہدایت سے محرومی برائیوں کی وجہ سے ہوتی ہے ۳۷۹
— جسے اللہ تعالیٰ ہدایت سے محروم کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۸۰- ۴۱۰
— ہدایت و ضلالت کی توفیق کا قانون ۴۱۱- ۵۳۸- ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دلوں پر ان کی باطل پرستی کی وجہ سے ٹھپا لگا دیا ۴۱۶
— کفر اور صد عن سبیل اللہ کا نتیجہ انتہائی گمراہی ہے ۴۲۶
— کفر و ظلم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جہنم کے راستے کے سوا اور کسی طرف راہ نمائی نہیں کرتا ۴۲۶
— اللہ تعالیٰ راہِ راست کی طرف کیسے لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے؟ ۴۳۱
— اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالبوں کے لیے قرآن ذریعہ ہدایت ہے ۴۵۶
— ہدایت پر عامل افراد ہی سیدھے راستے پر ہیں اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ ہیں ۴۵
— قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے ۵۰
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کون لوگ ہدایت پر ہیں؟ ۵۱
— اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا نورِ بصیرت ایک نعمت ہے ۵۶-۴۵۹
— ابتدائے آفرینش ہی میں انسانوں سے ہدایت کا راستہ واضح کر کے عہد لیا گیا تھا ۶۰
— جو لوگ ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان کے لیے رنج وغم کا موقع نہیں ہے لیکن جو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے ۶۸
— انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستے کی پیروی کرے جو اس کے رب نے اس کے لیے تجویز کیا ہے ۶۹-۴۹
— ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے کوئی آزمائش سخت نہیں ہے ۱۲۰
— بے علم ہو کر انسان صرف شیطان کے راستے پر چل سکتا ہے ۱۳۳
— ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴
— جو لوگ احکام کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کے لیے انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۱۳۵
— ہدایت کے بدلے ضلالت کمانے والے دراصل مغفرت کے بدلے عذاب مول لے رہے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت کرتا ہے اپنی مرضی سے کرتا ہے، کوئی کسی کی ہدایت وضلالت کا ذمہ دار نہیں ہے ۲۰۹
— ہدایت کی موجودگی میں گمراہی اختیار کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے ۲۶۷
— ہدایت نصیب ہو جانا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے ۳۵۸
— راہِ راست واضح ہو جانے کے بعد جو باطل کی راہ پر چلے گا اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلائے گا جو اس نے خود اپنے لیے پسند کی ہے ۳۹۷
— ایمان سے ہٹ کر کفر اختیار کرنا اور کفر میں بڑھتے جانا ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہ کرے گا اور انھیں کبھی ہدایت نصیب نہ ہوگی ۴۰۷-۴۰۸
— منافقین کفر اور ہدایت کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے بھٹکا دیا ہے اور وہ ہدایت نہیں پا سکتے ۴۱۰
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل کسی بھی ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴
— جس کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد اللہ تعالیٰ کرے ان کی ہدایت کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں سخت سزا ہے ۴۷۰-۴۷۱
— دعوت حق کے داعیان ہدایت کے ذریعے سے زندگی پا چکے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رشد و ہدایت کی روشنی کے ذریعے سے دنیوی زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸
— ہدایت ملنا زندگی ملنے کے مترادف ہے ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ نے تو راہ (ہدایت) بالکل واضح کر دی ہے، شاید کہ انسان نصیحت قبول کر لے ۶۰۱
— ہدایت کی موجودگی اور وضاحت کے بعد ضلالت اور گمراہی اختیار کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے ۲۷۶

(۳۳۷) ہلاکت

— اس لفظ کا معنی خیز استعمال ۵۸۶

ی

(۳۳۸) یتیم

— ان کے حقوق ۳۱۹ تا ۳۲۱
— یتیموں کے اموال میں ایمان داری ۳۱۹-۳۲۳-

۳۲۴-۳۲۵-۵۹۹-۶۰۰
— حقوقِ یتامیٰ اور تعدد ازدواج ۳۲۰
— بلوغ تک ان کے مال کی حفاظت ۳۲۲
— یتیم بچیوں اور بچوں کے بارے میں انصاف کی تلقین ۴۰۱
— یتیم کے مال کی حرمت کا حکم ۵۹۹-۶۰۰
— یتیم کے حقوق کے بارے میں قرآن حکیم کا خصوصی التزام ۴۰۱-۴۰۲
— یتیموں سے متعلق تدریجی احکام ۱۶۷-۱۶۸
— یتیم کا مال اس کے حوالے کرنے کی شرائط اور ان کی سرپرستی کے احکام ۳۲۳
— یتیم کا غریب ولی اپنا حق الخدمت معروف طریقے سے علانیہ وصول کرسکتا ہے ۳۲۴
— یتیموں کا مال ان کے حوالے کرتے وقت گواہ لے لو ۳۲۴
— یتیموں کے معاملے میں اپنے بچوں کو نظر میں رکھو کہ اگر تمھارا آخری وقت آ جائے تو اپنے بچوں کے متعلق تمھیں کیسے کیسے خدشات لاحق ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ان یتیموں کا خیال کرو جن کے تم ولی مقرر کیے گئے ہو ۳۲۵

(۳۳۹) حضرت یحییٰ علیہ السلام

— ان کا مظلومانہ قتل ۸۱
— کن اوصاف کے ساتھ پیدا کیے گئے ۲۴۹
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش ۲۵۰
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۰) حضرت یعقوب علیہ السلام

— آپ کی اپنی اولاد کو آخری وصیت ۱۱۳
— بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھے اور انھیں دنیا کی امامت کا فریضہ سونپا گیا ۱۰۹
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۱) حضرت یوسف علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۲) حضرت یونس علیہ السلام

— انھیں اللہ تعالیٰ نے خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۳۴۳) یہود، یہودی، یہودیت

— نزولِ قرآن کے وقت ان کی مذہبی و اخلاقی حالت ۴۶-۲۶۵
— ان کے بگاڑ پر قرآن کی تنقید کیا سبق دیتی ہے؟ ۴۷
— قرآن میں ان پر کیا تنقید کی گئی ہے؟ ۷۰-۸۷
— ان کے اخلاقی و مذہبی جرائم ۷۲-۹۴ تا ۹۷-۹۹-۱۰۰-۲۶۴ تا ۲۶۶-۲۷۲-۳۰۷-۳۶۰-۴۱۵ تا ۴۱۸-۴۲۲-۴۶۴-۴۷۱-۴۷۳-۴۷۴
— مشرکین عرب میں ان کا مذہبی و اخلاقی اثر ۷۲
— اسلام کے خلاف ان کے ہتھکنڈے ۷۲-۸۸-۲۲۹-۲۳۰
— یہودیوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم اور ان کی غفلت ۷۳
— ان کی بت پرستی ۸۱
— ان کا زعم باطل کہ نجات صرف انھی کا اجارہ ہے ۸۲-۹۵
— کتاب الٰہی میں ان کی تحریفات ۸۷-۸۹
— اہل مدینہ پر ان کے اخلاقی اور مذہبی اثرات ۸۷-۹۳
— ان کے علما کی اخلاقی حالت ۸۷-۸۹-۲۶۶-۲۶۷-۲۷۵
— خدا کے ساتھ ان کی بدگمانیاں ۸۸
— ان کے عوام کی جہالت ۸۸
— ان کی بگاڑ کے اسباب ۸۹-۹۱-۱۰۲-۱۲۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— آخرت کے متعلق ان کا غلط عقیدہ ۸۹-۲۶۶

— مدینہ کے یہودیوں کی اخلاقی حالت ۹۱-۹۳

— علمائے یہود پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقید ۲۵۴-۲۵۵

— یہود نے دعوت عیسوی کو رد کر دیا ۲۵۸

— اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے لیے جدا جدا اخلاقی رویہ ۲۶۶

— اخلاقی لحاظ سے یہودی نہایت بے اعتبار ہیں ۲۶۵-۲۶۶

— ان کا افترا علی اللہ ۲۶۶

— نیکی کے متعلق ان کا ظاہر پرستانہ تصور ۲۷۲

— ان کے علما کی فقہی نکتہ آفرینیاں ۲۷۳

— ان کی فتنہ انگیزیوں پر تنبیہ ۲۷۵

— مدینہ کے مسلمانوں سے تعلقات میں یہودیوں کا منافقانہ رویہ ۲۸۲

— اللہ کا مذاق اڑانے کی جسارت ۳۰۶

— بنی نضیر کی سازشی کارروائیاں ۳۱۸

— اسلام کی اصلاحات سے ان کی چڑ ۳۴۴-۳۴۵

— یہود کی تحریف کلمات کی تین صورتیں ۳۵۷

— جزئیات کی ناپ تول کے ساتھ ان کی شرک پسندی ۳۵۹

— مدینہ کے یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مضحکہ انگیز مطالبہ ۴۱۵

— یہودی ایک مسلّم فتنہ پرور قوم ہے ۴۲۲

— یہودیوں کی اسرائیل نامی ریاست کس طرح قائم ہوئی؟ ۲۸۰-۴۲۳

— ان کے لیے بعض طیبات کی حرمت بطور سزا ۴۲۲-۴۲۳-۵۹۳-۵۹۴

— ان کا اچھا عنصر ۴۲۳

— اس قوم کا نمونۂ عبرت ہونا ۴۲۳

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے خلاف ان کی قاتلانہ سازش ۴۵۰

— ان کا زعم کہ وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں ۴۵۷

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش پر ان کو لطیف ملامت ۴۶۳

— یہودیو! میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں گا ۷۱

— یہودیوں کو عربوں پر علمی برتری حاصل تھی ۷۲

— یہودیوں کو تنبیہ کہ تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کا کہتے ہو لیکن اس راہ کو خود بھلا بیٹھے ہو ۷۳

— قتل انبیا میں ملوث ہونا ۱۸۰-۱۸۲

— اللہ کا کلام سنتے ہیں، جانتے ہیں کہ یہی صداقت ہے لیکن پھر بھی اس میں دانستہ تحریف کرتے ہیں ۸۷

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہود کے مقدمات سننے یا نہ سننے کا اختیار ۴۷۱ تا ۴۷۳

— یہودی علما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت جانتے ہوئے اپنی مذہبی دکان داری ختم ہونے کے خوف سے حق کو چھپاتے تھے ۸۸

— یہودی علمانے یہ بات گھڑ لی تھی کہ روز آخرت چند روزہ عذاب ہی انھیں ملے گا پھر جنت ان کا مقدر ہوگی ۸۹-۲۴۲

— انھوں نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی لیکن وہ دنیا و آخرت میں صریح نقصان میں رہیں گے ۹۱-۹۲-۱۰۳

— ان کے مغضوب ہونے کا اعلان ۲۸۰

— یہودیوں کا تحویل قبلہ پر اعتراض حالانکہ کعبۃ اللہ کی حیثیت کو وہ خوب جانتے بوجھتے ہیں ۱۲۲-۱۲۳-۲۷۴

— یہودی قرآن کی حقانیت کو جانتے بوجھتے اس کی تکذیب کرتے ہیں ۹۳-۹۴

— یہودیوں نے انبیا کی تعلیمات کو اپنی خواہشات نفس کے خلاف پایا تو سرکشی اختیار کی، کسی نبی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا ۹۲

— یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۹۲

— یہودی غضب بالائے غضب کے مستحق قرار پائے ۹۴

— یہودی کہتے ہیں کہ ان کے دل محفوظ ہیں ۹۲
— ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ۴۷۱
— ان کا خدا کے قانون سے اعراض ۴۷۲
— ان کو حکم رجم کو چھپانا ۴۷۲
— ان کی مذہبی بددیانتی کی پردہ دری ۴۷۳
— ان کو دعوت اصلاح ۴۷۴
— ان کے لیے مسخ کی سزا ۴۸۴
— اللہ تعالیٰ پر بخیلی کی پھبتی کستے تھے ۴۸۵
— نزول قرآن ان کے لیے طغیان و کفر میں اضافہ کا سبب بن گیا ۴۸۵
— ان کے طغیان و کفر کا وبال ۴۸۶
— ان کا مشرکین مکہ سے جوڑ توڑ ۴۹۷-۴۹۶
— ان کا رسول اللہ کے بشر ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب ۵۶۲
— ان کا خود شارع بن بیٹھنا ۵۹۴
— ان کے مشیت الٰہی کے متعلق غلط تصورات ۵۹۶
— یہودیت حضرت ابراہیم کے بہت بعد تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی ۲۶۲
— یہودیت کے مذہبی نظام میں نسلی تعصب کی روح ۲۶۶
— یہودی رسول اللہ کی رسالت کے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵
— یہودی کھلم کھلا اعلان کرتے تھے کہ وہ اس کتاب اور نبوت پر ہی ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اتری ہو ۹۴
— یہودیوں کا خام خیال کہ دارِ آخرت میں ان کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور موت کی تمنا کرتے لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے ۹۵-۹۶
— دعوت رسول اللہ سے ان کی عداوت ۹۶-۱۰۱
— یہودی دراصل اس بات سے جلتے تھے کہ اللہ کا فضل (نبوت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں نصیب ہوا ۱۰۱
— یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ دین کے بارے میں شکوک پیدا کریں جس کے لیے وہ بہت سوال جواب کرتے تھے ۱۰۳
— یہودی اور نصرانی ایک دوسرے کو دین سے خارج قرار دیتے ہیں ۱۰۴
— یہودی اور عیسائی ہونا نجات کا باعث نہیں بلکہ صرف ابراہیم کا طریقہ ہی باعث نجات ہوتا ہے ۱۱۴
— یہودیوں کے ہاں رسم غسل (اصطباغ) ۱۱۶
— یہودی رب کے بارے میں یوں ہی جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ سب کا رب ہے اور سب ہی اس کا اقرار کرتے ہیں ۱۱۷
— حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام کے بہت بعد یہودیت اور عیسائیت نے جنم لیا ۱۱۷
— تعلیمات اور ہدایات خداوندی چھپانے پر یہودی اللہ تعالیٰ اور تمام انسانوں کی لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸
— یہودیوں کے جھوٹے دعووں اور غلط فہمیوں کی تردید ۱۳۵-۱۳۶
— یہودیوں کے اس خام خیال کی تردید کہ وہ اپنے مذاہب اور تعلیم کے علاوہ کسی کی بات نہیں جانیں مانیں گے ۲۶۴-۲۶۵
— یہودیوں کو پکے گمراہ کہا گیا ہے ۲۷۲
— مدینہ کے یہودیوں کی چال کہ اپنے آدمیوں کو صبح علی الاعلان مسلمان کراؤ اور شام کو مرتد کروالو، اس طرح اہل ایمان میں بددلی پھیلے گی ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۳
— ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت و پھٹکار ہے کیونکہ وہ کتمان حق کر کے ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں ۲۷۱-۲۷۶-۳۵۸
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) میں چند ایک باایمان بھی ہیں لیکن اکثریت نافرمانوں اور فاسقوں کی ہے ۲۷۹-۲۸۰
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اہل ایمان کا کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ کچھ ستالیں گے ۲۸۰
— اگر مسلمانوں سے لڑیں گے تو مار ہی کھائیں گے ۲۸۰
— یہودیوں پر محتاجی اور مغلوبیت مسلط کر دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گھر چکے ہیں ۲۸۰
— یہودیوں پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑے گی، وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے سے پناہ مل گئی تو اور بات ہے ۲۸۰-۴۲۳-۴۲۴
— یہودیوں کے دلوں کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو دلوں میں رکھتے ہیں وہ اور بھی شدید ہے ۲۸۳
— یہودی اہل ایمان سے بغض ہی رکھیں گے چاہے اہل ایمان ان سے محبت رکھیں جو انھیں ہرگز نہیں رکھنی چاہیے ۲۸۳
— اہل ایمان پر خوشی کا لمحہ آتا ہے تو انھیں برا لگتا ہے اور کوئی مصیبت آجاتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں ۲۸۳
— یہودیوں کے تکلیف دہ طعن اور جھوٹی نشر و اشاعت سے اہل ایمان کو آزمایا جاتا ہے، ان حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش اختیار کرنی چاہیے ۳۰۹
— وہ یہودی بن گئے ہیں حالانکہ ان کی اصل یہ نہ تھی ۳۵۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں یہودیوں کی حرکات ۳۵۷-۳۵۸
— یہود پر اللہ کی لعنت ہے اور جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے ان کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوسکتا ۳۶۰
— یہودی اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ۳۶۰
— یہودی، عیسائی اس قدر تنگ دل اور تنگ نظر ہیں کہ حق کا انکار کرنے سے بھی نہیں چوکتے، اگر کہیں حکومت کائنات ان کی ہوتی تو کسی کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے ۳۶۰
— یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے ہمارے سامنے نازل کراؤ ۴۱۵
— حق و ہدایت کو اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) کے لیے مشکوک بنا دیا گیا ہے ۴۱۸-۴۱۹
— حضرت عیسیٰ کی صلیب کے واقعے پر یہودیوں اور عیسائیوں میں پائے جانے والے خیالات غلط ہیں اور محض گمان کی پیروی کرتے ہیں ۴۱۹-۴۲۰
— یہودیوں کے جرائم (۱) حق کے ساتھ ظالمانہ رویہ (۲) اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا (۳) سود خواری کرنا (۴) لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا ۴۲۲-۴۲۳
— عیسائی اور یہودی دونوں حضرت عیسیٰ کے معاملے میں حد سے گزر گئے، یہودی انکار و مخالفت میں اور عیسائی عقیدت و محبت میں، اس کو اللہ تعالیٰ دین میں غلو قرار دیتا ہے ۴۲۷
— یہودی اپنے فطری عہد سے پھر گئے، وہ احکام الٰہی کے الفاظ کو ہیر پھیر کر بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں ۴۵۴
— یہودی تعلیماتِ خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن ان کے احکام الٰہی میں کی گئی خیانتوں کا پول کھلتا رہتا ہے اور اس خیانت سے بہت کم اہل کتاب بچے ہوئے ہیں ۴۵۴
— اہل کتاب کی حرکات اور خیانت سے چشم پوشی کرنے کا حکم ۴۵۵
— یہودیوں اور عیسائیوں کی بدعہدی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض وعناد کا بیج بو دیا ہے ۴۵۵
— یہودیوں کو ایک وقت ان کی دنیوی کارکردگی کے متعلق آگاہی دے دی جائے گی ۴۵۵
— یہودی ہرگز اللہ تعالیٰ کے چہیتے نہیں ہیں اسی لیے اپنے گناہوں پر سزا پاتے ہیں ۴۵۷
— بنی اسرائیل کے رویے میں حضرت آدم کے قاتل و مقتول بیٹوں کے واقعے کے ساتھ مماثلت ۴۶۳
— یہودی تورات کے الفاظ کے معانی درست متعین ہونے کے باوجود انھیں اصل معانی سے پھیرتے ہیں تاکہ ان سے من مانے احکام نکال سکیں ۴۷۰
— یہودیوں کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور

حرام مال کھانے والے ہیں ۴۷۱
— یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں ۴۸۰
— یہودیوں پر اللہ کی لعنت اور غضب ہے کیونکہ انھوں نے طاغوت کی زندگی اختیار کی ہے ۴۸۴
— یہودیوں کا انجام نہایت برا ہے اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹک گئے ہیں ۴۸۴
— اہل کتاب کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے لیکن یہودی اور عیسائی جب کبھی جنگ کی آگ بڑھاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کردیتا ہے ۴۸۶
— یہودی اور عیسائی جو ایمان لا کر نیک عمل کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— ان میں سے اکثر فاسق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گئے ہیں ۴۹۷
— اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں یہودی اور مشرکین مکہ بہت سخت تھے ۴۹۷
— یہودی مشرکین مکہ کو گمراہ کرتے تھے ۵۶۲-۵۶۳
— یہودیوں نے تورات کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا، کچھ دکھاتے اور کچھ چھپاتے تھے حالانکہ تورات تمام انسانوں کے لیے ہدایت اور روشنی تھی ۵۶۲-۵۶۳

Maktaba Tul Ishaat.com

نقشہ جنگِ اُحد

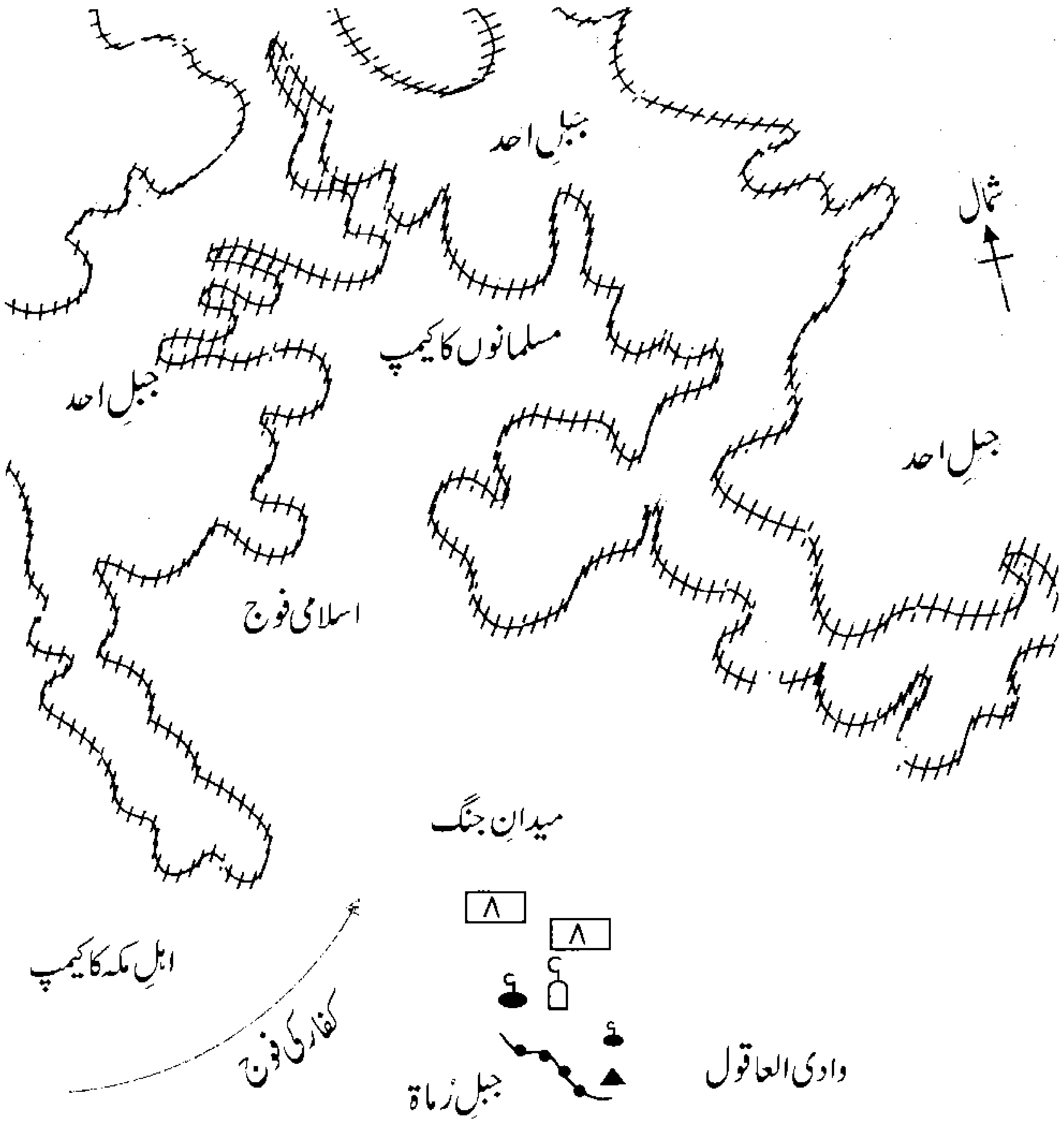

خالد بن ولید کے دستے کا راستہ

غار جہاں نبی کریمؐ نے زخمی ہونے پر پناہ لی | وہ مقام جہاں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے

یہاں رسولِ پاکؐ نے آرام فرمایا | حضرت حمزہؓ کا پہلا مدفن

مدفن دندان مبارک | مقبرہ حمزہؓ

چشمہ | مقابر شہداؓ

نخلستان | مسجد حمزہؓ

حضرت عبداللہؓ بن جُبیر کے سواروں کا دستہ | 0 500 میٹر

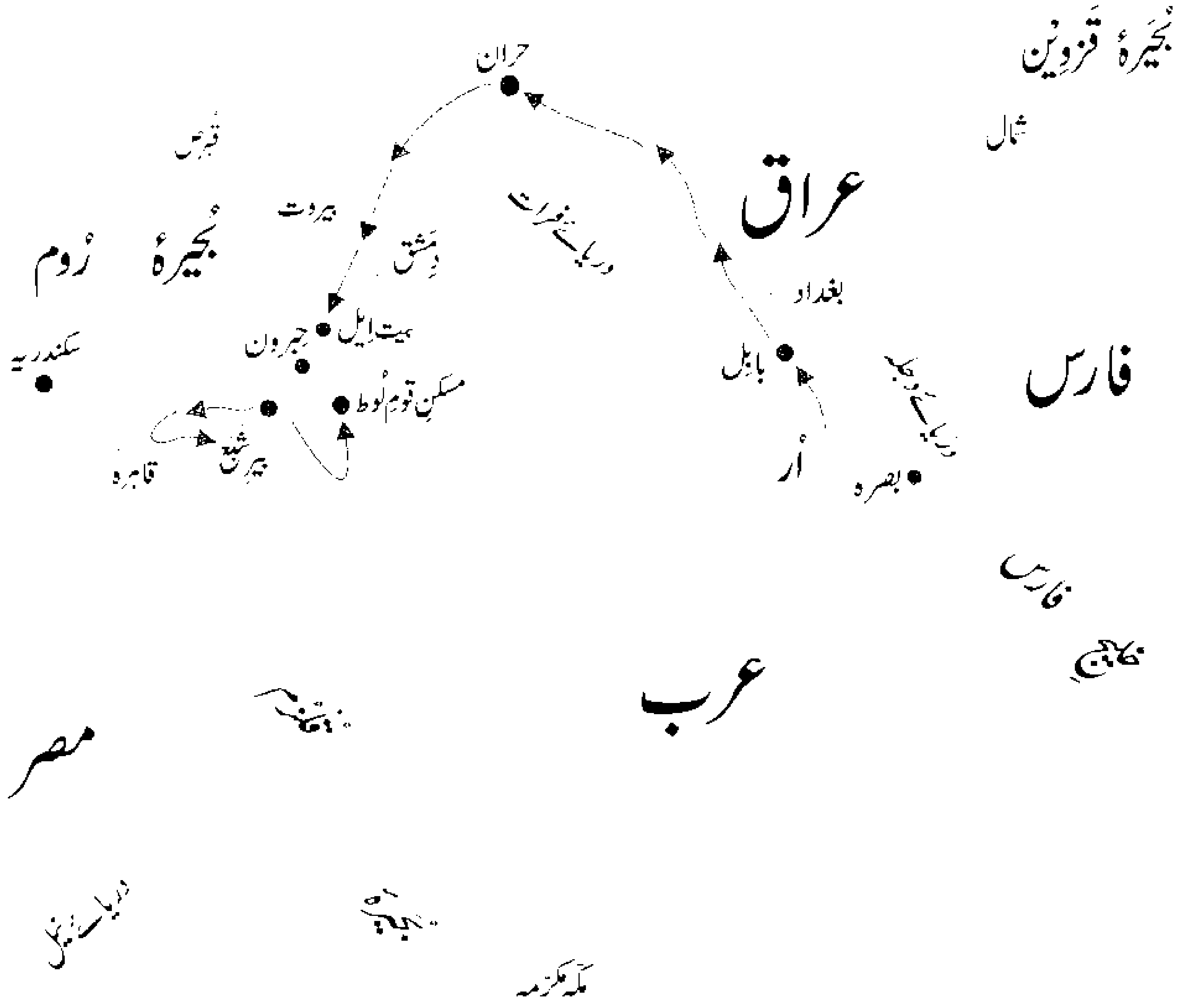

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں اُر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آگ کے الاؤ سے بچ نکلنے کے بعد آپ وطن چھوڑ کر پہلے حرّان (یا حاران) تشریف لے گئے۔ پھر وہاں سے فلسطین کی طرف منتقل ہوئے اور بیت ایل، بیت جبرون اور بیر شبع میں اپنی دعوت کے مراکز قائم کیے۔ پھر بحرِ لوط کے مشرق میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو مامور کیا۔ وہاں سے آپ مصر تشریف لے گئے جو اُس زمانے میں عراق کے بعد تہذیب وتمدن کا دوسرا عظیم الشان گہوارہ تھا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصر میں بھی آپ کا تبلیغی مشن قائم ہوا یا نہیں۔ اس کے بعد آپ نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ میں بیت اللہ تعمیر کرکے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس کی خدمت سپرد کی۔ پھر فلسطین میں جبرون کو اپنا مستقل مرکز بنایا اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے دوسرے صاحب زادے حضرت اسحاق علیہ السلام اس مرکز میں آپ کے جانشین ہوئے اور ان سے یہ میراث حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنچی۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۰۸ (جلد اول)

Maktaba Tul Ishaat.com

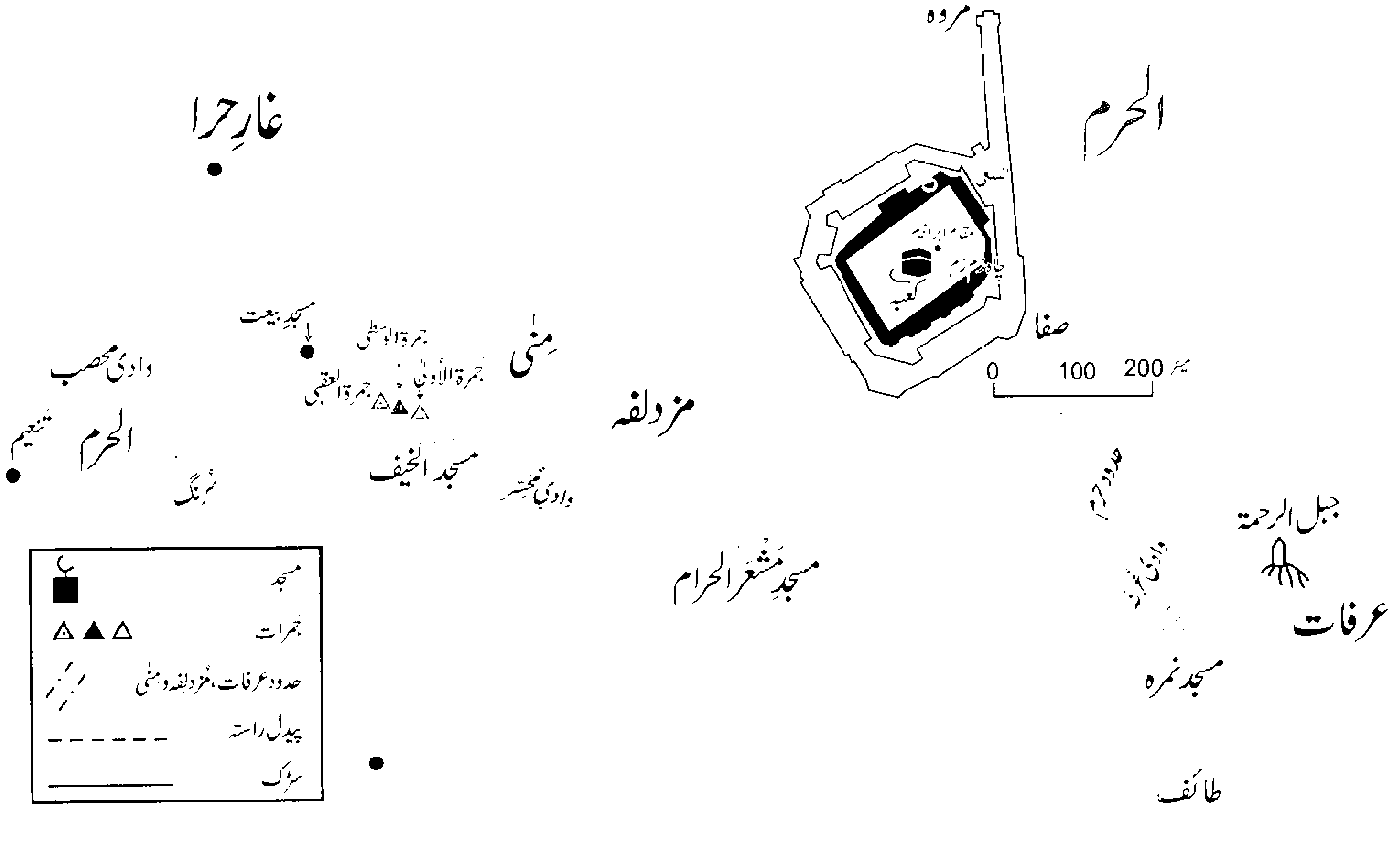

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۵۶ (جلد اول)

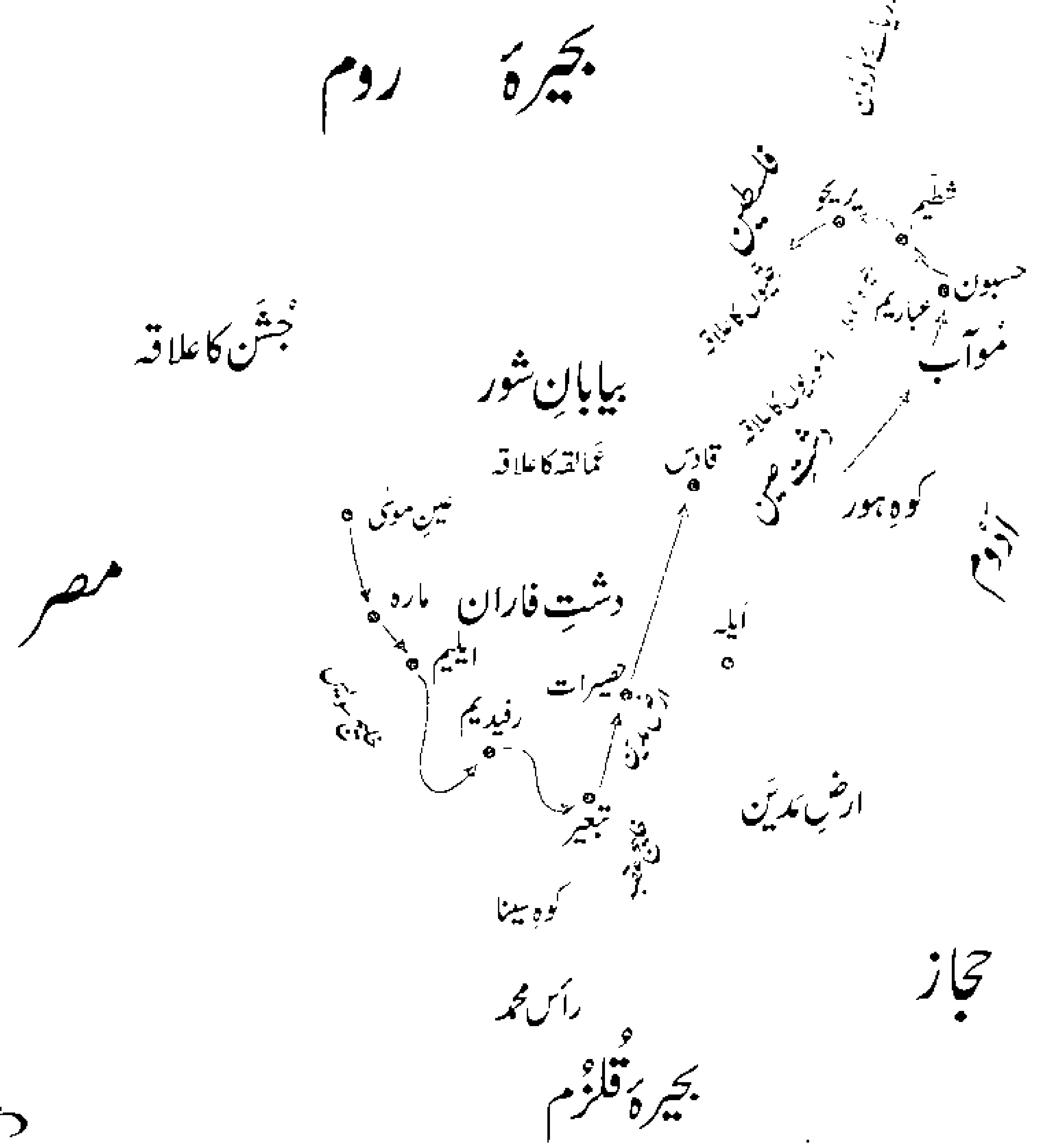

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم اور رفیدیم کے راستے کوہِ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک اس مقام پر ٹھیرے رہے۔ یہیں توراۃ کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوئے۔ پھر آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کرلو کہ وہ تمھاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیر اور حصیرات کے راستے دشتِ فاران میں تشریف لائے اور یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آکر اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ نہایت حوصلہ شکن تھی۔ جسے سن کر بنی اسرائیل چیخ اٹھے اور انھوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے اور ان کی موجودہ نسل، یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی شکل نہ دیکھنے پائے گی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل دشتِ فاران، بیابانِ شور اور دشتِ صین کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عمالقہ، اموریوں، اَدومیوں، مدیَنیوں اور موآب کے لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔ جب چالیس سال گزرنے کے قریب آئے تو ادوم کی سرحد کے قریب کوہِ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے موآب کے علاقے میں داخل ہوئے اور اس پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے حسبون اور شطیم تک پہنچ گئے۔ یہاں کوہِ عباریم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع علیہ السلام نے مشرق کی جانب سے دریائے اردن کو پار کر کے شہر یریحو (اریحا) کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک قلیل مدت ہی میں پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ اس نقشے میں ایلہ (قدیم نام ایلات اور موجودہ نام عَقبہ) وہ مقام ہے جہاں غالباً اصحاب السبت کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ بقرہ رکوع ۸، اور سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں آیا ہے۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۴۰۶ (جلد اول)

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذا بیانٌ للناس وهدًى وموعظةٌ للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جلد دوم

سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	الاعراف	۷	۵
۲	الانفال	۸	۱۱۸
۳	التوبہ	۹	۱۶۶
۴	یونس	۱۰	۲۵۸
۵	ہود	۱۱	۳۲۰
۶	یوسف	۱۲	۳۷۸
۷	الرعد	۱۳	۴۴۰
۸	ابراہیم	۱۴	۴۶۸
۹	الحجر	۱۵	۴۹۶
۱۰	النحل	۱۶	۵۲۲
۱۱	بنی اسرائیل	۱۷	۵۸۶
۱۲	فہرست موضوعات		۶۵۳

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست نقشہ جات

(تمام نقشہ جات جلد کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	ان قوموں کے علاقے جن کا ذکر سورۂ اعراف میں آیا ہے............	۵۸
۲	خروج بنی اسرائیل .... سُورۂ اعراف	۷۶
۳	قریش کی تجارتی شاہراہ ....الانفال	۱۲۲
۴	مدینہ سے بدر تک ....الانفال	۱۲۴
۵	جنگ بدر........................ الانفال	۱۲۶
۶	غزوۂ تبوک کے زمانہ کا عرب........................ توبہ	۱۶۸
۷	قوم نوح کا علاقہ اور جبل جودی........................ ہود	۳۴۰
۸	نقشہ قصہ یوسف علیہ السلام ....یوسف	۳۸۲
۹	فلسطین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ....بنی اسرائیل	۵۹۶
۱۰	حضرت داود وسلیمان علیہما السلام کی سلطنت ۱۰۰۰-۹۳۰ ق-م	۵۹۸
۱۱	بنی اسرائیل کی دو ریاستیں "یہودیہ" اور "اسرائیل" ۸۶۰ ق-م........	۵۹۹
۱۲	فلسطین بزمانۂ دولت مکابیہ ۱۶۸-۶۳ قبل مسیح	۶۰۰
۱۳	ہیرود اعظم کی سلطنت ۴۰-۴ قبل مسیح	۶۰۱
۱۴	فلسطین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں........................	۶۰۲

الاعراف

نام اس سورہ کا نام اَعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی آیات ۴۶-۴۷ میں اَعراف اور اصحابِ اَعراف کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے "سورۂ اعراف" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ "سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے۔"

زمانۂ نزول اِس کے مضامین پر غور کرنے سے بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول تقریباً وہی ہے جو سورۂ اَنعام کا ہے۔ یہ بات تو یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہے یا وہ۔ مگر اندازِ تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہے یہ اُسی دَور سے متعلق۔ لہٰذا اس کے تاریخی پَس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیباچے پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا جو ہم نے سورۂ اَنعام پر لکھا ہے۔

مَباحِث اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطَب ہیں (یعنی اہلِ مکہ) انھیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اُن کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو اُن سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رُجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قُبولِ رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو رَوِش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی رَوِش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان پر حُجت تمام ہونے کے قریب آ گئی ہے، اس لیے تقریر کے آخری حصّے میں دعوت کا رُخ اُن سے ہٹ کر اہلِ کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دَور جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہُوا کرتا ہے، خاتمے پر آ لگا ہے۔

دورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رُخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے، اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اِس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اُس کے ساتھ منافقانہ رَوِش اختیار کرنے، اور سمع و طاعت کا عہد اُستوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مُستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو حکمتِ تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیّت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور چیرہ دستیوں کے مقابلے میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۰۶ آیاتہا

۲۴ رکوعاتہا

سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓصٓ ۝۱ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ
حَرَجٌ مِّنْہُ لِتُنْذِرَ بِہٖ وَ ذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۲

ا، ل، م، ص۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے[۱]، پس اے محمدؐ! تمھارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو[۲]۔ اس کے اُتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۔[۳]

۱- کتاب سے مراد یہی سورۂ اعراف ہے۔

۲- یعنی بغیر کسی جھجک اور خوف کے اِسے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرو کہ مخالفین اس کا کیسا استقبال کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑیں۔ مذاق اُڑاتے ہیں، اُڑائیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی میں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، ہو جائیں۔ تم بے کھٹکے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذرا باک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَرَج استعمال ہوا ہے۔ لُغت میں حَرَج اُس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رُکے۔ اسی مضمون کو قرآنِ مجید میں مُتعدّد مقامات پر ضِیقِ صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ (الحِجر، آیت ۹۷) ''اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو۔'' یعنی تمھیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور مخالفتِ حق کا یہ حال ہے، انھیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (ہود، آیت ۱۲) ''تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمھاری دعوت کے جواب میں کہیں گے: اِس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُترا، یا اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔''

۳- مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کا اصل مقصد تو ہے اِنذار، یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج سے ڈرانا اور غافلوں کو چونکانا اور مُتنبّہ کرنا، رہی اہلِ ایمان کی تذکیر (یاد دہانی) تو وہ ایک ضمنی فائدہ ہے جو اِنذار کے سلسلے میں خود بخود

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ
اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَکَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا
فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ
جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾

لوگو! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو[4] ـــــ مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔

کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا، یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آ گیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے[5]۔

حاصل ہو جاتا ہے۔

۴ - یہ اِس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبے میں دی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ انسان کو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم اُسے درکار ہے، اور اپنے اَخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدُّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اُصولوں کا وہ محتاج ہے، ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اُسی ہدایت کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رُجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریقِ کار ہے، جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں "اَوْلِیَآء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہُوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے، اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے، خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بشدّت اس سے انکار کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الشُّوریٰ، حاشیہ ۶)

۵ - یعنی تمھاری عبرت کے لیے اُن قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں کی رہنمائی پر چلیں اور آخرِکار اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے آ کر اُن کی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِيۡنَۙ ﴿٦﴾

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم اُن لوگوں سے باز پُرس کریں[۶] جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں، اور پیغمبروں[۷] سے بھی پوچھیں (کہ انھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔

نجاست سے دُنیا کو پاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مقصود دو باتوں پر مُتنبّہ کرنا ہے: ایک یہ کہ تلافی کا وقت گزر جانے کے بعد کسی کا ہوش میں آنا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی صداؤں کو بہرے کانوں سے سُنے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں، بے شمار مثالیں تمھارے سامنے گزر چکی ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو چکتا ہے اور وہ اپنی مہلت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک اسے آ پکڑتی ہے، اور ایک مرتبہ پکڑ میں آ جانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل اُسے نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران میں ایک دو دفعہ نہیں، سیکڑوں اور ہزاروں مرتبہ یہی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضرور ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے، اور ہوش میں آنے کے لیے اُسی آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت واندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔

۶ – باز پُرس سے مراد روزِ قیامت کی باز پُرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دُنیا میں جو عذاب آتا ہے، وہ دراصل ان کے اعمال کی باز پُرس نہیں ہے اور نہ وہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر رہا تھا، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم و فساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخِ انسانی اس قسم کی گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے، اور یہ نظیریں اس بات کی ایک صریح علامت ہیں کہ انسان کو دنیا میں شُترِ بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اُوپر کوئی طاقت ہے جو ایک حدِ خاص تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات پر تنبیہات بھیجتی ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجربے پر غور کرے تو بآسانی یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرماں روا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اس نے ضرور ایسا ایک وقت مقرر کیا ہوگا جب اِن سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پُرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر کی آیت کو، جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد والی آیت کے ساتھ لفظ ”پس“ کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیوی عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

۷ – اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پُرس سراسر رسالت ہی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا، ان سے سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاؑ کا پیغام نہ پہنچا ہو، ان کے

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ
الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ
خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزن اُس روز عین حق[۸] ہوگا۔ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں[۹] گے، کیونکہ وہ ہماری

بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مُقدّمے کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ لیکن جن اشخاص و اقوام تک پیغمبروںؑ کی تعلیم پہنچ چکی ہے، ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور فسق و نافرمانی کے لیے کوئی حُجت نہ پیش کر سکیں گے، اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے جہنّم کی راہ لیں۔

۸ – اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز خدا کی میزانِ عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنیٰ ہوں گے۔ حق کے سوا کوئی چیز وہاں وزنی نہ ہوگی، اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی۔ جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا، اتنا ہی وہ باوزن ہوگا۔ اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا، کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی، خواہ دنیا میں کتنی ہی طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شان دار کارنامے اس کی پشت پر ہوں، اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل پرست جب اُس میزان میں تولے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دُنیا میں جو کچھ وہ مدت العمر کرتے رہے ہے وہ سب ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ کہف، آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دُنیا کی زندگی میں سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کام کیا کہ انجام کار کوئی آخرت نہیں ہے اور کسی کو حساب دینا نہیں ہے، ان کے کارنامۂ زندگی کو ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

۹ – اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کارنامۂ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا: ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو۔ مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا، اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ بس یہی ہوگی۔ بخلاف اس کے، حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہشِ نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیرِحق کی راہ میں کرتا ہے، وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا، اور صرف یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر ہوگا، بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامۂ زندگی کا مثبت پہلو اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿٩﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ
جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿١٠﴾ ع وَلَقَدْ
خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ

آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔

ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔ ع

ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو۔[10]

منفی پہلو پر غالب ہو اور نقصانات میں بہت کچھ دے دلا کر بھی اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ بچا رہ جائے۔ رہا وہ شخص جس کی زندگی کا منفی پہلو اُس کے تمام مثبت پہلوؤں کو دبالے، تو اُس کا حال بالکل اُس دیوالیہ تاجر کا سا ہوگا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان بھگتنے اور مطالبات ادا کرنے ہی میں کھپ جائے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ مطالبات اس کے ذمّے باقی رہ جائیں۔

۱۰- تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹۔

سورۂ بقرہ میں حکمِ سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے اُن سے شبہ ہو سکتا تھا کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم صرف آدم علیہ السلام کی شخصیت کے لیے دیا گیا تھا۔ مگر یہاں وہ شبہ دُور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا، وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا نمایندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو“، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمھاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمھارا مادّۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادّے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ ؔص میں ہے: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (آیات: ۷۱-۷۲) ”تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“ اِس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضا اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر آدم کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حِجر میں

بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (آیات: ۲۸-۲۹) ’’اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اُٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔‘‘

تخلیقِ انسانی کے اِس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیّت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح اِدراک نہیں کرسکتے کہ موادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی، اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیّت کیا تھی۔ لیکن بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت اُن نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانے میں ڈاروِن کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رُو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبۂ انسانیت تک پہنچا ہے، اور اس تدریجی ارتقا کے طویل خط میں کوئی نقطۂ خاص ایسا نہیں ہوسکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر ’’نوعِ انسانی‘‘ کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے، اُس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اوّل روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شُعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصوّر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین، حتّٰی کہ اَخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اُصول اُن قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اُس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرزِ عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے، وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدّنی آرایشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں، انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرلے۔ اس کے برعکس دوسرا تصوّر اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے ’’انسان‘‘ ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ ’’حیوانِ ناطق‘‘ یا ’’متمدن جانور‘‘ نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اُسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، اس کا نُطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی، بلکہ اس کی اَخلاقی ذمّہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سُپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویۂ نظر سے یک سر مختلف ہوجائے گی۔ آپ انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفۂ حیات اور ایک دوسرا ہی نظامِ اَخلاق وتمدّن و قانون طلب کرنے لگیں گے، اور اس فلسفے اور اس نظام کے اُصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالمِ اَسفَل کے بجائے عالَمِ بالا کی طرف اُٹھنے لگے گی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوسرا تصورِ انسان چاہے اخلاقی اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر محض اس تخیل

Maktaba Tul Ishaat.com

فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا
مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا
فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہُوا۔

پوچھا: ”تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ مَیں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟“

بولا: ”میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے۔“

فرمایا: ”اچھا، تو یہاں سے نیچے اُتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو اُن لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلّت چاہتے ہیں۔[۱۱]“

کی خاطر ایک ایسے نظریے کو کس طرح رد کر دیا جائے جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہے۔ لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ڈارونی نظریۂ ارتقا سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے؟ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے، لیکن محققین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سروسامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائلِ ثبوت کہا جاتا ہے وہ دراصل محض دلائلِ اِمکان ہیں، یعنی ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈارونی ارتقا کا ویسا ہی امکان ہے جیسا براہِ راست عملِ تخلیق سے ایک ایک نوع کے الگ الگ وجود میں آنے کا امکان ہے۔

۱۱- اصل میں لفظ صاغرین استعمال ہوا ہے۔ صاغر کے معنٰی ہیں: الراضی بالذُّل، یعنی وہ جو ذلّت اور صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا جو تصوّر تُو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجبِ توہین نظر آتا ہے، یہ دراصل یہ معنٰی رکھتا ہے کہ تُو خود اپنی ذلّت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار، عزت کا بے بنیاد اِدّعا، اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا تجھے بڑا اور ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا، بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل اور پست ہی بنائے گا، اور اپنی اس ذلّت

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾
قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۶﴾
ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ
وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾

بولا: ”مجھے اُس دن تک مُہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“

فرمایا: ”تجھے مُہلت ہے۔“

بولا: ”اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے، میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا، اور تُو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔[۱۲]“

وخواری کا سبب تُو آپ ہی ہوگا۔

۱۲ – یہ وہ چیلنج تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مُہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے، اِس سے فائدہ اُٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صَرف کردوں گا کہ انسان اُس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلے میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نمک حرام اور کیسا احسان فراموش ہے۔

یہ مُہلت جو شیطان نے مانگی اور خدا نے اسے عطا فرمادی، اس سے مراد محض وقت ہی نہیں ہے بلکہ اُس کام کا موقع دینا بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے انسان کو بہکانے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل آیات ۶۱-۶۵ میں اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اختیار دے دیا کہ آدمؑ اور اس کی اولاد کو راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو چالیں وہ چلنا چاہتا ہے، چلے۔ ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا، بلکہ وہ سب راہیں کُھلی رہیں گی جن سے وہ انسان کو فتنے میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ، یعنی میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا۔ تُو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی اُمیدیں دلائے، بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوش نُما بنا کر پیش کرے، لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دعوت دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ
لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ
الۡجَـنَّةَ فَكُلَا مِنۡ حَيۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوۡنَا
مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسۡوَسَ لَهُمَا الشَّيۡطٰنُ لِيُبۡدِىَ لَهُمَا مَا وٗرِىَ
عَنۡهُمَا مِنۡ سَوۡاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰٮكُمَا رَبُّكُمَا عَنۡ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ

فرمایا: "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہُوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنّم کو بھر دوں گا۔ اور اَے آدمؑ! تو اور تیری بیوی، دونوں اس جنّت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

پھر شیطان نے اُن کو بہکایا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چُھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا: "تمھارے رب نے تمھیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی

مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انھیں ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جائے اور اگر وہ خود راہِ راست پر چلنا چاہیں تو انھیں نہ چلنے دے۔ یہی بات سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالتِ الٰہی سے فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد شیطان اپنے پیرو انسانوں سے کہے گا: وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِىۡ ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِىۡ وَلُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ یعنی میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں کہ میں نے اپنی پیروی پر تمھیں مجبور کیا ہو، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمھیں اپنی راہ پر بُلایا اور تم نے میری دعوت قُبول کر لی۔ لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی معصیت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے۔ اُس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنے میں ڈالا اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نے تیری نافرمانی کی۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی، بلکہ جس پندارِ غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کُھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَٰلِدِينَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَآ
إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّٰصِحِينَ ﴿٢١﴾ فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا
الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ
الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل
لَّكُمَآ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا سكتة
وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾

وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔" اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔

اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کُھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنّت کے پتّوں سے ڈھانکنے لگے۔

تب ان کے رب نے انھیں پکارا: "کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟"

دونوں بول اُٹھے: "اے رب! ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا، اب اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"[13]

۱۳- اس قصّے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اوّلین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصّوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ

Maktaba Tul Ishaat.com

درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اوّل روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہ تھی کہ اُس کے اِس جذبۂ شرم وحیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدراہ کردے۔ بالفاظِ دیگر، اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملے کے لیے تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو تھا، اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اُس محافظِ فصیل پر لگائی جو شرم وحیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ رَوِش آج تک جوں کی توں قائم ہے۔ ''ترقی'' کا کوئی کام ان کے ہاں شروع نہیں ہوسکتا جب تک کہ عورت کو بے پردہ کر کے وہ بازار میں نہ لاکھڑا کریں اور اُسے کسی نہ کسی طرح عُریاں نہ کردیں۔

(۳) یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ بُرائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عُموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعیِ شر کو خیرخواہ کے بھیس ہی میں آنا پڑتا ہے۔

(۴) انسان کے اندر معالی اُمور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے، اور شیطان کو اُسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اِسی ذریعے سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اِس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی اُمید دلاتا ہے، اور پھر اُس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اُسے اُلٹا پستی کی طرف لے جائے۔

(۵) عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدمؑ کو پھانسنے کے لیے آلۂ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوّا کے متعلق اس مشہور روایَت نے دنیا میں عورت کے اَخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصّہ لیا ہے، وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر وقیمت سمجھ سکتے ہیں۔

(۶) یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا مزا چکھتے ہی آدم وحوّا کے ستر کُھل جانا اُس درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانکا تھا۔ جب انھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت اُن سے ہٹالی گئی، اُن کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود اُن کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا گیا کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام خود کریں اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں تو خدا کو اِس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر اس کا پردہ کُھل کر رہے گا۔ اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید وحمایت اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیع فرمان رہے گا۔ طاعت کے حُدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدا کی تائید ہرگز حاصل نہ ہوگی، بلکہ اسے خود اس کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو متعدّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اور اسی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ اللھم رحمتك ارجوا فلا تکلنی الی نفسی

طرفۃ عین (خدایا! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں، پس مجھے ایک لمحے کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر)۔

(۷) شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اُس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اُس کے مقابلے میں انسان کو دی گئی ہے۔لیکن پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کے امر کی فرماں برداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا، اور اس کی یہ کمزوری ظاہر ہوگئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آ کر اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے۔مگر بہرحال اس اوّلین مقابلے میں یہ قطعی ثابت ہوگیا کہ انسان اپنے اَخلاقی مرتبے میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً، شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا، اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً، شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔ ثالثاً: انسان نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعیِ شر کو داعیِ خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اِس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اُسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ رابعاً، شیطان کو تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قُصور پر مُتَنَبِّہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غَلَطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادم ہوا، اپنے قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

(۸) اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے بالکل متمیّز ہوگئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے، خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے، مُتَنَبِّہ کیے جانے کے باوجود پورے اِستِکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے چلا جائے، اور جو لوگ طاعت کی راہ چل رہے ہوں ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور اُن سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنّا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غَلَطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اُس قصور کی تلافی کردے جو اس سے سرزد ہوگیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصّے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ کرنا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم لوگ جارہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمھارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطینِ جن و اِنس کو اپنا ولی و سرپرست بنانا، اور یہ تمھارا پے در پے تنبیہات کے باوجود اپنی غلطی پر اصرار کیے چلے جانا، یہ دراصل خالص شیطانی رَوِیّہ ہے۔ تم اپنے اَزَلی دشمن کے دام میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے مکمل شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام پھر وہی ہے جس سے شیطان خود دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تم حقیقت میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور کچھ بھی ہوش تم میں باقی ہے تو سنبھلو اور وہ راہ اختیار کرو جو آخرِ کار تمھارے باپ اور تمھاری ماں آدم و حوّا نے اختیار کی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ
إِلَىٰ حِينٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾ ع
يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۖ

فرمایا: ”اتر جاؤ،[14] تم ایک دُوسرے کے دشمن ہو، اور تمھارے لیے ایک خاص مدّت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامانِ زیست ہے۔“ اور فرمایا: ”وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخرِ کار نکالا جائے گا۔“ ع

اے اولادِ آدم![15] ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے

۱۴ – یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم وحوّا علیہما السلام کو جنّت سے اُتر جانے کا یہ حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدّد مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انھیں معاف کر دیا۔ لہٰذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ یہ اُس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۴۸ و ۵۳)

۱۵ – اب قصۂ آدم وحوّا کے ایک خاص پہلو کی طرف توجّہ منعطف کر کے اہلِ عرب کے سامنے خود اُن کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انھیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروانہ کرنا اُن کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبے کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے، اور اس معاملے میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دُنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں، اس لیے خطاب اہلِ عرب کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے، اور سارے بنی آدم کو مُتنبّہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمھاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا، اور اس نے تمھیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اُسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمھارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کُھل جائے کہ رسولوں کی

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ
اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا
سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ
اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷

اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اُسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اُتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دُوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ اِن شیاطین کو ہم نے اُن لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔[۱۶]

رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

۱۶- ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں:

اوّل یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا۔ اس نے انسان کے لیے اُس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی ہی نہیں بنایا بلکہ سَوْأَۃ بھی بنایا، جس کے معنی عَرَبی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا)، تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اِس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رُو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مُقدّم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْأَۃ کو ڈھانکے۔

Maktaba Tul-Ishaat.com

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا
بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا

یہ لوگ جب کوئی شرم ناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے[17]۔ ان سے کہو: اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا[18]۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلّق

اور اس کی طبعی ضرورت موخّر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے رِیْش (جسم کی آرایش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اس باب میں بھی فطرتاً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ اُن کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا ''رِیش'' ہونا ہے، رہا اس کا ستر پوش ہونا، تو اُن کے اعضائے صنفی سرے سے سَوْاٰۃ ہی نہیں ہیں کہ انھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جِبِلّت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اُلٹ گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمھارے لیے لباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے رِیش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سَوْاٰۃ کو چھپانے والی چیز ہونا، تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضا سَوْاٰۃ نہیں ہیں، اسی طرح تمھارے یہ اعضا بھی سَوْاٰۃ نہیں، محض اعضائے صنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعۂ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت وحفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملے میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر وغرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر اُن ذہنی امراض کی نمایندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمایش کرنے لگتی ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملے میں اِس خیرِ مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح اُن لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیا علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غَلَطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی اُن بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دُنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اُوپر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، انھیں اگر تأمُّل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَ اَقِیۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ
مَسۡجِدٍ وَّ ادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ﴿۲۹﴾ؕ

تمھیں علم نہیں ہے (کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں؟) اے محمدؐ! ان سے کہو: میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اُسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔ جس طرح اُس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔[19]

۱۷- اشارہ ہے اہلِ عرب کے برہنہ طواف کی طرف، جس کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں۔ وہ لوگ اس کو ایک مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے۔

۱۸- بظاہر یہ ایک بہت ہی مختصر سا جملہ ہے مگر درحقیقت اس میں قرآنِ مجید نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ اس طرزِ اِستدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطورِ مقدّمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہییں:

ایک یہ کہ اہلِ عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے، لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرم ناک فعل ہونا خود ان کے نزدیک بھی مسلَّم تھا۔ چنانچہ کوئی شریف اور ذی عزت عرب اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ کسی مہذب مجلس میں، یا بازار میں، یا اپنے اَعِزّہ اور اقربا کے درمیان برہنہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرم ناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے، اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ اس پر قرآنِ مجید یہ اِستدلال کرتا ہے کہ جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ فحش ہے اس کے متعلق تم یہ کیسے باور کر لیتے ہو کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام کا حکم خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہوسکتا، اور اگر تمھارے مذہب میں ایسا حکم پایا جاتا ہے تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ تمھارا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

۱۹- مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمھاری ان بے ہودہ رسموں سے کیا تعلق۔ اس نے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اُصول تو یہ ہیں کہ:

(۱) انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے۔

(۲) عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک اس کی عبادت میں نہ ہو، معبودِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور عجز و نیاز کا رخ ذرا نہ پھرنے پائے۔

(۳) رہنمائی اور تائید و نصرت اور نگہبانی و حفاظت کے لیے خدا ہی سے دُعا مانگے، مگر شرط یہ ہے کہ اس چیز کی دُعا مانگنے والا آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور

Maktaba Tul Ishaat.com

فَرِيقًا هَدٰى وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ
اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ
وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع

ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ انھوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو[20] اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا[21] ؏

بندگیِ اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے کہ اے خدا! یہ بغاوت جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں، اس میں ہماری مدد فرما۔

(۴) اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہُوا ہے، اسی طرح ایک دوسرے عالَم میں بھی اس کو پیدا کیا جائے گا اور اسے اپنے اعمال کا حساب خدا کو دینا ہوگا۔

۲۰ – یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صرف اِتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی محض اپنا ستر چُھپا لے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی ہو اور زینت بھی۔ یہ حکم اُس غلط رَوِیّے کی تردید کے لیے ہے جس پر جُہلا اپنی عبادتوں میں عمل کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بَرَہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی ہیئتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس خدا کہتا ہے کہ اپنی زینت سے آراستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برہنگی تو کیا، ناشائستگی کا بھی شائبہ تک نہ ہو۔

۲۱ – یعنی خدا کو تمھاری خستہ حالی اور فاقہ کشی اور طیّباتِ رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجا لانے کے لیے یہ کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے عمدہ لباس پہنو اور پاک رزق سے متمتع ہو۔ اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے، خواہ یہ تجاوز حلال کو

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ
مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ

اے محمدؐ! اِن سے کہو: کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں[۲۲]؟ کہو: یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انھی کے لیے ہوں گی۔[۲۳] اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے

حرام کر لینے کی شکل میں ہو، یا حرام کو حلال کر لینے کی شکل میں۔

۲۲ – مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دُنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے اللہ کا منشا تو بہرحال یہ نہیں ہو سکتا کہ انھیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظامِ اخلاق و معاشرت ایسا ہے جو انھیں حرام، یا قابلِ نفرت، یا ارتقائے روحانی میں سدِّراہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کُھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی اُن حجتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہبِ باطلہ کے رَدّ میں پیش کی ہیں، اور اس کو سمجھ لینا قرآن کے طرزِ اِستدلال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

۲۳ – یعنی حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دُنیا کی زندگی میں بھی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہیں، کیونکہ وہی خدا کی وفادار رعایا ہیں، اور حقِ نمک صرف نمک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن دُنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمایش اور مہلت کے اُصول پر قائم کیا گیا ہے، اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں نمک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات نمک حلالوں سے بڑھ کر انھیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں (جہاں کا سارا انتظام خالص حق کی بنیاد پر ہوگا) زندگی کی آرایشیں اور رزق کے طیّبات سب کے سب محض نمک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ نمک حرام ان میں سے کچھ نہ پاسکیں گے جنھوں نے اپنے رب کے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ
تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ
اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

کام ــــ خواہ کُھلے ہوں یا چُھپے [۲۴] ــــ اور گناہ [۲۵] اور حق کے خلاف زیادتی [۲۶]، اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلّق تمھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

ہر قوم کے لیے مُہلت کی ایک مدّت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدّت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔[۲۷] (اور یہ بات اللہ نے آغازِ تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ)

۲۴ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حواشی ۱۲۸ و ۱۳۱۔

۲۵ - اصل میں لفظ اِثْم استعمال ہُوا ہے جس کے اصل معنی کوتاہی کے ہیں۔ اٰثِمَہ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بُوجھ کر سُست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہُوا ہے، یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت و فرماں برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بُوجھ کر قصور دکھانا۔

۲۶ - یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسے حُدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔ اس تعریف کی رُو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خود مختارانہ رَوِیّہ اختیار کرتے ہیں، اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجاتے ہیں، اور وہ بھی جو بندگانِ خدا کے حُقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔

۲۷ - مُہلت کی مدت مقرر کیے جانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر قوم کے لیے برسوں اور مہینوں اور دنوں کے لحاظ سے ایک عمر مقرر کی جاتی ہو اور اس عمر کے تمام ہوتے ہی اس قوم کو لازماً ختم کر دیا جاتا ہو۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم کو دُنیا میں کام کرنے کا جو موقع دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے، بایں معنٰی کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسُب برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلے میں تناسُب کی اُس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں اُس وقت تک اُسے اس کی تمام بُرائیوں کے باوجود مُہلت دی جاتی رہتی ہے، اور جب وہ اس حد سے

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ
فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى
اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ

اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمھارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمھیں میری آیات سُنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّے کی اصلاح کر لے گا، اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جُھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے، وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں[۲۸] گے۔ ظاہر ہے کہ اُس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو بالکل جُھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچّی آیات کو جُھٹلائے۔ ایسے لوگ اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنا حصّہ پاتے رہیں[۲۹] گے، یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی رُوحیں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ اُس وقت وہ اُن سے پوچھیں گے کہ بتاؤ، اب کہاں ہیں

گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار و بدصفات قوم کو مزید کوئی مُہلت نہیں دی جاتی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سورۂ نوح، آیات ۴-۱۰-۱۲ نگاہ میں رکھیے۔

۲۸ – یہ بات قرآنِ مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم وحوا علیہما السلام کے جنت سے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، آیات ۳۸-۳۹۔ طٰہٰ، آیات ۱۲۳-۱۲۴)۔ لہٰذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوعِ انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اُسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۶۹)

۲۹ – یعنی دُنیا میں جتنے دن ان کی مُہلت کے مقرر ہیں، یہاں رہیں گے، اور جس قسم کی بظاہر اچھی یا بُری زندگی گزارنا اُن کے نصیب میں ہے، گزار لیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا
عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ
قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

تمھارے وہ معبُود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ "سب ہم سے گُم ہو گئے۔" اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکرِ حق تھے۔ اللہ فرمائے گا: جاؤ، تم بھی اسی جہنّم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہِ جن و انس جا چکے ہیں۔ ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہُوا داخل ہو گا، حتّٰی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انہیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہوگا: ہر ایک کے لیے دُہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو[۳۰]۔

۳۰- یعنی بہرحال تم میں سے ہر گروہ کسی کا خَلَف تھا تو کسی کا سَلَف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اُس کے لیے فکر و عمل کی گمراہیوں کا وِرثہ چھوڑا تھا تو خود وہ بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی وِرثہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اگر ایک گروہ کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دُہرا عذاب ہے۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا، اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کے لیے جرائم پیشگی کی میراث چھوڑ آنے کی۔

حدیث میں اِسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ من ابتدع بدعة ضلالةٍ لا یرضاھا اللہ

ورسوله کان علیه من الاثم مثل اثام من عمل بها لا ینقص ذٰلك من اوزارهم شیئا۔ یعنی جس نے کسی نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمّہ داری عائد ہوگی جنھوں نے اس کے نکالے ہوئے طریقے پر عمل کیا، بغیر اس کے کہ خود ان عمل کرنے والوں کی ذمّہ داری میں کوئی کمی ہو۔ دوسری حدیث میں ہے: لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن اٰدم الاوّل کفل من دمها لانه اول من سن القتل۔ یعنی دنیا میں جو انسان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے اس کے خونِ ناحق کا ایک حصّہ آدمؑ کے اُس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، کیونکہ قتلِ انسان کا راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رَوِیّے کی بنا ڈالتا ہے، وہ صرف اپنی ہی غلطی کا ذمّہ دار نہیں ہوتا، بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے مُتأثِّر ہوتے ہیں اُن سب کے گناہ کی ذمّہ داری کا بھی ایک حصّہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہتا ہے، اور جب تک اس کی اس غلطی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اُس کے حساب میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمّہ دار نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب دہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مُترتّب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک زانی کو لیجیے۔ جن لوگوں کی تعلیم و تربیّت سے، جن کی صحبت کے اثر سے، جن کی بُری مثالیں دیکھنے سے، اور جن کی ترغیبات سے اس شخص کے اندر زِناکاری کی صفت نے ظہور کیا، وہ سب اس کے زناکار بننے میں حصّہ دار ہیں۔ اور خود اُن لوگوں نے اُوپر جہاں جہاں سے اس بدنظری و بدنیّتی اور بدکاری کی میراث پائی ہے، وہاں تک اس کی ذمّہ داری پہنچتی ہے، حتّٰی کہ یہ سلسلہ اُس اوّلین انسان پر منتہی ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کو خواہشِ نفس کی تسکین کا یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اُس زانی کے حساب کا وہ حصّہ ہے جو اس کے ہم عصروں اور اس کے اسلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنی زِناکاری کا ذمہ دار ہے۔ اُس کو بھلے اور بُرے کی جو تمیز دی گئی تھی، اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی تھی، اس کے اندر ضبطِ نفس کی جو قوت ودیعت کی گئی تھی، اس کو نیک لوگوں سے خیر و شر کا جو علم پہنچا تھا، اس کے سامنے اخیار کی جو مثالیں موجود تھیں، اس کو صنفی بدعملی کے بُرے نتائج سے جو واقفیت تھی، ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ نہ اُٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اُس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی تھی، خواہ وہ کسی طریقے سے ہو۔ یہ اس کے حساب کا وہ حصّہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یہ شخص اُس بدی کو، جس کا اکتساب اس نے کیا اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلانا شروع کرتا ہے۔ کسی مرضِ خبیث کی چھوت کہیں سے لگا لاتا ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑ آتا ہے اور جس بچے کی پرورش کا بار اسے خود اُٹھانا چاہیے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصّہ دار، اس کے بچوں کے حُقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حق دار بنا دیتا ہے، اور اس حق تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو پُھسلا کر بداخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بُری صفات اُبھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد، اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اپنے

Maktaba Tul Ishaat.com

اخلاق کی ایک بُری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے، جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدّت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ یہ سارا فساد جو اس شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا، انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اُس وقت تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔

اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔ جو نیک وِرثہ اپنے اسلاف سے ہم کو ملا ہے اُس کا اجر اُن سب لوگوں کو پہنچنا چاہیے جو ابتدائے آفرینش سے ہمارے زمانے تک اُس کے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں پھر اس ورثے کو لے کر اسے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم انجام دیں گے اس کا اجر ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ پھر اپنی سعیِ خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دُنیا میں چھوڑ جائیں گے انھیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب میں اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہیے جب تک یہ نقوش باقی رہیں، اور ان کے اثرات کا سلسلہ نوعِ انسانی میں چلتا رہے اور ان کے فوائد سے خلقِ خدا متمتع ہوتی رہے۔

جزا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے، ہر صاحبِ عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اِسی طرح ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے اُن لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دُور ہو سکتی ہیں جنھوں نے جزا کے لیے اِسی دُنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے، اور اُن لوگوں کی غلط فہمیاں بھی جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزا تناسُخ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔ ایک انسان آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا بُرے کام کرتا ہے ان کی ذمّہ داری میں نہ معلوم اُوپر کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزر چکیں اور آج یہ ممکن نہیں کہ انھیں اس کی جزا یا سزا پہنچ سکے۔ پھر اس شخص کے یہ اچھے یا بُرے اعمال جو وہ آج کر رہا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آیندہ صدہا برس تک چلتا رہے گا، ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتہ اُس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اِس دُنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے، درآں حالے کہ ابھی اس کے کسب کے اثرات کا لاکھواں حصّہ بھی رُونما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجایش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجیے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگِ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار بُرے نتائج ہزاروں برس تک اربوں انسانوں تک پھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بڑی سے بڑی جسمانی، اخلاقی، روحانی، یا مادّی سزا بھی، جو اس دُنیا میں دی جانی ممکن ہے، اُس کے اِس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی، جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، کسی ایسے شخص کے لیے کافی ہو سکتا ہے جو مدّت العمر نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سعی کے ثمرات سے فائدہ اُٹھائے چلے جا رہے ہوں؟ عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا، اُسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کے لیے ایک دوسرا ہی عالَم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں، تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کے لیے ایک

وَ قَالَتۡ اُوۡلٰىهُمۡ لِاُخۡرٰىهُمۡ فَمَا كَانَ لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع

ع ۴

اور پہلا گروہ دُوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابلِ الزام تھے) تو تمھی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔[۳۱] ع

علیم وخبیر خدا انصاف کی کُرسی پر مُتمکّن ہو، اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کے لیے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گردوپیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہلِ تناسُخ کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے، جس میں مبتلا ہو کر انھوں نے آواگون کا چکّر تجویز کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصر سی پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے کے لیے اُس سے ہزاروں گُنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے، کجا کہ اس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری اور پھر تیسری ذمہ دارانہ زندگی اِسی دُنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں جن کا اچھا یا بُرا پھل ہمیں ملنا ضروری ہو۔ اِس طرح تو حساب بے باق ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور اس کے بے باق ہونے کی نوبت کبھی آ ہی نہ سکے گی۔

۳۱ – اہلِ دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآنِ مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سبا، آیات ۳۱ - ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”کاش! تم دیکھ سکو اُس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ جو لوگ دُنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ اُن لوگوں سے جو بڑے بن کر رہے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان کمزور بنائے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ وہ تمھارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔“ مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمھیں دُنیا کے لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے، جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمھیں خریدا تو تم خود بِکنے کے لیے تیار تھے جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمھیں مادہ پرستی اور دُنیا پرستی اور قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بیزار اور دنیا کے پرستار تھے، جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بُلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہا۔ اگر ہم نے تمھیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو اُن چیزوں کی مانگ تو تمھارے ہی اندر موجود تھی جنھیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور بس تمھارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمھیں گھڑ کر دے دیے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم خدا سے بے پروا ہو کر دُنیا کے کُتّے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمّہ وہ لے لیں۔ ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمھیں فراہم

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ
اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ
سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ
مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَآ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ
نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ

یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے، ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ اُن کا جنّت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سُوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ مِلا کرتا ہے۔ ان کے لیے تو جہنّم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں ـــ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمّہ دار ٹھیراتے ہیں ـــ وہ اہلِ جنت ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دُوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے[۳۲]۔ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،

کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک و بے مزا دین داری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوش نما مذہب تمھارے لیے ایجاد کر دیے۔ غرض کہ ذمّہ داری تنہا ہمارے ہی اوپر نہیں ہے، تم بھی برابر کے ذمّہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔

۳۲- یعنی دُنیا کی زندگی میں ان نیک لوگوں کے درمیان اگر کچھ رنجشیں، بدمزگیاں اور آپس کی غلط فہمیاں رہی

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰٮنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰٮنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔" اُس وقت نِدا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، تمھیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے۔" [۳۳]

ہوں تو آخرت میں وہ سب دُور کر دی جائیں گی۔ ان کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے۔ وہ مخلص دوستوں کی حیثیت سے جنت میں داخل ہوں گے۔ اُن میں سے کسی کو یہ دیکھ کر تکلیف نہ ہوگی کہ فلاں جو میرا مخالف تھا اور فلاں جو مجھ سے لڑا تھا اور فلاں جس نے مجھ پر تنقید کی تھی، آج وہ بھی اس ضیافت میں میرے ساتھ شریک ہے۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ میرے اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ کے درمیان بھی صفائی کرا دے گا۔

اس آیت کو اگر ہم زیادہ وسیع نظر سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دُنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت انھیں جنت میں نہ لے جائے گا، بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انھیں بالکل پاک صاف کر دے گا اور وہ بے داغ زندگی لیے ہوئے وہاں جائیں گے۔

۳۳- یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہلِ جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی، بلکہ وہ خدا کی حمد وثنا اور شکر و احسان مندی میں رَطْبُ اللِّسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر اپنا احسان نہ جتائے گا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلے میں پایا ہے، یہ تمھاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمھیں دی جا رہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ تمھاری سعی کا اجر ہے، تمھارے کام کی مزدوری ہے، اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوتِ بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اِس اندازِ بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جواب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ نہیں فرماتا کہ ہم یوں کہیں گے، بلکہ انتہائی شانِ کریمی کے ساتھ فرماتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی۔

درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دُنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور اسی بنا پر وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا
رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ
مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ۙ الَّذِیۡنَ
یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ
کٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ۘ وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ (وقف لازم)
یَّعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ سَلٰمٌ

پھر یہ جنّت کے لوگ دوزخ والوں سے پُکار کر کہیں گے: "ہم نے اُن سارے وعدوں کو ٹھیک پا لیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمھارے رب نے کیے تھے؟" وہ جواب دیں گے: "ہاں"۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ "خدا کی لعنت اُن ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔"

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنّت والوں سے پکار کر کہیں گے

متکبر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجا لاتے ہیں، جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ مُتواضع اور رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ اپنے حُسنِ عمل پر غرور نہیں کرتے کہ ہم تو یقیناً بخشے ہی جائیں گے، بلکہ اپنی کوتاہیوں پر اِستغفار کرتے ہیں، اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کے بجائے کچھ دینا ہی نہ نکل آئے۔ بخاری و مسلم دونوں میں رِوایت موجود ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: اعلموا ان احدکم لن یدخلہ عملہ الجنۃ۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بُوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔ لوگوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں مَیں بھی، الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ وفضل، اِلّا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝٤٦ وَاِذَا صُرِفَتْ
اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٧ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا
يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ
تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٤٨ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ
بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ
تَحْزَنُوْنَ ۝٤٩ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا
عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا

کہ "سلامتی ہو تم پر!" یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔[۳۴] اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے: "اے رب، ہمیں اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمھارے جتھے تمھارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہلِ جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلّق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ آج انھی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمھارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمھیں دیا ہے اُسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں اُن منکرینِ حق پر حرام

۳۴- یعنی یہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہوگا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہوگا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اس لیے وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر رہیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٥٠ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا
كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝٥١ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى
عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝٥٢ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

کر دی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنھیں دُنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انھیں اسی طرح بُھلا دیں گے جس طرح وہ اِس دن کی ملاقات کو بُھولے رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔[۳۵]''

ہم اِن لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصّل بنایا[۳۶] ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت[۳۷] ہے۔ اب کیا یہ لوگ اِس کے سوا کسی اَور بات کے منتظر ہیں

۳۵- اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ اور اصحاب الاعراف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالَمِ آخرت میں انسان کی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا۔ وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور اعراف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ اِن مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی گُفت وشنید کرسکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو عالَمِ آخرت کے متعلق ہمیں قرآن میں ملتے ہیں، اِس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دُنیا کے قوانینِ طبیعی سے بالکل مختلف ہوں گے، اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گی جو یہاں ہیں۔ جن لوگوں کے دماغ اِس عالَمِ طبیعی کے حدود میں اس قدر مقیّد ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا، وہ قرآن اور حدیث کے اِن بیانات کو بڑے اچنبھے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اُڑا کر اپنی خفیف العقلی کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بے چاروں کا دماغ جتنا تنگ ہے، زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۳۶- یعنی اس میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دُنیا کی زندگی میں کون سا رَوِیّہ دُرست ہے اور صحیح طرزِ زندگی کے بنیادی اُصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات بھی قیاس یا گمان یا وہم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔

۳۷- مطلب یہ ہے کہ اوّل تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی

إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن
قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ
فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ
خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾ ع

ع ۶ ۱۳

کہ وہ انجام سامنے آ جائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے[۳۸]؟ جس روز وہ انجام سامنے آ گیا تو وہی لوگ جنھوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا، کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تا کہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں[۳۹]" ——— انھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔ ع

اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو مانتے ہیں، ان کی زندگی میں عملاً بھی اِس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت، اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ ہے اُن حیرت انگیز اثرات کی طرف جو اس کتاب پر ایمان لانے سے صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ظاہر ہو رہے تھے۔

۳۸- دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقے سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا، پھر اس کے سامنے کچھ لوگ صحیح راستے پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کر کے ان کی زندگی کتنی بہتر ہوگئی ہے، مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا، تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اب وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پا کر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی۔ جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفایاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے، وہ اب بسترِ مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک تھے۔

۳۹- یعنی وہ دوبارہ اِس دُنیا میں واپس آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اُس وقت ہم نے نہ مانا تھا، اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں، لہٰذا اگر ہمیں دُنیا میں پھر بھیج دیا جائے

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ قف يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا لا

درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[40]، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[41]۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے

تو ہمارا طرزِ عمل وہ نہ ہوگا جو پہلے تھا۔ اس درخواست اور اس کے جوابات کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام، آیت ۲۷ - ۲۸، ابراہیم ۴۴ - ۴۵، السجدہ ۱۲ - ۱۳، فاطر ۳۷، الزُّمَر ۵۶ تا ۵۹، المومن ۱۱ - ۱۲۔

۴۰ – یہاں دن کا لفظ یا تو اسی چوبیس گھنٹے کے دن کا ہم معنٰی ہے جسے دُنیا کے لوگ دن کہتے ہیں، یا پھر یہ لفظ دَور (period) کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ حج، آیت ۴۷ میں فرمایا: وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال کے برابر ہے اُس حساب سے جو تم لوگ لگاتے ہو)، اور سورۂ معارج کی آیت ۴ میں فرمایا کہ: تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (فرشتے اور جبریلؑ اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے)۔ اس کا صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۴۱ – خدا کے اِستواءعَلَی العرش (تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو، جہاں سے سارے عالَم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیرِ امر بھی فرمائی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدارِ فرماں روائی ہو اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے اس کی زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال اِستواءعَلَی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالقِ کائنات ہی نہیں ہے، بلکہ مدبّرِ کائنات بھی ہے۔ وہ دُنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے، بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جُزو کُل پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرّہ ذرّہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اُس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہُوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی ضلالت میں۔ خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے سر جھکا دے، یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے۔ قرآنِ مجید میں خدا اور خَلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا

سُورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے[۴۲]۔ بڑا بابرکت[۴۳] ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے

زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلحات، استعارے اور اندازِ بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرزِ بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو، اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی ”تصنیف“ ہے، اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلّط تھا، اس لیے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے، اور حاکمیت (sovereignity) جس شے کا نام ہے، وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظامِ کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جُزوی یا کُلّی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویّہ صحیح نہیں ہوسکتا کہ اُسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبُود بھی مانے اور سیاسی و تمدّنی معنوں میں واحد سلطان (sovereign) بھی تسلیم کرے۔

۴۲ – یہ اُسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو ”استواء علی العرش“ کے الفاظ میں مُجملاً بیان کیا گیا تھا۔یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں، آمر اور حاکم بھی ہے۔اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں، اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصّے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے۔ بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخّر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

۴۳ – برکت کے اصل معنیٰ ہیں نمو، افزایش اور بڑھوتری کے، اور اسی کے ساتھ اس لفظ میں رفعت و عظمت کا مفہوم بھی ہے اور ثبات اور جماؤ کا بھی۔ پھر ان سب مفہُومات کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصوّر لازماً شامل ہے۔پس اللہ کے نہایت بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں ہے، بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں، اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے، کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی یہ بھلائی اور رفعت مستقل ہے، عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔(مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الفرقان، حواشی ۱-۱۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي
الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ

اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے[۴۴] اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ،[۴۵] یقیناً اللہ کی رحمت

۴۴ – ”زمین میں فساد برپا نہ کرو“، یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا، اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدّن کو ایسے اُصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رُونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی مُتنبّہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو، بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے، جس کو دُور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس دُرست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظامِ حیات کو ازسرِ نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبرؐ بھیجتا رہا ہے، اور انھوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملے میں قرآن کا نقطۂ نظر اُن لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنھوں نے ارتقا کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا، اور خدا بار بار اپنے پیغمبروںؑ کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔ (سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۳۰)

۴۵ – اس فقرے سے واضح ہو گیا کہ اُوپر کے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ دراصل یہی ہے کہ انسان خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز اور کارفرما قرار دے کر مدد کے لیے پکارے۔ اور اصلاح اس کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اِس پکار کا مَرجَع پھر سے محض اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو، اور تمھاری اُمیدیں بھی اگر کسی سے

قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا
بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ
لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ
كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ
يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا
نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿٥٨﴾ ع ۷ ۱۴

نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھا لیتی ہیں تو انھیں کسی مُردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اُسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم مُردوں کو حالتِ موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔[46] اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔ ع

وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمھاری قسمت بالکلیّہ اس کی نظرِ عنایت پر منحصر ہے، فلاح و سعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے، ورنہ جہاں تم اس کی اعانت سے محروم ہوئے، پھر تمھارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

۴۶ – یہاں ایک لطیف مضمون ارشاد ہوا ہے جس پر مُتنبّہ ہو جانا اصل مُدّعا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ بارش اور اس کی برکتوں کے ذکر سے اِس مقام پر خدا کی قدرت کا بیان اور حیات بعد الممات کا اثبات بھی مقصود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمثیل کے پیرایے میں رسالت اور اس کی برکتوں کا اور اس کے ذریعے سے خوب و زِشت میں فرق اور خبیث و طیب میں امتیاز

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

ہم نے نُوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا[47]۔ اس نے کہا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو،

نمایاں ہو جانے کا نقشہ دکھانا بھی پیشِ نظر ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نُزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابرِ رحمت کے چھا جانے اور اَمرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعے سے مردہ پڑی ہوئی زمین کے یکا یک جی اُٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو اُس حالت کے لیے بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے یکا یک جاگ اُٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے اُبل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی صرف وہی انسان فائدہ اُٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسرِکار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث انسان، تو جس طرح شوریلی زمین بارانِ رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اُگل دیتی ہے، اسی طرح رسالت کے ظُہور سے انھیں بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں اُبھر کر پوری طرح برسرِکار آجاتی ہیں۔

اسی تمثیل کو بعد کے کئی رُکوعوں میں مسلسل تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں نبی کی بِعثت کے بعد انسانیت دو حصّوں میں تقسیم ہوتی رہی ہے۔ ایک طیّب حصّہ جو فیضِ رسالت سے پھلا اور پھولا اور بہتر برگ و بار لایا۔ دوسرا خبیث حصّہ جس نے کَسَوٹی کے سامنے آتے ہی اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر کے رکھ دی اور آخرِکار اس کو ٹھیک اسی طرح چھانٹ کر پھینک دیا گیا جس طرح سُنار چاندی سونے کے کھوٹ کو چھانٹ پھینکتا ہے۔

۴۷ – اس تاریخی بیان کی ابتدا حضرت نوحؑ اور ان کی قوم سے کی گئی ہے، کیونکہ قرآن کی رُو سے جس صالح نظامِ زندگی پر حضرت آدمؑ اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوحؑ کے دَور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔

قرآن کے اشارات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابِل کے آثارِ قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کُتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اُن میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصّہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع مَوصِل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کُردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں، اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی علاقے میں کسی مقام پر ٹھیری تھی۔ مَوصِل کے شمال میں جزیرۂ ابنِ عمر کے

مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۵۹﴾
قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰٮكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ

اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں [۴۸] ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو"۔ نوحؑ نے

آس پاس، آرمینیا کی سرحد پر کوہِ ارارات کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشان دہی اب بھی کی جاتی ہے، اور شہر نَخچِیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اِس شہر کی بنا حضرت نوحؑ نے ڈالی تھی۔

حضرت نوحؑ کے اس قصّے سے ملتی جُلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائرِ شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکا و یورپ کے مختلف حصّوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصّہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مُرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انھوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعے پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

۴۸ – یہاں اور دوسرے مَقامات پر حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو حال قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہوگئی تھی، شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصّہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہوگئیں۔ جو خود ساختہ معبُود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے، ان کی نمایندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی، سیاسی اور مَعاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اُونچ اور نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فُجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانۂ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیوں کہ اگر تُو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہوگا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ہود، رکوع ۳۔ سورۂ شُعَراء، رکوع ۶۔ اور سورۂ نوح مکمّل)

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾
اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾
اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ
لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ

کہا: ''اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجّب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟''[49] مگر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخرِ کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور اُن لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا[50] تھا، یقیناً

۴۹ – یہ معاملہ جو حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا، بعینہٖ ایسا ہی معاملہ مکّے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ جو پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، وہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ جو شبہات اہلِ مکہ کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے، وہی شبہات ہزاروں سال پہلے سردارانِ قومِ نوحؑ نے حضرت نوحؑ کی رسالت میں ظاہر کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوحؑ کہتے تھے، بعینہٖ وہی باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے تھے۔ آگے چل کر دوسرے انبیا علیہم السلام اور ان کی قوموں کے جو قصّے مسلسل بیان ہو رہے ہیں، ان میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رویّہ اہلِ مکّہ کے رویّے سے اور ہر نبی کی تقریر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ہُو بہُو مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی رہی ہے، اور خدا کے بھیجے ہوئے معلّموں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح اُن لوگوں کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہُوا ہے اور ہوگا جنھوں نے انبیا کی دعوت سے منہ موڑا اور اپنی گمراہی پر اصرار کیا۔

۵۰ – جو لوگ قرآن کے اندازِ بیان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شُبہے میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سارا معاملہ بس ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا ہو گا۔ نبی اُٹھا اور اس نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لوگوں نے اعتراضات کیے

اور نبی نے ان کا جواب دیا، لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے، وہ ایک نہایت طویل مدّت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ مخصوص طرزِ بیان ہے کہ وہ قصہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصّے کے صرف اُن اہم اجزا کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی قصّے کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اِسی قصۂ نوحؑ کو لیجیے۔ یہاں اس کے بیان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ پیغمبر کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ قصہ اس غرض کے لیے بیان ہُوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے وہاں خاص طور پر دعوتِ نوح علیہ السلام کی طویل مدّت کا ذکر کیا گیا ہے، تاکہ آں حضرتؐ اور آپؐ کے رفقا اپنی چند سال کی تبلیغی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہوتے نہ دیکھ کر بد دل نہ ہوں اور حضرت نوحؑ کے صبر کو دیکھیں جنھوں نے مدت ہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوتِ حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ عنکبوت، آیت ۱۴)

اس موقع پر ایک اور شک بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ جب ایک شخص قرآن میں بار بار ایسے واقعات پڑھتا ہے کہ فلاں قوم نے نبی کو جھٹلایا اور نبی نے اسے عذاب کی خبر دی اور اچانک اس پر عذاب آیا اور قوم تباہ ہوگئی، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے؟ اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور اُبھرتی بھی ہیں، لیکن اس عُروج و زوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان یا صاعقہ آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے اُس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہِ راست مخاطَب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلا واسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہنچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کر دے، اس پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے، اس کے لیے معذرت کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی، اور خدا کے فرستادہ کو دُو بدُو جھٹلا دینے کے بعد وہ اِس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چُکا دیا جائے۔ یہ نوعیتِ معاملہ اُن قوموں کے معاملے سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس خدا کا پیغام براہِ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہنچا ہو۔ پس اگر اب اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے جیسے انبیا علیہم السلام کے زمانے میں پیش آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی تھی تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اُسی شان کا عذاب آتا جیسا انبیاؑ کو دُو بدُو جھٹلانے والی قوموں پر آتا تھا۔

مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اب اُن قوموں پر عذاب آنے بند ہوگئے ہیں جو خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تنبیہی عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کُن عذاب بھی۔ لیکن کوئی نہیں جو انبیا علیہم السلام اور کُتبِ آسمانی کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۸ / ۱۵

كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

وہ اندھے لوگ تھے۔ ع

اور عاد[۵۱] کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟“

معنیٰ کی طرف انسان کو توجہ دلائے۔ بلکہ اس کے برعکس ظاہر بیں سائنس دانوں اور حقیقت سے ناواقف مؤرخین وفلاسفہ کا ایک کثیر گروہ نوعِ انسانی پر مسلّط ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبعیاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کرکے اس کو بُھلاوے میں ڈالتا رہتا ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر مُتنبِّہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے آنکھیں بند کرکے اپنی غلطی روی پر اصرار کیے چلی جاتی ہیں تو آخر کار انھیں تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

۵۱ – یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت وحشمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام ونشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہوکر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عَرَبی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں۔ جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوئی ہو، اُسے عادیُّ الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرینِ انساب بھی اپنے مُلک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنی ذُہل بن شَیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انھوں نے وہ قصّے حضوؐر کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقے کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آرہے تھے۔

قرآن کی رُو سے اس قوم کا اصل مَسکن اَحقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الرَّبع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل اور عُمّان وحَضرَموت سے عراق تک اپنی طاقت کا سکّہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہوچکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنھیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ حَضرَموت میں ایک مقام پر حضرت ہودؑ کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریزی بحری افسر (James R. Wellested) کو حِصنِ غُراب میں ایک پُرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہودؑ کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعتِ ہُود کے پیرو تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الاحقاف، حاشیہ ۲۵)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ
سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ
بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ
رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَ
اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي
الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا: ”ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔“ اس نے کہا: ”اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجّب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تا کہ وہ تمھیں خبردار کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوحؑ کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمھیں خوب تنومند کیا، پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو،[۵۲] اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ انھوں نے جواب دیا: ”کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا

۵۲ – اصل میں لفظ آلاء استعمال ہُوا ہے، جس کے معنی نعمتوں کے بھی ہیں، اور کرشمہ ہائے قدرت کے بھی، اور صفاتِ حمیدہ کے بھی۔ آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو بھی یاد رکھو اور یہ بھی فراموش نہ کرو کہ وہ تم سے یہ نعمتیں چھین لینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷۰
قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ
اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ
مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

کرتے آئے ہیں؟[۵۳] اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تُو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تُو سچّا ہے۔" اس نے کہا: "تمھارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں،[۵۴] جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟[۵۵] اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ

۵۳ – یہاں یہ بات پھر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ قوم بھی اللہ سے منکر یا ناواقف نہ تھی اور نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا۔ دراصل وہ حضرت ہودؑ کی جس بات کو ماننے سے انکار کرتی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ اکیلے اللہ کی بندگی کی جائے، کسی دوسرے کی بندگی اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے۔

۵۴ – یعنی تم کسی کو بارش کا، اور کسی کو ہوا کا، اور کسی کو دولت کا، اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ اس کی مثالیں موجودہ زمانے میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ کسی انسان کو لوگ مشکل کُشا کہتے ہیں، حالانکہ مشکل کُشائی کی کوئی طاقت اس کے پاس نہیں ہے۔ کسی کو گنج بخش کے نام سے پکارتے ہیں، حالانکہ اس کے پاس کوئی گنج نہیں کہ کسی کو بخشے۔ کسی کے لیے داتا کا لفظ بولتے ہیں، حالانکہ وہ کسی شے کا مالک ہی نہیں کہ داتا بن سکے۔ کسی کو غریب نواز کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ غریب اُس اقتدار میں کوئی حصّہ نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو غوث (فریادرس) کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمّٰی نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے، نہ کہ کسی حقیقت کے لیے۔

۵۵ – یعنی اللہ جس کو تم خود بھی ربِّ اکبر کہتے ہو، اس نے کوئی سند تمھارے اِن بناوٹی خداؤں کی الٰہیت و رُبوبیّت کے حق میں عطا نہیں کی ہے۔ اس نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں کی طرف اپنی خدائی کا اتنا حصّہ منتقل کر دیا ہے۔ کوئی پروانہ اس نے کسی کو مشکل کُشائی یا گنج بخشی کا نہیں دیا۔ تم نے آپ ہی اپنے وہم وگمان سے اس کی خدائی کا جتنا حصّہ جس کو چاہا ہے، دے ڈالا ہے۔

الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ
صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ

ع ۸ / ۱۶ وقف لازم

انتظار کرتا ہوں۔" آخرکار ہم نے اپنی مہربانی سے ہُودؑ اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔ ۵۶ ع

اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ ۵۷ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی

۵۶ – جڑ کاٹ دی، یعنی ان کا اِستیصال کر دیا اور ان کا نام و نشان تک دنیا میں باقی نہ چھوڑا۔ یہ بات خود اہلِ عرب کی تاریخی رِوایات سے بھی ثابت ہے، اور موجودہ اثری اِکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عادِ اُولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں۔ چنانچہ مؤرخینِ عرب انھیں عرب کی اُمَمِ بائدہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مُسلَّمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصّہ باقی رہا جو حضرت ہودؑ کا پیرو تھا۔ اِنھی بقایائے عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے، اور حِصنِ غُراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں، انھی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبے میں (جسے تقریباً ۱۸ سو برس قبلِ مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے) ماہرینِ آثار نے جو عبارت پڑھی ہے، اس کے چند جملے یہ ہیں:

"ہم نے ایک طویل زمانہ اس قَلعے میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دُور تھی، ہماری نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں............ اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بُرے خیالات سے پاک اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے، وہ ہم پر ہودؑ کی شریعت کے مطابق حُکومت کرتے تھے، اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے، اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔"

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوش حالی کے وارث آخرِکار وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے تھے۔

۵۷ – یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نُزولِ قرآن سے پہلے اس کے قصّے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اَسیریا کے کَتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیحؑ کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے، چنانچہ رومی مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نَبطیوں

Maktaba Tul Ishaat.com

بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۖ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ

کُھلی دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے[58]، لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی

کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی اَلحِجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائنِ صالح کہتے ہیں۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حِجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا، اور اس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نُزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشان دہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اُونٹنی پانی پیتی تھی، اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی دَرّے کو دکھا کر آپؐ نے بتایا کہ اسی دَرّے سے وہ اُونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فجُّ النّاقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے، اُن کو آپؐ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

۵۸ – ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کُھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہی اُونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں ''نشانی'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء، آیات ۱۵۴ تا ۱۵۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اُونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اُونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہُوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاؑ نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبے پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اُونٹنی کی معجزانہ پیدایش پر دلیل ہے کہ حضرت صالحؑ نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اُونٹنی کی جان کے ساتھ تمھاری زندگی معلّق ہے۔ یہ آزادانہ تمھاری زمینوں میں چَرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پییں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدّت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چَرتے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پییں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انھوں نے اسے قتل کیا، درآں حالے کہ حضرت صالحؑ کے پاس کوئی طاقت نہ تھی

فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾
وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ
تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ
الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا

زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آلے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قومِ عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اُس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو[۵۹]۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو[۶۰]۔"

اُس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے اُن لوگوں سے

جس کا انھیں کوئی خوف ہوتا، اِس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اُونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ مگر قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اُونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی حدیثِ صحیح میں بھی اس کے معجزے کے طور پر پیدا ہونے کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے اُن رِوایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسّرین نے اس کی کیفیتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔

۵۹ – ثمود کی یہ صنعت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، ایجنٹا اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے، یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے، جیسا کہ اُوپر بیان ہُوا۔ مدائنِ صالح میں اب تک ان کی کچھ عمارتیں جُوں کی تُوں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینیری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

۶۰ – یعنی عاد کے انجام سے سبق لو۔ جس خدا کی قدرت نے اُس مفسد قوم کو برباد کر کے تمھیں اس کی جگہ سربلند کیا، وہی خدا تمھیں برباد کر کے دوسروں کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے اگر تم بھی عاد کی طرح مفسد بن جاؤ۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۵۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ
قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ
وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ
رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

جو ایمان لے آئے تھے، کہا: "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اُسے ہم مانتے ہیں۔" اُن بڑائی کے مدعیوں نے کہا: "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔"

پھر انھوں نے اُس اُونٹنی کو مار ڈالا[۶۱] اور پُورے تمرّد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے، اور صالحؑ سے کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تُو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" آخرِکار ایک دہلا دینے والی آفت[۶۲] نے اُنھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اَوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالحؑ یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔"

---

۶۱ – اگرچہ مارا ایک شخص نے تھا، جیسا کہ سورۂ قمر اور سورۂ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پوری قوم اُس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اِس جرم میں قوم کی مرضی کا آلۂ کار تھا، اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے، یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو، ایک قومی گناہ ہے، خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فردِ واحد ہو۔ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان عَلَی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے، وہ بھی قومی گناہ ہے۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ
مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ

اور لُوطؑ کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اُس نے اپنی قوم سے [۶۳] کہا: "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فُحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔[۶۴]

۶۲ – اس آفت کو یہاں "رجفه" (اضطراب انگیز، ہلا مارنے والی) کہا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر اسی کے لیے "صَيْحَة" (چیخ)، "صاعقه" (کڑاکا) اور "طاغيه" (سخت زور کی آواز) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۶۳ – یہ قوم اس علاقے میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اُردُن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے، جو یا تو بُحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا، یا اب بحیرۂ مُردار میں غرق ہو چکا ہے۔ تَلمُود میں لکھا ہے کہ سَدُوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے، اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا، جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحرِ لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لُوط علیہ السّلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہلِ سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہو گا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لُوطؑ کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں، وہاں ایک دھبّا یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انھیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

۶۴ – دوسرے مقامات پر اس قوم کے بعض اور اخلاقی جرائم کا بھی ذکر آیا ہے، مگر یہاں اس کے سب سے بڑے جرم کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خدا کا عذاب اس پر نازل ہوا۔

یہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آئے، لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی کوشش کی، اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا، یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالسِ قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھیرا دیا۔ حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا
اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔" مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو اِن لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔"[۶۵] آخرِکار ہم نے لوطؑ اور

مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسُل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے، اور نوعِ انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اُس سے تمدّن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت کی دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں، ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے، ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذّت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی و محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذّت حاصل کرتا ہے، وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مُرتکب ہوتا ہے۔ اوّلاً: وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے، جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔ ثانیاً: وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدّن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حُقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا، وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چُرا لیتا ہے۔ ثالثاً: وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بد دیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدّنی اداروں سے فائدہ تو اُٹھا لیتا ہے، مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقے پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدّن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مُضرّت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نا اہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے، اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

۶۵ – اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بدکردار اور بد اخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انھیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ بدی میں یہاں تک غرق ہو چکے تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی کے اس تھوڑے سے عُنصر کو بھی نکال دینا چاہتے تھے جو اُن کی گھناؤنی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اِستیصال کا فیصلہ صادر ہوا۔ کیونکہ جس قوم کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عُنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ٘ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمْطَرْنَا
عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع

ع ۱۰ / ۱۴

اس کے گھر والوں کو ــــــ بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں[۶۶] میں تھی ــــــ بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک[۶۷] بارش، پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام[۶۸] ہوا۔ ع

سڑے ہوئے پھلوں کے ٹوکرے میں جب تک چند اچھے پھل موجود ہوں، اس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جا سکتا ہے، مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مَصرف اس کے سوا نہیں رہتا کہ اُسے کسی گھورے پر اُلٹ دیا جائے۔

۶۶ – دوسرے مَقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لُوطؑ کی یہ بیوی، جو غالباً اسی قوم کی بیٹی تھی، اپنے کافر رشتہ داروں کی ہم نوا رہی اور آخر وقت تک اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس لیے عذاب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ اور ان کے ایمان دار ساتھیوں کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو ہدایت فرما دی کہ اس عورت کو ساتھ نہ لیا جائے۔

۶۷ – بارش سے مراد یہاں پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے، جیسا کہ دوسرے مَقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ نیز یہ بھی قرآن میں ارشاد ہُوا ہے کہ اُن کی بستیاں اُلٹ دی گئیں اور انھیں تلپٹ کر دیا گیا۔

۶۸ – یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ عملِ قومِ لُوطؑ ایک بدترین گناہ ہے جس پر ایک قوم اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہوئی۔ اس کے بعد یہ بات ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے معلوم ہوئی کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرے کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا حکومت اسلامی کے فرائض میں سے ہے، اور یہ کہ اس جرم کے مرتکبین کو سخت سزا دی جانی چاہیے۔ حدیث میں مختلف رِوایات جو حضورؐ سے مروی ہیں، ان میں سے کسی میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اقتلوا الفاعل والمفعول بہ (فاعل اور مفعول کو قتل کر دو)۔ کسی میں اس حکم پر اتنا اضافہ اور ہے کہ احصنا اولم یحصنا (شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ)۔ اور کسی میں ہے: فارجموا الاعلی والاسفل (اُوپر اور نیچے والا، دونوں سنگسار کیے جائیں)۔ لیکن چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا کوئی مُقدّمہ پیش نہیں ہوا، اس لیے قطعی طور پر یہ بات متعین نہ ہوسکی کہ اس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ مجرم تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اس کی لاش جلائی جائے۔ اسی رائے سے حضرت ابوبکرؓ نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے وہ عمارت ان پر ڈھا دی جائے۔ ابنِ عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اُونچی عمارت پر سے ان کو سر کے بل پھینک دیا جائے اور اُوپر سے پتھر برسائے جائیں۔ فقہا میں سے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فاعل و مفعول واجب القتل ہیں، خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شَعْبی، زُہری، مالک اور احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ان کی سزا رجم ہے۔ سعید بن مُسَیَّب، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، سفیان ثَوری اور اَوزاعی رحمہم اللہ کی رائے میں اس جرم پر وہی سزا دی جائے گی جو زنا کی سزا ہے، یعنی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

اور مَدیَن[69] والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی

غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور جلاوطن کر دیا جائے گا، اور شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں اس پر کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ یہ فعل تعزیر کا مستحق ہے، جیسے حالات و ضروریات ہوں ان کے لحاظ سے کوئی عبرت ناک سزا اس پر دی جا سکتی ہے۔ ایک قول امام شافعیؒ سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔

معلوم رہے کہ آدمی کے لیے یہ بات قطعی حرام ہے کہ وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ عملِ قومِ لُوط کرے۔ ابوداؤد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ملعون من اتی المرأة فی دبرها (عورت سے یہ فعل کرنے والا ملعون ہے)۔ ابنِ ماجہ اور مُسنَدِ احمد میں حضورؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ لا ینظر اللّٰہ الی رجل جامع امرأته فی دبرها (اللہ اُس مرد کی طرف ہرگز نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا جو عورت سے اِس فعل کا ارتکاب کرے)۔ ترمذی میں آپؐ کا یہ فرمان ہے کہ من اتی حائضا او امرأة فی دبرها او کاهنا فصدّقه فقد کفر بما انزل علی محمّدؐ (جس نے حائضہ عورت سے مجامعت کی، یا عورت کے ساتھ عملِ قومِ لُوط کا ارتکاب کیا، یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کی، اُس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے)۔

۶۹ – مَدیَن کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیج عَقَبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہُوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحرِ احمر کے کنارے یمن سے مکّہ اور یَنبُوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مَدیَن سے واقف تھا، اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہلِ مَدیَن کے متعلق ایک اور ضروری بات، جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مِدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قَطُورا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانے کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے، وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولادِ یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو مِدیان بن ابراہیمؑ کے زیرِ اثر آئی، بنی مدیان کہلائی اور ان کے مُلک کا نام ہی مَدیَن یا مِدیان مشہور ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دینِ حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیبؑ کے ذریعے سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ

کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو،[۷۰] اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے،[۷۱] اسی میں تمھاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔[۷۲] اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ

قوم کی سی تھی جیسی ظہورِ موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

۷۰ – اس سے معلوم ہُوا کہ اس قوم میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں: ایک شرک، دوسرے تجارتی معاملات میں بد دیانتی۔ اور انھی دونوں چیزوں کی اصلاح کے لیے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔

۷۱ – اس فقرے کی جامع تشریح اسی سورۂ اَعراف کے حواشی ۴۴ و ۴۵ میں گزر چکی ہے۔ یہاں خُصوصیّت کے ساتھ حضرت شعیبؑ کے اس قول کا اشارہ اس طرف ہے کہ دینِ حق اور اخلاقِ صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت و رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا، اب تم اسے اپنی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی بدراہیوں سے خراب نہ کرو۔

۷۲ – اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعیِ ایمان تھے۔ جیسا کہ اُوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ دراصل بگڑے ہوئے مسلمان تھے اور اعتقادی و اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر انھیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمھارے نزدیک خیر اور بھلائی راست بازی اور دیانت میں ہونی چاہیے، اور تمھارا معیارِ خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾
وَاِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآىِٕفَةٌ لَّمْ
يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾

الجزء ۹

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ
مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا
يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ

تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اُس تعلیم پر جس کے ساتھ مَیں بھیجا گیا ہوں، ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ "اے شعیبؑ! ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، ورنہ تم لوگوں کو ہماری مِلّت میں واپس آنا ہوگا۔" شعیبؑ نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمھاری مِلّت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں اِلّا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔[۷۳]

۷۳۔ یہ فقرہ اُسی معنی میں ہے جس میں اِن شاء اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اور جس کے متعلق سورۂ کہف (آیات ۲۳-۲۴) میں ارشاد ہوا ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کروں گا، بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو

وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ
بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾
وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تُو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا: "اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔"^۷۴ مگر ہُوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے اُن کو آ لیا اور وہ

ایسا کروں گا۔ اس لیے کہ مومن، جو اللہ تعالیٰ کی سلطانی و بادشاہی کا اور اپنی بندگی و تابعیّت کا ٹھیک ٹھیک اِدراک رکھتا ہے، کبھی اپنے بل بُوتے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں فُلاں بات کر کے رہوں گا، یا فُلاں حرکت ہرگز نہ کروں گا، بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ میرا ارادہ ایسا کرنے کا یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مَشِیّت پر موقوف ہے، وہ توفیق بخشے گا تو اس میں کامیاب ہو جاؤں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا۔

۷۴ – اس چھوٹے سے فقرے پر سے سرسری طور پر نہ گزر جایئے۔ یہ ٹھیر کر بہت سوچنے کا مقام ہے۔ مَدیَن کے سردار اور لیڈر دراصل یہ کہہ رہے تھے اور اسی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلا رہے تھے کہ شعیبؑ جس ایمان داری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اُصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے، اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچّائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی دو سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چَوراہے پر بستے ہیں، اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدّن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں، اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پُر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جُغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی ــــــ یہ بات صرف قومِ شعیبؑ کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی رَوِش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلے میں جو زبردست

Maktaba Tul Ishaat.com

دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩١﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا
فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٢﴾
فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ
وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٩٣﴾ ع

اپنے گھروں میں اَوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیبؑ کے جُھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے[۷۵]۔ اور شعیبؑ یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نِکل گیا کہ ''اے برادرانِ قوم! میں نے اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اُس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے[۷۶]۔'' ع

عُذرات پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔

۷۵ - مَدیَن کی یہ تباہی مدت ہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضربُ المَثَل رہی ہے۔ چنانچہ زَبورِ داؤدؑ میں ایک جگہ آتا ہے کہ اے خدا! فُلاں فُلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے، لہٰذا تُو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مِدیان کے ساتھ کیا (۸۳: ۵ تا ۹)۔ اور یَسعِیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اَشُور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمھارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں، لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہو گا جو مِدیان کا ہوا۔ (یَسعِیاہ ۱۰: ۲۱ تا ۲۶)

۷۶ - یہ جتنے قصّے یہاں بیان کیے گئے ہیں ان سب میں ''سِرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں'' کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر قصّہ اُس معاملے پر پورا پورا چسپاں ہوتا ہے جو اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ ہر قصّے میں ایک فریق نبی ہے، جس کی تعلیم، جس کی دعوت، جس کی نصیحت و خیر خواہی، اور جس کی ساری باتیں بعینہٖ وہی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں۔ اور دوسرا فریق حق سے منہ موڑنے والی قوم ہے، جس کی اعتقادی گمراہیاں، جس کی اخلاقی خرابیاں، جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں، جس کے سرداروں کا اِستِکبار، جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار، غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں پایا جاتا تھا۔ پھر ہر قصّے میں منکر قوم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے، اس سے دراصل قریش کو عبرت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ
الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ
فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اُس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مُبتلا نہ کیا ہو، اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اُتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پُھولے اور کہنے لگے کہ ”ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے ہی رہے ہیں۔“ آخرکار ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔ اگر بستیوں کے

دلائی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بات نہ مانی اور اصلاحِ حال کا جو موقع تمھیں دیا جا رہا ہے اسے اندھی ضد میں مبتلا ہو کر کھو دیا، تو آخرِ کار تمھیں بھی اسی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی و فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصے میں آتی رہی ہے۔

۷۷ – ایک ایک نبی اور ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کرنے کے بعد اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جا رہا ہے جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کی بِعثت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبولِ دعوت کے لیے نہایت سازگار بنایا گیا۔ یعنی اس کو مصائب اور آفات میں مبتلا کیا گیا۔ قحط، وبا، تجارتی خسارے، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں اس پر ڈالی گئیں۔ تاکہ اس کا دل نرم پڑے، اس کی شیخی اور تکبّر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو، اس کا غرورِ طاقت اور نشۂ دولت ٹوٹ جائے، اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر اس کا اعتماد شکست ہو جائے، اُسے محسوس ہو کہ اُوپر کوئی اور طاقت بھی ہے جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت کی باگیں ہیں، اور اس طرح اس کے کان نصیحت کے لیے کُھل جائیں اور وہ اپنے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھک جانے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر جب اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس کو خوش حالی کے فتنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، اور یہاں سے اس کی بربادی کی تمہید شروع ہو جاتی ہے۔ جب وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے بُرے دن بھول جاتی ہے اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا اُتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی

Maktaba Tul Ishaat.com

الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ

لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے

اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی بُرے دن لاتی ہی رہتی ہے، لہٰذا مصائب اور آفات کے نُزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قُبول کر کے خدا کے آگے زاری و تضرُّع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کھینچا ہے: لا یزال البلاء بالمؤمن حتّٰی یخرجَ نقیًّا من ذنوبہٖ والمنافقُ مَثَلُہٗ کمثلِ الحِمار لا یدری فیمَ رَبَطہٗ اھلہٗ ولَا فِیْمَ ارسلوہ۔ یعنی ''مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اِس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے، لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا۔'' پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے، نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے، اور نہ کسی حال میں اصلاح قبول کرتی ہے، تو پھر اس کی بربادی اِس طرح اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے جیسے پورے دن کی حاملہ عورت کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کب اس کا وضعِ حمل ہو جائے۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطے کا ذکر فرمایا ہے، ٹھیک یہی ضابطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کے موقع پر بھی برتا گیا، اور شامت زدہ قوموں کے جس طرزِ عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ٹھیک وہی طرزِ عمل سورۂ اَعراف کے نُزول کے زمانے میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہ بن عباسؓ دونوں کی مُتّفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپؐ کی دعوت کے خلاف سخت رَویّہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! یوسفؑ کے زمانے میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا، ویسے ہی قحط سے اِن لوگوں کے مقابلے میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مُردار کھانے لگے، چمڑے اور ہڈیاں اور اُون تک کھا گئے۔ آخرِ کار مکے کے لوگوں نے، جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا، حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے خدا سے دعا کیجیے۔ مگر جب آپؐ کی دعا سے اللہ نے وہ بُرا وقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو اُن لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں، اور جن کے دل تھوڑے بہت پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرارِ قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں! یہ تو زمانے کا اُتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں، کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، لہٰذا ان چیزوں سے دھوکا کھا کر محمدؐ کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اُس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورۂ اَعراف نازل ہوئی ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے اِن کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: یونُس، آیت ۲۱۔ النحل ۱۱۲۔ المومنون ۵-۷۶-۷۷۔ الدُّخان ۹-۱۶)

الْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾
اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿٩٧﴾
اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ
يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ
بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ

دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جُھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بُری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔ پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا انھیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال[۷۸] سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔ع

اور کیا اُن لوگوں کو جو سابق اہلِ زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں، اِس امرِ واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انھیں پکڑ سکتے ہیں[۷۹]؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے

۷۸ – اصل میں لفظ مَکْر استعمال ہُوا ہے، جس کے معنی عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کُن ضرب نہ پڑ جائے، اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

۷۹ – یعنی ایک گرنے والی قوم کی جگہ جو دوسری قوم اُٹھتی ہے اس کے لیے اپنی پیش رَو قوم کے زوال میں کافی رہنمائی موجود ہوتی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لے تو سمجھ سکتی ہے کہ کچھ مدّت پہلے جو لوگ اسی جگہ دادِ عیش دے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ۝۱۰۰ تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ
عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ
بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ
كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۱۰۱ وَمَا وَجَدۡنَا
لِاَكۡثَرِهِمۡ مِّنۡ عَهۡدٍ ۚ وَاِنۡ وَّجَدۡنَاۤ اَكۡثَرَهُمۡ لَفٰسِقِيۡنَ ۝۱۰۲

دِلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سُنتے۔[۸۰] یہ قومیں جن کے قصّے ہم تمھیں سُنا رہے ہیں (تمھارے سامنے مثال میں موجود ہیں) ان کے رسول ان کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جُھٹلا چکے تھے پھر اُسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرینِ حق کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں۔[۸۱] ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاسِ عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔[۸۲]

یہاں لہرا رہا تھا انھیں فکر و عمل کی کن غلطیوں نے برباد کیا، اور یہ بھی محسوس کر سکتی ہے کہ جس بالاتر اقتدار نے کل اُنھیں اُن کی غلطیوں پر پکڑا تھا اور اُن سے یہ جگہ خالی کرالی تھی، وہ آج کہیں چلا نہیں گیا ہے، نہ اس سے کسی نے یہ مقدرت چھین لی ہے کہ اِس جگہ کے موجودہ ساکنین اگر وہی غلطیاں کریں جو سابق ساکنین کر رہے تھے تو وہ ان سے بھی اسی طرح جگہ خالی نہ کرا سکے گا جس طرح اس نے اُن سے خالی کرائی تھی۔

۸۰ – یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرتناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بُھلاوے میں ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی انھیں سوچنے سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے، اس کی بینائی تک آفتابِ روشن کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی۔ اور جو خود نہیں سننا چاہتا، اسے پھر کوئی کچھ نہیں سُنا سکتا۔

۸۱ – پچھلی آیت میں جو ارشاد ہُوا تھا کہ "ہم ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے"، اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرما دی ہے۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلوں پر مُہر لگانے سے مراد ذہنِ انسانی کا اُس نفسیاتی قانون کی زد میں آ جانا ہے جس کی رُو سے ایک دفعہ جاہلی تعصّبات یا نفسانی اغراض کی بِنا پر حق سے مُنہ موڑ لینے کے بعد پھر انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے اُلجھاؤ میں اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے، اور کسی دلیل، کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل کے دروازے قبولِ حق کے لیے نہیں کُھلتے۔

۸۲ – "کوئی پاسِ عہد نہ پایا"، یعنی کسی قسم کے عہد کا پاس بھی نہ پایا، نہ اُس فطری عہد کا پاس جس میں پیدائشی طور پر

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ

پھر اُن قوموں کے بعد (جن کا ذکر اُوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا،^۸۳ مگر انھوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا،^۸۴

ہر انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہُوا ہے، نہ اُس اجتماعی عہد کا پاس جس میں ہر فردِ بشر انسانی برادری کا ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، اور نہ اُس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مصیبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبۂ خیر کے موقع پر خدا سے بطورِ خود باندھا کرتا ہے۔ انھی تینوں عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق قرار دیا گیا ہے۔

۸۳ – اُوپر جو قصّے بیان ہوئے، ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے ردّ کر دیتی ہے، اسے پھر ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کے بعد اب موسیٰؑ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور اہم سبق بھی کفارِ قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیے گئے ہیں۔

کفارِ قریش کو اس قصّے کے پیرایے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوتِ حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسُب بظاہر نظر آتا ہے، اُس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی تو پوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی اقلیّت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی سر و سامان کے اُس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے، پھر بھی آخرکار وہی غالب آ کر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعیِ حق کے مقابلے میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ کس طرح اُلٹی پڑتی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرینِ حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اُن کو کتنی کتنی طویل مدّت تک سنبھلنے اور دُرست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے، اور جب کسی تنبیہ، کسی سبق آموز واقعے اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انھیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصّے میں دُہرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلّت و کمزوری کو اور مخالفینِ حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر اُن کی ہمت نہ ٹوٹے، اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی رَوِش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی اپنی عبرتناک تاریخ پیش کر کے انھیں باطل پرستی کے بُرے نتائج پر متنبّہ کیا گیا ہے اور اُس پیغمبرؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو پچھلے پیغمبروںؑ کے لائے ہوئے دین کو تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پھر اس کی اصلی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

۸۴ – نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، یعنی ان کو نہ مانا اور انھیں جادوگری قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ جس طرح کسی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى
يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ
لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ

پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

موسیٰؑ نے کہا: ”اے فرعون[85]! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمھارے رب کی طرف سے

ایسے شعر کو جو شعریّت کا مکمل نمونہ ہو، تُک بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اُڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفسِ شاعری اور ذوقِ شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے، اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے مِن جانب اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں اور جن کے متعلق کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ گمان تک نہ کر سکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہو سکتی ہیں، بلکہ جن کے متعلق خود فنِ سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دست رس سے بالاتر ہیں، ان کو سحر قرار دینا نہ صرف ان نشانیوں کے ساتھ، بلکہ عقلِ سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلمِ عظیم ہے۔

۸۵ – لفظ فرعون کے معنیٰ ہیں: ”سورج دیوتا کی اولاد“۔ قدیم اہلِ مصر سورج کو، جو اُن کا مہا دیو یا ربِّ اعلیٰ تھا، رَع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہلِ مصر کے اعتقاد کی رُو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اُس کا ارضی نمایندہ ہو، اِسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسرِ اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا، ”فرعون“ کا لقب اختیار کر کے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ تمھارا ربِّ اعلیٰ یا مہا دیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصّے کے سلسلے میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانے کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمسیس دوم تھا جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبلِ مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ان آیات میں ذکر ہو رہا ہے، مِنفِتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریکِ حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔ یہ قیاس بظاہر اس لحاظ سے مُشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخِ وفات ۱۲۷۲ قبلِ مسیح ہے۔ لیکن بہرحال یہ تاریخی قیاسات ہی ہیں اور مصری، اسرائیلی اور عیسوی جنتریوں کے تطابق سے بالکل صحیح تاریخوں کا

رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ
بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا
هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۚۖ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ؑ﴿۱۰۸﴾

صریح دلیلِ ماموریّت لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔"[۸۶]

فرعون نے کہا: "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچّا ہے تو اسے پیش کر۔"

موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔[۸۷] ع

حساب لگانا مشکل ہے۔

۸۶– حضرت موسیٰؑ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس بھیجے گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی، اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ قرآن میں ان دونوں دعوتوں کا کہیں یکجا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں موقع و محل کے لحاظ سے صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۸۷– یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کو اس امر کے ثبوت میں دی گئی تھیں کہ وہ اُس خدا کے نمایندے ہیں جو کائنات کا خالق اور فرماں روا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، پیغمبروںؑ نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادۂ ربّ العالمین کی حیثیّت سے پیش کیا تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العالمین کے نمایندے ہو تو تمھارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانینِ فطرت کی عام رَوِش سے ہٹا ہُوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ ربّ العالمین نے تمھاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اِسی مطالبے کے جواب میں انبیاؑ نے وہ نشانیاں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں "آیات" اور متکلّمین کی اصطلاح میں "معجزات" کہا جاتا ہے۔ ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ قوانینِ فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ درحقیقت کتاب اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا مؤقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے کہ قرآن جس جگہ صریح طور پر خارقِ عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی جِدّوجُہد محض ایک بھونڈی سُخن سازی ہے، جس کی ضرورت صرف اُن لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو اور دوسری طرف آبائی مذہب کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اُس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۹﴾ یُّرِیْدُ
اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ

اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ ”یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے[88]، اب کہو کیا کہتے ہو؟“ پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کُن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظامِ کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطّل ہو چکا ہے اور اب اِس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کرسکتا؟ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر وانتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور ہر آن اس کے احکام اِس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں، اور اُس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیا کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جُزئی طور پر یا کُلّی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیُّر کر دے؟ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں، ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے، کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصوّرِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصوُّرِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر وتشریح کرنے کے بجائے اُس کا صاف صاف انکار کر دیں، کیونکہ قرآن نے تو اپنا زورِ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصوّر کا ابطال اور مؤخر الذکر تصوّر کا اثبات کرنے پر صَرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہوکر دوسرے تصور کو قبول کر لے، اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ ہی یہ ہوگا کہ اژدہے جس طرح پیدا ہُوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اُس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے باہر ہے، تو آپ مجبُور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاٹھی اژدہے میں تبدیل ہوئی اور پھر اژدہے سے لاٹھی بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادّے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادّے کو جیسی چاہے زندگی عطا کرسکتا ہے، تو آپ کے لیے خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادّوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔ مُجرّد یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۸۸ - یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اُٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحرِ رُوم کے سواحل سے حَبَش تک کے عظیم الشان مُلک کا نہ صرف مُطلَق العِنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہُوا تھا، تو محض اُس کے اِس فعل سے کہ اس نے ایک لاٹھی کو اژدہا بنا دیا، اِتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنتِ مصر کا تختہ اُلٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقے سمیت مُلک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا ابھی کیوں ہُوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوّت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا

وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ

اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر ماہرِ فن جادوگر کو آپ کے

اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے نظامِ زندگی کو بحیثیتِ مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو ربّ العالمین کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کُلّی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ ربّ العالمین کا نمایندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے، اور کسی کافر کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیتِ رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے سامنے سیاسی و مَعاشی اور تمدّنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰؑ کے اِس دعوے کو مصر کے دربارِ شاہی میں اتنی اہمیّت ہی کیوں دی گئی جب کہ ان کے ساتھ ایک بھائی کے سوا کوئی معاون و مددگار اور صرف ایک سانپ بن جانے والی لاٹھی اور ایک چمکنے والے ہاتھ کے سوا کوئی نشانِ ماموریّت نہ تھا؟ تو میرے نزدیک اس کے دو بڑے سبب ہیں: ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے فرعون اور اس کے درباری خوب واقف تھے۔ ان کی پاکیزہ اور مضبوط سیرت، ان کی غیر معمولی قابلیت، اور قیادت و فرماں روائی کی پیدایشی صلاحیت کا سب کو علم تھا۔ تَلمُود اور یوسیفوس کی روایات اگر صحیح ہیں تو حضرت موسیٰؑ نے اِن پیدایشی قابلیتوں کے علاوہ فرعون کے ہاں عُلوم و فنون اور حکمرانی و سپہ سالاری کی وہ پوری تعلیم و تربیّت بھی حاصل کی تھی جو شاہی خاندان کے افراد کو دی جاتی تھی۔ اور زمانہ شاہزادگی میں حَبَش کی مہم پر جا کر وہ اپنے آپ کو ایک بہترین جنرل بھی ثابت کر چکے تھے۔ پھر جو تھوڑی بہت کمزوریاں شاہی محلوں میں پرورش پانے اور فرعونی نظام کے اندر امارت کے مناصب پر سرفراز رہنے کی وجہ سے ان میں پائی جاتی تھیں، وہ بھی آٹھ دس سال مَدیَن کے علاقے میں صحرائی زندگی گزارنے اور بکریاں چَرانے کی بدولت دُور ہو چکی تھیں، اور اب فرعونی دربار کے سامنے ایک ایسا سِن رسیدہ و سنجیدہ فقیر کِشور گیر نبوت کا دعویٰ لیے ہوئے کھڑا تھا جس کی بات کو بہر حال بادِ ہوائی سمجھ کر اُڑایا نہ جا سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عصا اور یدِ بیضا کی نشانیاں دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری سخت مرعوب ہو چکے تھے اور ان کو تقریباً یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص فی الواقع کوئی فوق الفطری طاقت اپنی پشت پر رکھتا ہے۔ ان کا حضرت موسیٰؑ کو ایک طرف جادوگر بھی کہنا اور پھر دوسری طرف یہ اندیشہ بھی ظاہر کرنا کہ یہ ہم کو اس سرزمین کی فرماں روائی سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، ایک صریح تضادِ بیان تھا اور اُس بوکھلاہٹ کا ثبوت تھا جو اُن پر نبوت کے اس اوّلین مظاہرے سے طاری ہو گئی تھی۔ اگر حقیقت میں وہ حضرت موسیٰؑ کو جادوگر سمجھتے تو ہرگز ان سے کسی سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ کرتے۔ کیونکہ جادو کے بل بُوتے پر کبھی دنیا میں کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہُوا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلِيۡمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ لَنَا لَاَجۡرًا
اِنۡ كُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمۡ وَ اِنَّكُمۡ لَمِنَ
الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ
نَّكُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلۡقُوۡا‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا
سَحَرُوۡۤا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ
عَظِيۡمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَلۡقِ عَصَاكَ‌ ۚ فَاِذَا هِىَ

پاس لے آئیں[89]۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔

اُنھوں نے کہا: ’’اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟‘‘

فرعون نے جواب دیا: ’’ہاں، اور تم مقرّبِ بارگاہ ہو گے۔‘‘

پھر اُنھوں نے موسیٰ سے کہا: ’’تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟‘‘

موسیٰ نے جواب دیا: ’’تم ہی پھینکو۔‘‘

انھوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔

ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے

۸۹- فرعونی درباریوں کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خدائی نشان اور جادو کے امتیازی فرق کا تصوّر بالکل واضح طور پر موجود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدائی نشان سے حقیقی تغیّر واقع ہوتا ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو مُتأثّر کر کے اشیا میں ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کراتا ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے حضرت موسیٰ کے دعوائے رسالت کو ردّ کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے، یعنی عصا حقیقت میں سانپ نہیں بن گیا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے، بلکہ صرف ہمیں ایسا نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا، جیسا کہ ہر جادوگر کر لیتا ہے۔ پھر انھوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بُلایا جائے اور ان کے ذریعے سے لاٹھیوں اور رسّیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جائے، تاکہ عامّۃ الناس کے دلوں میں اس پیغمبرانہ معجزے سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکلیّہ دُور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے۔

تَلۡقَفُ مَا يَاۡفِكُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الۡحَـقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوۡا
يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوۡا هُنَالِكَ وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلۡقِىَ
السَّحَرَةُ سٰجِدِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ
مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَـكُمۡ‌ ۚ
اِنَّ هٰذَا لَمَكۡرٌ مَّكَرۡتُمُوۡهُ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡهَاۤ اَهۡلَهَا‌ ۚ

اس جھوٹے طِلسم کو نگلتا چلا گیا۔[90]

اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انھیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: "ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں"۔[91]

فرعون نے کہا: "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اِس دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔

۹۰ – یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بنی نظر آ رہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر اُن کے اُس طِلسمِ فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادُو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسّیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں، اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر رہ گئی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: طٰہٰ، حاشیہ ۴۲)

۹۱ – اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی چال کو اُلٹا انھی پر پلٹ دیا۔ انھوں نے تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بُلا کر منظرِ عام پر اس لیے مظاہرہ کرایا تھا کہ عوام الناس کو حضرت موسیٰؑ کے جادوگر ہونے کا یقین دلائیں، یا کم از کم شک ہی میں ڈال دیں۔ لیکن اس مقابلے میں شکست کھانے کے بعد خود اُن کے اپنے بُلائے ہوئے ماہرینِ فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰؑ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ یقیناً ربّ العالمین کی طاقت کا کرشمہ ہے جس کے آگے کسی جادو کا زور نہیں چل سکتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ
خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا
مُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا
جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۴ ۱۸

اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمھیں معلوم ہُوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سُولی پر چڑھاؤں گا۔“

انھوں نے جواب دیا: ”بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تُو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔ اَے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اُٹھا تو اِس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں[۹۲]۔“ ع

ظاہر ہے کہ جادو کو خود جادوگروں سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا۔ پس جب انھوں نے عملی تجربے اور آزمایش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ چیز جادو نہیں ہے، تو پھر فرعون اور اس کے درباریوں کے لیے باشندگانِ ملک کو یہ یقین دلانا بالکل ناممکن ہو گیا کہ موسیٰؑ محض ایک جادوگر ہے۔

۹۲ - فرعون نے پانسا پلٹتے دیکھ کر آخری چال یہ چلی تھی کہ اس سارے معاملے کو موسیٰؑ اور جادوگروں کی سازش قرار دے دے اور پھر جادوگروں کو جسمانی عذاب اور قتل کی دھمکی دے کر ان سے اپنے اِس الزام کا اقبال کرا لے۔ لیکن یہ چال بھی اُلٹی پڑی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ اُن کا موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر ایمان لانا کسی سازش کا نہیں بلکہ سچے اعترافِ حق کا نتیجہ تھا۔ اب اُس کے لیے کوئی چارۂ کار اس کے سوا باقی نہ رہا کہ حق اور انصاف کا ڈھونگ جو وہ رچانا چاہتا تھا، اسے چھوڑ کر صاف صاف ظلم و ستم شروع کر دے۔

اس مقام پر یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ چند لمحوں کے اندر ایمان نے ان جادوگروں کی سیرت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انھی جادوگروں کی دناءت کا یہ حال تھا کہ اپنے دینِ آبائی کی نصرت و حمایت کے لیے گھروں سے چل کر آئے تھے اور فرعون سے پوچھ رہے تھے کہ اگر ہم نے اپنے مذہب کو موسیٰؑ کے حملے سے بچا لیا تو سرکار سے ہمیں انعام تو

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا
فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ
وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: ”کیا تُو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبُودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟“ فرعون نے جواب دیا: ”میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔[۹۳] ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔“

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی اُنھی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔“ اس کی قوم کے لوگوں نے کہا: ”تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا: ”قریب ہے وہ وقت کہ تمھارا رب

ملے گا نا؟ یا اب جو نعمتِ ایمان نصیب ہوئی تو اُنھی کی حق پرستی اور اُولُوا العزمی اس حد کو پہنچ گئی کہ تھوڑی دیر پہلے جس بادشاہ کے آگے لالچ کے مارے بچھے جا رہے تھے اب اس کی کبریائی اور اس کے جبرُوت کو ٹھوکر مار رہے ہیں اور ان بدترین سزاؤں کو بھگتنے کے لیے تیار ہیں جن کی دھمکی وہ دے رہا ہے، مگر اس حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی صداقت ان پر کُھل چکی ہے۔

۹۳ – واضح رہے کہ ایک دَورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدایش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانے میں جاری ہُوا تھا، اور دوسرا دورِ ستم یہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ
تَعْمَلُوْنَ ۱۲۹ وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۱۳۰ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا
هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ
اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۱۳۱ وَ قَالُوْا
مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۱۳۲

تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔"

ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے۔ مگر اُن کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اِسی کے مستحق ہیں، اور جب بُرا زمانہ آتا تو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھیراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انھوں نے موسیٰؑ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں[۹۴]۔"

کرایا گیا اور ان کی بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا، تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً اسی دَور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران میں ملا تھا، اور جس میں یہی فرعون منفتاح اپنے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المومن، آیت ۲۵)

۹۴– یہ انتہائی ہٹ دھرمی و سُخن پروری تھی کہ فرعون کے اہلِ دربار اُس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کرے گا کہ ایک پورے ملک میں قحط پڑ جانا اور زمین کی پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ مجید کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (النمل، آیات ۱۳-۱۴) یعنی "جب ہماری نشانیاں علانیہ اُن کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے، مگر انھوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا۔"

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ
وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾
وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ
مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ
هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي
الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا،[95] ٹڈی دَل چھوڑے، سُرسُریاں[96] پھیلائیں، مینڈک نکالے، اور خون برسایا، یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے، اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ جب کبھی اُن پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے: ”اے موسیٰ! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر، اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔“ مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقتِ مقرر تک کے لیے، جس کو وہ بہر حال پہنچنے والے تھے، ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔ تب ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور اُن سے بے پروا ہو گئے تھے۔

۹۵ – غالباً بارش کا طوفان مراد ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن بائبل میں ژالہ باری کے طوفان کا ہی ذکر ہے (خروج، باب ۹، آیت ۲۳) اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۹۶ – اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جوں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھر، سُرسُری وغیرہ۔ غالباً یہ جامع لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جُوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سُرسُریوں (گھن کے کیڑوں) نے غلّے کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔ (تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتاب خُروج، باب ۷ تا ۱۲۔ نیز الزُّخْرُف، حاشیہ ۴۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ جٰوَزْنَا
بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ
لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ

اور اُن کی جگہ ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔[۹۷] اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہُوا، کیونکہ اُنھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔

بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا، پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر اُن کا گزر ہُوا جو اپنے چند بُتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے: ”اے موسیٰؑ! ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے اِن لوگوں کے معبود[۹۸] ہیں۔“

۹۷ – یعنی بنی اسرائیل کو فلسطین کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ بنی اسرائیل خود سرزمینِ مصر کے مالک بنا دیے گئے۔ لیکن اس معنی کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تو قرآنِ کریم کے اشارات کافی واضح ہیں اور نہ تاریخ و آثار ہی سے اس کی کوئی قوی شہادت ملتی ہے، اس لیے اس معنی کو تسلیم کرنے میں ہمیں تأمّل ہے۔ (مُلاحظہ ہو: الکہف، حاشیہ ۵۷۔ الشُّعَراء، حاشیہ ۴۵)

۹۸ – بنی اسرائیل نے جس مقام سے بحرِ احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اُس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصّہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طُور اور ابوزَنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہلِ مصر بہت فائدہ اُٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ
فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ
اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ

موسیٰؑ نے کہا: ”تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقے کی پیروی کررہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے، اور جو عمل وہ کررہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔“ پھر موسیٰؑ نے کہا: ”کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمھارے لیے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور (اللہ فرماتا ہے)

چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انھی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مَفْقہ کے مقام پر تھی، جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً اِنھی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پر مصریوں کی غلامی نے مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہلِ مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۴۰ برس بعد حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشَعؑ بن نُون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمعِ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”پس اب تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت سے اُس کی پرستش کرو اور اُن دیوتاؤں کو دُور کردو جن کی پرستش تمھارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے، اور خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بُری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اُسے جس کی پرستش کروگے، چُن لو...... اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات، سو ہم تو خداوند کی پرستش کریں گے۔“ (یشوع ۲۴: ۱۴-۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یُوشَعؑ کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر کرلینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے اُن اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دَور میں اُس کی رگ رگ کے اندر اُتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بُت کدہ سامنے آگیا تھا، اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اُس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِذْ أَنْجَيْنَٰكُمْ مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ ۚ
يُقَتِّلُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ
مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾ وَوَٰعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَٰثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَٰهَا ع
بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَٰتُ رَبِّهِۦٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمھیں نجات دی، جن کا حال یہ تھا کہ تمھیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمایش تھی۔'' ع

ہم نے موسیٰ کو تیس شب و روز کے لیے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اِس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مدّت پورے چالیس دن ہوگئی۔[99] موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے

۹۹- مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہوگئیں اور اُنھیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہوگئی تو حکمِ خداوندی کے تحت حضرت موسیٰؑ کوہِ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انھیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس سلسلے کی پہلی طلبی تھی، اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰؑ ایک پورا چلّہ پہاڑ پر گزاریں اور روزے رکھ کر، شب و روز عبادت اور تفکّر و تدبُّر کر کے اور دل و دماغ کو یکسو کر کے اُس قولِ ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اُس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشے میں نبی صالح اور کوہِ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالحؑ ثمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے۔ آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبلِ ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہوکر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہِ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے چلّہ کیا تھا۔

مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ
سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ
رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ
انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا
تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ
اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾
قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ

بھائی ہارونؑ سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔[100]" جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ "اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔" فرمایا: "تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں، ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔" چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔" فرمایا: "اے موسیٰؑ! میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جَسٹینین کے زمانے کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: النمل، حواشی ۹-۱۰)

۱۰۰ - حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے لیکن کارِ نبوت میں حضرت موسیٰؑ کے ماتحت اور مددگار تھے۔ ان کی نبوت مستقل نہ تھی بلکہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کر کے ان کو اپنے وزیر کی حیثیت سے مانگا تھا، جیسا کہ آگے چل کر قرآن مجید میں بتصریح بیان ہُوا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ
فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ
فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ
دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا

اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا۔''

اس کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی[101] اور اس سے کہا:

''اِن ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں[102]۔ عنقریب میں تمھیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔[103] میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں[104]، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان

۱۰۱ – بائبل میں تصریح ہے کہ یہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں، اور ان تختیوں پر لکھنے کا فعل بائبل اور قرآن دونوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعیُّن کر سکیں کہ آیا ان تختیوں پر کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت سے کیا تھا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ استعمال فرمایا تھا۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۳۱، آیت ۱۸۔ باب ۳۲، آیت ۱۵-۱۶ – واِستِثنا، باب ۵، آیت ۶-۲۲)

۱۰۲ – یعنی احکامِ الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو عقلِ عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے گا جس کی نیت میں فساد، یا جس کے دل میں ٹیڑھ نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی گئی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادھے الفاظ میں سے قانونی اینچ پینچ اور حیلوں کے راستے اور فتنوں کی گنجایشیں نکالتے ہیں، کہیں ان کی مُوشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے۔

۱۰۳ – یعنی آگے چل کر تم لوگ اُن قوموں کے آثارِ قدیمہ پر سے گزرو گے جنھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا اور غلط روی پر اصرار کیا۔ ان آثار کو دیکھ کر تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ایسی روِش اختیار کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

بِهَا ۚ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا
سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَ
كَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾ ع

ع ۱۷

نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جُھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جُھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا اِنکار کیا، اُس کے سارے اعمال ضائع[105] ہو گئے۔ کیا لوگ اِس کے سوا کچھ اَور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟'' ع

۱۰۴ – یعنی میرا قانونِ فطرت یہی ہے کہ ایسے لوگ کسی عبرت ناک چیز سے عبرت اور کسی سبق آموز شے سے سبق حاصل نہیں کر سکتے۔

''بڑا بننا'' یا ''تکبّر کرنا'' قرآنِ مجید اس معنیٰ میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مَقام سے بالاتر سمجھنے لگے اور خدا کے احکام کی کچھ پروا نہ کرے، اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔ اس خود سری کی کوئی حقیقت ایک پندارِ غلط کے سوا نہیں ہے، کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ غیر کا بندہ بن کر رہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ''وہ بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔''

۱۰۵ – ضائع ہو گئے، یعنی بار آور نہ ہوئے، غیر مفید اور لا حاصل نکلے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بار آور ہونے کا انحصار بالکل دو اُمور پر ہے: ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیشِ نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی، وہاں لازماً حبطِ عمل واقع ہو گا۔ جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حق دار نہیں ہو سکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا، اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی اُمید نہ رکھنی چاہیے، اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشا کے خلاف تصرُّف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حق دار ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضے کے زمانے میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادے کے ساتھ کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرأتِ بے جا سے اِغماض کر رہا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا
لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ
اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا
اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ

وقف لازم

موسیٰؑ کے پیچھے[۱۰۶] اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پُتلا بنا لیا جس میں سے بَیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا اُنھیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملے میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم[۱۰۷] تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طِلِسم ٹوٹ گیا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" اُدھر سے موسیٰؑ غصّے اور رنج میں بھرا ہُوا اپنی قوم کی

اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اُٹھائے گا اور مالک کے قبضے میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب سے اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصّہ خواہ مخواہ اسے دوں؟

۱۰۶ – یعنی اُن چالیس دنوں کے دوران میں جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طلبی پر کوہِ سینا گئے ہوئے تھے اور یہ قوم پہاڑ کے نیچے میدانُ الرّاحہ میں ٹھیری ہوئی تھی۔

۱۰۷ – یہ اُس مصریت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا، اس سے یہ قوم اتنی شدّت کے ساتھ متأثر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعون کا غرق ہونا، اِن لوگوں کا بخیریت اُس بندِ غلامی سے نکل آنا جس کے ٹوٹنے کی کوئی اُمید نہ تھی، اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہُوا محض اللہ کی قدرت سے ہُوا ہے، کسی دوسرے کی طاقت و تصرّف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ مگر اس پر بھی انھوں نے پہلے تو پیغمبرؑ سے ایک مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر پیغمبرؑ کے پیٹھ موڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو اُس بدکار عورت

غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا: ”بہت بُری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے؟“ اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارونؑ نے کہا: ”اے میری ماں کے بیٹے! اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تُو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اِس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔“ [108]

سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا ہر دوسرے مرد سے دل لگاتی ہو اور جو شبِ اوّل میں بھی بے وفائی سے نہ چُوکی ہو۔

۱۰۸ – یہاں قرآنِ مجید نے ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارونؑ کی براءت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی اُن پر چسپاں کر رکھا تھا۔ بائبل میں بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارونؑ سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبود بنا دو، اور حضرت ہارونؑ نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا، جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اُٹھے کہ اے اسرائیل! یہی تیرا وہ خدا ہے جو تجھے ملکِ مصر سے نکال کر لایا ہے۔ پھر حضرت ہارونؑ نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے آگے قربانیاں چڑھائیں (خُروج، باب ۳۲، آیت ۱-۶)۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقتِ واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرمِ عظیم کا مرتکب خدا کا نبی ہارون نہیں بلکہ خدا کا باغی سامری تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ طٰہٰ، آیات ۹۰-۹۴)

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انھوں نے داغ دار کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے، اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغا بازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی، جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار، ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرم ناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ
ع ۱۸/۸ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ
غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي
الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَ
آمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾ وَلَمَّا سَكَتَ
عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى

تب موسیٰؑ نے کہا: ”اے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔“ ع (جواب میں ارشاد ہوا کہ) ”جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا، وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ برے عمل کریں پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔“

پھر جب موسیٰؑ کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اُٹھا لیں جن کی تحریر میں ہدایت

اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو، حتّٰی کہ علما و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بد اخلاقیوں کا سیلاب بہا لے گیا تو اُن کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عُذرات تراشنے شروع کیے، اور اسی سلسلے میں انھوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے، انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے، تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملے میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، مُنیوں اور اوتاروں کی، غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے، اُن سب کی زندگیاں بد اخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں، تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان اِن میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، اور پھر جب یہ افعال اتنے اُونچے مرتبے والوں کے لیے بھی شرم ناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں۔

وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ
سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ
شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ
مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ
تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور رحمت تھی اُن لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور اُس نے اپنی قوم کے ستّر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اُس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔[۱۰۹] جب اِن لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰؑ نے عرض کیا: "اے میرے سرکار! آپ چاہتے تو پہلے ہی اِن کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں، جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا، ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمایش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔[۱۱۰] ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔

۱۰۹ - یہ طلبی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے ۷۰ نمایندے کوہِ سینا پر پیشیِ خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے گوسالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور از سرِ نو اطاعت کا عہد اُستوار کریں۔ بائبل اور تلمود میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ جو تختیاں حضرت موسیٰؑ نے پھینک کر توڑ دی تھیں، ان کے بدلے دوسری تختیاں عطا کرنے کے لیے آپ کو سینا پر بُلایا گیا تھا (خُروج، باب ۳۴)۔

۱۱۰ - مطلب یہ ہے کہ ہر آزمایش کا موقع انسانوں کے درمیان فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں سے کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کو پھٹک کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا عین مُقتضا ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے رہیں۔ ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ ہی کی توفیق و رہنمائی سے پاتا ہے، اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اُس کی توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کی بدولت ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے توفیق اور رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو سراسر حکمت اور عدل پر مبنی ہے لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمایش کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٥٦ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ

اور ہمارے لیے اِس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رُجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا: "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے[111]، اور اُسے مَیں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔"

(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے) جو اِس پیغمبر، نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں[112] جس کا

مواقع پر کامیابی کی راہ پانا یا نہ پانا اللہ کی توفیق وہدایت پر منحصر ہے۔

۱۱۱ – یعنی اللہ تعالیٰ جس طریقے پر خدائی کر رہا ہے اس میں اصل چیز غضب نہیں ہے جس میں کبھی کبھی رحم اور فضل کی شان نمودار ہو جاتی ہو، بلکہ اصل چیز رحم ہے جس پر سارا نظامِ عالَم قائم ہے، اور اس میں غضب صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب بندوں کا تمرُّد حد سے فزوں ہو جاتا ہے۔

۱۱۲ – حضرت موسیٰؑ کی دعا کا جواب اُوپر کے فقرے پر ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدّعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے لیے جو شرائط موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں وہی آج تک قائم ہیں، اور دراصل یہ اُنھی شرائط کا تقاضا ہے کہ تم اِس پیغمبرؐ پر ایمان لاؤ۔ تم سے کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو نافرمانی سے پرہیز کریں۔ تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبرؐ کو خدا نے مامور کیا ہے، اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے۔ لہٰذا جب تک اِس نافرمانی سے پرہیز نہ کرو گے، تقویٰ کی جڑ ہی سرے سے قائم نہ ہو گی، خواہ جُزئیات و فُروعات میں تم کتنا ہی تقویٰ بگھارتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمتِ الٰہی سے حصّہ پانے کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے۔ تو آج کسی اِنفاقِ مال پر اُس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آ سکتی جب تک اِقامتِ دینِ حق کی اُس جِدّوجُہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اِس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب تک اِس راہ میں مال صَرف نہ کرو گے،

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

ذکر اُنھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہُوا ملتا ہے[113]۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے[114]، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے[115]۔

زکوٰۃ کی بنیاد ہی اُستوار نہ ہوگی، چاہے تم کتنی ہی خیرات اور نذر و نیاز کرتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف اُن لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں۔ تو آج جو آیات اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں، ان کا انکار کر کے تم کسی طرح بھی آیاتِ الٰہی کے ماننے والے قرار نہیں پا سکتے۔ لہٰذا جب تک اِن پر ایمان نہ لاؤ گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہوگی، خواہ تورات پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرتے رہو۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ”اُمّی“ کا لفظ بہت معنیٰ خیز استعمال ہُوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو اُمّی (gentiles) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر و غرور کسی اُمّی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اِس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمّیوں کے لیے اپنے برابر انسانی حُقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں آتا ہے کہ وہ کہتے تھے: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آلِ عمران، آیت ۷۵) ”اُمّیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“ پس اللہ تعالیٰ انھی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اِسی اُمّی کے ساتھ تمھاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصّہ پاؤ گے، ورنہ وہی غضب تمھارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔

۱۱۳ – مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں: اِستِثنا، باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ مَتّی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یُوحنّا، باب ۱، آیت ۱۹ تا ۲۱۔ یُوحنّا، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۱۷ و آیت ۲۵ تا ۳۰۔ یُوحنّا، باب ۱۵، آیت ۲۵-۲۶۔ یُوحنّا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔

۱۱۴ – یعنی جن پاک چیزوں کو انھوں نے حرام کر رکھا ہے، وہ انھیں حلال قرار دیتا ہے، اور جن ناپاک چیزوں کو یہ لوگ حلال کیے بیٹھے ہیں، انھیں وہ حرام قرار دیتا ہے۔

۱۱۵ – یعنی ان کے فقیہوں نے اپنی قانونی مُوشگافیوں سے، ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورّع کے مبالغوں سے، اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہّمات اور خود ساختہ حُدود و ضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ
اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ
رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِیِّ
الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَکَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾
وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّةٌ یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

لٰہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ع اے محمدؐ! کہو کہ ”اے انسانو! مَیں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبرؐ ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبیِ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، اُمّید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔“

۱۱۶ ۱۱۷
موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔

جکڑ بندیوں میں کس رکھا ہے، یہ پیغمبر وہ سارے بوجھ اُتار دیتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے۔

۱۱۶ – اصل سلسلۂ کلام بنی اسرائیل سے متعلق چل رہا تھا۔ بیچ میں موقع کی مناسبت سے رسالتِ محمدیؐ پر ایمان لانے کی دعوت بطور جملۂ معترضہ آ گئی۔ اب پھر تقریر کا رُخ اسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو پچھلے کئی رکوعوں سے بیان ہو رہا ہے۔

۱۱۷ – بیشتر مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق ہدایت اور انصاف کرتا ہے، یعنی ان کے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کی وہ اخلاقی و ذہنی حالت بیان کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ لیکن سیاق و سباق پر نظر کرتے ہوئے ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہ حال بیان

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی
مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ
كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ
وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا

اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انھیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی[118]۔ اور جب موسیٰؑ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پُھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعیّن کر لی۔ ہم نے اُن پر بادل کا سایہ کیا اور اُن پر مَنّ و سَلویٰ اتارا[119] ــــ کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے

ہُوا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھا، اور اس سے مدّعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب اس قوم میں گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا گیا اور حضرتِ حق کی طرف سے اس پر گرفت ہوئی تو اس وقت ساری قوم بگڑی ہوئی نہ تھی بلکہ اس میں ایک اچھا خاصا صالح عُنصر موجود تھا۔

۱۱۸ – اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس تنظیم کی طرف جو سورۂ مائدہ، آیت ۱۲ میں بیان ہوئی ہے اور جس کی پوری تفصیل بائبل کی کتاب گنتی میں ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے ۱۲ گھرانوں کو، جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں اور حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے، الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظّم کیا، اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا، تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدّنی و معاشرتی اور فوجی حیثیّت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوبؑ کے بارھویں بیٹے لاوِی کی اولاد کو، جس کی نسل سے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ تھے، ایک الگ جماعت کی شکل میں منظّم کیا، تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمعِ حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے۔

۱۱۹ – اُوپر جس تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ من جملہ اُن احسانات کے تھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد اب مزید تین احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقے میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام مَنّ و سلویٰ کے نُزول کی شکل میں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اِن تین اہم ترین ضروریاتِ زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقے میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ
اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ
سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا

تم کو بخشی ہیں۔ مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرتے رہے۔

یاد کرو[۱۲۰] وہ وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ "اِس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسبِ منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رَوِیّہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔" مگر جو لوگ اُن میں سے ظالم تھے انھوں نے اُس بات کو جو اُن سے

آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آ ٹھیرے تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سایے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، اور آج اِس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے مدبّروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے اُس حصے سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائبل اور قرآن میں ہُوا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصے میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیے کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکی تھی، خُصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عَمالِقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان اُمور کو پیشِ نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے، وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے، اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حواشی ۷۲، ۷۳، ۷۶)

غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوا يَظْلِمُونَ ع ﴿۱۶۲﴾ وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ
الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ
سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ

ع — وقف لازم — معانقة ٦

کہی گئی تھی بدل ڈالا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔[۱۲۱] ؏

اور ذرا اِن سے اُس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔[۱۲۲] اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سَبْت (ہفتہ) کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سَبْت ہی کے دن اُبھر اُبھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں[۱۲۳] اور سَبْت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے

۱۲۰ – اب تاریخِ بنی اسرائیل کے اُن واقعات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورۂ بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں کے ساتھ دیتے رہے اور پھر کس طرح مسلسل تباہی کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔

۱۲۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۷۴ و ۷۵۔

۱۲۲ – محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام اَیلہ یا اَیلات یا اَیلوت تھا جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اُردُن کی مشہور بندرگاہ عَقَبہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحرِ قُلزُم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانۂ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بحرِ قُلزُم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اِسی شہر کو بنایا تھا۔

جس واقعے کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہودیوں کی کُتُبِ مقدّسہ میں کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں، مگر قرآنِ مجید میں جس انداز سے اس واقعے کو یہاں اور سورۂ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نُزولِ قرآن کے دَور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعے سے خوب واقف تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ مدینے کے یہودیوں نے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

النصف

نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ
تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ
قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا

ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے[۱۲۴]۔ اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب اُن میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ ”تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے“ تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ”ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس اُمّید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔“ آخرِکار جب وہ اُن ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو

۱۲۳ – ”سَبت“ ہفتے کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے، اور یہ کہ جو شخص اس ضابطے کی خلاف ورزی کرے، اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یَرمیاہ نبی کے زمانے میں (جو ۶۲۸ اور ۵۸۶ قبلِ مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سَبت کے دن مال اسباب لے لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبیِ موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کُھلم کُھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذرِ آتش کر دیا جائے گا (یَرمیاہ ۱۷: ۲۱-۲۷)۔ اسی کی شکایت حِزقی اِیل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۵ اور ۵۳۶ قبلِ مسیح کے درمیان گزرا ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں سَبت کی بے حُرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حِزقی اِیل ۲۰: ۱۲-۲۴)۔ ان حوالوں سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید یہاں جس واقعے کا ذکر کر رہا ہے، وہ بھی غالباً اسی دَور کا واقعہ ہوگا۔

۱۲۴ – اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب مَیلان بڑھنے لگتا ہے، تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کُھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغ دار کرنا چاہتا ہے ان سے وہ صرف اس لیے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اُسے نہ مل

ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾
فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً

انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو بُرائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔[۱۲۵] پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ

رہے ہوں۔

۱۲۵ – اس بیان سے معلوم ہُوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے: ایک وہ جو دھڑلّے سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حُدود اللہ کی اس کُھلّم کُھلّا بے حُرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آ جائیں، اور اگر وہ راہِ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی بَراءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اِن تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا، کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی، اور وہی تھا جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہُوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے، لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سُکوت اختیار کیا ہے، لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک رِوایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا، بعد میں ان کے شاگرد عِکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے: ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو، اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا، تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی

Maktaba Tul Ishaat.com

خٰسِئِیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ
مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِۚۖ

ذلیل اور خوار۔[۱۲۶]

اور یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے اعلان کر دیا[۱۲۷] کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلّط کرتا رہے گا جو اُن کو بدترین عذاب دیں گے"[۱۲۸]، یقیناً تمھارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے

تائید مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے، جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذے سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ اُسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (ڈرو اُس فتنے سے جس کے وبال میں خصوصیّت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو)۔ اور اس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللّٰہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتّٰی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علٰی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذٰلك عذب اللّٰہ الخاصة والعامة، "یعنی اللہ عَزَّ وَجَلَّ خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا، جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہارِ ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عَذَابٍ بَئِیْسٍ (سخت عذاب) فرمایا گیا ہے، اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے، اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ اِن اصبتُ فمن اللّٰہ وان اخطأتُ فمن نفسی، واللّٰہ غفورٌ رحیم۔

۱۲۶ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۸۳۔

۱۲۷ – اصل میں لفظ تَاَذَّنَ استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو نوٹس دینے یا خبردار کر دینے کا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ
الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ
وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ
وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ
سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ

اور یقیناً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔

ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتابِ الٰہی کے وارث ہو کر اِسی دنیائے دَنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر وہی متاعِ دُنیا پھر سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔[۱۲۹]

۱۲۸- یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبلِ مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں یَسعیاہ اور یَرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاؑ کی تمام کتابیں اسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ پھر یہی تنبیہ مسیح علیہ السلام نے انھیں کی، جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدّد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی۔ اب یہ بات قرآن اور اس سے پہلے صحیفوں کی صداقت پر ایک بیّن شہادت ہے کہ اُس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامال نہ کی جاتی رہی ہو۔

۱۲۹- یعنی گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گناہ ہے، مگر اس بھروسے پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی، کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور خواہ ہم کچھ ہی کریں، بہرحال ہماری مغفرت ہونی ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں، بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدنصیب لوگ! اُس کتاب کے وارث ہوئے جو اُن کو دنیا کا امام بنانے والی تھی، مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخۂ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاعِ حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا، اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے عَلَم بردار

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ
اِلَّا الۡحَـقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ‌ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّـلَّذِيۡنَ
يَتَّقُوۡنَ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ‌ؕ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذۡ
نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌ ۢ بِهِمۡ‌ۚ

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے[۱۳۰]۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لیے ہی بہتر ہے[۱۳۱]، کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم رکھی ہے، یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ انھیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے، اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آ پڑے گا، اور اُس وقت

اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے محض دنیا کے کُتّے بن کر رہ گئے۔

۱۳۰ - یعنی یہ خود جانتے ہیں کہ تورات میں کہیں بھی بنی اسرائیل کے لیے نجات کے غیر مشروط پروانے کا ذکر نہیں ہے۔ نہ خدا نے کبھی ان سے یہ کہا اور نہ ان کے پیغمبروںؑ نے کبھی ان کو یہ اطمینان دلایا کہ تم جو چاہو کرتے پھرو بہر حال تمھاری مغفرت ضرور ہوگی۔ پھر آخر انھیں کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خود خدا نے کبھی نہیں کہی، حالانکہ ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ خدا کے نام سے کوئی بات خلافِ حق نہ کہیں گے۔

۱۳۱ - اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ ”خدا ترس لوگوں کے لیے تو آخرت کی قیام گاہ ہی بہتر ہے۔“ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مغفرت کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمھیں آخرت میں جگہ مل جائے اچھی، محض اس لیے کہ تم یہودی یا اسرائیلی ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہو تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ آخرت میں اچھا مقام صرف اُنھی لوگوں کو مل سکتا ہے جو دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ کام کریں۔ رہا دوسرا ترجمہ، تو اس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ دنیا اور اس کے فائدوں کو آخرت پر ترجیح دینا تو صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو ناخدا ترس ہوں، خدا ترس لوگ تو لازماً دنیا کی مَصلَحتوں پر آخرت کی مَصلَحت

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ

وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا معانقة ۷

ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔[۱۳۲] ع

اور[۱۳۳] اے نبیؐ! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمھارے رب نے بنی آدم کی پُشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' انھوں نے کہا: ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔''[۱۳۴] یہ ہم نے اس لیے کیا کہ

کو اور دنیا کے عیش پر آخرت کی بھلائی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۳۲ – اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جو موسیٰ علیہ السلام کو شہادت نامے کی سنگین لوحیں عطا کیے جانے کے موقع پر کوہِ سینا کے دامن میں پیش آیا تھا۔ بائبل میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے، اور وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے، اور کوہِ سینا اُوپر سے نیچے تک دھویں سے بھر گیا، کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کر اُس پر اُترا اور دھواں تنور کے دُھویں کی طرح اُوپر کو اُٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔'' (خُروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کتاب کی پابندی کا عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ان پر ایسا ماحول طاری کر دیا جس سے انھیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اس کے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہِ کائنات کے ساتھ میثاق اُستوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں۔ اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انھیں زبردستی خوف زدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہلِ ایمان تھے اور دامنِ کوہ میں میثاق باندھنے ہی کے لیے گئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و اقرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے، تاکہ اقرار کرتے وقت انھیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادرِ مُطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بد عہدی کرنے کا انجام کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر بنی اسرائیل سے خطاب ختم ہو جاتا ہے اور بعد کے رُکوعوں میں تقریر کا رُخ عام انسانوں کی طرف پھرتا ہے، جن میں خُصوصیّت کے ساتھ رُوئے سُخن ان لوگوں کی جانب ہے جو براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُخاطَب تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۳۳ – اُوپر کا سلسلۂ بیان اُس بات پر ختم ہُوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بندگی واطاعت کا عہد لیا تھا۔ اب عام انسانوں کی طرف خطاب کر کے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل ہی کی کوئی خصوصیّت نہیں ہے، درحقیقت تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمھیں ایک روز جواب دہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی۔

۱۳۴ – جیسا کہ متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ معاملہ تخلیقِ آدمؑ کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسانِ اوّل کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اُسی طرح پوری نسلِ آدمؑ کو بھی، جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی رُبُوبیّت کی شہادت لی تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت اُبَیؓ بن کعب نے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ”اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دَور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مُرتّب کر کے انھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انھیں آپ اپنے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا: ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمھارے باپ آدمؑ کو گواہ ٹھیراتا ہوں، تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے، اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمھارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا، جو تم کو یہ عہد و میثاق، جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے، اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبُود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔“

اس معاملے کو بعض لوگ محض تمثیلی اندازِ بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآنِ مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اللہ کی رُبُوبیّت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور اس بات کو یہاں ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالَمِ خارجی میں پیش آیا۔ لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اور صرف بیانِ واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہُوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حُجّت قائم کرتے ہوئے اس اَزَلی عہد و اقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالمِ خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع اُن تمام انسانوں کو، جنھیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بیک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انھیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی الٰہ اُس کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ کے سوا نہیں ہے، اور ان کے لیے کوئی صحیح طریقِ زندگی اُس کی بندگی و فرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت میں تو نسلِ انسانی کی موجودہ تدریجی

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾ اَوْ
تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ
بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذٰلِكَ

کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ”ہم تو اس بات سے بے خبر تھے“، یا یہ نہ کہنے لگو کہ ”شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔[۱۳۵]“ دیکھو! اِس طرح

پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی اَزَل میں ان کا مجموعی ظُہور، اور ابد میں ان کا مجموعی حشر ونشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحبِ عقل وشعور اور صاحبِ تصرف واختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیتِ خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار (oath of allegiance) لے۔ اس معاملے کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابلِ تعجب ہوتا۔

۱۳۵ – اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسلِ آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں، وہ اپنے اِس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ اُنھیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بَری الذمہ ہوسکیں۔ گویا بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ اس اَزَلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلیّہ بَری ہوسکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ اَزَلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شُعور اور حافظے میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا سوال ہوا تھا اور اس نے بَلٰی کہا تھا؟ اگر نہیں، تو پھر اُس اقرار کو، جس کی یاد ہمارے شُعور و حافظہ سے محو ہوچکی ہے، ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظے میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہوجاتا، کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنیٰ ہی باقی

Maktaba Tul Ishaat.com

نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشُّعور (sub-conscious mind) اور وِجدان(intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشُّعوری اور وجدانی عُلوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدُّن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے، وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بِالقُوَّة(potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مِل جُل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بِالقُوَّة تھا، اُسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اُس کے اندر بِالقُوَّة موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب مؤثّرات اگر اپنا تمام زور بھی صَرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بِالقُوَّة موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصلِ فطرت سے منحرف(pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بِالقُوَّة موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت اُن چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر(یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بِالقُوَّة موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کرسکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کرسکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی، دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اُس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے:

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دَور میں، زمین کے ہر خِطّے میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں اُبھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابقِ حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ اُبھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کار فرما ہُوا ہے، اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیا علیہم السلام اور کُتُبِ آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کو قرآن میں مذکّر(یاد دلانے والے)، ذکر(یاد)، تذکرہ(یادداشت)، اور ان کے کام کو تذکیر(یاد دہانی) کے الفاظ

نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ

ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں[۱۳۶]۔ اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں[۱۳۷]۔

اور اے محمدؐ! اِن کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا

سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاؑ اور کتابیں اور داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے، بلکہ اُسی چیز کو اُبھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو اُن کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانے میں اِس تذکیر کا جواب بصورتِ لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہُوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیّت اور خواہشاتِ نفس اور تعصّبات اور شیاطینِ جن وانس کی گمراہ کُن تعلیمات وترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجے میں شرک، دہریّت، اِلحاد، زَندقہ اور اخلاقی وعملی فساد رُونما ہوتا ہے۔ لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے مُتّحِدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر وتجدید کی کوششیں اُسے اُبھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مُصِرّ ہیں، وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں، یا کم از کم اسے مُشتَبَہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روزِ اوّل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جب کہ انھوں نے اس کو اپنا واحد معبُود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا، اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علیٰ رُؤس الاشہاد دکھا دے گا کہ انھوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اُٹھیں، اپنی اور اپنے گرد وپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چُھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ اُبھرنے پر آمادہ ہُوا، اور پھر وہ اپنے تعصّبات اور اپنی خواہشاتِ نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کر دیتے رہے۔ وہ وقت جب کہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا، بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا۔ اسی لیے قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بُوجھ کر حق کا انکار کیا۔ وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام: ۱۳۰)

۱۳۶ – یعنی معرفتِ حق کے جو نشانات انسان کے اپنے نفس میں موجود ہیں، ان کا صاف صاف پتا دیتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝۱۷۵
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ
هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ
تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ

علم عطا کیا تھا[۱۳۸] مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخرِ کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اُن آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشِ نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتّے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے[۱۳۹]۔ یہی مثال ہے اُن لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔

۱۳۷ – یعنی بغاوت و انحراف کی رَوِش چھوڑ کر بندگی و اطاعت کے رَوّیے کی طرف واپس ہوں۔

۱۳۸ – اِن الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہوگا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی بُرائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعُموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے، بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بُری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں، تاکہ اس کی رسوائی کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اسی لیے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں کہ وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، کون تھا۔ مفسرین نے عہدِ رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا ہے۔ کوئی بلعم بن باعُورا کا نام لیتا ہے، کوئی اُمیّۃ بن ابی الصَّلت کا، اور کوئی صَیفی ابن الراہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردے میں ہے جو اس تمثیل میں پیشِ نظر تھا، البتہ یہ تمثیل ہر اُس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔

۱۳۹ – اِن دو مختصر سے فقروں میں بڑا اہم مضمون ارشاد ہُوا ہے، جسے ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلًا
الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

تم یہ حکایات اِن کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غوروفکر کریں۔ بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیاتِ الٰہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس رَوِیّے سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا، اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے۔ اسی عمل مطابقِ علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذّتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشاتِ نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس نے ان کے آگے سپر ڈال دی، معالیِ اُمور کی طلب میں دنیا کی حرص وطمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص وطمع سے ایسا مغلوب ہوا کہ اپنے سب اُونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا، اور اُن تمام حُدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اُس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اَخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بُوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان، جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا، اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اُسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا، یہاں تک کہ ظالم نے اسے اُن لوگوں کے زُمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ عقل وہوش گم کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو کُتّے سے تشبیہ دیتا ہے، جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتشِ حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتا دیتی ہے۔ بِنائے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، دنیا کا کتّا کہتے ہیں۔ کُتّے کی جِبِلّت کیا ہے؟ حرص و آز۔ چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بُوئے طعام آ جائے۔ اسے پتھر ماریے تب بھی اس کی یہ توقع دُور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو پھینکی گئی ہے، کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ پیٹ کا بندہ ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجیے تب بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیے، زبان لٹکائے، ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو، جو کئی کُتّوں کے کھانے کو کافی ہو، تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصّہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا، بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتّے کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دے گا۔ اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ ہے شہوتِ فَرج۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دل چسپی رکھتا ہے، اور اسی کو سونگھنے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ
لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہِ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنّم ہی کے لیے پیدا کیا ہے[۱۴۰]۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

چاٹنے میں مشغول رہتا ہے۔ پس تشبیہ کا مدّعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تُڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے، تو پھر کُتّے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

۱۴۰ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اُن کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں اور ان کو وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ انھیں دوزخ کا ایندھن بنانا ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا دل، دماغ، آنکھیں اور کان دے کر، مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہ لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخرِ کار جہنّم کا ایندھن بن کر رہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے وہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو انسانی زبان میں انتہائی افسوس اور حسرت کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ماں کے متعدّد جوان بیٹے لڑائی میں جا کر لقمۂ اجل ہو گئے ہوں تو وہ لوگوں سے کہتی ہے کہ میں نے انھیں اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ لوہے اور آگ کے کھیل میں ختم ہو جائیں۔ اِس قول سے اس کا مدّعا یہ نہیں ہوتا کہ واقعی اس کے پالنے پوسنے کی غرض یہی تھی، بلکہ اس حسرت بھرے انداز میں دراصل وہ کہنا یہ چاہتی ہے کہ میں نے تو اتنی محنتوں سے اپنا خونِ جگر پلا پلا کر ان بچوں کو پالا تھا، مگر خدا اِن لڑنے والے فسادیوں سے سمجھے کہ

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اللہ اچھے ناموں[۱۴۱] کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں[۱۴۲] گے۔

میری محنت اور قربانی کے ثمرات یوں خاک میں مل کر رہے۔

۱۴۱ – اب تقریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے، اس لیے خاتمۂ کلام پر نصیحت اور ملامت کے ملے جُلے انداز میں لوگوں کو ان کی چند نمایاں ترین گمراہیوں پر متنبّہ کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی پیغمبرؐ کی دعوت کے مقابلے میں انکار و استہزا کا جو رویّہ انھوں نے اختیار کر رکھا تھا، اُس کی غلطی سمجھاتے ہوئے اس کے بُرے انجام سے اُنھیں خبردار کیا جا رہا ہے۔

۱۴۲ – انسان اپنی زبان میں اشیا کے جو نام رکھتا ہے، وہ دراصل اس تصوّر پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں اُن اشیا کے متعلق ہُوا کرتا ہے۔ تصور کا نَقص نام کے نَقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور نام کا نَقص تصوّر کے نَقص پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اشیا کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اُس تصوّر پر ہی مبنی ہوا کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان کے متعلق رکھتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے، اور تصور کی صحّت و دُرستی تعلق کی صحت و دُرستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح دنیا کی تمام چیزوں کے معاملے میں صحیح ہے، اسی طرح اللہ کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ اللہ کے لیے نام (خواہ وہ اسمائے ذات ہوں یا اسمائے صفات) تجویز کرنے میں انسان جو غلطی بھی کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر خدا کے متعلق اپنے تصور و اعتقاد میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے، اتنی ہی اور ویسی ہی غلطی اس سے اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رَوِیّے کی تشکیل میں بھی سرزد ہوتی ہے، کیونکہ انسان کے اخلاقی رَوِیّے کی تشکیل تمام تر منحصر ہے اُس تصوّر پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ خدا کے نام رکھنے میں غلطی کرنے سے بچو، خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اور اسے اُنھی ناموں سے یاد کرنا چاہیے، اس کے نام تجویز کرنے میں الحاد کا انجام بہت بُرا ہے۔

”اچھے ناموں“ سے مراد وہ نام ہیں جن سے خدا کی عظمت و برتری، اس کے تقدس اور پاکیزگی، اور اس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار ہوتا ہو۔ ”الحاد“ کے معنٰی ہیں: وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رُخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں: اَلحد السھمُ الھدفَ، یعنی تیر نے نشانے سے الحاد کیا۔ خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں، یا جن سے اس کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۲۲ / ۱۲

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝١٨١
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۝١٨٢ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝١٨٣ اَوَلَمْ
يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ۝١٨٤ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ

ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ؑ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انھیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انھیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔

اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ اِن کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار ہے جو (بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبّہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟[۱۴۳] اور کیا یہ بھی انھوں نے نہیں سوچا کہ شاید اِن کی مُہلتِ زندگی پوری ہونے کا وقت

نیز یہ بھی الحاد ہی ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ اللہ کے نام رکھنے میں جو لوگ الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھی طرح سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان کی کج بحثیوں میں تم کو الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی گمراہی کا انجام وہ خود دیکھ لیں گے۔

۱۴۳- رفیق سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ انھی لوگوں میں پیدا ہوئے، انھی کے درمیان رہے بسے، بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپؐ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت

اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ
عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا
يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا
تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْــَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

وقف منزل
وقف لازم

قریب آلگا ہو؟[۱۴۴] پھر آخر پیغمبرؐ کی اِس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟ ـــــ جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اُس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے، اور اللہ انہیں اِن کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہُوا چھوڑ ے دیتا ہے۔

یہ لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہو گی؟ کہو: ”اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اُسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔“ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو: ”اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔“

سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپؐ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمِ جُنون اُن باتوں پر نہ تھا جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے، بلکہ صرف انھی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپؐ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔ اِسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے، آخر ان باتوں میں سے کون سی بات جنون کی ہے؟ کون سی بات بے تُکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے، یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظرِ تأمّل دیکھتے تو انھیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگیِ رب کی دعوت اور انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کے بارے میں جو کچھ اُن کا بھائی انھیں سمجھا رہا ہے، اس کی صداقت پر پورا نظامِ کائنات اور خلق اللہ کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے۔

۱۴۴ – یعنی نادان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے، کچھ خبر نہیں کہ کب کس کی اجل آن پوری

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ
معانقة ٨ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا
مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ
ع ۲۳ يُّؤْمِنُوْنَ ۝١٨٨ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ
مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا
خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ ”میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔[۱۴۵] میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔“ ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سُکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے ربّ سے دعا

ہو۔ پھر اگر ان میں سے کسی کا آخری وقت آ گیا اور اپنے رَوِیّے کی اصلاح کے لیے جو مُہلت اسے ملی ہوئی ہے وہ انھی گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں ضائع ہوگئی، تو آخر اس کا حشر کیا ہوگا؟

۱۴۵ – مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ٹھیک تاریخ وہی بتا سکتا ہے جسے غیب کا علم ہو، اور میرا حال یہ ہے کہ میں کل کے متعلق بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ یا میرے بال بچوں کے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اگر یہ علم مجھے حاصل ہوتا تو میں کتنے نقصانات سے قبل از وقت آگاہ ہو کر بچ جاتا، اور کتنے فائدے محض پیشگی علم کی بدولت اپنی ذات کے لیے سمیٹ لیتا۔ پھر یہ تمھاری کتنی بڑی نادانی ہے کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ قیامت کب آئے گی۔

لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا
صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾

کی کہ اگر تُو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش وعنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیرانے لگے۔ اللہ بہت بلند وبرتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[۱۴۶]۔ کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ اُن کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں،

۱۴۶- یہاں مشرکین کی جاہلانہ گمراہیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ابتداءً وجود بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے، جس سے خود مشرکین کو بھی انکار نہیں۔ پھر ہر انسان کو وجود عطا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اس بات کو بھی مشرکین جانتے ہیں۔ عورت کے رحم میں نطفے کو ٹھیرانا، پھر اس خفیف سے حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچے کی صورت دینا، پھر اس بچے کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کرنا اور اس کو صحیح وسالم انسان بنا کر پیدا کرنا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ عورت کے پیٹ میں بندر یا سانپ یا کوئی اور عجیب الخلقت حیوان پیدا کر دے، یا بچے کو پیٹ ہی میں اندھا بہرا لنگڑا لُولا بنا دے، یا اس کی جسمانی و ذہنی اور نفسانی قوتوں میں کوئی نقص رکھ دے، تو کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ کی اس ساخت کو بدل ڈالے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح مُوَحِّدین۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حمل میں ساری اُمیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہوتی ہیں کہ وہی صحیح وسالم بچہ پیدا کرے گا۔ لیکن اس پر بھی جہالت و نادانی کے طُغیان کا یہ حال ہے کہ جب اُمید بر آتی ہے اور چاند سا بچہ نصیب ہو جاتا ہے تو شکریے کے لیے نذریں اور نیازیں کسی دیوی، کسی اوتار، کسی ولی اور کسی حضرت کے نام پر چڑھائی جاتی ہیں، اور بچے کو ایسے نام دیے جاتے ہیں کہ گویا وہ خدا کے سوا کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے، مثلاً حسین بخش، پیر بخش، عبدالرسول، عبدالعُزّیٰ اور عبدشمس وغیرہ۔

اس تقریر کے سمجھنے میں ایک بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے جسے ضعیف روایات نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔ چونکہ آغاز میں نوعِ انسانی کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر آیا ہے، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور پھر فوراً ہی ایک مرد وعورت کا ذکر شروع ہو گیا ہے جنھوں نے پہلے تو اللہ سے صحیح وسالم بچے کی پیدائش کے لیے دعا کی اور جب بچہ پیدا ہو گیا تو اللہ کی بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھیرا لیا، اس لیے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ شرک کرنے والے میاں بیوی ضرور حضرت آدم وحوا علیہما السلام ہی ہوں گے۔ اس غلط فہمی پر روایات کا ایک خول چڑھ گیا اور ایک پورا قصّہ تصنیف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَ اِنْ
تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ

جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں، تم خواہ انھیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں

کر دیا گیا کہ حضرت حوا کے بچے پیدا ہو ہو کر مر جاتے تھے، آخر کار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھ دیں۔ غضب یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچا دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام روایات غلط ہیں اور قرآن کی عبارت بھی ان کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا پہلا جوڑا جس سے آفرینش کی ابتدا ہوئی، اس کا خالق بھی اللہ ہی تھا، کوئی دوسرا اس کارِ تخلیق میں شریک نہ تھا، اور پھر ہر مرد و عورت کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے، جس کا اقرار تم سب لوگوں کے دلوں میں موجود ہے، چنانچہ اسی اقرار کی بدولت تم اُمید و بیم کی حالت میں جب دعا مانگتے ہو تو اللہ ہی سے مانگتے ہو، لیکن بعد میں جب اُمیدیں پوری ہو جاتی ہیں تو تمھیں شرک کی سوجھتی ہے۔ اس تقریر میں کسی خاص مرد اور خاص عورت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین میں سے ہر مرد اور ہر عورت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے، وہ عرب کے مشرکین تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لیے تو خدا ہی سے دعا مانگتے تھے، مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیے میں دوسروں کو شکریے کا حصہ دار ٹھیرا لیتے تھے۔ بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی، لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں، وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں، حمل کے زمانے میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی انھی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس پر بھی زمانۂ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ مؤحِّد ہیں، اُن کے لیے جہنم واجب تھی اور اِن کے لیے نجات کی گارنٹی ہے، اُن کی گمراہیوں پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر اِن کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مُسدّس میں کیا ہے:

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر ‏— جو ٹھیرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر ‏— کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں ‏— پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں ‏— اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں ‏— شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے ‏— نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ
اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾
اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ
اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ
قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ
وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

تمھارے لیے یکساں ہی رہے۔[۱۴۷] تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو، یہ تمھاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمھارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟[۱۴۸] اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو، پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے،[۱۴۹]

۱۴۷ – یعنی ان مشرکین کے معبودانِ باطل کا حال یہ ہے کہ سیدھی راہ دکھانا اور اپنے پرستاروں کی رہنمائی کرنا تو درکنار، وہ بیچارے تو کسی رہنما کی پیروی کرنے کے قابل بھی نہیں، حتّٰی کہ کسی پکارنے والے کی پکار کا جواب تک نہیں دے سکتے۔

۱۴۸ – یہاں ایک بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے۔ مشرکانہ مذاہب میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ اصنام، تصاویر یا علامات جو مَرجعِ پرستش (objects of worship) ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اشخاص یا ارواح یا مَعانی جو دراصل معبود قرار دیے جاتے ہیں، اور جن کی نمایندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ تیسرے وہ اعتقادات جو اِن مشرکانہ عبادات و اعمال کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ قرآن مختلف طریقوں سے ان تینوں چیزوں پر ضرب لگاتا ہے۔ اِس مقام پر اُس کی تنقید کا رُخ پہلی چیز کی طرف ہے، یعنی وہ بُت محلِ اعتراض ہیں جن کے سامنے مشرکین اپنے مراسمِ عبادات ادا کرتے اور اپنی عرضیاں اور نیازیں پیش کرتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَ لَاۤ
اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا
يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾
خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ
تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ

بخلاف اِس کے تم جنھیں خدا کو چھوڑ کر پُکارتے ہو، وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں، بلکہ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمھاری بات سُن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔''

اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔ اگر کبھی شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھُو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنّے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے۔ رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انھیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے چلے جاتے ہیں

۱۴۹ - یہ جواب ہے مشرکین کی اُن دھمکیوں کا جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم ہمارے اِن معبُودوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی طرف سے لوگوں کے عقیدے اسی طرح خراب کرتے رہے تو تم پر

ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا

اور انھیں بھٹکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔[150]

اے نبیؐ! جب تم اِن لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ

ان کا غضب ٹوٹ پڑے گا اور وہ تمھیں اُلٹ کر رکھ دیں گے۔

۱۵۰ – ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت وتبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں، اور مقصود صرف حضوؐر ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضوؐر کے ذریعے سے اُن سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضوؐر کے قائم مَقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اُٹھیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

(۱) داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خُو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامّۃ النّاس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اُس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، دُرُشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اِس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ ”غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جُڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں“ اور اسی چیز کی ہدایت آپؐ ان لوگوں کو کرتے تھے جنھیں آپؐ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا، یعنی ”جہاں تم جاؤ وہاں تمھاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جاں فزا ہو نہ کہ باعث نفرت، اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔“ اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی ”یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے نرم ہو، ورنہ اگر تم دُرُشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔“ (آلِ عمران، ۱۵۹)

(۲) دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی اُن سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنھیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں، یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (common sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیِ حق کا اپیل عوام و خواص سب کو متأثّر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ نکال لیتا ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا

Maktaba Tul Ishaat.com

کرتے ہیں، وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے، اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں، تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفینِ حق سے پھرتے اور داعیِ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخرِ کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہیں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصّبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپؐ کے بعد تھوڑی ہی مدّت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں ۱۰۰ فی صد اور کہیں ۸۰ اور ۹۰ فی صد باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے، وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے، خواہ وہ اُلجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملے میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑا لُو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے، اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) نمبر ۳ میں جو ہدایت کی گئی ہے، اسی کے سلسلے میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعیِ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اُکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اُس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے، اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اُٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیِ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیِ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُر فریب تاویلوں اور مذہبی اصلاحوں کے غلاف میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہش مند) ہیں، وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ حق کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلے میں نہیں ٹھیر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی میں

لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۲۰۳

تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟[151] اِن سے کہو: ”میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمھارے رب کی طرف سے، اور ہدایت اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو اِسے قبول کریں۔[152]

شیطان چاہتا ہے انھیں لیے پھرتا ہے، اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رُکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

اس ارشاد کا ایک عُمومی محل بھی ہے اور وہ یہ کہ اہلِ تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر ان کے دل کو چھو جاتا ہے تو انھیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک اُنگلی میں پھانس چبھ جانے یا آنکھ میں کسی ذرّے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خُوگر نہیں ہوتے، اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اُسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح اُنگلی کے لیے پھانس، یا آنکھ کے لیے ذرّہ، یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انھیں محسوس ہو جاتی ہے تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اُن کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبارِ شر کو اپنے اُوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے، ان کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اُپراہٹ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے، بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سؤر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔

۱۵۱ – کفار کے اس سوال میں ایک صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو، اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لیے بنا لائے ہوتے۔ لیکن آگے مُلاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس شان سے دیا جاتا ہے۔

۱۵۲ – یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی مَیں خود ضرورت محسوس کروں، اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے، وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ
الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔[۱۵۳]"

اے نبیؐ! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔[۱۵۴]

موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف ہُوَیدا ہونے لگتے ہیں۔

۱۵۳ – یعنی یہ جو تعصّب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور و غل برپا کرتے ہو تاکہ نہ خود سنو اور نہ کوئی دوسرا سُن سکے، اس رَوِش کو چھوڑ دو اور غور سے سنو تو سہی کہ اس میں تعلیم کیا دی گئی ہے۔ کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اُسی رحمت کے حصّہ دار بن جاؤ جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے۔ مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف و شیریں اور ایسا دلوں کو مسخّر کرنے والا اندازِ تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص حکمتِ تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو، وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں بڑے سبق پا سکتا ہے۔

اس آیت کا اصل مقصود تو وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے، لیکن ضمناً اس سے یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جب خدا کا کلام پڑھا جا رہا ہو تو لوگوں کو ادب سے خاموش ہو جانا چاہیے اور توجہ کے ساتھ اسے سننا چاہیے۔ اسی سے یہ بات بھی مُستنبط ہوتی ہے کہ امام جب نماز میں قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو مقتدیوں کو خاموشی کے ساتھ اس کی سماعت کرنی چاہیے۔ لیکن اس مسئلے میں ائمہ کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ امام کی قراءت خواہ جَہری ہو یا سِرّی، مقتدیوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ صرف جَہری قراءت کی صورت میں مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ جَہری اور سِرّی دونوں صورتوں میں مقتدی کو قراءت کرنی چاہیے، کیونکہ بعض احادیث کی بنا پر وہ سمجھے ہیں کہ جو شخص نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ۩ ﴿٢٠٦﴾

ع ۲۴ ۱۸ ۱۴ السجدة

جو فرشتے تمھارے رب کے حُضور تقرّب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آ کر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے،۱۵۵ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں،۱۵۶ اور اس کے آگے جُھکے رہتے ہیں۔۱۵۷ ع

۱۵۴ – یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی، خواہ وہ زبان سے ہو یا خیال سے۔ صبح و شام سے مراد یہی دونوں وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ کی یاد سے مقصود نماز ہے، اور صبح و شام کا لفظ ''دائماً'' کے معنٰی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہنا ہے۔ یہ آخری نصیحت ہے جو خطبے کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمھارا حال کہیں غافلوں کا سا نہ ہو جائے۔ دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رُونما ہوا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اُس کا رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اُس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ پس جو شخص راہِ راست پر چلنا اور دنیا کو اُس پر چلانا چاہتا ہو، اُس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں خود اُس کو لاحق نہ ہو جائے۔ اسی لیے نماز اور ذکرِ الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

۱۵۵ – مطلب یہ ہے کہ بڑائی کا گھمنڈ اور بندگی سے منہ موڑنا شیاطین کا کام ہے اور اس کا نتیجہ پستی و تنزّل ہے۔ بخلاف اس کے، خدا کے آگے جھکنا اور بندگی میں ثابت قدم رہنا ملکوتی فعل ہے اور اس کا نتیجہ ترقی و بلندی اور خدا سے تقرّب ہے۔ اگر تم اس ترقی کے خواہش مند ہو تو اپنے طرزِ عمل کو شیاطین کے بجائے ملائکہ کے طرزِ عمل کے مطابق بناؤ۔

۱۵۶ – تسبیح کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا بے عیب اور بے نَقص اور بے خطا ہونا، ہر قسم کی کمزوریوں سے اس کا مُنَزّہ ہونا، اور اس کا لاشریک اور بے مثل اور بے ہمتا ہونا دل سے مانتے ہیں، اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں اور دائماً اس کے اظہار و اعلان میں مشغول رہتے ہیں۔

۱۵۷ – اس مقام پر حکم ہے کہ جو شخص اس آیت کو پڑھے یا سُنے وہ سجدہ کرے، تاکہ اس کا حال ملائکۂ مقربین کے حال سے مطابق ہو جائے، اور ساری کائنات کا انتظام چلانے والے کارکن جس خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اسی کے آگے وہ بھی ان سب کے ساتھ جھک جائے اور اپنے عمل سے فوراً یہ ثابت کر دے کہ وہ نہ تو کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے اور نہ خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والا ہے۔

قرآنِ مجید میں ایسے ۱۴ مقامات ہیں جہاں آیاتِ سجدہ آئی ہیں۔ ان آیات پر سجدے کا مشروع ہونا تو مُتَّفَق عَلَیہ ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

مگر اس کے وُجوب میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سجدۂ تلاوت کو واجب کہتے ہیں، اور دوسرے علما نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے اور اس میں جب آیتِ سجدہ آتی تو آپؐ خود بھی سجدے میں گر جاتے تھے اور جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا تھا، حتّٰی کہ کسی کو سجدہ کرنے کے لیے جگہ نہ ملتی تو وہ اپنے آگے والے شخص کی پیٹھ پر سر رکھ دیتا۔ یہ بھی رِوایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے فتحِ مکہ کے موقع پر قرآن پڑھا اور اس میں جب آیتِ سجدہ آئی تو جو لوگ زمین پر کھڑے تھے انھوں نے زمین پر سجدہ کیا، اور جو گھوڑوں اور اُونٹوں پر سوار تھے وہ اپنی سواریوں پر ہی جھک گئے۔ کبھی آپؐ نے دورانِ خطبہ میں آیت سجدہ پڑھی ہے تو منبر سے اُتر کر سجدہ کیا ہے اور پھر اُوپر جا کر خطبہ شروع کر دیا ہے۔

اس سجدے کے لیے جُمہور اُنھی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں، یعنی باوضو ہونا، قبلہ رُخ ہونا، اور نماز کی طرح سجدے میں زمین پر سر رکھنا۔ لیکن جتنی احادیث سجودِ تلاوت کے باب میں ہم کو ملی ہیں، ان میں کہیں اِن شرطوں کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اُن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیتِ سجدہ سُن کر جو شخص جہاں، جس حال میں ہو، جُھک جائے، خواہ باوضو ہو یا نہ ہو، خواہ استقبالِ قبلہ ممکن ہو یا نہ ہو، خواہ زمین پر سر رکھنے کا موقع ہو یا نہ ہو۔ سَلَف میں بھی ہم کو ایسی شخصیّتیں ملتی ہیں جن کا عمل اِس طریقے پر تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کرتے تھے۔ اور ابوعبدالرحمٰن سُلَمی کے متعلق فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے قرآنِ مجید پڑھتے جاتے تھے، اور اگر کہیں آیتِ سجدہ آ جاتی تو بس سر جھکا لیتے تھے، خواہ باوضو ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ قبلہ رُخ بھی ہوں یا نہ ہوں۔ ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جُمہور ہی کا ہے، لیکن اگر کوئی شخص جُمہور کے مسلک کے خلاف عمل کرے تو اسے ملامت بھی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جُمہور کی تائید میں کوئی سنتِ ثابتہ موجود نہیں ہے، اور سَلَف میں ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کا عمل جُمہور کے مسلک سے مختلف تھا۔

تفہیم القرآن

الانفال

(۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

الانفال

زمانۂ نزول یہ سورہ ۲ ہجری میں جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں اسلام و کفر کی اِس پہلی جنگ پر مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، غالباً یہ ایک ہی تقریر ہے جو بیک وقت نازل فرمائی گئی ہوگی، مگر ممکن ہے کہ اس کی بعض آیات جنگِ بدر ہی سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق بعد میں اُتری ہوں اور پھر ان کو سلسلۂ تقریر میں مناسب جگہوں پر درج کر کے ایک مسلسل تقریر بنا دیا گیا ہو۔ بہر حال کلام میں کہیں کوئی ایسا جوڑ نظر نہیں آتا جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ یہ الگ الگ دو تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخی پس منظر قبل اس کے کہ اس سورہ پر تبصرہ کیا جائے، جنگِ بدر اور اس سے تعلق رکھنے والے حالات پر ایک تاریخی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ابتدائی دس بارہ سال میں، جب کہ آپؐ مکہ معظمہ میں مقیم تھے، اِس حیثیت سے اپنی پختگی و استواری ثابت کر چکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت، عالی ظرف اور دانش مندانہ عَلَم بردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرزِ عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اٹل ارادہ رکھتا ہے اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو انگیز کرنے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں خود ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور دماغوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اور جہالت و جاہلیّت اور تعصّبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے عرب کے پرانے نظامِ جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر، جو ابتداءً اس کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے، مکّی دَور کے آخری زمانے میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا زور اسے کچل دینے میں صَرف کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن اُس وقت تک چند حیثیات سے اس دعوت میں بہت کچھ کسر باقی تھی:

اوّلاً، یہ بات ابھی پوری طرح ثابت نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ایسے پیروؤں کی ایک کافی تعداد بہم پہنچ گئی ہے جو صرف اس کے ماننے والے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے اُصولوں کا سچا عشق بھی رکھتے ہیں، اس کو غالب و نافذ کرنے کی سعی میں اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایۂ زندگی کھپا دینے کے لیے تیار ہیں، اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لیے، دنیا بھر سے لڑ جانے کے لیے، حتّٰی کہ اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی کاٹ پھینکنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگرچہ مکہ میں پیروانِ اسلام نے قریش کے ظلم و ستم برداشت کر کے

اپنی صداقتِ ایمانی اور اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کی مضبوطی کا اچھا خاصا ثبوت دے دیا تھا، مگر ابھی یہ ثابت ہونے کے لیے بہت سی آزمایشیں باقی تھیں کہ دعوتِ اسلامی کو جاں فروش پیروؤں کا وہ گروہ ہے جو اپنے نصب العین کے مقابلے میں کسی چیز کو بھی عزیز تر نہیں رکھتا۔

ثانیاً، اس دعوت کی آواز اگرچہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی، لیکن اس کے اثرات منتشر تھے، اس کی فراہم کردہ قوت سارے ملک میں پراگندہ تھی، اس کو وہ اجتماعی طاقت بہم نہ پہنچی تھی جو پُرانے جمے ہوئے نظامِ جاہلیّت سے فیصلہ کُن مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔

ثالثاً، اس دعوت نے زمین میں کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی بلکہ ابھی تک وہ صرف ہوا میں سرایت کر رہی تھی۔ ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ قدم جما کر اپنے مَوقف کو مضبوط کرتی اور پھر آگے بڑھنے کی سعی کرتی۔ اُس وقت تک مسلمان جہاں بھی تھا، اس کی حیثیت نظامِ کفر وشرک میں بالکل ایسی تھی جیسے خالی معدے میں کونین، کہ معدہ ہر وقت اسے اُگل دینے کے لیے زور لگا رہا ہو اور قرار پکڑنے کے لیے اس کو جگہ ہی نہ ملتی ہو۔

رابعاً، اس وقت تک اِس دعوت کو عملی زندگی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ نہ یہ اپنا تمدّن قائم کر سکی تھی، نہ اس نے اپنا نظامِ معیشت و معاشرت اور نظامِ سیاست مرتّب کیا تھا، اور نہ دوسری طاقتوں سے اس کے معاملاتِ صلح وجنگ پیش آئے تھے۔ اس لیے نہ تو اُن اخلاقی اُصولوں کا مظاہرہ ہو سکا تھا جن پر یہ دعوت زندگی کے پورے نظام کو قائم کرنا اور چلانا چاہتی تھی، اور نہ یہی بات آزمایش کی کسَوٹی پر اچھی طرح نمایاں ہوئی تھی کہ اس دعوت کا پیغمبرؐ اور اس کے پیروؤں کا گروہ جس چیز کی طرف دنیا کو دعوت دے رہا ہے، اس پر عمل کرنے میں وہ خود کس حد تک راست باز ہے۔

بعد کے واقعات نے وہ مواقع پیدا کر دیے جن سے یہ چاروں کمیاں پوری ہو گئیں۔

مکّی دَور کے آخری تین چار سالوں سے یثرب میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ متعدّد وُجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ آخرِ کار نبوت کے بارھویں سال حج کے موقع پر ۷۵ نُفوس کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپؐ کو اور آپؐ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اہلِ یثرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام و فرماں روا کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بُلاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پا لیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطّوں میں جو

Maktaba Tul Ishaat.com

مسلمان منتشر ہیں، وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظم معاشرہ بنا لیں۔ اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو "مدینۃ الاسلام" کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنا لیا۔

اس پیش کش کے معنی جو کچھ تھے اس سے اہلِ مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور مَعاشی وتمدُّنی بائیکاٹ کے مقابلے میں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ بیعتِ عَقَبَہ کے موقع پر رات کی اُس مجلس میں اسلام کے ان اوّلین مددگاروں (انصار) نے اس نتیجے کو خوب اچھی طرح جان بُوجھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ عین اُس وقت جب کہ بیعت ہو رہی تھی، یثربی وفد کے ایک نوجوان رکن اَسعَدؓ بن زُرارہ نے، جو پورے وفد میں سب سے کم سِن شخص تھے، اُٹھ کر کہا:

رویدًا یا اھل یثرب! انا لم نضرب الیه اکباد الابل الا ونحن نعلم انه رسول اللّٰه، وان اخراجه الیوم مناوأۃ للعرب کافة، وقتل خیارکم، وتعضکم السیوف ۔ فاما انتم قوم تصبرون علٰی ذٰلك فخذوہ واجرہ علی اللّٰه ، واما انتم قوم تخافون من انفسکم خیفة فذروہ فبینوا ذٰلك فھو اعذر لکم عند اللّٰه ۔

"ٹھیرو اے اہلِ یثرب! ہم لوگ جو اِن کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج اِنھیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمھارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اور اگر تمھیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو، کیونکہ اس وقت عُذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔"

اسی بات کو وفد کے ایک دوسرے شخص عباسؓ بن عُبادہ بن نَضلَہؓ نے دُہرایا:

اتعلمون علام تبایعون ھٰذا الرجل؟ (قالوا نعم، قال) انکم تبایعونه علٰی حرب الاحمر والاسود من الناس ۔ فان کنتم ترون انکم اذا نھکت اموالکم مصیبة واشرافکم قتلا اسلمتموہ فمن الاٰن فدعوہ ، فھو واللّٰه ان فعلتم خزی الدنیا والاٰخرۃ وان کنتم ترون انکم وافون له بما دعوتموہ الیه علی نھکة الاموال وقتل الاشراف فخذوہ، فھو واللّٰه خیرالدنیا والاٰخرۃ۔

"جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ (آوازیں، ہاں جانتے ہیں) تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمھارا خیال یہ ہو کہ جب تمھارے مال تباہی کے اور تمھارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ

آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تمھارا ارادہ یہ ہے کہ جو بُلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔‘‘

اس پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا: فانا ناخذہ علی مصیبۃ الاموال وقتل الاشراف ’’ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔‘‘ تب وہ مشہور بیعت واقع ہوئی جسے تاریخ میں بیعتِ عَقَبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلِ مکہ کے لیے یہ معاملہ جو معنیٰ رکھتا تھا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ دراصل اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جن کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی قابلیتوں سے قریش کے لوگ واقف ہو چکے تھے، ایک ٹھکانا میسر آ رہا تھا، اور ان کی قیادت و رہنمائی میں پیروانِ اسلام، جن کی عزیمت و استقامت اور فدائیت کو بھی قریش ایک حد تک آزما چکے تھے، ایک منظم جتھے کی صورت میں مجتمع ہوئے جاتے تھے۔ یہ پرانے نظام کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نیز مدینہ جیسے مقام پر مسلمانوں کی اس طاقت کے مجتمع ہونے سے قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ ساحلِ بحرِ احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی، جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا، وہ مسلمانوں کی زد میں آ جاتی تھی اور اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان نظامِ جاہلی کی زندگی دشوار کر سکتے تھے۔ صرف اہلِ مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی، ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ طائف اور دوسرے مقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔

قریش اِن نتائج کو خوب سمجھتے تھے۔ جس رات بیعتِ عَقَبہ واقع ہوئی، اسی رات اس معاملے کی بھنک اہلِ مکہ کے کانوں میں پڑی اور پڑتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو انھوں نے اہلِ مدینہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑنے کی کوشش کی۔ پھر جب مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مدینے کی طرف ہجرت کرنے لگے اور قریش کو یقین ہو گیا کہ اب محمدؐ بھی وہاں منتقل ہو جائیں گے تو وہ اس خطرے کو روکنے کے لیے آخری چارہ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہجرتِ نبوی سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلسِ شُوریٰ منعقد ہوئی جس میں بڑی رَدّ وکَد کے بعد آخرِ کار یہ طے پا گیا کہ بنی ہاشم کے سوا تمام خانوادہ ہائے قریش کا ایک ایک آدمی چھانٹا جائے اور یہ سب لوگ مل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں، تاکہ بنی ہاشم کے لیے تمام خاندانوں سے تنہا لڑنا مشکل ہو جائے اور وہ انتقام کے بجائے خوں بہا قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن خدا کے فضل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد علی اللہ اور حسنِ تدبیر سے اُن کی یہ چال ناکام ہو گئی اور حضورؐ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ اس طرح جب قریش کو ہجرت کے روکنے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مدینے کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ کو (جسے ہجرت سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ

Maktaba Tul Ishaat.com

پہنچ جانے اور اَوس وخَزرج کی اکثریت کے مسلمان ہوجانے سے پانی پھر چکا تھا) خط لکھا کہ ”تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمھارے مَردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔“ عبداللہ بن اُبَیّ اس پر کچھ آمادۂ شر ہوا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شر کی روک تھام کر دی۔ پھر سعدؓ بن مُعاذ رئیسِ مدینہ عُمرے کے لیے مکّہ گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے ان کو ٹوک کر کہا: الا اُراك تطوف بمكة اٰمنًا وقد اويتم الصُّباة وزعمتم انكم تنصرونهم وتعينونهم؟ لولا انك مع ابي صفوان ما رجعت الي اهلك سالمًا (تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دو اور ان کی امداد واعانت کا دَم بھرو اور ہم تمھیں اطمینان سے مکّے میں طواف کرنے دیں؟ اگر تم اُمَیّۃ بن خَلَف کے مہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جاسکتے تھے)۔ سعدؓ نے جواب میں کہا: واللّٰہ لئن منعتني هٰذا لامنعنك ما هو اشد عليك منه، طريقك علي المدينة (بخدا اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمھیں اُس چیز سے روک دوں گا جو تمھارے لیے اس سے شدید تر ہے، یعنی مدینے پر سے تمھاری رہ گزر)۔ یہ گویا اہلِ مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ زیارتِ بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے، اور اس کا جواب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفینِ اسلام کے لیے پُرخطر ہے۔

اور فی الواقع اُس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں، تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستے سے وابستہ تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی مُعاندانہ ومزاحمانہ پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مجبور ہوجائیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوخیز اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم ونسق اور اطرافِ مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ منعطف فرمائی، وہ اسی شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے میں حضورؐ نے دو اہم تدبیریں اختیار کیں:

ایک یہ کہ مدینہ اور ساحلِ بحرِاحمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے، ان کے ساتھ گفت وشنید شروع کی، تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم ازکم ناطرف داری کے معاہدے کرلیں۔ چنانچہ اس میں آپؐ کو پوری کامیابی ہوئی۔ سب سے پہلے جُہَینَہ سے، جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقے میں ایک اہم قبیلہ تھا، معاہدۂ ناطرف داری طے ہوا۔ پھر ۱ ہجری کے آخر میں بنی ضَمْرَہ سے جن کا علاقہ یَنْبُوع اور ذوالعُشَیرہ سے متصل تھا، دفاعی معاونت (defensive alliance) کی قرارداد ہوئی۔ پھر ۲ ہجری کے وسط میں بنی مُدْلِج بھی اس قرارداد میں شریک ہوگئے کیونکہ وہ بنی ضَمْرَہ کے ہمسایے اور حلیف تھے۔ مزید برآں تبلیغِ اسلام نے ان قبائل میں اسلام کے حامیوں اور پیروؤں کا بھی ایک اچھا خاصا عُنصر پیدا کر دیا۔

دوسری تدبیر آپؐ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لیے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے

چھوٹے دستے بھیجنے شروع کیے، اور بعض دستوں کے ساتھ آپؐ خود بھی تشریف لے گئے۔ پہلے سال اس طرح کے چار دستے گئے جو مغازی کی کتابوں میں سَرِیّۂ حمزہ، سَرِیّۂ عُبَیدہ بن حارث، سَرِیّۂ سعد بن ابی وَقّاص اور غزوۃ الاَبْواء کے نام سے موسوم ہیں[1]۔ اور دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں دو مزید تاختیں اسی جانب کی گئیں جن کو اہلِ مغازی غزوۂ بُواط اور غزوۂ ذوالعُشَیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام مہموں کی دو خصوصیتیں قابلِ لحاظ ہیں: ایک یہ کہ ان میں سے کسی میں نہ تو کُشت وخون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لُوٹا گیا، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رُخ بتانا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی تاخت میں بھی حضوؐر نے اہلِ مدینہ کا کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے خالص مکّی مہاجرین سے ہی مرتب فرماتے رہے، تاکہ حتی الامکان یہ کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں اُلجھنے سے آگ پھیل نہ جائے۔ اُدھر سے اہلِ مکہ بھی مدینے کی طرف غارت گر دستے بھیجتے رہے، چنانچہ انھی میں سے ایک دستے نے کُرز بن جابر الفِہری کی قیادت میں عین مدینہ کے قریب ڈاکا مارا اور اہلِ مدینہ کے مویشی لُوٹ لیے۔ قریش کی کوشش اس سلسلے میں یہ رہی کہ دوسرے قبیلوں کو بھی اس کشمکش میں اُلجھا دیں، نیز یہ کہ انھوں نے بات کو محض دھمکی تک محدود نہ رکھا بلکہ لُوٹ مار تک نوبت پہنچا دی۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ شعبان ۲ ہجری (فروری یا مارچ ۶۲۳ء) میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ، جس کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار اشرفی کا مال تھا اور تیس چالیس سے زیادہ محافظ نہ تھے، شام سے مکہ کی طرف پلٹتے ہوئے اُس علاقے میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا۔ چونکہ مال زیادہ تھا، محافظ کم تھے، اور سابق حالات کی بنا پر خطرہ قوی تھا کہ کہیں مسلمانوں کا کوئی طاقتور دستہ اس پر چھاپا نہ مار دے، اس لیے سردارِ قافلہ ابوسفیان نے اس پُرخطر علاقے میں پہنچتے ہی ایک آدمی کو مکے کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہاں سے مدد لے آئے۔ اس شخص نے مکّہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اُونٹ کے کان کاٹے، اس کی ناک چیر دی، کجاوے کو اُلٹ کر رکھ دیا اور اپنا قمیص آگے پیچھے سے پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ: یا معشر قریش! اللطیمه اللطیمه، اموالکم مع ابی سفیان قد عرض لها محمد فی اصحابه، لا اُرٰی ان تُدْرِکوها ، الغوث ، الغوث (قریش والو! اپنے قافلۂ تجارت کی خبر لو، تمھارے مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں، محمدؐ اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہو گیا ہے، مجھے اُمید نہیں کہ تم انھیں پا سکو گے، دوڑو دوڑو مدد کے لیے)۔ اس پر سارے مکہ میں ہیجان برپا ہو گیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک ہزار مردانِ جنگی، جن میں سے ۶۰۰ زِرہ پوش تھے اور جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا، پوری شان وشوکت کے ساتھ لڑنے کے لیے چلے۔

---

[1] اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں سَرِیّہ اُس مہم کو کہتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کی قیادت میں بھیجا کرتے تھے اور غَزوہ اُس مہم کو کہتے تھے جس کی قیادت حضوؐر خود فرماتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اُن کے پیشِ نظر صرف یہی کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچالائیں، بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں، اور مدینہ میں یہ مخالف طاقت جو ابھی نئی نئی مجتمع ہونی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں، اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آیندہ کے لیے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے، محسوس فرمایا کہ فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ ایک جسُورانہ اِقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو تحریکِ اسلامی ہمیشہ کے لیے بے جان ہو جائے گی، بلکہ بعید نہیں کہ اس تحریک کے لیے سر اُٹھانے کا پھر کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ نئے دارالہجرت میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہاجرین بے سروسامان، انصار ابھی ناآزمودہ، یہودی قبائل برسرِ مخالفت، خود مدینے میں منافقین و مشرکین کا ایک اچھا خاصا طاقتور عُنصر موجود، اور گردوپیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی۔ ایسے حالات میں اگر قریش مدینے پر حملہ آور ہو جائیں تو ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دبکے بیٹھے رہیں، تب بھی یک لخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اُکھڑے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مدینے کے یہودی اور منافقین و مشرکین علی الاعلان سر اُٹھائیں گے اور دارالہجرت میں جینا مشکل کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب و اثر نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان، مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تامُّل ہو۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم فرمالیا کہ جو طاقت بھی اس وقت میسر ہے، اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل بوتا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔

اس فیصلہ کُن اقدام کا ارادہ کر کے آپؐ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ساری پوزیشن صاف صاف رکھ دی کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر چلا آ رہا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمھیں مل جائے گا، بتاؤ تم کس کے مقابلے پر چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہُوا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر کچھ اور تھا، اس لیے آپؐ نے اپنا سوال دُہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے مِقدادؓ بن عَمْرو نے اُٹھ کر کہا: یا رسول اللّٰہ، امض لما امرک اللّٰہ، فانا معک حیثما احببت، لا نقول لک کما قال بنو اسرائیل لموسٰی اذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، ولٰکن اذھب انت وربک فقاتلا انا معکما مقاتلون ما دامت عین منا تطرف۔ ”یا رسولؐ اللہ! جدھر آپؐ کا رب آپؐ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلیے، ہم آپؐ کے

ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمھارا خدا دونوں لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔نہیں، ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا، دونوں لڑیں، اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے، جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔" مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ابھی تک فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی اور ان کے لیے یہ آزمایش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انھوں نے اوّل روز کیا تھا اسے وہ کہاں تک نباہنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے براہِ راست ان کو مخاطب کیے بغیر پھر اپنا سوال دُہرایا۔ اس پر سعدؓ بن مُعاذ اُٹھے اور انھوں نے عرض کیا: شاید حضورؐ کا رُوئے سُخَن ہماری طرف ہے؟ فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: لقد اٰمنا بك وصدقناك وشهدنا ان ما جئت به هو الحق واعطيناك عهودنا ومواثيقنا على السّمع والطاعة۔ فامض يا رسول اللّٰه لما اردت۔ فوالذى بعثك بالحق لو استعرضت بنا هٰذا البحر فخضتهٗ لخضناه معك وما تخلف منا رجل واحد۔وما نكره ان تلقى بنا عدونا غدًا انا لنصبر عند الحرب صُدُقٌ عند اللقآء ولعل اللّٰه يريك منا ما تقر به عينك فسربنا علٰى بركة اللّٰه۔ "ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسولؐ! جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اُتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کُودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھِڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے، مقابلے میں سچّی جاں نثاری دکھائیں گے، اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دِکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔"

ان تقریروں کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ قافلے کے بجائے لشکرِ قریش ہی کے مقابلے پر چلنا چاہیے۔ لیکن یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جو لوگ اس تنگ وقت میں لڑائی کے لیے اُٹھے تھے، اُن کی تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی (۸۶ مہاجر، ۶۱ قبیلۂ اَوس کے اور ۱۷۰ قبیلۂ خَزرَج کے) جن میں صرف دو تین کے پاس گھوڑے تھے اور باقی آدمیوں کے لیے ۷۰ اُونٹوں سے زیادہ نہ تھے، جن پر تین تین چار چار اشخاص باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ سامانِ جنگ بھی بالکل ناکافی تھا۔ صرف ۶۰ آدمیوں کے پاس زِرہیں تھیں۔ اسی لیے چند سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر آدمی جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے، دلوں میں سہم رہے تھے اور انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جانتے بُوجھتے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ مَصلَحت پرست لوگ، جو اگرچہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں جان و مال کا زیاں ہو، اس مہم کو دیوانگی

Maktaba Tul Ishaat.com

سے تعبیر کر رہے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ دینی جذبے نے ان لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے۔ مگر نبیؐ اور مومنین صادقین یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ وقت جان کی بازی لگانے ہی کا ہے، اس لیے اللہ کے بھروسے پر وہ نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا۔ حالانکہ اگر ابتدا میں قافلے کو لُوٹنا مقصود ہوتا تو شمال مغرب کی راہ لی جاتی۔[1]

۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا۔ جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تین کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان ہے اور وہ بھی پوری طرح مسلح نہیں ہے، تو خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے اور انتہائی خُضوع وتَضَرُّع کے ساتھ عرض کرنا شروع کیا: اللھم ھٰذہٖ قریش قد اتت بخیلائھا تحاول ان تکذب رسولک، اللھم فنصرك الذی وعدتنی، اللّٰھم ان تھلك ھٰذہ العصابة الیوم لا تعبد۔ ”خدایا! یہ ہیں قریش، اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسولؐ کو جھوٹا ثابت کریں، خداوندا! بس اب آ جائے تیری وہ مدد جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اے خدا! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو رُوئے زمین پر پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔“

اس معرکۂ کارزار میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرینِ مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمایش سے صرف وہی لوگ گزر سکتے تھے جنھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تُل گئے ہوں۔ اور انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔ اب تک تو انھوں نے عرب کے طاقتور ترین قبیلے، قریش اور اس کے حلیف قبائل کی دشمنی صرف اسی حد تک مول لی تھی کہ ان کے عَلَی الرَّغم مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دے دی تھی۔ لیکن اب تو وہ اسلام کی حمایت میں ان کے خلاف لڑنے بھی جا رہے تھے، جس کے معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹی سی بستی جس کی آبادی چند ہزار نُفوس سے زیادہ نہیں ہے، سارے ملکِ عرب سے لڑائی مول لے رہی ہے۔ یہ جسارت صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو کسی صداقت پر ایسا ایمان لے آئے ہوں کہ اس کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی انھیں ذرہ برابر پروا نہ رہی ہو۔ آخر کار ان لوگوں کی صداقتِ ایمانی

[1] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنگِ بدر کے بیان میں تاریخ وسیرت کے مصنفین نے اُن رِوایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مَغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، لیکن ان رِوایات کا بڑا حصّہ قرآن کے خلاف ہے اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ محض ایمان ہی کی بنا پر ہم جنگِ بدر کے متعلق قرآن کے بیان کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی آج اس جنگ کے متعلق اگر کوئی معتبر ترین بیان موجود ہے تو وہ یہی سورۂ انفال ہے، کیونکہ یہ لڑائی کے بعد ہی مُتّصلاً نازل ہوئی تھی اور خود شرکائے جنگ اور مخالف وموافق سب نے اس کو سنا اور پڑھا تھا۔ معاذ اللہ! اس میں کوئی ایک بات بھی خلافِ واقعہ ہوتی تو ہزاروں زبانیں اس کی تردید کر ڈالتیں۔

خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور قریش اپنے سارے غرورِ طاقت کے باوجود ان بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کے ۷۰ آدمی مارے گئے، ۷۰ قید ہوئے، اور ان کا سروسامان غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار جو ان کے گلہائے سَرسَبَد اور اسلام کی مخالف تحریک کے رُوحِ رواں تھے، اس معرکے میں ختم ہو گئے اور اس فیصلہ کُن فتح نے عرب میں اسلام کو ایک قابلِ لحاظ طاقت بنا دیا۔ جیسا کہ ایک مغربی محقق نے لکھا ہے: ''بدر سے پہلے اسلام محض ایک مذہب اور ریاست تھا، مگر بدر کے بعد وہ مذہبِ ریاست بلکہ خود ریاست بن گیا۔''

مباحث یہ ہے وہ عظیم الشان معرکہ جس پر قرآن کی اس سورہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر اس تبصرے کا انداز تمام اُن تبصروں سے مختلف ہے جو دنیوی بادشاہ اپنی فوج کی فتح یابی کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اُن خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو اَخلاقی حیثیت سے ابھی مسلمانوں میں باقی تھیں، تاکہ آیندہ اپنی مزید تکمیل کے لیے سعی کریں۔

پھر اُن کو بتایا گیا ہے کہ اس فتح میں تائیدِ الٰہی کا کتنا بڑا حصہ تھا، تاکہ وہ اپنی جرأت و شہامت پر نہ پھولیں بلکہ خدا پر توکُّل اور خدا و رسول کی اطاعت کا سبق لیں۔

پھر اُس اَخلاقی مقصد کو واضح کیا گیا ہے جس کے لیے مسلمانوں کو یہ معرکۂ حق و باطل برپا کرنا ہے، اور ان اخلاقی صفات کی توضیح کی گئی ہے جن سے اس معرکے میں انھیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر مشرکین اور منافقین اور یہود اور ان لوگوں کو، جو جنگ میں قید ہو کر آئے تھے، نہایت سبق آموز انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔

پھر اُن اموال کے متعلق، جو جنگ میں ہاتھ آئے تھے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ انھیں اپنا مال نہ سمجھیں بلکہ خدا کا مال سمجھیں، جو کچھ اللہ اس میں سے ان کا حصّہ مقرر کرے اسے شکریے کے ساتھ قبول کرلیں، اور جو حصّہ اللہ اپنے کام اور اپنے غریب بندوں کی امداد کے لیے مقرر کرے اس کو برضا و رغبت گوارا کرلیں۔

پھر قانونِ جنگ و صلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں جن کی توضیح اِس مرحلے میں دعوتِ اسلامی کے داخل ہو جانے کے بعد ضروری تھی، تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیّت کے طریقوں سے بچیں اور دنیا پر ان کی اخلاقی برتری قائم ہو، اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام اوّل روز سے اخلاق پر عملی زندگی کی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے اس کی تعبیر واقعی عملی زندگی میں کیا ہے۔

پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت اُن مسلمانوں سے الگ کر دی گئی ہے جو دارالاسلام کے حُدود سے باہر رہتے ہوں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۷۵ — رکوعاتہا ۱۰

سُورَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ

تم سے اَنفال کے متعلّق پوچھتے ہیں؟ کہو: ”یہ اَنفال تو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلّقات دُرست کرو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔“[1] سچّے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر

۱- یہ اِس تبصرۂ جنگ کی عجیب تمہید ہے۔ بدر میں جو مالِ غنیمت لشکرِ قریش سے لُوٹا گیا تھا اس کی تقسیم پر مسلمانوں کے درمیان نزاع برپا ہوگئی۔ چونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں کو پہلی مرتبہ پرچم اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لیے ان کو معلوم نہ تھا کہ اس مسلک میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق کیا ضابطہ ہے۔ کچھ ابتدائی ہدایات سورۂ بقرہ اور سورۂ محمد میں دی جا چکی تھیں، لیکن ”تہذیبِ جنگ“ کی بنیاد ابھی رکھنی باقی تھی۔ بہت سے تمدّنی معاملات کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملے میں بھی اکثر پُرانی جاہلیّت ہی کے تصورات لیے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے بدر کی لڑائی میں کفار کی شکست کے بعد جن لوگوں نے جو جو کچھ مالِ غنیمت لُوٹا تھا، وہ عرب کے پُرانے طریقے کے مطابق اپنے آپ کو اس کا مالک سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن ایک دوسرا فریق جس نے غنیمت کی طرف رُخ کرنے کے بجائے کفار کا تعاقب کیا تھا، اس بات کا مدعی ہوا کہ اس مال میں ہمارا برابر کا حصّہ ہے، کیونکہ اگر ہم دشمن کا پیچھا کر کے اسے دُور تک بھگا نہ دیتے اور تمھاری طرح غنیمت پر ٹوٹ پڑتے تو ممکن تھا کہ دشمن پھر پلٹ کر حملہ کر دیتا اور فتح شکست سے بدل جاتی۔ ایک تیسرے فریق نے بھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہا تھا، اپنے دعاوی پیش کیے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سب سے بڑھ کر قیمتی خدمت تو اس جنگ میں ہم نے انجام دی ہے۔ اگر ہم رسولؐ اللہ کے گرد اپنی جانوں کا حصار بنائے ہوئے نہ رہتے اور آپؐ کو کوئی گزند پہنچ جاتا تو فتح ہی کب نصیب ہوسکتی تھی کہ کوئی مالِ غنیمت ہاتھ آتا اور اس کی تقسیم کا سوال اٹھتا۔ مگر مال عملاً جس فریق کے قبضے میں تھا اس کی مِلکیّت گویا کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی اور وہ دلیل کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ ایک امرِ واقعی اس کے زور سے بدل جائے۔ آخر کار اس نزاع نے تلخی کی صورت اختیار کرنی شروع کر دی اور زبانوں سے دلوں تک بدمزگی پھیلنے لگی۔

یہ تھا وہ نفسیاتی موقع جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا اور جنگ پر اپنے تبصرے کی ابتدا اسی مسئلے سے کی۔ پھر پہلا ہی فقرہ جو ارشاد ہوا، اُسی میں سوال کا جواب موجود تھا۔ فرمایا: ’’تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں؟‘‘ یہ ان اموال کو ’’غنائم‘‘ کے بجائے ’’اَنفال‘‘ کے لفظ سے تعبیر کرنا بجائے خود مسئلے کا فیصلہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ اَنفال جمع ہے نَفل کی۔ عربی زبان میں نَفل اُس چیز کو کہتے ہیں جو واجب سے یا حق سے زائد ہو۔ جب یہ تابع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ رضا کارانہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اپنے آقا کے لیے فرض سے بڑھ کر تَطَوُّعاً بجا لاتا ہے۔ اور جب یہ متبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عَطِیّہ وانعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔ پس ارشاد کا مطلب یہ ہُوا کہ یہ ساری رَدّ وکَد، یہ نزاع، یہ پوچھ گُچھ، کیا خدا کے بخشے ہوئے انعامات کے بارے میں ہو رہی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تم لوگ اِن کے مالک ومختار کہاں بنے جا رہے ہو کہ خود ان کی تقسیم کا فیصلہ کرو۔ مال جس کا بخشا ہوا ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ کسے دیا جائے اور کسے نہیں، اور جس کو بھی دیا جائے اسے کتنا دیا جائے۔

یہ جنگ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی اخلاقی اصلاح تھی۔ مسلمان کی جنگ دنیا کے مادّی فائدے بٹورنے کے لیے نہیں ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی وتمدّنی بگاڑ کو اُصولِ حق کے مطابق دُرست کرنے کے لیے ہے، جسے مجبُوراً اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ مزاحم قوتیں دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے اصلاح کو ناممکن بنا دیں۔ پس مصلحین کی نظر اپنے مقصد پر ہونی چاہیے، نہ کہ اُن فوائد پر جو مقصد کے لیے سعی کرتے ہوئے بطورِ انعام خدا کی عنایت سے حاصل ہوں۔ ان فوائد سے اگر ابتدا ہی میں ان کی نظر نہ ہٹا دی جائے تو بہت جلدی اَخلاقی انحطاط رونما ہو کر یہی فوائد مقصود قرار پا جائیں۔

پھر یہ جنگ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی انتظامی اصلاح بھی تھی۔ قدیم زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگتا، وہی اس کا مالک قرار پاتا۔ یا پھر بادشاہ یا سپہ سالار تمام غنائم پر قابض ہو جاتا۔ پہلی صورت میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ فتح یاب فوجوں کے درمیان اموالِ غنیمت پر سخت تنافُس برپا ہو جاتا اور بسا اوقات ان کی خانہ جنگی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتی۔ دوسری صورت میں سپاہیوں کو چوری کا عارضہ لگ جاتا تھا اور وہ غنائم کو چُھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن نے انفال کو اللہ اور رسولؐ کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مالِ غنیمت لا کر بے کم وکاست امام کے سامنے رکھ دیا جائے اور ایک سُوئی تک چُھپا کر نہ رکھی جائے۔ پھر آگے چل کر اس مال کی تقسیم کا قانون بنا دیا کہ پانچواں حصہ خدا کے کام اور اس کے غریب بندوں کی مدد کے لیے بیت المال میں رکھ دیا جائے اور باقی چار حصّے اُس پوری فوج میں تقسیم کر دیے جائیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ اس طرح وہ دونوں خرابیاں دُور ہو گئیں جو جاہلیّت کے طریقے میں تھیں۔

اس مَقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔ یہاں انفال کے قصّے کو صرف اتنی بات کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہیں۔ تقسیم کے مسئلے کو یہاں نہیں چھیڑا گیا، تاکہ پہلے تسلیم واطاعت مکمل ہو جائے۔ پھر چند رُکوع کے بعد بتایا گیا کہ ان اموال کو تقسیم کس طرح کیا جائے۔ اسی لیے یہاں انھیں ’’انفال‘‘ کہا گیا ہے اور رکوع ۵ میں جب تقسیم کا حکم بیان کرنے کی نوبت آئی تو انھی اموال کو ’’غنائم‘‘ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ كَمَآ اَخْرَجَكَ

لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں توان کا ایمان بڑھ جاتا ہے[۲] اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے[۳] اور بہترین رزق ہے۔ (اِس مالِ غنیمت کے معاملے میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اُس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ

۲- یعنی ہر ایسے موقع پر جب کہ کوئی حکم الٰہی آدمی کے سامنے آئے اور وہ اس کی تصدیق کر کے سرِ اطاعت جُھکا دے، آدمی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر اس موقع پر جب کہ کوئی چیز آدمی کی مرضی کے خلاف، اس کی رائے اور تصورات و نظریّات کے خلاف، اس کی مانوس عادتوں کے خلاف، اس کے مفاد اور اس کی لذت و آسایش کے خلاف، اس کی محبّتوں اور دوستیوں کے خلاف اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی ہدایت میں ملے اور آدمی اس کو مان کر فرمانِ خدا اور رسولؐ کو بدلنے کے بجائے اپنے آپ کو بدل ڈالے اور اس کی قبولیت میں تکلیف انگیز کر لے تو اس سے آدمی کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا کرنے میں آدمی دریغ کرے تو اس کے ایمان کی جان نکلنی شروع ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن و جامد چیز نہیں ہے، اور تصدیق وعَدَمِ تصدیق کا بس ایک ہی ایک مرتبہ نہیں ہے کہ اگر آدمی نے نہ مانا تو وہ بس ایک ہی نہ ماننا رہا، اور اگر اس نے مان لیا تو وہ بھی بس ایک ہی مان لینا ہُوا۔ نہیں، بلکہ تصدیق اور انکار دونوں میں انحطاط اور نشوونُما کی صلاحیت ہے۔ ہر انکار کی کیفیت گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اقرار و تصدیق میں ارتقا بھی ہو سکتا ہے اور تنزّل بھی۔ البتہ فقہی احکام کے اعتبار سے نظامِ تمدن میں حُقوق اور حیثیات کا تعیّن جب کیا جائے گا تو تصدیق اور عَدَمِ تصدیق دونوں کے بس ایک ہی مرتبے کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسلامی سوسائٹی میں تمام ماننے والوں کے آئینی حقوق و واجبات یکساں ہوں گے، خواہ ان کے درمیان ماننے کے مراتب میں کتنا ہی تفاوُت ہو۔ اور سب نہ ماننے والے ایک ہی مرتبے میں ذِمّی

رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ۙ
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ؕ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا

تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملے میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے دراں حالے کہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔[۴]

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں

یا حربی یا مُعاہَد و مسالم قرار دیے جائیں گے، خواہ ان میں کفر کے اعتبار سے مراتب کا کتنا ہی فرق ہو۔

۳- قصور بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر اہلِ ایمان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، اور جب تک انسان انسان ہے، یہ محال ہے کہ اس کا نامۂ اعمال سراسر معیاری کارناموں ہی پر مشتمل ہو اور لغزش، کوتاہی، خامی سے بالکل خالی رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے یہ بھی ایک بڑی رحمت ہے کہ جب انسان بندگی کی لازمی شرائط پوری کر دیتا ہے تو اللہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرماتا ہے اور اس کی خدمات جس صلے کی مستحق ہوتی ہیں اس سے کچھ زیادہ صلہ اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ ورنہ اگر قاعدہ یہ مقرر کیا جاتا کہ ہر قصور کی سزا اور ہر خدمت کی جزا الگ الگ دی جائے تو کوئی بڑے سے بڑا صالح بھی سزا سے نہ بچ سکتا۔

۴- یعنی جس طرح اُس وقت یہ لوگ خطرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے، حالانکہ حق کا مطالبہ اُس وقت یہی تھا کہ خطرے کے منہ میں چلے جائیں، اسی طرح آج انھیں مالِ غنیمت ہاتھ سے چھوڑنا ناگوار ہو رہا ہے، حالانکہ حق کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اسے چھوڑیں اور حکم کا انتظار کریں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ کی اطاعت کرو گے اور اپنے نفس کی خواہش کے بجائے رسولؐ کا کہا مانو گے تو ویسا ہی اچھا نتیجہ دیکھو گے جیسا ابھی جنگِ بدر کے موقع پر دیکھ چکے ہو کہ تمھیں لشکرِ قریش کے مقابلے پر جانا سخت ناگوار تھا اور اسے تم ہلاکت کا پیغام سمجھ رہے تھے، لیکن جب تم نے حکمِ خدا و رسول کی تعمیل کی تو یہی خطرناک کام تمھارے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہوا۔

قرآن کا یہ ارشاد ضمناً اُن رِوایات کی بھی تردید کر رہا ہے جو جنگِ بدر کے سلسلے میں عموماً کُتبِ سیرت و مغازی میں نقل کی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین قافلے کو لُوٹنے کے لیے مدینے سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر چند منزل آگے جا کر جب معلوم ہوا کہ قریش کا لشکر قافلے کی حفاظت کے لیے آرہا ہے تب یہ مشورہ کیا گیا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ
يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۙ‏ ﴿۷﴾ لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ
وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ‌ۚ ﴿۸﴾ اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ
فَاسۡتَجَابَ لَكُمۡ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ ﴿۹﴾
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى وَلِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ‌ ۚ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا

مل جائے گا۔[۵] تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمھیں ملے۔[۶] مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[۷]

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمھاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمھیں صرف اس لیے بتا دی کہ تمھیں خوشخبری ہو اور تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے

یا لشکر کا مقابلہ؟ اس بیان کے برعکس قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلے تھے، اسی وقت یہ امرِ حق آپؐ کے پیشِ نظر تھا کہ قریش کے لشکر سے فیصلہ کُن مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ مشاورت بھی اسی وقت ہوئی تھی کہ قافلے اور لشکر میں سے کس کو حملے کے لیے منتخب کیا جائے۔ اور باوجود یکہ مومنین پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ لشکر ہی سے نمٹنا ضروری ہے، پھر بھی ان میں سے ایک گروہ اس سے بچنے کے لیے حجّت کرتا رہا۔ اور بالآخر جب آخری رائے یہ قرار پا گئی کہ لشکر ہی کی طرف چلنا چاہیے تو یہ گروہ مدینے سے یہ خیال کرتا ہُوا چلا کہ ہم سیدھے موت کے منہ میں ہانکے جا رہے ہیں۔

۵ – یعنی تجارتی قافلہ یا لشکرِ قریش۔

۶ – یعنی قافلہ جس کے ساتھ صرف تیس چالیس محافظ تھے۔

۷ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت فی الواقع صورتِ حال کیا رونما ہو گئی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورہ کے دیباچے میں بیان کیا ہے، لشکرِ قریش کے نکل آنے سے دراصل سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ دعوتِ اسلامی اور نظامِ جاہلیت، دونوں میں سے کس کو عرب میں زندہ رہنا ہے۔ اگر مسلمان اس وقت مردانہ وار مقابلے کے لیے نہ نکلتے تو اسلام کے لیے زندگی کا کوئی موقع

ع ۱۵

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۰﴾ع اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ
اَمَنَةً مِّنْهُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ
وَ یُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَ لِیَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ
الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾ؕ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا

اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔ع

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا۸، اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا، تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمّت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۹۔

اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، پس تم ان کی

باقی نہ رہتا۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے نکلنے اور پہلے ہی بھرپور وار میں قریش کی طاقت پر کاری چوٹ لگا دینے سے وہ حالات پیدا ہوئے جن کی بدولت اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل گیا اور پھر اس کے مقابلے میں نظامِ جاہلیت پیہم شکست کھاتا ہی چلا گیا۔

۸ – یہی تجربہ مسلمانوں کو اُحُد کی جنگ میں پیش آیا، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۴ میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں مواقع پر وجہ وہی ایک تھی کہ جو موقع شدتِ خوف اور گھبراہٹ کا تھا اس وقت اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسے اطمینان سے بھر دیا کہ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

۹ – یہ اُس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اس بارش کے تین فائدے ہوئے: ایک یہ کہ مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی اور انھوں نے فوراً حوض بنا بنا کر بارش کا پانی روک لیا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصّے پر تھے اس لیے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہوگئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت بآسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکرِ کفار نشیب کی جانب تھا، اس لیے وہاں اس بارش کی بدولت کیچڑ ہوگئی اور

Maktaba Tul Ishaat.com

فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا
فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا

گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔"[۱۰] یہ اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا، اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لیے نہایت سخت گیر ہے[۱۱]۔۔۔۔۔۔ یہ[۱۲] ہے تم لوگوں کی سزا، اب اس کا مزا چکھو، اور تمھیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

اے ایمان لانے والو! جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ۔۔۔۔۔۔ اِلّا یہ کہ جنگی چال کے طور پر

پاؤں دھنسنے لگے۔

شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست سے مراد وہ ہراس اور گھبراہٹ کی کیفیت تھی جس میں مسلمان ابتداءً مبتلا تھے۔

۱۰ – جو اُصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعے سے معلوم ہیں، ان کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام نہیں لیا گیا ہوگا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں، بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

۱۱ – یہاں تک جنگِ بدر کے جن واقعات کو ایک ایک کر کے یاد دلایا گیا ہے، اس سے مقصود دراصل لفظ "انفال" کی معنویت واضح کرنا ہے۔ ابتدا میں ارشاد ہوا تھا کہ اس مالِ غنیمت کو اپنی جانفشانی کا ثمرہ سمجھ کر اس کے مالک و مختار کہاں بنے جاتے ہو، یہ تو دراصل عطیّۂ الٰہی ہے اور معطی خود ہی اپنے مال کا مختار ہے۔ اب اس کے ثبوت میں یہ واقعات گنائے گئے ہیں کہ اس فتح میں خود ہی حساب لگا کر دیکھ لو کہ تمھاری اپنی جانفشانی اور جرأت و جسارت کا کتنا حصہ تھا اور اللہ کی عنایت کا کتنا حصہ۔

لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ
الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٧﴾

ایسا کرے یا کسی دُوسری فوج سے جا ملنے کے لیے ـــــ تو وہ اللہ کے غضب میں گِھر جائے گا، اُس کا ٹھکانا جہنّم ہوگا، اور وہ بہت بُری جائے بازگشت ہے۔[۱۳]

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا، اور تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔[۱۴] (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سُننے اور جاننے والا ہے۔

---

۱۲ – خطاب کا رُخ یکایک کفار کی طرف پھر گیا ہے جن کے مستحقِ سزا ہونے کا ذکر اُوپر کے فقرے میں ہُوا تھا۔

۱۳ – دشمن کے شدید دباؤ پر مُرتّب پسپائی (orderly retreat) ناجائز نہیں ہے جب کہ اس کا مقصود اپنے عَقَبی مرکز کی طرف پلٹنا یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصّے سے جا ملنا ہو۔ البتہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ بھگدڑ (rout) ہے، جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی و شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس لیے ہوا کرتی ہے کہ بھگوڑے آدمی کو اپنے مقصد کی بہ نسبت جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی: ایک شرک، دوسرے والدین کی حق تلفی، تیسرے میدانِ قِتال فی سبیل اللہ سے فرار۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آپؐ نے سات بڑے گناہوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے تباہ کُن اور اس کے انجامِ اُخروی کے لیے غارت گر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ گناہ بھی ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی جنگ میں کفار کے آگے پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس فعل کو اتنا بڑا گناہ قرار دینے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ یہ ایک بُزدلانہ فعل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا بھگوڑا پن بسا اوقات ایک پوری پلٹن کو، اور ایک پلٹن کا بھگوڑا پن ایک پوری فوج کو بدحواس کر کے بھگا دیتا ہے۔ اور پھر جب ایک دفعہ کسی فوج میں بھگدڑ پڑ جائے تو کہا نہیں جا سکتا کہ تباہی کس حد پر جا کر ٹھیرے گی۔ اس طرح کی بھگدڑ صرف فوج ہی کے لیے تباہ کُن نہیں ہے بلکہ اُس مُلک کے لیے بھی تباہ کُن ہے جس کی فوج ایسی شکست کھائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا
فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ
تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ
وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

ع ۲ / ۱۶

یہ معاملہ تو تمھارے ساتھ ہے، اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔ (ان کافروں سے کہہ دو) ''اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو، فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا[15]۔ اب باز آ جاؤ تو تمھارے ہی لیے بہتر ہے، ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے اور تمھاری جمعیت، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمھارے کچھ کام نہ آ سکے گی۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔''ع

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور حکم سُننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سُنا، حالانکہ وہ نہیں سُنتے[16]۔

---

۱۴ – معرکۂ بدر میں جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور عام زد و خورد کا موقع آ گیا تو حضورؐ نے مٹھی بھر ریت ہاتھ میں لے کر شاھتِ الوُجُوہ کہتے ہوئے کفار کی طرف پھینکی اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کے اشارے سے مسلمان یکبارگی کفار پر حملہ آور ہوئے۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵ – مکے سے روانہ ہوتے وقت مشرکین نے کعبے کے پردے پکڑ کر دُعا مانگی تھی کہ خدایا! دونوں گروہوں میں سے جو بہتر ہے اس کو فتح عطا کر۔ اور ابوجہل نے خاص طور پر کہا تھا کہ خدایا! ہم میں سے جو برسرِ حق ہو اُسے فتح دے اور جو برسرِ ظلم ہو اُسے رسوا کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی منہ مانگی دُعائیں حرف بحرف پوری کر دیں اور فیصلہ کر کے بتا دیا کہ دونوں میں سے کون اچھا

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا
يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ
أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا
يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ
وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ

یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ[17] ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انھیں سُننے کی توفیق دیتا، (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سُنواتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے[18]۔

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسولؐ تمھیں اس چیز کی طرف بُلائے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے، اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے[19]۔ اور بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر

اور برسرِحق ہے۔

۱۶ – یہاں سُننے سے مراد وہ سننا ہے جو ماننے اور قبول کرنے کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ اشارہ اُن منافقین کی طرف ہے جو ایمان کا اقرار تو کرتے تھے مگر احکام کی اطاعت سے منہ موڑ جاتے تھے۔

۱۷ – یعنی جو نہ حق سنتے ہیں نہ حق بولتے ہیں۔ جن کے کان اور جن کے منہ حق کے لیے بہرے اور گونگے ہیں۔

۱۸ – یعنی جب ان لوگوں کے اندر خود حق پرستی اور حق کے لیے کام کرنے کا جذبہ نہیں ہے تو انھیں اگر تعمیلِ حکم میں جنگ کے لیے نکل آنے کی توفیق دے بھی دی جاتی تو یہ خطرے کا موقع دیکھتے ہی بے تکلّف بھاگ نکلتے اور ان کی معیّت تمھارے لیے مفید ثابت ہونے کے بجائے اُلٹی مضر ثابت ہوتی۔

۱۹ – نِفاق کی روش سے انسان کو بچانے کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ مؤثر تدبیر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو عقیدے انسان کے ذہن نشین ہو جائیں: ایک یہ کہ معاملہ اُس خدا کے ساتھ ہے جو دلوں کے حال تک جانتا ہے اور ایسا رازداں ہے کہ آدمی اپنے دل میں جو نیتیں، جو خواہشیں، جو اغراض و مقاصد اور جو خیالات چھپا کر رکھتا ہے وہ بھی اس پر عیاں ہیں۔ دوسرے

Maktaba-Tul-Ishaat.com

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي
الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ

صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔[20] اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے

یہ کہ جانا بہرحال خدا کے سامنے ہے، اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ یہ دو عقیدے جتنے زیادہ پختہ ہوں گے اُتنا ہی انسان نفاق سے دُور رہے گا۔ اسی لیے منافقت کے خلاف وعظ و نصیحت کے سلسلے میں قرآن اِن دو عقیدوں کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

۲۰ – اس سے مراد وہ اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف گناہ کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہ گار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں، ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متأثّر ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو۔ لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے، تو پھر ہوا اور زمین اور پانی ہر چیز میں سَمِّیَّت پھیل جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں جو وبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندا رہنے والے اور گندے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آ جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال بھی ہے کہ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے، جب اخلاقی بُرائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی، جب اس کے درمیان بُرے اور بے حیا اور بداخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو علانیہ اُچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں، اور جب اچھے لوگ بے عملی (passive attitude) اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں، تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آ جاتی ہے اور وہ فتنۂ عام برپا ہوتا ہے جس میں چنے کے ساتھ گُھن بھی پس جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ رسول جس اصلاح و ہدایت کے کام کے لیے اٹھا ہے اور تمھیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بُلا رہا ہے، اسی میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمھارے لیے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصّہ نہ لو گے اور ان بُرائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں، برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنۂ عام برپا ہوگا

بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔[21] اے ایمان لانے والو! جانتے بُوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں[22] میں غداری کے مرتکب نہ ہو، اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمایش ہیں[23]، اور اللہ کے

جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی، خواہ بہت سے افراد تمھارے درمیان ایسے موجود ہوں جو عملاً بُرائی کرنے اور بُرائی پھیلانے کے ذمہ دار نہ ہوں، بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلائی ہی لیے ہوئے ہوں۔ یہ وہی بات ہے جس کو سورۂ اَعراف، آیات ۱۶۳-۱۶۶ میں اصحاب السّبت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے، اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے اسلام کی اصلاحی جنگ کا بنیادی نظریہ کہا جا سکتا ہے۔

۲۱- یہاں شکر گزاری کا لفظ غور کے قابل ہے۔ اُوپر کے سلسلۂ تقریر کو نظر میں رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس موقع پر شکر گزاری کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ لوگ اللہ کے اِس احسان کو مانیں کہ اس نے اس کمزوری کی حالت سے انھیں نکالا اور مکہ کی پُرخطر زندگی سے بچا کر امن کی جگہ لے آیا جہاں طِیّبات رزق میسّر ہو رہے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی اسی شکر گزاری کے مفہوم میں داخل ہے کہ مسلمان اُس خدا کی اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کریں جس نے یہ احسانات ان پر کیے ہیں، اور رسولؐ کے مشن میں اخلاص و جاں نثاری کے ساتھ کام کریں، اور اس کام میں جو خطرات و مہالک اور مصائب پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ اُسی خدا کے بھروسے پر کرتے چلے جائیں جس نے اس سے پہلے ان کو خطرات سے بعافیت نکالا ہے، اور یقین رکھیں کہ جب وہ خدا کا کام اخلاص کے ساتھ کریں گے تو خدا ضرور ان کا وکیل و کفیل ہوگا۔ پس شکر گزاری محض اعترافی نوعیت ہی کی مطلوب نہیں ہے بلکہ عملی نوعیت کی بھی مطلوب ہے۔ احسان کا اعتراف کرنے کے باوجود محسن کی رضا جوئی کے لیے سعی نہ کرنا اور اس کی خدمت میں مخلص نہ ہونا اور اس کے بارے میں یہ شک رکھنا کہ نہ معلوم آیندہ بھی وہ احسان کرے گا یا نہیں، ہرگز شکر گزاری نہیں ہے بلکہ الٹی ناشکری ہے۔

۲۲- ''اپنی امانتوں'' سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار (trust) کر کے اس کے سُپرد کی جائیں، خواہ وہ عہدِ وفا کی ذمہ داریاں ہوں، یا اجتماعی معاہدات کی، یا جماعت کے رازوں کی، یا شخصی و جماعتی اموال کی، یا کسی ایسے عہدہ و منصب کی جو کسی شخص پر بھروسا کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کرے۔ (مزید تشریح کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۷

عِنْدَہٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۟ؑ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ
يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۟ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ؑ اے ایمان لانے والو! اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمھارے لیے کسوٹی بہم پہنچا دے[۲۴] گا اور تمھاری بُرائیوں کو تم سے دُور کرے گا، اور تمھارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے

مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۸۸)

۲۳ – انسان کے اخلاصِ ایمانی میں جو چیز بالعموم خلل ڈالتی ہے اور جس کی وجہ سے انسان اکثر منافقت، غداری اور خیانت میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اپنے مالی مفاد اور اپنی اولاد کے مفاد سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ مال اور اولاد، جن کی محبّت میں گرفتار ہو کر تم عموماً راستی سے ہٹ جاتے ہو، دراصل یہ دنیا کی امتحان گاہ میں تمھارے لیے سامانِ آزمائش ہیں۔ جسے تم بیٹا یا بیٹی کہتے ہو، حقیقت کی زبان میں وہ دراصل امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اور جسے تم جائداد یا کاروبار کہتے ہو، وہ بھی درحقیقت ایک دوسرا پرچۂ امتحان ہے۔ یہ چیزیں تمھارے حوالے کی ہی اس لیے گئی ہیں کہ ان کے ذریعے سے تمھیں جانچ کر دیکھا جائے کہ تم کہاں تک حقوق اور حدود کا لحاظ کرتے ہو، کہاں تک ذمہ داریوں کا بوجھ لادے ہوئے جذبات کی کشش کے باوجود راہِ راست پر چلتے ہو، اور کہاں تک اپنے نفس کو، جو اِن دنیوی چیزوں کی محبّت میں اسیر ہوتا ہے، اس طرح قابو میں رکھتے ہو کہ پوری طرح بندۂ حق بھی بنے رہو اور ان چیزوں کے حُقوق اس حد تک ادا بھی کرتے رہو جس حد تک حضرتِ حق نے خود ان کا استحقاق مقرر کیا ہے۔

۲۴ – کسوٹی اُس چیز کو کہتے ہیں جو کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کو نمایاں کرتی ہے۔ یہی مفہوم "فُرقان" کا بھی ہے، اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ اس لفظ سے کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو اور تمھاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ تمھارے اندر وہ قوتِ تمیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمھیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کون سا رَوِیّہ صحیح ہے اور کون سا غلط، کس رَوِیّے میں خدا کی رضا ہے اور کس میں اس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمھاری اندرونی بصیرت تمھیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہیے اور کدھر نہ اُٹھانا چاہیے، کون سی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ

لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ
اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ

کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں[۲۵]۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ”ہاں سُن لیا ہم نے، ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں، یہ تو وہی پُرانی

باطل ہے اور شیطان سے ملاقی ہے۔

۲۵ – یہ اُس موقع کا ذکر ہے جب کہ قریش کا یہ اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ چکا تھا کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ اس وقت وہ آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ شخص مکے سے نکل گیا تو پھر خطرہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ کے معاملے میں ایک آخری فیصلہ کرنے کے لیے دارالنّدوہ میں تمام رُؤسائے قوم کا ایک اجتماع کیا اور اس امر پر باہم مشاورت کی کہ اس خطرے کا سدِّ باب کس طرح کیا جائے۔ ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ اس شخص کو بیڑیاں پہنا کر ایک جگہ قید کر دیا جائے اور جیتے جی رہا نہ کیا جائے۔ لیکن اس رائے کو قبول نہ کیا گیا، کیونکہ کہنے والوں نے کہا کہ اگر ہم نے اسے قید کر دیا تو اس کے جو ساتھی قید خانے سے باہر ہوں گے وہ برابر اپنا کام کرتے رہیں گے، اور جب ذرا بھی قوت پکڑ لیں گے تو اسے چُھڑانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اسے اپنے ہاں سے نکال دو۔ پھر جب یہ ہمارے درمیان نہ رہے تو ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے، بہرحال اس کے وجود سے ہمارے نظامِ زندگی میں خلل پڑنا تو بند ہو جائے گا۔ لیکن اسے بھی یہ کہہ کر ردّ کر دیا گیا کہ یہ شخص جادو بیان آدمی ہے، دلوں کو موہنے میں اسے بلا کا کمال حاصل ہے، اگر یہ یہاں سے نکل گیا تو نہ معلوم عرب کے کن کن قبیلوں کو اپنا پیرو بنا لے گا اور پھر کتنی قوت حاصل کر کے قلبِ عرب کو اپنے اقتدار میں لانے کے لیے تم پر حملہ آور ہوگا۔ آخرِ کار ابوجہل نے یہ رائے پیش کی کہ ہم اپنے تمام قبیلوں میں سے ایک ایک عالی نسب تیز دست جوان منتخب کریں اور یہ سب مل کر یک بارگی محمدؐ پر ٹوٹ پڑیں اور اسے قتل کر ڈالیں۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبدِ مَناف کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ سب سے لڑ سکیں، اس لیے مجبوراً خوں بہا پر فیصلہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا، قتل کے لیے آدمی بھی نامزد ہو گئے اور قتل کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا، حتّٰی کہ جو رات اس کام کے لیے تجویز کی گئی تھی اس میں ٹھیک وقت پر قاتلوں کا گروہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچ بھی گیا، لیکن ان کا ہاتھ پڑنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل گئے اور ان کی بنی بنائی تدبیر عین وقت پر ناکام ہو کر رہ گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ
الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا
يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں۔" اور وہ بات بھی یاد ہے جو اُنھوں نے کہی تھی کہ "خدایا! اگر یہ واقعی حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔"[۲۶] اُس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تُو ان کے درمیان موجود تھا۔ اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ اِستِغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے۔[۲۷] لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجدِ حرام کا راستہ روک رہے ہیں،

۲۶ – یہ بات وہ دُعا کے طور پر نہیں کہتے تھے بلکہ چیلنج کے انداز میں کہتے تھے۔ یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی یہ حق ہوتا اور خدا کی طرف سے ہوتا تو اس کے جھٹلانے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم پر آسمان سے پتھر برستے اور عذابِ الیم ہمارے اُوپر ٹوٹ پڑتا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہ نہ حق ہے نہ مِن جانبِ اللہ ہے۔

۲۷ – یہ اُن کے اس سوال کا جواب ہے جو اُن کی اُوپر والی ظاہری دعا میں مُتَضَمّن تھا۔ اِس جواب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکّی دَور میں کیوں عذاب نہیں بھیجا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ جب تک نبی کسی بستی میں موجود ہو اور حق کی طرف دعوت دے رہا ہو، اس وقت تک بستی کے لوگوں کو مُہلت دی جاتی ہے اور عذاب بھیج کر قبل از وقت ان سے اصلاح پذیری کا موقع سلب نہیں کر لیا جاتا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک بستی میں سے ایسے لوگ پے در پے نکلتے چلے آ رہے ہوں جو اپنی سابقہ غفلت اور غلط روی پر مُتَنَبِّہ ہو کر اللہ سے معافی کی درخواست کرتے ہوں اور آیندہ کے لیے اپنے رَوِیّے کی اصلاح کر لیتے ہوں، اس وقت تک کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ اس بستی کو تباہ کر کے رکھ دے۔ البتہ عذاب کا اصلی وقت وہ ہوتا ہے جب نبی اس بستی پر حجّت پوری کرنے کے بعد مایوس ہو کر وہاں سے نکل جائے یا نکال دیا جائے یا قتل کر ڈالا جائے، اور وہ بستی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دے کہ وہ کسی صالح عُنصر کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا
مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۵
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز مُتولّی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولّی تو صرف اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے، بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں[۲۸]۔ پس اب لو، اِس عذاب کا مزا چکھو، اپنے اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو[۲۹]۔ جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، وہ اپنے مال خدا کے راستے سے

تیار نہیں ہے۔

۲۸ – یہ اشارہ اس غلط فہمی کی تردید میں ہے جو لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی اور جس سے عام طور پر اہلِ عرب دھوکا کھا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش چونکہ بیت اللہ کے مجاور اور مُتولّی ہیں اور وہاں عبادت بجالاتے ہیں، اس لیے ان پر اللہ کا فضل ہے۔ اس کے ردّ میں فرمایا کہ محض میراث میں مُجاوِرت اور تولِیَت پا لینے سے کوئی شخص یا گروہ کسی عبادت گاہ کا جائز مجاور و متولّی نہیں ہو سکتا۔ جائز مُجاوِر و متولّی تو صرف خدا ترس اور پرہیز گار لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اور اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک جماعت کو، جو خالص خدا کی عبادت کرنے والی ہے، اُس عبادت گاہ میں آنے سے روکتے ہیں جو خالص خدا کی عبادت ہی کے لیے وقف کی گئی تھی۔ اس طرح یہ متولّی اور خادم بن کر رہنے کے بجائے اس عبادت گاہ کے مالک بن بیٹھے ہیں اور اپنے آپ کو اس بات کا مختار سمجھنے لگے ہیں کہ جس سے یہ ناراض ہوں اسے عبادت گاہ میں نہ آنے دیں۔ یہ حرکت ان کے ناخدا ترس اور ناپرہیز گار ہونے کی صریح دلیل ہے۔ رہی ان کی عبادت جو وہ بیت اللہ میں کرتے ہیں، تو اس کے اندر نہ خُضوع وخُشوع ہے، نہ توجہ الی اللہ ہے، نہ ذکرِ الٰہی ہے، بس ایک بے معنیٰ شور وغل اور لَہو ولَعِب ہے جس کا نام انھوں نے عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ ایسی نام نہاد خدمتِ بیت اللہ اور ایسی جھوٹی عبادت پر آخر یہ فضلِ الٰہی کے مستحق کیسے ہو گئے اور یہ چیز انھیں عذابِ الٰہی سے کیونکر محفوظ رکھ سکتی ہے؟

۲۹ – وہ سمجھتے تھے کہ عذابِ الٰہی صرف آسمان سے پتھروں کی شکل میں یا کسی اور طرح قُوائے فطرت کے ہیجان ہی کی شکل میں آیا کرتا ہے۔ مگر یہاں انھیں بتایا گیا ہے کہ جنگِ بدر میں ان کی فیصلہ کُن شکست، جس کی وجہ سے اسلام کے لیے زندگی

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰہِ ؕ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ؕ
وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی جَہَنَّمَ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿۳۶﴾ۙ لِیَمِیۡزَ اللّٰہُ
الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجۡعَلَ الۡخَبِیۡثَ بَعۡضَہٗ عَلٰی بَعۡضٍ
فَیَرۡکُمَہٗ جَمِیۡعًا فَیَجۡعَلَہٗ فِیۡ جَہَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ
ع
الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا
قَدۡ سَلَفَ ۚ وَ اِنۡ یَّعُوۡدُوۡا فَقَدۡ مَضَتۡ سُنَّتُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۸﴾
وَ قَاتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ

روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے۔ مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لیے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنّم کی طرف گھیر لائے جائیں گے، تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے، پھر اس پلندے کو جہنّم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔[30] ع

اے نبیؐ! ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا

کا اور قدیم نظامِ جاہلیّت کے لیے موت کا فیصلہ ہوا ہے، دراصل ان کے حق میں اللہ کا عذاب ہی ہے۔

۳۰- اس سے بڑھ کر دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان جس راہ میں اپنا تمام وقت، تمام محنت، تمام قابلیت، اور پورا سرمایۂ زندگی کھپا دے، اُس کی انتہا پر پہنچ کر اُسے معلوم ہو کہ وہ اسے سیدھی تباہی کی طرف لے آئی ہے اور اس راہ میں جو کچھ اس نے کھپایا ہے، اس پر کوئی سود یا منافع پانے کے بجائے اسے اُلٹا جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔

لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

الجزء ۱۰

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ
وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

اللہ کے لیے ہو جائے۔[۳۱] پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے، اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔[۳۲]

---

۳۱ – یہاں پھر مسلمانوں کی جنگ کے اُسی ایک مقصد کا اِعادہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۳ میں بیان کیا گیا تھا۔ اس مقصد کا سلبی جُزیہ ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور ایجابی جُز یہ کہ دین بالکل اللہ کے لیے ہو جائے۔ بس یہی ایک اخلاقی مقصد ایسا ہے جس کے لیے لڑنا اہلِ ایمان کے لیے جائز بلکہ فرض ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے مقصد کی لڑائی جائز نہیں ہے اور نہ اہلِ ایمان کو زیبا ہے کہ اُس میں کسی طرح حصہ لیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حواشی ۲۰۴ و ۲۰۵)

۳۲ – یہاں اُس مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون بتایا ہے جس کے متعلق تقریر کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ یہ اللہ کا انعام ہے جس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کو حاصل ہے۔ اب وہ فیصلہ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ لڑائی کے بعد تمام سپاہی ہر طرح کا مالِ غنیمت لا کر امیر یا امام کے سامنے رکھ دیں اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھیں۔ پھر اس مال میں سے پانچواں حصّہ اُن اغراض کے لیے نکال لیا جائے جو آیت میں بیان ہوئی ہیں، اور باقی چار حصے ان سب لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں جنھوں نے جنگ میں حصّہ لیا ہو۔ چنانچہ اس آیت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ لڑائی کے بعد اعلان فرمایا کرتے تھے کہ ان ھٰذہ غنائمکم وانہ لیس لی فیھا الا نصیبی معکم الخمس والخمس مردود علیکم فادوا الخیط والمخیط واکبر من ذٰلک واصغر ولا تغلوا فان الغلول عار ونار" یہ غنائم تمہارے ہی لیے ہیں، میری اپنی ذات کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہے، بجز خُمس کے، اور وہ خُمس بھی تمہارے ہی اجتماعی مَصالح پر صَرف کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک ایک سُوئی اور ایک ایک تاگا تک لا کر رکھ دو، کوئی چھوٹی یا بڑی چیز چھپا کر نہ رکھو کہ ایسا کرنا شرمناک ہے اور اس کا

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا يَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ
يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۱﴾ اِذۡ اَنۡتُمۡ
بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰى وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ
مِنۡكُمۡ‌ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدْتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِى الۡمِيۡعٰدِ‌ۙ وَلٰـكِنۡ لِّيَقۡضِىَ
اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ۙ لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ

اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن، ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی،[۴۳] (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو)۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دُوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمھارے اور ان کے درمیان مقابلے کی قرارداد ہوچکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے، لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لیے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظُہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو

نتیجہ دوزخ ہے۔"

اس تقسیم میں اللہ اور رسولؐ کا حصہ ایک ہی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ خُمس کا ایک جُز اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دینِ حق کے کام میں صَرف کیا جائے۔

رشتہ داروں سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضورؐ ہی کے رشتہ دار تھے، کیونکہ جب آپؐ اپنا سارا وقت دین کے کام میں صرف فرماتے تھے اور اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپؐ کے لیے ممکن نہ رہا تھا، تو لامحالہ اِس کا انتظام ہونا چاہیے تھا کہ آپؐ کی اور آپؐ کے اہل و عیال اور اُن دوسرے اقربا کی، جن کی کفالت آپؐ کے ذمّے تھی، ضروریات پوری ہوں۔ اس لیے خُمس میں آپؐ کے اقربا کا حصہ رکھا گیا۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد ذَوِی القُربیٰ کا یہ حصّہ کس کو پہنچتا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حصہ منسُوخ ہوگیا۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ حضورؐ کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضورؐ کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصّہ خاندانِ نبوت کے فُقرا میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ جہاں تک مَیں تحقیق کر سکا ہوں، خلفائے راشدین کے زمانے میں اسی تیسری رائے پر عمل ہوتا تھا۔

وَّ یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۙ۴۲﴾ اِذۡ
یُرِیۡکَہُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَنَامِکَ قَلِیۡلًا ؕ وَ لَوۡ اَرٰىکَہُمۡ کَثِیۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ
وَ لَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾ وَ اِذۡ یُرِیۡکُمُوۡہُمۡ اِذِ الۡتَقَیۡتُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِکُمۡ قَلِیۡلًا
وَّ یُقَلِّلُکُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِہِمۡ لِیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ؕ

اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے[۳۴]، یقیناً خدا سُننے اور جاننے والا ہے[۳۵]۔

اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبیؐ! خدا اُن کو تمھارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا[۳۶]۔ اگر کہیں وہ تمھیں اُن کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملے میں جھگڑا شروع کر دیتے، لیکن اللہ ہی نے اِس سے تمھیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمھیں کم کر کے پیش کیا، تاکہ جو بات ہونی تھی اُسے اللہ ظہور میں لے آئے،

۳۳- یعنی وہ تائید و نصرت جس کی بدولت تمھیں فتح حاصل ہوئی۔

۳۴- یعنی ثابت ہو جائے کہ جو زندہ رہا اُسے زندہ ہی رہنا چاہیے تھا، اور جو ہلاک ہوا اسے ہلاک ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں زندہ رہنے والے اور ہلاک ہونے والے سے مراد افراد نہیں ہیں بلکہ اسلام اور جاہلیت ہیں۔

۳۵- یعنی خدا اندھا، بہرا، بے خبر خدا نہیں ہے بلکہ دانا و بینا ہے۔ اس کی خدائی میں اندھا دُھند کام نہیں ہو رہا ہے۔

۳۶- یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر مدینے سے نکل رہے تھے یا راستے میں کسی منزل پر تھے اور یہ متحقق نہ ہُوا تھا کہ کفار کا لشکر فی الواقع کتنا ہے۔ اس وقت حضوؐر نے خواب میں اس لشکر کو دیکھا اور جو منظر آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا اس سے آپؐ نے اندازہ لگایا کہ دشمنوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہی خواب آپؐ نے مسلمانوں کو سُنا دیا اور اس سے ہمت پا کر مسلمان آگے بڑھتے چلے گئے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۶

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً
فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ ع

اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو،[۳۷] یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور اُن لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اِتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔[۳۸]

۳۷- یعنی اپنے جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھو۔ جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور جچی تُلی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمھارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ وغضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرانے پائے۔ مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آ رہے ہوں تو اضطراب میں تمھارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصولِ مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمھارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد ومنافع اور لذاتِ نفس کی ترغیبات تمھیں اپنی طرف لُبھا رہی ہوں تو ان کے مقابلے میں بھی تمھارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔ یہ تمام مفہومات صرف ایک لفظ ''صبر'' میں پوشیدہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام حیثیات سے صابر ہوں، میری تائید انھی کو حاصل ہے۔

۳۸- اشارہ ہے کفارِ قریش کی طرف، جن کا لشکر مکے سے اس شان سے نکلا تھا کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں، جگہ جگہ ٹھیر کر رقص وسرود اور شراب نوشی کی محفلیں برپا کرتے جا رہے تھے، جو جو قبیلے اور قریے راستے میں ملتے تھے

وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ
جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ

جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا، اور یہ کہ میں تمھارے ساتھ ہوں مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ

ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے سرو سامان کا رعب جماتے تھے اور ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا ہمارے مقابلے میں کون سر اُٹھا سکتا ہے۔ یہ تو تھی ان کی اخلاقی حالت۔ اور اس پر مزید لعنت یہ تھی کہ ان کے نکلنے کا مقصد ان کے اخلاق سے بھی زیادہ ناپاک تھا۔ وہ اس لیے جان و مال کی بازی لگانے نہیں نکلے تھے کہ حق اور راستی اور انصاف کا عَلَم بلند ہو، بلکہ اس لیے نکلے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے، اور وہ اکیلا گروہ بھی جو دنیا میں اس مقصدِ حق کے لیے اٹھا ہے ختم کر دیا جائے، تاکہ اس عَلَم کو اُٹھانے والا دنیا بھر میں کوئی نہ رہے۔ اس پر مسلمانوں کو متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ تم کہیں ایسے نہ بن جانا۔ تمھیں اللہ نے ایمان اور حق پرستی کی جو نعمت عطا کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمھارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں اور تمھارا مقصدِ جنگ بھی پاک ہو۔

یہ ہدایت اُسی زمانے کے لیے نہ تھی، آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ کفار کی فوجوں کا جو حال اُس وقت تھا وہی آج بھی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈّے اور شراب کے پیپے ان کے ساتھ جُزوِ لاینفک کی طرح لگے رہتے ہیں۔ خفیہ طور پر نہیں بلکہ عَلَی الاعلان نہایت بے شرمی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ راشن مانگتے ہیں، اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی شہوات کا کھلونا بننے کے لیے پیش کرے۔ پھر بھلا کوئی دوسری قوم اِن سے کیا اُمید کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کی سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اُٹھا رکھیں گے۔ رہا ان کا تکبّر اور تفاخر، تو ان کے ہر سپاہی اور ہر افسر کی چال ڈھال اور اندازِ گفتگو میں وہ نمایاں دیکھا جا سکتا ہے، اور ان میں سے ہر قوم کے مدبرین کی تقریروں میں لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کی ڈینگیں سُنی جا سکتی ہیں۔ ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصدِ جنگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت مکّاری کے ساتھ دنیا کو یقین دلاتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر انسانیت کی فلاح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر درحقیقت ان کے پیشِ نظر ایک فلاحِ انسانیت ہی نہیں ہے، باقی سب کچھ ہے۔ ان کی لڑائی کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے، اس پر تنہا

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ
ع شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم
مَّرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ
يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾
ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ

میرا تمھارا ساتھ نہیں ہے، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ع جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، کہہ رہے تھے کہ اِن لوگوں کو تو اِن کے دین نے خبط میں مُبتلا کر رکھا ہے۔[۳۹] حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ کاش! تم اُس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی رُوحیں قبض کر رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: ”لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمھارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیّا کر رکھا تھا، ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا

ان کی قوم مُتصرّف ہو اور دوسرے اس کے چاکر اور دستِ نگر بن کر رہیں۔ پس اہلِ ایمان کو قرآن کی یہ دائمی ہدایت ہے کہ اِن فُسّاق و فُجّار کے طور طریقوں سے بھی بچیں اور اُن ناپاک مقاصد میں بھی اپنی جان و مال کھپانے سے پرہیز کریں جن کے لیے یہ لوگ لڑتے ہیں۔

۳۹- یعنی مدینہ کے منافقین اور وہ سب لوگ جو دنیا پرستی اور خدا سے غفلت کے مرض میں گرفتار تھے، یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت قریش جیسی زبردست طاقت سے ٹکرانے کے لیے جا رہی ہے، آپس میں کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دینی جوش میں دیوانے ہو گئے ہیں، اس معرکے میں ان کی تباہی یقینی ہے، مگر اس نبیؐ نے کچھ ایسا افسوں ان پر پھونک رکھا ہے کہ ان کی عقل خبط ہو گئی ہے اور آنکھوں دیکھے یہ موت کے منہ میں چلے جا رہے ہیں۔

لِّلْعَبِيْدِ ﴿٥١﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً
اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿٥٣﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ
فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٥٤﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٥﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ

نہیں ہے۔" یہ معاملہ ان کے ساتھ اُسی طرح پیش آیا جس طرح آلِ فرعون اور ان سے پہلے کے دُوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اِس سنّت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو، جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔[۴۰] اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ آلِ فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، وہ اسی ضابطے کے مطابق تھا۔ انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں ہلاک کیا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔

یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے

---

۴۰ - یعنی جب تک کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں بنا دیتی، اللہ اس سے اپنی نعمت

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡهُمۡ ثُمَّ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَهُمۡ فِىۡ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمۡ لَا
يَتَّقُوۡنَ ۝٥٦ فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِى الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ

ساتھ تُو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔[۴۱] پس اگر یہ لوگ تمھیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دُوسرے لوگ ایسی روش

سلب نہیں کیا کرتا۔

۴۱ - یہاں خاص طور پر اشارہ ہے یہود کی طرف۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے انھی کے ساتھ حُسنِ جوار اور باہمی تعاون و مددگاری کا معاہدہ کیا تھا اور اپنی حد تک پوری کوشش کی تھی کہ ان سے خوش گوار تعلقات قائم رہیں۔ نیز دینی حیثیت سے بھی آپؐ یہود کو مشرکین کی بہ نسبت اپنے سے قریب تر سمجھتے تھے اور ہر معاملے میں مشرکین کے بالمقابل اہلِ کتاب ہی کے طریقے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اُن کے علما اور مشائخ کو توحیدِ خالص اور اخلاقِ صالحہ کی وہ تبلیغ اور اعتقادی و عملی گمراہیوں پر وہ تنقید اور اقامتِ دینِ حق کی وہ سعی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، ایک آن نہ بھاتی تھی، اور ان کی پیہم کوشش یہ تھی کہ یہ نئی تحریک کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔ اسی مقصد کے لیے وہ مدینے کے منافق مسلمانوں سے ساز باز کرتے تھے۔ اسی کے لیے وہ اَوس اور خَزرَج کے لوگوں میں ان پُرانی عداوتوں کو بھڑکاتے تھے جو اسلام سے پہلے ان کے درمیان کُشت و خون کی موجب ہُوا کرتی تھیں۔ اسی کے لیے قریش اور دوسرے مخالفِ اسلام قبیلوں سے ان کی خفیہ سازشیں چل رہی تھیں، اور یہ سب حرکات اُس معاہدۂ دوستی کے باوجود ہو رہی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان لکھا جا چکا تھا۔ جب جنگِ بدر واقع ہوئی تو ابتدا میں ان کو توقع تھی کہ قریش کی پہلی ہی چوٹ اس تحریک کا خاتمہ کر دے گی۔ لیکن جب نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تو اُن کے سینوں کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ انھوں نے اس اندیشے سے کہ بدر کی فتح کہیں اسلام کی طاقت کو ایک مستقل ”خطرہ“ نہ بنا دے، اپنی مخالفانہ کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ حتّٰی کہ اُن کا ایک لیڈر کَعب بن اشرف (جو قریش کی شکست سنتے ہی چیخ اُٹھا تھا کہ آج زمین کا پیٹ ہمارے لیے اُس کی پیٹھ سے بہتر ہے) خود مکہ گیا اور وہاں اس نے ہیجان انگیز مرثیے کہہ کہہ کر قریش کو انتقام کا جوش دلایا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے بس نہ کی۔ یہودیوں کے قبیلۂ بنی قَینُقاع نے معاہدۂ حُسنِ جوار کے خلاف ان مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا جو ان کی بستی میں کسی کام سے جاتی تھیں۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حرکت پر ملامت کی تو انھوں نے جواب میں دھمکی دی کہ ”یہ قریش نباشد، ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں اور لڑنا جانتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں آؤ گے تب تمھیں پتا چلے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔“

مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ
خِيَانَةً فَانْۢبِذْ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ

اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔[۴۲] توقع ہے کہ بدعہدوں کے اِس انجام سے وہ سبق لیں گے۔ اور اگر کبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو عَلانیہ اس کے آگے پھینک دو،[۴۳] یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرینِ حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے،

۴۲ – اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدانہ ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصّہ لے، تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہو اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایک ایسی قوم کے افراد بھی شریکِ جنگ ہیں جس سے ہمارا معاہدہ ہے، تو ہم ان کو قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سا معاملہ کرنے میں ہرگز کوئی تأمّل نہ کریں گے، کیونکہ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اِس کا مستحق نہیں رہنے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملے میں اس معاہدے کا احترام ملحوظ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔

۴۳ – اس آیت کی رُو سے ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے، یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا، تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریقِ ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا، تاکہ فسخِ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے، ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اُصول قرار دیا تھا کہ من کان بینه وبین قوم عهد فلا یحلن عقدة حتی ینقضی امدها او ینبذ الیهم علی سواء۔ ''جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو، اسے چاہیے کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔'' پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اُصول یہ قائم کیا تھا کہ لا تخن من خانك ''جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے

Maktaba Tul Ishaat.com

خیانت نہ کر۔'' اور یہ اُصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ بادشاہی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدے کی مدّت ختم ہوتے ہی یکایک رُومی علاقے پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عَمْروؓ بن عَنْبَسَہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سُنا کر کہا کہ معاہدے کی مدّت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیر معاویہؓ کو اُس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماعِ فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ حال کی مہذّب جاہلیّت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگِ عظیم دوم میں رُوس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف رُوس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عُموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے مُطّلَع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اُٹھا لیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مَصلحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے اُن بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ فریقِ ثانی علی الاعلان معاہدے کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیتِ مذکورۂ بالا کے مطابق فسخِ معاہدہ کا نوٹس دیں، بلکہ ہمیں اِس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ اِستثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خُزاعہ کے معاملے میں صلحِ حُدَیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپؐ نے پھر انھیں فسخِ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بلا اطلاع مکے پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدۂ استثنا سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیشِ نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی، تاکہ پیروی ہو تو آپؐ کے پورے طرزِ عمل کی ہو، نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جُز کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً، قریش کی خلاف ورزیِ عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نَقضِ عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انھوں نے خود ابوسفیان کو تجدیدِ عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا، جس کے صاف معنیٰ یہی تھے کہ اُن کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقضِ عہد قوم کو خود بھی اپنے نَقضِ عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ یقیناً ضروری ہے کہ نقضِ عہد بالکل صریح اور غیر مُشتَبَہ ہو۔

ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتاً یا اشارتاً و کنایتاً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایما نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک اُن کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور

إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔

اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلے کے لیے مہیّا رکھو[۴۴] تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمھارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

ان کے ساتھ آپؐ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آ کر تجدیدِ معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً: قریش کے خلاف جنگی کارروائی آپؐ نے خود کی اور کُھلّم کُھلّا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپؐ کے طرزِ عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حَسَنہ ہے، لہٰذا آیتِ مذکورۂ بالا کے حکمِ عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقے سے کی جاسکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہد قوم سے کسی معاملے میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گُفت و شنید یا بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی، یا یہ کہ فریقِ ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تُلا ہُوا ہے، تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں لیکن آیتِ مذکورۂ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمالِ طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کُھلّم کُھلّا ہونا چاہیے۔ چوری چھپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا عَلانِیَہ اقرار کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں، ایک بداخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔

۴۴ – اس سے مطلب یہ ہے کہ تمھارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج (standing army) ہر وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ
حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ۙ
وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ
اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ

اور اے نبیؐ! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو، یقیناً وہی سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمھارے لیے اللہ کافی ہے[۴۵]۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تم رُوئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو اِن لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے[۴۶]، یقیناً وہ

تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضا کار اور اسلحہ اور سامان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔

۴۵ - یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمھاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسے پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے، بے تکلّف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہرحال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خوں ریزی کو طول کیوں دو۔ اور اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمھیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمھاری اخلاقی برتری ثابت ہو، اور لڑائی کے لیے اُٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوتِ بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمھیں نرم چارا سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

۴۶ - اشارہ ہے اُس بھائی چارے اور اُلفت و محبّت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہلِ عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جتھّا بنا دیا تھا، حالانکہ اس جتھّے کے افراد اُن مختلف قبیلوں سے نکلے ہوئے تھے جن کے درمیان

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ
اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ
يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ

ع ۸

بڑا زبردست اور دانا ہے۔ اے نبیؐ! تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہلِ ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔ؑ

اے نبیؐ! مومنوں کو جنگ پر اُبھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرینِ حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔[47] اچھا، اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں

صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ خُصوصیت کے ساتھ اللہ کا یہ فضل اَوس وخَزرَج کے معاملے میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور مشہور جنگِ بُعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے، جس میں اَوس نے خَزرَج کو اور خَزرَج نے اَوس کو گویا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو تین سال کے اندر گہری دوستی و برادری میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزا کو جوڑ کر ایسی ایک بُنیانِ مَرصوص بنا دینا جیسی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی جماعت تھی، یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا اور دنیوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تائید ونصرت نے یہ کچھ کر دکھایا ہے تو آیندہ بھی تمھاری نظر دنیوی اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تائید پر ہونی چاہیے، کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا۔

۴۷ – آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو قوتِ معنوی یا قوتِ اخلاقی (morale) کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی کو فقہ وفہم اور سمجھ بُوجھ (understanding) سے تعبیر کیا ہے، اور یہ لفظ اس مفہوم کے لیے جدید اصطلاح سے زیادہ سائنٹفک ہے۔ جو شخص اپنے مقصد کا صحیح شعور رکھتا ہو اور ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر اس لیے لڑ رہا ہو کہ جس چیز کے لیے وہ جان کی بازی لگانے آیا ہے، وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ ۚ وَ
اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ اَلۡفٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَيۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ
الصّٰبِرِيۡنَ ۝٦٦ مَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى
يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ تُرِيۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ

کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں [۴۸] گے، اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

کسی نبیؐ کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر

وہ بے شُعوری کے ساتھ لڑنے والے آدمی سے کئی گُنی زیادہ طاقت رکھتا ہے، اگرچہ جسمانی طاقت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ پھر جس شخص کو حقیقت کا شُعور حاصل ہو، جو اپنی ہستی اور خدا کی ہستی اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق اور حیاتِ دنیا کی حقیقت اور موت کی حقیقت اور حیات بعدِ موت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو، اور جسے حق اور باطل کے فرق اور غلبۂ باطل کے نتائج کا بھی صحیح اِدراک ہو، اس کی طاقت کو تو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیّت یا وطنیّت یا طبقاتی نزاع کا شُعور لیے ہوئے میدان میں آئیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ ایک سمجھ بُوجھ رکھنے والے مومن اور ایک کافر کے درمیان حقیقت کے شعور اور عَدمِ شُعور کی وجہ سے فطرتاً ایک اور دس کی نسبت ہے۔ لیکن یہ نسبت صرف سمجھ بُوجھ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صبر کی صفت بھی ایک لازمی شرط ہے۔

۴۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب چونکہ تم میں کمزوری آ گئی ہے اس لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی گئی ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہلِ ایمان اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت ہے، لیکن چونکہ ابھی تم لوگوں کی اَخلاقی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک تمہارا شعور اور تمہاری سمجھ بُوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہنچا ہے، اس لیے سرِدست بر بیلِ تنزّل تم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرانے میں تو تمھیں کوئی تامّل نہ ہونا چاہیے۔ خیال رہے کہ یہ ارشاد ۲ ھ کا ہے جب کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ ہی داخلِ اسلام ہوئے تھے اور ان کی تربیت ابتدائی حالت میں تھی۔ بعد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں یہ لوگ پختگی کو پہنچ گئے تو فی الواقع ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت قائم ہو گئی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے کی لڑائیوں میں بارہا اس کا تجربہ ہُوا ہے۔

الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٦٧ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ
لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٦٨ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ
حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٦٩ ع

ع ۵ ۵

آخرت ہے، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔[۴۹] یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

۴۹ – اس آیت کی تفسیر میں اہلِ تاویل نے جو روایات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ جنگِ بدر میں لشکرِ قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے تھے، ان کے متعلق بعد میں مشورہ ہُوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ قتل کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے قبول کی اور فدیے کا معاملہ طے کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات بطورِ عتاب نازل فرمائیں۔ مگر مفسرین آیت کے اس فقرے کی کوئی معقول تاویل نہیں کر سکے ہیں کہ ”اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا“۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد تقدیرِ الٰہی ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ ارادہ فرما چکا تھا کہ مسلمانوں کے لیے غنائم کو حلال کر دے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک وحیِ تشریعی کے ذریعے سے کسی چیز کی اجازت نہ دی گئی ہو، اس کا لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت پوری اسلامی جماعت اس تاویل کی رُو سے گناہ گار قرار پاتی ہے اور ایسی تاویل کو اخبارِ اٰحاد کے اعتماد پر قبول کر لینا ایک بڑی ہی سخت بات ہے۔

میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے سورۂ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی تھیں، ان میں یہ ارشاد ہُوا تھا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّا ۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (آیت ۴)۔ اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دے دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رُو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ وُصول کیا، وہ تھا تو اجازت کے مطابق، مگر غلطی یہ ہوئی کہ ”دشمن کی طاقت کو کچل دینے“ کی جو شرط مقدّم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت لُوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دُور تک تعاقب کیا۔ حالاں کہ اگر مسلمان پوری طاقت سے اُن کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اُسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے، اور یہ عتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ
اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ
فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ۝۷۱ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

اے نبیؐ! تم لوگوں کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے کہو: اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمھارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمھیں اُس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھاری خطائیں معاف کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انھیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم ہے۔
جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے

فرمانِ مبارک کا منشا یہ ہے کہ ”تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو۔ نبیؐ کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے، بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہِ راست تعلق رکھتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب ہو جاتا ہے۔ پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا، پھر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے غنیمت لُوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے، پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر تمھیں سخت سزا دیتے۔ خیر اب جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھا لو، مگر آیندہ ایسی رَوِش سے بچتے رہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔“ میں اس رائے پر پہنچ چکا تھا کہ امام جصّاص کی کتاب ”احکام القرآن“ میں یہ دیکھ کر مجھے مزید اطمینان حاصل ہوا کہ امام موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابلِ لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں۔ پھر سیرت ابنِ ہشام میں یہ روایت نظر سے گزری کہ جس وقت مجاہدینِ اسلام مالِ غنیمت لُوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہوئے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت سعدؓ بن مُعاذ کے چہرے پر کچھ کراہت کے آثار ہیں۔ حضورؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”اے سعد! معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمھیں پسند نہیں آرہی ہے۔“ انھوں نے عرض کیا: ”جی ہاں، یا رسولؐ اللہ! یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا
لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ

مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمھارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں[۵۰]۔ ہاں اگر وہ

نے اہلِ شرک کو شکست دلوائی ہے، اس موقع پر انھیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچا لینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا۔'' (جلد ۲، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱)

۵۰- یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے۔ اس میں یہ اُصول مقرر کیا گیا ہے کہ ''ولایت'' کا تعلق صرف اُن مسلمانوں کے درمیان ہو گا جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آ جائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حُدودِ ارضی سے باہر ہوں، تو اُن کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن ''ولایت'' کا تعلق نہ ہو گا، اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلقِ ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دارالاسلام میں آئیں۔ ''ولایت'' کا لفظ عَرَبی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اس آیت کے سِیاق و سَباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے، اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت ''دستوری و سیاسی ولایت'' کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتے سے خارج قرار دیتی ہے۔ اِس عَدَمِ ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اسی عَدَمِ ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے قانونی ولی (guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو۔ علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رُو سے دولتِ اسلامیہ کی ذمہ داری اُن مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کے حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کے لیے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ انا بریٔ من کل مسلم بین ظھرانی المشرکین۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔[۵۱] جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکرِ حق ہیں

''میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔'' اِس طرح اسلامی قانون نے اُس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی اُلجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سُلجھا سکتیں۔

۵۱ – اُوپر کی آیت میں دار الاسلام سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو ''سیاسی ولایت'' کے رشتے سے خارج قرار دیا گیا تھا۔ اب یہ آیت اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ اس رشتے سے خارج ہونے کے باوجود وہ ''دینی اخوت'' کے رشتے سے خارج نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ اسلامی برادری کے تعلق کی بنا پر دار الاسلام کی حکومت اور اس کے باشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔ لیکن اس کے بعد مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ اندھا دُھند انجام نہیں دیا جائے گا، بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے ہی انجام دیا جا سکے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دار الاسلام کے مُعاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو اِن تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آیت میں معاہدے کے لیے ''میثاق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادّہ ''وثوق'' ہے، جو عربی زبان کی طرح اُردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اُس چیز کو کہیں گے جس کی بنا پر کوئی قوم بطریقِ معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے، قطعِ نظر اس سے کہ ہمارا اُس کے ساتھ صریح طور پر عدمِ محاربہ کا عہد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

پھر آیت میں بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی ''تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو۔'' اس سے یہ صاف مُترشح ہوتا ہے کہ دار الاسلام کی حکومت نے جو معاہدانہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کیے ہوں، وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں اور ان کی اخلاقی ذمہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔ اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً جائز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے، ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد سُبک دوش رہیں۔ البتہ

بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى
الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ ؕ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَ
جٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰۤـئِكَ هُمُ
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا مَعَكُمۡ فَاُولٰۤـئِكَ مِنۡكُمۡ ؕ
وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰى بِبَعۡضٍ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۷۵﴾ ع

ع ۱۰

وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔[۵۲]

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جِدّوجُہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمھارے ساتھ مل کر جِدّوجُہد کرنے لگے، وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔ مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں،[۵۳] یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

حکومتِ دارالاسلام کے معاہدات کی پابندیاں صرف اُن مسلمانوں پر ہی عائد ہوں گی جو اس حکومت کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوں۔ اس دائرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ داریوں میں شریک نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حُدَیبِیہ میں جو صلح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ سے کی تھی، اس کی بنا پر کوئی پابندی حضرت ابوبصیرؓ اور ابوجندلؓ اور اُن دوسرے مسلمانوں پر عائد نہیں ہوئی جو دارالاسلام کی رعایا نہ تھے۔

۵۲ — اِس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کفار ایک دوسرے کی حمایت

Maktaba Tul Ishaat.com

کرتے ہیں، اگر تم اہلِ ایمان اُسی طرح آپس میں ایک دوسرے کی حمایت نہ کرو تو زمین میں فتنہ اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔ اور اگر اس کا تعلق اُن تمام ہدایات سے مانا جائے جو آیت ۷۲ سے یہاں تک دی گئی ہیں، تو اِس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے ولی نہ بنیں، اور اگر ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آنے والے اور دارالکفر میں مقیم رہنے والے مسلمانوں کو اہلِ دارالاسلام اپنی سیاسی ولایت سے خارج نہ سمجھیں، اور اگر باہر کے مظلوم مسلمانوں کے مدد مانگنے پر ان کی مدد نہ کی جائے، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ اس قاعدے کی پابندی بھی نہ کی جائے کہ جس قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو اس کے خلاف مدد مانگنے والے مسلمانوں کی مدد نہ کی جائے گی، اور اگر مسلمان کافروں سے موالات کا تعلق ختم نہ کریں، تو زمین میں فتنہ اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔

۵۳- مراد یہ ہے کہ اسلامی بھائی چارے کی بنا پر میراث قائم نہ ہوگی اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کے تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں، دینی بھائیوں کو ایک دوسرے کے معاملے میں حاصل ہوں گے۔ ان اُمور میں اسلامی تعلق کے بجائے رشتہ داری کا تعلق ہی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔ یہ ارشاد اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات کرائی تھی، اس کی وجہ سے بعض لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دینی بھائی ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے۔

تفہیم القرآن

التوبہ

(۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

التوبہ

نام یہ سورہ دو ناموں سے مشہور ہے: ایک التوبہ، دوسرے البراءۃ۔ توبہ اس لحاظ سے کہ اس میں ایک جگہ بعض اہلِ ایمان کے قصوروں کی معافی کا ذکر ہے۔ اور براءۃ اس لحاظ سے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بَرِیُ الذِمّہ ہونے کا اعلان ہے۔

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی جاتی۔ اس کے متعدد وُجوہ مفسّرین نے بیان کیے ہیں، جن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مگر صحیح بات وہی ہے جو امام رازیؒ نے لکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی اس لیے صحابۂ کرامؓ نے بھی نہیں لکھی اور بعد کے لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جُوں کا تُوں لینے اور جیسا دیا گیا تھا ویسا ہی اس کو محفوظ رکھنے میں کس درجے احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول و اجزائے سُورہ یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے:

پہلی تقریر آغازِ سورہ سے پانچویں رُکوع کے آخر تک چلتی ہے۔ اس کا زمانۂ نُزول ذی القَعدہ ۹ھ یا اس کے لگ بھگ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس سال حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحاجّ مقرر کر کے مکہ روانہ کر چکے تھے کہ یہ تقریر نازل ہوئی اور حضورؐ نے فوراً سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے بھیجا، تاکہ حج کے موقع پر تمام عرب کے نمایندہ اجتماع میں اسے سنائیں اور اس کے مطابق جو طرزِ عمل تجویز کیا گیا تھا اس کا اعلان کر دیں۔

دوسری تقریر رکوع ٦ کی ابتدا سے رکوع ۹ کے اختتام تک چلتی ہے، اور یہ رجب ۹ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ اس میں اہلِ ایمان کو جہاد پر اُکسایا گیا ہے اور اُن لوگوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جو نفاق یا ضعفِ ایمان یا سُستی و کاہلی کی وجہ سے راہِ خدا میں جان و مال کا زیاں برداشت کرنے سے جی چُرا رہے تھے۔

تیسری تقریر رُکوع ۱۰ سے شروع ہو کر سورت کے ساتھ ختم ہوتی ہے، اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں متعدد ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو انھی ایام میں مختلف مواقع پر اُترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ الٰہی سے ان سب کو یکجا کر کے ایک سلسلۂ تقریر میں منسلک کر دیا۔ مگر چونکہ وہ ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلۂ واقعات سے متعلق ہیں، اس لیے ربطِ تقریر میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا۔

اس میں منافقین کی حرکات پر تنبیہ، غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر زجر و توبیخ، اور اُن صادق الایمان لوگوں پر ملامت کے ساتھ معافی کا اعلان ہے جو اپنے ایمان میں سچّے تو تھے مگر جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے سے باز رہے تھے۔

نزولِ ترتیب کے لحاظ سے پہلی تقریر سب سے آخر میں آنی چاہیے تھی، لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے وہی سب سے مقدم تھی، اس لیے مُصحَف کی ترتیب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہلے رکھا اور بقیہ دونوں تقریروں کو مؤخر کر دیا۔

تاریخی پس منظر زمانۂ نزول کی تعیین کے بعد ہمیں اس سورہ کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ جس سلسلۂ واقعات سے اس کے مضامین کا تعلق ہے، اس کی ابتدا صلحِ حُدَیبِیَہ سے ہوتی ہے۔ حُدَیبِیَہ تک چھ سال کی مسلسل جدّوجُہد کا نتیجہ اِس شکل میں رُونما ہو چکا تھا کہ عرب کے تقریباً ایک تہائی حصے میں اسلام ایک منظم سوسائٹی کا دین، ایک مکمل تہذیب وتمدّن، اور ایک کامل بااختیار ریاست بن گیا تھا۔ حدیبیہ کی صلح جب واقع ہوئی تو اس دین کو یہ موقع بھی حاصل ہو گیا کہ اپنے اثرات نسبتاً زیادہ امن واطمینان کے ماحول میں ہر چہار طرف پھیلا سکے۔[1] اس کے بعد واقعات کی رفتار نے دو بڑے راستے اختیار کیے، جو آگے چل کر نہایت اہم نتائج پر منتہی ہوئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق عرب سے تھا اور دوسرے کا سلطنتِ رُوم سے۔

عرب کی تسخیر عرب میں حُدَیبِیَہ کے بعد دعوت وتبلیغ اور استحکام قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں، ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام کا دائرۂ اثر اتنا پھیل گیا اور اس کی طاقت اتنی زبردست ہو گئی کہ پرانی جاہلیت اس کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ آخرِ کار جب قریش کے زیادہ پُرجوش عناصر نے بازی ہَرتی دیکھی تو انھیں یارائے ضبط نہ رہا اور انھوں نے حُدَیبِیَہ کے معاہدے کو توڑ ڈالا۔ وہ اس بندش سے آزاد ہو کر اسلام سے ایک آخری فیصلہ کُن مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس عہد شکنی کے بعد ان کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا اور اچانک مکہ پر حملہ کر کے رمضان ۸ ھ میں اسے فتح کر لیا۔[2] اس کے بعد قدیم جاہلی نظام نے آخری حرکتِ مذبُوحی حُنَین کے میدان میں کی جہاں ہَوازِن، ثَقِیف، نَضر، جُشَم اور بعض دوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت لا کر جھونک دی، تاکہ اُس اصلاحی انقلاب کو روکیں جو فتحِ مکہ کے بعد تکمیل کے مرحلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن یہ حرکت بھی ناکام ہوئی اور حُنَین کی شکست کے ساتھ عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو گیا کہ اسے اب دارالاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعے پر پورا ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا اور نظامِ جاہلیت کے صرف چند پراگندہ عناصر

---

[1] تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: دیباچہ سورۂ مائدہ و سورۂ فتح۔

[2] دیکھو سورۂ انفال، حاشیہ ۴۳۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے۔ اس نتیجے کے حدِکمال تک پہنچنے میں اُن واقعات سے اور زیادہ مدد ملی جو شمال میں سلطنتِ رُوم کی سرحد پر اُسی زمانے میں پیش آ رہے تھے۔ وہاں جس جرأت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار کا زبردست لشکر لے کر گئے اور رومیوں نے آپؐ کے مقابلے پر آنے سے پہلوتہی کر کے جو کمزوری دکھائی، اس نے تمام عرب پر آپؐ کی اور آپؐ کے دین کی دھاک بٹھا دی اور اس کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ تبوک سے واپس آتے ہی حضورؐ کے پاس عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہو گئے اور وہ اسلام و اطاعت کا اقرار کرنے لگے۔[1] چنانچہ اسی کیفیت کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ ’’جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہوئی اور تُو نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔‘‘

غزوۂ تبوک رُومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کی ابتدا فتحِ مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حُدَیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے، ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحدِ شام سے مُتّصِل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے۔ ان لوگوں نے ذات الطَّلح (یا ذاتِ اَطلاح) کے مَقام پر اس وفد کے ۱۵ آدمیوں کو قتل کر دیا اور صرف رئیسِ وفد کعبؓ بن عُمَیر غِفاری بچ کر واپس آئے۔ اسی زمانے میں حضورؐ نے بُصریٰ کے رئیس شُرَحبِیل بن عَمرو کے نام بھی دعوتِ اسلام کا پیغام بھیجا تھا، مگر اُس نے آپؐ کے ایلچی حارثؓ بن عُمَیر کو قتل کر دیا۔ یہ رئیس بھی عیسائی تھا اور براہِ راست قیصرِ روم کے احکام کا تابع تھا۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جُمادی الاُولیٰ ۸ ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحدِ شام کی طرف بھیجی، تاکہ آیندہ کے لیے یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے پُر امن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ فوج جب مَعان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شُرَحبِیل بن عَمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلے پر آ رہا ہے، خود قیصرِ روم حِمص کے مَقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے۔ لیکن ان خوفناک اِطّلاعات کے باوجود ۳ ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور مُؤتہ کے مقام پر شُرَحبِیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس تہوّر کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجاہدینِ اسلام بالکل پِس جاتے، لیکن سارا عرب اور تمام شَرقِ اوسط یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اِس مقابلے میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو، بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی، جو کِسریٰ کے زیرِ اثر تھے، اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سُلَیم (جن کے سردار عباس بن مِرداس سُلَمی تھے)

[1] محدثین نے اِس موقع پر جن قبائل اور امراء و مُلوک کے وفود کا ذکر کیا ہے ان کی مجموعی تعداد ۷۰ تک پہنچتی ہے، جو عرب کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب، ہر علاقے سے آئے تھے۔

اور اَشجَع اور غَطفان اور ذُبیان اور فَزارَہ کے لوگ اسی زمانے میں داخلِ اسلام ہوئے۔ اور اسی زمانے میں سلطنتِ روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فَرْوَہ بن عَمْرو الجُذامی مسلمان ہوا، جس نے اپنے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ گردوپیش کے سارے علاقے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ قیصر کو جب فَرْوَہ کے قبولِ اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے انھیں گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے کہا کہ دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کرلو۔ یا ترکِ اسلام جس کے نتیجے میں تم کو نہ صرف رہا کیا جائے گا بلکہ تمھیں اپنے عہدے پر بھی بحال کر دیا جائے گا، یا اسلام جس کے نتیجے میں تمھیں سزائے موت دی جائے گی۔ انھوں نے ٹھنڈے دل سے اسلام کو چُن لیا اور راہِ حق میں جان دے دی۔ یہی واقعات تھے جنھوں نے قیصر کو اُس ''خطرے'' کی حقیقی اہمیت محسوس کرائی جو عرب سے اُٹھ کر اس کی سلطنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوۂ مُوتہ کی سزا دینے کے لیے سرحدِ شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غَسّانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپؐ ہر وقت ہر اُس چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی خبردار رہتے تھے جس کا اسلامی تحریک پر کچھ بھی مُوافق یا مخالف اثر پڑتا ہو۔ آپؐ نے ان تیاریوں کے معنیٰ فوراً سمجھ لیے اور بغیر کسی تأمُّل کے قیصر کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت، جس پر حُنَین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی، پھر جی اُٹھتی۔ دوسری طرف مدینہ کے منافقین، جو ابو عامر راہب کے واسطے سے غسّان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے، اور جنھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر دین داری کا پردہ ڈالنے کے لیے مدینہ سے متصل ہی مسجدِ ضِرار تعمیر کر رکھی تھی، بغل میں چُھرا گھونپ دیتے۔ سامنے سے قیصر، جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دُور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا، حملہ آور ہو جاتا۔ اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔ اس لیے باوجود اِس کے کہ ملک میں قحط سالی تھی، گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا، فصلیں پکنے کے قریب تھیں، سواریوں اور سرو سامان کا انتظام سخت مشکل تھا، سرمایے کی بہت کمی تھی اور دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ درپیش تھا، خدا کے نبی نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوتِ حق کے لیے زندگی و موت کے فیصلے کی گھڑی ہے، اسی حال میں تیاریِ جنگ کا اعلانِ عام کر دیا۔ پہلے تمام غزوات میں تو حضُورؐ کا قاعدہ تھا کہ آخر وقت تک کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کدھر جانا ہے اور کس سے مقابلہ درپیش ہے، بلکہ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی منزلِ مقصود کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے۔ لیکن اس موقع پر آپؐ نے یہ پردہ بھی نہ رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

اس موقع کی نزاکت کو عرب میں سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ جاہلیتِ قدیمہ کے بچے کُھچے عاشقوں

Maktaba Tul Ishaat.com

کے لیے یہ ایک آخری شعاعِ اُمید تھی اور رُوم و اسلام کی اس ٹکر کے نتیجے پر وہ بے چینی کے ساتھ نگاہیں لگائے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر کہیں سے اُمید کی جھلک نہیں دکھائی دیتی ہے۔ منافقین نے بھی اپنی آخری بازی اسی پر لگادی تھی اور وہ اپنی مسجدِ ضِرار بنا کر اس انتظار میں تھے کہ شام کی جنگ میں اسلام کی قسمت کا پانسا پلٹے تو اِدھر اندرونِ ملک میں وہ اپنے فتنہ کا عَلَم بلند کریں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس مہم کو ناکام کرنے کے لیے تمام ممکن تدبیریں بھی استعمال کر ڈالیں۔ ادھر مومنینِ صادقین کو بھی پورا احساس تھا کہ جس تحریک کے لیے ۲۲ سال سے وہ سربکف رہے ہیں، اِس وقت اس کی قسمت ترازو میں ہے، اس موقع پر جرأت دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ اس تحریک کے لیے ساری دنیا پر چھا جانے کا دروازہ کُھل جائے، اور کمزوری دکھانے کے معنٰی یہ ہیں کہ عرب میں بھی اس کی بساط اُلٹ جائے۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ ان فدائیانِ حق نے انتہائی جوش وخروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کر دی۔ غریب صحابیوں نے محنت مزدوری کر کر کے جو کچھ کمایا، لا کر حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر دے دیے۔ سرفروش والنٹیروں کے لشکر کے لشکر ہر طرف سے اُمنڈ اُمنڈ کر آنے شروع ہوئے اور انھوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ جن کو سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسولِ پاکؐ کا دل بھر آتا تھا۔ یہ موقع عملاً ایمان اور نِفاق کے امتیاز کی کسوٹی بن گیا تھا، حتّٰی کہ اس وقت پیچھے رہ جانے کے معنٰی یہ تھے کہ اسلام کے ساتھ آدمی کے تعلّق کی صداقت ہی مُشتَبہ ہو جائے۔ چنانچہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے دَورانِ سفر میں جو جو شخص پیچھے رہ جاتا تھا، صحابۂ کرامؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیتے تھے اور جواب میں حضوؐر برجستہ فرماتے تھے کہ دعوہ فان یك فیه خیر فسیلحقه اللّٰه بکم وان یك غیر ذٰلك فقد اراحکم اللّٰه منه۔ ”جانے دو، اگر اس میں کچھ بھلائی ہے تو اللہ اسے پھر تمھارے ساتھ لا ملائے گا، اور اگر کچھ دوسری حالت ہے تو شکر کرو کہ اللہ نے اس کی جھوٹی رفاقت سے تمھیں خلاصی بخشی۔“

رجب ۹ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے جن میں دس ہزار سوار تھے۔ اُونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اُونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت مستزاد۔ مگر جس عزمِ صادق کا ثبوت اس نازک موقع پر مسلمانوں نے دیا، اس کا ثمرہ تبوک پہنچ کر انھیں نقد مل گیا۔ وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ قیصر اور اس کے تابعین نے مقابلے پر آنے کے بجائے اپنی فوجیں سرحد سے ہٹا لی ہیں اور اب کوئی دشمن موجود نہیں ہے کہ اس سے جنگ کی جائے۔

سیرت نگار بالعموم اس واقعے کو اس انداز سے لکھ جاتے ہیں کہ گویا وہ خبر ہی سرے سے غلط نکلی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رُومی افواج کے اجتماع کے متعلق ملی تھی۔ حالانکہ دراصل واقعہ یہ تھا کہ قیصر نے اجتماعِ افواج شروع کیا تھا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلے پر پہنچ گئے تو اس نے سرحد سے فوجیں ہٹالینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ غزوۂ مُوتہ میں ۳ ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلے کی جو شان وہ دیکھ چکا تھا، اُس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود نبیؐ کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں وہ لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا۔

قیصر کے یوں طرح دے جانے سے جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور بجائے اس کے کہ تبوک سے آگے بڑھ کر سرحدِ شام میں داخل ہوتے، آپؐ نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس فتح سے انتہائی ممکن سیاسی و حربی فوائد حاصل کرلیں۔ چنانچہ آپؐ نے تبوک میں ۲۰ دن ٹھیر کر اُن بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنتِ روم اور دار الاسلام کے درمیان واقع تھیں اور اب تک رومیوں کے زیرِ اثر رہی تھیں، فوجی دباؤ سے سلطنتِ اسلامی کا باج گذار اور تابعِ امر بنالیا۔ اس سلسلے میں دُومۃُ الجَندَل کے عیسائی رئیس اُکَیدِر بن عبدالملک کندی، اَیلہ کے عیسائی رئیس یُوحَنّا بن رُؤبہ، اور اسی طرح مَقنا، جَرْبا اور اَذْرُح کے نصرانی رُؤسا نے بھی جزیہ ادا کرکے مدینہ کی تابعیت قبول کی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حدودِ اقتدار براہِ راست رومی سلطنت کی سرحد تک پہنچ گئے اور جن عرب قبائل کو قیاصرۂ روم اب تک عرب کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے، اب ان کا بیشتر حصہ رومیوں کے مقابلے پر مسلمانوں کا معاون بن گیا۔ پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سلطنتِ روم کے ساتھ ایک طویل کش مکش میں اُلجھ جانے سے پہلے اسلام کو عرب پر اپنی گرفت مضبوط کرلینے کا پورا موقع مل گیا۔ تبوک کی اس فتحِ بلا جنگ نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیتِ قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے، خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردے میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمتِ ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی آیندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد جو ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی، وہ اتنی بے بس ہوگئی تھی کہ اُس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہوسکتی تھی جس کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔

مسائل و مباحث

اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھنے کے بعد ہم بآسانی اُن بڑے بڑے مسائل کا احصا کر سکتے ہیں جو اس وقت درپیش تھے اور جن سے سورۂ توبہ میں تعرّض کیا گیا ہے:

(۱) اب چونکہ عرب کا نظم و نسق بالکلیہ اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور تمام مزاحم طاقتیں بے بس ہوچکی تھیں، اس لیے وہ پالیسی واضح طور پر سامنے آجانی چاہیے تھی جو عرب کو مکمل دار الاسلام بنانے کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

اختیار کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ وہ حسبِ ذیل صورت میں پیش کی گئی:

الف۔ عرب سے شرک کو قطعاً مٹا دیا جائے اور قدیم مشرکانہ نظام کا کُلّی اِستیصال کر ڈالا جائے، تاکہ مرکزِ اسلام ہمیشہ کے لیے خالص اسلامی مرکز ہو جائے اور کوئی دوسرا عُنصر اس کے اسلامی مزاج میں نہ تو خلل انداز ہو سکے اور نہ کسی خطرے کے موقع پر اندرونی فتنہ کا موجب بن سکے۔ اسی غرض کے لیے مشرکین سے بَراءت اور ان کے ساتھ معاہدوں کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

ب۔ کعبہ کا انتظام اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آ جانے کے بعد یہ بالکل نامناسب تھا کہ جو گھر خالص خدا کی پرستش کے لیے وقف کیا گیا تھا، اس میں بدستور شرک ہوتا رہے اور اس کی تَوَلیت بھی مشرکین کے قبضے میں رہے۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ آیندہ کعبہ کی تَوَلیت بھی اہلِ توحید کے قبضے میں رہنی چاہیے اور بیت اللہ کے حُدود میں شرک و جاہلیت کی تمام رسمیں بھی بزور بند کر دینی چاہییں، بلکہ اب مشرکین اس گھر کے قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں، تاکہ اس بِنائے ابراہیمی کے آلودۂ شرک ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ج۔ عرب کی تمدّنی زندگی میں رُسومِ جاہلیّت کے جو آثار ابھی تک باقی تھے ان کا جدید اسلامی دَور میں جاری رہنا کسی طرح دُرست نہ تھا، اس لیے ان کے اِستیصال کی طرف توجہ دلائی گئی۔ نَسی کا قاعدہ ان رُسوم میں سب سے زیادہ بدنما تھا اس لیے اس پر براہِ راست ضرب لگائی گئی اور اسی ضرب سے مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ بقیہ آثارِ جاہلیّت کے ساتھ انھیں کیا کرنا چاہیے۔

(۲) عرب میں اسلام کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر دینِ حق کا دائرۂ اثر پھیلایا جائے۔ اس معاملے میں روم و ایران کی سیاسی قوت سب سے بڑی سدِّراہ تھی اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہوتے ہی اس سے تصادُم ہو۔ نیز آگے چل کر دوسرے غیر مسلم سیاسی وتمدّنی نظاموں سے بھی اِسی طرح سابقہ پیش آنا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ عرب کے باہر جو لوگ دینِ حق کے پیرو نہیں ہیں، ان کی خود مختارانہ فرماں روائی کو بزورِ شمشیر ختم کر دو، تا آنکہ وہ اسلامی اقتدار کے تابع ہو کر رہنا قبول کر لیں۔ جہاں تک دینِ حق پر ایمان لانے کا تعلّق ہے، ان کو اختیار ہے کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر اپنا حکم جاری کریں اور انسانی سوسائٹیوں کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گمراہیوں کو خلقِ خدا پر اور ان کی آنے والی نسلوں پر زبردستی مسلّط کرتے رہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس آزادی کے استعمال کا انھیں اختیار دیا جا سکتا ہے، وہ بس اسی حد تک ہے کہ خود اگر گمراہ رہنا چاہتے ہیں تو رہیں، بشرطیکہ جزیہ دے کر اسلامی اقتدار کے مطیع بنے رہیں۔

(۳) تیسرا اہم مسئلہ منافقین کا تھا جن کے ساتھ اب تک وقتی مَصالح کے لحاظ سے چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کیا جا رہا تھا۔ اب چونکہ بیرونی خطرات کا دباؤ کم ہو گیا تھا بلکہ گویا نہیں رہا تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ

آیندہ ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے اور وہی سخت برتاؤ اِن چھپے ہوئے منکرینِ حق کے ساتھ بھی ہو جو کھلے منکرینِ حق کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی پالیسی تھی جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں سُوَیلم کے گھر میں آگ لگوا دی جہاں منافقین کا ایک گروہ اس غرض سے جمع ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو شرکتِ جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرے، اور اسی پالیسی کے تحت تبوک سے واپس تشریف لاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ مسجدِ ضرار کو ڈھانے اور جلا دینے کا حکم دے دیا۔

(۴) مومنینِ صادقین میں اب تک جو تھوڑا بہت ضُعفِ عزم باقی تھا اس کا علاج بھی ضروری تھا، کیونکہ اسلام عالمگیر جِدّوجُہد کے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا اور اس مرحلے میں، جب کہ اکیلے مسلم عرب کو پوری غیر مسلم دنیا سے ٹکرانا تھا، ضُعفِ ایمان سے بڑھ کر کوئی اندرونی خطرہ اسلامی جماعت کے لیے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقع پر سُستی اور کمزوری دکھائی تھی، ان کو نہایت شدت کے ساتھ ملامت کی گئی، پیچھے رہ جانے والوں کے اس فعل کو کہ وہ بلا عذرِ معقول پیچھے رہ گئے، بجائے خود ایک منافقانہ طرزِ عمل، اور ایمان میں ان کے ناراست ہونے کا ایک بیّن ثبوت قرار دیا گیا، اور آیندہ کے لیے پوری صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کر دی گئی کہ اِعلائے کلمۃ اللہ کی جِدّوجُہد اور کفر و اسلام کی کش مکش ہی وہ اصلی کَسَوٹی ہے جس پر مومن کا دعوائے ایمان پرکھا جائے گا۔ جو اِس آویزش میں اسلام کے لیے جان و مال اور وقت و محنت صَرف کرنے سے جی چُرائے گا، اس کا ایمان معتبر ہی نہ ہوگا اور اس پہلو کی کسر کسی دوسرے مذہبی عمل سے پوری نہ ہو سکے گی۔

ان اُمور کو نظر میں رکھ کر سورۂ توبہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے تمام مضامین بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رکوعاتها ۱۶

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١

اعلانِ براءت [1] ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے [2] تھے۔

---

۱ – جیسا کہ ہم سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، یہ خطبہ رکوع ۵ کے آخر تک ۹ ھ میں اُس وقت نازل ہُوا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لیے روانہ کر چکے تھے۔ ان کے پیچھے جب یہ نازل ہوا تو صحابۂ کرامؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اسے ابوبکرؓ کو بھیج دیجیے تاکہ وہ حج میں اس کو سنا دیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اس اہم معاملے کا اعلان میری طرف سے میرے ہی گھر کے کسی آدمی کو کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس خدمت پر مامور کیا اور ساتھ ہی ہدایت فرما دی کہ حاجیوں کے مجمعِ عام میں اسے سنانے کے بعد حسبِ ذیل چار باتوں کا اعلان بھی کر دیں: (۱) جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دینِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ (۲) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ (۳) بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔ (۴) جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہؐ کا معاہدہ باقی ہے، یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں، ان کے ساتھ مدتِ معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔

اس مقام پر یہ جان لینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ فتحِ مکہ کے بعد دَورِ اسلامی کا پہلا حج ۸ ھ میں قدیم طریقے پر ہوا۔ پھر ۹ ھ میں یہ دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقے پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریقے پر۔ اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ ھ میں خالص اسلامی طریقے پر ہوا، اور یہی وہ مشہور حج ہے جسے حَجَّۃُ الوداع کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دو سال حج کے لیے تشریف نہ لے گئے۔ تیسرے سال جب بالکل شرک کا استیصال ہوگیا تب آپؐ نے حج ادا فرمایا۔

۲ – سورۂ انفال آیت ۵۸ میں گزر چکا ہے کہ جب تمھیں کسی قوم سے خیانت (نقضِ عہد اور غداری) کا اندیشہ ہو تو علی الاعلان اس کا معاہدہ اس کی طرف پھینک دو اور اسے خبردار کر دو کہ اب ہمارا تم سے کوئی معاہدہ باقی نہیں ہے۔ اس اعلان کے بغیر کسی معاہد قوم کے خلاف جنگی کارروائی شروع کر دینا خود خیانت کا مرتکب ہونا ہے۔ اسی ضابطۂ اخلاقی کے مطابق معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلانِ عام اُن تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے تھے اور موقع پاتے ہی پاسِ عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اتر آتے تھے۔ یہ کیفیت بنی کنانہ اور بنی خُزاعہ اور شاید ایک آدھ اور قبیلے کے سوا باقی تمام اُن قبائل کی تھی جو اس وقت تک شرک پر قائم تھے۔

اس اعلانِ براءت سے عرب میں شرک اور مشرکین کا وجود گویا عملاً خلافِ قانون (outlaw) ہو گیا اور ان کے لیے سارے ملک میں کوئی جائے پناہ نہ رہی کیونکہ ملک کا بیشتر حصہ اسلام کے زیرِ حکم آ چکا تھا۔ یہ لوگ تو اپنی جگہ اس بات کے منتظر تھے کہ رُوم و فارس کی طرف سے اسلامی سلطنت کو جب کوئی خطرہ لاحق ہو، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا جائیں، تو یکایک نقضِ عہد کر کے

فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ
مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡـكٰفِرِيۡنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ

پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو،[۳] اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رُسوا کرنے والا ہے۔

اطلاعِ عام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے حجِ اکبر کے دن[۴] تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ

ملک میں خانہ جنگی برپا کر دیں۔ لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ نے اُن کی ساعتِ منتظرہ آنے سے پہلے ہی بساط ان پر اُلٹ دی اور اعلانِ براءت کر کے اُن کے لیے اِس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہنے دیا کہ یا تو لڑنے پر تیار ہو جائیں اور اسلامی طاقت سے ٹکرا کر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں، یا ملک چھوڑ کر نکل جائیں، یا پھر اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو اور اپنے علاقے کو اُس نظم وضبط کی گرفت میں دے دیں جو ملک کے بیشتر حصّے کو پہلے ہی منضبط کر چکا تھا۔

اس عظیم الشان تدبیر کی پوری حکمت اُسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب کہ ہم اُس فتنۂ ارتداد کو نظر میں رکھیں جو اس واقعے کے ڈیڑھ سال بعد ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ملک کے مختلف گوشوں میں برپا ہوا اور جس نے اسلام کے نوتعمیر قصر کو یکلخت متزلزل کر دیا۔ اگر کہیں ۹ ھ کے اِس اعلانِ براءت سے شرک کی منظّم طاقت ختم نہ کر دی گئی ہوتی اور پورے ملک پر اسلام کی قوتِ ضابطہ کا اِستیلا پہلے ہی مکمل نہ ہو چکا ہوتا، تو ارتداد کی شکل میں جو فتنہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آغاز میں اُٹھا تھا، اُس سے کم ازکم دس گُنی زیادہ طاقت کے ساتھ بغاوت اور خانہ جنگی کا فتنہ اُٹھتا اور شاید تاریخِ اسلام کی شکل اپنی موجودہ صورت سے بالکل ہی مختلف ہوتی۔

۳- یہ اعلان ۱۰ ذی الحجہ ۹ ھ کو ہُوا تھا۔ اس وقت سے ۱۰ ربیع الثانی ۱۰ ھ تک چار مہینے کی مُہلت ان لوگوں کو دی گئی کہ اس دَوران میں اپنی پوزیشن پر اچھی طرح غور کر لیں۔ لڑنا ہو تو لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں، ملک چھوڑنا ہو تو اپنی جائے پناہ تلاش کر لیں، اسلام قبول کرنا ہو تو سوچ سمجھ کر قبول کر لیں۔

۴- یعنی ۱۰ ذی الحجہ جسے یوم النَّحر کہتے ہیں۔ حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ حجۃ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے حاضرین سے پوچھا: یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یوم النَّحر ہے۔ فرمایا: ھذا یوم الحج الاکبر۔ ”یہ حجِ اکبر کا دن ہے۔“ حجِ اکبر کا لفظ حجِ اصغر کے مقابلے میں ہے۔ اہلِ عرب عُمرے کو چھوٹا حج کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ حج جو ذوالحجہ کی مقررہ تاریخوں میں کیا جاتا ہے، حجِ اکبر کہلاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ
حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا

مشرکین سے بَری الذّمہ ہے اور اُس کا رسولؐ بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمھارے ہی لیے بہتر ہے، اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبیؐ! انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سُنا دو، بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انھوں نے اپنے عہد کو پُورا کرنے میں تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدّتِ معاہدہ تک وفا کرو، کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔[۵]

پس جب حرام مہینے گزر[۶] جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات

---

۵ – یعنی یہ بات تقویٰ کے خلاف ہوگی کہ جنھوں نے تم سے کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے ان سے تم عہد شکنی کرو۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ صرف وہی لوگ ہیں جو ہر حال میں تقویٰ پر قائم رہیں۔

۶ – یہاں حرام مہینوں سے اصطلاحی اَشْہُرِ حُرُم مراد نہیں ہیں جو حج اور عمرے کے لیے حرام قرار دیے گئے ہیں، بلکہ اس جگہ وہ چار مہینے مراد ہیں جن کی مشرکین کو مہلت دی گئی تھی۔ چونکہ اس مہلت کے زمانے میں مسلمانوں کے لیے جائز نہ تھا کہ مشرکین پر حملہ آور ہو جاتے، اس لیے اِنھیں حرام مہینے فرمایا گیا ہے۔

لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ اَحَدٌ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ
ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع
كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ
اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا
اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

میں اُن کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔[7] اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمھارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سُنے) تو اُسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے۔ پھر اُسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔[8] ع

اِن مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہوسکتا ہے؟ ـــ بجز اُن لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا،[9] تو جب تک وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ـــ مگر اِن کے سوا

۷ ـ یعنی کفر و شرک سے محض توبہ کر لینے پر معاملہ ختم نہ ہوگا بلکہ انھیں عملاً نماز قائم کرنی اور زکوٰۃ دینی ہوگی۔ اس کے بغیر یہ نہیں مانا جائے گا کہ انھوں نے کفر چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیا ہے۔ اسی آیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنۂ ارتداد کے زمانے میں استدلال کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم اسلام کے منکر نہیں ہیں، نماز بھی پڑھنے کے لیے تیار ہیں، مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ صحابۂ کرامؓ کو بالعموم یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ایسے لوگوں کے خلاف تلوار کیسے اُٹھائی جاسکتی ہے؟ مگر حضرت ابوبکرؓ نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں تو اِن لوگوں کو چھوڑ دینے کا حکم صرف اُس صورت میں دیا گیا تھا جب کہ یہ شرک سے توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، مگر جب یہ تین شرطوں میں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا
وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ
وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا
فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾

دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اُن کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمھارے معاملے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا۔ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں[۱۰] اور ان میں اکثر فاسق ہیں[۱۱]۔ انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی[۱۲]، پھر اللہ کے راستے میں سدِّ راہ بن کر کھڑے ہو گئے[۱۳]۔ بہت بُرے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔

ایک شرط اُڑائے دیتے ہیں تو پھر انھیں ہم کیسے چھوڑ دیں۔

۸ – یعنی دورانِ جنگ میں اگر کوئی دشمن تم سے درخواست کرے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے امان دے کر اپنے ہاں آنے کا موقع دیں اور اسے سمجھائیں، پھر اگر وہ قبول نہ کرے تو اُسے اپنی حفاظت میں اُس کے ٹھکانے تک واپس پہنچا دیں۔ فقہِ اسلامی میں ایسے شخص کو جو امان لے کر دارالاسلام میں آئے، مُستامَن کہا جاتا ہے۔

۹ – یعنی بنی کنانہ اور بنی خُزاعہ اور بنی ضَمرہ۔

۱۰ – یعنی بظاہر تو وہ صلح کی شرطیں طے کرتے ہیں مگر دل میں بدعہدی کا ارادہ ہوتا ہے اور اس کا ثبوت تجربے سے اس طرح ملتا ہے کہ جب کبھی انھوں نے معاہدہ کیا، توڑنے ہی کے لیے کیا۔

۱۱ – یعنی ایسے لوگ ہیں جنھیں نہ اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور نہ اخلاق کی پابندیوں کے توڑنے میں کوئی باک۔

۱۲ – یعنی ایک طرف اللہ کی آیات ان کو بھلائی اور راستی اور قانونِ حق کی پابندی کا بُلاوا دے رہی تھیں، دوسری طرف دنیوی زندگی کے وہ چند روزہ فائدے تھے جو خواہشِ نفس کی بے لگام پیروی سے حاصل ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے ان دونوں چیزوں کا موازنہ کیا اور پھر پہلی کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اپنے لیے چُن لیا۔

۱۳ – یعنی ان ظالموں نے اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ ہدایت کے بجائے گمراہی کو خود اپنے لیے پسند کر لیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے کوشش یہ کی کہ دعوتِ حق کا کام کسی طرح چلنے نہ پائے، خیر و صلاح کی اس پکار کو کوئی سُننے نہ پائے، بلکہ وہ منہ ہی بند کر دیے جائیں جن سے یہ پکار بلند ہوتی ہے۔ جس صالح نظامِ زندگی کو اللہ تعالیٰ زمین میں قائم کرنا چاہتا تھا اس کے قیام کو روکنے میں

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱ وَ
اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ
فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝۱۲

کسی مومن کے معاملے میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انھی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔ اور جاننے والوں کے لیے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں[۱۴]۔ اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے عَلَم برداروں سے جنگ کرو، کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے[۱۵]۔

انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اُن لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو اس نظام کو حق پا کر اس کے مُتَّبِع بنے تھے۔

۱۴ – یہاں پھر یہ تصریح کی گئی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر محض توبہ کر لینے سے وہ تمھارے دینی بھائی نہیں بن جائیں گے۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ اگر ایسا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شرائط پوری کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ تمھارے لیے ان پر ہاتھ اُٹھانا اور ان کے جان و مال سے تعرّض کرنا حرام ہو جائے گا، بلکہ مزید برآں اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کو برابر کے حُقوق حاصل ہو جائیں گے۔ معاشرتی، تمدّنی اور قانونی حیثیت سے وہ تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح ہوں گے۔ کوئی فرق و امتیاز ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوگا۔

۱۵ – اس جگہ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ قسم اور عہد و پیمان سے مراد کفر چھوڑ کر اسلام قبول کر لینے کا عہد ہے۔ اس لیے کہ اُن لوگوں سے اب کوئی اور معاہدہ کرنے کا تو کوئی سوال باقی ہی نہ رہا تھا۔ پچھلے سارے معاہدے وہ توڑ چکے تھے۔ اُن کی عہد شکنیوں کی بنا پر ہی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف سے براءت کا اعلان اُنھیں صاف صاف سنایا جا چکا تھا۔ یہ بھی فرما دیا گیا تھا کہ آخر ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ فرمان بھی صادر ہو چکا تھا کہ اب انھیں صرف اسی صورت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ یہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اِقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی پابندی قبول کر لیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ

کیا تم نہ لڑو گے[16] ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنھوں نے رسول کو ملک سے

اس لیے یہ آیت مرتدین سے جنگ کے معاملے میں بالکل صریح ہے۔ دراصل اس میں اُس فتنۂ ارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال بعد خلافتِ صدیقی کی ابتدا میں برپا ہُوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ ٹھیک اس ہدایت کے مطابق تھا جو اس آیت میں پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب ’’مُرتد کی سزا اسلامی قانون میں‘‘)

۱۶ — اب تقریر کا رُخ مسلمانوں کی طرف پھرتا ہے اور ان کو جنگ پر اُبھارنے اور دین کے معاملے میں کسی رشتہ و قرابت اور کسی دنیوی مَصلَحت کا لحاظ نہ کرنے کی پُرزور تلقین کی جاتی ہے۔ اس حصّۂ تقریر کی پوری رُوح کو سمجھنے کے لیے پھر ایک مرتبہ اُس صورتِ حال کو سامنے رکھ لینا چاہیے جو اُس وقت درپیش تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اب ملک کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا تھا اور عرب میں کوئی ایسی بڑی طاقت نہ رہی تھی جو اس کو دعوتِ مُبارزت دے سکتی ہو، لیکن پھر بھی جو فیصلہ کُن قدم اور انتہائی انقلابی قدم اس موقع پر اٹھایا جا رہا تھا، اس کے اندر بہت سے خطرناک پہلو ظاہر بین نگاہوں کو نظر آ رہے تھے:

اوّلاً، تمام مشرک قبائل کو بیک وقت معاہدات کی منسوخی کا چیلنج دے دینا، پھر مشرکین کے حج کی بندش، کعبے کی تولیت میں تغیّر، اور رُسومِ جاہلیّت کا کُلّی انسداد یہ معنٰی رکھتا تھا کہ ایک مرتبہ سارے ملک میں آگ سی لگ جائے اور مشرکین و منافقین اپنا آخری قطرۂ خون تک اپنے مفادات اور تعصُّبات کی حفاظت کے لیے بہا دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

ثانیاً، حج کو صرف اہلِ توحید کے لیے مخصوص کر دینے اور مشرکین پر کعبے کا راستہ بند کر دینے کے معنٰی یہ تھے کہ ملک کی آبادی کا ایک مُعتَدبِہٖ حصہ، جو ابھی مشرک تھا، کعبہ کی طرف اُس نقل و حرکت سے باز رہ جائے جو صرف مذہبی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مَعاشی حیثیت سے بھی عرب میں غیر معمولی حیثیت رکھتی تھی اور جس پر اُس زمانے میں عرب کی مَعاشی زندگی کا بہت بڑا انحصار تھا۔

ثالثاً، جو لوگ صلحِ حُدَیبیہ اور فتحِ مکہ کے بعد ایمان لائے تھے ان کے لیے یہ معاملہ بڑی کڑی آزمائش کا تھا، کیونکہ ان کے بہت سے بھائی بند، عزیز اقارب ابھی تک مشرک تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے مفاد قدیم نظامِ جاہلی کے مناصب سے وابستہ تھے۔ اب جو بظاہر تمام مشرکینِ عرب کا تہس نہس کر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی تو اس کے معنٰی یہ تھے کہ یہ نئے مسلمان خود اپنے ہاتھوں اپنے خاندانوں اور اپنے جگر گوشوں کو پیوندِ خاک کریں اور ان کے جاہ و منصب اور صدیوں کے قائم شدہ امتیازات کا خاتمہ کر دیں۔

اگرچہ فی الواقع اِن میں سے کوئی خطرہ بھی عملاً بروئے کار نہ آیا۔ اعلانِ بَراءت سے مُلک میں حَربِ کُلّی کی آگ بھڑکنے کے بجائے یہ نتیجہ برآمد ہُوا کہ تمام اطراف و اکنافِ عرب سے بچے کھُچے مشرک قبائل اور اُمَرا و مُلوک کے وفد آنے شروع ہو گئے، جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسلام و اطاعت کا عہد کیا، اور ان کے اسلام قبول کر لینے پر نبیؐ نے ہر ایک کو اس کی پوزیشن پر بحال رکھا۔ لیکن جس وقت اِس نئی پالیسی کا اعلان کیا جا رہا تھا اُس وقت تو بہر حال کوئی بھی اِس نتیجے کو پیشگی نہ دیکھ سکتا تھا۔ نیز یہ کہ اس اعلان کے ساتھ ہی اگر مسلمان اسے بزور نافذ کرنے کے لیے پوری طرح تیار نہ ہو جاتے تو شاید یہ نتیجہ

الرَّسُوۡلِ وَ هُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ ۚ فَاللّٰهُ
اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوۡهُمۡ
يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَ
يَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾ۙ وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ
قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَيَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۵﴾
اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا

نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمھاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا، اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا۔[۱۷] اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔ کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنھوں نے (اس کی راہ

برآمد بھی نہ ہوتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو اس موقع پر جہاد فی سبیل اللہ کی پُرجوش تلقین کی جاتی اور ان کے ذہن سے اُن تمام اندیشوں کو دُور کیا جاتا جو اس پالیسی پر عمل کرنے میں ان کو نظر آ رہے تھے، اور ان کو ہدایت کی جاتی کہ اللہ کی مرضی پوری کرنے میں انھیں کسی چیز کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ یہی مضمون اس تقریر کا موضوع ہے۔

۱۷- یہ ایک ہلکا سا اشارہ ہے اُس امکان کی طرف جو آگے چل کر واقعے کی صورت میں نمودار ہوا۔ مسلمان جو یہ سمجھ رہے تھے کہ بس اس اعلان کے ساتھ ہی ملک میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی، ان کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے اشارتاً انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ پالیسی اختیار کرنے میں جہاں اس کا امکان ہے کہ ہنگامۂ جنگ برپا ہو گا، وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی۔ لیکن اس اشارے کو زیادہ نمایاں اس لیے نہیں کیا گیا کہ ایسا کرنے سے ایک طرف تو مسلمانوں کی تیاریِ جنگ ہلکی پڑ جاتی اور دوسری طرف مشرکین کے لیے اُس دھمکی کا پہلو بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ ع مَا كَانَ
لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسولؐ اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا،[18] جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں، درآنحالیکہ اپنے اُوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔[19] ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے[20] اور جہنم میں انھیں ہمیشہ رہنا ہے۔

خفیف ہو جاتا جس نے انھیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی پوزیشن کی نزاکت پر غور کرنے اور بالآخر نظامِ اسلامی میں جذب ہو جانے پر آمادہ کیا۔

۱۸ – خطاب ہے اُن نئے لوگوں سے جو قریب کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔ ان سے ارشاد ہو رہا ہے کہ جب تک تم اس آزمایش سے گزر کر یہ ثابت نہ کر دو گے کہ واقعی تم خدا اور اس کے دین کو اپنی جان و مال اور اپنے بھائی بندوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو، تم سچّے مومن قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب تک تو ظاہر کے لحاظ سے تمھاری پوزیشن یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنینِ صادقین اور سابقینِ اوّلین کی جانفشانیوں سے غالب آ گیا اور ملک پر چھا گیا، اس لیے تم مسلمان ہو گئے۔

۱۹ – یعنی جو مساجد خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنی ہوں، ان کے مُتولّی، مجاور، خادم اور آباد کار بننے کے لیے وہ لوگ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے جو خدا کے ساتھ خداوندی کی صفات، حُقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہوں۔ پھر جب کہ وہ خود بھی توحید کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر چکے ہوں اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہو کہ ہم اپنی بندگی و عبادت کو ایک خدا کے لیے مخصوص کر دینا قبول نہیں کریں گے تو آخر انھیں کیا حق ہے کہ کسی ایسی عبادت گاہ کے متولّی بنے رہیں جو صرف خدا کی عبادت کے لیے بنائی گئی تھی۔

یہاں اگرچہ بات عام کہی گئی ہے اور اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ عام ہے بھی، لیکن خاص طور پر یہاں اس کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ اور مسجدِ حرام پر سے مشرکین کی تَولیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس پر ہمیشہ کے لیے اہلِ توحید کی تَولیت قائم کر دی جائے۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ
يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ
عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وقف لازم

اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انھی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟[21] اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں، اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو انھی لوگوں کا

۲۰ – یعنی جو تھوڑی بہت واقعی خدمت انھوں نے بیت اللہ کی انجام دی وہ بھی اس وجہ سے ضائع ہو گئی کہ یہ لوگ اس کے ساتھ شرک اور جاہلانہ طریقوں کی آمیزش کرتے رہے۔ ان کی تھوڑی بھلائی کو ان کی بہت بڑی بُرائی کھا گئی۔

۲۱ – یعنی کسی زیارت گاہ کی سجادہ نشینی، مجاوری اور چند نمائشی مذہبی اعمال کی بجا آوری، جس پر دنیا کے سطح بیں لوگ بالعموم شرف اور تقدس کا مدار رکھتے ہیں، خدا کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ اصلی قدر و قیمت ایمان اور راہِ خدا میں قربانی کی ہے۔ ان صفات کا جو شخص بھی حامل ہو وہ قیمتی آدمی ہے، خواہ وہ کسی اُونچے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اور کسی قسم کے امتیازی طُرّے اس کو لگے ہوئے نہ ہوں۔ لیکن جو لوگ ان صفات سے خالی ہیں، وہ محض اس لیے کہ بزرگ زادے ہیں، سجادہ نشینی ان کے خاندان میں مدتوں سے چلی آ رہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی مراسم کی نمائش وہ بڑی شان کے ساتھ کر دیا کرتے ہیں، نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت ''موروثی'' حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی ادارے ان نالائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دیے جائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ
دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ
رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ
مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ
عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ
اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ
مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ
اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ
وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔ وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو اُن کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں اور تمھارے عزیز و اقارب اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمھارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے،

وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ
فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
ع ۸/۹ الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ
يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا

اور تمھارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے[۲۲]، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔ؑ

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حُنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو[۲۳])۔ اس روز تمھیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمھارے کچھ کام

۲۲ – یعنی تمھیں ہٹا کر سچّی دین داری کی نعمت اور اُس کی عَلَم برداری کا شرف اور رُشد و ہدایت کی پیشوائی کا منصب کسی اور گروہ کو عطا کر دے۔

۲۳ – جو لوگ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اعلانِ بَراءت کی خطرناک پالیسی پر عمل کرنے سے تمام عرب کے گوشے گوشے میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے گی اور اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا، ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان اندیشوں سے کیوں ڈرے جاتے ہو، جو خدا اس سے بہت زیادہ سخت خطرات کے موقعوں پر تمھاری مدد کر چکا ہے، وہ اب بھی تمھاری مدد کو موجود ہے۔ اگر یہ کام تمھاری قوت پر منحصر ہوتا تو مکہ ہی سے آگے نہ بڑھتا، ورنہ بَدر میں تو ضرور ہی ختم ہو جاتا۔ مگر اس کی پشت پر تو اللہ کی طاقت ہے اور پچھلے تجربات تم پر ثابت کر چکے ہیں کہ اللہ ہی کی طاقت اب تک اس کو فروغ دیتی رہی ہے۔ لہٰذا یقین رکھو کہ آج بھی وہی اسے فروغ دے گا۔

غزوۂ حُنین جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، شوّال ۸ھ میں ان آیات کے نزول سے صرف بارہ تیرہ مہینے پہلے مکّہ اور طائف کے درمیان وادیِ حُنین میں پیش آیا تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی طرف سے ۱۲ ہزار فوج تھی جو اس سے پہلے کبھی کسی اسلامی غزوہ میں اکٹھی نہیں ہوئی تھی، اور دوسری طرف کفار اُن سے بہت کم تھے۔ لیکن اس کے باوجود قبیلۂ ہَوازِن کے تیراندازوں نے ان کا منہ پھیر دیا اور لشکرِ اسلام بُری طرح تتر بتر ہو کر پسپا ہُوا۔ اس وقت صرف نبیؐ اور چند مٹھی بھر جانباز صحابہؓ تھے جن کے قدم

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ ضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ ۚ‏ ﴿۲۵﴾
ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَنۡزَلَ
جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَذٰ لِكَ جَزَآءُ
الۡكٰفِرِيۡنَ‏ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوۡبُ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰ لِكَ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ
نَجَسٌ فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ‌ۚ

نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سَکِینَت اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اُتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے،[۲۴] اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اَے ایمان لانے والو! مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجدِ حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔[۲۵]

اپنی جگہ جمے رہے، اور انھی کی ثابت قدمی کا نتیجہ تھا کہ دوبارہ فوج کی ترتیب قائم ہوسکی اور بالآخر فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ ورنہ فتحِ مکہ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا، اس سے بہت زیادہ حُنَین میں کھو دینا پڑتا۔

۲۴ – غزوۂ حُنَین میں فتح حاصل کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شکست خوردہ دشمنوں کے ساتھ جس فیاضی و کریم النفسی کا برتاؤ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں سے بیشتر آدمی مسلمان ہوگئے۔ اس مثال سے مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم نے یہی کیوں سمجھ رکھا ہے کہ بس اب سارے مشرکینِ عرب تہس نہس کر ڈالے جائیں گے۔ نہیں، پہلے کے تجربات کو دیکھتے ہوئے تو تم کو یہ توقع ہونی چاہیے کہ جب نظامِ جاہلیت کے فروغ و بقا کی کوئی اُمید ان لوگوں کو باقی نہ رہے گی اور وہ سہارے ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے یہ اب تک جاہلیت کو چمٹے ہوئے ہیں، تو خود بخود یہ اسلام کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کے لیے آ جائیں گے۔

۲۵ – یعنی آیندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں بلکہ مسجدِ حرام کے حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً فَسَوۡفَ یُغۡنِیۡکُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖۤ اِنۡ
شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۸﴾ قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ
بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ
وَ رَسُوۡلُہٗ وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ

اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے، اللہ علیم و حکیم ہے۔

جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے[26] اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے[27] اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے،

تا کہ شرک و جاہلیّت کے اعادے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ ''ناپاک'' ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود ناپاک ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریقِ زندگی ناپاک ہیں، اور اسی نجاست کی بنا پر حُدودِ حرم میں ان کا داخلہ بند کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عُمرہ اور مراسمِ جاہلیت ادا کرنے کے لیے حُدودِ حرم میں نہیں جا سکتے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجدِ حرام میں جا ہی نہیں سکتے۔ اور امام مالکؒ یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجدِ حرام ہی نہیں بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا دُرست نہیں۔ لیکن یہ آخری رائے درست نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسجدِ نبوی میں ان لوگوں کو آنے کی اجازت دی تھی۔

۲۶ – اگرچہ اہلِ کتاب خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کے مُدّعی ہیں لیکن فی الواقع نہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ خدا پر ایمان رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی بس اس بات کو مان لے کہ خدا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خدا کو الٰہِ واحد اور ربِّ واحد تسلیم کرے اور اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے حُقوق اور اس کے اختیارات میں نہ خود شریک بنے نہ کسی کو شریک ٹھیرائے۔ لیکن نصاریٰ اور یہود دونوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، جیسا کہ بعد والی آیات میں بتصریح بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کا خدا کو ماننا بے معنی ہے اور اسے ہرگز ایمان باللہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح آخرت کو ماننے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی یہ بات مان لے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اُٹھائے جائیں گے، بلکہ اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ، اور کسی بزرگ سے مُنتسب ہونا کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کسی کا کفّارہ بن سکے گا، خدا کی عدالت میں بے لاگ انصاف ہوگا اور آدمی کے ایمان و عمل کے سوا کسی چیز کا لحاظ نہ کیا جائے گا۔ اس عقیدے کے بغیر آخرت کو ماننا لاحاصل ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اسی پہلو

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۵ ۱۰

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ؑ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ

(ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جِزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔[۲۸] یہودی کہتے ہیں کہ

سے اپنے عقیدے کو خراب کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کا ایمان بالآخرت بھی مسلّم نہیں ہے۔

۲۷ – یعنی اس شریعت کو اپنا قانونِ زندگی نہیں بناتے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے سے نازل کی ہے۔

۲۸ – یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دینِ حق کے پیرو بن جائیں، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحبِ امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظامِ زندگی کی باگیں اور فرماں روائی و امامت کے اختیارات متبعینِ دینِ حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت تابع و مطیع بن کر رہیں۔

جِزیہ بدل ہے اُس امان اور اُس حفاظت کا جو ذمّیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی۔ نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابعِ امر بننے پر راضی ہیں۔ ''ہاتھ سے جزیہ دینے'' کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں بلکہ وہ اہلِ ایمان بڑے ہوں جو خلافتِ الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

ابتداءً یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق دیا گیا تھا، لیکن آگے چل کر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس سے جزیہ لے کر انھیں ذمّی بنایا اور اس کے بعد صحابۂ کرامؓ نے بالاتفاق بیرونِ عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔

یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لیے بڑی بڑی معذرتیں اُنیسویں صدی عیسوی کے دَورِ مذلّت میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور اُس دَور کی یادگار کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو صفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا کا دین اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے معذرت پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں، وہ حد سے حد بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انھیں اس کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرماں روائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی، فساد رُونما ہوگا اور اہلِ ایمان کا فرض ہو گا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انھیں نظامِ صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ جزیہ آخر کس چیز کی قیمت ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اُس آزادی کی قیمت ہے جو انھیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لیے دی جاتی ہے، اور اس قیمت کو اُس صالح نظامِ حکومت کے نظم و نسق پر صَرف ہونا چاہیے جو انھیں اِس آزادی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حُقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کرتے وقت ہر سال ذمیوں میں یہ احساس تازہ ہوتا رہے گا کہ خدا کی راہ میں زکوٰۃ دینے کے شَرف سے محرومی اور اس کے بجائے گمراہیوں پر قائم رہنے کی قیمت ادا کرنا کتنی بڑی بدقسمتی ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔

عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ
قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ
قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا

عُزیرؑ اللہ کا بیٹا ہے[۲۹]، اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے[۳۰]۔ خدا کی مار اِن پر، یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے[۳۱] اور اسی طرح مسیح ابنِ مریمؑ کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے

۲۹ – عُزَیر سے مراد عَزرا (Ezra) ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدِّد مانتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۴۵۰ قبلِ مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دَورِ ابتلا بنی اسرائیل پر آیا، اس میں نہ صرف یہ کہ تورات دنیا سے گم ہو گئی تھی بلکہ بابِل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت، اپنی روایات اور اپنی قومی زبان، عبرانی تک سے ناآشنا کر دیا تھا۔ آخرِ کار انھی عُزَیر یا عزرا نے بائبل کے پُرانے عہد نامے کو مرتّب کیا، اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں، اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا۔ یہاں قرآنِ مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق عَزرا کاہن کو خدا کا بیٹا بنایا ہے، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلّق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی رونما ہوئی، وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عَزرا کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہوئے۔

۳۰ – یعنی مصر، یونان، روم، ایران اور دوسرے ممالک میں جو قومیں پہلے گمراہ ہو چکی تھیں ان کے فلسفوں اور اَوہام و تخیُّلات سے متاثّر ہو کر ان لوگوں نے بھی ویسے ہی گمراہانہ عقیدے ایجاد کر لیے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: المائدہ، حاشیہ ۱۰۱)

۳۱ – حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عَدِیؓ بن حاتم، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبیؐ کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انھوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک یہ سوال بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علما اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ یہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ تو ضرور

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا
يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۱﴾ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَيَاۡبَى اللّٰهُ
اِلَّاۤ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ
رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ

سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمّل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے[۳۲]

ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا: بس یہی ان کو خدا بنا لینا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ کتاب اللہ کی سَنَد کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزَعمِ خود متمکّن ہوتے ہیں، اور جو اُن کے اس حقِ شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انھیں خدا بناتے ہیں۔

یہ دونوں الزام، یعنی کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا، اور کسی کو شریعت سازی کا حق دے دینا، اس بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے یہ مانتے ہوں مگر ان کا تصورِ خدائی اس قدر غلط ہے کہ اس کی وجہ سے ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔

۳۲- متن میں ’’اَلدِّیْن‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے ’’جنسِ دین‘‘ کیا ہے۔ دین کا لفظ، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عَرَبی زبان میں اُس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بِعثَتِ رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے، اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بِعثَت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے، وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجایشوں میں سمٹ کر رہے۔ بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا نمایندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجایشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے، جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذِمّیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: الزُمر، حاشیہ ۳۔ المومن، حاشیہ ۴۳۔ الشّوریٰ، حاشیہ ۲۰)

وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا
مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ
يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ
جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا
مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے ایمان لانے والو! اِن اہلِ کتاب کے اکثر علما اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں[۳۳]۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا ___ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔

۳۳- یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لُوٹتے ہیں، ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات اِن سے خریدیں اور اُن کا مرنا جینا اور شادی و غم کچھ بھی اِن کو کھلائے بغیر نہ ہو سکے، اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکیدار اِن کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی اِنھی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اُٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکّاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ
یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ
الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ
كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۳۶
اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ
عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے، اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے،[۳۴] اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں۔ یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔ لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اُوپر ظلم نہ کرو[۳۵] اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں،[۳۶] اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔ نَسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُس کو حرام کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور

۳۴- یعنی جب سے اللہ نے چاند، سورج اور زمین کو خلق کیا ہے اُسی وقت سے یہ حساب بھی چلا آ رہا ہے کہ مہینے میں ایک ہی دفعہ چاند ہلال بن کر طُلوع ہوتا ہے اور اس حساب سے سال کے ۱۲ ہی مہینے بنتے ہیں۔ یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ عرب کے لوگ نَسی کی خاطر مہینوں کی تعداد ۱۳ یا ۱۴ بنا لیتے تھے، تاکہ جس ماہِ حرام کو انھوں نے حلال کر لیا ہو، اسے سال کی جنتری میں کھپا سکیں۔ اس مضمون کی تشریح آگے آتی ہے۔

۳۵- یعنی جن مصالح کی بنا پر ان مہینوں میں جنگ کرنا حرام کیا گیا ہے ان کو ضائع نہ کرو اور ان ایّام میں بد امنی پھیلا کر اپنے اُوپر ظلم نہ کرو۔ چار حرام مہینوں سے مراد ہیں ذی القعدہ، ذی الحجّہ اور مُحرّم حج کے لیے اور رجب عُمرے کے لیے۔

۳۶- یعنی اگر مشرکین ان مہینوں میں بھی لڑنے سے باز نہ آئیں تو جس طرح وہ متفق ہو کر تم سے لڑتے ہیں، تم بھی متفق

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع ۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ

اللہ کا حرام کیا ہُوا حلال بھی کرلیں۔[۳۷] ان کے بُرے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ منکرینِ حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ع

اے [۳۸] لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں

ہو کر ان سے لڑو۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۴ اِس آیت کی تفسیر کرتی ہے۔

۳۷– عرب میں نَسی دو طرح کی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ و جدل اور غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کَبِیسہ کا ایک مہینا بڑھا دیتے تھے، تا کہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ اُن زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف چونتیسویں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹-۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو حِجّۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں فرمائی تھی کہ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض۔ یعنی اِس سال حج کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اُس تاریخ پر آ گیا ہے جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے۔

اس آیت میں نَسی کو حرام اور ممنوع قرار دے کر جُہلائے عرب کی اِن دونوں اغراض کو باطل کر دیا گیا ہے۔ پہلی غرض تو ظاہر ہے کہ صریح طور پر ایک گناہ تھی۔ اُس کے تو معنٰی ہی یہ تھے کہ خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال بھی کر لیا جائے اور پھر حیلہ بازی کر کے پابندیِ قانون کی ظاہری شکل بھی بنا کر رکھ دی جائے۔ رہی دوسری غرض، تو سرسری نگاہ میں وہ معصوم اور مبنی بر مَصلحت نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت وہ بھی خدا کے قانون سے بدترین بغاوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عائد کردہ فرائض کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب جن اہم مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے بندے زمانے کی تمام گردشوں میں، ہر قسم کے حالات اور کیفیات میں اُس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہوں۔ مثلاً رمضان ہے، تو وہ کبھی گرمی میں اور کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے، اور اہلِ ایمان اِن سب بدلتے ہوئے حالات میں روزے رکھ کر فرماں برداری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور بہترین اخلاقی تربیت بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح حج بھی قمری حساب سے مختلف موسموں میں آتا ہے اور ان سب طرح کے اچھے اور بُرے حالات میں خدا کی رضا کے لیے سفر کر کے بندے اپنے خدا کی آزمائش میں پورے بھی اُترتے ہیں اور بندگی میں پختگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی گروہ اپنے سفر اور اپنی تجارت اور اپنے میلوں ٹھیلوں کی سہولت کی خاطر حج کو

Maktaba Tul Ishaat.com

انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ
بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ

نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ دُنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔[۳۹] تم نہ اُٹھو گے تو خدا تمھیں دردناک سزا دے گا، اور تمھاری جگہ کسی اور گروہ کو

کسی خوش گوار موسم میں ہمیشہ کے لیے قائم کر دے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے مسلمان کوئی کانفرنس کر کے طے کر لیں کہ آیندہ سے رمضان کا مہینا دسمبر یا جنوری کے مطابق کر دیا جائے گا۔ اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ بندوں نے اپنے خدا سے بغاوت کی اور خود مختار بن بیٹھے۔ اسی چیز کا نام کفر ہے۔ علاوہ بریں ایک عالمگیر دین جو سب انسانوں کے لیے ہے، آخر کس شمسی مہینے کو روزے اور حج کے لیے مقرر کرے؟ جو مہینا بھی مقرر کیا جائے گا وہ زمین کے تمام باشندوں کے لیے یکساں سہولت کا موسم نہیں ہو سکتا۔ کہیں وہ گرمی کا زمانہ ہوگا اور کہیں سردی کا۔ کہیں وہ بارشوں کا موسم ہوگا اور کہیں خشکی کا۔ کہیں فصلیں کاٹنے کا زمانہ ہوگا اور کہیں بونے کا۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ نَسی کی منسوخی کا یہ اعلان ۹ ھ کے حج کے موقع پر کیا گیا اور اگلے سال ۱۰ ھ کا حج ٹھیک اُن تاریخوں میں ہُوا جو قمری حساب کے مطابق تھیں۔ اس کے بعد سے آج تک حج اپنی صحیح تاریخوں میں ہو رہا ہے۔

۳۸ – یہاں سے وہ خطبہ شروع ہوتا ہے جو غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں نازل ہوا تھا۔

۳۹ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ عالَمِ آخرت کی بے پایاں زندگی اور وہاں کے بے حد و حساب ساز و سامان کو جب تم دیکھو گے تب تمھیں معلوم ہوگا کہ دنیا کے تھوڑے سے عرصۂ حیات میں لُطف اندوزی کے جو بڑے سے بڑے امکانات تم کو حاصل تھے اور زیادہ سے زیادہ جو اسبابِ عیش تم کو میسر تھے، وہ ان غیر محدود امکانات اور اس نعیم و مُلکِ کبیر کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ اور اُس وقت تم کو اپنی اس ناعاقبت اندیشی و کم نگاہی پر افسوس ہوگا کہ تم نے کیوں ہمارے سمجھانے کے باوجود دنیا کے عارضی اور قلیل منافع کی خاطر اپنے آپ کو ان اَبدی اور کثیر منافع سے محروم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ مَتاعِ حیاتِ دنیا آخرت میں کام آنے والی چیز نہیں ہے۔ یہاں تم خواہ کتنا ہی سروسامان مہیا کر لو، موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور سرحدِ موت کے دوسری جانب جو عالَم ہے وہاں اِن میں سے کوئی چیز بھی تمھارے ساتھ منتقل نہ ہوگی۔ وہاں اِس کا کوئی حصّہ اگر تم پا سکتے ہو تو صرف وہی جسے تم نے خدا کی رضا پر قربان کیا ہو اور جس کی محبّت پر تم نے خدا اور اس کے دین کی محبّت کو ترجیح دی ہو۔

۴۰ – اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ جب تک نفیرِ عام (جنگی خدمت کے لیے عام بلاوا) نہ ہو، یا جب تک کسی علاقے کی

قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٣٩﴾
اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ
اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ
مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ

اُٹھائے گا،[۴۱] اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبیؐ کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اُس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"[۴۲] اُس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سُکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول

مسلم آبادی یا مسلمانوں کے کسی گروہ کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم نہ دیا جائے، اُس وقت تک تو جہاد فرضِ کفایہ رہتا ہے، یعنی اگر کچھ لوگ اسے ادا کرتے رہیں تو باقی لوگوں پر سے اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن جب امامِ مسلمین کی طرف سے مسلمانوں کو جہاد کا عام بلاوا ہو جائے، یا کسی خاص گروہ یا خاص علاقے کی آبادی کو بلاوا دے دیا جائے، تو پھر جنھیں بلاوا دیا گیا ہو، ان پر جہاد فرضِ عین ہے، حتّٰی کہ جو شخص کسی حقیقی معذوری کے بغیر نہ نکلے اس کا ایمان تک معتبر نہیں ہے۔

۴۱ – یعنی خدا کا کام کچھ تم پر منحصر نہیں ہے کہ تم کرو گے تو ہوگا ورنہ نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ تو خدا کا فضل و احسان ہے کہ وہ تمھیں اپنے دین کی خدمت کا زرّیں موقع دے رہا ہے۔ اگر تم اپنی نادانی سے اس موقع کو کھو دو گے تو خدا کسی اور قوم کو اس کی توفیق بخشے گا اور تم نامراد رہ جاؤ گے۔

۴۲ – یہ اُس موقع کا ذکر ہے جب کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر لیا تھا اور آپؐ عین اس رات کو، جو قتل کے لیے مقرر کی گئی تھی، مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد دو دو چار چار کر کے پہلے ہی مدینہ جا چکی تھی۔ مکہ میں صرف وہی مسلمان رہ گئے تھے جو بالکل بے بس تھے یا منافقانہ ایمان رکھتے تھے اور ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس حالت میں جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ آپؐ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے تو آپؐ صرف ایک رفیق حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکلے، اور اس خیال سے کہ آپؐ کا تعاقب ضرور کیا جائے گا، آپؐ نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر (جو شمال کی جانب تھی) جنوب کی راہ اختیار کی۔ یہاں تین دن تک آپؐ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ خون کے پیاسے دشمن آپؐ کو ہر طرف

Maktaba Tul Ishaat.com

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰىؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَاؕ وَ
اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا
لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْۚ وَ اللّٰهُ

نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اُونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے ـــــ نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل[۴۳]، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

اے نبیؐ! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمھارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا[۴۴]۔ اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب

ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اطرافِ مکّہ کی وادیوں کا کوئی گوشہ انھوں نے ایسا نہ چھوڑا جہاں آپؐ کو تلاش نہ کیا ہو۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ ان میں سے چند لوگ عین اُس غار کے دہانے پر بھی پہنچ گئے جس میں آپؐ چھپے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو سخت خوف لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر غار میں جھانک لیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا اور آپؐ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کو تسکین دی کہ ”غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

۴۳ — ہلکے اور بوجھل کے الفاظ بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے تو بہر حال تم کو نکلنا چاہیے، خواہ برضا و رغبت خواہ بکراہت، خواہ خوش حالی میں خواہ تنگ دستی میں، خواہ ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ خواہ بے سروسامانی کے ساتھ، خواہ موافق حالات میں خواہ ناموافق حالات میں، خواہ جوان و تندرست خواہ ضعیف و کمزور۔

ع ۶ / ۱۲

يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى
يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا
يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ
يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾
اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ؏

اے نبیؐ! اللہ تمھیں معاف کرے، تم نے کیوں انھیں رخصت دے دی؟ (تمھیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کُھل جاتا کہ کون لوگ سچّے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔[۴۵] جو لوگ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں، وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردّد ہو رہے ہیں۔[۴۶]

---

۴۴ – یعنی یہ دیکھ کر کہ مقابلہ روم جیسی طاقت سے ہے اور زمانہ شدید گرمی کا ہے اور ملک میں قحط برپا ہے اور نئے سال کی فصلیں، جن سے آس لگی ہوئی تھی، کٹنے کے قریب ہیں، ان کو تبوک کا سفر بہت ہی گراں محسوس ہونے لگا۔

۴۵ – بعض منافقین نے بناوٹی عذرات پیش کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مانگی تھی، اور حضورؐ نے بھی اپنے طبعی حلم کی بنا پر، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ محض بہانے کر رہے ہیں، ان کو رخصت عطا فرما دی تھی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور آپؐ کو تنبیہ کی کہ ایسی نرمی مناسب نہیں ہے۔ رخصت دے دینے کی وجہ سے ان منافقوں کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ اگر انھیں رخصت نہ دی جاتی اور پھر یہ گھر بیٹھے رہتے تو ان کا جھوٹا دعوائے ایمان بے نقاب ہو جاتا۔

۴۶ – اس سے معلوم ہوا کہ کفر و اسلام کی کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدّعیِ ایمان کے فرق کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ
انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝۴۶ لَوْ
خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ
يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸

اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ تیاری کرتے۔ لیکن اللہ کو ان کا اُٹھنا پسند ہی نہ تھا،[۴۷] اس لیے اس نے انھیں سُست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمھارے ساتھ نکلتے تو تمھارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، اور تمھارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی اُس میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اِن لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمھیں ناکام کرنے کے لیے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا اُلٹ پھیر کر چکے ہیں، یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔

صاف کھول کر رکھ دیتی ہے۔ جو شخص اس کش مکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور تمام ذرائع اس کو سربلند کرنے کی سعی میں کھپا دے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے، وہی سچا مومن ہے۔ بخلاف اس کے جو اس کش مکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چُرائے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلوتہی کرے، اس کی یہ روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔

۴۷ – یعنی بادلِ ناخواستہ اُٹھنا اللہ کو پسند نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ شرکتِ جہاد کے جذبے اور نیت سے خالی تھے اور ان کے اندر دین کی سربلندی کے لیے جاں فشانی کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی، تو وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی سے بددلی کے ساتھ یا کسی شرارت کی نیت سے مستعدی کے ساتھ اُٹھتے اور یہ چیز ہزار خرابیوں کی موجب ہوتی، جیسا کہ بعد والی آیات میں بتصریح فرما دیا گیا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ
سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ
حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ
اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ
لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ

ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالیے"[۴۸] ــــ سُن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں[۴۹] اور جہنّم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔[۵۰]

تمھارا بھلا ہوتا ہے تو انھیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہُوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (بُرائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے،

۴۸ – جو منافق بہانے کر کر کے پیچھے ٹھیر جانے کی اجازتیں مانگ رہے تھے، اُن میں سے بعض ایسے بے باک بھی تھے جو راہِ خدا سے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے مذہبی و اخلاقی نوعیت کے حیلے تراشتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص جد بن قَیس کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ میں ایک حُسن پرست آدمی ہوں، میری قوم کے لوگ میری اس کمزوری سے واقف ہیں کہ عورت کے معاملے میں مجھ سے صبر نہیں ہوسکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رومی عورتوں کو دیکھ کر میرا قدم پھسل نہ جائے۔ لہٰذا آپ مجھے فتنے میں نہ ڈالیں اور اس جہاد کی شرکت سے مجھ کو معذور رکھیں۔

۴۹ – یعنی نام تو فتنے سے بچنے کا لیتے ہیں مگر درحقیقت نفاق اور جھوٹ اور ریا کاری کا فتنہ بُری طرح ان پر مسلّط ہے۔ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے فتنوں کے امکان سے پریشانی وخوف کا اظہار کر کے یہ بڑے متقی ثابت ہوئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ فی الواقع کفر و اسلام کی فیصلہ کُن کشمکش کے موقع پر اسلام کی حمایت سے پہلو تہی کر کے یہ اتنے بڑے فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں جس سے بڑھ کر کسی فتنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۵۰ – یعنی تقویٰ کی اس نمائش نے ان کو جہنّم سے دُور نہیں کیا بلکہ نفاق کی اس لعنت نے انھیں جہنّم کے چُنگل میں اُلٹا پھنسا دیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ
بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ

اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔[۵۱]"

ان سے کہو: "تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو، وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔[۵۲] اور ہم تمھارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ

۵۱ - یہاں دنیا پرست اور خدا پرست کی ذہنیت کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ دنیا پرست جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی بعض دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادّی اسباب پر ہوتا ہے۔ وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسا اپنی قوت یا مادّی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ راہِ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو، دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامیابیاں اس کو اِتراہٹ میں مبتلا نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اوّل تو دونوں کو وہ اپنے حق میں خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اور اسے ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمایش سے بخیریت گزر جائے۔ دوسرے اس کے پیشِ نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ اس کے سامنے تو رضائے الٰہی کا مقصدِ وحید ہوتا ہے، اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حُصول یا عدمِ حُصول نہیں ہے، بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہِ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی ہَر گئی ہو، لیکن اسے پورا بھروسا رہتا ہے کہ جس خدا کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے، وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا کہ ان کی سازگاری یا ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کرے۔ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالمِ اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی اُسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہلِ دنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہُوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان دنیا پرست منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمھارے معاملے سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ تمھاری خوشی و رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور۔ تم اطمینان اور بے اطمینانی کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

۵۲ - منافقین حسبِ عادت اس موقع پر بھی کفر و اسلام کی اس کشمکش میں حصہ لینے کے بجائے اپنی دانست میں

يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا
اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا
لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا
مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى

اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں۔''

ان سے کہو: ''تم اپنے مال خواہ راضی خوشی خرچ کرو یا بکراہت،[۵۳] بہرحال وہ قبول نہ کیے جائیں گے کیونکہ تم فاسق لوگ ہو۔'' ان کے دیے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے، نماز کے لیے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں

کمال دانش مندی کے ساتھ دُور بیٹھے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے، رسول اور اصحابِ رسول فتح یاب ہو کر آتے ہیں یا رومیوں کی فوجی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب انھیں یہ دیا گیا کہ جن دو نتیجوں میں سے ایک کے ظہور کا تمھیں انتظار ہے، اہلِ ایمان کے لیے تو وہ دونوں ہی سراسر بھلائی ہیں۔ وہ اگر فتح یاب ہوں تو اس کا بھلائی ہونا تو ظاہر ہی ہے، لیکن اگر اپنے مقصد کی راہ میں جانیں لڑاتے ہوئے وہ سب کے سب پیوندِ خاک ہو جائیں تب بھی دنیا کی نگاہ میں چاہے یہ انتہائی ناکامی ہو، مگر حقیقت میں یہ بھی ایک دوسری کامیابی ہے۔ اس لیے کہ مومن کی کامیابی و ناکامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی ملک فتح کیا یا نہیں، یا کوئی حکومت قائم کر دی یا نہیں، بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں لڑا دیں یا نہیں۔ یہ کام اگر اس نے کر دیا تو درحقیقت وہ کامیاب ہے، خواہ دنیا کے اعتبار سے اس کی سعی کا نتیجہ صفر ہی کیوں نہ ہو۔

۵۳ – بعض منافق ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تو تیار نہ تھے، مگر یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اس جہاد اور اس کی سعی سے بالکل کنارہ کش رہ کر مسلمانوں کی نگاہ میں اپنی ساری وقعت کھو دیں اور اپنے نفاق کو علانیہ ظاہر کر دیں۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم جنگی خدمت انجام دینے سے تو اس وقت معذرت چاہتے ہیں، لیکن مال سے مدد کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ
وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى
الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔ اِن کے مال و دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انھی چیزوں کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے[۵۴] اور یہ جان بھی دیں تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں[۵۵]۔

۵۴ - یعنی اس مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر جو منافقانہ رَوِیّہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں یہ انتہائی ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے اور وہ ساری شانِ ریاست اور عزت و ناموری اور مشیخت اور چودھراہٹ، جو اب تک عربی سوسائٹی میں ان کو حاصل رہی ہے، نئے اسلامی نظامِ اجتماعی میں وہ خاک میں مل جائے گی۔ ادنیٰ ادنیٰ غلام اور غلام زادے اور معمولی کاشتکار اور چرواہے، جنھوں نے اخلاصِ ایمانی کا ثبوت دیا ہے، اس نئے نظام میں باعزت ہوں گے، اور خاندانی چودھری اپنی دنیا پرستی کی بدولت بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

اس کیفیت کا ایک دلچسپ نمونہ وہ واقعہ ہے جو ایک دفعہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں پیش آیا۔ قریش کے چند بڑے بڑے شُیوخ، جن میں سُہَیل بن عَمْرو اور حارث بن ہِشام جیسے لوگ بھی تھے، حضرت عمرؓ سے ملنے گئے۔ وہاں یہ صورت پیش آئی کہ انصار اور مہاجرین میں سے کوئی معمولی آدمی بھی آتا تو حضرت عمرؓ اسے اپنے پاس بلا کر بٹھاتے اور اِن شیوخ سے کہتے کہ اس کے لیے جگہ خالی کرو۔ تھوڑی دیر میں نوبت یہ آئی کہ یہ حضرات سرکتے سرکتے پائینِ مجلس میں پہنچ گئے۔ باہر نکل کر حارث بن ہِشام نے ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگوں نے دیکھا، آج ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے؟ سُہَیل بن عَمْرو نے کہا: اس میں عمرؓ کا کچھ قصور نہیں، قصور ہمارا ہے کہ جب ہمیں اِس دین کی طرف دعوت دی گئی تو ہم نے منہ موڑا اور یہ لوگ اس کی طرف دوڑ کر آئے۔ پھر یہ دونوں صاحب دوبارہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آج ہم نے آپ کا سلوک دیکھا، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے، مگر اب اس کی تلافی کی بھی کوئی صورت ہے؟ حضرت عمرؓ نے زبان سے کچھ جواب نہ دیا اور صرف سرحدِ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اب میدانِ جہاد میں جان و مال کھپاؤ تو شاید وہ پوزیشن پھر حاصل ہو جائے جسے کھو چکے ہو۔

۵۵ - یعنی اس ذلت و رسوائی سے بڑھ کر مصیبت ان کے لیے یہ ہوگی کہ جن منافقانہ اوصاف کو یہ اپنے اندر پرورش کر رہے ہیں، ان کی بدولت انھیں مرتے دم تک صدقِ ایمانی کی توفیق نصیب نہ ہوگی اور اپنی دنیا خراب کر لینے کے بعد یہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوں گے کہ آخرت بھی خراب بلکہ خراب تر ہوگی۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ ۖ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ
يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا
إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ۚ

وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمھی میں سے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوف زدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پا لیں یا کوئی کھوہ یا گھُس بیٹھنے کی جگہ، تو بھاگ کر اُس میں جا چھپیں۔[56]

اے نبیؐ! ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔

---

۵۶ - مدینہ کے یہ منافق زیادہ تر بلکہ تمام تر مال دار اور سن رسیدہ لوگ تھے۔ ابنِ کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ملتا ہے اور غریب ان میں سے کوئی بھی نہیں ـــــ یہ لوگ مدینہ میں جائدادیں اور پھیلے ہوئے کاروبار رکھتے تھے اور جہاندیدگی نے ان کو مصلحت پرست بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینہ پہنچا اور آبادی کے ایک بڑے حصے نے پورے اخلاص اور جوشِ ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا، تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصے میں مبتلا پایا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے اپنے قبیلوں کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے۔ ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست، عزت، شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے، حتّٰی کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سارے عرب سے بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اغراضِ نفسانی کی بندگی نے معاملے کے اس پہلو پر نظر کرنے کی استعداد تو ان کے اندر باقی ہی نہیں رہنے دی تھی کہ حق اور صداقت بجائے خود بھی کوئی قیمتی چیز ہے جس کے عشق میں انسان خطرات مول لے سکتا ہے اور جان و مال کی قربانیاں گوارا کر سکتا ہے۔ وہ دنیا کے سارے معاملات و مسائل پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کے لحاظ سے نگاہ ڈالنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کو اپنے مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں تاکہ اپنی قوم کے درمیان اپنی ظاہری عزت اور اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار کو برقرار رکھ سکیں، مگر مخلصانہ ایمان نہ اختیار کریں تاکہ اُن خطرات و نقصانات سے دوچار نہ ہوں جو اخلاص کی راہ اختیار کرنے سے لازماً پیش آنے تھے۔ ان کی اسی ذہنی کیفیت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہ لوگ تمھارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ نقصانات کے خوف نے انھیں زبردستی تمھارے ساتھ باندھ دیا ہے۔ جو چیز انھیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائیں، وہ صرف یہ خوف ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے علانیہ غیر مسلم بن کر رہیں تو جاہ و منزلت ختم ہوتی ہے اور بیوی بچوں تک سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ
يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا

اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔[۵۷] کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسولؐ نے جو کچھ بھی انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے[۵۸] اور کہتے کہ

مدینہ کو چھوڑ دیں تو اپنی جائدادوں اور تجارتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اور ان کے اندر کفر کے لیے بھی اتنا اخلاص نہیں ہے کہ اس کی خاطر وہ ان نقصانات کو برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اس مخمصے نے انھیں کچھ ایسا پھانس رکھا ہے کہ مجبوراً مدینہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، بادلِ ناخواستہ نمازیں پڑھ رہے ہیں اور زکوٰۃ کا ''جرمانہ'' بھگت رہے ہیں۔ ورنہ آئے دن جہاد اور آئے دن کسی نہ کسی خوفناک دشمن کے مقابلے اور آئے دن جان و مال کی قربانیوں کے مطالبے کی جو ''مصیبت'' ان پر پڑی ہوئی ہے، اس سے بچنے کے لیے اس قدر بے چین ہیں کہ اگر کوئی سُوراخ یا بِل بھی ایسا نظر آجائے جس میں انھیں امن ملنے کی اُمید ہو تو یہ بھاگ کر اس میں گھُس بیٹھیں۔

۵۷ - عرب میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے تمام اُن باشندوں پر جو ایک مقرر مقدار سے زائد مال رکھتے تھے، باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی اور وہ ان کی زرعی پیداوار سے، ان کے مویشیوں سے، ان کے اموالِ تجارت سے، اُن کے معدنیات سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ڈھائی فی صد، ۵ فی صد، ۱۰ فی صد اور ۲۰ فی صد کی مختلف شرحوں کے مطابق وصول کی جاتی تھی۔ یہ سب اموالِ زکوٰۃ ایک منظم طریقے سے وصول کیے جاتے اور ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم طریقے سے خرچ کیے جاتے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ملک کے اطراف سے اتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپؐ کے ہاتھوں خرچ ہوتی تھی جو عرب کے لوگوں نے کبھی اس سے پہلے کسی ایک شخص کے ہاتھوں جمع اور تقسیم ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ دنیا پرست منافقین کے منہ میں اس دولت کو دیکھ کر پانی بھر بھر آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بہتے ہوئے دریا سے ان کو خوب سیر ہو کر پینے کا موقع ملے، مگر یہاں پلانے والا خود اپنے اُوپر اور اپنے متعلقین پر اس دریا کے ایک ایک قطرے کو حرام کر چکا تھا اور کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے مستحق لوگوں کے سوا کسی اور کے لب تک جام پہنچ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم صدقات کو دیکھ دیکھ کر دلوں میں گھُٹتے تھے اور تقسیم کے موقع پر آپؐ کو طرح طرح کے الزامات سے مطعون کرتے تھے۔ دراصل شکایت تو انھیں یہ تھی کہ اس مال پر ہمیں دست درازی کا موقع نہیں دیا جاتا، مگر اس حقیقی شکایت کو چھپا کر وہ الزام یہ رکھتے تھے کہ مال کی تقسیم انصاف سے نہیں کی جاتی اور اس میں جانب داری سے کام لیا جاتا ہے۔

۵۸ - یعنی مالِ غنیمت میں سے جو حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیتے ہیں اس پر قانع رہتے، اور خدا کے فضل سے جو کچھ یہ خود کماتے ہیں اور خدا کے دیے ہوئے ذرائعِ آمدنی سے جو خوش حالی انھیں میسر ہے، اس کو اپنے لیے کافی سمجھتے۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ
رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا

ع ۱۴/۱۳

”اللہ ہمارے لیے کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا،[۵۹] ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں“[۶۰]۔ یہ صدقات تو دراصل فقیروں[۶۱] اور مسکینوں[۶۲] کے لیے ہیں اور اُن لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں،[۶۳]

۵۹ – یعنی زکوٰۃ کے علاوہ جو اموال حکومت کے خزانے میں آئیں گے، ان سے حسبِ استحقاق ہم لوگوں کو اسی طرح استفادے کا موقع حاصل رہے گا جس طرح اب تک رہا ہے۔

۶۰ – یعنی ہماری نظر دنیا اور اس کی متاعِ حقیر پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔ اسی کی خوشنودی ہم چاہتے ہیں۔ اسی سے اُمید رکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ دے اُس پر راضی ہیں۔

۶۱ – فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے، خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں، یا کسی عارضی سبب سے سرِ دست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انھیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں، مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔

۶۲ – مَسْکَنَت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحقِ امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں، مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ ولا یقوم فیسئال الناس ”مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا، اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے، اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔“ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

۶۳ – یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، اُن کی تنخواہیں بہرحال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہ الفاظ اور اسی سورت کی آیت ۱۰۳ کے الفاظ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنی ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِيۡنَ وَ فِيۡ

اور اُن کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب[۶۴] ہو۔نیز یہ گردنوں کے چھڑانے[۶۵] اور قرض داروں کی مدد کرنے میں[۶۶] اور

حرام قرار دیا تھا، چنانچہ آپؐ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے، لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپؐ کے خاندان کے لوگ اگر صاحبِ نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

۶۴ – تالیفِ قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انھیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں، یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عَطِیّے دے کر اسلام کا حامی و مددگار، یا مطیع و فرماں بردار، یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مَد پر غنائم اور دوسرے ذرائعِ آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے، اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مَد سے بھی۔ اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے، بلکہ وہ مال دار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ امر تو مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے وظیفے اور عَطِیّے دیے جاتے تھے، لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا آپؐ کے بعد بھی یہ مَد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مَد ساقط ہو گئی ہے اور اب مُؤَلَّفَۃُ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ کی مَد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں۔ اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا حصّہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

حَنَفِیَّہ کا اِستدلال اس واقعے سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد عُیَیْنَہ بن حِصْن اور اَقْرَع بن حابس حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی۔ آپ نے ان کو عَطِیّے کا فرمان لکھ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیانِ صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ چنانچہ گواہیاں بھی ہو گئیں۔ مگر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس گواہی لینے گئے تو انھوں نے فرمان کو پڑھ کر اسے ان کی آنکھوں کے سامنے چاک کر دیا اور ان سے کہا کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیفِ قلب کے لیے تمھیں دیا کرتے تھے، مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس پر وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت لے کر آئے اور آپ کو طعنہ بھی دیا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ لیکن نہ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نے اس پر

کوئی نوٹس لیا اور نہ دوسرے صحابہؓ میں سے ہی کسی نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس سے حَنفِیّہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مسلمان کثیر التعداد ہو گئے اور ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی کہ اپنے بل بُوتے پر کھڑے ہو سکیں تو وہ سبب باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ابتداءً مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا، اس لیے باجماعِ صحابہ یہ حصہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو گیا۔

امام شافعیؒ کا اِستدلال یہ ہے کہ تالیفِ قلب کے لیے کفار کو مالِ زکوٰۃ دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں ہے۔ جتنے واقعات حدیث میں ہم کو ملتے ہیں، ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کفار کو تالیفِ قلب کے لیے جو کچھ دیا وہ مالِ غنیمت سے دیا نہ کہ مالِ زکوٰۃ سے۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا حصّہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیفِ قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مَد میں کچھ نہ کچھ صَرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو، تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجایش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور صحابۂ کرامؓ کا اجماع جس امر پر ہُوا تھا، وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانے میں جو حالات تھے ان میں تالیفِ قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہؓ کے اجماع نے اُس مَد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالحِ دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

رہی امام شافعیؒ کی رائے، تو وہ اس حد تک تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب حکومت کے پاس دوسری مَداتِ آمدنی سے کافی مال موجود ہو تو اسے تالیفِ قلب کی مَد پر زکوٰۃ کا مال صَرف نہ کرنا چاہیے۔ لیکن جب زکوٰۃ کے مال سے اس کام میں مدد لینے کی ضرورت پیش آ جائے تو پھر یہ تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فاسقوں پر اسے صَرف کیا جائے اور کافروں پر نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن میں مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا جو حصّہ رکھا گیا ہے وہ ان کے دعوائے ایمان کی بِنا پر نہیں ہے بلکہ اس بِنا پر ہے کہ اسلام کو اپنے مصالح کے لیے ان کی تالیفِ قلب مطلوب ہے اور وہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کی تالیفِ قلب صرف مال ہی کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ یہ حاجت اور یہ صفت جہاں بھی متحقق ہو، وہاں امامِ مسلمین بشرطِ ضرورت زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کا ازرُوئے قرآن مجاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس مَد سے کفار کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کے پاس دوسری مَدات کا مال موجود تھا۔ ورنہ اگر آپؐ کے نزدیک کفار پر اس مَد کا مال صرف کرنا جائز نہ ہوتا تو آپؐ اس کی تشریح فرماتے۔

۶۵ – گردنیں چھُڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صَرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمھیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مَد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔ ان میں سے پہلی صورت پر تو سب فقہا متفق ہیں، لیکن دوسری صورت کو حضرت علیؓ، سعید بن جُبیر، لَیث، ثَوری، ابراہیم نَخَعی، شَعْبی، محمد بن سِیرین، حَنفِیّہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں، اور ابنِ عباسؓ، حسن بصری، مالک، احمد اور ابو ثَور جائز قرار دیتے ہیں۔

۶۶ – یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چُکا دیں تو ان کے پاس قدرِ نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار، اور خواہ عرفِ عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت

Maktaba Tul Ishaat.com

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ۝۶۰ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ

راہِ خدا میں[67] اور مسافر نوازی میں[68] استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔
ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دُکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص

زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ مگر متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بد اعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اُڑا کر اپنے آپ کو قرض داری میں مبتلا کیا ہو، اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔

۶۷ – راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اِس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رُو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صَرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے، اور ائمۂ سَلَف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے، یعنی وہ جِدّوجُہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جِدّوجُہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے، خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں، ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمۂ سَلَف کے کلام میں بالعُموم اس موقع پر غَزْو کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنٰی ہے، اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی جو مد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ، قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

۶۸ – مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو، لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔

یہاں بعض فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر مَعْصِیَت کے لیے نہ ہو، صرف وہی اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے۔ مگر قرآن و حدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے، اور دین کی اُصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو، اس کی دست گیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حُسنِ سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّـكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ
رَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ
لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝٦١ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَـكُمۡ لِيُرۡضُوۡكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ وَ
رَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ اِنۡ كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۝٦٢ اَلَمۡ
يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّهٗ مَنۡ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ

الخمسۃ

کانوں کا کچا ہے۔[۶۹] کہو: "وہ تمھاری بھلائی کے لیے ایسا ہے[۷۰]، اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہلِ ایمان پر اعتماد کرتا ہے[۷۱] اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایمان دار ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔"

یہ لوگ تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمھیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسولؐ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے

۶۹ - منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن عیُوب سے مُتّہم کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ حضوؐر ہر شخص کی سُن لیتے تھے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کی نگاہ میں عیب تھی۔ کہتے تھے کہ آپؐ کانوں کے کچے ہیں، جس کا جی چاہتا ہے آپؐ کے پاس پہنچ جاتا ہے، جس طرح چاہتا ہے آپؐ کے کان بھرتا ہے، اور آپؐ اس کی بات مان لیتے ہیں۔ اس الزام کا چرچا زیادہ تر اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ سچّے اہلِ ایمان اِن منافقین کی سازشوں اور ان کی شرارتوں اور ان کی مخالفانہ گفتگوؤں کا حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا کرتے تھے، اور اس پر یہ لوگ سیخ پا ہو کر کہتے تھے کہ آپؐ ہم جیسے شرفا و معززین کے خلاف ہر کنگلے اور ہر فقیر کی دی ہوئی خبروں پر یقین کر لیتے ہیں۔

۷۰ - جواب میں ایک جامع بات ارشاد ہوئی ہے جو اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے: ایک یہ کہ وہ فساد اور شر کی باتیں سننے والا آدمی نہیں ہے، بلکہ صرف انھی باتوں پر توجہ کرتا ہے جن میں خیر اور بھلائی ہے اور جن کی طرف التفات کرنا اُمت کی بہتری اور دین کی مصلحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ایسا ہونا تمھارے ہی لیے بھلائی ہے۔ اگر وہ ہر ایک کی سُن لینے والا اور ضبط و تحمل سے کام لینے والا آدمی نہ ہوتا تو ایمان کے وہ جھوٹے دعوے اور خیرسگالی کی وہ نمایشی باتیں اور راہِ خدا سے بھاگنے کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

خَالِدًا فِيهَا ۚ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُونَ أَنْ
تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِءُوا ۚ
إِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ
إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللّٰهِ وَآيٰتِهِ وَرَسُولِهِ

جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رُسوائی ہے۔

یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سُورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے[۷۲]۔ اے نبیؐ! ان سے کہو: "اور مذاق اُڑاؤ، اللہ اُس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو۔" اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے، تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے[۷۳]۔ ان سے کہو: "کیا تمھاری ہنسی دل لگی اللہ اور اُس کی آیات

وہ عُذراتِ لنگ جو تم کیا کرتے ہو، انھیں صبر سے سننے کے بجائے تمھاری خبر لے ڈالتا اور تمھارے لیے مدینہ میں جینا دشوار ہو جاتا۔ پس اس کی یہ صفت تو تمھارے حق میں اچھی ہے نہ کہ بُری۔

۷۱ – یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر ایک کی بات پر یقین لے آتا ہے۔ وہ چاہے سنتا سب کی ہو، مگر اعتماد صرف انھی لوگوں پر کرتا ہے جو سچے مومن ہیں۔ تمھاری جن شرارتوں کی خبریں اُس تک پہنچیں اور اس نے ان پر یقین کیا، وہ بداخلاق چغل خوروں کی پہنچائی ہوئی نہ تھیں بلکہ صالح اہلِ ایمان کی پہنچائی ہوئی تھیں اور اسی قابل تھیں کہ ان پر اعتماد کیا جاتا۔

۷۲ – یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر سچا ایمان تو نہیں رکھتے تھے لیکن جو تجربات انھیں پچھلے آٹھ نو برس کے دَوران میں ہو چکے تھے، ان کی بنا پر انھیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آپ کے پاس کوئی نہ کوئی فوق الفطری ذریعۂ معلومات ضرور ہے جس سے آپ کو ان کے پوشیدہ رازوں تک کی خبر پہنچ جاتی ہے اور بسا اوقات قرآن میں (جسے وہ حضورؐ کی اپنی تصنیف سمجھتے تھے) آپ ان کے نِفاق اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیتے ہیں۔

۷۳ – غزوۂ تبوک کے زمانے میں منافقین اکثر اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر نبیؐ اور مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے تھے اور اپنی تضحیک سے اُن لوگوں کی ہمتیں پست کرنے کی کوشش کرتے تھے جنھیں وہ نیک نیتی کے ساتھ آمادۂ جہاد پاتے۔ چنانچہ روایات میں ان لوگوں کے بہت سے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک محفل میں چند منافق بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ ایک نے کہا: "اجی کیا رومیوں کو بھی تم نے کچھ عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کل دیکھ لینا کہ یہ سب سُورما جو لڑنے تشریف لائے ہیں رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔"

كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾ ع اَلْمُنٰفِقُوْنَ
وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ

وقف لازم

اور اس کے رسولؐ ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو تو ہم ضرور سزا دیں گے، کیونکہ وہ مجرم ہے۔[74]" ع

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دُوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ بُرائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔[75] یہ اللہ کو بُھول گئے

دوسرا بولا: "مزا ہو جو اُوپر سے سو سو کوڑے بھی لگانے کا حکم ہو جائے۔" ایک اور منافق نے حضورؐ کو جنگ کی سرگرم تیاریاں کرتے دیکھ کر اپنے یار دوستوں سے کہا: "آپ کو دیکھیے، آپ روم و شام کے قلعے فتح کرنے چلے ہیں۔"

۷۴ - یعنی وہ کم عقل مسخرے تو معاف بھی کیے جا سکتے ہیں جو صرف اس لیے ایسی باتیں کرتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا میں کوئی چیز سنجیدہ ہے ہی نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے جان بُوجھ کر یہ باتیں اس لیے کی ہیں کہ وہ رسولؐ اور اس کے لائے ہوئے دین کو اپنے دعوائے ایمان کے باوجود ایک مضحکہ سمجھتے ہیں، اور جن کے اس تمسخر کا اصل مُدعا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی ہمتیں پست ہوں اور وہ پوری قوت کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کر سکیں، ان کو تو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ مسخرے نہیں بلکہ مجرم ہیں۔

۷۵ - یہ تمام منافقین کی مشترک خصوصیّت ہے۔ ان سب کو بُرائی سے دلچسپی اور بھلائی سے عداوت ہوتی ہے۔ کوئی شخص بُرا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں، ان کے مشورے، ان کی ہمت افزائیاں، ان کی اعانتیں، ان کی سفارشیں، ان کی تعریفیں اور مدح سرائیاں سب اس کے لیے وقف ہوں گی۔ دل و جان سے خود اس بُرے کام میں شریک ہوں گے، دوسروں کو اس میں حصّہ لینے کی ترغیب دیں گے، کرنے والے کی ہمت بڑھائیں گے، اور ان کی ہر ادا سے یہ ظاہر ہو گا کہ اس بُرائی کے پروان چڑھنے ہی سے کچھ ان کے دل کو راحت اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بخلاف اس کے کوئی بھلا کام ہو رہا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے، اس

Maktaba Tul Ishaat.com

فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ
هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ۙ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ
فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ
اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

تو اللہ نے بھی انھیں بُھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے ـــــ تم لوگوں[۷۶] کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمھارے پیش رَووں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال اور اولاد والے تھے۔ پھر انھوں نے دنیا میں اپنے حصّے کے مزے لُوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصّے کے مزے اسی طرح لُوٹے جیسے انھوں نے لُوٹے تھے، اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے، سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دُنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی

کے تصوّر سے ان کا دل دُکھتا ہے، اس کی تجویز تک انھیں گوارا نہیں ہوتی، اس کی طرف کسی کو بڑھتے دیکھتے ہیں تو ان کی روح بے چین ہونے لگتی ہے۔ ہر ممکن طریقے سے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس نیکی سے باز آجائے، اور باز نہیں آتا تو اس کام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ان سب کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا۔ خواہ وہ کنجوس ہوں یا بڑے خرچ کرنے والے، بہرحال ان کی دولت یا تو تجوریوں کے لیے ہوتی ہے یا پھر حرام راستوں سے آتی اور حرام ہی کے راستوں میں بہ جاتی ہے۔ بدی کے لیے چاہے وہ اپنے وقت کے قارون ہوں، مگر نیکی کے لیے

الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّ
ثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ
اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

وقف لازم

خسارے میں ہیں ___ کیا[۷۷] اِن لوگوں کو اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوحؑ کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیمؑ کی قوم، مَدیَن کے لوگ اور وہ بستیاں جنھیں اُلٹ دیا گیا۔[۷۸] اُن کے رسُول ان کے پاس کھُلی کھُلی نشانیاں لے کر آئے، پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اُوپر ظلم کرنے والے تھے۔[۷۹]

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے

ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں ہوتا۔

۷۶- منافقین کا غائبانہ ذکر کرتے کرتے یکایک ان سے براہِ راست خطاب شروع ہو گیا ہے۔

۷۷- یہاں سے پھر ان کا غائبانہ ذکر شروع ہو گیا۔

۷۸- اشارہ ہے قومِ لُوط کی بستیوں کی طرف۔

۷۹- یعنی ان کی تباہی و بربادی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ انھیں تباہ کرے۔ بلکہ دراصل انھوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرزِ زندگی پسند کیا جو انھیں بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ اللہ نے تو انھیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا، ان کی فہمایش کے لیے رسول بھیجے، رسولوں کے ذریعے سے ان کو غلط رَوی کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا اور انھیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ ان کے لیے فلاح کا راستہ کون سا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کون سا۔ مگر جب انھوں نے اصلاحِ حال کے کسی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر

Maktaba Tul Ishaat.com

أُولَٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾ وَعَدَ
اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا
الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ۚ وَ
رِضْوٰنٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٧٢﴾

ہیں[۸۰]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ؑ

ہو کر رہا، اور یہ ظلم ان پر اللہ نے نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اُوپر کیا۔

۸۰ – جس طرح منافقین ایک الگ اُمت ہیں اسی طرح اہلِ ایمان بھی ایک الگ اُمت ہیں۔ اگرچہ ایمان کا ظاہری اقرار اور اسلام کی پیروی کا خارجی اظہار دونوں گروہوں میں مشترک ہے، لیکن دونوں کے مزاج، اخلاق، اطوار، عادات اور طرزِ فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں زبان پر ایمان کا دعویٰ ہے، مگر دل سچّے ایمان سے خالی ہیں، وہاں زندگی کا سارا رنگ ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے دعوائے ایمان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اُوپر کے لیبل پر تو لکھا ہے کہ یہ مُشک ہے، مگر لیبل کے نیچے جو کچھ ہے وہ اپنے پورے وجود سے ثابت کر رہا ہے کہ یہ گوبر کے سوا کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے، وہاں مُشک اپنی صورت سے، اپنی خوشبو سے، اپنی خاصیتوں سے ہر آزمایش اور ہر معاملے میں اپنا مُشک ہونا کھولے دے رہا ہے۔ اسلام و ایمان کے عُرفی نام نے بظاہر دونوں گروہوں کو ایک اُمّت بنا رکھا ہے، مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاق مزاج اور رنگِ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اسی وجہ سے منافقانہ خصائل رکھنے والے مرد و زن ایک الگ جتھا بن گئے ہیں جن کو خدا سے غفلت، بُرائی سے دلچسپی، نیکی سے بُعد اور خیر سے عَدَمِ تعاوُن کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہلِ ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے۔ اور دوسری جانب سچّے مومن مرد و زن ایک دوسرا گروہ بن گئے ہیں، جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں، بدی سے نفرت کرتے ہیں، خدا کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت اِن کی زندگی کا دتیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرزِ زندگی نے انھیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ

اے نبیؐ[81]! کفار اور منافقین دونوں کا پُوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ،[82]

کے گروہ سے توڑ دیا ہے۔

۸۱ – یہاں سے وہ تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جو غزوۂ تبوک کے بعد نازل ہوئی تھی۔

۸۲ – اس وقت تک منافقین کے ساتھ زیادہ تر درگزر کا معاملہ ہو رہا تھا، اور اس کے دو وجوہ تھے: ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت ابھی اتنی مضبوط نہ ہوئی تھی کہ باہر کے دشمنوں سے لڑنے کے ساتھ ساتھ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لے لیتے۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے جو لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے۔ مسلمانوں کی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا، اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہو گیا تھا، تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ نہ کھڑا کر سکیں۔ پھر ان لوگوں کو پورے ۹ سال تک سوچنے، سمجھنے اور دینِ حق کو پَرکھنے کا موقع بھی دیا جا چکا تھا، جس سے وہ فائدہ اُٹھا سکتے تھے اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لیے حکم ہُوا کہ کفار کے ساتھ ساتھ اب اِن منافقین کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیا جائے، اور جو نرم رَویّہ اب تک ان کے معاملے میں اختیار کیا جاتا رہا ہے، اسے ختم کر کے اب ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے۔

منافقین کے خلاف جہاد اور سخت برتاؤ سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ دراصل اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ رَوِش سے جو چشم پوشی اب تک برتی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ مسلمانوں میں مِلے جُلے رہے، اور عام مسلمان ان کو اپنی ہی سوسائٹی کا ایک جُز سمجھتے رہے، اور ان کو جماعت کے معاملات میں دخل دینے اور سوسائٹی میں اپنے نِفاق کا زہر پھیلانے کا موقع ملتا رہا، اس کو آیندہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اب جو شخص بھی مسلمانوں میں شامل رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرزِ عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ خدا اور رسولؐ اور اہلِ ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے، اسے کُھلّم کُھلّا بے نقاب کیا جائے، عَلانیہ اس کو ملامت کی جائے، سوسائٹی میں اس کے لیے عزت و اعتبار کا کوئی مقام باقی نہ رہنے دیا جائے، معاشرت میں اس سے قطعِ تعلّق ہو، جماعتی مشوروں سے وہ الگ رکھا جائے، عدالتوں میں اس کی شہادت غیر معتبر ہو، عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند رہے، محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے، ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو خود معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں کہیں بھی اس کا کوئی وقار نہیں اور کسی دل میں بھی اس کے لیے احترام کا کوئی گوشہ نہیں۔ پھر اگر اُن میں سے کوئی شخص کسی صریح غداری کا مرتکب ہو تو اس کے جرم پر پردہ نہ ڈالا جائے، نہ اسے معاف کیا جائے، بلکہ علیٰ رؤس الاَشہاد اس پر مقدّمہ چلایا جائے اور اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو اس مرحلے پر مسلمانوں کو دی جانی ضروری تھی۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزّل و انحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کو پرورش کرتی ہو اور

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ
مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ
اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ

آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی، حالانکہ انھوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے[۸۳]۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے[۸۴]۔ یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے نا کہ

جس میں گھریلو سانپ عزت اور تحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں، اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نِفاق کا حال طاعون کا سا ہے اور منافق وہ چُوہا ہے جو اس وبا کے جراثیم لیے پھرتا ہے۔ اس کو آبادی میں آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقع دینا گویا پوری آبادی کو موت کے خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت و احترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری و منافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص، خیر خواہی اور صداقتِ ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہارِ ایمان کے ساتھ خیانت اور بے وفائی کا رَوِیّہ اختیار کر کے بھی یہاں آدمی پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے حکیمانہ فقرے میں بیان فرمایا ہے کہ من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام۔ ’’جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت کی تعظیم و توقیر کی، وہ دراصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار ہوا‘‘

۸۳ – وہ بات کیا تھی جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کے متعلق کوئی یقینی معلومات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ البتہ روایات میں متعدد ایسی کافرانہ باتوں کا ذکر آیا ہے جو اس زمانے میں منافقین نے کی تھیں۔ مثلاً ایک منافق کے متعلق مروی ہے کہ اس نے اپنے عزیزوں میں سے ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ’’اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کرتا ہے تو ہم سب گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔‘‘ ایک اور روایت میں ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی گم ہو گئی۔ مسلمان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس پر منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی مجلس میں بیٹھ کر خوب مذاق اُڑایا اور آپس میں کہا کہ ’’یہ حضرت آسمان کی خبریں تو خوب سناتے ہیں مگر ان کو اپنی اُونٹنی کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔‘‘

۸۴ – یہ اشارہ ہے اُن سازشوں کی طرف جو منافقوں نے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں کی تھیں۔ ان میں سے پہلی سازش کا واقعہ محدثین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تبوک سے واپسی پر جب مسلمانوں کا لشکر ایک ایسے مقام کے قریب پہنچا جہاں سے پہاڑوں کے درمیان راستہ گزرتا تھا تو بعض منافقین نے آپس میں طے کیا کہ رات کے وقت کسی گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے

أَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا
لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ
وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ

اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے[۸۵]! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انھی کے لیے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور زمین میں کوئی نہیں جو اِن کا حمایتی اور مددگار ہو۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا

نبیؐ کو کھڈ میں پھینک دیں گے۔ حضورؐ کو اس کی اِطّلاع ہوگئی۔ آپؐ نے تمام اہلِ لشکر کو حکم دیا کہ وادی کے راستے سے نکل جائیں، اور آپؐ خود صرف عمّار بن یاسرؓ اور حُذَیفہ بن یمانؓ کو لے کر گھاٹی کے اندر سے ہو کر چلے۔ اثنائے راہ میں یکایک معلوم ہوا کہ دس بارہ منافق ڈھاٹے باندھے ہوئے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت حُذَیفہؓ ان کی طرف لپکے تاکہ ان کے اُونٹوں کو مار مار کر ان کے منہ پھیر دیں۔ مگر وہ دُور ہی سے حضرت حُذَیفہؓ کو آتے دیکھ کر ڈر گئے اور اس خوف سے کہ کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں، فوراً بھاگ نکلے۔

دوسری سازش جس کا اس سلسلے میں ذکر کیا گیا ہے، یہ ہے کہ منافقین کو رومیوں کے مقابلے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے وفادار ساتھیوں کے بخیریت بچ کر واپس آجانے کی توقع نہ تھی، اس لیے انھوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ جونہی اُدھر کوئی سانحہ پیش آئے، اِدھر مدینہ میں عبداللہ بن اُبَیّ کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا جائے۔

۸۵- نبیؐ کی ہجرت سے پہلے مدینہ عرب کے قصبات میں سے ایک معمولی قصبہ تھا اور اَوس و خزرج کے قبیلے مال یا جاہ کے لحاظ سے کوئی اونچا درجہ نہ رکھتے تھے۔ مگر جب حضورؐ وہاں تشریف لے گئے اور انصار نے آپؐ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا تو آٹھ نو سال کے اندر اندر یہی متوسط درجے کا قصبہ تمام عرب کا دارالسلطنت بن گیا۔ وہی اَوس و خزرج کے کاشتکار سلطنت کے اَعیان و اکابر بن گئے اور ہر طرف سے فتوحات، غنائم اور تجارت کی برکات اس مرکزی شہر پر بارش کی

Maktaba Tul Ishaat.com

بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ
مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ

تو وہ بُخل پر اُتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انھیں اس کی پروا تک نہیں ہے[86]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اِس بدعہدی کی وجہ سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی، اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو ان کے مخفی راز اور ان کی پوشیدہ سرگوشیاں تک معلوم ہیں اور وہ تمام غیب کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے؟ (وہ خوب جانتا ہے اُن کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہلِ ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جن کے پاس (راہِ خدا میں دینے کے لیے) اُس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اُوپر مشقّت برداشت کر کے دیتے ہیں[87]۔

طرح برسنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ اسی پر انھیں شرم دلا رہا ہے کہ ہمارے نبیؐ پر تمھارا یہ غصہ کیا اسی قصور کی پاداش میں ہے کہ اس کی بدولت یہ نعمتیں تمھیں بخشی گئیں!

۸٦ – اُوپر کی آیت میں ان منافقین کی جس کافرِنعمتی و محسن کشی پر ملامت کی گئی تھی، اس کا ایک اور ثبوت خود انھی کی زندگیوں سے پیش کر کے یہاں واضح کیا گیا ہے کہ دراصل یہ لوگ عادی مجرم ہیں، ان کے ضابطۂ اخلاق میں شکر، اعترافِ نعمت اور پاسِ عہد جیسی خوبیوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔

۸۷ – غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبیؐ نے چندے کی اپیل کی تو بڑے بڑے مال دار منافقین ہاتھ روکے بیٹھے رہے۔ مگر جب مخلص اہلِ ایمان بڑھ بڑھ کر چندے دینے لگے تو ان لوگوں نے اُن پر باتیں چھانٹنی شروع کیں۔ کوئی ذی استطاعت

فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
ع ۱۰ ۸ ۱۲ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع فَرِحَ
الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ
يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا
لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا

اللہ اِن مذاق اُڑانے والوں کا مذاق اُڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے نبیؐ! تم خواہ ایسے لوگوں کے لیے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا۔ ع

جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی، وہ اللہ کے رسولؐ کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انھیں گوارا نہ ہُوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ”اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔“ ان سے کہو کہ جہنّم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انھیں

مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق یا اس سے بڑھ کر کوئی بڑی رقم پیش کرتا تو یہ اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے، اور اگر کوئی غریب مسلمان اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر کوئی چھوٹی سی رقم حاضر کرتا، یا رات بھر محنت مزدوری کر کے کچھ کھجوریں حاصل کرتا اور وہی لا کر پیش کر دیتا، تو یہ اس پر آوازے کستے کہ لو، یہ ٹِڈی کی ٹانگ بھی آ گئی ہے، تاکہ اس سے روم کے قلعے فتح کیے جائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ
لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ
عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ
الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾

اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انھیں اس پر رونا چاہیے)۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمھیں واپس لے جائے اور آیندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا کہ "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیّت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو۔"

اور آیندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نمازِ جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے[88]

۸۸ – تبوک سے واپسی پر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ عبداللہ بن اُبَی رئیس المنافقین مرگیا۔ اس کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ جو مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لیے آپؐ کا کُرتا مانگا۔ آپؐ نے کمال فراخ دلی کے ساتھ عطا کر دیا۔ پھر انھوں نے درخواست کی کہ آپؐ ہی اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں۔ آپؐ اس کے لیے بھی تیار ہوگئے۔ حضرت عمرؓ نے باصرار عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کیا آپ اس شخص پر نمازِ جنازہ پڑھیں گے جو یہ اور یہ کر چکا ہے۔ مگر حضورؐ ان کی یہ سب باتیں سُن کر مسکراتے رہے اور اپنی اُس رحمت کی بنا پر جو دوست دشمن سب کے لیے عام تھی، آپؐ نے اس بدترین دشمن کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرنے میں تامّل نہ کیا۔ آخر جب آپؐ نماز پڑھانے کھڑے ہی ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہِ راست حکمِ خداوندی سے آپؐ کو روک دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جا چکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح پنپنے نہ دیا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَ
اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ
اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ
الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

ان کی مالداری اور ان کی کثرتِ اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اللہ نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اِس مال و اولاد کے ذریعے سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

جب کبھی کوئی سُورت اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر جہاد کرو، تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحبِ مقدرت تھے، وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے، اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیا گیا، اس لیے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں[۸۹] آتا۔ بخلاف اس کے رسولؐ نے اور ان لوگوں نے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان لائے تھے،

جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ فُسّاق اور فُجّار اور مشہور بفسق لوگوں کی نمازِ جنازہ مسلمانوں کے امام اور سربرآوردہ لوگوں کو نہ پڑھانی چاہیے نہ پڑھنی چاہیے۔ ان آیات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہوگیا تھا کہ جب آپؐ کو کسی جنازے پر تشریف لانے کے لیے کہا جاتا تو آپؐ پہلے مرنے والے کے متعلق دریافت فرماتے تھے کہ کس قسم کا آدمی تھا، اور اگر معلوم ہوتا کہ بُرے چلن کا آدمی تھا تو آپؐ اس کے گھر والوں سے کہہ دیتے تھے کہ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو اسے دفن کردو۔

۸۹ – یعنی اگرچہ یہ بڑی شرم کے قابل بات ہے کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست، صاحبِ مقدرت لوگ، ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کام کا وقت آنے پر میدان میں نکلنے کے بجائے گھروں میں گُھس بیٹھیں اور عورتوں میں جا شامل ہوں، لیکن

Maktaba Tul Ishaat.com

جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع وَجَآءَ
الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

ع ۹ ۱۲

اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انھی کے لیے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی ع

بَدوی عربوں[90] میں سے بھی بہت سے لوگ آئے جنھوں نے عذر کیے، تاکہ انھیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔ اِس طرح بیٹھ رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا۔ ان بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے[91]، عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے۔

چونکہ ان لوگوں نے خود جان بُوجھ کر اپنے لیے یہی رَویّہ پسند کیا تھا، اس لیے قانونِ فطرت کے مطابق ان سے وہ پاکیزہ احساسات چھین لیے گئے جن کی بدولت آدمی ایسے ذلیل اطوار اختیار کرنے میں شرم محسوس کیا کرتا ہے۔

۹۰ – بدوی عربوں سے مراد مدینہ کے اطراف میں رہنے والے دیہاتی اور صحرائی عرب ہیں جنھیں عام طور پر بدّو کہا جاتا ہے۔

۹۱ – منافقانہ اظہارِ ایمان، جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق، تسلیم، اخلاص اور اطاعت نہ ہو، اور جس کے ظاہری اقرار کے باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز تر رکھتا ہو، اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے۔ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا، چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ٹھیرائے جا سکتے ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ ہوتا رہے۔ اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطے کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر یا اشتباہِ کفر کا حکم صرف انھی صورتوں میں لگایا جا سکتا ہے جب کہ انکار و بغاوت یا غداری و بے وفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ
مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ

ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جب کہ خلوصِ دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہوں[92]۔ ایسے محسنین پر

اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں۔ لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچ نکلنا یہ معنٰی نہیں رکھتا کہ قضائے خداوندی میں بھی وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ نکلے گا۔

۹۲ - اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں، ان کے لیے بھی مُجرَّد ضعیفی و بیماری یا محض ناداری کافی وجہ معافی نہیں ہے، بلکہ ان کی یہ مجبُوریاں صرف اُس صورت میں ان کے لیے وجہِ معافی ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سچے وفادار ہوں۔ ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقع پر بیمار یا نادار تھا۔ خدا صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے کہ ایسے سب لوگ جو بیماری کا طبّی صداقت نامہ یا بڑھاپے اور جسمانی نَقص کا عذر پیش کر دیں، اُس کے ہاں یکساں معذور قرار دے دیے جائیں اور ان پر سے باز پُرس ساقط ہو جائے۔ وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا، اس کے پورے مخفی و ظاہر برتاؤ کو دیکھے گا، اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی سی معذوری تھی یا ایک غدار اور باغی کی سی۔ ایک شخص ہے کہ جب اس نے فرض کی پکار سُنی تو دل میں لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ”بڑے اچھے موقع پر میں بیمار ہو گیا، ورنہ یہ بلا کسی طرح ٹالے نہ ٹلتی اور خواہ مخواہ مصیبت بھگتنی پڑتی۔“ دوسرے شخص نے یہی پکار سُنی تو تلملا اُٹھا کہ ”ہائے، کیسے موقع پر اس کم بخت بیماری نے آن دبوچا، جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا وہ کس بُری طرح یہاں بستر پر ضائع ہو رہا ہے۔“ ایک نے اپنے لیے تو خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بسترِ علالت پر مجبُور پڑا ہوا تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا رہا اور اپنے تیمارداروں سے بھی کہتا رہا کہ ”میرا اللہ مالک ہے، دوا دارو کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا، مجھ اکیلے انسان کے لیے تم اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دینِ حق کی خدمت میں صَرف ہونا چاہیے۔“ ایک نے بیماری کے عذر سے گھر بیٹھ کر سارا زمانۂ جنگ بددلی پھیلانے، بُری خبریں اُڑانے، جنگی مَساعی کو خراب کرنے اور مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر بگاڑنے میں صرف کیا۔ دوسرے نے یہ دیکھ کر کہ میدان میں جانے کے شَرَف سے وہ محروم رہ گیا ہے، اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ گھر کے محاذ (home-front) کو مضبوط رکھنے میں جو زیادہ سے زیادہ خدمت اس سے بن آئے اسے انجام دے۔ ظاہر کے اعتبار سے تو یہ دونوں ہی معذور ہیں، مگر خدا کی نگاہ میں یہ دو مختلف قسم کے معذور کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے ہاں معافی اگر ہے تو صرف دوسرے شخص کے لیے۔ رہا پہلا شخص،

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ سَبِيلٍ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَآ
أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوا وَّ
أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ﴿۹۲﴾ إِنَّمَا
السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوا بِأَنْ
يَّكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾

اعتراض کی کوئی گنجایش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنھوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کرسکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریکِ جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے[۹۳]۔ البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مال دار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انھیں شرکتِ جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انھوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپا لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے (کہ اللہ کے ہاں ان کی اس روش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے)۔

تو وہ اپنی معذوری کے باوجود غداری و ناوفاداری کا مجرم ہے۔

۹۳ – ایسے لوگ جو خدمتِ دین کے لیے بے تاب ہوں، اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کرسکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی سخت صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہُوا کرتا ہے، ان کا شمار خدا کے ہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا، اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو۔ اس لیے کہ وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کرسکے ہوں لیکن دل سے تو وہ برسرِ خدمت ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوۂ تبوک سے واپسی پر اثنائے سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رُفَقا کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی کہ ان بالمدینة اقوامًا ما سرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم۔ ”مدینہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمھارے ساتھ ساتھ نہ رہے ہوں۔“ صحابہؓ نے تعجب سے کہا: ”کیا مدینہ ہی میں رہتے ہوئے؟“ فرمایا: ”ہاں، مدینے

الجزء ۱۱

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى
اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۹۴ سَيَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا
عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۹۵ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ
تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۹۶

تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے۔ مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو، ہم تمھاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔ اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دیے ہیں۔ اب اللہ اور اس کا رسولؐ تمھارے طرزِ عمل کو دیکھے گا۔ پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔" تمھاری واپسی پر یہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرفِ نظر کرو۔ تو بے شک تم ان سے صرفِ نظر ہی کرلو،۹۴ کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنّم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انھیں نصیب ہوگی۔ یہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہوگا۔

ہی میں رہتے ہوئے۔ کیونکہ مجبوری نے انھیں روک لیا تھا، ورنہ وہ خود رُکنے والے نہ تھے۔"

۹۴ – پہلے فقرے میں صرفِ نظر سے مراد درگزر ہے، اور دوسرے فقرے میں قطعِ تعلّق۔ یعنی وہ تو چاہتے ہیں کہ تم ان سے تعرض نہ کرو، مگر بہتر یہ ہے کہ تم ان سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھو اور سمجھ لو کہ تم ان سے کٹ گئے اور وہ تم سے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ
اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۹۷ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ

یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حُدود سے ناواقف رہیں جو[95] اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدویوں میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں کچھ

۹۵ – جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں بَدوی عربوں سے مراد وہ دیہاتی و صحرائی عرب ہیں جو مدینہ کے اطراف میں آباد تھے۔ یہ لوگ مدینہ میں ایک مضبوط اور منظّم طاقت کو اُٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے، پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے دوران میں ایک مدت تک موقع شناسی و ابن الوقتی کی رَوِش پر چلتے رہے۔ پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز و نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قبیلوں کا زور اس کے مقابلے میں ٹوٹنے لگا تو ان لوگوں نے مَصلحتِ وقت اسی میں دیکھی کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دینِ حق سمجھ کر سچّے دل سے ایمان لائے ہوں اور مخلصانہ طریقے سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیشتر بدویوں کے لیے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مَصلحَت اور پالیسی کی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے حصے میں صرف وہ فوائد آ جائیں جو برسرِ اقتدار جماعت کی رُکنیت اختیار کرنے سے حاصل ہُوا کرتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی بندشیں جو اسلام ان پر عائد کرتا تھا، وہ نماز روزے کی پابندیاں جو اس دین کو قبول کرتے ہی ان پر لگ جاتی تھیں، وہ زکوٰۃ جو باقاعدہ تحصیل داروں کے ذریعے سے ان کے نخلستانوں اور ان کے گلّوں سے وصول کی جاتی تھی، وہ ضبط و نظم جس کے شکنجے میں وہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسے گئے تھے، وہ جان و مال کی قربانیاں جو لُوٹ مار کی لڑائیوں میں نہیں بلکہ خالص راہِ خدا کے جہاد میں آئے دن ان سے طلب کی جا رہی تھیں، یہ ساری چیزیں ان کو شدت کے ساتھ ناگوار تھیں اور وہ ان سے پیچھا چھُڑانے کے لیے ہر طرح کی چالبازیاں اور بہانہ سازیاں کرتے رہتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ حق کیا ہے اور ان کی اور تمام انسانوں کی حقیقی فلاح کس چیز میں ہے۔ انھیں جو کچھ بھی دلچسپی تھی، وہ اپنے مَعاشی مفاد، اپنی آسایش، اپنی زمینوں، اپنے اُونٹوں اور بکریوں اور اپنے خیمے کے آس پاس کی محدود دنیا سے تھی۔ اس سے بالاتر کسی چیز کے ساتھ وہ اُس طرح کی عقیدت تو رکھ سکتے تھے جیسی پیروں اور فقیروں سے رکھی جاتی ہے کہ یہ ان کے آگے نذر و نیاز پیش کریں اور وہ اس کے عوض ترقیِ روزگار اور آفات سے تحفّظ اور ایسی ہی دوسری اغراض کے لیے ان کو تعویذ گنڈے دیں اور ان کے لیے دعائیں کریں۔ لیکن ایسے ایمان و اعتقاد کے لیے وہ تیار نہ تھے جو ان کی پوری تمدّنی، مَعاشی اور معاشرتی زندگی کو اخلاق اور قانون کے ضابطے میں کس دے اور مزید برآں ایک عالمگیر اصلاحی مشن کے لیے ان سے جان و مال کی قربانیوں کا بھی مطالبہ کرے۔

ان کی اسی حالت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ دیہاتی و صحرائی لوگ زیادہ منافقانہ رَوِیّہ

مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ
عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ
الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ
قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ
سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾ ع

خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اُوپر زبردستی کی چٹّی سمجھتے ہیں[۹۶] اور تمھارے حق میں زمانے کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکّر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اُتار پھینکیں جس میں تم نے انھیں کس دیا ہے)۔ حالانکہ بدی کا چکّر خود انھی پر مسلّط ہے اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ اور انھی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرّب کا اور رسولؐ کی طرف سے رحمت کی دُعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرّب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

رکھتے ہیں اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے۔ پھر اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ شہری لوگ تو اہلِ علم اور اہلِ حق کی صحبت سے مستفید ہو کر کچھ دین کو اور اس کے حُدود کو جان بھی لیتے ہیں، مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک مَعاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے پھیر ہی میں پڑے رہتے ہیں اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملتا، اس لیے دین اور اس کے حُدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر موزوں نہ ہوگا کہ ان آیات کے نزول سے تقریباً دو سال بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی عہد میں ارتداد اور منعِ زکوٰۃ کا جو طوفان برپا ہُوا تھا، اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہی تھا جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔

۹۶ — مطلب یہ ہے کہ جو زکوٰۃ ان سے وصول کی جاتی ہے، اسے یہ ایک جرمانہ سمجھتے ہیں۔ مسافروں کی ضیافت و مہمان داری کا جو حق ان پر عائد کیا گیا ہے وہ ان کو بُری طرح کَھلتا ہے۔ اور اگر کسی جنگ کے موقع پر یہ کوئی چندہ دیتے ہیں تو اپنے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕۛ وَ مِنْ
اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ (وقف منزل ۵ مع)
نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ۚ

وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

تمھارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں، ان میں بہت سے منافق ہیں، اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انھیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں[۹۷]۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دُہری سزا دیں[۹۸] گے، پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے۔

دلی جذبے سے رضائے الٰہی کی خاطر نہیں دیتے بلکہ بادلِ ناخواستہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے دیتے ہیں۔

۹۷- یعنی اپنے نفاق کو چھپانے میں وہ اتنے مشّاق ہو گئے ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی کمال درجے کی فراست کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکتے تھے۔

۹۸- دُہری سزا سے مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ دنیا جس کی محبت میں مبتلا ہو کر انھوں نے ایمان و اخلاص کے بجائے منافقت اور غداری کا رویّہ اختیار کیا ہے، ان کے ہاتھ سے جائے گی اور یہ مال و جاہ اور عزت حاصل کرنے کے بجائے اُلٹی ذلت

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ
سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ
بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ
وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ
اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کرلیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے، کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ، اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو، کیونکہ تمھاری دُعا ان کے لیے وجہِ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمھارا طرزِ عمل اب کیا رہتا ہے۔[99]

ونامرادی پائیں گے۔ دوسری طرف جس مشن کو یہ ناکام دیکھنا اور اپنی چال بازیوں سے ناکام کرنا چاہتے ہیں، وہ ان کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم ان کی آنکھوں کے سامنے فروغ پائے گا۔

۹۹ – یہاں جھوٹے مدعیِ ایمان اور گنہگار مومن کا فرق صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے۔ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر فی الواقع خدا اور اس کے دین اور جماعتِ مومنین کے ساتھ کوئی خلوص نہیں رکھتا، اس کے عدمِ اخلاص کا ثبوت اگر اس کے طرزِ عمل سے مل جائے تو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا۔ خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لیے وہ کوئی مال پیش کرے تو اسے رد کر دیا جائے گا، مر جائے تو نہ مسلمان اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور نہ کوئی مومن اس کے لیے دُعائے مغفرت کرے گا، چاہے وہ اس کا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص مومن ہو اور اس سے کوئی غیر مخلصانہ طرزِ عمل سرزد ہو جائے، وہ اگر اپنے قصور کا اعتراف

Maktaba Tul Ishaat.com

کر لے تو اس کو معاف بھی کیا جائے گا، اس کے صدقات بھی قبول کیے جائیں گے اور اس کے لیے دعائے رحمت بھی کی جائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ کس شخص کو غیر مخلصانہ طرزِ عمل کے صُدور کے باوجود منافق کے بجائے محض گناہ گار مومن سمجھا جائے گا، تو یہ تین معیاروں سے پرکھی جائے گی جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) وہ اپنے قصور کے لیے عذراتِ لنگ اور تاویلات و توجیہات پیش نہیں کرے گا بلکہ جو قصور ہُوا ہے اسے سیدھی طرح صاف صاف مان لے گا۔

(۲) اس کے سابق طرزِ عمل پر نگاہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ یہ عَدَمِ اخلاص کا عادی مجرم تو نہیں ہے۔ اگر پہلے وہ جماعت کا ایک صالح فرد رہا ہے اور اس کے کارنامۂ زندگی میں مخلصانہ خدمات، ایثار و قربانی، اور سبقت الی الخیرات کا ریکارڈ موجود ہے تو باور کر لیا جائے گا کہ اِس وقت جو قصور اس سے سرزد ہُوا ہے وہ ایمان و اخلاص کے عَدَم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک کمزوری ہے جو وقتی طور پر رُونما ہوگئی ہے۔

(۳) اس کے آیندہ طرزِ عمل پر نگاہ رکھی جائے گی کہ آیا اس کا اعترافِ قصور محض زبانی ہے یا فی الواقع اس کے اندر کوئی گہرا احساسِ ندامت موجود ہے۔ اگر وہ اپنے قصور کی تلافی کے لیے بے تاب نظر آئے اور اس کی بات بات سے ظاہر ہو کہ جس نَقْصِ ایمانی کا نقش اس کی زندگانی میں ابھر آیا تھا اسے مٹانے اور اس کا تدارُک کرنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہے، تو سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں نادم ہے، اور یہ ندامت ہی اس کے ایمان و اخلاص کی دلیل ہوگی۔

محدثین نے ان آیات کی شانِ نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات ابولُبابہ بن عبدالمنذرؓ اور ان کے چھ ساتھیوں کے معاملے میں نازل ہوئی تھیں۔ ابولُبابہ ان لوگوں میں سے تھے جو بیعتِ عَقَبہ کے موقع پر ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے۔ پھر جنگِ بدر، جنگِ اُحُد اور دوسرے معرکوں میں برابر شریک رہے۔ مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر نفس کی کمزوری نے غلبہ کیا اور یہ کسی عذرِ شرعی کے بغیر بیٹھے رہ گئے۔ ایسے ہی مخلص ان کے دوسرے ساتھی بھی تھے اور ان سے بھی یہ کمزوری سرزد ہوگئی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور ان لوگوں کو معلوم ہُوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ اور رسولؐ کی کیا رائے ہے تو انھیں سخت ندامت ہوئی۔ قبل اس کے کہ کوئی باز پُرس ہوتی، انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب و خور حرام ہے، جب تک ہم معاف نہ کر دیے جائیں، یا پھر ہم مر جائیں۔ چنانچہ کئی روز وہ اسی طرح بے آب و دانہ اور بے خواب بندھے رہے حتّٰی کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ آخرِ کار جب انھیں بتایا گیا کہ اللہ اور رسولؐ نے تمھیں معاف کر دیا تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسایش نے ہمیں فرض سے غافل کیا، اسے اور اپنے تمام مال کو خدا کی راہ میں دے دیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں، صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ وہ انھوں نے اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ اس قصّے پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے ہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے۔ یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا کارنامۂ زندگی ان کے اخلاصِ ایمانی پر دلیل تھا۔ ان میں سے کسی نے عذرات نہیں تراشے بلکہ اپنے قصور کو خود ہی قصور مان لیا۔ انھوں نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا
يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا
ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ

پھر تم اُس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کُھلے اور چُھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔[۱۰۰]

کچھ دُوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھیرا ہُوا ہے، چاہے انھیں سزا دے اور چاہے اُن پر ازسرِنو مہربان ہو جائے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔[۱۰۱]

کچھ اَور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اِس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پُھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اُس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اُس کے رسولؐ کے

اس سلسلے میں ایک اور مفید نکتے پر بھی نگاہ رہنی چاہیے جو اِن آیات میں ارشاد ہُوا ہے۔ وہ یہ کہ گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے، اور عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صُدور ہُوا تھا، دُور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کرلے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔ پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔

۱۰۰ – مطلب یہ ہے کہ آخرِ کار معاملہ اُس خدا کے ساتھ ہے جس سے کوئی چیز چُھپ نہیں سکتی۔ اس لیے بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں اپنے نفاق کو چُھپانے میں کامیاب ہو جائے اور انسان جن جن معیاروں پر کسی کے ایمان و اخلاص کو پرکھ سکتے ہیں ان سب پر بھی پورا اتر جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نفاق کی سزا پانے سے بچ نکلا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۷ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ
اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ
رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝۱۰۸

خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دُوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی، وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں، اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔[۱۰۲]

۱۰۱ – یہ لوگ ایسے تھے جن کا معاملہ مشکوک تھا۔ نہ ان کے منافق ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا نہ گناہ گار مومن ہونے کا۔ ان دونوں چیزوں کی علامات ابھی پوری طرح نہ اُبھری تھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملے کو ملتوی رکھا۔ نہ اس معنی میں کہ فی الواقع خدا کے سامنے معاملہ مشکوک تھا، بلکہ اس معنی میں کہ مسلمانوں کو کسی شخص یا گروہ کے معاملے میں اپنا طرزِ عمل اس وقت تک متعیّن نہ کرنا چاہیے جب تک اس کی پوزیشن ایسی علامات سے واضح نہ ہو جائے جو علمِ غیب سے نہیں بلکہ حس اور عقل سے جانچی جا سکتی ہوں۔

۱۰۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے قبیلۂ خَزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیّت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکّہ بھی مدینہ اور اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہُوا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اس کی مَشیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے اُلٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی، اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضوؐر کی تشریف آوری کے بعد وہ نعمتِ ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپؐ کو اپنی مَشیخت کا حریف اور اپنے کاروبارِ درویشی کا دشمن سمجھ کر آپؐ کی اور آپؐ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفارِ قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہوگی۔ لیکن جنگِ بدر میں جب قریش نے شکستِ فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ جنگِ اُحد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا، اور کہا جاتا ہے کہ اُحد کے میدانِ جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گر کر زخمی ہوئے۔ پھر جنگِ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے، ان کو چڑھا لانے

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ

پھر تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر

میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگِ حُنین تک جتنی لڑائیاں مشرکینِ عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں، ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخرِ کار اسے اس بات سے مایوسی ہوگئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رُخ کیا تاکہ قیصر کو اس ''خطرے'' سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اُٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصرِ عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔

ابو عامر راہب کی اِن تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریکِ سازش تھا اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہم نوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصرِ روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنالیں گے، تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہوسکیں اور آیندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کرسکیں، بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں، وہ بھی غیر مُشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھیر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت وہ مسجد تیار کی گئی تھی جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجدِ قُبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجدِ نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِ ثواب ہو، قطعِ نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو، جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی عَلیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس تعمیرِ نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خُصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دُور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمایش کے ساتھ، جب یہ مسجدِ ضِرار بن کر تیار ہوئی تو یہ اشرار، نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرمادیں۔ مگر آپؐ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت مَیں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آکر دیکھوں گا۔ اس کے بعد آپ تبوک

Maktaba Tul Ishaat.com

اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ
نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ

رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر[۱۰۳] اُٹھائی اور وہ اسے لے کر
سیدھی جہنّم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا[۱۰۴]۔ یہ عمارت

کی طرف روانہ ہوگئے اور آپؐ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتّٰی کہ انھوں نے یہاں تک طے کرلیا کہ اُدھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور اِدھر یہ فوراً ہی عبداللہ بن اُبَیّ کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا، اس نے ان کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب ذِی اَوَان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپؐ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپؐ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجدِ ضرار کو مسمار کردیں۔

۱۰۳ – متن میں لفظ ''جُرُف'' استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی ندی یا دریا کے اُس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور اُوپر کا حصّہ بے سہارا کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں، ان کی تعمیرِ حیات کو یہاں اُس عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارۂ دریا پر اُٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقے سے اِس صورتِ حال کی نقشہ کشی نہیں کی جاسکتی۔ اس کی پوری معنویّت ذہن نشین کرنے کے لیے یوں سمجھیے کہ دنیوی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن، منافق، کافر، صالح، فاجر، غرض تمام انسان کام کرتے ہیں، مٹی کی اُس اوپری تہ کے مانند ہے جس پر دنیا میں ساری عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ تہ اپنے اندر خود کوئی پائداری نہیں رکھتی، بلکہ اس کی پائداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو۔ اگر کوئی تہ ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز، مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو جو ناواقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر اپنا مکان بنائے گا، اسے وہ اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائدار بنیاد پر اعتماد کرکے اپنا جو کچھ سرمایۂ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہوجائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیاتِ دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی، جس پر ہم سب اپنے کارنامۂ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں، بجائے خود کوئی ثبات وقرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی و پائداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کے خوف، اُس کے حضور جواب دہی کے احساس اور اُس کی مرضی کے اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی محض حیاتِ دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کرلیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہوکر کام کرتا ہے، وہ دراصل خود اپنی تعمیرِ زندگی کے نیچے سے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بے بنیاد سطح، جس پر اس نے اپنی عمر بھر کا سرمایۂ عمل جمع کیا ہے، ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمایے سمیت لے بیٹھے۔

بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَ

جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صُورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں [۱۰۵]۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔ ع

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں [۱۰۶]۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنّت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور

۱۰۴ – ”سیدھی راہ“ یعنی وہ راہ جس سے انسان بامراد ہوتا اور حقیقی کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

۱۰۵ – یعنی ان لوگوں نے منافقانہ مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ بھی ان میں موجود رہے گا۔ خدا سے کفر کرنے کے لیے جو شخص عَلانِیَہ بُت خانہ بنائے، یا اس کے دین سے لڑنے کے لیے کُھلّم کُھلّا مورچے اور دَمدَمے تیار کرے، اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے، کیونکہ اس کے اندر راست بازی، اخلاص اور اخلاقی جرأت کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آ سکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل، جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پُرفریب لبادہ اوڑھے، اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہی کہاں باقی رہ سکتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ سہار سکے۔

۱۰۶ – یہاں ایمان کے اُس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان طے ہوتا ہے، بَیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک مابعد الطبعیاتی عقیدہ نہیں ہے، بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رُو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضے میں خدا کی طرف سے اِس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم مضمون کے تضمُّنات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، کیونکہ وہی اُس کا

Maktaba Tul Ishaat.com

اور اُن ساری چیزوں کا خالق ہے جو اُس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرّف کر رہا ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نہ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اُسے بیچے، نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کُلّیتًا اس کے حوالے کر دیا ہے، اور وہ ہے اس کا اختیار، یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (free-will and freedom of choice)۔ اس اختیار کی بنا پر حقیقتِ نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظِ دیگر، اس اختیار کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور اُن اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ بلکہ اس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دے دی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حُقوقِ مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے، ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زَعم میں یہ خیال کرلے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حُدودِ اختیارات میں اپنے حسبِ منشا تصرّف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بَیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بَیع اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے، بلکہ اس معاملے کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے، اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے، اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بمجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے، اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرّف کرنا قبول کرلے، اور خیانت کی جو آزادی تجھے مَیں نے دی ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دُنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورتِ جنّت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بَیع کا یہ معاملہ طے کرلے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بَیع کا دوسرا نام ہے۔ اور جو شخص اس سے انکار کر دے، یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویّہ اختیار کرے جو بَیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ کافر ہے اور اس بَیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بَیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمُّنات کا تجزیہ کیجیے:

(۱) اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اُتر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے، اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اُس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

(۲) دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے، اس کی رُو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے، جس کے بعد کوئی قاضیِ شرع کسی کے غیر مومن یا خارج از ملّت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان معتبر ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اُس کے حق میں اپنے اِدّعائے ملکیّت سے کُلّیتًا دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص

کلمۂ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم وصلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم وجان کا، اپنے دل ودماغ اور بدن کی قوتوں کا، اپنے مال اور وسائل وذرائع کا، اور اپنے قبضہ واختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسبِ منشا تصرّف کرنے کی آزادی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو، تو ہوسکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے، مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا، کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں جو قرآن کی رُو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان ومال کھپانے سے دریغ کرنا اور جہاں اُس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا، یہ دونوں طرزِ عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعیِ ایمان نے یا تو جان ومال کو خدا کے ہاتھ بیچا نہیں ہے، یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بیچی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

(۳) ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رَوِیّۂ زندگی اور کافرانہ رَوِیّۂ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنیٰ میں خدا پر ایمان لایا ہو، اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رَوِیّے میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا۔ اِلّا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ اہلِ ایمان سے مرکّب ہو، وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرزِ تمدن وتہذیب، کوئی طریقِ معیشت ومعاشرت اور کوئی بین الاقوامی رَوِیّہ خدا کی مرضی اور اس کے قانونِ شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کرسکتا۔ اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تَنَبُّہ ہوگا، اسی وقت وہ آزادی کا رَوِیّہ چھوڑ کر بندگی کے رَوِیّے کی طرف پلٹ آئے گا۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس ومتعلقاتِ نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، بہر حال ایک کافرانہ رَوِیّۂ زندگی ہے، خواہ اس پر چلنے والے لوگ ''مسلمان'' کے نام سے موسوم ہوں یا ''غیر مسلم'' کے نام سے۔

(۴) اس بیع کی رُو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع آدمی پر لازم آتا ہے، وہ آدمی کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھیرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدۂ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رَوِیّۂ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اِس بیع کے تضمّنات ہیں، اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس خرید وفروخت کے معاملے میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر کیوں مؤخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اِس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ ''بائع نے اپنا نفس ومال خدا کے ہاتھ بیچ دیا''، بلکہ وہ اِس عمل کا معاوضہ ہے کہ ''بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیچی ہوئی چیز پر خود مختارانہ تصرّف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرّف کرے''۔ لہٰذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہوگی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحے تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ازرُوئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

اِن اُمور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اُوپر سے جو

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا

انجیل اور قرآن میں[۱۰۷]۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ

سلسلۂ تقریر چل رہا تھا، اُس میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جنھوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا، مگر جب امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے بعض نے تساہُل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے، اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رَوِیّے پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان، جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے، محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمھارے نفس اور تمھارے مال کا مالک ہے، پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اِس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چُراتے ہو، اور دوسری طرف اپنے نفس کی قوتوں کو اور اپنے ذرائع کو خدا کے منشا کے خلاف استعمال کرتے ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچے اہلِ ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انھیں بے دریغ قربان کرتے ہیں، اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی ادنیٰ سا جُز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۱۰۷ – اس امر پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انجیل کا تعلّق ہے، یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو اناجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں، ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنیٰ ہیں، مثلاً:

> ”مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنھی کی ہے۔“ (متّی ۵:۱۰)
>
> ”جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا، اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا۔“ (متّی ۱۰:۳۹)
>
> ”جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچّوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے، اس کو سو گُنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔“ (متّی ۱۹:۲۹)

البتہ تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا، اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اُخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دینِ حق کا جُزوِ لاینفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ تورات میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا دُرست نہیں ہے کہ واقعی تورات اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانۂ تنزّل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہوگئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنیٰ اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتابِ الٰہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے، ان سب کو وہ دنیا ہی میں اُتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انھوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر

بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَذٰ لِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّـآئِبُوۡنَ

اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چُکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے[۱۰۸]،

تورات میں متعدّد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:

”سُن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تُو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبّت رکھ۔“ (استثنا ۶: ۴-۵)

اور یہ کہ:

”کیا وہ تمھارا باپ نہیں جس نے تم کو خریدا ہے؟ اُسی نے تم کو بنایا اور قیام بخشا۔“ (استثنا ۳۲: ۶)

لیکن اس تعلّق باللہ کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اُس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تورات جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے، اوّل تو وہ پوری نہیں ہے، اور پھر وہ خالص کلامِ الٰہی پر بھی مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے اندر یہودیوں کی قومی روایات، اُن کے نسلی تعصّبات، ان کے اوہام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں، اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک مُعتدبہٖ حصّہ ایک ہی سلسلۂ عبارت میں کلامِ الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رَل مِل گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو اِن زوائد سے مُمیّز کرنا قطعاً غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۲)

۱۰۸- متن میں لفظ اَلتَّـآئِبُوۡنَ استعمال ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ”توبہ کرنے والے“ ہے۔ لیکن جس اندازِ کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ کرنا اہلِ ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ توبہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ اور توبہ کے اصل معنی رُجوع کرنے یا پلٹنے کے ہیں، لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تشریحی ترجمہ یوں کیا ہے کہ ”وہ اللہ کی طرف بار بار پلٹتے ہیں۔“ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس و مال کی بیع کا معاملہ طے کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ نفس اُس کا اپنا ہے اور مال اُس کا اپنا ہے، اور یہ بات کہ اِس نفس و مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک امرِ محسوس نہیں بلکہ محض ایک امرِ معقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جب کہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے معاملۂ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود مختارانہ طرزِ عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دُور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر گزرا ہے تو اسے ندامت لاحق ہوتی ہے، شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدا کی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے۔ ورنہ انسان جن بَشَری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک دفعہ نفس و مال بیچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں وہ اس بیع کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی غفلت و نسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ

اُس کی بندگی بجا لانے والے، اُس کی تعریف کے گُن گانے والے، اُس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے،[109] اُس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حُدُود کی حفاظت کرنے والے،[110] (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا

کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر آ کر کبھی اس سے پھسلتا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی قابلِ تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پھسل پھسل کر بار بار اُسی راہ کی طرف آتا ہے، اور یہی وہ بڑی سے بڑی خوبی ہے جس پر انسان قادر ہے۔

پھر اس موقع پر مومنین کی صفات میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر کرنے کی ایک اور مَصلحت بھی ہے۔ اُوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے، اس میں رُوئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جن سے ایمان کے منافی افعال کا ظُہور ہُوا تھا۔ لہٰذا ان کو ایمان کی حقیقت اور اس کا بنیادی مقتضا بتانے کے بعد اب یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ ایمان لانے والوں میں لازمی طور پر جو صفات ہونی چاہییں، ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کا قدم راہِ بندگی سے پھسل جائے وہ فوراً اس کی طرف پلٹ آئیں، نہ یہ کہ اپنے انحراف پر جمع رہیں اور زیادہ دُور نکلتے چلے جائیں۔

۱۰۹ – متن میں لفظ السَّآئِحُوْنَ استعمال ہوا ہے، جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصَّآئِمُوْنَ (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے۔ لیکن سیاحت کے معنٰی "روزہ" مجازی معنٰی ہیں۔ اصل لُغت میں اس کے یہ معنٰی نہیں ہیں۔ اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لفظ کے یہ معنٰی ارشاد فرمائے ہیں، اس کی نسبت حضُورؐ کی طرف دُرست نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس کو اصل لُغوی معنٰی ہی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنٰی خرچ کرنے کے ہیں اور مراد اُس سے راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے، اُسی طرح یہاں بھی سیاحت سے مراد محض گھومنا پھرنا نہیں ہے، بلکہ ایسے مقاصد کے لیے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جو پاک اور بلند ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو۔ مثلاً اقامتِ دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوتِ دین، اصلاحِ خلق، طلبِ علمِ صالح، مشاہدۂ آثارِ الٰہی اور تلاشِ رزقِ حلال۔ اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار پر گھروں سے نہیں نکلے تھے، ان کو یہ بتایا جائے کہ حقیقی مومن ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کا بول بالا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دنیا میں دوڑ دھوپ اور سعی و جُہد کرتا پھرتا ہے۔

۱۱۰ – یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدّن، معیشت، سیاست، عدالت اور صلح و جنگ کے

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ

یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ! ان مومنوں کو خوشخبری دے دو۔

نبیؐ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ ان پر یہ بات کُھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں[111]۔ ابراہیمؑ نے

معاملات میں جو حدیں مقرر کر دی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انھی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں، اور کبھی ان سے تجاوز کر کے نہ تو من مانی کارروائیاں کرنے لگتے ہیں اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ خدا کے حدود کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ان حُدود کو قائم کیا جائے اور انھیں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ لہٰذا سچّے اہلِ ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں، بلکہ مزید برآں ان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نگہبانی کرتے ہیں اور اپنا پورا زور اس سعی میں لگا دیتے ہیں کہ یہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔

۱۱۱ – کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اوّل تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملے میں تو دُرست ہیں جو وفاداری کے زُمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کُھلا ہُوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اُصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مُشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے، یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری مَحبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے، خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنّم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری مَحبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دُشمن ہمارا دُشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو“، بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ”تمھارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو“۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں، تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز

Maktaba Tul Ishaat.com

اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا
تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اپنے باپ کے لیے جو دُعائے مغفرت کی تھی وہ تو اُس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا،[۱۱۲] مگر جب اس پر یہ بات کُھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔[۱۱۳]

ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملے میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دُنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مُواسات، اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حُقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو بہرصورت سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

۱۱۲ – اشارہ ہے اُس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے کہی تھی کہ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿﴾ (مریم، آیت ۴۷) ”آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، وہ میرے اُوپر نہایت مہربان ہے۔“ اور لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (الممتحنہ، آیت ۴) ”میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوا لوں۔“ چنانچہ اس وعدے کی بنا پر آنجناب نے اپنے باپ کے لیے یہ دُعا مانگی تھی کہ: وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿﴾ (الشعراء، آیات ۸۶ تا ۸۹) ”اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا نہ کر جب کہ سب انسان اٹھائے جائیں گے، جب کہ نہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد، نجات صرف وہ پائے گا جو اپنے خدا کے حضور بغاوت سے پاک دل لے کر حاضر ہُوا ہو۔“ یہ دعا اوّل تو خود انتہائی محتاط لہجے میں تھی، مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی نظر اس طرف گئی کہ مَیں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کُھلم کُھلا باغی تھا، اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا، تو وہ اس سے بھی باز آ گئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انھوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبرّی کر دی، اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو پالا پوسا تھا۔

۱۱۳ – متن میں اَوَّاہٌ اور حَلِیْمٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اَوَّاہٌ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى
يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انھیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انھیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے[۱۱۴]۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضے میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے، اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے، اور تمھارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمھیں اس سے بچا سکے۔

میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور تعلّق خاطر میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دُہرے معنی دے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنّم کا ایندھن بن جائے گا۔ اور حلیم تھے، اُس ظلم و ستم کے باوجود جو ان کے باپ نے اسلام سے ان کو روکنے کے لیے ان پر ڈھایا تھا، ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کُھلی۔ پھر انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے، اس سے تبرّی کی، کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوُز کرنے والے نہ تھے۔

۱۱۴ – یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ لوگوں کو کن خیالات، کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ باز نہیں آتے اور غلط فکری و غلط کاری ہی پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اُسی غلط راہ پر انھیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔

یہ ارشاد ایک قاعدۂ کُلّیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآنِ مجید کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں جہاں ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ خدا کا ہدایت دینا یہ ہے کہ وہ صحیح طریقِ فکر و عمل اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دیتا ہے، پھر جو لوگ اس طریقے پر خود چلنے کے لیے آمادہ ہوں انھیں اس کی توفیق بخشتا ہے۔ اور خدا کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریقِ فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے، اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر کوئی اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو خدا اس کو زبردستی راست بیں اور راست رو نہیں بناتا، بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔

اس خاص سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مناسبت سے بیان ہوئی ہے، وہ پچھلی تقریر اور بعد کی تقریر پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے جو نہایت موزوں طریقے سے پچھلے بیان کا خاتمہ بھی قرار پا سکتی ہے اور آگے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ
فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ
تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ
خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ

اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور اُن مہاجرین و انصار کو جنھوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا۔[115] اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے،[116] (مگر جب انھوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انھیں معاف کر دیا،[117] بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور اُن تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔[118] جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں

جو بیان آ رہا ہے اس کی تمہید بھی۔

۱۱۵ – یعنی غزوۂ تبوک کے سلسلے میں جو چھوٹی چھوٹی لغزشیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ سے ہوئیں، ان سب کو اللہ نے ان کی اعلیٰ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے معاف فرما دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو لغزش ہوئی تھی، اس کا ذکر آیت ۴۳ میں گزر چکا ہے، یعنی یہ کہ جن لوگوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود جنگ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت مانگی تھی ان کو آپؐ نے اجازت دے دی تھی۔

۱۱۶ – یعنی بعض مخلص صحابہ بھی اس سخت وقت میں جنگ پر جانے سے کسی نہ کسی حد تک جی چُرانے لگے تھے، مگر چونکہ ان کے دلوں میں ایمان تھا اور وہ سچے دل سے دینِ حق کے ساتھ محبت رکھتے تھے، اس لیے آخر کار وہ اپنی اس کمزوری پر غالب آ گئے۔

۱۱۷ – یعنی اب اللہ اس بات پر ان سے مؤاخذہ نہ کرے گا کہ ان کے دلوں میں کجی کی طرف یہ میلان کیوں پیدا ہُوا تھا۔ اس لیے کہ اللہ اُس کمزوری پر گرفت نہیں کرتا جس کی انسان نے خود اصلاح کر لی ہو۔

۱۱۸ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے مدینہ واپس تشریف لائے تو وہ لوگ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ ان میں ۸۰ سے کچھ زیادہ منافق تھے اور تین سچے مومن بھی تھے۔ منافقین جھوٹے عذرات پیش کرتے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی معذرت قبول کرتے چلے گئے۔ پھر ان تینوں مومنوں کی باری آئی اور انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کرلیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے معاملے میں فیصلے کو ملتوی کر دیا اور عام مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ جب تک خدا کا حکم نہ آئے، ان سے

عَلَيۡهِمۡ اَنۡفُسُهُمۡ وَظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۱۸﴾

بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامنِ رحمت کے سوا نہیں ہے، تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے[119] ؏

کسی قسم کا معاشرتی تعلق نہ رکھا جائے۔ اسی معاملے کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اِن تین اصحاب کا معاملہ اُن سات اصحاب سے مختلف ہے جن کا ذکر حاشیہ ۹۹ میں گزر چکا ہے۔ انھوں نے بازپُرس سے پہلے ہی خود اپنے آپ کو سزا دے لی تھی)۔

۱۱۹ – یہ تینوں صاحب کَعب بن مالک، ہِلال بن اُمیّہ اور مُرارہ بن رَبیع رضی اللہ عنہم تھے۔ جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں، تینوں سچّے مومن تھے۔ اس سے پہلے اپنے اخلاص کا بارہا ثبوت دے چکے تھے۔ قربانیاں کر چکے تھے۔ آخر الذکر دو اصحاب تو غزوۂ بدر کے شرکا میں سے تھے جن کی صداقتِ ایمانی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اور اول الذکر بزرگ اگرچہ بدری نہ تھے لیکن بدر کے سوا ہر غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ان خدمات کے باوجود جو سُستی اِس نازک موقع پر، جب کہ تمام قابلِ جنگ اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے نکل آنے کا حکم دیا گیا تھا، اِن حضرات نے دکھائی، اُس پر سخت گرفت کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپس تشریف لا کر مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ کوئی ان سے سلام کلام نہ کرے۔ ۴۰ دن کے بعد ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کی تاکید کر دی گئی۔ فی الواقع مدینہ کی بستی میں ان کا وہی حال ہو گیا تھا جس کی تصویر اس آیت میں کھینچی گئی ہے۔ آخر کار جب ان کے مقاطعے کو ۵۰ دن ہو گئے تب معافی کا یہ حکم نازل ہُوا۔

ان تینوں صاحبوں میں سے حضرت کَعبؓ بن مالک نے اپنا قصّہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو غایت درجہ سبق آموز ہے۔ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں، جب کہ وہ نابینا ہو چکے تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے، جو ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں چلایا کرتے تھے، یہ قصّہ خود بیان کیا:

”غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے شرکتِ جنگ کی اپیل کرتے تھے، میں اپنے دل میں ارادہ کر لیتا تھا کہ چلنے کی تیاری کروں گا مگر پھر واپس آ کر سُستی کر جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ابھی کیا ہے، جب چلنے کا وقت آئے گا تو تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اسی طرح بات ٹلتی رہی، یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت آ گیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو، مَیں ایک دو روز بعد راستے ہی میں اس سے جا ملوں گا۔ مگر پھر وہی سُستی مانع ہوئی، حتّٰی کہ وقت نکل گیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس زمانے میں جب کہ مَیں مدینہ میں رہا، میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بے حد کُڑھتا تھا کہ میں پیچھے جن لوگوں کے ساتھ رہ گیا ہوں، وہ یا تو منافق ہیں یا وہ ضعیف اور مجبور لوگ جن کو اللہ نے معذور رکھا ہے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول آپؐ نے پہلے مسجد آ کر دو رکعت نماز پڑھی، پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔ اس مجلس میں منافقین نے آ آ کر اپنے عذرات لمبی چوڑی قسموں کے ساتھ پیش کرنے شروع کیے۔ یہ ۸۰ سے زیادہ آدمی تھے۔ حضورؐ نے ان میں سے ایک ایک کی بناوٹی باتیں سنیں۔ ان کے ظاہری عذرات کو قبول کر لیا، اور ان کے باطن کو خدا پر چھوڑ کر فرمایا: خدا تمھیں معاف کرے۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: ”تشریف لائیے! آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟“ میں نے عرض کیا: ”خدا کی قسم! اگر میں اہل دنیا میں سے کسی کے سامنے حاضر ہُوا ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، باتیں بنانی تو مجھے بھی آتی ہیں، مگر آپؐ کے متعلّق میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اِس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپؐ کو راضی کر بھی لیا تو اللہ ضرور آپؐ کو مجھ سے پھر ناراض کر دے گا۔ البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپؐ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے جسے پیش کر سکوں، میں جانے پر پوری طرح قادر تھا۔“ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ”یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔ اچھا، اُٹھ جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تمھارے معاملے میں کوئی فیصلہ کرے۔“ میں اُٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا بیٹھا۔ یہاں سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے بہت ملامت کی کہ تُو نے کوئی عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ باتیں سُن کر میرا نفس بھی کچھ آمادہ ہونے لگا کہ پھر حاضر ہو کر کوئی بات بنا دوں۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ دو اور صالح آدمیوں (مُرارہؓ بن رَبیع اور ہِلالؓ بن اُمَیّہ) نے بھی وہی سچی بات کہی ہے جو میں نے کہی تھی، تو مجھے تسکین ہوگئی اور میں اپنی سچائی پر جما رہا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حکم دے دیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر بیٹھ گئے، مگر میں نکلتا تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے، میں یہاں اجنبی ہوں اور اس بستی میں کوئی بھی میرا واقف کار نہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتا تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تھا، مگر بس انتظار ہی کرتا رہ جاتا تھا کہ جواب کے لیے آپؐ کے ہونٹ جنبش کریں۔ نماز میں نظریں چُرا کر حضورؐ کو دیکھتا تھا کہ آپؐ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک مَیں نماز پڑھتا آپؐ میری طرف دیکھتے رہتے، اور جہاں میں نے سلام پھیرا کہ آپؐ نے میری طرف سے نظر ہٹائی۔ ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچازاد بھائی اور بچپن کے یار ابوقتادہؓ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر انھیں سلام کیا۔ مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا: ”ابوقتادہ! میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا میں خدا اور اس کے رسول سے مَحبت نہیں رکھتا؟“ وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا۔ وہ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب میں نے قسم دے کر یہی سوال کیا تو انھوں نے بس اتنا کہا کہ ”اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔“ اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں دیوار سے اُتر آیا۔ انھی دنوں ایک دفعہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کے نَبطیوں میں سے ایک شخص مجھے ملا اور اس نے شاہِ غسّان کا خط حریر میں لپٹا ہُوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ ”ہم نے سنا ہے تمھارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو، نہ اس لائق ہو کہ تمھیں ضائع کیا جائے، ہمارے پاس آ جاؤ، ہم

تمھاری قدر کریں گے۔" میں نے کہا: یہ ایک اور بَلا نازل ہوئی، اور اسی وقت اس خط کو چولھے میں جھونک دیا۔

چالیس دن اس حالت پر گزر چکے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آدمی حکم لے کر آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا: کیا طلاق دے دوں؟ جواب ملا: نہیں، بس الگ رہو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کردے۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہُوا تھا اور اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا: "مبارک ہو، کعبؓ بن مالک!" میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا ہے۔ پھر تو فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھ کو مبارک باد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ میں اُٹھا اور سیدھا مسجدِ نبوی کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا: "تجھے مبارک ہو، یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر ہے۔" میں نے پوچھا: "یہ معافی حضور کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟" فرمایا: خدا کی طرف سے، اور یہ آیات سنائیں۔ میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔" فرمایا: "کچھ رہنے دو کہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔" میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا، باقی سب صدقہ کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے عہد کیا کہ جس راست گفتاری کے صلے میں اللہ نے مجھے معافی دی ہے اس پر تمام عمر قائم رہوں گا، چنانچہ آج تک میں نے کوئی بات جان بوجھ کر خلافِ واقعہ نہیں کہی، اور خدا سے اُمید رکھتا ہوں کہ آیندہ بھی مجھے اس سے بچائے گا۔"

یہ قصہ اپنے اندر بہت سے سبق رکھتا ہے جو ہر مومن کے دل نشین ہونے چاہییں:

سب سے پہلی بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ کفر و اسلام کی کش مکش کا معاملہ کس قدر اہم اور کتنا نازک ہے کہ اس کش مکش میں کفر کا ساتھ دینا تو درکنار، جو شخص اسلام کا ساتھ دینے میں، بدنیتی سے بھی نہیں نیک نیتی سے، تمام عمر بھی نہیں کسی ایک موقع ہی پر، کوتاہی برت جاتا ہے اس کی بھی زندگی بھر کی عبادت گزاریاں اور دین داریاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں، حتّٰی کہ ایسے عالی قدر لوگ بھی گرفت سے نہیں بچتے جو بدر و اُحد اور اَحزاب و حُنَین کے سخت معرکوں میں جانبازی کے جوہر دکھا چکے تھے اور جن کا اخلاص و ایمان ذرہ برابر بھی مُشتبہ نہ تھا۔

دوسری بات، جو اس سے کچھ کم اہم نہیں، یہ ہے کہ ادائے فرض میں تساہُل کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بسا اوقات محض تساہُل ہی تساہُل میں آدمی کسی ایسے قصور کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے، اور اس وقت یہ بات اسے پکڑ سے نہیں بچا سکتی کہ اس نے اس قصور کا ارتکاب بدنیتی سے نہیں کیا تھا۔

پھر یہ قصہ اُس معاشرے کی رُوح کو بڑی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں بنا تھا۔ ایک طرف منافقین ہیں جن کی غداریاں سب پر آشکارا ہیں، مگر ان کے ظاہری عذر سُن لیے جاتے ہیں اور درگزر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان سے خُلوص کی اُمید ہی کب تھی کہ اب اس کے عدم کی شکایت کی جاتی۔ دوسری طرف ایک آزمودہ کار مومن ہے جس کی جاں نثاری پر شبہے تک کی گنجایش نہیں، اور وہ جھوٹی باتیں بھی نہیں بناتا، صاف صاف قصور کا اعتراف کر لیتا ہے، مگر اس پر غضب کی بارش برسا دی جاتی ہے، نہ اس بنا پر کہ اس کے مومن ہونے میں کوئی شبہ ہو گیا ہے، بلکہ اس بنا پر کہ مومن ہو کر

Maktaba Tul Ishaat.com

اس نے وہ کام کیوں کیا جو منافقوں کے کرنے کا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ زمین کے نمک تو تم ہو، تم سے بھی اگر نمکینی حاصل نہ ہوئی تو پھر اور نمک کہاں سے آئے گا۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سارے قضیے میں لیڈر جس شان سے سزا دیتا ہے اور پیرو جس شان سے اس سزا کو بھگتتا ہے، اور پوری جماعت جس شان سے اس سزا کو نافذ کرتی ہے، اس کا ہر پہلو بے نظیر ہے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی زیادہ تعریف کی جائے۔ لیڈر نہایت سخت سزا دے رہا ہے مگر غصے اور نفرت کے ساتھ نہیں، گہری محبت کے ساتھ دے رہا ہے۔ باپ کی طرح شعلہ بار نگاہوں کا ایک گوشہ ہر وقت یہ خبر دیے جاتا ہے کہ تجھ سے دشمنی نہیں ہے بلکہ تیرے قصور پر تیری ہی خاطر دل دُکھا ہے۔ تُو درست ہو جائے تو یہ سینہ تجھے چمٹا لینے کے لیے بے چین ہے۔ پیرو سزا کی سختی پر تڑپ رہا ہے مگر صرف یہی نہیں کہ اس کا قدم جادۂ اطاعت سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ڈگمگاتا، اور صرف یہی نہیں کہ اس پر غرورِ نفس اور حمیتِ جاہلیہ کا کوئی دورہ نہیں پڑتا اور علانیہ استکبار پر اُتر آنا تو درکنار، وہ دل میں اپنے محبوب لیڈر کے خلاف کوئی شکایت تک نہیں آنے دیتا، بلکہ اس کے برعکس وہ لیڈر کی محبت میں اور زیادہ سرشار ہو گیا ہے۔ سزا کے ان پورے پچاس دنوں میں اس کی نظریں سب سے زیادہ بے تابی کے ساتھ جس چیز کی تلاش میں رہیں، وہ یہ تھی کہ سردار کی آنکھوں میں وہ گوشۂ التفات اس کے لیے باقی ہے یا نہیں جو اس کی امیدوں کا آخری سہارا ہے۔ گویا وہ ایک قحط زدہ کسان تھا جس کا سارا سرمایۂ امید بس ایک ذرا سا لکّۂ ابر تھا جو آسمان کے کنارے پر نظر آتا تھا۔ پھر جماعت کو دیکھیے تو اس کے ڈسپلن اور اس کی صالح اخلاقی اسپرٹ پر انسان عش عش کر جاتا ہے۔ ڈسپلن کا یہ حال کہ اُدھر لیڈر کی زبان سے بائیکاٹ کا حکم نکلا اِدھر پوری جماعت نے مجرم سے نگاہیں پھیر لیں۔ جلوت تو درکنار، خلوت تک میں کوئی قریب سے قریب رشتہ دار اور کوئی گہرے سے گہرا دوست بھی اس سے بات نہیں کرتا۔ بیوی تک اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ خدا کا واسطہ دے دے کر پوچھتا ہے کہ میرے خلوص میں تو تم کو شبہ نہیں ہے، مگر وہ لوگ بھی جو مدت العمر سے اس کو مخلص جانتے تھے، صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے نہیں، خدا اور اس کے رسولؐ سے اپنے خلوص کی سند حاصل کرو۔ دوسری طرف اخلاقی اسپرٹ اتنی بلند اور پاکیزہ کہ ایک شخص کی چڑھی ہوئی کمان اترتے ہی مردار خوروں کا کوئی گروہ اس کا گوشت نوچنے اور اسے پھاڑ کھانے کے لیے نہیں لپکتا، بلکہ اس پورے زمانۂ عتاب میں جماعت کا ایک ایک فرد اپنے اس معتوب بھائی کی مصیبت پر رنجیدہ اور اس کو پھر سے اُٹھا کر گلے لگا لینے کے لیے بے تاب رہتا ہے، اور معافی کا اعلان ہوتے ہی لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ جلدی سے جلدی پہنچ کر اس سے ملیں اور اسے خوشخبری پہنچائیں۔ یہ نمونہ ہے اُس صالح جماعت کا جسے قرآن دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم آیت زیر بحث کو دیکھتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان صاحبوں کو اللہ کے دربار سے جو معافی ملی ہے اور اس معافی کے اندازِ بیان میں جو رحمت و شفقت ٹپکی پڑ رہی ہے، اس کی وجہ ان کا وہ اخلاص ہے جس کا ثبوت انھوں نے پچاس دن کی سخت سزا کے دوران میں دیا تھا۔ اگر قصور کر کے وہ اکڑتے اور اپنے لیڈر کی ناراضی کا جواب غصے اور عناد سے دیتے اور سزا ملنے پر اُس طرح بپھرتے جس طرح کسی خود پرست انسان کا غرورِ نفس زخم کھا کر بپھرا کرتا ہے، اور مقاطعے کے دوران میں ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا کہ ہمیں جماعت سے کٹ جانا گوارا ہے مگر اپنی خودی کے بت پر چوٹ کھانا گوارا نہیں ہے، اور اگر یہ سزا کا پورا زمانہ وہ اس دوڑ دھوپ میں گزارتے کہ جماعت کے اندر بددلی پھیلائیں اور بددل لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ساتھ ملائیں تاکہ ایک جتھا تیار ہو، تو معافی کیسی، انھیں تو بالیقین جماعت سے کاٹ پھینکا جاتا اور اس سزا کے بعد ان کی اپنی منہ مانگی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ
لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ
رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا
يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ
مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینے کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسولؐ کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرینِ حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اُٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوتِ حق کا) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے

سزا ان کو یہ دی جاتی کہ جاؤ اب اپنی خودی کے بُت ہی کو پوجتے رہو، اِعلائے کلمۃ الحق کی جِدّوجُہد میں حصہ لینے کی سعادت اب تمھارے نصیب میں کبھی نہ آئے گی۔ لیکن ان تینوں صاحبوں نے اس کڑی آزمایش کے موقع پر یہ راستہ اختیار نہیں کیا، اگرچہ یہ بھی ان کے لیے کُھلا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے وہ روش اختیار کی جو ابھی آپ دیکھ آئے ہیں۔ اس روش کو اختیار کر کے انھوں نے ثابت کر دیا کہ خدا پرستی نے ان کے سینے میں کوئی بُت باقی نہیں چھوڑا ہے جسے وہ پوجیں، اور اپنی پوری شخصیت کو انھوں نے راہِ خدا کی جِدّوجُہد میں جھونک دیا ہے، اور وہ اپنی واپسی کی کشتیاں اس طرح جلا کر اسلامی جماعت میں آئے ہیں کہ اب یہاں سے پلٹ کر کہیں اور نہیں جاسکتے۔ یہاں کی ٹھوکریں کھائیں گے مگر یہیں مریں گے اور کھپیں گے۔ کسی دوسری جگہ بڑی سے بڑی عزت بھی ملتی ہو تو یہاں کی ذلّت چھوڑ کر اسے لینے نہ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر انھیں اُٹھا کر سینے سے لگا نہ لیا جاتا تو اور کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی معافی کا ذکر ایسے شفقت بھرے الفاظ میں فرماتا ہے کہ ’’ہم ان کی طرف پلٹے تاکہ وہ ہماری طرف پلٹ آئیں۔‘‘ ان چند لفظوں میں اِس حالت کی تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ آقا نے پہلے تو ان بندوں سے نظر پھیر لی تھی، مگر جب وہ بھاگے نہیں بلکہ دل شکستہ ہو کر اسی کے در پر بیٹھ گئے تو ان کی شانِ وفاداری دیکھ کر آقا سے خود نہ رہا گیا۔ جوشِ محبت سے بے قرار ہو کر وہ آپ نکل آیا تاکہ انھیں دروازے سے اُٹھا لائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً
وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ
لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ
وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

ع ۱۵ / ۴

حق میں ایک عملِ صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ (راہِ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اُٹھائیں اور (سعیِ جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے، تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انھیں عطا کرے۔ ع

اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہُوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصّے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے، تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔[120]

۱۲۰ – اس آیت کا منشا سمجھنے کے لیے اِسی سورت کی آیت ۹۷ پیشِ نظر رکھنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

”بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اُس دین کے حُدُود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے۔“

وہاں صرف اتنی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا کہ دارالاسلام کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصّہ مرضِ نفاق میں اس وجہ سے مبتلا ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، علم کے مرکز سے وابستہ نہ ہونے اور اہلِ علم کی صحبت میسّر نہ آنے کی وجہ سے اللہ کے دین کے حدود ان کو معلوم نہیں ہیں۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں کو اس حالت میں پڑا نہ رہنے دیا جائے بلکہ ان کی جہالت کو دُور کرنے اور ان کے اندر شعورِ اسلامی پیدا کرنے کا اب باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ

تمام دیہاتی عرب اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کر مدینے آ جائیں اور یہاں علم حاصل کریں۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہیے کہ ہر دیہاتی علاقے اور ہر بستی اور قبیلے سے چند آدمی نکل کر علم کے مرکزوں، مثلاً مدینے اور مکّے اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں آئیں اور یہاں دین کی سمجھ پیدا کریں، پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس جائیں اور عامّۃ النّاس کے اندر بیداری پھیلانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو تحریکِ اسلامی کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھیک موقع پر دی گئی۔ ابتدا میں جب کہ اسلام عرب میں بالکل نیا نیا تھا اور انتہائی شدید مخالفت کے ماحول میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس وقت تو اسلام قبول کرتا ہی وہ شخص تھا جو پوری طرح اسے سمجھ لیتا تھا اور ہر پہلو سے اس کو جانچ پرکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی کے مرحلوں میں داخل ہوئی اور زمین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں کی آبادیاں فوج در فوج اس میں شامل ہونے لگیں، جن کے اندر کم لوگ ایسے تھے جو اسلام کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ سمجھ بُوجھ کر اس پر ایمان لاتے تھے، ورنہ بیشتر لوگ محض وقت کے سیلاب میں غیر شعوری طور پر بہے چلے آ رہے تھے۔ نومسلم آبادی کا یہ تیز رفتار پھیلاؤ بظاہر تو اسلام کے لیے سببِ قوت تھا، کیونکہ پیروانِ اسلام کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن فی الحقیقت اسلامی نظام کے لیے ایسی آبادی کسی کام کی نہ تھی بلکہ اُلٹی نقصان دِہ تھی جو شُعورِ اسلامی سے خالی ہو اور اِس نظام کے اَخلاقی مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ چنانچہ یہ نقصان غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر کُھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس لیے عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ تحریکِ اسلامی کی یہ توسیع جس رفتار کے ساتھ ہو رہی ہے اسی کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر بھی ہونی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ ہر حصّۂ آبادی میں سے چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے، پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شُعور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ تعلیمِ عُمومی کے جس انتظام کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے، اس کا اصل مقصد عامّۃ النّاس کو محض خواندہ بنانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا، بلکہ واضح طور پر اس کا مقصدِ حقیقی یہ متعیّن کیا گیا تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رَوِیّۂ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نَوِشت و خواند اور کتاب خوانی اور دنیوی عُلوم کی واقفیت پھیلانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے جو اُوپر کے خط کشیدہ مقصد تک پہنچاتی ہو۔ ورنہ ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن سٹائن اور فرائڈ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رَوِیّۂ زندگی میں بھٹکا ہُوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پر لعنت بھیجتا ہے۔

اس آیت میں لفظ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو تَفَقُّہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا، جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی رُوح سے آشنا ہونا، اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کون

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا
فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ رکوع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو اُن منکرینِ حق سے جو تم سے قریب ہیں۔[۱۲۱] اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں،[۱۲۲] اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔[۱۲۳] جب کوئی نئی سورت

سا طریقِ فکر اور کون سا طرزِ عمل رُوحِ دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلۂ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا، لوگوں نے اشتراکِ لفظی کی بنا پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکمِ الٰہی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ وہ کُل مقصود نہیں بلکہ ایک جُزوِ مقصود تھا۔ اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروانِ دین کو پہنچے، ان کا جائزہ لینے کے لیے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔ مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لیے مختصراً اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے رُوحِ دین سے خالی کر کے محض جسمِ دین اور شکلِ دین کی تشریح پر مرتکز کر دیا، اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان ظاہر داری، دین داری کی آخری منزل بن کر رہ گئی، وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔

۱۲۱ – آیت کے ظاہر الفاظ سے جو مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ دار الاسلام کے جس حصے سے دشمنانِ اسلام کا جو علاقہ متصل ہو، اُس کے خلاف جنگ کرنے کی اوّلین ذمہ داری اُسی حصے کے مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اگر آگے کے سلسلۂ کلام کے ساتھ ملا کر اس آیت کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکارِ حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلط ملط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے۔ رُکوع ۱۰ کی ابتدا میں بھی، جہاں سے اس سلسلۂ تقریر کا آغاز ہوا تھا، پہلی بات یہی کہی گئی تھی کہ اب ان آستین کے سانپوں کے استیصال کرنے کے لیے باقاعدہ جہاد شروع کر دیا جائے۔ وہی بات اب تقریر کے اختتام پر تاکید کے لیے پھر دہرائی گئی ہے، تاکہ مسلمان اس کی اہمیت کو محسوس کریں اور ان منافقوں کے معاملے میں اُن نسلی و نسبی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ نہ کریں جو اُن کے اور اِن کے درمیان وابستگی کے موجب بنے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے خلاف ''جہاد'' کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہاں اس سے شدید تر لفظ ''قتال'' استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ ان کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے، کوئی کسر ان کی سرکوبی میں اُٹھا نہ رکھی جائے۔ وہاں ''کفار'' اور ''منافق'' دو الگ لفظ بولے گئے تھے، یہاں ایک ہی لفظ ''کفار'' پر اکتفا کیا گیا ہے، تاکہ اِن لوگوں کا انکارِ حق، جو صریح طور پر ثابت ہو چکا تھا، ان کے ظاہری اقرارِ ایمان کے پردے میں چھُپ کر کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھ لیا جائے۔

۱۲۲ – یعنی اب وہ نرم سُلوک ختم ہو جانا چاہیے جو اب تک ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ یہی بات رُکوع ۱۰ کی ابتدا میں کہی گئی تھی کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ، ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ
مَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ
مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پُوچھتے ہیں کہ "کہو: تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟" (اس کا جواب یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سُورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں، البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہُوا تھا اُن کی سابق نجاست پر (ہر نئی سُورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا[۱۲۴] اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مُبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟[۱۲۵] مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔

---

۱۲۳ – اس تنبیہ کے دو مطلب ہیں اور دونوں یکساں طور پر مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ان منکرینِ حق کے معاملے میں اگر تم نے اپنے شخصی اور خاندانی اور معاشی تعلقات کا لحاظ کیا تو یہ حرکت تقویٰ کے خلاف ہوگی، کیونکہ متقی ہونا اور خدا کے دشمنوں سے لاگ لگائے رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا خدا کی مدد اپنے شاملِ حال رکھنا چاہتے ہو تو اس لاگ لپیٹ سے پاک رہو۔ دوسرے یہ کہ یہ سختی اور جنگ کا جو حکم دیا جا رہا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سختی کرنے میں اَخلاق و انسانیت کی بھی ساری حدیں توڑ ڈالی جائیں۔ حدود اللہ کی نگہداشت تو بہرحال تمھاری ہر کارروائی میں ملحوظ رہنی ہی چاہیے۔ اس کو اگر تم نے چھوڑ دیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے۔

۱۲۴ – ایمان اور کفر و نفاق میں کمی بیشی کا کیا مفہوم ہے، اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انفال، حاشیہ ۲۔

۱۲۵ – یعنی کوئی سال ایسا نہیں گزر رہا ہے جب کہ ایک دو مرتبہ ایسے حالات نہ پیش آ جاتے ہوں جن میں ان کا دعوائے ایمان آزمائش کی کسوٹی پر کسا نہ جاتا ہو اور اس کی کھوٹ کا راز فاش نہ ہو جاتا ہو۔ کبھی قرآن میں کوئی ایسا حکم آ جاتا ہے جس سے ان کی خواہشاتِ نفس پر کوئی نئی پابندی عائد ہو جاتی ہے، کبھی دین کا کوئی ایسا مطالبہ سامنے آ جاتا ہے جس سے ان کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

جب کوئی سُورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دُوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں[۱۲۶]۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں[۱۲۷]۔

کبھی کوئی اندرونی قضیہ ایسا رُونما ہو جاتا ہے جس میں یہ امتحان مضمر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے دنیوی تعلقات اور اپنی شخصی و خاندانی اور قبائلی دلچسپیوں کی بہ نسبت خدا اور اس کا رسولؐ اور اس کا دین کس قدر عزیز ہے، کبھی کوئی جنگ ایسی پیش آ جاتی ہے جس میں یہ آزمایش ہوتی ہے کہ یہ جس دین پر ایمان لانے کا دعویٰ کر رہے ہیں اس کی خاطر جان، مال، وقت اور محنت کا کتنا ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر صرف یہی نہیں کہ منافقت کی وہ گندگی جو ان کے جھوٹے اقرار کے نیچے چھپی ہوئی ہے کھل کر منظرِ عام پر آ جاتی ہے بلکہ ہر مرتبہ جب یہ ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر بھاگتے ہیں تو ان کے اندر کی گندگی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

۱۲۶- قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اجتماع کا اعلان کراتے اور پھر مجمعِ عام میں اس سورہ کو خطبے کے طور پر سناتے تھے۔ اس محفل میں اہلِ ایمان کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ ہمہ تن گوش ہو کر اس خطبے کو سنتے اور اس میں مُستغرق ہو جاتے تھے، لیکن منافقین کا رنگ ڈھنگ کچھ اور تھا۔ وہ آتو اس لیے جاتے تھے کہ حاضری کا حکم تھا اور اجتماع میں شریک نہ ہونے کے معنیٰ اپنی منافقت کا راز خود فاش کر دینے کے تھے۔ مگر اس خطبے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ نہایت بددلی کے ساتھ اکتائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے اور اپنے آپ کو حاضرین میں شمار کرا لینے کے بعد انھیں بس یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کسی طرح جلدی سے جلدی یہاں سے بھاگ نکلیں۔ ان کی اسی حالت کی تصویر یہاں کھینچی گئی ہے۔

۱۲۷- یعنی یہ بے وقوف خود اپنے مفاد کو نہیں سمجھتے۔ اپنی فلاح سے غافل اور اپنی بہتری سے بے فکر ہیں۔ ان کو احساس نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو اس قرآن اور اس پیغمبرؐ کے ذریعے سے ان کو دی جا رہی ہے۔ اپنی چھوٹی سی دُنیا اور اس کی نہایت گھٹیا قسم کی دلچسپیوں میں یہ کنویں کے مینڈک ایسے غرق ہیں کہ اُس عظیم الشان علم اور اُس زبردست رہنمائی کی قدر و قیمت ان کی سمجھ میں نہیں آتی جس کی بدولت یہ ریگستانِ عرب کے اس تنگ و تاریک گوشے سے اُٹھ کر عالمِ انسانی کے امام و پیشوا بن سکتے ہیں، اور اس فانی دنیا ہی میں نہیں بلکہ بعد کی لازوال اَبدی زندگی میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرفراز ہو سکتے ہیں۔ اس نادانی و حماقت کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے انھیں استفادے کی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔ جب فلاح و کامرانی اور قوت و عظمت کا یہ خزانہ مفت لُٹ رہا ہوتا ہے اور خوش نصیب لوگ اسے دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان بدنصیبوں کے دل کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انھیں خبر تک نہیں ہوتی کہ کس دولت سے محروم رہ گئے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ
هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع

ع ۱۶

دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسُول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے ــــــ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ ''میرے لیے اللہ بس کرتا ہے، کوئی معبُود نہیں مگر وہ، اُسی پر میں نے بھروسا کیا اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

یُونُس

(۱۰)

یُونُس

نام اس سورہ کا نام حسبِ دستور محض علامت کے طور پر آیت ۹۸ سے لیا گیا ہے، جس میں اشارتاً حضرت یونسؑ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا موضوعِ بحث حضرت یونسؑ کا قصہ نہیں ہے۔

مقامِ نزول روایات سے معلوم ہوتا ہے اور نفسِ مضمون سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پوری سورت مکے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کی بعض آیتیں مدنی دَور کی ہیں، لیکن یہ محض ایک سطحی قیاس ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ مختلف تقریروں یا مختلف مواقع پر اُتری ہوئی آیتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی مربوط تقریر ہے جو بیک وقت نازل ہوئی ہوگی، اور مضمونِ کلام اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ یہ مکّی دَور کا کلام ہے۔

زمانۂ نزول زمانۂ نزول کے متعلق کوئی روایت ہمیں نہیں ملی۔ لیکن مضمون سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورت زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں نازل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس کے اندازِ کلام سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مخالفینِ دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے، وہ نبیؐ اور پیروانِ نبیؐ کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان سے اب یہ اُمید باقی نہیں رہی ہے کہ تفہیم و تلقین سے راہِ راست پر آ جائیں گے، اور اب انھیں اُس انجام سے خبردار کرنے کا موقع آ گیا ہے جو نبیؐ کو آخری اور قطعی طور پر رد کر دینے کی صورت میں انھیں لازماً دیکھنا ہوگا۔ مضمون کی یہی خصوصیات ہمیں بتاتی ہیں کہ کون سی سورتیں مکہ کے آخری دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اس سورہ میں ہجرت کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس لیے اس کا زمانہ ان سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیے جن میں کوئی نہ کوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلق ملتا ہے ـــــ زمانے کی اِس تعیین کے بعد تاریخی پس منظر بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس دَور کا تاریخی پس منظر سورۂ اَنعام اور سورۂ اَعراف کے دیباچوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔

موضوع موضوعِ تقریر دعوت، فہمائش اور تنبیہ ہے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ:

لوگ ایک انسان کے پیغامِ نبوت پیش کرنے پر حیران ہیں اور اِسے خواہ مخواہ ساحری کا الزام دے رہے ہیں، حالانکہ جو بات وہ پیش کر رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی نہ تو عجیب ہی ہے اور نہ سِحر و کہانت ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تو دو اہم حقیقتوں سے تم کو آگاہ کر رہا ہے: ایک یہ کہ جو خدا اس کائنات کا خالق ہے اور اس کا انتظام عملاً چلا رہا ہے، صرف وہی تمھارا مالک و آقا ہے اور تنہا اسی کا یہ حق ہے کہ تم اس کی بندگی کرو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

دوسرے یہ کہ موجودہ دنیوی زندگی کے بعد زندگی کا ایک اور دَور آنے والا ہے جس میں تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے، اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دو گے اور اس بنیادی سوال پر جزا یا سزا پاؤ گے کہ تم نے اُسی خدا کو اپنا آقا مان کر اس کے منشا کے مطابق نیک رَوِیّہ اختیار کیا یا اس کے خلاف عمل کرتے رہے۔ یہ دونوں حقیقتیں، جو وہ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے، بجائے خود امرِ واقعی ہیں، خواہ تم مانو یا نہ مانو۔ وہ تمھیں دعوت دیتا ہے کہ تم انھیں مان لو اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنالو۔ اس کی یہ دعوت اگر تم قبول کرو گے تو تمھارا اپنا انجام بہتر ہوگا، ورنہ خود ہی بُرا نتیجہ دیکھو گے۔

مَباحِث اس تمہید کے بعد حسبِ ذیل مَباحِث ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

(۱) وہ دلائل جو توحید رُبوبیّت اور حیاتِ اُخروی کے باب میں ایسے لوگوں کو عقل وضمیر کا اطمینان بخش سکتے ہیں جو جاہلانہ تعصّب میں مبتلا نہ ہوں اور جنھیں بحث کی ہار جیت کے بجائے اصل فکر اس بات کی ہو کہ خود غلط بینی اور اس کے بُرے نتائج سے بچیں۔

(۲) اُن غلط فہمیوں کا ازالہ اور اُن غفلتوں پر تنبیہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہی تھیں (اور ہمیشہ ہُوا کرتی ہیں)۔

(۳) اُن شبہات اور اعتراضات کا جواب جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپؐ کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں پیش کیے جاتے تھے۔

(۴) دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی پیشگی خبر، تاکہ انسان اس سے ہوشیار ہو کر اپنے آج کے طرزِ عمل کو دُرست کر لے اور بعد میں پچھتانے کی نوبت نہ آئے۔

(۵) اس امر پر تنبیہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی زندگی ہے اور اس امتحان کے لیے تمھارے پاس بس اتنی ہی مہلت ہے جب تک تم اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ اِس وقت کو اگر تم نے ضائع کر دیا اور نبی کی ہدایت قبول کر کے امتحان کی کامیابی کا سامان نہ کیا تو پھر کوئی دوسرا موقع تمہیں ملنا نہیں ہے۔ اس نبی کا آنا اور اس قرآن کے ذریعے سے تم کو علمِ حقیقت کا بہم پہنچایا جانا وہ بہترین اور ایک ہی موقع ہے جو تمھیں مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو بعد کی اَبدی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ پچھتاؤ گے۔

(۶) اُن کھلی کھلی جہالتوں اور ضلالتوں پر اشارہ جو لوگوں کی زندگی میں صرف اس وجہ سے پائی جا رہی تھیں کہ وہ خدائی ہدایت کے بغیر جی رہے تھے۔

اس سلسلے میں نوح علیہ السلام کا قصہ مختصراً اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس سے چار باتیں ذہن نشین کرنی مطلوب ہیں: اوّل یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ تم لوگ کر رہے ہو، وہ اس سے ملتا جلتا ہے جو نوح اور موسیٰ علیہما السلام کے ساتھ تمھارے پیش رو کر چکے ہیں، اور یقین رکھو کہ اس طرزِ عمل کا جو انجام وہ دیکھ چکے ہیں وہی تمھیں بھی دیکھنا پڑے گا۔ دوم یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

ان کے ساتھیوں کو آج جس بے بسی و کمزوری کے حال میں تم دیکھ رہے ہو، اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ صورتِ حال ہمیشہ یہی رہے گی۔ تمھیں خبر نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر وہی خدا ہے جو موسیٰؑ و ہارونؑ کی پشت پر تھا، اور وہ ایسے طریقے سے حالات کی بساط اُلٹ دیتا ہے جس تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ سوم یہ کہ سنبھلنے کے لیے جو مہلت خدا تمھیں دے رہا ہے، اسے اگر تم نے ضائع کر دیا اور پھر فرعون کی طرح خدا کی پکڑ میں آ جانے کے بعد عین آخری لمحے پر توبہ کی تو معاف نہیں کیے جاؤ گے۔ چہارم یہ کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے وہ مخالف ماحول کی انتہائی شدت اور اس کے مقابلے میں اپنی بیچارگی دیکھ کر مایوس نہ ہوں اور انھیں معلوم ہو کہ ان حالات میں ان کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز وہ اس امر پر بھی متنبہ ہو جائیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اِس حالت سے نکال دے تو کہیں وہ اُس رَوِش پر نہ چل پڑیں جو بنی اسرائیل نے مصر سے نجات پا کر اختیار کی۔

آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ مسلک ہے جس پر چلنے کی اللہ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی ہے، اس میں قطعاً کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی، جو اسے قبول کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا اور جو اس کو چھوڑ کر غلط راہوں میں بھٹکے گا وہ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۱۰۹ سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ
اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ
قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢﴾

المنزل ۳ — وقف لازم

ال ر، یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔[۱]

کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے خود اُنھی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوش خبری دے دے کہ ان کے لیے اُن کے رب کے پاس سچّی عزت و سرفرازی ہے؟[۲] (کیا یہی وہ بات ہے جس پر) منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کُھلا جادوگر ہے؟[۳]

۱ – اس تمہیدی فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مضمر ہے۔ نادان لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ پیغمبر قرآن کے نام سے جو کلام ان کو سنا رہا ہے وہ محض زبان کی جادوگری ہے، شاعرانہ پروازِ تخیّل ہے اور کچھ کاہنوں کی طرح عالمِ بالا کی گفتگو ہے۔ اس پر انھیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم گمان کر رہے ہو یہ وہ چیز نہیں ہے۔ یہ تو کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ اِن کی طرف توجہ نہ کرو گے تو حکمت سے محروم رہ جاؤ گے۔

۲ – یعنی آخر اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ انسانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا؟ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا خالق و پروردگار انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے، یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی انتظام کرے؟ اور اگر خدا کی طرف سے کوئی ہدایت آئے تو عزت و سرفرازی اُن کے لیے ہونی چاہیے جو اسے مان لیں یا ان کے لیے جو اسے رد کر دیں؟ پس تعجب کرنے والوں کو سوچنا تو چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں۔

۳ – یعنی جادوگر کی پھبتی تو انھوں نے اس پر کس دی مگر یہ نہ سوچا کہ وہ چسپاں بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ صرف یہ بات کہ کوئی شخص اعلیٰ درجے کی خطابت سے کام لے کر دلوں اور دماغوں کو مسخر کر رہا ہے، اُس پر یہ الزام عائد کر دینے کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ جادوگری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس خطابت میں وہ بات کیا کہتا ہے، کس غرض کے لیے قوتِ تقریر کو استعمال کر رہا ہے، اور جو اثرات اس کی تقریر سے ایمان لانے والوں کی زندگی پر مترتّب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب کسی ناجائز

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے[۴]۔ کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے[۵]۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے، لہٰذا تم اُسی کی عبادت کرو[۶]۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟

غرض کے لیے جادو بیانی کی طاقت استعمال کرتا ہے، وہ تو ایک منہ پھٹ، بے لگام، غیر ذمہ دار مقرر ہوتا ہے۔ حق اور صداقت اور انصاف سے آزاد ہو کر ہر وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو بس سننے والوں کو متأثر کر دے، خواہ بجائے خود کتنی ہی جھوٹی، مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ ہو۔ اس کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے۔ کسی منظّم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری ہوتی ہے۔ اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہُوا کرتی ہے۔ وہ تو محض اپنا سکّہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلے میں اُبھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے۔ اس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیُّر رونما ہوتا ہے اور نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق و صداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ جچا تُلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اس کی خطابت میں تم خلقِ خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے بُرے نتائج سے ان کو خبردار کرے اور انھیں اُس طریقے کی طرف بلائے جس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مُترتّب ہوئے ہیں وہ بھی جادوگروں کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جس نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے، اس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے اور اس کے سارے طرزِ عمل میں خیر و صلاح کی شان نمایاں ہو گئی ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو، کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج دکھایا کرتا ہے؟

۴ – یعنی پیدا کر کے وہ معطّل نہیں ہو گیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تختِ سلطنت پر وہ خود جلوہ فرما ہُوا اور اب سارے جہان کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان لوگ سمجھتے ہیں خدا نے کائنات کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے، یا دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسا چاہیں تصرُّف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبۡدَؤُا الۡخَـلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ
لِيَجۡزِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ ؕ وَالَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ ۝

اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۸، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۹، تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے، اور جنھوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہُوا پانی پییں اور دردناک سزا بھگتیں اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے۱۰۔

کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کی اس پوری کارگاہ پر آپ ہی حکمرانی کر رہا ہے، تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں، ساری زمامِ اقتدار پر وہ خود قابض ہے، کائنات کے گوشے گوشے میں ہر وقت ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے، براہِ راست اس کے حکم یا اذن سے ہو رہا ہے، اس جہانِ ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی اسے وجود میں لایا تھا، بلکہ ہمہ وقت وہی اس کا مدبر و منتظم ہے، اسی کے قائم رکھنے سے یہ قائم ہے اور اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اعراف، حاشیہ ۴۰ و ۴۱)

۵ – یعنی دنیا کی تدبیر و انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار، کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا کوئی فیصلہ بدلوا دے یا کسی کی قسمت بنوا دے یا بگڑوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے، مگر اس کی دعا کا قبول ہونا یا نہ ہونا بالکل خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ خدا کی خدائی میں اتنا زوردار کوئی نہیں ہے کہ اس کی بات چل کر رہے اور اس کی سفارش ٹل نہ سکے اور وہ عرش کا پایہ پکڑ کر بیٹھ جائے اور اپنی بات منوا کر ہی رہے۔

۶ – اُوپر کے تین فقروں میں حقیقتِ نفس الامری کا بیان تھا کہ فی الواقع خدا ہی تمھارا رب ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امرِ واقعی کی موجودگی میں تمھارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ جب واقعہ یہ ہے کہ رُبُوبیّت بالکلیّہ خدا کی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم صرف اُسی کی عبادت کرو۔ پھر جس طرح رُبُوبیّت کا لفظ تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پروردگاری، مالکی و آقائی اور فرماں روائی، اسی طرح اس کے بالمقابل عبادت کا لفظ بھی تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پرستش، غلامی اور اطاعت۔

خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکر گزار ہو، اسی سے دعائیں مانگے اور اسی کے آگے محبت و عقیدت سے سر جھکائے۔ یہ عبادت کا پہلا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد مالک و آقا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کا بندہ و غلام بن کر رہے، اُس کے مقابلے میں خود مختارانہ رَوِیّہ نہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی ذہنی یا عملی غلامی قبول نہ کرے۔ یہ عبادت کا دوسرا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد فرماں روا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے۔

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّ الۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۵﴾ اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ ﴿۶﴾

وہی ہے جس نے سُورج کو اُجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں، تاکہ تم اُس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ (کھیل کے طور پر نہیں بلکہ) بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور ہر اُس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (غلط بینی و غلط روی سے) بچنا چاہتے ہیں۔[11]

نہ خود اپنا حکمراں بنے اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیّت تسلیم کرے۔ یہ عبادت کا تیسرا مفہوم ہے۔

۷ – یعنی جب یہ حقیقت تمھارے سامنے کھول دی گئی ہے اور تم کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اس حقیقت کی موجودگی میں تمھارے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے، تو کیا اب بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں گی اور اُنھی غلط فہمیوں میں پڑے رہو گے جن کی بنا پر تمھاری زندگی کا پورا رویّہ اب تک حقیقت کے خلاف رہا ہے؟

۸ – یہ نبیؐ کی تعلیم کا دوسرا بنیادی اُصول ہے۔ اصلِ اوّل یہ کہ تمھارا رب صرف اللہ ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو۔ اور اصلِ دوم یہ کہ تمھیں اس دنیا سے واپس جا کر اپنے رب کو حساب دینا ہے۔

۹ – یہ فقرہ دعوے اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ خدا دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا، اور اس پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ اسی نے پہلی مرتبہ انسان کو پیدا کیا۔ جو شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ خدا نے خلق کی ابتدا کی ہے (اور اس سے بجز اُن دہریّوں کے جو محض پادریوں کے مذہب سے بھاگنے کے لیے خلقِ بے خالق جیسے احمقانہ نظریّے کو اوڑھنے پر آمادہ ہو گئے، اور کون انکار کر سکتا ہے) وہ اس بات کو ناممکن یا بعید از فہم قرار نہیں دے سکتا کہ وہی خدا اس خلق کا پھر اعادہ کرے گا۔

۱۰ – یہ وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ اُوپر جو دلیل دی گئی وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ خلق کا اعادہ ممکن ہے اور اسے مُستبعَد سمجھنا درست نہیں ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اعادۂ خلق عقل و انصاف کی رُو سے ضروری ہے اور یہ ضرورت تخلیقِ ثانیہ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ خدا کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ صحیح بندگی کا رویّہ اختیار کریں وہ اس کے مستحق ہیں کہ انھیں اپنے اس بجا طرزِ عمل کی پوری پوری جزا ملے۔ اور جو لوگ حقیقت سے

Maktaba Tul Ishaat.com

انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بے جا طرزِ عمل کا بُرا نتیجہ دیکھیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے (اور ہر شخص جو ہٹ دھرم نہیں ہے جانتا ہے کہ نہیں ہو رہی ہے) تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ اعراف، حاشیہ ۳۰ و سورۂ ہُود، حاشیہ ۱۰۵)

۱۱ – یہ عقیدۂ آخرت کی تیسری دلیل ہے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جو کام ہر طرف نظر آ رہے ہیں، جن کے بڑے بڑے نشانات سُورج اور چاند، اور لیل و نہار کی گردش کی صورت میں ہر شخص کے سامنے موجود ہیں، ان سے اس بات کا نہایت واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا خالق کوئی بچہ نہیں ہے جس نے محض کھیلنے کے لیے یہ سب کچھ بنایا ہو اور پھر دل بھر لینے کے بعد یونہی اس گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ صریح طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس کے ہر کام میں نظم ہے، حکمت ہے، مصلحتیں ہیں، اور ذرّے ذرّے کی پیدائش میں ایک گہری مقصدیت پائی جاتی ہے۔ پس جب وہ حکیم ہے اور اس کی حکمت کے آثار و علائم تمھارے سامنے علانیہ موجود ہیں، تو اس سے تم کیسے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انسان کو عقل اور اخلاقی حس اور آزادانہ ذمہ داری اور تصرّف کے اختیارات بخشنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب کبھی نہ لے گا اور عقلی و اخلاقی ذمہ داری کی بنا پر جزا و سزا کا جو استحقاق لازماً پیدا ہوتا ہے اسے یونہی مُہمل چھوڑ دے گا۔

اس طرح ان آیات میں عقیدۂ آخرت پیش کرنے کے ساتھ اس کی تین دلیلیں ٹھیک ٹھیک منطقی ترتیب کے ساتھ دی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ دوسری زندگی ممکن ہے، کیونکہ پہلی زندگی کا امکان واقعے کی صورت میں موجود ہے۔

دوم یہ کہ دوسری زندگی کی ضرورت ہے، کیونکہ موجودہ زندگی میں انسان اپنی اخلاقی ذمہ داری کو صحیح یا غلط طور پر جس طرح ادا کرتا ہے اور اس سے سزا اور جزا کا جو استحقاق پیدا ہوتا ہے، اس کی بنا پر عقل اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ایک اور زندگی ہو جس میں ہر شخص اپنے اخلاقی رویّے کا وہ نتیجہ دیکھے جس کا وہ مستحق ہے۔

سوم یہ کہ جب عقل و انصاف کی رُو سے دوسری زندگی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت یقیناً پوری کی جائے گی، کیونکہ انسان اور کائنات کا خالق حکیم ہے اور حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ حکمت و انصاف جس چیز کے متقاضی ہوں اسے وہ وجود میں لانے سے باز رہ جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زندگی بعدِ موت کو اِستدلال سے ثابت کرنے کے لیے یہی تین دلیلیں ممکن ہیں اور یہی کافی بھی ہیں۔ ان دلیلوں کے بعد اگر کسی چیز کی کسر باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کو آنکھوں سے دکھا دیا جائے کہ جو چیز ممکن ہے، جس کے وجود میں آنے کی ضرورت بھی ہے، اور جس کو وجود میں لانا خدا کی حکمت کا تقاضا بھی ہے، وہ دیکھ، یہ تیرے سامنے موجود ہے۔ لیکن یہ کسر بہرحال موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں کی جائے گی، کیونکہ دیکھ کر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا جو امتحان لینا چاہتا ہے وہ تو ہے ہی یہ کہ وہ حس اور مشاہدے سے بالاتر حقیقتوں کو خالص نظر و فکر اور استدلالِ صحیح کے ذریعے سے مانتا ہے یا نہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم مضمون بھی بیان فرما دیا گیا ہے جو گہری توجہ کا مستحق ہے۔ فرمایا کہ ”اللہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں“ اور ”اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غلط بینی و غلط رَوی سے بچنا چاہتے ہیں“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے زندگی کے مظاہر میں ہر طرف وہ آثار پھیلا رکھے ہیں جو ان مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کی صاف صاف نشان دہی کر رہے ہیں۔ لیکن ان نشانات سے حقیقت تک صرف وہ لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ دو صفات موجود ہوں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ﴿۷﴾ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دُنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا اُن بُرائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرزِ عمل کی وجہ سے) کرتے رہے[۱۲]۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنھوں نے اُن صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس

ایک یہ کہ وہ جاہلانہ تعصّبات سے پاک ہو کر علم حاصل کرنے کے اُن ذرائع سے کام لیں جو اللہ نے انسان کو دیے ہیں۔
دوسرے یہ کہ اُن کے اندر خود یہ خواہش موجود ہو کہ غلطی سے بچیں اور صحیح راستہ اختیار کریں۔

۱۲ – یہاں پھر دعوے کے ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی اشارتاً بیان کر دی گئی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت کے انکار کا لازمی اور قطعی نتیجہ جہنم ہے، اور دلیل یہ ہے کہ اس عقیدے سے منکر یا خالی الذہن ہو کر انسان اُن برائیوں کا اکتساب کرتا ہے جن کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہزار ہا سال کے انسانی رویّے کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔ جو لوگ خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذمّہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتے، جو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے کہ انھیں آخرکار خدا کو اپنے پورے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہے، جو اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ زندگی بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، جن کے نزدیک کامیابی و ناکامی کا معیار صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی نے کس قدر خوش حالی، آسایش، شہرت اور طاقت حاصل کی، اور جو اپنے انھی مادہ پرستانہ تخیّلات کی بنا پر آیاتِ الٰہی کو ناقابلِ توجہ سمجھتے ہیں، ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ دُنیا میں شُترِ بے مہار بن کر رہتے ہیں، نہایت بُرے اخلاق و اوصاف کا اکتساب کرتے ہیں، خدا کی زمین کو ظلم و فساد اور فِسق و فُجور سے بھر دیتے ہیں، اور اس بنا پر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔
یہ عقیدۂ آخرت پر ایک اور نوعیت کی دلیل ہے۔ پہلی تین دلیلیں عقلی اِستدلال کے قبیل سے تھیں، اور یہ تجرِبی استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہاں اسے صرف اشارتاً بیان کیا گیا ہے، مگر قرآن میں مختلف مواقع پر ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا انفرادی رویّہ اور انسانی گروہوں کا اجتماعی رویّہ کبھی اُس وقت تک دُرست نہیں ہوتا جب تک یہ شعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں پیوست نہ ہو کہ ہم کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی سیرت و کردار کی گاڑی بُرائی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ اگر عقیدۂ آخرت حقیقتِ نفس الامری کے مطابق نہ ہوتا اور اُس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لُزومی شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجرِبے میں آتے۔ ایک ہی چیز سے پیہم صحیح نتائج کا برآمد ہونا اور اس کے عدم سے

Maktaba Tul Ishaat.com

نتائج کا ہمیشہ غلط ہو جانا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ چیز بجائے خود صحیح ہے۔

اس کے جواب میں بسا اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بہت سے منکرینِ آخرت ایسے ہیں جن کا فلسفۂ اَخلاق اور دستورِ عمل سراسر دہریت و مادّہ پرستی پر مبنی ہے پھر بھی وہ اچھی خاصی پاک سیرت رکھتے ہیں اور ان سے ظلم و فساد اور فسق و فُجور کا ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے معاملات میں نیک اور خلقِ خدا کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بادنیٰ تأمّل واضح ہو جاتی ہے۔ تمام مادّہ پرستانہ لادینی فلسفوں اور نظاماتِ فکر کی جانچ پڑتال کر کے دیکھ لیا جائے۔ کہیں اُن اَخلاقی خوبیوں اور عملی نیکیوں کے لیے کوئی بنیاد نہ ملے گی جن کا خراجِ تحسین ان ''نیکوکار'' دہریوں کو دیا جاتا ہے۔ کسی مَنْطِق سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان لادینی فلسفوں میں راست بازی، امانت، دیانت، وفائے عہد، عدل، رحم، فیاضی، ایثار، ہمدردی، ضبطِ نفس، عِفّت، حق شناسی اور ادائے حُقوق کے لیے مُحرِّکات موجود ہیں۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد اخلاق کے لیے اگر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے تو وہ صرف افادیت (utilitarianism) کی بنیادوں پر بن سکتا ہے۔ باقی تمام اخلاقی فلسفے محض فرضی اور کتابی ہیں نہ کہ عملی۔ اور افادیت جو اخلاق پیدا کرتی ہے اسے خواہ کتنی ہی وسعت دی جائے، بہرحال وہ اس سے آگے نہیں جاتا کہ آدمی وہ کام کرے جس کا کوئی فائدہ اِس دنیا میں اُس کی ذات کی طرف، یا اُس معاشرے کی طرف جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، پلٹ کر آنے کی توقع ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو فائدے کی اُمید اور نقصان کے اندیشے کی بنا پر انسان سے سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، ایمان داری اور بے ایمانی، وفا اور غدر، انصاف اور ظلم، غرض ہر نیکی اور اس کی ضد کا حسبِ موقع ارتکاب کرا سکتی ہے۔ اِن اخلاقیات کا بہترین نمونہ موجودہ زمانے کی انگریز قوم ہے، جس کو اکثر اس امر کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے کہ مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات رکھنے اور آخرت کے تصوّر سے خالی ہونے کے باوجود اس قوم کے افراد بالعُموم دوسروں سے زیادہ سچے، کھرے، دیانت دار، عہد کے پابند، انصاف پسند اور معاملات میں قابلِ اعتماد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افادی اخلاقیات کی ناپائداری کا سب سے زیادہ نمایاں عملی ثبوت ہم کو اسی قوم کے کردار میں ملتا ہے۔ اگر فی الواقع انگریزوں کی سچائی، انصاف پسندی، راست بازی اور عہد کی پابندی اس یقین واذعان پر مبنی ہوتی کہ یہ صفات بجائے خود مستقل اخلاقی خوبیاں ہیں، تو آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک ایک انگریز تو اپنے شخصی کردار میں ان کا حامل ہوتا مگر ساری قوم مل کر جن لوگوں کو اپنا نمایندہ اور اپنے اجتماعی اُمور کا سربراہِ کار بناتی ہے، وہ بڑے پیمانے پر اس کی سلطنت اور اس کے بین الاقوامی معاملات کے چلانے میں عَلانیہ جھوٹ، بدعہدی، ظلم، بے انصافی اور بددیانتی سے کام لیتے اور پوری قوم کا اعتماد ان کو حاصل رہتا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ لوگ مستقل اخلاقی قدروں کے قائل نہیں ہیں، بلکہ دنیوی فائدے اور نقصان کے لحاظ سے بیک وقت دو متضاد اخلاقی رَوِیّے اختیار کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں؟

تاہم اگر کوئی منکرِ خدا و آخرت فی الواقع دنیا میں ایسا موجود ہے جو مستقل طور پر بعض نیکیوں کا پابند اور بعض بدیوں سے مجتنب ہے تو درحقیقت اس کی یہ نیکی اور پرہیز گاری اس کے مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن مذہبی اثرات کا نتیجہ ہے جو غیر شُعوری طور پر اس کے نفس میں متمکّن ہیں۔ اس کا اخلاقی سرمایہ مذہب سے چُرایا ہُوا ہے اور اس کو وہ ناروا طریقے سے لامذہبی میں استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی لامذہبی و مادّہ پرستی کے خزانے میں اِس سرمایے کے ماخذ کی نشان دہی ہرگز نہیں کر سکتا۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے، انھیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا، نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی،[۱۳] وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ "پاک ہے تو اے خدا"، ان کی دُعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ "ساری تعریف اللہ

۱۳- اس جملے پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔ اس کے مضمون کی ترتیب گہری توجہ کی مستحق ہے:

ان لوگوں کو آخرت کی زندگی میں جنت کیوں ملے گی؟ —— اس لیے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں سیدھی راہ چلے۔ ہر کام میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر انفرادی و اجتماعی معاملے میں انھوں نے برحق طریقہ اختیار کیا اور باطل طریقوں کو چھوڑ دیا۔

یہ ہر ہر قدم پر، زندگی کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر، اُن کو صحیح اور غلط، حق اور باطل، راست اور ناراست کی تمیز کیسے حاصل ہوئی؟ اور پھر اس تمیز کے مطابق راست روی پر ثبات اور کج روی سے پرہیز کی طاقت انھیں کہاں سے ملی؟ ان کے رب کی طرف سے، کیونکہ وہی علمی رہنمائی اور عملی توفیق کا منبع ہے۔

ان کا رب انھیں یہ ہدایت اور یہ توفیق کیوں دیتا رہا؟ —— ان کے ایمان کی وجہ سے۔

یہ نتائج جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، کس ایمان کے نتائج ہیں؟ —— اُس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنیٰ میں ہو، بلکہ اُس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہونے لگے۔ اپنی جسمانی زندگی میں آپ خود دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات، تندرستی، قوتِ کار اور لذتِ زندگانی کا حصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہوتا ہے، لیکن یہ نتائج اُس تغذیے کے نہیں ہوتے جو محض کھا لینے کے معنیٰ میں ہو، بلکہ اُس تغذیے کے ہوتے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر حصۂ جسم کو وہ طاقت بخشے جس سے وہ اپنے حصے کا کام ٹھیک کرنے لگے۔ بالکل اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت یابی، راست بینی، راست روی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح عقائد پر موقوف ہے، مگر یہ نتائج اُن عقائد کے نہیں ہیں جو محض زبان پر جاری ہوں یا دل و دماغ کے کسی گوشے میں بے کار پڑے ہوئے ہوں، بلکہ ان عقائد کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر اندازِ فکر اور مذاقِ طبع اور اُفتادِ مزاج بن جائیں، اور سیرت و کردار اور رویّۂ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوں۔ خدا کے قانونِ طبیعی میں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے، اُن انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ پھر کیوں توقع کی جائے کہ اُس کے قانونِ اخلاقی میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والے کی طرح رہے، اُن انعامات

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ

ع

رب العالمین ہی کے لیے ہے۔[14]"۲

اگر کہیں[15] اللہ لوگوں کے ساتھ بُرا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دُنیا کی بھلائی

کا مستحق ہوسکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لیے رکھے گئے ہیں؟

۱۴- یہاں ایک لطیف انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دار الامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنتوں میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ بس وہاں پہنچتے ہی سامانِ عیش پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور ہر طرف سے لاؤ حوریں، لاؤ شراب اور بجے چنگ و رباب کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی، جیسا کہ جنت کا نام سنتے ہی بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے۔ بلکہ درحقیقت صالح اہلِ ایمان دُنیا میں افکارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کر کے، اپنے جذبات کو سنوار کر، اپنی خواہشات کو سُدھار کر، اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر، جس قسم کی بلند ترین شخصیتیں اپنی ذات میں بہم پہنچائیں گے، وہی دُنیا کے ماحول سے مختلف، جنت کے پاکیزہ ترین ماحول میں اور زیادہ نکھر کر اُبھر آئیں گی اور اُن کے وہی اوصاف، جو دنیا میں انھوں نے پرورش کیے تھے، وہاں اپنی پوری شان کے ساتھ ان کی سیرت میں جلوہ گر ہوں گے۔ ان کا محبُوب ترین مشغلہ وہی اللہ کی حمد و تقدیس ہوگا جس سے دُنیا میں وہ مانوس تھے، اور ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کارفرما ہوگا جسے دُنیا میں انھوں نے اپنے اجتماعی رَوِیّے کی روح بنایا تھا۔

۱۵- اُوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب نصیحت اور تفہیم کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ اس تقریر کو پڑھنے سے پہلے اس کے پَس منظر سے متعلق دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہییں:

ایک یہ کہ اِس تقریر سے تھوڑی مدت پہلے وہ مسلسل اور سخت بلا انگیز قحط ختم ہُوا تھا جس کی مصیبت سے اہلِ مکہ چیخ اُٹھے تھے۔ اس قحط کے زمانے میں قریش کے متکبرین کی اکڑی ہوئی گردنیں بہت جھک گئی تھیں۔ دعائیں اور زاریاں کرتے تھے، بُت پرستی میں کمی آ گئی تھی، خدائے واحد کی طرف رُجوع بڑھ گیا تھا اور نوبت یہ آ گئی تھی کہ آخرِکار ابوسفیان نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ خدا سے اس بلا کو ٹالنے کے لیے دُعا کریں۔ مگر جب قحط دُور ہوگیا، بارشیں ہونے لگیں اور خوش حالی کا دَور آیا تو ان لوگوں کی وہی سرکشیاں اور بد اعمالیاں، اور دینِ حق کے خلاف وہی سرگرمیاں پھر شروع ہوگئیں اور جو دل خدا کی طرف رُجوع کرنے لگے تھے وہ پھر اپنی سابق غفلتوں میں ڈوب گئے۔ (مُلاحظہ ہو: النحل، آیت ۱۱۳۔ المؤمنون، آیات ۷۵ تا ۷۷۔ الدُّخان، آیات ۱۰ تا ۱۶)

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ان لوگوں کو انکارِ حق کی پاداش سے ڈراتے تھے تو یہ لوگ جواب میں کہتے تھے کہ تم جس عذابِ الٰہی کی دھمکیاں دیتے ہو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے۔

اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے، ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا۔ تم چاہتے ہو کہ جس طرح اس نے تمھاری دعائیں سُن کر بلائے قحط جلدی سے دُور کر دی، اُسی طرح وہ تمھارے

بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ
لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ
دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ
مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مُہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم اُن لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چُھوٹ دے دیتے ہیں۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی بُرے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ لوگو! تم سے پہلے کی قوموں[۱۶] کو (جو اپنے اپنے زمانے میں برسرِ عُروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا

چیلنج سُن کر اور تمھاری سرکشیاں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے۔ لیکن خدا کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ لوگ خواہ کتنی ہی سرکشیاں کیے جائیں، وہ ان کو پکڑنے سے پہلے سنبھلنے کا کافی موقع دیتا ہے۔ پیہم تنبیہات بھیجتا ہے اور رسّی ڈھیلی چھوڑے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب رعایت کی حد ہو جاتی ہے تب پاداشِ عمل کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے خدا کا طریقہ۔ اور اس کے برعکس کم ظرف انسانوں کا طریقہ وہ ہے جو تم نے اختیار کیا کہ جب مصیبت آئی تو خدا یاد آنے لگا، بلبلانا اور گڑگڑانا شروع کر دیا، اور جہاں راحت کا دَور آیا کہ سب کچھ بھول گئے۔ یہی وہ لچھن ہیں جن سے قومیں اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بناتی ہیں۔

۱۶ – اصل میں لفظ ”قَرن“ استعمال ہُوا ہے جس سے مراد عام طور پر تو عَرَبی زبان میں ایک ”عہد کے لوگ“ ہوتے ہیں، لیکن قرآنِ مجید میں جس انداز سے مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ”قرن“ سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دَور میں برسرِ عُروج اور کُلّی یا جُزئی طور پر امامتِ عالَم پر سرفراز رہی ہو۔ ایسی قوم کی ہلاکت لازماً یہی معنیٰ نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل غارت ہی کر دیا جائے، بلکہ اس کا مقامِ عروج و امامت سے گرا دیا جانا، اس کی تہذیب و تمدّن کا تباہ ہو جانا، اس کے تشخّص کا مٹ جانا اور اس کے اجزا کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا، یہ بھی ہلاکت ہی کی ایک صورت ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوۡا
لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
جَعَلۡنٰكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لِنَـنۡظُرَ كَيۡفَ
تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ
لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ ؕ قُلۡ
مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ

جب انھوں نے ظلم کی روش[17] اختیار کی اور اُن کے رسول اُن کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے اور انھوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تا کہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔[18]

جب انھیں ہماری صاف صاف باتیں سُنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ "اِس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔"[19] اے محمدؐ! ان سے کہو: "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیّر وتبدّل کرلوں۔ میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس

۱۷– یہ لفظِ ظلم اُن محدود معنوں میں نہیں ہے جو عام طور پر اس سے مراد لیے جاتے ہیں، بلکہ یہ ان تمام گناہوں پر حاوی ہے جو انسان بندگی کی حد سے گزر کر کرتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۴۹)

۱۸– خیال رہے کہ خطاب اہلِ عرب سے ہو رہا ہے، اور ان سے کہا یہ جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انھوں نے آخرِ کار ظلم وبغاوت کی رَوِش اختیار کی اور جو انبیاؑ ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے ان کی بات انھوں نے نہ مانی، اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہلِ عرب! تمھاری باری آئی ہے۔ تمھیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس سے تمھارے پیش رَو ناکام ہو کر نکالے جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمھارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہُوا تو اس موقع سے، جو تمھیں دیا جا رہا ہے، صحیح فائدہ اٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور اُن غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو اُن کی تباہی کی موجب ہوئیں۔

۱۹– اُن کا یہ قول اوّل تو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمدؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے، اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انھوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ

إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ
عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم
بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ

بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔[20]" اور کہو: "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟[21]" پھر اس سے

جائے۔ دوسرے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی، اگر رہنمائی کے لیے اُٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دُنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں اتنی لچک ہی پیدا کرو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کم و بیش پر مُصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمھاری مانیں، کچھ تم ہماری مان لو۔ تمھاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمھاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لیے اور تمھارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری ان امیدوں کے لیے بھی گنجایش نکلنی چاہیے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ہماری کسی نہ کسی طرح نجات ضرور ہو جائے گی۔ پھر تمھارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اُصول بھی ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصُّبات کے لیے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لیے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے، اور کچھ ہماری خواہشاتِ نفس کے لیے بھی جگہ نکلنی چاہیے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا ایک مناسب دائرہ ہماری اور تمھاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطے سے کس دینا چاہتے ہو۔

۲۰ – یہ اُوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے۔ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ وحی کے ذریعے سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی ردّ و بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملے میں مُصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو ورنہ پورے کو ردّ کر دو۔

۲۱ – یہ ایک زبردست دلیل ہے اُن کے اِس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمدؐ کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دُور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اُن لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے

Maktaba Tul Ishaat.com

سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جُلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انھی کے ساتھ تھا اور آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہُوا نہ تھا۔ ایسی جانی بُوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہوسکتی تھی۔

آپؐ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنھیں مکّہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپؐ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپؐ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپؐ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہوگئے۔ اس سے پہلے کبھی آپؐ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، اُن مَباحِث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جواب قرآن کی اِن پے در پے سورتوں میں زیرِ بحث آئے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپؐ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپؐ کی باتوں اور آپؐ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جاسکتا ہو جو آپؐ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقا کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کرلیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر اُنگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہوسکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جَعل، مکّاری، عیّاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یک جائی معاشرت میں آپؐ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہُوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ، اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیرِ کعبہ کے سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا جس میں حَجَرِ اَسْوَد کو نصب کرنے کے معاملے پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہُوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے: ھٰذا الامین، رضینا، ھٰذا محمد۔ ''یہ بالکل راست باز آدمی ہے۔ ہم اس پر راضی ہیں۔ یہ تو محمدؐ ہے۔'' اس طرح آپؐ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپؐ کے ''امین'' ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجایش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی جھوٹ، جَعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جَعل و فریب لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب

اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔[۲۲] یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔[۲۳]''

کرنے لگا۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو! کچھ عقل سے تو کام لو، میں کوئی باہر سے آیا ہُوا اجنبی آدمی نہیں ہوں، تمھارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمھارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ قصص، حاشیہ ۱۰۹)

۲۲ – یعنی اگر یہ آیات خدا کی نہیں ہیں اور میں انھیں خود تصنیف کر کے آیاتِ الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

۲۳ – بعض نادان لوگ ''فلاح'' کو طویل عمر، یا دنیوی خوش حالی، یا دنیوی فروغ کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا رہے، یا دُنیا میں پھلے پھُولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو، اُسے نبیِ برحق مان لینا چاہیے، کیونکہ اس نے فلاح پائی۔ اگر وہ نبیِ برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دُنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ اِستدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاحِ ''فلاح'' کا مفہوم جانتا ہو، نہ اُس قانونِ اِمہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مقرر فرمایا ہے، اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنیٰ میں آیا ہے۔

اوّل تو یہ بات کہ ''مجرم فلاح نہیں پا سکتے'' اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے، جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کر لیں کہ جو مدعیِ نبوت ''فلاح'' پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنیٰ میں کہی گئی ہے کہ ''میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لیے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمھارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو، اس لیے تمھیں فلاح نصیب نہیں ہو گی۔''

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنیٰ میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائدار کامیابی ہے جو کسی خُسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطعِ نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اِس ابتدائی مرحلے میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعیِ ضلالت دُنیا میں مزے سے جیے، خوب پھلے پھُولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خُسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعیِ حق دُنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدّتِ آلام سے نڈھال

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ

یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ

ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دُنیا سے جلدی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خُسران نہیں، عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ انھیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھُپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اُس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسّی دراز ہو رہی ہو اور اس پر دنیوی "فلاح" کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانونِ اِمہال واِستدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے، اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ اِستثنا کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اَور تو سارے فریب چلنے دیے جائیں گے لیکن اگر تُو اپنی طرف سے کوئی نبی کھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائے گا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ اَلحاقہ، آیات ۴۴-۴۶ میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ "یعنی اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔" لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعیِ نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچا ہے، ایک منطقی مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ اِمہال واِستدراج میں جو استثنا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے، وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انھی لوگوں پر ہو گا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر ضابطۂ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ضابطۂ فوجداری کے تحت عام بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۂ اَلحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا یہ معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹ لے تو سمجھیں جھوٹا ہے، ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام، اور

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱۸
وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۹

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو: "کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟[۲۴]" پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمت تھے، بعد میں انھوں نے مختلف عقیدے اور مسلک[۲۵] بنا لیے، اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔[۲۶]

اُس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو، ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

۲۴ – کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمھاری سفارش کرنے والا ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہے ہو؟

۲۵ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۳۰۔ الانعام، حاشیہ ۲۴۔

۲۶ – یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ حقیقت کو انسانوں کے حواس سے پوشیدہ رکھ کر ان کی عقل و فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمائش میں ڈالا جائے گا، اور جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر غلط راہ پر جانا چاہیں گے انھیں اس راہ پر جانے اور چلنے کا موقع دیا جائے گا، تو حقیقت کو آج ہی بے نقاب کر کے سارے اختلافات کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

یہاں یہ بات ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر آج بھی لوگ اس اُلجھن میں ہیں اور نزولِ قرآن کے وقت بھی تھے کہ دنیا میں بہت سے مذہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب والا اپنے ہی مذہب کو حق سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں آخر اس فیصلے کی صورت کیا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اختلافِ مذاہب دراصل بعد کی پیداوار ہے۔ ابتدا میں تمام نوعِ انسانی کا مذہب ایک تھا اور وہی مذہب حق تھا۔ پھر اس حق میں اختلاف کر کے لوگ مختلف عقیدے اور مذہب بناتے چلے گئے۔ اب اگر اس ہنگامۂ مذاہب کا فیصلہ تمھارے نزدیک عقل و شعور کے صحیح استعمال کے بجائے صرف اسی طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ
فَٱنتَظِرُوٓا۟ ۖ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً ع
مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اِس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتاری گئی،[27] تو ان سے کہو: "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔[28] ع

لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملے میں چال بازیاں شروع کر دیتے ہیں۔[29] ان سے کہو: "اللہ اپنی چال میں تم سے

ہوسکتا ہے کہ خدا خود حق کو بے نقاب کر کے سامنے لے آئے، تو یہ موجودہ دنیوی زندگی میں نہیں ہوگا۔ دُنیا کی یہ زندگی تو ہے ہی امتحان کے لیے، اور یہاں سارا امتحان اِسی بات کا ہے کہ تم حق کو دیکھے بغیر عقل و شُعور سے پہچانتے ہو یا نہیں۔

۲۷ – یعنی اس بات کی نشانی کہ یہ واقعی نبیِ برحق ہے اور جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل دُرست ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ نشانی کے لیے ان کا یہ مطالبہ کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ وہ سچّے دل سے دعوتِ حق کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے اخلاق کو، عادت کو، نظامِ معاشرت وتمدّن کو، غرض اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لیے تیار تھے اور بس اس وجہ سے ٹھیرے ہوئے تھے کہ نبی کی تائید میں کوئی نشانی ابھی انھوں نے ایسی نہیں دیکھی تھی جس سے انھیں اس کی نبوّت کا یقین آجائے۔ اصل بات یہ تھی کہ نشانی کا یہ مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لیے ایک بہانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کو دکھایا جاتا اس کے بعد وہ یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو ہم کو دکھائی ہی نہیں گئی۔ اس لیے کہ وہ ایمان لانا چاہتے نہ تھے۔ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو اختیار کرنے میں یہ جو آزادی ان کو حاصل تھی کہ نفس کی خواہشات ورغبات کے مطابق جس طرح چاہیں کام کریں اور جس چیز میں لذت یا فائدہ محسوس کریں اس کے پیچھے لگ جائیں، اِس کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقیقتوں (توحید وآخرت) کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جنھیں مان لینے کے بعد ان کو اپنا سارا نظامِ حیات مستقل اَخلاقی اُصولوں کی بندش میں باندھنا پڑ جاتا۔

۲۸ – یعنی جو کچھ اللہ نے اُتارا ہے وہ تو مَیں نے پیش کر دیا، اور جو اس نے نہیں اُتارا وہ میرے اور تمھارے لیے "غیب" ہے، جس پر سوائے خدا کے کسی کا اختیار نہیں، وہ چاہے تو اُتارے اور نہ چاہے تو نہ اُتارے۔ اب اگر تمھارا ایمان لانا اِسی پر موقوف ہے کہ جو کچھ خدا نے نہیں اُتارا ہے وہ اُترے تو اس کے انتظار میں بیٹھے رہو، میں بھی دیکھوں گا کہ تمھاری یہ ضد پوری کی جاتی ہے یا نہیں۔

۲۹ – یہ پھر اسی قحط کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیات ۱۱ – ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نشانی آخر کس منہ سے مانگتے ہو۔ ابھی جو قحط تم پر گزرا ہے اس میں تم اپنے اُن معبودوں سے مایوس ہوگئے تھے جنھیں تم نے اللہ کے ہاں اپنا سفارشی ٹھیرا رکھا

مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ
طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ
كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ
الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

زیادہ تیز ہے، اس کے فرشتے تمھاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں[30]۔" وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تُو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں[31] گے۔"

تھا اور جن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ فُلاں آستانے کی نیاز تو تیر بہدف ہے، اور فلاں درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کی دیر ہے کہ مراد بر آتی ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ ان نام نہاد خداؤں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور سارے اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے۔ اسی وجہ سے تو آخر کار تم اللہ ہی سے دعائیں مانگنے لگے تھے۔ کیا یہ کافی نشانی نہ تھی کہ تمھیں اُس تعلیم کے برحق ہونے کا یقین آ جاتا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو دے رہے ہیں؟ مگر اس نشانی کو دیکھ کر تم نے کیا کیا؟ جونہی کہ قحط دُور ہُوا اور بارانِ رحمت نے تمھاری مصیبت کا خاتمہ کر دیا تم نے اس بلا کے آنے اور پھر اس کے دُور ہونے کے متعلق ہزار قسم کی توجیہیں اور تاویلیں (چال بازیاں) کرنی شروع کر دیں، تاکہ توحید کے ماننے سے بچ سکو اور اپنے شرک پر جمے رہ سکو۔ اب جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو اس درجہ خراب کر لیا ہو انھیں آخر کون سی نشانی دکھائی جائے اور اس کے دکھانے سے حاصل کیا ہے؟

۳۰- اللہ کی چال سے مراد ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویّہ دُرست نہیں کرتے تو وہ تمھیں اسی باغیانہ رَوِش پر چلتے رہنے کی چھوٹ دے دے گا، تم کو جیتے جی اپنے رزق اور اپنی نعمتوں سے نوازتا رہے گا جس سے تمھارا نشۂ زندگانی یونہی تمھیں مست کیے رکھے گا، اور اس مستی کے دوران میں جو کچھ تم کرو گے وہ سب اللہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھتے رہیں گے، حتّٰی کہ اچانک موت کا پیغام آ جائے گا اور تم اپنے کرتوتوں کا حساب دینے کے لیے دھر لیے جاؤ گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَمَّآ اَنۡجٰہُمۡ اِذَا ہُمۡ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ
اِنَّمَا بَغۡیُکُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ ۙ مَّتَاعَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۫ ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُکُمۡ
فَنُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا کَمَآءٍ
اَنۡزَلۡنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡکُلُ النَّاسُ
وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَہَا وَازَّیَّنَتۡ وَظَنَّ
اَہۡلُہَاۤ اَنَّہُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡہَاۤ ۙ اَتٰىہَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَہَارًا فَجَعَلۡنٰہَا
حَصِیۡدًا کَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ

مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمھاری یہ بغاوت اُلٹی تمھارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دُنیا کے چند روزہ مزے ہیں (لُوٹ لو)، پھر ہماری طرف تمھیں پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت ہم تمھیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دُنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہوگئی، پھر عین اُس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اِس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو

۳۱ – یہ توحید کے برحق ہونے کی نشانی ہر انسان کے نفس میں موجود ہے۔ جب تک اسباب سازگار رہتے ہیں، انسان خدا کو بُھولا اور دنیا کی زندگی پر پُھولا رہتا ہے۔ جہاں اسباب نے ساتھ چھوڑا اور وہ سب سہارے جن کے بل پر وہ جی رہا تھا ٹوٹ گئے، پھر کٹے سے کٹے مشرک اور سخت سے سخت دہریے کے قلب سے بھی یہ شہادت اُبلنی شروع ہو جاتی ہے کہ اس سارے عالَمِ اسباب پر کوئی خدا کارفرما ہے اور وہ ایک ہی خدائے غالب و توانا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: الانعام، حاشیہ ۲۹)

يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى
وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا
السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ
اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ
مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اِس ناپائدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمھیں دار السّلام کی طرف دعوت دے رہا ہے[۳۲]۔ (ہدایت اُس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل[۳۳]۔ ان کے چہروں پر رُوسیاہی اور ذلّت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں، ان کی بُرائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں[۳۴] گے، ذلّت ان پر مسلّط ہوگی، کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی[۳۵] ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۳۲- یعنی دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے اُس طریقے کی طرف جو آخرت کی زندگی میں تم کو دار السّلام کا مستحق بنائے۔ دار السّلام سے مراد ہے جنّت، اور اس کے معنی ہیں سلامتی کا گھر، وہ جگہ جہاں کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی رنج اور کوئی تکلیف نہ ہو۔

۳۳- یعنی ان کو صرف ان کی نیکی کے مطابق ہی اجر نہیں ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید انعام بھی بخشے گا۔

۳۴- یعنی نیکو کاروں کے برعکس بدکاروں کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا کہ جتنی بدی ہے اتنی ہی سزا دے دی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ جرم سے ذرہ برابر بھی زیادہ سزا دی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: النمل، حاشیہ ۱۰۹ الف)

۳۵- وہ تاریکی جو مجرموں کے چہرے پر پکڑے جانے اور بچاؤ سے مایوس ہو جانے کے بعد چھا جاتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ
أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ
إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا
عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ
وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ ع النصف

جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا ہے کہیں گے کہ ٹھیر جاؤ تم بھی اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے[36] اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمھاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"[37]۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزا چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے، گم ہو جائیں گے۔ع

۳۶- متن میں فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ کے الفاظ ہیں۔ اس کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہم ان کا باہمی ربط و تعلق توڑ دیں گے تاکہ کسی تعلق کی بنا پر وہ ایک دوسرے کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن یہ معنی عربی محاورے کے مطابق نہیں ہیں۔ محاورۂ عرب کی رُو سے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان تمیز پیدا کر دیں گے، یا ان کو ایک دوسرے سے مُمیّز کر دیں گے۔ اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے ہم نے یہ طرزِ بیان اختیار کیا ہے کہ "ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے"۔ یعنی مشرکین اور اُن کے معبود آمنے سامنے کھڑے ہوں گے اور دونوں گروہوں کی امتیازی حیثیت ایک دوسرے پر واضح ہوگی۔ مشرکین جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جن کو ہم دُنیا میں معبود بنائے ہوئے تھے، اور ان کے معبود جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جنھوں نے ہمیں اپنا معبود بنا رکھا تھا۔

۳۷- یعنی وہ تمام فرشتے جن کو دُنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا، اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیا، اولیا، شہدا وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھیرا کر وہ حقوق انھیں ادا کیے گئے جو دراصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجا لا رہے ہو۔ تمھاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ
فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا
بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ
كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اِن سے پُوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اِس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو: پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمھارا حقیقی رب ہے[۳۸]۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟[۳۹] (اے نبیؐ! دیکھو) اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمھارے رب کی بات صادق آگئی کہ وہ مان کر نہ دیں[۴۰] گے۔

ہم تک نہیں پہنچی۔

۳۸- یعنی اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود مانتے ہو، تب تو تمھارا حقیقی پروردگار، مالک، آقا، اور تمھاری بندگی و عبادت کا حق دار اللہ ہی ہُوا۔ یہ دوسرے جن کا اِن کاموں میں کوئی حصّہ نہیں، آخر رُبوبیت میں کہاں سے شریک ہو گئے؟

۳۹- خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ "تم کدھر پھرے جاتے ہو" بلکہ یہ ہے کہ "تم کدھر پھرائے جا رہے ہو"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کُن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں سے اپیل یہ کیا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو، اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے۔ یہ طرزِ سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغۂ مجہول کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے، تاکہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر غور کر سکیں، اور کسی کو یہ کہہ کر انھیں اشتعال دلانے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو، یہ تمھارے بزرگوں اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں۔ اس میں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾
قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ

اِن سے پوچھو: تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ —— کہو: وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی[۴۱]، پھر تم یہ کس اُلٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو؟[۴۲]
اِن سے پوچھو: تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟[۴۳] ——

رہنا چاہیے۔

۴۰ – یعنی ایسی کُھلی کُھلی اور عام فہم دلیلوں سے بات سمجھائی جاتی ہے، لیکن جنھوں نے نہ ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے وہ اپنی ضد کی بنا پر کسی طرح مان کر نہیں دیتے۔

۴۱ – تخلیق کی ابتدا کے متعلق تو مشرکین مانتے ہی تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، ان کے شریکوں میں سے کسی کا اِس کام میں کوئی حصّہ نہیں۔ رہا تخلیق کا اعادہ، تو ظاہر ہے کہ جو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے وہی اس عملِ پیدائش کا اعادہ بھی کرسکتا ہے، مگر جو ابتداءً ہی پیدا کرنے پر قادر نہ ہو وہ کس طرح اعادۂ پیدائش پر قادر ہوسکتا ہے۔ یہ بات اگرچہ صریحاً ایک معقول بات ہے، اور خود مشرکین کے دل بھی اندر سے اس کی گواہی دیتے تھے کہ بات بالکل ٹھکانے کی ہے، لیکن انھیں اس کا اقرار کرنے میں اس بنا پر تأمّل تھا کہ اسے مان لینے کے بعد انکارِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر کے سوالات پر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ خود کہیں گے کہ یہ کام اللہ کے ہیں، مگر یہاں اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم ڈنکے کی چوٹ کہو کہ یہ ابتدائے خلق اور اعادۂ خلق کا کام بھی اللہ ہی کا ہے۔

۴۲ – یعنی جب تمھاری ابتدا کا سرا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انتہا کا سرا بھی اسی کے ہاتھ میں، تو خود اپنے خیرخواہ بن کر ذرا سوچو کہ آخر تمھیں یہ کیا باور کرایا جا رہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمھاری بندگیوں اور نیاز مندیوں کا حق پہنچ گیا ہے۔

۴۳ – یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ دُنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو کھانے، پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہنچے اور آفات، مصائب اور نقصانات سے وہ محفوظ رہے۔ بلکہ اُس کی ایک ضرورت (اور درحقیقت سب سے بڑی ضرورت) یہ بھی ہے کہ اسے دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ، اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ، اُس سروسامان کے ساتھ جو رُوئے زمین پر اُس کے تصرّف میں ہے،

قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۗ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ

کہو: وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اِس کا زیادہ مستحق ہے

اُن بے شمار انسانوں کے ساتھ جن سے مختلف حیثیتوں میں اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اور مجموعی طور پر اس نظام کائنات کے ساتھ جس کے ماتحت رہ کر ہی بہرحال اس کو کام کرنا ہے، وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی بحیثیتِ مجموعی کامیاب ہو اور اس کی کوششیں اور محنتیں غلط راہوں میں صرف ہو کر تباہی و بربادی پر منتج نہ ہوں۔ اسی صحیح طریقے کا نام ''حق'' ہے اور جو رہنمائی اس طریقے کی طرف انسان کو لے جائے وہی ''ہدایتِ حق'' ہے۔ اب قرآن تمام مشرکین سے اور اُن سب لوگوں سے جو پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، یہ پوچھتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن جن کی بندگی کرتے ہو، ان میں کوئی ہے جو تمھارے لیے ''ہدایتِ حق'' حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو؟ ـــــ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہیں:

ایک، وہ دیویاں، دیوتا اور زندہ یا مردہ انسان جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ سو اُن کی طرف تو انسان کا رُجوع صرف اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ فوق الفطری طریقے سے وہ اس کی حاجتیں پوری کریں اور اس کو آفات سے بچائیں۔ رہی ہدایتِ حق، تو وہ نہ کبھی ان کی طرف سے آئی، نہ کبھی کسی مشرک نے اس کے لیے اُن کی طرف رُجوع کیا، اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معبود اُسے اخلاق، معاشرت، تمدّن، معیشت، سیاست، قانون، عدالت وغیرہ کے اُصول سکھاتے ہیں۔

دوسرے، وہ انسان جن کے بنائے ہوئے اُصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت کی جاتی ہے۔ سو وہ رہنما تو ضرور ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع وہ ''رہنمائے حق'' بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا اُن میں سے کسی کا علم بھی اُن تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جاننا انسانی زندگی کے صحیح اصول وضع کرنے کے لیے ضروری ہے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اس پورے دائرے پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا ان میں سے کوئی بھی اُن کمزوریوں سے، اُن تعصّبات سے، اُن شخصی یا گروہی دلچسپیوں سے، اُن اغراض وخواہشات سے، اور اُن رُجحانات ومیلانات سے بالاتر ہے جو انسانی معاشرے کے لیے مُنصفانہ قوانین بنانے میں مانع ہوتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا، تو آخر یہ لوگ ''ہدایتِ حق'' کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمھارے اِن مذہبی معبودوں اور تمدّنی خداؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہِ راست کی طرف تمھاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ اُوپر کے سوالات کے ساتھ مل کر یہ آخری سوال دین و مذہب کے پورے مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں: ایک نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی اس کا پروردگار ہو، کوئی ملجا و ماویٰ ہو، کوئی دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا ہو جس کا مستقل سہارا اس عالمِ اسباب کے بے ثبات سہاروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ تھام سکے۔ سو اُوپر کے سوالات نے فیصلہ کر دیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی ایسا رہنما ہو

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰی ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَیْفَ
تَحْكُمُوْنَ ۝۳۵ وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ
مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَمَا كَانَ هٰذَا
الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ
یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۷

کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمھیں ہو گیا کیا ہے، کیسے اُلٹے اُلٹے فیصلے کرتے ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں[۴۴]، حالاں کہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پُورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے[۴۵]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرماں روائے کائنات کی طرف سے ہے۔

جو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے صحیح اُصول بتائے اور جس کے دیے ہوئے قوانینِ حیات کی پیروی پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کی جا سکے۔ سو اس آخری سوال نے اُس کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہ بھی صرف خدا ہی ہے۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر انسان مشرکانہ مذاہب اور لادینی (Secular) اُصولِ تمدّن و اخلاق و سیاست سے چمٹا رہے۔

۴۴ – یعنی جنھوں نے مذاہب بنائے، جنھوں نے فلسفے تصنیف کیے، اور جنھوں نے قوانینِ حیات تجویز کیے، انھوں نے بھی یہ سب کچھ علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان و قیاس کی بنا پر کیا، اور جنھوں نے ان مذہبی اور دنیوی رہنماؤں کی پیروی کی، انھوں نے بھی جان کر اور سمجھ کر نہیں بلکہ محض اس گمان کی بنا پر ان کا اتباع اختیار کر لیا کہ ایسے بڑے بڑے لوگ جب یہ کہتے ہیں اور باپ دادا ان کو مانتے چلے آ رہے ہیں اور ایک دنیا ان کی پیروی کر رہی ہے تو ضرور ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

۴۵ – ”جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق ہے“، یعنی ابتدا سے جو اُصولی تعلیمات انبیا علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں، یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انھی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شانِ امتیاز نمایاں کی جائے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ
اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۸﴾ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا
لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو: "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سُورت اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بُلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو[۴۶]" اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا[۴۷]۔ اِسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی

"الکتاب کی تفصیل ہے"، یعنی اُن اُصولی تعلیمات کو جو تمام کُتبِ آسمانی کا لُبِّ لُباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر دلائل وشواہد کے ساتھ، تلقین وتفہیم کے ساتھ، تشریح وتوضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۴۶ — عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجازِ قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی یکتائی وبے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وُجوہ سے ان کا مِن جانبِ اللہ ہونا یقینی اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے، ان کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے، اور ہم ایسے تمام مقامات کی تشریح پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور آیندہ بھی کریں گے۔ اس لیے یہاں بخوفِ طوالت اس بحث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الطور، حاشیہ ۲۶ و ۲۷)

۴۷ — تکذیب یا تو اس بنیاد پر کی جا سکتی تھی کہ ان لوگوں کو اس کتاب کا ایک جعلی کتاب ہونا تحقیقی طور پر معلوم ہوتا، یا پھر اس بنا پر وہ معقول ہو سکتی تھی کہ جو حقیقتیں اس میں بیان کی گئی ہیں اور جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ غلط ثابت ہو جاتیں۔ لیکن ان دونوں وجوہِ تکذیب میں سے کوئی وجہ بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ازرُوئے علم جانتا ہے کہ یہ کتاب گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ نہ کسی نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر یہ دیکھ لیا ہے کہ واقعی بہت سے خدا موجود ہیں اور یہ کتاب خواہ مخواہ ایک خدا کی خبر سنا رہی ہے، یا فی الواقع خدا اور فرشتوں اور وحی وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کتاب میں خواہ مخواہ یہ افسانہ بنا لیا گیا ہے۔ نہ کسی نے مر کر یہ دیکھ لیا ہے کہ دوسری زندگی اور اس کے حساب کتاب اور جزا وسزا کی ساری خبریں جو اس کتاب میں دی گئی ہیں، غلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نرے شک اور گمان کی بنیاد پر اس شان سے اس کی تکذیب کی جا رہی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ
يُّؤۡمِنُ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا يُؤۡمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعۡلَمُ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۴۰﴾ ع
وَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلۡ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَـكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِيۡٓـئُوۡنَ
مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُوۡنَ
اِلَيۡكَ‌ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۲﴾

جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو اُن ظالموں کا کیا انجام ہُوا۔ اِن میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور کچھ نہیں لائیں گے، اور تیرا رب اُن مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔[۴۸] ع اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ "میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بَری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بَری ہوں۔"[۴۹]
ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں مگر کیا تُو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟[۵۰]

کہ گویا علمی طور پر اس کے جعلی اور غلط ہونے کی تحقیق کر لی گئی ہے۔

۴۸ – ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ "خدا ان مُفسِدوں کو خوب جانتا ہے"۔ یعنی وہ دُنیا کا منہ تو یہ باتیں بنا کر بند کر سکتے ہیں کہ صاحب! ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی، اس لیے نیک نیتی کے ساتھ ہم اسے نہیں مانتے، لیکن خدا جو قلب و ضمیر کے چھپے ہوئے رازوں سے واقف ہے، وہ ان میں سے ایک ایک شخص کے متعلق جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل و دماغ پر قفل چڑھائے، اپنے آپ کو غفلتوں میں گم کیا، اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا، اپنے قلب میں حق کی شہادت کو اُبھرنے سے روکا، اپنے ذہن سے قبولِ حق کی صلاحیت کو مٹایا، سُن کر نہ سنا، سمجھتے ہوئے نہ سمجھنے کی کوشش کی، اور حق کے مقابلے میں اپنے تعصّبات کو، اپنے دنیوی مفاد کو، اپنی باطل سے اُلجھی ہوئی اغراض کو اور اپنے نفس کی خواہشوں اور رغبتوں کو ترجیح دی۔ اسی بنا پر وہ "معصوم گمراہ" نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مفسد ہیں۔

۴۹ – یعنی خواہ مخواہ جھگڑے اور کج بحثیاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میں افترا پردازی کر رہا ہوں تو اپنے عمل کا میں خود ذمہ دار ہوں، تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور اگر تم سچی بات کو جھٹلا رہے ہو تو میرا کچھ نہیں بگاڑتے اپنا ہی کچھ بگاڑ رہے ہو۔

۵۰ – ایک سننا تو اس طرح کا ہوتا ہے جیسے جانور بھی آواز سن لیتے ہیں۔ دوسرا سُننا وہ ہوتا ہے جس میں معنیٰ کی طرف توجہ ہو

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۴

ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں، مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انھیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟[51]
حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔[52] (آج یہ دُنیا کی زندگی میں

اور یہ آمادگی پائی جاتی ہو کہ بات اگر معقول ہوگی تو اسے مان لیا جائے گا۔ جو لوگ کسی تعصب میں مبتلا ہوں، اور جنھوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہو کہ اپنے موروثی عقیدوں اور طریقوں کے خلاف اور اپنے نفس کی رغبتوں اور دلچسپیوں کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو، مان کر نہ دیں گے، وہ سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی کچھ سن کر نہیں دیتے جو دُنیا میں جانوروں کی طرح غفلت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چرنے چُگنے کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، یا نفس کی لذتوں اور خواہشوں کے پیچھے ایسے مست ہوتے ہیں کہ انھیں اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہوتی کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ایسے سب لوگ کانوں کے تو بہرے نہیں ہوتے مگر دل کے بہرے ہوتے ہیں۔

۵۱ – یہاں بھی وہی بات فرمائی گئی ہے جو اُوپر کے فقرے میں ہے۔ سر کی آنکھیں کھلی ہونے سے کچھ فائدہ نہیں، ان سے تو جانور بھی آخر دیکھتا ہی ہے۔ اصل چیز دل کی آنکھوں کا کُھلا ہونا ہے۔ یہ چیز اگر کسی شخص کو حاصل نہ ہو تو وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں خطاب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر ملامت ان لوگوں کو کی جارہی ہے جن کی اصلاح کے آپ درپے تھے۔ اور اس ملامت کی غرض بھی محض ملامت کرنا نہیں ہے بلکہ طنز کا تیرونشتر اس لیے چبھویا جارہا ہے کہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت اس کی چبھن سے کچھ بیدار ہو اور ان کی چشم و گوش سے ان کے دل تک جانے والا راستہ کھلے، تاکہ معقول بات اور دردمندانہ نصیحت وہاں تک پہنچ سکے۔ یہ اندازِ بیان کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی نیک آدمی بگڑے ہوئے لوگوں کے درمیان بلند ترین اخلاقی سیرت کے ساتھ رہتا ہو اور نہایت اخلاص و دردمندی کے ساتھ اُن کو اُن کی اُس گری ہوئی حالت کا احساس دلا رہا ہو جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور بڑی معقولیت و سنجیدگی کے ساتھ انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان کے طریقِ زندگی میں کیا خرابی ہے اور صحیح طریقِ زندگی کیا ہے۔ مگر کوئی نہ تو اس کی پاکیزہ زندگی سے سبق لیتا ہو نہ اس کی ان خیر خواہانہ نصیحتوں کی طرف توجہ کرتا ہو۔ اس حالت میں عین اُس وقت جب کہ وہ ان لوگوں کو سمجھانے میں مشغول ہو اور وہ اس کی باتوں کو سُنی اَن سُنی کیے جا رہے ہوں، اس کا کوئی دوست آ کر اس سے کہے کہ میاں! یہ تم کن بہروں کو سنا رہے ہو اور کن اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہو، ان کے تو دل کے کان بند ہیں اور ان کی بیے کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ یہ بات کہنے سے اُس دوست کا منشا یہ نہیں ہوگا کہ وہ مردِ صالح اپنی سعی اصلاح سے باز آ جائے۔ بلکہ دراصل اس کی غرض یہ ہوگی کہ شاید اس طنز اور ملامت ہی سے ان نیند کے ماتوں کو کچھ ہوش آ جائے۔

۵۲ – یعنی اللہ نے تو انھیں کان بھی دیے ہیں اور آنکھیں بھی اور دل بھی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز ان کو دینے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ
يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا
كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۴۵ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ
نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۶
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ

مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دُنیا کی زندگی اِنھیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھیرے تھے۔[۵۳] (اس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا[۵۴] اور ہرگز وہ راہِ راست پر نہ تھے۔ جن بُرے نتائج سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اُٹھا لیں، بہرحال اِنھیں آنا ہماری ہی طرف ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔

ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے۔[۵۵] پھر جب کسی اُمّت کے پاس اُس کا رسول آجاتا ہے تو اس کا فیصلہ

میں بُخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری تھی۔ مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دُنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے بُرے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور ضمیری زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

۵۳ – یعنی جب ایک طرف آخرت کی بے پایاں زندگی ان کے سامنے ہوگی اور دوسری طرف یہ پلٹ کر اپنی دُنیا کی زندگی پر نگاہ ڈالیں گے تو انھیں مستقبل کے مقابلے میں اپنا یہ ماضی نہایت حقیر محسوس ہوگا۔ اُس وقت اِن کو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی سابقہ زندگی میں تھوڑی سی لذتوں اور منفعتوں کی خاطر اپنے اس ابدی مستقبل کو خراب کر کے کتنی بڑی حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔

۵۴ – یعنی اس بات کو کہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

۵۵ – ”اُمّت“ کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی اُمّت ہیں۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا تھا، اس وقت تک دُنیا کے

بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ
كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا
مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ
سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ

پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔[56]

کہتے ہیں: اگر تمھاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟ کہو: "میرے اختیار میں خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیّت پر موقوف ہے۔[57] ہر اُمّت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے، جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔"[58] اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا

سب لوگ اس کی اُمّت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم ثابت ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپ کی اُمّت ہیں اور اُس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ''ہر قوم میں ایک رسول ہے'' بلکہ ارشاد یہ ہُوا ہے کہ ''ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے''۔

۵۶ – مطلب یہ ہے کہ رسول کی دعوت کا کسی گروہِ انسانی تک پہنچنا گویا اُس گروہ پر اللہ کی حجت کا پورا ہو جانا ہے۔ اس کے بعد صرف فیصلہ ہی باقی رہ جاتا ہے، کسی مزید اِتمامِ حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ فیصلہ غایت درجہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جو لوگ رسول کی بات مان لیں اور اپنا رویّہ درست کر لیں، وہ اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اور جو اس کی بات نہ مانیں وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ عذاب دُنیا اور آخرت دونوں میں دیا جائے یا صرف آخرت میں۔

۵۷ – یعنی میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ فیصلہ میں چُکاؤں گا اور نہ ماننے والوں کو مَیں عذاب دوں گا۔ اس لیے مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ فیصلہ چُکائے جانے کی دھمکی کب پوری ہوگی۔ دھمکی تو اللہ نے دی ہے، وہی فیصلہ چُکائے گا اور اسی کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ کب کرے اور کس صورت میں اُس کو تمھارے سامنے لائے۔

۵۸ – مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد باز نہیں ہے۔ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت رسول کی دعوت کسی شخص یا گروہ کو پہنچی، اُسی وقت جو ایمان لے آیا بس وہ تو رحمت کا مستحق قرار پایا اور جس کسی نے اس کو ماننے سے انکار کیا یا ماننے میں تأمّل کیا اُس پر فوراً عذاب کا فیصلہ نافذ کر دیا گیا۔ نہیں، اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کے بعد وہ ہر فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے مطابق، اور ہر گروہ اور قوم کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق، سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی وقت دیتا ہے۔ یہ مہلت کا زمانہ

Maktaba Tul Ishaat.com

عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾
اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْٓ
اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ ع وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ
مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا

عذاب اچانک رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟ ـــــ اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے! پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزا چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے ہو، اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

پھر پوچھتے ہیں: کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو: ''میرے رب کی قسم! یہ بالکل سچ ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو۔'' اگر ہر اُس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے، روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اُس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیے میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے۔[59]

بسا اوقات صدیوں تک دراز ہوتا ہے اور اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ پھر جب وہ مہلت، جو سراسر انصاف کے ساتھ اس کے لیے رکھی گئی تھی، پوری ہو جاتی ہے اور وہ شخص یا گروہ اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتا، تب اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ یہ فیصلے کا وقت اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آ سکتا ہے اور نہ وقت آ جانے کے بعد ایک لمحے کے لیے ٹل سکتا ہے۔

۵۹ - جس چیز کو عمر بھر جھٹلاتے رہے، جسے جھوٹ سمجھ کر ساری زندگی غلط کاموں میں کھپا گئے، اور جس کی خبر دینے

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾
اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ
حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾
قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہوگا۔ سنو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سُن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ! کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔" اے نبیؐ! ان سے کہو: "تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق[۶۱] اللہ نے تمہارے لیے اُتارا تھا

والے پیغمبروں کو طرح طرح کے الزام دیتے رہے، وہی چیز جب ان کی توقعات کے بالکل خلاف اچانک سامنے آ کھڑی ہوگی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی۔ ان کا ضمیر انہیں خود بتا دے گا کہ جب حقیقت یہ تھی تو جو کچھ وہ دنیا میں کر کے آئے ہیں اس کا انجام اب کیا ہونا ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ زبانیں بند ہوں گی اور ندامت و حسرت سے دل اندر ہی اندر بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ جس شخص نے قیاس و گمان کے سودے پر اپنی ساری پونجی لگا دی ہو اور کسی خیرخواہ کی بات مان کر نہ دی ہو وہ دیوالہ نکلنے کے بعد خود اپنے سوا اور کس کی شکایت کرسکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ

اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا؟[60] اِن سے پوچھو: اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟[61]

۶۰ – اُردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اُس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دسترخوان کی چھوٹی سی دُنیا میں مذہبی اوہام یا رسم و رواج کی بنا پر لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں جہلا اور عوام ہی نہیں، علماء تک مبتلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنی تک محدود نہیں ہے، بلکہ عطا اور بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے، وہ سب اس کا رزق ہے، حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں بکثرت راویوں کے نام رزق اور رُزَیق اور رزق اللہ ملتے ہیں جس کے معنی تقریباً وہی ہیں جو اُردو میں ” اللہ دیا “ کے معنی ہیں۔ مشہور دُعا ہے: اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے۔ محاورے میں بولا جاتا ہے: رُزِقَ علمًا، فلاں شخص کو علم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اس کی مدتِ عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو اس بچے کو آیندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اُسے دُنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے: مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس رزق کو محض دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اُن پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں لوگوں نے بطورِ خود اختیار کر لی ہیں، سخت غلطی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ اس کی بدولت خدا کے دین کی ایک بہت بڑی اُصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلّت و حُرمت اور جواز و عدمِ جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن تمدّن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اُصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لیے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے، اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے، تو عامی تو درکنار، علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اور مفسرینِ قرآن و شیوخِ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح ماکولات و مشروبات میں شریعتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز کے حدود بطورِ خود مقرر کر لینا۔

۶۱ – یعنی تمھیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جرم ہے جو تم کر رہے ہو۔ رزق اللہ کا ہے اور تم خود اللہ کے ہو، پھر یہ حق آخر تمھیں کہاں سے حاصل ہوگیا کہ اللہ کی املاک میں اپنے تصرف، استعمال اور انتفاع کے لیے خود حد بندیاں مقرر کرو؟ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے اور اس معاملے میں آقا کے کچھ بولنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے تو اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ تمھارا اپنا ملازم اگر تمھارے گھر میں اور تمھارے گھر کی سب چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لیے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے؟ — اس نوکر کا معاملہ تو دوسرا ہی ہے جو سرے سے یہی نہیں مانتا کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور کوئی اس کا آقا بھی ہے اور یہ

اَمۡ عَلَى اللّٰهِ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ
يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا
يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع وَمَا تَكُوۡنُ فِىۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡهُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّ

ع ۶

یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟[۶۲] جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افترا باندھتے ہیں، ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہوگا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے۔[۶۳] ع

اے نبیؐ! تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سُناتے ہو، اور لوگو!

کسی اور کا مال ہے جو اس کے تصرّف میں ہے۔ اُس بدمعاش غاصب کی پوزیشن یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ یہاں سوال اُس نوکر کی پوزیشن کا ہے جو خود مان رہا ہے کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ مال اُسی کا ہے جس کا وہ نوکر ہے، اور پھر کہتا ہے کہ اس مال میں اپنے تصرّف کے حُدود مقرر کر لینے کا حق مجھے آپ ہی حاصل ہے اور آقا سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۶۲ – یعنی تمہاری یہ پوزیشن صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی کہ آقا نے خود تم کو مجاز کر دیا ہوتا کہ میرے مال میں تم جس طرح چاہو تصرّف کرو، اپنے عمل اور استعمال کے حدود، قوانین، ضوابط سب کچھ بنا لینے کے جملہ حقوق میں نے تمھیں سونپے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تمھارے پاس واقعی اس کی کوئی سند ہے کہ آقا نے تم کو یہ اختیارات دے دیے ہیں؟ یا تم بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ وہ تمام حُقوق تمھیں سونپ چکا ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو براہِ کرم وہ سند دکھاؤ، ورنہ بصورتِ دیگر یہ کُھلی بات ہے کہ تم بغاوت پر جھوٹ اور افترا پردازی کا مزید جرم کر رہے ہو۔

۶۳ – یعنی یہ تو آقا کی کمال درجے مہربانی ہے کہ وہ نوکر کو خود بتاتا ہے کہ میرے گھر میں اور میرے مال میں اور خود اپنے نفس میں تُو کون سا طرزِ عمل اختیار کرے گا تو میری خوشنودی اور انعام اور ترقی سے سرفراز ہوگا، اور کس طریقِ کار سے میرے غضب اور سزا اور تنزّل کا مُستوجب ہوگا۔ مگر بہت سے بے وقوف نوکر ایسے ہیں جو اس عنایت کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔ گویا ان کے نزدیک ہونا یہ چاہیے تھا کہ آقا ان کو بس اپنے گھر میں لا کر چھوڑ دیتا اور سب مال ان کے اختیار میں دے دینے کے بعد چُھپ کر دیکھتا رہتا کہ کون سا نوکر کیا کرتا ہے، پھر جو بھی اس کی مرضی کے خلاف ––––– جس کا کسی نوکر کو علم نہیں ––––– کوئی کام کرتا تو اُسے وہ سزا دے ڈالتا۔ حالانکہ اگر آقا نے اپنے نوکروں کو اتنے سخت امتحان میں ڈالا ہوتا تو ان میں سے کسی کا بھی سزا سے بچ جانا ممکن نہ تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ
فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي
السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَآ
اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ؕ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي
الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ ؕ وَلَا
يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

وقف لازم

تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اُس سب کے دَوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرّہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔[۶۴] سُنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رَوِیّہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اے نبیؐ! جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

---

۶۴ – یہاں اس بات کا ذکر کرنے سے مقصود نبیؐ کو تسکین دینا اور نبی کے مخالفین کو متنبّہ کرنا ہے۔ ایک طرف نبی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغامِ حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تن دِہی و جاں فشانی اور جس صبر و تحمل سے تم کام کر رہے ہو، وہ ہماری نظر میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس پُرخطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمھارے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ تمھارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں۔ دوسری طرف نبی کے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایک داعیِ حق اور خیر خواہِ خلق کی اصلاحی کوششوں میں روڑے اٹکا کر تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی تمھاری ان حرکتوں کو دیکھنے والا نہیں ہے اور کبھی تمھارے ان کرتوتوں کی باز پُرس نہ ہوگی۔ خبردار رہو! وہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو، خدا کے دفتر میں ثبت ہو رہا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ
الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ
وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا
فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

آگاہ رہو! آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں، وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (کُھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت کو) سُنتے ہیں۔[۶۵]

۶۵ – یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جسے بہت مختصر لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ فلسفیانہ تجسُّس، جس کا مقصد یہ پتا چلانا ہے کہ اس کائنات میں بظاہر جو کچھ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے یا نہیں، اور ہے تو وہ کیا ہے، دنیا میں اُن سب لوگوں کے لیے جو وحی و الہام سے براہِ راست حقیقت کا علم نہیں پاتے، مذہب کے متعلّق رائے قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی شخص بھی، خواہ وہ دہریت اختیار کرے یا شرک یا خدا پرستی، بہر حال ایک نہ ایک طرح کا فلسفیانہ تجسُّس کیے بغیر مذہب کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پیغمبروں نے جو مذہب پیش کیا ہے، اس کی جانچ بھی اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آدمی، اپنی بساط بھر، فلسفیانہ غور و فکر کر کے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ پیغمبر ہمیں مظاہرِ کائنات کے پیچھے جس حقیقت کے مستور ہونے کا پتا دے رہے ہیں وہ دل کو لگتی ہے یا نہیں۔ اس تجسُّس کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار طریقِ تجسُّس پر ہے۔ اس کے غلط ہونے سے غلط رائے اور صحیح ہونے سے صحیح رائے قائم ہوتی ہے۔ اب ذرا جائزہ لے کر دیکھیے کہ دنیا میں مختلف گروہوں نے اس تجسُّس کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے ہیں؟

مشرکین نے خالص وہم پر اپنی تلاش کی بنیاد رکھی ہے۔

اِشراقیوں اور جوگیوں نے اگرچہ مراقبے کا ڈھونگ رچایا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ہم ظاہر کے پیچھے جھانک کر باطن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں لیکن فی الواقع انھوں نے بِنٰی اس مراغ رسانی کی بنا گمان پر رکھی ہے۔ وہ مراقبہ دراصل اپنے گمان کا کرتے ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں نظر آتا ہے، اُس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ گمان سے جو خیال انھوں نے قائم کر لیا ہے اسی پر

Maktaba Tul Ishaat.com

تخیل کو جما دینے اور پھر اس پر ذہن کا دباؤ ڈالنے سے ان کو وہی خیال چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے۔

اصطلاحی فلسفیوں نے قیاس کو بنائے تحقیق بنایا جو اصل میں تو گمان ہی ہے لیکن اس گمان کے لنگڑے پن کو محسوس کر کے انھوں نے منطقی استدلال اور مصنوعی تعقل کی بیساکھیوں پر اسے چلانے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام ”قیاس“ رکھ دیا ہے۔

سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کیا، مگر مابعد الطبیعیات کے حُدود میں قدم رکھتے ہی وہ بھی علمی طریقے کو چھوڑ کر قیاس و گمان اور اندازے اور تخمینے کے پیچھے چل پڑے۔

پھر ان سب گروہوں کے اوہام اور گمانوں کو کسی نہ کسی طرح تعصب کی بیماری بھی لگ گئی، جس نے انھیں ایک دوسرے کی بات نہ سننے اور اپنی ہی محبوب راہ پر مُڑنے، اور مُڑ جانے کے بعد مُڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔

قرآن اس طریقِ تجسس کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم تلاشِ حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصب کی وجہ سے کسی کی معقول بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی دہری غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمھارے لیے خود حقیقت کو پالینا تو ناممکن تھا ہی، انبیا کے پیش کردہ دین کو جانچ کر صحیح رائے پر پہنچنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔

اس کے مقابلے میں قرآن نے فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی و عقلی طریقہ یہ بتایا ہے کہ پہلے تم حقیقت کے متعلق اُن لوگوں کا بیان کُھلے کانوں سے، بلا تعصب سنو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قیاس و گمان یا مراقبہ و استدراج کی بنا پر نہیں بلکہ ”علم“ کی بنا پر تمھیں بتا رہے ہیں کہ حقیقت یہ ہے۔ پھر کائنات میں جو آثار (باصطلاحِ قرآن ”نشانات“) تمھارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں ان پر غور کرو، ان کی شہادتوں کو مرتب کر کے دیکھو، اور تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشان دہی یہ لوگ کر رہے ہیں اُس کی طرف اشارہ کرنے والی علامات تم کو اسی ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم خواہ مخواہ اُن لوگوں کو جھٹلاؤ جن کا بیان آثار کی شہادتوں کے مطابق پایا جا رہا ہے ــــ یہی طریقہ فلسفۂ اسلام کی بنیاد ہے جسے چھوڑ کر افسوس ہے کہ مسلمان فلاسفہ بھی افلاطون و ارسطو کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔

قرآن میں جگہ جگہ نہ صرف اس طریق کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ خود آثارِ کائنات کو پیش کر کر کے ان سے نتیجہ نکالنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی گویا باقاعدہ تربیت دی گئی ہے، تاکہ سوچنے اور تلاش کرنے کا یہ ڈھنگ ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی مثال کے طور پر صرف دو آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یعنی رات اور دن۔ یہ انقلابِ لیل و نہار دراصل سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیر کی وجہ سے رُونما ہوتا ہے۔ یہ ایک عالم گیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے۔ اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے، کیونکہ تمام موجوداتِ زمین کی بے شمار مصلحتیں اسی گردشِ لیل و نہار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس میں صریح رُبوبیت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں، کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں، وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم گیر ناظم ایک ہے، اور یہ بھی کہ وہ کھلنڈرا نہیں بلکہ حکیم ہے اور بامقصد کام کرتا ہے، اور یہ بھی کہ وہی محسن و مُربّی ہونے کی حیثیت سے عبادت کا مستحق ہے، اور یہ بھی کہ گردشِ لیل و نہار کے تحت جو کوئی بھی ہے وہ رب نہیں مربوب ہے،

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ

لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے[۶۶] سُبحان اللہ![۶۷] وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی مِلک ہے۔[۶۸] تمھارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق

آقا نہیں غلام ہے۔ اِن آثاری شہادتوں کے مقابلے میں مشرکین نے گمان و قیاس سے جو مذہب ایجاد کیے ہیں وہ آخر کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں۔

۶۶ – اُوپر کی آیات میں لوگوں کی اس جاہلیت پر ٹوکا گیا تھا کہ اپنے مذہب کی بِنا علم کے بجائے قیاس و گمان پر رکھتے ہیں اور پھر کسی علمی طریقے سے یہ تحقیق کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ ہم جس مذہب پر چلے جا رہے ہیں اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ اب اسی سلسلے میں عیسائیوں اور بعض دوسرے اہلِ مذاہب کی اس نادانی پر ٹوکا گیا ہے کہ انھوں نے محض گمان سے کسی کو خدا کا بیٹا ٹھیرا لیا۔

۶۷ – سبحان اللہ کلمۂ تعجب کے طور پر کبھی اظہارِ حیرت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور کبھی اس کے واقعی معنٰی ہی مراد ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ ”اللہ تعالیٰ ہر عیب سے مُنزّہ ہے“۔ یہاں یہ کلمہ دونوں معنٰی دے رہا ہے۔ لوگوں کے اِس قول پر اظہارِ حیرت بھی مقصود ہے اور ان کی بات کے جواب میں یہ کہنا بھی مقصود ہے کہ اللہ تو بے عیب ہے، اس کی طرف بیٹے کی نسبت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

۶۸ – یہاں ان کے اس قول کی تردید میں تین باتیں کہی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ بے عیب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بے نیاز ہے۔ تیسرے یہ کہ آسمان و زمین کی ساری موجودات اُس کی مِلک ہیں۔ یہ مختصر جوابات تھوڑی سی تشریح سے بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں:

ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا تو صُلبی ہو سکتا ہے یا مُتبنّٰی۔ اگر یہ لوگ کسی کو خدا کا بیٹا صُلبی معنوں میں قرار دیتے ہیں تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ خدا کو اُس حیوان پر قیاس کرتے ہیں جو شخصی حیثیت سے فانی ہوتا ہے اور جس کے وجود کا تسلسل بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کی کوئی جنس ہو اور اس جنس سے کوئی اس کا جوڑا ہو اور ان دونوں کے صِنفی تعلّق سے اس کی اولاد ہو، جس کے ذریعے سے اس کا نوعی وجود اور اس کا کام باقی رہے۔ اور اگر یہ لوگ اس معنٰی میں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں کہ اس نے کسی کو مُتبنّٰی بنایا ہے، تو یہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو انھوں نے خدا کو اُس انسان پر قیاس کیا ہے جو لاوَلَد ہونے کی وجہ سے اپنی جنس کے کسی فرد کو اس لیے بیٹا بناتا ہے کہ وہ اس کا وارث ہو اور اُس نقصان کی، جو اسے بے اولاد رہ جانے کی وجہ سے پہنچ رہا ہے، برائے نام ہی سہی، کچھ تو تلافی کر دے۔ یا پھر ان کا گمان یہ ہے کہ خدا بھی انسان کی طرح جذباتی میلانات رکھتا ہے اور اپنے بے شمار بندوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کو کچھ ایسی محبت ہو گئی ہے کہ اس نے اسے بیٹا بنا لیا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، بہرحال اس عقیدے کے بنیادی تصوّرات میں خدا پر بہت سے عُیوب، بہت

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ
الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ
قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ

ع ۸ — وقف لازم — الثلثة

وہ باتیں کہتے ہو جو تمھارے علم میں نہیں ہیں؟ اے محمدؐ! کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دُنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کرلیں، پھر ہماری طرف اُن کو پلٹنا ہے، پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں ان کو سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ ع

ان کو نوحؑ[۶۹] کا قصّہ سُناؤ، اُس وقت کا قصّہ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادرانِ قوم! اگر میرا تمھارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سُنا سُنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے

سی کمزوریوں، بہت سے نقائص اور بہت سی احتیاجوں کی تہمت لگی ہُوئی ہے۔ اسی بنا پر پہلے فقرے میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام عُیوب، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو تم اس کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ دوسرے فقرے میں ارشاد ہوا کہ وہ اُن حاجتوں سے بھی بے نیاز ہے جن کی وجہ سے فانی انسانوں کو اولاد کی یا بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور تیسرے فقرے میں صاف کہہ دیا گیا کہ زمین و آسمان میں سب اللہ کے بندے اور اس کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اللہ کا ایسا کوئی مخصوص ذاتی تعلق نہیں ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسے وہ اپنا بیٹا یا اکلوتا یا ولی عہد قرار دے لے۔ صفات کی بنا پر بے شک اللہ بعض بندوں کو بعض کی بہ نسبت زیادہ محبوب رکھتا ہے، مگر اس محبّت کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کسی بندے کو بندگی کے مقام سے اُٹھا کر خدائی میں شرکت کا مقام دے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس محبّت کا تقاضا بس وہ ہے جو اس سے پہلے کی ایک آیت میں بیان کر دیا گیا ہے کہ "جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویّہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دُنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔"

۶۹ – یہاں تک تو ان لوگوں کو معقول دلائل اور دل کو لگنے والے نصائح کے ساتھ سمجھایا گیا تھا کہ ان کے عقائد اور خیالات اور طریقوں میں غلطی کیا ہے اور وہ کیوں غلط ہے، اور اس کے مقابلے میں صحیح راہ کیا ہے اور وہ کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اُس طرزِ عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اِس سیدھی سیدھی اور صاف صاف تفہیم و تلقین کے جواب میں اختیار کر رہے تھے۔ دس گیارہ سال سے ان کی رَوِش یہ تھی کہ وہ، بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی گمراہیوں پر نظرِ ثانی کرتے،

بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا
يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ فَاِنْ
تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ
فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسا اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمھارے پیشِ نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمھاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طالب نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔"

انھوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے، بچا لیا اور انھی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔

لیے اس شخص کی جان کے دشمن ہو گئے تھے جو ان باتوں کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ انھی کے بھلے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ دلیلوں کا جواب پتھروں سے اور نصیحتوں کا جواب گالیوں سے دے رہے تھے۔ اپنی بستی میں ایسے شخص کا وجود ان کے لیے سخت ناگوار بلکہ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا جو غلط کو غلط کہنے والا ہو اور صحیح بات بتانے کی کوشش کرتا ہو۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اندھوں کے درمیان جو آنکھوں والا پایا جاتا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے بجائے اپنی آنکھیں بھی بند کر لے، ورنہ ہم زبردستی اس کی آنکھیں پھوڑ دیں گے تاکہ بینائی جیسی چیز ہماری سرزمین میں نہ پائی جائے۔ یہ طرزِ عمل جو انھوں نے اختیار کر رکھا تھا، اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ انھیں نوح کا قصہ سنا دو، اسی قصے میں وہ اپنے اور تمھارے معاملے کا جواب بھی پا لیں گے۔

۷۰ – یہ چیلنج تھا کہ میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا، تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو، میرا بھروسا اللہ پر ہے۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو ہود، آیت ۵۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ
رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا
كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾ ثُمَّ
بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا
فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ
مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰى

پس دیکھ لو کہ جنھیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انھوں نے مان کر نہ دیا) اُن کا کیا انجام ہُوا۔

پھر نوحؑ کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو انھوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا، اسے پھر مان کر نہ دیا۔ اس طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیتے ہیں۔[۷۱]

پھر اُن[۷۲] کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[۷۳] اور وہ مُجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کُھلا جادو ہے۔[۷۴] موسیٰؑ نے کہا:

---

۷۱ – حد سے گزر جانے والے لوگ وہ ہیں جو ایک مرتبہ غلطی کر جانے کے بعد پھر اپنی بات کی پچ اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی اسی غلطی پر اڑے رہتے ہیں۔ اور جس بات کو ماننے سے ایک دفعہ انکار کر چکے ہیں، اُسے پھر کسی فہمایش، کسی تلقین اور کسی معقول سے معقول دلیل سے بھی مان کر نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں پر آخر کار خدا کی ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ انھیں پھر کبھی راہِ راست پر آنے کی توفیق نہیں ملتی۔

۷۲ – اس موقع پر ان حواشی کو پیشِ نظر رکھا جائے جو ہم نے سورۂ اعراف (رکوع ۱۳ تا ۲۱) میں قصۂ موسیٰ و فرعون پر لکھے ہیں۔ جن اُمور کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے ان کا اعادہ یہاں نہ کیا جائے گا۔

۷۳ – یعنی انھوں نے اپنی دولت و حکومت اور شوکت و حشمت کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے

اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ

”تم حق کو یہ کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے سامنے آ گیا؟ کیا یہ جادُو ہے؟ حالانکہ جادُوگر فلاح نہیں

بالاتر سمجھ لیا اور اطاعت میں سر جُھکا دینے کے بجائے اکڑ دکھائی۔

۷۴ – یعنی حضرت موسیٰؑ کا پیغام سُن کر وہی کچھ کہا جو کفارِ مکّہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر کہا تھا کہ ”یہ شخص تو کُھلا جادوگر ہے“ (مُلاحظہ ہو اِسی سورۂ یونس کی دوسری آیت)۔

یہاں سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات صریح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی دراصل اُسی خدمت پر مامور ہوئے تھے جس پر حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے تمام انبیاؑ، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، مامور ہوتے رہے ہیں۔ اس سورہ میں ابتدا سے ایک ہی مضمون چلا آ رہا ہے، اور وہ یہ کہ صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رب اور الٰہ مانو اور یہ تسلیم کرو کہ تم کو اِس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں اللہ کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ پھر جو لوگ پیغمبرؐ کی اس دعوت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے، ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نہ صرف تمھاری فلاح کا بلکہ ہمیشہ سے تمام انسانوں کی فلاح کا انحصار اِسی ایک بات پر رہا ہے کہ اس عقیدۂ توحید و آخرت کی دعوت کو، جسے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے، قبول کیا جائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اسی بنیاد پر قائم کر لیا جائے۔ فلاح صرف انھوں نے پائی جنھوں نے یہ کام کیا، اور جس قوم نے بھی اس سے انکار کیا وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہی۔ یہی اس سورت کا مرکزی مضمون ہے، اور اس سیاق میں جب تاریخی نظائر کے طور پر دوسرے انبیا کا ذکر آیا ہے تو لازماً اس کے یہی معنیٰ ہیں کہ جو دعوت اس سورہ میں دی گئی ہے وہی ان تمام انبیاؑ کی دعوت تھی، اور اسی کو لے کر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ بھی فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس گئے تھے۔ اگر واقعہ وہ ہوتا جو بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا مشن ایک خاص قوم کو دوسری قوم کی غلامی سے رہا کرانا تھا، تو اس سیاق و سباق میں اس واقعے کو تاریخی نظیر کے طور پر پیش کرنا بالکل بے جوڑ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کے مشن کا ایک جُز یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل (ایک مسلمان قوم) کو ایک کافر قوم کے تسلُّط سے (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے) نجات دلائیں۔ لیکن یہ ایک ضمنی مقصد تھا، نہ کہ اصل مقصدِ بِعثت۔ اصل مقصد تو وہی تھا جو قرآن کی رُو سے تمام انبیاؑ کی بِعثت کا مقصد رہا ہے اور سورۂ نازعات میں جس کو صاف طور پر بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۞ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۞ ”فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ حدِ بندگی سے گزر گیا ہے اور اس سے کہہ: کیا تُو اس کے لیے تیار ہے کہ سدھر جائے، اور میں تجھے تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو تُو اُس سے ڈرے؟“ مگر چونکہ فرعون اور اُس کے اَعیانِ سلطنت نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اور آخرکار حضرت موسیٰؑ کو یہی کرنا پڑا کہ اپنی مسلمان قوم کو اس کے تسلُّط سے نکال لے جائیں، اس لیے ان کے مشن کا یہی جُز تاریخ میں نمایاں ہو گیا اور قرآن میں بھی اس کو ویسا ہی نمایاں کر کے پیش کیا گیا جیسا کہ وہ تاریخ میں فی الواقع ہے۔ جو شخص قرآن کی تفصیلات کو اس کے کُلّیات سے جدا کر کے دیکھنے کی غلطی نہ کرتا ہو، بلکہ انھیں کُلّیات کے تابع کر کے ہی دیکھتا اور سمجھتا ہو، وہ کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ ایک قوم کی رہائی کسی نبی کی بِعثت کا

Maktaba Tul Ishaat.com

السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾
فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾
فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پایا کرتے[۷۵]۔" انھوں نے جواب میں کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے[۷۶]؟ تمھاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔" اور فرعون نے (اپنے آدمیوں سے) کہا کہ "ہر ماہرِ فن جادوگر کو میرے پاس حاضر کرو۔" ـــــ جب جادوگر آ گئے تو موسیٰؑ نے ان سے کہا: "جو کچھ تمھیں پھینکنا ہے پھینکو۔" پھر جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینک دیے تو موسیٰؑ نے کہا: "یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادو ہے[۷۷]، اللہ ابھی

اصل مقصد، اور دینِ حق کی دعوت محض اس کا ایک ضمنی مقصد ہو سکتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: طٰہٰ، آیات ۴۴ تا ۵۲۔ الزُّخرُف، ۴۶ تا ۵۶۔ المُزّمّل، ۱۵-۱۶)۔

۷۵ - مطلب یہ ہے کہ ظاہر نظر میں جادو اور معجزے کے درمیان جو مُشابہت ہوتی ہے، اس کی بنا پر تم لوگوں نے بے تکلّف اِسے جادو قرار دے دیا، مگر نادانو! تم نے یہ نہ دیکھا کہ جادوگر کس سیرت و اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کیا کرتے ہیں۔ کیا کسی جادوگر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بے غرض اور بے دھڑک ایک جبّار فرماں روا کے دربار میں آئے اور اسے اس کی گمراہی پر سرزنش کرے اور خدا پرستی اور طہارتِ نفس اختیار کرنے کی دعوت دے؟ تمھارے ہاں کوئی جادوگر آیا ہوتا تو پہلے درباریوں کے پاس خوشامدیں کرتا پھرتا کہ ذرا سرکار میں مجھے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دلوا دو، پھر جب اسے دربار میں رسائی نصیب ہوتی تو عام خوشامدیوں سے بھی کچھ بڑھ کر ذلّت کے ساتھ سلامیاں بجا لاتا، چیخ چیخ کر درازیِ عُمر و اقبال کی دعائیں دیتا، بڑی منت سماجت کے ساتھ درخواست کرتا کہ سرکار! کچھ فدوی کے کمالات بھی مُلاحظہ فرمائیں، اور جب تم اس کے تماشے دیکھ لیتے تو ہاتھ پھیلا دیتا کہ حضور! کچھ انعام مل جائے۔

اس پورے مضمون کو صرف ایک فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ جادوگر فلاح یافتہ انسان نہیں ہُوا کرتے۔

۷۶ - ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا اصل مطالبہ رہائیِ بنی اسرائیل کا ہوتا تو فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ اندیشہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ ان دونوں بزرگوں کی دعوت پھیلنے سے سرزمینِ مصر کا دین بدل جائے گا اور ملک میں

سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱ وَيُحِقُّ اللّٰهُ
الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲ۧ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا
ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ

ع ۸ ۱۲

اِسے باطل کیے دیتا ہے، مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا، اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔" ۷۷

(پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں[۷۸] کے سوا کسی نے نہ مانا[۷۹]، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں

ہمارے بجائے اِن کی بڑائی قائم ہو جائے گی۔ ان کے اس اندیشے کی وجہ تو یہی تھی کہ حضرت موسیٰؑ اہلِ مصر کو بندگیِ حق کی طرف دعوت دے رہے تھے اور اس سے وہ مشرکانہ نظام خطرے میں تھا جس پر فرعون کی بادشاہی اور اس کے سرداروں کی سرداری اور مذہبی پیشواؤں کی پیشوائی قائم تھی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، حاشیہ ۶۶۔ المومن، حاشیہ ۴۳)

۷۷ – یعنی جادو وہ نہ تھا جو میں نے دکھایا تھا، جادو یہ ہے جو تم دکھا رہے ہو۔

۷۸ – متن میں لفظ ذُرِّیَّۃٌ استعمال ہُوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ "نوجوان" کیا ہے۔ مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآنِ مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور عَلَم بردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ اُن کو خطرات سے پُرنظر آ رہا تھا، بلکہ وہ اُلٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ، ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہوگے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

یہ بات خاص طور پر قرآن نے نمایاں کر کے اس لیے پیش کی ہے کہ مکّہ کی آبادی میں سے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقتِ اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مصلحت کوش بوڑھا کوئی نہ تھا، سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علیؓ ابن ابی طالب، جعفر طیارؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، مصعبؓ بن عُمیرؓ، عبداللہؓ بن مسعود جیسے لوگ قبولِ اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، بلالؓ اور صہیبؓ کی عمریں ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَّفۡتِنَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ‏ ﴿۸۳﴾

مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔[۸۰]

ابوعُبیدہؓ بن الجرّاح، زیدؓ بن حارثہ، عثمانؓ بن عفّان اور عمرِ فاروقؓ ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سن رسیدہ ابوبکر صدیقؓ تھے اور ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تھی، یعنی حضرت عُبَیدہؓ بن حارث مُطّلبی۔ اور غالباً پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضورؐ کے ہم عمر تھے، یعنی عمّار بن یاسرؓ۔

۷۹ – متن میں فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤی کے الفاظ ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے۔ لیکن ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت وانقیاد کے معنی دیتا ہے، یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہے پر چلنا۔ پس دراصل ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوتِ اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا۔ پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے اُمّتی تھے، اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدّتِ دراز کے اَخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں اتنا بل بُوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا عَلَم لے کر خود اُٹھتے، یا جو اُٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اس کش مکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا، اس کا اندازہ بائبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

> ''جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستے پر کھڑے ملے۔ تب انھوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمھارا انصاف کرے، تم نے تو ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔'' (خروج ۶:‏۲۰-۲۱)

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے:

> ''ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آکر اس کو بچانے کی کوشش کی، اور دونوں کی کش مکش میں بکری کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ بس اسی طرح تمھاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔''

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ
كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسا کرو اگر مسلمان ہو۔[۸۱]" انھوں نے جواب دیا:[۸۲] "ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا[۸۳] اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے۔"

اِنھی باتوں کی طرف سورۂ اَعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (آیت ۱۲۹)۔

۸۰ – متن میں لفظ مُسْرِفِيْنَ استعمال ہُوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مُسرِفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطلب کے لیے کسی بُرے سے بُرے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تأمّل نہیں کرتے۔ کسی ظلم اور کسی بد اخلاقی اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چُوکتے۔ اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جاسکتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد نہیں جس پر جا کر وہ رُک جائیں۔

۸۱ – ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جاسکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی، اور حضرت موسیٰؑ اُن کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسا کرو۔

۸۲ – یہ جواب ان نوجوانوں کا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ یہاں قَالُوْا کی ضمیر قوم کی طرف نہیں بلکہ ذُرِّيَّةٌ کی طرف پھر رہی ہے جیسا کہ سیاقِ کلام سے خود ظاہر ہے۔

۸۳ – ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ "ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا"، بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ گمراہی کے عام غلبہ و تسلُّط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اُٹھتے ہیں، تو انھیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی عَلَم بردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے اِن داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلے میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے، کسی نہ کسی طرح درست ثابت کردے اور ان لوگوں کو اُلٹا برسرِ باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی اُس خلش

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ ”مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیّا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرالو اور نماز قائم کرو[۸۴] اور اہلِ ایمان کو بشارت دے دو[۸۵]۔“

کو مٹائے جو اُن کی دعوتِ اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخرکار اُسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلّا بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا، نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہوگئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا، اور آخرکار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلّف ہی کب کیا تھا، دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو اُن عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صُدور ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدت ہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اُٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنیٰ خیز دُعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا! ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا، اور ہماری سعی کو دنیا میں بارآور کر دے، تاکہ ہمارا وجود تیری خَلق کے لیے سببِ خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔

۸۴ – اس آیت کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے، غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدُّد سے اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضُعفِ ایمانی کی وجہ سے اسرائیلی اور مصری مسلمانوں کے ہاں نمازِ باجماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے کے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہو جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو ازسرِنو قائم کریں اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لیے تعمیر یا تجویز کر لیں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جایا کرے۔ کیونکہ ایک بگڑی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو ازسرِنو مجتمع کرنے کے لیے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی

وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَه زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ‌ ۚ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰۤى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَ

موسیٰؑ نے دُعا کی[۸۶]: "اے ہمارے رب! تُو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دُنیا کی زندگی میں زینت[۸۷] اور اموال[۸۸] سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مُہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔"[۸۹] اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: "تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور

جائے گی، اُس کا پہلا قدم لازماً یہی ہوگا کہ اس میں نمازِ باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرانے کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لیے مرکز اور مَرجع ٹھیرایا جائے، اور اس کے بعد ہی "نماز قائم کرو" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقرر مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں "اقامتِ صلوٰۃ" جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نمازِ باجماعت بھی شامل ہے۔

۸۵ – یعنی اہلِ ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور پژمُردگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دُور کرو۔ انھیں پُراُمید بناؤ، ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ۔ "بشارت دینے" کے لفظ میں یہ سب معنی شامل ہیں۔

۸۶ – اُوپر کی آیات حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے ابتدائی دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ دعا زمانۂ قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے کی ہے۔ بیچ میں کئی برس کا طویل فاصلہ ہے جس کی تفصیلات کو یہاں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں اس بیچ کے دَور کا بھی مفصّل حال بیان ہُوا ہے۔

۸۷ – یعنی ٹھاٹ، شان و شوکت اور تمدّن و تہذیب کی وہ خوش نمائی جس کی وجہ سے دنیا اُن پر اور اُن کے طور طریقوں پر ریجھتی ہے اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ ویسا ہی بن جائے جیسے وہ ہیں۔

۸۸ – یعنی ذرائع اور وسائل جن کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں رکھتے ہیں اور جن کے فُقدان کی وجہ سے اہلِ حق اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

۸۹ – جیسا کہ ابھی ہم بتا چکے ہیں، یہ دُعا حضرت موسیٰؑ نے زمانۂ قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی تھی، اور

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیۡلَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾ وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ
اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتۡبَعَہُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَ جُنُوۡدُہٗ بَغۡیًا وَّ عَدۡوًا ؕ حَتّٰۤی
اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ
بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ

اُن لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے[۹۰]۔"

اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے ـــــ حتّٰی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اُٹھا: "میں نے مان لیا کہ خداوندِ حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں[۹۱]۔ (جواب دیا گیا:) "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اِس سے پہلے تک تُو نافرمانی کرتا رہا

اس وقت کی تھی جب پے دَر پے نشانات دیکھ لینے اور دین کی حُجّت پوری ہو جانے کے بعد بھی فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت حق کی دشمنی پر انتہائی ہٹ دھرمی کے ساتھ جمے رہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر جو بددعا کرتا ہے وہ ٹھیک وہی ہوتی ہے جو کفر پر اصرار کرنے والوں کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، یعنی یہ کہ پھر انھیں ایمان کی توفیق نہ بخشی جائے۔

۹۰ – جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مَصلحتوں کو نہیں سمجھتے، وہ باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری، اور اقامتِ حق کے لیے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں، اور ائمۂ باطل کے ٹھاٹ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اس کے باغی دُنیا پر چھائے رہیں، اور شاید حضرتِ حق خود ہی باطل کے مقابلے میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بِنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اُس ذرا سی دین داری پر راضی ہو کر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر وفسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انھی ناموافق حالات میں کام کیے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عُموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

۹۱ – بائبل میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر تَلمود میں تصریح ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون نے کہا: "میں تجھ پر ایمان

وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ
خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع
وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ
الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ

اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے، تاکہ تُو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے[۹۲]، اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں[۹۳]۔'' ع

ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا دیا[۹۴] اور نہایت عمدہ وسائلِ زندگی انھیں عطا کیے۔ پھر انھوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر اُس وقت جب کہ علم اُن کے پاس آچکا تھا[۹۵]۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے روز

لاتا ہوں، اے خداوند! تیرے سوا کوئی خدا نہیں۔''

۹۲- آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبلِ فرعون کہتے ہیں، اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمامِ فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اُوپر شمال کی جانب ہے، اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون مِنفِتہ ہے جس کو زمانۂ حال کی تحقیق نے فرعونِ موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی مَمّی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

۹۳- یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات دکھائے ہی جائیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بڑی سے بڑی عبرت ناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

۹۴- یعنی مصر سے نکلنے کے بعد ارضِ فلسطین۔

۹۵- مطلب یہ ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے دین میں جو تفرقے برپا کیے اور نئے نئے مذہب نکالے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں دیا گیا تھا اور ناواقفیت کی بنا پر انھوں نے مجبوراً ایسا کیا، بلکہ فی الحقیقت یہ سب کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ
شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵
اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۹۶

اُن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اب اگر تجھے اُس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو اُن لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے، لہٰذا تُو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے، ورنہ تُو نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔[۹۶]

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آگیا ہے[۹۷] ان کے سامنے خواہ کوئی نشانی

ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ خدا کی طرف سے تو انھیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دینِ حق یہ ہے، یہ اس کے اُصول ہیں، یہ اس کے تقاضے اور مطالبے ہیں، یہ کفر و اسلام کے امتیازی حُدُود ہیں، طاعت اس کو کہتے ہیں، مَعْصِیَت اِس کا نام ہے، اِن چیزوں کی باز پُرس خدا کے ہاں ہونی ہے، اور یہ وہ قواعد ہیں جن پر دُنیا میں تمھاری زندگی قائم ہونی چاہیے۔ مگر ان صاف صاف ہدایتوں کے باوجود انھوں نے ایک دین کے بیسیوں دین بنا ڈالے اور خدا کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری ہی بنیادوں پر اپنے مذہبی فرقوں کی عمارتیں کھڑی کر لیں۔

۹۶ – یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات اُن لوگوں کو سُنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور اہلِ کتاب کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، ان کے لیے یہ آواز ایک نئی آواز تھی، مگر اہلِ کتاب کے عُلَما میں سے جو لوگ مُتَدَیِّن اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی دعوت تمام پچھلے انبیا دیتے رہے ہیں۔

۹۷ – یعنی یہ قول کہ جو لوگ خود طالبِ حق نہیں ہوتے، اور جو اپنے دلوں پر ضد تعصب اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھائے

وَلَوۡ جَآءَتۡهُمۡ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوۡلَا
كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ
اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ

آجائے، وہ کبھی ایمان لاکر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہُوا ہو؟ یُونس ؑ کی قوم کے سوا [98] (اس کی کوئی نظیر نہیں)۔ وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دُنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا [99] تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے

رکھتے ہیں، اور جو دُنیا کے عشق میں مدہوش اور عاقبت سے بے فکر ہوتے ہیں، انھیں ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

۹۸ – یونس علیہ السلام (جن کا نام بائبل میں یُوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰-۷۸۴ قبلِ مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے) اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اشُور (اَسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اشُوریوں کو یہاں قومِ یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اس زمانے میں نینویٰ کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈر آج تک دریائے دِجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر مَوصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں، اور اسی علاقے میں ”یونس نبی“ کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عُروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دارالسّلطنت نینویٰ تقریباً ۶۰ میل کے دَور میں پھیلا ہُوا تھا۔

۹۹ – قرآن میں اس قصّے کی طرف تین جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی (مُلاحظہ ہو: سورۂ انبیاء، آیات ۸۷-۸۸۔ الصّافّات، ۱۳۹-۱۴۸۔ القلم، ۴۸-۵۰)، اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم کن خاص وُجوہ کی بنا پر خدا کے اِس قانون سے مُستثنیٰ کی گئی کہ ”عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لیے نافع نہیں ہوتا“۔ بائبل میں ”یُوناہ“ کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے، نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے، بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخِ یونس کے طور پر لکھ کر مجموعۂ کُتبِ مقدّسہ میں شامل کر دیا ہے۔ دوسرے اس میں بعض صریح مُہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں۔ تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرینِ قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس ؑ چونکہ عذاب کی اِطّلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ کر چلے گئے تھے، اس لیے جب آثارِ عذاب دیکھ کر اشُوریوں نے توبہ واِستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا۔ قرآنِ مجید میں خدائی دستور کے جو اُصول وکُلّیات بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حُجّت پوری نہیں کر لیتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ
أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ

بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔[100]

اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔[101] پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟[102] کوئی متنفس اللہ

پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطورِ خود ہی وہ ہجرت کر گیا، تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر سورۂ الصافات، حاشیہ ۸۵)

۱۰۰- جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر خیال و عمل کی گمراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحُوم نبی (۷۲۰ - ۶۹۸ قبلِ مسیح) نے اسے متنبہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ پھر صَفنیاہ نبی (۶۴۰ - ۶۰۹ قبلِ مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار ۶۱۲ ق م کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلّط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے اَشُور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ اَشُوری فوج شکست کھا کر نینوی میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دجلہ کی طُغیانی نے فصیلِ شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہُوا۔ اَشُور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا، اور اس کے ساتھ ہی اَشُوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

۱۰۱- یعنی اگر اللہ کی خواہش یہ ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اطاعت گزار و فرماں بردار ہی بسیں اور کفر و نافرمانی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو تو اس کے لیے نہ یہ مشکل تھا کہ وہ تمام اہلِ زمین کو مومن و مطیع پیدا کرتا اور نہ یہی مشکل تھا کہ سب کے دل اپنے ایک ہی تکوینی اشارے سے ایمان و اطاعت کی طرف پھیر دیتا۔ مگر نوعِ انسانی کے پیدا کرنے میں جو حکیمانہ غرض اس کے پیشِ نظر ہے، وہ اس تخلیقی و تکوینی جبر کے استعمال سے فوت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ خود ہی انسانوں کو ایمان لانے یا نہ لانے اور اطاعت اختیار کرنے یا نہ کرنے میں آزاد رکھنا چاہتا ہے۔

۱۰۲- اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ دراصل اس فقرے میں وہی اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بکثرت مقامات پر ہمیں ملتا ہے، کہ خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبی کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے۔ یہاں جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ لوگو! حجت اور دلیل سے ہدایت و ضلالت کا فرق کھول کر رکھ دینے اور راہِ راست

اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱ فَهَلْ

کے اِذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا[۱۰۳]، اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔[۱۰۴]

اِن سے کہو: "زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔" اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں[۱۰۵]۔ اب یہ لوگ اِس کے سوا

صاف صاف دکھا دینے کا جو حق تھا وہ تو ہمارے نبیؐ نے پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ اب اگر تم خود راست رَو بننا نہیں چاہتے اور تمہارا سیدھی راہ پر آنا صرف اسی پر موقوف ہے کہ کوئی تمہیں زبردستی راہِ راست پر لائے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبیؐ کے سُپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا جبری ایمان اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے لیے اُسے نبیؐ بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ کام تو وہ خود جب چاہتا کر سکتا تھا۔

۱۰۳ – یعنی جس طرح تمام نعمتیں تنہا اللہ کے اختیار میں ہیں اور کوئی شخص کسی نعمت کو بھی اللہ کے اِذن کے بغیر نہ خود حاصل کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے شخص کو بخش سکتا ہے، اسی طرح یہ نعمت بھی کہ کوئی شخص صاحبِ ایمان ہو اور راہِ راست کی طرف ہدایت پائے، اللہ کے اِذن پر منحصر ہے۔ کوئی شخص نہ اس نعمت کو اذنِ الٰہی کے بغیر خود پا سکتا ہے، اور نہ کسی انسان کے اختیار میں یہ ہے کہ جس کو چاہے یہ نعمت عطا کر دے۔ پس نبی اگر سچے دل سے یہ چاہے بھی کہ لوگوں کو مومن بنا دے تو نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے اللہ کا اِذن اور اس کی توفیق درکار ہے۔

۱۰۴ – یہاں صاف بتا دیا گیا کہ اللہ کا اِذن اور اس کی توفیق کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے کہ بغیر کسی حکمت اور بغیر کسی معقول ضابطے کے یوں ہی جس کو چاہا نعمتِ ایمان پانے کا موقع دیا اور جسے چاہا اس موقع سے محروم کر دیا۔ بلکہ اس کا ایک نہایت حکیمانہ ضابطہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقے سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے، اس کے لیے تو اللہ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی وطلب کے تناسب سے مہیا کر دیے جاتے ہیں، اور اسی کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق بخشی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو طالبِ حق ہی نہیں ہیں اور جو اپنی عقل کو تعصّبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں، یا سرے سے تلاشِ حقیقت میں اُسے استعمال ہی نہیں کرتے، تو اُن کے لیے اللہ کے خزانۂ قسمت میں جہالت اور گمراہی اور غلط بینی وغلط کاری کی نجاستوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو انھی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں اور یہی ان کے نصیب میں

Maktaba Tul Ishaat.com

يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا
إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا
كَذَٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ ع قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ
فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ
أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾

اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی بُرے دن دیکھیں جو اِن سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ اِن سے کہو: ”اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔“ پھر (جب ایسا وقت آتا ہے تو) ہم اپنے رسُولوں کو اور اُن لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچالیں۔ ع

اے نبیؐ! کہہ دو[۱۰۶] کہ لوگو! اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سُن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا، بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمھاری موت ہے۔[۱۰۷] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔

لکھی جاتی ہیں۔

۱۰۵ – یہ ان کے اُس مطالبے کا آخری اور قطعی جواب ہے جو وہ ایمان لانے کے لیے شرط کے طور پر پیش کرتے تھے کہ ہمیں کوئی نشانی دکھائی جائے جس سے ہم کو یقین آ جائے کہ تمھاری نبوت سچی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تمھارے اندر حق کی طلب اور قبولِ حق کی آمادگی ہو تو وہ بے حد و حساب نشانیاں جو زمین و آسمان میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، تمھیں پیغامِ محمدیؐ کی صداقت کا اطمینان دلانے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ صرف آنکھیں کھول کر انھیں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر یہ طلب اور یہ آمادگی ہی تمھارے اندر موجود نہیں ہے تو پھر کوئی نشانی بھی، خواہ وہ کیسی ہی خارقِ عادت اور عجیب و غریب ہو، تم کو نعمتِ ایمان سے بہرہ ور نہیں کر سکتی۔ ہر معجزے کو دیکھ کر تم فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرح کہو گے کہ یہ تو جادوگری ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان کی آنکھیں صرف اُس وقت کُھلا کرتی ہیں جب خدا کا قہر و غضب اپنی ہولناک سخت گیری کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑتا ہے، جس طرح فرعون کی آنکھیں ڈوبتے وقت کھلی تھیں۔ مگر عین گرفتاری کے موقع پر جو توبہ کی جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اِس دین پر قائم کر دے،[۱۰۸] اور ہرگز ہرگز

۱۰۶- جس مضمون سے تقریر کی ابتدا کی گئی تھی اسی پر اب تقریر کو ختم کیا جا رہا ہے۔ تقابل کے لیے پہلے رُکوع کے مضمون پر پھر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۰۷- متن میں لفظ یَتَوَفّٰىكُمْ ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے: ''جو تمھیں موت دیتا ہے''۔ لیکن اس لفظی ترجمے سے اصل روح ظاہر نہیں ہوتی۔ اس ارشاد کی روح یہ ہے کہ ''وہ جس کے قبضے میں تمھاری جان ہے، جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو، اور جس وقت اس کا اشارہ ہو جائے اسی آن تمھیں اپنی جان اُس جان آفریں کے حوالے کر دینی پڑتی ہے، میں صرف اُسی کی پرستش اور اسی کی بندگی و غلامی اور اسی کی اطاعت و فرماں برداری کا قائل ہوں''۔ یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ مشرکینِ مکہ یہ مانتے تھے اور آج بھی ہر قسم کے مشرک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موت صرف اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے، اس پر کسی دوسرے کا قابو نہیں ہے۔ حتّٰی کہ جن بزرگوں کو یہ مشرکین خدائی صفات و اختیارات میں شریک ٹھیراتے ہیں، ان کے متعلق بھی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی خود اپنی موت کا وقت نہیں ٹال سکا ہے۔ پس بیانِ مدعا کے لیے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے کسی دوسری صفت کا ذکر کرنے کے بجائے یہ خاص صفت کہ ''وہ جو تمھیں موت دیتا ہے'' یہاں اس لیے انتخاب کی گئی ہے کہ اپنا مسلک بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح ہونے کی دلیل بھی دے دی جائے۔ یعنی سب کو چھوڑ کر میں اُس کی بندگی اس لیے کرتا ہوں کہ زندگی و موت پر تنہا اسی کا اقتدار ہے۔ اور اس کے سوا دوسروں کی بندگی آخر کیوں کروں جب کہ وہ خود اپنی زندگی و موت پر بھی اقتدار نہیں رکھتے، کجا کہ کسی اور کی زندگی و موت کے مختار ہوں۔ پھر کمالِ بلاغت یہ ہے کہ ''وہ مجھے موت دینے والا ہے'' کہنے کے بجائے ''وہ جو تمھیں موت دیتا ہے'' فرمایا۔ اس طرح ایک ہی لفظ میں بیانِ مدعا، دلیلِ مدعا، اور دعوت الی المدّعیٰ، تینوں فائدے جمع کر دیے گئے ہیں۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ ''میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو مجھے موت دینے والا ہے'' تو اس سے صرف یہی معنیٰ نکلتے کہ ''مجھے اس کی بندگی کرنی ہی چاہیے''۔ اب جو یہ فرمایا کہ ''میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو تمھیں موت دینے والا ہے''، تو اس سے یہ معنیٰ نکلے کہ مجھے ہی نہیں، تم کو بھی اُسی کی بندگی کرنی چاہیے اور تم یہ غلطی کر رہے ہو کہ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کیے جاتے ہو۔

۱۰۸- اس مطالبے کی شدت قابلِ غور ہے۔ بات ان الفاظ میں بھی ادا ہو سکتی تھی کہ تو ''اِس دین کو اختیار کر لے'' یا ''اِس دین پر چل'' یا ''اِس دین کا پیرو بن جا''۔ مگر اللہ تعالیٰ کو بیان کے یہ سب پیرایے ڈھیلے ڈھالے نظر آئے۔ اس دین کی جیسی سخت اور کُھلی اور کسی ہوئی پیروی مطلوب ہے، اس کا اظہار ان کمزور الفاظ سے نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش فرمایا کہ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔ اَقِمْ وَجْهَكَ کے لفظی معنیٰ ہیں: ''اپنا چہرہ جما دے''۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تیرا رُخ ایک ہی طرف قائم ہو۔ ڈگمگاتا اور ہلتا ڈُلتا نہ ہو۔ کبھی پیچھے اور کبھی آگے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں نہ مڑتا رہے۔ بالکل ناک کی سیدھ اُسی راستے پر نظر جمائے ہوئے چل جو تجھے دکھا دیا گیا ہے۔ یہ بندش بجائے خود بہت چُست تھی، مگر اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا۔ اس پر ایک اور قید

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ

مشرکوں میں سے[۱۰۹] نہ ہو۔ اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔

حَنِيْفًا کی بڑھائی گئی۔ حنیف اس کو کہتے ہیں جو سب طرف سے مڑ کر ایک طرف کا ہو رہا ہو۔ پس مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کو، اِس بندگیِ خدا کے طریقے کو، اس طرزِ زندگی کو کہ پرستش، بندگی، غلامی، اطاعت، فرماں برداری سب کچھ صرف اللہ ربّ العالمین ہی کی کی جائے، ایسی یکسوئی کے ساتھ اختیار کر کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرّہ برابر مَیلان و رُجحان بھی نہ ہو، اس راہ پر آ کر اُن غلط راہوں سے کچھ بھی لگاؤ باقی نہ رہے جنھیں تو چھوڑ کر آیا ہے اور اُن ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ پڑے جن پر دُنیا چلی جا رہی ہے۔

۱۰۹ – یعنی ان لوگوں میں ہرگز شامل نہ ہو جو اللہ کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حُقوق میں اور اس کے اختیارات میں کسی طور پر غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ خواہ وہ غیر اللہ ان کا اپنا نفس ہو، یا کوئی دوسرا انسان ہو، یا انسانوں کا کوئی مجموعہ ہو، یا کوئی روح ہو، جن ہو، فرشتہ ہو، یا کوئی مادّی یا خیالی یا وہمی وجود ہو۔ پس مطالبہ صرف اِس ایجابی صورت ہی میں نہیں ہے کہ توحیدِ خالص کا راستہ پوری استقامت کے ساتھ اختیار کر، بلکہ اِس سلبی صورت میں بھی ہے کہ ان لوگوں سے الگ ہو جا جو کسی شکل اور ڈھنگ کا شرک کرتے ہوں۔ عقیدے ہی میں نہیں عمل میں بھی، انفرادی طرزِ زندگی ہی میں نہیں اجتماعی نظامِ حیات میں بھی، مَعْبدوں اور پرستش گاہوں ہی میں نہیں درس گاہوں میں بھی، عدالت خانوں میں بھی، قانون سازی کی مجلسوں میں بھی، سیاست کے اَیوانوں میں بھی، معیشت کے بازاروں میں بھی، غرض ہر جگہ اُن لوگوں کے طریقے سے اپنا طریقہ الگ کر لے جنھوں نے اپنے افکار و اعمال کا پورا نظام خدا پرستی اور ناخدا پرستی کی آمیزش پر قائم کر رکھا ہے۔ توحید کا پیرو زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے میں بھی شرک کی راہ چلنے والوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا، کجا کہ آگے وہ ہوں اور پیچھے یہ، اور پھر بھی اس کی توحید پرستی کے تقاضے اطمینان سے پورے ہوتے رہیں!

پھر مطالبہ شرکِ جلی ہی سے پرہیز کا نہیں ہے بلکہ شرکِ خفی سے بھی کامل اور سخت اجتناب کا ہے۔ بلکہ شرکِ خفی زیادہ خوف ناک ہے اور اس سے ہوشیار رہنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ بعض نادان لوگ "شرکِ خفی" کو "شرکِ خفیف" سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ اس کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا شرکِ جلی کا ہے۔ حالاں کہ خفی کے معنی خفیف کے نہیں ہیں، پوشیدہ و مستور کے ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو دشمن منہ کھول کر دن دہاڑے سامنے آ جائے وہ زیادہ خطرناک ہے، یا وہ جو آستین میں چھپا ہُوا ہو یا دوست کے لباس میں معانقہ کر رہا ہو؟ بیماری وہ زیادہ مہلک ہے جس کی علامات بالکل نمایاں ہوں، یا وہ جو مدتوں تک تندرستی کے دھوکے میں رکھ کر اندر ہی اندر صحت کی جڑ کھوکھلی کرتی رہے؟ جس شرک کو ہر شخص بیک نظر دیکھ کر کہہ دے کہ یہ شرک ہے، اُس سے تو دینِ توحید کا تصادُم بالکل کُھلا ہوا ہے۔ مگر جس شرک کو سمجھنے کے لیے گہری نگاہ اور مُقتضیاتِ توحید کا عمیق فہم درکار ہے، وہ اپنی غیر مرئی جڑیں دین کے نظام میں اس طرح پھیلاتا ہے کہ عام اہلِ توحید کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی اور رفتہ رفتہ ایسے غیر محسوس طریقے سے دین کے مغز کو کھا جاتا ہے کہ کہیں خطرے کا الارم بجنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ
اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا
رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ
بِوَكِيْلٍ ؕ ﴿۱۰۸﴾ وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ
اللّٰهُ ۚۖ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع

ع ۱۱

اگر تُو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے محمدؐ! کہہ دو کہ "لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے، اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کُن ہے۔ اور میں تمھارے اُوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔" اور اے نبیؐ! تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمھاری طرف بذریعۂ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ع

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

ھُود

(۱۱)

ھُود

زمانۂ نزول اس سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُسی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جس میں سورۂ ''یونس'' نازل ہوئی تھی۔ بعید نہیں کہ یہ اس کے ساتھ مُتَّصِلاً ہی نازل ہوئی ہو، کیونکہ موضوعِ تقریر وہی ہے، مگر تنبیہ کا انداز اس سے زیادہ سخت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''میں دیکھتا ہوں کہ آپؐ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟'' جواب میں حضورؐ نے فرمایا: شَیَّبَتْنِی ھُود واَخواتھا۔ ''مجھ کو سورۂ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہ زمانہ کیسا سخت ہوگا جب کہ ایک طرف کفارِ قریش اپنے تمام ہتھیاروں سے اس دعوتِ حق کو کچل دینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں آپؐ کو ہر وقت یہ اندیشہ گُھلائے دیتا ہوگا کہ کہیں اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم نہ ہو جائے اور وہ آخری ساعت نہ آ جائے جب کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب میں پکڑ لینے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ فی الواقع اس سورہ کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک سیلاب کا بند ٹوٹنے کو ہے اور اُس غافل آبادی کو، جو اس سیلاب کی زد میں آنے والی ہے، آخری تنبیہ کی جا رہی ہے۔

موضوع اور مَباحِث موضوعِ تقریر، جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے، وہی ہے جو سورۂ یونس کا تھا۔ یعنی دعوت، فہمایش اور تنبیہ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورۂ یونس کی بہ نسبت یہاں دعوت مختصر ہے، فہمایش میں اِستدلال کم اور وعظ و نصیحت زیادہ ہے، اور تنبیہ مفصل اور پُرزور ہے۔

دعوت یہ ہے کہ پیغمبر کی بات مانو، شرک سے باز آ جاؤ، سب کی بندگی چھوڑ کر اللہ کے بندے بنو اور اپنی دُنیوی زندگی کا سارا نظام آخرت کی جواب دِہی کے احساس پر قائم کرو۔

فہمایش یہ ہے کہ حیاتِ دُنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر کے جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا ہے، وہ اس سے پہلے نہایت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں، اب کیا ضرور ہے کہ تم بھی اسی راہ چلو جسے تاریخ کے مسلسل تجرِبات قطعی طور پر تباہی کی راہ ثابت کر چکے ہیں۔

تنبیہ یہ ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، یہ دراصل ایک مُہلت ہے جو اللہ اپنے فضل سے تمھیں عطا کر رہا ہے۔ اس مُہلت کے اندر اگر تم نہ سنبھلے تو وہ عذاب آئے گا جو کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا اور اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمھاری ساری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے براہِ راست خطاب کی بہ نسبت قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لُوط، اصحابِ مَدیَن اور قومِ فرعون کے قصّوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ان قصّوں میں خاص طور پر جو بات نمایاں کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا جب فیصلہ چکانے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لاگ طریقے سے چُکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرّہ برابر رعایت نہیں ہوتی۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس کا بیٹا اور کس کا عزیز ہے۔ رحمت صرف اُس کے حصّے میں آتی ہے جو راہِ راست پر آ گیا ہو، ورنہ خدا کے غضب سے نہ کسی پیغمبر کا بیٹا بچتا ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بیوی۔ یہی نہیں بلکہ جب ایمان و کفر کا دوٹوک فیصلہ ہو رہا ہو تو دین کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ خود مومن بھی باپ اور بیٹے اور شوہر اور بیوی کے رشتوں کو بھول جائے اور خدا کی شمشیرِ عدل کی طرح بالکل بے لاگ ہو کر ایک رشتۂ حق کے سوا ہر دوسرے رشتے کو کاٹ پھینکے۔ ایسے موقع پر خون اور نسب کی رشتہ داریوں کا ذرّہ برابر لحاظ کر جانا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا پورا پورا مظاہرہ تین چار سال بعد مکے کے مہاجر مسلمانوں نے جنگِ بَدر میں کر کے دکھا دیا۔

آیاتہا ۱۲۳ سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ

ال ر، فرمان[1] ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصّل ارشاد ہوئی ہیں،[2] ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے، کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اُس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدّتِ خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے[3] گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے[4] گا۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں

۱- ”کتاب“ کا ترجمہ یہاں اندازِ بیان کی مناسبت سے ”فرمان“ کیا گیا ہے۔ عَرَبی زبان میں یہ لفظ کتاب اور نَوِشتے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ حکم اور فرمانِ شاہی کے معنی میں بھی آتا ہے اور خود قرآن میں متعدّد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں مُستعمل ہُوا ہے۔

۲- یعنی اس فرمان میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ پکی اور اٹل ہیں۔ خوب جچی تُلی ہیں۔ نری لفّاظی نہیں ہے۔ خطابت کی ساحری اور تخیّل کی شاعری نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھیک حقیقت بیان کی گئی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو حقیقت سے کم یا زیادہ ہو۔ پھر یہ آیتیں مفصّل بھی ہیں، ان میں ایک ایک بات کھول کھول کر واضح طریقے سے ارشاد ہوئی ہے۔ بیان اُلجھا ہُوا، گُنجلک اور مُبہَم نہیں ہے۔ ہر بات کو الگ الگ، صاف صاف سمجھا کر بتایا گیا ہے۔

۳- یعنی دُنیا میں تمہارے ٹھیرنے کے لیے جو وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ تم کو بُری طرح نہیں بلکہ اچھی طرح رکھے گا۔ اس کی نعمتیں تم پر برسیں گی۔ اس کی برکتوں سے سرفراز ہو گے۔ خوش حال و فارغ البال رہو گے۔ زندگی میں امن اور چین نصیب ہوگا۔ ذلّت وخواری کے ساتھ نہیں بلکہ عزت وشَرَف کے ساتھ جیو گے۔ یہی مضمون دوسرے موقع پر اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل، آیت ۹۷) ”جو شخص بھی ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔“ اس سے لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو رفع کرنا مقصود ہے جو شیطان نے ہر نادان دُنیا پرست آدمی کے کان میں پھونک رکھی ہے کہ خدا ترسی اور راست بازی اور

Maktaba Tul Ishaat.com

أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ۝٣ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝٤ أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ
لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ
مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝٥

الجزء ۱۲ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا

تمھارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

دیکھو! یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں۵۔ خبردار! جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں، اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی، وہ تو اُن بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں۔ زمین میں چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمّے نہ ہو

احساسِ ذمہ داری کا طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت بنتی ہو تو بنتی ہو، مگر دُنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اور یہ کہ ایسے لوگوں کے لیے دُنیا میں فاقہ مستی و خستہ حالی کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید میں فرماتا ہے کہ اس راہِ راست کو اختیار کرنے سے تمھاری صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دُنیا بھی بنے گی۔ آخرت کی طرح اس دُنیا کی حقیقی عزت و کامیابی بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے جو سچّی خدا پرستی کے ساتھ صالح زندگی بسر کریں۔ جن کے اخلاق پاکیزہ ہوں، جن کے معاملات دُرست ہوں، جن پر ہر معاملے میں بھروسا کیا جا سکے، جن سے ہر شخص بھلائی کا متوقع ہو، جن سے کسی انسان کو یا کسی قوم کو شر کا اندیشہ نہ ہو۔

اس کے علاوہ ''مَتَاعٌ حَسَنٌ'' کے الفاظ میں ایک اور پہلو بھی ہے جو نگاہ سے اوجھل نہ رہ جانا چاہیے۔ دنیا کا سامانِ زیست قرآنِ مجید کی رُو سے دو قسم کا ہے۔ ایک وہ سروسامان ہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لیے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دُنیا پرستی و خدا فراموشی میں اور زیادہ گم کر دیتے ہیں۔ یہ بظاہر تو نعمت ہے مگر بباطن خدا کی پھٹکار اور اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ قرآنِ مجید اس کو مَتَاعُ غُرُوْرٍ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ دوسرا وہ سروسامان ہے جس سے انسان خوش حال اور قوی بازو ہو کر اپنے خدا کا اور زیادہ شکرگزار بنتا ہے، خدا اور اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حُقُوق زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے، خدا کے دیے ہوئے وسائل سے طاقت پا کر دُنیا میں خیر و صلاح کی ترقی اور شر و فساد کے اِستیصال کے لیے زیادہ کارگر کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں ''مَتَاعٌ حَسَنٌ'' ہے،

وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ
عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنْ

اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے[۶]، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ــــ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا[۷] ــــ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے[۸]۔ اب اگر اے محمدؐ!

یعنی ایسا اچھا سامانِ زندگی جو محض عیشِ دُنیا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجے میں عیشِ آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

۴ – یعنی جو شخص اخلاق و اعمال میں جتنا بھی آگے بڑھے گا، اللہ اس کو اتنا ہی بڑا درجہ عطا کرے گا۔ اللہ کے ہاں کسی کی خوبی پر پانی نہیں پھیرا جاتا۔ اس کے ہاں جس طرح برائی کی قدر نہیں ہے، اسی طرح بھلائی کی ناقدری بھی نہیں ہے۔ اس کی سلطنت کا دستور یہ نہیں ہے کہ

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں　　　　طوقِ زرّیں ہمہ در گردن خرمی بینم!

وہاں تو جو شخص بھی اپنی سیرت و کردار سے اپنے آپ کو جس فضیلت کا مستحق ثابت کر دے گا، وہ فضیلت اس کو ضرور دی جائے گی۔

۵ – مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا ہوا تو بہت سے لوگ وہاں ایسے تھے جو مخالفت میں تو کچھ بہت زیادہ سرگرم نہ تھے مگر آپؐ کی دعوت سے سخت بیزار تھے۔ ان لوگوں کا رَوِیّہ یہ تھا کہ آپؐ سے کتراتے تھے، آپؐ کی کسی بات کو سُننے کے لیے تیار نہ تھے، کہیں آپؐ کو بیٹھے دیکھتے تو اُلٹے پاؤں پھر جاتے، دُور سے آپؐ کو آتے دیکھ لیتے تو رُخ بدل دیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے، تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپؐ انھیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں۔ اسی قسم کے لوگوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ لوگ حق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور شُتُر مُرغ کی طرح منہ چھپا کر سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت ہی غائب ہو گئی جس سے انھوں نے منہ چھپایا ہے۔ حالاں کہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے اور وہ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ یہ بیوقوف اس سے بچنے کے لیے منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔

۶ – یعنی جس خدا کے علم کا حال یہ ہے کہ ایک ایک چڑیا کا گھونسلا اور ایک ایک کیڑے کا بِل اس کو معلوم ہے اور وہ اسی کی جگہ پر اس کو سامانِ زیست پہنچا رہا ہے، اور جس کو ہر آن اس کی خبر ہے کہ کون سا جان دار کہاں رہتا ہے اور کہاں اپنی جان جان آفریں کے سُپرد کر دیتا ہے، اُس کے متعلق اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس طرح منہ چھپا چھپا کر یا کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یا آنکھوں پر پردہ ڈال کر تم اس کی پکڑ سے بچ جاؤ گے تو سخت نادان ہو۔ داعیِ حق سے تم نے منہ چھپا بھی لیا تو آخر اس کا حاصل کیا ہے؟ کیا خدا سے بھی تم چھپ گئے؟ کیا خدا یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ ایک شخص تمھیں امرِ حق سے آگاہ کرنے میں لگا ہُوا ہے اور تم یہ کوشش کر رہے ہو کہ کسی طرح اس کی کوئی بات تمھارے کان میں نہ پڑنے پائے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى
اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ
مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَلَىِٕنْ
اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ

ع ۴

تم کہتے ہو کہ لوگو! مرنے کے بعد تم دوبارہ اُٹھائے جاؤ گے، تو منکرین فوراً بول اُٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادُوگری ہے۔[9] اور اگر ہم ایک خاص مدّت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اُسے روک رکھا ہے؟ سنو! جس روز اُس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اُڑا رہے ہیں ع

اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے

۷ – جملہ معترضہ ہے جو غالباً لوگوں کے اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اگر پہلے نہ تھے اور بعد میں پیدا کیے گئے تو پہلے کیا تھا؟ اس سوال کو یہاں نقل کیے بغیر اس کا جواب اس مختصر سے فقرے میں دے دیا گیا ہے کہ پہلے پانی تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے۔ یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں، یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادّے کی اس مائع (fluid) حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی؟ رہا یہ ارشاد کہ خدا کا عرش پہلے پانی پر تھا، تو اس کا مفہوم ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ خدا کی سلطنت پانی پر تھی۔

۸ – اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو اس لیے پیدا کیا کہ تم کو (یعنی انسان کو) پیدا کرنا مقصود تھا، اور تمھیں اس لیے پیدا کیا کہ تم پر اَخلاقی ذمّہ داری کا بار ڈالا جائے، تم کو خلافت کے اختیارات سُپرد کیے جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ تم میں سے کون ان اختیارات کو اور اس اخلاقی ذمّہ داری کے بوجھ کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ اگر اس تخلیق کی تہ میں یہ مقصد نہ ہوتا، اگر اختیارات کی تفویض کے باوجود کسی امتحان کا، کسی محاسبہ اور باز پرس کا اور کسی جزا و سزا کا کوئی سوال نہ ہوتا، اور اگر انسان کو اخلاقی ذمّہ داری کا حامل ہونے کے باوجود یونہی بے نتیجہ مر کر مٹی ہو جانا ہی ہوتا، تو پھر یہ سارا کارِ تخلیق بالکل ایک مُہمل کھیل تھا اور اس تمام ہنگامۂ وجود کی کوئی حیثیت ایک فعلِ عَبَث کے سوا نہ تھی۔

۹ – یعنی ان لوگوں کی نادانی کا یہ حال ہے کہ کائنات کو ایک کھلنڈرے کا گھروندا اور اپنے آپ کو اس کے جی بہلانے کا کھلونا

كَفُوْرٌ ﴿٩﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ
ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿١٠﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١١﴾

اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اُس مصیبت کے بعد جو اُس پر آئی تھی، ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دِلدّر پار ہو گئے، پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے[١٠]۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے[١١] اور نیکو کار ہیں، اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی[١٢]۔

سمجھے بیٹھے ہیں اور اس احمقانہ تصوّر میں اتنے مگن ہیں کہ جب تم انہیں اس کارگاہِ حیات کا سنجیدہ مقصد، اور خود ان کے وجود کی معقول غرض وغایت سمجھاتے ہو تو قہقہہ لگاتے ہیں اور تم پر پھبتی کستے ہیں کہ یہ شخص تو جادو کی سی باتیں کرتا ہے۔

۱۰ – یہ انسان کے چھچھورے پن، سطح بینی اور قلتِ تدبُّر کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج خوش حال اور زور آور ہیں تو اکڑ رہے ہیں اور فخر کر رہے ہیں، ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزاں بھی آ سکتی ہے۔ کل کسی مصیبت کے پھیر میں آ گئے تو بلبلا اُٹھے، حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے، اور بہت تلملائے تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدائی پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے۔ پھر جب بُرا وقت گزر گیا اور بھلے دن آئے تو وہی اکڑ، ڈینگیں اور نعمت کے نشے میں وہی سرمستیاں پھر شروع ہو گئیں۔

انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض ایک نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبّہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبرؐ تمہیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب آئے گا، اور تم اس کی یہ بات سُن کر ایک زور کا ٹھٹھا مارتے ہو اور کہتے ہو کہ "دیوانے! دیکھتا نہیں کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریرے اُڑ رہے ہیں، اس وقت تجھے دن دہاڑے یہ ڈراؤنا خواب کیسے نظر آ گیا کہ کوئی عذاب ہم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے"، تو دراصل پیغمبرؐ کی نصیحت کے جواب میں تمہارا یہ ٹھٹھا اِسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل تر مظاہرہ ہے۔ خدا تو تمہاری گمراہیوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمہاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ، مگر تم اس مُہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کہ ہماری خوش حالی کیسی پائدار بنیادوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چمن کیسا سدا بہار ہے کہ اس پر خزاں آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔

۱۱ – یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ صبر کی صفت اُس چھچھورپن کی ضد ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ صابر وہ شخص ہے جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے۔ وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویّے پر ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولت مندی، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے۔ اور اگر کسی دوسرے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ
يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ
نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ
فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ

تو اے پیغمبرؐ! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اُن چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمھاری طرف وحی کی جارہی ہیں اور اِس بات پر دل تنگ ہو کہ وہ کہیں گے: ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُتارا گیا“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا“۔ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو، آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔[۱۳]

کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو: ”اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں، اُن کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو

وقت مصائب و مشکلات کی چکّی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہرِ انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے۔ خدا کی طرف سے آزمایش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

۱۲ – یعنی اللہ ایسے لوگوں کے قصور معاف بھی کرتا ہے اور ان کی بھلائیوں پر اجر بھی دیتا ہے۔

۱۳ – اس ارشاد کا مطلب سمجھنے کے لیے اُن حالات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن میں یہ فرمایا گیا ہے۔ مکّہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہُوا ہے۔ عین اس حالت میں جب کہ یہ لوگ اپنے انتہائی عُروج پر ہیں، اس بستی کا ایک آدمی اُٹھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے، جس نظامِ تمدّن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے، خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تُلا کھڑا ہے اور تمھارے لیے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اُس مذہبِ حق اور اُس نظامِ صالح کو قبول کر لو جو میں خدا کی طرف سے تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس شخص کے ساتھ اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے سوا کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے عام لوگ اسے مامور من اللہ سمجھیں۔ اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تمدّن کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہر علامت نہیں ہے جو نزولِ عذاب کی نشان دہی کرتی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں

اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ
اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ فَہَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

تو بُلا لو، اگر تم (انھیں معبُود سمجھنے میں) سچّے ہو۔ اب اگر وہ (تمھارے معبُود) تمھاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبُود نہیں ہے۔ پھر کیا تم (اِس امرِ حق کے آگے) سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟[۱۴]"

علامتیں یہی ظاہر کر رہی ہیں کہ ان لوگوں پر خدا کا (اور ان کے عقیدے کے مطابق) دیوتاؤں کا بڑا فضل ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، اور اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا، کہ چند نہایت صحیح الدماغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوا بستی کے سب لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی ظلم و ستم سے اس کو دبانا چاہتا ہے۔ کوئی جھوٹے الزامات اور اوچھے اعتراضات سے اس کی ہوا اُکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی متعصبانہ بے رُخی سے اس کی ہمّت شکنی کرتا ہے اور کوئی مذاق اُڑا کر، آوازے اور پھبتیاں کَس کر، اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اُڑا دینا چاہتا ہے۔ یہ استقبال جو کئی سال تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا رہتا ہے، جیسا کچھ دل شکن اور مایوس کُن ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ بس یہی صورتِ حال ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کی ہمت بندھانے کے لیے تلقین فرماتا ہے کہ اچھے حالات میں پھول جانا اور بُرے حالات میں مایوس ہو جانا چھچورے لوگوں کا کام ہے۔ ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہٰذا جس تعصب سے، جس بے رُخی سے، جس تضحیک و استہزا سے اور جن جاہلانہ اعتراضات سے تمھارا مقابلہ کیا جا رہا ہے ان کی وجہ سے تمھارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعۂ وحی منکشف کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمھیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمھارے دل میں اس خیال کا کبھی گزر تک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جب کہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں، اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جب کہ کوئی اس کے سننے تک کا رَوادار نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، تم جسے حق پاتے ہو، اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیے جاؤ، آگے سب معاملات اللہ کے حوالے ہیں۔

۱۴ - یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) اگر تمھارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے، لہٰذا تمھارا یہ دعویٰ کہ میں نے اسے خود تصنیف کیا ہے، صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر بار بار چیلنج دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔

(۲) پھر جب کہ اس کتاب میں تمھارے معبُودوں کی بھی کھُلم کھُلّا مخالفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دو کیونکہ اُلوہیّت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے، تو ضرور ہے کہ تمھارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمھاری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھڑی میں بھی تمھاری

Maktaba Tul Ishaat.com

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا
وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

جو لوگ بس اِسی دُنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں[15]، ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے[16]۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انھوں نے دُنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

مدد نہیں کرتے اور تمھارے اندر کوئی ایسی طاقت نہیں پھونکتے کہ تم اس کتاب کی نظیر تیار کر سکو، تو اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شائبۂ اُلوہیت نہیں ہے جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے مستحق ہوں۔

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ سورہ ترتیبِ نُزول کے اعتبار سے سورۂ یُونس سے پہلے کی ہے۔ یہاں دس سورتیں بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا ہے اور جب وہ اس کا جواب نہ دے سکے تو پھر سورۂ یُونس میں کہا گیا کہ اچھا ایک ہی سورت اس کے مانند تصنیف کر لاؤ۔ (یونس، آیت ۳۸، حاشیہ ۴۶)

۱۵ – اس سلسلۂ کلام میں یہ بات اس مناسبت سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن کی دعوت کو جس قسم کے لوگ اُس زمانے میں رڈ کر رہے تھے اور آج بھی رڈ کر رہے ہیں، وہ زیادہ تر وہی تھے اور ہیں جن کے دل و دماغ پر دُنیا پرستی چھائی ہوئی ہے۔ خدا کے پیغام کو رڈ کرنے کے لیے جو دلیل بازیاں وہ کرتے ہیں وہ سب تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی چیز جو اس انکار کا اصل سبب ہے، وہ ان کے نفس کا یہ فیصلہ ہے کہ دُنیا اور اس کے مادّی فائدوں سے بالاتر کوئی شے قابلِ قدر نہیں ہے، اور یہ کہ ان فائدوں سے مُتمتّع ہونے کے لیے ان کو پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔

۱۶ – یعنی جس کے پیشِ نظر محض دُنیا اور اس کا فائدہ ہو، وہ اپنی دُنیا بنانے کی جیسی کوشش یہاں کرے گا، ویسا ہی اس کا پھل اسے یہاں مل جائے گا۔ لیکن جب کہ آخرت اس کے پیشِ نظر نہیں ہے اور اس کے لیے اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی دُنیا طلب مساعی کی بارآوری کا سلسلہ آخرت تک دراز ہو۔ وہاں پھل پانے کا امکان تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ دُنیا میں آدمی کی سعی اُن کاموں کے لیے ہو جو آخرت میں بھی نافع ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص چاہتا ہے کہ ایک شان دار مکان اسے رہنے کے لیے ملے اور وہ اس کے لیے اُن تدابیر کو عمل میں لاتا ہے جن سے یہاں مکان بنا کرتے ہیں، تو ضرور ایک عالی شان محل بن کر تیار ہو جائے گا اور اس کی کوئی اینٹ بھی محض اس بنا پر جمنے سے انکار نہ کرے گی کہ ایک کافر اسے جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس شخص کو اپنا یہ محل اور اس کا سارا سروسامان موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی اِس دُنیا میں چھوڑ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ

پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا[17]، اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آ گیا[18]، اور پہلے موسیٰؑ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دُنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں[19] گے۔ اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے

دینا پڑے گا اور اس کی کوئی چیز بھی وہ اپنے ساتھ دوسرے عالَم میں نہ لے جا سکے گا۔ اگر اس نے آخرت میں محل تعمیر کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا یہ محل وہاں اس کے ساتھ منتقل ہو۔ وہاں کوئی محل وہ پا سکتا ہے تو صرف اس صورت میں پا سکتا ہے جب کہ دُنیا میں اس کی سعی اُن کاموں میں ہو جن سے قانونِ الٰہی کے مطابق آخرت کا محل بنا کرتا ہے۔

اب سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس دلیل کا تقاضا تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں اسے کوئی محل نہ ملے۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ محل کے بجائے وہاں اُسے آگ ملے گی؟ اس کا جواب یہ ہے (اور یہ قرآن ہی کا جواب ہے جو مختلف مواقع پر اس نے دیا ہے) کہ جو شخص آخرت کو نظر انداز کر کے محض دُنیا کے لیے کام کرتا ہے وہ لازماً و فطرتاً ایسے طریقوں سے کام کرتا ہے جن سے آخرت میں محل کے بجائے آگ کا الاؤ تیار ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ یونس، حاشیہ ۱۲)

۱۷ – یعنی جس کو خود اپنے وجود میں اور زمین و آسمان کی ساخت میں اور کائنات کے نظم و نسق میں اِس امر کی کُھلی شہادت مل رہی تھی کہ اِس دُنیا کا خالق، مالک، پروردگار اور حاکم و فرماں روا صرف ایک خدا ہے، اور پھر انھی شہادتوں کو دیکھ کر جس کا دل یہ گواہی بھی پہلے ہی سے دے رہا تھا کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں انسان اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دے اور اپنے کیے کی جزا و سزا پائے۔

۱۸ – یعنی قرآن، جس نے آ کر اُس فطری و عقلی شہادت کی تائید کی اور اسے بتایا کہ فی الواقع حقیقت وہی ہے جس کا نشان آفاق و انفُس کے آثار میں تُو نے پایا ہے۔

۱۹ – سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو پر اور اس کی خوش نمائیوں پر فریفتہ ہیں، اُن کے لیے تو قرآن کی دعوت کو رد کر دینا آسان ہے۔ مگر وہ شخص جو اپنی ہستی میں اور کائنات کے نظام میں پہلے سے توحید و آخرت کی کھلی شہادت پا رہا تھا، پھر قرآن نے آ کر ٹھیک وہی بات کہی جس کی شہادت وہ پہلے سے اپنے اندر بھی پا رہا تھا اور باہر بھی، اور پھر اس کی مزید تائید قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابِ آسمانی میں بھی اسے مل گئی، آخر وہ کس طرح اتنی زبردست شہادتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اِن منکرین کا ہم نوا ہو سکتا ہے؟ اس ارشاد سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ قرآن سے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی
اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ
الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ۙ
الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ

تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ! تم اِس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا، یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹ گھڑے؟[20] ایسے لوگ اپنے رب کے حُضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب پر جھُوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر[21] ـــ اُن ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں،[22] اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں[23]

پہلے ایمان بالغیب کی منزل سے گزر چکے تھے۔ جس طرح سورۂ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نبی ہونے سے پہلے آثارِ کائنات کے مشاہدے سے توحید کی معرفت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غور و فکر سے اس حقیقت کو پا لیا تھا، اور اس کے بعد قرآن نے آ کر اس کی نہ صرف تصدیق و توثیق کی، بلکہ آپؐ کو حقیقت کا براہِ راست علم بھی عطا کر دیا گیا۔

۲۰ – یعنی یہ کہے کہ اللہ کے ساتھ خدائی اور استحقاقِ بندگی میں دوسرے بھی شریک ہیں۔ یا یہ کہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس نے کوئی کتاب اور کوئی نبیؐ ہماری ہدایت کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جو ڈھنگ چاہیں اپنی زندگی کے لیے اختیار کر لیں۔ یا یہ کہے کہ خدا نے ہمیں یونہی کھیل کے طور پر پیدا کیا اور یونہی ہم کو ختم کر دے گا، کوئی جواب دہی ہمیں اس کے سامنے نہیں کرنی ہے اور کوئی جزا و سزا نہیں ہونی ہے۔

۲۱ – یہ عالمِ آخرت کا بیان ہے کہ وہاں یہ اعلان ہوگا۔

۲۲ – یہ جملۂ معترضہ ہے کہ جن ظالموں پر وہاں خدا کی لعنت کا اعلان ہوگا، وہ وہی لوگ ہوں گے جو آج دُنیا میں یہ حرکات کر رہے ہیں۔

۲۳ – یعنی وہ اس سیدھی راہ کو جو اُن کے سامنے پیش کی جا رہی ہے پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ راہ کچھ ان کی خواہشاتِ

بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۱۹ اُولٰٓئِكَ لَمۡ يَكُوۡنُوۡا مُعۡجِزِيۡنَ
فِى الۡاَرۡضِ وَمَا كَانَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ‌ ۘ وقف لازم
يُضٰعَفُ لَهُمُ الۡعَذَابُ‌ ؕ مَا كَانُوۡا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ السَّمۡعَ وَمَا
كَانُوۡا يُبۡصِرُوۡنَ ۝۲۰ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَضَلَّ
عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝۲۱ لَا جَرَمَ اَنَّهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ هُمُ
الۡاَخۡسَرُوۡنَ ۝۲۲ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَاَخۡبَتُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ‌ ۚ هُمۡ
فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۲۳ مَثَلُ الۡفَرِيۡقَيۡنِ كَالۡاَعۡمٰى وَالۡاَصَمِّ وَ

اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ـــــ وہ زمین[24] میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انھیں اب دُہرا عذاب دیا جائے[25] گا۔ وہ نہ کسی کی سُن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انھیں کچھ سُوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انھوں نے گھڑ رکھا تھا۔[26] ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے، تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں[27] گے۔ اِن دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا، اور

نفس اور ان کے جاہلانہ تعصّبات اور ان کے اَوہام وتخیُّلات کے مطابق ٹیڑھی ہو جائے تو وہ اسے قبول کریں۔

۲۴ – یہ پھر عالَمِ آخرت کا بیان ہے۔

۲۵ – ایک عذاب خود گمراہ ہونے کا۔ دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے اور بعد کی نسلوں کے لیے گمراہی کی میراث چھوڑ جانے کا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۳۰)

۲۶ – یعنی وہ سب نظریات پادر ہوا ہو گئے جو انھوں نے خدا اور کائنات اور اپنی ہستی کے متعلق گھڑ رکھے تھے، اور وہ سب بھروسے بھی جھوٹے ثابت ہوئے جو انھوں نے اپنے معبُودوں اور سفارشیوں اور سرپرستوں پر رکھے تھے، اور وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَ
لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾ اَنْ
لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾
فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا
مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ

دوسرا ہو دیکھنے اور سُننے والا، کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟[28] کیا تم (اِس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟ ؏

(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔[29] (اُس نے کہا:) ”میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا۔“[30] جواب میں اُس کی قوم کے سردار، جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے: ”ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔[31] اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس اُن لوگوں نے، جو ہمارے ہاں اراذل تھے، بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار

قیاسات بھی غلط نکلے جو انھوں نے زندگی بعدِ موت کے بارے میں قائم کیے تھے۔

۲۷ – یہاں عالمِ آخرت کا بیان ختم ہُوا۔

۲۸ – یعنی کیا ان دونوں کا طرزِ عمل اور آخرِ کار دونوں کا انجام یکساں ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو شخص نہ خود راستہ دیکھتا ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی بات ہی سنتا ہے جو اسے راستہ بتا رہا ہو، وہ ضرور کہیں ٹھوکر کھائے گا اور کہیں کسی سخت حادثے سے دوچار ہو گا۔ بخلاف اس کے، جو شخص خود بھی راستہ دیکھ رہا ہو اور کسی واقفِ راہ کی ہدایات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہو، وہ ضرور اپنی منزل پر بسلامت پہنچ جائے گا۔ بس یہی فرق اُن لوگوں کے درمیان بھی ہے جن میں سے ایک اپنی آنکھوں سے بھی کائنات میں حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے رہنماؤں کی بات بھی سنتا ہے، اور دوسرا نہ خود ہی کی آنکھیں کھلی رکھتا ہے کہ خدا کی نشانیاں اسے نظر آئیں اور نہ پیغمبروں کی بات ہی سن کر دیتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ زندگی میں ان دونوں کا طرزِ عمل یکساں ہو؟ اور پھر کیا وجہ ہے کہ آخرِ کار ان کے انجام میں فرق نہ ہو؟

الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً
مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

کرلی ہے[۳۲]۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو،[۳۳] بلکہ ہم تو تمھیں جھُوٹا سمجھتے ہیں۔" اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر مَیں اپنے رب کی طرف سے ایک کھُلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا[۳۴] مگر وہ تم کو نظر نہ آئی، تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمھارے سر چیپک دیں؟

۲۹- مناسب ہو کہ اس موقع پر سورۂ اعراف، رکوع ۸ کے حواشی پیشِ نظر رکھے جائیں۔

۳۰- یہ وہی بات ہے جو اس سورہ کے آغاز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔

۳۱- وہی جاہلانہ اعتراض جو مکے کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص ہماری ہی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا اور جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ یٰسین، حاشیہ ۱۱)

۳۲- یہ بھی وہی بات ہے جو مکے کے بڑے لوگ اور اُونچے طبقے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ اِن کے ساتھ ہے کون؟ یا تو چند سر پھرے لڑکے ہیں جنھیں دُنیا کا کچھ تجربہ نہیں، یا کچھ غلام اور ادنیٰ طبقے کے عوام ہیں جو عقل سے کورے اور ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ انعام، حواشی ۳۴ تا ۳۷ و سورۂ یونس، حاشیہ ۷۸)

۳۳- یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم پر خدا کا فضل ہے اور اس کی رحمت ہے اور وہ لوگ خدا کے غضب میں مبتلا ہیں جنھوں نے ہمارا راستہ اختیار نہیں کیا ہے، تو اس کی کوئی علامت ہمیں نظر نہیں آتی۔ فضل اگر ہے تو ہم پر ہے کہ مال و دولت اور خدم و حشم رکھتے ہیں اور ایک دنیا ہماری سرداری مان رہی ہے۔ تم ٹٹ پُونجیے لوگ آخر کس چیز میں ہم سے بڑھے ہوئے ہو کہ تمھیں خدا کا چہیتا سمجھا جائے۔

۳۴- یہ وہی بات ہے جو ابھی پچھلے رُکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہوائی جا چکی ہے کہ پہلے مَیں خود آفاق و انفُس میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر توحید کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (یعنی وحی) سے مجھے نوازا اور ان حقیقتوں کا براہِ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہلے سے گواہی دے رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام پیغمبر نبوت سے قبل اپنے غور و فکر سے ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان کو منصبِ نبوت عطا کرتے وقت ایمان بالشہادت عطا کرتا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا
بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ
قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ
اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

اور اے برادرانِ قوم! مَیں اِس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا،[۳۵] میرا اجر تو اللہ کے ذمّے ہے۔ اور میں اُن لوگوں کو دھکّے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں[۳۶] مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔[۳۷] اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو

۳۵– یعنی مَیں ایک بے غرض ناصح ہوں۔ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی بھلے کے لیے یہ ساری مشقّتیں اور تکلیفیں برداشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی مفاد کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس امرِ حق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ محنتیں کرنے اور مصیبتیں جھیلنے میں میرے پیشِ نظر ہو۔ (ملاحظہ ہو: المؤمنون، حاشیہ ۷۰۔ یٰسین حاشیہ ۱۷۔ الشّوریٰ، حاشیہ ۴۱)

۳۶– یعنی ان کی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہے وہ ان کے رب کو معلوم ہے اور اسی کے حضور جا کر وہ کھلے گی۔ اگر یہ قیمتی جواہر ہیں تو میرے اور تمھارے پھینک دینے سے پتھر نہ ہو جائیں گے، اور اگر یہ بے قیمت پتھر ہیں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ انھیں جہاں چاہے پھینکے۔ (مُلاحظہ ہو: الانعام، آیت ۵۲۔ الکہف، آیت ۲۸)

۳۷– یہ اس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم بس اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر حضرت نوحؑ فرماتے ہیں کہ واقعی مَیں ایک انسان ہی ہوں، میں نے انسان کے سوا کچھ اور ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا کہ تم مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اس کی آزمائش تم جس طرح چاہو کرلو۔ مگر اس دعوے کی آزمائش کا آخر یہ کون سا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پوچھتے ہو اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے

تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا
فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲
قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳
وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ
يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ قف وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴ ۭ

تمھاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔“

آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ ”اے نوحؑ! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کرلیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو۔“ نوحؑ نے جواب دیا: ”وہ تو اللہ ہی لائے گا، اگر چاہے گا، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو۔ اب اگر میں تمھاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب کہ اللہ ہی نے تمھیں بھٹکا دینے کا ارادہ کرلیا ہو،[۳۸] وہی تمھارا رب ہے اور اُسی کی طرف تمھیں پلٹنا ہے۔“

کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کُنجیاں میرے پاس ہیں، اور کبھی اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہوں، گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدّن میں صحیح رہبری کا دعویٰ کیا ہے اس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو پوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹڑا جنے گی یا پڑیا۔ گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اُصولِ اخلاق وتمدّن بتانے کا کوئی تعلق بھینس کے حمل سے بھی ہے! (مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حاشیہ ۳۱، ۳۲)

۳۸ — یعنی اگر اللہ نے تمھاری ہٹ دھرمی، شر پسندی اور خیر سے بے رغبتی دیکھ کر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تمھیں راست روی کی توفیق نہ دے اور جن راہوں میں تم خود بھٹکنا چاہتے ہو انھی میں تم کو بھٹکا دے، تو اب تمھاری بھلائی کے لیے میری کوئی

Maktaba Tul Ishaat.com

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا
بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۟۳۵ وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ ع
قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۟ۚۖ۳۶ وَ
اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ

اَے محمدؐ! کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو: ''اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جُرم کی ذمہ داری ہے، اور جو جُرم تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بَری ہوں [۳۹]۔'' ع

نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتُوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو، جن لوگوں نے ظلم کیا ہے اُن کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا،

کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔

۳۹- اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوحؑ کا یہ قصّہ سنتے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوگا کہ محمدؐ یہ قصّے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتا ہے کہ انھیں ہم پر چسپاں کرے۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہِ راست نہیں کرنا چاہتا ان کے لیے ایک قصّہ گھڑتا ہے اور اس طرح ''در حدیثِ دیگراں'' کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے۔ لہٰذا سلسلۂ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اِس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے بُرے پہلو کی طرف جایا کرتا ہے اور اچھائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پہلو پر ان کی نظر جا سکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے یا وہ تمھیں کوئی مفید سبق دے رہا ہے، یا تمھاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے، تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو۔ مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں برائی کا کوئی ایسا پہلو تلاش کرے گا جس سے حکمت اور نصیحت پر پانی پھیر دے اور نہ صرف خود اپنی بُرائی پر قائم رہے بلکہ قائل کے ذمے بھی اُلٹی کچھ بُرائی لگا دے۔ بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جا سکتی ہے اگر سننے والا اسے خیر خواہی کے بجائے ''چوٹ'' کے معنی میں لے لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس و ادراک کے بجائے برا ماننے کی طرف چل پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی فکر

اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۖ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ
مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا
نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ
عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں۔[۴۰]

نُوح کشتی بنارہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اس نے کہا: "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں، عنقریب تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔"[۴۱]

کی بنا ایک بنیادی بدگمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقتِ واقعی ہونے اور ایک بناوٹی داستان ہونے کا یکساں امکان ہو، مگر وہ ٹھیک ٹھیک تمھارے حال پر چسپاں ہو رہی ہو اور اس میں تمھاری کسی غلطی کی نشان دہی ہوتی ہو، تو تم ایک دانش مند آدمی ہو گے اگر اُسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اٹھاؤ گے، اور محض ایک بدگمان و کج نظر آدمی ہو گے اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگا دو گے کہ قائل نے محض ہم پر چسپاں کرنے کے لیے یہ قصّہ تصنیف کر لیا ہے۔ اسی بنا پر یہ فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے تو اپنے جرم کا میں ذمہ دار ہوں، لیکن جس جُرم کا تم ارتکاب کر رہے ہو وہ تو اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

۴۰ – اس سے معلوم ہُوا کہ جب نبی کا پیغام کسی قوم کو پہنچ جائے تو اسے صرف اُس وقت تک مہلت ملتی ہے جب تک اس میں کچھ بھلے آدمیوں کے نکل آنے کا امکان باقی ہو۔ مگر جب اس کے صالح اجزا سب نکل چکتے ہیں اور وہ صرف فاسد عناصر ہی کا مجموعہ رہ جاتی ہے تو اللہ اس قوم کو پھر کوئی مہلت نہیں دیتا اور اس کی رحمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ سڑے ہوئے پھلوں کے اس ٹوکرے کو دور پھینک دیا جائے تاکہ وہ اچھے پھلوں کو بھی خراب نہ کر دے۔ پھر اس پر رحم کھانا ساری دُنیا کے ساتھ اور آنے والی انسانی نسلوں کے ساتھ بے رحمی ہے۔

۴۱ – یہ ایک عجیب معاملہ ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دُنیا کے ظاہر سے کس قدر دھوکا کھاتا ہے۔ جب نوح علیہ السلام دریا سے بہت دُور خشکی پر اپنا جہاز بنا رہے ہوں گے تو فی الواقع لوگوں کو یہ ایک نہایت مضحکہ خیز فعل محسوس ہوتا ہوگا اور وہ ہنس ہنس کر کہتے ہوں گے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر کو یہاں تک پہنچی کہ اب آپ خشکی میں جہاز چلائیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا [۴۲] تو ہم نے کہا: ”ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اپنے گھر والوں کو بھی ـــــ سوائے اُن اشخاص کے جن کی نشان دِہی پہلے کی جا چکی ہے [۴۳] ـــــ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں [۴۴]۔“ اور تھوڑے ہی

اس وقت کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی ہوگی کہ چند روز بعد واقعی یہاں جہاز چلے گا۔ وہ اس فعل کو حضرت نوحؑ کی خرابیِ دماغ کا ایک صریح ثبوت قرار دیتے ہوں گے اور ایک ایک سے کہتے ہوں گے کہ اگر پہلے تمھیں اس شخص کے پاگل پن میں کچھ شبہ تھا تو لو، اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے۔ لیکن جو شخص حقیقت کا علم رکھتا تھا اور جسے معلوم تھا کہ کل یہاں جہاز کی کیا ضرورت پیش آنے والی ہے، اسے ان لوگوں کی جہالت و بے خبری پر اور پھر ان کے احمقانہ اطمینان پر اُلٹی ہنسی آتی ہوگی اور وہ کہتا ہوگا کہ کس قدر نادان ہیں یہ لوگ کہ شامت ان کے سر پر تُلی کھڑی ہے، میں انھیں خبردار کر چکا ہوں کہ وہ بس آیا چاہتی ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری بھی کر رہا ہوں، مگر یہ مطمئن بیٹھے ہیں اور اُلٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملے کو اگر پھیلا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا کے ظاہر ومحسوس پہلو کے لحاظ سے عقل مندی و بے وقوفی کا جو معیار قائم کیا جاتا ہے، وہ اُس معیار سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو علمِ حقیقت کے لحاظ سے قرار پاتا ہے۔ ظاہر بیں آدمی جس چیز کو انتہائی دانش مندی سمجھتا ہے، وہ حقیقت شناس آدمی کی نگاہ میں انتہائی بے وقوفی ہوتی ہے، اور ظاہر بیں کے نزدیک جو چیز بالکل لغو، سراسر دیوانگی اور نرا مضحکہ ہوتی ہے، حقیقت شناس کے لیے وہی کمالِ دانش، انتہائی سنجیدگی اور عین مقتضائے عقل ہوتی ہے۔

۴۲ – اس کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو قرآن کے صریح الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتدا ایک خاص تنور سے ہوئی، جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ یہاں صرف تنور کے اُبل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورۂ قمر میں اس کی تفصیل دی گئی ہے کہ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ”ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیے جن سے لگاتار بارش برسنے لگی اور زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے پھوٹ نکلے، اور یہ دونوں طرح کے پانی اُس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا۔“ نیز لفظ تنور پر الف لام داخل کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنور کو اس کام کی ابتدا کے لیے نامزد فرما دیا تھا، جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر اُبل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنور کی حیثیت

مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ
مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِىَ تَجْرِىْ بِهِمْ فِىْ مَوْجٍ
كَالْجِبَالِ قف وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ
لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِىْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِىْ مِنَ الْمَآءِ ؕ

قرأ حفص بفتح الميم وامالة الراء ۱۲

لوگ تھے جو نوحؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوحؑ نے کہا: "سوار ہو جاؤ اِس میں، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھیرنا بھی، میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔[۴۵]"

کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اُٹھ رہی تھی۔ نوحؑ کا بیٹا دُور فاصلے پر تھا۔ نُوحؑ نے پکار کر کہا: "بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جا، کافروں کے ساتھ نہ رہ۔" اُس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔"

سے معروف ہو گیا۔ سورۂ مؤمنون، آیت ۲۷ میں تصریح ہے کہ اس تنور کو پہلے سے نامزد کر دیا گیا تھا۔

۴۳ - یعنی تمھارے گھر کے جن افراد کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں ہیں، انھیں کشتی میں نہ بٹھاؤ۔ غالباً یہ دو ہی شخص تھے۔ ایک حضرت نوحؑ کا بیٹا جس کے غرق ہونے کا ابھی ذکر آتا ہے۔ دوسری حضرت نوحؑ کی بیوی جس کا ذکر سورۂ تحریم میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے افرادِ خاندان بھی ہوں، مگر قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

۴۴ - اس سے اُن مؤرخین اور علمائے انساب کے نظریے کی تردید ہوتی ہے جو تمام انسانی نسلوں کا شجرۂ نسب حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں تک پہنچاتے ہیں۔ دراصل اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ اس طوفان سے حضرت نوحؑ اور ان کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا (ملاحظہ ہو: بائبل کی کتاب پیدائش ۶:۱۸ و ۷:۷ و ۹:۱ و ۹:۱۹)۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر اس کی تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے خاندان کے سوا اُن کی قوم کی ایک مُعتدبہ تعداد کو بھی، اگرچہ وہ تھوڑی تھی، اللہ نے طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف نوحؑ کی اولاد نہیں بلکہ اُن سب لوگوں کی اولاد قرار دیتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کشتی میں بچایا تھا۔ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ (بنی اسرائیل، آیت ۳)، اور مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ (مریم، آیت ۵۸)

۴۵ - یہ ہے مومن کی اصلی شان۔ وہ عالمِ اسباب میں ساری تدابیر قانونِ فطرت کے مطابق اسی طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہلِ دُنیا کرتے ہیں، مگر اس کا بھروسا اُن تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ پر ہوتا ہے اور وہ خوب سمجھتا ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ
بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ
مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ ع

نوحؑ نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے۔" اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔

حکم ہُوا: "اے زمین! اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان! رُک جا۔" چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا، فیصلہ چُکا دیا گیا، کشتی جُودی پر ٹِک گئی،[۴۶] اور کہہ دیا گیا کہ دُور ہوئی ظالموں کی قوم!

شروع ہو سکتی ہے، نہ ٹھیک چل سکتی ہے اور نہ آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے جب تک اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم شاملِ حال نہ ہو۔

۴۶ – جُودی پہاڑ کُردستان کے علاقے میں جزیرۂ ابنِ عمر کے شمالی مشرقی جانب واقع ہے۔ بائبل میں اس کشتی کے ٹھیرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے، جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلۂ کوہستان کا نام بھی۔ سلسلۂ کوہستان کے معنیٰ میں جس کو اراراط کہتے ہیں، وہ آرمینیا کی سطحِ مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کُردستان تک چلتا ہے، اور جبل الجُودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جُودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھیرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیحؑ سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسُس (Berasus) نے پُرانی کِلدانی رِوایات کی بنا پر اپنے مُلک کی جو تاریخ لکھی ہے، اس میں وہ کشتیِ نوحؑ کے ٹھیرنے کا مقام جُودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں، جنھیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔

یہ طوفان جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، عالم گیر طوفان تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوحؑ کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہُوا۔ اسرائیلی رِوایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام رُوئے زمین پر آیا تھا (پیدائش ۷: ۱۸-۲۴)۔ مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی

وَنَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ
الۡحَـقُّ وَاَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰـنُوۡحُ اِنَّهٗ لَـيۡسَ مِنۡ
اَهۡلِكَ‌ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ‌ ‌ۖ فَلَا تَسۡـئَلۡنِ مَا لَـيۡسَ لَكَ

نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا: "اے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے[47] اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔"[48] جواب میں ارشاد ہوا: "اے نوحؑ! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے،[49] لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت

نسلیں انھی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بچا لیے گئے تھے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام رُوئے زمین پر آیا ہو، کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اُس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطّے تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا، اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بتدریج تمام دنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریے کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے: ایک یہ کہ دِجلہ و فُرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے، آثارِ قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن رُوئے زمین کے تمام خطّوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالم گیر طوفان کا یقین کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفانِ عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتّٰی کہ آسٹریلیا، امریکا اور نیوگنی جیسے دُور دراز علاقوں کی پُرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آبا و اجداد ایک ہی خطے میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا، اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو یہ روایات ان کے ساتھ گئیں۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ نمبر ۴۷)

۴۷ – یعنی تُو نے وعدہ کیا تھا کہ میرے گھر والوں کو اس تباہی سے بچا لے گا، تو میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں ہی میں سے ہے، لہٰذا اسے بھی بچا لے۔

۴۸ – یعنی تیرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے، جس کی کوئی اپیل نہیں۔ اور تو جو فیصلہ بھی کرتا ہے خالص علم اور کامل انصاف کے ساتھ کرتا ہے۔

۴۹ – یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کے جسم کا کوئی عضو سڑ گیا ہو اور ڈاکٹر نے اس کو کاٹ پھینکنے کا فیصلہ کیا ہو۔ اب وہ مریض ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ یہ تو میرے جسم کا ایک حصّہ ہے، اسے کیوں کاٹتے ہو۔ اور ڈاکٹر اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ تمھارے جسم کا حصّہ نہیں ہے، کیونکہ یہ سڑ چکا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ فی الواقع وہ سڑا ہوا عُضو جسم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہوگا کہ تمھارے جسم کے لیے جو اعضا مطلوب ہیں وہ تندرست اور کار آمد عضو ہیں نہ کہ سڑے ہوئے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ

تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔“[50] نوحؑ نے فوراً عرض کیا:

اعضا جو خود بھی کسی کام کے نہ ہوں اور باقی جسم کو بھی خراب کر دینے والے ہوں۔ لہٰذا جو عضو بگڑ چکا ہے، وہ اب اُس مقصد کے لحاظ سے تمھارے جسم کا ایک حصہ نہیں رہا جس کے لیے اعضا سے جسم کا تعلق مطلوب ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک صالح باپ سے یہ کہنا کہ یہ بیٹا تمھارے گھر والوں میں سے نہیں ہے کیونکہ اخلاق و عمل کے لحاظ سے بگڑ چکا ہے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کے بیٹا ہونے کی نفی کی جا رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ بگڑا ہوا انسان تمھارے صالح خاندان کا فرد نہیں ہے۔ وہ تمھارے نسبی خاندان کا ایک رکن ہو تو ہوا کرے، مگر تمھارے اخلاقی خاندان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور آج جو فیصلہ کیا جا رہا ہے، وہ نسلی یا قومی نزاع کا نہیں ہے کہ ایک نسل والے بچائے جائیں اور دوسری نسل والے غارت کر دیے جائیں، بلکہ یہ کفر و ایمان کی نزاع کا فیصلہ ہے، جس میں صرف صالح بچائے جائیں گے اور فاسد مٹا دیے جائیں گے۔

بیٹے کو بگڑا ہُوا کام کہہ کر ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ ظاہر بین آدمی اولاد کو صرف اس لیے پرورش کرتا ہے اور اسے محبوب رکھتا ہے کہ وہ اس کی صُلب سے یا اس کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ صالح ہو یا غیر صالح۔ لیکن مومن کی نگاہ تو حقیقت پر ہونی چاہیے۔ اُسے تو اولاد کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ چند انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے فطری طریقے سے میرے سُپرد کیا ہے، تاکہ ان کو پال پوس کر اور تربیت دے کر اُس مقصد کے لیے تیار کروں جس کے لیے اللہ نے دُنیا میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اب اگر اس کی تمام کوششوں اور محنتوں کے باوجود کوئی شخص جو اس کے گھر پیدا ہوا تھا، اس مقصد کے لیے تیار نہ ہو سکا اور اپنے اُس رب ہی کا وفادار خادم نہ بنا جس نے اس کو مومن باپ کے حوالے کیا تھا، تو اس باپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی ساری محنت و کوشش ضائع ہو گئی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسی اولاد کے ساتھ اسے کوئی دل بستگی ہو۔

پھر جب یہ معاملہ اولاد جیسی عزیز ترین چیز کے ساتھ ہے تو دوسرے رشتہ داروں کے متعلق مومن کا نقطۂ نظر جو کچھ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ایمان ایک فکری و اخلاقی صفت ہے۔ مومن اسی صفت کے لحاظ سے مومن کہلاتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ مومن ہونے کی حیثیت سے اس کا کوئی رشتہ بجز اخلاقی و ایمانی رشتے کے نہیں ہے۔ گوشت پوست کے رشتہ دار اگر اس صفت میں اس کے ساتھ شریک ہیں تو یقیناً وہ اس کے رشتہ دار ہیں، لیکن اگر وہ اس صفت سے خالی ہیں تو مومن محض گوشت پوست کی حد تک ان سے تعلق رکھے گا، اس کا قلبی و روحی تعلق ان سے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایمان و کفر کی نزاع میں وہ مومن کے مدِمقابل آئیں تو اس کے لیے وہ اور اجنبی کافر یکساں ہوں گے۔

۵۰ – اس ارشاد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ حضرت نوحؑ کے اندر رُوحِ ایمان کی کمی تھی، یا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شائبہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاؑ بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اُس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی

رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا
تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۴۷ قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ
بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ
سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۴۸ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ
الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ

”اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اِس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تُو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔“[51]

حکم ہُوا: ”اے نوحؑ! اُتر[52] جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامانِ زندگی بخشیں گے پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔“

اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے

جیسا اعلیٰ واشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیارِ مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تامّل نہیں ہوتا۔ حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارے سے کلیجا منہ کو آ رہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انھیں مُتنبّہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا، اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمھاری صُلب سے پیدا ہوا ہے، محض ایک جاہلیّت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اُس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔

۵۱ – پسرِ نوحؑ کا یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤثر پیرایے میں یہ بتایا ہے کہ اُس کا انصاف کس قدر بے لاگ اور اس کا فیصلہ کیسا دو ٹوک ہوتا ہے۔ مشرکینِ مکہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں مگر ہم پر خدا کا غضب نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور فلاں فلاں دیویوں اور دیوتاؤں کے متوسّل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی ایسے ہی کچھ گمان تھے اور ہیں۔ اور بہت سے غلط کار مسلمان بھی اس قسم کے جھوٹے بھروسوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں حضرت کی اولاد اور فلاں حضرت

Maktaba Tul Ishaat.com

قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝٤٩ وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ
هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝٥٠ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى
الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٥١ وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ

ع ۹ معانقة

الوقف علیٰ قاصبر احسن والیٰ ۱۲

اور نہ تمھاری قوم۔ پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے۔[53]

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہُودؑ کو بھیجا۔[54] اُس نے کہا: "اَے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، تمھارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔[55] اَے برادرانِ قوم! اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟[56] اور اَے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر

کے دامن گرفتہ ہیں، ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے بچا لے گی۔ لیکن یہاں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لختِ جگر کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے اور تڑپ کر بیٹے کی معافی کے لیے درخواست کرتا ہے، لیکن دربارِ خداوندی سے اُلٹی اس پر ڈانٹ پڑ جاتی ہے اور باپ کی پیغمبری بھی ایک بدعمل بیٹے کو عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

۵۲ – یعنی اُس پہاڑ سے جس پر کشتی ٹھیری تھی۔

۵۳ – یعنی جس طرح نوحؑ اور ان کے ساتھیوں ہی کا آخرِ کار بول بالا ہُوا، اسی طرح تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا بھی ہوگا۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ ابتدائے کار میں دشمنانِ حق خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخری کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جو خدا سے ڈر کر فکر و عمل کی غلط راہوں سے بچتے ہوئے مقصدِ حق کے لیے کام کرتے ہیں۔ لہٰذا اِس وقت جو مصائب و شدائد تم پر گزر رہے ہیں، جن مشکلات سے تم دوچار ہو رہے ہو اور تمھاری دعوت کو دبانے میں تمھارے مخالفوں کو بظاہر جو کامیابی ہوتی نظر آ رہی ہے، اس پر بددل نہ ہو بلکہ ہمت اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے چلے جاؤ۔

۵۴ – سورۂ اعراف، رُکوع ۵ کے حواشی پیشِ نظر رہیں۔

۵۵ – یعنی وہ تمام دوسرے معبُود جن کی تم بندگی و پرستش کر رہے ہو، حقیقت میں کسی قسم کی بھی خدائی صفات اور طاقتیں نہیں رکھتے۔ بندگی و پرستش کا کوئی استحقاق ان کو حاصل نہیں ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبُود بنا رکھا ہے اور بلاوجہ اُن سے حاجت روائی کی آس لگائے بیٹھے ہو۔

مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾
اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ
اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ
فَكِيْدُوْنِىْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىْ
وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰي صِرَاطٍ

تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، اور تجھ پر ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اُوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔[59]"

ہُودؑ نے کہا: "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں[60]۔ اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا ہے، اس سے میں بیزار ہوں[61]۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اُٹھا رکھو اور مجھے ذرا مُہلت نہ دو[62]، میرا بھروسا اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی

---

۵۸ – یعنی ایسی کوئی کھُلی علامت یا ایسی کوئی واضح دلیل جس سے ہم غیر مُشتبہ طور پر معلوم کر لیں کہ اللہ نے تجھے بھیجا ہے اور جو بات تُو پیش کر رہا ہے وہ حق ہے۔

۵۹ – یعنی تو نے کسی دیوی یا دیوتا یا کسی حضرت کے آستانے پر کچھ گستاخی کی ہوگی، اسی کا خمیازہ ہے جو تو بھگت رہا ہے کہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے اور وہی بستیاں جن میں کل تُو عزت کے ساتھ رہتا تھا، آج وہاں گالیوں اور پتھروں سے تیری تواضع ہو رہی ہے۔

۶۰ – یعنی تم کہتے ہو کہ میں کوئی شہادت لے کر نہیں آیا، حالانکہ چھوٹی چھوٹی شہادتیں پیش کرنے کے بجائے میں تو سب سے بڑی شہادت اس خدا کی پیش کر رہا ہوں جو اپنی ساری خدائی کے ساتھ کائناتِ ہستی کے ہر گوشے اور ہر جلوے میں اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ جو حقیقتیں میں نے تم سے بیان کی ہیں، وہ سراسر حق ہیں، ان میں جھوٹ کا کوئی شائبہ تک نہیں، اور جو تصورات تم نے قائم کر رکھے ہیں، وہ بالکل افترا ہیں، سچائی ان میں ذرہ برابر بھی نہیں۔

۶۱ – یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ فرمایا: میرا بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ۝۵۲ قَالُوۡا يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ

اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۵۷۔ مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔"
انھوں نے جواب دیا: "اے ہُودؑ! تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے،۵۸ اور

۵۶ – یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے جس میں ایک بڑا اِستدلال سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بات کو جس طرح سرسری طور پر تم نظر انداز کر رہے ہو اور اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ورنہ اگر تم عقل سے کام لینے والے ہوتے تو ضرور سوچتے کہ جو شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ اور تذکیر و نصیحت کی یہ سب مشقتیں جھیل رہا ہے، جس کی اس تگ و دو میں تم کسی شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں پا سکتے، وہ ضرور اپنے پاس یقین و اِذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے جس کی بنا پر اس نے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر، اپنی دُنیا بنانے کی فکر سے بے پروا ہو کر، اپنے آپ کو اس جوکھم میں ڈالا ہے کہ صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے عقائد، رُسوم اور طرزِ زندگی کے خلاف آواز اُٹھائے اور اس کی بدولت دُنیا بھر کی دشمنی مول لے لے۔ ایسے شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن تو نہیں ہو سکتی کہ بغیر سوچے سمجھے اسے یونہی ٹال دیا جائے اور اس پر سنجیدہ غور و فکر کی ذرا سی تکلیف بھی ذہن کو نہ دی جائے۔

۵۷ – یہ وہی بات ہے جو پہلے رُکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی تھی کہ "اپنے ربّ سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا۔" اس سے معلوم ہُوا کہ آخرت ہی میں نہیں، اس دُنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اُتار چڑھاؤ اخلاقی بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عالَم پر جو فرماں روائی کر رہا ہے، وہ اخلاقی اُصولوں پر مبنی ہے، نہ کہ اُن طبعی اُصولوں پر جو اخلاقی خیر و شر کے امتیاز سے خالی ہوں۔ یہ بات کئی مقامات پر قرآن میں فرمائی گئی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبی کے ذریعے سے خدا کا پیغام پہنچتا ہے تو اس کی قسمت اُس پیغام کے ساتھ معلّق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر رَدّ کر دیتی ہے تو اسے تباہ کر ڈالا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک دفعہ ہے اُس اَخلاقی قانون کی جس پر اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اسی طرح اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جو قوم دُنیا کی خوش حالی سے فریب کھا کر ظلم و معصیت کی راہوں پر چل نکلتی ہے، اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ اپنے اس بُرے انجام کی طرف بگ ٹُٹ چلی جا رہی ہو، اگر وہ اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے، اس کی مُہلتِ عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، ترقی اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٦﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ
وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ
جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ
عَنِيْدٍ ﴿٥٩﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

راہ پر ہے[۶۳]۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو۔ جو پیغام دے کر میں تمھارے پاس بھیجا گیا تھا، وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمھاری جگہ دوسری قوم کو اُٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے[۶۴]۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔"

پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہُودؑ کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انھیں بچا لیا۔

یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی[۶۵]، اور ہر جبّار دشمنِ حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دُنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔

یہ فیصلہ سُن رکھو کہ تمھارے ان معبودوں سے میں قطعی بیزار ہوں۔

۶۲ – یہ ان کے اس فقرے کا جواب ہے کہ ہمارے معبودوں کی تجھ پر مار پڑی ہے۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: یونس، آیت ۷۱)

۶۳ – یعنی وہ جو کچھ کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔ اس کا ہر کام سیدھا ہے۔ اس کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ وہ سراسر حق اور عدل کے ساتھ خدائی کر رہا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم گمراہ و بدکار رہو اور پھر فلاح پاؤ، اور میں راست باز و نیکوکار رہوں اور پھر ٹوٹے میں رہوں۔

۶۴ – یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

۶۵ – اگرچہ ان کے پاس ایک ہی رسول آیا تھا مگر جس چیز کی غرض اس نے دعوت دی تھی، وہ وہی ایک دعوت تھی

Maktaba Tul Ishaat.com

أَلَآ إِنَّ عَادًا كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾ ع وَ
إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَٰلِحًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ
إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ وَٱسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا
فَٱسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّى قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾

ع ۵ وقف لازم

سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دُور پھینک دیے گئے عاد، ہُودؑ کی قوم کے لوگ۔ ؏

اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔[٦٦] اُس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے۔[٦٧] لہٰذا تم اُس سے معافی چاہو[٦٨] اور اُس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دُعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔“[٦٩]

جو ہمیشہ ہر زمانے اور ہر قوم میں خدا کے رسول پیش کرتے رہے ہیں، اسی لیے ایک رسول کی بات نہ ماننے کو سارے رسولوں کی نافرمانی قرار دیا گیا۔

٦٦ – سورۂ اعراف، رکوع ۱۰ کے حواشی پیشِ نظر رہیں۔

٦٧ – یہ دلیل ہے اس دعوے کی جو پہلے فقرے میں کیا گیا تھا کہ اللہ کے سوا تمھارا کوئی خدا اور کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ مشرکین خود بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اللہ ہی ہے۔ اسی مسلّمہ حقیقت پر بِنائے اِستدلال قائم کر کے حضرت صالحؑ ان کو سمجھاتے ہیں کہ جب وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کے بے جان مادّوں کی ترکیب سے تم کو یہ انسانی وجود بخشا، اور وہ بھی اللہ ہی ہے جس نے زمین میں تم کو آباد کیا، تو پھر اللہ کے سوا خدائی اور کس کی ہوسکتی ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ تم اس کی بندگی و پرستش کرو۔

٦٨ – یعنی اب تک جو تم دوسروں کی بندگی و پرستش کرتے رہے ہو، اس جرم کی اپنے رب سے معافی مانگو۔

٦٩ – یہ مشرکین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا رد ہے جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے اور ان اہم اسباب میں سے ایک ہے جنھوں نے ہر زمانے میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں جو رعیت سے دور اپنے محلوں میں دادِ عیش دیا کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی، جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مقربینِ بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے، اور پھر اگر خوش قسمتی سے کسی کی

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ

انھوں نے کہا: ''اے صالحؑ! اس سے پہلے تُو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تُو ہمیں اُن معبُودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے

درخواست ان کے آستانہ بلند پر پہنچ بھی جاتی ہے تو ان کا پندارِ خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کو جواب دیں، بلکہ جواب دینے کا کام مقربین ہی میں سے کسی کے سُپرد کیا جاتا ہے۔ اس غلط گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوندِ عالم کا آستانہ قدس عام انسانوں کی دست رس سے بہت ہی دُور ہے۔ اس کے دربار تک بھلا کسی عامی کی پہنچ کیسے ہوسکتی ہے۔ وہاں تک دعاؤں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہوسکتا، جب تک کہ پاک روحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور اُن مذہبی منصب داروں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں جو اُوپر تک نذریں، نیازیں اور عرضیاں پہنچانے کے ڈھب جانتے ہیں۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبُودوں اور سفارشیوں کا ایک جمِ غفیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ مَہنت گری (Priesthood) کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسّط کے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدائش سے لے کر موت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔

حضرت صالح علیہ السلام جاہلیت کے اس پورے طِلسم کو صرف دو لفظوں سے توڑ پھینکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ قریب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مجیب ہے۔ یعنی تمھارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ تم سے دُور ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ تم براہِ راست اس کو پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کرسکتے۔ وہ اگرچہ بہت بالا و برتر ہے مگر اس کے باوجود وہ تم سے بہت قریب ہے۔ تم میں سے ایک ایک شخص اپنے پاس ہی اس کو پاسکتا ہے، اس سے سرگوشی کرسکتا ہے، خلوت اور جلوت دونوں میں علانیہ بھی اور بصیغۂ راز بھی اپنی عرضیاں خود اس کے حضور پیش کرسکتا ہے۔ اور پھر وہ براہِ راست اپنے ہر بندے کی دُعاؤں کا جواب خود دیتا ہے۔ پس جب سلطانِ کائنات کا دربارِ عام ہر وقت ہر شخص کے لیے کُھلا ہے اور ہر شخص کے قریب ہی موجود ہے، تو یہ تم کس حماقت میں پڑے ہو کہ اس کے لیے واسطے اور وسیلے ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ (نیز ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۸۸)

• ۷ – یعنی تمھاری ہوش مندی، ذکاوت، فراست، سنجیدگی و متانت اور پُروقار شخصیت کو دیکھ کر ہم یہ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ بڑے آدمی ہو گے، اپنی دنیا بھی خوب بناؤ گے اور ہمیں بھی دوسری قوموں اور قبیلوں کے مقابلے میں تمھارے تدبر سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملے گا۔ مگر تم نے یہ توحید و آخرت کا نیا راگ چھیڑ کر تو ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یاد رہے کہ ایسے ہی کچھ خیالات محمدؐ کے متعلق بھی آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے۔ وہ بھی نبوت سے پہلے آپ کی بہترین قابلیتوں کے معترف تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص ایک بہت بڑا تاجر بنے گا اور اس کی بیدار مغزی سے ہم کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ مگر جب ان کی توقعات کے خلاف آپ نے توحید و آخرت اور مکارمِ اخلاق کی دعوت دینی شروع کی تو وہ آپ سے نہ صرف مایوس بلکہ بیزار ہوگئے اور کہنے لگے کہ اچھا خاصا کام کا آدمی تھا، خدا جانے اسے کیا جنون لاحق ہوگیا کہ اپنی زندگی

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ
اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ مِنۡہُ رَحۡمَۃً
فَمَنۡ یَّنۡصُرُنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اِنۡ عَصَیۡتُہٗ ۟ قف فَمَا تَزِیۡدُوۡنَنِیۡ غَیۡرَ

باپ دادا کرتے تھے؟[71] تو جس طریقے کی طرف ہمیں بُلا رہا ہے، اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے، جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔[72]"

صالحؑ نے کہا: "اے برادرانِ قوم! تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا، تو اِس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اُس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ

بھی برباد کی اور ہماری اُمیدوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔

۷۱ - یہ گویا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ معبود کیوں عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پوجا کس لیے ہوتی رہنی چاہیے۔ یہاں جاہلیت اور اسلام کے طرزِ استدلال کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت صالحؑ نے کہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، اور اس پر دلیل یہ دی تھی کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور زمین میں آباد کیا ہے۔ اس کے جواب میں ان کی مشرک قوم کہتی ہے کہ ہمارے یہ معبود بھی مستحقِ عبادت ہیں اور ان کی عبادت ترک نہیں کی جاسکتی، کیونکہ باپ دادا کے وقتوں سے ان کی عبادت ہوتی چلی آرہی ہے۔ یعنی مکھی پر مکھی صرف اس لیے ماری جاتی رہنی چاہیے کہ ابتدا میں کسی بے وقوف نے اس جگہ مکھی مار دی تھی، اور اب اس مقام پر مکھی مارتے رہنے کے لیے اس کے سوا کسی معقول وجہ کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں مدتوں سے مکھی ماری جارہی ہے۔

۷۲ - یہ شبہ اور یہ خلجان کس امر میں تھا؟ اس کی کوئی تصریح یہاں نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلجان میں تو سب پڑ گئے تھے مگر ہر ایک کا خلجان الگ نوعیت کا تھا۔ یہ دعوتِ حق کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ اٹھتی ہے تو لوگوں کا اطمینانِ قلب رخصت ہو جاتا ہے اور ایک عام بے کلی پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ ہر ایک کے احساسات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، مگر اس بے کلی میں سے سب کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل کر رہتا ہے۔ اس سے پہلے جس اطمینان کے ساتھ لوگ اپنی ضلالتوں میں منہمک رہتے تھے اور کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، وہ اطمینان اس دعوت کے اُٹھنے کے بعد باقی نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا۔ نظامِ جاہلیت کی کمزوریوں پر دعوتِ حق کی بے رحم تنقید، اثباتِ حق کے لیے اس کے پُرزور اور دل لگتے دلائل، پھر اس کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا حلم، اس کی شرافتِ نفس، اس کا نہایت کھرا اور راست بازانہ رویّہ اور اس کی وہ زبردست حکیمانہ شان جس کا سکہ بڑے سے بڑے ہٹ دھرم مخالف کے دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے، پھر وقت کی سوسائٹی

تَخۡسِیۡرٍ ﴿۶۳﴾ وَ یٰقَوۡمِ ہٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃً فَذَرُوۡہَا تَاۡکُلۡ فِیۡۤ
اَرۡضِ اللّٰہِ وَ لَا تَمَسُّوۡہَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَکُمۡ عَذَابٌ قَرِیۡبٌ ﴿۶۴﴾
فَعَقَرُوۡہَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِیۡ دَارِکُمۡ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِکَ وَعۡدٌ غَیۡرُ
مَکۡذُوۡبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ
بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا وَ مِنۡ خِزۡیِ یَوۡمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ الۡقَوِیُّ

خسارے میں ڈال دو گے ۔ اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اُونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی ہے۔ اِسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اِس سے ذرا تعرّض نہ کرنا، ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔"

مگر انھوں نے اُونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالحؑ نے اُن کو خبردار کر دیا کہ "بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی۔"

آخرکار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالحؑ کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اُس دن کی رُسوائی سے ان کو محفوظ رکھا ۔ بیشک تیرا رب ہی دراصل طاقتور

میں سے بہترین عناصر کا اس سے متاثر ہوتے چلے جانا اور ان کی زندگیوں میں دعوتِ حق کی تاثیر سے غیر معمولی انقلاب رُونما ہونا، یہ ساری چیزیں مل جل کر ان سب لوگوں کے دلوں کو بے چین کر ڈالتی ہیں جو حق آ جانے کے بعد بھی پرانی جاہلیت کا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔

۷۳ — یعنی اگر میں اپنی بصیرت کے خلاف اور اُس علم کے خلاف جو اللہ نے مجھے دیا ہے، محض تم کو خوش کرنے کے لیے گمراہی کی راہ اختیار کر لوں تو یقین نہیں کہ خدا کی پکڑ سے تم مجھ کو بچا نہ سکو گے، بلکہ تمھاری وجہ سے میرا جرم اور زیادہ سخت ہو جائے گا کیونکہ میں جانتے بوجھتے اس بات کا مزید سزاوار ہوں گا کہ میں نے تم کو سیدھا راستہ بتانے کے بجائے تمھیں جان بوجھ کر گمراہ کیا۔

۷۴ — جزیرہ نمائے سینا میں جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ثمود پر عذاب آیا تو حضرت صالحؑ ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ والے پہاڑ کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام نبی صالح ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہی جگہ آنجناب کی جائے قیام تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۗ
اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾ ع ٦ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى
قَالُوْا سَلٰمًا ۗ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾
فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۗ
قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ

اور بالا دست ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا تھا، تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دُور پھینک دیے گئے ثمود! ع

اور دیکھو، ابراہیمؑ کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا: تم پر سلام ہو۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا: تم پر بھی سلام ہو۔[۷۵] پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیمؑ ایک بُھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مُشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔[۷۶] اُنھوں نے کہا: ”ڈرو نہیں، ہم تو لوطؑ کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔“[۷۷] ابراہیمؑ کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

۷۵ – اس سے معلوم ہُوا کہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں انسانی صورت میں پہنچے تھے اور ابتداءً انھوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے خیال کیا کہ یہ کوئی اجنبی مہمان ہیں، اور ان کے آتے ہی فوراً ان کی ضیافت کا انتظام فرمایا۔

۷۶ – بعض مفسّرین کے نزدیک یہ خوف اس بنا پر تھا کہ جب ان اجنبی نو واردوں نے کھانے میں تأمّل کیا تو حضرت ابراہیمؑ کو ان کی نیت پر شبہ ہونے لگا اور آپ اس خیال سے اندیشہ ناک ہوئے کہ کہیں یہ کسی دشمنی کے ارادے سے تو نہیں آئے ہیں، کیونکہ عرب میں جب کوئی شخص کسی کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کرتا تو اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ قتل و غارت کی نیت سے آیا ہے۔ لیکن بعد کی آیت اس تفسیر کی تائید نہیں کرتی۔

فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾
قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا

وہ یہ سُن کر ہنس دی۔[78] پھر ہم نے اس کو اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی خوش خبری دی۔[79] وہ بولی: ”ہائے میری کم بختی![80] کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بُڑھیا پھونس ہوگئی اور یہ میرے میاں بھی بُوڑھے ہو چکے؟[81] یہ تو

۷۷- اِس اندازِ کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے کی طرف ان کے ہاتھ نہ بڑھنے سے ہی حضرت ابراہیمؑ تاڑ گئے تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ اور چونکہ فرشتوں کا عَلانیہ انسانی شکل میں آنا غیر معمولی حالات ہی میں ہُوا کرتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ کو خوف جس بات پر ہُوا، وہ دراصل یہ تھی کہ کہیں آپ کے گھر والوں سے یا آپ کی بستی کے لوگوں سے، یا خود آپ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہوگیا ہے جس پر گرفت کے لیے فرشتے اس صورت میں بھیجے گئے ہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو بعض مفسرین نے سمجھی ہے تو فرشتے یوں کہتے کہ ”ڈرو نہیں، ہم تمھارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں“۔ لیکن جب انھوں نے آپ کا خوف دُور کرنے کے لیے کہا کہ ”ہم تو قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں“ تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا فرشتہ ہونا تو حضرت ابراہیمؑ جان گئے تھے، البتہ پریشانی اس بات کی تھی کہ یہ حضرات اس فتنے اور آزمایش کی شکل میں جو تشریف لائے ہیں تو آخر وہ بدنصیب کون ہے جس کی شامت آنے والی ہے۔

۷۸- اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آنے کی خبر سنتے ہی سارا گھر پریشان ہوگیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ پھر جب انھوں نے یہ سُن لیا کہ ان کے گھر پر یا ان کی بستی پر کوئی آفت آنے والی نہیں ہے، تب کہیں ان کی جان میں جان آئی اور وہ خوش ہوگئیں۔

۷۹- فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کے بجائے حضرت سارہؓ کو یہ خوش خبری اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں تو ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہؓ سے سیدنا اسماعیلؑ پیدا ہو چکے تھے، مگر حضرت سارہؓ اس وقت تک بے اولاد تھیں اور اس بنا پر دل انھی کا زیادہ غمگین تھا۔ ان کے اس غم کو دُور کرنے کے لیے فرشتوں نے انھیں صرف یہی خوش خبری نہیں سنائی کہ تمھارے ہاں اسحاقؑ جیسا جلیل القدر بیٹا پیدا ہوگا، بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس بیٹے کے بعد پوتا بھی یعقوبؑ جیسا عالی شان پیغمبر ہوگا۔

۸۰- اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت سارہؓ فی الواقع اس پر خوش ہونے کے بجائے اُلٹی اس کو کم بختی سمجھتی تھیں۔ بلکہ دراصل یہ اس قسم کے الفاظ میں سے ہے جو عورتیں بالعموم تعجب کے مواقع پر بولا کرتی ہیں اور جن سے لُغوی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ محض اظہارِ تعجب مقصود ہوتا ہے۔

۸۱- بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت ۱۰۰ برس اور حضرت سارہؓ کی عمر ۹۰ برس کی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ
بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ
عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ؕ
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ
اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

بڑی عجیب بات ہے۔" فرشتوں نے کہا: "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟[۸۲] ابراہیمؑ کے گھر والو! تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں، اور یقیناً اللہ نہایت قابلِ تعریف اور بڑی شان والا ہے۔"

پھر جب ابراہیمؑ کی گھبراہٹ دُور ہوگئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہوگیا تو اس نے قومِ لوطؑ کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔[۸۳] حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رُجوع کرتا تھا۔ (آخرِ کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا:) "اے ابراہیمؑ! اس سے باز آجاؤ، تمھارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے نہیں پھر سکتا۔"[۸۴]

۸۲ – مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عادتاً اس عمر میں انسان کے ہاں اولاد نہیں ہُوا کرتی، لیکن اللہ کی قدرت سے ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ اور جب کہ یہ خوش خبری تم کو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم جیسی ایک مومنہ اس پر تعجب کرے۔

۸۳ – "جھگڑے" کا لفظ اس موقع پر اُس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لفظ سے یہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیر تک رَدّوکَد جاری رہتی ہے۔ بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قومِ لوطؑ پر سے عذاب ٹال دیا جائے۔ خدا جواب میں کہہ رہا ہے کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد سے گزر چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جاسکے۔ مگر بندہ ہے کہ پھر یہی کہے جاتا ہے کہ "پروردگار! اگر کچھ تھوڑی سی بھلائی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مُہلت دے دے، شاید کہ وہ بھلائی پھل لے آئے۔" بائبل میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے، لیکن قرآن کا مُجمل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: کتابِ پیدائش، باب ۱۸، آیت ۲۳-۳۲)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ

اور جب ہمارے فرشتے لُوطؑ کے پاس پہنچے[۸۵] تو اُن کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہُوا اور

۸۴- اس سلسلۂ بیان میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ واقعہ، خُصوصاً قوم لوطؑ کے قصّے کی تمہید کے طور پر، بظاہر کچھ بے جوڑ سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اُس مقصد کے لحاظ سے نہایت برمحل ہے جس کے لیے پچھلی تاریخ کے یہ واقعات یہاں بیان کیے جارہے ہیں۔ اس کی مناسبت سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل دو باتوں کو پیشِ نظر رکھیے:

(۱) مخاطَب قریش کے لوگ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی وجہ ہی سے تمام عرب کے پیرزادے، کعبۃ اللہ کے مجاور اور مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و تمدّنی پیشوائی کے مالک بنے ہوئے ہیں اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہوسکتا ہے جب کہ ہم خدا کے اُس پیارے بندے کی اولاد ہیں اور وہ خدا کے دربار میں ہماری سفارش کرنے کو موجود ہے۔ اس پندارِ غلط کو توڑنے کے لیے پہلے تو انھیں یہ منظر دکھایا گیا کہ حضرت نوحؑ جیسا عظیم الشان پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے اور تڑپ کر خدا سے دُعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچالیا جائے، مگر صرف یہی نہیں کہ اس کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو اُلٹی ڈانٹ سُننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد اب یہ دوسرا منظر خود حضرت ابراہیمؑ کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایاں عنایات ہیں اور نہایت پیار کے انداز میں ان کا ذکر ہورہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیم خلیلؑ انصاف کے معاملے میں دخل دیتے ہیں تو ان کے اصرار و الحاح کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم کے معاملے میں ان کی سفارش کو رد کر دیتا ہے۔

(۲) اس تقریر میں یہ بات بھی قریش کے ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانونِ مکافات، جس سے لوگ بالکل بے خوف اور مطمئن بیٹھے ہوئے تھے، کس طرح تاریخ کے دوران میں تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے اور خود ان کے گرد و پیش اس کے کیسے کھلے کھلے آثار موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں جو حق و صداقت کی خاطر گھر سے بے گھر ہو کر ایک اجنبی ملک میں مقیم ہیں، اور بظاہر کوئی طاقت ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے حُسنِ عمل کا یہ پھل ان کو دیتا ہے کہ بانجھ بیوی کے پیٹ سے بڑھاپے میں اسحاقؑ پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کے ہاں یعقوبؑ کی پیدایش ہوتی ہے، اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے جس کی عظمت کے ڈنکے صدیوں تک اُسی فلسطین و شام میں بجتے رہے جہاں حضرت ابراہیمؑ ایک بے خانماں مہاجر کی حیثیت سے آکر آباد ہوئے تھے۔ دوسری طرف قوم لوطؑ ہے جو اسی سرزمین کے ایک حصے میں اپنی خوش حالی پر مگن اور اپنی بدکاریوں میں مست ہے۔ دُور دُور تک کہیں بھی اس کو اپنی شامتِ اعمال کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں، اور لوطؑ کی نصیحتوں کو وہ چٹکیوں میں اُڑا رہی ہے۔ مگر جس تاریخ کو ابراہیمؑ کی نسل سے ایک بڑی اقبال مند قوم کے اُٹھائے جانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ٹھیک وہی تاریخ ہے جب اِس بدکار قوم کو دُنیا سے نیست و نابود کرنے کا فرمان نافذ ہوتا ہے اور وہ ایسے عبرت ناک طریقے سے فنا کی جاتی ہے کہ آج اس کی بستیوں کا نشان کہیں ڈھونڈے نہیں ملتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَ
مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ
اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ
رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ

کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے[۸۶]۔ (ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دَوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خُوگر تھے۔ لُوطؑ نے ان سے کہا: ”بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں[۸۷]۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟“ انھوں نے جواب دیا: ”تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصّہ نہیں[۸۸] ہے،

---

۸۵ – سورۂ اعراف، رکوع ۱۰ کے حواشی پیشِ نظر رہیں۔

۸۶ – اس قصّے کی جو تفصیلات قرآنِ مجید میں بیان ہوئی ہیں، ان کے فَحوائے کلام سے یہ بات صاف مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لُوط علیہ السلام کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

۸۷ – ہوسکتا ہے کہ حضرت لُوطؑ کا اشارہ قوم کی لڑکیوں کی طرف ہو۔ کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے، اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوطؑ نے ان سے زنا کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ ”یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں“ کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجایش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوطؑ کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوتِ نفس کو اُس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اور اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

۸۸ – یہ فقرہ ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں رہی تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلافِ فطرت راہ پر چل پڑے تھے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اُس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لیے بنا ہی

وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى
رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا
امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ

اور تُو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔‘‘ لوطؑ نے کہا: ’’کاش! میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمہیں سیدھا کر دیتا، یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا۔‘‘ تب فرشتوں نے اس سے کہا کہ ’’اے لوطؑ! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بس تُو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو! تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔[89] مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔[90] ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔

نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو محض نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سُدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سُدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بگڑا ہُوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھے کہ حلال اس کے لیے ہے ہی نہیں، تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دراصل ایک گندہ کیڑا ہے جو غلاظت ہی میں پرورش پاتا ہے اور طَیِّبات سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیڑے اگر کسی صفائی پسند انسان کے گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ پہلی فرصت میں فینائل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔ پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گوارا کر سکتا تھا۔

۸۹ – مطلب یہ ہے کہ اب تم لوگوں کو بس یہ فکر ہونی چاہیے کہ کسی طرح جلدی سے جلدی اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے شور اور دھماکوں کی آوازیں سُن کر راستے میں ٹھیر جاؤ اور جو رقبہ عذاب کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے، اس میں عذاب کا وقت آ جانے کے بعد بھی تم میں سے کوئی رُکا رہ جائے۔

۹۰ – یہ تیسرا عبرت ناک واقعہ ہے جو اِس سورہ میں لوگوں کو یہ سبق دینے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ تم کو کسی بزرگ کی رشتہ داری اور کسی بزرگ کی سِفارش اپنے گناہوں کی پاداش سے نہیں بچا سکتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَهَا
سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾ ۙ
مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ ﴿۸۳﴾ ع وَ
اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ
مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىكُمۡ
بِخَیۡرٍ وَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡكُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ ﴿۸۴﴾ وَ یٰقَوۡمِ
اَوۡفُوا الۡمِكۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تَبۡخَسُوا

النصف ع ۷

—— صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!“

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا اور اس پر پکّی ہوئی مٹّی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے،[91] جن میں سے ہر پتھر تیرے ربّ کے ہاں نشان زدہ تھا۔[92] اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دُور نہیں ہے۔[93] ع

اور مدیَن والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔[94] اُس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادرانِ قوم! ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں

۹۱ - غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشانی انفجار کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اُوپر زور کا پتھراؤ ہوا۔ پکّی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مراد شاید وہ مُتحجّر مٹی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیرِ زمین حرارت اور لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحرِ لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

۹۲ - یعنی ہر ہر پتھر خدا کی طرف سے نامزد کیا ہُوا تھا کہ اسے تباہ کاری کا کیا کام کرنا ہے اور کس پتھر کو کس مجرم پر پڑنا ہے۔

النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ قَالُوْا
يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ

گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور بہرحال میں تمھارے اُوپر کوئی نگرانِ کار نہیں ہوں[95]۔"

انھوں نے جواب دیا: "اے شعیبؑ! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے[96] کہ ہم ان سارے معبُودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے

۹۳ - یعنی آج جو لوگ ظلم کی اس رَوش پر چل رہے ہیں، وہ بھی اس عذاب کو اپنے سے دُور نہ سمجھیں۔ عذاب اگر قومِ لوطؑ پر آ سکتا تھا تو اِن پر بھی آ سکتا ہے۔ خدا کو نہ لوطؑ کی قوم عاجز کر سکی تھی، نہ یہ کر سکتے ہیں۔

۹۴ - سورۂ اَعراف، رکوع ۱۱ کے حواشی پیشِ نظر رہیں۔

۹۵ - یعنی میرا کوئی زور تم پر نہیں ہے۔ میں تو بس ایک خیر خواہ ناصح ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمھیں سمجھا دوں۔ آگے تمھیں اختیار ہے، چاہے مانو، چاہے نہ مانو۔ سوال میری باز پُرس سے ڈرنے یا نہ ڈرنے کا نہیں ہے۔ اصل چیز خدا کی باز پُرس ہے، جس کا اگر تمھیں کچھ خوف ہو تو اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ۔

۹۶ - یہ دراصل ایک طعن آمیز فقرہ ہے جس کی رُوح آج بھی آپ ہر اُس سوسائٹی میں موجود پائیں گے جو خدا سے غافل اور فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہو۔ چونکہ نماز دین داری کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں مظہر ہے، اور دین داری کو فاسق و فاجر لوگ ایک خطرناک، بلکہ سب سے زیادہ خطرناک مرض سمجھتے ہیں، اس لیے نماز ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں عبادت کے بجائے علامتِ مرض شمار ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اپنے درمیان نماز پڑھتے دیکھ کر انھیں فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس شخص پر "مرضِ دین داری" کا حملہ ہو گیا ہے۔ پھر یہ لوگ دین داری کی اس خاصیت کو بھی جانتے ہیں کہ یہ چیز جس شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، وہ صرف اپنے حُسنِ عمل پر قانع نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو بھی دُرست کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور بے دینی و بد اخلاقی پر تنقید کیے بغیر اُس سے رہا نہیں جاتا، اس لیے نماز پر ان کا اضطراب صرف اسی حیثیت سے نہیں ہوتا کہ ان کے ایک بھائی پر دین داری کا دَورہ پڑ گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی انھیں یہ کھٹکا بھی لگ جاتا ہے کہ اب عنقریب اخلاق و دیانت کا وعظ شروع ہونے والا ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں کیڑے نکالنے کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی میں نماز سب سے بڑھ کر طعن و تشنیع کی ہدف بنتی ہے۔ اور اگر کہیں نمازی آدمی ٹھیک ٹھیک اُنھی اندیشوں کے مطابق، جو اس کی نماز سے پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے،

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝۸۷ قَالَ يٰقَوْمِ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ

منشا کے مطابق تصرّف کرنے کا اختیار نہ ہو؟[97] بس تُو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے!"
شعیبؑ نے کہا: "بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کُھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے اپنے ہاں سے مجھ کو اچھا رزق بھی عطا کیا[98] (تو اس کے بعد میں تمھاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں

بُرائیوں پر تنقید اور بھلائیوں کی تلقین بھی شروع کر دے، تب تو نماز اس طرح کوسی جاتی ہے کہ گویا یہ ساری بلا اُسی کی لائی ہوئی ہے۔

۹۷- یہ اسلام کے مقابلے میں جاہلیّت کے نظریّے کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے غلط ہے اور اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ دوسرے کسی طریقے کے لیے عقل، علم اور کُتبِ آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہیں ہونی چاہیے، بلکہ تمدّن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دُنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرُّف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں جاہلیّت کا نظریّہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آ رہا ہو، انسان کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے، اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پاٹ سے ہے، رہے ہماری زندگی کے عام دنیوی معاملات، تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔
اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیّل آج کوئی نیا تخیل نہیں ہے، بلکہ آج سے تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہلِ مغرب اور اُن کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی نئی "روشنی" نہیں ہے جو انسان کو آج "ذہنی ارتقا" کی بدولت نصیب ہوگئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزار ہا برس پہلے کی جاہلیّت میں بھی اِسی شان سے پائی جاتی تھی۔ اور اس کے خلاف اسلام کی کش مکش بھی آج کی نہیں ہے، بہت قدیم ہے۔

۹۸- رزق کا لفظ یہاں دُہرے معنٰی دے رہا ہے۔ اس کے ایک معنٰی تو علمِ حق کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشا گیا ہو۔ اور دوسرے معنٰی وہی ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ ذرائع جو زندگی بسر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ پہلے معنٰی کے لحاظ سے یہ آیت اُسی مضمون کو ادا کر رہی ہے جو اس سورہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نوحؑ اور صالحؑ کی زبان سے ادا ہوتا چلا آیا ہے کہ نبوت سے پہلے بھی میں اپنے رب کی طرف سے حق کی کُھلی کُھلی شہادت اپنے نفس میں اور کائنات کے آثار میں پا رہا تھا، اور اس کے بعد میرے رب نے براہِ راست علمِ حق بھی مجھے دے دیا۔ اب میرے لیے

وَمَآ اُرِيۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰى مَاۤ اَنۡهٰٮكُمۡ عَنۡهُ‌ ؕ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا
الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ‌ ؕ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ
اُنِيۡبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ
قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ‌ ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۹﴾

تمھارا شریکِ حال کیسے ہوسکتا ہوں؟) اور مَیں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں، ان کا خود ارتکاب کروں۔[99] میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں، اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اُسی پر مَیں نے بھروسا کیا اور ہر معاملے میں اسی کی طرف میں رُجوع کرتا ہوں۔ اور اَے برادرانِ قوم! میرے خلاف تمھاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخرِ کار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوطؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔[100]

یہ کس طرح ممکن ہے کہ جان بُوجھ کر اُن گمراہیوں اور بد اخلاقیوں میں تمھارا ساتھ دوں جن میں تم مبتلا ہو۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے یہ آیت اُس طعنے کا جواب ہے جو ان لوگوں نے حضرت شعیبؑ کو دیا تھا کہ ”بس تم ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔“ اس تُند و تُرش حملے کا یہ ٹھنڈا جواب دیا گیا ہے کہ بھائیو! اگر میرے ربّ نے مجھے حق شناس بصیرت بھی دی ہو اور رزقِ حلال بھی عطا کیا ہو تو آخر تمھارے طعنوں سے یہ فضل غیر فضل کیسے ہو جائے گا۔ آخر میرے لیے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے مجھ پر یہ فضل کیا ہے تو میں تمھاری گمراہیوں اور حرام خوریوں کو حق اور حلال کہہ کر اس کی ناشکری کروں۔

۹۹ – یعنی میری سچّائی کا تم اس بات سے اندازہ کر سکتے ہو کہ جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں، اسی پر خود عمل کرتا ہوں۔ اگر میں تم کو غیر اللہ کے آستانوں سے روکتا اور خود کسی آستانے کا مجاور بن بیٹھا ہوتا تو بلاشبہ تم یہ کہہ سکتے تھے کہ اپنی پیری چمکانے کے لیے دوسری دکانوں کی ساکھ بگاڑنا چاہتا ہے۔ اگر میں تم کو حرام کے مال کھانے سے منع کرتا اور خود اپنے کاروبار میں بے ایمانیاں کر رہا ہوتا تو ضرور تم یہ شبہ کر سکتے تھے کہ میں اپنی ساکھ جمانے کے لیے ایمان داری کا ڈھول پیٹ رہا ہوں۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ میں خود ان برائیوں سے بچتا ہوں جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔ میری اپنی زندگی ان دھبّوں سے پاک ہے جن سے تمھیں پاک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے بھی اُسی طریقے کو پسند کیا ہے جس کی تمھیں دعوت دے رہا ہوں۔ یہ چیز اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ میں اپنی اس دعوت میں صادق ہوں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

دیکھو! اپنے ربّ سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبّت رکھتا ہے[۱۰۱]۔‘‘

۱۰۰ – یعنی قومِ لُوطؑ کا واقعہ تو ابھی تازہ ہی ہے اور تمھارے قریب ہی کے علاقے میں پیش آچکا ہے۔ غالبًا اس وقت قومِ لوطؑ کی تباہی پر چھ سات سو برس سے زیادہ نہ گزرے تھے۔ اور جُغرافی حیثیت سے بھی قومِ شعیبؑ کا مُلک اس علاقے سے بالکل متّصل واقع تھا جہاں قومِ لوطؑ رہتی تھی۔

۱۰۱ – یعنی اللہ تعالیٰ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہے۔ اس کو اپنی مخلوقات سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ سزا دینے ہی کو اس کا جی چاہے اور اپنے بندوں کو مار مار کر ہی وہ خوش ہو۔ تم لوگ اپنی سرکشیوں میں جب حد سے گزر جاتے ہو اور کسی طرح فساد پھیلانے سے باز ہی نہیں آتے، تب وہ بادِلِ ناخواستہ تمھیں سزا دیتا ہے۔ ورنہ اس کا حال تو یہ ہے کہ تم خواہ کتنے ہی قصور کر چکے ہو، جب بھی اپنے افعال پر نادم ہو کر اس کی طرف پلٹو گے، اس کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے وسیع پاؤ گے۔ کیونکہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے وہ بے پایاں محبّت رکھتا ہے۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نہایت لطیف مثالوں سے واضح فرمایا ہے۔ ایک مثال تو آپؐ نے یہ دی ہے کہ اگر تم میں سے کسی شخص کا اُونٹ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں کھو گیا ہو اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اسی اُونٹ پر ہو اور وہ شخص اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو، یہاں تک کہ زندگی سے بے آس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ہو، اور عین اس حالت میں یکایک وہ دیکھے کہ اس کا اُونٹ سامنے کھڑا ہے، تو اس وقت جیسی کچھ خوشی اس کو ہوگی، اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ کو اپنے بھٹکے ہوئے بندے کے پلٹ آنے سے ہوتی ہے۔ دوسری مثال اس سے بھی زیادہ مؤثّر ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شِیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا، اور وہ مامتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پا لیتی، اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا: کیا تم لوگ یہ توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے عرض کیا: ہرگز نہیں، خود پھینکنا تو درکنار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک تو اسے بچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گی۔ فرمایا: اللّٰہ ارحم بعبادہٖ من ھٰذہ بولدھا۔ ’’اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔‘‘

اور ویسے بھی غور کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جس نے بچوں کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں محبّت پیدا کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا اس محبّت کو پیدا نہ کرتا تو ماں اور باپ سے بڑھ کر بچوں کا کوئی دشمن نہ ہوتا۔ کیونکہ سب سے بڑھ کر وہ انھی کے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اب ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ جو خدا محبّتِ مادری اور

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ
وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ
اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ

اُنھوں نے جواب دیا: ”اے شعیبؑ! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔[۱۰۲] اور ہم دیکھتے ہیں کہ تُو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے، تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے، تیرا بل بُوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔[۱۰۳]“ شعیبؑ نے کہا: ”بھائیو! کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اَے میری قوم کے لوگو! تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر

شفقتِ پدری کا خالق ہے، خود اُس کے اندر اپنی مخلوق کے لیے کیسی کچھ محبّت موجود ہو گی۔

۱۰۲ – یہ سمجھ میں نہ آنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ حضرت شعیبؑ کسی غیر زبان میں کلام کرتے تھے، یا ان کی باتیں بہت مُغلق اور پیچیدہ ہوتی تھیں۔ باتیں تو سب صاف اور سیدھی ہی تھیں اور اُسی زبان میں کی جاتی تھیں جو یہ لوگ بولتے تھے، لیکن ان کے ذہن کا سانچا اس قدر ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ حضرت شعیبؑ کی سیدھی باتیں کسی طرح اس میں نہ اتر سکتی تھیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جو لوگ تعصّبات اور خواہشِ نفس کی بندگی میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوتے ہیں اور کسی خاص طرزِ خیال پر جامد ہو چکے ہوتے ہیں، وہ اوّل تو کوئی ایسی بات سُن ہی نہیں سکتے جو اُن کے خیالات سے مختلف ہو، اور اگر سُن بھی لیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس دُنیا کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

۱۰۳ – یہ بات پیشِ نظر رہے کہ بعینہٖ یہی صورتِ حال اِن آیات کے نُزول کے وقت مکّے میں درپیش تھی۔ اس وقت قریش کے لوگ بھی اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ آپؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن صرف اس وجہ سے آپؐ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ بنی ہاشم آپؐ کی پشت پر تھے۔ پس حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کا یہ قصہ ٹھیک ٹھیک قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے پر چسپاں کرتے ہوئے بیان کیا جا رہا ہے، اور آگے حضرت شعیبؑ کا

Maktaba Tul Ishaat.com

عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ
هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ
اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا
لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا
وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ
فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ

ع ۸

کرتا رہوں گا، جلدی ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلّت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ چشم براہ ہوں۔"

آخرِ کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیبؑ اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچالیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حسّ و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے، گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔

سنو! مدیَن والے بھی دُور پھینک دیے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے۔ ع

اور موسیٰؑ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کُھلی کُھلی سندِ ماموریّت کے ساتھ فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز

جو انتہائی سبق آموز جواب نقل کیا گیا ہے، اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ اے قریش کے لوگو! تم کو بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے یہی جواب ہے۔

الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝۹۸ وَاُتْبِعُوْا فِيْ
هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝۹۹ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝۱۰۰ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ
وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ

وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں انھیں دوزخ کی طرف لے جائے گا[۱۰۴]۔ کیسی بدتر جائے وُرُود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے! اور ان لوگوں پر دُنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی۔ کیسا بُرا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے!

یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمھیں سُنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا، انھوں نے آپ ہی اپنے اُوپر ستم ڈھایا۔ اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبُود، جنھیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پُکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انھوں نے ہلاکت و

---

۱۰۴ – اس آیت سے اور قرآنِ مجید کی بعض دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دُنیا میں کسی قوم یا جماعت کے رہنما ہوتے ہیں وہی قیامت کے روز بھی اس کے رہنما ہوں گے۔ اگر وہ دُنیا میں نیکی اور سچائی اور حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو جن لوگوں نے یہاں ان کی پیروی کی ہے، وہ قیامت کے روز بھی انھی کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ان کی پیشوائی میں جنّت کی طرف جائیں گے۔ اور اگر وہ دُنیا میں کسی ضلالت، کسی بد اخلاقی یا کسی ایسی راہ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں جو دینِ حق کی راہ نہیں ہے، تو جو لوگ یہاں ان کے پیچھے چل رہے ہیں، وہ وہاں بھی ان کے پیچھے ہوں گے اور انھی کی سرکردگی میں جہنم کا رُخ کریں گے۔ اسی مضمون کی ترجمانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں پائی جاتی ہے کہ امرؤ القیس حامل لواء شعراء الجاھلیة الی النار۔ یعنی ”قیامت کے روز جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا امرؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور عرب جاہلیت کے تمام شعرا اسی کی پیشوائی میں دوزخ کی راہ لیں گے۔“ اب یہ منظر ہر شخص کا اپنا تخیّل اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ سکتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے جلوس کس شان سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لیڈروں نے دُنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور خلافِ حق راہوں پر چلایا ہے، اُن کے پیرو جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ ظالم ہم کو کس خوف ناک انجام کی طرف کھینچ لائے ہیں، تو وہ اپنی ساری مصیبتوں کا ذمّے دار انھی کو سمجھیں گے، اور اُن کا جلوس اس شان سے

Maktaba Tul Ishaat.com

غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ
ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ
عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ

بربادی کے سوا انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔

اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہُوا کرتی ہے۔ فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو عذابِ آخرت کا خوف کرے[105]۔ وہ ایک دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اُس روز ہوگا، سب کی

دوزخ کی راہ پر رواں ہوگا کہ آگے آگے وہ ہوں گے اور پیچھے پیچھے ان کے پیروؤں کا ہجوم ان کو گالیاں دیتا ہوا اور ان پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہُوا جا رہا ہوگا۔ بخلاف اس کے، جن لوگوں کی رہنمائی نے لوگوں کو جنتِ نعیم کا مستحق بنایا ہوگا، ان کے پیرو اپنا یہ انجام خیر دیکھ کر اپنے لیڈروں کو دعائیں دیتے ہوئے اور ان پر مدح و تحسین کے پھول برساتے ہوئے چلیں گے۔

۱۰۵ – یعنی تاریخ کے اِن واقعات میں ایک ایسی نشانی ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ عذابِ آخرت ضرور پیش آنے والا ہے اور اس کے متعلق پیغمبروں کی دی ہوئی خبر سچی ہے۔ نیز اسی نشانی سے وہ یہ بھی معلوم کرسکتا ہے کہ عذابِ آخرت کیسا سخت ہوگا اور یہ علم اس کے دل میں خوف پیدا کر کے اسے سیدھا کر دے گا۔

اب رہی یہ بات کہ تاریخ میں وہ کیا چیز ہے جو آخرت اور اس کے عذاب کی علامت کہی جاسکتی ہے، تو ہر وہ شخص اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے جو تاریخ کو محض واقعات کا مجموعہ ہی نہ سمجھتا ہو بلکہ ان واقعات کی منطق پر بھی کچھ غور کرتا ہوا اور ان سے نتائج بھی اخذ کرنے کا عادی ہو۔ ہزارہا برس کی انسانی تاریخ میں قوموں اور جماعتوں کا اٹھنا اور گرنا جس تسلسل اور باضابطگی کے ساتھ رُونما ہوتا رہا ہے، اور پھر اس گرنے اور اُٹھنے میں جس طرح صریحاً کچھ اخلاقی اسباب کارفرما رہے ہیں، اور گرنے والی قومیں جیسی جیسی عبرت انگیز صورتوں سے گری ہیں، یہ سب کچھ اس حقیقت کی طرف کُھلا اشارہ ہے کہ انسان اس کائنات میں ایک ایسی حکومت کا محکوم ہے جو محض اندھے طبیعیاتی قوانین پر فرماں روائی نہیں کر رہی ہے، بلکہ اپنا ایک معقول اخلاقی قانون رکھتی ہے، جس کے مطابق وہ اخلاق کی ایک خاص حد سے اُوپر رہنے والوں کو جزا دیتی ہے، اس سے نیچے اُترنے والوں کو کچھ مدت تک ڈھیل دیتی رہتی ہے، اور جب وہ اس سے بہت زیادہ نیچے چلے جاتے ہیں تو پھر انھیں گرا کر ایسا پھینکتی ہے کہ وہ ایک داستانِ عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان واقعات کا ہمیشہ ایک ترتیب کے ساتھ رُونما ہوتے رہنا اس امر میں شبہ کرنے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں چھوڑتا کہ جزا اور مُکافات اس سلطنتِ کائنات کا ایک مستقل قانون ہے۔

مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا
تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ

آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں، بس ایک گنی چُنی مدّت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے[۱۰۶]۔ پھر کچھ لوگ اس روز بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدّت سے) وہ ہانپیں گے اور پھُنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں

پھر جو عذاب مختلف قوموں پر آئے ہیں، اُن پر مزید غور کرنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ازرُوئے انصاف قانونِ جزا و مُکافات کے جو اخلاقی تقاضے ہیں، وہ ایک حد تک تو ان عذابوں سے ضرور پورے ہوئے ہیں، مگر بہت بڑی حد تک ابھی تشنہ ہیں۔ کیونکہ دُنیا میں جو عذاب آیا، اس نے صرف اُس نسل کو پکڑا جو عذاب کے وقت موجود تھی۔ رہیں وہ نسلیں جو شرارتوں کے بیج بو کر اور ظلم و بدکاری کی فصلیں تیار کر کے کٹائی سے پہلے ہی دُنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اور جن کے کرتوتوں کا خمیازہ بعد کی نسلوں کو بھگتنا پڑا، وہ تو گویا قانونِ مُکافات کے عمل سے صاف ہی بچ نکلی ہیں۔ اب اگر ہم تاریخ کے مطالعے سے سلطنتِ کائنات کے مزاج کو ٹھیک ٹھیک سمجھ چکے ہیں تو ہمارا یہ مطالعہ ہی اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ عقل اور انصاف کی رُو سے قانونِ مُکافات کے جو اَخلاقی تقاضے ابھی تشنہ ہیں، ان کو پورا کرنے کے لیے یہ عادل سلطنت یقیناً پھر ایک دوسرا عالم برپا کرے گی اور وہاں تمام ظالموں کو ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور وہ بدلہ دُنیا کے اِن عذابوں سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۳۰ و سورۂ یونس، حاشیہ ۱۰)

۱۰۶- یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فُلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے، فُلاں بزرگ اَڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک مُتوسّل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے، فُلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں، جنّت کے راستے میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ حالانکہ اَڑنا اور مچلنا کیسا، اُس پُرجلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجالِ دم زدن تک نہ ہوگی، اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اُس وقت جب کہ اَحکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دے دے۔ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے غیر اللہ کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں چڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا اثر و رُسوخ رکھتے ہیں، اور اُن کی سفارش کے بھروسے پر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کیے جا رہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ
رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ
هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ

وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں[۱۰۷]، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا ربّ پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے[۱۰۸]۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، تو وہ جنّت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے[۱۰۹]۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔

پس اے نبیؐ! تو اِن معبُودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اُسی طرح پُوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے[۱۱۰]،

---

۱۰۷ – ان الفاظ سے یا تو عالَمِ آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں، یا پھر محض محاورے کے طور پر ان کو دوام اور ہمیشگی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال موجودہ زمین و آسمان تو مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کے بیان کی رُو سے یہ قیامت کے روز بدل ڈالے جائیں گے، اور یہاں جن واقعات کا ذکر ہو رہا ہے وہ قیامت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔

۱۰۸ – یعنی کوئی اور طاقت تو ایسی ہے ہی نہیں جو ان لوگوں کو اس دائمی عذاب سے بچا سکے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے انجام کو بدلنا چاہے، یا کسی کو ہمیشگی کا عذاب دینے کے بجائے ایک مدت تک عذاب دے کر معاف کر دینے کا فیصلہ فرمائے، تو اسے ایسا کرنے کا پورا اختیار ہے، کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضع ہے، کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو۔

۱۰۹ – یعنی ان کا جنت میں ٹھیرنا بھی کسی ایسے بالاتر قانون پر مبنی نہیں ہے جس نے اللہ کو ایسا کرنے پر مجبور کر رکھا ہو۔ بلکہ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہوگی کہ وہ ان کو وہاں رکھے گا۔ اگر وہ ان کی قسمت بھی بدلنا چاہے تو اسے بدلنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

۱۱۰ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ان معبُودوں کی طرف سے کسی شک میں تھے، بلکہ دراصل

ع ۱۴

وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا
لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور ہم اِن کا حصہ اِنھیں بھرپور دیں گے، بغیر اِس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔ ع

ہم اس سے پہلے موسیٰؑ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اِس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمھیں دی گئی ہے)۔[111] اگر تیرے ربّ کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو اِن اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چُکا دیا گیا ہوتا۔[112] یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انھیں ان کے اعمال کا پُورا کا پُورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔

یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جا رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مردِ معقول کو اس شک میں نہ رہنا چاہیے کہ یہ لوگ جو ان معبودوں کی پرستش کرتے اور ان سے دعائیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں، تو آخر کچھ تو انھوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی امیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں اور نیازیں اور دعائیں کسی علم، کسی تجربے اور کسی حقیقی مشاہدے کی بنا پر نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ نری اندھی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی تو موجود تھے، اور ایسی ہی ان کی کرامتیں ان میں بھی مشہور تھیں۔ مگر جب خدا کا عُذاب آیا تو وہ تباہ ہوگئیں اور یہ آستانے یونہی دھرے کے دھرے رہ گئے۔

۱۱۱ – یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج اس قرآن کے بارے میں مختلف لوگ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے پہلے جب موسیٰؑ کو کتاب دی گئی تھی تو اس کے بارے میں بھی ایسی ہی مختلف رائے زنیاں کی گئی تھیں، لہٰذا اے محمدؐ! تم یہ دیکھ کر بددل اور شکستہ خاطر نہ ہو کہ ایسی سیدھی سیدھی اور صاف باتیں قرآن میں پیش کی جا رہی ہیں اور پھر بھی لوگ ان کو قبول نہیں کرتے۔

۱۱۲ – یہ فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ
طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

پس اے محمدؐ! تم، اور تمھارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ اور بندگی کی حدّ سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اس پر تمھارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ اِن ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنّم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے، اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو! نماز قائم کرو دن کے دونوں سِروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔[۱۱۳] درحقیقت نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔[۱۱۴] اور صبر کر، اللہ نیکی کرنے

کہ تم اس بات کے لیے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلافات کر رہے ہیں، ان کا فیصلہ جلدی سے چُکا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ فیصلہ وقتِ مقرر سے پہلے نہ کیا جائے گا، اور یہ کہ دُنیا کے لوگ فیصلہ چاہنے میں جو جلد بازی کرتے ہیں، اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

۱۱۳ – دن کے دونوں سِروں پر سے مراد صبح اور مغرب ہے، اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشا کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اُس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج وقتہ نماز فرض ہوئی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۵۔ طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱۔ الروم، حاشیہ ۱۲۴)

۱۱۴ – یعنی جو بُرائیاں دُنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو برائیاں تمھارے ساتھ اس دعوتِ حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اِس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو خدا کی یاد کو تازہ کرتی رہے گی اور اس کی طاقت سے تم بدی کے اِس منظّم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دُنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: العنکبوت، حواشی ۷۷ تا ۷۹)

أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا
بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا
مِنْهُمْ ۗ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾
وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿١١٧﴾

والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

پھر کیوں نہ اُن قوموں میں، جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو انھی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انھیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے، حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔[115]

۱۱۵- ان آیات میں نہایت سبق آموز طریقے سے ان قوموں کی تباہی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تاریخ پچھلے چھ رکوعوں میں بیان ہوئی ہے۔ اس تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ صرف انھی قوموں کو نہیں، بلکہ پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں، ان سب کو جس چیز نے گرایا، وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوش حالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجے بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں، ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے۔ اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے، اور لوگوں کے شر کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو، اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہلِ خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں، یا اہلِ خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی نہ سُنے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے، تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ

بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اِسی (آزادیِ انتخاب و اختیار) کے لیے ہی تو اس نے انھیں پیدا کیا تھا۔[۱۱۶] اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے

منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ، کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کب اس کا وضعِ حمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انھی چند گنے چُنے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں، تو سمجھ لو کہ اس کے بُرے دن قریب آ گئے ہیں، کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہوگئی ہے۔ اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں دعوتِ خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظامِ صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہو تو اس پر عذابِ عام نہیں بھیجا جاتا، بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاحِ حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کے لیے کافی ہو سکیں، اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے کے بعد اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئلے ہی کوئلے باقی رہ گئے ہیں، تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ بھٹی سُلگا دی جاتی ہے جو ان کوئلوں کو پھونک کر رکھ دے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الذاریات، حاشیہ ۳۴)

۱۱۶ – یہ اس شبہ کا جواب ہے جو بالعموم ایسے مواقع پر تقدیر کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اُوپر اقوامِ گزشتہ کی تباہی کا جو سبب بیان کیا گیا ہے، اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا تھا کہ ان میں اہلِ خیر کا موجود نہ رہنا یا بہت کم پایا جانا بھی تو آخر اللہ کی مشیّت ہی سے تھا، پھر اس کا الزام ان قوموں پر کیوں رکھا جائے؟ کیوں نہ اللہ نے ان کے اندر بہت سے اہلِ خیر پیدا کر دیے؟ اس کے جواب میں یہ حقیقتِ حال صاف صاف بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کی مَشیّت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ حیوانات اور نباتات اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی طرح اُس کو بھی جِبلّی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوتِ ایمان، بِعثتِ انبیا اور تنزیلِ کُتُب کی ضرورت ہی کیا تھی، سارے انسان مسلم و مومن ہی پیدا ہوتے، اور کفر و عصیان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ لیکن اللہ نے انسان کے بارے میں جو مشیت فرمائی ہے، وہ دراصل یہ ہے کہ اس کو انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی جائے، اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف

لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ
عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢـبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ‌ۚ وَجَآءَكَ فِىۡ
هٰذِهِ الۡحَـقُّ وَمَوۡعِظَةٌ وَّذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيۡنَ
لَا يُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ‌ؕ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ۙ

کہی تھی کہ میں جہنّم کو جن اور انسان، سب سے بھر دوں گا۔

اور اے محمدؐ! یہ پیغمبروں کے قصّے جو ہم تمھیں سُناتے ہیں، وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں،

راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے، اس کے سامنے جنّت اور دوزخ دونوں کی راہیں کھول دی جائیں، اور پھر ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کو موقع دیا جائے کہ وہ ان میں سے جس راہ کو بھی اپنے لیے پسند کرے اس پر چل سکے، تاکہ ہر ایک جو کچھ بھی پائے، اپنی سعی وکسب کے نتیجے میں پائے۔ پس جب وہ اسکیم جس کے تحت انسان پیدا کیا گیا ہے، آزادیِ انتخاب اور اختیاری کفر وایمان کے اُصول پر مبنی ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی قوم خود تو بڑھنا چاہے بدی کی راہ پر اور اللہ زبردستی اس کو خیر کے راستے پر موڑ دے۔ کوئی قوم خود اپنے انتخاب سے تو انسان سازی کے وہ کارخانے بنائے جو ایک سے ایک بڑھ کر بدکار اور ظالم اور فاسق آدمی ڈھال ڈھال کر نکالیں، اور اللہ اپنی براہِ راست مداخلت سے اس کو وہ پیدائشی نیک انسان مہیا کرے جو اس کے بگڑے ہوئے سانچوں کو ٹھیک کر دیں۔ اس قسم کی مداخلت خدا کے دستور میں نہیں ہے۔ نیک ہوں یا بد، دونوں قسم کے آدمی ہر قوم کو خود ہی مہیا کرنے ہوں گے۔ جو قوم بحیثیتِ مجموعی بدی کی راہ کو پسند کرے گی، جس میں سے کوئی مُعتَدبِہ گروہ ایسا نہ اُٹھے گا جو نیکی کا جھنڈا بلند کرے، اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں اس امر کی گنجایش ہی نہ چھوڑی ہوگی کہ اصلاح کی کوششیں اس کے اندر پھل پھول سکیں، خدا کو کیا پڑی ہے کہ اس کو بزور نیک بنائے۔ وہ تو اس کو اسی انجام کی طرف دھکیل دے گا جو اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا ہے۔ البتہ خدا کی رحمت کی مستحق اگر کوئی قوم ہوسکتی ہے تو صرف وہ جس میں بہت سے افراد ایسے نکلیں جو خود دعوتِ خیر کو لبیک کہنے والے ہوں اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں یہ صلاحیت باقی رہنے دی ہو کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے اس کے اندر کام کرسکیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام، حاشیہ ۲۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع

ع ۱۰

انجامِ کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہُوا ہے، سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رُجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبیؐ! تُو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسا رکھ، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، تیرا ربّ اس سے بے خبر نہیں ہے[۱۱۷]۔ ع

۱۱۷ – یعنی کفر و اسلام کی اس کش مکش کے دونوں فریق جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے۔ اللہ کی سلطنت کوئی اندھیر نگری چوپٹ راجا کی مِصداق نہیں ہے کہ اس میں خواہ کچھ ہی ہوتا رہے، شہ بے خبر کو اس سے کچھ سروکار نہ ہو۔ یہاں حکمت اور بُردباری کی بنا پر دیر تو ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ جو لوگ اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں، وہ یقین رکھیں کہ ان کی محنتیں ضائع نہ ہوں گی۔ اور وہ لوگ بھی جو فساد کرنے اور اسے برپا رکھنے میں لگے ہوئے ہیں، جو اصلاح کی سعی کرنے والوں پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، اور جنھوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں لگا رکھا ہے کہ اصلاح کا یہ کام کسی طرح چل نہ سکے، انھیں بھی خبردار رہنا چاہیے کہ ان کے یہ سارے کرتوت اللہ کے علم میں ہیں اور ان کی پاداش انھیں ضرور بھگتنی پڑے گی۔

تفہیم القرآن

یُوسُف

(۱۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

یوسف

زمانۂ نُزول وسببِ نُزول

اس سورہ کے مضمون سے مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں نازل ہوئی ہوگی، جب کہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں یا جلاوطن کریں یا قید کریں۔ اس زمانے میں بعض کفارِ مکّہ نے (غالبًا یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آپؐ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہُوا۔ چونکہ اہلِ عرب اس قصّے سے ناواقف تھے، اس کا نام ونشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا، اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی اس کا ذکر نہ سنا گیا تھا، اس لیے انھیں توقع تھی کہ آپؐ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اِس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے، اور اس طرح آپؐ کا بھرم کھل جائے گا۔ لیکن اس امتحان میں انھیں اُلٹی منہ کی کھانی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ فوراً اُسی وقت یوسف علیہ السلام کا یہ پورا قصہ آپؐ کی زبان پر جاری کر دیا، بلکہ مزید برآں اس قصّے کو قریش کے اُس معاملے پر چسپاں بھی کر دیا جو وہ برادرانِ یوسفؑ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر رہے تھے۔

مقاصدِ نُزول

اس طرح یہ قصہ دو اہم مقاصد کے لیے نازل فرمایا گیا تھا:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور اُن کے تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ آپؐ سنی سنائی باتیں بیان نہیں کرتے، بلکہ فی الواقع آپؐ کو وحی کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو آیات ۳ و ۷ میں بھی صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے اور آیات ۱۰۲-۱۰۳ میں بھی پورے زور کے ساتھ اس کی تصریح کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ سردارانِ قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اُس وقت جو معاملہ چل رہا تھا، اس پر برادرانِ یوسف اور یوسف علیہ السلام کے قصے کو چسپاں کرتے ہوئے قریش والوں کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ مگر جس طرح وہ خدا کی مشیّت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخرکار اُسی بھائی کے قدموں میں آ رہے جس کو انھوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنویں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمھاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور ایک دن تمھیں بھی اپنے اِسی بھائی سے رحم وکرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تُلے ہوئے ہو۔ یہ مقصد بھی سورہ کے آغاز میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ”یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصے میں اِن پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے قصے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے

قرآنِ مجید نے گویا ایک صریح پیش گوئی کر دی تھی جسے آیندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس سورہ کے نُزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ قریش والوں نے برادرانِ یوسفؑ کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی اور آپؐ کو مجبُوراً ان سے جان بچا کر مکے سے نکلنا پڑا۔ پھر اُن کی توقّعات کے بالکل خلاف آپؐ کو بھی جلا وطنی میں ویسا ہی عُروج و اقتدار نصیب ہوا جیسا یوسف علیہ السلام کو ہُوا تھا۔ پھر فتحِ مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آیا جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائیوں کی آخری حضوری کے موقع پر پیش آیا تھا۔ وہاں جب برادرانِ یوسفؑ انتہائی عجز و درماندگی کی حالت میں ان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ”ہم پر صدقہ کیجیے، اللہ صدقہ کرنے والوں کو نیک جزا دیتا ہے“، تو یوسف علیہ السلام نے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود انھیں معاف کر دیا اور فرمایا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، ”آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے، وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔“ اسی طرح یہاں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے اور آنحضرتؐ ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپؐ نے ان سے پوچھا: ”تمھارا کیا خیال ہے کہ میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟“ انھوں نے عرض کیا: اخ کریم وابن اخ کریم ”آپؐ ایک عالی ظرف بھائی ہیں، اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔“ اس پر آپؐ نے فرمایا: فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوتہ، لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اذھبوا فانتم الطلقاء۔ ”میں تمھیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تمھیں معاف کیا۔“

مَباحِث و مسائل یہ دو پہلو تو اس سورہ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اس قصے کو بھی قرآنِ مجید محض قصہ گوئی و تاریخ نگاری کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق وہ اسے اپنی اصل دعوت کی تبلیغ میں استعمال کرتا ہے۔

وہ اس پوری داستان میں یہ بات نمایاں کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور اسی چیز کی طرف وہ بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے کردار اور دوسری طرف برادرانِ یوسفؑ، قافلۂ تُجّار، عزیزِ مصر، اس کی بیوی، بیگماتِ مصر اور حکّامِ مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیتا ہے، اور محض اپنے اندازِ بیان سے سامعین و ناظرین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام، یعنی خدا کی بندگی اور حسابِ آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت اور دنیا پرستی اور خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر

Maktaba Tul Ishaat.com

تیار ہوتے ہیں۔ اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں سے کس نمونے کو پسند کرتا ہے۔

پھر اس قصے سے قرآنِ حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے، وہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا، مگر نتیجے میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اس کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو کنویں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔ مگر فی الواقع انھوں نے یوسفؑ کو اُس بامِ عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا، اور اپنی اس حرکت سے انھوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسفؑ کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے، انھیں ندامت و شرمساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ عزیزِ مصر کی بیوی یوسفؑ کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو اُن سے انتقام لے رہی تھی، مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تختِ سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا، اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرماں روائے ملک کی مُربّیہ کہلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دُنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی۔ بلکہ دُنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اُٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے، اور اُن لوگوں کے حصے میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنھوں نے اسے گرانا چاہا تھا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس، خدا جسے گرانا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی، بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں اُلٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

اس حقیقتِ حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدابیر، دونوں میں اُن حُدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانونِ الٰہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی و ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا، وہ اگر ناکام بھی ہوا تو بہرحال ذلّت و رسوائی سے دوچار نہ ہو گا۔ اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا، وہ آخرت میں تو یقیناً رُسوا ہو گا ہی، مگر دُنیا میں بھی اس کے لیے رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔ دوسرا اہم سبق اس سے توکّل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کا ملتا ہے۔ جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دُنیا انھیں مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہو، وہ اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں تو انھیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہو گی، اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے، بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دیے چلے جائیں گے۔

مگر سب سے بڑا سبق جو اس قصے سے ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو، تو وہ محض اپنے اخلاق کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو دیکھیے ۱۷ برس کی عمر، تن تنہا، بے سرو سامان، اجنبی ملک، اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں۔ تاریخ کے اُس دور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انھیں جیل بھیج دیا گیا، جس کی میعادِ سزا بھی کوئی نہ تھی۔ اس حالت تک گرا دیے جانے کے بعد وہ محض اپنے ایمان اور اخلاق کے بل پر اٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو مسخر کر لیتے ہیں۔

تاریخی و جغرافی حالات اس قصّے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی و جغرافی معلومات بھی ناظرین کے پیشِ نظر رہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پرپوتے تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوب کی جائے قیام حبرون (موجودہ الخلیل) کی وادی میں تھی جہاں حضرت اسحاقؑ اور ان سے پہلے حضرت ابراہیمؑ رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب کی کچھ زمین سِکم (موجودہ نابُلس) میں بھی تھی۔

بائبل کے علما کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس قصّے کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنویں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسف کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ جس کنویں میں وہ پھینکے گئے، وہ بائبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سِکم کے شمال میں دُوتن (موجودہ دُثان) کے قریب واقع تھا، اور جس قافلے نے انھیں کنویں سے نکالا، وہ جِلعاد (شرقِ اُردُن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔ (جِلعاد کے کھنڈر اب بھی دریائے اُردُن کے مشرق میں وادیِ الیابس کے کنارے واقع ہیں)۔

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین و شام سے مصر جا کر ۲ ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں سلطنتِ مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مؤرخین اور مفسرینِ قرآن نے ان کے لیے ”عمالیق“ کا نام استعمال کیا ہے، جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کے خانگی نزاعات کے سبب سے انھیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسفؑ کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبلِ مسیح کے اواخر تک یہ لوگ

Maktaba Tul Ishaat.com

مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ اُسی دَور کی طرف سورۂ مائدہ، آیت ۲۰ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا۔ اس کے بعد ملک میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اُٹھی جس نے ہِکسُوس اقتدار کا تختہ اُلٹ دیا۔ ڈھائی لاکھ کی تعداد میں عَمالِقہ ملک سے نکال دیے گئے۔ ایک نہایت متعصب قِبطی النّسل خاندان برسرِ اقتدار آ گیا اور اس نے عَمالِقہ کے زمانے کی یادگاروں کو چُن چُن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پر اُن مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰؑ کے قصّے میں آتا ہے۔

مصری تاریخ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو ''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ ''فرعون'' مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بائبل میں غلطی سے اس کو بھی ''فرعون'' ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتّب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ ''فراعنہ'' ہی تھے۔

موجودہ زمانے کے محققین، جنھوں نے بائبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرماں روا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے، وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالسلطنت اُس زمانے میں مَمفِس (منف) تھا، جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیزِ مصر کے گھر رہے۔ آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔ ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرماں روا ہوئے، اور ۸۰ سال تک بلاشرکتِ غیرے تمام مملکتِ مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انھوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دِمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جُشَن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیّت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔

یوسف علیہ السلام کے قصّے کی جو تفصیلات بائبل اور تَلمُود میں بیان کی گئی ہیں، ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، مگر قصّے کے اہم اجزا میں تینوں متفق ہیں۔ ہم اپنے حواشی میں حسبِ ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔

سُورَةُ يُوسُفَ مَكِّيَّةٌ

آیاتہا ۱۱۱ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞۱ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞۲ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ
بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ

ا، ل، ر۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن[1] بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہلِ عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔[2] اے محمدؐ! ہم اس قرآن کو تمھاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایے میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے)

۱ – قرآن مصدر ہے قَرَأَ یَقْرَأُ سے۔ اس کے اصل معنی ہیں "پڑھنا"۔ مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنیِ مصدری بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کسی شخص کو ہم بہادر کہنے کے بجائے "بہادری" کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر شجاعت ایسی کمال درجے کی پائی جاتی ہے کہ گویا وہ اور شجاعت ایک چیز ہیں۔ پس اس کتاب کا نام "قرآن" (پڑھنا) رکھنے کا مطلب یہ ہُوا کہ یہ عام وخاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

۲ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب مخصوص طور پر اہلِ عرب ہی کے لیے نازل کی گئی ہے۔ بلکہ اس فقرے کا اصل مدعا یہ کہنا ہے کہ "اے اہلِ عرب! تمھیں یہ باتیں کسی یونانی یا ایرانی زبان میں تو نہیں سنائی جا رہی ہیں، تمھاری اپنی زبان میں ہیں، لہٰذا تم نہ تو یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ یہ باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کتاب میں اعجاز کے جو پہلو ہیں، جو اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، وہ تمھاری نگاہوں سے پوشیدہ رہ جائیں۔"

بعض لوگ قرآنِ مجید میں اس طرح کے فقرے دیکھ کر اعتراض پیش کرتے ہیں کہ یہ کتاب تو اہلِ عرب کے لیے ہے، غیر اہلِ عرب کے لیے نازل ہی نہیں کی گئی ہے، پھر اسے تمام انسانوں کے لیے ہدایت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن محض ایک سرسری سا اعتراض ہے جو حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر جڑ دیا جاتا ہے۔ انسانوں کی عام ہدایت کے لیے جو چیز بھی پیش کی جائے گی، وہ بہرحال انسانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان ہی میں پیش کی جائے گی، اور اس کے پیش کرنے والے کی کوشش یہی ہوگی کہ پہلے وہ اُس قوم کو اپنی تعلیم سے پوری طرح متاثر کرے جس کی زبان میں وہ اسے پیش کر رہا ہے، پھر وہی قوم دوسری قوموں تک اس تعلیم کے پہنچنے کا وسیلہ

Maktaba Tul Ishaat.com

الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ
اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝
قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ
كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَكَذٰلِكَ

تم بالکل ہی بے خبر تھے۔[3]

یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: ''ابا جان! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔ جواب میں اس کے باپ نے کہا: ''بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سُنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے،[4] حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کُھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تُو نے خواب میں دیکھا ہے کہ)

بنے۔ یہی ایک فطری طریقہ ہے کسی دعوت وتحریک کے بین الاقوامی پیمانے پر پھیلنے کا۔

۳- سورہ کے دیباچے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کفارِ مکہ میں سے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے، بلکہ اپنے نزدیک آپؐ کا بھرم کھولنے کے لیے، غالباً یہودیوں کے اشارے پر، آپؐ کے سامنے اچانک یہ سوال پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے مصر پہنچنے کا کیا سبب ہوا۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں تاریخِ بنی اسرائیل کا یہ باب پیش کرنے سے پہلے تمہیداً یہ فقرہ ارشاد ہُوا ہے کہ اَے محمدؐ! تم ان واقعات سے بے خبر تھے، دراصل یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعے سے تمھیں ان کی خبر دے رہے ہیں۔ بظاہر اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل میں رُوئے سُخن اُن مخالفین کی طرف ہے جن کو یقین نہ تھا کہ آپؐ کو وحی کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔

۴- اس سے مراد حضرت یوسفؑ کے وہ دس بھائی ہیں جو دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسفؑ سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انھیں کوئی تامّل ہو۔ اس لیے انھوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب یہ تھا کہ سورج سے مراد حضرت یعقوبؑ، چاند سے مراد ان کی بیوی (حضرت یوسفؑ کی سوتیلی والدہ) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں۔

يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ
قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾ ع لَقَدْ كَانَ
فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۷﴾ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ

تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب[5] کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے[6] گا اور تیرے اُوپر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے، یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے[7]۔'' ع

حقیقت یہ ہے کہ یُوسُفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصّے میں اِن پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا: ''یہ یُوسُفؑ

۵ - یعنی نبوت عطا کرے گا۔

۶ - ''تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' کا مطلب محض تعبیرِ خواب کا علم نہیں ہے، جیسا کہ گمان کیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تُو ہر معاملے کی گہرائی میں اُترنے اور اس کی تہ کو پالینے کے قابل ہو جائے گا۔

۷ - بائبل اور تَلمُود کا بیان قرآن کے اس بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خواب سُن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا: ''اچھا اب تُو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔'' لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے نہ کہ بائبل اور تَلمُود کا۔ حضرت یوسفؑ نے خواب بیان کیا تھا، کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس کی جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب ہی سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسفؑ کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عُروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار، ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر بُرا ماننے اور خواب دیکھنے والے کو اُلٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے آیندہ عُروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيۡنَا مِنَّا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىۡ
ضَلٰلٍ مُّبِيۡنِ ۚ ۖ ۝۸ اقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡهُ اَرۡضًا يَّخۡلُ لَـكُمۡ
وَجۡهُ اَبِيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ ۝۹ قَالَ
قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ

اور اس کا بھائی،[۸] دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔[۹] چلو یوسفؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو، تاکہ تمھارے والد کی توجہ صرف تمھاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔"[۱۰] اس پر ان میں سے ایک بولا: "یوسفؑ کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔

اُلٹا جل بھُن جائے؟

۸ – اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بن یمین ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوبؑ اِن دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی ساری اولاد میں صرف ایک حضرت یوسفؑ ہی ایسے تھے جن کے اندر اُن کو آثارِ رُشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اُوپر حضرت یوسفؑ کا خواب سُن کر انھوں نے جو کچھ فرمایا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحب زادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے۔ پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائبل میں برادرانِ یوسف کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے اُلٹا الزام حضرت یوسفؑ پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے، اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔

۹ – اس فقرے کی رُوح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کوئی ریاست موجود نہیں ہوتی اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں، وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اِس پر ہوتا ہے کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے بہت سے ہوں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں

يَّلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝١٠ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا
مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝١١ اَرْسِلْهُ
مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝١٢ قَالَ اِنِّيْ
لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ
عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝١٣ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ

کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔" اس قرارداد پر انھوں نے جا کر اپنے باپ سے کہا: "ابا جان! کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسا نہیں کرتے، حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں؟ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے، کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔" باپ نے کہا: "تمھارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جب کہ تم اس سے غافل ہو۔" انھوں نے جواب دیا: "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھا لیا، جب کہ ہم ایک جتھا ہیں،

جو دشمنوں کے مقابلے میں کام آ سکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بھائیوں نے کہا کہ ہمارے والد بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں۔ ہم جوان بیٹوں کا جتھا، جو بُرے وقت پر اُن کے کام آ سکتا ہے، ان کو اتنا عزیز نہیں ہے جتنے یہ چھوٹے چھوٹے بچے، جو ان کے کسی کام نہیں آ سکتے، بلکہ اُلٹے خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

۱۰- یہ فقرہ اُن لوگوں کے نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کے حوالے کر دینے کے ساتھ ایمان اور نیکی سے بھی کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نفس ان سے کسی بُرے کام کا تقاضا کرتا ہے تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے نفس کا تقاضا پورا کرنے پر تُل جاتے ہیں، اور جب ضمیر اندر سے چٹکیاں لیتا ہے تو اسے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر، یہ ناگزیر گناہ، جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے، کر گزرنے دے، پھر ان شاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

۱۱- یہ بیان بھی بائبل اور تَلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ برادرانِ یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سِکم کی طرف گئے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے خود حضرت یعقوبؑ نے ان کی تلاش میں حضرت یوسف کو بھیجا تھا۔ [پیدائش ۳۷: ۱۳] مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ اُن کے حسد کا حال جاننے کے باوجود انھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ
فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا
وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ؕ
قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا
فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾

تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے۔" اس طرح اصرار کر کے جب وہ اُسے لے گئے اور انھوں نے طے کرلیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یُوسفؑ کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تُو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔[12]" شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا: "ابا جان! ہم دَوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آ کر اُسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔"

آپ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بھیجا ہو۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔

۱۲- متن میں وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسفؑ کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تُو ایسے حالات میں ان کی یہ حرکت انھیں جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انھیں وہم وگمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بُوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آیندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو آگے چل کر تاریخِ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے والا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنویں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا ایسے موقع پر کرے گا۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ
اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸
وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى
هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۹

اور وہ یوسفؑ کے قمیص پر جھوٹ مُوٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سُن کر ان کے باپ نے کہا: ”بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا، صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا،[۱۳] جو بات تم بنا رہے ہو، اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔“[۱۴]

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اُس نے اپنے سقّے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقّے نے جو کنویں میں ڈول ڈالا تو (یُوسفؑ کو دیکھ کر) پکار اُٹھا: ”مبارک ہو، یہاں تو ایک لڑکا ہے۔“ ان لوگوں نے اس کو مالِ تجارت سمجھ کر چھپا لیا، حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔

---

۱۳ – متن میں ”فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ“ کے الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ”اچھا صبر“ ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، جزَع فزَع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آ پڑی ہو۔

۱۴ – بائبل اور تلمود یہاں حضرت یعقوبؑ کے تأثّر کا نقشہ بھی کچھ ایسا کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تأثّر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ”تب یعقوبؑ نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔“ [پیدایش ۳۷: ۳۴] اور تلمود کا بیان ہے کہ ”یعقوبؑ بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اَوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں، یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے...... اور وہ سالہا سال تک یوسفؑ کا ماتم کرتا رہا۔“ اس نقشے میں حضرت یعقوبؑ وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجے بُردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازُن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے معاملے کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو اِن حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے، اور پھر

Maktaba Tul Ishaat.com

وَشَرَوۡهُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَكَانُوۡا فِيۡهِ مِنَ الزّٰهِدِيۡنَ ۝٢٠ وَقَالَ الَّذِى اشۡتَرٰٮهُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِهٖۤ اَكۡرِمِىۡ

ع

آخرِکار انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا[15] اور وہ اس کی قیمت کے معاملے میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔

مصر کے جس شخص نے اسے خریدا[16] اس نے اپنی بیوی[17] سے کہا: "اس کو اچھی طرح

عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسا کرتا ہے۔

۱۵ – اس معاملے کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے، بعد میں قافلے والوں نے آ کر ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ برادرانِ یوسف نے بعد میں اسماعیلیوں کے ایک قافلے کو دیکھا اور چاہا کہ یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر ان کے ہاتھ بیچ دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی مَدیَن کے سوداگر انھیں کنویں سے نکال چکے تھے۔ ان سوداگروں نے حضرت یوسفؑ کو بیس روپے میں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر آگے چل کر بائبل کے مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر وہ اسماعیلیوں کے ہاتھ حضرت یوسفؑ کو فروخت کرا چکے ہیں۔ چنانچہ وہ اسماعیلیوں کے بجائے پھر مَدیَن ہی کے سوداگروں سے مصر میں انھیں دوبارہ فروخت کراتے ہیں (ملاحظہ ہو: کتابِ پیدائش، باب ۳۷، آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶)۔ اس کے برعکس تلمود کا یہ بیان ہے کہ مَدیَن کے سوداگروں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا۔ پھر برادرانِ یوسفؑ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے قبضے میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا۔ آخرِکار انھوں نے ۲۰ درہم قیمت ادا کر کے برادرانِ یوسفؑ کو راضی کیا۔ پھر انھوں نے ۲۰ ہی درہم میں یوسف علیہ السلام کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر انھیں فروخت کیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادرانِ یوسف نے حضرت یوسفؑ کو فروخت کیا تھا۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اس روایت کی تائید نہیں کرتا۔

۱۶ – بائبل میں اس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ قرآن مجید آگے چل کر اسے "عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور پھر ایک دوسرے موقع پر یہی لقب حضرت یوسفؑ کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بہت بڑا عہدہ دار یا صاحبِ منصب تھا، کیونکہ "عزیز" کے معنی ایسے بااقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جا سکتی ہو۔ بائبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا، اور ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہی خزانے کا افسر تھا۔

۱۷ – تلمود میں اس عورت کا نام زَلیخا (Zelicha) لکھا ہے، اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا۔ مگر یہ جو ہمارے ہاں عام شہرت ہے کہ بعد میں اس عورت سے حضرت یوسفؑ کا نکاح ہوا، اس کی کوئی اصل نہیں ہے،

مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى

رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔"[18] اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اُس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔[19] اللہ اپنا کام

نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلی تاریخ میں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اس کو ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔ قرآنِ مجید میں یہ قاعدۂ کلیّہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ۔ بُری عورتیں بُرے مردوں کے لیے ہیں اور بُرے مرد بُری عورتوں کے لیے۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔

۱۸ – تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر ۱۸ سال کی تھی اور فوطیفار ان کی شان دار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ جب وہ انھیں خرید رہا تھا اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ غلام تو نہیں معلوم ہوتا، مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چُرا لائے ہو۔ اسی بنا پر فوطیفار نے ان سے غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے گھر اور اپنی کل املاک کا مختار بنا دیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ "اُس نے اپنا سب کچھ یوسفؑ کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سوا روٹی کے جسے وہ کھا لیتا تھا اُسے اپنی کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔" (پیدائش ۳۹: ۶)

۱۹ – حضرت یوسفؑ کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اُس وقت نہ کوئی منظم ریاست تھی اور نہ تمدّن و تہذیب نے کوئی بڑی ترقی کی تھی۔ کچھ آزاد قبائل تھے جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے، اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بنالی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے پہلو میں قریب قریب وہی تھا جو ہماری شمال مغربی سرحد پر آزاد علاقے کے پٹھان قبائل کا ہے۔ یہاں حضرت یوسفؑ کو جو تعلیم و تربیت ملی تھی، اس میں بدویانہ زندگی کے محاسن اور خانوادۂ ابراہیمی کی خدا پرستی و دین داری کے عناصر تو ضرور شامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ اُس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک، یعنی مصر میں اُن سے جو کام لینا چاہتا تھا، اور اس کے لیے جس واقفیت، جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی، اس کے نشوونما کا کوئی موقع بدوی زندگی میں نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انھیں سلطنتِ مصر کے ایک بڑے عہدہ دار کے ہاں پہنچا دیا اور اس نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں اپنے گھر اور اپنی جاگیر کا مختارِ کل بنا دیا۔ اس طرح یہ موقع پیدا ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشوونما پاسکیں جو اَب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں، اور انھیں ایک چھوٹی جاگیر کے انتظام سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَمۡرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۲۱ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ
اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۲۲ وَ
رَاوَدَتۡهُ الَّتِىۡ هُوَ فِىۡ بَيۡتِهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَغَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ
وَقَالَتۡ هَيۡتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىۡۤ اَحۡسَنَ
مَثۡوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۲۳ وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ وَ

کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا[20]، اِس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اُس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی: "آ جا"۔ یوسفؑ نے کہا: "خدا کی پناہ! میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے[21]۔" وہ اُس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی

وہ تجربہ حاصل ہو جائے جو آیندہ ایک بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانے کے لیے درکار تھا۔ اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

۲۰ – قرآن کی زبان میں اِن الفاظ سے مراد بالعُموم "نبوت عطا کرنا" ہوتا ہے۔ "حُکم" کے معنٰی قوتِ فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حُکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیّت بھی عطا کی اور اختیارات بھی تفویض فرمائے۔ رہا "علم"، تو اس سے مراد وہ خاص علمِ حقیقت ہے جو انبیاؑ کو وحی کے ذریعے سے براہِ راست دیا جاتا ہے۔

۲۱ – عام طور پر مفسرین اور مترجمین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں "میرے رب" کا لفظ حضرت یوسفؑ نے اُس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جس کی ملازمت میں وہ اُس وقت تھے، اور ان کے اِس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میرے آقا نے تو مجھے ایسی اچھی طرح رکھا ہے، پھر میں یہ نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے زنا کروں۔ لیکن مجھے اس ترجمہ و تفسیر سے سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے کی بھی گنجایش ہے، کیونکہ عربی میں لفظ رب "آقا" کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ بات ایک نبی کی شان سے بہت گری ہوئی ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔

هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ

اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی بُرہان نہ دیکھ لیتا[۲۲]۔ ایسا ہُوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دُور کر دیں[۲۳]، درحقیقت وہ ہمارے چُنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخرِکار یوسفؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے

اور قرآن میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ کسی نبی نے خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب کہا ہو۔ آگے چل کر آیات ۴۱، ۴۲، ۵۰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے اور مصریوں کے مسلک کا یہ فرق بار بار واضح فرماتے ہیں کہ اُن کا رب تو اللہ ہے اور مصریوں نے بندوں کو اپنا رب بنا رکھا ہے۔ پھر جب آیت کے الفاظ میں یہ مطلب لینے کی بھی گنجایش موجود ہے کہ حضرت یوسفؑ نے رَبّیِ کہہ کر اللہ کی ذات مراد لی ہو، تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک ایسے معنیٰ کو اختیار کریں جس میں صریحاً قباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

۲۲ – بُرہان کے معنیٰ ہیں دلیل اور حُجت کے۔ رب کی بُرہان سے مراد خدا کی سُجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بنا پر حضرت یوسفؑ کے ضمیر نے اُن کے نفس کو اس بات کا قائل کیا کہ اِس عورت کی دعوتِ عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ اور وہ دلیل تھی کیا؟ اسے پچھلے فقرے میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ ”میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا بُرا کام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہُوا کرتی۔“ یہی وہ بُرہانِ حق تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر مَعصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ ”یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی بُرہان نہ دیکھ لیتا“ تو اس سے عِصمتِ انبیاؑ کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش وخطا کی قوت واِستِعداد سلب کر لی گئی ہے، حتّٰی کہ گناہ کا صُدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بَشریّت کی تمام صفات سے مُتّصف ہونے کے باوجود، اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خداترس ہوتا ہے کہ جان بُوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلے میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحیِ جلی کے ذریعے سے اس کی اصلاح فرما دیتا ہے، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری اُمت کی لغزش ہے۔ وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دُنیا گمراہی میں میلوں دُور نکل جائے۔

۲۳ – اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کا دلیلِ رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق و ہدایت سے ہوا، کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دُور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسفؑ کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلے میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾
قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَن نَّفْسِي ۚ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ

اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی: "کیا سزا ہے اُس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اِس کے سوا اور کیا سزا ہوسکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے۔" یوسف نے کہا: "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔" اُس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی[۲۴]

بدی اور بے حیائی سے پاک کرنے اور ان کی طہارتِ نفس کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے مصلحتِ الٰہی میں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری طاقت پرہیزگاری وتقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے بُرے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دے دیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس مخصوص طریقۂ تربیت کے اختیار کرنے کی مصلحت اور اہمیت اُس اخلاقی ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے جو اُس وقت کی مصری سوسائٹی میں پایا جاتا تھا۔ آگے رُکوع ۴ میں اس ماحول کی جو ایک ذرا سی جھلک دکھائی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت کے "مہذّب مصر" میں بالعموم اور اُس کے اونچے طبقے میں بالخصوص صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی جس پر ہم اپنے زمانے کے اہلِ مغرب اور مغرب زدہ طبقوں کو "فائز" پا رہے ہیں۔ حضرت یوسف کو ایسے بگڑے ہوئے لوگوں میں رہ کر کام کرنا تھا، اور کام بھی ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرماں روائے ملک کی حیثیت سے کرنا تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو خواتینِ کرام ایک حسین غلام کے آگے بچھی جا رہی تھیں، وہ ایک جوان اور خوب صورت فرماں روا کو پھانسنے اور بگاڑنے کے لیے کیا نہ کر گزرتیں۔ اسی کی پیش بندی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی کہ ایک طرف تو ابتدا ہی میں اِس آزمائش سے گزار کر حضرت یوسفؑ کو پختہ کر دیا، اور دوسری طرف خود خواتینِ مصر کو بھی ان سے مایوس کر کے ان کے سارے فتنوں کا دروازہ بند کر دیا۔

۲۴ – اس سے معاملے کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صاحبِ خانہ کے ساتھ خود اس عورت کے بھائی بندوں میں سے بھی کوئی شخص آ رہا ہوگا اور اس نے یہ قضیہ سُن کر کہا ہوگا کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے تو قرینے کی شہادت سے اس معاملے کی یوں تحقیق کی جاسکتی ہے۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہادت پیش کرنے والا ایک شیر خوار بچہ تھا جو وہاں پنگھوڑے میں لیٹا ہوا تھا اور خدا نے اسے گویائی عطا کر کے اس سے یہ شہادت دلوائی۔ لیکن یہ روایت نہ تو کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور نہ اس معاملے میں خواہ مخواہ معجزے سے مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔

إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۱۳

کہ ''اگر یوسفؑ کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا، اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔''[۲۵] جب شوہر نے دیکھا کہ یوسفؑ کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا: ''یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں، واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں۔ یوسفؑ! اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی۔''[۲۵ الف] ؏

اُس شاہد نے قرینے کی جس شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ سراسر ایک معقول شہادت ہے اور اس کو دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک معاملہ فہم اور جہاں دیدہ آدمی تھا جو صورتِ معاملہ سامنے آتے ہی اس کی تہ کو پہنچ گیا۔ بعید نہیں کہ وہ کوئی جج یا مجسٹریٹ ہو۔ (مفسّرین کے ہاں شیر خوار بچے کی شہادت کا قصہ دراصل یہودی روایات سے آیا ہے۔ مُلاحظہ ہو: اقتباساتِ تلمود، از پال اسحاق ہرشون، لندن، ۱۸۸۰ء، صفحہ ۲۵۶)

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ اگر یوسفؑ کا قمیص سامنے سے پھٹا ہو تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ اقدام یوسفؑ کی جانب سے تھا اور عورت اپنے آپ کو بچانے کے لیے کش مکش کر رہی تھی۔ لیکن اگر یوسفؑ کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عورت اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور یوسفؑ اس سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ قرینے کی ایک اور شہادت بھی اس شہادت میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ اُس شاہد نے توجہ صرف یوسف علیہ السلام کے قمیص کی طرف دلائی۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورت کے جسم یا اس کے لباس پر تشدد کی کوئی علامت سرے سے پائی ہی نہ جاتی تھی، حالانکہ اگر یہ مقدمہ اقدامِ زنا بالجبر کا ہوتا تو عورت پر اس کے کھُلے آثار پائے جاتے۔

۲۵ الف – بائبل میں اس قصے کو جس بھونڈے طریقے سے بیان کیا گیا ہے، وہ ذرا ملاحظہ ہو:

''تب اُس عورت نے اُس کا پیراہن پکڑ کر کہا کہ میرے ساتھ ہم بستر ہو۔ وہ اپنا پیراہن اُس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ اپنا پیراہن اُس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گیا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، محبّت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔" اس نے جو اُن کی یہ مکّارانہ باتیں سُنیں تو اُن کو بُلا وا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی[۲۶] اور ضیافت میں

تو اُس نے اپنے گھر کے آدمیوں کو بُلا کر اُن سے کہا کہ دیکھو وہ ایک عبری کو ہم سے مذاق کرنے کے لیے ہمارے پاس لے آیا ہے۔ یہ مجھ سے ہم بستر ہونے کو اندر گھس آیا اور میں بلند آواز سے چلّانے لگی۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں زور زور سے چلّا رہی ہوں تو اپنا پیراہن میرے پاس چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔ اور وہ اُس کا پیراہن اس کے آقا کے گھر لوٹنے تک اپنے پاس رکھے رہی...... جب اُس کے آقا نے اپنی بیوی کی وہ باتیں جو اُس نے اُس سے کہیں، سُن لیں کہ تیرے غلام نے مجھ سے ایسا ایسا کیا تو اُس کا غضب بھڑکا، اور یوسفؑ کے آقا نے اس کو لے کر قید خانے میں جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے، ڈال دیا۔ (پیدائش ۳۹: ۱۲-۲۰)

خلاصہ اس عجیب و غریب رِوایت کا یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے جسم پر لباس کچھ اس قسم کا تھا کہ اِدھر زلیخا نے اس پر ہاتھ ڈالا اور اُدھر وہ پورا لباس خود بخود اُتر کر اُس کے ہاتھ میں آ گیا! پھر لُطف یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ وہ لباس اس کے پاس چھوڑ کر یونہی برہنہ بھاگ نکلے اور ان کا لباس (یعنی ان کے قصور کا ناقابلِ انکار ثبوت) اس عورت کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ کے مجرم ہونے میں آخر کون شک کر سکتا تھا۔

یہ تو ہے بائبل کی روایت۔ رہی تَلمُود، تو اس کا بیان ہے کہ فوطیفار نے جب اپنی بیوی سے یہ شکایت سنی تو اس نے یوسفؑ کو خوب پٹوایا، پھر ان کے خلاف عدالت میں اِستغاثہ دائر کیا اور حُکّامِ عدالت نے حضرت یوسفؑ کے قمیص کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ قصور عورت کا ہے، کیونکہ قمیص پیچھے سے پھٹا ہے نہ کہ آگے سے۔ لیکن یہ بات ہر صاحبِ عقل آدمی تھوڑے سے غور و تأمّل سے بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کی رِوایت تَلمُود کی روایت سے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ آخر کس طرح یہ باور کر لیا جائے کہ ایسا بڑا ایک ذی وجاہت آدمی اپنی بیوی پر اپنے غلام کی دست درازی کا معاملہ خود عدالت میں لے گیا ہوگا۔

یہ ایک نمایاں ترین مثال ہے قرآن اور اسرائیلی روایات کے فرق کی، جس سے مغربی مُستشرقین کے اس الزام کی لغویت صاف واضح ہو جاتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ قرآن نے تو ان کی اصلاح کی ہے اور اصل واقعات دُنیا کو بتائے ہیں۔

كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا
رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا
بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ
لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ
يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ

ہر ایک کے آگے ایک ایک چھُری رکھ دی۔ (پھر عین اُس وقت جب کہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یُوسُفؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پُکار اُٹھیں: "حاشا لِلّٰہ! یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔" عزیز کی بیوی نے کہا: "دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رِجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل وخوار[٢٧] ہوگا۔" یُوسُفؑ نے کہا: "اے میرے ربّ!

---

٢٦ – یعنی ایسی مجلس جس میں مہمانوں کے لیے تکیے لگے ہوئے تھے۔ مصر کے آثارِ قدیمہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں تکیوں کا استعمال بہت ہوتا تھا۔

بائبل میں اس ضیافت کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ تلمُود میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، مگر وہ قرآن سے بہت مختلف ہے۔ قرآن کے بیان میں جو زندگی، جو رُوح، جو فطریّت اور جو اخلاقیت پائی جاتی ہے، اس سے تلمود کا بیان بالکل خالی ہے۔

٢٧ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت مصر کے اُونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے جن عورتوں کو بُلایا ہوگا، وہ اُمَرا و رُؤسا اور بڑے عہدہ داروں کے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی۔ ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوب صورت جوانی دکھا کر انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوانِ رَعنا پر میں مر نہ مِٹتی تو آخر اور کیا کرتی۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ واقعی ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو بیگم عزیز نے کیا۔ پھر شریف خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو عَلانیہ اپنے اِس عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر اس کا خوب صورت غلام اس کی خواہشِ نفس کا کھلونا بننے پر

Maktaba Tul Ishaat.com

السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ

قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔[۲۸] — اس کے رب نے

راضی نہ ہوا تو وہ اسے جیل بھجوا دے گی۔ یہ سب کچھ اس بات کا پتا دیتا ہے کہ یورپ اور امریکا اور ان کے مشرقی مقلدین آج عورتوں کی جس آزادی و بے باکی کو بیسویں صدی کی ترقیات کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں، وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بہت پرانی چیز ہے۔ دقیانوس سے سیکڑوں برس پہلے مصر میں یہ اسی شان کے ساتھ پائی جاتی تھی جیسی آج اِس ''روشن زمانے'' میں پائی جا رہی ہے۔

۲۸ — یہ آیات ہمارے سامنے اُن حالات کا ایک عجیب نقشہ پیش کرتی ہیں جن میں اس وقت حضرت یوسفؑ مبتلا تھے۔ اُنیس بیس سال کا ایک خوب صورت نوجوان ہے جو بدویانہ زندگی سے بہترین تندرستی اور بھری جوانی لیے ہوئے آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور جبری غلامی کے مراحل سے گزرنے کے بعد قسمت اسے دنیا کی سب سے بڑی متمدن سلطنت کے پایۂ تخت میں ایک بڑے رئیس کے ہاں لے آئی ہے۔ یہاں پہلے تو خود اس گھر کی بیگم ہی اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے جس سے اس کا شب و روز کا سابقہ ہے۔ پھر اس کے حُسن کا چرچا سارے دار السلطنت میں پھیلتا ہے اور شہر بھر کے امیر گھرانوں کی عورتیں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف سیکڑوں خوب صورت جال ہیں جو ہر وقت ہر جگہ اسے پھانسنے کے لیے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی تدبیریں اس کے جذبات کو بھڑکانے اور اس کے زہد کو توڑنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ جدھر جاتا ہے یہی دیکھتا ہے کہ گناہ اپنی ساری خوش نمائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا ہے۔ کوئی تو فجور کے مواقع خود ڈھونڈتا ہے، مگر یہاں خود مواقع اس کو ڈھونڈ رہے ہیں اور اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ جس وقت بھی اس کے دل میں برائی کی طرف ادنیٰ میلان پیدا ہو، وہ فوراً اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے وہ اس خطرے میں بسر کر رہا ہے کہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ارادے کی بندش میں کچھ ڈھیل آ جائے تو وہ گناہ کے اُن بے شمار دروازوں میں سے کسی میں داخل ہو سکتا ہے جو اس کے انتظار میں کُھلے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں یہ خدا پرست نوجوان جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتا ہے، وہ بجائے خود کچھ کم قابلِ تعریف نہیں ہے۔ مگر ضبطِ نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عرفانِ نفس اور طہارتِ فکر کا مزید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی اس کے دل میں کبھی یہ متکبرانہ خیال نہیں آتا کہ واہ رے میں، کیسا مضبوط ہے میری سیرت کہ ایسی ایسی حسین اور جوان عورتیں میری گرویدہ ہیں اور پھر بھی میرے قدم نہیں پھسلتے۔ اس کے بجائے وہ اپنی بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کرتا ہے کہ اے رب! میں ایک کمزور انسان ہوں، میرا اتنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں، تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا، ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم پھسل

لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ
بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ ع

اس کی دُعا قبول کی اور اُن عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں،[۲۹] بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

پھر ان لوگوں کو یہ سُوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں، حالانکہ وہ (اس کی پاک دامنی اور خود اپنی عورتوں کے بُرے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[۳۰]

نہ جائیں ـــــ درحقیقت یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ دیانت، امانت، عفت، حق شناسی، راست رَوی، انضباط اور توازنِ ذہنی کی غیر معمولی صفات جو اَب تک ان کے اندر چھپی ہوئی تھیں اور جن سے وہ خود بھی بے خبر تھے، وہ سب کی سب اس شدید آزمائش کے دَور میں اُبھر آئیں، پورے زور کے ساتھ کام کرنے لگیں، اور انھیں خود بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے اندر کون کون سی قوتیں موجود ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے سکتے ہیں۔

۲۹ - دفع کرنا اس معنی میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کی سیرتِ صالحہ کو ایسی مضبوطی بخش دی گئی جس کے مقابلے میں ان عورتوں کی ساری تدبیریں ناکام ہو کر رہ گئیں۔ نیز اس معنی میں بھی ہے کہ مشیّتِ الٰہی نے جیل کا دروازہ ان کے لیے کُھلوا دیا۔

۳۰ - اس طرح حضرت یوسفؑ کا قید میں ڈالا جانا درحقیقت ان کی اخلاقی فتح اور مصر کے پورے طبقۂ اُمَراء و حُکّام کی اخلاقی شکست کا اتمام و اعلان تھا۔ اب حضرت یوسفؑ کوئی غیر معروف اور گمنام آدمی نہ رہے تھے۔ سارے ملک میں، اور کم از کم دار السلطنت میں تو عام و خاص سب ان سے واقف ہو چکے تھے۔ جس شخص کی دلفریب شخصیت پر ایک دو نہیں، اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی خواتین فریفتہ ہوں، اور جس کے فتنۂ روزگار حُسن سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی ہو کہ اسے قید کر دیں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ یقیناً گھر گھر اس کا چرچا پھیل گیا ہو گا۔ عام طور پر لوگ اس بات سے بھی واقف ہو گئے ہوں گے کہ یہ شخص کیسے بلند اور مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے، اور یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ اس شخص کو جیل اپنے کسی جرم پر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ مصر کے اُمرا اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنے کے بجائے اس بے گناہ کو جیل بھیج دینا زیادہ آسان پاتے تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ کسی شخص کو شرائطِ انصاف کے مطابق عدالت میں مجرم ثابت کیے بغیر، بس یونہی پکڑ کر جیل بھیج دینا، بے ایمان حکمرانوں کی پُرانی سنت ہے۔ اس معاملے میں بھی آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ "جمہوریت" کا نام نہیں لیتے تھے، اور یہ اپنے اِن کرتوتوں کے ساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکتیں کیا کرتے تھے، اور یہ ہر ناروا زیادتی کے لیے پہلے ایک "قانون" بنا لیتے ہیں۔ وہ صاف صاف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ

قید خانے میں[31] دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے۔[32] ایک روز اُن میں سے ایک نے اُس سے کہا: ”میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں۔“ دوسرے نے کہا: ”میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں۔“ دونوں نے کہا: ”ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں۔“[33] یوسفؑ نے کہا:

اپنی اغراض کے لیے لوگوں پر دست درازی کرتے تھے، اور یہ جس پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے متعلق دُنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُس سے اِن کو نہیں بلکہ ملک اور قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ صرف ظالم تھے، یہ اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں۔

۳۱- غالباً اس وقت جب کہ حضرت یوسفؑ قید کیے گئے، ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تَلْمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے چھوٹ کر جب وہ مصر کے فرماں روا ہوئے تو ان کی عمر تیس سال تھی، اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں وہ بِضْعَ سِنِيْنَ یعنی کئی سال رہے۔ بِضْعَ کا اطلاق عربی زبان میں دس تک کے عدد کے لیے ہوتا ہے۔

۳۲- یہ دو غلام جو قید خانے میں حضرت یوسفؑ کے ساتھ داخل ہوئے تھے، ان کے متعلق بائبل کی روایت ہے کہ ان میں سے ایک شاہ مصر کے ساقیوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی نان بائیوں کا افسر۔ تَلْمود کا بیان ہے کہ ان دونوں کو شاہِ مصر نے اس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے ایک گلاس میں مکھی نکل آئی تھی!

۳۳- اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسفؑ کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُوپر جن واقعات کا ذکر گزر چکا ہے، ان کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات قابلِ تعجب نہیں رہتی کہ ان دو قیدیوں نے آخر حضرت یوسفؑ ہی سے آکر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی اور ان کی خدمت میں یہ نذرِ عقیدت کیوں پیش کی کہ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس آدمی ہے، سخت ترین آزمائشوں میں اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے چکا ہے، آج پورے ملک میں اس سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے، حتّٰی کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں بھی اس کی نظیر مفقود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ قید خانے کے حُکّام اور اہل کار تک ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ چنانچہ بائبل میں ہے کہ ”قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یُوسُفؑ کے ہاتھ میں سونپا

لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ
يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ
اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ
بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا

"یہاں جو کھانا تمھیں ملا کرتا ہے، اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم اُن علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا)، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند

اور جو کچھ وہ کرتے اُسی کے حکم سے کرتے تھے، اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے بے فکر تھا۔" (پیدائش ۳۹: ۲۲-۲۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۞۴۰ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ۞۴۱ؕ

نازل نہیں کی۔فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔یہی ٹھیٹ سیدھا طریقِ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔اے زنداں کے ساتھیو! تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہِ مصر) کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا، تو اسے سُولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔فیصلہ ہو گیا اُس بات کا جو تم پُوچھ رہے تھے۔[۳۴]

۳۴- یہ تقریر جو اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے، بائبل اور تلمود میں کہیں اِس کی طرف ادنیٰ اشارہ تک نہیں ہے۔وہ حضرت یوسفؑ کو محض ایک دانش منداور پرہیزگار آدمی کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔مگر قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی سیرت کے اِن پہلوؤں کو بھی بائبل اور تلمود کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن کر کے پیش کرتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنا ایک پیغمبرانہ مشن رکھتے تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ کا کام انھوں نے قید خانے ہی میں شروع کر دیا تھا۔

یہ تقریر ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یونہی سرسری طور پر گزر جایئے۔اس کے متعدّد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) یہ پہلا موقع ہے جب کہ حضرت یوسفؑ ہم کو دینِ حق کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔اس سے پہلے ان کی داستانِ حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیے ہیں، ان میں صرف اخلاقِ فاضلہ کی مختلف خُصوصیّات مختلف مرحلوں پر اُبھرتی رہی ہیں مگر تبلیغ کا کوئی نشان وہاں نہیں پایا جاتا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مراحل محض تیاری اور تربیت کے تھے۔نبوت کا کام عملاً اس قید خانے کے مرحلے میں ان کے سُپرد کیا گیا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریرِ دعوت ہے۔

(۲) یہ بھی پہلا ہی موقع ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی۔اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ

نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اُس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی۔ جب قافلے والوں نے ان کو پکڑ کر غلام بنایا، جب وہ مصر لائے گئے، جب انھیں عزیزِ مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا، جب انھیں جیل بھیجا گیا، ان میں سے کسی موقع پر بھی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کا پوتا اور یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ دادا کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے، خواہ اہلِ مَدیَن ہوں یا اسماعیلی، دونوں ان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے ہی تھے۔ اہلِ مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیمؑ سے تو ناواقف نہ تھے۔ (بلکہ حضرت یوسفؑ جس انداز سے ان کا اور حضرت یعقوبؑ اور حضرت اسحاقؑ کا ذکر کر رہے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں بزرگوں کی شہرت مصر میں پہنچی ہوئی تھی)۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے کبھی باپ دادا کا نام لے کر اپنے آپ کو ان حالات سے نکالنے کی کوشش نہ کی جن میں وہ پچھلے چار پانچ سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انھیں بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ان کا اِن حالات سے گزرنا ہی ضروری ہے۔ مگر اب انھوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوتِ توحید کی اُس عالم گیر تحریک سے ہے جس کے ائمہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعیِ حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اُٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سُوجھی تھی، بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں اُس اَزلی و اَبدی حقیقت کی طرف بُلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہلِ حق پیش کرتے رہے ہیں۔

(۳) پھر حضرت یوسفؑ نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا، اِس میں ہم کو حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمھیں ضرور بتاؤں گا، مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمھیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ اُن کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغِ حق کی دُھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دُھن لگی ہوئی نہیں ہوتی اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا۔ مگر وہ جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اُس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر لیچڑپن اور جھگڑالو پن سے انھیں اُلٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوتِ دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اُصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے، بلکہ ان کے سامنے دین کے اُس نقطۂ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہلِ حق کا راستہ اہلِ باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقلِ عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اُتر گئی ہوگی کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿٤٢﴾ ع ۵

پھر اُن میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا، اس سے یُوسُفؑ نے کہا کہ "اپنے رب (شاہِ مصر) سے میرا ذکر کرنا" مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہِ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسفؑ کئی سال قید خانے میں پڑا رہا۔[35]

بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو، اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا، مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم اَن داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالکِ زمین اور کسی کو ربِّ دولت یا مختارِ صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب خالی خولی نام ہی ہیں، ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی اَن داتائی و خداوندی اور مالکیّت و رُبوبیّت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو، اور اس نے ان میں سے کسی کے لیے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اُتاری ہے۔ اس نے تو فرماں روائی کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لیے مخصوص رکھے ہیں، اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(۵) اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے قید خانے کی زندگی کے یہ آٹھ دس سال کس طرح گزارے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چونکہ ان کے ایک ہی وعظ کا ذکر ہے اس لیے انھوں نے صرف ایک ہی دفعہ دعوتِ دین کے لیے زبان کھولی تھی۔ مگر اوّل تو ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان کرنا ہی سخت بدگمانی ہے کہ وہ اپنے اصل کام سے غافل ہوگا۔ پھر جس شخص کی تبلیغی دُھن کا یہ حال تھا کہ دو آدمی تعبیرِ خواب پوچھتے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دین کی تبلیغ شروع کر دیتا ہے، اُس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اُس نے قید خانے کے یہ چند سال خاموش ہی گزار دیے ہوں گے۔

۳۵۔ اِس مقام کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ "شیطان نے حضرت یوسفؑ کو اپنے رب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی یاد سے غافل کر دیا اور انھوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ اپنے رب (یعنی شاہِ مصر) سے ان کا تذکرہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں پڑے رہے۔" درحقیقت یہ تفسیر بالکل غلط ہے۔ صحیح یہی ہے، جیسا کہ علامہ ابن کثیرؒ، اور متقدمین میں سے مجاہد اور محمد بن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے کہ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کی ضمیر اس شخص کی طرف پھرتی ہے جس کے متعلق حضرت یوسفؑ کا گمان تھا کہ وہ رہائی پانے والا ہے، اور اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ "شیطان نے اسے اپنے آقا سے حضرت یوسفؑ کا ذکر کرنا بھلا دیا۔" اس سلسلے میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ نبیؐ نے

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ
عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ
اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ
اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝۴۴ وَ قَالَ الَّذِیْ
نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵

ایک[۳۶] روز بادشاہ نے کہا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سُوکھی۔ اے اہلِ دربار! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو۔"[۳۷] لوگوں نے کہا: "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔"

اُن دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اُسے ایک مدتِ دراز کے بعد اب بات یاد آئی، اُس نے کہا: "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں، مجھے ذرا (قید خانے میں یوسفؑ کے پاس) بھیج دیجیے۔"[۳۸]

فرمایا کہ "اگر یوسف علیہ السلام نے وہ بات نہ کہی ہوتی جو انھوں نے کہی تو وہ قید میں کئی سال نہ پڑے رہتے۔" لیکن علامہ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث جتنے طریقوں سے روایت کی گئی ہے، وہ سب ضعیف ہیں۔ بعض طریقوں سے یہ مرفوعاً روایت کی گئی ہے اور ان میں سُفیان بن وَکیع اور ابراہیم بن یزید راوی ہیں جو دونوں ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اور بعض طریقوں سے یہ مُرسَلاً روایت ہوئی ہے اور ایسے معاملات میں مُرسَلات کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" علاوہ بریں دِرایت کے اعتبار سے بھی یہ بات باور کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ایک مظلوم شخص کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدبیر کرنا خدا سے غفلت اور توکُّل کے فُقدان کی دلیل قرار دیا گیا ہوگا۔

۳۶- بیچ میں کئی سال کے زمانۂ قید کا حال چھوڑ کر اب سررشتۂ بیان اُس مقام سے جوڑا جاتا ہے جہاں سے حضرت یوسفؑ کا دنیوی عُروج شروع ہُوا۔

۳۷- بائبل اور تلمود کا بیان ہے کہ ان خوابوں سے بادشاہ بہت پریشان ہوگیا تھا اور اس نے اعلانِ عام کے ذریعے سے اپنے ملک کے تمام دانش مندوں، کاہنوں، مذہبی پیشواؤں اور جادوگروں کو جمع کر کے ان سب کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ
سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ
اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝٤٦ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ
دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝٤٧
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝٤٨ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ

اس نے جا کر کہا: ”یوسُفؑ! اے سراپا راستی[۳۹]! مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں اُن لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں۔“ یُوسُفؑ نے کہا: ”سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ اس دَوران میں جو فصلیں تم کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصّہ، جو تمھاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی کو اس کی بالوں ہی میں رہنے دو۔ پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اُس زمانے میں وہ سب غلّہ کھا لیا جائے گا جو تم اُس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں

۳۸- قرآن نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ بائبل اور تلمود سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے (اور قیاس بھی کہتا ہے کہ ضرور ایسا ہُوا ہوگا) کہ سردار ساقی نے یوسف علیہ السلام کے حالات بادشاہ سے بیان کیے، اور جیل میں اس کے خواب اور اس کے ساتھی کے خواب کی جیسی صحیح تعبیر انھوں نے دی تھی اس کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ میں ان سے اس کی تاویل پوچھ کر آتا ہوں، مجھے قید خانے میں ان سے ملنے کی اجازت عطا کی جائے۔

۳۹- متن میں لفظ ”صِدّیق“ استعمال ہوا ہے، جو عربی زبان میں سچّائی اور راست بازی کے انتہائی مرتبے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے کے زمانۂ قیام میں اس شخص نے یوسف علیہ السلام کی سیرتِ پاک سے کیسا گہرا اثر لیا تھا اور یہ اثر ایک مدّتِ دراز گزر جانے کے بعد بھی کتنا راسخ تھا۔ صِدّیق کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: جلد اوّل، سورۂ نساء، حاشیہ ۹۹۔

يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ

ع ۶

باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔"[41] ع

بادشاہ نے کہا: "اسے میرے پاس لاؤ۔" مگر جب شاہی فرستادہ یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا:[42] "اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے

۴۰ – یعنی آپ کی قدر و منزلت جان لیں اور ان کو احساس ہو کہ کس پایے کے آدمی کو انھوں نے کہاں بند کر رکھا ہے، اور اس طرح مجھے اپنے اس وعدے کے ایفا کا موقع مل جائے جو میں نے آپ سے قید کے زمانے میں کیا تھا۔

۴۱ – متن میں لفظ "یَعْصِرُوْنَ" استعمال ہُوا ہے، جس کے لفظی معنٰی "نچوڑنے" کے ہیں۔ اس سے مقصود یہاں سرسبزی و شادابی کی وہ کیفیت بیان کرنا ہے جو قحط کے بعد بارانِ رحمت اور دریائے نیل کے چڑھاؤ سے رُونما ہونے والی تھی۔ جب زمین سیراب ہوتی ہے تو تیل دینے والے بیج اور رس دینے والے پھل اور میوے خوب پیدا ہوتے ہیں، اور مویشی بھی چارا اچھا ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دینے لگتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس تعبیر میں صرف بادشاہ کے خواب کا مطلب بتانے ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ خوشحالی کے ابتدائی سات برسوں میں آنے والے قحط کے لیے کیا پیش بندی کی جائے اور غلّے کو محفوظ رکھنے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ پھر مزید برآں آپ نے قحط کے بعد اچھے دن آنے کی خوشخبری بھی دے دی، جس کا ذکر بادشاہ کے خواب میں نہ تھا۔

۴۲ – یہاں سے لے کر بادشاہ کی ملاقات تک جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے ـــــ جو اس قصّے کا ایک بڑا ہی اہم باب ہے ـــــ اس کا کوئی ذکر بائبل اور تَلمُود میں نہیں ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر حضرت یوسفؑ فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے، حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی زیادہ گھٹیا صورت میں اس واقعے کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ "بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے حضور پیش کرو، اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو، ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسفؑ کو قید خانے سے نکالا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہاں زر و جواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسفؑ ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جاتا اور بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اور جب ادنیٰ طبقے کا کوئی آدمی شاہی مُخاطبہ کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اُتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسفؑ اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہُوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی، اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اُتر کر اس سے گفتگو کی۔" اس تصویر میں

Maktaba Tul Ishaat.com

النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۵۰
قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ

جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔" اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمھارا کیا تجربہ ہے اُس وقت کا جب تم نے یوسفؑ کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟

بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو جتنا گرا کر پیش کیا ہے اس کو نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن ان کے قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان اور کس آن بان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر صاحبِ نظر کا اپنا کام ہے کہ ان دونوں تصویروں میں سے کون سی تصویر پیغمبری کے مرتبے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی عقلِ عام کو کھٹکتی ہے کہ اگر بادشاہ کی ملاقات کے وقت تک حضرت یوسفؑ کی حیثیت اتنی ہی گری ہوئی تھی جتنی تلمود کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، تو خواب کی تعبیر سنتے ہی یکایک ان کو تمام سلطنت کا مختارِ کل کیسے بنا دیا گیا۔ ایک مہذب و متمدن ملک میں اتنا بڑا مرتبہ تو آدمی کو اُسی وقت ملا کرتا ہے جب کہ وہ اپنی اخلاقی و ذہنی برتری کا سکہ لوگوں پر بٹھا چکا ہو۔ پس عقل کی رُو سے بھی بائبل اور تلمود کی بہ نسبت قرآن ہی کا بیان زیادہ مطابقِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

۴۳ – یعنی جہاں تک میرے رب کا معاملہ ہے، اس کو تو پہلے ہی میری بے گناہی کا حال معلوم ہے۔ مگر تمھارے رب کو بھی میری رہائی سے پہلے اُس معاملے کی پوری طرح تحقیق کر لینی چاہیے جس کی بنا پر مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا۔ کیونکہ میں کسی شبہ اور کسی بدگمانی کا داغ لیے ہوئے خلق کے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ مجھے رہا کرنا ہے تو پہلے برسرِعام یہ ثابت ہونا چاہیے کہ میں بے قصور تھا۔ اصل قصوروار تمھاری سلطنت کے کارفرما اور کارپرداز تھے، جنھوں نے اپنی بیگمات کی بداطواری کا خمیازہ میری پاک دامنی پر ڈالا۔

اس مطالبے کو حضرت یوسفؑ جن الفاظ میں پیش کرتے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہِ مصر اُس پورے واقعے سے پہلے ہی واقف تھا جو بیگمِ عزیز کی دعوت کے موقع پر پیش آیا تھا۔ بلکہ وہ ایسا مشہور واقعہ تھا کہ اس کی طرف صرف ایک اشارہ ہی کافی تھا۔

پھر اس مطالبے میں حضرت یوسفؑ عزیزِ مصر کی بیوی کو چھوڑ کر صرف ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کے ذکر پر اکتفا فرماتے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی شرافتِ نفس کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس عورت نے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کی ہو، مگر پھر بھی اس کا شوہر ان کا محسن تھا، اس لیے انھوں نے نہ چاہا کہ اس کے ناموس پر خود کوئی حرف لائیں۔

۴۴ – ممکن ہے کہ شاہی محل میں ان تمام خواتین کو جمع کر کے یہ شہادت لی گئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ نے کسی معتمدِ خاص کو بھیج کر فرداً فرداً ان سے دریافت کرایا ہو۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ
الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ
لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ

سب نے یک زبان ہو کر کہا: ”حاشَ للہ! ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔“ عزیز کی بیوی بول اٹھی: ”اب حق کھل چکا ہے، وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی، بے شک وہ بالکل سچا ہے۔“[45]

(یوسفؑ نے کہا:)[46] ”اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی، اور

۴۵ – اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان شہادتوں نے کس طرح آٹھ نو سال پہلے کے واقعات کو تازہ کر دیا ہوگا، کس طرح حضرت یوسفؑ کی شخصیت زمانۂ قید کی طویل گمنامی سے نکل کر یکایک پھر سطح پر آ گئی ہوگی، اور کس طرح مصر کے تمام اشراف، معززین، متوسطین اور عوام تک میں آپ کا اخلاقی وقار قائم ہو گیا ہوگا۔ اُوپر بائبل اور تلمود کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ بادشاہ نے اعلانِ عام کر کے تمام مملکت کے دانش مندوں اور علما اور پیروں کو جمع کیا تھا اور وہ سب اس کے خواب کا مطلب بیان کرنے سے عاجز ہو چکے تھے۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس کا مطلب بتایا۔ اس واقعے کی بنا پر پہلے ہی سے سارے ملک کی نگاہیں آپ کی ذات پر مرتکز ہو چکی ہوں گی۔ پھر جب بادشاہ کی طلبی پر آپ نے باہر نکلنے سے انکار کیا ہوگا تو سارے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ عجیب قسم کا بلند حوصلہ انسان ہے جس کو آٹھ نو برس کی قید کے بعد بادشاہِ وقت مہربان ہو کر بلا رہا ہے اور پھر بھی وہ بیتاب ہو کر دوڑ نہیں پڑتا۔ پھر جب لوگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ یوسفؑ نے اپنی رہائی قبول کرنے اور بادشاہِ وقت کی ملاقات کو آنے کے لیے کیا شرط پیش کی ہے تو سب کی نگاہیں اس تحقیقات کے نتیجے پر لگ گئی ہوں گی۔ اور جب لوگوں نے اس کا نتیجہ سنا ہوگا تو ملک کا بچہ بچہ عش عش کر تا رہ گیا ہوگا کہ کس قدر پاکیزہ سیرت کا ہے یہ انسان جس کی طہارتِ نفس پر آج وہی لوگ گواہی دے رہے ہیں جنھوں نے مل جُل کر کل اُسے جیل میں ڈالا تھا۔ اس صورتِ حال پر اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اُس وقت حضرت یوسفؑ کے بامِ عُروج پر پہنچنے کے لیے کس طرح فضا سازگار ہو چکی تھی۔ اس کے بعد یہ بات کچھ بھی قابلِ تعجب نہیں رہتی کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے ملاقات کے موقع پر خزائنِ ارض کی سُپردگی کا مطالبہ کیسے بے دھڑک پیش کر دیا اور بادشاہ نے اسے کیوں بے تأمل قبول کر لیا۔ اگر بات صرف اسی قدر ہوتی کہ جیل کے ایک قیدی نے بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر بتا دی تھی تو ظاہر ہے کہ اس پر وہ زیادہ سے زیادہ کسی انعام کا اور خلاصی پا جانے کا مستحق ہو سکتا تھا۔ اتنی سی بات اس کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بادشاہ سے کہے: ”خزائنِ ارض میرے حوالے کر دو“ اور بادشاہ کہہ دے ”لیجیے، سب کچھ حاضر ہے“۔

۴۶ – یہ بات غالباً حضرت یوسفؑ نے اُس وقت کہی ہوگی جب قید خانے میں آپ کو تحقیقات کے نتیجے کی خبر دی گئی ہوگی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآىِٕنِیْنَ ﴿۵۲﴾

الجزء ۱۳ وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ

اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ

یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی بَراءَت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے، اِلّا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔“

بادشاہ نے کہا: ”انھیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کرلوں۔“

بعض مفسرین، جن میں ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ کثیر جیسے فُضلا بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسفؑ کا نہیں بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصّہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ اِمرأۃ العزیز کے قول سے متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ ”اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ“ پر امرأۃ العزیز کی بات ختم ہوگئی اور بعد کا کلام حضرت یوسفؑ کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی صراحت نہ ہو کہ یہ قول فُلاں کا ہے اور یہ فُلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جا سکے، اور یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک پورا کلام اِمرأۃ العزیز کا ہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابنِ تیمیہ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چُوک گئی کہ شانِ کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے، جس کے ہوتے کسی اور قرینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلاشبہ اِمرأۃ العزیز کے منہ پر پھبتا ہے، مگر کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شانِ کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل حضرت یوسفؑ ہیں نہ کہ عزیزِ مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خدا ترسی بول رہی ہے، وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اس زبان سے نکلا ہُوا نہیں ہوسکتا جس سے هَیْتَ لَكَ نکلا تھا، جس سے مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا نکلا تھا، اور جس سے بھری محفل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ لَىِٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ۔ ایسا پاکیزہ فقرہ تو وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ کہہ چکی تھی، جو رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ کہہ چکی تھی، جو اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسفِ صدیق کے بجائے اِمرأۃ العزیز کا کلام ماننا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ و ایمان اور اصلاحِ نفس کی توفیق نصیب ہوگئی تھی، اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

جب یُوسُفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا: ”اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے[۴۷]۔“ یُوسُفؑ نے کہا: ”مُلک کے خزانے میرے سُپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں[۴۷ الف]۔“

۴۷ – یہ بادشاہ کی طرف سے گویا ایک کھلا اشارہ تھا کہ آپ کو ہر ذمہ داری کا منصب سونپا جا سکتا ہے۔

۴۷ الف – اس سے پہلے جو توضیحات گزر چکی ہیں، ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ کوئی نوکری کی درخواست نہیں تھی جو کسی طالبِ جاہ نے وقت کے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے پیش کر دی ہو۔ درحقیقت یہ اُس انقلاب کا دروازہ کھولنے کے لیے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسفؑ کی اخلاقی طاقت سے پچھلے دس بارہ سال کے اندر نشو و نما پا کر ظہور کے لیے تیار ہو چکا تھا، اور اب جس کا فتحِ باب صرف ایک ٹھوکے ہی کا محتاج تھا۔ حضرت یوسفؑ آزمایشوں کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر آ رہے تھے۔ اور یہ آزمایشیں کسی گمنامی کے گوشے میں پیش نہیں آئی تھیں، بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شہریوں تک مصر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ان آزمایشوں میں انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت، راست بازی، حِلم، ضبطِ نفس، عالی ظرفی، ذہانت و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانے کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں۔ دل ان سے مسخّر ہو چکے تھے۔ خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اُن کا ”حفیظ“ اور ”علیم“ ہونا اب محض ایک دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ واقعہ تھا، جس پر سب ایمان لا چکے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف اتنی کہ حضرت یوسفؑ خود حکومت کے اُن اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے پر رضا مندی ظاہر کریں جن کے لیے بادشاہ اور اس کے اعیانِ سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وہ کسر تھی جو انھوں نے اپنے اس فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبے کے نکلتے ہی بادشاہ اور اس کی کونسل نے جس طرح اسے بسر و چشم قبول کیا وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لیے ایک اشارے ہی کا منتظر تھا۔ (تلمود کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہا بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پوری شاہی کونسل نے بالاتفاق اِس کے حق میں رائے دی تھی)۔

یہ اختیارات جو حضرت یوسفؑ نے مانگے اور ان کو سونپے گئے، ان کی نوعیت کیا تھی؟ ناواقف لوگ یہاں ”خزائنِ ارض“ کے الفاظ اور آگے چل کر غلّے کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ شاید یہ افسرِ خزانہ، یا افسرِ مال، یا قحط کمشنر، یا وزیرِ مالیات، یا وزیرِ غذائیات کی قسم کا کوئی عہدہ ہو گا۔ لیکن قرآن، بائبل اور تلمود کی مُتّفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت حضرت یوسفؑ سلطنتِ مصر کے مختارِ کل (رومی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ سپید سب کچھ ان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ جب حضرت یعقوبؑ مصر پہنچے ہیں، اُس وقت حضرت یوسفؑ تخت نشین تھے (وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ)۔ حضرت یوسفؑ کی اپنی زبان سے نکلا ہُوا یہ فقرہ قرآن میں منقول ہے کہ ”اے میرے رب! تُو نے مجھے بادشاہی عطا کی“ (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ)۔ پیالے کی چوری کے موقع پر سرکاری ملازم حضرت یوسف کے پیالے کو بادشاہ کا پیالہ کہتے ہیں (قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ)۔ اور اللہ تعالیٰ مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت یہ بیان فرماتا ہے کہ ساری سرزمینِ مصر اُن کی تھی (يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ)۔ رہی بائبل، تو وہ شہادت دیتی ہے کہ فرعون نے یوسف علیہ السلام سے کہا:

”سو تُو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا...... دیکھ، میں تجھے سارے ملکِ مصر کا حاکم بناتا ہوں...... اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملکِ مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔ اور فرعون نے یوسفؑ کا نام صَفِنات فَعْنیح (دنیا کا نجات دہندہ) رکھا“ (پیدائش ۴۱: ۴۰-۴۵)

اور تلمود کہتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے والد سے حاکمِ مصر (یوسفؑ) کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا:

”اپنے ملک کے باشندوں پر اس کا اقتدار سب سے بالا ہے۔ اس کے حکم پر وہ نکلتے اور اسی کے حکم پر وہ داخل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سارے ملک پر فرماں روائی کرتی ہے۔ کسی معاملے میں فرعون کے اِذن کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ اختیارات کس غرض کے لیے مانگے تھے؟ انھوں نے اپنی خدمات اس لیے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اُصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظامِ تمدّن و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر ”کشّاف“ میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت یوسفؑ نے اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے، اور وہ اُس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کر لیں جس کے لیے انبیاؑ بھیجے جاتے ہیں۔ انھوں نے بادشاہی کی محبّت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔“

اور سچ یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہی تصور ملتا ہے کہ اسلام کا داعی خود نظامِ کفر کو کافرانہ اُصولوں پر چلانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا، اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھیرتا ہے، یعنی یہ کہ حضرت یوسفؑ ایک راست باز آدمی بھی تھے یا نہیں؟ اگر راست باز تھے تو کیا ایک راست باز انسان کا یہی کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے کرے کہ ”بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے“، اور بار بار اہلِ مصر پر بھی واضح کر دے کہ تمھارے اِن بہت سے متفرق خود ساختہ خداؤں میں سے

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۚ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

اِس طرح ہم نے اُس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔[۴۸] ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا،

ایک یہ شاہِ مصر بھی ہے، اور صاف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ "فرماں روائی کا اقتدار خدائے واحد کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے"، مگر جب عملی آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اُس نظامِ حکومت کا خادم، بلکہ ناظم اور محافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہِ مصر کی رُبوبیت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ "فرماں روائی کے اختیارات خدا کے لیے نہیں بلکہ بادشاہ کے لیے ہیں" تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دَورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اُسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں، ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے، تاکہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا۔ انھیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی، مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے عَلَم برداروں کی بلندی دیکھ کر انھیں شرم آئی، لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی دراصل انھیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مُجرّد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے، اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

۴۸ – یعنی اب ساری سرزمینِ مصر اس کی تھی۔ اُس کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کہہ سکتا تھا۔ وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جو اس سے روکا جا سکتا ہو۔ یہ گویا اُس کامل تسلّط اور ہمہ گیر اقتدار کا بیان ہے جو حضرت یوسفؑ کو اُس ملک پر حاصل تھا۔ قدیم مفسرین بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن زید کے حوالے سے علامہ ابنِ جریر طَبَریؒ نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "ہم نے یوسفؑ کو ان سب چیزوں کا مالک بنا دیا جو مصر میں تھیں، دنیا کے اس حصے میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا تھا کر سکتا، وہ سرزمین اس کے حوالے کر دی گئی تھی، حتّٰی کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو اپنا زیردست کر لے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا۔" دوسرا قول علامہ موصوف نے مجاہدؒ کا نقل کیا ہے جو مشہور ائمۂ تفسیر میں سے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بادشاہِ مصر نے یوسفؑ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۷

وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَجَآءَ
اِخۡوَةُ يُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۵۸﴾
وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ قَالَ ائۡتُوۡنِىۡ بِاَخٍ لَّكُمۡ مِّنۡ اَبِيۡكُمۡ‌ ۚ

اور آخرت کا اجر اُن لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔[۴۹] ع

یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔[۵۰] اس نے انھیں پہچان لیا مگر وہ اس سے نا آشنا تھے۔[۵۱] پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا۔

۴۹ – یہ تنبیہ ہے اِس امر پر کہ کوئی شخص دنیوی حکومت و اقتدار کو نیکی و نیکوکاری کا اصلی اجر اور حقیقی اجرِ مطلوب نہ سمجھ بیٹھے، بلکہ خبردار رہے کہ بہترین اجر، اور وہ اجر جو مومن کو مطلوب ہونا چاہیے، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔

۵۰ – یہاں پھر سات آٹھ برس کے واقعات درمیان میں چھوڑ کر سلسلۂ بیان اس جگہ سے جوڑ دیا گیا ہے جہاں سے بنی اسرائیل کے مصر منتقل ہونے اور حضرت یعقوبؑ کو اپنے گم شدہ صاحبزادے کا پتا ملنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بیچ میں جو واقعات چھوڑ دیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خواب والی پیش خبری کے مطابق حضرت یوسفؑ کی حکومت کے پہلے سات سال مصر میں انتہائی خوشحالی کے گزرے اور ان ایام میں انھوں نے آنے والے قحط کے لیے وہ تمام پیش بندیاں کر لیں جن کا مشورہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتاتے وقت وہ دے چکے تھے۔ اس کے بعد قحط کا دَور شروع ہُوا، اور یہ قحط صرف مصر ہی میں نہ تھا بلکہ آس پاس کے مَمالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شام، فلسطین، شرقِ اُردن، شمالی عرب، سب جگہ خشک سالی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں حضرت یوسفؑ کے دانش مندانہ انتظام کی بدولت صرف مصر ہی وہ ملک تھا جہاں قحط کے باوجود غلّے کی اِفراط تھی۔ اس لیے ہمسایہ مَمالک کے لوگ مجبور ہوئے کہ غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر کی طرف رُجوع کریں۔ یہی وہ موقع تھا جب فلسطین سے حضرت یوسفؑ کے بھائی غلّہ خریدنے کے لیے مصر پہنچے۔ غالباً حضرت یوسفؑ نے غلے کی اس طرح ضابطہ بندی کی ہوگی کہ بیرونی مَمالک میں خاص اجازت ناموں کے بغیر اور خاص مقدار سے زیادہ غلہ نہ جا سکتا ہوگا۔ اس وجہ سے جب برادرانِ یوسفؑ نے غیر ملک سے آکر غلّہ حاصل کرنا چاہا ہوگا تو انھیں اس کے لیے خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور اس طرح حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کی پیشی کی نوبت آئی ہوگی۔

۵۱ – برادرانِ یوسفؑ کا آپ کو نہ پہچاننا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ جس وقت انھوں نے آپ کو کنویں میں پھینکا تھا اس وقت آپ صرف سترہ سال کے لڑکے تھے، اور اب آپ کی عمر ۳۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ اتنی طویل مدت آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ پھر یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس بھائی کو وہ کنویں میں پھینک گئے تھے، وہ آج مصر کا مختارِ مُطلق ہوگا۔

اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ
عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ
رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ
یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ

دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمھارے لیے کوئی غلّہ نہیں ہے، بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔"[۵۲] انھوں نے کہا: "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں، اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔" یوسف نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلّے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چُپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو۔" یہ یُوسُفؑ نے اِس اُمید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہُوا مال پہچان جائیں گے (یا اِس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں۔

جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا: "ابا جان! آیندہ ہم کو غلّہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے،

۵۲ - اختصارِ بیان کی وجہ سے شاید کسی کو یہ سمجھنے میں دِقت ہو کہ حضرت یوسفؑ جب اپنی شخصیت کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے تو پھر ان کے سوتیلے بھائی کا ذکر کیسے آ گیا اور اس کے لانے پر اس قدر اصرار کرنے کے کیا معنٰی تھے؟ کیونکہ اس طرح تو راز فاش ہوا جاتا تھا۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے بات صاف سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہاں غلّے کی ضابطہ بندی تھی اور ہر شخص ایک مقرر مقدارِ غلّہ ہی لے سکتا تھا۔ غلّہ لینے کے لیے یہ دس بھائی آئے تھے۔ مگر وہ اپنے والد اور اپنے گیارھویں بھائی کا حصّہ بھی مانگتے ہوں گے۔ اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا ہو گا کہ تمھارے والد کے خود نہ آنے کے لیے تو یہ عذر معقول ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بوڑھے اور نابینا ہیں، مگر بھائی کے نہ آنے کا کیا معقول سبب ہو سکتا ہے؟ کہیں تم ایک فرضی نام سے زائد غلّہ حاصل کرنے اور پھر ناجائز تجارت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں اپنے گھر کے کچھ حالات بیان کیے ہوں گے اور بتایا ہو گا کہ وہ ہمارا سوتیلا بھائی ہے اور بعض وجوہ سے ہمارے والد اس کو ہمارے ساتھ بھیجنے میں تأمّل کرتے ہیں۔ تب حضرت یوسفؑ نے فرمایا ہو گا کہ خیر، اس وقت تو ہم تمھاری زبان کا اعتبار کر کے تم کو پورا غلّہ دیے دیتے ہیں، مگر آیندہ اگر تم اس کو ساتھ نہ لائے تو تمھارا اعتبار جاتا رہے گا اور تمھیں یہاں سے کوئی غلّہ نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝٦٣ قَالَ هَلْ
اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ
حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝٦٤ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا
بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا
رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ
بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝٦٥ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ
مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ

لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تاکہ ہم غلّہ لے کر آئیں۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔" باپ نے جواب دیا: "کیا میں اُس کے معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسا کروں جیسا اِس سے پہلے اُس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔" پھر جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انھیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اُٹھے: "ابا جان! اور ہمیں کیا چاہیے، دیکھیے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بارِ شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے، اتنے غلّے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔" ان کے باپ نے کہا: "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے اِلّا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لیے جاؤ۔" جب انھوں نے اس کو

مل سکے کہ اس سامان کے ساتھ آپ نے ان پر اپنے احسان اور اپنی مہمان نوازی سے بھی رام کرنے کی کوشش کی کیونکہ دل اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے اور گھر کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ معاملے کی ایک سادہ سی صورت ہے جو ذرا غور کرنے سے

مَّوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا
مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ

اپنے اپنے پیمان دے دیے تو اس نے کہا: ”دیکھو! ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے۔“ پھر اس نے کہا: ”میرے بچو! مصر کے دارالسّلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔[۵۳] مگر میں اللہ کی مَشِیّت سے تم کو نہیں بچا سکتا، حکم اُس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا، اسی پر میں نے بھروسا کیا، اور جس کو بھی بھروسا کرنا ہو اسی پر کرے۔“ اور واقعہ بھی یہی ہُوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں (متفرق دروازوں سے) داخل ہوئے تو اس کی یہ

خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس صورت میں بائبل کی اُس مبالغہ آمیز داستان پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی جو کتابِ پیدائش کے باب ۴۲-۴۳ میں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

۵۳ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسفؑ کے بعد ان کے بھائی کو بھیجتے وقت حضرت یعقوبؑ کے دل پر کیا کچھ گزر رہی ہو گی۔ گو خدا پر بھروسا تھا اور صبر و تسلیم میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، مگر پھر بھی تھے تو انسان ہی۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں آتے ہوں گے اور رہ رہ کر اس خیال سے کانپ اُٹھتے ہوں گے کہ خدا جانے اب اس لڑکے کی صورت بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔ اسی لیے وہ چاہتے ہوں گے کہ اپنی حد تک احتیاط میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی جائے۔

یہ احتیاطی مشورہ کہ مصر کے دارالسلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازے سے نہ جائیں، اُن سیاسی حالات کا تصوّر کرنے سے صاف سمجھ میں آ جاتا ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ سلطنتِ مصر کی سرحد پر آزاد قبائلی علاقے کے رہنے والے تھے۔ اہلِ مصر اس علاقے کے لوگوں کو اسی شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس نگاہ سے ہندوستان کی برطانوی حکومت آزاد سرحدی علاقے والوں کو دیکھتی رہی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ اس قحط کے زمانے میں اگر یہ لوگ ایک جتھا بنے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انھیں مُشتبہ سمجھا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لُوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں۔ پچھلی آیت میں حضرت یعقوبؑ کا یہ ارشاد کہ ”اِلّا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لیے جاؤ“ اس مضمون کی طرف خود اشارہ کر رہا ہے کہ یہ مشورہ سیاسی اسباب کی بنا پر تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا كَانَ يُغْنِىْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِىْ نَفْسِ
يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ ع وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ
اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

احتیاطی تدبیر اللہ کی مَشِیَّت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آسکی۔ ہاں بس یعقوبؑ کے دل میں جو ایک کھٹک تھی اُسے دُور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کرلی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحبِ علم تھا، مگر اکثر لوگ معاملے کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں[۵۴]۔

یہ لوگ یوسفؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بُلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھویا گیا تھا)۔ اب تو اُن باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں[۵۵]۔"

۵۴ – اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر اور توکّل کے درمیان یہ ٹھیک ٹھیک توازن جو تم حضرت یعقوبؑ کے مذکورۂ بالا اقوال میں پاتے ہو، یہ دراصل علمِ حقیقت کے اُس فیضان کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُن پر ہُوا تھا۔ ایک طرف وہ عالمِ اسباب کے قوانین کے مطابق تمام ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل و فکر اور تجربے کی بنا پر اختیار کرنی ممکن تھیں۔ بیٹوں کو ان کا پہلا جُرم یاد دلا کر زجر و تنبیہ کرتے ہیں، تاکہ وہ دوبارہ ویسا ہی جرم کرنے کی جرأت نہ کریں، ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے، اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جس احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے بھی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں، تاکہ اپنی حد تک کوئی خارجی سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے جو ان لوگوں کے گھِر جانے کا موجب ہو۔ مگر دوسری طرف ہر آن یہ بات ان کے پیشِ نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیّت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی، اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے، اور بھروسا اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہیے۔ یہ صحیح توازن اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں صرف وہی شخص قائم کرسکتا ہے جو حقیقت کا علم رکھتا ہو۔ جو یہ بھی جانتا ہو کہ حیاتِ دنیا کے ظاہری پہلو میں اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسان سے کس سعی و عمل کا تقاضا کرتی ہے، اور اس سے بھی واقف ہو کہ اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقتِ نفس الامری پوشیدہ ہے، اس کی بنا پر اصل کارفرما طاقت کون سی ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی سعی و عمل پر انسان کا بھروسا کس قدر بے بنیاد ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر ظاہر کا غلبہ ہوتا ہے وہ توکّل سے غافل ہو کر تدبیر ہی کو سب کچھ

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ

جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لَدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔[56] پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا: ”اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو۔“[57] انھوں نے پلٹ کر پوچھا: ”تمھاری کیا چیز کھوئی گئی؟“ سرکاری ملازموں نے کہا: ”بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا۔“ (اور ان کے جمعدار

سمجھ بیٹھتا ہے، اور جس کے دل پر باطن چھا جاتا ہے وہ تدبیر سے بے پروا ہو کر نرے توکّل ہی کے بل پر زندگی کی گاڑی چلانا چاہتا ہے۔

۵۵ – اس فقرے میں وہ ساری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو اکیس بائیس برس کے بعد دونوں ماں جائے بھائیوں کے ملنے پر پیش آئی ہوگی۔ حضرت یوسفؑ نے بتایا ہوگا کہ وہ کن حالات سے گزرتے ہوئے اس مرتبے پر پہنچے۔ بِن یمین نے سُنایا ہوگا کہ ان کے پیچھے سوتیلے بھائیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا بدسلوکیاں کیں۔ پھر حضرت یوسفؑ نے بھائی کو تسلی دی ہوگی کہ اب تم میرے پاس ہی رہو گے، ان ظالموں کے پنجے میں تم کو دوبارہ نہیں جانے دوں گا۔ بعید نہیں کہ اسی موقع پر دونوں بھائیوں میں یہ بھی طے ہو گیا ہو کہ بِن یمین کو مصر میں روک رکھنے کے لیے کیا تدبیر کی جائے جس سے وہ پردہ بھی پڑا رہے جو حضرت یوسفؑ مصلحتاً ابھی ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

۵۶ – پیالہ رکھنے کا فعل غالباً حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کی رضامندی سے اور اس کے علم میں کیا تھا، جیسا کہ اس سے پہلے والی آیت اشارہ کر رہی ہے۔ حضرت یوسفؑ اپنے مدتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی کو ان ظالم سوتیلے بھائیوں کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہوں گے۔ بھائی خود بھی ان ظالموں کے ساتھ واپس نہ جانا چاہتا ہوگا۔ مگر علانیہ آپ کا اسے روکنا اور اس کا رُک جانا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ حضرت یوسفؑ اپنی شخصیت کو ظاہر کرتے۔ اور اس کا اظہار اس موقع پر مَصلحَت کے خلاف تھا۔ اس لیے دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہوگا کہ اسے روکنے کی یہ تدبیر کی جائے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے اس میں بھائی کی سُبکی تھی، کہ اس پر چوری کا دھبا لگتا تھا، لیکن بعد میں یہ دھبا اس طرح بآسانی دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملے کو دنیا پر ظاہر کر دیں۔

۵۷ – اس آیت میں، اور بعد والی آیات میں بھی کہیں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے ملازموں کو اس راز میں شریک کیا تھا اور انھیں خود یہ سکھایا تھا کہ قافلے والوں پر جھوٹا الزام لگاؤ۔ واقعے کی سادہ صورت جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیالہ خاموشی کے ساتھ رکھ دیا گیا ہوگا، بعد میں جب سرکاری ملازموں نے اسے نہ پایا ہوگا تو قیاس کیا ہوگا کہ ہو نہ ہو، یہ کام انھی قافلے والوں میں سے کسی کا ہے جو یہاں ٹھیرے ہوئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ
مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا
جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ
فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ
قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ
كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ

نے کہا:) ”جو شخص لا کر دے گا اُس کے لیے ایک بارِ شُتر انعام ہے، اس کا میں ذمہ لیتا ہوں۔“ ان بھائیوں نے کہا: ”خدا کی قسم! تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔“ انھوں نے کہا: ”اچھا، اگر تمھاری بات جھُوٹی نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”اُس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے، ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔“[58] تب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے اُن کی خُرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی، پھر اپنے بھائی کی خُرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔۔۔۔۔ اِس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔[59] اُس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا،

۵۸ – خیال رہے کہ یہ بھائی خاندانِ ابراہیمی کے افراد تھے، لہٰذا انھوں نے چوری کے معاملے میں جو قانون بیان کیا وہ شریعتِ ابراہیمی کا قانون تھا، یعنی یہ کہ چور اس شخص کی غلامی میں دے دیا جائے جس کا مال اس نے چُرایا ہو۔

۵۹ – یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ اس پورے سلسلۂ واقعات میں وہ کون سی تدبیر ہے جو حضرت یوسفؑ کی تائید میں براہِ راست خدا کی طرف سے کی گئی؟ ظاہر ہے کہ پیالہ رکھنے کی تدبیر تو حضرت یوسفؑ نے خود کی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سرکاری ملازموں کا چوری کے شبہے میں قافلے والوں کو روکنا بھی حسبِ معمول وہ کام تھا جو ایسے مواقع پر سب سرکاری ملازم کیا کرتے ہیں۔ پھر وہ خاص خدائی تدبیر کون سی ہے؟ اُوپر کی آیات میں تلاش کرنے سے اِس کے سوا کسی دوسری چیز کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا کہ سرکاری ملازموں نے خلافِ معمول خود مُشتبہ ملزموں سے چور کی سزا پوچھی، اور انھوں نے وہ سزا بتائی جو شریعتِ ابراہیمی کی رُو سے چور کو دی جاتی تھی۔ اس کے دو فائدے ہوئے: ایک

اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِىۡ

اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔[60] ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں، اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے

یہ کہ حضرت یوسفؑ کو شریعتِ ابراہیمی پر عمل کا موقع مل گیا۔ دوسرا یہ کہ بھائی کو حوالات میں بھیجنے کے بجائے اب وہ اسے اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

۶۰ – یعنی یہ بات حضرت یوسفؑ کی شانِ پیغمبری کے شایاں نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ذاتی معاملے میں شاہِ مصر کے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو روک رکھنے کے لیے انھوں نے خود جو تدبیر کی تھی، اس میں یہ خلل رہ گیا تھا کہ بھائی کو روکا تو ضرور جا سکتا تھا مگر شاہِ مصر کے قانونِ تعزیرات سے کام لینا پڑتا، اور یہ اس پیغمبر کی شان کے مطابق نہ تھا جس نے اختیاراتِ حکومت غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی شریعت نافذ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ اگر اللہ چاہتا تو اپنے نبی کو اس بدنما غلطی میں مبتلا ہو جانے دیتا، مگر اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ یہ دھبّا اس کے دامن پر رہ جائے، اس لیے اس نے براہِ راست اپنی تدبیر سے یہ راہ نکال دی کہ اتفاقاً برادرانِ یوسفؑ سے چور کی سزا پوچھ لی گئی اور انھوں نے اس کے لیے شریعتِ ابراہیمی کا قانون بیان کر دیا۔ یہ چیز اس لحاظ سے بالکل برمحل تھی کہ برادرانِ یوسفؑ مصری رعایا نہ تھے، ایک آزاد علاقے سے آئے ہوئے لوگ تھے، لہٰذا اگر وہ خود اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے آدمی کو اُس شخص کی غلامی میں دینے کے لیے تیار تھے جس کا مال اس نے چُرایا تھا، تو پھر مصری قانونِ تعزیرات سے اِس معاملے میں مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہی وہ چیز ہے جس کو بعد کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان اور اپنی علمی برتری سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک بندے کے لیے اس سے بڑھ کر بلندیِ درجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کبھی بشری کمزوری کی بنا پر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ غیب سے اس کو بچانے کا انتظام فرما دے۔ ایسا بلند مرتبہ صرف انھی لوگوں کو ملا کرتا ہے جو اپنی سعی و عمل سے بڑی بڑی آزمائشوں میں اپنا ”محسن“ ہونا ثابت کر چکے ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ حضرت یوسفؑ صاحبِ علم تھے، خود بہت دانش مندی کے ساتھ کام کرتے تھے، مگر پھر بھی اس موقع پر ان کے علم میں ایک کسر رہ ہی گئی اور اُسے اُس ہستی نے پورا کیا جو ہر صاحبِ علم سے بالاتر ہے۔

یہاں چند اُمور اور وضاحت طلب رہ جاتے ہیں جن پر ہم مختصر کلام کریں گے:

(۱) عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ”یوسفؑ بادشاہ کے قانون کی رُو سے اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتا تھا۔“ یعنی مَا کَانَ لِیَاۡخُذَ کو مترجمین و مفسرین عدمِ قدرت کے معنیٰ میں لیتے ہیں، نہ کہ عدمِ صحت اور عدمِ مناسبت کے معنیٰ میں۔ لیکن اوّل تو یہ ترجمہ و تفسیر عربی محاورے اور قرآنی استعمالات دونوں کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ عربی میں عموماً مَا کَانَ لَہٗ بمعنی مَا یَنۡبَغِیۡ لَہٗ، مَا صَحَّ لَہٗ، مَا اسۡتَقَامَ لَہٗ، وغیرہ آتا ہے، اور قرآن میں بھی یہ زیادہ تر اسی معنیٰ میں آیا ہے۔ مثلاً مَا کَانَ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ – مَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ – مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ – مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظۡلِمَهُمۡ – مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡهِ – مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا۔ دوسرے، اگر اس کے وہ معنیٰ لیے جائیں جو مترجمین و مفسرین بالعموم بیان کرتے ہیں تو بات بالکل مُہمل ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کے قانون میں چور کو نہ پکڑ سکنے کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا دنیا میں کبھی کوئی سلطنت ایسی بھی رہی ہے جس کا قانون

Maktaba Tul Ishaat.com

چور کو گرفتار کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو؟

(۲) اللہ تعالیٰ نے شاہی قانون کے لیے ''دِیۡنِ الۡمَلِكِ'' کا لفظ استعمال کر کے خود اُس مطلب کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جو مَا كَانَ لِيَاۡخُذَ سے لیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر زمین میں ''دین اللہ'' جاری کرنے کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ ''دین الملک'' جاری کرنے کے لیے۔ اگر حالات کی مجبوری سے اُس کی حکومت میں اُس وقت تک پوری طرح دین المِلک کی جگہ دین اللہ جاری نہ ہو سکا تھا تب بھی کم از کم پیغمبر کا اپنا کام تو یہ نہ تھا کہ اپنے ایک شخصی معاملے میں دین الملک پر عمل کرے۔ لہٰذا حضرت یوسفؑ کا دین المِلک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بنا پر نہیں تھا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجایش نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اپنی ذاتی حد تک دین اللہ پر عمل کرنا ان کا فرض تھا اور دین المِلک کی پیروی ان کے لیے قطعاً نامناسب تھی۔

(۳) قانونِ ملکی (law of the land) کے لیے لفظِ ''دین'' استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنیِ دین کی وسعت پوری طرح واضح کر دی ہے۔ اِس سے اُن لوگوں کے تصورِ دین کی جڑ کٹ جاتی ہے جو انبیا علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدائے واحد کی پوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم وعقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسانی تمدُّن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دنیوی اُمور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان اُمور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سِفارشات ہیں، جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اُصول وضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مُضایقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصورِ دین، جس کا ایک مدّت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر وجاہلیّت کے نظامِ زندگی پر نہ صرف راضی ہوئے بلکہ ایک نبی کی سُنّت سمجھ کر اس نظام کے پُرزے بننے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے، اِس آیت کی رُو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ اور وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس سے مراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے، جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی۔

(۴) سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصر کی حکومت میں ''دین المِلک'' ہی جاری تھا۔ اب اگر اس حکومت کے حاکمِ اعلیٰ حضرت یوسفؑ ہی تھے، جیسا کہ تم خود پہلے ثابت کر چکے ہو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت یوسفؑ، خدا کے پیغمبر، خود اپنے ہاتھوں سے مُلک میں ''دین الملک'' جاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر اپنے ذاتی معاملے میں حضرت یوسفؑ نے ''دین الملک'' کے بجائے شریعتِ ابراہیمی پر عمل کیا بھی تو اس سے فرق کیا واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ مامور تو دین اللہ جاری کرنے ہی پر تھے اور یہی ان کا پیغمبرانہ مشن اور ان کی حکومت کا مقصد تھا، مگر ایک ملک کا نظام عملاً ایک دن کے اندر نہیں بدل جایا کرتا۔ آج اگر کوئی ملک بالکلّیہ ہمارے اختیار میں ہو اور ہم اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی خالص نیت ہی سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں، تب بھی اس کے نظامِ تمدُّن، نظامِ مَعاش، نظامِ سیاست اور نظامِ عدالت و قانون کو

عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾ قَالُوٓا۟ إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُۥ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِى نَفْسِهِۦ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ

جو ہر صاحبِ علم سے بالاتر ہے۔

ان بھائیوں نے کہا: "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسفؑ) بھی چوری کر چکا ہے۔"[۶۱] یوسفؑ اُن کی یہ بات سُن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھولی، بس (زیرِ لب) اتنا کہہ کر رہ گیا

بالفعل بدلتے بدلتے برسوں لگ جائیں گے اور کچھ مدت تک ہم کو اپنے انتظام میں بھی سابق قوانین برقرار رکھنے پڑیں گے۔ کیا تاریخ اس بات پر شاہد نہیں ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب کے نظامِ زندگی میں پورا اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے نو دس سال لگے تھے؟ اس دوران میں خاتم النّبیینؐ کی اپنی حکومت میں چند سال شراب نوشی ہوتی رہی، سود لیا اور دیا جاتا رہا، جاہلیّت کا قانونِ میراث جاری رہا، پُرانے قوانینِ نکاح وطلاق برقرار رہے، بُیوعِ فاسدہ کی بہت سی صورتیں عمل میں آتی رہیں، اور اسلامی قوانینِ دیوانی وفوجداری بھی اوّل روز ہی بتمام وکمال نافذ نہیں ہو گئے۔ پس اگر حضرت یوسفؑ کی حکومت میں ابتدائی آٹھ نو سال تک سابق مصری بادشاہت کے کچھ قوانین چلتے رہے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اور اس سے یہ دلیل کیسے نکل آتی ہے کہ خدا کا پیغمبر مصر میں خدا کے دین کو نہیں بلکہ بادشاہ کے دین کو جاری کرنے پر مامور تھا۔ رہی یہ بات کہ جب مُلک میں دین الملِک جاری تھا تو آخر حضرت یوسفؑ کی اپنی ذات کے لیے اس پر عمل کرنا کیوں شایانِ شان نہ تھا، تو یہ سوال بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر غور کرنے سے بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دَور میں جب تک قوانینِ اسلامی جاری نہ ہوئے تھے، لوگ پُرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے، مگر کیا حضورؐ نے بھی پی؟ لوگ سود لیتے دیتے تھے، مگر کیا آپؐ نے بھی سودی لین دین کیا؟ لوگ مُتعہ کرتے رہے اور جمع بین الاُختَین کرتے رہے، مگر کیا حضورؐ نے بھی ایسا کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعیِ اسلام کا عملی مجبوریوں کی بنا پر احکامِ اسلامی کے اجرا میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے، اور اس کا خود اس تدریج کے دَور میں جاہلیّت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی رُخصتیں دوسروں کے لیے ہیں۔ داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

۶۱ – یہ انھوں نے اپنی خفّت مٹانے کے لیے کہا۔ پہلے کہہ چکے تھے کہ ہم لوگ چور نہیں ہیں۔ اب جو دیکھا کہ مال ہمارے بھائی کی خُرجی سے برآمد ہو گیا ہے، تو فوراً ایک جھوٹی بات بنا کر اپنے آپ کو اس بھائی سے الگ کر لیا اور اس کے ساتھ اس کے پہلے بھائی کو بھی لپیٹ لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے پیچھے بن یمین کے ساتھ ان بھائیوں کا کیا سلوک رہا ہو گا اور کس بنا پر اس کی اور حضرت یوسفؑ کی یہ خواہش ہو گی کہ وہ ان کے ساتھ نہ جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ ع

کہ ”بڑے ہی بُرے ہو تم لوگ، (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو، اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے۔“

انھوں نے کہا: ”اے سردارِ ذی اقتدار (عزیز[۶۲])! اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں۔“ یوسفؑ نے کہا: ”پناہ بخدا! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے[۶۳]، اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے۔“ ع

۶۲ – یہاں لفظ ”عزیز“ حضرت یوسفؑ کے لیے جو استعمال ہُوا ہے، صرف اس کی بنا پر مفسرین نے قیاس کر لیا کہ حضرت یوسفؑ اسی منصب پر مامور ہوئے تھے جس پر اس سے پہلے زلیخا کا شوہر مامور تھا۔ پھر اس پر مزید قیاسات کی عمارت کھڑی کر لی گئی کہ سابق عزیز مر گیا تھا، حضرت یوسفؑ اس کی جگہ مقرر کیے گئے، زلیخا از سرِ نو معجزے کے ذریعے سے جوان کی گئی، اور شاہِ مصر نے اس سے حضرت یوسفؑ کا نکاح کر دیا۔ حد یہ ہے کہ شبِ عُروسی میں حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے درمیان جو باتیں ہوئیں، وہ تک کسی ذریعے سے ہمارے مفسرین کو پہنچ گئیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں سراسر وہم ہیں۔ لفظِ ”عزیز“ کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ مصر میں کسی خاص منصب کا نام نہ تھا بلکہ محض ”صاحبِ اقتدار“ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً مصر میں بڑے لوگوں کے لیے اُس طرح کا کوئی لفظ اصطلاحاً رائج تھا جیسے ہمارے ملک میں لفظِ ”سرکار“ بولا جاتا ہے۔ اسی کا ترجمہ قرآن میں ”عزیز“ کیا گیا ہے۔ رہا زلیخا سے حضرت یوسفؑ کا نکاح، تو اس افسانے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ بائبل اور تلمود میں فوطیفرع کی بیٹی آسناتھ سے اُن کے نکاح کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اور زلیخا کے شوہر کا نام فوطیفار تھا۔ یہ چیزیں اسرائیلی روایات سے نقل در نقل ہوتی ہوئی مفسرین تک پہنچیں، اور جیسا کہ زبانی افواہوں کا قاعدہ ہے، فوطیفرع باسانی فوطیفار بن گیا، بیٹی کی جگہ بیوی کو مل گئی، اور بیوی لامحالہ زلیخا ہی تھی، لہٰذا اس سے حضرت یوسفؑ کا نکاح کرنے کے لیے فوطیفار کو مار دیا گیا، اور اس طرح ”یوسف زلیخا“ کی تصنیف مکمل ہو گئی۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ
اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ
يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ
لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۰ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ
اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا

جب وہ یوسفؑ سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا: ”تم جانتے نہیں ہو کہ تمھارے والد تم سے خدا کے نام پر کیا عہد و پیمان لے چکے ہیں اور اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملے میں جو زیادتی تم کر چکے ہو، وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں، یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ فرما دے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جا کر اپنے والد سے کہو کہ ”ابا جان! آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے۔ ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو کچھ ہمیں معلوم ہُوا ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں، اور غیب کی

۶۳ – احتیاط مُلاحظہ ہو کہ ”چور“ نہیں کہتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ”جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے“۔ اسی کو اصطلاحِ شرع میں ”تَورِیَہ“ کہتے ہیں، یعنی ”حقیقت پر پردہ ڈالنا“، یا ”امرِ واقعہ کو چھپانا“۔ جب کسی مظلوم کو ظالم سے بچانے یا کسی بڑے مَظلِمہ کو دفع کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ ہو کہ کچھ خلافِ واقعہ بات کہی جائے، یا کوئی خلافِ حقیقت حیلہ کیا جائے، تو ایسی صورت میں ایک پرہیزگار آدمی صریح جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوئے ایسی بات کہنے یا ایسی تدبیر کرنے کی کوشش کرے گا جس سے حقیقت کو چھپا کر بدی کو دفع کیا جا سکے۔ ایسا کرنا شرع و اخلاق میں جائز ہے، بشرطیکہ محض کام نکالنے کے لیے ایسا نہ کیا جائے، بلکہ کسی بڑی بُرائی کو دُور کرنا ہو۔ اب دیکھیے کہ اس سارے معاملے میں حضرت یوسفؑ نے کس طرح جائز تَورِیَہ کی شرائط پوری کی ہیں۔ بھائی کی رضامندی سے اس کے سامان میں پیالہ رکھ دیا، مگر ملازموں سے یہ نہیں کہا کہ اس پر چوری کا الزام لگاؤ۔ پھر جب سرکاری ملازم چوری کے الزام میں ان لوگوں کو پکڑ لائے تو خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر تلاشی لے لی۔ پھر اب جو اِن بھائیوں نے کہا کہ بن یمین کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، تو اس کے جواب میں بھی بس اُنھی کی بات اُن پر اُلٹ دی کہ تمھارا اپنا فتویٰ یہ تھا کہ جس کے سامان میں سے تمھارا مال نکلے وہی رکھ لیا جائے، سو اب تمھارے سامنے بن یمین کے سامان میں سے ہمارا مال نکلا ہے اور اسی کو ہم رکھے لیتے ہیں،

Maktaba Tul Ishaat.com

لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ
الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ
اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ
جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى
عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ
مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ

نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اُس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے۔ اُس قافلے سے دریافت کر لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں بالکل سچّے ہیں۔"

باپ نے یہ داستان سُن کر کہا: "دراصل تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔ اچھا، اس پر بھی صبر کروں گا[۶۴] اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لا ملائے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں۔" پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ "ہائے یوسف!" ـــــ وہ دل ہی دل میں غم سے گُھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں ـــــ بیٹوں نے کہا: "خدارا! آپ تو بس یوسفؑ ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آ گئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گُھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے۔" اُس نے کہا: "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی

دوسرے کو اس کی جگہ کیسے رکھ سکتے ہیں؟ اس قسم کے توریہ کی مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں بھی ملتی ہیں، اور کسی دلیل سے بھی اس کو اخلاقاً معیوب نہیں کہا جا سکتا۔

۶۴ – یعنی تمھارے نزدیک یہ باور کر لینا بہت آسان ہے کہ میرا بیٹا، جس کے حُسنِ سیرت سے مَیں خوب واقف ہوں، ایک پیالے کی چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ پہلے تمھارے لیے اپنے ایک بھائی کو جان بُوجھ کر گم کر دینا اور اس کے قمیص پر جھوٹا

إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ يَٰبَنِيَّ اذْهَبُوا
فَتَحَسَّسُوا مِن يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ ۖ
إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا
دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا
بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ
يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُم مَّا فَعَلْتُم بِيُوسُفَ
وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ

فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا، اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو! جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہُوا کرتے ہیں۔“

جب یہ لوگ مصر جا کر یوسفؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انھوں نے عرض کیا کہ ”اے سردارِ با اقتدار! ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں بھرپور غلّہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں[۶۵]، اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔“ (یہ سُن کر یوسفؑ سے نہ رہا گیا) اُس نے کہا: ”تمھیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب کہ تم نادان تھے۔“ وہ چونک کر بولے: ”ہائیں! کیا تم یوسفؑ ہو؟“ اُس نے کہا: ”ہاں،

خون لگا کر لے آنا بہت آسان کام ہو گیا تھا۔ اب ایک دوسرے بھائی کو واقعی چور مان لینا اور مجھے آ کر اس کی خبر دینا بھی ویسا ہی آسان ہو گیا۔

۶۵ – یعنی ہماری اس گزارش پر جو کچھ آپ دیں گے وہ گویا آپ کا صدقہ ہو گا۔ اس غلّے کی قیمت میں جو پونجی ہم پیش کر رہے ہیں، وہ تو بے شک اس لائق نہیں ہے کہ ہم کو اُس قدر غلّہ دیا جائے جو ہماری ضرورت کو کافی ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ٘ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ
وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۹۰ قَالُوْا تَاللّٰهِ
لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ ۝۹۱ قَالَ لَا تَثْرِیْبَ
عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ٘ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝۹۲
اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ
وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۹۳ ع۱۰ وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ
لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝۹۴ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ

میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔" انھوں نے کہا: "بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطا کار تھے۔" اس نے جواب دیا: "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ جاؤ، میرا یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، اُن کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔" ع

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا: "میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں[۶۶]، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔" گھر کے لوگ بولے: "خدا کی قسم! آپ

۶۶ – اس سے انبیا علیہم السلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسفؑ کا قمیص لے کر مصر سے چلا ہے اور اُدھر سیکڑوں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوبؑ اس کی مہک پا لیتے ہیں۔ مگر اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کی یہ قوتیں کچھ ان کی ذاتی نہ تھیں بلکہ اللہ کی بخشش سے ان کو ملی تھیں، اور اللہ جب اور جس قدر چاہتا تھا انھیں کام کرنے کا موقع دیتا تھا۔ حضرت یوسفؑ برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوبؑ کو ان کی خوشبو نہ آئی۔ مگر اب یکایک قوتِ اِدراک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی ان کا قمیص مصر سے چلا ہے اور وہاں ان کی مہک آنی شروع ہو گئی۔

لَفِیۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِیۡمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِیۡرُ اَلۡقٰىهُ عَلٰی
وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا ۚ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ ۚۙ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا
خٰطِـِٕیۡنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ
الرَّحِیۡمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡهِ اَبَوَیۡهِ وَ

ابھی تک اپنے اسی پُرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں۔"[67]

پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسفؑ کا قمیص یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا: "میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" سب بول اُٹھے: "ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دُعا کریں، واقعی ہم خطا کار تھے۔" اُس نے کہا: "میں اپنے رب سے تمھارے لیے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

پھر جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے[68] تو اُس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا[69] اور (اپنے

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف قرآن حضرت یعقوبؑ کو اِس پیغمبرانہ شان کے ساتھ پیش کر رہا ہے، اور دوسری طرف بنی اسرائیل ان کو ایسے رنگ میں دکھاتے ہیں جیسا عرب کا ہر معمولی بدّو ہو سکتا ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ جب بیٹوں نے آ کر خبر دی کہ "یوسفؑ اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملکِ مصر کا حاکم ہے تو یعقوبؑ کا دل دھک سے رہ گیا، کیونکہ اُس نے اُن کا یقین نہ کیا...... اور جب اُن کے باپ یعقوبؑ نے وہ گاڑیاں دیکھ لیں جو یوسفؑ نے اُس کے لانے کو بھیجی تھیں تب اُس کی جان میں جان آئی۔" (پیدائش ۴۵: ۲۶-۲۷)

۶۷- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے خاندان میں حضرت یوسفؑ کے سوا کوئی اپنے باپ کا قدر شناس نہ تھا، اور حضرت یعقوبؑ خود بھی ان لوگوں کی ذہنی و اخلاقی پستی سے مایوس تھے۔ گھر کے چراغ کی روشنی باہر پھیل رہی تھی، مگر خود گھر والے اندھیرے میں تھے اور ان کی نگاہ میں وہ ایک ٹھیکرے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ فطرت کی اس ستم ظریفی سے تاریخ کی اکثر و بیشتر بڑی شخصیتوں کو سابقہ پیش آیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۶۸ – بائبل کا بیان ہے کہ سب افرادِ خاندان، جو اس موقع پر مصر گئے، ۶۷ تھے۔ اس تعداد میں دوسرے گھرانوں کی اُن لڑکیوں کو شمار نہیں کیا گیا ہے جو حضرت یعقوبؑ کے ہاں بیاہی ہوئی آئی تھیں۔ اس وقت حضرت یعقوبؑ کی عمر ۱۳۰ سال تھی، اور اس کے بعد وہ مصر میں ۱۷ سال زندہ رہے۔

اس موقع پر ایک طالبِ علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسفؑ سمیت ان کی تعداد ۶۸ تھی، اور جب تقریباً ۵ سو سال کے بعد وہ مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ بائبل کی روایت ہے کہ خُروج کے بعد دوسرے سال بیابانِ سینا میں حضرت موسیٰؑ نے ان کی جو مَردُم شماری کرائی تھی، اس میں صرف قابلِ جنگ مَردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی۔ [گنتی ۱:۴۶] اس کے معنٰی یہ ہیں کہ عورت، مرد، بچے، سب ملا کر وہ کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔ کیا کسی حساب سے پانچ سو سال میں ۶۸ آدمیوں کی اتنی اولاد ہو سکتی ہے؟ مصر کی کل آبادی اگر اس زمانے میں ۲ کروڑ فرض کی جائے (جو یقیناً بہت مبالغہ آمیز اندازہ ہوگا) تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ صرف بنی اسرائیل وہاں ۱۰ فی صد تھے۔ کیا ایک خاندان محض تناسُل کے ذریعے سے اتنا بڑھ سکتا ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ۵ سو برس میں ایک خاندان تو اتنا نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد تھے۔ ان کے لیڈر حضرت یوسفؑ، جن کی بدولت مصر میں ان کے قدم جمے، خود پیغمبر تھے۔ ان کے بعد چار پانچ صدی تک ملک کا اقتدار انھی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس دوران میں یقیناً انھوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی۔ اہلِ مصر میں سے جو جو لوگ اسلام لائے ہوں گے، ان کا مذہب ہی نہیں بلکہ ان کا تمدّن اور پورا طریقِ زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا۔ مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھیرایا ہوگا جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھیرایا۔ ان کے اُوپر اسرائیلی کا لفظ اسی طرح چسپاں کر دیا گیا ہوگا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر ’’محمڈن‘‘ کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی روابط اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصر میں قوم پرستی کا طوفان اُٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل ہی پر نہیں ہوئے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ یکساں لپیٹ لیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ ہی نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا۔

ہمارے اس قیاس کی تائید بائبل کے متعدّد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ’’خُروج‘‘ میں جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے، بائبل کا مصنف کہتا ہے کہ ’’ان کے ساتھ ایک مِلی جُلی گروہ بھی گئی‘‘ (۱۲:۳۸)۔ اسی طرح ’’گنتی‘‘ میں وہ پھر کہتا ہے کہ ’’جو ملی جُلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی، وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی‘‘ (۱۱:۴)۔ پھر بتدریج ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے لیے ’’اجنبی‘‘ اور ’’پردیسی‘‘ کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ تورات میں حضرت موسیٰؑ کو جو احکام دیے گئے، ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے:

> ’’تمھارے لیے اور اُس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں جیسے تم ہو۔ تمھارے لیے اور پردیسیوں کے لیے جو تمھارے ساتھ رہتے ہیں ایک ہی شرع اور ایک ہی قانون ہو۔‘‘ (گنتی ۱۵:۱۵-۱۶)
>
> ’’جو شخص بے باک ہو کر گناہ کرے، خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی، وہ خداوند کی اہانت کرتا ہے۔ وہ شخص

قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ

سب کنبے والوں سے) کہا: ”چلو، اب شہر میں چلو، اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے۔“ (شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اُٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔ یوسفؑ نے کہا: ”ابا جان! یہ تعبیر ہے میرے اُس خواب

اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے گا۔“ (گنتی ۱۵:۳۰)

”خواہ بھائی بھائی کا معاملہ ہو یا پردیسی کا، تم ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا۔“ (اِستثنا ۱:۱۶)

اب یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ کتابِ الٰہی میں غیر اسرائیلیوں کے لیے وہ اصل لفظ کیا استعمال کیا گیا تھا جسے مترجموں نے ”پردیسی“ بنا کر رکھ دیا۔

۶۹ – تَلمُود میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دار السلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ سلطنت کے بڑے بڑے امرا و اہلِ مناصب اور فوج فرّا کو لے کر ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے تُزک و اِحتشام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے۔ وہ دن وہاں جشن کا دن تھا۔ عورت، مرد، بچے، سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

۷۰ – اس لفظِ ”سجدہ“ سے بکثرت لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حتّٰی کہ ایک گروہ نے تو اسی سے اِستدلال کر کے بادشاہوں اور پیروں کے لیے سجدۂ تحیۃ اور سجدۂ تعظیمی کا جواز نکال لیا۔ دوسرے لوگوں کو اس قباحت سے بچنے کے لیے اس کی یہ توجیہ کرنی پڑی کہ اگلی شریعتوں میں صرف سجدۂ عبادت غیر اللہ کے لیے حرام تھا، باقی رہا وہ سجدہ جو عبادت کے جذبے سے خالی ہو، تو وہ خدا کے سوا دوسروں کو بھی کیا جا سکتا تھا، البتہ شریعتِ محمدیؐ میں ہر قسم کا سجدہ غیر اللہ کے لیے حرام کر دیا گیا۔ لیکن ساری غلط فہمیاں دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ لفظِ ”سجدہ“ کو موجودہ اسلامی اصطلاح کا ہم معنی سمجھ لیا گیا، یعنی ہاتھ، گھٹنے اور پیشانی زمین پر ٹکانا۔ حالانکہ سجدہ کے اصل معنی محض جھکنے کے ہیں، اور یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ قدیم تہذیب میں یہ عام طریقہ تھا (اور آج بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے) کہ کسی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، یا کسی کا استقبال کرنے کے لیے، یا محض سلام کرنے کے لیے سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آگے کی طرف جھکتے تھے۔ اسی جھکاؤ کے لیے عربی میں سُجود اور انگریزی میں (bow) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بائبل میں اس کی بکثرت مثالیں ہم کو ملتی ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ طریقہ آدابِ تہذیب میں شامل تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے خیمے کی طرف تین آدمیوں کو آتے دیکھا تو وہ ان کے استقبال کے لیے دوڑے اور زمین تک جھکے۔ عربی بائبل میں اس موقع پر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: فلما نظر رکض لاستقبالھم من باب الخیمۃ وسجد الی الارض۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ

کی جو مَیں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اُس نے مجھے

(تکوین ۱۸:۲) پھر جس موقع پر یہ ذکر آتا ہے کہ بنی حِتّ نے حضرت سارہ کے دفن کے لیے قبر کی زمین مفت دی، وہاں اُردو بائبل کے الفاظ یہ ہیں: ''ابرہام نے اُٹھ کر اور بنی حِتّ کے آگے، جو اُس ملک کے لوگ ہیں، آداب بجا لا کر اُن سے یوں گفتگو کی۔'' اور جب ان لوگوں نے قبر کی زمین ہی نہیں بلکہ ایک پورا کھیت اور ایک غار نذر میں پیش کر دیا، ''تب ابرہام اُس ملک کے لوگوں کے سامنے جھکا۔'' مگر عربی ترجمے میں ان دونوں مواقع پر آداب بجا لانے اور جھکنے کے لیے ''سجدہ کرنے'' ہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: فقام ابراھیم وسجد لشعب الارض لبنی حِت (تکوین ۷:۲۳) فسجد ابراھیم امام شعب الارض (۱۲:۲۳)۔ انگریزی بائبل میں ان مواقع پر جو الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

Bowed himself towards the ground.

Bowed himself to the people of the land and Abraham bowed.

اس مضمون کی مثالیں بڑی کثرت سے بائبل میں ملتی ہیں، اور ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سجدے کا مفہوم وہ ہے ہی نہیں جو اَب اسلامی اصطلاح کے لفظ ''سجدہ'' سے سمجھا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے معاملے کی اس حقیقت کو جانے بغیر اس کی تاویل میں سرسری طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ اگلی شریعتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا یا سجدۂ تَحِیَّۃ بجا لانا جائز تھا، انھوں نے محض ایک بے اصل بات کہی ہے۔ اگر سجدے سے مراد وہ چیز ہو جسے اسلامی اصطلاح میں سجدہ کہا جاتا ہے، تو وہ خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت میں کبھی کسی غیر اللہ کے لیے جائز نہیں رہا ہے۔ بائبل میں ذکر آتا ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانے میں جب اَخْسوِیرُس بادشاہ نے ہامان کو اپنا امیر الاُمرا بنایا اور حکم دیا کہ سب لوگ اس کو سجدۂ تعظیمی بجا لایا کریں تو مردکی نے، جو بنی اسرائیل کے اولیا میں سے تھے، یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا (آستر، ۳:۱-۲)۔ تَلمُود میں اس واقعے کی شرح کرتے ہوئے اس کی جو تفصیل دی گئی ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے:

> ''بادشاہ کے ملازموں نے کہا: آخر تُو کیوں ہامان کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے؟ ہم بھی آدمی ہیں مگر شاہی حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: تم لوگ نادان ہو۔ کیا ایک فانی انسان، جو کل خاک میں مل جانے والا ہے، اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کی بڑائی مانی جائے؟ کیا میں اُس کو سجدہ کروں جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، کل بچہ تھا، آج جوان ہے، کل بوڑھا ہو گا، اور پرسوں مر جائے گا؟ نہیں، میں تو اُس اَزَلی و اَبَدی خدا ہی کے آگے جھکوں گا جو حَیّ و قیُّوم ہے..... وہ جو کائنات کا خالق اور حاکم ہے، میں تو بس اسی کی تعظیم بجا لاؤں گا، اور کسی کی نہیں۔''

اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ
الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ
مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ
فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

قید خانے سے نکالا، اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا، حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیّت پُوری کرتا ہے، بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ اے میرے رب! تُو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے! تُو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجامِ کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔[۷۱]‘‘

یہ تقریر نزولِ قرآن سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے ایک اسرائیلی مومن کی زبان سے ادا ہوئی ہے اور اس میں کوئی شائبہ تک اِس تخیُّل کا نہیں پایا جاتا کہ غیر اللہ کو کسی معنیٰ میں بھی ’’سجدہ‘‘ کرنا جائز ہے۔

۷۱ – یہ چند فقرے جو اس موقع پر حضرت یوسفؑ کی زبان سے نکلے ہیں، ہمارے سامنے ایک سچّے مومن کی سیرت کا عجیب دلکش نقشہ پیش کرتے ہیں۔ صحرائی گلّہ بانوں کے خاندان کا ایک فرد، جس کو خود اُس کے بھائیوں نے حسد کے مارے ہلاک کر دینا چاہا تھا، زندگی کے نشیب و فراز دیکھتا ہُوا بالآخر دنیوی عُروج کے انتہائی مقام پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے قحط زدہ اہلِ خاندان اب اس کے دستِ نگر ہو کر اس کے حضور آئے ہیں، اور وہ حاسد بھائی بھی، جو اس کو مار ڈالنا چاہتے تھے، اس کے تختِ شاہی کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ یہ موقع دنیا کے عام دستور کے مطابق فخر جتانے، ڈینگیں مارنے، گلے اور شکوے کرنے، اور طعن و ملامت کے تیر برسانے کا تھا۔ مگر ایک سچا خدا پرست انسان اس موقع پر کچھ دوسرے ہی اخلاق ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے اس عُروج پر فخر کرنے کے بجائے اس خدا کے احسان کا اعتراف کرتا ہے جس نے اسے یہ مرتبہ عطا کیا۔ وہ خاندان والوں کو اُس ظلم و ستم پر کوئی ملامت نہیں کرتا جو اوائلِ عمر میں انھوں نے اس پر کیے تھے۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر شکر ادا کرتا ہے کہ خدا نے اتنے دنوں کی جدائی کے بعد ان لوگوں کو مجھ سے ملایا۔ وہ حاسد بھائیوں کے خلاف شکایت کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتا۔ حتّٰی کہ یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے میرے ساتھ برائی کی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ
اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ
حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ

اَے محمدؐ! یہ قصّہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت موجود نہ تھے جب یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو، اِن میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔[۷۲] حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اُجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو

بلکہ ان کی صفائی خود ہی اس طرح پیش کرتا ہے کہ شیطان نے میرے اور ان کے درمیان بُرائی ڈال دی تھی۔ اور پھر اس بُرائی کے بھی بُرے پہلو چھوڑ کر اس کا یہ اچھا پہلو پیش کرتا ہے کہ خدا جس مرتبے پر مجھے پہنچانا چاہتا تھا، اس کے لیے یہ لطیف تدبیر اُس نے فرمائی۔ یعنی بھائیوں سے شیطان نے جو کچھ کرایا، اسی میں حکمتِ الٰہی کے مطابق میرے لیے خیر تھی۔ چند الفاظ میں یہ سب کچھ کہہ جانے کے بعد وہ بے اختیار اپنے خدا کے آگے جھک جاتا ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہے کہ تُو نے مجھے بادشاہی دی اور وہ قابلیتیں بخشیں جن کی بدولت مَیں قید خانے میں سڑنے کے بجائے آج دنیا کی سب سے بڑی سلطنت پر فرماں روائی کر رہا ہوں۔ اور آخر میں خدا سے کچھ مانگتا ہے تو یہ کہ دنیا میں جب تک زندہ رہوں تیری بندگی و غلامی پر ثابت قدم رہوں، اور جب اس دنیا سے رخصت ہوں تو مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ کس قدر بلند اور کتنا پاکیزہ ہے یہ نمونۂ سیرت!

حضرت یوسفؑ کی اس قیمتی تقریر نے بھی بائبل اور تَلمُود میں کوئی جگہ نہیں پائی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ کتابیں قصّوں کی غیر ضروری تفصیلات سے تو بھری پڑی ہیں، مگر جو چیزیں کوئی اخلاقی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور جن سے انبیاؑ کی اصلی تعلیم اور ان کے حقیقی مشن اور ان کی سیرتوں کے سبق آموز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، ان سے ان کتابوں کا دامن خالی ہے۔

یہاں یہ قصّہ ختم ہو رہا ہے اس لیے ناظرین کو پھر اس حقیقت پر مُتنَبِّہ کر دینا ضروری ہے کہ قصّۂ یوسف علیہ السلام کے متعلق قرآن کی یہ رِوایت اپنی جگہ ایک مستقل روایت ہے، بائبل یا تَلمُود کا چربہ نہیں ہے۔ تینوں کتابوں کا متقابل مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قصّے کے متعدِّد اہم اجزا میں قرآن کی روایت ان دونوں سے مختلف ہے۔ بعض چیزیں قرآن ان سے زائد بیان کرتا ہے، بعض ان سے کم، اور بعض میں ان کی تردید کرتا ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قصّہ سنایا وہ بنی اسرائیل سے سُن لیا ہو گا۔

۷۲ - یعنی اِن لوگوں کی ہٹ دھرمی کا عجیب حال ہے۔ تمھاری نبوت کی آزمایش کے لیے بہت سوچ سمجھ کر اور مشورے کر کے جو مطالبہ انھوں نے کیا تھا، اسے تم نے بھری محفل میں برجستہ پورا کر دیا، اب شاید تم متوقع ہو گے کہ اس کے بعد تو

رکوع ۱۱ ع ۵

اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ

ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔[۷۳] ع

زمین[۷۴] اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔[۷۵] ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح

انھیں یہ تسلیم کر لینے میں کوئی تأمّل نہ رہے گا کہ تم یہ قرآن خود تصنیف نہیں کرتے ہو بلکہ واقعی تم پر وحی آتی ہے۔ مگر یقین جانو کہ یہ اب بھی نہ مانیں گے اور اپنے انکار پر جمے رہنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ کیونکہ ان کے نہ ماننے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری صداقت کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے یہ کھلے دل سے کوئی معقول دلیل چاہتے تھے اور وہ ابھی تک انھیں نہیں ملی۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمھاری بات یہ ماننا چاہتے نہیں ہیں، اِس لیے ان کو تلاش دراصل ماننے کے لیے کسی دلیل کی نہیں بلکہ نہ ماننے کے لیے کسی بہانے کی ہے۔ اس کلام سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی غلط فہمی کو رفع کرنا نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر خطاب آپؐ ہی سے ہے، لیکن اس کا اصل مقصد مخاطب گروہ کو، جس کے مجمع میں یہ تقریر کی جا رہی تھی، ایک نہایت لطیف و بلیغ طریقے سے اس کی ہٹ دھرمی پر مُتنبّہ کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی محفل میں آپ کو امتحان کے لیے بلایا تھا اور اچانک یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر تم نبی ہو تو بتاؤ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا قصہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں ان کو وہیں اور اسی وقت پورا قصہ سنا دیا گیا، اور آخر میں یہ مختصر سا فقرہ کہہ کر آئینہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ہٹ دھرمو! اس میں اپنی صورت دیکھ لو، تم کس منہ سے امتحان لینے بیٹھے تھے؟ معقول انسان اگر امتحان لیتے ہیں تو اس لیے لیتے ہیں کہ اگر حق ثابت ہو جائے تو اسے مان لیں، مگر تم وہ لوگ ہو جو اپنا منہ مانگا ثبوت مل جانے پر بھی مان کر نہیں دیتے۔

۷۳ – اُوپر کی تنبیہ کے بعد یہ دوسری لطیف تر تنبیہ ہے جس میں ملامت کا پہلو کم اور فہمایش کا پہلو زیادہ ہے۔ اس ارشاد کا خطاب بھی بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اصل مخاطَب کفار کا مجمع ہے، اور اس کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ کے بندو! غور کرو، تمھاری یہ ہٹ دھرمی کس قدر بے جا ہے۔ اگر پیغمبر نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے دعوت و تبلیغ کا یہ کام جاری کیا ہوتا، یا اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی چاہا ہوتا تو بے شک تمھارے لیے یہ کہنے کا موقع تھا کہ ہم اس مطلبی آدمی کی بات کیوں مانیں۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص بے غرض ہے، تمھاری اور دنیا بھر کی بھلائی کے لیے نصیحت کر رہا ہے، اور اس میں اُس کا اپنا کوئی مفاد پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اس کا مقابلہ اس ہٹ دھرمی سے کرنے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ جو انسان سب کے بھلے کے لیے ایک بات بے غرضی کے ساتھ پیش کرے، اس سے کسی کو خواہ مخواہ ضد کیوں ہو؟ کھلے دل سے اس کی بات سنو، دل کو لگتی ہو تو مانو، نہ لگتی ہو نہ مانو۔

۷۴ – اُوپر کے گیارہ رُکوعوں میں حضرت یوسفؑ کا قصہ ختم ہو گیا۔ اگر وحیِ الٰہی کا مقصد محض قصّہ گوئی ہوتا تو اسی جگہ تقریر ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر یہاں تو قصّہ کسی مقصد کی خاطر کہا جاتا ہے اور اس مقصد کی تبلیغ کے لیے جو موقع بھی مل جائے اس سے فائدہ

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ
عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ

کہ اُس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہیں۔[۷۶] کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی بلا انھیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی؟[۷۷] تم ان سے صاف کہہ دو کہ

اُٹھانے میں دریغ نہیں کیا جاتا۔ اب چونکہ لوگوں نے خود نبیؐ کو بلایا تھا اور قصّہ سننے کے لیے کان متوجہ تھے، اس لیے ان کے مطلب کی بات ختم کرتے ہی چند جملے اپنے مطلب کے بھی کہہ دیے گئے اور غایت درجہ اختصار کے ساتھ ان چند جملوں ہی میں نصیحت اور دعوت کا سارا مضمون سمیٹ دیا گیا۔

۷۵ – اس سے مقصد لوگوں کو ان کی غفلت پر مُتنبّہ کرنا ہے۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز بجائے خود محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے، جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، وہ انسان کا سا دیکھنا نہیں بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا دیکھتے ہیں۔ درخت کو درخت، اور پہاڑ کو پہاڑ، اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے، اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان چیزوں کا مَصرَف بھی جانتا ہے۔ مگر جس مقصد کے لیے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے، وہ صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مَصرَف اور استعمال معلوم کرے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی حقیقت کی جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعے سے اس کا سراغ لگائے۔ اسی معاملے میں اکثر انسان غفلت برت رہے ہیں، اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر دلوں پر یہ قفل نہ چڑھا لیا گیا ہوتا تو انبیاؑ کی بات سمجھنا اور ان کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانا لوگوں کے لیے اس قدر مشکل نہ ہو جاتا۔

۷۶ – یہ فطری نتیجہ ہے اُس غفلت کا جس کی طرف اُوپر کے فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے نشانِ راہ سے آنکھیں بند کیں تو سیدھے راستے سے ہٹ گئے اور اطراف کی جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ اس پر بھی کم انسان ایسے ہیں جو منزل کو بالکل ہی گم کر چکے ہوں اور جنھیں اِس بات سے قطعی انکار ہو کہ خدا ان کا خالق و رازق ہے۔ بیشتر انسان جس گمراہی میں مبتلا ہیں، وہ انکارِ خدا کی گمراہی نہیں بلکہ شرک کی گمراہی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتے کہ خدا نہیں ہے، بلکہ اس غَلَط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی ذات اور اس کی صفات، اختیارات اور حُقوق میں دوسرے بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں۔ یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہوتی اگر زمین و آسمان کی اُن نشانیوں کو نگاہِ عبرت سے دیکھا جاتا جو ہر جگہ اور ہر آن خدائی کی وحدت کا پتا دے رہی ہیں۔

۷۷ – اس سے مقصود لوگوں کو چونکانا ہے کہ فرصتِ زندگی کو دراز سمجھ کر اور حال کے امن کو دائم خیال کر کے فکرِ مآل کو کسی آنے والے وقت پر نہ ٹالو۔ کسی انسان کے پاس بھی اس امر کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کی مہلتِ حیات فُلاں وقت تک یقیناً باقی رہے گی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اچانک اس کی گرفتاری ہو جاتی ہے اور کہاں سے کس حال میں وہ پکڑ بلایا جاتا ہے۔ تمھارا شب و روز

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا
فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ
وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٩﴾

"میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بُلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے[78] اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

اَے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے، اور انھی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے، اور اُنھی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن قوموں کا انجام اِنھیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے اَور زیادہ بہتر ہے جنھوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے؟[79]

کا تجربہ ہے کہ پردۂ مستقبل ایک لمحہ پہلے بھی خبر نہیں دیتا کہ اس کے اندر تمھارے لیے کیا چُھپا ہوا ہے۔ لہٰذا کچھ فکر کرنی ہے تو ابھی کرلو۔ زندگی کی جس راہ پر چلے جا رہے ہو، اس میں آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھیر کر سوچ لو کہ کیا یہ راستہ ٹھیک ہے؟ اِس کے دُرست ہونے کے لیے کوئی واقعی حجت موجود ہے؟ اِس کے راہِ راست ہونے کی کوئی دلیل آثارِ کائنات سے مل رہی ہے؟ اس پر چلنے کے جو نتائج تمھارے اَبنائے نوع پہلے دیکھ چکے ہیں اور جو نتائج اب تمھارے تمدن میں رونما ہو رہے ہیں، وہ یہی تصدیق کرتے ہیں کہ تم ٹھیک جا رہے ہو؟

۷۸ – یعنی اُن باتوں سے پاک جو اس کی طرف منسوب کی جارہی ہیں۔ ان نقائص اور کمزوریوں سے پاک جو ہر مشرکانہ عقیدے کی بنا پر لازماً اس کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ان عُیوب اور خطاؤں اور بُرائیوں سے پاک جن کا اس کی طرف منسوب ہونا شرک کا منطقی نتیجہ ہے۔

۷۹ – یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو دو تین جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے: "یہ لوگ تمھاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل ان کے شہر میں پیدا ہوا اور انھی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوا، اس کے متعلق یہ کیسے مان لیں کہ یکا یک ایک روز خدا نے اُسے اپنا سفیر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں پہلی مرتبہ انھی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ سب بھی انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَہُمۡ
نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ
الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ
مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی وَ لٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ
وَ تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾ ع

(پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ مدّتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سُن کر نہ دیا) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ اُن سے جھُوٹ بولا گیا تھا، یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں، بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔
اگلے لوگوں کے ان قصّوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انھی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل[۸۰] اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔ ع

کبھی نہیں ہُوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ مَیں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اُٹھائے گئے، وہ سب ان کی اپنی ہی بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مسیح، موسیٰ، ابراہیم، نوح (علیہم السلام) آخر کون تھے؟ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیّلات اور بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں، ان کا انجام کیا ہُوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مدیَن، اور قومِ لُوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے رہے ہو۔ کیا وہاں کوئی سبق تمھیں نہیں ملا؟ یہ انجام جو انھوں نے دنیا میں دیکھا، یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کر لی، وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے، آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا۔''

۸۰ – یعنی ہر اُس چیز کی تفصیل جو انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ضروری ہے۔ بعض لوگ ''ہر چیز کی تفصیل'' سے مراد خواہ مخواہ دنیا بھر کی چیزوں کی تفصیل لے لیتے ہیں، اور پھر ان کو یہ پریشانی پیش آتی ہے کہ قرآن میں جنگلات اور طِبّ اور ریاضی اور دوسرے عُلوم وفُنون کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

تفہیم القرآن

الرّعد

(۱۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

الرَّعد

نام آیت نمبر ۱۳ کے فقرے وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ کے لفظ الرعد کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس نام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سورت میں بادل کی گرج کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے، بلکہ یہ صرف علامت کے طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ الرعد آیا ہے، یا جس میں رَعد کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزول رکوع ۴ اور رکوع ۶ کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ یہ سورت بھی اسی دَور کی ہے جس میں سورۂ یونس، ہُود اور اعراف نازل ہوئی ہیں، یعنی زمانۂ قیامِ مکّہ کا آخری دَور۔ اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ایک مدّتِ دراز گزر چکی ہے، مخالفین آپؐ کو زک دینے اور آپؐ کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلتے رہے ہیں، مومنین بار بار تمنائیں کر رہے ہیں کہ کاش! کوئی معجزہ دکھا کر ہی اِن لوگوں کو راہِ راست پر لایا جائے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی راہ دکھانے کا یہ طریقہ ہمارے ہاں رائج نہیں ہے، اور اگر دشمنانِ حق کی رسّی دراز کی جا رہی ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے تم گھبرا اُٹھو۔ پھر آیت ۳۱ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بار بار کفار کی ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ ہو چکا ہے جس کے بعد یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اگر قبروں سے مردے بھی اُٹھ کر آ جائیں تو یہ لوگ نہ مانیں گے بلکہ اس واقعے کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالیں گے۔ ان سب باتوں سے یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکے کے آخری دَور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون سورت کا مدعا پہلی ہی آیت میں پیش کر دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے، مگر یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اسے نہیں مانتے۔ ساری تقریر اسی مرکزی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ اس سلسلے میں بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے، ان پر ایمان لانے کے اخلاقی و روحانی فوائد سمجھائے گئے ہیں، ان کو نہ ماننے کے نقصانات بتائے گئے ہیں، اور یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ کفر سراسر ایک حماقت اور جہالت ہے۔ پھر چونکہ اس سارے بیان کا مقصد محض دماغوں کو مطمئن کرنا ہی نہیں ہے، دلوں کو ایمان کی طرف کھینچنا بھی ہے، اس لیے نرے منطقی اِستدلال سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ایک ایک دلیل اور ایک ایک شہادت کو پیش کرنے کے بعد ٹھیر کر طرح طرح سے تخویف، ترہیب اور مشفقانہ تلقین کی گئی ہے، تاکہ نادان لوگ اپنی گمراہانہ ہٹ دھرمی سے باز آ جائیں۔

دَورانِ تقریر میں جگہ جگہ مخالفین کے اعتراضات کا ذکر کیے بغیر ان کے جوابات دیے گئے ہیں، اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے تھے، یا مخالفین کی طرف سے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ اہلِ ایمان کو بھی، جو کئی برس کی طویل اور سخت جدّ و جُہد کی وجہ سے تھکے جا رہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے، تسلّی دی گئی ہے۔

۴۳ آیاتہا

سُوْرَۃُ الرَّعۡدِ مَدَنِيَّۃٌ

۶ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓرٰ ۟ قف تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ
وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ
بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ

ا-ل-م-ر- یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں، اور جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے، مگر (تمھاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں[۱]۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں[۲]، پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[۳]، اور اُس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا

۱ - یہ اس سورہ کی تمہید ہے جس میں مقصودِ کلام کو چند لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ رُوئے سُخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور آپؐ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبیؐ! تمھاری قوم کے اکثر لوگ اس تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اِسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے اور یہی حق ہے، خواہ لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل تقریر شروع ہو جاتی ہے، جس میں منکرین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیم کیوں حق ہے اور اس کے بارے میں اُن کا رویّہ کس قدر غلط ہے۔ اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ابتدا ہی سے یہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت جس چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، وہ تین بنیادی باتوں پر مشتمل تھی: ایک یہ کہ خدائی پوری کی پوری اللہ کی ہے، اس لیے اس کے سوا کوئی بندگی و عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تم کو اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور جو کچھ پیش کر رہا ہوں، اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں۔ یہی تین باتیں ہیں جنھیں ماننے سے لوگ انکار کر رہے تھے، اِنھی کو اس تقریر میں بار بار طریقے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور انھی کے متعلق لوگوں کے شبہات و اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے۔

۲ - بالفاظِ دیگر، آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے حد و حساب اَجرامِ فلکی کو تھامے ہوئے ہو مگر ایک غیر محسوس طاقت ایسی ہے جو ہر ایک کو اس کے مقام و مدار پر روکے ہوئے

Maktaba Tul Ishaat.com

الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

پابند[۴] بنایا۔ اِس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کے لیے چل رہی[۵] ہے اور اللہ ہی اِس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا[۶] ہے،

ہے اور ان عظیم الشان اجسام کو زمین پر ایک دوسرے پر گرنے نہیں دیتی۔

۳ – اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ اعراف، حاشیہ ۴۱۔ مختصراً یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ عرش (یعنی سلطنتِ کائنات کے مرکز) پر اللہ تعالیٰ کی جلوہ فرمائی کو جگہ جگہ قرآن میں جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ وہ آپ ہی اس سلطنت پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ یہ جہانِ ہَستْ و بُود کوئی خود بخود چلنے والا کارخانہ نہیں ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں، اور نہ مختلف خداؤں کی آماج گاہ ہے، جیسا کہ بہت سے دوسرے جاہل سمجھے بیٹھے ہیں، بلکہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جسے اس کا پیدا کرنے والا خود چلا رہا ہے۔

۴ – یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ مخاطَب وہ قوم ہے جو اللہ کی ہستی کی منکر نہ تھی، نہ اس کے خالق ہونے کی منکر تھی، اور نہ یہ گمان رکھتی تھی کہ یہ سارے کام جو یہاں بیان کیے جا رہے ہیں، اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں۔ اس لیے بجائے خود اس بات پر دلیل لانے کی ضرورت نہ سمجھی گئی کہ واقعی اللہ ہی نے آسمانوں کو قائم کیا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو ایک ضابطے کا پابند بنایا ہے۔ بلکہ ان واقعات کو، جنھیں مخاطَب خود ہی مانتے تھے، ایک دوسری بات پر دلیل قرار دیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس نظامِ کائنات میں صاحبِ اقتدار نہیں ہے جو معبُود قرار دیے جانے کا مستحق ہو۔ رہا یہ سوال کہ جو شخص سرے سے اللہ کی ہستی کا اور اس کے خالق و مدبر ہونے ہی کا قائل نہ ہو، اس کے مقابلے میں یہ استدلال کیسے مفید ہو سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کے مقابلے میں توحید کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتا ہے، وہی دلائل مَلاحِدہ کے مقابلے میں وجودِ باری کے اثبات کے لیے بھی کافی ہیں۔ توحید کا سارا استدلال اس بنیاد پر قائم ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، اور بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار جس طرح اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کے بہت سے فرماں روا نہیں ہیں، اسی طرح اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کا ایک فرماں روا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور ایک حکمراں کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ہٹ دھرم ہو، یا پھر وہ جس کی عقل ماری گئی ہو۔

۵ – یعنی یہ نظام صرف اِسی امر کی شہادت نہیں دے رہا ہے کہ ایک ہمہ گیر اقتدار اس پر فرماں روا ہے اور ایک زبردست حکمت اس میں کام کر رہی ہے، بلکہ اس کے تمام اجزا اور اُن میں کام کرنے والی ساری قوتیں اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ اس نظام کی کوئی چیز غیر فانی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے جس کے اختتام تک وہ چلتی ہے، اور جب اُس کا وقت آن پورا ہوتا

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝٢ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ
فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ
اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝٣

شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔[۷]

اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اُسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں، اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔[۸] ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

ہے تو مٹ جاتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اِس نظام کے ایک ایک جُز کے معاملے میں صحیح ہے، اسی طرح اس پورے نظام کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اس عالمِ طبیعی کی مجموعی ساخت یہ بتا رہی ہے کہ یہ اَبدی و سَرمدی نہیں ہے، اس کے لیے بھی کوئی وقت ضرور مقرر ہے جب یہ ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا عالم برپا ہوگا۔ لہٰذا قیامت، جس کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اس کا آنا مُستبعَد نہیں بلکہ نہ آنا مُستبعَد ہے۔

٦ – یعنی اِس امر کی نشانیاں کہ رسولِ خدا جن حقیقتوں کی خبر دے رہے ہیں، وہ فی الواقع سچّی حقیقتیں ہیں۔ کائنات میں ہر طرف اُن پر گواہی دینے والے آثار موجود ہیں۔ اگر لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آ جائے کہ قرآن میں جن جن باتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے بے شمار نشانات اُن کی تصدیق کر رہے ہیں۔

۷ – اُوپر جن آثارِ کائنات کو گواہی میں پیش کیا گیا ہے، ان کی یہ شہادت تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس عالم کا خالق و مدبر ایک ہی ہے، لیکن یہ بات کہ موت کے بعد دوسری زندگی، اور عدالتِ الٰہی میں انسان کی حاضری، اور جزا و سزا کے متعلق رسولُ اللہ نے جو خبریں دی ہیں، ان کے برحق ہونے پر بھی یہی آثار شہادت دیتے ہیں، ذرا مخفی ہے اور زیادہ غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے پہلی حقیقت پر مُتنبِّہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، کیونکہ سننے والا محض دلائل کو سُن کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ دوسری حقیقت پر خصوصیت کے ساتھ مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ اپنے رب کی ملاقات کا یقین بھی تم کو اِنھی نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا نشانیوں سے آخرت کا ثبوت دو طرح سے ملتا ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک یہ کہ جب ہم آسمانوں کی ساخت اور شمس وقمر کی تسخیر پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان اَجرامِ فلکی پیدا کیے ہیں، اور جس کی قدرت اتنے بڑے بڑے کُروں کو فضا میں گردش دے رہی ہے، اُس کے لیے نوعِ انسانی کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اسی نظامِ فلکی سے ہم کو یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ اِس کا پیدا کرنے والا کمال درجے کا حکیم ہے، اور اُس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو ایک ذی عقل وشعور اور صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق بنانے کے بعد، اور اپنی زمین کی بے شمار چیزوں پر تصرّف کی قدرت عطا کرنے کے بعد، اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب نہ لے، اُس کے ظالموں سے بازپُرس اور اُس کے مظلوموں کی دادرسی نہ کرے، اُس کے نیکوکاروں کو جزا اور اُس کے بدکاروں کو سزا نہ دے، اور اُس سے کبھی یہ پوچھے ہی نہیں کہ جو بیش قیمت امانتیں میں نے تیرے سُپرد کی تھیں، ان کے ساتھ تُو نے کیا معاملہ کیا۔ ایک اندھا راجا تو بے شک اپنی سلطنت کے معاملات اپنے کار پردازوں کے حوالے کر کے خوابِ غفلت میں سرشار ہو سکتا ہے، لیکن ایک حکیم و دانا سے اس غلط بخشی و تغافُل کیشی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس طرح آسمانوں کا مُشاہدہ ہم کو نہ صرف آخرت کے امکان کا قائل کرتا ہے، بلکہ اس کے وقوع کا یقین بھی دلاتا ہے۔

۸ – اَجرامِ فلکی کے بعد عالَمِ ارضی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور یہاں بھی خدا کی قدرت اور حکمت کے نشانات سے اُنھی دونوں حقیقتوں (توحید اور آخرت) پر اِستشہاد کیا گیا ہے جن پر پچھلی آیات میں عالمِ سماوی کے آثار سے استشہاد کیا گیا تھا۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اَجرامِ فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق، زمین کی بے شمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، یہ ساری چیزیں اس بات پر کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے اور نہ مختلف بااختیار خدا ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ مسلسل قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لیے تخلیق و تدبیر کا ایسا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لے کر آسمانوں تک ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جائے اور کبھی ان کی مَصلَحتوں کے درمیان تصادُم واقع نہ ہونے پائے۔

(۲) زمین کے اِس عظیم الشان کُرے کا فضائے بَسیط میں معلّق ہونا، اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا اُبھر آنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اِس کی گود میں طرح طرح کے بے حد وحساب درختوں کا پھلنا، اور پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا، یہ سب چیزیں اُس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں، حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

(۳) زمین کی ساخت میں، اُس پر پہاڑوں کی پیدایش میں، پہاڑوں سے دریاؤں کی روانی کا انتظام کرنے میں، پھلوں کی ہر قسم میں دو دو طرح کے پھل پیدا کرنے میں، اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات باقاعدگی کے ساتھ لانے میں

وَ فِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّ
نَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا
عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾

اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خِطّے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مُتَّصِل واقع ہیں۔[9] انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں، جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دُہرے۔[10] سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔[11]

جو بے شمار حکمتیں اور مَصلحَتیں پائی جاتی ہیں، وہ پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے تخلیق کا یہ نقشہ بنایا ہے، وہ کمال درجے کا حکیم ہے۔ یہ ساری چیزیں خبر دیتی ہیں کہ یہ نہ تو کسی بے ارادہ طاقت کی کارفرمائی ہے اور نہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے اندر ایک حکیم کی حکمت اور انتہائی بالغ حکمت کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف ایک نادان ہی ہوسکتا ہے جو یہ گمان کرے کہ زمین پر انسان کو پیدا کر کے اور اُسے ایسی ہنگامہ آرائیوں کے مواقع دے کر وہ اس کو یونہی خاک میں گم کر دے گا۔

۹ – یعنی ساری زمین کو اس نے یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا ہے، بلکہ اس میں بے شمار خِطّے پیدا کر دیے ہیں، جو متصل ہونے کے باوجود شکل میں، رنگ میں، مادۂ ترکیب میں، خاصیتوں میں، قوتوں اور صلاحیتوں میں، پیداوار اور کیمیاوی یا معدنی خزانوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان مختلف خِطّوں کی پیدائش اور ان کے اندر طرح طرح کے اختلافات کی موجودگی اپنے اندر اتنی حکمتیں اور مَصلحَتیں رکھتی ہے کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ دوسری مخلوقات سے قطعِ نظر، صرف ایک انسان ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی مختلف اغراض و مصالح اور زمین کے اِن خِطّوں کی گوناگونی کے درمیان جو مناسبتیں اور مطابقتیں پائی جاتی ہیں، اور ان کی بدولت انسانی تمدّن کو پھَلنے پھُولنے کے جو مواقع بہم پہنچے ہیں، وہ یقیناً کسی حکیم کی فکر اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کے دانش مندانہ ارادے کا نتیجہ ہیں۔ اسے محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کے لیے بڑی ہٹ دھرمی درکار ہے۔

۱۰ – کھجور کے درختوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی جڑ سے ایک ہی تنا نکلتا ہے، اور بعض میں ایک جڑ سے دو یا زیادہ تنے نکلتے ہیں۔

۱۱ – اس آیت میں اللہ کی توحید اور اس کی قدرت و حکمت کے نشانات دکھانے کے علاوہ ایک اور حقیقت کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے اِس کائنات میں کہیں بھی یکسانی نہیں رکھی ہے۔ ایک ہی زمین ہے، مگر اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِىۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَ
اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۵﴾ وَ يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ
بِالسَّيِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ

اب اگر تمھیں تعجّب کرنا ہے تو تعجّب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ ”جب ہم مر کر مٹّی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟“ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے[12]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں[13]۔ یہ جہنّمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ لوگ بھلائی سے پہلے بُرائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں[14]، حالانکہ ان سے پہلے (جو لوگ اس روش پر چلے ہیں، ان پر خدا کے عذاب کی) عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

قطعے اپنے اپنے رنگوں، شکلوں اور خاصیتوں میں جُدا ہیں۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی ہے مگر اس سے طرح طرح کے غلّے اور پھل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک ہی درخت ہے اور اس کا ہر پھل دوسرے پھل سے نوعیت میں متحد ہونے کے باوجود شکل اور جسامت اور دوسری خُصوصیّات میں مختلف ہے۔ ایک ہی جڑ ہے اور اس سے دو الگ تنے نکلتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی الگ انفرادی خُصوصیّات رکھتا ہے۔ ان باتوں پر جو شخص غور کرے گا، وہ کبھی یہ دیکھ کر پریشان نہ ہوگا کہ انسانی طبائع اور میلانات اور مزاجوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر اسی سورت میں فرمایا گیا ہے، اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو یکساں بنا سکتا تھا، مگر جس حکمت پر اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ یکسانی کی نہیں بلکہ تنوّع اور رنگا رنگی کی متقاضی ہے۔ سب کو یکساں بنا دینے کے بعد تو یہ سارا ہنگامۂ وجود ہی بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا۔

۱۲ – یعنی ان کا آخرت سے انکار دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ! وہ خدا عاجز، درماندہ اور نادان و بے خرد ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

۱۳ – گردن میں طوق پڑا ہونا قیدی ہونے کی علامت ہے۔ ان لوگوں کی گردنوں میں طوق پڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت کے، اپنی ہٹ دھرمی کے، اپنی خواہشاتِ نفس کے، اور اپنے آباو اجداد کی اندھی تقلید کے اسیر بنے ہوئے ہیں۔

رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَاۤ اَنْتَ
مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۷ ع اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ

تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔

یہ لوگ جنھوں نے تمھاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ "اِس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتری؟"[15] ـــــ تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو، اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔[16] ع

اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے

یہ آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتے۔ اِنھیں اِن کے تعصبات نے ایسا جکڑ رکھا ہے کہ یہ آخرت کو نہیں مان سکتے اگرچہ اس کا ماننا سراسر معقول ہے، اور انکارِ آخرت پر جمے ہوئے ہیں اگرچہ وہ سراسر نامعقول ہے۔

۱۴ – کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر تم واقعی نبی ہو اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے تم کو جھٹلا دیا ہے تو اب آخر ہم پر وہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو؟ اس کے آنے میں خواہ مخواہ دیر کیوں لگ رہی ہے؟ کبھی وہ چیلنج کے انداز میں کہتے کہ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (خدایا! ہمارا حساب تو ابھی کر دے، قیامت پر نہ اُٹھا رکھ)۔ اور کبھی کہتے کہ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (خدایا! اگر یہ باتیں جو محمدؐ پیش کر رہے ہیں حق ہیں اور تیری ہی طرف سے ہیں، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کر دے)۔ اس آیت میں کفار کی انھی باتوں کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ نادان خیر سے پہلے شر مانگتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو سنبھلنے کے لیے جو مہلت دی جا رہی ہے اس سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مہلت کو جلدی ختم کر دیا جائے اور ان کی باغیانہ رَوِش پر فوراً گرفت کر ڈالی جائے۔

۱۵ – نشانی سے ان کی مراد ایسی نشانی تھی جسے دیکھ کر ان کو یقین آ جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں۔ وہ آپ کی بات کو اس کی حقانیت کے دلائل سے سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ آپ کی سیرتِ پاک سے سبق لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس زبردست اخلاقی انقلاب سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو آپ کی تعلیم کے اثر سے آپ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸ عٰلِمُ الْغَیْبِ
وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ
جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰
لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ

اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے[17]۔ ہر چیز کے لیے اُس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر، ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ، اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو، اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال

رُونما ہو رہا تھا۔ وہ اُن معقول دلائل پر بھی غور کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کے مشرکانہ مذہب اور ان کے اوہامِ جاہلیت کی غلطیاں واضح کرنے کے لیے قرآن میں پیش کیے جا رہے تھے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر وہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی کرشمہ دکھایا جائے جس کے معیار پر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جانچ سکیں۔

۱۶ – یہ اُن کے مطالبے کا مختصر سا جواب ہے جو براہِ راست اُن کو دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ! تم اس فکر میں نہ پڑو کہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے آخر کون سا کرشمہ دکھایا جائے۔ تمھارا کام ہر ایک کو مطمئن کر دینا نہیں ہے۔ تمھارا کام تو صرف یہ ہے کہ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو چونکا دو اور اُن کو غلط روی کے بُرے انجام سے خبردار کر دو۔ یہ خدمت ہم نے ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ایک نہ ایک ہادی مقرر کر کے لی ہے۔ اب تم سے یہی خدمت لے رہے ہیں۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے آنکھیں کھولے، اور جس کا جی چاہے غفلت میں پڑا رہے۔ یہ مختصر جواب دے کر اللہ تعالیٰ اُن کے مطالبے کی طرف سے رُخ پھیر لیتا ہے اور اُن کو مُتنبّہ کرتا ہے کہ تم کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہو جہاں کسی چوپٹ راجا کا راج ہو۔ تمھارا واسطہ ایک ایسے خدا سے ہے جو تم میں سے ایک ایک شخص کو اُس وقت سے جانتا ہے جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بن رہے تھے، اور زندگی بھر تمھاری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اُس کے ہاں تمھاری قسمتوں کا فیصلہ ٹھیٹ عدل کے ساتھ تمھارے اوصاف کے لحاظ سے ہوتا ہے، اور زمین و آسمان میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اُس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔

۱۷ – اس سے مراد یہ ہے کہ ماؤں کے رحم میں بچے کے اعضا، اُس کی قوتوں اور قابلیتوں، اور اُس کی صلاحیتوں اور استعدادوں

اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ
وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۚ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ
مِنۡ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ ہُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنۡشِئُ
السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿ۚ۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِہٖ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ

کر رہے ہیں[18]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے[19]۔

وہی ہے جو تمھارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے، جنھیں دیکھ کر تمھیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور اُمیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے[20] اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اُس کی

میں جو کچھ کمی یا زیادتی ہوتی ہے، اللہ کی براہِ راست نگرانی میں ہوتی ہے۔

۱۸ – یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ہر حال میں براہِ راست خود دیکھ رہا ہے اور اُس کی تمام حرکات وسکنات سے واقف ہے، بلکہ مزید برآں اللہ کے مقرر کیے ہوئے نگرانِ کار بھی ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور اس کے پورے کارنامۂ زندگی کا ریکارڈ محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایسے خدا کی خدائی میں جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں کہ انھیں شُترِ بے مُہار کی طرح زمین پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کوئی نہیں جس کے سامنے وہ اپنے نامۂ اعمال کے لیے جواب دہ ہوں، وہ دراصل اپنی شامت آپ بلاتے ہیں۔

۱۹ – یعنی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر، یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ، یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ ہی کرتے رہو، وہ تمھاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمھیں تمھارے بُرے اعمال کی پاداش سے بچا لے گا۔

۲۰ – یعنی بادلوں کی گرج یہ ظاہر کرتی ہے کہ جس خدا نے یہ ہوائیں چلائیں، یہ بھاپیں اُٹھائیں، یہ کثیف بادل جمع کیے، اس بجلی کو بارش کا ذریعہ بنایا اور اس طرح زمین کی مخلوقات کے لیے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا، وہ سُبّوح و قُدّوس ہے، اپنی حکمت اور قدرت میں کامل ہے، اپنی صفات میں بے عیب ہے، اور اپنی خدائی میں لاشریک ہے۔ جانوروں کی طرح سننے والے تو اِن بادلوں میں صرف گرج کی آواز ہی سنتے ہیں، مگر جو ہوش کے کان رکھتے ہیں وہ بادلوں کی زبان سے توحید کا یہ اعلان سنتے ہیں۔

Maktaba-Tul-Ishaat.com

خِيۡفَتِهٖ‌ۚ وَيُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيۡبُ بِهَا مَنۡ يَّشَآءُ وَهُمۡ
يُجَادِلُوۡنَ فِى اللّٰهِ‌ۚ وَهُوَ شَدِيۡدُ الۡمِحَالِؕ ۝۱۳ لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَـقِّ‌ ؕ
وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا يَسۡتَجِيۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَىۡءٍ اِلَّا
كَبَاسِطِ كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ‌ ؕ وَمَا
دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ‏ ۝۱۴ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ

تسبیح کرتے ہیں[۲۱]۔ وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات) انھیں جس پر چاہتا ہے، عین اس حالت میں گرا دیتا ہے جب کہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے[۲۲]۔

اسی کو پکارنا برحق ہے[۲۳]۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنھیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ اُن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انھیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اُس سے درخواست کرے کہ تُو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اِسی طرح کافروں کی دُعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیرِ بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و

۲۱ – فرشتوں کے جلالِ خداوندی سے لرزنے اور تسبیح کرنے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ یہاں اس لیے کیا کہ مشرکین ہر زمانے میں فرشتوں کو دیوتا اور معبُود قرار دیتے رہے ہیں اور اُن کا یہ گمان رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی خدائی میں شریک ہیں۔ اس غلط خیال کی تردید کے لیے فرمایا گیا کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں خدا کے شریک نہیں ہیں بلکہ فرماں بردار خادم ہیں اور اپنے آقا کے جلال سے کانپتے ہوئے اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔

۲۲ – یعنی اس کے پاس بے شمار حربے ہیں اور وہ جس وقت جس کے خلاف جس حربے سے چاہے ایسے طریقے سے کام لے سکتا ہے کہ چوٹ پڑنے سے ایک لمحہ پہلے بھی اسے خبر نہیں ہوتی کہ کدھر سے کب چوٹ پڑنے والی ہے۔ ایسی قادرِ مُطلق ہستی کے بارے میں یوں بے سوچے سمجھے جو لوگ اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں، انھیں کون عقل مند کہہ سکتا ہے؟

۲۳ – پکارنے سے مراد اپنی حاجتوں میں مدد کے لیے پکارنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حاجت روائی و مشکل کشائی کے سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں، اِس لیے صرف اُسی سے دعائیں مانگنا برحق ہے۔

وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ قُلْ
مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ
يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ

آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے[۲۴] اور سب چیزوں کے سایے صبح و شام اُس کے آگے جھکتے ہیں۔[۲۵]

اِن سے پوچھو: آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ ـــــ کہو: اللہ۔[۲۶] پھر ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبُودوں کو اپنا کارساز ٹھیرا لیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو: کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہُوا کرتا ہے؟[۲۷] کیا روشنی اور تاریکیاں

۲۴ – سجدے سے مراد اطاعت میں جھکنا، حکم بجالانا اور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اِس معنیٰ میں اللہ کو سجدہ کر رہی ہے کہ وہ اس کے قانون کی مطیع ہے اور اس کی مَشیّت سے بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتی۔ مومن اس کے آگے برضا و رغبت جھکتا ہے تو کافر کو مجبوراً جھکنا پڑتا ہے، کیونکہ خدا کے قانونِ فطرت سے ہٹنا اُس کی مقدرت سے باہر ہے۔

۲۵ – سایوں کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اشیا کے سایوں کا صبح و شام مغرب اور مشرق کی طرف گرنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب چیزیں کسی کے امر کی مطیع اور کسی کے قانون سے مسخر ہیں۔

۲۶ – واضح رہے کہ وہ لوگ خود اس بات کے قائل تھے کہ زمین و آسمان کا رب اللہ ہے۔ وہ اِس سوال کا جواب انکار کی صورت میں نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ یہ انکار خود اُن کے اپنے عقیدے کے خلاف تھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر وہ اقرار کی صورت میں بھی اس کا جواب دینے سے کتراتے تھے، کیونکہ اقرار کے بعد توحید کا ماننا لازم آجاتا تھا اور شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد باقی نہیں رہتی تھی۔ اس لیے اپنے مَوقف کی کمزوری محسوس کر کے وہ اس سوال کے جواب میں چپ سادھ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان سے پوچھو، زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ کائنات کا رب کون ہے؟ تم کو رزق دینے والا کون ہے؟ پھر حکم دیتا ہے کہ تم خود کہو کہ اللہ، اور اس کے بعد یوں استدلال کرتا ہے کہ جب یہ سارے کام اللہ کے ہیں تو آخر یہ دوسرے کون ہیں جن کی تم بندگی کیے جا رہے ہو؟

۲۷ – اندھے سے مراد وہ شخص ہے جس کے آگے کائنات میں ہر طرف اللہ کی وحدانیت کے آثار و شواہد پھیلے ہوئے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ النُّوۡرُ ۚ۬ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

یکساں ہوتی ہیں؟[۲۸] اور اگر ایسا نہیں تو کیا اِن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اُس کی وجہ سے اِن پر تخلیق کا معاملہ مُشتبَہ ہوگیا؟[۲۹] — کہو: ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب[۳۰]!

ہیں مگر وہ اُن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اور آنکھوں والے سے مراد وہ ہے جس کے لیے کائنات کے ذرّے ذرّے اور پتّے پتّے میں معرفتِ کردگار کے دفتر کُھلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اِس سوال کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے اندھو! اگر تمھیں کچھ نہیں سُوجھتا تو آخر چشمِ بینا رکھنے والا اپنی آنکھیں کیسے پھوڑ لے؟ جو شخص حقیقت کو آشکار دیکھ رہا ہے، اس کے لیے کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم بے بصیرت لوگوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرے؟

۲۸- روشنی سے مراد علمِ حق کی وہ روشنی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے متبعین کو حاصل تھی۔ اور تاریکیوں سے مراد جہالت کی وہ تاریکیاں ہیں جن میں منکرین بھٹک رہے تھے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس کو روشنی مل چکی ہے، وہ کس طرح اپنی شمع بجھا کر اندھیروں میں ٹھوکریں کھانا قبول کرسکتا ہے؟ تم اگر نور کے قدر شناس نہیں ہو تو نہ سہی۔ لیکن جس نے اُسے پالیا ہے، جو نور وظلمت کے فرق کو جان چکا ہے، جو دن کے اُجالے میں سیدھا راستہ صاف دیکھ رہا ہے، وہ روشنی کو چھوڑ کر تاریکیوں میں بھٹکتے پھرنے کے لیے کیسے آمادہ ہوسکتا ہے؟

۲۹- اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ دوسروں نے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا کہ خدا کا تخلیقی کام کون سا ہے اور دوسروں کا کون سا، تب تو واقعی شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد ہوسکتی تھی۔ لیکن جب یہ مشرکین خود مانتے ہیں کہ ان کے معبُودوں میں سے کسی نے ایک تنکا اور ایک بال تک پیدا نہیں کیا ہے، اور جب انھیں خود تسلیم ہے کہ خلق میں ان جعلی خداؤں کا ذرّہ برابر بھی کوئی حصّہ نہیں ہے، تو پھر یہ جعلی معبُود خالق کے اختیارات اور اس کے حُقوق میں آخر کس بنا پر شریک ٹھیرا لیے گئے؟

۳۰- اصل میں لفظ قہّار استعمال ہُوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: "وہ ہستی جو اپنے زور سے سب پر حکم چلائے اور سب کو مغلوب کر کے رکھے۔" یہ بات کہ "اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے"، مشرکین کی اپنی تسلیم کردہ حقیقت ہے، جس سے انھیں کبھی انکار نہ تھا۔ اور یہ بات کہ "وہ یکتا اور قہار ہے"، اس تسلیم شدہ حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے جس سے انکار کرنا، پہلی حقیقت کو مان لینے کے بعد، کسی صاحبِ عقل کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اِس لیے کہ جو ہر چیز کا خالق ہے، وہ لامحالہ یکتا و یگانہ ہے، کیونکہ دوسری جو چیز بھی ہے وہ اسی کی مخلوق ہے، پھر بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کی ذات، یا صفات، یا اختیارات، یا حقوق میں اس کی شریک ہو؟ اسی

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اُٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے[۳۱]۔ اور ایسے ہی جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اُٹھتے ہیں جنھیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں[۳۲]۔ اِسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے، اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔

طرح وہ لامحالہ قہّار بھی ہے، کیونکہ مخلوق کا اپنے خالق سے مغلوب ہو کر رہنا عین تصورِ مخلوقیت میں شامل ہے۔ غلبۂ کامل اگر خالق کو حاصل نہ ہو تو وہ خلق ہی کیسے کر سکتا ہے۔ پس جو شخص اللہ کو خالق مانتا ہو، اس کے لیے ان دو خالص عقلی و منطقی نتیجوں سے انکار کرنا ممکن نہیں رہتا، اور اس کے بعد یہ بات سراسر غیر معقول ٹھیرتی ہے کہ کوئی شخص خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کرے اور غالب کو چھوڑ کر مغلوب کو مشکل کُشائی کے لیے پکارے۔

۳۱- اس تمثیل میں اُس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا، آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو ان ندی نالوں کے مانند ٹھیرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق بارانِ رحمت سے بھرپور ہو کر رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ اور اُس ہنگامہ و شورش کو جو تحریکِ اسلامی کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی، اُس جھاگ اور خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اُٹھتے ہی سطح پر اپنی اُچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔

۳۲- یعنی بھٹی جس کام کے لیے گرم کی جاتی ہے، وہ تو ہے خالص دھات کو تپا کر کار آمد بنانا۔ مگر یہ کام جب بھی کیا جاتا ہے، میل کچیل ضرور اُبھر آتا ہے اور اس شان سے چرخ کھاتا ہے کہ کچھ دیر تک سطح پر بس وہی وہ نظر آتا رہتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؔ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ
اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ۬ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۟

جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کرلی اُن کے لیے بھلائی ہے، اور جنھوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کرلیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس سب کو فدیے میں دے ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔[۳۳] یہ وہ لوگ ہیں جن سے بُری طرح حساب لیا جائے گا[۳۴] اور اُن کا ٹھکانا جہنّم ہے، بہت ہی بُرا ٹھکانا۔

۳۳- یعنی اُس وقت ان پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے دنیا و مافیہا کی دولت دے ڈالنے میں بھی تأمل نہ کریں گے۔

۳۴- بُری حساب فہمی یا سخت حساب فہمی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی کی کسی خطا اور کسی لغزش کو معاف نہ کیا جائے، کوئی قصور جو اس نے کیا ہو، مؤاخذے کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کا محاسبہ اپنے اُن بندوں سے کرے گا جو اُس کے باغی بن کر دنیا میں رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جنھوں نے اپنے خدا سے وفاداری کی ہے اور اس کے مطیع فرمان بن کر رہے ہیں، ان سے ''حسابِ یسیر'' یعنی ہلکا حساب لیا جائے گا، اُن کی خدمات کے مقابلے میں ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور اُن کے مجموعی طرزِ عمل کی بھلائی کو ملحوظ رکھ کر اُن کی بہت سی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے گا۔ اس کی مزید توضیح اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہؓ سے ابوداؤد میں مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے زیادہ خوفناک آیت وہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ''جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا''۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: عائشہ! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا کے مطیع فرمان بندے کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، حتّٰی کہ اگر کوئی کانٹا بھی اُس کو چُبھتا ہے، تو اللہ اُسے اُس کے کسی نہ کسی قصور کی سزا قرار دے کر دنیا ہی میں اس کا حساب صاف کر دیتا ہے؟ آخرت میں تو جس سے بھی محاسبہ ہوگا، وہ سزا پا کر رہے گا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ''جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا''۔ حضورؐ نے جواب دیا: اس سے مراد ہے پیشی (یعنی اس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی بُرائیاں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ضرور ہوں گی)، مگر جس سے باز پُرس ہوئی وہ تو بس سمجھ لو کہ مارا گیا۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ
اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا
يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۙ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمھارے رب کی اِس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟[35] نصیحت تو دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں[36]۔ اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے[37]۔ اُن کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے[38] انھیں برقرار رکھتے ہیں،

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اپنے وفادار اور فرماں بردار ملازم کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر کبھی سخت گرفت نہیں کرتا بلکہ اس کے بڑے بڑے قصوروں کو بھی اس کی خدمات کے پیشِ نظر معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی ملازم کی غداری و خیانت ثابت ہو جائے تو اس کی کوئی خدمت قابلِ لحاظ نہیں رہتی اور اس کے چھوٹے بڑے سب قصور شمار میں آجاتے ہیں۔

۳۵ – یعنی نہ دنیا میں ان دونوں کا رویّہ یکساں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں ان کا انجام یکساں۔

۳۶ – یعنی خدا کی بھیجی ہوئی اِس تعلیم اور خدا کے رسول کی اس دعوت کو جو لوگ قبول کیا کرتے ہیں وہ عقل کے اندھے نہیں بلکہ ہوشِ گوش رکھنے والے بیدار مغز لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر دنیا میں ان کی سیرت و کردار کا وہ رنگ اور آخرت میں اُن کا وہ انجام ہوتا ہے جو بعد کی آیتوں میں بیان ہُوا ہے۔

۳۷ – اس سے مراد وہ اَزلی عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں تمام انسانوں سے لیا تھا کہ وہ صرف اسی کی بندگی کریں گے (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۳۴ و ۱۳۵)۔ یہ عہد ہر انسان سے لیا گیا ہے، ہر ایک کی فطرت میں مُضمر ہے، اور اُسی وقت پختہ ہو جاتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے وجود میں آتا اور اس کی رُبوبیت سے پرورش پاتا ہے۔ خدا کے رزق سے پلنا، اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے کام لینا اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو استعمال کرنا آپ سے آپ انسان کو خدا کے ساتھ ایک میثاقِ بندگی میں باندھ دیتا ہے، جسے توڑنے کی جراَت کوئی ذی شعور اور نمک حلال آدمی نہیں کر سکتا، اِلّا یہ کہ نادانستہ کبھی اَحیاناً اس سے کوئی لغزش ہو جائے۔

۳۸ – یعنی وہ تمام معاشرتی اور تمدّنی روابط جن کی دُرستی پر انسان کی اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾

اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں،[۳۹] نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔[۴۰] آخرت کا گھر انھی لوگوں کے لیے ہے،

۳۹- یعنی اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے جذبات اور میلانات کو حُدود کا پابند بناتے ہیں، خدا کی نافرمانی میں جن جن فائدوں اور لذتوں کا لالچ نظر آتا ہے انھیں دیکھ کر پھسل نہیں جاتے، اور خدا کی فرماں برداری میں جن جن نقصانات اور تکلیفوں کا اندیشہ ہوتا ہے، انھیں برداشت کر لے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی پوری زندگی درحقیقت صبر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ رضائے الٰہی کی اُمید پر اور آخرت کے پائدار نتائج کی توقع پر اس دنیا میں ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے اور گناہ کی جانب نفس کے ہر میلان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

۴۰- یعنی وہ بدی کے مقابلے میں بدی نہیں بلکہ نیکی کرتے ہیں۔ وہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں بلکہ خیر ہی سے کرتے ہیں۔ کوئی اُن پر خواہ کتنا ہی ظلم کرے، وہ جواب میں ظلم نہیں بلکہ انصاف ہی کرتے ہیں۔ کوئی ان کے خلاف کتنا ہی جھوٹ بولے، وہ جواب میں سچ ہی بولتے ہیں۔ کوئی اُن سے خواہ کتنی ہی خیانت کرے، وہ جواب میں دیانت ہی سے کام لیتے ہیں۔ اسی معنیٰ میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے:

لا تکونوا امعة تقولون ان احسن الناس احسنا وان ظلمونا ظلمنا۔ ولکن وطّنوا انفسکم ، ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤا فلا تظلموا۔	تم اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے، اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو، اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

اسی معنیٰ میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو۹ باتوں کا حکم دیا ہے۔ اور ان میں سے چار باتیں آپ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں، جو میرا حق مارے میں اس کا حق

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ
وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ وَالَّذِيْنَ
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ
وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ

یعنی ایسے باغ جواُن کی اَبدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آبا واجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں، وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے اُن کے استقبال کے لیے آئیں گے اور اُن سے کہیں گے کہ ”تم پر سلامتی ہے[۴۱]، تم نے دُنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اُس کی بدولت آج تم اِس کے مستحق ہوئے ہو“ ــــــ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر! رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا رزق

ادا کروں، جو مجھے محروم کرے میں اس کو عطا کروں، اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ اور اسی معنٰی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ لا تخن من خانك، ”جو تجھ سے خیانت کرے تُو اس سے خیانت نہ کر۔“ اور اسی معنٰی میں ہے حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ ”جو شخص تیرے ساتھ معاملہ کرنے میں خدا سے نہیں ڈرتا، اُس کو سزا دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ تو اُس کے ساتھ خدا سے ڈرتے ہوئے معاملہ کر۔“

۴۱ــ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ملائکہ ہر طرف سے آ کر ان کو سلام کریں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ملائکہ ان کو اس بات کی خوشخبری دیں گے کہ اب تم ایسی جگہ آ گئے ہو جہاں تمھارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اب یہاں تم ہر آفت سے،

Maktaba Tul Ishaat.com

يَقۡدِرُ ؕ وَفَرِحُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝۲۶ وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ اَنَابَ ۝۲۷

ع

دیتا ہے[۴۲]۔ یہ لوگ دُنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ لوگ جنھوں نے (رسالتِ محمدیؐ کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں: "اِس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتری"[۴۳] ـــــ کہو: اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے[۴۴]۔

ہر تکلیف سے، ہر مشقت سے، اور ہر خطرے اور اندیشے سے محفوظ ہو۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ حجر، حاشیہ ۲۹)

۴۲- اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ عام جُہلا کی طرح کُفارِ مکہ بھی عقیدہ وعمل کے حُسن و قُبح کو دیکھنے کے بجائے امیری اور غریبی کے لحاظ سے انسانوں کی قدر و قیمت کا حساب لگاتے تھے۔ اُن کا گمان یہ تھا کہ جسے دنیا میں خوب سامانِ عیش مل رہا ہے وہ خدا کا محبُوب ہے، خواہ وہ کیسا ہی گمراہ و بدکار ہو، اور جو تنگ حال ہے وہ خدا کا مغضوب ہے، خواہ وہ کیسا ہی نیک ہو۔ اسی بنیاد پر وہ قریش کے سرداروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غریب ساتھیوں پر فضیلت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھ لو، اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس پر مُتنبّہ فرمایا جا رہا ہے کہ رزق کی کمی وبیشی کا معاملہ اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون سے تعلق رکھتا ہے، جس میں بے شمار دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے کسی کو زیادہ دیا جاتا ہے اور کسی کو کم۔ یہ کوئی معیار نہیں ہے جس کے لحاظ سے انسانوں کے اخلاقی ومعنوی حُسن و قُبح کا فیصلہ کیا جائے۔ انسانوں کے درمیان فرقِ مراتب کی اصل بنیاد اور ان کی سعادت و شقاوت کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ کس نے فکر و عمل کی صحیح راہ اختیار کی اور کس نے غلط، کس نے عمدہ اوصاف کا اکتساب کیا اور کس نے بُرے اوصاف کا۔ مگر نادان لوگ اس کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ کس کو دولت زیادہ ملی اور کس کو کم۔

۴۳- اس سے پہلے آیت ۷ میں اِس سوال کا جو جواب دیا جا چکا ہے، اسے پیشِ نظر رکھا جائے۔ اب دوبارہ اُن کے اسی اعتراض کو نقل کر کے ایک دوسرے طریقے سے اُس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

۴۴- یعنی جو اللہ کی طرف خود رُجوع نہیں کرتا اور اس سے رُوگردانی اختیار کرتا ہے، اُسے زبردستی راہِ راست دکھانے کا طریقہ اللہ کے ہاں رائج نہیں ہے۔ وہ ایسے شخص کو اُنھی راستوں میں بھٹکنے کی توفیق دے دیتا ہے جن میں وہ

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ
تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴿۲۸﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی
لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ هُمْ
یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوتِ حق کو مانا اور نیک عمل کیے، وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔

اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے[۴۸]، ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے، اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں[۴۹]۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے،

خود بھٹکنا چاہتا ہے۔ وہی سارے اسباب جو کسی ہدایت طلب انسان کے لیے سببِ ہدایت بنتے ہیں، ایک ضلالت طلب انسان کے لیے سببِ ضلالت بنا دیے جاتے ہیں۔ شمعِ روشن بھی اس کے سامنے آتی ہے تو راستہ دکھانے کے بجائے اس کی آنکھیں خیرہ ہی کرنے کا کام دیتی ہے۔ یہی مطلب ہے اللہ کے کسی شخص کو گمراہ کرنے کا۔

نشانی کے مطالبے کا یہ جواب اپنی بلاغت میں بے نظیر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی نشانی دکھاؤ تو ہمیں تمھاری صداقت کا یقین آئے۔ جواب میں کہا گیا کہ نادانو! تمھیں راہِ راست نہ ملنے کا اصل سبب نشانیوں کا فقدان نہیں ہے بلکہ تمھاری اپنی ہدایت طلبی کا فقدان ہے۔ نشانیاں تو ہر طرف بے حد و حساب پھیلی ہوئی ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی تمھارے لیے نشانِ راہ نہیں بنتی، کیونکہ تم خدا کے راستے پر جانے کے خواہش مند ہی نہیں ہو۔ اب اگر کوئی اور نشانی آئے تو وہ تمھارے لیے کیسے مفید ہو سکتی ہے؟ تم شکایت کرتے ہو کہ کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی، مگر جو خدا کی راہ کے طالب ہیں، انھیں نشانیاں نظر آ رہی ہیں اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کر راہِ راست پا رہے ہیں۔

۴۵ – یعنی کسی ایسی نشانی کے بغیر جس کا یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ
الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ
الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ

اُسی پر میں نے بھروسا کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔

اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اُتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین شق ہو جاتی، یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟[۴۷] (اس طرح کی نشانیاں دِکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[۴۸] پھر کیا اہلِ ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو

۴۶ — یعنی اُس کی بندگی سے منہ موڑے ہوئے ہیں، اس کی صفات اور اختیارات اور حُقوق میں دوسروں کو اُس کا شریک بنا رہے ہیں، اور اُس کی نعمتوں کے شکریے دوسروں کو ادا کر رہے ہیں۔

۴۷ — اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفار کی طرف سے بار بار نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش! اِن لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اِس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورت کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں یکایک دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمھیں اِن سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبیؐ کی پاکیزہ زندگی میں، صحابۂ کرامؓ کے انقلابِ حیات میں نورِ حق نظر نہ آیا، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پالیں گے؟

۴۸ — یعنی نشانیوں کے نہ دکھانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دکھانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان طریقوں سے کام لینا اللہ کی مَصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اصل مقصود تو ہدایت ہے نہ کہ ایک نبی کی نبوت کو منوا لینا، اور ہدایت اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کی فکر و بصیرت کی اصلاح ہو۔

لِيَهْدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ
بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ
وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ ع وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ
بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ قف
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا
كَسَبَتْ ۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ

ع ۵ / ۱۰

سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا[۴۹]؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویّہ اختیار کر رکھا ہے، اُن پر ان کے کرتُوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے، یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پُورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ع تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے، مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخرِ کار ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔

پھر کیا وہ جو ایک ایک مُتنفّس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے[۵۰] (اس کے مقابلے میں یہ جسارتیں کی جا رہی ہیں کہ[۵۱]) لوگوں نے اُس کے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں؟ اَے نبیؐ! اِن سے کہو: (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) ذرا اُن کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو

۴۹ – یعنی اگر سمجھ بُوجھ کے بغیر محض ایک غیر شعوری ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے نشانیاں دکھانے کے تکلّف کی کیا حاجت تھی۔ یہ کام تو اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ سارے انسانوں کو مومن ہی پیدا کر دیتا۔

۵۰ – یعنی جو ایک ایک شخص کے حال سے فرداً فرداً واقف ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی نیک آدمی کی نیکی چھپی ہوئی ہے نہ کسی بد کی بدی۔

۵۱ – جسارتیں یہ کہ اس کے ہمسر اور مدِّمقابل تجویز کیے جا رہے ہیں، اس کی ذات اور صفات اور حُقوق میں اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا

جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟[۵۲] حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، ان کے لیے اُن کی مکاریاں[۵۳] خوشنما بنادی گئی ہیں اور وہ راہِ راست سے روک دیے گئے ہیں،[۵۴] پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اُسے کوئی

مخلوق کو شریک کیا جا رہا ہے، اور اس کی خدائی میں رہ کر لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ چاہیں کریں، ہم سے کوئی بازپُرس کرنے والا نہیں۔

۵۲ – یعنی اس کے شریک جو تم نے تجویز کر رکھے ہیں، اُن کے معاملے میں تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک یہ کہ تمھارے پاس کوئی مستند اطلاع آئی ہو کہ اللہ نے فلاں فُلاں ہستیوں کو اپنی صفات، یا اختیارات، یا حقوق میں شریک قرار دیا ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو ذرا براہِ کرم ہمیں بھی بتاؤ کہ وہ کون کون اصحاب ہیں، اور اُن کے شریکِ خدا مقرر کیے جانے کی اطلاع آپ حضرات کو کس ذریعے سے پہنچی ہے۔

دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اللہ کو خود خبر نہیں ہے کہ زمین میں کچھ حضرات اُس کے شریک بن گئے ہیں اور اب آپ اس کو یہ اطلاع دینے چلے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو صفائی کے ساتھ اپنی اس پوزیشن کا اقرار کرو۔ پھر ہم بھی دیکھ لیں گے کہ دنیا میں کتنے ایسے احمق نکلتے ہیں جو تمھارے اس سراسر لغو مسلک کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔

لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو پھر تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم بغیر کسی سند اور بغیر کسی دلیل کے یونہی جس کو چاہتے ہو، خدا کا رشتہ دار ٹھیرا لیتے ہو جس کو چاہتے ہو داتا اور فریادرس کہہ دیتے ہو، اور جس کے متعلق چاہتے ہو دعویٰ کر دیتے ہو کہ فُلاں علاقے کے سلطان فلاں صاحب ہیں اور فلاں کام فلاں حضرت کی تائید وامداد سے بر آتے ہیں۔

۵۳ – اس شرک کو مکّاری کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ دراصل جن اَجرامِ فلکی یا فرشتوں یا ارواح یا بزرگ انسانوں کو خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دیا گیا ہے، اور جن کو خدا کے مخصوص حُقوق میں شریک بنا لیا گیا ہے، ان میں سے کسی نے بھی کبھی نہ ان صفات و اختیارات کا دعویٰ کیا، نہ ان حقوق کا مطالبہ کیا، اور نہ لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ تم ہمارے آگے پرستش کے مراسم ادا کرو، ہم تمہارے کام بنایا کریں گے۔ یہ تو چالاک انسانوں کا کام ہے کہ انھوں نے عوام پر اپنی خدائی کا سکہ جمانے کے لیے اور ان کی کمائیوں میں حصہ بٹانے کے لیے کچھ بناوٹی خدا تصنیف کیے، لوگوں کو اُن کا معتقد بنایا، اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی طور پر ان کا نمائندہ ٹھیرا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ
الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا
دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ
النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ

راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب اُس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو انھیں خدا سے بچانے والا ہو۔ خدا ترس انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال۔ یہ انجام ہے متقی لوگوں کا۔ اور منکرینِ حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔

اے نبیؐ! جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اِس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے۔ تم صاف کہہ دو کہ

دوسری وجہ شرک کو مکر سے تعبیر کرنے کی یہ ہے کہ دراصل یہ ایک فریبِ نفس ہے اور ایک چور دروازہ ہے، جس کے ذریعے سے انسان دنیا پرستی کے لیے، اخلاقی بندشوں سے بچنے کے لیے اور غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کے لیے راہِ فرار نکالتا ہے۔

تیسری وجہ جس کی بنا پر مشرکین کے طرزِ عمل کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے، آگے آتی ہے۔

۵۴ – یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان ایک چیز کے مقابلے میں دوسری چیز کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنی راست روی کا یقین دلانے کے لیے اپنی اختیار کردہ چیز کو ہر طریقے سے اِستدلال کر کے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنی رد کردہ چیز کے خلاف ہر طرح کی باتیں چھانٹنی شروع کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر

Maktaba Tul Ishaat.com

اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا
جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ
اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ
وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ

"مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رُجوع ہے[55]۔" اِسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمانِ عَرَبی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اِس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آچکا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمھارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔ ع

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور اُن کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔[56] اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اِذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔[57] ہر دَور کے لیے

فرمایا گیا ہے کہ جب انھوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا تو قانونِ فطرت کے مطابق ان کے لیے اُن کی گمراہی، اور اُس گمراہی پر قائم رہنے کے لیے اُن کی مکّاری خوشنما بنا دی گئی، اور اسی فطری قانون کے مطابق یہ راہِ راست پر آنے سے روک دیے گئے۔

۵۵ - یہ ایک خاص بات کا جواب ہے جو اُس وقت مخالفین کی طرف سے کہی جا رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ صاحب واقعی وہی تعلیم لے کر آئے ہیں جو پچھلے انبیاؑ لائے تھے، جیسا کہ اِن کا دعویٰ ہے، تو آخر کیا بات ہے کہ یہود و نصاریٰ، جو پچھلے انبیاؑ کے پیرو ہیں، آگے بڑھ کر اِن کا استقبال نہیں کرتے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اُن میں سے بعض لوگ اِس پر خوش ہیں اور بعض ناراض، مگر اے نبیؐ! خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض، تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو خدا کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور میں بہرحال اسی کی پیروی کروں گا۔

۵۶ - یہ ایک اور اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی اور بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

۵۷ - یہ بھی ایک اعتراض کا جواب ہے۔ مخالفین کہتے تھے کہ موسیٰؑ ید بیضا اور عصا لائے تھے۔ مسیحؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ صالحؑ نے اُونٹنی کا نشان دکھایا تھا۔ تم کیا نشانی لے کر آئے ہو؟ اس کا جواب یہ

كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ
الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي
الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ

ایک کتاب ہے۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے، اُمُّ الکتاب اسی کے پاس ہے۔[۵۸]

اور اے نبیؐ! جس بُرے انجام کی دھمکی ہم اِن لوگوں کو دے رہے ہیں، اُس کا کوئی حصّہ خواہ ہم تمھارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمھیں اُٹھا لیں، بہرحال تمھارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے، اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔[۵۹] کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اِس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں؟[۶۰] اللہ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے والا نہیں ہے،

دیا گیا ہے کہ جس نبی نے جو چیز بھی دکھائی ہے، اپنے اختیار اور اپنی طاقت سے نہیں دکھائی ہے۔ اللہ نے جس وقت جس کے ذریعے سے جو کچھ ظاہر کرنا مناسب سمجھا، وہ ظہور میں آیا۔ اب اگر اللہ کی مصلحت ہوگی تو جو کچھ وہ چاہے گا دکھائے گا۔ پیغمبر خود کسی خدائی اختیار کا مدعی نہیں ہے کہ تم اس سے نشانی دکھانے کا مطالبہ کرتے ہو۔

۵۸ - یہ بھی مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پہلے آئی ہوئی کتابیں جب موجود تھیں تو اس نئی کتاب کی کیا ضرورت تھی؟ تم کہتے ہو کہ اُن میں تحریف ہوگئی ہے، اب وہ منسوخ ہیں اور اس نئی کتاب کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر خدا کی کتاب میں تحریف کیسے ہوسکتی ہے؟ خدا نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ اور کوئی خدائی کتاب منسوخ کیسے ہوسکتی ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ اُسی خدا کی کتاب ہے جس نے تورات وانجیل نازل کی تھیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ تمھارا طریقہ تورات کے بعض احکام کے خلاف ہے؟ مثلاً بعض چیزیں جنھیں تورات والے حرام کہتے ہیں، تم انھیں حلال سمجھ کر کھاتے ہو۔ ان اعتراضات کے جوابات بعد کی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ یہاں ان کا صرف ایک مختصر جامع جواب دے کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

"اُمُّ الکِتٰب" کے معنی ہیں "اصل کتاب"، یعنی وہ منبع و سرچشمہ جس سے تمام کُتُبِ آسمانی نکلی ہیں۔

۵۹ - مطلب یہ ہے کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمھاری اِس دعوتِ حق کو جھٹلا دیا ہے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب وہ ظہور میں آتا ہے۔ تمھارے سُپرد جو کام کیا گیا ہے، اُسے پوری یکسوئی کے ساتھ کیے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل بات اُن مخالفین کو سنانی مقصود ہے جو چیلنج کے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ
الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّرُ
لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ
مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۙ
وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾ ع

ع ۶ ۱۲

اور اُسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اِن سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں[61]، مگر اصل فیصلہ کُن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے، اور عنقریب یہ منکرینِ حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے۔

یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو: ''میرے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر ہر اُس شخص کی گواہی جو کتابِ آسمانی کا علم رکھتا ہے[62]۔'' ع

انداز میں بار بار حضورؐ سے کہتے تھے کہ ہماری جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی۔

۶۰ – یعنی کیا تمھارے مخالفین کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ اسلام کا اثر سرزمینِ عرب کے گوشے گوشے میں پھیلتا جا رہا ہے اور چاروں طرف سے اِن پر حلقہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے؟ یہ اِن کی شامت کے آثار نہیں ہیں تو کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''ہم اس سرزمین پر چلے آ رہے ہیں'' ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے۔ چونکہ دعوتِ حق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ اس کے پیش کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے کسی سرزمین میں اس دعوت کے پھیلنے کو اللہ تعالیٰ یوں تعبیر فرماتا ہے کہ ہم خود اس سرزمین میں بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

۶۱ – یعنی آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ حق کی آواز کو دبانے کے لیے جھوٹ اور فریب اور ظلم کے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پچھلی تاریخ میں بارہا ایسی ہی چالوں سے دعوتِ حق کو شکست دینے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

۶۲ – یعنی ہر وہ شخص جو واقعی آسمانی کتابوں کے علم سے بہرہ ور ہے، اس بات کی شہادت دے گا کہ جو کچھ مَیں پیش کر رہا ہوں وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ لے کر آئے تھے۔

تفہیم القرآن

ابراہیم

(۱۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

ابراہیم

نام آیت ۳۵ کے فقرے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے، بلکہ یہ بھی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول عام اندازِ بیان مکے کے آخری دَور کی سورتوں کا سا ہے۔ سورۂ رَعد سے قریب زمانے ہی کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ خُصوصاً آیت ۱۳ کے الفاظ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا توتمھیں ہماری مِلّت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال دیں گے) کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ اُس وقت مکے میں مسلمانوں پر ظلم وستم انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اہلِ مکہ پچھلی کافر قوموں کی طرح اپنے ہاں کے اہلِ ایمان کو خارج البلد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو وہ دھمکی سنائی گئی جو اُن کے سے رَویّے پر چلنے والی پچھلی قوموں کو دی گئی تھی کہ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (ہم ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے) اور اہلِ ایمان کو وہی تسلی دی گئی جو ان کے پیش رووں کو دی جاتی رہی ہے کہ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (ہم ان ظالموں کو ختم کرنے کے بعد تم ہی کو اس سرزمین میں آباد کریں گے)۔

اسی طرح آخری رُکوع کے تیور بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ کے آخری دَور سے تعلق رکھتی ہے۔

مرکزی مضمون اور مُدّعا جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے اور آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بدتر سے بدتر چالیں چل رہے تھے، ان کو فہمایش اور تنبیہ۔ لیکن فہمایش کی بہ نسبت اس سورہ میں تنبیہ اور ملامت اور زَجر و توبیخ کا انداز زیادہ تیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفہیم کا حق اس سے پہلے کی سورتوں میں بخوبی ادا کیا جا چکا تھا اور اس کے باوجود کفارِ قریش کی ہٹ دھرمی، عناد، مزاحمت، شرارت اور ظلم وجَور میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

---

۵۲ اٰیاتھا

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ

رکوعاتھا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ ①
اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

ا۔ ل۔ ر۔ اے محمدؐ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمھاری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے، اُس خدا کے راستے[۱] پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود[۲] ہے اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے۔

۱ - یعنی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے کا مطلب شیطانی راستوں سے ہٹا کر خدا کے راستے پر لانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر وہ شخص جو خدا کی راہ پر نہیں ہے، وہ دراصل جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی روشن خیال سمجھ رہا ہو اور اپنے زعم میں کتنا ہی نورِ علم سے منور ہو۔ بخلاف اس کے جس نے خدا کا راستہ پا لیا وہ علم کی روشنی میں آ گیا، چاہے وہ ایک ان پڑھ دیہاتی ہی کیوں نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تم اِن کو اپنے رب کے اِذن یا اُس کی توفیق سے خدا کے راستے پر لاؤ، تو اس میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلّغ، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، راہِ راست پیش کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس راستے پر لے آنا اُس کے بس میں نہیں ہے۔ اِس کا انحصار سراسر اللہ کی توفیق اور اُس کے اِذن پر ہے۔ اللہ کسی کو توفیق دے تو وہ ہدایت پا سکتا ہے، ورنہ پیغمبر جیسا کامل مبلغ اپنا پورا زور لگا کر بھی اس کو ہدایت نہیں بخش سکتا۔ رہی اللہ کی توفیق، تو اس کا قانون بالکل الگ ہے، جسے قرآن میں مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اُسی کو ملتی ہے جو خود ہدایت کا طالب ہو، ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصب سے پاک ہو، اپنے نفس کا بندہ اور اپنی خواہشات کا غلام نہ ہو، کھلی آنکھوں سے دیکھے، کھلے کانوں سے سُنے، صاف دماغ سے سوچے سمجھے، اور معقول بات کو بے لاگ طریقے سے مانے۔

۲ - "حمید" کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے، مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے۔ محمود کسی شخص کو اُسی وقت کہیں گے جب کہ اس کی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔ مگر حمید آپ سے حمد کا مستحق ہے، خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ

اور سخت تباہ کُن سزا ہے قبولِ حق سے انکار کرنے والوں کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں[۳]، جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے[۴]۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے، تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے[۵]۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا

نہ کرے۔ اس لفظ کا پورا مفہوم ستودہ صفات، سزاوارِ حمد اور مستحقِ تعریف جیسے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ''اپنی ذات میں آپ محمود'' کیا ہے۔

۳- یا بالفاظِ دیگر، جنھیں ساری فکر بس دنیا کی ہے، آخرت کی پروا نہیں ہے۔ جو دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آسایشوں کی خاطر آخرت کا نقصان تو مول لے سکتے ہیں، مگر آخرت کی کامیابیوں اور خوش حالیوں کے لیے دنیا کا کوئی نقصان، کوئی تکلیف اور کوئی خطرہ، بلکہ کسی لذّت سے محرومی تک برداشت نہیں کر سکتے۔ جنھوں نے دنیا اور آخرت دونوں کا موازنہ کر کے ٹھنڈے دل سے دنیا کو پسند کر لیا ہے، اور آخرت کے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں اُس کا مفاد دنیا کے مفاد سے ٹکرائے گا، وہاں اُسے قربان کرتے چلے جائیں گے۔

۴- یعنی وہ اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین اُن کی مرضی کا تابع ہو کر رہے۔ اُن کے ہر خیال، ہر نظریے اور ہر وہم و گمان کو اپنے عقائد میں داخل کرے اور کسی ایسے عقیدے کو اپنے نظامِ فکر میں نہ رہنے دے جو اُن کی کھوپڑی میں نہ سماتا ہو۔ اُن کی ہر رسم، ہر عادت اور ہر خصلت کو سندِ جواز دے اور کسی ایسے طریقے کی پیروی کا اُن سے مطالبہ نہ کرے جو انھیں پسند نہ ہو۔ وہ اِن کا ہاتھ بندھا غلام ہو کہ جدھر جدھر یہ اپنے شیطانِ نفس کے اتباع میں مڑیں اُدھر وہ بھی مُڑ جائے، اور کہیں نہ تو وہ انھیں ٹوکے اور نہ کسی مقام پر انھیں اپنے راستے کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔ وہ اللہ کی بات صرف اُسی صورت میں مان سکتے ہیں جب کہ وہ اِس طرح کا دین

مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڏ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے[۶]، وہ بالا دست اور حکیم[۷] ہے۔

ہم اِس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں۔ اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انھیں تاریخِ[۸] الٰہی کے سبق آموز واقعات سُنا کر نصیحت کر۔ اِن واقعات میں

ان کے لیے بھیجے۔

۵ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی جس قوم میں بھیجا، اُس پر اُسی قوم کی زبان میں اپنا کلام نازل کیا، تاکہ وہ قوم اسے اچھی طرح سمجھے، اور اسے یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ آپ کی بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آتی تھی پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض معجزہ دکھانے کی خاطر کبھی یہ نہیں کیا کہ رسول تو بھیجے عرب میں، اور وہ کلام سنائے چینی یا جاپانی زبان میں۔ اس طرح کے کرشمے دکھانے اور لوگوں کی عجائب پسندی کو آسودہ کرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تعلیم و تلقین اور تفہیم و تبیین کی اہمیت زیادہ رہی ہے، جس کے لیے ضروری تھا کہ ایک قوم کو اسی زبان میں پیغام پہنچایا جائے جسے وہ سمجھتی ہو۔

۶ – یعنی باوجود اِس کے کہ پیغمبر ساری تبلیغ و تلقین اُسی زبان میں کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے، پھر بھی سب کو ہدایت نصیب نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ کسی کلام کے محض عام فہم ہونے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ سب سننے والے اسے مان جائیں۔ ہدایت اور ضلالت کا سر رشتہ بہرحال اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے اپنے اِس کلام کے ذریعے سے ہدایت عطا کرتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے اسی کلام کو اُلٹی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے۔

۷ – یعنی لوگوں کا بطورِ خود ہدایت پا لینا یا بھٹک جانا تو اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ وہ کاملاً خود مختار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی بالا دستی سے مغلوب ہیں۔ لیکن اللہ اپنی اس بالا دستی کو اندھا دُھند استعمال نہیں کرتا کہ یونہی بغیر کسی معقول وجہ کے جسے چاہے ہدایت بخش دے اور جسے چاہے خواہ مخواہ بھٹکا دے۔ وہ بالا دست ہونے کے ساتھ حکیم و دانا بھی ہے۔ اُس کے ہاں سے جس کو ہدایت ملتی ہے معقول وجوہ سے ملتی ہے، اور جس کو راہِ راست سے محروم کر کے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ خود اپنی ضلالت پسندی کی وجہ سے اس سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔

۸ – ''ایّام'' کا لفظ عَرَبی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لیے بولا جاتا ہے۔ ''ایام اللہ'' سے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۵﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ
اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ
نِسَآءَكُمْ ۭ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۶﴾ ع وَ اِذْ تَاَذَّنَ
رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ

ع ۱۳

بڑی نشانیاں ہیں[9] ہر اُس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو[10]۔

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، تمھارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمایش تھی۔ ع اور یاد رکھو، تمھارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ ”اگر شکر گزار بنو گے[11] تو میں تم کو اَور زیادہ نوازوں گا اور اگر کُفرانِ نعمت

مراد تاریخِ انسانی کے وہ اہم ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ زمانے کی قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کو اُن کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا سزا دی ہے۔

۹- یعنی ان تاریخی واقعات میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے ایک آدمی توحیدِ خداوندی کے برحق ہونے کا ثبوت بھی پا سکتا ہے اور اس حقیقت کی بھی بے شمار شہادتیں فراہم کر سکتا ہے کہ مُکافات کا قانون ایک عالمگیر قانون ہے، اور وہ سراسر حق اور باطل کے علمی و اخلاقی امتیاز پر قائم ہے، اور اُس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک دوسرا عالَم، یعنی عالمِ آخرت ناگزیر ہے۔ نیز ان واقعات میں وہ نشانیاں بھی موجود ہیں جن سے ایک آدمی باطل عقائد و نظریّات پر زندگی کی عمارت اُٹھانے کے بُرے نتائج معلوم کر سکتا ہے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

۱۰- یعنی یہ نشانیاں تو اپنی جگہ موجود ہیں مگر ان سے فائدہ اُٹھانا صرف اُنھی لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی آزمایشوں سے صبر اور پامردی کے ساتھ گزرنے والے، اور اللہ کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر کے اُن کا صحیح شکریہ ادا کرنے والے ہوں۔ چھچھورے اور کم ظرف اور احسان ناشناس لوگ اگر اِن نشانیوں کا اِدراک کر بھی لیں تو ان کی یہ اخلاقی کمزوریاں اُنھیں اِس ادراک سے فائدہ اُٹھانے نہیں دیتیں۔

اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ

کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔[12] اور موسیٰؑ نے کہا کہ "اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے

۱۱- یعنی اگر ہماری نعمتوں کا حق پہچان کر ان کا صحیح استعمال کرو گے، اور ہمارے احکام کے مقابلے میں سرکشی و اِستکبار نہ برتو گے، اور ہمارا احسان مان کر ہمارے مطیع فرمان بنے رہو گے۔

۱۲- اس مضمون کی تقریر بائبل کی کتاب اِستثنا میں بڑی شرح و بَسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں۔ پھر توارت کے اُن تمام احکام کو دُہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے۔ پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں، جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنے رب کی فرماں برداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے، اور اگر نافرمانی کی رَوِش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی۔ یہ خطبہ کتاب ِ اِستثنا کے ابواب ۴-۶-۸-۱۰-۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں پھیلا ہُوا ہے اور اس کے بعض بعض مَقامات کمال درجے مؤثّر و عبرت انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اُس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کا اندازہ ہوسکتا ہے:

"سُن اَے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تُو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کے ساتھ مَحبّت رکھ۔ اور یہ باتیں جن کا حکم آج مَیں تجھے دیتا ہوں تیرے دل پر نقش رہیں۔ اور تُو اِن کو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا اور گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے اِن کا ذکر کیا کرنا۔" (باب ۶، آیات ۴-۷)

"پس اے اسرائیل! خداوند تیرا خدا تجھ سے اِس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کا خوف مانے اور اُس کی سب راہوں پر چلے اور اُس سے مَحبّت رکھے اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آئین مَیں تجھ کو آج بتاتا ہوں اُن پر عمل کرے تاکہ تیری خیر ہو۔ دیکھ، آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے۔" (باب ۱۰، آیات ۱۲-۱۴)

"اور اگر تُو خداوند اپنے خدا کی بات کو جاں فشانی سے مان کر اُس کے اِن سب حکموں پر جو آج کے دن مَیں تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا۔ اور اگر تُو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو مِلیں گی۔ شہر میں بھی تُو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک...... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے رُوبرو شکست دلائے گا...... خداوند تیرے انبار خانوں میں اور سب

Maktaba Tul Ishaat.com

فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٨﴾

بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"[13]

کاموں میں، جن میں تُو ہاتھ ڈالے، برکت کا حکم دے گا...... تجھ کو اپنی پاک قوم بنا کر قائم رکھے گا اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تُو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی...... تُو بہت سی قوموں کو قرض دے گا پر خود قرض نہیں لے گا اور خداوند تجھ کو دُم نہیں بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تُو پست نہیں بلکہ سرفراز ہی رہے گا"۔ (باب ۲۸، آیات ۱-۱۳)

"لیکن اگر تُو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سُن کر اُس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن مَیں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تُو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی...... خداوند اُن سب کاموں میں جن کو تُو ہاتھ لگائے، لعنت اور اضطراب اور پھٹکار کو تجھ پر نازل کرے گا...... وبا تجھ سے لپٹی رہے گی...... آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی...... خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تُو اُن کے مقابلے کے لیے تو ایک ہی راستے سے جائے گا مگر اُن کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا...... عورت سے منگنی تو تُو کرے گا لیکن دوسرا اُس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بنائے گا پر اُس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا پر اُس کا پھل استعمال نہ کرے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائے گا...... بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تُو اپنے اُن دشمنوں کی خدمت کرے گا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جُوا رکھے رہے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے...... خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کرے گا"۔ (باب ۲۸، آیات ۱۵-۶۴)

۱۳- اس جگہ حضرت موسیٰؑ اور اُن کی قوم کے معاملے کی طرف یہ مختصر اشارہ کرنے سے مقصود اہلِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ اللہ جب کسی قوم پر احسان کرتا ہے اور جواب میں وہ قوم نمک حرامی اور سرکشی دکھاتی ہے تو پھر ایسی قوم کو وہ عبرت ناک انجام دیکھنا پڑتا ہے جو تمھاری آنکھوں کے سامنے بنی اسرائیل دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا تم بھی خدا کی نعمت اور اس کے احسان کا جواب کفرانِ نعمت سے دے کر یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جس نعمت کی قدر کرنے کا یہاں قریش سے مطالبہ فرما رہا ہے وہ خُصوصیّت کے ساتھ اُس کی یہ نعمت ہے کہ اُس نے محمدِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے درمیان پیدا کیا اور آپؐ کے ذریعے سے اُن کے پاس وہ عظیم الشان تعلیم بھیجی جس کے متعلق حضورؐ بار بار قریش سے فرمایا کرتے تھے کہ کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ؕ وَ ع
الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ لَا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا اللّٰہُ ؕ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ
بِالۡبَیِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاہِہِمۡ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا کَفَرۡنَا بِمَاۤ
اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ وَ اِنَّا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ ﴿۹﴾ قَالَتۡ الثلثۃ

کیا تمھیں[14] اُن قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوحؑ ، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ اُن کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کُھلی کُھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انھوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے[15] اور کہا کہ ”جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اُس کی طرف سے ہم سخت خَلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں[16]۔“ اُن کے رسولوں نے

بھا العرب وتدین لکم بھا العجم ”میری ایک بات مان لو، عرب اور عجم سب تمھارے تابع ہو جائیں گے۔“

۱۴- حضرت موسیٰؑ کی تقریر اُوپر ختم ہوگئی۔ اب براہِ راست کفّارِ مکہ سے خطاب شروع ہوتا ہے۔

۱۵- ان الفاظ کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف پیش آیا ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف معنیٰ بیان کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک اِن کا قریب ترین مفہوم وہ ہے جسے ادا کرنے کے لیے ہم اُردو میں کہتے ہیں: کانوں پر ہاتھ رکھے، یا دانتوں میں اُنگلی دبائی۔ اس لیے کہ بعد کا فقرہ صاف طور پر انکار اور اچنبھے، دونوں مضامین پر مشتمل ہے اور کچھ اس میں غصّے کا انداز بھی ہے۔

۱۶- یعنی ایسا شک جس کی وجہ سے اطمینان رخصت ہوگیا ہے۔ یہ دعوتِ حق کا خاصّہ ہے کہ جب وہ اُٹھتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کھلبلی ضرور مچ جاتی ہے اور انکار و مخالفت کرنے والے بھی پورے اطمینان کے ساتھ نہ اس کا انکار کرسکتے ہیں نہ اُس کی مخالفت۔ وہ چاہے کتنی ہی شدّت کے ساتھ اُسے ردّ کریں اور کتنا ہی زور اُس کی مخالفت میں لگائیں، دعوت کی سچائی، اس کی معقول دلیلیں، اُس کی کھری کھری اور بے لاگ باتیں، اُس کی دل موہ لینے والی زبان، اس کے داعی کی بے داغ سیرت، اُس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں کا صریح انقلاب، اور اپنے صدقِ مقال کے عین مطابق اُن کے پاکیزہ اعمال، یہ ساری چیزیں مل جُل کر کٹّے سے کٹّے مخالف کے دل میں بھی ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ داعیانِ حق

Maktaba Tul Ishaat.com

رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ

کہا: ”کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟[17] وہ تمھیں بُلا رہا ہے تاکہ تمھارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدّتِ مقرر تک مُہلت دے۔“[18] اُنھوں نے جواب دیا: ”تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔[19] تم ہمیں اُن ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند۔“[20] ان کے رُسولوں نے ان سے کہا:

کو بے چین کرنے والا خود بھی چین سے محروم ہو جاتا ہے۔

۱۷- رسولوں نے یہ بات اس لیے کہی کہ ہر زمانے کے مشرکین خدا کی ہستی کو مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق وہی ہے۔ اسی بنیاد پر رسولوں نے فرمایا کہ آخر تمھیں شک کس چیز میں ہے؟ ہم جس چیز کی طرف تمھیں دعوت دیتے ہیں، وہ اِس کے سوا اور کیا ہے کہ اللہ فاطر السماوات والارض تمھاری بندگی کا حقیقی مستحق ہے۔ پھر کیا اللہ کے بارے میں تم کو شک ہے؟

۱۸- مدّتِ مقرر سے مراد افراد کی موت کا وقت بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بھی۔ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے، ان کے اُٹھنے اور گرنے کے لیے اللہ کے ہاں مدت کا تعیُّن اُن کے اوصاف کی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ ایک اچھی قوم اگر اپنے اندر بگاڑ پیدا کر لے تو اس کی مُہلتِ عمل گھٹا دی جاتی ہے اور اسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک بگڑی ہوئی قوم اگر اپنے بُرے اوصاف کو اچھے اوصاف سے بدل لے تو اس کی مُہلتِ عمل بڑھا دی جاتی ہے، حتّٰی کہ وہ قیامت تک بھی دراز ہو سکتی ہے۔ اسی مضمون کی طرف سورۂ رعد کی آیت ۱۱ اِشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اوصاف کو نہ بدل دے۔

۱۹- اُن کا مطلب یہ تھا کہ تم ہر حیثیت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھاتے ہو، پیتے ہو، سوتے ہو، بیوی بچے رکھتے ہو، بھوک، پیاس، بیماری، دُکھ، سردی، گرمی، ہر چیز کے احساس میں اور ہر بشری کمزوری میں ہمارے مشابہ ہو۔ تمھارے اندر کوئی غیر معمولی پن ہمیں نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہ مان لیں کہ تم کوئی پہنچے ہوئے لوگ ہو اور خدا تم سے

إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا
نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ
اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ ع وَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ

”واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے[21]۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمھیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آ سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسا کرنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسا کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو اُن پر ہم صبر کریں گے، اور بھروسا کرنے والوں کا بھروسا اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔“ ع

آخرِ کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ”یا تو تمھیں ہماری ملّت میں واپس آنا ہو گا[22] ورنہ ہم تمھیں

ہم کلام ہوتا ہے اور فرشتے تمھارے پاس آتے ہیں۔

۲۰ – یعنی کوئی ایسی سند جسے ہم آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے چھوئیں اور جس سے ہم کو یقین آ جائے کہ واقعی خدا نے تم کو بھیجا ہے اور یہ پیغام جو تم لائے ہو، خدا ہی کا پیغام ہے۔

۲۱ – یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی، مگر اللہ نے تمھارے درمیان ہم کو ہی علمِ حق اور بصیرتِ کاملہ عطا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو جو کچھ چاہے دے۔ ہم نہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے وہ تمھارے پاس بھجوا دیں، اور نہ یہی کر سکتے ہیں کہ جو حقیقتیں ہم پر منکشف ہوئی ہیں اُن سے آنکھیں بند کر لیں۔

۲۲ – اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیا علیہم السلام منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنی گمراہ قوموں

Maktaba Tul Ishaat.com

مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ
لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ
خَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾ وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ
وَّرَآىٕهٖ جَهَنَّمُ وَ یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ یَّتَجَرَّعُهٗ وَ

اپنے ملک سے نکال دیں گے۔“ تب اُن کے رب نے اُن پر وحی بھیجی کہ ”ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور اُن کے بعد تمھیں زمین میں آباد کریں گے۔[۲۳] یہ انعام ہے اُس کا جو میرے حضور جواب دِہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔“ اُنھوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں اُن کا فیصلہ ہُوا) اور ہر جبّار دشمنِ حق نے منہ کی کھائی۔[۲۴] پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنّم ہے۔ وہاں اُسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا، جسے وہ زبردستی حلق سے اُتارنے کی کوشش کرے گا اور

کی مِلّت میں شامل ہُوا کرتے تھے، بلکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ نبوت سے پہلے چونکہ وہ ایک طرح کی خاموش زندگی بسر کرتے تھے، کسی دین کی تبلیغ اور کسی رائج الوقت دین کی تردید نہیں کرتے تھے، اس لیے اُن کی قوم یہ سمجھتی تھی کہ وہ ہماری ہی مِلّت میں ہیں، اور نبوت کا کام شروع کر دینے کے بعد اُن پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ مِلّتِ آبائی سے نکل گئے ہیں۔ حالانکہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی مشرکین کی مِلّت میں شامل نہ ہوئے تھے کہ اس سے خُروج کا الزام اُن پر لگ سکتا۔

۲۳ – یعنی گھبراؤ نہیں، یہ کہتے ہیں کہ تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے، مگر ہم کہتے ہیں کہ اب یہ اِس سرزمین میں نہ رہنے پائیں گے۔ اب تو جو تمھیں مانے گا، وہی یہاں رہے گا۔

۲۴ – ملحوظِ خاطر رہے کہ یہاں اِس تاریخی بیان کے پیرایے میں دراصل کفّارِ مکّہ کو اُن باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔ ذکر بظاہر پچھلے انبیاؑ اور ان کی قوموں کے واقعات کا ہے، مگر چسپاں ہو رہا ہے وہ اُن حالات پر جو اس سورہ کے زمانۂ نزول میں پیش آ رہے تھے۔ اس مقام پر کفارِ مکہ کو، بلکہ مشرکینِ عرب کو گویا صاف صاف مُتنبّہ کر دیا گیا کہ تمھارا مستقبل اب اُس رَوِیّے پر منحصر ہے جو دعوتِ محمدیہ کے مقابلے میں تم اختیار کرو گے۔ اگر اسے قُبول کر لو گے تو عرب کی سرزمین میں رہ سکو گے، اور اگر اسے ردّ کر دو گے تو یہاں سے تمھارا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ چنانچہ اس بات کو تاریخی واقعات نے ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا۔ اس پیشین گوئی پر پورے پندرہ برس بھی نہ گزرے تھے کہ سرزمینِ عرب میں ایک مشرک بھی باقی نہ رہا۔

لَا يَكَادُ يُسِيغُهٗ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلٰى شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيدُ ﴿۱۸﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنْ يَّشَأْ

مشکل ہی سے اُتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا۔

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے، ان کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے[۲۵]۔ یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے[۲۶]؟ وہ چاہے تو

---

۲۵ – یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ نمک حرامی، بے وفائی، خود مختاری اور نافرمانی و سرکشی کی روش اختیار کی، اور اطاعت و بندگی کا وہ طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، اُن کا پورا کارنامۂ حیات اور زندگی بھر کا سارا سرمایۂ عمل آخرِ کار ایسا لاحاصل اور بے معنٰی ثابت ہوگا جیسے ایک راکھ کا ڈھیر تھا جو اکٹھا ہو ہو کر مدّتِ دراز میں بڑا بھاری ٹیلا سا بن گیا تھا، مگر صرف ایک ہی دن کی آندھی نے اس کو ایسا اُڑایا کہ اُس کا ایک ایک ذرّہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ اُن کی نظر فریب تہذیب، اُن کا شاندار تمدُّن، اُن کی حیرت انگیز صنعتیں، اُن کی زبردست سلطنتیں، اُن کی عالی شان یونیورسٹیاں، اُن کے عُلوم و فُنون اور ادبِ لطیف و کثیف کے اتھاہ ذخیرے، حتّٰی کہ اُن کی عبادتیں اور اُن کی ظاہری نیکیاں اور اُن کے بڑے بڑے خیراتی اور رفاہی کارنامے بھی، جن پر وہ دنیا میں فخر کرتے ہیں، سب کے سب آخرِ کار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے جسے یومِ قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی، اور عالمِ آخرت میں اُس کا ایک ذرّہ بھی اُن کے پاس اس لائق نہ رہے گا کہ اُسے خدا کی میزان میں رکھ کر کچھ بھی وزن پا سکیں۔

۲۶ – یہ دلیل ہے اُس دعوے کی جو اُوپر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سُن کر تمھیں تعجب کیوں ہوتا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ زمین و آسمان کا عظیم الشان کارخانہ تخلیقِ حق پر قائم ہُوا ہے نہ کہ باطل پر؟ یہاں جو چیز حقیقت اور

Maktaba Tul Ishaat.com

يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٩﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿٢٠﴾

تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمھاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔[۲۷]

واقعیت پر مبنی نہ ہو، بلکہ محض ایک بے اصل قیاس و گمان پر جس کی بنا رکھ دی گئی ہو، اُسے کوئی پائداری نصیب نہیں ہوسکتی۔ اُس کے لیے قرار و ثبات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اُس کے اعتماد پر کام کرنے والا کبھی اپنے اعتماد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جو شخص پانی پر نقش بنائے اور ریت پر قصر تعمیر کرے وہ اگر یہ اُمید رکھتا ہے کہ اس کا نقش باقی رہے گا اور اُس کا قصر کھڑا رہے گا، تو اس کی یہ اُمید کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پانی کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ نقش قبول کرے اور ریت کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ عمارتوں کے لیے مضبوط بنیاد بن سکے۔ لہٰذا سچّائی اور حقیقت کو نظر انداز کر کے جو شخص باطل اُمیدوں پر اپنے عمل کی بنیاد رکھے، اُسے ناکام ہونا ہی چاہیے۔ یہ بات اگر تمھاری سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ سُن کر تمھیں حیرت کس لیے ہوتی ہے کہ خدا کی اِس کائنات میں جو شخص اپنے آپ کو خدا کی بندگی و اطاعت سے آزاد فرض کر کے کام کرے گا، یا خدا کے سوا کسی اَور کی خدائی مان کر (جس کی فی الواقع خدائی نہیں ہے) زندگی بسر کرے گا، اس کا پورا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا؟ جب واقعہ یہ نہیں ہے کہ انسان یہاں خود مختار ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا بندہ ہو، تو اِس جھوٹ پر، اِس خلافِ واقعہ مفروضے پر، اپنے پورے نظامِ فکر و عمل کی بنیاد رکھنے والا انسان تمھاری رائے میں پانی پر نقش کھینچنے والے احمق کا سا انجام نہ دیکھے گا تو اس کے لیے اور کس انجام کی تم توقع رکھتے ہو؟

۲۷ - دعوے پر دلیل پیش کرنے کے بعد فوراً ہی یہ فقرہ نصیحت کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اس میں ایک شُبہے کا ازالہ بھی ہے، جو اُوپر کی دوٹوک بات سُن کر آدمی کے دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ ایک شخص پوچھ سکتا ہے کہ اگر بات وہی ہے جو ان آیتوں میں فرمائی گئی ہے تو یہاں ہر باطل پرست اور غلط کار آدمی فنا کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ اُسے فنا کر دینا اللہ کے لیے کچھ دشوار ہے؟ یا اللہ سے اس کا کوئی رشتہ ہے کہ اس کی شرارتوں کے باوجود اللہ نے محض اقربا پروری کی بنا پر اُسے مجبوراً چھوٹ دے رکھی ہو؟ اگر یہ بات نہیں ہے، اور تو خود جانتا ہے کہ نہیں ہے، تو پھر تجھے سمجھنا چاہیے کہ ایک باطل پرست اور غلط کار قوم ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہے کہ اسے ہٹا دیا جائے اور کسی دوسری قوم کو اس کی جگہ کام کرنے کا موقع دے دیا جائے۔ اس خطرے کے عملاً رونما ہونے میں اگر دیر لگ رہی ہے تو اِس غلط فہمی کے نشے میں مست نہ ہو جا کہ خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مہلت کے ایک ایک لمحے کو غنیمت جان اور اپنے باطل نظامِ فکر و عمل کی ناپائداری کو محسوس کر کے اسے جلدی سے جلدی پائدار بنیادوں پر قائم کر لے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا
لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ
قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ
ع ۱۵ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾ ؑ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ
اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ

اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے[۲۸] تو اُس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ اُن لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے: ”دنیا میں ہم تمھارے تابع تھے، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟“ وہ جواب دیں گے: ”اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمھیں بھی دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں[۲۹] ؑ۔“

اور جب فیصلہ چُکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پُورا نہ کیا۔[۳۰] میرا تم پر کوئی

---

۲۸ – بروز کے معنی محض نکل کر سامنے آنے اور پیش ہونے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اس میں ظاہر ہونے اور کھل جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اِسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ”بے نقاب ہو کر سامنے آجانا“ کیا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے تو بندے ہر وقت اپنے رب کے سامنے بے نقاب ہیں، مگر آخرت کی پیشی کے دن جب وہ سب کے سب اللہ کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو انھیں خود بھی معلوم ہوگا کہ ہم اس احکم الحاکمین اور مالکِ یوم الدین کے سامنے بالکل بے نقاب ہیں، ہمارا کوئی کام بلکہ کوئی خیال اور دل کے گوشوں میں چھپا ہُوا کوئی ارادہ تک اس سے مخفی نہیں ہے۔

۲۹ – یہ تنبیہ ہے اُن سب لوگوں کے لیے جو دنیا میں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں، یا اپنی کمزوری کو حجت بنا کر طاقت ور ظالموں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ آج جو تمھارے لیڈر اور پیشوا اور افسر اور حاکم بنے ہوئے ہیں، کل اِن میں سے کوئی بھی تمھیں خدا کے عذاب سے ذرّہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔ لہٰذا آج ہی سوچ لو کہ تم جس کے پیچھے چل رہے ہو یا جس کا حکم مان رہے ہو، وہ خود کہاں جا رہا ہے اور تمھیں کہاں پہنچا کر چھوڑے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ

زور تو تھا نہیں، میں نے اِس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمھیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبّیک کہا۔[31] اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمھاری فریاد رسی کرسکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا[32] میں اس سے بَری الذّمہ

۳۰- یعنی تمھارے تمام گِلے شکوے اِس حد تک تو بالکل صحیح ہیں کہ اللہ سچّا تھا اور میں جھوٹا تھا۔ اِس واقعے سے مجھے ہرگز انکار نہیں ہے۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان میں سے ہر بات جُوں کی تُوں سچی نکلی۔ اور میں خود مانتا ہوں کہ جو بھروسے میں نے تمھیں دلائے، جن فائدوں کے لالچ تمھیں دیے، جن خوش نُما توقعات کے جال میں تم کو پھانسا، اور سب سے بڑھ کر یہ یقین جو تمھیں دلایا کہ اوّل تو آخرت واخرت کچھ بھی نہیں ہے، سب محض ڈھکوسلا ہے، اور اگر ہوئی بھی تو فُلاں حضرت کے تصدّق سے تم صاف بچ نکلو گے، بس اُن کی خدمت میں نذر و نیاز کی رشوت پیش کرتے رہو اور پھر جو چاہو کرتے پھرو، نجات کا ذمہ اُن کا، یہ ساری باتیں جو میں تم سے کہتا رہا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سے کہلواتا رہا، یہ سب محض دھوکا تھا۔

۳۱- یعنی اگر آپ حضرات ایسا کوئی ثبوت رکھتے ہوں کہ آپ خود راہِ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو غلط راستے پر کھینچ لیا، تو ضرور اُسے پیش فرمائیے، جو چور کی سزا سو میری۔ لیکن آپ خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ دعوتِ حق کے مقابلے میں اپنی دعوتِ باطل آپ کے سامنے پیش کی، سچّائی کے مقابلے میں جھوٹ کی طرف آپ کو بلایا، نیکی کے مقابلے میں بدی کی طرف آپ کو پکارا۔ ماننے اور نہ ماننے کے جملہ اختیارات آپ ہی حضرات کو حاصل تھے۔ میرے پاس آپ کو مجبُور کرنے کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اب اپنی اِس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں۔ مگر آپ نے جو اس پر لبیک کہا، اِس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کہاں ڈالنے چلے ہیں، اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہیے۔

۳۲- یہاں پھر شرکِ اعتقادی کے مقابلے میں شرک کی ایک مستقل نوع، یعنی شرکِ عملی کے وجود کا ایک ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی نہ خدائی میں شریک ٹھیراتا ہے اور نہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ سب اُس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں۔ البتہ اس کی اطاعت اور غلامی اور اُس کے طریقے کی اندھی یا آنکھوں دیکھے پیروی ضرور کی جا رہی ہے،

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ

ہوں، ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے۔“

بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے، اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارک باد سے[۳۳] ہوگا۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے

اور اُسی کو یہاں شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب جواب میں فرمائیں کہ یہ تو شیطان کا قول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اوّل تو اس کے قول کی اللہ تعالیٰ خود تردید فرما دیتا اگر وہ غلط ہوتا۔ دوسرے شرکِ عملی کا صرف یہی ایک ثبوت قرآن میں نہیں ہے، بلکہ اس کے متعدّد ثبوت پچھلی سورتوں میں گزر چکے ہیں اور آگے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے اَحبار اور رُہبان کو اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنائے ہوئے ہیں (التوبہ، آیت ۳۱)۔ جاہلیّت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے پیروؤں نے انھیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام، آیت ۱۳۷)۔ خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنے والوں کے متعلق یہ فرمانا کہ انھوں نے اپنی خواہشِ نفس کو خدا بنا لیا ہے (الفرقان، آیت ۴۳)۔ نافرمان بندوں کے متعلق یہ ارشاد کہ وہ شیطان کی عبادت کرتے رہے ہیں (یٰسین، آیت ۶۰)۔ انسانی ساخت کے قوانین پر چلنے والوں کو اِن الفاظ میں ملامت کہ اِذنِ خداوندی کے بغیر جن لوگوں نے تمھارے لیے شریعت بنائی ہے وہ تمھارے ”شریک“ ہیں (الشّوریٰ، آیت ۲۱)۔ یہ سب کیا اُسی شرکِ عملی کی نظیریں نہیں ہیں جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے؟ ان نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کوئی شخص عقیدتاً کسی غیر اللہ کو خدائی میں شریک ٹھیرائے۔ اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدائی سند کے بغیر، یا احکامِ خداوندی کے علی الرّغم، اُس کی پیروی اور اطاعت کرتا چلا جائے۔ ایسا پیرو اور مطیع اگر اپنے پیشوا اور مُطاع پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی عملاً یہ رَوِش اختیار کر رہا ہو تو قرآن کی رُو سے وہ اُس کو خدائی میں شریک بنائے ہوئے ہے، چاہے شرعاً اُس کا حکم بالکل وہی نہ ہو جو اعتقادی مشرکین کا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حاشیہ ۸۷ و ۱۰۷، الکہف، حاشیہ ۵۰)

۳۳- تَحِیَّۃ کے لُغوی معنی ہیں دعائے درازیِ عمر۔ مگر اصطلاحاً عَرَبی زبان میں یہ لفظ اس کلمۂ خیر مقدم یا کلمۂ استقبال کے لیے بولا جاتا ہے جو لوگ آمنا سامنا ہونے پر سب سے پہلے ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ اُردو میں اس کا ہم معنی لفظ

Maktaba Tul Ishaat.com

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي
السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِإِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ
الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ

کلمۂ طیّبہ[۳۴] کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں[۳۵]، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے[۳۶]۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔ اور کلمۂ خبیثہ[۳۷] کی مثال

یا تو ''سلام'' ہے، یا پھر علیک سلیک۔ لیکن پہلا لفظ استعمال کرنے سے ترجمہ ٹھیک نہیں ہوتا، اور دوسرا لفظ مُبتذل ہے، اس لیے ہم نے اس کا ترجمہ ''استقبال'' کیا ہے۔

تَحِیَّتُھُم کے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کے استقبال کا طریقہ یہ ہوگا، اور یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا اس طرح استقبال ہوگا۔ نیز سَلٰمٌ میں دعائے سلامتی کا مفہوم بھی ہے اور سلامتی کی مبارکباد کا بھی۔ ہم نے موقع کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ مفہوم اختیار کیا ہے جو ترجمے میں درج ہے۔

۳۴- کلمۂ طَیِّبہ کے لفظی معنیٰ تو ''پاکیزہ بات'' کے ہیں، مگر اِس سے مراد ہے وہ قولِ حق اور عقیدۂ صالحہ جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔ یہ قول اور عقیدہ قرآنِ مجید کی رُو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی کا اقرار، اور آخرت کا اقرار ہو، کیونکہ قرآن اِنھی اُمور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

۳۵- دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ زمین سے لے کر آسمان تک چونکہ سارا نظامِ کائنات اُسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اقرار ایک مومن اپنے کلمۂ طَیِّبہ میں کرتا ہے، اس لیے کسی گوشے میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکراتا، کسی شے کی بھی اصل اور جِبِلَّت اُس سے اِبا نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اُس سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسی لیے زمین اور اُس کا پورا نظام اُس سے تعاون کرتا ہے، اور آسمان اور اُس کا پورا عالَم اُس کا خیر مَقدَم کرتا ہے۔

۳۶- یعنی وہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کَلِمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اِسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے، اُس کو ہر آن اِس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامتی، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، روح میں لطافت، جسم میں طہارت و نظافت، برتاؤ میں خوش گواری، معاملات میں راست بازی، کلام میں صداقت شعاری، قول و قرار میں پختگی، معاشرت میں حُسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدُّن میں توازن، معیشت میں عدل و مُواسات، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خُلوص اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرتا ہے۔

كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۟اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اُس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔[۳۸]

وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کرلے تو کُندن بن جائے۔

۳۷ – یہ لفظ کلمۂ طیّبہ کی ضد ہے، جس کا اطلاق اگرچہ ہر خلافِ حقیقت اور مبنی بر غلط قول پر ہو سکتا ہے، مگر یہاں اس سے مراد ہر وہ باطل عقیدہ ہے جس کو انسان اپنے نظامِ زندگی کی بنیاد بنائے، عام اِس سے کہ وہ دہریّت ہو، اِلحاد و زندقہ ہو، شرک و بُت پرستی ہو، یا کوئی اور ایسا تخیّل جو انبیاؑ کے واسطے سے نہ آیا ہو۔

۳۸ – دوسرے الفاظ میں اِس کا مطلب یہ ہوا کہ عقیدۂ باطل چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے قانونِ فطرت کہیں بھی اُس سے مُوافقت نہیں کرتا۔ کائنات کا ہر ذرّہ اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تردید کرتی ہے۔ زمین میں اُس کا بیج بونے کی کوشش کی جائے تو ہر وقت وہ اُسے اُگلنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ آسمان کی طرف اس کی شاخیں بڑھنا چاہیں تو وہ انھیں نیچے دھکیلتا ہے۔ انسان کو اگر امتحان کی خاطر انتخاب کی آزادی اور عمل کی مُہلت نہ دی گئی ہوتی تو یہ بدذات درخت کہیں اُگنے ہی نہ پاتا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدم کو اپنے رُجحان کے مطابق کام کرنے کا موقع عطا کیا ہے، اس لیے جو نادان لوگ قانونِ فطرت سے لڑ بھڑ کر یہ درخت لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کے زور مارنے سے زمین اُسے تھوڑی بہت جگہ دے دیتی ہے، ہوا اور پانی سے کچھ نہ کچھ غذا بھی اِسے مل جاتی ہے، اور فضا بھی اِس کی شاخوں کو پھیلنے کے لیے بادِلِ ناخواستہ کچھ موقع دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے، کڑوے، کسیلے، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے، اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھٹکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

کلمۂ طیّبہ اور کلماتِ خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص بآسانی محسوس کر سکتا ہے جو دنیا کی مذہبی، اخلاقی، فکری اور تمدّنی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ وہ دیکھے گا کہ آغازِ تاریخ سے آج تک کلمۂ طیّبہ تو ایک ہی رہا ہے، مگر کلماتِ خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں۔ کلمۂ طیّبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جا سکا، مگر کلماتِ خبیثہ کی فہرست ہزاروں مُردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے، حتّٰی کہ اُن میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ آج تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں اُن کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اپنے زمانے میں جن کلمات کا بڑا زور شور رہا ہے، آج اُن کا ذکر کیا جائے تو لوگ حیران رہ جائیں کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے۔

پھر کلمۂ طیّبہ کو جب، جہاں، جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنایا، اُس کی خوشبو سے اُس کا ماحول معطّر ہو گیا اور اُس کی برکتوں سے صرف اُسی شخص یا قوم نے فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اُس کے گرد و پیش کی دنیا بھی اُن سے مالا مال ہو گئی۔ مگر کسی کلمۂ خبیثہ نے جہاں جس انفرادی یا اجتماعی زندگی میں بھی جڑ پکڑی، اُس کی سڑاند سے سارا ماحول متعفن ہو گیا، اور اُس کے کانٹوں کی چُبھن سے نہ اس کا ماننے والا امن میں رہا، نہ کوئی ایسا شخص جس کو اُس سے سابقہ پیش آیا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ ع

ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے[۳۹]، اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے[۴۰]۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔ ع

اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں تمثیل کے پیرایے میں اُسی مضمون کو سمجھایا گیا ہے جو اُوپر آیت ۱۸ میں یوں بیان ہُوا تھا کہ ”اپنے رب سے کفر کرنے والوں کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو۔“ اور یہی مضمون اِس سے پہلے سورۂ رعد، آیت ۱۷ میں ایک دوسرے انداز سے سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھاتوں کی تمثیل میں بیان ہو چکا ہے۔

۳۹– یعنی دنیا میں اُن کو اِس کلمے کی وجہ سے ایک پائدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظامِ فکر، اور ایک جامع نظریہ ملتا ہے، جو ہر عُقدے کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لیے شاہِ کلید کا حکم رکھتا ہے۔ سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی اُستواری نصیب ہوتی ہے، جسے زمانے کی گردشیں متزلزل نہیں کرسکتیں۔ زندگی کے ایسے ٹھوس اُصول ملتے ہیں جو ایک طرف اُن کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انھیں سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے اور تلوّن کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں۔ پھر جب وہ موت کی سرحد پار کرکے عالمِ آخرت کے حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی اور سراسیمگی و پریشانی اُن کو لاحق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہاں سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ وہ اُس عالم میں اِس طرح داخل ہوتے ہیں گویا اُس کی راہ و رسم سے پہلے ہی واقف تھے۔ وہاں کوئی مرحلہ ایسا پیش نہیں آتا جس کی اُنھیں پہلے خبر نہ دے دی گئی ہو اور جس کے لیے انھوں نے قبل از وقت تیاری نہ کر رکھی ہو۔ اس لیے وہاں ہر منزل سے وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ ان کا حال وہاں اُس کافر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے مرتے ہی اپنی توقعات کے سراسر خلاف ایک دوسری ہی صورتِ حال سے اچانک سابقہ پیش آتا ہے۔

۴۰– یعنی جو ظالم کلمۂ طیّبہ کو چھوڑ کر کسی کلمۂ خبیثہ کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور اُن کی مساعی کو پریشان کر دیتا ہے۔ وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پاسکتے۔ ان کا کوئی تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ
الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا
لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾
قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ
سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ﴿٣١﴾
اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً

تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اُسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور (اپنے ساتھ) اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا ـــــ یعنی جہنّم، جس میں وہ جُھلسے جائیں گے، اور وہ بدترین جائے قرار ہے ـــــ اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لیے تاکہ وہ انھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں۔ اِن سے کہو: اچھا مزے کر لو، آخرکار تمھیں پلٹ کر جانا دوزخ ہی میں ہے۔

اَے نبیؐ! میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے کُھلے اور چُھپے (راہِ خیر میں) خرچ کریں[۴۱]، قبل اِس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی[۴۲]۔

اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر

۴۱ - مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی رَوِش کفار کی رَوِش سے مختلف ہونی چاہیے۔ وہ تو کافرِ نعمت ہیں۔ انھیں شکرگزار ہونا چاہیے، اور اس شکرگزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ نماز قائم کریں اور خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کریں۔

۴۲ - یعنی نہ تو وہاں کچھ دے دلا کر ہی نجات خریدی جا سکے گی اور نہ کسی کی دوستی کام آئے گی کہ وہ تمھیں خدا کی پکڑ سے بچا لے۔

۴۳ - یعنی وہ اللہ جس کی نعمت کا کفران کیا جا رہا ہے، جس کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا جا رہا ہے، جس کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ
لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ ﴿۳۲﴾ وَ
سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ
النَّهَارَ ۚ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۧ ﴿۳۴﴾ وَاِذْ
قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ

ع ۱۴

اس کے ذریعے سے تمھاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمھارے لیے مسخّر کیا کہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلے، اور دریاؤں کو تمھارے لیے مسخّر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخّر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں، اور رات اور دن کو تمھارے لیے مسخّر کیا۔[۴۴] جس نے وہ سب کچھ تمھیں دیا جو تم نے[۴۵] مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔[۴۶] ؏

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ ”پروردگار! اِس[۴۷] شہر کو امن کا شہر بنا اور

زبردستی کے شریک ٹھیرائے جارہے ہیں، وہ وہی تو ہے جس کے یہ اور یہ احسانات ہیں۔

۴۴ - ”تمھارے لیے مسخر کیا“ کو عام طور پر لوگ غلطی سے ”تمھارے تابع کر دیا“ کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ حتّٰی کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ اِن آیات کی رُو سے تسخیرِ سماوات و ارض انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مسخّر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہوگئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کرسکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی اُن سے نہریں نہ نکالی جاسکتیں۔ سورج اور چاند اور روز و شب اگر ضابطوں میں کَسے ہوئے نہ ہوتے تو یہاں زندگی ہی ممکن نہ ہوتی، کجا کہ ایک پھلتا پھولتا انسانی تمدّن وجود میں آسکتا۔

۴۵ - یعنی تمھاری فطرت کی ہر مانگ پوری کی، تمھاری زندگی کے لیے جو جو کچھ مطلوب تھا مہیا کیا، تمھارے بقا اور ارتقا کے لیے جن جن وسائل کی ضرورت تھی سب فراہم کر دیے۔

اجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ
كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾ رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ

مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار! اِن بُتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے[۴۸] (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں، لہٰذا اُن میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تُو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔[۴۹] پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں

۴۶ – عام احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب اُن خاص احسانات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قریش پر کیے تھے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمھارے باپ ابراہیمؑ نے یہاں لا کر کن تمناؤں کے ساتھ تمھیں بسایا تھا، اُس کی دعاؤں کے جواب میں کیسے کیسے احسانات ہم نے تم پر کیے، اور اب تم اپنے باپ کی تمناؤں اور اپنے رب کے احسانات کا جواب کن گمراہیوں اور بداعمالیوں سے دے رہے ہو۔

۴۷ – یعنی مکّہ۔

۴۸ – یعنی خدا سے پھیر کر اپنا گرویدہ کیا ہے۔ یہ مجازی کلام ہے۔ بُت چونکہ بہتوں کی گمراہی کے سبب بنے ہیں، اس لیے گمراہ کرنے کے فعل کو ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

۴۹ – یہ حضرت ابراہیمؑ کی کمال درجے نرم دلی اور نوعِ انسانی کے حال پر ان کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ کسی حال میں بھی انسان کو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے، بلکہ آخر وقت تک عفو و درگزر کی التجا کرتے رہتے ہیں۔ رزق کے معاملے میں تو انھوں نے یہاں تک کہہ دینے میں دریغ نہ فرمایا کہ وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ، آیت ۱۲۶)۔ لیکن جہاں آخرت کی پکڑ کا سوال آیا، وہاں ان کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جو میرے طریقے کے خلاف چلے اُسے سزا دے ڈالیو، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اُن کے معاملے میں کیا عرض کروں، تو غَفُوْرٌ رَّحِیْم ہے۔ اور یہ کچھ اپنی ہی اولاد کے ساتھ اس سراپا رحم و شفقت انسان کا مخصوص رویّہ نہیں ہے، بلکہ جب فرشتے قومِ لوط جیسی بدکار قوم کو تباہ کرنے جا رہے تھے، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ بڑی محبّت کے انداز میں فرماتا ہے کہ ”ابراہیمؑ ہم سے جھگڑنے لگا“ (ھود، آیت ۷۴)۔ یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے رُودررُو عیسائیوں کی گمراہی ثابت کر دیتا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ”اگر حضور ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر معاف کر دیں تو آپ بالادست اور حکیم ہیں“ (المائدہ، آیت ۱۱۸)۔

Maktaba Tul Ishaat.com

غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ
تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ
فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ
عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾
رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا

اپنی اولاد کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تُو لوگوں کے دلوں کو اِن کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے،[۵۰] شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار! تُو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"[۵۱] ـــــ اور[۵۲] واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہُوا نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں ـــــ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے اِس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیے، حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دُعا سنتا ہے۔ اَے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اُٹھا جو یہ کام کریں)۔

---

۵۰ - یہ اُسی دُعا کی برکت ہے کہ پہلے سارا عرب مکہ کی طرف حج اور عُمرے کے لیے کھنچ کر آتا تھا، اور اب دنیا بھر کے لوگ کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی اُسی دُعا کی برکت ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کے پھل، غلّے اور دوسرے سامانِ رزق وہاں پہنچتے رہتے ہیں، حالانکہ اس وادیِ غیر ذی زرع میں جانوروں کے لیے چارا تک پیدا نہیں ہوتا۔

۵۱ - یعنی خدایا! جو کچھ مَیں زبان سے کہہ رہا ہوں وہ بھی تو سُن رہا ہے اور جو جذبات میرے دل میں چھپے ہوئے ہیں اُن سے بھی تُو واقف ہے۔

۵۲ - یہ جملۂ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے قول کی تصدیق میں فرمایا ہے۔

وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ
یَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ
الظّٰلِمُوْنَ ؕ۬ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ لا
مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ
هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ ؕ وَ اَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ
ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ
الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ لا

(ع ۱۸ in margin)

پروردگار! میری دُعا قبول کر۔ پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو[۵۳] اور سب ایمان لانے والوں کو اُس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔" ع

اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو اِنھیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اُٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اُوپر جمی ہیں[۵۴] اور دل اُڑے جاتے ہیں۔ اَے محمدؐ! اُس دن سے تم اِنھیں ڈراؤ جب کہ عذاب اِنھیں آلے گا۔ اُس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ "اَے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مُہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔" (مگر انھیں صاف جواب دے دیا جائے گا کہ) کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اِس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟

۵۳ – حضرت ابراہیمؑ نے اس دُعائے مغفرت میں اپنے باپ کو اُس وعدے کی بنا پر شریک کر لیا تھا جو اُنھوں نے وطن سے نکلتے وقت کیا تھا کہ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ (مریم، آیت ۴۷)۔ مگر بعد میں جب اُنھیں احساس ہُوا کہ وہ تو اللہ کا دشمن تھا تو انھوں نے اُس سے صاف تبرّی فرما دی۔ (التوبہ، آیت ۱۱۴)

۵۴ – یعنی قیامت کا جو ہولناک نظارہ اُن کے سامنے ہوگا اُس کو اِس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہوں گے گویا کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ
كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا
مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ
مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ
رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ
الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا، اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے اُن سے کیا سلوک کیا، اور اُن کی مثالیں دے دے کر ہم تمھیں سمجھا بھی چکے تھے۔ انھوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں، مگر اُن کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا، اگرچہ اُن کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ اُن سے ٹل جائیں[۵۵]۔

پس اَے نبیؐ! تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا[۵۶]۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔ ڈراؤ اِنھیں اُس دن سے جب کہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے جائیں گے[۵۷] اور سب کے سب اللہ واحد قہّار کے سامنے بے نقاب

ان کے دیدے پتھرا گئے ہیں، نہ پلک جھپکے گی، نہ نظر ہٹے گی۔

۵۵- یعنی تم یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ تمھاری پیش رو قوموں نے قوانینِ الٰہی کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچنے اور انبیاؑ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کیسی کیسی زبردست چالیں چلیں، اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اللہ کی ایک ہی چال سے وہ کس طرح مات کھا گئے۔ مگر پھر بھی تم حق کے خلاف چال بازیاں کرنے سے باز نہ آئے اور یہی سمجھتے رہے کہ تمھاری چالیں ضرور کامیاب ہوں گی۔

۵۶- اِس جملے میں کلام کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر دراصل سُنانا آپؐ کے مخالفین کو مقصود ہے۔ اُنھیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ نے پہلے بھی اپنے رسولوں سے جو وعدے کیے تھے وہ پورے کیے اور اُن کے مخالفین کو نیچا دکھایا، اور اب بھی جو وعدہ وہ اپنے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہا ہے اسے پورا کرے گا اور اُن لوگوں کو تہس نہس کر دے گا جو اُس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي
الْأَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾
لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

حاضر ہو جائیں گے۔ اُس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے، تارکول[۵۸] کے لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے اُن کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے۔ یہ اِس لیے ہوگا کہ اللہ ہر متنفّس کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا۔ اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

---

۵۷ – اس آیت سے اور قرآن کے دوسرے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں زمین و آسمان بالکل نیست و نابود نہیں ہو جائیں گے، بلکہ صرف موجودہ نظامِ طبیعی کو درہم برہم کر ڈالا جائے گا۔ اُس کے بعد نفخِ صُورِ اوّل اور نفخِ صُورِ آخر کے درمیان ایک خاص مدّت میں، جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، زمین اور آسمانوں کی موجودہ ہیئت بدل دی جائے گی اور ایک دوسرا نظامِ طبیعت، دوسرے قوانینِ فطرت کے ساتھ بنا دیا جائے گا۔ وہی عالمِ آخرت ہوگا۔ پھر نفخِ صورِ آخر کے ساتھ ہی تمام وہ انسان جو تخلیقِ آدم سے لے کر قیامت تک پیدا ہوئے تھے، از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ اِسی کا نام قرآن کی زبان میں حشر ہے، جس کے لُغوی معنی سمیٹنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ قرآن کے اشارات اور حدیث کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ حشر اِسی زمین پر برپا ہوگا، یہیں عدالت قائم ہوگی، یہیں میزان لگائی جائے گی، اور قضیۂ زمین بر سرِ زمین ہی چُکایا جائے گا۔ نیز یہ بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ ہماری وہ دوسری زندگی جس میں یہ معاملات پیش آئیں گے، محض روحانی نہیں ہوگی، بلکہ ٹھیک اُسی طرح جسم و روح کے ساتھ ہم زندہ کیے جائیں گے جس طرح آج زندہ ہیں، اور ہر شخص ٹھیک اُسی شخصیت کے ساتھ وہاں موجود ہوگا جسے لیے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہُوا تھا۔

۵۸ – بعض مترجمین و مفسرین نے قطِران کے معنی گندھک اور بعض نے پگھلے ہوئے تانبے کے بیان کیے ہیں، مگر درحقیقت عَرَبی میں قطِران کا لفظ زِفت، قیر، رال اور تارکول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع

ع ۱۹

یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے، اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ اُن کو اِس کے ذریعے سے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے، اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں۔

تفہیم القرآن

الحجر

(۱۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

الحجر

نام آیت ۸۰ کے فقرے کَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور اندازِ بیان سے صاف مُترشّح ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول سورۂ ابراہیم سے متّصل ہے۔ اس کے پَسِ منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں: ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتے ایک مُدت گزر چکی ہے اور مخاطَب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزاء، مزاحمت اور ظلم و ستم کی حد ہوگئی ہے، جس کے بعد اب تفہیم کا موقع کم اور تنبیہ و اِنذار کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و جُحُود اور مزاحمت کے پہاڑ توڑتے توڑتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپؐ پر طاری ہو رہی ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپؐ کو تسلی دے رہا ہے اور آپؐ کی ہمت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون یہی دو مضمون اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ اُن لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپؐ کا مذاق اُڑاتے اور آپؐ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے۔ اور تسلّی و ہمت افزائی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورہ تفہیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مُجرّد تنبیہ، یا خالص زَجر و توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور ملامتوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اور دوسری طرف قصۂ آدم و ابلیس سنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

آیاتہا ۹۹ رکوعاتہا ۶

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱

الجزء ۱۴ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲ ذَرْهُمْ

يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳ وَ مَاۤ

اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴ مَا تَسْبِقُ

ا-ل-ر۔ یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور قرآنِ مبین کی۔[۱]

بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنھوں نے آج (دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے، پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش! ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انھیں۔ کھائیں پییں، مزے کریں، اور بُھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی اُمید۔ عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اِس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے، اس کے لیے ایک خاص مُہلتِ عمل لکھی جا چکی تھی۔[۲] کوئی قوم

۱- یہ اس سورہ کی مختصر تعارفی تمہید ہے جس کے بعد فوراً ہی اصل موضوع پر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن کے لیے "مبین" کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہُوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اُس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔

۲- مطلب یہ ہے کہ کفر کرتے ہی فوراً تو ہم نے کبھی کسی قوم کو بھی نہیں پکڑ لیا ہے، پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب و استہزا کی جو روش انھوں نے اختیار کر رکھی ہے اُس پر چونکہ ابھی تک انھیں سزا نہیں دی گئی، اس لیے یہ نبی سرے سے نبی ہی نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے لیے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے اتنی مہلت دی جائے گی، اور اس حد تک اُس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مُہلت جب تک باقی رہتی ہے، اور ہماری مقرر کی ہوئی حد جس وقت تک آ نہیں جاتی، ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ (مہلتِ عمل کی تشریح کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ
عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا
مُّنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾

نہ اپنے وقتِ مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اُس کے بعد چھُوٹ سکتی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں: "اے وہ شخص جس پر ذکر[۳] نازل ہُوا ہے[۴]، تُو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تُو سچّا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟" ـــــــ ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اُتار دیا کرتے۔ وہ جب اُترتے ہیں تو حق کے ساتھ اُترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو مُہلت نہیں دی جاتی[۵]۔ رہا یہ ذکر، تو اِس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اِس کے نگہبان ہیں[۶]۔

مُلاحظہ ہو: سورۂ ابراہیم، حاشیہ ۱۸)

۳- "ذکر" کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلامِ الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے۔ پہلے جتنی کتابیں انبیاؑ پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی "ذکر" تھیں اور یہ قرآن بھی "ذکر" ہے۔ ذکر کے اصل معنی ہیں: "یاد دلانا"، "ہوشیار کرنا"، اور "نصیحت کرنا"۔

۴- یہ فقرہ وہ لوگ طنز کے طور پر کہتے تھے۔ اُن کو تو یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ یہ ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ نہ اِسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے۔ دراصل اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ "اے وہ شخص جس کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے"۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں سے کہی تھی کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ، "یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، ان کا دماغ دُرست نہیں ہے۔"

۵- یعنی فرشتے محض تماشا دکھانے کے لیے نہیں اُتارے جاتے کہ جب کسی قوم نے کہا بلاؤ فرشتوں کو، اور وہ فوراً آ حاضر ہوئے۔ نہ فرشتے اِس غرض کے لیے کبھی بھیجے جاتے ہیں کہ وہ آ کر لوگوں کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کریں اور پردۂ غیب کو چاک کر کے وہ سب کچھ دکھا دیں جس پر ایمان لانے کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ فرشتوں کو بھیجنے کا وقت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ
قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ

اے محمدؐ! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور اُنھوں نے اُس کا مذاق نہ اُڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اِسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اِس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اِس قُماش کے لوگوں کا یہی طریقہ

تو وہ آخری وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کا فیصلہ چُکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اُس وقت بس فیصلہ چُکایا جاتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ اب ایمان لاؤ تو چھوڑے دیتے ہیں۔ ایمان لانے کی جتنی مہلت بھی ہے، اسی وقت تک ہے جب تک کہ حقیقت بے نقاب نہیں ہو جاتی۔ اُس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد ایمان لانے کا کیا سوال۔

"حق کے ساتھ اُترتے ہیں" کا مطلب "حق لے کر اُترنا" ہے۔ یعنی وہ اس لیے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

۶ – یعنی یہ "ذکر" جس کے لانے والے کو تم مجنون کہہ رہے ہو، یہ ہمارا نازل کیا ہُوا ہے، اس نے خود نہیں گھڑا ہے۔ اس لیے یہ گالی اس کو نہیں، ہمیں دی گئی ہے۔ اور یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو کہ تم اِس "ذکر" کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ یہ براہِ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمھارے مٹائے مٹ سکے گا، نہ تمھارے دبائے دب سکے گا، نہ تمھارے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ تمھارے روکے اس کی دعوت رُک سکے گی، نہ اس میں تحریف اور ردّ و بدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکے گا۔

۷ – عام طور پر مترجمین و مفسرین نے نَسْلُكُهٗ کی ضمیر اِستہزا کی طرف، اور لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کی ضمیر ذکر کی طرف پھیری ہے، اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ہم اسی طرح اس استہزا کو مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اس ذکر پر ایمان نہیں لاتے۔" اگرچہ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک نحو کے اعتبار سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ضمیریں ذکر کی طرف پھیری جائیں۔
سلک کے معنیٰ عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانے، گزارنے اور پرونے کے ہیں، جیسے تاگے کو سوئی کے ناکے میں گزارنا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اُترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شتابا بن کر لگتا ہے اور ان کے اندر اِسے سُن کر ایسی آگ بھڑک اُٹھتی ہے گویا کہ ایک گرم سلاخ تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَوَّلِيْنَ ۞ ۱۳ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ
يَعْرُجُوْنَ ۞ ۱۴ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ
مَّسْحُوْرُوْنَ ۞ ۱۵ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا ع ۱۵
لِلنّٰظِرِيْنَ ۞ ۱۶ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۞ ۱۷ اِلَّا مَنِ

چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم اُن پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اُس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادُو کر دیا گیا ہے۔ ع

یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے[۸] بنائے، اُن کو دیکھنے والوں کے لیے مُزیّن[۹] کیا، اور ہر شیطانِ مرُدود سے ان کو محفوظ کر دیا[۱۰]۔ کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پا سکتا، اِلّا یہ کہ

---

۸ – بُرج عَرَبی زبان میں قَلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علمِ ہیئت میں ''بُرج'' کا لفظ اصطلاحاً اُن بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اِس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انھی بُروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لیے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالَمِ بالا کے وہ خِطّے ہیں جن میں سے ہر خِطّے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خِطّے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بَسیط میں غیر مرئی طور پر کھنچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خِطّے سے دوسرے خِطّے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہُوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ خِطّوں (fortified spheres) کے معنٰی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

۹ – یعنی ہر خِطّے میں کوئی نہ کوئی روشن سیارہ یا تارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اُٹھا۔ بالفاظِ دیگر، ہم نے اس ناپیدا کنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا، بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاریگری میں صرف ایک صانعِ اکبر کی صنعت اور ایک حکیمِ اجلّ کی حکمت ہی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ یہی مضمون ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے: اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ، آیت ۷) ''وہ خدا کہ جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی۔''

۱۰ – یعنی جس طرح زمین کی دوسری مخلوقات زمین کے خِطّے میں مقیّد ہیں، اُسی طرح شیاطینِ جن بھی اِسی خِطّے میں

اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ⑪

کچھ سُن گُن لے لے[11]۔ اور جب وہ سُن گُن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلۂ روشن اُس کا پیچھا کرتا ہے[12]۔

مقیّد ہیں، عالَمِ بالا تک اُن کی رسائی نہیں ہے۔ اِس سے دراصل لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو دُور کرنا مقصود ہے جس میں پہلے بھی عوام الناس مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذرّیت کے لیے ساری کائنات کُھلی پڑی ہے، جہاں تک وہ چاہیں پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن اِس کے جواب میں بتاتا ہے کہ شیاطین ایک خاص حد سے آگے نہیں جاسکتے، انھیں غیر محدود پرواز کی طاقت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔

۱۱– یعنی وہ شیاطین جو اپنے اولیا کو غیب کی خبریں لا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بہت سے کاہن، جوگی، عامل اور فقیر نما بہروپیے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں، اُن کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔ وہ کچھ سُن گُن لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کیونکہ اُن کی ساخت انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع اُن کے پلّے کچھ پڑتا نہیں ہے۔

۱۲– ”شِہابِ مبین“ کے لُغوی معنٰی ”شعلۂ روشن“ کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآنِ مجید میں اس کے لیے ”شِہابِ ثاقب“ کا لفظ استعمال ہُوا ہے، یعنی ”تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ“۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں، مثلاً کائناتی شعاعیں (cosmic rays)، یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہابِ ثاقب مراد ہوں جنھیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کے مُشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دُوربین سے دکھائی دینے والے شہابِ ثاقب جو فضائے بَسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خِطّے میں داخل ہوتے ہیں، اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے، اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکا کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہابِ ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ۱۹۴۶ء، جلد ۱۵، ص ۳۳۷–۳۳۹)۔ ہوسکتا ہے کہ یہی بارش عالمِ بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حُدود سے گزر کر فضائے بسیط میں ۱۰ کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات اُن کے لیے اس فضا کو بالکل ناقابلِ عُبور بنا دیتی ہوگی۔

اِس سے کچھ اُن ”محفوظ قلعوں“ کی نوعیت کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ
بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ

ہم نے زمین کو پھیلایا، اُس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اُگائی،[۱۳] اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے، تمھارے لیے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں

شفّاف ہے جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت بنی نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خِطّوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خِطّے کو دوسرے خطّوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انھی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہابِ ثاقب ۱۰ کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں، ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر ۱۱ فٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر $36\frac{1}{2}$ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے، جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس داں اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہُوا ہے۔ قیاس کیجیے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو اِن ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآنِ مجید نے ’’بروج‘‘ (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

۱۳- اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع میں تناسُل کی اِس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع مل جاتا تو چند سال کے اندر رُوئے زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کے لیے کوئی جگہ نہ رہتی۔ مگر یہ ایک حکیم اور قادرِ مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اِس زمین پر اُگ رہی ہیں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر رُک جاتی ہے۔ اِسی منظر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہر نوع کی جسامت، پھیلاؤ، اُٹھان اور نشوونما کی ایک حد مقرر ہے جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز نہیں کر سکتی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہر درخت، ہر پودے اور ہر بیل بُوٹے کے لیے جسم، قد، شکل، برگ و بار اور پیداوار کی ایک مقدار پورے ناپ تول اور حساب و شمار کے ساتھ

إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢١﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوهُ ۚ وَمَآ أَنتُمْ لَهُ بِخٰزِنِينَ ﴿٢٢﴾
وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِۦ وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا
الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَـْٔخِرِينَ ﴿٢٤﴾
وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ إِنَّهُۥ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ ع ۲

ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں۔[14]

بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اُس پانی سے تمھیں سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔

زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں۔[15] پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں اُن کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمھارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔[16]

مقرر کر رکھی ہے۔

۱۴- یہاں اس حقیقت پر مُتنبّہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام موجودات کے معاملے میں عام ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر نوع، ہر جنس، اور ہر قوت و طاقت کے لیے ایک حد مقرر ہے جس پر وہ ٹھیری ہوئی ہے، اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ اسی تقدیر اور کمال درجے کی حکیمانہ تقدیر ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک پورے نظام کائنات میں یہ توازُن، یہ اعتدال اور یہ تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ ہوتی، یا بہت سے خداؤں کی کاریگری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بے شمار مختلف اشیا اور قوتوں کے درمیان ایسا مکمل توازن و تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہ سکتا؟

۱۵- یعنی تمھارے بعد ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تمھیں جو کچھ بھی ملا ہُوا ہے محض عارضی استعمال کے لیے ملا ہوا ہے۔ آخرکار ہماری دی ہوئی ہر چیز کو یونہی چھوڑ کر تم خالی ہاتھ رخصت ہو جاؤ گے اور یہ سب چیزیں جوں کی توں ہمارے خزانے میں رہ جائیں گی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ ﴿۲۶﴾
وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾
فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا[17]، اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے[18]۔ پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ ”میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں[19] تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“

---

۱۶ – یعنی اُس کی حکمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ سب کو اکٹھا کرے، اور اس کا علم سب پر اس طرح حاوی ہے کہ کوئی متنفس اُس سے چھوٹ نہیں سکتا، بلکہ کسی اگلے پچھلے انسان کی خاک کا کوئی ذرہ بھی اُس سے گم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو شخص حیاتِ اُخروی کو مُستبعد سمجھتا ہے وہ خدا کی صفتِ حکمت سے بے خبر ہے، اور جو شخص حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ ”جب مرنے کے بعد ہماری خاک کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا تو ہم کیسے دوبارہ پیدا کیے جائیں گے“ وہ خدا کی صفتِ علم کو نہیں جانتا۔

۱۷ – یہاں قرآن اِس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حُدود میں نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دَور کے ڈارونیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اُس کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادّوں سے ہوئی ہے، جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ حَمَا عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بُو پیدا ہو چکی ہو، یا بالفاظِ دیگر، خمیر اُٹھ آیا ہو۔ مَسْنُوْن کے دو معنی ہیں: ایک معنی ہیں: متغیر، مُنتِن اور املس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی ہیں: مصوَّر اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اُس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اُٹھی ہوئی مٹی کا ایک پُتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔

۱۸ – سَموم گرم ہوا کو کہتے ہیں، اور نار کو سَموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اُن مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝۳۰ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ
مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۱ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۲
قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔[۲۰] رب نے پوچھا: ”اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟“ اُس نے کہا: ”میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اِس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے

کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ رحمٰن، حواشی ۱۴ تا ۱۶)

۱۹ – اِس سے معلوم ہُوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے، وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار، اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعے ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبُدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے، اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔

یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے، اس کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ وَاَنْزَلَ فِي الْاَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰى تَرْفَعُ الدَّآبَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَّلَدِهَا خَشْيَةَ اَنْ تُصِيْبَهٗ۔ (بخاری و مسلم) ”اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اُتارا۔ یہ اُسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کُھر اُٹھاتا ہے تاکہ اُسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اُسی حصۂ رحمت کا اثر ہے۔“ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے، اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کر جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا اُلوہیت کا کوئی جُز پا لینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ اُلوہیت اِس سے وراء الوراء ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پا سکے۔

۲۰ – تقابُل کے لیے سورۂ بقرہ رکوع ۴، سورۂ نساء رکوع ۱۸، سورۂ اعراف رکوع ۲ پیشِ نظر رہے۔ نیز

Maktaba Tul Ishaat.com

مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ
عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى
يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوۡمِ
الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ
فِى الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ
الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَىَّ مُسۡتَقِيۡمٌ ﴿۴۱﴾

گارے سے پیدا کیا ہے۔" رب نے فرمایا: "اچھا تو نکل جا یہاں سے، کیونکہ تُو مردود ہے، اور اب روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔[۲۱]" اُس نے عرض کیا: "میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس روز تک کے لیے مُہلت دے جب کہ سب انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔" فرمایا: "اچھا، تجھے مُہلت ہے اُس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔" وہ بولا: "میرے رب! جیسا تُو نے مجھے بہکایا اُسی طرح اب مَیں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا،[۲۲] سوائے تیرے اُن بندوں کے جنھیں تُو نے اِن میں سے خالص کر لیا ہو۔" فرمایا: "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔[۲۳]

ہمارے اُن حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو اِن مقامات پر لکھے گئے ہیں۔

۲۱ – یعنی قیامت تک تُو ملعون رہے گا، اس کے بعد جب روزِ جزا قائم ہوگا تو پھر تجھے تیری نافرمانیوں کی سزا دی جائے گی۔

۲۲ – یعنی جس طرح تُو نے اِس حقیر اور کم تر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا کہ تیرا حکم نہ مانوں، اسی طرح اب میں ان انسانوں کے لیے دنیا کو ایسا دلفریب بنا دوں گا کہ یہ سب اُس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔ بالفاظِ دیگر، ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں زمین کی زندگی اور اُس کی لذتوں اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسان کے لیے ایسا خوش نما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں اور آخرت کی باز پُرس کو بھول جائیں گے اور خود تجھے بھی یا تو فراموش کر دیں گے، یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾

بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف اُن بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں[۲۴]، اور ان سب کے لیے جہنّم کی وعید ہے[۲۵]۔''

۲۳- هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنٰی وہ ہیں جو ہم نے ترجمے میں بیان کیے ہیں، اور دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ ھٰذَا طَرِیْقٌ حَقٌّ عَلَیَّ اَنْ اُرَاعِیَہٗ، یعنی یہ بات دُرست ہے، میں بھی اس کا پابند رہوں گا۔

۲۴- اس فقرے کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے، اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں (یعنی عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو اُنھیں زبردستی نافرمان بنا دے، البتہ جو خود ہی بہکے ہوئے ہوں اور آپ ہی تیری پیروی کرنا چاہیں، اُنھیں تیری راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا، انھیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنٰی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، جو لوگ اِس راستے کو اختیار کرلیں گے اُن پر شیطان کا بس نہ چلے گا، اُنھیں اللہ اپنے لیے خالص فرما لے گا، اور شیطان خود بھی اقراری ہے کہ وہ اُس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہوکر اپنی فلاح وسعادت کی راہ گم کردیں گے وہ ابلیس کے ہتّے چڑھ جائیں گے، اور پھر جدھر جدھر وہ انھیں فریب دے کر لے جانا چاہے گا، وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دُور سے دُور تر نکلتے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنٰی کے لحاظ سے اِس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا: شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لیے اپنا طریقِ کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو اُن کے لیے خوش نُما بنا کر انھیں خدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شرط میں نے مانی، اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کردی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جارہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جارہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر اُنھیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے اُن بندوں کو مستثنٰی کیا جنھیں اللہ اپنے لیے خالص فرما لے۔ اس سے یہ غلط فہمی مُترشّح ہورہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یونہی جس کو چاہے گا خالص کرلے گا اور وہ شیطان کی دسترس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کردی کہ جو خود بہکا ہُوا ہوگا وہی تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظِ دیگر، جو بہکا ہُوا نہ ہوگا وہ تیری پیروی نہ کرے گا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہوگا جسے ہم خالص اپنا کرلیں گے۔

۲۵- اس جگہ یہ قصّہ جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاق وسباق کو

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۳
لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾

یہ جہنّم (جس کی وعید پیروانِ ابلیس کے لیے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے اُن میں سے ایک حصّہ مخصوص کر دیا گیا ہے[۲۶]۔ بخلاف اِس کے متّقی لوگ[۲۷] باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔

واضح طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ پہلے اور دوسرے رُکوع کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں آدمؑ و ابلیس کا یہ قصّہ بیان کرنے سے مقصود کفار کو اس حقیقت پر متنبّہ کرنا ہے کہ تم اپنے ازلی دشمن، شیطان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور اُس پستی میں گرے چلے جا رہے ہو جس میں وہ اپنے حسد کی بنا پر تمھیں گرانا چاہتا ہے۔ اِس کے برعکس یہ نبی تمھیں اُس کے پھندے سے نکال کر اُس بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے جو دراصل انسان ہونے کی حیثیت سے تمھارا فطری مقام ہے۔ لیکن تم عجیب احمق لوگ ہو کہ اپنے دشمن کو دوست، اور اپنے خیر خواہ کو دشمن سمجھ رہے ہو۔

اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اِسی قصّے سے اُن پر واضح کی گئی ہے کہ تمھارے لیے راہِ نجات صرف ایک ہے، اور وہ اللہ کی بندگی ہے۔ اِس راہ کو چھوڑ کر تم جس راہ پر بھی جاؤ گے، وہ شیطان کی راہ ہے جو سیدھی جہنّم کی طرف جاتی ہے۔

تیسری بات جو اس قصے کے ذریعے سے ان کو سمجھائی گئی ہے، یہ ہے کہ اپنی اس غلطی کے ذمّہ دار تم خود ہو۔ شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ظاہرِ حیاتِ دنیا سے تم کو دھوکا دے کر تمھیں بندگی کی راہ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سے دھوکا کھانا تمھارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمھارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔ (اس کی مزید توضیح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲ و حاشیہ ۳۱)

۲۶ – جہنّم کے یہ دروازے اُن گمراہیوں اور معصیتوں کے لحاظ سے ہیں جن پر چل کر آدمی اپنے لیے دوزخ کی راہ کھولتا ہے۔ مثلاً کوئی دہریّت کے راستے سے دوزخ کی طرف جاتا ہے، کوئی شرک کے راستے سے، کوئی نفاق کے راستے سے، کوئی نفس پرستی اور فسق و فُجور کے راستے سے، کوئی ظلم و ستم اور خلق آزاری کے راستے سے، کوئی تبلیغ ضلالت اور اقامتِ کفر کے راستے سے، اور کوئی اشاعتِ فحشاء و مُنکر کے راستے سے۔

۲۷ – یعنی وہ لوگ جو شیطان کی پیروی سے بچے رہے ہوں اور جنھوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے عبدیّت کی زندگی بسر کی ہو۔

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۴۷﴾
لَا یَمَسُّہُمۡ فِیۡہَا نَصَبٌ وَّمَا ہُمۡ مِّنۡہَا بِمُخۡرَجِیۡنَ ﴿۴۸﴾ نَبِّیٴۡ
عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِیۡ ہُوَ الۡعَذَابُ
الۡاَلِیۡمُ ﴿۵۰﴾ وَنَبِّئۡہُمۡ عَنۡ ضَیۡفِ اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۵۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ

وقف لازم

اُن کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں[28] گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انھیں نہ وہاں کسی مشقّت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔[29]

اَے نبیؐ! میرے بندوں کو خبر دے دو کہ مَیں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں۔ مگر اِس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔

اور اِنھیں ذرا ابراہیمؑ کے مہمانوں کا قصّہ سناؤ۔[30] جب وہ آئے اُس کے ہاں اور

۲۸ – یعنی نیک لوگوں کے درمیان آپس کی غلط فہمیوں کی بنا پر دنیا میں اگر کچھ کدورتیں پیدا ہوگئی ہوں گی تو جنّت میں داخل ہونے کے وقت وہ دُور ہو جائیں گی اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف کر دیے جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اعراف، حاشیہ ۳۲)

۲۹ – اِس کی تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ نے خبر دی ہے کہ یقال لاھل الجنۃ ان لکم ان تصحوا ولا تمرضوا ابدًا، وان لکم ان تعیشوا فلا تموتوا ابدا، وان لکم ان تشبّوا ولا تھرموا ابدًا، وان لکم ان تقیموا فلا تظعنوا ابدًا۔ یعنی ”اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے، کبھی بیمار نہ پڑو گے۔ اور اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی۔ اور اب تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی بڑھاپا تم پر نہ آئے گا۔ اور اب تم ہمیشہ مقیم رہو گے، کبھی کوچ کرنے کی تمھیں ضرورت نہ ہوگی۔“ اِس کی مزید تشریح اُن آیات و احادیث سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو اپنی معاش اور اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے کوئی محنت نہ کرنی پڑے گی، سب کچھ اسے بلاسعی و مشقّت ملے گا۔

۳۰ – یہاں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بعد متصلاً قومِ لوط کا قصّہ جس غرض کے لیے سنایا جا رہا ہے، اُس کو سمجھنے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا
نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِىۡ عَلٰٓى اَنۡ مَّسَّنِىَ الۡكِبَرُ
فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوۡا بَشَّرۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡقٰنِطِيۡنَ ﴿۵۵﴾
قَالَ وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا
خَطۡبُكُمۡ اَيُّهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمٍ

کہا: ”سلام ہو تم پر“، تو اُس نے کہا: ”ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔“[۳۱] انھوں نے جواب دیا: ”ڈرو نہیں، ہم تمھیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں۔“[۳۲] ابراہیمؑ نے کہا: ”کیا تم اِس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟“ انھوں نے جواب دیا: ”ہم تمھیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو۔“ ابراہیمؑ نے کہا ”اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہُوا کرتے ہیں۔“ پھر ابراہیمؑ نے پوچھا: ”اے فرستادگانِ الٰہی! وہ مہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟“[۳۳] وہ بولے: ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف

کے لیے اس سورت کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ آیات ۷-۸ میں کفارِ مکّہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ”اگر تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کر کیوں نہیں آتے؟“ اس کا مختصر جواب وہاں صرف اِس قدر دے کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ ”فرشتوں کو ہم یونہی نہیں اُتار دیا کرتے، انھیں تو ہم جب بھیجتے ہیں حق کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں۔“ اب اُس کا مفصل جواب یہاں اِن دونوں قصوں کے پیرایے میں دیا جا رہا ہے۔ یہاں انھیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک ”حق“ تو وہ ہے جسے لے کر فرشتے ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے، اور دوسرا حق وہ ہے جسے لے کر وہ قومِ لُوط پر پہنچے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تمھارے پاس اِن میں سے کون سا حق لے کر فرشتے آ سکتے ہیں۔ ابراہیمؑ والے حق کے لائق تو ظاہر ہے کہ تم نہیں ہو۔ اب کیا اس حق کے ساتھ فرشتوں کو بلوانا چاہتے ہو جسے لے کر وہ قومِ لوط کے ہاں نازل ہوئے تھے؟

۳۱ - تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ہود، رکوع ۷ مع حواشی۔

۳۲ - یعنی حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت، جیسا کہ سورۂ ہود میں بصراحت بیان ہُوا ہے۔

۳۳ - حضرت ابراہیمؑ کے اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا ہمیشہ غیر معمولی

مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِلَّا
امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ
بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ

بھیجے گئے ہیں۔[34] صرف لُوطؑ کے گھر والے مستثنیٰ ہیں، ان سب کو ہم بچالیں گے، سوائے اُس کی بیوی کے جس کے لیے (اللہ فرماتا ہے کہ) ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔''ع

پھر جب یہ فرستادے لُوطؑ کے ہاں پہنچے[35] تو اُس نے کہا: ''آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔''[36] انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کررہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمھارے پاس آئے ہیں، لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔[37] تم میں سے کوئی پلٹ کر

حالات ہی میں ہُوا کرتا ہے اور کوئی بڑی مہم ہی ہوتی ہے جس پر وہ بھیجے جاتے ہیں۔

۳۴- اشارے کا یہ اختصار صاف بتا رہا ہے کہ قومِ لُوط کے جرائم کا پیمانہ اس وقت اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے باخبر آدمی کے سامنے اس کا نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، بس ''ایک مجرم قوم'' کہہ دینا بالکل کافی تھا۔

۳۵- تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۰، وسورۂ ہود، رکوع ۷۔

۳۶- یہاں بات مختصر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے آنے سے حضرت لُوطؑ بہت گھبرائے اور سخت دل تنگ ہوئے اور اُن کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کہنے لگے کہ آج بڑا سخت وقت آیا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ جو قرآن کے بیان سے اشارتاً اور روایات سے صراحتاً معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ یہ فرشتے نہایت خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لُوطؑ کے ہاں پہنچے تھے، اور حضرت لُوطؑ اپنی قوم کی بدمعاشی سے واقف تھے، اس لیے آپ سخت پریشان ہوئے کہ آئے ہوئے مہمانوں کو واپس بھی نہیں کیا جا سکتا، اور انھیں اِن بدمعاشوں سے بچانا بھی مشکل ہے۔

۳۷- یعنی اس غرض سے اپنے گھر والوں کے پیچھے چلو کہ ان میں سے کوئی ٹھیرنے نہ پائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡكُمۡ اَحَدٌ وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ۞ وَقَضَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ
ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ۞ وَ
جَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ۞ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ

نہ دیکھے[۳۸]۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔" اور اُسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے اِن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

اِتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بے تاب ہو کر لوطؑ کے گھر چڑھ آئے[۳۹]۔ لوطؑ نے کہا: "بھائیو! یہ

۳۸- اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو جاؤ گے، جیسا کہ بائبل میں بیان ہُوا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غُل سُن کر تماشا دیکھنے کے لیے نہ ٹھیر جانا۔ یہ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے، اور نہ مجرم قوم کی ہلاکت پر آنسو بہانے کا۔ ایک لمحہ بھی اگر تم نے معذّب قوم کے علاقے میں دم لے لیا تو بعید نہیں کہ تمہیں بھی اس ہلاکت کی بارش سے کچھ گزند پہنچ جائے۔

۳۹- اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوب صورت مہمانوں کا آ جانا اِس بات کے لیے کافی تھا کہ اُس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم اُمنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ اُن کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عُنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اُٹھاتا، اور نہ اُن کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لُوطؑ جیسے مقدس انسان اور معلّمِ اَخلاق کے گھر پر بھی جب بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہو گا۔

تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں اُن کا ایک خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں، جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو گا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عَیلامی مسافر اُن کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستے میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ اپنا زادِ راہ تھا۔ کسی سے اُس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اُتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اُٹھا کر اُسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اُسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اس کے زین اور مالِ تجارت سمیت اُڑا دیا۔ اس نے شور مچایا، مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سُنی۔ بلکہ بستی کے لوگوں نے اُس کا رہا سہا مال بھی لُوٹ کر اُسے نکال باہر کیا۔

ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ؕ

میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رُسوا نہ کرو" وہ بولے: "کیا ہم بارہا تمھیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لُوطؑ نے عاجز ہو کر کہا: "اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں[۴۰]!"

ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لُوطؑ کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اپنے غلام اِلیعزر کو سدوم بھیجا۔ اِلیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ اِلیعزر نے اسے شرم دلائی کہ تم بے کس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سرِ بازار اِلیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے اُن کے شہر میں آیا اور کسی نے اُسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لُوطؑ کی بیٹی نے اُسے دیکھ لیا اور اس کے لیے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لُوطؑ اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور انھیں دھمکیاں دی گئیں کہ اِن حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔

اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تَلمُود کا مصنف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکے باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مرجاتا اور یہ اُس کے کپڑے اُتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرِ عام لُوٹ لیے جاتے اور اُن کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو اُنھوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ عَلانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لُوطؑ کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔ قرآنِ مجید میں اس پوری داستان کو سمیٹ کر صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (وہ پہلے سے بہت بُرے بُرے کام کر رہے تھے)، اور اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (تم مَردوں سے خواہشِ نفس پوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا بدکاریاں کرتے ہو؟)

۴۰- اس کی تشریح سورۂ ہود کے حاشیہ ۸۷ میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ کلمات ایک شریف آدمی کی زبان پر ایسے وقت میں آئے ہیں جب کہ وہ بالکل تنگ آ چکا تھا اور بدمعاش لوگ اس کی ساری فریاد و فُغاں سے بے پروا ہو کر اُس کے مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً
مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهَا

تیری جان کی قسم اے نبیؐ! اُس وقت اُن پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔

آخرِکار پَو پھٹتے ہی اُن کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور ہم نے اُس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹّی کے پتّھروں کی بارش برسا دی۔[۴۱]

اِس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو صاحبِ فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں

اِس موقع پر ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ سورۂ ہود میں واقعہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے، اُس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت لُوطؑ کو بدمعاشوں کے اِس حملے کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ وہ اُس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ چند مسافر لڑکے ہیں جو ان کے ہاں آ کر ٹھیرے ہیں۔ انھوں نے اپنے فرشتہ ہونے کی حقیقت اُس وقت کھولی جب بدمعاشوں کا ہجوم مہمانوں کی قیام گاہ پر پِل پڑا اور حضرت لُوطؑ نے تڑپ کر فرمایا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (کاش! مجھے تمھارے مقابلے کی طاقت حاصل ہوتی، یا میرا کوئی سہارا ہوتا جس سے میں حمایت حاصل کرتا)۔ اس کے بعد فرشتوں نے اُن سے کہا کہ اب تم اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور ہمیں اِن سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دو۔ واقعات کی اس ترتیب کو نگاہ میں رکھنے سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت لُوطؑ نے یہ الفاظ کس تنگ موقع پر عاجز آ کر فرمائے تھے۔ اِس سورہ میں چونکہ واقعات کو اُن کی ترتیبِ وقوع کے لحاظ سے نہیں بیان کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس خاص پہلو کو خاص طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے جسے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہی یہ قصّہ یہاں نقل کیا گیا ہے، اِس لیے ایک عام ناظر کو یہاں یہ غلط فہمی پیش آتی ہے کہ فرشتے ابتدا ہی میں اپنا تعارف حضرت لُوطؑ سے کرا چکے تھے اور اب اپنے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے ان کی یہ ساری فریاد و فغاں محض ایک ڈرامائی انداز کی تھی۔

۴۱ – یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہابِ ثاقب کی نوعیت کے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار (volcanic eruption) کی بدولت زمین سے نکل کر اُڑے ہوں اور پھر اُن پر بارش کی طرح برس گئے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سخت آندھی نے یہ پتھراؤ کیا ہو۔

لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۷﴾
وَاِنۡ كَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ لَظٰلِمِيۡنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ ‌ۘ وقف لازم
وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۷۹﴾ وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ ع ۱۹ ۵
الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۸۰﴾ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا
مُعۡرِضِيۡنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوۡا يَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا

یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزرگاہِ عام پر واقع ہے[۴۲]، اُس میں سامانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو صاحبِ ایمان ہیں۔

اور اَیکہ والے[۴۳] ظالم تھے، تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی اُن سے انتقام لیا، اور اِن دونوں قوموں کے اُجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں[۴۴]۔ ع

حِجر[۴۵] کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں، اپنی نشانیاں اُن کو دکھائیں مگر وہ سب کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے

۴۲ – یعنی حجاز سے شام، اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحرِ لوط (بُحیرۂ مُردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اِس درجے ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر رُوئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

۴۳ – یعنی حضرت شعیبؑ کی قوم کے لوگ۔ اس قوم کا نام بنی مدیان تھا۔ مَدیَن اُن کے مرکزی شہر کو بھی کہتے تھے اور اُن کے پورے علاقے کو بھی۔ رہا اَیکہ، تو یہ تبوک کا قدیم نام تھا۔ اس لفظ کے لُغوی معنیٰ گھنے جنگل کے ہیں۔ آج کل ایکہ ایک پہاڑی نالے کا نام ہے جو جبل اللَّوز سے وادیِ اَفَل میں آ کر گرتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الشُّعَراء، حاشیہ ۱۱۵)

۴۴ – مَدیَن اور اصحاب الایکہ کا علاقہ بھی حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔

۴۵ – یہ قومِ ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینے کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العُلا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہراہِ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابنِ بَطُوطہ حج کو جاتے

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ
الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا

اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخرِ کار ایک زبردست دھماکے نے اُن کو صبح ہوتے آ لیا اور اُن کی کمائی اُن کے کچھ کام نہ آئی[۴۶]۔

ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے، اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے محمدؐ! تم (اِن لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ[۴۷] درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمھارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے[۴۸]۔ ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی

ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”یہاں سُرخ رنگ کے پہاڑوں میں قومِ ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انھوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ اُن کے نقش و نگار اِس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ اِن مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔“ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۵۷)

۴۶ – یعنی اُن کے وہ سنگین مکانات جو اُنھوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر بنائے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔

۴۷ – یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلّی کے لیے فرمائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت بظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستے میں جن مشکلات اور مصائب سے تمھیں سابقہ پیش آ رہا ہے، اس سے گھبراؤ نہیں۔ یہ ایک عارضی کیفیت ہے، مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے۔ اِس لیے کہ زمین و آسمان کا یہ پورا نظامِ حق پر تعمیر ہُوا ہے نہ کہ باطل پر۔ کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ۔ لہٰذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لیے ہے نہ کہ باطل کے لیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ابراہیم، حواشی ۲۵-۲۶۔ ۳۵ تا ۳۹)

۴۸ – یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلُّط رکھتا ہے، کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اِس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے، جو کچھ اِن لوگوں کی اصلاح کے لیے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے، اور جن ہتھکنڈوں سے یہ تمھاری سعیِ اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں اُن کا بھی اسے علم ہے۔ لہٰذا تمھیں گھبرانے

مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

ہیں جو بار بار دُہرائی جانے کے لائق ہیں[۴۹]، اور تمھیں قرآنِ عظیم عطا کیا ہے[۵۰]۔ تم اُس متاعِ دنیا کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ اِن کے حال پر اپنا دل کُڑھاؤ[۵۱]۔ انھیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے)

اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چُکا دیا جائے گا۔

۴۹ – یعنی سورۂ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو دو سو آیتیں ہیں، یعنی البقرہ، آلِ عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور یونُس، یا انفال و توبہ۔ لیکن سَلَف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورۂ فاتحہ ہی مراد ہے۔ بلکہ امام بخاریؒ نے دو مرفوع رِوایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ سے مراد سورۂ فاتحہ بتائی ہے۔

۵۰ – یہ بات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلّی کے لیے فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب حضورؐ اور آپ کے ساتھی سب کے سب انتہائی خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ کارِ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضورؐ کی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور حضرت خدیجہؓ کا سرمایہ بھی دس بارہ سال کے عرصے میں خرچ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں سے بعض کم سِن نوجوان تھے جو گھروں سے نکال دیے گئے تھے، بعض صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے جن کے کاروبار مَعاشی مقاطعے کی مسلسل ضرب سے بالکل بیٹھ گئے تھے، اور بعض بیچارے پہلے ہی غلام یا مَوالی تھے جن کی کوئی مَعاشی حیثیت نہ تھی۔ اس پر مزید یہ ہے کہ حضورؐ سمیت تمام مسلمان مکّے اور اطراف و نواح کی بستیوں میں انتہائی مظلومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف سے مطعون تھے، ہر جگہ تذلیل و تحقیر اور تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور قلبی و روحانی تکلیفوں کے ساتھ جسمانی اذیّتوں سے بھی کوئی بچا ہُوا نہ تھا۔ دوسری طرف سردارانِ قریش دنیا کی نعمتوں سے مالا مال اور ہر طرح کی خوش حالیوں میں مگن تھے۔ ان حالات میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم شکستہ خاطر کیوں ہوتے ہو، تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ رشک کے لائق تمھاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے، نہ کہ اُن لوگوں کی مادّی دولت جو طرح طرح کے حرام طریقوں سے کما رہے ہیں اور طرح طرح کے حرام راستوں میں اس کمائی کو اُڑا رہے ہیں اور آخرکار بالکل مفلس و قلاش ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔

۵۱ – یعنی اُن کے اِس حال پر نہ کُڑھو کہ اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں، اپنی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں کو اپنی خوبیاں سمجھے بیٹھے ہیں، خود اُس راستے پر جا رہے ہیں اور اپنی ساری قوم کو اس پر لیے جا رہے ہیں جس کا یقینی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾
الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾
الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

کہہ دو کہ مَیں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں۔ یہ اُسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے اُن تفرِقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی جنھوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے[۵۲]۔ تو قسم ہے تیرے رب کی! ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

پس اَے نبیؐ! جس چیز کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمھاری طرف سے ہم اُن مذاق اُڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔

انجام ہلاکت ہے، اور جو شخص انھیں سلامتی کی راہ دکھا رہا ہے، اُس کی سعیِ اصلاح کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیے ڈالتے ہیں۔

۵۲ – اس گروہ سے مراد یہود ہیں۔ ان کو مُقْتَسِمِیْن اس معنیٰ میں فرمایا گیا ہے کہ انھوں نے دین کو تقسیم کر ڈالا، اس کی بعض باتوں کو مانا اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی و بیشی کر کے بیسیوں فرقے بنا لیے۔ ان کے ''قرآن'' سے مراد توراۃ ہے، جو ان کو اُسی طرح دی گئی تھی جس طرح اُمتِ محمدیہ کو قرآن دیا گیا ہے۔ اور اس ''قرآن'' کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے سے مراد وہی فعل ہے جسے سورۂ بقرہ، آیت ۸۵ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب اللہ کی بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو؟) پھر یہ جو فرمایا کہ یہ تنبیہ جو آج تم کو کی جا رہی ہے یہ ویسی ہی تنبیہ ہے جیسی تم سے پہلے یہود کو کی جا چکی ہے، تو اس سے مقصود دراصل یہود کے حال سے عبرت دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے غفلت برت کر جو انجام دیکھا ہے، وہ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب سوچ لو، کیا تم بھی یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ یَضِیۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ۙ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ كُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿ۙ۹۸﴾ وَ اعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰی یَاۡتِیَكَ الۡیَقِیۡنُ ﴿۹۹﴾ ع۶

ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمھارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ، اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔[۵۳] ع

۵۳ - یعنی تبلیغِ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمھیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگیِ رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمھیں تسلّی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمھارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمّتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اُس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمھارے رب کی رضا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

النَّحل

(١٦)

النَّحل

نام آیت ۶۸ کے فقرے وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی محض علامت ہے نہ کہ موضوعِ بحث کا عنوان۔

زمانۂ نزول متعدد اندرونی شہادتوں سے اس کے زمانۂ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

آیت ۴۱ کے فقرے وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہجرتِ حبشہ واقع ہو چکی تھی۔

آیت ۱۰۶ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ الآیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ظلم و ستم پوری شدت کے ساتھ ہو رہا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ناقابلِ برداشت اذیت سے مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

آیات ۱۱۲-۱۱۴ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً .... اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے بعد مکّے میں جو زبردست قحط رُونما ہُوا تھا، وہ اِس سورہ کے نُزول کے وقت ختم ہو چکا تھا۔

اِس سورہ میں آیت ۱۱۵ ایسی ہے جس کا حوالہ سورۂ اَنعام آیت ۱۱۹ میں دیا گیا ہے، اور دوسری آیت (نمبر ۱۱۸) ایسی ہے جس میں سورۂ اَنعام کی آیت ۱۴۶ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں سورتوں کا نُزول قریب العہد ہے۔

ان شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول بھی مکّے کا آخری دَور ہی ہے، اور اسی کی تائید سورہ کے عام اندازِ بیان سے بھی ہوتی ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، دعوتِ پیغمبر کو نہ ماننے کے بُرے نتائج پر تنبیہ و فہمایش، اور حق کی مخالفت و مزاحمت پر زَجر و توبیخ۔

مَباحِث سورہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے یک لخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔ کفارِ مکّہ بار بار کہتے تھے کہ "جب ہم تمھیں جھٹلا چکے ہیں اور کھلّم کھلّا تمھاری مخالفت کر رہے ہیں تو آخر وہ خدا کا عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔" اس بات کو وہ بالکل تکیۂ کلام کی طرح اس لیے دُہراتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر نہ ہونے کا سب سے زیادہ صریح ثبوت تھا۔ اس پر فرمایا

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ بے وقوفو! خدا کا عذاب تو تمھارے سر پر تُلا کھڑا ہے، اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لیے جلدی نہ مچاؤ بلکہ جو ذرا سی مہلت باقی ہے، اس سے فائدہ اُٹھا کر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد فوراً ہی تفہیم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے اور حسبِ ذیل مضامین بار بار یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں:

(۱) دل لگتے دلائل اور آفاق و اَنفُس کے آثار کی کھلی کھلی شہادتوں سے سمجھایا جاتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے۔

(۲) منکرین کے اعتراضات، شکوک، حجتوں اور حیلوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

(۳) باطل پر اصرار اور حق کے مقابلے میں اِستکبار کے بُرے نتائج سے ڈرایا جاتا ہے۔

(۴) اُن اخلاقی اور عملی تغیّرات کو مُجمَل مگر دل نشین انداز سے بیان کیا جاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین انسانی زندگی میں لانا چاہتا ہے، اور اس سلسلے میں مشرکین کو بتایا جاتا ہے کہ خدا کو رب ماننا، جس کا انھیں دعویٰ تھا، محض خالی خولی مان لینا ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے جو عقائد، اخلاق اور عملی زندگی میں نمودار ہونے چاہییں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کفار کی مزاحمتوں اور جفا کاریوں کے مقابلے میں ان کا رَوِیّہ کیا ہونا چاہیے۔

---

۱۲۸ آیاتہا — سُوْرَۃُ النَّحْلِ مَکِّیَّۃٌ — ۱۶ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱﴾
یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖۤ

آ گیا اللہ کا فیصلہ[1]، اب اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں[2]۔ وہ اِس رُوح[3] کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے سے نازل

۱ – یعنی بس وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اُس کے ظہور و نفاذ کا وقت قریب آ لگا ہے۔ اس بات کو صیغۂ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے کے لیے فرمایا گیا، یا پھر اس لیے کہ کفارِ قریش کی سرکشی و بدعملی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور آخری فیصلہ کُن قدم اُٹھائے جانے کا وقت آ گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فیصلہ" کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں (اللہ اعلم بالصّواب) کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے، جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے، اُن کے جُحُود و انکار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ حکم اُن کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یا تو اُن پر تباہ کُن عذاب آ جاتا ہے، یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہجرت جب واقع ہوئی تو کفارِ مکّہ سمجھے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہے۔ مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکّے سے بلکہ پوری سرزمینِ عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

۲ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کا باہمی ربط سمجھنے کے لیے پَس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کفار جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار چیلنج کر رہے تھے کہ اب کیوں نہیں آ جاتا خدا کا وہ فیصلہ جس کے تم ہمیں ڈراوے دیا کرتے ہو، اِس کے پیچھے دراصل ان کا یہ خیال کارفرما تھا کہ اُن کا مشرکانہ مذہب ہی برحق ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ اللہ کا نام لے کر ایک غلط مذہب پیش کر رہے ہیں جسے اللہ کی طرف سے کوئی منظوری حاصل نہیں ہے۔ ان کا اِستدلال یہ تھا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ سے پھرے ہوئے ہوتے اور محمدؐ اس کے بھیجے ہوئے نبی ہوتے اور پھر بھی جو کچھ ہم ان کے ساتھ کر رہے ہیں اُس پر ہماری شامت نہ آ جاتی۔ اس لیے خدائی فیصلے کا اعلان کرتے ہی فوراً یہ ارشاد ہوا کہ اس کے نفاذ میں تاخیر کی وجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اللہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے کہ کوئی اس کا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ۝٢ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝٣

فرما دیتا ہے[۴] (اِس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) "آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمھارا معبُود نہیں ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو[۵]۔" اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے، وہ بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[۶]۔

شریک ہو۔

۳ – یعنی روحِ نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی میں وہی مقام رکھتی ہے جو طبعی زندگی میں روح کا مقام ہے، اس لیے قرآن میں متعدّد مقامات پر اس کے لیے روح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائیوں نے روح القدس (Holy Ghost) کو تین خداؤں میں سے ایک خدا بنا ڈالا۔

۴ – فیصلہ طلب کرنے کے لیے کفار جو چیلنج کر رہے تھے اس کے پسِ پشت چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار بھی موجود تھا، اس لیے شرک کی تردید کے ساتھ اور اس کے معاً بعد آپؐ کی نبوت کا اثبات فرمایا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بناوٹی باتیں ہیں جو یہ شخص بنا رہا ہے۔ اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ نہیں، یہ ہماری بھیجی ہوئی روح ہے جس سے لبریز ہو کر یہ شخص نبوت کر رہا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ اپنے جس بندے پر اللہ چاہتا ہے یہ روح نازل کرتا ہے، تو یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضوؐر پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس محمدؐ بن عبداللہ ہی اس کام کے لیے رہ گیا تھا، مکّے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی! اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، اور یہی متعدّد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، اسے تم سے مشورہ لینے کی حاجت نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔

۵ – اس فقرے سے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ رُوحِ نبوّت جہاں جس انسان پر بھی نازل ہوئی ہے، یہی ایک دعوت لے کر آئی ہے کہ خدائی صرف ایک اللہ کی ہے اور بس وہی اکیلا اِس کا مستحق ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے۔ کوئی دوسرا اس لائق نہیں کہ اس کی ناراضی کا خوف، اس کی سزا کا ڈر، اور اس کی نافرمانی کے نتائجِ بد کا اندیشہ انسانی اخلاق کا لنگر اور انسانی فکر و عمل کے پورے نظام کا محوَر بن کر رہے۔

۶ – دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات جس کی دعوت خدا کے پیغمبر دیتے

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴ وَالْاَنْعَامَ
خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵ وَلَكُمْ فِيْهَا
جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ
اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ

اُس نے انسان کو ایک ذرا سی بُوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالُو ہستی بن گیا۔[۷] اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمھارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ اُن میں تمھارے لیے جمال ہے جب کہ صبح تم انھیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ شام انھیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمھارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جاں فشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب

ہیں، اسی کی شہادت زمین و آسمان کا پورا کارخانۂ تخلیق دے رہا ہے۔ یہ کارخانہ کوئی خیالی گورکھ دھندا نہیں ہے، بلکہ ایک سراسر مبنی بر حقیقت نظام ہے۔ اس میں تم جس طرف چاہو نگاہ اُٹھا کر دیکھ لو، شرک کی گواہی کہیں سے نہ ملے گی، اللہ کے سوا دوسرے کی خدائی کہیں چلتی نظر نہ آئے گی، کسی چیز کی ساخت یہ شہادت نہ دے گی کہ اس کا وجود کسی اور کا بھی رہینِ منت ہے۔ پھر جب یہ ٹھوس حقیقت پر بنا ہوا نظام خالص توحید پر چل رہا ہے تو آخر تمھارے اِس شرک کا سکّہ کس جگہ رواں ہو سکتا ہے جب کہ اس کی تہ میں وہم و گمان کے سوا واقعیت کا شائبہ تک نہیں ہے؟ —— اس کے بعد آثارِ کائنات سے اور خود انسان کے اپنے وجود سے وہ شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طرف توحید پر اور دوسری طرف رسالت پر دلالت کرتی ہیں۔

۷ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے نُطفے کی حقیری سی بوند سے وہ انسان پیدا کیا جو بحث و استدلال کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنے مدعا کے لیے حجتیں پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس انسان کو خدا نے نطفے جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا ہے، اس کی خودی کا طغیان تو دیکھو کہ وہ خود خدا ہی کے مقابلے میں جھگڑنے پر اُتر آیا ہے۔ پہلے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت اُسی استدلال کی ایک کڑی ہے جو آگے مسلسل کئی آیتوں میں پیش کیا گیا ہے (جس کی تشریح ہم اس سلسلۂ بیان کے آخر میں کریں گے)۔ اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت انسان کو مُتنبّہ کرتی ہے کہ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے سے پہلے ذرا اپنی ہستی کو دیکھ۔ کس شکل میں تو کہاں سے نکل کر کہاں پہنچا، کس جگہ تو نے ابتداءً پرورش پائی، پھر کس راستے سے تو برآمد ہو کر دنیا میں آیا، پھر کن مرحلوں سے گزرتا ہوا تو جوانی کی عمر کو پہنچا اور اب

Maktaba Tul Ishaat.com

لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۙ﴿۷﴾ وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً ؕ
وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸﴾ وَعَلَى اللّٰهِ قَصۡدُ السَّبِيۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ ؕ

بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اُس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے، تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمھاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمھارے فائدے کے لیے) پیدا کرتا ہے جن کا تمھیں علم تک نہیں ہے[8]۔ اور اللہ ہی کے ذمّے ہے سیدھا راستہ بتانا، جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں[9]۔

اپنے آپ کو بھول کر تُو کس کے منہ آ رہا ہے۔

۸ – یعنی بکثرت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی بھلائی کے لیے کام کر رہی ہیں اور انسان کو خبر تک نہیں ہے کہ کہاں کہاں کتنے خُدّام اُس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور کیا خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۹ – توحید اور رحمت و رُبوبیّت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارتاً نبوت کی بھی ایک دلیل پیش کر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے:

دنیا میں انسان کے لیے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت تو حق نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح نظریۂ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو اُس سچائی کے مطابق ہو۔ اور عمل کے بے شمار ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔

اس صحیح نظریے اور صحیح راہِ عمل سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے۔ کیونکہ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اُونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کرو کہ جس خدا نے تمھیں وجود میں لانے سے پہلے تمھارے لیے یہ کچھ سرو سامان مہیا کر کے رکھا، اور جس نے وجود میں لانے کے بعد تمھاری حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اِتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اِتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ اس نے تمھاری انسانی زندگی کی اِس سب سے بڑی اور اصلی ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہو گا؟

یہی بندوبست تو ہے جو نبوّت کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔ اگر تم نبوت کو نہیں مانتے تو بتاؤ کہ تمھارے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لیے اور کون سا انتظام کیا ہے؟ اِس کے جواب میں تم نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لیے عقل و فکر دے رکھی ہے، کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار مختلف راستے ایجاد کر بیٹھی ہے، جو راہِ راست کی

ع ۹

وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾ ع هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾ يُنْۢبِتُ
لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔[۹ ع]

وہی ہے جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی برسایا، جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمھارے جانوروں کے لیے بھی چارا پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اِس میں ایک بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور نہ تم یہی کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے، کیونکہ خدا کے ساتھ اِس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ جانور ہونے کی حیثیت سے تو تمھاری پرورش اور تمھارے نشو و نما کا اِتنا مفصّل اور مکمل انتظام کرے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے تم کو یونہی تاریکیوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۃ الرحمٰن، حاشیہ ۲-۳)

۱۰- یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اِس ذمہ داری کو (جو نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے اس نے خود اپنے اُوپر عائد کی ہے) اس طرح ادا کرتا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کے مانند برسرِ ہدایت بنا دیتا۔ لیکن یہ اس کی مشیّت کا تقاضا نہ تھا۔ اُس کی مشیّت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی آزادی کے استعمال کے لیے اس کو علم کے ذرائع دیے گئے، عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں، خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں، اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرّف کے اختیارات عطا کیے گئے، اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیے گئے جو اس کے لیے ہدایت اور ضلالت، دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنیٰ ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رَو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلندترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی کے نتیجے میں اس کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ
مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ۙ وَمَا
ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى
الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اُس نے تمھاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخّر کر رکھا ہے، اور سب تارے بھی اُسی کے حکم سے مسخّر ہیں۔ اِس میں بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں، اِن میں بھی ضرور نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

وہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخّر کر رکھا ہے، تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو[11] اور اس کے شکر گزار بنو۔

جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا، تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہِ راست بھی معقول ترین طریقے سے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔

۱۱- یعنی حلال طریقوں سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا
لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔[۱۲]
اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے[۱۳] تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں،[۱۴] اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔[۱۵]

۱۲ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطحِ زمین پر پہاڑوں کے اُبھار کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گردش اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کر کے بتایا گیا ہے، جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں اور اصل فائدہ یہی حرکتِ زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (regulate) کرنا ہے۔

۱۳ – یعنی وہ راستے جو ندی نالوں اور دریاؤں کے ساتھ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان قدرتی راستوں کی اہمیت خُصوصیت کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں محسوس ہوتی ہے، اگرچہ میدانی علاقوں میں بھی وہ کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

۱۴ – یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطّے کو مختلف امتیازی علامات (landmarks) سے ممتاز کیا۔ اِس کے بہت سے دوسرے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور اپنی منزلِ مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ اسے کبھی ایسے ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہُوا ہو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم الشان نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اللہ نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے، اور وہ ہیں تارے، جنھیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کر رہا ہے۔

یہاں پھر توحید اور رحمت و رُبوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ دلیلِ رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے ہوئے ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس خدا نے تمھاری مادّی زندگی میں تمھاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے ہیں، کیا وہ تمھاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمھاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے؟ ظاہر ہے کہ مادّی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس ربِّ کریم کو ہماری مادّی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لیے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سَمتِ سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝١٧ وَاِنْ

پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟[16] کیا تم ہوش میں نہیں آتے؟ اگر تم

اس سے یہ بدگمانی کیسے کی جاسکتی ہے کہ اس نے ہماری اخلاقی فلاح کے لیے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اس راستے کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراجِ منیر روشن نہ کیا ہوگا؟

۱۵ – یہاں تک آفاق اور اَنفُس کی بہت سی نشانیاں جو پے در پے بیان کی گئی ہیں، ان سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ انسان اپنے وجود سے لے کر زمین اور آسمان کے گوشے گوشے تک جدھر چاہے نظر دوڑا کر دیکھ لے، ہر چیز پیغمبر کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے اور کہیں سے بھی شرک کی ـــــ اور ساتھ ساتھ دہریت کی بھی ـــــ تائید میں کوئی شہادت فراہم نہیں ہوتی۔ یہ ایک حقیر بوند سے بولتا چالتا اور حجت و استدلال کرتا انسان بنا کر کھڑا کرنا۔ یہ اُس کی ضرورت کے عین مطابق بہت سے جانور پیدا کرنا جن کے بال اور کھال، خون اور دودھ، گوشت اور پیٹھ، ہر چیز میں انسانی فطرت کے بہت سے مطالبات کا، حتّٰی کہ اس کے ذوقِ جمال کی مانگ تک کا جواب موجود ہے۔ یہ آسمان سے بارش کا انتظام، اور یہ زمین میں طرح طرح کے پھلوں اور غلّوں اور چاروں کی روئیدگی کا انتظام، جس کے بے شمار شعبے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتے چلے جاتے ہیں اور پھر انسان کی بھی فطری ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ یہ رات اور دن کی باقاعدہ آمد و رفت، اور یہ چاند اور سورج اور تاروں کی انتہائی منظّم حرکات، جن کا زمین کی پیداوار اور انسان کی مَصلَحتوں سے اِتنا گہرا ربط ہے۔ یہ زمین میں سمندروں کا وجود، اور یہ اُن کے اندر انسان کی بہت سی طبعی اور جمالی طلبوں کا جواب۔ یہ پانی کا چند مخصوص قوانین سے جکڑا ہُوا ہونا، اور پھر اس کے یہ فائدے کہ انسان سمندر جیسی ہولناک چیز کا سینہ چیرتا ہوا اس میں اپنے جہاز چلاتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر اور تجارت کرتا پھرتا ہے۔ یہ دھرتی کے سینے پر پہاڑوں کے اُبھار اور یہ انسان کی ہستی کے لیے اُن کے فائدے۔ یہ سطحِ زمین کی ساخت سے لے کر آسمان کی بلند فضاؤں تک بے شمار علامتوں اور امتیازی نشانوں کا پھیلاؤ اور پھر اس طرح ان کا انسان کے لیے مفید ہونا۔ یہ ساری چیزیں صاف شہادت دے رہی ہیں کہ ایک ہی ہستی نے یہ منصوبہ سوچا ہے، اُسی نے اپنے منصوبے کے مطابق اِن سب کو ڈیزائن کیا ہے، اُسی نے اس ڈیزائن پر ان کو پیدا کیا ہے، وہی ہر آن اِس دنیا میں نت نئی چیزیں بنا بنا کر اس طرح لا رہا ہے کہ مجموعی اسکیم اور اس کے نظم میں ذرا فرق نہیں آتا، اور وہی زمین سے لے کر آسمانوں تک اِس عظیم الشان کارخانے کو چلا رہا ہے۔ ایک بیوقوف یا ایک ہٹ دھرم کے سوا اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ ہے؟ یا یہ کہ اس کمال درجے منظم، مربوط اور متناسب کائنات کے مختلف کام یا مختلف اجزا مختلف خداؤں کے آفریدہ اور مختلف خداؤں کے زیرِ انتظام ہیں؟

۱۶ – یعنی اگر تم یہ مانتے ہو (جیسا کہ فی الواقع کفارِ مکہ بھی مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین بھی مانتے ہیں) کہ خالق اللہ ہی ہے اور اس کائنات کے اندر تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کسی کا کچھ بھی پیدا کیا ہوا نہیں ہے،

تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑱ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ⑲ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا
يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۭ⑳ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ

اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے[۱۷]، حالانکہ وہ تمھارے کُھلے سے بھی واقف ہے اور چُھپے سے بھی۔[۱۸]

اور وہ دوسری ہستیاں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مُردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ

تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ خالق کے خلق کیے ہوئے نظام میں غیر خالق ہستیوں کی حیثیت خود خالق کے برابر یا کسی طرح بھی اُس کے مانند ہو؟ کیونکر ممکن ہے کہ اپنی خلق کی ہوئی کائنات میں جو اختیارات خالق کے ہیں وہی ان غیر خالقوں کے بھی ہوں، اور اپنی مخلوق پر جو حُقوق خالق کو حاصل ہیں وہی حقوق غیر خالقوں کو بھی حاصل ہوں؟ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خالق اور غیر خالق کی صفات ایک جیسی ہوں گی، یا وہ ایک جنس کے افراد ہوں گے، حتّٰی کہ ان کے درمیان باپ اور اولاد کا رشتہ ہوگا؟

۱۷- پہلے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک پوری داستان اَن کہی چھوڑ دی ہے، اس لیے کہ وہ اس قدر عیاں ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اس کی طرف محض یہ لطیف اشارہ ہی کافی ہے کہ اللہ کے بے پایاں احسانات کا ذکر کرنے کے معاً بعد اس کے غَفور و رحیم ہونے کا ذکر کر دیا جائے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس انسان کا بال بال اللہ کے احسانات میں بندھا ہوا ہے، وہ اپنے مُحسن کی نعمتوں کا جواب کیسی کیسی نمک حرامیوں، بے وفائیوں، غداریوں اور سرکشیوں سے دے رہا ہے، اور پھر اس کا محسن کیسا رحیم اور حلیم ہے کہ ان ساری حرکتوں کے باوجود وہ سالہا سال ایک نمک حرام شخص کو اور صدہا برس ایک باغی قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو عَلانیہ خالق کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور پھر بھی نعمتوں سے مالا مال ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ بھی پائے جاتے ہیں جو خالق کی ذات، صفات، اختیارات، حُقوق، سب میں غیر خالق ہستیوں کو اس کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور منعم کی نعمتوں کا شکریہ غیر منعموں کو ادا کر رہے ہیں، پھر بھی نعمت دینے والا ہاتھ نعمت دینے سے نہیں رُکتا۔ وہ بھی ہیں جو خالق کو خالق اور منعم ماننے کے باوجود اس کے مقابلے میں سرکشی و نافرمانی ہی کو اپنا شیوہ اور اس کی اطاعت سے آزادی ہی کو اپنا مسلک بنائے رکھتے ہیں، پھر بھی مدت العمر اس کے بے حد و حساب احسانات کا سلسلہ اُن پر جاری رہتا ہے۔

۱۸- یعنی کوئی احمق یہ نہ سمجھے کہ انکارِ خدا اور شرک اور مَعصِیَت کے باوجود نعمتوں کا سلسلہ بند نہ ہونا کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾
لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ

ع ۲ / ۸

انھیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اُٹھایا جائے گا۔[19] ع

تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، اُن کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔[20] اللہ یقیناً اِن کے سب کرتوت جانتا ہے چھپے ہوئے بھی اور کُھلے ہوئے بھی۔ وہ

اس وجہ سے ہے کہ اللہ کو لوگوں کے کرتوتوں کی خبر نہیں ہے۔ یہ کوئی اندھی بانٹ اور غلط بخشی نہیں ہے جو بے خبری کی وجہ سے ہو رہی ہو۔ یہ تو وہ حلم اور درگزر ہے جو مجرموں کے پوشیدہ اَسرار بلکہ دل کی چُھپی ہوئی نیتوں تک سے واقف ہونے کے باوجود کیا جا رہا ہے، اور یہ وہ فیاضی و عالی ظرفی ہے جو صرف رب العالمین ہی کو زیب دیتی ہے۔

۱۹ - یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبُودوں کی تردید کی جا رہی ہے، وہ فرشتے، یا جن، یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملے میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انھیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیا، اولیا، شہدا، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کُشا، فریاد رَس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اِس نوعیت کے معبُود نہیں پائے جاتے تھے، تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدّد قبائل، رَبیعَہ، کَلب، تَغلِب، قُضَاعَہ، کِنَانَہ، حَرث، کَعب، کِندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے، اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیا، اولیا اور شہدا کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکینِ عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبُود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنھیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق، نَسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنھیں بعد کے لوگ بت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ کی رِوایت ہے کہ اِساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مَناۃ اور عُزّٰی کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عُزّٰی اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ

لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ
قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَآءَ
مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾ ع قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ

اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔

اور[21] جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں: "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں[22]۔" یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اُٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ اُن لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنھیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمّہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں[ع]۔ اِن سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لیے) ایسی ہی مکّاریاں کر چکے ہیں، تو دیکھ لو کہ اللہ نے اُن کے مکر کی عمارت جڑ سے

میاں جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عُزّٰی کے ہاں بسر کرتے تھے، سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

۲۰ – یعنی آخرت کے انکار نے اُن کو اس قدر غیر ذمہ دار، بے فکر، اور دنیا کی زندگی میں مست بنا دیا ہے کہ اب انھیں کسی حقیقت کا انکار کر دینے میں باک نہیں رہا، کسی صداقت کی ان کے دل میں قدر باقی نہیں رہی، کسی اخلاقی بندش کو اپنے نفس پر برداشت کرنے کے لیے وہ تیار نہیں رہے، اور انھیں یہ تحقیق کرنے کی پروا ہی نہیں رہی کہ جس طریقے پر وہ چل رہے ہیں، وہ حق ہے بھی یا نہیں۔

۲۱ – یہاں سے تقریر کا رُخ دوسری طرف پھرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں جو شرارتیں کفارِ مکّہ کی طرف سے ہو رہی تھیں، جو حجتیں آپؐ کے خلاف پیش کی جا رہی تھیں، جو حیلے اور بہانے ایمان نہ لانے کے لیے گھڑے جا رہے تھے، جو اعتراضات آپؐ پر وارد کیے جا رہے تھے، ان کو ایک ایک کر کے لیا جاتا ہے اور ان پر فہمائش، زجر اور نصیحت کی جاتی ہے۔

۲۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو مکّے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے، اُن سے پوچھا جاتا تھا کہ تمھارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اُٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکّہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ
فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ
وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٧﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ

اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اُوپر سے ان کے سر پر آ رہی، اور ایسے رُخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا اُن کو گمان تک نہ تھا۔ پھر قیامت کے روز اللہ انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور اُن سے کہے گا: ''بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لیے تم (اہلِ حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟'' ـــــ جن[23] لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے: ''آج رُسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے۔'' ہاں،[24] انھی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں[25] تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''ہم تو کوئی قصور نہیں

سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جائے، یا کم از کم اُس کو آپ سے اور آپ کی نبوت کے معاملے سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے۔

۲۳ - پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑے غور و فکر سے خود بھر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سوال کرے گا تو سارے میدانِ حشر میں ایک سناٹا چھا جائے گا۔ کفّار و مشرکین کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ اُن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اس لیے وہ دم بخود رہ جائیں گے اور اہلِ علم کے درمیان آپس میں یہ باتیں ہوں گی۔

۲۴ - یہ فقرہ اہلِ علم کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خود بطورِ تشریح فرما رہا ہے۔ جن لوگوں نے اِسے بھی اہلِ علم ہی کا قول سمجھا ہے، انھیں بڑی تاویلوں سے بات بنانی پڑی ہے اور پھر بھی بات پوری نہیں بن سکی ہے۔

۲۵ - یعنی جب موت کے وقت ملائکہ ان کی رُوحیں ان کے جسم سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔

مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا
اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

کر رہے تھے۔" ملائکہ جواب دیتے ہیں: "کر کیسے نہیں رہے تھے! اللہ تمھارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے۔ اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔[۲۶]" پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے۔

۲۶ – یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، جس میں قبضِ روح کے بعد متقیوں اور ملائکہ کی گفتگو کا ذکر ہے، قرآن مجید کی اُن متعدّد آیات میں سے ہے جو صریح طور پر عذاب و ثوابِ قبر کا ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالمِ برزخ کے لیے استعمال ہُوا ہے، اور اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرینِ حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم بالکل عَدَمِ محض کا عالم ہے، جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ کفار کی رُوحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی بُرا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ بتاتے ہیں اور جہنّم واصل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اتقیا کی رُوحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو ملائکہ اُن کو سلام بجا لاتے ہیں اور جنّتی ہونے کی پیشگی مبارک باد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شُعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کُھلا ہُوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ اِسی سے ملتا جُلتا مضمون سورۂ نساء، آیت ۹۷ میں گزر چکا ہے، جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں سے قبضِ رُوح کے بعد ملائکہ کی گفتگو کا ذکر آیا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ صاف الفاظ میں عذابِ برزخ کی تصریح سورۂ مومن، آیت ۴۵-۴۶ میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرماتا ہے کہ "ایک سخت عذاب اُن کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے، نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی، بلکہ اُس پوری شخصیّت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجرِبات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں رُوح کے شُعور، احساس، مُشاہدات اور تجرِبات کی کیفیت خواب سے ملتی جُلتی ہوتی ہے۔ ایک مجرم رُوح سے فرشتوں کی بازپُرس اور پھر اُس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا اور دوزخ کے سامنے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰ۙ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ”بہترین چیز اُتری ہے۔“[۲۷] اِس طرح کے نیکوکار لوگوں کے لیے اِس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھّا گھر ہے متقیوں کا، دائمی قیام کی جنتیں[۲۸]، جن میں وہ داخل ہوں گے، نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی،

پیش کیا جانا، سب کچھ اُس کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک قتل کے مجرم پر پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ایک ڈراؤنے خواب کی شکل میں گزرتی ہوگی۔ اسی طرح ایک پاکیزہ رُوح کا استقبال، اور پھر اُس کا جنت کی بشارت سننا، اور اُس کا جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے متمتع ہونا، یہ سب بھی اُس ملازم کے خواب سے مِلتا جُلتا ہوگا جو حُسنِ کارکردگی کے بعد سرکاری بلاوے پر ہیڈکوارٹر میں حاضر ہُوا ہو اور وعدۂ ملاقات کی تاریخ سے ایک دن پہلے آیندہ انعامات کی اُمیدوں سے لبریز ایک سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب یک لخت نَفخِ صُورِ دوم سے ٹوٹ جائے گا، اور یکایک میدانِ حشر میں اپنے آپ کو جسم و روح کے ساتھ زندہ پا کر مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (ارے یہ کون ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھا لایا؟) مگر اہلِ ایمان پورے اطمینان سے کہیں گے کہ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچّا تھا)۔ مجرمین کا فوری احساس اُس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں (جہاں بسترِ موت پر اُنھوں نے دنیا میں جان دی تھی) شاید کوئی ایک گھنٹا بھر سوئے ہوں گے اور اب اچانک اس حادثے سے آنکھ کھلتے ہی کہیں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان پورے ثباتِ قلب کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ...... وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (اللہ کے دفتر میں تو تم روزِ حشر تک ٹھیرے رہے ہو، اور یہی روزِ حشر ہے، مگر تم اِس چیز کو جانتے نہ تھے)۔

۲۷ – یعنی مکّے سے باہر کے لوگ جب خدا سے ڈرنے والے اور راست باز لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو ان کا جواب جھوٹے اور بددیانت کافروں کے جواب سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا پروپیگنڈا نہیں کرتے۔ وہ عوام کو بہکانے اور غلط فہمیوں میں ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ حضورؐ کی اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم کی تعریفیں کرتے ہیں اور لوگوں کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُونَ ۚ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾
الَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّآ
أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوٓا
أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۳﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ

اور سب کچھ وہاں عین اُن کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو۔ اُن متقیوں کو جن کی رُوحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ”سلام ہو تم پر، جاؤ جنّت میں اپنے اعمال کے بدلے۔“

اے محمدؐ! اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اِس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ ہی آ پہنچیں، یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟[29] اِس طرح کی ڈِھٹائی اِن سے پہلے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ پھر جو کچھ اُن کے ساتھ ہُوا وہ اُن پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ اُن کا اپنا ظلم تھا جو اُنھوں نے خود اپنے اُوپر کیا۔ اُن کے کرتُوتوں کی خرابیاں آخرِ کار اُن کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز اُن پر مسلّط

---

۲۸ – یہ ہے جنّت کی اصل تعریف۔ وہاں انسان جو کچھ چاہے گا وہی اُسے ملے گا اور کوئی چیز اس کی مرضی اور پسند کے خلاف واقع نہ ہوگی۔ دنیا میں کسی رئیس، کسی امیر کبیر، کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی یہ نعمت کبھی میسر نہیں آئی ہے، نہ یہاں اس کے حُصول کا کوئی امکان ہے۔ مگر جنّت کے ہر مکین کو راحت و مَسَرّت کا یہ درجۂ کمال حاصل ہوگا کہ اُس کی زندگی میں ہر وقت ہر طرف سب کچھ اس کی خواہش اور پسند کے عین مطابق ہوگا۔ اُس کا ہر ارمان نکلے گا۔ اس کی ہر آرزو پوری ہوگی۔ اس کی ہر چاہت عمل میں آ کر رہے گی۔

۲۹ – یہ چند کلمے بطور نصیحت اور تنبیہ کے فرمائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک سمجھانے کا تعلق تھا، تم نے ایک ایک حقیقت پوری طرح کھول کر سمجھا دی۔ دلائل سے اُس کا ثبوت دے دیا۔ کائنات کے پورے نظام سے اس کی شہادتیں پیش کر دیں۔ کسی ذی فہم آدمی کے لیے شرک پر جمے رہنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں چھوڑی۔ اب یہ لوگ ایک صاف سیدھی بات کو ماننے میں کیوں تامّل کر رہے ہیں؟ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کا فرشتہ سامنے آ کھڑا ہو تو

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۵

بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ
اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا
مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ فَهَلۡ عَلَى
الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ

ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

یہ مشرکین کہتے ہیں: ”اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اُس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اُس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔“[۳۰] ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔[۳۱] تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ

زندگی کے آخری لمحے میں مانیں گے؟ یا خدا کا عذاب سر پر آ جائے تو اس کی پہلی چوٹ کھا لینے کے بعد مانیں گے؟

۳۰- مشرکین کی اس حُجت کو سورۂ انعام، آیات ۱۴۸ - ۱۴۹ میں بھی نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ مقام اور اس کے حواشی اگر نگاہ میں رہیں تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو گی۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ انعام، حواشی ۱۲۴ تا ۱۲۶)

۳۱- یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج تم لوگ اللہ کی مشیّت کو اپنی گمراہی اور بد اعمالی کے لیے حُجت بنا رہے ہو۔ یہ تو بڑی پُرانی دلیل ہے جسے ہمیشہ سے بگڑے ہوئے لوگ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے اور ناصحوں کا منہ بند کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ مشرکین کی حُجت کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا پورا لطف اٹھانے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ ابھی چند سطریں پہلے مشرکین کے اُس پروپیگنڈے کا ذکر گزر چکا ہے جو وہ قرآن کے خلاف یہ کہہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ ”اجی، وہ تو پُرانے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔“ گویا اُن کو نبی پر اعتراض یہ تھا کہ یہ صاحب نئی بات کون سی لائے ہیں، وہی پرانی باتیں دُہرا رہے ہیں جو طوفانِ نوحؑ کے وقت سے لے کر آج تک ہزاروں مرتبہ کہی جا چکی ہیں۔ اس کے جواب میں یہاں اُن کی دلیل (جسے وہ بڑے زور کی دلیل سمجھتے ہوئے پیش کرتے تھے) کا ذکر کرنے کے بعد یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرات! آپ ہی کون سے مازرن ہیں، یہ مایۂ ناز دلیل جو آپ لائے ہیں، اِس میں قطعی کوئی اُپج موجود نہیں ہے، وہی دقیانوسی بات ہے جو ہزاروں برس سے گمراہ لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں، آپ نے بھی اُسی کو دُہرا دیا ہے۔

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ
وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ
فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۷

''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔[۳۲]'' اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلّط ہو گئی۔[۳۳] پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔[۳۴] ـــــ اے محمدؐ! تم چاہے اِن کی ہدایت کے لیے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اُسے ہدایت نہیں دیا کرتا اور اس طرح کے لوگوں کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔

۳۲۔ یعنی تم اپنے شرک اور اپنی خود مختارانہ تحلیل و تحریم کے حق میں ہماری مشیّت کو کیسے سندِ جواز بنا سکتے ہو جب کہ ہم نے ہر اُمّت میں اپنے رسول بھیجے اور اُن کے ذریعے سے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ تمھارا کام صرف ہماری بندگی کرنا ہے، طاغوت کی بندگی کے لیے تم پیدا نہیں کیے گئے ہو۔ اس طرح جب کہ ہم پہلے ہی معقول ذرائع سے تم کو بتا چکے ہیں کہ تمھاری ان گمراہیوں کو ہماری رضا حاصل نہیں ہے، تو اس کے بعد ہماری مشیّت کی آڑ لے کر تمھارا اپنی گمراہیوں کو جائز ٹھیرانا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ تم چاہتے تھے کہ ہم سمجھانے والے رسول بھیجنے کے بجائے ایسے رسول بھیجتے جو ہاتھ پکڑ کر تم کو غلط راستوں سے کھینچ لیتے اور زبردستی تمھیں راست رَو بناتے۔ (مشیّت اور رضا کے فرق کو سمجھنے کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۸۰۔ سورۂ زُمر، حاشیہ ۲۰)

۳۳۔ یعنی ہر پیغمبر کی آمد کے بعد اُس کی قوم دو حصّوں میں تقسیم ہوئی۔ بعض نے اس کی بات مانی (اور یہ مان لینا اللہ کی توفیق سے تھا) اور بعض اپنی گمراہی پر جمے رہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۲۸)

۳۴۔ یعنی تجربے سے بڑھ کر تحقیق کے لیے قابلِ اعتماد کسَوٹی اور کوئی نہیں ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تاریخِ انسانی کے پے در پے تجربات کیا ثابت کر رہے ہیں۔ عذابِ الٰہی فرعون و آلِ فرعون پر آیا یا موسیٰؑ اور بنی اسرائیل پر؟ صالحؑ کے جھٹلانے والوں پر آیا یا ماننے والوں پر؟ ہودؑ اور نوحؑ اور دوسرے انبیاءؑ کے منکرین پر آیا یا مومنین پر؟ کیا واقعی اِن تاریخی تجربات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو ہماری مشیّت نے شرک اور شریعت سازی کے ارتکاب کا موقع دیا تھا، اُن کو ہماری رضا حاصل تھی؟ اس کے برعکس یہ واقعات تو صریحاً یہ ثابت کر رہے ہیں کہ فہمایش اور نصیحت کے باوجود جو لوگ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ
يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اُٹھائے گا" — اُٹھائے گا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پُورا کرنا اس نے اپنے اُوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ اِن کے سامنے اُس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں، اور منکرینِ حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھُوٹے تھے۔[۳۵] (رہا اس کا اِمکان، تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے

اِن گمراہیوں پر اصرار کرتے ہیں، انھیں ہماری مشیّت ایک حد تک ارتکابِ جرائم کا موقع دیتی چلی جاتی ہے اور پھر ان کا سفینہ خوب بھر جانے کے بعد ڈبو دیا جاتا ہے۔

۳۵ – یہ حیات بعد الموت اور قیامِ حشر کی عقلی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ دنیا میں جب سے انسان پیدا ہُوا ہے، حقیقت کے بارے میں بے شمار اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ انھی اختلافات کی بنا پر نسلوں اور قوموں اور خاندانوں میں پھوٹ پڑی ہے۔ انھی کی بنا پر مختلف نظریات رکھنے والوں نے اپنے الگ مذہب، الگ معاشرے، الگ تمدن بنائے یا اختیار کیے ہیں۔ ایک ایک نظریّے کی حمایت اور وکالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے مختلف زمانوں میں جان، مال، آبرو، ہر چیز کی بازی لگا دی ہے۔ اور بے شمار مواقع پر ان مختلف نظریات کے حامیوں میں ایسی سخت کشاکش ہوئی ہے کہ ایک نے دوسرے کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کی ہے، اور مٹنے والے نے مٹتے مٹتے بھی اپنا نقطۂ نظر نہیں چھوڑا ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ ایسے اہم اور سنجیدہ اختلافات کے متعلق کبھی تو صحیح اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ فی الواقع ان کے اندر حق کیا تھا اور باطل کیا، راستی پر کون تھا اور ناراستی پر کون۔ اِس دنیا میں تو کوئی امکان اس پردے کے اُٹھنے کا نظر نہیں آتا۔ اس دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں حقیقت پر سے پردہ اُٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا لامحالہ عقل کے اِس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرا ہی عالَم درکار ہے۔

اور یہ صرف عقل کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اخلاق کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ ان اختلافات اور ان کشمکشوں میں بہت سے فریقوں نے حصّہ لیا ہے۔ کسی نے ظلم کیا ہے اور کسی نے سہا ہے۔ کسی نے قربانیاں کی ہیں اور کسی نے ان قربانیوں کو وصول کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے نظریّے کے مطابق ایک اخلاقی فلسفہ اور ایک اخلاقی رَوِیّہ اختیار کیا ہے اور اس سے اربوں

إِذَآ أَرَدْنٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝٤٠ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي
اللّٰهِ مِنۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ
الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝٤١ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝٤٢ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيٓ

ع — وقف لازم

اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہوجا" اور بس وہ ہو جاتی ہے۔[36] ع

جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں، ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔[37] کاش! جان لیں وہ مظلوم جنھوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)۔

اے محمدؐ! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں، جن کی طرف ہم اپنے

اور کھربوں انسانوں کی زندگیاں بُرے یا بھلے طور پر متأثر ہوئی ہیں۔ آخر کوئی وقت تو ہونا چاہیے جب کہ ان سب کا اخلاقی نتیجہ صلے یا سزا کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس دنیا کا نظام اگر صحیح اور مکمل اخلاقی نتائج کے ظہور کا متحمل نہیں ہے تو ایک دوسری دنیا ہونی چاہیے جہاں یہ نتائج ظاہر ہو سکیں۔

۳۶- یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور تمام اگلے پچھلے انسانوں کو بیک وقت جِلا اُٹھانا کوئی بڑا ہی مشکل کام ہے۔ حالانکہ اللہ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے کو پورا کرنے کے لیے کسی سروسامان، کسی سبب اور وسیلے، اور کسی سازگاریِ احوال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا ہر ارادہ محض اس کے حکم سے پُورا ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہی سروسامان وجود میں لاتا ہے۔ اس کے حکم ہی سے اسباب و وسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا حکم ہی اس کی مرادات کے عین مطابق احوال تیار کر دیتا ہے۔ اس وقت جو دنیا موجود ہے یہ بھی مُجرّد حکم سے وجود میں آئی ہے، اور دوسری دنیا بھی آن کی آن میں محض ایک حکم سے ظہور میں آسکتی ہے۔

۳۷- یہ اشارہ ہے ان مہاجرین کی طرف جو کفار کے ناقابلِ برداشت مظالم سے تنگ آکر مکے سے حَبَش کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ منکرینِ آخرت کی بات کا جواب دینے کے بعد یکایک مہاجرینِ حبشہ کا ذکر چھیڑ دینے میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ اس سے مقصود کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ ظالمو! یہ جفا کاریاں کرنے کے بعد اب تم سمجھتے ہو کہ کبھی تم سے باز پُرس اور مظلوموں کی دادرسی کا وقت ہی نہ آئے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ‏ ﴿۴۳﴾ بِالۡبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ

پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔[38] اہلِ ذکر[39] سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ پچھلے رسُولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے،[40]

۳۸ – یہاں مشرکینِ مکّہ کے ایک اعتراض کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض وہی ہے جو پہلے بھی تمام انبیاؑ پر ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین نے بھی آپؐ پر بارہا کیا تھا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو، پھر ہم کیسے مان لیں کہ خدا نے تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

۳۹ – یعنی علمائے اہلِ کتاب، اور وہ دوسرے لوگ جو چاہے سکہ بند علما نہ ہوں مگر بہرحال کُتُبِ آسمانی کی تعلیمات سے واقف اور انبیائے سابقین کی سرگزشت سے آگاہ ہوں۔

۴۰ – تشریح و توضیح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی، اور اپنی رہنمائی میں ایک پوری مسلم سوسائٹی کی تشکیل کر کے بھی، اور ”ذکرِ الٰہی“ کے منشا کے مطابق اُس کے نظام کو چلا کر بھی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ ”ذِکر“ فرشتوں کے ذریعے سے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و رُبوبیت اس کی تنزیل کی متقاضی تھی۔ اُس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اس ”ذِکر“ کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے، اس کا مطلب سمجھائے۔ جنھیں کچھ شک ہو، ان کا شک رفع کرے۔ جنھیں کوئی اعتراض ہو، ان کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں، اُن کے مقابلے میں وہ اُس طرح کا رَوِیّہ برت کر دکھائے جو اس ”ذِکر“ کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں، انھیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے، اور ان کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطورِ مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام ”ذِکر“ کے منشا کی شرح ہو۔

یہ آیت جس طرح اُن منکرینِ نبوت کی حُجت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا ”ذِکر“ بشر کے ذریعے سے آنے کو نہیں مانتے تھے، اُسی طرح آج یہ اُن منکرینِ حدیث کی حُجت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبی کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف ”ذِکر“ کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ذکر پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے

النصف

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ
يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ

اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔

پھر کیا وہ لوگ جو (دعوتِ پیغمبرؐ کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں، اِس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے، یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے

کے لائق صرف ذکر ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اِس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے، نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض اِن چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں، اُن کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ نبی نے اُس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے، یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اُسے واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا ''ذکر'' ایک نبی کے ذریعے سے بھیجا۔ کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہو جانے کا ہو سکتا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوتِ محمدیؐ، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے، جس کے بعد اگر کوئی مسلکِ معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآنِ مجید کے مقصدِ نُزول کی تکمیل کے لیے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں: پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوتِ محمدیؐ ختم ہو گئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا جیسا ہُود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر ان کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوّت کی ضرورت آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے، صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختمِ نبوت پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں، مُدعی سست کی حمایت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ
الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٩﴾

جدھر سے اس کے آنے کا ان کو وہم و گمان تک نہ ہو، یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑ لے، یا ایسی حالت میں انھیں پکڑے جب کہ انھیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہُوا ہو اور وہ اس سے بچنے کی فکر میں چوکنّے ہوں؟ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے، یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب بڑا ہی نرم خُو اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حُضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟[41] سب کے سب اس طرح اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جان دار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔[42] وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے،

گویا اِن چُست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی، اور ایک نئی کتاب کے نُزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رُو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ، اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

۴۱ – یعنی تمام جسمانی اشیا کے سایے اس بات کی علامت ہیں کہ پہاڑ ہوں یا درخت، جانور ہوں یا انسان، سب کے سب ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، سب کی پیشانی پر بندگی کا داغ لگا ہُوا ہے، اُلوہیت میں کسی کا کوئی ادنیٰ حصّہ بھی نہیں ہے۔ سایہ پڑنا ایک چیز کے مادّی ہونے کی کھلی علامت ہے، اور مادّی ہونا بندہ و مخلوق ہونے کا کُھلا ثبوت۔

۴۲ – یعنی زمین ہی کی نہیں، آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جن کو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا اور خدا کے رشتہ دار ٹھیراتے آئے ہیں، دراصل غلام اور تابعِ فرمان ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی خداوندی میں کوئی حصّہ نہیں۔

ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جان دار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں بلکہ عالمِ بالا کے سیاروں میں بھی ہیں۔ یہی بات سورۂ شُوریٰ، آیت ۲۹ میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔

السجدة ۳ ع ۱۲

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۩ ﴿٥٠﴾ وَقَالَ
اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ
الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ
فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـــَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ۚ ثُمَّ اِذَا
كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ ۙ

اپنے رب سے جواُن کے اُوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ع

اللہ کا فرمان ہے کہ ”دوخدا نہ بنالو،[۴۳] خدا تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔ اُسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور خالصاً اُسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے۔[۴۴] پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کروگے؟[۴۵]

تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اُسی کی طرف دوڑتے ہو۔[۴۶] مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے،[۴۷]

۴۳- دوخداؤں کی نفی میں دو سے زیادہ خداؤں کی نفی آپ سے آپ شامل ہے۔

۴۴- دوسرے الفاظ میں اسی کی اطاعت پر اس پورے کارخانۂ ہستی کا نظام قائم ہے۔

۴۵- بالفاظِ دیگر، کیا اللہ کے بجائے کسی اور کا خوف اور کسی اور کی ناراضی سے بچنے کا جذبہ تمھارے نظامِ زندگی کی بنیاد بنے گا؟

۴۶- یعنی یہ توحید کی ایک صریح شہادت تمھارے اپنے نفس میں موجود ہے۔ سخت مصیبت کے وقت جب

Maktaba Tul Ishaat.com

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۵۵
وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ
عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۶ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ
وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۵۷ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝۵۸ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا

تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا، مزے کر لو، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا۔

یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں[48]، اُن کے حصے ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے مقرر کرتے ہیں[49] ـــــ خدا کی قسم! ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے؟

یہ خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں[50]۔ سُبحان اللہ! اور ان کے لیے وہ جو یہ خود چاہیں[51]؟ جب اِن میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھُپتا پھرتا ہے کہ اِس بُری خبر کے بعد کیا

تمام مَن گھڑت تصوّرات کا زنگ ہٹ جاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے تمھاری اصل فطرت اُبھر آتی ہے، جو اللہ کے سوا کسی الٰہ، کسی رب اور کسی مالکِ ذی اختیار کو نہیں جانتی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حواشی ۲۹ و ۴۱۔ یونس، حاشیہ ۳۱)

۴۷ – یعنی اللہ کے شکریے کے ساتھ ساتھ کسی بزرگ یا کسی دیوی دیوتا کے شکریے کی بھی نیازیں اور نذریں چڑھانی شروع کر دیتا ہے اور اپنی بات بات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی اس مہربانی میں اُن حضرت کی مہربانی کا بھی دخل تھا، بلکہ اللہ ہرگز مہربانی نہ کرتا اگر وہ حضرت مہربان ہو کر اللہ کو مہربانی پر آمادہ نہ کرتے۔

۴۸ – یعنی جن کے متعلق کسی مستند ذریعۂ تعلیم سے اِنھیں یہ تحقیق نہیں ہُوا ہے کہ اللہ میاں نے اُن کو واقعی شریکِ خدا نامزد کر رکھا ہے، اور اپنی خدائی کے کاموں میں سے کچھ کام یا اپنی سلطنت کے علاقوں میں سے کچھ علاقے ان کو سونپ رکھے ہیں۔

۴۹ – یعنی اُن کی نذر، نیاز اور بھینٹ کے لیے اپنی آمدنیوں اور اپنی اراضی کی پیداوار میں سے ایک مقرر حصہ الگ نکال رکھتے ہیں۔

۵۰ – مشرکینِ عرب کے معبودوں میں دیوتا کم تھے، دیویاں زیادہ تھیں، اور ان دیویوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ

بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمۡسِکُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ
اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ مَثَلُ
السَّوۡءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰی ؕ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶۰﴾ ع وَ لَوۡ
یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلۡمِهِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡهَا مِنۡ دَآبَّةٍ وَّ لٰکِنۡ
یُّؤَخِّرُهُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ
سَاعَةً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰهِ مَا یَکۡرَهُوۡنَ

کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ ـــــ دیکھو، کیسے بُرے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں[52]۔ بُری صفات سے متّصف کیے جانے کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ، تو اُس کے لیے سب سے برتر صفات ہیں، وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے۔ ع

اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو رُوئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقتِ مقرر تک مُہلت دیتا ہے، پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لیے تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لیے انھیں ناپسند ہیں،

یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کو بھی وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

۵۱- یعنی بیٹے۔

۵۲- یعنی اپنے لیے جس بیٹی کو یہ لوگ اس قدر موجبِ ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسی کو خدا کے لیے بلا تأمل تجویز کر دیتے ہیں۔ قطعِ نظر اس سے کہ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا بجائے خود ایک شدید جہالت اور گستاخی ہے، مشرکینِ عرب کی اس حرکت پر یہاں اِس خاص پہلو سے گرفت اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ کے متعلق اُن کے تصور کی پستی واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ مشرکانہ عقائد نے اللہ کے معاملے میں ان کو کس قدر جری اور گستاخ بنا دیا ہے اور وہ کس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے کوئی قباحت تک محسوس نہیں کرتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ تَصِفُ اَلۡسِنَتُهُمُ الۡكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الۡحُسۡنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ
لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ ﴿۶۲﴾ تَاللّٰهِ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤى
اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُوَ
وَلِيُّهُمُ الۡيَوۡمَ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ
الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ۙ وَهُدًى وَّ
رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَاللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

اور جھوٹ کہتی ہیں اِن کی زبانیں کہ ان کے لیے بھلا ہی بھلا ہے۔ اِن کے لیے تو ایک ہی چیز ہے، اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ضرور یہ سب سے پہلے اُس میں پہنچائے جائیں گے۔

خدا کی قسم، اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے اُن کے بُرے کرتوت اُنھیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انھوں نے مان کر نہ دی)۔ وہی شیطان آج اِن لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہُوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم اُن اختلافات کی حقیقت اِن پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اُتری ہے اُن لوگوں کے لیے جو اِسے مان لیں۔[۵۳]

(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مُردہ پڑی ہوئی زمین میں اُس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے

۵۳- دوسرے الفاظ میں، اس کتاب کے نزول سے اِن لوگوں کو اس بات کا بہترین موقع ملا ہے کہ اوہام اور تقلیدی تخیُّلات کی بنا پر جن بے شمار مختلف مسلکوں اور مذہبوں میں یہ بٹ گئے ہیں، اُن کے بجائے صداقت کی ایک ایسی پائدار بنیاد پالیں جس پر یہ سب متفق ہو سکیں۔ اب جو لوگ اِتنے بے وقوف ہیں کہ اِس نعمت کے آ جانے پر بھی اپنی پچھلی حالت

ع ۸ ۱۵

لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ ع وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا
فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾
وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا

سُننے والوں کے لیے[۵۳ الف] ع

اور تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ اُن کے پیٹ سے گوبر اور خُون کے درمیان ہم ایک چیز تمھیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دُودھ[۵۴]، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔ (اسی طرح) کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمھیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور

ہی کو ترجیح دے رہے ہیں، وہ تباہی اور ذلت کے سوا اور کوئی انجام دیکھنے والے نہیں ہیں۔ اب تو سیدھا راستہ وہی پائے گا اور وہی برکتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہوگا جو اس کتاب کو مان لے گا۔

۵۳، الف۔ یعنی یہ منظر ہر سال تمھاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھوس ہے، نہ بیل بُوٹے، نہ پھول پتّی، اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آ گیا اور ایک دو چھینٹے پڑتے ہی اُسی زمین سے زندگی کے چشمے اُبلنے شروع ہو گئے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکا یک جی اُٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہو گئی جو پچھلی برسات میں پیدا ہونے کے بعد مر چکی تھی۔ بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گرمی کے زمانے میں باقی نہ رہا تھا، یکا یک پھر اُسی شان سے نمودار ہو گئے جیسے پچھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو، اور پھر بھی تمھیں نبیؐ کی زبان سے یہ سُن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمھارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سا مشاہدہ ہے۔ تم کائنات کے کرشموں کو تو دیکھتے ہو، مگر اُن کے پیچھے خالق کی قدرت اور حکمت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبیؐ کا بیان سُن کر تمھارا دل نہ پکار اُٹھتا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اُس کے بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

۵۴ – ”گوبر اور خون کے درمیان“ کا مطلب یہ ہے کہ جانور جو غذا کھاتے ہیں، اُس سے ایک طرف تو خون بنتا ہے، اور دوسری طرف فُضلہ۔ مگر انھی جانوروں کی صنفِ اُناث میں اُسی غذا سے ایک تیسری چیز بھی پیدا ہو جاتی ہے جو خاصیت، رنگ و بُو، فائدے اور مقصد میں اِن دونوں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر خاص طور پر مویشیوں میں اس چیز کی پیداوار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان کے لیے بھی یہ بہترین غذا کثیر مقدار میں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۶۷ وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ

بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔[55] یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔

اور دیکھو، تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی[56] کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور ٹٹیوں

۵۵ – اس میں ایک ضمنی اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ پھلوں کے اِس عرق میں وہ مادّہ بھی موجود ہے جو انسان کے لیے حیات بخش غذا بن سکتا ہے، اور وہ مادّہ بھی موجود ہے جو سڑ کر الکحل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی قوتِ انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اس سرچشمے سے پاک رزق حاصل کرتا ہے یا عقل و خرد زائل کر دینے والی شراب۔ ایک اور ضمنی اشارہ شراب کی حُرمت کی طرف بھی ہے کہ وہ پاک رزق نہیں ہے۔

۵۶ – وحی کے لُغوی معنیٰ ہیں خفیہ اور لطیف اشارے کے، جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ اِلقا (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے، وہ چونکہ کسی مکتب و درس گاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور اِلقا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظِ وحی، انبیا کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ الہام کو اولیا اور بندگانِ خدا کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اور اِلقا نسبتاً عام ہے۔

لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے، جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا حٰم السجدہ)۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے، جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے (یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا ۝ الزلزال)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں (اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ، الانفال)۔ شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام وحی (فطری تعلیم) کے ذریعے سے سکھایا جاتا ہے، جیسا کہ آیتِ زیرِ بحث میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اُڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحیِ خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو غور و فکر اور تحقیق و تجسُّس کے بغیر جو صحیح تدبیر، یا صائب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سُجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ، القصص) اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے اکتشافات ہوئے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبّرین، فاتحین، مفکّرین اور مصنّفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں، اُن سب میں اس وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اِس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں

وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ
رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ
شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چُوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ[۵۷]۔ اِس مکّھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے[۵۸]۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں[۵۹]۔

ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوجھ گئی، یا خواب میں کچھ دیکھ لیا، اور بعد میں تجرِبے سے پتا چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انھیں حاصل ہوئی تھی۔

ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیا علیہم السلام نوازے جاتے ہیں، اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شُعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آ رہی ہے۔ اُسے اس کے مِن جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے، اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی رہنمائی کرے۔

۵۷- ''رب کی ہموار کی ہوئی راہوں'' کا اشارہ اُس پورے نظام اور طریقِ کار کی طرف ہے جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک گروہ کام کرتا ہے۔ ان کے چھتّوں کی ساخت، ان کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیمِ کار، ان کی فراہمیِ غذا کے لیے پیہم آمد و رفت، ان کا باقاعدگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو ان کے عمل کے لیے ان کے رب نے اس طرح ہموار کر دی ہیں کہ انھیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرر نظام ہے جس پر ایک لگے بندھے طریقے پر عَسکر کے یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزار ہا برس سے کام کیے چلے جا رہے ہیں۔

۵۸- شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے اندر شفا ہونا نسبتاً ایک مخفی بات ہے، اِس لیے اس پر مُتنَبِّہ کر دیا گیا۔ شہد اوّل تو بعض امراض میں بجائے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر پھولوں اور پھلوں کا رس، اور ان کا گلوکوز اپنی بہترین شکل میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصّہ کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدّت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ الکحل کے بجائے دنیا کے فنِّ دواسازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ مزید برآں شہد کی مکّھی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے جہاں کوئی خاص جڑی بُوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ

اور دیکھو، اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے[۶۰]، اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو

ہوتا بلکہ اس جڑی بُوٹی کا بہترین جوہر بھی ہوتا ہے اور اُس مرض کے لیے مفید ہوتا ہے جس کی دوا اُس جڑی بُوٹی میں خدا نے پیدا کی ہے۔ شہد کی مکھی سے یہ کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شہد علیحدہ علیحدہ محفوظ کیے جائیں، تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شہد لیبارٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

۵۹ – اِس پورے بیان سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دوسرے جُز کی صداقت ثابت کرنا ہے۔ کفار و مشرکین دو ہی باتوں کی وجہ سے آپؐ کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ آپؐ آخرت کی زندگی کا تصور پیش کرتے ہیں جو اخلاق کے پورے نظام کا نقشہ بدل ڈالتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ صرف ایک اللہ کو معبُود اور مُطاع اور مشکل کُشا و فریاد رس قرار دیتے ہیں، جس سے وہ پورا نظامِ زندگی غلط قرار پاتا ہے جو شرک یا دہریت کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ دعوتِ محمّدی کے اِنھی دونوں اجزا کو برحق ثابت کرنے کے لیے یہاں آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بیان کا مدعا یہ ہے کہ اپنے گردوپیش کی دنیا پر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، یہ آثار جو ہر طرف پائے جاتے ہیں، نبیؐ کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں یا تمھارے اَوہام و تخیلات کی؟ نبی کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جاؤ گے۔ تم اسے ایک اَن ہونی بات قرار دیتے ہو۔ مگر زمین ہر بارش کے موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اعادۂ خلق نہ صرف ممکن ہے بلکہ روز تمھاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ نبیؐ کہتا ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ تمھارے دہریے اس بات کو ایک بے ثبوت دعوٰی قرار دیتے ہیں۔ مگر مویشیوں کی ساخت، کھجوروں اور انگوروں کی بناوٹ اور شہد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور ربِّ رحیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے، ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ اتنے جانور اور اتنے درخت اور اتنی مکھیاں مل جُل کر انسان کے لیے ایسی ایسی نفیس اور لذیذ اور مفید چیزیں اس باقاعدگی کے ساتھ پیدا کرتی رہتیں۔ نبیؐ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی تمھاری پرستش اور حمد و ثنا اور شکر و وفا کا مستحق نہیں ہے۔ تمھارے مشرکین اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اپنے بہت سے معبُودوں کی نذر و نیاز بجا لانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر تم خود ہی بتاؤ کہ یہ دودھ اور یہ کھجوریں اور یہ انگور اور یہ شہد، جو تمھاری بہترین غذائیں ہیں، خدا کے سوا اور کس کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں؟ کس دیوی یا دیوتا یا ولی نے تمھاری رزق رسانی کے لیے یہ انتظامات کیے ہیں؟

۶۰ – یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تمھاری پرورش اور رزق رسانی کا سارا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے بلکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ تمھاری زندگی اور موت، دونوں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے کا اختیار رکھتا ہے نہ موت دینے کا۔

ع ۹ ۱۵ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَ
اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا
بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ
اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ

پہنچا دیا جاتا ہے، تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے[۶۱]۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی ع

اور دیکھو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔ پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے، وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصّہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے اِن لوگوں کو انکار ہے[۶۲]؟

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں، اور اسی نے

---

۶۱ – یعنی یہ علم جس پر تم ناز کرتے ہو اور جس کی بدولت ہی زمین کی دوسری مخلوقات پر تم کو شرف حاصل ہے، یہ بھی خدا کا بخشا ہُوا ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے یہ عبرت ناک منظر دیکھتے رہتے ہو کہ جب کسی انسان کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ لمبی عمر دے دیتا ہے تو وہی شخص جو کبھی جوانی میں دوسروں کو عقل سکھاتا تھا، کس طرح گوشت کا ایک لوتھڑا بن کر رہ جاتا ہے جسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا۔

۶۲ – زمانۂ حال میں اس آیت سے جو عجیب و غریب معنٰی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن کی آیات کو ان کے سِیاق و سَباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنٰی لینے سے کیسی کیسی لاطائل تاویلوں کا دروازہ کُھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفۂ معیشت کی اصل اور قانونِ معیشت کی ایک اہم دفعہ ٹھیرایا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو، انھیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی طرف ضرور لوٹا دینا چاہیے، اگر نہ لوٹائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے۔ حالانکہ اس پورے سلسلۂ کلام میں قانونِ معیشت کے بیان کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اُوپر سے تمام تقریر شرک کے اِبطال اور توحید کے اثبات میں ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی مسلسل یہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یکایک قانونِ معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر

Maktaba Tul Ishaat.com

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ

ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔

کون سا تک ہے؟ آیت کو اس کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں اِستدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جب برابر کا درجہ نہیں دیتے ــــ حالانکہ یہ مال خدا کا دیا ہُوا ہے ــــ تو آخر کس طرح یہ بات تم صحیح سمجھتے ہو کہ جو احسانات اللہ نے تم پر کیے ہیں، ان کے شکریے میں اللہ کے ساتھ اس کے بے اختیار غلاموں کو بھی شریک کرلو اور اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھو کہ اختیارات اور حقوق میں اللہ کے یہ غلام بھی اس کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں؟

ٹھیک یہی استدلال، اسی مضمون سے سورۂ روم، آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے۔ وہاں اس کے الفاظ یہ ہیں: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ”اللہ تمھارے سامنے ایک مثال خود تمھاری اپنی ذات سے پیش کرتا ہے۔ کیا تمھارے اُس رزق میں جو ہم نے تمھیں دے رکھا ہے، تمھارے غلام تمھارے شریک ہیں حتّٰی کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں؟ اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنے برابر والوں سے ڈرا کرتے ہو؟ اس طرح اللہ کھول کھول کر نشانیاں پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

دونوں آیتوں کا تقابُل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی مثال سے استدلال کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسری کی تفسیر کر رہی ہے۔

شاید لوگوں کو غلط فہمی اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ انھوں نے تمثیل کے بعد متصلاً یہ فقرہ دیکھ کر خیال کیا کہ ہو نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اپنے زیردستوں کی طرف رزق نہ پھیر دینا ہی اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ حالانکہ جو شخص قرآن میں کچھ بھی نظر رکھتا ہے، وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ غیر اللہ کو ادا کرنا اس کتاب کی نگاہ میں اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے۔ یہ مضمون اس کثرت سے قرآن میں دُہرایا گیا ہے کہ تلاوت و تدبُّر کی عادت رکھنے والوں کو تو اس میں اشتباہ پیش نہیں آ سکتا، البتہ انڈکسوں کی مدد سے اپنے مطلب کی آیات نکال کر مضامین تیار کرنے والے حضرات اس سے ناواقف ہو سکتے ہیں۔

نعمتِ الٰہی کے انکار کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس فقرے کا یہ مطلب صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جب یہ لوگ مالک اور مملوک کا فرق خوب جانتے ہیں، اور خود اپنی زندگی میں ہر وقت اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں، تو کیا پھر ایک اللہ ہی کے معاملے میں انھیں اس بات پر اصرار ہے کہ اُس کے بندوں کو اس کا شریک و سہیم ٹھیرائیں اور جو نعمتیں انھوں نے اُس سے پائی ہیں، اُن کا شکریہ اُس کے بندوں کو ادا کریں؟

أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿٧٢﴾ وَيَعْبُدُونَ
مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں[۶۳] اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پُوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انھیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین[۶۴] سے،

۶۳- ''باطل کو مانتے ہیں''، یعنی یہ بے بنیاد اور بے حقیقت عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا، ان کی مرادیں بَر لانا اور دُعائیں سننا، انھیں اولاد دینا، ان کو روزگار دلوانا، ان کے مقدّمے جتوانا، اور انھیں بیماریوں سے بچانا کچھ دیویوں اور دیوتاؤں اور جِنّوں اور اگلے پچھلے بزرگوں کے اختیار میں ہے۔

۶۴- اگرچہ مشرکینِ مکّہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، اور اِن نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انھیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انھوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اِس نعمت بخشی میں دخیل اور حصّہ دار ٹھیرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن ''اللہ کے احسان کا انکار'' قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کُلِّیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اُصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فُلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سِفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

یہ دونوں اُصولی باتیں سراسر انصاف اور عقلِ عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود بادنیٰ تأمّل ان کی معقولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت اُٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرے آدمی کا شکریہ ادا کر دیتا ہے جس کا اس امداد میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخ دلی کی بنا پر اُس کی اِس بیہودگی کو نظر انداز کر دیں اور آیندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اُس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، درآں حالے کہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لامحالہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اُس کی اِس بیہودہ تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہوگا کہ وہ آپ سے سخت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں، بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، چند لگے بندھے دوستوں کے توسُّل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد اُن دوستوں کی خاطر کر دیتے ہیں، ورنہ آپ

Maktaba Tul Ishaat.com

شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا
لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ
مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں؟ پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو،[۶۵] اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔[۶۶] ایک تو ہے غلام، جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کُھلے اور چُھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟[۶۷] ــــ الحمدللہ! مگر اکثر لوگ (اس سیدھی

کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہوسکتا۔

۶۵ – ''اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو''، یعنی اللہ کو دنیوی بادشاہوں اور راجوں اور مہاراجوں پر قیاس نہ کرو کہ جس طرح کوئی ان کے مصاحبوں اور مُقرّبِ بارگاہ ملازموں کے توسُّط کے بغیر اُن تک اپنی عرض معروض نہیں پہنچا سکتا اسی طرح اللہ کے متعلق بھی تم یہ گمان کرنے لگو کہ وہ اپنے قصرِ شاہی میں ملائکہ اور اولیا اور دوسرے مقربین کے درمیان گِھرا بیٹھا ہے اور کسی کا کوئی کام ان واسطوں کے بغیر اس کے ہاں سے نہیں بن سکتا۔

۶۶ – یعنی اگر مثالوں ہی سے بات سمجھنی ہے تو اللہ صحیح مثالوں سے تم کو حقیقت سمجھاتا ہے۔ تم جو مثالیں دے رہے ہو وہ غلط ہیں، اس لیے تم ان سے غلط نتیجے نکال بیٹھتے ہو۔

۶۷ – سوال اور الحمدللہ کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، جسے بھرنے کے لیے خود لفظ الحمدللہ ہی میں بلیغ اشارہ موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نبیؐ کی زبان سے یہ سوال سُن کر مشرکین کے لیے اس کا یہ جواب دینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ دونوں برابر ہیں۔ لامحالہ اس کے جواب میں کسی نے صاف صاف اقرار کیا ہوگا کہ واقعی دونوں برابر نہیں ہیں، اور کسی نے اس اندیشے سے خاموشی اختیار کر لی ہوگی کہ اقراری جواب دینے کی صورت میں اُس کے منطقی نتیجے کا بھی اقرار کرنا ہوگا اور اس سے خود بخود اُن کے شرک کا اِبطال ہو جائے گا۔ لہٰذا نبیؐ نے دونوں کا جواب پا کر فرمایا: الحمدللہ۔ اقرار کرنے والوں کے اقرار پر بھی الحمدللہ، اور خاموش رہ جانے والوں کی خاموشی پر بھی الحمدللہ۔ پہلی صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ''خدا کا شکر ہے، اتنی بات تو تمھاری سمجھ میں آئی''۔ دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ''خاموش ہوگئے؟ الحمدلِلہ، اپنی ساری ہٹ دھرمیوں کے باوجود

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا
يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ
بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ ع وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ

ع ۱۰ ۱۶

بات کو) نہیں جانتے۔[۶۸]

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے آقا پر بوجھ بنا ہُوا ہے، جدھر بھی وہ اسے بھیجے، کوئی بھلا کام اُس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہِ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟[۶۹] ع

اور زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔[۷۰] اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا

دونوں کو برابر کہہ دینے کی ہمت تم بھی نہ کر سکے۔"

۶۸ – یعنی باوجودیکہ انسانوں کے درمیان وہ صریح طور پر بااختیار اور بے اختیار کے فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور اس فرق کو ملحوظ رکھ کر ہی دونوں کے ساتھ الگ الگ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، پھر بھی وہ ایسے جاہل و نادان بنے ہوئے ہیں کہ خالق اور مخلوق کا فرق ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ خالق کی ذات اور صفات اور حُقوق اور اختیارات، سب میں وہ مخلوق کو اس کا شریک سمجھ رہے ہیں اور مخلوق کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں جو صرف خالق کے ساتھ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ عالمِ اسباب میں کوئی چیز مانگنی ہو تو گھر کے مالک سے مانگیں گے نہ کہ گھر کے غلام سے۔ مگر مَبْدءِ فیض سے حاجات طلب کرنی ہوں تو کائنات کے مالک کو چھوڑ کر اس کے بندوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیں گے۔

۶۹ – پہلی مثال میں اللہ اور بناوٹی معبُودوں کے فرق کو صرف اختیار اور بے اختیاری کے اعتبار سے نمایاں کیا گیا تھا۔ اب اس دوسری مثال میں وہی فرق اور زیادہ کھول کر صفات کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اِن بناوٹی معبُودوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک بااختیار مالک ہے اور دوسرا بے اختیار غلام، بلکہ مزید برآں یہ فرق بھی ہے کہ یہ غلام نہ تمھاری پکار سنتا ہے، نہ اس کا جواب دے سکتا ہے، نہ کوئی کام بااختیارِ خود کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا سارا انحصار اُس کے آقا کی ذات پر ہے۔ اور آقا اگر کوئی کام اس پر چھوڑ دے تو وہ کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ بخلاف اس کے، آقا کا حال یہ ہے کہ صرف ناطق ہی نہیں، ناطقِ حکیم ہے، دنیا کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ اور صرف فاعلِ مختار

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۷۷﴾
وَاللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ
لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾

مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے، بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔[۷۱] حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمھیں کان دیے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیے،[۷۲] اس لیے کہ تم شکر گزار بنو۔[۷۳]

ہی نہیں، فاعلِ برحق ہے، جو کچھ کرتا ہے راستی اور صحت کے ساتھ کرتا ہے۔ بتاؤ یہ کون سی دانائی ہے کہ تم ایسے آقا اور ایسے غلام کو یکساں سمجھ رہے ہو؟

۷۰ – بعد کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل جواب ہے کفارِ مکّہ کے اُس سوال کا جو وہ اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے کہ اگر واقعی وہ قیامت آنے والی ہے جس کی تم ہمیں خبر دیتے ہو تو آخر وہ کس تاریخ کو آئے گی۔ یہاں اُن کے سوال کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

۷۱ – یعنی قیامت رفتہ رفتہ کسی طویل مدّت میں واقع نہ ہوگی، نہ اس کی آمد سے پہلے تم دُور سے اس کو آتے دیکھو گے کہ سنبھل سکو اور کچھ اس کے لیے تیاری کر سکو۔ وہ تو کسی روز اچانک چشم زدن میں، بلکہ اس سے بھی کم مدّت میں آ جائے گی۔ لہٰذا جس کو غور کرنا ہو سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، اور اپنے رَوِیّے کے متعلق جو فیصلہ بھی کرنا ہو جلدی کر لے۔ کسی کو اِس بھروسے پر نہ رہنا چاہیے کہ ابھی تو قیامت دُور ہے، جب آنے لگے گی تو اللہ سے معاملہ دُرست کر لیں گے ـــــ توحید کی تقریر کے درمیان یکایک قیامت کا یہ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگ توحید اور شرک کے درمیان کسی ایک عقیدے کے انتخاب کے سوال کو محض ایک نظری سوال نہ سمجھ بیٹھیں۔ انھیں یہ احساس رہنا چاہیے کہ ایک فیصلے کی گھڑی کسی نامعلوم وقت پر اچانک آ جانے والی ہے اور اُس وقت اِسی انتخاب کے صحیح یا غلط ہونے پر آدمی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہوگا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہو جاتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۷۲ – یعنی وہ ذرائع جن سے تمھیں دنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دنیا کے کام چلا سکو۔ انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے، اتنا کسی جانور کا نہیں ہوتا۔ مگر یہ صرف اللہ کے دیے ہوئے ذرائعِ علم (سماعت، بینائی اور تعقّل و تفکّر) ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجوداتِ ارضی پر حکمرانی کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔

۷۳ – یعنی اُس خدا کے شکر گزار جس نے یہ بے بہا نعمتیں تم کو عطا کیں۔ اِن نعمتوں کی اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ
اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ اللّٰہُ
جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ
الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ
اِقَامَتِکُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا
وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۸۰﴾ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا
وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ

کیا اِن لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخّر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے اِن کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو جائے سُکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمھارے لیے ایسے مکان پیدا کیے[۷۴] جنھیں تم سفر اور قیام، دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔[۷۵] اُس نے جانوروں کے صُوف اور اُون اور بالوں سے تمھارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدّتِ مقررہ تک تمھارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمھارے لیے سایے کا انتظام کیا، پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائیں، اور تمھیں ایسی

ہو سکتی ہے کہ اِن کانوں سے آدمی سب کچھ سنے مگر ایک خدا ہی کی بات نہ سنے، اِن آنکھوں سے سب کچھ دیکھے مگر ایک خدا ہی کی آیات نہ دیکھے، اور اس دماغ سے سب کچھ سوچے مگر ایک یہی بات نہ سوچے کہ میرا وہ محسن کون ہے جس نے یہ انعامات مجھے دیے ہیں۔

۷۴ – یعنی چمڑے کے خیمے جن کا رواج عرب میں بہت ہے۔

۷۵ – یعنی جب کوچ کرنا چاہتے ہو تو انھیں آسانی سے تہ کر کے اُٹھا لے جاتے ہو، اور جب قیام کرنا چاہتے ہو تو

Maktaba Tul Ishaat.com

سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ ۚ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ

پوشاکیں بخشیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں[۷۶] اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمھاری حفاظت کرتی ہیں[۷۷]۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے[۷۸]، شاید کہ تم فرماں بردار بنو۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے محمدؐ! تم پر صاف صاف پیغامِ حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں[۷۹]۔ اور اِن میں بیش تر لوگ ایسے

آسانی سے اُن کو کھول کر ڈیرا جما لیتے ہو۔

۷۶ – سردی سے بچانے کا ذکر یا تو اس لیے نہیں فرمایا کہ گرمی میں کپڑوں کا استعمال انسانی تمدّن کا تکمیلی درجہ ہے، اور درجۂ کمال کا ذکر کر دینے کے بعد ابتدائی درجات کے ذکر کی حاجت نہیں رہتی، یا پھر اسے خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جن ملکوں میں نہایت مہلک قسم کی بادِ سموم چلتی ہے وہاں سردی کے لباس سے بھی بڑھ کر گرمی کا لباس اہمیّت رکھتا ہے۔ ایسے ممالک میں اگر آدمی سر، گردن، کان اور سارا جسم اچھی طرح ڈھانک کر نہ نکلے تو گرم ہوا اُسے جُھلس کر رکھ دے، بلکہ بعض اوقات تو آنکھوں کو چھوڑ کر پورا منہ تک لپیٹ لینا پڑتا ہے۔

۷۷ – یعنی زرہ بکتر۔

۷۸ – اِتمامِ نعمت یا تکمیلِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی ضروریات کا پوری جُزرسی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام فرماتا ہے۔ مثلاً اِسی معاملے کو لیجیے، کہ خارجی اثرات سے انسان کے جسم کی حفاظت مطلوب تھی۔ اس کے لیے اللہ نے کس کس پہلو سے کتنا کتنا اور کیسا کچھ سروسامان پیدا کیا، اس کی تفصیلات اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جائے۔ یہ گویا لباس اور مکان کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اِتمام ہے۔ یا مثلاً تغذیے کے معاملے کو لیجیے۔ اس کے لیے کتنے بڑے پیانے پر کیسے کیسے تنوّعات کے ساتھ کیسی کیسی جُزئی ضرورتوں تک کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ نے بے حد و حساب ذرائع فراہم کیے، اُن کا اگر کوئی جائزہ لینے بیٹھے تو شاید محض اقسامِ غذا اور اشیائے غذا کی فہرست ہی ایک ضخیم مُجلّد بن جائے۔ یہ گویا تغذیے کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔ اِسی طریقے سے اگر انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر گوشے میں اللہ نے ہم پر اپنی نعمتوں کا اِتمام کر رکھا ہے۔

ع
الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا
الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ

ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔[79]

(انھیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اُس روز کیا بنے گی) جب کہ ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ[80] کھڑا کریں گے، پھر کافروں کو نہ حجّتیں پیش کرنے کا موقع دیا[81] جائے گا نہ ان سے توبہ واِستغفار ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔[82] ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ اُن کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انھیں ایک لمحہ بھر کی مُہلت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنھوں نے

۷۹ – انکار سے مراد وہی طرزِ عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفارِ مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سارے احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں، مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات اُن کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مداخلت سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکریہ اللہ کے ساتھ، بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر اُن مُتوسِّط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اِسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور احسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔

۸۰ – یعنی اُس اُمت کا نبی، یا کوئی ایسا شخص جس نے نبی کے گزر جانے کے بعد اس اُمّت کو توحید اور خالص خدا پرستی کی دعوت دی ہو، شرک اور مشرکانہ اَوہام و رُسوم پر مُتنبّہ کیا ہو، اور روزِ قیامت کی جواب دِہی سے خبردار کر دیا ہو۔ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ میں نے پیغامِ حق اِن لوگوں کو پہنچا دیا تھا، اس لیے جو کچھ انھوں نے کیا، وہ ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ جانتے بُوجھتے کیا۔

۸۱ – یہ مطلب نہیں ہے کہ انھیں صفائی پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے جرائم ایسی صریح ناقابلِ انکار اور ناقابلِ تاویل شہادتوں سے ثابت کر دیے جائیں گے کہ ان کے لیے صفائی پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔

۸۲ – یعنی اُس وقت اُن سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اب اپنے رب سے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لو۔ کیونکہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، معافی طلب کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ قرآن اور حدیث دونوں اس معاملے میں ناطق ہیں کہ توبہ واِستغفار کی جگہ دنیا ہے نہ کہ آخرت۔ اور دنیا میں بھی اس کا موقع صرف اُسی وقت تک ہے جب تک آثارِ موت طاری نہیں ہو جاتے۔ جس وقت آدمی کو یقین ہو جائے کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے، اُس وقت کی توبہ نا قابلِ قبول ہے۔ موت کی سرحد میں داخل

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا
الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ۚ ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

دنیا میں شرک کیا تھا، اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: ”اے پروردگار! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنھیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔“ اس پر اُن کے وہ معبود انھیں صاف جواب دیں گے کہ ”تم جھوٹے ہو۔“[۸۳] اُس وقت یہ سب اللہ کے آگے جُھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افترا پردازیاں رفو چکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔[۸۴] جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا، انھیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے،[۸۵] اُس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے۔

ہوتے ہی آدمی کی مُہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے اور صرف جزا و سزا ہی کا استحقاق باقی رہ جاتا ہے۔

۸۳ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بجائے خود اِس واقعے کا انکار کریں گے کہ مشرکین انھیں حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ اس واقعے کے متعلق اپنے علم و اطلاع اور اس پر اپنی رضامندی و ذمہ داری کا انکار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارا کرو، نہ ہم تمھاری اس حرکت پر راضی تھے، بلکہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہمیں پکار رہے ہو۔ تم نے اگر ہمیں سمیع الدّعا اور مجیب الدعوات، اور دستگیر و فریاد رس قرار دیا تھا تو یہ قطعی ایک جھوٹی بات تھی جو تم نے گھڑ لی تھی اور اس کے ذمہ دار تم خود تھے۔ اب ہمیں اس کی ذمہ داری میں لپیٹنے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

۸۴ – یعنی وہ سب غلط ثابت ہوں گی۔ جن جن سہاروں پر وہ دنیا میں بھروسا کیے ہوئے تھے، وہ سارے کے سارے گم ہو جائیں گے۔ کسی فریاد رس کو وہاں فریاد رسی کے لیے موجود نہ پائیں گے۔ کوئی مشکل کُشا ان کی مشکل حل کرنے کے لیے نہیں ملے گا۔ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ یہ میرے مُتوسّل تھے، انھیں کچھ نہ کہا جائے۔

۸۵ – یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا، اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہِ خدا سے روکنے کا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا
بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ
وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ
وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ

ع ١٢ ۔ ١٨

(اے محمدؐ! انھیں اُس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر اُمّت میں خود اُسی کے اندر سے ایک گواہ اُٹھا کھڑا کریں گے جو اُس کے مقابلے میں شہادت دے گا، اور اِن لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمھیں لائیں گے۔ اور (یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے[٨٦] اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے سرِتسلیم خم کر دیا ہے۔[٨٧] ع
اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے[٨٨] اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے

٨٦ – یعنی ہر ایسی چیز کی وضاحت جس پر ہدایت و ضلالت اور فلاح و خُسران کا مدار ہے، جس کا جاننا راست روی کے لیے ضروری ہے، جس سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہوتا ہے ـــــ غلطی سے لوگ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور اس کی ہم معنی آیات کا مطلب یہ لے لیتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نباہنے کے لیے قرآن سے سائنس اور فنون کے عجیب عجیب مضامین نکالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

٨٧ – یعنی جو لوگ آج اِس کتاب کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے، ان کو یہ زندگی کے ہر معاملے میں صحیح رہنمائی دے گی، اور اس کی پیروی کی وجہ سے اُن پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی اور انھیں یہ کتاب خوشخبری دے گی کہ فیصلے کے دن اللہ کی عدالت سے وہ کامیاب ہو کر نکلیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسے نہ مانیں گے، وہ صرف یہی نہیں کہ ہدایت اور رحمت سے محروم رہیں گے، بلکہ قیامت کے روز جب خدا کا پیغمبرؑ ان کے مقابلے میں گواہی دینے کھڑا ہو گا تو یہی دستاویز اُن کے خلاف ایک زبردست حجت ہو گی۔ کیونکہ پیغمبرؑ یہ ثابت کر دے گا کہ اس نے وہ چیز انھیں پہنچا دی تھی جس میں حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا گیا تھا۔

٨٨ – اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی دُرستی کا انحصار ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

پہلی چیز عدل ہے، جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حُقوق میں توازُن اور تناسُب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اُس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہُوم کو لفظ ''انصاف'' سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ اور پھر اسی سے عدل کے معنٰی مُساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں، جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازُن اور تناسُب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افرادِ معاشرہ میں مُساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوقِ شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مُساوات بالکل خلافِ عدل ہے، مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مُساوات، اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مُساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے، وہ حقوق میں مُساوات نہیں بلکہ توازُن و تناسُب ہے، اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے اخلاقی، معاشرتی، قانونی اور سیاسی و تمدّنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے، جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رَوِیّہ، رواداری، خوش خُلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کی ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کُھرّے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر محبّت اور شُکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا، جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونَما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلۂ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریکِ حال ہو اور جائز حُدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنٰی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے، بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اِس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عُنصرِ ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال

وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ

منع کرتا ہے[۸۹]۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اُوپر

افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق اُن پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدّد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اوّلین حق دار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے، اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اُصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں، اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا ـــــ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (unit) اِس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے، اس میں مَعاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔

۸۹ – اُوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین بُرائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو، اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشاء ہے، جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ بُرائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فُحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عُریانی، عَملِ قومِ لوط، مُحرّمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان بُرے کام کرنا اور بُرائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر اُبھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عُریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمایش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز مُنکَر ہے، جس سے مراد ہر وہ بُرائی ہے جسے انسان بالعُموم بُرا جانتے ہیں، ہمیشہ سے بُرا کہتے رہے ہیں، اور تمام شرائعِ الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بَغی ہے، جس کے معنی ہیں: اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حُقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق

Maktaba Tul Ishaat.com

كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ
غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ
اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ

گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمھارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمھاری حالت اُس عورت کی سی نہ
ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سُوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا[۹۰]۔ تم اپنی
قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو، تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ
کر فائدے حاصل کرے۔ حالاں کہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعے سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے[۹۱]،

خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

۹۰ – یہاں علی الترتیب تین قسم کے مُعاہدوں کو ان کی اہمیّت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک، وہ عہد جو انسان نے خدا کے ساتھ باندھا ہو، اور یہ اپنی اہمیّت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دوسرا، وہ عہد جو ایک انسان یا گروہ نے دوسرے انسان یا گروہ سے باندھا ہو اور اس پر اللہ کی قَسم کھائی ہو، یا کسی نہ کسی طور پر اللہ کا نام لے کر اپنے قول کی پختگی کا یقین دلایا ہو۔ یہ دوسرے درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ تیسرا، وہ عہد و پیمان جو اللہ کا نام لیے بغیر کیا گیا ہو۔ اس کی اہمیّت اُوپر کی دونوں قسموں کے بعد ہے۔ لیکن پابندی ان سب کی ضروری ہے اور خلاف ورزی ان میں سے کسی کی بھی روا نہیں ہے۔

۹۱ – یہاں خُصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اُس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر مُوجبِ فساد ہوتی ہے اور جسے بڑے بڑے اُونچے درجے کے لوگ بھی کارِ ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داد پاتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں کی سیاسی، مَعاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کا لیڈر ایک وقت میں دوسری قوم سے ایک معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد کی خاطر یا تو اسے عَلانِیَہ توڑ دیتا ہے یا درپردہ اس کی خلاف ورزی کر کے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ تک کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راست باز ہوتے ہیں۔ اور ان حرکتوں پر صرف یہی نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اُٹھتی، بلکہ ہر طرف سے اُن کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس طرح کی چالبازیوں کو ڈپلومیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر مُتَنَبِّہ فرماتا ہے کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرنے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے، اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوں گے وہ اللہ کی عدالت میں مؤاخذے سے نہ بچ سکیں گے۔

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ
اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ

اورضرور وہ قیامت کے روز تمھارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔[۹۲] اگر اللہ کی مشیّت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا،[۹۳] مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور

۹۲ – یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمھارے درمیان کش مکش برپا ہے، ان میں برسرِ حق کون ہے اور برسرِ باطل کون۔ لیکن بہرحال، خواہ کوئی سراسر حق پر ہی کیوں نہ ہو، اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پرست ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلے میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہوگا، کیونکہ حق پرستی صرف نظریّے اور مقصد ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی، طریقِ کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے۔ یہ بات خُصوصیّت کے ساتھ اُن مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اِس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرف دار ہیں اور ہمارا فریقِ مقابل خدا کا باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقے سے بھی ممکن ہو، زک پہنچائیں۔ ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفائے عہد کا لحاظ رکھیں۔ ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ۔ یعنی مشرکینِ عرب کے معاملے میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے، اُن سے ہر طرح کی خیانت کی جا سکتی ہے، جس چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو زک پہنچے وہ بالکل روا ہے، اس پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔

۹۳ – یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرف دار سمجھ کر بھلے اور بُرے ہر طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا اختیار چھین لیا جائے اور چار و ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ کو اپنے نام نہاد ”طرف داروں“ کی اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن و فرماں بردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟

Maktaba Tul Ishaat.com

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا
اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ
بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا
تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ

جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے،[۹۴] اور ضرور تم سے تمھارے اعمال کی باز پُرس ہو کر رہے گی۔

(اور اے مسلمانو!) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اُکھڑ جائے[۹۵] اور تم اِس جُرم کی پاداش میں، کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، بُرا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد[۹۶] کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے نہ بیچ ڈالو،[۹۷] جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے،

۹۴ – یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے، اس لیے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں۔ کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے، اور کوئی راہِ راست کا طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرما دیتا ہے۔

۹۵ – یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمھاری بد اخلاقی دیکھ کر اِس دین سے برگشتہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رُک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہو، ان کو اخلاق اور معاملات میں اُس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔

۹۶ – یعنی اُس عہد کو جو تم نے اللہ کے نام پر کیا ہو، یا دینِ الٰہی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہو۔

۹۷ – یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے بڑے فائدے کے بدلے بیچ سکتے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا جو فائدہ بھی ہے وہ اللہ کے عہد کی قیمت میں تھوڑا ہے۔ اس لیے اس بیش بہا چیز کو اس چھوٹی چیز کے عوض بیچنا بہر حال خسارے کا سودا ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوٓا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً
طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٧﴾

اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں[98] کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے[99] اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں[100] گے۔

۹۸- ''صبر سے کام لینے والوں کو''، یعنی اُن لوگوں کو جو ہر طمع اور خواہش اور جذبۂ نفسانی کے مقابلے میں حق اور راستی پر قائم رہیں، ہر اُس نقصان کو برداشت کرلیں جو اِس دنیا میں راست بازی اختیار کرنے سے پہنچتا ہو، ہر اُس فائدے کو ٹھکرا دیں جو دنیا میں ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہو، اور حُسنِ عمل کے مفید نتائج کے لیے اُس وقت تک انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں جو موجودہ دنیوی زندگی ختم ہو جانے کے بعد دوسری دنیا میں آنے والا ہے۔

۹۹- اس آیت میں مسلم اور کافر دونوں ہی گروہوں کے اُن تمام کم نظر اور بے صبر لوگوں کی غلط فہمی دُور کی گئی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی اور دیانت اور پرہیزگاری کی رَوِش اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت چاہے بن جاتی ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے۔ اِس صحیح رَوِیّے سے محض آخرت ہی نہیں بنتی، دنیا بھی بنتی ہے۔ جو لوگ حقیقت میں ایمان دار اور پاک باز اور معاملے کے کھرے ہوتے ہیں ان کی دنیوی زندگی بھی بے ایمان اور بدعمل لوگوں کے مقابلے میں صریحاً بہتر رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچّی عزّت اپنی بے داغ سیرت کی وجہ سے انھیں نصیب ہوتی ہے، وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں انھیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ان لوگوں کو میسّر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گِھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بوریا نشین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اس کا کوئی ادنیٰ سا حصّہ بھی محلوں میں رہنے والے فُسّاق و فُجّار نہیں پا سکتے۔

۱۰۰- یعنی آخرت میں ان کا مرتبہ اُن کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، جس شخص نے دنیا میں چھوٹی اور بڑی، ہر طرح کی نیکیاں کی ہوں گی، اُسے وہ اونچا مرتبہ دیا جائے گا جس کا وہ اپنی بڑی سے بڑی نیکی کے لحاظ سے مستحق ہوگا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ
لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾
اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ
مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔[۱۰۱] اُسے اُن لوگوں پر تسلّط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں۔ع

جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں___اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا

۱۰۱ – اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہہ دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کُن وسوسوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو، قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیُّلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے جو اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابنِ آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رُجوع کرتا ہے تو شیطان اُسے بہکانے اور اخذِ ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی چوکنّا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اُسے اس سرچشمۂ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کر دیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پا سکے گا، اور جو اس کتاب سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکّر سے نہ نکال سکے گی۔

اس سلسلۂ کلام میں یہ آیت جس غرض کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ آگے چل کر اُن اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے جو مشرکینِ مکہ قرآنِ مجید پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے پہلے تمہید کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کی گمراہ کُن وسوسہ اندازیوں سے چوکنّا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾
قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ

نازل کرے ــــــ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔[۱۰۲] اصل بات یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اِسے تو رُوح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے[۱۰۳] تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ

۱۰۲- ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملے میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دودو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زِنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنیٰ لینے میں اس بنا پر تأمّل ہے کہ سورۂ نحل کی یہ آیت مکّی دَور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس دَور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں ’’ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے‘‘ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کے مختلف مَقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصّہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملے کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اُسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مُجمَل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصّل۔ یہی چیز تھی جسے کفارِ مکّہ اِس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا اِستدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علمِ الٰہی ہوتا تو پوری بات بیک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ کوئی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک بیٹھتی نظر نہ آئے تو دوسرے طریقے سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمھارے اس کلام میں نظر آ رہی ہیں۔

۱۰۳- ’’روح القُدُس‘‘ کا لفظی ترجمہ ہے: ’’پاک رُوح‘‘ یا ’’پاکیزگی کی روح‘‘۔ اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریلؑ کو دیا گیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے مقصود سامعین کو اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنا ہے کہ اِس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آ رہی ہے جو بشَری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے۔ نہ کذّاب و مفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے۔ نہ بدنیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝١٠٢ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ
يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ
اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝١٠٣ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

کرے[104] اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے[105] اور انھیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔[106]

ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمھارے متعلّق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔[107] حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی

۱۰۴– یعنی اُس کے بتدریج اِس کلام کو لے کر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوتِ فہم اور قوتِ اخذ میں نقص ہے، جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی ہوئی بات میں پختہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اِس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی اِجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقے سے بات سمجھائے اور کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقے طریقے سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبینِ حق ایمان لاسکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و اِدراک میں پختہ ہوسکیں۔

۱۰۵– یہ اس تدریج کی دوسری مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ جو لوگ ایمان لا کر فرماں برداری کی راہ چل رہے ہیں، ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ نہ اُنھیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہوسکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

۱۰۶– یہ اُس کی تیسری مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ فرماں برداروں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے اور جس جس طرح انھیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کے کام میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِّ راہ ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے، تاکہ وہ پُر اُمید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

۱۰۷– رِوایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ اُن میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴ اِنَّمَا
يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۵ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا
مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ
بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

آیات کو نہیں مانتے اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔ ۱۰۸

جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر)، مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا، اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے

ایک روایت میں اس کا نام جبر بیان کیا گیا ہے، جو عامر بن الحضرمی کا ایک رومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں حُوَیطِب بن عبد العُزّیٰ کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائش یا یَعیش کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یَسار کا نام لیا گیا ہے، جس کی کنیت ابوفُکَیہہ تھی اور جو مکے کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بَلعان یا بَلعام نامی ایک رومی غلام سے متعلق ہے۔ بہرحال ان میں سے جو بھی ہو، کفارِ مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص تورات و انجیل پڑھتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پردازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدروقیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخِ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اس وقت دنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے۔ مگر ان عقل کے اندھوں کو اس کے مقابلے میں ایک عجمی غلام، جو کچھ تورات و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابل تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہرِ نایاب اس کوئلے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ ۙ وَ
اَنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ

بڑا عذاب ہے۔[۱۰۹] یہ اس لیے کہ اُنھوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا، اور اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا جو اُس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے

۱۰۸ – دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”جھوٹ تو وہ لوگ گھڑا کرتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے“۔

۱۰۹ – اس آیت میں اُن مسلمانوں کے معاملے سے بحث کی گئی ہے جن پر اُس وقت سخت مظالم توڑے جا رہے تھے اور ناقابلِ برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر محض جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے ادا کر دو، اور دل تمھارا عقیدۂ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر دل سے تم نے کفر قبول کر لیا تو دنیا میں چاہے جان بچا لو، خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مؤاخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقامِ عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم تِکّا بوٹی کر ڈالا جائے، بہرحال وہ کلمۂ حق ہی کا اعلان کرتا رہے۔ دونوں قسم کی نظیریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف خبّابؓ بن اَرَت ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا، یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلنے سے آگ بجھ گئی، مگر وہ سختی کے ساتھ اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلالؓ حَبَشی ہیں جن کو لوہے کی زرہ پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا، مگر وہ اَحَد اَحَد ہی کہتے رہے۔ حبیب بن زَیدؓ بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عُضو مُسَیلمۂ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مُسَیلمہ کو نبی مان لیں، مگر ہر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے، یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انھوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف عمّار بن یاسرؓ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دے دے کر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابلِ برداشت اذیت دی گئی کہ آخرِ کار انھوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار اُن سے کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا تُرِکْتُ حَتّٰی سَبَبْتُکَ وَذَکَرْتُ اٰلِہَتَہُمْ بِخَیْرٍ۔ ”یا رسولؐ اللہ! مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپؐ کو بُرا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا۔“ حضورؐ نے پوچھا: کَیْفَ تَجِدُ قَلْبَکَ۔ ”اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو؟“ عرض کیا: مُطْمَئِنًّا بِالْاِیْمَانِ۔ ”ایمان پر پوری طرح مطمئن۔“ اس پر حضورؐ نے فرمایا: اِنْ عَادُوْا فَعُدْ۔ ”اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر یہی باتیں کہہ دینا۔“

اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ
مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع يَوْمَ تَاْتِىْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ
نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ

دِلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں[۱۱۰] رہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو اُنھوں نے گھر بار چھوڑ دیے، ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا،[۱۱۱] اُن کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے۔ ع (اِن سب کا فیصلہ اُس دن ہوگا) جب کہ ہر متنفّس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پُورا پُورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائے گا۔

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اُس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔

۱۱۰- یہ فقرے اُن لوگوں کے بارے میں فرمائے گئے ہیں جنھوں نے راہِ حق کو کٹھن پا کر ایمان سے توبہ کر لی تھی اور پھر اپنی کافر و مشرک قوم میں جا ملے تھے۔

۱۱۱- اشارہ ہے مہاجرینِ حبشہ کی طرف۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ
لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ
هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ

تب اللہ نے اس کے باشندوں کو اُن کے کرتُوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بُھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ اُن کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا۔ مگر اُنھوں نے اس کو جُھٹلا دیا۔ آخرِ کار عذاب نے اُن کو آلیا جب کہ وہ ظالم ہو چکے تھے۔[۱۱۲]

پس اَے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو[۱۱۳] اگر تم واقعی اُسی کی بندگی کرنے والے ہو۔[۱۱۴] اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے، وہ ہے مُردار اور خُون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اَور کا نام لیا گیا

۱۱۲ – یہاں جس بستی کی مثال پیش کی گئی ہے، اس کی کوئی نشان دِہی نہیں کی گئی۔ نہ مفسّرین یہ تعیُّن کر سکے ہیں کہ یہ کون سی بستی ہے۔ بظاہر ابنِ عباسؓ ہی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خود مکّے کو نام لیے بغیر مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں خوف اور بھوک کی جس مصیبت کے چھا جانے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد وہ قحط ہوگا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے بعد ایک مدّت تک اہلِ مکہ پر مسلط رہا۔

۱۱۳ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کے نُزول کے وقت وہ قحط ختم ہو چکا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔

۱۱۴ – یعنی اگر واقعی تم اللہ کی بندگی کے قائل ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو حرام وحلال کے خود مختار نہ بنو۔ جس رزق کو اللہ نے حلال وطیّب قرار دیا ہے، اسے کھاؤ اور شکر کرو۔ اور جو کچھ اللہ کے قانون میں حرام وخبیث ہے، اس سے پرہیز کرو۔

بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا
حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ
عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ

ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی اِن چیزوں کو کھا لے، بغیر اس کے کہ وہ قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو، یا حدِ ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے[۱۱۵]۔ اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو[۱۱۶]۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔ دنیا کا عیش چند روزہ ہے۔ آخرِ کار اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔

[۱۱۷] وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے

---

۱۱۵ – یہ حکم سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳، سورۂ مائدہ آیت ۳ اور سورۂ انعام آیت ۱۴۵ میں بھی گزر چکا ہے۔

۱۱۶ – یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظِ دیگر، قانون ساز صرف اللہ ہے۔ دوسرا جو شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جراءت کرے گا، وہ اپنی حد سے تجاوز کرے گا، اِلّا یہ کہ وہ قانونِ الٰہی کو سند مان کر اُس کے فرامین سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہے کہ فُلاں چیز یا فُلاں فعل جائز ہے اور فُلاں ناجائز۔

اِس خود مختارانہ تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور افترا اس لیے فرمایا گیا کہ جو شخص اِس طرح کے احکام لگاتا ہے، اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا: یا وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتابِ الٰہی کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز یا ناجائز کہہ رہا ہے، اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھیرایا ہے۔ یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے، وہ لامحالہ جھوٹ اور اللہ پر افترا ہے۔

۱۱۷ – یہ پورا پیراگراف اُن اعتراضات کے جواب میں ہے جو مذکورۂ بالا حکم پر کیے جا رہے تھے۔ کفارِ

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾
ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا
مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا

کر چکے ہیں[۱۱۸]۔ اور یہ اُن پر ہمارا ظلم نہ تھا بلکہ اُن کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اُوپر کر رہے تھے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر بُرا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب

مکہ کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو تم نے حلال کر رکھا ہے۔ اگر وہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم خود اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اور اگر وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ تمھاری شریعت بھی خدا کی طرف سے ہے تو دونوں میں یہ اختلاف کیسا ہے؟ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں سَبت کی حُرمت کا جو قانون تھا اس کو بھی تم نے اُڑا دیا ہے۔ یہ تمھارا اپنا خود مختارانہ فعل ہے یا اللہ ہی نے اپنی دو شریعتوں میں دو متضاد حکم دے رکھے ہیں؟

۱۱۸ – اشارہ ہے سورۂ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (آیت ۱۴۶) کی طرف، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کے باعث خصوصیت کے ساتھ کون کون سی چیزیں حرام کی گئی تھیں۔

اس جگہ ایک اِشکال پیش آتا ہے۔ سورۂ نحل کی اس آیت میں سورۂ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ لیکن ایک مقام پر سورۂ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (آیت ۱۱۹) اس میں سورۂ نحل کی طرف صاف اشارہ ہے، کیونکہ مکی سورتوں میں سورۂ انعام کے سوا بس یہی ایک سورت ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی سورت پہلے نازل ہوئی تھی اور کون سی بعد میں؟ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورۂ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر کفارِ مکہ نے سورۂ نحل کی ان آیتوں پر وہ اعتراضات وارد کیے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت سورۂ انعام نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے، یعنی سورۂ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اور چونکہ یہ اعتراض سورۂ نحل پر کیا گیا تھا، اس لیے اس کا جواب بھی سورۂ نحل ہی میں جملۂ معترضہ کے طور پر درج کیا گیا۔

ع ۱۵/۱۶

لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیۡفًا ؕ
وَلَمۡ یَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ ۙ شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ ؕ اِجۡتَبٰىهُ
وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَیۡنٰهُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً ؕ
وَاِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ ؕ ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ اَنِ
اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾

اُن کے لیے غفور اور رحیم ہے۔ ع واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک پوری اُمّت تھا،[119] اللہ کا مطیعِ فرمان اور یک سُو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمھاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یک سُو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔[120]

---

۱۱۹ – یعنی وہ اکیلا انسان بجائے خود ایک اُمّت تھا۔ جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا تو ایک طرف وہ اکیلا اسلام کا عَلَم بردار تھا اور دوسری طرف ساری دنیا کفر کی عَلَم بردار تھی۔ اُس اکیلے بندۂ خدا نے وہ کام کیا جو ایک اُمّت کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ ایک پورا ادارہ تھا۔

۱۲۰ – یہ معترضین کے پہلے اعتراض کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کے دو اجزا ہیں: ایک یہ کہ خدا کی شریعت میں تضاد نہیں ہے، جیسا کہ تم نے یہودیوں کے مذہبی قانون اور شریعتِ محمدیؐ کے ظاہری فرق کو دیکھ کر گمان کیا ہے، بلکہ دراصل یہودیوں کو خاص طور پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں چند نعمتوں سے محروم کیا گیا تھا، جن سے دوسروں کو محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا جُز یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ مِلّتِ ابراہیمی میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو یہودیوں کے ہاں حرام ہیں۔ مثلاً یہودی اُونٹ نہیں کھاتے، مگر مِلّتِ ابراہیمی میں وہ حلال تھا۔ یہودیوں کے ہاں شُتُرمرغ، بط، خرگوش وغیرہ حرام ہیں، مگر مِلّتِ ابراہیمی میں یہ سب چیزیں حلال تھیں۔ اس جواب کے ساتھ ساتھ کفارِ مکّہ کو اس بات پر بھی مُتنبّہ کر دیا گیا کہ نہ تم کو ابراہیمؑ سے کوئی واسطہ ہے نہ یہودیوں کو، کیونکہ تم دونوں ہی شرک کر رہے ہو۔ مِلّتِ ابراہیمی کا اگر کوئی صحیح پیرو ہے تو وہ یہ نبیؐ اور اس کے ساتھی ہیں، جن کے عقائد اور اعمال میں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ
لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اُدْعُ
اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ

رہا سَبْت، تو وہ ہم نے اُن لوگوں پر مُسلّط کیا تھا جنھوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا،[۱۲۱] اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اَے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ،[۱۲۲] اور لوگوں سے

۱۲۱ – یہ کفارِ مکّہ کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ اس میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی کہ سَبْت بھی یہودیوں کے لیے مخصوص تھا اور ملّتِ ابراہیمی میں حُرمتِ سبت کا کوئی وجود نہ تھا، کیونکہ اس بات کو خود کفارِ مکّہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے صرف اتنا ہی اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا کہ یہودیوں کے ہاں سبت کے قانون میں جو سختیاں تم پاتے ہو، یہ ابتدائی حکم میں نہ تھیں بلکہ یہ بعد میں یہودیوں کی شرارتوں اور احکام کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ قرآنِ مجید کے اس اشارے کو آدمی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ ایک طرف بائبل کے اُن مقامات کو نہ دیکھے جہاں سبت کے احکام بیان ہوئے ہیں (مثلاً مُلاحظہ ہو: خُروج باب ۲۰، آیت ۸ تا ۱۱۔ باب ۲۳، آیت ۱۲ و ۱۳۔ باب ۳۱، آیت ۱۲ تا ۱۷۔ باب ۳۵، آیت ۲ و ۳۔ گنتی باب ۱۵، آیت ۳۲ تا ۳۶)، اور دوسری طرف اُن جسارتوں سے واقف نہ ہو جو یہودی سبت کی حرمت کو توڑنے میں ظاہر کرتے رہے (مثلاً مُلاحظہ ہو: یَرمیاہ باب ۱۷، آیت ۲۱ تا ۲۷۔ حِزقی اِیل باب ۲۰، آیت ۱۲ تا ۲۴)۔

۱۲۲ – یعنی دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں: ایک حکمت، دوسرے عمدہ نصیحت۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دُھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطَب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ مخاطَب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے اِبطال نہ کیا جائے بلکہ انسان

بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ
سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا
بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾
وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ
ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا

مُباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔[۱۲۳] تمھارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہُوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اَے محمدؐ! صبر سے کام کیے جاؤ ـــــ اور تمھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ـــــ اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں

کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے، اسے بھی اُبھارا جائے اور ان کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اُسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے۔ بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

۱۲۳ – یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کُشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریفِ مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو، بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجے کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے، اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دُور نہ نکل جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۶ ۹ ۲۲

وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿١٢٨﴾ ع

اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔[۱۲۴] ع

۱۲۴- یعنی جو خدا سے ڈر کر ہر قسم کے بُرے طریقوں سے پرہیز کرتے ہیں اور ہمیشہ نیک رَوِیّے پر قائم رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی بُرائی کریں، وہ ان کا جواب بُرائی سے نہیں بلکہ بھلائی ہی سے دیے جاتے ہیں۔

تفہیم القرآن

بنی اِسرائیل

(۱۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

بنی اسرائیل

نام آیت ۴ کے فقرے وَ قَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ سے ماخوذ ہے۔ مگر اِس میں موضوعِ بحث بنی اسرائیل نہیں ہیں، بلکہ یہ نام بھی اکثر قرآنی سورتوں کی طرح صرف علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول پہلی ہی آیت اس بات کی نشان دہی کر دیتی ہے کہ یہ سورت معراج کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ معراج کا واقعہ حدیث اور سیرت کی اکثر روایات کے مطابق ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا، اِس لیے یہ سورت بھی انھی سورتوں میں سے ہے جو مکّی دَور کے آخری زمانے میں نازل ہوئیں۔

پس منظر اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ آپؐ کے مخالفین آپؐ کا راستہ روکنے کے لیے سارے جتن کر چکے تھے۔ مگر ان کی تمام مزاحمتوں کے باوجود آپؐ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا تھا جس میں دو چار آدمی آپؐ کی دعوت سے متأثّر نہ ہو چکے ہوں۔ خود مکّے میں ایسے مخلص لوگوں کا ایک مختصر جتھا بن چکا تھا جو ہر خطرے کو اِس دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے انگیز کرنے کو تیار تھے۔ مدینے میں اَوس اور خَزرَج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد آپؐ کی حامی بن چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آلگا تھا جب آپؐ کو مکّے سے مدینے کی طرف منتقل ہو جانے اور منتشر مسلمانوں کو سمیٹ کر اسلام کے اُصولوں پر ایک ریاست قائم کر دینے کا موقع ملنے والا تھا۔

اِن حالات میں معراج پیش آئی، اور واپسی پر یہ پیغام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو سنایا۔

موضوع اور مضمون اس سورت میں تنبیہ، تفہیم اور تعلیم، تینوں ایک متناسب انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔

تنبیہ، کفارِ مکّہ کو کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے انجام سے سبق لو اور خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر، جس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آلگا ہے، سنبھل جاؤ، اور اس دعوت کو قبول کر لو جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ مٹا دیے جاؤ گے اور تمھاری جگہ دوسرے لوگ زمین پر بسائے جائیں گے۔ نیز ضمناً بنی اسرائیل کو بھی، جو ہجرت کے بعد عنقریب زبانِ وحی کے مُخاطَب ہونے والے تھے، یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلے جو سزائیں تمھیں مل چکی ہیں اُن سے عبرت حاصل کرو

اور اب جو موقع تمھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے مل رہا ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ، یہ آخری موقع بھی اگر تم نے کھو دیا اور پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو دردناک انجام سے دوچار ہو گے۔

تفہیم کے پہلو میں بڑے دلنشین طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ انسانی سعادت و شقاوت اور فلاح و خُسران کا مدار دراصل کن چیزوں پر ہے۔ توحید، معاد، نبوت اور قرآن کے برحق ہونے کی دلیلیں دی گئی ہیں۔ اُن شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو اِن بنیادی حقیقتوں کے بارے میں کفارِ مکّہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اور استدلال کے ساتھ بیچ بیچ میں منکرین کی جہالتوں پر زجر و توبیخ بھی کی گئی ہے۔

تعلیم کے پہلو میں اخلاق اور تمدّن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوتِ محمدی کے پیشِ نظر تھا۔ یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہلِ عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ خاکہ ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کی اور پھر پوری انسانیت کی زندگی کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

اِن سب باتوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ مشکلات کے اس طوفان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے مَوقِف پر جمے رہیں اور کفر کے ساتھ مُصالحت کا خیال تک نہ کریں۔ نیز مسلمانوں کو، جو کبھی کبھی کفار کے ظلم و ستم اور ان کی کج بحثیوں، اور ان کے طوفانِ کِذب و اِفترا پر بے ساختہ جھنجلا اُٹھتے تھے، تلقین کی گئی ہے کہ پورے صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہیں اور تبلیغ و اصلاح کے کام میں اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ اس سلسلے میں اصلاحِ نفس اور تزکیۂ نفس کے لیے اُن کو نماز کا نسخہ بتایا گیا ہے، کہ یہ وہ چیز ہے جو تم کو اُن صفاتِ عالیہ سے مُتّصِف کرے گی جن سے راہِ حق کے مجاہدوں کو آراستہ ہونا چاہیے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب پنج وقتہ نماز پابندیِ اوقات کے ساتھ مسلمانوں پر فرض کی گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رکوعاتہا ۱۲ سُورَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّةٌ ایاتہا ۱۱۱

المنزل ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الجزء ۱۵

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ

پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دُور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔[1] حقیقت میں وہی ہے

۱ - یہ وہی واقعہ ہے جو اصطلاحاً ''معراج'' اور ''اِسراء'' کے نام سے مشہور ہے۔ اکثر اور معتبر رِوایات کی رُو سے یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعے کی تفصیلات بکثرت صحابہؓ سے مروی ہیں جن کی تعداد ۲۵ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے مفصّل ترین رِوایات حضرت اَنسؓ بن مالک، حضرت مالکؓ بن صَعْصَعَہ، حضرت ابو ذرغفاریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ، حضرت حُذَیفہ بن یمانؓ، حضرت عائشہؓ اور متعدّد دوسرے صحابہؓ نے بھی اس کے بعض اجزا بیان کیے ہیں۔

قرآنِ مجید یہاں صرف مسجدِ حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجدِ اقصٰی (یعنی بیت المَقدِس) تک حضوؐر کے جانے کی تصریح کرتا ہے اور اس سفر کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔ اِس سے زیادہ کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ حدیث میں جو تفصیلات آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبریل علیہ السلام آپؐ کو اُٹھا کر مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصٰی تک بُراق پر لے گئے۔ وہاں آپؐ نے انبیا علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر وہ آپؐ کو عالمِ بالا کی طرف لے چلے اور وہاں مختلف طبقاتِ سماوی میں مختلف جلیل القدر انبیا سے آپؐ کی ملاقات ہوئی۔ آخرکار آپؐ انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے اور اس حضوری کے موقع پر دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپؐ کو پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم ہوا۔ اس کے بعد آپؐ بیت المَقدِس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجدِ حرام واپس تشریف لائے۔ اس سلسلے میں بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو جنت اور دوزخ کا بھی مشاہدہ کرایا گیا۔ نیز معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ دوسرے روز جب آپؐ نے اس واقعے کا لوگوں سے ذکر کیا تو کفارِ مکّہ نے اس کا بہت مذاق اُڑایا اور مسلمانوں میں سے بھی بعض کے ایمان متزلزل ہو گئے۔

حدیث کی یہ زائد تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس کے بیان پر اضافہ ہیں، اور ظاہر ہے کہ اضافے کو

قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر کوئی شخص اُن تفصیلات کے کسی حصّے کو نہ مانے جو حدیث میں آئی ہیں تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی، البتہ جس واقعے کی تصریح قرآن کر رہا ہے اس کا انکار موجبِ کفر ہے۔

اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالمِ خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں؟ اور آیا حضورؐ بذاتِ خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپؐ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآنِ مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی سے بیان کی ابتدا کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رونما ہُوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پر دیکھنا یہ اہمیّت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا۔ پھر یہ الفاظ بھی کہ ’’ایک رات اپنے بندے کو لے گیا‘‘ جسمانی سفر پر صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر، یا کشفی سفر کے لیے یہ الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔

اب اگر ایک رات میں ہوائی جہاز کے بغیر مکّہ سے بیت المَقدِس جانا اور آنا اللہ کی قدرت سے ممکن تھا، تو آخر اُن دوسری تفصیلات ہی کو ناممکن کہہ کر کیوں رد کر دیا جائے جو حدیث میں بیان ہوئی ہیں؟ ممکن اور ناممکن کی بحث تو صرف اُس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب کہ کسی مخلوق کے باختیارِ خود کوئی کام کرنے کا معاملہ زیرِ بحث ہو۔ لیکن جب ذکر یہ ہو کہ خدا نے فلاں کام کیا، تو پھر امکان کا سوال وہی شخص اٹھا سکتا ہے جسے خدا کے قادرِ مُطلَق ہونے کا یقین نہ ہو۔ اس کے علاوہ جو دوسری تفصیلات حدیث میں آئی ہیں، ان پر منکرینِ حدیث کی طرف سے متعدّد اعتراضات کیے جاتے ہیں، مگر ان میں سے صرف دو ہی اعتراضات ایسے ہیں جو کچھ وزن رکھتے ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پر مقیم ہونا لازم آتا ہے، ورنہ اس کے حضور بندے کی پیشی کے لیے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقامِ خاص تک لے جایا جاتا؟

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ اور جنّت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کے مبتلائے عذاب ہونے کا معاینہ کیسے کرا دیا گیا جب کہ ابھی بندوں کے مقدّمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے؟ یہ کیا کہ سزا و جزا کا فیصلہ تو ہونا ہے قیامت کے بعد، اور کچھ لوگوں کو سزا دے ڈالی گئی ابھی سے؟

لیکن دراصل یہ دونوں اعتراض بھی قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ پہلا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اِطلاقی شان رکھتا ہے، مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بنا پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سُن اور سمجھ سکے، حالانکہ بجائے خود اس کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے، کیونکہ وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ۝ وَاٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَجَعَلۡنٰهُ هُدًى لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِىۡ وَكِيۡلًا ؕ ۝۲

سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا۔

ہم نے اِس سے پہلے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اُسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعۂ ہدایت بنایا تھا،[۲] اِس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔[۳]

ساری کائنات کو بیک وقت اُس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور باریابی کا بھی ہے کہ خالق بذاتِ خود کسی مقام پر متمکّن نہیں ہے، مگر بندہ اس کی ملاقات کے لیے ایک جگہ کا محتاج ہے جہاں اس کے لیے تجلیات کو مرکوز کیا جائے۔ ورنہ اُس کی شانِ اطلاق میں اس سے ملاقات بندۂ محدود کے لیے ممکن نہیں ہے۔

رہا دوسرا اعتراض، تو وہ اس لیے غلط ہے کہ معراج کے موقع پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائے گئے تھے ان میں بعض حقیقتوں کو مُمَثّل کر کے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذرا سے شگاف میں سے ایک موٹا سا بیل نکلا اور پھر اس میں واپس نہ جا سکا۔ یا زنا کاروں کی یہ تمثیل کہ ان کے پاس تازہ نفیس گوشت موجود ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہُوا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی طرح بُرے اعمال کی جو سزائیں آپ کو دکھائی گئیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالمِ آخرت کی سزاؤں کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔

اصل بات جو معراج کے سلسلے میں سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے ملکوتِ سماوات وارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادّی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل مُمیّز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے، وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاءؑ جو کچھ کہتے ہیں، وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں، اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم اِن باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔

۲ – معراج کا ذکر صرف ایک فقرے میں کر کے یکایک بنی اسرائیل کا یہ ذکر جو شروع کر دیا گیا ہے، سرسری نگاہ میں یہ آدمی کو کچھ بے جوڑ سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر سورت کے مُدّعا کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس کی مناسبت صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ سورت کا اصل مدعا کفارِ مکّہ کو متنبّہ کرنا ہے۔ آغاز میں معراج کا ذکر صرف اس غرض کے لیے کیا گیا ہے کہ مخاطبین کو آگاہ کر دیا جائے کہ یہ باتیں تم سے وہ شخص کر رہا ہے جو ابھی ابھی اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر آ رہا ہے۔ اس کے بعد

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ③ وَ
قَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ
مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ④ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا

تم اُن لوگوں کی اولاد ہو جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور نوحؑ ایک شکر گزار بندہ تھا۔
پھر ہم نے اپنی کتاب[5] میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم
برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔[6] آخرِ کار جب اُن میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا، تو

اب بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت دلائی جاتی ہے کہ اللہ کی طرف سے کتاب پانے والے جب اللہ کے مقابلے میں سر اُٹھاتے ہیں تو دیکھو کہ پھر ان کو کیسی دردناک سزا دی جاتی ہے۔

۳- وکیل، یعنی اعتماد اور بھروسے کا مدار، جس پر توکّل کیا جائے، جس کے سُپرد اپنے معاملات کر دیے جائیں، جس کی طرف ہدایت اور استمداد کے لیے رُجوع کیا جائے۔

۴- یعنی نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کی اولاد ہونے کی حیثیت سے تمھارے شایانِ شان یہی ہے کہ تم صرف ایک اللہ ہی کو اپنا وکیل بناؤ، کیونکہ جن کی تم اولاد ہو وہ اللہ ہی کو وکیل بنانے کی بدولت طوفان کی تباہی سے بچے تھے۔

۵- کتاب سے مراد یہاں تورات نہیں ہے بلکہ صُحُفِ آسمانی کا مجموعہ ہے، جس کے لیے قرآن میں اصطلاح کے طور پر لفظ ''الکتاب'' کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

۶- بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مقدسہ میں یہ تنبیہات مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ پہلے فساد اور اس کے بُرے نتائج پر بنی اسرائیل کو زبور، یَسَعیاہ، یَرمیاہ اور حِزقی اِیل میں متنبہ کیا گیا ہے، اور دوسرے فساد اور اس کی سخت سزا کی پیش گوئی حضرت مسیحؑ نے کی ہے جو مَتّی اور لُوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔ ذیل میں ہم ان کتابوں کی متعلقہ عبارتیں نقل کرتے ہیں تا کہ قرآن کے اس بیان کی پوری تصدیق ہو جائے۔

پہلے فساد پر اوّلین تنبیہ حضرت داؤدؑ نے کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں:

''اُنھوں نے اُن قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا، بلکہ اُن قوموں کے ساتھ مل گئے اور اُن کے سے کام سیکھ گئے اور اُن کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو اُن کے لیے پھندا بن گئے۔ بلکہ انھوں نے اپنے بیٹوں بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا، اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں بیٹیوں کا خون بہایا...... اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اُسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی، اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اُس نے اُن کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور اُن سے عداوت رکھنے والے اُن پر حکمراں ہو گئے۔"
(زَبور، باب ۱۰۶، آیات ۳۴-۴۱)

اِس عبارت میں اُن واقعات کو جو بعد میں ہونے والے تھے، بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے، گویا کہ وہ ہو چکے۔ یہ کُتُبِ آسمانی کا خاص اندازِ بیان ہے۔

پھر جب یہ فسادِ عظیم رونما ہو گیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت یَسعِیاہ نبی اپنے صحیفے میں یوں دیتے ہیں:

"آہ! خطا کار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، مکّار اولاد، جنھوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قُدّوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے، تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اَور مار کھاؤ گے؟" (باب ۱، آیت ۴-۵)

"وفادار بستی کیسی بدکار ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی اور راست بازی اُس میں بستی تھی، لیکن اب خونی رہتے ہیں...... تیرے سردار گردن کش اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام کا طالب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد اُن تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے خداوند ربُّ الافواج اسرائیل کا قادر یوں فرماتا ہے کہ آہ! میں ضرور اپنے مخالفوں سے آرام پاؤں گا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا۔" (باب ۱، آیت ۲۱-۲۴)

"وہ اہلِ مشرق کی رُسوم سے پُر ہیں اور فلِستیوں کی مانند شگون لیتے اور بیگانوں کی اولاد کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں...... اور اُن کی سرزمین بُتوں سے بھی پُر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت، یعنی اپنی ہی اُنگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔" (باب ۲، آیت ۶-۸)

"اور خداوند فرماتا ہے: چونکہ صِیُّون (صِہیونی) کی بیٹیاں (یعنی یروشلم کی رہنے والیاں) متکبّر ہیں اور گردن کشی اور شوخ چشمی سے خراماں ہوتی اور اپنے پاؤں سے ناز رفتاری کرتی اور گھنگھرو بجاتی جاتی ہیں اس لیے خداوند صِیُّون کی بیٹیوں کے سر گنجے اور یہوواہ اُن کے بدن بے پردہ کر دے گا...... تیرے بہادر تہِ تیغ ہوں گے اور تیرے پہلوان جنگ میں قتل ہوں گے۔ اُس کے پھاٹک ماتم اور نوحہ کریں گے اور وہ اُجاڑ ہو کر خاک پر بیٹھے گی۔" (باب ۳، آیت ۱۶-۲۶)

"اب دیکھ! خداوند دریائے فُرات کے سخت شدید سیلاب کو، یعنی شاہِ اَسُور (سوریا) اور اُس کی ساری شوکت کو اِن پر چڑھا لائے گا اور وہ اپنے سب نالوں پر اور اپنے سب کناروں سے بہ نکلے گا۔" (باب ۸، آیت ۷)

"یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں جو خداوند کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں، جو غیب بینوں سے کہتے ہیں غیب بینی نہ کرو، اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوّتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوش گوار باتیں سناؤ

اور ہم سے جھوٹی نبوّت کرو...... پس اسرائیل کا قدّوس یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم اِس کلام کو حقیر جانتے ہو اور ظلم اور کج روی پر بھروسا رکھتے ہو اور اُسی پر قائم ہو، اس لیے یہ بدکرداری تمھارے لیے ایسی ہوگی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے...... وہ اِسے کُمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا، اِسے بے دریغ چکنا چُور کرے گا، چنانچہ اِس کے ٹکڑوں میں ایک ٹھیکرا بھی نہ ملے گا جس میں چولھے پر سے آگ اُٹھائی جائے یا حوض سے پانی لیا جائے۔'' (باب ۳۰، آیت ۹-۱۴)

پھر جب سیلاب کے بند بالکل ٹوٹنے کو تھے تو یَرمیاہ نبی کی آواز بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

''خداوند یوں فرماتا ہے کہ تمھارے باپ دادا نے مجھ میں کون سی بے انصافی پائی جس کے سبب سے وہ مجھ سے دُور ہو گئے اور بُطلان کی پیروی کر کے باطل ہوئے؟...... مَیں تم کو باغوں والی زمین میں لایا کہ تم اُس کے میوے اور اُس کے اچھے پھل کھاؤ، لیکن جب تم داخل ہوئے تو تم نے میری زمین کو ناپاک کر دیا اور میری میراث کو مکروہ بنایا...... مدت ہوئی کہ تُو نے اپنے جُوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں تابع نہ رہوں گی۔ ہاں، ہر ایک اُونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے تُو بدکاری کے لیے لیٹ گئی (یعنی ہر طاقت کے آگے جھکی اور ہر بُت کو سجدہ کیا)...... جس طرح چور پکڑا جانے پر رُسوا ہوتا ہے اُسی طرح اِسرائیل کا گھرانا رُسوا ہُوا، وہ اور اُس کے بادشاہ اور اُمرا اور کاہن اور (جھوٹے) نبی، جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے، اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنم دیا، کیونکہ اُنھوں نے میری طرف منہ نہ کیا بلکہ پیٹھ کی، پر اپنی مصیبت کے وقت وہ کہیں گے کہ اُٹھ کر ہم کو بچا۔ لیکن تیرے بُت کہاں ہیں جن کو تُو نے اپنے لیے بنایا؟ اگر وہ تیری مصیبت کے وقت تجھے بچا سکتے ہیں تو اُٹھیں، کیونکہ اَے یہوداہ! جتنے تیرے شہر ہیں اُتنے ہی تیرے معبُود ہیں۔'' (باب ۲، آیت ۵-۲۸)

''خداوند نے مجھ سے فرمایا: کیا تو نے دیکھا برگشتہ اسرائیل (یعنی سامریہ کی اسرائیلی ریاست) نے کیا کیا ہے؟ وہ ہر ایک اُونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری (یعنی بُت پرستی) کی...... اور اس کی بے وفا بہن یہوداہ (یعنی یروشلم کی یہودی ریاست) نے یہ حال دیکھا۔ پھر مَیں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زِناکاری (یعنی شرک) کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اُسے طلاق نامہ لکھ دیا (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا) تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی، اور ایسا ہوا کہ اپنی بدکاری کی بُرائی سے زمین کو ناپاک کیا اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زناکاری (یعنی بت پرستی) کی۔'' (باب ۳، آیت ۶-۹)

''اب یروشلیم کے کوچوں میں اِدھر اُدھر گشت کرو اور دیکھو اور دریافت کرو اور اُس کے چَوکوں میں ڈھونڈو، اگر کوئی آدمی وہاں ملے جو انصاف کرنے والا اور سچّائی کا طالب ہو تو مَیں اُسے معاف کروں گا...... میں تجھے کیونکر معاف کروں، تیرے فرزندوں نے مجھ کو چھوڑا اور اُن کی قسم کھائی جو خدا نہیں ہیں۔ جب میں نے اُن کو

Maktaba Tul Ishaat.com

سیر کیا تو انھوں نے بدکاری کی اور پرے باندھ کر قحبہ خانوں میں اکٹھے ہوئے۔ وہ پیٹ بھرے گھوڑوں کے مانند ہو گئے، ہر ایک صبح کے وقت اپنے پڑوسی کی بیوی پر ہنہنانے لگا۔ خدا فرماتا ہے: کیا میں ان باتوں کے لیے سزا نہ دوں گا اور کیا میری روح ایسی قوم سے انتقام نہ لے گی؟'' (باب ۵، آیت ۱-۹)

''اے اسرائیل کے گھرانے! دیکھ، میں ایک قوم کو دُور سے تجھ پر چڑھا لاؤں گا۔ خداوند فرماتا ہے: وہ زبردست قوم ہے۔ وہ قدیم قوم ہے۔ وہ ایسی قوم ہے جس کی زبان تُو نہیں جانتا اور اُن کی بات کو تُو نہیں سمجھتا۔ ان کے ترکش کھُلی قبریں ہیں۔ وہ سب بہادر مرد ہیں۔ اور وہ تیری فصل کا اناج اور تیری روٹی جو تیرے بیٹوں اور بیٹیوں کے کھانے کی تھی، کھا جائیں گے۔ تیرے گائے بیل اور تیری بھیڑ بکریوں کو چٹ کر جائیں گے۔ تیرے انگور اور انجیر نگل جائیں گے۔ تیرے حَصِین (مضبوط) شہروں کو، جن پر تیرا بھروسا ہے، تلوار سے ویران کر دیں گے۔'' (باب ۵، آیت ۱۵-۱۷)

''اس قوم کی لاشیں ہوائی پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوں گی اور اُن کو کوئی نہ ہنکائے گا۔ تب میں یہوداہ کے شہروں میں اور یروشلیم (یروشلم) کے بازاروں میں خوشی اور شادمانی کی آواز، دُولھا اور دُلھن کی آواز موقوف کروں گا، کیونکہ یہ ملک ویران ہو جائے گا۔'' (باب ۷، آیت ۳۳-۳۴)

''اِن کو میرے سامنے سے نکال دے کہ چلے جائیں۔ اور جب وہ تجھ سے کہیں کہ ہم کدھر جائیں، تو اُن سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ جو موت کے لیے ہیں وہ موت کی طرف جائیں، اور جو تلوار کے لیے ہیں وہ تلوار کی طرف، اور جو کال کے لیے ہیں وہ کال کو، اور جو اَسیری کے لیے ہیں وہ اسیری میں۔'' (باب ۱۵، آیت ۱-۲)

پھر عین وقت پر حزقی ایل نبی اٹھے اور انھوں نے یروشلم کو خطاب کر کے کہا:

''اے شہر! تُو اپنے اندر خونریزی کرتا ہے تاکہ تیرا وقت آ جائے اور تو اپنے واسطے بُتوں کو اپنے ناپاک کرنے کے لیے بناتا ہے...... دیکھ، اسرائیل کے امرا، سب کے سب، جو تجھ میں ہیں، مقدور بھر خوں ریزی پر مستعد تھے۔ تیرے اندر اُنھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا۔ تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا۔ تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور بیواؤں پر ستم کیا ہے۔ تو نے میری پاک چیزوں کو ناچیز (ناپاک) جانا اور میرے سَبتوں کو ناپاک کیا۔ تیرے اندر وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو بُتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فُجور کرتے ہیں۔ تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی۔ تجھ میں اُنھوں نے اُس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی، مباشرت کی۔ کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی، کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی، اور کسی نے اپنی بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رُسوا کیا۔ تیرے اندر انھوں نے خوں ریزی کے لیے رشوت خواری کی۔ تو نے بیاج اور سود کیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لُوٹا اور مجھے فراموش کیا...... کیا تیرے ہاتھوں میں زور ہو گا جب میں تیرا معاملہ فیصل کروں گا؟...... ہاں میں تجھ کو قوموں میں تتر بتّر کروں گا، اور تیری گندگی تجھ میں سے نابود کر دوں گا، اور تُو قوموں کے سامنے اپنے آپ

بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا
خِلَٰلَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ

اے بنی اسرائیل! ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اُٹھائے جو نہایت زورآور تھے اور وہ تمھارے مُلک میں گُھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اِس کے بعد ہم نے تمھیں

میں ناپاک ٹھیرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔'' (باب ۲۲، آیت ۳-۱۶)

یہ تھیں وہ تنبیہات جو بنی اسرائیل کو پہلے فسادِ عظیم کے موقع پر کی گئیں۔ پھر دوسرے فسادِ عظیم اور اس کے ہولناک نتائج پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو خبردار کیا۔ متّی باب ۲۳ میں آنجناب کا ایک مفصّل خطبہ درج ہے جس میں وہ اپنی قوم کے شدید اخلاقی زوال پر تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اے یروشلیم! اے یروشلیم! تُو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے! کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے، اُسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں، مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو، تمھارا گھر تمھارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے''۔ (آیت ۳۷-۳۸)

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتّھر پر پتّھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔'' (باب ۲۴، آیت ۲)

پھر جب رومی حکومت کے اہل کار حضرت مسیح کو صلیب دینے کے لیے لے جا رہے تھے اور لوگوں کی ایک بھیڑ جس میں عورتیں بھی تھیں، روتی پیٹتی ان کے پیچھے جا رہی تھیں، تو انھوں نے آخری خطاب کرتے ہوئے مجمع سے فرمایا:

''اے یروشلیم (یروشلم) کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ۔ کیونکہ دیکھو، وہ دن آتے ہیں جن میں کہیں گے: مبارک ہیں بانجھیں اور وہ رحم (پیٹ) جو بار ور نہ ہوئے (نہ جنے) اور وہ چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا۔ اُس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپا لو۔'' (لُوقا، باب ۲۳، آیت ۲۸-۳۰)

۷- اس سے مراد وہ ہولناک تباہی ہے جو اَشُوریوں اور اہلِ بابل کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر نازل ہوئی۔ اس کا تاریخی پس منظر سمجھنے کے لیے صرف وہ اقتباسات کافی نہیں ہیں جو اُوپر ہم صُحُفِ انبیاؑ سے نقل کر چکے ہیں، بلکہ ایک مختصر تاریخی بیان بھی ضروری ہے، تاکہ ایک طالبِ علم کے سامنے وہ تمام اسباب آجائیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک حاملِ کتاب قوم کو امامتِ اقوام کے منصب سے گرا کر ایک شکست خوردہ، غلام اور سخت پس ماندہ قوم بنا کر رکھ دیا۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حِتّی، اَمُوری، کَنعانی، فِرِزّی، حِوِی، یَبُوسی، فِلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ایل

Maktaba Tul Ishaat.com

تھا جسے یہ دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عُموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عَشیرہ تھا اور اس سے خداؤں اور خدائنوں کی ایک پوری نسل چلی تھی، جن کی تعداد ۷۰ تک پہنچتی تھی۔ اس کی اولاد میں سب سے زیادہ زبردست بَعْل تھا جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اُناث کہلاتی تھی اور فلسطین میں عِستارات۔ یہ دونوں خواتین عشق اور افزایشِ نسل کی دیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا، کسی دیوی کے قبضے میں صحّت تھی، کسی دیوتا کو وبا اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے، اور یوں ساری خدائی بہت سے معبُودوں میں بٹ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف واعمال منسوب تھے کہ اَخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں، وہ اَخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو حالات آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں، وہ شدید اَخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زنا کاری کے اڈّے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزا میں داخل تھا۔ اور اسی طرح کی اور بہت سی بداخلاقیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں، ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی واعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انھوں نے اپنی کوئی مُتّحِدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقت ور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخرِ کار انھیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل مسخّر نہ کر سکے۔ اسی بات کی شکایت زبور کی اُس عبارت میں کی گئی ہے جسے ہم نے حاشیہ ۶ کے آغاز میں نقل کیا ہے۔

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت بائبل کی کتاب قُضاۃ میں یوں کی گئی ہے:

> ”اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے۔ اور اُنھوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو اُن کو مُلکِ مصر سے نکال لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو اُن کے گرد اگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے، پیروی کرنے اور اُن کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بَعْل اور عِستارات کی پرستش کرنے لگے، اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا۔“ (باب ۲، آیت ۱۱-۱۴)

اس کے بعد دوسرا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انھوں نے چھوڑ دی تھیں، انھوں نے اور فِلِستیوں نے، جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک مُتّحِدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا، حتّٰی کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوتِ سکینہ) تک چھین لیا۔ آخرِ کار بنی اسرائیل کو ایک فرماں روا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے ۱۰۲۰ قبلِ مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔ (اس کی تفصیل سورۂ بقرہ، رکوع ۳۲ میں گزر چکی ہے)۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرماں روا ہوئے: طالوت (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ ق م)، حضرت داؤد علیہ السلام (۱۰۰۴ تا ۹۶۵ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م)۔ ان فرماں رواؤں نے اُس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شِمالی ساحل پر فینیقیوں کی اور جنوبی ساحل پر فِلِستیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنھیں مسخّر نہ کیا جا سکا اور محض باج گذار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انھوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شِمالی فلسطین اور شرقِ اُردُن میں سلطنتِ اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخرِ کار سامِریہ قرار پایا، اور جنوبی فلسطین اور اَدُوم کے علاقے میں سلطنتِ یہودیہ، جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کش مکش اوّل روز سے شروع ہوگئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرماں روا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متأثّر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرماں روا اَخی اَب نے صَیدا کی مشرک شہزادی ایزبِل سے شادی کر لی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع سے شرک اور بد اخلاقیاں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاس اور حضرت الیَسَع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی، مگر یہ قوم جس تَنَزُّل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخرِ کار اللہ کا غضب اَشُوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبلِ مسیح سے فلسطین پر اَشُوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ اس دَور میں عاموس نبی (۷۸۷ تا ۷۴۷ قبلِ مسیح) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبلِ مسیح) نے اُٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں، مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے، وہ تنبیہ کی تُرشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ عامُوس نبی کو شاہِ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولتِ سامِریہ کے حُدود میں اپنی نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبلِ مسیح میں اَشُور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامِریہ کو فتح کر کے دولتِ اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزار ہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اَشُوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بِتّر کر دیا گیا، اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عُنصُر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ
نَفِيْرًا ﴿٦﴾ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ قف وَ اِنْ اَسَاْتُمْ

اُن پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھا دی[8]۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمھارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور بُرائی کی تو وہ تمھاری اپنی

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بد اخلاقی میں مبتلا ہوگئی، مگر نسبتاً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولتِ اسرائیل کی بہ نسبت سُست رفتار تھا، اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ دولتِ اسرائیل کی طرح اس پر بھی اَشُوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اَشُوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہوسکی بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یَسعیاہ اور حضرت یَرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بُت پرستی اور بد اخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبلِ مسیح میں بابِل کے بادشاہ بُختِ نَصَّر نے یروشلم سمیت پوری دولتِ یہودیہ کو مسخر کرلیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یَرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال دُرست کرنے کے بجائے بابِل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبلِ مسیح میں بُختِ نَصَّر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو اس طرح پیوندِ خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک میں تتّر بتّر کر دیا، اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بُری طرح ذلیل اور پامال ہوکر رہے۔

یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو مُتنبہ کیا گیا تھا، اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اس کی پاداش میں ان کو دی گئی۔

۸ – یہ اشارہ ہے اُس مہلت کی طرف جو یہودیوں (یعنی اہلِ یہودیہ) کو بابِل کی اسیری سے رہائی کے بعد عطا کی گئی۔ جہاں تک سامِریّہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے، وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اُٹھے، مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیّہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اُس نے اُن لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کُھچے رہ گئے تھے، اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابِل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ آخرکار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابِل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ قبلِ مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خُورس یا خُسرَو) نے بابِل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے

قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے، جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ سائرس نے یہودیوں کو ہیکلِ سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی، مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقے میں آباد ہوگئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر داریوس (دارا) اوّل نے ۵۲۲ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرُبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حَجَّیَ نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکلِ مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عُزَیر (عزرا) یہودیہ پہنچے اور شاہِ ایران ارتخششتا (ارتازرکسز یا اَردشیر) نے ایک فرمان کی رُو سے ان کو مجاز کیا کہ:

''تُو اپنے خدا کی اُس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کر، تاکہ دریا پار کے سب لوگوں کا، جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں، انصاف کریں، اور تم اُس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ، اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے، اُس کو بلاتوقّف قانونی سزا دی جائے، خواہ موت ہو، یا جلاوطنی، یا مال کی ضبطی، یا قید'' (عزرا، باب ۷، آیت ۲۵-۲۶)

اس فرمان سے فائدہ اٹھا کر حضرت عُزَیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انھوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کُتُبِ خمسہ کو، جن میں تورات تھی، مرتّب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی بُرائیوں کو دُور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گُھس آئی تھیں، اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے، اور بنی اسرائیل سے ازسرِ نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

۴۴۵ ق م میں نَحمیاہ کے زیرِ قیادت ایک اور جلاوطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہِ ایران نے نَحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیتُ المَقدِس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عُزَیر کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا، بلکہ بیت المَقدِس کے مقابلے میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہِ جرزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلۂ اہلِ کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہودیوں اور سامریوں کے درمیان بُعد اور زیادہ بڑھ گیا۔

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عُروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی، ان میں سے شام کا علاقہ اُس سَلُوقی سلطنت کے حصّے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرماں روا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح جو مذہباً مشرک، اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور مَعاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عُنصُر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تَفرِقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا، اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ۝۷

ذات کے لیے بُرائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلّط کیا، تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیتِ المَقدِس) میں اُسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گُھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اُسے تباہ کر کے رکھ دیں[9]۔

پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔ ۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب اپی فانیس یعنی مظہرِ خدا) تھا، جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب وتہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدِس کے ہیکل میں زبردستی بُت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبُور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرائی۔ اس نے یہودیوں کو مشرکانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اُن سب لوگوں کے لیے سزائے موت تجویز کی جو اپنے گھروں میں تورات کا نسخہ رکھیں، یا سَبت کے احکام پر عمل کریں، یا اپنے بچوں کے ختنے کرائیں۔ لیکن یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مَکّابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کش مکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں، اور انھوں نے عملاً مَکّابی بغاوت کو کچلنے میں اَنطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا، لیکن عام یہودیوں میں حضرت عُزَیرؑ کی پھونکی ہوئی رُوحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مَکّابیوں کے ساتھ ہو گئے، اور آخرِ کار انھوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حُدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگیں تھے، بلکہ فِلِستِیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔

انھی واقعات کی طرف قرآنِ مجید کی زیرِ تفسیر آیت اشارہ کرتی ہے۔

۹ – اس دوسرے فساد اور اس کی سزا کا تاریخی پَس منظر یہ ہے:

مَکّابیوں کی تحریک جس اخلاقی ودینی روح کے ساتھ اُٹھی تھی، وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہر داری نے لے لی۔ آخرِ کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انھوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہُوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم ونسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فلسطین میں اپنے زیرِ سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی، جو بالآخر ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ

شخص ہیرودِ اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرماں روائی پورے فلسطین اور شرقِ اُردُن پر ۴۰ سے ۴ قبلِ مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعد اس کی ریاست تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

اس کا ایک بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی اِدُومیہ کا فرماں روا ہوا، مگر ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اُٹھے اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر ان کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونتس پیلاطُس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرود اینٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرقِ اُردُن کا مالک ہوا، اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہِ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہوا اور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمۂ خیر کے پنپنے کی اتنی گنجائش بھی نہ تھی جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

۴۱ء میں ہیرودِ اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے اُن تمام علاقوں کا فرماں روا بنا دیا جن پر ہیرودِ اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی اور اپنا پورا زور خدا ترسی و اصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کو کچلنے میں صَرف کر ڈالا جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

اس دَور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اُن تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں ان پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیلِ اربعہ میں موجود ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کیا گیا مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح علیہ السلام کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا مگر تھوڑے سے راست باز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اس بدبختی پر ماتم کرتا۔ حد یہ ہے کہ جب پونتس پیلاطُس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ آج تمھاری عید کا دن ہے اور قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مستحق مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، بتاؤ یسوع کو چھوڑوں یا بَرابا ڈاکو کو؟ تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ بَرابا کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کش مکش شروع ہوگئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس، دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام

Maktaba Tul Ishaat.com

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝٨ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝٩ ۙ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا

وقف لازم

—— ہو سکتا ہے کہ اب تمھارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے، اور کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنّم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔[۱۰]

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انھیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے، اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انھیں یہ خبر دیتا ہے کہ

ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کرلیا۔ اس موقع پر قتلِ عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے، ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزار ہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا، تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چُن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا، اور یروشلم کا ہیکلِ مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اب اس کا نام ایلیا تھا اور اس میں مدت ہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یہ تھی وہ سزا جو بنی اسرائیل کو دوسرے فسادِ عظیم کی پاداش میں ملی۔

۱۰ – اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اِس پوری تقریر کے مُخاطَب بنی اسرائیل ہیں۔ مُخاطَب تو کفارِ مکہ ہی ہیں، مگر چونکہ اُن کو متنبّہ کرنے کے لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چند عبرت ناک شواہد پیش کیے گئے تھے، اس لیے بطور ایک جملۂ معترضہ کے یہ فقرہ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرما دیا گیا، تاکہ اُن اصلاحی تقریروں کے لیے تمہید کا کام دے جن کی نوبت ایک ہی سال بعد مدینے میں آنے والی تھی۔

ع

لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٠﴾ وَ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ
بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿١١﴾ وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ
النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ
مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿١٢﴾

ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔[11] ع

انسان شر اُس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہیے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہُوا ہے۔[12]

دیکھو، ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا، اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا، تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو۔ اِسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیّز کر کے رکھا ہے۔[13]

۱۱ – مُدّعا یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ یا قوم اس قرآن کی تنبیہ و فہمایش سے راہِ راست پر نہ آئے، اسے پھر اُس سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے جو بنی اسرائیل نے بھگتی ہے۔

۱۲ – یہ جواب ہے کفارِ مکّہ کی اُن احمقانہ باتوں کا جو وہ بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہتے تھے کہ بس لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈرایا کرتے ہو۔ اُوپر کے بیان کے بعد معاً یہ فقرہ ارشاد فرمانے کی غرض اس بات پر متنبّہ کرنا ہے کہ بیوقوفو! خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگتے ہو؟ تمھیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ خدا کا عذاب جب کسی قوم پر آتا ہے تو اس کی کیا گت بنتی ہے؟

اس کے ساتھ اس فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مسلمانوں کے لیے بھی تھی جو کفار کے ظلم و ستم اور ان کی ہٹ دھرمیوں سے تنگ آ کر کبھی کبھی ان کے حق میں نزولِ عذاب کی دعا کرنے لگتے تھے، حالانکہ ابھی انھی کفار میں بہت سے وہ لوگ موجود تھے جو آگے چل کر ایمان لانے والے اور دنیا بھر میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان بڑا بے صبر واقع ہوا ہے، ہر وہ چیز مانگ بیٹھتا ہے جس کی بروقت ضرورت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ بعد میں اسے خود تجربے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اُس وقت اُس کی دعا قبول کر لی جاتی تو وہ اس کے حق میں خیر نہ ہوتی۔

۱۳ – مطلب یہ ہے کہ اختلافات سے گھبرا کر یکسانی و یک رنگی کے لیے بے چین نہ ہو۔ اس دنیا کا تو سارا کارخانہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ
عَلَیْكَ حَسِیْبًا ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ

ہر انسان کا شگون ہم نے اُس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے[14]، اور قیامت کے روز ہم ایک نوِشتہ اُس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کُھلی کتاب کی طرح پائے گا ــــــ پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تُو خود ہی کافی ہے۔

جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے،

ہی اختلاف اور امتیاز اور تنوّع کی بدولت چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر تمھارے سامنے نمایاں ترین نشانیاں یہ رات اور دن ہیں جو روز تم پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھو کہ ان کے اختلاف میں کتنی عظیم الشان مصلحتیں موجود ہیں۔ اگر تم پر دائماً ایک ہی حالت طاری رہتی تو کیا یہ ہنگامۂ وجود چل سکتا تھا؟ پس جس طرح تم دیکھ رہے ہو کہ عالمِ طبیعیات میں فرق و اختلاف اور امتیاز کے ساتھ بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں، اسی طرح انسانی مزاجوں اور خیالات اور رجحانات میں بھی جو فرق و امتیاز پایا جاتا ہے وہ بڑی مصلحتوں کا حامل ہے۔ خیر اس میں نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اس کو مٹا کر سب انسانوں کو جبراً نیک اور مومن بنا دے، یا کافروں اور فاسقوں کو ہلاک کر کے دنیا میں صرف اہلِ ایمان و طاعت ہی کو باقی رکھا کرے۔ اس کی خواہش کرنا تو اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ خواہش کرنا کہ صرف دن ہی دن رہا کرے، رات کی تاریکی سرے سے کبھی طاری ہی نہ ہو۔ البتہ خیر جس چیز میں ہے، وہ یہ ہے کہ ہدایت کی روشنی جن لوگوں کے پاس ہے، وہ اسے لے کر ضلالت کی تاریکی دُور کرنے کے لیے مسلسل سعی کرتے رہیں، اور جب رات کی طرح کوئی تاریکی کا دَور آئے تو وہ سورج کی طرح اُس کا پیچھا کریں، یہاں تک کہ روزِ روشن نمودار ہو جائے۔

۱۴ – یعنی ہر انسان کی نیک بختی و بد بختی، اور اس کے انجام کی بھلائی اور بُرائی کے اسباب و وجوہ خود اس کی اپنی ذات ہی میں موجود ہیں۔ اپنے اوصاف، اپنی سیرت و کردار، اور اپنی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ و انتخاب کے استعمال سے وہ خود ہی اپنے آپ کو سعادت کا مستحق بھی بناتا ہے اور شقاوت کا مستحق بھی۔ نادان لوگ اپنی قسمت کے شگون باہر لیتے پھرتے ہیں اور ہمیشہ خارجی اسباب ہی کو اپنی بد بختی کا ذمہ دار ٹھیراتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا پروانۂ خیر و شر اُن کے اپنے گلے کا ہار ہے۔ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں تو دیکھ لیں کہ جس چیز نے ان کو بگاڑ اور تباہی کے راستے پر ڈالا اور آخرِ کار خائب و خاسر بنا کر چھوڑا، وہ ان کے اپنے ہی بُرے اوصاف اور بُرے فیصلے تھے، نہ یہ کہ باہر سے آ کر کوئی چیز زبردستی ان پر

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ
اُخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اُسی پر ہے۔[۱۵] کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔[۱۶] اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغام بر نہ بھیج دیں۔[۱۷]

مسلّط ہوگئی تھی۔

۱۵ – یعنی راہِ راست اختیار کر کے کوئی شخص خدا پر، یا رسول پر، یا اصلاح کی کوشش کرنے والوں پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ خود اپنے ہی حق میں بھلا کرتا ہے۔ اور اسی طرح گمراہی اختیار کر کے یا اس پر اصرار کر کے وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا، اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ خدا اور رسول اور داعیانِ حق انسان کو غلط راستوں سے بچانے اور صحیح راہ دکھانے کی جو کوشش کرتے ہیں، وہ اپنی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ انسان کی خیر خواہی کے لیے کرتے ہیں۔ ایک عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ جب دلیل سے اس کے سامنے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیا جائے تو وہ تعصُّبات اور مفاد پرستیوں کو چھوڑ کر سیدھی طرح باطل سے باز آجائے اور حق اختیار کر لے۔ تعصب یا مفاد پرستی سے کام لے گا تو وہ آپ ہی اپنا بدخواہ ہوگا۔

۱۶ – یہ ایک نہایت اہم اُصولی حقیقت ہے جسے قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ اسے سمجھے بغیر انسان کا طرزِ عمل کبھی دُرست نہیں ہو سکتا۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی شخصی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دِہ ہے۔ اس ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ دنیا میں خواہ کتنے ہی آدمی، کتنی ہی قومیں اور کتنی ہی نسلیں اور پشتیں ایک کام یا ایک طریقِ عمل میں شریک ہوں، بہر حال خدا کی آخری عدالت میں اُس مُشترک عمل کا تجزِیہ کر کے ایک ایک انسان کی ذاتی ذمہ داری الگ مُشَخَّص کر لی جائے گی اور اس کو جو کچھ بھی جزا یا سزا ملے گی، اس عمل کی ملے گی جس کا وہ خود اپنی انفرادی حیثیت میں ذمہ دار ثابت ہوگا۔ اس انصاف کی میزان میں نہ یہ ممکن ہوگا کہ دوسروں کے کیے کا وبال اس پر ڈال دیا جائے، اور نہ یہی ممکن ہوگا کہ اس کے کرتوتوں کا بارِ گناہ کسی اور پر پڑ جائے۔ اس لیے ایک دانش مند آدمی کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں، بلکہ اسے ہر وقت اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اگر اسے اپنی ذاتی ذمہ داری کا صحیح احساس ہو تو دوسرے خواہ کچھ کر رہے ہوں، وہ بہر حال اُسی طرزِ عمل پر ثابت قدم رہے گا جس کی جواب دِہی خدا کے حضور وہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہو۔

۱۷ – یہ ایک اور اُصولی حقیقت ہے جسے قرآن بار بار مختلف طریقوں سے انسان کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ⑯ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں[18]۔ دیکھ لو، کتنی ہی نسلیں ہیں جو نُوحؑ کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں۔ تیرا رب اپنے

کرتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ پیغمبر اور اس کا لایا ہُوا پیغام ہی بندوں پر خدا کی حُجّت ہے۔ یہ حجّت قائم نہ ہو تو بندوں کو عذاب دینا خلافِ انصاف ہو گا، کیونکہ اس صورت میں وہ یہ عُذر پیش کر سکیں گے کہ ہمیں آگاہ کیا ہی نہ گیا تھا، پھر اب ہم پر یہ گرفت کیسی۔ مگر جب یہ حجت قائم ہو جائے تو اس کے بعد انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اُن لوگوں کو سزا دی جائے جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغام سے منہ موڑا ہو، یا اسے پا کر پھر اس سے انحراف کیا ہو۔ بے وقوف لوگ اِس طرح کی آیات پڑھ کر اس سوال پر غور کرنے لگتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کسی نبی کا پیغام نہیں پہنچا ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔ حالانکہ ایک عقل مند آدمی کو غور اس بات پر کرنا چاہیے کہ تیرے پاس تو پیغام پہنچ چکا ہے، اب تیری اپنی پوزیشن کیا ہے۔ رہے دوسرے لوگ، تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے پاس، کب، کس طرح اور کس حد تک اس کا پیغام پہنچا اور اس نے اس کے معاملے میں کیا رَوِیّہ اختیار کیا اور کیوں کیا۔ عالم الغیب کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا کہ کس پر اللہ کی حجّت پوری ہوئی ہے اور کس پر نہیں ہوئی۔

۱۸ – اس آیت میں حکم سے مراد حکمِ طبعی اور قانونِ فطری ہے۔ یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے مُترفین فاسق ہو جاتے ہیں۔ ہلاک کرنے کے ارادے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یونہی بے قصور کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسانی آبادی بُرائی کے راستے پر چل پڑتی ہے اور اللہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے تباہ کرنا ہے تو اس فیصلے کا ظہور اس طریقے سے ہوتا ہے۔

دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبّہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوش حال لوگوں اور اُونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت منداور صاحبِ اقتدار لوگ فِسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں، اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو، اسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور

بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ﴿۱۷﴾ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ
عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ‌ۚ يَصۡلٰٮهَا
مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا
وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓـئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ
هٰٓؤُلَۤاءِ وَهٰٓؤُلَۤاءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ‌ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ

بندوں کے گناہوں سے پُوری طرح باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

جو کوئی عاجلہ[19] کا خواہش مند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں، جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محرُوم ہو کر[20]۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے، اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور[21] ہو گی۔ اِن کو بھی اور اُن کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم (دُنیا میں) سامانِ زیست دیے جا رہے ہیں، یہ تیرے رب کا عَطیہ ہے، اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا

معاشی دولت کی کُنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

۱۹ – عاجلہ کے لُغوی معنیٰ ہیں: جلدی ملنے والی چیز۔ اور اصطلاحاً قرآنِ مجید اس لفظ کو دنیا کے لیے استعمال کرتا ہے، جس کے فائدے اور نتائج اِسی زندگی میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے کی اصطلاح ''آخرت'' ہے، جس کے فوائد اور نتائج کو موت کے بعد دوسری زندگی تک مؤخّر کر دیا گیا ہے۔

۲۰ – مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو نہیں مانتا، یا آخرت تک صبر کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اپنی کوششوں کا مقصود صرف دنیا اور اس کی کامیابیوں اور خوش حالیوں ہی کو بناتا ہے، اسے جو کچھ بھی ملے گا بس دنیا میں مل جائے گا۔ آخرت میں وہ کچھ نہیں پا سکتا۔ اور بات صرف یہیں تک نہ رہے گی کہ اُسے کوئی خوش حالی آخرت میں نصیب نہ ہو گی، بلکہ مزید برآں دنیا پرستی اور آخرت کی جواب دہی و ذمہ داری سے بے پروائی اس کے طرزِ عمل کو بنیادی طور پر ایسا غلط کر کے رکھ دے گی کہ آخرت میں وہ اُلٹا جہنم کا مستحق ہو گا۔

۲۱ – یعنی اس کے کام کی قدر کی جائے گی اور جتنی اور جیسی کوشش بھی اس نے آخرت کی کامیابی کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

مَحْظُوْرًا ﴿٢٠﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ
اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ
فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿٢٢﴾ ع وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ

کوئی نہیں ہے[٢٢]۔ مگر دیکھ لو! دُنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے، اور آخرت میں اُس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے، اور اس کی فضیلت اَور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی[٢٣]۔

تُو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبُود نہ بنا[٢٤]، ورنہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا۔ع تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے[٢٥] کہ:

(۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی[٢٦]۔

کی ہوگی، اس کا پھل وہ ضرور پائے گا۔

۲۲ – یعنی دنیا میں رزق اور سامانِ زندگی دنیا پرستوں کو بھی مل رہا ہے اور آخرت کے طلب گاروں کو بھی۔ عَطِیّہ اللہ ہی کا ہے، کسی اور کا نہیں ہے۔ نہ دنیا پرستوں میں یہ طاقت ہے کہ آخرت کے طلب گاروں کو رزق سے محروم کر دیں، اور نہ آخرت کے طلب گار ہی یہ قدرت رکھتے ہیں کہ دنیا پرستوں تک اللہ کی نعمت نہ پہنچنے دیں۔

۲۳ – یعنی دنیا ہی میں یہ فرق نمایاں ہو جاتا ہے کہ آخرت کے طلب گار دنیا پرست لوگوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ فضیلت اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ان کے کھانے اور لباس اور مکان اور سواریاں اور تمدّن و تہذیب کے ٹھاٹ اُن سے کچھ بڑھ کر ہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ جو کچھ بھی پاتے ہیں صداقت، دیانت اور امانت کے ساتھ پاتے ہیں، اور وہ جو کچھ پا رہے ہیں ظلم سے، بے ایمانیوں سے، اور طرح طرح کی حرام خوریوں سے پا رہے ہیں۔ پھر ان کو جو کچھ ملتا ہے، وہ اعتدال کے ساتھ خرچ ہوتا ہے، اس میں سے حق داروں کے حُقوق ادا ہوتے ہیں، اس میں سے سائل اور محروم کا حصہ بھی نکلتا ہے، اور اس میں سے خدا کی خوشنودی کے لیے دوسرے نیک کاموں پر بھی مال صَرف کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دنیا پرستوں کو جو کچھ ملتا ہے، وہ بیش تر عیاشیوں اور حرام کاریوں اور طرح طرح کے فساد انگیز اور فتنہ خیز کاموں میں پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام حیثیتوں سے آخرت کے طلب گار کی زندگی خدا ترسی اور پاکیزگیِ اخلاق کا ایسا نمونہ ہوتی ہے جو پیوند لگے ہوئے کپڑوں اور خس کی جھونپڑیوں میں بھی اس قدر درخشاں نظر آتا ہے کہ دنیا پرست کی زندگی اس کے مقابلے میں ہر چشمِ بینا کو تاریک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جبّار بادشاہوں اور دولت مند امیروں کے لیے بھی ان کے ہم جنس انسانوں کے دلوں میں کوئی سچی عزّت اور محبّت اور عقیدت کبھی پیدا نہ ہوئی اور اس کے برعکس فاقہ کش اور بوریا نشین اتقیا کی فضیلت

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا
أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا
كَرِيمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ
رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ﴿٢٤﴾ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي

---

(۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے پاس اُن میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دُعا کیا کرو کہ "پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔" تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ تمھارے

کو خود دنیا پرست لوگ بھی ماننے پر مجبور ہو گئے۔ یہ کھُلی کھُلی علامتیں اس حقیقت کی طرف صاف اشارہ کر رہی ہیں کہ آخرت کی پائدار مستقل کامیابیاں ان دونوں گروہوں میں سے کس کے حصّے میں آنے والی ہیں۔

۲۴ – دوسرا ترجمہ اس فقرے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا نہ گھڑ لے، یا کسی اور کو خدا نہ قرار دے لے۔

۲۵ – یہاں وہ بڑے بڑے بنیادی اُصول پیش کیے جا رہے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا منشور ہے جسے مکّی دَور کے خاتمے اور آنے والے مدنی دَور کے نقطۂ آغاز پر پیش کیا گیا، تاکہ دنیا بھر کو معلوم ہو جائے کہ اس نئے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد کن فکری، اخلاقی، تمدّنی، معاشی اور قانونی اُصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس موقع پر سُورۂ انعام، رکوع ۱۹ اور اس کے حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

۲۶ – اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ بندگی اور غلامی اور بے چُون و چرا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو، اسی کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ، اور صرف انفرادی طرزِ عمل کے لیے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اس پورے نظامِ اخلاق و تمدّن و سیاست کا سنگِ بنیاد بھی ہے جو مدینۂ طیّبہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کیا۔ اس کی عمارت اِسی نظریّے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ جلّ شانہٗ ہی مُلک کا مالک اور بادشاہ ہے، اور اسی کی شریعت ملک کا قانون ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ
غَفُوْرًا ۝۲۵ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا
تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝۲۶ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَ
كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝۲۷ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ
رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝۲۸

دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔[۲۷]

(۳) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔

(۴) فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

(۵) اگر اُن سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمھیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو، تو انھیں نرم جواب دے دو۔[۲۸]

---

۲۷ – اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہیے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جو اولاد کو والدین سے بے نیاز بنانے والا نہ ہو بلکہ ان کا احسان مند اور ان کے احترام کا پابند بنائے، اور بڑھاپے میں اُسی طرح ان کی خدمت کرنا سکھائے جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش اور ناز برداری کر چکے ہیں۔ یہ آیت بھی صرف ایک اخلاقی سفارش نہیں ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر بعد میں والدین کے وہ شرعی حقوق و اختیارات مقرر کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور ان کے حقوق کی نگہداشت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اُصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے ذریعے سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی نہ کہ اسے کمزور بنانے کی۔

۲۸ – ان تین دفعات کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص نہ رکھے،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ
فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ

(۶) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔[29] تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے

بلکہ اپنی ضروریات اعتدال کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجت مند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور حق شناسی وحق رسانی کی روح جاری وساری ہو۔ ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون، اور ہر مستطیع انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے، اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص اُن سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو۔ ان کی خدمت کرے تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ ان کا حق ادا کر رہا ہے، نہ یہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے۔ اگر کسی کی خدمت سے معذور ہو تو اس سے معافی مانگے اور خدا سے فضل طلب کرے، تاکہ وہ بندگانِ خدا کی خدمت کرنے کے قابل ہو۔

منشورِ اسلامی کی یہ دفعات بھی صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں، بلکہ آگے چل کر مدینۂ طیّبہ کے معاشرے اور ریاست میں انھی کی بنیاد پر صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کے احکام دیے گئے، وصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے، یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا، ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی روح جاری وساری ہوگئی، حتّٰی کہ لوگ آپ ہی آپ قانونی حقوق کے ماسوا اُن اخلاقی حقوق کو بھی سمجھنے اور ادا کرنے لگے جنھیں نہ قانون کے زور سے مانگا جا سکتا ہے نہ دلوایا جا سکتا ہے۔

۲۹ - ہاتھ باندھنا استعارہ ہے بُخل کے لیے، اور اسے کھلا چھوڑ دینے سے مراد ہے فضول خرچی۔ دفعہ ۴ کے ساتھ دفعہ ۶ کے اس فقرے کو ملا کر پڑھنے سے منشا صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع کریں۔ اس کے برعکس ان کے اندر توازن کی ایسی صحیح حس موجود ہونی چاہیے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بے جا خرچ کی خرابیوں میں مبتلا بھی نہ ہوں۔ فخر اور ریا اور نمایش کے خرچ، عیاشی اور فسق و فجور کے خرچ، اور تمام ایسے خرچ جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہا دیں، دراصل خدا کی نعمت کا کُفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۴ ۸ ۴

وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ

تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے۔[۳۰] ع

(۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔

یہ دفعات بھی محض اخلاقی تعلیم اور انفرادی ہدایات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ صاف اشارہ اس بات کی طرف کر رہی ہیں کہ ایک صالح معاشرے کو اخلاقی تربیت، اجتماعی دباؤ اور قانونی پابندیوں کے ذریعے سے بے جا صَرفِ مال کی روک تھام کرنی چاہیے۔ چنانچہ آگے چل کر مدینۂ طیبہ کی ریاست میں ان دونوں دفعات کے منشا کی صحیح ترجمانی مختلف عملی طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازرُوئے قانون حرام کیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بے جا صَرفِ مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف معاشرتی اصلاح کے ذریعہ سے ان بہت سی رسموں کا خاتمہ کیا گیا جن میں فضول خرچیاں کی جاتی تھیں۔ پھر حکومت کو یہ اختیارات دیے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو اپنے انتظامی احکام کے ذریعے سے روک دے۔ اسی طرح زکوٰۃ و صدقات کے احکام سے بخل کا زور بھی توڑا گیا اور اس امر کے امکانات باقی نہ رہنے دیے گئے کہ لوگ زر اندوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام پیدا کی گئی جو فیاضی اور فضول خرچی کا فرق ٹھیک ٹھیک جانتی تھی اور بُخل اور اعتدال میں خوب تمیز کرتی تھی۔ اس رائے عام نے بخیلوں کو ذلیل کیا، اعتدال پسندوں کو معزز بنایا، فضول خرچوں کو ملامت کی، اور فیاض لوگوں کو پوری سوسائٹی کا گُلِ سرِسَبد قرار دیا۔ اس وقت کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا یہ اثر آج تک مسلم معاشرے میں موجود ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں، کنجوسوں اور زر اندوزوں کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور سخی انسان آج بھی ان کی نگاہ میں معزز و محترم ہے۔

۳۰ — یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کم و بیش کا جو فرق رکھا ہے انسان اس کی مَصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا تقسیم رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے دخل انداز نہ ہونا چاہیے۔ فطری نامُساوات کو مصنوعی مُساوات میں تبدیل کرنا، یا اس نامُساوات کو فطرت کے حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں ہی یکساں غلط ہیں۔ ایک صحیح مَعاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے طریقِ تقسیمِ رزق سے قریب تر ہو۔

اس فقرے میں قانونِ فطرت کے جس قاعدے کی طرف رہنمائی کی گئی تھی، اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیُّل سرے سے کوئی راہ نہ پا سکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوُت اور تفاضُل بجائے خود کوئی بُرائی ہے جسے مٹانا اور ایک بے طبقات سوسائٹی پیدا کرنا کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ اس کے برعکس مدینۂ طیبہ میں انسانی تمدُّن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو راہِ عمل اختیار کی گئی، وہ یہ تھی کہ فطرتُ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت

اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۳۲﴾

درحقیقت اُن کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔[۳۱]

(۸) زِنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ۔[۳۲]

پر برقرار رکھا جائے اور اُوپر کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانینِ عمل کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ مَعاش کا فرق و تفاوُت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے اُن بے شمار اخلاقی، روحانی اور تمدُّنی فوائد و برکات کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

۳۱– یہ آیت اُن مَعاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اُٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہُوا کرتا تھا، اور آج وہ ایک تیسری تدبیر، یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشورِ اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر اُن تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صَرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق رزق میں افزایش ہُوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رُو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار مَعاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزایشِ نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبّہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اُس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجرِبہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے، اُتنے ہی، بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ مَعاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے دَور سے لے کر آج تک کسی دَور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کُشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔

۳۲– ”زنا کے قریب نہ پھٹکو“، اس حکم کے مُخاطَب افراد بھی ہیں، اور معاشرہ بحیثیتِ مجموعی بھی۔ افراد کے لیے اس حکم کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ محض فعلِ زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ زنا کے مقدِّمات اور اس کے اُن ابتدائی محرّکات سے بھی دُور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رہا معاشرہ، تو اس حکم کی رُو سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا، اور محرِّکاتِ زنا، اور اسبابِ زنا کا سدِّباب کرے، اور اس غرض کے لیے قانون سے، تعلیم و تربیت سے، اجتماعی ماحول کی اصلاح سے، معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے، اور دوسری تمام مؤثّر تدابیر سے کام لے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّیْ

(۹) قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے[۳۳]، مگر حق کے ساتھ[۳۴]۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اس کے ولی کو ہم نے قِصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے[۳۵]، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے

یہ دفعہ آخرکار اسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اس کے منشا کے مطابق زنا اور تُہمتِ زنا کو فوجداری جُرم قرار دیا گیا، پردے کے احکام جاری کیے گئے، فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں، اور ایک ایسا ازدِواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

۳۳- قتلِ نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں ہے، بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔ اس لیے کہ نفس، جس کو اللہ نے ذی حُرمت ٹھیرایا ہے، اس کی تعریف میں دوسرے نُفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتلِ انسان ہے، اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکُشی بھی ہے۔ آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک، اور اپنی اِس مِلکیّت کو باختیارِ خود تلف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ جان اللہ کی مِلکیت ہے، اور ہم اس کے اِتلاف تو درکنار، اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان لے، اسی طرح ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے، خواہ حالاتِ امتحان اچھے ہوں یا بُرے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے، کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جُرمِ عظیم کے ذریعے سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رُسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور اَبَدی تکلیف و رسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔

۳۴- بعد میں اسلامی قانون نے قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں محدود کر دیا: ایک قتلِ عَمد کے مجرم سے قِصاص۔ دوسرے دینِ حق کے راستے میں مُزاحمت کرنے والوں سے جنگ۔ تیسرے اسلامی نظامِ حکومت کو اُلٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا، چوتھے شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکابِ زنا کی سزا۔ پانچویں ارتداد کی سزا۔ صرف یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حُرمت مرتفع ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

۳۵- اصل الفاظ ہیں: ''اس کے ولی کو ہم نے سلطان عطا کیا ہے۔'' سلطان سے مراد یہاں ''حجت'' ہے جس کی بنا پر وہ قِصاص کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس سے اسلامی قانون کا یہ اُصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مُدّعی حکومت نہیں بلکہ اولیائے مقتول ہیں، اور وہ قاتل کو معاف کرنے اور قِصاص کے بجائے خوں بہا لینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔

الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ
اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵

نہ گزرے[۳۶]، اُس کی مدد کی جائے گی[۳۷]۔

(۱۰) مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے[۳۸]۔

(۱۱) عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی[۳۹]۔

(۱۲) پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو[۴۰]۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظِ انجام بھی یہی بہتر ہے[۴۱]۔

---

۳۶ – قتل میں حد سے گزرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ سب ممنوع ہیں۔ مثلاً جوشِ انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا، یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالنا، یا خوں بہا لینے کے بعد پھر اسے قتل کرنا وغیرہ۔

۳۷ – چونکہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اس لیے اس بات کو نہیں کھولا گیا کہ اس کی مدد کون کرے گا۔ بعد میں جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو یہ طے کر دیا گیا کہ اس کی مدد کرنا اس کے قبیلے یا اس کے حلیفوں کا کام نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اس کے نظامِ عدالت کا کام ہے۔ کوئی شخص یا گروہ بطورِ خود قتل کا انتقام لینے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ یہ منصب اسلامی حکومت کا ہے کہ حصولِ انصاف کے لیے اس سے مدد مانگی جائے۔

۳۸ – یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی بلکہ آگے چل کر جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے انتظامی اور قانونی، دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں، جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اُصول اخذ کیا گیا کہ اسلامی ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَهٗ (میں ہر اُس شخص کا سرپرست ہوں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو) اسی طرف اشارہ کرتا ہے، اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

۳۹ – یہ بھی صرف انفرادی اخلاقیات ہی کی ایک دفعہ نہ تھی، بلکہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کو پوری قوم

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ
مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

---

(۱۳) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپُرس ہونی ہے۔[۴۲]

(۱۴) زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔[۴۳]

کی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد ٹھیرایا گیا۔

۴۰ – یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی، بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اُصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سدِّباب کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

۴۱ – یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس کا انجام اس لیے بہتر ہے کہ اس سے باہمی اعتماد قائم ہوتا ہے، بائع اور خریدار دونوں ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں، اور یہ چیز انجام کار تجارت کے فروغ اور عام خوش حالی کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ رہی آخرت، تو وہاں انجام کی بھلائی کا سارا دارومدار ہی ایمان اور خدا ترسی پر ہے۔

۴۲ – اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کے بجائے ”علم“ کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظامِ ملکی میں، عُلوم وفنون اور نظامِ تعلیم میں، غرض ہر شعبۂ حیات میں کی گئی اور اُن بے شمار خرابیوں سے فکر وعمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اُصول طے کر دیا گیا کہ محض شُبہے پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیشِ جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں یہ پالیسی متعیّن کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے اور نہ مجرّد شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظامِ تعلیم میں بھی اُن نام نہاد عُلوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اُس چیز کو مانیں جو خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى
اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى
فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ
وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع

اِن اُمور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے[۴۴]۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

اور دیکھ! اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبُود نہ بنا بیٹھ، ورنہ تُو جہنّم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محرُوم ہو کر[۴۵] — کیسی عجیب بات ہے کہ تمھارے رب نے تمھیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لیے ملائکہ کو بیٹیاں بنا لیا[۴۶]؟ بڑی جھُوٹی بات ہے جو تم لوگ زبانوں سے نکالتے ہو۔ؑ

علم کی رو سے ثابت ہو۔

۴۳ – مطلب یہ ہے کہ جبّاروں اور متکبّروں کی رَوِش سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرزِ عمل اور قومی رَوِیّے، دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیّبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زندگی میں جبّاری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ حتّٰی کہ عین حالتِ جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے فخر و غرور کی کوئی بات نہ نکلی۔ ان کی نِشَست و برخاست، چال ڈھال، لباس، مکان، سواری اور عام برتاؤ میں انکسار و تواضع، بلکہ فقیری و درویشی کی شان پائی جاتی تھی، اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے، اس وقت بھی اکڑ اور تبختُر سے کبھی اپنا رعب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

۴۴ – یعنی ان میں سے جو چیز بھی ممنوع ہے، اس کا ارتکاب اللہ کو ناپسند ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں، جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے۔

۴۵ – بظاہر تو خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو خطاب کر کے جو بات فرمایا کرتا ہے، اس کا اصل مُخاطب ہر انسان ہُوا کرتا ہے۔

۴۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نحل، آیات ۵۷ تا ۵۹ مع حواشی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا
نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا
اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ

ہم نے اِس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں، مگر وہ حق سے اور زیادہ دُور ہی بھاگے جا رہے ہیں۔ اَے محمدؐ! ان سے کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دُوسرے خدا بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو وہ مالکِ عرش کے مقام پر پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے۔[۴۷] پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اُس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری

۴۷ – یعنی وہ خود مالکِ عرش بننے کی کوشش کرتے۔ اس لیے کہ چند ہستیوں کا خدائی میں شریک ہونا دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو وہ سب اپنی اپنی جگہ مستقل خدا ہوں۔ یا ان میں سے ایک اصل خدا ہو، اور باقی اس کے بندے ہوں، جنھیں اس نے کچھ خدائی اختیارات دے رکھے ہوں۔ پہلی صورت میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ یہ سب آزاد و خودمختار خدا ہمیشہ، ہر معاملے میں، ایک دوسرے کے ارادے سے موافقت کر کے اِس اتھاہ کائنات کے نظم کو اتنی مکمل ہم آہنگی، یکسانی اور تناسُب و توازن کے ساتھ چلا سکتے۔ ناگزیر تھا کہ اُن کے منصوبوں اور ارادوں میں قدم قدم پر تصادُم ہوتا اور ہر ایک اپنی خدائی دوسرے خداؤں کی موافقت کے بغیر چلتی نہ دیکھ کر یہ کوشش کرتا کہ وہ تنہا ساری کائنات کا مالک بن جائے۔ رہی دوسری صورت، تو بندے کا ظرف خدائی اختیارات تو درکنار، خدائی کے ذرا سے وہم اور شائبے تک کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اگر کہیں کسی مخلوق کی طرف ذرا سی خدائی بھی منتقل کر دی جاتی تو وہ پھٹ پڑتا، چند لمحوں کے لیے بھی بندہ بن کر رہنے پر راضی نہ ہوتا، اور فوراً ہی خداوندِ عالم بن جانے کی فکر شروع کر دیتا۔

جس کائنات میں گیہوں کا ایک دانہ اور گھاس کا ایک تنکا بھی اُس وقت تک پیدا نہ ہوتا ہو جب تک کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں مل کر اُس کے لیے کام نہ کریں، اُس کے متعلق صرف ایک انتہا درجے کا جاہل اور کُند ذہن آدمی ہی یہ تصور کرسکتا ہے کہ اُس کی فرماں روائی ایک سے زیادہ خودمختار یا نیم مختار خدا کر رہے ہوں گے۔ ورنہ جس نے کچھ بھی اس نظام کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے کی کوشش کی ہو، وہ تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہاں خدائی بالکل ایک ہی کی ہے اور اس کے ساتھ کسی درجے میں بھی کسی اور کے شریک ہونے کا قطعی امکان نہیں ہے۔

وَ مَنْ فِيهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا
تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَ اِذَا قَرَاْتَ
الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا
مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ

چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں[۴۸]۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی[۴۹] ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بُردبار اور درگزر کرنے والا ہے[۵۰]۔

جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمھارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں، اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے، اور ان کے کانوں میں

---

۴۸ – یعنی ساری کائنات اور اس کی ہر شے اپنے پورے وجود سے اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور جو اس کی پروردگاری و نگہبانی کر رہا ہے، اس کی ذات ہر عیب اور نقص اور کمزوری سے منزّہ ہے، اور وہ اس سے بالکل پاک ہے کہ خدائی میں کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔

۴۹ – حمد کے ساتھ تسبیح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے نہ صرف یہ کہ اپنے خالق اور رب کا عُیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہونا ظاہر کر رہی ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ اُس کا تمام کمالات سے متّصف اور تمام تعریفوں کا مستحق ہونا بھی بیان کرتی ہے۔ ایک ایک چیز اپنے پورے وجود سے یہ بتا رہی ہے کہ اس کا صانع اور منتظم وہ ہے جس پر سارے کمالات ختم ہو گئے ہیں اور حمد اگر ہے تو بس اسی کے لیے ہے۔

۵۰ – یعنی یہ اُس کا حلم اور اس کی شانِ غفاری ہے کہ تم اس کی جناب میں گستاخیوں پر گستاخیاں کیے جاتے ہو، اور اُس پر طرح طرح کے بہتان تراشتے ہو اور پھر بھی وہ درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ نہ رزق بند کرتا ہے، نہ اپنی نعمتوں سے محروم کرتا ہے، اور نہ ہر گستاخ پر فوراً بجلی گرا دیتا ہے۔ پھر یہ بھی اس کی بردباری اور اس کے درگزر ہی کا ایک کرشمہ ہے کہ وہ افراد کو بھی اور قوموں کو بھی سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، انبیا اور مصلحین اور مبلّغین کو اُن کی فہمایش اور رہنمائی کے لیے بار بار اُٹھاتا رہتا ہے، اور جو بھی اپنی غلطی کو محسوس کر کے سیدھا راستہ اختیار کر لے اس کی پچھلی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ

گرانی پیدا کردیتے ہیں۵۱۔ اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ

۵۱ - یعنی آخرت پر ایمان نہ لانے کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ آدمی کے دل پر قُفل چڑھ جائیں اور اس کے کان اُس دعوت کے لیے بند ہو جائیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی تو دعوت ہی اس بنیاد پر ہے کہ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو سے دھوکا نہ کھاؤ۔ یہاں اگر کوئی حساب لینے والا اور جواب طلب کرنے والا نظر نہیں آتا تو یہ نہ سمجھو کہ تم کسی کے سامنے ذمہ دار و جواب دہ ہو ہی نہیں۔ یہاں اگر شرک، دہریّت، کفر، توحید، سب ہی نظریّے آزادی سے اختیار کیے جاسکتے ہیں، اور دنیوی لحاظ سے کوئی خاص فرق پڑتا نظر نہیں آتا، تو یہ نہ سمجھو کہ ان کے کوئی الگ الگ مستقل نتائج ہیں ہی نہیں۔ یہاں اگر فسق و فُجور اور طاعت و تقویٰ، ہر قسم کے رَوِیّے اختیار کیے جاسکتے ہیں اور عملاً ان میں سے کسی رَوِیّے کا کوئی ایک لازمی نتیجہ رونما نہیں ہوتا، تو یہ نہ سمجھو کہ کوئی اٹل اخلاقی قانون سرے سے ہے ہی نہیں۔ دراصل حساب طلبی و جواب دِہی سب کچھ ہے، مگر وہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ہوگی۔ توحید کا نظریّہ برحق اور باقی سب نظریّات باطل ہیں، مگر ان کے اصلی اور قطعی نتائج حیات بعد الموت میں ظاہر ہوں گے اور وہیں وہ حقیقت بے نقاب ہوگی جو اس پردۂ ظاہر کے پیچھے چُھپی ہوئی ہے۔ ایک اٹل اخلاقی قانون ضرور ہے جس کے لحاظ سے فِسق نقصان رساں اور طاعت فائدہ بخش ہے، مگر اس قانون کے مطابق آخری اور قطعی فیصلے بھی بعد کی زندگی ہی میں ہوں گے۔ لہٰذا تم دنیا کی اِس عارضی زندگی پر فریفتہ نہ ہو اور اس کے مشکوک نتائج پر اعتماد نہ کرو، بلکہ اُس جواب دِہی پر نگاہ رکھو جو تمھیں آخرِ کار اپنے خدا کے سامنے کرنی ہوگی، اور وہ صحیح اعتقادی اور اخلاقی رَوِیّہ اختیار کرو جو تمھیں آخرت کے امتحان میں کامیاب کرے ــــــ یہ ہے قرآن کی دعوت۔ اب یہ بالکل ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو شخص سرے سے آخرت ہی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور جس کا سارا اعتماد اِسی دنیا کے مظاہر اور محسوسات و تجرِبات پر ہے، وہ کبھی قرآن کی اِس دعوت کو قابلِ التفات نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کے پردۂ گوش سے تو یہ آواز ٹکرا ٹکرا کر ہمیشہ اُچٹتی ہی رہے گی، کبھی دل تک پہنچنے کی راہ نہ پائے گی۔ اسی نفسیاتی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ جو آخرت کو نہیں مانتا، ہم اس کے دل اور اس کے کان قرآن کی دعوت کے لیے بند کر دیتے ہیں۔ یعنی یہ ہمارا قانونِ فطرت ہے جو اُس پر یوں نافذ ہوتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ کفارِ مکّہ کا اپنا قول تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر اُلٹ دیا ہے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ○ (آیت ۵) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ”اے محمدؐ! تو جس چیز کی طرف ہمیں دعوت دیتا ہے اس کے لیے ہمارے دل بند ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان حجاب حائل ہو گیا ہے۔ پس تُو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔“ یہاں ان کے اسی قول کو دُہرا کر اللہ تعالیٰ یہ بتا رہا ہے کہ یہ کیفیت جسے تم اپنی خوبی سمجھ کر بیان کر رہے ہو،

نُفُوۡرًا ﴿۴۶﴾ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ اِذۡ ہُمۡ
نَجۡوٰۤی اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ﴿۴۷﴾
اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۴۸﴾ الربع

موڑ لیتے ہیں[52]۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب وہ کان لگا کر تمھاری بات سُنتے ہیں تو دراصل کیا سُنتے ہیں، اور جب بیٹھ کر باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں کہ یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم لوگ جا رہے ہو[53] ــــــ دیکھو، کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں۔ یہ بھٹک گئے ہیں۔ انھیں راستہ نہیں ملتا[54]۔

یہ تو دراصل ایک پھٹکار ہے جو تمھارے انکارِ آخرت کی بدولت ٹھیک قانونِ فطرت کے مطابق تم پر پڑی ہے۔

۵۲ – یعنی انھیں یہ بات سخت ناگوار ہوتی ہے کہ تم بس اللہ ہی کو رب قرار دیتے ہو، ان کے بنائے ہوئے دوسرے ارباب کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اُن کو یہ وہابیت ایک آن پسند نہیں آتی کہ آدمی بس اللہ ہی اللہ کی رٹ لگائے چلا جائے۔ نہ بزرگوں کے تصرّفات کا کوئی ذکر، نہ آستانوں کی فیض رسانی کا کوئی اعتراف، نہ اُن شخصیتوں کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین جن پر، ان کے خیال میں، اللہ نے اپنی خدائی کے اختیارات بانٹ رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب شخص ہے جس کے نزدیک علمِ غیب ہے تو اللہ کو، قدرت ہے تو اللہ کی، تصرُّفات و اختیارات ہیں تو بس ایک اللہ ہی کے۔ آخر یہ ہمارے آستانوں والے بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں، جن کے ہاں سے ہمیں اولاد ملتی ہے، بیماروں کو شفا نصیب ہوتی ہے، کاروبار چمکتے ہیں، اور منہ مانگی مرادیں بَر آتی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الزُّمَر، آیت ۴۵، حاشیہ ۶۴)

۵۳ – یہ اشارہ ہے اُن باتوں کی طرف جو کفارِ مکّہ کے سردار آپس میں کیا کرتے تھے۔ اُن کا حال یہ تھا کہ چھپ چھپ کر قرآن سنتے اور پھر آپس میں مشورے کرتے تھے کہ اس کا توڑ کیا ہونا چاہیے۔ بسا اوقات انھیں اپنے ہی آدمیوں میں سے کسی پر یہ شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ شاید یہ شخص قرآن سن کر کچھ متاثّر ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ سب مل کر اس کو سمجھاتے تھے کہ اجی، یہ کس کے پھیر میں آ رہے ہیں، یہ شخص تو سحر زدہ ہے، یعنی کسی دشمن نے اس پر جادو کر دیا ہے اس لیے بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

۵۴ – یعنی یہ تمھارے متعلق کوئی ایک رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ مختلف اوقات میں بالکل مختلف اور متضاد باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں: تم خود جادوگر ہو۔ کبھی کہتے ہیں: تم پر کسی اور نے جادو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں: تم شاعر ہو۔ کبھی کہتے ہیں: تم مجنون ہو۔ ان کی یہ متضاد باتیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت ان کو معلوم نہیں ہے، ورنہ ظاہر ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا
يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ
فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ
مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ
فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ع ۵

وہ کہتے ہیں: ''جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے؟'' ـــــ ان سے کہو: ''تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ، یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمھارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو'' (پھر بھی تم اُٹھ کر رہو گے)۔ وہ ضرور پوچھیں گے:[55] ''کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟'' جواب میں کہو: ''وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا۔'' وہ سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے ''اچھا، تو یہ ہو گا کب؟'' تم کہو: ''کیا عجب، وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ جس روز وہ تمھیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمھارا گمان اُس وقت یہ ہو گا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔''[56] ؏

کہ وہ آئے دن ایک نئی بات چھانٹنے کے بجائے کوئی ایک ہی قطعی رائے ظاہر کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کسی قول پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ایک الزام رکھتے ہیں، پھر آپ ہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ چسپاں نہیں ہوتا۔ اس کے بعد دوسرا الزام لگاتے ہیں، اور اسے بھی لگتا ہوا نہ پا کر ایک تیسرا الزام تصنیف کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ہر نیا الزام ان کے پچھلے الزام کی تردید کر دیتا ہے، اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ صداقت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہے، محض عداوت کی بنا پر یہ بیہودہ تہمتیں گھڑے جا رہے ہیں۔

۵۵ - انغاض کے معنی ہیں سر کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف ہلانا، جس طرح اظہارِ تعجب کے لیے، یا مذاق اُڑانے کے لیے آدمی کرتا ہے۔

۵۶ - یعنی دنیا میں مرنے کے وقت سے لے کر قیامت میں اُٹھنے کے وقت تک کی مدت تم کو چند گھنٹوں سے زیادہ محسوس نہ ہو گی۔ تم اس وقت یہ سمجھو گے کہ ہم ذرا دیر سوئے پڑے تھے کہ یکایک اس شورِ محشر نے ہمیں جگا اُٹھایا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ
بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ
اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ

اور اے محمدؐ! میرے بندوں[57] سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔[58] دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔[59] تمھارا رب تمھارے حال سے زیادہ واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمھیں عذاب دے دے۔[60] اور اے نبیؐ! ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں

اور یہ جو فرمایا کہ تم اللہ کی حمد کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہو گے، تو یہ ایک بڑی حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اور کافر، ہر ایک کی زبان پر اس وقت اللہ کی حمد ہو گی۔ مومن کی زبان پر اس لیے کہ پہلی زندگی میں اس کا اعتقاد و یقین اور اس کا وظیفہ یہی تھا۔ اور کافر کی زبان پر اس لیے کہ اس کی فطرت میں یہی چیز ودیعت تھی، مگر اپنی حماقت سے وہ اس پر پردہ ڈالے ہوئے تھا۔ اب نئے سرے سے زندگی پاتے وقت سارے مصنوعی حجابات ہٹ جائیں گے اور اصل فطرت کی شہادت بلا ارادہ اس کی زبان پر جاری ہو جائے گی۔

۵۷ – یعنی اہلِ ایمان سے۔

۵۸ – یعنی کفار و مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی اور مبالغے اور غلو سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں، مسلمانوں کو بہرحال نہ تو کوئی بات خلافِ حق زبان سے نکالنی چاہیے، اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے۔ انھیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچی تُلی ہو، برحق ہو، اور ان کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

۵۹ – یعنی جب کبھی تمھیں مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو، اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے، تو فوراً سمجھو کہ یہ شیطان ہے جو تمھیں اکسا رہا ہے، تاکہ دعوتِ دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوعِ انسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

۶۰ – یعنی اہلِ ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے نہ آنے چاہییں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے۔ اس چیز کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہی سب انسانوں کے ظاہر و باطن اور ان کے حال و مستقبل سے واقف ہے۔ اسی کو یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَ
لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

بھیجا ہے۔[۶۱]

تیرا رب زمین اور آسمانوں کی مخلوقات کو زیادہ جانتا ہے۔ ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیے،[۶۲] اور ہم نے ہی داؤدؑ کو زبور دی تھی۔[۶۳]

فیصلہ کرنا ہے کہ کس پر رحمت فرمائے اور کسے عذاب دے۔ انسان اُصولی حیثیت سے تو یہ کہنے کا ضرور مجاز ہے کہ کتاب اللہ کی رُو سے کس قسم کے انسان رحمت کے مستحق ہیں اور کس قسم کے انسان عذاب کے مستحق۔ مگر کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں شخص کو عذاب دیا جائے گا اور فلاں شخص بخشا جائے گا۔

غالبًا یہ نصیحت اس بنا پر فرمائی گئی ہے کہ کبھی کبھی کفار کی زیادتیوں سے تنگ آ کر مسلمانوں کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے ہوں گے کہ تم لوگ دوزخ میں جاؤ گے، یا تم کو خدا عذاب دے گا۔

۶۱ – یعنی نبیؐ کا کام دعوت دینا ہے۔ لوگوں کی قسمتیں اس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئی ہیں کہ وہ کسی کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ کرتا پھرے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ تنبیہ فرمائی۔ بلکہ دراصل اس سے مسلمانوں کو متنبّہ کرنا مقصود ہے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جب نبیؐ تک کا یہ منصب نہیں ہے تو تم جنت اور دوزخ کے ٹھیکیدار کہاں بنے جا رہے ہو۔

۶۲ – اس فقرے کے اصل مخاطَب کفارِ مکّہ ہیں، اگرچہ بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ جیسا کہ معاصرین کا بالعُموم قاعدہ ہوتا ہے، آنحضرتؐ کے ہم عصر اور ہم قوم لوگوں کو آپؐ کے اندر کوئی فضل و شرف نظر نہ آتا تھا۔ وہ آپؐ کو اپنی بستی کا ایک معمولی انسان سمجھتے تھے، اور جن مشہور شخصیتوں کو گزرے ہوئے چند صدیاں گزر چکی تھیں، ان کے متعلق یہ گمان کرتے تھے کہ عظمت تو بس اُن پر ختم ہو گئی ہے۔ اس لیے آپؐ کی زبان سے نبوت کا دعویٰ سُن کر وہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ شخص دُوں کی لیتا ہے، اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھا ہے، بھلا کہاں یہ اور کہاں اگلے وقتوں کے وہ بڑے بڑے پیغمبر جن کی بزرگی کا سکّہ ایک دنیا مان رہی ہے۔ اس کا مختصر جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ زمین اور آسمان کی ساری مخلوق ہماری نگاہ میں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کون کیا ہے اور کس کا کیا مرتبہ ہے۔ اپنے فضل کے ہم خود مالک ہیں اور پہلے بھی ایک سے ایک بڑھ کر عالی مرتبہ نبی پیدا کر چکے ہیں۔

۶۳ – یہاں خاص طور پر داؤد علیہ السلام کو زَبُور دیے جانے کا ذکر غالبًا اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ داؤد علیہ السلام بادشاہ تھے، اور بادشاہ بالعُموم خدا سے زیادہ دُور ہُوا کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین جس وجہ سے آپؐ کی پیغمبری

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝۵۶ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ

اِن سے کہو: پکار دیکھو اُن معبُودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو، وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں[۶۴]۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اُس سے قریب تر ہو جائے، اور وہ اس کی رحمت کے اُمیدوار اور اُس کے عذاب سے خائف ہیں[۶۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ

وخدارسیدگی ماننے سے انکار کرتے تھے، وہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ آپ عام انسانوں کی طرح بیوی بچے رکھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، بازاروں میں چل پھر کر خرید وفروخت کرتے تھے، اور وہ سارے ہی کام کرتے تھے جو کوئی دنیادار آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے کیا کرتا ہے۔ کفارِ مکہ کا کہنا یہ تھا کہ تم تو ایک دنیادار آدمی ہو، تمھیں خدارسیدگی سے کیا تعلق؟ پہنچے ہوئے لوگ تو وہ ہوتے ہیں جنھیں اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں ہوتا، بس ایک گوشے میں بیٹھے اللہ کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہ کہاں اور گھر کے آٹے دال کی فکر کہاں! اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ایک پوری بادشاہت کے انتظام سے بڑھ کر دنیاداری اور کیا ہوگی۔ مگر اس کے باوجود داؤدؑ کو نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا گیا۔

۶۴ – اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا ہی شرک نہیں ہے، بلکہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے دُعا مانگنا، یا اس کو مدد کے لیے پکارنا بھی شرک ہے۔ دُعا اور استمداد و استعانت، اپنی حقیقت کے اعتبار سے عبادت ہی ہیں، اور غیر اللہ سے مُناجات کرنے والا ویسا ہی مجرم ہے جیسا ایک بُت پرست مجرم ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی کچھ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ نہ کوئی دوسرا کسی مصیبت کو ٹال سکتا ہے، نہ کسی بُری حالت کو اچھی حالت سے بدل سکتا ہے۔ اس طرح کا اعتقاد خدا کے سوا جس ہستی کے بارے میں بھی رکھا جائے، بہرحال ایک مشرکانہ اعتقاد ہے۔

۶۵ – یہ الفاظ خود گواہی دے رہے ہیں کہ مشرکین کے جن معبودوں اور فریادرسوں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، ان سے مراد پتھر کے بُت نہیں ہیں، بلکہ یا تو فرشتے ہیں یا گزرے ہوئے زمانے کے برگزیدہ انسان۔ مطلب صاف صاف یہ ہے کہ انبیاؑ ہوں یا اولیا یا فرشتے، کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ تمھاری دعائیں سُنے اور تمھاری مدد کو پہنچے۔ تم حاجت روائی کے لیے اُن کو وسیلہ بنا رہے ہو، اور اُن کا حال یہ ہے کہ وہ خود اللہ کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں، اور اس کا زیادہ سے زیادہ تقرّب حاصل کرنے کے وسائل ڈھونڈ رہے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا
نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا
شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَمَا مَنَعَنَآ
اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَ
اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ
بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ

تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق۔

اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں۔[۶۶] یہ نوِشتۂ الٰہی میں لکھا ہُوا ہے۔

اور ہم کو نشانیاں بھیجنے[۶۷] سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ اِن سے پہلے کے لوگ اُن کو جھٹلا چکے ہیں۔ (چنانچہ دیکھ لو) ثمود کو ہم نے عَلانیہ اُونٹنی لا کر دی اور انھوں نے اس پر ظلم کیا۔[۶۸] ہم نشانیاں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انھیں دیکھ کر ڈریں۔[۶۹] یاد کرو اے محمدؐ! ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تیرے رب نے

---

۶۶ – یعنی بقائے دوام کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ہر بستی کو یا تو طبعی موت مرنا ہے، یا خدا کے عذاب سے ہلاک ہونا ہے۔ تم کہاں اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ ہماری یہ بستیاں ہمیشہ کھڑی رہیں گی؟

۶۷ – یعنی محسوس معجزات جو دلیلِ نبوّت کی حیثیت سے پیش کیے جائیں، جن کا مطالبہ کفارِ قریش بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔

۶۸ – مدعا یہ ہے کہ ایسا معجزہ دیکھ لینے کے بعد جب لوگ اُس کی تکذیب کرتے ہیں، تو پھر لامحالہ ان پر نزولِ عذاب واجب ہو جاتا ہے، اور پھر ایسی قوم کو تباہ کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ پچھلی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ متعدد قوموں نے صریح معجزے دیکھ لینے کے بعد بھی اُن کو جھٹلایا اور پھر تباہ کر دی گئیں۔ اب یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ایسا کوئی معجزہ نہیں بھیج رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمھیں سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے مہلت دے رہا ہے۔ مگر تم ایسے بیوقوف لوگ ہو کہ معجزے کا مطالبہ کر کر کے ثمود کے سے انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو۔

۶۹ – یعنی معجزے دکھانے سے مقصود تماشا دکھانا تو کبھی نہیں رہا ہے۔ اس سے مقصود تو ہمیشہ یہی رہا ہے کہ لوگ

اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ
وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا
طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۞۶۰ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ

ع ۶

اِن لوگوں کو گھیر رکھا ہے[۷۰]۔ اور یہ جو کچھ ابھی ہم نے تمھیں دکھایا ہے[۷۱]، اِس کو اور اُس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے[۷۲]، ہم نے اِن لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا[۷۳]۔ ہم اِنھیں تنبیہ پر تنبیہ کیے جا رہے ہیں، مگر ہر تنبیہ اِن کی سرکشی ہی میں اضافہ کیے جاتی ہے۔ ؏
اور یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا، مگر

انھیں دیکھ کر خبردار ہو جائیں، انھیں معلوم ہو جائے کہ نبی کی پشت پر قادرِ مُطلق کی بے پناہ طاقت ہے، اور وہ جان لیں کہ اس کی نافرمانی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

۷۰ – یعنی تمھاری دعوتِ پیغمبرانہ کے ابتدائی دَور میں ہی، جب کہ قریش کے ان کافروں نے تمھاری مخالفت و مُزاحمت شروع کی تھی، ہم نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کو گھیرے میں لے رکھا ہے، یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دیکھ لیں، یہ کسی طرح تیری دعوت کا راستہ نہ روک سکیں گے، اور یہ کام جو تو نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اِن کی ہر مزاحمت کے باوجود ہو کر رہے گا۔ اب اگر ان لوگوں کو معجزہ دیکھ کر ہی خبردار ہونا ہے، تو انھیں یہ معجزہ دکھایا جا چکا ہے کہ جو کچھ ابتدا میں کہہ دیا گیا تھا وہ پورا ہو کر رہا، اِن کی کوئی مخالفت بھی دعوتِ اسلامی کو پھیلنے سے نہ روک سکی، اور یہ تیرا بال تک بیکا نہ کر سکے۔ ان کے پاس آنکھیں ہوں تو یہ اس امرِ واقعہ کو دیکھ کر خود سمجھ سکتے ہیں کہ نبی کی اس دعوت کے پیچھے اللہ کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

یہ بات کہ اللہ نے مخالفین کو گھیرے میں لے رکھا ہے، اور نبی کی دعوت اللہ کی حفاظت میں ہے، مکّے کے ابتدائی دَور کی سورتوں میں متعدد جگہ ارشاد ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ بروج میں فرمایا: بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِيْبٍ ۞۱۹ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۞ (مگر یہ کافر جُھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، اور اللہ نے اِن کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔)

۷۱ – اشارہ ہے معراج کی طرف۔ اس کے لیے یہاں لفظِ ''رؤیا'' جو استعمال ہوا ہے یہ ''خواب'' کے معنی میں نہیں ہے بلکہ آنکھوں دیکھنے کے معنی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ محض خواب ہوتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خواب ہی کی حیثیت سے کفار کے سامنے بیان کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان کے لیے فتنہ بن جاتا۔ خواب ایک سے ایک عجیب دیکھا جاتا ہے، اور لوگوں سے بیان بھی کیا جاتا ہے، مگر وہ کسی کے لیے بھی ایسے اچنبھے کی چیز نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی وجہ سے خواب دیکھنے والے کا مذاق اُڑائیں اور اس پر جھوٹے دعوے یا جنون کا الزام لگانے لگیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِبۡلِيۡسَ ؕ قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِيۡنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيۡتَكَ
هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَاَحۡتَنِكَنَّ
ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذۡهَبۡ فَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّ جَهَنَّمَ

ابلیس نے نہ کیا۔[۷۵] اس نے کہا: ''کیا میں اُس کو سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے بنایا ہے؟'' پھر وہ بولا: ''دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تُو نے اِسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تُو مجھے قیامت کے دن تک مُہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں،[۷۵] بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اچھا تو جا، ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں، تجھ سمیت اُن سب کے لیے جہنم ہی

۷۲ – یعنی زَقُّوم، جس کے متعلق قرآن میں خبر دی گئی ہے کہ وہ دوزخ کی تہ میں پیدا ہوگا اور دوزخیوں کو اسے کھانا پڑے گا۔ اس پر لعنت کرنے سے مُراد اُس کا اللہ کی رحمت سے دُور ہونا ہے۔ یعنی وہ اللہ کی رحمت کا نشان نہیں ہے کہ اسے اپنی مہربانی کی وجہ سے اللہ نے لوگوں کی غذا کے لیے پیدا فرمایا ہو، بلکہ وہ اللہ کی لعنت کا نشان ہے، جسے ملعون لوگوں کے لیے اس نے پیدا کیا ہے، تاکہ وہ بھوک سے تڑپ کر اس پر منہ ماریں اور مزید تکلیف اُٹھائیں۔ سورۂ دُخان (آیات ۴۳-۴۶) میں اس درخت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ دوزخی جب اس کو کھائیں گے تو وہ ان کے پیٹ میں ایسی آگ لگائے گا جیسے ان کے پیٹ میں پانی کھول رہا ہو۔

۷۳ – یعنی ہم نے اِن کی بھلائی کے لیے تم کو معراج کے مشاہدات کرائے، تاکہ تم جیسے صادق و امین انسان کے ذریعے سے ان لوگوں کو حقیقتِ نفس الامری کا علم حاصل ہو اور یہ متنبّہ ہو کر راہِ راست پر آ جائیں، مگر اِن لوگوں نے اُلٹا اُس پر تمھارا مذاق اُڑایا۔ ہم نے تمھارے ذریعے سے اِن کو خبردار کیا کہ یہاں کی حرام خوریاں آخرکار تمھیں زَقُّوم کے نوالے کھلوا کر رہیں گی، مگر انھوں نے اُس پر ایک ٹھٹھا لگایا اور کہنے لگے: ذرا اس شخص کو دیکھو، ایک طرف کہتا ہے کہ دوزخ میں بلا کی آگ بھڑک رہی ہو گی، اور دوسری طرف خبر دیتا ہے کہ وہاں درخت اُگیں گے!

۷۴ – تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹، النساء، آیات ۱۱۷-۱۲۱، الاعراف، آیات ۱۱-۲۵، الحجر، آیات ۲۶-۴۲، اور ابراہیم، آیت ۲۲۔

اِس سلسلۂ کلام میں یہ قصّہ دراصل یہ بات ذہن نشین کرنے کے لیے بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں اِن کافروں کا یہ تمرّد، اور تنبیہات سے اِن کی یہ بے اعتنائی، اور کج روی پر ان کا یہ اصرار ٹھیک ٹھیک اُس شیطان کی پیروی ہے جو ازل سے انسان کا دشمن ہے، اور اس روش کو اختیار کر کے درحقیقت یہ لوگ اُس جال میں پھنس رہے ہیں جس میں اولادِ آدم کو پھانس کر

جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ
بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٦٤﴾

بھرپور جزا ہے۔ تُو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے[76]، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا[77]، مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا[78]، اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس[79]۔۔۔۔ اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔۔۔۔

تباہ کر دینے کے لیے شیطان نے آغازِ تاریخ انسانی میں چیلنج کیا تھا۔

۷۵ – "بیخ کنی کر ڈالوں"، یعنی ان کے قدم سلامتی کی راہ سے اکھاڑ پھینکوں۔ "احتناک" کے اصل معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں۔ چونکہ انسان کا اصل مقام خلافتِ الٰہی ہے، جس کا تقاضا اطاعت میں ثابت قدم رہنا ہے، اس لیے اس مقام سے اُس کا ہٹ جانا بالکل ایسا ہے جیسے کسی درخت کا بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا جانا۔

۷۶ – اصل میں لفظ "اِسْتَفْزِزْ" استعمال ہُوا ہے، جس کے معنی اِستخفاف کے ہیں۔ یعنی کسی کو ہلکا اور کمزور پا کر اسے بہا لے جانا، یا اس کے قدم پھسلا دینا۔

۷۷ – اِس فقرے میں شیطان کو اس ڈاکو سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی بستی پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لائے اور ان کو اشارہ کرتا جائے کہ اِدھر لُوٹو، اُدھر چھاپا مارو، اور وہاں غارت گری کرو۔ شیطان کے سواروں اور پیادوں سے مراد وہ سب جِنّ اور انسان ہیں جو بے شمار مختلف شکلوں اور حیثیتوں میں ابلیس کے مِشن کی خدمت کر رہے ہیں۔

۷۸ – یہ ایک بڑا ہی معنی خیز فقرہ ہے جس میں شیطان اور اس کے پیرووں کے باہمی تعلق کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ جو شخص مال کمانے اور اس کو خرچ کرنے میں شیطان کے اشاروں پر چلتا ہے، اس کے ساتھ گویا شیطان مفت کا شریک بنا ہُوا ہے۔ محنت میں اس کا کوئی حصّہ نہیں، جرم اور گناہ اور غلط کاری کے بُرے نتائج میں وہ حصہ دار نہیں، مگر اس کے اشاروں پر یہ بیوقوف اِس طرح چل رہا ہے جیسے اِس کے کاروبار میں وہ برابر کا شریک، بلکہ شریکِ غالب ہے۔ اسی طرح اولاد تو آدمی کی اپنی ہوتی ہے، اور اُسے پالنے پوسنے میں سارے پاپڑ آدمی خود بیلتا ہے، مگر شیطان کے اشاروں پر وہ اس اولاد کو گمراہی اور بداخلاقی کی تربیت اس طرح دیتا ہے گویا اس اولاد کا تنہا وہی باپ نہیں ہے بلکہ شیطان بھی باپ ہونے میں اس کا شریک ہے۔

۷۹ – یعنی ان کو غلط اُمیدیں دلا۔ ان کو جھوٹی توقعات کے چکّر میں ڈال۔ اُن کو سبز باغ دکھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾
رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾ وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ

یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا،[۸۰] اور توکّل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔[۸۱]''
تمھارا (حقیقی) رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمھاری کشتی چلاتا ہے[۸۲] تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔[۸۳] حقیقت یہ ہے کہ وہ تمھارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا

۸۰ – اس کے دو مطلب ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ میرے بندوں، یعنی انسانوں پر تجھے یہ اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انھیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ تو فقط بہکانے اور پُھسلانے اور غلط مشورے دینے اور جھوٹے وعدے کرنے کا مجاز کیا جاتا ہے، مگر تیری بات کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان بندوں کا اپنا کام ہوگا۔ تیرا ایسا تسلُّط اُن پر نہ ہوگا کہ وہ تیری راہ پر جانا چاہیں یا نہ چاہیں، بہرحال تُو ہاتھ پکڑ کر ان کو گھسیٹ لے جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میرے خاص بندوں، یعنی صالحین پر تیرا بس نہ چلے گا۔ کمزور اور ضعیف الارادہ لوگ تو ضرور تیرے وعدوں سے دھوکا کھائیں گے، مگر جو لوگ میری بندگی پر ثابت قدم ہوں، وہ تیرے قابو میں نہ آسکیں گے۔

۸۱ – یعنی جو لوگ اللہ پر اعتماد کریں، اور جن کا بھروسا اسی کی رہنمائی اور توفیق اور مدد پر ہو، اُن کا بھروسا ہرگز غلط ثابت نہ ہوگا۔ انھیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اللہ ان کی ہدایت کے لیے بھی کافی ہوگا اور ان کی دست گیری و اعانت کے لیے بھی۔ البتہ جن کا بھروسا اپنی طاقت پر ہو، یا اللہ کے سوا کسی اور پر ہو، وہ اس آزمایش سے بخیریت نہ گزر سکیں گے۔

۸۲ – اُوپر کے سلسلۂ بیان سے اس کا تعلق سمجھنے کے لیے اِس رُکوع کے ابتدائی مضمون پر پھر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابلیس اوّل روزِ آفرینش سے اولادِ آدم کے پیچھے پڑا ہُوا ہے تاکہ اس کو آرزوؤں اور تمناؤں اور جھوٹے وعدوں کے دام میں پھانس کر راہِ راست سے ہٹالے جائے اور یہ ثابت کر دے کہ وہ اس بزرگی کا مستحق نہیں ہے جو اسے خدا نے عطا کی ہے۔ اس خطرے سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی بندگی پر ثابت قدم رہے اور ہدایت و اعانت کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کرے اور اسی کو اپنا وکیل (مدارِ توکّل) بنائے۔ اس کے سوا دوسری جو راہ بھی انسان اختیار کرے گا، شیطان کے پھندوں سے نہ بچ سکے گا ــــــ اس تقریر سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ جو لوگ توحید کی دعوت کو رد کر رہے ہیں اور شرک پر اصرار کیے جاتے ہیں، وہ دراصل آپ ہی اپنی تباہی کے درپے ہیں۔ اسی مناسبت سے یہاں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال کیا جا رہا ہے۔

تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ
الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۞ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ
يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۞ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ
يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ
فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۞ وَلَقَدْ
كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۞ ۧ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ

دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گُم ہو جاتے ہیں [۸۴]، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ اچھا، تو کیا تم اِس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے، یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟ اور کیا تمھیں اِس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمھاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمھیں غرق کر دے، اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اُس سے تمھارے اِس انجام کی پُوچھ گچھ کر سکے؟ —— یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی [۸۵]۔ ع پھر خیال کرو اس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی گروہ کو اس کے

۸۳ – یعنی ان معاشی اور تمدّنی اور علمی و ذہنی فوائد سے مُتمتّع ہونے کی کوشش کرو جو بحری سفروں سے حاصل ہوتے ہیں۔

۸۴ – یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمھاری اصلی فطرت ایک خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اور تمھارے اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ شُعور موجود ہے کہ نفع و نقصان کے حقیقی اختیارات کا مالک بس وہی ایک ہے۔ ورنہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ جو اصل وقت دستگیری کا ہے اُس وقت تم کو ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا دستگیر نہیں سُوجھتا؟ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، سورہ یُونس، حاشیہ ۳۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ یَقْرَءُوْنَ
كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾ وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى
فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾ وَ اِنْ كَادُوْا
لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖۗ وَ
اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ﴿۷۳﴾ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ

پیشوا کے ساتھ بُلائیں گے۔ اُس وقت جن لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا، وہ اپنا کارنامہ پڑھیں[۸۶] گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور جو اِس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا، بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

اَے محمدؐ! ان لوگوں نے اِس کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی کہ تمھیں فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمھاری طرف بھیجی ہے، تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔[۸۷] اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمھیں اپنا دوست بنا لیتے۔ اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمھیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف

---

۸۵ – یعنی یہ ایک بالکل کُھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کو زمین اور اس کی اشیا پر یہ اقتدار کسی جن یا فرشتے یا سیّارے نے نہیں عطا کیا ہے، نہ کسی ولی یا نبی نے اپنی نوع کو یہ اقتدار دلوایا ہے۔ یقیناً یہ اللہ ہی کی بخشش اور اس کا کرم ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر حماقت اور جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس مرتبے پر فائز ہو کر اللہ کے بجائے اس کی مخلوق کے آگے جھکے۔

۸۶ – یہ بات قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز نیک لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ خوشی خوشی اسے دیکھیں گے، بلکہ دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ رہے بد اعمال لوگ، تو ان کا نامۂ سیاہ ان کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اسے لیتے ہی پیٹھ پیچھے چھپانے کی کوشش کریں گے۔ مُلاحظہ ہو: سورۂ الحاقہ، آیت ۱۹–۲۸، اور سورۂ انشقاق، آیت ۷–۱۳

۸۷ – یہ اُن حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو مکّے میں پیش آ رہے تھے۔ کُفارِ مکّہ اس بات کے درپے تھے کہ جس طرح بھی ہو آپؐ کو توحید کی اس دعوت سے ہٹا دیں جسے آپؐ پیش کر رہے

اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمھیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔[۸۸]

اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمھارے قدم اِس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمھیں یہاں سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمھارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔[۸۹]

تھے اور کسی نہ کسی طرح آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ ان کے شرک اور رُسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مُصالحت کرلیں۔ اس غرض کے لیے اُنھوں نے آپ کو فتنے میں ڈالنے کی ہر کوشش کی۔ فریب بھی دیے، لالچ بھی دلائے، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پروپیگنڈے کا طوفان بھی اُٹھایا، ظلم وستم بھی کیا، معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی مقاطعہ بھی کیا، اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لیے کیا جا سکتا تھا۔

۸۸ – اللہ تعالیٰ اس ساری رُوداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے: ایک، یہ کہ اگر تم حق کو حق جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتا کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر بھڑک اُٹھتا اور تمھیں دنیا و آخرت، دونوں میں دُہری سزا دی جاتی۔ دوسرے، یہ کہ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے بل بُوتے پر باطل کے اِن طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جب تک کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہُوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلابِ بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

۸۹ – یہ صریح پیشین گوئی ہے جو اُس وقت تو صرف ایک دھمکی نظر آتی تھی، مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرف بحرف سچی ثابت ہوگئی۔ اس سورت کے نزول پر ایک ہی سال گزرا تھا کہ کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، اور اس پر ۸ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمینِ عرب مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی۔ پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر

Maktaba Tul Ishaat.com

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا
تَحْوِيْلًا ۝ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ع ۸

یہ ہمارا مستقل طریقِ کار ہے جو اُن سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا[۹۰]، اور ہمارے طریقِ کار میں تم کوئی تغیّر نہ پاؤ گے۔ ع

نماز قائم کرو[۹۱] زوالِ آفتاب[۹۲] سے لے کر رات کے اندھیرے[۹۳] تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو[۹۴]،

وہاں نہ ٹھیر سکا۔

۹۰ – یعنی سارے انبیاؑ کے ساتھ اللہ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ جس قوم نے ان کو قتل یا جلاوطن کیا، پھر وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ نہ ٹھیر سکی۔ پھر یا تو خدا کے عذاب نے اسے ہلاک کیا، یا کسی دشمن قوم کو اس پر مسلّط کیا گیا، یا خود اسی نبی کے پیروؤں سے اس کو مغلوب کرا دیا گیا۔

۹۱ – مشکلات و مصائب کے اِس طوفان کا ذکر کرنے کے بعد فوراً ہی نماز قائم کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ثابت قدمی جو ان حالات میں ایک مومن کو درکار ہے، اقامتِ صلوٰۃ سے حاصل ہوتی ہے۔

۹۲ – ’’زوالِ آفتاب‘‘ ہم نے دُلُوْکِ الشَّمْسِ کا ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ و تابعین نے دُلُوک سے مراد غروب بھی لیا ہے، لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد آفتاب کا نصف النہار سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت عمرؓ، ابنِ عمرؓ، اَنَسؓ بن مالک، ابوبرزہ الاسلمی، حسن بصری، شَعْبِی، عَطاء، مجاہد، اور ایک روایت کی رُو سے ابنِ عباسؓ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام محمد باقر اور امام جعفرِ صادق سے بھی یہی قول مروی ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دُلُوکِ شمس کی یہی تشریح منقول ہے، اگرچہ ان کی سند کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔

۹۳ – غَسَقِ الَّیْلِ بعض کے نزدیک ’’رات کا پوری طرح تاریک ہو جانا‘‘ ہے، اور بعض اس سے نصف شب مراد لیتے ہیں۔ اگر پہلا قول تسلیم کیا جائے تو اس سے عشا کا اوّل وقت مراد ہو گا، اور اگر دُوسرا قول صحیح مانا جائے تو پھر یہ اشارہ عشا کے آخر وقت کی طرف ہے۔

۹۴ – فجر کے لُغوی معنیٰ ہیں: ’’پَو پھٹنا‘‘۔ یعنی وہ وقت جب اوّل اوّل سپیدۂ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے۔

فجر کے قرآن سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآنِ مجید میں نماز کے لیے کہیں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہُوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزا میں سے کسی جُز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً تسبیح، حمد، ذکر، قیام، رُکوع، سُجود وغیرہ۔ اسی طرح یہاں فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا مطلب محض قرآن پڑھنا نہیں، بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس طریقے سے

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً

کیونکہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے[95]۔ اور رات کو تہجد پڑھو[96]، یہ تمھارے لیے

قرآنِ مجید نے ضمناً یہ اشارہ کر دیا ہے کہ نماز کن اجزا سے مرکّب ہونی چاہیے۔ اور انھی اشارات کی رہنمائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی وہ ہیئت مقرر فرمائی جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

۹۵- قرآنِ فجر کے مشہود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں بتصریح بیان ہُوا ہے۔ اگرچہ فرشتے ہر نماز اور ہر نیکی کے گواہ ہیں، لیکن جب خاص طور پر نمازِ فجر کی قراءت پر ان کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز میں طویل قراءت کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا، اور اسی کی پیروی صحابۂ کرامؓ نے کی اور بعد کے ائمہ نے اسے مستحب قرار دیا۔

اس آیت میں مُجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پنج وقتہ نماز، جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی، اس کے اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہُوا کہ ایک نماز تو طُلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے، اور باقی چار نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد سے ظلمتِ شب تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریل علیہ السلام بھیجے گئے، جنھوں نے نماز کے ٹھیک ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ چنانچہ ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ”جبریل نے دو مرتبہ مجھ کو بیت اللہ کے قریب نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جب کہ سورج ابھی ڈھلا ہی تھا اور سایہ ایک جوتی کے تسمے سے زیادہ دراز نہ تھا، پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے قد کے برابر تھا، پھر مغرب کی نماز ٹھیک اُس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، پھر عشا کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھا دی، اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن اُنھوں نے ظہر کی نماز مجھے اُس وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اُس کے قد کے برابر تھا، اور عصر کی نماز اس وقت جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد سے دو گُنا ہو گیا، اور مغرب کی نماز اس وقت جب کہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، اور عشا کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر، اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی پھیل جانے پر۔ پھر جبریلؑ نے پلٹ کر مجھ سے کہا کہ اے محمدؐ! یہی اوقات انبیاؑ کے نماز پڑھنے کے ہیں، اور نمازوں کے صحیح اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔“ (یعنی پہلے دن ہر وقت کی ابتدا اور دوسرے دن ہر وقت کی انتہا بتائی گئی ہے۔ ہر وقت کی نماز اِن دونوں کے درمیان ادا ہونی چاہیے۔)

قرآنِ مجید میں خود بھی نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف مختلف مواقع پر اشارے کیے گئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ ہُود میں فرمایا:

Maktaba Tul Ishaat.com

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ (آیت ۱۱۴)

نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر (یعنی فجر اور مغرب) اور کچھ رات گزرنے پر (یعنی عشا)۔

اور سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا:

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ (آیت ۱۳۰)

اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر طلوعِ آفتاب سے پہلے (فجر) اور غروب آفتاب سے پہلے (عصر)، اور رات کے اوقات میں، پھر تسبیح کر (عشا) اور دن کے سروں پر (یعنی صبح، ظہر اور مغرب)۔

پھر سورۂ روم میں ارشاد ہوا:

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ○ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ○ (آیت ۱۷-۱۸)

پس اللہ کی تسبیح کرو جب کہ تم شام کرتے ہو (مغرب) اور جب صبح کرتے ہو (فجر)۔ اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور اس کی تسبیح کرو دن کے آخری حصے میں (عصر) اور جب کہ تم دوپہر کرتے ہو (ظہر)۔

نماز کے اوقات کا یہ نظام مقرر کرنے میں جو مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک اہم مصلحت یہ بھی ہے کہ آفتاب پرستوں کے اوقاتِ عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ آفتاب ہر زمانے میں مشرکین کا سب سے بڑا، یا بہت بڑا معبود رہا ہے، اور اس کے طُلوع و غُروب کے اوقات خاص طور پر اُن کے اوقاتِ عبادت رہے ہیں، اس لیے ان اوقات میں تو نماز پڑھنا حرام کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ آفتاب کی پرستش زیادہ تر اس کے عُروج کے اوقات میں کی جاتی رہی ہے، لہٰذا اسلام میں حکم دیا گیا کہ تم دن کی نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد پڑھنی شروع کرو اور صبح کی نماز طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اس مصلحت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضرت عَمرو بن عَبَسہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اوقات دریافت کیے تو آپ نے فرمایا:

صل صلوۃ الصبح ثم اقصر عن الصلوۃ حین تطلع الشمس حتی ترتفع فانها تطلع حین تطلع بین قرنی الشیطن وحینئذ یسجد له الکفار ۔

صبح کی نماز پڑھو اور جب سورج نکلنے لگے تو نماز سے رُک جاؤ، یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے۔ کیونکہ سورج جب نکلتا ہے تو شیطان کے سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

پھر آپ نے عصر کی نماز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ثم اقصر عن الصلوۃ حتی تغرب الشمس فانها تغرب بین قرنی

پھر نماز سے رُک جاؤ، یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، کیونکہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان

لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ
اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِىْ مُخْرَجَ صِدْقٍ

نفل[97] ہے، بعید نہیں کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود[98] پر فائز کر دے۔

[99] اور دعا کرو کہ پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچّائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچّائی کے ساتھ نکال

الشیطن وحینئذ یسجد لھا الکفار (رواہ مسلم) غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

اس حدیث میں سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع اور غروب ہونا ایک استعارہ ہے یہ تصوّر دلانے کے لیے کہ شیطان اس کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات کو لوگوں کے لیے ایک فتنۂ عظیم بنا دیتا ہے۔ گویا جب لوگ اس کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھ کر سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطان اسے اپنے سر پر لیے ہوئے آیا ہے اور سر ہی پر لیے جا رہا ہے۔ اس استعارے کی گرہ حضورؐ نے خود اپنے اس فقرے میں کھول دی ہے کہ ''اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔''

۹۶ – تہجّد کے معنٰی ہیں نیند توڑ کر اُٹھنے کے۔ پس رات کے وقت تہجّد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رات کا ایک حصّہ سونے کے بعد پھر اُٹھ کر نماز پڑھی جائے۔

۹۷ – نفل کے معنٰی ہیں: ''فرض سے زائد''۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکل آیا کہ وہ پانچ نمازیں جن کے اوقات کا نظام پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا، فرض ہیں، اور یہ چھٹی نماز فرض سے زائد ہے۔

۹۸ – یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم محمودِ خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستایش کی بارش ہو، اور تمھاری ہستی ایک قابلِ تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمھارے مخالفین تمھاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انھوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے، مگر وہ وقت دُور نہیں ہے جب کہ دنیا تمھاری تعریفوں سے گونج اُٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبۂ محمودیت کا ایک حصّہ ہے۔

۹۹ – اس دُعا کی تلقین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت اب بالکل قریب آ لگا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تمھاری دُعا یہ ہونی چاہیے کہ صداقت کا دامن کسی حال میں تم سے نہ چھُوٹے، جہاں سے بھی نکلو صداقت کی خاطر نکلو، اور جہاں بھی جاؤ صداقت کے ساتھ جاؤ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ
الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔[100]

اور اعلان کر دو کہ ”حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔“[101]

۱۰۰ – یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر، یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے، تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اِس بگاڑ کو دُرست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اِس سیلاب کو روک سکوں، اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے، اور اسی کو ابنِ جریر اور ابنِ کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ، یعنی ”اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے اُن چیزوں کا سدِ باب کر دیتا ہے جن کا سدِ باب قرآن سے نہیں کرتا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت اور اجرائے حُدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حُصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا، تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔ اگر جہاد کے لیے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکام شریعت کے لیے سیاسی اقتدار کا طالب ہونا آخر کیسے گناہ ہو جائے گا؟

۱۰۱ – یہ اعلان اس وقت کیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مکّہ چھوڑ کر حَبَش میں پناہ گزین تھی، اور باقی مسلمان سخت بے کسی و مظلومی کی حالت میں مکہ اور اطرافِ مکّہ میں زندگی بسر کر رہے تھے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہر وقت خطرے میں تھی۔ اس وقت بظاہر باطل ہی کا غلبہ تھا اور غلبۂ حق کے آثار کہیں دُور دُور نظر نہ آتے تھے۔ مگر اسی حالت میں نبیؐ کو حکم دے دیا گیا کہ تم صاف صاف ان باطل پرستوں کو سنا دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ ایسے وقت میں یہ عجیب اعلان لوگوں کو محض زبان کا پھاگ محسوس ہوا اور انھوں نے اسے ٹھٹھوں میں اُڑا دیا۔ مگر اس پر نو برس ہی گزرے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی شہرِ مکّہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپؐ نے کعبے میں جا کر اُس باطل کو مٹا دیا جو تین سو ساٹھ بتوں کی صورت میں وہاں سجا رکھا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ فتحِ مکّہ کے دن حضورؐ کعبے کے بتوں پر ضرب لگا رہے تھے اور آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ: جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا – جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَۙ وَ لَا یَزِیْدُ
الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ
وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰى
شَاكِلَتِهٖؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِیْلًا ﴿۸۴﴾ ع وَ
یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ

ہم اِس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔[۱۰۲] انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اینٹھتا اور پیٹھ موڑ لیتا ہے، اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے۔ اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ ”ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے، اب یہ تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدھی راہ پر کون ہے۔“ ع

یہ لوگ تم سے رُوح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو ”یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے

۱۰۲ – یعنی جو لوگ اس قرآن کو اپنا رہنما اور اپنے لیے کتابِ آئین مان لیں، ان کے لیے تو یہ خدا کی رحمت اور ان کے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی اور تمدّنی امراض کا علاج ہے۔ مگر جو ظالم اسے ردّ کرکے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر آپ ظلم کریں، ان کو یہ قرآن اُس حالت پر بھی نہیں رہنے دیتا جس پر وہ اس کے نُزول سے، یا اس کے جاننے سے پہلے تھے، بلکہ یہ انھیں اُلٹا اس سے زیادہ خسارے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک قرآن آیا نہ تھا، یا جب تک وہ اس سے واقف نہ ہوئے تھے، ان کا خسارہ محض جہالت کا خسارہ تھا۔ مگر جب قرآن ان کے سامنے آ گیا اور اس نے حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا تو ان پر خدا کی حجت تمام ہوگئی۔ اب اگر وہ اسے ردّ کرکے گمراہی پر اصرار کرتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جاہل نہیں بلکہ ظالم اور باطل پرست اور حق سے نفور ہیں۔ اب ان کی حیثیت وہ ہے جو زہر اور تریاق، دونوں کو دیکھ کر زہر انتخاب کرنے والے کی ہوتی ہے۔ اب اپنی گمراہی کے وہ پورے ذمہ دار، اور ہر گناہ جو اس کے بعد وہ کریں اس کی پوری سزا کے مستحق ہیں۔ یہ خسارہ جہالت کا نہیں بلکہ شرارت کا خسارہ ہے، جسے جہالت کے خسارے سے بڑھ کر ہی ہونا چاہیے۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت مختصر سے بلیغ جملے میں بیان

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ

علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔[103] اور اے محمدؐ! ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعے

فرمائی ہے کہ القراٰن حجة لك او عليك، یعنی قرآن یا تو تیرے حق میں حجت ہے یا پھر تیرے خلاف حجت۔

۱۰۳ – عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوحِ حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تأمّل ہے، اس لیے کہ یہ معنی صرف اُس صورت میں لیے جاسکتے ہیں جب کہ سیاق وسباق کو نظر انداز کردیا جائے اور سلسلۂ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلۂ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو رُوح کو جان کے معنی میں لینے سے عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جہاں پہلے تین آیتوں میں قرآن کے نسخۂ شفا ہونے اور منکرینِ قرآن کے ظالم اور کافرِ نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آ گیا کہ جان داروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟

ربطِ عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد ''وحی'' یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہوسکتا ہے۔ مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ! تم سے یہ لوگ روح، یعنی ماخذِ قرآن، یا ذریعۂ حُصولِ قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ انھیں بتادو کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے کہ تم انسانی ساخت کے کلام اور وحیِ ربّانی کے ذریعے سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

یہ تفسیر نہ صرف اس لحاظ سے قابلِ ترجیح ہے کہ تقریرِ ماسبق اور تقریرِ مابعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا متقاضی ہے، بلکہ خود قرآنِ مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب انھی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومن میں ارشاد ہُوا ہے: يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (آیت ۱۵) ''وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے، تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کردے۔'' اور سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (آیت ۵۲) ''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی۔ تُو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔''

سلف میں سے ابن عباسؓ، قتادہ اور حسن بصری نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالے سے ابنِ عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے، مگر یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ابنِ عباسؓ اس خیال کو چھپا کر بیان کرتے تھے۔ اور صاحبِ رُوح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''رُوح سے مراد جبرائیل ہیں، اور سوال

اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ
رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّىِٕنِ
اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

سے تم کو عطا کیا ہے، پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پاؤ گے جو اسے واپس دلا سکے۔ یہ تو جو کچھ تمھیں ملا ہے تمھارے رب کی رحمت سے ملا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔[۱۰۴] کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔[۱۰۵]

دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا اِلقا ہوتا ہے۔"

۱۰۴ - خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر مقصود دراصل کفار کو سنانا ہے جو قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہُوا یا کسی انسان کا در پردہ سکھایا ہُوا کلام کہتے تھے۔ اُن سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کلام پیغمبر نے نہیں گھڑا بلکہ ہم نے عطا کیا ہے، اور اگر ہم اسے چھین لیں تو نہ پیغمبر کی یہ طاقت ہے کہ وہ ایسا کلام تصنیف کر کے لا سکے اور نہ کوئی دوسری طاقت ایسی ہے جو اس کو ایسی معجزانہ کتاب پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔

۱۰۵ - یہ چیلنج اس سے پہلے قرآنِ مجید میں تین مقامات پر گزر چکا ہے۔ سورۂ بقرہ، آیات ۲۳ - ۲۴، سورۂ یونس، آیت ۳۸، اور سورۂ ہُود، آیت ۱۳۔ آگے سورۂ طور، آیات ۳۳ - ۳۴ میں بھی یہی مضمون آ رہا ہے۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود یہ قرآن تصنیف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورۂ یُونس، آیت ۱۶ میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۠ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ یعنی "اے محمدؐ! ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمھیں سناؤں تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا، بلکہ اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں تمھارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

ان آیات میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر جو اِستدلال کیا گیا ہے، وہ دراصل تین دلیلوں سے مرکّب ہے:

ایک، یہ کہ یہ قرآن اپنی زبان، اُسلوبِ بیان، طرزِ استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اخبارِ غیب کے

Maktaba Tul-Ishaat.com

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكۡثَرُ
النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا ﴿۸۹﴾ وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ
الۡاَرۡضِ يَنۡۢبُوۡعًا ﴿۹۰﴾ اَوۡ تَكُوۡنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ
الۡاَنۡهٰرَ خِلٰلَهَا تَفۡجِيۡرًا ﴿۹۱﴾ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے۔ اور انھوں نے کہا: ”ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تُو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تُو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تُو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے، جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔

لحاظ سے ایک معجزہ ہے، جس کی نظیر لانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اسے ایک انسان نے تصنیف کیا ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس شان کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جِن جنھیں مشرکین نے اپنا معبُود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبُودیت پر یہ کتاب عَلانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرینِ قرآن کی مدد پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پائے کی کتاب تصنیف کر کے اِس چیلنج کو رد کر سکیں۔

دوسرے، یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمھارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی ۴۰ سال تمھارے درمیان رہ چکے ہیں۔ کیا دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اِس طرز کا کلام، اور ان مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سنا تھا؟ اگر نہیں سنا تھا اور یقیناً نہیں سنا تھا، تو کیا یہ بات تمھاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرزِ فکر و بیان میں یکایک ایسا تغیرُ واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے، یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمھارے درمیان ہی رہتے سہتے ہیں۔ تم ان کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سنا کرتے ہو۔ قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اُسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانے میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سیکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب

اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِیْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ
اَوْ تَرْقٰى فِی السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَیْنَا
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ ع

یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تُو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تُو ہمارے اُوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائے جسے ہم پڑھیں"____اے محمدؐ! اِن سے کہو: "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"[۱۰۶] ع

قرآن کی زبان اور اُسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رَمز آشنا نقّاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ یونس، حاشیہ ۲۱۔ الطّور، حواشی ۲۲-۲۷)

۱۰۶ - معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اس سے پہلے آیت ۵۹ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اس مختصر سے جواب کی بلاغت تعریف سے بالاتر ہے۔ مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف ایک اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ پھوٹ بہے، یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمھارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آ کھڑے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ ہم ہی نے محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں____اِن لمبے چوڑے مطالبوں کا بس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ "اِن سے کہو: پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یعنی بیوقوفو! کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادرِ مُطلَق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اول روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمھیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو، میرے اَخلاق کو، میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبہ کرنے لگے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ
يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اِسی قول نے کہ ''کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟'' [۱۰۷] اِن سے کہو: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔ [۱۰۸]

کہ زمین پھاڑو اور آسمان گراؤ؟ آخر پیغمبری کا ان کاموں سے کیا تعلق ہے؟

۱۰۷- یعنی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہُوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ پیغمبر نہیں ہے، کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدّت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوگئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا، کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اس کو خدا بنایا، کسی نے اسے خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں حلول کر گیا تھا۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک مُعمّا ہی بنا رہا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ یٰسین، حاشیہ ۱۱)

۱۰۸- یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آ کر پیغام سنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اُصولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اسے خود اپنی زندگی میں ان اُصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے، تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اسے انکار اور مخالفت و مُزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جِدّوجُہد کرنی ہوتی ہے، تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جب کہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہوسکتا تھا۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۹۶﴾ وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ
فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا
خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا

اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمھارے درمیان بس ایک اللہ کی گواہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے[109]۔

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے سوا ایسے لوگوں کے لیے تُو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا[110]۔ ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ لائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے[111]۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی، ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔ یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انھوں نے ہماری

۱۰۹- یعنی جس جس طرح سے میں تمھیں سمجھا رہا ہوں اور تمھاری اصلاحِ حال کے لیے کوشش کر رہا ہوں اسے بھی اللہ جانتا ہے، اور جو جو کچھ تم میری مخالفت میں کر رہے ہو اس کو بھی اللہ دیکھ رہا ہے۔ فیصلہ آخرِ کار اسی کو کرنا ہے اس لیے بس اسی کا جاننا اور دیکھنا کافی ہے۔

۱۱۰- یعنی جس کی ضلالت پسندی اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اللہ نے اس پر ہدایت کے دروازے بند کر دیے ہوں اور جسے اللہ ہی نے اُن گمراہیوں کی طرف دھکیل دیا ہو جن کی طرف وہ جانا چاہتا تھا، تو اب اور کون ہے جو اس کو راہِ راست پر لا سکے؟ جس شخص نے سچائی سے منہ موڑ کر جھوٹ پر مطمئن ہونا چاہا، اور جس کی اِس خباثت کو دیکھ کر اللہ نے بھی اس کے لیے وہ اسباب فراہم کر دیے جن سے سچائی کے خلاف اُس کی نفرت میں اور جھوٹ پر اُس کے اطمینان میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جائے، اسے آخر دنیا کی کون سی طاقت جھوٹ سے منحرف اور سچائی پر مطمئن کر سکتی ہے؟ اللہ کا یہ قاعدہ نہیں کہ جو خود بھٹکنا چاہے اسے زبردستی ہدایت دے، اور کسی دوسری ہستی میں یہ طاقت نہیں کہ لوگوں کے دل بدل دے۔

۱۱۱- یعنی جیسے وہ دنیا میں بن کر رہے کہ نہ حق دیکھتے تھے، نہ حق سنتے تھے اور نہ حق بولتے تھے، ویسے ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ
رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ
قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ

آیات کا انکار کیا اور کہا: ''کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اُٹھا کھڑا کیا جائے گا؟'' کیا ان کو یہ نہ سُوجھا کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، وہ اِن جیسوں کو پیدا کرنے کی ضرور قدرت رکھتا ہے؟ اس نے اِن کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے، مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے۔

اے محمدؐ! اِن سے کہو: اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمھارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہُوا ہے[112] ع

ہم نے موسٰیؑ کو نو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں[113]۔ اب یہ تم خود

وہ قیامت میں اُٹھائے جائیں گے۔

۱۱۲- یہ اشارہ اسی مضمون کی طرف ہے جو اس سے پہلے آیت ۵۵ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں گزر چکا ہے۔ مشرکینِ مکّہ جن نفسیاتی وُجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے تھے، ان میں سے ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس طرح انھیں آپؐ کا فضل و شرف ماننا پڑتا تھا، اور اپنے کسی معاصر اور ہم چشم کا فضل ماننے کے لیے انسان مشکل ہی سے آمادہ ہُوا کرتا ہے۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی بخیلی کا حال یہ ہے کہ کسی کے واقعی مرتبے کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کا دل دُکھتا ہے، انھیں اگر کہیں خدا نے اپنے خزانہ ہائے رحمت کی کنجیاں حوالے کر دی ہوتیں تو وہ کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے۔

اِسۡرَآءِیۡلَ اِذۡ جَآءَہُمۡ فَقَالَ لَہٗ فِرۡعَوۡنُ اِنِّیۡ لَاَظُنُّکَ یٰمُوۡسٰی
مَسۡحُوۡرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ ہٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ

بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ ”اے موسیٰ! مَیں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے۔[114]“ موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا: ”تُو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں ربّ السماوات والارض کے سوا کسی نے نازل

۱۱۳ – واضح رہے کہ یہاں پھر کفارِ مکّہ کو معجزات کے مطالبے کا جواب دیا گیا ہے، اور یہ تیسرا جواب ہے۔ کفّار کہتے تھے کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم یہ اور یہ کام کر کے نہ دکھاؤ۔ جواب میں ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم سے پہلے فرعون کو ایسے ہی صریح معجزات، ایک دو نہیں، پے در پے ۹ دکھائے گئے تھے، پھر تمھیں معلوم ہے کہ جو نہ ماننا چاہتا تھا اس نے انھیں دیکھ کر کیا کہا؟ اور یہ بھی خبر ہے کہ جب اس نے معجزات دیکھ کر بھی نبی کو جھٹلایا تو اس کا انجام کیا ہُوا؟

وہ نو نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورۂ اَعراف میں گزر چکی ہیں۔ یعنی عصا[1]، جو اژدہا بن جاتا تھا، یدِ بیضا[2]، جو بغل سے نکالتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا، جادوگروں کے جادو[3] کو برسرِ عام شکست دینا، ایک اعلان کے مطابق سارے[4] ملک میں قحط برپا ہو جانا، اور پھر یکے بعد[5] دیگرے طوفان، ٹِڈّی[6] دَل، سُرسُریوں[7]، مینڈکوں[8] اور خون کی بلاؤں[9] کا نازل ہونا۔

۱۱۴ – یہ وہی خطاب ہے جو مشرکینِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ اسی سورت کی آیت ۴۷ میں ان کا یہ قول گزر چکا ہے کہ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا (تم تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے چلے جا رہے ہو)۔ اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ ٹھیک اسی خطاب سے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو نوازا تھا۔

اس مقام پر ایک ضمنی مسئلہ اور بھی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ زمانۂ حال میں منکرینِ حدیث نے احادیث پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ حدیث کی رُو سے ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو گیا تھا، حالانکہ قرآن کی رُو سے کفار کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحر زدہ آدمی ہیں۔ منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ اس طرح راویانِ حدیث نے قرآن کی تکذیب اور کفارِ مکہ کی تصدیق کی ہے۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ بعینہٖ قرآن کی رُو سے حضرت موسیٰؑ پر بھی فرعون کا یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحر زدہ آدمی ہیں، اور پھر قرآن خود ہی سورۂ طٰہٰ میں کہتا ہے کہ فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَعِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ۝ فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ۝ یعنی ”جب جادوگروں نے اپنے اَنجھر پھینکے تو یکایک ان کے جادو سے موسیٰؑ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی لاٹھیاں اور رسّیاں دوڑ رہی ہیں، پس موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر سا گیا۔“ کیا یہ الفاظ صریح طور پر

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ
یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّ قُلْنَا

نہیں کی ہیں[115]، اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون! تُو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے[116]۔" آخرکار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے، مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد

دلالت نہیں کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اس وقت جادو سے متأثّر ہو گئے تھے؟ اور کیا اس کے متعلّق بھی منکرینِ حدیث یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ یہاں قرآن نے خود اپنی تکذیب اور فرعون کے جھوٹے الزام کی تصدیق کی ہے؟

دراصل اس طرح کے اعتراضات اُٹھانے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کفارِ مکہ اور فرعون کس معنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "مسحور" کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کسی دشمن نے جادو کر کے ان کو دیوانہ بنا دیا ہے اور اسی دیوانگی کے زیرِ اثر یہ نبوت کا دعویٰ کرتے اور ایک نرالا پیغام سناتے ہیں۔ قرآن ان کے اسی الزام کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ رہا وقتی طور پر کسی شخص کے جسم یا کسی حاسۂ جسم کا جادو سے متأثّر ہو جانا، تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو پتھر مارنے سے چوٹ لگ جائے۔ اس چیز کا نہ کفار نے الزام لگایا تھا، نہ قرآن نے اس کی تردید کی، اور نہ اس طرح کے کسی وقتی تأثّر سے نبی کے منصب پر کوئی حرف آتا ہے۔ نبی پر اگر زہر کا اثر ہو سکتا تھا، نبی اگر زخمی ہو سکتا تھا، تو اس پر جادو کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے منصبِ نبوت پر حرف آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ منصبِ نبوت میں اگر قادح ہو سکتی ہے تو یہ بات کہ نبی کے قُوائے عقلی و ذہنی جادو سے مغلوب ہو جائیں، حتّٰی کہ اس کا کام اور کلام سب جادو ہی کے زیرِ اثر ہونے لگے۔ مخالفینِ حق حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی الزام لگاتے تھے اور اسی کی تردید قرآن نے کی ہے۔

۱۱۵ – یہ بات حضرت موسیٰؑ نے اس لیے فرمائی کہ کسی ملک پر قحط آ جانا، یا لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقے میں مینڈکوں کا ایک بلا کی طرح نکلنا، یا تمام ملک کے غلّے کے گوداموں میں گُھن لگ جانا، اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرتب سے رونما نہیں ہو سکتے۔ پھر جب کہ ہر بلا کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰؑ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تُو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت پر مسلّط کی جائے گی، اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف ایک دیوانہ یا ایک سخت ہٹ دھرم آدمی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ ان بلاؤں کا نزول ربّ السماوات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

۱۱۶ – یعنی میں تو سحر زدہ نہیں ہوں مگر تُو ضرور شامت زدہ ہے۔ تیرا ان خدائی نشانیوں کو پے در پے دیکھنے کے بعد بھی اپنی ہٹ پر قائم رہنا صاف بتا رہا ہے کہ تیری شامت آ گئی ہے۔

مِنۡۢ بَعۡدِهٖ لِبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اسۡكُنُوا الۡاَرۡضَ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ
الۡاٰخِرَةِ جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا ؕ﴿۱۰۴﴾ وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ
وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۘ﴿۱۰۵﴾ وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ
لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ وَّنَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِيۡلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلۡ اٰمِنُوۡا بِهٖۤ

وقف لازم

بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو،[۱۱۷] پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پُورا ہو گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے۔

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہُوا ہے، اور اے محمدؐ! تمھیں ہم نے اِس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اُسے) متنبّہ کر دو۔[۱۱۸] اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے، تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سُناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اُتارا ہے۔[۱۱۹] اے محمدؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو

۱۱۷- یہ ہے اصل غرض اس قصے کو بیان کرنے کی۔ مشرکینِ مکہ اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں کو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سرزمینِ عرب سے ناپید کر دیں۔ اس پر انھیں یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہی کچھ فرعون نے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے ساتھ کرنا چاہا تھا۔ مگر ہُوا یہ کہ فرعون اور اس کے ساتھی ناپید کر دیے گئے اور زمین پر موسیٰؑ اور پیروانِ موسیٰؑ ہی بسائے گئے۔ اب اگر اسی رَوش پر تم چلو گے تو تمھارا انجام اس سے کچھ بھی مختلف نہ ہو گا۔

۱۱۸- یعنی تمھارے ذمے یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کی تعلیمات کو جانچ کر حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اُن کو تم چشمے نکال کر اور باغ اُگا کر اور آسمان پھاڑ کر کسی نہ کسی طرح مومن بنانے کی کوشش کرو، بلکہ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بات پیش کر دو اور پھر انھیں صاف صاف بتا دو کہ جو اسے مانے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ بُرا انجام دیکھے گا۔

۱۱۹- یہ مخالفین کے اس شبہے کا جواب ہے کہ اللہ میاں کو پیغام بھیجنا تھا تو پورا پیغام بیک وقت کیوں نہ بھیج دیا؟ یہ آخر ٹھیر ٹھیر کر تھوڑا تھوڑا پیغام کیوں بھیجا جا رہا ہے؟ کیا خدا کو بھی انسانوں کی طرح سوچ سوچ کر بات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؟ اس شبہے کا مفصل جواب سورۂ نحل، آیات ۱۰۱-۱۰۲ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

أَوْ لَا تُؤْمِنُوا ۚ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ
يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿١٠٧﴾ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ
وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ
خُشُوعًا ۩ السجدة ﴿١٠٩﴾ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ۖ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ السجدة ۴
الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ
بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے[120]، انھیں جب یہ سُنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب! اُس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔"[121] اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سُن کر اُن کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔[122] سجدہ

اَے نبیؐ! اِن سے کہو: اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اُس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔[123] اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔[124] اور کہو: "تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا،

کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۰ – یعنی وہ اہلِ کتاب جو آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے واقف ہیں اور ان کے اندازِ کلام کو پہچانتے ہیں۔

۱۲۱ – یعنی قرآن کو سُن کر وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ جس نبی کے آنے کا وعدہ پچھلے انبیاؑ کے صحیفوں میں کیا گیا تھا وہ آ گیا ہے۔

۱۲۲ – صالحینِ اہلِ کتاب کے اس رَوِیّے کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً آلِ عمران، آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ – ۱۹۹، اور المائدہ، آیات ۸۲ – ۸۵

۱۲۳ – یہ جواب ہے مشرکین کے اس اعتراض کا کہ خالق کے لیے "اللہ" کا نام تو ہم نے سنا تھا، مگر یہ "رحمٰن" کا نام تم نے کہاں سے نکالا؟ ان کے ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نام رائج نہ تھا اس لیے وہ اس پر ناک بھوں

وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرۡهُ تَكۡبِيۡرًا ۱۱۱ ع

ع ۱۲ ۱۱ ۱۲

نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو۔[۱۲۵] اور اس کی بڑائی بیان کرو، کمال درجے کی بڑائی۔ ع

چڑھاتے تھے۔

۱۲۴- ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ مکے میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے صحابہؓ نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہُوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سُن کر ہجوم کریں، اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمھارے اپنے ساتھی بھی نہ سُن سکیں۔ یہ حکم صرف انھی حالات کے لیے تھا۔ مدینے میں جب حالات بدل گئے تو یہ حکم باقی نہ رہا۔ البتہ جب کبھی مسلمانوں کو مکّے کے سے حالات سے دوچار ہونا پڑے، انھیں اسی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

۱۲۵- اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے ان مشرکین کے عقائد پر جو مختلف دیوتاؤں اور بزرگ انسانوں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں نے اپنی خدائی کے مختلف شعبے یا اپنی سلطنت کے مختلف علاقے ان کے انتظام میں دے رکھے ہیں۔ اس بیہودہ عقیدے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی خدائی کا بار سنبھالنے سے عاجز ہے اس لیے وہ اپنے پشتیبان تلاش کر رہا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اللہ عاجز نہیں ہے کہ اسے کچھ ڈپٹیوں اور مددگاروں کی حاجت ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست موضوعات

الف

ابراہیم علیہ السلام

— ۳۵۶-۳۸۵-۴۳۱-۴۳۲
— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۳۵۳ تا ۳۵۵-۴۸۸ تا ۴۹۱-۵۰۹ تا ۵۱۱
— قوم ابراہیم ۲۱۳
— آپ کی صفات ۲۴۲-۳۵۵-۴۸۹-۵۸۰
— آپ شرک سے بالکل پاک تھے ۵۸۰
— اپنی ذات میں ایک امت تھے ۵۸۰
— اللہ کے ساتھ آپ کا تعلق ۳۵۵
— آپ کا دین کیا تھا ۴۰۱
— فلسطین میں آپ کی جائے قیام ۳۸۱
— مصر میں آپ غیر معروف نہ تھے ۴۰۳
— آپ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کیوں کی تھی؟ ۲۴۲-۴۹۱
— اپنی اولاد کو مکہ میں بساتے وقت آپ کی دعا ۴۸۸ تا ۴۹۱
— آپ کے ہاں فرشتوں کا آنا اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت دینا ۵۰۹-۵۱۰
— بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش ۵۱۰
— ملت ابراہیمی اور شریعت یہود کا فرق ۵۸۰-۵۸۱
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم کیوں دیا گیا؟ ۵۸۰-۵۸۱

ابلیس:

— ۱۲-۵۰۵-۶۲۸
(تفصیلات کے لیے دیکھو: ''شیطان'')

اجر:

— کیسے لوگ اس کے مستحق ہیں؟ ۱۳۹-۱۴۰-۳۲۶-۴۱۴
— اللہ کے ہاں کسی مستحق کا اجر مارا نہیں جاتا ۹۴-۲۵۰-۳۷۲-۴۱۳-۴۲۸
— اللہ نیکی کا اجر آدمی کے عمل سے زیادہ دیتا ہے ۲۸۰
— نیکی کی جزا دینے میں اللہ کا قانون برائی کی سزا سے مختلف ہے ۲۵۰-۲۸۰-۵۷۰
— اللہ کے پاس اجر عظیم ہے ۱۴۰-۱۸۴
— اجر کبیر کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۲۰۲
— اصل اہمیت اجر آخرت کی ہے ۴۱۴
— صبر کا اجر ۵۷۰
— ایمان و عمل صالح کا اجر ۵۷۰

احسان

— معنی اور تشریح ۵۶۵-۵۸۳
— معاشرے میں اس کی اہمیت ۵۶۵
— محسنین کون ہیں؟ ۲۲۳-۲۵۰
— اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے ۳۹
— محسنین پر اللہ کے انعامات ۸۸
— اللہ محسنوں کے ساتھ ہے ۵۸۳

احکام القرآن:

— اصولی احکام ۷-۲۱ تا ۲۴-۳۸-۴۰-۴۴-۴۷-۴۹-۵۴-۵۵-۷۷-۷۸-۱۳۶-۱۳۷-۱۴۸-۱۸۴-۱۹۲-۲۲۱-۲۴۹-۲۹۲ تا ۲۹۴-۳۶۰-۳۷۱-۵۶۴ تا ۵۶۶-۵۷۴-۵۸۲-۶۱۶

— اعتقادات سے متعلق ۸۶-۱۰۳-۳۱۵ تا ۳۱۷-۴۰۲-۴۶۴-۵۴۰-۶۰۸-۶۱۶
— عبادات سے متعلق ۲۱-۲۲-۳۷-۳۸-۱۱۴ تا ۱۱۶-۲۰۵ تا ۲۰۸-۲۳۲-۲۶۲-۳۲۱-۳۳۳-۳۴۵-۳۵۹-۳۷۱-۶۰۸-۶۳۴ تا ۶۳۷
— اسلامی ریاست اور اسلامی نظام جماعت سے متعلق (دیکھو "اسلامی ریاست" اور "اسلامی نظام جماعت")
قانونی احکام (دیکھو "قانون اسلام")
— جنگ سے متعلق (دیکھو "جہاد"، "قانون" اور "قتال فی سبیل اللہ")
— اخلاق سے متعلق (دیکھو "اخلاق اور اخلاقی تعلیمات"، "قرآن، اس کا اخلاقی نقطۂ نظر، اس کا فلسفۂ اخلاق")
— دعوت و تبلیغ سے متعلق (دیکھو "حکمت تبلیغ" اور "دعوت حق")
— مساجد سے متعلق (دیکھو "مسجد حرام" اور "مساجد اللہ")
— تمدن و معاشرت سے متعلق ۱۹-۱۹۲-۶۰۹ تا ۶۱۱-۶۱۳-۶۱۵
— معاشی معاملات سے متعلق ۵۵-۱۹۱-۳۵۹-۳۶۰-۶۱۰-۶۱۲ تا ۶۱۵
— وراثت سے متعلق ۶۳
— کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق ۲۹۲ تا ۲۹۴-۵۷۷-۵۷۸

آخرت

— توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ ۲۶۳
— اس کے دلائل ۸-۲۸-۲۶۳-۲۸۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۶۷-۳۶۸-۴۳۸-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۶-۵۰۴
— اس کے امکان کے دلائل ۵۴۱-۵۴۲-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۳
— اس کی ضرورت ۲۶۳-۲۶۴-۳۶۴-۵۴۱
— نظام کائنات سے اس کے وقوع پر استدلال ۲۶۴-۲۶۵
— اس کا وقوع عقل اور انصاف کا تقاضا ہے ۲۶۴-۳۶۸
— اس کے حق میں تجربی استدلال ۲۶۶
— عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج ۱۳۷-۱۳۸-۱۹۴-۲۱۹-۲۲۵-۲۳۱-۳۶۷-۴۴۹-۴۸۱-۵۵۹-۵۶۹-۶۰۵-۶۰۸
— منکرین آخرت کی اس دلیل کا جواب کہ بہت سے لوگ آخرت کو نہ ماننے کے باوجود بااخلاق ہوتے ہیں ۲۶۷
— اس کا انکار دراصل خدا کا انکار ہے ۴۴۶
— آخرت کو نہ ماننے کے نتائج ۷۹-۲۶۶-۲۷۰-۵۳۳-۵۳۴-۶۰۷-۶۰۸-۶۱۹-۶۲۰
— آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کے نتائج ۱۹۴-۴۷۰-۵۷۵
— انکار آخرت کی غیر معقولیت ۲۸-۴۴۶
— منکرین آخرت بدترین صفات سے متصف ہونے کے لائق ہیں ۵۴۸
— منکرین آخرت کا انجام ۳۲-۳۴-۷۹-۲۶۶-۲۸۹-۳۳۲-۶۰۲
— عالم آخرت کے احوال بیان کرنے کا مقصد ۲۵۹
— عالم آخرت کا نقشہ ۳۲-۳۳-۳۴-۲۶۶-۴۹۳
— اللہ کی نگاہ میں اصل اہمیت آخرت کی ہے ۱۵۸-۴۱۴-۵۶۹
— وہی عمل مقبول ہے جو آخرت کے لیے کیا جائے ۶۰۷
— عقیدۂ آخرت کی اہمیت ۵۵۹-۵۶۹
— آخرت کے مقابلے میں دنیا کی بے حقیقتی ۱۹۴-۲۸۹-۴۵۸-۵۶۹
— اہل ایمان کے اجر کو آخرت پر کیوں مؤخر کیا گیا ہے ۲۳۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— عقیدۂ آخرت کی تفصیلات ۲۶۳
— وہاں کی کامیابی کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے ۹۴
— وہاں کوئی شخص فدیہ دے کر نہ چھوٹ سکے گا ۲۹۱-۴۵۴
— وہاں نجات خریدی نہ جاسکے گی ۴۸۷
— وہاں دوستیاں کام نہ آئیں گی ۴۸۷
— وہاں پیشوا اپنے پیروؤں کے کسی کام نہ آسکیں گے ۴۸۱
— وہاں اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا ۲۸۰-۴۸۱-۳۳۲
— جو دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ وہاں بھی اندھا ہی رہے گا ۶۳۲
— وہاں ہر شخص اپنے کیے کا نتیجہ دیکھ لے گا ۲۸۱
— وہاں اللہ بتا دے گا کہ لوگ دنیا میں کیا کر کے آئے ہیں ۲۲۵-۲۳۱-۲۷۹
— جو شخص آخرت کی بھلائی کا طالب نہ ہو اس کے لیے وہاں کوئی بھلائی نہیں ہے ۳۲۹
— وہاں تمام اختلافات کی حقیقت کھول دی جائے گی ۵۶۸
— وہاں سب اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے ۴۸۱-۴۹۲
— وہاں اگلی پچھلی تمام نسلوں کو جمع کیا جائے گا ۶۴۰
— ہر گروہ اپنے اس پیشوا کی قیادت میں ہوگا جس کی پیروی وہ دنیا میں کرتا رہا تھا ۶۱۳
— ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری الگ الگ تشخیص کی جائے گی ۶۰۵
— وہاں کوئی شخص اس عذر کی بنا پر نہ چھوٹ سکے گا کہ وہ گمراہ لوگوں میں پیدا ہوا تھا ۹۷
— وہاں کس چیز کی بازپرس ہونی ہے؟ ۸
— انجام کی بھلائی کا انجام کس چیز پر ہے؟ ۶۱۶
— وہاں کام آنے والی چیزیں کیا ہیں؟ ۱۹۴-۴۵۵-۴۵۶
— وہاں جزا و سزا رسالت کے اقرار و انکار کی بنیاد پر ہوگی ۶۰۵
— وہاں عدالت کس طرح ہوگی؟ ۹-۲۸۱-۳۳۱
— وہاں کس طرح انسان پر حجت قائم کی جائے گی؟ ۹۶-۹۷-۹۹-۲۸۱-۵۶۲-۵۶۴
— وہاں کس طرح خدا کی عدالت میں مجرموں کی پیشی ہوگی؟ ۳۳۱
— نامہ اعمال کس طرح دیا جائے گا؟ ۶۳۲
— گواہ پیش ہوں گے ۳۳۱-۵۶۲-۵۶۴-۶۳۲
— اعمال کا حساب کس طرح لیا جائے گا؟ ۴۵۴
— اعمال کے تولے جانے کا مطلب ۹
— سخت اور نرم حساب فہمی کا مطلب اور اس کا قاعدہ ۴۵۴
— اللہ کو حساب لینے میں دیر نہ لگے گی ۴۶۶
— وہاں برے رہنما اور ان کے پیرو آپس میں دشمن ہوں گے ۲۶-۲۹
— وہاں شیطان اپنے پیروؤں کو ملزم ٹھیرائے گا ۴۸۱
— مشرکین کے معبود ان کو جھوٹا قرار دیں گے ۵۶۳
— مشرکین کے معبود انھیں کہیں نہ ملیں گے کہ سفارش کے لیے آئیں ۵۳۵
— وہاں مشرکین کا عقیدۂ شفاعت غلط ثابت ہوگا ۳۵-۳۳۲-۳۶۸
— وہاں کفار و مشرکین کے خیالات کی غلطی کھل جائے گی ۲۶-۲۸۱-۳۳۲-۵۴۱-۵۶۳
— وہاں ثابت ہوجائے گا کہ انبیاؐ ہی برحق تھے ۳۱-۳۵
— وہاں ثابت ہوجائے گا کہ اللہ کے وعدے سچے تھے ۳۲-۴۸۱
— رسولوں کو نہ ماننے والے پچھتائیں گے ۴۹۱-۴۹۷
— منکرین حق کو پچھتانا پڑے گا ۳۵-۲۹۱
— کفار وہاں کی ہر چیز کو اپنی توقعات کے خلاف پائیں گے ۴۸۶
— اہل ایمان کے لیے وہاں کی تمام کیفیات جانی بوجھی ہوں گی ۴۸۶

— وہاں کی کامیابی صرف متقین کے لیے ہے ۹۴-۴۳۷

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "حشر"، "زندگی بعد موت" اور "قیامت")

اخلاق اور اخلاقی تعلیمات:

— دین میں اخلاق کی اہمیت ۵۶۹

— اللہ کو عالم الغیب والشہادہ ماننے کے اخلاقی نتائج ۳۲۳-۳۲۴

— وہ اخلاق فاضلہ جن سے ایک مسلمان کو آراستہ ہونا چاہیے ۴۵۵-۴۵۶-۴۷۲-۵۱۷-۵۶۴تا۵۶۶

— وہ برائیاں جن سے روکا گیا ہے ۴۵۷-۵۶۴ تا ۵۶۶-۵۶۸

— صالحین کے اخلاق اور فاسقین کے اخلاق کا فرق ۳۱-۳۲-۳۲۶

— معاشرے کو بگاڑنے والے اسباب اور ان کی روک تھام ۶۰۶

— معاشرے میں حقوق کا وسیع تصور ۶۱۱

— امانت کا وسیع مفہوم ۱۳۹

— مقصد کی پاکی کے ساتھ ذرائع بھی پاک ہونے چاہییں ۵۶۸

— فرض شناسی کی اہمیت ۲۴۷

— صبر کی اخلاقی اہمیت ۳۲۶-۳۲۷

— فیاضی اور تواضع کی تعلیم ۶۱۰

— خرچ میں اعتدال کی تعلیم ۶۱۱

— اجتماعی زندگی میں عدل و احسان کی تعلیم ۵۶۴-۵۶۵

— شرم انسانی فطرت کا تقاضا ہے ۱۵

— نصیحت کو غلط رنگ میں لینے کا نقصان ۳۳۷-۳۳۸

— معاہدات کے احترام کا حکم ۱۵۳-۵۶۶-۵۶۹-۶۱۵

— عہد شکنی بدترین گناہ ہے ۱۵۲-۵۶۹

— عہد و پیمان کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنانا چاہیے ۵۶۹

— قومی مفاد کے لیے عہد شکنی کرنا گناہ عظیم ہے ۵۶۷

— مذہبی بہانوں سے عہد شکنی خدا کے ہاں مقبول نہیں ۵۶۸

— مسلمان اگر عہد شکنی کریں تو دہرے مجرم ہیں ۵۶۹

— مفسدین کی پیروی کی مخالفت ۷۷

— خیانت کی ممانعت ۱۳۹-۱۵۳

— اسراف کی ممانعت ۶۱۰-۶۱۱

— بخل کی ممانعت ۶۱۱

— زنا اور محرکات زنا سے اجتناب کا حکم ۶۱۳

— عمل قوم لوط کی شناعت ۵۱-۵۲

— تکبر کی مذمت ۱۲-۷۸-۷۹-۵۳۴-۶۱۶-۶۱۷

— محض گمان کی بنا پر کسی کے خلاف کارروائی نہ کرنی چاہیے ۶۱۶

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "حقوق العباد"، "قرآن، اس کا اخلاقی نقطۂ نظر" اور "اس کا فلسفۂ اخلاق")

آدم علیہ السلام:

— قصہ آدم و حوا ۱۰ تا ۱۸-۵۰۴ تا ۵۰۷-۶۲۷ تا ۶۳۰

— وہ نتائج جو قصہ آدم و حوا سے نکلتے ہیں ۱۵ تا ۱۷

— ان کو نوع انسانی کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے سجدہ کرایا گیا تھا ۱۰-۵۰۴

— ان پر شرک کے الزام کی تردید ۱۰۷-۱۰۸

ارتداد:

— اس کے اخلاقی اسباب ۵۷۵

— اس کے اخلاقی و نفسیاتی نتائج ۵۷۶

— اس کی اخروی سزا ۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶

— اس کی دنیوی سزا ۱۷۹

— برضا و رغبت کلمۂ کفر کہنے والے اور زبردستی کفر پر مجبور کیے جانے والے کی حیثیت اور حکم کا فرق ۵۷۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— خلافت صدیقی میں فتنۂ ارتداد برپا ہونے کے اسباب ۲۲۷
— دور صدیقی میں آنے والے فتنۂ ارتداد کے لیے قرآن کی پیش بندی ۱۷۵
— مرتدین کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگی کارروائی قرآن کے عین مطابق تھی ۱۷۹
— مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے کس دلیل کی بنا پر جنگ کی ۱۷۷

آزمائش:

— تخلیق انسانی کا مقصد انسان کی آزمائش ہے ۳۲۴
— دنیوی زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے ۲۵۹
— آزمائش کا مقصد ۹۳
— آزمائش کی اہمیت انسانی زندگی میں ۸۳
— اللہ کی طرف سے انسان کی آزمائش کس کس طرح ہوتی ہے ۷۲-۸۳-۸۹ تا ۹۱-۱۳۹-۱۴۰-۲۷۱-۲۷۶-۵۶۷-۶۲۷-۶۲۸
— اہل ایمان کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۷۶-۱۳۵-۲۸۲-۳۳۶
— آزمائش بغرض تربیت ۳۹۳-۳۹۴-۳۹۹
— مومن اور منافق کا فرق آزمائشوں میں ڈالنے سے کس طرح کھلتا ہے ۲۵۳

اسباط-۸۷

استکبار- (دیکھو ''تکبر'' اور ''اخلاق'')

اسحاق علیہ السلام-۳۵۶-۳۱۵-۴۹۰

— ان کی پیدائش کی بشارت ۳۵۴-۵۱۰
— فلسطین میں ان کی جائے قیام ۳۸۱
— ان کا دین کیا تھا؟ ۴۰۱
— ان کی تعریف ۵۱۰

اسراف- (دیکھو ''اخلاق'' اور ''مسرفین'')

اسلام:

— اس کی بنیادی تعلیمات ۲۱-۲۳-۲۴-۳۱۵ تا ۳۱۸-۴۰۱-۴۰۲-۴۶۴-۵۴۰-۵۶۴ تا ۵۶۶-۶۰۸ تا ۶۱۷
— وہ تمام انبیا کا دین تھا ۷۰-۳۰۰-۳۰۶-۳۰۹
— اس میں رہبانیت نہیں ہے ۲۲-۲۳
— وہ کم سے کم شرائط جن کے بغیر یہ نہیں مانا جا سکتا کہ ایک شخص نے اسلام قبول کرلیا ہے ۱۷۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''ایمان'' اور ''دین'')

اسلامی ریاست:

— اسلام کے لیے اس کی اہمیت اور ضرورت ۶۳۸
— اس کا منشور جو مکہ معظمہ کے آخری دور میں پیش کیا گیا ۵۸۷-۶۰۹ تا ۶۱۷
— اس کی تعلیمی پالیسی ۲۵۰ تا ۲۵۲
— اس کی معاشرتی و معاشی پالیسی ۶۱۲
— اس میں خاندان کی اہمیت ۶۱۰
— اس کی داخلی و خارجی سیاست عہد و پیمان اور قول و قرار کی پابندی پر مبنی ہونی چاہیے ۶۱۶
— معاشرے کو زنا اور محرکات زنا سے پاک رکھنا اس کا فرض ہے ۶۱۴
— یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت اس کے فرائض میں سے ہے ۶۱۵
— وہ ان تمام لوگوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی حفاظت خود کرنے کے قابل نہ ہوں ۶۱۵
— تجارت کو بے ایمانیوں سے پاک رکھنا اس کے فرائض میں سے ہے ۶۱۶

— اس کے حکمرانوں کو غرور و تکبر سے پاک ہونا چاہیے ۶۱۷
— منافقین کے بارے میں اس کی پالیسی ۲۱۵-۲۱۶-۲۵۲
— بین الاقوامی معاہدات کا احترام ۶۱۵
— دارالاسلام کے تمام باشندے اسلامی ریاست کے کیے ہوئے معاہدات کے پابند ہیں ۱۶۲
— کفار کے محکوم مسلمانوں کی مدد اسلامی ریاست پر کس صورت میں واجب ہے ۱۶۲
— اسلامی ریاست کو بین الاقوامی پیچیدگیوں سے بچانے کے لیے ایک اہم دستوری قاعدہ ۱۶۱
— تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کارروائی کرنا ممنوع ہے ۶۱۶
— اس کی بین الاقوامی سیاست دلیرانہ ہونی چاہیے ۱۵۶
— اس کی ضروریات پر مال خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے ۱۵۶

اسلامی نظام جماعت

— اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی ۱۶۳
— اسلامی معاشرے میں شامل ہونے اور شامل رہنے کی ضروری شرطیں ۱۷۹
— اہل ایمان کی جماعت کیسی ہونی چاہیے ۲۴۸
— اہل ایمان کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار ہونا چاہیے ۱۶۳
— باہمی تعلقات درست رکھنے کا حکم ۱۲۸
— نزاع و اختلاف سے بچنے کا حکم ۱۴۸
— اطاعت امر کا حکم ۱۲۸-۱۳۶-۱۳۷-۱۴۸
— اجتماعی زندگی میں امانت کا حکم اور غداری و خیانت سے بچنے کی تاکید ۱۳۹
— معاشرے کو بگاڑنے والے اسباب اور ان کی روک تھام کی تدابیر ۶۰۶
— اصلاح معاشرہ کے ذرائع ۶۱۲-۶۱۳
— معاشرے کو زنا اور محرکات زنا سے پاک رکھنے کی ہدایات ۶۱۳
— معاشرے میں فساق و فجار کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے ۲۲۱
— مشتبہ لوگوں کے طرز عمل پر نگاہ رکھی جائے ۲۲۹
— معاشرے میں منافقین کی شمولیت کا نقصان ۱۹۸-۲۱۵-۲۱۶
— منافقین کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے ۲۱۵-۲۱۶-۲۲۰-۲۲۵-۲۲۹-۲۵۲

اسماعیل علیہ السلام ۳۵۴-۴۹۰

— بنی اسماعیل حضرت یوسفؑ کے زمانے میں ۳۹۰-۴۰۳

آسمان:

— ان کی حقیقت ۴۴۱-۴۴۲-۵۰۰ تا ۵۰۲
— سات آسمان ۶۱۸

اشہر حرم-۱۹۲

اصحاب السبت ۸۹ تا ۹۲

اعراف:

— اہل اعراف کون ہیں؟ ۳۲-۳۳
— اہل اعراف کی اہل جنت اور اہل دوزخ سے گفتگو ۳۲-۳۳

اقامت دین-(دیکھو: ''دعوت حق'')

اقامت صلوٰۃ (دیکھو: ''نماز'')

اللہ:

— احکم الحاکمین ۳۴۲
— ارحم الراحمین ۸۲-۴۱۶-۴۲۸
— بصیر ۱۴۵-۵۹۰-۶۰۷-۶۱۲-۶۴۵
— تواب ۲۲۹-۲۴۵
— حکیم ۱۳۳-۱۵۰-۱۵۷-۱۵۹-۱۶۰-۱۸۱-

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۸۷- ۱۹۶- ۲۰۸- ۲۱۴- ۲۲۶- ۲۳۱- ۲۳۵-
۳۲۱-۳۸۵-۴۲۶-۴۳۳-۴۷۱-۵۰۳-۵۴۸
— حلیم ۶۱۹
— حمید ۳۵۵-۴۶۹-۴۷۴
— خلاق ۵۱۶
— خیرالحاکمین ۵۶-۳۱۸-۴۳۵
— خیرالغافرین ۸۳
— خیرالفاتحین ۵۷
— خیرالماکرین ۱۴۱ (اس کے لیے لفظ مکر کس معنی میں استعمال ہوتا ہے ۲۷۸)
— رب السماوات والارض ۴۵۱-۶۴۷
— رب العالمین ۳۷-۴۲-۴۵-۶۴-۶۹-۲۸۵
— رحمٰن ۴۵۹-۶۵۰
— رحیم ۸۲- ۹۳- ۱۵۹- ۱۶۰- ۱۷۷- ۱۸۶-
۲۲۴- ۲۲۷- ۲۲۹- ۲۴۴- ۲۴۵- ۳۱۸-
۳۴۰- ۳۶۳- ۴۱۰- ۴۲۹- ۴۸۹- ۵۰۹-
۵۲۷-۵۴۵-۵۷۶-۵۷۸-۵۸۰-۶۳۰
— رؤف ۲۴۴-۵۲۷-۵۴۵
— سریع الحساب ۴۶۶-۴۹۳
— سریع العقاب ۹۲
— سمیع ۱۱۰- ۱۳۵- ۱۴۷- ۱۵۱- ۱۵۶- ۲۲۷-
۲۲۹-۲۹۵-۳۹۹-۵۹۰
— شدید العقاب ۱۳۴-۱۳۸-۱۵۰-۱۵۱-۴۴۷
— عالم الغیب والشہادہ ۲۲۵-۲۳۱-۳۴۸
— عزیز ۱۳۳- ۱۵۰-۱۵۷-۱۵۹-۱۹۶-۲۱۴-
۳۵۳-۳۶۹-۴۷۱-۴۹۲-۵۴۸
— علام الغیوب ۲۱۸
— علیم ۱۱۰- ۱۳۵- ۱۴۷- ۱۵۱- ۱۵۶- ۱۶۰-
۱۸۱-۱۸۷-۲۰۸-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۹-۲۳۱-
۲۳۵- ۲۹۵- ۳۸۵- ۳۹۹- ۴۲۶- ۴۳۳-
۵۰۳-۵۱۶-۵۵۴
— غفور ۸۲- ۹۳- ۱۵۹- ۱۶۰- ۱۷۷- ۱۸۶-
۲۲۴- ۲۲۷- ۲۲۹- ۳۱۸- ۳۴۰- ۴۱۰-
۴۲۹- ۴۸۹- ۵۰۹- ۵۷۶- ۵۷۸- ۵۸۰-
۶۱۰-۶۱۹
— غنی ۲۹۸-۴۷۴
— فاطر السماوات والارض ۴۳۳-۴۷۶
— قدیر ۵۵۴
— قوی ۱۵۱-۳۵۲
— قہار ۴۰۱-۴۵۲-۴۹۲
— کبیر ۴۴۸
— متعال ۴۴۸
— مجید ۳۵۵
— واحد ۴۰۱-۴۵۲-۴۹۲
— ودود ۳۶۳
— بڑی برکت والا ۳۷
— بڑے اجر والا ۱۴۰
— بڑا فضل فرمانے والا ۱۴۰
— ہر عیب اور نقص اور کمزوری سے پاک ۴۳۷
— اسی کے لیے حمد ہے ۶۵۰
— اس کے لیے برتر صفات ہیں ۵۴۸
— اس کے لیے اچھے ہی نام ہیں ۱۰۳-۶۵۰
— اس کی صفات تمام مخلوقات کی صفات کا منبع ہیں ۵۰۵
— اس کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ۵۵۷
— خدائی صفات اور انسانی صفات کا فرق ۵۸۹-۵۹۰
— انسانی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی ۷۷
— وہ راہ راست پر ہے ۳۴۸

— زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے ۶۱۹
— زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے آگے سربسجود ہے ۴۵۱-۵۴۵
— تمام مخلوقات اس کے آگے سربسجود ہیں ۵۴۵
— وہ بندوں سے قریب ہے ۳۴۹
— دعائیں سنتا اور ان کا جواب دیتا ہے ۳۴۹-۴۹۰
— اس سے بڑھ کر کوئی اپنے وعدوں کا پورا کرنے والا نہیں ۲۳۸
— وہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۴۱۶
— وہی ملجا و ماویٰ ہے ۴۶۰
— بہترین حامی و مددگار، بہترین محافظ ۱۴۵-۴۱۶
— اہل ایمان کا مولیٰ ۱۹۹
— اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۴۱-۴۴-۴۷-۵۵-۵۷-۸۶-۱۹۰-۲۵۵-۳۲۸-۳۴۵-۳۴۹-۳۵۹-۴۵۹-۴۹۴-۵۲۵-۵۳۳-۵۴۶
— وہی عبادت کا مستحق ہے ۴۰-۴۴-۴۷-۵۴-۱۹۰-۲۶۲-۳۲۱-۳۳۳-۳۴۵-۳۴۹-۳۵۹-۳۷۵-۴۰۲
— اس کے سوا کسی کو معبود نہ بنایا جائے ۶۰۸-۶۱۷
— وہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو ۵۲۴-۵۲۵
— بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ۶۵۱
— اس کا کوئی بیٹا نہیں ۲۹۸-۶۵۰
— اس کے سوا کسی کو ''وکیل'' نہ بنایا جائے ۵۹۰-۵۹۱
— اس کے سوا کسی سے دعا نہ مانگی جائے ۴۵۰
— اسی سے مدد مانگنی چاہیے ۱۷
— اسی سے پناہ مانگنی چاہیے ۱۱۰-۵۷۱
— خوف اور طمع اسی سے ہونی چاہیے ۳۸
— اسی کے غضب سے ڈرنا چاہیے ۱۸۱
— اسی پر بھروسا کرنا چاہیے ۱۵۶-۲۰۰-۲۵۵
— وہی اعتماد کے لیے کافی ہے ۶۳۰
— وہی مدد کے لیے کافی ہے ۱۵۶-۱۵۷-۲۵۵-۵۱۸
— اس پر بھروسا کرنا کبھی غلط ثابت نہ ہوگا ۶۳۰
— اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کرسکتا ۲۶۲
— فکر اسی کی رضا کی ہونی چاہیے ۲۲۵
— اس کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے ۲۱۴
— اس کو اپنا ولی نہ بنانے والے گمراہ ہیں ۲۲
— وہ دنیا کی ہر چیز کی رہنمائی کرتا ہے ۵۵۱-۵۵۲
— وہی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے ۲۸۴
— راہ راست بتانا اس کے ذمے ہے ۵۲۷
— انسان کی بھلائی اسی کی ہدایت کے اتباع میں ہے ۷-۳۱۸
— وہ اپنے بندوں سے بڑی محبت رکھتا ہے ۳۶۳-۳۶۴
— اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۸۴
— اس کی فرمانروائی میں اصل چیز رحم ہے نہ کہ غضب ۸۴
— اس کی رحمت سے مایوس ہونا کافروں اور گمراہوں کا کام ہے ۴۲۷-۵۱۰
— وہ بہت درگزر کرنے والا ہے ۴۴۷
— وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے ۲۲۹
— گناہ گار بندے کی توبہ اسے نہایت محبوب ہے ۲۴۵-۲۴۹-۲۶۳-۲۶۴
— وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ سنبھلنے کے لیے مہلت پر مہلت دیتا ہے ۲۶۹-۲۷۰-۲۷۸-۴۶۱-

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۹۷-۵۴۸
— اس کی شان حلیمی وغفاری ۶۱۹
— اس کی بے پایاں رحمت اور شان کریمی ۵۳۳
— انسان پر اس کے احسانات ۴۸۷-۴۸۸-۵۲۶
تا ۵۳۰-۵۵۹ تا ۵۶۱-۶۳۰-۶۳۱
— انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے ۸-۳۳۱-
۵۱۸-۵۴۷-۵۶۹-۶۰۵-۶۱۶
— اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۲۶۳-
۲۷۹-۲۸۹-۲۹۲-۳۲۳-۳۳۶
— وہ بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۱۵۰-۲۱۳-
۲۸۸-۳۶۶-۳۷۲
— اس کا انصاف بے لاگ ہے ۵۳-۲۵۰-۳۲۱-
۳۴۰ تا ۳۴۵-۳۵۶-۳۵۸-۵۱۱
— وہ نیک کردار لوگوں کی ناقدری نہیں کرتا ۳۲۲
— اس کے ہاں کسی مستحق کا اجر مارا نہیں جاتا
۹۴-۲۵۰-۳۷۲-۴۱۳-۴۲۸
— وہ بھلائی کا اجر آدمی کے عمل سے زیادہ دیتا ہے
۲۵۰-۲۸۰
— وہ کسی کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا نہیں دیتا ۲۸۰
— وہ انتقام لینے والا ہے ۴۹۲
— اس کی پکڑ بڑی سخت ہے ۳۶۷
— وہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا ۲۰
— وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۲۲-۳۸
— وہ فاسقوں کو پسند نہیں کرتا ۲۲۵
— وہ متکبروں کو پسند نہیں کرتا ۵۳۴
— وہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا ۱۵۳
— اس کے غضب کے مستحق کیسے لوگ ہیں ۴۶-
۸۲-۱۳۵

— وہ صرف پاکیزہ لوگوں کو پسند کرتا ہے ۲۳۲
— وہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۱۷۶-۱۷۸
— وہ محسنوں کے ساتھ ہے ۵۸۳
— وہ تمام چیزوں کا خالق ہے ۳۶-۳۷-۱۰۶-
۱۹۲-۲۶۱-۲۸۳-۳۲۴-۳۴۹-۳۵۳-
۴۵۲-۴۸۷-۵۲۵-۵۲۶-۶۴۶
— اس نے کائنات کو بے مقصد نہیں بنایا ہے ۲۶۴
— اس نے آسمان وزمین کو برحق پیدا کیا ہے ۴۷۹-
۴۸۰-۵۱۶-۵۲۵
— اسی نے انسان کو زمین پر بسایا ہے ۳۴۹
— وہی انسان کا مالک اور رب ہے ۳۶-۲۶۱-
۲۶۲-۲۸۱-۲۸۲-۳۳۶-۳۴۷-۴۵۹
— وہی ساری کائنات کا مالک، منتظم اور فرمانروا ہے
۳۶-۳۷-۷۱-۸۶-۲۴۳-۲۵۵-۲۶۲-
۲۸۲-۲۹۲-۲۹۶-۲۹۸-۴۰۲-۴۱۷-
۴۴۱-۴۴۲-۴۵۱-۴۶۵-۴۶۹-۵۲۹-
۵۴۶-۶۱۸
— ہر چیز کے خزانوں کا مالک ۵۰۲
— ہر چیز کی تقدیر مقرر کرنے والا ۵۰۲-۵۰۳
— ہر چیز پر نگراں ۳۴۸
— ہر چیز پر وکیل ۳۲۷
— تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں ۴۶۰
— تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع
ہوتے ہیں ۱۴۸-۳۷۵
— اس کے فیصلے اٹل ہیں ۴۴۹
— کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں
ہے ۴۶۵
— وہ بے نیاز ہے، اس کا محتاج نہیں ہے کہ لوگ اس کو

خدا مانیں، تب ہی وہ خدا ہو ۲۹۸-۴۷۳-۴۷۴

— اس کے اختیارات غیر محدود ہیں ۳۶۹

— ہر چیز پر قادر ۱۴۶-۱۹۵-۳۲۳-۵۵۹

— آسمان و زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ۳۷۵

— وہ عاجز نہیں ہے ۶۵۱

— اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں ۵۸۹

— صرف اس کا حکم ہی اس کے ارادے کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے ۵۴۲

— اس کے لیے ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو لے آنا کچھ مشکل نہیں ۴۸۰

— اس کی پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکتا ۴۶۳-۴۶۴

— اس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں ۱۴۹-۳۴۷-۳۶۴-۵۱۶

— اس کی چال کا کوئی توڑ نہیں، اس کی چالیں زبردست ہیں ۱۰۴-۴۵۰-۴۶۶

— اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی ۱۵۵-۱۷۵-۱۷۶-۳۳۶-۳۷۸-۳۸۰-۴۱۷-۴۱۸-۴۴۹-۴۹۲-۵۴۵

— اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا ۲۴۳-۳۷۱-۴۴۹

— وہ جس کے ساتھ ہو اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا ۱۳۶

— اس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ۱۹۵-۳۴۸

— اس کی باتیں بدل نہیں سکتیں ۲۹۵

— اسی کا بول بالا ہے ۱۹۶

— فتح و کامرانی اسی کے بخشنے سے حاصل ہوتی ہے ۱۳۲-۱۵۸

— وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے ۳۹۱

— وہ غیر محسوس طریقوں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے ۶۱-۱۰۴-۴۳۳

— عزت ساری کی ساری اس کے اختیار میں ہے ۲۹۵

— اس کے اذن کے بغیر کوئی نعمت کسی کو نہیں مل سکتی ۳۱۴

— اس کی ڈالی ہوئی مصیبت کو کوئی دور نہیں کرسکتا ۳۱۸

— زندگی و موت اس کے اختیار میں ہے ۸۶-۲۴۳-۲۸۲-۲۹۲-۵۰۳-۵۵۳

— انسان کی سماعت اور بینائی کا مالک و مختار وہی ہے ۲۸۲

— وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۴۸۶

— جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بناتا ہے ۷۱-۷۴

— جو کچھ وہ چاہے وہی ہوتا ہے ۱۰۶-۲۹۰-۳۳۶

— اپنی رحمت سے جس کو چاہے نوازے ۴۱۳

— جس بندے پر چاہے فضل فرمائے ۳۱۸

— جسے چاہے بلند درجے دے ۴۲۱

— اس کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ۶۰۷

— وہ جس کا بھلا کرنا چاہے اسے کوئی روک نہیں سکتا ۳۱۸

— جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے ۸۴-۱۸۱-۱۸۶-۲۳۱-۳۳۶-۶۲۳

— اس کی قدرت اور حکمت کے کرشمے ۳۶-۳۷-۳۹-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۴-۲۸۲-۲۹۶-۳۲۴-۴۴۱ تا ۴۴۵-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۲-۴۸۷-۴۸۸-۵۰۰-۵۰۲-۵۰۳-۵۲۶- تا ۵۳۰-۵۵۰ تا ۵۵۲-۵۵۵۵۴-۵۶۰-۵۶۱-۶۳۰

— دنیا میں جو کچھ کسی کو مل رہا ہے اسی کے دینے سے مل رہا ہے ۶۰۷

— وہی رزق دینے والا ہے ۲۸۲-۴۵۷-۵۵۳-۵۵۵

— ہر جاندار کا رزق اس کے ذمے ہے ۳۲۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— رزق کی تنگی و کشادگی اسی کے اختیار میں ہے ۶۱۱
— آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کو وہ جانتا ہے ۵۵۸
— ہر ذی علم سے بڑا ذی علم ہے ۴۲۱
— آسمان و زمین کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ۴۹۰
— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۵۷-۱۶۳-۲۱۸-۲۴۳-۳۲۳-۴۴۷-۴۴۸-۴۹۰-۵۲۳
— تمام مخلوقات کے حال سے باخبر ہے ۶۲۴
— ہر جان دار کے رہنے اور مرنے کی جگہ سے واقف ہے ۳۲۴
— تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۹-۴۵-۱۶۲-۱۸۲-۲۸۵-۲۸۹-۲۹۵-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۵-۵۳۶-۵۶۷-۶۰۷-۶۱۲-۶۲۳-۶۴۵
— فرداً فرداً ہر متنفس کے حال پر نگاہ رکھتا ہے ۴۶۱-۴۶۶
— دلوں کے چھپے بھید تک جانتا ہے ۱۳۷-۱۴۷-۳۲۳-۳۳۶
— تمام اگلی پچھلی نسلوں کا حال جانتا ہے ۵۰۳
— نافرمانوں کے کرتوتوں سے وہ غافل نہیں ہے ۴۹۱
— اس کی معرفت کی نشانیاں (دیکھو "آیت")
— اس کی ہستی کے دلائل (دیکھو "توحید" اور "شرک")

الحاد- معنی اور تشریح ۱۰۳

القا

— وحی اور القا کا فرق ۵۵۱

الہام-

— وحی اور الہام کا فرق ۵۵۱

الیاس علیہ السلام

— ان کا زمانہ اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے ان کی کوششیں ۵۹۷

امت:

— پیغمبر کی امت سے کیا مراد ہے ۲۸۹

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

— اس کی اہمیت انسانی زندگی میں ۹۰ تا ۹۲-۳۷۲-۳۷۳-۵۱۲
— وہ اہل ایمان کی خصوصیت ہے ۲۱۳-۲۴۰
— وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم عنصر ہے ۸۵

انبیا- (دیکھو: "نبوت")

انجیل:

— اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ۸۵
— اس میں بنی اسرائیل کو تنبیہات ۹۳-۵۹۵
— اس کی اور قرآن کی مطابقت ۲۳۸

انسان:

— تخلیق انسانی کے متعلق قرآن کا بیان ۱۰-۱۱-۱۰۶-۵۰۴
— ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور قرآن ۱۱-۵۰۴
— فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا گیا ۱۰-۵۰۴-۵۰۵-۶۲۷
— دنیا میں اس کی حیثیت ۱۰
— روح انسانی کی حقیقت ۵۰۴-۵۰۵
— خلافت کی حقیقت ۵۰۵
— دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اس کی فضیلت کا سبب ۵۰۵
— اس پر خدا کے احسانات (دیکھو: "اللہ، انسان پر اس کے احسانات")
— خدا نے اس کو انتخاب اور ارادے کی آزادی بخشی ہے ۵۲۸-۵۶۸-۵۶۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "تقدیر")

— وہ آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۳۲۴
— اس کو ازل میں حقیقت کا علم دیا گیا تھا ۹۵-۹۷
— اس کے علم کی حقیقت ۵۵۴
— اس کے لیے کائنات کو کس معنی میں مسخر کیا گیا ہے ۴۸۸-۵۲۹
— تمام انسان ایک ہی جوڑے سے پیدا ہوئے ہیں ۱۰۶
— انسان روح مر کر معدوم نہیں ہوتی ۱۵۰-۵۳۵ تا ۵۳۸
— انسانی فطرت برائی کو پسند نہیں کرتی ۱۶
— اس میں بلندی اور دوام کی طلب موجود ہے ۱۶
— شرم وحیا اس میں ودیعت کی گئی ہے ۱۵
— اس کے تحت الشعور میں توحید کی شہادت موجود ہے ۹۷-۹۹-۲۷۸-۶۲۳-۶۳۱
— دنیا میں آنے سے پہلے اس سے توحید کا اقرار لیا گیا تھا ۹۵ تا ۹۷
— ابتدا میں تمام انسانوں کا مذہب ایک تھا ۲۷۶
— انسانی طبائع اور افکار و اطوار کا اختلاف عین تقاضائے فطرت ہے ۳۷۳-۳۷۴-۴۴۶-۵۶۸-۶۰۴
— انسانی فطرت کی کمزوریاں ۲۷۰-۳۲۵-۳۲۶-۵۲۶-۶۰۳-۶۳۹-۶۴۶
— انسان سے شیطان کی ازلی دشمنی ۱۳-۱۵-۱۸-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۸-۶۲۸
— اس کی فضیلت کو غلط ثابت کرنے کے لیے شیطان کا چیلنج ۶۲۸
— اس کو بہکانے کے لیے شیطان کو قیامت تک کی مہلت ۱۳-۵۰۶
— شیطان کو اس پر کس قسم کے اختیارات دیے گئے ۱۳-۱۴-۵۰۷-۵۰۸-۶۲۹-۶۳۰
— جنت میں شیطان اور انسان کا پہلا معرکہ اور اس کے نتائج ۱۷
— اس کو بہکانے کے لیے شیطان کی چالیں ۱۴-۱۶-۱۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۳۹-۴۸۲-۵۰۶-۵۴۹-۶۲۹
— کیسے انسانوں پر شیطان کا بس چلتا ہے ۵۷۱-۶۳۰
— کیسے انسان شیطان کے دھوکے سے محفوظ رہتے ہیں ۵۰۶-۵۰۷-۵۷۱-۶۳۰
— اس کے لیے شیطان کے پھندے سے بچنے کی واحد صورت ۱۳۰
— اس کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے ۱۷-۲۵-۳۷-۵۰
— اس کی نجات کا انحصار کس چیز پر ہے ۳۱-۳۲
— اس کی حقیقی ترقی کس راہ میں ہے ۱۱۵
— اس کی تباہی کس راستے میں ہے ۲۵-۳۴
— اس کی رہنمائی کے لیے نبوت کی ضرورت ۱۸-۲۰-۵۲۷-۵۲۸
— وہ حکمت جس کی بنا پر خدا نے اس کی رہنمائی کے لیے انسانوں ہی میں سے بعض کو نبی بنایا ۵۲۸-۵۲۹-۵۴۳
— اس کی رہنمائی کے لیے اللہ کی ہدایات (دیکھو: ''اسلام، اس کی بنیادی تعلیمات'')
— اس کے اخلاقی پستی میں مبتلا ہونے کے اسباب ۱۴-۱۹-۲۰-۲۲-۱۰۰-۱۰۱-۱۱۵
— اس کے مبتلائے ضلالت ہونے کے اسباب (دیکھو: ''ضلالت، اس کے اسباب'')
— وہ اپنی گمراہی کے لیے خود ذمہ دار ہے ۹۷-۹۹-۴۸۱-۴۸۲-۵۰۶ تا ۵۰۸
— وہ تمام ان لوگوں کی گمراہی کا بھی ذمہ دار ہے جو

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے ذریعے سے گمراہ ہوں ۵۳۴
— وہ ان اثرات کا بھی ذمہ دار ہے جو اس کے عمل سے دوسروں کی زندگی پر مترتب ہوں ۲۶ تا ۲۸
— گمراہی قبول کرنے والے کی ذمہ داری گمراہ کرنے والے سے کم نہیں ہے ۲۹
— ہر انسان اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ۶۰۵
— اپنی بری اور بھلی قسمت کے لیے انسان کی اپنی ذمہ داری ۶۰۴
— انسان کی ذمہ داری اس کی اپنی استطاعت کے لحاظ سے ہے ۳۰
— وہ اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے ۸-۳۳۱-۵۱۸-۵۴۷-۵۶۹-۶۰۵-۶۱۶

انصار:
— انھوں نے کن عزائم کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینے تشریف لانے کی دعوت دی تھی ۱۲۰-۱۲۱
— ان کو کفار مکہ کا الٹی میٹم ۱۲۲
— جنگ بدر میں ان کی جاں نثاری ۱۲۵-۱۲۶
— اسلام نے ان کی باہمی دشمنیوں کو کس طرح ختم کیا ۱۵۷

انفاق فی سبیل اللہ:
— اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ ۲۲۷
— سچے اہل ایمان کی خصوصیت ۱۳۰
— منافقین کا اس سے بیزار رہنا ۲۲۷
— منافق کا انفاق خدا کے ہاں مقبول نہیں ۲۰۱
— اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے والوں کا انجام ۱۹۱
— اللہ کی راہ میں صرف کیا ہوا مال ضائع نہیں ہوتا ۱۵۵-۲۵۰
— اسلامی ریاست کی ضروریات پر مال خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے ۱۵۵ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "زکوۃ")

اوہام جاہلیت- (دیکھو "شرک" اور "عرب")

اہل کتاب:
— مکی دور میں ان سے خطاب کی ابتدا ۵
— ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے ۸۴-۸۶
— عرب میں علمائے اہل کتاب کی حیثیت ۳۱۱
— ان کے علما کی حق دشمنی ۱۹۱
— ان کے علما اور درویشوں کی حرام خوریاں ۱۹۱
— اسلام اپنی حقانیت کے لیے اہل کتاب کی تصدیق کا محتاج نہیں ۴۶۴
— ان کا دعوائے ایمان کیوں معتبر نہیں ۱۸۷-۱۸۹-۱۹۰
— ان کے خلاف جنگ کا حکم ۱۸۷-۱۸۸
— کتب آسمانی کا علم رکھنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو غلط نہیں کہہ سکتے ۴۶۶
— سچے اہل کتاب قرآن کے نزول پر خوش تھے ۴۶۳
— وہ قرآن کو حق مانتے ہیں ۶۵۰

آیت، آیات:
— آیات الٰہی کی تکذیب کا برا انجام ۲۵-۳۰-۳۴-۴۲-۴۷-۷۳-۷۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۴-۱۵۱-۳۱۱-۳۲۸

آیات: (بمعنی معرفت حق کے نشانات اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں) ۱۹-۳۹-۴۰-۷۳-۷۴-۷۸-۹۹-۲۷۹-۲۹۶-۳۱۲-۳۶۷-۳۸۶-۴۳۵-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۵-۴۷۲-۵۲۸-۵۲۹-۵۴۹-۵۵۱-۵۵۲-۵۶۰-۵۸۸-۶۰۳
— آیات الٰہی کی طرف توجہ دلانے کا مقصد ۹۹
— آیات الٰہی سے غفلت برتنے کا نتیجہ ۲۶۶-۵۱۵

— آیاتِ الٰہی سے مکر کرنے کا مطلب ۲۷۷
— آیاتِ الٰہی کی مدد سے تلاشِ حقیقت کا صحیح طریقہ ۲۹۶- ۲۹۷ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قرآن، وہ تلاشِ حقیقت کے کس طریقے کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے'')
— آیاتِ الٰہی غور و فکر رکھنے والوں کے لیے بیان کی جاتی ہیں ۲۶۴
— آیاتِ الٰہی سے ہدایت پانے کی لازمی شرطیں ۲۶۴-۲۶۵-۲۹۶

آیت (بمعنی نشانِ عبرت) ۳۱۰

آیت (بمعنی معجزہ) ۴۸- ۶۳- ۶۵- ۷۰- ۷۲- ۷۳-۱۱۱-۲۷۷-۳۰۱-۳۵۲-۳۶۵-۴۴۷- ۴۵۸- ۴۶۴- ۶۲۶-۶۴۶

— اللہ کی آیات کے ساتھ ظلم کرنے کا انجام ۱۰
— آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے کافر ہیں ۲۱۰
— جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے اللہ ان کو ہدایت نہیں دیتا ۵۷۴
— آیاتِ الٰہی کا علم رکھنے کے باوجود ان سے منہ موڑنے کا نتیجہ ۱۰۰
— آیاتِ الٰہی کو تھوڑی قیمت پر بیچنے کا مطلب ۱۷۸
— اللہ اپنی آیات علم رکھنے والوں کے لیے بیان کرتا ہے ۲۳-۱۷۹
— اللہ کی رحمت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس کی آیات پر ایمان لائیں ۸۴
— اللہ کی آیات انسان کو بلندی عطا کرنے کے لیے ہیں ۱۰۰
— آیاتِ الٰہی کی تلاوت کا اثر اہلِ ایمان پر ۱۳۰

ایکہ-۵۱۵

ایمان:

— کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ۸۵-۸۶- ۱۸۳-۲۲۷
— ایمان کی حقیقت ۱۸۷- ۲۳۵ تا ۲۳۸- ۲۶۸
— ایمان بالغیب کی حکمت و مصلحت ۲۶۵- ۲۶۶- ۲۷- ۴۹۸-۴۹۹
— مومن کے اجر کو آخرت پر کیوں مؤخر کیا گیا ہے ۲۳۷
— موت کے آثار دیکھ کر ایمان لانا بیکار ہے ۳۰۹
— عذابِ الٰہی کو آتے دیکھ کر ایمان لانا بیکار ہے ۳۱۲
— کیا چیزیں ایمان لانے میں مانع ہوتی ہیں ۲۸۷- ۲۸۸- ۳۰۱- ۳۱۱- ۳۱۴- ۳۲۹- ۴۴۶-۴۵۱-۴۷۶-۶۴۴
— اللہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ انسان کی آزادی انتخاب سلب کر کے اس کو بجبر مومن بنائے ۳۱۳
— نعمت ایمان اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ملتی ۳۱۴ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'')
— ایمان نہ لانے والوں کا سرپرست شیطان ہوتا ہے ۱۹
— اس مومن کا حکم جسے کفر پر مجبور کیا گیا ہو ۵۷۴
— مومن کا ایمان قرآن سے نشو و نما پاتا ہے ۲۵۳
— ایمان میں کمی و بیشی نہ ہونے کا صحیح مطلب ۱۳۰
— مومن کے لیے قرآن شفا اور رحمت اور ہدایت ہے ۳۴-۱۱۳-۲۹۲-۴۳۸-۵۴۹-۶۳۹
— اہلِ ایمان کی بھلائی کس چیز میں ہے ۵-۳۶۰
— اہلِ ایمان کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۱۳۵-۱۸۲-۲۳۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— ایمان کے تقاضے ۱۲۸- ۱۳۰- ۱۳۶- ۱۳۹-
۱۴۰- ۱۴۵- ۱۴۶- ۱۸۱- ۱۸۴- ۱۸۵- ۱۹۴-
۱۹۷- ۲۰۹- ۲۲۷- ۲۳۷- ۲۴۱- ۲۴۹-
۳۰۶- ۳۲۱- ۴۵۵- ۴۵۶- ۴۸۷- ۵۷۵-
۵۷۶- ۶۰۷

— مومن کی صفات ۱۲۸- ۱۳۰- ۱۶۳- ۱۸۱-
۱۸۳- ۲۰۴- ۲۰۵- ۲۱۳- ۲۲۱- ۲۲۷- ۲۳۵
تا ۲۴۰- ۲۴۹- ۳۱۵- ۳۴۰- ۳۷۱- ۴۵۵-
۴۵۶- ۴۵۹- ۴۷۷

— صداقت ایمانی کا معیار ۱۲۶- ۱۷۰- ۱۷۳-
۱۸۰- ۱۸۱- ۱۸۴- ۱۸۵- ۱۹۴- ۱۹۵- ۱۹۷-
۲۲۱- ۲۲۲- ۲۲۳- ۲۲۴- ۲۲۷- ۲۲۹- ۲۳۰-
۲۴۷- ۳۲۱- ۵۷۶

— مومن کی نگاہ دنیوی فائدوں کے بجائے آخرت کے فائدوں پر ہونی چاہیے ۱۵۸- ۴۱۴

— ایمان کے لیے اللہ اور رسول کی وفاداری شرط لازم ہے ۲۲۳

— اہل ایمان کو نہ چاہیے کہ وہ اپنی جان کو رسول سے عزیز تر رکھیں ۲۴۹

— اہل ایمان کو نہ چاہیے کہ وہ کفر و اسلام کی جنگ میں پیچھے رہ جائیں ۱۹۷- ۲۴۹

— اہل ایمان کو نہ چاہیے کہ وہ غیر مسلموں کو اپنا جگری دوست بنائیں ۱۸۲- ۱۸۴

— مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے مشرک رشتہ دار کے لیے دعائے مغفرت کرے ۲۴۱

— اہل ایمان کو ایک دوسرے کا مددگار ہونا چاہیے ۱۶۳

— اہل ایمان کی جماعت کیسی ہونی چاہیے ۲۴۸-
۲۴۹

— اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے ۲۰

— اہل ایمان کی مدد کے لیے اللہ کافی ہے ۱۵۷- ۵۱۸

— مومن کی کامیابی و ناکامی کا معیار ۲۰۱

— مومن کی ذہنیت اور اس کا انداز فکر ۳۴۳- ۵۶۹

— ایمان اور کفر کا فرق ۴۶۹

— ایمان اور کفر کا فرق بلحاظ حقائق اور بلحاظ تجربات تاریخی ۴۸۵

— مومن اور کافر کا فرق ۱۵۷- ۱۵۸- ۲۰۰- ۲۰۱-
۲۳۳- ۳۶۱- ۳۹۰- ۴۵۱- ۴۵۵- ۴۸۷-
۵۱۷

— مومن اور منافق کا فرق ۲۱۴- ۲۵۳

— گناہ گار مومن اور منافق کا فرق ۲۲۹

— منافق اور گناہ گار مومن میں تمیز کیسے کی جا سکتی ہے ۳۰

— حقیقی مومن اور قانونی مسلمان کا فرق ۲۲۲-
۲۳۶- ۳۳۷

— ایمان کے اثرات انسانی سیرت پر ۷۰- ۴۸۴-
۴۸۶

— سچے اہل ایمان شیطان کے فتنے سے محفوظ رہتے ہیں ۵۷۰

— ایمان صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی نافع ہے ۵۷- ۶۰- ۲۹۵- ۳۲۲- ۳۶۶- ۴۸۴-
۴۸۵- ۵۷۰

— دنیا اور آخرت کی نعمتیں اہل ایمان ہی کا حق ہیں ۲۳

— اہل ایمان کے لیے بشارت ۲۴۱- ۲۶۰- ۲۹۵-
۶۰۲- ۶۴۹

— مومن متقی کے لیے خوف و حزن نہیں ہے ۲۹۵

— تمام متقی اہل ایمان اللہ کے ولی ہیں ۲۹۵

— اللہ دشمن اہل ایمان کا دشمن ہے اور اہل ایمان کا

دشمن اللہ کا دشمن ۱۵۵
__ اللہ مومن کی توبہ قبول کرتا ہے ۸۲
__ اللہ کی رحمت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس کی آیات پر ایمان لائیں ۸۴
__ ایمان و عمل صالح کا انجام نیک ۳۰-۱۳۰-۲۱۴-۲۲۲-۲۳۵-۲۶۱-۲۶۳-۲۶۶-۲۶۸-۲۹۵-۳۳۲-۴۵۹-۴۸۳-۴۸۶-۵۷۰-۶۰۲-۶۰۷
__ اہل ایمان پر اللہ کی عنایات ۱۳۵-۱۳۶-۲۴۹
__ اہل ایمان کے لیے اللہ کے ہاں سچی عزت اور سرفرازی ہے ۲۶۱
__ اللہ پر یہ حق ہے کہ مومن کو عذاب نہ دے ۳۱۵
__ اطاعت شعار مومن کا حساب دنیا ہی میں تکلیفیں ڈال کر صاف کر دیا جاتا ہے ۴۵۴

ب

بائبل: ۴۰-۵۱-۵۸-۷۸-۸۷-۹۰-۹۳-۹۵-۲۳۹-۳۰۵-۳۰۹-۳۵۴-۳۵۵-۳۸۱-۳۸۳-۳۹۰-۳۹۱-۴۰۰-۴۰۵-۴۰۶-۴۱۱-۴۱۲-۴۲۴-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۷۳-۵۸۱-۵۹۱-۵۹۶-۵۹۹
__ بائبل اور قرآن کے اختلافات ۵۱-۸۱-۸۵-۳۰۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۸۲-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۴۰۲-۴۰۷-۴۱۷-۴۲۹-۴۳۴-۵۱۲
__ بائبل کے صحیفہ یونس کی حقیقت ۳۱۲
__ مجموعہ صحف سماوی ۵۹۱

برزخ:
__ موت اور قیامت کے درمیان برزخی زندگی کی کیفیت ۵۳۶ تا ۵۳۸
__ عذاب قبر (یعنی عذاب برزخ) کا ثبوت ۱۵۰-۵۳۵ تا ۵۳۷
__ ثواب برزخ کا ثبوت ۵۳۸

برکت-معنی اور تشریح ۳۷
__ اللہ کے بابرکت ہونے کا مطلب ۳۷

بشارت-معنی اور تشریح ۳۰۸

بغی-معنی اور تشریح ۵۶۶

بنی اسرائیل-۳۵۶-۶۴۷-۶۴۸
__ ان کی تاریخ کا عبرتناک پہلو ۶۳-۵۹۱
__ ان کا اصل مذہب اسلام ہی تھا ۳۰۵-۳۰۶-۳۰۹
__ دین میں ان کی تفرقہ انگیزیاں جہالت کی بنا پر نہ تھیں بلکہ علم کے باوجود تھیں ۳۱۰
__ ان کی تاریخ حضرت یوسفؑ کے دور سے حضرت موسیٰ کی ولادت تک ۳۸۲-۳۸۳
__ ان کا مصر پہنچنا ۴۲۸-۴۲۹
__ مصر میں داخلے کے وقت ان کی تعداد ۴۳۰
__ حضرت یوسفؑ اور ان کے بعد آنے والے مبلغین اسلام کی کوششوں سے مصریوں میں اسلام کی کتنی اشاعت ہوئی ۴۳۰
__ حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت ان کی حالت ۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶
__ ان پر مصر کی غلامی کے اثرات ۷۵-۸۰
__ حضرت موسیٰ فرعون سے ان کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں ۶۵-۷۳
__ ان پر فرعون کے مظالم ۷۱-۷۶-۳۰۴-۳۰۵-۴۷۲
__ مظالم دو فرعونوں کے عہد میں ہوئے ۷۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— ان کو خلافت دینے کا وعدہ ۷۳

— ان کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی گئی ۷۵

— مصر میں حضرت موسیٰ نے ان کی تنظیم کس طرح کی ۳۰۷

— مصر سے ان کا خروج ۴۷-۳۰۹

— سمندر کو کس مقام پر عبور کیا گیا ۴۷

— مصر سے نکلتے ہی ایک بناوٹی خدا کا مطالبہ کرتے ہیں ۴۷

— کوہ سینا کے دامن میں قیام ۷۶

— بیابان سینا میں ان پر اللہ کے احسانات ۸۷-۸۸

— بچھڑے کو معبود بنا لیتے ہیں ۸۰

— شرک سے ان کی توبہ ۸۰

— حضرت موسیٰ کا غصہ ۸۱

— بنی اسرائیل کے ستر نمایندے گوسالہ پرستی کی معافی مانگنے کے لیے جاتے ہیں ۸۳

— شریعت عطا کی جاتی ہے ۷۶-۷۸-۷۹

— ان سے میثاق لیا جاتا ہے ۹۴-۹۵

— بیابان سینا میں ان کی پہلی مردم شماری ۴۳۰

— ان کی اجتماعی تنظیم کس شکل میں کی گئی ۸۷

— ان کی ہدایت کے لیے تورات کا نزول ۵۹۰

— ان کو حضرت موسیٰ کی آخری وصیتیں ۴۷۲ تا ۴۷۴

— ان کی تاریخ حضرت موسیٰ کی وفات سے بخت نصر کے حملے تک ۵۹۵ تا ۵۹۸

— ان کی تاریخ بابل کی اسیری سے چھوٹنے کے بعد حضرت مسیح کے دور تک ۵۹۸ تا ۶۰۰

— ان کی تاریخ مسیح علیہ السلام کے دور میں ۶۰۰ تا ۶۰۲

— ان کا اخلاقی و مذہبی انحطاط ۸۱-۸۲-۸۵-۹۳

— ان کی نافرمانیاں ۸۸ تا ۹۵

— ان پر آسمان سے عذاب کا نزول ۸۹

— ان کو سبت شکنی کی سزا ۹۱-۹۲

— انبیائے بنی اسرائیل ان کو بدکار عورت سے تشبیہ دیتے ہیں ۸۰

— ان کو انبیائے بنی اسرائیل کی پے در پے تنبیہات ۹۳

— تاریخ میں ان کے دو بڑے فساد جن پر انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو پے در پے متنبہ کیا ۵۹۱ تا ۵۹۵

— پہلے فساد کی سزا ۵۹۵-۵۹۸

— دوسرے فساد کی سزا ۶۰۰ تا ۶۰۲

— ان پر قیامت تک ایسے ظالم مسلط کیے جاتے رہیں گے جو انھیں سخت عذاب دیں گے ۹۲-۹۳

— وہ اسباب جن کی بنا پر وہ امامت اقوام کے منصب سے ہٹائے گئے ۵۹۵ تا ۵۹۸

— سارے بنی اسرائیل بگڑے ہوئے ہی نہ تھے ۸۶

— ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے ۸۴ تا ۸۶-۵۸۶-۵۸۷

— ان کی شریعت میں بعض ان چیزوں کے حرام ہونے کی وجہ جو شریعت محمدیہ میں حلال ہیں ۵۷۹-۵۸۱

ت

تابوت سکینہ-۵۹۷

تزکیۂ نفس- صدقہ اس کے اہم ذرائع میں سے ہے ۲۲۹

تسبیح- معنی اور تشریح ۱۱۵-۶۱۹

— ''سبحان اللہ'' کا مطلب ۲۹۸-۴۳۷

— آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ۶۱۸

— بے جان مخلوق کس طرح خدا کی تسبیح کرتی ہے ۴۴۹

تعلیم- اسلام میں تعلیم کا مقصد ۲۵۱

— اسلامی ریاست کی تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہیے ۲۵۰ تا ۲۵۲

— اسلامی حکومت میں عرب کی جہالت دور کرنے کے لیے کیا کوششیں کی گئیں ۲۵۱

— موجودہ مذہبی تعلیم کے بنیادی نقائص ۲۵۱-۲۵۲
— نظام تعلیم میں وہ علوم ناپسندیدہ ہیں جن کی بنیاد محض ظن وتخمین پر ہو ۶۱۶

تقدیر:

— ہر چیز کی حد اور مقدار مقرر کردی گئی ہے جس سے کوئی شے تجاوز نہیں کرسکتی ۵۰۲-۵۰۳
— قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا اللہ کے اختیار میں ہے ۲۷
— اللہ کے فیصلوں کو کوئی طاقت نفاذ سے نہیں روک سکتی ۴۴۹
— اللہ کی مشیت کے مقابلے میں انسانی تدابیر کارگر نہیں ہوتیں ۳۷۸-۳۸۰-۴۱۷-۴۱۸
— اللہ جسے چاہے اپنے فضل سے غنی کردے ۱۸۷
— اس کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا ۳۱۸
— اس کی ڈالی ہوئی مصیبت کو کوئی دور نہیں کرسکتا ۳۱۸
— رزق کی کمی وبیشی اس کے اختیار میں ہے ۴۵۷-۴۵۸-۶۱۱
— فتح اسی کے اذن سے حاصل ہوتی ہے ۱۵۸
— لوگوں کے دلوں کو جوڑنا اور اتفاق پیدا کرنا اسی کا کام ہے ۱۵۶
— وہ جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بناتا ہے ۱۷-۴۷
— ہر شخص اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتا ہے ۲۵
— ہر قوم کے لیے ایک مہلت عمل مقرر کردی جاتی ہے ۲۴-۲۹۰-۴۷۶-۴۹۷
— کوئی قوم نہ خدا کی دی ہوئی مہلت عمل ختم ہونے سے پہلے مٹ سکتی ہے نہ اس کے بعد باقی رہ سکتی ہے ۲۹۸-۵۲۸
— ہدایت اور ضلالت اللہ کے اختیار میں ۲۸۰-۴۷۱-۵۴۰-۶۲۵
— اللہ جسے گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۲
— اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی کسی کو راہ راست پر نہیں لا سکتا ۳۶۹
— برے لوگوں کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنادیے جاتے ہیں ۲۷۰
— خدا کی توفیق کے بغیر کوئی شخص راہ حق پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا ۶۳۳
— انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دینا اور کفر وایمان کے فیصلے میں مختار چھوڑنا عین مشیت الٰہی تھا ۳۱۳-۳۶۱-۵۲۸
— انسانی اختلافات کی اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو انتخاب و ارادہ کی آزادی بخشی ہے ۳۷۳-۳۷۴-۵۶۸
— بری اور بھلی قسمت میں انسان کی اپنی ذمہ داری ۶۰۴
— ہدایت اختیار کرنے والا خود اپنا بھلا کرتا ہے اور ضلالت اختیار کرنے والا خود اپنا نقصان کرتا ہے ۳۱۸-۶۰۴-۶۰۵
— انسانی اختیار کی حقیقت ۲۳۶
— انسانی تدبیر اور الٰہی تقدیر کا باہمی تعلق ۳۴۰-۳۶۲
— انسان کے ارادوں کا پورا ہونا اللہ کی مشیت پر منحصر ہے ۵۶
— خدا پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈالنا شیطانی فعل ہے ۱۴
— گمراہ لوگ اپنی گمراہی کے لیے عقیدۂ جبر کی آڑ لینے میں غلطی پر ہیں ۵۳۹
— اپنی گمراہی کے جواز میں عقیدۂ جبر سے دلیل لانے والوں کو قرآن کا جواب ۵۴۰
— قوموں کی تقدیر بنانے اور بگاڑنے کے متعلق اللہ کا قانون ۱۵۱-۱۹۴-۱۹۵-۲۱۳-۳۴۶-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۴۴۹-۴۷۹-۶۰۶
— ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے معاملے میں اللہ

Maktaba Tul Ishaat.com

کا قانون ۲۴۳-۴۵۸-۴۵۹-۴۷۱-۴۸۶

— اللہ کے کسی کو ہدایت دینے اور کسی کو گمراہ کرنے کا مطلب ۸۳-۱۰۲-۲۴۳-۳۳۶-۴۸۶-۵۶۹-۶۴۵

— اللہ کے کسی کو فتنے میں ڈالنے کا مطلب ۲۵۳

— اللہ کی طرف سے دلوں اور کانوں پر مہر لگائے جانے کا مطلب ۶۱۹-۶۲۰

— بعض لوگوں کے جہنم کے لیے پیدا کیے جانے کا مطلب ۱۰۲

— کیسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگائی جاتی ہے ۶۳-۲۲۱-۲۲۴-۳۰۱-۵۷۶

— کیسے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا جاتا ہے ۷۸-۷۹-۱۰۵

— گمراہی میں ڈالنے کی صورتیں کیا ہیں ۷۸-۷۹

— کیسے لوگوں کو نیکی اور ایمان کی توفیق نہیں دی جاتی ۱۳۷-۱۹۸-۲۸۲-۳۰۸-۳۱۱-۳۱۴

— کیسے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے ۱۸۳-۱۸۵-۱۹۲-۲۱۹-۲۳۴-۵۴۰-۵۷۴-۵۷۵

— کیسے لوگوں کے دل حق سے پھیرے جاتے ہیں ۲۵۴

— کیسے لوگوں کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے ۲۷۰-۲۷۸

— کیسے لوگوں کے دلوں پر کفر مسلط کیا جاتا ہے ۲۲۱

— کیسے لوگوں کے دلوں میں منافقت پیدا کی جاتی ہے ۲۱۸

— کیسے لوگوں کو برائی سے بچایا جاتا ہے ۴۲۱

— کیسے لوگوں کو ہدایت بخشی جاتی ہے ۲۶۸-۴۵۸-۴۶۹

— عقیدۂ تقدیر کے اخلاقی نتائج ۱۹۹-۲۰۰-۳۸۰-۳۸۱

تقلید - تمام گمراہ قومیں تقلید آبائی پر اصرار کرتی رہی ہیں ۴۷۶

— عاد کا تقلید آبائی پر اصرار ۴۵

— ثمود کا اصرار ۳۵۱

— قوم شعیب کا اصرار ۳۶۰

— قوم فرعون کا اصرار ۳۰۳

— مشرکین عرب کا اصرار ۲۰

— اندھی تقلید اہم ترین اسباب ضلالت میں سے ہے ۳۶۹-۳۷۰

تقویٰ - اس کے معنی ۴۲-۴۴-۹۵

— تقویٰ صرف خدا سے ہونا چاہیے ۵۲۵-۵۴۶

— تقویٰ کی جڑ ایمان کے بغیر قائم نہیں ہوتی ۸۴

— ہدایت حاصل کرنے کے لیے تقویٰ ضروری شرط ہے ۲۶۴-۲۶۵

— ہر اس زندگی کا انجام تباہی ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو ۲۳۴

— تقویٰ کے تقاضے ۱۲۸-۱۵۲-۱۷۶-۱۹۳-۲۴۹-۲۵۳-۲۸۲-۴۱۴

— متقین کی صفات اور ان کا طرز عمل ۱۱۰ تا ۱۱۳-۱۵۹-۱۷۸-۱۹۷

— تمام متقی اہل ایمان اللہ کے ولی ہیں ۲۹۵

— اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۱۷۶-۱۷۸

— اللہ متقین کے ساتھ ہے ۱۹۲-۲۵۲-۵۸۲

— متقی لوگ ہی اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں ۸۴

— متقین کے لیے دنیا میں بھی بھلائی ہے ۵۳۷

— لباس تقویٰ کی تعریف ۱۹-۲۰

— تقویٰ کا انجام نیک ۲۵-۴۲-۶۰-۷۱-۹۳-۱۳۰-۲۹۵-۳۴۵-۴۲۸-۴۳۷-۴۶۳-۵۰۸-۵۳۷-۵۳۸

— متقین کی روحوں کا استقبال عالم برزخ میں کس

طرح ہوتا ہے ۵۳۸

تکبر-اس کی مذمت اور ممانعت ۶۱۶-۶۱۷

— بندے کو تکبر کا حق نہیں ہے ۱۲-۷۸-۷۹

— تکبر و استکبار کی حقیقت ۳۰۱

— اللہ متکبرین کو پسند نہیں کرتا ۵۳۴

— تکبر کے نتائج ۱۲-۲۵-۳۰-۷۳-۷۸-۱۱۵-۵۳۶

تلمود - ۵۱- ۳۰۵- ۳۰۹- ۳۸۱- ۳۸۳- ۳۹۰-۳۹۱- ۴۰۰- ۴۰۵- ۴۰۶- ۴۱۱-۴۱۲- ۴۲۴-۴۳۱-۴۳۲-۵۱۲-۵۱۳

— قرآن اور تلمود کے اختلافات ۳۸۵- ۳۸۷- ۳۸۸- ۳۸۹- ۳۹۰- ۳۹۶- ۳۹۷- ۴۰۲- ۴۰۷-۴۳۴

تناسخ-اس کی تردید ۲۸

توبہ-وہ ایمان کے ساتھ ہی نافع ہوتی ہے ۸۲

— اس کی حقیقت ۲۳۹

— آثار موت طاری ہو جانے کے بعد اس کا موقع نہیں رہتا ۵۶۲

— کیسے لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے ۲۲۹- ۲۳۰- ۲۴۴-۵۷۹

— اللہ کو اپنے گناہ گار بندے کی توبہ کس قدر محبوب ہے ۳۶۳-۳۶۴

— شرمسار مومن کی توبہ کس شان سے قبول کی جاتی ہے ۲۴۵-۲۴۹

— توبہ کو موثر بنانے کا طریقہ ۲۳۱

— توبہ و استغفار کے نتائج ۳۲۲- ۳۴۵- ۳۴۶- ۵۷۹

توحید-اس کی تشریح اور اس کی حقیقت ۱۸۹- ۱۹۰- ۲۶۲- ۲۸۴- ۳۱۵ تا ۳۱۸- ۴۰۱- ۴۰۲- ۵۲۵- ۶۰۸-۶۰۹

— اس کے دلائل ۸-۲۶-۳۶-۳۷-۹۵ تا ۹۹-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴- ۲۹۷- ۳۲۸- ۳۴۹- ۴۰۱ تا ۴۰۳- ۴۴۱- ۴۴۲- ۴۴۳- ۴۴۵- ۴۴۹ تا ۴۵۲- ۵۰۳- ۵۲۵- ۵۲۶- ۵۳۱-۵۳۲- ۵۴۵ تا ۵۴۷-۵۵۳ تا ۵۵۶- ۶۱۸- ۶۳۰- ۶۳۱

— توحید کے دلائل ہی خدا کی ہستی کے دلائل بھی ہیں ۴۴۲

— اس بات کا ثبوت کہ توحید کا اعتقاد انسان کی فطرت میں مضمر ہے ۹۷- ۹۹- ۸- ۲۷۸- ۶۲۳- ۶۳۱

— عقیدۂ توحید کے تقاضے ۳۸- ۳۹- ۱۸۹- ۱۹۰- ۲۶۲- ۲۶۳- ۳۱۵ تا ۳۱۸- ۴۰۲- ۴۵۰- ۴۸۳- ۵۲۵- ۵۳۶- ۵۴۷- ۵۵۶- ۶۰۸

تورات-وہ بنی اسرائیل کا قرآن تھی ۵۱۸

— حضرت موسیٰ کو عطا کی گئی تھی ۵۹۰

— اس کے احکام جو پتھر کی تختیوں پر لکھ کر دیے گئے ۷۸

— اس کی تعریف ۸۲

— حضرت عزیر نے اس کو از سر نو مرتب کیا ۵۹۹

— اس میں فلسطین کی قوموں کو مٹا دینے کا حکم ۵۹۶

— اس کے ساتھ یہودیوں کا سلوک ۵۱۸

— اس میں یہودیوں کی تحریفات ۲۳۸-۲۳۹

— اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ۸۵

— قرآن کا اس سے استشہاد ۹۴

توکل-اس کی حقیقت ۳۴۰

— اس کے عملی اثرات ۳۸۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— دنیوی اسباب اور تدابیر سے کام لینا توکل کے خلاف نہیں ہے ۴۰۵
— تدبیر اور توکل کا صحیح تعلق ۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸
— توکل کا وسیع مفہوم ۶۳۰
— اللہ پر توکل ایمان کا تقاضا ہے ۱۳۰-۳۰۶
— وہ ایک زبردست طاقت پر توکل ہے ۱۵۰
— وہ کبھی غلط ثابت نہ ہوگا ۶۳۰
— وہ عزم کی مضبوطی کا ذریعہ ہے ۵۷-۱۵۷-۳۰۰-۳۶۲-۴۶۰
— وہ مصائب میں ہراس اور بے اطمینانی سے بچاتا ہے ۲۰۰-۳۷۵-۳۸۹-۴۷۷
— وہ دلیری پیدا کرتا ہے ۱۵۶-۳۰۶-۳۴۷
— وہ استغنا پیدا کرتا ہے ۲۵۵
— وہ آدمی کو شیطان کے فتنوں سے محفوظ رکھتا ہے ۵۷۱

ث

ثمود- ۲۱۳-۳۶۵-۴۷۵
— عاد کے بعد زمین میں خلیفہ بنائے جاتے ہیں ۴۹
— ان کی تاریخ، علاقہ، اور آثار قدیمہ ۴۷-۴۸-۴۹-۵۱۵-۵۱۶
— ان کا دارالسلطنت حجر ۵۱۵
— حضرت صالح کی دعوت کے مقابلہ میں ان کا طرز عمل اور انجام ۴۷ تا ۵۰-۳۴۹ تا ۳۵۳-۵۱۵-۵۱۶-۶۲۶

ج

جادو- اس کی حقیقت ۶۸
— معجزے اور جادو کا فرق ۶۸-۶۹-۷۲-۶۴۸
— نبی اور جادوگر کا فرق ۳۰۳
— کیا ایک نبی پر جادو ہو سکتا ہے ۶۴۷-۶۴۸

جبر وقدر- (دیکھو "تقدیر")

جبریل- ان کا لقب "روح القدس" ۵۷۲
— قرآن لانے والے ۵۷۲

جزا و سزا:
— خدا کے قانون مکافات کی دلیلیں انسانی تاریخ میں ۳۶۷-۳۶۸
— ہر شخص کی جزا اس کے عمل کے مطابق ۷۹-۱۰۳-۱۵۰-۲۹۱-۴۹۳
— ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا بدلہ دیا جائے گا ۳۷۰
— اللہ کی نافرمانی کر کے کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی سزا سے نہیں بچ سکتی ۲۷۲
— نیکیوں کی جزا دینے میں اللہ کا قانون بدی کی سزا سے مختلف ہے ۲۵۰-۲۸۰-۵۷۰
— اطاعت شعار مومن کا حساب دنیا ہی میں تکلیفیں ڈال کر صاف کر دیا جاتا ہے ۴۵۴
— جزائے عمل ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ ہوگی ۲۹۰-۲۹۲
— خدا کا بے لاگ انصاف ۵۳-۳۲۱-۳۴۰ تا ۳۴۵-۳۵۶-۳۵۸-۵۱۱-۶۰۵

جن- ۲۶-۱۰۲-۱۰۴-۳۷۴-۶۴۱
— جنوں کا مادۂ تخلیق ۵۰۴

جنت
— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۳۰-۱۸۴-۲۱۴-۲۲۲-۲۲۸-۲۳۵-۲۶۸-۲۸۰-۳۳۲-۳۶۹-۴۵۶-۴۵۷-۴۶۳-۴۸۳-۵۰۸-۵۳۷-۵۳۸
— اس کی کیفیت ۳۰-۱۸۴-۲۱۴-۲۲۸-۲۶۸-

۲۸۰-۳۶۹-۴۵۷-۴۶۳-۴۸۳-۵۰۸-
۵۰۹-۵۲۷-۵۳۸
— اس کا دوام ۳۰-۱۸۴-۲۱۴-۲۲۲-۲۲۸-
۲۸۰-۳۳۲-۳۶۹-۴۵۷-۵۲۷
— انسان اپنے عمل نیک کی بدولت اسے پائے گا ۳۱
— اہل جنت پر خدا کی مہربانیاں ۳۱-۳۳
— اہل جنت کے اخلاق ۳۱-۲۶۹
— وہاں داخل ہونے سے پہلے دنیوی زندگی کے سب داغ دھودیے جائیں گے ۳۱
— اہل جنت کے دلوں سے باہمی کدورتیں نکال دی جائیں گی ۳۰-۵۰۹
— کون لوگ جنت میں داخل نہیں ہوسکتے ۳۰-۱۷۴
— اس کی نعمتیں کافروں کے لیے حرام ہیں ۳۳
— اہل جنت اور اہل دوزخ کی باہمی گفتگو ۳۳
— وہاں آدم وحوا کا قیام اور امتحان ۱۴ تا ۱۷

جنگ - (دیکھو "جہاد" اور "قتال فی سبیل اللہ")

جنگ بدر:

— اس کے اسباب ۱۲۲-۱۲۳
— اس کی اہمیت ۱۲۴-۱۳۲-۱۳۶
— کفار کن ارادوں کے ساتھ آئے تھے ۱۲۴-۱۳۶-۱۴۹
— کس شان کے ساتھ آئے تھے ۱۴۸-۱۴۹
— ان کے لشکر کی تعداد ۱۲۳
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے لیے نکلنے کا فیصلہ کن حالات میں کیا تھا ۱۲۴
— آپ کا مقصد جنگ ۱۲۶
— اللہ کے پیش نظر کیا مقصد تھا ۱۳۲-۱۴۶
— جنگ کے لیے نکلتے وقت مسلمانوں کی کیفیت ۱۳۱-۱۴۶
— ان کی تعداد ۱۲۵
— جنگ کی تیاری ۱۲۴
— جنگ کی ابتدا کس طرح ہوئی (مغازی کی روایات اور قرآن کے بیان کا اختلاف) ۱۳۱
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ۱۲۶
— کفار کے ساتھ شیطان تھا، مگر خدا کا عذاب دیکھ کر بھاگ گیا ۱۴۹-۱۵۰
— مسلمانوں کی مدد خدا نے کس کس طرح کی ۱۳۲-۱۳۳-۱۴۷
— اہل ایمان کی آزمائش ۱۳۵
— مہاجرین و انصار کی جاں نثاری ۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۳۲۱
— منافقین کا رویہ ۱۲۶-۱۵۰-۱۵۲
— مدینے کے یہودیوں کا طرز عمل ۱۵۲
— قریش کی طاقت پر پہلی کاری ضرب ۱۲۷
— قریش کی شکست ان کے خلاف اللہ کا فیصلہ تھی ۱۳۶-۱۴۶
— وہ ان کے حق میں خدا کا عذاب تھی ۱۴۳
— مقتول کافروں کا انجام ۱۵۰
— مال غنیمت کی تقسیم پر مسلمانوں میں اختلاف اور اس کا فیصلہ ۱۲۸-۱۴۶
— مسلمانوں کی ایک غلطی جس پر عتاب فرمایا گیا ۱۵۹-۱۶۰
— جنگ کے اثرات ونتائج ۱۲۷
— جنگ پر قرآن کا تبصرہ ۱۲۷
— اسیران جنگ سے خطاب ۱۶۰

جنگ تبوک

— اس کے اسباب ۱۶۸-۱۶۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کی اہمیت ۱٦۹-۱۷۰-۱۹۵

— اس کے حالات ۱٦٦ تا ۱۷۱

— اس کے اثرات عرب کی سیاست پر ۱٦۸ تا ۱۷۱

— اس کا فیصلہ کن حالات میں کیا گیا ۱٦۹-۱۷۰-۱۹٦

— وہ خطبہ جو جنگ پر ابھارنے کے لیے نازل ہوا ۱۹۳

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیرانہ پالیسی ۱٦۸-۱٦۹-۱۷۰

— ان سچے مسلمانوں کی کیفیت جو جنگ پر نہ جا سکے ۲۲۳-۲۲۴

— منافقین کا رویہ ۱٦۹-۱۷۰-۱۹٦-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۱۰-۲۱٦-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۲-۲۲۴-۲۲۵-۲۳۱ تا ۲۳۴

— مسجد ضرار اور ابو عامر راہب کی سرگرمیاں ۱٦۹-۱۷۰-۲۳۱ تا ۲۳۴

— اطراف مدینہ کے بدوؤں کی روش ۲۲٦-۲۲۷

— لڑائی نہ ہونے کی اصل وجہ ۱۷۱

— اس موقع پر اسلامی معاشرے کی کیا کمزوریاں ظہور میں آئیں اور انھیں دور کرنے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں ۲۵۱

— وہ خطبہ وہ جنگ کے بعد نازل ہوا ۲۱۵

— جنگ سے پیچھے ٹھیر جانے والوں پر عتاب ۲۱۹-۲۲۰

— ان اہل ایمان کا معاملہ جو نفس کی کمزوری کے سبب سے جنگ میں نہ گئے ۲۹۹ تا ۲۳۱-۲۴۲ تا ۲۴٦

— جنگ سے واپسی پر ان لوگوں سے باز پرس جو پیچھے رہ گئے تھے ۲۴۴

— منافقین سے باز پرس ۲۴۴

— قصوروار مومنوں سے باز پرس ۲۴۴

— حضرت کعب بن مالک کا سبق آموز واقعہ ۲۴۵ تا ۲۴۹

جنگ حنین:

— آخری معرکہ جس میں کفار عرب کی طاقت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی ۱٦۷

— اس میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست کے اسباب ۱۸۵-۱۸٦

— اس میں اللہ نے کس طرح مسلمانوں کی مدد کی ۱۸۵-۱۸٦

— اس کے اثرات اسلام کی اشاعت پر ۱۸٦

جنگ موتہ - اس کے اثرات ونتائج ۱٦۸-۱۷۱

جہاد فی سبیل اللہ:

— جہاد کے معنی ۲۱۵

— ''جہاد فی سبیل اللہ'' کیا ہے ۲۰۸

— جہاد اور قتال کا فرق ۲۰۸

— اسلام میں اس کی اہمیت ۱۷۳-۱۸۱-۱۸۵-۲۴۹

— ایمان کی کسوٹی ۱۹۷-۲۰۲-۲۲۱ تا ۲۲۴-۲۳۰-۲۳۸-۲۴۷

— اس کی فضیلت ۱۸۳-۱۸۴-۲۴۹

— اس کا اجر ۲۴۹-۲۵۰-۵۷٦

— اسی میں اہل ایمان کی بھلائی ہے ۱۹٦

— اس سے جی چرانے والے منافق ہیں ۲۱۹-۲۲۰

— مجاہدین کی مدد کے لیے مال زکوٰۃ کا استعمال ۲۰۸

— منافقین اور کفار کے خلاف جہاد کا مطلب ۲۱۵

جہالت:

— قرآن کی نگاہ میں ''جہالت'' کیا ہے ۷۵-۲۴۳-۴۲۷-۴٦۹

جہنم - کیسے لوگوں کے لیے ہے ۱۴-۲۵-۲٦-۳۰-۱۰۲-۱۳۴-۱۳۵-۱۴۴-۱۵۰-۱۸۲-۱۹۱-۱۹۹-۲۰۹-۲۱۲-۲۱٦-۲۱۹-۲۲۵-۲۳۴-۲۴۱-۲٦٦-۲۸۰-۳۲۹-۳۳۱-

-۳۶۸-۴۴۶-۴۵۴-۴۶۳-۴۷۸-۴۸۷-
-۴۹۳-۵۰۷-۵۳۶-۵۴۹-۶۰۲-۶۰۷-
۶۱۷-۶۳۸-۶۴۵

— اس کی کیفیت ۲۱۹-۲۶۳-۲۸۰-۳۶۸-
۴۴۶-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۷-۴۹۳-۵۰۸-
۶۲۸

— اس کا دوام ۳۵-۱۸۲-۲۰۹-۲۱۲-۲۸۰-
۳۶۹-۴۴۶-۵۳۶

— اس کی طرف جانے کے سات راستے ۵۰۸

— وہ جنوں اور انسانوں سے بھری جائے گی ۳۷۴

— ہر گمراہ گروہ کے پیشوا ہی اس کو قیامت کے روز جہنم کی طرف لے جائیں گے ۳۶۶

— اہل دوزخ کی ایک دوسرے سے لڑائی ۲۶

— اہل جنت اور اہل دوزخ کی باہم گفتگو ۳۳

— اس کا وہ درخت جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے ۶۲۷-۶۲۸

ح

حبط اعمال

— حبط عمل کے معنی ۷۹

— اس کے وجوہ ۷۹-۳۲۹-۴۷۹-۴۸۰

— کیسے لوگوں کے اعمال ضائع ہوتے ہیں ۷۹-
۱۸۲-۲۱۲-۳۲۹-۴۷۹

حج - اس کے قدیم طریقوں کی اصلاح ۱۷۴-۱۹۴

— یوم الحج الاکبر سے کیا مراد ہے ۱۷۵

— حجۃ الوداع (دیکھو "محمد صلی اللہ علیہ وسلم")

حجر:

— ثمود کا دارالسلطنت ۵۱۵

حدود اللہ:

— ان سے ناواقفیت آدمی کو منافقت اور جاہلیت میں مبتلا کرتی ہے ۲۲۶

— ان کی حفاظت اہل ایمان کی خصوصیت ہے ۲۴۰

— حدود اللہ اور ان کی حفاظت کا وسیع مفہوم ۲۴۰-
۲۴۱

حساب - (دیکھو "آخرت")

حشر - اس کے معنی ۴۹۳

— وہ اسی زمین پر ہوگا ۴۹۳

— اس میں تمام اگلی پچھلی نسلوں کو اکٹھا کیا جائے گا ۵۰۳

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "آخرت" اور "قیامت")

حق - تشریح ۴۸۴

— اللہ نے نظام کائنات کو حق پر پیدا کیا ہے ۲۶۴-
۴۷۹-۴۸۰-۵۱۶-۵۲۵-۵۲۶

— حق کی طرف رہنمائی صرف اللہ ہی کرسکتا ہے ۴۸۴

— حق کا اختیار کرنا آدمی کے لیے مفید اور رد کرنا اسی کے لیے نقصان دہ ہے ۳۱۸

— علم حق رکھنے والے اور اس سے غافل رہنے والے یکساں نہیں ہوسکتے ۴۵۵

— حق کو قبول نہ کرنے کے نتائج ۴۵۴

— اللہ حق کو حق ثابت کرکے ہی رہتا ہے ۳۰۴

— حق آخر کار غالب ہی ہو کر رہتا ہے ۴۵۳

حقوق العباد:

— والدین کے حقوق ۶۰۹-۶۱۰

— اولاد اور نسل کے حقوق ۶۱۲

— رشتہ داروں کے حقوق ۵۱۵-۵۶۶-۶۱۰

— یتیموں کے حقوق ۶۱۵

— مساکین کے حقوق ۲۰۵-۶۱۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— مسافروں کے حقوق ۲۰۸-۲۱۰
— اجتماعی و معاشرتی حقوق کا وسیع تصور ۶۱۱

حکمت تبلیغ - ۵- ۱۰۰- ۱۱۰ تا ۱۱۴- ۲۸۲- ۳۷۱- ۴۰۳- ۴۰۴- ۴۳۵- ۵۸۱- ۵۸۲- ۶۲۳- ۶۲۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''دعوت حق'')

حکمت تشریع
— نئے احکام جاری کرنے سے پہلے مناسب ماحول پیدا کرنا ضروری ہے ۴۲۳
— اجرائے احکام میں تدریج ۴۲۳
— نماز کے اوقات میں کیا حکمتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں ۶۳۶
— اسلام میں عبادات کے لیے قمری تاریخیں کیوں اختیار کی گئی ہیں ۱۹۳

حلال و حرام
— انسان کو خود حلال و حرام کے حدود مقرر کر لینے کا حق نہیں ہے ۲۹۲ تا ۲۹۴- ۵۷۷- ۵۷۸
— کیا چیزیں حرام کی گئی ہیں ۵۷۷
— حرام چیز کن حالات میں کن شرائط کے تحت کھائی جا سکتی ہے ۵۷۸

حمد - اس کے معنی ۴۹۹
— زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی حمد کر رہی ہے ۶۱۹
— بے جان مخلوق کس طرح اللہ کی حمد کرتی ہے ۴۴۹

حنیف - معنی اور تشریح ۳۱۶

حوا - قرآن اس کی تردید کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو بہکانے میں وہ شیطان کی ایجنٹ بنیں ۱۶

حیات بعد الموت - (دیکھو ''زندگی بعد موت'')

حیات دنیا (دیکھو ''دنیا'')

خ

خسران - کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹- ۳۵- ۵۸- ۶۱- ۸۰- ۱۰۲- ۱۴۴- ۲۱۲- ۲۸۹- ۳۱۱- ۳۳۲- ۳۵۲- ۵۷۶- ۶۳۹

خلافت:
— انسان کو زمین پر خلافت دینے سے پہلے حلف وفاداری لیا گیا ۹۶-۹۷
— خلافت بغرض امتحان و آزمائش دی جاتی ہے ۲۷۱-۷۲
— قوم نوح کے بعد عاد خلیفہ بنائے گئے ۴۵
— عاد کو دھمکی دی گئی کہ خدا تمھاری جگہ دوسروں کو خلیفہ بنائے گا ۳۴۸
— عاد کے بعد ثمود خلیفہ بنائے گئے ۴۹
— بنی اسرائیل کو خلافت دینے کا وعدہ ۲۷

د

داود علیہ السلام
— ان کا زمانہ اور مدت سلطنت ۵۹۷
— ان کی سیرت ۶۲۴
— ان کو زبور دی گئی ۶۲۴

دعا - غیر اللہ سے دعا اور استمداد شرک ہے ۶۲۵
— صرف اللہ ہی سے دعا مانگنا برحق ہے ۴۵۰
— دوسروں سے دعا مانگنا باطل ہے ۱۰۹- ۱۱۰- ۴۵۰
— اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنے کا برا انجام ۲۶
— مشرکین کے غیر اللہ سے دعا مانگنے کی اصل وجہ ۳۴۹-۳۵۰
— غیر اللہ سے دعا مانگنا وہ برائی ہے جسے مٹانے کے لیے انبیا آئے ۳۸
— اللہ سے دعا مانگنے کی لازمی شرطیں ۲۱
— اللہ کو کس طرح پکارنا چاہیے ۳۷-۳۸

— اللہ اپنے ہر بندے سے قریب ہے اور دعاؤں کا جواب دیتا ہے ۳۴۹
— دعا کا قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے ۲۶۲
— نبی تک کی دعا رد کر دی جاتی ہے ۳۴۲
(نیز دیکھو "قرآنی دعائیں")

دعوت حق - اس کا صحیح طریقہ (دیکھو "حکمت تبلیغ")
— اس کی کامیابی سروسامان پر منحصر نہیں ہے ۶۳-۳۸۱-۴۱۳
— اللہ اس کے ساتھ ہے ۴۶۵-۴۶۶
— اس کے مقابلے میں مخالفوں کی چالیں کامیاب نہیں ہو سکتیں ۴۶۶
— اس کے خلاف چالبازیاں کرنے والے آخر کار عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر رہتے ہیں ۵۳۴
— آخری کامیابی اسی کے لیے ہے ۴۶۶
— اس کا ظہور جاہلی سوسائٹی میں کس طرح کھلبلی ڈالتا ہے ۳۵۱-۴۷۵
— اس کے نازک مراحل ۳۰۶-۳۰۷
— اس کے راستے کی رکاوٹیں ۳۰۸
— اس میں صبر کی اہمیت ۳۰۹-۳۱۸-۳۲۶-۳۲۷-۳۷۰-۳۷۱-۵۱۶-۵۸۷-۶۰۳
— اس میں سمجھ بوجھ اور صحیح طرز فکر کی اہمیت ۳۰۹
— اس میں نماز کی اہمیت ۳۷۱-۵۱۹-۵۸۷
— اس میں نماز باجماعت کی اہمیت ۳۰۷
— وہ چیزیں جن سے داعی حق کو طاقت ملتی ہے ۵۱۹
— داعی حق کو کسی کی پروا کیے بغیر حق کا اظہار و اعلان کرنا چاہیے ۵۱۸
— اس کو دین میں مصالحت و مداہنت پر آمادہ نہ ہونا چاہیے ۳۷۱-۵۸۷-۶۳۳
— اس کو لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرنا چاہیے ۴۶۴
— اس کو جاہلی قوانین کی پیروی سے اجتناب کرنا چاہیے ۴۲۳
— اس کو دنیا پرستوں کی شان و شوکت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا چاہیے ۵۱۷
— اس کو اختلافات سے نہ گھبرانا چاہیے ۳۷۱-۶۰۴
— اس کو مخالفین کی بیہودگیوں کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے ۵۱۶
— اس کو نیکی کے ذریعے سے برائیوں کو دفع کرنا چاہیے ۳۷۱
— اسے اس بات کی فکر نہ ہونی چاہیے کہ خدا اس کے مخالفین کو دنیا میں کیا سزا دیتا ہے ۴۶۵

دنیا - دارالامتحان ۲۷-۲۷۱-۲۷۶-۳۲۴
— دنیوی زندگی دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے لیے انسان کو دیا گیا ہے ۱۵۹
— حیات دنیا کی حقیقت ۲۷۹-۵۰۳
— آخرت کے مقابلے میں اس کی بے حقیقتی ۱۹۴-۲۸۹-۴۵۸-۵۶۹
— دنیوی زندگی میں آدمی کا امتحان کس طرح لیا جا رہا ہے ۲۶۵
— غافل انسان دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو سے کس طرح دھوکا کھاتے ہیں ۳۳۸-۳۳۹
— دنیوی نعمتوں کی دو قسمیں: متاع غرور اور متاع حسن ۳۲۲
— دنیوی نعمتوں کو نادان لوگ ہمیشہ سے مقبول بارگاہ خداوندی ہونے کی علامت سمجھتے رہے ہیں ۳۳۴
— دنیوی نعمتیں اس بات کی علامت نہیں ہیں کہ نعمت پانے والا اللہ کا محبوب ہے ۲۰۲-۲۱۲-۲۲۱-۲۷۵-۳۲۲-۴۵۷-۴۵۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— گمراہ لوگوں کا ہمیشہ یہ نظریہ رہا ہے کہ ایمان داری اور راست بازی اختیار کرنے سے آدمی کی دنیا برباد ہو جاتی ہے ۵۷-۳۳۲
— اس خیال کی غلطی ۳۴۶-۵۷۰
— دنیوی کامیابیوں کا نام قرآن کی زبان میں ''فلاح'' نہیں ہے ۲۷۴
— جو شخص محض دنیا چاہتا ہو اس کے لیے آخرت میں جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے ۳۲۹-۶۰۷
— دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے لازماً ہدایت سے محروم رہتے ہیں ۵۷۵
— دنیا کی زندگی سے دھوکا کھانے کا برا انجام ۳۴
— آخرت سے بے پروا ہو کر دنیا کی زندگی پر مطمئن ہونے کا انجام ۲۶۶
— دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا انجام ۱۹۴-۴۷۰-۵۷۵
— دنیا میں کافروں اور ظالموں کو خدا کی نعمتیں کیوں ملتی ہیں ۲۳
دوزخ-(دیکھو ''جہنم'')
دہریت-اس کی تردید کے لیے توحید کے دلائل ہی کافی ہیں ۴۴۲-۴۴۵
دین-معنی اور تشریح ۱۹۰-۱۹۲-۲۸۴
— جس کا قانون ملک میں رائج ہو اسی کا دین ملک کا دین ہے ۴۲۰-۴۲۱
— ان لوگوں کے خیال کی غلطی جو ''دین'' کو صرف پوجا پاٹ اور ''مذہبی مراسم'' میں محدود سمجھتے ہیں ۴۲۲
— اللہ کا دین ہی ساری کائنات کے نظام کا دین ہے ۵۴۶
— اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب ۲۱-۴۷۸
— دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہونا چاہیے ۱۴۴
— دین حق کو پورے ''الدین'' پر غالب کرنے کا مطلب ۱۹۰
— ان لوگوں کے خیال کی غلطی جو کافرانہ قوانین کی پیروی کے لیے حضرت یوسفؑ کے اسوہ سے دلیل لاتے ہیں ۴۲۲
— دین کو کھیل اور تفریح بنا لینے کا برا انجام ۳۴
دین حق (دیکھو ''اسلام'')

ذ

ذکر (بمعنی قرآن) ۴۳۵-۴۹۸-۵۴۳
ذکر (بمعنی کتاب الٰہی) ۴۲-۴۵-۴۹۸-۵۴۳
ذکر (بمعنی یاد الٰہی) اس کے معنی ۱۱۵
— اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا حکم ۱۴۸
— اللہ کا ذکر کس طرح کیا جائے ۱۱۴-۱۱۵
— ذکر الٰہی کے اثرات انسانی قلوب پر ۴۵۹
ذکر (بمعنی یاد دہانی) ۶-۹۹

ر

رب:
— اللہ ہی تمام کائنات کا رب ہے ۳۷-۴۲-۴۵-۶۴-۶۹-۲۸۵-۴۵۱-۶۴۷
— وہی انسان کا رب ہے ۳۶-۲۶۱-۲۶۳-۲۸۱-۲۸۲-۳۳۶-۳۴۷-۴۵۹
— کسی کو قانون ساز مان کر اس کے امر و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کرنا دراصل اس کو رب بنانا ہے ۱۹-۱۹۸
— کسی کو بادشاہ اور ملک کا مختار مطلق تسلیم کرنا اسے رب ماننا ہے ۴۰۲-۴۰۴-۴۰۷
رحمت
— نظام عالم اللہ کی رحمت پر قائم ہے ۸۴
— رحمت بمعنی بارش ۳۹
— علم حق اللہ کی رحمت ہے ۳۳۴-۳۵۱

— نبوت اللہ کی رحمت ہے ٦٤١
— اختلاف سے بچ جانا اللہ کی رحمت ہے ٣٧٣
— گناہ سے بچ جانا اللہ کی رحمت ہے ٤١٠
— اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا صرف کافروں اور گمراہوں کا کام ہے ٤٢٧-٥١٠
— اللہ کی رحمت کیسے لوگوں کے لیے ہے ٣٨-٤٢-٨٤-١٨٤-٢١٤-٢٢٧-٣٥٥-٣٦٥
— اس کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ ١١٤

رزق- اس کا وسیع مفہوم ٢٩٢-٢٩٣-٣٦١
— رزق کی تقسیم کا خدائی انتظام ٦١٢
— رزق کی کمی و بیشی اخلاق کے حسن و قبح پر مبنی نہیں ہوتی ٤٥٧-٤٥٨
— ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے ٣٢٣
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "اللہ"، "تقدیر" اور "دنیا")

رسالت- (دیکھو "نبوت")

رسول- (بمعنی فرشتہ کے لیے دیکھو "فرشتہ")

روح- بمعنی وحی ٥٢٤-٥٢٥-٦٣٩-٦٤٠
— (روح انسانی کے لیے دیکھو "انسان")

روح القدس- ٥٧٢

رہبانیت: کوئی رہبانی مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا ٢٣
— اسلام میں رہبانیت نہیں ہے ٢٢

ز

زبور- ٦٢٤

زکوٰۃ- ١٨٣-٢١٣-٤٥٦
— شکر نعمت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ آدمی راہ خدا میں مال صرف کرے ٤٨٧
— اللہ کی رحمت کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو زکوٰۃ دیں ٨٤
— وہ ہمیشہ دین الٰہی کے ارکان میں شامل رہی ہے ٨٤
— وہ اللہ ہی کو پہنچتی ہے ٢٢٩
— اللہ صدقہ دینے والوں کو جزا دیتا ہے ٤٢٧
— وہ ایک ذریعہ ہے تزکیۂ نفس کا ٢٢٩
— وہ ایک ذریعہ ہے توبہ کو موثر بنانے کا ٢٣١
— اس کی اہمیت اسلام کے دستوری قانون میں ١٧٩
— اس کی اہمیت اسلام کے جنگی قانون میں ١٧٧
— مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کی دلیل ١٧٧
— وہ انقلاب عظیم جو زکوٰۃ کی تنظیم نے عرب کی زندگی میں برپا کیا ٢٠٤
— زکوٰۃ کی تحصیل اسلامی حکومت کے ذمے ہے ٢٢٩
— مستحقین زکوٰۃ ٢٠٥ تا ٢٠٨
— بنی ہاشم پر زکوٰۃ لینا حرام ہے ٢٠٥
— کیا بنی ہاشم خود آپس میں ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟ ٢٠٦
— فقیر اور مسکین کی تشریح ٢٠٥
— کیا مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو چکا ہے؟ ٢٠٦-٢٠٧
— غلاموں کی آزادی کے لیے مال زکوٰۃ کا استعمال ٢٠٧
— قرض داروں کی مدد کے لیے اس کا استعمال ٢٠٧
— "فی سبیل اللہ" کی تشریح ٢٠٨
— مسافر نوازی کے لیے زکوٰۃ کا استعمال ٢٠٨

زلیخا- اس سے حضرت یوسفؑ کی شادی کی غلط روایت ٣٩١-٤٢٤

زنا- اس کی ممانعت اور معاشرے کو اس کے اسباب و محرکات سے پاک رکھنے کا حکم ٦١٣

Maktaba Tul Ishaat.com

زندگی بعد موت - ۱۸-۲۱-۵۳۳

— یہ ایک وعدہ ہے جسے اللہ پورا کر کے رہے گا ۵۴۱

— اس کے منکر کافر ہیں ۳۲۵

— وہ محض روحانی نہیں بلکہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی ہماری موجودہ زندگی ہے ۴۹۳-۶۲۲-۶۴۶

— قیامت کے روز مردوں کے جی اٹھنے کی کیفیت ۵۳۷-۶۲۲

— اس کی عقلی و اخلاقی ضرورت ۵۴۱

— اس کے امکان اور وقوع کے دلائل ۳۹-۲۶۳-۲۶۴-۵۰۴-۵۴۲-۵۵۰-۵۵۳-۶۳۲-۶۴۶

— موت اور قیامت کے درمیان برزخی زندگی کی کیفیت ۵۳۵ تا ۵۳۸

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''حشر''، ''قیامت'')

س

الساعہ (قیامت یا فیصلہ کی گھڑی) ۱۰۵-۴۳۶-۵۱۶-۵۵۸

سبت - یہودی شریعت میں اس کا قانون ۹۰-۵۸۱

— بنی اسرائیل کی سبت شکنی اور اس کی سزا ۹۱-۹۲

— احکام سبت کے معاملے میں شریعت محمدیہ اور یہودی شریعت کے درمیان فرق کیوں ہے ۵۷۹ تا ۵۸۱

سبع مثانی - ۵۱۷

سجدہ:

— اصطلاحی سجدے اور لغوی سجدے کا فرق ۴۳۲

— اس خیال کی غلطی کہ پچھلی شریعتوں میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز تھا ۴۳۱-۴۳۲

— زمین و آسمان کی ہر چیز کا خدا کو سجدہ کرنا ۴۵۱-۵۴۵

— قرآن میں کتنے سجدے ہیں ۱۱۵

— سجدۂ تلاوت، اس کی حکمت اور اس کے احکام ۱۱۵-۱۱۶

سحر - (دیکھو ''جادو'')

سلیمان علیہ السلام:

— ان کا زمانہ اور مدت سلطنت ۵۹۷

— ان کا بحری بیڑا ۸۹

— ان کے بعد سلطنت کی ابتری ۵۹۷-۵۹۸

ش

شراب - اس کی حرمت سے متعلق ابتدائی اشارات ۵۵۱

شرک:

— اس کی حقیقت اور تشریح ۱۰۷ تا ۱۱۰-۱۸۹-۱۹۰-۲۷۵-۲۷۶-۳۱۷-۴۸۷-۵۱۸-۵۵۶-۵۵۸-۶۲۵

— صرف پتھر کے بت پوجنا ہی شرک نہیں ہے بلکہ اولیا اور انبیا کو مدد کے لیے پکارنا بھی شرک ہے ۵۳۳

— توسل اور شفاعت کے مشرکانہ تصورات ۲۷۵-۲۷۶-۵۵۶-۵۵۷-۵۶۲

— مذہب شرک کے تین اجزا ۱۰۹

— شرک خفی اور اس کے نقصانات ۳۱۷

— شرک کی ایک مستقل قسم، شرک عملی اور اس کی تشریح ۴۸۲-۴۸۳

— مشرکین کو خدائے واحد کا ذکر ہمیشہ ناگوار ہوتا ہے ۶۲۰

— مشرکین عرب کی ذہنیت ۶۲۱

— مشرکین عرب کا شرک کس نوعیت کا تھا ۱۰۷ تا ۱۱۰-۲۷۵-۲۷۶-۲۸۲-۳۱۶-۴۴۲-۴۵۱-۵۳۳-۵۴۶ تا ۵۴۸-۵۵۶-۶۲۱

— انسان کے مبتلائے شرک ہونے کے اسباب ۳۴۹-۳۵۰-۴۳۶

— نوع انسانی میں پروہتوں اور پادریوں کی پیدائش

کیسے ہوئی ۳۵۰

— شرک کے خلاف قرآن کے دلائل ۴۲-۸۰-
۱۰۲ تا ۱۱۰- ۲۷۵- ۲۷۶- ۲۷۸- ۲۷۹-
۲۸۲- ۲۸۳- ۲۸۴- ۲۹۶ تا ۲۹۹- ۳۱۶-
۳۱۷- ۳۲۸- ۳۴۹- ۳۵۰- ۳۶۶- ۳۶۹-
۴۰۱- ۴۰۴- ۴۳۷- ۴۵۰ تا ۴۵۲- ۴۶۱-
۴۶۲- ۵۲۴ تا ۵۲۶- ۵۳۱- ۵۳۲- ۵۳۹-
۵۴۰- ۵۴۶ تا ۵۴۸- ۵۵۳ تا ۵۵۸- ۶۱۷-
۶۱۸- ۶۲۵- ۶۳۰- ۶۳۱- ۶۳۳- ۶۵۱

— اس کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ۴۴-۴۶

— اس کی بنیاد محض قیاس و گمان پر ہے ۲۹۶

— اس کے حق میں کوئی دلیل و سند نہیں ۲۹۸

— وہ ایک جہالت ہے ۵۷

— وہ محض جھوٹ ہے ۳۴۵

— وہ سراسر باطل ہے ۵۷

— وہ ظلم ہے ۸۰-۸۱-۳۱۸-۴۸۳

— وہ مکر ہے ۴۶۲

— وہ اللہ کی ناشکری ہے ۴۰۱

— مشرکین محض اندھے مقلد ہیں ۲۸۵- ۳۵۱-
۳۶۹-۳۷۰

— ان کے معبودوں کو کچھ پتا نہیں کہ ان کی عبادت کی
جارہی ہے ۲۸۱

— ان کے معبود کبھی انھیں خدا کے عذاب سے نہ بچا
سکے ۳۶۶

— آخرت میں ان کے معبود خود انھیں جھوٹا قرار دیں
گے ۵۶۳

— آخرت میں ثابت ہو جائے گا کہ ان کے تمام
عقائد باطل تھے ۲۸۱-۳۶۸

— اس بات کا ثبوت کہ مشرکین کے اپنے تحت الشعور
میں شرک کا بطلان اور توحید کا اعتقاد موجود ہے
۲۷۸

— مشرکین کا سرپرست شیطان ہوتا ہے ۵۷۱

— ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے ۱۸۲

— شرک کے نتائج دنیا میں ۸۲-۱۸۲

— اس کے نتائج آخرت میں ۸۲-۱۸۲- ۴۸۷-
۵۳۵-۶۱۷

— مشرک کس معنی میں ناپاک ہیں ۱۸۶- ۱۸۷

— مشرک کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں ۲۴۱

— مساجد میں مشرکین کے داخلے کا مسئلہ ۱۸۷

شریعت- اس کا عطا کرنا اللہ کی مہربانی ہے ۲۹۴

— شرائع الہیہ میں تضاد نہیں ہے ۵۱۰

— اختلاف شرائع کے اسباب ۵۷۹

— شریعت میں بعض قیود بعض قوموں پر سزا کے طور
پر بھی عائد کی گئی ہیں ۵۷۸ تا ۵۸۱

— یہودی شریعت اور شریعت محمدیہ میں فرق کی وجہ
۵۸۰

شعیب، علیہ السلام:

— آپ کا قصہ ۵۴ تا ۵۸-۳۵۹ تا ۳۶۵

— آپ کی سیرت ۳۶۱-۳۶۲

— اپنی قوم میں آپ کی حیثیت ۳۶۴

— آپ ہی کی قوم کا نام اصحاب الایکہ تھا ۵۱۵

شفاعت:

— اس کا مشرکانہ عقیدہ اور اس کا ابطال ۲۷۵-
۲۷۶-۴۴۹-۵۵۶-۵۵۷-۵۶۲

— اسلامی عقیدۂ شفاعت ۲۶۲

— اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق ۳۵۶-
۳۶۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— اپنے بیٹے کے حق میں حضرت نوحؑ کی شفاعت رد کی گئی ۳۴۲

— قوم لوط کے حق میں حضرت ابراہیمؑ کی شفاعت قبول نہ ہوئی ۳۵۵

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اگر تم ستر دفعہ بھی منافقوں کے لیے دعائے مغفرت کرو گے تو اللہ انھیں معاف نہ کرے گا ۲۱۹

— آخرت میں مشرکین کا عقیدۂ شفاعت غلط ثابت ہو جائے گا ۳۵-۳۳۲-۳۶۸

شکر - اس کے معنی ۴۷۳

— اللہ کی نعمتوں کا فطری تقاضا ۱۰-۵۲۹

— اسلام میں اس کی اہمیت ۴۷۲

— شیطان انسان کو ناشکرا بنانا چاہتا ہے ۱۳

— شرک اللہ کی ناشکری ہے ۴۰۱

— شریعت الٰہی کو قبول نہ کرنا اور خود قانون ساز بننا اللہ کی ناشکری ہے ۲۹۴

— محسن کے احسان کا شکر دوسروں کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار ہے ۵۵۶-۵۶۱-۵۶۲-۶۳۱

— اللہ کی نعمتوں کا شکر دوسروں کو ادا کرنا ناشکری ہے ۵۴۷

— اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ ہے کہ ان سے صحیح کام لیا جائے ۵۵۹-۵۶۰

— اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ ہے کہ اللہ کی بندگی کی جائے ۴۸۷-۴۹۰

— اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ ہے کہ اس کی آیات سے سبق لیا جائے ۳۹

— اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ ہے کہ اس کی اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا جائے ۱۳۹

— اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ ہے کہ جو چیز

اللہ سے اس پر مطمئن رہا جائے ۷۸

— شکر کا انجام ۴۷۲

شہاب - وہ شعلہ جو شیطان کا پیچھا کرتا ہے ۵۰۱-۵۰۲

شہادت - (دیکھو "قانون اسلام")

شہد - اس کا انسان کے لیے شفا ہونا ۵۵۲

شیطان - اس کا مادۂ تخلیق ۱۲-۵۰۴

— اس کا تکبر ۱۲-۵۰۵

— اس کی خصوصیات ۱۹-۱۵۰

— خدا کا ناشکرا ۶۱۰

— اپنی گمراہی کے لیے خدا کو ملزم ٹھیراتا ہے ۱۳-۱۴-۵۰۶

— مردود بارگاہ ۵۰۶

— قیامت تک کے لیے اس پر لعنت ۵۰۶

— خدائی طاقت کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہے ۱۴۹-۱۵۰

— اس کی پرواز غیر محدود نہیں ہے ۵۰۰-۵۰۱

— اس کو غیب دانی کے ذرائع حاصل نہیں ۵۰۱

— فرشتوں سے سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے ۵۰۱

— اس کا آدم کو سجدہ کرنے سے انکار ۱۲-۵۰۵-۵۲۸

— اس کا انسان سے حسد ۶۲۸

— انسان کی فضیلت غلط ثابت کرنے کے لیے خدا کو چیلنج دیتا ہے ۱۳-۶۲۸

— انسان کو بہکانے کا عزم کرتا ہے ۱۳-۵۰۶

— اس کو قیامت تک کے لیے مہلت دی جاتی ہے کہ اپنے اس عزم کو پورا کرے ۱۳-۵۰۶-۶۲۸

— انسان پر اس کو کس قسم کے اختیارات دیے گئے ۱۳-۱۴-۵۰۷-۵۰۸-۶۲۹-۶۳۰

— جنت میں انسان سے اس کا پہلا معرکہ اور اس کے نتائج ۱۵-۱۶-۱۷

— وہ انسان کا ازلی دشمن ہے۱۳-۱۵-۱۸-۳۸۵-۵۰۵-۵۰۸-۶۲۳
— اس کے وعدے محض دھوکا ہیں ۶۲۹
— آدمی کو بے شرم بنانا چاہتا ہے۱۴-۱۹
— اس کی رہنمائی قبول کرنے سے آدمی اپنی فطرت سے منحرف ہو جاتا ہے۲۰
— اس کی پیروی آدمی کو لازماً گمراہ کر دیتی ہے ۲۲
— انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اس کی چالیں ۱۶-۱۴۹-۴۸۲-۵۰۶-۵۴۹-۶۲۹
— وہ کس طرح انسان کو دنیا پرستی میں مبتلا کرتا ہے ۱۰۰-۱۰۱
— وہ آدمی کو آدمی سے لڑانا چاہتا ہے ۶۲۳
— آدمی کے دل میں بزدلی پیدا کرتا ہے ۱۳۳
— ایمان نہ لانے والوں کا سرپرست ۱۹
— گمراہوں کا سرپرست ۵۴۹
— اس کے اغوا کے باوجود اس کے پیرو اپنی گمراہی کے خود ذمہ دار ہیں ۴۸۲-۵۰۷
— وہ آخرت میں کس طرح اپنے پیروؤں کو ملزم ٹھیرائے گا ۴۸۱-۴۸۲
— اس کا اور اس کے پیروؤں کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے ۶۲۹
— فضول خرچی کرنے والے اس کے بھائی ہیں ۶۱۰
— کیسے لوگوں پر اس کا بس چلتا ہے ۵۷۱-۶۳۰
— کیسے لوگ اس کے دھوکے سے محفوظ رہتے ہیں ۵۰۶-۵۰۷-۵۷۱-۶۳۰
— دعوت حق کو ناکام کرنے کے لیے اس کی چالیں ۱۱۰-۶۲۳
— اس کو سب سے زیادہ ناگوار یہ ہے کہ آدمی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھائے ۵۷۱

ص

صالح علیہ السلام:

— ان کا قصہ ۴۷ تا ۵۰-۳۴۹-۳۵۳
— ان کی تعلیم ۴۷-۳۴۹
— نبوت سے پہلے اپنی قوم میں ان کی حیثیت ۳۵۰
— ان کا معجزہ ۴۸-۵۰-۳۵۲
— ثمود کی تباہی کے بعد جزیرہ نمائے سینا میں ان کا قیام ۷۶-۳۵۲
— قوم صالح ۳۶۲

صبر ۷۰-۷۱-۳۱۸

— اس کے معنی ۱۴۸-۳۲۶-۴۵۶-۵۷۰-۵۸۷
— صبر جمیل کیا ہے ۳۸۹-۴۲۶
— اسلام میں اس کی اہمیت ۴۵۶-۴۷۲
— اس کی اخلاقی اہمیت ۱۵۷-۱۵۸-۳۲۶
— دعوت حق میں اس کی اہمیت ۳۰۹-۳۴۵-۳۷۱-۴۷۷-۵۱۶-۵۸۲-۵۸۷-۶۰۳
— اس کی برکات اور نتائج ۷۴-۴۲۸-۴۵۷
— اللہ صابروں کے ساتھ ہے ۱۴۸-۱۵۸
— اس کا اجر ۵۷۰-۵۷۶

صحابہ کرام:

— ان کی صداقت ایمانی پر قرآن کی فیصلہ کن شہادت ۱۶۳
— ان کے مقبول بارگاہ اور جنتی ہونے پر قرآن کی شہادت ۲۲۸
— وہ جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے معنی کیا ہیں ۱۲۰-۱۲۱
— ان کی قربانیاں جنگ بدر میں ۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶
— ان کی قربانیاں جنگ تبوک کے موقع پر ۱۷۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— قرآن کی حفاظت کے لیے ان کا اہتمام ۱۶۶
— ان کی جماعت کا نظم و ضبط اور بلند ترین اخلاقی معیار ۲۴۵ تا ۲۴۸
صدقہ - (دیکھو "زکوٰۃ")
صدیق - اس کے معنی ۴۰۷
صلوٰۃ - (بمعنی دعائے رحمت) ۲۲۷-۲۲۹
صلوٰۃ - (بمعنی نماز کے لیے دیکھو "نماز")
صلح حدیبیہ - اس کے اثرات ونتائج ۱۶۷
— کفار مکہ کا اس کو علانیہ توڑنا ۱۵۴
صلۂ رحمی - اس کی تشریح اور معاشرے میں اس کی اہمیت ۵۶۵-۵۶۶
صور - نفخ صور کی کیفیت ۴۹۳

ض

ضبط ولادت - ۶۱۲-۶۱۳

ضلالت - اس کو اختیار کر کے آدمی خود اپنا ہی نقصان کرتا ہے ۳۱۸-۶۰۵
— گمراہ کرنے والا ان تمام لوگوں کے گناہ میں شریک ہے جو اس کی وجہ سے گمراہ ہوں ۵۳۴
— گمراہی قبول کرنے والے کی ذمہ داری گمراہ کرنے والے سے کم نہیں ہے ۲۹
— آدمی اپنی گمراہی کا خود ذمہ دار ہے ۵۰۶-۵۰۷
— ضلال بعید کیا ہے ۴۷۰-۴۷۹
— باطل عقیدہ اختیار کرنے کے نتائج ۴۸۶
— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۶۴۵

اسباب ضلالت:

— اندھی تقلید ۲۰- ۴۵- ۹۷- ۲۸۵- ۳۰۳-
۳۵۱-۳۶۰-۳۶۹-۳۷۰-۴۷۶
— اللہ کی صفات کا صحیح تصور نہ ہونا ۳۴۹-۳۵۰
— اللہ کو بھول جانا ۱۱۵
— اللہ کی رہنمائی چھوڑ کر شیاطین کی رہنمائی قبول کرنا ۲۲
— اللہ کے حضور جواب دہی سے غافل ہو جانا ۳۴
— یہ خیال کہ ہم کو مر کر بس مٹی میں مل جانا ہے، دوسری کوئی زندگی نہیں جہاں ہمیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہو ۴۴۶
— آخرت کا انکار اور اس کی وجہ سے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ لینا ۵۳۳-۵۳۴-۶۱۹-۶۲۰
— یہ توقع کہ ہم خواہ کچھ کریں اللہ کے ہاں کچھ سفارشی ہمیں بچالیں گے ۹۳-۳۶۸
— دوسروں کو اللہ کا ہمسر سمجھ بیٹھنا ۴۸۷
— خدا کی دی ہوئی آزادیِ انتخاب و ارادہ کا غلط استعمال ۵۲۸
— علم کو چھوڑ کر قیاس و گمان کی پیروی کرنا ۲۸۵
— خدا کے دیے ہوئے حواس اور اس کی بخشی ہوئی عقل سے کام نہ لینا ۸۰- ۱۰۲- ۱۳۷- ۲۱۴- ۴۵۱-۴۵۵-۴۵۸-۴۵۹-۶۳۲
— خدا کی آیات سے تغافل - ۴۳- ۴۷- ۴۸- ۴۹- ۴۳۶
— احمقانہ تصور تاریخ اور تاریخ کے عبرت ناک حقائق سے غفلت برتنا ۵۹- ۶۰- ۶۱- ۶۲- ۴۴۶-۴۹۲
— اپنے ضمیر کو فریب دینا ۲۷۷-۲۷۸
— حق کے خلاف ضد اور ہٹ دھرمی ۶۲- ۶۳- ۶۴- ۶۷- ۴۲- ۴۳- ۴۸- ۴۹- ۳۰۱- ۵۰۰-۵۳۸
— استکبار اور غرور نفس ۱۲- ۲۵- ۴۳- ۴۷- ۴۸- ۴۹-۵۳۳-۵۳۴

— اپنی گمراہی وغلط کاری کے لیے عقیدۂ جبر کی آڑ لینا ۱۳-۱۴-۵۳۹-۵۴۰
— دین کے معاملے میں سرے سے سنجیدہ ہی نہ ہونا ۳۴
— اپنے اعمال کے بجائے دوسروں کو اپنی بدقسمتی کا ذمہ دار ٹھیرانا ۴۷
— ظاہر حیات دنیا سے دھوکا کھانا اور دنیا پرستی میں گم ہوجانا ۳۴- ۳۲۷- ۳۲۹- ۳۳۴- ۴۹۲- ۵۰۶-۶۱۹-۶۲۰
— خوش حالی میں مگن ہوجانا ۲۷۰
— یہ خیال کہ دنیا کی نعمتیں مقبول بارگاہِ الٰہی ہونے کی اور خستہ حالی مغضوب ہونے کی یقینی علامات ہیں ۲۷۵-۳۳۴
— یہ خیال کہ راست بازی و دیانت اختیار کرنے سے آدمی کی دنیا برباد ہوجاتی ہے ۵۷
— کفار کے غلبے اور شان وشوکت کو دیکھ کر دھوکا کھانا ۳۰۸
— گمراہ قوموں کے سیاسی و ذہنی غلبے کا اثر ۷۴- ۷۵
— یہ خیال کہ بشر نبی نہیں ہوسکتا اور نبی بشر نہیں ہوسکتا ۴۲-۴۵-۲۶۱-۳۳۳-۳۳۴-۵۷۳-۶۴۴
— انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کو بھلا دینا ۹۰
— آیاتِ الٰہی کا علم رکھنے کے باوجود خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنا ۱۰۰-۱۰۱
— خدا کے قانون میں حیلہ بازیاں کرنا ۱۹۲
— سبب خدا سے [illegible] ہیں ۲۱- ۲۱۱- ۳۶۱-[illegible]

ط

طالوت- زمانہ اور مدتِ سلطنت ۵۹۶

ظ

ظلم:

— گناہ اور خدا کی نافرمانی ظلم ہے ۱۴- ۱۵- ۸۸- ۸۹-۹۱-۱۳۸-۳۵۹-۳۶۵-۳۹۲-۴۲۰- ۴۴۷-۴۴۸-۵۶۲-۵۷۹
— خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرنا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے ۱۹۲
— تعصب اور ضد کی بنا پر حق کو نہ ماننا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے ۲۸۸-۳۶۶-۵۳۸
— خلافِ حق بات کہنا ظلم ہے ۳۳۶
— رسولوں کی دعوت پر ایمان نہ لانے والے ظالم ہیں ۲۷۱-۲۹۱
— اللہ کے نبیوں کو جھٹلانا ظلم ہے ۲۵-۲۱۳- ۳۳۷- ۳۵۳-۳۶۵-۴۷۸-۵۱۵
— اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ظالم ہیں ۳۰- ۶۳-۱۰۱-۱۵۱-۲۷۴-۲۸۷
— معجزہ دیکھ لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار ظلم ہے ۶۲۶
— نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا ظالم ہے ۲۵-۴-۲۷
— جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرنے والا ظالم ہے ۲۳۱
— اللہ کی نعمتوں کا جواب کفر وشرک سے دینے والے ظالم ہیں ۴۸۸-۴۹۱
— عقیدۂ ظِل اختیار کرنے والے ظالم ہیں ۴۸۶
— شرک کرنے والے ظالم ہیں ۸۰-۸۱-۳۱۸-۴۸۳
— آخرت کے منکر ظالم ہیں ۳۲-۳۳۲-۶۴۶
— خدا کے دیے ہوئے حواس اور اس کی بخشی ہوئی عقل سے کام نہ لینے والے ظالم ہیں ۳۲-۳۳۱
— عیش پرستی میں نیک و بد کو بھول جانے والے ظالم ہیں ۳۴۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ کے راستے سے روکنے والے ظالم ہیں
۳۳۱-۳۲
— منافقین ظالم ہیں ۱۹۸-۲۳۴
— کافروں سے محبت رکھنے والے ظالم ہیں ۱۸۴
— قرآن کی دعوت پہنچ جانے کے بعد اس سے منہ موڑنے والے ظالم ہیں ۶۳۹
— ظالموں کو ہدایت نہیں دی جاتی ۱۸۳-۲۳۴
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ۳۹۲
— ظالموں پر خدا کی لعنت ۳۲-۳۳۱
— ظالموں سے خدا کا عذاب دور نہیں ہے ۳۵۹
— ظالموں کا انجام ۷-۱۰-۳۰-۸۸-۸۹-۱۵۱-
-۲۷۱ -۲۹۱ -۳۳۱ -۳۴۱ -۳۵۳ -۴۷۸
۵۳۸

ع

عاد-۲۱۳-۲۴۵-۴۷۵
— ان کا علاقہ اور تاریخ ۴۴
— قوم نوح کے بعد خلیفہ بنائے گئے ۴۵
— ان کی اصل گمراہی کیا تھی ۴۵-۴۶
— حضرت ہودؑ کے ساتھ ان کا معاملہ اور انجام ۴۴-
۴۷-۳۴۶ تا ۳۴۹
عبادت-معنی اور تشریح ۱۹۰-۲۶۳
— اس کی حقیقت ۶۲۵
— کسی کو قانون ساز مان کر اس کے امر و نہی کی بے چون و چرا پیروی کرنا اس کی عبادت ہے ۱۸۹-۱۹۰
— انسان کو ایک ہی الہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے ۱۹۰
— صرف اللہ کی عبادت ہونی چاہیے ۴۰-۴۴-
۴۷-۵۴-۱۹۰
— عبادت کا صحیح طریقہ ۲۱-۲۲
— مشرکین اور جہلا کی عبادت اور اسلامی عبادت کا اصولی فرق ۲۲
عدل-معنی کی تشریح اور معاشرے میں اس کی اہمیت
۵۶۵
عذاب-گمراہ لوگوں کے لیے دنیا ہی میں عذاب ہے۔
۴۶۳
— بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب بطور تنبیہ آتے ہیں ۴۶۱
— دنیوی عذاب کی حکمت ۳۷۸
— دنیوی عذاب کی اصل حیثیت ۸-۳۶۸
— سزا دینے سے پہلے اللہ نافرمانوں کو سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے ۲۶۹-۲۷۰-۲۷۸-
۴۶۱-۴۹۷-۵۴۸
— دنیا میں نزول عذاب کا قانون ۷-۴۱-۴۳-
۴۹-۵۲-۵۹-۶۰-۶۱-۷۲-۷۳-۸۹ تا ۹۲-
۱۰۴-۱۳۸-۱۴۲-۱۵۱-۱۹۴-۲۶۹ تا ۲۷۱-
۲۹۱-۳۱۲-۳۱۵-۳۲۰-۳۳۷-۳۳۸-
۳۴۳-۳۴۹-۳۵۲-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۵-
۳۶۶-۳۶۷-۳۷۲-۳۷۳-۴۳۸-۴۶۱-
۴۷۲ تا ۴۷۴-۴۹۷-۴۹۸-۵۳۵-۵۴۴-
۵۴۵-۵۴۸-۶۰۵-۶۰۶-۶۲۶
— دنیا میں نزول عذاب کی مختلف شکلیں ۴۲-۵۰-
۵۳-۵۷-۵۹-۶۱-۷۲-۷۳-۸۲-۹۲-
۱۴۳-۱۵۱-۱۸۱-۱۸۶-۱۹۴-۲۰۱-۲۰۲-
۲۲۱-۲۲۸-۲۷۰-۳۰۰-۳۰۹-۳۱۰-۳۳۷
تا ۳۴۱-۳۵۳-۳۵۷-۳۵۹-۳۶۵-۵۱۱-
۵۱۴-۵۴۴-۵۴۵
— خدا کا عذاب ایسے رخ سے آتا ہے جدھر آدمی کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا ۵۳۵-۵۴۵
— نبی کے جھٹلانے پر عذاب کب نازل ہوتا ہے
۱۴۲-۳۳۷

— عذاب سے متنبہ کرنے کے اخلاقی فوائد ۴۳۶

— عذاب الٰہی کی شدت ۲۹۱-۵۰۹

— عذاب الٰہی سے بے فکر نہ ہونا چاہیے ۴۳۶

— خدا کا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا ۲۹۱-۳۲۵-۳۳۶-۳۵۵-۴۳۸

— اس سے کوئی بچا نہیں سکتا ۳۴۱-۴۶۳

— عذاب قبر (یعنی عذاب برزخ) کا ثبوت ۱۵۰-۵۳۵ تا ۶۰۵

— آخرت میں عذاب کا قانون ۲۶-۲۹-۳۰-۱۵۰-۶۰۵

— آخرت کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۱۹۱-۲۰۹-۲۱۲-۲۱۹-۲۲۲-۲۲۸-۲۶۳-۲۹۱-۲۹۹-۳۲۳-۳۳۲-۴۶۳-۴۷۰-۴۸۳-۵۳۵-۵۶۳

— عذاب الیم کے مستحق کون ہیں؟ ۵۴۹-۵۷۴-۵۷۸-۶۰۳

— عذاب عظیم کن لوگوں کے لیے ہے ۵۶۹-۵۷۴

— ہمیشگی کا عذاب ۲۹۱

— اس کی کیفیت ۵۶۲

— اس سے بچانے والا کوئی نہیں ۴۸۱

— وہ بے ہی ڈرنے کے لائق چیز ۶۲۶

عرب - جاہلیت میں ان کی رسمیں ۱۸-۱۷۲-۱۷۴-۱۹۲-۱۹۳

— وہ اپنی ان رسموں کو خدا کے دین کی تعلیم سمجھتے تھے ۲۰-۲۱

— ان کا شرک کس نوعیت کا تھا (دیکھو "شرک، مشرکین عرب کا شرک کس نوعیت کا تھا")

— ان کے جاہلانہ خیالات ۲۱-۵۴-۲۷۶

— ان کا طریقہ عبادت ۱۴۳

— ان کے ہاں عورتوں کی حیثیت ۵۴۷-۵۴۸

— ان کا تقلید آبائی پر اصرار ۲۰

— آغاز حکومت اسلامی میں بدوؤں کی حالت ۲۲۶

— عرب سے جہالت دور کرنے کے لیے اسلامی حکومت کی کوششیں ۲۵۱

— وہ ہمہ گیر انقلاب جو اسلام نے عرب میں برپا کیا ۲۰۲-۲۰۴ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "شرک" اور "محمد صلی اللہ علیہ وسلم")

عرش:

— اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا مطلب ۳۶-۲۶۲

— قرآن میں استواء علی العرش کا مضمون بار بار کس لیے بیان کیا گیا ہے ۳۶-۴۴۱-۴۴۲

— عرش عظیم ۲۵۵

— اس کے پانی پر ہونے کا مطلب ۳۲۴

عزیر - یہود کا ان کو ابن اللہ کہنا ۱۸۹

— بنی اسرائیل کی تاریخ میں ان کا مرتبہ ۱۸۹

— شریعت موسوی کی تجدید کے لیے ان کے کارنامے ۵۹۹-۶۰۰

عمل صالح - اس کے معنی ۲۵۰

— صالحین کی صفات ۳۲۶

— اس کا انجام نیک ۲۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "ایمان")

عورت - عرب جاہلیت میں اس کی حیثیت ۵۴۷-۵۴۸

عہد - قرآن میں اس کا وسیع مفہوم ۶۲

— وہ عہد جو آغاز آفرینش میں تمام نوع انسانی سے لیا گیا تھا ۹۵ تا ۹۹-۴۵۵

— وہ عہد جو ایمان لاتے ہی خدا اور بندے کے درمیان قائم ہو جاتا ہے ۲۳۵-۲۳۹

— اللہ کے ساتھ عہد باندھنے کا مطلب ۴۵۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ کے عہد کو تھوڑی قیمت پر بیچنے کا مطلب ۵۶۹
— عہد کی تین قسمیں اور ان کا حکم ۵۶۶ تا ۵۶۹
— عہد شکنی بدترین گناہ ہے ۱۵۲
— قومی مفاد کی خاطر عہد شکنی کرنا سخت قبیح فعل ہے ۵۶۷
— عہد شکنی کے لیے مذہبی بہانے خدا کے نزدیک مقبول نہیں ہیں ۵۶۸
— مسلمان اگر عہد شکنی کریں تو دہرے گنہگار ہیں ۵۶۹

عیسیٰ علیہ السلام:
— عیسائیوں کا ان کو ابن اللہ کہنا ۱۸۹
— ان کے اخلاق و اوصاف ۴۸۹
— ان کے دور میں بنی اسرائیل کی اخلاقی و مذہبی اور سیاسی حالت ۶۰۰ تا ۶۰۲

عیسائی:
— ان کے ایمان میں کیا خرابی ہے ۱۸۷-۱۹۰
— ان کی گمراہیاں ۱۸۹
— ابن اللہ کے عقیدے کی تردید ۲۹۸-۲۹۹

غ

غلامی - غلاموں کی آزادی کی صورتیں جو اسلام میں پیدا کی گئی ہیں ۲۰۷
غنیمت - (دیکھو: ''قانون اسلام'')

ف

فاسق - (دیکھو: ''فسق'')
— فتنہ بمعنی آزمائش (دیکھو: ''آزمائش'')
— بمعنی غلبۂ کفر ۱۲۳
— بمعنی شرارت ۱۹۸
— بمعنی ظلم و ستم ۳۰۵-۶۳۲
— ظالموں کے لیے اہل ایمان کے ''فتنہ'' بننے کا مطلب ۳۰۶-۳۰۷
— فتنۂ اجتماعی اور اس کے نتائج ۱۳۷-۱۳۸
— وہ فتنہ کیا ہے جس کو مٹانے کے لیے اسلام میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے ۱۴۴-۱۴۵
— فتنۂ ارتداد (دیکھو: ''ارتداد'')

فحشاء - معنی اور تشریح ۵۶۶

فرشتہ - ان کے متعلق مشرکین کے عقائد ۴۵۰-۵۴۸-۶۱۷
— فرشتوں کی صفات ۱۱۵
— رسول بمعنی فرشتہ ۲۵-۲۷۸-۳۵۳
— وہ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں ۴۴۹
— وہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں ۵۴۵
— بندگی سے سرتابی نہیں کرسکتے ۵۴۵
— خدا سے ڈرتے ہیں ۵۴۵
— احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں ۵۴۶
— ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ۴۴۸-۴۴۹
— انسانوں کے اعمال ثبت کررہے ہیں ۲۷۸
— نیکی کے گواہ ہوتے ہیں ۶۳۵
— انسانوں کی روحیں قبض کرتے ہیں ۲۵-۱۵۰
— ان کا انسانی شکل میں آنا ۳۵۳-۳۵۴-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۴
— وہ نمایاں صورت میں کب بھیجے جاتے ہیں ۴۹۸-۴۹۹-۵۱۰
— وحی لانے پر مامور ہوتے ہیں ۵۲۴
— قرآن لانے والا فرشتہ ۵۷۲
— جنگ بدر میں ان کا مسلمانوں کی مدد کے لیے آنا ۱۳۲ تا ۱۳۴
— انھیں آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا

۱۰-۵۰۴-۵۰۵-۶۲۷
— وہ اہل جنت کا استقبال کریں گے ۴۵۷

فرعون-اس کے معنی ۶۴
— مصر کے سب بادشاہ فراعنہ ہی نہ تھے ۳۸۲
— حضرت موسیٰ کے ہم عصر فرعون کون کون تھے ۶۴-۷۱
— قوم فرعون کی اصل گمراہی کیا تھی ۶۴-۳۶۵
— اسے خوف لاحق ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت سے مصر میں سیاسی انقلاب برپا ہوجائے گا۔ ۶۶-۳۰۳
— اس کی سیاسی چالیں ۶۹-۷۰
— اس کے مظالم ۷۰-۷۱-۷۶-۳۰۴-۳۰۵-۴۷۲
— اس کی ہٹ دھرمی ۶۷-۷۲-۷۳-۳۰۱-۶۴۷-۶۴۸
— اس کی قوم پر پے درپے بلاؤں کا نزول ۷۲-۷۳
— اس کے حق میں حضرت موسیٰ کی بددعا ۳۰۸
— ڈوبتے وقت اس کا ایمان لانا ۳۰۹
— اسے اور اس کے لاؤلشکر کو عبرت ناک سزا ۱۵۱
— اللہ نے اس کی لاش کو عبرت بننے کے لیے محفوظ کردیا ۳۱۰
— قیامت کے روز اس کی قوم اسی کی قیادت میں جہنم کی طرف جائے گی ۳۶۵-۳۶۶

فساد-فساد فی الارض کیا ہے ۳۸-۴۵۷
— اس کی ممانعت ۳۸-۴۹-۵۵
— اسے روکنے کی کوشش نہ کرنے کے نتائج ۳۷۲
— کفر ایک فساد ہے ۵۶۳
— غلبۂ کفر فساد ہے ۱۶۳
— راہ حق سے روکنا فساد ہے ۵۶۳
— مفسدین کون ہیں؟ ۶۴-۷۷-۲۸۷-۳۱۰-۳۶۰
— مفسدین کی پیروی نہ کرنی چاہیے ۷۷
— ان کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا ۳۰۴

فسق-فاسقین کون ہیں ۶۲-۷۸-۷۹-۹۰-۱۷۸-۱۸۵-۲۰۱-۲۱۹-۲۲۵
— ان کو ہدایت نہیں دی جاتی ۱۸۵-۲۱۹
— ان کو دنیا میں کیا سزا دی جاتی ہے ۶۲-۷۸-۷۹-۹۰ تا ۹۲-۲۸۲
— ان سے اللہ ہرگز راضی نہ ہوگا ۲۲۵

فقہ-اس کے معنی ۲۵۱
— رائج الوقت مفہوم کی غلطی اور اس کا اثر مسلمانوں کے تصور دین اور دینی تعلیم پر ۲۵۲

فلاح-اس کا مفہوم قرآن کی زبان میں ۲۷۴
— اس کے پانے کا راستہ ۴۵-۱۴۸
— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹-۸۶-۲۲۲-۳۹۲
— کیسے لوگ اسے نہیں پاسکتے ۲۷۴-۲۹۹-۳۰۲-۵۷۸

فوز:
— فوز عظیم کیا ہے ۲۱۴-۲۲۲-۲۲۸-۲۳۹-۲۹۵
— فائزین کون ہیں؟ ۱۸۴

ق

قادیانی ''نبوت'' - اس کے بعض دلائل اور ان کا جواب ۲۷۴-۲۷۵

قانون اسلام

اصول قانون اور اصولی احکام:
— حلال وحرام کے حدود مقرر کرنے کا خدا کے سوا کسی کو حق نہیں ہے ۱۸۹-۱۹۰-۲۹۲ تا ۲۹۴-۵۷۸
— خدا کے قانون میں حیلہ بازی کرکے ناجائز کو جائز کرلینا ایک کافرانہ فعل ہے ۱۹۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— حیلہ کے معنی ۱۹۳
— گمان علم کی جگہ نہیں لے سکتا ۲۸۵
— محض شک اور گمان کی بنا پر کسی کے خلاف کارروائی کرنا درست نہیں ۲۳۲-۶۱۶
— کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ۳۱۳
— جس شخص سے زبردستی گناہ کرایا جائے وہ قابل معافی ہے ۵۷۴
— مجبوری کی حالت کے شرائط اور حدود ۵۷۸
— بدلہ اصل زیادتی سے بڑھ کر نہ ہونا چاہیے ۵۸۲
— جھوٹ اور توریے کا فرق، توریے کا محل اور اس کے شرائط ۴۲۵

بین الاقوامی قانون:

— معاہدات کے احترام کا حکم ۱۵۲-۱۵۳-۱۶۲-۱۷۶-۱۷۷-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۶۱۵
— معاہدات کی پابندی کے لیے لازمی شرط ۱۷۸
— معاہدہ شکنی کرنے والوں کے ساتھ معاہدات کی پابندی نہیں کی جا سکتی ۱۷۷-۱۷۸
— معاہدہ توڑ دینے والے فریق کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ۱۵۲-۱۵۳-۱۷۲-۱۷۴-۱۸۰-۱۸۱
— الٹی میٹم کا طریقہ ۱۷۲-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶
— الٹی میٹم کی مدت گزرنے سے پہلے کوئی جنگی کارروائی نہ کی جائے ۱۷۶
— وہ استثنائی صورتیں جن میں اختتام معاہدہ کا نوٹس دیے بغیر جنگی کارروائی کی جا سکتی ہے ۱۵۴
— دوران جنگ میں دشمن قوم کے افراد کو مستامن کی حیثیت سے داخل ہونے کی اجازت دینا ۱۷۷
— اگر دشمن حرام مہینوں کی حرمت کا لحاظ نہ کرے تو مسلمان بھی نہ کریں گے ۱۹۲
— اسیران جنگ ۱۵۹
— دشمن اگر صلح کی درخواست کرے تو خدا کے بھروسے پر قبول کر لی جائے ۱۵۶

جنگی قوانین:

— اسلامی قانون جنگ کا ارتقا ۱۲۸
— جنگ کی اخلاقی اور انتظامی اصلاح ۱۲۹
— دشمن اگر اسلام قبول کر لے تو اس کے خلاف جنگ بند کر دی جائے ۱۷۷
— وہ کم سے کم شرائط جن کے بغیر یہ نہیں مانا جا سکتا کہ دشمن نے اسلام قبول کر لیا ہے ۱۷۷-۱۷۹
— اسیران جنگ کے فدیے کا مسئلہ ۱۵۹
— اموال غنیمت کی حیثیت اور ان کی تقسیم کا قاعدہ ۱۲۸-۱۲۹-۱۴۵-۱۴۶
— مال غنیمت میں اللہ اور رسول کے حصے اور ذوی القربیٰ کے حصے سے کیا مراد ہے ۱۴۶
— جزیے کا حکم اور اس کی تشریح ۱۷۲-۱۸۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے "جہاد" اور "قتال فی سبیل اللہ")

دستوری قانون:

— خدا کی قانونی حاکمیت ۴۰۲-۶۰۹
— قانون سازی کا مطلق اختیار اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے ۱۸۹-۱۹۰-۲۹۲-۲۹۴-۵۷۷-۵۷۸
— اسلامی معاشرے کی رکنیت کی شرطیں ۱۷۹
— نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت اسلام کے دستوری قانون میں ۱۷۷-۱۷۹
— قانونی مسلمان اور حقیقی مسلمانوں کی حیثیتوں کا فرق ۲۲۲-۲۳۶-۲۳۷

— نفاق اور کفر کے شبہے کے باوجود وہ لوگ قانونی حیثیت سے مسلمان ہی شمار ہوں گے جن کا کفر یا نفاق ثابت نہ ہو جائے ۲۲۲
— ہجرت کے اثرات و نتائج دستوری قانون میں ۱۶۰-۱۶۱
— اہل ایمان کی سیاسی حیثیت ۱۶۱
— اسلامی ریاست کے واجبات میں وہ اہل ایمان شامل نہیں ہیں جو دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں ۱۶۳
— اسلامی ریاست کن مسلمانوں کی ''ولی'' ہے اور کن کی نہیں ہے ۱۶۰-۱۶۱
— ریاست کے تمام باشندے اس کی اخلاقی ذمہ داریوں میں شریک ہیں ۱۶۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'')

قانون شہادت:

— شہادت بالقرائن ۳۹۴

فوجداری قانون:

— ارتداد کی سزا ۱۷۹
— ارتداد پر مجبور کیا جانے والا قابل مؤاخذہ نہیں ہے ۵۷۴-۵۷۵
— عمل قوم لوط کی سزا ۵۱ تا ۵۴
— قتل نفس کی حرمت ۶۱۴
— خودکشی بھی قتل نفس ہے ۶۱۴
— وہ پانچ صورتیں جن میں آدمی کی جان لی جا سکتی ہے ۶۱۴
— قصاص کے مطالبے کا حق اولاً و ابتداءً اولیائے مقتول کو پہنچتا ہے ۶۱۴
— قصاص لینا مدعیوں کا اپنا کام نہیں بلکہ قصاص دلوانا عدالت کا کام ہے ۶۱۵
— قصاص میں حد سے تجاوز کرنا ممنوع ہے ۶۱۵

معاشرتی قوانین:

— کفار و مشرکین کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھے جا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں ۱۷۷-۱۸۲-۱۸۴-۱۸۷-۲۴۱-۲۴۲
— منافقین کے ساتھ معاشرے میں کیا برتاؤ ہونا چاہیے ۲۱۵-۲۲۰-۲۲۵-۲۳۱-۲۳۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی نظام جماعت'')

معاشی قانون:

— کم ناپنا اور کم تولنا حرام ہے ۵۵-۳۵۹
— اوزان اور پیمانوں کی نگرانی حکومت کے فرائض میں سے ہے ۶۱۵
— مال جمع کر کے رکھنا اور اسے راہ خدا میں خرچ نہ کرنا سخت گناہ ہے ۱۹۱
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قرآن، اس کا معاشی نقطۂ نظر'')

قانون میراث:

— میراث کے حقوق کی بنیاد رشتہ داری پر ہے نہ کہ محض اسلامی برادری پر ۱۶۳

قبلہ۔ بمعنی مرکز و مرجع ۳۰۷

قتال فی سبیل اللہ:

— اسلام میں جنگ کا مقصد اور بنیادی نظریہ ۱۲۹-۱۳۹-۱۴۴-۱۴۵-۱۷۲-۱۸۸
— دین میں قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت ۲۳۵-۲۴۹-۲۵۰
— قتال فی سبیل اللہ میں حصہ لینا عین اس معاہدے کا تقاضا ہے جو ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن اور خدا کے درمیان قائم ہو جاتا ہے ۲۳۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— راہ خدا کی جنگ سے جی چرانا کافرانہ و منافقانہ رویہ ہے ۲۱۹-۲۲۲
— اہل ایمان کو نہ چاہیے کہ وہ کفر و اسلام کی جنگ میں پیچھے رہیں ۱۹۷-۲۴۹
— جن لوگوں کو اسلامی حکومت جنگ کے لیے طلب کرے ان سب پر فوجی خدمت فرض عین ہے ۱۹۴-۱۹۵
— جب جنگ کے لیے طلب کر لیا جائے تو ذاتی سہولت وصعوبت کا خیال کیے بغیر ہر مسلمان کو نکلنا چاہیے ۱۹۶
— مگر ہر وہ شخص لازماً منافق ہی نہیں ہے جو لبیک نہ کہے ۲۲۹
— لبیک نہ کہنے والے مومنوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ۲۳۰-۲۴۴ تا ۲۴۹
— جنگ پر نہ جانے کے لیے جائز عذرات کیا ہو سکتے ہیں ۲۲۳-۲۲۴
— جائز عذر بھی صرف اسی کا مقبول ہے جو اللہ اور رسول کا سچا وفادار ہو ۲۲۳
— بے جا عذرات کرنے والوں یا بلا عذر بیٹھے رہ جانے والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴-۲۲۵
— بزدلی ایک نجاست ہے جو شیطان آدمی کے دل میں ڈالتا ہے ۱۳۳
— میدان جنگ سے فرار حرام ہے ۱۳۴-۱۳۵
— مسلمانوں کو اپنی فوجی طاقت ہر وقت مضبوط رکھنے کا حکم ۱۵۵
— فوجی ضروریات پر مال خرچ کرنے میں بخل نہ کیا جائے ۱۵۵
— اسلامی جنگ کے آداب ۱۴۸
— کفار کی فوجوں کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کی ممانعت ۱۴۸-۱۴۹
— دشمن کی فوجی طاقت [illegible] اصل ہدف ہے

جس پر میدان جنگ میں فوج کی نگاہ جمی رہنی چاہیے ۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰
— اسیران جنگ کو اسلام کی تبلیغ ۱۶۰
— دوران جنگ میں دشمن کو تبلیغ کی جاتی رہے ۱۷۷
— ظالموں اور معاہدہ شکنوں کے خلاف جنگ کا حکم ۱۸۰-۱۸۱
— اہل کتاب کے خلاف جنگ کا حکم ۱۸۷-۱۸۸
— مرتدین کے خلاف جنگ کا حکم ۱۷۹

قتل-(دیکھو "قانون اسلام")

قتل اولاد-اس کی حرمت ۶۱۲-۶۱۳

قرآن-لفظ "قرآن" کے معنی ۳۸۳
— "کتاب الٰہی" کے وسیع تر معنی میں اس نام کا استعمال ۵۱۸
— اس کا لانے والا روح القدس ہے ۵۷۲
— اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ۶-۲۸۵-۳۱۱-۳۲۱-۳۲۸-۳۳۱-۳۸۳-۴۶۴-۴۶۹-۴۹۸-۵۴۹-۵۷۲-۶۱۷-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۹
— اس کے کلام الٰہی ہونے کے دلائل ۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۸۵-۲۸۶-۳۲۸-۶۴۰ تا ۶۴۲
— وہ اللہ کے سوا کسی کا کلام نہیں ہو سکتا ۲۸۵
— دنیا کو اس کے مثل بنا کر لانے کا چیلنج ۲۸۶-۳۲۸-۶۴۱
— یہ وہ معجزہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ۱۱۳
— کن کن حیثیتوں سے وہ معجزہ ہے ۲۸۶-۶۴۱-۶۴۲
— اس کی صداقت کے دلائل و شواہد ۹۳-۱۰۴-۱۰۵-۳۲۸-۳۷۹-۴۳۴-۴۳۵-۶۳۳-۶۳۸
— وہ سراسر حق ہے اور حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے ۳۱۱-۳۱۸-۳۳۱-۴۴۱-۶۴۹

— وہ بالکل سیدھی راہ دکھاتا ہے ۶۰۳
— وہ ایک حکم ہے خدا کی طرف سے ۴۶۴
— وہ سب انسانوں کے لیے خدا کا پیغام ہے ۴۹۴
— اس خیال کی تردید کہ وہ صرف عربوں کے لیے نازل ہوا ہے ۳۸۳-۳۸۴
— وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے ۳۸۳-۴۶۴
— وہ اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں ۳۸۳-۵۴۴
— اس کے نزول کا طریقہ ۳۷۸-۵۷۲
— اس کے بتدریج نازل ہونے کی حکمت ۵۷۳-۶۴۹
— اس کے تازہ احکام کا اعلان کس طرح کیا جاتا تھا ۲۵۴
— اس کی ترتیب ۱۶۶-۱۶۷
— اس کے مفصل ہونے اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہونے کا مطلب ۳۴-۴۳۸-۵۶۴
— خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے ۴۹۸-۴۹۹
— صحابہ کرام نے اس کی حفاظت کا کس درجہ اہتمام کیا ۱۶۶
— اس کی تعریف ۳۴-۱۱۳-۲۶۰-۲۹۲-۳۲۱-۳۸۳-۴۳۵-۴۳۸-۴۹۷-۵۴۹-۵۶۴
— اس کی برکات ۱۱۴
— دنیا کی ہر دولت سے زیادہ قیمتی ۲۹۲
— سب سے بڑی نعمت ۵۱۷
— اس کو ذکر کس معنی میں کہا گیا ہے ۹۹
— ماننے والوں کے لیے ہدایت اور شفا اور رحمت ۳۴-۶۳۸
— اس سے منہ موڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۳۹
— اس کے نزول کا مقصد ۶-۲۶۹-۴۹۴-۵۴۹-۵۶۴-۶۱۸
— اس کی دعوت ۷-۳۸-۶۲۰
— اس کی دعوت پہنچ جانے کے بعد آدمی پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے ۶۳۹
— صحیح الدماغ آدمی اس کی دعوت قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۳۳۰
— اس کی دعوت وہی ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی تھی ۳۱۱
— آخرت کو نہ ماننے والے اس کی ہدایت سے کیوں محروم رہتے ہیں ۶۱۹-۶۲۰
— مجرموں کو اس کی تعلیم سخت ناگوار ہوتی ہے ۴۹۹
— شیطان کو سب سے زیادہ ناگوار یہ ہے کہ آدمی اس سے فائدہ اٹھائے ۵۷۱
— اس کی کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے ۵۸۹
— اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے صحیح طریق مطالعہ ۵۷۱
— اس کو سننے کے آداب ۱۱۴
— اس کو پڑھنے کے آداب ۵۷۱
— اس کی تفسیر کا یہ طریقہ غلط ہے کہ سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کی کسی آیت کا مطلب نکالا جائے ۵۵۴-۵۵۵-۶۴۰
— اس کو سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تشریح ضروری ہے ۵۴۳-۵۴۴
— حدیث کی کسی بات کا قرآن سے زائد ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے ۵۸۹
— اہل ایمان پر اس کے اثرات ۲۵۳
— منافق پر اس کے اثرات ۲۵۳
— اس کا استقبال عرب کے راست باز لوگ کس طرح کر رہے تھے ۵۳۷
— اس کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کیا طریقے اختیار کر رہے تھے ۵۳۴
— اس پر کفار مکہ کے اعتراضات اور ان کے جوابات

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۴۱-۱۴۲-۲۶۰-۲۷۱-۲۸۶-۴۶۵-۵۷۱ تا
۵۷۴
— اس کا طرز بیان ۳۶- ۳۷- ۴۲- ۴۳- ۵۸-
۱۰۰- ۲۸۳- ۲۸۸- ۳۱۱- ۳۱۳- ۳۸۰-
۴۴۰- ۴۹۲- ۴۹۶- ۵۲۳- ۵۲۴- ۵۳۰-
۵۳۲- ۵۳۵- ۵۴۲- ۵۵۷- ۵۷۲- ۵۷۳-
۵۸۷
— مکی دور کی آخری سورتوں کا انداز بیان ۵-
۲۵۸-۳۲۰-۴۴۰-۴۶۸-۴۹۶-۵۸۶
— اس کا طرز استدلال ۲۱- ۲۳- ۳۶- ۳۷-
۴۶- ۱۰۴- ۱۰۵- ۱۰۷ تا ۱۱۰- ۲۶۱- ۲۶۳-
۲۶۴- ۲۶۵- ۲۶۶- ۲۷۲- ۲۷۳- ۲۷۴-
۲۷۸- ۲۸۲- ۲۸۳- ۲۸۴- ۲۸۵- ۲۹۶-
۲۹۸- ۲۹۹- ۳۰۳- ۳۱۶- ۳۲۴- ۳۲۵-
۳۲۸- ۳۴۶- ۳۴۹- ۳۵۰- ۳۶۷- ۴۴۱ تا
۴۴۵- ۴۵۰ تا ۴۵۲- ۴۶۱- ۴۶۲- ۴۷۹-
۴۸۰- ۵۲۴ تا ۵۲۸- ۵۳۰ تا ۵۳۲- ۵۳۹ تا
۵۴۱- ۵۴۹- ۵۵۰- ۵۵۳ تا ۵۵۶
— وہ انسان کی عقل وفکر سے اپیل کرتا ہے ۱۰۴-
۲۷۲- ۲۷۹- ۲۸۰- ۲۸۲- ۲۸۳- ۲۸۵-
۲۹۶- ۳۳۳- ۳۳۵- ۳۴۶- ۴۳۶- ۴۳۷-
۴۳۸- ۴۴۳ تا ۴۴۵- ۴۵۱- ۴۵۲- ۴۵۵-
۴۹۴- ۵۲۹- ۵۳۱- ۵۵۱- ۵۵۲
— نظام کائنات کے متعلق اس کا بیان ۳۶- ۳۷-
۲۶۱- ۲۶۲- ۲۶۴- ۴۴۱ تا ۴۴۶- ۴۴۸-
۴۷۹- ۴۸۰- ۴۸۸- ۵۰۰ تا ۵۰۳- ۵۱۶-
۵۲۵- ۵۲۹- ۵۳۰- ۵۴۵- ۶۰۳- ۶۰۴-
۶۱۸
— مابعد الطبیعی حقائق کے متعلق اس کا بیان ۱۰ تا ۱۹-
۲۵- ۳۲- ۳۳- ۳۴- ۳۶- ۳۷- ۹۵ تا ۹۹-
۳۲۴- ۵۰۴ تا ۵۰۷- ۵۶۸- ۶۰۴- ۶۲۰-
۶۲۸
— تخلیق انسان کے متعلق اس کا بیان (دیکھو
"انسان")
— مذاہب کی اصلیت کے متعلق اس کا بیان ۲۷۶
— وہ تمام کتب آسمانی کی تصدیق کرتا ہے ۲۸۵-
۲۸۶-۴۳۸
— کتب آسمانی اس کی تائید کرتی ہیں ۳۱۱
— پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تعلیمات کو وہ مفصل بیان
کرتا ہے ۲۸۵-۲۸۶
— وہ انبیائے بنی اسرائیل کو خود بنی اسرائیل کی لگائی
ہوئی تہمتوں سے پاک کرتا ہے ۸۱
— اس کا فلسفۂ تاریخ ۷- ۸- ۲۴- ۳۸- ۴۰- ۴۲-
۵۸ تا ۶۳- ۷۱- ۷۲- ۱۵۱- ۲۱۲- ۲۱۳- ۲۶۶-
۲۷۰- ۲۷۱- ۲۷۶- ۲۹۰- ۳۲۰- ۳۴۶-
۳۵۶- ۳۶۶ تا ۳۶۸- ۳۷۲ تا ۳۷۴- ۴۴۹-
۴۵۳- ۴۷۱- ۴۷۲- ۴۷۶- ۴۷۸- ۴۹۷-
۴۹۸- ۵۴۰- ۶۰۶
— اس کا فلسفۂ اخلاق ۱۵- ۲۶ تا ۲۸- ۲۹- ۳۰-
۵۰- ۷۹- ۸۳- ۹۱- ۹۲- ۱۰۱- ۱۳۳- ۱۳۷ تا
۱۴۰- ۱۵۶- ۱۵۷- ۱۵۸- ۲۳۵- ۲۶۶-
۲۶۷- ۲۶۸- ۳۷۲ تا ۳۷۴- ۳۸۱- ۵۶۸-
۶۰۴- ۶۰۵
— اس کا اخلاقی نقطۂ نظر ۱۲- ۳۱- ۳۲- ۱۸۳-
۱۸۴- ۲۰۰- ۲۰۱- ۲۷۴- ۳۲۲- ۳۵۸-
۴۵۸- ۵۶۹- ۵۷۰- ۶۰۷- ۶۳۰
— اس کی اخلاقی تعلیمات کے لیے دیکھو 'اخلاق'
— اس کا فلسفۂ تمدن و معاشرت ۱۵- ۲۳- ۳۸-
۱۰۶- ۵۶۵- ۵۶۶- ۶۱۲- ۶۱۳
— اس کا علم النفس ۱۵- ۱۶- ۵۹- ۶۲- ۶۷- ۷۸- ۹۷ تا
۹۹- ۱۵۷- ۱۵۸- ۳۶۴- ۴۶۲- ۴۶۳-
۴۹۹- ۵۷۳- ۶۲۰

— اس میں اسلامی فلسفے کی بنیادیں ۲۹۶-۲۹۷

— وہ تلاشِ حقیقت کے کس طریقے کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے ۱۰۴- ۱۰۵- ۲۶۳- تا ۲۶۷- ۲۹۶- ۲۹۷- ۳۱۴- ۳۱۵- ۴۳۶- ۴۳۷-۴۴۳ تا ۴۴۵-۴۵۹-۴۷۲

— اس کا معاشی نقطۂ نظر ۶۱۲-۶۱۳-۶۳۰-۶۳۱

— اشتراکیت کے حق میں اس سے ایک غلط استدلال ۵۵۴-۵۵۵

— اس میں قصے کس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں؟ ۴۰-۴۲-۴۳-۵۸-۶۰-۳۲۱-۳۶۴-۳۷۴-۴۳۵-۴۳۸-۴۷۸-۴۸۹-۴۹۲-۵۹۰-۵۹۱-۶۰۲

— قصہ آدم و حوا بیان کرنے کا مقصد ۱۷-۵۰۷-۵۰۸-۶۲۸

— قصہ نوح بیان کرنے کا مقصد ۴۰-۲۵۹-۲۶۰-۲۹۹-۳۴۴-۳۴۷

— قصہ ابراہیمؑ بیان کرنے کا مقصد ۳۵۶-۴۸۹-۵۰۹-۵۱۰

— قصہ لوطؑ بیان کرنے کا مقصد ۳۵۶- ۳۵۸-۵۰۹-۵۱۰

— قصہ یوسفؑ بیان کرنے کا مقصد ۳۷۸-۳۷۹-۳۸۶

— قصہ موسیٰ و بنی اسرائیل بیان کرنے کا مقصد ۶۳-۲۵۹- ۲۶۰- ۳۰۲- ۴۷۴- ۶۰۲- ۶۴۷-۶۴۹

— قرآنی قصوں کا مطلب قریش خوب سمجھتے تھے ۳۳۷

— قصے بیان کرنے میں قرآن کا طریقہ ۳۷۹

— مستشرقین کے اس الزام کی تردید کہ وہ بنی اسرائیل سے روایات نقل کرتا ہے ۲۹۶-۴۳۴

قرآنی تمثیلات:

— نبوت کے لیے بارانِ رحمت کی تمثیل ۳۹

— علم حق رکھنے کے باوجود دنیا پرستی میں مبتلا ہونے والوں کی تمثیل ۱۰۰-۱۰۱

— خدا سے بے خوف ہو کر زندگی بسر کرنے والوں کی تمثیل ۲۳۴

— دنیوی زندگی کی تمثیل ۲۷۹

— خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے دعا مانگنے والوں کی تمثیل ۴۵۰

— کشمکشِ حق و باطل کی تمثیل ۴۵۳

— کافروں کے اعمال اکارت جانے کی تمثیل ۴۷۹

— کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کی تمثیل ۴۸۴-۴۸۵

— مشرکین کے معبودوں کی تمثیل ۵۵۴- ۵۵۷-۵۵۸

قرآنی دعائیں:

— حضرت آدم وحوا کی دعائے استغفار ۱۵

— اہل اعراف کی دعا ۳۳

— حضرت شعیب کی دعا ۵۷

— ساحرانِ مصر کی دعا ایمان لانے کے بعد ۷۰

— حضرت موسیٰ کی دعائے استغفار ۸۲-۸۳-۸۴

— بنی اسرائیل کی دعا فرعون کے ظلم سے نجات پانے کے لیے ۳۰۶

— حضرت موسیٰ کی بددعا فرعون کے حق میں ۳۰۸

— حضرت نوحؑ کی دعائے استغفار ۳۴۴

— حضرت یوسفؑ کی دعا زنانِ مصر کے فتنے سے بچنے کے لیے ۳۹۸

— حضرت یوسفؑ کی آخری دعا ۴۳۳

— حضرت ابراہیمؑ کی دعا اپنی اولاد کو مکہ میں آباد کرتے وقت ۴۸۸ تا ۴۹۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ دعا جو مکی دور کے انتہائی سخت زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی گئی ۶۲۷ - ۶۳۸

قرآنی قصے:

— قصہ آدم وحوا ۱۰ تا ۱۸ - ۵۰۴ تا ۵۰۷ - ۶۲۷ تا ۶۳۰
— قصہ نوح علیہ السلام ۴۰ تا ۴۴ - ۲۹۹ تا ۳۰۱ - ۳۳۳ تا ۳۴۴
— قصہ ہود علیہ السلام ۴۴ تا ۴۷ - ۳۴۵ تا ۳۴۹
— قصہ صالح علیہ السلام ۴۷ تا ۵۰ - ۳۴۹ تا ۳۵۳
— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۳۵۳ - ۳۵۵ - ۴۸۸ تا ۴۹۱ - ۵۰۹ تا ۵۱۱
— قصہ لوط علیہ السلام ۵۱ تا ۵۳ - ۳۵۳ - ۳۵۵ - ۳۵۶ تا ۳۵۹ - ۵۱۱ تا ۵۱۵
— قصہ یوسف علیہ السلام ۳۷۸ تا ۴۳۴
— قصہ شعیب علیہ السلام ۵۴ تا ۵۸ - ۳۵۹ تا ۳۶۵
— قصہ موسیٰ علیہ السلام ۶۳ تا ۸۸ - ۳۰۱ تا ۳۱۰ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۴۷۱ تا ۴۷۴ - ۶۴۶ تا ۶۴۹

قریش - عرب میں ان کے اثرات ۱۴۳ - ۳۵۶
— ان کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ۴۵۸
— ان کے مذہبی اور نسلی دعووں پر قرآن کی ضرب ۱۴۳ - ۱۸۳
— اللہ تعالیٰ کا اعلان کہ ان کو کعبہ کی تولیت کا حق نہیں پہنچتا جب تک کہ وہ کافر ہیں ۱۴۳
— ان کا صلح حدیبیہ کی علانیہ خلاف ورزی کرنا ۱۵۴
— ان کی آخری شکست ۱۶۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "محمد صلی اللہ علیہ وسلم")

قسم:

— اس کی اخلاقی و دینی اہمیت ۵۶۹
— اس کے توڑنے کی ممانعت ۵۶۶ - ۵۶۹

قصاص - (دیکھو: "قانون اسلام")

قضاوقدر - (دیکھو: "تقدیر")

قیامت:

— یوم القیامت ۹۲ - ۲۹۴ - ۳۴۸ - ۳۶۶ - ۵۳۴ - ۵۳۵
— قیام قیامت کے دلائل ۴۴۲ - ۴۴۳
— اس سے پہلے سب ہلاک ہو جائیں گے ۶۲۶
— بازپرس کا دن ۹۷
— فیصلے کا دن ۳۱۱
— جزاوسزا کا دن ۵۰۶
— حساب لینے کا دن ۴۹۱
— فیصلے کی گھڑی (الساعۃ) ۱۰۵ - ۴۳۶ - ۵۱۶ - ۵۵۸
— تمام انسانوں کے زندہ کر کے اٹھائے جانے کا دن ۵۰۶
— تمام انسانوں کے بیک وقت جمع کیے جانے کا دن ۲۸۱ - ۲۸۹ - ۳۶۷
— اللہ سے ملاقات کا دن ۳۴ - ۲۸۹
— شیطان کو اس دن تک کے لیے مہلت دی گئی ہے ۶۲۸
— وہ اچانک آئے گا ۱۰۵ - ۴۳۶ - ۵۵۸ - ۵۵۹
— اس کا وقت مقرر ہے ۳۶۸ - ۵۰۶
— اس کا وقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۱۰۵ - ۵۰۶
— اس کی کیفیت ۱۰۵ - ۳۶۸ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳
— اس روز مردوں کے زندہ ہو کر اٹھنے کی کیفیت ۵۳۷
— اس روز مومن وکافر سب خدا کی حمد کریں گے ۶۲۳
— اس روز نفسی نفسی کا عالم ہوگا ۵۷۶
— گمراہ لوگ کس حالت میں لائے جائیں گے ۶۴۵
— خدا کی عدالت میں تمام انسانوں کی پیشی ۶۳۱
— نامۂ اعمال پیش ہوں گے ۲۰۴
— اعمال کے وزن پر فیصلہ ہوگا ۹
— ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا بدلہ دیا جائے گا ۵۷۶

— تمام اختلافات کی حقیقت کھول دی جائے گی اور ان کا فیصلہ کر دیا جائے ۳۱۱-۵۲۸-۵۸۱
— اس روز خدا کی نعمتیں صرف اہل ایمان کے لیے ہوں گی ۲۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت'' اور ''حشر'')

ک

کافر-(دیکھو ''کفر'')
کتاب (بمعنی کتاب الٰہی یا کتب الٰہی) ۹۴-۲۸۵-۳۷۰-۴۶۵-۴۹۷-۵۹۰
— ام الکتاب ۴۶۵
— کتاب اللہ سے فائدہ اٹھانے کی صحیح صورت ۸۷
— کتاب اللہ کی پیروی پر ثابت قدم رہنے کا مطالبہ ۸۷
کتاب (بمعنی حکم یا فرمان الٰہی) ۱۵۹-۱۹۲-۳۲۱
کتاب (بمعنی سورۂ قرآن) ۶
کتاب (بمعنی فیصلہ اور نوشتۂ تقدیر) ۳۷۰-۶۲۶
کتاب (بمعنی قرآن) ۳۴-۳۸۳-۴۴۱-۴۶۹-۴۹۷
کتاب (بمعنی لوح محفوظ یا دفتر خداوندی) ۲۹۵-۳۲۴
کفر-بمعنی کفران نعمت ۲۷۴
— کفر کی حقیقت ۲۳۶-۴۵۹-۴۶۰
— قرآن کو نہ ماننے والے کافر ہیں ۳۳۰
— قرآن کی کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے ۵۸۹
— آخرت کے نہ ماننے والے کافر ہیں ۳۲۵-۳۳۲-۴۴۶
— آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والے اور خدا اور رسول کا استہزا کرنے والے کافر ہیں ۲۱۰-۲۱۱-۲۱۶
— قانون الٰہی میں حیلہ بازی کفر پر مزید ایک کفر ہے ۱۹۲
— منافقانہ اظہار ایمان کفر ہے ۱۹۹-۲۰۱-۲۰۲-۲۱۱-۲۱۶-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۳۱-۲۵۲
— مومن اور کافر کا فرق ۳۳۳
— کافر ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں ۴۲۷
— کفر ایک ناشکری ہے ۴۸۷-۵۶۱-۵۶۲
— وہ خلاف فطرت ہے ۴۸۵
— کفر کے اخلاقی و ذہنی نتائج ۴۶۲
— کافروں کا انداز فکر ۵۷
— کافرانہ طرز عمل ۱۴۳-۱۴۴
— کافرانہ رویۂ زندگی اور مسلمانہ رویۂ زندگی کا فرق ۲۳۷
— کفر و ایمان کا مقابلہ بلحاظ نتائج و تجربات تاریخی ۴۸۵-۴۸۶
— کافر کی اخلاقی طاقت لازماً اہل ایمان کی طاقت سے کم ہوتی ہے ۱۵۷-۱۵۸
— کافر مساجد اللہ کے متولی ہونے کے قابل نہیں ہیں ۱۸۲
— کفر کرنے والے بدترین مخلوق ہیں ۱۵۱
— ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے جاتے ہیں ۱۹۳
— کفر پر اصرار کرنے والوں کے دلوں پر ٹھپا لگا دیا جاتا ہے ۶۲
— ان کا کفر اللہ کے لیے نہیں بلکہ خود انھی کے لیے نقصان دہ ہے ۴۷۳-۴۷۴
— وہ اللہ کی تائید سے محروم رہتے ہیں ۱۳۶
— اللہ ان کو رسوا کرنے والا ہے ۱۷۵
— وہ سزا کے مستحق ہیں ۱۵۱-۴۷۰-۴۷۳
— ان کے لیے مغفرت نہیں ہے ۲۱۹
— ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے ۹۷-۴۷۹-۴۸۰
— مرتے وقت فرشتے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں ۱۵۰-۵۳۵ تا ۵۳۷
— آخرت میں وہ اپنے قصوروں کا خود اعتراف

Maktaba Tul Ishaat.com

کریں گے ۲۶
— ان کا انجام ۲۶- ۳۴- ۱۳۴- ۱۴۴- ۱۵۰-
۱۸۲- ۲۱۲- ۲۱۶- ۲۶۳- ۲۹۹-
۳۳۰- ۳۴۹- ۳۵۳- ۴۴۶- ۴۶۳- ۴۷۰-
۴۸۷- ۵۳۵- ۵۶۲- ۵۶۳- ۶۰۲- ۶۴۵
— ان کا انجام کسی افسوس کا مستحق نہیں ۵۸
کلمۂ طیبہ-اس کی تشریح ۴۸۴
— اس کو ماننے کے فوائد دنیا اور آخرت میں ۴۸۴ تا ۴۸۶
— کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کا تقابل ۴۸۴ تا ۴۸۵

گ

گمراہی-(دیکھو ’’ضلالت‘‘)
گناہ-اصل گناہ کیا ہے ۲۲
— گناہ کی حقیقت ۲۴
— اجتماعی گناہ کیا ہے ۵۰-۹۱-۹۲-۱۳۸
— وہ بڑے گناہ جن کے ساتھ کوئی نیکی نافع نہیں ہوتی ۱۳۵
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اخلاق‘‘)

ل

لباس-انسانی فطرت اس کا تقاضا کیوں کرتی ہے ۱۵-۱۹
— اس کا مقصد ۱۸
— وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے ۱۹-۲۰
— اس کی اخلاقی ضرورت طبعی ضرورت پر مقدم ہے ۱۹
— لباس تقویٰ کیا ہے ۱۹-۲۰
— لباس کے معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر ۱۹
— اس کے معاملے میں شیطان کے شاگردوں کی بنیادی غلط فہمی ۲۰
— عبادت کے وقت کیسا لباس ہونا چاہیے ۲۲
لعنت-اس کے معنی ۶۲۸
— خدا کی لعنت کے مستحق کیسے لوگ ہیں ۳۲-۲۱۲-
۳۳۱-۳۴۸-۳۶۶-۴۵۷
لوط علیہ السلام:
— ان کا قصہ ۵۱ تا ۵۳-۳۵۳-۳۵۵-۳۵۶ تا
۳۵۹-۵۱۱ تا ۵۱۵
— قوم لوط کا علاقہ ۵۱
— قوم لوط ہی کی بستیوں کو ’’موتفکات‘‘ کہتے ہیں
۲۱۳-۳۶۲
— وہ علاقہ آج تک تباہی کا عبرت ناک نمونہ بنا ہوا ہے ۵۱۵
— قوم لوط کی اخلاقی پستی ۵۱-۵۲-۵۳-۳۵۷-
۳۵۸-۵۱۱ تا ۵۱۴
— قوم لوط کے حق میں حضرت ابراہیم کی شفاعت رد کردی گئی ۴۸۹
— حضرت لوط کی بیوی کا انجام ۵۳-۵۱۱

م

متقی-(دیکھو ’’تقویٰ‘‘)
محسن-(دیکھو ’’احسان‘‘)
محمد صلی اللہ علیہ وسلم
— نبی اُمی ۸۴-۸۵-۸۶
— نذیر مبین ۱۰۴
— نذیر و بشیر ۱۰۶-۳۲۱-۳۲۷
— تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ۸۶-
۲۹۰
— اہل کتاب کو بھی آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ۸۴ تا ۸۶-۵۷۶-۵۸۷
— تورات و انجیل میں آپ کا ذکر خیر ۸۵
— آپ پر ایمان لانے والے ہی فلاح پائیں گے ۸۶
— آپ کی دعوت قبول کرنے کے نتائج ۳۲۲
— قبول نہ کرنے کے نتائج ۳۲۲-۳۲۳

— آپ کو اذیت دینے والے کا انجام ۲۰۹

— آخرت میں آپ ان سب لوگوں پر گواہ ہوں گے جن تک آپ کی دعوت پہنچی ہے ۵۶۴

— آپ کی نبوت کے دلائل ۱۰۴- ۱۰۵- ۲۷۲- ۲۷۳-۲۷۴-۳۷۸-۴۳۴-۴۳۵-۶۴۳

— آپ کی دعوت ۲۸۵-۲۶۳-۳۰۲-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۴۳۷-۴۴۱-۴۵۹-۴۶۴-۵۵۳

— آپ کی دعوت وہی تھی جو تمام انبیا علیہم السلام کی رہی ہے ۳۰۲-۳۳۰

— آپ کے لائے ہوئے دین کی بنیادی تعلیمات (دیکھو: ''اسلام'')

— کس کام کے لیے بھیجے گئے ۸۵-۱۹۰-۴۶۹

— کفار آپ کے کیوں مخالف تھے ۵۵۳-۶۲۱

— آپ کا کام صرف قرآن پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ اپنے قول و عمل سے قرآن کے منشا کی تشریح کرنا بھی تھا ۵۴۳-۵۴۴

— آپ کی بعثت ایک بڑی نعمت تھی ۴۷۴

— آپ کی بعثت کے معنی یہ تھے کہ اب اہل عرب کو خلافت کا موقع دیا جا رہا ہے ۴۷۱

— قریش سے آپ کا ارشاد کہ اگر تم میری دعوت مان لو تو عرب و عجم کے حکمران ہو جاؤ گے ۴۷۴-۴۷۵

— اہل عرب کو تنبیہ کہ اب تمھاری قسمت اس رویے پر منحصر ہے جو تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کرو گے ۴۷۸

— آپ کو دلیل نبوت کے طور پر قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ۱۱۳-۴۵۹

— معجزہ نہ دینے کی وجہ ۴۶۰

— کفار کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اور اس کے جوابات ۱۱۲ تا ۱۱۴- ۲۷۷- ۳۱۵- ۳۲۷- ۴۴۷- ۴۵۸- ۴۶۰- ۴۶۴- ۴۹۸- ۵۱۰-

۶۲۶- ۶۲۷- ۶۴۲- ۶۴۳- ۶۴۷

— آپ نبوت سے پہلے عقل و فکر کے صحیح استعمال سے توحید کی حقیقت پا چکے تھے ۳۳۰

— آپ نبوت سے پہلے وہ باتیں نہ جانتے تھے جو آپ کو وحی کے ذریعے سے بتائی گئیں ۳۴۴- ۳۸۳-۳۸۴

— آپ کا کام صرف وحی الٰہی کی پیروی کرنا تھا ۱۱۳- ۲۷۱-۲۷۲

— آپ عالم الغیب نہ تھے ۱۰۶-۲۲۸

— آپ کو قیامت کے وقت کا علم نہ تھا ۱۰۵

— خود اپنے نفع و نقصان کے مختار نہ تھے ۱۰۶-۲۹۰

— آپ کی بشریت ۲۶۰-۵۴۲-۶۴۳

— اس روایت پر بحث جس میں آپ پر جادو کا اثر ہونے کا ذکر ہے ۶۴۷-۶۴۸

— کفار کے مقابلے میں آپ کی استقامت اللہ کی توفیق سے تھی ۶۴۳

— آپ کی زندگی قبل نبوت ۲۷۲-۲۷۳

— بعثت سے پہلے آپ کے متعلق اہل مکہ کے خیالات ۲۷۳-۳۵۰

— آپ نے کبھی جاہلیت کے قوانین کی پیروی نہیں کی ۴۲۳

— نبوت کے کام میں بالکل بے غرض تھے ۴۳۴- ۴۳۵

— آپ کی بصیرت ۱۷۰

— شجاعت ۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۸۵-۱۹۶

— فیاضی و فراخ حوصلگی ۱۸۶-۲۲۰

— خلق خدا سے محبت اور خیر خواہی ۲۵۵-۳۲۰

— آپ کی صفات بحیثیت ایک رہنما اور سردار قوم کے ۲۰۹-۲۴۵-۲۴۸

— آپ کی صفات بحیثیت ایک مدبر کے ۱۶۹-۱۷۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— آپ کی صفات بحیثیت ایک سپہ سالار کے ۱۶۹
— آپ نے عرب میں اسلامی احکام کو کس طرح بتدریج رائج کیا ۴۲۳
— وہ نقصانات جو آپ کو دعوت حق کے لیے اٹھانے پڑے ۵۱۷
— وہ ہدایات جو آپ کو تبلیغ حق کے لیے دی گئیں ۱۱۰ تا ۱۱۵- ۲۸۲- ۳۷۱- ۴۰۳- ۴۰۴- ۴۳۵- ۵۱۶ تا ۵۱۹- ۵۸۱ تا ۵۸۳- ۵۸۷- ۵۲۳- ۶۲۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''دعوت حق'')
— خدا کی طرف سے آپ کو مقام محمود پر پہنچانے کا وعدہ ۶۳۷
— مکہ میں آپ کی اور کفار قریش کی کشمکش ۴۲- ۵۸- ۶۳- ۱۰۴- ۱۰۵- ۱۰۹- ۱۱۰- ۱۴۰- ۱۴۱- ۳۲۳- ۳۲۷- ۴۹۹- ۵۱۷- ۵۱۹- ۵۳۴- ۶۳۲- ۶۳۳- ۶۵۱
— آپ کی دعوت پر ان کی حیرانی ۲۶۰
— وہ آپ کی قدر نہ پہچانتے تھے ۶۴۴- ۶۴۶
— ان کے الزامات، اعتراضات، شبہات اور وجوہ مخالفت ۱۰۴- ۲۶۱- ۲۷۱- ۳۲۵- ۳۳۴- ۳۳۷- ۴۳۷- ۴۶۴- ۴۶۵- ۴۶۶- ۴۹۸- ۵۲۳- ۵۲۵- ۵۳۹- ۵۴۳- ۵۵۳- ۵۷۳- ۵۷۴- ۵۷۸ تا ۵۸۱- ۶۲۱- ۶۲۴- ۶۲۵- ۶۴۱- ۶۴۷- ۶۴۸
— آغاز بعثت میں مکہ کا ہفت سالہ قحط اور اس زمانے میں نیز اس کے بعد کفار کا رویہ ۶۰- ۲۶۹- ۲۷۷- ۲۷۸- ۵۷۷
— کفار کی ہٹ دھرمیاں ۶۰- ۲۷۷- ۲۷۸- ۲۹۹- ۳۰۰- ۴۳۴- ۴۳۵- ۴۴۰- ۵۰۰
— آپ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے ان کی چالیں ۵۳۴
— آپ کے ساتھ ان کا رویہ برادران یوسف کے رویے سے مشابہ تھا ۳۷۸- ۳۷۹
— ان کا مطالبہ کہ دین میں کچھ ترمیم کر کے آپ ان کے ساتھ مصالحت کر لیں ۶۴۲
— ان کا بار بار چیلنج کے طور پر آپ سے نزول عذاب کا مطالبہ اور اس کے جوابات ۱۴۲- ۳۲۵- ۴۴۷- ۵۲۲- ۵۲۵- ۶۰۳
— آپ کو جھٹلا دینے کے باوجود اہل مکہ پر عذاب کیوں نہ آیا ۱۴۲- ۶۰۳
— کفار آپ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کیوں ڈرتے تھے ۳۶۴
— مکی دور میں اسلام اور مسلمانوں کا حال ۱۱۸- ۱۱۹- ۱۳۸- ۵۷۵
— اس دور میں ایمان لانے والے زیادہ تر نوجوان تھے ۳۰۴
— وہ دعا جو اس دور کے انتہائی سخت زمانے میں آپ کو سکھائی گئی ۶۳۷- ۶۳۸
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو صبر و ثبات کی تلقین ۳۱۸- ۳۲۷
— واقعۂ معراج اور اس کا تاریخی پس منظر ۵۸۶- ۵۸۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''معراج'')
— مکی دور میں دعوت اسلامی کا کتنا اور کیا کام ہوا ۱۱۸- ۱۱۹- ۵۸۶
— مکی دور کے آخری زمانے میں اسلامی نظام حیات کا منشور جو آپ نے خدا کی طرف سے پیش کیا ۶۰۸ تا ۶۱۷
— عرب کے راست باز لوگ آپ کی دعوت کا استقبال کس طرح کر رہے تھے ۵۳۷
— مدنی دور کا آغاز کس طرح ہوا؟ ۱۱۹ تا ۱۲۲

— بیعت عقبہ ۱۲۰-۱۲۱

— ہجرت ۱۲۰-۱۲۱-۱۹۵

— غار ثور کا واقعہ ۱۹۵

— کفار مکہ آپ کی ہجرت کو کیوں خطرناک سمجھتے تھے ۱۲۱-۱۲۲

— ہجرت کے اثرات و نتائج ۱۲۱

— اہل مدینہ کو کفارہ کا الٹی میٹم اور مسلمانوں کے لیے حج کی بندش ۱۲۲

— ہجرت کے بعد کفار مکہ نے مسلمانوں کو کس کس طرح تنگ کرنے کی کوشش کی ۱۲۲

— ہجرت کے بعد آپ کی تدابیر ۱۲۲-۱۵۲-۱۶۴

— ہجرت کے بعد مدینے کی ترقی ۲۱۷

— قریش سے جنگی چھیڑ چھاڑ کی ابتدا ۱۲۳

— جنگ بدر (دیکھو: ''جنگ بدر'')

— صلح حدیبیہ کے ٹوٹ جانے کے بعد آپ نے کن وجوہ سے مکہ پر اچانک حملہ کر دیا ۱۵۴

— فتح مکہ اور قریش کی آخری شکست ۱۶۷

— غزوۂ تبوک (دیکھو: ''جنگ تبوک'')

— تبوک کے سفر میں ثمود کے آثار قدیمہ پر آپ کا ورود اور مسلمانوں کو ان سے عبرت دلانا ۴۸

— تبوک کے سفر میں آپ کو شہید کرنے کے لیے منافقین کی سازش ۲۱۶

— عرب پر غلبہ اسلام کی تکمیل کے آخری مراحل ۱۶۷-۱۶۹-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۴-۱۷۵-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۵-۱۸۶

— شرک و مشرکین کے لیے آپ کے آخری اقدامات ۱۷۲

— رسوم جاہلیت کا استیصال ۱۷۲-۱۷۴-۱۹۲

— مشرکین کے حج کی بندش ۱۷۴-۱۸۶

— حجۃ الوداع ۱۷۴-۱۹۳

— حج کے قدیم طریقوں کی اصلاح ۱۷۴

— کعبہ کی تولیت سے مشرکین کی بے دخلی ۱۸۲-۱۸۳

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''نبوت'')

مدین:

— اصحاب مدین ۲۱۳

— اصحاب الایکہ ۵۱۵

— علاقہ اور تاریخ ۵۴-۵۱۵

— مدین کے لوگ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں ۳۹۰-۴۰۳

— ان کی اخلاقی و مذہبی حالت ۵۴-۵۵-۳۵۹-۳۶۰

— ان کی اصل گمراہی کیا تھی ۵۵-۳۶۰-۳۶۱

— حضرت شعیبؑ کی رہنمائی قبول نہ کرنے کے لیے ان کے عذرات ۵۷

— ان کا عبرت ناک انجام ۵۸-۳۶۵

مدینہ - (دیکھو ''انصار''، ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم''، ''منافقین'' اور ''یہود'')

مذاہب:

— مذہبی تفرقہ و اختلاف کی اصل ۲۷۶-۵۶۸

— ان اختلافات کی حقیقت قیامت کے روز کھولی جائے گی ۳۱۱-۳۷۰-۵۶۸

— ان کا فیصلہ موجودہ دنیوی زندگی میں کیوں نہیں کر دیا جاتا ۲۷۶

— مذہبی تحقیقات کے غلط طریقوں پر قرآن کی گرفت اور صحیح طریقے کی رہنمائی ۲۹۶-۲۹۷

— مذاہب باطلہ کے خلاف قرآن کے دلائل ۲۰-۲۱-۲۳-۲۸۳ تا ۲۸۵

مساجد اللہ - مشرک اور کافر ان کے متولی نہیں ہو سکتے ۱۸۲

— ان کی تولیت کے مستحق کون لوگ ہیں ۱۸۳

— ان میں مشرکین کے داخلے کا شرعی حکم ۱۸۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— نماز پڑھنے کے قابل وہ مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو نہ کہ وہ جو فتنہ پردازی کے لیے بنائی جائے ۲۳۲

مسجد اقصیٰ - ۵۸۸

مسجد حرام - ۵۸۸

— کفار اس کے متولی نہیں ہو سکتے ۱۴۲-۱۴۳

— اس کے جائز متولی صرف اہل تقویٰ ہیں ۱۴۳

— مشرکین اس کی تولیت سے عملاً بے دخل کیے جاتے ہیں ۱۷۲-۱۸۲

— مشرکین کے لیے اس کے قریب جانا بھی ممنوع ہے ۱۸۶

مسجد ضرار (دیکھو ''جنگ تبوک'' اور ''منافقین، جنگ تبوک کے موقع پر ان کا رویہ'')

مسرف - کیسے لوگ مسرف ہیں ۳۰۶

مسکنت - معنی اور تشریح ۲۰۵

(مسکین کی تعریف کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'')

مسیح - (دیکھو: ''عیسیٰ علیہ السلام'')

مسیحی، مسیحیت (دیکھو: ''عیسائیت'')

مشرک (دیکھو: ''شرک'')

مشرکین عرب (دیکھو: ''شرک'' اور ''عرب'')

مشیت الٰہی (دیکھو: ''تقدیر'')

مصلح، مصلحین - کیسے لوگ ہیں ۹۴

معجزات - معجزے کی حقیقت ۶۵

— معجزات کے برحق ہونے کی دلیل ۶۶

— معجزے اور جادو کا فرق ۶۸-۶۹-۷۲-۶۲۸

— معجزات کو طبعی اور عادی واقعات ثابت کرنے والوں کی غلطی ۶۵

— معجزات کی وہ خاص قسم جو دلیل نبوت کے طور پر دی جاتی ہے ۶۲۶

— انبیا کو معجزے کس لیے دیے جاتے ہیں ۶۵-۶۲۶

— حضرت صالح کی اونٹنی کا معجزہ ۴۸-۴۹-۵۰-۳۵۲-۶۲۶

— حضرت ابراہیم کے ہاں بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش ۳۵۴-۵۱۰

— حضرت یوسفؑ کا معجزہ ۴۲۸

— وہ معجزات جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے ۶۵-۶۸-۹۶-۷۲-۷۳-۸۷-۶۴۶ تا ۶۴۸

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دلیل نبوت کے طور پر صرف قرآن کا معجزہ دیا گیا ۱۱۳-۴۵۹

— حضورؐ کو حسی معجزہ کے بجائے عقلی معجزہ دینے کی وجہ ۴۶۰

— کفار مکہ کی طرف سے معجزات کے پیہم مطالبات اور ان کے جوابات ۱۱۲ تا ۱۱۴-۲۷۷-۳۱۵-۳۲۷-۴۴۷-۴۵۸-۴۶۰-۴۶۴-۴۹۸-۵۱۰-۶۲۶-۶۲۷-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۷

معراج - اس کا زمانہ اور حالات ۵۸۶

— اس کی تفصیلات جو احادیث میں آئی ہیں ۵۸۸-۵۹۰

— حدیث کی تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں ہیں ۵۸۸

— وہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھی ۵۸۹

— اس کے امکان کی بحث ۵۸۹

— منکرین حدیث کے اعتراضات اور ان کا جواب ۵۸۹

— تمام انبیا کو اس طرح کے مشاہدات کرائے گئے ہیں ۵۹۰

— اس کے لیے رؤیا کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے ۶۲۷

مغفرت - کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۲-۱۳۰-۱۶۰-۱۶۳-۳۲۶

— کیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے ۲۱۹

— مغفرت کی شرط ۱۴۰-۱۴۴

— مشرک کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں ۲۴۱

مقام محمود- اس سے کیا مراد ہے ۶۳۷

مکہ- (دیکھو ''ابراہیم'' علیہ السلام، ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم، ''قریش'')

ملائکہ- (دیکھو ''فرشتہ'')

منافق، منافقین:

— ان کی صفات اور طرز عمل ۱۳۶- ۱۳۷- ۱۹۹- ۲۰۱- ۲۰۲- ۲۰۳- ۲۱۰- ۲۱۱- ۲۱۷- ۲۱۸- ۲۲۶- ۲۲۷

— وہ اصل میں کافر ہیں ۱۹۹- ۲۰۱- ۲۰۲- ۲۱۱- ۲۱۶- ۲۱۹- ۲۲۰- ۲۲۱- ۲۲۲- ۲۳۱- ۲۳۵- ۲۵۲- ۲۵۳

— وہ فاسق ہیں ۲۰۱- ۲۱۲- ۲۱۹- ۲۲۰- ۲۲۵

— منافقت ایک گندگی ہے ۲۲۵- ۲۵۳

— اسباب نفاق ۲۱۷- ۲۱۸- ۲۲۶- ۲۵۰- ۲۵۴

— قرآن کا مطالعہ منافق کی گندگی میں الٹا اضافہ کرتا ہے ۲۵۳

— منافقت کے اثرات انسانی سیرت پر ۲۳۵

— مومن اور منافق کا فرق ۲۱۴

— گناہ گار مومن اور منافق کا فرق ۲۲۹

— مومن اور منافق کا فرق کیسے کھلتا ہے ۲۵۳

— نماز با جماعت منافق کو مومن سے الگ نمایاں کر کے رکھ دیتی ہے ۲۰۱

— منافق اور گناہ گار مومن کا فرق کیسے معلوم کیا جائے ۲۳۰

— اسلامی معاشرے میں منافقین کے شامل رہنے کا نقصان ۱۹۸- ۲۲۵- ۲۵۲

— منافقین مدینہ کی اخلاقی و ذہنی حالت ۲۰۳- ۲۰۴- ۲۰۹- ۲۲۶- ۲۲۷- ۲۲۸- ۲۳۲- ۲۵۳- ۲۵۴

— جنگ بدر کے موقع پر ان کا رویہ ۱۲۶- ۱۵۰

— جنگ تبوک کے موقع پر ان کا رویہ ۱۶۹- ۱۷۰- ۱۹۶- ۱۹۷- ۱۹۸- ۱۹۹- ۲۰۰- ۲۰۱- ۲۱۰- ۲۱۶- ۲۱۷- ۲۱۸- ۲۱۹- ۲۲۲- ۲۲۴- ۲۲۵- ۲۳۱ تا ۲۳۴

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے اعتراضات ۲۰۳- ۲۰۴- ۲۰۸- ۲۰۹

— ان کی سرکوبی کے لیے قرآن کے آخری احکام ۱۷۲

— ان کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدابیر ۱۷۳- ۲۱۵- ۲۲۰- ۲۲۱

— ان کے ساتھ اسلامی سوسائٹی میں کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ ۲۱۵- ۲۱۶- ۲۲۰- ۲۲۵- ۲۲۹- ۲۵۲

— ان کے بارے میں اسلامی حکومت کی پالیسی ۲۱۵- ۲۵۲

— منافق کا انفاق فی سبیل اللہ مقبول نہیں ۲۰۱

— اس کے لیے مغفرت نہیں ہے ۲۱۹

— منافقین کا انجام ۲۰۲-۵- ۲۰۹- ۲۱۱- ۲۱۲- ۲۱۶- ۲۱۷- ۲۲۱- ۲۲۵- ۲۲۸- ۲۵۳

منکر- معنی اور تشریح ۵۶۶

من وسلوی- ۸۷

موسیٰ علیہ السلام ۶۳ تا ۸۸- ۳۰۱ تا ۳۱۰- ۳۳۰- ۳۶۵- ۳۶۶- ۳۷۰- ۳۸۲- ۳۸۳- ۴۷۱ تا ۴۷۴- ۶۴۶ تا ۶۴۹

— آپ کا زمانہ ۶۴

— زندگی قبل نبوت ۶۷

— شخصیت اور قابلیتیں ۶۷

— بعثت کے وقت بنی اسرائیل کی حالت ۳۰۴- ۳۰۵

— آپ کی دعوت ۶۵

— بعثت کا مقصد ۳۰۲- ۳۰۳- ۴۷۱

— وہ معجزات جو آپ کو دیے گئے ۶۵- ۶۸- ۶۹- ۷۲- ۷۳- ۸۷- ۶۴۶ تا ۶۴۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— مصر میں آپ نے بنی اسرائیل کی تنظیم کس طرح کی ۳۰۷
— فرعون کو آپ سے سیاسی انقلاب کا خطرہ کیوں لاحق ہوا ۶۶-۳۰۳-۳۰۴
— اس نے آپ کے مقابلے میں جادوگروں کو کیوں بلوایا ۶۸-۶۹
— جادوگروں سے مقابلہ ۶۸ تا ۷۰-۳۰۳-۳۰۴
— ان کا ایمان لانا اور یکایک ان کے اندر ایک اخلاقی انقلاب واقع ہوجانا ۶۹-۷۰
— فرعون کے حق میں آپ کی بددعا ۳۰۸
— مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلتے ہیں ۷۴-۳۰۹
— بنی اسرائیل کے ساتھ غیر اسرائیلی مسلمانوں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی ۴۳۰
— سمندر پار کرنے کی جگہ ۷۴
— بنی اسرائیل آپ سے ایک مصنوعی خدا مانگتے ہیں ۷۴-۷۵
— آپ کو شریعت اور کتاب عطا کی جاتی ہے ۷۶-۷۸-۵۹۰
— اللہ کو دیکھنے کی درخواست اور پھر اس جسارت پر توبہ ۷۷
— اللہ تعالیٰ کا آپ سے کلام کرنا ۷۷-۷۸
— حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بناتے ہیں ۷۷
— آپ کے پیچھے بنی اسرائیل کا بچھڑے کو معبود بنالینا ۸۰-۸۱
— دشت سینا میں پہلی مرتبہ بنی اسرائیل کی مردم شماری کراتے ہیں ۴۳۰
— آپ کا آخری خطبہ اور بنی اسرائیل کو وصیتیں ۴۷۲ تا ۴۷۴۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'')

مومن-(دیکھو ''ایمان'')

مہاجرین-جنگ بدر میں ان کی جان نثاری ۱۲۴-۱۲۶

میثاق-معنی اور تشریح ۱۶۲

میزان-قیامت کے روز اعمال تولے جانے کا مطلب ۹

ن

نبوت-وہ ایک وہبی چیز ہے نہ کہ کسبی ۵۲۵
— ہر امت کے لیے ایک رسول ہے ۲۸۹-۴۴۷
— انسان اس کی رہنمائی کا کیوں محتاج ہے ۱۸-۲۰-۵۲۷-۵۲۸
— اس کے حق میں عقلی دلائل ۲۶۱-۵۲۷-۵۲۸-۵۳۰
— تمام انبیا انسان تھے ۴۲-۴۵-۳۳۳-۳۳۵-۴۳۷-۴۶۴-۴۷۶-۴۷۷-۵۴۲
— دنیا میں ہمیشہ جاہل لوگوں نے اپنے جیسے انسانوں کو نبی ماننے سے انکار کیا ہے ۴۲-۴۵-۲۶۱-۳۳۳-۳۳۴-۳۷۶-۶۲۵-۶۴۴
— وہ حکمت جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نبوت کا طریقہ اختیار فرمایا ۵۲۸-۵۲۹-۵۴۳
— انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے ۶۴۴
— نبوت کسی کو عطا کرنا اللہ کی نعمت کا اتمام اور اللہ کی رحمت ہے ۳۸۵-۶۴۱
— سچے نبی اور جھوٹے نبی کا فرق ۲۷۵
— نبی کی صداقت کن باتوں سے پہچانی جاتی ہے ۳۳۵-۳۴۶-۳۶۲-۴۳۴-۴۳۵-۴۴۷-۴۶۰
— جھوٹا مدعی نبوت سب سے بڑا ظالم ہے ۲۵-۲۷۴
— نبی کی خطابت اور دنیا پرستوں کی خطابت کا فرق ۲۶۱
— نبی اور فلسفی کا فرق ۵۹۰
— نبی اور جادوگروں کا فرق ۳۰۳
— نبوت سے پہلے انبیا کی زندگی کیسی ہوتی تھی

۴۷۷-۴۷۸
— نبوت سے پہلے تمام انبیا عقل سلیم کے صحیح استعمال سے توحید کی حقیقت پا چکے ہوتے تھے ۳۳۰-۳۳۴-۳۵۱-۳۶۱
— قبول وحی کے لیے نبی کو کس طرح تیار کیا جاتا ہے ۶۷
— انبیا کو وہ علم دیا جاتا ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا ۴۲
— نبی کو اللہ حقیقت شناس اور معاملہ فہم بناتا ہے ۳۸۵
— انبیا کو حکم اور علم عطا ہوتا ہے ۳۹۲
— وہ تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں ۴۰۱
— انبیا کو حقائق کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے ۵۹۰
— انبیا کس چیز میں عام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں ۴۷۷
— انبیا پر صرف وہی وحی نہیں آتی جو تبلیغ کے لیے ہو بلکہ ان کو دوسری ہدایات بھی ملتی ہیں ۳۳۷
— نبی خدا کا برگزیدہ ہوتا ہے ۳۸۵
— انبیا کی غیر معمولی قوتیں ۴۲۸
— انبیا عالم الغیب اور فوق البشری صفات کے مالک نہیں ہوتے ۳۳۵
— انبیا غیب کی باتیں بس اتنی ہی جانتے ہیں جتنی اللہ تعالیٰ انھیں بتاتا ہے ۴۲۹
— عصمت انبیا کی حقیقت ۳۴۳-۳۴۴-۳۹۳-۴۲۱
— لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنا نبی کا کام نہیں ۴۲۳-۴۲۴
— نبی کی ذمہ داری کس حد تک ہے ۵۳۹
— نبی کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ ضرور لوگوں کو راہ راست پر لا کر ہی چھوڑے ۳۱۸-۳۳۴-۳۶۰-۶۴۹
— نبی کو مذکر کس معنی میں کہا جاتا ہے ۹۹
— نبی کا کام صرف وحی الٰہی کی پیروی کرنا ہے ۳۱۸
— نبی کا کام کیا ہے اور کیا نہیں ہے ۴۴۷-۴۴۸-
۴۶۹-۵۲۵-۶۴۴
— انبیا کی بعثت کا مقصد ۳۸-۹۸-۹۹-۱۹۰
— انسانیت کے لیے نبی کی بعثت وہی حیثیت رکھتی ہے جو زمین کے لیے بارش کی ہے ۳۹-۴۰
— انسانیت کی فلاح کا انحصار انبیا کی پیروی پر ہے ۲۵
— نبی کی آمد ایک قوم کی قسمت کے فیصلے کی ساعت ہوتی ہے ۲۸۹-۲۹۰
— نبی کی پیروی کے بغیر خدا پرستی کے کوئی معنی نہیں ۲۳۷
— انبیا قابل اعتماد ہوتے ہیں ۴۵
— اپنی قوم کے خیر خواہ ہوتے ہیں ۴۲-۴۵-۵۰-۵۸
— وہ کوئی بات خلاف حق نہیں کہتے ۶۴
— نبی اپنے کام میں بے غرض ہوتا ہے ۳۰۰-۳۳۵-۳۴۵
— انبیا کی دعوت ۳۰۳-۵۴۰
— تمام انبیا کی تعلیم و دعوت ایک تھی ۴۰-۴۱-۴۴-۴۵-۴۷-۵۴-۵۵-۷۵-۳۰۰-۳۰۲-۳۳۳-۳۴۵-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۹-۳۷۹-۴۰۱-۴۷۶-۵۲۵-۵۳۹-۵۴۰
— تمام انبیا کا دین ایک تھا ۴۰۳
— کوئی نبی کسی نئے مذہب کا بانی نہ تھا ۴۰۳
— تمام انبیا اپنی قوم کی زبان ہی میں خدا کا پیغام لاتے تھے ۴۷۰
— انبیا کا یہ کام نہیں تھا کہ قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کی پیروی کریں ۴۲۱-۴۲۲
— انبیا کافر حکومتوں کی اطاعت کے لیے نہیں آتے تھے ۶۷
— انبیا صرف ”مذہب“ کی نہیں بلکہ پورے نظام زندگی کی اصلاح کے لیے آتے تھے ۶۷-۴۲۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— خدا کی اطاعت کے ساتھ نبی کی اطاعت کا حکم ۱۲۸-۱۳۶-۱۳۷-۱۴۸-۲۱۳-۲۱۴
— انبیا کو معجزے کس غرض کے لیے دیے گئے ۶۵-۶۲۶
— نبی خود معجزے دکھانے پر قادر نہیں ہوتا ۴۶۴-۴۷۷
— نبی کا فرض ہے کہ بے خوف ہو کر اپنی دعوت پیش کرے ۶
— انبیا کے درمیان مراتب کا فرق ہے ۶۲۴
— ایک رسول کی نافرمانی تمام رسولوں کی نافرمانی ہے ۳۴۸
— نبوت کی اہلیت ۸-۳۹۳-۶۰۵-۶۰۶
— اس سوال کا جواب کہ جس شخص کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی اس کی پوزیشن کیا ہے ۶۰۶
— جو قوم براہ راست نبی کی مخاطب ہو اس کی پوزیشن ان قوموں سے مختلف ہے جنھیں بالواسطہ پیغام پہنچے ۴۳
— نبی کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے ۱۳۴
— نبی کو جھٹلانے والے عذاب کے مستحق ہیں ۵۴۹
— انبیا کی مخالفت کر کے کوئی قوم تباہی سے نہیں بچ سکتی ۶۲۴
— نبی کے جھٹلانے والوں پر عذاب کیوں نازل ہوتا ہے ۱۴۲
— نبی کن حالات میں بد دعا کرتا ہے ۳۰۸
— مجرمین نے ہمیشہ انبیا کا مذاق اڑایا ہے ۴۹۹
— نبی کو اذیت دینے کا انجام ۲۰۹
— نبی کے ساتھ منافقانہ روش برتنے کا انجام ۵
— اللہ اور رسول کا مقابلہ کرنے والوں کا انجام ۲۰۹
— ہلاک ہونے والی قوموں نے انبیا کا استقبال کس طرح کیا ہے ۴۷۵ تا ۴۷۸
— انبیا کے جھٹلانے والوں کا برا انجام ۲۵-۴۲-۴۷-۵۰-۵۳-۵۷-۵۹-۶۱-۲۱۳-۲۷۰-۲۷۲-۲۷۴-۳۰۰-۳۴۱-۳۴۸-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۹-۳۶۵-۴۳۷-۴۳۸-۴۶۱-۴۷۸-۵۱۵-۵۱۶-۵۴۰-۵۷۷
— انبیا کی بات نہ ماننے والوں کو آخرت میں پچھتانا پڑے گا ۳۵-۲۹۱-۴۹۱
— آخرت میں ثابت ہو جائے گا کہ انبیا ہی برحق تھے ۳۱-۳۵
نسی - اس کی تشریح ۱۹۳-۱۹۴
— اس کا انسداد ۱۷-۱۹۲-۱۹۴
نصاریٰ - (دیکھو ”عیسائیت“)
نفاق - (دیکھو ”منافق“)
نفل - معنی اور تشریح ۱۲۹-۶۳۷
نماز - ۹۴-۱۳۰-۱۸۳-۲۱۳-۴۵۶-۴۹۰
— شکر نعمت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے ۴۸۷
— اس کے اخلاقی و روحانی فوائد ۱۷ ۳
— اس کی اخلاقی و اجتماعی اہمیت ۳۶۰
— اس کی اہمیت اسلامی نظام زندگی میں ۳۰۷-۳۰۸
— اس کی اہمیت تحریک اقامت دین میں ۳۷۱-۵۱۹-۵۸۷-۶۳۴
— اس کی اہمیت اسلام کے دستوری قانون میں ۱۷۹
— اس کی اہمیت اسلام کے جنگی قانون میں ۱۷۷
— اس پر طعن کرنا جاہلوں کا پرانا شیوہ ہے ۳۶۰
— اقامت صلوٰۃ کے مفہوم میں نماز باجماعت شامل ہے ۳۰۸
— نماز باجماعت مومن اور منافق کا فرق کھول دیتی ہے ۲۰۱
— پنج وقتہ نماز کی فرضیت ۵۸۷-۵۸۸-۶۳۵-۶۳۷
— نماز کے اوقات ۳۷۱-۶۳۴ تا ۶۳۷

— اوقات نماز کی حکمتیں ۶۳۶
— نماز کے اجزا و ارکان کے متعلق قرآن کے اشارات ۶۳۴-۶۳۵
— نماز فجر کی اہمیت ۶۳۵
— نماز فجر میں طول قراءت کی حکمت ۶۳۵
— تہجد، اس کی فضیلت، اس کے فوائد اور اس کی شرعی حیثیت ۶۳۵ تا ۶۳۷
— نماز میں قراءت خلف الامام کا مسئلہ ۱۱۴
— منافق کی نماز جنازہ جائز نہیں ۲۲۰
— فساق و فجار کی نماز جنازہ قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو نہ پڑھنی چاہیے ۲۲۱
— مکے میں نماز آہستہ پڑھنے کا حکم کس لیے دیا گیا تھا ۶۵۰-۶۵۱

نوح علیہ السلام -۲۱۳-۳۶۲-۴۷۵-۶۰۶
— ان کا قصہ ۴۰ تا ۴۴-۲۹۹ تا ۳۰۱-۳۳۳ تا ۳۴۴
— اس کے بیان کرنے کا مقصد ۴۰-۲۵۹-۲۶۰-۲۹۹-۳۳۴-۳۳۷
— قوم نوح کس علاقے میں آباد تھی ۴۰
— حضرت نوح کی تعریف ۵۹۱
— نبوت سے پہلے اپنی عقل و فکر سے توحید کی حقیقت جان چکے تھے ۳۳۴
— منصب نبوت پر سرفرازی ۴۰-۳۳۳
— ان کی دعوت ۴۰-۴۱-۳۳۳
— ان کا مذہب بھی اسلام ہی تھا ۳۰۰
— ان کا اقرار کہ نہ میں علم غیب رکھتا ہوں نہ فوق البشری قوتوں کا مالک ہوں ۳۳۵
— ان کی قوم کا یہ خیال کہ ہم اپنے جیسے انسان کو نبی کیسے مان لیں ۴۲-۳۳۳
— ان کی قوم کی اصل گمراہی کیا تھی ۴۱-۳۳۳-۳۳۴
— ان پر صرف نوجوان اور غریب لوگ ہی ایمان لائے ۳۳۳-۳۳۴
— عذاب کے لیے قوم کا مطالبہ ۳۳۶
— کشتی بنانے کا حکم ۳۳۷
— کشتی خاص اللہ کی نگرانی میں بنائی گئی ۳۳۷
— کشتی بناتے دیکھ کر قوم کے لوگ حضرت نوح کا مذاق اڑاتے تھے ۳۳۸
— ایک تنور سے طوفان کی ابتدا ۳۳۹
— طوفان کی کیفیت ۳۳۹
— کشتی میں کون کون سوار کیے گئے ۳۳۹
— کشتی کے تمام سوار ہونے والے بچا لیے گئے اور وہی زمین میں آباد ہوئے ۴۲-۳۰۰
— حضرت نوح کی بیوی اور ان کے بیٹے کا مبتلائے عذاب ہونا ۳۴۰
— پسر نوح کا حال ۳۴۰ تا ۳۴۳
— کشتی کے ٹھیرنے کی جگہ اور جودی کی جائے وقوع ۴۰-۳۴۱
— کیا طوفان نوح عالمگیر تھا؟ ۳۴۱-۳۴۲
— طوفان نوح کی روایت دنیا بھر کی قوموں میں پائی جاتی ہے ۴۱
— تمام انسان ان لوگوں کی اولاد ہیں جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیے گئے تھے ۵۹۱
— یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوئی کہ تمام موجودہ انسان صرف حضرت نوح کی اولاد ہیں ۳۴۰

و

وراثت -(دیکھو "قانون اسلام")

Maktaba Tul Ishaat.com

وراثت زمین - اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بناتا ہے۶۱-۷۱-۷۴

وحی - بمعنی القائے خیال ۳۸۸
— غیر نبی کی طرف وحی ۳۸۸
— ملائکہ کی طرف وحی ۱۳۳
— وحی اور القاوالہام کا فرق ۵۵۱-۵۵۲
— لفظ وحی کا استعمال کن کن معنوں میں ہوتا ہے ۵۵۱-۵۵۲
— انبیا کی طرف وحی رسالت ۲۶۰-۴۳۷
— وحی رسالت کے لیے لفظ روح کا استعمال ۵۲۴-۵۲۵-۶۳۹
— وحی رسالت خدا کی رحمت ہے ۳۴۴-۳۵۱
— باران رحمت سے اس کی مشابہت ۴۵۳
— وحی رسالت کے لیے محض ''علم'' عطا کرنے کی اصطلاح ۳۹۲
— انبیا پر صرف وہی وحی نہیں آتی جو خلق تک پہنچانے کے لیے ہو بلکہ دوسری ہدایات بھی ملتی ہیں ۶۸-۸۷-۳۰۷-۳۳۷
— قرآن کا نزول بذریعۂ وحی ۱۷۱-۳۲۶-۳۴۴-۳۸۳-۴۴۴-۴۵۹

ولی - انسان جس کی بھی بے چون وچرا اطاعت کرے اس کو وہ اپنا ولی بناتا ہے ۷
— اللہ کے سوا کسی کو اپنا ولی نہ بناؤ ۷
— ایمان نہ لانے والوں کا ولی شیطان ہوتا ہے ۱۹
— اللہ ہی صالحوں کا ولی ہے ۱۰۹
— تمام متقی اہل ایمان اللہ کے ولی (بمعنی دوست) ہوتے ہیں ۲۹۵
— ''ولی'' کی تشریح ایک دستوری اصطلاح کی حیثیت سے ۱۶۱

ھ

ہارون علیہ السلام - ۶۹-۱۰۳
— حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں ان کی جانشینی کرتے ہیں ۷۷
— ان کی خلافت کے زمانے میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کو معبود بنانا ۸۱
— ان پر یہود کا جھوٹا الزام ۸۱

ہجرت - دنیا اور آخرت میں اس کا اجر ۵۴۲-۵۷۶
— ہجرت حبشہ ۵۴۲
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے لیے دیکھو ''محمد'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
— ہجرت کے قانونی اثرات ونتائج کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، دستوری قانون''

ہدایت - اس کا وسیع مفہوم ۷-۲۸۳-۲۸۴
— ہدایت حق کے معنی ۲۸۳-۲۸۴
— انسان کو صحیح رہنمائی صرف اللہ کی نازل کردہ تعلیم ہی میں مل سکتی ہے ۷-۲۸۳-۲۸۵
— اللہ کی رہنمائی کے بغیر کسی کو ہدایت نہیں مل سکتی ۳۱-۱۰۲-۱۰۵
— اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۲۶۸
— ہدایت دینا اللہ کا کام ہے ۵۴۰
— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۶۴۵
— اللہ کیسے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے ۲۶۸
— وہ کیسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۵۴۰
— ہدایت پانے والے کون ہیں ۱۸۳
— آخرت کے منکر ہدایت پانے والے نہیں ہیں ۲۸۹
— حصول ہدایت کی لازمی شرطیں ۲۶۴-۲۶۵
— ہدایت پانے کی واحد صورت ایمان اور اتباع رسول

ہے ۸۶

— ہدایت اختیار کرنے والا خود اپنا بھلا کرتا ہے ۳۱۸-۶۰۴

ہوٰی - اتباع ہوٰی کے نتائج ۱۰۰-۱۰۱

ہود علیہ السلام - ان کا قصہ ۴۴ تا ۴۷ - ۳۴۵ تا ۳۴۹

— ان کی تعلیم ۴۴-۴۵

— قوم ہود ۳۶۲

ی

یتیم - یتامٰی کے حقوق ۶۱۵

— ان کے حقوق و مفاد کی حفاظت اسلامی ریاست کے فرائض میں داخل ہے ۶۱۵

یحیٰی علیہ السلام - ان کے زمانے میں یہودیوں کی اخلاقی و مذہبی اور سیاسی حالت ۶۰۱

— ان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کیا گیا ۶۰۱

الیسع علیہ السلام - ان کا زمانہ اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے ان کی مساعی ۵۹۷

یعقوب علیہ السلام - ان کی پیدائش کی بشارت ۳۵۴

— فلسطین میں ان کی جائے قیام ۳۸۱

— ان کی اعلیٰ درجے کی بصیرت ۳۸۵-۳۸۹-۴۱۷-۴۱۸-۴۲۶

— ان کے اخلاق فاضلہ ۳۸۹

— ان کا توکل علی اللہ ۴۱۷-۴۲۶

— وہ اللہ کے دیے ہوئے علم سے صاحب علم تھے ۴۱۸

— ان کا صبر ۴۲۶

— ان کا تعلق باللہ ۴۲۷

— ان کی غیر معمولی قوتیں ۴۲۸

— حضرت یوسف کی جدائی میں ان کا حال ۴۲۶

— ان کی بینائی کا پلٹ آنا ۴۲۹

— ان کا مصر تشریف لے جانا ۴۲۹

— مصر میں وہ پہلے بھی غیر معروف نہ تھے ۴۰۳

— ان کی عمر اور مصر میں زمانہ قیام ۴۳۰

— ان کا دین کیا تھا ۴۰۱

یہود - ان کا اخلاقی و مذہبی انحطاط اور اس کے اسباب ۸۵-۲۳۸-۵۶۸

— ان کی گمراہیاں ۱۸۹

— ان کے ایمان میں کیا خرابی ہے ۱۸۷-۱۹۰

— اپنے انبیا کی سیرتوں کے متعلق ان کے غلط تصورات ۳۸۵-۳۸۶-۳۸۸-۳۸۹-۴۰۷-۴۲۹

— اپنے انبیا پر ان کی تہمتیں ۵۱-۸۱

— تورات کے ساتھ ان کا سلوک ۲۳۸-۲۳۹-۵۱۸

— ان کا سبت کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرنا ۹۰

— ان کی شرارتوں کے باعث ان پر شریعت کی قیود بڑھادی گئیں ۵۷۸ تا ۵۸۱

— مدینے کے یہودیوں کا طرز عمل ۱۵۲

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اہل کتاب''، ''بنی اسرائیل''، ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم)

یوسف علیہ السلام - قصہ یوسف ۳۷۸ تا ۴۳۴

— وہ نتائج جو ان کے قصے سے نکلتے ہیں ۳۰۹ تا ۳۸۱-۴۱۳

— وہ مقصد جس کے لیے یہ قصہ قرآن میں بیان ہوا ہے ۳۷۸

— قصہ یوسف اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں مشابہت ۳۷۹-۳۸۶

— سورۂ یوسف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک صریح ثبوت ہے ۴۳۴-۴۳۵

— حضرت یوسف کے حالات ۳۸۱ تا ۳۸۳

— ان کے زمانے میں مصر کا شاہی خاندان ۳۸۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— ان سے بھائیوں کا حسد ۳۸۴-۳۸۵
— ان کی نبوت کی پیشین گوئی ۳۸۵
— وہ اپنے والد کو کیوں محبوب تھے ۳۸۶
— بھائیوں کی سازش ۳۸۶ تا ۳۸۹
— برادران یوسف کی اخلاقی حالت ۳۸۷ تا ۳۸۹-۴۲۳
— کنوئیں میں پھینکا جانا ۳۸۸
— غلام بنا کر بیچے گئے ۳۸۹-۳۹۰
— قافلے والوں کی بے ایمانی ۳۸۹-۳۹۰
— عزیز مصر کے ہاں پہنچتے ہیں ۳۹۰-۳۹۱
— لفظ ''عزیز'' کے معنی ۳۹۰-۴۲۴
— مصر میں پہنچنے کے وقت ان کی عمر ۳۹۱
— اللہ نے ان کو دنیا کے معاملات سے واقف کرنے کے لیے کیا انتظام فرمایا ۳۹۱
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''حکم'' اور ''علم'' کا عطیہ ۳۹۲
— اس خیال کی غلطی کہ حضرت یوسفؑ نے عزیز مصر کو اپنا رب کہا ۳۹۲-۳۹۳
— زلیخا کی بدنیتی اور ان کا اس سے اجتناب ۳۹۲-۳۹۳
— وہ برہان رب کیا تھی جس نے ان کو گناہ سے بچایا ۳۹۳
— اللہ کی طرف سے ان کی اخلاقی تربیت ۳۹۳-۳۹۴
— اس زمانے کے مصر کی اخلاقی حالت ۳۹۴-۳۹۷-۳۹۸
— زلیخا کی مکاری ۳۹۴
— اس خیال کی غلطی کہ حضرت یوسفؑ کے حق میں شہادت دینے والا کوئی بچہ تھا ۳۹۴
— زلیخا کا جھوٹ کیسے کھلا ۳۹۵
— مصر کی عورتوں میں زلیخا کے عشق کا چرچا ۳۹۶
— زنان مصر کا حسن یوسف پر فریفتہ ہونا ۳۹۷
— حضرت یوسفؑ کی عصمت پر زلیخا کی پہلی شہادت ۳۹۷
— قید کی دھمکی دے کر ان سے بدکاری کا مطالبہ کرتی ہے ۳۹۷
— وہ گناہ کے ارتکاب کی بہ نسبت قید کو قبول کرتے ہیں ۳۹۸
— گناہ سے بچنے کے لیے خدا سے دعا مانگتے ہیں ۳۹۸
— ان کی سیرت کی مضبوطی، عرفان نفس اور انابت الی اللہ ۳۹۸
— بے گناہ قید کیے جاتے ہیں ۳۹۹
— مصر کا سیفٹی ایکٹ ۳۹۹-۴۰۰
— مصر کے سیفٹی ایکٹ میں بھی قید کے لیے کوئی مدت مقرر نہ تھی ۴۰۰
— اس سیفٹی ایکٹ میں ''ملکی مفاد'' کے نام سے کن قصوروں پر لوگ پکڑے جاتے تھے ۴۰۰
— مصر میں حضرت یوسفؑ کی شہرت کا آغاز ۳۹۹-۴۰۰
— مصر کے طبقۂ امرا پر ان کی اخلاقی فتح ۳۹۹
— جیل میں ان کا اخلاقی اثر ۴۰۰-۴۰۶
— جیل کے دو قیدی اپنا خواب سناتے ہیں ۴۰۰-۴۰۲
— جیل میں توحید کا وعظ ۴۰۱-۴۰۲
— حضرت یوسفؑ نے تبلیغ رسالت کا کام کب شروع کیا ۴۰۲
— پہلی مرتبہ اپنی خاندانی حیثیت پر سے پردہ اٹھاتے ہیں ۴۰۲
— ان کے طرز تبلیغ کی حکمتیں ۴۰۲-۴۰۴
— جیل سے رہائی کی تدبیر، اور اس خیال کی غلطی کہ ان کی یہ تدبیر خدا فراموشی کا نتیجہ تھی ۴۰۴
— جیل میں ان کا کام ۴۰۴
— شاہ مصر کا خواب اور مصر کے مذہبی پیشواؤں کا اس کی تعبیر بتانے سے عاجز رہنا ۴۰۵
— حضرت یوسف سے تعبیر پوچھی جاتی ہے ۴۰۵
— تعبیر کے ساتھ ساتھ قحط سے بچنے کی تدبیر بھی بتاتے ہیں ۴۰۶
— شاہی دربار میں طلبی ۴۰۷
— رہائی سے پہلے اس معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ

کرتے ہیں جس پر آپ کو قید کیا گیا تھا ۴۰۷-۴۰۸
— آپ کی شرافت نفس ۴۰۸
— آپ کی پاک دامنی پر زنان مصر کی متفقہ شہادت ۴۰۹
— خود زلیخا بھی دوبارہ شہادت دیتی ہے ۴۰۹
— آپ کے بام عروج پر پہنچنے کے حقیقی اسباب ۴۰۹-۴۱۱
— آپ کا کبر نفس سے پاک ہونا ۴۱۰
— بادشاہ سے ملاقات اور اس کی طرف سے عہدے کی پیش کش ۴۱۱
— سلطنت مصر کے مختار کل بنائے جاتے ہیں ۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳
— آپ کے لیے ''عزیز'' کا لقب ۴۲۴-۴۲۷
— اس روایت کی غلطی کہ زلیخا سے آپ کی شادی ہوئی ۳۹۱-۴۲۴
— اس خیال کی غلطی کہ آپ نے نظام کفر کو چلانے کے لیے حکومت مصر کی ملازمت کی تھی ۴۱۲-۴۱۳
— ان لوگوں کے خیال کی غلطی جو قوانین کفر کی پیروی کے لیے حضرت یوسفؑ کے اسوہ کو دلیل بناتے ہیں ۴۲۱-۴۲۳
— یہ روایت کہ شاہ مصر مسلمان ہو گیا تھا ۴۱۳
— حضرت یوسفؑ کا حسن انتظام ۴۱۴
— برادران یوسف کی پہلی آمد ۴۱۴
— حضرت یوسفؑ ان سے اپنے بھائی بن یمین کو لانے کی فرمائش کرتے ہیں ۴۱۵
— بن یمین آپ کے حقیقی بھائی تھے ۳۸۶
— بن یمین کی حفاظت کے لیے حضرت یعقوبؑ کی احتیاطی تدبیریں ۴۱۷
— برادران یوسف کی دوسری آمد، بن یمین سے آپ کی ملاقات اور ان کو روک رکھنے کے لیے آپ کی تدبیریں ۴۱۸-۴۲۰
— اللہ نے حضرت یوسفؑ کو مصر کے شاہی قانون پر عمل کرنے سے کس طرح بچایا ۴۲۰-۴۲۱
— حضرت یوسفؑ کی بردباری ۴۲۳
— ان کا بن یمین کو روک رکھنا ۴۲۴-۴۲۵
— ان کا توریہ ۴۲۵
— برادران یوسف کی واپسی اور حضرت یعقوبؑ کا حال ۴۲۶-۴۲۷
— برادران یوسف کی تیسری آمد اور حضرت یوسفؑ کا ان پر اپنے آپ کو ظاہر کرنا ۴۲۷-۴۲۸
— بھائیوں کا اعتراف قصور اور آپ کا انھیں معاف کرنا ۴۲۸
— حضرت یوسفؑ کا معجزہ، حضرت یعقوبؑ کی کھوئی ہوئی بینائی کا عود کر آنا ۴۲۸-۴۲۹
— بنی اسرائیل اور حضرت یعقوبؑ کا مصر پہنچنا ۴۲۸-۴۲۹
— حضرت یوسفؑ کی آخری تقریر والدین اور بھائیوں کے سامنے ۴۳۱ تا ۴۳۳
— اس خواب کی تعبیر جو بچپن میں آپ نے دیکھا تھا ۴۳۱
— والدین اور بھائیوں نے آپ کو ''سجدہ'' کس معنی میں کیا تھا ۴۳۱
— سیرت یوسفیؑ پر تبصرہ ۴۳۳-۴۳۴

یونس علیہ السلام- ان کے حالات ۳۱۲
— ان کی قوم کا ایمان عذاب الٰہی کے سامنے آجانے کے بعد کیوں قبول کیا گیا ۳۱۲
— بائبل کے صحیفۂ یونس کی حقیقت ۳۱۲
— قوم یونس کی آخری تباہی ۳۱۳

Maktaba Tul Ishaat.com

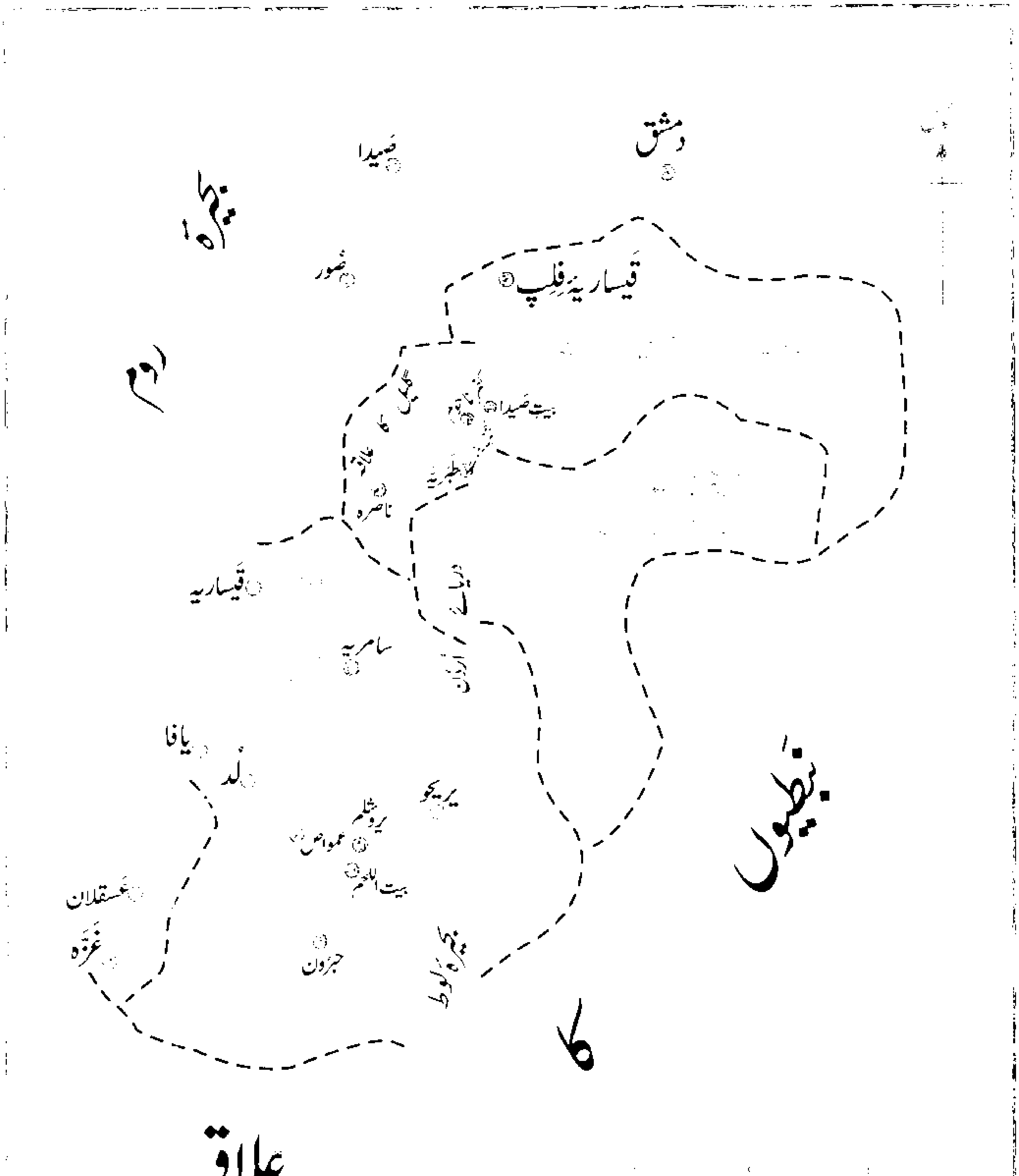

نقشہ متعلقہ صفحہ ۲۰۲ (جلد دوم)

فلسطین بزمانۂ دولت مکابیہ

۱۶۸-۶۳ قبل مسیح

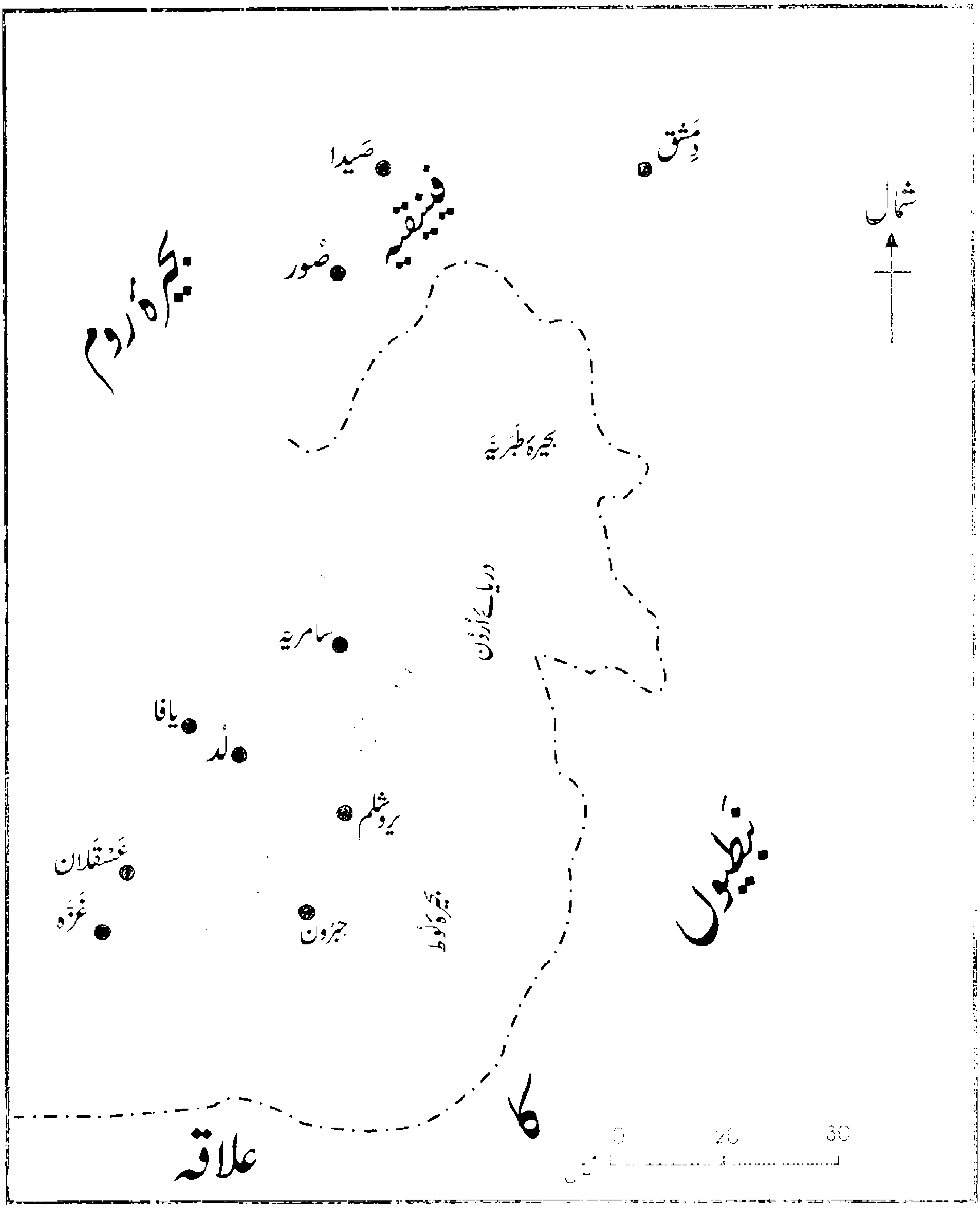

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۰۰ (جلد دوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

نقشہ متعلق صفحہ ۵۹۸ (جلد دوم)

نقشہ قصۂ یوسف علیہ السلام

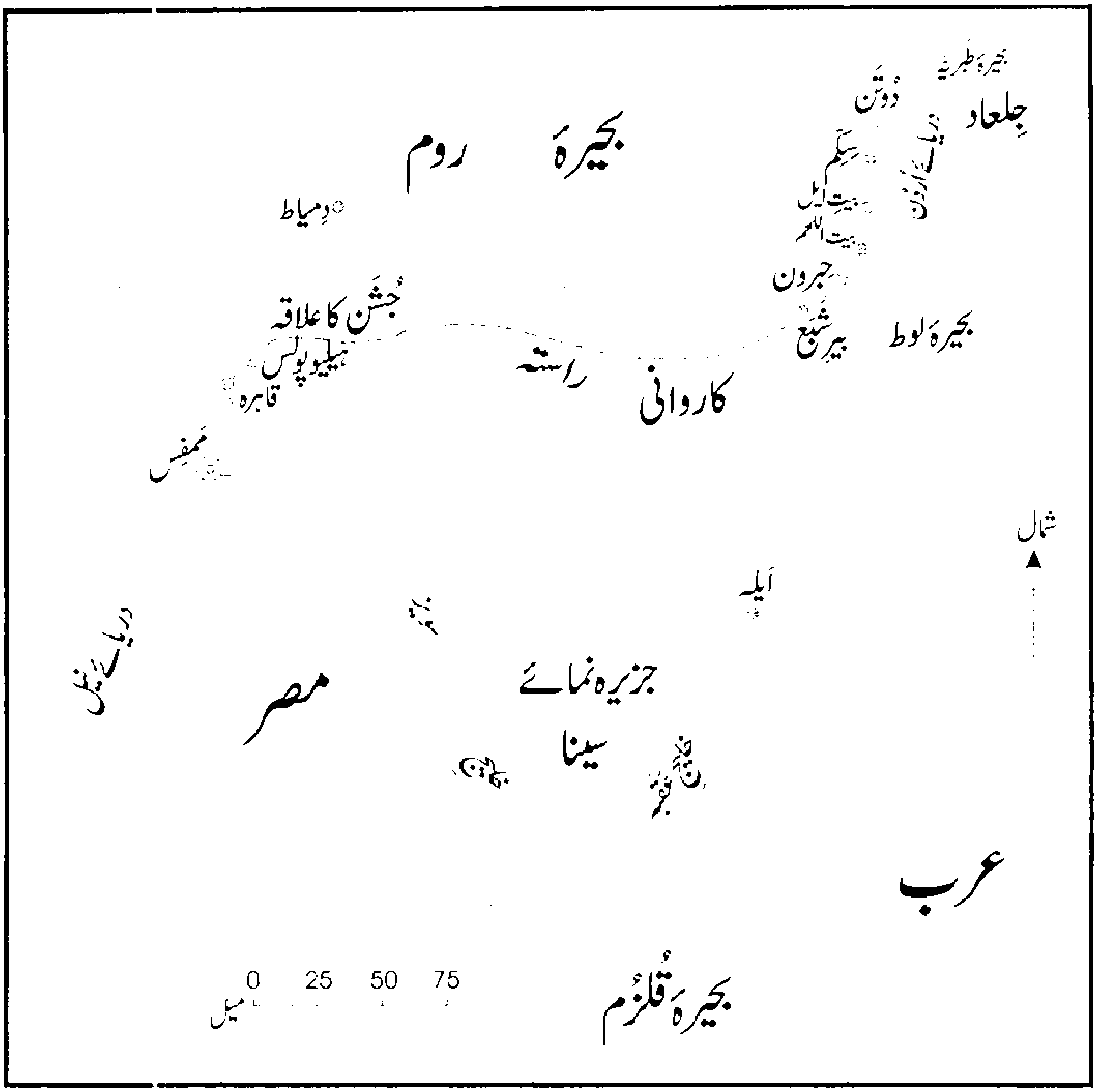

وہ مقام ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا۔

وہ مقام جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی آبائی جائداد تھی۔ اب اس مقام کا نام نابلس ہے۔

وہ مقام جہاں حضرت یعقوب عیہ السلام رہتے تھے۔ اس کو الخلیل بھی کہتے ہیں۔

مصر کا قدیم پایۂ تخت۔ اب اہل مصر اس کو منف کہتے ہیں۔

وہ علاقہ جہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کو آباد کیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

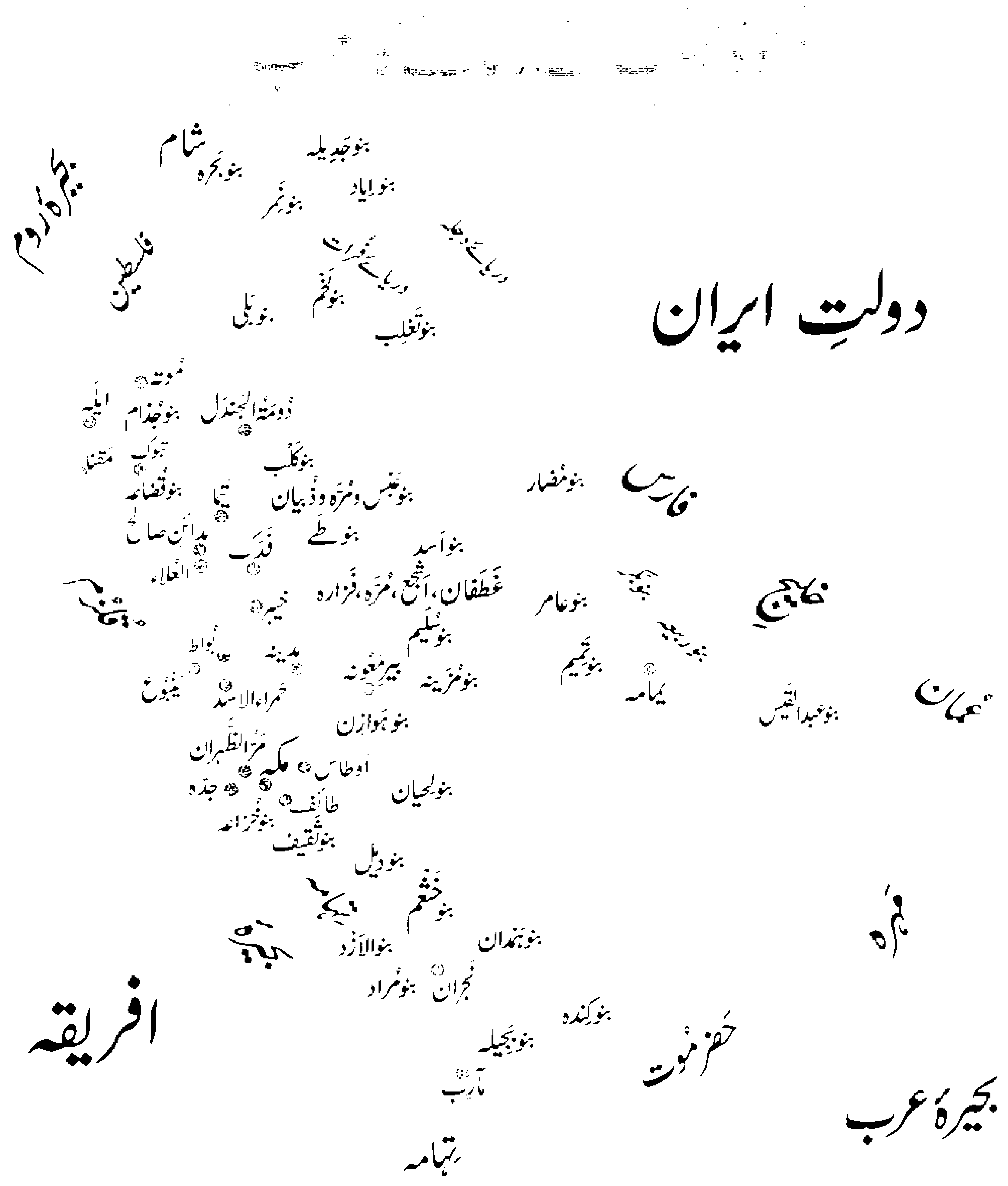

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۶۸ (جلد دوم)

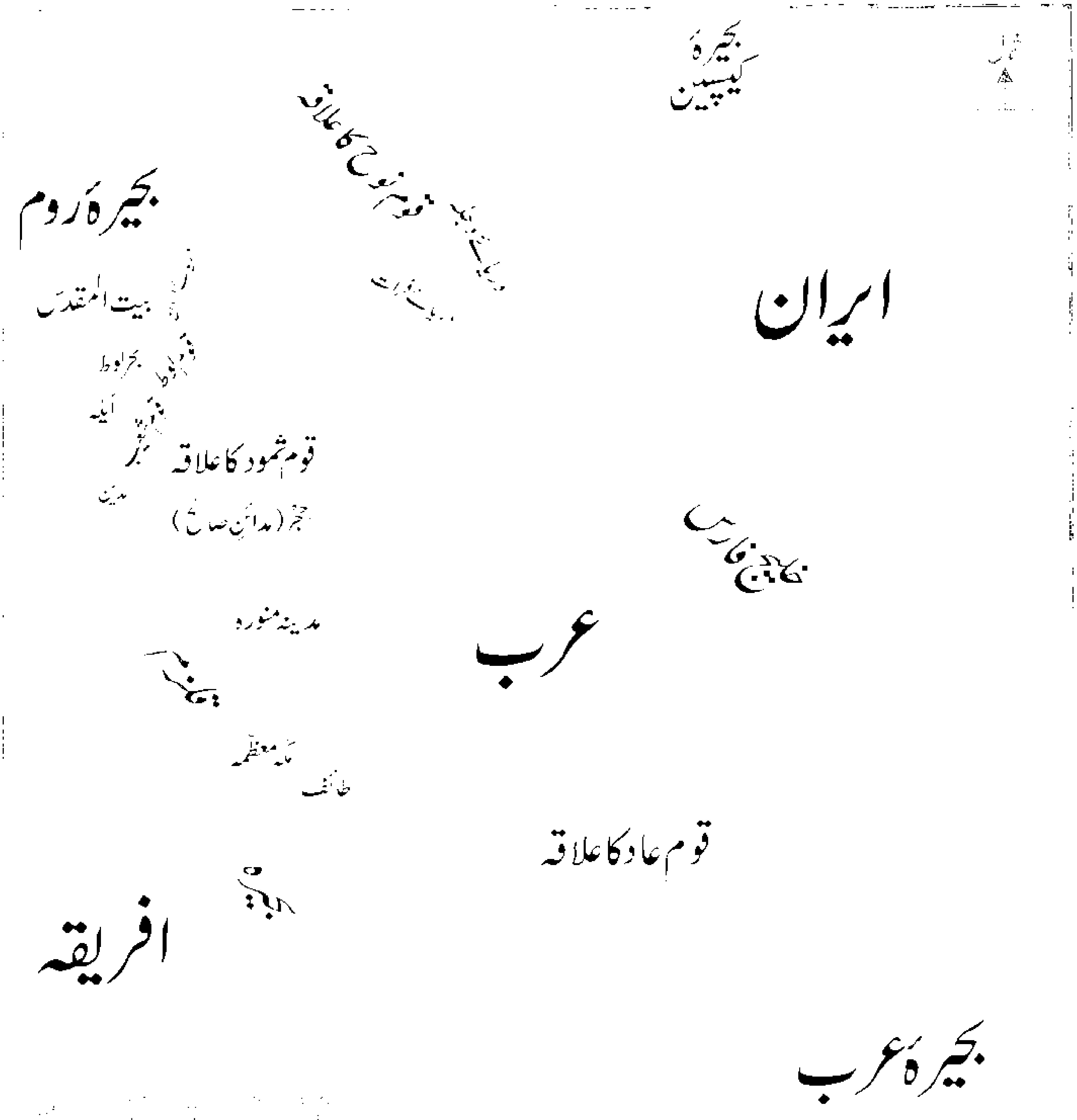

نقشہ متعلقہ صفحہ (جلد دوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

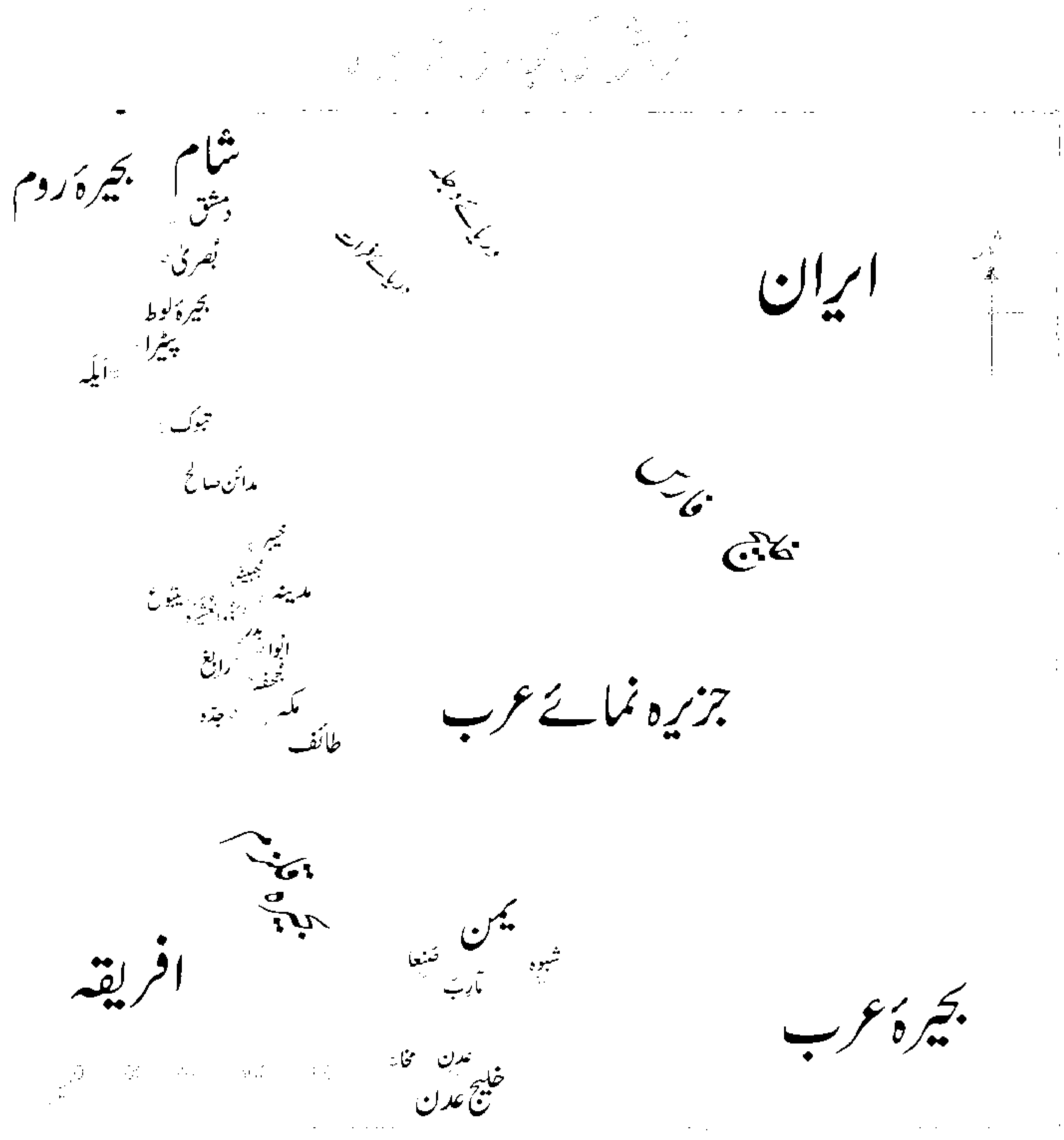

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۲۲ (جلد دوم)

نقشہ جنگِ بدر

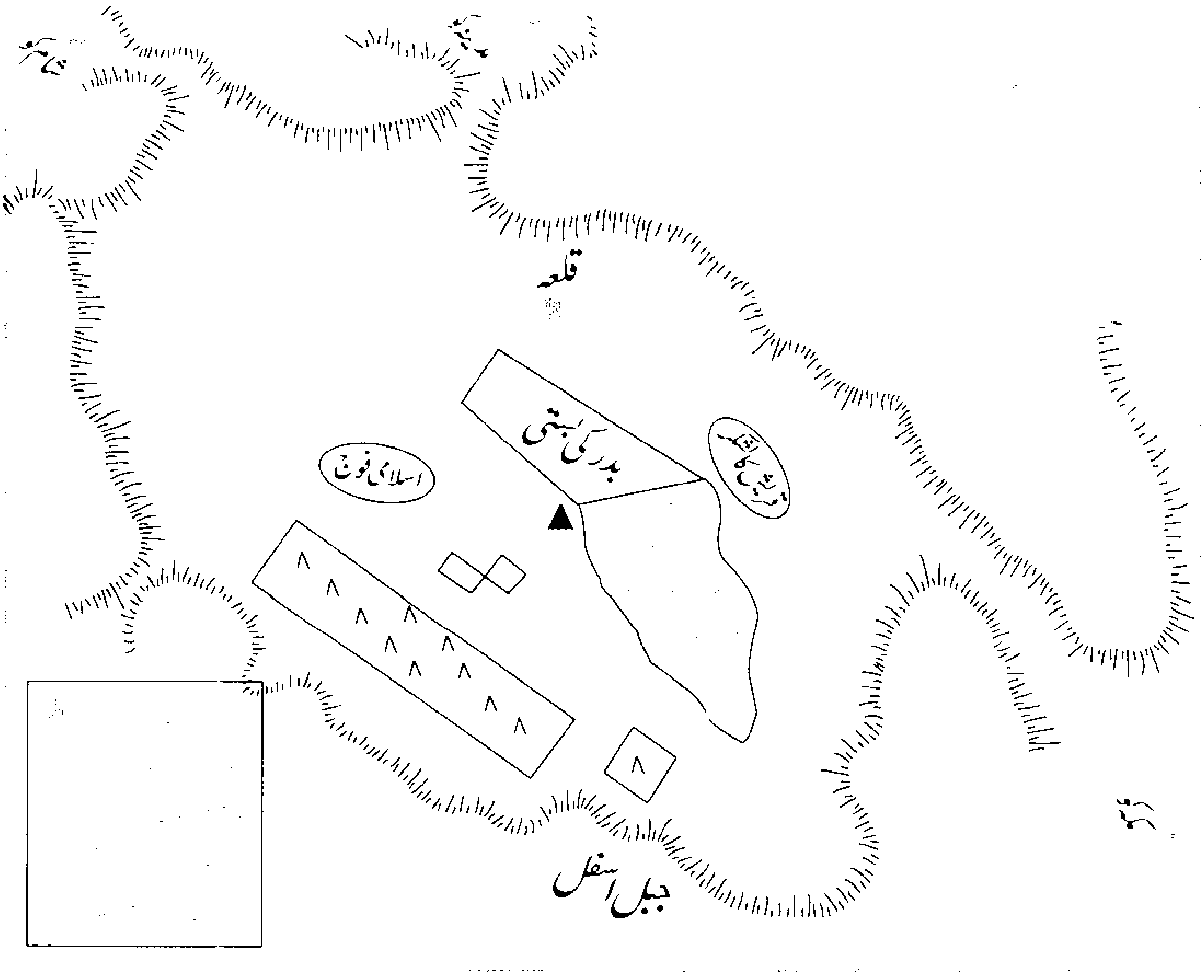

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۲۶ (جلد دوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

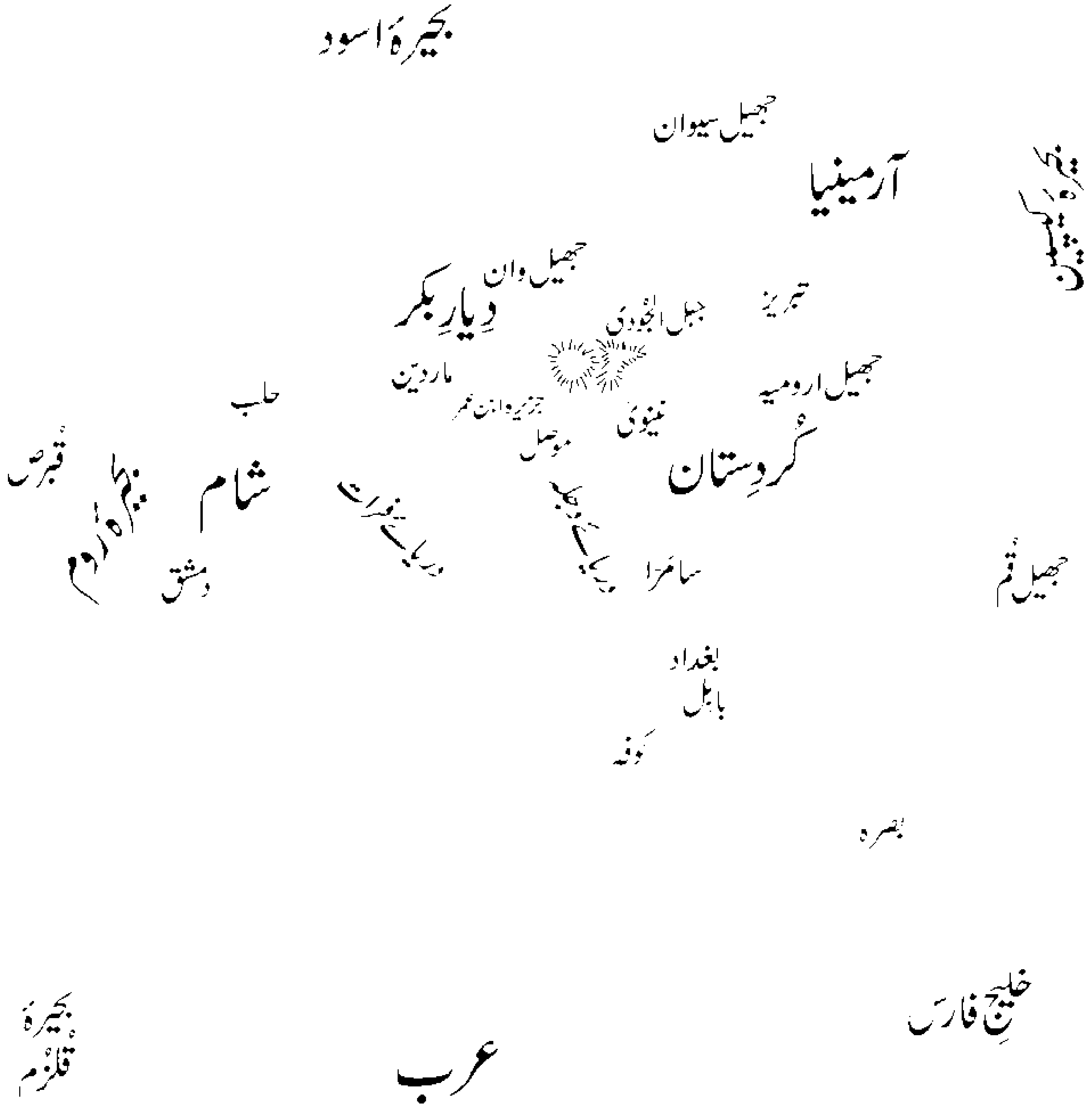

نقشہ متعلقہ صفحہ ۳۴۰ (جلد دوم)

بنی اسرائیل کی دو ریاستیں "یہودیہ" اور "اسرائیل"

۸۶۰ قبل مسیح

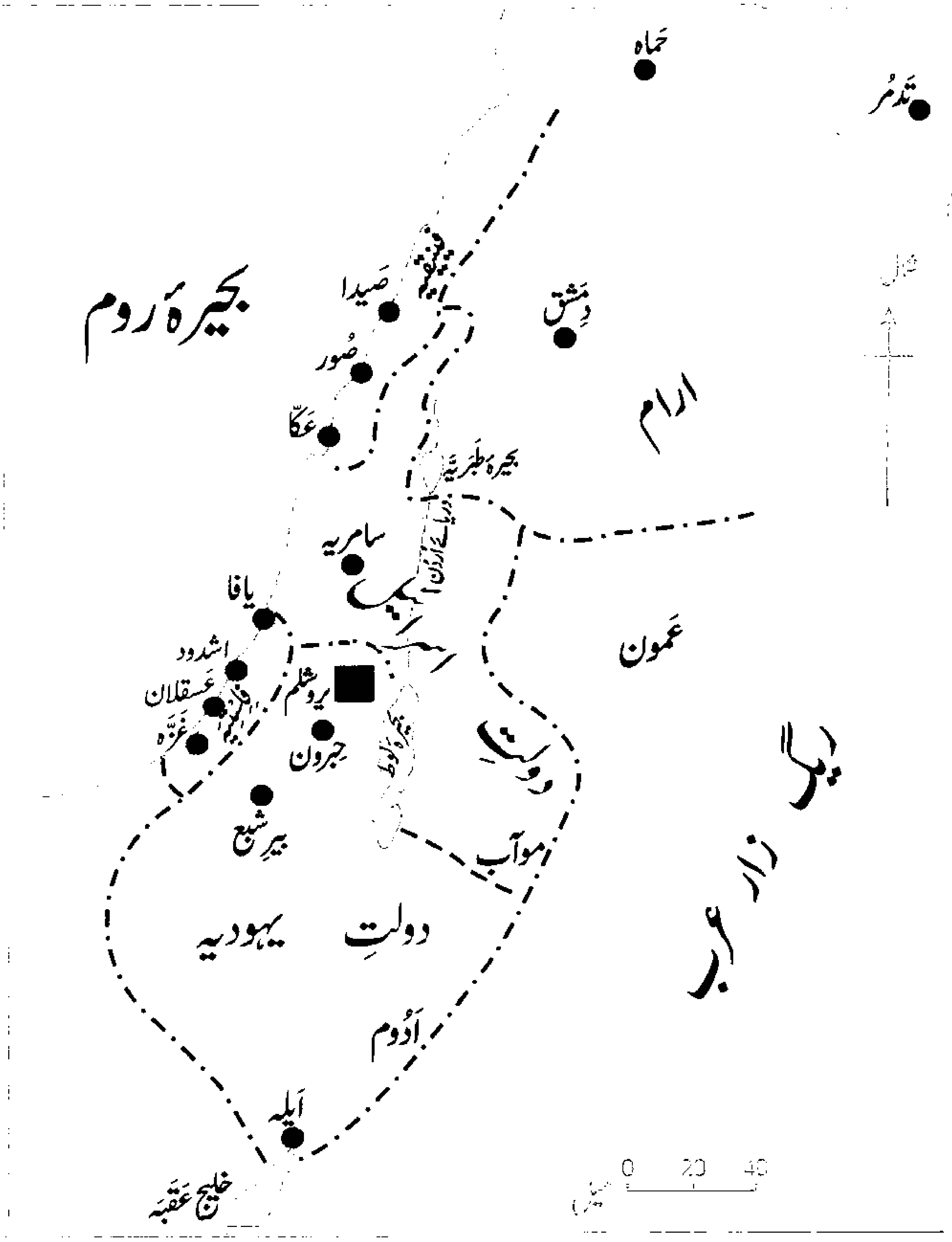

Maktaba Tul Ishaat.com

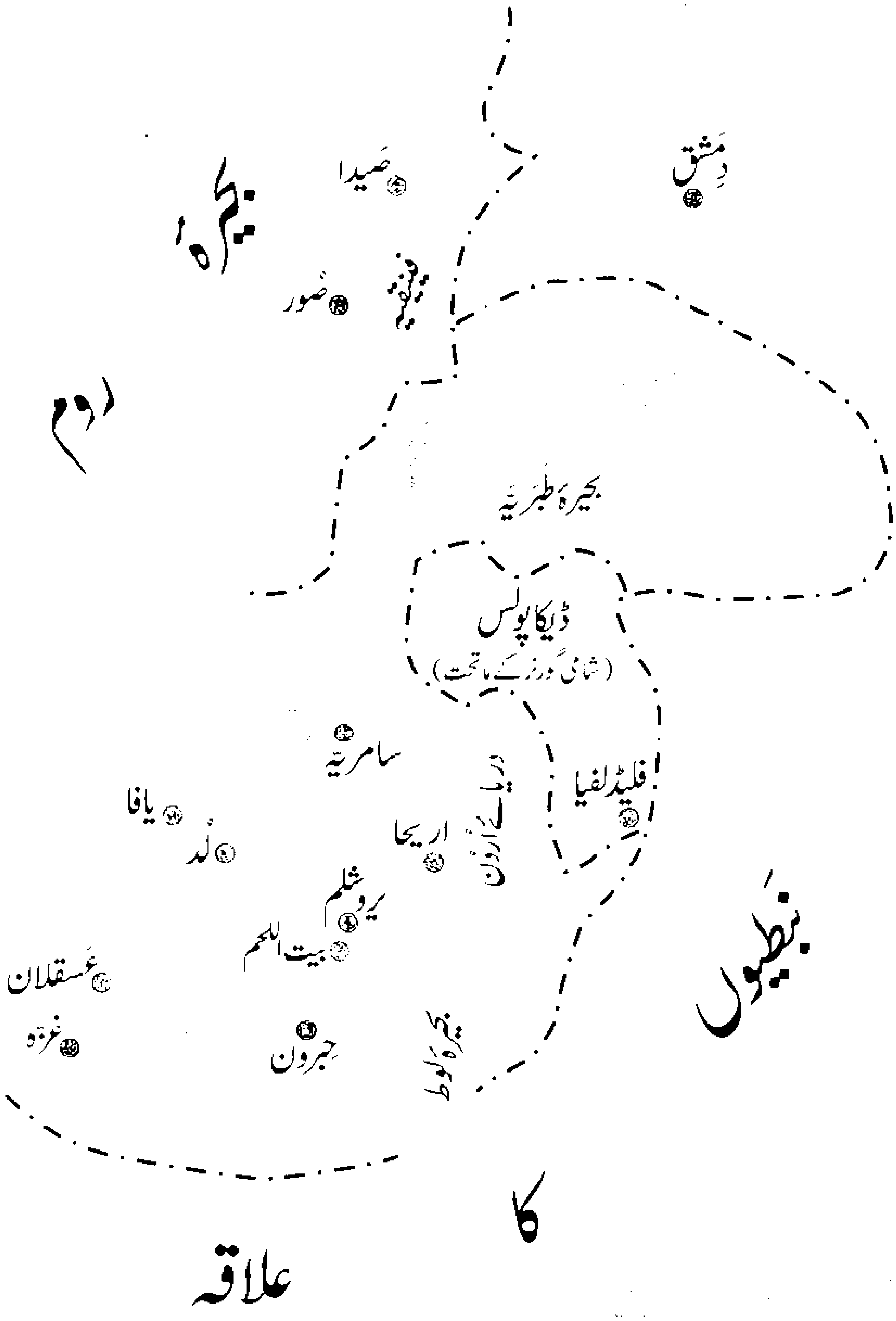

نقشہ متعلقہ صفحہ ۹۰۱ (جلد دوم)

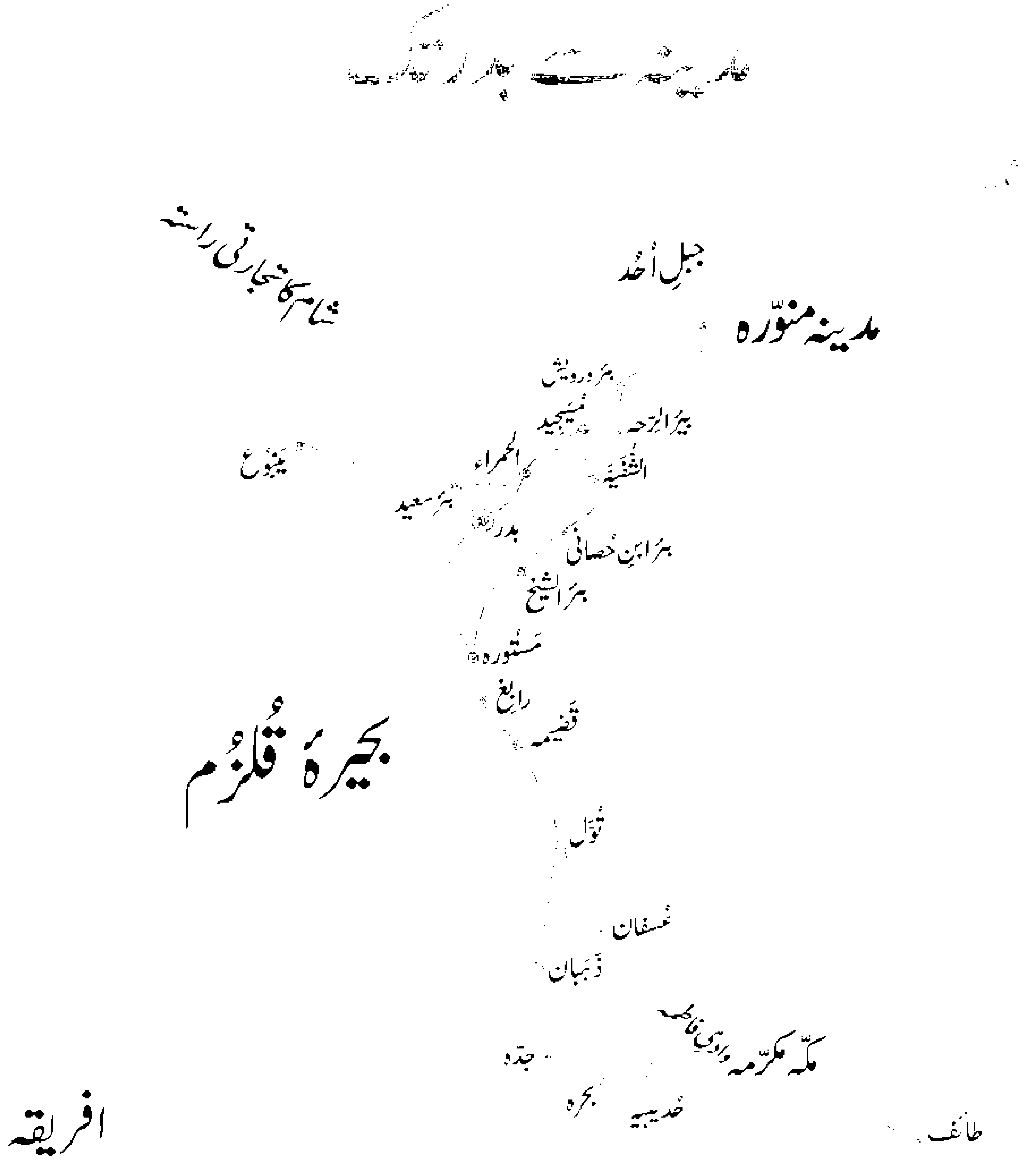

اس نقشے میں قافلوں کے وہ راستے دکھانے گئے ہیں جو مکے سے بدر ہوتے ہوئے شام کی طرف جاتے ہیں۔ نیز وہ راستہ بھی دکھایا گیا ہے جو مدینے سے بدر کی طرف آتا ہے۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۲۴ (جلد دوم)

نقشہ خروجِ بنی اسرائیل

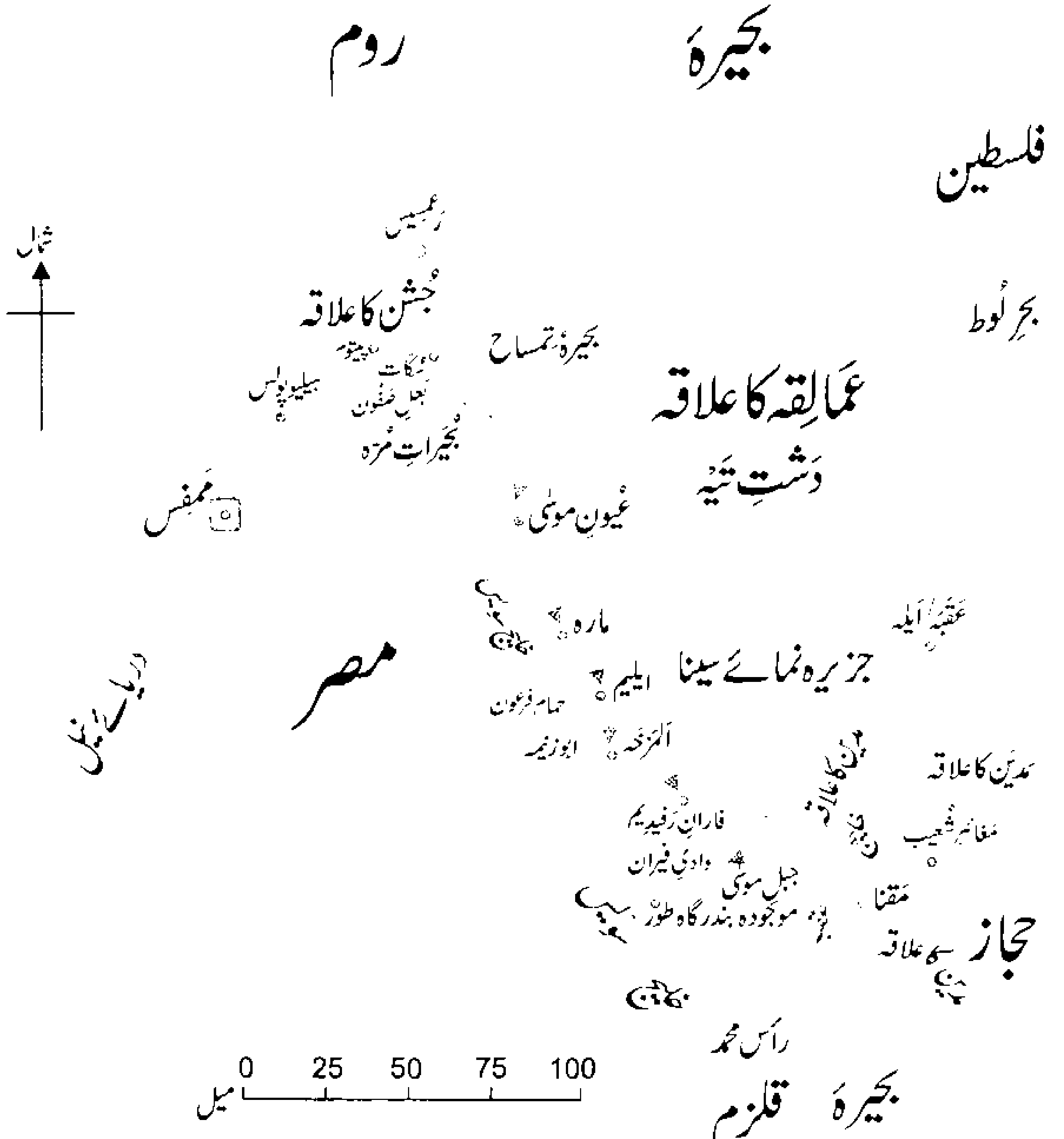

تشریح: جُشن کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آباد کیا تھا۔

ممفس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر کا دارالسلطنت تھی۔

بحیراتِ مُرّہ تلخ پانی کی وہ جھیلیں ہیں جو آج تو خشکی سے فاصلے پر واقع ہیں مگر قدیم زمانے میں سمندر کا پانی ان سے جا ملتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام رعمسیس سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور راستے میں بنی اسرائیل ہر طرف سے سمٹ کر ان سے آ کر ملتے چلے گئے۔ غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام صحرا کے صاف راستے سے سینا کی طرف جانا چاہتے ہوں گے مگر ایک طرف مصر کی فوجی چھاؤنیوں سے بچنے کی کوشش اور دوسری طرف فرعون کے تعاقب نے ان کو بعلِ صفون کے قریب لا پہنچایا۔ یہاں خدا کے حکم سے انہوں نے بحیراتِ مُرّہ کی مقام سے عبور کیا اور یہیں فرعون غرق ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل مارہ، ایلیم، المرخہ اور فاران رفیدیم کے راستے اس مقام تک پہنچے جسے آج کل جبل موسیٰ کہتے ہیں اور جس کا قدیم نام سینا ہے۔ اسی کا نام طور بھی ہے اور اسی کی وادی کو "وادیٔ مقدس طویٰ" کہا گیا ہے۔

حمامِ فرعون وہ جگہ ہے جس کے متعلق آج تک جزیرہ نمائے سینا کے لوگوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ اسی جگہ فرعون کی لاش پانی میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔

طور کے نام سے آج کل جو بندرگاہ جزیرہ نمائے سینا میں پائی جاتی ہے اس سے مراد وہ طور نہیں ہے، بلکہ یہ طور کی بندرگاہ ہے۔

المرخہ اس علاقے کے سرے پر ہے جس کا نام بائبل میں "بیابانِ سین" لکھا ہے۔ یہیں سے من وسلویٰ کا نزول شروع ہوا۔

رفیدیم کے قریب عرب کی وہ مشہور چٹان واقع ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تھا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔

دشتِ تیہ وہ علاقہ ہے جس میں بنی اسرائیل چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔ تیہ کے معنی بھٹکنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی آیت فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ (المائدہ: ۲۶) سے ماخوذ ہے۔

عقبہ یا ایلہ جس کا قدیم نام عصیون جابر تھا، وہ مقام ہے جہاں عام روایات کے مطابق اصحاب السبت کا مشہور واقعہ پیش آیا۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۷۶ ، جلد دوم۔

هٰذا بیانٌ للناس وھدًی وموعظةٌ للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جلد سوم

سورۃ الکہف تا سورۃ الروم

ادارہ ترجمان القرآن

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الکہف تا سورۃ الروم

جلد سوم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	الکہف	۱۸	۵
۲	مریم	۱۹	۵۱
۳	طٰہٰ	۲۰	۸۳
۴	الانبیاء	۲۱	۱۴۱
۵	الحج	۲۲	۱۹۵
۶	المومنون	۲۳	۲۵۷
۷	النور	۲۴	۳۰۵
۸	الفرقان	۲۵	۴۲۹
۹	الشعرآء	۲۶	۴۷۳
۱۰	النمل	۲۷	۵۵۱
۱۱	القصص	۲۸	۶۰۹
۱۲	العنکبوت	۲۹	۶۷۱
۱۳	الروم	۳۰	۷۲۳
۱۴	ضمیمہ ۱		۷۶۹
۱۵	ضمیمہ ۲		۷۷۱
۱۶	فہرست موضوعات		۷۷۳

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست تصاویر ارض القرآن ونقشہ جات

۱	اصحاب کہف کا غار واقع افسس (ترکی)	۱۲
۲	اصحاب کہف کا غار واقع عمان (اردن)	۱۲
۳	جبل قفقاز (Caucasus) میں واقع درۂ داریال جہاں سد ذوالقرنین تعمیر کی گئی	۴۶
۴	نقشہ بسلسلہ قصہ خضر وموسیٰ علیہما السلام	۳۴
۵	نقشہ بسلسلہ قصہ ذوالقرنین	۴۳
۶	نقشہ خانہ کعبہ	۲۱۸
۷	نقشہ غزوہ بنی المصطلق	۳۰۹
۸	العلاء کے پہاڑ	۵۲۲ — ۵۲۳
۹	مدائن صالح کے پہاڑ	
۱۰	مدائن صالح کی چند ثمودی عمارات	
۱۱	مدین میں ثمودی طرز کی عمارات	
۱۲	پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت	
۱۳	مدائن صالح میں ثمودی عمارات	
۱۴	مدائن صالح کی ثمودی عمارات	
۱۵	مدائن صالح میں وہ کنواں جس پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی	
۱۶	پیٹرا میں ثمودی طرز کی عمارات	
۱۷	مدین میں ثمودی طرز کی ایک عمارت	
۱۸	پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت	
۱۹	کوہِ طور کے دامن میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ	۵۵۸
۲۰	کوہِ طور کے دامن میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں واقع کنیسہ اور مسجد	۵۵۸
۲۱	وہ درخت جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام الٰہی کی آواز آئی تھی	۵۵۸
۲۲	کوہِ طور کے دامن میں کیتھرائن کی خانقاہ کی وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھاڑی	۵۵۸
	میں آگ لگی ہوئی نظر آئی تھی۔	۵۵۸
۲۳	وہ کنواں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریوں کو پانی پلایا کرتے تھے	۶۲۷
۲۴	مدین کی وادی	۶۲۷

تفہیم القرآن

الکہف

(۱۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

الکہف

نام اس سورہ کا نام پہلے رُکوع کی دسویں آیت اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَہْفِ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں کہف کا لفظ آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول یہاں سے اُن سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جو مکّی زندگی کے تیسرے دَور میں نازل ہوئی ہیں۔ مکّی زندگی کو ہم نے چار بڑے بڑے دَوروں میں تقسیم کیا ہے، جن کی تفصیل سورۂ انعام کے دیباچے میں گزر چکی ہے۔ اس تقسیم کے لحاظ سے تیسرا دَور تقریباً ۵ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر قریب قریب ۱۰ نبوی تک چلتا ہے۔ اس دَور کو جو چیز دوسرے دَور سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے دَور میں تو قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تحریک اور جماعت کو دبانے کے لیے زیادہ تر تضحیک، اِستہزا، اعتراضات، الزامات، تخویف، اِطماع اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر اعتماد کر رکھا تھا، مگر اس تیسرے دَور میں انھوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار پوری سختی کے ساتھ استعمال کیے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک چھوڑ کر حَبَش کی طرف نکل جانا پڑا، اور باقی ماندہ مسلمانوں کو اور ان کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کو شِعْبِ ابی طالب میں محصور کر کے ان کا مکمل معاشی اور معاشرتی مُقاطعہ کر دیا گیا۔ تاہم اس دَور میں دو شخصیتیں ـــــــ ابوطالب اور اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ ـــــــ ایسی تھیں جن کے ذاتی اثر کی وجہ سے قریش کے دو بڑے خاندان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ۱۰ نبوی میں ان دونوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ دَور ختم ہو گیا، اور چوتھا دَور شروع ہوا جس میں مسلمانوں پر مکے کی زندگی تنگ کر دی گئی، یہاں تک کہ آخرِکار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام مسلمانوں کو مکے سے نکل جانا پڑا۔

سورۂ کہف کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسرے دَور کے آغاز میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ ظلم وستم اور مزاحمت نے شدّت تو اختیار کر لی تھی، مگر ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحابِ کہف کا قصّہ سنایا گیا، تاکہ ان کی ہمّت بندھے اور انھیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

موضوع اور مضمون

یہ سورہ مشرکینِ مکہ کے تین سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے، جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے: اصحابِ کہف کون تھے؟ قصۂ خضر کی حقیقت کیا ہے؟[1] اور ذوالقرنین کا کیا قصہ ہے؟ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اسی لیے اہلِ کتاب نے امتحان کی غرض سے اِن کا انتخاب کیا تھا، تاکہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبی کی زبان سے ان کے سوالات کا پورا جواب دیا، بلکہ اُن کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصّوں کو پوری طرح اُس صورتِ حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اُس وقت مکے میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی:

۱- اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور اُن کا حال مکے کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رویّہ کفارِ قریش کے رویّے سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مُہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے، بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں ضمناً کفارِ مکہ کو یہ بھی بتایا کہ اصحابِ کہف کا قصہ عقیدۂ آخرت کی صحت کا ایک ثبوت ہے۔ جس طرح خدا نے اصحابِ کہف کو ایک مدتِ دراز تک موت کی نیند سلانے کے بعد پھر جِلا اُٹھایا، اُسی طرح اُس کی قدرت سے وہ بَعث بعد الموت بھی کچھ بعید نہیں ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔

۲- اصحابِ کہف کے قصے سے راستہ نکال کر اُس ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل پر گفتگو شروع کر دی گئی جو مکے کے سردار اور کھاتے پیتے لوگ اپنی بستی کی چھوٹی سی نو مسلم جماعت کے ساتھ برت رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ نہ ان ظالموں سے کوئی مُصالحت کرو اور نہ اپنے غریب ساتھیوں کے مقابلے میں اِن بڑے بڑے لوگوں کو کوئی اہمیت دو۔ دوسری طرف ان رئیسوں کو نصیحت کی گئی کہ اپنے چند روزہ عیشِ زندگانی پر نہ پھولو، بلکہ ان بھلائیوں کے طالب بنو جو اَبدی اور پائدار ہیں۔

۳- اسی سلسلۂ کلام میں قصۂ خضر و موسیٰؑ کچھ اس انداز سے سنایا گیا کہ اس میں کفار کے سوالات کا جواب

---

[1] روایات میں آتا ہے کہ دوسرا سوال رُوح کے متعلق تھا، جس کا جواب سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۱۰ میں دیا گیا ہے۔ مگر سورۂ کہف اور بنی اسرائیل کے زمانۂ نُزول میں کئی سال کا فرق ہے، اور سورۂ کہف میں دو کے بجائے تین قصّے بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا سوال دراصل قِصّۂ خضر سے متعلق تھا، نہ کہ رُوح سے متعلق۔ خود قرآن میں بھی ایک اشارہ ایسا موجود ہے جس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ ۶۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی تھا اور مومنین کے لیے سامانِ تسلّی بھی۔ اس قصّے میں دراصل جو سبق دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی مَشِیّت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے، وہ چونکہ تمھاری نظر سے پوشیدہ ہیں، اس لیے تم بات بات پر حیران ہوتے ہو کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیا ہوگیا؟ یہ تو بڑا غضب ہوا! حالانکہ اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو تمھیں خود معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے، اور بظاہر جس چیز میں بُرائی نظر آتی ہے، آخرِکار وہ بھی کسی نتیجۂ خیر ہی کے لیے ہوتی ہے۔

۴- اس کے بعد قصّۂ ذوالقرنین ارشاد ہوتا ہے، اور اس میں سائلوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم تو اپنی اِتنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پُھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرمانروا اور ایسا زبردست فاتح اور اس قدر عظیم الشان ذرائع کا مالک ہو کر بھی اپنی حقیقت کو نہ بُھولا تھا اور اپنے خالق کے آگے ہمیشہ سرِتسلیم خم رکھتا تھا۔ نیز یہ کہ تم اپنی ذرا ذرا سی حویلیوں اور باغیچیوں کی بہار کو لازوال سمجھ بیٹھے ہو، مگر وہ دُنیا کی سب سے زیادہ مستحکم دیوارِ تحفظ بنا کر بھی یہی سمجھتا تھا کہ اصل بھروسے کے لائق اللہ ہے نہ کہ یہ دیوار۔ اللہ کی مرضی جب تک ہے، یہ دیوار دشمنوں کو روکتی رہے گی، اور جب اُس کی مرضی کچھ اور ہو گی تو اس دیوار میں رخنوں اور شگافوں کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

اس طرح کفار کے امتحانی سوالات کو اُنھی پر پوری طرح اُلٹ دینے کے بعد خاتمۂ کلام میں پھر اُنھی باتوں کو دُہرا دیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوئی ہیں، یعنی یہ کہ توحید اور آخرت سراسر حق ہیں اور تمھاری اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ انھیں مانو، ان کے مطابق اپنی اصلاح کرو اور خدا کے حضور اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے دُنیا میں زندگی بسر کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمھاری اپنی زندگی خراب ہوگی اور تمھارا سب کچھ کیا کرایا اَکارت جائے گا۔

---

۱۱۰ ایاتہا

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ

۱۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ
عِوَجًا ۞ ۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا
حَسَنًا ۞ ۲ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۞ ۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا
اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۞ ۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ
كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۞ ۵

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی[۱] ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے، اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے[۲] اِس بات کا نہ اُنھیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا[۳] بڑی بات ہے جو ان کے مُنہ سے نکلتی ہے۔ وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔

۱- یعنی نہ اس میں کوئی اینچ پینچ کی بات ہے جو سمجھ میں نہ آ سکے، اور نہ کوئی بات حق و صداقت کے خطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے جسے ماننے میں کسی راستی پسند انسان کو تأمّل ہو۔

۲- یعنی جو خدا کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ اس میں عیسائی بھی شامل ہیں اور یہود بھی اور مشرکینِ عرب بھی۔

۳- یعنی ان کا یہ قول کہ فُلاں خدا کا بیٹا ہے، یا فُلاں کو خدا نے بیٹا بنا لیا ہے، کچھ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ ان کو خدا کے ہاں اولاد ہونے یا خدا کے کسی کو مُتبنّٰی بنانے کا علم ہے، بلکہ محض اپنی عقیدت مندی کے غُلوّ میں وہ ایک من مانا حکم لگا بیٹھے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ وہ کیسی سخت گمراہی کی بات کہہ رہے ہیں، اور کتنی بڑی گستاخی اور افترا پردازی ہے جو اللہ رب العالمین کی جناب میں ان سے سرزد ہو رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ
اَسَفًا ۝٦ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ
اَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝٨

اچھا، تو اے محمدؐ! شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اِس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔[4] واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں، اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخرِ کار اِس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔[5]

۴ - یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبتلا تھے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو رنج اُن تکلیفوں کا نہ تھا جو آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، بلکہ جو چیز آپؐ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ آپؐ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آپؐ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذابِ الٰہی ہے۔ آپؐ ان کو اس سے بچانے کے لیے اپنے دن اور راتیں ایک کیے دے رہے تھے۔ مگر انھیں اصرار تھا کہ وہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہی رہیں گے۔ اپنی اس کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ”میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی روشنی کے لیے، مگر پروانے ہیں کہ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں، جل جانے کے لیے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں، مگر پروانے اس کی ایک نہیں چلنے دیتے۔ ایسا ہی حال میرا ہے، کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑتے ہو“ (بخاری و مسلم، نیز تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الشعراء، آیت ۳)

اس آیت میں بظاہر تو بات اتنی ہی فرمائی گئی ہے کہ شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے کھو دو گے، مگر اسی میں ایک لطیف انداز سے آپؐ کو تسلی بھی دے دی گئی کہ ان کے ایمان نہ لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس لیے تم کیوں اپنے آپ کو رنج و غم میں گُھلائے دیتے ہو؟ تمھارا کام صرف بشارت اور انذار ہے، لوگوں کو مومن بنا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ لہٰذا تم بس اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیے جاؤ۔ جو مان لے، اسے بشارت دے دو۔ جو نہ مانے، اسے بُرے انجام سے مُتنبّہ کر دو۔

۵ - پہلی آیت کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور ان دونوں آیتوں کا رُوئے سُخن کفار کی جانب ہے۔ نبیؐ کو ایک حرفِ تسلّی دینے کے بعد اب آپؐ کے منکرین کو مخاطَب کیے بغیر یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہ سروسامان جو زمین کی سطح پر تم دیکھتے ہو اور جس کی دلفریبیوں پر تم فریفتہ ہو، یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض تمھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے مہیّا کی گئی ہے۔ تم

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩
إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً

کیا تم سمجھتے ہو کہ غار[6] اور کتبے[7] والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟[8] جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ”اے پروردگار! ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز

اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے تمھارے عیش و عشرت کے لیے فراہم کیا ہے، اس لیے تم زندگی کے مزے لُوٹنے کے سوا اور کسی مقصد کی طرف توجّہ نہیں کرتے، اور اسی لیے تم کسی سمجھانے والے کی بات پر کان بھی نہیں دھرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سامانِ عیش نہیں بلکہ وسائلِ امتحان ہیں، جن کے درمیان تم کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ تم میں سے کون اپنی اصل کو فراموش کر کے دنیا کی ان دلفریبیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور کون اپنے اصل مقام (بندگیِ رب) کو یاد رکھ کر صحیح رَوِیّے پر قائم رہتا ہے۔ جس روز یہ امتحان ختم ہو جائے گا، اسی روز یہ بساطِ عیش اُلٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔

۶ – عربی زبان میں ”کہف“ وسیع غار کو کہتے ہیں، اور ”غار“ کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اُردو میں غار ”کہف“ کا ہم معنیٰ ہے۔

۷ – ”الرقیم“ کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور وہ اَیلہ (یعنی عَقَبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ اور بعض قدیم مفسّرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کَتبہ ہے جو اس غار پر اصحابِ کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ”ترجمان القرآن“ میں پہلے معنیٰ کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸، آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نَبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتابِ یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے، اور خود اسی کتاب کے بیان کی رُو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اُردُن اور بحرِ لُوط کے مغرب میں واقع تھا، جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں، اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہوداہ اور اَدُومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تأمّل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۶ء، جلد ۱۷، ص ۶۵۸) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کَتبہ ہے۔

۸ – یعنی کیا تم اس خدا کی قدرت سے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، اس بات کو کچھ بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو دو تین سو برس تک سُلائے رکھے اور پھر ویسا ہی جوان و تندرست جگا اُٹھائے جیسے وہ سوئے تھے؟ اگر سورج اور چاند اور زمین کی تخلیق پر تم نے کبھی غور کیا ہوتا تو تم ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ خدا کے لیے یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبۡنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمۡ فِى الۡكَهۡفِ
سِنِيۡنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثۡنٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ اَىُّ الۡحِزۡبَيۡنِ اَحۡصٰى لِمَا لَبِثُوۡۤا
اَمَدًا ۝١٢ نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَـقِّ‌ؕ اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ

ع ۱۲ ۱۲

اور ہمارا معاملہ دُرست کردے"، تو ہم نے انھیں اُسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سُلا دیا، پھر ہم نے انھیں اُٹھایا تاکہ دیکھیں، اُن کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدّتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے ع
ہم ان کا اصل قصّہ تمھیں سُناتے ہیں۔[9] وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے

۹- اس قصّے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا، اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دَور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابنِ جریر طبَری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبّن نے اپنی کتاب "تاریخِ زوال وسُقوطِ دولتِ روم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصّے کا جو خلاصہ دیا ہے، وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصّے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسّرین اس کا نام دَقْیَنُوس، یا دَقیانوس، یا دَقیُوس بتاتے ہیں، اور گبّن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈِیسِیَس (Decius) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرماں روائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم وستم کرنے کے معاملے میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا نام ہمارے مفسرین اِفسُس یا اِفسُوس لکھتے ہیں، اور گبّن اس کا نام اِفِسُس (Ephesus) بتاتا ہے، جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ترکی کے شہر اِزمیر (سمرنا) سے ۲۰-۲۵ میل بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: نقشہ نمبر ۲، صفحہ ۴۳) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے، اس کا نام ہمارے مفسّرین تیذوسیس لکھتے ہیں، اور گبّن کہتا ہے کہ ان کے بَعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا، جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا، اس کا نام ہمارے مفسّرین یَمْلِیخا بتاتے ہیں اور گبّن اسے یَمْبلِخُس (Jamblchus) لکھتا ہے۔

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ
اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا

تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔[10] ہم نے ان کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اُٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔" (پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا:) "یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔

قصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈِیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے، جب کہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو قصۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن اُن کے قیامِ غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب ہم نے حاشیہ ۲۵ میں دے دیا ہے۔

اس سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گِبَن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے، اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے، اور اتنی مدّت کے اندر زبانی روایات کے ایک مُلک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(قصۂ اصحابِ کہف کے متعلق مزید معلومات ضمیمہ نمبر ۱ میں بیان کی گئی ہیں جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔)

۱۰- یعنی جب وہ سچّے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا ؕ﴿۱۵﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا
اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ
اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ
كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ
وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ

یہ لوگ ان کے معبُود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبُودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فُلاں غار میں چل کر پناہ لو[11]۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سروسامان مہیّا کر دے گا۔‘‘

تم انھیں غار میں دیکھتے[12] تو تمھیں یُوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اُتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں[13]۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جس کو اللہ ہدایت

---

۱۱ – جس زمانے میں اِن خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی، اُس وقت شہر اِفِسُس ایشیائے کوچک میں بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا، جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا، اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصّہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، عنوان ....) شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا، اُس کا اندازہ اصحابِ کہف کے اُس فقرے سے کیا جاسکتا ہے، جو اگلے رُکوع میں آ رہا ہے، کہ ’’ اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی اپنی ملّت میں واپس لے جائیں گے۔‘‘

۱۲ – بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا کہ اس قرار دادِ باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان

فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ ع
وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ
وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ
مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا
بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ

دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولیِّ مُرشد نہیں پا سکتے ؏ تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے[۱۴]۔ اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر اُنھیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی[۱۵]۔

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اُٹھا بٹھایا[۱۶] تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: "کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسروں نے کہا: "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔"

ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا مجبوراً مرتد ہو جانے سے بچ سکیں۔

۱۳ – یعنی ان کے غار کا دہانہ شمال کے رُخ تھا، جس کی وجہ سے سورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی، اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

۱۴ – یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو اِن سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

۱۵ – یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے کتّے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔

۱۶ – یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دُنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى
الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا
يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝۱۹ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ
فِىْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝۲۰ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا
اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ

نصف القرآن باعتبار عدد الحروف فان التاء بعد الیاء من النصف الاول واللام الثانیۃ من النصف الاخیر ۱۲

پھر وہ بولے: "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکّہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں اُن لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملّت میں واپس لے جائیں گے، اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے"——اِس طرح ہم نے اہلِ شہر کو ان کے حال پر مُطّلع کیا،[۱۷] تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچّا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آ کر رہے گی۔[۱۸] (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اُس وقت وہ آپس میں اِس بات پر جھگڑ رہے تھے

عجیب کرشمۂ قدرت ان کا ایک طویل مدّت کے بعد جاگنا بھی تھا۔

۱۷- یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دُنیا بدل چکی تھی۔ بُت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدّت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدّن، لباس، ہر چیز میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی سج دھج، لباس، زبان، ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈِیسیَس کے وقت کا سکّہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دکان دار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُریانی رِوایت کی رُو سے دکان دار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال لایا ہے۔ چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجّہ کیا اور آخرکار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص تو اُن پیروانِ مسیحؑ میں سے ہے جو دو سو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحابِ کہف خبردار ہوئے کہ وہ دو سو برس بعد سو کر اُٹھے ہیں، تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح

اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۖ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا

کہ اِن (اصحابِ کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا: ”اِن پر ایک دیوار چُن دو، ان کا رب ہی اِن کے معاملے کو بہتر جانتا ہے۔[19]“ مگر جو لوگ اُن کے معاملات پر غالب[20] تھے،

پرواز کرگئی۔

۱۸- سُریانی روایت کے مطابق اُس زمانے میں وہاں قیامت اور عالَمِ آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چِھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کرچکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رُومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے، جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ اِفِسُس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صَدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلّم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا، اور مسیحی علما کے پاس اُس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ مَتّی، مَرقُس، لُوقا، تینوں انجیلوں میں صَدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اُس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہُوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے، جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: مَتّی باب ۲۲، آیت ۲۳ تا ۳۳۔ مرقُس، باب ۱۲، آیت ۱۸ تا ۲۷۔ لُوقا، باب ۲۰، آیت ۲۷ تا ۴۰) اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلّا بھاری ہو رہا تھا اور مومنینِ آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اُس وقت اصحابِ کہف کے بَعْث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بَعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔

۱۹- فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحینِ نصاریٰ کا قول تھا۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ اصحابِ کہف جس طرح غار میں لیٹے ہوئے ہیں، اسی طرح انھیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔

۲۰- اس سے مراد رُومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رُومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیا پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیحؑ، مریمؑ اور حواریوں کے مجسّمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بَعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی اِفِسُس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی، جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت اور حضرت مریمؑ کے ”مادرِ خدا“ ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیحؑ کے مقابلے میں اُس وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًا ۢ بِالۡغَيۡبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَبۡعَةٌ

انھوں نے کہا: ”ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔“[۲۱]

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کُتّا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب بے تُکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اَور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے

عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہِ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی اُمور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے عَلَم بردار تھے اور انھوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

۲۱ - مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآنِ مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابرِ صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن اُن کی اِس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بَعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انھوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے اِستدلال کیا جا سکتا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن اللّٰہ تعالٰی زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسُّرُج۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ)

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءھم مساجد فانی انھٰکم عن ذٰلک۔ (مسلم)

خبردار رہو! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاؑ کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمھیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لعن اللّٰہ تعالٰی الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیآءھم مساجد۔ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انھوں نے اپنے انبیاؑ کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

اِنَّ اُولٰئك اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علٰی قبرہ مسجدا وصوّروا فیه تلك الصور اولٰئك شرار الخلق یوم القیٰمة۔ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

وَ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ قف فَلَا
تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ ع وَ

ع ۳ ۴ ۱۵

اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔[۲۲] کہو: میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پُوچھو[۲۳] ع ——— اور دیکھو،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایتاً ذکر کیا گیا ہے، اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے ''ایشیائے کوچک کے اِکتشافات'' (discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے، ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر اِفسُس کے کھنڈروں سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریمؑ اور ''سات لڑکوں'' (یعنی اصحابِ کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

۲۲ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نُزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں، وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے، اور اِمتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ تاہم چونکہ تیسرے قول کی تردید اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے، اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔

۲۳ – مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔ اِس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دُنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے، اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اُٹھا دینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس ''عادتِ جاریہ'' کو لوگ ''قانونِ فطرت'' سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دُنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے، اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سُلا کر اس طرح اُٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس اِمتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫
وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَ قُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ
هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا

کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کردوں گا۔(تم کچھ نہیں کر سکتے) اِلّا یہ کہ اللہ چاہے۔ اگر بھُولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو اور کہو: ’’اُمید ہے کہ میرا رب اِس معاملے میں رُشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا‘‘[۲۴] ـــــــ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال

سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انھوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انھیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے ـــــــ یہ ہیں وہ اصل سبق جو آدمی کو اس قصّے سے لینے چاہییں، اور اس میں توجّہ کے قابل یہی اُمور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر اِس کھوج میں لگ جانا کہ اصحابِ کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور ان کا کتا کس رنگ کا تھا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم ان میں نہ اُلجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی، تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

۲۴ – یہ ایک جملۂ معترضہ ہے جو پچھلی آیت کے مضمون کی مناسبت سے سلسلۂ کلام کے بیچ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پچھلی آیت میں ہدایت کی گئی تھی کہ اصحابِ کہف کی تعداد کا صحیح علم اللہ کو ہے اور اس کی تحقیق کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، لہٰذا خواہ مخواہ ایک غیر ضروری بات کی کھوج میں لگنے سے پرہیز کرو، اور اس پر کسی سے بحث بھی نہ کرو۔ اس سلسلے میں آگے کی بات ارشاد فرمانے سے پہلے جملۂ معترضہ کے طور پر ایک اور ہدایت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو دی گئی، اور وہ یہ کہ تم کبھی دعوے سے یہ نہ کہہ دینا کہ میں کل فُلاں کام کر دوں گا۔ تم کو کیا خبر کہ تم وہ کام کر سکو گے یا نہیں۔ نہ تمھیں غیب کا علم، اور نہ تم

تِسۡعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَهٗ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ
الۡاَرۡضِ ؕ اَبۡصِرۡ بِهٖ وَ اَسۡمِعۡ ؕ مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ ۫ وَّلَا
يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَاتۡلُ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ كِتَابِ
رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۷﴾
وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ

اور بڑھ گئے ہیں[۲۵]۔ تم کہو: اللہ ان کے قیام کی مدّت زیادہ جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اُسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سُننے والا! زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اُس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اے نبیؐ![۲۶] تمھارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے، اسے (جوں کا توں) سُنا دو، کوئی اُس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے، (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردّ و بدل کرو گے تو) اُس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے[۲۷]۔ اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیّت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے

اپنے افعال میں ایسے خودمختار کہ جو کچھ چاہو کر سکو۔ اس لیے اگر کبھی بے خیالی میں ایسی بات زبان سے نکل بھی جائے تو فوراً مُتنبِّہ ہو کر اللہ کو یاد کرو اور اِن شاء اللہ کہہ دیا کرو۔ مزید برآں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس کام کے کرنے کو تم کہہ رہے ہو، آیا اس میں خیر ہے، یا کوئی دوسرا کام اس سے بہتر ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہا کرو کہ اُمید ہے، میرا رب اس معاملے میں صحیح بات، یا صحیح طرزِ عمل کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا۔

۲۵- اس فقرے کا تعلّق ہمارے نزدیک جملۂ معترضہ سے پہلے کے فقرے کے ساتھ ہے۔ یعنی سلسلۂ عبارت یوں ہے کہ ”کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا، .... اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور بعض لوگ اس مدّت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے ہیں۔“ اس عبارت میں تین سو اور تین سو نو سال کی تعداد جو بیان کی گئی ہے، ہمارے خیال میں یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو: اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدّت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی، تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟[۲۸]

۲۶ – اصحابِ کہف کا قصّہ ختم کرنے کے بعد اب یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے، اور اس میں اُن حالات پر تبصرہ ہے جو اس وقت مکے میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔

۲۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کی خاطر قرآن میں کچھ ردّوبدل کر دینے اور سردارانِ قریش سے کچھ کم وبیش پر مُصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے منع فرما رہا تھا۔ بلکہ دراصل اس میں رُوئے سُخن کفارِ مکہ کی طرف ہے، اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اسے بے کم وکاست پہنچا دیں۔ تمھیں ماننا ہے تو اس پورے دین کو جُوں کا تُوں مانو جو خداوندِ عالم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو۔ مگر یہ اُمید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمھیں راضی کرنے کے لیے اِس دین میں تمھاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو۔ یہ جواب ہے اُس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا، کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمھاری پوری بات مان لیں۔ آخر کچھ تو ہمارے آبائی دین کے عقائد اور رسم ورواج کی رعایت ملحوظ رکھو۔ کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمھاری مان لیں۔ اس پر سمجھوتا ہو سکتا ہے اور برادری پھُوٹ سے بچ سکتی ہے۔ قرآن میں ان کے اس مطالبے کا متعدّد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یونس کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ " جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔"

۲۸ – ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق، قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صُہیبؓ اور عمّارؓ اور خبّابؓ اور ابنِ مسعودؓ جیسے غریب لوگ، جو تمھاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انھیں ہٹاؤ تو ہم تمھاری مجلس میں آ سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر تمھارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب وروز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، ان کی معیّت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم اِن مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ دنیوی ٹھاٹ باٹ رکھنے والے لوگ تمھارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بھی بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر سنانا دراصل سردارانِ قریش کو مقصود ہے، کہ تمھاری یہ دکھاوے کی شان وشوکت، جس پر تم پھول رہے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں کچھ قدر وقیمت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو[۲۹] جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے[۳۰]۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے[۳۱]۔

رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ ٹھیک یہی معاملہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ ''ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو رذیل لوگ ہیں، وہ بے سوچے سمجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔'' اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ مَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ، ''میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا''، اور وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ، ''جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انھیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے۔'' (ہود، آیات ۲۷-۲۹-۳۱۔ نیز سورۂ انعام، آیت ۵۲۔ اور سورۃ الحجر، آیت ۸۸)

۲۹- یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ جھکو، اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو۔ یہاں ''اطاعت'' کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

۳۰- وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اخلاقی حُدود کو توڑ کر بگ ٹٹ چلنے والا ہے۔'' دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے۔ جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے، اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حُدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حُدود نا آشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مُطاع بھٹکے، اسی میں مُطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔

۳۱- یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ اصحابِ کہف کا قصّہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحابِ کہف کے جو واقعات اُوپر بیان ہوئے ہیں، ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انھوں نے کس طرح اُٹھ کر دوٹوک بات کہہ دی کہ ''ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔'' اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مُصالحت پر آمادہ نہ ہوئے، بلکہ انھوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ ''ہم اُس کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے۔'' اور کس طرح انھوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سرو سامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انھیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدانخواستہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انھیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔[۳۲] وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا[۳۳] ہوگا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بُری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

ہماری قوم ہم کو اپنی ملّت کی طرف پھیر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ اِن واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے ــــــ اور سنانا دراصل مخالفینِ اسلام کو مقصود ہے ــــــ کہ اِن مشرکین اور منکرینِ حق سے مُصالحت قطعاً خارج از بحث ہے۔ جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے، اسے بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کردو۔ مانتے ہیں تو مانیں، نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے۔ جنھوں نے مان لیا ہے، خواہ وہ کم سِن نوجوان ہوں، یا بے مال و زر فقیر، یا غلام اور مزدور، بہرحال وہی قیمتی جواہر ہیں، انھی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا، اور ان کو چھوڑ کر اُن بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں، مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔

۳۲- سُرادِق کے اصل معنٰی ہیں: قناتیں اور سراپردے، جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ لیکن جہنّم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سُرادِق سے مراد اس کے وہ بیرونی حُدود ہیں جہاں تک اس کی لپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ''اس کے سُرادِق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔'' بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنٰی میں لیا ہے، یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالَمِ آخرت میں جہنّم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے۔ لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے منہ موڑنے والے ظالم یہیں سے جہنّم کی لپیٹ میں آچکے ہیں اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

۳۳- لغت میں مُہل کے مختلف معنٰی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنٰی ''تیل کی تلچھٹ'' بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ ''لاوے'' کے معنٰی میں آتا ہے، یعنی زمین کے وہ مادّے جو شدّتِ حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنٰی پیپ اور لہو کے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهِمُ ٱلْأَنْهَٰرُ يُحَلَّوْنَ
فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ
وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ ٱلثَّوَابُ ۚ
وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾ ع وَٱضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا
جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَٰبٍ وَحَفَفْنَٰهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾
كِلْتَا ٱلْجَنَّتَيْنِ ءَاتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِم مِّنْهُ شَيْـًٔا ۚ وَفَجَّرْنَا خِلَٰلَهُمَا
نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَكَانَ لَهُۥ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَٰحِبِهِۦ وَهُوَ يُحَاوِرُهُۥٓ أَنَا

ان کے لیے سدا بہار جنّتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں[۳۴] گے، باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور اُونچی مسندوں[۳۵] پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام! ع

اے محمدؐ! اِن کے سامنے ایک مثال پیش کر دو[۳۶]۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور اُن کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پُھولے اور بار آور ہونے میں انھوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اُن باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اُسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسایے سے بات کرتے ہوئے بولا:

۳۴- قدیم زمانے میں بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے تھے۔ اہلِ جنّت کے لباس میں اس چیز کا ذکر کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ وہاں ان کو شاہانہ لباس پہنائے جائیں گے۔ ایک کافر و فاسق بادشاہ وہاں ذلیل و خوار ہوگا، اور ایک مومن و صالح مزدور وہاں بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے رہے گا۔

۳۵- اَرائک جمع ہے اَرِیکہ کی۔ اَرِیکہ عربی زبان میں ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر چتر لگا ہوا ہو۔ اس سے بھی یہی تصور دلانا مقصود ہے کہ وہاں ہر جنتی تختِ شاہی پر متمکن ہوگا۔

۳۶- اس مثال کی مناسبت سمجھنے کے لیے پچھلے رکوع کی وہ آیت نگاہ میں رہنی چاہیے جس میں کے کے متکبر سرداروں کی اس بات کا جواب دیا گیا تھا کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آ کر نہیں بیٹھ سکتے، انھیں ہٹا دیا جائے تو ہم آ کر سنیں گے کہ تم کیا کہنا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ
مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ
رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ
يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ
رَجُلًا ؕ ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ

”میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔“ پھر وہ اپنی جنّت میں داخل ہوا[۳۷] اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا: ”میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اِس سے بھی زیادہ شان دار جگہ پاؤں گا۔“[۳۸] اُس کے ہمسایے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا: ”کیا تو کفر کرتا ہے اُس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟[۳۹] رہا میں، تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنی جنّت میں داخل

چاہتے ہو۔ اس مقام پر وہ مثال بھی نگاہ میں رہے جو سورۂ القلم، آیات ۱۷ تا ۳۳ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ نیز سورۂ مریم، آیات ۷۳-۷۷، سورۂ المومنون، آیات ۵۵ تا ۶۱، سورۂ سبا، آیات ۳۴ تا ۳۶، اور حٰم سجدہ، آیات ۴۹-۵۰ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۳۷- یعنی جن باغوں کو وہ اپنی جنّت سمجھ رہا تھا۔ کم ظرف لوگ، جنھیں دنیا میں کچھ شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے، ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انھیں دنیا ہی میں جنّت نصیب ہو چکی ہے، اب اور کون سی جنت ہے جسے حاصل کرنے کی وہ فکر کریں۔

۳۸- یعنی اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے بھی تو میں وہاں اس سے بھی زیادہ خوش حال رہوں گا، کیونکہ یہاں میرا خوش حال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں خدا کا محبوب اور اس کا چہیتا ہوں۔

۳۹- اگرچہ اُس شخص نے خدا کی ہستی سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کا قائل تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے ہمسایے نے اسے کفر باللہ کا مجرم قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر باللہ محض ہستیِ باری کے انکار ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ تکبّر اور فخر و غرور اور انکارِ آخرت بھی اللہ سے کفر ہی ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ بس میں ہی میں ہوں، میری دولت اور شان و شوکت کسی کا عطیہ نہیں بلکہ میری قوت و قابلیت کا نتیجہ ہے، اور میری دولت

جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ
مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا
حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا
فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ
اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ
بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ
مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ ؕ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

ع ۵ ۱۷

ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ، لاقوۃ الّا باللہ؟[۴۰] اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنّت سے بہتر عطا فرما دے، اور تیری جنّت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے، یا اس کا پانی زمین میں اُتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔" آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر اُلٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ "کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہوتا" ـــــ نہ ہُوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ ـــــ اُس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے، انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے، اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے۔ع

لازوال ہے، کوئی اس کو مجھ سے چھیننے والا نہیں، اور کسی کے سامنے مجھے حساب دینا نہیں، وہ اگر خدا کو مانتا بھی ہے، تو محض ایک وجود کی حیثیت سے مانتا ہے، اپنے مالک اور آقا اور فرماں روا کی حیثیت سے نہیں مانتا۔ حالانکہ ایمان باللہ اسی حیثیت سے خدا کو ماننا ہے، نہ کہ محض ایک موجودِ ہستی کی حیثیت سے۔

۴۰ – "یعنی جو کچھ اللہ چاہے وہی ہوگا۔ میرا اور کسی کا کچھ زور نہیں ہے۔ ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ ہی کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ
نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ
بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ

اور اے نبیؐ! اِنھیں حیاتِ دُنیا کی حقیقت اِس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خُوب گھنی ہوگئی، اور کل وہی نباتات بُھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اُڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[41]۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دُنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرایش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور اُنھی سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ فکر اُس دن کی ہونی چاہیے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے[42]، اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے[43]، اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا[44]، اور سب کے سب تمھارے رب کے حُضور صف درصف پیش کیے جائیں گے۔

توفیق وتائید سے چل سکتا ہے۔"

۴۱ – یعنی وہ زندگی بھی بخشتا ہے اور موت بھی۔ وہ عُروج بھی عطا کرتا ہے اور زوال بھی۔ اس کے حکم سے بہار آتی ہے تو خزاں بھی آ جاتی ہے۔ اگر آج تمھیں عیش اور خوش حالی میسّر ہے تو اس غرّے میں نہ رہو کہ یہ حالت لازوال ہے۔ جس خدا کے حکم سے یہ کچھ تمھیں ملا ہے، اسی کے حکم سے سب کچھ تم سے چِھن بھی سکتا ہے۔

۴۲ – یعنی جب کہ زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور پہاڑ اس طرح چلنے شروع ہوں گے جیسے بادل چلتے ہیں۔ اِس کیفیت کو ایک دوسرے مقام پر قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ (النمل: ۸۸) "تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ سخت جمے ہوئے ہیں، مگر وہ چلیں گے اس طرح جیسے بادل چلتے ہیں۔"

۴۳ – یعنی اس پر کوئی روئیدگی اور کوئی عمارت باقی نہ رہے گی، بالکل ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ یہ وہی بات ہے جو اِس سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی تھی کہ "جو کچھ اس زمین پر ہے، اسے ہم نے لوگوں کی آزمایش کے لیے ایک عارضی آرایش

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ
مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ
وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا
كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ
اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ

ع ۶ ۱۸

—— لو دیکھ لو، آ گئے نا تم ہمارے پاس اُسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔[۴۵] تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمھارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے۔ نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو۔ جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔[۴۶] ع

یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔[۴۷]

بنایا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بالکل ایک بے آب و گیاہ صحرا بن کر رہ جائے گی۔"

۴۴ – یعنی ہر انسان جو آدمؑ سے لے کر قیامت کی آخری ساعت تک پیدا ہوا ہے، خواہ ماں کے پیٹ سے نکل کر اس نے ایک ہی سانس لیا ہو، اُس وقت دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور سب کو ایک وقت میں جمع کر دیا جائے گا۔

۴۵ – یعنی اُس وقت منکرینِ آخرت سے کہا جائے گا کہ دیکھو، انبیاؑ کی دی ہوئی خبر سچی ثابت ہوئی نا۔ وہ تمھیں بتاتے تھے کہ جس طرح اللہ نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا، مگر تم اسے ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بتاؤ، اب دوبارہ تم پیدا ہو گئے یا نہیں؟

۴۶ – یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہوگا کہ آدمی کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے، یا بے گناہ پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔

۴۷ – اس سلسلۂ کلام میں قصۂ آدمؑ و ابلیس کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود گمراہ انسانوں کو ان کی اس حماقت پر متنبّہ

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝۵۱

وہ جِنّوں میں سے تھا، اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔[۴۸] اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اُس کو اور اس کی ذُرِّیّت کو اپنا سرپرست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی بُرا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں نے آسمان و زمین پیدا کرتے وقت اُن کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود اُن کی اپنی تخلیق میں انھیں شریک کیا تھا۔[۴۹] میرا یہ کام نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں۔

کرنا ہے کہ وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار اور خیر خواہ پیغمبروں کو چھوڑ کر اپنے اُس اَزَلی دشمن کے پھندے میں پھنس رہے ہیں جو اوّل روزِ آفرینش سے ان کے خلاف حسد رکھتا ہے۔

۴۸- یعنی ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنّوں میں سے تھا، اسی لیے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لیے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرتاً مطیع فرمان ہیں: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم:۶) ”اللہ جو حکم بھی ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جو اُن کو حکم دیا جاتا ہے۔“ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (النحل:۵۰) ”وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے رب سے جو اُن کے اوپر ہے۔ ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔“ بخلاف اس کے، جِنّ انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے، جسے پیدائشی فرماں بردار نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ کفر و ایمان اور طاعت و معصیت، دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اسی حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنّوں میں سے تھا، اس لیے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح اُن تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا، اور فرشتہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ معلم الملکوت۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الحجر، آیت ۲۷- اور الجن، آیات ۱۳-۱۵)

رہا یہ سوال کہ جب ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو پھر قرآن کا یہ طرزِ بیان کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، پس ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا“؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کے معنی یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقاتِ ارضی بھی انسان کی مطیعِ فرمان بن جائیں جو کُرۂ زمین کی عمل داری میں فرشتوں کے زیرِ انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سربسجود ہوئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ (لفظ ابلیس کے معنی کے لیے ملاحظہ ہو: المومنون، حاشیہ ۷۳)

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ
يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ
فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ع وَلَقَدْ
صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط وَكَانَ الْاِنْسَانُ
اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ

رکوع ۱۹

پھر کیا کریں گے یہ لوگ اُس روز جب کہ اِن کا رب اِن سے کہے گا کہ پکارو اب اُن ہستیوں کو جنھیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔[۵۰] یہ ان کو پکاریں گے، مگر وہ اِن کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے۔[۵۱] سارے مجرم اُس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انھیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔ ع

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ اُن کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر اُن کو

---

۴۹ – مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین آخر تمھاری طاعت و بندگی کے مستحق کیسے بن گئے؟ بندگی کا مستحق تو صرف خالق ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان شیاطین کا حال یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق میں شریک ہونا تو درکنار، یہ تو خود مخلوق ہیں۔

۵۰ – یہاں پھر وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے بھی کئی جگہ قرآن میں گزر چکا ہے کہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے احکام اور رہنمائی کا اتباع کرنا دراصل اس کو خدائی میں اللہ کا شریک ٹھیرانا ہے، خواہ آدمی اُس دوسرے کو زبان سے خدا کا شریک قرار دیتا ہو، یا نہ قرار دیتا ہو۔ بلکہ اگر آدمی اُن دوسری ہستیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی امرِ الٰہی کے مقابلے میں ان کے اوامر کا اتباع کر رہا ہو، تب بھی وہ شرک کا مجرم ہے۔ چنانچہ یہاں شیاطین کے معاملے میں آپ علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ہر ایک ان پر لعنت کرتا ہے، مگر اس لعنت کے باوجود جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، قرآن اُن سب کو یہ الزام دے رہا ہے کہ تم شیاطین کو خدا کا شریک بنائے ہوئے ہو۔ یہ شرکِ اعتقادی نہیں بلکہ شرکِ عملی ہے، اور قرآن اس کو بھی شرک ہی کہتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۹۱-۱۴۵۔ الانعام، حاشیہ ۸۷-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱۔ ابراہیم، حاشیہ ۳۲۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۷۔ المومنون، حاشیہ ۴۱۔ الفرقان، حاشیہ ۵۶۔ القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳۔ یٰسین، حاشیہ ۵۳۔ الشوریٰ، حاشیہ ۳۸۔ الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

۵۱ – مفسّرین نے اس آیت کے دو مفہوم بیان کیے ہیں: ایک وہ جو ہم نے اُوپر ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا

Maktaba Tul Ishaat.com

الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ
الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ
وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ
وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا
وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ

کس چیز نے روک دیا؟ اِس کے سوا اَور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے، یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں![۵۲]

رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اَور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں۔[۵۳] مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انھوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو، جو انھیں کی گئیں، مذاق بنالیا ہے۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے منہ پھیرے اور اُس بُرے انجام کو بُھول جائے جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے؟ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیے ہیں جو انھیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے،

مفہوم یہ ہے کہ ''ہم ان کے درمیان عداوت ڈال دیں گے۔'' یعنی دنیا میں ان کے درمیان جو دوستی تھی، آخرت میں وہ سخت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔

۵۲ - یعنی جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے، قرآن نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ دل اور دماغ کو اپیل کرنے کے جتنے مؤثر طریقے اختیار کرنے ممکن تھے، وہ سب بہترین انداز میں یہاں اختیار کیے جا چکے ہیں۔ اب وہ کیا چیز ہے جو انھیں قبولِ حق میں مانع ہو رہی ہے؟ صرف یہ کہ انھیں عذاب کا انتظار ہے۔ جوتے کھائے بغیر سیدھے نہیں ہونا چاہتے۔

۵۳ - اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ رسولوں کو ہم اسی لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ بے وقوف لوگ ان پیشگی تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اسی انجامِ بد کو دیکھنے پر مُصِر ہیں جس سے رسول انھیں بچانا چاہتے ہیں۔

وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا
اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا
لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾
وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کردی ہے۔ تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔[۵۴]

تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انھیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج دیتا۔ مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے۔[۵۵]

یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمھارے سامنے موجود[۵۶] ہیں۔ انھوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ع

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو عذاب ہی دیکھنا منظور ہے تو پیغمبر سے اس کا مطالبہ نہ کریں، کیونکہ پیغمبر عذاب دینے کے لیے نہیں بلکہ عذاب سے پہلے صرف خبردار کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

۵۴ – یعنی جب کوئی شخص یا گروہ دلیل وحجت اور خیرخواہانہ نصیحت کے مقابلے میں جھگڑالوپن پر اُتر آتا ہے، اور حق کا مقابلہ جھوٹ اور مکر وفریب کے ہتھیاروں سے کرنے لگتا ہے، اور اپنے کرتُوتوں کا بُرا انجام دیکھنے سے پہلے کسی کے سمجھانے سے اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ پھر اس کے دل پر قفل چڑھا دیتا ہے اور اس کے کان ہر صدائے حق کے لیے بہرے کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ نصیحت سے نہیں مانا کرتے، بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں گر کر ہی انھیں یقین آتا ہے کہ وہ ہلاکت تھی جس کی راہ پر وہ بڑھے چلے جا رہے تھے۔

۵۵ – یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے قصور سرزد ہو، اُسی وقت پکڑ کر اسے سزا دے ڈالے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ مجرموں کے پکڑنے میں وہ جلدبازی سے کام نہیں لیتا اور مدتوں ان کو سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر سخت نادان ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو غلط معنی میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ خواہ کچھ ہی کرتے رہیں، ان سے کبھی باز پرس ہوگی ہی نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤی اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَیۡنِهِمَا نَسِیَا حُوۡتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ

(ذرا اِن کو وہ قصّہ سُناؤ جو موسیٰؑ کو پیش آیا تھا) جب کہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ”میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔“[۵۷] پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا

۵۶ – اشارہ ہے سَبا اور ثمود اور مَدیَن اور قومِ لُوط کے اُجڑے دیاروں کی طرف، جنھیں قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں آتے جاتے دیکھا کرتے تھے، اور جن سے عرب کے دوسرے لوگ بھی خوب واقف تھے۔

۵۷ – اس مرحلے پر یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بیں نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے، اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنھیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرماں برداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کُنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں اُلجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجا نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں، اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیّت کا پردہ اُٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی، تا کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے، کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عَوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جس میں وہ ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا۔ لیکن ابنِ عباسؓ سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کُتُبِ حدیث میں منقول ہیں، وہ اس بیان کی تائید نہیں کرتیں، اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ کبھی مصر میں رہے تھے۔ بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خُروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تِیہ میں گزرا۔ اس لیے یہ روایت تو قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ جب ہم خود اس قصّے کی تفصیلات پر غور کرتے

فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ

میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سُرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا: ”لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے

ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں: ایک، یہ کہ یہ مُشاہدات حضرت موسیٰؑ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دَور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغازِ نبوت ہی میں انبیا علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے، یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان مشاہدات کی ضرورت اُس زمانے میں پیش آئی ہو گی جب کہ بنی اسرائیل کو بھی اُسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (واللہ اعلم عنداللہ) کہ اس واقعے کا تعلق اُس دور سے ہے جب کہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اُوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے بازپُرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا! ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰؑ یہ پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ ”اے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اے پروردگار! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟“ (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۰۸)

اگر ہمارا یہ قیاس دُرست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰؑ کا یہ سفر سُودان (سوڈان) کی جانب تھا، اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خُرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق آ کر ملتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: نقشہ ۱، صفحہ ۳۴) حضرت موسیٰؑ نے اپنی پوری زندگی جن علاقوں میں گزاری ہے، ان میں اس ایک مقام کے سوا اور کوئی مجمع البحرین نہیں پایا جاتا۔

بائبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تَلمُود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت موسیٰؑ کے بجائے رَبّی یہوحانان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ رَبّی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاسؑ کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دُنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔ (The Talmud Selections by H. Polano, pp. 313-316) ممکن ہے کہ خُروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو، اور صدیوں بعد انھوں نے قصّے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں۔ تلمُود کی اسی روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو تلمُود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جا سکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقے سے کیا گیا ہو گا، اور پھر جب کہ معتبر احادیث میں حضرت اُبَیؓ بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصّے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ

سفر میں تو ہم بُری طرح تھک گئے ہیں۔" خادم نے کہا: "آپ نے دیکھا! یہ کیا ہُوا؟ جب ہم اُس چٹان کے

موسیٰ پیغمبرِ بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائقِ التفات نہیں رہتا۔

مستشرقینِ مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآنِ مجید کے اس قصّے کے بھی مآخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصوں پر اُنگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نقل کر کے یہ قصہ بنا لیا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اُوپر بذریعۂ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک، داستانِ گلگامیش، دوسرے، سکندر نامۂ سُریانی، اور تیسرے، وہ یہودی روایت جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بدطینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں، اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہر حال مُنَزّل مِنَ اللہ تو نہیں ماننا ہے، اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فُلاں فُلاں مقامات سے چُرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرزِ تحقیق میں یہ لوگ اِس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھِن آنے لگتی ہے، اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر۔ ان کی اس متعصبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالبِ علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

اوّل، یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جُلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انھی کتابوں سے ماخوذ ہے؟

دوسرے، یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں آپ لوگوں نے قرآنِ مجید کے قصّوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دی ہیں، اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کُتُب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکے میں اُس وقت موجود تھا اور مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار اُن دو تین سفروں پر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لائے تھے؟ اور اعلانِ نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپؐ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

تیسرے، یہ کہ کفارِ مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سَرقے کا پتا نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انھیں تو بار بار تحدّی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن مُنَزّل مِنَ اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ
سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓی
اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ

پاس ٹھیرے ہوئے تھے، اُس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بُھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔" موسیٰؑ نے کہا: "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی۔"[58] چنانچہ وہ دونوں اپنے نقشِ قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔[59]

موسیٰؑ نے اس سے کہا: "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی

ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے مُعاصر دشمنانِ اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے، جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار، شک ہی کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج معاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہر حال ہے نا کہ قرآن مُنزّل مِنَ اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے اُنھی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے مسخ ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا، اور کیوں صرف اِسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن اُن قصّوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصّب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا، وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مُستشرقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالبِ علم کے لیے قابلِ التفات نہیں ہے۔

۵۸ – یعنی منزلِ مقصود کا یہی نشان تو ہم کو بتایا گیا تھا۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا

Maktaba Tul Ishaat.com

مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ
تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا
وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى
اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع فَانْطَلَقَا وقفة حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ط
قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ج لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ

تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟" اس نے جواب دیا: "آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو، آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔" موسیٰؑ نے کہا "ان شاءاللہ، آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔" اس نے کہا: "اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں، جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔" ع

اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی۔" اس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ

یہ سفر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور ان کو منزلِ مقصود کی علامت یہی بتائی گئی تھی کہ جہاں ان کے ناشتے کی مچھلی غائب ہو جائے، وہی مقام اس بندے کی ملاقات کا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔

۵۹ – اس بندے کا نام تمام معتبر احادیث میں خَضِر بتایا گیا ہے۔ اس لیے اُن لوگوں کے اقوال کسی التفات کے مستحق نہیں ہیں جو اسرائیلی رِوایات سے متاثّر ہو کر حضرت الیاسؑ کی طرف اس قصے کو منسوب کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول نہ صرف اس بنا پر غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے متصادم ہوتا ہے، بلکہ اس بنا پر بھی سراسر لغو ہے کہ حضرت الیاسؑ، حضرت موسیٰؑ کے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے خادم کا نام بھی قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں ذکر ہے کہ وہ حضرت یوشعؑ بن نُون تھے جو بعد میں حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ ہوئے۔

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا
تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ
قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ الجزء ۱۶
عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾
فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ اِۨسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ
يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ
شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ

تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰؑ نے کہا: "بھول چُوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔"

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی، حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا۔" اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰؑ نے کہا: "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پُوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے، اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔"

پھر وہ آگے چلے، یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اُس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے۔" اُس نے کہا: "بس میرا تمھارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمھیں ان باتوں

Maktaba Tul Ishaat.com

بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ
لِمَسٰكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ
يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ أَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَآ
أَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَآ أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ
زَكٰوةً وَّأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي
الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ
أَنْ يَّبْلُغَآ أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا
فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾ ع ١٢

حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلۂ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اِس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے اِن بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے[٦٠]۔" ع

٦٠ - اس قصّے میں ایک بڑی پیچیدگی ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے۔ حضرت خضرؑ نے یہ تین کام جو کیے ہیں، ان میں سے تیسرا کام تو خیر شریعت سے نہیں ٹکراتا، مگر پہلے دونوں کام یقیناً اُن احکام سے متصادم ہوتے ہیں جو ابتدائے

عہدِ انسانیت سے آج تک تمام شرائعِ الٰہیہ میں ثابت رہے ہیں۔ کوئی شریعت بھی کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کی مملوکہ چیز کو خراب کر دے، اور کسی مُتَنَفِّس کو بے قصور قتل کر ڈالے۔ حتّٰی کہ اگر کسی انسان کو بطریقِ الہام بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کشتی کو آگے جا کر ایک غاصب چھین لے گا، اور فلاں لڑکا بڑا ہو کر سرکش اور کافر نکلے گا، تب بھی اس کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں سے کسی شریعت کی رُو سے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس الہامی علم کی بنا پر کشتی میں چھید کر دے اور ایک بے گناہ لڑکے کو مار ڈالے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ حضرت خِضرؑ نے یہ دونوں کام اللہ کے حکم سے کیے تھے، فی الواقع اس پیچیدگی کو کچھ بھی رفع نہیں کرتا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حضرت خِضرؑ نے یہ کام کس کے حکم سے کیے تھے۔ ان کا حکمِ الٰہی سے ہونا تو بالیقین ثابت ہے، کیونکہ حضرت خِضرؑ خود فرماتے ہیں کہ ان کے یہ افعال ان کے اختیاری نہیں ہیں بلکہ اللہ کی رحمت ان کی محرک ہوئی ہے، اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ خود فرما چکا ہے کہ حضرت خِضرؑ کو اللہ کی طرف سے ایک علمِ خاص حاصل تھا۔ پس یہ امر تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ کام اللہ کے حکم سے کیے گئے تھے۔ مگر اصل سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے اِن احکام کی نوعیت کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ تشریعی احکام نہ تھے، کیونکہ شرائعِ الٰہیہ کے جو بنیادی اُصول قرآن اور اس سے پہلے کی کُتُبِ آسمانی سے ثابت ہیں، ان میں کبھی کسی انسان کے لیے یہ گنجایش نہیں رکھی گئی کہ وہ بلا ثبوتِ جرم کسی دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ احکام اپنی نوعیت میں اللہ تعالیٰ کے اُن تکوینی احکام سے مشابہت رکھتے ہیں جن کے تحت دنیا میں ہر آن کوئی بیمار کر ڈالا جاتا ہے اور کوئی تندرست کیا جاتا ہے، کسی کو موت دی جاتی ہے اور کسی کو زندگی سے نوازا جاتا ہے، کسی کو تباہ کیا جاتا ہے اور کسی پر نعمتیں نازل کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ تکوینی احکام ہیں تو ان کے مخاطَب صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں، جن کے بارے میں شرعی جواز و عدمِ جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی اختیار کے بغیر صرف اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل کرتے ہیں۔ رہا انسان، تو خواہ وہ بلا ارادہ کسی تکوینی حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنے اور خواہ الہاماً اس طرح کا کوئی غیبی علم اور حکم پا کر اس پر عمل درآمد کرے، بہر حال وہ گناہگار ہونے سے نہیں بچ سکتا اگر وہ کام جو اس نے کیا ہے، کسی حکمِ شرعی سے ٹکراتا ہو۔ اس لیے کہ انسان بحیثیت اس کے کہ وہ انسان ہے، احکامِ شرعیہ کا مکلَّف ہے، اور اُصولِ شریعت میں کہیں یہ گنجایش نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لیے محض اس بنا پر احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعۂ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعۂ علمِ غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابر صوفیہ بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علّامہ آلوسیؒ نے تفصیل کے ساتھ عبدالوہاب شَعرانی، مُحیُ الدین ابنِ عَرَبی، مُجدِّدِ الفِ ثانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، جُنَید بغدادی، سَرِی سَقَطی، ابوالحسین النُّوری، ابوسعید الخَرّاز، ابوالعباس احمد الدِّینَوَری اور امام غزّالی رحمہم اللہ جیسے نامور بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحبِ الہام تک کے لیے جائز نہیں ہے جو نصِّ شرعی کے خلاف ہو۔ (رُوح المعانی، ج ١٦، ص ١٦-١٨)

اب کیا ہم یہ مان لیں کہ اس قاعدۂ کُلِّیّہ سے صرف ایک انسان مستثنٰی کیا گیا ہے، اور وہ ہیں حضرت خِضرؑ؟ یا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۞۸۳

اور اے محمدؐ! یہ لوگ تم سے ذُوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۶۱۔ ان سے کہو: میں اس کا کچھ حال تم کو سُناتا ہوں۶۲۔

یہ سمجھیں کہ خِضرؑ کوئی انسان نہ تھے، بلکہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیّتِ الٰہی کے تحت (نہ کہ شریعتِ الٰہی کے تحت) کام کرتے ہیں؟

پہلی صورت کو ہم تسلیم کر لیتے اگر قرآن بالفاظِ صریح یہ کہہ دیتا کہ وہ ''بندہ'' جس کے پاس حضرت موسیٰؑ اس تربیت کے لیے بھیجے گئے تھے، انسان تھا۔ لیکن قرآن اس کے انسان ہونے کی تصریح نہیں کرتا، بلکہ صرف عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کے الفاظ بولتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اُس بندے کے انسان ہونے کو مُستلزم نہیں ہیں، قرآنِ مجید میں متعدد جگہ فرشتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہُوا ہے، مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ انبیاء، آیت ۲۶ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۱۹۔ پھر کسی صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی ایسا ارشاد منقول نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ حضرت خِضرؑ کو نوعِ انسانی کا ایک فرد قرار دیا گیا ہو۔ اس باب میں مستند ترین روایات وہ ہیں جو عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس، عن اُبیّ بن کعب، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے ائمۂ حدیث کو پہنچی ہیں۔ ان میں حضرت خِضرؑ کے لیے صرف رَجُل کا لفظ آیا ہے، جو اگرچہ مرد انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر انسانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں یہ لفظ جنّوں کے لیے مستعمل ہو چکا ہے، جیسا کہ سورۂ جنّ میں ارشاد ہوا ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ جن یا فرشتہ یا کوئی اور غیر مرئی وجود جب انسانوں کے سامنے آئے گا تو انسانی شکل ہی میں آئے گا اور اس حالت میں اس کو بشر یا انسان ہی کہا جائے گا۔ حضرت مریمؑ کے سامنے جب فرشتہ آیا تھا تو قرآن اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے کہ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''وہاں انھوں نے ایک مرد کو پایا'' حضرت خِضرؑ کے انسان ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم ''خِضرؑ'' کو انسان نہ مانیں بلکہ فرشتوں میں سے، یا اللہ کی کسی اور ایسی مخلوق میں سے سمجھیں جو شرائع کی مکلّف نہیں ہے بلکہ کارگاہِ مشیّت کی کارکن ہے۔ متقدمین میں سے بھی بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے، جسے ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ماوَردی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

۶۱ – وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ کا عطف لامحالہ پچھلے قصے ہی پر ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قصہ موسیٰ و خِضر بھی لوگوں کے سوال ہی کے جواب میں سنایا گیا ہے، اور یہ بات ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے کہ اس سورہ کے یہ تینوں اہم قصے دراصل کفارِ مکہ نے اہلِ کتاب کے مشورے سے امتحاناً دریافت کیے تھے۔

۶۲ – یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ ''ذوالقرنین'' جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، کون تھا۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا، لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے۔

ہیں، وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرماں روا خورس (خُسرَو یا سائرس) کی طرف ہے، اور یہ نسبتاً زیادہ قرینِ قیاس ہے، مگر بہرحال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیت کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

قرآنِ مجید جس طرح اُس کا ذکر کرتا ہے، اس سے ہم کو چار باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس کا لقب ذوالقرنین (لغوی معنیٰ "دو سینگوں والا") کم از کم یہودیوں میں، جن کے اشارے سے کفارِ مکہ نے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، ضرور معروف ہونا چاہیے۔ اس لیے لامحالہ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے اسرائیلی لٹریچر کی طرف رُجوع کرنا پڑے گا کہ وہ "دو سینگوں والے" کی حیثیت سے کس شخصیت یا سلطنت کو جانتے تھے۔

(۲) وہ ضرور کوئی بڑا فرمانروا اور فاتح ہونا چاہیے جس کی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچی ہوں، اور تیسری جانب شمال یا جنوب میں بھی وسیع ہوئی ہوں۔ ایسی شخصیتیں نُزولِ قرآن سے پہلے چند ہی گزری ہیں اور لامحالہ انھی میں سے کسی میں اس کی دوسری خصوصیات ہمیں تلاش کرنی ہوں گی۔

(۳) اُس کا مِصداق ضرور کوئی ایسا فرمانروا ہونا چاہیے جس نے اپنی مملکت کو یاجوج و ماجوج کے حملوں سے بچانے کے لیے کسی پہاڑی دَرّے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہو۔ اس علامت کی تحقیق کے لیے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ یاجوج و ماجوج سے مراد کون سی قومیں ہیں، اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے علاقے سے متصل کون سی ایسی دیوار کبھی دنیا میں بنائی گئی ہے اور وہ کس نے بنائی ہے۔

(۴) اس میں مذکورۂ بالا خصوصیات کے ساتھ ایک یہ خصوصیت بھی پائی جانی چاہیے کہ وہ خدا پرست اور عادل فرمانروا ہو، کیونکہ قرآن یہاں سب سے بڑھ کر اس کی اِسی خصوصیّت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان میں سے پہلی علامت آسانی کے ساتھ خورس پر چسپاں کی جا سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفۂ دانی ایل میں دانیال نبی کا جو خواب بیان کیا گیا ہے، اس میں وہ یونانیوں کے عُروج سے قبل مِیڈیا اور فارس کی مُتَّحِدہ سلطنت کو ایک مینڈھے کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ تھے۔ یہودیوں میں اس "دو سینگوں والے" کا بڑا چرچا تھا، کیونکہ اسی کی ٹکر نے آخرکار بابل کی سلطنت کو پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی۔ (تفہیم القرآن، جلد ۲ ص ۵۹۸-۵۹۹)

دوسری علامت بڑی حد تک اُس پر چسپاں ہوتی ہے، مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی فتوحات بلاشبہ مغرب میں ایشیائے کُوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بَلخ) تک وسیع ہوئیں، مگر شمال یا جنوب میں اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا

اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سروسامان کیا حتٰی کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا[۶۳] تو اس نے

کسی بڑی مہم کا سراغ ابھی تک تاریخ سے نہیں ملا ہے، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ ایک تیسری مہم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ تاہم اس مہم کا پیش آنا بعید از قیاس نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کی رُو سے خُورس کی سلطنت شمال میں کاکیشیا (قَفقاز) تک وسیع تھی۔

تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب محقق ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد رُوس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ہُن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کے حملوں سے بچنے کے لیے قَفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ابھی تک ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ خُورس ہی نے یہ استحکامات تعمیر کیے تھے۔

آخری علامت قدیم زمانے کے معروف فاتحوں میں اگر کسی پر چسپاں کی جاسکتی ہے تو وہ خُورس ہی ہے۔ کیونکہ اس کے دشمنوں تک نے اس کے عدل کی تعریف کی ہے، اور بائبل کی کتاب عَزرا اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ضرور ایک خدا پرست اور خداترس بادشاہ تھا جس نے بنی اسرائیل کو ان کی خدا پرستی ہی کی بنا پر بابل کی اسیری سے رہا کیا اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے بیت المَقدِس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس بنا پر ہم یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نُزولِ قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحینِ عالم گزرے ہیں، ان میں سے خُورس ہی کے اندر "ذوالقرنین" کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں، لیکن تعیُّن کے ساتھ اسی کو ذُوالقرنین قرار دے دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خُورس ہے۔

تاریخی بیان کے لیے صرف اتنا ذکر کافی ہے کہ خُورس ایک ایرانی فرمانروا تھا جس کا عُروج ۵۴۹ ق م کے قریب زمانے میں شروع ہوا۔ اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال) اور لیڈیا (ایشیائے کُوچک) کی سلطنتوں کو مسخر کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابل کو بھی فتح کرلیا، جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستے میں مُزاحم نہیں رہی۔ اُس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صُغد (موجودہ تُرکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک، اور دوسری طرف تھریس اور مقدُونیا تک وسیع ہوگیا، اور شمال میں اس کی سلطنت قَفقاز (کاکیشیا) اور خُوارِزم تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابعِ فرمان تھی۔

۶۳ – غروبِ آفتاب کی حد سے مراد، جیسا کہ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے: اقصی ما یسلك فيه من الارض من ناحیة المغرب ہے، نہ کہ آفتاب غروب ہونے کی جگہ۔ مراد یہ ہے کہ وہ مغرب کی جانب ملک پر ملک فتح کرتا ہوا خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا جس کے آگے سمندر تھا۔

تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ
اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا
مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ
مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ
الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا

سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا[۶۴] اور وہاں اُسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: ”اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ اِن کے ساتھ نیک رویّہ اختیار کرے۔“[۶۵] اس نے کہا: ”جو اِن میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو اِن میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔“

پھر اُس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی، یہاں تک کہ طلوعِ آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے

---

۶۴ – یعنی وہاں غروبِ آفتاب کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج سمندر کے سیاہی مائل گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اگر فی الواقع ذوالقرنین سے مراد خورس ہی ہو تو یہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہوگا جہاں بحرِ ایجیئن چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس قیاس کی تائید یہ بات بھی کرتی ہے کہ قرآن یہاں بحر کے بجائے عین کا لفظ استعمال کرتا ہے، جو سمندر کے بجائے جھیل یا خلیج ہی پر زیادہ صحت کے ساتھ بولا جا سکتا ہے۔

۶۵ – ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات براہِ راست وحی یا الہام کے ذریعے ہی سے ذوالقرنین کو خطاب کر کے فرمائی ہو، حتّٰی کہ اس سے ذوالقرنین کا نبی یا مُحدَّث ہونا لازم آئے۔ بلکہ یہ ارشاد زبانِ حال کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ ذوالقرنین اُس وقت فتح یاب ہو کر اس علاقے پر قابض ہوا تھا۔ مفتوح قوم اس کے بس میں تھی۔ اللہ نے اس صورتِ حال میں اس کے ضمیر کے سامنے یہ سوال رکھ دیا کہ یہ تیرے امتحان کا وقت ہے۔ یہ قوم

Maktaba Tul Ishaat.com

سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ
يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ
فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

نہیں کیا ہے[66]۔ یہ حال تھا اُن کا، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا، اُسے ہم جانتے تھے۔

پھر اُس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا، یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا[67] تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی[68]۔ اُن لوگوں نے کہا کہ "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج[69] اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟"

تیرے آگے بے بس ہے۔ تُو ظلم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور شرافت کا سلوک کرنا چاہے تو یہ بھی تیرے اختیار میں ہے۔

۶۶ – یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہُوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہنچ گیا جہاں مہذب دُنیا کی سرحد ختم ہوگئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار، خیمے بنانا تک نہ جانتی تھیں۔

۶۷ – چونکہ آگے یہ ذکر آ رہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یاجوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لیے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد کاکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحرِ خَزَر (کیسپین یا [قزوین]) اور بحرِ اَسْوَد کے درمیان واقع ہیں۔

۶۸ – یعنی اس کی زبان ذوالقرنین اور اس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔ سخت وحشی ہونے کے سبب سے نہ کوئی ان کی زبان سے واقف تھا اور نہ وہ کسی غیر زبان سے واقف تھے۔

۶۹ – یاجوج ماجوج سے مراد، جیسا کہ اُوپر حاشیہ ۶۲ میں اشارہ کیا جاچکا ہے، ایشیا کے شمالی مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اُٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رُخ کرتے رہے ہیں۔ بائبل کی کتابِ پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حِزقی اِیل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور تُوبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس اُن سے مراد سیتھین قوم لیتا ہے، جس کا علاقہ بحرِ اَسْوَد کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ
انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا
اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن
رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾

اس نے کہا: "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں[۷۰]۔ مجھے لوہے کی چادریں لا کر دو۔" آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سُرخ ہوگئی تو اس نے کہا: "لاؤ، اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا اُنڈیلوں گا۔" (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا: "یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے[۷۱] گا، اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے[۷۲]۔"

کے شمال میں بحرِ خزر کے قریب آباد تھے۔

۷۰ – یعنی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کو غارت گروں کے حملے سے بچاؤں۔ اس کام کے لیے تم پر کوئی الگ ٹیکس لگانا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ ملک کا جو خزانہ اللہ تعالیٰ نے میرے حوالے کیا ہے، وہ اس خدمت کے لیے کافی ہے۔ البتہ ہاتھ پاؤں کی محنت سے تم کو میری مدد کرنی ہوگی۔

۷۱ – یعنی اگرچہ میں نے اپنی حد تک انتہائی مستحکم دیوار تعمیر کی ہے، مگر یہ لازوال نہیں ہے۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے، یہ قائم رہے گی، اور جب وہ وقت آئے گا جو اللہ نے اس کی تباہی کے لیے مقدر کر رکھا ہے تو پھر اس کو پارہ پارہ ہونے سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔ "وعدے کا وقت" ذومعنی لفظ ہے۔ اس سے مراد اس دیوار کی تباہی کا وقت بھی ہے، اور وہ ساعت بھی جو اللہ نے ہر چیز کی موت اور فنا کے لیے مقرر فرما دی ہے، یعنی قیامت۔ (اس دیوار کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۲)

۷۲ – یہاں پہنچ کر ذوالقرنین کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ اگرچہ کفارِ مکہ کے امتحانی سوال پر سنایا گیا ہے مگر

Maktaba Tul Ishaat.com

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾
الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ ع ۱۱ ۱۹ ۲
مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

اور اُس [۷۳] روز ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دُوسرے سے گُتھم گُتھا ہوں اور صُور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ اور وہ دن ہوگا جب ہم جہنّم کو کافروں کے سامنے لائیں گے، اُن کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سُننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ ع

تو کیا [۷۴] یہ لوگ، جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے، یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں [۷۵]؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔

قصّۂ اصحابِ کہف اور قصّۂ موسٰی و خضر کی طرح اس کو بھی قرآن نے اپنے قاعدے کے مطابق اپنے مدعا کے لیے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ذوالقرنین، جس کی عظمت کا حال تم نے اہلِ کتاب سے سنا ہے، محض ایک فاتح ہی نہ تھا، بلکہ توحید اور آخرت کا قائل تھا، عدل و انصاف اور فیاضی کے اُصولوں پر عامل تھا، اور تم لوگوں کی طرح کم ظرف نہ تھا، کہ ذرا سی سرداری ملی اور سمجھ بیٹھے کہ ہم چُومن دیگرے نیست۔

۷۳ – یعنی قیامت کے روز۔ ذوالقرنین نے جو اشارہ قیامت کے وعدۂ برحق کی طرف کیا تھا، اسی کی مناسبت سے یہ فقرے اُس کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

۷۴ – یہ پوری سورت کا خاتمۂ کلام ہے اس لیے اس کی مناسبت ذوالقرنین کے قصّے میں نہیں بلکہ سورت کے مجموعی مضمون میں تلاش کرنی چاہیے۔ سورت کا مجموعی مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور دُنیا پرستی چھوڑ کر آخرت پر یقین لانے کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر قوم کے بڑے بڑے سردار اپنی دولت اور شوکت وحشمت کے زَعم میں نہ صرف آپؐ کی اس دعوت کو ردّ کر رہے تھے، بلکہ اُن چند راستی پسند انسانوں کو بھی، جنھوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی، ظلم وستم اور تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس پر وہ ساری تقریر کی گئی جو شروع سورہ سے یہاں تک چلی آرہی ہے، اور اسی تقریر کے دوران میں یکے بعد دیگرے اُن تین قصّوں کو بھی، جنھیں مخالفین نے امتحاناً دریافت کیا تھا،

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾

اے محمدؐ! ان سے کہو: کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دُنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجُہد راہِ راست سے بھٹکی رہی[۷۶] اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں[۷۷] گے۔

ٹھیک موقع پر نگینوں کی طرح جڑ دیا گیا۔ اب تقریر ختم کرتے ہوئے پھر کلام کا رُخ اسی مدعا کی طرف پھیرا جا رہا ہے جسے تقریر کے آغاز میں پیش کیا گیا تھا، اور جس پر رُکوع ۴ سے ۸ تک مسلسل گفتگو کی جا چکی ہے۔

۷۵ – یعنی کیا یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان کا خیال یہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رَوِش ان کے لیے نافع ہوگی؟

۷۶ – اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا، یہ کہ ”جن کی ساری سعی وجُہد دُنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی“۔ یعنی انھوں نے جو کچھ بھی کیا، خدا سے بے نیاز اور آخرت سے بے فکر ہو کر صرف دنیا کے لیے کیا۔ دنیوی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھا۔ دنیا کی کامیابیوں اور خوش حالیوں ہی کو اپنا مقصود بنایا۔ خدا کی ہستی کے اگر قائل ہوئے بھی تو اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ اس کی رضا کیا ہے اور ہمیں کبھی اس کے حضور جا کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ اپنے آپ کو محض ایک خود مختار وغیر ذمہ دار حیوانِ عاقل سمجھتے رہے، جس کے لیے دُنیا کی اس چراگاہ سے تمتّع کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔

۷۷ – یعنی اس طرح کے لوگوں نے دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے کیے ہوں، بہر حال وہ دُنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اپنے قصر اور محلات، اپنی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں، اپنے کارخانے اور معمل، اپنی سڑکیں اور ریلیں، اپنی ایجادیں اور صنعتیں، اپنے علوم وفنون اور اپنی آرٹ گیلریاں، اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے ہیں، ان میں سے تو کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے، کہ خدا کی میزان میں اس کو رکھ سکیں۔ وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے، وہ صرف مقاصدِ عمل اور نتائجِ عمل ہیں۔ اب اگر کسی کے سارے مقاصد دُنیا تک محدود تھے، اور نتائج بھی اس کو دُنیا ہی میں مطلوب تھے، اور دُنیا میں وہ اپنے نتائجِ عمل دیکھ بھی چکا ہے، تو اس کا سب کیا کرایا دنیائے فانی کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔ آخرت میں جو کچھ پیش کر کے وہ کوئی وزن پا سکتا ہے، وہ تو لازماً کوئی ایسا ہی کارنامہ ہونا چاہیے جو اس نے خدا کی رضا کے لیے کیا ہو، اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے کیا ہو، اور اُن نتائج کو مقصود بنا کر کیا ہو جو آخرت میں نکلنے والے ہیں۔ ایسا کوئی کارنامہ اگر اس کے حساب میں نہیں ہے تو وہ ساری دوڑ دھوپ بلاشبہ اَکارت گئی جو اس نے دنیا میں کی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ
هُزُوًا ۝١٠٦ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتۡ لَهُمۡ جَنّٰتُ
الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ۝١٠٧ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا لَا يَبۡغُوۡنَ عَنۡهَا حِوَلًا ۝١٠٨ قُلْ لَّوۡ
كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّـكَلِمٰتِ رَبِّىۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ
كَلِمٰتُ رَبِّىۡ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا ۝١٠٩ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ
يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ
فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝١١٠ ع

ان کی جزا جہنّم ہے اُس کفر کے بدلے جو انھوں نے کیا اور اُس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، ان کی میزبانی کے لیے فردوس[78] کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اُس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو اُن کا جی نہ چاہے[79] گا۔

اَے محمدؐ! کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں[80] لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے۔

اَے محمدؐ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا اُمیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔ ع

۷۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۰۔

۷۹ – یعنی اُس حالت سے بہتر اور کوئی حالت ہوگی ہی نہیں کہ جنت کی زندگی کو اس سے بدل لینے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی خواہش پیدا ہو۔

۸۰ – ”باتوں“ سے مراد اس کے کام اور کمالات اور عجائبِ قدرت وحکمت ہیں۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۸۔

تفہیم القرآن

مریم

(۱۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

مریم

نام اس سورت کا نام آیت وَ اذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں حضرت مریمؑ کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا زمانۂ نزول ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا ہے۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین اسلام جب نَجاشی کے دربار میں بلائے گئے تھے، اس وقت حضرت جعفرؓ نے یہی سورت بھرے دربار میں تلاوت کی تھی۔

تاریخی پَسِ منظر جس دَور میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس کے حالات کی طرف ہم کسی حد تک سورۂ کہف کے دیباچے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن وہ مختصر اشارہ اِس سورہ کو اور اس دَور کی دوسری سورتوں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے ہم ذرا اُس وقت کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

قریش کے سردار جب تضحیک، اِستہزا، اِطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریکِ اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے، تو انھوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور مَعاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے قبیلے کے نومسلموں کو تنگ پکڑا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دے کر، حتّٰی کہ سخت جسمانی اذیتیں دے دے کر انھیں اسلام چھوڑنے پر مجبُور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خُصوصیّت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور مَوالی، جو قریش والوں کے تحت زیردست کی حیثیت سے رہتے تھے، بُری طرح پیسے گئے۔ مثلاً بلالؓ، عامرؓ بن فُہَیرہ، اُمِ عُبَیسؓ، زِنّیرہؓ، عَمّارؓ بن یاسرؓ اور ان کے والدین وغیرہم۔ ان لوگوں کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکے کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دُھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے، ان سے کام لیا جاتا اور اُجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّؓ کی یہ رِوایت موجود ہے کہ:

''میں مکے میں لوہار کا کام کرتا تھا، مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اُجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اُجرت نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔''

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے، ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوششیں کی جاتیں، اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے، ان کو ہر طریقے سے ذلیل و رُسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خَبّابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سایے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''یارسولؐ اللہ! اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپؐ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟'' یہ سن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپؐ نے فرمایا: ''تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے، اُن پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صَنعا سے حَضرَ مَوت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔'' (بخاری)

یہ حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشة فان بها ملکًا لا یُظلَم عندہ احد وھی ارض صدق حتی یجعل اللہ لکم فرجًا مما انتم فیہ۔'' اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمھاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔''

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مَردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی، یہاں تک کہ ۸۳ مرد، ۱۱ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے، اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اِس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کُہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سَلَمہ بن ہِشَام، اس کے چچازاد بھائی ہِشَام بن ابی حُذَیفہ اور عَیّاش بن ابی ربیعہ اور اس کی چچازاد بہن حضرت اُمّ سَلَمہ، ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہ، عُتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے سگے بھائی ابوحُذَیفَہ، سُہَیل بن عَمرو کی بیٹی سَہلہ، اور اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اسی لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعے سے متاثّر نہ ہُوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخرِکار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعے سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰؓ بنت حَثْمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی، اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمرؓ آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے: ''عبداللہ کی ماں! جا رہی ہو؟'' میں نے کہا: ''ہاں، خدا کی قسم! تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا۔ خدا کی زمین کُھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔'' یہ سن کر عمرؓ کے چہرے پر رِقّت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے، اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ ''خدا تمھارے ساتھ ہو۔''

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عَمْرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نَجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ نے (جو خود مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہرِ سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انھوں نے نجاشی کے اَعیانِ سلطنت میں خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ ''ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں، اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انھوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔'' ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ ''ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے، ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔'' مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ ''اس طرح تو میں انھیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے، ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انھیں بُلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔'' چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے، ہم تو

وہی بے کم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دُنیا کے دوسرے اَدیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمھارا نیا دین ہے کیا؟" اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی، جس میں پہلے عرب جاہلیّت کی دینی، اَخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپؐ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ "ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمھارے نبی پر اُترا ہے۔" حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصّہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا، یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، خدا کی قسم! میں تمھیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔"

دوسرے روز عَمْرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عَمْرو کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسولؐ نے سکھائی۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عَمْرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تأمّل کہا کہ هو عبدالله ورسوله وروحُهٗ وكلمتهٗ القاها الٰی مریَمَ العذراء البتول "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کَلِمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا۔" نجاشی نے سن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا: "خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔" اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں رشوت نہیں لیتا، اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

موضوع اور مضمون اس تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اس سورہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اوّلین بات نمایاں ہو کر ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرّہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زادِراہ کے طور پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی، تاکہ عیسائیوں کے ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

پہلے دو رُکوعوں میں حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا قصہ سنانے کے بعد پھر تیسرے رکوع میں حالاتِ زمانہ کی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا قصہ سنایا گیا ہے، کیونکہ ایسے ہی حالات میں وہ بھی اپنے باپ اور خاندان اور اہلِ ملک کے ظلم سے تنگ آ کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے ایک طرف کفارِ مکّہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان ابراہیمؑ کی پوزیشن میں ہیں، اور تم لوگ اُن ظالموں کی پوزیشن میں ہو جنھوں نے تمھارے باپ اور پیشوا ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن سے نکل کر تباہ نہ ہوئے بلکہ اور زیادہ سر بلند ہو گئے، ایسا ہی انجامِ نیک تمھارا انتظار کر رہا ہے۔

اس کے بعد چوتھے رُکوع میں دوسرے انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، مگر انبیاؑ کے گزر جانے کے بعد ان کی اُمتیں بگڑتی رہی ہیں، اور آج مختلف اُمتوں میں جو گمراہیاں پائی جا رہی ہیں، یہ اسی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔

آخری دو رُکوعوں میں کفارِ مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مُژدہ سنایا گیا ہے کہ دُشمنانِ حق کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبُوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

۹۸ آیاتہا
سُوۡرَۃُ مَرۡیَمَ مَکِّیَّۃٌ
۶ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کٓہٰیٰعٓصٓ ۝۱ ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَہٗ زَکَرِیَّا ۝۲ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝۳ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَہَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَاشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَیۡبًا وَّلَمۡ اَکُنۡۢ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ۝۴ وَاِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ

ک، ہ، ی، ع، ص۔ ذکر[1] ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریّا[2] پر کی تھی، جب کہ اُس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔

اُس نے عرض کیا: ”اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گُھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی

۱ – تقابُل کے لیے سورۂ آلِ عمران، رکوع ۴ پیشِ نظر رہے جس میں یہ قصّہ دوسرے الفاظ میں بیان ہو چکا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد ۱، ص ۲۴۶-۲۵۰)

۲ – یہ حضرت زکریّاؑ جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، حضرت ہارونؑ کے خاندان سے تھے۔ ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے نظامِ کہانت (priesthood) کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا، اور تیرھواں قبیلہ (یعنی لاوِی بن یعقوبؑ کا گھرانا) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی اصل وہ خاندان جو ”مَقدِس میں خداوند کے آگے بخور جلانے کی خدمت“ اور ”پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام“ کرتا تھا، حضرت ہارونؑ کا خاندان تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوِی مَقدِس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے، سَبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے، اور مَقدِس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مَقدِس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھی خاندانوں میں سے ایک اَبیّاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریّاؑ تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مَقدِس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتابِ تواریخ

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ وَّرَآءِىْ وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ﴿۵﴾
يَّرِثُنِىْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ
اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾
قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ
مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ
خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْــًٔا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ

بُرائیوں کا خوف ہے[۳]، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی پائے[۴]، اور اے پروردگار! اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔"

(جواب دیا گیا:) "اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہوگا۔ ہم نے اِس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا[۵]۔"

عرض کیا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سُوکھ چکا ہوں؟"

جواب ملا: "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا[۶]۔"

زکریاؑ نے کہا: "پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔"

اوّل، باب ۲۳ و ۲۴)

۳- مطلب یہ ہے کہ اَبیاہ کے خاندان میں میرے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دینی اور اَخلاقی حیثیت سے اس منصب کا اہل ہو جسے مَیں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آگے جو نسل اُٹھتی نظر آ رہی ہے، اس کے لچھن بگڑے ہوئے ہیں۔

۴- یعنی مجھے صرف اپنی ذات ہی کا وارث مطلوب نہیں ہے بلکہ خانوادۂ یعقوبؑ کی بھلائیوں کا وارث مطلوب ہے۔

۵- لُوقا کی انجیل میں الفاظ یہ ہیں: "تیرے کُنبے میں کسی کا یہ نام نہیں۔" (۱:۶۱)

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۱۱﴾

فرمایا: "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تُو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔"
چنانچہ وہ محراب[7] سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔[8]

۶ – حضرت زکریاؑ کے اس سوال اور فرشتے کے جواب کو نگاہ میں رکھیے، کیونکہ آگے چل کر حضرت مریمؑ کے قصّے میں پھر یہی مضمون آ رہا ہے، اور اس کا جو مفہوم یہاں ہے وہی وہاں بھی ہونا چاہیے۔ حضرت زکریاؑ نے کہا کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ "ایسا ہی ہوگا"، یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود تیرے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حوالہ دیا کہ جس خدا نے تجھے نیست سے ہست کیا، اُس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تجھ جیسے شیخِ فانی سے ایک ایسی عورت کے ہاں اولاد پیدا کر دے جو عمر بھر بانجھ رہی ہے۔

۷ – محراب کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۳۶۔

۸ – اس واقعے کی جو تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کے سامنے قرآن کی رِوایت کے ساتھ مسیحی روایت بھی رہے۔ درمیان میں قوسین کی عبارتیں ہماری اپنی ہیں:

"یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹) اَبِیّاہ کے فریق میں سے زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارونؑ کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام اَلِیشِبَع (Elizabeth) تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کے اولاد نہ تھی، کیونکہ اَلِیشِبَع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے مُوافق اس کے نام کا قرعہ نکلا، کہ خداوند کے مَقدِس میں جا کر خوشبو جلائے۔ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی، کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مَذبَح کی داہنی طرف کھڑا ہوا اُس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی۔ مگر فرشتے نے اس سے کہا: اے زکریاہ! خوف نہ کر، کیونکہ تیری دُعا سن لی گئی (حضرت زکریاؑ کی دعا کا ذکر بائبل میں کہیں نہیں ہے) اور تیرے لیے تیری بیوی اَلِیشِبَع کے بیٹا ہوگا۔ تُو اس کا نام یُوحنّا (یعنی یحییٰ) رکھنا، اور تجھے خوشی وُخرّمی ہوگی، اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہوں گے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ۙ۱۲ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا

”اے یحیٰؑ! کتابِ الٰہی کو مضبوط تھام لے۔[9]“

ہم نے اسے بچپن ہی میں ”حکم“[10] سے نوازا، اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی[11]

ہوگا (سورۂ آلِ عمران میں اس کے لیے لفظ سَیِّدًا استعمال ہوا ہے)، ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیے گا (تَقِیًّا)، اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القُدس سے بھر جائے گا (وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا)، اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف، جو اُن کا خدا ہے، پھیرے گا۔ اور وہ ایلیّاہ (الیاس علیہ السلام) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔“

”زکریاہ نے فرشتے سے کہا: ”میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔“ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا: ”میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں، اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے اِن باتوں کی خوش خبری دوں۔ اور دیکھ، جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں، تو چُپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا، اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا، جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی، یقین نہ کیا۔ (یہ بیان قرآن سے مختلف ہے۔ قرآن اسے نشانی قرار دیتا ہے، اور لُوقا کی روایت اسے سزا کہتی ہے۔ نیز قرآن صرف تین دن کی خاموشی کا ذکر کرتا ہے، اور لوقا کہتا ہے کہ اس وقت سے حضرت یحیٰؑ کی پیدایش تک حضرت زکریاؑ گونگے رہے۔) اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مَقدِس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مَقدِس میں رُؤیا دیکھی ہے، اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔“ (لُوقا، باب ۱، آیت ۵ تا ۲۲)

۹ – بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ اس فرمانِ الٰہی کے مطابق حضرت یحیٰؑ پیدا ہوئے اور جوانی کی عمر کو پہنچے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ سِنِّ رُشد کو پہنچے تو کیا کام اُن سے لیا گیا۔ یہاں صرف ایک فقرے میں اس مشن کو بیان کر دیا گیا ہے جو منصبِ نبوت پر مامور کرتے وقت ان کے سُپرد کیا گیا تھا۔ یعنی وہ تورات پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور بنی اسرائیل کو اس پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔

۱۰ – ”حکم“، یعنی قوتِ فیصلہ، قوتِ اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت، اور اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار۔

۱۱ – اصل میں لفظ حَنَان استعمال ہوا ہے جو قریب قریب مامتا کا ہم معنٰی ہے۔ یعنی ایک ماں کو جو غایت درجے

وَّزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۙ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾
وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ ع

ع ۱۵/۳ وقف لازم

اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیز گار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبّار نہ تھا اور نہ نافرمان۔
سلام اُس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے، اور جس روز وہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے[۱۲]۔ ع

کی شفقت اپنی اولاد پر ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہے، وہ شفقت حضرت یحییٰؑ کے دل میں بندگانِ خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

۱۲ – حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں، جس سے سورۂ آلِ عمران اور اس سورہ کے مختصر اشارات کی توضیح ہو گی۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے، اور یُوحنّا کی روایت کے مطابق انھوں نے شرقِ اُردُن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

"میں، جیسا یَسْعِیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔" (یُوحنّا ۱:۲۳)

مَرقُس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے، یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے، تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے۔ (مَرقُس ۱:۴-۵) اسی بنا پر ان کا نام یُوحنّا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔ (متّی ۲۱:۲۶) مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں یُوحنّا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔" (متّی ۱۱:۱۱)

وہ اُونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے، اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متّی ۳:۴) اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ مُنادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔" (متّی ۳:۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیحؑ کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ (آلِ عمران: ۳۹)

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے۔ (متّی ۹:۱۴۔ لُوقا ۵:۳۳۔ لُوقا ۱۱:۱) وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کُرتے ہوں وہ اُس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے، اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔" محصول لینے والوں نے پوچھا کہ اُستاد! ہم کیا کریں؟ تو انھوں نے فرمایا: "جو تمھارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا: ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا: "نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔" (لوقا ۳:۱۰-۱۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

رکوع ٢

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ‌ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ۙ‏ ﴿١٦﴾
فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۖ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

اور اے محمدؐ! اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو،[13] جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہوگئی تھی اور پردہ ڈال کر اُن سے چُھپ بیٹھی تھی۔[14] اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی

بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علما، فریسی اور صَدُوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا: ”اے سانپ کے بچّو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟.... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے.....اب درختوں کی جڑوں پر کلھاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا، وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔“ (مَتّی ٣:٧-١٠)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فِسق و فُجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فِلِپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس جُرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راست باز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰؑ جو اَخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں، وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہوگئی۔ آخرِکار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پالیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا، جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا: مانگ، کیا مانگتی ہے؟ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا: کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: مجھے یُوحنّا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہُوا، مگر محبُوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے ردّ کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰؑ کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (مَتّی ١٤:٣-١١۔ مَرقُس ٦:١٧-٢٨۔ لُوقا ٣:١٩-٢٠)

١٣ — تقابُل کے لیے تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ٤٢، ٥٥، النساء، حاشیہ ١٩٠-١٩١۔

١٤ — سورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المَقدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریّا نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمّے لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہوگئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب، جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں بیت المَقدِس کے شرقی حصّے میں واقع تھی اور انھوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے

بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾
قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ أَنَّىٰ
يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذَٰلِكِ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۖ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

شکل میں نمودار ہو گیا۔

مریمؑ یکایک بول اُٹھی کہ ”اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔“

اُس نے کہا: ”میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دُوں۔“

مریمؑ نے کہا: ”میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا؟ جب کہ مجھے کسی بَشَر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔“

فرشتے نے کہا: ”ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں[15] اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔

والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی مُوافقت کی خاطر مَکَانًا شَرْقِيًّا سے مُراد ناصرہ لیا ہے، انھوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

۱۵- جیسا کہ ہم حاشیہ ۶ میں اشارہ کر آئے ہیں، حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ ”ایسا ہی ہوگا“ ہرگز اس معنیٰ میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا، باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اُوپر انھی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے، اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہؑ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا، تو فرشتہ اُن کو جواب دیتا ہے کہ كَذَٰلِكِ ”ایسا ہی ہوگا“۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر كَذَٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہُوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾
فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا
وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰٮهَا مِنۡ تَحۡتِهَاۤ اَلَّا تَحۡزَنِىۡ قَدۡ جَعَلَ
رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّىۡۤ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ

اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔"

مریمؑ کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی[16]۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی: "کاش! میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔"[17] فرشتے نے پائینتی سے اس کو پکار کر کہا: "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اِس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اُوپر تر و تازہ

کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، اور اسی معنیٰ پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔

۱٦- دُور کے مقام سے مراد بیتِ لَحم ہے۔ حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المَقدِس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں، تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دُور دراز مقام پر چلی جاتیں۔

۱۷- ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت

رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ
أَحَدًا ۙ فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ ۚ
فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يَا أُخْتَ
هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ ۖ

کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی[18]۔"

پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے: "اے مریمؑ! یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارونؑ کی بہن[19]! نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی[19الف]۔"

ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر اُن کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انھیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا، اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے اُن سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اُسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہُوا کرتا۔

۱۸ – مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو، اُس کا جواب اب ہمارے ذمّے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹی کا بچہ اگر دُنیا کے معروف طریقے پر پیدا ہو تو آخر اُسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

۱۹ – ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ انھیں ظاہری معنیٰ میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے، یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُخْتَ ھٰرُوْنَ کے معنیٰ "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے، مثلاً قبیلۂ مُضَر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مُضَر کے بھائی!) اور قبیلۂ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی!) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنیٰ منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنیٰ کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنیٰ کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعے سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ
اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِىۡ مُبٰرَكًا

مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔
لوگوں نے کہا: ”ہم اِس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچّہ ہے؟“[۲۰]
بچہ بول اُٹھا: ”میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا

گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا، وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اُصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نَسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے، اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنیٰ لازماً ”ہارون کی بہن“ ہی ہیں۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے، کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہؓ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ”تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیا اور صلحا کے نام پر رکھتے تھے؟“ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

۱۹، الف — جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں، وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور اُن پر یہ طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟

۲۰ — قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ”ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔“ یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی، اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا، وہ محسوس کر لے گا کہ یہ محض ایک مُہمَل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے، وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی، نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰، دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچّے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود

اَیْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا
بِوَالِدَتِیْ٘ ۫ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ
یَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ
الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ
وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ ؕ

جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا[۲۰الف]، اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا، اور جب کہ میں مروں، اور جب کہ زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں[۲۱]۔‘‘

یہ ہے عیسیٰؑ ابنِ مریم، اور یہ ہے اُس کے بارے میں وہ سچّی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے[۲۲]۔

حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔

۲۰، الف— یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ اُن کو عیسیٰؑ ابنِ مریم کہا گیا ہے۔

۲۱— یہ ہے وہ ’’نشانی‘‘ جو حضرت عیسیٰؑ کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو، جو بیت المَقدِس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا، تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا، تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ
الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ
الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وقف لازم

(اور عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔" مگر پھر مختلف گروہ[۲۳] باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے وہ وقت بڑی تباہی کا ہوگا جب کہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے، اُس روز تو اُن کے کان بھی خوب سُن رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی، مگر آج یہ ظالم کُھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے محمدؐ! اِس حالت میں، جب کہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں، اِنھیں اس دن سے ڈرا دو جب کہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ آخرکار ہم ہی زمین

اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جو دُنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۴۴، ۵۳۔ النساء، حاشیہ ۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۸-۸۹-۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳)

۲۲- یہاں تک جو بات عیسائیوں کے سامنے واضح کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰؑ کی پیدایش نے اُن کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا، اُسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انھیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، دونوں ایک ایک طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن ہی کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کا غُلُوّ ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں، اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔

ع ۲ ۲۵ ۵

وَمَنۡ عَلَيۡهَا وَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ۝۴۰ وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ۝۴۱ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا
لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِىۡ عَنۡكَ شَيۡـًٔا ۝۴۲ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ

اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری طرف ہی پلٹائے جائیں گے۔ع

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصّہ بیان کرو[۲۶]، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ (انھیں ذرا اُس موقع کی یاد دلاؤ) جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابّا جان! آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابّا جان! میرے

۲۳ – یہاں عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام انبیا علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور اُنھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمھاری اپنی ایجاد ہے۔ تمھارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۶۸۔ مائدہ، حاشیہ ۱۰۰-۱۰۱-۱۳۰۔ جلد چہارم۔ الزُّخرُف، حواشی ۵۷-۵۸)

۲۴ – یعنی عیسائیوں کے گروہ۔

۲۵ – یہاں وہ تقریر ختم ہوتی ہے جو عیسائیوں کو سنانے کے لیے نازل فرمائی گئی تھی۔ اِس تقریر کی عظمت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی اس کو پڑھتے وقت وہ تاریخی پَس منظر نگاہ میں رکھے جو ہم نے اِس سورہ کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ یہ تقریر اُس موقع پر نازل ہوئی تھی جب کہ مکے کے مظلوم مسلمان ایک عیسائی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے جا رہے تھے، اور اس غرض کے لیے نازل کی گئی تھی کہ جب وہاں مسیحؑ کے متعلق اسلامی عقائد کا سوال چھڑے تو یہ "سرکاری بیان" عیسائیوں کو سنا دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کسی حال میں بھی حق و صداقت کے معاملے میں مداہنت برتنا نہیں سکھایا ہے۔ پھر وہ سچّے مسلمان جو حبش کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، اُن کی قوتِ ایمانی بھی حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے عین دربارِ شاہی میں ایسے نازک موقع پر اُٹھ کر یہ تقریر سنا دی جب کہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر اُنھیں ان کے دشمنوں کے سُپرد کر دینے پر تُلے گئے تھے۔ اُس وقت اس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا یہ بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جائے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قسائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرہ برابر تأمّل نہ کیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِكَ فَاتَّبِعۡنِیۡۤ اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾
یٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّیۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾ یٰۤاَبَتِ
اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّیۡطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾
قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِیۡ یٰۤـاِبۡرٰهِیۡمُ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ
وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیۡكَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّیۡ ؕ

پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابّا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں[۲۷]، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابّا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"

باپ نے کہا: "ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبُودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دُوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔"

ابراہیمؑ نے کہا: "سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے،[۲۷الف]

۲۶ – یہاں سے خطاب کا رُخ اہلِ مکّہ کی طرف پھر رہا ہے جنھوں نے اپنے نوجوان بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو اُسی طرح خدا پرستی کے جرم میں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ اور بھائی بندوں نے دیس نکالا دیا تھا۔ اس غرض کے لیے دوسرے انبیاؑ کو چھوڑ کر خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ قریش کے لوگ ان کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور انھی کی اولاد ہونے پر عرب میں اپنا فخر جتایا کرتے تھے۔

۲۷ – اصل الفاظ ہیں: لَا تَعۡبُدِ الشَّیۡطٰنَ ؕ، یعنی "شیطان کی عبادت نہ کریں۔" اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے والد اور قوم کے دوسرے لوگ عبادت بتوں کی کرتے تھے، لیکن چونکہ اطاعت وہ شیطان کی کر رہے تھے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی اِس اطاعتِ شیطان کو بھی عبادتِ شیطان قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت محض پوجا اور پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتے ہوئے بھی اس کی بندگی بجا لائے تو وہ اُس کی عبادت کا مجرم ہے، کیونکہ شیطان بہر حال کسی زمانے میں بھی لوگوں کا "معبُود" (بمعنیٰ معروف) نہیں رہا ہے، بلکہ اس کے نام پر ہر زمانے میں لوگ لعنت ہی بھیجتے رہے ہیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم،

إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا
رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا
يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا
نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع
وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ ۚ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾

میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔"

پس جب وہ اُن لوگوں سے اور اُن کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اُس کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی نام وری عطا کی[۲۸]۔ ع

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا۔ وہ ایک چیدہ[۲۹] شخص تھا اور رسول نبی[۳۰] تھا۔

الکہف، حاشیہ ۴۹-۵۰)

۴۷، الف— تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۱۲۔

۲۸— یہ حرفِ تسلّی ہے اُن مہاجرین کے لیے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اُلٹے سربلند و سرفراز ہو کر رہے، اُسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے، بلکہ وہ عزت پاؤ گے جس کا تصور بھی جاہلیت میں پڑے ہوئے کفارِ قریش نہیں کر سکتے۔

۲۹— اصل میں لفظ مُخلَص استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں "خالص کیا ہوا"۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے شخص تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا کر لیا تھا۔

۳۰— "رسول" کے معنی ہیں "فرستادہ"، "بھیجا ہوا"۔ اس معنی کے لحاظ سے عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ یا تو ان ملائکہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کارِ خاص پر بھیجے جاتے ہیں، یا پھر اُن انسانوں کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے خلق کی طرف اپنا پیغام

Maktaba Tul Ishaat.com

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ

ہم نے اُس کو طُور کے داہنی جانب سے پکارا[31] اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا[32]، اور اپنی مہربانی سے

پہنچانے کے لیے مامور فرمایا۔

''نبی'' کے معنیٰ میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نَبَا سے مُشتق قرار دیتے ہیں، جس کے معنیٰ ''خبر'' کے ہیں، اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنیٰ ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادّہ نبو ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔ اور اس معنیٰ کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے: ''بلند مرتبہ'' اور ''عالی مقام''۔ ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبیٔ ہے، جس کے معنیٰ طریق اور راستے کے ہیں، اور انبیاؑ کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

پس کسی شخص کو ''رسول نبی'' کہنے کا مطلب یا تو ''عالی مقام پیغمبر'' ہے، یا ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر''، یا پھر ''وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے''۔

قرآنِ مجید میں یہ دونوں الفاظ بالعُموم ہم معنیٰ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخصیت کو کہیں صرف رسول کہا گیا ہے، اور کہیں صرف نبی، اور کہیں رسول اور نبی ایک ساتھ۔ لیکن بعض مَقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اصطلاحی فرق ہے۔ مثلاً سورۂ حج، رُکوع ۷ میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ...... ''ہم نے تم سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ نبی مگر......'' یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول اور نبی دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں، جن کے درمیان کوئی معنوی فرق ضرور ہے۔ اسی بنا پر اہلِ تفسیر میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ اس فرق کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطعی دلائل کے ساتھ کوئی بھی رسول اور نبی کی الگ الگ حیثیتوں کا تعیُّن نہیں کر سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے، یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا بالفاظِ دیگر، انبیاؑ میں سے رسول کا لفظ اُن جلیل القدر ہستیوں کے لیے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاؑ کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سُپرد کیا گیا تھا۔ اِسی کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت ابو اُمامہؓ سے اور حاکم نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی، اور انبیاؑ کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا اس کے ضعف کو بڑی حد تک دُور کر دیتا ہے۔

۳۱ - کوہِ طور کے داہنی جانب سے مراد اس کا مشرقی دامن ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ مَدیَن سے مصر جاتے ہوئے اُس راستے سے گزر رہے تھے جو کوہِ طُور کے جنوب سے جاتا ہے، اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو ''داہنی جانب''

مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ
كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ
بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ
اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

اس کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنا کر اُسے (مددگار کے طور پر) دیا۔

اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچّا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا[۳۲] اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔

اور اس کتاب میں ادریسؑ[۳۳] کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اُسے ہم نے بلند مقام پر اُٹھایا تھا۔[۳۴]

فرمایا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بجائے خود پہاڑ کا کوئی دایاں یا بایاں رُخ نہیں ہوتا۔

۳۲۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۲۰۶۔

۳۳۔ حضرت ادریسؑ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی تھے۔ مگر اکثریت اس طرف گئی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ہم کو ایسی نہیں ملی جس سے ان کی شخصیت کے تعیُّن میں کوئی مدد ملتی ہو۔ البتہ قرآن کا ایک اشارہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے متقدم ہیں۔ کیونکہ بعد والی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ انبیا جن کا ذکر اُوپر گزرا ہے، آدمؑ کی اولاد، نوحؑ کی اولاد، ابراہیمؑ کی اولاد اور اسرائیلؑ کی اولاد سے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ، عیسیٰ اور موسیٰ علیہم السلام تو بنی اسرائیل میں سے ہیں، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اولادِ ابراہیمؑ سے ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اولادِ نوحؑ سے، اس کے بعد صرف حضرت ادریسؑ ہی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اولادِ آدمؑ سے ہیں۔

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حَنُوک (Enoch) بتایا گیا ہے، وہی حضرت ادریسؑ ہیں۔ ان کے متعلق بائبل کا بیان یہ ہے:

”اور حَنُوک پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا، اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حَنُوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا............ اور وہ غائب ہو گیا، کیونکہ خدا نے اسے اُٹھا لیا۔“

Maktaba Tul Ishaat.com

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ

السجدة ۵

یہ وہ پیغمبرؑ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور اسرائیلؑ کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سُنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ سجدہ

پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا[۳۵] اور خواہشاتِ نفس

(پیدائش، باب ۵، آیت ۲۱-۲۴)

تلمود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو خدا کے فرشتے نے حنوک کو، جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پکارا کہ ”اے حنوک! اُٹھو، گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر ان کو وہ راستہ بتاؤ جس پر ان کو چلنا چاہیے، اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انھیں عمل کرنا چاہیے۔“ یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انھوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسلِ انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ حنوک ۳۵۳ برس تک نسلِ انسانی پر حکمراں رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر خدا کی رحمتیں برستی رہیں۔ (The Talmud Selections, pp 18-21)

۳۴- اس کا سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا، لیکن اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر یہ بات ہمارے ہاں بھی مشہور ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ بائبل میں تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہو گئے، کیونکہ ”خدا نے ان کو اُٹھا لیا“، مگر تلمود میں اس کا ایک طویل قصّہ بیان ہوا ہے، جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ ”حنوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے۔“

۳۵- یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پروائی برتنے لگے۔ یہ ہر اُمّت کے زوال و انحطاط کا پہلا

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝٥٩ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝٦٠ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ
عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝٦١ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا
سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝٦٢ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ

کی پیروی کی[۳۶]، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کرلیں، وہ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنّتیں ہیں، جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے درپردہ وعدہ کر رکھا ہے[۳۷]۔ اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہوکر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سُنیں گے، جو کچھ بھی سُنیں گے ٹھیک ہی سُنیں گے[۳۸]۔ اور ان کا رزق انھیں پیہم صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنّت جس کا وارث

قدم ہے۔ نماز وہ اوّلین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شب و روز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محور سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندھن ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دُور اور دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے، حتّٰی کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلّق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدۂ کلّیّہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا ہے۔

۳۶- یہ تعلق باللہ کی کمی اور اس کے فُقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ نماز کی اضاعت سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی، خواہشاتِ نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کے اَخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکامِ الٰہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہوکر رہا۔

۳۷- یعنی جس کا وعدہ رحمٰن نے اس حالت میں کیا ہے کہ وہ جنّتیں ان کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔

۳۸- اصل میں لفظ ”سلام“ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: عیب اور نقص سے محفوظ۔ جنت میں جو نعمتیں انسان کو میسّر ہوں گی، ان میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں کوئی بیہودہ اور فضول اور گندی بات سننے میں نہ آئے گی۔ وہاں کا پورا معاشرہ ایک ستھرا اور سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ ہوگا، جس کا ہر فرد سلیم الطبع ہوگا۔ وہاں کے رہنے والوں کو غیبتوں اور گالیوں اور فحش گانوں اور دوسری بُری آوازوں کی سماعت سے پوری نجات مل جائے گی۔ وہاں آدمی جو کچھ بھی سنے گا، بھلی اور معقول اور بجا باتیں ہی سُنے گا۔ اِس نعمت کی قدر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دُنیا میں فی الواقع ایک پاکیزہ اور ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ کیونکہ وہی یہ محسوس

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهُ مَا بَيْنَ
أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ
تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ ع ۱۵

ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے۔

اے[39] محمدؐ! ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمھارا رب بُھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ پس تم اُس کی بندگی کرو اور اُسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔[40] کیا ہے کوئی ہستی تمھارے علم میں اس کی ہم پایہ؟[41] ع

انسان کہتا ہے: کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟

کر سکتا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسی گندی سوسائٹی میں رہنا کتنی بڑی مصیبت ہے جہاں کسی وقت بھی اس کے کان جھوٹ، غیبت، فتنہ و فساد، شرارت، گندگی اور شہوانیت کی باتوں سے محفوظ نہ ہوں۔

۳۹- یہ پورا پیراگراف ایک جملۂ معترضہ ہے جو ایک سلسلۂ کلام کو ختم کر کے دوسرا سلسلۂ کلام شروع کرنے سے پہلے ارشاد ہُوا ہے۔ اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ سورت بڑی دیر کے بعد ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہے جب کہ نبیؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بڑے اضطراب انگیز حالات سے گزر رہے ہیں۔ حضورؐ کو اور آپؐ کے صحابیوں کو ہر وقت وحی کا انتظار ہے، تاکہ اس سے رہنمائی بھی ملے اور تسلّی بھی حاصل ہو۔ جوں جوں وحی آنے میں دیر ہو رہی ہے، اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ اس حالت میں جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے وہ فرمان سناتے ہیں جو موقع کی ضرورت کے لحاظ سے فوراً درکار تھا۔ پھر آگے بڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اشارے سے یہ چند کلمات اپنی طرف سے کہتے ہیں، جن میں اتنی دیر تک اپنے حاضر نہ ہونے کی معذرت بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرفِ تسلّی بھی، اور ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی تلقین بھی۔

یہ صرف کلام کی اندرونی شہادت ہی نہیں ہے بلکہ متعدّد روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں جنھیں ابنِ جریر، ابنِ کثیر اور صاحبِ رُوح المعانی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

۴۰- یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں، ان کا

أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ
لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ
مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ
بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ
حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم! ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی[۴۲] گھیر لائیں گے، پھر جہنّم کے گرد لا کر انھیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔ پھر ہر گروہ میں سے ہر اُس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا[۴۳]، پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنّم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنّم پر وارد نہ ہو[۴۴]، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ پھر ہم اُن لوگوں کو بچا لیں گے جو (دُنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اُسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیعِ فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیّت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمھارے سُپرد کی گئی ہے۔

۴۱ – اصل میں لفظ سَمِی استعمال ہوا ہے، جس کے لُغوی معنٰی ''ہم نام'' کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو الٰہ ہے، کیا کوئی دُوسرا الٰہ بھی تمھارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر تمھارے لیے اس کے سوا اور راستہ ہی کون سا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے حکم کے بندے بن کر رہو۔

۴۲ – یعنی اُن شیاطین کو جن کے یہ چیلے بنے ہوئے ہیں اور جن کے سکھائے پڑھائے میں آ کر انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں جہاں ہمیں خدا کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔

۴۳ – یعنی ہر باغی گروہ کا لیڈر۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ
اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ
فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ
وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾
وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ

اِن لوگوں کو جب ہماری کُھلی کُھلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: "بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شان دار ہیں؟"[۴۵] حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اِن سے کہو: جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اُسے رحمٰن ڈھیل دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے ــــــ خواہ وہ عذابِ الٰہی ہو یا قیامت کی گھڑی ــــــ تب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتّھا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہِ راست اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے[۴۶]، اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے

۴۴ – "وارد ہونے" کے معنٰی بعض روایات میں "داخل ہونے" کے بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے کسی کی سند بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی۔ اور پھر یہ بات قرآنِ مجید اور اُن کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنینِ صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مزید برآں لغت میں بھی ورود کے معنٰی دخول کے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر تو سب کا ہوگا مگر، جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے، پرہیزگار لوگ اس سے بچا لیے جائیں گے اور ظالم اس میں جھونک دیے جائیں گے۔

۴۵ – یعنی ان کا اِستدلال یہ تھا کہ دیکھ لو، دُنیا میں کون اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔

عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ
لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ
عَهۡدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ‌ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾
وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا
لَهُمۡ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ‌ؕ سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ وَيَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

ع ۵

رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

پھر تو نے دیکھا اُس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟[۴۷] کیا اسے غیب کا پتا چل گیا ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ —— ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے، اسے ہم لکھ لیں[۴۸] گے اور اس کے لیے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سرو سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے، وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہوگا۔

اِن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں، تاکہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں[۴۹]۔ کوئی پشتیبان نہ ہوگا۔ وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں[۵۰] گے اور اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے۔ع

کس کے گھر زیادہ شان دار ہیں؟ کس کا معیارِ زندگی زیادہ بلند ہے؟ کس کی محفلیں زیادہ ٹھاٹ سے جمتی ہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہمیں میسّر ہے اور تم اس سے محروم ہو تو خود سوچ لو کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم باطل پر ہوتے اور یوں مزے اُڑاتے، اور تم حق پر ہوتے اور اس طرح خستہ و درماندہ رہتے؟ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حواشی ۳۷-۳۸۔

۴۶ - یعنی ہر آزمایش کے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کو صحیح فیصلے کرنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشتا ہے، اُن کو بُرائیوں اور غلطیوں سے بچاتا ہے، اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے وہ برابر راہِ راست پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

۴۷ - یعنی وہ کہتا ہے کہ تم مجھے خواہ کتنا ہی گمراہ و بدکار کہتے رہو اور عذابِ الٰہی کے ڈراوے دیا کرو، میں تو آج بھی تم سے زیادہ خوش حال ہوں اور آیندہ بھی مجھ پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہے گی۔ میری دولت دیکھو، میری وجاہت اور ریاست دیکھو،

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمۡ تَرَ اَنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ تَؤُزُّہُمۡ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعۡجَلۡ
عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾ یَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِیۡنَ اِلَی الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ﴿۸۵﴾
وَّ نَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ اِلٰی جَہَنَّمَ وِرۡدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ وقف لازم
اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا ﴿۸۷﴾ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمۡ وقف لازم

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے اِن منکرینِ حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انھیں خُوب خُوب (مُخالفتِ حق پر) اکسا رہے ہیں؟ اچھا، تو اب اِن پر نزولِ عذاب کے لیے بے تاب نہ ہو۔ ہم اِن کے دن گِن رہے ہیں[۵۱]۔ وہ دن آنے والا ہے جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حُضور پیش کریں گے، اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنّم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔ اُس وقت لوگ کوئی سِفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے، بجز اُس کے جس نے رحمٰن کے حُضور سے پروانہ حاصل کرلیا ہو[۵۲]۔

وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ——— سخت بے ہُودہ بات ہے جو

میرے نامور بیٹوں کو دیکھو، میری زندگی میں آخر تمھیں کہاں یہ آثار نظر آتے ہیں کہ میں خدا کا مغضوب ہوں؟ ——— یہ مکے میں کسی ایک شخص کے خیالات نہ تھے بلکہ کفارِ مکہ کا ہر شیخ اور سردار اسی خبط میں مبتلا تھا۔

۴۸ – یعنی اس کے جرائم کے ریکارڈ میں اس کا یہ کلمۂ غرور بھی شامل کرلیا جائے گا اور اس کا مزا بھی اسے چکھنا پڑے گا۔

۴۹ – اصل میں لفظ عِزًّا استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ان کے لیے سببِ عزت ہوں۔ مگر عزت سے مراد عَرَبی زبان میں کسی شخص کا ایسا طاقت ور اور زبردست ہونا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے، اور ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے سببِ عزت بننا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس کی حمایت پر ہو، جس کی وجہ سے اس کا کوئی مخالف اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

۵۰ – یعنی وہ کہیں گے کہ نہ ہم نے کبھی اِن سے کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ یہ احمق لوگ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔

۵۱ – مطلب یہ ہے کہ اِن کی زیادتیوں پر تم بے صبر نہ ہو۔ اِن کی شامت قریب آ لگی ہے۔ پیمانہ بھرا چاہتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی مہلت کے کچھ دن باقی ہیں، انھیں پورا ہو لینے دو۔

۵۲ – یعنی سِفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔

شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ
الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ
يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ
اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ

تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں، سب اس کے حُضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے اُن کو شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔

یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں محبّت پیدا کر دے گا۔[۵۳] پس اے محمدؐ! اِس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمھاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم

آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔
یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمٰن سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور خدا سے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے، وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہوں گے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔

۵۳ – یعنی آج مکے کی گلیوں میں وہ ذلیل و رُسوا کیے جا رہے ہیں، مگر یہ حالت دیرپا نہیں ہے۔ قریب ہے وہ وقت جب کہ اپنے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حَسَنہ کی وجہ سے وہ محبوبِ خلائق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھنچیں گے۔ دُنیا ان کے آگے

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ
هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع

النصف

پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو، یا اُن کی بِھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟ ع

پلکیں بچھائے گی۔ فِسق و فُجور، رعونت اور کبر، جھوٹ اور ریاکاری کے بل پر جو سیادت و قیادت چلتی ہو، وہ گردنوں کو چاہے جھکا لے، دلوں کو مسخّر نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس جو لوگ صداقت، دیانت، اخلاص اور حُسنِ اَخلاق کے ساتھ راہِ راست کی طرف دعوت دیں، ان سے اوّل اوّل چاہے دُنیا کتنی ہی اُپرائے، آخر کار وہ دلوں کو موہ لیتے ہیں اور بددیانت لوگوں کا جھوٹ زیادہ دیر تک ان کا راستہ روکے نہیں رہ سکتا۔

تفہیم القرآن

طٰہٰ

(۲۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

طٰہٰ

زمانۂ نُزُول اِس سورت کا زمانۂ نزول سورۂ مریم کے قریب زمانے ہی کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہجرتِ حبشہ کے زمانے میں یا اس کے بعد نازل ہوئی ہو۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے یہ نازل ہو چکی تھی۔

اُن کے قبولِ اسلام کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر رِوایت یہ ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تو راستے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمھاری اپنی بہن اور بہنوئی اِس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں اُن کی بہن فاطمہؓ بنتِ خَطّاب اور ان کے بہنوئی سعیدؓ بن زید بیٹھے ہوئے حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ سے ایک صحیفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی ان کی بہن نے صحیفہ فوراً چھپا لیا۔ مگر حضرت عمرؓ اس کے پڑھنے کی آواز سُن چکے تھے۔ انھوں نے پہلے کچھ پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد بہنوئی پر پِل پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے بچانا چاہا تو انھیں بھی مارا، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ آخرکار بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا کہ ہاں، ہم مسلمان ہو چکے ہیں، تم سے جو کچھ ہو سکے کرلو۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کا خون بہتے دیکھ کر کچھ پشیمان سے ہوگئے اور کہنے لگے کہ اچھا، مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن نے پہلے قسم لی کہ وہ اسے پھاڑ نہ دیں گے۔ پھر کہا کہ تم جب تک غسل نہ کرلو، اس پاک صحیفے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور پھر وہ صحیفہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں یہی سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ پڑھتے پڑھتے یک لخت ان کی زبان سے نکلا: ''کیا خوب کلام ہے۔'' یہ سنتے ہی حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ، جو ان کی آہٹ پاتے ہی چھپ گئے تھے، باہر آگئے اور کہا کہ ''بخدا! مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے نبی کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا۔ کل ہی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا! ابوالحکم بن ہِشَام (ابوجہل) یا عمر بن خَطّاب، دونوں میں سے کسی کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اے عمر! اللہ کی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو۔'' اس فقرے نے رہی سہی کسر پوری کر دی، اور اسی وقت حضرت خَبّابؓ کے ساتھ جا کر حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرلیا۔ یہ ہجرتِ حبشہ سے تھوڑی مدّت بعد ہی کا قصہ ہے۔

موضوع و مَبحث سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اَے محمدؐ! یہ قرآن تم پر کچھ اس لیے نازل نہیں کیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے تم کو ایک مصیبت میں ڈال دیا جائے۔ تم سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ پتھر کی چٹانوں سے دودھ کی نہر نکالو، نہ ماننے والوں کو منوا کر چھوڑو، اور ہٹ دھرم لوگوں کے دلوں میں ایمان

پیدا کر کے دکھاؤ۔ یہ تو بس ایک نصیحت اور یاددہانی ہے، تاکہ جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور جو اس کی پکڑ سے بچنا چاہے، وہ سُن کر سیدھا ہو جائے۔ یہ مالکِ زمین و آسمان کا کلام ہے، اور خدائی اس کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

اس تمہید کے بعد یکایک حضرت موسیٰؑ کا قصّہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ محض ایک قصّے کی شکل میں بیان ہوا ہے۔ وقت کے حالات کی طرف اس میں کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ مگر جس ماحول میں یہ قصّہ سنایا گیا ہے، اس کے حالات سے مل جُل کر یہ اہلِ مکہ سے کچھ اور باتیں کرتا نظر آتا ہے، جو اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے بین السُّطور سے ادا ہو رہی ہیں۔ اُن باتوں کی تشریح سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ عرب میں کثیر التعداد یہودیوں کی موجودگی اور اہلِ عرب پر یہودیوں کے علمی و ذہنی تفوّق کی وجہ سے، نیز روم اور حبش کی عیسائی سلطنتوں کے اثر سے بھی، عربوں میں بالعموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھنے کے بعد اب دیکھیے کہ وہ باتیں کیا ہیں جو اس قصّے کے بین السطور سے اہلِ مکہ کو جتائی گئی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت اس طرح عطا نہیں کیا کرتا کہ ڈھول تاشے اور نفیریاں بجا کر ایک خلق اکٹھی کر لی جائے اور پھر باقاعدہ ایک تقریب کی صورت میں یہ اعلان کیا جائے کہ آج سے فلاں شخص کو ہم نے نبی مقرر کیا ہے۔ نبوت تو جس کو بھی دی گئی ہے، کچھ اسی طرح بصیغۂ راز دی گئی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔ اب تمھیں کیوں اس بات پر اچنبھا ہے کہ محمدؐ یکایک نبی بن کر تمھارے سامنے آ گئے اور اس کا اعلان نہ آسمان سے ہوا، نہ زمین پر فرشتوں نے چل پھر کر اس کا ڈھول پیٹا۔ ایسے اعلانات پہلے نبیوں کے تقرر پر کب ہوئے تھے کہ آج ہوتے؟

(۲) جو بات آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) ٹھیک وہی بات منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سکھائی تھی۔

(۳) پھر جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی سروسامان اور لاؤ لشکر کے تنِ تنہا قریش کے مقابلے میں دعوتِ حق کا علَم بردار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی یکایک اتنے بڑے کام پر مامور کر دیے گئے تھے کہ جا کر فرعون جیسے جبّار بادشاہ کو سرکشی سے باز آنے کی تلقین کریں۔ کوئی لشکر اُن کے ساتھ بھی نہیں بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے ایسے ہی عجیب ہیں۔ وہ مَدیَن سے مصر جانے والے ایک مسافر کو راہ چلتے پکڑ کر بلا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جا، اور وقت کے سب سے بڑے جابر حکمران سے ٹکرا جا۔ بہت کیا تو اس کی درخواست پر اس کے بھائی کو مددگار کے طور پر دے دیا۔ کوئی فوج فرا اور ہاتھی گھوڑے اِس کارِ عظیم کے لیے اس کو نہیں دیے گئے۔

(۴) جو اعتراضات اور شبہات اور الزامات اور مکر و ظلم کے ہتھکنڈے اہلِ مکہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں، اُن سے بڑھ چڑھ کر وہی سب ہتھیار فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

استعمال کیے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ کس طرح وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہوا اور آخر کار کون غالب آ کر رہا؟ خدا کا بے سروسامان نبی؟ یا لاؤ لشکر والا فرعون؟ اس سلسلے میں خود مسلمانوں کو بھی ایک غیر ملفوظ تسلّی دی گئی ہے کہ اپنی بے سروسامانی اور کفارِ قریش کے سروسامان پر نہ جائیں، جس کام کے پیچھے خدا کا ہاتھ ہوتا ہے، وہ آخرکار غالب ہی ہو کر رہتا ہے۔ اِسی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے ساحرانِ مصر کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب حق اُن پر منکشف ہو گیا تو وہ بے دھڑک اُس پر ایمان لے آئے، اور پھر فرعون کے انتقام کا خوف انھیں بال برابر بھی ایمان کی راہ سے نہ ہٹا سکا۔

(۵) آخر میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک شہادت پیش کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں اور معبُودوں کے گھڑے جانے کی ابتدا کس مضحکہ انگیز طریقے سے ہوا کرتی ہے، اور یہ کہ خدا کے نبی اِس گِھناؤنی چیز کا نام و نشان تک باقی رہنے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ پس آج اس شرک اور بُت پرستی کی جو مخالفت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں، وہ نبوت کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

اِس طرح قصّۂ موسیٰؑ کے پیرایے میں اُن تمام معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اُس وقت اُن کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی کش مکش سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر وعظ کیا گیا ہے کہ بہرحال یہ قرآن ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے جو تمھاری اپنی زبان میں تم کو سمجھانے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اس پر کان دھرو گے اور اس سے سبق لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود بُرا انجام دیکھو گے۔

پھر آدم علیہ السلام کا قصّہ بیان کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جس رَوش پر تم لوگ جا رہے ہو، یہ دراصل شیطان کی پیروی ہے۔ اَحیاناً شیطان کے بہکائے میں آ جانا تو خیر ایک وقتی کمزوری ہے جس سے انسان بمشکل ہی بچ سکتا ہے۔ مگر آدمی کے لیے صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ جب اس پر اس کی غَلَطی واضح کر دی جائے تو وہ اپنے باپ آدمؑ کی طرح صاف صاف اس کا اعتراف کر لے، توبہ کرے، اور پھر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے۔ غَلَطی اور اس پر ہٹ اور نصیحت پر نصیحت کیے جانے پر بھی اُس سے باز نہ آنا، اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مارنا ہے، جس کا نقصان آدمی کو خود ہی بھگتنا پڑے گا، کسی دوسرے کا کچھ نہ بگڑے گا۔

آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اِن منکرینِ حق کے معاملے میں جلدی اور بے صبری نہ کرو۔ خدا کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و انکار پر فوراً نہیں پکڑ لیتا، بلکہ سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے۔ لہٰذا گھبراؤ نہیں، صبر کے ساتھ اِن لوگوں کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جاؤ، اور نصیحت کا حق ادا کرتے رہو۔

اسی سلسلے میں نماز کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ اہلِ ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا ہوں جو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہیں۔

آیاتہا ۱۳۵ سُوْرَۃُ طٰہٰ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طٰہٰ ۚ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْکِرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۙ﴿۳﴾
تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ؕ﴿۴﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ
اسْتَوٰی ﴿۵﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا وَمَا تَحْتَ
الثَّرٰی ﴿۶﴾ وَاِنْ تَجْہَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ﴿۷﴾ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ

طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے[۱]۔ نازل کیا گیا ہے اُس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہے[۲]۔ مالک ہے اُن سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں، اور جو مٹی کے نیچے ہیں تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے[۳]۔ وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی خدا

۱ – یہ فقرہ پہلے فقرے کے مفہوم پر خود روشنی ڈالتا ہے۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کو نازل کر کے ہم کوئی اَن ہونا کام تم سے نہیں لینا چاہتے۔ تمھارے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے اُن کو منوا کر چھوڑو، اور جن کے دل ایمان کے لیے بند ہو چکے ہیں ان کے اندر ایمان اُتار کر ہی رہو۔ یہ تو بس ایک تذکیر اور یاد دہانی ہے، اور اس لیے بھیجی گئی ہے کہ جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو، وہ اسے سن کر ہوش میں آجائے۔ اب اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں خدا کا کچھ خوف نہیں، اور جنھیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ان کے پیچھے پڑنے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں۔

۲ – یعنی پیدا کرنے کے بعد کہیں جا کر سو نہیں گیا ہے بلکہ آپ اپنے کارخانۂ تخلیق کا سارا انتظام چلا رہا ہے، خود اس ناپیدا کنار سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے، خالق ہی نہیں ہے بالفعل حکمراں بھی ہے۔

۳ – یعنی کچھ ضروری نہیں ہے کہ جو ظلم و ستم تم پر اور تمھارے ساتھیوں پر ہو رہا ہے اور جن شرارتوں اور خباثتوں سے تمھیں نیچا دکھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ان پر تم بآوازِ بلند ہی فریاد کرو۔ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم پر کیا کیفیت گزر رہی ہے۔ وہ تمھارے دلوں کی پکار تک سن رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم
إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ﴿٨﴾ وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿٩﴾
إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا
بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ﴿١١﴾
إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾

نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں[۴]۔

اور تمھیں کچھ موسیٰؑ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی[۵] اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ "ذرا ٹھیرو! میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمھارے لیے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اِس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے[۶]۔"
وہاں پہنچا تو پکارا گیا: "اے موسیٰؑ! میں ہی تیرا رب ہوں، جُوتیاں اُتار دے[۷]۔ تو وادیِ مقدس طُویٰ[۸] میں ہے۔

۴ – یعنی وہ بہترین صفات کا مالک ہے۔

۵ – یہ اُس وقت کا قصّہ ہے جب حضرت موسیٰؑ چند سال مَدیَن میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو (جن سے مَدیَن ہی میں شادی ہوئی تھی) لے کر مصر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کی سرگزشت سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک مصری ہلاک ہو گیا تھا اور اس پر انھیں اپنی گرفتاری کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، تو وہ مصر سے بھاگ کر مَدیَن میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔

۶ – ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا زمانہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے سے گزر رہے تھے۔ دُور سے ایک آگ دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ یا تو وہاں سے تھوڑی سی آگ مل جائے گی، تاکہ بال بچوں کو رات بھر گرم رکھنے کا بندوبست ہو جائے، یا کم از کم وہاں سے یہ پتا چل جائے گا کہ آگے راستہ کدھر ہے۔ خیال کیا تھا دُنیا کا راستہ ملنے کا، اور وہاں مل گیا عقبیٰ کا راستہ۔

۷ – غالباً اسی واقعے کی وجہ سے یہودیوں میں یہ شرعی مسئلہ بن گیا کہ جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے فرمایا: خالفوا الیھود فانھم لا یُصَلّون فی نعالھم ولا خفافھم، "یہودیوں کے خلاف عمل کرو۔ کیونکہ وہ جوتے اور چمڑے کے موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے۔" (ابوداؤد) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضرور جوتے ہی پہن کر نماز پڑھنی چاہیے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اس لیے دونوں طرح عمل کرو۔ ابوداؤد میں عَمرْوؓ بن عاص کی روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مُسنَدِ احمد اور ابوداؤد

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا
فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ

اور میں نے تجھ کو چُن لیا ہے، سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے،
پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔[9] قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اُس کا وقت

میں ابو سعید خُدریؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو جوتے کو پلٹ کر دیکھ لے۔ اگر کوئی گندگی لگی ہو تو زمین سے رگڑ کر صاف کر لے اور انھی جوتوں کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔" ابو ہُریرہؓ کی روایت میں حضورؐ کے یہ الفاظ ہیں: "اگر تم میں سے کسی نے اپنے جوتے سے گندگی کو پامال کیا ہو تو مٹی اس کو پاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔" اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی روایت میں ہے: یطھرہ ما بعدہ، یعنی "ایک جگہ گندگی لگی ہوگی تو دوسری جگہ جاتے جاتے خود زمین ہی اس کو پاک کر دے گی۔" ان کثیر التعداد روایات کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام اَوزاعیؒ اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ جوتا ہر حال میں زمین کی مٹی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایک ایک قول امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی اس کی تائید میں ہے۔ مگر امام شافعیؒ کا مشہور قول اِس کے خلاف ہے۔ غالباً وہ جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو ادب کے خلاف سمجھ کر منع کرتے ہیں، اگرچہ سمجھا یہی گیا ہے کہ ان کے نزدیک جوتا مٹی پر رگڑنے سے پاک نہیں ہوتا۔ (اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں چٹائی تک کا فرش نہ تھا، بلکہ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا ان احادیث سے اِستدلال کر کے اگر کوئی شخص آج کی مسجدوں کے فرش پر جوتے لے جانا چاہے تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ البتہ گھاس پر یا کُھلے میدان میں جوتے پہنے پہنے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو میدان میں نمازِ جنازہ پڑھتے وقت بھی جوتے اُتارنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ دراصل احکام سے ناواقف ہیں۔)

۸ – عام خیال یہ ہے کہ "طُویٰ" اس وادی کا نام تھا۔ مگر بعض مفسرین نے "وادیِ مقدسِ طُویٰ" کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ "وہ وادی جو ایک ساعت کے لیے مقدس کر دی گئی ہے۔"

۹ – یہاں نماز کی اصلی غرض پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی خدا سے غافل نہ ہو جائے، دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر اُس کو اِس حقیقت سے بے فکر نہ کر دیں کہ میں کسی کا بندہ ہوں، آزاد و خود مختار نہیں ہوں۔ اس فکر کو تازہ رکھنے اور خدا سے آدمی کا تعلق جوڑے رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے، جو ہر روز کئی بار آدمی کو دُنیا کے ہنگاموں سے ہٹا کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ نماز قائم کر تاکہ مَیں تجھے یاد کروں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ "مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔"

ضمناً اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس شخص کو بھول لاحق ہو جائے، اسے جب بھی یاد آئے، نماز ادا کر لینی چاہیے۔ حدیث میں حضرت اَنَسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من نسی صَلاۃ فلیصلّھا اذا ذکرھا لا کفارۃ

Maktaba Tul-Ishaat.com

أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ
بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ﴿١٦﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ
عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ﴿١٨﴾

مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفّس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔[10] پس کوئی ایسا شخص جو اُس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا ہے، تجھ کو اُس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے، ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا—— اور اے موسیٰؑ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا[11] ہے؟"

موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتّے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں[12]۔"

لها الا ذٰلك۔ "جو شخص کسی وقت کی نماز بھول گیا ہو، اُسے چاہیے کہ جب یاد آئے ادا کر لے، اِس کے سوا اس کا کوئی کفّارہ نہیں ہے۔" (بخاری، مسلم، احمد) اسی معنیٰ میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، جسے مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے لیا ہے۔ اور ابو قتادہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا: "اگر ہم نماز کے وقت سو گئے ہوں تو کیا کریں؟" آپؐ نے فرمایا: "نیند میں کچھ قصور نہیں، قصور تو جاگنے کی حالت میں ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص بھول جائے یا سو جائے تو جب بیدار ہو یا جب یاد آئے، نماز پڑھ لے۔" (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

۱۰- توحید کے بعد دوسری حقیقت، جو ہر زمانے میں تمام انبیا علیہم السلام پر منکشف کی گئی اور جس کی تعلیم دینے پر وہ مامور کیے گئے، آخرت ہے۔ یہاں نہ صرف اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ساعتِ منتظرہ اِس لیے آئے گی کہ ہر شخص نے دُنیا میں جو سعی کی ہے، اس کا بدلہ آخرت میں پائے۔ اور اس کے وقت کو مخفی بھی اس لیے رکھا گیا ہے کہ آزمائش کا مدّعا پورا ہو سکے۔ جسے عاقبت کی کچھ فکر ہو، اس کو ہر وقت اِس گھڑی کا کھٹکا لگا رہے، اور یہ کھٹکا اسے بے راہ روی سے بچاتا رہے۔ اور جو دُنیا میں گم رہنا چاہتا ہو، وہ اس خیال میں مگن رہے کہ قیامت ابھی کہیں دُور دُور بھی آتی نظر نہیں آتی۔

۱۱- یہ سوال طلبِ علم کے لیے نہ تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کو بھی معلوم تھا کہ موسیٰؑ کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ پوچھنے سے مقصود یہ تھا کہ لاٹھی کا لاٹھی ہونا حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں اچھی طرح مُستحضر ہو جائے اور پھر وہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیں۔

۱۲- اگرچہ جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ حضور! یہ لاٹھی ہے، مگر حضرت موسیٰؑ نے اس سوال کا جو لمبا جواب دیا، وہ ان کی اُس وقت کی قلبی کیفیت کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب آدمی کو کسی بہت

قَالَ اَلۡقِهَا يٰمُوۡسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذۡهَا
وَلَا تَخَفۡ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى
جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ
مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ﴿۲۳﴾ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ ع

فرمایا: "پھینک دے اس کو موسیٰؑ۔"

اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا تھا۔

فرمایا: "پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہُوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف[13] کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے۔" ع

بڑی شخصیّت سے بات کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ اپنی بات کو طول دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اُسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اُس کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل رہے۔

۱۳ – یعنی روشن ایسا ہوگا جیسے سورج ہو، مگر تمھیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بائبل میں یدِ بیضا کی ایک اور ہی تعبیر کی گئی ہے جو وہاں سے نقل کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گئی۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے جب بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو پورا ہاتھ برَص کے مریض کی طرح سفید تھا، پھر جب دوبارہ اُسے بغل میں رکھا تو وہ اصلی حالت پر آ گیا۔ یہی تعبیر اِس معجزے کی تلمود میں بھی بیان کی گئی ہے، اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ فرعون کو برص کی بیماری تھی جسے وہ چھپائے ہوئے تھا، اس لیے اس کے سامنے یہ معجزہ پیش کیا گیا کہ دیکھ، یوں آناً فاناً برص کا مرض پیدا بھی ہوتا ہے اور کافور بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو ذوقِ سلیم اس سے اِبا کرتا ہے کہ کسی نبی کو برص کا معجزہ دے کر ایک بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے۔ دوسرے اگر فرعون کو مخفی طور پر برص کی بیماری تھی تو یدِ بیضا صرف اُس کی ذات کے لیے معجزہ ہوسکتا تھا، اس کے درباریوں پر اس معجزے کا کیا رُعب طاری ہوتا۔ لہٰذا صحیح بات وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کی کہ اس ہاتھ میں سورج کی سی چمک پیدا ہو جاتی تھی جسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ قدیم مفسرین میں سے بھی بہتوں نے اس کے یہی معنیٰ لیے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ

موسیٰؑ نے عرض کیا: "پروردگار! میرا سینہ کھول دے[14]، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سُلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں[15]، اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر

۱۴ – یعنی میرے دل میں اس منصبِ عظیم کو سنبھالنے کی ہمت پیدا کر دے، اور میرا حوصلہ بڑھا دے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا کام حضرت موسیٰؑ کے سپرد کیا جا رہا تھا جس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی، اس لیے آپ نے دعا کی کہ مجھے وہ صبر، وہ ثبات، وہ تحمل، وہ بے خوفی اور وہ عزم عطا کر جو اس کام کے لیے درکار ہے۔

۱۵ – بائبل میں اس کی جو تشریح بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: "اے خداوند! میں فصیح نہیں۔ نہ تو پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا۔ بلکہ رُک رُک کر بولتا ہوں اور میری زبان کُند ہے۔" (خُروج ۴: ۱۰) مگر تلمُود میں اِس کا ایک لمبا چوڑا قصّہ بیان ہوا ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ بچپن میں جب حضرت موسیٰ فرعون کے گھر پرورش پا رہے تھے، ایک روز انھوں نے فرعون کے سر کا تاج اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بچے نے یہ کام بالارادہ کیا ہے، یا یہ محض طفلانہ فعل ہے۔ آخرکار یہ تجویز کیا گیا کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ، دونوں ساتھ رکھے جائیں۔ چنانچہ دونوں چیزیں لا کر سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰؑ نے اُٹھا کر آگ منہ میں رکھ لی۔ اس طرح ان کی جان تو بچ گئی، مگر زبان میں ہمیشہ کے لیے لکنت پڑ گئی۔

یہی قصّہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گیا۔ لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اُٹھا کر منہ میں لے جا سکے۔ بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ منہ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آ سکتی ہے؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور ان کو اندیشہ لاحق تھا کہ نبوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے اگر تقریر کی ضرورت کبھی پیش آئی (جس کا انھیں اُس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا) تو ان کی طبیعت کی جھجک مانع ہو جائے گی۔ اس لیے انھوں نے دعا فرمائی کہ یا اللہ! میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ میں اچھی طرح اپنی بات لوگوں کو سمجھا سکوں۔ یہی چیز تھی جس کا فرعون نے ایک مرتبہ ان کو طعنہ دیا کہ "یہ شخص تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔" (لَا یَکَادُ یُبِیْنُ۔ الزُّخرُف: ۵۲) اور یہی کمزوری تھی جس کو محسوس کر کے حضرت موسیٰؑ نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ کو مددگار کے طور پر مانگا۔ سورۂ قصص میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً۔ "میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اُس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج۔" آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی یہ کمزوری دُور ہو گئی تھی اور وہ خوب زوردار تقریر کرنے لگے تھے، چنانچہ قرآن میں اور بائبل میں ان کی بعد کے دَور کی جو تقریریں

اَهۡلِيۡ ﴿۲۹﴾ هٰرُوۡنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِيۡ ﴿۳۱﴾ وَاَشۡرِكۡهُ فِيۡۤ اَمۡرِيۡ ﴿۳۲﴾ كَيۡ
نُسَبِّحَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدۡ
اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَيۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذۡ
اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوۡحٰٓى ﴿۳۸﴾ اَنِ اقۡذِفِيۡهِ فِي التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِيۡهِ فِي
الۡيَمِّ فَلۡيُلۡقِهِ الۡيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّيۡ وَعَدُوٌّ لَّهٗ

مقرر کر دے۔ ہارون، جو میرا بھائی ہے[16]۔ اُس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے۔“

فرمایا: ”دیا گیا جو تو نے مانگا اَے موسیٰؑ! ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا[17]۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا، ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعے سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچّے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا اور اسے میرا دشمن اور اس بچّے کا دشمن اُٹھا لے گا۔

آئی ہیں، وہ کمال فصاحت وطلاقتِ لِسانی کی شہادت دیتی ہیں۔

یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے۔ رسول ہمیشہ شکل، صورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوئے ہیں، جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متأثر کرنے والا ہوتا تھا۔ کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں بھیجا جا سکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے، یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۱۶- بائبل کی رِوایت کے مطابق حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ سے تین برس بڑے تھے۔ (خُروج ۷:۷)

۱۷- اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو ایک ایک کر کے وہ احسانات یاد دلاتا ہے جو پیدائش کے وقت سے لے کر اس وقت تک اس نے ان پر کیے تھے۔ اِن واقعات کی تفصیل سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف اشارات کیے گئے ہیں جن سے مقصود حضرت موسیٰؑ کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم اُسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور اُسی کام کے لیے آج تک خاص طور پر سرکاری نگرانی میں پرورش پاتے رہے ہو جس پر اب تمھیں مامور کیا جا رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف لازم

وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝۳۹ اِذْ تَمْشِيْۤ
اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ
كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ
وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ قف فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ
عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝۴۰ وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝۴۱ ۚ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ
اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝۴۲ ۚ اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ۝۴۳ ۚۖ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴

میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبّت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔ یاد کر جب کہ تیری بہن چل رہی تھی، پھر جا کر کہتی ہے: ''میں تمھیں اُس کا پتا دُوں جو اِس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے؟'' اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا، تاکہ اُس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو۔ اور (یہ بھی یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، ہم نے تجھے اِس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمایشوں سے گزارا اور تو مَدیَن کے لوگوں میں کئی سال ٹھیرا رہا۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تُو آ گیا ہے اَے موسیٰؑ۔ میں نے تجھ کو اپنے کام کا بنا لیا ہے۔ جا، تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور دیکھو! تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس، کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے[18]''

۱۸- آدمی کے راہِ راست پر آنے کی دو ہی شکلیں ہیں: یا تو وہ تفہیم و تلقین سے مطمئن ہو کر صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے، یا پھر بُرے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جاتا ہے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِىْ
مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ
اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

دونوں نے[١٨ الف] عرض کیا: ”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔“

فرمایا: ”ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں، اور سلامتی ہے اُس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اُس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے[١٩]۔“

١٨، الف — معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ مصر پہنچ گئے اور حضرت ہارونؑ عملاً ان کے شریکِ کار ہو گئے۔ اس وقت فرعون کے پاس جانے سے پہلے دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ گزارش کی ہو گی۔

١٩ — اس واقعے کو بائبل اور تلمود میں جس طرح بیان کیا گیا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجیے، تاکہ اندازہ ہو کہ قرآنِ مجید انبیا علیہم السلام کا ذکر کس شان سے کرتا ہے اور بنی اسرائیل کی روایات میں ان کی کیسی تصویر پیش کی گئی ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ پہلی مرتبہ جب خدا نے موسیٰؑ سے کہا کہ ”سو اب آ، میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے“ تو حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا: ”میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں؟“ پھر خدا نے حضرت موسیٰؑ کو بہت کچھ سمجھایا، ان کی ڈھارس بندھائی، معجزے عطا کیے، مگر حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا تو یہی کہا کہ ”اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں، کسی اور کے ہاتھ سے، جسے تو چاہے، یہ پیغام بھیج۔“ (خروج ۴: ۱۳) تلمود کی روایت اس سے بھی چند قدم آگے جاتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان سات دن تک اِسی بات پر ردّ و کد ہوتی رہی۔ اللہ کہتا رہا کہ نبی بن، مگر موسیٰؑ کہتے رہے کہ میری زبان ہی نہیں کھلتی تو میں نبی کیسے بن جاؤں۔ آخر اللہ میاں نے کہا: میری خوشی یہ ہے کہ تو ہی نبی بن۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ لُوط کو بچانے کے لیے آپ نے فرشتے بھیجے، ہاجرہ جب سارہ کے گھر سے نکلی تو اس کے لیے پانچ فرشتے بھیجے، اور اب اپنے خاص بچوں (بنی اسرائیل) کو مصر سے نکلوانے کے لیے آپ مجھے بھیج رہے ہیں۔ اس پر خدا ناراض ہو گیا اور اس نے رسالت میں ان کے ساتھ ہارونؑ کو شریک کر دیا اور موسیٰؑ کی اولاد کو محروم کر کے کہانت کا منصب ہارونؑ کی اولاد کو دے دیا ـــــ یہ کتابیں ہیں جن کے متعلق بے شرم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان سے یہ قصے نقل کر لیے گئے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ

فرعون نے کہا: ”اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اَے موسیٰؑ[21] ؟“

موسیٰؑ نے جواب دیا: ”ہمارا رب وہ[22] ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی،

۲۰ - یہاں قصّے کی اِن تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح فرعون کے پاس پہنچے اور کس طرح اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۳ میں گزر چکی ہیں، اور آگے سورۂ شُعَراء، رکوع ۲ - ۳، سورۂ قصص، رکوع ۴، اور سورۂ نازعات، رکوع ۱ میں آنے والی ہیں۔

فرعون کے متعلق ضروری معلومات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔

۲۱ - دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحبِ دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے، اس لیے فرعون نے انھی کو مخاطب کیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ خطاب کا رُخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارونؑ کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور خطابت کے پہلو میں حضرت موسیٰؑ کے ضعف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہلِ مصر کا رب تو میں ہوں۔ سورۂ نازعات میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى، ”اے اہلِ مصر! تمھارا ربِّ اعلیٰ میں ہوں۔“ سورۂ زُخرُف میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے: يٰقَوۡمِ اَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِىۡ ۚ ”اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟“ (آیت ۵۱) سورۂ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں بکارتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَاُ مَا عَلِمۡتُ لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرِىۡ ۚ فَاَوۡقِدۡ لِىۡ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّىۡ صَرۡحًا لَّعَلِّىۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوۡسٰى ۙ، ”اے سردارانِ قوم! میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور بھی اللہ ہے۔ اے ہامان! ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تیار کرا، تاکہ میں ذرا اُوپر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کسے اللہ بنا رہا ہے۔“ (آیت ۳۸) سورۂ شُعَراء میں وہ حضرت موسیٰؑ کو ڈانٹ کر کہتا ہے: لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰهًا غَيۡرِىۡ لَاَجۡعَلَنَّكَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِيۡنَ ۝، ”اگر تُو نے میرے سوا کسی کو اللہ بنایا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا۔“ (آیت ۲۹)

اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبُود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رَع یا راع) کے اَوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا، اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ ”واحد مرکزِ پرستش“ ہونے کا نہ تھا، بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریّے کے اعتبار سے دراصل پوری نوعِ انسانی کی سیاسی رُبوبیّت و خداوندی کا مدعی تھا، اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اُس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرماں روا ہو جس کا نمایندہ آ کر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔ بعض لوگوں کو اُس کی لن ترانیوں سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ

ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝۵۱

پھر اس کو راستہ بتایا[۲۳]۔''

فرعون بولا: ''اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں، ان کی پھر کیا حالت تھی[۲۴]؟''

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر تھا اور خود خدا ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ مگر یہ بات قرآن سے ثابت ہے کہ وہ عالَمِ بالا پر کسی اور کی حکمرانی مانتا تھا۔ سورۂ المومن، آیات ۲۸ تا ۳۴ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۵۳ کو غور سے دیکھیے۔ یہ آیتیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ہستی سے اُس کو انکار نہ تھا۔ البتہ جس چیز کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ تھا، وہ یہ تھی کہ اس کی سیاسی خدائی میں اللہ کا کوئی دخل ہو اور اللہ کا کوئی رسول آ کر اُس پر حکم چلائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حاشیہ ۵۳)

۲۲ – یعنی ہم ہر معنیٰ میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار، آقا، مالک، حاکم، سب کچھ ہمارے نزدیک وہی ہے۔ کسی معنیٰ میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔

۲۳ – یعنی دُنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل وصورت، جو قوت وصلاحیت، اور جو صفت وخاصیت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دُنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصّے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

پھر اس نے ایسا نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اُسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اُڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اُگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں، ہادی اور معلّم بھی ہے۔

اِس بے نظیر، جامع ومختصر جملے میں حضرت موسیٰؑ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اُس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا۔ دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں آ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجودِ خاص کے لیے اللہ کا ممنونِ احسان ہے، اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحے کے لیے زندہ تک نہیں رہ سکتا جب تک اس کا دل اور اس کے پھیپھڑے اور اس کا معدہ وجگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے چلے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں، اِسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے اشارتاً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾

موسیٰؑ نے کہا: "اُس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چُوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔"[25]

انکار تھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے، اور جو ہر چیز کو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالم گیر منصبِ ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شُعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے۔ اور انسان کی شُعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہوسکتی جو مچھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انھیں سیدھا راستہ بتائے۔

۲۴ — یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا، اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو صد ہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آرہے ہیں، ان کی تمھارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے؟ کیا ان سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟ یہ تھا فرعون کے پاس حضرت موسیٰؑ کی اس دلیل کا جواب۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جواب اُس نے بربنائے جَہالت دیا ہو، اور ہوسکتا ہے کہ بربنائے شرارت۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی وہ خود بھی اس بات پر جھلّا گیا ہو کہ اِس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہلِ دربار اور عام اہلِ مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے۔ اہلِ حق کی تبلیغ کے خلاف ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لیے بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ خُصوصاً اُس زمانے میں جب کہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے کام لیا جا رہا تھا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون کی اس مکّاری کا ذکر یہاں بالکل برمحل تھا۔

۲۵ — یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اس وقت دیا، اور اس سے حکمتِ تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے۔ فرعون کا مقصد، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، سامعین کے، اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنّم کا ایندھن بنیں گے، تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰؑ کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا۔ اس لیے آنجناب نے کمالِ دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے۔ آپؑ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں۔ ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے۔ نہ خدا کی نگاہ سے کوئی چیز بچی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظے سے کوئی شے محو ہوئی ہے۔ ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے، اس کو وہی جانتا ہے۔ مجھے اور تمھیں یہ فکر نہیں

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ کُلُوۡا
وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۵۴﴾ ع مِنۡہَا
خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾

ع

وہی[۲۶] جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور اُس میں تمھارے چلنے کو راستے بنائے، اور اُوپر سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعے سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔[۲۷] ع اِسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اِسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے، اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں[۲۸] گے۔

ہونی چاہیے کہ ان کا مَوقِف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا مَوقِف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

۲۶ – اندازِ کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا جواب ”نہ بُھولتا ہے“ پر ختم ہو گیا، اور یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ شرح و تذکیر ارشاد ہوئی ہے۔ قرآن میں اس طرح کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ کسی گزرے ہوئے یا آیندہ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے جب کسی شخص کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے بعد متصلاً چند فقرے وعظ و پند، یا شرح و تفسیر، یا تفصیل و توضیح کے طور پر مزید ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور صرف اندازِ کلام سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ اس شخص کا قول نہیں ہے جس کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول ہے۔

واضح رہے کہ اس عبارت کا تعلق صرف قریب کے فقرے ”میرا رب نہ چُوکتا ہے نہ بُھولتا ہے“ سے ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰؑ کے پورے کلام سے ہے، جو رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ سے شروع ہوا ہے۔

۲۷ – یعنی جو لوگ عقلِ سلیم سے کام لے کر جستجوئے حق کرنا چاہتے ہوں، وہ اِن نشانات کی مدد سے منزلِ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ نشانات اُن کو بتا دیں گے کہ اس کائنات کا ایک رب ہے اور رُبوبیّت ساری کی ساری اسی کی ہے۔ کسی دوسرے رب کے لیے یہاں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

۲۸ – یعنی ہر انسان کو لازماً تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ ایک مرحلہ موجودہ دُنیا میں پیدایش سے لے کر موت تک کا۔ دوسرا مرحلہ موت سے قیامت تک کا۔ اور تیسرا قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کا مرحلہ۔ یہ تینوں مرحلے اِس

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ۝۵۶ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا
مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝۵۷ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ
بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝۵۸

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں[۲۹] دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔ کہنے لگا: ”اے موسیٰؑ! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے مُلک سے نکال باہر کرے[۳۰]؟ اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادُو لاتے ہیں۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اِس قرار داد سے پھریں گے، نہ تو پھریو۔ کُھلے میدان میں سامنے آ جا۔“

آیت کی رُو سے اِسی زمین پر گزرنے والے ہیں۔

۲۹ – یعنی آفاق و اَنفُس کے دلائل کی نشانیاں بھی، اور وہ معجزات بھی جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے تھے۔ قرآن میں متعدِّد مقامات پر حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریریں بھی موجود ہیں جو انھوں نے فرعون کو سمجھانے کے لیے کیں، اور وہ معجزات بھی مذکور ہیں جو اس کو پے در پے دکھائے گئے۔

۳۰ – جادو سے مراد عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ ہے جو سورۂ اَعراف اور سورۂ شعراء کی تفصیلات کے بموجب حضرت موسیٰؑ نے پہلی ہی ملاقات کے وقت بھرے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس معجزے کو دیکھ کر فرعون پر جو بدحواسی طاری ہوئی، اس کا اندازہ اس کے اِسی فقرے سے کیا جا سکتا ہے کہ ”تو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔“ دُنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا اور نہ بعد میں کبھی پیش آیا کہ کسی جادُوگر نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک فتح کر لیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں سیکڑوں ہزاروں جادُوگر موجود تھے جو تماشے دکھا دکھا کر انعام کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھرتے تھے۔ اس لیے فرعون کا ایک طرف یہ کہنا کہ تو جادُوگر ہے، اور دوسری طرف یہ خطرہ ظاہر کرنا کہ تو میری سلطنت چھین لینا چاہتا ہے، کھلی ہوئی بدحواسی کی علامت ہے۔ دراصل وہ حضرت موسیٰؑ کی معقول و مدلّل تقریر، اور پھر ان کے معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہلِ دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی عوام و خواص اس سے متأثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس نے جھوٹ اور فریب اور تعصّبات کی انگیخت سے کام نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے کہا: یہ معجزہ نہیں جادو ہے اور ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اِسی طرح لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو! ذرا دیکھو، یہ تمھارے باپ دادا کو گمراہ اور جہنمی ٹھیراتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، یہ پیغمبر ویغمبر کچھ نہیں ہے، اقتدار کا بھوکا ہے، چاہتا ہے کہ یوسف کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمراں ہو جائیں اور قبطی قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔ اِن

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى

موسیٰؑ نے کہا: "جشن کا دن طے ہوا، اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔"[31]

فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آ گیا۔[32]

موسیٰؑ نے (عین موقع پر گروہِ مقابل کو مُخاطب کر کے) کہا:[33] "شامت کے مارو، نہ جھوٹی تہمتیں

ہتھکنڈوں سے وہ دعوتِ حق کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ (مزید تشریحات کے لیے تفہیم القرآن، جلد دوم کے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: الاعراف، حواشی ۸۷-۸۸-۸۹۔ یونُس، حاشیہ ۷۵) اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ہر زمانے میں برسرِ اقتدار لوگوں نے داعیانِ حق کو یہی الزام دیا ہے کہ وہ دراصل اقتدار کے بھوکے ہیں اور ساری باتیں اسی مقصد کے لیے کر رہے ہیں۔ اس کی مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۱۱۰، ۱۲۳۔ یونُس، آیت ۷۸۔ المومنون، آیت ۲۴۔

۳۱- فرعون کا مدّعا یہ تھا کہ ایک دفعہ جادوگروں سے لاٹھیوں اور رسّیوں کا سانپ بنوا کر دکھا دوں تو موسیٰؑ کے معجزے کا جو اثر لوگوں کے دلوں پر ہوا ہے، وہ دُور ہو جائے گا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی منہ مانگی مراد تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ الگ کوئی دن اور جگہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جشن کا دن قریب ہے، جس میں تمام ملک کے لوگ دارالسلطنت میں کھنچ کر آ جاتے ہیں۔ وہیں میلے کے میدان میں مقابلہ ہو جائے، تاکہ ساری قوم دیکھ لے۔ اور وقت بھی دن کی پوری روشنی کا ہونا چاہیے، تاکہ شک وشبہ کے لیے کوئی گنجایش نہ رہے۔

۳۲- فرعون اور اس کے درباریوں کی نگاہ میں اس مقابلے کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اسی کے فیصلے پر اپنی قسمت کا فیصلہ معلّق سمجھ رہے تھے۔ تمام ملک میں آدمی دوڑا دیے گئے کہ جہاں جہاں کوئی ماہر جادوگر موجود ہو، اُسے لے آئیں۔ اسی طرح عوام کو بھی جمع کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی گئی، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اکٹھے ہوں اور اپنی آنکھوں سے جادو کے کمالات دیکھ کر عصائے موسیٰؑ کے رُعب سے محفوظ ہو جائیں۔ کُھلم کُھلّا کہا جانے لگا کہ ہمارے دین کا انحصار اب جادوگروں کے کرتب پر ہے۔ وہ جیتیں تو ہمارا دین بچے گا، ورنہ موسیٰؑ کا دین چھا کر رہے گا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ شعراء، رکوع ۳)

اس مقام پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مصر کے شاہی خاندان اور طبقۂ امرا کا مذہب عوام کے مذہب سے کافی مختلف تھا۔ دونوں کے دیوتا اور مندر الگ الگ تھے، مذہبی مراسم بھی یکساں نہ تھے، اور زندگی بعدِ موت کے معاملے میں بھی، جس کو مصر میں بہت بڑی اہمیّت حاصل تھی، دونوں کے عملی طریقے اور نظری انجام میں بہت بڑا امتیاز پایا جاتا تھا۔ (مُلاحظہ ہو Toynbee کی A Study of History، صفحہ ۳۱-۳۲) علاوہ بریں مصر میں اس سے پہلے جو مذہبی انقلابات رُونما ہوئے تھے، ان کی بدولت وہاں کی آبادی میں متعدد ایسے عناصر پیدا ہو چکے تھے جو ایک مشرکانہ مذہب کی بہ نسبت ایک توحیدی مذہب کو ترجیح دیتے تھے، یا دے سکتے تھے۔ مثلاً خود بنی اسرائیل اور ان کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا
اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ

باندھو اللہ پر،[۳۴] ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمھارا ستیاناس کر دے گا۔ جُھوٹ جس نے بھی گھڑا، وہ نامراد ہوا۔"

یہ سُن کر اُن کے درمیان اختلافِ رائے ہوگیا اور وہ چُپکے چُپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔[۳۵] آخرِ کار کچھ لوگوں نے کہا کہ[۳٦] "یہ دونوں تو محض جادُوگر ہیں۔ اِن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادُو کے

ہم مذہب لوگ آبادی کا کم از کم دس فی صد حصّہ تھے۔ اس کے علاوہ اُس مذہبی انقلاب کو ابھی پورے ڈیڑھ سو برس بھی نہ گزرے تھے جو فرعون اَمینوفس یا اَخناتُون (۱۳۷۷-۱۳٦۰ ق م) نے حکومت کے زور سے برپا کیا تھا، جس میں تمام معبُودوں کو ختم کر کے صرف ایک معبُود آتُون باقی رکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس انقلاب کو بعد میں حکومت ہی کے زور سے اُلٹ دیا گیا، مگر کچھ نہ کچھ تو اپنے اثرات وہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ اِن حالات کو نگاہ میں رکھا جائے تو فرعون کی وہ گھبراہٹ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اس موقع پر اسے لاحق تھی۔

۳۳- یہ خطاب عوام سے نہ تھا جنھیں ابھی حضرت موسٰیؑ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ معجزہ دکھاتے ہیں یا جادُو، بلکہ خطاب فرعون اور اس کے درباریوں سے تھا جو انھیں جادوگر قرار دے رہے تھے۔

۳۴- یعنی اُس کے معجزے کو جادو اور اس کے پیغمبر کو ساحر کذّاب نہ قرار دو۔

۳۵- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنی کمزوری کو خود محسوس کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ حضرت موسٰیؑ نے جو کچھ دکھایا ہے، وہ جادُو نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس مقابلے میں ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے آئے تھے، اور جب عین موقع پر حضرت موسٰیؑ نے ان کو للکار کر مُتنبّہ کیا تو ان کا عزم یکایک متزلزل ہوگیا۔ ان کا اختلافِ رائے اس امر میں ہُوا ہو گا کہ آیا اِس بڑے تہوار کے موقع پر، جب کہ پورے ملک سے آئے ہوئے آدمی اکٹھے ہیں، کھلے میدان اور دن کی پوری روشنی میں یہ مقابلہ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر یہاں ہم شکست کھا گئے اور سب کے سامنے جادو اور معجزے کا فرق کھل گیا تو پھر بات سنبھالے نہ سنبھل سکے گی۔

۳٦- اور یہ کہنے والے لازماً فرعونی پارٹی کے وہ سر پھرے لوگ ہوں گے جو حضرت موسٰیؑ کی مخالفت میں ہر بازی کھیل جانے پر تیار تھے۔ جہاں دیدہ اور معاملہ فہم لوگ قدم آگے بڑھاتے ہوئے جھجک رہے ہوں گے، اور یہ سر پھرے جوشیلے لوگ کہتے ہوں گے کہ خواہ مخواہ کی دُور اندیشیاں چھوڑ دو اور جی کڑا کر کے مقابلہ کر ڈالو۔

يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝٦٣
فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝٦٤
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝٦٥ قَالَ
بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا
تَسْعٰى ۝٦٦ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝٦٧ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ

زور سے تم کو تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں[۳۷]۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایکا کر کے میدان میں[۳۸] آؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا، وہی جیت گیا۔"

جادوگر[۳۹] بولے: "موسیٰؑ! تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں؟"

موسیٰؑ نے کہا: "نہیں، تم ہی پھینکو۔"

یکایک اُن کی رسّیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادُو کے زور سے موسیٰؑ کو دَوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں[۴۰]، اور موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گیا[۴۱]۔ ہم نے کہا: "مت ڈر، تو ہی غالب

۳۷- یعنی اُن لوگوں کا دارومدار دو باتوں پر تھا: ایک، یہ کہ اگر جادوگر بھی موسیٰؑ کی طرح لاٹھیوں سے سانپ بنا کر دکھا دیں گے تو موسیٰؑ کا جادوگر ہونا مجمعِ عام میں ثابت ہو جائے گا۔ دوسرے، یہ کہ وہ تعصّبات کی آگ بھڑکا کر حکمران طبقے کو اندھا جوش دلانا چاہتے تھے اور یہ خوف انھیں دلا رہے تھے کہ موسیٰؑ کا غالب آجانا تمھارے ہاتھوں سے ملک نکل جانے اور تمھارے مثالی (ideal) طریقِ زندگی کے ختم ہو جانے کا ہم معنیٰ ہے۔ وہ ملک کے بااثر طبقے کو ڈرا رہے تھے کہ اگر موسیٰؑ کے ہاتھ اقتدار آگیا تو یہ تمھاری ثقافت، اور یہ تمھارے آرٹ، اور یہ تمھارا حسین و جمیل تمدّن، اور یہ تمھاری تفریحات، اور یہ تمھاری خواتین کی آزادیاں (جن کے شان دار نمونے حضرت یوسفؑ کے زمانے کی خواتین پیش کر چکی تھیں) غرض وہ سب کچھ جس کے بغیر زندگی کا کوئی مزا نہیں، غارت ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد تو نری "مُلّائیت" کا دَور دَورہ ہو گا، جسے برداشت کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔

۳۸- یعنی اِن کے مقابلے میں مُتّحِدہ محاذ پیش کرو۔ اگر اس وقت تمھارے درمیان آپس ہی میں پھوٹ پڑ گئی اور عین مقابلے کے وقت مجمعِ عام کے سامنے یہ ہچکچاہٹ اور سرگوشیاں ہونے لگیں تو ابھی ہوا اُکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھ لیں گے کہ تم خود اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ دلوں میں چور لیے ہوئے مقابلے پر آئے ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ
سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا

رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی اِن کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔[۴۲]
یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں، یہ تو جادُوگر کا فریب ہے، اور جادُوگر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، خواہ کسی
شان سے وہ آئے۔" آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادُوگر سجدے میں گرا دیے گئے[۴۳] اور پکار اُٹھے:

۳۹ - بیچ کی یہ تفصیل چھوڑ دی گئی کہ اِس پر فرعون کی صفوں میں اعتماد بحال ہوگیا اور مقابلہ شروع کرنے کا فیصلہ کر کے جادُوگروں کو احکام دے دیے گئے کہ میدان میں اُتر آئیں۔

۴۰ - سورۂ اعراف میں بیان ہوا تھا کہ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ "جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینکے تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور انھیں دہشت زدہ کر دیا" (آیت ۱۱۶) یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ اثر صرف عام لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا، خود حضرت موسیٰؑ بھی سحر کے اثر سے متأثّر ہوگئے تھے۔ ان کی صرف آنکھوں ہی نے یہ محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاٹھیاں اور رسّیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔

۴۱ - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جونہی حضرت موسیٰؑ کی زبان سے "پھینکو" کا لفظ نکلا، جادُوگروں نے یک بارگی اپنی لاٹھیاں اور رسّیاں ان کی طرف پھینک دیں، اور اچانک ان کو یہ نظر آیا کہ سیکڑوں سانپ دوڑتے ہوئے ان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ اِس منظر سے فوری طور پر اگر حضرت موسیٰؑ نے ایک دہشت اپنے اندر محسوس کی ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ انسان بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، انسانیت کے تقاضے اُس سے مُنفک نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت موسیٰؑ کو یہ خوف لاحق ہوا ہو کہ معجزے سے اس قدر مشابہ منظر دیکھ کر عوام ضرور فتنے میں پڑ جائیں گے۔

اس مقام پر یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ قرآن یہاں اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادُو سے متأثّر ہوسکتا ہے۔ اگرچہ جادُوگر اس کی نبوت سلب کر لینے، یا اس کے اُوپر نازل ہونے والی وحی میں خلل ڈال دینے، یا جادُو کے اثر سے اس کو گمراہ کر دینے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن فی الجملہ کچھ دیر کے لیے اس کے قُویٰ پر یک گونہ اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی کھل جاتی ہے جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادُو کا اثر ہونے کی روایات پڑھ کر نہ صرف اُن روایات کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمام حدیثوں کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرانے لگتے ہیں۔

۴۲ - ہوسکتا ہے کہ معجزے سے جو اژدہا پیدا ہوا تھا، وہ ان تمام لاٹھیوں اور رسّیوں ہی کو نگل گیا ہو جو سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن جن الفاظ میں یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں اس واقعے کو بیان کیا گیا ہے، اُن سے بظاہر گمان یہی ہوتا ہے کہ اس نے لاٹھیوں اور رسّیوں کو نہیں نگلا، بلکہ اُس جادُو کے اثر کو باطل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔

اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝۷۰ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ

"مان لیا ہم نے ہارونؑ اور موسیٰؑ کے ربّ[۴۴] کو۔"

فرعون نے کہا: "تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اس کی اجازت دیتا؟ معلوم

سورۂ اَعراف اور شعراء میں الفاظ یہ ہیں کہ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ "جو جھوٹ وہ بنا رہے تھے، اس کو وہ نگلے جا رہا تھا۔" اور یہاں الفاظ یہ ہیں کہ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا "وہ نگل جائے گا اُس چیز کو جو انھوں نے بنا رکھی ہے۔" اب یہ ظاہر ہے کہ ان کا جھوٹ اور ان کی بناوٹ لاٹھیاں اور رسّیاں نہ تھیں، بلکہ وہ جادُو تھا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ جدھر جدھر وہ گیا، لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل کر اس طرح پیچھے پھینکتا چلا گیا کہ ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر پڑی رہ گئی۔

۴۳ - یعنی جب انھوں نے عصائے موسیٰ کا کارنامہ دیکھا تو انھیں فوراً یقین آ گیا کہ یہ یقیناً معجزہ ہے، اُن کے فن کی چیز ہرگز نہیں ہے، اس لیے وہ اس طرح یک بارگی اور بے ساختہ سجدے میں گرے جیسے کسی نے اُٹھا اُٹھا کر اُن کو گرا دیا ہو۔

۴۴ - اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰؑ اور جادُوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰؑ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ، خالقِ زمین و آسمان کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر فی الواقع اژدہا بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو برسرِ عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اژدہا بن جانا معجزہ نہیں ہے، بلکہ محض جادُو کا کرتب ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہاں فرعون اور جادُوگر اور سارے تماشائی عوام و خواص معجزے اور جادُو کے فرق سے واقف تھے، اور امتحان اِس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰؑ جو کچھ دکھا رہے ہیں، یہ جادُو کی قسم سے ہے، یا اُس معجزے کی قسم سے جو ربّ العالَمین کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادُوگروں نے اپنے جادُو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ "ہم نے مان لیا، موسیٰؑ ہم سے زیادہ باکمال ہے"، بلکہ انھیں فوراً یقین آ گیا کہ موسیٰؑ واقعی اللہ ربّ العالَمین کے سچّے پیغمبر ہیں، اور وہ پکار اُٹھے کہ ہم اُس خدا کو مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰؑ اور ہارونؑ آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجمعِ عام پر اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے، اور پھر پورے ملک پر اس کا کیسا زبردست اثر ہوا ہوگا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی میلے میں یہ مقابلہ اِس اُمید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاٹھی سے سانپ بنا دینا موسیٰؑ کا کوئی نرالا کمال نہیں ہے، ہر جادُوگر یہ کرتب دکھا لیتا ہے، تو موسیٰؑ کی ہوا اُکھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اُسی پر اُلٹ پڑی، اور قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِيۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ
مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِيۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۡ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ
عَذَابًا وَّاَبۡقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ

ہوگیا کہ یہ تمھارا گُرو ہے جس نے تمھیں جادُوگری سکھائی تھی۔[۴۵] اچھا، اب میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سَمتوں سے کٹواتا ہوں[۴۶] اور کھجور کے تنوں پر تم کو سُولی دیتا ہوں[۴۷]۔ پھر تمھیں پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے[۴۸]۔" (یعنی میں تمھیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰؑ۔) جادُوگروں نے جواب دیا: "قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا

سامنے خود جادُوگروں ہی نے بالاتفاق اِس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰؑ جو کچھ دکھا رہے ہیں، یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے، یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

۴۵- سورۂ اَعراف میں الفاظ یہ ہیں: اِنَّ هٰذَا لَمَكۡرٌ مَّكَرۡتُمُوۡهُ فِي الۡمَدِيۡنَةِ لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡهَاۤ اَهۡلَهَا ۚ، "یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے، تاکہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دو۔" یہاں اس قول کی مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ تمھارے درمیان صرف ملی بھگت ہی نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمھارا سردار اور گُرو ہے، تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے، اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے اور اسے اُس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاسی انقلاب برپا کر دو۔

۴۶- یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں۔

۴۷- صلیب یا سولی دینے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ ایک لمبا شہتیر سا لے کر زمین میں گاڑ دیتے تھے، یا کسی پرانے درخت کا تنا اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اس کے اوپر کے سرے پر ایک تختہ آڑا کر کے باندھ دیتے تھے۔ پھر مجرم کو اُوپر چڑھا کر اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلا کر آڑے تختے کے ساتھ کیلیں ٹھونک دیتے تھے۔ اس طرح مجرم تختے کے بل لٹکا رہ جاتا تھا اور گھنٹوں سسک سسک کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب دیے ہوئے یہ مجرم ایک مدّت تک یونہی لٹکے رہنے دیے جاتے تھے، تاکہ لوگ انھیں دیکھ دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

۴۸- یہ ہاری ہوئی بازی جیت لینے کے لیے فرعون کا آخری داؤں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جادوگروں کو انتہائی خوف ناک سزا سے ڈرا کر ان سے یہ اقبال کرالے کہ واقعی یہ اُن کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت تھی اور وہ ان سے مل کر

وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ
الدُّنْیَا ؕ ﴿۷۲﴾ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ
السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ
جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ﴿۷۴﴾ وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ
عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ

کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں[49]، تو جو کچھ کرنا چاہے کرلے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اِسی دُنیا کی زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کردے اور اُس جادوگری سے، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔" حقیقت[50] یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حُضور حاضر ہوگا، اُس کے لیے جہنّم ہے جس میں وہ نہ جیے گا نہ مرے گا[51]۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کیے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں

سلطنت کے خلاف سازش کرچکے تھے۔ مگر جادوگروں کے عزم و استقامت نے اُس کا یہ داؤں بھی اُلٹ دیا۔ انھوں نے اتنی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہوکر دُنیا بھر کو یہ یقین دلا دیا کہ سازش کا الزام محض بگڑی ہوئی بات بنانے کے لیے ایک بے شرمانہ سیاسی چال کے طور پر گھڑا گیا ہے، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ سچّے دل سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں۔

۴۹ – دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے: "یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم اُن روشن نشانیوں کے مقابلے میں جو ہمارے سامنے آچکی ہیں، اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تجھے ترجیح دیں۔"

۵۰ – یہ جادُوگروں کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے۔ اندازِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ عبارت جادُوگروں کے قول کا حصّہ نہیں ہے۔

۵۱ – یعنی موت اور زندگی کے درمیان لٹکتا رہے گا۔ نہ موت آئے گی کہ اس کی تکلیف اور مصیبت کا خاتمہ کردے، اور نہ جینے کا ہی کوئی لطف اسے حاصل ہوگا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دے سکے۔ زندگی سے بیزار رہوگا، مگر موت نصیب نہ ہوگی۔ مرنا چاہے گا مگر مر نہ سکے گا۔ قرآنِ مجید میں دوزخ کے عذابوں کی جتنی تفصیلات دی گئی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ خوفناک

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۲

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى۠ ﴿۷۶﴾
وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ۬ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی
الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ
فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ؕ﴿۷۸﴾ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ع

ہم[52] نے موسٰیؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے سمندر میں سے سُوکھی سڑک بنا[53] لے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔

پیچھے سے فرعون اپنا لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر اُن پر چھا گیا، جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔[54] فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی۔[55]

صورتِ عذاب یہی ہے جس کے تصوّر سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔

۵۲ - بیچ میں اُن حالات کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو اس کے بعد مصر کے طویل زمانۂ قیام میں پیش آئے۔ ان تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، رکوع ۱۵-۱٦، سورۂ یُونس، رکوع ۹، سورۂ مومن، رکوع ۳ تا ۵، اور سورۂ زُخرف، رکوع ۵۔

۵۳ - اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرکار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہرِ سویز موجود نہ تھی۔ بحرِ احمر سے بحرِ روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کُھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسٰیؑ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالبًا ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آ پہنچا جب کہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۂ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین

کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ، ''اپنا عصا سمندر پر مار۔'' فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ''فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔'' اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصّہ، اُوپر کی آیت کے مطابق خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے، وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور بیچ کا حصّہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۷)

۵۴ - سورۂ شُعَراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اتر آیا۔ (آیت ۶۴-۶۶) یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ (آیت ۵۰) اور سورۂ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اُٹھا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ ''میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں۔'' مگر اس آخری لمحے کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا: آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ ''اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا۔ اچھا، آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں، تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے۔'' (آیات ۹۰-۹۲)

۵۵ - بڑے لطیف انداز میں کفارِ مکہ کو متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ تمھارے سردار اور لیڈر بھی تم کو اسی راستے پر لیے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کوئی صحیح رہنمائی نہ تھی۔

اِس قصّے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے، تاکہ اُن لوگوں کے جھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصّے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خُروج (Exodus) میں اِس قصّے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کے حسبِ ذیل اجزا قابلِ توجُّہ ہیں:

(۱) باب ۴، آیت ۲-۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔ اور آیت ۱۷ میں انھی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ''تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا۔'' مگر آگے جا کر نہ معلوم یہ لاٹھی کس طرح حضرت ہارونؑ کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارونؑ ہی لاٹھی کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

(۲) باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰؑ کی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سرے سے اُس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی رُبوبیّت کے مسئلے پر اُن کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی۔ فرعون کہتا ہے کہ ''خداوند کون ہے کہ میں اُس کی بات کو مان کر بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

مگر حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اِس کے سوا کچھ جواب نہیں دیتے کہ ’’عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے۔‘‘ (باب ۵، آیت ۲-۳)

(۳) جادوگروں سے مقابلے کی پوری داستان بس اِن چند فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے:

’’اور خداوند نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ، تو ہارونؑ سے کہنا کہ اپنی لاٹھی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دے، تاکہ وہ سانپ بن جائے۔ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور انھوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا، اور ہارونؑ نے اپنی لاٹھی فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادُوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادُوگروں نے بھی اپنے جادُو سے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ انھوں نے بھی اپنی اپنی لاٹھی سامنے ڈالی اور وہ سانپ بن گئیں۔ لیکن ہارونؑ کی لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی۔‘‘ (باب ۷، آیت ۸-۱۲)

اِس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کر کے دیکھ لیا جائے کہ قصّے کی ساری روح یہاں کس بُری طرح فنا کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جشن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ چیلنج کے بعد مقابلہ ہونا، اور پھر شکست کے بعد جادُوگروں کا ایمان لانا، جو قصّے کی اصل جان تھا، سرے سے یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ بنی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ مطالبہ صرف یہ تھا: ’’ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزلِ بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔‘‘ (باب ۵، آیت ۳)

(۵) مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصّل حال باب ۱۱ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی مفید معلومات، اور قرآن کے اِجمال کی تفصیلات بھی ہمیں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ متعدّد عجیب باتیں بھی۔ مثلاً باب ۱۴ کی آیت ۱۶ میں حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ’’اور تو اپنی لاٹھی (جی ہاں، اب لاٹھی حضرت ہارونؑ سے لے کر پھر حضرت موسیٰؑ کو دے دی گئی ہے) اُٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھا اور اسے دو حصّے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔‘‘ لیکن آگے چل کر آیت ۲۱-۲۲ میں کہا جاتا ہے کہ ’’پھر موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھایا، اور خداوند نے رات بھر تُند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصّے ہو گیا، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے، اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔‘‘ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رُونما ہو گیا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔ اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھڑا کر دیا اور بیچ میں سے خشک راستہ بنا دیا۔ کیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کرشمے دکھاتی ہے؟

تلمود کا بیان نسبتاً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہِ راست علمِ وحی کی بنا پر واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، اور دوسری جگہ صدیوں کی سینہ بسینہ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝۸۰ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ

اے[۵۶] بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے نجات دی، اور طور کے دائیں جانب[۵۷] تمھاری حاضری کے لیے وقت مقرر کیا[۵۸] اور تم پر مَن و سَلوٰی اُتارا[۵۹] ـــــ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور

روایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہو گئی ہے۔ مُلاحظہ ہو:

The Talmud Selections, H. Polano, pp 150-54.

۵۶ - سمندر کو عبور کرنے سے لے کر کوہِ سینا کے دامن میں پہنچنے تک کی داستان بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۶-۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ اور وہاں یہ بھی گزر چکا ہے کہ مصر سے نکلتے ہی بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے ایک مندر کو دیکھ کر اپنے لیے ایک بناوٹی خدا مانگ بیٹھے تھے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۸)

۵۷ - یعنی طور کے مشرقی دامن میں۔

۵۸ - سورۂ بقرہ، رکوع ۶، اور سورۂ اعراف، رکوع ۱۷ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت کا ہدایت نامہ عطا کرنے کے لیے چالیس دن کی میعاد مقرر کی تھی، جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا کیے گئے۔

۵۹ - مَن وسَلوٰی کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۷۳۔ الاعراف، حاشیہ ۱۱۹۔ بائبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی، اس وقت مَن و سلوٰی کا نُزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ (خُروج، باب ۱۶۔ گنتی، باب ۱۱، آیت ۷-۹۔ یشوع، باب ۵، آیت ۱۲) کتابِ خُروج میں مَن و سلوٰی کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

''اور یوں ہُوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اَوس پڑی ہوئی تھی، اور جب وہ اَوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے: مَنْ؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔'' (باب ۱۶، آیت ۱۳-۱۵)

''اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام مَنّ رکھا، اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزا شہد کے بنے ہوئے پُوئے کی طرح تھا۔'' (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ
هَوٰى ۝۸۱ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝۸۲
وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝۸۳ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَ
عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝۸۴ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ

اسے کھا کر سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب ٹُوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹُوٹا، وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اُس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں[60]۔

[61] اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰؑ[62]؟

اُس نے عرض کیا: ''وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حُضور آ گیا ہوں اے میرے رب! تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔''

فرمایا: ''اچھا، تو سنو! ہم نے تمھارے پیچھے تمھاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا

''لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کُوٹ لیتے تھے، پھر اُسے ہانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزا تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا۔'' (باب ۱۱، آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک دشت نوَردی کی تھی۔ مَن اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔

۶۰ – یعنی مغفرت کے لیے چار شرطیں ہیں۔ اوّل، توبہ، یعنی سرکشی و نافرمانی یا شرک و کفر سے باز آ جانا۔ دوسرے، ایمان، یعنی اللہ اور رسول اور کتاب اور آخرت کو صدقِ دل سے مان لینا۔ تیسرے، عملِ صالح، یعنی اللہ اور رسول کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا۔ چوتھے، اہتدا، یعنی راہِ راست پر ثابت قدم رہنا اور پھر غلط راستے پر نہ جا پڑنا۔

۶۱ – یہاں سے سلسلۂ بیان اُس واقعے کے ساتھ جُڑتا ہے جو ابھی اُوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل سے

وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ

اور سامری[۶۳] نے انھیں گمراہ کر ڈالا۔"

موسیٰؑ سخت غصّے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اُس نے کہا:

یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ تم طُور کے دائیں جانب ٹھیرو، اور چالیس دن کی مدّت گزرنے پر تمھیں ہدایت نامہ عطا کیا جائے گا۔

۶۲ – اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طُور کی جانبِ اَیمن میں، جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اکیلے روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ اُس موقع پر جو معاملات خدا اور بندے کے درمیان ہوئے، ان کی تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۷ میں درج ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا دیدارِ الٰہی کی اِستِدعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، پھر اللہ کا ایک پہاڑ پر ذرا سی تجلّی فرما کر اسے ریزہ ریزہ کر دینا اور حضرت موسیٰؑ کا بے ہوش ہو کر گر پڑنا، اس کے بعد پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا ہونا، یہ سب اسی وقت کے واقعات ہیں۔ یہاں ان واقعات کا صرف وہ حصہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔ اس کے بیان سے مقصود کفارِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ ایک قوم میں بت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا کرتا ہے، اور اللہ کے نبی اس فتنے کو اپنی قوم میں سر اُٹھاتے دیکھ کر کیسے بے تاب ہو جایا کرتے ہیں۔

۶۳ – یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہر حال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو، یا نسل کی طرف، یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السَّامِرِيُّ کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سامری قبیلے، یا نسل، یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے، جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اِس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اُن اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں، اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ، معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولتِ اسرائیل کا دارالسلطنت "سامریہ" اِس واقعے کے کئی صدی بعد ۹۲۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سُن گُن پا لی ہوگی، اس لیے اُنھوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اِسی طرح کی باتیں اِن لوگوں نے ہامان کے معاملے میں بنائی ہیں، جسے قرآن فرعون

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ۙ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

”اے میری قوم کے لوگو! کیا تمھارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟[۶۴] کیا تمھیں دن لگ گئے ہیں؟[۶۵] یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اُوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟[۶۶]“

کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اور عیسائی مشنری اور مُستشرِقین اسے اخسویرس (شاہِ ایران) کے درباری امیر ”ہامان“ سے لے جا کر ملا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدّعیانِ علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص، یا قبیلہ، یا مقام ہوا کرتا تھا، اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص، یا قبیلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ سُمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص ”سمر“ نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا۔ اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا، اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا۔ (۱-سلاطین، باب ۱۶، آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے ”سمر“ نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری، اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

۶۴ - ”اچھا وعدہ نہیں کیا تھا“ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ متن میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تمھارے رب نے تمھارے ساتھ جتنی بھلائیوں کا وعدہ بھی کیا ہے، وہ سب تمھیں حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تمھیں مصر سے بخیریت نکالا، غلامی سے نجات دی، تمھارے دشمن کو تہس نہس کیا، تمھارے لیے اِن صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں سایے اور خوراک کا بندوبست کیا۔ کیا یہ سارے اچھے وعدے پورے نہیں ہوئے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمھیں شریعت اور ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، کیا تمھارے نزدیک وہ کسی خیر اور بھلائی کا وعدہ نہ تھا؟

۶۵ - دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا وعدہ پورا ہونے میں بہت دیر لگ گئی کہ تم بے صبر ہو گئے؟“ پہلے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ ابھی ابھی جو عظیم الشان احسانات کر چکا ہے، کیا اُن کو کچھ بہت زیادہ مدّت گزر گئی ہے کہ تم انھیں بھول گئے؟ کیا تمھاری مصیبت کا زمانہ بیتے قرنیں گزر چکی ہیں کہ تم سرمست ہو کر بہکنے لگے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب صاف ہے کہ ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے وفا ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی ہے جس کو تم اپنے لیے عذر اور بہانہ بنا سکو۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا

انھوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لَد گئے تھے اور ہم نے بس اُن کو پھینک[٦٧] دیا تھا"[٦٦] ـــــــ پھر[٦٨] اِسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مُورت بنا کر نکال لایا جس میں سے

٦٦ – اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر قوم اپنے نبی سے کرتی ہے۔ اُس کے اتباع کا وعدہ۔ اس کی دی ہوئی ہدایت پر ثابت قدم رہنے کا وعدہ۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنے کا وعدہ۔

٦٧ – یہ اُن لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا، وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لَد گئے تھے"، اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے، وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگنے کو لے لیے تھے، اور اِس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لُوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اَخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطورِ خود اسے انجام دیا ہو، بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی۔ بائبل کی کتاب خُروج میں ارشاد ہوتا ہے:

> "خدا نے موسیٰؑ سے کہا...... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور اُن کو کہہ...... کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے، بلکہ تمھاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لُوٹ لو گے۔" (باب ۳، آیت ۱۴ تا ۲۲)
>
> "اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا...... سو اب تُو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ اُن میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے، اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا۔" (باب ۱۱، آیت ۱-۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ؕ﴿۸۸﴾ اَفَلَا یَرَوْنَ
اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ۬ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ ع
وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ
رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ

بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔لوگ پکار اُٹھے: ”یہی ہے تمھارا خدا اور موسٰیؑ کا خدا، موسٰیؑ اِسے بھول گیا۔“ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ اُن کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ع

ہارونؑ (موسٰیؑ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ ”لوگو! تم اِس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمھارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔“ مگر اُنھوں نے اس سے کہہ دیا کہ ”ہم تو اسی کی

”اور بنی اسرائیل نے موسٰیؑ کے کہنے کے مُوافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے، اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انھوں نے مانگا، اُنھوں نے دے دیا۔ سو انھوں نے مصریوں کو لُوٹ لیا۔“ (باب ۱۲، آیت ۳۵-۳۶)

افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اِس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے، اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اِسی لُوٹ کا بوجھ تھا۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے ”اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا“ کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات کو لادے پھرنے سے لوگ تنگ آ گئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات قرار پائی ہو گی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے، پھر اِن کو گلا کر اینٹوں اور سلاخوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے، تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جا سکے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لا لا کر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہو گا۔

۶۸ — یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی عبارت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ قوم کا جواب ”پھینک دیا تھا“ پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورتِ واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پیش آنے والے فتنے سے بے خبر، اپنے اپنے زیور لا لا کر ڈھیر کرتے چلے گئے، اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ بعد میں زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی، اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی مورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اِس طرح سامری نے قوم کو دھوکا

عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ

پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آجائے۔[69]"

موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارونؑ کی طرف پلٹا اور) بولا: "ہارونؑ! تم نے جب دیکھا تھا کہ

دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصوروار ہوں، یہ تمھارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔

۶۹ — بائبل اِس کے برعکس حضرت ہارونؑ پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہِ عظیم انھی سے سرزد ہوا تھا:

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارونؑ کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ، ہمارے لیے دیوتا بنا دے، جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اِس مرد موسیٰؑ کو، جو ہم کو مُلکِ مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے اُن سے کہا: تمھاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں، ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ اُن کے کانوں سے سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر ان کو ہارونؑ کے پاس لے آئے۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے: اے اسرائیل! یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارونؑ نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اُس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہو گی۔" (خُروج، باب ۳۲، آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اِس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہو، اور بعد کے لوگوں نے اِس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خَلط مَلط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مُستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، بچھڑے کو خدا اُن کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا، اور ان کے دامن سے اِس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال! اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اِسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے بعد بنی لاوِی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے اُنھیں قتل کیا جائے، اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اُس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبانی تھے تو انھیں اس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟ کیا بنی لاوِی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ! ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں

Maktaba Tul Ishaat.com

إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ﴿٩٢﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ﴿٩٣﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ
لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ
بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿٩٤﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾

یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمھارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟[۷۰]"

ہارونؑ نے جواب دیا: "اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ،[۷۱] مجھے اِس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا: تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔[۷۲]"

موسیٰؑ نے کہا: "اور سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟"

اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے، حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا؟ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے، میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔" (خروج، ۳۲: ۳۳) لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کا نام نہ مٹایا گیا۔ بلکہ اِس کے برعکس ان کو اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مَقدِس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔ (گنتی، باب ۱۸، آیت ۱-۷) کیا بائبل کی یہ اندرونی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟

۷۰- حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جاتے وقت، اور اپنی جگہ حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی سرداری سونپتے وقت حضرت موسیٰؑ نے دیا تھا۔ سورۂ اعراف میں اسے اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ○ "اور موسیٰؑ نے (جاتے ہوئے) اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور دیکھو، اصلاح کرنا، مفسدوں کے طریقے کی پیروی نہ کرنا۔" (آیت ۱۴۲)

۷۱- ان آیات کے ترجمے میں ہم نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ چھوٹے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے بڑے تھے، اور حضرت ہارونؑ بڑے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔

۷۲- حضرت ہارونؑ کے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قوم کا مجتمع رہنا اس کے راہِ راست پر رہنے سے زیادہ اہمیّت رکھتا ہے، اور اتحاد چاہے وہ شرک ہی پر کیوں نہ ہو، افتراق سے بہتر ہے، خواہ اس کی بنا حق اور باطل ہی کا اختلاف ہو۔

قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ يَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ
اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾

اس نے جواب دیا: ”میں نے وہ چیز دیکھی جو اِن لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اُٹھالی اور اُس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سُجھایا۔“ [۷۳]

اس آیت کا یہ مطلب اگر کوئی شخص لے گا تو قرآن سے ہدایت کے بجائے گمراہی اخذ کرے گا۔ حضرت ہارونؑ کی پوری بات سمجھنے کے لیے اس آیت کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ وہاں وہ فرماتے ہیں کہ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِىۡ وَكَادُوۡا يَقۡتُلُوۡنَنِىۡ ۖ فَلَا تُشۡمِتۡ بِىَ الۡاَعۡدَآءَ وَلَا تَجۡعَلۡنِىۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ○ ”میری ماں کے بیٹے! اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ میں مجھے شمار نہ کر۔“ اب ان دونوں آیتوں کو جمع کر کے دیکھیے تو صورتِ واقعہ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس گمراہی سے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر انھوں نے آنجناب کے خلاف سخت فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تُل گئے۔ مجبوراً آپ اس اندیشے سے خاموش ہو گئے کہ کہیں حضرت موسیٰؑ کے آنے سے پہلے یہاں خانہ جنگی برپا نہ ہو جائے، اور وہ بعد میں آ کر شکایت کریں کہ تم اگر اس صورتِ حال سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے تو تم نے معاملات کو اس حد تک کیوں بگڑنے دیا، میرے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ سورۂ اعراف والی آیت کے آخری فقرے سے یہ بھی مُترشّح ہوتا ہے کہ قوم میں دونوں بھائیوں کے دشمنوں کی ایک تعداد موجود تھی۔

۷۳ – اس آیت کی تفسیر میں دو گروہوں کی طرف سے عجیب کھینچ تان کی گئی ہے۔

ایک گروہ، جس میں قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے مفسرین کی بڑی اکثریت شامل ہے، اس کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ ”سامری نے رسول یعنی حضرت جبریل کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور ان کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر مٹی اُٹھالی تھی، اور یہ اسی مٹی کی کرامت تھی کہ جب اسے بچھڑے کے بُت پر ڈالا گیا تو اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور جیتے جاگتے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگی۔“ حالانکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بازپُرس کے جواب میں سامری نے یہ بات بنائی۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امرِ واقعی، اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے سمجھ بیٹھے۔

دوسرا گروہ، سامری کے قول کو ایک اور ہی معنیٰ پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ ”مجھے رسول، یعنی حضرت موسیٰؑ میں، یا اُن کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہ آئی۔ اس لیے میں نے ایک حد تک اُس کے نقشِ قدم کی پیروی کی، مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا۔“ یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اصفہانی کو سوجھی تھی، پھر امام رازیؒ نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اور اب طرزِ جدید کے مفسرین بالعُموم اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن مُعمّوں اور پہیلیوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ صاف اور عام فہم عربی مبین میں نازل ہوا ہے، جس کو ایک عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے کے مطابق سمجھ سکے۔ کوئی شخص جو عربی زبان کے معروف

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَ اِنَّ

موسیٰؑ نے کہا: ”اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا۔ اور

محاورے اور روزمرہ سے واقف ہو، کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ سامری کے اس مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے عربیِ مبین میں وہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جو آیتِ زیرِ تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ نہ ایک عام عرب ان الفاظ کو سن کر کبھی وہ مطلب لے سکتا ہے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں سے کسی لفظ کے وہ مختلف مفہومات تلاش کر لینا جو مختلف محاوروں میں اس سے مراد لیے جاتے ہوں، اور ان میں سے کسی مفہوم کو لا کر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دینا جہاں ایک عام عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کرے گا، زباں دانی تو نہیں ہو سکتا، البتہ سُخَن سازی کا کرتب ضرور مانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کرتب فرہنگِ آصفیہ ہاتھ میں لے کر اگر کوئی شخص خود اِن حضرات کی اُردو تحریروں میں، یا آکسفورڈ ڈکشنری لے کر ان کی انگریزی تحریروں میں دکھانے شروع کر دے، تو شاید اپنے کلام کی دو چار ہی تاویلیں سن کر یہ حضرات چیخ اُٹھیں۔ بالعموم قرآن میں ایسی تاویلیں اُس وقت کی جاتی ہیں جب کہ ایک شخص کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑی بے احتیاطی ہوگئی، لاؤ میں ان کی بات اس طرح بنا دوں کہ ان کی غلطی کا پردہ ڈھک جائے اور لوگوں کو ان پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

اس طرزِ فکر کو چھوڑ کر جو شخص بھی اِس سلسلۂ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا، وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا، جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکروفریب کی اسکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ بلکہ اس پر مزید یہ جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک پُرفریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریلؑ ہی ہوں، جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور مکّاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ذہنی رشوت دینی چاہتا تھا، تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پُھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطورِ واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لُغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پُرفریب افسانے کو سنتے ہی انھوں نے اس کے منہ پر مار دیا۔

۷۴ – یعنی صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلّقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، بلکہ یہ ذمّہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دُور ہی سے لوگوں کو

لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ
عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ
الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَیْكَ
مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَیْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ
اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ

تیرے لیے باز پُرس کا ایک وقتِ مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اِس خدا کو، جس پر تو ریجھا ہُوا تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو! تمھارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اُس کا علم حاوی ہے۔"

اے محمدؐ! [۷۵] اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سُناتے ہیں، اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک "ذِکر" (درسِ نصیحت) عطا کیا ہے [۷۶]۔ جو کوئی اِس سے منہ موڑے گا، وہ قیامت کے روز سخت بارِ گناہ اُٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے،

مُطّلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائبل کی کتاب اَحبار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں، اُن میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو، اُس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں، اور وہ اپنے اُوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چِلّا چِلّا کر کہے: "ناپاک ناپاک۔" جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے، وہ ناپاک رہے گا، اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے، اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔" (باب ۱۳، آیت ۴۵-۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا، یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے، اُسی طرح اِس اَخلاقی کوڑھ کے مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مُطّلع کرتا رہے کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔

۷۵ — موسیٰ علیہ السلام کا قصّہ ختم کر کے اب پھر تقریر کا رُخ اُس مضمون کی طرف مڑتا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پلٹ کر سورہ کی اُن ابتدائی آیات کو پڑھ لیجیے جن کے بعد یکایک حضرت موسیٰؑ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا

اور قیامت کے دن اُن کے لیے (اِس جُرم کی ذمّہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دِہ بوجھ ہوگا، ۷۷ اُس دن جب کہ صُور پُھونکا جائے گا ۷۸ اور ہم مجرموں کو اِس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی، ۷۹ آپس میں چُپکے چُپکے کہیں گے کہ دُنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن

کا قصّہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے آپ کی سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آ جائے گی کہ سورہ کا اصل موضوعِ بحث کیا ہے، بیچ میں قصّۂ موسیٰؑ کس لیے بیان ہوا ہے، اور اب قصّہ ختم کر کے کس طرح تقریر اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہی ہے۔

۷۶ – یعنی یہ قرآن، جس کے متعلق آغازِ سورہ میں کہا گیا تھا کہ یہ کوئی اَن ہونا کام تم سے لینے اور تم کو بیٹھے بٹھائے ایک مَشَقّت میں مبتلا کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا ہے، یہ تو ایک یاد دہانی اور نصیحت (تذکرہ) ہے ہر اُس شخص کے لیے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو۔

۷۷ – اس میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ جو شخص اس درسِ نصیحت، یعنی قرآن سے منہ موڑے گا اور اس کی ہدایت و رہنمائی قبول کرنے سے انکار کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بھیجنے والے خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اُس کی یہ حماقت دراصل اس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہو گی۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ کوئی شخص، جس کو قرآن کی یہ نصیحت پہنچے اور پھر وہ اسے قبول کرنے سے پہلو تہی کرے، آخرت میں سزا پانے سے بچ نہیں سکتا۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ کسی قوم، کسی ملک، کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ جب تک یہ قرآن دُنیا میں موجود ہے، جہاں جہاں، جس جس ملک اور قوم کے، جس شخص کو بھی یہ پہنچے گا، اس کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوں گے۔ تیسرا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ یا تو اس کو ماننے اور اس کی پیروی اختیار کرے۔ یا اس کو نہ ماننے اور اس کی پیروی سے منہ موڑ لے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام آگے آ رہا ہے۔ اور دوسرا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہے جو اِس آیت میں بتا دیا گیا ہے۔

۷۸ – صُور، یعنی نرسنگھا، قرنا، یا بوق۔ آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور ہدایات دینے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ اور اصطلاحیں استعمال فرماتا ہے جو خود انسانی زندگی میں اسی سے ملتے جُلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان الفاظ اور اصطلاحوں کے استعمال سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہے، نہ یہ کہ ہم سلطنتِ الٰہی کے نظم کی مختلف چیزوں کو بعینہٖ ان محدود معنوں میں لے لیں، اور ان محدود صورتوں کی چیزیں سمجھ لیں جیسی کہ وہ ہماری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک لوگوں کو جمع کرنے اور اہم باتوں کا اعلان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی چیز پھونکی جاتی رہی ہے جو صور یا بگل سے ملتی جُلتی ہو۔

عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً

گزارے ہوں گے[80] ــــ ہمیں[81] خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اُس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا، وہ کہے گا کہ

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت کے روز پھونکی جائے گی جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے کی سی ہوگی۔ ایک دفعہ وہ پھونکی جائے گی اور سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ دوسری دفعہ پھونکنے پر سب جی اُٹھیں گے اور زمین کے ہر گوشے سے نکل نکل کر میدانِ حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۱۰۶)

۷۹ – اصل میں لفظ ''زُرْقًا'' استعمال ہوا ہے جو اَزْرَق کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود اَزْرَق (سفیدی مائل نیلگوں) ہو جائیں گے، کیونکہ خوف و دہشت کے مارے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو ازرق العین (کرنجی آنکھوں والے) کے معنیٰ میں لیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شدّتِ ہول سے ان کے دیدے پتھرا جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے حدقۂ چشم کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

۸۰ – دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''موت کے بعد سے اِس وقت تک تم کو مشکل ہی سے دس دن گزرے ہوں گے۔'' قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی دنیوی زندگی کے متعلق بھی یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی، اور موت سے لے کر قیامت تک جو وقت گزرا ہوگا، اس کے متعلق بھی ان کے اندازے کچھ ایسے ہی ہوں گے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿﴾ ''اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے: ایک دن یا دن کا ایک حصہ رہے ہوں گے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔'' (المومنون، آیات ۱۱۲-۱۱۳) دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾ ''اور جس روز قیامت قائم ہو جائے گی تو مجرم لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم (موت کی حالت میں) ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں پڑے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دُنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا، وہ کہیں گے کہ کتاب اللہ کی رُو سے تو تم یوم البعث تک پڑے رہے ہو، اور یہ وہی یوم البعث ہے، مگر تم جانتے نہ تھے۔'' (الروم، آیات ۵۵-۵۶) ان مختلف تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی، دونوں ہی کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے۔ دُنیا کی زندگی کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی اُمیدوں کے بالکل خلاف جب انھیں آخرت،

Maktaba Tul Ishaat.com

ع اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَيَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا

نہیں، تمھاری دُنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی ع ـــــــــ یہ لوگ [۸۲] تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب ان کو دُھول بنا کر

کی اَبدی زندگی میں آنکھیں کھولنی پڑیں گی، اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کر کے نہیں آئے ہیں، تو انتہا درجے کی حسرت کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور کفِ افسوس ملیں گے کہ چار دن کے لطف و مَسَرّت اور فائدہ و لذت کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلھاڑی مار لی۔ موت کے بعد سے قیامت تک کا وقت انھیں اس لیے تھوڑا نظر آئے گا کہ زندگی بعدِ موت کو وہ دُنیا میں غیر ممکن سمجھتے تھے اور قرآن کے بتائے ہوئے عالَمِ آخرت کا جغرافیہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ ان کے ذہن میں اُترا ہی نہ تھا۔ یہی تصورات لیے ہوئے دُنیا میں احساس و شُعور کی آخری ساعت انھوں نے ختم کی تھی۔ اب جو اچانک وہ آنکھیں ملتے ہوئے دُوسری زندگی میں بیدار ہوں گے اور دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو ایک بِگل یا نرسنگھے کی آواز پر مارچ کرتے پائیں گے، تو وہ شدید گھبراہٹ کے ساتھ اندازہ لگائیں گے کہ فُلاں ہسپتال میں بے ہوش ہونے، یا فلاں جہاز میں ڈوبنے، یا فلاں مَقام پر حادثے سے دوچار ہونے کے بعد سے اِس وقت تک آخر کتنا وقت لگا ہوگا۔ اُن کی کھوپری میں اُس وقت یہ بات سمائے گی ہی نہیں کہ دُنیا میں وہ جاں بحق ہو چکے تھے اور اب یہ وہی دُوسری زندگی ہے جسے ہم بالکل لَغوبات کہہ کر ٹھٹھوں میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھے گا کہ شاید میں چند گھنٹے یا چند دن بے ہوش پڑا رہا ہوں، اور اب شاید ایسے وقت مجھے ہوش آیا ہے، یا ایسی جگہ اتفاق سے پہنچ گیا ہوں جہاں کسی بڑے حادثے کی وجہ سے لوگ ایک طرف کو بھاگے جا رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ آج کل کے مرنے والے صاحب لوگ صور کی آواز کو کچھ دیر تک ہوائی حملے کا سائرن ہی سمجھتے رہیں۔

۸۱ – یہ جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سامعین کے اس شبہے کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے کہ آخر اُس وقت میدانِ حشر میں بھاگتے ہوئے لوگ چپکے چپکے جو باتیں کریں گے، وہ آج یہاں کیسے بیان ہو رہی ہیں۔

۸۲ – یہ بھی جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سورت ایک الہامی تقریر کے انداز میں سنائی جا رہی ہوگی، اس وقت کسی نے مذاق اُڑانے کے لیے یہ سوال اُٹھایا ہوگا کہ قیامت کا جو نقشہ آپ کھینچ رہے ہیں، اُس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بھر کے لوگ کسی ہموار میدان میں بھاگے چلے جا رہے ہوں گے۔ آخر یہ بڑے بڑے پہاڑ اس وقت کہاں چلے جائیں گے؟ اس سوال کا موقع سمجھنے کے لیے اس ماحول کو نگاہ میں رکھیے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ مکہ جس مَقام پر واقع ہے، اس کی حالت ایک حوض کی سی ہے جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ سائل نے انھی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہوگی۔ اور وحی کے اشارے سے جواب برملا اسی وقت یہ دے دیا گیا کہ یہ پہاڑ کُوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے جیسے ریت کے ذرّے، اور ان کو دُھول کی طرح اُڑا کر

رَبِّیْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَیَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ
اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ یَوْمَىِٕذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ
الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ یَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ

اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بَل اور سَلوٹ نہ دیکھو گے۔[۸۳] اُس روز سب لوگ مُنادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے، کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی، ایک سرسراہٹ[۸۴] کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اُس روز شفاعت

ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس میں کوئی اُونچ نیچ نہ رہے گی، کوئی نشیب و فراز نہ ہو گا، اس کی حالت ایک ایسے صاف فرش کی سی ہوگی جس میں ذرا سا بل اور کوئی معمولی سی سَلوٹ تک نہ ہو۔

۸۳ – عالَمِ آخرت میں زمین کی جو نئی شکل بنے گی، اسے قرآنِ مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انشقاق میں فرمایا: اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، ”زمین پھیلا دی جائے گی۔“ سورۂ انفطار میں فرمایا: اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿﴾ ”سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔“ جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی تہیں پھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر اُتر جائے گا۔ سورۂ تکویر میں فرمایا: اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿﴾ ”سمندر بھر دیے جائیں گے، یا پاٹ دیے جائیں گے۔“ اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔ اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ عالَمِ آخرت میں یہ پورا کُرۂ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، نشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔ یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورۂ ابراہیم، آیت ۴۸ میں فرمایا: یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ، ”وہ دن جب کہ زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی۔“ اور یہی زمین کی وہ شکل ہوگی جس پر حشر قائم ہوگا اور اللہ تعالیٰ عدالت فرمائے گا۔ پھر اس کی آخری اور دائمی شکل وہ بنا دی جائے گی جس کو سورۂ زُمر، آیت ۷۴ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿﴾ یعنی ”متقی لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پورے کیے اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم اس جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔“ اِس سے معلوم ہوا کہ آخر کار یہ پورا کُرہ جنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہوں گے۔ اُس وقت پوری زمین ایک مُلک ہوگی۔ پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گے۔ (واضح رہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ میں سے ابنِ عباسؓ اور قتادہؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جنّت اِسی زمین پر ہوگی، اور سورۂ نجم کی آیت عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ﴿﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ﴿﴾

Maktaba Tul Ishaat.com

الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ
اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ

کارگر نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سُننا پسند کرے [۸۵] ـــــ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دُوسروں کو اس کا پورا علم نہیں [۸۶] ہے ـــــ لوگوں کے سر اُس

کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جنت ہے جس میں اب شہدا کی ارواح رکھی جاتی ہیں)۔

۸۴ - اصل میں لفظ "ھَمْس" استعمال ہوا ہے، جو قدموں کی آہٹ، چپکے چپکے بولنے کی آواز، اُونٹ کے چلنے کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز، بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ اور چپکے چپکے بات کرنے والوں کی کُھسر پُھسر کے نہیں سنی جائے گی۔ ایک پُرہیبت سماں بندھا ہوا ہوگا۔

۸۵ - اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک، وہ جو متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا، یہ کہ "اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ کسی کے حق میں رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو" الفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی، کجا کہ کوئی سفارش کے لیے بطورِ خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے، اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الٰہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدّد مقامات پر کھول کر بتادی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟" (بقرہ، آیت ۲۵۵) اور: یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○ "وہ دن جب کہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔" (النبا، آیت ۳۸) دوسری طرف ارشاد ہوا: وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○ "اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے، بجز اس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر (رحمٰن) راضی ہو، اور وہ اُس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔" (الانبیاء، آیت ۲۸) اور كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ○ "کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی، بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے۔" (النجم، آیت ۲۶)

۸۶ - یہاں وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیا یا اولیا، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دُنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کیسی کیسی ذمّہ داریوں کے بار لے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے،

لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ
مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّ لَا ہَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾

حیّ و قیّوم کے آگے جُھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اُس وقت کسی ظلم کا بارِ گناہ اُٹھائے ہوئے ہو۔
اور کسی ظلم یا حق تلفی کا خطرہ نہ ہوگا اُس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اِس کے ساتھ وہ مومن[۸۷] بھی ہو۔

اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اس کا موقف کیا ہے۔ نیک ہے تو کیسا نیک ہے، اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے۔ معافی کے قابل ہے یا نہیں۔ پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیا اور صلحا کو سفارش کی کھلی چھٹی دے دی جائے، اور ہر ایک جس کے حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا، اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لائیں گے، درآں حالے کہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں، ان کے نامۂ اعمال کیسے ہیں۔ دُنیا میں جو افسر کچھ بھی احساسِ ذمہ داری رکھتا ہے، اس کی رَوِش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصوروار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نافرض شناس، رشوت خوار اور خلقِ خدا کو تنگ کرنے والا ہے، میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے، وہ کس قدر صحیح، معقول اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے، جو دُنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انھیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انھیں بولنے کی اجازت دے گا، صرف اُسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی برحق ہو، جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشادِ ربانی صاف بتا رہا ہے۔ بونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دُنیا میں سیکڑوں، ہزاروں بندگانِ خدا کے حُقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اُٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور! اسے انعام سے سرفراز فرمائیں، یہ میرا خاص آدمی ہے۔

۸۷ – یعنی وہاں فیصلہ ہر انسان کے اوصاف (merits) کی بنیاد پر ہوگا۔ جو شخص کسی ظلم کا بارِ گناہ اُٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے ظلم اپنے خدا کے حُقوق پر کیا ہو، یا خلقِ خدا کے حقوق پر، یا خود اپنے نفس پر، بہر حال یہ چیز اسے کامیابی کا منہ نہ دیکھنے دے گی۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان اور عملِ صالح (محض عملِ صالح نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح، اور محض ایمان بھی نہیں بلکہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان) لیے ہوئے آئیں گے، اُن کے لیے وہاں نہ تو اس امر کا کوئی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور اے محمدؐ! اِسی طرح ہم نے اِسے قرآنِ عربی بنا کر نازل کیا ہے[88] اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات کی ہیں، شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اِس کی بدولت پیدا ہوں[89]۔

پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہِ حقیقی[90]۔

اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو، جب تک کہ تمہاری طرف اُس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے، اور دُعا کرو کہ اَے پروردگار! مجھے مزید علم عطا کر[91]۔

اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم ہو گا، یعنی خواہ مخواہ بے قصور ان کو سزا دی جائے گی، اور نہ اسی امر کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جائے گا اور ان کے جائز حقوق مار کھائے جائیں گے۔

۸۸ – یعنی ایسے ہی مضامین اور تعلیمات اور نصائح سے لبریز۔ اِس کا اشارہ ان تمام مضامین کی طرف ہے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض قریبی مضمون کی طرف جو اُوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلۂ بیان اُن آیات سے جڑتا ہے جو قرآن کے متعلق آغازِ سورہ اور پھر قصۂ موسیٰ کے اختتام پر ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ”تذکرہ“ جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، اور وہ ”ذِکر“ جو ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو عطا کیا ہے، اِس شان کا تذکرہ اور ذِکر ہے۔

۸۹ – یعنی اپنی غفلت سے چونکیں، بھولے ہوئے سبق کو کچھ یاد کریں، اور ان کو کچھ اِس امر کا احساس ہو کہ کن راہوں میں بھٹکے چلے جا رہے ہیں اور اس گمراہی کا انجام کیا ہے۔

۹۰ – اِس طرح کے فقرے قرآن میں بالعموم ایک تقریر کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کلام کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا پر ہو۔ اندازِ بیان اور سیاق وسباق پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک تقریر ختم ہو گئی ہے اور وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ سے دوسری تقریر شروع ہوتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں گی، اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ الٰہی کے تحت ان کو ایک سورہ میں جمع کر دیا ہو گا۔ جمع کرنے کی وجہ دونوں کے مضمون کی مناسبت ہے جس کو ابھی ہم واضح کریں گے۔

۹۱ – فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ پر تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رخصت ہوتے ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر خبردار کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اب وہ اس کا نوٹس لے رہا ہے۔ بات کیا تھی جس پر

ع ۱۱/۱۵

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ ع

ہم[92] نے اِس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا[93] تھا، مگر وہ بُھول گیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا۔[94] ع

یہ تنبیہ کی گئی، اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دُہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اس کوشش کی وجہ سے آپؐ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہوگی۔ سلسلۂ اخذِ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسُوس کی گئی کہ آپؐ کو پیغامِ وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے، اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپؐ کرتے ہیں، اس سے منع کر دیا جائے۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ کا یہ حصہ ابتدائی زمانے کی وحیوں میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے میں، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی اخذِ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی، آپؐ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے، اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی فقرہ اِس پر آپؐ کو مُتنبّہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورۂ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی ہوا تھا، اور اس پر سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپؐ کو ٹوکا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهِۦ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِۦٓ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُۥ وَقُرْءَانَهُۥ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَٰهُ فَٱتَّبِعْ قُرْءَانَهُۥ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُۥ ۝ ”اسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اِسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے، لہٰذا جب ہم اسے سنا رہے ہوں تو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔“ سورۂ اعلیٰ میں بھی آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم اسے پڑھوا دیں گے اور آپؐ بھولیں گے نہیں: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰٓ۔ بعد میں جب آپؐ کو پیغاماتِ وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہوگئی تو اس طرح کی کیفیات آپؐ پر طاری ہونی بند ہوگئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تنبیہ ہمیں نہیں ملتی۔

۹۲ – جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، یہاں سے ایک الگ تقریر شروع ہوتی ہے جو غالباً اُوپر والی تقریر کے بعد کسی وقت نازل ہوئی ہے اور مضمون کی مناسبت سے اُس کے ساتھ ملا کر ایک ہی سورہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ مضمون کی مناسبتیں متعدّد ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) وہ بھولا ہُوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے، وہی سبق ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا، اور جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار ”ذِکر“ آتے رہے ہیں۔

(۲) انسان اُس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے، اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اُس کے اوّلین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے، اِسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاد دہانی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اُس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اِس

Maktaba Tul Ishaat.com

''ذِکر'' کے ساتھ وہ کرے گا، آغازِ آفرینش ہی میں صاف صاف بتا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہو گے، ورنہ دُنیا و آخرت، دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

(۴) ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری، جس کی وجہ سے انسان اپنے اَزلی دشمن، شیطان کے بہکائے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویّے کی اصلاح کر لے اور انحراف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی، جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اِس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا، اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس رَوِش پر چلے گا۔

۹۳ – آدم علیہ السلام کا قصّہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف (دو مقامات پر)، سورۂ حِجر، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے۔ یہ ساتواں موقع ہے جب کہ اسے دُہرایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ سلسلۂ بیان سے اس کی مناسبت الگ ہے، اور ہر جگہ اسی مناسبت کے لحاظ سے قصّے کی تفصیلات مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ قصّے کے جو اجزا ایک جگہ کے موضوعِ بحث سے مناسبت رکھتے ہیں، وہ اسی جگہ بیان ہوئے ہیں، دوسری جگہ وہ نہ ملیں گے، یا طرزِ بیان ذرا مختلف ہوگا۔ پورے قصّے کو اور اس کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان تمام مَقامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ اس کے ربط و تعلق اور اس سے نکلنے والے نتائج کو اپنے حواشی میں بیان کر دیا ہے۔

۹۴ – یعنی اُس نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا، وہ اِستکبار اور قصدی و ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال اور نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پروا کرتا ہوں، اس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا، خدا کون ہوتا ہے کہ میرے معاملات میں دخل دے۔ اِس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا، اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا، اُس وقت وہ ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمائش کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرتا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔

بعض لوگوں نے ''اُس میں عزم نہ پایا'' کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا''، یعنی اُس نے جو کچھ کیا بھولے سے کیا، نافرمانی کے عزم کی بنا پر نہیں کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا عَلَى الْعِصْيَانِ کہا جاتا، نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فُقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت کو دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قصّہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا، اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنستی رہی ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾
فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدمؑ [95] سے کہا کہ "دیکھو! یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے [96]، ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں

مزید برآں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا، اس کے ذہن میں پہلا مفہوم یہی آئے گا کہ "ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم، یا مضبوط ارادہ نہ پایا۔" دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ آدم علیہ السلام کی طرف مَعصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنٰی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی رائے علامہ آلوسیؒ نے بھی اس موقع پر اپنی تفسیر میں ظاہر فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں: لٰکن لا یخفٰی علیك ان ھٰذا التفسیر غیر متبادرٍ ولا کثیر المناسبة للمقام، "مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع و محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔" (مُلاحظہ ہو: روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۲۴۳)

۹۵ – یہاں وہ اصل حکم بیان نہیں کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ "اِس خاص درخت کا پھل نہ کھانا" وہ حکم دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر چونکہ بتانے کی اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہ اور فہمایش کے باوجود اپنے جانے بُوجھے دشمن کے اغوا سے متاثّر ہو جاتا ہے، اور کس طرح اس کی یہی کمزوری اس سے وہ کام کرا لیتی ہے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصل حکم کا ذکر کرنے کے بجائے یہاں اُس فہمایش کا ذکر کیا ہے جو اس حکم کے ساتھ حضرت آدمؑ کو کی گئی تھی۔

۹۶ – دشمنی کا مظاہرہ اُسی وقت ہو چکا تھا۔ آدم اور حوا علیہما السلام خود دیکھ چکے تھے کہ ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے، اور صاف صاف یہ کہہ کر کیا ہے کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔" (اعراف، آیت ۱۲۔ ص، آیت ۷۶) اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ "ذرا دیکھ تو سہی، یہ ہے وہ ہستی جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔" ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ "اب کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" (بنی اسرائیل، آیات ۶۱-۶۲) پھر اتنے ہی پر اس نے اکتفا نہ کیا کہ کھلم کھلا اپنے حسد کا اظہار کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس نے مہلت بھی مانگی کہ مجھے اپنی فضیلت اور اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیجیے، میں اِسے بہکا کر آپ کو دکھا دوں گا کہ کیسا ہے یہ آپ کا خلیفہ۔ اعراف، حِجر اور بنی اسرائیل میں اس کا یہ چیلنج گزر چکا ہے اور آگے سورۂ ص میں بھی آ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ یہ تمھارا دشمن ہے، تو یہ محض ایک امرِ غیب کی اطلاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے عین برسرِ موقع دونوں میاں بیوی اپنی آنکھوں دیکھ چکے اور اپنے کانوں سن چکے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ
اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ

جنت سے نکلوا دے[97] اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں یہ آسایشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دُھوپ تمھیں ستاتی ہے[98]۔" لیکن شیطان نے اس کو پُھسلایا[99]۔ کہنے لگا: "آدمؑ! بتاؤں تمھیں وہ درخت جس سے اَبَدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے[100]؟" آخرِکار دونوں (میاں بیوی) اُس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے سَتر

۹۷- اس طرح یہ بھی دونوں کو بتا دیا گیا کہ اگر اس کے بہکائے میں آ کر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو جنّت میں نہ رہ سکو گے اور وہ تمام نعمتیں تم سے چِھن جائیں گی جو تم کو یہاں حاصل ہیں۔

۹۸- یہ تشریح ہے اُس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسان کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ یہاں تمھارے لیے غذا، پانی، لباس اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے، تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا علیہما السلام پر واضح ہو گئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکائے میں آ کر حکمِ سرکار کی خلاف ورزی کریں گے تو جنّت سے نکل کر انھیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسایشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات تک کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینا جب تک نہ بہائیں گے، ایک وقت کی روٹی تک نہ پا سکیں گے۔ مَعاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصّہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی نہ طاقت۔

۹۹- یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم و حوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے وسوسے میں ڈالا، آدم علیہ السلام تھے، نہ کہ حضرت حواؑ۔ اگرچہ سورۂ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطَب دونوں ہی تھے اور بہکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی وسوسہ اندازی کا رُخ دراصل حضرت آدمؑ ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس بائبل کا بیان یہ ہے کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی، اور پھر عورت نے اپنے شوہر کو بہکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا۔ (پیدایش، باب ۳)

۱۰۰- سورۂ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے: وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ○ "اور اس نے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ جیتے نہ رہو۔" (آیت ۲۰)

لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤى
اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ

ایک دوسرے کے آگے کُھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنّت کے پتّوں سے ڈھانکنے۔[۱۰۱] آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔[۱۰۲] پھر اُس کے رب نے اُسے برگزیدہ کیا[۱۰۳] اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی۔[۱۰۴] اور فرمایا: ”تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور

۱۰۱ – بالفاظِ دیگر، نافرمانی کا صُدور ہوتے ہی وہ آسایشیں ان سے چھین لی گئیں جو سرکاری انتظام سے ان کو مہیا کی جاتی تھیں، اور اس کا اوّلین ظہور لباس چھن جانے کی شکل میں ہوا۔ غذا، پانی اور مسکن سے محرومی کی نوبت تو بعد کو ہی آنی تھی، اس کا پتا تو بھوک پیاس لگنے پر ہی چل سکتا تھا، اور مکان سے نکالے جانے کی باری بھی بعد ہی میں آ سکتی تھی۔ مگر پہلی چیز جس پر نافرمانی کا اثر پڑا، وہ سرکاری پوشاک تھی جو اسی وقت اُتروا لی گئی۔

۱۰۲ – یہاں اُس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسایشیں حاصل تھیں، ان کا تجرِبہ انھیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمھارا دشمن تمھیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا تمھیں یہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ شیطان اُن کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کَنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصح، مشفق اور خیر خواہ دوست کے بھیس میں آ کر ایک بہتر حالت (زندگیِ جاوداں اور سلطنتِ لازوال) کا لالچ دلایا، تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں نہ جم سکے اور پھسل گئے، حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا، اور اس کے فرمان کے بارے میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری جذبے نے، جو شیطانی تحریص کے زیرِ اثر اُبھر آیا تھا، ان پر ذہول طاری کر دیا، اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مَقامِ بلند سے مَعصِیَت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ ”بھول“ اور ”فُقدانِ عزم“ ہے جس کا ذکر قصّے کے آغاز میں کیا گیا تھا، اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی، اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

۱۰۳ – یعنی شیطان کی طرح راندۂ درگاہ نہ کر دیا، اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں وہ گر گئے تھے، وہیں انھیں پڑا نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اُٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے اور اکڑ اور ہیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا، اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر

Maktaba Tul Ishaat.com

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دُوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے "ذِکر" (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا، اُس کے لیے دُنیا میں تنگ زندگی ہوگی[105] اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اُٹھائیں گے۔[106]"

اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بُھول" اور "فقدانِ عزم" کی وجہ سے قصور کر گزرا ہو، اور پھر ہوش آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا، کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" (اعراف، آیت ۲۳)

۱۰۴ – یعنی صرف معاف ہی نہ کیا، بلکہ آیندہ کے لیے راہِ راست بھی بتائی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

۱۰۵ – دُنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اِقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی، جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کش مکش جاری رہے گی، جو اسے کبھی امن و اطمینان اور سچّی مَسَرّت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

۱۰۶ – اس جگہ آدم علیہ السلام کا قصّہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصّہ جس طریقے سے یہاں، اور قرآن کے دوسرے مَقامات پر بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت ممکن ہے کہ آسمانوں میں ہو، اور ممکن ہے کہ اِسی زمین پر بنائی گئی ہو۔ بہر حال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمے تھا اور خدمت گار (فرشتے) اُس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا، تاکہ اُمیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔

چنانچہ امتحان لیا گیا، اور جو بات کُھلی، وہ یہ تھی کہ یہ اُمیدوار تحریص واِطماع کے اثر میں آ کر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا، اور اس کے علم پر نسیان غالب آ جاتا ہے۔ اِس امتحان کے بعد آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمایشی خلافت دی گئی، اور آزمایش کے لیے ایک مدت (اَجَلِ مُسَمّٰی، جس کا اختتام قیامت پر ہوگا) مقرر کر دی گئی۔ اِس آزمایش کے دَور میں اُمیدواروں کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انھیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمایش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر بھول لاحق ہوتی ہے، یا تحریص واِطماع کے اثر میں آ کر پھسلتے ہیں، تو تنبیہ، تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سنبھلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا معصیت کا؟ اس آزمایشی خلافت کے دَوران میں ہر ایک کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے، انھی کو پھر مستقل خلافت، اُس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اُس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے وہ صالح بندے ہوں گے جنھوں نے آزمایشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا بھول لاحق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف پلٹ کر اپنی اہلیّت ثابت کر دی ہوگی۔ جنت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اَینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہوگی، بغیر اس کے کہ اس کے لیے کسی تنزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافتِ الٰہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا، بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور اُن خدمات کا تصور کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچّے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیّات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن میں جنت کی زندگی کے صرف انھی لذائذ کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دُنیا کی لذتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آدمؑ وحوّا کا قصہ جس طرح بائبل میں بیان ہوا ہے، اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ بائبل کا بیان ہے کہ "اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا، تو انسان جیتی جان ہوا۔ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو، جسے اُس نے بنایا تھا، وہاں رکھا۔" "اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک وبد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔" "اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے، لیکن نیک وبد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا، تو مرا۔" "اور خداوند خدا اس پسلی سے، جو اس نے آدمؑ میں سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر اسے آدمؑ کے پاس لایا۔" "اور آدمؑ اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔" "اور سانپ کُل دشتی جانوروں سے، جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا، اور اس نے عورت سے کہا: کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟" "سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔" چنانچہ عورت نے اس کا پھل لے کر کھایا اور

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِيۡۤ اَعۡمٰى وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ
اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا‌ ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ اَسۡرَفَ

——وہ کہے گا: ”پروردگار! دُنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”ہاں، اِسی طرح تو ہماری آیات کو، جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تُو نے بھلا دیا تھا۔ اُسی طرح آج تو بُھلایا جا رہا ہے۔[۱۰۷]“——اِس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے

اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔“ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں، اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدمؑ اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔“ پھر خدا نے آدمؑ کو پکارا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں تیری آواز سن کر ڈرا اور چھپ گیا، کیونکہ میں ننگا تھا۔ خدا نے کہا: ارے، تجھ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تو ننگا ہے؟ ضرور تو نے اس درخت کا پھل کھایا ہو گا جس سے میں نے منع کیا تھا۔ آدمؑ نے کہا کہ مجھے حوا نے اس کا پھل کھلایا، اور حوا نے کہا مجھے سانپ نے بہکایا تھا۔ اس پر خدا نے سانپ سے کہا: ”اس لیے کہ تو نے یہ کیا، تُو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھیرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا، اور میں تیرے اور عورت کے درمیان، اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گی، اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔“ اور عورت کو یہ سزا دی کہ ”میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی، اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی، اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔“ اور آدمؑ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور میرے حکم کے خلاف کیا ”اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، مشقّت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا...... تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔“ پھر ”خداوند خدا نے آدمؑ اور اس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کُرتے بنا کر اُن کو پہنائے۔“ ”اور خداوند خدا نے کہا: دیکھو، انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اُس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔“ (پیدائش، باب ۲، آیات ۷-۲۵، باب ۳، آیات ۱-۲۳)

بائبل کے اِس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔

۱۰۷- قیامت کے روز نئی زندگی کے آغاز سے لے کر جہنّم میں داخل ہونے تک جو مختلف کیفیات مجرمین پر گزریں گی، ان کو قرآنِ مجید میں مختلف مواقع پر جُدا جُدا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کیفیت یہ ہے: لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا

وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ
يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ

رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دُنیا میں) بدلہ دیتے ہیں،[۱۰۸] اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

پھر کیا اِن لوگوں کو[۱۰۹] (تاریخ کے اِس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ اِن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت

عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ ”تو اِس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا ہے، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔“ یعنی تجھے خوب نظر آ رہا ہے۔ (ق، آیت ۲۲) دوسری کیفیت یہ ہے: اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ ”اللہ تو انھیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اُٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اُوپر جمی ہیں اور دل ہیں کہ اُڑے جاتے ہیں۔“ (ابراہیم، آیت ۴۳) تیسری کیفیت یہ ہے: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ ”اور قیامت کے روز ہم اس کے لیے ایک نوشتہ نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب پائے گا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تُو خود ہی کافی ہے۔“ (بنی اسرائیل، آیت ۱۳-۱۴) اور انھی کیفیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو آیتِ زیرِ بحث میں بیان ہوئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ لوگ آخرت کے ہولناک مناظر اور اپنی شامتِ اعمال کے نتائج کو تو خوب دیکھیں گے، لیکن بس ان کی بینائی یہی کچھ دیکھنے کے لیے ہوگی۔ باقی دوسری حیثیتوں سے ان کا حال اندھے کا سا ہوگا جسے اپنا راستہ نظر نہ آتا ہو، جو نہ لاٹھی رکھتا ہو کہ ٹٹول کر چل سکے، نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کے چلانے والا ہو، قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا ہو، اور اس کو کچھ نہ سُوجھتا ہو کہ کدھر جائے اور اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرے۔ اسی کیفیت کو اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ ”جس طرح تو نے ہماری آیات کو بھلا دیا تھا، اُسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔“ یعنی آج کوئی پروا نہ کی جائے گی کہ تو کہاں کہاں ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے اور کیسی کیسی محرومیاں برداشت کر رہا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے گا، کوئی تیری حاجتیں پوری نہ کرے گا، اور تیری کچھ بھی خبر گیری نہ کی جائے گی۔

۱۰۸- اشارہ ہے اس ”تنگ زندگی“ کی طرف جو اللہ کے ”ذِکر“، یعنی اس کی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے درسِ نصیحت سے منہ موڑنے والوں کو دُنیا میں بسر کرائی جاتی ہے۔

۱۰۹- اشارہ ہے اہلِ مکہ کی طرف جو اُس وقت مخاطب تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ۱۲۸ وَ لَوۡ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَكَانَ
لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی ۱۲۹ فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ
قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِهَا ۚ وَ مِنۡ اٰنَآئِ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ
النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرۡضٰی ۱۳۰ وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡكَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا

اِس میں[۱۱۰] بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں ؏

اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مُہلت کی ایک مدّت مقرر نہ کی جاچکی ہوتی تو ضرور اِن کا بھی فیصلہ چُکا دیا جاتا۔ پس اے محمدؐ! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سُورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی[۱۱۱]، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ[۱۱۲]۔ اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان و شوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف

۱۱۰ – یعنی تاریخ کے اِس سبق میں، آثارِ قدیمہ کے اس مشاہدے میں، نسلِ انسانی کے اِس تجربے میں۔

۱۱۱ – یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ابھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مُہلت کی ایک مدّت مقرر کر چکا ہے، اس لیے اُس کی دی ہوئی اس مُہلت کے دَوران میں یہ جو کچھ بھی تمھارے ساتھ کریں، اُس کو تمھیں برداشت کرنا ہوگا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ و ترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضۂ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اِس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمھیں نماز سے ملے گی، جس کو تمھیں اِن اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

''رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح'' کرنے سے مراد نماز ہے، جیسا کہ آگے چل کر خود فرما دیا: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ''اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔''

نماز کے اوقات کی طرف یہاں بھی صاف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ سُورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز، سُورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز، اور رات کے اوقات میں عشا اور تہجد کی نماز۔ رہے دن کے کنارے، تو وہ تین ہی ہو سکتے ہیں: ایک کنارہ صبح ہے، دوسرا کنارہ زوالِ آفتاب، اور تیسرا کنارہ شام۔ لہٰذا دن کے کناروں سے مراد فجر، ظہر اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۱۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۱ تا ۹۷۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۲۴۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۷۴۔

مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ ‌ؕ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ
وَّاَبۡقٰى ﴿١٣١﴾ وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا ‌ؕ لَا نَسۡـئَلُكَ رِزۡقًا ‌ؕ نَحۡنُ
نَرۡزُقُكَ ‌ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوۡا لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ‌ؕ

قِسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انھیں آزمایش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال[113] ہی بہتر اور پایندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو[114] اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمھیں دے رہے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔[115]

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟

١١٢ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمھیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں، اور اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی، وہ داعیِ حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندناتے بھی پھریں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا جس سے تمھارا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا: عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۝ "توقع ہے کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود پر پہنچا دے گا" (آیت ٧٩) اور سورۂ ضحیٰ میں فرمایا: وَلَلۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُوۡلٰى ؕ ۝ وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ؕ ۝ "تمھارے لیے بعد کا دَور یقیناً پہلے دَور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔" (آیت ۴-۵)

١١٣ – رزق کا ترجمہ ہم نے "رزقِ حلال" کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو "رزقِ رب" سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا اور تمھارے ساتھی اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ یہ فُسّاق و فجار ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی زندگی میں جو ظاہری چمک دمک پیدا کر لیتے ہیں، اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ شان و شوکت تمھارے لیے ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے۔ جو پاک رزق تم اپنی محنت سے کماتے ہو، وہ خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو، راست باز اور ایمان دار آدمیوں کے لیے وہی بہتر ہے اور اسی میں وہ بھلائی ہے جو دُنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔

١١٤ – یعنی تمھارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کے مقابلے میں اِن حرام خوروں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں۔ یہ چیز اُن کے زاویۂ نظر کو بدل دے گی۔ ان کے معیارِ قدر کو بدل دے گی۔ ان کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ
بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ
اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع

اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیانِ واضح نہیں آ گیا؟[۱۱۶] اگر ہم اُس کے آنے سے پہلے اِن کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اَے ہمارے پروردگار! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اے محمدؐ! اِن سے کہو: ہر ایک انجامِ کار کے انتظار میں ہے[۱۱۷]۔ پس اب منتظر رہو، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ ع

توجُّہات کا مرکز بدل دے گی۔ وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اُس بھلائی کو، جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے، اُس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دُنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۱۵ – یعنی ہم نماز پڑھنے کے لیے تم سے اس لیے نہیں کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہے۔ فائدہ تمھارا اپنا ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو گا جو دُنیا اور آخرت دونوں ہی میں آخری اور مستقل کامیابی کا وسیلہ ہے۔

۱۱۶ – یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انھی میں سے ایک اُمّی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کُتُبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اُن کتابوں میں جو کچھ تھا، وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا، بلکہ اس کو ایسا کھول کر واضح بھی کر دیا گیا کہ صحرا نشین بدّو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

۱۱۷ – یعنی جب سے یہ دعوت تمھارے شہر میں اُٹھی ہے، نہ صرف اس شہر کا بلکہ گرد و پیش کے علاقے کا بھی ہر شخص انتظار کر رہا ہے کہ اس کا انجام آخرِ کار کیا ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن

الانبیآء

(۲۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

الانبیآء

نام اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسلسل بہت سے انبیاؑ کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام ''الانبیاء'' رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورت کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

زمانۂ نُزُول مضمون اور اندازِ بیان، دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکے کا دَورِ متوسط، یعنی ہماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کا تیسرا دَور ہے۔ اس کے پس منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دَور کی سورتوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

موضوع ومضمون اس سورہ میں وہ کش مکش زیرِ بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرتؐ کے دعوائے رسالت اور آپؐ کی دعوتِ توحید وعقیدۂ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے، ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپؐ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جارہی تھیں، ان پر زَجر وتوبیخ کی گئی ہے اور اِن حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپؐ کی دعوت کا استقبال کررہے تھے، اُس پر مُتنبّہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو، وہ دراصل تمھارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

دَورانِ تقریر میں خاص طور پر جو اُمور زیرِ بحث آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) کفارِ مکہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہوسکتا، اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کرنا ــــــ اِس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

(۲) اُن کا آپؐ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر نہ جمنا ــــــ اِس پر مختصر مگر نہایت پُرزور اور معنیٰ خیز طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

(۳) ان کا یہ تصور کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روز کھیل کر یونہی ختم ہو جانا ہے، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا ہے، کسی حساب کتاب اور جزاوسزا سے سابقہ نہیں پیش آنا ہے ــــــ یہ چیز چونکہ اُس غفلت وبے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

(۴) شرک پر ان کا اصرار اور توحید کے خلاف ان کا جاہلانہ تعصّب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نِزاع تھا ـــــ اِس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور توحید کے حق میں مختصر مگر بہت وزنی اور دل نشین دلائل دیے گئے ہیں۔

(۵) ان کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار جھٹلانے کے باوجود جب ان پر کوئی عذاب نہیں آتا تو ضرور نبی جھوٹا ہے اور عذابِ الٰہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے ہمیں سناتا ہے، محض خالی خولی دھمکیاں ہیں ـــــ اِس کو اِستدلال اور نصیحت، دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیا علیہم السلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظیریں پیش کی گئی ہیں، جن سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دَوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دُنیا کے عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ اُلوہیّت اور خدائی کا ان میں شائبہ تک نہ تھا، بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے ساتھ انھی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اور بھی واضح کی گئی ہیں: ایک، یہ کہ انبیاؑ پر طرح طرح کے مصائب آئے ہیں، اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو برباد کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے، یہ کہ تمام انبیاؑ کا دین ایک تھا، اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی ہے، اور باقی جتنے مذاہب دُنیا میں بنے ہیں، وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے تفرِقے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے، وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جو لوگ اسے رد کر دیں گے، وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبیؐ کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۱۲ آیاتہا — سُوْرَةُ الْاَنْبِیَآءِ مَکِّیَّةٌ — ۷ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجزء ۱۷

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا یَاْتِیْهِمْ
مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ ۝۲
لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَی ۖ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ

قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت[۱]، اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں[۲]۔ اُن کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے[۳]، اُس کو بہ تکلّف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں[۴]، دِل ان کے (دُوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں۔

اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ "یہ شخص آخر تم جیسا

۱ — مراد ہے قربِ قیامت۔ یعنی اب وہ وقت دُور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا: "بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَیْنِ" "میں ایسے وقت پر معبوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت اِن دو اُنگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حائل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور بشیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔

۲ — یعنی کسی تنبیہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ خود سوچتے ہیں کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے اور نہ اُس پیغمبر کی بات سنتے ہیں جو انھیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۳ — یعنی قرآن کی ہر نئی سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے اور انھیں سنائی جاتی ہے۔

۴ — وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو اُوپر ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس میں کھیل سے مراد یہی زندگی کا کھیل ہے جسے خدا اور آخرت سے غافل لوگ کھیل رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ

اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ۝۳

ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادُو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟[۵]"

اسے سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے بلکہ کھیل اور مذاق کے طور پر سنتے ہیں۔

۵ - "پھنسے جاتے ہو" بھی ترجمہ ہوسکتا ہے، اور دونوں ہی مطلب صحیح ہیں۔ سرگوشیاں کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہرحال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اِس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو اور ہماری بہ نسبت اِس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو؟ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادُو ہے، کہ جو اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے، وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادُو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔

جس چیز کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "سحر" کا الزام چسپاں کرتے تھے، اس کی چند مثالیں آپؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق (متوفّٰی ۱۵۲ھ) نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عُتبہ بن ربیعہ (ابوسفیانؓ کے خسر، ہندؓ جگر خوار کے باپ) نے سردارانِ قریش سے کہا: اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمدؐ سے ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تعداد روز بروز بڑھتی دیکھ کر اکابرِ قریش سخت پریشان ہو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا: ابوالولید! تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔ وہ حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا: "بھتیجے! ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو، اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تَفرِقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ اس کے دین اور اس کے معبودوں کی بُرائی کی۔ باپ دادا جو مر چکے ہیں، ان سب کو تم نے گمراہ اور کافر بنایا۔ بھتیجے! اگر ان باتوں سے تمھارا مقصد دُنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے، تو آؤ ہم سب مل کر تم کو اتنا روپیا دے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ سرداری چاہتے ہو تو ہم تمھیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر تمھیں کوئی بیماری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم کو واقعی سوتے یا جاگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے، تو ہم سب مل کر بہترین طبیبوں سے تمھارا علاج کرائے دیتے ہیں۔" یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپؐ نے فرمایا: "ابوالولید! جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟" اس نے کہا: "بس مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔" آپؐ نے فرمایا: اچھا، اب میری سنو: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ، حٰمٓ ۚ تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۚ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپؐ سورۂ حٰم السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عُتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اڑتیسویں آیت پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، اور پھر سر اُٹھا کر عُتبہ سے فرمایا:

Maktaba Tul Ishaat.com

''ابوالولید! جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عتبہ یہاں سے اُٹھ کر سردارانِ قریش کی طرف پلٹا تو لوگوں نے دُور سے ہی اس کو آتے دیکھ کر کہا: ''خدا کی قسم! ابوالولید کا چہرا بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا۔'' اس کے پہنچتے ہی لوگوں نے سوال کیا: ''کہو ابوالولید! کیا کر آئے ہو؟'' اس نے کہا: ''خدا کی قسم! آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ! یہ شعر نہیں ہے، نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ اے مَعْشرِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں، رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کا خون تمھاری گردن پر نہ ہوگا، دوسروں پر ہوگا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمھاری حکومت ہوگی، اور اس کی عزت تمھاری عزت۔'' لوگوں نے کہا: ''واللہ، ابوالولید! تم پر بھی اس کا جادُو چل گیا۔'' اس نے کہا: ''یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمھارا کام۔'' (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۳۱۳-۳۱۴) بَیْہقی نے اِس واقعے کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں، ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضورؐ سورہ حٰمٓ السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اِس آیت پر پہنچے کہ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (آیت ۱۳) تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔

دوسرا واقعہ ابنِ اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلۂ اَرَاش کا ایک شخص کچھ اُونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اس کے اُونٹ خرید لیے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اَرَاشی نے تنگ آ کر ایک روز حرم کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمع عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے اس شخص سے کہا کہ ''ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو، وہ صاحب جو اس کونے میں بیٹھے ہیں، ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تمھارا روپیا دلوا دیں گے۔'' اَرَاشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا: ''آج لُطف آئے گا۔'' اَرَاشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی۔ آپؐ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے، اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا: ''کون؟'' آپؐ نے جواب دیا: ''محمدؐ۔'' وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپؐ نے اس سے کہا: ''اس شخص کا حق ادا کر دو۔'' اس نے جواب میں کوئی چُون وچَرا نہ کی، اندر گیا اور اس کے اُونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا، اور کہنے لگا کہ واللہ! آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو کبھی نہ دیکھا تھا، حَکَم بن ہِشام (ابوجہل) جب نکلا ہے تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اُس کا رنگ فق ہو گیا، اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حَکَم بن ہِشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابنِ ہِشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت وکردار کا اثر، اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادُو قرار دیتے تھے اور ناواقف لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا، ورنہ جادُو کر دے گا۔

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ

رسولؐ نے کہا: میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے۔[6]
وہ کہتے ہیں: "بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اِس کی مَن گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔[7]

۶ – یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (whispering campaign) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ "تم لوگ جو کچھ باتیں بناتے ہو، سب خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔" وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اُتر آیا۔

۷ – اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکے کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کی جائے، اور ہر اس شخص کو، جو مکے میں زیارت کے لیے آئے، آپؐ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپؐ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے، جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے، اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی! وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تُلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انھوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپؐ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی، وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدّت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفَیل بن عَمرو دَوسی کا قصہ ہے، جسے ابنِ اسحاق نے خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبیؐ کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپؐ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝٥ مَآ اٰمَنَتْ
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝٦

ورنہ یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پُرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔"
حالاں کہ اِن سے پہلے کوئی بستی بھی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں[۸] گے؟

آپؐ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپؐ کعبے کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں۔ آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ جب نبیؐ نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپؐ کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور آپؐ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا، اور میں آپؐ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی تھی تا کہ آپؐ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپؐ کی زبان سے سنے ہیں، وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپؐ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپؐ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعتِ اسلام کرتا رہا، یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے ستر اسّی گھرانے مسلمان ہو گئے۔ (ابنِ ہشام، جلد ۲، ص ۲۲-۲۴)

ایک اور روایت جو ابنِ اسحاق نے نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بناتے ہیں، وہ محض جھوٹ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مجلس میں نَضر بن حارث نے تقریر کی کہ "تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو، اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمھارے درمیان نو عمر جوان تھا تو تمھارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچّا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آ گئے، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا! وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا! وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تُک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا! وہ شاعر بھی نہیں ہے، شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں، اور اُس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا۔ بخدا! وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تُکی بڑ وہ ہانکتا ہے، کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سردارانِ قریش! کچھ اَور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ تمھیں درپیش ہے، وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو۔" اس کے بعد اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصّے لا کر پھیلائے جائیں، تا کہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انھیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ
اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا
كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ
وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا

اور اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔[9] تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پُوچھ لو۔[10] اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پُورے کیے، اور انھیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچالیا، اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔[11]

لوگو! ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمھارا ہی ذکر ہے، کیا تم

عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۳۲۰-۳۲۱)

۸ - اس مختصر سے جملے میں نشانی کے مطالبے کا جو جواب دیا گیا ہے، وہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے: ایک، یہ کہ تم پچھلے رسولوں کی سی نشانیاں مانگتے ہو، مگر یہ بھول جاتے ہو کہ ہٹ دھرم لوگ اُن نشانیوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ دوسرے، یہ کہ تم نشانی کا مطالبہ تو کرتے ہو، مگر یہ یاد نہیں رکھتے کہ جس قوم نے بھی صریح معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کیا ہے، وہ پھر ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہی ہے۔ تیسرے، یہ کہ تمھاری منہ مانگی نشانی نہ بھیجنا تو تم پر خدا کی ایک بڑی مہربانی ہے۔ اب تک تم انکار پر انکار کیے جاتے رہے اور مبتلائے عذاب نہ ہوئے۔ کیا اب نشانی اس لیے مانگتے ہو کہ ان قوموں کا سا انجام دیکھو جو نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں اور تباہ کر دی گئیں؟

۹ - یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ ”یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔“ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بَشَرِیّت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپؐ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پہلے زمانے کے جن لوگوں کو تم خود مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، وہ سب بھی بشر ہی تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۱۱)

۱۰ - یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمھارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤ پیچ سکھایا کرتے ہیں،

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

تَعۡقِلُوۡنَ ۝۱۰ؑ وَكَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً وَّاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا
اٰخَرِيۡنَ ۝۱۱ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ ۝۱۲ؕ لَا تَرۡكُضُوۡا
وَارۡجِعُوۡۤا اِلٰى مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ وَمَسٰكِنِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ ۝۱۳
قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝۱۴ فَمَا زَالَتۡ تِّلۡكَ دَعۡوٰىهُمۡ

سمجھتے نہیں[۱۲] ہو؟ ع

کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پِیس کر رکھ دیا اور اُن کے بعد دُوسری کسی قوم کو اُٹھایا۔ جب اُن کو ہمارا عذاب محسوس ہوا[۱۳] تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ (کہا گیا:) ”بھاگو نہیں، جاؤ اپنے انھی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے[۱۴]۔“ کہنے لگے: ”ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔“ اور وہ یہی پکارتے رہے،

انھی سے پوچھ لو کہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کون تھے۔ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

۱۱- یعنی پچھلی تاریخ کا سبق صرف اتنا ہی نہیں بتاتا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ انسان تھے، بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی نصرت و تائید کے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے جتنے وعدے اللہ نے ان سے کیے تھے، وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اب تم اپنا انجام خود سوچ لو۔

۱۲- یہ اکٹھا جواب ہے کفارِ مکہ کے ان مضطرب اقوال کا جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے، کہ یہ شاعری ہے، یہ ساحری ہے، یہ پراگندہ خواب ہیں، یہ من گھڑت افسانے ہیں، وغیرہ۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں آخر وہ کون سی نرالی بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہ آتی ہو، جس کی وجہ سے اس کے متعلق تم اتنی متضاد رائیں قائم کر رہے ہو۔ اس میں تو تمھارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمھاری ہی نفسیات اور تمھارے ہی معاملاتِ زندگی زیرِ بحث ہیں۔ تمھاری ہی فطرت اور ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے۔ تمھارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چن چن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اور تمھارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمھارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمھاری عقل عاجز ہو؟

حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ
لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ
فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا۔

ہم نے اِس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے، کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔[۱۵] اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔[۱۶] مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے، اور تمھارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔[۱۷]

۱۳ – یعنی جب عذابِ الٰہی سر پر آ گیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ آ گئی شامت۔

۱۴ – نہایت معنیٰ خیز فقرہ ہے اور اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، مثلاً ذرا اچھی طرح اِس عذاب کا معائنہ کرو، تاکہ کل کوئی اس کی کیفیت پوچھے تو ٹھیک بتا سکو۔ اپنے وہی ٹھاٹ جما کر پھر مجلسیں گرم کرو، شاید اب بھی تمھارے خَدَم وحَشَم ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ حضور! کیا حکم ہے۔ اپنی وہی کونسلیں اور کمیٹیاں جمائے بیٹھے رہو، شاید اب بھی تمھارے عاقلانہ مشوروں اور مدبرانہ آرا سے استفادہ کرنے کے لیے دُنیا حاضر ہو۔

۱۵ – یہ تبصرہ ہے اُن کے اُس پورے نظریۂ حیات پر جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان دُنیا میں بس یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جیے، کوئی باز پُرس اس سے نہیں ہونی ہے۔ کسی کو اسے حساب نہیں دینا ہے۔ چند روز کی بھلی بُری زندگی گزار کر سب کو بس یونہی فنا ہو جانا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا ہو۔ یہ خیال درحقیقت اِس بات کا ہم معنیٰ تھا کہ کائنات کا یہ سارا نظام محض کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے۔ اور یہی خیال دعوتِ پیغمبر سے ان کی بے اعتنائی کا اصل سبب تھا۔

۱۶ – یعنی ہمیں کھیلنا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اِس صورت میں یہ ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شُعور، ذمہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا، اُس کے درمیان حق و باطل کی یہ کشمکش اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں، اور محض اپنے لُطف و تفریح کے لیے ہم دوسروں کو بلا وجہ تکلیفوں میں ڈالتے۔ تمھارے خدا نے یہ دُنیا کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ
عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝۱۹ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے، اللہ کی ہے[۱۸]۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں[۱۹]، وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اُس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں[۲۰]۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔

رومی اکھاڑے (Colosseum) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو درندوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں نُچوا کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے۔

۱۷ – یعنی ہم بازی گر نہیں ہیں، نہ ہمارا کام کھیل تماشا کرنا ہے۔ ہماری یہ دُنیا ایک سنجیدہ نظام ہے جس میں کوئی باطل چیز نہیں جم سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اُٹھاتا ہے، حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے، اور آخر کار وہ مٹ کر ہی رہتا ہے۔ اس دُنیا کو اگر تم تماشا گاہ سمجھ کر جیو گے، یا حقیقت کے خلاف باطل نظریّات پر کام کرو گے تو نتیجہ تمھاری اپنی ہی تباہی ہوگا۔ نوعِ انسانی کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو کہ دُنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خوانِ یغما، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاؑ کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریّات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ پھر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ جب سمجھانے والا سمجھائے تو اس کا مذاق اُڑاؤ، اور جب اپنے ہی کیے کرتوتوں کے نتائج عذابِ الٰہی کی صورت میں سر پر آ جائیں تو چیخنے لگو کہ ”ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔“

۱۸ – یہاں سے توحید کے اثبات اور شرک کے اِبطال پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکینِ مکہ کے درمیان اصل بنائے نزاع تھی۔ اب مشرکین کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات کا یہ نظام جس میں تم جی رہے ہو (جس کے متعلق ابھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ایک سنجیدہ اور بامقصد اور مبنی بر حقیقت نظام ہے، اور جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس میں باطل ہمیشہ حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے) اِس کی حقیقت یہ ہے کہ اس پورے نظام کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف ایک خدا ہے، اور اس حقیقت کے مقابلے میں باطل یہ ہے کہ اسے بہت سے خداؤں کی مشترک سلطنت سمجھا جائے، یا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بڑے خدا کی خدائی میں دوسرے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بھی کچھ دخل ہے۔

۱۹ – یعنی وہی فرشتے جن کو مشرکینِ عرب خدا کی اولاد سمجھ کر، یا خدائی میں دخیل مان کر معبود بنائے ہوئے تھے۔

۲۰ – یعنی خدا کی بندگی کرنا ان کو ناگوار بھی نہیں ہے کہ بادلِ ناخواستہ بندگی کرتے کرتے وہ ملول ہو جاتے ہوں۔

اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

کیا اِن لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اُٹھا کھڑا کرتے ہوں[۲۱]؟

اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا[۲۲]۔ پس پاک ہے اللہ ربُّ العرش[۲۳] اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔

اصل میں لفظ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ استحسار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد وہ تکان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لاحق ہوتی ہے۔

۲۱ – اصل میں لفظ ''یُنْشِرُوْنَ'' استعمال ہُوا ہے جو ''اِنشار'' سے مُشتق ہے۔ اِنشار کے معنی ہیں: بے جان پڑی ہوئی چیز کو اُٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآنِ مجید میں بالعموم زندگی بعدِ موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصطلاحی مفہوم سے قطعِ نظر، اصل لُغوی معنٰی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادے میں زندگی پھونک دینے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں کو انھوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبُود بنایا ہے، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مادّۂ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے ـــــ اور مشرکینِ عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے ـــــ تو پھر وہ اُن کو خدا اور معبُود کس لیے مان رہے ہیں؟

۲۲ – یہ اِستِدلال سادہ بھی ہے اور بہت گہرا بھی۔ سادہ سی بات، جس کو ایک بدّوی، ایک دیہاتی، ایک موٹی سی سمجھ کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے، یہ ہے کہ ایک معمولی گھر کا نظام بھی چار دن بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحبِ خانہ ہوں۔ اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام، زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیّاروں تک، ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا، اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں کے درمیان تناسُب اور توازُن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی اٹل اور غالب و قاہر ضابطہ ان بے شمار اشیا اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم تعاون کرتے رہنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے مُطلَق العِنان فرماں رواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے؟ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مُستلزِم ہے۔ قانون اور ضابطے کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۷،

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ
اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا
فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ

وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دِہ نہیں ہے اور سب جواب دِہ ہیں۔

کیا اُسے چھوڑ کر اِنھوں نے دُوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ ”لاؤ اپنی دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دَور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔[۲۴]“ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔[۲۵] ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اُس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

یہ کہتے ہیں: ”رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔[۲۶]“ سبحان اللہ! وہ تو بندے ہیں جنھیں

جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۸۵)

۲۳ - رب العرش، یعنی کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک۔

۲۴ - پہلے دو اِستدلال عقلی تھے، اور یہ استدلال نقلی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنی کتابیں بھی خدا کی طرف سے دُنیا کے کسی ملک میں کسی قوم کے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں، اِن میں سے کسی میں یہ نکال کر دکھا دو کہ ایک اللہ، خالقِ زمین و آسمان کے سوا کوئی دوسرا بھی خدائی کا کوئی شائبہ رکھتا ہے، اور کسی اور کو بھی بندگی و عبادت کا حق پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسا مذہب تم لوگوں نے بنا رکھا ہے جس کی تائید میں نہ عقل سے کوئی دلیل ہے اور نہ آسمانی کتابیں ہی جس کے لیے کوئی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

۲۵ - یعنی نبی کی بات پر اِن کا توجہ نہ کرنا علم پر نہیں بلکہ جہل پر مبنی ہے۔ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لیے سمجھانے والے کی بات کو ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔

۲۶ - یہاں پھر فرشتوں ہی کا ذکر ہے جن کو مشرکینِ عرب خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بعد کی تقریر سے

مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ
مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ
مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ
فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا

عزت دی گئی ہے۔ اُس کے حُضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے، اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سِفارش نہیں کرتے، بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں[۲۷]۔ اور جو اُن میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں، تو اُسے ہم جہنّم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے۔ ع

کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنھیں جُدا کیا[۲۸]، اور پانی سے ہر

یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے۔

۲۷۔ مشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبود بناتے تھے: ایک، یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے۔ دوسرے، یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انھیں خدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنانا چاہتے تھے۔ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ (یونس، آیت ۱۸) اور مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ (الزمر، آیت ۳) ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اِس جگہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنھیں تم شفیع قرار دیتے ہو، وہ علمِ غیب نہیں رکھتے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہیں، اور اُن باتوں کو بھی جو اُن سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سِفارش کرنے کا مُطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے، جب کہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰ وَ جَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ
رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ۪ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ
یَهْتَدُوْنَ ۝۳۱ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَّ هُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا

زندہ چیز پیدا[29] کی۔ کیا وہ (ہماری اِس خلّاقی کو) نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے[30]، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں[31]، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں[32]۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا[33] دیا، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف[34]

خواہ فرشتے ہوں یا انبیا و صالحین، ہر ایک کا اختیارِ شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطورِ خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور دستِ سوال دراز کیا جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۵-۸۶)

۲۸ – اصل میں ”رَتْق“ اور ”فَتْق“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَتْق کے معنیٰ ہیں: یک جا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فَتْق کے معنیٰ پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (mass) کی سی تھی، بعد میں اُس کو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اَجرامِ فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۱۳-۱۴-۱۵)

۲۹ – اس سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ پانی کو خدا نے سببِ زندگی اور اصلِ حیات بنایا، اُسی میں اور اُسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جگہ اس مطلب کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ (النور، آیت ۴۵) ”اور خدا نے ہر جان دار کو پانی سے پیدا کیا۔“

۳۰ – اس کی تشریح سورۂ نحل، حاشیہ ۱۲ میں گزر چکی ہے۔

۳۱ – یعنی پہاڑوں کے درمیان ایسے دَرّے رکھ دیے اور دریا نکال دیے جن کی وجہ سے پہاڑی علاقوں سے گزرنے اور زمین کے ایک خطّے سے دوسرے خطّے کی طرف عُبور کرنے کے راستے نکل آتے ہیں۔ اِسی طرح زمین کے دوسرے حصّوں کی ساخت بھی ایسی رکھی ہے کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے کے لیے راہ بن جاتی ہے یا بنالی جا سکتی ہے۔

۳۲ – ذُو معنیٰ فقرہ ہے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ زمین میں چلنے کے لیے راہ پائیں، اور یہ بھی کہ وہ اِس حکمت

مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ

توجّہ ہی نہیں کرتے۔اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے،اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں[۳۵]۔

اور[۳۶] اے محمدؐ! ہمیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے۔

اور اِس کاریگری اور اِس انتظام کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ پائیں۔

۳۳- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۃ الحِجر، حواشی ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

۳۴- یعنی اُن نشانیوں کی طرف جو آسمانوں میں ہیں۔

۳۵- کُلٌّ اور یَسْبَحُوْنَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مراد صرف سورج اور چاند ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے اَجرامِ فلکی، یعنی تارے بھی مراد ہیں، ورنہ جمع کے بجائے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ فَلَک، جو فارسی کے چرخ اور گردوں کا ٹھیک ہم معنی ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ ’’سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں‘‘ سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں: ایک، یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی ’’فلک‘‘ میں نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے، یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں اور وہ خود انھیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو، بلکہ وہ کوئی سیّال شے ہے، یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے، جس میں اِن تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۷)

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان و زمین کے رَتق وفَتق، اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے، اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبعیات (Physics)، حیاتیات (Biology) اور علمِ ہیئت (Astronomy) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا ہے، اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ اِن الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہرحال موجودہ زمانے کا انسان اِن تینوں آیات کو بالکل اپنی جدید ترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ سے لے کر وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ تک کی تقریر شرک کی تردید میں ہے، اور اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا سے لے کر فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے، اس میں توحید کے لیے ایجابی (positive) دلائل دیے گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ نظامِ کائنات جو تمھارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ ربّ العالمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کاریگری تمھیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کارفرمائی میں بن سکتا تھا اور اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَاۡئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ‌ؕ
وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً‌ ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا
رَاٰكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ

اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جان دار کو موت کا مزا چکھنا ہے،[۳۷] اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔[۳۸] آخرکار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔
یہ منکرینِ حق جب تمھیں دیکھتے ہیں تو تمھارا مذاق بنالیتے ہیں۔ کہتے ہیں: "کیا یہ ہے وہ شخص

متعلق کوئی صاحبِ عقل وخرد آدمی یہ تصوّر کرسکتا ہے کہ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، اور اس نے محض تفریح کے لیے چند گڑیاں بنائی ہیں، جن سے کچھ مدت کھیل کر بس وہ یونہی اِن کو خاک میں ملادے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات ماننے سے انکار کیے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز اس نظریۂ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے؟ ان نشانیوں کے ہوتے تم کہتے ہو کہ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ، "یہ نبی کوئی نشانی لے کر آئے"۔ کیا نبی کی دعوتِ توحید کے حق ہونے پر گواہی دینے کے لیے یہ نشانیاں کافی نہیں ہیں؟

۳۶- یہاں سے پھر سلسلۂ تقریر اُس کش مکش کی طرف مُڑتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان برپا تھی۔

۳۷- یہ مختصر جواب ہے اُن ساری دھمکیوں اور بددعاؤں اور کوسنوں اور قتل کی سازشوں کا جن سے ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابرِ قریش تھے جو آئے دن آپ کو اِس تبلیغ کے خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے، اور ان میں سے بعض پُر جوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپ کا کام تمام کردیں۔ دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کرلیتا تھا، آپ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اُس کی عورتیں آپ کو کلپ کلپ کر کوسنے اور بددعائیں دیتی تھیں اور اُس کے مرد آپ کو ڈراوے دیتے پھرتے تھے۔ خُصوصاً ہجرتِ حبشہ کے بعد تو مکے بھر کے گھروں میں کُہرام مچ گیا تھا، کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا گھرانا بچا رہ گیا تھا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دُہائیاں دیتے تھے کہ اِس شخص نے ہمارے گھر برباد کیے ہیں۔ انھی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم ان کی پروا کیے بغیر، بے خوف اپنا کام کیے جاؤ۔

۳۸- یعنی راحت اور رنج، مفلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، غرض تمام مختلف حالات میں تم لوگوں کی آزمائش کی جارہی ہے، تاکہ دیکھیں تم اچھے حالات میں متکبر، ظالم، خدا فراموش، بندۂ نفس تو

يَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ ۚ وَهُمۡ بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝٣٦ خُلِقَ
الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ۝٣٧ وَيَقُوۡلُوۡنَ
مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝٣٨ لَوۡ يَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

جو تمھارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟[39]" اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں[40]۔
انسان جلد باز مخلوق ہے[41]۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ[42]۔۔۔۔ یہ
لوگ کہتے ہیں: "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو۔" کاش اِن کافروں کو اُس وقت کا کچھ علم ہوتا

نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں کم ہمتی کے ساتھ پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لہٰذا کسی صاحبِ عقل آدمی کو اِن مختلف حالات کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جو حالت بھی اُسے پیش آئے، اُس کے امتحانی اور آزمایشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے، اور اس سے بخیریت گزرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے، اور جب بُرے حالات پیش آ جائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔

۳۹ – یعنی برائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ فقرہ ان کے مذاق کا مضمون نہیں بتا رہا ہے، بلکہ مذاق اُڑانے کی وجہ اور بنیاد پر روشنی ڈال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ بجائے خود کوئی مذاق کا فقرہ نہیں ہے۔ مذاق تو وہ دوسرے ہی الفاظ میں اُڑاتے ہوں گے اور کچھ اور ہی طرح کے آوازے کستے اور فقرے چُست کرتے ہوں گے۔ البتہ یہ سارا دل کا بخار جس وجہ سے نکالا جاتا تھا، وہ یہ تھی کہ آپؐ ان کے خود ساختہ معبُودوں کی خدائی کا ردّ کرتے تھے۔

۴۰ – یعنی بتوں اور بناوٹی خداؤں کی مخالفت تو انھیں اس قدر ناگوار ہے کہ اس کا بدلہ لینے کے لیے تمھاری تضحیک و تذلیل کرتے ہیں، مگر انھیں خود اپنے حال پر شرم نہیں آتی کہ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کا ذکر سُن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

۴۱ – اصل میں خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ہے: "انسان جلد بازی سے بنایا گیا ہے، یا پیدا کیا گیا ہے"۔ لیکن یہ لفظی معنی اصل مقصودِ کلام نہیں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں: فُلاں شخص عقل کا پُتلا ہے، اور فلاں شخص حرفوں کا بنا ہوا ہے، اُسی طرح عَرَبی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کی سرِشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ۝ "انسان جلد باز واقع ہوا ہے" (بنی اسرائیل، آیت ۱۱) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ
يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ
سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ
اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ

جب کہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں، اور نہ ان کو کہیں سے مدد پہنچے گی۔ وہ بلا اچانک آئے گی اور اِنھیں اِس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ اِن کو لمحہ بھر مُہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اُڑایا جا چکا ہے، مگر اُن کا مذاق اُڑانے والے اُسی چیز کے پھیر میں آ کر رہے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے ؏

اے محمدؐ! اِن سے کہو: ”کون ہے جو رات کو یا دن کو تمھیں رحمٰن سے بچا سکتا ہو؟“[۴۳] مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید

۴۲ – بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں ”نشانیوں“ سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اُڑاتے تھے، اُن میں سے ایک عذابِ الٰہی، اور قیامت اور جہنّم کا مضمون بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص آئے دن ہمیں ڈراوے دیتا ہے کہ میرا انکار کرو گے تو خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا، اور قیامت میں تم پر یہ بنے گی اور تم لوگ یوں جہنم کے ایندھن بنائے جاؤ گے۔ مگر ہم روز انکار کرتے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی عذاب آتا دکھائی دیتا ہے اور نہ کوئی قیامت ہی ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۴۳ – یعنی اگر اچانک دن کو یا رات کو کسی وقت خدا کا زبردست ہاتھ تم پر پڑ جائے تو آخر وہ کون سا زور آور حامی و ناصر ہے جو اس کی پکڑ سے تم کو بچا لے گا؟

مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۗ اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۗ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ ۖ وَلَا یَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ

اُن کو حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اور اِن کے آبا و اجداد کو ہم زندگی کا سروسامان دیے چلے گئے، یہاں تک کہ اِن کو دن لگ گئے[۴۴]۔ مگر کیا انھیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں؟[۴۵] پھر کیا یہ غالب آجائیں گے؟[۴۶] اِن سے کہہ دو کہ "میں تو وحی کی بنا پر تمھیں مُتنبّہ کر رہا ہوں" ــــــ مگر بہرے پُکار کو نہیں سنا کرتے

۴۴- یعنی ہماری اِس مہربانی اور پرورش سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کا کوئی ذاتی استحقاق ہے جس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ اپنی خوش حالیوں اور سرداریوں کو یہ لازوال سمجھنے لگے ہیں، اور ایسے سرمست ہوگئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

۴۵- یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد، آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ ۶۰) یہاں اس سیاق و سباق میں یہ ایک اور معنی بھی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ زمین میں ہر طرف ایک غالب طاقت کی کار فرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی قحط کی شکل میں، کبھی وبا کی شکل میں، کبھی سیلاب کی شکل میں، کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں، اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آجاتی ہے جو انسان کے سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مرجاتے ہیں۔ بستیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں غارت ہوجاتی ہیں۔ پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائلِ زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی واقع ہوجاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے۔ اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۴، السجدہ، حاشیہ ۳۳)

۴۶- یعنی جب کہ اِن کے تمام وسائلِ زندگی ہمارے ہاتھ میں ہیں، جس چیز کو چاہیں گھٹا دیں اور جسے چاہیں روک لیں، تو کیا یہ اتنا بل بوتا رکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں غالب آجائیں اور ہماری پکڑ سے بچ نکلیں؟ کیا یہ آثار ان کو یہی اطمینان دلا رہے ہیں کہ تمھاری طاقت لازوال اور تمھارا عیش غیر فانی ہے اور کوئی تمھیں پکڑنے والا نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِذَا مَا يُنۡذَرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنۡ مَّسَّتۡهُمۡ نَفۡحَةٌ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّكَ
لَيَقُوۡلُنَّ يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الۡمَوَازِيۡنَ الۡقِسۡطَ
لِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡـئًا ؕ وَاِنۡ كَانَ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ
مِّنۡ خَرۡدَلٍ اَتَيۡنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى
وَهٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكۡرًا لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيۡنَ

جب کہ اُنھیں خبردار کیا جائے۔ اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انھیں چھُو جائے[۴۷] تو ابھی چیخ اُٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔

قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا، وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں[۴۸]۔

[۴۹]پہلے ہم موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور "ذکر"[۵۰] عطا کر چکے ہیں، اُن متقی لوگوں کی بھلائی کے لیے[۵۱]

---

۴۷ – وہی عذاب جس کے لیے یہ جلدی مچاتے ہیں اور مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ لاؤ نا وہ عذاب، کیوں نہیں وہ ٹوٹ پڑتا۔

۴۸ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸-۹۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ترازو کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہرحال وہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو مادّی چیزوں کو تولنے کے بجائے انسان کے اَخلاقی اوصاف و اعمال اور اس کی نیکی و بدی کو تولے گی اور ٹھیک ٹھیک وزن کر کے بتا دے گی کہ اَخلاقی حیثیت سے کس شخص کا کیا پایہ ہے۔ نیک ہے تو کتنا نیک ہے، اور بد ہے تو کتنا بد۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری زبان کے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر "ترازو" کا لفظ یا تو اس وجہ سے انتخاب فرمایا ہے کہ اس کی نوعیت ترازو سے اشبہ ہوگی، یا اس انتخاب کا مقصد یہ تصور دلانا ہے کہ جس طرح ایک ترازو کے پلڑے دو چیزوں کے وزن کا فرق ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں، اسی طرح ہماری میزانِ عدل بھی ہر انسان کے کارنامۂ زندگی کو جانچ کر بے کم و کاست بتا دے گی کہ اس میں نیکی کا پہلو غالب ہے یا بدی کا۔

۴۹ – یہاں سے انبیا علیہم السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پے در پے بہت سے انبیاؑ کی زندگی کے

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ
هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ
اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ ج

جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اُس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ اور اب یہ بابرکت "ذکر" ہم نے (تمھارے لیے) نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو؟ ع
اُس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی ہوش مندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔

مفصل یا مختصر واقعات کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ ذکر جس سیاق و سباق میں آیا ہے، اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حسبِ ذیل باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:

اول، یہ کہ تمام پچھلے انبیاؑ بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوم، یہ کہ پہلے انبیاؑ بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

سوم، یہ کہ انبیا علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں۔ سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں۔ شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخرکار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

چہارم: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبولِ بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود، تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ اُلوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور فیصلے میں ان سے غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ بیمار بھی وہ ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتّٰی کہ قصور بھی ان سے ہو جاتے تھے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ بھی ہوتا تھا۔

۵۰ – تینوں الفاظ تورات کی تعریف میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی وہ حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، وہ انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اور وہ اولادِ آدمؑ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔

۵۱ – یعنی اگرچہ بھیجی گئی تھی وہ تمام انسانوں کے لیے، مگر اس سے فائدہ عملاً وہی لوگ اُٹھا سکتے تھے جو ان

Maktaba Tul Ishaat.com

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیۡلُ الَّتِیۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا

یاد کرو وہ موقع[۵۴] جب کہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "یہ مُورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ

صفات سے مُتّصِف ہوں۔

۵۲ - جس کا ابھی اُوپر ذکر گزرا ہے، یعنی قیامت۔

۵۳ - "ہوش مندی" ہم نے "رُشد" کا ترجمہ کیا ہے، جس کے معنٰی ہیں: "صحیح و غلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا، اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا"۔ اس مفہوم کے لحاظ سے "رُشد" کا ترجمہ "راست روی" بھی ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ رُشد کا لفظ محض راست رَوی کو نہیں بلکہ اُس راست رَوی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہو فکرِ صحیح اور عقلِ سلیم کے استعمال کا، اس لیے ہم نے "ہوش مندی" کے لفظ کو اس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

"ابراہیم کو اُس کی ہوش مندی بخشی"، یعنی جو ہوش مندی اس کو حاصل تھی، وہ ہماری عطا کردہ تھی۔

"ہم اُس کو خوب جانتے تھے"، یعنی ہماری یہ بخشش کوئی اندھی بانٹ نہ تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے، اس لیے ہم نے اُس کو نوازا۔ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ "اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے۔" (الأنعام، آیت ۱۲۴) اس میں ایک لطیف اشارہ ہے سردارانِ قریش کے اُس اعتراض کی طرف جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آخر اِس شخص میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ ہم کو چھوڑ کر اُسے رسالت کے منصب پر مقرر کرے۔ اس کا جواب مختلف مَقامات پر قرآنِ مجید میں مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اِس لطیف اشارے پر اکتفا کیا گیا کہ یہی سوال ابراہیمؑ کے متعلق بھی ہو سکتا تھا، پوچھا جا سکتا تھا کہ سارے مُلکِ عراق میں ایک ابراہیمؑ ہی کیوں اس نعمت سے نوازا گیا، مگر ہم جانتے تھے کہ ابراہیمؑ میں کیا اہلیت ہے، اس لیے ان کی پوری قوم میں سے اُن کو اِس نعمت کے لیے منتخب کیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اِس سے پہلے سورۂ بقرہ، آیات ۱۲۴ تا ۱۴۱ – ۲۵۸ – ۲۶۰۔ الأنعام، آیات ۷۴ تا ۸۱۔ جلد دوم، التوبہ، آیت ۱۱۴۔ ہود، آیات ۶۹ تا ۷۶۔ ابراہیم، آیات ۳۵ تا ۴۱۔ الحجر، آیات ۵۱ تا ۶۰۔ النحل، آیات ۱۲۰ تا ۱۲۳ میں گزر چکے ہیں، جن پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

۵۴ - جس واقعے کا آگے ذکر کیا جا رہا ہے، اس کو پڑھنے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ قریش کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے، کعبہ انھی کا تعمیر کردہ تھا، سارے عرب میں کعبے کی مرکزیت انھی کی نسبت کے سبب سے تھی، اور قریش کا سارا بھرم اِسی لیے بندھا ہوا تھا کہ یہ اولادِ ابراہیمؑ ہیں اور کعبۂ ابراہیمی کے مجاور ہیں۔ آج اِس زمانے اور عرب سے دُور دراز کے ماحول میں تو حضرت ابراہیمؑ کا یہ قصہ صرف ایک سبق آموز تاریخی واقعہ ہی نظر آتا ہے، مگر جس زمانے اور ماحول میں اوّل اوّل یہ بیان کیا گیا تھا، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ قریش کے مذہب اور ان کی برہمنیت پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی جو ٹھیک اس کی جڑ پر جا کر لگتی تھی۔

عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ
اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ
فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ
اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا

گرویدہ ہو رہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔" اس نے کہا: "تم بھی گمراہ ہو اور تمھارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" انھوں نے کہا "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟[۵۵]" اُس نے جواب دیا: "نہیں، بلکہ فی الواقع تمھارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اِس پر میں تمھارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم! میں تمھاری غیر موجودگی میں ضرور تمھارے بُتوں کی خبر لوں گا۔[۵۶]" چنانچہ اس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا[۵۷] اور صرف ان کے بڑے کو

---

۵۵ - اِس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "کیا تُو ہمارے سامنے حق پیش کر رہا ہے یا کھیلتا ہے؟" لیکن اصل مفہوم وہی ہے جس کی ترجمانی اُوپر کی گئی ہے۔ ان لوگوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ یہ باتیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ یہ تم محض مذاق اور کھیل کر رہے ہو، یا واقعی تمھارے یہی خیالات ہیں۔

۵۶ - یعنی اگر تم اِستدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں عملاً تمھیں مشاہدہ کرا دوں گا کہ یہ بے بس ہیں، ان کے پاس کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں، اور ان کو خدا بنانا غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ عملی تجرِبے اور مُشاہَدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے، تو اِس کی تفصیل حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر نہیں بتائی۔

۵۷ - یعنی موقع پا کر، جب کہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے، حضرت ابراہیمؑ ان کے مرکزی بُت خانے میں گُھس گئے، اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝٥٨ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ
لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٥٩ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝٦٠
قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝٦١ قَالُوْٓا
ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝٦٢ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ
هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝٦٣ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

چھوڑ دیا، تاکہ شاید وہ اس کی طرف رُجوع کریں۔[58] (اُنھوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے: "ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔" (بعض لوگ) بولے: "ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سُنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔" اُنھوں نے کہا: "تو پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے، تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُس کی کیسی خبر لی جاتی ہے[59])۔" (ابراہیمؑ کے آنے پر) اُنھوں نے پوچھا: "کیوں ابراہیم! تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟" اُس نے جواب دیا: "بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے، اِن ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں[60]۔" یہ سُن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے

۵۸ - "اُس کی طرف" کا اشارہ بڑے بت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنٰی ہے۔ یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انھیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچومر بنا ڈالا ہو۔ یا پھر بڑے حضرت سے یہ پوچھیں کہ حضور! آپ کی موجودگی میں یہ کیا ہوا؟ کون یہ کام کر گیا؟ اور آپ نے اسے روکا کیوں نہیں؟ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہو گا، اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

۵۹ - یہ گویا حضرت ابراہیمؑ کی منہ مانگی مراد تھی، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ بات صرف پروہتوں اور پجاریوں ہی کے سامنے نہ ہو، بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بُت جو اُن کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں، کیسے بے بس ہیں اور خود یہ پروہت حضرات ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ اِس طرح ان پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بھی جادُوگروں سے حضرت موسٰیؑ کا مقابلہ کرانے کے لیے ملک بھر کی خلقت جمع کی تھی، اور اِنھوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کا مُقدّمہ سننے کے لیے عوام کو اکٹھا کر لیا۔ وہاں حضرت موسٰیؑ کو سب کے سامنے

یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں، وہ جادُو نہیں معجزہ ہے۔ اور یہاں حضرت ابراہیمؑ کو ان کے دشمنوں نے آپ ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے اُن کے مکروفریب کا طلسم توڑ دیں۔

۶۰ – یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیمؑ نے بت شکنی کے اِس فعل کو بڑے بت کی طرف جو منسوب کیا ہے اِس سے اُن کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین پر حجّت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انھوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور اُن سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جا سکتی۔ ایسے مواقع پر ایک شخص اِستدلال کی خاطر جو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے، اس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیّت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ ان کے مخاطب ہی اِسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے حجّت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے، اور سننے والا بھی اُسے اسی معنیٰ میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک رِوایت میں یہ بات آ گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک ”جھوٹ“ تو یہ ہے، اور دوسرا ”جھوٹ“ سورۂ صافّات میں حضرت ابراہیمؑ کا قول اِنِّیْ سَقِیْمٌ ہے، اور تیسرا ”جھوٹ“ اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے، جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائبل کی کتابِ پیدایش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غُلُوّ کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک رِوایت کو لے کر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اُٹھا کر پھینک دو، کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابلِ اعتماد ہوں۔ اور نہ فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مُستلزِم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابلِ اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابلِ اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے، اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث، جس میں حضرت ابراہیمؑ کے تین ”جھوٹ“ بیان کیے گئے ہیں، صرف اِسی وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے، بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تینوں ہی محلِّ نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک ”جھوٹ“ کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اِس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیمؑ کے اس قول پر لفظ ”جھوٹ“ کا اِطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، معاذ اللہ، اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ والا واقعہ، تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اِس زیرِ بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو

Maktaba Tul Ishaat.com

فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ
عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا
لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ

دِلوں میں) کہنے لگے: "واقعی تم خود ہی ظالم ہو۔" مگر پھر اُن کی مت پلٹ گئی[61] اور بولے: "تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔" ابراہیمؑ نے کہا: "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمھیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمھارے اِن معبُودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر

بہن قرار دینے کا واقعہ، تو وہ بجائے خود ایسا مُہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے۔ بائبل کی رُو سے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیمؑ کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہِ مصر اس خوب صورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمھیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمھیں اپنی بہن بتاؤں گا، تاکہ میری جان تو بچ جائے۔ (پیدایش، باب ۱۲) حدیث کی زیرِ بحث روایت میں تیسرے "جھوٹ" کی بنیاد اِسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو، اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی اِفراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نوبت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرینِ حدیث کر رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب "رسائل و مسائل" جلد دوم، ص ۳۵ تا ۳۹)

۶۱ – اصل میں نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ (اَوندھا دیے گئے اپنے سروں کے بَل) فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انھوں نے خجالت کے مارے سر جھکا لیے۔ لیکن موقع و محل اور اُسلوبِ بیان اس معنیٰ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلۂ کلام اور اندازِ کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا جواب سنتے ہی پہلے تو انھوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو تم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبُودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا بیتی اور کون انھیں مار کر رکھ گیا، آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے، جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان پر ضد اور جہالت سوار ہو گئی اور، جیسا کہ ضد کا خاصّہ ہے، اس کے سوار ہوتے ہی ان کی عقل اَوندھ گئی۔ دماغ سیدھا سوچتے سوچتے یکایک اُلٹا سوچنے لگا۔

دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝۶۷ قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ
كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ۝۶۸ قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ ۝۶۹ۙ
وَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَخۡسَرِيۡنَ ۝۷۰ۚ وَنَجَّيۡنٰهُ وَلُوۡطًا اِلَى
الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا لِلۡعٰلَمِيۡنَ ۝۷۱ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ ؕ وَيَعۡقُوۡبَ

پُوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟" انھوں نے کہا: "جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی، اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔" ہم نے کہا: "اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔"[۶۲] وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں، مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا۔ اور ہم اُسے اور لوطؑ کو بچا کر[۶۳] اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دُنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔[۶۴] اور ہم نے اسے اسحاقؑ عطا کیا اور یعقوبؑ اس پر

---

۶۲ – الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے کہ انھوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے اُنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی اُن معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اِن معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظامِ عالَم کے معمول (routine) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اُٹھاتا ہے۔ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بندۂ خدا! تیرے اُوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انھیں منوا کر ہی چھوڑے؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جب کہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اِس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۳۹)

۶۳ – بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے: نحور اور حاران۔ حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے۔ (پیدایش، باب ۱۱، آیت ۲۶) سورۂ عنکبوت میں حضرت ابراہیمؑ کا جو تذکرہ آیا ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوطؑ ہی ان پر ایمان لائے تھے۔ (ملاحظہ ہو: آیت ۲۶)

۶۴ – یعنی شام و فلسطین کی سرزمین۔ اس کی برکتیں مادّی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مادّی حیثیت سے وہ دُنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ہے۔ اور رُوحانی حیثیت سے وہ ۲ ہزار برس تک انبیا علیہم السلام کا مہبط رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا
وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ
وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ
مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَـبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فٰسِقِيْنَ ۝ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ۧ ع ۵

مزید[۶۵]، اور ہر ایک کو صالح بنایا۔ اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے سے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے[۶۶]۔

اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا[۶۷] اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی ـــــ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی ـــــ اور لوطؑ کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا[ع]

دُنیا کے کسی دوسرے خطّے میں اتنی کثرت سے انبیاؑ مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۶۵ – یعنی بیٹے کے بعد پوتا بھی ایسا ہوا جسے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

۶۶ – حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دَور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ نمرود سے ان کی مُڈبھیڑ، باپ اور قوم سے ان کی کش مکش، بت پرستی کے خلاف ان کی جِدّوجُہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصّہ، اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائبل کی کتاب ''پیدائش'' کے مصنف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ مَعاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو لے کر حاران میں جا بسا۔ (باب ۱۱، آیات ۲۷ تا ۳۲) اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا'' اور میں تجھے ایک

بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعثِ برکت ہو! جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا، اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا، اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔" (باب ۱۲، آیت ۱-۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیمؑ پر یہ نظرِ عنایت کیوں ہو گئی؟

تَلمُود میں البتہ سیرتِ ابراہیمی کے عراقی دَور کی وہ بیش تر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ مگر دونوں کا تقابُل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصّے کے اہم اجزا میں بیّن تفاوُت نظر آتا ہے، بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تَلمُود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلافِ قیاس باتوں سے بھرا ہوا ہے، اور اس کے برعکس قرآن بالکل مُنقّح صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے اہم واقعاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے، جن میں کوئی لَغویات آنے نہیں پائی ہے۔ توضیحِ مدّعا کے لیے ہم یہاں تَلمُود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، تاکہ ان لوگوں کی غَلَطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔

تَلمُود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود کو مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ اُن کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انھیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا، جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارھویں سال حضرت ابراہیمؑ کو تارح نے حضرت نوحؑ کے پاس پہنچا دیا، اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوحؑ اور اُن کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۴۲ سال چھوٹی تھیں۔ (بائبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی صرف ۱۰ سال بتاتی ہے۔) (پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۹۔ اور باب ۱۷، آیت ۱۷)

پھر تَلمُود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پچاس سال کی عمر میں حضرت نوحؑ کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ باپ بت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انھوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اُس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھریلو بُت خانے کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آ کر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا نمرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا، آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے، آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بلا کر حضرت ابراہیمؑ سے باز پرس کی۔ انھوں نے سخت جوابات دیے۔ نمرود نے ان کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا، تاکہ صلاح مشورے سے اس مُقدّمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کرایا گیا اور حضرت ابراہیمؑ اس میں پھینک دیے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے بھائی اور خسر، حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اِسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کرایا، تو اس نے کہا کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی۔ اس لیے خود اس فعل کے مرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡکَرۡبِ

اور یہی نعمت ہم نے نوحؑ کو دی۔ یاد کرو جب کہ اِن سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا[68] تھا۔ ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم[69] سے

جل بُھن کر کوئلا ہو گیا، مگر حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرود کو اس معاملے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے آ کر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا کہ "آسمانی خدا کے بندے! آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا۔" حضرت ابراہیمؑ باہر آ گئے۔ نمرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تلمود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا، اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیمؑ تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرا دے۔ اس نے ان کے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیمؑ کو خود نمرود ہی کے عطا کیے ہوئے ایک غلام، الیعزر نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیمؑ نے بھاگ کر حضرت نوحؑ کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آ کر اُن سے خفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوحؑ اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُر سے حاران چلا گیا۔ (منتخباتِ تلمود از ایچ پولانو، لندن، صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

۶۷ – "حکم اور علم بخشا" بالعموم قرآنِ مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنٰی ہوتا ہے۔ "حکم" سے مراد حکمت بھی ہے، صحیح قوتِ فیصلہ بھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سندِ حکمرانی (authority) حاصل ہونا بھی۔ رہا "علم"، تو اس سے مراد وہ علمِ حق ہے جو وحی کے ذریعے سے عطا کیا گیا ہو۔ (حضرت لوطؑ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، آیات ۶۹ تا ۸۳۔ الحجر، آیات ۵۷ تا ۷۶)

۶۸ – اشارہ ہے حضرت نوحؑ کی اُس دُعا کی طرف جو ایک مدّتِ دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنے کے بعد آخرِ کار تھک کر انھوں نے مانگی تھی کہ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ "پروردگار! میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب میری مدد کو پہنچ۔" (القمر، آیت ۱۰) اور رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا "پروردگار! زمین پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ۔" (نوح، آیت ۲۶)

۶۹ – کَربِ عظیم سے مراد یا تو ایک بدکردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے، یا پھر طوفان۔ (حضرت نوحؑ کے قصّے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳)

الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ
يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ
شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ

نجات دی اور اُس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جُھٹلا دیا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ تھے، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جب کہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدّمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دُوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔٧٠

٧٠ — اس واقعے کا ذکر بائبل میں نہیں ہے، اور یہودی لٹریچر میں بھی ہمیں اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گُھس گئی تھیں۔ اُس نے حضرت داؤدؑ کے ہاں استغاثہ کیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اِسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اُس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اُس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمانؑ کو سمجھایا تھا۔ مگر چونکہ مُقدّمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کے مُقدّمے میں یہی ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہوگا یا نہیں، اور عائد ہوگا تو کس صورت میں ہوگا اور کس صورت میں نہیں، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہوگی۔

اس سیاق و سباق میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیا علیہم السلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور قابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ
صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾
وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ

داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخّر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے[۷۱]، اِس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمھارے فائدے کے لیے زِرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے[۷۲]، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟[۷۳] اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخّر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے

تھے، الوہیّت کا کوئی شائبہ ان میں نہ ہوتا تھا۔ اس مُقدّمے میں حضرت داؤدؑ کی رہنمائی وحی کے ذریعے سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے، حضرت سلیمانؑ کی رہنمائی کی گئی اور انھوں نے صحیح فیصلہ کیا، حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ آگے ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ یہ وہبی کمالات تھے، اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔

ضمناً اِس آیت سے عدالت کا یہ اُصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دو جج ایک مقدمے کا فیصلہ کریں، اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہوگا، لیکن دونوں برحق ہوں گے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور ناتجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ بخاری میں عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا اجتھد الحاکم فاصاب فلہ اجران واذا اجتھد فاخطأ فلہ اجرٌ۔ ’’اگر حاکم اپنی حد تک فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اس کے لیے دُہرا اجر ہے، اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر۔‘‘ ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں بُریدہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ’’قاضی تین قسم کے ہیں۔ ایک ان میں سے جنتی ہے اور دو جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے۔ مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلافِ حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے۔ اور اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے بیٹھ جائے۔‘‘

۷۱ – مَعَ دَاوٗدَ کے الفاظ ہیں، لِدَاوٗدَ کے الفاظ نہیں ہیں، یعنی ’’داؤد علیہ السلام کے لیے‘‘ نہیں بلکہ ’’ان کے ساتھ‘‘ پہاڑ اور پرندے مسخّر کیے گئے تھے، اور اس تسخیر کا حاصل یہ تھا کہ وہ بھی حضرتِ ممدوح کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے

تھے۔ یہی بات سورۂ ص میں بیان کی گئی ہے: اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ۝ ”ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے، اور پرندے بھی مسخر کر دیے تھے جو اکٹھے ہو جاتے تھے، سب اس کی تسبیح کو دُہراتے۔“ سورۂ سبا میں اس کی مزید وضاحت یہ ملتی ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ ”پہاڑوں کو ہم نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ تسبیح دُہراؤ، اور یہی حکم پرندوں کو دیا۔“ ان ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سریلی آواز سے پہاڑ گونج اُٹھتے تھے، پرندے ٹھیر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اس معنٰی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسٰی اَشْعَرِیؓ، جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپؐ نے فرمایا: لقد اوتی مزماراً من مزامیر اٰل داؤد، یعنی اس شخص کو داؤد کی خوش آوازی کا ایک حصہ ملا ہے۔

۷۲ – سورۂ سبا میں مزید تفصیل یہ ہے: وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ”اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے حضرت داؤدؑ کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی، اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔ موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنٰی پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ دُنیا میں لوہے کے استعمال کا دَور (iron-age) ۱۲۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے۔ اوّل اوّل شام اور ایشیائے کُوچک کی حِتّی قوم (Hittites) کو، جس کے عروج کا زمانہ ۲۰۰۰ ق م سے ۱۲۰۰ ق م تک رہا ہے، لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا، اور وہ شدت کے ساتھ اس کو دُنیا بھر سے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا، وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ عام استعمال میں نہ آ سکتا تھا۔ بعد میں فِلِستیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طالوت کی بادشاہی سے پہلے حِتّیوں اور فِلِستیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے تقریباً بے دخل کر دیا تھا، بائبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے۔ (یشوع، باب ۱۷، آیت ۱۶۔ قُضاۃ، باب ۱، آیت ۱۹۔ باب ۴، آیت ۲-۳) ۱۰۲۰ ق م میں جب طالوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا ہوا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا بڑا حصّہ واپس لے لیا، اور پھر حضرت داؤدؑ (۱۰۰۴-۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرقِ اُرْدُن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصّے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں آہن سازی کا وہ راز جو حِتّیوں اور فِلِستیوں کے قبضے میں تھا، بے نقاب ہو گیا، اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ فلسطین کے جنوب میں اُدُوم کا علاقہ خام لوہے (iron ore) کی دولت سے مالا مال ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ

برکتیں رکھی ہیں، ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو

اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عَقَبہ اور اَیلہ سے متصل حضرت سلیمانؑ کے زمانے کی بندرگاہ، عِصْیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے، اس کے معاینے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اُصول استعمال کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (blast furnace) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قُدرتی بات ہے کہ حضرت داؤدؑ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی ہی مدت پہلے آس پاس کی دشمن قوموں نے اِسی لوہے کے ہتھیاروں سے اُن کی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔

۷۳۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۲۵۱۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۳،۷۔

۷۴۔ اس کی تفصیل سورۂ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ ''اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اُس کا چلنا شام کو۔'' پھر اس کی مزید تفصیل سورۂ ص میں یہ آتی ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۙ ''پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمانؑ کے لیے اِس طرح تابعِ امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک مہینے کی راہ تک کے مقامات کا سفر بسہولت کیا جا سکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ اُن کی مرضی کے مطابق بادِ مُوافق ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے دَورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عِصْیُون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی مَمالک کی طرف جاتے تھے، اور دوسری طرف بحرِ روم کے بندرگاہوں سے ان کا بیڑا (جسے بائبل میں ''ترسیسی بیڑا'' کہا گیا ہے) مغربی مَمالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عِصْیُون جابر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے، اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں اَدوم کے علاقۂ عَرَبہ کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں پگھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآنِ مجید کی اُس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق آئی ہے کہ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ ''اور ہم نے اس کے لیے پگھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا۔'' نیز اِس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک مہینے کی راہ تک ہوا کی رفتار کو ''مسخر'' کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اُس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار

يَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ وَيَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ‌ۚ وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَۙ ۝۸۲

اس کا تابع بنا دیا تھا جو اُس کے لیے غوطے لگاتے اور اِس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگراں ہم ہی تھے۔[۷۵]

بادِ مُوافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمانؑ پر یہ کرمِ خاص تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے دونوں بحری بیڑوں کو ان کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ (اس کے حکم سے چلتی تھی) کے ظاہر الفاظ سے مُترشّح ہوتا ہے، تو یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے۔ جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دُکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۷۵ — سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ‌ؕ وَمَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِيۡرِ ۝ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ‌ؕ ...... فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ‌ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ۝ ”اور جنّوں میں سے ایسے جنّ ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے، اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اس کے لیے جیسے وہ چاہتا، قصر اور مجسّمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے .... پھر جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو ان جنّوں کو اس کی موت پر مُطّلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، مگر زمین کا کیڑا (یعنی گھُن) جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنّوں کو پتا چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو اِس ذلّت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔“ اِس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جنّ تھے، اور جنّ بھی وہ جن جن کے بارے میں مشرکینِ عرب کا یہ عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علمِ غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآنِ مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے تعصبات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلق ”شیطان“ اور ”جنّ“ کے الفاظ استعمال کرتا ہے، وہاں اس کی مراد کون سی مخلوق ہوتی ہے، اور قرآن کی رُو سے وہ کون سے جنّ ہیں جن کو مشرکینِ عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جنّ اور شیاطین جو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۸۳﴾
فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَکَشَفۡنَا مَا بِہٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَیۡنٰہُ اَہۡلَہٗ وَمِثۡلَہُمۡ

اور یہی (ہوش مندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ[76] کو دی تھی۔ یاد کرو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے"۔[77] ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور جو تکلیف اُسے تھی اس کو دُور کر دیا،[78] اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ

حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور آس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں اُن کی اِس تاویل کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصّہ آیا ہے، وہاں کا سیاق و سباق اور اندازِ بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انھی کی کون سی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اہرامِ مصر سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسان نے نہیں بنایا ہے، اور کس بادشاہ یا رئیس یا مَلِکُ التُّجّار کے لیے وہ "جن" اور "شیاطین" فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمانؑ کے لیے فراہم کر رہے ہیں؟

۷۶- حضرت ایوبؑ کی شخصیت، زمانہ، قومیّت، ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جدید زمانے کے محققین میں سے کوئی ان کو اسرائیلی قرار دیتا ہے، کوئی مصری اور کوئی عرب۔ کسی کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے کا ہے، کوئی انھیں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے زمانے کا آدمی قرار دیتا ہے، اور کوئی ان سے بھی متأخر۔ لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد اُس سِفرِ ایوب یا صحیفۂ ایوب پر ہے جو بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں شامل ہے۔ اسی کی زبان، اندازِ بیان، اور کلام کو دیکھ کر یہ مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، نہ کہ کسی اور تاریخی شہادت پر۔ اور اس سِفرِ ایوب کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد ہے اور اس کا بیان قرآنِ مجید کے بیان سے بھی اتنا مختلف ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں مانا جا سکتا، لہٰذا ہم اس پر قطعاً اعتماد نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد شہادت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یسعیاہ نبی اور حزقی ایل نبی کے صحیفوں میں ان کا ذکر آیا ہے، اور یہ صحیفے تاریخی حیثیت سے زیادہ مستند ہیں۔ یسعیاہ نبی آٹھویں صدی اور حزقی ایل نبی چھٹی صدی قبلِ مسیح میں گزرے ہیں، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نویں صدی یا اس سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ رہی ان کی قومیت، تو سورۂ نساء، آیت ۱۶۳ اور سورۂ اَنعام، آیت ۸۴ میں جس طرح ان کا ذکر آیا ہے، اس سے گمان تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر وہب بن مُنَبِّہ کا یہ بیان بھی کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے عیسُو کی نسل سے تھے۔

۷۷- دُعا کا انداز کس قدر لطیف ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس

مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

اتنے ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔[۷۹]

یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ "تو ارحم الراحمین ہے"۔ آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرضِ مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرزِ دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی پے در پے فاقوں سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ "میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں"، آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

۷۸- سورۂ ص کے چوتھے رُکوع میں اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ○ "اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے نہانے کو اور پینے کو۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پاؤں مارتے ہی اللہ نے ان کے لیے ایک قدرتی چشمہ جاری کر دیا، جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اس سے غسل کرنے اور اس کو پینے سے ان کی بیماری دُور ہوگئی۔ یہ علاج اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو کوئی سخت جِلدی بیماری ہوگئی تھی، اور بائبل کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان کا جسم سر سے پاؤں تک پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ (ایوب، باب ۲، آیت ۷)

۷۹- اس قصّے میں قرآنِ مجید حضرت ایوبؑ کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سِفرِ ایوبؑ پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسّم شکایت، اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اُس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں: "نابود ہو وہ دن جس میں مَیں پیدا ہوا۔" "میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا۔" "میں نے پیٹ سے نکلتے ہی جان کیوں نہ دے دی۔" اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ "قادرِ مُطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری رُوح انھی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراوَنی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں۔" "اے بنی آدم کے ناظر! اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے، یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دُور کر دیتا؟" "میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے مُلزم نہ ٹھیرا۔ مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مشوَرت کو روشن کرے؟" اُس کے تین دوست اسے آ کر تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے، اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم

Maktaba Tul Ishaat.com

ہے جو مجھ جیسے ایک متقی وعبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکو کار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخرِ کار اس کے دوست اس کی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہوتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی، جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا، بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوبؑ کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ ”اس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھیرایا۔“ اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور ایوبؑ کے درمیان خوب دُو بدُو بحث ہوتی ہے۔ اِس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اُس صبرِ مجسّم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصّہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصّہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصّہ کہتا ہے کہ ایوبؑ ایک نہایت راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ ”اہلِ مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔“ ایک روز خدا کے ہاں اُس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوبؑ پر فخر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا: آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے، اس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا؟ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے، وہ آپ کے منہ پر آپ کی ”تکفیر“ نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا: اچھا، اس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیو۔ شیطان نے جا کر ایوبؑ کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا، اور ایوبؑ ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا، مگر ایوبؑ کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا: ”ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔“ پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ اُن کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوبؑ کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا: جناب! ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھیے، وہ آپ کے منہ پر آپ کی ”تکفیر“ کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا: اچھا، جا، اُس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور آ کر اس نے ”ایوب کو تلوے سے چاند تک دردناک پھوڑوں سے دُکھ دیا۔“ اس کی بیوی نے اس سے کہا: ”کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا۔“ اس نے جواب دیا: ”تو نادان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دُکھ نہ پائیں؟“

یہ ہے سِفرِ ایوبؑ کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوبؑ کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات والزامات کی ایک مسلسل داستان ہے،

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ

اور یہی نعمت اسماعیلؑ اور ادریسؑ[۸۰] اور ذوالکفلؑ[۸۱] کو دی، کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو

اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوبؑ کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب دُوبدُو بحث کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توکّل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوبؑ ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دُور کر دیتے ہیں، اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا، اس سے دوچند دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصّے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوبؑ اور اللہ میاں دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے، تاکہ شیطان کے سامنے ان کی ہیٹی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوبؑ کا۔ بلکہ یہ حضرت ایوبؑ کے زمانے کا بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصّۂ ایوبؑ کو بنیاد بنا کر ''یوسف زلیخا'' کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوبؑ، الیفز تیمانی، سوخی بِلدد، نعماتی ضُوفر، براکیل بُوزی کا بیٹا الیہو، چند کریکٹر ہیں جن کی زبان سے نظامِ کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زورِ بیان کی جس قدر جی چاہے داد دے لیجیے، مگر کُتبِ مقدّسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنیٰ نہیں۔ ایوبؑ کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ''یوسف زلیخا'' کا تعلق سیرتِ یُوسُفی سے ہے، بلکہ شاید اُتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصّے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، اُن میں صحیح تاریخ کا ایک عُنصر پایا جاتا ہے، اور وہ شاعر نے یا تو زبانی رِوایات سے لیا ہو گا جو اس کے زمانے میں مشہور ہوں گی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہو گا جو اب ناپید ہے۔

۸۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، تفسیر سورۂ مریم، حاشیہ ۳۳۔

۸۱ – ذُوالکِفل کا لفظی ترجمہ ہے ''صاحبِ نصیب''، اور مُراد ہے اَخلاقی بزرگی اور ثوابِ آخرت کے لحاظ سے صاحبِ نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگ کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآنِ مجید میں دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے، نام نہیں لیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملے میں بہت مضطرب ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریّاؑ کا دوسرا نام ہے (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے)، کوئی کہتا ہے یہ حضرت الیاسؑ ہیں، کوئی یُوشَعؑ بن نُون کا نام لیتا ہے، کوئی کہتا ہے یہ اَلْیَسَعؑ ہیں، (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورۂ صٓ میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذُوالکفل کا الگ)، کوئی انھیں حضرت اَلْیَسَعؑ کا خلیفہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا

ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔
اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔[۸۲] یاد کرو جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا[۸۳]

بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بِشر تھا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ ''یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقیال (حزقی ایل) نبی ہیں، جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ ق م) کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہرِ خابُور کے کنارے ایک بستی میں فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے۔''

ان مختلف اقوال کی موجودگی میں یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے، لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکے۔ تاہم اگر اس کے لیے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفۂ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں جو اس آیت میں کی گئی ہے، یعنی صابر اور صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بُخْتِ نَصَّر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بُخْتِ نصّر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دریائے خابُور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تلِ اَبِیب تھا۔ اِسی مقام پر ۵۹۴ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے، جب کہ ان کی عمر ۳۰ سال تھی، اور مسلسل ۲۲ سال تک ایک طرف گرفتارِ بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کو چونکانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کارِ عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا، اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال اُن کی بیوی، جنھیں وہ خود ''منظورِ نظر'' کہتے ہیں، انتقال کر جاتی ہیں، لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور یہ اپنا دُکھڑا چھوڑ کر اپنی مِلّت کو خدا کے اس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اس کے سر پر تُلا کھڑا تھا۔ (باب ۲۴، آیات ۱۵-۲۷) بائبل کا صحیفۂ حزقی ایل ان صحیفوں میں سے ہے جنھیں پڑھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الہامی کلام ہے۔

۸۲ – مراد ہیں حضرت یُونُسؑ۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں ''ذوالنُّون'' اور ''صاحب الحُوت''، یعنی ''مچھلی والے'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا اُنھیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں پکڑتے یا بیچتے تھے، بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا، جیسا کہ سورۂ صافات، آیت ۱۴۲ میں بیان ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، یونس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ الصّافّات حواشی ۷۷ تا ۸۵)

۸۳ – یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے، قبل اِس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور اُن کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ
سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ
مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ
رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ
وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي
الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔[84] آخر کو اُس نے تاریکیوں میں سے پکارا:[85] ”نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔“ تب ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اِسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

اور زکریاؑ کو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”اے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور بہترین وارث تو تُو ہی ہے۔“ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اسے یحییٰؑ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے دُرست کر دیا۔[86] یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دَوڑ دھوپ کرتے تھے، اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جُھکے ہوئے تھے۔[87]

---

۸۴ – انھوں نے خیال کیا کہ اس قوم پر تو عذاب آنے والا ہے، اب مجھے کہیں چل کر پناہ لینی چاہیے، تاکہ خود بھی عذاب میں نہ گِھر جاؤں۔ یہ بات بجائے خود تو قابلِ گرفت نہ تھی، مگر پیغمبر کا اذنِ الٰہی کے بغیر ڈیوٹی سے ہٹ جانا قابلِ گرفت تھا۔

۸۵ – یعنی مچھلی کے پیٹ میں سے، جو خود تاریک تھا، اور اُوپر سے سمندر کی تاریکیاں مزید۔

۸۶ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، آیات ۳۷ تا ۴۱ مع حواشی۔ جلد سوم، مریم، آیات ۲ تا ۱۵ مع حواشی۔ بیوی کو دُرست کر دینے سے مراد ان کا بانجھ پن دُور کر دینا اور سن رسیدگی کے باوجود حمل کے قابل بنا دینا ہے۔ ”بہترین وارث تو تُو ہی ہے“، یعنی تو اولاد نہ بھی دے تو غم نہیں، تیری ذات پاک وارث ہونے کے لیے کافی ہے۔

۸۷ – اس سیاق و سباق میں انبیاؑ کا ذکر جس مقصد کے لیے کیا گیا ہے، اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ
اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ

اور وہ خاتون جس نے اپنی عِصمت کی حفاظت کی تھی[88]۔ ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح سے پھُونکا[89] اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو دُنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا[90]۔

یہ تمھاری اُمّت حقیقت میں ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمھارا رب ہوں،

اُلوہیّت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونسؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اُولُوا العزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہوا تو انھیں پکڑ لیا گیا۔ اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوبؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلائے مصیبت ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاؑ توحید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو، مگر آخرکار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوئی ہیں۔

۸۸ – مراد ہیں حضرت مریم علیہا السلام۔

۸۹ – حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (ص، آیات ۷۱-۷۲) ''میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس (اے فرشتو!) جب میں اسے پورا بنالوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔'' اور یہی بات حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗٓ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (آیت ۱۷۱) ''اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح۔'' اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہوا: وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (آیت ۱۲) ''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، پس پھونک دیا ہم نے اُس میں اپنی رُوح سے۔'' اس کے ساتھ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ

ع ١٨

فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ
يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ
كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى

پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انھوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا[91] ــــــ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے، ع پھر جو نیک عمل کرے گا، اِس حال میں کہ وہ مومن ہو، تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے[92]۔ یہاں تک کہ

كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (آیت ۵۹) ''عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے، جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا: ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتا ہے۔'' ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معمولی طریقۂ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہِ راست اپنے حکم سے وجود میں لا کر زندگی بخشتا ہے تو اس کو ''اپنی روح سے پھونکنے'' کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس رُوح کی نسبت اللہ کی طرف غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس کا پھونکا جانا معجزے کی غیر معمولی شان رکھتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ٢١٢-٢١٣)

۹۰ - یعنی یہ دونوں ماں بیٹے خدا یا خدائی میں شریک نہ تھے بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ ''نشانی'' وہ کس معنی میں تھے، اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ مریم، حاشیہ ٢١ - اور سورۂ المومنون، حاشیہ ۴٣۔

۹۱ - ''تم'' کا خطاب تمام انسانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو! تم سب حقیقت میں ایک ہی اُمّت اور ایک ہی ملّت تھے، دُنیا میں جتنے نبی بھی آئے، وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے، وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک ایک جُز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملّتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فُلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملّتوں اور مذہبوں کا تفرِقہ انبیاؑ کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ یہ مختلف ملّتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاؑ کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملّتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاؑ کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاؑ دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَ
اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ط
يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ إِنَّكُمْ

جب یاجُوج و ماجُوج کھول دیے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے پُورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا[۹۳]، تو یکایک اُن لوگوں کے دِیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے: ''ہائے ہماری کم بختی! ہم اِس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، بلکہ ہم خطاکار[۹۴] تھے۔'' بے شک تم

۹۲- اس آیت کے تین مطلب ہیں:

ایک، یہ کہ جس قوم پر ایک مرتبہ عذابِ الٰہی نازل ہو چکا ہو، وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ اس کی نشأۃِ ثانیہ اور اس کی حیاتِ نَو ممکن نہیں ہے۔

دوسرے، یہ کہ ہلاک ہو جانے کے بعد پھر اِس دُنیا میں اُس کا پلٹنا اور اسے دوبارہ امتحان کا موقع ملنا غیر ممکن ہے۔ پھر تو اللہ کی عدالت ہی میں اُس کی پیشی ہوگی۔

تیسرے، یہ کہ جس قوم کی بدکاریاں اور زیادتیاں اور ہدایتِ حق سے پیہم رُوگردانیاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر رُجوع اور توبہ و انابت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اُس کے لیے پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ضلالت سے ہدایت کی طرف پلٹ سکے۔

۹۳- یاجُوج و ماجُوج کی تشریح سورۂ کہف حاشیہ ۶۲ و ۶۹ میں کی جا چکی ہے۔ اُن کے کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ ''وعدۂ حق پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا'' کا اشارہ صاف طور پر اِس طرف ہے کہ یاجوج و ماجوج کی یہ عالم گیر یورش آخری زمانے میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آ جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنٰی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے حُذیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کی رِوایت سے نقل کیا ہے کہ ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو: دُھواں، دجّال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طُلوع، عیسٰی ابنِ مریمؑ کا نزول، یاجُوج و ماجُوج کی یورش، اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسا، یا landslide) ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی۔ (یعنی بس اس کے بعد

وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾
لَوۡ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا ؕ وَكُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمۡ

اور تمھارے وہ معبود جنھیں تم پُوجتے ہو، جہنّم کا ایندھن ہیں، وہیں تم کو جانا ہے۔[۹۵] اگر
یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اِسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ

قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج و ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضورؐ نے فرمایا: اُس وقت قیامت اِس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پیٹوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جَن دے، رات کو یا دن کو۔ (کالحامل المتم لا یدری اھلھا متی تفجؤھم بولدھا لیلا او نھارًا) لیکن قرآنِ مجید اور احادیث میں یاجوج و ماجوج کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ مُترشح نہیں ہوتا کہ یہ دونوں متحد ہوں گے اور مل کر دُنیا پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں یہ دونوں آپس ہی میں لڑ جائیں اور پھر ان کی لڑائی ایک عالم گیر فساد کی موجب بن جائے۔

۹۴- ''غفلت'' میں پھر ایک طرح کی معذرت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنی غفلت کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی صاف صاف اعتراف کریں گے کہ ہم کو انبیاءؑ نے آکر اِس دن سے خبردار کیا تھا، لہٰذا درحقیقت ہم غافل و بے خبر نہ تھے بلکہ خطا کار تھے۔

۹۵- روایات میں آیا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن اَلزِّبَعرَیٰ نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو صرف ہمارے ہی معبود نہیں، مسیحؑ اور عُزیرؑ اور ملائکہ بھی جہنّم میں جائیں گے، کیونکہ دُنیا میں ان کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم، کل من احبّ ان یعبد من دون اللّٰہ فھو مع من عبدہٗ، ''ہاں، ہر وہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُس کی بندگی کی جائے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جنھوں نے اس کی بندگی کی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے خلقِ خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انھی کو معبود بنا بیٹھے، یا جو غریب اِس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دُنیا میں ان کی بندگی کی جارہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کے جہنّم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اس شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ البتہ جنھوں نے خود معبود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلقِ خدا کے اِس شرک میں واقعی دخل ہے، وہ سب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنّم میں جائیں گے۔ اِسی طرح وہ لوگ بھی جہنّم میں جائیں گے جنھوں نے اپنی اغراض کے لیے غیراللہ کو معبود بنوایا، کیونکہ اس صورت میں مشرکین کے اصلی معبود وہی قرار پائیں گے، نہ کہ وہ جن کو اِن اَشرار نے بظاہر معبود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے، کیونکہ اُس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبود بنایا جاتا ہے، اصل معبود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے، جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامانِ پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنّم میں داخل کیا جائے گا، تاکہ وہ ان پر آتشِ جہنّم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انھیں مزید تکلیف ہو، کہ جن سے

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيهَا زَفِيرٌ وَّهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا
الْحُسْنَىٰٓ ۙ أُولَٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ
فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ
وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ
نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ

پُھنکارے ماریں[96] گے اور حال یہ ہوگا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہوگا، تو وہ یقیناً اُس سے دُور رکھے جائیں[97] گے، اُس کی سرسراہٹ تک نہ سُنیں گے، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے۔ وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت اُن کو ذرا پریشان نہ کرے[98] گا، اور ملائکہ بڑھ کر اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ "یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔"

وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طُومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم پھر اُس کا

وہ شفاعت کی اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے، وہ اُن پر اُلٹے عذاب کی شدّت کے موجب بنے ہوئے ہیں۔

۹۶ – اصل میں لفظ زَفِیْرٌ استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور تکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اس کو ایک پُھنکار کی شکل میں نکالتا ہے، تو اسے عربی میں زفیر کہتے ہیں۔

۹۷ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دُنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ وعدہ فرما چکا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور ان کو نجات دی جائے گی۔

۹۸ – یعنی روزِ محشر اور خدا کے حضور پیشی کا وقت، جو عام لوگوں کے لیے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہوگا، اس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لیے کہ سب کچھ اُن کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایمان وعملِ صالح کی جو پونجی لیے ہوئے وہ دُنیا سے رخصت ہوئے تھے، وہ اُس وقت خدا کے فضل سے اُن کی ڈھارس بندھائے گی اور خوف وحُزن کے بجائے ان کے دلوں میں یہ اُمید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے

نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ
مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِىْ هٰذَا
لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمّے، اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے۔ اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ اِس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔[۹۹]

اے محمدؐ! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دُنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔[۱۰۰]

نتائجِ خیر سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

۹۹ – اِس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کَنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دُنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرماں روائی اور زمین کے وسائل پر تصرّف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انھی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کُلّیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے، جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے، اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر اُن قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دُنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر، سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں، جنھیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فِسق، فُجور، مَعصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرماں رواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کُھلّم کُھلّا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدِّ مقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمین ہوئے ہیں۔ اِس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کُلّیہ تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ ''صالح'' کے اُس مفہوم میں ہے جو اَب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں ''صالح'' قرار پا سکیں، قطعِ نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ہوں، یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ ''صلاح'' کو ڈارونی تصورِ ''صلاحیت'' (fitness) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس نئی تفسیر کی رُو سے آیتِ زیرِ بحث کے معنٰی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی مَمالک کو فتح کرنے اور اُن پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی ''خدا کا صالح بندہ'' ہے اور اس کا یہ فعل تمام ''عابد'' انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ''عبادت'' اِس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجے میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو، تو نہ تمھارا شمار صالحین میں ہوسکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ معنٰی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر ''صلاح'' اور ''عبادت'' کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرُّسُل، ایمان بالکُتُب) کیا ہے جس کے بغیر، خود اِسی قرآن کی رُو سے، خدا کے ہاں کوئی عملِ صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اِس دعوت کے کیا معنٰی ہیں کہ اُس نظامِ اخلاق اور قانونِ زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسولؐ کے ذریعے سے بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنٰی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے، وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان داری کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غَلَطی ہوئی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنٰی بدل ڈالے، تاکہ وہ سب اُن کی اِس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں، اور اس ایک چیز کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انھوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو اُلٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مَرمّتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں، اُن کو یہ اُلٹا الزام دیتے ہیں کہ ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں''۔ یہ دراصل مادّی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تأمُّل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غَلَطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اُصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص، جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقوٰی اور بھلائی کہتا ہے، وہ ''مادّی ترقی اور حکمرانی کی صلاحیت'' کی ہم معنٰی نہیں ہے، اور ''صالح'' کو اگر ''صاحبِ صلاحیت'' کے معنٰی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہُوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سِیاق وسَباق سے الگ کر کے بے تکلُّف جو معنٰی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنٰی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق وسباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اُوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے، وہ عالَمِ آخرت میں مومنین، صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکایک اِس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کون سا موقع تھا کہ دُنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اُصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر

اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اُس اَبدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظامِ زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون، آیات ۴-۱۱ میں بھی ارشاد ہُوا ہے، اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زُمر کے خاتمے پر بیان کیا گیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صُورِ اوّل وثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفر کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ ’’اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا، وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے لیے جنّت کے دروازے کھول دیے جائیں گے، اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ اب اِس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اُس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔‘‘ دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالَمِ آخرت سے ہے نہ کہ اس دُنیا سے۔

اب زَبور کو لیجیے جس کا حوالہ آیت زیرِ بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اِس وقت پائی جاتی ہے، یہ اپنی اصلی غیر مُحرّف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزامیرِ داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خَلط مَلط ہو گئے ہیں اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زَبور اس وقت موجود ہے، اس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکّل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

’’کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے، لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، مُلک کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا، تُو اُس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہو گا، لیکن حلیم مُلک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے .... ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہو گی .... صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔‘‘ (۳۷ داؤد کا مزمور، آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹)

دیکھیے، یہاں راست باز لوگوں کے لیے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں کی رُو سے خلود اور اَبدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے، نہ کہ اِس دُنیا کی زندگی سے۔

دُنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے، اسے سورۂ اعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ (آیت ۱۲۸) ’’زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔‘‘ مشیّتِ الٰہی کے تحت یہ وراثت مومن اور کافر، صالح اور فاسق، فرماں بردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے، مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر، جیسا کہ اِسی آیت کے بعد دوسری آیت میں فرمایا: وَيَسْتَخْلِفَكُمْ

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰىٓ اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ
مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اِن سے کہو: ”میرے پاس جو وحی آتی ہے، وہ یہ ہے کہ تمھارا خدا صرف ایک خدا ہے، پھر کیا تم سرِ اطاعت جُھکاتے ہو؟“ اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ ”میں نے عَلَی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[101]، قریب ہے یا دُور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو بآوازِ بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چُھپا کر کرتے ہو[102]۔

فِی الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿ (آیت ۱۲۹) ”اور وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔“ اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک ضابطے کے مطابق دُنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس آخرت میں اِسی زمین کا دوامی بندوبست ہوگا، اور قرآن کے متعدد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اِس قاعدے پر ہوگا کہ ”زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنینِ صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر نہیں، بلکہ اُس نیک رَوِیّے کی اَبدی جزا کے طور پر جو انھوں نے دُنیا میں اختیار کیا۔“ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، النور، حاشیہ ۸۳)

۱۰۰ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے تم کو دُنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔“ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت دراصل نوعِ انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے، کیونکہ آپؐ نے آ کر غفلت میں پڑی ہوئی دُنیا کو چونکایا ہے، اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے، اور اس کو بالکل غیر مُشتبہ طریقے سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کون سی ہے اور سلامتی کی راہ کون سی۔ کفارِ مکہ حضوؐر کی بِعثَت کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت تمھارے لیے خدا کی رحمت ہے۔

۱۰۱ – یعنی خدا کی پکڑ جو دعوتِ رسالت کو ردّ کر دینے کی صورت میں آئے گی، خواہ کسی نوعیت کے عذاب کی شکل میں آئے۔

۱۰۲ – اشارہ ہے اُن مخالفانہ باتوں اور سازشوں اور سرگوشیوں کی طرف جن کا آغازِ سورہ میں ذکر کیا گیا تھا۔ وہاں بھی رسولؐ کی زبان سے اِن کا یہی جواب دلوایا گیا تھا کہ جو باتیں تم بنا رہے ہو، وہ سب خدا سُن رہا ہے اور جانتا ہے۔ یعنی

وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ
احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

ع ۷ — النصف

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمھارے لیے ایک فتنہ[۱۰۳] ہے اور تمھیں ایک وقتِ خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔''

(آخرِ کار) رسولؐ نے کہا کہ ''اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو، اُن کے مقابلے میں ہمارا ربِّ رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے۔'' ع

اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ہوا میں اُڑ گئیں اور کبھی ان کی باز پُرس نہ ہو گی۔

۱۰۳ - یعنی تم اس تاخیر کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تاخیر تو اس لیے کی جا رہی ہے کہ تمھیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دی جائے اور جلد بازی کر کے فوراً ہی نہ پکڑ لیا جائے۔ مگر تم اِس سے اِس غلط فہمی میں پڑ گئے ہو کہ نبی کی سب باتیں جھوٹی ہیں، ورنہ اگر یہ سچا نبی ہوتا اور خدا ہی کی طرف سے آیا ہوتا، تو اس کو جھٹلا دینے کے بعد ہم کبھی کے دھر لیے گئے ہوتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الحج

(۲۲)

الحج

نام چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس سورہ میں مکّی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات ملی جُلی پائی جاتی ہیں۔ اِسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہوا ہے کہ یہ مکّی ہے یا مدنی۔ لیکن ہمارے نزدیک اِس کے مضامین اور اندازِ بیان کا یہ رنگ اِس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکّی دَور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دَور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

ابتدائی حصّے کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتاتا ہے کہ یہ مکّے میں نازل ہوا ہے، اور اغلب یہ ہے کہ مکّی زندگی کے آخری دَور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا ہو۔ یہ حصہ آیت ۲۴ (وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ) پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر تک کا حصہ مدینۂ طیّبہ میں نازل ہوا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ذی الحجہ میں نازل ہُوا ہو، کیونکہ آیات ۲۵ تا ۴۱ کا مضمون اِسی بات کی نشان دہی کرتا ہے، اور آیات ۳۹-۴۰ کی شانِ نُزول بھی اس کی مؤید ہے۔ اُس وقت مہاجرین ابھی تازہ تازہ ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے میں آئے تھے۔ حج کے زمانے میں اُن کو اپنا شہر اور حج کا اجتماع یاد آرہا ہوگا اور یہ بات بُری طرح کَھل رہی ہوگی کہ مشرکینِ قریش نے اُن پر مسجدِ حرام کا راستہ تک بند کر دیا ہے۔ اُس زمانے میں وہ اس بات کے بھی منتظر ہوں گے کہ جن ظالموں نے ان کو گھروں سے نکالا، مسجدِ حرام کی زیارت سے محروم کیا، اور خدا کا راستہ اختیار کرنے پر ان کی زندگی تک دشوار کر دی، اُن کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ ٹھیک نفسیاتی موقع تھا اِن آیات کے نُزول کا۔ اِن میں پہلے تو حج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مسجدِ حرام اس لیے بنائی گئی تھی اور یہ حج کا طریقہ اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ دُنیا میں خدائے واحد کی بندگی کی جائے، مگر آج وہاں شرک ہو رہا ہے اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والوں کے لیے اس کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں اور انھیں بے دخل کر کے ملک میں وہ نظامِ صالح قائم کریں جس میں بُرائیاں دبیں اور نیکیاں فروغ پائیں۔ ابنِ عباسؓ، مجاہد، عُروَہ بن زُبیر، زید بن اسلم، مُقاتل بن حَیّان، قتادہ اور دوسرے اکابر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ پہلی آیت ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور حدیث و سیرت کی روایات سے ثابت ہے کہ اِس اجازت کے بعد فوراً ہی قریش کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں، اور پہلی مہم صفر ۲ ھ میں ساحل بحر احمر کی طرف روانہ ہوئی جو غزوۂ وَدّان یا غزوۂ اَبوا کے نام سے مشہور ہے۔

موضوع و مَبحَث اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں: مشرکینِ مکہ، مذبذب اور متردّد مسلمان، اور مومنینِ صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکے میں کی گئی اور مدینے میں اُس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ مُتنبِہّ کیا گیا ہے کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے بے بنیاد جاہلانہ خیالات پر اصرار کیا، خدا کو چھوڑ کر اُن معبُودوں پر اعتماد کیا جن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اور خدا کے رسولؐ کو جھٹلا دیا۔ اب تمھارا انجام وہی کچھ ہو کر رہے گا جو تم سے پہلے اس رَوِش پر چلنے والوں کا ہو چکا ہے۔ نبی کو جھٹلا کر اور اپنی قوم کے صالح ترین عُنصر کو نشانۂ ستم بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خدا کا جو غضب تم پر نازل ہوگا، اس سے تمھارے بناوٹی معبود تمھیں نہ بچا سکیں گے۔ اس تنبیہ و اِنذار کے ساتھ افہام و تفہیم کا پہلو بالکل خالی نہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری سورت میں جگہ جگہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ آخر کیسا ایمان ہے کہ راحت، مَسرّت، عیش نصیب ہو تو خدا تمھارا خدا اور تم اس کے بندے۔ مگر جہاں خدا کی راہ میں مصیبت آئی اور سختیاں جھیلنی پڑیں، پھر نہ خدا تمھارا خدا رہا اور نہ تم اس کے بندے رہے۔ حالانکہ تم اپنی اس رَوِش سے کسی ایسی مصیبت اور نقصان اور تکلیف کو نہیں ٹال سکتے جو خدا نے تمھارے نصیب میں لکھ دی ہو۔

اہلِ ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے: ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطَب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی۔ اور دوسرے خطاب میں صرف اہل ایمان مخاطب ہیں۔

پہلے خطاب میں مشرکینِ مکہ کی اس رَوِش پر گرفت کی گئی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے، حالانکہ مسجدِ حرام ان کی ذاتی جائداد نہیں ہے اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے۔ یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بجائے خود حق بجانب تھا، بلکہ سیاسی حیثیت سے یہ قریش کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بھی تھا۔ اس سے عرب کے تمام دوسرے قبائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا گیا کہ قریش حرم کے مجاور ہیں یا مالک؟ اگر آج اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر وہ ایک

گروہ کو حج سے روک دیتے ہیں اور اس کو برداشت کر لیا جاتا ہے، تو کیا بعید ہے کہ کل جس سے بھی اُن کے تعلقات خراب ہوں، اُس کو وہ حُدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیں اور اس کا عمرہ و حج بند کر دیں۔ اس سلسلے میں مسجدِ حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کے حکم سے اس کو تعمیر کیا تھا تو سب لوگوں کو حج کا اِذنِ عام دیا تھا اور وہاں اوّل روز سے مَقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حُقوق یکساں قرار دیے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھر شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا، اب یہ کیا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع، اور بتوں کی پرستش کے لیے ہو پوری آزادی۔

دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تمھیں اقتدار حاصل ہو تو تمھاری رَوِش کیا ہونی چاہیے اور اپنی حکومت میں تم کو کس مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہ مضمون سورہ کے وسط میں بھی ہے اور آخر میں بھی۔ آخر میں گروہِ اہلِ ایمان کے لیے ’’مسلم‘‘ کے نام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کے اصل جانشین تم لوگ ہو، تمھیں اِس خدمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے کہ دُنیا میں شہادت عَلَی النَّاس کے مَقام پر کھڑے ہو، اب تمھیں اِقامتِ صلوٰۃ، اِیتائے زکوٰۃ اور فعلِ الخیرات سے اپنی زندگی کو بہترین نمونے کی زندگی بنانا چاہیے اور اللہ کے اعتماد پر اِعلائے کَلِمَۃُ اللہ کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

اس موقع پر سورہَ بَقَرہ اور سورہَ اَنفال کے دیباچوں پر بھی نگاہ ڈال لی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتها ۷۸ سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔[۱]

۱ – یہ زلزلہ قیامت کی ابتدائی کیفیات میں سے ہے، اور اغلب یہ ہے کہ اس کا وقت وہ ہوگا جب کہ زمین یکا یک اُلٹی پھرنی شروع ہو جائے گی اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طُلوع ہوگا۔ یہی بات قدیم مفسرین میں سے عَلْقمہ اور شَعْبی نے بیان کی ہے کہ یکون ذٰلک عند طلوع الشمس من مغربھا۔ اور یہی بات اُس طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو ابن جَریر اور طَبرانی اور ابنِ ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ نفخِ صُور کے تین مواقع ہیں: ایک نَفخِ فَزَع، دوسرا نفخِ صَعق اور تیسرا نفخِ قیام لِربّ العالمین۔ یعنی پہلا نفخ عام سراسیمگی پیدا کرے گا، دوسرے نفخ پر سب مر کر گر جائیں گے، اور تیسرے نفخ پر سب لوگ زندہ ہو کر خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ پھر پہلے نفخ کی تفصیلی کیفیت بیان کرتے ہوئے آپؐ بتاتے ہیں کہ اُس وقت زمین کی حالت اُس کشتی کی سی ہوگی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو، یا اُس معلّق قندیل کی سی جس کو ہوا کے جھونکے بُری طرح جھنجوڑ رہے ہوں۔ اُس وقت زمین کی آبادی پر جو کچھ گزرے گی، اُس کا نقشہ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ مثلاً:

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ (الحاقہ)	پس جب صُور میں ایک پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑ اُٹھا کر ایک ہی چوٹ میں توڑ دیے جائیں گے، تو وہ واقعۂ عظیم پیش آجائے گا۔
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ (الزلزال)	جب کہ زمین پوری کی پوری ہلا ماری جائے گی، اور وہ اپنے پیٹ کے بوجھ نکال پھینکے گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے۔
يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۙ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ (النازعات)	جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا ایک جھٹکا اور اس کے بعد دوسرا جھٹکا، اس دن دل کانپ رہے ہوں گے اور نگاہیں خوف زدہ ہوں گی۔
اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ (الواقعہ)	جس روز زمین جھنجوڑ ڈالی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح اُڑنے لگیں گے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿۲﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ

جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہو گا کہ ہر دُودھ پلانے والی اپنے دُودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی[۲]، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا[۳]۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں[۴] اور ہر شیطانِ سرکش

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۚ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (المزمل) اگر تم نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو کیسے بچو گے اُس دن کی آفت سے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور جس کی شدت سے آسمان پھٹا پڑتا ہو گا۔

اگر چہ بعض مفسرین نے اس زلزلے کا وقت وہ بتایا ہے جب کہ مُردے زندہ ہو کر اپنے ربّ کے حضور پیش ہوں گے، اور اس کی تائید میں متعدد احادیث بھی نقل کی ہیں، لیکن قرآن کا صریح بیان ان روایات کو قبول کرنے میں مانع ہے۔ قرآن اِس کا وقت وہ بتا رہا ہے جب کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوں گی، اور پیٹ والیوں کے پیٹ گر جائیں گے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آخرت کی زندگی میں نہ کوئی عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہوگی اور نہ کسی حاملہ کے وضعِ حمل یا اسقاط کا کوئی موقع ہوگا، کیونکہ قرآن کی واضح تصریحات کی رُو سے وہاں سب رشتے منقطع ہو چکے ہوں گے اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے خدا کے سامنے حساب دینے کے لیے کھڑا ہوگا۔ لہٰذا قابلِ ترجیح وہی روایت ہے جو ہم نے پہلے نقل کی ہے۔ اگر چہ اس کی سند ضعیف ہے مگر قرآن سے مطابقت اس کے ضعف کو دُور کر دیتی ہے۔ اور یہ دوسری روایات گو سنداً قوی تر ہیں، لیکن قرآن کے ظاہر بیان سے عدمِ مطابقت ان کو ضعیف کر دیتی ہے۔

۲ – آیت میں مُرْضِعٌ کے بجائے مُرْضِعَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربیّت کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ مُرضِع اُس عورت کو کہتے ہیں جو دودھ پلانے والی ہو، اور مُرضِعہ اُس حالت میں بولتے ہیں جب کہ وہ بالفعل دودھ پلا رہی ہو اور بچہ اس کی چھاتی منہ میں لیے ہوئے ہو۔ پس یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ جب وہ قیامت کا زلزلہ آئے گا تو مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ نکلیں گی اور کسی ماں کو یہ ہوش نہ رہے گا کہ اس کے لاڈلے پر کیا گزری۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ ۝۳ كُتِبَ عَلَيۡهِ اَنَّهٗ مَنۡ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ
يَهۡدِيۡهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ۝۴ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ
الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ
مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ

کی پیروی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اُس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا، اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذابِ جہنّم کا راستہ دکھائے گا۔ لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نُطفے سے[5]، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی[6]۔ (یہ ہم اِس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھیرائے

---

۳ – واضح رہے کہ یہاں اصل مقصودِ کلام قیامت کا حال بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ خدا کے عذاب کا خوف دلا کر اُن باتوں سے بچنے کی تلقین کرنا ہے جو اس کے غضب کی موجب ہوتی ہیں۔ لہٰذا قیامت کی اِس مختصر کیفیت کے بعد آگے اصل مقصود پر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

۴ – آگے کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے بارے میں ان کے جس جھگڑے پر گفتگو کی جارہی ہے، وہ اللہ کی ہستی اور اس کے وجود کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حُقوق اور اختیارات اور اس کی بھیجی ہوئی تعلیمات کے بارے میں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے توحید اور آخرت منوانا چاہتے تھے، اور اسی پر وہ آپؐ سے جھگڑتے تھے۔ ان دونوں عقیدوں پر جھگڑا آخرکار جس چیز پر جا کر ٹھیرتا تھا، وہ یہی تھی کہ خدا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، اور یہ کہ کائنات میں آیا خدائی صرف ایک خدا ہی کی ہے، یا کچھ دوسری ہستیوں کی بھی۔

۵ – اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادّوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اِس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا، جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا: وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۚ (آیات ۷-۸) ”انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔“

مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ
لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى
اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى
الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ
وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ

رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بُلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے، تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے[7]۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سُوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اُٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[8]،

۶ – یہ اشارہ ہے اُن مختلف اطوار کی طرف جن سے ماں کے پیٹ میں بچہ گزرتا ہے۔ ان کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خُردبینوں ہی سے نظر آ سکتی ہیں، بلکہ ان بڑے بڑے نمایاں تغیُّرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بدُّو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداءً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے، جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انھی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے علم الجنین کی تفصیلی تحقیقات کی نہ اُس وقت ضرورت تھی نہ آج ہے۔

۷ – یعنی بڑھاپے کی وہ حالت جس میں آدمی کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ وہی شخص جو دوسروں کو عقل بتاتا تھا، بوڑھا ہو کر اُس حالت کو پہنچ جاتا ہے جو بچے کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے۔ جس علم و واقفیت اور تجربہ کاری و جہاں دیدگی پر اس کو ناز تھا، وہ ایسی بے خبری میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ بچے تک اس کی باتوں پر ہنسنے لگتے ہیں۔

۸ – اس سلسلۂ کلام میں یہ فقرہ تین معنیٰ دے رہا ہے: ایک، یہ کہ اللہ ہی سچّا ہے اور تمھارا یہ گمان محض باطل ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ کا وجود محض ایک خیالی اور فرضی وجود نہیں ہے جسے بعض عقلی مشکلات رفع کرنے کی خاطر مان لیا گیا ہو۔ وہ نرا فلسفیوں کے خیال کا آفریدہ، واجب الوجود اور علّت العلل

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور یہ (اِس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اُٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں[9]۔

(first cause) ہی نہیں ہے، بلکہ وہ حقیقی فاعلِ مختار ہے جو ہر آن اپنی قدرت، اپنے ارادے، اپنے علم اور اپنی حکمت سے پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی تدبیر کر رہا ہے۔ تیسرے، یہ کہ وہ کھلنڈرا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے کھلونے بنائے اور پھر یونہی توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دے۔ وہ حق ہے، اس کے سب کام سنجیدہ اور بامقصد اور پُرحکمت ہیں۔

۹ — اِن آیات میں انسان کی پیدایش کے مختلف اطوار، زمین پر بارش کے اثرات، اور نباتات کی پیداوار کو پانچ حقیقتوں کی نشان دہی کرنے والے دلائل قرار دیا گیا ہے:

(۱) یہ کہ اللہ ہی حق ہے،

(۲) یہ کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے،

(۳) یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے،

(۴) یہ کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اور

(۵) یہ کہ اللہ ضرور اُن سب لوگوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا جو مر چکے ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ آثار ان پانچوں حقیقتوں کی کس طرح نشان دہی کرتے ہیں:

پورے نظامِ کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدایش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ ایک ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے، اور ہر ایک کے وجود اور نشو ونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے، جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آئے کہ ایک ایک فردِ انسانی جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے، اس میں ایک حکیم و قادرِ مُطلق ہستی کا ارادی فیصلہ کس شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے، اس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اُس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جا کر کہیں بال، کہیں گوشت اور

کہیں ہڈی بنتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اُس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تخموں کی کثرت کا حال یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے، اُس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بیضۂ اُنثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر یہ کسی حکیم و قدیر اور حاکمِ مطلق کا فیصلہ ہے جو ان بے شمار امیدواروں میں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر چھانٹ کر بیضۂ اُنثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح اِستقرارِ حمل رُونما ہوتا ہے۔ پھر اِستقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بَیضی خَلِیّے (egg cell) کے ملنے سے جو چیز ابتداءً بنتی ہے، وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خُردبین کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ حقیر سی چیز ۹ مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پا کر جن بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے، اُن میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمھارا دل گواہی دے گا کہ یہاں ہر آن ایک حکیمِ فعّال کا ارادی فیصلہ کام کرتا رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل کو پہنچانا ہے اور کسے خون کے لوتھڑے، یا گوشت کی بوٹی، یا ناتمام بچے کی شکل میں ساقط کر دینا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالنا ہے اور کس کو مردہ۔ کس کو معمولی انسان کی صورت و ہیئت میں نکالنا ہے اور کسے اَن گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دینی ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالنا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا، یا ٹُنڈا اور لُنجا بنا کر پھینک دینا ہے۔ کس کو خوب صورت بنانا ہے اور کسے بدصورت۔ کس کو مرد بنانا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر بھیجنا ہے اور کسے کَودن اور کُند ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل، جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحموں میں ہو رہا ہے، اِس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دُنیا کی کوئی طاقت ذرّہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے۔ حالانکہ انسانی آبادیوں کی قسمت کے کم از کم ۹۰ فی صد فیصلے انھی مراحل میں ہو جاتے ہیں، اور یہیں افراد ہی کے نہیں، قوموں کے، بلکہ پوری نوعِ انسانی کے مستقبل کی شکل بنائی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچے دُنیا میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے، اور کس کو قیامت کے بورے سمیٹنے ہیں؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے، اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی کارفرمائی کسی عالمگیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے، جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو اس امر میں شک ہے کہ اللہ ''حق'' ہے اور صرف اللہ ہی ''حق'' ہے، تو بے شک وہ عقل کا اندھا ہے۔

دوسری بات جو پیش کردہ آثار سے ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔'' لوگوں کو تو یہ سُن کر اچنبھا ہوتا ہے کہ اللہ کسی وقت مُردوں کو زندہ کرے گا، مگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آئے کہ وہ تو ہر وقت مُردے جِلا رہا ہے۔ جن مادّوں سے آپ کا جسم بنا ہے اور جن غذاؤں سے وہ پرورش پاتا ہے، اُن کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے۔ کوئلا، لوہا، چونا، کچھ نمکیات، کچھ ہوائیں، اور ایسی ہی چند چیزیں اور ہیں۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی حیات

Maktaba Tul Ishaat.com

اور نفسِ انسانی کے خواص موجود نہیں ہیں۔ مگر انھی مردہ، بے جان مادّوں کو جمع کر کے آپ کو جیتا جاگتا وجود بنا دیا گیا ہے۔ پھر انھی مادّوں کی غذا آپ کے جسم میں جاتی ہے اور وہاں اس سے مَردوں میں وہ تخم اور عورتوں میں وہ بیضی خَلِیّے بنتے ہیں جن کے ملنے سے آپ ہی جیسے جیتے جاگتے انسان روز بن بن کر نکل رہے ہیں۔ اس کے بعد ذرا اپنے گردو پیش کی زمین پر نظر ڈالیے۔ بے شمار مختلف چیزوں کے بیج تھے جن کو ہواؤں اور پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا، اور بے شمار مختلف چیزوں کی جڑیں تھیں جو جگہ جگہ پیوندِ خاک ہوئی پڑی تھیں۔ ان میں کہیں بھی نباتی زندگی کا کوئی ظہور موجود نہ تھا۔ آپ کے گردو پیش کی سوکھی زمین ان لاکھوں مُردوں کی قبر بنی ہوئی تھی۔ مگر جونہی کہ پانی کا ایک چھینٹا پڑا، ہر طرف زندگی لہلہانے لگی، ہر مُردہ جڑ اپنی قبر سے جی اُٹھی، اور ہر بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ اِحیائے اموات کا عمل ہر برسات میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

تیسری چیز جو ان مشاہدات سے ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ’’اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘‘۔ ساری کائنات کو چھوڑ کر صرف اپنی اِسی زمین کو لے لیجیے، اور زمین کے بھی تمام حقائق و واقعات کو چھوڑ کر صرف انسان اور نباتات ہی کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ یہاں اُس کی قدرت کے جو کرشمے آپ کو نظر آتے ہیں، کیا انھیں دیکھ کر کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خدا بس وہی کچھ کر سکتا ہے جو آج ہم اسے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اور کل اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا؟ خدا تو خیر بہت بلند و برتر ہستی ہے، انسان کے متعلق پچھلی صدی تک لوگوں کے یہ اندازے تھے کہ یہ صرف زمین ہی پر چلنے والی گاڑیاں بنا سکتا ہے، ہوا پر اُڑنے والی گاڑیاں بنانا اس کی قدرت میں نہیں ہے۔ مگر آج کے ہوائی جہازوں نے بتا دیا کہ انسان کے ’’امکانات‘‘ کی حدیں تجویز کرنے میں ان کے اندازے کتنے غلط تھے۔ اب اگر کوئی شخص خدا کے لیے اُس کے صرف آج کے کام دیکھ کر امکانات کی کچھ حدیں تجویز کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا، تو وہ صرف اپنے ہی ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے، خدا کی قدرت بہرحال اس کی باندھی ہوئی حدوں میں بند نہیں ہو سکتی۔

چوتھی اور پانچویں بات، یعنی یہ کہ ’’قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی‘‘ اور یہ کہ ’’اللہ ضرور ان سب لوگوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا جو مر چکے ہیں‘‘، اُن تین مُقدِمات کا عقلی نتیجہ ہے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کے کاموں کو اس کی قدرت کے پہلو سے دیکھیے تو دل گواہی دے گا کہ وہ جب چاہے قیامت برپا کر سکتا ہے، اور جب چاہے اُن سب مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے جن کو پہلے وہ عَدَم سے وجود میں لایا تھا۔ اور اگر اُس کے کاموں کو اس کی حکمت کے پہلو سے دیکھیے تو عقل شہادت دے گی کہ یہ دونوں کام بھی وہ ضرور کر کے رہے گا، کیونکہ ان کے بغیر حکمت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اور ایک حکیم سے یہ بعید ہے کہ وہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ جو محدود سی حکمت و دانائی انسان کو حاصل ہے، اس کا یہ نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی اپنا مال، یا جائداد، یا کاروبار جس کے سُپرد بھی کرتا ہے، اس سے کسی نہ کسی وقت حساب ضرور لیتا ہے۔ گویا امانت اور محاسبے کے درمیان ایک لازمی عقلی رابطہ ہے جس کو انسان کی محدود حکمت بھی کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتی۔ پھر اسی حکمت کی بنا پر آدمی اِرادی اور غیر اِرادی افعال کے درمیان فرق کرتا ہے، اِرادی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ
مُّنِيْرٍ ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ

بعض اَور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم[۱۰] اور ہدایت[۱۱] اور روشنی بخشنے والی کتاب[۱۲] کے بغیر، گردن اکڑائے ہوئے[۱۳]، خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں، تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں[۱۴]۔ ایسے شخص کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور قیامت کے روز اُس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے ـــــ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے

افعال کے ساتھ اَخلاقی ذمہ داری کا تصوّر وابستہ کرتا ہے، افعال میں نیک اور بد کی تمیز کرتا ہے، اچھے افعال کا نتیجہ تحسین اور انعام کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، اور بُرے افعال پر سزا کا تقاضا کرتا ہے، حتّٰی کہ خود ایک نظامِ عدالت اِس غرض کے لیے وجود میں لاتا ہے۔ یہ حکمت جس خالق نے انسان میں پیدا کی ہے، کیا باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود اس حکمت سے عاری ہوگا؟ کیا مانا جا سکتا ہے کہ اپنی اتنی بڑی دُنیا اتنے سروسامان اور اس قدر اختیارات کے ساتھ انسان کے سپرد کر کے وہ بُھول گیا ہے، اس کا حساب وہ کبھی نہ لے گا؟ کیا کسی صحیح الدماغ آدمی کی عقل یہ گواہی دے سکتی ہے کہ انسان کے جو بُرے اعمال سزا سے بچ نکلے ہیں، یا جن برائیوں کی متناسب سزا اسے نہیں مل سکی ہے، ان کی باز پُرس کے لیے کبھی عدالت قائم نہ ہوگی، اور جو بھلائیاں اپنے منصفانہ انعام سے محروم رہ گئی ہیں، وہ ہمیشہ محروم ہی رہیں گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قیامت اور زندگی بعدِ موت خدائے حکیم کی حکمت کا ایک لازمی تقاضا ہے، جس کا پورا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا سراسر بعید از عقل ہے۔

۱۰ – یعنی وہ ذاتی واقفیت جو براہِ راست مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوئی ہو۔

۱۱ – یعنی وہ واقفیت جو کسی دلیل سے حاصل ہوئی ہو، یا کسی علم رکھنے والے کی رہنمائی سے۔

۱۲ – یعنی وہ واقفیت جو خدا کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہوئی ہو۔

۱۳ – اس میں تین کیفیتیں شامل ہیں: جاہلانہ ضد اور ہٹ دھرمی۔ تکبر اور غرورِ نفس۔ اور کسی سمجھانے والے کی بات کی طرف التفات نہ کرنا۔

۱۴ – پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جو خود گمراہ ہیں، اور اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو خود ہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

یَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۠﴿۱۰﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ
اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ اِ۟طْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ
انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ۫ خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِیْنُ ﴿۱۱﴾ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهٗ وَ مَا لَا یَنْفَعُهٗ ؕ

تیار کیا ہے، ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ ع

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے،[۱۵] اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو اُلٹا پھر گیا۔[۱۶] اُس کی دُنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔[۱۷] پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارتا ہے جو نہ اُس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ،

۱۵ – یعنی دائرۂ دین کے وسط میں نہیں بلکہ کنارے پر، یا بالفاظِ دیگر، کفر و اسلام کی سرحد پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے۔ جیسے ایک مذبذب آدمی کسی فوج کے کنارے پر کھڑا ہو، اگر فتح ہوتی دیکھے تو ساتھ آ ملے اور شکست ہوتی دیکھے تو چپکے سے سٹک جائے۔

۱۶ – اس سے مراد ہیں وہ خام سیرت، مضطرب العقیدہ اور بندۂ نفس لوگ جو اسلام قبول تو کرتے ہیں مگر فائدے کی شرط کے ساتھ۔ ان کا ایمان اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں، ہر طرح چین ہی چین نصیب ہو، نہ خدا کا دین ان سے کسی قربانی کا مطالبہ کرے، اور نہ دُنیا میں ان کی کوئی خواہش اور آرزو پوری ہونے سے رہ جائے۔ یہ ہو تو خدا سے وہ راضی ہیں اور اس کا دین ان کے نزدیک بہت اچھا ہے۔ لیکن جہاں کوئی آفت آئی، یا خدا کی راہ میں کسی مصیبت اور مشقّت اور نقصان سے سابقہ پیش آ گیا، یا کوئی تمنا پوری ہونے سے رہ گئی، پھر ان کو خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت اور دین کی حقانیت، کسی چیز پر بھی اطمینان نہیں رہتا۔ پھر وہ ہر اُس آستانے پر جھکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جہاں سے ان کو فائدے کی اُمید اور نقصان سے بچ جانے کی توقع ہو۔

۱۷ – یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جو چند لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ مذبذب مسلمان کا حال درحقیقت سب سے بدتر ہوتا ہے۔ کافر اپنے رب سے بے نیاز، آخرت سے بے پروا، اور قوانینِ الٰہی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر جب یکسوئی کے ساتھ مادّی فائدوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے، تو چاہے وہ اپنی آخرت کھو دے، مگر دُنیا تو کچھ نہ کچھ بنا ہی لیتا ہے۔ اور مومن جب پورے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ خدا کے دین کی پیروی کرتا ہے، تو اگرچہ دُنیا کی کامیابی بھی آخرِکار اس کے قدم چوم کر رہتی ہے، تاہم اگر دُنیا بالکل ہی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے، آخرت میں بہرحال اس کی فلاح

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ
لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا

یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ اُن کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے،[18] بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق۔[19] (اِس کے برعکس) اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے،[20] یقیناً ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ

وکامرانی یقینی ہے۔ لیکن یہ مذبذب مسلمان نہ اپنی دُنیا ہی بنا سکتا ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے لیے فلاح کا کوئی امکان ہے۔ دُنیا کی طرف لپکتا ہے تو کچھ نہ کچھ خدا اور آخرت کے ہونے کا گمان، جو اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں رہ گیا ہے، اور کچھ نہ کچھ اَخلاقی حُدود کا لحاظ، جو اسلام سے تعلق نے پیدا کر دیا ہے، اس کا دامن کھینچتا رہتا ہے، اور خالص دُنیا طلبی کے لیے جس یکسوئی واستقامت کی ضرورت ہے، وہ کافر کی طرح اسے بہم نہیں پہنچتی۔ آخرت کا خیال کرتا ہے تو دُنیا کے فائدوں کا لالچ اور نقصانات کا خوف، اور خواہشات پر پابندیاں قبول کرنے سے طبیعت کا انکار اُس طرف جانے نہیں دیتا، بلکہ دُنیا پرستی اس کے عقیدے اور عمل کو اتنا کچھ بگاڑ دیتی ہے کہ آخرت میں اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح وہ دُنیا بھی کھوتا ہے اور آخرت بھی۔

۱۸ – پہلی آیت میں معبُودانِ غیر اللہ کے نافع وضار ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کسی نفع وضرر کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اُن کے نقصان کو اُن کے نفع سے قریب تر بتایا گیا ہے، کیونکہ ان سے دُعائیں مانگ کر اور ان کے آگے حاجت روائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ اپنا ایمان تو فوراً اور یقیناً کھو دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ نفع اسے حاصل ہو جس کی اُمید پر اس نے انھیں پکارا تھا، تو حقیقت سے قطعِ نظر، ظاہر حال کے لحاظ سے بھی وہ خود مانے گا کہ اس کا حصول نہ تو یقینی ہے اور نہ قریب الوقوع۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو مزید فتنے میں ڈالنے کے لیے کسی آستانے پر اس کی مراد برلائے، اور ہو سکتا ہے کہ اُس آستانے پر وہ اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھا آئے اور اپنی مراد بھی نہ پائے۔

۱۹ – یعنی جس نے بھی اس کو اس راستے پر ڈالا، خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان، وہ بدترین کارساز و سرپرست اور بدترین دوست اور ساتھی ہے۔

۲۰ – یعنی جن کا حال اس مطلب پرست، مذبذب اور بے یقین مسلمان کا سا نہیں ہے، بلکہ جو ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر خدا اور رسولؐ اور آخرت کو ماننے کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر چلتے رہتے ہیں،

Maktaba Tul Ishaat.com

يُرِيْدُ ⑭ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا
يَغِيْظُ ⑮ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ⑯

چاہتا ہے[۲۱]۔ جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دُنیا اور آخرت میں اُس کی کوئی مدد نہ کرے گا، اُسے چاہیے کہ ایک رسّی کے ذریعے سے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھ لے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو ردّ کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے[۲۲] ــــــ ایسی ہی کُھلی کُھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

خواہ اچھے حالات سے سابقہ پیش آئے یا بُرے حالات سے، خواہ مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں یا انعامات کی بارشیں ہونے لگیں۔

۲۱ – یعنی اللہ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ دُنیا میں، یا آخرت میں، یا دونوں جگہ، وہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے، اور جس سے جو کچھ چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ وہ دینا چاہے تو کوئی روکنے والا نہیں۔ نہ دینا چاہے تو کوئی دِلوانے والا نہیں۔

۲۲ – اس آیت کی تفسیر میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ مختلف مفسرین کے بیان کردہ مطالب کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اُس کی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہ کرے گا، وہ چھت سے رسّی باندھ کر خودکشی کر لے۔

(۲) " " " " وہ کسی رسّی کے ذریعے سے آسمان پر جائے اور مدد بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۳) " " " " وہ آسمان پر جا کر وحی کا سلسلہ منقطع کرنے کی کوشش کر دیکھے۔

(۴) " " " " وہ آسمان پر جا کر اس کا رزق بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۵) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اُس کی (یعنی خود اس طرح کا خیال کرنے والے کی) مدد نہ کرے گا، وہ اپنے گھر کی چھت سے رسّی لٹکائے اور خودکشی کر لے۔

(۶) " " " " وہ آسمان تک پہنچ کر مدد لانے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَ

جو لوگ ایمان لائے[۲۳]، اور جو یہودی ہوئے[۲۴]، اور صابی[۲۵]، اور نصاریٰ[۲۶]، اور مجوس[۲۷]، اور

کی کوشش کر دیکھے۔

ان میں سے پہلے چار مفہومات تو بالکل ہی سیاق و سباق سے غیر متعلق ہیں۔ اور آخری دو مفہوم اگرچہ سیاق و سباق سے قریب تر ہیں، لیکن کلام کے ٹھیک مدعا تک نہیں پہنچتے۔ سلسلۂ تقریر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے، جب تک حالات اچھے رہتے ہیں مطمئن رہتا ہے، اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے، یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے، تو خدا سے پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے۔ اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سررشتے اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں، اور اللہ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے اُمیدیں وابستہ کرتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں، وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے، حتّٰی کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھِگلی لگا سکتا ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیرِ الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے۔ آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے مراد ہے وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو۔ ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے۔

۲۳ – یعنی ”مسلمان“ جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں خدا کے تمام انبیاؑ اور اس کی کتابوں کو مانا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جنھوں نے پچھلے انبیاؑ کے ساتھ آپ پر بھی ایمان لانا قبول کیا۔ ان میں صادق الایمان بھی شامل تھے اور وہ بھی تھے جو ماننے والوں میں شامل تو ہو جاتے تھے مگر ”کنارے“ پر رہ کر بندگی کرتے تھے اور کفر و ایمان کے درمیان مذبذب تھے۔

۲۴ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۷۲۔

۲۵ – صابی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے: ایک، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے، اور حضرت یحییٰؑ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے، ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیثؑ اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حَرّان تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فنِ طِب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔

۲۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، المائدہ، حاشیہ ۳۶۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ
كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

جن لوگوں نے شرک کیا[۲۸]، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کردے گا[۲۹]، ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں[۳۰] وہ سب جو آسمانوں میں ہیں[۳۱] اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان[۳۲] اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں[۳۳]؟ اور جسے اللہ ذلیل و خوار کردے، اُسے پھر

۲۷- یعنی ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زَرتُشت کا پیرو کہتے تھے۔ ان کے مذہب و اَخلاق کو مزدَک کی گمراہیوں نے بُری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا، حتّٰی کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

۲۸- یعنی عرب اور دوسرے مُمالک کے مشرکین جو مذکورۂ بالا گروہوں کی طرح کسی خاص نام سے موسوم نہ تھے۔ قرآنِ مجید ان کو دوسرے گروہوں سے مُمیّز کرنے کے لیے مُشْرِكِيْنَ اور الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا کے اصطلاحی ناموں سے یاد کرتا ہے، اگرچہ اہلِ ایمان کے سوا باقی سب کے ہی عقائد و اعمال میں شرک داخل ہو چکا تھا۔

۲۹- یعنی خدا کے بارے میں مختلف انسانی گروہوں کے درمیان جو جھگڑا ہے، اُس کا فیصلہ اِس دُنیا میں نہیں ہوگا بلکہ قیامت کے روز ہوگا۔ وہیں اس بات کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ان میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اگرچہ ایک معنٰی کے لحاظ سے یہ فیصلہ اس دُنیا میں بھی خدا کی کتابیں کرتی رہی ہیں، لیکن یہاں فیصلے کا لفظ ''جھگڑا چکانے'' اور فریقین کے درمیان عدالت کرنے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، جب کہ ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف باقاعدہ ڈگری دے دی جائے۔

۳۰- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۴-۲۵-النحل، حاشیہ ۴۱-۴۲۔

۳۱- یعنی فرشتے، اَجرامِ فلکی، اور وہ سب مخلوقات جو زمین کے ماورا دوسرے جہانوں میں ہیں، خواہ وہ انسان کی طرح ذی عقل و ذی اختیار ہوں، یا حیوانات، نباتات، جمادات اور ہوا اور روشنی کی طرح بے عقل و بے اختیار۔

۳۲- یعنی وہ جو محض مجبوراً ہی نہیں بلکہ بالارادہ اور بطوع و رغبت بھی اُس کو سجدہ کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں

سجدۃ

مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝۱۸ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ

کوئی عزت دینے والا نہیں ہے،[۳۴] اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔[۳۵]

یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔[۳۶] اِن میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اُن کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں،[۳۷] اُن کے سروں پر

دوسرا اِنسانی گروہ، جس کا بعد کے فقرے میں ذکر آ رہا ہے، وہ ہے جو اپنے ارادے سے خدا کے آگے جھکنے سے انکار کرتا ہے، مگر دوسری بے اختیار مخلوقات کی طرح وہ بھی قانونِ فطرت کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور سب کے ساتھ مجبُوراً سجدہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس کے مستحقِ عذاب ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں بغاوت کی رَوِش اختیار کرتا ہے۔

۳۳- مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان مختلف گروہوں کے جھگڑے کا فیصلہ تو قیامت ہی کے روز چکایا جائے گا، لیکن کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو وہ آج بھی دیکھ سکتا ہے کہ حق پر کون ہے اور آخری فیصلہ کس کے حق میں ہونا چاہیے۔ پوری کائنات کا نظام اس بات پر شاہد ہے کہ زمین سے آسمانوں تک ایک ہی خدا کی خدائی پورے زور اور پوری ہمہ گیری کے ساتھ چل رہی ہے۔ زمین کے ایک ذرّے سے لے کر آسمان کے بڑے بڑے سیّاروں تک سب ایک قانون میں جکڑے ہوئے ہیں، جس سے بال برابر بھی جنبش کرنے کا کسی کو یارا نہیں ہے۔ مومن تو خیر دل سے اس کے آگے سر جھکاتا ہے، مگر وہ دہریہ جو اس کے وجود تک کا انکار کر رہا ہے، اور وہ مشرک جو ایک ایک بے اختیار ہستی کے آگے جھک رہا ہے، وہ بھی اُس کی اطاعت پر اُسی طرح مجبُور ہے جس طرح ہوا اور پانی۔ کسی فرشتے، کسی جن، کسی نبی اور ولی، اور کسی دیوی یا دیوتا کے پاس خدائی کی صفات اور اختیارات کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے کہ اس کو اُلوہیت اور معبُودیت کا مقام دیا جا سکے، یا خداوندِ عالَم کا ہم جنس یا مثیل ٹھیرایا جا سکے۔ کسی قانونِ بے حاکم، اور فطرتِ بے صانع، اور نظامِ بے ناظم کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لا سکے اور باقاعدگی کے ساتھ خود ہی چلاتا رہے، اور قدرت و حکمت کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھا سکے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ کائنات کی یہ کھلی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی جو شخص انبیاؑ کی بات نہیں مانتا اور مختلف خود ساختہ عقیدے اختیار کر کے خدا کے بارے میں جھگڑتا ہے، اس کا برسرِ باطل ہونا آج بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح قیامت کے روز ثابت ہو گا۔

۳۴- یہاں ذلّت اور عزت سے مراد حق کا انکار اور اس کی پیروی ہے، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ذلّت اور عزت ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جو شخص کھلے کھلے اور روشن حقائق کو آنکھیں کھول کر نہ دیکھے، اور سمجھانے والے کی بات بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝۱۹ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝۲۰ وَلَهُمْ
مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝۲۱ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ
اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۲۲ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ ع ۱۲/۹
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ
فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝۲۳ وَهُدُوْٓا

کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا، جس سے اُن کی کھالیں ہی نہیں، پیٹ کے اندر کے حصّے تک گل جائیں گے، اور اُن کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گُرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنّم سے نکلنے کی کوشش کریں گے، پھر اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے، کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزا۔ع (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اُن کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہاں وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیے جائیں گے[۳۸] اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔ ان کو پاکیزہ

سن کر نہ دے، وہ خود ہی ذلّت وخواری کو اپنے اُوپر دعوت دیتا ہے، اور اللہ وہی چیز اس کے نصیب میں لکھ دیتا ہے جو اس نے خود مانگی ہے۔ پھر جب اللہ ہی نے اس کو پیروی حق کی عزت نہ دی، تو اب کون ہے جو اس کو اس عزت سے سرفراز کر دے؟

۳۵- یہاں سجدۂ تلاوت واجب ہے، اور سورۂ حج کا یہ سجدہ مُتَّفَق عَلَیہ ہے۔ سجدۂ تلاوت کی حکمت اور اس کے احکام کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۵۷۔

۳۶- یہاں خدا کے بارے میں جھگڑا کرنے والے تمام گروہوں کو ان کی کثرت کے باوجود دو فریقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک فریق وہ جو انبیاؑ کی بات مان کر خدا کی صحیح بندگی اختیار کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو ان کی بات نہیں مانتا اور کفر کی راہ اختیار کرتا ہے، خواہ اس کے اندر آپس میں کتنے ہی اختلافات ہوں اور اس کے کفر نے کتنی ہی مختلف صورتیں اختیار کر لی ہوں۔

۳۷- مستقبل میں جس چیز کا پیش آنا بالکل قطعی اور یقینی ہو، اس کو زور دینے کے لیے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ پیش آ چکی ہے۔ آگ کے کپڑوں سے مراد غالبًا وہی چیز ہے جسے سورۂ ابراہیم، آیت ۵۰ میں سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ فرمایا گیا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، ابراہیم، حاشیہ ۵۸۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٢﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ
لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿١٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا

یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ اُن کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے[18]، بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق[19]۔ (اس کے برعکس) اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے[20]، یقیناً ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ

و کامرانی یقینی ہے۔ لیکن یہ مذبذب مسلمان نہ اپنی دُنیا ہی بنا سکتا ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے لیے فلاح کا کوئی امکان ہے۔ دُنیا کی طرف لپکتا ہے تو کچھ نہ کچھ خدا اور آخرت کے ہونے کا گمان، جو اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں رہ گیا ہے، اور کچھ نہ کچھ اخلاقی حُدود کا لحاظ، جو اسلام سے تعلق نے پیدا کر دیا ہے، اس کا دامن کھینچتا رہتا ہے، اور خالص دُنیا طلبی کے لیے جس یکسوئی و استقامت کی ضرورت ہے، وہ کافر کی طرح اسے بہم نہیں پہنچتی۔ آخرت کا خیال کرتا ہے تو دُنیا کے فائدوں کا لالچ اور نقصانات کا خوف، اور خواہشات پر پابندیاں قبول کرنے سے طبیعت کا انکار اُس طرف جانے نہیں دیتا، بلکہ دُنیا پرستی اس کے عقیدے اور عمل کو اتنا کچھ بگاڑ دیتی ہے کہ آخرت میں اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح وہ دُنیا بھی کھوتا ہے اور آخرت بھی۔

۱۸ – پہلی آیت میں معبُودانِ غیر اللہ کے نافع و ضار ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کسی نفع و ضرر کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اُن کے نقصان کو اُن کے نفع سے قریب تر بتایا گیا ہے، کیونکہ ان سے دُعائیں مانگ کر اور ان کے آگے حاجت روائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ اپنا ایمان تو فوراً اور یقیناً کھو دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ نفع اسے حاصل ہو جس کی اُمید پر اس نے انھیں پکارا تھا، تو حقیقت سے قطعِ نظر، ظاہر حال کے لحاظ سے بھی وہ خود مانے گا کہ اس کا حصول نہ تو یقینی ہے اور نہ قریب الوقوع۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو مزید فتنے میں ڈالنے کے لیے کسی آستانے پر اس کی مراد بر لائے، اور ہو سکتا ہے کہ اُس آستانے پر وہ اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھا آئے اور اپنی مراد بھی نہ پائے۔

۱۹ – یعنی جس نے بھی اس کو اس راستے پر ڈالا، خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان، وہ بدترین کارساز و سرپرست اور بدترین دوست اور ساتھی ہے۔

۲۰ – یعنی جن کا حال اس مطلب پرست، مذبذب اور بے یقین مسلمان کا سا نہیں ہے، بلکہ جو ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر خدا اور رسولؐ اور آخرت کو ماننے کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر چلتے رہتے ہیں،

Maktaba Tul Ishaat.com

مراد کفارِ مکہ ہیں۔

۴۲- یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو حج اور عمرہ نہیں کرنے دیتے۔

۴۳- یعنی جو کسی شخص، یا خاندان، یا قبیلے کی جائداد نہیں ہے، بلکہ وقفِ عام ہے، اور جس کی زیارت سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

یہاں فقہی نقطۂ نظر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں فقہائے اسلام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ ''مسجدِ حرام'' سے مراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرم مکہ؟

دوم: یہ کہ اس میں عاکف (رہنے والے) اور باد (باہر سے آنے والے) کے حقوق برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم، جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے مُترشّح ہوتا ہے۔ اور اس میں حُقوق کے مُساوی ہونے سے مراد عبادت کے حق میں مُساوات ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یا بنی عبد مناف من ولی منکم من امور الناس شیئا فلا یمنعن احدًا طاف بھٰذا البیت او صلّٰی اٰیّۃَ ساعۃ شاء من لیل او نھار۔ ''اے اولادِ عبدِ مناف! تم میں سے جو کوئی لوگوں کے معاملات پر کسی اقتدار کا مالک ہو، اسے چاہیے کہ کسی شخص کو رات اور دن کے کسی وقت میں بھی خانۂ کعبہ کا طواف کرنے یا نماز پڑھنے سے منع نہ کرے۔'' اس رائے کے حامی کہتے ہیں کہ مسجدِ حرام سے پورا حرم مراد لینا اور پھر وہاں جملہ حیثیات سے مَقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر قرار دینا غلط ہے۔ کیونکہ مکے کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حُقوقِ مِلکیّت و وراثت اور حقوقِ بیع و اِجارہ اسلام سے پہلے قائم تھے اور اسلام کے بعد بھی قائم رہے، حتّٰی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صَفوانؓ بن اُمیّہ کا مکان مکہ میں جیل کی تعمیر کے لیے چار ہزار درہم میں خریدا گیا۔ لہٰذا یہ مُساوات صرف عبادت ہی کے معاملے میں ہے، نہ کہ کسی اور چیز میں۔ یہ امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال اصحاب کا قول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ خود اس آیت میں جس چیز پر مشرکینِ مکہ کو ملامت کی گئی ہے، وہ مسلمانوں کے حج میں مانع ہونا ہے، اور ان کے اس فعل کو یہ کہہ کر ردّ کیا گیا ہے کہ وہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حج صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتا، بلکہ صفا اور مَروہ سے لے کر مِنٰی، مُزدَلفہ، عَرَفات، سب مناسکِ حج کے مَقامات ہیں۔ پھر قرآن میں ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات پر مسجدِ حرام بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ ''مسجدِ حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے۔'' (البقرہ، آیت ۲۱۷) ظاہر ہے کہ یہاں مسجد سے نماز پڑھنے والوں کو نکالنا نہیں، بلکہ مکے سے مسلمان باشندوں کو نکالنا مراد ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ ''یہ رعایت اُس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجدِ حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔'' (البقرہ، آیت ۱۹۶) یہاں بھی مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے نہ کہ محض مسجد۔ لہٰذا ''مسجدِ حرام'' میں مُساوات کو صرف

مسجد میں مُساوات تک محدود نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ حرم مکہ میں مساوات ہے۔

پھر یہ گروہ کہتا ہے کہ یہ مساوات صرف عبادت اور تعظیم وحرمت ہی میں نہیں ہے، بلکہ حرم مکہ میں تمام حُقوق کے اعتبار سے ہے۔ یہ سرزمین خدا کی طرف سے وقفِ عام ہے، لہٰذا اس پر اور اس کی عمارات پر کسی کے حُقوقِ مِلکیت نہیں ہیں۔ ہر شخص ہر جگہ ٹھیر سکتا ہے، کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ کسی بیٹھے ہوئے کو اُٹھا سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ لوگ بکثرت احادیث اور آثار پیش کرتے ہیں، مثلاً:

عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مکۃ مناخٌ لا تُبَاع رباعھا ولا تؤاجر بیوتھا، ’’مکہ مسافروں کے اُترنے کی جگہ ہے، نہ اس کی زمینیں بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرایے پر چڑھائے جائیں۔‘‘

ابراہیم نَخَعی کی مُرسَل روایت کہ حضورؐ نے فرمایا: مکۃ حرمھا اللّٰہ لا یحل بیع رباعھا ولا اجارۃ بیوتھا، ’’مکے کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے، اس کی زمین کو بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔‘‘ (واضح رہے کہ ابراہیم نَخَعی کی مُرسَلات حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہیں، کیونکہ اُن کا یہ قاعدہ مشہور ومعروف ہے کہ جب وہ مُرسَل رِوایت کرتے ہیں تو دراصل عبداللہؓ بن مسعود کے واسطے سے روایت کرتے ہیں)۔ مجاہد نے بھی تقریباً انھی الفاظ میں ایک روایت نقل کی ہے۔

عَلقَمہ بن نَضلہ کی رِوایت کہ ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مکے کی زمینیں سوائب (اُفتادہ زمینیں یا شاملات) سمجھی جاتی تھیں، جس کو ضرورت ہوتی وہ رہتا تھا، اور جب ضرورت نہ رہتی، دوسرے کو ٹھیرا دیتا تھا۔

عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایت کہ حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا تھا کہ حج کے زمانے میں مکے کا کوئی شخص اپنا دروازہ بند نہ کرے۔ بلکہ مجاہد کی روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ مکہ کو اپنے مکانات کے صحن کھلے چھوڑ دینے کا حکم دے رکھا تھا، اور وہ ان پر دروازے لگانے سے منع کرتے تھے، تاکہ آنے والا جہاں چاہے ٹھیرے۔ یہی روایت عطاؒ کی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ صرف سُہَیلؓ بن عَمرو کو فاروقِ اعظمؓ نے صحن پر دروازے لگانے کی اجازت دی تھی، کیونکہ ان کو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں اپنے اونٹ وہاں بند کرنے ہوتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کا قول کہ جو شخص مکے کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے، وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ کا قول کہ اللہ نے پورے حرم مکہ کو مسجد بنا دیا ہے، جہاں سب کے حُقوق برابر ہیں۔ مکہ والوں کو باہر والوں سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان امیرِ مکہ کے نام کہ مکے کے مکانات پر کرایہ نہ لیا جائے، کیونکہ یہ حرام ہے۔

ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں، اور فقہا میں سے امام مالک، امام ابوحنیفہ، سُفیان ثَوری، امام احمد بن حَنبل اور اسحاق بن راہَوَیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضیِ مکہ کی بیع، اور کم از کم موسمِ حج میں مکے کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں۔ البتہ بیشتر فقہا نے مکے کے مکانات پر لوگوں کی مِلکیت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیتِ عمارت، نہ کہ بحیثیتِ زمین

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۰

بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ

ظلم کا طریقہ اختیار کرے[۴۴] گا، اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ ع

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی، (اِس

بیع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

یہی مسلک کتاب اللہ و سنتِ رسولؐ اللہ اور سنتِ خلفائے راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دُنیا کے مسلمانوں پر حج اس لیے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہلِ مکہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنے، اور جو مسلمان احساسِ فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں، انھیں وہاں کے مالکانِ زمین اور مالکانِ مکانات خوب کرایے وصول کر کر کے لُوٹیں۔ وہ ایک وقفِ عام ہے تمام اہلِ ایمان کے لیے۔ اس کی زمین کسی کی مِلک نہیں ہے۔ ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھیر جائے۔

۴۴۔ اس سے ہر وہ فعل مراد ہے جو راستی سے ہٹا ہوا ہو اور ظلم کی تعریف میں آتا ہو، نہ کہ کوئی خاص فعل۔ اس طرح کے افعال اگرچہ ہر حال میں گناہ ہیں، مگر حرم میں ان کا ارتکاب زیادہ شدید گناہ ہے۔ مفسرین نے بلاضرورت قسم کھانے تک کو اِلحاد فی الحرم میں شمار کیا ہے اور اس آیت کا مِصداق ٹھیرایا ہے۔ ان عام گناہوں کے علاوہ حرم کی حرمت کے متعلق جو خاص احکام ہیں، ان کی خلاف ورزی بدرجۂ اَولیٰ اس تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً:

حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو، یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو جس پر حد لازم آتی ہو، اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے، تو جب تک وہ وہاں رہے، اس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی ہے، اور فتحِ مکہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اُٹھائی گئی، پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئی۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ”جو اس میں داخل ہو گیا، وہ امن میں آ گیا“۔ حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر روایات میں آئے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جُمہور تابعین اور حَنفِیّہ اور حنابلہ اور اہلِ حدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جرم کا قِصاص حرم میں نہیں لیا جا سکتا۔

وہاں جنگ اور خوں ریزی حرام ہے۔ فتحِ مکہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا، اس میں آپؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ”لوگو! اللہ نے مکہ کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے۔“ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ”اگر میری اِس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خون ریزی کو جائز ٹھیرائے، تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمھارے لیے۔ اور میرے لیے بھی یہ صرف ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا تھا، پھر آج اُس کی حرمت اُسی طرح قائم ہوگئی جیسی کل تھی۔“

وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا، نہ خودرو گھاس اُکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْقَآئِمِیْنَ
وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی
كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ

ہدایت کے ساتھ) کہ ”میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رُکوع و سُجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو[۴۵] اور لوگوں کو حج کے لیے اِذنِ عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اُونٹوں[۴۶] پر سوار آئیں[۴۷]“ تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے رکھے گئے ہیں،[۴۸]

جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے، اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جا سکتا ہے، تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اِس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ اور خودرو گھاس سے اِذخر اور خشک گھاس مستثنیٰ کی گئی ہے۔ اِن اُمور کے متعلق صحیح احادیث میں صاف صاف احکام وارد ہوئے ہیں۔

وہاں کی گری پڑی چیز اُٹھانا ممنوع ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں آیا ہے: ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نھٰی عن لقطۃ الحاج، یعنی ”آپؐ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اُٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔“

وہاں جو شخص بھی حج یا عُمرے کی نیّت سے آئے، وہ اِحرام کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دوسری کسی غرض سے داخل ہونے والے کے لیے بھی اِحرام باندھ کر جانا ضروری ہے یا نہیں۔ ابنِ عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ کسی حال میں بلا اِحرام داخل نہیں ہو سکتے۔ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی ایک ایک قول اسی کا مؤیِّد ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ صرف وہ لوگ اِحرام کی قید سے مستثنیٰ ہیں جن کو بار بار اپنے کام کے لیے وہاں جانا آنا پڑتا ہو۔ باقی سب کو اِحرام بند جانا چاہیے۔ یہ امام احمدؒ اور شافعیؒ کا دوسرا قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ جو شخص میقاتوں کے حُدود میں رہتا ہو، وہ مکے میں بلا اِحرام داخل ہو سکتا ہے، مگر جو حدودِ میقات سے باہر کا رہنے والا ہو، وہ بلا اِحرام نہیں جا سکتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

۴۵ – بعض مفسرین نے ”پاک رکھو“ پر اُس فرمان کو ختم کر دیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، اور ”حج کے لیے اِذنِ عام دے دو“ کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مانا ہے۔ لیکن اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ خطاب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرف ہے اور اُسی حکم کا ایک حصّہ ہے جو اُن کو خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دیا گیا تھا۔ علاوہ بریں مقصودِ کلام بھی یہاں یہی بتانا ہے کہ اوّل روز ہی سے یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور تمام خدا پرستوں کو یہاں حج کے لیے آنے کا اذنِ عام تھا۔

۴۶ – اصل میں لفظ ضَامِرٍ استعمال ہوا ہے، جو خاص طور پر دُبلے اُونٹوں کے لیے بولتے ہیں۔ اس سے اُن مسافروں کی تصویر کھینچنا مقصود ہے جو دُور دراز مقامات سے چلے آ رہے ہوں اور راستے میں اُن کے اُونٹ چارا پانی نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انھیں بخشے ہیں،[۴۹]

ملنے کی وجہ سے دُبلے ہو گئے ہوں۔

۴۷- یہاں وہ حکم ختم ہوتا ہے جو ابتداءً حضرت ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا، اور آگے کا ارشاد اس پر اضافہ ہے جو بطورِ تشریح مزید کیا گیا ہے۔ ہماری اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کا خاتمہ ''اِس قدیم گھر کا طواف کریں'' پر ہوا ہے، جو ظاہر ہے کہ تعمیرِ خانۂ کعبہ کے وقت نہ فرمایا گیا ہوگا۔ (حضرت ابراہیمؑ کی تعمیرِ خانۂ کعبہ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقَرہ، آیات ۱۲۵-۱۲۹۔ آلِ عمران، آیات ۹۶-۹۷۔ ابراہیم، آیات ۳۵-۴۱)

۴۸- اس سے مراد صرف دینی فائدے ہی نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے بھی ہیں۔ یہ اسی خانۂ کعبہ اور اس کے حج کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ڈھائی ہزار برس کی مدّت میں عربوں کو ایک مرکزِ وحدت حاصل رہا، جس نے اُن کی عَرَبیّت کو قبائلیت میں بالکل گم ہو جانے سے بچائے رکھا۔ اس کے مرکز سے وابستہ ہونے اور حج کے لیے ہر سال ملک کے تمام حصوں سے آتے رہنے کی بدولت ان کی زبان ایک رہی، ان کی تہذیب ایک رہی ان کے اندر عرب ہونے کا احساس باقی رہا، اور ان کو خیالات، معلومات اور تمدُّنی طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ بھی اسی حج کی برکت تھی کہ عرب کی اس عام بد امنی میں کم از کم چار مہینے ایسے امن کے میسر آجاتے تھے جن میں ملک کے ہر حصّے کا آدمی سفر کر سکتا تھا اور تجارتی قافلے بھی بخیریت گزر سکتے تھے۔ اس لیے عرب کی مَعاشی زندگی کے لیے بھی حج ایک رحمت تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، آلِ عمران، حواشی ۸۰-۸۱۔ المائدہ، حاشیہ ۱۱۳)

اسلام کے بعد حج کے دینی فائدوں کے ساتھ اس کے دنیوی فائدے بھی کئی گُنے زیادہ ہو گئے۔ پہلے وہ صرف عرب کے لیے رحمت تھا۔ اب وہ ساری دُنیا کے اہلِ توحید کے لیے رحمت ہو گیا۔

۴۹- جانوروں سے مراد مویشی جانور ہیں، یعنی اُونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، جیسا کہ سورۂ اَنعام، آیات ۱۴۲-۱۴۴ میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

اُن پر اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کے نام پر اور اُس کا نام لے کر انھیں ذبح کرنا ہے، جیسا کہ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں قربانی کے لیے بالعُموم ''جانور پر اللہ کا نام لینے'' کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کرنا ہی ہے۔ اس طرح گویا اس حقیقت پر مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر، یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور کو ذبح کرنا کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ مسلمان جب کبھی جانور کو ذبح کرے گا، اللہ کا نام لے کر کرے گا، اور جب کبھی قربانی کرے گا، اللہ کے لیے کرے گا۔

ایّامِ معلومات (چند مقرر دنوں) سے مراد کون سے دن ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد ذی الحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ ابنِ عباسؓ، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، قَتادَہ اور متعدّد دوسرے صحابہؓ و تابعینؒ سے

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَ

خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں[50]، پھر اپنا میل کچیل دُور کریں[51] اور

یہ قول منقول ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم النحر (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) اور اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ اس کی تائید میں ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، ابراہیم نَخَعی، حسن اور عطاء کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں، اور امام شافعیؒ و احمدؒ سے بھی ایک ایک قول اس کے حق میں منقول ہوا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین دن ہیں، یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔ اس کی تائید میں حضرات عمر، علی، ابنِ عمر، ابنِ عباس، اَنَس بن مالک، ابو ہریرہ، سعید بن مُسَیَّب اور سعید بن جُبَیر رضی اللہ عنہم کے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ فقہا میں سے سُفیان ثَوری، امام مالکؒ، امام ابو یُوسُفؒ اور امام محمدؒ نے یہی قول اختیار کیا ہے اور مذہبِ حَنفی و مالکی میں اسی پر فتویٰ ہے۔ باقی کچھ شاذ اقوال بھی ہیں۔ مثلاً کسی نے یکم محرم تک قربانی کے ایام کو دراز کیا ہے، کسی نے صرف یوم النحر تک اسے محدود کر دیا ہے، اور کسی نے یوم النحر کے بعد صرف ایک دن مزید قربانی کا مانا ہے۔ لیکن یہ کمزور اقوال ہیں جن کی دلیل مضبوط نہیں ہے۔

۵۰ — بعض لوگوں نے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں واجب ہیں، کیونکہ حکم بصیغۂ امر دیا گیا ہے۔ دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ کھانا مستحب ہے اور کھلانا واجب۔ یہ رائے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں مستحب ہیں۔ کھانا اس لیے مستحب ہے کہ جاہلیّت کے زمانے میں لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانا ممنوع سمجھتے تھے، اور کھلانا اس لیے پسندیدہ کہ اس میں غریبوں کی امداد و اعانت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ ابنِ جَریر نے حسن بصری، عطاء، مجاہد اور ابراہیم نَخَعی کے یہ اقوال نقل کیے ہیں کہ فَكُلُوا مِنْهَا میں صیغۂ امر کے استعمال سے کھانے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امر ویسا ہی ہے جیسے فرمایا: وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا، ''جب تم حالتِ احرام سے نکل آؤ تو پھر شکار کرو'' (المائدہ، آیت ۲) اور فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ، ''پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ'' (الجمعہ، آیت ۱۰) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احرام سے نکل کر شکار کرنا اور نمازِ جمعہ کے بعد زمین میں پھیل جانا واجب ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پھر ایسا کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی چونکہ لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانے کو ممنوع سمجھتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ نہیں، اسے کھاؤ، یعنی اس کی کوئی مُمانعت نہیں ہے۔

تنگ دست فقیر کو کھلانے کے متعلق جو فرمایا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنی کو نہیں کھلایا جا سکتا۔ دوست، ہمسایے، رشتہ دار، خواہ محتاج نہ ہوں، پھر بھی انھیں قربانی کے گوشت میں سے دینا جائز ہے۔ یہ بات صحابۂ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ عَلْقَمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے میرے ہاتھ قربانی کے جانور بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ یوم النحر کو انھیں ذبح کرنا، خود بھی کھانا، مساکین کو بھی دینا، اور میرے بھائی کے گھر بھی بھیجنا۔ ابنِ عمرؓ کا بھی یہی قول

Maktaba Tul Ishaat.com

لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا

اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔
یہ تھا (تعمیرِ کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے۔
اور تمھارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے، ماسوا اُن چیزوں کے جو

ہے کہ ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ ہمسایوں کو دو، اور ایک حصہ مساکین میں تقسیم کرو۔

۵۱ - یعنی یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانی سے فارغ ہو کر اِحرام کھول دیں، حجامت کرائیں، نہائیں، دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو اِحرام کی حالت میں عائد ہو گئی تھیں۔ لغت میں تَفَث کے اصل معنیٰ اُس غبار اور مَیل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر حج کے سلسلے میں جب مَیل کچیل دُور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا جو اُوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسکِ حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے، وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے، اور نہ جسم کی دوسری صفائی کر سکتا ہے۔ (اِس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ قربانی سے فراغت کے بعد دوسری تمام پابندیاں تو ختم ہو جاتی ہیں، مگر بیوی کے پاس جانا اُس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک آدمی طوافِ افاضہ نہ کر لے۔)

۵۲ - یعنی جو نذر بھی کسی نے اِس موقع کے لیے مانی ہو۔

۵۳ - کعبے کے لیے ”بیتِ عتیق“ کا لفظ بہت معنیٰ خیز ہے۔ ”عتیق“ عَرَبی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، قدیم۔ دوسرے، آزاد، جس پر کسی کی مِلکیت نہ ہو۔ تیسرے، مکرّم اور معزز۔ یہ تینوں ہی معنیٰ اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔

طواف سے مراد طوافِ افاضہ، یعنی طوافِ زیارت ہے، جو یوم النحر کو قربانی کرنے اور اِحرام کھول دینے کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ ارکانِ حج میں سے ہے۔ اور چونکہ قضائے تَفَث کے حکم سے متصل اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طواف قربانی کرنے اور اِحرام کھول کر نہا دھو لینے کے بعد کیا جانا چاہیے۔

۵۴ - بظاہر یہ ایک عام نصیحت ہے جو اللہ کی قائم کی ہوئی تمام حرمتوں کا احترام کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں وہ حرمتیں بدرجۂ اولیٰ مراد ہیں جو مسجدِ حرام اور حج اور عمرے اور حرمِ مکہ کے باب میں قائم کی گئی ہیں۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ قریش نے حرم سے مسلمانوں کو نکال کر، اور ان پر حج کا راستہ بند کر کے اور مناسکِ حج میں مشرکانہ و جاہلانہ رسمیں شامل کر کے، اور بیت اللہ کو شرک کی گندگی سے ملوث کر کے اُن بہت سی حرمتوں کی ہتک کر ڈالی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قائم کر دی گئی تھیں۔

يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰

تمھیں بتائی جا چکی ہیں۔[۵۶] پس بُتوں کی گندگی سے بچو،[۵۷] جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو،[۵۸]

۵۵- اس موقع پر مویشی جانوروں کی حلّت کا ذکر کرنے سے مقصود دو غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے: اوّل، یہ کہ قریش اور مشرکینِ عرب بَحِیرہ اور سائبہ اور وَصِیلہ اور حام کو بھی اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں شمار کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ اس کی قائم کردہ حرمتیں نہیں ہیں، بلکہ اس نے تمام مویشی جانور حلال کیے ہیں۔ دوم، یہ کہ حالتِ اِحرام میں جس طرح شکار حرام ہے، اُسی طرح کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مویشی جانوروں کا ذبح کرنا اور ان کو کھانا بھی حرام ہے۔ اس لیے بتایا گیا کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں سے نہیں ہے۔

۵۶- اشارہ ہے اس حکم کی طرف جو سورۂ اَنعام اور سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ ہیں مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر ذبح کیا جائے۔" (الاَنعام، آیت ۱۴۵۔ النحل، آیت ۱۱۵)

۵۷- یعنی بتوں کی پرستش سے اس طرح بچو جیسے غلاظت سے آدمی گِھن کھاتا ہے اور دُور ہٹتا ہے۔ گویا کہ وہ نجاست سے بھرے ہوئے ہیں اور قریب جاتے ہی آدمی اُن سے نجس اور پلید ہو جائے گا۔

۵۸- اگرچہ الفاظ عام ہیں، اور ان سے ہر جھوٹ، بہتان اور جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں خاص طور پر اشارہ اُن باطل عقائد اور احکام اور رُسوم اور اَوہام کی طرف ہے جن پر کفر و شرک کی بنیاد ہے۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں اس کے بندوں کو حصّہ دار بنانا وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ اور پھر وہ جھوٹ بھی اس فرمان کی براہِ راست زد میں آتا ہے جس کی بنا پر مشرکینِ عرب بَحِیرہ اور سائبہ اور حام وغیرہ کو حرام قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۂ نحل میں فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ "اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو" (آیت ۱۱۶)

اس کے ساتھ جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی اسی حکم کے تحت آتی ہے، جیسا کہ صحیح احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: عُدِلت شھادۃ الزور بالاشراک باللّٰہِ، "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے"، اور پھر آپ نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔ اسلامی قانون میں یہ جرم مُستلزِمِ تعزیر ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شخص عدالت میں جھوٹا گواہ ثابت ہو جائے، اُس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔ یہی حضرت عمرؓ کا قول اور فعل بھی ہے۔ مَکحُول کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یُضرب ظھرہ ویحلق رأسہ ویسخم وجھہ ویطال حبسہ، "اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں، اس کا سر مونڈا جائے اور منہ کالا کیا جائے، اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔" عبداللہ بن عامرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں ایک شخص

Maktaba Tul Ishaat.com

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ
السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱
ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲

یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے، یا ہَوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔[59]

یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ[60] شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔[61]

کی گواہی جھوٹی ثابت ہوگئی تو انھوں نے اس کو ایک دن برسرِ عام کھڑا رکھ کر اعلان کرایا کہ یہ فُلاں بن فُلاں جھوٹا گواہ ہے، اِسے پہچان لو، پھر اس کو قید کر دیا۔ موجودہ زمانے میں ایسے شخص کا نام اخبارات میں نکال دینا تشہیر کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔

۵۹ – اس تمثیل میں آسمان سے مراد ہے انسان کی فطری حالت جس میں وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہوتا اور توحید کے سوا اُس کی فطرت کسی اور مذہب کو نہیں جانتی۔ اگر انسان انبیاؑ کی دی ہوئی رہنمائی قبول کر لے تو وہ اسی فطری حالت پر علم اور بصیرت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے، اور آگے اس کی پرواز مزید بلندیوں ہی کی طرف ہوتی ہے، نہ کہ پستیوں کی طرف۔ لیکن شرک (اور صرف شرک ہی نہیں بلکہ دہریت اور الحاد بھی) اختیار کرتے ہی وہ اپنی فطرت کے آسمان سے یکایک گر پڑتا ہے اور پھر اس کو دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آتی ہے: ایک، یہ کہ شیاطین اور گمراہ کرنے والے انسان، جن کو اس تمثیل میں شکاری پرندوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اس کی طرف جھپٹتے ہیں، اور ہر ایک اسے اُچک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کی اپنی خواہشاتِ نفس اور اس کے اپنے جذبات اور تخیّلات، جن کو ہَوا سے تشبیہ دی گئی ہے، اسے اُڑائے اُڑائے لیے پھرتے ہیں اور آخرکار اُس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیتے ہیں۔

سَحِیْق کا لفظ سحق سے نکلا ہے، جس کے اصل معنٰی پیسنے کے ہیں۔ کسی جگہ کو سَحِیق اُس صورت میں کہیں گے جب کہ وہ اتنی گہری ہو کہ جو چیز اس میں گرے، وہ پاش پاش ہو جائے۔ یہاں فکر و اَخلاق کی پستی کو اس گہرے کھڈ سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں گر کر آدمی کے پُرزے اُڑ جائیں۔

ع لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ع

تمھیں ایک وقتِ مقرر تک اُن (ہَدی کے جانوروں) سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہے[۶۲]، پھر اُن (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے[۶۳]۔ ع

۶۰ – یعنی خدا پرستی کی علامات، خواہ وہ اعمال ہوں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ، یا اشیا ہوں، جیسے مسجد اور ہَدی کے اونٹ وغیرہ۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۵)

۶۱ – یعنی یہ احترام دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ نہ کچھ خدا کا خوف ہے، جبھی تو وہ اس کے شعائر کا احترام کر رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص جان بُوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو چکا ہے، یا تو وہ خدا کا قائل ہی نہیں ہے، یا ہے تو اس کے مقابلے میں باغیانہ رَوِش اختیار کرنے پر اُتر آیا ہے۔

۶۲ – پہلی آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے اور اسے دل کے تقویٰ کی علامت ٹھیرانے کے بعد یہ فقرہ ایک غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ شعائر اللہ میں ہَدی کے جانور بھی داخل ہیں، جیسا کہ اہلِ عرب مانتے تھے، اور قرآن خود بھی آگے چل کر کہتا ہے کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ'' اور ان ہَدی کے اُونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔'' اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حکم اُوپر دیا گیا ہے، کیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہَدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی طرف جب لے جانے لگیں تو ان کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے؟ ان پر سواری کرنا، یا سامان لادنا، یا ان کے دودھ پینا تعظیمِ شعائرِ اللہ کے خلاف تو نہیں ہے؟ عرب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ وہ ان جانوروں کو بالکل کوتَل لے جاتے تھے۔ راستے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ اِسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قربانی کی جگہ پہنچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، ایسا کرنا تعظیمِ شعائرِ اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہی بات اُن احادیث سے معلوم ہوتی ہے جو اس مسئلے میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت اَنسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اُونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جا رہا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس پر سوار ہو جا۔'' اُس نے عرض کیا: ''یہ ہَدی کا اونٹ ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''ارے سوار ہو جا۔''

مفسرین میں سے ابنِ عباسؓ، قتادہ، مجاہد، ضحّاک اور عطاء خُراسانی اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں ''ایک وقتِ مقرر تک'' سے مراد ''جب تک کہ جانور کو قربانی کے لیے نامزد اور ہَدی سے موسوم نہ کر دیا جائے'' ہے۔ اس تفسیر کی رُو سے آدمی ان جانوروں سے صرف اس وقت تک فائدہ اُٹھا سکتا ہے جب تک کہ وہ اسے ہَدی کے نام سے موسوم نہ کردے۔ اور جونہی کہ وہ اسے ہَدی بنا کر بیت اللہ لے جانے کی نیت کر لے، پھر اسے کوئی فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں رہتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ

ہر اُمّت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے، تاکہ (اُس اُمّت کے) لوگ اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے ان کو بخشے ہیں[۶۴]۔ (اِن مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اُسی کے تم مطیعِ فرمان بنو۔ اور اَے نبیؐ! بشارت دے دے

لیکن یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوّل تو اس صورت میں استعمال اور استفادے کی اجازت دینا ہی بے معنیٰ ہے۔ کیونکہ ''ہَدی'' کے سوا دوسرے جانوروں سے استفادہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی شک پیدا ہی کب ہوا تھا کہ اسے اجازت کی تصریح سے رفع کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ پھر آیت صریح طور پر کہہ رہی ہے کہ اجازت ان جانوروں کے استعمال کی دی جا رہی ہے جن پر ''شعائر اللہ'' کا اطلاق ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ انھیں ہَدی قرار دے دیا جائے۔

دُوسرے مفسرین، مثلاً عُرْوَہ بن زبیر اور عطاء بن ابی رَباح کہتے ہیں کہ ''وقتِ مقرر'' سے مراد ''قربانی کا وقت'' ہے۔ قربانی سے پہلے ہَدی کے جانوروں کو سواری کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں، ان کے دودھ بھی پی سکتے ہیں، ان کے بچے بھی لے سکتے ہیں اور اُن کا اُون، صوف، بال وغیرہ بھی اتار سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ حنفیہ اگرچہ پہلی تفسیر کے قائل ہیں، لیکن وہ اس میں اتنی گنجایش نکال دیتے ہیں کہ بشرطِ ضرورت استفادہ جائز ہے۔

۶۳ - جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ، آیت ۹۵) اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کعبہ پر، یا مسجدِ حرام میں قربانی کی جائے، بلکہ حرم کے حُدود میں قربانی کرنا مراد ہے۔ یہ ایک اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآن کعبہ، یا بیت اللہ، یا مسجدِ حرام بول کر بالعُموم حرمِ مکہ مراد لیتا ہے، نہ کہ صرف وہ عمارت۔

۶۴ - اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ قربانی تمام شرائعِ الٰہیہ کے نظامِ عبادت کا ایک لازمی جز رہی ہے۔ توحید فی العبادت کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان نے جن جن صورتوں سے غیر اللہ کی بندگی کی ہے، ان سب کو غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مختص کر دیا جائے۔ مثلاً انسان نے غیر اللہ کے آگے رکوع و سجود کیا ہے۔ شرائعِ الٰہیہ نے اسے اللہ کے لیے خاص کر دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے آگے مالی نذرانے پیش کیے ہیں۔ شرائعِ الٰہیہ نے انھیں ممنوع کر کے زکوٰۃ و صدقہ اللہ کے لیے واجب کر دیا۔ انسان نے معبودانِ باطل کی تیرتھ یاترا کی ہے۔ شرائعِ الٰہیہ نے کسی نہ کسی مقام کو مقدس یا بیت اللہ قرار دے کر اس کی زیارت اور طواف کا حکم دے دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے نام کے روزے رکھے ہیں۔ شرائعِ الٰہیہ نے انھیں بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح انسان اپنے خودساختہ معبودوں کے لیے

الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ
الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا

عاجزانہ رَوِش اختیار کرنے والوں کو،[۶۵] جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اُٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی اُن پر آتی ہے اُس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔[۶۶]

اور (قربانی کے) اُونٹوں[۶۷] کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمھارے لیے اُن میں

جانوروں کی قربانیاں بھی کرتا رہا ہے، اور شرائعِ الٰہیہ نے ان کو بھی غیر کے لیے قطعاً حرام اور اللہ کے لیے واجب کر دیا۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ اصل چیز اللہ کے نام پر قربانی ہے، نہ کہ اس قاعدے کی یہ تفصیلات کہ قربانی کب کی جائے اور کہاں کی جائے اور کس طرح کی جائے۔ ان تفصیلات میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں اور ملکوں کے انبیا کی شریعتوں میں حالات کے لحاظ سے اختلافات رہے ہیں، مگر سب کی رُوح اور سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے۔

۶۵ - اصل میں لفظ مُخْبِتِین استعمال کیا گیا ہے، جس کا مفہوم کسی ایک لفظ سے پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ اس میں تین مفہومات شامل ہیں: اِستکبار اور غرورِ نفس چھوڑ کر اللہ کے مقابلے میں عجز اختیار کرنا، اُس کی بندگی و غلامی پر مطمئن ہو جانا، اس کے فیصلوں پر راضی ہو جانا۔

۶۶ - اس سے پہلے ہم اس امر کی تصریح کر چکے ہیں کہ اللہ نے کبھی حرام و ناپاک مال کو اپنا رزق نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو پاک رزق ہم نے انھیں بخشا ہے اور جو حلال کمائیاں ان کو عطا کی ہیں، ان میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ سے مراد بھی ہر طرح کا خرچ نہیں ہے، بلکہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، رشتہ داروں اور ہمسایوں اور حاجت مند لوگوں کی مدد کرنا، رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لینا، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مالی ایثار کرنا مراد ہے۔ بے جا خرچ، اور عیش و عشرت کے خرچ، اور ریاکارانہ خرچ وہ چیز نہیں ہے جسے قرآن "انفاق" قرار دیتا ہو، بلکہ یہ اس کی اصطلاح میں اسراف اور تبذیر ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور تنگ دلی کے ساتھ جو خرچ کیا جائے، کہ آدمی اپنے اہل و عیال کو بھی تنگ رکھے، اور خود بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ضرورتیں پوری نہ کرے، اور خلقِ خدا کی مدد بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرنے سے جی چُرائے، تو اس صورت میں اگرچہ آدمی خرچ تو کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے، مگر قرآن کی زبان میں اس خرچ کا نام "اِنفاق" نہیں ہے۔ وہ اس کو "بُخل" اور "شُحِّ نفس" کہتا ہے۔

۶۷ - اصل میں لفظ "بُدْن" استعمال ہوا ہے، جو عربی زبان میں اُونٹوں کیلیے مخصوص ہے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم

Maktaba Tul Ishaat.com

خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا

بھلائی ہے۶۸، پس انھیں کھڑا کر کے۶۹ ان پر اللہ کا نام لو،۷۰ اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹِک

نے قربانی کے حکم میں گائے کو بھی اُونٹوں کے ساتھ شامل فرمادیا ہے۔ جس طرح ایک اُونٹ کی قربانی سات آدمیوں کے لیے کافی ہوتی ہے، اسی طرح ایک گائے کی قربانی بھی سات آدمی مل کر کر سکتے ہیں۔ مسلم میں جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلّم ان نشترك في الاضاحي البدنة عن سبعة والبقرة عن سبعة، ''رسولؐ اللہ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم قربانیوں میں شریک ہو جایا کریں، اُونٹ سات آدمیوں کے لیے اور گائے سات آدمیوں کے لیے۔''

۶۸ – یعنی تم ان سے بکثرت فائدے اُٹھاتے ہو۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمھیں ان کی قربانی کیوں کرنی چاہیے۔ آدمی خدا کی بخشی ہوئی جن جن چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی قربانی اس کو اللہ کے نام پر کرنی چاہیے، نہ صرف شکرِ نعمت کے لیے، بلکہ اللہ کی برتری اور مالکیت تسلیم کرنے کے لیے بھی، تاکہ آدمی دل میں بھی اور عمل سے بھی اس امر کا اعتراف کرے کہ یہ سب کچھ خدا کا ہے جو اُس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ایمان اور اسلام نفس کی قربانی ہے۔ نماز اور روزہ جسم اور اس کی طاقتوں کی قربانی ہے۔ زکوٰۃ اُن اموال کی قربانی ہے جو مختلف شکلوں میں ہم کو اللہ نے دیے ہیں۔ جہاد وقت اور ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی قربانی ہے۔ قتال فی سبیل اللہ جان کی قربانی ہے۔ یہ سب ایک ایک طرح کی نعمت اور ایک ایک عطیے کے شکریے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی قربانی بھی ہم پر عائد کی گئی ہے، تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی اِس عظیم الشان نعمت پر اُس کا شکر ادا کریں اور اس کی بڑائی مانیں کہ اس نے اپنے پیدا کیے ہوئے بکثرت جانوروں کو ہمارے لیے مسخر فرمایا، جن پر ہم سوار ہوتے ہیں، جن سے کھیتی باڑی اور بار برداری کی خدمت لیتے ہیں، جن کے گوشت کھاتے ہیں، جن کے دودھ پیتے ہیں، جن کی کھالوں اور بالوں اور خون اور ہڈی، غرض ایک ایک چیز سے بے حساب فائدے اُٹھاتے ہیں۔

۶۹ – واضح رہے کہ اُونٹ کی قربانی اس کو کھڑا کر کے کی جاتی ہے۔ اُس کا ایک پاؤں باندھ دیا جاتا ہے، پھر اس کے حلقوم میں زور سے نیزہ مارا جاتا ہے جس سے خون کا ایک فوّارہ نکل پڑتا ہے، پھر جب کافی خون نکل آتا ہے تب اُونٹ زمین پر گر پڑتا ہے۔ یہی مفہوم ہے صَوَآفَّ کا۔ ابنِ عباسؓ، مجاہد، ضحّاک وغیرہ نے اس کی یہی تشریح کی ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ مسلم اور بخاری میں روایت ہے کہ ابنِ عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے اُونٹ کو بٹھا کر قربانی کر رہا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: ابعثها قياما مقيدة سنة ابى القاسم صلى الله عليه وسلّم ''اس کو پاؤں باندھ کر کھڑا کر، یہ ہے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔'' ابوداؤد میں جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اُونٹ کا بایاں پاؤں باندھ کر باقی تین پاؤں پر اُسے کھڑا کرتے تھے، پھر اس کو نحر کرتے تھے۔ اسی مفہوم کی طرف خود قرآن بھی اشارہ کر رہا ہے: فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا ''جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹِک جائیں۔'' یہ اُسی صورت میں بولیں گے جب کہ جانور کھڑا ہو اور پھر زمین پر گرے۔ ورنہ لٹا کر قربانی کرنے کی صورت میں تو پیٹھ ویسے ہی ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔

۷۰ – یہ الفاظ پھر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنے سے کوئی جانور حلال نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو ''ذبح کرو'' کہنے کے بجائے ''ان پر اللہ کا نام لو'' فرما رہا ہے، اور مطلب اس کا جانوروں کو ذبح کرنا ہے۔ اس سے

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ
التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ

جائیں[۷۱] تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں، اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ اِن جانوروں کو ہم نے اس طرح تمھارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو[۷۲]۔ نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اُسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے[۷۳]۔ اُس نے ان کو تمھارے لیے اِس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اُس کی تکبیر کرو[۷۴]۔ اور اے نبیؐ!

خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی شریعت میں جانور کے ذبح کرنے کا کوئی تصور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے سوا نہیں ہے۔

ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنے کا طریقہ بھی اسی مقام سے ماخوذ ہے۔ آیت ۳۶ میں فرمایا: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا، ''ان پر اللہ کا نام لو'' اور آیت ۳۷ میں فرمایا: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ ''تاکہ اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو''

قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینے کی مختلف صورتیں احادیث میں منقول ہیں، مثلاً (۱) بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ ''اللہ کے نام کے ساتھ، اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔'' (۲) اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ، ''اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔'' (۳) اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ ''میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور قربانی اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اِسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔''

۷۱ – ٹکنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ زمین پر گر جائیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ گر کر ٹھیر جائیں، یعنی تڑپنا بند کر دیں اور جان پوری طرح نکل جائے۔ ابوداؤد، ترمذی اور مُسندِ احمد میں نبی کریمؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ما قطع (اوما بان) من البھیمة وھی حیة فھو میتة، یعنی ''جانور سے جو گوشت اس حالت میں کاٹا جائے کہ ابھی وہ زندہ ہو، وہ مُردار ہے۔''

۷۲ – یہاں پھر اشارہ ہے اِس مضمون کی طرف کہ قربانی کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ فرمایا: اس لیے کہ یہ شکریہ ہے اُس عظیم الشان نعمت کا جو اللہ نے مویشی جانوروں کو تمھارے لیے مسخر کر کے تمھیں بخشی ہے۔

۷۳ – جاہلیت کے زمانے میں اہلِ عرب جس طرح بتوں کی قربانی کا گوشت بتوں پر لے جا کر چڑھاتے تھے، اُسی

Maktaba Tul Ishaat.com

طرح اللہ کے نام کی قربانی کا گوشت کعبے کے سامنے لا کر رکھتے اور خون اس کی دیواروں پر لتھیڑتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ قربانی گویا اس لیے کی جاتی تھی کہ اللہ کے حضور اس کا خون اور گوشت پیش کیا جائے۔ اس جہالت کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ اصل چیز جو اللہ کے حضور پیش ہوتی ہے، وہ جانور کا خون اور گوشت نہیں، بلکہ تمھارا تقویٰ ہے۔ اگر تم شکرِ نعمت کے جذبے کی بنا پر خالص نیت کے ساتھ صرف اللہ کے لیے قربانی کرو گے، تو اس جذبے اور نیت اور خلوص کا نذرانہ اس کے حضور پہنچ جائے گا، ورنہ خون اور گوشت یہیں دھرا رہ جائے گا۔ یہی بات ہے جو حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ لا ینظر الی صورکم ولا الی الوانکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم، ''اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے رنگ نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دل اور اعمال دیکھتا ہے۔''

۷۴ - یعنی دل سے اس کی بڑائی اور برتری مانو اور عمل سے اس کا اعلان و اظہار کرو۔ یہ پھر حکمِ قربانی کی غرض اور علت کی طرف اشارہ ہے۔ قربانی صرف اسی لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ یہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر اللہ کا شکریہ ہے، بلکہ اس لیے بھی واجب کی گئی ہے کہ جس کے یہ جانور ہیں، اور جس نے انھیں ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اس کے حقوقِ مالکانہ کا ہم دل سے بھی اور عملاً بھی اعتراف کریں، تاکہ ہمیں کبھی یہ بھول لاحق نہ ہو جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا مال ہے۔ اسی مضمون کو وہ فقرہ ادا کرتا ہے جو قربانی کرتے وقت کہا جاتا ہے کہ اَللّٰھُمَّ مِنْكَ وَلَكَ، ''خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔''

اس مقام پر یہ جان لینا چاہیے کہ اس پیراگراف میں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ صرف حاجیوں کے لیے ہی نہیں ہے، اور صرف مکے میں حج ہی کے موقع پر ادا کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے عام ہے، جہاں بھی وہ ہوں، تاکہ وہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر شکریہ اور تکبیر کا فرض بھی ادا کریں اور ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقامات پر حاجیوں کے شریکِ حال بھی ہو جائیں۔ حج کی سعادت میسر نہ آئی، نہ سہی، کم از کم حج کے دنوں میں ساری دُنیا کے مسلمان وہ کام تو کر رہے ہوں جو حاجی جوارِ بیت اللہ میں کریں۔ اس مضمون کی تصریح متعدد صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور بکثرت معتبر روایات سے بھی ثابت ہوا ہے کہ نبیؐ خود مدینۂ طیّبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ہر سال بقرعید کے موقع پر قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں میں آپؐ ہی کی سنت سے یہ طریقہ جاری ہوا۔ مُسندِ احمد اور ابنِ ماجہ میں ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من وجد سعة فلم یُضَحِّ فلا یقربن مصلّانا۔	جو شخص استطاعت رکھتا ہو پھر قربانی نہ کرے، وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ محدثین میں صرف اس امر پر اختلاف ہے کہ یہ مرفوع روایت ہے یا موقوف۔ ترمذی میں ابنِ عمرؓ کی روایت ہے:

اقام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم بالمدینة عشر سنین یُضَحّی۔	نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں دس سال رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔

بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے روز فرمایا:

من کان ذبح قبل الصلوٰة فلیعُد ومن	جس نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا، اسے دوبارہ

بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ

بشارت دے دے نیکوکار لوگوں کو۔

یقیناً[۷۵] اللہ مُدافعت کرتا ہے اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔[۷۶] یقیناً اللہ

ذبح بعد الصلوٰۃ فقد تم نسکہ واصاب سنۃ المسلمین ۔ قربانی کرنی چاہیے، اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی، اس کی قربانی پوری ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کا طریقہ پالیا۔

اور یہ معلوم ہے کہ یوم النحر کو مکے میں کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کرنا سنتِ مسلمین کے خلاف ہو اور بعد کرنا اس کے مطابق۔ لہٰذا لامحالہ یہ ارشاد مدینے ہی میں ہوا ہے، نہ کہ حج کے موقع پر مکے میں۔

مسلم میں جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں بقرعید کی نماز پڑھائی اور بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ آپؐ قربانی کر چکے ہیں، اپنی اپنی قربانیاں کرلیں۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے قربانی کرلی ہے، وہ پھر اعادہ کریں۔

پس یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ بقرعید کے روز جو قربانی عام مسلمان دُنیا بھر میں کرتے ہیں، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جاری کی ہوئی سنّت ہے۔ البتہ اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ آیا یہ واجب ہے یا صرف سنّت۔ ابراہیم نخعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام محمدؒ، اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسفؒ بھی، اس کو واجب مانتے ہیں۔ مگر امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ صرف سنتِ مسلمین ہے، اور سفیان ثوریؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ تاہم علمائے اُمّت میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اگر تمام مسلمان متفق ہو کر اسے چھوڑ دیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ نئی اُپج صرف ہمارے زمانے کے بعض لوگوں کو سوجھی ہے، جن کے لیے ان کا نفس ہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

۷۵ - یہاں سے تقریر کا رُخ ایک دوسرے مضمون کی طرف پھرتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں تازہ کرلیجیے کہ یہ تقریر اس وقت کی ہے جب ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ حج کا موسم آیا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو مہاجرین اور انصارِ مدینہ، دونوں کو یہ بات سخت شاق گزر رہی تھی کہ وہ حج کی نعمت سے محروم کر دیے گئے ہیں اور ان پر زیارتِ حرم کا راستہ زبردستی بند کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں پر نہ صرف اُس ظلم کے داغ تازہ تھے جو مکے میں ان پر کیے گئے تھے، بلکہ اس بات پر بھی وہ سخت رنجیدہ تھے کہ گھربار چھوڑ کر جب وہ مکے سے نکل گئے تو اب مدینے میں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا جارہا ہے۔ اس موقع پر جو تقریر فرمائی گئی، اس کے پہلے حصے میں کعبہ کی تعمیر، اور حج کے ادارے اور قربانی کے طریقے پر مفصّل گفتگو کر کے بتایا گیا کہ ان سب چیزوں کا اصل مقصد کیا تھا اور جاہلیت نے ان کو بگاڑ کر کیا سے کیا کر دیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کر دیا گیا کہ انتقام کی نیت سے نہیں بلکہ اصلاح کی نیت سے اِس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اُٹھیں۔ نیز اس کے ساتھ مدینے میں قربانی کا طریقہ جاری کر کے مسلمانوں کو یہ موقع بھی فراہم کر دیا گیا کہ حج کے زمانے میں اپنے اپنے گھروں پر ہی قربانی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

کسی خائن کافرِنعمت کو پسند نہیں کرتا۷۷ ع اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں۷۸، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۷۹۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال

کر کے اس سعادت میں حصہ لے سکیں جس سے دشمنوں نے ان کو محروم کرنے کی کوشش کی ہے، اور حج سے الگ ایک مستقل سنّت کی حیثیت سے قربانی جاری کر دی، تاکہ جو حج کا موقع نہ پائے، وہ بھی اللہ کی نعمت کے شکر اور اس کی تکبیر کا حق ادا کر سکے۔ اس کے بعد اب دوسرے حصّے میں مسلمانوں کو اس ظلم کے خلاف تلوار اُٹھانے کی اجازت دی جا رہی ہے جو اُن پر کیا گیا تھا اور کیا جا رہا تھا۔

۷۶ – ”مدافعت“ دفع سے ہے، جس کے اصل معنی کسی چیز کو ہٹانے اور دُور کرنے کے ہیں۔ مگر جب دفع کرنے کے بجائے مدافعت کرنا بولیں گے تو اس میں دو مفہوم اور شامل ہو جائیں گے: ایک، یہ کہ کوئی دشمن طاقت ہے جو حملہ آور ہو رہی ہے اور مُدافَعت کرنے والا اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دوسرے، یہ کہ یہ مقابلہ بس ایک دفعہ ہی ہو کر نہیں رہ گیا، بلکہ جب بھی وہ حملہ کرتا ہے، یہ اس کو دفع کرتا ہے۔ ان دو مفہومات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اہلِ ایمان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے مُدافَعت کرنے کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کفر اور ایمان کی کشمکش میں اہلِ ایمان یکّہ و تنہا نہیں ہوتے بلکہ اللہ خود ان کے ساتھ ایک فریق ہوتا ہے۔ وہ ان کی تائید اور حمایت فرماتا ہے، ان کے خلاف دشمنوں کی چالوں کا توڑ کرتا ہے اور موذیوں کے ضرر کو اُن سے دفع کرتا رہتا ہے۔ پس یہ آیت حقیقت میں اہلِ حق کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے، جس سے بڑھ کر ان کا دل مضبوط کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

۷۷ – یہ وجہ ہے اس بات کی کہ اِس کش مکش میں اللہ کیوں اہلِ حق کے ساتھ ایک فریق بنتا ہے۔ اس لیے کہ حق کے خلاف کش مکش کرنے والا دوسرا فریق خائن ہے، اور کافرِ نعمت ہے۔ وہ ہر اس امانت میں خیانت کر رہا ہے جو اللہ نے اس کے سُپرد کی ہے، اور ہر اس نعمت کا جواب ناشکری اور کفران اور نمک حرامی سے دے رہا ہے جو اللہ نے اس کو بخشی ہے۔ لہٰذا اللہ اس کو ناپسند فرماتا ہے اور اس کے خلاف جِدّوجُہد کرنے والے حق پرستوں کی تائید کرتا ہے۔

۷۸ – جیسا کہ دیباچے میں بیان کیا جا چکا ہے، یہ قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں اوّلین آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس آیت میں صرف اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں سورۂ بَقَرہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں جنگ کا حکم دے دیا گیا، یعنی وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (آیت ۱۹۰)، اور وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (آیت ۱۹۱)، اور وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ (آیت ۱۹۳)، اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ (آیت ۲۱۶)، اور وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿﴾ (آیت ۲۴۴)

بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

دیے گئے،[80] صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: "ہمارا رب اللہ ہے۔"[81] اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے

اجازت اور حکم میں صرف چند مہینوں کا فصل ہے۔ اجازت ہماری تحقیق کے مطابق ذی الحجہ ۱ ھ میں نازل ہوئی، اور حکم جنگِ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان ۲ ھ میں نازل ہُوا۔

۷۹ – یعنی اس کے باوجود کہ یہ چند مٹھی بھر آدمی ہیں، اللہ ان کو تمام مشرکینِ عرب پر غالب کر سکتا ہے۔ یہ بات نگاہ میں رہے کہ جس وقت تلوار اُٹھانے کی یہ اجازت دی جا رہی تھی، مسلمانوں کی ساری طاقت صرف مدینے کے ایک معمولی قصبے تک محدود تھی اور مہاجرین و انصار مل کر بھی ایک ہزار کی تعداد تک نہ پہنچتے تھے۔ اور اس حالت میں چیلنج دیا جا رہا تھا قریش کو، جو تنہا نہ تھے، بلکہ عرب کے دوسرے مشرک قبائل بھی ان کی پشت پر تھے اور بعد میں یہودی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ "اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے" نہایت برمحل تھا۔ اس سے ان مسلمانوں کی بھی ڈھارس بندھائی گئی جنھیں پورے عرب کی طاقت کے مقابلے میں تلوار لے کر اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے اُبھارا جا رہا تھا، اور کفار کو بھی مُتنبّہ کر دیا گیا کہ تمھارا مقابلہ دراصل ان مٹھی بھر مسلمانوں سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اس کے مقابلے کی ہمت ہو تو سامنے آ جاؤ۔

۸۰ – یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ سورۂ حج کا یہ حصہ لازماً ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے۔

۸۱ – جس ظلم کے ساتھ یہ لوگ نکالے گئے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل کے چند واقعات مُلاحظہ ہوں:

حضرت صُہَیبؓ رومی جب ہجرت کرنے لگے تو کفارِ قریش نے ان سے کہا کہ تم یہاں خالی ہاتھ آئے تھے اور اب خوب مال دار ہو گئے ہو۔ تم جانا چاہو تو خالی ہاتھ ہی جا سکتے ہو، اپنا مال نہیں لے جا سکتے۔ حالانکہ انھوں نے جو کچھ کمایا تھا، اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا تھا، کسی کا دیا نہیں کھاتے تھے۔ آخر وہ غریب دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور سب کچھ ظالموں کے حوالے کر کے اس حال میں مدینے پہنچے کہ تن کے کپڑوں کے سوا اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔

حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اور ان کے شوہر ابو سَلَمہؓ اپنے دودھ پیتے بچے کو لے کر ہجرت کے لیے نکلے۔ بنی مُغیرہ (اُمِّ سَلَمہؓ کے خاندان) نے راستہ روک لیا اور ابو سَلَمہؓ سے کہا کہ تمھارا جہاں جی چاہے پھرتے رہو، مگر ہماری لڑکی کو لے کر نہیں جا سکتے۔ مجبُوراً بے چارے بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر بنی عبد الاسد (ابو سَلَمہؓ کے خاندان والے) آگے بڑھے اور انھوں نے کہا کہ بچہ ہمارے قبیلے کا ہے، اسے ہمارے حوالے کرو۔ اس طرح بچہ بھی ماں اور باپ، دونوں سے چھین لیا گیا۔ تقریباً ایک سال تک حضرت اُمِّ سَلَمہؓ بچے اور شوہر کے غم میں تڑپتی رہیں، اور آخر بڑی مصیبت سے اپنے بچے کو حاصل کر کے مکے سے اس حال میں نکلیں کہ اکیلی عورت گود میں بچہ لیے اُونٹ پر سوار تھی اور ان راستوں پر جا رہی تھی جن سے مسلح قافلے بھی گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

عَیّاش بن ابی رَبیعہ، ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ پیچھے پیچھے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ؕ وَلَيَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ

سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد[۸۲] اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں[۸۳]۔ اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے[۸۴]۔ اللہ بڑا طاقتور اور

ابوجہل اپنے ایک بھائی کو ساتھ لے کر جا پہنچا اور بات بنائی کہ اماں جان نے قسم کھالی ہے کہ جب تک عیّاش کی صورت نہ دیکھ لوں گی، نہ دھوپ سے سایے میں جاؤں گی اور نہ سر میں کنگھی کروں گی۔ اس لیے تم بس چل کر انھیں صورت دکھا دو، پھر واپس آ جانا۔ وہ بیچارے ماں کی محبت میں ساتھ ہو لیے۔ راستے میں دونوں بھائیوں نے ان کو قید کر لیا اور مکے میں انھیں لے کر اس طرح داخل ہوئے کہ وہ رسّیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں بھائی پکارتے جا رہے تھے کہ ''اے اہلِ مکہ! اپنے اپنے نالائق لونڈوں کو یوں سیدھا کرو جس طرح ہم نے کیا ہے۔'' کافی مدّت تک یہ بیچارے قید رہے اور آخر کار ایک جانباز مسلمان ان کو نکال لانے میں کامیاب ہوا۔

اس طرح کے مظالم سے قریب قریب ہر اس شخص کو سابقہ پیش آیا جس نے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی۔ ظالموں نے گھر بار چھوڑتے وقت بھی ان غریبوں کو خیریت سے نہ نکلنے دیا۔

۸۲ – اصل میں صَوَامِعُ اور بِيَعٌ اور صَلَوٰتٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صومعہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں راہب اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقیر رہتے ہوں۔ بیعہ کا لفظ عربی زبان میں عیسائیوں کی عبادت گاہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صَلَوات سے مراد یہودیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہودیوں کے ہاں اس کا نام صلوتا تھا جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ بعید نہیں کہ انگریزی لفظ (salute) اور (salutation) اسی سے نکل کر لاطینی میں اور پھر انگریزی میں پہنچا ہو۔

۸۳ – یعنی یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے کسی ایک گروہ یا قوم کو دائمی اقتدار کا پٹا لکھ کر نہیں دے دیا، بلکہ وہ وقتاً فوقتاً دُنیا میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرتا رہتا ہے۔ ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو کہیں پٹا مل گیا ہوتا، تو قلعے اور قصر اور ایوانِ سیاست اور صنعت وتجارت کے مرکز ہی تباہ نہ کر دیے جاتے بلکہ عبادت گاہیں تک دست درازیوں سے نہ بچتیں۔ سورۂ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے: وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ''اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد مچ جاتا۔ مگر اللہ دُنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔'' (آیت ۲۵۱)

۸۴ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو توحید کی طرف بلانے اور دینِ حق کو قائم کرنے اور شر کی جگہ خیر کو فروغ دینے کی سعی وجُہد کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے مددگار ہیں، کیونکہ یہ اللہ کا کام ہے جسے انجام دینے میں وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۵۰)

عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ
عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ ﴿٤١﴾ وَإِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ
قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ إِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿٤٣﴾
وَّأَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَأَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ

زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔[85] اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[86]

اے نبیؐ! اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں[87] تو اُن سے پہلے قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ اور اہلِ مَدیَن بھی جُھٹلا چکے ہیں اور موسٰیؑ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ ان سب منکرینِ حق کو میں نے پہلے مُہلت دی،

۸۵- یعنی اللہ کے مددگار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دُنیا میں انھیں حکومت و فرماں روائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فسق و فُجور اور کبر و غرور کے بجائے اِقامتِ صلوٰۃ ہو، اُن کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صَرف ہو، ان کی حکومت نیکی کو دبانے کے بجائے اُسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے، اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ اس ایک فقرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خُصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔

۸۶- یعنی یہ فیصلہ کہ زمین کا انتظام کس وقت کسے سونپا جائے، دراصل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مغرور بندے اس غلط فہمی میں ہیں کہ زمین اور اس کے بسنے والوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنے والے وہ خود ہیں۔ مگر جو طاقت ایک ذرا سے بیج کو تناور درخت بنا دیتی ہے، اور ایک تناور درخت کو ہیزم سوختنی میں تبدیل کر دیتی ہے، اسی کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جن کے دبدبے کو دیکھ کر لوگ خیال کرتے ہوں کہ بھلا ان کو کون ہلا سکے گا، اُنھیں ایسا گرائے کہ دُنیا کے لیے نمونۂ عبرت بن جائیں، اور جنھیں دیکھ کر کوئی گمان بھی نہ کر سکتا ہو کہ یہ بھی کبھی اُٹھ سکیں گے، اُنھیں ایسا سربلند کرے کہ دُنیا میں اُن کی عظمت و بزرگی کے ڈنکے بج جائیں۔

۸۷- یعنی کفارِ مکہ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ
اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ
مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ
لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا
تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

پھر پکڑ لیا۔[۸۸] اب دیکھ لو کہ میری عُقُوبت کیسی تھی۔[۸۹] کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں[۹۰] بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے اور اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔[۹۱]

۸۸ – یعنی ان میں سے کسی قوم کو بھی نبی کی تکذیب کرتے ہی فوراً نہیں پکڑ لیا گیا تھا، بلکہ ہر ایک کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی وقت دیا گیا، اور گرفت اُس وقت کی گئی جب کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو چکے تھے۔ اسی طرح کفارِ مکہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ ان کی شامت آنے میں جو دیر لگ رہی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ نبی کی تنبیہات محض خالی خولی دھمکیاں ہیں۔ درحقیقت یہ مُہلتِ غور وفکر ہے جو اللہ اپنے قاعدے کے مطابق ان کو دے رہا ہے، اور اس مُہلت سے اگر انھوں نے فائدہ نہ اُٹھایا تو ان کا انجام بھی وہی ہو کر رہنا ہے جو اُن کے پیش رووں کا ہو چکا ہے۔

۸۹ – اصل میں لفظ نکیر استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہُوم عقوبت یا کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ یہ لفظ دو معنٰی دیتا ہے: ایک، یہ کہ کسی شخص کی بُری رَوِش پر ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ اُس کو ایسی سزا دی جائے جو اس کی حالت دِگرگوں کر دے۔ اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا جائے۔ کوئی دیکھے تو پہچان نہ سکے کہ یہ وہی شخص ہے۔ ان دونوں مفہُومات کے لحاظ سے اس فقرے کا پورا مطلب یہ ہے کہ "اب دیکھ لو کہ ان کی اس رَوِش پر جب میرا غضب بھڑکا تو پھر میں نے ان کی حالت کیسی دِگرگوں کر دی۔"

۹۰ – عرب میں کنواں اور بستی قریب قریب ایک دوسرے کے ہم معنٰی ہیں۔ کسی قبیلے کی بستی کا نام لینا ہو تو کہتے ہیں: ماءِ بنی فلان، یعنی فُلاں قبیلے کا کنواں۔ ایک عرب کے سامنے جب یہ کہا جائے گا کہ کنویں بیکار پڑے ہیں، تو اس کے ذہن میں اس کا یہ مطلب آئے گا کہ بستیاں اُجڑی پڑی ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا
عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ
لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَىَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ ع قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ
اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔[۹۲] اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔[۹۳] کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں، میں نے ان کو پہلے مُہلت دی، پھر پکڑ لیا۔ اور سب کو واپس تو میرے ہی پاس آنا ہے۔ ع

اے محمدؐ! کہہ دو کہ "لوگو! میں تو تمھارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (بُرا وقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔[۹۴] پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، اُن کے لیے مغفرت ہے

---

۹۱ – خیال رہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ یہاں خواہ مخواہ ذہن اس سوال میں نہ اُلجھ جائے کہ سینے والا دل کب سوچا کرتا ہے۔ اَدَبی زبان میں احساسات، جذبات، خیالات، بلکہ قریب قریب تمام ہی افعالِ دماغ سینے اور دل ہی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ کسی چیز کے "یاد ہونے" کو بھی یوں کہتے ہیں کہ "وہ تو میرے سینے میں محفوظ ہے"۔

۹۲ – یعنی بار بار چیلنج کر رہے ہیں کہ میاں! اگر تم سچے نبی ہو تو کیوں نہیں آجاتا ہم پر وہ عذاب جو خدا کے بھیجے ہوئے نبی برحق کے جھٹلانے پر آنا چاہیے، اور جس کی دھمکیاں بھی تم بار ہا ہم کو دے چکے ہو۔

۹۳ – یعنی انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے تمھاری گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے کہ آج ایک صحیح یا غلط رَوِش اختیار کی اور کل اس کے اچھے یا بُرے نتائج ظاہر ہو گئے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ فُلاں طرزِ عمل اختیار کرنے کا انجام تمھاری تباہی کی صورت میں نکلے گا، تو وہ بڑی ہی احمق ہو گی اگر جواب میں یہ اِستدلال کرے کہ جناب! اس طرزِ عمل کو اختیار کیے ہمیں دس، بیس یا پچاس برس ہو چکے ہیں، ابھی تک تو ہمارا کچھ بگڑا نہیں۔ تاریخی نتائج کے لیے دن اور مہینے اور سال تو درکنار، صدیاں بھی کوئی بڑی چیز نہیں ہیں۔

۹۴ – یعنی میں تمھاری قسمتوں کے فیصلے کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ صرف خبردار کرنے والا ہوں۔ میرا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ شامت آنے سے پہلے تم کو مُتنبّہ کر دوں۔ آگے فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی طے کرے گا کہ کس کو کب تک

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝٥٠ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝٥١ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ
اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا
يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٥٢

اور عزّت کی روزی[95]۔ اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے، وہ دوزخ کے یار ہیں۔

اور اے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی[96] (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اُس نے تمنّا[97] کی، شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہو گیا[98]۔ اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے[99]، اللہ علیم ہے اور حکیم[100]۔ (وہ اس لیے ایسا

مُہلت دیتی ہے اور کب کس صورت میں اس پر عذاب لاتا ہے۔

۹۵- ''مغفرت'' سے مراد ہے خطاؤں اور کمزوریوں اور لغزشوں سے چشم پوشی و درگزر۔ اور ''رزقِ کریم'' کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ عمدہ رزق دیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ عزت کے ساتھ بٹھا کر دیا جائے۔

۹۶- رسول اور نبی کے فرق کی تشریح سورۂ مریم، حاشیہ ۳۰ میں کی جا چکی ہے۔

۹۷- تَمَنّٰی کا لفظ عَرَبی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنٰی تو وہی ہیں جو اُردو میں لفظ تمنا کے ہیں، یعنی کسی چیز کی خواہش اور آرزو۔ دوسرے معنٰی تلاوت کے ہیں، یعنی کسی چیز کو پڑھنا۔

۹۸- ''تمنّا'' کا لفظ اگر پہلے معنٰی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ شیطان نے اس کی آرزو پوری ہونے میں رخنے ڈالے اور رکاوٹیں پیدا کیں۔ دوسرے معنٰی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ جب بھی اُس نے کلامِ الٰہی لوگوں کو سنایا، شیطان نے اس کے بارے میں طرح طرح کے شبہے اور اعتراضات پیدا کیے، عجیب عجیب معنٰی اس کو پہنائے، اور ایک صحیح مطلب کے سوا ہر طرح کے اُلٹے سیدھے مطلب لوگوں کو سمجھائے۔

۹۹- پہلے معنٰی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی خلل اندازیوں کے باوجود آخرکار نبی کی تمنا کو (اور آخر نبی کی تمنا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی مساعی بار آور ہوں اور اس کا مشن فروغ پائے) پورا کرتا ہے اور اپنی آیات کو (یعنی ان وعدوں کو جو اس نے نبی سے کیے تھے) پختہ اور اٹل وعدے ثابت کر دیتا ہے۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات و اعتراضات کو اللہ رفع کر دیتا ہے، اور ایک آیت کے بارے میں جو اُلجھنیں وہ لوگوں کے ذہنوں میں ڈالتا ہے، انھیں بعد کی کسی واضح تر آیت سے صاف کر دیا جاتا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ
الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ﴿۵۳﴾ وَّ لِيَعْلَمَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ
قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے اُن لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نِفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دُور نکل گئے ہیں ـــــ اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جُھک جائیں، یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔[۱۰۱]

۱۰۰ – یعنی وہ جانتا ہے کہ شیطان نے کہاں کیا خلل اندازی کی اور اس کے کیا اثرات ہوئے۔ اور اس کی حکمت ہر شیطانی فتنے کا توڑ کر دیتی ہے۔

۱۰۱ – یعنی شیطان کی ان فتنہ پردازیوں کو اللہ نے لوگوں کی آزمائش، اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ بگڑی ہوئی ذہنیت کے لوگ اِنھی چیزوں سے غلط نتیجے اخذ کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے گمراہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ صاف ذہن کے لوگوں کو یہی باتیں نبی اور کتاب اللہ کے برحق ہونے کا یقین دلاتی ہیں اور وہ محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ سب شیطان کی شرارتیں ہیں، اور یہ چیز انھیں مطمئن کر دیتی ہے کہ یہ دعوت یقیناً خیر اور راستی کی دعوت ہے، ورنہ شیطان اس پر اس قدر نہ تلملاتا۔

سلسلۂ کلام کو نظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اِن آیات کا مطلب صاف سمجھ میں آ جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس وقت جس مرحلے میں تھی، اس کو دیکھ کر تمام ظاہر بیں نگاہیں یہ دھوکا کھا رہی تھیں کہ آپ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے ہیں۔ دیکھنے والے جو کچھ دیکھ رہے تھے، وہ تو یہی تھا کہ ایک شخص، جس کی تمنا اور آرزو یہ تھی کہ اس کی قوم اس پر ایمان لائے، وہ تیرہ برس، معاذ اللہ، سر مارنے کے بعد آخر کار اپنے مٹھی بھر پیروؤں کو لے کر وطن سے نکل جانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں جب لوگ آپ کے اس بیان کو دیکھتے تھے کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اس کی تائید میرے ساتھ ہے، اور قرآن کے ان اعلانات کو دیکھتے تھے کہ نبی کو جھٹلا دینے والی قوم پر عذاب آ جاتا ہے، تو انھیں آپ کی اور قرآن کی

Maktaba Tul Ishaat.com

صداقت مُشتبہ نظر آنے لگتی تھی، اور آپؐ کے مخالفین اس پر بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے کہ کہاں گئی وہ خدا کی تائید، اور کیا ہوئیں وہ عذاب کی وعیدیں، اب کیوں نہیں آجاتا وہ عذاب جس کے ہم کو ڈراوے دیے جاتے تھے۔ انھی باتوں کا جواب اس سے پہلے کی آیتوں میں دیا گیا تھا، اور انھی کے جواب میں یہ آیات بھی ارشاد ہوئی ہیں۔ پہلے کی آیتوں میں جواب کا رُخ کفار کی طرف تھا، اور ان آیتوں میں اُس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو کفار کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو رہے تھے۔ پورے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> ''کسی قوم کا اپنے پیغمبر کی تکذیب کرنا انسانی تاریخ میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ پھر اس تکذیب کا جو انجام ہوا، وہ تمھاری آنکھوں کے سامنے تباہ شدہ قوموں کے آثارِ قدیمہ کی صورت میں موجود ہے۔ سبق لینا چاہو تو اس سے لے سکتے ہو۔ رہی یہ بات کہ تکذیب کرتے ہی وہ عذاب کیوں نہ آگیا جس کی وعیدیں قرآن کی بکثرت آیتوں میں کی گئی تھیں، تو آخر یہ کب کہا گیا تھا کہ ہر تکذیب فوراً ہی عذاب لے آتی ہے۔ اور نبی نے یہ کب کہا تھا کہ عذاب لانا اس کا اپنا کام ہے۔ اس کا فیصلہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جلد باز نہیں ہے۔ پہلے بھی وہ عذاب لانے سے پہلے قوموں کو مُہلت دیتا رہا ہے اور اب بھی دے رہا ہے۔ مُہلت کا یہ زمانہ اگر صدیوں تک بھی دراز ہو تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ سب وعیدیں خالی خُولی دھمکیاں ہی تھیں جو پیغمبر کے جھٹلانے والوں پر عذاب آنے کے متعلق کی گئی تھیں۔
>
> پھر یہ بات بھی کوئی نئی نہیں ہے کہ پیغمبر کی آرزوؤں اور تمناؤں کے بر آنے میں رکاوٹیں واقع ہوں، یا اس کی دعوت کے خلاف جھوٹے الزامات اور طرح طرح کے شبہات و اعتراضات کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہو۔ یہ سب کچھ بھی تمام پچھلے پیغمبروں کی دعوتوں کے مقابلے میں ہو چکا ہے۔ مگر آخر کار اللہ تعالیٰ اِن شیطانی فتنوں کا استیصال کر دیتا ہے۔ رکاوٹوں کے باوجود دعوتِ حق فروغ پاتی ہے، اور محکم آیات کے ذریعے سے شبہات کے رخنے بھر دیے جاتے ہیں۔ شیطان اور اس کے چیلے ان تدبیروں سے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں، مگر اللہ انھی کو انسانوں کے درمیان کھوٹے اور کھرے کی تمیز کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اس ذریعے سے کھرے آدمی دعوتِ حق کی طرف کھنچ آتے ہیں، اور کھوٹے لوگ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں۔''

یہ ہے وہ صاف اور سیدھا مفہوم جو سیاق و سباق کی روشنی میں اِن آیات سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایک روایت نے ان کی تفسیر میں اتنا بڑا گھپلا ڈال دیا کہ نہ صرف ان کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے، بلکہ سارے دین کی بنیاد ہی خطرے میں پڑ گئی۔ ہم اس کا ذکر یہاں اس لیے کرتے ہیں کہ قرآن کے طالبِ علم فہمِ قرآن میں روایات سے مدد لینے کے صحیح اور غلط طریقوں کا فرق اچھی طرح سمجھ سکیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ روایت پرستی میں ناروا غُلُو کیا نتائج پیدا کرتا ہے، اور قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر تنقید کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش! قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہو جائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دور ہو اور وہ کچھ قریب آ جائیں۔ یا کم از کم اُن کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انھیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپؐ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپؐ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپؐ نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ جب آپؐ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۔ پر پہنچے تو یکایک آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: تلك الغرانقة العلی ۝ وان شفاعتهن لترجی۔ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس کے بعد آگے پھر آپؐ سورۂ نجم کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتام سورہ پر آپؐ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمدؐ سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انھوں نے کہا: یہ آپؐ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپؐ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۸ میں ہے کہ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ...... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۔ یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی، یہاں تک کہ سورۂ حج کی یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں آنحضرتؐ کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاؑ کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سُن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرینِ حَبَشہ تک اس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ صُلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کفر کی دشمنی جُوں کی تُوں قائم ہے۔

یہ قصہ ابنِ جَریر اور بہت سے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں، ابنِ سعد نے طبقات میں، الواحدی نے اسبابُ النُّزول میں، موسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں، ابنِ اسحاق نے سیرت میں، اور ابنِ ابی حاتم، ابن المُنذِر، بزّار، ابنِ مَردُویہ اور طَبرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہوا ہے، وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قُرظی، عُروہ بن زبیر، ابو صالح، ابوالعالیہ، سعید بن جُبَیر، ضحّاک، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قَتَادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شہاب زُہری، اور ابنِ عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابنِ عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں: ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے ان کا اِستقصا کرنے کی کوشش کی تو ۱۵ عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رُو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپؐ پر اِلقا کر دیے اور آپؐ سمجھے کہ یہ بھی جبریلؑ لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اُس خواہش کے زیرِ اثر سہواً آپؐ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپؐ کو اُونگھ آ گئی تھی اور اس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپؐ نے یہ قصداً کہے مگر استفہامِ انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپؐ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی تھا۔

ابن کثیر، بَیہقی، قاضی عیاض، ابنِ خُزَیمہ، قاضی ابوبکر ابنُ العَرَبی، امام رازی، قُرطبی، بدرالدین عَینی، شوکانی، آلوسی وغیرہ

Maktaba Tul Ishaat.com

حضرات اس قصّے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ ’’جتنی سندوں سے یہ روایت ہوا ہے، سب مُرسَل اور منقطع ہیں، مجھے کسی صحیح متصل سند سے یہ نہیں ملا۔‘‘ بَیہقی کہتے ہیں کہ ’’ازروئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں ہے۔‘‘ ابنِ خُزَیمہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ ’’یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے۔‘‘ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ’’اس کی کمزوری اسی سے ظاہر ہے کہ صحاحِ سِتّہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح، متصل، بے عیب سند کے ساتھ ثِقہ راویوں سے منقول ہوا ہے۔‘‘ امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کر کے اسے بڑے پرزور طریقے سے رَدّ کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف حافظ ابنِ حَجَر جیسے بلند پایہ محدث، اور ابوبکر جَصّاص جیسے نامور فقیہ اور زَمَخشَری جیسے عقلیّت پسند مفسّر، اور ابنِ جَریر جیسے امامِ تفسیر و تاریخ وفقہ اس کو صحیح مانتے ہیں، اور اسی کو آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابنِ حَجَر کا محدّثانہ استدلال یہ ہے کہ:

> ’’سعید بن جُبیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے، وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریقے سے متصلاً بسندِ صحیح بھی نقل ہوا ہے، جسے بزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یوسف بن حماد عن اُمیّۃ بن خالد عن شُعبۃ عن ابی بِشر عن سعید بن جُبیر عن ابنِ عباسؓ)۔ اور دو طریقوں سے یہ اگرچہ مُرسَل ہے مگر اس کے راوی شیخین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طبری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریقِ یونس بن یزید عن ابن شہاب، دوسری بطریقِ مُعتَمِر بن سلیمان وحماد بن سلمۃ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العالیہ۔‘‘

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعُموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے رَدّ کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصّے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے رَدّ کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مُشتَبَہ ہوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا اِستدلال ان لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں، یا جو اب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مُشتَبَہ قرار پاتا ہو، انھیں رَدّ کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نامور صحابی اور بکثرت تابعین و تبع تابعین، اور متعدّد معتبر راویانِ حدیث کی روایت سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے، تو اسے صرف اس بنا پر کیوں رَدّ کر دیا جائے کہ اس سے آپ کا دین مُشتَبَہ ہوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے، جب کہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر ہی رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصّے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو یا قوی ہوتی۔

پہلی چیز خود اُس کی اندرونی شہادت ہے جو اُسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ

اُس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ واقع ہو چکی تھی، اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرینِ حبشہ میں سے ایک گروہ مکہ واپس آ گیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق مُلاحظہ کیجیے:

— ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ نبوی میں واقع ہوئی، اور مہاجرینِ حبشہ کا ایک گروہ مُصَالحت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکے واپس آ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ نبوی کا ہے۔

— سورۂ بنی اسرائیل، جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی، معراج کے بعد اُتری ہے، اور معراج کا زمانہ معتبر ترین رِوایات کی رُو سے ۱۱ یا ۱۲ نبوی کا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

— اور زیرِ بحث آیت، جیسا کہ اس کا سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے، ۱ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو اِلقائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان ۹ سال بعد؟

پھر اس قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۂ نجم میں ہوئی تھی اور اس طرح ہوئی کہ ابتدا سے آپ اصل سورت کے الفاظ پڑھتے چلے آ رہے تھے، یکایک وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچ کر آپ نے بطورِ خود یا شیطانی اغوا سے یہ فقرہ ملایا، اور آگے پھر سورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفارِ مکہ اسے سُن کر خوش ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا۔ مگر سورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں اس الحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:

> ’’پھر تم نے کچھ غور بھی کیا اِن لات اور عُزّیٰ پر اور تیسری ایک اور (دیوی) مناۃ پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ کیا تمھارے لیے تو ہوں بیٹے اور اس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آ گئی ہے۔‘‘

دیکھیے، اس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ واقعی تمھاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شَفاعت ضرور متوقع ہے۔ دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر اُن پر چوٹ کی جاتی ہے کہ بے وقوفو! یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمھیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصے میں آئیں بیٹیاں! یہ سب تمھاری من گھڑت ہے، جسے خدا کی طرف سے کوئی سندِ اعتبار حاصل نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مردِ عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پا کر یہ الفاظ زبان سے

Maktaba Tul Ishaat.com

نکلوا دیے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اُسے سُن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہوگیا تھا کہ بعد کے فقروں میں ان تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سُن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سننے کے بعد یہ پکار اُٹھے ہوں گے کہ چلو آج ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہوگیا؟

یہ تو ہے اس قصّے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لغو اور مُہمل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نُزول بیان کی جارہی ہے، آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصّے میں بیان یہ کیا جارہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو ۵ نبوی میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعے کی توجیہ سورۂ حج کی زیرِ بحث آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہوگی: یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جب کہ آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یوں ہی ڈالے رکھا گیا، اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اس میں لاکر چپکا دیا گیا۔ پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی برس تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نُزول تک اسے کہیں نہ چسپاں کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعے کے ۶ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی، تو علاوہ اُس بے تُکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے۔

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جارہی ہو، اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق وسباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رُکوع پڑھ کر دیکھیے، اور اس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعے پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے (قطع نظر اس سے کہ آیت وَ اِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں، اور آیت کے الفاظ کفار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق)۔ اسی طرح سورۂ حج آپ کے سامنے موجود ہے۔ آیتِ زیرِ بحث سے پہلے کا مضمون بھی پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سیاق وسباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آ گیا کہ ’’اے نبی! ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہوگئی تھی، اُس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیاؑ سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیاؑ اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کرکے اپنی آیات کو پھر پختہ کر دیتا ہے۔‘‘

ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا

ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق وسباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک مُتشکِّک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصّہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا، جب کہ وہ عَلانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ رِوایت قرآن کی ایک نہیں، بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپؐ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش! اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرما بیٹھیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپؐ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مُشتبَہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریلؑ کے ساتھ شیطان بھی آپؐ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے اور آپؐ اسی غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریلؑ ہی لائے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ! اُس روایت پرستی سے جو محض سند کا اِتّصال یا راویوں کی ثِقاہت یا طُرُقِ روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصّے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اس قصّے کی کوئی اصلیت نہیں ہے تو نبیؐ اور قرآن پر اتنا بڑا بہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعے سے، جن میں بعض بڑے نامور ثِقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث ہی کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور مُسنَدِ احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُرتاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک مُلہمانہ شان کے ساتھ ادا ہونا، اس کو سُن کر اگر پورے مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو اور آپؐ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تأثُّر پر کچھ پشیمان سے ہوئے ہوں گے، اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کی ہوگی کہ صاحب، ہمارے کانوں نے تو محمدؐ کی زبان سے اپنے معبُودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے، اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔ دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حبشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہو گئی ہے، کیونکہ دیکھنے والے نے آپؐ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرین میں سے تقریباً ۳۳ آدمی مکّے میں واپس آ گئے۔ ایک صدی کے اندر یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اس سجدے کی یہ توجیہ، اور مہاجرینِ حبشہ کی واپسی، مل جُل کر ایک قصّے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثِقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہو گئے۔ انسان آخر انسان ہے۔ بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً
اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾ ع وَ
الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ

انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ یا تو اُن پر قیامت کی گھڑی اچانک آجائے، یا ایک منحوس[۱۰۲] دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ اُس روز بادشاہی اللہ کی ہوگی، اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے گا۔ جو ایمان رکھنے والے اور عملِ صالح کرنے والے ہوں گے، وہ نعمت بھری جنتوں میں جائیں گے، اور جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہوگا، اُن کے لیے رُسوا کن عذاب ہوگا۔ع اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر قتل کر دیے گئے یا مر گئے، اللہ ان کو اچھا رزق

لغزش ہو جاتی ہے، اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ عقیدت میں بے جا غُلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں۔ اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انھیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو ان کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذرِ آتش کر دینے کے لائق ہے۔

۱۰۲ - اصل میں لفظ عَقِیْم استعمال ہُوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ''بانجھ'' ہے۔ دن کو بانجھ کہنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ ایسا منحوس دن ہو جس میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، ہر کوشش اُلٹی پڑے، اور ہر اُمید مایوسی میں تبدیل ہو جائے۔ دوسرے، یہ کہ وہ ایسا دن ہو جس کے بعد رات دیکھنی نصیب نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں مراد ہے وہ دن جس میں کسی قوم کی بربادی کا فیصلہ ہو جائے۔ مثلاً جس روز قومِ نوح پر طوفان آیا، وہ اس کے لیے ''بانجھ'' دن تھا۔ اسی طرح عاد، ثمود، قومِ لوط، اہلِ مَدیَن، اور دوسری سب تباہ شدہ قوموں کے حق میں عذابِ الٰہی کے نزول کا دن بانجھ ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اُس ''اِمروز'' کا کوئی ''فردا'' پھر وہ نہ دیکھ سکے، اور کوئی چارہ گری اُن کے لیے ممکن نہ ہوئی جس سے وہ اپنی قسمت کی بگڑی بنا سکتے۔

رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۵۸﴾ لَیُدْخِلَنَّهُمْ
مُّدْخَلًا یَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ ﴿۵۹﴾ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ
عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْهِ لَیَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ
یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ

دے گا۔ اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انھیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔ بے شک اللہ علیم اور حلیم ہے[۱۰۳]۔ یہ تو ہے اُن کا حال، اور جو کوئی بدلہ لے، ویسا ہی جیسا اُس کے ساتھ کیا گیا، اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو، تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا[۱۰۴]۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے[۱۰۵]۔

یہ اس[۱۰۶] لیے کہ رات سے[۱۰۷] دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے[۱۰۸]۔ یہ اس لیے

---

۱۰۳ - ''علیم'' ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ کس نے فی الحقیقت اُسی کی راہ میں گھر بار چھوڑا ہے اور وہ کس انعام کا مستحق ہے۔ ''حلیم'' ہے، یعنی ایسے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ان کی بڑی بڑی خدمات اور قربانیوں پر پانی پھیر دینے والا نہیں ہے۔ وہ ان سے درگزر فرمائے گا اور ان کے قصور معاف کر دے گا۔

۱۰۴ - پہلے ان مظلوموں کا ذکر تھا جو ظلم کے مقابلے میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکے ہوں، اور یہاں اُن کا ذکر ہے جو ظالموں کے مقابلے میں قوت استعمال کریں۔

امام شافعیؒ نے اس آیت سے یہ اِستدلال کیا ہے کہ قِصاص اُسی شکل میں لیا جائے گا جس شکل میں ظلم کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی شخص نے اگر آدمی کو ڈبو کر مارا ہے تو اسے بھی ڈبو کر مارا جائے گا، اور کسی نے جلا کر مارا ہے تو اسے بھی جلا کر مارا جائے گا۔ لیکن حَنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ قاتل نے قتل خواہ کسی طریقے سے کیا ہو، اس سے قِصاص ایک ہی معروف طریقے سے لیا جائے گا۔

۱۰۵ - اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں: ایک، یہ کہ ظلم کے مقابلے میں جو کُشت و خون کیا جائے وہ اللہ کے ہاں معاف ہے، اگرچہ کُشت وخون بجائے خود اچھی چیز نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ جس کے تم بندے ہو، عَفو و درگزر کرنے والا ہے، اس لیے تم کو بھی، جہاں تک بھی تمھارے بس میں ہو، عَفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ اہلِ ایمان کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰہَ ھُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ھُوَ الۡبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ
الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصۡبِحُ
الۡاَرۡضُ مُخۡضَرَّۃً ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿ۚ۶۳﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ

کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں[109]، اور اللہ ہی بالا دست اور بزرگ ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے[110]؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے[111]۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

اَخلاق کا زیور یہی ہے کہ وہ حلیم، عالی ظرف اور متحمل ہوں۔ بدلہ لینے کا حق انھیں ضرور حاصل ہے، مگر بالکل منتقمانہ ذہنیت اپنے اُوپر طاری کر لینا ان کے لیے موزوں نہیں ہے۔

۱۰۶ – اس پیراگراف کا تعلق اُوپر کے پورے پیراگراف سے ہے، نہ کہ صرف قریب کے آخری فقرے سے۔ یعنی کفر و ظلم کی رَوِش اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کرنا، مومن و صالح بندوں کو انعام دینا، مظلوم اہلِ حق کی داد رسی کرنا، اور طاقت سے ظلم کا مقابلہ کرنے والے اہلِ حق کی نصرت فرمانا، یہ سب کس وجہ سے ہے؟ اس لیے کہ اللہ کی صفات یہ اور یہ ہیں۔

۱۰۷ – یعنی تمام نظامِ کائنات پر وہی حاکم ہے اور گردشِ لیل و نہار اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس ظاہری معنیٰ کے ساتھ اِس فقرے میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو خدا رات کی تاریکی میں سے دن کی روشنی نکال لاتا ہے اور چمکتے ہوئے دن پر رات کی ظلمت طاری کر دیتا ہے، وہی خدا اس پر بھی قادر ہے کہ آج جن کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر ہے، اُن کے زوال و غروب کا منظر بھی دنیا کو جلدی ہی دکھا دے، اور کفر و جہالت کی جو تاریکی اِس وقت حق و صداقت کی فجر کا راستہ روک رہی ہے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے حکم سے چھٹ جائے اور وہ دن نکل آئے جس میں راستی اور علم و معرفت کے نور سے دُنیا روشن ہو جائے۔

۱۰۸ – یعنی وہ دیکھنے اور سننے والا خدا ہے، اندھا بہرا نہیں ہے۔

۱۰۹ – یعنی حقیقی اختیارات کا مالک اور واقعی رب وہی ہے، اس لیے اس کی بندگی کرنے والے خائب و خاسر نہیں رہ سکتے۔ اور دوسرے تمام معبود سراسر بے حقیقت ہیں، ان کو جن صفات اور اختیارات کا مالک سمجھ لیا گیا ہے، اُن کی سرے سے کوئی اصلیت نہیں ہے، اس لیے خدا سے منہ موڑ کر اُن کے اعتماد پر جینے والے کبھی فلاح و کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔

۱۱۰ – یہاں پھر ظاہر مفہُوم کے پیچھے ایک لطیف اشارہ چھپا ہُوا ہے۔ ظاہر مفہوم تو محض اللہ کی قدرت کا بیان ہے۔ مگر لطیف اشارہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کی برسائی ہوئی بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی تم دیکھتے ہو کہ سوکھی پڑی

ع ۹ ۱۵

مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶۴ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ
لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ
السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝۶۵ وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ

جو کچھ زمین میں ہے۔ بے شک وہی غنی و حمید ہے[۱۱۲] ع کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے، اور اُسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے، اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اِذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا؟[۱۱۳] واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے۔ وہی ہے جس نے تمھیں زندگی بخشی ہے، وہی تم کو موت دیتا ہے اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی

ہوئی زمین یکایک لہلہا اُٹھتی ہے، اسی طرح یہ وحی کا بارانِ رحمت جو آج ہو رہا ہے، عنقریب تم کو یہ منظر دکھانے والا ہے کہ یہی عرب کا بنجر ریگستان علم اور اَخلاق اور تہذیبِ صالح کا وہ گلزار بن جائے گا جو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

۱۱۱ - "لطیف" ہے، یعنی غیر محسوس طریقوں سے اپنے ارادے پورے کرنے والا ہے۔ اس کی تدبیریں ایسی ہوتی ہیں کہ لوگ اُن کے آغاز میں کبھی اُن کے انجام کا تصوُّر تک نہیں کر سکتے۔ لاکھوں بچے دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں، کون جان سکتا ہے کہ ان میں سے کون ابراہیمؑ ہے جو تین چوتھائی دُنیا کا روحانی پیشوا ہو گا، اور کون چنگیز ہے جو ایشیا اور یورپ کو تہ و بالا کر ڈالے گا۔ خُردبین جب ایجاد ہوئی تھی، اس وقت کون تصوّر کر سکتا تھا کہ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک نوبت پہنچائے گی۔ کولمبس جب سفر کو نکل رہا تھا تو کسے معلوم تھا کہ یہ ریاست ہائے مُتّحدہ امریکا کی بِنا ڈالی جا رہی ہے۔ غرض خدا کے منصوبے ایسے ایسے دقیق اور ناقابلِ اِدراک طریقوں سے پورے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ جائیں، کسی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ کس چیز کے لیے کام ہو رہا ہے۔

"خبیر" ہے، یعنی وہ اپنی دُنیا کے حالات، مصالح اور ضروریات سے باخبر ہے، اور جانتا ہے کہ اپنی خدائی کا کام کس طرح کرے۔

۱۱۲ - وہی "غنی" ہے، یعنی صرف اسی کی ذات ایسی ہے جو کسی کی محتاج نہیں۔ اور وہی "حمید" ہے، یعنی تعریف اور حمد اسی کے لیے ہے اور وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، خواہ کوئی حمد کرے یا نہ کرے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي
الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ وَاِنْ
جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي

منکرِ حق ہے۔[114]

ہر اُمّت[115] کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت[116] مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے، پس اے محمدؐ! وہ اِس معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں[117]۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو[118]۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ "جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے، اللہ قیامت کے روز تمھارے درمیان اُن سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔" کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان وزمین

---

۱۱۳ – آسمان سے مراد یہاں پورا عالَمِ بالا ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ تھمی ہوئی ہے۔

۱۱۴ – یعنی یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اُس حقیقت کا انکار کیے جاتا ہے جسے انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔

۱۱۵ – یعنی ہر نبی کی اُمّت۔

۱۱۶ – یہاں "مَنسَک" کا لفظ قربانی کے معنیٰ میں نہیں بلکہ پورے نظامِ عبادت کے معنیٰ میں ہے۔ اِس سے پہلے اسی لفظ کا ترجمہ "قربانی کا قاعدہ" کیا گیا تھا، کیونکہ وہاں بعد کا فقرہ "تاکہ لوگ اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں" اس کے وسیع معانی میں سے صرف قربانی مراد ہونے کی تصریح کر رہا تھا۔ لیکن یہاں اسے محض "قربانی" کے معنیٰ میں لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ عبادت کو بھی اگر "پرستش" کے بجائے "بندگی" کے وسیع تر مفہوم میں لیا جائے تو مدعا سے قریب تر ہوگا۔ اس طرح مَنسَک (طریقِ بندگی) کے وہی معنیٰ ہو جائیں گے جو شریعت اور منہاج کے معنیٰ ہیں، اور یہ اسی مضمون کا اعادہ ہوگا جو سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔" (آیت ۴۸)

۱۱۷ – یعنی جس طرح پہلے انبیا اپنے اپنے دَور کی اُمتوں کے لیے ایک "مَنسَک" لائے تھے، اسی طرح اس دَور کی اُمّت کے لیے تم ایک "مَنسَک" لائے ہو۔ اب کسی کو تم سے نزاع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس دَور کے لیے یہی مَنسَکِ حق ہے۔ سورۂ جاثیہ میں اِس مضمون کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ

السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ فِیۡ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ
یَسِیۡرٌ ﴿۷۰﴾ وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا وَّ مَا
لَیۡسَ لَہُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ نَّصِیۡرٍ ﴿۷۱﴾ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ
اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمُنۡکَرَ ؕ یَکَادُوۡنَ

کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔[119] یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کر رہے ہیں جن کے لیے نہ تو اس نے کوئی سند نازل کی ہے اور نہ یہ خود اُن کے بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں۔[120] اِن ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے۔[121] اور جب ان کو ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ منکرینِ حق کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے

اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (آیت ۱۸) ''پھر (انبیائے بنی اسرائیل کے بعد) اَے محمدؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک شریعت (طریقے) پر قائم کیا، پس تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔'' (مفصّل تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۲۰)

۱۱۸ – یہ فقرہ اس مطلب کو پوری طرح واضح کر رہا ہے جو پچھلے فقرے کی تفسیر میں ابھی ہم بیان کر آئے ہیں۔

۱۱۹ – سلسلۂ کلام سے اس پیراگراف کا تعلق سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۵۵ تا ۵۷ نگاہ میں رہنی چاہئیں۔

۱۲۰ – یعنی نہ تو خدا کی کسی کتاب میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے فلاں فلاں کو اپنے ساتھ خدائی میں شریک کیا ہے، لہٰذا ہمارے ساتھ تم ان کی بھی عبادت کیا کرو، اور نہ ان کو کسی علمی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ واقعی اُلوہیّت میں حصّہ دار ہیں اور اس بنا پر ان کو عبادت کا حق پہنچتا ہے۔ اب یہ جو طرح طرح کے معبُود گھڑے گئے ہیں، اور ان کی صفات اور اختیارات کے متعلق قسم قسم کے عقائد تصنیف کر لیے گئے ہیں، اور ان کے آستانوں پر جبہہ سائیاں ہو رہی ہیں، دُعائیں مانگی جا رہی ہیں، چڑھاوے چڑھ رہے ہیں، نیازیں دی جا رہی ہیں، طواف کیے جا رہے ہیں اور اعتکاف ہو رہے ہیں، یہ سب جاہلانہ گمان کی پیروی کے سوا آخر اور کیا ہے۔

۱۲۱ – یعنی یہ احمق لوگ سمجھ رہے ہیں کہ یہ معبُود دُنیا اور آخرت میں ان کے مددگار ہیں، حالانکہ حقیقت میں ان کا کوئی بھی مددگار نہیں ہے۔ نہ یہ معبُود، کیونکہ ان کے پاس مدد کی کوئی طاقت نہیں، اور نہ اللہ، کیونکہ اس سے یہ بغاوت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اپنی اس حماقت سے یہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کر رہے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ
ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ ع ۹ / ۸ / ۱۲
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ
الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ
الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

کہ ابھی وہ اُن لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے جو انھیں ہماری آیات سُناتے ہیں۔ ان سے کہو: ”میں بتاؤں تمھیں کہ اس سے بدتر چیز کیا ہے؟[۱۲۲] آگ، اللہ نے اُسی کا وعدہ اُن لوگوں کے حق میں کر رکھا ہے جو قبولِ حق سے انکار کریں، اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔“ ع

لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اُسے چُھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔[۱۲۳] اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی، جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔

۱۲۲– یعنی کلامِ الٰہی کی آیات سن کر جو غصّے کی جلن تم کو لاحق ہوتی ہے، اس سے شدید تر چیز، یا یہ کہ ان آیات کو سنانے والوں کے ساتھ جو زیادہ سے زیادہ برائی تم کر سکتے ہو، اس سے زیادہ بدتر چیز، جس سے تمھیں سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۱۲۳– یعنی مدد چاہنے والا تو اس لیے کسی بالاتر طاقت کی طرف استمداد کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ مگر اس غرض کے لیے یہ جن کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، ان کی کمزوری کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مکھی سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اب غور کرو کہ اُن لوگوں کی کمزوری کا کیا حال ہوگا جو خود بھی کمزور ہوں اور ان کی امیدوں کے سہارے بھی کمزور۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ
بَصِيْرٌ ۚ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۩﴿۷۷﴾ وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ

السجدۃ عند الشافعیؒ

حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔[۱۲۴] وہ سمیع اور بصیر ہے، جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے،[۱۲۵] اور سارے معاملات اسی کی طرف رُجوع ہوتے ہیں۔[۱۲۶]

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، رُکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔[۱۲۷] اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔[۱۲۸] اس نے

۱۲۴ – مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبود بنایا ہے، ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیاء۔ اور ان کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں، جن کو اس نے اس خدمت کے لیے چُن لیا ہے۔ محض یہ فضیلت ان کو خدا، یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔

۱۲۵ – یہ فقرہ قرآنِ مجید میں بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیاء و صلحا کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھ کر نہ سہی، اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کے کھلے اور چھُپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے، ملائکہ اور انبیا سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔

۱۲۶ – یعنی تدبیرِ امر بالکل اس کے اختیار میں ہے۔ کائنات کے کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مَرجَع کوئی دوسرا نہیں ہے کہ اس کے پاس تم اپنی درخواستیں لے جاؤ۔ ہر معاملہ اسی کے آگے فیصلے کے لیے پیش ہوتا ہے۔ لہٰذا دستِ طلب بڑھانا ہے تو اس کی طرف بڑھاؤ۔ ان بے اختیار ہستیوں سے کیا مانگتے ہو جو خود اپنی بھی کوئی حاجت آپ پوری کر لینے پر قادر نہیں ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۲۷- یعنی فلاح کی توقع اگر کی جا سکتی ہے تو یہی رَوِش اختیار کرنے سے کی جا سکتی ہے۔لیکن جو شخص بھی یہ رَوِش اختیار کرے، اُسے اپنے عمل پر گھمنڈ نہ ہونا چاہیے کہ میں جب ایسا عبادت گزار اور نیکوکار ہوں تو ضرور فلاح پاؤں گا، بلکہ اسے اللہ کے فضل کا امیدوار رہنا چاہیے اور اسی کی رحمت سے توقعات وابستہ کرنی چاہییں۔ وہ فلاح دے تب ہی کوئی شخص فلاح پا سکتا ہے۔خود فلاح حاصل کر لینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

''شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو'' یہ فقرہ ارشاد فرمانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح فلاح نصیب ہونا مشکوک ہے۔ بلکہ دراصل یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ بادشاہ اگر اپنے کسی ملازم سے یہ کہے کہ فلاں کام کرو، شاید کہ تمھیں فُلاں منصب مل جائے، تو ملازم کے گھر شادیانے بج جاتے ہیں، کیونکہ یہ اشارتاً ایک وعدہ ہے، اور ایک مہربان آقا سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ کسی خدمت پر ایک صلے کی اُمید وہ خود دلائے اور پھر اپنے وفادار خادم کو مایوس کرے۔

امام شافعی، امام احمد، عبداللہ بن مبارک اور اسحاق بن رَاہَوَیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سورۂ حج کی یہ آیت بھی آیتِ سجدہ ہے۔مگر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، حسن بصریؒ، سعید بن المُسَیَّب، سعید بن جُبَیرؒ، ابراہیم نَخَعیؒ اور سفیان ثَوریؒ اس جگہ سجدۂ تلاوت کے قائل نہیں ہیں۔دونوں طرف کے دلائل ہم مختصراً یہاں نقل کر دیتے ہیں:

پہلے گروہ کا اوّلین اِستدلال ظاہرِ آیت سے ہے کہ اس میں سجدے کا حکم ہے۔دوسری دلیل عُقبہؓ بن عامر کی وہ روایت ہے جسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ مَردُوْیَہ اور بَیہَقی نے نقل کیا ہے کہ قلت یا رسول اللّٰہ افضلت سورۃ الحج علی سائر القراٰن بسجدتین؟ قال نعم فمن لم یسجدھما فلا یقرأھما، ''میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا سورۂ حج کو سارے قرآن پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، پس جو اُن پر سجدہ نہ کرے وہ انھیں نہ پڑھے۔'' تیسری دلیل ابوداؤد اور ابنِ ماجہ کی وہ روایت ہے جس میں عَمروؓ بن عاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورۂ حج میں دو سجدے سکھائے تھے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرات عمرؓ، علیؓ، عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، ابنِ عباسؓ، ابوالدَّرداءؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ اور عَمّار بن یاسرؓ سے یہ بات منقول ہے کہ سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔

دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ آیت میں محض سجدے کا حکم نہیں ہے بلکہ رکوع اور سجدے کا ایک ساتھ ہے، اور قرآن میں رُکوع وسجود ملا کر جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے۔ نیز رکوع وسجود کا اجتماع نماز ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔عُقبہؓ بن عامر کی روایت کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔اس کو ابنِ لہیعہ، ابوالمُصعَب بصری سے روایت کرتا ہے اور یہ دونوں ضعیف راوی ہیں۔خاص کر ابوالمُصعَب تو وہ شخص ہے جو حجاج بن یوسُف کے ساتھ کعبے پر منجنیق سے پتھر برسانے والوں میں شامل تھا۔عَمروؓ بن عاص والی روایت کو بھی وہ پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کو سعید العتقی، عبداللہ بن مُنَین الکِلَابی سے روایت کرتا ہے، اور دونوں مجہول ہیں، کچھ پتا نہیں کہ کون تھے اور کس پایے کے آدمی تھے۔اقوالِ صحابہؓ کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ابنِ عباسؓ نے سورۂ حج میں دو سجدے ہونے کا یہ مطلب صاف بتایا ہے کہ الاولی عزمۃ والاخرۃ تعلیم، یعنی پہلا سجدہ لازمی ہے، اور دوسرا سجدہ تعلیمی۔

۱۲۸- جہاد سے مراد محض ''قِتال'' (جنگ) نہیں ہے، بلکہ یہ لفظ جِدّوجُہد اور کشمکش اور انتہائی سعی وکوشش

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ
بَصِيْرٌ ۚ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۷۷﴾ وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ

السجدة عند الشافعي

حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔[۱۲۴] وہ سمیع اور بصیر ہے، جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے،[۱۲۵] اور سارے معاملات اسی کی طرف رُجوع ہوتے ہیں۔[۱۲۶] اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، رُکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔[۱۲۷] اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔[۱۲۸] اس نے

۱۲۴ – مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبود بنایا ہے، ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیا۔ اور ان کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں، جن کو اس نے اس خدمت کے لیے چُن لیا ہے۔ محض یہ فضیلت ان کو خدا، یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔

۱۲۵ – یہ فقرہ قرآنِ مجید میں بالعُموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیا وصلحا کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھ کر نہ سہی، اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کے کھلے اور چھپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے، ملائکہ اور انبیا سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔

۱۲۶ – یعنی تدبیر امر بالکل اس کے اختیار میں ہے۔ کائنات کے کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مرجع کوئی دوسرا نہیں ہے کہ اس کے پاس تم اپنی درخواستیں لے جاؤ۔ ہر معاملہ اسی کے آگے فیصلے کے لیے پیش ہوتا ہے۔ لہٰذا دستِ طلب بڑھانا ہے تو اس کی طرف بڑھاؤ۔ ان بے اختیار ہستیوں سے کیا مانگتے ہو جو خود اپنی بھی کوئی حاجت آپ پوری کر لینے پر قادر نہیں ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِبْرٰهِيمَ ۚ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ
شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا
الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ ۗ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٧٨﴾ ع

کی ملّت پر[۱۳۱]۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے[۱۳۲])۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر[۱۳۳]۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ[۱۳۴]۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ، اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔ ع

ان کو جانی پہچانی نیکیوں کا حکم دیتا ہے، اور ان بُرائیوں سے روکتا ہے جن سے فطرتِ انسانی انکار کرتی ہے، اور وہ چیزیں حلال کرتا ہے جو پاکیزہ ہیں، اور وہ چیزیں حرام کرتا ہے جو گندی ہیں، اور ان پر سے وہ بھاری بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے، اور وہ زنجیریں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔" (اعراف، آیت ۱۵۷)

۱۳۱ – اگرچہ اسلام کو ملّتِ نوحؑ، ملّتِ موسیٰؑ، ملّتِ عیسیٰؑ بھی اسی طرح کہا جا سکتا ہے جس طرح ملّتِ ابراہیمؑ، لیکن قرآنِ مجید میں اس کو بار بار ملّتِ ابراہیمؑ کہہ کر اس کے اتباع کی دعوت تین وجوہ سے دی گئی ہے: ایک یہ کہ قرآن کے اوّلین مخاطَب اہلِ عرب تھے اور وہ حضرت ابراہیمؑ سے جس طرح مانوس تھے، کسی اور سے نہ تھے۔ ان کی تاریخ، روایات اور معتقدات میں جس شخصیت کا رُسوخ و اثر رچا ہوا تھا، وہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی شخصیت تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہی وہ شخص تھے جن کی بزرگی پر یہودی، عیسائی، مسلمان، مشرکینِ عرب، اور شرقِ اَوسَط کے صابی، سب مُتّفِق تھے۔ انبیاؑ میں کوئی دوسرا ایسا نہ تھا اور نہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب ملّتوں کی پیدائش سے پہلے گزرے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور صابئیّت کے متعلق تو معلوم ہی ہے کہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ رہے مشرکینِ عرب، تو وہ بھی یہ مانتے تھے کہ ان کے ہاں بت پرستی کا رواج عَمرو بن لُحَیّ سے شروع ہوا جو بنی خُزاعہ کا سردار تھا اور مآب (مُوآب) کے علاقے سے ہُبَل نامی بت لے آیا تھا۔ اُس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو سال قبلِ مسیح کا ہے۔ لہٰذا یہ ملّت بھی حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد پیدا ہوئی۔ اس صورتِ حال میں قرآن جب کہتا ہے کہ ان ملّتوں کے بجائے ملّتِ ابراہیمؑ کو اختیار کرو، تو وہ دراصل اس حقیقت پر مُتنبِّہ کرتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ برحق اور برسرِ ہدایت تھے، اور ان ملّتوں میں سے کسی کے پیرو نہ تھے، تو لامحالہ پھر وہی ملّت اصل ملّتِ حق ہے، نہ کہ یہ بعد کی ملّتیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اُسی ملّت کی طرف ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۳۴-۱۳۵۔ آلِ عمران، حواشی ۵۸-۷۹۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۲۰)

۱۳۲ – "تمہارا" کا خطاب مخصوص طور پر صرف اُنھی اہلِ ایمان کی طرف نہیں ہے جو اِس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، یا اس کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں داخل ہوئے، بلکہ اس کے مخاطَب تمام وہ لوگ ہیں جو آغاز

تاریخِ انسانی سے توحید، آخرت، رسالت اور کُتُبِ الٰہی کے ماننے والے رہے ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ اس ملّتِ حق کے ماننے والے پہلے بھی ''نوحی''، ''ابراہیمی''، ''موسوی''، ''مسیحی'' وغیرہ نہیں کہلاتے تھے، بلکہ ان کا نام ''مسلم'' (اللہ کے تابعِ فرمان) تھا، اور آج بھی وہ ''محمدی'' نہیں بلکہ ''مسلم'' ہیں۔ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ سوال مُعمّا بن گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کا نام قرآن سے پہلے کس کتاب میں مسلم رکھا گیا تھا۔

۱۳۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴۔ اس سے زیادہ شرح وبَسط کے ساتھ اس مضمون پر ہم نے اپنے رسالہ ''شہادتِ حق'' میں روشنی ڈالی ہے۔

۱۳۴ – یا دوسرے الفاظ میں اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ ہدایت اور قانونِ زندگی بھی اسی سے لو، اطاعت بھی اسی کی کرو، خوف بھی اسی کا رکھو، اُمیدیں بھی اسی سے وابستہ کرو، مدد کے لیے بھی اسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ، اور اپنے توکّل واعتماد کا سہارا بھی اسی کی ذات کو بناؤ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

المومنون

(۲۳)

المومنون

نام پہلی ہی آیت قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اندازِ بیان اور مضامین، دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزُول مکے کا دَورِ متوسّط ہے۔ پسِ منظر میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان سخت کش مکش برپا ہے، لیکن ابھی کفار کے ظلم وستم نے پورا زور نہیں پکڑا ہے۔ آیت ۷۵-۷۶ سے صاف طور پر یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ مکے کے اُس قحط کی شدّت کے زمانے میں نازل ہوئی ہے جو معتبر روایات کی رو سے اسی دورِ متوسّط میں برپا ہوا تھا۔ عُروہؒ بن زبیرؓ کی ایک رِوایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عمرؓ ایمان لا چکے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ سورت ان کے سامنے نازل ہوئی ہے۔ وہ خود نزولِ وحی کی کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے، اور جب حضورؐ اس سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ اگر کوئی اُن کے معیار پر پورا اُتر جائے تو یقیناً جنت میں جائے گا، پھر آپؐ نے اس سورہ کی ابتدائی آیات سنائیں۔ (احمد، ترمذی، نسائی، حاکم)

موضوع اور مباحث اتباعِ رسولؐ کی دعوت اِس سورت کا مرکزی مضمون ہے اور پوری تقریر اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔

آغازِ کلام اس طرح ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اِس پیغمبر کی بات مان لی ہے، اُن کے اندر یہ اور یہ اوصاف پیدا ہو رہے ہیں، اور یقیناً ایسے ہی لوگ دُنیا و آخرت کی فلاح کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد انسان کی پیدائش، آسمان و زمین کی پیدائش، نباتات و حیوانات کی پیدائش، اور دوسرے آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جس سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ توحید اور مَعاد کی جن حقیقتوں کو ماننے کے لیے یہ پیغمبر تم سے کہتا ہے، ان کے برحق ہونے پر تمھارا اپنا وجود اور یہ پورا نظامِ عالم گواہ ہے۔

پھر انبیا علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے قصّے شروع کیے گئے ہیں، جو بظاہر تو قصّے ہی نظر آتے ہیں، لیکن دراصل اس پیرایے میں چند باتیں سامعین کو سمجھائی گئی ہیں:

اوّل، یہ کہ آج تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو شبہات و اعتراضات وارد کر رہے ہو، وہ کچھ نئے نہیں ہیں۔ پہلے بھی جو انبیاؑ دُنیا میں آئے تھے، جن کو تم خود فرستادۂ الٰہی مانتے ہو، ان سب پر ان کے زمانے کے جاہلوں نے یہی اعتراضات کیے تھے۔ اب دیکھ لو کہ تاریخ کا سبق کیا بتا رہا ہے۔ اعتراضات کرنے والے برحق تھے یا انبیاؑ۔

دوم، یہ کہ توحید و آخرت کے متعلق جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، یہی تعلیم ہر زمانے کے انبیاؑ نے

Maktaba Tul Ishaat.com

دی ہے۔ اُس سے مختلف کوئی نرالی چیز آج نہیں پیش کی جا رہی ہے جو کبھی دُنیا نے نہ سنی ہو۔

سوم، یہ کہ جن قوموں نے انبیاؑ کی بات سُن کر نہ دی اور ان کی مخالفت پر اصرار کیا وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہیں۔

چہارم، یہ کہ خدا کی طرف سے ہر زمانے میں ایک ہی دین آتا رہا ہے اور تمام انبیاؑ ایک ہی اُمّت کے لوگ تھے۔ اُس دینِ واحد کے سوا، جو مختلف مذاہب تم لوگ دنیا میں دیکھ رہے ہو، یہ سب لوگوں کے طبع زاد ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مِن جانبِ اللہ نہیں ہے۔

ان قصوں کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیوی خوش حالی، مال و دولت، آل و اولاد، حَشم و خَدَم، قوت و اقتدار وہ چیزیں نہیں ہیں جو کسی شخص یا گروہ کے راہِ راست پر ہونے کی یقینی علامت ہوں اور اس بات کی دلیل قرار دی جائیں کہ خدا اس پر مہربان ہے اور اس کا رَوِیّہ خدا کو محبوب ہے۔ اسی طرح کسی کا غریب اور خستہ حال ہونا بھی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا اس سے اور اس کے رَوِیّے سے ناراض ہے۔ اصل چیز جس پر خدا کے ہاں محبوب یا مغضوب ہونے کا مدار ہے، وہ آدمی کا ایمان اور اس کی خدا ترسی و راست بازی ہے۔ یہ باتیں اس لیے ارشاد ہوئی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اُس وقت جو مزاحمت ہو رہی تھی، اس کے عَلَم بردار سب کے سب مکے کے شُیوخ اور بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ اپنی جگہ خود بھی یہ گھمنڈ رکھتے تھے، اور ان کے زیرِ اثر لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نعمتوں کی بارش جن لوگوں پر ہو رہی ہے اور جو بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں، اُن پر ضرور خدا اور دیوتاؤں کا کرم ہے۔ رہے یہ ٹوٹے مارے لوگ جو محمدؐ کے ساتھ ہیں، اِن کی تو حالت خود ہی یہ بتا رہی ہے کہ خدا اِن کے ساتھ نہیں ہے، اور دیوتاؤں کی تو مار ہی ان پر پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اہلِ مکہ کو مختلف پہلوؤں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ قحط جو تم پر نازل ہوا ہے، یہ ایک تنبیہ ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو دیکھ کر سنبھلو اور راہِ راست پر آ جاؤ۔ ورنہ اس کے بعد سخت تر سزا آئے گی جس پر بلبلا اُٹھو گے۔

پھر ان کو از سرِ نَو اُن آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو کائنات میں اور خود ان کے اپنے وجود میں موجود ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھو، جس توحید اور جس حیات بعد الموت کی حقیقت سے یہ پیغمبر تم کو آگاہ کر رہا ہے، کیا ہر طرف اس کی شہادت دینے والے آثار پھیلے ہوئے نہیں ہیں؟ کیا تمھاری عقل اور فطرت اس کی صحّت و صداقت پر گواہی نہیں دیتی؟

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ یہ لوگ تمھارے مقابلے میں کیسا ہی بُرا رَوِیّہ اختیار کریں، تم بھلے طریقوں ہی سے مُدافعت کرنا۔ شیطان کبھی تم کو جوش میں لا کر بُرائی کا جواب بُرائی سے دینے پر آمادہ نہ کرنے پائے۔

خاتمۂ کلام پر مخالفینِ حق کو آخرت کی باز پُرس سے ڈرایا گیا ہے اور انھیں مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ جو کچھ تم دعوتِ حق اور اس کے پیروؤں کے ساتھ کر رہے ہو، اس کا سخت حساب تم سے لیا جائے گا۔

---

۱۱۸ آیاتہا

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ

۶ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الجزء ۱۸

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾

یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے[۱] جو:

اپنی[۲] نماز میں خشوع[۳] اختیار کرتے ہیں۔

۱ – ایمان لانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی، آپؐ کو اپنا ہادی و رہبر مان لیا، اور اُس طریقِ زندگی کی پیروی پر راضی ہو گئے جسے آپؐ نے پیش کیا ہے۔

فلاح کے معنٰی ہیں: کامیابی وخوش حالی۔ یہ لفظ خُسران کی ضد ہے، جو ٹوٹے اور گھاٹے اور نامرادی کے معنٰی میں بولا جاتا ہے۔ اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنٰی ہیں: فلاں شخص کامیاب ہوا، اپنی مراد کو پہنچا، آسودہ و خوش حال ہو گیا، اس کی کوشش بار آور ہوئی، اس کی حالت اچھی ہو گئی۔

قَدْ اَفْلَحَ ''یقیناً فلاح پائی''۔ آغازِ کلام اِن الفاظ سے کرنے کی معنویت اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک وہ ماحول نگاہ میں نہ رکھا جائے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ اُس وقت ایک طرف دعوتِ اسلامی کے مخالف سردارانِ مکہ تھے جن کی تجارتیں چمک رہی تھیں، جن کے پاس دولت کی ریل پیل تھی، جن کو دنیوی خوش حالی کے سارے لوازم میسّر تھے۔ اور دوسری طرف دعوتِ اسلامی کے پیرو تھے، جن میں سے اکثر تو پہلے ہی غریب اور خستہ حال تھے، اور بعض جو اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یا اپنے کاروبار میں پہلے کامیاب تھے، ان کو بھی اب قوم کی مخالفت نے بدحال کر دیا تھا۔ اس صورتِ حال میں جب تقریر کا آغاز اِس فقرے سے کیا گیا کہ ''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے'' تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلا کہ تمھارا معیارِ فلاح وخُسران غلط ہے، تمھارے اندازے غلط ہیں، تمھاری نگاہ دوررس نہیں ہے، تم اپنی جس عارضی ومحدود خوش حالی کو فلاح سمجھ رہے ہو، وہ فلاح نہیں خُسران ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو جو تم ناکام ونامراد سمجھ رہے ہو، وہ دراصل کامیاب وبامراد ہیں۔ اس دعوتِ حق کو مان کر انھوں نے خسارے کا سودا نہیں کیا ہے، بلکہ وہ چیز پائی ہے جو دُنیا اور آخرت، دونوں میں ان کو پائدار خوش حالی سے ہم کنار کرے گی۔ اور اسے رد کر کے دراصل خسارے کا سودا تم نے کیا ہے، جس کے بُرے نتائج تم یہاں بھی دیکھو گے اور دُنیا سے گزر کر دوسری زندگی میں بھی دیکھتے رہو گے۔

یہی اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے اور ساری تقریر اوّل سے آخر تک اسی مدعا کو ذہن نشین کرنے کے لیے کی گئی ہے۔

۲ – یہاں سے آیت ۹ تک ایمان لانے والوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ گویا دلیلیں ہیں اس

Maktaba Tul Ishaat.com

دعوے کی کہ انھوں نے ایمان لا کر درحقیقت فلاح پائی ہے۔ بالفاظِ دیگر، گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ ایسے لوگ آخر کیوں کر فلاح یاب نہ ہوں جن کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ اِن اوصاف کے لوگ ناکام و نامراد کیسے ہو سکتے ہیں۔ کامیابی انھیں نصیب نہ ہوگی تو اور کسے ہوگی۔

۳- خُشوع کے اصل معنٰی ہیں کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا، اظہارِ عجز و انکسار کرنا۔ اس کیفیت کا تعلق دل سے بھی ہے اور جسم کی ظاہری حالت سے بھی۔ دل کا خشوع یہ ہے کہ آدمی کسی کی ہیبت اور عظمت و جلال سے مرعوب ہو۔ اور جسم کا خشوع یہ ہے کہ جب وہ اُس کے سامنے جائے تو سر جھک جائے، اعضا ڈھیلے پڑ جائیں، نگاہ پست ہو جائے، آواز دب جائے، اور ہیبت زدگی کے وہ سارے آثار اس پر طاری ہو جائیں جو اُس حالت میں فطرتاً طاری ہو جایا کرتے ہیں جب کہ آدمی کسی زبردست باجَبرُوت ہستی کے حضور پیش ہو۔ نماز میں خشوع سے مراد دل اور جسم کی یہی کیفیت ہے اور یہی نماز کی اصل روح ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: لو خشع قلبہ خشعت جوارحہٗ۔ ”اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جسم پر بھی خشوع طاری ہوتا“۔

اگرچہ خشوع کا تعلق حقیقت میں دل سے ہے، اور دل کا خشوع آپ سے آپ جسم پر طاری ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورۂ بالا حدیث سے ابھی معلوم ہوا۔ لیکن شریعت میں نماز کے کچھ ایسے آداب بھی مقرر کر دیے گئے ہیں جو ایک طرف قلبی خشوع میں مددگار ہوتے ہیں، اور دوسری طرف خشوع کی گھٹتی بڑھتی کیفیات میں فعلِ نماز کو کم از کم ظاہری حیثیت سے ایک معیارِ خاص پر قائم رکھتے ہیں۔ ان آداب میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی دائیں بائیں نہ مڑے اور نہ سر اُٹھا کر اُوپر کی طرف دیکھے۔ (زیادہ سے زیادہ صرف گوشۂ چشم سے اِدھر اُدھر دیکھا جا سکتا ہے۔ حَنَفِیّہ اور شافعیہ کے نزدیک نگاہ سجدہ گاہ سے متجاوز نہ ہونی چاہیے، مگر مالکیہ اس بات کے قائل ہیں کہ نگاہ سامنے کی طرف رہنی چاہیے)۔ نماز میں ہلنا اور مختلف سَمتوں میں جھکنا بھی ممنوع ہے۔ کپڑوں کو بار بار سمیٹنا، یا اُن کو جھاڑنا، یا ان سے شغل کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی اپنے بیٹھنے کی جگہ یا سجدے کی جگہ صاف کرنے کی کوشش کرے۔ تن کر کھڑے ہونا، بہت بلند آواز سے کڑک کر قراءت کرنا، یا قراءت میں گانا بھی آدابِ نماز کے خلاف ہے۔ زور زور سے جمائیاں لینا اور ڈکاریں مارنا بھی نماز میں بے ادبی ہے۔ جلدی جلدی مارا مار نماز پڑھنا بھی سخت ناپسندیدہ ہے۔ حکم یہ ہے کہ نماز کا ہر فعل پوری طرح سُکون اور اطمینان سے ادا کیا جائے، اور ایک فعل، مثلاً رکوع یا سجود یا قیام یا قعود جب تک مکمل نہ ہو لے، دوسرا فعل شروع نہ کیا جائے۔ نماز میں اگر کوئی چیز اذیت دے رہی ہو تو اسے ایک ہاتھ سے دفع کیا جا سکتا ہے، مگر بار بار ہاتھوں کو حرکت دینا، یا دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔

ان ظاہری آداب کے ساتھ یہ چیز بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آدمی نماز میں جان بوجھ کر غیر متعلق باتیں سوچنے سے پرہیز کرے۔ بلا ارادہ خیالات ذہن میں آئیں اور آتے رہیں تو یہ نفسِ انسانی کی ایک فطری کمزوری ہے۔ لیکن آدمی کی پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نماز کے وقت اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو، اور جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہو وہی دل سے بھی عرض کرے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴

لغویات سے دُور رہتے ہیں[4]۔
زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں[5]۔

اس دوران میں اگر بے اختیار دوسرے خیالات آجائیں تو جس وقت بھی آدمی کو اُن کا احساس ہو، اسی وقت اسے اپنی توجہ ان سے ہٹا کر نماز کی طرف پھیر لینی چاہیے۔

۴ – ''لغو'' ہر اس بات اور کام کو کہتے ہیں جو فضول، لایعنی اور لاحاصل ہو۔ جن باتوں یا کاموں کا کوئی فائدہ نہ ہو، جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو، جن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو، جن سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہ ہو، وہ سب ''لغویات'' ہیں۔

''مُعْرِضُوْنَ'' کا ترجمہ ہم نے ''دُور رہتے ہیں'' کیا ہے۔ مگر اس سے بات پوری طرح ادا نہیں ہوتی۔ آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ وہ لغویات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جہاں ایسی باتیں ہو رہی ہوں یا ایسے کام ہو رہے ہوں، وہاں جانے سے پرہیز کرتے ہیں، ان میں حصّہ لینے سے اجتناب کرتے ہیں، اور اگر کہیں ان سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو ٹل جاتے ہیں، کترا کر نکل جاتے ہیں، یا بدرجۂ آخر بے تعلق ہو رہتے ہیں۔ اسی بات کو دُوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (الفرقان، آیت ۷۲) یعنی جب کسی ایسی جگہ سے ان کا گزر ہوتا ہے جہاں لغو باتیں ہو رہی ہوں، یا لغو کام ہو رہے ہوں، وہاں سے مہذب طریقے پر گزر جاتے ہیں۔

یہ چیز، جسے اس مختصر سے فقرے میں بیان کیا گیا ہے، دراصل مومن کی اہم ترین صفات میں سے ہے۔ مومن وہ شخص ہوتا ہے جسے ہر وقت اپنی ذمہ داری کا احساس رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے، اور جس چیز کو زندگی اور عمر اور وقت کے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک نپی تُلی مدّت ہے جو اسے امتحان کے لیے دی گئی ہے۔ یہ احساس اس کو بالکل اُس طالبِ علم کی طرح سنجیدہ اور مشغول اور منہمک بنا دیتا ہے جو امتحان کے کمرے میں بیٹھا اپنا پرچہ حل کر رہا ہو۔ جس طرح اس طالب علم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ امتحان کے یہ چند گھنٹے اس کی آیندہ زندگی کے لیے فیصلہ کُن ہیں، اور اس احساس کی وجہ سے وہ اُن گھنٹوں کا ایک ایک لمحہ اپنے پرچے کو صحیح طریقے سے حل کرنے کی کوشش میں صَرف کر ڈالنا چاہتا ہے اور ان کا کوئی سیکنڈ فضول ضائع کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح مومن بھی دُنیا کی اس زندگی کو اُنھی کاموں میں صرف کرتا ہے جو انجام کار کے لحاظ سے مفید ہوں۔ حتّٰی کہ وہ تفریحات اور کھیلوں میں سے بھی ان چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو محض تضیعِ وقت نہ ہوں بلکہ کسی بہتر مقصد کے لیے اسے تیار کرنے والی ہوں۔ اس کے نزدیک وقت ''کاٹنے'' کی چیز نہیں ہوتی بلکہ استعمال کرنے کی چیز ہوتی ہے۔

علاوہ بریں مومن ایک سلیم الطبع، پاکیزہ مزاج، خوش ذوق انسان ہوتا ہے۔ بیہودگیوں سے اس کی طبیعت کو کسی قسم کا لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ مفید باتیں کر سکتا ہے، مگر فضول گپیں نہیں ہانک سکتا۔ وہ ظرافت اور مزاح اور لطیف مذاق

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝٥ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ

اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۶، سوائے اپنی بیویوں کے اور اُن عورتوں کے جو ان کی مِلکِ

کی حد تک جا سکتا ہے، مگر ٹھٹھے بازیاں نہیں کر سکتا، گندا مذاق اور مسخرہ پن برداشت نہیں کر سکتا، تفریحی گفتگوؤں کو اپنا مشغلہ نہیں بنا سکتا۔ اُس کے لیے تو وہ سوسائٹی ایک مستقل عذاب ہوتی ہے جس میں کان کسی وقت بھی گالیوں سے، غیبتوں اور تہمتوں اور جھوٹی باتوں سے، گندے گانوں اور فحش گفتگوؤں سے محفوظ نہ ہوں۔ اس کو اللہ تعالیٰ جس جنّت کی اُمید دلاتا ہے، اُس کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی بیان کرتا ہے کہ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ”وہاں تو کوئی لغو بات نہ سنے گا۔“

۵ – ”زکوٰۃ دینے“ اور ”زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہونے“ میں معنیٰ کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، جسے نظر انداز کر کے دونوں کو ہم معنیٰ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے یہاں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ کا معروف انداز چھوڑ کر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ کا غیر معمولی طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ عَرَبی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے: ایک ”پاکیزگی“، دوسرے ”نشوونما“۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں اُن کو دُور کرنا، اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا، یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ایک، وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے، بجائے خود تزکیہ کا فعل۔ اگر وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ کہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ تزکیے کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصّہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیے کا فعل کرتے ہیں، اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی، بلکہ تزکیۂ نفس، تزکیۂ اَخلاق، تزکیۂ زندگی، تزکیۂ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی۔ اور مزید برآں، اس کا مطلب صرف اپنی ہی زندگی کے تزکیے تک محدود نہ رہے گا، بلکہ اپنے گردوپیش کی زندگی کے تزکیے تک بھی پھیل جائے گا۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ”وہ تزکیے کا کام کرنے والے لوگ ہیں“، یعنی اپنے آپ کو بھی پاک کرتے ہیں اور دوسروں کو پاک کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، اپنے اندر بھی جوہرِ انسانیت کو نشوونما دیتے ہیں اور باہر کی زندگی میں بھی اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ میں فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ ”فلاح پائی اس شخص نے جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھی۔“ اور سورۂ شمس میں فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ”بامراد ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔“ مگر یہ آیت ان دونوں کی بہ نسبت وسیع تر مفہوم کی حامل ہے، کیونکہ وہ صرف اپنے نفس کے تزکیے پر زور دیتی ہیں، اور یہ بجائے خود فعلِ تزکیہ کی اہمیت بیان کرتی ہے، جو اپنی ذات اور معاشرے کی زندگی، دونوں ہی کے تزکیے پر حاوی ہے۔

۶ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اپنے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو چھپا کر رکھتے ہیں، یعنی عُریانی سے پرہیز

اَيۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَيۡرُ مَلُوۡمِيۡنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ﴿۷﴾

یمین میں ہوں، کہ ان پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اُس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی زیادتی کرنے والے ہیں،ے

کرتے ہیں اور اپنا ستر دوسروں کے سامنے نہیں کھولتے۔ دوسرے، یہ کہ وہ اپنی عصمت وعفت کو محفوظ رکھتے ہیں، یعنی صنفی معاملات میں آزادی نہیں برتتے اور قوتِ شہوانی کے استعمال میں بے لگام نہیں ہوتے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النور، حواشی ۳۰-۳۲)

ے - یہ جملۂ معترضہ ہے جو اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے جو ''شرم گاہوں کی حفاظت'' کے لفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں پہلے بھی یہ سمجھا جاتا رہا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قوتِ شہوانی بجائے خود ایک بُری چیز ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنا، خواہ جائز طریقے ہی سے کیوں نہ ہو، بہرحال نیک اور اللہ والے لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کو تقویت پہنچ جاتی اگر صرف اتنا ہی کہہ کر بات ختم کر دی جاتی کہ فلاح پانے والے اہلِ ایمان اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا تھا کہ وہ لنگوٹ بند رہتے ہیں، راہب اور سنیاسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، شادی بیاہ کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ اس لیے ایک جملۂ معترضہ بڑھا کر حقیقت واضح کر دی گئی کہ جائز مقام پر اپنی خواہشِ نفس پوری کرنا کوئی قابلِ ملامت چیز نہیں ہے، البتہ گناہ یہ ہے کہ آدمی شہوت رانی کے لیے اس معروف اور جائز صورت سے تجاوز کر جائے۔

اس جملۂ معترضہ سے چند احکام نکلتے ہیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں:

(۱) شرم گاہوں کی حفاظت کے حکمِ عام سے دو قسم کی عورتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے: ایک ازواج، دوسرے مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ ۔ ''ازواج'' کا اطلاق عربی زبان کے معروف استعمال کی رُو سے بھی اور خود قرآن کی تصریحات کے مطابق بھی صرف اُن عورتوں پر ہوتا ہے جن سے باقاعدہ نکاح کیا گیا ہو، اور یہی اس کے ہم معنیٰ اُردو لفظ ''بیوی'' کا مفہوم ہے۔ رہا لفظ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ تو عربی زبان کے محاورے اور قرآن کے استعمالات، دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اس کا اطلاق لونڈی پر ہوتا ہے، یعنی وہ عورت جو آدمی کی مِلک میں ہو۔ اس طرح یہ آیت صاف تصریح کر دیتی ہے کہ منکوحہ بیوی کی طرح مملوکہ لونڈی سے بھی صنفی تعلق جائز ہے، اور اس کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ مِلک ہے۔ اگر اس کے لیے بھی نکاح شرط ہوتا تو اسے ازواج سے الگ بیان کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی، کیونکہ منکوحہ ہونے کی صورت میں وہ بھی ازواج میں داخل ہوتی۔ آج کل کے بعض مفسرین، جنھیں لونڈی سے تمتُّع کا جواز تسلیم کرنے سے انکار ہے، سورۂ نساء کی آیت وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ (آیت ۲۵) سے اِستدلال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لونڈی سے تمتُّع بھی صرف نکاح ہی کر کے کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمھاری مالی حالت کسی آزاد خاندانی عورت سے شادی کرنے کی متحمل نہ ہو تو کسی لونڈی سے ہی نکاح کر لو۔ لیکن ان لوگوں کی یہ عجیب خصوصیّت ہے کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے کو مفید مطلب پا کر لے لیتے ہیں، اور اسی آیت کا جو ٹکڑا ان کے مدّعا کے خلاف پڑتا ہو اُسے جان بُوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آیت میں لونڈیوں

Maktaba Tul Ishaat.com

سے نکاح کرنے کی ہدایت جن الفاظ میں دی گئی ہے وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''پس ان (لونڈیوں) سے نکاح کرلو اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اور اُن کو معروف طریقے سے اُن کے مہر ادا کرو۔'' یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خود لونڈی کے مالک کا معاملہ زیرِ بحث نہیں ہے، بلکہ کسی ایسے شخص کا معاملہ زیرِ بحث ہے جو آزاد عورت سے شادی کا خرچ نہ برداشت کرسکتا ہو اور اس بنا پر کسی دوسرے شخص کی مملوکہ لونڈی سے نکاح کرنا چاہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ اپنی ہی لونڈی سے نکاح کرنے کا ہو تو اس کے وہ ''اہل'' (سرپرست) کون ہو سکتے ہیں جن سے اس کو اجازت لینے کی ضرورت ہو؟ مگر قرآن سے کھیلنے والے صرف فَانْكِحُوْهُنَّ کو لے لیتے ہیں اور اس کے بعد ہی بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ کے جو الفاظ موجود ہیں، انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مزید برآں، وہ ایک آیت کا ایسا مفہوم نکالتے ہیں جو اسی موضوع سے متعلق قرآنِ مجید کی دوسری آیات سے ٹکراتا ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے خیالات کی نہیں بلکہ قرآنِ پاک کی پیروی کرنا چاہتا ہو تو وہ سورۂ نساء، آیت ۳-۲۵، سورۂ احزاب، آیت ۵۰-۵۲، اور سورۂ معارج، آیت ۳۰ کو سورۂ مومنون کی اس آیت کے ساتھ ملا کر پڑھے۔ اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا قانون اس مسئلے میں کیا ہے۔ (اِس مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۴۴۔ تفہیمات، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰ تا ۳۲۴۔ رسائل و مسائل، جلد اوّل، صفحہ ۳۲۴ تا ۳۳۳)

(۲) اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ میں لفظ عَلٰٓى اس بات کی صراحت کر دیتا ہے کہ اس جملۂ معترضہ میں جو قانون بیان کیا جا رہا ہے، اس کا تعلق صرف مَردوں سے ہے۔ باقی تمام آیات قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے لے کر خٰلِدُوْنَ تک، مذکر کی ضمیروں کے باوجود مرد و عورت دونوں کو شامل ہیں، کیونکہ عربی زبان میں عورتوں اور مردوں کے مجموعے کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو ضمیر مذکر ہی استعمال کی جاتی ہے، لیکن یہاں لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ کے حکم سے مستثنیٰ کرتے ہوئے عَلٰٓى کا لفظ استعمال کر کے یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ اِستثنا مردوں کے لیے ہے نہ کہ عورتوں کے لیے۔ اگر ''ان پر'' کہنے کے بجائے ''اُن سے'' محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں کہا جاتا تو البتہ یہ حکم بھی مرد و عورت، دونوں پر حاوی ہوسکتا تھا۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک عورت حضرت عمرؓ کے زمانے میں اپنے غلام سے تمتع کر بیٹھی تھی۔ صحابہ کرامؓ کی مجلسِ شُوریٰ میں جب اس کا معاملہ پیش کیا گیا تو سب نے بالاتفاق کہا کہ تاولت کتاب اللّٰه تعالٰی غیر تاویله، ''اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا غلط مفہوم لے لیا۔'' یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اگر یہ استثنا مردوں کے لیے خاص ہے تو پھر بیویوں کے لیے ان کے شوہر کیسے حلال ہوئے؟ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ جب بیویوں کے معاملے میں شوہروں کو حفظِ فروج کے حکم سے مستثنیٰ کیا گیا تو اپنے شوہروں کے معاملے میں بیویاں آپ سے آپ اِس حکم سے مستثنیٰ ہوگئیں۔ ان کے لیے پھر الگ کسی تصریح کی حاجت نہ رہی۔ اس طرح اس حکمِ استثنا کا اثر عملاً صرف مرد اور اس کی مملوکہ عورت تک محدود ہو جاتا ہے، اور عورت پر اس کا غلام حرام قرار پاتا ہے۔ عورت کے لیے اِس چیز کو حرام کرنے کی حکمت یہ ہے کہ غلام اس کی خواہشِ نفس تو پوری کرسکتا ہے مگر اس کا اور گھر کا قوام نہیں بن سکتا، جس کی وجہ سے خاندانی زندگی کی چول ڈھیلی رہ جاتی ہے۔

(۳) ''البتہ جو اُس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی زیادتی کرنے والے ہیں''، اِس فقرے نے مذکورۂ بالا دو جائز صورتوں کے سوا خواہشِ نفس پوری کرنے کی تمام دوسری صورتوں کو حرام کر دیا، خواہ وہ زنا ہو، یا عملِ قومِ لوط، یا وطیِ بہائم، یا کچھ اور۔ صرف ایک اِستمنا بالیَد (masturbation) کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس کو قطعی حرام ٹھیراتے ہیں۔ اور حنفیہؒ کے نزدیک اگرچہ یہ حرام ہے، لیکن وہ کہتے ہیں

کہ اگر شدید غلبۂ جذبات کی حالت میں آدمی سے احیاناً اس فعل کا صُدور ہو جائے تو اُمید ہے کہ معاف کر دیا جائے گا۔

(۴) بعض مفسرین نے متعہ کی حرمت بھی اس آیت سے ثابت کی ہے۔ ان کا اِستِدلال یہ ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے۔ اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے، نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اس کے لیے عدّت ہے، نہ طلاق، نہ نفقہ، نہ ایلا اور ظِہار اور لعان وغیرہ۔ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔ پس جب وہ ''بیوی'' اور ''لونڈی''، دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ''ان کے علاوہ کچھ اور'' میں شمار ہوگی، جس کے طالب کو قرآن ''حد سے گزرنے والا'' قرار دیتا ہے۔ یہ اِستِدلال بہت قوی ہے، مگر اس میں کمزوری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ متعہ کی حُرمت کے بارے میں یہ آیت ناطق ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتحِ مکہ کے سال دیا ہے، اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمتِ متعہ کا حکم قرآن کی اس آیت ہی میں آ چکا تھا جو بالاتفاق مکّی ہے اور ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی، تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتحِ مکہ تک جائز رکھتے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ متعہ کی حرمت قرآنِ مجید کے کسی صریح حکم پر نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر مبنی ہے۔ سنت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔ متعہ کا جب ذکر آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی اور توضیح کر دی جائے: اول، یہ کہ اس کی حرمت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسے حضرت عمرؓ نے حرام کیا، دُرست نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اس حکم کے مُوجِد نہیں تھے بلکہ صرف اسے شائع اور نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ یہ حکم حضورؐ نے آخر زمانے میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہ پہنچا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی عام اشاعت کی اور بذریعۂ قانون اسے نافذ کیا۔ دوم، یہ کہ شیعہ حضرات نے متعہ کو مطلقاً مباح ٹھیرانے کا جو مسلک اختیار کیا ہے، اس کے لیے تو بہرحال نُصوصِ کتاب و سنّت میں سرے سے کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ صدرِ اوّل میں صحابہؓ اور تابعین اور فقہا میں سے چند بزرگ جو اس کے جواز کے قائل تھے، وہ اسے صرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اسے نکاح کی طرح مباحِ مطلق اور عام حالات میں معمول بہ بنا لینے کا قائل نہ تھا۔ ابنِ عباسؓ، جن کا نام قائلینِ جواز میں سب سے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے، اپنے مسلک کی توضیح خود ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ماھی الا کالمیتۃ لاتحل الا للمضطر (یہ تو مردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں)۔ اور اس فتوے سے بھی وہ اُس وقت باز آ گئے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجایش سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اسے موقوف نہیں رکھتے۔ اس سوال کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ ابنِ عباسؓ اور ان کے ہم خیال چند گنے چُنے اصحاب نے اس مسلک سے رُجوع کر لیا تھا یا نہیں، تو اُن کے مسلک کو اختیار کرنے والا زیادہ سے زیادہ جواز بحالتِ اضطرار کی حد تک جا سکتا ہے۔ مطلق اباحت، اور بلاضرورت تمتّع، حتّٰی کہ منکوحہ بیویوں تک کی موجودگی میں بھی ممتوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوقِ سلیم بھی گوارا نہیں کرتا، کجا کہ اسے شریعتِ محمدیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمۂ اہلِ بیت کو اس سے مُتّہم کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ خود شیعہ حضرات میں سے بھی کوئی شریف آدمی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹

اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں،[8]
اور اپنی نمازوں کی مُحافَظت کرتے ہیں۔[9]

یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی یا بہن کے لیے نکاح کے بجائے متعہ کا پیغام دے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جوازِ متعہ کے لیے معاشرے میں زنانِ بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ایسا ادنیٰ طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے تمتُّع کرنے کا دروازہ کُھلا رہے۔ یا پھر یہ کہ متعہ صرف غریب لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ہو اور اس سے فائدہ اُٹھانا خوش حال طبقے کے مردوں کا حق ہو۔ کیا خدا اور رسولؐ کی شریعت سے اس طرح کے غیر منصفانہ قوانین کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کیا خدا اور اس کے رسولؐ سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے فعل کو مباح کر دیں گے جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی؟

۸ – ’’امانات‘‘ کا لفظ جامع ہے ان تمام امانتوں کے لیے جو خداوندِ عالَم نے، یا معاشرے نے، یا افراد نے کسی شخص کے سُپرد کی ہوں۔ اور عہد و پیمان میں وہ سارے معاہَدے داخل ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان، یا انسان اور انسان کے درمیان، یا قوم اور قوم کے درمیان اُستوار کیے گئے ہوں۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی امانت میں خیانت نہ کرے گا، اور کبھی اپنے قول و قرار سے نہ پھرے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے: لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ ولا دین لمن لا عھد لہ، ’’جو امانت کی صفت نہیں رکھتا وہ ایمان نہیں رکھتا، اور جو عہد کا پاس نہیں رکھتا وہ دین نہیں رکھتا۔‘‘ (بَیْہَقِی فی شُعَبِ الایمان) بخاری و مسلم کی مُتّفَق عَلَیْہِ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ’’چار خصلتیں ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے، جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے: جب کوئی امانت اس کے سُپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ اور جب کسی سے جھگڑے تو (اَخلاق و دیانت کی) ساری حدیں پھاند جائے۔‘‘

۹ – اُوپر خشوع کے ذکر میں ’’نماز‘‘ فرمایا تھا اور یہاں ’’نمازوں‘‘ بصیغۂ جمع ارشاد فرمایا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں جنسِ نماز مراد تھی، اور یہاں ایک ایک وقت کی نماز فرداً فرداً مراد ہے۔ ’’نمازوں کی محافظت‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، ارکان و اجزائے نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری نگہداشت کرتے ہیں۔ جسم اور کپڑے پاک رکھتے ہیں۔ وضو ٹھیک طرح سے کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کبھی بے وضو نہ پڑھ بیٹھیں۔ صحیح وقت پر نماز ادا کرنے کی فکر کرتے ہیں، وقت ٹال کر نہیں پڑھتے۔ نماز کے تمام ارکان پوری طرح سکون و اطمینان کے ساتھ ادا کرتے ہیں، ایک بوجھ کی طرح جلدی سے اُتار کر بھاگ نہیں جاتے۔ اور جو کچھ نماز میں پڑھتے ہیں، وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ جیسے بندہ اپنے خدا سے کچھ عرض کر رہا ہے، نہ اس طرح کہ گویا ایک رَٹی ہوئی عبارت کو کسی نہ کسی طور پر ہوا میں پھونک دینا ہے۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس[10] پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔[11]

۱۰– فردوس، جنت کے لیے معروف ترین لفظ ہے جو قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں پَرَدِیْشَا، قدیم کِلدانی زبان میں پَردیسا، قدیم ایرانی (ژند) میں پیری وائزا، عبرانی میں پَردیس، اَرمنی میں پَردیز، سُریانی میں فَردیسو، یونانی میں پارادائسوس، لاطینی میں پاراڈائس، اور عربی میں فردوس۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کے لیے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو، وسیع ہو، آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو، اور اس میں ہر قسم کے پھل، خُصوصاً انگور پائے جاتے ہوں۔ بلکہ بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلام جاہلیّت میں بھی لفظِ فردوس مستعمل تھا۔ اور قرآن میں اس کا اطلاق متعدِد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ کہف میں ارشاد ہوا: كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ”ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہیں“۔ اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت باغ اور چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔

اہلِ ایمان کے وارثِ فردوس ہونے پر، سورۂ طٰہٰ (حاشیہ ۸۳)، اور سورۂ انبیاء (حاشیہ ۹۹) میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

۱۱– اِن آیات میں چار اہم مضمون ادا ہوئے ہیں:

اوّل، یہ کہ جو لوگ بھی قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان کر یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں گے اور اس رَوِیّے کے پابند ہو جائیں گے، وہ دُنیا اور آخرت میں فلاح پائیں گے، قطعِ نظر اس سے کہ کسی قوم، نسل یا ملک کے ہوں۔

دوم، یہ کہ فلاح محض اقرارِ ایمان، یا محض اَخلاق اور عمل کی خوبیوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ جب آدمی خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مانے، پھر اس کے مطابق اخلاق اور عمل کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کر لے، تب وہ فلاح سے ہم کنار ہو گا۔

سوم، یہ کہ فلاح محض دنیوی اور مادّی خوش حالی اور محدود وقتی کامیابیوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک وسیع تر حالتِ خیر کا نام ہے، جس کا اطلاق دنیا اور آخرت میں پائدار و مستقل کامیابی و آسودگی پر ہوتا ہے۔ یہ چیز ایمان و عملِ صالح کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ اور اس کُلیّے کو نہ تو گمراہوں کی وقتی خوش حالیاں اور کامیابیاں توڑتی ہیں، نہ مومنینِ صالحین کے عارضی مصائب کو اس کی نقیض ٹھیرایا جا سکتا ہے۔

چہارم، یہ کہ مومنین کے ان اوصاف کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی صداقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور یہی مضمون آگے کی تقریر سے ان آیات کا ربط قائم کرتا ہے۔ تیسرے رکوع کے خاتمے تک کی پوری تقریر کا سلسلۂ استدلال اس طرح پر ہے کہ آغاز میں تجربی دلیل ہے، یعنی یہ کہ اس نبی کی تعلیم نے خود تمھاری ہی سوسائٹی کے افراد میں یہ سیرت و

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ
قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۪ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً
فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا،[۱۲] پھر اسے ایک دُوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔[۱۳]

کردار اور یہ اَخلاق و اوصاف پیدا کر کے دکھائے ہیں، اب تم خود سوچ لو کہ یہ تعلیم حق نہ ہوتی تو ایسے صالح نتائج کس طرح پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے بعد مُشاہَداتی دلیل ہے، یعنی یہ کہ انسان کے اپنے وجود میں اور گرد و پیش کی کائنات میں جو آیات نظر آتی ہیں، وہ سب توحید اور آخرت کی اس تعلیم کے برحق ہونے کی شہادت دے رہی ہیں جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ پھر تاریخی دلائل آتے ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ نبی اور اس کے منکرین کی کش مکش آج نئی نہیں ہے بلکہ انھی بنیادوں پر قدیم ترین زمانے سے چلی آ رہی ہے، اور اس کش مکش کا ہر زمانے میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا رہا ہے، جس سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ فریقین میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔

۱۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہوں: سورۂ حج کے حواشی ۵، ۶، ۹۔

۱۳ – یعنی کوئی خالی الذہن آدمی بچے کو ماں کے رحم میں پرورش پاتے دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہاں وہ انسان تیار ہو رہا ہے جو باہر جا کر عقل اور دانائی اور صنعت کے یہ کچھ کمالات دکھائے گا اور ایسی ایسی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں اس سے ظاہر ہوں گی۔ وہاں وہ ہڈیوں اور گوشت پوست کا ایک پلندا سا ہوتا ہے جس میں وضعِ حمل کے آغاز تک زندگی کی ابتدائی خُصوصیّات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی، نہ عقل و خرد، نہ اور کوئی خوبی۔ مگر باہر آ کر وہ چیز ہی کچھ اور بن جاتا ہے جس کو پیٹ والے جنین سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ اب وہ ایک سمیع و بصیر اور ناطق وجود ہوتا ہے۔ اب وہ تجرِبے اور مُشاہَدے سے علم حاصل کرتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک ایسی خودی اُبھرنی شروع ہوتی ہے جو بیداری کے پہلے ہی لمحے سے اپنی دسترس کی ہر چیز پر تحکُّم جتاتی اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے، اُس کی ذات میں یہ "چیزے دیگر" ہونے کی کیفیت نمایاں تر اور افزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جوان ہوتا ہے تو بچپن کی بہ نسبت کچھ اَور ہوتا ہے۔ ادھیڑ ہوتا ہے تو جوانی کے مقابلے میں کوئی اَور چیز ثابت ہوتا ہے۔ بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو نئی نسلوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا بچپن کیا تھا اور جوانی کیسی تھی۔ اتنا بڑا تغیر کم از کم اِس دُنیا کی کسی دوسری مخلوق میں واقع نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ایک طرف کسی پختہ عمر کے انسان کی طاقتیں اور قابلیتیں اور کام دیکھے، اور دوسری طرف یہ تصور کرے کہ

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝١٤ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝١٥ ثُمَّ
اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝١٦ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ
مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝١٧ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ

پس بڑا ہی با برکت ہے[۱۴] اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اُٹھائے جاؤ گے۔
اور تمھارے اُوپر ہم نے سات راستے بنائے[۱۵]، تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے[۱۶]۔
اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو

پچاس ساٹھ برس پہلے ایک روز جو بوند ٹپک کر رحمِ مادر میں گری تھی اس کے اندر یہ کچھ بھرا ہوا تھا، تو بے اختیار اس کی زبان سے وہی بات نکلے گی جو آگے کے فقرے میں آ رہی ہے۔

۱۴- اصل میں فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، جن کی پوری معنویت ترجمے میں ادا کرنا محال ہے۔ لغت اور استعمالاتِ زبان کے لحاظ سے اس میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک، یہ کہ وہ نہایت مقدس اور مُنزّہ ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ اس قدر خیر اور بھلائی اور خوبی کا مالک ہے کہ جتنا تم اُس کا اندازہ کرو، اس سے زیادہ ہی اُس کو پاؤ، حتّٰی کہ اس کی خیرات کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حواشی ۱ و ۱۹) ان دونوں معنوں پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ تخلیقِ انسانی کے مراتب بیان کرنے کے بعد فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کا فقرہ محض ایک تعریفی فقرہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ دلیل کے بعد نتیجۂ دلیل بھی ہے۔ اس میں گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جو خدا مٹی کے ست کو ترقی دے کر ایک پورے انسان کے مرتبے تک پہنچا دیتا ہے، وہ اس سے بدرجہا زیادہ منزّہ ہے کہ خدائی میں کوئی اس کا شریک ہو سکے، اور اس سے بدرجہا مقدس ہے کہ اُسی انسان کو پھر پیدا نہ کر سکے، اور اس کی خیرات کا یہ بڑا ہی گھٹیا اندازہ ہے کہ بس ایک دفعہ انسان بنا دینے ہی پر اس کے کمالات ختم ہو جائیں، اس سے آگے وہ کچھ نہ بنا سکے۔

۱۵- اصل میں لفظ طَرَآئِقَ استعمال ہوا ہے جس کے معنٰی راستوں کے بھی ہیں اور طبقوں کے بھی۔ اگر پہلے معنٰی لیے جائیں تو غالباً اس سے مراد سات سیاروں کی گردش کے راستے ہیں، اور چونکہ اس زمانے کا انسان سبع سیارہ ہی سے واقف تھا، اس لیے سات ہی راستوں کا ذکر کیا گیا۔ اِس کے معنٰی بہرحال یہ نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ اور دوسرے راستے نہیں ہیں۔ اور اگر دوسرے معنٰی لیے جائیں تو سَبْعَ طَرَآئِقَ کا وہی مفہوم ہوگا جو سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (سات آسمان طبق برطبق) کا مفہوم ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "تمھارے اوپر" ہم نے سات راستے بنائے، تو اس کا ایک تو سیدھا سادھا مطلب وہی ہے جو ظاہر الفاظ سے ذہن میں آتا ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم سے بھی زیادہ بڑی چیز ہم نے یہ آسمان

Maktaba Tul Ishaat.com

فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ﴿١٨﴾ فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ

زمین میں ٹھیرا دیا،[۱۷] ہم اُسے جس طرح چاہیں غائب کرسکتے ہیں۔[۱۸] پھر اس پانی کے ذریعے سے ہم نے تمھارے لیے

بنائے ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ’’آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے۔‘‘ (المومن، آیت ۵۷)

۱۶- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ’’اور مخلوقات کی طرف سے ہم غافل نہ تھے، یا نہیں ہیں۔‘‘ متن میں جو مفہوم لیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ جو ہم نے بنایا ہے، یہ بس یونہی کسی اناڑی کے ہاتھوں اَلل ٹپ نہیں بن گیا ہے، بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر پورے علم کے ساتھ بنایا گیا ہے، اہم قوانین اس میں کارفرما ہیں، ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سارے نظامِ کائنات میں ایک مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور اس کارگاہِ عظیم میں ہر طرف ایک مقصدیّت نظر آتی ہے، جو بنانے والے کی حکمت پر دلالت کر رہی ہے۔ دوسرا مفہوم لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے، اس کی کسی حاجت سے ہم کبھی غافل، اور کسی حالت سے کبھی بے خبر نہیں رہے ہیں۔ کسی چیز کو ہم نے اپنے منصوبے کے خلاف بننے اور چلنے نہیں دیا ہے۔ کسی چیز کی فطری ضروریات فراہم کرنے میں ہم نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ اور ایک ایک ذرّے اور پتّے کی حالت سے ہم باخبر رہے ہیں۔

۱۷- اس سے مراد اگرچہ موسمی بارش بھی ہوسکتی ہے، لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے ایک دوسرا مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آغازِ آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اتنی مقدار میں زمین پر پانی نازل فرما دیا تھا جو قیامت تک اِس کُرے کی ضروریات کے لیے اُس کے علم میں کافی تھا۔ وہ پانی زمین ہی کے نشیبی حصوں میں ٹھیر گیا، جس سے سمندر اور بُحَیرے وجود میں آئے اور آبِ زیرِ زمین (sub-soil water) پیدا ہوا۔ اب یہ اسی پانی کا اُلٹ پھیر ہے جو گرمی، سردی اور ہواؤں کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، اسی کو بارشیں، برف پوش پہاڑ، دریا، چشمے اور کنویں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلاتے رہتے ہیں، اور وہی بے شمار چیزوں کی پیدایش اور ترکیب میں شامل ہوتا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے۔ شروع سے آج تک پانی کے اس ذخیرے میں نہ ایک قطرے کی کمی ہوئی اور نہ ایک قطرے کا اضافہ ہی کرنے کی کوئی ضرورت پیش آئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پانی، جس کی حقیقت آج ہر مدرسے کے طالب علم کو معلوم ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن، دو گیسوں کے امتزاج سے بنا ہے، ایک دفعہ تو اتنا بن گیا کہ اس سے سمندر بھر گئے، اور اب اس کے ذخیرے میں ایک قطرے کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ کون تھا جس نے ایک وقت میں اتنی ہائیڈروجن اور آکسیجن ملا کر اس قدر پانی بنا دیا؟ اور کون ہے جو اب انھی دونوں گیسوں کو اُس خاص تناسُب کے ساتھ نہیں ملنے دیتا جس سے پانی بنتا ہے، حالانکہ دونوں گیسیں اب بھی دُنیا میں موجود ہیں؟ اور جب پانی بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ جاتا ہے تو اس وقت کون ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ ہو جانے سے روکے رکھتا ہے؟ کیا دہریوں کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ اور کیا پانی اور ہوا اور گرمی اور سردی کے الگ الگ خدا ماننے والے اس کا کوئی

وقف لازم

جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ

اِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ

کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیے، تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں[19] اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو[20]۔ اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طُورِ سینا سے نکلتا ہے[21]، تیل بھی لیے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز ہم تمھیں پلاتے ہیں[22]، اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے

جواب رکھتے ہیں؟

۱۸ – یعنی اسے غائب کر دینے کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے، بے شمار صورتیں ممکن ہیں، اور ان میں سے جس کو ہم جب چاہیں، اختیار کر کے تمھیں زندگی کے اس اہم ترین وسیلے سے محروم کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ آیت سورۂ ملک کی اُس آیت سے وسیع تر مفہوم رکھتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ”ان سے کہو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر تمہارا یہ پانی زمین میں بیٹھ جائے تو کون ہے جو تمھیں بہتے چشمے لا دے گا؟“

۱۹ – یعنی کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ بھی طرح طرح کے میوے اور پھل۔

۲۰ – یعنی ان باغوں کی پیداوار سے، جو پھل، غلّے، لکڑی اور دوسری مختلف صورتوں میں حاصل ہوتی ہے، تم اپنی مَعاش پیدا کرتے ہو۔ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ میں مِنْهَا کی ضمیر جَنّٰتٍ کی طرف پھرتی ہے نہ کہ پھلوں کی طرف۔ اور تَاْكُلُوْنَ کے معنیٰ صرف یہی نہیں ہیں کہ ان باغوں کے پھل تم کھاتے ہو، بلکہ یہ بحیثیتِ مجموعی روزی حاصل کرنے کے مفہوم پر حاوی ہے۔ جس طرح ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے فلاں کام کی روٹی کھاتا ہے، اُسی طرح عربی زبان میں بھی کہتے ہیں: فلان یاکل من حرفتہ۔

۲۱ – مراد ہے زیتون، جو بحرِ روم کے گرد و پیش کے علاقے کی پیداوار میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ اس کا درخت ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار برس تک چلتا ہے، حتّٰی کہ فلسطین کے بعض درختوں کا قد و قامت اور پھیلاؤ دیکھ کر اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک چلے آ رہے ہیں۔ طورِ سینا کی طرف اس کو منسوب کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہی علاقہ جس کا مشہور ترین اور نمایاں ترین مقام طورِ سینا ہے، اس درخت کا وطنِ اصلی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

كَثِيرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ
أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ
أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَٰئِكَةً

فائدے بھی ہیں۔ اُن کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔[۲۳]

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔[۲۴] اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی اور معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟"[۲۵] اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا، وہ کہنے لگے کہ "یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔[۲۶] اِس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔[۲۷] اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔[۲۷ الف] یہ بات

۲۲ – یعنی دُودھ، جس کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ خون اور گوبر کے درمیان یہ ایک تیسری چیز ہے جو جانور کی غذا سے پیدا کر دی جاتی ہے۔ (النحل، آیت ۶۶)

۲۳ – مویشیوں اور کشتیوں کا ایک ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب سواری اور بار برداری کے لیے زیادہ تر اُونٹ استعمال کرتے تھے، اور اُونٹوں کے لیے "خشکی کے جہاز" کا استعارہ بہت پرانا ہے۔ جاہلیّت کا شاعر ذُوالرُّمّہ کہتا ہے:

ع سفينة برٍّ تحت خدى زمامها

۲۴ – تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہُود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳۔ الانبیاء، آیات ۷۶-۷۷

۲۵ – یعنی کیا تمھیں اپنے اصلی اور حقیقی خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ جو تمھارا اور سارے جہان کا مالک و فرمانروا ہے، اُس کی سلطنت میں رہ کر اس کے بجائے دوسروں کی بندگی و اطاعت کرنے اور دوسروں کی رُبوبیت و خداوندی تسلیم کرنے کے کیا نتائج ہوں گے؟

۲۶ – یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا اور نبی بشر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصور کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاءؑ انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہوں: الاعراف، آیات ۶۳-۶۹، یونس: ۲، ہود: ۲۷-۳۱، یوسف: ۱۰۹، الرعد: ۳۸، ابراہیم: ۱۰-۱۱، النحل: ۴۳، بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵، الکہف: ۱۱۰، الانبیاء: ۳-۳۴،

المومنون: ۳۳-۳۴-۴۷، الفرقان: ۷-۲۰، الشعراء: ۱۵۴-۱۸۶، یٰسٓ: ۱۵، حٰم السجدہ: ۶ مع حواشی)

۲۷- یہ بھی مخالفینِ حق کا قدیم ترین حربہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے اُٹھے، اُس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ پر لگایا تھا کہ تم اس لیے اُٹھے ہو کہ تمھیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے، وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ (یونس، آیت ۷۸) یہی حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سردارانِ قریش کو تھا، چنانچہ کئی مرتبہ انھوں نے آپؐ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو ''اپوزیشن'' چھوڑ کر ''حزبِ اقتدار'' میں شامل ہو جاؤ، تمھیں ہم بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دُنیا اور اس کے مادّی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں، اُن کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اسی دُنیا میں کوئی انسان نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاحِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دل فریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے دعوے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کبھی لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ ان کا اپنا ہم جنس ہی ہو گا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف ''اقتدار کی بھوک'' کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انھیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے، وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں، البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ جس کے لیے یہ ''غذا'' پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی ''بھوک'' محسوس کر رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۳۶)

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اُٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا، اس کے لیے بہر حال یہ بات ناگزیر ہو گی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِّ راہ ہوں، انھیں ہٹانے کی کوشش کرے اور اُن طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہو گی، اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو گا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا، اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی، یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیا اور مصلحینِ عالَم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا، اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امرِ واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا، اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟ ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصدِ خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجے میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ صرف اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریقِ کار اور دونوں

Maktaba Tul Ishaat.com

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۴ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۲۵ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝۲۶ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ

توہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سُنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔ کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جُنون لاحق ہوگیا ہے۔ کچھ مدّت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔" نوحؑ نے کہا: "پروردگار! ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے اس پر اب تُو ہی میری نصرت فرما۔"[۲۸] ہم نے اس پر وحی کی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر۔ پھر جب ہمارا حکم آجائے اور تنور اُبل پڑے[۲۹] تو

کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

۲۷، الف۔ یہ اس امر کا کُھلا ہُوا ثبوت ہے کہ قومِ نوحؑ اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر نہ تھی اور نہ اس بات کی منکر تھی کہ رب العالمین وہی ہے اور سارے فرشتے اس کے تابعِ فرمان ہیں۔ اس قوم کی اصل گمراہی شرک تھی نہ کہ انکارِ خدا۔ وہ خدائی کی صفات اور اختیارات میں اور اُس کے حُقوق میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتی تھی۔

۲۸ – یعنی میری طرف سے اس تکذیب کا بدلہ لے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ "پس نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا کہ میں دبا لیا گیا ہوں، اب تو اُن سے بدلہ لے۔" (القمر، آیت ۱۰) اور سورۂ نوح میں فرمایا: وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ "اور نوحؑ نے کہا: "اے میرے پروردگار! اس زمین پر کافروں میں سے ایک بسنے والا بھی نہ چھوڑ، اگر تونے ان کو رہنے دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان کی نسل سے بدکار منکرینِ حق ہی پیدا ہوں گے۔" (آیت ۲۶-۲۷)

۲۹ – بعض لوگوں نے تنور سے مراد زمین لی ہے، بعض نے زمین کا بلند ترین حصہ مراد لیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ فَارَ التَّنُّوْرُ کا مطلب طُلوعِ فجر ہے، اور بعض کی رائے میں یہ حمی الوطیس کی طرح ایک استعارہ ہے "ہنگامہ گرم ہو جانے" کے معنی میں۔ لیکن کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ قرآن کے الفاظ کو بغیر کسی قرینے کے مجازی معنوں میں لیا جائے، جب کہ ظاہری مفہوم لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ الفاظ پڑھ کر ابتداءً جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، وہ یہی ہے کہ کوئی خاص تنور پہلے سے نامزد کر دیا گیا تھا کہ طوفان کا آغاز اس کے نیچے سے پانی اُبلنے پر ہوگا۔ دوسرے کوئی معنیٰ سوچنے کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب کہ آدمی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو کہ اتنا بڑا طوفان ایک تنور کے نیچے سے پانی اُبل پڑنے پر شروع ہوا ہوگا۔ مگر خدا کے معاملات عجیب ہیں۔ وہ جب کسی قوم کی شامت لاتا ہے تو ایسے رُخ سے لاتا ہے جدھر اس کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔

فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ
الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۲۷
فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ
نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۸ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا
وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۲۹ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝۳۰

ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جا، اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے، سوائے اُن کے جن کے خلاف پہلے فیصلہ ہو چکا ہے، اور ظالموں کے معاملے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا، یہ اب غرق ہونے والے ہیں۔ پھر جب تو اپنے ساتھیوں سمیت کشتی پر سوار ہو جائے تو کہہ: شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی[۳۰]۔ اور کہہ: پروردگار! مجھ کو برکت والی جگہ اُتار اور تُو بہترین جگہ دینے والا ہے[۳۱]۔"

اِس قصّے میں بڑی نشانیاں ہیں[۳۲]، اور آزمائش تو ہم کر کے ہی رہتے ہیں[۳۳]۔

۳۰- یہ کسی قوم کی انتہائی بداطواری اور خباثت و شرارت کا ثبوت ہے کہ اس کی تباہی پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔

۳۱- "اُتارنے" سے مراد محض اتارنا ہی نہیں ہے، بلکہ عربی محاورے کے مطابق اس میں "میزبانی" کا مفہوم بھی شامل ہے۔ گویا اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! اب ہم تیرے مہمان ہیں اور تو ہی ہمارا میزبان ہے۔

۳۲- یعنی عبرت آموز سبق ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ توحید کی دعوت دینے والے انبیاؑ حق پر تھے اور شرک پر اصرار کرنے والے کفار باطل پر، اور یہ کہ آج وہی صورتِ حال مکے میں درپیش ہے جو کسی وقت حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان تھی، اور اُس کا انجام بھی کچھ اُس سے مختلف ہونے والا نہیں ہے، اور یہ کہ خدا کے فیصلے میں چاہے دیر کتنی ہی لگے مگر فیصلہ آخرِ کار ہو کر رہتا ہے اور وہ لازماً اہلِ حق کے حق میں اور اہلِ باطل کے خلاف ہوتا ہے۔

۳۳- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آزمائش تو ہمیں کرنی ہی تھی"، یا "آزمائش تو ہمیں کرنی ہی ہے"۔ تینوں صورتوں میں مدعا اس حقیقت پر خبردار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بھی اپنی زمین اور اس کی بے شمار چیزوں پر اقتدار عطا کر کے بس یونہی اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اس کی آزمائش کرتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح استعمال کر رہی ہے۔ قومِ نوحؑ کے ساتھ جو کچھ ہوا اسی قانون کے مطابق ہوا، اور دوسری کوئی قوم بھی اللہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا

ع

ان کے بعد ہم نے ایک دوسرے دَور کی قوم اُٹھائی۔[۳۴] پھر ان میں خود انھی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انھیں دعوت دی) کہ اللہ کی بندگی کرو، تمھارے لیے اُس کے سوا کوئی اور معبُود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ع اُس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جُھٹلایا، جن کو ہم نے دُنیا کی زندگی میں آسُودہ کر رکھا تھا،[۳۵] وہ کہنے لگے: "یہ شخص کچھ

کی ایسی چیپتی نہیں ہے کہ وہ بس اسے خوانِ یغما پر ہاتھ مارنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ اس معاملے سے ہر ایک کو لازماً سابقہ پیش آنا ہے۔

۳۴- بعض لوگوں نے اس سے مراد قومِ ثمود لی ہے، کیونکہ آگے چل کر ذکر آرہا ہے کہ یہ قوم صَیحَہ کے عذاب سے تباہ کی گئی، اور دوسرے مقامات پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ثمود وہ قوم ہے جس پر یہ عذاب آیا۔ (ہود: ۶۷۔ الحِجر: ۸۳۔ القمر: ۳۱) بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ ذکر دراصل قومِ عاد کا ہے، کیونکہ قرآن کی رُو سے قومِ نوحؑ کے بعد یہی قوم اُٹھائی گئی تھی، وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف، آیت ۶۹) صحیح بات یہی دوسری معلوم ہوتی ہے، کیونکہ "قومِ نوحؑ کے بعد" کا اشارہ اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ رہا صَیحَہ (چیخ، آوازہ، شور، ہنگامۂ عظیم) تو محض اس کی مناسبت اس قوم کو ثمود قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ لفظ جس طرح اُس آوازۂ تُند کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہلاکتِ عام کی موجب ہو، اسی طرح اس شور و ہنگامہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو ہلاکتِ عام کے وقت برپا ہوا کرتا ہے، خواہ سببِ ہلاکت کچھ ہی ہو۔

۳۵- یہ خصوصیات لائقِ غور ہیں۔ پیغمبر کی مخالفت کے لیے اُٹھنے والے اصل لوگ وہ تھے جنھیں قوم کی سرداری حاصل تھی۔ ان سب کی مشترک گمراہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے منکر تھے، اس لیے خدا کے سامنے کسی ذمہ داری و جواب دہی کا انھیں اندیشہ نہ تھا، اور اسی لیے وہ دُنیا کی اِس زندگی پر فریفتہ تھے اور "مادّی فلاح و بہبود" سے بلند تر کسی قدر کے قائل نہ تھے۔ پھر اس گمراہی میں جس چیز نے ان کو بالکل ہی غرق کر دیا تھا، وہ خوش حالی و آسودگی تھی جسے وہ اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ عقیدہ، وہ نظامِ اَخلاق، اور وہ طرزِ زندگی غلط بھی ہو سکتا ہے جس پر چل کر انھیں دُنیا میں یہ کچھ کامیابیاں نصیب ہو رہی ہیں۔ انسانی تاریخ بار بار اس حقیقت کو دُہراتی رہی ہے کہ دعوتِ حق کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ انھی تین خصوصیات کے حامل لوگ ہوئے ہیں۔ اور یہی اُس وقت کا منظر بھی تھا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ
مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ
مُّخْرَجُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا
الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا

نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کرلی تو تم گھاٹے ہی میں رہے۔[۳۶] یہ تمھیں اطّلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے، اُس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید، بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دُنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے

میں اصلاح کی سعی فرما رہے تھے۔

۳۶- بعض لوگوں نے یہ غلط سمجھا ہے کہ یہ باتیں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نہیں، یہ خطاب دراصل عوام الناس سے تھا۔ سردارانِ قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متأثر ہو جائیں گے، اور ان کے متأثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انھوں نے یہ تقریریں کر کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ یہ اُسی معاملے کا ایک دوسرا پہلو ہے جو اُوپر سردارانِ قومِ نوحؑ کے ذکر میں بیان ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے، محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کرا رہی ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ بھائیو! ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے۔ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اِس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر کیوں یہ بڑا بنے اور تم اِس کے فرمان کی اطاعت کرو؟ ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ ہم جو تمھارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے، ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیر بحث ہماری سرداری نہیں ہے، کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے، البتہ زیرِ بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات سردارانِ قومِ نوحؑ کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، جن کے نزدیک قابلِ الزام اگر کوئی چیز تھی تو وہ ”اقتدار کی بھوک“ تھی جو کسی نئے آنے والے کے اندر محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہ کیا جا سکے۔ رہا ان کا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے، جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابلِ اعتراض نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَجُلُ ۨافۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحۡنُ لَهٗ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِىۡ
بِمَا كَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيۡلٍ لَّيُصۡبِحُنَّ نٰدِمِيۡنَ ۚ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتۡهُمُ
الصَّيۡحَةُ بِالۡحَقِّ فَجَعَلۡنٰهُمۡ غُثَآءً ۚ فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾ ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا
مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قُرُوۡنًا اٰخَرِيۡنَ ؕ﴿۴۲﴾ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ؕ﴿۴۳﴾
ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا كَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا
بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ
اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۙ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ

نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے،[۳۶ الف] اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں۔" رسول نے کہا: "پروردگار! اِن لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے، اس پر اب تُو ہی میری نصرت فرما۔" جواب میں ارشاد ہوا: "قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔" آخرِکار ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامۂ عظیم نے ان کو آلیا اور ہم نے ان کو کچرا[۳۷] بنا کر پھینک دیا ــــ دُور ہو ظالم قوم!

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اُٹھائیں۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھیر سکی۔ پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا، اُس نے اُسے جھٹلایا، اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا ــــ پھٹکار اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے![۳۸]

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور کُھلی سند[۳۹] کے ساتھ فرعون اور اس کے

---

۳۶ الف۔ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے یہ لوگ بھی منکر نہ تھے، ان کی بھی اصل گمراہی شرک ہی تھی۔ دوسرے مقامات پر بھی قرآنِ مجید میں اس قوم کا یہی جرم بیان کیا گیا ہے۔ مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۷۰۔ ہود: ۵۳-۵۴۔ حٰمٓ السجدہ: ۱۴۔ الاحقاف: ۲۱-۲۲

۳۷۔ اصل میں لفظ غُثَاء استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں: وہ کُوڑا کرکٹ جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہوا آتا ہے اور پھر کناروں پر لگ کر پڑا سڑتا رہتا ہے۔

وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ
لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ
الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلْنَا
ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

اَعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے تکبّر کیا اور بڑی دُون کی لی۔[۴۰] کہنے لگے: "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟[۴۰ الف] اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔[۴۱]" پس اُنھوں نے دونوں کو جُھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والوں میں جا ملے۔[۴۲] اور موسیٰؑ کو ہم نے کتاب عطا فرمائی، تاکہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں۔

اور ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشان بنایا[۴۳] اور ان کو ایک سطحِ مُرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔[۴۴] ع

---

۳۸ – یا بالفاظِ دیگر، پیغمبروں کی بات نہیں مانتے۔

۳۹ – "نشانیوں" کے بعد "کُھلی سند" سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان نشانیوں کا ان کے ساتھ ہونا ہی اس بات کی کُھلی سند تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ یا پھر نشانیوں سے مراد عصا کے سوا دوسرے وہ تمام معجزات ہیں جو مصر میں دکھائے گئے تھے، اور کُھلی سند سے مراد عصا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے جو معجزے رُونما ہوئے، اُن کے بعد تو یہ بات بالکل ہی واضح ہو گئی تھی کہ یہ دونوں بھائی مامور من اللہ ہیں۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرُف، حواشی ۴۳-۴۴)

۴۰ – اصل میں وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ کے الفاظ ہیں، جن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ بڑے گھمنڈی، ظالم اور دراز دست تھے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بڑے اُونچے بنے اور انھوں نے بڑی دوں کی لی۔

۴۰، الف – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۲۶۔

۴۱ – اصل الفاظ ہیں: "جن کی قوم ہماری عابد ہے"۔ عربی زبان میں کسی کا "مطیعِ فرمان" ہونا اور "اس کا عبادت گزار" ہونا، دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ جو کسی کی بندگی و اطاعت کرتا ہے، وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے۔ اس سے بڑی اہم روشنی پڑتی ہے لفظ "عبادت" کے معنی پر اور انبیا علیہم السلام کی اس دعوت پر کہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے سوا ہر ایک کی عبادت چھوڑ دینے کی تلقین جو وہ کرتے تھے، اس کا پورا مفہوم کیا تھا۔ "عبادت" ان کے نزدیک صرف "پوجا" نہ تھی۔ ان کی دعوت یہ نہیں تھی کہ صرف پوجا اللہ کی کرو، باقی بندگی و اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ وہ انسان کو اللہ کا پرستار بھی بنانا چاہتے تھے اور مطیعِ فرمان بھی، اور ان دونوں معنوں کے لحاظ سے دوسروں کی عبادت کو غلط ٹھیراتے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؕ﴿۵۱﴾

اے پیغمبرو[۴۵]! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح[۴۶]، تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں اس کو خوب جانتا ہوں۔

۴۲ – قصّۂ موسیٰؑ و فرعون کی تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: البقرہ، آیات ۴۹-۵۰، الاعراف: ۱۰۳ تا ۱۳۶، یونُس: ۷۵ تا ۹۲، ہود: ۹۶ تا ۹۹، بنی اسرائیل: ۱۰۱ تا ۱۰۴، طٰہٰ: ۹ تا ۸۰۔

۴۳ – یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابنِ مریمؑ تھے اور ایک نشانی خود مریمؑ۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریمؑ اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریمؑ کا پیدا ہونا، اور مرد کی صحبت کے بغیر مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بے پدر کے منکر ہیں، وہ ماں اور بیٹے کے ایک آیت ہونے کی کیا توجیہ کریں گے؟ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۴-۵۳۔ النساء، حواشی ۱۹۰-۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲۔ الانبیاء، حواشی ۸۹-۹۰) یہاں دو باتیں اور بھی قابلِ توجہ ہیں: اوّل، یہ کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدۂ ماجدہ کا معاملہ جاہل انسانوں کی ایک دوسری کمزوری کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُوپر جن انبیاؑ کا ذکر تھا، اُن پر تو ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ تم بشر ہو، بھلا بشر بھی کہیں نبی ہوسکتا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کے جب لوگ معتقد ہوئے تو پھر ایسے ہوئے کہ انھیں بشَریّت کے مَقام سے اُٹھا کر خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوم، یہ کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش، اور ان کی گہوارے والی تقریر سے اس کے معجزہ ہونے کا کھلا کھلا ثبوت دیکھ لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کیا اور حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی، اُن کو پھر سزا بھی ایسی دی گئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُنیا کے سامنے ایک نمونۂ عبرت بن گئی۔

۴۴ – مختلف لوگوں نے اس سے مختلف مقامات مراد لیے ہیں۔ کوئی دِمَشق کہتا ہے، کوئی الرَّملَہ، کوئی بیت المَقدِس، اور کوئی مصر۔ مسیحی رِوایات کے مطابق حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبُور ہوئیں۔ پہلے ہیرودِیس بادشاہ کے عہد میں وہ انھیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں۔ پھر ارَخِلاؤس کے عہدِ حکومت میں ان کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی۔ (مَتّی ۲-۱۳ تا ۲۳) اب یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ قرآن کا اشارہ کس مَقام کی طرف ہے۔ لغت میں رَبْوَہ اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گرد و پیش کے علاقے سے اُونچی ہو۔ ذاتِ قرار سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت کی سب چیزیں پائی جاتی ہوں اور رہنے والا وہاں بفراغت زندگی بسر کرسکتا ہو۔ اور مَعِین سے مراد ہے: بہتا ہوا پانی یا چشمۂ جاری۔

۴۵ – پچھلے دو رُکوعوں میں متعدّد انبیاؑ کا ذکر کرنے کے بعد اب یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کہہ کر تمام پیغمبروں کو خطاب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں یہ سارے پیغمبر یک جا موجود تھے اور ان سب کو خطاب کر کے یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا۔ بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر زمانے میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں میں آنے والے انبیاؑ کو یہی ہدایت کی گئی تھی، اور سب کے سب اختلافِ زمانہ و مَقام کے باوجود ایک ہی حکم کے مخاطب تھے۔ بعد کی آیت میں چونکہ تمام انبیاؑ کو ایک اُمّت، ایک جماعت، ایک گروہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے طرزِ بیان یہاں ایسا اختیار کیا گیا کہ نگاہوں کے سامنے ان سب کے ایک گروہ ہونے کا نقشہ

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ

اور یہ تمھاری اُمّت ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، پس مجھی سے تم ڈرو۔[۴۷] مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، اُسی میں وہ مگن ہے[۴۸] ـــــــ اچھا، تو چھوڑو انھیں، ڈوبے

کھنچ جائے۔ گویا وہ سارے کے سارے ایک جگہ جمع ہیں اور سب کو ایک ہی ہدایت دی جا رہی ہے۔ مگر اس طرزِ کلام کی لطافت اس دَور کے بعض کُند ذہن لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکی اور وہ اس سے یہ نتیجہ نکال بیٹھے کہ یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے انبیاؑ کی طرف ہے، اور اس سے حضورؐ کے بعد بھی سلسلۂ نبوت کے جاری ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ تعجب ہے، جو لوگ زبان و ادب کے ذوقِ لطیف سے اس قدر کورے ہیں، وہ قرآن کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

۴۶ – پاک چیزوں سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو بجائے خود بھی پاکیزہ ہوں، اور پھر حلال طریقے سے بھی حاصل ہوں۔ طیّبات کھانے کی ہدایت کر کے رہبانیت اور دُنیا پرستی کے درمیان اسلام کی راہِ اعتدال کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ مسلمان نہ تو راہب کی طرح اپنے آپ کو پاکیزہ رزق سے محروم کرتا ہے، اور نہ دُنیا پرست کی طرح حرام و حلال کی تمیز کے بغیر ہر چیز پر منہ مار دیتا ہے۔

عملِ صالح سے پہلے طیّبات کھانے کی ہدایت سے صاف اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ حرام خوری کے ساتھ عملِ صالح کے کوئی معنٰی نہیں ہیں۔ صلاح کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ آدمی رزقِ حلال کھائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ ”لوگو! اللہ خود پاک ہے، اس لیے پاک ہی چیز کو پسند کرتا ہے۔“ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا: الرجل یطیل السفر اشعث اغبر ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام یمد یدیه الی السماء یا رب یا رب فانی یستجاب لذالك ”ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار آلود و پراگندہ مُو آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دُعائیں مانگتا ہے، یا رب یا رب! مگر حال یہ ہوتا ہے کہ روٹی اس کی حرام، کپڑے اس کے حرام، اور جسم اس کا حرام کی روٹیوں سے پلا ہوا۔ اب کس طرح ایسے شخص کی دُعا قبول ہو۔“ (مسلم، ترمذی، احمد من حدیثِ ابی ہریرہؓ)

۴۷ – ”تمھاری امت ایک ہی اُمّت ہے“، یعنی تم ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ ”اُمّت“ کا لفظ اُس مجموعۂ افراد پر بولا جاتا ہے جو کسی اصلِ مشترک پر جمع ہو۔ انبیاؑ چونکہ اختلافِ زمانہ و مقام کے باوجود ایک عقیدے، ایک دین اور ایک دعوت پر جمع تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ ان سب کی ایک ہی اُمّت ہے۔ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے کہ وہ اصلِ مشترک کیا تھی جس پر سب انبیاؑ جمع تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۱۳۰ تا ۱۳۳ – ۲۱۳ ۔ آلِ عمران: ۱۹ – ۲۰ – ۳۳ – ۳۴ – ۶۴ – ۷۹ تا ۸۵ ۔ النساء: ۱۵۰ تا ۱۵۲ ۔ الاعراف: ۵۹ – ۶۵ – ۷۳ – ۸۵ ۔ یوسف: ۳۷ تا ۴۰ ۔ مریم: ۴۹ تا ۵۹ ۔ الانبیاء: ۷۱ تا ۹۳ ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

غَمۡرَتِهِمۡ حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ وَّبَنِيۡنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمۡ فِى الۡخَيۡرٰتِ‌ ؕ بَلْ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ هُمۡ

رہیں اپنی غفلت میں ایک وقتِ خاص تک[49]۔

کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انھیں مال اولاد سے مدد دیے جا رہے ہیں تو گویا انھیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انھیں شعور نہیں ہے[50]۔ بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور

۴۸ – یہ محض بیانِ واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس اِستدلال کی ایک کڑی بھی ہے جو آغازِ سورہ سے چلا آ رہا ہے۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک تمام انبیاؑ یہی توحید اور عقیدۂ آخرت کی تعلیم دیتے رہے ہیں، تو لامحالہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی اسلام ہے، اور دوسرے تمام مذاہب جو آج پائے جاتے ہیں، وہ اسی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، جو اس کی بعض صداقتوں کو مسخ کر کے اور اس کے اندر بعض من گھڑت باتوں کا اضافہ کر کے بنالی گئی ہیں۔ اب اگر غلطی پر ہیں تو وہ لوگ ہیں جو اُن مذاہب کے گرویدہ ہو رہے ہیں، نہ کہ وہ جو ان کو چھوڑ کر اصل دین کی طرف بلا رہا ہے۔

۴۹ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک خلا ہے جسے بھرنے کے بجائے سامع کے تخیُّل پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ اس کو تقریر کا پسِ منظر خود بھر رہا ہے۔ پسِ منظر یہ ہے کہ خدا کا ایک بندہ پانچ چھ سال سے لوگوں کو اصل دین کی طرف بلا رہا ہے، دلائل سے بات سمجھا رہا ہے، تاریخ سے نظیریں پیش کر رہا ہے، اس کی دعوت کے اثرات و نتائج عملاً نگاہوں کے سامنے آرہے ہیں، اور پھر اس کا ذاتی کردار بھی اس امر کی ضمانت دے رہا ہے کہ وہ ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگ صرف یہی نہیں کہ اُس باطل میں مگن ہیں جو اُن کو باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا، اور صرف اِس حد تک بھی نہیں کہ وہ اُس حق کو مان کر نہیں دیتے جو روشن دلائل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ وہ ہاتھ دھو کر اس داعیِ حق کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور ہٹ دھرمی، طعن، ملامت، ظلم، جھوٹ، غرض کوئی بُری سے بُری تدبیر بھی اس کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اس صورتِ حال میں اصل دینِ حق کی وحدت، اور بعد کے ایجاد کردہ مذاہب کی حقیقت بیان کرنے کے بعد یہ کہنا کہ ”چھوڑو انھیں، ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں“، خود بخود اس معنٰی پر دلالت کرتا ہے کہ ”اچھا، اگر یہ لوگ نہیں مانتے اور اپنی گمراہیوں ہی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو چھوڑو انھیں“۔ اس ”چھوڑو“ کو بالکل لفظی معنوں میں لے کر یہ سمجھ بیٹھنا کہ ”اب تبلیغ ہی نہ کرو“، کلام کے تیوروں سے ناآشنائی کا ثبوت ہوگا۔ ایسے مواقع پر یہ بات تبلیغ و تلقین سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ غافلوں کو جھنجوڑنے کے لیے کہی جایا کرتی ہے۔ پھر ”ایک وقتِ خاص تک“ کے الفاظ میں ایک بڑی گہری تنبیہ ہے جو یہ بتا رہی ہے کہ غفلت کا یہ استغراق زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گا، ایک وقت آنے والا ہے جب یہ چونک پڑیں گے اور انھیں پتا چل جائے گا کہ بلانے والا جس چیز کی طرف بلا رہا تھا وہ کیا تھی، اور یہ جس چیز میں مگن تھے وہ کیسی تھی۔

۵۰ – اس مقام پر آغازِ سورہ کی آیتوں پر پھر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اُسی مضمون کو اب پھر ایک دوسرے انداز سے دُہرایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ ’’فلاح‘‘ اور ’’خیر‘‘ اور ’’خوش حالی‘‘ کا ایک محدود مادّی تصور رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک جس نے اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا گھر پالیا، جو مال و اولاد سے نواز دیا گیا، اور جسے معاشرے میں نام و نمود اور رُسُوخ و اثر حاصل ہو گیا، اس نے بس فلاح پالی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا، وہ ناکام و نامراد رہا۔ اس بنیادی غلط فہمی سے وہ پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اور وہ یہ تھی کہ جسے اس معنیٰ میں فلاح نصیب ہے، وہ ضرور راہِ راست پر ہے، بلکہ خدا کا محبوب ہے، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ اسے یہ کامیابیاں حاصل ہوتیں۔ اور اس کے برعکس جو اس فلاح سے ہم کو عَلانِیَہ محروم نظر آ رہا ہے، وہ یقیناً عقیدے اور عمل میں گمراہ اور خدا (یا خداؤں) کے غضب میں گرفتار ہے۔ اس غلط فہمی کو، جو درحقیقت مادہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کی ضلالت کے اہم ترین اسباب میں سے ہے، قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے، مختلف طریقوں سے اس کی تردید کی گئی ہے، اور طرح طرح سے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۱۲۶-۲۱۲۔ الاعراف: ۳۲۔ التوبہ: ۵۵-۶۹-۸۵۔ یونس: ۱۷۔ ہود: ۳-۲۷ تا ۳۱-۳۸-۳۹۔ الرعد: ۲۶۔ الکہف: ۲۸-۳۲ تا ۴۳-۱۰۳ تا ۱۰۵۔ مریم: ۷۷ تا ۸۰۔ طٰہٰ: ۱۳۱-۱۳۲۔ الانبیاء: ۴۴- مع حواشی)

اس سلسلے میں چند اہم حقیقتیں ایسی ہیں کہ جب تک آدمی ان کو اچھی طرح نہ سمجھ لے، اس کا ذہن کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔

اوّل یہ کہ ’’انسان کی فلاح‘‘ اِس سے وسیع تر اور بلند تر چیز ہے کہ اسے کسی فرد یا گروہ یا قوم کی محض مادّی خوش حالی اور وقتی کامیابی کے معنیٰ میں لے لیا جائے۔

دوم یہ کہ فلاح کو اس محدود معنیٰ میں لینے کے بعد اگر اسی کو حق و باطل اور خیر و شر کا معیار قرار دے لیا جائے تو یہ ایک ایسی بنیادی گمراہی بن جاتی ہے جس سے نکلے بغیر ایک انسان کبھی عقیدہ و فکر اور اَخلاق و سیرت میں راہِ راست پا ہی نہیں سکتا۔

سوم یہ کہ دنیا فی الاصل دار الجزا نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ یہاں اخلاقی جزا و سزا اگر ہے بھی تو بہت محدود پیمانے پر اور ناقص صورت میں ہے، اور امتحان کا پہلو خود اس میں بھی موجود ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لینا کہ یہاں جس کو جو نعمت بھی مل رہی ہے وہ ’’انعام‘‘ ہے اور اس کا ملنا انعام پانے والے کے برحق اور صالح اور محبوبِ رب ہونے کا ثبوت ہے، اور جس پر جو آفت بھی آ رہی ہے وہ ’’سزا‘‘ ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سزا پانے والا باطل پر ہے، غیر صالح ہے، اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے، یہ سب کچھ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی بلکہ حماقت ہے، جس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسری چیز ہمارے تصورِ حق اور معیارِ اَخلاق کو بگاڑ دینے والی ہو۔ ایک طالبِ حقیقت کو اوّل قدم پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دُنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں بے شمار مختلف صورتوں سے افراد کا، قوموں کا اور تمام انسانوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان کے دوران میں جو مختلف حالات لوگوں کو پیش آتے ہیں، وہ جزا و سزا کے آخری فیصلے نہیں ہیں کہ انھی کو نظریّات، اخلاق اور اعمال کی صحت اور غلطی کا معیار بنا لیا جائے، اور انھی کو خدا کے ہاں محبوب یا مغضوب ہونے کی علامت قرار دے لیا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِيْنَ

سبقت کرکے انھیں پا لینے والے تو[۵۰ الف] درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں[۵۱]، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں[۵۲]، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے[۵۳]، اور جن کا حال یہ ہے

چہارم، یہ کہ فلاح کا دامن یقیناً حق اور نیکی کے ساتھ بندھا ہوا ہے، اور بلاشک و ریب یہ ایک حقیقت ہے کہ باطل اور بدی کا انجام خُسران ہے۔ لیکن اس دُنیا میں چونکہ باطل اور بدی کے ساتھ عارضی و نمایشی فلاح، اور اسی طرح حق اور نیکی کے ساتھ ظاہری اور وقتی خُسران ممکن ہے، اور اکثر و بیشتر یہ چیز دھوکا دینے والی ثابت ہوتی ہے، اس لیے حق و باطل اور خیر و شر کی جانچ کے لیے ایک مستقل کسوٹی کی ضرورت ہے جس میں دھوکے کا خطرہ نہ ہو۔ انبیا علیہم السلام کی تعلیمات اور آسمانی کتابیں ہم کو وہ کسوٹی بہم پہنچاتی ہیں، انسانی عقلِ عام (common sense) اس کی صحت کی تصدیق کرتی ہے اور معروف و منکر کے متعلق نوعِ انسانی کے مشترک وجدانی تصورات اُس پر گواہی دیتے ہیں۔

پنجم، یہ کہ جب کوئی شخص یا قوم ایک طرف تو حق سے منحرف اور فسق و فجور اور ظلم و طغیان میں مبتلا ہو، اور دوسری طرف اس پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہو، تو عقل اور قرآن دونوں کی رُو سے یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ خدا نے اس کو شدید تر آزمایش میں ڈال دیا ہے اور اس پر خدا کی رحمت نہیں بلکہ اس کا غضب مسلط ہو گیا ہے۔ اسے غلطی پر چوٹ لگتی تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ خدا ابھی اس پر مہربان ہے، اسے تنبیہ کر رہا ہے اور سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔ لیکن غلطی پر ''انعام'' یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، اور اس کی کشتی اس لیے تیر رہی ہے کہ خوب بھر کر ڈوبے۔ اس کے برعکس جہاں ایک طرف سچی خدا پرستی ہو، اَخلاق کی پاکیزگی ہو، معاملات میں راست بازی ہو، خلقِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک اور رحمت و شفقت ہو، اور دوسری طرف مصائب اور شدائد اس پر موسلا دھار برس رہے ہوں اور چوٹوں پر چوٹیں اسے لگ رہی ہوں، تو یہ خدا کے غضب کی نہیں، اس کی رحمت ہی کی علامت ہے۔ سُنار اس سونے کو تپا رہا ہے تاکہ خوب نکھر جائے اور دنیا پر اس کا کامل العیار ہونا ثابت ہو جائے۔ دنیا کے بازار میں اس کی قیمت نہ بھی اُٹھے تو پروا نہیں۔ سُنار خود اس کی قیمت دے گا، بلکہ اپنے فضل سے مزید عطا کرے گا۔ اس کے مصائب اگر غضب کا پہلو رکھتے ہیں تو خود اس کے لیے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں ہی کے لیے رکھتے ہیں، یا پھر اس سوسائٹی کے لیے جس میں صالحین ستائے جائیں اور فُسّاق نوازے جائیں۔

۵۰، الف۔ اُردو زبان کی رعایت سے ہم نے آیت ۶۱ کا ترجمہ پہلے کر دیا ہے اور آیات ۵۷ تا ۶۰ کا ترجمہ بعد میں کیا ہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ آیت ۶۱ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

۵۱ – یعنی وہ دُنیا میں خدا سے بے خوف اور بے فکر ہو کر نہیں رہتے کہ جو دل چاہے کرتے رہیں اور کبھی نہ سوچیں

يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ

کر دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل اُن کے اِس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے[54]۔ وہی بھلائیوں

کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ظلم اور زیادتی پر پکڑنے والا ہے، بلکہ ان کے دل میں ہر وقت اس کا خوف رہتا ہے اور وہی انھیں برائیوں سے روکتا رہتا ہے۔

۵۲ - آیات سے مراد دونوں طرح کی آیات ہیں، وہ بھی جو خدا کی طرف سے اس کے انبیاؑ پیش کرتے ہیں، اور وہ بھی جو انسان کے اپنے نفس میں اور ہر طرف آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آیاتِ کتاب پر ایمان لانا اُن کی تصدیق کرنا ہے، اور آیاتِ آفاق و اَنفُس پر ایمان لانا اُن حقیقتوں پر ایمان لانا ہے جن پر وہ دلالت کر رہی ہیں۔

۵۳ - اگرچہ آیات پر ایمان سے خود ہی یہ لازم آتا ہے کہ انسان توحید کا قائل و معتقد ہو، لیکن اس کے باوجود شرک نہ کرنے کا ذکر الگ اس لیے کیا گیا ہے کہ بسا اوقات انسان آیات کو مان کر بھی کسی نہ کسی طور کے شرک میں مبتلا رہتا ہے۔ مثلاً ریا، کہ وہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ یا انبیا اور اولیا کی تعظیم میں ایسا مبالغہ جو شرک تک پہنچا دے۔ یا غیر اللہ سے دُعا اور استعانت۔ یا برضا و رغبت اربابٌ مِن دُون اللہ کی بندگی و اطاعت اور غیر الٰہی قوانین کا اتباع۔ پس ایمان بآیاتِ اللہ کے بعد شرک کی نفی کا الگ ذکر کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اللہ کے لیے اپنی بندگی، اطاعت اور عُبودیّت کو بالکل خالص کر لیتے ہیں، اس کے ساتھ کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک لگا نہیں رکھتے۔

۵۴ - عربی زبان میں "دینے" (ایتاء) کا لفظ صرف مال یا کوئی مادّی چیز دینے ہی کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے کہتے ہیں: اٰتیتہٗ من نفسی القبول۔ کسی شخص کی اطاعت سے انکار کر دینے کے لیے کہتے ہیں: اٰتیتہ من نفسی الاباءۃ۔ پس اس دینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ راہِ خدا میں مال دیتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب اللہ کے حضور طاعت و بندگی پیش کرنے پر بھی حاوی ہے۔

اسی معنیٰ کے لحاظ سے آیت کا پورا مفہوم یہ ہوا کہ وہ اللہ کی فرماں برداری میں جو کچھ بھی نیکیاں کرتے ہیں، جو کچھ بھی خدمات انجام دیتے ہیں، جو کچھ بھی قربانیاں کرتے ہیں، ان پر وہ پُھولتے نہیں ہیں، غرورِ تقویٰ اور پندارِ خدا رسیدگی میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ اپنے مقدور بھر سب کچھ کر کے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ خدا جانے یہ قبول ہو یا نہ ہو، ہمارے گناہوں کے مقابلے میں وزنی ثابت ہو یا نہ ہو، ہمارے رب کے ہاں ہماری مغفرت کے لیے کافی ہو یا نہ ہو۔ یہی مطلب ہے جس پر وہ حدیث روشنی ڈالتی ہے جو احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ، حاکم اور ابنِ جَریر نے نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص چوری اور زنا اور شراب نوشی کرتے ہوئے اللہ سے ڈرے؟" اس سوال سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اسے يَأْتُوْنَ مَآ اَتَوْا کے معنیٰ میں لے رہی تھیں، یعنی "کرتے ہیں جو کچھ بھی کرتے ہیں"۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یا بنت الصدیق ولکنه الذی یصلی ویصوم ویتصدق وهو یخاف اللّٰه عزّوجلّ، "نہیں، اے صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور پھر اللہ عزّوجلّ سے ڈرتا رہتا ہے۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ ٦١ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ ٦٢ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِىْ غَمْرَةٍ

کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انھیں پالینے والے ہیں۔ ہم[۵۴ الف] کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے[۵۵]، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے، جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے[۵۶]، اور لوگوں پر ظلم بہر حال نہیں کیا جائے گا[۵۷]۔ مگر یہ لوگ اس معاملے سے

اس جواب سے پتا چلا کہ آیت کی صحیح قراءت یَأْتُوْنَ نہیں بلکہ یُؤْتُوْنَ ہے، اور یہ یُؤْتُوْنَ صرف مال دینے کے محدود معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ طاعت بجا لانے کے وسیع معنیٰ میں ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک مومن کس قلبی کیفیت کے ساتھ اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اس کی مکمل تصویر حضرت عمرؓ کی وہ حالت ہے کہ عمر بھر کی بے نظیر خدمات کے بعد جب دنیا سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو خدا کے محاسبے سے ڈرتے ہوئے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر آخرت میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے خوب کہا ہے کہ مومن طاعت کرتا ہے پھر بھی ڈرتا رہتا ہے، اور منافق معصیت کرتا ہے پھر بھی بے خوف رہتا ہے۔

۵۴، الف – واضح رہے کہ آیت ۶۱ کا ترجمہ آیات ۵۷ تا ۶۰ کے ترجمے سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں سے آیت ۶۲ کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

۵۵ – اس سیاق و سباق میں یہ فقرہ اپنے اندر بڑی گہری معنویت رکھتا ہے، جسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پچھلی آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ بھلائیاں لُوٹنے والے اور سبقت کر کے انھیں پالینے والے دراصل کون لوگ ہیں اور ان کی صفات کیا ہیں۔ اس مضمون کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ہم کسی کو اس کی مقدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ سیرت، یہ اخلاق اور یہ کردار کوئی فوق البشری چیز نہیں ہے۔ تم ہی جیسے گوشت پوست کے انسان اس رَوِش پر چل کر دکھا رہے ہیں۔ لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو انسانی مقدرت سے باہر ہے۔ انسان کو تو مقدرت اُس رویّے کی بھی حاصل ہے جس پر تم چل رہے ہو، اور اُس کی بھی حاصل ہے جس پر تمھاری اپنی قوم کے چند اہلِ ایمان چل رہے ہیں۔ اب فیصلہ جس چیز پر ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ان دونوں امکانی رویّوں میں سے کون کس کا انتخاب کرتا ہے۔ اس انتخاب میں غلطی کر کے اگر آج تم اپنی ساری محنتیں اور کوششیں بُرائیاں سمیٹنے میں صَرف کر دیتے ہو اور بھلائیوں سے محروم رہ جاتے ہو، تو کل اپنی اس حماقت کا خمیازہ بھگتنے سے تم کو یہ جھوٹی معذرت نہیں بچا سکے گی کہ بھلائیوں تک پہنچنے کا راستہ ہماری مقدرت سے باہر تھا۔ اُس وقت یہ عذر پیش کرو گے تو تم سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ راستہ انسانی مقدرت سے باہر تھا تو تم ہی جیسے بہت سے انسان اس پر چلنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔

۵۶ – کتاب سے مراد ہے نامۂ اعمال، جو ہر ایک شخص کا الگ الگ مرتّب ہو رہا ہے، جس میں اس کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت، حتّٰی کہ خیالات اور ارادوں تک کی ایک ایک حالت ثبت کی جا رہی ہے۔ اسی کے متعلق سورۂ کہف

مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝٦٣ حَتّٰٓى اِذَآ
اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔـرُوْنَ ۝٦٤ لَا تَجْـَٔـرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ
مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝٦٥ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

بے خبر ہیں[58]۔ اور ان کے اعمال بھی اُس طریقے سے (جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) مختلف ہیں۔ وہ اپنے یہ کرتوت کیے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ جب ہم اُن کے عیّاشوں[59] کو عذاب میں پکڑ لیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں[60] گے ــــ اب[61] بند کرو اپنی فریاد و فغاں، ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمھیں نہیں ملنی۔ میری آیات سُنائی جاتی تھیں تو تم (رسول کی آواز سنتے ہی) اُلٹے پاؤں

میں فرمایا گیا ہے کہ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝ ”اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا، پھر تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اُس کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے، اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ایسی نہیں رہ گئی جو اس میں درج نہ ہو۔ جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“ (آیت ۴۹) بعض لوگوں نے یہاں کتاب سے مراد قرآن لے کر آیت کا مطلب خبط کر دیا ہے۔

۵۷ - یعنی نہ تو کسی کے ذمّے کوئی ایسا الزام تھوپا جائے گا جس کا وہ درحقیقت قصور وار نہ ہو، نہ کسی کی کوئی ایسی نیکی ماری جائے گی جس کے صلے کا وہ فی الواقع مستحق ہو، نہ کسی کو بے جا سزا دی جائے گی اور نہ کسی کو حق کے مطابق بجا انعام سے محروم رکھا جائے گا۔

۵۸ - یعنی اس امر سے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، کہہ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں، یہ سب کچھ کہیں درج ہو رہا ہے اور کبھی اس کا حساب ہونے والا ہے۔

۵۹ - ”عیّاش“ یہاں مُتْرَفِيْنَ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ مُتْرَفِيْنَ اصل میں اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو دنیوی مال و دولت کو پا کر مزے کر رہے ہوں اور خدا و خلق کے حُقوق سے غافل ہوں۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم لفظ عیّاش سے ادا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اسے صرف شہوت رانی کے معنیٰ میں نہ لیا جائے بلکہ عیش کوشی کے وسیع تر معنوں میں لیا جائے۔
عذاب سے مراد یہاں غالباً آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ دنیا کا عذاب ہے جو اِسی زندگی میں ظالموں کو دیکھنا پڑے۔

۶۰ - اصل میں لفظ جُؤَار استعمال کیا گیا ہے جو بیل کی اُس آواز کو کہتے ہیں جو سخت تکلیف کے وقت وہ نکالتا ہے۔ یہ لفظ یہاں محض فریاد و فُغان کے معنیٰ میں نہیں بلکہ اُس شخص کی فریاد و فُغان کے معنیٰ میں بولا گیا ہے جو کسی رحم کا مستحق نہ ہو۔ اس میں تحقیر اور طنز کا انداز چھپا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ ”اچھا، اب جو اپنے کرتوتوں کا مزا چکھنے کی نوبت آئی تو بلبلانے لگے۔“

Maktaba Tul Ishaat.com

تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ
جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ

بھاگ نکلتے تھے[۶۲]، اپنے گھمنڈ میں اُس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے، اپنی چوپالوں میں اُس پر باتیں چھانٹتے[۶۳] اور بکواس کیا کرتے تھے۔

تو کیا اِن لوگوں نے کبھی اِس کلام پر غور نہیں کیا؟[۶۴] یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی؟[۶۵] یا یہ اپنے رسول سے کبھی کے واقف نہ تھے کہ (اَن جانا آدمی ہونے کے باعث)

۶۱ – یعنی اُس وقت ان سے یہ کہا جائے گا۔

۶۲ – یعنی اس کی بات سننا تک تمھیں گوارا نہ تھا۔ یہ تک برداشت نہ کرتے تھے کہ اس کی آواز کان میں پڑے۔

۶۳ – اصل میں لفظ ’’ سٰمِرًا ‘‘ استعمال کیا گیا ہے۔ سمر کے معنٰی ہیں: رات کے وقت بات چیت کرنا، گپیں ہانکنا، قصے کہانیاں کہنا۔ دیہاتی اور قصباتی زندگی میں یہ راتوں کی گپیں عموماً چوپالوں میں ہُوا کرتی ہیں، اور یہی اہلِ مکّہ کا بھی دستور تھا۔

۶۴ – یعنی کیا ان کے اس رَوَیّے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کو انھوں نے سمجھا ہی نہیں اس لیے وہ اسے نہیں مانتے؟ ظاہر ہے کہ یہ وجہ نہیں ہے۔ قرآن کوئی چیستان نہیں ہے، کسی ناقابلِ فہم زبان میں نہیں ہے۔ کسی ایسے مضمون اور موضوعِ کلام پر مشتمل نہیں ہے جو آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ وہ اس کی ایک ایک بات اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ پیش کر رہا ہے اسے نہیں ماننا چاہتے، نہ اس لیے کہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اور سمجھ میں نہ آیا۔

۶۵ – یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نرالی بات پیش کر رہا ہے جس سے انسانی کان کبھی آشنا ہی نہ ہوئے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ وجہ بھی نہیں ہے۔ خدا کی طرف سے انبیاؑ کا آنا، کتابیں لے کر آنا، توحید کی دعوت دینا، آخرت کی باز پرس سے ڈرانا، اور اَخلاق کی معروف بھلائیاں پیش کرنا، اِن میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تاریخ میں آج پہلی مرتبہ رُونما ہوئی ہو، اور اس سے پہلے کبھی اس کا ذکر نہ سُنا گیا ہو۔ ان کے گرد و پیش عراق، شام اور مصر میں انبیا پر انبیا آئے ہیں جنھوں نے یہی باتیں پیش کی ہیں اور یہ لوگ اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ خود ان کی اپنی سرزمین میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام آئے، ہُود اور صالح اور شعیب علیہم السلام آئے، ان کے نام آج تک ان کی زبانوں پر ہیں، ان کو یہ خود فرستادۂ الٰہی مانتے ہیں، اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مشرک نہ تھے بلکہ خدائے واحد کی بندگی سکھاتے تھے۔ اس لیے درحقیقت اِن کے انکار کی یہ وجہ بھی نہیں ہے کہ ایک بالکل ہی انوکھی بات سن رہے ہیں جو کبھی نہ سنی گئی تھی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الفرقان، حاشیہ ۸۴۔ السجدہ، حاشیہ ۵۔ سبا، حاشیہ ۳۵)

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ

اُس سے بِدَکتے ہیں؟[66] یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنُون ہے؟[67] نہیں، بلکہ وہ حق لایا ہے اور

٦٦ – یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل اجنبی آدمی، جس سے یہ کبھی کے واقف نہ تھے، اچانک ان کے درمیان آ کھڑا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے مان لو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی نہیں ہے۔ جو شخص یہ دعوت پیش کر رہا ہے، وہ ان کی اپنی بَرادری کا آدمی ہے۔ اس کی نسبی شرافت ان سے مخفی نہیں۔ اس کی ذاتی زندگی ان سے چھپی ہوئی نہیں۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی سرحد تک وہ ان کے سامنے پہنچا ہے۔ اس کی صداقت سے، اس کی راست بازی سے، اس کی امانت سے، اس کی بے داغ سیرت سے یہ خوب واقف ہیں۔ اس کو خود امین کہتے رہے ہیں۔ اس کی دیانت پر ان کی ساری برادری بھروسا کرتی رہی ہے۔ اس کے بدترین دشمن تک یہ مانتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اس کی پوری جوانی عفت اور پاک دامنی کے ساتھ گزری ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ نہایت شریف اور نہایت نیک آدمی ہے۔ حلیم ہے۔ حق پسند ہے۔ امن پسند ہے۔ جھگڑوں سے کنارہ کش ہے۔ معاملے میں کھرا ہے۔ قول و قرار کا پکا ہے۔ ظلم نہ خود کرتا ہے نہ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔ کسی حق دار کا حق ادا کرنے میں اُس نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ ہر مصیبت زدہ، بے کس، حاجت مند کے لیے اس کا دروازہ ایک رحیم و شفیق ہمدرد کا دروازہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبوت کے دعوے سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ کسی دعوے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اور جس روز اس نے دعویٰ کیا، اس کے بعد سے آج تک وہ ایک ہی بات کہتا رہا ہے۔ کوئی پلٹی اُس نے نہیں کھائی ہے۔ کوئی ردّ و بدل اپنے دعوے اور دعوت میں اس نے نہیں کیا ہے۔ کوئی تدریجی ارتقا اس کے دعووں میں نظر نہیں آتا، کہ کوئی یہ گمان کر سکے کہ آہستہ آہستہ قدم جما جما کر دعووں کی وادی میں پیش قدمی کی جا رہی ہے۔ پھر اس کی زندگی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جو کچھ اس نے دوسروں سے کہا ہے، وہ پہلے خود کر کے دکھایا ہے۔ اس کے قول اور عمل میں تضاد نہیں ہے۔ اس کے پاس ہاتھی کے دانت نہیں ہیں کہ دکھانے کے اور ہوں، اور چبانے کے اور۔ وہ دینے کے باٹ الگ اور لینے کے الگ نہیں رکھتا۔ ایسے جانے بُوجھے اور جانچے پرکھے آدمی کے متعلق وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ "صاحب! دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے، بڑے بڑے فریبی آتے ہیں اور دل موہ لینے والی باتیں کر کے اوّل اوّل اعتبار جما لیتے ہیں، بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سب محض چکما ہی چکما تھا، یہ صاحب بھی کیا خبر، اصل میں کیا ہوں اور بناوٹ کا مُلمّع اُترنے کے بعد کیا کچھ ان کے اندر سے نکل آئے، اس لیے ان کو مانتے ہوئے ہمارا تو ماتھا ٹھنکتا ہے۔" (اس سلسلے میں مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الانعام، حاشیہ ۲۱۔ یُونس، حاشیہ ۲۱۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۵)

٦٧ – یعنی کیا اِن کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ واقعی وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بھی اصلی وجہ نہیں ہے، کیونکہ زبان سے چاہے وہ کچھ ہی کہتے رہیں، دلوں میں تو اُن کی دانائی و زیرکی کے قائل ہیں۔ علاوہ بریں ایک پاگل اور ایک ہوش مند آدمی کا فرق کوئی ایسا چھپا ہوا تو نہیں ہوتا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو۔ آخر ایک ہٹ دھرم اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے ـــــ اور حق اگر کہیں اِن کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا [۶۸] ـــــ نہیں، بلکہ ہم ان کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں [۶۹]۔

بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سُن کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی دیوانے کا کلام ہے، اور اس شخص کی زندگی کو دیکھ کر یہ رائے ظاہر کر سکتا ہے کہ یہ کسی مخبوط الحواس آدمی کی زندگی ہے؟ بڑا ہی عجیب ہے وہ جُنون (یا مُستشرقینِ مغرب کی بکواس کے مطابق مِرگی کا وہ دَورہ) جس میں آدمی کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلے اور جس میں آدمی ایک تحریک کی ایسی کامیاب راہ نمائی کرے کہ اپنے ہی ملک کی نہیں، دنیا بھر کی قسمت بدل ڈالے۔

۶۸ - اس مختصر سے جملے میں ایک بڑی بات کہی گئی ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دُنیا میں نادان لوگوں کی بالعُموم یہ رَوِش ہوتی ہے کہ جو شخص ان سے حق بات کہتا ہے، وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات وہ کہی جائے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، نہ کہ وہ جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ حالانکہ حقیقت بہرحال حقیقت ہی رہتی ہے، خواہ وہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند۔ تمام دنیا کی مُتفقہ خواہش بھی کسی واقعہ کو غیرِ واقعہ اور کسی امرِ حق کو غیرِ حق نہیں بنا سکتی، کجا کہ حقائق اور واقعات ایک ایک شخص کی خواہشات کے مطابق ڈھلا کریں اور ہر آن بے شمار متضاد خواہشوں سے ہم آہنگ ہوتے رہیں۔ حماقت مآب ذہن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حقیقت اور ان کی خواہش کے درمیان اگر اختلاف ہے تو یہ قصور حقیقت کا نہیں بلکہ ان کے اپنے نفس کا ہے۔ وہ اس کی مخالفت کر کے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اپنا ہی کچھ بگاڑ لیں گے۔ کائنات کا یہ عظیم الشان نظام جن اٹل حقائق اور قوانین پر مبنی ہے، ان کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ اپنے خیالات، خواہشات اور طرزِ عمل کو حقیقت کے مطابق بنائے، اور اس غرض کے لیے ہر وقت دلیل، تجرِبے اور مشاہَدے سے یہ جاننے کی کوشش کرتا رہے کہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی یہاں یہ طرزِ فکر و عمل اختیار کر سکتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ بیٹھا ہے، یا جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے کہ ہو، یا جو کچھ اپنے تعصُّبات کی بنا پر وہ فرض کر چکا ہے کہ ہے یا ہونا چاہیے، اُس پر جم کر رہ جائے اور اس کے خلاف کسی کی مضبوط سے مضبوط اور معقول سے معقول دلیل کو بھی سننا گوارا نہ کرے۔

۶۹ - یہاں لفظِ ذکر کے تین معنی ممکن ہیں اور تینوں ہی صحیح بیٹھتے ہیں:

(۱) ذکر بمعنیٰ بیانِ فطرت۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی دوسرے عالَم کی باتیں نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کی اپنی ہی حقیقت اور فطرت اور اس کے مقتضیات ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، تاکہ وہ اپنے اِس بُھولے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ

کیا تُو ان سے کچھ مانگ رہا ہے؟ تیرے لیے تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔ تُو تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بُلا رہا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، وہ راہِ راست سے

ہوئے سبق کو یاد کریں، مگر وہ اسے قبول کرنے سے کترا رہے ہیں۔ ان کا یہ فرار کسی غیر متعلق چیز سے نہیں بلکہ اپنے ہی ذکر سے ہے۔

(۲) ذکر بمعنیٰ نصیحت۔ اس کی رُو سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، یہ انھی کے بھلے کے لیے ایک نصیحت ہے، اور ان کا یہ فرار کسی اور چیز سے نہیں، اپنی ہی بھلائی کی بات سے ہے۔

(۳) ذکر بمعنیٰ شرف و اعزاز۔ اِس معنیٰ کو اختیار کیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم وہ چیز ان کے پاس لائے ہیں جسے یہ قبول کریں تو انھی کو عزت اور سرفرازی نصیب ہوگی۔ اس سے ان کی یہ رُوگردانی کسی اَور چیز سے نہیں، اپنی ہی ترقی اور اپنے ہی اُٹھان کے ایک زرّین موقع سے رُوگردانی ہے۔

۷۰ — یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے حق میں ایک اور دلیل ہے۔ یعنی یہ کہ آپؐ اپنے اس کام میں بالکل بے لوث ہیں۔ کوئی شخص ایمان داری کے ساتھ یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپؐ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہے ہیں کہ کوئی نفسانی غرض آپؐ کے پیشِ نظر ہے۔ اچھی خاصی تجارت چمک رہی تھی، اب افلاس میں مبتلا ہوگئے۔ قوم میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ہر شخص ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ اب گالیاں اور پتھر کھا رہے ہیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑے ہیں۔ چین سے اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔ اب ایک ایسی سخت کش مکش میں پڑ گئے ہیں جو کسی دم قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ بات وہ لے کر اُٹھے ہیں جس کی بدولت سارا ملک دشمن ہوگیا ہے، حتّٰی کہ خود اپنے ہی بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خود غرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خود غرض آدمی اپنی قوم اور قبیلے کے تعصُّبات کا عَلَم بردار بن کر اپنی قابلیت اور جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اُٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصُّبات کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اُس چیز کی جڑ ہی کاٹ دیتی ہے جس پر مشرکینِ عرب میں اس کے قبیلے کی چودھراہٹ قائم ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس کو قرآن میں نہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، بلکہ بالعُموم تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام، آیت ۹۰۔ یونس: ۷۲۔ ہود: ۲۹-۵۱۔ یوسف: ۱۰۴۔ الفرقان: ۵۷۔ الشعراء: ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰۔ سبا: ۴۷۔ یٰسٓ: ۲۱۔ ص: ۸۶۔ الشوریٰ: ۲۳۔ النجم: ۴۰۔ مع حواشی)

Maktaba Tul Ishaat.com

لَنٰكِبُوْنَ۝ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ۝
حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ۝ ع

ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔[۷۱]

اگر ہم اِن پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں، دُور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔[۷۲] اِن کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے اِنھیں تکلیف میں مبتلا کیا، پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں تو یکایک تم دیکھو گے کہ اس حالت میں یہ ہر خیر سے مایوس ہیں۔[۷۳] ع

۷۱ – یعنی آخرت کے انکار نے ان کو غیر ذمہ دار، اور احساسِ ذمہ داری کے فُقدان نے ان کو بے فکر بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب وہ سرے سے یہی نہیں سمجھتے کہ ان کی اس زندگی کا کوئی مآل اور نتیجہ بھی ہے اور کسی کے سامنے اپنے اس پورے کارنامۂ حیات کا حساب بھی دینا ہے، تو پھر انھیں اس کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ جانوروں کی طرح ان کی بھی غایتِ مقصود بس یہ ہے کہ ضروریاتِ نفس و جسم خوب اچھی طرح پوری ہوتی رہیں۔ یہ مقصود حاصل ہو تو پھر حق و باطل کی بحث ان کے لیے محض لایعنی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں کوئی خرابی رونما ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ سوچیں گے، وہ صرف یہ کہ اُس خرابی کا سبب کیا ہے اور اسے کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے۔ راہِ راست اس ذہنیت کے لوگ نہ چاہ سکتے ہیں نہ پا سکتے ہیں۔

۷۲ – اشارہ ہے اُس تکلیف و مصیبت کی طرف جس میں وہ قحط کی بدولت پڑے ہوئے تھے۔ اس قحط کے متعلق روایات نقل کرتے ہوئے بعض لوگوں نے دو قحطوں کے قصّوں کو خلط مَلط کر دیا ہے، جس کی وجہ سے آدمی کو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے یا بعد کا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں اہلِ مکہ کو دو مرتبہ قحط سے سابقہ پیش آیا ہے۔ ایک نبوت کے آغاز سے کچھ مدت بعد، دوسرا ہجرت کے کئی سال بعد، جب کہ ثُمامہ بن اُثال نے یمامہ سے مکے کی طرف غلّے کی برآمد روک دی تھی۔ یہاں ذکر دوسرے قحط کا نہیں بلکہ پہلے قحط کا ہے۔ اس کے متعلق صحیحین میں ابنِ مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ جب قریش نے نبیؐ کی دعوت قبول کرنے سے پیہم انکار کیا اور سخت مزاحمت شروع کر دی تو حضورؐ نے دعا کی کہ اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف "خدایا! ان کے مقابلے میں میری مدد یوسفؑ کے ہفت سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر۔" چنانچہ ایسا سخت قحط شروع ہوا کہ مُردار تک کھانے کی نوبت آ گئی۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا
مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ۝۷۹ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۸۰ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیے۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔[۷۴] وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اُسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔[۷۵] کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی؟[۷۶] مگر یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پیش رو

اس قحط کی طرف مکی سورتوں میں بکثرت اشارات ملتے ہیں۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الانعام: ۴۲ تا ۴۴۔ الاعراف: ۹۴ تا ۹۹۔ یونس: ۱۱-۱۲-۲۱۔ النحل: ۱۱۲-۱۱۳۔ الدخان: ۱۰ تا ۱۶۔ مع حواشی)

۷۳ – اصل میں لفظ مُبْلِسُوْنَ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم مایوسی سے ادا نہیں ہوتا۔ بَلَس اور اِبلاس کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حیرت کی وجہ سے دنگ ہو کر رہ جانا۔ خوف اور دہشت کے مارے دم بخود ہو جانا۔ رنج و غم کے مارے دل شکستہ ہو جانا۔ ہر طرف سے نااُمید ہو کر ہمت توڑ بیٹھنا۔ اور اسی کا ایک پہلو مایوسی و نامرادی کی وجہ سے برافروختہ (desperate) ہو جانا بھی ہے، جس کی بنا پر شیطان کا نام ابلیس رکھا گیا ہے۔ اس نام میں یہ معنیٰ پوشیدہ ہیں کہ یاس اور نامرادی (frustration) کی بنا پر اُس کا زخمی تکبُّر اس قدر برانگیختہ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان سے ہاتھ دھو کر ہر بازی کھیل جانے اور ہر جرم کا ارتکاب کر گزرنے پر تُلا ہوا ہے۔

۷۴ – مطلب یہ ہے کہ بدنصیبو! یہ آنکھ، کان اور دل و دماغ تم کو کیا اس لیے دیے گئے تھے کہ تم ان سے بس وہ کام لو جو حیوانات لیتے ہیں؟ کیا ان کا صرف یہی مَصرَف ہے کہ تم جانوروں کی طرح جسم اور نفس کے مطالبات پورے کرنے کے ذرائع ہی تلاش کرتے رہو، اور ہر وقت اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تدبیریں ہی سوچتے رہا کرو؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ناشکری ہو سکتی ہے کہ تم بنائے تو گئے تھے انسان، اور بن کر رہ گئے نرے حیوان؟ جن آنکھوں سے سب کچھ دیکھا جائے مگر حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے نشانات ہی نہ دیکھے جائیں، جن کانوں سے سب کچھ سُنا جائے مگر ایک سبق آموز بات ہی نہ سُنی جائے، اور جس دل و دماغ سے سب کچھ سوچا جائے مگر بس یہی نہ سوچا جائے کہ مجھے یہ وجود کیسے ملا ہے، کس لیے ملا ہے اور کیا میری زندگی کی غایت ہے، حیف ہے اگر وہ پھر ایک بیل کے بجائے ایک انسان کے ڈھانچے میں ہوں۔

۷۵ – علم کے ذرائع (حواس اور قوتِ فکر) اور ان کے مصرفِ صحیح سے انسان کی غفلت پر مُتنبِّہ کرنے کے بعد

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ
اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ
رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ

کہہ چکے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: ”کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں۔“[۷۷]

ان سے کہو: بتاؤ، اگر تم جانتے ہو، کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ کی۔ کہو: پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟[۷۸] ان سے پُوچھو: ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ۔[۷۹] کہو: پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟[۸۰] اِن سے کہو: بتاؤ، اگر تم جانتے ہو، کہ ہر چیز پر اقتدار[۸۱]

اب اُن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کا مشاہدہ اگر کھلی آنکھوں سے کیا جائے اور جن کی نشان دِہی سے اگر صحیح طور پر اِستدلال کیا جائے، یا کھلے کانوں سے کسی معقول استدلال کو سنا جائے، تو آدمی حق تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی بے خدا، یا بہت سے خداؤں کا ساختہ و پرداختہ نہیں ہے، بلکہ توحید کی اساس پر قائم ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ یہ بے مقصد نہیں ہے، نِرا کھیل اور محض ایک بے معنیٰ طِلسم نہیں ہے، بلکہ ایک مبنی بر حکمت نظام ہے، جس میں انسان جیسی ذی اختیار مخلوق کا غیر جواب دہ ہونا اور بس یونہی مر کر مٹی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

۷۶ – واضح رہے کہ یہاں توحید اور حیات بعد الموت، دونوں پر ایک ساتھ اِستدلال کیا جا رہا ہے، اور آگے تک جن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اُن سے شرک کے اِبطال اور انکارِ آخرت کے اِبطال، دونوں پر دلیل لائی جا رہی ہے۔

۷۷ – خیال رہے کہ اُن کا آخرت کو مُستَبعَد سمجھنا صرف آخرت ہی کا انکار نہ تھا، خدا کی قدرت اور حکمت کا بھی انکار تھا۔

۷۸ – یعنی کیوں یہ بات نہیں سمجھتے کہ پھر اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق بھی نہیں ہے، اور اس کے لیے زمین کی اس آبادی کو دوبارہ پیدا کر دینا بھی مشکل نہیں ہے۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى
تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ

کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو: پھر کہاں سے تم کو دھوکا لگتا ہے؟[۸۲] جو امرِ حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔[۸۳] اللہ نے کسی کو اپنی

۷۹ – اصل میں لفظ لِلّٰهِ استعمال ہوا ہے، یعنی "یہ سب چیزیں بھی اللہ کی ہیں"۔ ہم نے ترجمے میں محض اُردو زبان کے حُسنِ کلام کی خاطر وہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔

۸۰ – یعنی، پھر کیوں تمھیں اُس سے بغاوت کرتے اور اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ اور کیوں تم کو یہ خوف لاحق نہیں ہوتا کہ آسمان و زمین کے فرمانروا نے اگر کبھی ہم سے حساب لیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟

۸۱ – اصل میں لفظ مَلَكُوْتُ استعمال ہوا ہے جس میں مُلک (بادشاہی) اور مِلک (مالکیت)، دونوں مفہوم شامل ہیں، اور اس کے ساتھ یہ انتہائی مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس تفصیل کے لحاظ سے آیت کے پیش کردہ سوال کا پورا مطلب یہ ہے کہ "ہر چیز پر کامل اقتدار کس کا ہے اور ہر چیز پر پورے پورے مالکانہ اختیارات کس کو حاصل ہیں؟"

۸۲ – اصل الفاظ ہیں: اَنّٰى تُسْحَرُوْنَ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: "کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو؟" سِحر اور جادو کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو اس کی اصل ماہیت اور صحیح صورت کے خلاف بنا کر دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے ذہن میں یہ غلط تأثر پیدا کرتا ہے کہ اُس شے کی اصلیت وہ ہے جو بناوٹی طور پر ساحر پیش کر رہا ہے۔ پس آیت میں جو سوال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کس نے تم پر یہ سِحر کر دیا ہے کہ یہ سب باتیں جاننے کے باوجود حقیقت تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟ کس کا جادو تم پر چل گیا ہے کہ جو مالک نہیں ہیں، وہ تمھیں مالک یا اس کے شریک نظر آتے ہیں، اور جنھیں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے، وہ اصل صاحبِ اقتدار کی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تم کو بندگی کے مستحق محسوس ہوتے ہیں؟ کس نے تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے کہ جس خدا کے متعلق خود مانتے ہو کہ اس کے مقابلے میں کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے، اس سے غداری و بے وفائی کرتے ہو اور پھر بھروسا اُن کی پناہ پر کر رہے ہو جو اُس سے تم کو نہیں بچا سکتے؟ کس نے تم کو اس دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ جو ہر چیز کا مالک ہے، وہ تم سے کبھی نہ پوچھے گا کہ تم نے میری چیزوں کو کس طرح استعمال کیا، اور جو ساری کائنات کا بادشاہ ہے، وہ کبھی تم سے اس کی باز پُرس نہ کرے گا کہ میری بادشاہی میں تم اپنی بادشاہیاں چلانے یا دوسروں کی بادشاہیاں ماننے کے کیسے مجاز ہو گئے؟ سوال کی یہ نوعیت اور زیادہ معنیٰ خیز ہو جاتی ہے جب یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قریش کے لوگ نبیؐ پر سِحر کا الزام رکھتے تھے۔ اس طرح گویا سوال کے انھی الفاظ میں یہ مضمون بھی ادا ہو گیا کہ بے وقوفو! جو شخص تمھیں اصل حقیقت (وہ حقیقت جسے تمھارے اپنے اعترافات کے مطابق حقیقت ہونا چاہیے) بتاتا ہے، وہ تو تم کو نظر آتا ہے جادوگر، اور جو لوگ تمھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ
لَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَۙ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الۡغَيۡبِ

اولاد نہیں بنایا ہے،[۸۴] اور کوئی دوسرا خدا اُس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا، اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔[۸۵] پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ کُھلے اور

رات دن حقیقت کے خلاف باتیں باور کراتے رہتے ہیں، حتّٰی کہ جنھوں نے تم کو صریح عقل اور مَنطق کے خلاف، تجربے اور مشاہدے کے خلاف، تمھاری اپنی اعتراف کردہ صداقتوں کے خلاف، سراسر جھوٹی اور بے اصل باتوں کا معتقد بنا دیا ہے، اُن کے بارے میں کبھی تمھیں یہ شبہ نہیں ہوتا کہ اصل جادوگر تو وہ ہیں۔

۸۳ – یعنی اپنے اس قول میں جھوٹے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی اُلوہیت (خدائی کی صفات، اختیارات اور حُقوق، یا ان میں سے کوئی حصّہ) حاصل ہے۔ اور اپنے اِس قول میں جھوٹے کہ زندگی بعدِ موت ممکن نہیں ہے۔ ان کا جھوٹ اُن کے اپنے اعترافات سے ثابت ہے۔ ایک طرف یہ ماننا کہ زمین و آسمان کا مالک اور کائنات کی ہر چیز کا مختار اللہ ہے، اور دوسری طرف یہ کہنا کہ خدائی تنہا اسی کی نہیں ہے بلکہ دوسروں کا بھی (جو لامحالہ اُس کے مملوک ہی ہوں گے) اُس میں کوئی حصّہ ہے، یہ دونوں باتیں صریح طور پر ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ اسی طرح ایک طرف یہ کہنا کہ ہم کو اور اِس عظیم الشان کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے، اور دوسری طرف یہ کہنا کہ خدا اپنی ہی پیدا کردہ مخلوق کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا، صریحاً خلافِ عقل ہے۔ لہٰذا ان کی اپنی مانی ہوئی صداقتوں سے یہ ثابت ہے کہ شرک اور انکارِ آخرت، دونوں ہی جھوٹے عقیدے ہیں جو انھوں نے اختیار کر رکھے ہیں۔

۸۴ – یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ارشاد محض عیسائیت کی تردید میں ہے۔ نہیں، مشرکینِ عرب بھی اپنے معبُودوں کو خدا کی اولاد قرار دیتے تھے، اور دُنیا کے اکثر مشرکین اس گمراہی میں ان کے شریکِ حال رہے ہیں۔ چونکہ عیسائیوں کا عقیدۂ ”ابن اللہ“ زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اس لیے بعض اکابر مفسرین تک کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ یہ آیت اسی کی تردید میں وارد ہوئی ہے۔ حالانکہ ابتدا سے رُوئے سُخن کفارِ مکہ کی طرف ہے اور آخر تک ساری تقریر کے مخاطب وہی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں یکایک عیسائیوں کی طرف کلام کا رُخ پھر جانا بے معنٰی ہے۔ البتہ ضمناً اس میں ان تمام لوگوں کے عقائد کی تردید ہو گئی ہے جو خدا سے اپنے معبُودوں یا پیشواؤں کا نسب ملاتے ہیں، خواہ وہ عیسائی ہوں، یا مشرکینِ عرب، یا کوئی اور۔

۸۵ – یعنی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کائنات کی مختلف قوتوں اور مختلف حصّوں کے خالق اور مالک الگ الگ خدا ہوتے اور پھر ان کے درمیان ایسا مکمل تعاون ہوتا جیسا کہ تم اس پورے نظامِ عالَم کی بے شمار قوتوں اور بے حد وحساب چیزوں میں، اور اَن گنت تاروں اور سیاروں میں پا رہے ہو۔ نظام کی باقاعدگی اور اجزائے نظام کی ہم آہنگی اقتدار

وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾
رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ

چُھپے کا جاننے والا[۸۶]، وہ بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کر رہے ہیں ؏

اے محمدؐ! دعا کرو کہ "پروردگار! جس عذاب کی اِن کو دھمکی دی جارہی ہے، وہ اگر میری موجودگی میں تُو لائے، تو اَے میرے رب! مجھے اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو"[۸۷] اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تمھاری

کی مرکزیت و وحدت پر خود دلالت کر رہی ہے۔ اگر اقتدار بٹا ہوا ہوتا تو اصحابِ اقتدار میں اختلاف رونما ہونا یقیناً ناگزیر تھا۔ اور یہ اختلاف ان کے درمیان جنگ اور تصادم تک پہنچے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہی مضمون سورۂ انبیاء میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (آیت ۲۲) "اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔" اور یہی اِستدلال سورۂ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے کہ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ (آیت ۴۲) "اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو ضرور وہ مالکِ عرش کے مقام پر پہنچنے کی کوشش کرتے۔" (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۲۲)

۸۶ – اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اُس خاص قسم کے شرک کی طرف جس نے پہلے شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی، اور پھر غیر اللہ کے لیے علمِ غیب (علم ما کان و ما یکون) کے اثبات کی شکل اختیار کر لی۔ یہ آیت اِس شرک کے دونوں پہلوؤں کی تردید کر دیتی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۲۷)

۸۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ، اُس عذاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبتلا ہو جانے کا فی الواقع کوئی خطرہ تھا، یا یہ کہ اگر آپؐ یہ دُعا نہ مانگتے تو اس میں مبتلا ہو جاتے۔ بلکہ اس طرح کا اندازِ بیان یہ تصور دلانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ خدا کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق چیز۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا مطالبہ کیا جائے، اور اگر اللہ اپنی رحمت اور اپنے حلم کی وجہ سے اس کے لانے میں دیر کرے تو اطمینان کے ساتھ شرارتوں اور نافرمانیوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ درحقیقت وہ ایسی خوف ناک چیز ہے کہ گناہ گاروں ہی کو نہیں، نیکو کاروں کو بھی اپنی ساری نیکیوں کے باوجود اس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ علاوہ بریں اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اجتماعی گناہوں کی پاداش میں جب عذاب کی چکی چلتی ہے، تو صرف بُرے لوگ ہی اس میں نہیں پِستے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بھلے لوگ بھی بسا اوقات لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لہٰذا ایک گمراہ اور بدکار معاشرے میں رہنے والے ہر نیک آدمی کو ہر وقت خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ کچھ خبر نہیں کہ کب کس صورت میں ظالموں پر قہرِ الٰہی کا کوڑا برسنا شروع ہو جائے اور کون اس کی زد میں آجائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ
بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ
رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ
ارْجِعُوْنِ ۙ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ

آنکھوں کے سامنے ہی وہ چیز لے آنے کی پُوری قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی ہم انھیں دے رہے ہیں۔

اَے محمدؐ! بُرائی کو اُس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں، وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ اور دُعا کرو کہ "پروردگار! میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اَے میرے رب! میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔[88]"

(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب! مجھے اُسی دُنیا میں واپس بھیج دیجیے[89] جسے میں چھوڑ آیا ہوں، اُمید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا[90]" ـــــ ہرگز نہیں،[91] یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔[92]

۸۸ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۷۱-۷۲۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۳۸-۱۵۰ تا ۱۵۳۔ یونس، حاشیہ ۳۹۔ الحجر، حاشیہ ۴۸۔ النحل، حواشی ۱۲۲ تا ۱۲۴۔ بنی اسرائیل، حواشی ۵۸ تا ۶۳۔ حٰم السجدہ، حواشی ۳۶ تا ۴۱۔

۸۹ - اصل میں رَبِّ ارْجِعُوْنِ کے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خطاب کر کے جمع کے صیغے میں درخواست کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تعظیم کے لیے ہو، جیسا کہ تمام زبانوں میں طریقہ ہے۔ اور دوسری وجہ بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کی ہے کہ یہ لفظ تکرارِ دعا کا تصور دلانے کے لیے ہے، یعنی وہ اِرْجِعْنِيْ اِرْجِعْنِيْ (مجھے واپس بھیج دے، مجھے واپس بھیج دے) کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ رَبِّ کا خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے، اور ارْجِعُوْنِ کا خطاب ان فرشتوں سے جو اس مجرم روح کو گرفتار کر کے لیے جا رہے ہوں گے۔ یعنی بات یوں ہے: "ہائے میرے رب! مجھ کو واپس کر دو۔"

۹۰ - یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر آیا ہے کہ مجرمین موت کی سرحد میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر آخرت میں واصل بجہنم ہونے تک، بلکہ اس کے بعد بھی، بار بار یہی درخواستیں کرتے رہیں گے کہ ہمیں بس ایک دفعہ دُنیا میں اور بھیج دیا جائے، اب ہماری توبہ ہے، اب ہم کبھی نافرمانی نہیں کریں گے، اب ہم سیدھی راہ چلیں گے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام،

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ
فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ

اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک[۹۳]۔ پھر جونہی کہ صُور پھونک دیا گیا، ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پُوچھیں[۹۴] گے۔ اُس وقت جن کے

آیات ۲۷ - ۲۸۔ الاعراف: ۵۳۔ ابراہیم: ۴۴ - ۴۵۔ المومنون: ۱۰۵ تا ۱۱۵۔ الشعراء: ۱۰۲۔ السجدہ: ۱۲ تا ۱۴۔ فاطر: ۳۷۔ الزمر: ۵۸ - ۵۹۔ المومن: ۱۰ تا ۱۲۔ الشوریٰ: ۴۴۔ مع حواشی)

۹۱ - یعنی اس کو واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ ازسرِنو عمل کرنے کے لیے کوئی دوسرا موقع اب اسے نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں دوبارہ امتحان کے لیے آدمی کو اگر واپس بھیجا جائے تو لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک ہی صورت اختیار کرنی ہوگی: یا تو اس کے حافظے اور شعور میں وہ سب مشاہدے محفوظ ہوں جو مرنے کے بعد اس نے کیے۔ یا ان سب کو محو کر کے اسے پھر ویسا ہی خالی الذہن پیدا کیا جائے جیسا وہ پہلی زندگی میں تھا۔ اول الذکر صورت میں امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں تو آدمی کا امتحان ہے ہی اس بات کا کہ وہ حقیقت کا مشاہدہ کیے بغیر اپنی عقل سے حق کو پہچان کر اسے مانتا ہے یا نہیں، اور طاعت و مَعصِیَت کی آزادی رکھتے ہوئے ان دونوں راہوں میں سے کس راہ کو انتخاب کرتا ہے۔ اب اگر اسے حقیقت کا مشاہدہ بھی کرا دیا جائے اور مَعصِیَت کا انجام عملاً دکھا کر معصیت کے انتخاب کی راہ بھی اس پر بند کر دی جائے، تو پھر امتحان گاہ میں اسے بھیجنا فضول ہے۔ اس کے بعد کون ایمان نہ لائے گا اور کون طاعت سے منہ موڑ سکے گا۔ رہی دوسری صورت، تو یہ آزمودہ را آزمودن کا ہم معنیٰ ہے۔ جو شخص ایک دفعہ اسی امتحان میں ناکام ہو چکا ہے، اُسے پھر بعینہٖ ویسا ہی ایک اور امتحان دینے کے لیے بھیجنا لاحاصل ہے، کیونکہ وہ پھر وہی کچھ کرے گا جیسا پہلے کر چکا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۲۸۔ الانعام، حواشی ۶-۹-۱۳۹ - ۱۴۰۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۶)

۹۲ - یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''یہ تو اب اسے کہنا ہی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ بات قابلِ التفات نہیں ہے۔ شامت آ جانے کے بعد اب وہ یہ نہ کہے گا تو اور کیا کہے گا؟ مگر یہ محض کہنے کی بات ہے۔ پلٹے گا تو پھر وہی کچھ کرے گا جو کر کے آیا ہے۔ لہٰذا اِسے بکنے دو۔ واپسی کا دروازہ اس پر نہیں کھولا جا سکتا۔

۹۳ - برزخ فارسی لفظ ''پردہ'' کا مُعَرّب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اب اِن کے اور دُنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انھیں واپس جانے نہیں دے گی، اور قیامت تک یہ دُنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حدِ فاصل میں ٹھیرے رہیں گے۔

۹۴ - اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ باپ نہ رہے گا اور بیٹا بیٹا نہ رہے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس وقت نہ باپ بیٹے کے کام آئے گا نہ بیٹا باپ کے۔ ہر ایک اپنے حال میں کچھ اس طرح گرفتار ہو گا کہ دوسرے کو پوچھنے تک کا

Maktaba-Tul-Ishaat.com

مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا

پلڑے بھاری ہوں[95] گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا[96]۔ وہ جہنّم میں ہمیشہ رہیں گے۔ آگ اُن کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آئیں گے[97] ــــ "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو کہ میری آیات تمھیں سُنائی جاتی تھیں تو تم انھیں جھٹلاتے تھے؟" وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار! اب ہمیں یہاں سے نکال دے،

ہوش نہ ہوگا، کجا کہ اس کے ساتھ کوئی ہمدردی یا اُس کی کوئی مدد کر سکے۔ دوسرے مقامات پر اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا، "کوئی جگری دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا۔" (المعارج، آیت ۱۰) اور يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ "اس روز مجرم کا جی چاہے گا کہ اپنی اولاد اور بیوی اور بھائی اور اپنی حمایت کرنے والے قریب ترین کنبے اور دُنیا بھر کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور اپنے آپ کو عذاب سے بچالے۔" (المعارج، آیات ۱۱ تا ۱۴) اور يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝ "وہ دن کہ آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور اولاد سے بھاگے گا۔ اس روز ہر شخص اپنے حال میں ایسا مبتلا ہوگا کہ اسے کسی کا ہوش نہ رہے گا۔" (عبس، آیات ۳۴ تا ۳۷)

۹۵ - یعنی جن کے قابلِ قدر اعمال وزنی ہوں گے۔ جن کی نیکیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا۔

۹۶ - آغازِ سورہ میں، اور پھر چوتھے رُکوع میں فلاح اور خُسران کا جو معیار پیش کیا جا چکا ہے، اسے ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔

۹۷ - اصل میں لفظ كٰلِحُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ "کالح" عَرَبی زبان میں اس چہرے کو کہتے ہیں جس کی کھال الگ ہو گئی ہو اور دانت باہر آ گئے ہوں، جیسے بکرے کی بُھنی ہوئی سری۔ عبداللہؓ بن مسعود سے کسی نے کالح کے معنی پوچھے تو انھوں نے کہا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الرأس المشيط؟ "کیا تم نے بُھنی ہوئی سری نہیں دیکھی؟"

فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ
كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ
ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ
اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾
قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ
لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا

پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے۔" اللہ تعالیٰ جواب دے گا: "دُور ہو میرے سامنے سے، پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔[98] تم وہی لوگ تو ہو کہ میرے کچھ بندے جب کہتے تھے کہ اَے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمیں معاف کردے، ہم پر رحم کر، تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے، تو تم نے ان کا مذاق بنالیا۔ یہاں تک کہ ان کی ضد نے تمھیں یہ بھی بُھلا دیا کہ میں بھی کوئی ہوں، اور تم اُن پر ہنستے رہے۔ آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب[99] ہیں۔" پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: "بتاؤ، زمین میں تم کتنے سال رہے؟" وہ کہیں گے: "ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصّہ ہم وہاں ٹھیرے[100] ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔" ارشاد ہوگا: "تھوڑی ہی دیر ٹھیرے ہو نا۔ کاش تم نے یہ اُس وقت جانا[101] ہوتا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمھیں فضول ہی

۹۸ – یعنی اپنی رہائی کے لیے کوئی عرض معروض نہ کرو۔ اپنی معذرتیں پیش نہ کرو۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے بالکل چپ ہو جاؤ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ ان کا آخری کلام ہوگا جس کے بعد ان کی زبانیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔ مگر یہ بات بظاہر قرآن کے خلاف پڑتی ہے، کیونکہ آگے خود قرآن ہی ان کی اور اللہ تعالیٰ کی گفتگو نقل کر رہا ہے۔ لہٰذا یا تو یہ روایات غلط ہیں، یا پھر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد وہ رہائی کے لیے کوئی عرض معروض نہ کر سکیں گے۔

۹۹ – پھر اسی مضمون کا اعادہ ہے کہ فلاح کا مستحق کون ہے اور خُسران کا مستحق کون۔

۱۰۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔

۱۰۱ – یعنی دنیا میں ہمارے نبی تم کو بتاتے رہے کہ یہ دُنیا کی زندگی محض امتحان کی چند گنی چُنی ساعتیں ہیں، انھی

Maktaba Tul Ishaat.com

خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا
بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

پیدا کیا ہے[۱۰۲] اور تمھیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟"
پس بالا و برتر ہے[۱۰۳] اللہ، پادشاہِ حقیقی، کوئی خدا اُس کے سوا نہیں، مالک ہے عرشِ بزرگ کا۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اَور معبُود کو پکارے، جس کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں،[۱۰۴] تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے[۱۰۵]۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے[۱۰۶]۔

کو اصل زندگی اور بس ایک ہی زندگی نہ سمجھ بیٹھو۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہاں کے وقتی فائدوں اور عارضی لذتوں کی خاطر وہ کام نہ کرو جو آخرت کی اَبدی زندگی میں تمھارے مستقبل کو برباد کر دینے والے ہوں۔ مگر اُس وقت تم نے ان کی بات سن کر نہ دی۔ تم اِس عالَمِ آخرت کا انکار کرتے رہے۔ تم نے زندگی بعدِ موت کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھا۔ تم اپنے اس خیال پر مُصِر رہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دُنیا میں ہے، اور جو کچھ مزے لُوٹنے ہیں یہیں لوٹ لینے چاہییں۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوش آنے کا وقت تو وہ تھا جب تم دُنیا کی چند روزہ زندگی کے لُطف پر یہاں کی اَبدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر رہے تھے۔

۱۰۲ – اصل میں عَبَثًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ایک مطلب تو ہے: "کھیل کے طور پر"۔ اور دوسرا مطلب ہے: "کھیل کے لیے"۔ پہلی صورت میں آیت کے معنٰی یہ ہوں گے: "کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں یونہی بطورِ تفریح بنا دیا ہے، تمھاری تخلیق کی کوئی غرض و غایت نہیں ہے، محض ایک بے مقصد مخلوق بنا کر پھیلا دی گئی ہے۔" دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا: "کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ تم بس کھیل کود اور تفریح اور ایسی لاحاصل مصروفیتوں کے لیے پیدا کیے گئے ہو، جن کا کبھی کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔"

۱۰۳ – یعنی بالا و برتر ہے اس سے کہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب اس سے ہو، اور بالا و برتر ہے اس سے کہ اس کے بندے اور مملوک اس کی خدائی میں اس کے شریک ہوں۔

۱۰۴ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبُود کو پکارے، اُس کے لیے اپنے اس فعل کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔"

۱۰۵ – یعنی وہ محاسبے اور باز پُرس سے بچ نہیں سکتا۔

۱۰۶ – یہ پھر اسی مضمون کا اعادہ ہے کہ اصل میں فلاح پانے والے کون ہیں اور اس سے محروم رہنے والے کون۔

ع ۶ ۶

وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

اَے محمدؐ! کہو: "میرے رب! درگزر فرما، اور رحم کر، اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔[۱۰۷]" ع

۱۰۷ – یہاں اِس دعا کی لطیف معنویت نگاہ میں رہے۔ ابھی چند سطر اُوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے دشمنوں کو معاف کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمائے گا کہ میرے جو بندے یہ دُعا مانگتے تھے، تم ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اس کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (اور ضمناً صحابۂ کرامؓ کو بھی) یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ٹھیک وہی دُعا مانگو جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔ ہماری صاف تنبیہ کے باوجود اب اگر یہ تمھارا مذاق اُڑائیں تو آخرت میں اپنے خلاف گویا خود ہی ایک مضبوط مُقدّمہ تیار کر دیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

النور

(۲۴)

النور

نام پانچویں رکوع کی پہلی آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول یہ امر مُتّفق عَلَیہ ہے کہ یہ سورت غزوۂ بنی المُصطَلِق کے بعد نازل ہوئی ہے۔ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نُزول واقعۂ اِفک کے سلسلے میں ہوا ہے (جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دوسرے اور تیسرے رکوع میں آیا ہے) اور وہ تمام معتبر روایات کی رُو سے غزوۂ بنی المُصطَلِق کے سفر میں پیش آیا تھا۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا یہ غزوہ ۵ ہجری میں غزوۂ اَحزاب سے پہلے ہوا تھا، یا ۶ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد۔ اصل واقعہ کیا ہے، اِس کی تحقیق اس لیے ضروری ہے کہ پردے کے احکام قرآنِ مجید کی دو ہی سورتوں میں آئے ہیں: ایک یہ سورت، دوسری سورۂ احزاب جس کا نزول بالاتفاق غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا ہے۔ اب اگر غزوۂ اَحزاب پہلے ہو تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ پردے کے احکام کی ابتدا اُن ہدایات سے ہوئی جو سورۂ احزاب میں وارد ہوئی ہیں، اور تکمیل اُن احکام سے ہوئی جو اس سورت میں آئے ہیں۔ اور اگر غزوۂ بنی المُصطَلِق پہلے ہو تو احکام کی ترتیب اُلٹ جاتی ہے اور آغاز سورۂ نور سے مان کر تکمیل سورۂ اَحزاب والے احکام پر ماننی پڑتی ہے۔ اس طرح اُس حکمتِ تشریع کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو احکامِ حجاب میں پائی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے ہم آگے بڑھنے سے پہلے زمانہ نزول کی تحقیق کر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ غزوۂ بنی المُصطَلِق شعبان ۵ ہجری میں پیش آیا اور پھر ذی القعدہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب (یا غزوۂ خندق) واقع ہوا۔ اس کی تائید میں سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ واقعۂ اِفک کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے جو رِوایات مروی ہیں، ان میں سے بعض میں حضرت سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ کے جھگڑے کا ذکر آتا ہے، اور تمام معتبر روایات کی رُو سے حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا انتقال غزوۂ بنی قُرَیظہ میں ہوا تھا، جس کا زمانۂ وقوع غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد ہے، لہٰذا ۶ھ میں ان کے موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

دوسری طرف محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوۂ احزاب شوال ۵ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ بنی المُصطَلِق شعبان ۶ھ کا۔ اس کی تائید وہ کثیر التعداد معتبر روایات کرتی ہیں جو اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے لوگوں سے مروی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ اِفک سے پہلے احکامِ حجاب نازل ہو چکے تھے، اور وہ سورۂ اَحزاب میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہو چکا تھا، اور وہ غزوۂ احزاب کے بعد ذی القعدہ ۵ھ کا واقعہ ہے، اور سورۂ احزاب میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ علاوہ بریں ان رِوایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ کی بہن حَمنَہ بنت جَحش نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں محض اس وجہ سے حصّہ لیا تھا کہ حضرت عائشہؓ ان کی بہن کی سوکن تھیں، اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات پیدا ہونے کے لیے سوکناپے کا رشتہ شروع ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ مدّت درکار ہوتی ہے۔ یہ سب شہادتیں ابنِ اسحاق کی رِوایت کو مضبوط کر دیتی ہیں۔

اس روایت کو قبول کرنے میں صرف یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ واقعۂ اِفک کے زمانے میں حضرت سعدؓ بن مُعاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس مشکل کو جو چیز رفع کر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس واقعے کے متعلق حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں، ان میں سے بعض میں حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا ذکر ہے اور بعض میں ان کے بجائے حضرت اُسَیدؓ بن حُضَیر کا۔ اور یہ دوسری روایت اُن دوسرے واقعات کے ساتھ پوری طرح مطابق ہو جاتی ہے جو اس سلسلے میں خود حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہیں۔ ورنہ محض سعدؓ بن مُعاذ کے زمانۂ حیات سے مطابق کرنے کی خاطر اگر غزوۂ بنی المُصطَلِق اور قصّۂ اِفک کو غزوۂ احزاب و قُرَیظہ سے پہلے کے واقعات مان لیا جائے تو اس پیچیدگی کا کوئی حل نہیں ملتا کہ پھر آیتِ حجاب کا نزول اور نکاحِ زینبؓ کا واقعہ اس سے بھی پہلے پیش آنا چاہیے، حالانکہ قرآن اور کثیر التعداد رِوایاتِ صحیحہ، دونوں اس پر شاہد ہیں کہ نکاحِ زینبؓ اور حکمِ حجاب، احزاب و قُرَیظہ کے بعد کے واقعات ہیں۔ اسی بنا پر ابنِ حَزم اور ابنِ قیّم اور بعض دوسرے محققین نے محمد بن اسحاق کی روایت ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور ہم بھی اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔

تاریخی پس منظر اب یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ سورۂ نور ۶ھ کے نصفِ آخر میں سورۂ احزاب کے کئی مہینے بعد نازل ہوئی ہے، ہمیں اُن حالات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے جن میں اس کا نزول ہوا۔

جنگِ بَدر کی فتح سے عرب میں تحریکِ اسلامی کا جو عروج شروع ہوا تھا، وہ غزوۂ خندق تک پہنچتے پہنچتے اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مشرکین، یہود، منافقین اور مُتربِّصین، سب ہی یہ محسُوس کرنے لگے تھے کہ اس نوخیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جا سکتی۔ جنگِ خندق میں یہ لوگ متحد ہو کر ۱۰ ہزار فوج کے ساتھ مدینے پر چڑھ آئے تھے، مگر ایک مہینے تک سر مارنے کے بعد آخرکار ناکام ہو کر چلے گئے، اور ان کے جاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علَی الاعلان فرما دیا: لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا، ولٰکنکم تغزونھم، ''اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔'' (ابنِ ہِشام، جلد۳، ص ۲۶۶)

یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ مخالفِ اسلام طاقتوں کی قوتِ اقدام ختم ہو چکی ہے، اب اسلام بچاؤ کی نہیں بلکہ اقدام کی لڑائی لڑے گا اور کفر کو اقدام کے بجائے بچاؤ کی لڑائی لڑنی پڑے گی۔ یہ حالات کا

بالکل صحیح جائزہ تھا جسے دوسرا فریق بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

اسلام کے اِس روز افزوں عروج کی اصل وجہ مسلمانوں کی تعداد نہ تھی۔ بدر سے خندق تک ہر لڑائی میں کفار اُن سے کئی گنی زیادہ قوت لے کر آئے تھے، اور مَردُم شماری کے لحاظ سے بھی مسلمان اس وقت تک عرب میں بمشکل ۱/۱۰ فی صد تھے۔ اس عروج کی وجہ مسلمانوں کے اسلحے کی برتری بھی نہ تھی۔ ہر طرح کے ساز وسامان میں کفار ہی کا پلّا بھاری تھا۔ مَعاشی طاقت اور اثر ورُسوخ کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا اُن سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اُن کے پاس تمام عرب کے مَعاشی وسائل تھے، اور مسلمان بھوکوں مر رہے تھے۔ اُن کی پشت پر تمام عرب کے مشرک اور اہلِ کتاب قبائل تھے، اور مسلمان ایک نئے دین کی دعوت دے کر قدیم نظام کے سارے حامیوں کی ہمدردیاں کھو چکے تھے۔ ان حالات میں جو چیز مسلمانوں کو برابر آگے بڑھائے لیے جا رہی تھی، وہ دراصل مسلمانوں کی اَخلاقی برتری تھی، جسے تمام دشمنانِ اسلام خود بھی محسُوس کر رہے تھے۔ ایک طرف وہ دیکھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی بے داغ سیرتیں ہیں جن کی طہارت و پاکیزگی اور مضبوطی دلوں کو مسخر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ انفرادی و اجتماعی اَخلاق کی طہارت نے مسلمانوں کے اندر کمال درجے کا اتحاد اور نظم وضبط بھی پیدا کر دیا ہے، جس کے سامنے مشرکین اور یہود کا ڈھیلا نظامِ جماعت امن اور جنگ، دونوں حالتوں میں شکست کھاتا چلا جاتا ہے۔

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں، اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اُس کی خوبیاں اُسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انھیں گرا رہی ہیں، تو انھیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دُور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں، بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے، اُس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم ازکم اس کے اُوپر خوب گندگی اُچھالیں، تاکہ دُنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کا رخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر رذیلانہ حملوں اور داخلی فتنہ انگیزیوں کی طرف پھیر دیا۔ اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے، اس لیے بالارادہ یا بلا ارادہ طریقِ کار یہ قرار پایا کہ مدینے کے منافقین اندر سے فتنے اٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذی القعدہ ۵ھ میں ہوا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے تَبنِّیت[1] کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے مُتبنّٰی (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) کی مُطلّقہ بیوی (زینبؓ بنت

[1] دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانا اور خاندان میں اسے بالکل صُلبی بیٹے کی حیثیت دے دینا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جَحش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینے کے منافقین پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پردازیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے عجیب عجیب قصّے گھڑ گھڑ کر پھیلا دیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوگئے، اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دست بردار ہوگیا، اور پھر کس طرح انھوں نے خود اپنی بہو سے بیاہ کرلیا۔ یہ قصّے اس کثرت سے پھیلائے گئے کہ مسلمان تک ان کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ محدثین اور مفسّرین کے ایک گروہ نے حضرت زینبؓ اور زیدؓ کے متعلق جو روایتیں نقل کی ہیں، اِن میں آج تک ان من گھڑت قصّوں کے اجزا پائے جاتے ہیں اور مُستَشرِقینِ مغرب ان کو خوب نمک مرچ لگا کر اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی (اُمَیمَہ بنت عبدالمُطَّلِب) کی صاحبزادی تھیں، بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضوؐر کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، ان کو اتفاقاً ایک روز دیکھ لینے اور معاذ اللہ، ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعے سے ایک ہی سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو مجبُور کر کے حضرت زیدؓ سے ان کی شادی کی تھی۔ ان کے بھائی عبداللہؓ بن جَحش اس شادی سے ناراض تھے۔ خود حضرت زینبؓ اس پر راضی نہ تھیں، کیونکہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی بننا قریش کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی طبعًا قبول نہ کرسکتی تھی۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں معاشرتی مُساوات قائم کرنے کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کریں، انھیں حکماً اس پر راضی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوست اور دشمن سب کو معلوم تھیں، اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہ تھا کہ حضرت زینبؓ کا احساسِ فخرِ نسبی ہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ان کا اور زیدؓ بن حارثہ کا نباہ نہ ہوسکا اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچی۔ مگر اس کے باوجود بے شرم افترا پردازوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بدترین اَخلاقی الزامات لگائے اور ان کو اس کثرت سے رواج دیا کہ آج تک ان کا یہ پروپیگنڈا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔

اس کے بعد دوسرا حملہ غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر کیا گیا، اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ بنی المُصطَلِق قبیلۂ بنی خُزاعہ کی ایک شاخ تھی جو ساحلِ بحرِ اَحمر پر جِدّے اور رابغ کے درمیان قُدَید کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے چشمے کا نام مُرَیسِیع تھا جس کے آس پاس اس قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس مناسبت سے احادیث میں اس مہم کا نام غزوۂ مُرَیسِیع بھی آیا ہے۔ نقشے سے اس کی صحیح جائے وقوع معلوم ہوسکتی ہے۔

شعبان ٦ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپؐ

ایک لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہوگئے، تاکہ فتنے کے سر اُٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ اس مہم میں عبداللہ بن اُبَیّ بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپ کے ساتھ ہو گیا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے۔ مُریسیع کے مقام پر آنحضرتؐ نے اچانک دشمن کو جالیا، اور تھوڑی سی زد و خورد کے بعد پورے قبیلے کو مال اسباب سمیت گرفتار کرلیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابھی مُریسیع ہی پر لشکرِ اسلام پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم (جَہجَاہ بن مسعود غِفاری) اور قبیلۂ خَزرَج کے ایک حلیف (سِنَان بن وبر جُہَنی) کے درمیان پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے انصار کو پکارا۔ دوسرے نے مہاجرین کو آواز دی۔ لوگ دونوں طرف سے جمع ہوگئے اور معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ لیکن عبداللہ بن اُبَیّ نے، جو انصار کے قبیلۂ خَزرَج سے تعلق رکھتا تھا، بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اس نے انصار کو یہ کہہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ "یہ مہاجرین ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ہمارے حریف بن بیٹھے ہیں۔ ہماری اور ان قریشی کنگلوں کی مثال ایسی ہے کہ کتے کو پال تاکہ تجھی کو بھنبھوڑ کھائے۔ یہ سب کچھ تمھارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود ہی انھیں لا کر اپنے ہاں بسایا ہے اور ان کو اپنے مال و جائداد میں حصہ دار بنایا ہے۔ آج اگر تم ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔" پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ "مدینے واپس پہنچنے کے بعد جو ہم میں سے عزت والا ہے، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کر دے گا۔"[1] اُس کی ان باتوں کی اطلاع جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کرا دینا چاہیے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا: فکیف یا عمر اذا تحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه (عمرؓ! دنیا کیا کہے گی کہ محمدؐ خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے)۔ پھر آپؐ نے فوراً ہی اس مقام سے کوچ کا حکم دے دیا اور دوسرے دن دوپہر تک کسی جگہ پڑاؤ نہ کیا، تاکہ لوگ خوب تھک جائیں اور کسی کو بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرنے اور سننے کی مُہلت نہ ملے۔ راستے میں اُسَیدؓ بن حُضَیر نے عرض کیا: "یا نبیؐ اللہ! آج آپؐ نے اپنے معمول کے خلاف ناوقت کوچ کا حکم دے دیا؟" آپؐ نے جواب دیا: "تم نے سُنا نہیں کہ تمھارے صاحب نے کیا باتیں کی ہیں؟" انھوں نے پوچھا: "کون صاحب؟" آپؐ نے فرمایا: "عبداللہ بن اُبَیّ۔" انھوں نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! اس شخص سے رعایت فرمایئے، آپؐ جب مدینہ تشریف لائے ہیں تو ہم لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپؐ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اسی کی جلن وہ نکال رہا ہے۔"

یہ شوشہ ابھی تازہ ہی تھا کہ اسی سفر میں اُس نے ایک اور خطرناک فتنہ اُٹھا دیا، اور فتنہ بھی ایسا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کمال درجے ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینے کی نوخیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا فتنہ تھا۔

---

[1] سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے خود اُس کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کا واقعہ خود انھی کی زبان سے سنیے جس سے پوری صورتِ حال سامنے آجائے گی۔ بیچ بیچ میں جو اُمور تشریح طلب ہوں گے، انھیں ہم دوسری معتبر رِوایات کی مدد سے قوسین میں بڑھاتے جائیں گے، تاکہ جنابِ صدیقہؓ کے تسلسلِ بیان میں خلل نہ واقع ہو۔ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپؐ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپؐ کی بیویوں میں سے کون آپؐ کے ساتھ جائے۔[1] غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپؐ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت رسولؐ اللہ نے پڑاؤ کیا، اور ابھی رات کا کچھ حصّہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں اُٹھ کر رفعِ حاجت کے لیے گئی، اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسُوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی، اور اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہَودے میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اُٹھا کر اُونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب سے بہت ہلکی پُھلکی تھیں۔ میرا ہَودہ اُٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہَودہ اُونٹ پر رکھ کر روانہ ہوگئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آگئی۔ صبح کے وقت صَفوانؓ بن مُعَطَّل سُلَمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے، کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ صاحب بدری صحابیوں میں سے تھے۔ ان کو صبح دیر تک سونے کی عادت[2] تھی، اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں

---

[1] اس قرعہ اندازی کی نوعیت لاٹری کی سی نہ تھی۔ دراصل تمام بیویوں کے حُقوق برابر کے تھے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود کسی کو انتخاب کرتے تو دوسری بیویوں کی دل شکنی ہوتی، اور ان میں باہم رشک و رقابت پیدا ہونے کے لیے بھی یہ ایک محرک بن جاتا۔ اس لیے آپؐ قرعہ اندازی سے اس کا فیصلہ فرماتے تھے۔ شریعت میں قرعہ اندازی ایسی ہی صورتوں کے لیے ہے جب کہ چند آدمیوں کا جائز حق بالکل برابر ہو، اور کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو، مگر حق کسی ایک ہی کو دیا جاسکتا ہو۔

[2] ابوداؤد اور دوسری کُتُبِ سُنَن میں یہ ذکر آتا ہے کہ ان کی بیوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صبح کی نماز وقت پر نہیں پڑھتے۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ یارسولؐ اللہ! یہ میرا خاندانی عیب ہے، دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دُور نہیں کرسکتا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا، جب آنکھ کھلے، نماز ادا کرلیا کرو۔ بعض محدثین نے ان کے قافلے سے پیچھے رہ جانے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ مگر بعض دوسرے محدثین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اُٹھ کر مدینے جارہے تھے)۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اُونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی یہیں رہ گئیں۔'' اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اُٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لاکر اپنا اُونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اُونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جالیا، جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھیرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتا نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اُٹھانے والوں نے بہتان اُٹھا دیے، اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن اُبَیّ تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔''

(دوسری روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صَفوانؓ کے اُونٹ پر حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح پیچھے چھوٹ گئی تھیں، اُسی وقت عبداللہ بن اُبَیّ پکار اٹھا کہ ''خدا کی قسم! یہ بچ کر نہیں آئی ہے، لو دیکھو، تمھارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے عَلانِیَہ لیے چلا آرہا ہے۔'')

''مدینے پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی، وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپؐ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے: کیف تیکم (کیسی ہیں یہ؟) خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپؐ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی، تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کرسکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اُس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مِسْطَحؓ بن اُثاثَہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ (دوسری رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ذمّے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مِسْطَحؓ بھی اُن لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے)۔ راستے میں اُن کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ''غارت ہو مِسْطَح!'' میں نے کہا: ''اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگِ بَدر میں حصّہ لیا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''بِٹیا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر

ان کو اس خدمت پر مقرر کیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں کوچ کرنے کی وجہ سے اگر کسی کی کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو صبح اسے تلاش کر کے لیتے آئیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں؟'' پھر انھوں نے سارا قصہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اُڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے، ان میں مِسطحؓ، حسّانؓ بن ثابت مشہور شاعرِ اسلام، اور حَمنہؓ بنت جَحش، حضرت زینبؓ کی بہن کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔) یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی، سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی۔''

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''میرے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ اور اُسامہ بن زیدؓ کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اُسامہؓ نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اور عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! بھلائی کے سوا آپؐ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کِذب اور باطل ہے جو اُڑایا جا رہا ہے۔'' رہے علیؓ، تو انھوں نے کہا: ''یا رسولؐ اللہ! عورتوں کی کمی نہیں ہے، آپؐ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں، اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔'' چنانچہ خدمت گار کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا: ''اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اُن میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بی بی! ذرا آٹے کا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے۔'' اسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: ''مسلمانو! کون ہے جو اُس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا! میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔'' اس پر اُسَیدؓ بن حُضَیر (بعض روایات میں سعدؓ بن معاذ)[1] نے اُٹھ کر کہا: ''یا رسولؐ اللہ! اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خَزرَجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں، ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔'' یہ سنتے ہی سعدؓ بن عُبادہ، رئیسِ خَزرَج اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''جھوٹ کہتے ہو، تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام صرف اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خَزرَج میں سے ہے۔ اگر وہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے۔''[2] اُسَیدؓ بن حُضَیر رضی اللہ عنہ

---

[1] غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نام لینے کے بجائے سَیِّدِ اَوس کے الفاظ استعمال فرمائے ہوں گے۔ کسی راوی نے اس سے مراد حضرت سعدؓ بن مُعاذ کو سمجھ لیا، کیونکہ اپنی زندگی میں وہی قبیلہ اَوس کے سردار تھے، اور تاریخ میں وہی اس حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ حالانکہ دراصل اس واقعے کے وقت ان کے چچازاد بھائی اُسَیدؓ بن حُضَیر اوس کے سردار تھے۔

[2] حضرت سعدؓ بن عُبادہ اگرچہ نہایت صالح اور مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبیؐ سے گہری عقیدت و محبّت رکھتے تھے، اور مدینے میں جن لوگوں کے ذریعے سے اسلام پھیلا تھا، ان میں ایک نمایاں شخص وہ بھی تھے، لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان کے اندر قومی حمیت (اور عرب میں اس وقت قوم کے معنیٰ قبیلے کے تھے) بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے عبداللہ بن اُبَیّ کی پشت پناہی کی، کیونکہ وہ ان کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اِسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ ''الیوم یوم الملحمۃ،

نے جواب میں کہا: "تم منافق ہو، اسی لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔" اس پر مسجدِ نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اَوس اور خَزرَج مسجد ہی میں لڑ پڑتے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اُتر آئے۔"

حضرت عائشہؓ کے قصے کی باقی تفصیلات ہم اثنائے تفسیر میں اُس جگہ نقل کریں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی براءت نازل ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ نے یہ شوشہ چھوڑ کر بیک وقت کئی شکار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی عزت پر حملہ کیا۔ دوسری طرف اس نے اسلامی تحریک کے بلند ترین اَخلاقی وقار کو گرانے کی کوشش کی۔ تیسری طرف اس نے یہ ایک ایسی چنگاری پھینکی تھی کہ اگر اسلام اپنے پیرووں کی کایا نہ پلٹ چکا ہوتا تو مہاجرین اور انصار، اور خود انصار کے بھی دونوں قبیلے آپس میں لڑ مرتے۔

موضوع اور مباحث

یہ تھے وہ حالات جن میں پہلے حملے کے موقع پر سورۂ احزاب کے آخری ۶ رکوع نازل ہوئے، اور دوسرے حملے کے موقع پر یہ سورۂ نور اُتری۔ اس پَسِ منظر کو نگاہ میں رکھ کر ان دونوں سورتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیا جائے تو وہ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے جو ان کے احکام میں مضمر ہے۔

منافقین مسلمانوں کو اُس میدان میں شکست دینا چاہتے تھے جو ان کے تفوُّق کا اصل میدان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے، بجائے اس کے کہ وہ اُن کے اَخلاقی حملوں پر ایک غضب ناک تقریر فرماتا، یا مسلمانوں کو جوابی حملے کرنے پر اُکساتا، تمام تر توجہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دینے پر صَرف فرمائی کہ تمھارے اَخلاقی محاذ میں جہاں جہاں رخنے موجود ہیں، ان کو بھرو اور اِس محاذ کو اور زیادہ مضبوط کر لو۔ ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ نکاحِ زینبؓ کے موقع پر منافقین اور کفار نے کیا طوفان اُٹھایا تھا۔ اب ذرا سورۂ اَحزاب نکال کر پڑھیے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ ٹھیک اُسی طوفان کا زمانہ تھا جب کہ معاشرتی اصلاح کے متعلق حسبِ ذیل ہدایات دی گئیں:

(۱) ازواجِ مطہراتؓ کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ نکلو،

الیوم تستحل الحرمة (آج کُشت وخون کا دن ہے۔ آج یہاں کی حرمت حلال کی جائے گی)، اور اس پر عتاب فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لشکر کا جھنڈا واپس لے لیا۔ پھر آخرکار یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں یہ دعویٰ کیا کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور جب ان کی بات نہ چلی اور انصار و مہاجرین، سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو تنہا وہی ایک تھے جنھوں نے بیعت سے انکار کر دیا اور مرتے دم تک قریشی خلیفہ کی خلافت تسلیم نہ کی۔ (ملاحظہ ہو: الاِصابہ، لابنِ حَجر، اور الاستیعاب، لابنِ عبدالبَرّ، ذکر سعدؓ بن عُبادہ، صفحہ ۱۰-۱۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

اور غیر مردوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو، کہ کوئی شخص بے جا توقعات قائم کر لے۔ (آیات ۳۲-۳۳)

(۲) حضورؐ کے گھروں میں غیر مردوں کے بلا اجازت داخل ہو جانے کو روک دیا گیا، اور ہدایت کی گئی کہ ازواجِ مطہراتؓ سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ (آیت ۵۳)

(۳) غیر محرم مردوں اور محرم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ازواجِ مطہراتؓ کے صرف محرم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپؐ کے گھروں میں آ جا سکتے ہیں۔ (آیت ۵۵)

(۴) مسلمانوں کو بتایا گیا کہ نبی کی بیویاں تمھاری مائیں ہیں اور ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے لیے اَبداً حرام ہیں جس طرح اس کی حقیقی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں ہر مسلمان اپنی نیت کو بالکل پاک رکھے۔ (آیت ۵۳-۵۴)

(۵) مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ نبیؐ کو اذیت دینا دُنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت اور رُسوا کُن عذاب کا موجب ہے، اور اسی طرح کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا اور اس پر ناحق الزام لگانا بھی سخت گناہ ہے۔ (آیات ۵۷-۵۸)

(۶) تمام مسلمان عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلا کریں۔ (آیت ۵۹)

پھر جب واقعۂ اِفک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلچل برپا ہوئی تو یہ سورۂ نور اَخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام و ہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ اوّل تو مسلم معاشرے کو برائیوں کی پیداوار اور ان کے پھیلاؤ سے محفوظ رکھا جائے، اور اگر وہ پیدا ہو ہی جائیں تو پھر ان کا پورا پورا تدارُک کیا جائے۔ ان احکام و ہدایات کو ہم اُسی ترتیب کے ساتھ یہاں خلاصتاً درج کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ اس سورہ میں نازل ہوئے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ قرآن ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے کس طرح قانونی، اَخلاقی اور معاشرتی تدابیر بیک وقت تجویز کرتا ہے:

(۱) زِنا، جسے معاشرتی جرم پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا (سورۂ نساء، آیات ۱۵-۱۶)، اب اس کو فوج داری جرم قرار دے کر اس کی سزا سو کوڑے مقرر کر دی گئی۔

(۲) بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور اُن کے ساتھ رشتۂ مُناکحت جوڑنے سے اہلِ ایمان کو منع کر دیا گیا۔

(۳) جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

(۴) شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لِعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۵) حضرت عائشہؓ پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو۔ اس طرح کی افواہیں اگر اُڑ رہی ہوں تو انھیں دبانا اور ان کا سدِّباب کرنا چاہیے، نہ یہ کہ ایک منہ سے لے کر دوسرا منہ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ اسی سلسلے میں یہ بات ایک اُصولی حقیقت کے طور پر سمجھائی گئی کہ طیّب آدمی کا جوڑ طیّب عورت ہی سے لگ سکتا ہے، خبیث عورت کے اطوار سے اس کا مزاج چند روز بھی مُوافقت نہیں کر سکتا۔ اور ایسا ہی حال طیّب عورت کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی رُوح طیّب مرد ہی سے مُوافقت کر سکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اب اگر رسولؐ کو تم جانتے ہو کہ وہ ایک طیّب، بلکہ اطیب انسان ہیں، تو کس طرح یہ بات تمھاری عقل میں سما گئی کہ ایک خبیث عورت ان کی محبُوب ترین رفیقۂ حیات بن سکتی تھی۔ جو عورت عملاً زنا تک کر گزرے، اس کے عام اطوار کب ایسے ہو سکتے ہیں کہ رسولؐ جیسا پاکیزہ انسان اس کے ساتھ یوں نباہ کرے۔ پس صرف یہ بات کہ ایک کمینے آدمی نے ایک بے ہودہ الزام کسی پر لگا دیا ہے، اسے قابلِ قبول کیا معنیٰ، قابلِ توجہ اور ممکن الوقوع سمجھ لینے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ الزام لگانے والا کون ہے اور الزام لگا کس پر رہا ہے۔

(۶) جو لوگ بے ہودہ خبریں اور بری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فُحش اور فواحش کو رواج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

(۷) یہ قاعدۂ کُلِّیّہ مقرر کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلّقات کی بنیاد باہمی حسنِ ظن پر ہونی چاہیے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ اس کے گناہ گار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گناہ گار سمجھا جائے جب تک کہ اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

(۸) لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلّف نہ گھُس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جائیں۔

(۹) عورتوں اور مردوں کو غَضِّ بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھُورنے یا جھانک تاک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

(۱۰) عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سَر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔

(۱۱) عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے مَحرَم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سوا کسی کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔

(۱۲) ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چُھپا کر نکلیں، بلکہ بجنے والے زیور بھی پہن کر نہ نکلیں۔

(۱۳) معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم

Maktaba Tul Ishaat.com

دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں حتّٰی کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ تجرُّد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مُجرَّد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

(۱۴) لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مُکاتبَت کی راہ نکال دی گئی اور مالکوں کے علاوہ دوسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ مُکاتَب غلاموں اور لونڈیوں کی مالی مدد کریں۔

(۱۵) لونڈیوں سے کسب کرانا ممنوع قرار دیا گیا۔ عرب میں یہ پیشہ لونڈیوں ہی سے کرانے کا رواج تھا، اس لیے اس کی ممانعت دراصل قحبہ گری کی قانونی بندش تھی۔

(۱۶) گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خَلوَت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گُھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۱۷) بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اُتار کر رکھ دیں تو مُضایقہ نہیں، مگر حکم دیا گیا کہ تبَرُّج (بَن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انھیں نصیحت کی گئی کہ بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اُوپر ڈالے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

(۱۸) اندھے، لنگڑے، لُولے اور بیمار کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ کھانے کی کوئی چیز کسی کے ہاں سے بلا اجازت کھالے تو اس کا شمار چوری اور خیانت میں نہ ہوگا۔ اُس پر کوئی گرفت نہ کی جائے۔

(۱۹) قریبی عزیزوں اور بے تکلف دوستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں بلا اجازت بھی کھا سکتے ہیں، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے گھر میں کھا سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے پردے ہٹا دیے گئے، تاکہ آپس کی محبّت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے اُن رخنوں کو بند کر دیں جن سے کوئی فتنہ پرداز پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

ان ہدایات کے ساتھ ساتھ منافقین اور مومنین کی وہ کُھلی کُھلی علامتیں بیان کر دی گئیں جن سے ہر مسلمان یہ جان سکے کہ معاشرے میں مخلص اہلِ ایمان کون لوگ ہیں اور منافق کون۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جماعتی نظم و ضبط کو اور کَس دیا گیا اور اس کے لیے چند مزید ضابطے بنا دیے گئے، تاکہ وہ طاقت اور زیادہ مضبوط ہو جائے جس سے غیظ کھا کر کفار و منافقین فساد انگیزیاں کر رہے تھے۔

اس تمام بحث میں نمایاں چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ پوری سورۂ نور اُس تلخی سے خالی ہے جو شرم ناک اور بے ہودہ حملوں کے جواب میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک طرف اُن حالات کو دیکھیے جن میں یہ سورت نازل ہوئی ہے، اور دوسری طرف سورت کے مضامین اور اندازِ کلام کو دیکھیے۔ اس قدر اشتعال انگیز صورتِ حال میں

کیسے ٹھنڈے طریقے سے قانون سازی کی جا رہی ہے، مصلحانہ احکام دیے جا رہے ہیں، حکیمانہ ہدایات دی جا رہی ہیں، اور تعلیم و نصیحت کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اس سے صرف یہی سبق نہیں ملتا کہ ہم کو فتنوں کے مقابلے میں سخت سے سخت اشتعال کے مواقع پر بھی کس طرح ٹھنڈے تدبُّر اور عالی ظرفی اور حکمت سے کام لینا چاہیے، بلکہ اس سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہ کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، کسی ایسی ہستی ہی کا نازل کیا ہوا ہے جو بہت بلند مقام سے انسانی حالات اور معاملات کا مشاہدہ کر رہی ہے، اور اپنی ذات میں ان حالات و معاملات سے غیر مُتأثِّر رہ کر خالص ہدایت و رہنمائی کا منصب ادا کر رہی ہے۔ اگر یہ آنحضرتؐ کا اپنا کلام ہوتا تو آپؐ کی انتہائی بلند نظری کے باوجود اس میں اُس فطری تلخی کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پایا جاتا جو خود اپنی عزت و ناموس پر کمینہ حملوں کو سن کر ایک شریف آدمی کے جذبات میں لازماً پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۶۴ | رکوعاتہا ۹

سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱﴾ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ
جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اور اسے ہم نے فرض کیا ہے، اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں[۱]، شاید کہ تم سبق لو۔

زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو[۲]۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور

۱- ان سب فقروں میں "ہم نے" پر زور ہے۔ یعنی اس کا نازل کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ "ہم" ہیں، اس لیے اسے کسی بے زور ناصح کے کلام کی طرح ایک ہلکی چیز نہ سمجھ بیٹھنا۔ خوب جان لو کہ اس کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کے قبضے میں تمھاری جانیں اور قسمتیں ہیں، اور جس کی گرفت سے تم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔

دوسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو باتیں اس سورہ میں کہی گئی ہیں، وہ "سفارشات" نہیں ہیں کہ آپ کا جی چاہے تو مانیں ورنہ جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، بلکہ یہ قطعی احکام ہیں جن کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اگر مومن اور مسلم ہو تو تمھارا فرض ہے کہ ان کے مطابق عمل کرو۔

تیسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو ہدایات اس سورہ میں دی جا رہی ہیں، ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ صاف صاف اور کھلی کھلی ہدایات ہیں، جن کے متعلق تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ فلاں بات ہماری سمجھ ہی میں نہیں آئی تھی تو ہم عمل کیسے کرتے۔

بس یہ اس فرمانِ مبارک کی تمہید (preamble) ہے جس کے بعد احکام شروع ہو جاتے ہیں۔ اس تمہید کا اندازِ بیان خود بتا رہا ہے کہ سورۂ نور کے احکام کو اللہ تعالیٰ کتنی اہمیت دے کر پیش فرما رہا ہے۔ کسی دوسری احکامی سورت کا دیباچہ اتنا پُر زور نہیں ہے۔

۲- اس مسئلے کے بہت سے قانونی، اخلاقی اور تاریخی پہلو تشریح طلب ہیں، جن کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو موجودہ زمانے میں ایک آدمی کے لیے اس تشریعِ الٰہی کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے ذیل میں ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر سلسلہ وار روشنی ڈالیں گے:

(۱) زنا کا عام مفہوم، جس سے ہر شخص واقف ہے، یہ ہے کہ "ایک مرد اور ایک عورت، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان جائز رشتۂ زن و شو ہو، باہم مباشرت کا ارتکاب کریں۔" اس فعل کا اخلاقاً برا ہونا، یا مذہباً گناہ ہونا، یا معاشرتی حیثیت سے معیوب

اور قابلِ اعتراض ہونا، ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام انسانی معاشرے متفق رہے ہیں، اور اس میں بجز اُن متفرق لوگوں کے، جنھوں نے اپنی عقل کو اپنی نفس پرستی کے تابع کر دیا ہے، یا جنھوں نے خبطی پن کی اُپج کو فلسفہ طرازی سمجھ رکھا ہے، کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس عالم گیر اتفاقِ رائے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زِنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوعِ انسانی کا بقا اور انسانی تمدّن کا قیام، دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کے لیے ملنے اور پھر الگ ہو جانے میں آزاد نہ ہوں، بلکہ ہر جوڑے کا باہمی تعلق ایک ایسے مستقل اور پائیدار عہدِ وفا پر اُستوار ہو، جو معاشرے میں معلوم و معروف بھی ہو اور جسے معاشرے کی ضمانت بھی حاصل ہو۔ اس کے بغیر انسانی نسل ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی، کیونکہ انسان کا بچہ اپنی زندگی اور اپنے انسانی نشو و نما کے لیے کئی برس کی دردمندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور تنہا عورت اس بار کو اُٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مرد اس کا ساتھ نہ دے جو اس بچے کے وجود میں آنے کا سبب بنا ہو۔ اسی طرح اس معاہدے کے بغیر انسانی تمدّن بھی برقرار نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمدّن کی تو پیدائش ہی ایک مرد اور ایک عورت کے مل کر رہنے، ایک گھر اور ایک خاندان وجود میں لانے، اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر عورت اور مرد گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطعِ نظر کر کے محض لطف و لذت کے لیے آزادانہ ملنے لگیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں، اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے، اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدّن کی یہ عمارت اُٹھی ہے۔ ان وُجوہ سے عورت اور مرد کا ایسا آزادانہ تعلق، جو کسی معلوم و معروف اور مسلّم عہدِ وفا پر مبنی نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انھی وجوہ سے انسان اِس کو ہر زمانے میں ایک سخت عیب، ایک بڑی بد اخلاقی، اور مذہبی اصطلاح میں ایک شدید گناہ سمجھتا رہا ہے۔ اور انھی وجوہ سے ہر زمانے میں انسانی معاشروں نے نکاح کی ترویج کے ساتھ ساتھ زِنا کے سدِّباب کی بھی کسی نہ کسی طور پر ضرور کوشش کی ہے۔ البتہ اس کوشش کی شکلوں میں مختلف قوانین اور اخلاقی تمدّنی اور مذہبی نظاموں میں فرق رہا ہے، جس کی بنیاد دراصل اس فرق پر ہے کہ نوع اور تمدّن کے لیے زِنا کے نقصان دِہ ہونے کا شعور کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ، کہیں واضح ہے اور کہیں دوسرے مسائل سے اُلجھ کر رہ گیا ہے۔

(۲) زِنا کی حرمت پر متفق ہونے کے بعد اختلاف جس امر میں ہوا ہے، وہ اس کے جرم، یعنی قانوناً مُستلزِم سزا ہونے کا مسئلہ ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور دوسرے مذاہب اور قوانین کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ انسانی فطرت سے قریب جو معاشرے رہے ہیں، انھوں نے ہمیشہ زنا، یعنی عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کو بجائے خود ایک جرم سمجھا ہے اور اس کے لیے سخت سزائیں رکھی ہیں۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشروں کو تمدّن خراب کرتا گیا ہے، رویّہ نرم ہوتا چلا گیا ہے۔

اس معاملے میں اوّلین تساہُل، جس کا ارتکاب بالعُموم کیا گیا، یہ تھا کہ ''محض زنا'' (fornication) اور ''زنا بزنِ غیر'' (adultery) میں فرق کر کے، اوّل الذکر کو ایک معمولی سی غلطی، اور صرف مؤخر الذکر کو جرمِ مُستلزِمِ سزا قرار دیا گیا۔

محض زنا کی تعریف جو مختلف قوانین میں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''کوئی مرد، خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ، کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو کسی دوسرے شخص کی بیوی نہ ہو۔'' اس تعریف میں اصل اعتبار مرد کی حالت کا نہیں، بلکہ عورت کی حالت کا کیا گیا ہے۔ عورت اگر بے شوہر ہے تو اس سے مباشرت محض زنا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ مرد بیوی رکھتا ہو

Maktaba Tul Ishaat.com

یا نہ رکھتا ہو۔ قدیم مصر، بابل، اَشُور (اَسیریا) اور ہندوستان کے قوانین میں اس کی سزا بہت ہلکی تھی۔ اسی قاعدے کو یونان اور روم نے اختیار کیا، اور اسی سے آخرکار یہودی بھی متأثر ہو گئے۔ بائبل میں یہ صرف ایک ایسا قصور ہے جس سے مرد پر محض مالی تاوان واجب آتا ہے۔ کتاب ''خُروج'' میں اس کے متعلق جو حکم ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو، جس کی نسبت (یعنی منگنی) نہ ہوئی ہو، پُھسلا کر اس سے مباشرت کرے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے بیاہ کر لے، لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے، تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق (یعنی جتنا مہر کسی کنواری لڑکی کو دیا جاتا ہو) اسے نقدی دے۔'' (باب ۲۲، آیت ۱۶-۱۷)

کتاب ''اِستِثنا'' میں یہی حکم ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوا ہے، اور پھر تصریح کی گئی ہے کہ مرد سے لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی (تقریباً ۵۵ روپے) تاوان دلوایا جائے۔ (باب ۲۲، آیت ۲۸-۲۹) البتہ اگر کوئی شخص کاہن (یعنی پروہت۔ Priest) کی بیٹی سے زنا کرے تو اس کے لیے یہودی قانون میں پھانسی کی سزا ہے، اور لڑکی کے لیے زندہ جلانے کی۔ (Everyman's Talmud, p. 319-20)

یہ تخیل ہندوؤں کے تخیل سے کس قدر مشابہ ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے منو کی دھرم شاستر سے مقابلہ کر کے دیکھیے۔ وہاں لکھا ہے کہ:

''جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زنا کرے، وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کر لے۔ البتہ اگر لڑکی اُونچی ذات کی ہو اور مرد نیچ ذات کا، تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطعِ اعضا کی سزا دینی چاہیے۔'' (ادھیائے ۸، اشلوک ۳۶۵-۳۶۶) ''اور یہ سزا زندہ جلا دیے جانے کی سزا میں تبدیل کی جا سکتی ہے جب کہ لڑکی برہمن ہو۔ (اشلوک ۳۷۷)

دراصل ان سب قوانین میں زنا بزنِ غیر ہی اصلی اور بڑا جرم تھا، یعنی یہ کہ کوئی شخص (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو دوسرے شخص کی بیوی ہو۔ اس فعل کے جرم ہونے کی بنیاد یہ نہ تھی کہ ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ یہ تھی کہ ان دونوں نے مل کر ایک شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسے کسی ایسے بچے کو پالنا پڑے جو اس کا نہیں ہے۔ گویا زنا نہیں بلکہ اختلاطِ نسب کا خطرہ اور ایک کے بچے کا دوسرے کے خرچ پر پلنا اور اس کا وارث ہونا اصل بنائے جرم تھا جس کی وجہ سے عورت اور مرد، دونوں مجرم قرار پاتے تھے۔ مصریوں کے ہاں اس کی سزا یہ تھی کہ مرد کو لاٹھیوں سے خوب پیٹا جائے اور عورت کی ناک کاٹ دی جائے۔ قریب قریب ایسی ہی سزائیں بابل، اَشُور اور قدیم ایران میں بھی رائج تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں عورت کی سزا یہ تھی کہ اس کو کتوں سے پھڑوا دیا جائے، اور مرد کی یہ کہ اسے لوہے کے گرم پلنگ پر لٹا کر چاروں طرف آگ جلا دی جائے۔ یونان اور روم میں ابتداءً ایک مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو زنا کرتے دیکھ لے تو اسے قتل کر دے، یا چاہے تو اس سے مالی تاوان وصول کر لے۔ پھر پہلی صدی قبلِ مسیح میں قیصر آگسٹس

نے یہ قانون مقرر کیا کہ مرد کی آدھی جائداد ضبط کر کے اسے جلاوطن کر دیا جائے، اور عورت کا آدھا مہر ساقط اور اس کی ۱/۳ جائداد ضبط کر کے اُسے بھی مملکت کے کسی دُور دراز حصّے میں بھیج دیا جائے۔ قسطنطین نے اس قانون کو بدل کر عورت اور مرد، دونوں کے لیے سزائے موت مقرر کی۔ لیو (Leo) اور مارسِیَن (Marcian) کے دور میں اس سزا کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر قیصر جَسٹِینِین نے اس میں مزید تخفیف کر کے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ عورت کو کوڑوں سے پیٹ کر کسی راہب خانے میں ڈال دیا جائے، اور اس کے شوہر کو یہ حق دیا جائے کہ چاہے تو دو سال کے اندر اُسے نکلوا لے، ورنہ ساری عمر وہیں پڑا رہنے دے۔

یہودی قانون میں زِنا بزَنِ غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

> ''اگر کوئی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو، تو ان دونوں کو سزا ملے، لیکن وہ جان سے مارے نہ جائیں، اس لیے کہ وہ عورت آزاد نہ تھی۔'' (اَحبار، ۱۹:۲۰)

> ''جو شخص دوسرے کی بیوی سے، یعنی اپنے ہمسایے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ، دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔'' (اَحبار، ۲۰:۱۰)

> ''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔'' (اِستثنا، ۲۲:۲۲)

> ''اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی ہو (یعنی اس کی منگنی ہو) اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم اُن دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلّائی، اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسایے کی بیوی کو بے حرمت کیا...... پر اگر اس آدمی کو وہی لڑکی، جس کی نسبت ہو چکی ہو، کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے، تو فقط وہ آدمی ہی، جس نے صحبت کی، مار ڈالا جائے، پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔'' (استثنا، ۲۲: ۲۳ تا ۲۶)

لیکن حضرت عیسٰیؑ کے عہد سے بہت پہلے یہودی علما، فقہا، اُمرا اور عوام، سب اس قانون کو عملاً منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ بائبل میں لکھا ہوا تھا اور خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتّٰی کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسٰیؑ جب دعوتِ حق لے کر اُٹھے اور علمائے یہود نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا: اس کا فیصلہ فرمائیے۔ (یُوحنّا، باب ۸، آیت ۱-۱۱) اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کو کنویں یا کھائی، دونوں میں سے کسی ایک میں کُودنے پر مجبور کر دیں۔ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لیجیے، یہ نرالے پیغمبر صاحب تشریف لائے ہیں جنھوں نے دنیوی مصلحتوں کی خاطر خدائی قانون بدل ڈالا۔ اور اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف رومی قانون سے آپ کو ٹکرا دیا جائے، اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانو ان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا، اب تورات کی پوری شریعت تمھاری پیٹھوں اور جانوں پر برسے گی۔ لیکن

Maktaba Tul Ishaat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انھی پر اُلٹ دیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے جو خود پاک دامن ہو، وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی، ایک ایک منہ چھپا کر رخصت ہو گیا، اور ''حاملانِ شرعِ متین'' کی اخلاقی حالت بالکل برہنہ ہو کر رہ گئی۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کے رخصت کر دیا، کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ اس کے مُقدّمے کا فیصلہ کرتے، نہ اُس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعے سے اور آپ کے چند اور متفرق اقوال سے، جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، عیسائیوں نے غلط اِستنباط کر کے زنا کے جرم کا ایک اور تصور قائم کر لیا۔ ان کے ہاں زنا اگر غیر شادی شدہ مرد، غیر شادی شدہ عورت سے کرے تو یہ گناہ تو ہے، مگر جرم مُستلزِم سزا نہیں ہے۔ اور اگر اس فعل کا کوئی ایک فریق، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، شادی شدہ ہو، یا دونوں شادی شدہ ہوں، تو یہ جرم ہے، مگر اس کو جرم بنانے والی چیز دراصل ''عہد شکنی'' ہے، نہ کہ محض زنا۔ ان کے نزدیک جس نے بھی شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا، وہ اس لیے مجرم ہے کہ اس نے اس عہد وفا کو توڑ دیا جو قربان گاہ کے سامنے اس نے پادری کے توسُّط سے اپنی بیوی یا اپنے شوہر کے ساتھ باندھا تھا۔ مگر اس جرم کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ زانی مرد کی بیوی اپنے شوہر کے خلاف بے وفائی کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے، اور زانیہ عورت کا شوہر ایک طرف اپنی بیوی پر دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے اور دوسری طرف اُس شخص سے بھی تاوان لینے کا حق دار ہو جس نے اس کی بیوی کو خراب کیا۔ بس یہ سزا ہے جو مسیحی قانون شادی شدہ زانیوں اور زانیات کو دیتا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ یہ سزا بھی دو دھاری تلوار ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے، تو وہ بے وفا شوہر سے تو نجات حاصل کر لے گی، لیکن مسیحی قانون کی رُو سے پھر وہ عمر بھر کوئی دوسرا نکاح نہ کر سکے گی۔ اور ایسا ہی حشر اُس مرد کا بھی ہوگا جو بیوی پر ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے، کیونکہ مسیحی قانون اس کو بھی نکاحِ ثانی کا حق نہیں دیتا۔ گویا زوجین میں سے جس کو بھی تمام عمر راہب بن کر رہنا ہو، وہ اپنے شریکِ زندگی کی بے وفائی کا شکوہ مسیحی عدالت میں لے جائے۔

موجودہ زمانے کے مغربی قوانین، جن کی پیروی اب خود مسلمانوں کے بھی بیش تر ممالک کر رہے ہیں، انھی مختلف تصورات پر مبنی ہیں۔ ان کے نزدیک زنا، عیب یا بد اخلاقی یا گناہ جو کچھ بھی ہو، جرم بہر حال نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی چیز جرم بنا سکتی ہے تو وہ جبر ہے، جب کہ فریقِ ثانی کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے مباشرت کی جائے۔ رہا کسی شادی شدہ مرد کا ارتکاب زنا، تو وہ اگر وجۂ شکایت ہے تو اس کی بیوی کے لیے ہے، وہ چاہے تو اس کا ثبوت دے کر طلاق حاصل کر لے۔ اور زنا کی مرتکب اگر شادی شدہ عورت ہے تو اس کے شوہر کو نہ صرف اس کے خلاف بلکہ زانی مرد کے خلاف بھی وجۂ شکایت پیدا ہوتی ہے، اور دونوں پر دعویٰ کر کے وہ بیوی سے طلاق اور زانی مرد سے تاوان وصول کر سکتا ہے۔

(۳) اسلامی قانون ان سب تصورات کے برعکس زنا کو بجائے خود ایک جرم مستلزِم سزا قرار دیتا ہے اور شادی شدہ ہو کر زنا کرنا اس کے نزدیک جرم کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے، نہ اس بنا پر کہ مجرم نے کسی سے ''عہد شکنی'' کی، یا کسی دوسرے کے بستر پر دست درازی کی، بلکہ اس بنا پر کہ اس کے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک جائز ذریعہ موجود تھا اور پھر بھی

اس نے ناجائز ذریعہ اختیار کیا۔ اسلامی قانون زنا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کی اگر آزادی ہو جائے تو ایک طرف نوعِ انسانی کی اور دوسری طرف تمدّنِ انسانی کی جڑ کٹ جائے۔ نوع کے بقا اور تمدّن کے قیام، دونوں کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق صرف قانون کے مطابق قابلِ اعتماد رابطے تک محدود ہو۔ اور اسے محدود رکھنا ممکن نہیں ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ آزادانہ تعلق کی بھی کھلی گنجایش موجود رہے۔ کیونکہ گھر اور خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالے بغیر جہاں لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کے مواقع حاصل رہیں، وہاں ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھی خواہشات کی تسکین کے لیے وہ پھر اتنی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بیٹھنے کے لیے ٹکٹ کی شرط بے معنیٰ ہے اگر بلا ٹکٹ سفر کرنے کی آزادی بھی لوگوں کو حاصل رہے۔ ٹکٹ کی شرط اگر ضروری ہے تو اسے مؤثر بنانے کے لیے بلا ٹکٹ سفر کو جرم ہونا چاہیے۔ پھر اگر کوئی شخص پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بے ٹکٹ سفر کرے تو کم درجے کا مجرم ہے، اور مال دار ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت کرے تو جرم اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

(۴) اسلام انسانی معاشرے کو زنا کے خطرے سے بچانے کے لیے صرف قانونی تعزیر کے ہتھیار پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے وسیع پیانے پر اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرتا ہے، اور یہ قانونی تعزیر اس نے محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر تجویز کی ہے۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روز ان پر کوڑے برسانے کے لیے ٹکٹکیاں لگی رہیں، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا ارتکاب نہ کریں اور کسی کو اس پر سزا دینے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے، اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بٹھاتا ہے، اُسے آخرت کی باز پُرس کا احساس دلاتا ہے، جس سے مر کر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اُس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے، اور پھر اسے بار بار مُتنبّہ کرتا ہے کہ زنا اور بے عصمتی اُن بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت باز پرس کرے گا۔ یہ مضمون سارے قرآن میں جگہ جگہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ آدمی کے لیے نکاح کی تمام ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ ایک بیوی سے تسکین نہ ہو تو چار چار تک سے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے۔ دل نہ ملیں تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خُلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ اور ناموافقت کی صورت میں خاندانی پنچایت سے لے کر سرکاری عدالت تک کی طرف رُجوع کا راستہ کھول دیتا ہے، تاکہ یا تو مُصالحت ہو جائے، یا پھر زوجین ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جہاں دل ملے، نکاح کر لیں۔ یہ سب کچھ آپ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اسی سورۂ نور میں آپ ابھی دیکھیں گے کہ مَردوں اور عورتوں کے بِن بیاہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور صاف حکم دے دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے نکاح کر دیے جائیں، حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی مُجرّد نہ چھوڑا جائے۔ پھر وہ معاشرے سے اُن اسباب کا خاتمہ کرتا ہے جو زنا کی رغبت دلانے والے، اس کی تحریک کرنے والے، اور اس کے لیے مواقع پیدا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ زنا کی سزا بیان کرنے سے ایک سال پہلے سورۂ اَحزاب میں عورتوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ گھر سے نکلیں تو چادریں اوڑھ کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلیں، اور مسلمان عورتوں کے لیے جس نبی کا گھر نمونے کا گھر تھا، اس کی عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ گھروں میں وقار و سکینت کے ساتھ بیٹھو، اپنے حسن اور بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کرو، اور باہر کے مرد تم سے کوئی چیز لیں تو پردے کے پیچھے سے لیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ نمونہ دیکھتے دیکھتے ان تمام صاحبِ ایمان عورتوں میں پھیل گیا جن کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کی بے حیا عورتیں نہیں بلکہ نبیؐ کی بیویاں اور بیٹیاں تقلید کے لائق تھیں۔ اس طرح فوج داری قانون کی سزا مقرر کرنے سے پہلے عورتوں اور مردوں کی خَلط مَلط معاشرت بند کی گئی، بنی سنوری عورتوں کا باہر نکلنا بند کیا گیا، اور ان اسباب و ذرائع کا دروازہ بند کر دیا گیا جو زنا کے مواقع اور اس کی آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سب کے بعد جب زنا کی فوج داری سزا مقرر کی گئی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ اسی سورۂ نور میں اشاعتِ فحش کو بھی روکا جا رہا ہے، قحبہ گری (prostitution) کی قانونی بندش بھی کی جا رہی ہے، عورتوں اور مردوں پر بدکاری کے بے ثبوت الزام لگانے اور ان کے چرچے کرنے کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی جا رہی ہے، غضِ بصر کا حکم دے کر نگاہوں پر پہرے بھی بٹھائے جا رہے ہیں، تاکہ دیدہ بازی سے حُسن پرستی تک اور حُسن پرستی سے عشق بازی تک نوبت نہ پہنچے، اور عورتوں کو یہ حکم بھی دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں مَحرَم اور غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان تمیز کریں اور غیر مَحرَموں کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔ اس سے آپ اُس پوری اصلاحی اسکیم کو سمجھ سکتے ہیں جس کے ایک جُز کے طور پر زنا کی قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزا اس لیے ہے کہ تمام داخلی و خارجی تدابیرِ اصلاح کے باوجود جو شریر النفس لوگ کھلے ہوئے جائز مواقع کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے ہی اپنی خواہشِ نفس پوری کرنے پر اصرار کریں، ان کی کھال اُدھیڑ دی جائے، اور ایک بدکار کو سزا دے کر معاشرے کے اُن بہت سے لوگوں کا نفسیاتی آپریشن کر دیا جائے جو اس طرح کے میلانات رکھتے ہوں۔ یہ سزا محض ایک مجرم کی عقوبت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بالفعل اعلان بھی ہے کہ مسلم معاشرہ بدکاروں کی تفریح گاہ نہیں ہے، جس میں ذَوّاقین اور ذَوّاقات اخلاقی قُیود سے آزاد ہو کر مزے لُوٹتے پھریں۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی شخص اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو سمجھے تو وہ بآسانی محسوس کر لے گا کہ اس پوری اسکیم کا ایک جُز بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ردّ و بدل کا خیال یا تو وہ نادان کر سکتا ہے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھے بغیر مُصلح بن بیٹھا ہو، یا پھر وہ مفسد ایسا کر سکتا ہے جس کی اصل نیّت اُس مقصد کو بدل دینے کی ہو جس کے لیے یہ اسکیم حکیمِ مُطلَق نے تجویز کی ہے۔

(۵) زنا کو قابلِ سزا فعل تو ۳ھ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اس وقت یہ ایک ”قانونی“ جرم نہ تھا جس پر ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے، بلکہ اس کی حیثیت ایک ”معاشرتی“ یا ”خاندانی“ جرم کی سی تھی، جس پر اہلِ خاندان ہی کو بطورِ خود سزا دے لینے کا اختیار تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر چار گواہ اِس امر کی شہادت دے دیں کہ انھوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو دونوں کو مارا پیٹا جائے، اور عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ قاعدہ ”تا حکمِ ثانی“ ہے، اصل قانون بعد میں آنے والا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۳۱) اس کے ڈھائی تین سال بعد یہ حکم نازل ہوا جو آپ اس آیت میں پا رہے ہیں، اور اس نے حکمِ سابق کو منسوخ کر کے زنا کو ایک قانونی جرم قابلِ دست اندازیِ سرکار (cognizable offence) قرار دے دیا۔

(۶) اس آیت میں زنا کی جو سزا مقرر کی گئی ہے، وہ دراصل ”محض زنا“ کی سزا ہے، زنا بعدِ احصان (یعنی شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کے ارتکاب) کی سزا نہیں ہے جو اسلامی قانون کی نگاہ میں سخت تر جرم ہے۔ یہ بات خود قرآن ہی کے ایک اشارے

سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہاں اُس زنا کی سزا بیان کر رہا ہے جس کے فریقین غیر شادی شدہ ہوں۔ سورۂ نساء میں پہلے ارشاد ہوا کہ:

وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ (آیت ۱۵)	تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔

اس کے بعد تھوڑی دُور آگے چل کر پھر فرمایا:

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ ...... فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ (آیت ۲۵)	اور تم میں سے جو لوگ اتنی مَقدِرت نہ رکھتے ہوں کہ مومنوں میں سے مُحصَنات کے ساتھ نکاح کریں تو وہ تمھاری مومن لونڈیوں سے نکاح کرلیں...... پھر اگر وہ (لونڈیاں) مُحْصَنہ ہو جانے کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو مُحصَنات کو (ایسے جرم پر) دی جائے۔

اِن میں سے پہلی آیت میں توقع دلائی گئی ہے کہ زانیہ عورتیں جن کو سرِدست قید کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کا یہ دوسرا حکم وہی چیز ہے جس کا وعدہ سورۂ نساء کی مذکورۂ بالا آیت میں کیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں شادی شدہ لونڈی کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ یہاں ایک ہی آیت اور ایک ہی سلسلۂ بیان میں دو جگہ مُحصَنات کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ دونوں جگہ اس کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ اب آغاز کے فقرے کو دیکھیے تو وہاں کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ ''مُحصَنات سے نکاح کرنے کی مَقدِرت نہ رکھتے ہوں''۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شادی شدہ عورت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک آزاد خاندان کی بن بیاہی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اختتام کے فقرے میں فرمایا جاتا ہے کہ لونڈی منکوحہ ہونے کے بعد اگر زنا کرے تو اس کو اُس سزا سے آدھی سزا دی جائے جو مُحصَنات کو اس جرم پر ملنی چاہیے۔ سیاقِ عبارت صاف بتاتا ہے کہ اس فقرے میں بھی مُحصَنات کے معنیٰ وہی ہیں جو پہلے فقرے میں تھے، یعنی شادی شدہ عورت نہیں بلکہ آزاد خاندان کی حفاظت میں رہنے والی بن بیاہی عورت۔ اس طرح سورۂ نساء کی یہ دونوں آیتیں مل کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ سورۂ نور کا یہ حکم، جس کا وہاں وعدہ کیا گیا تھا، غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کرتا ہے۔ (مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۴۶)

(۷) یہ امر کہ زنا بعدِ احصان کی سزا کیا ہے، قرآنِ مجید نہیں بتاتا، بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قولاً اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے، بلکہ عملاً آپؐ نے متعدد مقدمات میں یہی سزا نافذ بھی کی ہے۔ پھر آپؐ کے بعد چاروں خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے دَور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ میں یہ مسئلہ بالکل مُتّفَق عَلَیہ تھا۔ کسی ایک شخص کا بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

کوئی قول ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ قرنِ اوّل میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکم شرعی ہونے میں کوئی شک تھا۔ ان کے بعد تمام زمانوں اور ملکوں کے فقہائے اسلام اس بات پر متفق رہے ہیں کہ یہ ایک سنتِ ثابتہ ہے، کیونکہ اس کی صحت کے اتنے متواتر اور قوی ثبوت موجود ہیں جن کے ہوتے کوئی صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اُمت کی پوری تاریخ میں بجز خوارج اور بعض مُعتزِلہ کے، کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، اور ان کے انکار کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی نشان دہی کر سکے ہوں، بلکہ وہ اسے ''قرآن کے خلاف'' قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے فہمِ قرآن کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ کے مطلق الفاظ استعمال کر کے اس کی سزا سو کوڑے بیان کرتا ہے، لہٰذا قرآن کی رُو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے، اور اس سے زانی مُحْصَن کو الگ کر کے اس کی کوئی اور سزا تجویز کرنا قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں، وہی قانونی وزن ان کی اُس تشریح کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، بشرطیکہ وہ آپؐ سے ثابت ہو۔ قرآن نے ایسے ہی مُطلَق الفاظ میں وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ کا حکم بھی قطعِ ید بیان کیا ہے۔ اس حکم کو اگر ان تشریحات سے مُقیَّد نہ کیا جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں تو اس کے الفاظ کی عُمومیّت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک سُوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی آدمی کو سارق قرار دیں اور پھر پکڑ کر اس کا ہاتھ شانے کے پاس سے کاٹ دیں۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری کرنے والا بھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو آپ کو اسے چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کہتا ہے: فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ (المائدہ، آیت ۳۹) اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے، رضاعی بیٹی کی حرمت اس اِستدلال کی رُو سے قرآن کے خلاف ہونی چاہیے۔ قرآن صرف دو بہنوں کے جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی، اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو جو شخص حرام کہے، اس پر قرآن کے خلاف حکم لگانے کا الزام عائد ہونا چاہیے۔ قرآن صرف اُس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جب کہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ مطلقاً اس کی حرمت خلافِ قرآن قرار پانی چاہیے۔ قرآن صرف اُس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے جب کہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ آئے۔ حضر میں، اور کاتب کے قابلِ حصول ہونے کی صورت میں رہن کا جواز قرآن کے خلاف ہونا چاہیے۔ قرآن عام لفظوں میں حکم دیتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (گواہ بناؤ جب کہ آپس میں خرید و فروخت کرو)۔ اب وہ تمام خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے جو رات دن ہماری دکانوں پر گواہی کے بغیر ہو رہی ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ہی اُن لوگوں کے اِستدلال کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے جو رجم کے حکم کو خلافِ قرآن کہتے ہیں۔ نظامِ شریعت میں نبی کا یہ منصب ناقابلِ انکار ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد ہمیں بتائے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے، اُس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے، کن معاملات پر اس کا اطلاق ہوگا، اور کن معاملات کے لیے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار صرف اُصولِ دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے اتنی عملی قباحتیں لازم آتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔

(۸) زنا کی قانونی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حَنَفِیَہ اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ "ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قُبُل میں مباشرت کرنا جو نہ تو اس کے نکاح یا مِلکِ یمین میں ہو اور نہ اس امر کے شبہے کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یا مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے۔" اس تعریف کی رُو سے وطی فی الدُّبُر، عملِ قومِ لوط، بہائم سے مُجامَعَت وغیرہ، ماہیّتِ زنا سے خارج ہو جاتے ہیں اور صرف عورت سے قُبُل میں مباشرت ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جب کہ شرعی حق یا اس کے شبہے کے بغیر یہ فعل کیا گیا ہو۔ بخلاف اس کے شافعیہ اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: "شرم گاہ کو ایسی شرم گاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جا سکتی ہو۔" اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے: "شرعی حق یا اس کے شبہے کے بغیر قُبُل یا دُبُر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا۔" ان دونوں تعریفوں کی رو سے عملِ قومِ لوط بھی زنا میں شمار ہو جاتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں تعریفیں لفظِ زنا کے معروف معنوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔ قرآنِ مجید ہمیشہ الفاظ کو اُن کے معروف اور عام فہم معنیٰ میں استعمال کرتا ہے، اِلّا یہ کہ وہ کسی لفظ کو اپنی اصطلاحِ خاص بنا رہا ہو، اور اصطلاحِ خاص بنانے کی صورت میں وہ خود اپنے مفہُوم خاص کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ لفظِ زنا کو کسی مخصوص معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہو، لہٰذا اسے معروف معنیٰ ہی میں لیا جائے گا، اور وہ عورت سے فطری مگر ناجائز تعلق تک ہی محدود ہے، شہوت رانی کی دوسری صورتوں تک وسیع نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں یہ بات معلوم ہے کہ عملِ قومِ لوطؑ کی سزا کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس فعل کا شمار بھی اسلامی اصطلاح کی رُو سے زنا میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اختلافِ رائے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

(۹) قانوناً ایک فعلِ زنا کو مُستَلزِمِ سزا قرار دینے کے لیے صرف اِدخالِ حَشَفَہ کافی ہے۔ پورا اِدخال یا تکمیلِ فعل اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر اِدخالِ حشفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر یک جا پایا جانا، یا مُلاعَبَت کرتے ہوئے دیکھا جانا، یا برہنہ پایا جانا، کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا ڈاکٹری معاینہ کرا کے زنا کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حدِّ زِنا جاری کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی بے حیائی میں مبتلا پائے جائیں، ان پر صرف تعزیر ہے، جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے حاکم عدالت خود کرے گا، یا جس کے لیے اسلامی حکومت کی مجلسِ شُوریٰ کوئی سزا تجویز کرنے کی مجاز ہو گی۔ یہ تعزیر اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو دس کوڑوں سے زیادہ نہیں لگائے جا سکتے، کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ لا یجلد فوق عشر جلداتٍ الّا فی حدٍّ من حدود اللہ، "اللہ کی مقرر کردہ حدود کے سوا کسی اور جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد) اور اگر کوئی شخص پکڑا نہ گیا ہو بلکہ خود نادم ہو کر ایسے کسی قصور کا اعتراف کرے تو اس کے لیے صرف توبہ کی تلقین کافی ہے۔ عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "شہر کے باہر میں ایک عورت سے سب کچھ کر گزرا بجز جماع کے۔ اب حضور جو چاہیں مجھے سزا دیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا: "جب خدا نے پردہ ڈال دیا تھا تو تُو بھی پردہ پڑا رہنے دیتا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور وہ شخص چلا گیا۔ پھر آپ نے اسے واپس بلایا اور یہ آیت پڑھی: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ "نماز قائم کر دن کے دونوں

Maktaba Tul Ishaat.com

سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔" (ہود، آیت ۱۱۴) ایک شخص نے پوچھا: "کیا یہ اسی کے لیے خاص ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "نہیں، سب کے لیے ہے۔" (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی) یہی نہیں بلکہ شریعت اس کو بھی جائز نہیں رکھتی کہ کوئی شخص اگر جُرم کی تصریح کے بغیر اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرے تو کھوج لگا کر اس سے پوچھا جائے کہ تو نے کون سا جرم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے۔" مگر آپؐ نے اس سے نہیں پوچھا کہ تو کس حد کا مستحق ہوا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر وہ شخص پھر اُٹھا اور کہنے لگا کہ میں مجرم ہوں، مجھے سزا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تو نے ابھی ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی ہے؟" اس نے عرض کیا: "جی ہاں"۔ فرمایا: "بس تو اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔" (بخاری، مسلم، احمد)

(۱۰) کسی شخص (مرد یا عورت) کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعلِ زنا صادر ہوا ہے، بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہییں۔ یہ شرطیں زنائے محض کے معاملے میں اَور ہیں، اور زنا بعدِ احصان کے معاملے میں اور۔

زنائے محض کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل ہو اور بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حدِّ زنا کا مستحق نہیں ہے۔

اور زنا بعدِ احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ چند مزید شرطیں بھی ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ اس شرط پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ قرآن خود اشارہ کرتا ہے کہ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ لونڈی اگر نکاح کے بعد زنا کی مرتکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھی سزا دینی چاہیے۔ فقہا نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہو گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ شادی شدہ ہو۔ یہ شرط بھی مُتَّفَق عَلَیہ ہے، اور اس شرط کی رُو سے کوئی ایسا شخص جو مِلکِ یَمین کی بنا پر تمتُّع کر چکا ہو، یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو، شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا، یعنی اُس سے اگر زنا کا صدور ہو تو اس کو رجم کی نہیں بلکہ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا محض نکاح ہی نہ ہوا ہو بلکہ نکاح کے بعد خَلوَتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو۔ صرف عقدِ نکاح کسی مرد کو مُحصَن، یا عورت کو مُحصَنہ نہیں بنا دیتا کہ زنا کے ارتکاب کی صورت میں اس کو رجم کر دیا جائے۔ اس شرط پر بھی اکثر فقہا متفق ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اس میں اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو مُحصَن صرف اسی صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوتِ صحیحہ کے وقت زوجین آزاد، بالغ اور عاقل ہوں۔ اس مزید شرط سے جو فرق واقع ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک مرد کا نکاح ایسی عورت سے ہوا ہو جو لونڈی ہو، یا نابالغ ہو، یا مجنون ہو، تو خواہ وہ اس حالت میں اپنی بیوی سے لذت اندوز ہو بھی چکا ہو، پھر بھی وہ مرتکبِ زنا ہونے کی صورت میں رجم کا مستحق نہ ہو گا۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے کہ اگر اس کو اپنے نابالغ، یا مجنون، یا غلام شوہر سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل چکا ہو، پھر بھی وہ مرتکبِ زنا ہونے کی صورت میں رجم کی مستحق نہ ہو گی۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی معقول اضافہ ہے جو ان دونوں بالغ النظر بزرگوں نے کیا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور

امام احمدؒ اس کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ذمی بھی اگر زنا بعدِ احصان کا مرتکب ہوگا تو رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعدِ احصان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔ اس کے دلائل میں سے سب سے زیادہ معقول اور وزنی دلیل یہ ہے کہ ایک آدمی کو سنگساری جیسی خوف ناک سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل ''احصان'' کی حالت میں ہو اور پھر بھی زنا کے ارتکاب سے باز نہ آئے۔ احصان کا مطلب ہے: ''اخلاقی قلعہ بندی''، اور اس کی تکمیل تین حصاروں سے ہوتی ہے: اوّلین حصار یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہو، آخرت کی جواب دہی کا قائل ہو اور شریعتِ خداوندی کو تسلیم کرتا ہو۔ دوسرا حصار یہ ہے کہ وہ معاشرے کا آزاد فرد ہو، کسی دوسرے کی غلامی میں نہ ہو جس کی پابندیاں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز تدابیر اختیار کرنے میں مانع ہوتی ہیں، اور لاچاری و مجبوری اس سے گناہ کرا سکتی ہے، اور کوئی خاندان اسے اپنے اخلاق اور اپنی عزت کی حفاظت میں مدد دینے والا نہیں ہوتا۔ تیسرا حصار یہ ہے کہ اس کا نکاح ہو چکا ہو اور اسے تسکینِ نفس کا جائز ذریعہ حاصل ہو۔ یہ تینوں حصار جب پائے جاتے ہوں تب ''قلعہ بندی'' مکمل ہوتی ہے اور تب ہی وہ شخص بجا طور پر سنگساری کا مستحق قرار پا سکتا ہے جس نے ناجائز شہوت رانی کی خاطر تین تین حصار توڑ ڈالے۔ لیکن جہاں پہلا اور سب سے بڑا حصار، یعنی خدا اور آخرت اور قانونِ خداوندی پر ایمان ہی موجود نہ ہو، وہاں یقیناً قلعہ بندی مکمل نہیں ہے اور اس بنا پر فجور کا جرم بھی اس شدت کو پہنچا ہوا نہیں ہے جو اسے انتہائی سزا کا مستحق بنا دے۔ اسی دلیل کی تائید ابنِ عمرؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے اسحاق بن راہَوَیہ نے اپنی مسند میں اور دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ من اشرك بالله فليس بمحصن ''جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا وہ مُحصن نہیں ہے۔'' اگرچہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ابنِ عمرؓ نے اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے، یا یہ ان کا اپنا فتویٰ ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود اس کا مضمون اپنے معنٰی کے لحاظ سے نہایت قوی ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہودیوں کے اس مُقدمے سے استدلال کیا جائے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم نافذ فرمایا تھا، تو ہم کہیں گے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس مقدمے کے متعلق تمام معتبر روایات کو جمع کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اسلام کا ملکی قانون (law of the land) نہیں بلکہ ان کا اپنا مذہبی قانون (personal law) نافذ فرمایا تھا۔ بخاری و مسلم کی مُتفقہ روایت ہے کہ جب یہ مقدمہ آپؐ کے پاس لایا گیا تو آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا کہ ما تجدون فی التوراۃ فی شان الرجم یاما تجدون فی کتابکم، یعنی ''تمھاری کتاب تورات میں اس کا کیا حکم ہے؟'' پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کے ہاں رجم کا حکم ہے تو حضورؐ نے فرمایا: فانی احکم بما فی التوراۃ ''میں وہی فیصلہ کرتا ہوں جو تورات میں ہے۔'' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: اللھم انی اول من احیا امرك اذ اماتوہ، ''خداوندا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جب کہ انھوں نے اسے مُردہ کر دیا تھا۔'' (مسلم، ابوداؤد، احمد)

(۱۱) فعلِ زنا کے مرتکب کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی آزاد مرضی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبر و اکراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے پر شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ ''آدمی جبراً کرائے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سے بری ہے''، بلکہ آگے چل کر اسی

Maktaba Tul Ishaat.com

سورہ میں خود قرآن اُن عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو۔ نیز متعدد احادیث میں تصریح ہے کہ زنا بالجبر کی صورت میں صرف زانیِ جابر کو سزا دی گئی اور جس پر جبر کیا گیا تھا، اسے چھوڑ دیا گیا۔ ترمذی و ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک عورت اندھیرے میں نماز کے لیے نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو گرالیا اور زبردستی اس کی عصمت دری کر دی۔ اس کے شور مچانے پر لوگ آ گئے اور زانی پکڑا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجم کرا دیا اور عورت کو چھوڑ دیا۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک شخص نے ایک لڑکی سے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ آپ نے اسے کوڑے لگوائے اور لڑکی کو چھوڑ دیا۔ ان دلائل کی بنا پر عورت کے معاملے میں تو قانون مُتَّفَق عَلَیہ ہے۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہُوا ہے کہ آیا مرد کے معاملے میں بھی جبر و اکراہ معتبر ہے یا نہیں۔ امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام حَسَنؒ بن صالح کہتے ہیں کہ مرد بھی اگر زنا کرنے پر مجبُور کیا گیا ہو تو معاف کیا جائے گا۔ امام زُفرؒ کہتے ہیں کہ اسے معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ انتشارِ عُضو کے بغیر اس فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اور انتشارِ عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرک ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبُور کیا ہو تو سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ جب خود حکومت ہی جرم پر مجبور کرنے والی ہو تو اُسے سزا دینے کا حق نہیں رہتا۔ لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزا دی جائے گی، کیونکہ ارتکابِ زنا بہرحال وہ اپنی شہوت کے بغیر نہ کر سکتا تھا اور شہوت جبراً پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ان تینوں اقوال میں سے پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انتشارِ عضو چاہے شہوت کی دلیل ہو مگر رضا و رغبت کی لازمی دلیل نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ظالم کسی شریف آدمی کو زبردستی پکڑ کر قید کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک جوان، خوب صورت عورت کو بھی برہنہ کر کے ایک ہی کمرے میں بند رکھتا ہے، اور اسے اس وقت تک رہا نہیں کرتا جب تک کہ وہ زنا کا مرتکب نہ ہو جائے۔ اس حالت میں اگر یہ دونوں زنا کے مرتکب ہو جائیں اور وہ ظالم اس کے چار گواہ بنا کر انھیں عدالت میں پیش کر دے، تو کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان کے حالات کو نظر انداز کر کے انھیں سنگسار کر دیا جائے یا ان پر کوڑے برسائے جائیں؟ اس طرح کے حالات عقلاً یا عادتاً ممکن ہیں جن میں شہوت لاحق ہو سکتی ہے، بغیر اس کے کہ اس میں آدمی کی اپنی رضا و رغبت کا دخل ہو۔ اگر کسی شخص کو قید کر کے شراب کے سوا پینے کو کچھ نہ دیا جائے، اور اس حالت میں وہ شراب پی لے، تو کیا محض اس دلیل سے اس کو سزا دی جا سکتی ہے کہ حالات تو واقعی اس کے لیے مجبُوری کے تھے، مگر حلق سے شراب کا گھونٹ وہ اپنے ارادے کے بغیر نہ اُتار سکتا تھا؟ جرم کے متحقق ہونے کے لیے محض ارادے کا پایا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آزاد ارادہ ضروری ہے۔ جو شخص زبردستی ایسے حالات میں مبتلا کیا گیا ہو کہ وہ جرم کا ارادہ کرنے پر مجبُور ہو جائے، وہ بعض صورتوں میں تو قطعی مجرم نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں اس کا جرم بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

(۱۲) اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے، اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام اُمت کے فقہا کا اتفاق ہے کہ آیت زیرِ بحث میں حکم فَاجْلِدُوْا (ان کو کوڑے مارو) کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ اسلامی حکومت کے حکام اور قاضی ہیں۔ البتہ غلام کے معاملے میں اختلاف ہے کہ آیا اس پر اس کا آقا حد جاری کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ مذہبِ حنفی کے تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ وہ اس کا مجاز نہیں ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مجاز ہے۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ آقا کو سرقے میں ہاتھ کاٹنے کا تو حق نہیں ہے، مگر زنا، قذف اور شراب نوشی پر وہ حد

جاری کرسکتا ہے۔

(۱۳) اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانونِ مملکت کا ایک حصّہ قرار دیتا ہے، اس لیے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہوگا، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس سے امام مالکؒ کے سوا غالباً ائمہ میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ رجم کی سزا غیر مسلموں پر جاری کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف اس بنیاد پر نہیں ہے کہ یہ قانونِ مملکت نہیں ہے، بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک رجم کی شرائط میں سے ایک شرط زانی کا پورا مُحصَن ہونا ہے اور احصان کی تکمیل اسلام کے بغیر نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ کے نزدیک اس حکم کے مخاطب مسلمان ہیں نہ کہ کافر، اس لیے وہ حدِ زنا کو مسلمانوں کے شخصی قانون (پرسنل لا) کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔ رہا مُستامن (جو کسی دوسرے ملک سے دارالاسلام میں اجازت لے کر آیا ہو)، تو امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ بھی اگر دار الاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اُس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔

(۱۴) اسلامی قانون یہ لازم نہیں کرتا کہ کوئی شخص اپنے جرم کا خود اقرار کرے، یا جو لوگ کسی شخص کے جرم زنا پر مطلع ہوں، وہ ضرور ہی اس کی خبر حکام تک پہنچائیں۔ البتہ جب حکام اس پر مُطّلع ہو جائیں تو پھر اس جرم کے لیے معافی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من اتی شیئا من ھٰذہ القاذورات فلیستتر بستر اللّٰہ فان ابدیٰ لنا صفحتہ اقمنا علیہ کتاب اللّٰہ ”تم میں سے جو شخص ان گندے کاموں میں سے کسی کا مرتکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پردے میں چھپا رہے۔ لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے۔“ (احکام القرآن، للجصّاص) ابوداؤد میں ہے کہ ماعزؓ بن مالک اَسلمی سے جب زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو ہَزّالؓ بن نُعَیم نے ان سے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے اس جرم کا اقرار کرو۔ چنانچہ انھوں نے جا کر حضورؐ سے اپنا جُرم بیان کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ایک طرف تو انھیں رجم کی سزا دی اور دوسری طرف ہَزّالؓ سے فرمایا: لو سترتہ بثوبك كان خیرًا لك، ”کاش! تم اس کا پردہ ڈھانک دیتے تو تمھارے لیے زیادہ اچھا تھا۔“ ابوداؤد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تعافوا الحدود فی ما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب۔ ”حدود کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو۔ مگر جس حد (یعنی جُرمِ مُستلزِمِ حد) کا معاملہ مجھ تک پہنچ جائے گا پھر وہ واجب ہو جائے گی۔“

(۱۵) اسلامی قانون میں یہ جرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کُتُبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اُجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کیا۔ مگر جب یہ مقدمہ نبیؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے فرمایا: اما غنمك وجاریتك فردٌّ علیك ”تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھی کو واپس“، اور پھر آپؐ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرما دی۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس جرم میں راضی نامے کی کوئی گنجایش نہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں عصمتوں کا معاوضہ مالی تاوانوں کی شکل میں نہیں دلوایا جا سکتا۔ آبرو کی قیمت کا یہ دَیُّوثانہ تصوُّر مغربی قوانین ہی کو مبارک رہے۔

(۱۶) [illegible] کسی شخص [illegible] زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا [illegible]ت

نہ مل جائے۔ ثبوتِ جرم کے بغیر کسی کی بدکاری خواہ کتنے ہی ذرائع سے حکام کے علم میں ہو، وہ بہرحال اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ مدینے میں ایک عورت تھی جس کے متعلق روایات ہیں کہ وہ کھلی کھلی فاحشہ تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے: کانت تظھر فی الاسلام السوء۔ دوسری روایت میں ہے: کانت قد اعلنت فی الاسلام۔ ابنِ ماجہ کی روایت ہے: فقد ظھر منھا الرّیبۃ فی منطقھا وھیئتھا ومن یدخل علیھا۔ لیکن چونکہ اس کے خلاف بدکاری کا ثبوت نہ تھا، اس لیے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالانکہ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ تک نکل گئے تھے کہ لو کنت راجمًا احدًا بغیر بینۃ لرجمتھا، ’’اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو ضرور رجم کرا دیتا۔‘‘

(۱۷) جرمِ زنا کا پہلا ممکن ثبوت یہ ہے کہ شہادت اس پر قائم ہو۔ اس کے متعلق قانون کے اہم اجزا یہ ہیں:

الف۔ قرآن تصریح کرتا ہے کہ زنا کے لیے کم سے کم چار عینی شاہد ہونے چاہییں۔ اس کی صراحت سورۂ نساء، آیت ۱۵ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے اسی سورۂ نور میں بھی دو جگہ آ رہی ہے۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا، خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکابِ جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔

ب۔ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہییں جو اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے قابلِ اعتماد ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ پہلے کسی مُقدّمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں، مُلزَم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو، وغیرہ۔ بہرحال ناقابلِ اعتماد شہادت کی بنا پر نہ تو کسی کو رجم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا سکتے ہیں۔

ج۔ گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیے کہ انھوں نے مُلزَم اور مُلزَمہ کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے، یعنی کالمیل فی المکحلۃ والرشاء فی البئر (اس طرح جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنویں میں رسّی)۔

د۔ گواہوں کو اس امر میں متفق ہونا چاہیے کہ انھوں نے کب، کہاں، کس کو، کس سے زنا کرتے دیکھا ہے۔ ان بنیادی اُمور میں اختلاف ان کی شہادت کو ساقط کر دیتا ہے۔

شہادت کی یہ شرائط خود ظاہر کر رہی ہیں کہ اسلامی قانون کا منشا یہ نہیں ہے کہ ٹکٹکیاں لگی ہوں اور روز لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے برستے رہیں۔ بلکہ وہ ایسی حالت ہی میں یہ سخت سزا دیتا ہے جب کہ تمام اصلاحی اور انسدادی تدابیر کے باوجود اسلامی معاشرے میں کوئی جوڑا ایسا بے حیا ہو کہ چار چار آدمی اس کو جرم کرتے دیکھ لیں۔

(۱۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا، جب کہ عورت کا کوئی شوہر، یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم و معروف نہ ہو، ثبوتِ زنا کے لیے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے، اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کو رجم کر دیا جائے، یا کسی کی پیٹھ پر سو کوڑے برسا دیے جائیں۔ اتنی بڑی سزا کے لیے ناگزیر ہے کہ یا تو شہادت موجود ہو، یا پھر اقرار۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ شبہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کے لیے محرک ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ادفعوا الحدود ما وجدتم لھا مدفعاً، ’’سزاؤں کو دفع کرو جہاں تک بھی ان کو دفع کرنے کی گنجایش پاؤ۔‘‘ (ابنِ ماجہ) ایک دوسری حدیث میں ہے: ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان لہٗ

مخرجٌ فخلوا سبیلہ، فان الامام ان یخطئی فی العفو خیر من ان یخطئی فی العقوبۃ،'' مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی مُلزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔'' (ترمذی) اس قاعدے کے لحاظ سے حمل کی موجودگی، چاہے شبہے کے لیے کتنی ہی قوی بنیاد ہو، زنا کا یقینی ثبوت بہر حال نہیں ہے، اس لیے کہ لاکھ میں ایک درجے کی حد تک اس امر کا بھی امکان ہے کہ مباشرت کے بغیر کسی عورت کے رحم میں کسی مرد کے نطفے کا کوئی جز پہنچ جائے اور وہ حاملہ ہو جائے۔ اتنے خفیف شبہے کا امکان بھی اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ مُلزمہ کو زنا کی ہولناک سزا سے معاف رکھا جائے۔

(۱۹) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ اگر زنا کے گواہوں میں اختلاف ہو جائے، یا اور کسی وجہ سے ان کی شہادتوں سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا اُلٹے گواہ جھوٹے الزام کی سزا پائیں گے؟ فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس صورت میں وہ قاذف قرار پائیں گے اور انھیں ۸۰ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہ گواہ کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ مدّعی کی حیثیت سے۔ اور اگر اس طرح گواہوں کو سزا دی جائے تو پھر زنا کی شہادت بہم پہنچنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ آخر کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ سزا کا خطرہ مول لے کر شہادت دینے آئے، جب کہ اس امر کا یقین کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ چاروں گواہوں میں سے کوئی ٹوٹ نہ جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے معقول ہے، کیونکہ شبہے کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملنا چاہیے، اسی طرح گواہوں کو بھی ملنا چاہیے۔ اگر ان کی شہادت کی کمزوری اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ مُلزم کو زنا کی خوف ناک سزا دے ڈالی جائے، تو اسے اس بات کے لیے بھی کافی نہ ہونا چاہیے کہ گواہوں پر قذف کی خوف ناک سزا برسا دی جائے، اِلّا یہ کہ ان کا صریح جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ پہلے قول کی تائید میں دو بڑی دلیلیں دی جاتی ہیں: اوّل یہ کہ قرآن زنا کی جھوٹی تہمت کو مستوجب سزا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ دلیل اس لیے غلط ہے کہ قرآن خود قاذف (تہمت لگانے والے) اور شاہد کے درمیان فرق کر رہا ہے، اور شاہد محض اس بنا پر قاذف قرار نہیں پا سکتا کہ عدالت نے اس کی شہادت کو ثبوتِ جرم کے لیے کافی نہیں پایا۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے میں حضرت عمرؓ نے ابوبکرہؓ اور ان کے دو ساتھی شاہدوں کو قذف کی سزا دی تھی۔ لیکن اس مقدمے کی پوری تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نظیر ہر اُس مقدّمے پر چسپاں نہیں ہوتی جس میں ثبوتِ جرم کے لیے شہادتیں ناکافی پائی جائیں۔ مُقدّمے کے واقعات یہ ہیں کہ بصرے کے گورنر مُغیرہؓ بن شُعبہ سے ابوبکرہؓ کے تعلّقات پہلے سے خراب تھے۔ دونوں کے مکان ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے واقع تھے۔ ایک روز یکایک ہوا کے زور سے دونوں کے کمروں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ ابوبکرہؓ اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیے اُٹھے تو ان کی نگاہ سامنے کے کمرے پر پڑی اور انھوں نے حضرت مُغیرہؓ کو مباشرت میں مشغول دیکھا۔ ابوبکرہؓ کے پاس ان کے تین دوست (نافع بن کَلَدہ، زیاد اور شِبل بن مَعْبد) بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آؤ، دیکھو، اور گواہ رہو کہ مغیرہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستوں نے پوچھا: یہ عورت کون ہے؟ ابوبکرہؓ نے کہا: اُمِّ جمیل۔ دوسرے روز اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی گئی۔ انھوں نے فوراً حضرت مغیرہؓ کو معطّل کر کے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا اور مُلزم کو گواہوں سمیت مدینے طلب کر لیا۔ پیشی پر ابوبکرہؓ

Maktaba Tul Ishaat.com

اور دو گواہوں نے کہا کہ ہم نے مُغیرہ کو اُمِّ جمیل کے ساتھ بالفعل مباشرت کرتے دیکھا۔ مگر زیاد نے کہا کہ عورت صاف نظر نہیں آتی تھی، اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اُمِّ جمیل تھی۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ نے جرح میں یہ ثابت کر دیا کہ جس رُخ سے یہ لوگ اُنھیں دیکھ رہے تھے، اس سے دیکھنے والا عورت کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ان کی بیوی اور اُمِّ جمیل باہم بہت مشابہ ہیں۔ قرائن خود بتا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت میں، ایک صوبے کا گورنر، خود اپنے سرکاری مکان میں، جہاں اس کی بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی، ایک غیر عورت کو بلا کر زنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ابوبکرہؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ سمجھنا کہ مغیرہؓ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے بجائے اُمِّ جمیل سے مباشرت کر رہے ہیں، ایک نہایت بے جا بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صرف مُلزَم کو بَری کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابوبکرہؓ، نافع اور شِبل پر حدِّ قَذَف بھی جاری فرمائی۔ یہ فیصلہ اس مُقدّمے کے مخصوص حالات کی بنا پر تھا، نہ کہ اِس قاعدۂ کُلِیّہ کی بنا پر کہ جب کبھی شہادتوں سے جُرمِ زنا ثابت نہ ہو تو گواہ ضرور پِیٹ ڈالے جائیں۔ (مقدّمے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: احکام القرآن لابن العَرَبی، جلد ۲، صفحہ ۸۸-۸۹)

(۲۰) شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے، وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ یہ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں فعلِ زنا کے ارتکاب کا ہونا چاہیے، یعنی اسے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے ایک ایسی عورت سے، جو اس کے لیے حرام تھی کالمیل فی المکحلۃ یہ فعل کیا ہے۔ اور عدالت کو پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطورِ خود بحالتِ ہوش و حواس یہ اقرار کر رہا ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیے۔ (یہ امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، ابنِ ابی لیلیٰ، اسحاق بن رَاہَوَیہ اور حسن بن صالح کا مسلک ہے)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے۔ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عثمان اَلبَتّی اور حسن بصریؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں)۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ کسی دوسرے تائیدی ثبوت کے بغیر صرف مجرم کے اپنے ہی اقرار پر فیصلہ کیا گیا ہو، اگر عین سزا کے دَوران میں بھی مجرم اپنے اقرار سے پھر جائے تو سزا کو روک دینا چاہیے، خواہ یہ بات صریحاً ہی کیوں نہ ظاہر ہو رہی ہو کہ وہ مار کی تکلیف سے بچنے کے لیے اقرار سے رُجوع کر رہا ہے۔ اِس پورے قانون کا ماخذ وہ نظائر ہیں جو زنا کے مُقدّمات کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مقدّمہ ماعزؓ بن مالک اَسلَمی کا ہے جسے متعدّد صحابہؓ سے بکثرت راویوں نے نقل کیا ہے اور قریب قریب تمام کُتُبِ حدیث میں اس کی روایات موجود ہیں۔ یہ شخص قبیلۂ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا جس نے حضرت ہَزّالؓ بن نُعَیم کے ہاں پرورش پائی تھی۔ یہاں وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زِنا کر بیٹھا۔ حضرت ہَزّالؓ نے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس گناہ کی خبر دے، شاید کہ آپؐ تیرے لیے دعائے مغفرت فرما دیں۔ اس نے جا کر مسجد نبویؐ میں حضورؐ سے کہا: یا رسولؐ اللہ! مجھے پاک کر دیجیے، میں نے زنا کیا ہے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: ویحک ارجع فاستغفر اللّٰہ وتب الیہ ’’ارے، چلا جا اور اللہ سے توبہ و اِستغفار کر۔‘‘ مگر اس نے پھر سامنے آکر وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری بار وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو مُتنبِّہ کیا کہ دیکھ، اب چوتھی بار اگر تو نے اقرار کیا تو رسولؐ اللہ تجھے رجم کرا دیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دُہرائی۔ اب حضورؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا:

لعلك قبلت او غمزت او نظرت، ”شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا، یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی، یا نظرِ بد ڈالی ہوگی“ (اور تو سمجھ بیٹھا ہوگا کہ یہ زنا کا ارتکاب ہے)۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے پوچھا: ”کیا تو اس سے ہم بستر ہوا؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: ”کیا تو نے اس سے مباشرت کی؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: ”کیا تو نے اس سے مُجامعَت کی؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر آپؐ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عَرَبی زبان میں صریحاً فعلِ مباشرت کے لیے بولا جاتا ہے اور فحش سمجھا جاتا ہے۔ ایسا لفظ حضورؐ کی زبان سے نہ پہلے کبھی سنا گیا نہ اس کے بعد کسی نے سنا۔ اگر ایک شخص کی جان کا معاملہ نہ ہوتا تو زبانِ مبارک سے کبھی ایسا لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیا۔ آپؐ نے پوچھا: حتّٰی غاب ذٰلك منك فی ذٰلك منها۔ (کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اس کی اس چیز میں غائب ہوگئی؟) اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: کما یغیب المیل فی المکحلة والرشاء فی البئر (کیا اس طرح غائب ہوگئی جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنویں میں رسّی؟) اس نے کہا: ہاں۔ پوچھا: ”کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔“ آپؐ نے پوچھا: ”کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں“۔ آپؐ نے پوچھا: ”تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟“ اس نے کہا: نہیں۔ ایک شخص نے اُٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپؐ نے اس کے محلّے والوں سے دریافت کیا کہ یہ دیوانہ تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: ”ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔“ آپؐ نے ہزّالؓ سے فرمایا: لو سترته بثوبك كان خیرًا لك، ”کاش! تم نے اس کا پردہ ڈھانک دیا ہوتا تو تمھارے لیے اچھا تھا۔“ پھر آپؐ نے ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا اور اسے شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا گیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگا اور اس نے کہا: ”لوگو! مجھے رسولؐ اللہ کے پاس واپس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انھوں نے مجھے دھوکا دیا کہ رسولؐ اللہ مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔“ مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں جب حضورؐ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا: ”تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، میرے پاس لے آئے ہوتے، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔“

دوسرا واقعہ غامِدِیّہ کا ہے جو قبیلہ غامِد (قبیلہ جُہَینہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اُس نے بھی آ کر چار مرتبہ اقرار کیا کہ وہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اسے ناجائز حمل ہے۔ آپؐ نے اس سے بھی پہلے اقرار پر فرمایا: ویحك، ارجعی فاستغفری الی اللّٰه وتوبی الیه (”اری، چلی جا، اللہ سے معافی مانگ اور توبہ کر۔“) مگر اس نے کہا: ”یا رسولؐ اللہ! کیا آپ مجھے ماعز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں؟ میں زنا سے حاملہ ہوں۔“ یہاں چونکہ اقرار کے ساتھ حمل بھی موجود تھا، اس لیے آپؐ نے اُس قدر مفصّل جرح نہ فرمائی جو ماعز کے ساتھ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا، نہیں مانتی تو جا، وضعِ حمل کے بعد آئیو۔“ وضعِ حمل کے بعد وہ بچے کو لے کر آئی اور کہا: ”اب مجھے پاک کر دیجیے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”جا اور اس کو دودھ پلا۔ دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو۔“ پھر وہ دودھ چھُٹانے کے بعد آئی اور ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لیتی آئی۔ بچے کو روٹی کا ٹکڑا کھلا کر حضورؐ کو دکھایا اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے، اور دیکھیے، یہ روٹی کھانے لگا ہے۔ تب آپؐ نے بچے کو پرورش کے لیے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

ان دونوں واقعات میں بصراحت چار اقراروں کا ذکر ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت بُرَیدہؓ کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام کا عام خیال یہی تھا کہ اگر ماعز اور غامِدِیّہ چار مرتبہ اقرار نہ کرتے تو انھیں رجم نہ کیا جاتا۔ البتہ تیسرا واقعہ (جس کا ذکر ہم

Maktaba Tul Ishaat.com

اُوپر نمبر ۱۵ میں کر چکے ہیں) اس میں صرف یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''جا کر اس کی بیوی سے پوچھ، اور اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔'' اس میں چار اعترافوں کا ذکر نہیں ہے، اور اسی سے فقہا کے ایک گروہ نے اِستدلال کیا ہے کہ ایک ہی اعتراف کافی ہے۔

(۲۱) اُوپر ہم نے جن تین مُقدّمات کی نظیریں پیش کی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقراری مجرم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اس طرح ایک کے بجائے دو کو سزا دینی پڑے گی، اور شریعت لوگوں کو سزائیں دینے کے لیے بے چین نہیں ہے۔ البتہ اگر مجرم خود یہ بتائے کہ اس فعل کا فریقِ ثانی فلاں ہے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ بھی اعتراف کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ انکار کر دے تو صرف اقراری مجرم ہی حد کا مستحق ہوگا۔ اس امر میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اِس دوسری صورت میں (یعنی جب کہ فریقِ ثانی اس کے ساتھ مرتکبِ زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے) اُس پر آیا حدِّ زنا جاری کی جائے گی یا حدِّ قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حدِّ زنا کا مُستوجِب ہے، کیونکہ اسی جرم کا اس نے اقرار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام اَوزاعیؒ کی رائے میں اس پر حدِّ قذف جاری کی جائے گی، کیونکہ فریقِ ثانی کے انکار نے اس کے جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے، البتہ اس کا جرمِ قذف بہرحال ثابت ہے۔ اور امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے (امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے) کہ اسے زنا کی سزا بھی دی جائے گی اور قذف کی بھی، کیونکہ اپنے جرمِ زنا کا وہ خود معترف ہے، اور فریقِ ثانی پر اپنا الزام وہ ثابت نہیں کر سکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اس قسم کا ایک مقدّمہ آیا تھا۔ اس کی ایک رِوایت جو مُسندِ احمد اور ابوداؤد میں سَہلؓ بن سعد سے منقول ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ''ایک شخص نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار کیا کہ وہ فلاں عورت سے زنا کا مرتکب ہوا ہے۔ آپؐ نے عورت کو بلا کر پوچھا۔ اس نے انکار کیا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔'' اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کون سی حد جاری کی۔ دوسری روایت ابوداؤد اور نَسائی نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ پہلے اس کے اقرار پر آپؐ نے حدِ زنا جاری کی، پھر عورت سے پوچھا، اور اس کے انکار پر اس شخص کو حدِ قَذف کے کوڑے لگوائے۔ لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے ایک راوی قاسم بن فیّاض کو متعدد محدثین نے ساقط الاعتبار ٹھیرایا ہے، اور قیاس کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آپؐ نے اسے کوڑے لگوانے کے بعد عورت سے پوچھا ہوگا۔ صریح عقل اور انصاف کا تقاضا، جسے حضورؐ نظر انداز نہیں فرما سکتے تھے، یہ تھا کہ جب اس نے عورت کا نام لے دیا تھا تو عورت سے پوچھے بغیر اس کے مُقدّمے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ اسی کی تائید سَہلؓ بن سعد والی روایت بھی کر رہی ہے۔ لہٰذا دوسری روایت لائقِ اعتماد نہیں ہے۔

(۲۲) ثبوتِ جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کیا سزا دی جائے گی، اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ مختلف فقہا کے مسلک اس باب میں حسبِ ذیل ہیں:

شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا:

— امام احمدؒ، داؤد ظاہری اور اسحاق بن رَاہوَیہ کے نزدیک سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا ہے۔

— باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم اور سزائے تازیانہ کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

غیر شادی شدہ کی سزا:

— امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اسحاق، داؤد ظاہری، سفیان ثَوری، ابنِ ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح کے نزدیک سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، مرد وعورت ہر دو کے لیے۔

— امام مالکؒ اور امام اَوزاعیؒ کے نزدیک مرد کے لیے ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے۔

(جلاوطنی سے مراد ان سب کے نزدیک یہ ہے کہ مجرم کو اس کی بستی سے نکال کر کم از کم اتنے فاصلے پر بھیج دیا جائے جس پر نماز میں قصر واجب ہوتا ہے۔ مگر زید بن علیؒ اور امام جعفر صادقؒ کے نزدیک قید کر دینے سے بھی جلاوطنی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے)۔

— امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف، امام زُفَر اور امام محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حدِ زنا مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ اس پر کسی اور سزا، مثلاً قید یا جلاوطنی کا اضافہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ قاضی اگر یہ دیکھے کہ مجرم بدچلن ہے، یا مجرم اور مجرمہ کے تعلّقات بہت گہرے ہیں، تو حسبِ ضرورت وہ انھیں خارج البلد بھی کرسکتا ہے اور قید بھی کرسکتا ہے۔

(حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ حد ایک مقرر سزا ہے جو ثبوتِ جرم کی شرائط پوری ہونے کے بعد لازماً دی جائے گی۔ اور تعزیر اُس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظِ مقدار ونوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدّمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کرسکتی ہو)۔

ان مختلف مسالک میں سے ہر ایک نے مختلف احادیث کا سہارا لیا ہے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عُبَادہؓ بن صامت کی رِوایت، جسے مسلم، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ترمذی اور امام احمد نے نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خذوا عني خذوا عني، قد جعل الله لهن سبيلا، البكر بالبكر جلد مأة وتغريب عام والثيب بالثيب جلد مأة و الرجم (او رمي بالحجارة ـ او رجم بالحجارة) ''مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے زانیہ عورتوں کے لیے طریقہ مقرر کر دیا۔ غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، اور شادی شدہ مرد کی شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور سنگساری۔'' (یہ حدیث اگرچہ سنداً صحیح ہے، مگر روایاتِ صحیحہ کا ایک جمِ غفیر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر نہ عہدِ نبویؐ میں کبھی عمل ہوا، نہ عہدِ خلفائے راشدینؓ میں، اور نہ فقہا میں سے کسی نے ٹھیک اس کے مضمون کے مطابق فتویٰ دیا۔ فقہِ اسلامی میں جو بات مُتَّفَق عَلَیہ ہے، وہ یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کے مُحصَن اور غیر مُحصَن ہونے کا الگ الگ اعتبار کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ عورت سے، دونوں حالتوں میں اس کی سزا ایک ہے، اور شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ سے، ہر دو حالتوں میں اس کو ایک ہی سزا دی جائے گی۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ وہ شادی شدہ ہو تو ہر حالت میں ایک ہی سزا پائے گی، خواہ اس سے زنا کرنے والا مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اور باکرہ ہونے کی صورت میں بھی اس کے لیے ایک ہی سزا ہے، بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ساتھ زنا کرنے والا مُحصَن ہے یا غیر مُحصَن)۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زیدؓ بن خالد جُہنی کی رِوایت، جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذِی، نسائی، ابنِ ماجہ اور امام احمدؒ نے نقل کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو اَعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدّمہ لائے۔ ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اِس شخص کے ہاں اُجرت پر کام کرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی سے مُلَوّث ہوگیا۔ مَیں نے اس کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر راضی کیا۔ مگر اہلِ علم نے بتایا کہ یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ دوسرے نے بھی کہا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ حضوؐر نے فرمایا: میں کتاب اللہ ہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور لونڈی تجھی کو واپس۔ تیرے بیٹے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جَلاوطنی۔ پھر آپ نے قبیلۂ اسلم کے ایک شخص سے فرمایا: اے اُنَیس! تو جا کر اس کی بیوی سے پوچھ۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔ چنانچہ اس نے اعتراف کیا اور رجم کر دی گئی۔ (اس میں رجم سے پہلے کوڑے لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور غیر شادی شدہ مرد کو شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے پر تازیانے اور جَلاوطنی کی سزا دی گئی ہے)۔

ماعز اور غامِدِیّہ کے مقدّمات کی جتنی رُودادیں احادیث کی مختلف کتابوں میں مروی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ملتا کہ حضوؐر نے رجم کرانے سے پہلے ان کو سو کوڑے بھی لگوائے ہوں۔

کوئی روایت کسی حدیث میں نہیں ملتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقدّمے میں رجم کے ساتھ سزائے تازیانہ کا بھی فیصلہ فرمایا ہو۔ زنا بعدِ اِحصان کے تمام مقدمات میں آپؐ نے صرف رجم کی سزا دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور خطبہ، جس میں انھوں نے پورے زور کے ساتھ زنا بعدِ احصان کی سزا رجم بیان کی ہے، بخاری و مسلم اور ترمِذِی ونَسائی نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے اور امام احمد نے بھی اس کی متعدِد روایتیں لی ہیں، مگر اس کی کسی روایت میں بھی رجم مع سزائے تازیانہ کا ذکر نہیں ہے۔

خلفائے راشدینؓ میں سے صرف حضرت علیؓ نے سزائے تازیانہ اور سنگساری کو ایک سزا میں جمع کیا ہے۔ امام احمدؒ اور بخاریؒ عامر شَعْبی سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت شُراحہ نامی نے ناجائز حمل کا اعتراف کیا، حضرت علیؓ نے جمعرات کے روز اسے کوڑے لگوائے اور جمعے کے روز اس کو رجم کرایا، اور فرمایا: ہم نے اسے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے لگائے ہیں اور سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق سنگسار کرتے ہیں۔ اس ایک واقعے کے سوا عہدِ خلافتِ راشدہ کا کوئی دوسرا واقعہ رجم مع تازیانہ کے حق میں نہیں ملتا۔

جابرؓ بن عبداللہ کی ایک روایت، جسے ابوداؤد اور نَسائی نے نقل کیا ہے، یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص زنا کا مرتکب ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف سزائے تازیانہ دی، پھر معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ تھا، تب آپؐ نے اسے رجم کرایا۔ اس کے علاوہ متعدِد رِوایات ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کو آپؐ نے صرف سزائے تازیانہ دی۔ مثلاً وہ شخص جس نے نماز کے لیے جاتی ہوئی عورت سے زنا بالجبر کی تھی، اور وہ شخص جس نے زنا کا اعتراف کیا اور عورت نے انکار کیا۔

حضرت عمرؓ نے رَبیعہ بن اُمَیّہ بن خَلَف کو شراب نوشی کے جرم میں جَلاوطن کیا اور وہ بھاگ کر رومیوں سے جا ملا۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آیندہ میں کسی کو جلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے غیر شادی شدہ مرد و عورت کو زنا کے جرم میں جلاوطن کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، جلد ۳، صفحہ ۳۱۵)

اِن تمام روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہی صحیح ہے، یعنی زنا بعدِ احصان کی حد صرف رجم ہے، اور محض زنا کی حد صرف ۱۰۰ کوڑے۔ تازیانے اور رجم کو جمع کرنے پر تو عہدِ نبویؐ سے لے کر عہدِ عثمانی تک کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ رہا تازیانے اور جلاوطنی کو جمع کرنا، تو اس پر کبھی عمل ہوا ہے اور کبھی نہیں ہوا۔ اس سے مسلکِ حنفی کی صحت صاف ثابت ہو جاتی ہے۔

(۲۳) ضربِ تازیانہ کی کیفیت کے متعلق پہلا اشارہ خود قرآن کے لفظ فَاجْلِدُوْا میں ملتا ہے۔ جَلد کا لفظ جِلد (یعنی کھال) سے ماخوذ ہے۔ اس سے تمام اہلِ لغت اور علمائے تفسیر نے یہی معنیٰ لیے ہیں کہ مار ایسی ہونی چاہیے جس کا اثر جِلد تک رہے، گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضربِ تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اُڑ جائیں، یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے، قرآن کے خلاف ہے۔

مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں وہ اوسط درجے کا ہونا چاہیے۔ نہ بہت موٹا اور سخت، اور نہ بہت پتلا اور نرم۔ مُوَطّا میں امام مالکؒ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضربِ تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرتِ استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: فوق ھٰذا (اس سے زیادہ سخت لاؤ)۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں کے درمیان۔ پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا۔ اس سے آپؐ نے ضرب لگوائی۔ اسی مضمون سے ملتی جلتی روایت ابوعثمان النّہدی نے حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کی ہے کہ وہ اوسط درجے کا کوڑا استعمال کرتے تھے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) گرہ لگا ہوا کوڑا یا دو شاخہ سہ شاخہ کوڑا بھی استعمال کرنا ممنوع ہے۔

مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ مارنے والے کو ہدایت کرتے تھے کہ لا ترفع (یا لا تخرج) ابطلٹ "اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے۔" یعنی پوری طاقت سے ہاتھ کو تان کر نہ مار۔ (احکام القرآن، ابنِ عَرَبی، ج ۲، ص ۸۴۔ احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ ضرب مُبرِح نہیں ہونی چاہیے، یعنی زخم ڈال دینے والی۔ ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہیے بلکہ تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔ صرف منہ اور شرم گاہ کو (اور حَنفِیَّہ کے نزدیک سر کو بھی) بچا لینا چاہیے، باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیے۔ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو کوڑے لگواتے وقت فرمایا: "ہر عضو کو اس کا حق دے اور صرف منہ اور شرم گاہ کو بچا لے۔" دوسری روایت میں ہے: "صرف سر اور شرم گاہ کو بچا لے۔" (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا ضرب احدکم فلیتق الوجہ "جب تم میں سے کوئی مارے تو منہ پر نہ مارے۔" (ابوداؤد)

مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیے اور عورت کو بٹھا کر۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں کوفے کے قاضی ابنِ ابی لیلیٰ نے ایک عورت کو کھڑا کر کے پِٹوایا۔ اس پر امام ابوحنیفہؒ نے سخت گرفت کی اور علانیہ ان کے فیصلے کو غلط ٹھیرایا۔ (اس سے قانونِ توہینِ عدالت کے معاملے میں بھی امام صاحب کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے)۔ ضربِ تازیانہ کے وقت عورت اپنے پورے

Maktaba Tul Ishaat.com

کپڑے پہنے رہے گی، بلکہ اس کے کپڑے اچھی طرح باندھ دیے جائیں گے، تاکہ اس کا جسم کُھل نہ جائے۔ صرف موٹے کپڑے اُتروا دیے جائیں گے۔ مرد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ وہ صرف پاجامہ پہنے رہے گا، اور بعض کہتے ہیں کہ قمیص بھی نہ اُتروایا جائے گا۔ حضرت ابوعُبَیدہؓ بن الجَرّاح نے ایک زانی کو سزائے تازیانہ کا حکم دیا۔ اس نے کہا: ''اِس گناہ گار جسم کو اچھی طرح مار کھانی چاہیے''، اور یہ کہہ کر وہ قمیص اُتارنے لگا۔ حضرت ابوعُبَیدہؓ نے فرمایا: ''اسے قمیص نہ اُتارنے دو۔'' (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک شخص کو کوڑے لگوائے گئے اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

سخت سردی اور سخت گرمی کے وقت مارنا ممنوع ہے۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔

باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اِلّا یہ کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں: لا یحل فی ھٰذہ الامۃ تجرید ولا مدّ ''اس اُمّت میں ننگا کر کے اور ٹکٹکی پر باندھ کر مارنا حلال نہیں ہے۔''

فقہا نے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اَولیٰ یہی ہے کہ بیک وقت پوری سزا دے دی جائے۔

مار کا کام اُجڈ جلّادوں سے نہیں لینا چاہیے بلکہ صاحبِ علم وبصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے، جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابنِ قَیِّم نے زادُالمَعاد میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زُبیرؓ، مِقدادؓ بن عَمرو، محمدؓ بن مَسلَمہ، عاصمؓ بن ثابت اور ضَحّاکؓ بن سُفیان جیسے صلحا ومعززین سے جلّادی کی خدمت لی جاتی تھی۔ (ج ۱، ص ۴۴-۴۵)

اگر مجرم مریض ہو، اور اس کے صحت یاب ہونے کی اُمید نہ ہو، یا بہت بوڑھا ہو، تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی، یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینا چاہیے، تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بوڑھا مریض زنا کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور آپؐ نے اس کے لیے یہی سزا تجویز فرمائی تھی۔ (احمد، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ) حاملہ عورت کو سزائے تازیانہ دینی ہو تو وضعِ حمل کے بعد نفاس کا زمانہ گزر جانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور رجم کرنا ہو تو جب تک اس کے بچے کا دودھ نہ چھُوٹ جائے، سزا نہیں دی جا سکتی۔

اگر زنا شہادتوں سے ثابت ہو تو گواہ ضرب کی ابتدا کریں گے، اور اگر اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہو تو قاضی خود ابتدا کرے گا، تاکہ گواہ اپنی گواہی کو اور جج اپنے فیصلوں کو کھیل نہ سمجھ بیٹھیں۔ شُراحہ کے مقدمے میں جب حضرت علیؓ نے رجم کا فیصلہ کیا تو فرمایا: ''اگر اس کے جرم کا کوئی گواہ ہوتا تو اسی کو مار کی ابتدا کرنی چاہیے تھی، مگر اس کو اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہے، اس لیے میں خود ابتدا کروں گا۔'' حَنَفِیّہ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ شافعیہ اس کو واجب نہیں مانتے، مگر سب کے نزدیک اَولیٰ یہی ہے۔

ضربِ تازیانہ کے قانون کی ان تفصیلات کو دیکھیے اور پھر ان لوگوں کی جرأت کی داد دیجیے جو اسے تو وحشیانہ سزا کہتے ہیں، مگر وہ سزائے تازیانہ ان کے نزدیک بڑی مہذب سزا ہے جو آج جیلوں میں دی جارہی ہے۔ موجودہ قانون کی رُو سے صرف عدالت ہی نہیں، جیل کا ایک معمولی سپرنٹنڈنٹ بھی ایک قیدی کو حکم عدولی یا گستاخی کے قصور میں ۳۰ ضرب بید تک کی سزا دینے کا مجاز ہے۔ یہ بید لگانے کے لیے ایک آدمی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس غرض کے لیے بید بھی خاص طور پر بھگو بھگو کر تیار کیے جاتے ہیں، تاکہ جسم کو چھری کی طرح کاٹ دیں۔ مجرم کو ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ تڑپ بھی نہ سکے۔ صرف ایک پتلا سا کپڑا اس کے ستر کو چھپانے کے لیے رہنے دیا جاتا ہے اور وہ ٹنکچر آیوڈین سے بھگو دیا جاتا ہے۔ جلاد دور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور پوری طاقت سے مارتا ہے۔ ضرب ایک ہی مخصوص حصۂ جسم (یعنی سُرین) پر مسلسل لگائی جاتی ہے، یہاں تک کہ گوشت قیمہ ہو کر اُڑتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات ہڈی نظر آنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور آدمی بھی پورے تیس بید کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے زخم بھرنے میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔ اِس ''مہذب'' سزا کو جو لوگ آج جیلوں میں خود نافذ کر رہے ہیں، اُن کا یہ منہ ہے کہ اسلام کی مقرر کی ہوئی سزائے تازیانہ کو ''وحشیانہ'' سزا کے نام سے یاد فرمائیں! پھر ان کی پولیس ثابت شدہ مجرموں کو نہیں بلکہ محض مُشتبہ لوگوں کو تفتیش کی خاطر (خصوصاً سیاسی جرائم کے شبہات میں) جیسے جیسے عذاب دیتی ہے، وہ آج کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

(۲۴) رجم کی سزا میں جب مجرم مرجائے تو پھر اس سے پوری طرح مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کی تجہیز و تکفین کی جائے گی۔ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کو عزت کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے گی اور کسی کے لیے جائز نہ ہوگا کہ اس کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرے۔ بخاری میں جابرؓ بن عبداللہ انصاری کی روایت ہے کہ جب رجم سے ماعز بن مالک کی موت واقع ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ''خیر سے یاد فرمایا اور اس کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی۔'' مسلم میں حضرت بُرَیدہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: استغفروا لماعز بن مالك، لقد تاب توبة لو قسمت بين امة لوسعتهم، ''ماعز بن مالک کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری امت پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔'' اسی روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ غامِدِیّہ جب رجم سے مرگئی تو حضورؐ نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی، اور جب حضرت خالدؓ بن ولید نے اس کا ذکر برائی سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: مهلا يا خالد، فوالذی نفسی بيده لقد تابت توبة لو تابها صاحب مكس لغفرله، ''خالد! اپنی زبان روکو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ظالمانہ محصول وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔'' ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ماعز کے واقعے کے بعد ایک روز حضورؐ راستے سے گزر رہے تھے۔ آپؐ نے دو شخصوں کو ماعز کا ذکر برائی سے کرتے سنا۔ چند قدم آگے جا کر ایک گدھے کی لاش پڑی نظر آئی۔ حضورؐ ٹھیر گئے اور ان دونوں آدمیوں سے کہا: ''آپ حضرات اس میں سے کچھ نوشِ جان فرمائیں۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یا نبی اللہ! اسے کون کھا سکتا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی آبرو سے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۳ اور ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۴۔

جو کچھ آپ ابھی تناول فرما رہے تھے، وہ اسے کھانے کی بہ نسبت بدتر چیز تھی۔'' مسلم میں عمران بن حُصَین کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے غامِدیّہ کی نماز جنازہ کے موقع پر عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! کیا اب اِس زانیہ کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟'' آپ نے فرمایا: لقد تابت توبة لو قسمت بين اهل المدينة لوسعتهم ''اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہلِ مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔'' بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص کو شراب نوشی کے جرم میں سزا دی جا رہی تھی۔ کسی کی زبان سے نکلا: ''خدا تجھے رُسوا کرے!'' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس طرح نہ کہو، اُس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو۔'' ابوداؤد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''بلکہ یوں کہو: اللّٰھمّ اغفرلہ، اللّٰھمّ ارحمہ، ''خدایا! اسے معاف کر دے، خدایا! اس پر رحم کر۔'' یہ ہے اسلام میں سزا کی اصل روح۔ اسلام کسی بڑے سے بڑے مجرم کو بھی دشمنی کے جذبے سے سزا نہیں دیتا بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے دیتا ہے، اور جب سزا دے چکتا ہے تو پھر اسے رحمت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کم ظرفی صرف موجودہ تہذیب نے پیدا کی ہے کہ حکومت کی فوج یا پولیس جسے مار دے، اور کوئی عدالتی تحقیقات جس کے مارنے کو جائز ٹھیرا دے، اس کے متعلق یہ تک گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی اس کا جنازہ اُٹھائے یا کسی کی زبان سے اس کا ذکرِ خیر سنا جائے۔ اس پر اَخلاقی جرأت (یہ موجودہ تہذیب میں ڈِھٹائی کا مہذّب نام ہے) کا یہ عالَم ہے کہ دنیا کو رواداری کے وعظ سنائے جاتے ہیں۔

(۲۵) محرّمات سے زنا کے متعلق شریعت کا قانون تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۳۶ پر، اور عملِ قومِ لوط کے متعلق شرعی فیصلہ تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۵۱-۵۴ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ رہا جانور سے فعلِ بد، تو بعض فقہا اس کو بھی زنا کے حکم میں شمار کرتے ہیں اور اس کے مرتکب کو حدِّ زنا کا مستحق ٹھیراتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زُفَرؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ زنا نہیں ہے، اس لیے اس کا مرتکب تعزیر کا مستحق ہے نہ کہ حدِّ زنا کا۔ تعزیر کے متعلق ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس کا فیصلہ قاضی کی رائے پر چھوڑا گیا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شُوریٰ ضرورت سمجھے تو اس کے لیے کوئی مناسب شکل خود تجویز کر سکتی ہے۔

۳- اوّلین چیز جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ یہاں فوج داری قانون کو ''دِیْنِ اللّٰہِ'' فرمایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں، مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظامِ شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو، وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا ادھورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو ردّ کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ ردّ کر دیا گیا۔

دوسری چیز جو اس میں قابلِ توجہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی یہ تنبیہ ہے کہ زانی اور زانیہ پر میری تجویز کردہ سزا نافذ کرنے

اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ

زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے

میں مجرم کے لیے رحم اور شفقت کا جذبہ تمھارا ہاتھ نہ پکڑے۔ اس بات کو اور زیادہ کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے: یؤتی بوالٍ نقص من الحد سوطا فیقال له لِمَ فعلت ذاك؟ فیقول رحمة لعبادك۔ فیقال له انت ارحم بهم منی؟ فیومر به الی النار۔ ویؤتی بمن زاد سوطا فیقال له لم فعلت ذاك؟ فیقول لینتهوا عن معاصیك۔ فیقول انت احکم بهم منی؟ فیومر به الی النار "قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا: یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا: آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہوگا: اچھا، تو اُن کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا! پھر حکم ہوگا: لے جاؤ اسے دوزخ میں۔ ایک اور حاکم لایا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا: تو نے یہ کس لیے کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا: تاکہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا: اچھا، تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا! پھر حکم ہوگا: لے جاؤ اسے دوزخ میں۔" (تفسیر کبیر، ج ۶، ص ۲۲۵) یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ کمی بیشی کا عمل رحم یا مصلحت کی بنا پر ہو۔ لیکن اگر کہیں احکام میں ردّ و بدل مجرموں کے مرتبے کی بنا پر ہونے لگے تو پھر یہ ایک بدترین جرم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: "لوگو! تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں وہ ہلاک ہو گئیں، اس لیے کہ جب ان میں کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے، اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔" ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "ایک حد جاری کرنا اہلِ زمین کے لیے ۴۰ دن کی بارش سے زیادہ مفید ہے۔" (نَسائی و ابنِ ماجہ)

بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد چھوڑ نہ دیا جائے اور نہ سزا میں کمی کی جائے، بلکہ پورے سو کوڑے مارے جائیں۔ اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہلکی مار نہ ماری جائے، جس کی کوئی تکلیف ہی مجرم محسوس نہ کرے۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ دونوں ہی مراد معلوم ہوتے ہیں۔ اور مزید برآں یہ مراد بھی ہے کہ زانی کو وہی سزا دی جائے جو اللہ نے تجویز فرمائی ہے، اسے کسی اور سزا سے نہ بدل دیا جائے۔ کوڑوں کے بجائے کوئی اور سزا دینا اگر رحم اور شفقت کی بنا پر ہو تو مَعْصِیَت ہے، اور اگر اس خیال کی بنا پر ہو کہ کوڑوں کی سزا ایک وحشیانہ سزا ہے تو یہ قطعی کفر ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی ایمان کے ساتھ ایک سینے میں جمع نہیں ہو سکتا۔ خدا کو خدا بھی ماننا اور اس کو، معاذ اللہ، وحشی بھی کہنا صرف انھی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو ذلیل ترین قسم کے منافق ہیں۔

۴ – یعنی سزا علی الاعلان عام لوگوں کے سامنے دی جائے، تاکہ ایک طرف مجرم کو فضیحت ہو اور دوسری طرف

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝

مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔ؔ۵

عوام الناس کو نصیحت۔ اس سے اسلام کے نظریۂ سزا پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں چوری کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ "ان کے کیے کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے جرم کو روکنے والی سزا" (آیت ۳۸) اور اب یہاں ہدایت کی جا رہی ہے کہ زانی کو علانیہ لوگوں کے سامنے عذاب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون میں سزا کے تین مقصد ہیں: اوّل یہ کہ مجرم سے اُس زیادتی کا بدلہ لیا جائے اور اس کو اُس بُرائی کا مزا چکھایا جائے جو اُس نے کسی دوسرے شخص یا معاشرے کے ساتھ کی تھی۔ دوم یہ کہ اُسے اعادۂ جرم سے باز رکھا جائے۔ سوم یہ کہ اس کی سزا کو ایک عبرت بنا دیا جائے، تاکہ معاشرے میں جو دوسرے لوگ بُرے میلانات رکھنے والے ہوں، ان کے دماغ کا آپریشن ہو جائے اور وہ اس طرح کے کسی جرم کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ علانیہ سزا دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں حُکام سزا دینے میں بے جا رعایت یا بے جا سختی کرنے کی کم ہی جرأت کر سکتے ہیں۔

۵ – یعنی زانیِ غیر تائب کے لیے اگر موزوں ہے تو زانیہ ہی موزوں ہے، یا پھر مشرکہ۔ کسی مومنۂ صالحہ کے لیے وہ موزوں نہیں ہے، اور حرام ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ وہ جانتے بُوجھتے اپنی لڑکیاں ایسے فاجروں کو دیں۔ اسی طرح زانیہ (غیر تائبہ) عورتوں کے لیے اگر موزوں ہیں تو انھی جیسے زانی یا پھر مشرک۔ کسی مومنِ صالح کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں، اور حرام ہے مومنوں کے لیے کہ جن عورتوں کی بدچلنی کا حال انھیں معلوم ہو، ان سے وہ دانستہ نکاح کریں۔ اس حکم کا اطلاق صرف انھی مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو اپنی بُری رَوِش پر قائم ہوں۔ جو لوگ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں، ان پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ توبہ و اصلاح کے بعد "زانی" ہونے کی صفت ان کے ساتھ لگی نہیں رہتی۔

زانی کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا مطلب امام احمد بن حنبلؒ نے یہ لیا ہے کہ سرے سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد محض مُمانعت ہے، نہ یہ کہ اس حکمِ ممانعت کے خلاف اگر کوئی نکاح کرے تو وہ قانوناً نکاح ہی نہ ہو اور اس نکاح کے باوجود فریقین زانی شمار کیے جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ایک قاعدۂ کُلِّیَہ کے طور پر ارشاد فرمائی ہے کہ الحرام لا یحرم الحلال، "حرام حلال کو حرام نہیں کر دیتا" (طَبَرانی، دارقُطنی) یعنی ایک غیر قانونی فعل کسی دوسرے قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنا دیتا۔ لہٰذا کسی شخص کا ارتکابِ زنا اس بات کا موجب نہیں ہو سکتا کہ وہ نکاح بھی کرے تو اس کا شمار زنا ہی میں ہو، اور معاہدۂ نکاح کا دوسرا فریق جو بدکار نہیں ہے، وہ بھی بدکار قرار پائے۔ اُصولاً بغاوت کے سوا کوئی غیر قانونی فعل اپنے مرتکب کو خارج از حدودِ قانون (outlaw) نہیں بنا دیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی فعل بھی قانونی نہ ہو سکے۔ اس چیز کو نگاہ میں رکھ کر اگر آیت پر غور کیا جائے تو اصل منشا صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی بدکاری جانی بُوجھی ہو، ان کو نکاح کے لیے منتخب کرنا ایک گناہ ہے، جس سے اہلِ ایمان کو پرہیز

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے

کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بدکاروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے، حالانکہ شریعت انھیں معاشرے کا ایک مکروہ اور قابلِ نفرت عُنصر قرار دینا چاہتی ہے۔

اسی طرح اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ زانیِ مسلم کا نکاح مشرک عورت سے، اور زانیۂ مُسلِمہ کا نکاح مشرک مرد سے صحیح ہے۔ آیت کا منشا دراصل یہ بتانا ہے کہ زنا ایسا سخت قبیح فعل ہے کہ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ مسلم معاشرے کے پاک اور صالح لوگوں سے اس کا رشتہ ہو۔ اسے یا تو اپنے ہی جیسے زانیوں میں جانا چاہیے، یا پھر ان مشرکوں میں جو سرے سے احکامِ الٰہی پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

آیت کے منشا کی صحیح ترجمانی وہ احادیث کرتی ہیں جو اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ مُسْندِ احمد اور نَسائی میں عبداللہؓ بن عَمْرو بن عاص کی رِوایت ہے کہ ایک عورت اُمِّ مَہزول نامی تھی جو قَحْبہ گری کا پیشہ کرتی تھی۔ ایک مسلمان نے اس سے نکاح کرنا چاہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی۔ آپؐ نے منع فرمایا اور یہی آیت پڑھی۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ مَرثَدؓ بن ابی مَرثَد ایک صحابی تھے، جن کے زمانۂ جاہلیّت میں مکے کی ایک بدکار عورت عَناق سے ناجائز تعلّقات رہ چکے تھے۔ بعد میں انھوں نے چاہا کہ اس سے نکاح کرلیں اور حضورؐ سے اجازت مانگی۔ دو دفعہ پوچھنے پر آپؐ خاموش رہے۔ تیسری دفعہ پھر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: یا مرثد، الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة فلا تنکحھا۔ اس کے علاوہ متعدّد روایات حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عمّار بن یاسرؓ سے منقول ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص دَیُّوث ہو (یعنی جسے معلوم ہو کہ اس کی بیوی بدکار ہے اور یہ جان کر بھی وہ اس کا شوہر بنا رہے)، وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔“ (احمد، نَسائی، ابوداؤد طَیالِسی) شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو غیر شادی شدہ مرد و عورت زِنا کے الزام میں گرفتار ہوتے، ان کو وہ پہلے سزائے تازیانہ دیتے تھے اور پھر انھی کا آپس میں نکاح کر دیتے تھے۔ ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک روز ایک شخص بڑی پریشانی کی حالت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور کچھ اس طرح بات کرنے لگا کہ اس کی زبان پوری طرح کھلتی نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اسے الگ لے جا کر معاملہ پوچھو۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ ایک شخص اس کے ہاں مہمان کے طور پر آیا تھا، وہ اس کی لڑکی سے مُلَوّث ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: قبحك الله، الاسترت علی ابنتك، ”تیرا بُرا ہو، تُو نے اپنی لڑکی کا پردہ ڈھانک نہ دیا؟“ آخرِ کار لڑکے اور لڑکی پر مقدّمہ قائم ہوا، دونوں پر حدّ جاری کی گئی، اور پھر ان دونوں کا باہم نکاح کر کے حضرت ابوبکرؓ نے ایک سال کے لیے ان کو شہر بدر کر دیا۔ ایسے ہی اور چند واقعات قاضی ابوبکر ابن العَرَبی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں نقل کیے ہیں۔ (جلد ۲، ص ۸۶)

Maktaba Tul Ishaat.com

ثَمٰنِيۡنَ جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ‏ ﴿۴﴾
اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰ لِكَ وَاَصۡلَحُوۡا‌ ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ﴿۵﴾

مارو اور ان کی شہادت کبھی قُبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں، سوائے اُن لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں کہ اللہ ضرور (اُن کے حق میں) غفور و رحیم ہے۔[۶]

۶- اس حکم کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی آشنائیوں اور ناجائز تعلّقات کے چرچے قطعی طور پر بند کر دیے جائیں، کیونکہ اس سے بے شمار بُرائیاں پھیلتی ہیں، اور ان میں سب سے بڑی بُرائی یہ ہے کہ اس طرح غیر محسوس طریقے پر ایک عام زنا کارانہ ماحول بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک شخص مزے لے لے کر کسی کے صحیح یا غلط گندے واقعات دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ دوسرے اس میں نمک مرچ لگا کر اور لوگوں تک انھیں پہنچاتے ہیں، اور ساتھ ساتھ کچھ مزید لوگوں کے متعلق بھی اپنی معلومات یا بدگمانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ شہوانی جذبات کی ایک عام رَو چل پڑتی ہے، بلکہ بُرے میلانات رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرے میں کہاں کہاں اُن کے لیے قسمت آزمائی کے مواقع موجود ہیں۔ شریعت اِس چیز کا سدِّ باب پہلے ہی قدم پر کر دینا چاہتی ہے۔ ایک طرف وہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی زنا کرے اور شہادتوں سے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو وہ انتہائی سزا دو جو کسی اور جرم پر نہیں دی جاتی۔ اور دوسری طرف وہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے، وہ یا تو شہادتوں سے اپنا الزام ثابت کرے، ورنہ اس پر اَسّی کوڑے برسا دو، تاکہ آیندہ کبھی وہ اپنی زبان سے ایسی بات بلا ثبوت نکالنے کی جراَت نہ کرے۔ بالفرض اگر الزام لگانے والے نے کسی کو اپنی آنکھوں سے بھی بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو، تب بھی اسے خاموش رہنا چاہیے اور دوسروں تک اسے نہ پہنچانا چاہیے، تاکہ گندگی جہاں ہے وہیں پڑی رہے، آگے نہ پھیل سکے۔ البتہ اگر اس کے پاس گواہ موجود ہیں تو معاشرے میں بے ہودہ چرچے کرنے کے بجائے معاملہ حُکّام کے پاس لے جائے اور عدالت میں مُلزَم کا جرم ثابت کر کے اسے سزا دلوا دے۔

اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیلات نگاہ میں رہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ان کو نمبروار بیان کرتے ہیں:

(۱) آیت میں الفاظ ’’وَالَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ‘‘ استعمال ہوئے ہیں، جن کے معنیٰ ہیں ’’وہ لوگ جو الزام لگائیں‘‘۔ لیکن سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد ہر قسم کا الزام نہیں، بلکہ مخصوص طور پر زنا کا الزام ہے۔ پہلے زنا کا حکم بیان ہوا ہے اور آگے لِعان کا حکم آ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان اس حکم کا آنا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں ’’الزام‘‘ سے مراد کس نوعیت کا الزام ہے۔ پھر الفاظ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ (الزام لگائیں پاک دامن عورتوں پر) سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مراد وہ الزام ہے جو پاک دامنی کے خلاف ہو۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانونِ اسلامی میں صرف زنا کا نصابِ شہادت ہے۔ اِن قرائن کی بنا پر تمام اُمت کے علما کا اجماع ہے کہ اس آیت میں صرف

الزامِ زنا کا حکم بیان ہُوا ہے، جس کے لیے علما نے ’’قَذف‘‘ کی مستقل اصطلاح مقرر کردی ہے، تاکہ دوسری تہمت تراشیاں (مثلاً کسی کو چور، یا شرابی، یا سود خوار، یا کافر کہہ دینا) اس حکم کی زد میں نہ آئیں۔ ’’قَذف‘‘ کے سوا دوسری تہمتوں کی سزا قاضی خود تجویز کرسکتا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شُوریٰ حسبِ ضرورت ان کے لیے توہین اور ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا کوئی عام قانون بنا سکتی ہے۔

(۲) آیت میں اگرچہ الفاظ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں) استعمال ہوئے ہیں، لیکن فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حکم صرف عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے، بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لیے الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف مردوں ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اگر جرمِ قذف کی مرتکب ہوں تو وہ اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔ کیونکہ جرم کی شُناعت میں قاذِف یا مقذوف کے مرد یا عورت ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا قانون کی شکل یہ ہوگی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے، اس کا یہ حکم ہے۔ (واضح رہے کہ یہاں مُحصِن اور مُحصِنہ سے مراد شادی شدہ مرد وعورت نہیں بلکہ پاک دامن مرد وعورت ہیں)۔

(۳) یہ حکم صرف اسی صورت میں نافذ ہوگا جب کہ الزام لگانے والے نے مُحصِنین یا مُحصَنات پر الزام لگایا ہو۔ کسی غیر مُحصِن پر الزام لگانے کی صورت میں اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ غیر مُحصِن اگر بدکاری میں معروف ہو تب تو اس پر ’’الزام‘‘ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلاثبوت الزام لگانے والے کے لیے قاضی خود سزا تجویز کرسکتا ہے، یا ایسی صورتوں کے لیے مجلسِ شُوریٰ حسبِ ضرورت قانون بنا سکتی ہے۔

(۴) کسی فعلِ قذف کے مُستَلزِم سزا ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بدکاری کا بلاثبوت الزام لگایا ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں، اور کچھ مقذوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) میں، اور کچھ خود فعلِ قذف میں پائی جانی ضروری ہیں۔

قاذف میں جو شرطیں پائی جانی چاہییں، وہ یہ ہیں: اوّل یہ کہ وہ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جاسکتی ہے، مگر اس پر حدّ جاری نہیں کی جاسکتی۔ دوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ مجنون پر حدِقذف جاری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں، مثلاً کلوروفارم کے زیرِ اثر الزام لگانے والے کو بھی مجرم نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ سوم یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (فقہا کی اصطلاح میں طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چہارم یہ کہ وہ مقذوف کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ اُن پر حدِقذف جاری نہیں کی جاسکتی۔ ان کے علاوہ حَنَفِیَہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ وہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حدِّ قذف کا مُستَوجِب نہ ہوگا۔ لیکن امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، تو وہ قاذف ہے، کیونکہ اس کا اشارہ ایک شخص کو بدنام و رُسوا کردینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کے برعکس حَنَفِیَہ کے نزدیک محض اشارے کی صراحت اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ایک آدمی کو

Maktaba Tul Ishaat.com

۸۰ کوڑوں کی سزا دے ڈالی جائے۔ وہ اس پر صرف تعزیر دیتے ہیں۔

مقذوف میں جو شرطیں پائی جانی چاہییں، وہ یہ ہیں: پہلی شرط یہ کہ وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالتِ عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ مجنون پر (خواہ وہ بعد میں عاقل ہو گیا ہو یا نہ ہُوا ہو) الزام لگانے والا حدِ قذف کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حدِ زنا کا مستحق ہوتا ہے، نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لہٰذا اس پر الزام لگانے والا بھی حدِ قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن امام مالکؒ اور امام لَیث بن سعدؒ کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذِف حد کا مستحق ہے، کیونکہ بہر حال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔ یعنی اس پر بحالتِ بلوغ زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو۔ بچے پر الزام لگانا، یا جوان پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، حدِ قذف کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، نہ وہ حدِ زنا کا مُستوجِب ہوتا ہے، اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ سِنِّ بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذِف حد کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرانے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو، تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو جاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہو جاتا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، یعنی اس پر بحالتِ اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ کفر اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حد نہیں ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ لونڈی یا غلام پر الزام، یا آزاد پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ غلامی اس کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حد نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔ خود قرآن میں بھی غلامی کی حالت کو اِحصان کی حالت قرار نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ نساء میں مُحصَنَات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ لیکن داؤد ظاہریؒ اس دلیل کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حد کا مستحق ہے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبۂ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرمِ زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبۂ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاحِ فاسد، یا خفیہ نکاح، یا مُشتبَہ مِلکیت، یا شبۂ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالاتِ زندگی ایسے ہوں جن میں اُس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں ہو سکتا ہو، اور نہ زنا سے کم تر درجے کی بداَخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی عفّت مجروح ہو جاتی ہے، اور ایسی مجروح عفت پر الزام لگانے والا ۸۰ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حتّٰی کہ اگر حدِ قذف جاری ہونے سے پہلے مقذوف کے خلاف کسی جرمِ زنا کی شہادت قائم ہو جائے، تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔

مگر ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ مجنون، یا بچے، یا کافر، یا غلام، یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزامِ زنا لگا دینے والا مستحقِ تعزیر بھی نہیں ہے۔

اب وہ شرطیں لیجیے جو خود فعلِ قذف میں پائی جانی چاہییں۔ ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز

قذف بنا سکتی ہے۔ یا تو قاذف نے مقذوف پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقذوف پر حد واجب ہو جائے۔ یا پھر اس نے مقذوف کو وَلَدُ الزِّنا قرار دیا ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام صاف اور صریح ہونا چاہیے۔ کنایات کا اعتبار نہیں ہے، جن سے زنا یا طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے۔ مثلاً کسی کو فاسق، فاجر، بدکار، بدچلن وغیرہ الفاظ سے یاد کرنا، یا کسی عورت کو رنڈی، کسبن، یا چھنال کہنا، یا کسی سید کو پٹھان کہہ دینا کنایہ ہے، جس سے صریح قذف لازم نہیں آتا۔ اسی طرح جو الفاظ محض گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً حرامی یا حرام زادہ وغیرہ، ان کو بھی صریح قذف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے یوں کہے کہ ’’ہاں، مگر میں تو زانی نہیں ہوں‘‘، یا ’’میری ماں نے تو زنا کرا کے مجھے نہیں جنا ہے‘‘۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض جس سے صاف سمجھ میں آ جائے کہ قائل کی مراد مخاطب کو زانی یا وَلَدُ الزِّنا قرار دینا ہے، قذف ہے، جس پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، اور امام شافعیؒ، سفیان ثوری، ابنِ شُبْرُمہ اور حسن بن صالح اس بات کے قائل ہیں کہ تعریض میں بہر حال شک کی گنجایش ہے، اور شک کے ساتھ حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ تعریض اگر لڑائی جھگڑے میں ہو تو قذف ہے، اور ہنسی مذاق میں ہو تو قذف نہیں ہے۔ خلفا میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تعریض پر حد جاری کی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ’’نہ میرا باپ زانی تھا نہ میری ماں زانیہ تھی۔‘‘ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا: آپ لوگ اِس سے کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا: اِس نے اپنے باپ اور ماں کی تعریف کی ہے، اُس کے ماں باپ پر تو حملہ نہیں کیا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا: اِس کے لیے اپنے ماں باپ کی تعریف کرنے کے لیے کیا یہی الفاظ رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ کو اس موقع پر استعمال کرنے سے صاف مراد یہی ہے کہ اُس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے گروہ سے اتفاق کیا اور حد جاری کر دی۔ (جصاص، ج ۳، ص ۳۳۰) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کسی پر عملِ قومِ لوط کے ارتکاب کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اسے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

(۵) جرمِ قذف قابلِ دست اندازیِ سرکار (cognizable offence) ہے یا نہیں، اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ یہ حق اللہ ہے، اس لیے قاذف پر بہر حال حد جاری کی جائے گی، خواہ مقذوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنی میں تو حق اللہ ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پر مقدمہ چلانا مقذوف کے مطالبے پر موقوف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حقِ آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ اور امام اَوزاعیؒ کی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم قابلِ دست اندازیِ سرکار ہے، ورنہ اس پر کارروائی کرنا مقذوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

(۶) جرمِ قذف قابلِ راضی نامہ (compoundable offence) نہیں ہے۔ مقذوف عدالت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

دعویٰ لے کر نہ آئے تو یہ دوسری بات ہے، لیکن عدالت میں معاملہ آ جانے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے، اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔ نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود مقذوف۔ نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے، نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حدٍ فقد وجب، ”حدود کو آپس ہی میں معاف کر دو، مگر جس حد کا معاملہ میرے پاس پہنچ گیا، وہ پھر واجب ہو گئی۔“

(۷) حنفیہ کے نزدیک حدِ قذف کا مطالبہ یا تو خود مقذوف کر سکتا ہے، یا پھر وہ جس کے نسب پر اس سے حرف آتا ہو اور مطالبہ کرنے کے لیے خود مقذوف موجود نہ ہو، مثلاً باپ، ماں، اولاد اور اولاد کی اولاد۔ مگر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حق قابلِ توریث ہے۔ مقذوف مر جائے تو اس کا ہر شرعی وارث حد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعیؒ بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے اور بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی دلیلیں کمزور ہیں۔ مطالبۂ حد کو قابلِ توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، خود قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملے میں چاہے صحیح ہو، مگر بیوی کے معاملے میں تو قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام رکھا جائے، اس کی تو پوری اولاد کا نسب مُشتبَہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حدِ قذف صرف نسب پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے۔ نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے، اور ایک شریف مرد یا عورت کے لیے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بدکار قرار دیا جائے۔ لہٰذا اگر حدِ قذف کا مطالبہ قابلِ توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

(۸) یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز اُسے حد سے بچا سکتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انھوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہییں اور انھیں بیک وقت شہادت دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا، اور اس کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؒ اور عثمان البَتّیؒ نے کہی ہے کہ گواہوں کے بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرے مقدمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔ حنفیہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر قاذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو وہ حدِ قذف سے بچ جائے گا، اور ساتھ ہی مقذوف بھی حدِ زنا سے محفوظ رہے گا، کیونکہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر، یا اندھے، یا غلام، یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کر کے قاذف سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مگر امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قاذف اگر فاسق گواہ پیش کرے تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے۔

اور یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک ہی اَقرب اِلَی الصَّواب معلوم ہوتا ہے۔ گواہ اگر عادل ہوں تو قاذف جرم قذف سے بَری ہو جائے گا اور مقذوف پر جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ لیکن اگر گواہ عادل نہ ہوں تو قاذف کا قذف، اور مقذوف کا فعلِ زنا، اور گواہوں کا صِدق و کِذب، ساری ہی چیزیں مشکوک قرار پائیں گی اور شک کی بنا پر کسی کو بھی حد کا مُستوجِب قرار نہ دیا جاسکے گا۔

(۹) جو شخص ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے جرم قذف سے بَری کر سکتی ہو، اس کے لیے قرآن نے تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ اسے ۸۰ کوڑے لگائے جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سوائے اُن لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں، کہ اللہ غفور اور رحیم ہے)۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فقرے میں توبہ اور اصلاح سے جس معافی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے۔ فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں ہے، یعنی توبہ سے حد ساقط نہ ہو گی اور مجرم کو سزائے تازیانہ بہر حال دی جائے گی۔ فقہا اس پر بھی متفق ہیں کہ اس معافی کا تعلق آخری حکم سے ہے، یعنی توبہ اور اصلاح کے بعد مجرم فاسق نہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ (اِس میں اختلاف صرف اس پہلو سے ہے کہ آیا مجرم نفسِ قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔ امام شافعیؒ اور لیث بن سعدؒ کے نزدیک وہ نفسِ قذف سے فاسق ہو جاتا ہے، اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے، اس لیے وہ نفاذِ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مجرم کا عند اللہ فاسق ہونا نفسِ قذف کا نتیجہ ہے، اور عند الناس فاسق ہونا اس پر موقوف ہے کہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو اور وہ سزا پا جائے)۔ اب رہ جاتا ہے بیچ کا حکم، یعنی یہ کہ "قاذف کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔" فقہا کے درمیان اس پر بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کے فقرے کا تعلق اِس حکم سے بھی ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس فقرے کا تعلق صرف آخری حکم سے ہے، یعنی جو شخص توبہ اور اصلاح کر لے گا، وہ عند اللہ اور عند الناس فاسق نہ رہے گا، لیکن پہلے دونوں حکم اس کے باوجود برقرار رہیں گے، یعنی مجرم پر حد بھی جاری کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت بھی رہے گا۔ اِس گروہ میں قاضی شُرَیح، سعید بن مُسَیَّب، سعید بن جُبَیر، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، ابنِ سیرِین، مَکْحُول، عبدالرحمٰن بن زید، ابوحنیفہ، ابویوسف، زُفَر، محمد، سفیان ثَوری اور حسن بن صالح رحمہم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کا تعلق پہلے حکم سے تو نہیں ہے مگر آخری دونوں حکموں سے ہے، یعنی توبہ کے بعد قذف کے سزا یافتہ مجرم کی شہادت بھی قُبول کی جائے گی اور وہ فاسق بھی نہ شمار ہو گا۔ اس گروہ میں عطاء، طاؤس، مجاہد، شَعْبی، قاسم بن محمد، سالم، زُہری، عِکْرِمَہ، عمر بن عبدالعزیز، ابنِ ابی نَجِیح، سلیمان بن یَسار، مَسْرُوق، ضَحّاک، مالک بن اَنَس، عثمان البَتّی، لَیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل اور ابنِ جَریر طَبَری رحمہم اللہ جیسے بزرگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنی تائید میں دوسرے دلائل کے ساتھ حضرت عمرؓ کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اُس فیصلے کو بھی پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے میں کیا تھا، کیونکہ اس کی بعض رِوایات میں یہ ذکر ہے کہ حدّ جاری کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ابو بکرہؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں سے کہا: اگر تم توبہ کرلو (یا ''اپنے جھوٹ کا اقرار کرلو'') تو میں آیندہ تمھاری شہادت قبول کروں گا، ورنہ نہیں۔ دونوں ساتھیوں نے اقرار کرلیا، مگر ابو بکرہؓ اپنے قول پر قائم رہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی قوی تائید معلوم ہوتی ہے، لیکن مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے کی جو رُوداد ہم پہلے درج کرچکے ہیں، اُس پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس نظیر سے اس مسئلے میں اِستدلال کرنا دُرست نہیں ہے۔ وہاں نفسِ فعل مُتَّفَق عَلَیہ تھا اور خود مغیرہؓ بن شعبہ کو بھی اس سے انکار نہ تھا۔ بحث اس میں تھی کہ عورت کون تھی۔ مغیرہؓ بن شعبہ کہتے تھے کہ وہ اُن کی اپنی بیوی تھیں جنھیں یہ لوگ اُمِّ جمیل سمجھ بیٹھے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ حضرت مغیرہؓ کی بیوی اور اُمِّ جَمیل باہم اس حد تک مشابہ تھیں کہ واقعہ جتنی روشنی میں جتنے فاصلے سے دیکھا گیا، اس میں یہ غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ عورت اُمِّ جمیل ہے۔ مگر قرائن سارے کے سارے مغیرہؓ بن شعبہ کے حق میں تھے اور خود اِستغاثے کا بھی ایک گواہ اقرار کرچکا تھا کہ عورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ کے حق میں فیصلہ دیا اور ابو بکرہؓ کو سزا دینے کے بعد وہ بات کہی جو مذکورۂ بالا رِوایتوں میں منقول ہوئی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشا دراصل یہ تھا کہ تم لوگ مان لو کہ تم نے بے جا بدگمانی کی تھی، اور آیندہ کے لیے ایسی بدگمانیوں کی بنا پر لوگوں کے خلاف الزامات عائد کرنے سے توبہ کرو، ورنہ آیندہ تمھاری شہادت کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو شخص صریح جھوٹا ثابت ہو جائے، وہ بھی حضرت عمرؓ کے نزدیک توبہ کرکے مقبول الشہادت ہوسکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں پہلے گروہ ہی کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ آدمی کی توبہ کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہمارے سامنے جو شخص توبہ کرے گا ہم اسے اس حد تک تو رعایت دے سکتے ہیں کہ اسے فاسق کے نام سے یاد نہ کریں، لیکن اس حد تک رعایت نہیں دے سکتے کہ جس کی زبان کا اعتبار ایک دفعہ جاتا رہا ہے اس پر پھر محض اس لیے اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ہمارے سامنے توبہ کر رہا ہے۔ علاوہ بریں خود قرآن کی عبارت کا اندازِ بیان بھی یہی بتا رہا ہے کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا تعلق صرف اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ سے ہے۔ اس لیے کہ عبارت میں پہلی دو باتیں حکم کے الفاظ میں فرمائی گئی ہیں: ''ان کو اَسّی کوڑے مارو''، ''اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو''۔ اور تیسری بات خبر کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے: ''وہ خود ہی فاسق ہیں''۔ اس تیسری بات کے بعد متصلاً یہ فرمانا کہ ''سوائے اُن لوگوں کے جو توبہ کرلیں''، خود ظاہر کردیتا ہے کہ یہ استثنا آخری فقرۂ خبریہ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ پہلے دو حکمی فقروں سے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ استثنا آخری فقرے تک محدود نہیں ہے، تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ''شہادت قبول نہ کرو'' کے فقرے تک پہنچ کر رُک کیسے گیا، ''اسّی کوڑے مارو'' کے فقرے تک بھی کیوں نہ پہنچ گیا۔

(۱۰) سوال کیا جاسکتا ہے کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا استثنا آخر پہلے حکم سے بھی متعلق کیوں نہ مان لیا جائے؟ قذف آخر ایک قسم کی توہین ہی تو ہے۔ ایک آدمی اس کے بعد اپنا قصور مان لے، مقذوف سے معافی مانگ لے اور آیندہ کے لیے اس حرکت سے توبہ کرلے، تو آخر کیوں نہ اسے چھوڑ دیا جائے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ خود حکم بیان کرنے کے بعد فرما رہا ہے: اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا .... فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۔ یہ تو ایک عجیب بات ہوگی کہ خدا معاف کردے اور بندے معاف نہ کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ دراصل ت و ب ہ کے تلفظ کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کے احساسِ ندامت اور عزمِ اصلاح اور رُجوع الی الخیر کا نام ہے، اور اس چیز کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے توبہ سے دنیوی سزائیں معاف نہیں ہوتیں بلکہ صرف اخروی سزا معاف ہوتی ہے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو تم انھیں چھوڑ دو، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ توبہ کرلیں گے، میں ان کے حق میں غفور و رحیم ہوں۔ اگر توبہ سے دنیوی سزائیں بھی معاف ہونے لگیں، تو آخر وہ کون سا مجرم ہے جو سزا سے بچنے کے لیے توبہ نہ کرلے گا؟

(۱۱) یہ بھی سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنے الزام کے ثبوت میں شہادت نہ لاسکنا لازماً یہی معنیٰ تو نہیں رکھتا کہ وہ جھوٹا ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا الزام واقعی صحیح ہو اور وہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے صرف ثبوت نہ دے سکنے کی بنا پر فاسق ٹھیرایا جائے، اور وہ بھی عندالناس ہی نہیں، عنداللہ بھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنی آنکھوں سے بھی کسی کو بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو، پھر بھی وہ اس کا چرچا کرنے اور شہادت کے بغیر اس پر الزام عائد کرنے میں گناہ گار ہے۔ شریعتِ الٰہی یہ نہیں چاہتی کہ ایک شخص اگر ایک گوشے میں نجاست لیے بیٹھا ہو تو دوسرا شخص اسے اُٹھا کر سارے معاشرے میں پھیلانا شروع کردے۔ اس نجاست کی موجودگی کا اگر اُس کو علم ہے تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں: یا اُس کو جہاں وہ پڑی ہے وہیں پڑا رہنے دے، یا پھر اس کی موجودگی کا ثبوت دے، تاکہ حکومتِ اسلامی کے حکام اسے صاف کردیں۔ ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اگر وہ پبلک میں چرچا کرے گا تو محدود گندگی کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کا مجرم ہوگا۔ اور اگر وہ قابلِ اطمینان شہادت کے بغیر حکام تک معاملہ لے جائے گا تو حکام اس گندگی کو صاف نہ کرسکیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اس مقدّمے کی ناکامی گندگی کی اشاعت کا سبب بھی بنے گی اور بدکاروں میں جرأت بھی پیدا کردے گی۔ اسی لیے ثبوت اور شہادت کے بغیر قذف کا ارتکاب کرنے والا بہرحال فاسق ہے، خواہ وہ اپنی جگہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۲) حدِّ قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی بہ نسبت ہلکی مار ماری جائے۔ یعنی تازیانے تو ۸۰ ہی ہوں، مگر ضرب اتنی سخت نہ ہونی چاہیے جتنی زانی کو لگائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس الزام کے قصور میں اسے سزا دی جارہی ہے، اس میں اس کا جھوٹا ہونا بہرحال یقینی نہیں ہے۔

(۱۳) تکرارِ قذف کے بارے میں حنفیہ اور جُمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو، اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی۔ اور اگر اجرائے حد کے بعد وہ اپنے سابق الزام ہی کی تکرار کرتا رہے، تو جو حد اسے لگائی جاچکی ہے وہی کافی ہوگی۔ البتہ اگر اجرائے حد کے بعد وہ اس شخص پر ایک نیا الزام زنا عائد کردے تو پھر نئے سرے سے مقدّمہ قائم کیا جائے گا۔ مغیرہؓ بن شعبہ کے مقدّمے میں سزا پانے کے بعد ابوبکرہؓ کھلے بندوں کہتے رہے کہ ”میں شہادت دیتا ہوں کہ مغیرہ نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔“ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ان پر پھر مقدمہ قائم کریں۔ مگر چونکہ وہ سابق الزام ہی کو دُہرا رہے تھے، اس لیے حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اس پر دوسرا مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا، اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے قبول کرلی۔ اس کے بعد فقہا میں اس بات پر قریب قریب اتفاق ہوگیا کہ سزا یافتہ قاذف کو صرف نئے الزام ہی پر پکڑا جاسکتا ہے، سابق الزام کے اعادے پر نہیں۔

Maktaba Tul-Ishaat.com

وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ شُہَدَآءُ اِلَّاۤ اَنۡفُسُہُمۡ
فَشَہَادَۃُ اَحَدِہِمۡ اَرۡبَعُ شَہٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۶﴾
وَ الۡخَامِسَۃُ اَنَّ لَعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَیۡہِ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۷﴾ وَ یَدۡرَؤُا
عَنۡہَا الۡعَذَابَ اَنۡ تَشۡہَدَ اَرۡبَعَ شَہٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ۙ﴿۸﴾
وَ الۡخَامِسَۃَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰہِ عَلَیۡہَاۤ اِنۡ کَانَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۹﴾
وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ وَ اَنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۰﴾ ع

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دُوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچّا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھُوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اُس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچّا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے، تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمھیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)۔

(۱۴) قذفِ جماعت کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پر بھی الزام لگائے، خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں، تو اس پر ایک ہی حدّ لگائی جائے گی، اِلّا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔ اس لیے کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: ''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں۔'' اس سے معلوم ہُوا کہ ایک فرد ہی نہیں، ایک جماعت پر الزام لگانے والا بھی صرف ایک ہی حد کا مستحق ہوتا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ زنا کا کوئی الزام ایسا نہیں ہو سکتا جو کم از کم دو شخصوں پر نہ لگتا ہو۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایک ہی حد کا حکم دیا، عورت پر الزام کے لیے الگ اور مرد پر الزام کے لیے الگ حد کا حکم نہیں دیا۔ بخلاف اس کے، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک جماعت پر الزام لگانے والا خواہ ایک لفظ میں الزام لگائے یا الگ الگ الفاظ میں، اس پر ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔ یہی رائے عثمان البَتّی کی بھی ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ کا قول، جس میں شَعبی اور اَوزاعی بھی ان کے ہم نوا ہیں،

یہ ہے کہ ایک لفظ میں پوری جماعت کو زانی کہنے والا ایک حد کا مستحق ہے، اور الگ الگ الفاظ میں ہر ایک کو کہنے والا ہر ایک کے لیے الگ حد کا مستحق۔

۷ – یہ آیات پچھلی آیات کے کچھ مدّت بعد نازل ہوئی ہیں۔ حدِ قذف کا حکم جب نازل ہوا تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور عورت کی بدچلنی دیکھ کر تو آدمی صبر کر سکتا ہے، گواہ موجود نہ ہوں تو زبان پر قفل چڑھا لے اور معاملے کو نظر انداز کر دے۔ لیکن اگر وہ خود اپنی بیوی کی بدچلنی دیکھ لے تو کیا کرے؟ قتل کر دے تو اُلٹا سزا کا مُستوجِب ہو۔ گواہ ڈھونڈنے جائے تو ان کے آنے تک مجرم کب ٹھیرا رہے گا۔ صبر کرے تو آخر کیسے کرے؟ طلاق دے کر عورت کو رخصت کر سکتا ہے، مگر نہ اس عورت کو کسی قسم کی مادّی یا اخلاقی سزا ملی نہ اس کے آشنا کو۔ اور اگر اسے ناجائز حمل ہو تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ یہ سوال ابتداءً تو حضرت سعدؓ بن عُبادہ نے ایک فرضی سوال کی حیثیت میں پیش کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں اگر خدانخواستہ اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو گواہوں کی تلاش میں نہیں جاؤں گا بلکہ تلوار سے اُسی وقت معاملہ طے کر دوں گا۔ (بخاری و مسلم) لیکن تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ بعض ایسے مُقدّمات عملاً پیش آ گئے جن میں شوہروں نے اپنی آنکھوں سے یہ معاملہ دیکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی شکایت لے گئے۔ عبداللہؓ بن مسعود اور ابنِ عمرؓ کی رِوایات ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (غالباً عُوَیمِر عَجلانی) نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے اور منہ سے بات نکالے تو آپ حدِ قذف جاری کر دیں گے، قتل کر دے تو آپ اسے قتل کر دیں گے، چپ رہے تو غیظ میں مبتلا رہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ اس پر حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! اس مسئلے کا فیصلہ فرما۔ (مسلم، بخاری، ابوداؤد، احمد، نسائی) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ہِلالؓ بن اُمیّہ نے آ کر اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا جسے انھوں نے بچشمِ خود مُلوّث دیکھا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ثبوت لاؤ، ورنہ تم پر حدِ قذف جاری ہو گی۔'' صحابہؓ میں اس پر عام پریشانی پھیل گئی، اور ہِلالؓ نے کہا: اُس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے، میں بالکل صحیح واقعہ عرض کر رہا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ایسا حکم نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ بچا دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری، احمد، ابوداؤد) اس میں جو طریقِ تصفیہ تجویز کیا گیا ہے، اُسے اسلامی قانون کی اصطلاح میں ''لِعان'' کہا جاتا ہے۔

یہ حکم آ جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مقدّمات کا فیصلہ فرمایا، ان کی مفصل رودادیں کُتبِ حدیث میں منقول ہیں اور وہی لِعان کے مفصّل قانون اور ضابطۂ کارروائی کا ماخذ ہیں۔

ہِلالؓ بن اُمیّہ کے مقدّمے کی جو تفصیلات صحاحِ سِتّہ اور مُسندِ احمد اور تفسیر ابنِ جریر میں ابنِ عباس اور انَس بن مالک رضی اللہ عنہما سے منقول ہوئی ہیں، ان میں بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ہِلالؓ اور ان کی بیوی، دونوں عدالتِ نبوی میں حاضر کیے گئے۔ حضورؐ نے پہلے حکمِ خداوندی سنایا، پھر فرمایا: ''خوب سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دُنیا کے عذاب سے زیادہ سخت چیز ہے۔'' ہِلالؓ نے عرض کیا: میں نے اس پر بالکل صحیح الزام لگایا ہے۔ عورت نے کہا: یہ بالکل جھوٹ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ''اچھا، تو اِن دونوں میں مُلاعنت کرائی جائے۔'' چنانچہ پہلے ہِلالؓ اُٹھے اور انھوں نے حکمِ قرآنی کے مطابق قسمیں کھانی شروع کیں۔ نبیؐ اس دَوران میں بار بار فرماتے رہے: ''اللہ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟''

Maktaba Tul Ishaat.com

پانچویں قَسم سے پہلے حاضرین نے ہِلالؓ سے کہا: "خدا سے ڈرو، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ یہ پانچویں قسم تم پر عذاب واجب کر دے گی۔" مگر ہِلالؓ نے کہا: "جس خدا نے یہاں میری پیٹھ بچائی ہے، وہ آخرت میں بھی مجھے عذاب نہیں دے گا۔" یہ کہہ کر انھوں نے پانچویں قسم بھی کھالی۔ پھر عورت اُٹھی اور اس نے بھی قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قَسم سے پہلے اسے بھی روک کر کہا گیا کہ "خدا سے ڈر، آخرت کے عذاب کی بہ نسبت دُنیا کا عذاب برداشت کر لینا آسان ہے۔ یہ آخری قسم تجھ پر عذابِ الٰہی کو واجب کر دے گی۔" یہ سن کر وہ کچھ دیر رُکتی اور جھجکتی رہی۔ لوگوں نے سمجھا، اعتراف کرنا چاہتی ہے۔ مگر پھر کہنے لگی: "میں ہمیشہ کے لیے اپنے قبیلے کو رُسوا نہیں کروں گی۔" اور پانچویں قَسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی اور فیصلہ فرمایا کہ اس کا بچہ (جو اس وقت پیٹ میں تھا) ماں کی طرف منسوب ہوگا، باپ کا نہیں پکارا جائے گا، کسی کو اس پر یا اِس کے بچے پر الزام لگانے کا حق نہ ہوگا، جو اس پر یا اس کے بچّے پر الزام لگائے گا وہ حدِّ قذف کا مستحق ہوگا، اور اِس کو زمانۂ عدّت کے نفقے اور سُکونت کا کوئی حق ہِلالؓ پر حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ طلاق یا وفات کے بغیر شوہر سے جدا کی جا رہی ہے۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ اس کے ہاں جب بچہ ہو تو دیکھو، وہ کس پر گیا ہے۔ اگر اِس اِس شکل کا ہو تو ہِلال کا ہے، اور اگر اس صورت کا ہو تو اُس شخص کا ہے جس کے بارے میں اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ وضعِ حمل کے بعد دیکھا گیا کہ وہ مؤخر الذکر صورت کا تھا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: لولا الایمان (یا بروایتِ دیگر لولا مضٰی من کتاب اللہ) لکان لی ولھا شان، یعنی اگر قَسمیں نہ ہوتیں (یا خدا کی کتاب پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکی ہوتی) تو میں اس عورت سے بُری طرح پیش آتا۔

عُوَیمِر عَجلانیؓ کے مُقدّمے کی رُوداد سَہل بن سعد ساعِدی اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ اور مُسنَدِ احمد میں ملتی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ عُوَیمرؓ اور ان کی بیوی، دونوں مسجدِ نبوی میں بلائے گئے۔ مُلاعَنَت سے پہلے حضورؐ نے ان کو بھی تنبیہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟" جب کسی نے توبہ نہ کی تو دونوں میں مُلاعَنَت کرائی گئی۔ اس کے بعد عُوَیمرؓ نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اب اگر میں اس عورت کو رکھوں تو جھوٹا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے تین طلاقیں دے دیں بغیر اس کے کہ حضورؐ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ سہلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ ان طلاقوں کو حضورؐ نے نافذ فرما دیا اور ان کے درمیان تفریق کرا دی اور فرمایا کہ "یہ تفریق ہے ہر ایسے جوڑے کے معاملے میں جو باہم لِعان کرے۔" اور سنّت یہ قائم ہوگئی کہ لِعان کرنے والے زوجین کو جدا کر دیا جائے، پھر وہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ مگر ابنِ عمرؓ صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ان کے درمیان تفریق کرا دی۔ سہلؓ بن سعد یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عورت حاملہ تھی اور عُوَیمرؓ نے کہا کہ یہ حمل میرا نہیں ہے۔ اس بنا پر بچہ ماں کی طرف منسوب کیا گیا، اور سنّت یہ جاری ہوئی کہ اس طرح کا بچہ ماں سے میراث پائے گا اور ماں ہی اس سے میراث پائے گی۔

ان دو مقدّموں کے علاوہ متعدّد روایات ہم کو کُتبِ حدیث میں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ کن اشخاص کے مقدموں کی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض انھی دونوں مقدموں سے تعلق رکھتی ہوں، مگر بعض میں کچھ دوسرے مقدّمات کا بھی ذکر ہے اور ان سے قانونِ لِعان کے بعض اہم نِکات پر روشنی پڑتی ہے۔

ابنِ عمرؓ ایک مقدمے کی رُوداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زوجین جب لِعان کر چکے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کے درمیان تفریق کر دی۔ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ابنِ جریر) ابنِ عمرؓ کی ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص اور اس کی بیوی کے درمیان لِعان کرایا گیا۔ پھر اس نے حمل سے انکار کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ بچہ صرف ماں کا ہوگا۔ (صحاح ستّہ اور احمد) ابنِ عمرؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ مُلاعَنَت کے بعد حضورؐ نے فرمایا: ''تمھارا حساب اب اللہ کے ذمے ہے، تم میں سے ایک بہرحال جھوٹا ہے۔'' پھر آپؐ نے مرد سے فرمایا: لا سبیل لك علیھا (یعنی اب یہ تیری نہیں رہی۔ نہ تُو اس پر کوئی حق جتا سکتا ہے، نہ کسی قسم کی دست درازی یا دوسری منتقمانہ حرکت اس کے خلاف کرنے کا مجاز ہے)۔ مرد نے کہا: یا رسولؐ اللہ! اور میرا مال؟ (یعنی وہ مہر تو مجھے دلوائیے جو میں نے اسے دیا تھا)۔ فرمایا: لا مال لك، ان کنت صدقت علیھا فھو بما استحللت من فرجھا وان کنت کذبت علیھا فذاك ابعد لك منھا (یعنی مال واپس لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے، اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو وہ مال اُس لذت کا بدل ہے جو تو نے حلال کر کے اس سے اُٹھائی، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی زیادہ دور چلا گیا، وہ اس کی بہ نسبت تجھ سے زیادہ دُور ہے)۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

دارقُطنی نے علی بن ابی طالب اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: ''سنّت یہ مقرر ہو چکی ہے کہ لِعان کرنے والے زوجین پھر کبھی باہم جمع نہیں ہو سکتے'' (یعنی ان کا دوبارہ نکاح پھر کبھی نہیں ہو سکتا)۔ اور دارقُطنی ہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ یہ دونوں پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

قَبیصہ بن ذُؤَیب کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے حمل کو ناجائز قرار دیا، پھر اعتراف کر لیا کہ یہ حمل اُس کا اپنا ہے، پھر وضعِ حمل کے بعد کہنے لگا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے اس پر حدِقذف جاری کی اور فیصلہ کیا کہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ (دارقُطنی، بَیہَقی)

ابنِ عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری ایک بیوی ہے جو مجھے بہت محبُوب ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہے کہ کسی ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی۔ (واضح رہے کہ یہ کِنایہ تھا، جس کے معنیٰ زنا کے بھی ہو سکتے ہیں اور زِنا سے کم تر درجے کی اَخلاقی کمزوری کے بھی)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طلاق دے دے۔ اس نے کہا: مگر میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ فرمایا: تو اسے رکھے رہ! (یعنی آپؐ نے اُس سے اِس کِنایے کی تشریح نہیں کرائی اور اس کے قول کو الزام زنا پر محمول کر کے لِعان کا حکم نہیں دیا)۔ (نَسائی)

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری بیوی نے کالا لڑکا جنا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرا ہے (یعنی محض لڑکے کے رنگ نے اسے شبہے میں ڈالا تھا، ورنہ بیوی پر زنا کا الزام لگانے کے لیے اس کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی)۔ آپؐ نے پوچھا: تیرے پاس کچھ اُونٹ تو ہوں گے۔ اس نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے پوچھا: ان کے رنگ کیا ہیں؟ کہنے لگا: سُرخ۔ آپؐ نے پوچھا: ان میں کوئی خاکستری بھی ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں، بعض ایسے بھی ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ رنگ کہاں سے آیا؟ کہنے لگا: شاید کوئی رَگ کھینچ لے گئی (یعنی ان کے باپ دادا میں سے کوئی اس رنگ کا ہوگا اور اسی کا اثر ان میں آ گیا)۔ فرمایا: ''شاید اس بچے کو بھی کوئی رَگ کھینچ لے گئی'' اور آپؐ نے اسے نفیِ وَلَد (بچے کے نسب سے انکار) کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اجازت نہ دی۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد)

ابو ہریرہؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ لِعان پر کلام کرتے ہوئے فرمایا: ''جو عورت کسی خاندان میں ایسا بچہ گھُسا لائے جو اس خاندان کا نہیں ہے، (یعنی حرام کا پیٹ رکھوا کر شوہر کے سر منڈھ دے) اُس کا اللہ سے کچھ واسطہ نہیں، اللہ اس کو جنت میں ہرگز داخل نہ کرے گا۔ اور جو مرد اپنے بچے کے نسب سے انکار کرے حالانکہ بچہ اس کو دیکھ رہا ہو، اللہ قیامت کے روز اس سے پردہ کرے گا اور اسے تمام اگلی پچھلی خلق کے سامنے رُسوا کر دے گا۔ (ابوداؤد، نسائی، دارمی)

آیتِ لِعان اور یہ روایات و نظائر اور شریعت کے اُصولِ عامہ اسلام میں قانونِ لِعان کے وہ مآخذ ہیں جن کی روشنی میں فقہا نے لِعان کا مفصّل ضابطہ بنایا ہے۔ اس ضابطے کی اہم دفعات یہ ہیں:

(۱) جو شخص بیوی کی بدکاری دیکھے اور لِعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قتل کا مرتکب ہو جائے، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس کو بطورِ خود حد جاری کرنے کا حق نہ تھا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے فعل پر کوئی مواخذہ ہوگا، بشرطیکہ اُس کی صداقت ثابت ہو جائے (یعنی یہ کہ فی الواقع اس نے زنا ہی کے ارتکاب پر یہ فعل کیا)۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن رَاہویہؒ کہتے ہیں کہ اُسے اس امر کے دو گواہ لانے ہوں گے کہ قتل کا سبب یہی تھا۔ مالکیہ میں سے ابن القاسم اور ابنِ حبیب اس پر مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ زانی جسے قتل کیا گیا وہ شادی شدہ ہو، ورنہ کنوارے زانی کو قتل کرنے پر اُس سے قِصاص لیا جائے گا۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اس کو قصاص سے صرف اُس صورت میں معاف کیا جائے گا جب کہ وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے، یا مقتول مرنے سے پہلے خود اس امر کا اعتراف کر چکا ہو کہ وہ اس کی بیوی سے زنا کر رہا تھا، اور مزید یہ کہ مقتول شادی شدہ ہو۔ (نَیلُ الأوْطَار، ج ۶، ص ۲۲۸)

(۲) لِعان گھر بیٹھے آپس ہی میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔

(۳) لِعان کے مطالبے کا حق صرف مرد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت بھی عدالت میں اس کا مطالبہ کر سکتی ہے، جب کہ شوہر اُس پر بدکاری کا الزام لگائے یا اس کے بچے کا نسب تسلیم کرنے سے انکار کرے۔

(۴) کیا لِعان ہر زوج اور زوجہ کے درمیان ہو سکتا ہے یا اس کے لیے دونوں میں کچھ شرائط ہیں؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس کی قسم قانونی حیثیت سے معتبر ہو اور جس کو طلاق دینے کا اختیار ہو، وہ لِعان کر سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صرف عاقل اور بالغ ہونا اہلیتِ لِعان کے لیے کافی ہے، خواہ زوجین مسلم ہوں یا کافر، غلام ہوں یا آزاد، مقبول الشہادت ہوں یا نہ ہوں، اور مسلم شوہر کی بیوی مسلمان ہو یا ذِمّی۔ قریب قریب یہی رائے امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی بھی ہے۔ مگر حَنفِیَّہ کہتے ہیں کہ لِعان صرف ایسے آزاد مسلمان زوجین ہی میں ہو سکتا ہے جو قذف کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔ اگر عورت اور مرد دونوں کافر ہوں، یا غلام ہوں، یا قَذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ ہوں تو ان کے درمیان لِعان نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں اگر عورت کبھی اس سے پہلے حرام یا مُشتبَہ طریقے پر کسی مرد سے مُلَوّث ہو چکی ہو، تب بھی لِعان دُرست نہ ہوگا۔ یہ شرطیں حنفیہ نے اس بنا پر لگائی ہیں کہ ان کے نزدیک لِعان کے قانون اور قذف کے قانون میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ غیر آدمی اگر قذف کا مرتکب ہو تو اس کے لیے حد ہے، اور شوہر اس کا ارتکاب کرے تو وہ لِعان

کر کے چھوٹ سکتا ہے۔ باقی تمام حیثیتوں سے لِعان اور قذف ایک ہی چیز ہے۔ علاوہ بریں حَنَفِیَہ کے نزدیک چونکہ لِعان کی قسمیں شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے وہ کسی ایسے شخص کو اُس کی اجازت نہیں دیتے جو شہادت کا اہل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں حَنَفِیَہ کا مسلک کمزور ہے اور صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؒ نے فرمائی ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے قذفِ زوجہ کے مسئلے کو آیتِ قذف کا ایک جُز نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے لیے الگ قانون بیان کیا ہے، اس لیے اس کو قانونِ قذف کے ضمن میں لا کر وہ تمام شرائط اس میں شامل نہیں کی جا سکتیں جو قذف کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ آیت لِعان کے الفاظ آیتِ قذف کے الفاظ سے مختلف ہیں اور دونوں الگ الگ حکم ہیں، اس لیے لِعان کا قانون آیتِ لِعان ہی سے اخذ کرنا چاہیے نہ کہ آیتِ قذف سے۔ مثلاً آیتِ قذف میں سزا کا مستحق وہ شخص ہے جو پاک دامن عورتوں (مُحْصَنات) پر الزام لگائے۔ لیکن آیتِ لِعان میں پاک دامن بیوی کی شرط کہیں نہیں ہے۔ ایک عورت چاہے کبھی گناہ گار بھی رہی ہو، اگر بعد میں وہ توبہ کر کے کسی شخص سے نکاح کر لے اور پھر اس کا شوہر اُس پر ناحق الزام لگائے تو آیتِ لعان یہ نہیں کہتی کہ اس عورت پر تہمت رکھنے کی یا اس کی اولاد کے نسب سے انکار کر دینے کی شوہر کو کھلی چھٹی دے دو، کیونکہ اس کی زندگی کبھی داغ دار رہ چکی ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم وجہ یہ ہے کہ قذفِ زوجہ اور قذفِ اجنبیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ان دونوں کے بارے میں قانون کا مزاج ایک نہیں ہو سکتا۔ غیر عورت سے آدمی کا کوئی واسطہ نہیں۔ نہ جذبات کا، نہ عزت کا، نہ معاشرت کا، نہ حُقوق کا، اور نہ نسل و نسب کا۔ اُس کے چال چلن سے اگر ایک آدمی کو کوئی بڑی سے بڑی باوقعت دلچسپی ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ معاشرے کو بداَخلاقی سے پاک دیکھنے کا جوش اُسے لاحق ہو۔ اِس کے برعکس اپنی بیوی سے آدمی کا تعلق ایک طرح کا نہیں، کئی طرح کا ہے اور بہت گہرا ہے۔ وہ اس کے نسب اور اس کے مال اور اس کے گھر کی امانت دار ہے۔ اس کی زندگی کی شریک ہے۔ اس کے رازوں کی امین ہے۔ اس کے نہایت گہرے اور نازک جذبات اس سے وابستہ ہیں۔ اُس کی بدچلنی سے آدمی کی غیرت اور عزت پر، اُس کے مفاد پر، اور اُس کی آیندہ نسل پر سخت چوٹ لگتی ہے۔ یہ دونوں معاملے آخر ایک کس حیثیت سے ہیں کہ دونوں کے لیے قانون کا مزاج ایک ہی ہو۔ کیا ایک ذِمّی، یا ایک غلام، یا ایک سزا یافتہ آدمی کے لیے اُس کی بیوی کا معاملہ کسی آزاد اہلِ شہادت مسلمان کے معاملے سے کچھ بھی مختلف یا اہمیت اور نتائج میں کچھ بھی کم ہے؟ اگر وہ اپنی آنکھوں سے کسی کے ساتھ اپنی بیوی کو ملوث دیکھ لے، یا اس کو یقین ہو کہ اس کی بیوی غیر سے حاملہ ہے، تو کون سی معقول وجہ ہے کہ اسے لِعان کا حق نہ دیا جائے؟ اور یہ حق اس سے سلب کرنے کے بعد ہمارے قانون میں اس کے لیے اور کیا چارۂ کار ہے؟ قرآنِ مجید کا منشا تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ جوڑوں کو اُس پیچیدگی سے نکالنے کی ایک صورت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں بیوی کی حقیقی بدکاری یا ناجائز حمل سے ایک شوہر، اور شوہر کے جھوٹے الزام یا اولاد کے نسب سے بے جا انکار کی بدولت ایک بیوی مبتلا ہو جائے۔ یہ ضرورت صرف اہلِ شہادت آزاد مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے، اور قرآن کے الفاظ میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کو صرف انھی تک محدود کرنے والی ہو۔ رہا یہ اِستِدلال کہ قرآن نے لِعان کی قسموں کو شہادت قرار دیا ہے اس لیے شہادت کی شرائط یہاں عائد ہوں گی، تو اس کا تقاضا پھر یہ ہے کہ اگر عادل مقبول الشہادت شوہر قسمیں کھا لے اور عورت قسم کھانے سے پہلوتہی کرے تو عورت کو رجم کر دیا جائے، کیونکہ اس کی بدکاری پر شہادت قائم ہو چکی ہے۔ لیکن یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

عجیب بات ہے کہ اِس صورت میں حنفیہ رجم کا حکم نہیں لگاتے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ خود بھی ان قسموں کو بعینہٖ شہادت کی حیثیت نہیں دیتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود قرآن بھی ان قسموں کو شہادت کے لفظ سے تعبیر کرنے کے باوجود شہادت نہیں قرار دیتا، ورنہ عورت کو چار کے بجائے آٹھ قسمیں کھانے کا حکم دیتا۔

(۵) لِعان محض کنایے اور استعارے یا اظہارِ شک وشبہ پر لازم نہیں آتا، بلکہ صرف اُس صورت میں لازم آتا ہے جب کہ شوہر صریح طور پر زنا کا الزام عائد کرے، یا صاف الفاظ میں بچے کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ امام مالکؒ اور لَیث بن سعدؒ اس پر یہ مزید شرط بڑھاتے ہیں کہ قسم کھاتے وقت شوہر کو یہ کہنا چاہیے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بیوی کو زنا میں مبتلا دیکھا ہے۔ لیکن یہ قید بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی اصل نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔

(۶) اگر الزام لگانے کے بعد شوہر قسم کھانے سے پہلوتہی کرے تو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ اسے قید کر دیا جائے گا، اور جب تک وہ لعان نہ کرے یا اپنے الزام کا جھوٹا ہونا نہ مان لے، اسے نہ چھوڑا جائے گا، اور جھوٹ مان لینے کی صورت میں اس کو حدِّ قذف لگائی جائے گی۔ اس کے برعکس امام مالکؒ، شافعیؒ، حسن بن صالح اور لَیث بن سعد کی رائے یہ ہے کہ لعان سے پہلوتہی کرنا خود ہی اقرارِ کِذب ہے، اس لیے حدِّ قذف واجب آ جاتی ہے۔

(۷) اگر شوہر کے قسم کھا چکنے کے بعد عورت لِعان سے پہلوتہی کرے، تو حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ لِعان نہ کرے، یا پھر زنا کا اقرار نہ کر لے۔ دوسری طرف مذکورۂ بالا ائمہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اسے رجم کر دیا جائے گا۔ ان کا اِستدلال قرآن کے اس ارشاد سے ہے کہ عورت سے عذاب صرف اس صورت میں دفع ہو گا جب کہ وہ بھی قسم کھا لے۔ اب چونکہ وہ قسم نہیں کھاتی، اس لیے لامحالہ وہ عذاب کی مستحق ہے۔ لیکن اس دلیل میں کمزوری یہ ہے کہ قرآن یہاں ''عذاب'' کی نوعیت تجویز نہیں کرتا بلکہ مطلقاً سزا کا ذکر کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سزا سے مراد یہاں زنا ہی کی سزا ہو سکتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ زنا کی سزا کے لیے قرآن نے صاف الفاظ میں چار گواہوں کی شرط لگائی ہے۔ اس شرط کو محض ایک شخص کی چار قسمیں پورا نہیں کر دیتیں۔ شوہر کی قسمیں اس بات کے لیے تو کافی ہیں کہ وہ خود قذف کی سزا سے بچ جائے اور عورت پر لِعان کے احکام مُترتّب ہو سکیں، مگر اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ان سے عورت پر زنا کا الزام ثابت ہو جائے۔ عورت کا جوابی قسمیں کھانے سے انکار شبہ ضرور پیدا کرتا ہے اور بڑا قوی شبہ پیدا کر دیتا ہے، لیکن شبہات پر حُدود جاری نہیں کی جا سکتیں۔ اس معاملے کو مرد کی حدِّ قذف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا قذف تو ثابت ہے، جبھی تو اس کو لِعان پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس عورت پر زنا کا الزام ثابت نہیں ہے، کیونکہ وہ اُس کے اپنے اقرار یا چار عینی شہادتوں کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۸) اگر لعان کے وقت عورت حاملہ ہو تو امام احمد کے نزدیک لِعان بجائے خود اس بات کے لیے کافی ہے کہ مرد اس حمل سے بَری الذمہ ہو جائے اور بچہ اُس کا قرار نہ پائے، قطعِ نظر اِس سے کہ مرد نے حمل کو قبول کرنے سے انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مرد کا الزامِ زنا اور نفیِ حمل دونوں ایک چیز نہیں ہیں، اس لیے مرد جب تک حمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے صریح طور پر انکار نہ کرے وہ الزامِ زنا کے باوجود اُسی کا قرار پائے گا، کیونکہ عورت کے زانیہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو حمل

بھی زنا ہی کا ہو۔

(۹) امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دورانِ حمل میں مرد کو نفیِ حمل کی اجازت دیتے ہیں اور اس بنیاد پر لِعان کو جائز رکھتے ہیں۔ مگر امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مرد کے الزام کی بنیاد زِنا نہ ہو بلکہ صرف یہ ہو کہ اس نے عورت کو ایسی حالت میں حاملہ پایا ہے جب کہ اُس کے خیال میں حمل اُس کا نہیں ہو سکتا، تو اس صورت میں لعان کے معاملے کو وضعِ حمل تک ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات کوئی بیماری حمل کا شبہ پیدا کر دیتی ہے اور درحقیقت حمل ہوتا نہیں ہے۔

(۱۰) اگر باپ بچے کے نسب سے انکار کرے تو بالاتفاق لِعان لازم آتا ہے۔ اور اس امر میں بھی اتفاق ہے کہ ایک دفعہ بچے کو قبول کر لینے کے بعد (خواہ یہ قبول کر لینا صریح الفاظ میں ہو یا قبولیت پر دلالت کرنے والے افعال، مثلاً پیدائش پر مبارک باد لینے یا بچے کے ساتھ پدرانہ شفقت برتنے اور اس کی پرورش سے دلچسپی لینے کی صورت میں) پھر باپ کو انکارِ نسب کا حق نہیں رہتا، اور اگر کرے تو حدِ قذف کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ باپ کو کس وقت تک انکارِ نسب کا حق حاصل ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر شوہر اُس زمانے میں گھر پر موجود رہا ہے جب کہ بیوی حاملہ تھی، تو زمانۂ حمل سے لے کر وضعِ حمل تک اس کے لیے انکار کا موقع ہے، اس کے بعد وہ انکار کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ اگر وہ غائب تھا اور اس کے پیچھے ولادت ہوئی تو جس وقت اُسے علم ہو، وہ انکار کر سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر پیدائش کے بعد ایک دو روز کے اندر وہ انکار کرے تو لعان کر کے وہ بچے کی ذمہ داری سے بَری ہو جائے گا، لیکن اگر سال دو سال بعد انکار کرے تو لِعان ہو گا مگر وہ بچے کی ذمہ داری سے بَری نہ ہو سکے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ولادت کے بعد، یا ولادت کا علم ہونے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر باپ کو انکارِ نسب کا حق ہے، اس کے بعد یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ مگر یہ چالیس دن کی قید بے معنیٰ ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ نے فرمائی ہے کہ ولادت کے بعد یا اس کا علم ہونے کے بعد ایک دو روز کے اندر ہی انکارِ نسب کیا جا سکتا ہے، اِلّا یہ کہ اس میں کوئی ایسی رکاوٹ ہو جسے معقول رکاوٹ تسلیم کیا جا سکے۔

(۱۱) اگر شوہر طلاق دینے کے بعد مُطلّقہ بیوی پر زِنا کا الزام لگائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک لِعان نہیں ہو گا بلکہ اس پر قذف کا مقدّمہ قائم کیا جائے گا، کیونکہ لعان زوجین کے لیے ہے اور مُطلّقہ عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ طلاقِ رَجعی ہو اور مدتِ رُجوع کے اندر وہ الزام لگائے۔ مگر امام مالکؒ کے نزدیک یہ قذف صرف اس صورت میں ہے جب کہ کسی حمل یا بچے کا نسب قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ درمیان میں نہ ہو۔ ورنہ مرد کو طلاقِ بائن کے بعد بھی لِعان کا حق حاصل ہے، کیونکہ وہ عورت کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود ایک ایسے بچے کی ذمّہ داری سے بچنے کے لیے لِعان کر رہا ہے جسے وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ قریب قریب یہی رائے امام شافعیؒ کی بھی ہے۔

(۱۲) لِعان کے قانونی نتائج میں سے بعض مُتّفَق عَلَیہ ہیں، اور بعض میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

مُتّفَق عَلَیہ نتائج یہ ہیں: عورت اور مرد، دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے۔ مرد بچے کے نسب کا منکر ہو تو بچہ صرف ماں کا قرار پائے گا۔ نہ باپ کی طرف منسوب ہو گا نہ اس سے میراث پائے گا۔ ماں اس کی وارث ہو گی اور وہ ماں کا وارث ہو گا۔ عورت کو زانیہ اور اس کے بچے کو وَلَد الزنا کہنے کا کسی کو حق نہ ہو گا، خواہ لِعان کے وقت اس کے حالات ایسے ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ

جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں[8] وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں[9]۔ اس واقعے کو اپنے

کیوں نہ ہوں کہ لوگوں کو اس کے زانیہ ہونے میں شک نہ رہے۔ جو شخص لعان کے بعد اس پر یا اس کے بچے پر سابق الزام کا اعادہ کرے گا، وہ حدّ کا مستحق ہو گا۔ عورت کا مہر ساقط نہ ہو گا۔ عورت دورانِ عدّت میں مرد سے نفقہ اور مسکن پانے کی حق دار نہ ہو گی۔ عورت اس مرد کے لیے حرام ہو جائے گی۔

اختلاف دو مسئلوں میں ہے: ایک یہ کہ لعان کے بعد عورت اور مرد کی علیٰحدگی کیسے ہو گی؟ دوسرے یہ کہ لعان کی بنا پر علیٰحدہ ہو جانے کے بعد کیا ان دونوں کا پھر مل جانا ممکن ہے؟ پہلے مسئلے میں امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس وقت مرد لعان سے فارغ ہو جائے، اسی وقت فرقت آپ سے آپ واقع ہو جاتی ہے، خواہ عورت جوابی لعان کرے یا نہ کرے۔ امام مالک، لَیث بن سَعد اور زُفر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں جب لِعان سے فارغ ہوں تب فُرقت واقع ہوتی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ لعان سے فرقت آپ ہی آپ واقع نہیں ہو جاتی بلکہ عدالت کے تفریق کرانے سے ہوتی ہے۔ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر، ورنہ حاکمِ عدالت ان کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔ دوسرے مسئلے میں امام مالک، ابو یوسف، زُفر، سُفیان ثَوری، اسحاق بن رَاہَوَیہ، شافعی، احمد بن حنبل اور حَسَن بن زیاد کہتے ہیں کہ لعان سے جو زوجین جدا ہوئے ہیں، وہ پھر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں، دوبارہ وہ باہم نکاح کرنا بھی چاہیں تو کسی حال میں نہیں کر سکتے۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی بھی ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن مُسَیَّب، ابراہیم نَخَعی، شَعبی، سعید بن جُبَیر، ابو حنیفہ اور محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر شوہر اپنا جھوٹ مان لے اور اس پر حدِّ قذف جاری ہو جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرنے والی چیز لِعان ہے۔ جب تک وہ اس پر قائم رہیں، حرمت بھی قائم رہے گی۔ مگر جب شوہر اپنا جھوٹ مان کر سزا پا گیا تو لِعان ختم ہو گیا اور حُرمت بھی اُٹھ گئی۔

۸ - اشارہ ہے اُس الزام کی طرف جو حضرت عائشہؓ پر لگایا گیا تھا۔ اس کو اِفک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے۔ اِفک کے معنیٰ ہیں: بات کو اُلٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افترا کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنیٰ سراسر بہتان کے ہیں۔

یہاں سے اُس واقعے پر کلام شروع ہوتا ہے جو اِس سورہ کے نُزول کا اصل سبب تھا۔ دیباچے میں ہم اس کا ابتدائی قصہ خود حضرت عائشہؓ کی رِوایت سے نقل کر آئے ہیں۔ بعد کی داستان بھی انھی کی زبان سے سنیے۔ فرماتی ہیں: "اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری

مدت میں آپؐ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور اُمِّ رُومانؓ (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کُن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: عائشہ! مجھے تمھارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو اُمید ہے کہ اللہ تمھاری بَراءت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ رسولؐ اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انھوں نے فرمایا: بیٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ ہی کچھ کہیں۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی: آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے، اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں ــــــ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں ــــــ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی ــــــ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی ــــــ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اُس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا: اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی، کہ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ (اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جب کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ان کے بیٹے بِن یَمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا۔ سورۂ یوسف، رُکوع ۱۰ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے)۔ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری براءت ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتّٰی کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپؐ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے، اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دُور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ! اللہ نے تمھاری بَراءت نازل فرما دی، اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں۔ (یعنی آیت ۱۱ سے ۲۱ تک) میری والدہ نے کہا کہ اُٹھو اور رسولؐ اللہ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا: میں نہ اِن کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔'' (واضح رہے کہ یہ کسی ایک روایت کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں جتنی روایتیں حضرت عائشہؓ سے اس سلسلے میں مروی ہیں، ان سب کو جمع کر کے ہم نے ان کا خلاصہ نکال لیا ہے)۔

اس موقع پر یہ نکتۂ لطیف بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہؓ کی براءت بیان کرنے سے پہلے پورے ایک رُکوع میں زنا اور قذف اور لِعان کے احکام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل اس حقیقت پر مُتنبّہ فرمایا ہے کہ زنا کے الزام کا معاملہ

Maktaba Tul Ishaat.com

شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے۔[10] جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا،

کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے جسے نُقلِ محفل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ الزام لگانے والے کا الزام اگر سچّا ہے تو وہ گواہی لائے۔ زانی اور زانیہ کو انتہائی ہولناک سزا دی جائے گی۔ اگر جھوٹا ہے تو الزام لگانے والا اس لائق ہے کہ اُس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے برسا دیے جائیں، تاکہ آیندہ وہ یا کوئی اور ایسی جرأت نہ کرے۔ اور یہ الزام اگر شوہر لگائے تو عدالت میں لعان کر کے اُسے معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اس بات کو زبان سے نکال کر کوئی شخص بھی خیریت سے بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ مسلم معاشرہ ہے جسے دُنیا میں بھلائی قائم کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اِس میں نہ زنا ہی تفریح بن سکتی ہے اور نہ اس کے چرچے ہی خوش باشی اور دل لگی کے موضوع قرار پا سکتے ہیں۔

۹ – روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جو یہ افواہیں پھیلا رہے تھے۔ عبداللہ بن اُبَیّ، زید بن رفاعہ (جو غالباً رفاعہ بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)، مِسطَحؓ بن اُثاثہ، حسّانؓ بن ثابت اور حَمنہؓ بنتِ جَحش۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے، جو غلطی اور کمزوری سے اِس فتنے میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سوا اور جو لوگ اِس گناہ میں کم و بیش مبتلا ہوئے، ان کا ذکر حدیث و سیرت کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

۱۰ – مطلب یہ ہے کہ گھبراؤ نہیں، منافقین نے اپنی دانست میں تو یہ بڑے زور کا وار تم پر کیا ہے، مگر اِن شاءاللہ یہ انھی پر اُلٹا پڑے گا اور تمھارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، منافقین نے یہ شوشہ اس لیے چھوڑا تھا کہ مسلمانوں کو اُس میدان میں شکست دیں جو اُن کے تفوّق کا اصل میدان تھا، یعنی اخلاق، جس میں فائق ہونے ہی کی وجہ سے وہ ہر میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لیے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی مسلمانوں کے لیے سببِ خیر بنا دیا۔ اس موقع پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان والوں نے، اور تیسری طرف عام اہلِ ایمان نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اُس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابط و متحمل، کیسے انصاف پسند اور کس درجے کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اشارہ اُن لوگوں کی گردنیں اُڑا دینے کے لیے کافی تھا جنھوں نے آپؐ کی عزت پر یہ حملہ کیا تھا، مگر مہینے بھر تک آپؐ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو صرف اُن تین مسلمانوں کو، جن پر جرمِ قذف ثابت تھا، حد لگوا دی، منافقین کو پھر بھی کچھ نہ کہا۔ حضرت ابوبکرؓ کا اپنا رشتہ دار، جس کی اور جس کے گھر بھر کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل و جگر پر یہ تیر چلاتا رہا، مگر اللہ کے اُس نیک بندے نے اس پر بھی نہ برادری کا تعلق منقطع کیا، نہ اس کی اور اس کے خاندان کی مدد ہی بند کی۔ ازواجِ مطہّراتؓ میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرہ برابر حصّہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ درجے میں بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا۔ حتّٰی کہ حضرت زینبؓ کی سگی بہن حَمنہؓ بنتِ جَحش محض اُن کی خاطر اُن کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انھوں نے سوکن کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہا۔

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْ لَآ اِذْ

اور جس شخص نے اِس کی ذمّہ داری کا بڑا حصّہ اپنے سر لیا[11]، اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت

حضرت عائشہؓ کی اپنی رِوایت ہے کہ ازواجِ رسولؐ اللہ میں سب سے زیادہ زینبؓ ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر واقعۂ اِفک کے سلسلے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ عائشہ کے متعلق تم کیا جانتی ہو، تو انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! خدا کی قسم! میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسّانؓ بن ثابت نے اُنھیں بدنام کرنے میں نمایاں حصّہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا، تو یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دشمنِ اسلام شعرا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا اُن لوگوں کا حال جن کا اس معاملے سے براہِ راست تعلق تھا۔ اور عام مسلمانوں کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ان کی بیوی نے جب ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے: ''ایوب کی ماں! اگر تم عائشہ کی جگہ اُس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟'' بولیں: ''خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی۔'' حضرت ابو ایوبؓ نے کہا: ''تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوانؓ کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا، صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔'' اِس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اَخلاقی تفوّق پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا، اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین و احکام اور تمدّنی ضوابط میں بڑے اہم اضافوں کا موجب بن گیا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل ہوئیں جن پر عمل کر کے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برائیوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے، اور پیدا ہو جائیں تو ان کا بروقت تدارُک کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں اس میں خیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں ہیں، جو کچھ اللہ بتاتا ہے وہی کچھ جانتے ہیں، اس کے ماسوا آپؐ کا علم اُتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہو سکتا ہے۔ ایک مہینے تک آپؐ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے۔ کبھی خادمہ سے پوچھتے تھے، کبھی ازواجِ مطہراتؓ سے، کبھی حضرت علیؓ سے اور کبھی حضرت اُسامہؓ سے۔ آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کرو، اور نہیں کیا تو امید ہے کہ اللہ تمھاری بے گناہی ثابت کر دے گا۔ اگر آپؐ عالم الغیب ہوتے تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقینِ توبہ کیوں ہوتی؟ البتہ جب وحیِ خداوندی نے حقیقت بتا دی تو آپؐ کو وہ علم حاصل ہو گیا جو مہینے بھر تک حاصل نہ تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے مسلمانوں کو اُس غُلو اور مبالغے سے بچانے کا انتظام فرما دیا جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملے میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے۔

Maktaba Tul-Ishaat.com

سَمِعۡتُمُوۡهُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِهِمۡ خَيۡرًا ۙ وَّقَالُوۡا
هٰذَاۤ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۲﴾ لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ

تم لوگوں نے اسے سُنا تھا، اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا[12]
اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے[13]؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟

بعید نہیں کہ مہینے بھر تک وحی نہ بھیجنے میں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو۔ اوّل روز ہی وحی آ جاتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوسکتا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۹۵ تا ۵۹۸)

۱۱ - یعنی عبداللہ بن اُبَیّ، جو اس الزام کا اصل مصنف اور فتنے کا اصل بانی تھا۔ بعض رِوایات میں غلطی سے حضرت حَسّانؓ بن ثابت کو اس آیت کا مِصداق بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلط فہمی ہے، ورنہ حضرت حَسّانؓ کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابلِ ذکر تک نہ تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا جھوٹ، بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی اُمیّہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِس آیت کا مِصداق قرار دیا۔ بخاری، طَبَرانی اور بَیْہَقی میں ہِشام بن عبدالملک اُمَوی کا یہ قول منقول ہے کہ اَلَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَهٗ کے مصداق علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا سرے سے اس فتنے میں کوئی حصّہ ہی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انھوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشان دیکھا تو حضورؐ کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں آپ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں۔ آپ چاہیں تو عائشہ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اُس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہؓ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرتؐ کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

۱۲ - دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے لوگوں، یا اپنی مِلّت اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، اور اس ذومعنیٰ فقرے کے استعمال میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جو صورتِ معاملہ حضرت عائشہؓ اور صَفوانؓ بن مُعَطّل کے ساتھ پیش آئی تھی، وہ یہی تو تھی کہ قافلے کی ایک خاتون (قطعِ نظر اس سے کہ وہ رسول کی بیوی تھیں) اتفاق سے پیچھے رہ گئی تھیں اور قافلے ہی کا ایک آدمی، جو خود اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا، انھیں دیکھ کر اپنے اُونٹ پر ان کو بٹھا لایا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ، یہ دونوں تنہا ایک دوسرے کو پا کر گناہ میں مبتلا ہو گئے، تو اس کا یہ کہنا اپنے ظاہر الفاظ کے پیچھے دو اور مفروضے بھی رکھتا ہے: ایک یہ کہ قائل (خواہ مرد ہو یا عورت) اگر خود اس جگہ ہوتا تو کبھی گناہ کیے بغیر نہ رہتا، کیونکہ وہ اگر گناہ سے رُکا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے صِنفِ مقابل کا کوئی فرد اِس طرح تنہائی میں ہاتھ نہ آ گیا، ورنہ ایسے نادر موقع کو وہ چھوڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جس معاشرے سے وہ تعلق رکھتا ہے، اس کی اخلاقی حالت کے متعلق اس کا گمان یہ ہے کہ یہاں کوئی عورت بھی ایسی

نہیں ہے اور نہ کوئی مرد ایسا ہے جسے اس طرح کا کوئی موقع پیش آ جائے اور وہ گناہ سے باز رہ جائے۔ یہ تو اُس صورت میں ہے جب کہ معاملہ محض ایک مرد اور ایک عورت کا ہو۔ اور بالفرض اگر وہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہوں، اور عورت جو اتفاقاً قافلے سے بچھڑ گئی تھی، اُس مرد کے کسی دوست، یا رشتہ دار یا ہمسایے، یا واقف کار کی بیوی، بہن، یا بیٹی ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس کے معنٰی پھر یہ ہو جاتے ہیں کہ کہنے والا خود اپنی ذات کے متعلق بھی اور اپنے معاشرے کے متعلق بھی ایسا سخت گِھناؤنا تصور رکھتا ہے جسے شرافت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ کون بھلا آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے کسی دوست یا ہمسایے یا واقف کار کے گھر کی کوئی عورت اگر اتفاق سے کہیں بھولی بھٹکی اُسے راستے میں مل جائے تو وہ پہلا کام بس اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے ہی کا کرے گا، پھر کہیں اُسے گھر پہنچانے کی تدبیر سوچے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ہزار گنا زیادہ سخت تھا۔ خاتون کوئی اور نہ تھیں، رسولؐ اللہ کی بیوی تھیں، جنھیں ہر مسلمان اپنی ماں سے بڑھ کر احترام کے لائق سمجھتا تھا، جنھیں اللہ نے خود ہر مسلمان پر ماں کی طرح حرام قرار دیا تھا۔ مرد نہ صرف یہ کہ اسی قافلے کا ایک آدمی، اسی فوج کا ایک سپاہی اور اسی شہر کا ایک باشندہ تھا، بلکہ وہ مسلمان تھا، اُن خاتون کے شوہر کو اللہ کا رسول اور اپنا ہادی و پیشوا مانتا تھا، اور ان کے فرمان پر جان قربان کرنے کے لیے جنگِ بدر جیسے خطرناک معرکے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں تو اس قول کا ذہنی پَس منظر گھناؤنے پن کی اُس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے بڑھ کر کسی گندے تخیل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مسلم معاشرے کے جن افراد نے یہ بات زبان سے نکالی یا اسے کم از کم شک کے قابل خیال کیا، انھوں نے خود اپنے نفس کا بھی بہت بُرا تصور قائم کیا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو بھی بڑے ذلیل اَخلاق و کردار کا مالک سمجھا۔

۱۳ – یعنی یہ بات تو قابلِ غور تک نہ تھی۔ اسے تو سنتے ہی ہر مسلمان کو سراسر جھوٹ اور کِذب و افترا کہہ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے، کوئی شخص یہاں یہ سوال کرے کہ جب یہ بات تھی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے کیوں نہ اوّل روز ہی جُھٹلا دیا اور کیوں انھوں نے اسے اتنی اہمیّت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر اور باپ کی پوزیشن عام آدمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک شوہر سے بڑھ کر کوئی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتا، اور ایک شریف و صالح بیوی کے متعلق کوئی صحیح الدماغ شوہر لوگوں کے بہتانوں پر فی الواقع بدگمان نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کی بیوی پر الزام لگا دیا جائے تو وہ اس مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اسے بہتان کہہ کر رَدّ کر بھی دے تو کہنے والوں کی زبان نہ رکے گی، بلکہ وہ اس پر ایک اور رَدَا یہ چڑھائیں گے کہ بیوی نے میاں صاحب کی عقل پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے، سب کچھ کر رہی ہے اور میاں یہ سمجھتے ہیں کہ میری بیوی بڑی پاک دامن ہے۔ ایسی ہی مشکل ماں باپ کو پیش آتی ہے۔ وہ غریب اپنی بیٹی کی عِصمت پر صریح جھوٹے الزام کی تردید میں اگر زبان کھولیں بھی تو بیٹی کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی۔ کہنے والے یہی کہیں گے کہ ماں باپ ہیں، اپنی بیٹی کی حمایت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہی چیز تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور اُمّ رُومانؓ کو اندر ہی اندر غم سے گھلائے دے رہی تھی۔ ورنہ حقیقت میں کوئی شک ان کو لاحق نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطبے ہی میں صاف فرما دیا تھا کہ میں نے نہ اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں،

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝۱۳ وَ لَوْ لَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِیْ مَاۤ اَفَضْتُمْ
فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۱۴ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا
لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا ۖۗ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ ۝۱۵

اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں[۱۴]۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آلیتا۔ (ذرا غور تو کرو، اُس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جب کہ تمھاری ایک زبان سے دُوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے متعلق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

جس کے متعلق یہ الزام لگایا جا رہا ہے۔

۱۴ – ’’اللہ کے نزدیک‘‘ یعنی اللہ کے قانون میں، یا اللہ کے قانون کے مطابق۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو الزام بجائے خود جھوٹا تھا، اس کا جھوٹ ہونا اس بات پر مبنی نہ تھا کہ یہ لوگ گواہ نہیں لائے ہیں۔

اس جگہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہاں الزام کے غلط ہونے کی دلیل اور بنیاد محض گواہوں کی غیر موجودگی کو ٹھیرایا جا رہا ہے، اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی صرف اس وجہ سے اس کو صریح بہتان قرار دو کہ الزام لگانے والے چار گواہ نہیں لائے ہیں۔ یہ غلط فہمی اُس صورتِ واقعہ کو نگاہ میں نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جو فی الواقع وہاں پیش آئی تھی۔ الزام لگانے والوں نے الزام اس وجہ سے نہیں لگایا تھا کہ انھوں نے، یا ان میں سے کسی شخص نے وہ بات دیکھی تھی جو وہ زبان سے نکال رہے تھے، بلکہ صرف اس بنیاد پر اتنا بڑا الزام تصنیف کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہؓ قافلے سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوانؓ بعد میں ان کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قافلے میں لے آئے۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی بھی اس موقع پر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا اس طرح پیچھے رہ جانا، معاذ اللہ، کسی ساز باز کا نتیجہ تھا۔ ساز باز کرنے والے اس طریقے سے تو ساز باز نہیں کیا کرتے کہ سالارِ لشکر کی بیوی چپکے سے قافلے کے پیچھے ایک شخص کے ساتھ رہ جائے اور پھر وہی شخص اس کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دن دہاڑے، ٹھیک دوپہر کے وقت لیے ہوئے علانیہ لشکر کے پڑاؤ پر پہنچے۔ یہ صورتِ حال خود ہی ان دونوں کی معصومیت پر دلالت کر رہی تھی۔ اس حالت میں اگر الزام لگایا جا سکتا تھا تو صرف اِس بنیاد پر ہی لگایا جا سکتا

وَلَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ قُلۡتُمۡ مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبۡحٰنَكَ
هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِهٖۤ اَبَدًا اِنۡ كُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ
الَّذِيۡنَ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِيۡعَ الۡفَاحِشَةُ فِى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ
فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ

کیوں نہ اسے سُنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ” ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سُبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔“ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمھیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم[15] ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے، وہ دُنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں[16]، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے[17]۔ اگر اللہ کا فضل اور

تھا کہ کہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی معاملہ دیکھا ہو۔ ورنہ قرائن، جن پر ظالموں نے الزام کی بِنا رکھی تھی، کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ رکھتے تھے۔

۱۵ – اِن آیات سے، اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ ” مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا“ یہ قاعدۂ کُلِّیّہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تمام معاملات کی بنا حُسنِ ظن پر ہونی چاہیے، اور سُوءِ ظن صرف اُس حالت میں کیا جانا چاہیے جب کہ اس کے لیے کوئی ثبوتی وایجابی بنیاد ہو۔ اُصول یہ ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے، جب تک کہ اس کے مجرم ہونے یا اس پر جرم کا شبہ کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو۔ اور ہر شخص اپنی بات میں سچّا ہے جب تک کہ اس کے ساقط الاعتبار ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

۱۶ – موقع و محل کے لحاظ سے تو آیت کا براہِ راست مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انھیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بد اخلاقی پھیلانے اور اُمّتِ مسلمہ کے اخلاق پر دھبّا لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں، وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن آیت کے الفاظ فُحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اِطلاق عملاً بدکاری کے اڈّے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بد اخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اُکسانے والے قصوں، اشعار،

Maktaba-Tul-Ishaat.com

ع ۲/۸ النصف

اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَّبِعۡ خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاۡمُرُ
بِالۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنۡكُمۡ
مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۱﴾

اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے، ع (تو یہ چیز جو ابھی تمھارے اندر پھیلائی گئی تھی، بدترین نتائج دکھا دیتی)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فُحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔[18] مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔[19]

گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلَب اور ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آ جاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں، دُنیا میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعتِ فُحش کے اِن تمام ذرائع و وسائل کا سَدِّ باب کرے۔ اس کے قانونِ تعزیرات میں ان تمام افعال کو مُستلزِمِ سزا، قابلِ دست اندازیِ پولیس ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں پبلک کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

۱۷ – یعنی تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں، کتنے افراد کو متأثر کرتے ہیں، اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے، انھیں پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ دراصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

۱۸ – یعنی شیطان تو تمھیں برائی کی نجاستوں میں آلودہ کرنے کے لیے اس طرح تُلا بیٹھا ہے کہ اگر اللہ اپنے

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٢﴾

تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مَقدِرت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انھیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صِفت یہ ہے کہ وہ غَفُور اور رحیم ہے۔[۲۰]

فضل و کرم سے تم کو نیک و بد کی تمیز نہ سمجھائے اور تم کو اصلاح کی تعلیم و توفیق سے نہ نوازے تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے بل بُوتے پر پاک نہ ہو سکے۔

۱۹ — یعنی اللہ کی یہ مَشیّت کہ وہ کسے پاکیزگی بخشے، اندھا دُھند نہیں ہے بلکہ علم کی بنا پر ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس میں بھلائی کی طلب موجود ہے اور کون برائی کی رغبت رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنی خلوتوں میں جو باتیں کرتا ہے، انھیں اللہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں بھی جو کچھ سوچا کرتا ہے، اللہ اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ اسی براہِ راست علم کی بنا پر اللہ فیصلہ کرتا ہے کہ کسے پاکیزگی بخشے اور کسے نہ بخشے۔

۲۰ — حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مذکورۂ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرما دی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھالی کہ وہ آیندہ کے لیے مِسطَح بن اُثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، کیونکہ انھوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ اُن احسانات ہی کی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر اُن پر اور اُن کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس کو سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا: بلٰی واللّٰہ انا نحب ان تغفرلنا یا ربنا، ''واللہ! ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔'' چنانچہ آپ نے پھر مِسطحؓ کی مدد شروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ بعض اور صحابہؓ نے بھی کھائی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصہ لیا ہے، ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔ اس آیت کے نُزول کے بعد اِن سب نے اپنے عہد سے رُجوع کر لیا۔ اس طرح وہ تلخی آناً فاناً دور ہو گئی جو اس فتنے نے پھیلا دی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کر لے جس میں بھلائی ہے، تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفّارہ ادا کرنا چاہیے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿ۙ۲۳﴾ یَّوۡمَ تَشۡہَدُ عَلَیۡہِمۡ اَلۡسِنَتُہُمۡ وَ

جو لوگ پاک دامن، بے خبر،[۲۱] مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بُھول نہ جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے

یا نہیں۔ فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کَفّارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفّارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے اِستدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کَفّارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر وذٰلك کفارتہٗ۔ (جو شخص کسی بات کی قسم کھا لے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، تو اسے وہی بات کرنی چاہیے جو بہتر ہے، اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفّارہ ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے (البقرہ، آیت ۲۲۵، المائدہ، آیت ۸۹)، جسے اس آیت نے نہ تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے۔ اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کے لیے تو ضرور فرمایا ہے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کَفّارہ واجب نہیں ہے۔ رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھا لینے سے جو گناہ ہوتا ہے، وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے دُھل جاتا ہے۔ اس ارشاد کا مقصد کفّارۂ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے، چنانچہ دوسری حدیث اس کی توضیح کر دیتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہٖ (جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفّارہ ادا کر دے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے، اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفّارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے، اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص، حاشیہ ۴۶)

۲۱ — اصل میں لفظ غَافِلَات استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹے نہیں جانتیں، جن کے دل پاک ہیں، جنھیں کچھ خبر نہیں کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگا بیٹھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا اُن سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو ''موبقات'' (تباہ کُن) ہیں۔ اور طَبَرانی میں حضرت حُذَیفَہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: قذف المحصنۃ یھدم عمل مأۃ سنۃ، ''ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے۔''

اَیۡدِیۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ یَوۡمَئِذٍ یُّوَفِّیۡهِمُ اللّٰهُ دِیۡنَهُمُ
الۡحَقَّ وَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ الۡمُبِیۡنُ ﴿۲۵﴾ اَلۡخَبِیۡثٰتُ لِلۡخَبِیۡثِیۡنَ
وَ الۡخَبِیۡثُوۡنَ لِلۡخَبِیۡثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیۡنَ وَ الطَّیِّبُوۡنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ
اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا یَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِیۡمٌ ﴿۲۶﴾ ع

اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔[۲۱ الف] اس دن اللہ وہ بدلہ انھیں بھرپور دے دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا۔

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں،[۲۲] ان کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم ع

۲۱، الف۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۵۵، حٰم السجدہ، حاشیہ ۲۵۔

۲۲ ۔ اس آیت میں ایک اُصولی بات سمجھائی گئی ہے کہ خبیثوں کا جوڑ خبیثوں ہی سے لگتا ہے، اور پاکیزہ لوگ پاکیزہ لوگوں ہی سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک بدکار آدمی صرف ایک ہی برائی نہیں کیا کرتا ہے، کہ اور تو سب حیثیتوں سے وہ بالکل ٹھیک ہو مگر بس ایک بُرائی میں مبتلا ہو۔ اس کے تو اطوار، عادات، خصائل، ہر چیز میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں جو اس کی ایک بڑی برائی کو سہارا دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی میں یکایک کوئی ایک برائی کسی ازغیبی گولے کی طرح پھٹ پڑے، جس کی کوئی علامت اس کے چال چلن میں اور اس کے رنگ ڈھنگ میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تم ہر وقت انسانی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اب کس طرح تمھاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایک پاکیزہ انسان، جس کی ساری زندگی سے تم واقف ہو، کسی ایسی عورت سے نباہ کر لے اور برسوں نہایت محبّت کے ساتھ نباہ کیے چلا جاتا رہے جو زناکار ہو۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بدکار بھی ہو اور پھر اس کی رفتار، گفتار، انداز، اطوار، کسی چیز سے بھی اس کے برے لچھن ظاہر نہ ہوتے ہوں؟ یا ایک شخص پاکیزہ نفس اور بلند اخلاق بھی ہو اور پھر ایسی عورت سے خوش بھی رہے جس کے یہ لچھن ہوں؟ یہ بات یہاں اس لیے سمجھائی جا رہی ہے کہ آیندہ اگر کسی پر کوئی الزام لگایا جائے تو لوگ اندھوں کی طرح اسے بس سنتے ہی نہ مان لیا کریں، بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ کس پر الزام لگایا جا رہا ہے، کیا الزام لگایا جا رہا ہے، اور وہ کس طرح وہاں چسپاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ بات لگتی ہوئی ہو تو آدمی ایک حد تک اسے مان سکتا ہے، یا کم از کم ممکن اور متوقع سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک انوکھی بات، جس کی صداقت کی تائید کرنے والے آثار

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى

اے[۲۳] لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ

کہیں نہ پائے جاتے ہوں، صرف اس لیے کیسے مان لی جائے گی کہ کسی احمق یا خبیث نے اسے منہ سے خارج کر دیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ بُری باتیں برے لوگوں کے لیے ہیں (یعنی وہ ان کے مستحق ہیں) اور بھلی باتیں بھلے لوگوں کے لیے ہیں، اور بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ باتیں ان پر چسپاں ہوں جو بدگو اشخاص ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بُرے اعمال بُرے ہی لوگوں کو سجتے ہیں اور نیک اعمال نیک ہی لوگوں کو سزاوار ہیں، نیک لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ بُرے اعمال ان پر چسپاں ہوں جو منسوب کرنے والے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بری باتیں بُرے ہی لوگوں کے کرنے کی ہیں اور بھلے لوگ بھلی باتیں ہی کیا کرتے ہیں، بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں کریں جیسی یہ افترا پرداز لوگ کر رہے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں ان سب تفسیروں کی گنجائش ہے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر پہلا مفہوم جو ذہن میں آتا ہے وہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور موقع و محل کے لحاظ سے بھی جو معنویت اُس میں ہے وہ ان دوسرے مفہومات میں نہیں ہے۔

۲۳ – سورہ کے آغاز میں جو احکام دیے گئے تھے، وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں برائی رُونما ہو جائے تو اس کا تدارُک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دیے جا رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے برائیوں کی پیدائش ہی کو روک دیا جائے اور تمدُّن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے اُن اسباب کا سدِّ باب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رُونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ واقعۂ اِفک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشخیص میں زوجۂ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نُفُوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے، اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دِید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے، عورتوں کو ایک قریبی حلقے کے سوا غیر مَحرَم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے، قَحبہ گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے، مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مُجَرَّد نہ رہنے دیا جائے، اور لونڈی غلاموں تک کے تجرّد کا مداوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی، اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مُجَرَّد رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے، اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، اُن کے کان، ان کی زبانیں، ان کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (scandal) میں پڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ

تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَ تُسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَہۡلِہَا ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۷﴾
فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِیۡہَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡہَا حَتّٰی یُؤۡذَنَ لَکُمۡ ۚ

گھر والوں کی رضا نہ لے لو[24] اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔[25] پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی

تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ شریعتِ الٰہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ اُن اسباب کا بھی خاتمہ کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اُس برائی میں مبتلا ہونے پر اُکساتے ہوں، یا اس کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسبابِ جرم، محرکاتِ جرم اور رسائل و ذرائعِ جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے، تاکہ آدمی کو اصل جرم کی عین سرحد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹہلتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (prosecutor) ہی نہیں ہے بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو برائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

۲۴ – اصل میں لفظ حَتّٰی تَسۡتَاۡنِسُوۡا استعمال ہوا ہے، جس کو عُموماً لوگوں نے حَتّٰی تَسۡتَاۡذِنُوۡا کے معنیٰ میں لے لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حَتّٰی تَسۡتَاۡذِنُوۡا فرمایا جاتا تو آیت کے معنیٰ یہ ہوتے کہ ’’لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔‘‘ اس طرزِ تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حَتّٰی تَسۡتَاۡنِسُوۡا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادہ اُنس ہے جو اُردو زبان میں بھی اُسی معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جس میں عَرَبی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادّے سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اس کے معنیٰ ہوں گے: اُنس معلوم کرنا، یا اپنے سے مانوس کرنا۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ’’لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کر لو، یا ان کا اُنس معلوم نہ کر لو‘‘، یعنی یہ معلوم نہ کر لو کہ تمھارا آنا صاحبِ خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ’’اجازت لینے‘‘ کے بجائے ’’رضا لینے‘‘ کے الفاظ سے کیا ہے، کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

۲۵ – جاہلیّت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حییتم صَبَاحًا، حییتم مَسَاءً (صبح بخیر، شام بخیر) کہتے ہوئے بے تکلّف ایک دوسرے کے گھر میں گُھس جاتے تھے، اور بسا اوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اُصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیہ (privacy) کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیے میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلل انداز

Maktaba Tul Ishaat.com

ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے، انھیں ہم ذیل میں نمبروار بیان کرتے ہیں:

(۱) حضورؐ نے تخلیے کے اس حق کو صرف گھروں میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا، جس کی رُو سے دوسرے کے گھروں میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتّٰی کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثَوبانؓ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا دخل البصر فلا اذن، ''جب نگاہ داخل ہوگئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا؟'' (ابوداؤد) حضرت ہُزَیل بن شُرَحْبِیل کہتے ہیں: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہوکر اجازت مانگنے لگا۔ حضورؐ نے اسے فرمایا: ھٰکذا عنك، فانما الاستیذان من النظر، ''پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اسی لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے۔'' (ابوداؤد) حضورؐ کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے، کیونکہ اُس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپؐ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوکر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے۔ (ابوداؤد) حضرت اَنسؓ خادمِ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضورؐ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپؐ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے۔ (ابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار، ''جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی، وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔'' (ابوداؤد) صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لو ان امرأ اطلع علیك بغیر اذن فخذفته محصاة ففقأت علیه ما کان علیك من جناح، ''اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں۔'' اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے: من اطلع دار قوم بغیر اذنھم ففقؤا عینه فقد ھدرت عینه، ''جس نے کسی کے گھر میں جھانکا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ مؤاخذہ نہیں۔'' امام شافعیؒ نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حَنفیَہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جب کہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھُس آئے اور گھر والوں کے روکنے پر وہ باز نہ آئے اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کش مکش اور مزاحمت میں اُس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عُضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۸۵)

(۲) فقہا نے نگاہ ہی کے حکم میں سَماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیے کے حق میں بے جا مداخلت ہے۔

(۳) اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی

اجازت طلب کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے، کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا: اتحب ان تراھا عریانۃ، ''کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟'' (ابنِ جَرِیر عن عطاء بن یَسار مُرسَلاً) عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے: علیکم ان تستاذنوا علی امھاتکم واخواتکم، ''اپنی ماں بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔'' (ابنِ کثیر) بلکہ ابنِ مسعودؓ تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ اُن کی بیوی زینب کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آ رہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں۔ (ابنِ جَرِیر)

(۴) اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مُستثنیٰ ہے کہ کسی کے گھر پر اچانک کوئی مصیبت آ جائے، مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور گھس آئے۔ ایسے مواقع پر مدد کے لیے بلا اجازت جا سکتے ہیں۔

(۵) اوّل اوّل جب اِستیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا: أألج (کیا میں گھس آؤں؟) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی روضہ سے فرمایا: یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اُٹھ کر اسے بتا کہ یوں کہنا چاہیے: السلام علیکم أأدخل؟ (ابنِ جَرِیر، ابوداؤد) جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرتؐ کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے عرض کیا: ''میں ہوں۔'' آپؐ نے دو تین مرتبہ فرمایا: ''میں ہوں؟ میں ہوں؟'' یعنی اس ''میں ہوں'' سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو۔ (ابوداؤد) ایک صاحب کَلَدَہ بن حَنْبَل ایک کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئے اور سلام کے بغیر یونہی جا بیٹھے۔ آپؐ نے فرمایا: باہر جاؤ، اور ''السلام علیکم'' کہہ کر اندر آؤ۔ (ابوداؤد) استیذان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کرے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق رِوایت ہے کہ وہ حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے: السلام علیکم یا رسول اللہ، ایدخل عمر۔ (ابوداؤد) اجازت لینے کے لیے حضوؐر نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا: اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد) یہی حضوؐر کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عُبادہ کے ہاں گئے اور ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت سعدؓ اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! میں آپؐ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا۔ (ابوداؤد، احمد) یہ تین مرتبہ پکارنا پے در پے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھیر ٹھیر کر پکارنا چاہیے، تاکہ صاحبِ خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

(۶) اجازت یا تو خود صاحبِ خانہ کی معتبر ہے، یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذمہ دار قسم کا فرد۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنۡ قِيۡلَ لَكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا هُوَ اَزۡكٰى لَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ
عَلِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ مَسۡكُوۡنَةٍ
فِيۡهَا مَتَاعٌ لَّكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۲۹﴾ قُلۡ
لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ‌ؕ ذٰلِكَ

جائے،[۲۶] اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے[۲۷] اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ البتہ تمھارے لیے اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمھارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو،[۲۸] تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں[۲۹] اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں،[۳۰] یہ

کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آجاؤ، تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

(۷) اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جم کر کھڑے ہو جانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ اِستیذان کے بعد صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

۲۶ – یعنی کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ صاحبِ خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر وہ کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کر دیتی کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

۲۷ – یعنی اس پر برا نہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشغولیت ملاقات میں مانع ہو تو معذرت کر دے۔ اِرۡجِعُوۡا (واپس ہو جاؤ) کے حکم کا فقہا نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھیر کر اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

۲۸ – اس سے مراد ہیں: ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دکانیں، مسافر خانے وغیرہ، جہاں لوگوں کے لیے داخلے

کی عام اجازت ہو۔

۲۹ - اصل میں الفاظ ہیں: یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ۔ غَضّ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور پست کرنے کے۔ غَضِّ بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہ نیچی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس حکم کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا، اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔ یہ مفہوم "نظر بچانے" سے ٹھیک ادا ہوتا ہے، یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو، اس سے نظر ہٹا لی جائے، قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچی کرے یا کسی اور طرف اسے بچا لے جائے۔ مِنْ اَبْصَارِھِمْ میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق و سباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے، وہ ہے مردوں کا عورتوں کو دیکھنا، یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا، یا فحش مناظر پر نگاہ جمانا۔

کتاب اللہ کے اس حکم کی جو تشریح سنت نے کی ہے، اس کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی مَحرَم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زِنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے۔ لگاوٹ کی بات چیت زبان کا زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کا زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کا زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہو چکتی ہیں تب شرم گاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد) حضرت بُرَیدَہؓ کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لك الاولی ولیست لك الاخرۃ، "اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری معاف نہیں۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی) حضرت جریر بن عبداللہ بَجَلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو۔ (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نَسائی) عبداللہؓ بن مسعود رِوایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان النظر سھم من سھام ابلیس مسموم، من ترکھا مخافتی ابدلتہ ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ، "نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا، میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (طَبَرانی) ابواُمامہؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ما من مسلم ینظر الی محاسن امرأۃ ثم یغض بصرہ الا اخلف اللّٰہ لہ عبادۃ یجد حلاوتھا، "جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حُسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔" (مُسنَدِ احمد) امام جعفر صادقؒ اپنے والد امام محمد باقرؒ سے اور وہ حضرت

Maktaba Tul Ishaat.com

جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی فضل بن عباسؓ (جو اس وقت ایک نوجوان لڑکے تھے) مَشعرِحرام سے واپسی کے وقت حضورؐ کے ساتھ اُونٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضلؓ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسری طرف پھیر دیا۔ (ابوداؤد) اسی حجۃ الوداع کا قصّہ ہے کہ قبیلۂ خَثعم کی ایک عورت راستے میں حضورؐ کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباسؓ نے اُس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمِذی)

(۲) اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غَضِّ بصر کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال؟ یہ اِستِدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعے کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آ سکتے ہیں جب کہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے۔ اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رائج ہونے کے باوجود بہرحال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہٰذا محض غَضِّ بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مُستَلزِم ہے۔ اور واقعے کے اعتبار سے یہ اس لیے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا، اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعۂ اِفک کے متعلق حضرت عائشہؓ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے، اُس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آ کر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صَفوانؓ بن مُعَطَّل وہاں سے گزرا تو دُور سے کسی کو پڑے دیکھ کر اُدھر آ گیا۔ فعرفنی حین رانی و کان قد رانی قبل الحجاب فاستیقظت باسترجاعه حین عرفنی فخمرت وجھی بجلبابی، "وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا، کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے پہچان کر جب اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانک لیا۔" (بخاری، مسلم، احمد، ابنِ جَریر، سیرت ابنِ ہِشام) ابوداؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُمِّ خَلّاد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر اس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بعض صحابہؓ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اس وقت بھی تمھارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اس اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں: ان ارزأ ابنی فلن ارزأ حیائی، "میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیا تو نہیں کھو دی۔" ابوداؤد ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست دی۔ حضورؐ نے پوچھا: یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اُس نے عرض کیا: عورت ہی کا ہے۔ فرمایا: "عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے

رنگ لیے ہوتے۔" رہے حج کے موقع کے وہ دو واقعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، تو وہ عہدِ نبویؐ میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ احرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالتِ احرام مکے کی طرف جا رہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں، اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں۔ (ابوداؤد، باب فی المحرمۃ تغطّی وجھھا)

(۳) غضِّ بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو۔ اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ کی رِوایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم نے لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: انظر الیھا فانہ احری ان یُّؤدم بینکما، "اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تمھارے درمیان مُوافقت ہوگی۔" (احمد، تِرمذِی، نَسائی، ابنِ ماجہ، دارمی) ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انظر الیھا فان فی اعین الانصار شیئًا، "لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے۔" (مسلم، نَسائی، احمد) جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا خطب احدکم المرأۃ فَقَدَرَ اَن یریٰ منھا بعض ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل، "تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا خواستگار ہو تو حتی الامکان اُسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اُس کے ساتھ نکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو۔" (احمد، ابوداؤد) مُسندِ احمد میں ابوحُمَیدہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فلا جناح علیہ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مُضایقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی سے فقہا نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تفتیشِ جرائم کے سلسلے میں کسی مُشتبَہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا، یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

(۴) غضِّ بصر کے حکم کا منشا یہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا تنظر المرأۃ الی عورۃ المرأۃ، "کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے، اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔" (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذِی) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: لا تنظر الی فخذ حی ولا میت، "کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو۔" (ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

۳۰- شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد محض ناجائز شہوت رانی سے پرہیز ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے پرہیز بھی ہے۔ مرد کے لیے ستر کے حُدود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائے ہیں۔ عورۃ الرجل ما بین سرتہ الی رکبتہ، "مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے۔" (دارقطنی، بَیہقی)

Maktaba Tul Ishaat.com

اَزۡکٰی لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَ قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ یَغۡضُضۡنَ
مِنۡ اَبۡصَارِہِنَّ وَ یَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَہُنَّ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا

اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے۔

اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں[۳۱]، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں[۳۲]، اور[۳۳] اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں[۳۴] بجز اُس کے

اِس حصۂ جسم کو بیوی کے سوا کسی کے سامنے قصداً کھولنا حرام ہے۔ حضرت جَرْہَد اَسلمیؓ، جو اصحابِ صُفَّہ میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا: اما علمت ان الفخذ عورۃ، ''کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے؟'' (ترمذی، ابوداؤد، مؤطّا) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تبرز (یا لا تکشف) فخذك، ''اپنی ران کبھی نہ کھولو۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ) صرف دوسروں کے سامنے ہی نہیں، تنہائی میں بھی ننگا رہنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے: ایاکم والتعرّی فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الٰی اھلہٖ فاستحیوھم واکرموھم، ''خبردار! کبھی ننگے نہ رہو، کیونکہ تمھارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے)، سوائے اس وقت کے جب تم رفعِ حاجت کرتے ہو، یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو، لہٰذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام ملحوظ رکھو۔'' (ترمذی) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: احفظ عورتك الا من زوجتك او ما ملکت یمینك، ''اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو۔'' سائل نے پوچھا: اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا: فاللّٰہ تبارك وتعالٰی احق ان یستحیا منہ، ''تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔'' (ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ)

۳۱- عورتوں کے لیے بھی غَضِّ بصر کے احکام وہی ہیں جو مَردوں کے لیے ہیں، یعنی انھیں قصداً غیر مردوں کو نہ دیکھنا چاہیے، نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے، اور دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مرد کو دیکھنے کے معاملے میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اور حضرت مَیمونہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ آ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں بیویوں سے فرمایا: احتجبا منہ، ''ان سے پردہ کرو۔'' بیویوں نے عرض کیا: یا رسول اللّٰہ الیس اعمٰی لا یبصرنا ولا یعرفنا، ''یا رسولؐ اللہ! کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے۔'' فرمایا: افعمیا وان انتما، الستما تبصرانہٖ، ''کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟'' حضرت اُمِّ سَلَمہؓ تصریح کرتی ہیں کہ ذٰلك بعد ان امر بالحجاب، ''یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آ چکا تھا۔'' (احمد، ابوداؤد، ترمذی) اور اس کی تائید مُؤطّا کی یہ

روایت کرتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اُس سے پردہ کیا۔ کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں، یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا؟ جواب میں اُمّ المومنین نے فرمایا: لکنی انظر الیہ، ''میں تو اسے دیکھتی ہوں۔'' دوسری طرف ہمیں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ملتی ہے کہ ۷ھ میں حبشیوں کا وفد مدینے آیا اور اس نے مسجدِ نبوی کے احاطے میں ایک تماشا کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا۔ (بخاری، مسلم، احمد) تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فاطمہؓ بنتِ قیس کو جب اُن کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدّت کہاں گزاریں۔ پہلے حضورؐ نے فرمایا: اُمّ شریک انصاریہ کے ہاں رہو۔ پھر فرمایا: ''ان کے ہاں میرے صحابہ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مال دار اور فیّاض خاتون تھیں، بکثرت لوگ اُن کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں)، لہٰذا تم ابنِ اُمّ مکتوم کے ہاں رہو، وہ اندھے آدمی ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکو گی۔'' (مسلم، ابوداؤد) اِن روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی مردوں کے عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں ہے۔ ایک مجلس میں آمنے سامنے بیٹھ کر دیکھنا ممنوع ہے۔ راستہ چلتے ہوئے یا دور سے کوئی جائز قسم کا کھیل تماشا دیکھتے ہوئے مردوں پر نگاہ پڑنا ممنوع نہیں ہے۔ اور کوئی حقیقی ضرورت پیش آ جائے تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دیکھنے میں مُضایقہ نہیں ہے۔ امام غزالیؒ اور ابنِ حجر عَسقلانیؒ نے بھی روایات سے قریب قریب یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ شوکانی نَیْل الاَوطار میں ابنِ حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''جواز کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں، اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مرد ان کو نہ دیکھیں، مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے۔'' (ج ۶، ص ۱۰۱) تاہم یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں اطمینان سے مردوں کو گھوریں اور ان کے حُسن سے آنکھیں سینکیں۔

۳۲ - یعنی ناجائز شہوت رانی سے بھی پرہیز کریں، اور اپنا ستر دوسروں کے سامنے کھولنے سے بھی۔ اس معاملے میں عورتوں کے لیے بھی وہی احکام ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ لیکن عورت کے ستر کے حُدود مردوں سے مختلف ہیں۔ نیز عورت کا ستر مردوں کے لیے الگ ہے اور عورتوں کے لیے الگ۔

مردوں کے لیے عورت کا ستر ہاتھ اور منہ کے سوا اُس کا پورا جسم ہے جسے شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد، حتّٰی کہ باپ اور بھائی کے سامنے بھی نہ کھلنا چاہیے، اور عورت کو ایسا باریک یا چست لباس بھی نہ پہننا چاہیے جس سے بدن اندر سے جھلکے یا بدن کی ساخت نمایاں ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اُن کی بہن حضرت اسماؓ بنتِ ابی بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ حضورؐ نے فوراً منہ پھیر لیا اور فرمایا: یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح لہا ان یرٰی منہا الا ھٰذا وھٰذا واشار الٰی وجھہٖ وکفیہ، ''اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا اُس کے جسم کا کوئی حصّہ نظر آئے۔'' (ابوداؤد) اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابنِ جَریر نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ان کے ہاں ان کے اَخیافی بھائی عبداللہ بن الطُّفَیل کی صاحبزادی آئی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ گھر میں تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ میری بھتیجی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ وَلَا

جو خود ظاہر ہو جائے[۳۵]، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں[۳۶]۔ وہ اپنا

آپؐ نے فرمایا: اذا عرکت المرأۃ لم یحل لھا ان تظھر الا وجھھا والا ما دون ھٰذا وقبض علٰی ذراع نفسہ وترک بین قبضتہ وبین الکف مثل قبضۃ اخرٰی، ''جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ ظاہر کرے اپنے منہ کے سوا اور اپنے ہاتھ کے سوا، اور ہاتھ کی حد آپؐ نے خود اپنی کلائی پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بتائی کہ آپؐ کی مٹھی اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی کی جگہ اور باقی تھی۔'' اس معاملے میں صرف اتنی رعایت ہے کہ اپنے محرّم رشتہ داروں (مثلاً باپ بھائی وغیرہ) کے سامنے عورت اپنے جسم کا اُتنا حصہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جیسے آٹا گوندھتے ہوئے آستینیں اُوپر چڑھا لینا، یا گھر کا فرش دھوتے ہوئے پائینچے کچھ اُوپر کر لینا۔

اور عورت کے لیے عورت کے ستر کے حُدود وہی ہیں جو مرد کے لیے مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برہنہ رہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصّوں کا ڈھانکنا فرض نہیں ہے۔

۳۳ - یہ بات نگاہ میں رہے کہ شریعتِ الٰہی عورتوں سے صرف اُتنا ہی مطالبہ نہیں کرتی جو مردوں سے اس نے کیا ہے، یعنی نظر بچانا اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، بلکہ وہ اُن سے کچھ اور مطالبے بھی کرتی ہے جو اس نے مردوں سے نہیں کیے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں عورت اور مرد یکساں نہیں ہیں۔

۳۴ - ''بناؤ سنگھار'' ہم نے ''زینت'' کا ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے دوسرا لفظ آرایش بھی ہے۔ اس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے: خوش نما کپڑے، زیور، اور سر، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی مختلف آرایشیں جو بالعُموم عورتیں دُنیا میں کرتی ہیں، جن کے لیے موجودہ زمانے میں make up کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار کس کو نہ دکھایا جائے، اِس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۳۵ - اِس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مُبہم بنا دیا ہے، ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے۔ پہلے فقرے میں ارشاد ہوا ہے کہ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَهُنَّ، ''وہ اپنی آرایش و زیبایش کو ظاہر نہ کریں''۔ اور دوسرے فقرے میں اِلَّا بول کر اس حکمِ نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ ہے مَا ظَهَرَ مِنۡهَا'' جو کچھ اس آرایش و زیبایش میں سے ظاہر ہو، یا ظاہر ہو جائے''۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمایش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اُڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا) یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہرحال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے، اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہرحال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اس پر خدا کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حسن بصریؒ، ابنِ سِیرین اور ابراہیم نَخعی نے بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے مَا ظَهَرَ مِنۡهَا

کا مطلب لیا ہے: ما یظھرہ الانسان علی العادۃ الجاریۃ (جسے عادتاً انسان ظاہر کرتا ہے)، اور پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرائشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منہ کو مِسّی اور سرمے اور سُرخی پاؤڈر سے، اور اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی چھلے اور چوڑیوں اور کنگن وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہائے حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، جلد ۳، صفحہ ۳۸۸ - ۳۸۹) لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ مَا ظَهَرَ کے معنٰی مَا یُظْهِرُ عَرَبی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ ''ظاہر ہونے'' اور ''ظاہر کرنے'' میں کھلا ہوا فرق ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر ''ظاہر کرنے'' سے روک کر ''ظاہر ہونے'' کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو ''ظاہر کرنے'' کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور اُن رِوایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں حکمِ حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں، اور حکمِ حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب، تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکامِ حجاب کی ہے۔

۳۶ - زمانۂ جاہلیّت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں، جن کی گرہ جُوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کا ایک حصّہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینے کا بالائی حصّہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اور پیچھے دو دو تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں۔ (تفسیر کَشّاف، جلد ۲، صفحہ ۹۰۔ ابنِ کثیر، جلد ۳، صفحہ ۲۸۳ - ۲۸۴) اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹّا رائج کیا گیا، جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج کل کی صاحبزادیوں کی طرح بس اُسے بل دے کر گلے کا ہار بنا لیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ، سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں۔ اہلِ ایمان خواتین نے قرآن کا یہ حکم سنتے ہی فوراً جس طرح اس کی تعمیل کی، اس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سورۂ نور نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انھوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اُٹھی اور کسی نے اپنا کمر پٹّا کھول کر اور کسی نے چادر اُٹھا کر فوراً اس کا دوپٹّا بنایا اور اوڑھ لیا۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت جتنی عورتیں مسجدِ نبویؐ میں حاضر ہوئیں، سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ مزید تفصیل یہ بتاتی ہیں کہ عورتوں نے باریک کپڑے چھوڑ کر اپنے موٹے موٹے کپڑے چھانٹے اور ان کے دوپٹے بنائے۔ (ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۴۔ ابوداؤد، کتاب اللباس)

یہ بات کہ دوپٹا باریک کپڑے کا نہ ہونا چاہیے، ان احکام کے مزاج اور مقصد پر غور کرنے سے خود ہی آدمی کی

Maktaba Tul Ishaat.com

يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ

بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اِن لوگوں کے سامنے:[۳۷] شوہر، باپ، شوہروں کے باپ،[۳۸] اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے،[۳۹] بھائی،[۴۰] بھائیوں کے بیٹے،[۴۱]

سمجھ میں آ جاتی ہے۔ چنانچہ انصار کی خواتین نے حکم سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا منشا کس طرح کے کپڑے کا دوپٹا بنانے سے پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بھی صرف لوگوں کے فہم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ خود اس کی تصریح فرما دی۔ دِحیَہ کلبیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک ململ (قَباطی) آئی۔ آپؐ نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور فرمایا: ایک حصّہ پھاڑ کر اپنا کُرتا بنا لو اور ایک حصّہ اپنی بیوی کو دوپٹا بنانے کے لیے دے دو، مگر ان سے کہہ دینا کہ تجعل تحتہ ثوبًا لا یصفھا ”اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لیں، تاکہ جسم کی ساخت اندر سے نہ جھلکے۔“ (ابوداؤد، کتاب اللباس)

۳۷- یعنی جس حلقے میں ایک عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے رہ سکتی ہے، وہ اِن لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہیں، خواہ وہ رشتے دار ہوں یا اجنبی، بہرحال ایک عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آئے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے فقرے میں جو حکم دیا گیا تھا، اس کا مطلب یہاں کھول دیا گیا ہے کہ اس محدود حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہوں، ان کے سامنے ایک عورت کو اپنی آرایش قصداً یا بے پروائی کے ساتھ خود نہ ظاہر کرنی چاہیے، البتہ جو ان کی کوشش کے باوجود یا ان کے ارادے کے بغیر ظاہر ہو جائے، یا جس کا چھپانا ممکن نہ ہو، وہ اللہ کے ہاں معاف ہے۔

۳۸- اصل میں لفظ اٰبَآء استعمال ہوا ہے، جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا پَردادا اور نانا پَرنانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی دَدھیال اور ننھیال، اور اپنے شوہر کی دَدھیال اور ننھیال کے اِن سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آ سکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خُسر کے سامنے آ سکتی ہے۔

۳۹- بیٹوں میں پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب شامل ہیں۔ اور اس معاملے میں سگے سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہارِ زینت کر سکتی ہے جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

۴۰- ”بھائیوں“ میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے، بھائی سب شامل ہیں۔

۴۱- بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہے، یعنی ان کے پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

اَوۡ بَنِیۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیۡنَ

بہنوں کے بیٹے[۴۲]، اپنے میل جول کی عورتیں[۴۳]، اپنے مملوک[۴۴]، وہ زیردست مرد

۴۲- یہاں چونکہ رشتہ داروں کا حلقہ ختم ہو رہا ہے اور آگے غیر رشتہ دار لوگوں کا ذکر ہے، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے تین مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے، کیونکہ ان کو نہ سمجھنے سے متعدد اُلجھنیں واقع ہوتی ہیں:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اظہارِ زینت کی آزادی کو صرف اُن رشتہ داروں تک محدود سمجھتے ہیں جن کا نام یہاں لیا گیا ہے، باقی سب لوگوں کو، حتّٰی کہ سگے چچا اور سگے ماموں تک کو ان رشتہ داروں میں شمار کرتے ہیں جن سے پردہ کیا جانا چاہیے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سگے چچا اور ماموں تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو رضاعی چچا اور ماموں سے بھی پردہ کرنے کی حضرت عائشہؓ کو اجازت نہ دی۔ صِحاح ستہ اور مُسندِ احمد میں حضرت عائشہؓ کی اپنی روایت ہے کہ ابو القُعَیس کے بھائی اَفلح ان کے ہاں آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ چونکہ پردے کا حکم آ چکا تھا اس لیے حضرت عائشہؓ نے اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہلا کر بھیجا کہ تم تو میری بھتیجی ہو، کیونکہ میرے بھائی ابو القُعَیس کی بیوی کا تم نے دودھ پیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو اس میں تأمّل تھا کہ یہ رشتہ بھی ایسا ہے جس میں پردہ اٹھا دینا جائز ہو۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپؐ نے فرمایا کہ وہ تمھارے پاس آ سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اِس آیت کو اس معنٰی میں نہیں لیا ہے کہ اس میں جن جن رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے ان سے پردہ نہ ہو اور باقی سب سے ہو۔ بلکہ آپ نے اس سے یہ اُصول اخذ کیا ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے، وہ سب اِسی آیت کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً چچا، ماموں، داماد اور رضاعی رشتہ دار۔ تابعین میں سے حضرت حَسَن بصریؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور اسی کی تائید علامہ ابوبکر جَصّاص نے احکام القرآن میں فرمائی ہے۔ (ج ۳، ص ۳۹۰)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے اَبدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ نہ تو محرم رشتہ داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف ان کے سامنے اپنی زینت کے ساتھ آئیں، اور نہ بالکل اجنبیوں کے حکم میں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پردہ کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رَوِیّہ ہونا چاہیے، یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا تعین ہو نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتہ داروں کے معاملے میں اُن کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط، اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہئیں۔ اِس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرزِ عمل جو کچھ تھا، اس سے ہم کو یہی رہنمائی ملتی ہے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت اَسماءؓ بنتِ ابی بکر، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں، آپؐ کے سامنے ہوتی تھیں، اور آخر وقت تک آپؐ کے اور ان کے درمیان کم از کم چہرے اور ہاتھوں کی حد تک کوئی پردہ نہ تھا۔ حجۃ الوداع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے، اور اُس وقت بھی یہی حالت تھی۔ (مُلاحظہ ہو: ابوداؤد، کتاب الحج، باب المحرم یؤدّب غلامہٗ)

Maktaba Tul Ishaat.com

اسی طرح حضرت اُمّ ہانیؓ، جو ابو طالب کی صاحبزادی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن تھیں، آخر وقت تک حضورؐ کے سامنے ہوتی رہیں، اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انھوں نے آپؐ سے کبھی نہیں کیا۔ فتحِ مکہ کے موقع کا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتی ہیں جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: ابوداؤد، کتاب الصوم، بابٌ فی النیۃ فی الصوم والرخصۃ فیہ) دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ اپنے بیٹے فضل کو اور ربیعہ بن حارث بن عبدالمُطّلِب (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی) اپنے بیٹے عبدالمطّلِب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم لوگ جوان ہوگئے ہو، تمھیں جب تک روزگار نہ ملے، تمھاری شادیاں نہیں ہوسکتیں، لہٰذا تم رسولؐ اللہ کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔ یہ دونوں حضرت زینبؓ کے مکان پر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینبؓ فضلؓ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اور عبدالمُطّلِب بن ربیعہ کے والد سے بھی ان کا وہی رشتہ ہے جو فضلؓ سے۔ لیکن وہ ان دونوں کے سامنے نہیں ہوتیں اور حضورؐ کی موجودگی میں ان کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کرتی ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الخَراج) اِن دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو مسئلے کی صورت وہی کچھ سمجھ میں آتی ہے جو اُوپر ہم بیان کر آئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں رشتے میں شبہ پڑ جائے، وہاں مَحرم رشتہ دار سے بھی احتیاطاً پردہ کرنا چاہیے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضرت سَودَہؓ اُمّ المومنین کا ایک بھائی لونڈی زادہ تھا۔ (یعنی ان کے باپ کی لونڈی کے بطن سے تھا)۔ اس کے متعلق حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کو ان کے بھائی عُتبہ نے وصیت کی کہ اس لڑکے کو اپنا بھتیجا سمجھ کر اس کی سرپرستی کرنا، کیونکہ وہ دراصل میرے نُطفے سے ہے۔ یہ مُقدّمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے حضرت سعدؓ کا دعویٰ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ ”بیٹا اس کا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، رہا زانی، تو اس کے حصّے میں کنکر پتھر“۔ لیکن ساتھ ہی آپؐ نے حضرت سَودَہؓ سے فرمایا کہ اس لڑکے سے پردہ کرنا (احتجبی منه)، کیونکہ یہ اطمینان نہ رہا تھا کہ وہ واقعی ان کا بھائی ہے۔

۴۳ – اصل میں لفظ نِسَآىِٕهِنَّ استعمال ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ہے: ”ان کی عورتیں“۔ اس سے کون عورتیں مراد ہیں، یہ بحث تو بعد کی ہے۔ سب سے پہلے جو بات قابلِ غور اور قابلِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ محض ”عورتوں“ (النِّسَاء) کا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے مسلمان عورت کے لیے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہارِ زینت کرنا جائز ہو جاتا، بلکہ نِسَآىِٕهِنَّ کہہ کر عورتوں کے ساتھ اُس کی آزادی کو بہرحال ایک خاص دائرے تک محدود کر دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ دائرہ کوئی سا ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کون سا دائرہ ہے، اور وہ کون عورتیں ہیں جن پر لفظ نِسَآىِٕهِنَّ کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں فقہا اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذِمّی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔ ابنِ عباسؓ، مُجاہد اور ابن جُرَیج کی یہی رائے ہے، اور یہ لوگ اپنی تائید میں یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعُبَیدہؓ کو لکھا: ”میں نے سنا ہے مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں۔ حالانکہ جو عورت اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو،

اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس کے جسم پر اس کے اہلِ ملّت کے سوا کسی اَور کی نظر پڑے۔" یہ خط جب حضرت ابو عُبیدہؓ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "خدایا! جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے اِن حماموں میں جائے، اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے۔" (ابنِ جَریر، بَیْہقی، ابنِ کثیر)

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازیؒ کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا تو پھر نِسَآىِٕهِنَّ کہنے کا کیا مطلب؟ اس صورت میں تو محض النِّسَآءِ کہنا چاہیے تھا۔

تیسری رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں، اُن کی جانی بُوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور ان کے کام کاج میں حصّہ لینے والی عورتیں مراد ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اور مقصود اُن عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں کہ ان کے اَخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو، یا جن کے ظاہری حالات مُشتبَہ ہوں اور ان پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔ اس رائے کی تائید اُن صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مُطہّرات کے پاس ذِمّی عورتوں کی حاضری کا ذکر آتا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا، وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں، ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں، خواہ "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے، کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کُن نہیں ہے۔ رہیں اَن جانی عورتیں، جن کی حالت معلوم نہیں ہے، تو ان سے ملاقات کی حد ہمارے نزدیک وہی ہے جو غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے آزادی کی زیادہ سے زیادہ حد ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ عورت صرف منہ اور ہاتھ ان کے سامنے کھولے، باقی اپنا سارا جسم اور آرائش چھپا کر رکھے۔

۴۴ – اِس حکم کا مطلب سمجھنے میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ایک گروہ اس سے مراد صرف وہ لونڈیاں لیتا ہے جو کسی عورت کی مِلک میں ہوں۔ ان حضرات کے نزدیک ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لونڈی خواہ مشرکہ ہو یا اہلِ کتاب میں سے، مسلمان مالکہ اس کے سامنے تو اظہارِ زینت کر سکتی ہے مگر غلام، چاہے وہ عورت کا اپنا مملوک ہی کیوں نہ ہو، پردے کے معاملے میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی آزاد اجنبی مرد کی ہے۔ یہ عبداللہؓ بن مسعود، مجاہد، حسن بصری، ابنِ سیرین، سعید بن مُسَیّب، طاؤس اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے، اور ایک قول امام شافعیؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ اِن بزرگوں کا اِستدلال یہ ہے کہ غلام کے لیے اُس کی مالکہ محرم نہیں ہے۔ اگر وہ آزاد ہو جائے تو اپنی اسی سابق مالکہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا محض غلامی اس امر کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہی آزادی برتے جس کی اجازت محرم مردوں کے سامنے برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں، جو لونڈی اور غلام، دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، پھر اسے لونڈیوں کے لیے خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى

جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں[۴۵]، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف

اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر موقع و محل ان کا مفہوم لونڈیوں کے لیے خاص کر رہا ہے۔ پہلے نِسَآىِٕهِنَّ فرمایا، پھر مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ارشاد ہوا۔ نِسَآىِٕهِنَّ کے الفاظ سن کر عام آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کسی عورت کی ملنے جُلنے والی یا رشتہ دار ہوں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ شاید لونڈیاں اس میں شامل نہ ہوں۔ اس لیے مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کہہ کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ آزاد عورتوں کی طرح لونڈیوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس اجازت میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں۔ یہ حضرت عائشہؓ اور اُمّ سَلَمَہؓ اور بعض ائمۂ اہلِ بیت کا مذہب ہے، اور امام شافعیؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ ان کا اِستدلال صرف لفظ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے عُموم ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ سنت سے بھی اپنی تائید میں شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام عبداللہ بن مسعدہ الفزاری کو لیے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے، اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا: ليس عليكِ بأسٌ، انما هو ابوك وغلامك "کوئی حرج نہیں، یہاں بس تمہارا باپ ہے اور تمہارا غلام۔" (ابوداؤد، احمد، بَیہقی بروایتِ اَنسؓ بن مالک۔ ابنِ عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ غلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو دے دیا تھا، انھوں نے اسے پرورش کیا اور پھر آزاد کر دیا، مگر اس احسان کا جو بدلہ اس نے دیا، وہ یہ تھا کہ جنگِ صِفّین کے زمانے میں وہ حضرت علیؓ کا بدترین دشمن اور امیر معاویہؓ کا پرجوش حامی تھا)۔ اسی طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اذا كان لاحداكن مكاتب وكان له مايؤدي فلتحتجب منه، "جب تم میں سے کوئی اپنے غلام سے مُکاتبت کرے اور وہ مالِ کتابت ادا کرنے کی مَقدِرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے غلام سے پردہ کرے"۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، بروایتِ اُمّ سَلَمَہؓ)

۴۵ – اصل میں التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ کے الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ہوگا: "مردوں میں سے وہ مرد جو تابع ہوں خواہش نہ رکھنے والے۔" ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محرم مردوں کے سوا دوسرے کسی مرد کے سامنے ایک مسلمان عورت صرف اُس صورت میں اظہارِ زینت کر سکتی ہے جب کہ اس میں دو صفات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ تابع، یعنی زیردست اور ماتحت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خواہش نہ رکھنے والا ہو، یعنی اپنی عمر یا جسمانی عدمِ اہلیّت، یا عقلی کمزوری، یا فقر و مَسکَنت، یا زیردستی و محکومی کی بنا پر جس میں یہ طاقت یا جرأت نہ ہو کہ صاحبِ خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کے متعلق کوئی بری نیت دل میں لا سکے۔ اس حکم کو جو شخص بھی فرماں برداری کی نیت سے، نہ کہ نافرمانی کی گنجایشیں ڈھونڈنے کی نیت سے، پڑھے گا، وہ اوّل نظر ہی میں محسوس کر لے گا کہ آج کل کے بیرے،

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ

نہ ہوئے ہوں[۴۶]۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے[۴۷]۔

خانسامے، شوفر اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہرحال اس تعریف میں نہیں آتے۔ مفسرین اور فقہا نے اس کی جو تشریحات کی ہیں، ان پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلِ علم ان الفاظ کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں:

ابنِ عباسؓ: اس سے مراد وہ سیدھا سادھا بُدھو (مُغَفَّل) آدمی ہے جو عورتوں سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

قَتَادَہؒ: ایسا دست نگر آدمی جو پیٹ کی روٹی پالنے کے لیے تمھارے ساتھ لگا رہے۔

مجاہد: اَبلَہ، جو روٹی چاہتا ہے اور عورتوں کا طالب نہیں ہے۔

شَعْبی: وہ جو صاحبِ خانہ کا تابع و دست نگر ہو اور جس کی اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ عورتوں پر نگاہ ڈال سکے۔

ابنِ زید: وہ جو کسی خاندان کے ساتھ لگا رہے، حتّٰی کہ گویا اسی گھر کا ایک فرد بن گیا ہو اور اسی گھر میں پلا بڑھا ہو۔ جو گھر والوں کی عورتوں پر نگاہ نہ رکھتا ہو، نہ اس کی ہمت ہی کر سکتا ہو۔ وہ ان کے ساتھ اس لیے لگا رہتا ہو کہ ان سے اس کو روٹی ملتی ہے۔

طاؤس اور زُہری: بے وقوف آدمی جس میں نہ عورتوں کی طرف رغبت ہو اور نہ اس کی ہمت۔

(ابنِ جَریر، ج ۱۸، ص ۹۵-۹۶۔ ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۵)

ان تشریحات سے بھی زیادہ واضح تشریح وہ واقعہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آیا تھا اور جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور احمد وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہؓ اور اُمِّ سَلَمہؓ سے رِوایت کیا ہے۔ مدینہ طیبہ میں ایک مُخَنَّث تھا جسے ازواجِ مطہراتؓ اور دوسری خواتین غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ میں شمار کر کے اپنے ہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپؐ نے اس کو حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے بھائی عبداللہؓ بن ابی اُمَیَّہ سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہو جائے تو غَیلان ثَقَفی کی بیٹی بادِیَہ کو حاصل کیے بغیر نہ رہنا۔ پھر اُس نے بادِیَہ کے حُسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے پوشیدہ اعضا تک کی صفت بیان کر ڈالی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا: ’’خدا کے دشمن! تُو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں۔‘‘ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آیندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپؐ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مُخَنَّثوں کو بھی گھروں میں گھُسنے سے منع فرما دیا، کیونکہ ان کو مُخَنَّث سمجھ کر عورتیں ان سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے لائق نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صِنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

اَے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو[۴۸]، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔[۴۹]

سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہرحال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

۴۶ – یعنی جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تعریف زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس کی عمر تک کے لڑکوں پر صادق آ سکتی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ نابالغ ہوں، مگر ان میں صنفی احساسات بیدار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

۴۷ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو صرف زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا ہے کہ نگاہ کے سوا دوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اُس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہارِ زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تمنعوا اماء اللّٰه مساجد اللّٰه ولکن لیخرجن وھن تفلات، ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، مگر وہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔'' (ابوداؤد، احمد) اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ انھوں نے اسے روک کر پوچھا: ''اے خدائے جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آ رہی ہے؟'' اس نے کہا: ہاں۔ بولے: ''میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے، اس کی نماز اُس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسلِ جنابت نہ کر لے۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، احمد، نَسائی) ابوموسیٰ اَشعَریؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا استعطرت المرأة فمرت علی القوم لیجدوا ریحھا فھی کذا و کذا قال قولا شدیدا، ''جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تا کہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے، آپؐ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔'' (ترمِذی، ابوداؤد، نَسائی) آپؐ کی ہِدایت یہ تھی کہ عورتوں کو وہ خوشبو استعمال کرنی چاہیے جس کا رنگ تیز ہو اور بُو ہلکی ہو۔ (ابوداؤد)

اسی طرح آپؐ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ عورتیں بلا ضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ ضرورت پڑنے پر بات کرنے کی اجازت تو خود قرآن میں دی گئی ہے، اور لوگوں کو دینی مسائل خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ بتایا کرتی تھیں۔ لیکن جہاں اس کی نہ ضرورت ہو اور نہ کوئی دینی یا اخلاقی فائدہ، وہاں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا ہے کہ عورتیں اپنی آواز غیر مردوں کو سنائیں۔ چنانچہ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر امام کو مُتنبّہ کریں۔ التسبیح للرجال والتصفیق للنساء۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمِذی، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ)

۴۸ – یعنی اُن لغزشوں اور غلطیوں سے توبہ کرو جو اس معاملے میں اب تک کرتے رہے ہو، اور آیندہ کے لیے

اپنے طرزِ عمل کی اصلاح اُن ہدایات کے مطابق کرلو جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہیں۔

۴۹ – اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن دوسری اصلاحات کا بھی ایک خلاصہ دے دیا جائے جو اِن احکام کے نُزول کے بعد قرآن کی روح کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں رائج فرمائیں:

(۱) آپؐ نے محرم رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں دوسرے لوگوں کو (خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) کسی عورت سے تنہا ملنے اور اس کے پاس تنہا بیٹھنے سے منع فرما دیا۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم، ''جن عورتوں کے شوہر باہر گئے ہوئے ہوں ان کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تم میں سے ایک شخص کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔'' (ترمذی)۔ انھی حضرت جابرؓ کی دوسری روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یخلون بامرأۃ لیس معھا ذو محرم منھا فان ثالثھما الشیطان، ''جو شخص اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتا ہو، وہ کبھی کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی مَحرم نہ ہو، کیونکہ تیسرا اس وقت شیطان ہوتا ہے۔'' (احمد) قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور روایت امام احمدؒ نے عامر بن رَبیعہ سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں حضورؐ کی اپنی احتیاط کا یہ عالَم تھا کہ ایک دفعہ رات کے وقت آپؐ حضرت صَفِیّہؓ کے ساتھ اُن کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں دو انصاری پاس سے گزرے۔ آپؐ نے ان کو روک کر ان سے فرمایا: یہ میرے ساتھ میری بیوی صَفِیّہؓ ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: سبحان اللہ! یا رسولؐ اللہ! بھلا آپ کے متعلق بھی کوئی بدگمانی ہوسکتی ہے؟ فرمایا: شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہیں وہ تمھارے دل میں کوئی برا گمان نہ ڈال دے۔ (ابوداؤد، کتاب الصوم)

(۲) آپؐ نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو لگے۔ چنانچہ آپؐ مردوں سے بیعت تو ہاتھ میں ہاتھ لے کر کرتے تھے، لیکن عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ آپؐ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی غیر عورت کے جسم کو نہیں لگا۔ آپؐ عورت سے صرف زبانی عہد لیتے تھے، اور جب وہ عہد کر چکتی تھی تو فرماتے: جاؤ بس تمھاری بیعت ہوگئی۔'' (ابوداؤد، کتاب الخَراج)

(۳) آپؐ نے عورت کو مَحرَم کے بغیر تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ بخاری و مسلم میں ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: لا یخلون رجل بامرأۃ الا ومعھا ذومحرم، ولا تسافر المرأۃ الا مع ذی محرم، ''کوئی مرد کسی عورت سے خلوَت میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم نہ ہو، اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا کوئی محرم اس کے ساتھ نہ ہو۔'' ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کیا: میری بیوی حج کو جا رہی ہے اور میرا نام فلاں مہم پر جانے والوں میں لکھا جا چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فانطلق فحج مع امرأتك، ''اچھا، تو تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلے جاؤ۔'' اس مضمون کی متعدّد احادیث ابنِ عمر، ابوسعید خُدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے معتبر کُتُبِ حدیث میں مروی ہیں جن میں صرف مدّتِ سفر یا مَسافتِ سفر کے اعتبار سے اختلافِ بیان ہے، مگر اس امر میں اتفاق ہے کہ کسی مومن عورت کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کو مانتی ہو، محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں ہے۔ ان میں سے کسی حدیث میں ۱۲ میل یا اس سے

Maktaba Tul Ishaat.com

زیادہ کے سفر پر پابندی کا ذکر ہے، کسی میں ایک دن، کسی میں ایک شب و روز، کسی میں دو دن اور کسی میں تین دن کی حد بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان احادیث کو نہ تو ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے یہی ضروری ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک رِوایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اُس حد کو قانونی مقدار قرار دینے کی کوشش کریں جو اس روایت میں بیان ہوئی ہو۔ اس لیے کہ اِس اختلاف کی یہ معقول وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ مختلف مواقع پر جیسی صورتِ معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوئی ہو، اسی کے لحاظ سے آپؐ نے حکم بیان فرمایا ہو۔ مثلاً کوئی عورت تین دن کی مَسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے محرم کے بغیر جانے سے منع فرمایا ہو، اور کوئی ایک دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے بھی روک دیا ہو۔ اس میں مختلف سائلوں کے الگ الگ حالات اور ہر ایک کو آپؐ کے مختلف جوابات اصل چیز نہیں ہیں، بلکہ اصل چیز وہ قاعدہ ہے جو اُوپر ابنِ عباسؓ والی روایت میں ارشاد ہوا ہے، یعنی سفر، جسے عرفِ عام میں سفر کہا جاتا ہے، محرم کے بغیر کسی عورت کو نہ کرنا چاہیے۔

(۴) آپؐ نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو روکنے کی عملاً بھی کوشش فرمائی اور قولاً بھی اس سے منع فرمایا۔ اسلامی زندگی میں جمعہ اور جماعت کی جو اہمیت ہے، کسی صاحبِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ جمعہ کو اللہ نے خود فرض کیا ہے، اور نمازِ باجماعت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر مسجد میں حاضر نہ ہو اور اپنے گھر میں نماز پڑھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق اس کی نماز مقبول ہی نہیں ہوتی۔ (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دارقُطنی، حاکم بروایت ابنِ عباسؓ) لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جمعے کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ (ابوداؤد بروایت اُمِّ عَطِیّہ، دارقُطنی و بَیْہَقی بروایتِ جابرؓ، ابوداؤد و حاکم بروایتِ طارقؓ بن شہاب) اور نمازِ باجماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ ابنِ عمرؓ اور ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تمنعوا اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ، ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔'' (ابوداؤد) دوسری روایات ابنِ عمرؓ سے اِن الفاظ اور ان سے ملتے جُلتے الفاظ میں ہیں: ائذنوا للنساء الی المساجد باللیل، ''عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو۔'' (بخاری، مسلم، ترمذی، نَسائی، ابوداؤد) اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے: لا تمنعوا نساء کم المساجد و بیوتھن خیر لھن، ''اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگرچہ ان کے گھر اُن کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔'' (احمد، ابوداؤد) اُمِّ حُمَید ساعِدِیّہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا: ''تمھارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمھارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلّے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمھارا اپنے محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔'' (احمد، طَبَرانی) قریب قریب اسی مضمون کی روایت ابوداؤد میں عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے، اور حضرت اُمِّ سَلَمَہؓ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، ''عورتوں کے لیے بہترین مسجد ان کے گھروں کے اندرونی حصّے ہیں۔'' (احمد، طَبَرانی) لیکن حضرت عائشہؓ دورِ بنی اُمَیّہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں: ''اگر نبیؐ

عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جو اب ہیں تو اُن کا مسجدوں میں آنا اسی طرح بند فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد) مسجدِ نبویؐ میں حضورؐ نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ مخصوص کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ اپنے دورِ حکومت میں مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت مُمانعت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد، باب اعتزال النساء فی المساجد اور باب ما جاء فی خُروج النساء إلی المساجد) جماعت میں عورتوں کی صفیں مردوں سے پیچھے رکھی جاتی تھیں اور نماز کے خاتمے پر حضورؐ سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے، تاکہ مردوں کے اُٹھنے سے پہلے عورتیں اُٹھ کر چلی جائیں۔ (احمد و بخاری بروایتِ اُمِّ سَلَمہؓ) آپؐ کا ارشاد تھا کہ مردوں کی بہترین صف سب سے آگے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے پیچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صف۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے پیچھے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے آگے کی (یعنی مردوں سے قریب کی) صف ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد) عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں مگر ان کی جگہ مردوں سے الگ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے۔ (ابوداؤد بروایتِ جابرؓ بن عبداللہ، بخاری و مسلم بروایتِ ابنِ عباسؓ) ایک مرتبہ مسجدِ نبویؐ کے باہر آنحضرتؐ نے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپؐ نے عورتوں سے فرمایا: استاخرن فانه لیس لکن ان تحتضن الطریق، علیکن بحافات الطریق، ''ٹھیر جاؤ، تمھارے لیے سڑک کے بیچ میں چلنا دُرست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔'' یہ ارشاد سنتے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ (ابوداؤد) ان احکام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجلس اسلام کے مزاج سے کیسی سخت مُغایرت رکھتی ہے۔ جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی دونوں صِنفوں کو خَلَط مَلَط نہیں ہونے دیتا، اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور جلسوں میں اِسی اختلاط کو جائز رکھے گا؟

(۵) عورتوں کو اعتدال کے ساتھ بناؤ سنگھار کرنے کی آپؐ نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بسا اوقات خود اس کی ہدایت فرمائی ہے، مگر اس میں حد سے گزر جانے کو بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اُس زمانے میں جس قسم کے بناؤ سنگھار عرب کی عورتوں میں رائج تھے، اُن میں سے حسبِ ذیل چیزوں کو آپؐ نے قابلِ لعنت اور سببِ ہلاکتِ اقوام قرار دیا: اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا کر ان کو زیادہ لمبا اور گھنا دِکھانے کی کوشش کرنا۔ جسم کے مختلف حصوں کو گودنا اور مصنوعی تِل بنانا۔ بال اُکھاڑ اُکھاڑ کر بھویں خاص وضع کی بنانا اور روئیں نوچ نوچ کر منہ صاف کرنا، دانتوں کو گِھس گِھس کر باریک بنانا، یا دانتوں کے درمیان مصنوعی چِھریاں پیدا کرنا۔ زعفران یا وَرس وغیرہ کے مصنوعی اُبٹنے مل کر چہرے پر مصنوعی رنگ پیدا کرنا۔ یہ احکام صِحاحِ سِتّہ اور مُسنَدِ احمد میں حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ بنتِ ابی بکر، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور امیر معاویہؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہیں۔

اللہ اور رسولؐ کی ان صاف صاف ہدایات کو دیکھ لینے کے بعد ایک مومن انسان کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی، اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو اُن اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سَدِّباب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسولؐ نے سنت میں اس قدر تفصیلی احکام دیے ہیں۔ یا پھر اگر وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَ الصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَ اِمَآئِكُمۡ ؕ

تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں[50] اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں[51]، ان کے نکاح کر دو۔[52]

اپنے نفس کی کمزوری کے باعث اِن کی یا اِن میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ مانے، اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے گناہ کو صواب بنانے کی کوشش نہ کرے۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر جو لوگ قرآن و سنت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر انھی کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور علانیہ دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردے کا حکم موجود ہی نہیں ہے، وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھٹائی کا اور اضافہ کر لیتے ہیں، جس کی قدر نہ دُنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے اس کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں تو منافقوں سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا اور رسولؐ کے ان احکام کو غلط اور اُن طریقوں کو صحیح و برحق سمجھتے ہیں جو انھوں نے غیر مسلم قوموں سے سیکھے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اِس کے بعد بھی اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر اسلام اور کفر کے الفاظ قطعاً بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نام بدل دیتے اور علانیہ اسلام سے نکل جاتے تو ہم کم از کم ان کی اَخلاقی جرأت کا اعتراف کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دُنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اس سیرت و اَخلاق کے لوگوں سے کوئی جَعل سازی، کوئی فریب، کوئی دغا بازی اور کوئی خیانت بھی خلافِ توقع نہیں ہے۔

۵۰ – اصل میں لفظ اَیَامٰی استعمال ہوا ہے، جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ اَیَامٰی جمع ہے اَیِّم کی، اور اَیِّم ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مُجرّد کیا ہے۔

۵۱ – یعنی جن کا رَویّہ تمھارے ساتھ بھی اچھا ہو، اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ اِزدِواجی زندگی نباہ لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یا لونڈی کا رَویّہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکے گا، اُس کا نکاح کر دینے کی ذمہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے فرد کی زندگی کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذمہ داری درحقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعۂ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ ناکح اور منکوح کی اپنی ہی رضامندی سے ہوتا ہے۔ لیکن غلام یا لونڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذمہ داری اس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر جان بُوجھ کر کسی غریب کو ایک بدمزاج اور بدسرِشت آدمی کے ساتھ بندھوا دے تو اس کا سارا وبال اُسی کے سر ہو گا۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾
وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے گا[۵۳]، اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انھیں چاہیے کہ عِفّت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے[۵۴]۔

۵۲ – بظاہر یہاں صیغۂ امر دیکھ کر علما کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود بتا رہی ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نکاح کر دینا دوسروں پر واجب کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر کس کا کس سے نکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بالفرض اگر واجب ہو بھی تو خود اُس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نکاح پیشِ نظر ہے؟ کیا دوسرے لوگ جہاں بھی اس کا نکاح کرنا چاہیں، اسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اس پر فرض ہے تو گویا اس کے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں۔ اور اگر اسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے، وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سُبک دوش ہوں؟ انھی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جمہور فقہا نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں بلکہ مندوب قرار دیتا ہے، یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بِن بیاہے نہ بیٹھے رہیں۔ خاندان والے، دوست، ہمسایے، سب اس معاملے میں دلچسپی لیں، اور جس کا کوئی نہ ہو اس کو حکومت اس کام میں مدد دے۔

۵۳ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نکاح ہو جائے گا اللہ اس کو مال دار بنا دے گا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے۔ اور نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کُشایش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ تھوڑی آمدنی بھی ہو تو اللہ کے بھروسے پر شادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات دُرست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آ جاتے ہیں۔ ذمہ داریاں سر پر آ جانے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات بُرے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں، اور بُرے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ

اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مُکاتَبت کی درخواست کریں[۵۵] ان سے مکاتبت[۵۶] کرلو اگر تمھیں

۵۴ - ان آیات کی بہترین تفسیر وہ احادیث ہیں جو اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: یا معشر الشباب ، من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء، ’’نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کرسکتا ہو اسے کرلینی چاہیے، کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کردیتے ہیں۔‘‘ (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ثلثۃ حق علی اللّٰہ عونھم ، الناکح یرید العفاف، والمکاتب یرید الاداء، والغازی فی سبیل اللّٰہ، ’’تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذمے ہے: ایک وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے۔ دوسرے وہ مُکاتَب جو مالِ کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے۔ تیسرے وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔‘‘ (ترمذی، نَسائی، ابن ماجہ، احمد۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، آیت ۲۵)

۵۵ - مُکاتَبت کے لفظی معنٰی تو ہیں ’’لکھا پڑھی‘‘، مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنٰی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیش کش کرے اور جب آقا اسے قبول کرلے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہوجائے۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔ آقا کے لیے کوئی خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہوجائیں۔ معاہدہ ہوجانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بے جا رکاوٹیں ڈالے۔ وہ اس کو مالِ کتابت فراہم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دے گا اور مدّتِ مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمّے کی رقم یا خدمت انجام دے دے، وہ اس کو آزاد کردے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مُکاتَبت کی اور مدّتِ مقررہ سے پہلے ہی مالِ کتابت فراہم کرکے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سال بہ سال اور ماہ بہ ماہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے فرمایا: یہ رقم بیت المال میں داخل کردے اور جا، تُو آزاد ہے۔ پھر مالکہ کو کہلا بھیجا کہ تیری رقم یہاں جمع ہوچکی ہے، اب تُو چاہے تو یک مشت لے لے ورنہ ہم تجھے سال بہ سال اور ماہ بہ ماہ دیتے رہیں گے۔ (دارقطنی بروایتِ ابوسعید مقبُری)

۵۶ - اس آیت کا مطلب فقہا کے ایک گروہ نے یہ لیا ہے کہ جب کوئی لونڈی یا غلام مُکاتَبت کی درخواست کرے تو آقا پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ یہ عطاء، عَمرو بن دینار، ابنِ سیرین، مَسْرُوق، ضَحّاک، عِکرِمہ، ظاہریہ اور ابنِ جریر طَبَری کا مسلک ہے اور امام شافعیؒ بھی پہلے اسی کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب اور مندوب ہے۔ اس گروہ میں شَعْبی، مُقاتِل بن حَیّان، حسن بصری، عبدالرحمٰن بن زید، سُفیان ثَوری، ابوحنیفہ اور مالک بن اَنَس جیسے

عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ

معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے[57]، اور ان کو اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے[58]۔

بزرگ شامل ہیں، اور آخر میں امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ پہلے گروہ کے مسلک کی تائید دو چیزیں کرتی ہیں: ایک یہ کہ آیت کے الفاظ ہیں: کَاتِبُوْھُمْ ''ان سے مُکاتبَت کر لو۔'' یہ الفاظ صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ مشہور فقیہ و محدث حضرت محمد بن سِیرینؒ کے والد سِیرین نے اپنے آقا حضرت اَنسؓ سے جب مُکاتبت کی درخواست کی اور انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو سیرین حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لے گئے۔ انھوں نے واقعہ سنا تو دُرّہ لے کر حضرت اَنسؓ پر پِل پڑے اور فرمایا: ''اللہ کا حکم ہے کہ مُکاتبَت کرلو۔'' (بخاری) اس واقعے سے اِستدلال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذاتی فعل نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر اظہارِ اختلاف نہیں کیا، لہٰذا یہ اس آیت کی مستند تفسیر ہے۔ دوسرے گروہ کا اِستدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف فَکَاتِبُوْھُمْ نہیں فرمایا ہے بلکہ فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ارشاد فرمایا ہے، یعنی ''ان سے مُکاتبت کرلو، اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ۔'' یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، اور کوئی متعین معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جانچ سکے۔ قانونی احکام کی یہ شان نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اس حکم کو تلقین اور ہدایت ہی کے معنیٰ میں لیا جائے گا، نہ کہ قانونی حکم کے معنیٰ میں۔ اور سیرین کی نظیر کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں کوئی ایک غلام تو نہ تھا جس نے مکاتبت کی درخواست کی ہو۔ ہزار ہا غلام عہدِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں موجود تھے، اور بکثرت غلاموں نے مکاتبت کی ہے۔ سیرین والے واقعے کے سوا کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ کسی آقا کو عدالتی حکم کے ذریعے سے مُکاتبت پر مجبور کیا گیا ہو۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو ایک عدالتی فعل سمجھنے کے بجائے ہم اس معنیٰ میں لیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محض قاضی ہی نہ تھے بلکہ افرادِ ملّت کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور اولاد کا سا تھا۔ بسا اوقات وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں ایک باپ تو دخل دے سکتا ہے مگر ایک حاکمِ عدالت دخل نہیں دے سکتا۔

۵۷ - بھلائی سے مراد تین چیزیں ہیں:

ایک یہ کہ غلام میں مالِ کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو، یعنی وہ کما کر یا محنت کر کے اپنی آزادی کا فدیہ ادا کر سکتا ہو، جیسا کہ ایک مُرسَل حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان علمتم فیھم حرفۃ ولا ترسلوھم کلًّا علی الناس، ''اگر تمھیں معلوم ہو کہ وہ کما سکتا ہے تو مُکاتبَت کرو۔ یہ نہ ہو کہ اسے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرنے کے لیے چھوڑ دو۔'' (ابنِ کثیر، بحوالہ ابوداؤد)

دوسرے یہ کہ اس میں اتنی دیانت اور راست بازی موجود ہو کہ اس کے قول پر اعتماد کر کے معاہدہ کیا جا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ مکاتبت کر کے وہ مالک کی خدمت سے چھٹی بھی پالے اور جو کچھ اس دوران میں کمائے، اسے کھا پی کر برابر بھی کر دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تیسرے یہ کہ مالک اس میں ایسے بُرے اَخلاقی رُجحانات، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے ایسے تلخ جذبات نہ پاتا ہو جن کی بنا پر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی آزادی مسلم معاشرے کے لیے خطرناک ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہو کہ مسلم معاشرے کا ایک اچھا آزاد شہری بن سکے گا نہ کہ آستین کا سانپ بن کر رہے گا۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ معاملہ جنگی قیدیوں کا بھی تھا جن کے بارے میں یہ احتیاطیں ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت تھی۔

۵۸ - یہ عام حکم ہے جس کے مخاطب آقا بھی ہیں، عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔

آقاؤں کو ہدایت ہے کہ مالِ کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دو، چنانچہ متعدّد روایات سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرامؓ اپنے مُکاتبوں کو مالِ کتابت کا ایک مُعتد بہٖ حصّہ معاف کر دیا کرتے تھے، حتّٰی کہ حضرت علیؓ نے تو ہمیشہ ۱/۴ حصّہ معاف کیا ہے اور اسی کی تلقین فرمائی ہے۔ (ابنِ جَرِیر)

عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ جو مُکاتَب بھی اپنا مالِ کتابت ادا کرنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرے، وہ دل کھول کر اس کی امداد کریں۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فِی الرِّقَابِ بھی ہے، یعنی ”گردنوں کو بندِ غلامی سے رہا کرانا“۔ (سورۂ توبہ، آیت ۶۰) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک فَكُّ رَقَبَةٍ ”گردن کا بند کھولنا“ ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔ (سورۂ بَلَد، آیت ۱۳) حدیث میں ہے کہ ایک اَعرابی نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”مجھے وہ عمل بتایئے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔“ حضورؐ نے فرمایا ”تو نے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈالی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور تیرا جو رشتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلائی کی تلقین کر، برائی سے منع کر۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اپنی زبان کو روک کر رکھ۔ کھلے تو بھلائی کے لیے کھلے، ورنہ بند رہے۔“ (بَیْہَقی فی شُعَب الایمان عن البراءؓ بن عازِب)

اسلامی حکومت کو بھی ہدایت ہے کہ بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع ہو، اُس میں سے مُکاتَب غلاموں کی رہائی کے لیے ایک حصّہ خرچ کریں۔

اِس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے: ایک، جنگی قیدی۔ دوسرے، آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرے، وہ جو نسلوں سے غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ پتا نہ تھا کہ ان کے آبا واجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام تھے۔ اسلام جب آیا تو عرب اور بیرونِ عرب، دُنیا بھر کا معاشرہ اِن تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا مَعاشی و معاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ اِن غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ اسلام کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں، اُن کا کیا کیا جائے۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آیندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا کیا حل ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یکلخت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر سے لوگوں کے حُقوقِ مِلکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و مَعاشی نظام مفلوج ہو جاتا، بلکہ عرب کو امریکا کی خانہ جنگی سے بھی بدرجہا زیادہ سخت تباہ کُن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا، اور

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دُنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبُور نہ کرو جب کہ وہ خود پاک دامن

پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا، جس طرح امریکا میں حل نہ ہوسکا اور سیاہ فام لوگوں (negroes) کی ذلت کا مسئلہ بہر حال باقی رہ گیا۔ اس احمقانہ طریقِ اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے فَكُّ رَقَبَةٍ کی ایک زبردست اَخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین وترغیب، مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعے سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کریں، یا اپنے قصوروں کے کفّارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انھیں رہا کریں، یا مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیں، اس تحریک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۳ غلام آزاد کیے۔ آپؐ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے اپنی زندگی میں ۷۰ غلاموں کو آزاد کیا۔ حکیمؓ بن حزام نے ۱۰۰، عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار، ذُوالکِلاع حِمْیَریؓ نے آٹھ ہزار، عبدالرحمٰنؓ بن عَوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہؓ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید خرید کر آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں تک سابق دَور کے غلاموں کا تعلق ہے وہ خلفائے راشدینؓ کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔

اب رہ گیا آیندہ کا مسئلہ۔ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اِس شکل کو تو قطعی حرام اور قانوناً مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا اور بیچا اور خریدا جائے۔ البتہ جنگی قیدیوں کو صرف اُس صورت میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت (حکم نہیں بلکہ اجازت) دی جب کہ اُن کی حکومت ہمارے جنگی قیدیوں سے اُن کا تبادلہ کرنے پر راضی نہ ہو اور وہ خود بھی اپنا فدیہ ادا نہ کریں۔ پھر ان غلاموں کے لیے ایک طرف اِس امر کا موقع کھلا رکھا گیا کہ وہ اپنے مالکوں سے مُکاتبَت کر کے رہائی حاصل کر لیں، اور دوسری طرف وہ تمام ہدایات ان کے حق میں موجود رہیں جو قدیم غلاموں کے بارے میں تھیں کہ نیکی کا کام سمجھ کر رضائے الٰہی کے لیے انھیں آزاد کیا جائے، یا گناہوں کے کفّارے میں ان کو آزادی بخش دی جائے، یا کوئی شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور بعد کے لیے وصیت کر دے کہ اس کے مرتے ہی وہ آزاد ہو جائے گا (جسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدبیر اور ایسے غلام کو مُدبَّر کہتے ہیں)، یا کوئی شخص اپنی لونڈی سے تمتُّع کرے اور اس کے ہاں اولاد ہو جائے، اس صورت میں مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی، خواہ مالک نے وصیّت کی ہو یا نہ کی ہو ——— یہ حل ہے جو اسلام نے غلامی کے مسئلے کا کیا ہے۔ جاہل معترضین اس کو سمجھے بغیر اعتراضات جَڑتے ہیں اور معذرت پیشہ حضرات اس کی معذرتیں پیش کرتے کرتے آخر کار اس امرِ واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الدُّنْيَا ۗ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

رہنا چاہتی ہوں^[۵۹]، اور جو کوئی اُن کو مجبور کرے تو اِس جبر کے بعد اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم ہے۔

۵۹ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو ان کو قحبہ گری پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لونڈی خود اپنی مرضی سے بدکاری کی مرتکب ہو تو وہ اپنے جرم کی آپ ذمہ دار ہے، قانون اس کے جرم پر اُسی کو پکڑے گا، لیکن اگر اس کا مالک جبر کر کے اس سے یہ پیشہ کرائے تو ذمہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جبر کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا ''دنیوی فائدوں کی خاطر'' کا فقرہ، تو دراصل یہ ثبوت حکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے کہ اگر مالک اس کی کمائی نہ کھا رہا ہو تو لونڈی کو قحبہ گری پر مجبور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اِس سے مقصود اُس کمائی کو بھی حرمت کے حکم میں شامل کرنا ہے جو اس ناجائز جبر کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہو۔

لیکن اِس حکم کا پورا مقصد محض اس کے الفاظ اور سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اُس وقت عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں: ایک، خانگی کا پیشہ۔ دوسرے، باقاعدہ چکلا۔

''خانگی'' کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت رفع کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت اُن مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے، اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیت ایک قسم کا ''نکاح'' سمجھتے تھے۔ اسلام نے آ کر نکاح کے صرف اُس معروف طریقے کو قانونی نکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے، اور اس طرح باقی تمام صورتیں زِنا میں شمار ہو کر آپ سے آپ جرم ہو گئیں۔ (ابوداؤد، باب فی وجوہ النکاح التی کان یتناکح اہل الجاہلیہ)

دوسری صورت، یعنی کھلی قحبہ گری، تمام تر لونڈیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے: ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں، اس کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعے سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گُنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنھیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ''حاجت مند'' آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں ''قلیقیات'' کہلاتی تھیں اور ان کے گھر ''مَواخیر'' کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے

چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن اُبَیّ (رئیس المنافقین، وہی صاحب جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے) مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلا موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی گئی تھیں۔ ان کے ذریعے سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی انھی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خَدَم و حَشَم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ انھی لونڈیوں میں سے ایک، جس کا نام مُعاذَہ تھا، مسلمان ہو گئی اور اس نے توبہ کرنی چاہی۔ ابنِ اُبَیّ نے اُس پر تشدد کیا۔ اس نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے معاملہ سرکار تک پہنچایا، اور سرکارِ رسالت مآبؐ نے حکم دے دیا کہ لونڈی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے۔ (ابنِ جَریر، ج ۱۸، ص ۵۵ تا ۵۸ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - اَلْاِستیعاب لابنِ عبدالبرّ، ج ۲، ص ۷۶۲۔ ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۸-۲۸۹) یہی زمانہ تھا جب بارگاہِ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پَسِ منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود محض لونڈیوں کو جرمِ زنا پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دولتِ اسلامیہ کے حدود میں قحبہ گری (prostitution) کے کاروبار کو بالکل خلافِ قانون قرار دے دینا ہے، اور ساتھ ساتھ اُن عورتوں کے لیے اعلانِ معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آ جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: لا مساعاۃ فی الاسلام ''اسلام میں قحبہ گری کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔'' (ابوداؤد بروایتِ ابنِ عباسؓ باب فی ادعاء وَلَد الزنا) دوسرا حکم جو آپؐ نے دیا، وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعے سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافعؓ بن خَدِیج کی روایت ہے کہ آپؐ نے مهر البَغی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شر المکاسب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) ابوجُحَیفہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے کسب البغی یعنی پیشہ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھیرایا۔ (بخاری، مسلم، احمد) ابومسعود عُقبہؓ بن عَمرو کی روایت ہے کہ آپؐ نے مَهر البَغی کالین دین ممنوع قرار دیا۔ (صحاح سِتّہ و احمد) تیسرا حکم آپؐ نے یہ دیا کہ لونڈی سے جائز طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جا سکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کر سکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لاتی ہے۔ رافعؓ بن خَدِیج کہتے ہیں کہ نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم عن کسب الْاَمَۃ حتی یُعلَم من این ھو، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ آمدنی اُسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔'' (ابوداؤد، کتاب الاِجارہ) رافعؓ بن رِفاعَہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ نھانا نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم عن کسب الامۃ الا ما عملت بیدھا وقال ھٰکذا باصابعہ نحو الخبز والغزل والنفش، ''اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا، بجز اُس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے، اور آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روٹی پکانا، سُوت کاتنا، یا اُون اور رُوئی دھنکنا۔'' (مُسندِ احمد، ابوداود کتاب الاجارہ) اسی معنی میں ایک روایت ابوداؤد اور مُسندِ احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس میں کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور مھر البغی (زنا کی آمدنی) وصول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اِس آیت کے منشا کے مطابق قحبہ گری کی ان تمام صورتوں کو مذہباً ناجائز

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ
وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۞ ع ۳۴ اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ

ع ۸ ۱۰

ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمھارے پاس بھیج دی ہیں، اور ان قوموں کی عبرت ناک مثالیں بھی ہم تمھارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں[۶۰]۔ ع

اللہ[۶۱] آسمانوں اور زمین کا نور ہے[۶۲]۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

اور قانوناً ممنوع قرار دے دیا جو اس وقت عرب میں رائج تھیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، عبداللہ بن اُبَیّ کی لونڈی مُعاذہ کے معاملے میں جو کچھ آپؐ نے فیصلہ فرمایا، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لونڈی سے اُس کا مالک جبراً پیشہ کرائے، اس پر سے مالک کی ملکیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ امام زُہریؒ کی روایت ہے جسے ابنِ کثیر نے مُسنَدِ عبدالرزاق کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

۶۰ - اس آیت کا تعلق صرف اوپر کی آخری آیت ہی سے نہیں ہے بلکہ اُس پورے سلسلۂ بیان سے ہے جو آغازِ سورہ سے یہاں تک چلا آ رہا ہے۔ صاف صاف ہِدایتیں دینے والی آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں زنا اور قَذف اور لِعان کا قانون بیان کیا گیا ہے، بدکار مردوں اور عورتوں سے اہلِ ایمان کو شادی بیاہ کے معاملے میں مُقاطعَہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، شریف لوگوں پر بے بنیاد تہمتیں لگانے اور معاشرے میں فواحش کی اشاعت کرنے سے روکا گیا ہے، مردوں اور عورتوں کو غَضِّ بصر اور حفظِ فُروج کی تاکید کی گئی ہے، عورتوں کے لیے پردے کے حُدود قائم کیے گئے ہیں، شادی کے قابل لوگوں کے مُجرّد بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، غلاموں کی آزادی کے لیے کتابت کی صورت تجویز کی گئی ہے، اور معاشرے کو قَحبہ گری کی لعنت سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان ارشادات کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈر کر سیدھی راہ اختیار کر لینے والوں کو جس طرح تعلیم دی جاتی ہے، وہ تو ہم نے دے دی ہے، اب اگر تم اِس تعلیم کے خلاف چلو گے تو اس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ تم اُن قوموں کا سا انجام دیکھنا چاہتے ہو جن کی عبرتناک مثالیں خود اسی قرآن میں ہم تمھارے سامنے پیش کر چکے ہیں ——— غالباً ایک حکم نامے کے اختتام پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ مگر آفرین ہے اس قوم پر جو ماشاء اللہ مومن بھی ہو اور اس حکم نامے کی تلاوت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اس حکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے۔

۶۱ - یہاں سے رُوئے سُخن منافقین کی طرف پھرتا ہے جو اسلامی معاشرے میں فتنوں پر فتنے اُٹھائے چلے جا رہے تھے اور اسلام، اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست و جماعت کو زک دینے میں اسی طرح سرگرم تھے جس طرح باہر کے کھلے کھلے کافر دشمن سرگرم تھے۔ یہ لوگ ایمان کے مدعی تھے، مسلمانوں میں شامل تھے، مسلمانوں کے ساتھ، اور خصوصاً انصار کے ساتھ، رشتہ و برادری کے تعلقات رکھتے تھے، اسی لیے ان کو مسلمانوں میں اپنے فتنے پھیلانے کا زیادہ موقع ملتا تھا،

اور بعض مخلص مسلمان تک اپنی سادہ لوحی یا کمزوری کی بنا پر ان کے آلۂ کار بھی بن جاتے تھے اور پشت پناہ بھی۔ لیکن درحقیقت ان کی دنیا پرستی نے ان کی آنکھیں اندھی کر رکھی تھیں اور دعوائے ایمان کے باوجود وہ اُس نور سے بالکل بے بہرہ تھے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا میں پھیل رہا تھا۔ اس موقع پر ان کو خطاب کیے بغیر ان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا جا رہا ہے، اس سے مقصود تین اُمور ہیں: اوّل یہ کہ ان کو فہمائش کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رُبوبیّت کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جو بندہ بھی بہکا اور بھٹکا ہوا ہو، اس کی تمام شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود اسے آخر وقت تک سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ ایمان اور نِفاق کا فرق صاف صاف کھول کر بیان کر دیا جائے، تاکہ کسی صاحبِ عقل وخِرَد انسان کے لیے مسلم معاشرے کے مومن اور منافق افراد کے درمیان تمیز کرنا مشکل نہ رہے، اور اس توضیح و تصریح کے باوجود جو شخص منافقوں کے پھندے میں پھنسے یا ان کی پشتیبانی کرے وہ اپنے اِس فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہو۔ سوم یہ کہ منافقین کو صاف صاف مُتنبّہ کر دیا جائے کہ اللہ کے جو وعدے اہلِ ایمان کے لیے ہیں، وہ صرف انھی لوگوں کو پہنچتے ہیں جو سچے دل سے ایمان لائیں اور پھر اُس ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ یہ وعدے ان سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو محض مسلمانوں کی مردم شماری میں شامل ہوں۔ لہٰذا منافقین اور فاسقین کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ وہ ان وعدوں میں سے کوئی حصّہ پا سکیں گے۔

۶۲ – آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآنِ مجید میں بالعُموم ''کائنات'' کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیا کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سوجھنے کی کیفیت کا نام انسان نے اندھیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے، اور اس کے برعکس جب سب کچھ سُجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''نور'' کا استعمال اِسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے، نہ اس معنیٰ میں کہ معاذ اللہ، وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکزِ بینائی کو مُتاثّر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اُس معنیٰ کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہم اُن روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادّی دنیا کے اندر ہمارے تجرِبے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے جتنے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں، نہ کہ اُن کے مادّی مدلولات کے اعتبار سے۔ مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عُضو کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔ ہم اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعے سے سنتا ہے۔ اس کے لیے ہم پکڑ اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ وہ ہاتھ نام کے ایک آلے سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اس کے لیے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں، اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سَماعت اور بینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اُس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و بینائی اور گرفت کے سوا ہونی غیر ممکن ہے جو

Maktaba Tul Ishaat.com

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ

طاق میں چراغ رکھا ہُوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک[۶۳] درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی[۶۴]، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اِس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں[۶۵])۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی

ہمارے تجربے میں آتی ہے۔ اسی طرح ''نور'' کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تنگ خیالی ہے کہ اس کے معنیٰ کا مصداق صرف اُس شعاع ہی کی صورت میں پایا جا سکتا ہے جو کسی چمکنے والے جِرم سے نکل کر آنکھ کے پردے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اِس محدود معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ مُطلَق معنیٰ میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل ''سببِ ظہور'' ہے، باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اسی کی بخشی ہوئی روشنی سے روشن اور روشن گر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں جس سے وہ یہ کرشمہ دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنیٰ میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہِ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجتاً ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

۶۳ – مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

۶۴ – یعنی جو کھلے میدان میں یا اونچی جگہ واقع ہو، جہاں صبح سے شام تک اس پر دھوپ پڑتی ہو۔ کسی آڑ میں نہ ہو کہ اس پر صرف صبح کی یا صرف شام کی دُھوپ پڑے۔ زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ محض شرقی یا محض غربی رُخ کے درخت نسبتاً غلیظ تیل دیتے ہیں اور چراغ میں ان کی روشنی ہلکی رہتی ہے۔

۶۵ – اس تمثیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے، اور فانوس سے مراد وہ پردہ ہے جس میں حضرتِ حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پردہ فی الحقیقت خِفا کا نہیں، شدتِ ظہور کا پردہ ہے۔ نگاہِ خلق جو اس کو دیکھنے سے عاجز ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حائل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پردہ شفاف ہے اور اس شفاف پردے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید اور بسیط اور محیط ہے کہ محدود طاقت

لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے[66]، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب

رکھنے والی بینائیاں اس کا اِدراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہیں۔ یہ کمزور بینائیاں صرف اُن محدود روشنیوں کا اِدراک کر سکتی ہیں جن کے اندر کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی زائل ہوتی ہیں اور کبھی پیدا ہو جاتی ہیں جن کے مقابلے میں کوئی تاریکی موجود ہوتی ہے اور اپنی ضد کے سامنے آ کر وہ نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن نورِ مطلق جس کا کوئی مدِمقابل نہیں، جو کبھی زائل نہیں ہوتا، جو سدا ایک ہی شان سے ہر طرف چھایا رہتا ہے، اس کا اِدراک اِن کے بس سے باہر ہے۔

رہا یہ مضمون کہ ''چراغ ایک ایسے درختِ زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی''، تو یہ صرف چراغ کی روشنی کے کمال اور اس کی شدت کا تصور دلانے کے لیے ہے۔ قدیم زمانے میں زیادہ سے زیادہ روشنی روغنِ زیتون کے چراغوں سے حاصل کی جاتی تھی، اور ان میں روشن ترین چراغ وہ ہوتا تھا جو بلند اور کھلی جگہ کے درخت سے نکالے ہوئے تیل کا ہو۔ تمثیل میں اس مضمون کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اللہ کی ذات، جسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، کسی اور چیز سے طاقت (energy) حاصل کر رہی ہے، بلکہ مقصود یہ کہنا ہے کہ مثال میں معمولی چراغ نہیں بلکہ اُس روشن ترین چراغ کا تصور کرو جو تمھارے مشاہدے میں آتا ہے۔ جس طرح ایسا چراغ سارے مکان کو جگمگا دیتا ہے، اسی طرح اللہ کی ذات نے ساری کائنات کو بُقعۂ نور بنا رکھا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''اُس کا تیل آپ سے آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے''، اِس سے بھی چراغ کی روشنی کے زیادہ سے زیادہ تیز ہونے کا تصور دلانا مقصود ہے۔ یعنی مثال میں اس انتہائی تیز روشنی کے چراغ کا تصور کرو جس میں ایسا لطیف اور ایسا سخت اشتعال پذیر تیل پڑا ہوا ہو۔ یہ تینوں چیزیں یعنی زیتون اور اس کا غیر شرقی وغربی ہونا، اور اس کے تیل کا آگ لگے بغیر ہی آپ سے آپ بھڑکا پڑنا مستقل اجزائے تمثیل نہیں ہیں بلکہ پہلے جزوِ تمثیل یعنی چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں۔ اصل اجزائے تمثیل تین ہیں: چراغ، طاق، اور فانوسِ شفاف۔

آیت کا یہ فقرہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ ''اس کے نور کی مثال ایسی ہے''۔ اِس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' کے الفاظ سے کسی کو ہو سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اللہ کو ''نور'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ، اس کی حقیقت ہی بس ''نور'' ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ایک ذاتِ کامل واکمل ہے جو صاحبِ علم، صاحبِ قدرت، صاحبِ حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نورِ محض اس کے کمالِ نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے، جیسے کسی کے کمالِ فیاضی کا حال بیان کرنے کے لیے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے، یا اس کے کمالِ خوبصورتی کا وصف بیان کرنے کے لیے خود اسی کو حُسن کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے۔

۶۶ – یعنی اگرچہ اللہ کا یہ نورِ مطلق سارے جہان کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا اِدراک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے اِدراک کی توفیق اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ جس طرح اندھے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ
وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ

واقف ہے[67]۔ (اُس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنھیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے[68]، اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دِیدے

کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اُسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی تو روشنی ہے مگر اللہ کا نور اس کو سُجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اس بدنصیب کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ آنکھوں کا اندھا اپنے پاس کی چیز نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک کہ جب اس سے ٹکرا کر چوٹ کھا جاتا ہے تب اسے پتا چلتا ہے کہ یہ چیز یہاں موجود تھی۔ اسی طرح بصیرت کا اندھا اُن حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو عین اُس کے پہلو میں اللہ کے نور سے جگمگا رہی ہوں۔ اُسے ان کا پتا صرف اُس وقت چلتا ہے جب وہ ان سے ٹکرا کر اپنی شامت میں گرفتار ہو چکا ہوتا ہے۔

۶۷ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ وہ جانتا ہے کس حقیقت کو کس مثال سے بہترین طریقے پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کون اِس نعمت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔ جو شخص نورِ حق کا طالب ہی نہ ہو اور ہمہ تن اپنی دنیوی اغراض ہی میں گم اور مادّی لذتوں اور منفعتوں ہی کی جستجو میں منہمک ہو، اسے زبردستی نورِ حق دکھانے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس عَطِیّے کا مستحق تو وہی ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ وہ اس کا طالب اور مخلص طالب ہے۔

۶۸ – بعض مفسرین نے ان "گھروں" سے مراد مساجد لی ہیں، اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین ان سے مراد اہلِ ایمان کے گھر لیتے ہیں، اور انھیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انھیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔ "اُن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے"، یہ الفاظ بظاہر مسجد والی تفسیر کے زیادہ مؤید نظر آتے ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری تفسیر کے بھی اتنے ہی مؤید ہیں جتنے پہلی تفسیر کے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی شریعت کہانت زدہ مذاہب کی طرح عبادت کو صرف مَعْبدوں تک ہی محدود نہیں رکھتی جہاں کاہن یا پُجاری طبقے کے کسی فرد کی پیشوائی کے بغیر مراسمِ بندگی ادا نہیں کیے جا سکتے، بلکہ یہاں مسجد کی طرح گھر بھی عبادت گاہ ہے اور ہر شخص اپنا پروہت آپ ہے۔ چونکہ اس سورہ میں تمام تر خانگی زندگی کو اعلیٰ و ارفع بنانے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے دوسری تفسیر ہم کو موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ پہلی تفسیر کو بھی رد کر دینے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔

وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا
وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ

پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی، (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔[۶۹] (اس کے برعکس) جنھوں نے کفر کیا[۷۰] اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب، کہ پیاسا اُس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چُکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔[۷۱] یا پھر

کیا مُضایقہ ہے اگر اس سے مراد مومنوں کے گھر اور ان کی مسجدیں، دونوں ہی ہوں۔

۶۹ – یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی جو اللہ کے نورِ مطلق کا اِدراک کرنے اور اس کے فیض سے بہرہ مند ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کہ یونہی جسے چاہا مالا مال کر دیا اور جسے چاہا دھتکار دیا۔ وہ جسے دیتا ہے، کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے، اور نعمتِ حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس کی محبّت، اور اس سے دلچسپی، اور اس کا خوف، اور اس کے انعام کی طلب، اور اُس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دنیا پرستی میں گُم نہیں ہے بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اُس کے دل میں اپنے خدا کی یاد بسی رہتی ہے۔ وہ پستیوں میں پڑا نہیں رہنا چاہتا بلکہ اس بلندی کو عملاً اختیار کرتا ہے جس کی طرف اُس کا مالک اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اسی حیاتِ چند روزہ کے فائدوں کا طلب گار نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ آخرت کی اَبدی زندگی پر جمی ہوئی ہے۔ یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ اس کی دین کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۷۰ – یعنی اُس تعلیمِ حق کو بصدقِ دل قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اللہ کی طرف سے اُس کے پیغمبروں نے دی ہے اور جو اُس وقت اللہ کے پیغمبر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ اُوپر کی آیات خود بتا رہی ہیں کہ اللہ کا نور پانے والوں سے مراد سچے اور صالح مومن ہیں۔ اس لیے اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی حالت بتائی جا رہی ہے جو اس نور کو پانے کے اصلی اور

Maktaba Tul Ishaat.com

كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ اُوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اُوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلّط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔[۷۲]

واحد ذریعے، یعنی رسول ہی کو ماننے اور اس کا اتباع کرنے سے انکار کر دیں، خواہ دل سے انکار کریں اور محض زبان سے اقراری ہوں، یا دل اور زبان دونوں ہی سے انکاری ہوں۔

۷۱ – اس مثال میں اُن لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو کفر و نفاق کے باوجود بظاہر کچھ نیک اعمال بھی کرتے ہوں اور فی الجملہ آخرت کے بھی قائل ہوں، اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہوں کہ ایمانِ صادق اور صفاتِ اہلِ ایمان، اور اطاعت و اتباعِ رسولؐ کے بغیر ان کے یہ اعمال آخرت میں ان کے لیے کچھ مفید ہوں گے۔ مثال کے پیرایے میں ان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جن ظاہری و نمائشی اعمالِ خیر سے آخرت میں فائدے کی امید رکھتے ہو، ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ ریگستان میں چمکتی ہوئی ریت کو دُور سے دیکھ کر جس طرح پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ پانی کا ایک تالاب موجیں مار رہا ہے اور منہ اٹھائے اس کی طرف پیاس بجھانے کی اُمید لیے ہوئے دوڑتا چلا جاتا ہے، اسی طرح تم اِن اعمال کے جھوٹے بھروسے پر موت کی منزل کا سفر طے کرتے چلے جا رہے ہو۔ مگر جس طرح سراب کی طرف دوڑنے والا جب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے تالاب نظر آ رہا تھا تو کچھ نہیں پاتا، اسی طرح جب تم منزلِ موت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کا تم کوئی فائدہ اٹھا سکو، بلکہ اس کے برعکس اللہ تمھارے کفر و نفاق کا، اور ان بداعمالیوں کا جو تم ان نمائشی نیکیوں کے ساتھ کر رہے تھے، حساب لینے اور پورا پورا بدلہ دینے کے لیے موجود ہے۔

۷۲ – اس مثال میں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں نمائشی نیکیاں کرنے والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں، خواہ وہ دنیا کی اصطلاحوں میں علامۂ دہر اور عُلوم و فُنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو، روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور آواز سے تیز رفتار طیارے، اور چاند تک پہنچنے والی ہوائیاں بنا لینے کا نام علم ہے۔ ان کے نزدیک مَعاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے۔ مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے، اور اس کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ جاہلِ محض ہیں، اور ایک اَن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے اگر وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔

ع ۵

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝۴۰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ
عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۱ وَلِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۴۲ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ
سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ

جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔[۷۳] ع

کیا[۷۴] تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے

---

۷۳ – یہاں پہنچ کر وہ اصل مدعا کھول دیا گیا ہے جس کی تمہید اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے مضمون سے اُٹھائی گئی تھی۔ جب کائنات میں کوئی نور درحقیقت اللہ کے نور کے سوا نہیں ہے، اور سارا ظہورِ حقائق اسی نور کی بدولت ہو رہا ہے، تو جو شخص اللہ سے نور نہ پائے، وہ اگر کامل تاریکی میں مبتلا نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ کہیں اور تو روشنی موجود ہی نہیں ہے کہ اس سے ایک کرن بھی وہ پا سکے۔

۷۴ – اُوپر ذکر آچکا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے مگر اس نور کے اِدراک کی توفیق صرف صالح اہلِ ایمان ہی کو نصیب ہوتی ہے، باقی سب لوگ اس نورِ کامل وشامل کے محیط ہوتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح تاریکی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اب اس نور کی طرف رہنمائی کرنے والے بے شمار نشانات میں سے صرف چند کو بطورِ نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دل کی آنکھیں کھول کر کوئی انھیں دیکھے تو ہر وقت ہر طرف اللہ کو کام کرتے دیکھ سکتا ہے۔ مگر جو دل کے اندھے ہیں، وہ اپنے سر کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھتے ہیں تو انھیں بیولوجی اور زُولوجی اور طرح طرح کی دوسری لوجیاں تو اچھی خاصی کام کرتی

Maktaba Tul Ishaat.com

يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ
فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ
يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝٤٣ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً
لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝٤٤ وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ
عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى
اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤٥ لَقَدْ
اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٤٦

قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے، اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں،[۷۵] اولے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے۔ اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ رات اور دن کا اُلٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اِس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

اور اللہ نے ہر جان دار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں، آگے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

نظر آتی ہیں، مگر اللہ کہیں کام کرتا نظر نہیں آتا۔

۷۵ - اِس سے مراد سردی سے جمے ہوئے بادل بھی ہو سکتے ہیں جنھیں مجازاً آسمان کے پہاڑ کہا گیا ہو۔ اور زمین کے پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں جو آسمان میں بلند ہیں، جن کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کے اثر سے بسا اوقات ہوا اتنی سرد ہو جاتی ہے کہ بادلوں میں انجماد پیدا ہونے لگتا ہے اور اولوں کی شکل میں بارش ہونے لگتی ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷ وَاِذَا
دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ۝۴۸ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝۴۹ ؕ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں[۷۶]۔ جب ان کو بُلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف تاکہ رسولؐ ان کے آپس کے مقدّمے کا فیصلہ کرے[۷۷] تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے[۷۸]۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں[۷۹]۔

---

۷۶ – یعنی اطاعت سے رُوگردانی ان کے دعوائے ایمان کی خود تردید کر دیتی ہے، اور اس حرکت سے یہ بات کُھل جاتی ہے کہ انھوں نے جھوٹ کہا جب کہا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی۔

۷۷ – یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسولؐ کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اُس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلایا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلایا جانا نہیں بلکہ اللہ اور رسول، دونوں کی طرف بلایا جانا ہے۔ نیز اس آیت اور اوپر والی آیت سے یہ بات بلا کسی اشتباہ کے بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے بغیر ایمان کا دعویٰ بے معنیٰ ہے اور اطاعتِ خدا و رسول کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمان بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ قوم اُس قانون کے آگے جھک جائیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے ان کو دیا ہے۔ یہ طرزِ عمل اگر وہ اختیار نہیں کرتے تو اُن کا دعوائے ایمان ایک منافقانہ دعویٰ ہے۔ (تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو، سورۂ نساء، آیات ۵۹-۶۱، مع حواشی ۸۹ تا ۹۲)

۷۸ – واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کے لیے نہ تھا، بلکہ آپؐ کے بعد جو بھی اسلامی حکومت کے منصبِ قضا پر ہو اور کتاب اللہ و سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق فیصلے کرے اس کی عدالت کا سمن دراصل اللہ اور رسول کی عدالت کا سمن ہے، اور اس سے منہ موڑنے والا درحقیقت اس سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول سے منہ موڑنے والا ہے۔ اس مضمون کی یہ تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مُرسَل حدیث میں مروی ہے جسے حسن بصری رحمہ اللہ نے رِوایت کیا ہے کہ من دعی الی حاکم من حکام المسلمین فلم یجب فھو ظالم لا حق له ”جو شخص مسلمانوں کے حُکّامِ عدالت میں سے کسی حاکم کی طرف بلایا جائے اور وہ حاضر نہ ہو تو وہ ظالم ہے، اس کا کوئی حق نہیں ہے۔“ (احکام القرآن، جصّاص، ج ۳، ص ۴۰۵) بالفاظِ دیگر، ایسا شخص سزا کا بھی مستحق ہے، اور مزید برآں اس کا بھی مستحق ہے کہ اسے برسرِ باطل فرض کر کے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ دے دیا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى
اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾
وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾

ع ۶ / ۱۲

کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہُوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔[۸۰] ع ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسولؐ کی طرف بُلائے جائیں تاکہ رسولؐ ان کے مقدّمے کا فیصلہ کرے، تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

۷۹ – یہ آیت اس حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہے کہ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے لے، مگر جو کچھ خدا کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہو اسے رد کر دے، اور اس کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے قوانین کو ترجیح دے، وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے، کیونکہ وہ ایمان خدا اور رسول پر نہیں، اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے۔ اِس رَوِیّے کے ساتھ خدا کی شریعت کے کسی جز کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو خدا کی نگاہ میں اس طرح کے ماننے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

۸۰ – یعنی اِس طرزِ عمل کی تین ہی وجہیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طریقے پر محض دھوکا دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اسے اس امر میں ابھی تک شک ہو کہ رسول خدا کا رسول ہے یا نہیں، اور قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں، اور آخرت واقعی آنے والی ہے بھی یا یہ محض ایک افسانہ تراشیدہ ہے، بلکہ خدا بھی حقیقت میں موجود ہے یا یہ بھی ایک خیال ہے جو کسی مصلحت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا کی کتاب نے فلاں حکم دے کر تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا، اور خدا کے رسول کا فلاں ارشاد یا فلاں طریقہ تو ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اِن تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، ایسے لوگوں کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے، وہ بہت بڑا دغا باز، خائن اور جعل ساز ہے۔ وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے ذلیل ترین خصائل کا پیکر بناتا چلا جاتا ہے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اُس کے ظاہری کلمۂ شہادت پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت کا ایک جز مان لیتے ہیں اور

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَىٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَیَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا
تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِیْعُوا
اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا
حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۵۴﴾
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی

یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ”آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں۔“ اِن سے کہو: ”قسمیں نہ کھاؤ، تمھاری اطاعت کا حال معلوم ہے[81]، تمھارے کرتُوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے[82]۔“ کہو: ”اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابعِ فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمّہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمّہ دار تم۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔ ورنہ رسولؐ کی ذمّہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔“

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بُنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے

پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی، تمدّنی، سیاسی اور اَخلاقی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

۸۱ – دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ ایمان سے جو اطاعت مطلوب ہے، وہ معروف اور معلوم قسم کی اطاعت ہے جو ہر شبہے سے بالاتر ہو، نہ کہ وہ اطاعت جس کا یقین دلانے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پڑے اور پھر بھی یقین نہ آسکے۔ جو لوگ حقیقت میں مطیعِ فرمان ہوتے ہیں، ان کا رویّہ کسی سے چھپا ہُوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر محسوس کر لیتا ہے کہ یہ اطاعت گزار لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش ہی نہیں ہوتی کہ اسے رفع

Maktaba Tul Ishaat.com

اَرۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًـا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰ لِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾

اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں[۸۳]۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے[۸۴] تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

کرنے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پیش آئے۔

۸۲ – یعنی یہ فریب کاریاں مخلوق کے مقابلے میں تو شاید چل بھی جائیں مگر خدا کے مقابلے میں کیسے چل سکتی ہیں جو کھلے اور چھپے سب حالات، بلکہ دلوں کے مخفی ارادے اور خیالات تک سے واقف ہے۔

۸۳ – جیسا کہ اس سلسلۂ کلام کے آغاز میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، اِس ارشاد سے مقصود منافقین کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اُس کے مخاطب محض مردُم شماری کے مسلمان نہیں ہیں، بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اَخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ اِن صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے۔ لہٰذا وہ اس میں حصّہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و تمکّن کے معنٰی میں لے لیتے ہیں، پھر اِس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے، وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگیِ حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے، اور اِس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اِس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان، صَلاح، دینِ حق، عبادتِ الٰہی اور شرک، ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو اُن کے اِس نظریے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اِس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنٰی پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اِس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنھوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکّن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں، خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فِسق و فُجور کی اُن تمام آلایشوں میں بُری طرح لِتھڑے ہوئے ہوں جنھیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے، جیسے سود، زنا، شراب اور جُوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومنِ صالح ہیں اور اِسی لیے خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنٰی قوانینِ طبیعی کو ماننے، اور صَلاح کے معنٰی اُن قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ اُن قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے

جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جُہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ اُن مفید قواعد وضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کرلے؟ مگر کیا کوئی شخص، جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عملِ صالح اور دینِ حق اور عبادتِ الٰہی اور توحید اور شرک کے یہی معنٰی ہیں؟ یہ معنٰی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات و تصوُّرات کے مطابق ڈھال لیا ہو، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کرسکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اُن سب آیات کو اپنے زُعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور الٰہ، اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعۂ ہدایت، اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اُس زندگی میں اپنی جواب دِہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اِس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے، وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح وصاف الفاظ میں بار بار دُہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمان داری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی اُن غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیتِ استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظِ خلافت و استخلاف کے جس معنٰی پر انھوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے، وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنٰی کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے، اور ہر جگہ سیاق و سباق سے پتا چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنٰی میں یہ لفظ بولا گیا ہے:

اس کے ایک معنی ہیں: ”خدا کے دیے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا“۔ اس معنٰی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔

دوسرے معنٰی ہیں: ”خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کے امرِ شرعی (نہ کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا“۔ اس معنٰی میں صرف مومنِ صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے مُلک میں اُس کے دیے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

تیسرے معنٰی ہیں: ”ایک دَور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا“۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنٰی ”نیابت“ سے ماخوذ ہیں، اور یہ آخری معنی خلافت بمعنٰی ”جانشینی“ سے ماخوذ۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنٰی لغتِ عرب میں معلوم و معروف ہیں۔

اب جو شخص بھی یہاں اِس سیاق و سباق میں آیتِ استخلاف کو پڑھے گا، وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اُس حکومت کے معنٰی میں استعمال ہُوا ہے جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانینِ فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جارہا ہے۔ اسی لیے فرمایا جارہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ

Maktaba Tul Ishaat.com

کا پسند کردہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لیے اِس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اِس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکا سے لے کر رُوس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں بج رہا ہو اُس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طُغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لعنت کا مستحق قرار دیا؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الانبیاء، حاشیہ ۹۹)

اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے، بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالتِ خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالتِ خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقا کے بڑے حصّے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کُرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اِس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہرِ تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغہ میں سّیدنا علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انھوں نے حضرت عمرؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

> ’’اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت وقلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا شکر ہے جس کی اس نے تائید ونصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اِس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ...... اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قَیِّم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور پراگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی چکّی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آ جائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہوگی۔ اور اُدھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جما دیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اِسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے، اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہلِ عجم بڑی کثیر تعداد میں اُمنڈ آئے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۵۶ لَا
تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ
لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۵۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ

ع ۷ ۱۲

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ع

اے[۸۵] لوگو جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمھارے مملوک[۸۶] اور تمھارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں،[۸۷] تین اوقات میں اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے پہلے بھی ہم جو اُن سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔"

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اِس تقریر میں جنابِ امیر کس کو آیتِ استخلاف کا مصداق ٹھیرا رہے ہیں۔

۸۴ - کفر سے مراد یہاں کفرانِ نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکارِ حق بھی۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس کے مصداق وہ لوگ ہوں گے جو نعمتِ خلافت پانے کے بعد طریقِ حق سے ہٹ جائیں۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس کے مصداق منافقین ہوں گے جو اللہ کا یہ وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روش نہ چھوڑیں۔

۸۵ - یہاں سے پھر احکامِ معاشرت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ سورۂ نور کا یہ حصّہ اوپر کی تقریر کے کچھ مدت بعد نازل ہوا ہو۔

۸۶ - جمہور مفسرین و فقہا کے نزدیک اس سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابن عمرؓ اور مجاہدؒ اِس آیت میں مملوکوں سے مراد صرف غلام لیتے ہیں اور لونڈیوں کو اس سے مُستثنیٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حکم بیان کیا گیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیے کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کا اچانک آ جانا مناسب نہیں، اُسی طرح خادمہ کا بھی آ جانا غیر مناسب ہے۔

یہ امر مُتفَق علیہ ہے کہ اس آیت کا حکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

۸۷ - دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالغوں کا سا خواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہا نے لڑکوں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ

اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اُتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشا کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں۔[88] اِن کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ اُن پر،[89] تمھیں ایک دُوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔[90] اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے،

کے معاملے میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے، وہ اس بنا پر قابلِ ترجیح ہے کہ یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامتِ بلوغ قرار دینے کے بعد حکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملے میں ایامِ ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حکم کا منشا یہ ہے کہ جب تک گھر کے بچے اُس عمر کو نہ پہنچیں جس میں ان کے اندر صنفی شعور بیدار ہوا کرتا ہے، وہ اس قاعدے کی پابندی کریں، اور جب اس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

۸۸ – اصل میں لفظ عَوْرٰتٍ استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "یہ تین وقت تمھارے لیے عورات ہیں۔" عورت اردو میں تو صنفِ اُناث کے لیے بولا جاتا ہے مگر عربی میں اس کے معنٰی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اُس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعثِ شرم ہو، یا جس کا ظاہر ہو جانا اُس کو ناگوار ہو، نیز اس معنٰی میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنٰی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے مفہوم میں کسی نہ کسی حد تک سبھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک تمھارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اُن کو یہ ہدایت کرو کہ اِن تین وقتوں میں جب وہ تمھاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

۸۹ – یعنی ان تین وقتوں کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت عورتوں اور مردوں کے پاس اُن کے کمرے میں یا اُن کے تخلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آ جائیں تو تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ پھر یہ تمھاری اپنی حماقت ہوگی کہ کام کاج کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخلیے کے مذکورۂ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آ جائیں، تو وہ قصور وار ہیں اگر تمھاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہو اگر تم نے اپنے بچوں اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۵۹﴾ وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا

اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمھارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں[91] تو چاہیے کہ اُسی طرح اجازت لے کر

۹۰- یہ وجہ ہے اُس اجازتِ عام کی جو تین اوقاتِ مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اِس سے اُصولِ فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی عِلّت ضرور ہے، خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

۹۱- یعنی بالغ ہو جائیں۔ جیسا کہ اوپر حاشیہ ۸۷ میں بیان کیا جا چکا ہے، لڑکوں کے معاملے میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملے میں ایامِ ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک اِن جسمانی تغیُّرات سے خالی رہ جائیں، ان کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک اس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا، اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی ایک قول اِس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اِس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقیہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں، لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر ہی کو غیر محتلم لڑکوں اور غیر حائضہ لڑکیوں کے معاملے میں حدِ بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں جسمانی نَشو و نَما کے حالات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عُموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام اور ایامِ ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں، اُن کا اوسط فرق نکال لیا جائے، اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے مُعتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مُعتاد عمر پر اِس اوسط کا اضافہ کر کے اُسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعُموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو، تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہو گا، اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سِنِّ بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اسی قاعدے پر مختلف مَمالک کے اہلِ قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

۱۵ برس کی حد کے حق میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، اور وہ ابنِ عمرؓ کی یہ رِوایت ہے کہ میں ۱۴ سال کا تھا جب غزوۂ اُحُد کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپؐ نے مجھے شریکِ جنگ ہونے کی اجازت نہ دی، پھر غزوۂ خندق کے موقع پر، جب کہ میں ۱۵ سال کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپؐ نے مجھ کو اجازت دے دی۔ (صِحاحِ سِتّہ و مُسندِ احمد) لیکن یہ روایت دو وجوہ سے قابلِ اِستِدلال نہیں ہے: اوّل یہ کہ غزوۂ اُحُد شوال ۳ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ خندق بقول محمد بن اسحاق، شوال ۵ھ میں اور بقول ابنِ سعد، ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کا فرق ہے۔ اب اگر غزوۂ اُحُد کے زمانے میں ابنِ عمرؓ ۱۴ سال کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوۂ خندق کے زمانے میں وہ صرف ۱۵ سال کے ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ۚ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۚ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

آیا کریں جس طرح اُن کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اِس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے سامنے کھولتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔

اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں[۹۲] ، نکاح کی اُمیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اُتار کر رکھ دیں[۹۳] تو اُن پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں[۹۴]۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو اُن کے حق میں اچھا ہے، اور اللہ سب کچھ سُنتا ہے اور جانتا ہے۔

---

۱۳ سال ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۴ سال، اور ۱۵ برس ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۵ سال کہہ دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ غیر محتلم لڑکے کے لیے ۱۵ برس کی عمر مقرر کرنا ایک قیاسی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

۹۲ – اصل میں قَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی ”عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں“ یا ”بیٹھی ہوئی عورتیں“۔ اس سے مراد ہے سنِ یاس، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مر چکی ہوں اور اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ نہ پیدا ہوسکتا ہو۔ اسی معنیٰ کی طرف بعد کا فقرہ اشارہ کر رہا ہے۔

۹۳ – اصل الفاظ ہیں: یَضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ، ”اپنے کپڑے اتار دیں“۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد سارے کپڑے اُتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے تمام فقہا اور مفسرین نے بالاتفاق اس سے مراد وہ چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حکم سورۂ احزاب کی آیت یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ میں دیا گیا تھا۔

۹۴ – اصل الفاظ ہیں: غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ ”زینت کے ساتھ تبرّج کرنے والی نہ ہوں“۔ تبرّج کے معنیٰ ہیں اظہار و نمایش کے۔ بارِج اُس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھت نہ ہو۔ اسی معنیٰ میں عورت کے لیے یہ لفظ اُس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرایش کا اظہار کرے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اتار دینے

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ
لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ
بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ
اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا

کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمھارے اُوپر اِس میں کوئی مضایقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ، یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھُوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا اُن گھروں سے جن کی کُنجیاں تمھاری سُپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔[۹۵] اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔[۹۶] البتہ جب

کی یہ اجازت اُن بوڑھی عورتوں کو دی جا رہی ہے جن کے اندر بَن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمایشِ زینت کی شکل اختیار کر رہی ہو، تو پھر اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۹۵- اس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے: اول یہ کہ آیت کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اسی طرح کے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اَخلاقی تعلیمات سے اہلِ عرب کی ذہنیت میں جو زبردست انقلاب واقع ہوا تھا، اس کی وجہ سے حرام وحلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حِس انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ ابنِ عباسؓ کے بقول، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو حکم دیا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے؛ حتّیٰ کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحبِ خانہ کی دعوت واجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اس میں اپنے گھروں سے کھانے کا جو ذکر ہے، وہ اجازت دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں

Maktaba Tul Ishaat.com

دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً
طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع اِنَّمَا
الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ

ع ۸ ۱۳

گھروں میں داخل ہُوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دُعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بُوجھ سے کام لو گے۔ ع

مومن ۹۷ تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام

اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معذور آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھا سکتا ہے، اس کی معذوری بجائے خود سارے معاشرے پر اس کا حق قائم کر دیتی ہے۔ اس لیے جہاں سے بھی اس کو کھانے کے لیے ملے وہ اس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی، تو اُن کے لیے ان کے اپنے گھر اور ان لوگوں کے گھر جن کا ذکر کیا گیا ہے، یکساں ہیں۔ اُن میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اِس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہوگی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جا سکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں، ان میں اولاد کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اس کا اپنا ہی گھر ہے۔

دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ان سے مراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں، جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ ان کا حلوا اُڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو درکنار، انھیں اس پر اُلٹی خوشی ہو۔

۹۶ – قدیم زمانے کے اہلِ عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اور کھائے۔ وہ مل کر ایک ہی جگہ کھانا برا سمجھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض قبیلے تنہا کھانے کو بُرا جانتے تھے، حتّٰی کہ فاقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

۹۷ – یہ آخری ہدایات ہیں جو مسلمانوں کی جماعت کا نظم و ضبط پہلے سے زیادہ کس دینے کے لیے دی جا رہی ہیں۔

جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ
فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ

کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔[۹۸] جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں[۹۹] تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو[۱۰۰] اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دُعائے مغفرت کیا کرو،[۱۰۱] اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔

مسلمانو! اپنے درمیان رسولؐ کے بُلانے کو آپس میں ایک دُوسرے کا سا بُلانا نہ سمجھ بیٹھو۔[۱۰۲]

۹۸- یہی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشینوں اور اسلامی نظام جماعت کے اُمرا کا بھی ہے۔ جب کسی اجتماعی مقصد کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا جائے، قطعِ نظر اس سے کہ جنگ کا موقع ہو یا حالتِ امن کا، بہر حال ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر واپس چلے جائیں یا منتشر ہو جائیں۔

۹۹- اس میں یہ تنبیہ ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر اجازت طلب کرنا تو سرے سے ہی ناجائز ہے۔ جواز کا پہلو صرف اُس صورت میں نکلتا ہے جب کہ جانے کے لیے کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو۔

۱۰۰- یعنی ضرورت بیان کرنے پر بھی اجازت دینا یا نہ دینا رسول کی، اور رسول کے بعد امیرِ جماعت کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہو کہ اجتماعی ضرورت اُس شخص کی انفرادی ضرورت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے تو وہ پورا حق رکھتا ہے کہ اجازت نہ دے، اور اس صورت میں ایک مومن کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۱- اس میں پھر تنبیہ ہے کہ اجازت طلب کرنے میں اگر ذرا سی بہانہ بازی کا بھی دخل ہو، یا اجتماعی ضروریات پر انفرادی ضروریات کو مُقدّم رکھنے کا جذبہ کارفرما ہو تو یہ ایک گناہ ہے۔ لہٰذا رسول اور اس کے جانشین کو صرف اجازت دینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ جسے بھی اجازت دے، ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ خدا تمھیں معاف کرے۔

۱۰۲- اصل میں لفظ دُعَآء استعمال ہوا ہے، جس کے معنی بلانے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی۔ نیز دُعَآءَ الرَّسُوْلِ کے معنی رسول کا بلانا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے، اور رسول کو پکارنا بھی۔ ان مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی صحیح و معقول ہیں:

اوّل یہ کہ "رسولؐ کے بُلانے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بُلانے کی طرح نہ سمجھو"، یعنی رسولؐ کا بُلاوا غیر معمولی اہمیت

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ
يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ
اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ
يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۹ ۱۵

اللہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دُوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چُپکے سے سَٹک جاتے ہیں[۱۰۳]۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو[۱۰۴] جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔ خبردار رہو، آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اُس کی طرف پلٹیں گے وہ اُنھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ع

رکھتا ہے۔ دوسرا کوئی بلائے اور تم لبیک نہ کہو تو تمھیں آزادی ہے، لیکن رسولؐ بلائے اور تم نہ جاؤ، یا دل میں ذرّہ برابر بھی تنگی محسوس کرو تو ایمان کا خطرہ ہے۔

دوم یہ کہ ”رسولؐ کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو“۔ وہ تم سے خوش ہو کر دعا دیں تو تمھارے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور ناراض ہو کر بد دعا دے دیں تو تمھاری اس سے بڑھ کر کوئی بدنصیبی نہیں۔

سوم یہ کہ ”رسولؐ کو پکارنا عام آدمیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح نہ ہونا چاہیے“۔ یعنی تم عام آدمیوں کو جس طرح اُن کے نام لے کر باآوازِ بلند پکارتے ہو، اُس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارا کرو۔ اس معاملے میں اُن کا انتہائی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، کیونکہ ذرا سی بے ادبی بھی اللہ کے ہاں مؤاخذے سے نہ بچ سکے گی۔

یہ تینوں مطلب اگرچہ معنیٰ کے لحاظ سے صحیح ہیں اور قرآن کے الفاظ انتینوں کو شامل ہیں، لیکن بعد کے مضمون سے پہلا مطلب ہی مناسبت رکھتا ہے۔

۱۰۳ – یہ منافقین کی ایک اور علامت بتائی گئی ہے کہ اسلام کی اجتماعی خدمات کے لیے جب بلایا جاتا ہے تو وہ آ تو جاتے ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل رہنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حاضری ان کو سخت ناگوار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح چھپ چُھپا کر نکل بھاگتے ہیں۔

۱۰۴ – امام جعفرِ صادق رحمہ اللہ نے فتنے کا مطلب ”ظالموں کا تسلّط“ لیا ہے۔ یعنی اگر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو ان پر جابر و ظالم حکمراں مسلط کر دیے جائیں گے۔ بہر حال فتنے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اس کے سوا دوسری بے شمار صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً آپس کے تفرِقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظامِ جماعت کی پراگندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادّی طاقت کا ٹوٹ جانا، غیروں کا محکوم ہو جانا وغیرہ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الفرقان

(۲۵)

الفُرقان

نام پہلی ہی آیت تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی قرآن کی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے نہ کہ عنوانِ مضمون کے طور پر۔ تاہم مضمونِ سورہ کے ساتھ یہ نام ایک قریبی مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

زمانۂ نُزُول اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول بھی وہی ہے جو سورۂ مومنون وغیرہ کا ہے، یعنی زمانۂ قیامِ مکہ کا دورِ متوسط۔ ابنِ جَریر اور امام رازی نے ضَحّاک بن مُزاحِم اور مُقاتِل بن سلیمان کی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت سورۂ نساء سے ۸ سال پہلے اُتری تھی۔ اِس حساب سے بھی اس کا زمانۂ نزول وہی دورِ متوسط قرار پاتا ہے۔ (ابنِ جَریر، جلد ۱۹، صفحہ ۲۸-۳۰۔ تفسیر کبیر، جلد ۶، صفحہ ۳۵۸)

موضوع و مَباحِث اس میں اُن شبہات و اعتراضات پر کلام کیا گیا ہے جو قرآن، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اور آپ کی پیش کردہ تعلیم پر کفارِ مکّہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اُن میں سے ایک ایک کا جچا تُلا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دعوتِ حق سے منہ موڑنے کے بُرے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اَخلاقی خوبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اس کَسَوٹی پر کس کر دیکھ لو، کون کھوٹا ہے اور کون کھرا۔ ایک طرف اِس سیرت و کردار کے لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اب تک تیار ہوئے ہیں اور آیندہ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف وہ نمونۂ اَخلاق ہے جو عام اہلِ عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے جاہلیت کے عَلَم بردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اب خود فیصلہ کرو کہ ان دونوں نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟ یہ ایک غیر ملفوظ سوال تھا جو عرب کے ہر باشندے کے سامنے رکھ دیا گیا، اور چند سال کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس کا جو جواب دیا، وہ جَریدۂ روزگار پر ثبت ہو چکا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رکوعاتہا ۶ سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ ۷۷ آیاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ

نہایت متبرک[1] ہے وہ جس نے یہ فرقان[2] اپنے بندے پر نازل[3] کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے

۱ – اصل میں لفظ تَبٰرَكَ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار، ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے۔ اس کا مادّہ ب ر ک ہے، جس سے دو مصدر بَرَکَة اور بُرُوك نکلے ہیں۔ بَرَکَة میں افزونی، فراوانی، کثرت اور زیادتی کا تصور ہے، اور بُرُوك میں ثبات، بقا اور لُزُوم کا تصور۔ پھر جب اس مصدر سے تَبَارَكَ کا صیغہ بنایا جاتا ہے تو بابِ تفاعُل کی خصوصیت، مبالغہ اور اظہارِ کمال، اس میں اور شامل ہو جاتی ہے اور اس کا مفہوم انتہائی فراوانی، بڑھتی اور چڑھتی افزونی، اور کمال درجے کی پائیداری ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے کسی چیز کی فراوانی کے لیے، یا اس کے ثبات و دوام کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی اس سے مراد بلندی میں بہت بڑھ جانا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں: تبارکت النخلة، یعنی فلاں کھجور کا درخت بہت اونچا ہو گیا۔ اَصمَعی کہتا ہے کہ ایک بدو ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: تَبَارَكْتُ عَلَيْكُمْ "میں تم سے اونچا ہو گیا ہوں۔" کبھی اسے عظمت اور بزرگی میں بڑھ جانے کے لیے بولتے ہیں۔ کبھی اس کو فیض رسانی اور خیر اور بھلائی میں بڑھے ہوئے ہونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اس سے پاکیزگی و تقدس کا کمال مراد ہوتا ہے۔ اور یہی کیفیت اس کے معنیٰ ثبوت و لُزوم کی بھی ہے۔ موقع و محل اور سیاق و سباق بتا دیتا ہے کہ کس جگہ اِس لفظ کا استعمال کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ یہاں جو مضمون آگے چل کر بیان ہو رہا ہے، اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے تَبٰرَكَ ایک معنیٰ میں نہیں، بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(۱) بڑا محسن اور نہایت باخیر، اس لیے کہ اس نے اپنے بندے کو فرقان کی عظیم الشان نعمت سے نواز کر دنیا بھر کو خبردار کرنے کا انتظام فرمایا۔

(۲) نہایت بزرگ و باعظمت، اس لیے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اُسی کی ہے۔

(۳) نہایت مقدس و مُنزّہ، اس لیے کہ اُس کی ذات ہر شائبۂ شرک سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی ہم جنس کہ ذاتِ خداوندی میں اس کا نظیر و مثیل ہو، اور نہ اس کے لیے فنا و تغیر کہ اسے جانشینی کے لیے بیٹے کی حاجت ہو۔

(۴) نہایت بلند و برتر، اس لیے کہ بادشاہی ساری کی ساری اسی کی ہے اور کسی دوسرے کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اختیارات میں اس کا شریک ہو سکے۔

(۵) کمالِ قدرت کے اعتبار سے برتر، اس لیے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور ہر شے کی تقدیر مقرر

نَذِيْرَا ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

نذیر ہو[۴] ___ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک[۵] ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے[۶]،

کرنے والا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حاشیہ ۱۹)

۲- یعنی قرآن مجید۔ فرقان مصدر ہے مادّۂ ف رق سے، جس کے معنیٰ ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا، یا ایک ہی چیز کے اجزا کا الگ الگ ہونا۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارق کے معنیٰ میں ہوا ہے، یا مفروق کے معنیٰ میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔ اگر اسے پہلے اور تیسرے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی، اور فیصلہ کُن چیز، اور معیارِ فیصلہ (criterion) کے ہوں گے۔ اور اگر دوسرے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزا پر مشتمل، اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزا پر مشتمل چیز کے ہوں گے۔ قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے "الفرقان" کہا گیا ہے۔

۳- اصل میں لفظ نَزَّلَ استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: بتدریج، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا۔ اس تمہیدی مضمون کی مناسبت آگے چل کر آیت ۳۲ (رکوع ۳) کے مطالعے سے معلوم ہو گی جہاں کفارِ مکہ کے اِس اعتراض پر گفتگو کی گئی ہے کہ "یہ قرآن پورا کا پورا ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟"

۴- یعنی خبر دار کرنے والا، مُتنبِّہ کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرانے والا۔ اِس سے مراد "فرقان" بھی ہو سکتا ہے، اور وہ "بندہ" بھی جس پر فرقان نازل کیا گیا۔ الفاظ ایسے جامع ہیں کہ دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے چونکہ دونوں ایک ہیں، اور ایک ہی کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہنا چاہیے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا کہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے، اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا، "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" (الاعراف، آیت ۱۵۸) وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ "میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے میں تم کو خبردار کروں اور جس جس کو یہ پہنچے۔" (الانعام آیت ۱۹) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، "ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔" (سبا، آیت ۲۸) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "اور ہم نے تم کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (الانبیاء، آیت ۱۰۷) اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بُعثت الی الاحمر والاسود، "میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔" اور کان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعثت الی الناس عامة، "پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔" (بخاری و مسلم) اور وارسلت الی الخلق کافة وخُتِم بی النبیون، "میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں، اور ختم کر دیے گئے میری آمد پر انبیا۔" (مسلم)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا ۝۲

جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے[6]، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی[8]۔

۵ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے“، یعنی وہی اس کا حق دار ہے اور اسی کے لیے وہ مخصوص ہے، کسی دوسرے کو نہ اس کا حق پہنچتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ ہے۔

۶ – یعنی نہ تو کسی سے اس کا کوئی نسبی تعلق ہے، اور نہ کسی کو اس نے اپنا مُتَبنّیٰ بنایا ہے۔ کوئی ہستی کائنات میں ایسی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نسلی تعلق یا تَبَنِّیت کے تعلق کی بنا پر اس کو معبودیت کا استحقاق پہنچتا ہو۔ اس کی ذات یکتائے محض ہے، کوئی اس کا ہم جنس نہیں، اور کوئی خدائی خاندان نہیں ہے کہ معاذ اللہ، ایک خدا سے کوئی نسل چلی ہو اور بہت سے خدا پیدا ہوتے چلے گئے ہوں۔ اس لیے وہ تمام مشرکین سراسر جاہل و گمراہ ہیں جنھوں نے فرشتوں، یا جنّوں، یا بعض انسانوں کو خدا کی اولاد سمجھا اور اس بنا پر انھیں دیوتا اور معبود قرار دے لیا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی نری جہالت و گمراہی میں مبتلا ہیں جنھوں نے نسلی تعلق کی بنا پر نہ سہی، کسی خُصوصیت کی بنا پر ہی سہی، اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ خداوندِ عالَم نے کسی شخص کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ ”بیٹا بنالینے“ کے اس تصور کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے، یہ سخت غیر معقول نظر آتا ہے، کجا کہ یہ ایک امرِ واقعی ہو۔ جن لوگوں نے یہ تصور ایجاد یا اختیار کیا، ان کے گھٹیا ذہن ذاتِ الٰہی کی برتری کا تصور کرنے سے عاجز تھے۔ انھوں نے اُس ذاتِ بے ہمتا و بے نیاز کو انسانوں پر قیاس کیا، جو یا تو تنہائی سے گھبرا کر کسی دوسرے کے بچے کو گود لے لیتے ہیں، یا جذباتِ محبت کے وُفور سے کسی کو بیٹا بنالیتے ہیں، یا مُتَبنّیٰ بنانے کی اس لیے ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی تو اُن کا وارث اور ان کے نام اور کام کو زندہ رکھنے والا ہو۔ یہی تین وجوہ ہیں جن کی بنا پر انسانی ذہن میں تَبَنِّیت کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور اِن میں سے جس وجہ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے، سخت جہالت اور گستاخی اور کم عقلی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حواشی ۶۶ تا ۶۸)

۷ – اصل میں لفظ مُلْک استعمال ہوا ہے، جو عَرَبی زبان میں بادشاہی، اقتدارِ اعلیٰ، اور حاکمیت (sovereignity) کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مُطلَق ہے اور فرمانروائی کے اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اِس بات کو مُستلزم ہے کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان جس کو بھی معبود بناتا ہے، یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھا یا برا اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو ملجا و ماویٰ بنانے کے لیے کوئی احمق سے احمق انسان بھی کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ جَلّ شانُہٗ کے سوا اس کائنات میں کسی کے پاس بھی کوئی زور نہیں ہے، تو پھر نہ کوئی گردن اُس کے سوا کسی کے آگے اظہارِ عجز و نیاز کے لیے جھکے گی، نہ کوئی ہاتھ اُس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لیے بڑھے گا، نہ کوئی زبان اُس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی، یا دعا و التجا کے لیے کھلے گی، اور نہ دنیا کے کسی نادان سے نادان آدمی سے بھی کبھی یہ حماقت سرزد ہوسکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کی طاعت و بندگی بجا لائے، یا کسی کو بذاتِ خود حکم چلانے کا حق دار مانے۔ اس مضمون کو مزید تقویت اوپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبُود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں[9]، جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں نہ جِلا سکتے ہیں، نہ مَرے ہوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں[10]۔

''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے اور اُسی کے لیے ہے۔''

۸ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر رکھا''، یا ''ہر چیز کے لیے ٹھیک ٹھیک پیمانہ مقرر کیا''۔ لیکن خواہ کوئی ترجمہ بھی کیا جائے، بہر حال اس سے پورا مطلب ادا نہیں ہوتا۔ پورا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ کائنات کی ہر چیز کو وجود بخشا ہے، بلکہ وہی ہے جس نے ایک ایک چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت و استعداد، اوصاف و خصائص، کام اور کام کا طریق، بقا کی مدت، عُروج و ارتقا کی حد، اور دوسری وہ تمام تفصیلات مقرر کی ہیں جو اُس چیز کی ذات سے متعلق ہیں، اور پھر اسی نے عالَم وجود میں وہ اسباب و وسائل اور مواقع پیدا کیے ہیں جن کی بدولت ہر چیز یہاں اپنے اپنے دائرے میں اپنے حصے کا کام کر رہی ہے۔

اس ایک آیت میں توحید کی پوری تعلیم سمیٹ دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی جامع آیات میں سے یہ ایک عظیم الشان آیت ہے جس کے چند الفاظ میں اتنا بڑا مضمون سمو دیا گیا ہے کہ ایک پوری کتاب بھی اس کی وسعتوں کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ کان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم اذا افصح الغلام من بنی عبدالمطلب علمہ ھٰذہ الاٰیۃ، ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قاعدہ تھا کہ حضورؐ کے خاندان میں جب کسی بچے کی زبان کھل جاتی تھی تو آپؐ یہ آیت اسے سکھاتے تھے۔'' (مُصَنَّفِ عبدالرزاق و مُصَنَّفِ ابنِ ابی شَیْبَہ، بروایت عَمرو بن شُعیب عن اَبیہ عن جَدِّہٖ) اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے ذہن میں توحید کا پورا تصور بٹھانے کے لیے یہ آیت ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کے بچے جب ہوشیار ہونے لگیں تو آغاز ہی میں ان کے ذہن پر یہ نقش ثبت کر دے۔

۹ – جامع الفاظ ہیں جو ہر قسم کے جعلی معبودوں پر حاوی ہیں۔ وہ بھی جن کو خدا نے پیدا کیا اور انسان ان کو معبود مان بیٹھا، مثلاً فرشتے، جن، انبیاء، اولیا، سورج، چاند، سیّارے، درخت، دریا، جانور وغیرہ۔ اور وہ بھی جن کو انسان خود بناتا ہے اور خود ہی معبود بنا لیتا ہے، مثلاً پتھر اور لکڑی کے بُت۔

۱۰ – حاصلِ کلام یہ ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے ایک بندے پر فرقان اس لیے نازل کیا کہ حقیقت تو تھی وہ، اور لوگ اس سے غافل ہو کر پڑ گئے اِس گمراہی میں، لہٰذا ایک بندہ نذیر بنا کر اُٹھایا گیا ہے، تاکہ لوگوں کو اس حماقت کے بُرے نتائج سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ١فْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ
قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝٤ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ
اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝٥ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ
يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٦

معانقۃ ۱۰

جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اِس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دُوسرے لوگوں نے اِس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم[11] اور سخت جھُوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اِسے صبح و شام سُنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "اِسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔"[12] حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفورٌ رحیم ہے۔[13]

خبردار کرے، اور اس پر بتدریج یہ فرقان نازل کرنا شروع کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے وہ حق کو باطل سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے دکھا دے۔

۱۱- دوسرا ترجمہ "بڑی بے انصافی کی بات" بھی ہو سکتا ہے۔

۱۲- یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مُستشرقینِ مغرب قرآنِ مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بُحَیرا راہب سے جب ملے تھے، اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے، اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی رَبّیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے، اُن کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سیکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں بُحَیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، یا ۲۵ برس کی عمر سے، جب کہ اس نے تجارتی سفر شروع کیے تھے، حاصل ہونی شروع ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمّازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اتنے سفید جھوٹ کی جرأت نہ کی اور اُسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص اَن پڑھ ہے۔ خود مُطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک اُن باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان

ں رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سر چشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن قتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انھیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انھیں رکے ہمیں دن کو سناتا ہے۔ رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ تاب تھے، پڑھے لکھے تھے، اور مکے میں رہتے تھے، یعنی عَدّاس (حُوَیطِب بن عبدالعُزّٰی کا آزاد کردہ غلام)، یَسار علا بن الحَضرَمی کا آزاد کردہ غلام)، اور جَبرؔ (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وَحی کے دعوے کو ردّ کرنے کے لیے نبی کے مآخذِ علم کی نشان دہی کر دینے سے بڑھ کر اور کون سا اعتراض وزنی ہوسکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اُٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کا بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے اور اس کو یوں حقارت سے ردّ کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس ”جھوٹ اور ظلم“ کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا، نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا، اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اِس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گتھی کا حل ہمیں اُسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفینِ اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا:

پہلی بات یہ تھی کہ مکے کے وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کُوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمدؐ کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اِس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئین و ضابطہ مانع نہ تھا، اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوتِ محمدی کے خطرے کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کُن قدم اُٹھا کر انھوں نے نہ دکھایا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس سلسلے میں وہ جن لوگوں کے نام لیتے تھے، وہ کہیں باہر کے نہ تھے، اسی شہرِ مکہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چُھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں، وہ کس پایے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زورِ کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمدؐ ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں، ورنہ اس قول میں کسی شبہے کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے، وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے

Maktaba Tul Ishaat.com

تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انھوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انھیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے؟

تیسری بات یہ تھی کہ وہ سب اشخاص، جن کا اس سلسلے میں نام لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقت ور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے وِلاء (سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت، معاذ اللہ، ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپؐ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر ایسے شخص کے وہ مخلص رفیقِ کار اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انھی سے کچھ باتیں سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب و مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کُوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انھوں نے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا، اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انھی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چمکائی جا رہی ہے؟

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس ضَرْبُ الْمَثَل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابۂ کرامؓ آنحضورؐ کی ذاتِ مقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود وہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنھوں نے اس کے بنانے کی سازش میں خود حصّہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہلِ ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عَدّاس اور یَسار اور جَبر کے بل بُوتے پر، اور نبی کے دستِ راست بنیں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ابو عُبَیدہؓ؟

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جاتا تھا تو وہ زیدؓ بن حارثہ، علیؓ بن ابی طالب، ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے اُن لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب و روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟ اس الزام میں برائے نام بھی کوئی شائبۂ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضورؐ پر ایمان لاتے اور آپؐ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات و نقصانات برداشت کرتے؟ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں، اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔

۱۳ – اس جگہ یہ فقرہ بڑا معنیٰ خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا شان ہے خدا کی رحیمی و غفّاری کی، جو لوگ حق کو نیچا دکھانے

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ
لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ
اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا
رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا

کہتے ہیں: ”یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے[۱۴]؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا[۱۵]؟ یا اور کچھ نہیں تو اِس کے لیے کوئی خزانہ ہی اُتار دیا جاتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا[۱۶]۔“ اور ظالم کہتے ہیں: ”تم لوگ تو ایک سحر زدہ[۱۷] آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔“ دیکھو، کیسی کیسی عجیب حُجّتیں یہ لوگ تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں، ایسے بہکے ہیں کہ کوئی

کے لیے ایسے ایسے جھوٹ کے طوفان اٹھاتے ہیں، اُن کو بھی وہ مہلت دیتا ہے اور سنتے ہی عذاب کا کوڑا نہیں برسا دیتا۔ اس تنبیہ کے ساتھ اس میں ایک پہلو تلقین کا بھی ہے کہ ظالمو! اب بھی اگر عناد سے باز آ جاؤ اور حق بات کو سیدھی طرح مان لو تو جو کچھ آج تک کرتے رہے ہو، وہ سب معاف ہو سکتا ہے۔

۱۴ — یعنی اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر، اُن کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۲۶)

۱۵ — یعنی اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔

۱۶ — یہ گویا بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ۝ تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا

ع ۱۱

ٹھکانے کی بات اِن کو نہیں سُوجھتی۔[18] بڑا بابرکت ہے[19] وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی

نصیب، اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں۔

۱۷ – یعنی دیوانہ۔ اہلِ عرب کے نزدیک دیوانگی کے دو ہی وجوہ تھے: یا تو کسی پر جن کا سایہ ہو گیا ہو۔ یا کسی دشمن نے جادو کر کے پاگل بنا دیا ہو۔ ایک تیسری وجہ ان کے نزدیک اور بھی تھی، اور وہ یہ کہ کسی دیوی، یا دیوتا کی شان میں آدمی کوئی گستاخی کر بیٹھا ہو اور اس کی مار پڑ گئی ہو۔ کفارِ مکہ وقتاً فوقتاً یہ تینوں وجوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرتے تھے۔ کبھی کہتے: اس شخص پر کسی جن کا تسلط ہو گیا ہے۔ کبھی کہتے: کسی دشمن نے بیچارے پر جادو کر دیا ہے۔ اور کبھی کہتے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی کی بے ادبی کرنے کا خمیازہ ہے جو غریب بھگت رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اتنا ہوشیار بھی مانتے تھے کہ ایک دارالترجمہ اس شخص نے قائم کر رکھا ہے اور پرانی پرانی کتابوں کے اقتباسات نکلوا نکلوا کر یاد کرتا ہے۔ مزید برآں وہ آپؐ کو ساحر اور جادوگر بھی کہتے تھے۔ گویا آپؐ ان کے نزدیک مسحور بھی تھے اور ساحر بھی۔ اس پر ایک اور رَدّا شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا۔

۱۸ – یہ اعتراضات بھی جواب دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ ان کی جو باتیں اوپر نقل کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جائے۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ مخالفین کا دامن معقول دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلّل اُصولی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے: لوگو! یہ شرک جس پر تمھارے مذہب وتمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی، بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے: کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے: جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے: تم دنیا میں شُترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو، تمھیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور اس حقیقت پر یہ اَخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ علمی وعقلی اُمور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے: شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے: میں خدا کی طرف سے تمھارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث وتنقید نہیں ہوتی، بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت وکردار کو پیش کرتا ہے، اور اس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیرووں کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمھاری اَرْدَلی میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمھارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بے تکی ہانک رہا ہے۔

مِّنۡ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ وَ یَجۡعَلۡ لَّكَ قُصُوۡرًا ﴿۱۰﴾
بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالسَّاعَةِ ۟ وَ اَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیۡرًا ﴿۱۱﴾ۚ اِذَا

زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، (ایک نہیں) بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور بڑے بڑے محل۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اُس گھڑی"[۲۰] کو جھٹلا چکے ہیں[۲۱] ـــــــــ اور جو اُس گھڑی کو جھٹلائے، اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر رکھی ہے۔ وہ جب

۱۹ - یہاں پھر وہی تَبٰرَكَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنیٰ ہیں "بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے"۔ "غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے"۔ "اس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے"۔

۲۰ - اصل میں لفظ السَّاعَةِ استعمال ہُوا ہے۔ ساعت کے معنیٰ گھڑی اور وقت کے ہیں اور ال اس پر عہد کا ہے، یعنی وہ مخصوص گھڑی جو آنے والی ہے، جس کے متعلق ہم پہلے تم کو خبر دے چکے ہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر اُس وقتِ خاص کے لیے بولا گیا ہے جب کہ قیامت قائم ہوگی، تمام اوّلین و آخرین از سرِ نو زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے، سب کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے عقیدہ و عمل کے لحاظ سے جزا یا سزا دے گا۔

۲۱ - یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو واقعی کسی قابلِ لحاظ بنیاد پر قرآن کے جعلی کلام ہونے کا شبہ ہے، یا ان کو درحقیقت یہ گمان ہے کہ جن آزاد کردہ غلاموں کے یہ نام لیتے ہیں، وہی تم کو سکھاتے پڑھاتے ہیں، یا انھیں تمھاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، یا وہ تمھاری تعلیمِ حق کو مان لینے کے لیے تیار تھے مگر صرف اس لیے رک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمھاری اردلی میں تھا اور نہ تمھارے لیے کوئی خزانہ اتارا گیا تھا۔ اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ آخرت کا انکار ہے جس نے ان کو حق اور باطل کے معاملے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، اور تمھاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لیے ایسی ایسی مضحکہ انگیز حجتیں پیش کرنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہن اس تخیل سے خالی ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں انھیں خدا کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس چار دن کی زندگی کے بعد مر کر سب کو مٹی ہو جانا ہے۔ بُت پرست بھی مٹی ہو جائے گا اور خدا پرست بھی اور منکرِ خدا بھی۔ نتیجہ کسی چیز کا بھی کچھ نہیں نکلنا ہے۔ پھر کیا فرق پڑ جاتا ہے مشرک ہو کر مرنے اور مؤحد یا ملحد ہو کر مرنے میں۔ صحیح اور غلط کے امتیاز کی اگر ان کے نزدیک کوئی ضرورت ہے تو اس دنیا کی کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے ہے۔ اور یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کسی عقیدے یا اخلاقی اُصول کا بھی کوئی متعین نتیجہ نہیں ہے جو پوری یکسانی کے ساتھ ہر شخص اور ہر رویّے کے معاملے میں نکلتا ہو۔ دہریے، آتش پرست، عیسائی،

Maktaba Tul Ishaat.com

رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا
مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا
الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ
جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾

دُور سے اِن کو دیکھے گی[22] تو یہ اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سُن لیں گے۔ اور جب یہ دست و پا بستہ اُس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت کو نہیں بہت سی مَوتوں کو پکارو۔

اِن سے پوچھو: یہ انجام اچھا ہے یا وہ اَبدی جنّت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے؟ جو اُن کے عمل کی جزا اور اُن کے سفر کی آخری منزل ہوگی، جس میں اُن کی ہر خواہش پُوری ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جس کا عطا کرنا تمھارے رب کے ذمّے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔[23]

موسائی، ستارہ پرست، بُت پرست، سب اچھے اور بُرے دونوں ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی ایک عقیدہ نہیں جس کے متعلق تجربہ بتاتا ہو کہ اسے اختیار کرنے والا، یا رد کر دینے والا اِس دنیا میں لازماً خوشحال یا لازماً بدحال رہتا ہو۔ بدکار اور نیکوکار بھی یہاں ہمیشہ اپنے اعمال کا ایک ہی مقرر نتیجہ نہیں دیکھتے۔ ایک بدکار مزے کر رہا ہے اور دوسرا سزا پا رہا ہے۔ ایک نیکوکار مصیبت جھیل رہا ہے تو دوسرا معزز و محترم بنا ہوا ہے۔ لہٰذا دنیوی نتائج کے اعتبار سے کسی مخصوص اخلاقی رَوَیّے کے متعلق بھی منکرینِ آخرت اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ خیر ہے یا شر ہے۔ اس صورتِ حال میں جب کوئی شخص ان کو ایک عقیدے اور ایک اَخلاقی ضابطے کی طرف دعوت دیتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی سنجیدہ اور معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت پیش کرے، ایک منکرِ آخرت کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا، بلکہ طفلانہ اعتراضات کر کے اسے ٹال دے گا۔

۲۲ – آگ کا کسی کو دیکھنا ممکن ہے کہ استعارے کے طور پر ہو، جیسے ہم کہتے ہیں، وہ جامع مسجد کے مینار تم کو دیکھ رہے ہیں، اور ممکن ہے حقیقی معنوں میں ہو، یعنی جہنّم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح بے شعور نہ ہو بلکہ دیکھ بھال کر جلانے والی ہو۔

۲۳ – اصل الفاظ ہیں: وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا یعنی ایسا وعدہ جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شخص یہ سوال اُٹھا سکتا ہے کہ جنت کا یہ وعدہ اور دوزخ کا یہ ڈراوا کسی ایسے شخص پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ
اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ

اور وہی دن ہوگا جب کہ (تمھارا رب) اِن لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے اُن معبُودوں[۲۴] کو بھی بُلالے گا جنھیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پُوج رہے ہیں، پھر وہ اُن سے پُوچھے گا: "کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟[۲۵]" وہ عرض کریں گے: "پاک ہے آپ کی ذات،

جو قیامت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا پہلے ہی منکر ہو؟ اس لحاظ سے تو یہ بظاہر ایک بے محل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ میں ایک بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا تو بحث و حجت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں اپنے مخاطب سے اِس انداز میں گفتگو کر رہا ہوں کہ زیرِ بحث مسئلہ میری بات ماننے یا نہ ماننے کا نہیں بلکہ تمھارے اپنے مفاد کا ہے، تو مخاطب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے۔ اس صورت میں مخاطب کو خود اپنی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہرحال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اور امکان دونوں ہی کا ہے۔ اب اگر دوسری زندگی نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں، تو ہمیں بھی مر کر مٹی ہو جانا ہے اور آخرت کے قائل کو بھی۔ اس صورت میں دونوں برابر رہیں گے۔ لیکن اگر کہیں بات وہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے، تو یقیناً پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ اس طرح یہ طرزِ کلام مخاطب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جانے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲، حاشیہ ۶۹۔ الاحقاف، آیت ۱۰)

۲۴۔ آگے کا مضمون خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں معبُودوں سے مراد بُت نہیں ہیں بلکہ فرشتے، انبیا، اولیا، شہدا اور صالحین ہیں جنھیں مختلف قوموں کے مشرکین معبُود بنا بیٹھے ہیں۔ بظاہر ایک شخص وَمَا يَعْبُدُوْنَ کے الفاظ پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ اس سے مراد بُت ہیں، کیونکہ عربی زبان میں عُموماً مَا غیر ذوی العقول اور مَنْ ذوی العقول کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے ہم اُردو زبان میں "کیا ہے" غیر ذوی العقول اور "کون ہے" ذوی العقول کے لیے بولتے ہیں۔ مگر اردو کی طرح عربی میں بھی یہ الفاظ بالکل اِن معنوں کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ بسا اوقات ہم اُردو میں کسی انسان کے متعلق تحقیر کے طور پر کہتے ہیں: "وہ کیا ہے" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کوئی بڑی ہستی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال عربی زبان کا بھی ہے۔ چونکہ معاملہ اللہ کے مقابلے میں اس کی مخلوق کو معبُود بنانے کا ہے، اس لیے خواہ فرشتوں اور بزرگ انسانوں کی حیثیت بجائے خود بہت بلند ہو مگر اللہ کے مقابلے میں تو گویا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے موقع و محل کی مناسبت سے ان کے لیے مَنْ کے بجائے مَا کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا كَانَ يَنۡۢبَغِىۡ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ مِنۡ دُوۡنِكَ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ وَلٰـكِنۡ مَّتَّعۡتَهُمۡ وَاٰبَآءَهُمۡ حَتّٰى نَسُوا الذِّكۡرَ‌ۚ وَكَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدۡ كَذَّبُوۡكُمۡ بِمَا تَقُوۡلُوۡنَ ۙ فَمَا تَسۡتَطِيۡعُوۡنَ صَرۡفًا وَّلَا نَصۡرًا‌ ۚ

ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے اِن کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا حتّٰی کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔[۲۶] "یوں جُھٹلا دیں گے وہ (تمھارے معبُود) تمھاری اُن باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو،[۲۷] پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے۔

۲۵ - یہ مضمون متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ سَبا میں ہے: وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ يَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ○ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ اَنۡتَ وَلِيُّنَا مِنۡ دُوۡنِهِمۡ‌ۚ بَلۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ‌ۚ اَكۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ○ "جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمھاری ہی بندگی کر رہے تھے؟ وہ کہیں گے: پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اِن سے۔ یہ لوگ تو جِنّوں (یعنی شیاطین) کی بندگی کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر انھی کے مومن تھے۔" (آیات: ۴۰-۴۱) اسی طرح سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں ہے: وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِحَقٍّ‌ ...... مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِىۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ‌ۚ "اور جب اللہ پوچھے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ وہ عرض کرے گا: پاک ہے آپ کی ذات، میرے لیے یہ کب زیبا تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا...... میں نے تو ان سے بس وہی کچھ کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔"

۲۶ - یعنی یہ کم ظرف اور کمینے لوگ تھے۔ آپ نے رزق دیا تھا کہ شکر کریں۔ یہ کھا پی کر نمک حرام ہو گئے اور وہ سب نصیحتیں بھلا بیٹھے جو آپ کے بھیجے ہوئے انبیاؑ نے ان کو کی تھیں۔

۲۷ - یعنی تمھارا یہ مذہب، جس کو تم حق سمجھے بیٹھے ہو، بالکل بے اصل ثابت ہوگا، اور تمھارے وہ معبود جن پر تمھیں بھروسا ہے کہ یہ خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، اُلٹے تم کو خطاکار ٹھیرا کر بری الذمہ ہو جائیں گے۔ تم نے جو کچھ بھی اپنے معبُودوں کو قرار دے رکھا ہے، بطورِ خود ہی قرار دے رکھا ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تم سے یہ نہ کہا تھا کہ ہمیں یہ کچھ مانو، اور اس طرح ہماری نذر و نیاز کیا کرو، اور ہم خدا کے ہاں تمھاری سفارش کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ ایسا کوئی قول کسی فرشتے یا کسی بزرگ کی طرف سے نہ یہاں تمھارے پاس موجود ہے، نہ قیامت میں تم اسے ثابت کر سکو گے، بلکہ وہ سب کے سب خود تمھاری آنکھوں کے سامنے ان باتوں کی تردید کریں گے اور تم اپنے کانوں سے ان کی تردید سن لوگے۔

وَ مَنۡ یَّظۡلِمۡ مِّنۡکُمۡ نُذِقۡہُ عَذَابًا کَبِیۡرًا ﴿۱۹﴾ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّاۤ اِنَّہُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَ یَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ ؕ وَ جَعَلۡنَا بَعۡضَکُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَۃً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ۚ وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیۡرًا ﴿۲۰﴾ ع

اور جو بھی تم میں سے ظلم[۲۸] کرے، اُسے ہم سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

اے محمدؐ! تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے، وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔[۲۹] دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دُوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔[۳۰] کیا تم صبر کرتے ہو؟[۳۱] تمھارا رب سب کچھ دیکھتا ہے[۳۲] ع

۲۸ – یہاں ظلم سے مراد حقیقت اور صداقت پر ظلم ہے، یعنی کفر و شرک۔ سیاق و سباق خود ہی ظاہر کر رہا ہے کہ نبی کو نہ ماننے والے اور خدا کے بجائے دوسروں کو معبود بنا بیٹھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے ''ظلم'' کے مرتکب قرار دیے جا رہے ہیں۔

۲۹ – یہ جواب ہے کفارِ مکہ کی اُس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفارِ مکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاؑ سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اُٹھا رہے ہو؟ پہلے کون سا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟ اور تو اور، خود عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، جن کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے (اور جن کا مجسمہ کفارِ مکہ نے بھی کعبہ میں رکھ چھوڑا تھا) انجیلوں کے اپنے بیان کے مطابق کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔

۳۰ – یعنی رسول اور اہلِ ایمان کے لیے منکرین آزمائش ہیں اور منکرین کے لیے رسول اور اہلِ ایمان۔ منکرین نے ظلم و ستم اور جاہلانہ عداوت کی جو بھٹی گرم کر رکھی ہے، وہی تو وہ ذریعہ ہے جس سے ثابت ہوگا کہ رسول اور اس کے صادق الایمان پیرو کھرا سونا ہیں۔ کھوٹ جس میں بھی ہوگی، وہ اس بھٹی سے بخیریت نہ گزر سکے گا، اور اس طرح خالص اہلِ ایمان کا ایک چیدہ گروہ چھٹ کر نکل آئے گا جس کے مقابلے میں پھر دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکے گی۔ یہ بھٹی گرم نہ ہوتو ہر طرح کے کھوٹے اور کھرے آدمی نبی کے گرد جمع ہو جائیں گے، اور دین کی ابتدا ہی ایک خام جماعت سے ہوگی۔ دوسری طرف منکرین کے لیے بھی رسول اور اصحابِ رسول ایک سخت آزمائش ہیں۔ ایک عام انسان کا اپنی ہی برادری کے درمیان سے یکایک نبی بنا کر اُٹھا دیا جانا، اُس کے پاس کوئی فوج فرّا اور مال و دولت نہ ہونا، اس کے ساتھ کلامِ الٰہی اور پاکیزہ سیرت کے سوا کوئی عجوبہ چیز نہ ہونا،

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۹ الجزء

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟[۳۳] یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں۔"[۳۴] بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں[۳۵] اور حد سے گزر گئے یہ اپنی سرکشی میں۔

اُس کے ابتدائی پیرووں میں زیادہ تر غریبوں، غلاموں اور نوعمر لوگوں کا شامل ہونا اور اللہ تعالیٰ کا اِن چند مٹھی بھر انسانوں کو گویا بھیڑیوں کے درمیان بے سہارا چھوڑ دینا، یہی وہ چھلنی ہے جو غلط قسم کے آدمیوں کو دین کی طرف آنے سے روکتی ہے، اور صرف ایسے ہی لوگوں کو چھان چھان کر آگے گزارتی ہے جو حق کو پہچاننے والے اور راستی کو ماننے والے ہوں۔ یہ چھلنی اگر نہ لگائی جاتی اور رسول بڑی شان و شوکت کے ساتھ آ کر تختِ فرماں روائی پر جلوہ گر ہوتا، خزانوں کے منہ اس کے ماننے والوں کے لیے کھول دیے جاتے، اور سب سے پہلے بڑے بڑے رئیس آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے، تو آخر کون سا دنیا پرست اور بندۂ غرض انسان اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ اس پر ایمان لانے والوں میں شامل نہ ہو جاتا۔ اس صورت میں تو راستی پسند لوگ سب سے پیچھے رہ جاتے اور دنیا کے طالب بازی لے جاتے۔

۳۱– یعنی اس مَصلَحت کو سمجھ لینے کے بعد کیا اب تم کو صبر آ گیا کہ آزمائش کی یہ حالت اُس مقصدِ خیر کے لیے نہایت ضروری ہے جس کے لیے تم کام کر رہے ہو؟ کیا اب تم وہ چوٹیں کھانے پر راضی ہو جو اس آزمائش کے دَور میں لگنی ناگزیر ہیں؟

۳۲– اس کے دو معنیٰ ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تمھارا رب جو کچھ کر رہا ہے، کچھ دیکھ کر ہی کر رہا ہے، اس کی نگری اندھیر نگری نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس خلوص اور راست بازی کے ساتھ اس کٹھن خدمت کو تم انجام دے رہے ہو، وہ بھی تمھارے رب کی نگاہ میں ہے، اور تمھاری مساعیِ خیر کا مقابلہ جن زیادتیوں اور بے ایمانیوں سے کیا جا رہا ہے، وہ بھی اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا پورا اطمینان رکھو کہ نہ تم اپنی خدمات کی قدر سے محروم رہو گے اور نہ وہ اپنی زیادتیوں کے وبال سے بچے رہ جائیں گے۔

۳۳– یعنی اگر واقعی خدا کا ارادہ یہ ہے کہ ہم تک اپنا پیغام پہنچائے، تو ایک نبی کو واسطہ بنا کر صرف اُس کے پاس فرشتہ بھیج دینا کافی نہیں ہے، ہر شخص کے پاس ایک فرشتہ آنا چاہیے جو اسے بتائے کہ تیرا رب تجھے یہ ہدایت دیتا ہے۔ یا فرشتوں کا ایک وفد مجمعِ عام میں ہم سب کے سامنے آ جائے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ سورۂ انعام میں بھی ان کے اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے: وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ "جب کوئی آیت ان کے سامنے پیش ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ ہمیں وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کا کیا انتظام کرے۔" (آیت ۱۲۴)

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا
مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ
السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ

جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ[۳۶] ہوگا، چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا! اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں[۳۷] گے۔ بس وہی لوگ جو جنّت کے مستحق ہیں اُس دن اچھی جگہ ٹھیریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں[۳۸] گے۔ آسمان کو چیرتا ہُوا ایک بادل اُس روز نمودار ہوگا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اُتار دیے جائیں گے۔ اُس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمٰن[۳۹] کی ہوگی۔

۳۴- یعنی اللہ میاں خود تشریف لے آئیں اور فرمائیں کہ بندو! میری تم سے یہ التماس ہے۔

۳۵- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ''بڑی چیز سمجھ لیا اپنی دانست میں انھوں نے اپنے آپ کو''۔

۳۶- یہی مضمون سورۂ انعام، آیت ۸ اور سورۂ حجر، آیات ۷-۸ اور آیات ۵۱ تا ۶۴ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۹۰ تا ۹۵ میں بھی کفار کے بہت سے عجیب و غریب مطالبات کے ساتھ اِس کا ذکر کر کے جواب دیا گیا ہے۔

۳۷- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۲۵-۲۶۔

۳۸- یعنی میدانِ حشر میں جنت کے مستحق لوگوں کے ساتھ مجرمین سے مختلف معاملہ ہوگا۔ وہ عزت کے ساتھ بٹھائے جائیں گے اور روزِ حشر کی سخت دوپہر گزارنے کے لیے اُن کو آرام کی جگہ دی جائے گی۔ اُس دن کی ساری سختیاں مجرموں کے لیے ہوں گی نہ کہ نیکوکاروں کے لیے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، حضورؐ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ اِنَّہٗ لیخفف علی المؤمن حتی یکون اخف علیہ من صلوۃ مکتوبۃ یصلیھا فی الدنیا۔ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کا عظیم الشان اور خوفناک دن ایک مومن کے لیے بہت ہلکا کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ اتنا ہلکا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے۔'' (مُسندِ احمد بروایتِ ابی سعید خدریؓ)

۳۹- یعنی وہ ساری مجازی بادشاہیاں اور ریاستیں ختم ہو جائیں گی جو دنیا میں انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہاں صرف ایک بادشاہی باقی رہ جائے گی اور وہ وہی اللہ کی بادشاہی ہے جو اس کائنات کا حقیقی فرمانروا ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہُوا ہے: يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿﴾ ''وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا
خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى

اور وہ منکرین کے لیے بڑا سخت دن ہوگا۔ ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اُس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی، شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"[40] اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک[41] بنالیا تھا۔"

اے محمدؐ! ہم نے تو اِسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا[42] ہے اور تمھارے لیے تمھارا

دن جب کہ یہ سب لوگ بے نقاب ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ پوچھا جائے گا: آج بادشاہی کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب آئے گا: اکیلے اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔" (آیت ۱۶) حدیث میں اس مضمون کو اور زیادہ کھول دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک ہاتھ میں آسمانوں اور دوسرے ہاتھ میں زمین کو لے کر فرمائے گا: انا الملك، انا الديان، اين ملوك الارض؟ اين الجبارون ؟ اين المتكبرون؟ "میں ہوں بادشاہ، میں ہوں فرمانروا، اب کہاں ہیں وہ زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں وہ جبار؟ کہاں ہیں وہ متکبر لوگ؟" (یہ روایت مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، اور ابوداؤد میں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے)۔

۴۰ – ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کافر ہی کے قول کا ایک حصہ ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ اس دوسری صورت میں مناسب ترجمہ یہ ہوگا: "اور شیطان تو ہے ہی انسان کو عین وقت پر دغا دینے والا"۔

۴۱ – اصل میں لفظ مَهْجُوْرًا استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنی ہیں۔ اگر اسے هَجْر سے مُشتق مانا جائے تو معنی ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا، نہ اسے قبول کیا اور نہ اس سے کوئی اثر لیا۔ اور اگر هُجْر سے مُشتق مانا جائے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ انھوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اسے اپنے ہذیان اور اپنی بکواس کا ہدف بنالیا اور اس پر طرح طرح کی باتیں چھانٹتے رہے۔

بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا ﴿۳۱﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ
مع جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا ﴿۳۲﴾ وَ

رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔[۴۳]

منکرین کہتے ہیں: "اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟"[۴۴] ——ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمھارے ذہن نشین کرتے رہیں[۴۵] اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے)

۴۲- یعنی آج جو دشمنی تمھارے ساتھ کی جارہی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب کوئی نبی حق اور راستی کی دعوت دینے اُٹھا تو وقت کے سارے جرائم پیشہ لوگ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ مضمون سورۂ اَنعام آیات ۱۱۲-۱۱۳ میں بھی گزر چکا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دشمن بنایا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانونِ فطرت یہی کچھ ہے، لہٰذا ہماری اس مَشِیَّت پر صبر کرو، اور قانونِ فطرت کے تحت جن حالات سے دوچار ہونا ناگزیر ہے، ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔ اس بات کی اُمید نہ رکھو کہ اِدھر تم نے حق پیش کیا اور اُدھر ایک دنیا کی دنیا اُسے قبول کرنے کے لیے اُمنڈ آئے گی، اور سارے غلط کار اپنی غلط کاریوں سے تائب ہو کر اسے ہاتھوں ہاتھ لینے لگیں گے۔

۴۳- رہنمائی سے مراد صرف علمِ حق عطا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ تحریکِ اسلامی کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے، اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لیے بروقت صحیح تدبیریں سُجھانا بھی ہے۔ اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کُھلیں، ہر ایک پر اہلِ حق کی تائید میں کُمک پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہلِ حق کو حُجّتِ بالغہ عطا کرتا ہے۔ اَخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہلِ حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے۔ تنظیم کا مقابلہ ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل پھاڑتا اور اہلِ حق کے دل جوڑتا ہے۔ انسانی طاقت کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص اور گروہوں کو لا لا کر اہلِ حق کی جمعیت بڑھاتا ہے۔ مادّی وسائل کی ضرورت ہو تو وہی اہلِ حق کے تھوڑے مال و اسباب میں وہ برکت دیتا ہے کہ اہلِ باطل کے وسائل کی فراوانی ان کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتی ہے۔ غرض کوئی پہلو مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہلِ حق کے لیے اللہ کافی نہ ہو اور انھیں کسی دوسرے سہارے کی حاجت ہو، بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمان و اعتماد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں، بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑائیں۔

یہ بات نگاہ میں رہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصّہ نہ ہوتا تو پہلا حصّہ انتہائی دل شکن تھا۔ اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے

Maktaba Tul Ishaat.com

والی چیز اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بُوجھ کر تیرے سُپرد ایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دنیا بھر کے کتّے اور بھیڑیے تجھے لپٹ جائیں گے۔ لیکن اس اطلاع کی ساری خوفناکی یہ حرفِ تسلی سُن کر دور ہو جاتی ہے کہ اس جاں گُسل کش مکش کے میدان میں اتار کر ہم نے تجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں۔ ایمان دل میں ہو تو اس سے بڑھ کر ہمت دلانے والی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ خداوندِ عالَم آپ ہماری مدد اور رہنمائی کا ذمہ لے رہا ہے۔ اس کے بعد تو صرف ایک کم اعتقاد بزدل ہی میدان میں آگے بڑھنے سے ہچکچا سکتا ہے۔

۴۴ – یہ کفارِ مکہ کا بڑا دل پسند اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دُہراتے تھے، اور قرآن میں بھی اس کو متعدّد مقامات پر نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل حواشی ۱۰۱ تا ۱۰۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۱۹) اُن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر، یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں میں سے نقل کر کر کے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے، بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو پوری کتاب اکٹھی ایک وقت میں کیوں نہیں آ جاتی۔ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

۴۵ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "اس کے ذریعے سے ہم تمھارا دل مضبوط کرتے رہیں"، یا "تمھاری ہمت بندھاتے رہیں"۔ الفاظ دونوں مفہُوموں پر حاوی ہیں اور دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ اس طرح ایک ہی فقرے میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کر دی گئی ہیں:

(۱) وہ لفظ بلفظ حافظے میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبی کے ذریعے سے اَن پڑھ قوم میں زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اس کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جائے تو ہوش پراگندہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور روح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے، بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتّب کر کے بیک وقت دے دیے گئے ہوں۔

(۴) تحریکِ اسلامی کے دَوران میں، جب کہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے، بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر عمر بھر کے لیے دنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اسے

لَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَٰكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ الَّذِينَ
يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٣٤﴾ ع
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَٰرُونَ وَزِيرًا ﴿٣٥﴾

کہ جب کبھی وہ تمھارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمھیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی[46] ___ جو لوگ اَوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں، ان کا مَوقِف بہت بُرا اور ان کی راہ حد درجے غلط ہے۔[47] ع

ہم نے موسیٰؑ کو کتاب[48] دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو مددگار کے طور پر لگایا اور

شرفِ باریابی و مخاطبت عطا فرما کر اس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

۴۶ – یہ نزولِ قرآن میں تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت ہے۔ قرآنِ مجید کی شانِ نزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ''ہدایت'' کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبی کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہی ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اُٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمے لیا ہے، تو دوسری طرف یہ کام بھی اپنے ہی ذمے رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہ یا اُلجھن پیش کریں، اُسے وہ صاف کر دے۔ اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنیٰ پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ ان مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں، ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے، اور یہ ایک کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے معرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّل لحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے، یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۳ تا ۲۵)

۴۷ – یعنی جو لوگ سیدھی بات کو اُلٹی طرح سوچتے ہیں اور اُلٹے نتائج نکالتے ہیں، ان کی عقل اَوندھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کی حقانیت پر دلالت کرنے والی حقیقتوں کو اس کے بُطلان پر دلیل قرار دے رہے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ اَوندھے منہ جہنم کی طرف گھسیٹے جائیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ﴿۳۶﴾
وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ
اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚۖ﴿۳۷﴾ وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ
قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا

اُن سے کہا کہ جاؤ اُس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا[۴۹] دیا ہے۔آخر کار اُن لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔یہی حال قومِ نوحؑ کا ہوا جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب[۵۰] کی۔ ہم نے اُن کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا، اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر رکھا ہے[۵۱]۔اِسی طرح عاد اور ثمود اور اصحابُ الرسّ[۵۲] اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت

۴۸ – یہاں کتاب سے مراد غالباً وہ کتاب نہیں جو توراۃ کے نام سے معروف ہے اور مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی، بلکہ اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جو نبوت کے منصب پر مامور ہونے کے وقت سے لے کر خُروج تک حضرت موسیٰؑ کو دی جاتی رہیں۔ان میں وہ خطبے بھی شامل ہیں جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں دیے، اور وہ ہدایات بھی شامل ہیں جو فرعون کے خلاف جِدّوجُہد کے دوران میں آپ کو دی جاتی رہیں۔قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اِن چیزوں کا ذکر ہے، مگر اغلب یہ ہے کہ یہ چیزیں توراۃ میں شامل نہیں کی گئیں۔توراۃ کا آغاز اُن احکامِ عشر سے ہوتا ہے جو خُروج کے بعد طورِ سینا پر سنگین کتبوں کی شکل میں آپ کو دیے گئے تھے۔

۴۹ – یعنی اُن آیات کو جو حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو پہنچی تھیں، اور جن کی تبلیغ بعد میں ایک مدت تک بنی اسرائیل کے صلحا کرتے رہے۔

۵۰ – چونکہ انھوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ بشر کبھی رسول بن کر آ سکتا ہے، اس لیے ان کی تکذیب تنہا حضرت نوحؑ کی تکذیب ہی نہ تھی بلکہ بجائے خود منصبِ نبوت کی تکذیب تھی۔

۵۱ – یعنی آخرت کا عذاب۔

۵۲ – اصحاب الرّس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ تھے۔مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنویں میں پھینک کر یا لٹکا کر مارا تھا۔رس عربی زبان میں پُرانے کنویں یا اندھے کنویں کو کہتے ہیں۔

تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِىْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ
اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا
رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىْ بَعَثَ اللّٰهُ
رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ
سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾
اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ

کر دیا۔ اور اُس بستی پر تو اِن کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی[۵۳]۔ کیا انھوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہوگا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے[۵۴]۔

یہ لوگ جب تمھیں دیکھتے ہیں تو تمھارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ (کہتے ہیں:) ''کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبُودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے[۵۵]۔'' اچھا، وہ وقت دُور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر اِنھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دُور نکل گیا تھا۔

کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو[۵۶]؟ کیا تم ایسے شخص کو

---

۵۳ – یعنی قومِ لوط کی بستی۔ بدترین بارش سے مراد پتھروں کی بارش ہے، جس کا ذکر کئی جگہ قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اہلِ حجاز کے قافلے فلسطین و شام جاتے ہوئے اس علاقے سے گزرتے تھے اور نہ صرف تباہی کے آثار دیکھتے تھے بلکہ آس پاس کے باشندوں سے قومِ لُوط کی عبرت ناک داستانیں بھی سنتے رہتے تھے۔

۵۴ – یعنی چونکہ یہ آخرت کے قائل نہیں ہیں، اس لیے اِن آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ انھوں نے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیا، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کے قائل کی نگاہ اور اس کے منکر کی نگاہ میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک تماشا دیکھتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تاریخ مرتّب کرتا ہے۔ دوسرا انھی چیزوں سے اَخلاقی سبق لیتا ہے اور زندگی سے ماورا حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

۵۵ – کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اُڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک آنحضرتؐ نے اپنی حیثیت سے بہت اونچا دعویٰ کر دیا تھا۔ دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے دلائل کی قوت اور آپؐ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٤٤﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ

راہِ راست پر لانے کا ذمّہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سُنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔[۵۷] ع

تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سُورج کو اُس پر دلیل[۵۸] بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اُٹھتا جاتا ہے) ہم اس سایے کو

اگر ہم تعصّب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اکھاڑ چکا ہوتا۔ یہ متضاد باتیں خود بتا رہی ہیں کہ اسلامی تحریک نے ان لوگوں کو کس قدر بَوکھلا دیا تھا۔ کھسیانے ہو کر مذاق بھی اُڑاتے تھے تو احساسِ کمتری بلا ارادہ ان کی زبان سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جن سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ دلوں میں وہ اس طاقت سے کس قدر مرعوب ہیں۔

۵۶ – خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد اس کی بندگی کرنا ہے، اور یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی شرک ہے جیسا بُت کو پوجنا یا کسی مخلوق کو معبود بنانا۔ حضرت ابو اُمامہؓ کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما تحت ظل السمآء من الٰہ یعبد من دون اللّٰہ تعالٰی اعظم عند اللّٰہ عزّوجل من ھوی یتبع، ”اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے معبُود بھی پوجے جا رہے ہیں ان میں اللہ کے نزدیک بدترین معبود وہ خواہشِ نفس ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔“ (طَبرانی) مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الکہف، حاشیہ ۵۰۔

جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہو اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہو کہ اس کے لیے صحیح راہ کون سی ہے اور غلط کون سی، وہ اگر کسی قسم کے شرک یا کفر میں مبتلا بھی ہو تو اس کو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے، اور یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ راہِ راست اختیار کرنے کا فیصلہ کر لے گا تو اس پر ثابت قدم رہے گا۔ لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شُترِ بے مہار ہے۔ اُسے تو اس کی خواہشات جدھر جدھر لے جائیں گی، وہ ان کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔ اس کو سرے سے یہ فکر ہی نہیں ہے کہ صحیح و غلط اور حق و باطل میں تمیز کرے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرے۔ پھر بھلا کون اسے سمجھا کر راستی کا قائل کر سکتا ہے۔ اور بالفرض اگر وہ بات مان بھی لے تو اسے کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند بنا دینا تو کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

۵۷ – یعنی جس طرح بھیڑ بکریوں کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ ہانکنے والا انھیں چراگاہ کی طرف لے جا رہا ہے یا بُوچڑ خانے کی طرف۔ وہ بس آنکھیں بند کر کے ہانکنے والے کے اشاروں پر چلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح یہ عوام الناس بھی اپنے شیطانِ نفس اور اپنے گمراہ کُن لیڈروں کے اشاروں پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں کچھ نہیں جانتے کہ وہ انھیں فلاح کی طرف ہانک رہے ہیں یا

اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا

رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔[59]

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے لباس[60]، اور نیند کو سکونِ موت،

تباہی و بربادی کی طرف۔ اس حد تک تو ان کی حالت بھیڑ بکریوں کے مشابہ ہے۔ لیکن بھیڑ بکریوں کو خدا نے عقل و شعور سے نہیں نوازا ہے۔ وہ اگر چرواہے اور قسائی میں امتیاز نہیں کرتیں تو کچھ عیب نہیں۔ البتہ حیف ہے ان انسانوں پر جو خدا سے عقل و شعور کی نعمتیں پا کر بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں کی سی غفلت و بے شعوری میں مبتلا کر لیں۔

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس تقریر کا منشا تبلیغ کو لا حاصل قرار دینا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ باتیں اس لیے فرمائی جا رہی ہیں کہ لوگوں کو سمجھانے کی فضول کوشش چھوڑ دیں۔ نہیں، اس تقریر کے اصل مُخاطَب سامعین ہی ہیں، اگرچہ رُوئے سُخن بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ دراصل سنانا ان کو مقصود ہے کہ غافلو! یہ کس حال میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا خدا نے تمھیں سمجھ بُوجھ اس لیے دی تھی کہ دنیا میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو؟

۵۸ – یہاں لفظ "دلیل" ٹھیک اسی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے جس میں انگریزی لفظ (pilot) استعمال ہوتا ہے۔ ملّاحوں کی اصطلاح میں "دلیل" اس شخص کو کہتے ہیں جو کشتیوں کو راستہ بتاتا ہُوا چلے۔ سایے پر سورج کو دلیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ سایے کا پھیلنا اور سکڑنا سورج کے عُروج و زوال اور طُلوع و غروب کا تابع ہے۔

سایے سے مراد روشنی اور تاریکی کے بین بین وہ درمیانی حالت ہے جو صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے ہوتی ہے اور دن بھر مکانوں میں، دیواروں کی اوٹ میں اور درختوں کے نیچے رہتی ہے۔

۵۹ – اپنی طرف سمیٹنے سے مراد غائب اور فنا کرنا ہے، کیونکہ ہر چیز جو فنا ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف پلٹتی ہے۔ ہر شے اسی کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف جاتی ہے۔

اس آیت کے دو رُخ ہیں: ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ غفلت میں پڑے ہوئے مشرکین کو بتا رہی ہے کہ اگر تم دنیا میں جانوروں کی طرح نہ جیتے اور کچھ عقل و ہوش کی آنکھوں سے کام لیتے، تو یہی سایہ جس کا تم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہو، تمھیں یہ سبق دینے کے لیے کافی تھا کہ نبی جس توحید کی تعلیم تمھیں دے رہا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ تمھاری ساری زندگی اسی سایے کے مَدّ و جزر سے وابستہ ہے۔ اَبدی سایہ ہو جائے تو زمین پر کوئی جان دار مخلوق، بلکہ نباتات تک باقی نہ رہ سکے، کیونکہ سورج کی روشنی و حرارت ہی پر ان سب کی زندگی موقوف ہے۔ سایہ بالکل نہ رہے تب بھی زندگی محال ہے، کیونکہ ہر وقت سورج کے سامنے رہنے اور اس کی شعاعوں سے کوئی پناہ نہ پا سکنے کی صورت میں نہ جان دار زیادہ دیر تک باقی رہ سکتے ہیں نہ نباتات، بلکہ پانی تک کی خیر نہیں۔ دھوپ اور سایے میں یک لخت تغیُّرات ہوتے رہیں تب بھی زمین کی مخلوقات اِن جھٹکوں کو زیادہ دیر تک نہیں سہار سکتی۔ مگر ایک صانع حکیم اور قادرِ مُطلَق ہے جس نے زمین اور سورج کے درمیان ایسی مناسبت قائم کر رکھی ہے جو دائماً ایک لگے بندھے طریقے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ
يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً
مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ

اور دن کو جی اُٹھنے کا وقت [61] بنایا۔

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر آسمان سے پاک [62] پانی نازل کرتا ہے، تاکہ ایک مُردہ علاقے کو اس کے ذریعے سے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے [63]۔ اس کرشمے کو ہم بار باران کے سامنے

آہستہ آہستہ سایہ ڈالتی اور بڑھاتی گھٹاتی ہے اور بتدریج دھوپ نکالتی اور چڑھاتی اتارتی رہتی ہے۔ یہ حکیمانہ نظام نہ اندھی فطرت کے ہاتھوں خود بخود قائم ہوسکتا تھا اور نہ بہت سے بااختیار خدا اِسے قائم کر کے یوں ایک مسلسل باقاعدگی کے ساتھ چلا سکتے تھے۔

مگر ان ظاہری الفاظ کے بین السُّطور سے ایک اور لطیف اشارہ بھی جھلک رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کفر و شرک کی جہالت کا یہ سایہ جو اس وقت چھایا ہوا ہے، کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ آفتابِ ہدایت، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں طلوع ہو چکا ہے۔ بظاہر سایہ دور دور تک پھیلا نظر آتا ہے، مگر جوں جوں یہ آفتاب چڑھے گا، سایہ سمٹتا چلا جائے گا۔ البتہ ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کا قانون کبھی یک لخت تغیُّرات نہیں لاتا۔ مادّی دنیا میں جس طرح سورج آہستہ آہستہ ہی چڑھتا اور سایہ آہستہ آہستہ ہی سکڑتا ہے، اسی طرح فکر و اَخلاق کی دنیا میں بھی آفتاب ہدایت کا عُروج اور سایۂ ضلالت کا زوال آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔

۶۰ – یعنی ڈھانکنے اور چھپانے والی چیز۔

۶۱ – اس آیت کے تین رخ ہیں۔ ایک رخ سے یہ توحید پر اِستدلال کر رہی ہے۔ دوسرے رُخ سے یہ روز مرّہ کے انسانی تجربے و مشاہدے سے زندگی بعدِ موت کے امکان کی دلیل فراہم کر رہی ہے۔ اور تیسرے رخ سے یہ ایک لطیف انداز میں بشارت دے رہی ہے کہ جاہلیّت کی رات ختم ہو چکی، اب علم و شعور اور ہدایت و معرفت کا روزِ روشن نمودار ہو گیا ہے اور ناگزیر ہے کہ نیند کے ماتے دیر یا سویر بیدار ہوں۔ البتہ جن کے لیے رات کی نیند موت کی نیند تھی، وہ نہ جاگیں گے، اور اُن کا نہ جاگنا خود انھی کے لیے زندگی سے محرومی ہے، دن کا کاروبار ان کی وجہ سے بند نہ ہو جائے گا۔

۶۲ – یعنی ایسا پانی جو ہر طرح کی گندگیوں سے بھی پاک ہوتا ہے اور ہر طرح کے زہریلے مادّوں اور جراثیم سے بھی پاک۔ جس کی بدولت نجاستیں دُھلتی ہیں اور انسان، حیوان، نباتات، سب کو زندگی بخشنے والا جوہرِ خالص بہم پہنچتا ہے۔

۶۳ – اس آیت کے بھی وہی تین رخ ہیں جو اُوپر والی آیت کے تھے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی ہیں اور آخرت کے

بَيۡنَهُمۡ لِيَذَّكَّرُوۡا ۖ فَاَبٰۤى اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا ۝۵۰

لاتے ہیں[۶۴] تاکہ وہ کچھ سبق لیں، مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویّہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں[۶۵]۔

دلائل بھی۔ اور اِن دونوں مضمونوں کے ساتھ اس میں یہ لطیف مضمون بھی پوشیدہ ہے کہ جاہلیت کا دَور حقیقت میں خشک سالی اور قحط کا دَور تھا جس میں انسانیت کی زمین بنجر ہو کر رہ گئی تھی۔ اب یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ نبوت کا ابرِ رحمت لے آیا جو علم وحی کا خالص آبِ حیات برسا رہا ہے، سب نہیں تو بہت سے بندگانِ خدا تو اس سے فیض یاب ہوں گے ہی۔

۶۴ – اصل الفاظ ہیں: لَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ۔ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ بارش کے اِس مضمون کو ہم نے بار بار قرآن میں بیان کر کے حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم بار بار گرمی و خشکی کے، موسمی ہواؤں اور گھٹاؤں کے، اور برسات اور اُس سے رونما ہونے والی رونقِ حیات کے کرشمے ان کو دکھاتے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم بارش کو گردش دیتے رہتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ ہر جگہ یکساں بارش نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کہیں بالکل خشک سالی ہوتی ہے، کبھی کہیں کم بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں مناسب بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں طوفان اور سیلاب کی نوبت آ جاتی ہے، اور ان سب حالتوں کے بے شمار مختلف نتائج ان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔

۶۵ – اگر پہلے رخ (یعنی توحید کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو محض بارش کے انتظام ہی میں اللہ کے وجود اور اس کی صفات اور اس کے واحد ربّ العالمین ہونے پر دلالت کرنے والی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ تنہا وہی ان کو پیغمبر کی تعلیمِ توحید کے برحق ہونے کا اطمینان دلا سکتی ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ ہم بار بار اس مضمون کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اور باوجود اس کے کہ دنیا میں پانی کی تقسیم کے یہ کرشمے نت نئے انداز سے پے در پے ان کی نگاہوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ ظالم کوئی سبق نہیں لیتے۔ نہ حق وصداقت کو مان کر دیتے ہیں، نہ عقل وفکر کی اُن نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں جو ہم نے ان کو دی ہیں، اور نہ اس احسان کے لیے شکر گزار ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ خود نہیں سمجھ رہے تھے، اسے سمجھانے کے لیے قرآن میں بار بار کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسرے رُخ (یعنی آخرت کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال اِن کے سامنے گرمی و خشکی سے بے شمار مخلوقات پر موت طاری ہونے اور پھر برسات کی برکت سے مردہ نباتات وحشرات کے جی اُٹھنے کا ڈراما ہوتا رہتا ہے، مگر سب کچھ دیکھ کر بھی یہ بے وقوف زندگی بعدِ موت کو ناممکن ہی کہتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار انھیں اس صریح نشانِ حقیقت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، مگر کفر و انکار کا جمود ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا، نعمتِ عقل و بینائی کا کفران ہے کہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا، اور احسانِ تذکیر وتعلیم کی ناشکری ہے کہ برابر ہوئے چلی جاتی ہے۔

اگر تیسرے رُخ (یعنی خشک سالی سے جاہلیت کی اور بارانِ رحمت سے وحی و نبوت کی تشبیہ) کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے دَوران میں بار بار یہ منظر سامنے آتا رہا ہے کہ جب کبھی دنیا نبی اور کتابِ الٰہی کے فیض سے محروم ہوئی، انسانیت بنجر ہو گئی اور فکر و اَخلاق کی زمین میں خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ اُگا۔ اور جب کبھی وحی و رسالت

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ
بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ
هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾

اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک نذیر اُٹھا کھڑا کرتے[۶۶]۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہادِ کبیر[۶۷] کرو۔

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے[۶۸]۔

کا آبِ حیات اس سرزمین کو بہم پہنچ گیا گلشنِ انسانیت لہلہا اُٹھا۔ جہالت و جاہلیّت کی جگہ علم نے لی۔ ظلم و طُغیان کی جگہ انصاف قائم ہوا۔ فِسق و فُجور کی جگہ اخلاقی فضائل کے پھول کھلے۔ جس گوشے میں جتنا بھی اس کا فیض پہنچا، شر کم ہُوا اور خیر میں اضافہ ہُوا۔ انبیاؑ کی آمد ہمیشہ ایک خوش گوار اور فائدہ بخش فکری و اَخلاقی انقلاب ہی کی موجب ہوئی ہے، کبھی اس سے بُرے نتائج رونما نہیں ہوئے۔ اور انبیاؑ کی ہدایت سے محروم یا منحرف ہو کر ہمیشہ انسانیت نے نقصان ہی اُٹھایا ہے، کبھی اس سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ یہ منظر تاریخ بھی بار بار دکھاتی ہے اور قرآن بھی اس کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے، مگر لوگ پھر بھی سبق نہیں لیتے۔ ایک مُجرَّب حقیقت ہے جس کی صداقت پر ہزار ہا برس کے انسانی تجرِبے کی مہر ثبت ہو چکی ہے، مگر اس کا انکار کیا جا رہا ہے۔ اور آج خدا نے نبی اور کتاب کی نعمت سے جس بستی کو نوازا ہے، وہ اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے اُلٹی ناشکری کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

۶۶ – یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا، چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے، مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک ہی نبی مبعوث کر دیا۔ جس طرح ایک سورج سارے جہان کے لیے کافی ہو رہا ہے، اُسی طرح یہ اکیلا آفتابِ ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے۔

۶۷ – جہادِ کبیر کے تین معنٰی ہیں: ایک، انتہائی کوشش، جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جِدّ و جُہد، جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جِدّ و جُہد، جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں، اُس پر اپنی طاقت بھی لگا دے، اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے، اور جان و مال کا بھی، اور توپ و تفنگ کا بھی۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے[۶۹]۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔
اس خدا کو چھوڑ کر لوگ اُن کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، اور اُوپر سے مزید

---

۶۸ – یہ کیفیت ہر اُس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مَقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں، جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتبِ رومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں، جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیجِ فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے مَیں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیجِ فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظَہران کے پاس کنویں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بَحرَین کے قریب بھی سمندر کی تہ میں آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے لوگ کچھ مدت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔

یہ تو ہے آیت کا ظاہری مضمون، جو اللہ کی قدرت کے ایک کرشمے سے اُس کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے پر استدلال کر رہا ہے۔ مگر اس کے بین السّطور سے بھی ایک لطیف اشارہ ایک دوسرے مضمون کی طرف نکلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سمندر خواہ کتنا ہی تلخ و شور ہو جائے، اللہ جب چاہے اس کی تہ سے ایک جماعتِ صالحہ کا چشمۂ شیریں نکال سکتا ہے، اور سمندر کے آبِ تلخ کی موجیں خواہ کتنا ہی زور مار لیں وہ اُس چشمے کو ہڑپ کر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

۶۹ – یعنی بجائے خود یہی کرشمہ کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنا کھڑی کرتا ہے، مگر اس پر مزید کرشمہ یہ ہے کہ اس نے انسان کا بھی ایک نمونہ نہیں بلکہ دو الگ نمونے (عورت اور مرد) بنائے جو انسانیت میں یکساں مگر جسمانی و نفسانی خُصوصیات میں نہایت مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی وجہ سے باہم مخالف و متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہیں۔ پھر ان جوڑوں کو ملا کر وہ عجیب توازُن کے ساتھ (جس میں کسی دوسرے کی تدبیر کا ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے) دنیا میں مرد بھی پیدا کر رہا ہے اور عورتیں بھی، جن سے ایک سلسلۂ تعلقات بیٹوں اور پوتوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں، اور ایک دوسرا سلسلۂ تعلقات بیٹیوں اور نواسیوں کا چلتا ہے، جو دوسرے گھروں کی بہوئیں بن کر جاتی ہیں۔ اس طرح خاندان سے خاندان جُڑ کر پورے پورے مُلک ایک نسل اور ایک تمدُّن سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہُوا ہے۔[۷۰]

اے محمدؐ! تم کو تو ہم نے بس ایک مُبَشّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔[۷۱] اِن سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے"[۷۱الف]۔

یہاں بھی ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ اس سارے کارخانۂ حیات میں جو حکمت کام کر رہی ہے، اس کا اندازِ کار ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں اختلاف، اور پھر مختلفین کے جوڑ سے ہی سارے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لٰہذا جس اختلاف سے تم دوچار ہو، اس پر گھبراؤ نہیں۔ یہ بھی ایک نتیجہ خیز چیز ہے۔

۷۰ – یعنی اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے احکام وقوانین کو نافذ کرنے کے لیے جو کوشش بھی کہیں ہو رہی ہو، کافر کی ہمدردیاں اس کوشش کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گی جو اسے نیچا دکھانے کے درپے ہوں۔ اِسی طرح اللہ کی فرماں برداری و اطاعت سے نہیں بلکہ اس کی نافرمانی ہی سے کافر کی ساری دلچسپیاں وابستہ ہوں گی۔ نافرمانی کا کام جو جہاں بھی کر رہا ہو، کافر اگر عملاً اس کا شریک نہ ہو سکے گا تو کم ازکم زندہ باد کا نعرہ ہی مار دے گا، تاکہ خدا کے باغیوں کی ہمت افزائی ہو۔ بخلاف اس کے اگر کوئی فرماں برداری کا کام کر رہا ہو تو کافر اس کی مزاحمت میں ذرا دریغ نہ کرے گا۔ خود مزاحمت نہ کر سکتا ہو تو اس کی ہمت شکنی کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہے کر گزرے گا، چاہے وہ ناک بھوں چڑھانے کی حد تک ہی سہی۔ نافرمانی کی ہر خبر اس کے لیے مژدۂ جاں فزا ہوگی، اور فرماں برداری کی ہر اطلاع اُسے تیر بن کر لگے گی۔

۷۱ – یعنی تمھارا کام نہ کسی ایمان لانے والے کو جزا دینا ہے، نہ کسی انکار کرنے والے کو سزا دینا۔ تم کسی کو ایمان کی طرف کھینچ لانے اور انکار سے زبردستی روک دینے پر مامور نہیں کیے گئے ہو۔ تمھاری ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو راہِ راست قبول کرے اسے انجامِ نیک کی بشارت دے دو، اور جو اپنی بدراہی پر جما رہے اس کو اللہ کی پکڑ سے ڈرا دو۔

اس طرح کے ارشادات قرآنِ مجید میں جہاں بھی آئے ہیں، ان کا اصل روئے سُخن کفار کی طرف ہے، اور مقصد دراصل ان کو یہ بتانا ہے کہ نبی ایک بے غرض مصلح ہے جو خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے خدا کا پیغام پہنچاتا ہے اور انھیں اُن کے انجام کا نیک وبد بتا دیتا ہے۔ وہ تمھیں زبردستی تو اس پیغام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ اس پر بگڑنے اور لڑنے پر تُل جاتے ہو۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، اسے کچھ نہ دے دو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا نقصان کرو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑ و گے۔ وہ پیغام پہنچا کر سبکدوش ہو چکا، اب تمھارا معاملہ ہم سے ہے ـــــ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بسا اوقات لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملے میں بھی نبی کا کام بس خدا کا پیغام پہنچا دینے اور انجامِ نیک کا مُژدہ سنا دینے

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى
بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚۛ ﴿۵۸﴾ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ مع ۸
الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚۛ
اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ
قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿۶۰﴾ السجدۃ ع ۵

اے محمدؐ! اُس خدا پر بھروسا رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔ وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی (کائنات کے تختِ سلطنت) ''عرش'' پر جلوہ فرما ہوا[۷۲]۔ رحمٰن، اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو[۷۳]۔ اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: ''رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں[۷۴]؟'' یہ دعوت ان کی نفرت میں اُلٹا اور اضافہ کر دیتی ہے[۷۵]۔ ع

تک محدود ہے۔ حالانکہ قرآن جگہ جگہ اور بار بار تصریح کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نبی صرف مبشر ہی نہیں ہے بلکہ معلم اور مُزکّی اور نمونۂ عمل بھی ہے، حاکم اور قاضی اور امیرِ مُطاع بھی ہے، اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر فرمان ان کے حق میں قانون کا حکم رکھتا ہے، جس کے آگے اُن کو دل کی پوری رضا مندی سے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ لہٰذا سخت غلطی کرتا ہے وہ شخص جو مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا، اور اسی مضمون کی دوسری آیات کو نبی اور اہلِ ایمان کے باہمی تعلق پر چسپاں کرتا ہے۔

۷۱، الف۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۰۔

۷۲۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر جلوہ گر ہونے کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۴۱-۴۲۔ یونس، حاشیہ ۴۔ ہود، حاشیہ ۷۔

زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا مضمون متشابہات کے قبیل سے ہے، جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن سے مراد ایک دَور ہو۔ اور ممکن ہے کہ اس سے مراد وقت کی اتنی ہی مقدار ہو جس پر ہم دنیا میں لفظ ''دن'' کا اِطلاق کرتے ہیں۔ (مفصل تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۷۳۔ یہ بات دراصل وہ محض کافرانہ شوخی اور سراسر ہٹ دھرمی کی بنا پر کہتے تھے، جس طرح فرعون نے

Maktaba Tul Ishaat.com

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ

بڑا متبرّک ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے[75] اور اس میں ایک چراغ[76] اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہے[77]۔
رحمٰن کے (اصلی) بندے[78] وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[79] اور جاہل ان کے منہ آئیں تو

حضرت موسیٰ سے کہا تھا: وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ''رب العالمین کیا ہوتا ہے؟'' حالانکہ نہ کفارِ مکہ خدائے رحمٰن سے بے خبر تھے اور نہ فرعون ہی اللہ رب العالمین سے ناواقف تھا۔ بعض مفسّرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ''رحمٰن'' کا اسمِ مبارک شائع نہ تھا، اس لیے انھوں نے یہ اعتراض کیا۔ لیکن آیت کا اندازِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ اعتراض ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ طُغیانِ جاہلیت کی بنا پر تھا، ورنہ اس پر گرفت کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ نرمی کے ساتھ انھیں سمجھا دیتا کہ یہ بھی ہمارا ہی ایک نام ہے، اس پر کان نہ کھڑے کرو۔ علاوہ بریں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ عرب میں اللہ تعالیٰ کے لیے قدیم زمانے سے رحمٰن کا لفظ معروف و مستعمل تھا۔ ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵۔ سبا، حاشیہ ۳۵۔

۷۴ – اس جگہ سجدۂ تلاوت مشروع ہے اور اس پر تمام اہلِ علم متفق ہیں۔ ہر قاری اور سامع کو اس مقام پر سجدہ کرنا چاہیے۔ نیز یہ بھی مسنون ہے کہ آدمی جب اس آیت کو سنے تو جواب میں کہے: زَادَنَا اللهُ خُضُوْعًا مَّا زَادَ لِلْاَعْدَآءِ نُفُوْرًا، ''اللہ کرے ہمارا خضوع اتنا ہی بڑھے جتنا دشمنوں کا نُفور بڑھتا ہے۔''

۷۵ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔

۷۶ – یعنی سورج، جیسا کہ سورۂ نوح میں بتصریح فرمایا: وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (آیت ۱۶)

۷۷ – یہ دو مراتب ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے الگ اور اپنے مزاج کے اعتبار سے لازم و ملزوم ہیں۔ گردشِ لیل و نہار کے نظام پر غور کرنے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اس سے توحید کا درس لے اور اگر خدا سے غفلت میں پڑا ہوا تھا تو چونک جائے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی رُبوبیت کا احساس کر کے سرِنیاز جھکا دے اور سراپا امتنان بن جائے۔

۷۸ – یعنی جس رحمٰن کو سجدہ کرنے کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے اور تم اس سے انحراف کر رہے ہو، اس کے پیدائشی بندے تو سب ہی ہیں، مگر اس کے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو شعوری طور پر بندگی اختیار کر کے یہ اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سجدہ جس کی تمھیں دعوت دی جا رہی ہے، اُس کے نتائج یہ ہیں جو اس کی بندگی قبول کرنے والوں کی زندگی

قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾

کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔[80] جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔[81]

میں نظر آتے ہیں، اور اس سے انکار کے نتائج وہ ہیں جو تم لوگوں کی زندگی میں عیاں ہیں۔ اس مقام پر اصل مقصود سیرت و اخلاق کے دو نمونوں کا تقابل ہے۔ ایک وہ نمونہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں میں پیدا ہو رہا تھا، اور دوسرا وہ جو جاہلیت پر جمے ہوئے لوگوں میں ہر طرف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس تقابل کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ صرف پہلے نمونے کی نمایاں خصوصیات کو سامنے رکھ دیا، اور دوسرے نمونے کو ہر دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن پر چھوڑ دیا کہ وہ آپ ہی مقابل کی تصویر کو دیکھے اور آپ ہی دونوں کا موازنہ کر لے۔ اُس کے بیان کی حاجت نہ تھی، کیونکہ وہ گرد و پیش سارے معاشرے میں موجود تھا۔

۷۹ – یعنی تکبّر کے ساتھ اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جبّاروں اور مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا زور جتانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ ''نرم چال'' سے مراد ضعیفانہ اور مریضانہ چال نہیں ہے، اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریا کار آدمی اپنے انکسار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنّع سے اختیار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اِس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف اُتر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے ایک جوان آدمی کو مریل چال چلتے دیکھا تو روک کر پوچھا: کیا تم بیمار ہو؟ اس نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے دُرّہ اٹھا کر اسے دھمکایا اور بولے: قوت کے ساتھ چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے، نہ کہ وہ جو بناوٹ سے منکسرانہ بنائی گئی ہو، یا جس سے خواہ مخواہ کی مسکنت اور ضعیفی ٹپکتی ہو۔

مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تأمّل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے اندازِ رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اوّلین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیّار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند متکبّر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے انسانوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمٰن کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے، اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۳۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۳۳)

۸۰ – جاہل سے مراد اَن پڑھ یا بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت پر اُتر آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمٰن کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور اسی طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ ٭ۖ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ
غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّہَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ
یُسۡرِفُوۡا وَ لَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَ کَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ

جو دُعائیں کرتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب! جہنّم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔[۸۲]“ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بُخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔[۸۳] جو

کی ہر بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے، بلکہ جو ان کے ساتھ یہ رَویہ اختیار کرتا ہے، وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡہُ وَ قَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۫ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۫ لَا نَبۡتَغِی الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿﴾ (القصص، آیت ۵۵) ”اور جب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں، کہتے ہیں: بھائی! ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، سلام ہے تم کو، ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگتے۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حواشی ۷۲-۷۸)

۸۱ – یعنی وہ اُن کے دن کی زندگی تھی اور یہ ان کی راتوں کی زندگی ہے۔ ان کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں، نہ ناچ گانے میں، نہ لَہو ولَعب میں، نہ گپوں اور افسانہ گوئیوں میں، اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے اِن معروف مشاغل کے برعکس یہ اِس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حُضور کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے دعا و عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سجدہ میں فرمایا: تَتَجَافٰی جُنُوۡبُہُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ”ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں۔“ (آیت ۱۶) اور سورۂ ذاریات میں فرمایا: کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ ﴿﴾ وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿﴾ ”یہ اہلِ جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سَحَر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔“ (آیات ۱۷-۱۸) اور سورۂ زُمَر میں ارشاد ہوا: اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ ”کیا اس شخص کا انجام کسی مشرک جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرماں بردار ہو، رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو، اور اپنے رب کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہو؟“ (آیت ۹)

۸۲ – یعنی یہ عبادت ان میں کوئی غرور پیدا نہیں کرتی۔ انھیں اس بات کا کوئی زَعم نہیں ہوتا کہ ہم تو اللہ کے پیارے اور اس کے چہیتے ہیں، بھلا آگ ہمیں کہاں چھو سکتی ہے۔ بلکہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود وہ اِس خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے عمل کی کوتاہیاں ہم کو مبتلائے عذاب نہ کر دیں۔ وہ اپنے تقویٰ کے زور سے جنت جیت لینے کا پندار نہیں رکھتے،

لَا يَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا
بِالۡحَـقِّ وَلَا يَزۡنُوۡنَ‌ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰ لِكَ يَلۡقَ اَثَامًا ۙ‏ ﴿٦٨﴾ يُّضٰعَفۡ لَهُ الۡعَذَابُ

اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۸۴ ـــــ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اُس کو مکرّر

بلکہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے عذاب سے بچ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے بھی ان کا اعتماد اپنے عمل پر نہیں بلکہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

۸۳ – یعنی نہ توان کا حال یہ ہے کہ عیاشی، اور قمار بازی، اور شراب نوشی، اور یار باشی، اور میلوں ٹھیلوں، اور شادی بیاہ میں بے دریغ روپیا خرچ کریں اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی شان دکھانے کے لیے غذا، مکان، لباس اور تزئین و آرائش پر دولت لٹائیں۔ اور نہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک زر پرست آدمی کی طرح پیسا جوڑ جوڑ کر رکھیں، نہ خود کھائیں، نہ بال بچوں کی ضروریات اپنی استطاعت کے مطابق پوری کریں، اور نہ کسی راہِ خیر میں خوش دلی کے ساتھ کچھ دیں۔ عرب میں یہ دونوں قسم کے نمونے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو خوب دل کھول کر خرچ کرتے تھے، مگر ان کے ہر خرچ کا مقصود یا تو ذاتی عیش و تَنَعُّم تھا، یا برادری میں ناک اونچی رکھنا اور اپنی فیاضی و دولت مندی کے ڈنکے بجوانا۔ دوسری طرف وہ بخیل تھے جن کی کنجوسی مشہور تھی۔ اعتدال کی رَوِش بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی تھی، اور اِن کم لوگوں میں اُس وقت سب سے زیادہ نمایاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تھے۔

اس موقع پر یہ جان لینا چاہیے کہ اِسراف کیا چیز ہے اور بُخل کیا چیز۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اِسراف تین چیزوں کا نام ہے: ایک، ناجائز کاموں میں دولت صَرف کرنا، خواہ وہ ایک پیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے، جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوُز کر جانا، خواہ اِس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرے، یا اس لحاظ سے کہ آدمی کو جو دولت اس کی ضرورت سے بہت زیادہ مل گئی ہو، اسے وہ اپنے ہی عیش اور ٹھاٹ باٹ میں صَرف کرتا چلا جائے۔ تیسرے، نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا، مگر اللہ کے لیے نہیں بلکہ ریا اور نمایش کے لیے۔ اس کے برعکس بُخل کا اِطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے: ایک یہ کہ آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی مَقدِرت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اس کے ہاتھ سے پیسا نہ نکلے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اسلام کی راہ ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ **من فقه الرجل قصده فی معیشته**، ”اپنی معیشت میں توسُّط اختیار کرنا آدمی کے فقیہ (دانا) ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔“ (احمد و طبرانی، بروایتِ ابی الدَّرْدَاءؓ)

۸۴ – یعنی وہ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جن میں اہلِ عرب کثرت سے مبتلا ہیں۔ ایک شرک باللہ، دوسرے قتلِ ناحق، تیسرے زنا۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے پوچھا گیا: سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰہِ نِدًّا وَّھُوَ خَلَقَكَ ”یہ کہ تو کسی کو اللہ کا

Maktaba Tul Ishaat.com

مدِمقابل اور ہمسر ٹھیرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے۔'' پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: ان تقتل ولدك خشية ان يطعمَ معك، ''یہ کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔'' پوچھا گیا: پھر؟ فرمایا: ان تزانی حلیلة جارك، ''یہ کہ تو اپنے ہمسایے کی بیوی سے زنا کرے۔'' (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد) اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں، لیکن عرب کی سوسائٹی پر اُس وقت سب سے زیادہ تسلّط انھی تین گناہوں کا تھا، اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں یہ چند لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بچ گئے ہیں۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین کے نزدیک تو شرک سے پرہیز کرنا ایک بہت بڑا عیب تھا، پھر اسے مسلمانوں کی ایک خوبی کی حیثیت سے اُن کے سامنے پیش کرنے کی کون سی معقول وجہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصّب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپری سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری اُتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں رچی ہوئی موجود تھی، جس کو اُبھارنے کے لیے اُوپر کی سطح کو بس ذرا زور سے کُھرچ دینے کی ضرورت تھی۔ جاہلیّت کی تاریخ کے متعدّد واقعات اِن دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً اَبرَہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ بُت نہیں ٹال سکتے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی تباہی پر ہم عصر شعرا نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اِس واقعے کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اِس میں اُن کے معبُودوں کا کوئی داخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکینِ عرب کے سامنے آیا تھا کہ اَبرَہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہلِ طائف نے اِس اندیشے سے کہ یہ کہیں اُن کے معبُود ''لات'' کے مندر کو بھی نہ گرا دے، اپنی خدمات کعبے کو منہدم کرنے کے لیے اس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بَدرَقے اس کے ساتھ کر دیے، تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس کے لشکر کو بخیریت مکہ تک پہنچا دیں۔ اس واقعے کی تلخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور سالہا سال تک وہ اُس شخص کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے جو طائف کے بَدرَقے کا سردار تھا۔ علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور خُصوصاً مناسکِ حج کو دینِ ابراہیمی ہی کے اجزا قرار دیتے تھے، اور یہ بھی مانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ خالص خدا پرست تھے، بُتوں کی پرستش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی رِوایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بُت پرستی اُن کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بُت کب، کہاں سے، کون لایا۔ اپنے معبُودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آ جاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذُوالخَلَصہ نامی بُت کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلوائی۔ جواب نکلا: یہ کام نہ کیا جائے۔

يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَيَخۡلُدۡ فِيۡهٖ مُهَانًا ۝۶۹ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ
وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ

عذاب دیا جائے گا[85] اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلّت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو۔[86] ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا[87]

اس پر عرب طیش میں آ گیا۔ کہنے لگا:

لو کنت یا ذا الخلص الموتورا　　　مثلی وکان شیخك المقبورا

لم تنه عن قتل العداۃ زورا

یعنی اے ذُوالخَلَصہ! اگر میری جگہ تُو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔ ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلّہ اپنے معبُود سَعْد نامی کے آستانے پر لے گئے، تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا تڑنگا بُت تھا جس پر قربانیوں کا خون لتھڑا ہُوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح تِتَّر بِتَّر ہوتے دیکھ کر غصّے میں آ گیا۔ بُت پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رہے سہے اونٹ بھی بھگا دیے۔" متعدّد بت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے۔ مثلاً اَساف اور نائلہ جن کے مجسّمے صفا اور مَروہ پر رکھے ہوئے تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنھوں نے خانۂ کعبہ میں زِنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبُودوں کی ہو، ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دلوں میں نہیں ہو سکتی۔ ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر و منزلت تو دلوں میں موجود تھی، مگر ایک طرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا، اور دوسری طرف قریش کے پروہت اُس کے خلاف تعصّبات بھڑکاتے رہتے تھے، کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آ جائے گا۔ ان سہاروں پر جو مذہبِ شرک قائم تھا، وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بے تکلُّف کہا کہ تمھارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے، ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہے مشرکین تیار نہ ہوں، مگر دلوں میں وہ اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔

۸۵- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ عذاب کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے گا، بلکہ پے در پے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ
يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا

اور وہ بڑا غفورٌ رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے
جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے[88] ___ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں[89] بنتے اور کسی لغو

جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کفر یا شرک یا دہریّت والحاد کے ساتھ قتل اور زنا اور دوسری معصیتوں کا بوجھ لیے ہوئے جائے گا، اُس کو بغاوت کی سزا الگ ملے گی اور ایک ایک جرم کی سزا الگ الگ۔ اس کا ہر چھوٹا بڑا قصور حساب میں آئے گا۔ کوئی ایک خطا بھی معاف نہ ہوگی۔ قتل کی سزا ایک نہیں ہوگی بلکہ ہر فعلِ قتل کی الگ سزا اس کو بھگتنی ہوگی۔ زنا کی سزا بھی ایک نہیں ہوگی بلکہ جتنی بار وہ اس جرم کا مرتکب ہوا ہے، اس کی جداگانہ سزا پائے گا۔ اور یہی حال دوسرے تمام جرائم اور معاصی کے معاملے میں بھی ہوگا۔

۸۶ - یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ یہی عام معافی (general amnesty) کا اعلان تھا جس نے اُس بگڑے ہوئے معاشرے کے لاکھوں افراد کو سہارا دے کر مستقل بگاڑ سے بچا لیا۔ اِسی نے ان کو اُمید کی روشنی دکھائی اور اصلاحِ حال پر آمادہ کیا۔ ورنہ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو، ان کی سزا سے اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، تو یہ انھیں مایوس کر کے ہمیشہ کے لیے بدی کے بھنور میں پھنسا دیتا اور کبھی ان کی اصلاح نہ ہوسکتی۔ مجرم انسان کو صرف معافی کی امید ہی جرم کے چکر سے نکال سکتی ہے۔ مایوس ہو کر وہ ابلیس بن جاتا ہے۔

توبہ کی اس نعمت نے عرب کے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا، اس کا اندازہ اُن بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو جسے ابنِ جَریر اور طَبَرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہُریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مسجدِ نبویؐ سے عشا کی نماز پڑھ کر پلٹا تو دیکھا کہ ایک عورت میرے دروازے پر کھڑی ہے۔ میں اس کو سلام کر کے اپنے حُجرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے نوافل پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھا: کیا چاہتی ہے؟ وہ کہنے لگی: میں آپ سے ایک سوال کرنے آئی ہوں۔ مجھ سے زِنا کا ارتکاب ہوا۔ ناجائز حمل ہُوا۔ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اُسے مار ڈالا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ معاف ہونے کی بھی کوئی صورت ہے؟ میں نے کہا: ہرگز نہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ آہیں بھرتی ہوئی واپس چلی گئی، اور کہنے لگی: ’’افسوس! یہ حُسن آگ کے لیے پیدا ہوا تھا۔‘‘ صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ کر جب میں فارغ ہوا تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کا قصہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: بڑا غلط جواب دیا ابوہریرہؓ تم نے، کیا یہ آیت قرآن میں تم نے نہیں پڑھی: وَالَّذِيْنَ

لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سن کر میں نکلا اور اس عورت کو تلاش کرنا شروع کیا۔ رات کو عشا ہی کے وقت وہ ملی۔ میں نے اسے بشارت دی اور بتایا کہ سرکار رسالت مآبؐ نے تیرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ وہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی: شکر ہے اُس خدائے پاک کا جس نے میرے لیے معافی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے گناہ سے توبہ کی اور اپنی لونڈی کو اس کے بیٹے سمیت آزاد کر دیا۔ اِس سے ملتا جُلتا واقعہ احادیث میں ایک بڈھے کا آیا ہے جس نے آ کر حضورؐ سے عرض کیا تھا کہ یا رسولؐ اللہ! ساری زندگی گناہوں میں گزری ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا ارتکاب نہ کر چکا ہوں۔ اپنے گناہ تمام رُوئے زمین کے باشندوں پر بھی تقسیم کر دوں تو سب کو لے ڈوبیں۔ کیا اب بھی میری معافی کی کوئی صورت ہے؟ فرمایا: کیا تو نے اسلام قبول کر لیا ہے؟ اس نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ فرمایا: جا، اللہ معاف کرنے والا اور تیری برائیوں کو بھلائی سے بدل دینے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: میرے سارے جرم اور قصور؟ فرمایا: ہاں، تیرے سارے جرم اور قصور۔ (ابنِ کثیر، بحوالہ ابنِ ابی حاتم)

۸۷۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جب وہ توبہ کر لیں گے تو کفر کی زندگی میں جو برے افعال وہ پہلے کیا کرتے تھے، ان کی جگہ اب طاعت اور ایمان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیک افعال کرنے لگیں گے اور تمام برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ دوسرے یہ کہ توبہ کے نتیجے میں صرف اتنا ہی نہ ہوگا کہ ان کے نامۂ اعمال سے وہ تمام قُصور کاٹ دیے جائیں گے جو انھوں نے کفر و گناہ کی زندگی میں کیے تھے، بلکہ ان کی جگہ ہر ایک کے نامۂ اعمال میں یہ نیکی لکھ دی جائے گی کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے بغاوت اور نافرمانی کو چھوڑ کر طاعت و فرماں برداری اختیار کر لی۔ پھر جتنی بار بھی وہ اپنی سابقہ زندگی کے برے اعمال کو یاد کر کے نادم ہوا ہوگا اور اس نے اپنے خدا سے اِستِغفار کیا ہوگا، اس کے حساب میں اتنی ہی نیکیاں لکھ دی جائیں گی، کیونکہ خطا پر شرمسار ہونا اور معافی مانگنا بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس طرح اس کے نامۂ اعمال میں تمام پچھلی برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی اور اس کا انجام صرف سزا سے بچ جانے تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ وہ الٹا انعامات سے سرفراز ہوگا۔

۸۸۔ یعنی فطرت کے اعتبار سے بھی بندے کا اصلی مَرجَع اسی کی بارگاہ ہے، اور اَخلاقی حیثیت سے بھی وہی ایک بارگاہ ہے جس کی طرف اسے پلٹنا چاہیے، اور نتیجے کے اعتبار سے بھی اس بارگاہ کی طرف پلٹنا مفید ہے، ورنہ کوئی دوسری جگہ ایسی نہیں ہے جدھر رُجوع کر کے وہ سزا سے بچ سکے یا ثواب پا سکے۔ علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ پلٹ کر ایک ایسی بارگاہ کی طرف جاتا ہے جو واقعی ہے ہی پلٹنے کے قابل جگہ، بہترین بارگاہ، جہاں سے تمام بھلائیاں ملتی ہیں، جہاں سے قصوروں پر شرمسار ہونے والے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ معافی اور انعام سے نوازے جاتے ہیں، جہاں معافی مانگنے والے کے جرم نہیں گِنے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے توبہ کر کے اپنی اصلاح کتنی کر لی، جہاں بندے کو وہ آقا ملتا ہے جو انتقام پر خار کھائے نہیں بیٹھا ہے، بلکہ اپنے ہر شرمسار غلام کے لیے دامنِ رحمت کھولے ہوئے ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِّرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ يَخِرُّوۡا
عَلَيۡهَا صُمًّا وَّعُمۡيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ
اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعۡيُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ

چیز پر اُن کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں[۹۰]۔ جنھیں اگر اُن کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ[۹۱] جاتے۔ جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک[۹۲] دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام[۹۳] بنا" ___ یہ ہیں وہ لوگ جو

۸۹- اس کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے اور کسی ایسی چیز کو واقعہ اور حقیقت قرار نہیں دیتے جس کے واقعہ اور حقیقت ہونے کا انھیں علم نہ ہو، یا جس کے خلافِ واقعہ وحقیقت ہونے کا انھیں اطمینان ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مُشاہدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے، اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس دوسرے مطلب کے اعتبار سے "جھوٹ" کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنیٰ ہے۔ انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا ہے، لذّت یا خوشنمائی یا ظاہری فائدے کے اُس جھوٹے مُلمّع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مُلمّع اتر جائے تو ہر بدی سراسر کھوٹ ہی کھوٹ ہے جس پر انسان کبھی نہیں ریجھ سکتا۔ لہٰذا ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی اس لحاظ سے جھوٹ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی چمک دمک کی وجہ ہی سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے۔ مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، اس لیے وہ اِس کھوٹ کو ہر روپ میں پہچان جاتا ہے، خواہ وہ کیسے ہی دلفریب دلائل، یا نظر فریب آرٹ، یا سماعت فریب خوش آوازیوں کا جامہ پہن کر آئے۔

۹۰- لَغْو کا لفظ اُس "جھوٹ" پر بھی حاوی ہے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، اور اس کے ساتھ تمام فضول، لایعنی اور بے فائدہ باتیں اور کام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اللہ کے صالح بندوں کی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ جان بُوجھ کر اس طرح کی چیزیں دیکھنے یا سننے یا ان میں حصّہ لینے کے لیے نہیں جاتے، اور اگر کبھی ان کے راستے میں ایسی کوئی چیز آ جائے تو ایک نگاہِ غلط انداز تک ڈالے بغیر اُس پر سے اِس طرح گزر جاتے ہیں جیسے ایک نفیس مزاج آدمی گندگی کے ڈھیر سے گزر جاتا ہے۔ غلاظت اور تعفُّن سے دلچسپی ایک بد ذوق اور پلید آدمی تو لے سکتا ہے، مگر ایک خوش ذوق اور مہذب انسان مجبوری کے بغیر اس کے پاس سے بھی گزرنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ بدبو سے مستفید ہونے کے لیے ایک سانس بھی وہاں لے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم،

يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾

اپنے صبر[94] کا پھل منزلِ بلند کی شکل میں[95] پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے اُن کا استقبال ہو گا۔

المومنون حاشیہ ۴)

۹۱ – اصل میں الفاظ ہیں: لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ''وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے۔'' لیکن یہاں ''گرنے'' کا لفظ اپنے لُغوی معنیٰ کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں: ''جہاد کا حکم سن کر بیٹھے رہ گئے۔'' اس میں بیٹھنے کا لفظ اپنے لُغوی معنیٰ میں نہیں بلکہ جہاد کے لیے حرکت نہ کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ٹس سے مَس نہ ہوں، بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایت اُن آیات میں آئی ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں، جس چیز کو فرض قرار دیا گیا ہو اُسے بجا لاتے ہیں، جس چیز کی مذمّت بیان کی گئی ہو اُس سے رک جاتے ہیں، اور جس عذاب سے ڈرایا گیا ہو اُس کے تصوُّر سے کانپ اُٹھتے ہیں۔

۹۲ – یعنی اُن کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دے، اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر، کیونکہ ایک مومن کو بیوی بچوں کے حسن و جمال اور عیش و آرام سے نہیں بلکہ ان کی نیک خصالی سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہو سکتی کہ جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ پیارے ہیں، انھیں دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے دیکھے۔ ایسی صورت میں تو بیوی کا حسن اور بچوں کی جوانی و لیاقت اس کے لیے اور بھی زیادہ سوہانِ روح ہو گی، کیونکہ وہ ہر وقت اس رنج میں مبتلا رہے گا کہ یہ سب اپنی اِن خوبیوں کے باوجود اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں۔

یہاں خاص طور پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں، وہ وقت وہ تھا جب کہ مکے کے مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے محبوب ترین رشتہ دار کفر و جاہلیّت میں مبتلا نہ ہوں۔ کوئی مرد ایمان لے آیا تھا تو اس کی بیوی ابھی کافر تھی۔ کوئی عورت ایمان لے آئی تھی تو اس کا شوہر ابھی کافر تھا۔ کوئی نوجوان ایمان لے آیا تھا تو اس کے ماں باپ اور بھائی بہن، سب کے سب کفر میں مبتلا تھے۔ اور کوئی باپ ایمان لے آیا تھا تو اس کے اپنے جوان جوان بچے کفر پر قائم تھے۔ اس حالت میں ہر مسلمان ایک شدید روحانی اذیت میں مبتلا تھا اور اس کے دل سے وہ دعا نکلتی تھی جس کی بہترین ترجمانی اس آیت میں کی گئی ہے۔ ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' نے اِس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے کہ اپنے پیاروں کو کفر و جاہلیت میں مبتلا دیکھ کر ایک آدمی کو ایسی اذیّت ہو رہی ہے جیسے اس کی آنکھیں آشوبِ چشم سے اُبل آئی ہوں اور کھٹک سے سُوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ اِس سلسلۂ کلام میں ان کی اس کیفیت کو دراصل یہ بتانے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس دین پر ایمان لائے ہیں، پورے خلوص کے ساتھ لائے ہیں۔ ان کی حالت اُن لوگوں کی سی نہیں ہے جن کے خاندان کے

Maktaba Tul Ishaat.com

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝۷۶ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ
رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَامًا ۝۷۷ ع

ع ۶ | ۱۱

وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

اے محمدؐ! لوگوں سے کہو: "میرے رب کو تمھاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اُس کو نہ پکارو۔[96] اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے، عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہو گی۔" ع

لوگ مختلف مذہبوں اور پارٹیوں میں شامل رہتے ہیں اور سب مطمئن رہتے ہیں کہ چلو، ہر بینک میں ہمارا کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔

۹۳ – یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھ جائیں، بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں، محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت و حشمت میں نہیں بلکہ نیکی و پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہمارے زمانے میں کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اِس آیت کو بھی امامت کی امیدواری اور ریاست کی طلب کے لیے دلیلِ جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ! متقی لوگوں کو ہماری رعیت اور ہم کو ان کا حکمراں بنا دے۔" اس سُخن فہمی کی داد "اُمیدواروں" کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔

۹۴ – صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دینِ حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جِدّوجُہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرَّغم فرض کو بجا لانا، حرام سے پرہیز کرنا اور حُدود اللہ پر قائم رہنا۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ غَرَض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رَوِیّے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

۹۵ – اصل میں لفظ غُرْفَۃ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی بلند و بالا عمارت کے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "بالاخانہ" کیا جاتا ہے، جس سے آدمی کے ذہن میں ایک دومنزلہ کوٹھے کی سی تصویر آ جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، حتّٰی کہ ہندوستان کا روضۂ تاج اور امریکا کے "فلک شگاف" (sky-scrapers) تک جنت کے اُن محلات کی محض ایک بھونڈی سی نقل ہیں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولادِ آدم کے لاشُعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔

۹۶ - یعنی اگر تم اللہ سے دعائیں نہ مانگو، اور اس کی عبادت نہ کرو، اور اپنی حاجات کے لیے اس کو مدد کے لیے نہ پکارو، تو پھر تمھارا کوئی وزن بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ پرکاہ کے برابر بھی تمھاری پروا کرے۔ محض مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں۔ تم سے اللہ کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ تم بندگی نہ کرو گے تو اس کا کوئی کام رُکا رہ جائے گا۔ اس کی نگاہِ التفات کو جو چیز تمھاری طرف مائل کرتی ہے، وہ تمھارا اُس کی طرف ہاتھ پھیلانا اور اس سے دعائیں مانگنا ہی ہے۔ یہ کام نہ کرو گے تو کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیے جاؤ گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الشُّعرآء

(۲۶)

الشُّعَرَآء

نام آیت ۲۲۴ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضمون اور اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول مکے کا دَورِ متوسط ہے۔ ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر واقعہ، اور اس کے بعد الشعرآء۔ (روح المعانی، جلد ۱۹، صفحہ ۶۴) اور سورۂ طٰہٰ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

موضوع اور مباحث تقریر کا پسِ منظر یہ ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تذکیر کا مقابلہ پیہم جُحود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر ہمیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو۔ کبھی آپ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اُڑا دینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپ کے مشن کا استخفاف کرتے کہ اِن کے پیرو یا تو چند نادان نوجوان ہیں، یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات کے لوگ، حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشرافِ قوم اور شیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و معاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، مگر وہ ہٹ دھرمی کی نت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی چیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوہانِ رُوح بنی ہوئی تھی اور اس غم میں آپ کی جان گھلی جاتی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم اِن کے پیچھے اپنی جان کیوں گھُلاتے ہو؟ اِن کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے کوئی نشان نہیں دیکھی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے، کسی ایسی نشانی کے طالب ہیں جو زبردستی ان کی گردنیں جھکا دے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آ جائے گی تو انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات اِنھیں سمجھائی جا رہی تھی، وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد دسویں رُکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ طالبِ حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنھیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے ہیں، نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاؑ کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آ کر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں، جنھوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

اُسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفارِ مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں: ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر صاحبِ عقل آدمی تحقیق کرسکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے، وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قومِ نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قومِ لوط اور اصحاب الاَیکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی حُجّتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے۔ اور آخر کار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاؑ کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اَخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حجت کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسری بات جو بار بار دُہرائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رُکوع میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں۔ اِس قرآن کو دیکھو جو تمھاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جن کا کلام ہوسکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا تمھیں کاہن نظر آتا ہے؟ کیا محمدؐ اور ان کے اصحاب تمھیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مَشرب ہُوا کرتے ہیں؟ ضدّم ضدّا کی بات دوسری ہے، مگر اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجام دیکھ کر رہو گے۔

المنزل (۵)

آیاتہا ۲۲۷ — سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا
خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ

ط-س-م- یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔[۱]

اے محمدؐ! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔[۲] ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ اِن کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔[۳] اِن لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے

۱- یعنی یہ آیات، جو اس سورہ میں پیش کی جا رہی ہیں، اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدّعا صاف صاف کھول کر بیان کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر یا سُن کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی طرف بلاتی ہے، کس چیز سے روکتی ہے، کسے حق کہتی ہے اور کسے باطل قرار دیتی ہے۔ ماننا یا نہ ماننا الگ بات ہے، مگر کوئی شخص یہ بہانہ کبھی نہیں بنا سکتا کہ اس کتاب کی تعلیم اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ اس سے یہ معلوم ہی نہ کر سکا کہ وہ اُس کو کیا چیز چھوڑنے اور کیا اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

قرآن کو الْكِتٰبِ الْمُبِيْن کہنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے مضامین، اس کے پیش کردہ حقائق، اور اس کے حالاتِ نزول، سب کے سب صاف صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ خداوندِ عالَم ہی کی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ہر فقرہ جو اس کتاب میں آیا ہے، ایک نشانی اور ایک معجزہ (آیت) ہے۔ کوئی شخص عقل و خرد سے کام لے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کرنے کے لیے کسی اور نشانی کی حاجت نہیں، کتابِ مبین کی یہی آیات (نشانیاں) اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ مختصر تمہیدی فقرہ اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے اُس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو آگے اس سورہ میں بیان ہوا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگتے تھے، تاکہ اس نشانی کو دیکھ کر انہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

اطمینان ہو کہ واقعی آپؐ یہ پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر حقیقت میں کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتابِ مبین کی یہ آیات موجود ہیں۔ اسی طرح کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ آپ شاعر یا کاہن ہیں۔ فرمایا گیا کہ یہ کتاب کوئی چیستاں اور مُعمّا تو نہیں ہے۔ صاف صاف کھول کر اپنی تعلیم پیش کر رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسی شاعر یا کاہن کی ہو سکتی ہے؟

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کا ذکر قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ”شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔“ (آیت ۶) اور سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ”ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمھاری جان نہ گھلے۔“ (آیت ۸) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دَور میں اپنی قوم کی گمراہی و ضلالت، اس کی اَخلاقی پستی، اس کی ہٹ دھرمی، اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کا رنگ دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم برسوں اپنے شب و روز کس دل گداز و جاں گُسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔ بَخع کے اصل معنیٰ پوری طرح ذبح کر ڈالنے کے ہیں۔ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے لُغوی معنیٰ یہ ہوئے کہ تم اپنے آپ کو قتل کیے دے رہے ہو۔

۳- یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و طاعت کی رَوِش اختیار کرنے پر مجبور کر دے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل وخِرَد سے کام لے کر اُن آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتابِ الٰہی میں پیش کی گئی ہیں، جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بُوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترکِ باطل اور اتباعِ حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط، جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جا سکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رُجحانات رکھ دیے ہیں، فُجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے، نبوت اور وحی اور دعوتِ خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسبِ حال صلاحیتیں دے کر اس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و طاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائے

مُعۡرِضِيۡنَ ۝۵ فَقَدۡ كَذَّبُوۡا فَسَيَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۶

منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں، عنقریب اِن کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اُڑاتے رہے ہیں۴۔

جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اُسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرماں بردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآنِ مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۝ ’’اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟‘‘ (یونس آیت ۹۹) اور وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِيۡنَ ۝ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ ؕ ’’اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمّت بنا سکتا تھا۔ وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا۔‘‘ (ہود، آیت ۱۱۸-۱۱۹) مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حواشی ۱۰۱-۱۰۲۔ ہود، حاشیہ ۱۱۶۔

۴- یعنی جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقولیت کے ساتھ ان کو سمجھانے اور راہِ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے، اس کا مقابلہ بے رخی و بے التفاتی سے کریں، ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انھیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف وہ بے رخی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکذیب پر، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اُڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجامِ بد انھیں دکھا دیا جائے۔ یہ انجامِ بد اس شکل میں بھی انھیں دکھایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاحمتوں کے باوجود غالب آجائے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ اس کی شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان پر ایک عذابِ الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اِس شکل میں بھی ان کے سامنے آسکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخرکار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انھوں نے اپنا تمام سرمایۂ زندگانی کھپا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیا علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اُڑاتے رہے۔ اس انجامِ بد کے سامنے آنے کی چونکہ

Maktaba Tul Ishaat.com

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝۸ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝۹ ع

اور کیا انھوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے،[۵] مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔[۶] ع

بہت سی شکلیں ہیں اور مختلف لوگوں کے سامنے وہ مختلف صورتوں سے آسکتا ہے اور آتا رہا ہے، اسی لیے آیت میں نَبَا کے بجائے اَنْبٰٓؤا بصیغۂ جمع فرمایا گیا، یعنی جس چیز کا یہ مذاق اُڑا رہے ہیں، اس کی حقیقت آخر کار بہت سی مختلف شکلوں میں انھیں معلوم ہوگی۔

۵ – یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اِس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحیدِ الٰہ) انبیا علیہم السلام پیش کرتے ہیں، وہ صحیح ہے، یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرینِ خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادّوں اور قوتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اُگ رہی ہیں، پھر ان کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے۔ یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی، اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصّب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

۶ – یعنی اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزا دینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے۔ مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے،

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۝۱۰ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ
اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝۱۱ قَالَ رَبِّ اِنِّىْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ؕ۝۱۲ وَ يَضِيْقُ صَدْرِىْ

انھیں اُس وقت کا قصّہ سُناؤ جب کہ تمھارے رب نے موسیٰؑ کو پکارا:[7] ”ظالم قوم کے پاس جا ــــ فرعون کی قوم کے پاس[8] ــــ کیا وہ نہیں ڈرتے؟“[9] اُس نے عرض کیا: ”اے میرے رب! مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جُھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گُھٹتا ہے

سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیے جاتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

۷ – اُوپر کی مختصر تمہیدی تقریر کے بعد اب تاریخی بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کی ابتدا حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے قصّے سے کی گئی ہے۔ اس سے خاص طور پر جو سبق دینا مقصود ہے، وہ یہ کہ:

اوّلاً: حضرت موسیٰؑ کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ اُن حالات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ سخت تھے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ درپیش تھا۔ حضرت موسیٰؑ ایک غلام قوم کے فرد تھے جو فرعون اور اس کی قوم سے بری طرح دبی ہوئی تھی، بخلاف اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک فرد تھے اور آپؐ کا خاندان قریش کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بالکل برابر کی پوزیشن رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے خود اس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی اور ایک قتل کے الزام میں دس برس روپوش رہنے کے بعد انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اسی بادشاہ کے دربار میں جا کھڑے ہوں جس کے ہاں سے وہ جان بچا کر فرار ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کسی نازک صورتِ حال سے سابقہ نہ تھا۔ پھر فرعون کی سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ور سلطنت تھی۔ قریش کی طاقت کو اس کی طاقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخرکار اُن سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ جس کی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہو، اس کا مقابلہ کر کے کوئی جیت نہیں سکتا۔ جب فرعون کی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کچھ پیش نہ گئی تو تم بیچارے کیا ہستی ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں بازی جیت لے جاؤ گے۔

ثانیاً: جو نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے فرعون کو دکھائی گئیں، اس سے زیادہ کھلی نشانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں فرعون ہی کے چیلنج پر علی الاعلان جادوگروں سے مقابلہ کرا کے یہ ثابت بھی کر دیا گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام دکھا رہے ہیں، وہ جادو نہیں ہے۔ فنِ سحر کے جو ماہرین

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَا يَنۡطَلِقُ لِسَانِىۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰى هٰرُوۡنَ ۝۱۳ وَ لَهُمۡ عَلَىَّ

اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارونؑ کی طرف رسالت بھیجیں۔ اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جُرم کا

فرعون کی اپنی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور اُس کے اپنے بُلائے ہوئے تھے، انھوں نے خود یہ تصدیق کر دی کہ حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی کا اژدہا بن جانا ایک حقیقی تغیّر ہے اور یہ صرف خدائی معجزے سے ہوسکتا ہے، جادوگری کے ذریعے سے ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ ساحروں نے ایمان لاکر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس امر میں کسی شک کی گنجایش بھی باقی نہ چھوڑی کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ نشانی واقعی معجزہ ہے، جادوگری نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی جو لوگ ہٹ دھرمی میں مبتلا تھے، انھوں نے نبی کی صداقت تسلیم کر کے نہ دی۔ اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمھارا ایمان لانا درحقیقت کوئی حِسّی معجزہ اور مادّی نشان دیکھنے پر موقوف ہے۔ تَعَصُّب، حَمِیّتِ جاہلیہ، اور مفاد پرستی سے آدمی پاک ہو اور کُھلے دل سے حق اور باطل کا فرق سمجھ کر غلط بات کو چھوڑنے اور صحیح بات قبول کرنے کے لیے کوئی شخص تیار ہو تو اس کے لیے وہی نشانیاں کافی ہیں جو اِس کتاب میں اور اس کے لانے والے کی زندگی میں اور خدا کی وسیع کائنات میں ہر آنکھوں والا ہر وقت دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ ایک ہٹ دھرم آدمی، جسے حق کی جستجو ہی نہ ہو اور اغراضِ نفسانی کی بندگی میں مبتلا ہو کر جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ کسی ایسی صداقت کو قبول نہ کرے گا جس سے اس کی اغراض پر ضرب لگتی ہو، وہ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے گا، خواہ زمین اور آسمان ہی اس کے سامنے کیوں نہ اُلٹ دیے جائیں۔

ثالثاً: اس ہٹ دھرمی کا جو انجام فرعون نے دیکھا، وہ کوئی ایسا انجام تو نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ بے تاب ہوں۔ اپنی آنکھوں سے خدائی طاقت کے نشانات دیکھ لینے کے بعد جو نہیں مانتے، وہ پھر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کیا تم لوگ اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس کا مزا چکھنا ہی پسند کرتے ہو؟

تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۱۰۳ تا ۱۳۷۔ یُونُس، ۷۵ تا ۹۲۔ بنی اسرائیل، ۱۰۱ تا ۱۰۴۔ جلد سوم، طٰہٰ، ۹ تا ۷۹۔

۸ – یہ اندازِ بیان قومِ فرعون کے انتہائی ظلم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعارف ہی ''ظالم قوم'' کے لقب سے کرایا گیا ہے۔ گویا اس کا اصل نام ظالم قوم ہے اور قومِ فرعون اس کا ترجمہ وتفسیر۔

۹ – یعنی اے موسیٰ! دیکھو کیسی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مختارِ مُطلَق سمجھتے ہوئے دنیا میں ظلم و ستم ڈھائے جارہے ہیں اور اس بات سے بے خوف ہیں کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان سے باز پُرس کرنے والا ہے۔

ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ ۚ‏ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذۡهَبَا

الزام بھی ہے، اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔[11]" فرمایا: "ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ

۱۰- سورۂ طٰہٰ، رکوع ۲، اور سورۂ قصص، رکوع ۴ میں اس کی جو تفصیل آئی ہے، اسے ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اوّل تو اتنے بڑے مشن پر تنہا جاتے ہوئے گھبراتے تھے ("میرا سینہ گھٹتا ہے" کے الفاظ اسی کی نشان دہی کرتے ہیں)، دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت ہارونؑ کو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے نبی بنا کر بھیجا جائے، کیونکہ وہ زیادہ زبان آور ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو وہ ان کی تائید و تصدیق کر کے ان کی پشت مضبوط کریں گے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً حضرت موسیٰؑ کی درخواست یہی رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارونؑ کو اس منصب پر مامور کیا جائے، اور بعد میں جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ مرضیِ الٰہی آپ ہی کو مامور کرنے کی ہے تو پھر یہ درخواست کی ہو کہ انھیں آپ کا وزیر اور مددگار بنایا جائے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ ان کو وزیر بنانے کی درخواست نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ فَاَرۡسِلۡ اِلٰى هٰرُوۡنَ "آپ ہارونؑ کی طرف رسالت بھیجیں۔" اور سورۂ طٰہٰ میں وہ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وَاجۡعَلۡ لِّىۡ وَزِيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِىۡ ۙ‏ هٰرُوۡنَ اَخِى ۙ‏ "میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر مقرر فرما دیجیے، میرے بھائی ہارون کو۔" نیز سورۂ قصص میں وہ یہ عرض کرتے ہیں کہ وَاَخِىۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّىۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِىَ رِدۡاً يُّصَدِّقُنِىۡۤ "میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہیں، لہٰذا آپ انھیں مددگار کے طور پر میرے ساتھ بھیجیے، تاکہ وہ میری تصدیق کریں۔" اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ مؤخر الذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں، اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰؑ سے اِس سورہ میں نقل ہوئی ہے۔

بائبل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قومِ فرعون کی تکذیب کا خوف اور اپنی زبان کے کُند ہونے کا عذر پیش کر کے یہ منصب قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا: "اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں، کسی اور کے ہاتھ سے، جسے تو چاہے، یہ پیغام بھیج۔" پھر اللہ تعالیٰ نے بطورِ خود حضرت ہارونؑ کو ان کے لیے مددگار مقرر فرما کر انھیں اس بات پر راضی کیا کہ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس جائیں۔ (خُروج، باب ۴۔ آیات ۱ تا ۱۷) مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۹۔

۱۱- یہ اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جو سورۂ قصص، رکوع ۲ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قومِ فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ اس واقعے کی اطلاع قومِ فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں، تو وہ ملک چھوڑ کر مَدیَن کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشی کے بعد یکایک انھیں یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا
وَلِیْدًا وَّ لَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ
فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾

ہماری نشانیاں [12] لے کر، ہم تمھارے ساتھ سب کچھ سُنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: ہم کو ربّ العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے [13]۔"

فرعون نے کہا: "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچّہ سا نہیں پالا تھا [14]؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے، اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا [15]، تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔"

موسیٰ نے جواب دیا: "اُس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا [16] تھا۔

حکم دیا گیا کہ تم پیغامِ رسالت لے کر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمھارے خلاف قتل کا مُقدمہ پہلے سے موجود ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سنانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا۔

۱۲ – نشانیوں سے مراد عصا اور یدِ بیضا کے معجزے ہیں جن کے عطا کیے جانے کی تفصیل سورۂ الاعراف رُکوع ۱۳ - ۱۴، طٰہٰ رکوع ۱، سورۂ نمل رکوع ۱، اور سورۂ قصص رکوع ۴ میں بیان ہوئی ہے۔

۱۳ – حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی دعوت کے دو جز تھے: ایک، فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، جو تمام انبیا علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود رہا ہے۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو فرعون کے بندِ غلامی سے نکالنا، جو مخصوص طور پر انھی دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآنِ مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جز کا ذکر کیا گیا ہے (مثلاً سورۂ نازعات میں)، اور کسی جگہ صرف دوسرے جُز کا۔

۱۴ – اس سے ایک اشارہ اس خیال کی تائید میں نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون نہ تھا جس کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی، بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔ اگر یہ وہی فرعون ہوتا تو کہتا کہ میں نے تجھے پالا تھا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہاں تُو رہا ہے اور ہم نے تیری پرورش کی ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو:

فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا وَّجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝۲۱ وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنۡ عَبَّدْتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۝۲۲ قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۲۳ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ۝۲۴ قَالَ لِمَنۡ حَوۡلَهٗۤ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ۝۲۵

پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا[17] اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ رہا تیرا احسان جو تُو نے مجھ پر جتایا ہے، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا[18]۔"

فرعون نے کہا:[19] "اور یہ ربّ العالمین کیا ہوتا ہے[20]؟"

موسیٰؑ نے جواب دیا: "آسمانوں اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو[21]۔"

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا: "سُنتے ہو؟"

تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۵-۹۳)

۱۵- اشارہ ہے اسی واقعۂ قتل کی طرف جو حضرت موسیٰؑ سے سرزد ہو گیا تھا۔

۱۶- اصل الفاظ ہیں: وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ "میں اُس وقت ضلالت میں تھا" یا "میں نے اس وقت یہ کام ضلالت کی حالت میں کیا تھا"۔ یہ لفظِ ضلالت لازماً "گمراہی" کا ہی ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ عَرَبی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطا، نِسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے یہاں ضلالت بمعنیٰ خطا یا نادانستگی ہی لینا زیادہ صحیح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ایک اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھ کر صرف ایک گھونسا مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ گھونسے سے بالعموم آدمی مرتا نہیں ہے، نہ قتل کی نیت سے گھونسا مارا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے وہ شخص مر گیا۔ اس لیے صحیح صورتِ واقعہ یہی ہے کہ یہ قتل عمد نہیں بلکہ قتلِ خطا تھا۔ قتل ہوا ضرور، مگر بالارادہ قتل کی نیت سے نہیں ہوا، نہ کوئی ایسا آلہ یا ذریعہ استعمال کیا گیا جو قتل کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے یا جس سے قتل واقع ہونے کی

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ
اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَیْنَهُمَاؕ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ

موسیٰؑ نے کہا: ”تمھارا رب بھی اور تمھارے اُن آبا و اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔[۲۲]“

فرعون نے (حاضرین سے) کہا: ”تمھارے یہ رسول صاحب جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“

موسیٰؑ نے کہا: ”مشرق و مغرب اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے، سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔[۲۳]“

فرعون نے کہا: ”اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی اُن لوگوں میں شامل

توقع کی جاسکتی ہے۔

۱۷- یعنی علم و دانش اور پروانۂ نبوت۔ حکم کے معنیٰ حکمت و دانش کے بھی ہیں، اور اس سندِ اقتدار (authority) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو عطا کی جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ اختیار کے ساتھ بولتا ہے۔

۱۸- یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا۔ تیرے ہی ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا؟ اس لیے اس پرورش کا احسان جتانا تجھے زیب نہیں دیتا۔

۱۹- بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کر کے فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ یہ بات آپ سے آپ ظاہر ہے کہ نبی نے ضرور وہ پیغام پہنچا دیا ہو گا جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اسے چھوڑ کر اب وہ گفتگو نقل کی جاتی ہے جو اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون اور موسیٰؑ کے درمیان ہوئی۔

۲۰- یہ اُس کا سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِس قول پر تھا کہ میں ربّ العالمین (تمام جہان والوں کے

مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔"[۲۴]

موسیٰؑ نے کہا: " اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟"[۲۵]

مالک و آقا اور فرماں روا) کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس پیغام کی نوعیت صریح طور پر سیاسی تھی۔ اس کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ حضرت موسیٰؑ جس کی نمایندگی کے مُدّعی ہیں، وہ سارے جہان والوں پر حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون کو اپنا تابع قرار دے کر اس کے دائرۂ حکومت و اقتدار میں ایک بالاتر فرمانروا کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مداخلت کر رہا ہے بلکہ اس کے نام یہ فرمان بھیج رہا ہے کہ تو اپنی رعایا کے ایک حصے کو میرے نامزد کردہ نمایندے کے حوالے کر دے، تاکہ وہ اسے تیری سلطنت سے نکال کر لے جائے۔ اس پر فرعون پوچھتا ہے کہ یہ سارے جہان والوں کا مالک و فرمانروا ہے کون جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کے ہاتھوں یہ حکم بھیج رہا ہے۔

۲۱- یعنی میں زمین پر بسنے والے کسی مخلوق اور فانی مُدّعیِ مُلوکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک و فرمانروا ہے تو تمھیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہونی چاہیے کہ سارے جہاں والوں کا رب کون ہے۔

۲۲- حضرت موسیٰؑ کا یہ خطاب فرعون کے درباریوں سے تھا جن سے فرعون نے کہا تھا کہ "سنتے ہو۔" حضرت موسیٰؑ نے اُن سے فرمایا کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے، اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں۔ تمھارا یہ فرعون جو آج تمھارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا، اور کل تمھارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں۔ میں صرف اُس رب کی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں جو آج بھی تمھارا اور اِس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمھارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں، ان سب کا رب بھی تھا۔

۲۳- یعنی مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارا فرعون ہے جو زمین کے ایک ذرا سے رقبے پر بادشاہ بن بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مصر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو فرماں روائی اُسی کی مانتا ہوں اور اسی کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

۲۴- اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی "معبود" کا تصوُّر صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا۔ یعنی یہ کہ اُسے بس پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۳۱ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ

فرعون نے کہا: ''اچھا تو لے آ اگر تُو سچّا ہے۔''[۲۶]

(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک

استمداد و استعانت کے لیے دعائیں مانگیں۔ لیکن کسی معبُود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملاتِ دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امرونہی کو قانونِ برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختارِ مُطلق ہیں، کسی معبود کو ہماری سیاست اور ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہیوں سے انبیا علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ اُنھوں نے اِن سے خداوندِعالَم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے، اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیتِ مُطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انھوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھیرایا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے۔ اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر صرف اسی معنیٰ میں توحید فی العبادت کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضب ناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دینِ آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰؑ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پنڈتوں سے مناظرہ کرلو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا، وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کے نمایندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آ کر اس سے اطاعتِ امر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس معنیٰ میں وہ اپنے اُوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم برتر مانے۔ اسی لیے اس نے پہلے ''رب العالمین'' کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبُودیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العالمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف صاف دھمکی دے دی کہ ملکِ مصر میں تم نے میرے اقتدارِ اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام بھی لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ۚ﴿۳۲﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ ع

صریح اژدہا تھا۔[27] پھر اُس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔[28] ع

۲۵- یعنی کیا تو اُس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جب کہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اُس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العالمین، رب السماوات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے؟

۲۶- حضرت موسیٰؑ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا۔ وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ کے الٰہ الآلہہ ہونے کو مانتا تھا اور انھی کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اُس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اسی کا بھیجا ہوا ہوں۔ اور اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالکِ کائنات ہونے ہی میں اسے کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ نشانی کی بات تو اسی صورت میں درمیان میں آسکتی تھی جب کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا قادرِ مُطلَق ہونا تو مسلّم ہو، اور بحث اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰؑ اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

۲۷- قرآنِ مجید میں کسی جگہ اس کے لیے حَیَّۃٌ (سانپ)، اور کسی جگہ جَآنٌّ (جو بالعُموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اُسے ثُعۡبَانٌ (اژدہا) کہا جا رہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازیؒ اس طرح کرتے ہیں کہ حَیَّۃٌ عَربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور ثُعۡبَانٌ کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ جسامت کے اعتبار سے وہ اژدہے کی طرح تھا۔ اور جَآنٌّ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ اس کی پُھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔

۲۸- بعض مفسرین نے یہودی روایات سے مُتأثّر ہو کر بَیۡضَآءُ کے معنیٰ "سفید" کیے ہیں، اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بغل سے نکالتے ہی بھلا چنگا ہاتھ برص کے مریض کی طرح سفید ہو گیا۔ لیکن ابن جَریر، ابنِ کثیر، زَمَخشَری، رازی، ابو السعود عِمادی، آلُوسی اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں بَیۡضَآءُ بمعنیٰ روشن اور چمک دار ہے۔ جونہی کہ حضرت موسیٰؑ نے بغل سے ہاتھ نکالا، یکایک سارا ماحول جگمگا اُٹھا اور یوں محسوس ہوا جیسے سورج نکل آیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، طٰہٰ، حاشیہ ۱۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝۳۴ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ
مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝۳۵ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ
وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝۳۶ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝۳۷

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا: "یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دے[29]۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو[30]؟"

انھوں نے کہا: "اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔"

۲۹ – دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یا تو ایک لمحہ پہلے وہ اپنی رعیت کے ایک فرد کو برسرِ دربار رسالت کی باتیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتے دیکھ کر پاگل قرار دے رہا تھا (کیونکہ اس کے نزدیک ایک غلام قوم کے فرد کا اس جیسے باجَبرُوت بادشاہ کے حُضور ایسی جسارت کرنا پاگل پن کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا)، اور اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود مانا تو جیل میں سڑا سڑا کر مار دوں گا، یا اب ان نشانیوں کو دیکھتے ہی اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسے اپنی بادشاہی اور اپنا ملک چھننے کا خطرہ لاحق ہو گیا، اور بدحواسی میں اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں بھرے دربار میں اپنے نوکروں کے سامنے کیسی بے تکی باتیں کر رہا ہوں۔ بنی اسرائیل جیسی دبی ہوئی قوم کے دو افراد وقت کے سب سے بڑے طاقت ور بادشاہ کے سامنے کھڑے تھے۔ کوئی لاؤ لشکر ان کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی جان ان کی قوم میں نہ تھی۔ کسی بغاوت کا نام و نشان تک ملک کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ اس حالت میں صرف ایک لاٹھی کا اژدہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتے دیکھ کر یکایک اس کا چیخ اٹھنا کہ یہ دو بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دیں گے اور پورے حکمران طبقے کو اقتدار سے بے دخل کر دیں گے، آخر کیا معنٰی رکھتا ہے؟ اس کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا، مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہُوا، کوئی ملک فتح نہیں ہُوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادوگر تو اس کے اپنے ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے۔ مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کر کے انعام لینے سے بڑھ کر ان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ سلطنت تو کجا، وہ بیچارے تو سلطنت کے کسی پولیس کانسٹیبل کو بھی چیلنج کرنے کی

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۟ۙ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ
مُّجْتَمِعُوْنَ ۟ۙ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ
السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

چنانچہ ایک روز مقرر وقت پر[۳۱] جادُوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا: ''تم اجتماع میں چلو گے؟[۳۲] شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔[۳۳]''

جب جادوگر میدان میں آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: ''ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟[۳۴]''

ہمّت نہ کر سکتے تھے۔

۳۰- یہ فقرہ فرعون کی مزید بدحواسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کہاں تو وہ الٰہ بنا ہُوا تھا اور یہ سب اس کے بندے تھے۔ کہاں اب الٰہ صاحب مارے خوف کے بندوں سے پوچھ رہے ہیں کہ تمھارا حکم کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری عقل تو اب کچھ کام نہیں کرتی، تم بتاؤ کہ اس خطرے کا مقابلہ میں کیسے کروں۔

۳۱- سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ اس مقابلے کے لیے قبطیوں کی قومی عید کا دن (يَوْمُ الزِّيْنَةِ) مقرر کیا گیا تھا، تاکہ ملک کے گوشے گوشے سے میلوں ٹھیلوں کی خاطر آنے والے سب لوگ یہ عظیم الشان ''دنگل'' دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں، اور اس کے لیے وقت بھی دن چڑھے کا طے ہوا تھا، تاکہ روزِ روشن میں سب کی آنکھوں کے سامنے فریقین کی طاقت کا مظاہرہ ہو اور روشنی کی کمی کے باعث کوئی شک وشبہ پیدا ہونے کی گنجایش نہ رہے۔

۳۲- یعنی صرف اعلان و اشتہار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آدمی اس غرض کے لیے چھوڑے گئے کہ لوگوں کو اُکسا اُکسا کر یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے لائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھرے دربار میں جو معجزات حضرت موسیٰؑ نے دکھائے تھے، ان کی خبر عام لوگوں میں پھیل چکی تھی اور فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس سے ملک کے باشندے متأثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور خود دیکھ لیں کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہمارے ملک کا ہر جادُوگر یہ کمال دکھا سکتا ہے۔

۳۳- یہ فقرہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جن حاضرینِ دربار نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھا تھا اور باہر جن لوگوں تک اس کی معتبر خبریں پہنچی تھیں، ان کے عقیدے اپنے دینِ آبائی پر سے متزلزل ہوئے جا رہے تھے، اور اب ان کے دین کا دارومدار بس اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادُوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ
اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

اس نے کہا: ”ہاں، اور تم تو اس وقت مقرّبین میں شامل ہو جاؤ گے۔“[۳۵]
موسیٰؑ نے کہا: ”پھینکو جو تمھیں پھینکنا ہے۔“
انھوں نے فوراً اپنی رسّیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے: ”فرعون کے اقبال سے

نے کیا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کُن مقابلہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے پھرتے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو ہم موسیٰؑ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے، ورنہ ہمارے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے۔

۳۴- یہ تھے وہ حامیانِ دین مشرکین جو موسیٰ علیہ السلام کے حملے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے اس فیصلہ کُن مقابلے کے وقت اِن پاکیزہ جذبات کے ساتھ آئے تھے کہ ہم نے پالا مار لیا تو سرکار سے کچھ انعام مل جائے گا۔

۳۵- اور یہ تھا وہ بڑے سے بڑا اجر جو اِن خادمانِ دین و ملّت کو بادشاہِ وقت کے ہاں سے مل سکتا تھا۔ یعنی روپیا پیسا ہی نہیں ملے گا، دربار میں کرسی بھی نصیب ہو جائے گی۔ اس طرح فرعون اور اس کے ساحروں نے پہلے ہی مرحلے پر نبی اور جادُوگر کا عظیم اَخلاقی فرق خود کھول کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ حوصلہ تھا کہ بنی اسرائیل جیسی پِسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں دَرّانہ آ کھڑا ہوتا ہے اور دھڑلّے کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اللہ ربّ العالَمین کا بھیجا ہوا ہوں، بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر۔ فرعون سے دُوبدُو بحث کرنے میں وہ ادنیٰ سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کو وہ پرِکاہ کے برابر بھی وُقعت نہیں دیتا۔ دوسری طرف یہ کم حوصلگی ہے کہ اسی فرعون کے ہاں باپ دادا کے دین کو بچانے کی خدمت پر بلائے جا رہے ہیں، پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار! کچھ انعام تو مل جائے گا نا؟ اور جواب میں یہ سُن کر پُھولے نہیں سماتے کہ پیسا بھی ملے گا اور قربِ شاہی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو مقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جادُوگروں کی کیا ہستی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص بے حیائی کی ساری حدوں کو نہ پھاند جائے وہ نبی کو جادوگر کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا
یَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾
رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ
اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ

ہم ہی غالب رہیں[۳۶] گے۔" پھر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اُٹھے کہ "مان گئے ہم ربّ العالمین کو ـــــ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے ربّ[۳۷] کو۔"

فرعون نے کہا: "تم موسیٰؑ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے[۳۸]۔ اچھا، ابھی تمھیں معلوم ہُوا جاتا ہے، میں تمھارے

۳۶- یہاں یہ ذکر چھوڑ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی جب جادُوگروں نے اپنی رسّیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو یکایک وہ بہت سے سانپوں کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کی طرف لپکتی نظر آئیں۔ اس کی تفصیل قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہو چکی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ﴿۰﴾ "جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینکے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا، سب کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا، اور بڑا بھاری جادو بنا لائے۔" سورۂ طٰہٰ میں اس وقت کا نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۰﴾ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى ﴿۰﴾ "یکایک ان کے سحر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑی چلی آ رہی ہیں، اِس سے موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر سے گئے۔"

۳۷- یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں ان کی طرف سے محض شکست کا اعتراف نہیں تھا کہ کوئی شخص یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا کہ ایک بڑے جادوگر نے چھوٹے جادُوگروں کو نیچا دکھا دیا، بلکہ ان کا سجدے میں گر کر اللہ ربّ العالمین پر ایمان لے آنا گویا برسرِعام ہزارہا باشندگانِ مصر کے سامنے اس بات کا اقرار و اعلان تھا کہ موسیٰؑ جو کچھ لائے ہیں یہ ہمارے فن کی چیز ہی نہیں ہے، یہ کام تو صرف اللہ ربّ العالمین ہی کی قدرت سے ہو سکتا ہے۔

۳۸- یہاں چونکہ سلسلۂ کلام کی مناسبت سے صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٤٩﴾ قَالُوْا لَا
ضَيْرَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿٥٠﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ
اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْۤ

ع ۳ / ۱۸

ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سُولی چڑھا دوں گا۔[۳۹]"

انھوں نے جواب دیا "کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا، کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔[۴۰]" ع

ہم[۴۱] نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ،

کس طرح ایک صریح معجزہ دیکھ کر، اور اس کے معجزہ ہونے پر خود جادُوگروں کی شہادت سن کر بھی اسے جادُو کہے جاتا ہے، اس لیے فرعون کا صرف اتنا ہی فقرہ نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ فرعون نے بازی ہرتی دیکھ کر فوراً ہی ایک سیاسی سازش کا افسانہ گھڑ لیا۔ اس نے کہا: اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ "یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے مل کر اس دار السلطنت میں تیار کی ہے، تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔" اس طرح فرعون نے عوام الناس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جادوگروں کا یہ ایمان معجزے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ملی بھگت ہے، یہاں آنے سے پہلے ان کے اور موسیٰؑ کے درمیان معاملہ طے ہو گیا تھا کہ یوں وہ موسیٰؑ کے مقابلے میں آ کر شکست کھائیں گے، اور نتیجے میں جو سیاسی انقلاب ہوگا، اس کے مزے وہ اور یہ مل کر لُوٹیں گے۔

۳۹- یہ خوف ناک دھمکی فرعون نے اپنے اِس نظریے کو کامیاب کرنے کے لیے دی تھی کہ جادُوگر دراصل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سازش کر کے آئے ہیں۔ اُس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ اس طرح یہ لوگ جان بچانے کے لیے سازش کا اعتراف کر لیں گے اور وہ ڈرامائی اثر کافور ہو جائے گا جو شکست کھاتے ہی اُن کے سجدے میں گر کر ایمان لے آنے سے اُن ہزارہا ناظرین پر مُترتّب ہوا تھا جو خود اس کی دعوت پر یہ فیصلہ کُن مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جنھیں خود اس کے بھیجے ہوئے لوگوں نے یہ خیال دلایا تھا کہ مصری قوم کا دین و ایمان بس ان جادُوگروں کے سہارے لٹک رہا ہے، یہ کامیاب ہوں تو قوم اپنے دینِ آبائی پر قائم رہ سکے گی، ورنہ موسیٰؑ کی دعوت کا سیلاب اُسے اور اس کے ساتھ فرعون کی سلطنت کو بھی بہا لے جائے گا۔

۴۰- یعنی ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا تو بہر حال ایک نہ ایک دن ضرور ہے۔ اب اگر تُو قتل کر دے گا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ وہ دن جو کبھی آنا تھا، آج آ جائے گا۔ اس صورت میں ڈرنے کا کیا سوال؟ ہمیں تو اُلٹی مغفرت اور خطا بخشی کی اُمید ہے، کیونکہ آج اِس جگہ حقیقت کُھلتے ہی ہم نے مان لینے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کی اور اس پورے مجمع میں سب سے پہلے پیش قدمی کر کے ہم ایمان لے آئے۔

جادوگروں کے اس جواب نے دو باتیں تمام اُس خلقت کے سامنے واضح کر دیں جسے فرعون نے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر جمع کیا تھا۔

اوّل یہ کہ فرعون نہایت جھوٹا، ہٹ دھرم اور مکّار ہے۔ جو مقابلہ اُس نے خود فیصلے کے لیے کرایا تھا، اُس میں موسیٰ علیہ السلام کی کھلی کھلی فتح کو سیدھی طرح مان لینے کے بجائے اب اس نے فوراً ایک جھوٹی سازش کا افسانہ گھڑ لیا اور قتل و تعذیب کی دھمکی دے کر زبردستی اس کا اقرار کرانے کی کوشش کی۔ اس افسانے میں ذرہ برابر بھی کوئی صداقت ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ جادُوگر ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سولی پر چڑھ جانے کے لیے یوں تیار ہو جاتے۔ ایسی کسی سازش سے اگر کوئی سلطنت مل جانے کا لالچ تھا تو اب اس کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہی، کیونکہ سلطنت کے مزے تو جو لُوٹے گا سو لُوٹے گا، ان غریبوں کے حصے میں تو صرف کٹ کٹ کر جان دینا ہی رہ گیا ہے۔ اس ہولناک خطرے کو انگیز کر کے بھی ان جادُوگروں کا اپنے ایمان پر قائم رہنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ سازش کا الزام سراسر جھوٹا ہے اور سچی بات یہی ہے کہ جادُوگر اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے ٹھیک ٹھیک جان گئے ہیں کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے دکھایا ہے وہ ہرگز جادو نہیں ہے، بلکہ واقعی اللہ رب العالمین ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

دوسری بات جو اس وقت ملک کے گوشے گوشے سے سمٹ کر آئے ہوئے ہزار ہا آدمیوں کے سامنے کُھل کر آ گئی، وہ یہ تھی کہ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتے ہی ان جادُوگروں میں کیسا زبردست اَخلاقی انقلاب واقع ہو گیا۔ کہاں تو ان کی پستیِ ذہن و فکر کا یہ حال تھا کہ دینِ آبائی کی نصرت کے لیے آئے تھے اور فرعون کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انعام مانگ رہے تھے، اور کہاں اب آن کی آن میں ان کی بلندیِ ہمّت و عزم اس درجے کو پہنچ گئی کہ وہی فرعون ان کی نگاہ میں ہیچ ہو گیا، اس کی بادشاہی کی ساری طاقت کو انھوں نے ٹھوکر مار دی اور اپنے ایمان کی خاطر وہ موت اور بدترین جسمانی تعذیب تک برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر مصریوں کے دینِ شرک کی تذلیل اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ حق کی مؤثر تبلیغ اس نازک نفسیاتی موقع پر شاید ہی کوئی اور ہو سکتی تھی۔

۴۱- اُوپر کے واقعات کے بعد ہجرت کا ذکر شروع ہو جانے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے بعد بس فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل سمیت مصر سے نکل جانے کے احکام دے دیے گئے۔ دراصل یہاں کئی سال کی تاریخ بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے، جسے سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۵-۱۶، اور سورۂ یُونس، رکوع ۹ میں

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَۤاءِ
لَشِرۡذِمَةٌ قَلِيۡلُوۡنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمۡ لَنَا لَغَآئِظُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيۡعٌ حٰذِرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔[۴۲]" اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیے (اور کہلا بھیجا) کہ "یہ کچھ مُٹھی بھر لوگ ہیں، اور انھوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے، اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنّا رہنا ہے۔[۴۳]"

بیان کیا جا چکا ہے، اور جس کا ایک حصّہ آگے سورۂ مومن، رکوع ۲-۵ اور الزُّخرُف، رکوع ۵ میں آرہا ہے۔ یہاں چونکہ سلسلۂ کلام کی مناسبت سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس فرعون نے صریح نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود یہ ہٹ دھرمی دکھائی تھی اس کا انجام آخرکار کیا ہوا، اور جس دعوت کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت تھی وہ کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوئی، اس لیے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کش مکش کے ابتدائی مرحلے کا ذکر کرنے کے بعد اب قصّہ مختصر کر کے اس کا آخری منظر دکھایا جا رہا ہے۔

۴۲- واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ مجتمع نہ تھی، بلکہ ملک کے تمام شہروں اور بستیوں میں بٹی ہوئی تھی اور خُصوصیت کے ساتھ منف (Mamphis) سے رَعمسیس تک اس علاقے میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی جسے جُشَن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: "نقشۂ خُروجِ بنی اسرائیل"، تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۷۶) لہٰذا حضرت موسیٰؑ کو جب حکم دیا گیا ہوگا کہ اب تمھیں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا ہے تو انھوں نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں میں ہِدایات بھیج دی ہوں گی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ہجرت کے لیے تیار ہو جائیں، اور ایک خاص رات مقرر کر دی ہوگی کہ اس رات ہر بستی کے مہاجرین نکل کھڑے ہوں۔ یہ ارشاد کہ "تمھارا پیچھا کیا جائے گا" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہجرت کے لیے رات کو نکلنے کی ہدایت کیوں کی گئی تھی۔ یعنی قبل اِس کے کہ فرعون لشکر لے کر تمھارے تعاقب میں نکلے، تم راتوں رات اپنا راستہ اس حد تک طے کر لو کہ اس سے بہت آگے نکل چکے ہو۔

۴۳- یہ باتیں فرعون کی اُس چُھپی ہوئی خوف زدگی کو ظاہر کرتی ہیں جس پر وہ بے خوفی کا نمایشی پردہ ڈال رہا تھا۔ ایک طرف وہ جگہ جگہ سے فوجیں بھی فوری امداد کے لیے بُلا رہا تھا، جو اس بات کی کھلی علامت تھی کہ اسے بنی اسرائیل سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو چھپانا بھی چاہتا تھا کہ مدت ہائے دراز کی دبی اور پِسی ہوئی قوم، جو انتہائی ذلّت کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی، اس سے فرعون جیسا قاہر فرمانروا کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہے، حتّٰی کہ اسے فوری امداد کے لیے فوجیں طلب کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس لیے وہ اپنا

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ
وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ

اِس طرح ہم انھیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔[۴۴] یہ تو ہُوا اُن کے ساتھ، اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔[۴۵]

صبح ہوتے ہی یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا

پیغام اس انداز میں بھیجتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل بیچارے چیز ہی کیا ہیں، کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں جو ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، لیکن انھوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ہمیں ان پر غصہ آ گیا ہے اس لیے ہم انھیں سزا دینا چاہتے ہیں، اور فوجیں ہم کسی خوف کی وجہ سے جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف ایک احتیاطی کارروائی ہے، ہماری دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی بعید سے بعید بھی امکانی خطرہ ہو تو ہم بروقت اس کی سرکوبی کرنے کے لیے تیار رہیں۔

۴۴ – یعنی فرعون نے تو یہ کام اپنے نزدیک بڑی عقل مندی کا کیا تھا کہ دُور دُور سے فوجیں طلب کر کے بنی اسرائیل کو دُنیا سے مٹا دینے کا سامان کیا، لیکن خدائی تدبیر نے اُس کی چال اس پر یوں اُلٹ دی کہ دولتِ فرعونیہ کے بڑے بڑے ستون اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اُس جگہ جا پہنچے جہاں انھیں اور ان کے سارے لاؤ لشکر کو ایک ساتھ غرق ہونا تھا۔ اگر وہ بنی اسرائیل کا پیچھا نہ کرتے تو نتیجہ صرف اتنا ہی ہوتا کہ ایک قوم ملک چھوڑ کر نکل جاتی۔ اس سے بڑھ کر ان کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور وہ حسبِ سابق اپنے عیش کدوں میں بیٹھے زندگی کے مزے لُوٹتے رہتے۔ لیکن انھوں نے کمال درجے کی ہوشیاری دکھانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کو بخیریت نہ گزر جانے دیں، بلکہ ان کے مہاجر قافلوں پر یک بارگی حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے ان کا قلع قمع کر دیں۔ اس غرض کے لیے ان کے شہزادے اور بڑے بڑے سردار اور اعیانِ سلطنت خود بادشاہِ ذی جاہ سمیت اپنے محلوں سے نکل آئے، اور اِسی دانائی نے یہ دُہرا نتیجہ دکھایا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل بھی گئے اور مصر کی ظالم فرعونی سلطنت کا مکھن نذرِ دریا بھی ہو گیا۔

۴۵ – بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے، انھی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کے معنیٰ لازماً یہ ہونے چاہییں کہ فرعون کے غرق ہو جانے پر بنی اسرائیل پھر مصر واپس پہنچ گئے ہوں اور آلِ فرعون کی دولت و حشمت ان کے قبضے میں آ گئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآنِ مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اِس آیت کا یہ مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔ سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں جو حالات

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ۞ (۶۱) قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ
سَيَهۡدِيۡنِ ۞ (۶۲) فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ ؕ فَانْفَلَقَ
فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ ۞ (۶۳) وَاَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِيۡنَ ۞ (۶۴) وَاَنۡجَيۡنَا

تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ نے کہا: ”ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔[۴۶]“ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ ”مار اپنا عصا سمندر پر۔“ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہوگیا۔[۴۷] اُسی جگہ ہم دُوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔[۴۸] موسیٰؑ اور

بیان کیے گئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے، اور پھر حضرت داؤد کے زمانے (۱۰۱۳-۹۷۳ ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے، وہ سب اُس علاقے میں پیش آئے جو آج جزیرہ نمائے سینا، شمالی عرب، شرقِ اُردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ اور چشمے اور خزانے اور محلّات بنی اسرائیل کو بخش دیے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور اُمرا نکالے گئے تھے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آلِ فرعون کو اِن نعمتوں سے محروم کیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرما دیں، یعنی وہ فلسطین کی سرزمین میں باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ قیام گاہوں کے مالک ہوئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورۂ اعراف کی یہ آیت کرتی ہے: فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ۞ وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِيۡنَ كَانُوۡا يُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا ؕ (آیات ۱۳۶-۱۳۷) ”تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور ان کے بجائے ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔“ یہ برکتوں سے مالا مال سرزمین کا استعارہ قرآن مجید میں عُموماً فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے، اور کسی علاقے کا نام لیے بغیر جب اُس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِىۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ — اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا: وَنَجَّيۡنٰهُ وَلُوۡطًا اِلَى الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا لِلۡعٰلَمِيۡنَ ۞ اور وَلِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِىۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَى الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا ؕ — اسی طرح سورۂ سبا میں بھی الۡقُرَى الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا کے الفاظ سرزمینِ شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔

مُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَہٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿ۚ۶۵﴾ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿ؕ۶۶﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ
لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿٪۶۸﴾ ع

اُن سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، ہم نے بچا لیا، اور دُوسروں کو غرق کر دیا۔
اس واقعے میں ایک نشانی ہے، [۴۹] مگر اِن لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

۴۶ – یعنی مجھے اس آفت سے بچنے کی راہ بتائے گا۔

۴۷ – اصل الفاظ ہیں: کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ- طود عربی زبان میں کہتے ہی بڑے پہاڑ کو ہیں۔ لسان العرب میں ہے: الطود، الجبل العظیم۔ اس کے لیے پھر عظیم کی صفت لانے کے معنٰی یہ ہوئے کہ پانی دونوں طرف بہت اُونچے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ سمندر حضرت موسیٰؑ کے عصا مارنے سے پھٹا تھا، اور یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصود فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا، تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا کی ضرب لگنے پر پانی نہایت بلند پہاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا اور اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس میں سے گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پورا لشکر ان کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانونِ فطرت کے تحت جو طوفانی ہوائیں چلتی ہیں، وہ خواہ کیسی ہی تند و تیز ہوں، ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پہاڑوں کی طرح اتنی دیر تک کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر مزید سورۂ طٰہٰ کا یہ بیان ہے کہ فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ۙ ’’ان کے لیے سمندر میں سوکھا راستہ بنا دے۔‘‘ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ سمندر پر عصا مارنے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ بیچ میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی کیچڑ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ اس کے ساتھ سورۂ دُخان، آیت ۲۴ کے یہ الفاظ بھی قابلِ غور ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی کہ سمندر پار کر لینے کے بعد ’’اس کو اسی حال پر رہنے دے، لشکرِ فرعون یہاں غرق ہونے والا ہے۔‘‘ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اگر دوسرے ساحل پر پہنچ کر سمندر پر عصا مار دیتے تو دونوں طرف کھڑا ہُوا پانی پھر مل جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا، تاکہ لشکرِ فرعون اس راستے میں اتر آئے اور پھر پانی دونوں طرف سے آ کر اسے غرق کر دے۔ یہ صریحًا ایک معجزے کا بیان ہے اور اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقعے کی تعبیر عام قوانینِ فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳)

۴۸ – یعنی فرعون اور اس کے لشکر کو۔

۴۹ – یعنی قریش کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ہٹ دھرم لوگ کھلے کھلے معجزات دیکھ کر بھی کس طرح ایمان لانے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰهِيۡمَ ﴿۶۹﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ وَ قَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۰﴾
قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلۡ يَسۡمَعُوۡنَكُمۡ اِذۡ

اور انھیں ابراہیمؑ کا قصّہ سُناؤ[50] جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پُوچھا تھا کہ ”یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟“[51] انھوں نے جواب دیا: ”کچھ بُت ہیں جن کی ہم پُوجا کرتے ہیں اور انھی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔“[52] اس نے پوچھا: ”کیا یہ تمھاری سُنتے ہیں جب تم انھیں

سے انکار ہی کیے جاتے ہیں، اور پھر اس ہٹ دھرمی کا انجام کیسا دردناک ہوتا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کے تمام سرداروں اور ہزار ہا لشکریوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوئی تھی کہ سالہا سال تک جو نشانیاں ان کو دکھائی جاتی رہیں، ان کو تو وہ نظر انداز کرتے ہی رہے تھے، آخر میں عین غرق ہونے کے وقت بھی ان کو یہ نہ سوجھا کہ سمندر اس قافلے کے لیے پھٹ گیا ہے، پانی پہاڑوں کی طرح دونوں طرف کھڑا ہے اور بیچ میں سوکھی سڑک سی بنی ہوئی ہے۔ یہ صریح علامتیں دیکھ کر بھی ان کو عقل نہ آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خدائی طاقت کام کر رہی ہے اور وہ اس طاقت سے لڑنے جا رہے ہیں۔ ہوش ان کو آیا بھی تو اس وقت جب پانی نے دونوں طرف سے ان کو دبوچ لیا تھا اور وہ خدا کے غضب میں گھر چکے تھے۔ اس وقت فرعون چیخ اٹھا کہ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِيۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ○ (یونُس، آیت ۹۰)

دوسری طرف اہلِ ایمان کے لیے بھی اس میں یہ نشانی ہے کہ ظلم اور اس کی طاقتیں خواہ بظاہر کیسی ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہوں، آخر کار اللہ تعالیٰ کی مدد سے حق کا یوں بول بالا ہوتا ہے اور باطل اس طرح سرنگوں ہو کر رہتا ہے۔

۵۰ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کی حیاتِ طیّبہ کے اُس دَور کا قصّہ بیان ہوا ہے جب کہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کش مکش شروع ہوئی تھی۔ اس دَور کی تاریخ کے مختلف گوشے قرآنِ مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر بیان ہوئے ہیں: البقرہ، رکوع ۳۵۔ الانعام، رکوع ۹۔ مریم، رکوع ۳۔ الانبیاء، رکوع ۵۔ الصّافّات، رکوع ۳۔ الممتحنہ، رکوع ۱۔

سیرتِ ابراہیمی کے اس دَور کی تاریخ خاص طور پر جس وجہ سے قرآنِ مجید بار بار سامنے لاتا ہے، وہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ بالعموم اور قریش بالخصوص اپنے آپ کو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے اور کہتے تھے اور یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ ملّتِ ابراہیمی ہی ان کا مذہب ہے۔ مشرکینِ عرب کے علاوہ نصاریٰ اور یہود کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ ان کے دین کے پیشوا ہیں۔ اس پر قرآنِ مجید جگہ جگہ ان لوگوں کو مُتنبّہ کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام

تَدۡعُوۡنَ ﴿۷۲﴾ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَكُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ
یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۵﴾ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمُ

پکارتے ہو؟ یا یہ تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: "نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔[۵۳]" اس پر ابراہیمؑ نے کہا: "کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) اُن چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمھارے پچھلے باپ دادا

جو دین لے کر آئے تھے وہ یہی خالص اسلام تھا جسے نبیِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس سے آج تم لوگ برسرِ پیکار ہو۔ وہ مشرک نہ تھے بلکہ ان کی ساری لڑائی شرک ہی کے خلاف تھی، اور اسی لڑائی کی بدولت انھیں اپنے باپ، خاندان، قوم، وطن سب کو چھوڑ کر شام و فلسطین اور حجاز میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح وہ یہودی و نصرانی بھی نہ تھے بلکہ یہودیت و نصرانیت تو ان کے صدیوں بعد وجود میں آئیں۔ اس تاریخی اِستدلال کا کوئی جواب نہ مشرکین کے پاس تھا نہ یہود و نصاریٰ کے پاس، کیونکہ مشرکین کو بھی یہ تسلیم تھا کہ عرب میں بُتوں کی پرستش حضرت ابراہیمؑ کے کئی صدی بعد شروع ہوئی تھی، اور یہود و نصاریٰ بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جن مخصوص عقائد اور اعمال پر یہ لوگ اپنے دین کا مدار رکھتے ہیں، وہ اُس دینِ قدیم کے اجزا نہیں ہیں جو ابتدا سے چلا آ رہا تھا، اور صحیح دین وہی ہے جو ان آمیزشوں سے پاک ہو کر خالص خدا پرستی پر مبنی ہو۔ اسی بنیاد پر قرآن کہتا ہے:

مَا كَانَ اِبۡرٰهِیۡمُ یَهُوۡدِیًّا وَّلَا نَصۡرَانِیًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ○ اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ (آلِ عمران، آیات ۶۷-۶۸)	ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلمِ یکسو تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہ تھا۔ درحقیقت حضرت ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق انھی لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کے طریقے کی پیروی کی، (اور اب یہ حق) اس نبیؐ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو (پہنچتا ہے)۔

۵۱ - حضرت ابراہیمؑ کے اس سوال کا مدّعا یہ معلوم کرنا نہ تھا کہ وہ کن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ ان بتوں کو تو وہ خود بھی دیکھ رہے تھے جن کی پرستش وہاں ہوتی تھی۔ ان کا مدّعا دراصل ان لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ ان معبودوں کی حقیقت کیا ہے جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اسی سوال کو سورۂ انبیاء میں بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے: "یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟"

۵۲ - یہ جواب بھی محض یہ خبر دینے کے لیے نہ تھا کہ ہم بُتوں کی پوجا کرتے ہیں، کیونکہ سائل و مسئول

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ

بجا لاتے رہے؟[۵۴] میرے تو یہ سب دشمن ہیں،[۵۵] بجز ایک ربّ العالمین[۵۶] کے، جس نے

دونوں کے سامنے یہ امرِ واقعہ عیاں تھا۔ اس جواب کی اصل روح اپنے عقیدے پر ان کا ثبات اور اطمینان تھا۔ گویا دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہاں، ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بُت ہیں جن کی ہم پوجا کر رہے ہیں، مگر ہمارا دین وایمان یہی ہے کہ ہم ان کی پرستش اور خدمت میں لگے رہیں۔

۵۳ - یعنی ہماری اس عبادت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ہماری مناجاتیں اور دعائیں اور فریادیں سنتے ہیں یا ہمیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں، اس لیے ہم نے ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے، بلکہ اصل وجہ اس عبادت کی یہ ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طرح انھوں نے خود یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے مذہب کے لیے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آخر تم نئی بات ہمیں کیا بتانے چلے ہو؟ کیا ہم خود نہیں دیکھتے کہ یہ لکڑی اور پتھر کی مورتیں ہیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ لکڑیاں سُنا نہیں کرتیں اور پتھر کسی کا کام بنانے یا بگاڑنے کے لیے نہیں اُٹھا کرتے؟ مگر یہ ہمارے بزرگ جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ ان کی پوجا کرتے چلے آ رہے ہیں تو کیا وہ سب تمھارے نزدیک بے وقوف تھے؟ ضرور کوئی وجہ ہوگی کہ وہ ان بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے رہے۔ لہٰذا ہم بھی ان کے اعتماد پر یہ کام کر رہے ہیں۔

۵۴ - یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے؟ کیا نسل پر نسل یونہی آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجا لا رہے ہیں، ان کے اندر واقعی خدائی کی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں، اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟

۵۵ - یعنی میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش کروں گا تو میری دُنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت کو محض بے نفع اور بے ضرر ہی نہیں سمجھتا بلکہ اُلٹا نقصان دہ سمجھتا ہوں، اس لیے میرے نزدیک تو ان کو پوجنا دشمن کو پوجنا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے اس قول میں اُس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورۂ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّیَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَیَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ (آیات ۸۱-۸۲) ”انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جب کہ وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور اُلٹے ان کے مخالف ہوں گے۔“ یعنی قیامت کے روز وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، نہ ہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

یہاں حکمتِ تبلیغ کا بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمھارے دشمن ہیں، بلکہ

خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ﴿ۙ۷۸﴾ وَ الَّذِیۡ ہُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ﴿ۙ۷۹﴾ وَ اِذَا
مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۪ۙ۸۰﴾ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿ۙ۸۱﴾ وَ الَّذِیۡۤ

مجھے پیدا کیا[۵۷]، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے[۵۸]۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے

یہ فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کہتے کہ یہ تمھارے دشمن ہیں، تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہوگئے۔ بخلاف اس کے جب انھوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں، تو اس سے مخاطب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہوگیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور بُرے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ اس طریقے سے حضرت ابراہیمؑ نے گویا ہر انسان کے اُس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بُوجھ کر کبھی اپنا بُرا نہیں چاہتا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ و دانستہ میں اپنی بدخواہی نہیں کر سکتا، لہٰذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں۔ اس کے بعد مخاطب فطرتاً یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو۔

۵۶ - یعنی تمام اُن معبُودوں میں سے، جن کی دنیا میں بندگی و پرستش کی جاتی ہے، صرف ایک اللہ رب العالمین ہے جس کی بندگی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے، اور جس کی عبادت میرے نزدیک ایک دشمن کی نہیں بلکہ اپنے اصل مُربّی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ چند فقروں میں وہ وُجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر صرف اللہ رب العالمین ہی عبادت کا مستحق ہے، اور اس طرح اپنے مخاطبوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمھارے پاس تو معبُودانِ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معقول وجہ بجز تقلیدِ آبائی کے نہیں ہے جسے تم بیان کر سکو، مگر میرے پاس صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کے لیے نہایت معقول وجوہ موجود ہیں جن سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔

۵۷ - یہ اوّلین وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ اور صرف ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ مخاطب بھی اس حقیقت کو جانتے اور مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے، اور انھیں یہ بھی تسلیم تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حتّٰی کہ اپنے معبُودوں کے بارے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالقِ کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل یہ تھی کہ میں صرف اُس کی عبادت کو صحیح و برحق سمجھتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ دوسری کوئی ہستی میری عبادت کی کیسے مستحق ہو سکتی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لِىۡ خَطِيۡٓـــَٔتِىۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِؕ‏ ﴿۸۲﴾ رَبِّ هَبۡ لِىۡ حُكۡمًا وَّ

میں اُمید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔[59]" (اس کے بعد ابراہیمؑ نے دُعا کی:) "اے میرے رب! مجھے حکم عطا کر۔[60] اور

جب کہ میرے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مخلوق کو اپنے خالق کی بندگی تو کرنی ہی چاہیے، لیکن غیر خالق کی بندگی وہ کیوں کرے؟

۵۸– یہ دوسری وجہ ہے اللہ اور اکیلے اللہ ہی کے مستحقِ عبادت ہونے کی۔ اگر اس نے انسان کو بس پیدا ہی کر کے چھوڑ دیا ہوتا اور آگے اس کی خبر گیری سے وہ بالکل بے تعلق رہتا، تب بھی کوئی معقول وجہ اس امر کی ہو سکتی تھی کہ انسان اس کے علاوہ کسی دوسری طرف بھی سہارے ڈھونڈنے کے لیے رُجوع کرتا۔ لیکن اس نے تو پیدا کرنے کے ساتھ رہنمائی، پرورش، نگہداشت، حفاظت اور حاجت روائی کا ذمّہ بھی خود ہی لے لیا ہے۔ جس لمحے انسان دُنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت ایک طرف اس کی ماں کے سینے میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کوئی اَن دیکھی طاقت اسے دودھ چوسنے اور حلق سے اُتارنے کا طریقہ سکھا دیتی ہے۔ پھر اس تربیت و رہنمائی کا سلسلہ اوّل روزِ پیدایش سے شروع ہو کر موت کی آخری ساعت تک برابر جاری رہتا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو اپنے وجود اور نشوونما اور بقا و ارتقا کے لیے جس جس نوعیت کے سروسامان کی حاجت پیش آتی ہے، وہ سب اس کے پیدا کرنے والے نے زمین سے لے کر آسمان تک ہر طرف مہیا کر دیا ہے۔ اس سروسامان سے فائدہ اٹھانے اور کام لینے کے لیے جن جن طاقتوں اور قابلیتوں کی اس کو حاجت پیش آتی ہے، وہ سب بھی اس کی ذات میں ودیعت کر دی ہیں۔ اور ہر شعبۂ حیات میں جس جس طرح کی رہنمائی اس کو درکار ہوتی ہے، اس کا بھی پورا انتظام اس نے کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انسانی وجود کی حفاظت کے لیے اور اس کو آفات سے، بیماریوں سے، مہلک جراثیم سے، اور زہریلے اثرات سے بچانے کے لیے خود اس کے جسم میں اتنے زبردست انتظامات کیے ہیں کہ انسان کا علم ابھی تک ان کا پورا احاطہ بھی نہیں کر سکا ہے۔ اگر یہ قدرتی انتظامات موجود نہ ہوتے تو ایک معمولی کانٹا چبھ جانا بھی انسان کے لیے مہلک ثابت ہوتا اور اپنے علاج کے لیے آدمی کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکتی۔ خالق کی یہ ہمہ گیر رحمت و رُبوبیت جب ہر آن ہر پہلو سے انسان کی دست گیری کر رہی ہے تو اس سے بڑی حماقت و جہالت اور کیا ہو سکتی ہے، اور اس سے بڑھ کر احسان فراموشی بھی اور کون سی ہو سکتی ہے کہ انسان اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کے آگے سرِ نیاز جھکائے اور حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے کسی اور کا دامن تھامے۔

۵۹– یہ تیسری وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت دُرست نہیں ہو سکتی۔ انسان کا معاملہ اپنے خدا کے ساتھ صرف اس دُنیا اور اس کی زندگی تک محدود نہیں ہے کہ وجود کی سرحد میں قدم رکھنے سے

اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾

مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا[61]۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری[62] عطا کر۔

شروع ہو کر موت کی آخری ہچکی پر وہ ختم ہو جائے، بلکہ اس کے بعد اس کا انجام بھی سراسر خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی خدا جو اس کو وجود میں لایا ہے، آخر کار اسے اِس دُنیا سے واپس بلا لیتا ہے، اور کوئی طاقت دُنیا میں ایسی نہیں ہے جو انسان کی اس واپسی کو روک سکے۔ آج تک کسی دوا، یا طبیب، یا دیوی دیوتا کی مداخلت اُس ہاتھ کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے جو انسان کو یہاں سے نکال لے جاتا ہے، حتّیٰ کہ وہ بہت سے انسان بھی، جنھیں معبُود بنا کر انسانوں نے پوج ڈالا ہے، خود اپنی موت کو نہیں ٹال سکے ہیں۔ صرف خدا ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس شخص کو کب اِس جہان سے واپس طلب کرنا ہے، اور جس وقت جس کی طلبی بھی اس کے ہاں سے آ جاتی ہے، اُسے چار و ناچار جانا ہی پڑتا ہے۔ پھر وہی خدا ہے جو اکیلا اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کب ان تمام انسانوں کو، جو دُنیا میں پیدا ہوئے تھے، دوبارہ وجود میں لائے اور ان سے ان کی حیاتِ دُنیا کا محاسبہ کرے۔ اُس وقت بھی کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ بعث بعد الموت سے کسی کو بچا سکے یا خود بچ سکے۔ ہر ایک کو اس کے حکم پر اُٹھنا ہی ہوگا اور اس کی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ پھر وہی اکیلا خدا اس عدالت کا قاضی و حاکم ہوگا۔ کوئی دوسرا اس کے اختیارات میں ذرّہ برابر بھی شریک نہ ہوگا۔ سزا دینا یا معاف کرنا بالکل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ جسے وہ سزا دینا چاہے اس کو بخشوا لے جائے، یا جسے وہ بخشنا چاہے اسے سزا دلوا سکے۔ دُنیا میں جن کو بخشوا لینے کا مختار سمجھا جاتا ہے، وہ خود اپنی بخشش کے لیے بھی اسی کے فضل و کرم کی آس لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان حقائق کی موجودگی میں جو شخص خدا کے سوا کسی کی بندگی کرتا ہے، وہ اپنی بدانجامی کا خود سامان کرتا ہے۔ دُنیا سے لے کر آخرت تک آدمی کی ساری قسمت تو ہو خدا کے اختیار میں، اور اسی قسمت کے بناؤ کی خاطر آدمی رُجوع کرے اُن کی طرف جن کے اختیار میں کچھ نہیں ہے! اس سے بڑھ کر شامتِ اعمال اور کیا ہو سکتی ہے۔

۶۰ – ''حکم'' سے مراد ''نبوت'' یہاں دُرست نہیں ہے، کیونکہ جس وقت کی یہ دُعا ہے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ دُعا اس سے پہلے کی بھی ہو تو نبوت کسی کی طلب پر اسے عطا نہیں کی جاتی، بلکہ وہ ایک وہبی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اس لیے یہاں حکم سے مراد علم، حکمت، فہمِ صحیح اور قوتِ فیصلہ ہی لینا دُرست ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی یہ دُعا قریب قریب اسی معنیٰ میں ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے کہ اَرِنَا الْاَشْیَآءَ کَمَا ھِیَ یعنی ہم کو اس قابل بنا کہ ہم ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھیں جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، اور ہر معاملے میں وہی رائے قائم کریں جیسی کہ اس کی حقیقت کے لحاظ سے قائم کی جانی چاہیے۔

۶۱ – یعنی دُنیا میں مجھے صالح سوسائٹی دے اور آخرت میں میرا حشر صالحوں کے ساتھ کر۔ جہاں تک

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾ وَ اغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ
كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾ وَ لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ یَوْمَ

اور مجھے جنّتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے[۶۳] اور مجھے اُس دن رُسوا نہ کر جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔[۶۴] جب کہ

آخرت کا تعلق ہے، صالح لوگوں کے ساتھ کسی کا حشر ہونا اور اس کا نجات پانا گویا ہم معنٰی ہیں، اس لیے یہ تو ہر اُس انسان کی دُعا ہونی ہی چاہیے جو حیات بعد الموت اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن دنیا میں بھی ایک پاکیزہ روح کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بد اَخلاق فاسق و فاجر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی مصیبت سے نجات دے اور اس کو نیک لوگوں کے ساتھ ملائے۔ معاشرے کا بگاڑ جہاں چاروں طرف محیط ہو، وہاں ایک آدمی کے لیے صرف یہی چیز ہمہ وقت اذیت کی موجب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش گندگی ہی گندگی پھیلی ہوئی دیکھتا ہے، بلکہ اس کے لیے خود پاکیزہ رہنا اور اپنے آپ کو گندگی کی چھینٹوں سے بچا کر رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک صالح آدمی اس وقت تک بے چین ہی رہتا ہے جب تک یا تو اس کا اپنا معاشرہ پاکیزہ نہ ہو جائے، یا پھر اس سے نکل کر وہ کوئی دوسری ایسی سوسائٹی نہ پالے جو حق و صداقت کے اُصولوں پر چلنے والی ہو۔

۶۲ – یعنی بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں۔ میں دُنیا سے وہ کام کر کے نہ جاؤں کہ نسلِ انسانی میرے بعد میرا شمار اُن ظالموں میں کرے جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دُنیا کو بگاڑ کر چلے گئے، بلکہ مجھ سے وہ کارنامے انجام پائیں جن کی بدولت رہتی دُنیا تک میری زندگی خلقِ خدا کے لیے روشنی کا مینار بنی رہے اور مجھے انسانیت کے محسنوں میں شمار کیا جائے۔ یہ محض شہرت و ناموری کی دُعا نہیں ہے بلکہ سچی شہرت اور حقیقی ناموری کی دُعا ہے جو لازماً ٹھوس خدمات اور بیش قیمت کارناموں ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اس چیز کا حاصل ہونا اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے: دُنیا میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی نسلوں کو بری مثالوں کے مقابلے میں ایک نیک مثال ملتی ہے، جس سے وہ بھلائی کا سبق حاصل کرتی ہیں اور ہر سعید روح کو راہِ راست پر چلنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی چھوڑی ہوئی نیک مثال سے قیامت تک جتنے لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہوئی ہو، ان کا ثواب اس شخص کو بھی ملے گا اور قیامت کے روز اس کے اپنے اعمال کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خدا کی یہ گواہی بھی اس کے حق میں موجود ہوگی کہ وہ دنیا میں بھلائی کے چشمے رواں کر کے آیا ہے جن سے نسل پر نسل سیراب ہوتی رہی ہے۔

۶۳ – بعض مفسرین نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعائے مغفرت کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ مغفرت بہر حال اسلام کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے آں جناب کا اپنے والد کی مغفرت کے لیے دعا کرنا گویا اس بات کی دُعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اس کے متعلق مختلف مقامات پر جو تصریحات ملتی ہیں، وہ اس

لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاُزْلِفَتِ
الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ

نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔[۶۵]"

——— (اُس[۶۶] روز) جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی، اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے[۶۷] گی اور ان سے پوچھا جائے گا

توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے ظلم سے تنگ آ کر جب گھر سے نکلنے لگے تو انھوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ○ (مریم، آیت ۴۷) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش کی دُعا کروں گا، وہ میرے اُوپر نہایت مہربان ہے۔" اسی وعدے کی بنا پر انھوں نے یہ دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لیے کی بلکہ ایک دوسرے مقام پر بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے کی: رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ (ابراہیم، آیت ۴۱) لیکن بعد میں انھیں خود یہ احساس ہوگیا کہ ایک دشمنِ حق، چاہے وہ ایک مومن کا باپ ہی کیوں نہ ہو، دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ (التوبہ، آیت ۱۱۴) "ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا۔ مگر جب یہ بات اس پر کھل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اظہارِ بیزاری کر دیا۔"

۶۴ – یعنی قیامت کے روز یہ رسوائی مجھے نہ دکھا کہ میدانِ حشر میں تمام اولین و آخرین کے سامنے ابراہیمؑ کا باپ سزا پا رہا ہو اور ابراہیمؑ کھڑا دیکھ رہا ہو۔

۶۵ – ان دو فقروں کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا کا حصّہ ہیں یا انھیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اگر پہلی بات مانی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کے لیے یہ دُعا کرتے وقت خود بھی ان حقائق کا احساس رکھتے تھے۔ اور دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی دُعا پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے کام اگر کوئی چیز آ سکتی ہے تو وہ مال اور اولاد نہیں بلکہ صرف قلبِ سلیم ہے، ایسا دل جو کفر و شرک و نافرمانی اور فسق و فجور سے پاک ہو۔ مال اور اولاد بھی قلبِ سلیم ہی کے ساتھ نافع ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔ مال صرف اس صورت میں وہاں مفید ہوگا جب کہ آدمی نے دُنیا میں ایمان و اخلاص کے ساتھ اسے اللہ کی راہ میں صَرف کیا ہو، ورنہ کروڑ پتی اور ارب پتی آدمی بھی وہاں کنگال ہوگا۔ اولاد بھی صرف اسی حالت میں وہاں کام

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيۡنَمَا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَۙ ﴿۹۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِؕ هَلۡ يَنۡصُرُوۡنَكُمۡ اَوۡ يَنۡتَصِرُوۡنَؕ ﴿۹۳﴾
فَكُبۡكِبُوۡا فِيۡهَا هُمۡ وَالۡغَاوٗنَۙ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوۡدُ اِبۡلِيۡسَ اَجۡمَعُوۡنَؕ ﴿۹۵﴾ قَالُوۡا وَهُمۡ
فِيۡهَا يَخۡتَصِمُوۡنَۙ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنۡ كُنَّا لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍۙ ﴿۹۷﴾ اِذۡ نُسَوِّيۡكُمۡ
بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۸﴾ وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَۙ ﴿۱۰۰﴾

کہ ”اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمھاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟“ پھر وہ معبُود اور یہ بہکے ہوئے لوگ، اور ابلیس کے لشکر، سب کے سب اس میں اُوپر تلے دھکیل دیے جائیں[۶۸] گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبُودوں سے) کہیں گے کہ ”خدا کی قسم! ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو ربّ العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا[۶۹]۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے

آسکے گی جب کہ آدمی نے دُنیا میں اسے اپنی حد تک ایمان اور حسنِ عمل کی تعلیم دی ہو، ورنہ بیٹا اگر نبی بھی ہو تو وہ باپ سزا پانے سے نہیں بچ سکتا جس کا اپنا خاتمہ کفر و معصیت پر ہوا ہو اور اولاد کی نیکی میں جس کا اپنا کوئی حصہ نہ ہو۔

۶۶ - یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کا جُز نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس کا مضمون صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔

۶۷ - یعنی ایک طرف متقی لوگ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ کیسی نعمتوں سے لبریز جگہ ہے جہاں اللہ کے فضل سے ہم جانے والے ہیں۔ اور دوسری طرف گمراہ لوگ ابھی میدانِ حشر ہی میں ہوں گے کہ ان کے سامنے اُس جہنّم کا ہولناک منظر پیش کر دیا جائے گا جس میں انھیں جانا ہے۔

۶۸ - اصل میں لفظ فَكُبۡكِبُوۡا فرمایا گیا ہے، جس میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک یہ کہ ایک کے اُوپر ایک دھکیل دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ قعرِ جہنّم تک لڑھکتے چلے جائیں گے۔

۶۹ - یہ پیروؤں اور معتقدوں کی طرف سے اُن لوگوں کی تواضع ہو رہی ہوگی جنھیں یہی لوگ دُنیا میں بزرگ، پیشوا اور رہنما مانتے رہے تھے، جن کے ہاتھ پاؤں چومے جاتے تھے، جن کے قول و عمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزرانی جاتی تھیں۔ آخرت میں جا کر جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ

وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾

اور نہ کوئی جگری دوست[۷۱]۔ کاش! ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں[۷۲]" ـــــــ

آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھیرائیں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ عالمِ آخرت کا یہ عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے، تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دُنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ سورۂ اَعراف میں فرمایا:

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ○ (آیت ۳۸)

ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اب انھیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔ رب فرمائے گا: سب ہی کے لیے دُہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔

سورۂ حٰم السجدہ میں ارشاد ہُوا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ○ (آیت ۲۹)

اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے پروردگار! اُن جنّوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لا جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، تاکہ ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں اور وہ پست و ذلیل ہو کر رہیں۔

یہی مضمون سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ○ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ○ (آیات ۶۷-۶۸)

اور وہ کہیں گے: اے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہم کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔

۷۰- یعنی جنھیں ہم دُنیا میں سِفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا پار ہے، ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کے لیے زبان کھولنے والا نہیں ہے۔

۷۱- یعنی کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ہمارا غم خوار اور ہمارے لیے کُڑھنے والا ہو، چاہے ہم کو چھڑا نہ سکے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اِنَّ رَبَّکَ
لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾ ع كَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣالۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ۚۖ اِذۡ
قَالَ لَہُمۡ اَخُوۡہُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ۚ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ۙ

ع ۳۱

یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے[۷۳]، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

قومِ[۷۴] نوحؑ نے رسولوں کو جھٹلایا[۷۵]۔ یاد کرو جب کہ اُن کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا تھا: ''کیا تم ڈرتے نہیں ہو[۷۶]؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۷۷]،

مگر کم از کم اسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی ہی ہو۔ قرآنِ مجید یہ بتاتا ہے کہ آخرت میں دوستیاں صرف اہلِ ایمان ہی کی باقی رہ جائیں گی۔ رہے گمراہ لوگ، تو وہ دُنیا میں چاہے کیسے ہی جگری دوست رہے ہوں، وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں گے، ایک دوسرے کو مجرم ٹھیرائیں گے اور اپنی بربادی کا ذمّہ دار قرار دے کر ہر ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے کی کوشش کرے گا۔ اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿ؕ﴾ (الزُّخرُف، آیت ۶۷) ''دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر متقین (کی دوستیاں قائم رہیں گی)۔''

۷۲ – اس تمنا کا جواب بھی قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ (الانعام، آیت ۲۸) ''اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا ہے۔'' رہا یہ سوال کہ انھیں واپسی کا موقع کیوں نہ دیا جائے گا، اس کے وجوہ پر مفصّل بحث ہم سورۂ مؤمنون، حواشی ۹۰ تا ۹۲ میں کر چکے ہیں۔

۷۳ – حضرت ابراہیمؑ کے اس قصّے میں نشانی کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ مشرکینِ عرب اور بالخصوص قریش کے لوگ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے ہیں، مگر دوسری طرف اُسی شرک میں مبتلا ہیں جس کے خلاف جِدّوجُہد کرتے اُن کی عمر بیت گئی تھی، اور ان کے لائے ہوئے دین کی دعوت آج جو نبی پیش کر رہا ہے، اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تو شرک کے دشمن اور دعوتِ توحید کے عَلَم بردار تھے، تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ حضرتِ ممدوح مشرک نہ تھے، مگر پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو۔ دوسرا پہلو اس قصّے میں نشانی کا یہ ہے کہ قومِ ابراہیم

دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ و اسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہوا۔ قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار مُعذَّب قوموں ہی میں کیا گیا ہے: اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ (التوبہ، آیت ۷۰)

۷۴۔ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳۔ الانبیاء، آیات ۷۶-۷۷۔ المومنون، آیات ۲۳ تا ۳۰۔ الفرقان، آیت ۳۷۔ اس کے علاوہ قصۂ نوح علیہ السلام کی تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی پیشِ نظر رہیں: العنکبوت، آیات ۱۴-۱۵۔ الصّافّات آیات ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، آیات ۹-۱۵، سورۂ نوح مکمل۔

۷۵۔ اگرچہ انھوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا، لیکن چونکہ رسول کی تکذیب درحقیقت اُس دعوت اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لے کر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس لیے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کر دے، وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے۔ یہ ایک بڑی اہم اُصولی حقیقت ہے جسے قرآن میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ وہ لوگ بھی کافر ٹھیرائے گئے ہیں جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہوں، باقی تمام انبیا کو مانتے ہوں۔ اس لیے کہ جو شخص اصل پیغامِ رسالت کا ماننے والا ہے، وہ تو لازماً ہر رسول کو مانے گا۔ مگر جو شخص کسی رسول کا انکار کرتا ہے وہ اگر دوسرے رسولوں کو مانتا بھی ہے تو کسی عصبیت یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر مانتا ہے، نفسِ پیغامِ رسالت کو نہیں مانتا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اسے مان لے اور وہی دوسرا پیش کرے تو یہ اس کا انکار کر دے۔

۷۶۔ دوسرے مقامات پر حضرت نوحؑ کا اپنی قوم سے ابتدائی خطاب ان الفاظ میں آیا ہے: اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (المومنون، آیت ۲۳) ''اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے، تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟'' اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ۙ (نوح، آیت ۳) ''اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' اس لیے یہاں حضرت نوحؑ کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف نہیں بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہوگئے؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس باغیانہ روش کا انجام کیا ہوگا؟

دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویّے کی بدانجامی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہِ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔[۷۸] میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔[۷۹] پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو۔[۸۰]"

۷۷ – اس کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر یا کم و بیش کر کے بیان نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راست باز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تمھیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں، اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دُنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔

۷۸ – یعنی میرے رسولِ امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مُطاعوں کی اطاعت چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو اور جو احکام میں تمھیں دیتا ہوں اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو، کیونکہ میں خداوندِ عالَم کی مرضی کا نمایندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہے وہ اس کی صداقت تسلیم کر لیں اور اسے رسولِ برحق مان لیں۔ بلکہ اس کو خدا کا سچّا رسول مانتے ہی آپ سے آپ یہ بھی لازم آ جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑ کر صرف اسی کے لائے ہوئے قانون کا اتباع کیا جائے۔ رسول کو رسول نہ ماننا، یا رسول مان کر اس کی اطاعت نہ کرنا، دونوں صورتیں دراصل خدا سے بغاوت کی ہم معنیٰ ہیں، اور دونوں کا نتیجہ خدا کے غضب میں گرفتار ہونا ہے۔ اسی لیے ایمان اور اطاعت کے مطالبے سے پہلے "اللہ سے ڈرو" کا تنبیہی فقرہ ارشاد فرمایا گیا، تاکہ ہر مخاطَب اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ رسول کی رسالت تسلیم نہ کرنے یا اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔

۷۹ – یہ اپنی صداقت پر حضرت نوحؑ کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ دعوائے نبوت سے پہلے میری ساری زندگی تمھارے درمیان گزری ہے اور آج تک تم مجھے ایک امین آدمی کی حیثیت سے جانتے رہے ہو۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں، تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو، یا جس کے حُصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقے سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوتِ حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں

صَرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھا رہا ہوں، تو تمھیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، ایمان داری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلقِ خدا کی فلاح دیکھتا ہوں، وہی پیش کر رہا ہوں، کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔

یہ دونوں دلیلیں اُن اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآنِ مجید نے بار بار انبیا علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کَسَوٹی قرار دیتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو شخص ایک معاشرے میں برسوں زندگی بسر کر چکا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ ہر معاملے میں اسے سچا اور راست باز آدمی پایا ہو، اس کے متعلق کوئی غیر متعصب آدمی مشکل ہی سے یہ شک کر سکتا ہے کہ وہ یکایک خدا کے نام سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر اُتر آئے گا کہ اسے نبی نہ بنایا گیا ہو اور وہ کہے کہ خدا نے مجھے نبی بنایا ہے۔ پھر دوسری اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسا سفید جھوٹ کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تو نہیں گھڑا کرتا۔ لامحالہ کوئی نفسانی غرض ہی اس فریب کاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنی اغراض کے لیے اس طرح کی فریب کاری کرتا ہے تو اِخفا کی تمام کوششوں کے باوجود اس کے آثار نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ اسے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں، جن کے گھناؤنے پہلو گردوپیش کے معاشرے میں چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ اور مزید برآں وہ اپنی پیری کی دکان چمکا کر کچھ نہ کچھ اپنا بھلا کرتا نظر آتا ہے۔ نذرانے وصول کیے جاتے ہیں، لنگر جاری ہوتے ہیں، جائدادیں بنتی ہیں، زیور گھڑے جاتے ہیں، اور فقیری کا آستانہ دیکھتے دیکھتے شاہی دربار بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے برعکس نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی ذاتی زندگی ایسے فضائلِ اَخلاق سے لبریز نظر آئے کہ اس میں کہیں ڈھونڈے سے بھی کسی فریب کارانہ ہتھکنڈے کا نشان نہ مل سکے، اور اس کام سے کوئی ذاتی فائدہ اُٹھانا تو درکنار، وہ اپنا سب کچھ اِسی خدمتِ بے مزد کی نذر کر دے، وہاں جھوٹ کا شبہ کرنا کسی معقول انسان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ کوئی شخص جو عقل بھی رکھتا ہو اور بے انصاف بھی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آخر ایک اچھا بھلا آدمی، جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، کیوں بلاوجہ ایک جھوٹا دعویٰ لے کر اُٹھے، جب کہ اسے کوئی فائدہ اس جھوٹ سے نہ ہو، بلکہ وہ اُلٹا اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی ساری قوتیں اور محنتیں اس کام میں کھپا رہا ہو اور بدلے میں دنیا بھر کی دشمنی مول لے رہا ہو۔ ذاتی مفاد کی قربانی آدمی کے مخلص ہونے کی سب سے زیادہ نمایاں دلیل ہوتی ہے۔ یہ قربانی کرتے جس کو سالوں بیت جائیں، اسے بدنیت یا خود غرض سمجھنا خود اس شخص کی اپنی بدنیتی کا ثبوت ہوتا ہے جو ایسے آدمی پر یہ الزام لگائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۰)

۸۰ — اس فقرے کی تکرار بے وجہ نہیں ہے۔ پہلے یہ ایک اور مناسبت سے فرمایا گیا تھا اور یہاں ایک دوسری مناسبت سے اس کو دُہرایا گیا ہے۔ اُوپر اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ سے فَاتَّقُوا اللّٰهَ کے فقرے کی مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، جس کی صفتِ امانت سے تم لوگ خود بھی واقف ہو، اُسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ سے اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے بغیر محض اصلاحِ خلق کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ

انھوں نے جواب دیا: ”کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟[81]“ نوحؑ نے کہا: ”میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں، ان کا حساب تو میرے رب کے ذمّے ہے، کاش! تم کچھ شعور سے کام لو۔[82] میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں اُن کو میں

کام کر رہا ہے، اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اس بات کو اتنا زور دے کر بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قوم کے سردار حضرت نوحؑ کی مخلصانہ دعوتِ حق میں کیڑے ڈالنے کے لیے ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ شخص دراصل یہ ساری دوڑ دھوپ اپنی بڑائی کے لیے کر رہا ہے: یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ (المومنون، آیت ۲۴) ”یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔“

۸۱ - یہ لوگ جنھوں نے حضرت نوحؑ کو دعوتِ حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شُیوخ اور اشراف تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصّے کے سلسلے میں بیان ہُوا ہے: فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ۔ (ھود، آیت ۲۷) ”اُس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمھاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بُوجھے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اَراذِل ہیں، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے طبقے کے بااثر اور خوش حال لوگ، تو وہ ان کی مخالفت پر کمربستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ حضرت نوحؑ کے خلاف پیش کرتے تھے، ان میں سے ایک اِستِدلال یہ تھا کہ اگر نوحؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اُمَرا، علما، مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن اُن میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بُوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ اِن بے شعور اور کمین لوگوں کے زُمرے میں شامل ہو جائیں؟

بعینہٖ یہی بات قریش کے کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ اِن کے پیرو یا تو غلام اور غریب

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ
يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ النصف

دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف مُتنَبِّہ کر دینے والا آدمی ہوں۔[۸۳]" انھوں نے کہا: "اے نوحؑ! اگر تُو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا۔[۸۴]" نوح نے دُعا کی "اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھُٹلا دیا۔[۸۵]

لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابوسُفیان نے ہِرقل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ تَبِعَہٗ مِنَّا الضُّعَفَآءُ وَ الْمَسَاکِیْنُ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے)۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں، کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفارِ مکہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا، وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ (الزُّخرُف، آیت ۳۱) "وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔"

۸۲ – یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، اُن کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں، یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بُوجھ سے عاری ہوتے ہیں، اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی، نہ ان کا اعتقاد لائقِ اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔ حضرت نوحؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آ کر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے، میرا اور تمھارا کام نہیں ہے۔

۸۳ – یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے اُونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زُمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ اے نوحؑ! کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اَراذِل اور سفہا میں شمار کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں؟ حضرت نوح علیہ السلام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں، اور جو میری بات مانتے ہیں انھیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے، اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے، اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں، اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں "کمین" ہوں تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ اِن آیات کے نُزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان چل رہا تھا، اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔ کفارِ مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلالؓ اور عمارؓ اور صُہَیبؓ جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف اِدھر کا رُخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دوٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیے جا سکتے:

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰىۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰىؕ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰىؕ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰىۙ وَ هُوَ یَخْشٰىۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰىۚ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗۘ
(عبس، آیات ۵ تا ۱۲)

اے محمدؐ! جس نے بے نیازی برتی، تم اس کے پیچھے پڑتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے، تم اس سے بے رخی برتتے ہو؟ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗؕ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۝ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ

نہ دُور پھینکو ان لوگوں کو جو شب و روز اپنے رب کو پکارتے ہیں محض اُس کی خوشنودی کی خاطر۔ ان کا کوئی حساب تمھارے ذمہ نہیں، اور تمھارا کوئی حساب ان کے ذمہ نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انھیں دُور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ ہم نے

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات[۸۶] دے۔"

بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ (الانعام، آیت ۵۲-۵۳) تو اس طرح اِن لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ کہیں: "کیا ہمارے درمیان بس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا؟" ہاں، کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا؟

۸۴ – اصل الفاظ ہیں لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ اِس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے معنٰی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی، جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے ان الفاظ کے یہ دونوں معنٰی لیے جا سکتے ہیں۔

۸۵ – یعنی آخری اور قطعی طور پر جھٹلا دیا ہے جس کے بعد اب کسی تصدیق و ایمان کی اُمید باقی نہیں رہی۔ ظاہرِ کلام سے کوئی شخص اس شبہے میں نہ پڑے کہ بس پیغمبر اور سردارانِ قوم کے درمیان اوپر کی گفتگو ہوئی اور ان کی طرف سے پہلی ہی تکذیب کے بعد پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حُضور رپورٹ پیش کر دی کہ یہ میری نبوت نہیں مانتے، اب آپ میرے اور ان کے مقدّمے کا فیصلہ فرما دیں۔ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل کش مکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کش مکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک مُمتد رہا ہے۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ (آیت ۱۴) حضرت نوحؑ نے اس زمانے میں پشت در پشت اُن کے اجتماعی طرزِ عمل کو دیکھ کر نہ صرف یہ اندازہ فرما لیا کہ ان کے اندر قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آیندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایمان دار آدمیوں کے اُٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (نوح، آیت ۲۷) "اے رب! اگر تو نے انھیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، فاجر اور سخت منکرِ حق ہوگا۔" خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علمِ کامل و شامل کی بنا پر فرمایا: لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (ہود، آیت ۳۶) "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔"

۸۶ – یعنی صرف یہی فیصلہ نہ کر دے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون، بلکہ وہ فیصلہ اس شکل میں نافذ فرما کہ باطل پرست تباہ کر دیے جائیں اور حق پرست بچا لیے جائیں۔ یہ الفاظ کہ "مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو بچا لے"

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ ﴿۱۲۰﴾
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۲﴾ ع كَذَّبَتْ عَادُ ا۟لْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ
هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

آخرکار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا۔[87] اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔[88] یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہُود نے ان سے کہا تھا:[89] ''کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو

خود بخود اپنے اندر یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں پر عذاب نازل کر اور انھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دے۔

۸۷ – ''بھری ہوئی کشتی'' سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی ایمان لانے والے انسانوں اور تمام جانوروں سے بھر گئی تھی، جن کا ایک ایک جوڑا ساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ہود، آیت ۴۰۔

۸۸ – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۶۵ تا ۷۲۔ ہود، ۵۰ تا ۶۰۔ مزید برآں اس قصے کی تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی نگاہ میں رہیں: حٰمٓ السجدہ، آیات ۱۳-۱۶۔ الاحقاف، ۲۱-۲۶۔ الذاریات، ۴۱-۴۵۔ القمر، ۱۸-۲۲۔ الحاقّہ، ۴-۸۔ الفجر، ۶-۸۔

۸۹ – حضرت ہودؑ کی اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے متعلق وہ معلومات ہماری نگاہ میں رہیں جو قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر ہمیں بہم پہنچائی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ:

قومِ نوحؑ کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عُروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی:

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (الاعراف:۶۹)	یاد کرو (اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ) نوحؑ کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔

وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲٦﴾ وَ مَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔ یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، [90]

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے:

وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ (الاعراف:٦٩) اور تمھیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔

اپنے دَور میں یہ بے نظیر قوم تھی۔ کوئی دوسری قوم اس کی ٹکّر کی نہ تھی:

الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (الفجر:۸) جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

اس کا تمدّن بڑا شان دار تھا، اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دُنیا میں مشہور تھی:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ (الفجر:٦-۷) تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عادِ اِرَم کے ساتھ؟

اس مادّی ترقی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبر بنا دیا تھا اور انھیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ (حٰم السجدہ:۱۵) رہے عاد، تو انھوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا:

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ (ہود:۵۹) اور انھوں نے ہر جبار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ (الاعراف:۷۰) انھوں نے (ہودؑ سے) کہا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

اِن خصوصیات کو نظر میں رکھنے سے حضرت ہود علیہ السلام کی یہ تقریرِ دعوت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

۹۰- یعنی محض اپنی عظمت و خوش حالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسی عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے ہو جن کا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ
جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣١﴾ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ

اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے[91]۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو[92]۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمھیں دیا ہے

کوئی مَصرَف نہیں، جن کی کوئی حاجت نہیں، جن کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہیں کہ وہ بس تمھاری دولت و شوکت کی نمود کے لیے ایک نشانی کے طور پر کھڑی رہیں۔

۹۱ – یعنی تمھاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں، مگر ان کو شان دار، مُزَیَّن اور مستحکم بنانے میں تم اس طرح اپنی دولت، محنت اور قابلیتیں صَرف کرتے ہو جیسے دُنیا میں ہمیشہ رہنے کا سامان کر رہے ہو، جیسے تمھاری زندگی کا مقصد بس یہیں کے عیش کا اہتمام کرنا ہے اور اس کے ماورا کوئی چیز نہیں ہے جس کی تمھیں فکر ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ بلا ضرورت یا ضرورت سے زیادہ شان دار عمارتیں بنانا کوئی منفرد فعل نہیں ہے جس کا ظُہور کسی قوم میں اس طرح ہو سکتا ہو کہ اس کی اور سب چیزیں تو ٹھیک ہوں اور بس یہی ایک کام وہ غلط کرتی ہو۔ یہ صورتِ حال تو ایک قوم میں رُونما ہی اُس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف اس میں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کے اندر نفس پرستی و مادہ پرستی کی شدّت بڑھتے بڑھتے جُنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ حالت جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا سارا ہی نظامِ تمدّن فاسد ہو جاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی تعمیرات پر جو گرفت کی، اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ ان کے نزدیک صرف یہ عمارتیں ہی بجائے خود قابلِ اعتراض تھیں، بلکہ دراصل وہ بحیثیتِ مجموعی ان کے فسادِ تمدّن و تہذیب پر گرفت کر رہے تھے، اور ان عمارتوں کا ذکر انھوں نے اس حیثیت سے کیا تھا کہ سارے ملک میں ہر طرف یہ بڑے بڑے پھوڑے اس فساد کی نمایاں ترین علامت کے طور پر اُبھرے نظر آتے تھے۔

۹۲ – یعنی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں تو تم اس قدر غُلُو کر گئے ہو کہ رہنے کے لیے تم کو مکان نہیں محل اور قصر درکار ہیں، اور ان سے بھی جب تمھاری تسکین نہیں ہوتی تو بلا ضرورت عالی شان عمارتیں بنا ڈالتے ہو، جن کا کوئی مصرف اظہارِ قوت و ثروت کے سوا نہیں ہے۔ لیکن تمھارا معیارِ انسانیت اتنا گرا ہوا ہے کہ کمزوروں کے لیے تمھارے دلوں میں کوئی رحم نہیں، غریبوں کے لیے تمھاری سرزمین میں کوئی انصاف نہیں، گردوپیش کی ضعیف قومیں ہوں یا خود اپنے ملک کے پست طبقات، سب تمھارے جبر و ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور کوئی تمھاری چیرہ دستیوں سے بچا نہیں رہ گیا ہے۔

بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْۤ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَاۤ اَوَعَظْتَ
اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا
نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ ع ۸

جو تم جانتے ہو۔ تمھیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔" انھوں نے جواب دیا: "تُو نصیحت کر یا نہ کر، ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں۔[93] اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔" آخر کار انھوں نے اُسے جُھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔[94]

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

۹۳ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، یہ آج کوئی نئی چیز نہیں ہے، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہی ان کا دین تھا، یہی ان کا تمدّن تھا اور ایسے ہی ان کے اَخلاق اور معاملات تھے۔ کون سی آفت اُن پر ٹوٹ پڑی تھی کہ اب ہم اس کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ کریں۔ اس طرزِ زندگی میں کوئی خرابی ہوتی تو پہلے ہی وہ عذاب آچکا ہوتا جس سے تم ڈراتے ہو۔ دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو باتیں تم کر رہے ہو، ایسی ہی باتیں پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں بگھارنے والے کرتے رہے ہیں، مگر دُنیا کی گاڑی جس طرح چل رہی تھی اسی طرح چلے جا رہی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی باتیں نہ ماننے کا یہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوا کہ یہ گاڑی کسی صدمے سے دوچار ہو کر اُلٹ گئی ہوتی۔

۹۴ – اس قوم کے ہلاک ہونے کی جو تفصیل قرآنِ مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچانک زور کی آندھی اُٹھی۔ یہ لوگ دُور سے اس کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھ کر سمجھے کہ گھٹا چھائی ہے۔ خوشیاں منانے لگے کہ اب خوب بارش ہوگی۔ مگر وہ تھا خدا کا عذاب۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس نے

Maktaba Tul Ishaat.com

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۴۱ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۴۲
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝۱۴۳ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۱۴۴ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۴۵ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا[۹۵]۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا: "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۹۶]۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے

ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالَم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی گرمی و خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ طوفان اس وقت تک نہ تھما جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک مُتنفّس ختم نہ ہو گیا۔ بس اِن کی بستیوں کے کھنڈر ہی ان کے انجام کی داستان سنانے کے لیے کھڑے رہ گئے۔ اور آج کھنڈر بھی باقی نہیں ہیں۔ اَحقاف کا پورا علاقہ ایک خوف ناک ریگستان بن چکا ہے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ۲۵)

۹۵ - تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود، ۶۱-۶۸۔ الحِجر، ۸۰-۸۴۔ بنی اسرائیل، ۵۹۔ مزید تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی پیشِ نظر رہیں: النمل، ۴۵-۵۳۔ الذاریات، ۴۳-۴۵۔ القمر، ۲۳-۳۱۔ الحاقّہ، ۴-۵۔ الفجر، ۹۔ الشّمس، ۱۱۔

اس قوم کے متعلق قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی، جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف، آیت ۷۴) مگر اس کی تمدّنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیّت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنٹا کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بُت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اُونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا۔ اُونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝ "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، اس کو ہم نہیں مان سکتے۔"

اٰمِنِيْنَ ۝١٤٦ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝١٤٧ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝١٤٨
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝١٤٩ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝١٥٠

دیے جاؤ گے؟[٩٧] اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟[٩٨] تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو۔[٩٩] اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

٩٦ – حضرت صالحؑ کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآنِ مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے: قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود، آیت ٦٢) ”انھوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔“

٩٧ – یعنی کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ تمھارا یہ عیش دائمی اور اَبدی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی ان نعمتوں کا حساب نہ لیا جائے گا اور کبھی ان اعمال کی باز پُرس نہ ہوگی جن کا تم ارتکاب کر رہے ہو؟

٩٨ – اصل میں لفظ هَضِيْمٌ استعمال ہُوا ہے، جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لد کر جُھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

٩٩ – جس طرح عاد کے تمدّن کی نمایاں ترین خُصوصیت یہ تھی کہ وہ اُونچے اُونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدّن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے، اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ، ”وہ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں۔“ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے: تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا۔ (الاعراف، آیت ٧٤) اور ان تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت وقوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمایش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدّن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چُھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف اُمرا اور اہلِ ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلاضرورت نمایشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنھیں ١٩٥٩ء کے دسمبر میں، میں نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے صفحات میں ان کی بعض تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینۂ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العُلا (جسے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمۡرَ ٱلۡمُسۡرِفِينَ ۝١٥١ ٱلَّذِينَ يُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَا
يُصۡلِحُونَ ۝١٥٢ قَالُوٓا إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ ٱلۡمُسَحَّرِينَ ۝١٥٣ مَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٞ

اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے[100]۔" انھوں نے جواب دیا: "تُو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے[101]۔ تو ہم جیسے ایک انسان

عہدِ نبویؐ میں وادی القُریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانبِ شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحِجر اور مدائنِ صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العُلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر الحِجر کے گرد و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنویں ہیں۔ انھی میں سے ایک کنویں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی اُسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے (اس کی تصویر بھی مقابل کے صفحات میں دی جارہی ہے)۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العُلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کِھیل کِھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انھیں سطحِ زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جارہی ہیں)۔ اِسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العُلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اُردُن کے حدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلۂ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ثمود کی جو عمارتیں ہم نے الحِجر میں دیکھی تھیں، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلیجِ عَقَبہ کے کنارے مَدْیَن کے مقام پر، اور اُردُن کی ریاست میں پیٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیّت کے ساتھ پیٹرا میں ثمود کی عمارات اور نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اُن کی تراش خراش اور طرزِ تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے (ان کے الگ الگ نمونوں کی تصویریں بھی ہم نے مقابل کے صفحات میں دی ہیں)۔ انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے الحِجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انھیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نَبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبلِ مسیح میں اسے عُروج پر پہنچایا، اور پھر ایلورا میں (جس کے غار پیٹرا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

مِّثْلُنَا ۖۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا
شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ ۚ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ

کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تُو سچّا ہے۔[۱۰۲]" صالحؑ نے کہا: "یہ اُونٹنی ہے۔[۱۰۳] ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔[۱۰۴] اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک

۱۰۰ – یعنی اپنے ان اُمرا و رؤسا اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمھارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ مُسرف لوگ ہیں، اَخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شُترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے، اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمھارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو، اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اُٹھا ہوں ـــــ یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدّنی و اَخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

۱۰۱ – "سحر زدہ" یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا تو کسی جِنّ کے اثر سے لاحق ہوتا تھا، یا جادو کے اثر سے۔ اس لیے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے، اس کو یا تو "مجنون" کہتے تھے یا مسحور اور مسحَّر۔

۱۰۲ – یعنی بظاہر تو ہم میں اور تجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ ہم تجھے خدا کا فرستادہ مان لیں۔ لیکن اگر تو اپنے مامور من اللہ اور مُرسَل مِنْ جانبِ اللہ ہونے کے دعوے میں سچّا ہے تو کوئی ایسا محسوس معجزہ پیش کر جس سے ہمیں یقین آجائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

۱۰۳ – معجزے کے مطالبے پر اُونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اُونٹنی نہ تھی جیسی ہر عرب کے پاس وہاں پائی جاتی تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خِلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ اگر حضرت صالحؑ اس مطالبے کے جواب میں یونہی کسی اونٹنی کو پکڑ کے کھڑا کر دیتے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوتی جس کی کسی پیغمبر تو درکنار، ایک عام معقول آدمی سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات یہاں تو صرف سیاقِ کلام ہی کے اقتضا سے سمجھ میں آتی ہے، لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس اُونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ سورۂ اَعراف

Maktaba Tul Ishaat.com

عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١۵٦﴾ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿١۵٧﴾

بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا۔'' مگر انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں[105] اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے۔

اور سورۂ ہود میں فرمایا گیا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً ''یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے نشانی کے طور پر ہے۔'' اور سورۂ بنی اسرائیل میں اس سے بھی زیادہ پُرزور الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ○ (آیت ۵٩)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔ اور ہم ثمود کے سامنے آنکھوں دیکھتے اونٹنی لے آئے، پھر بھی انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔ نشانیاں تو ہم خوف دلانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں (تماشا دکھانے کے لیے تو نہیں بھیجتے)۔

اس پر مزید وہ چیلنج ہے جو اُونٹنی کو میدان میں لے آنے کے بعد اس کافر قوم کو دیا گیا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ صرف ایک معجزہ ہی پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جا سکتا تھا۔

١٠۴ - یعنی ایک دن تنہا یہ اونٹنی تمھارے کنوؤں اور چشموں سے پانی پیے گی اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور پییں گے۔ خبردار! اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، قبیلہ قبیلے سے لڑ جاتا تھا اور جان جوکھوں کی بازی لگا کر کسی کنویں یا چشمے سے پانی لینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سرزمین میں کسی شخص کا اُٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اکیلی اُونٹنی پانی پیے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور صرف دوسرے دن ہی پانی لے سکیں گے، یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ دراصل پوری قوم کو لڑائی کا چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر کوئی آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا اور کوئی قوم یہ بات اُس وقت تک نہ سُن سکتی تھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیرزن اور تیرانداز موجود ہیں جو مقابلے پر اُٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن حضرت صالحؑ نے بغیر کسی لاؤ لشکر کے تنہا اُٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دیا، اور قوم نے نہ صرف یہ کہ اس کو کان لٹکا کر سنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اس کی تعمیل بھی کرتی رہی۔

سورۂ اعراف اور سورۂ ہُود میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ ''یہ اللہ کی اُونٹنی تمھارے لیے نشانی کے طور پر ہے، چھوڑ دو اسے کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، ہرگز اسے بُرے ارادے سے نہ چھونا۔'' یعنی چیلنج صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ہر دوسرے روز اکیلی یہ اونٹنی دن بھر سارے علاقے کے پانی کی اجارہ دار رہے گی، بلکہ اس پر مزید یہ چیلنج بھی تھا کہ یہ تمھارے

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾
وَ اِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۣالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ
قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۶۲﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ

عذاب نے انھیں آلیا۔[۱۰۶]

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

لُوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۱۰۷] یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لُوطؑ نے ان سے کہا تھا: ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو

کھیتوں اور باغوں اور نخلستانوں اور چراگاہوں میں دندناتی پھرے گی، جہاں چاہے گی جائے گی، جو کچھ چاہے گی کھائے گی، خبردار! جو کسی نے اسے چھیڑا۔

۱۰۵- یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انھوں نے حضرت صالحؑ سے یہ چیلنج سنا، اسی وقت وہ اُونٹنی پر پل پڑے اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ اُونٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی، لوگ اس پر دلوں میں اَونٹتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخرکار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ سورۂ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا ”جب کہ اُٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی۔“ اور سورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے: فَنَادَوۡا صَاحِبَهُمۡ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ”انھوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی، آخرکار وہ یہ کام اپنے ذمے لے کر اُٹھا اور اس نے کوچیں کاٹ ڈالیں۔“

۱۰۶- قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ جب اُونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا: تَمَتَّعُوۡا فِیۡ دَارِکُمۡ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ”تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو۔“ (ہود، آیت ۶۵) اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۱۶۴ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ۱۶۵ وَ
تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۱۶۶

ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مَردوں کے پاس جاتے ہو[108] اور تمھاری بیویوں میں تمھارے ربّ نے تمھارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟[109] بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔[110]"

کُچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انھیں اس آفت سے بچا سکے، نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ○ (القمر، آیت ۳۱) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○ (اعراف، آیت ۷۸) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ○ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○ (الحجر، آیت ۸۳-۸۴)

۱۰۷- تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، ۷۴ تا ۸۳۔ الحجر، ۵۷ تا ۷۷۔ الانبیاء، ۷۱ تا ۷۵۔ النمل، ۵۴ تا ۵۸۔ العنکبوت، ۲۸-۳۵۔ الصافات، ۱۳۳ تا ۱۳۸۔ القمر، ۳۳ تا ۳۹۔

۱۰۸- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہشِ نفس پوری کرو، حالانکہ دُنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دُنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے، بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔ اس دوسرے مفہوم کی صراحت سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ○ "کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟"

۱۰۹- اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدا نے پیدا کی تھیں، انھیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کو اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدا نے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا، اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔ اس دوسرے مطلب میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ ظالم لوگ اپنی عورتوں سے بھی خلافِ وضعِ فطری فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔ بعید نہیں کہ وہ یہ حرکت خاندانی منصوبہ بندی کی خاطر کرتے ہوں۔

۱۱۰- یعنی تمھارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے۔ تمھاری زندگی کا تو سارا انجار ہی حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے اس عام بگاڑ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ (النمل، آیت ۵۴) "کیا تمھارا یہ حال ہو گیا ہے کہ کھلم کھلا دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے فحش کام

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّیْ
لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّیْنٰهُ وَ
اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾

انھوں نے کہا: ”اے لُوطؑ! اگر تُو اِن باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں، اُن میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔“[111] اس نے کہا: ”تمھارے کرتوتوں پر جو لوگ کُڑھ رہے ہیں میں اُن میں شامل ہوں۔ اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے۔“[112] آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا، بجز ایک بُڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔[113] پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا

کرتے ہو؟“ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (العنکبوت، آیت ۲۹) ”کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ مَردوں سے مُباشرت کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں عَلانیہ بُرے کام کرتے ہو؟“ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حاشیہ ۳۹)

۱۱۱– یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے، یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے، وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تُو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔ سورۂ اعراف اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوطؑ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ○ ”لوطؑ اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ اِن ”صالحین“ کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔“

۱۱۲– اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمالِ بد کے بُرے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس بدکردار بستی میں جو اخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوت کہیں ہماری آل اولاد کو نہ لگ جائے، اہلِ ایمان کی اپنی نسلیں کہیں اس بگڑے ہوئے ماحول سے متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے اے پروردگار! ہمیں اس ہر وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

۱۱۳– اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے۔ سورۂ تحریم میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا۔ (آیت ۱۰) ”یہ دونوں عورتیں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً ؕ
وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۷۵﴾

ع ۹ / ۱۷ / ۱۲

اور ان پر برسائی ایک برسات، بڑی ہی بُری بارش تھی جو اُن ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔[۱۱۴]
یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انھوں نے ان کے ساتھ خیانت کی۔" یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر جب اللہ تعالیٰ نے قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت لوطؑ کو حکم دیا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں، تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرما دی کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاؤ، فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا (آیت ۸۱) "پس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جا، اُس پر وہی کچھ گزرنی ہے جو ان لوگوں پر گزرنی ہے۔"

۱۱۴- اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ جب رات کے پچھلے پہر اپنے بال بچوں کو لے کر نکل گئے تو صبح پو پھٹتے ہی یکایک ایک زور کا دھماکا ہوا (فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ)، ایک ہولناک زلزلے نے ان کی بستیوں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا (جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا)، ایک زبردست آتش فشانی اِنفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے (وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ)، اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھراؤ کیا گیا (اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا)۔

بائبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے، اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

بُحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتا دیتی ہے کہ یہ کسی زمانے میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سیکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوش حالی کا دَور ۲۳۰۰ قبلِ مسیح سے ۱۹۰۰ قبلِ مسیح تک

رہا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائبل میں "سِدّیم کی وادی" کہا گیا ہے، جس کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ "وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سَدُوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے ملک کی مانند خوب سیراب تھی۔" (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱۰) موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بُحَیرۂ مُردار کے اندر غرق ہے، اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانے میں بحیرۂ مُردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔ شرقِ اُردُن کے موجودہ شہر الکَرک کے سامنے مغرب کی جانب اس بُحَیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما "اللِّسان" پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصّہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ملحقہ نقشے میں ہم نے آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے)، پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادیِ سِدّیم تھی جس میں قومِ لوطؑ کے بڑے بڑے شہر سَدُوم، عمورہ، اَدْمہ، ضبوئیم اور ضُغَر واقع تھے۔ دو ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بُحَیرۂ مردار کا پانی اس کے اُوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصّہ ہے، مگر رومی عہد میں یہ اتنا اُتھلا تھا کہ لوگ اللّسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اِس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات ڈوبی ہوئی ہیں۔

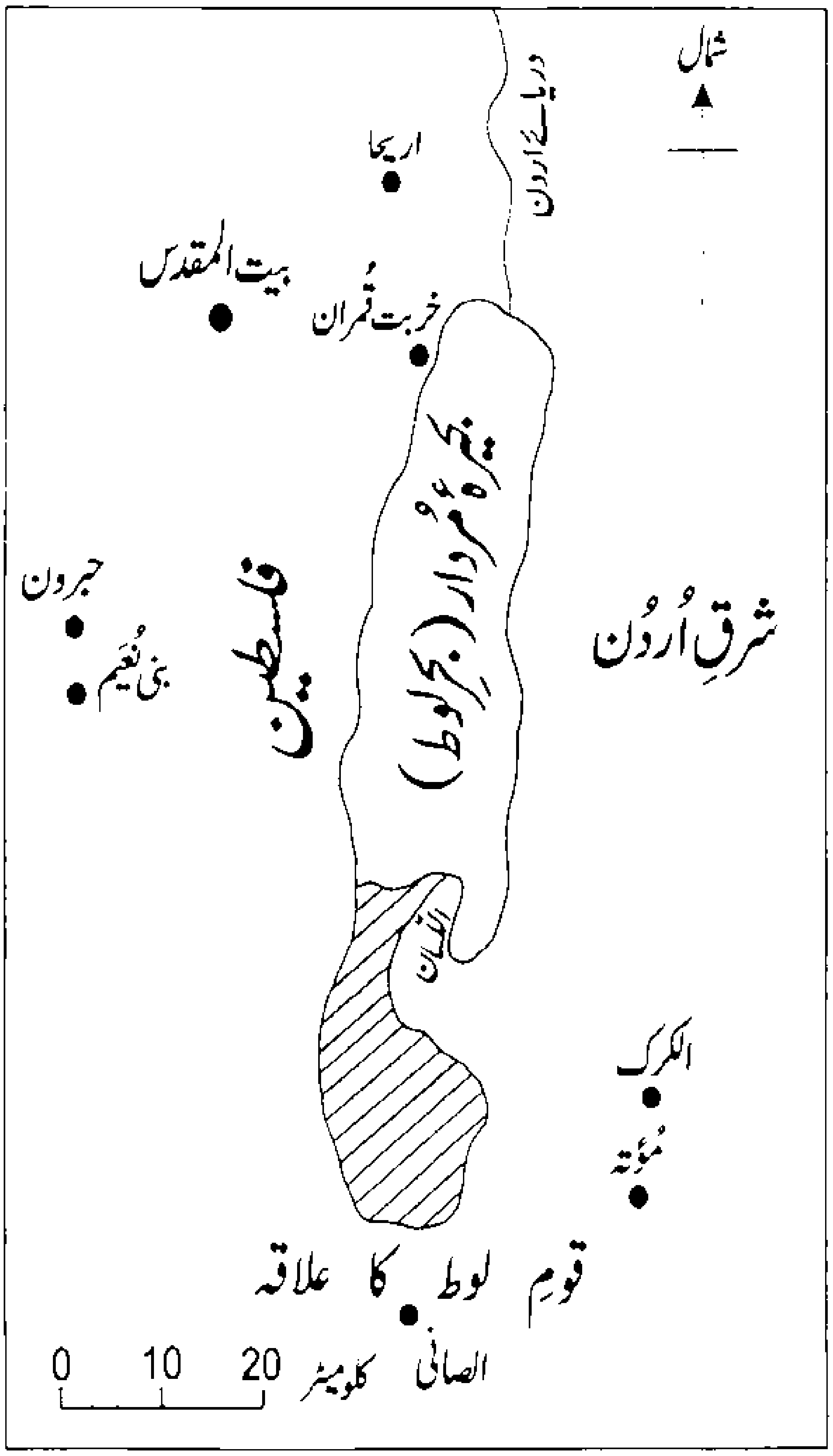

بائبل اور قدیم یونانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں جگہ جگہ نَفط (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے، اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیرِ زمین پٹرول اور گیسوں کا پتا چلتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اصحابُ الایکہ نے رسُولوں کو جُھٹلایا۔[115] یاد کرو جب کہ شعیبؑ نے ان سے کہا تھا: "کیا تم ڈرتے نہیں؟

طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اُٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اُڑ گیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیمؑ جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اُٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے۔ (پیدائش، باب ۱۹، آیت ۲۸)

۱۱۵ – اصحاب الأیکہ کا مختصر ذکر سورۂ الحجر، آیت ۷۸ - ۸۴ میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مَدیَن اور اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں، اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورۂ اعراف میں حضرت شعیبؑ کو اہلِ مَدیَن کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا)، اور یہاں اصحاب الایکہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ (جب کہ ان سے شعیب نے کہا)، "ان کے بھائی" (اَخُوْهُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں، کیونکہ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحابِ مَدیَن کے بیان ہوئے ہیں، وہی یہاں اصحاب الایکہ کے بیان ہو رہے ہیں، حضرت شعیبؑ کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے، اور آخرکار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

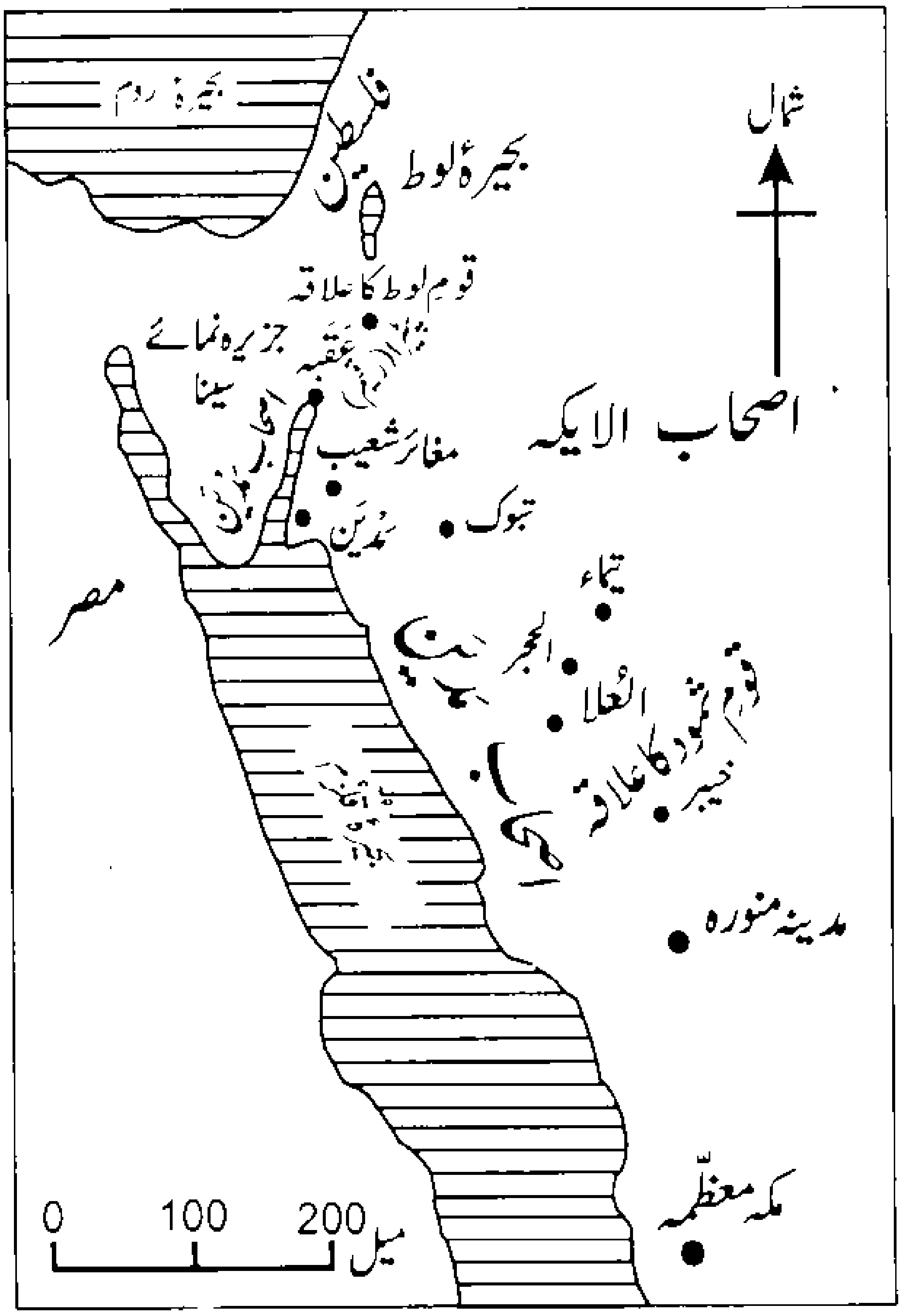

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطُورا کے بطن سے تھی، وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطُورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحابِ مَدیَن کہلایا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ۙ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾ۚ وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ
عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾ؕ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ

میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو

جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ قُلزم اور خلیجِ عَقَبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مَدیَن تھا، جس کی جائے وقوع ابوالفدا نے خلیجِ عَقَبہ کے مغربی کنارے اَیلَہ (موجودہ عَقَبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قَطُورا، جن میں بنی دِدان (Dedanites) نسبتاً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں تَیماء اور تبوک اور العُلاء کے درمیان آباد ہوئے، اور ان کا صدر مقام تبوک تھا، جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔ (یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں لفظ ''ایکہ'' کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہلِ تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے۔ بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قَطُورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا، اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اَخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ بَعلِ فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو اُن کے اندر بھی انھوں نے شرک اور زنا کاری کی وبا پھیلا دی۔ (گنتی، باب ۲۵، آیت ۱-۵، باب ۳۱، آیت ۱٦-۱۷) پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی اُن دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیجِ فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انھوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خَراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے، اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انھوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآنِ مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: وَ اِنَّہُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ''یہ دونوں (قومِ لوط اور اصحاب الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے۔'' اور ان کی رہزنی کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ ''اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو۔'' یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَ
لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾
قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ
اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اُس ذات کا خوف کرو جس نے تمھیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔"
انھوں نے کہا: "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔"
شعیبؑ نے کہا: "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔"[۱۱۶] انھوں نے اسے جھٹلا دیا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا،[۱۱۷] اور وہ بڑے ہی خوف ناک دن کا عذاب تھا۔

حضرت شعیبؑ اور اہلِ مَدیَن کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۵-۹۳۔ ہود، ۸۴-۹۵۔ العنکبوت، ۳۶-۳۷۔

۱۱۶- یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے، اور وہ تمھارے کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمھیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرما دے گا۔ اصحاب الایکہ کے اس مطالبے اور حضرت شعیبؑ کے اس جواب میں کفارِ قریش کے لیے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مطالبے کرتے تھے: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا "یا پھر گرا دے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔" (بنی اسرائیل، آیت ۹۲) اس لیے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اُس کا جو جواب انھیں ملا، وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمھاری طلب کا جواب بھی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۹۰ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۱۹۱ ع وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۹۲ ؕ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ؏

یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے[118] [119]۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار رُوح[120]

۱۱۷– اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآنِ مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک بارانِ عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ مَدیَن کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔ یہ، جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے، چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور اُن پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ اور وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش دُرست نہیں ہے۔ بعض مفسّرین نے عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابنِ جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثك من العلماء ما عذاب یوم الظلة فکذبه، ”علما میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظُّلّہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو۔“

۱۱۸– تاریخی بیان ختم کر کے اب سلسلۂ کلام اُسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورت کا آغاز فرمایا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر پلٹ کر پہلے رُکوع کو دیکھ لینا چاہیے۔

۱۱۹– یعنی یہ ”کتابِ مبین“ جس کی آیات یہاں سنائی جا رہی ہیں، اور یہ ”ذکر“ جس سے لوگ منہ موڑ رہے ہیں، کسی انسان کی من گھڑت چیز نہیں ہے، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف نہیں کر لیا ہے، بلکہ یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے۔

۱۲۰– مراد ہیں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ دوسری جگہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ – (البقرہ، آیت ۹۷) ”کہہ دے کہ جو کوئی دشمن ہے جبریلؑ کا، تو اسے معلوم ہو کہ اُسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔“ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَمِيْنُ ۙ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ
مُّبِيْنٍ ؕ﴿۱۹۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً

اُتری ہے، تاکہ تو اُن لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) مُتنبّہ کرنے والے ہیں، صاف صاف
عربی زبان میں[۱۲۱]۔ اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے[۱۲۲]۔ کیا ان (اہلِ مکّہ) کے لیے یہ کوئی نشانی

روحِ امین (امانت دار روح) کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رب العالمین کی طرف سے اس تنزیل کو لے کر کوئی مادّی طاقت نہیں آئی ہے، جس کے اندر تغیّر و تبدّل کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خالص روح ہے بلا شائبۂ مادّیت، اور وہ پوری طرح امین ہے، خدا کا پیغام، جیسا اس کے سُپرد کیا جاتا ہے، ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ بڑھانا، یا گھٹا دینا، یا بطورِ خود کچھ تصنیف کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

۱۲۱ – اس فقرے کا تعلق ''امانت دار روح اتری ہے'' سے بھی ہو سکتا ہے اور ''مُتنبّہ کرنے والے ہیں'' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ امانت دار روح اسے صاف صاف عربی زبان میں لائی ہے، اور دوسری صورت میں معنٰی یہ ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن انبیاؑ میں شامل ہوں جنھیں عربی زبان میں خلقِ خدا کو مُتنبّہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا، یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام۔ دونوں صورتوں میں مقصودِ کلام ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ رب العالمین کی طرف سے یہ تعلیم کسی مُردہ یا جِناتی زبان میں نہیں آئی ہے، نہ اس میں کوئی مُعمّے یا چیستان کی سی گنجلک زبان استعمال کی گئی ہے، بلکہ یہ ایسی صاف اور فصیح عربی زبان میں ہے، جس کا مفہوم و مدّعا ہر عرب اور ہر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہو، بے تکلُّف سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے منہ موڑ رہے ہیں ان کے لیے یہ عذر کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس تعلیم کو سمجھ نہیں سکے ہیں، بلکہ ان کے اعراض و انکار کی وجہ صُرف یہ ہے کہ یہ اُسی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں فرعونِ مصر اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ نوحؑ اور قومِ لوطؑ اور عاد و ثمود اور اصحاب الأیکہ مبتلا تھے۔

۱۲۲ – یعنی یہی ذکر اور یہی تنزیل اور یہی الٰہی تعلیم سابق کُتُبِ آسمانی میں بھی موجود ہے۔ یہی خدائے واحد کی بندگی کا بلاوا، یہی آخرت کی زندگی کا عقیدہ، یہی انبیاؑ کی پیروی کا طریقہ اُن سب میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ سب کتابیں جو خدا کی طرف سے آئی ہیں، شرک کی مذمّت ہی کرتی ہیں، مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کو چھوڑ کر اُسی برحق نظریۂ حیات کی طرف دعوت دیتی ہیں جس کی بنیاد خدا کے حضور انسان کی جواب دہی کے تصور پر ہے، اور انسان سے یہی مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اُن الٰہی احکام کی پیروی اختیار کرے جو انبیا علیہم السلام لائے ہیں۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نرالی نہیں جو دُنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ تم وہ بات کر رہے ہو جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

یہ آیت مِن جملہ اُن دلائل کے ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اِس قدیم رائے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص عربی میں قرآن پڑھنے کی قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ بنائے اِستدلال علّامہ ابوبکر جَصّاص کے الفاظ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرما رہا ہے کہ یہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں وہ عربی الفاظ کے ساتھ نہ تھا۔ لہٰذا کسی دوسری زبان میں اس کے مضامین کو نقل کر دینا اسے قرآن ہونے سے خارج نہیں کر دیتا۔ (احکام القرآن، جلد سوم، صفحہ ۴۲۹) لیکن اس اِستدلال کی کمزوری بالکل ظاہر ہے۔ قرآنِ مجید ہو یا کوئی دوسری آسمانی کتاب، کسی کے نُزول کی کیفیت بھی یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف معانی نبی کے دل پر القا کر دیے ہوں اور نبی نے پھر انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ بلکہ ہر کتاب جس زبان میں بھی آئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معنٰی اور لفظ، دونوں کے ساتھ آئی ہے۔ اس لیے قرآن کی تعلیم جن پچھلی کتابوں میں تھی، انسانی الفاظ میں نہیں، خدائی الفاظ ہی میں تھی، اور ان میں سے کسی کے ترجمے کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اصل کا قائم مقام ٹھیرایا جا سکے۔ رہا قرآن، تو اس کے متعلق بار بار بصراحت فرمایا گیا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف، آیت ۲) وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا (الرعد، آیت ۳۷) قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ (الزمر، آیت ۲۸) اور خود اسی آیتِ زیرِ بحث سے پہلے متصلاً فرمایا جا چکا ہے کہ روح الامین اسے زبانِ عربی میں لے کر اترا ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی ترجمہ جو کسی انسان نے دوسری زبان میں کیا ہو، وہ بھی قرآن ہی ہوگا اور اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے قائم مقام ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِستدلال کی اس کمزوری کو بعد میں خود امامِ ممدوح نے بھی محسوس فرما لیا تھا، چنانچہ معتبر رِوایات سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے اس مسئلے میں اپنی رائے سے رُجوع کر کے امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے قبول کر لی تھی، یعنی یہ کہ جو شخص عربی زبان میں قراءت پر قادر نہ ہو، وہ اُس وقت تک نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے جب تک اس کی زبان عربی الفاظ کے تلفظ کے قابل نہ ہو جائے، لیکن جو شخص عربی میں قرآن پڑھ سکتا ہو، وہ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبَین نے یہ رعایت دراصل اُن عجمی نومسلموں کے لیے تجویز کی تھی جو اسلام قبول کرتے ہی فوراً عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکتے تھے۔ اور اس میں بنائے استدلال یہ نہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ بھی قرآن ہے، بلکہ ان کا اِستدلال یہ تھا کہ جس طرح اشارے سے رُکوع وسُجود کرنا اُس شخص کے لیے جائز ہے جو رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو، اسی طرح غیر عربی میں نماز پڑھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو عربی تلفظ پر قادر نہ ہو۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس، جس طرح عجز رفع ہو جانے کے بعد اشارے سے رکوع وسجود کرنے والے کی نماز نہ ہوگی، اسی طرح قرآن کے تلفظ پر قادر ہو جانے کے بعد ترجمہ پڑھنے والے کی نماز بھی نہ ہوگی۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: مَبۡسُوط سَرَخۡسی جلد اوّل، صفحہ ۳۷۔ فتح القدیر وشرح عنایہ علی الہدایہ، جلد ۱، صفحہ ۱۹۰-۲۰۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾
فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ

نہیں ہے کہ اِسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟[۱۲۳] (لیکن اِن کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سُناتا تب بھی یہ مان کر نہ دیتے۔[۱۲۴] اِسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں

۱۲۳- یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآنِ مجید میں دی گئی ہے، وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کُتُبِ آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہلِ مکہ خود علمِ کتاب سے نا آشنا سہی، بنی اسرائیل کے اہلِ علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا اور نرالا ''ذکر'' نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمدؐ بن عبداللہ نے لا کر تمھارے سامنے رکھ دیا ہو، بلکہ ہزار ہا برس سے خدا کے نبی یہی ذکر پے در پے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العالمین کی طرف سے ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل کی تھیں؟

سیرت ابنِ ہِشام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے زمانۂ نزول سے قریب ہی یہ واقعہ پیش آ چکا تھا کہ حَبَش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دعوت سُن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجدِ حرام میں کفّارِ قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ان کو قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپؐ کے رسولِ برحق ہونے کی تصدیق کر کے آپؐ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضورؐ کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل قریش کے چند لوگوں کے ساتھ ان سے ملا اور انھیں سخت ملامت کی۔ اس نے کہا: ''تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ نامرادو! تمھارے ہاں کے لوگوں نے تو تمھیں اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر تم ابھی اس سے ملے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے۔'' وہ شریف لوگ ابوجہل کی اس زَجر و توبیخ پر اُلجھنے کے بجائے سلام کر کے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے، آپ اپنے دین کے مختار ہیں اور ہم اپنے دین کے مختار، ہمیں جس چیز میں اپنی خیر نظر آئی، اسے ہم نے اختیار کر لیا۔ (جلد دوم، صفحہ ۳۲) اسی واقعے کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ○ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ○ ...... وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ○ (آیات ۵۲-۵۵)'' جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب

الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝۲۰۰ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ۝۲۰۱ فَیَاۡتِیَہُمۡ

گزارا ہے۔[۱۲۵] وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔[۱۲۶] پھر جب وہ بے خبری

دی تھی، وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ انھیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے......اور جب انھوں نے بیہودہ باتیں سنیں تو اُلجھنے سے پرہیز کیا اور بولے: ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ پسند نہیں کرتے (کہ چار باتیں تم ہمیں سناؤ تو چار ہم تمھیں سنائیں)۔"

۱۲۴ - یعنی اب انھی کی قوم کا ایک آدمی انھیں عربیِ مبین میں یہ کلام پڑھ کر سنا رہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر ادا ہونے میں آخر معجزے کی کیا بات ہے کہ ہم اسے خدا کا کلام مان لیں۔ لیکن اگر یہی فصیح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیرِ عرب پر بطورِ معجزہ نازل کر دیا جاتا اور وہ ان کے سامنے آ کر نہایت صحیح عربی لہجے میں اسے پڑھتا تو یہ ایمان نہ لانے کے لیے دوسرا بہانہ تراشتے، اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی جِن آ گیا ہے جو عجمی کی زبان سے عربی بولتا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۵۴ تا ۵۸) اصل چیز یہ ہے کہ جو شخص حق پسند ہوتا ہے، وہ اُس بات پر غور کرتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جا رہی ہو، اور ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ یہ معقول بات ہے یا نہیں۔ اور جو شخص ہٹ دھرم ہوتا ہے اور نہ ماننے کا ارادہ کر لیتا ہے، وہ اصل مضمون پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اسے رد کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اس کے سامنے بات خواہ کسی طریقے سے پیش کی جائے، وہ بہر حال اسے جھٹلانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لے گا۔ کفارِ قریش کی اس ہٹ دھرمی کا پردہ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ فاش کیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ تم ایمان لانے کے لیے معجزہ دکھانے کی شرط آخر کس منہ سے لگاتے ہو، تم تو وہ لوگ ہو کہ تمھیں خواہ کوئی چیز دکھا دی جائے، تم اُسے جھٹلانے کے لیے کوئی بہانہ نکال لو گے، کیونکہ در اصل تمھیں حق بات مان کر نہیں دینی ہے: وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡہِمۡ لَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝ (الانعام، آیت ۷) "اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا، وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔" وَلَوۡ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوۡا فِیۡہِ یَعۡرُجُوۡنَ ۝ لَقَالُوۡۤا اِنَّمَا سُکِّرَتۡ اَبۡصَارُنَا بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ۝ (الحجر، آیات ۱۴-۱۵) "اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

۱۲۵ - یعنی یہ اہلِ حق کے دلوں کی طرح تسکینِ روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝۲۰۲ فَيَقُوۡلُوۡا هَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَ ۝۲۰۳ اَفَبِعَذَابِنَا
يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ۝۲۰۴ اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَ ۝۲۰۵ ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا
كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ ۝۲۰۶ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُمَتَّعُوۡنَ ۝۲۰۷ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا
مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۝۲۰۸ ذِكۡرٰى قف وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝۲۰۹ ع ۹

میں ان پر آپڑتا ہے اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ "کیا اب ہمیں کچھ مُہلت مل سکتی ہے؟"[۱۲۷]

تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انھیں برسوں تک عیش کرنے کی مُہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آ جائے جس سے انھیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ زیست جو ان کو ملا ہُوا ہے ان کے کس کام آئے گا؟[۱۲۸]

(دیکھو!) ہم نے کبھی کسی بستی کو اِس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے خبردار کرنے والے حقِ نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے۔ اور ہم ظالم نہ تھے۔[۱۲۹]

---

۱۲۶ – ویسا ہی عذاب جیسا وہ قومیں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورہ میں گزرا ہے۔

۱۲۷ – یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ہی مجرموں کو یقین آیا کرتا ہے کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ اُس وقت وہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل مل کر کہتے ہیں کہ کاش! اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

۱۲۸ – اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی مچانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ جیسی چین کی بنسری آج تک ہم بجاتے رہے ہیں، اسی طرح ہمیشہ بجاتے رہیں گے۔ اسی اعتماد پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو اور ہم تمھیں جھٹلا کر عذابِ الٰہی کے مستحق ہو رہے ہیں تو لو ہم نے تمھیں جھٹلا دیا، اب لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے: اچھا، اگر بالفرض ان کا یہ بھروسا صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انھیں دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے جس کی توقع پر یہ پھول رہے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و ثمود یا قومِ لوط اور اصحاب الایکہ کی سی کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے، یا اور کچھ نہیں تو موت ہی کی

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ

اِس (کتابِ مُبین) کو شیاطین لے کر نہیں اُترے ہیں[۱۳۰]، نہ یہ کام ان کو سجتا ہے[۱۳۱]، اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں[۱۳۲]۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دُور رکھے گئے ہیں[۱۳۳]۔

پس اے محمدؐ! اللہ کے ساتھ کسی دُوسرے معبُود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں

آخری گھڑی آن پہنچی جس سے بہرحال کسی کو مفر نہیں، تو اس وقت عیشِ دنیا کے یہ چند سال آخر ان کے لیے کیا مفید ثابت ہوں گے؟

۱۲۹ – یعنی جب انھوں نے خبردار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اُس وقت ہوتا جب کہ ہلاک کرنے سے پہلے انھیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔

۱۳۰ – پہلے اس معاملے کا مثبت پہلو ارشاد ہُوا تھا کہ یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے اور اسے روح الامین لے کر اترا ہے۔ اب اس کا منفی پہلو بیان کیا جا رہا ہے کہ اسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں، جیسا کہ حق کے دشمنوں کا الزام ہے۔ کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی، اس میں سب سے بڑی مشکل انھیں یہ پیش آ رہی تھی کہ اُس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آ رہا تھا اور دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بات تو ان کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کُن مسئلہ ان کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اِس گھبراہٹ میں جو الزامات انھوں نے عوام میں پھیلائے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین اِلقا کرتے ہیں۔ اس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کے پاس اس بات کو جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہوسکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان، اور شیطانی اِلقا کی تردید آخر کوئی کرے گا تو کیسے۔

۱۳۱ – یعنی یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے بھی تو نہیں ہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں، جو قرآن میں بیان ہو رہی ہیں، شیاطین کی طرف سے بھی ہوسکتی ہیں؟ کیا تمھاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں، وہ تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعے سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بت پرستی سے روکا ہو؟

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ

شامل ہو جاؤ گے[۱۳۴]۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ[۱۳۵]، اور ایمان لانے والوں میں سے

آخرت کی باز پُرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بد اَخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راست بازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ ان کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انھیں بُرائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جُوئے میں کون سا داؤں مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فُلاں شخص کا اونٹ کس نے چُرایا ہے؟ یہ مسائل اور معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور برائیوں کے اِستیصال کی کب سے فکر لاحق ہوگئی؟

۱۳۲ – یعنی شیاطین اگر کرنا چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلّم اور حقیقی مزکّی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی اگر یہ روپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چُھپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمّازی نہ کر دیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت لازماً اُس شخص کی زندگی میں بھی اور اُس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین اِلقا کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔ پھر تعلیم کی بلندی و پاکیزگی پر مزید وہ فصاحت و بلاغت اور وہ علمِ حقائق ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن میں بار بار یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ انسان اور جن مل کر بھی چاہیں تو اس کتاب کے مانند کوئی چیز تصنیف کر کے نہیں لا سکتے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل، آیت ۸۸) قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (یونس، آیت ۳۸)

۱۳۳ – یعنی اس قرآن کے القا میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سُن گُن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو بتا سکیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فُلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافات، حواشی ۵ تا ۷، اور سورۂ جن، آیات ۸-۹-۲۷)

۱۳۴ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا کوئی خطرہ تھا اور اس بنا پر آپؐ کو دھمکا کر اس سے روکا گیا۔ دراصل اس سے مقصود کفار و مشرکین کو مُتنبّہ کرنا ہے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں

جو تعلیم پیش کی جا رہی ہے، یہ چونکہ خالص حق ہے فرماں روائے کائنات کی طرف سے، اور اس میں شیطانی آلائشوں کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے، اس لیے یہاں حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ رُو رعایت کا کوئی کام نہیں۔ خدا کو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق میں کوئی عزیز و محبوب ہو سکتا ہے تو وہ اس کا رسولِ پاک ہے۔ لیکن بالفرض اگر وہ بھی بندگی کی راہ سے بال برابر ہٹ جائے اور خدائے واحد کے سوا کسی اور کو معبود کی حیثیت سے پکار بیٹھے، تو پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ اس معاملے میں جب خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تو اور کون ہے جو خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک ٹھیرانے کے بعد یہ امید کر سکتا ہو کہ خود بچ نکلے گا یا کسی کے بچانے سے بچ جائے گا۔

۱۳۵۔ یعنی خدا کے اس بے لاگ دین میں جس طرح نبی کی ذات کے لیے کوئی رعایت نہیں، اسی طرح نبی کے خاندان اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی کسی رعایت کی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے، اس کے اوصاف (merits) کے لحاظ سے ہے۔ کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بدعملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں، مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں۔ اس لیے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف مُتنبّہ کر دو۔ اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آسکے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر رِوایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نُزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا بنی عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیۃ عمۃ رسول اللّٰہ، یا فاطمۃ بنت محمد، انقذوا انفسکم من النار، فانی لا املک لکم من اللّٰہ شیئًا، سلونی من مالی ما شئتم ”اے بنی عبدالمُطّلِب! اے عباس! اے صَفِیّہ رسول اللہ کی پھوپھی! اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔“ پھر آپؐ نے صبح سویرے صَفا کے سب سے اونچے مَقام پر کھڑے ہو کر پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو! اے بنی کَعب بن لُوَیّ! اے بنی مُرّہ! اے آلِ قُصَیّ! اے بنی عَبدِمَناف! اے بنی عبدِشمس! اے بنی ہاشم! اے آلِ عبدالمُطّلِب!۔ اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپؐ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتا چل جاتا، وہ اِسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے، اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: ”لوگو! اگر میں تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے، تو تم میری بات سچ مانو گے؟“

Maktaba Tul Ishaat.com

اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

جو لوگ تمھاری پیروی اختیار کریں، ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ، لیکن اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بَری الذّمّہ ہوں۔[۱۳۶]

سب نے کہا: ''ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔'' آپؐ نے فرمایا: ''اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اُٹھائے ہوئے آؤ۔ اُس وقت تم پکارو گے: ''یا محمدؐ!'' مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمھاری طرف سے منہ پھیرلوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمھارے ساتھ ہر طرح کی صلۂ رحمی کروں گا۔'' (اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ترمذی، نَسائی اور تفسیر ابنِ جریر میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زُہیرؓ بن عَمرو اور حضرت قَبیصہؓ بن مخارق سے مروی ہیں)۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا حکم آیا اور حضورؐ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی۔ دراصل اس میں جو اُصول واضح کیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہرِ قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے، نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو مُتنبّہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا، ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے، نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے، تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے۔ اِسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر عامل رہے۔ فتحِ مکہ کے روز جب آپؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اعلان کیا کہ کل ربا فی الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی ھاتین واوّل ما اضعہ ربا العباس۔'' زمانہ جاہلیت کا ہر سود جو لوگوں کے ذمے تھا، میرے اِن قدموں تلے روند ڈالا گیا۔ اور سب سے پہلے جس سود کو میں ساقط کرتا ہوں، وہ میرے چچا عباسؓ کا ہے۔'' (واضح رہے کہ سُود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے حضرت عباسؓ سود پر روپیا چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سُود اُس وقت لوگوں کے ذمّے واجب الادا تھا)۔ ایک مرتبہ چوری کے جرم میں قریش کی ایک عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپؐ نے حکم دیا۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے اس کے حق میں سفارش کی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔''

۱۳۶ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تمھارے رشتہ داروں میں سے جو لوگ ایمان لاکر

وَ تَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِىۡ يَرٰٮكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾
وَ تَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيۡنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلۡ
اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰى مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ

اور اس زبردست اور رحیم پر توکّل کرو[۱۳۷] جو تمھیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اُٹھتے ہو،[۱۳۸] اور سجدہ گزار لوگوں میں تمھاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔[۱۳۹] وہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔
لوگو! کیا مَیں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جَعل ساز بدکار پر

تمھاری پیروی اختیار کریں، ان کے ساتھ نرمی اور مُلاطفت اور تواضُع کا رَوَیّہ اختیار کرو، اور جو تمھاری بات نہ مانیں، ان سے اعلانِ براءت کردو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف اُن رشتہ داروں سے متعلق نہ ہو جنھیں مُتنبِّہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ سب کے لیے عام ہو۔ یعنی جو بھی ایمان لاکر تمھارا اتباع کرے اس کے ساتھ تواضع برتو، اور جو بھی تمھاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کردو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت قریش اور آس پاس کے اہلِ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہوگئے تھے، مگر انھوں نے عملاً آپؐ کی پیروی اختیار نہ کی تھی، بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مل جُل کر اُسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ماننے والوں کو اُن اہلِ ایمان سے الگ قرار دیا جنھوں نے حضورؐ کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپؐ کا اتباع بھی اختیار کرلیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اِسی مؤخر الذکر گروہ کے لیے تھا۔ باقی رہے وہ لوگ جو حضورؐ کی فرمانبرداری سے منہ موڑے ہوئے تھے، جن میں آپؐ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے اور آپؐ کا انکار کر دینے والے بھی، ان کے متعلق حضورؐ کو ہدایت کی گئی کہ ان سے بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود بھگتو گے، تمھیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمھارے کسی فعل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۱۳۷ – یعنی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پروانہ کرو اور اُس ذات کے بھروسے پر اپنا کام کیے چلے جاؤ جو زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ اُس کا زبردست ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جس کی پشت پر اس کی تائید ہو، اُسے دنیا میں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ اور اُس کا رحیم ہونا اس اطمینان کے لیے کافی ہے کہ جو شخص اس کی خاطر اعلائے کلمۃ الحق کے کام میں جان لڑائے گا، اس کی کوششوں کو وہ کبھی رائگاں نہ جانے دے گا۔

۱۳۸ – اُٹھنے سے مراد راتوں کو نماز کے لیے اُٹھنا بھی ہوسکتا ہے اور فریضۂ رسالت ادا کرنے کے لیے اُٹھنا بھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَثِيۡمٍ ۝۲۲۲ يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ۝۲۲۳ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ ۝۲۲۴ اَلَمۡ تَرَ

اُترا کرتے ہیں[۱۴۰]۔ سُنی سُنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں[۱۴۱]۔
رہے شُعَرا، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں[۱۴۲]۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو

۱۳۹ — اس سے کئی معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آپؐ جب نمازِ باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ اُٹھتے اور بیٹھتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں، اُس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے جب راتوں کو اُٹھ کر آپؐ اپنے ساتھیوں کو (جن کے لیے ''سجدہ گزار'' کا لفظ امتیازی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے) دیکھتے پھرتے ہیں کہ وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں، اس وقت آپؐ اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس تمام دوڑ دھوپ اور تگ و دَو سے واقف ہے جو آپؐ اپنے سجدہ گزار ساتھیوں کی معیت میں اُس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کر رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ سجدہ گزار لوگوں کے گروہ میں آپؐ کے تمام تصرّفات اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آپؐ کس طرح ان کی تربیت کر رہے ہیں، کیسا کچھ ان کا تزکیہ آپؐ نے کیا ہے اور کس طرح مسِ خام کو کُندن بنا کر رکھ دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کی اِن صفات کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا گیا ہے، اس کا تعلق اُوپر کے مضمون سے بھی ہے اور آگے کے مضمون سے بھی۔ اُوپر کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ آپؐ حقیقت میں اللہ کی رحمت اور اس کی زبردست تائید کے مستحق ہیں، اس لیے کہ اللہ کوئی اندھا بہرا معبُود نہیں ہے، دیکھنے اور سننے والا فرماں روا ہے، اس کی راہ میں آپؐ کی دوڑ دھوپ اور اپنے سجدہ گزار ساتھیوں میں آپؐ کی سرگرمیاں، سب کچھ اس کی نگاہ میں ہیں۔ بعد کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی یہ کچھ ہو جیسی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور جس کے ساتھیوں کی صفات وہ کچھ ہوں جیسی کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، اس کے متعلق کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر شیاطین اترتے ہیں یا وہ شاعر ہے۔ شیطان جن کاہنوں پر اُترتے ہیں اور شعرا اور ان کے ساتھ لگے رہنے والوں کے جیسے کچھ رنگ ڈھنگ ہیں، وہ آخر کس سے پوشیدہ ہیں۔ تمھارے اپنے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے ہی جاتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھوں والا ایمان داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی زندگی میں اور شاعروں اور کاہنوں کی زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ اب یہ کیسی ڈھٹائی ہے کہ اِن خدا کے بندوں پر کھلّم کھلّا کہانت اور شاعری کی پھبتی کسی جاتی ہے اور کسی کو اس پر شرم بھی نہیں آتی۔

۱۴۰ — مراد ہیں کاہن، جوتشی، فال گیر، رَمّال، اور ''عامل'' قسم کے لوگ جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں۔ گول مول لچھے دار باتیں بنا کر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں، یا سیانے بن کر جنّوں اور روحوں اور مؤکّلوں کے ذریعے سے لوگوں کی بگڑی بنانے کا کاروبار کرتے ہیں۔

۱۴۱- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ شیاطین کچھ سن گن لے کر اپنے اولیا پر اِلقا کرتے ہیں اور اس میں تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ بہت سا جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے لپاٹیے کاہن شیاطین سے کچھ باتیں سُن لیتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ ملا کر لوگوں کے کانوں میں پھونکتے پھرتے ہیں۔ اس کی تشریح ایک حدیث میں بھی آئی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہؓ سے رِوایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کچھ نہیں ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! بعض اوقات تو وہ ٹھیک بات بتا دیتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: وہ ٹھیک بات جو ہوتی ہے اسے کبھی کبھار جِنّ لے اُڑتے ہیں اور جا کر اپنے دوست کے کان میں پھونک دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ جھوٹ کی بہت سی آمیزش کر کے ایک داستان بنا لیتا ہے۔

۱۴۲- یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اَخلاق، عادات و خصائل اور اُفتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمھیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کُھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حُقوق کا پاس ولحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجے کی دیانت وامانت ہے۔ اور زبان جب کُھلتی ہے خیر ہی کے لیے کُھلتی ہے، شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اِن لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سُخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہَزل بکا جا رہا ہے یا مَسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہَجو اُڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹ کے ٹھٹ لگتے ہیں، اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں، ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات وخواہشات کی رَو میں بہنے والے، اور لطف ولذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد ونصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ

کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں[۱۴۳] اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں[۱۴۴] ــــــ بجز اُن لوگوں کے جو

نکل کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گرد جمع ہونے والے اُسی قبیل کے لوگ ہیں جیسے شعرا اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

۱۴۳- یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صَرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا توسَنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے، اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے، جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صِدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں، اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سِفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا، اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثّریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انھیں ذرا تأمّل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبّا لگانے اور اس کی عزّت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حُسنِ اَخلاق اور بد اخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعرا کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو، اس کے دماغ میں آخر یہ بے تکی بات کیسے اُتر سکتی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تُلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے، اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مَقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ‌ؕ (یٰسٓ، آیت ۶۹) ”ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے، نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے۔“ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، وہ سب اسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یاد نہ تھا۔ دَورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے، یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا:

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اصل مصرع یوں ہے:

کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا

ایک مرتبہ عباسؓ بن مرداس سُلمی سے آپؐ نے پوچھا: کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نھبی ونھب العبید وبین الاقرع وعیینۃ

انھوں نے عرض کیا: آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے: بین عُیَیْنَۃَ والاقرع۔

آپؐ نے فرمایا: معنٰی میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: شعر سے بڑھ کر آپؐ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے: یا رسولؐ اللہ! یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپؐ فرماتے کہ ’’بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔‘‘

جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی، وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ و جدل کے، یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں، اور مشرکانہ خُرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان یمتلئ جوف احدکم قیحا خیر لہ من ان یمتلئ شعرًا۔ ’’تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔‘‘ تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی، آپؐ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان من الشعر لحکمۃ۔ ’’بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔‘‘ اُمَیَّہ بن ابی الصَّلْت کا کلام سن کر آپؐ نے فرمایا: اٰمن شعرہ وکفر قلبہ۔ ’’اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے۔‘‘ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سَوْ کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپؐ کو سنائے اور آپؐ فرماتے گئے: ھیہ ’’اور سناؤ۔‘‘

۱۴۴ – یہ شاعروں کی ایک اور خُصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپؐ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپؐ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپؐ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپؐ کے گرد و پیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعرا کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں، اور کرنے کی اور۔ سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہو گا۔ مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہو گا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت و خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّانْتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا‌ ؕ وَسَيَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَىَّ مُنۡقَلَبٍ يَّنۡقَلِبُوۡنَ ۝٢٢٧ ع ١١

ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا[۱۴۵] ـــــ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں[۱۴۶]۔ ع

۱۴۵- یہاں شعرا کی اُس عام مذمّت سے، جو اوپر بیان ہوئی ، اُن شعرا کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیّات کے حامل ہیں:

اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتابوں کو سچّے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اَخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی، اور اپنے کلام میں بھی۔ یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہدوتقویٰ سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رِندی و ہوس ناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہیں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اُس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہَجو نہ کریں، نہ ذاتی یا نسلی وقومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیروشمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھگیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیازمندانہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اسی کے متعلق رِوایات میں آتا ہے کہ کفار و مشرکین کے شاعر، اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الزامات کا جو طوفان اُٹھاتے اور نفرت وعداوت کا جو زہر پھیلاتے تھے، اس کا جواب دینے کے لیے حضورؐ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ کَعبؓ بن مالک سے آپؐ نے فرمایا: اهجهم فوالذی نفسی بیده لهو اشد علیهم من النبل۔ ''ان کی

ہجو کہو، کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمھارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔" حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اھجھم وجبریل معك، اور قل و روح القدس معك، "ان کی خبر لو اور جبریل تمھارے ساتھ ہے۔" "کہو اور روح القدس تمھارے ساتھ ہے۔" آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان المؤمن یجاھد بسیفه ولسانه "مومن تلوار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی۔"

۱۴۶- ظلم کرنے والوں سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے سراسر ہٹ دھرمی کی راہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شاعری اور کہانت اور ساحری اور جُنون کی تہمتیں لگاتے پھرتے تھے، تاکہ ناواقف لوگ آپؐ کی دعوت سے بدگمان ہوں اور آپؐ کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

النمل

(۲۷)

النمل

نام دوسرے رُکوع کی چوتھی آیت میں وَادِ النَّمْلِ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورت جس میں النمل کا قصّہ مذکور ہے۔ یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔

زمانہ نُزُول مضمون اور اندازِ بیان مکہ کے دورِ متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس کی تائید رِوایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابنِ عباسؓ اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ ”پہلے سورۂ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص۔“

موضوع اور مَباحِث یہ سورت دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغازِ سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔ اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورت کے اختتام تک۔

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنھیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر مان لینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت و اتباع کا رَوِیّہ اختیار کریں۔ لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے، وہ انکارِ آخرت ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمہ دار، بندۂ نفس اور فریفتۂ حیاتِ دنیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اَخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں:

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قومِ ثمود اور سرکشانِ قومِ لوط کا ہے، جن کی سیرت فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجتاً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے اُن لوگوں کے دشمن ہو گئے جنھوں نے ان کو خیر و صلاح کی طرف بلایا۔ انھوں نے اپنی اُن بدکاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گِھناؤنا پن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انھیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے تک بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمانؑ کا ہے، جن کو خدا نے دولت، حکومت اور شوکت و حشمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حُضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انھیں احساس تھا کہ انھیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے جو تاریخ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غُرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کرسکتا ہے، وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں درجے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اُس سے بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہوسکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہوگیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی، کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلّط نہ تھا۔ خدا کے حضور جواب دِہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

دوسرے خطبے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہور حقائق کی طرف اشارے کر کے کفارِ مکّہ سے پے درپے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اُس شرک کی شہادت دے رہے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اُس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اس قرآن میں تمھیں دی جارہی ہے؟ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سُن کر بھی کچھ نہیں سنتے، وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے لیے زندگی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ کیونکہ جب ان کے نزدیک آخرکار سب کچھ مٹی ہو جانا ہے، اور حیاتِ دُنیا کی اس ساری تگ ودَو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے، تو آدمی کے لیے پھر حق اور باطل سب یکساں ہیں۔ اُس کے لیے اِس سوال میں سرے سے کوئی اہمیّت ہی نہیں رہتی کہ اُس کا نظامِ حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یاس نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہیں تو انھیں دعوت دینا بے کار ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مقصود سونے والوں کو جھنجوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے درپے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں، اس سے غفلت برتنے کے نتائج پر مُتنبّہ کریں، اور انھیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اُس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثّر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمھارے اپنے لیے نافع اور اسے رَدّ کرنا تمھارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کروگے جن کے سامنے آجانے کے بعد مانے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا۔ اُس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

آیاتہا ۹۳ سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ

ط - س - یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبین[1] کی، ہدایت اور بشارت[2] اُن ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[3]، اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر

۱ - ''کتابِ مُبِین'' کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بالکل واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر ہے۔ جو کوئی اسے آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا کلام نہیں ہے۔

۲ - یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ ''ہدایت کرنے والی'' اور ''بشارت دینے والی'' کہنے کے بجائے انھیں بجائے خود ''ہدایت'' اور ''بشارت'' کہا گیا، جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے۔ جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کے بجائے مجسم سخاوت اور حسین کہنے کے بجائے از سرتا پا حُسن کہیں۔

۳ - یعنی قرآنِ مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف اُنھی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام نیک کی خوش خبری بھی صرف انھی لوگوں کو دیتی ہیں جن میں دو خصوصیات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ ایمان لائیں۔ اور ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیں، خدائے واحد کو اپنا ایک ہی الٰہ اور رب مان لیں، قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر لیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیِ برحق مان کر اپنا پیشوا بنا لیں، اور یہ عقیدہ بھی اختیار کر لیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں ہم کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزائے اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ اِن چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لیے آمادہ ہوں۔ اور اس آمادگی کی اوّلین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کر دیں گے، انھی کو قرآن کی آیات دُنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی، اس راستے کے ہر مرحلے میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سمجھائیں گی، اس کے ہر موڑ پر انھیں غلط راہوں کی طرف جانے سے بچائیں گی، اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راست روی کے نتائج دُنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں، آخر کار ابدی اور دائمی فلاح اِسی کی بدولت انھیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يُوقِنُوْنَ ۝٣ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ
اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝٤ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ

پُورا یقین رکھتے ہیں[4]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، ان کے لیے ہم نے اُن کے کرتُوتوں کو خوش نُما بنا دیا ہے، اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں[5]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بُری سزا ہے[6] اور

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک معلّم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے واقعی اس کی شاگردی قبول کر لے اور پھر اس کی ہدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مریض کر سکتا ہے جو اسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور پرہیز وغیرہ کے معاملے میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اسی صورت میں معلّم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائجِ مطلوبہ حاصل ہوں گے۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اختیار کریں۔ لیکن قرآنِ مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد وہ زکوٰۃ ادا کرنا ہے جو نماز کے ساتھ اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ علاوہ بریں زکوٰۃ کے لیے اِیتَاءَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو زکوٰۃِ مال ادا کرنے کے معنی متعین کر دیتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں پاکیزگی اختیار کرنے کے لیے تَزَکّی کا لفظ بولا جاتا ہے، نہ کہ ایتائے زکوٰۃ۔ دراصل یہاں جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت واتباع کا رَویّہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے، اور اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ وہ پہلی علامت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آدمی نے واقعی اطاعت قبول کر لی ہے۔ یہ علامت جہاں غائب ہوئی، وہاں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی سرکش ہے، حاکم کو حاکم چاہے اس نے مان لیا ہو، مگر حکم کی پیروی کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

۴ – اگرچہ آخرت کا عقیدہ ایمانیات میں شامل ہے، اور اس بنا پر ”ایمان لانے والوں“ سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو توحید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیات کے ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں، ان کے لیے اِس قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیارِ خیر و شر صرف اُنھی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اِس دُنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت و ہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اُخروی کو سود و زیاں اور نفع و نقصان کا معیار قرار دے کر خیر و شر کا تعیُّن کرتی ہو۔ ایسے لوگ اوّل تو انبیا علیہم السلام کی تعلیم پر کان ہی نہیں دھرتے، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو بھی جائیں تو ... رت کا یقین نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ایمان و اسلام کے راستے پر ایک قدم چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس راہ میں پہلی ہی آزمائش جب پیش آئے گی، جہاں دُنیوی

فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ

آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اے محمدؐ!) بلاشبہ تم یہ قرآن

فائدے اور اُخروی نقصان کے تقاضے انھیں دو مختلف سمتوں میں کھینچیں گے تو وہ بے تکلّف دنیا کے فائدے کی طرف کھنچ جائیں گے اور آخرت کے نقصان کی ذرّہ برابر پروا نہ کریں گے، خواہ زبان سے وہ ایمان کے کتنے ہی دعوے کرتے رہیں۔

۵ — یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی فطری مَنطِق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی و عمل کے نتائج کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھے گا، جب وہ کسی ایسی عدالت کا قائل نہ ہوگا جہاں انسان کے پورے کارنامۂ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حُسن و قُبح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جانے والا ہو، اور جب وہ موت کے بعد کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہوگا جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق ٹھیک ٹھیک جزا و سزا دی جانے والی ہو، تو لازماً اس کے اندر ایک مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بداخلاقی کی ساری بحثیں سراسر بے معنٰی نظر آئیں گی۔ جو کچھ اُسے اِس دنیا میں لذت و عیش اور مادّی ترقی و خوش حالی اور قوت و اقتدار سے ہم کنار کرے، وہی اس کے نزدیک بھلائی ہوگی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی طرزِ زندگی اور نظامِ اخلاق ہو۔ اس کو حقیقت اور صداقت سے دراصل کوئی غرض ہی نہ ہوگی۔ اس کی اصل مطلوب صرف حیاتِ دنیا کی زینتیں اور کامرانیاں ہوں گی، جن کے حصول کی فکر اسے ہر وادی میں لیے بھٹکتی پھرے گی۔ اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا، اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا، اور اُلٹا اُن لوگوں کو بے وقوف سمجھے گا جو اُس کی طرح دنیا طلبی میں منہمک نہیں ہیں اور اخلاق و بداخلاقی سے بے نیاز ہو کر ہر کام کر گزرنے میں بے باک نہیں ہیں۔

کسی کے اعمالِ بد کو اس کے لیے خوش نما بنا دینے کا یہ فعل قرآنِ مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہُوا، یہ ہوتی ہے کہ جو شخص یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، اسے فطرتاً زندگی کا یہی ہنجار خوش آیند محسوس ہوتا ہے۔ اور جب یہ فعل شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اختیار کرنے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی جنت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش برخوردار! بہت اچھے جا رہے ہو۔

۶ — اس بُری سزا کی صورت، وقت اور جگہ کا تعیُّن نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس دنیا میں بھی مختلف افراد، گروہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عین موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالمِ برزخ میں بھی اس سے آدمی دوچار ہوتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝٦ إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝٧

ایک حکیم وعلیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔[7]

(انھیں اُس وقت کا قصّہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا[8] کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں، یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں، تاکہ تم لوگ گرم ہوسکو۔"

اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا جو پھر کہیں جا کر ختم نہ ہو گا۔

۷ – یعنی یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جارہی ہیں، اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس و رائے پر مبنی ہیں، بلکہ انھیں ایک حکیم و علیم ذات اِلقا کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدابیر اختیار کرتی ہے۔

۸ – یہ اُس وقت کا قصّہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مَدیَن میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر کوئی ٹھکانا تلاش کرنے جا رہے تھے۔ مَدیَن کا علاقہ خلیجِ عَقبَہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے سواحل پر واقع تھا۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۱۵) وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصّے میں اُس مَقام پر پہنچے جو اَب کوہِ سینا اور جبلِ موسیٰؑ کہلاتا ہے اور نُزولِ قرآن کے زمانے میں طُور کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

یہاں جو قصّہ بیان کیا جا رہا ہے، اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورۂ طٰہٰ (رکوع ۱) میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

۹ – فَحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انھیں کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کون سی بستی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کدھر کدھر راستے جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے جن سے کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں تو کم از کم میں کچھ انگارے ہی لے آؤں گا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل کرسکو۔

یہ مَقام جہاں حضرت موسیٰؑ نے جھاڑی میں آگ لگی ہوئی دیکھی تھی، کوہِ طُور کے دامن میں سطحِ سمندر سے تقریباً ۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں رومی سلطنت کے پہلے عیسائی بادشاہ قُسطنطین نے ۳۶۵ء کے لگ بھگ

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ۟

وہاں جو پہنچا تو ندا آئی [10] کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ، سب جہان والوں کا پروردگار [11]۔ اے موسیٰؑ! یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔

زمانے میں ٹھیک اُس مقام پر ایک کنیسہ تعمیر کرا دیا تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے دو سو برس بعد قیصر جسٹینین نے یہاں ایک دیر (Monastery) تعمیر کرایا جس کے اندر قسطنطین کے بنائے ہوئے کنیسہ کو بھی شامل کر لیا۔ یہ دیر اور کنیسہ دونوں آج تک موجود ہیں اور یونانی کلیسا (Greek Orthodox Church) کے راہبوں کا ان پر قبضہ ہے۔ میں نے جنوری ۱۹۶۰ء میں اس مقام کی زیارت کی ہے۔ مقابل کے صفحے پر اس مقام کی کچھ تصاویر ملاحظہ ہوں۔

۱۰- سورۂ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ- اس سے جو صورتِ معاملہ سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اُٹھ رہا تھا، اور اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جس پر سے یکایک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔

یہ ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو غارِ حرا کی تنہائی میں یکایک ایک فرشتہ آیا اور اس نے اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص سفر کرتا ہوا ایک جگہ ٹھیرا ہے، دُور سے آگ دیکھ کر راستہ پوچھنے یا انگارا چننے کی غرض سے آتا ہے اور یکلخت اللہ رب العالمین کی ہر قیاس و گمان سے بالا ذات اس سے مخاطب ہو جاتی ہے۔ ان مواقع پر درحقیقت ایک ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیا علیہم السلام کے نفس میں بھی موجود ہوتی ہے جس کی بنا پر انھیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی جن یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ اُن کے حواس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوندِ عالم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہم کلام ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: النجم، حاشیہ ۱۰)

۱۱- اس موقع پر "سبحان اللہ" ارشاد فرمانے سے دراصل حضرت موسیٰؑ کو اس بات پر مُتنبّہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجے تنزیہ کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ رب العالمین اس درخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نورِ مُطلق تمھاری بینائی کے حُدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدودیتوں سے پاک اور مُنزّہ ہوتے ہوئے وہ بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ
يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ⑩ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ
ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑪ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ

اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی۔" جُونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بَل کھا رہی ہے[12] تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ "اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ میرے حُضور رسول ڈرا نہیں کرتے[13]، اِلّا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو[14]۔ پھر اگر بُرائی کے بعد اُس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں[15]۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان

۱۲ – سورۂ اَعراف اور سورۂ شعراء میں اس کے لیے ثُعبان (اژدہے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور یہاں اسے "جانّ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اژدہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہُوم کو سورۂ طٰہٰ میں حَيَّةٌ تَسْعٰى (دوڑتے ہوئے سانپ) کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۱۳ – یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصبِ عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اس لیے خواہ کیسا ہی کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آئے، رسول کو بے خوف اور مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس کے لیے وہ کسی طرح ضرر رساں نہ ہوگا۔

۱۴ – یہ اِستثنا متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خوف کی معقول وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے، جب تک کہ آدمی قصوروار نہ ہو۔

۱۵ – یعنی قصور کرنے والا بھی اگر توبہ کر کے اپنے رَوّیے کی اصلاح کر لے اور بُرے عمل کے بجائے نیک عمل کرنے لگے تو میرے ہاں اس کے لیے عَفو و درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نادانستگی میں ایک قِبطی کو قتل کر کے مصر سے نکلے تھے۔ یہ ایک قصور تھا جس کی طرف لطیف اشارہ فرما دیا گیا۔ پھر جس وقت یہ قصور اچانک بلا ارادہ ان سے سرزد ہوا تھا، اس کے بعد فوراً ہی انھوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی کہ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ۔ (اے پروردگار! میں اپنے

جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ فِىۡ تِسۡعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ
وَقَوۡمِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا
مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ
اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۱۴﴾ ع

میں تو ڈالو۔ چمکتا ہُوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے[16])، وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔"

مگر جب ہماری کُھلی کُھلی نشانیاں اُن لوگوں کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کُھلا جادُو ہے۔ انھوں نے سراسر ظلم اور غُرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا، حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے[17]۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ ع

نفس پر ظلم کر گزرا، مجھے معاف فرما دے!) اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انھیں معاف بھی فرما دیا تھا، فَغَفَرَ لَہٗ (القصص، آیت ۱۶)، اب یہاں اُسی معافی کی بشارت انھیں دی گئی ہے۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰؑ! میرے حضور تمھارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمھارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اِس وقت میں نے تمھیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دے کر میں تمھیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

۱۶ — سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نو نشانیاں (تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ) عطا فرمائی تھیں۔ اور سورۂ اعراف میں ان کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے: (۱) لاٹھی جو اژدہا بن جاتی تھی۔ (۲) ہاتھ جو بغل سے سورج کی طرح چمکتا ہُوا نکلتا تھا۔ (۳) جادُوگروں کو برسرِ عام شکست دینا۔ (۴) حضرت موسیٰؑ کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط۔ (۵) طوفان۔ (۶) ٹڈی دَل۔ (۷) تمام غلّے کے ذخیروں میں سُرسُریاں اور انسان و حیوان سب میں جوئیں۔ (۸) مینڈکوں کا طوفان۔ (۹) اور خون۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الزُّخرُف، حاشیہ ۴۳)

۱۷ — قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بَلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰؑ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلوا دو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تُل جاتا تھا۔ (الاعراف، آیت ۱۳۴۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ

(دُوسری طرف) ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم عطا کیا[18] اور اُنھوں نے کہا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی[19]۔ اور داؤدؑ کا وارث سلیمانؑ[20] ہوا۔

الزُّخرُف، آیت ۴۹-۵۰) بائبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ (خُروج، باب ۸ تا ۱۰) اور ویسے بھی یہ بات کسی طرح تصوُّر میں نہ آسکتی تھی کہ ایک پورے ملک پر قحط اور طوفان اور ٹِڈی دَلوں کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سُرسُریوں کے بے شمار لشکروں کا اُمنڈ آنا کسی جادو کا کرشمہ ہوسکتا ہے۔ یہ ایسے کُھلے ہوئے معجزے تھے جن کو دیکھ کر ایک بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ پیغمبر کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کے کہنے پر ان کا دُور ہوجانا صرف اللہ ربّ العالمین ہی کے تصرُّف کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ”تو خوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مالکِ زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں۔“ (بنی اسرائیل، آیت ۱۰۲) لیکن جس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے جان بُوجھ کر ان کا انکار کیا، وہ یہ تھی کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ”کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں، حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے؟“ (المومنون، آیت ۴۷)

۱۸ - یعنی حقیقت کا علم۔ اِس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عَطِیَّہ ہے، اور اُس پر تصرُّف کرنے کے جو اختیارات بھی ان کو بخشے گئے ہیں، انھیں اللہ ہی کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے، اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انھیں مالکِ حقیقی کے حضور جواب دہی کرنی ہے۔ یہ علم اُس جَہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اُس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی، اس کا نمونہ اُوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔ بادشاہی، دولت، حَشمت، طاقت، دونوں طرف یکساں ہے۔ فرعون کو بھی یہ ملی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بھی۔ لیکن جَہالت اور علم کے فرق نے ان کے درمیان کتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا۔

۱۹ - یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ ہماری کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مُملکت کی فرمانروائی کے لیے منتخب فرمایا۔

۲۰ - وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوئی بھی ہو تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ حضرت داؤدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اُس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جاسکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ ”ہم انبیاؑ کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا

وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ

اور اس نے کہا: "لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں[21] اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں[22]، بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔" سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے[23] اور

وہ صدقہ ہے۔" (بخاری، کتاب فرض الخمس) اور ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین۔ "نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا، جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقرا اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔" (مُسندِ احمد، مرویاتِ ابوبکر صدیقؓ، حدیث ۶۰ و ۷۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو "سلیم" کا ہم معنی ہے۔ ۹۶۵ قبلِ مسیح میں حضرت داؤدؑ کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ ق م تک تقریباً ۴۰ سال فرماں روا رہے۔ (ان کے حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۴-۷۵) ان کے حدودِ سلطنت کے متعلق ہمارے مفسرین نے بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ وہ انہیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمراں بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف موجودہ فلسطین و شرق اُردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشۂ مُلک سلیمان، تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۹۵)

۲۱ – بائبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۱، ص ۴۳۹)

۲۲ – یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اس بات کو لفظی معنوں میں لینا درست نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے۔ یہ بات حضرت سلیمانؑ نے فخر یہ نہیں فرمائی تھی، بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی عطا و بخشش کا شکریہ ادا کرنا مقصود تھا۔

۲۳ – بائبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جن حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھے اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تلمود اور ربیوں کی روایات میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۱، صفحہ ۴۴۰) موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن اور طیر سے مراد جنات اور پرندے نہیں ہیں، بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں مختلف کام کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مسخر کیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے۔ اور طیر سے مراد گھوڑ سواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں بے جا تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن، انس اور طیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے، اور تینوں پر الف لام تعریفِ جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر،

Maktaba Tul Ishaat.com

فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٧﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ
ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٨﴾

وہ پُورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کُوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ”اے چیونٹیو! اپنے بِلوں میں گُھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمھیں کُچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔[۲۴]“

الْاِنْس میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرّہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجن بول کر انسانوں کا کوئی گروہ، یا محض الطَّیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے، اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنیٰ سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادت کام کی وجہ سے جِنّ، یا کسی عورت کو اس کے حُسن کی وجہ سے پری، اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اب جِنّ کے معنیٰ طاقت ور آدمی اور پری کے معنیٰ حسین عورت، اور پرندے کے معنیٰ تیز رفتار انسان ہی کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنیٰ تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی، اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنیٰ چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اُسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اُسی وقت لے سکتے ہیں جب کہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ یہاں آخر کون سا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لُغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؟ بلکہ آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے، وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف معنیٰ پر صریح دلالت کر رہا ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی اَخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنیٰ پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے، حالانکہ دراصل قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔

۲۴- اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسّرین نے تاویل کے خَرّاد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملة کے معنیٰ ایک چیونٹی کے نہیں بلکہ یہ ایک قبیلے کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”جب حضرت سلیمانؑ وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اے قبیلۂ نمل کے لوگو......“۔ لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض وادی النمل کو اُس وادی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ

رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔ اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کَلب، اَسَد وغیرہ۔ لیکن کوئی عرب قبیلۂ کَلب کے کسی فرد کے متعلق قَالَ کَلب (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلۂ اَسَد کے کسی شخص کے متعلق قَالَ اَسَدٌ (ایک شیر نے کہا) ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لیے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قَالَتْ نَمْلَةٌ (ایک چیونٹی یہ بولی) قطعاً عربی محاورہ و استعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ ''اے نملیو! اپنے گھروں میں گُھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو'' بالکل بے معنیٰ ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کچلا کرتا۔ اگر وہ اُن پر حملے کی نیت سے آیا ہو تو اُن کا اپنے گھروں میں گُھس جانا لاحاصل ہے۔ حملہ آور اُن کے گھروں میں گُھس کر انھیں اور زیادہ اچھی طرح کچلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہُوا گزر رہا ہو تو اس کے لیے بس راستہ صاف چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں آکر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کچل ڈالیں۔ لہٰذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ ''اے نملیو! بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو، تاکہ سلیمان کے لشکر تمھیں تباہ نہ کر دیں۔'' اور حملے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں وہ کہتا کہ ''اے نملیو! راستے سے ہٹ جاؤ، تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمانؑ کے لشکروں کی جھپیٹ میں نہ آجائے۔''

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمونِ عبارت کے اعتبار سے ہے۔ رہی یہ بات کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا، اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کے لیے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے، انھوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قَتادَہ اور مُقاتِل کہتے ہیں کہ واد بارض الشامِ کثیر النمل ''وہ ایک وادی ہے سرزمینِ شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں۔'' لیکن تاریخ و جغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اس وادی میں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ بھی رہتا تھا۔ یہ صرف ایک من گھڑت ہے جو اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لیے وضع کر لی گئی ہے۔

بنی اسرائیل کی رِوایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے، مگر اس کا آخری حصہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت سلیمانؑ کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جب ایک وادی سے گزر رہے تھے جس میں چیونٹیاں بہت تھیں تو انھوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ ''اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، ورنہ سلیمانؑ کے لشکر تمھیں کچل ڈالیں گے۔'' اس پر حضرت سلیمانؑ نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبّر کا اظہار کیا اور جواب میں اس چیونٹی نے ان سے کہا کہ تمھاری حقیقت کیا ہے، ایک حقیر بُوند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔ یہ سن کر حضرت سلیمانؑ شرمندہ ہو گئے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۴۰) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کس طرح بنی اسرائیل کی غلط رِوایات کی تصحیح کرتا ہے اور ان گندگیوں کو صاف کرتا ہے جو انھوں نے خود اپنے پیغمبروں کی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنۡ قَوۡلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰٮهُ وَ اَدۡخِلۡنِىۡ بِرَحۡمَتِكَ فِىۡ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۹﴾

سلیمانؑ اس کی بات پر مُسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا ـــــ ”اے میرے رب! مجھے قابو میں[۲۵] رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکرادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عملِ صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر[۲۶]۔“

سیرتوں پر ڈال دی تھیں۔ اِن روایات کے متعلق مغربی مُستشرقین بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے سب کچھ ان سے سرقہ کرلیا ہے۔

عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گُھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کی بات کیسے سُن لی، تو جس شخص کے حواس کلامِ وحی جیسی لطیف چیز کا اِدراک کر سکتے ہوں، اس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (crude) چیز کا ادراک کرلینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

۲۵ – اصل الفاظ ہیں: رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ۔ وزع کے اصل معنٰی عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ (مجھے روک کہ میں تیرے احسان کا شکرادا کروں) ہمارے نزدیک دراصل یہ معنٰی دیتا ہے کہ اے میرے رب! جو عظیم الشان قوتیں اور قابلیتیں تو نے مجھے دی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ اگر میں ذرا سی غفلت میں بھی مبتلا ہو جاؤں تو حدِ بندگی سے خارج ہو کر اپنی کبریائی کے خَبط میں نہ معلوم کہاں سے کہاں نکل جاؤں۔ اس لیے اے میرے پروردگار! تو مجھے قابو میں رکھ، تاکہ میں کافرِ نعمت بننے کے بجائے شکرِ نعمت پر قائم رہوں۔

۲۶ – صالح بندوں میں داخل کرنے سے مراد غالبًا یہ ہے کہ آخرت میں میرا انجام صالح بندوں کے ساتھ ہو اور میں ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے کہ آدمی جب عملِ صالح کرے گا تو صالح تو وہ آپ سے آپ ہو گا ہی، البتہ آخرت میں کسی کا جنت میں داخل ہونا محض اس کے عملِ صالح کے بل بُوتے پر نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لن یدخل احدکم الجنۃ عملہ ”تم میں سے کسی کو بھی محض اس کا عمل جنت میں نہیں پہنچا دے گا۔“ عرض کیا گیا کہ ولا انت یا رسول اللہ ”کیا حضورؐ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے؟“

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾
لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾

(ایک اور موقع پر) سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا[۲۷] اور کہا: "کیا بات ہے کہ
مَیں فُلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا
دوں گا، یا ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہو گی۔"[۲۸]

فرمایا: ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ تعالٰی برحمتہ۔ "ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے بل بُوتے پر جنت میں نہ چلا جاؤں گا جب تک اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نہ ڈھانک لے۔"

حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا اس موقع پر بالکل بے محل ہو جاتی ہے اگر النَّمْل سے مراد انسانوں کا کوئی قبیلہ لے لیا جائے اور نملۃ کے معنی قبیلۂ نمل کے ایک فرد کے لے لیے جائیں۔ ایک بادشاہ کے لشکرِ جرار سے ڈر کر کسی انسانی قبیلے کے ایک فرد کا اپنے قبیلے کو خطرے سے خبردار کرنا آخر کون سی ایسی غیر معمولی بات ہے کہ وہ جلیل القدر بادشاہ اس پر خدا سے یہ دعا کرنے لگے۔ البتہ ایک شخص کو اتنی زبردست قوت ادراک حاصل ہونا کہ وہ دُور سے ایک چیونٹی کی آواز بھی سُن لے اور اس کا مطلب سمجھ جائے، ضرور ایسی بات ہے جس سے آدمی کے غرورِ نفس میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اِسی صورت میں حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا برمحل ہو سکتی ہے۔

۲۷- یعنی اُن پرندوں کا جن کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جنّ اور اِنس کی طرح ان کے لشکر بھی حضرت سلیمانؑ کے عساکر میں شامل تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان سے خبر رسانی، شکار اور اسی طرح کے دوسرے کام لیتے ہوں۔

۲۸- موجودہ زمانے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہُدہُد سے مراد وہ پرندہ نہیں ہے جو عربی اور اُردو زبان میں اس نام سے معروف ہے، بلکہ یہ ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت سلیمانؑ کی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس دعوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ تاریخ میں کہیں ہُدہُد نام کا کوئی شخص اِن حضرات کو سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے افسروں کی فہرست میں مل گیا ہے، بلکہ یہ عمارت صرف اس اِستدلال پر کھڑی کی گئی ہے کہ جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام رکھنے کا رواج تمام زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی تھا۔ نیز یہ کہ آگے اس ہُدہُد کا جو کام بیان کیا گیا ہے اور حضرت سلیمانؑ سے اس کی گفتگو کا جو ذکر ہے، وہ ان کے نزدیک صرف ایک انسان ہی کر سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کے سیاقِ کلام کو آدمی دیکھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی تحریف، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر اس کی تغلیط ہے۔ آخر قرآن کو انسان کی عقل و خرد سے کیا دشمنی ہے کہ وہ کہنا تو یہ چاہتا ہو کہ حضرت سلیمانؑ کے رسالے

Maktaba Tul Ishaat.com

یا پلٹن یا محکمۂ خبر رسانی کا ایک آدمی غائب تھا جسے انھوں نے تلاش کیا اور اس نے حاضر ہو کر یہ خبر دی اور اسے حضرتِ موصوف نے اِس خدمت پر بھیجا، لیکن اسے وہ مسلسل ایسی چیستان کی زبان میں بیان کرے کہ پڑھنے والا اوّل سے لے کر آخر تک اسے پرندہ ہی سمجھنے پر مجبور ہو۔ اس سلسلے میں ذرا قرآنِ مجید کے بیان کی ترتیب مُلاحظہ فرمائیے:

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس فضل پر اظہارِ اِمتنان کیا کہ ''ہمیں مَنْطِقُ الطَّیر کا علم دیا گیا ہے۔'' اس فقرے میں اوّل تو طَیر کا لفظ مُطلَق ہے جسے ہر عرب اور عربی دان پرندے ہی کے معنیٰ میں لے گا۔ کیونکہ کوئی قرینہ اس کے استعارہ و مجاز ہونے پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے، اگر طَیر سے مراد پرند نہیں بلکہ انسانوں کا کوئی گروہ ہوتا اس کے لیے مَنْطِق (بولی) کے بجائے لُغت یا لِسان (یعنی زبان) کا لفظ زیادہ صحیح ہوتا۔ اور پھر کسی شخص کا کسی دوسرے انسانی گروہ کی زبان جاننا کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے کہ وہ خاص طور پر اس کا ذکر کرے۔ آج ہمارے درمیان ہزار ہا آدمی بہت سی غیر زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ یہ آخر کون سا بڑا کمال ہے جسے اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی عَطِیَّہ قرار دیا جاسکے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس فضل پر اظہار امتنان کیا کہ '' ہمیں مَنطِق الطیر کا علم دیا

اوّل تو جِنّ اور اِنس اور طَیر، تین معروف اسمائے جنس استعمال ہوئے ہیں، جو تین مختلف اور معلوم اجناس کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ پھر انھیں مُطلَق استعمال کیا گیا ہے اور کوئی قرینہ ان میں سے کسی کے استعارہ و مجاز یا تشبیہ ہونے کا موجود نہیں ہے، جس سے ایک آدمی لغت کے معروف معنوں کے سوا کسی اور معنیٰ میں انھیں لے۔ پھر اِنس کا لفظ جِنّ اور طَیر کے درمیان آیا ہے جو یہ معنیٰ لینے میں صریحاً مانع ہے کہ جِنّ اور طَیر دراصل اِنس ہی کی جنس کے دو گروہ تھے۔ یہ معنیٰ مراد ہوتے تو اَلْجِنِّ وَالطَّيْرِ مِنَ الْاِنْسِ کہا جاتا، نہ کہ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ طَیر کا جائزہ لے رہے تھے اور ہُدہُد کو غائب دیکھ کر انھوں نے یہ بات فرمائی۔ اگر یہ طَیر انسان تھے اور ہُدہُد بھی کسی آدمی کا نام ہی تھا تو کم از کم کوئی لفظ تو ایسا کہہ دیا جاتا کہ بے چارہ پڑھنے والا اس کو جانور نہ سمجھ بیٹھتا۔ گروہ کا نام پرندہ اور اس کے ایک فرد کا نام ہُدہُد، پھر بھی ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم آپ سے آپ اسے انسان سمجھ لیں گے۔

پھر حضرت سلیمانؑ فرماتے ہیں کہ ہُدہُد یا تو اپنے غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بیان کرے ورنہ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذَبح کر دوں گا۔ انسان کو قتل کیا جاتا ہے، پھانسی دی جاتی ہے، سزائے موت دی جاتی ہے، ذبح کون کرتا ہے؟ کوئی بڑا ہی سنگدل اور بے درد آدمی جوشِ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو تو شاید کسی آدمی کو ذبح بھی کر دے، مگر کیا پیغمبر سے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اپنی فوج کے ایک آدمی کو محض غیر حاضر (deserter) ہونے کے جرم میں ذبح کر دینے کا اعلان کرے گا، اور اللہ میاں سے یہ حُسنِ ظن رکھیں کہ وہ ایسی سنگین بات کا ذکر کر کے اس پر مَذمّت کا ایک لفظ بھی نہ فرمائیں گے؟

کچھ دُور آگے چل کر ابھی آپ دیکھیں گے کہ حضرت سلیمانؑ اسی ہُدہُد کو ملکۂ سبا کے نام خط دے کر بھیجتے ہیں

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ
يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اُس نے آ کر کہا: "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سَبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔[29] میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے۔ اُس کو ہر طرح کا سرو سامان بخشا گیا ہے اور اُس کا تخت بڑا

اور فرماتے ہیں کہ اسے ان کی طرف ڈال دے یا پھینک دے (اَلْقِہْ اِلَیْھِمْ)۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت پرندے کو تو دی جا سکتی ہے لیکن کسی آدمی کو سفیر یا ایلچی یا قاصد بنا کر بھیجنے کی صورت میں یہ انتہائی غیر موزوں ہے۔ کسی کی عقل ہی خبط ہو گئی ہو تو وہ مان لے گا کہ ایک ملک کا بادشاہ دوسرے ملک کی ملکہ کے نام خط دے کر اپنے سفیر کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج سکتا ہے کہ اسے لے جا کر اس کے آگے ڈال دے، یا اس کی طرف پھینک دے۔ کیا تہذیب و شائستگی کے اُس ابتدائی مرتبے سے بھی حضرت سلیمانؑ کو گرا ہُوا فرض کر لیا جائے جس کا لحاظ ہم جیسے معمولی لوگ بھی اپنے کسی ہمسایے کے پاس اپنے ملازم کو بھیجتے ہوئے ملحوظ رکھتے ہیں؟ کیا کوئی شریف آدمی اپنے ملازم سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ خط لے جا کر فُلاں صاحب کے آگے پھینک آ؟

یہ تمام قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں ہُدہُد کا مفہُوم وہی ہے جو ازرُوئے لُغت اس لفظ کا مفہُوم ہے، یعنی یہ کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک پرندہ تھا۔ اب اگر کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ایک ہُدہُد وہ باتیں کر سکتا ہے جو قرآن اس کی طرف منسوب کر رہا ہے تو اسے صاف صاف کہنا چاہیے کہ میں قرآن کی اس بات کو نہیں مانتا۔ اپنے عَدمِ ایمان کو اس پردے میں چھپانا کہ قرآن کے صاف اور صریح الفاظ میں اپنے من مانے معنیٰ بھرے جائیں، گھٹیا درجے کی منافقت ہے۔

٢٩ - سَبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مآرِب، موجودہ یمن کے دارالسلطنت صَنعاء سے ۵۵ میل بجانبِ شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانۂ عروج مَعِین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ١١٠٠ ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ١١۵ ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حِمیَر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حَضرَموت، اور افریقا میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ مشرقی افریقا، ہندوستان، مشرقِ بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی، وہ زیادہ تر انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانے میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مال دار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوش حالی کا

Maktaba Tul Ishaat.com

عَظِيمٌ ۞۲۳ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ
لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۞۲۴ اَلَّا
يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ[30] کرتی ہے''۔۔۔۔شیطان[31] نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نُما بنا دیے[32] اور انھیں شاہراہ سے روک دیا، اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اُس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا

بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آب پاشی قائم کر رکھا تھا، جس سے اُن کا پورا علاقہ جنت بنا ہُوا تھا۔ اُن کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مورخین نے بھی کیا ہے اور سورۂ سبا کے دوسرے رُکوع میں قرآنِ مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہُدہُد کا یہ بیان کہ ''میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں'' یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ حضرت سلیمانؑ سَبا سے بالکل ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ فلسطین و شام کے جس فرمانروا کی سلطنت بحرِ احمر کے شمالی کنارے (خلیجِ عَقبہ) تک پہنچی ہوئی تھی، وہ اسی بحرِ احمر کے جنوبی کنارے (یمن) کی ایک ایسی قوم سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا جو بین الاقوامی تجارت کے ایک اہم حصے پر قابض تھی۔ علاوہ ازیں زَبور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے بھی پہلے اُن کے والد ماجد حضرت داؤدؑ سَبا سے واقف تھے۔ اُن کی دُعا کے یہ الفاظ زَبور میں ہمیں ملتے ہیں:

''اے خدا! بادشاہ (یعنی خود حضرت داؤدؑ) کو اپنے احکام اور شاہزادے (یعنی حضرت سلیمانؑ) کو اپنی صداقت عطا فرما......تَرسِیس اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے۔ سبا اور شیبا (یعنی سبا کی یمنی اور حبشی شاخوں) کے بادشاہ ہدیے لائیں گے۔'' (۷۲: ۱ و ۱۰)

اس لیے ہُدہُد کے قول کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا کے مرکز میں جو چشم دید حالات میں دیکھ کر آیا ہوں، وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچے ہیں۔

۳۰- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اس زمانے میں آفتاب پرستی کے مذہب کی پیرو تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابنِ اسحاق علمائے انساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورثِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبدِ شمس (بندۂ آفتاب یا سورج کا پرستار) اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ ہُدہُد جب حضرت سلیمانؑ کا خط لے کر پہنچا تو ملکۂ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں وہ خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا۔

وَيَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۲۶﴾ سجدۃ

ہے[۳۳] اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو[۳۴]۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرشِ عظیم کا مالک ہے[۳۵]۔

۳۱- اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر پیراگراف تک کی عبارت ہُدہُد کے کلام کا جز نہیں ہے بلکہ ''سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے'' پر اس کی بات ختم ہوگئی اور اس کے بعد اب یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بطورِ اضافہ ہے۔ اس قیاس کو جو چیز تقویت دیتی ہے، وہ یہ فقرہ ہے: وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ'' اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔'' ان الفاظ سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ متکلم ہُدہُد اور مخاطب حضرت سلیمانؑ اور ان کے اہلِ دربار نہیں ہیں، بلکہ متکلّم اللہ تعالیٰ اور مخاطب مشرکینِ مکہ ہیں، جن کو نصیحت کرنے ہی کے لیے یہ قصّہ سنایا جا رہا ہے۔ مفسرین میں سے علّامۂ آلُوسی، صاحبِ روح المعانی بھی اسی قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

۳۲- یعنی دُنیا کی دولت کمانے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ شان دار بنانے کے جس کام میں وہ منہمک تھے، شیطان نے اُن کو سُجھا دیا کہ بس یہی عقل وفکر کا ایک مَصرَف اور قُوائے ذہنی وجسمانی کا ایک استعمال ہے، اس سے زیادہ کسی چیز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے کہ تم خواہ مخواہ اِس فکر میں پڑو کہ اس ظاہر حیاتِ دُنیا کے پیچھے حقیقتِ واقعیہ کیا ہے اور تمھارے مذہب، اَخلاق، تہذیب اور نظامِ حیات کی بنیادیں اُس حقیقت سے مطابقت رکھتی ہیں یا سراسر اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ شیطان نے ان کو مطمئن کر دیا کہ جب تم دنیا میں دولت اور طاقت اور شان وشوکت کے لحاظ سے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو تو پھر تمھیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہمارے یہ عقائد اور فلسفے اور نظریے ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ان کے ٹھیک ہونے کی تو یہی ایک دلیل کافی ہے کہ تم مزے سے دولت کما رہے ہو اور عیش اُڑا رہے ہو۔

۳۳- یعنی جو ہر آن اُن چیزوں کو ظہور میں لا رہا ہے جو پیدائش سے پہلے نہ معلوم کہاں کہاں پوشیدہ تھیں۔ زمین کے پیٹ سے ہر آن بے شمار نباتات نکال رہا ہے اور طرح طرح کے مَعدِنیات خارج کر رہا ہے۔ عالمِ بالا کی فضاؤں سے وہ وہ چیزیں سامنے لا رہا ہے جن کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان کا وہم وگمان بھی ان تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

۳۴- یعنی اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے لیے ظاہر اور مخفی سب یکساں ہیں۔ اس پر سب کچھ عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بطورِ نمونہ بیان کرنے سے مقصود دراصل یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اگر وہ لوگ شیطان کے دھوکے میں نہ آتے تو یہ سیدھا راستہ انھیں صاف نظر آ سکتا تھا کہ آفتاب نامی ایک دہکتا ہُوا کُرہ، جو بے چارہ خود اپنے وجود کا ہوش بھی نہیں رکھتا، کسی عبادت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستی اس کا استحقاق رکھتی ہے جو علیم وخبیر ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ
هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾

سلیمانؑ نے کہا: ''ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں[۳۶]۔''

اور جس کی قدرت ہر لحظہ نئے نئے کرشمے ظہور میں لا رہی ہے۔

۳۵- اِس مَقام پر سجدہ واجب ہے۔ یہ قرآن کے اُن مَقامات میں سے ہے جہاں سجدۂ تلاوت واجب ہونے پر فقہا کا اتفاق ہے۔ یہاں سجدہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو آفتاب پرستوں سے جدا کرے اور اپنے عمل سے اس بات کا اقرار و اظہار کرے کہ وہ آفتاب کو نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مسجود و معبود مانتا ہے۔

۳۶- یہاں پہنچ کر ہُدہُد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیت کے مدّعی حضرات نے جس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں ایک پرندے کا اِس قوتِ مشاہدہ، قوتِ تمیز اور قوتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مُلک پر گزرے اور یہ جان لے کہ یہ قومِ سبا کا ملک ہے، اس ملک کا نظامِ حکومت یہ ہے، اس کی فرمانروا فلاں عورت ہے، اس کا مذہب آفتاب پرستی ہے، اس کو خدائے واحد کا پرستار ہونا چاہیے تھا مگر یہ گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے یہ سارے مشاہدات وہ آکر اس وضاحت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ سے بیان کر دے۔ اِنھی وُجوہ سے کھلے کھلے ملاحدہ قرآن پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کَلِیْلَہ دِمْنَہ کی سی باتیں کرتا ہے، اور قرآن کی عقلی تفسیریں کرنے والے اس کے الفاظ کو ان کے صریح معنیٰ سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرتِ ہُدہُد تو سرے سے کوئی پرندے تھے ہی نہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے حضرات کے پاس آخر وہ کیا سائنٹفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیّت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور اِن کی مختلف اَنواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو وہ معلومات سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اُس نہایت ناکافی مشاہدے سے اخذ کردہ نتائج ہیں جو محض سرسری طور پر حیوانات کی زندگی اور ان کے برتاؤ کا کیا گیا ہے۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعے سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سوچتے اور سمجھتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت مُشاہدہ مختلف انواعِ حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے، اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتا چلا ہے۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّىۡۤ اُلۡقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيۡمٌ ﴿٢٩﴾ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ
اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴿٣٠﴾ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿٣١﴾ ع

ملکہ بولی: ”اے اہلِ دربار! میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ ”میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔[٣٧]“ ع

اب اگر اللہ تعالیٰ، جو اِن حیوانات کا خالق ہے، ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی مَنطِق سمجھنے اور ان سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہُدہُد اس قابل ہو گیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کر کے آتا اور پیغمبر کو ان کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اِس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور بہت سے قیاسات پر نظرِ ثانی کریں، یہ کیا عقل مندی ہے کہ ہم اپنے اس ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

٣٧- یعنی خط کی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ وہ عجیب غیر معمولی طریقے سے آیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی سفارت اسے لا کر دیتی، ایک پرندے نے اسے لا کر مجھ پر ٹپکا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ فلسطین و شام کے عظیم فرمانروا سلیمانؑ کی جانب سے ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، حالانکہ دنیا میں کہیں کسی سلطنت کے مراسلوں میں یہ طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر سب دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف خدائے بزرگ و برتر کے نام پر خط لکھنا بھی ہماری دنیا میں ایک غیر معمولی بات ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر اس کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ اس میں بالکل صاف صاف ہم کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ ہم سرکشی چھوڑ کر اطاعت اختیار کر لیں اور تابع فرمان بن کر یا مسلمان ہو کر سلیمانؑ کے آگے حاضر ہو جائیں۔

”مسلم“ ہو کر حاضر ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ مطیع بن کر حاضر ہو جاؤ۔ دوسرے یہ کہ دینِ اسلام قبول کر کے حاضر ہو جاؤ۔ پہلا مفہوم حضرت سلیمانؑ کی شانِ فرماں روائی سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا مفہوم ان کی شانِ پیغمبری سے۔ غالباً یہ جامع لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خط میں یہ دونوں مقاصد شامل تھے۔ اسلام کی طرف سے خود مختار قوموں اور حکومتوں کو ہمیشہ یہی دعوت دی گئی ہے کہ یا تو دینِ حق قبول کرو اور ہمارے ساتھ نظامِ اسلامی میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ، یا پھر اپنی سیاسی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اسلامی نظام کی ماتحتی قبول کرو اور سیدھے ہاتھ سے جزیہ دو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً
اَمۡرًا حَتّٰی تَشۡهَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ
شَدِیۡدٍ ۬ۙ وَّ الۡاَمۡرُ اِلَیۡكِ فَانۡظُرِیۡ مَاذَا تَاۡمُرِیۡنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتۡ اِنَّ
الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ
اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَ اِنِّیۡ مُرۡسِلَةٌ اِلَیۡهِمۡ بِهَدِیَّةٍ

(خط سُنا کر) ملکہ نے کہا: ”اے سردارانِ قوم! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہیں کرتی ہوں[۳۸]۔“ اُنھوں نے جواب دیا: ”ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔“ ملکہ نے کہا کہ ”بادشاہ جب کسی مُلک میں گُھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزّت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں[۳۹]۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں[۴۰]۔ میں اِن لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں،

۳۸۔ اصل الفاظ ہیں: حَتّٰی تَشۡهَدُوۡنِ، جب تک کہ تم حاضر نہ ہو، یا تم گواہ نہ ہو۔ یعنی اہم معاملات میں فیصلہ کرتے وقت تم لوگوں کی موجودگی میرے نزدیک ضروری ہے، اور یہ بھی کہ جو فیصلہ مَیں کروں، اس کے صحیح ہونے کی تم شہادت دو۔ اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ قوم سبا میں بادشاہی نظام تو تھا مگر وہ اِستبدادی نظام نہ تھا، بلکہ فرماں روائے وقت معاملات کے فیصلے اَعیانِ سلطنت کے مشورے سے کرتا تھا۔

۳۹۔ اس ایک فقرے میں امپیریلزم اور اس کے اثرات و نتائج پر مکمل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کی غَرض ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کیے ہیں، ان سے وہ خود مُتمتّع ہوں اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں سر اُٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی خوش حالی اور طاقت اور عزّت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں، اس کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دَم داعیہ ہوتا ہے انھیں کچل کر رکھ دیتے ہیں، اس کے افراد میں غلامی، خوشامد، ایک دوسرے کی کاٹ، ایک دوسرے کی جاسوسی، فاتح کی نقالی، اپنی تہذیب کی تحقیر، فاتح تہذیب کی تعظیم اور ایسے ہی دوسرے کمینہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں، اور انھیں بتدریج اس بات کا خوگر بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی کسی مقدس سے مقدس چیز کو بھی بیچ دینے میں تأمّل نہ کریں اور اُجرت پر ہر ذلیل سے ذلیل خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ
بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰٮنِۦَ اللّٰهُ خَيۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِهَدِيَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ﴿۳۶﴾
اِرۡجِعۡ اِلَيۡهِمۡ فَلَنَاۡتِيَنَّهُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَلَنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ
اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَيُّكُمۡ يَاۡتِيۡنِىۡ بِعَرۡشِهَا

پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔"

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا: "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمھیں دیا ہے[۴۱]۔ تمھارا ہدیہ تمھی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر!) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں[۴۲] گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انھیں ایسی ذلّت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔"

سلیمانؑ[۴۳] نے کہا: "اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے

۴۰ - اس فقرے میں دو برابر کے احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ ملکۂ سبا ہی کا قول ہو اور اس نے اپنے پچھلے قول پر بطورِ تاکید اس کا اضافہ کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہو جو مَلِکہ کے قول کی تائید کے لیے جملۂ معترضہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۴۱ - اس جملے سے مقصود اظہارِ فخر و تکبر نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ مجھے تمھارا مال مطلوب نہیں ہے بلکہ تمھارا ایمان مطلوب ہے۔ یا پھر کم سے کم جو چیز میں چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم ایک صالح نظام کے تابع ہو جاؤ۔ اگر تم ان دونوں باتوں میں سے کسی کے لیے راضی نہیں ہو تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ مال و دولت کی رشوت لے کر تمھیں اس شرک اور اس فاسد نظامِ زندگی کے معاملے میں آزاد چھوڑ دوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے کہ میں تمھارے مال کا لالچ کروں۔

۴۲ - پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جو کلام پر غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یعنی پوری بات یوں ہے کہ: اے سفیر! یہ ہدیہ واپس لے جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف، انھیں یا تو ہماری

Maktaba Tul Ishaat.com

قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں[۴۴]؟" جنّوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا: "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں[۴۵]۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار

پہلی بات ماننی پڑے گی کہ مسلم ہو کر ہمارے پاس حاضر ہو جائیں، ورنہ ہم ان پر لشکر لے کر آئیں گے۔

۴۳ – بیچ میں یہ قصّہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ سفارت ملکہ کا ہدیہ واپس لے کر پہنچی اور جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ ملکہ نے اس سے حضرت سلیمانؑ کے جو حالات سنے، ان کی بنا پر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ان کی ملاقات کے لیے بیت المَقدِس جائے۔ چنانچہ وہ خَدَم وحَشَم اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ سَبا سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور اس نے دربارِ سلیمانی میں اطلاع بھیج دی کہ میں آپ کی دعوت خود آپ کی زبان سے سننے اور بالمُشافِہہ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہو رہی ہوں۔ اِن تفصیلات کو چھوڑ کر اب اُس وقت کا قصّہ بیان کیا جا رہا ہے جب ملکہ بیت المَقدِس کے قریب پہنچ گئی تھی اور ایک دو ہی دن میں حاضر ہونے والی تھی۔

۴۴ – یعنی وہی تخت جس کے متعلق ہُدہُد نے بتایا تھا کہ "اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔" بعض مفسرین نے غضب کیا ہے کہ ملکہ کے آنے سے پہلے اس کا تخت منگوانے کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر ملکہ مسلمان ہوگئی تو پھر اس کے مال پر اس کی مرضی کے بغیر قبضہ کر لینا حرام ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے اس کے آنے سے پہلے تخت منگا لینے کی جلدی کی، کیونکہ اس وقت ملکہ کا مال مباح تھا۔ استغفراللہ! ایک نبی کی نیت کے متعلق یہ تصور بڑا ہی عجیب ہے۔ آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ اور اس کے درباریوں کو ایک معجزہ بھی دکھانا چاہتے تھے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ ربّ العالمین اپنے انبیا کو کیسی غیر معمولی قدرتیں عطا فرماتا ہے، اور اسے یقین آجائے کہ حضرت سلیمانؑ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے بھی کچھ زیادہ غضب بعض جدید مفسرین نے کیا ہے۔ وہ آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "تم میں سے کون ہے جو ملکہ کے لیے ایک تخت مجھے لا دے۔" حالانکہ قرآن یاتینی بعرش لہا نہیں بلکہ بِعَرْشِهَا کہہ رہا ہے، جس کے معنیٰ "اس کا تخت" ہیں نہ کہ "اس کے لیے ایک تخت"۔ یہ بات صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ قرآن کے اس بیان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے کہ حضرت سلیمانؑ اس ملکہ ہی کا تخت یمن سے بیت المَقدِس اُٹھوا منگانا چاہتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ ملکہ کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ آجائے۔

۴۵ – اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو جنّ تھے، وہ آیا موجودہ زمانے کے بعض عقل پرست مفسرین کی تاویلوں کے مطابق بنی نوعِ انسان میں سے تھے، یا عُرفِ عام کے مطابق اُسی پوشیدہ مخلوق میں سے جو جنّ کے نام سے معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار کی نشست زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے کی

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ

ہوں۔[۴۶] "جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا: "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں۔"[۴۷] جُونہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اُٹھا: "یہ میرے رب کا فضل

ہوگی، اور بیت المقدس سے سبا کے پایۂ تخت مآرب کا فاصلہ پرندے کی اُڑان کے لحاظ سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا۔ اتنے فاصلے سے ایک ملکہ کا عظیم الشان تخت اتنی کم مدّت میں اُٹھا لانا کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا، خواہ وہ عَمالِقہ میں سے کتنا ہی موٹا تازہ آدمی کیوں نہ ہو۔ یہ کام تو آج کل کا جٹ طیارہ بھی انجام دینے پر قادر نہیں ہے۔ مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے کہ تخت کہیں جنگل میں رکھا ہو اور اسے اُٹھا لایا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تخت ایک ملکہ کے محل میں تھا جس پر یقیناً پہرے دار متعین ہوں گے اور وہ ملکہ کی غیر موجودگی میں ضرور محفوظ جگہ رکھا گیا ہوگا۔ انسان جا کر اٹھا لانا چاہتا تو اس کے ساتھ ایک چھاپا مار دستہ ہونا چاہیے تھا کہ لڑ بھڑ کر اسے پہرے داروں سے چھین لائے۔ یہ سب کچھ آخر دربار برخاست ہونے سے پہلے کیسے ہو سکتا تھا۔ اس چیز کا تصور اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک حقیقی جِنّ ہی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔

۴۶ – یعنی آپ مجھ پر یہ بھروسا کر سکتے ہیں کہ میں اسے خود اُڑا نہ لے جاؤں گا، یا اس میں سے کوئی قیمتی چیز نہ چُرا لوں گا۔

۴۷ – اس شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کون تھا، اور اس کے پاس وہ کس خاص قسم کا علم تھا، اور اس کتاب سے کون سی کتاب مراد ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ ان اُمور کی کوئی وضاحت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیثِ صحیح میں۔ مفسرین میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ کوئی انسان تھا۔ پھر اُس انسان کی شخصیت کے تعیُّن میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہے۔ کوئی آصَف بن بَرخیاہ (Asaf-B-Barchiah) کا نام لیتا ہے جو یہودی ربّیوں کی رِوایات کے مطابق رئیس الرِّجال (Prince of Men) تھے، کوئی کہتا ہے کہ وہ حضرت خِضرؑ تھے، کوئی کسی اَور کا نام لیتا ہے، اور امام رازیؒ کو اصرار ہے کہ وہ خود حضرت سلیمانؑ تھے، لیکن ان میں سے کسی کا بھی کوئی قابلِ اعتماد ماخذ نہیں ہے، اور امام رازیؒ کی بات تو قرآن کے سِیاق و سَباق سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح کتاب کے بارے میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور کوئی کتابِ شریعت مراد لیتا ہے۔ لیکن یہ سب محض قیاسات ہیں۔ اور ایسے ہی قیاسات اُس علم کے بارے میں بھی بلا دلیل و ثبوت قائم کر لیے گئے ہیں جو کتاب سے اس شخص کو حاصل تھا۔ ہم صرف اُتنی ہی بات جانتے اور مانتے ہیں جتنی قرآن میں فرمائی گئی ہے، یا جو اس کے الفاظ سے مُترشّح ہوتی ہے۔ وہ شخص بہرحال جِنّ کی نوع میں سے نہ تھا،

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبِّیْ ﵞ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۝۴۰ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ

ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں۔[۴۸] اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"[۴۹]

سلیمانؑ نے کہا: "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں[۵۰]

اور بعید نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہو۔ اس کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا اور وہ اللہ کی کسی کتاب (اَلْكِتٰب) سے ماخوذ تھا۔ جنّ اپنے وجود کی طاقت سے اس تخت کو چند گھنٹوں میں اُٹھا لانے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ یہ شخص علم کی طاقت سے اس کو ایک لحظے میں اُٹھا لایا۔

۴۸ - قرآن مجید کا اندازِ بیان اس معاملے میں بالکل صاف ہے کہ اُس دیو ہیکل جنّ کے دعوے کی طرح اِس شخص کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نہ رہا بلکہ فی الواقع جس وقت اس نے دعویٰ کیا، اسی وقت ایک ہی لحظے میں وہ تخت حضرت سلیمانؑ کے سامنے رکھا نظر آیا۔ ذرا اِن الفاظ پر غور کیجیے:

"اس شخص نے کہا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لے آتا ہوں۔ جونہی کہ سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس رکھا دیکھا۔"

جو شخص بھی واقعے کے عجیب و غریب ہونے کا تصور ذہن سے نکال کر بجائے خود اس عبارت کو پڑھے گا، وہ اس سے یہی مفہوم لے گا کہ اس شخص کے یہ کہتے ہی دوسرے لمحے میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس کا اس نے دعویٰ کیا تھا۔ اس سیدھی سی بات کو خواہ مخواہ تاویل کے خراد پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر تخت کو دیکھتے ہی حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں" اسی صورت میں برمحل ہو سکتا ہے جب کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو۔ ورنہ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ ان کا ایک ہوشیار ملازم ملکہ کے لیے جلدی سے ایک تخت بنا لایا یا بنوا لایا، تو ظاہر ہے کہ یہ ایسی کوئی نادر بات نہ ہو سکتی تھی کہ اس پر حضرت سلیمانؑ بے اختیار ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ پکار اُٹھتے اور ان کو یہ خطرہ لاحق ہو جاتا کہ اتنے جلدی مہمانِ عزیز کے لیے تخت تیار ہو جانے سے کہیں مَیں شاکرِ نعمت بننے کے بجائے کافرِ نعمت نہ بن جاؤں۔ آخر اتنی سی بات پر کسی مومن فرماں روا کو اتنا غرور اور کبرِ نفس لاحق ہو جانے کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے، خُصوصاً جب کہ وہ ایک معمولی مومن نہ ہو بلکہ اللہ کا نبی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکتے کس طرح اُٹھ کر آ گیا، تو اس کا مختصر

اَتَهۡتَدِيۡۤ اَمۡ تَكُوۡنُ مِنَ الَّذِيۡنَ لَا يَهۡتَدُوۡنَ ۝۴۱ فَلَمَّا جَآءَتۡ

وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔"[۵۰] ملکہ جب حاضر ہوئی

جواب یہ ہے کہ زمان و مکان اور مادّہ و حرکت کے جو تصوّرات ہم نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر قائم کیے ہیں، ان کے جملہ حُدود و صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حُدود سے محدود ہے۔ اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار، سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیّاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے۔ جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آ گئی ہے، اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکۂ سَبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔ آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المَقدِس لے بھی گیا اور واپس بھی لے آیا۔

۴۹ – یعنی وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی خدائی میں کسی کی شکر گزاری سے نہ ذرہ برابر کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری و احسان فراموشی سے یک سرِ مُو کوئی کمی آتی ہے۔ وہ آپ اپنے ہی بل بُوتے پر خدائی کر رہا ہے، بندوں کے ماننے یا نہ ماننے پر اس کی خدائی منحصر نہیں ہے۔ یہی بات قرآنِ مجید میں ایک جگہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نقل کی گئی ہے کہ اِنۡ تَكۡفُرُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝ "اگر تم اور ساری دنیا والے مل کر بھی کفر کریں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔" (ابراہیم، آیت ۸) اور یہی مضمون اس حدیثِ قُدسی کا ہے جو صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے کہ:

یقول اللہ تعالیٰ یا عبادی لو ان اوّلکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب رجل منکم ما زاد ذٰلك فی ملکی شیئا۔ یا عبادی لو ان اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علیٰ افجر قلب رجل منکم ما نقص ذٰلك فی ملکی شیئا۔ یا عبادی انما ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا۔ فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذٰلك فلا یلومن الا نفسه۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک تم سب اِنس اور جن اپنے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہ ہو جائے گا۔ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک تم سب اِنس اور جن اپنے سب سے زیادہ بدکار شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو میری بادشاہی میں اس سے کوئی کمی نہ ہو جائے گی۔ اے میرے بندو! یہ تمھارے اپنے اعمال ہی ہیں جن کا میں تمھارے حساب میں شمار کرتا ہوں، پھر ان کی پوری پوری جزا تمھیں دیتا ہوں۔ پس جسے کوئی بھلائی نصیب ہو اسے چاہیے کہ اللہ کا شکر ادا کرے، اور جسے کچھ اور نصیب ہو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

۵۰ – بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ ملکہ کیسے بیت المَقدِس پہنچی اور کس طرح اس کا استقبال ہُوا۔ اسے چھوڑ کر اب اُس وقت کا حال بیان کیا جا رہا ہے جب وہ حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کے لیے ان کے محل میں پہنچ گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قِيۡلَ اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ ؕ قَالَتۡ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوۡتِيۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهَا وَكُنَّا مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتۡ تَّعۡبُدُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا

تو اس سے کہا گیا: ''کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟'' وہ کہنے لگی: ''یہ تو گویا وہی ہے۔[۵۲] ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سرِ اطاعت جھکا دیا تھا (یا ہم مسلم ہو چکے تھے)۔[۵۳]'' اُس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ اُن معبودوں کی عبادت تھی جنھیں وہ اللہ کے سوا پُوجتی تھی، کیونکہ وہ

۵۱ – ذومعنیٰ فقرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ یکایک اپنے ملک سے اتنی دُور اپنا تخت موجود پا کر یہ سمجھ جاتی ہے یا نہیں کہ یہ اسی کا تخت اُٹھا لایا گیا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ وہ اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر ہدایت پاتی ہے یا اپنی گمراہی پر قائم رہتی ہے۔

اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اس تخت پر قبضہ کرنے کی نیت رکھتے تھے۔ یہاں وہ خود اس مقصد کا اظہار فرما رہے ہیں کہ انھوں نے یہ کام ملکہ کی ہدایت کے لیے کیا تھا۔

۵۲ – اس سے ان لوگوں کے خیالات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جنھوں نے صورتِ واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ گویا حضرت سلیمانؑ اپنی مہمان ملکہ کے لیے ایک تخت بنوانا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انھوں نے ٹینڈر طلب کیے، ایک ہٹے کٹے کاریگر نے کچھ زیادہ مدت میں تخت بنا دینے کی پیش کش کی، مگر ایک دوسرے ماہر اُستاد نے کہا: میں تُرت پُھرت بنائے دیتا ہوں۔ اس سارے نقشے کا تار و پود اس بات سے بکھر جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خود ملکہ ہی کا تخت لانے کے لیے فرمایا تھا (اَيُّكُمۡ يَاۡتِيۡنِيۡ بِعَرۡشِهَا)، اور اس کی آمد پر اپنے ملازموں کو اسی کا تخت انجان طریقے سے اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا تھا (نَكِّرُوۡا لَهَا عَرۡشَهَا)، پھر جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے (اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ) اور اس نے کہا: گویا یہ وہی ہے (كَاَنَّهٗ هُوَ)۔ اس صاف بیان کی موجودگی میں اُن لاطائل تاویلات کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک رہے تو بعد کا فقرہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

۵۳ – یعنی یہ معجزہ دیکھنے سے پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے جو اوصاف اور حالات ہمیں معلوم ہو چکے تھے، ان کی بنا پر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، محض ایک سلطنت کے فرمانروا نہیں ہیں۔ تخت کو دیکھنے اور ''گویا یہ وہی ہے'' کہنے کے بعد اس فقرے کا اضافہ کرنے میں آخر کیا معنویت باقی رہ جاتی ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کے لیے ایک تخت بنوا کر رکھ دیا تھا؟ بالفرض اگر وہ تخت ملکہ کے تخت سے مشابہ ہی تیار کرا لیا گیا ہو تب بھی اس میں آخر وہ کیا کمال ہو سکتا تھا کہ ایک آفتاب پرست ملکہ اسے دیکھ کر یہ بول اُٹھتی کہ

كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۭ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ

ایک کافر قوم سے تھی۔[54]

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اُترنے کے لیے اس نے اپنے پائینچے اُٹھالیے۔ سلیمانؑ نے کہا: "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔"[55] اس پر وہ پکار اُٹھی: "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ

اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ "ہم کو پہلے ہی علم نصیب ہو گیا تھا اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔"

۵۴ – یہ فقرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ یعنی اس میں ضد اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ وہ اس وقت تک صرف اس لیے کافر تھی کہ کافر قوم میں پیدا ہوئی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس کو جس چیز کے آگے سجدہ ریز ہونے کی عادت پڑی ہوئی تھی، بس وہی اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ سے سابقہ پیش آنے پر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس رکاوٹ کے ہٹ جانے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔

۵۵ – یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمانؑ کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت ہدیوں کو رد کرنا تھا، جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمانؑ کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوتِ حق کا علم ہُوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے، اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ "ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔" چوتھی چیز اس عظیم الشان تخت کا آناً فاناً مآرب سے بیت المقدس پہنچ جانا تھا، جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش و تنعّم رکھتا ہے اور ایسے شان دار محل میں رہتا ہے، وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے، کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے، اور اس کی زندگی فریفتگانِ حیاتِ دُنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اُٹھنے پر مجبور کر دیا جو آگے اس کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا

ع ۳

اللہ ربّ العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔"[۵۶] ع

اور[۵۷] ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی

۵۶ – حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سَبا کا یہ قصّہ بائبل کے عہدِ عتیق و جدید اور رِوایاتِ یہود، سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ عہدِ عتیق میں اس قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

"اور جب سَبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اُسے آزمائے۔ اور وہ بہت بڑی جلَو کے ساتھ یروشلم میں آئی...... جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اُس نے اُن سب باتوں کے بارے میں، جو اُس کے دل میں تھیں، اُس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اُس کے سب سوالوں کا جواب دیا...... اور جب سَبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اُس محل کو جو اس نے بنایا تھا، اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نِشَست، اور اس کے خادموں کی حاضر باشی، اور ان کی پوشاک، اور اس کے ساقیوں، اور اس سیڑھی کو، جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچّی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تَو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا۔ اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا، کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اُس شہرت سے، جو میں نے سنی، بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حُضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو، جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا ہے...... اور اُس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قِنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے، اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے...... اور سلیمان بادشاہ نے سَبا کی ملکہ کو سب کچھ، جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اُس نے مانگا، دیا...... پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لَوٹ گئی۔" (۱-سلاطین ۱۰: ۱-۱۳۔ اسی سے ملتا جُلتا مضمون ۲-تواریخ ۹: ۱-۱۲ میں بھی ہے)۔

عہدِ جدید میں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکۂ سَبا کے متعلق منقول ہوا ہے:

"دکّھن کی ملکہ عدالت کے دن اِس زمانے کے لوگوں کے ساتھ اُٹھ کر اِن کو مجرم ٹھیرائے گی، کیونکہ وہ دُنیا کے کنارے سے سلیمانؑ کی حکمت سننے کو آئی، اور دیکھو، یہاں وہ ہے جو سلیمانؑ سے بھی بڑا ہے۔" (متّی ۱۲: ۴۲۔ لُوقا ۱۱: ۳۱)

اللّٰہَ فَاِذَا ھُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ

کرو، تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔[58] صالحؑ نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے

یہودی ربّیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سَبا کا قصّہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعے سے خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اُس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گراتا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزرا کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اُترنے کے لیے پائینچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہُوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اُٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخرکار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکۂ سَبا کے ساتھ، معاذ اللہ، زِنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بُخْتِ نَصَّر پیدا ہُوا جس نے بیت المَقدِس کو تباہ کیا۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، صفحہ ۴۴۳) اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علما کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۳۹-۴۴۱) اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائبل انھیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ، احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہوگیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا، اور جو خدا کے سوا دوسرے معبُودوں کی طرف مائل ہوگیا۔ (۱-سلاطین، ۱۱:۱-۱۱) ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا، اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

۵۷ – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ھود، ۶۱ تا ۶۸۔ الشعراء، ۱۴۱ تا ۱۵۹۔ القمر، ۲۳ تا ۳۲۔ الشمس، ۱۱-۱۵۔

۵۸ – یعنی جونہی کہ حضرت صالحؑ کی دعوت کا آغاز ہوا، ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا۔ اور اس تفرقے کے ساتھ ہی ان کے درمیان کش مکش شروع ہوگئی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ ○ "اس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے، انھوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا
بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾

پہلے بُرائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟[59] کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے؟" انھوں نے کہا: "ہم نے تو تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔"[60] صالحؑ نے جواب دیا: "تمھارے نیک و بدشگون کا سرِرشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔"[61]

ان لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، جو اُن میں سے ایمان لائے تھے، کہا: کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لے کر وہ بھیجے گئے ہیں۔ ان متکبّرین نے کہا: جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، اس کے ہم کافر ہیں۔" (الاعراف، آیات ۷۵-۷۶) یاد رہے کہ ٹھیک یہی صورتِ حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کے ساتھ مکے میں بھی پیدا ہوئی تھی کہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں گروہوں میں کش مکش شروع ہوگئی۔ اس لیے یہ قصہ آپ سے آپ اُن حالات پر چسپاں ہو رہا تھا جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

۵۹ - یعنی اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی کرتے ہو؟ دوسرے مقام پر قومِ صالح کے سرداروں کا یہ قول نقل ہو چکا ہے کہ یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ "اے صالح! لے آ وہ عذاب ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی رسولوں میں سے ہے۔" (الاعراف، آیت ۷۷)

۶۰ - ان کے اس قول کا ایک مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ تحریک ہمارے لیے سخت منحوس ثابت ہوئی ہے، جب سے تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے دینِ آبائی کے خلاف یہ بغاوت شروع کی ہے، ہم پر آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے، کیونکہ ہمارے معبود ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس معنٰی کے لحاظ سے یہ قول اکثر اُن مشرک قوموں کے اقوال سے مشابہ ہے جو اپنے انبیا کو منحوس قرار دیتی تھیں۔ چنانچہ سورۂ یٰسین میں ایک قوم کا ذکر آتا ہے کہ اس نے اپنے انبیاؑ سے کہا: اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ "ہم نے تم کو منحوس پایا ہے۔" (آیت ۱۸) یہی بات فرعون کی قوم حضرت موسیٰؑ کے متعلق کہتی تھی: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ "جب ان پر کوئی اچھا وقت آتا تو کہتے کہ ہمارے لیے یہی ہے، اور جب کوئی مصیبت آ جاتی تو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کو اس کا ذمہ دار ٹھیراتے۔" (الاعراف، آیت ۱۳۱) قریب قریب ایسی ہی باتیں مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہی جاتی تھیں۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝٤٨
قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا
مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ۝٤٩ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ

اُس شہر میں نو جتھے دار تھے[٦٢] جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انھوں نے آپس میں کہا: "خدا کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی[٦٣] سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں[٦٤]۔" یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی

دوسرا مطلب اس قول کا یہ ہے کہ تمھارے آتے ہی ہماری قوم میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پہلے ہم ایک قوم تھے جو ایک دین پر مجتمع تھی۔ تم ایسے سبز قدم آئے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا اور بیٹا باپ سے کٹ گیا۔ اس طرح قوم کے اندر ایک نئی قوم اُٹھ کھڑی ہونے کا انجام ہمیں اچھا نظر نہیں آتا۔ یہی وہ الزام تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپؐ کے خلاف بار بار پیش کرتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کا آغاز ہوتے ہی سردارانِ قریش کا جو وفد ابو طالب کے پاس گیا تھا، اس نے یہی کہا تھا کہ "اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو جس نے تمھارے دین اور تمھارے باپ دادا کے دین کی مخالفت کی ہے اور تمھاری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور ساری قوم کو بے وقوف قرار دیا ہے۔" (ابنِ ہِشَام، جلد اوّل، ص ۲۸۵) حج کے موقع پر جب کفارِ مکہ کو اندیشہ ہوا کہ باہر کے زائرین آ کر کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر نہ ہو جائیں تو انھوں نے باہم مشورہ کرنے کے بعد یہی طے کیا کہ قبائلِ عرب سے کہا جائے: "یہ شخص جادوگر ہے، اس کے جادو کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بیٹا باپ سے، بھائی بھائی سے، بیوی شوہر سے، اور آدمی اپنے سارے خاندان سے کٹ جاتا ہے۔" (ابنِ ہِشَام، ص ۲۸۹)

٦١ - یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم نے سمجھ رکھی ہے۔ اصل معاملہ جسے اب تک تم نہیں سمجھے ہو، یہ ہے کہ میرے آنے سے تمھارا امتحان شروع ہوگیا ہے۔ جب تک میں نہ آیا تھا، تم اپنی جہالت میں ایک ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ حق اور باطل کا کوئی کھلا امتیاز سامنے نہ تھا۔ کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کا کوئی معیار نہ تھا۔ بدتر سے بدتر لوگ اُونچے ہو رہے تھے، اور اچھی سے اچھی صلاحیتوں کے لوگ خاک میں ملے جا رہے تھے۔ مگر اب ایک کسوٹی آ گئی ہے جس پر تم سب جانچے اور پرکھے جاؤ گے۔ اب بیچ میدان میں ایک ترازو رکھ دیا گیا ہے جو ہر ایک کو اس کے وزن کے لحاظ سے تولے گا۔ اب حق اور باطل آمنے سامنے موجود ہیں۔ جو حق کو قبول کرے گا وہ بھاری اُترے گا، خواہ آج تک اس کی کوڑی بھر بھی قیمت نہ رہی ہو۔ اور جو باطل پر جمے گا اس کا وزن رتی بھر بھی نہ رہے گا، چاہے وہ آج تک امیر الامرا ہی بنا رہا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

انھیں خبر نہ تھی۔[۶۵] اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہُوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ اُن کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے، اس میں ایک نشانِ عبرت ہے

اب فیصلہ اس پر نہیں ہوگا کہ کون کس خاندان کا ہے، اور کس کے ذرائع و وسائل کتنے ہیں، اور کون کتنا زور رکھتا ہے، بلکہ اس پر ہوگا کہ کون سیدھی طرح صداقت کو قبول کرتا ہے اور کون جھوٹ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیتا ہے۔

۶۲ - یعنی ۹ سردارانِ قبائل جن میں سے ہر ایک اپنے ساتھ ایک بڑا جتھا رکھتا تھا۔

۶۳ - یعنی حضرت صالح علیہ السلام کے قبیلے کے سردار سے، جس کو قدیم قبائلی رسم و رواج کے مطابق ان کے خون کے دعوے کا حق پہنچتا تھا۔ یہ وہی پوزیشن تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپؐ کے چچا ابو طالب کو حاصل تھی۔ کفارِ قریش بھی اِسی اندیشے سے ہاتھ روکتے تھے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں گے تو بنی ہاشم کے سردار ابو طالب اپنے قبیلے کی طرف سے خون کا دعویٰ لے کر اُٹھیں گے۔

۶۴ - یہ بعینہٖ اُسی نوعیت کی سازش تھی جیسی مکے کے قبائلی سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سوچتے رہتے تھے، اور بالآخر یہی سازش انھوں نے ہجرت کے موقع پر حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے کی۔ یعنی یہ کہ سب قبیلوں کے لوگ مل کر آپؐ پر حملہ کریں، تاکہ بنی ہاشم کسی ایک قبیلے کو ملزم نہ ٹھیرا سکیں اور سب قبیلوں سے بیک وقت لڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

۶۵ - یعنی قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں شب خون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا، اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اُونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب انھوں نے اُونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انھیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا (فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۰﴾)۔ اس پر شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ صالحؑ کا عذابِ موعود تو آئے چاہے نہ آئے، ہم لگے ہاتھوں اُونٹنی کے ساتھ اس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انھوں نے شب خون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہوگی جس رات عذاب آنا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا، خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔

لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۝۵۲ وَاَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ۝۵۳ وَلُوۡطًا اِذۡ
قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ۝۵۴ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ
شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ۝۵۵ فَمَا كَانَ جَوَابَ

اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔[۶۶] اور بچا لیا ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔

اور لوطؑ[۶۷] کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا: "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟[۶۸] کیا تمھارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو۔[۶۹]" مگر اُس کی قوم کا جواب

---

۶۶ – یعنی جاہلوں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ حضرت صالحؑ اور ان کی اُونٹنی کے معاملے سے اُس زلزلے کا کوئی تعلق نہیں ہے جو قومِ ثمود پر آیا، یہ چیزیں تو اپنے طبیعی اسباب سے آیا کرتی ہیں، اِن کے آنے یا نہ آنے میں اس چیز کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا کہ کون اس علاقے میں نیکوکار تھا اور کون بدکار، اور کس نے کس پر ظلم کیا تھا اور کس نے رحم کھایا تھا، یہ محض واعظانہ ڈھکوسلے ہیں کہ فُلاں شہر یا فُلاں علاقہ فِسق و فُجور سے بھر گیا تھا اس لیے اس پر سیلاب آ گیا، یا زلزلے نے اس کی بستیاں اُلٹ دیں، یا کسی اور بلائے ناگہانی نے اسے تلپٹ کر ڈالا۔ لیکن جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی اندھا بہرا خدا اِس کائنات پر حکومت نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک حکیم و دانا ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے۔ اس کے فیصلے طبیعی اسباب کے غلام نہیں ہیں بلکہ طبیعی اسباب اس کے ارادے کے غلام ہیں۔ اس کے ہاں قوموں کو گرانے اور اٹھانے کے فیصلے اندھا دھند نہیں کیے جاتے بلکہ حکمت اور عدل کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اور ایک قانونِ مُکافات بھی اس کی کتابِ آئین میں شامل ہے، جس کی رُو سے اَخلاقی بنیادوں پر اس دُنیا میں بھی ظالم کیفرِ کردار کو پہنچائے جاتے ہیں۔ ان حقیقتوں سے جو لوگ باخبر ہیں وہ اُس زلزلے کو اسبابِ طبیعی کا نتیجہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ وہ اسے اپنے حق میں تنبیہ کا کوڑا سمجھیں گے۔ وہ اس سے عبرت حاصل کریں گے۔ وہ اُن اَخلاقی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن کی بنا پر خالق نے اپنی پیدا کی ہوئی ایک پھلتی پھولتی قوم کو غارت کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے رَوِیّے کو اُس راہ سے ہٹائیں گے جو اس کا غضب لانے والی ہے اور اس راہ پر ڈالیں گے جو اس کی رحمت سے ہم کنار کرنے والی ہے۔

۶۷ – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، ۷۴ تا ۸۳۔ الحجر، ۵۷ تا ۷۷۔ الانبیاء، ۷۱ تا ۷۵۔ الشعراء، ۱۶۰ تا ۱۷۴۔ العنکبوت، ۲۸ تا ۳۵۔ الصّافّات، ۱۳۳ تا ۱۳۸۔ القمر، ۳۳ تا ۳۹۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝٥٦ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ۝٥٧ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝٥٨ ع

ع ۱۴ / ۱۹

اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا: "نکال دو لُوطؑ کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔" آخر کار ہم نے بچا لیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو، بجز اُس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا، اور برسائی اُن لوگوں پر ایک برسات، بہت ہی بُری برسات تھی وہ اُن لوگوں کے حق میں جو متنبّہ کیے جا چکے تھے ع

۶۸ - اس ارشاد کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تم اِس فعل کے فحش اور کارِ بد ہونے سے ناواقف نہیں ہو، بلکہ جانتے بوجھتے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہو کہ مرد کی خواہشِ نفس کے لیے مرد نہیں پیدا کیا گیا بلکہ عورت پیدا کی گئی ہے، اور مرد و عورت کا فرق بھی ایسا نہیں ہے کہ تمھاری آنکھوں کو نظر نہ آتا ہو، مگر تم کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ جیتی مکھی نگلتے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم علانیَہ یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جب کہ دیکھنے والی آنکھیں تمھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، جیسا کہ آگے سورۂ عنکبوت میں آ رہا ہے: وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ "اور تم اپنی مجلسوں میں برا کام کرتے ہو۔" (آیت ۲۹)

۶۹ - جَہالت کا لفظ یہاں حماقت اور سفاہت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اُردو زبان میں بھی ہم گالی گلوچ اور بے ہودہ حرکات کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ جہالت پر اُتر آیا ہے۔ اسی معنیٰ میں یہ لفظ عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے: وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ (الفرقان، آیت ۶۳) لیکن اگر اس لفظ کو بے علمی ہی کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی ان حرکات کے بُرے انجام کو نہیں جانتے۔ تم یہ تو جانتے ہو کہ یہ ایک لذتِ نفس ہے جو تم حاصل کر رہے ہو۔ مگر تمھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس انتہائی مجرمانہ اور گِھناؤنی لذت چشی کا کیسا سخت خمیازہ تمھیں عنقریب بھگتنا پڑے گا۔ خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم ہو کہ انجام سے بے خبر اپنے اس گندے کھیل میں منہمک ہو۔

۷۰ - یعنی پہلے ہی حضرت لُوطؑ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، کیونکہ اسے اپنی قوم کے ساتھ ہی تباہ ہونا ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

(اے نبیؐ!) کہو: حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے اُن بندوں پر جنھیں اس نے برگزیدہ کیا۔[۷۱]

(اِن سے پُوچھو:) اللہ بہتر ہے یا وہ معبُود جنھیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟[۷۲]

۷۱- یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے اور یہ فقرہ اس کی تمہید ہے۔ اس تمہید سے یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تقریر کا آغاز کس طرح کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والے لوگ ہمیشہ سے اپنی تقریریں اللہ کی حمد اور اس کے نیک بندوں پر سلام سے شروع کرتے رہے ہیں۔ مگر اب اُسے مُلّائیت سمجھا جانے لگا ہے اور موجودہ زمانے کے مسلمان مقررین اس سے کلام کی ابتدا کرنے کا تصور تک اپنے ذہن میں نہیں رکھتے، یا پھر اس میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

۷۲- بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبُودانِ باطل۔ حقیقت کے اعتبار سے تو معبُودانِ باطل میں سرے سے کسی خیر کا سوال ہی نہیں ہے کہ اللہ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رہے مشرکین، تو وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ اللہ کا اور اُن کے معبُودوں کا کوئی مقابلہ ہے۔ لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لیے رکھا گیا کہ وہ اپنی غَلَطی پر مُتَنَبِّہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا میں کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے نزدیک اس میں کسی بھلائی یا فائدے کا خیال نہ رکھتا ہو۔ اب اگر یہ مشرک لوگ اللہ کی عبادت کے بجائے ان معبُودوں کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے، تو یہ اس کے بغیر بالکل بے معنیٰ تھا کہ ان معبُودوں میں کوئی خیر ہو۔ اسی بنا پر ان کے سامنے صاف الفاظ میں یہ سوال رکھا گیا کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا تمھارے یہ معبُود؟ کیونکہ اس دوٹوک سوال کا سامنا کرنے کی ان میں ہمّت نہ تھی۔ ان میں سے کوئی کٹّے سے کٹّا مشرک بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ ہمارے معبُود بہتر ہیں۔ اور یہ مان لینے کے بعد کہ اللہ بہتر ہے، ان کے پورے دین کی بنیاد ڈھے جاتی تھی، اس لیے کہ پھر یہ بات سراسر نامعقول قرار پاتی تھی کہ بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اس طرح قرآن نے تقریر کے پہلے ہی فقرے میں مخالفین کو بے بس کر دیا۔ اس کے بعد اب پے در پے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک ایک کرشمے کی طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس کے ہیں؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ دوسرے آخر کیا ہیں کہ انھیں تم نے معبُود بنا رکھا ہے۔

رِوایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت فرماتے تو فوراً اس کے جواب میں فرماتے:

Maktaba Tul Ishaat.com

الجزء ۲۰

اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے وہ خوش نُما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمھارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (اِن کاموں میں شریک) ہے؟[۷۳] (نہیں)،

بَلِ اللّٰهُ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى وَ اَجَلُّ وَ اَكۡرَمُ، ''نہیں، بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔''

۷۳ – مشرکوں میں سے کوئی بھی اس سوال کا یہ جواب نہ دے سکتا تھا کہ یہ کام اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ان میں شریک ہے۔ قرآنِ مجید دوسرے مقامات پر کفارِ مکہ اور مشرکینِ عرب کے متعلق کہتا ہے: وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ۙ ''اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اُس زبردست، علم والے نے ہی ان کو پیدا کیا ہے۔'' (الزُّخرُف، آیت ۹) وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ''اور اگر ان سے پوچھو کہ خود انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' (الزُّخرُف، آیت ۸۷) وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِهَا لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ ''اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔'' (العنکبوت، آیت ۶۳) قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ...... وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ ۚ ''ان سے پوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون جان دار کو بے جان میں سے اور بے جان کو جان دار میں سے نکالتا ہے؟ کون اس نظامِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔'' (یونس، آیت ۳۱) عرب کے مشرکین ہی نہیں، دُنیا بھر کے مشرکین بالعموم یہی مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اور نظامِ کائنات کا مدبّر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کے اس سوال کا یہ جواب اُن میں سے کوئی شخص ہٹ دھرمی کی بنا پر برائے بحث بھی نہ دے سکتا تھا کہ ہمارے معبُود خدا کے ساتھ اِن کاموں میں شریک ہیں، کیونکہ اگر وہ ایسا کہتا تو اس کی اپنی ہی قوم کے ہزارہا آدمی اس کو جھٹلا دیتے اور صاف کہتے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریّت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اِسی پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اُگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ
خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ

بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار[74] بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے[75]؟

کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر ٹھیک وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اُٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے، کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانش مندانہ تدبیر اور غالب قدرت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزارہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رُونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی، جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو، اسے ایک امرِ اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔

۷۴ – زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کُرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مُطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کُرہ فضائے بسیط میں معلّق ہے، کسی چیز پر ٹِکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آ جانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں، تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کُرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چُھپتا ہے، جس سے رات اور دن کا اختلاف رُونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی، کیونکہ ایک رُخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی اور دوسرے رُخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کُرے پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف رِدّا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوف ناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب، جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ
اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔

کون ہے جو بے قرار کی دُعا سنتا ہے جب کہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟[۷۵] اور (کون ہے جو) تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟[۷۶] کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام

بادل اُٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے، اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کُرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سرو سامان مفقود ہوتا ہے، وہاں کی زمین کسی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اِس کُرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام اُن اشیا کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لیے اس کُرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو ہوا اور پانی، دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی یہاں دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بہت بڑھ جاتا، بخاراتِ آبی کا اُٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو سکتیں، سردی زیادہ ہوتی، زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے، بلکہ کششِ ثِقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لیے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں، اس کُرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو سورج سے اس کو حرارت کم ملتی، سردی بہت زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے، اور مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا۔ اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جُل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان اُمور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے

اللّٰہِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ
وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔

اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے[۷۸] اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری لے کر بھیجتا ہے[۷۹]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟

کو بنانے اور رُوبعمل لانے میں کسی دیوی دیوتا، یا جن، یا نبی و ولی، یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔

۷۵ – یعنی میٹھے اور کھاری پانی کے ذخیرے، جو اسی زمین پر موجود ہیں، مگر باہم خلط ملط نہیں ہوتے۔ زیرِ زمین پانی کی موتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لے کر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور ان کی دھار سمندر کے پانی سے اس طرح الگ ہوتی ہے کہ بحری مسافر اس میں سے پینے کے لیے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ الفرقان، حاشیہ ۶۸)

۷۶ – مشرکینِ عرب خود اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ مصیبت کو ٹالنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید جگہ جگہ انھیں یاد دلاتا ہے کہ جب تم پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو تم خدا ہی سے فریاد کرتے ہو، مگر جب وہ وقت ٹل جاتا ہے تو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہو۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۹-۴۱۔ جلد دوم، یونس، آیات ۲۱-۲۲، حاشیہ ۳۱۔ النحل، حاشیہ ۴۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۴) اور یہ بات صرف مشرکینِ عرب ہی تک محدود نہیں ہے۔ دُنیا بھر کے مشرکین کا بالعموم یہی حال ہے۔ حتّٰی کہ روس کے منکرینِ خدا جنھوں نے خدا پرستی کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے، اُن پر بھی جب گزشتہ جنگِ عظیم میں جرمن فوجوں کا نرغہ سخت ہو گیا تو انھیں خدا کو پکارنے کی ضرورت محسوس ہو گئی تھی۔

۷۷ – اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم اُٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو زمین میں تصرُّف اور فرمانروائی کے اختیارات عطا کرتا ہے۔

۷۸ – یعنی جس نے ستاروں کے ذریعے سے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ تدبیروں میں سے ایک ہے کہ اس نے بحری اور برّی سفروں میں انسان کی رہنمائی کے لیے وہ ذرائع پیدا کر دیے ہیں جن سے وہ اپنی سَمتِ سفر اور منزلِ مقصود کی طرف اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ دن کے وقت زمین کی مختلف علامتیں اور آفتاب کے طُلوع و غروب کی سَمتیں اس کی مدد کرتی ہیں اور تاریک راتوں میں تارے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احسانات میں شمار کیا گیا ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے[80]؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے[81]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ (آیت ۱٦)

۷۹ – رحمت سے مراد ہے بارش، جس کے آنے سے پہلے ہوائیں اس کی آمد آمد کی خبر دے دیتی ہیں۔

۸۰ – یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے، اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دُور تک اُترتا جاتا ہے، اتنے ہی وجودِ الٰہ اور وحدتِ الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھیے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اِس وقت تک مسلَّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادّے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہوسکتی۔ حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں، ان سب کا ٹھیک تناسُب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (law of chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (laboratories) میں بے جان مادّے سے جان دار مادّہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے، وہ صرف وہ مادّہ ہے جسے اصطلاح میں D.N.A کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادّہ ہے جو زندہ خَلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ حیات تو ضرور ہے مگر خود جان دار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے۔ زندگی محض ایک مجرّد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار مُتنوّع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک رُوئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتا چلا ہے۔ یہ لاکھوں انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیّات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیّہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوّع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں

کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیّات کا ڈھانچا توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ مُتحجّرات (fossils) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے، اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خُنثیٰ مُشکَل کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق البارئ المصوّر ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں مُتنوّع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اِعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد وحساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج وخصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسُل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسُل (genetics) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خُصوصیات کی حامل ہو، اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں مُمیّز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسُل کا سامان ہر پودے کے ایک خَلیّے (cell) کے ایک حصّے میں ہوتا ہے، جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خُردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینیر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نَشو ونَما کو حتماً اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانے سے آج تک جتنے پودے بھی دُنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انھوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رُونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جَو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصوُّر وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے، جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اُسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالُد وتناسُل کے اس خُردبینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصّے میں لیے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عُضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پُر پیچ عملیات (progresses) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخمِ تناسُل اُسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے دُرست طریقے پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حیّ وقیّوم کی طالب ہے جو ایک لحظے کے لیے بھی اِن کارخانوں کی نگرانی ورہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق

Maktaba Tul Ishaat.com

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔[۸۲]

اِن سے کہو: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔[۸۳] اور وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔[۸۴]

یہ گمان کرسکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ، یا جن، یا نبی، یا ولی ذرہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے۔ اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصب سے پاک ہوکر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اِس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جارہا ہے۔

۸۱ – رزق دینے کا معاملہ بھی اُتنا سادہ نہیں ہے جتنا سرسری طور پر ان مختصر سے الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص محسوس کرتا ہے۔ اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات کی اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں، اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے اور ہر ایک کی دسترس کے اِس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے۔ پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جُل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ گرمی، روشنی، ہوا، پانی اور زمین کے مختلف الاقسام مادّوں کے درمیان اگر ٹھیک تناسُب کے ساتھ تعاون نہ ہو تو غذا کا ایک ذرّہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ کون شخص تصوّر کرسکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبّر کی تدبیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر یونہی اتفاقاً ہوسکتا تھا؟ اور کون اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ خیال کرسکتا ہے کہ اس انتظام میں کسی جن، یا فرشتے، یا کسی بزرگ کی روح کا کوئی دخل ہے؟

۸۲ – یعنی یا تو اس بات پر دلیل لاؤ کہ ان کاموں میں واقعی کوئی اور بھی شریک ہے، یا نہیں تو پھر کسی معقول دلیل سے یہی بات سمجھا دو کہ یہ سارے کام تو ہوں صرف ایک اللہ کے، مگر بندگی و عبادت کا حق پہنچے اُس کے سوا کسی اور کو، یا اس کے ساتھ کسی اور کو بھی۔

۸۳ – اُوپر تخلیق، تدبیر اور رزّاقی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے الٰہِ واحد (یعنی اکیلے خدا اور اکیلے مستحقِ عبادت) ہونے پر استدلال کیا گیا تھا۔ اب خدائی کی ایک اور اہم صفت، یعنی علم کے لحاظ سے بتایا جارہا ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ لاشریک ہے۔ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا جن یا انبیا اور اولیا یا دوسرے انسان اور غیر انسان، سب کا علم محدود ہے۔ سب سے کچھ نہ کچھ پوشیدہ ہے۔ سب کچھ جاننے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، جس سے اس کائنات کی کوئی چیز اور کوئی بات پوشیدہ نہیں، جو ماضی و حال اور مستقبل سب کو جانتا ہے۔

غیب کے معنی مخفی، پوشیدہ اور مستور کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو معلوم نہ ہو، جس تک

ذرائعِ معلومات کی رسائی نہ ہو۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بحیثیتِ مجموعی پوری نوعِ انسانی کے علم میں نہ کبھی تھیں، نہ آج ہیں، نہ آیندہ کبھی آئیں گی۔ ایسا ہی معاملہ جنّوں اور فرشتوں اور دوسری مخلوقات کا ہے کہ بعض چیزیں ان میں سے کسی سے مخفی اور کسی کو معلوم ہیں، اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ان سب سے مخفی ہیں اور کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ تمام اقسام کے غیب صرف ایک ذات پر روشن ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز غیب نہیں، سب شہادت ہی شہادت ہے۔

اس حقیقت کو بیان کرنے میں سوال کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو اوپر تخلیق و تدبیر کائنات اور رزّاقی کے بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن صفات کے آثار تو بالکل نمایاں ہیں جنھیں ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور ان کے بارے میں کفار و مشرکین تک یہ مانتے تھے اور مانتے ہیں کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اس لیے وہاں طرزِ استدلال یہ تھا کہ جب یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں اور کوئی ان میں اس کا شریک نہیں ہے، تو پھر خدائی میں تم نے دوسروں کو کیسے شریک بنالیا اور عبادت کے مستحق وہ کس بنا پر ہو گئے؟ لیکن علم کی صفت اپنے کوئی محسوس آثار نہیں رکھتی جن کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ یہ معاملہ صرف غور و فکر ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس لیے اس کو سوال کے بجائے دعوے کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ہر صاحبِ عقل کا کام ہے کہ وہ اپنی جگہ اس امر پر غور کرے کہ فی الحقیقت کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب ہو؟ یعنی تمام اُن احوال اور اشیا اور حقائق کا جاننے والا ہو جو کائنات میں کبھی تھیں، یا اب ہیں، یا آیندہ ہوں گی۔ اور اگر کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا تو پھر کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ جو لوگ پوری طرح حقائق اور احوال سے واقف ہی نہیں ہیں، ان میں سے کوئی بندوں کا فریاد رس اور حاجت رَوا اور مشکل کشا ہو سکے؟

اُلوہیت اور علم غیب کے درمیان ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں بھی خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے، اُس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا انسان کا ذہن اِس حقیقت سے بالکل بدیہی طور پر آگاہ ہے کہ قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا، دعاؤں کا سننا، حاجتیں پوری کرنا اور ہر طالبِ امداد کی مدد کو پہنچنا صرف اُسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو سب کچھ جانتی ہو اور جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ ہو۔ اِسی بنا پر تو انسان جس کو بھی خدائی اختیارات کا حامل سمجھتا ہے اُسے لازماً عالم الغیب بھی سمجھتا ہے، کیونکہ اس کی عقل بلا ریب شہادت دیتی ہے کہ علم اور اختیارات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ خالق اور مدبِّر اور مجیب الدعوات اور رازق خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، جیسا کہ اُوپر کی آیات میں ثابت کیا گیا ہے، تو آپ سے آپ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم الغیب بھی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ آخر کون اپنے ہوش و حواس میں یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی فرشتے یا جن یا نبی یا ولی کو، یا کسی مخلوق کو بھی یہ معلوم ہو گا کہ سمندر میں، اور ہوا میں، اور زمین کی تہوں میں، اور سطحِ زمین کے اُوپر کس کس قسم کے کتنے جانور کہاں کہاں ہیں؟ اور عالَمِ بالا کے بے حدّ و حساب سیّاروں کی ٹھیک تعداد کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک میں کس کس طرح کی مخلوقات موجود ہیں؟ اور ان مخلوقات کا ایک ایک فرد کہاں ہے اور کیا اس کی ضروریات ہیں؟

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ سب کچھ اللہ کو تو لازماً معلوم ہونا چاہیے، کیونکہ اس نے انھیں پیدا کیا ہے، اور اسی کو ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کے حالات کی نگہبانی کرنی ہے، اور وہی ان کے رزق کا انتظام کرنے والا ہے۔ لیکن دوسرا کوئی اپنے محدود وجود میں یہ وسیع و محیط علم رکھ کیسے سکتا ہے، اور اس کا کیا تعلق اِس کارِ خلّاقی و رزّاقی سے ہے کہ وہ اِن چیزوں کو جانے؟

پھر یہ صفت قابلِ تجزیہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بندہ مثلاً صرف زمین کی حد تک، اور زمین میں بھی صرف انسانوں کی حد تک عالم الغیب ہو۔ یہ اُسی طرح قابلِ تجزیہ نہیں ہے جس طرح خدا کی خلّاقی و رزّاقی اور قیّومی و پروردگاری قابلِ تجزیہ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انسان دُنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور قیامت تک پیدا ہوں گے، رحمِ مادر میں استقرار کے وقت سے آخری ساعتِ حیات تک ان سب کے تمام حالات و کیفیات کو جاننا آخر کس بندے کا کام ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیسے اور کیوں اس کو جانے گا؟ کیا وہ اِس بے حد و حساب خلقت کا خالق ہے؟ کیا اس نے ان کے باپوں کے نطفے میں ان کے جرثومے کو وجود بخشا تھا؟ کیا اس نے ان کی ماؤں کے رحم میں ان کی صورت گری کی تھی؟ کیا اس نے ان کی زندہ ولادت کا انتظام کیا تھا؟ کیا اس نے ان میں سے ایک ایک شخص کی قسمت بنائی تھی؟ کیا وہ ان کی موت اور حیات، ان کی صحت اور مرض، ان کی خوش حالی اور بدحالی، اور ان کے عُروج اور زوال کے فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہے؟ اور آخر یہ کام کب سے اس کے ذمے ہُوا؟ اس کی اپنی ولادت سے پہلے یا اس کے بعد؟ اور صرف انسانوں کی حد تک یہ ذمہ داریاں محدود کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ کام تو لازماً زمین اور آسمانوں کے عالم گیر انتظام کا ایک جُز ہے۔ جو ہستی ساری کائنات کی تدبیر کر رہی ہے، وہی تو انسان کی پیدایش و موت اور ان کے رزق کی تنگی و کشادگی اور ان کی قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور جس قدر چاہے اپنی معلومات کا کوئی گوشہ کھول دے، اور کسی غیب یا بعض غیوب کو اس پر روشن کر دے، لیکن علمِ غیب بحیثیتِ مجموعی کسی کو نصیب نہیں اور عالم الغیب ہونے کی صفت صرف اللہ رب العالمین کے لیے مخصوص ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ”اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں کوئی نہیں جانتا اُس کے سوا۔“ (الانعام، آیت ۵۹) اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ”اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش نازل کرنے والا ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا (پرورش پا رہا) ہے۔ اور کوئی مُتنفّس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی مُتنفّس کو خبر نہیں ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی۔“ (لقمان، آیت ۳۴) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ ”وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اور اس کے علم میں سے کسی چیز پر بھی وہ احاطہ نہیں کر سکتے، اِلّا یہ کہ وہ جس چیز کا چاہے انھیں علم دے۔“ (البقرہ، آیت ۲۵۵)

قرآنِ مجید مخلوقات کے لیے علمِ غیب کی اس عام اور مُطلَق نفی پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ خاص طور پر انبیا علیہم السلام

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۟ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۟ بَلْ هُمْ
مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝٦٦ ع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ

بلکہ آخرت کا تو علم ہی اِن لوگوں سے گُم ہوگیا ہے، بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے ہیں ۸۵ ع یہ منکرین کہتے ہیں: "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے

اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس امر کی صاف صاف تصریح کرتا ہے کہ وہ عالم الغیب نہیں ہیں اور اُن کو غیب کا صرف اُتنا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے جو رسالت کی خدمت انجام دینے کے لیے درکار تھا۔ سورۂ انعام، آیت ۵۰۔ الاعراف، آیت ۱۸۷۔ التوبہ، آیت ۱۰۱۔ ھود، آیت ۳۱۔ اَحزاب، آیت ۶۳۔ الاحقاف، آیت ۹۔ التحریم، آیت ۳۔ اور الجن، آیات ۲۶ تا ۲۸ اِس معاملے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں چھوڑتیں۔

قرآن کی یہ تمام تصریحات زیرِ بحث آیت کی تائید و تشریح کرتی ہیں، جن کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجایش نہیں رہتی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ کوئی دوسرا بھی جمیع ما کان وما یکون کا علم رکھتا ہے، قطعاً ایک غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ شیخین، ترمذی، نَسائی، امام احمد، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے صحیح سندوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من زعم انه (ای النبی صلی اللّٰہ علیه وسلّم) یعلم ما یکون فی غد فقد اعظم علی اللّٰہ الفریة واللّٰہ یقول قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یعنی "جس نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے، اس نے اللہ پر سخت جھوٹ کا الزام لگایا، کیونکہ اللہ تو فرماتا ہے: اے نبی! تم کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہے۔" ابن المُنذِر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگرد عِکرِمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "اے محمدؐ! قیامت کب آئے گی؟ اور ہمارے علاقے میں قحط برپا ہے، بارش کب ہوگی؟ اور میری بیوی حاملہ ہے، وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں نے آج کیا کمایا ہے، کل میں کیا کماؤں گا؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں، مروں گا کہاں؟" ان سوالات کے جواب میں سورۂ لقمان کی وہ آیت حضورؐ نے سنائی جو اُوپر ہم نے نقل کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ...... پھر بخاری و مسلم اور دوسری کُتبِ حدیث کی وہ مشہور روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے جس میں ذکر ہے کہ صحابہؓ کے مجمع میں حضرت جبریلؑ نے انسانی شکل میں آ کر حضورؐ سے جو سوالات کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے جواب دیا: ما المسئول عنها باعلم من السائل (جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا)۔ پھر فرمایا: یہ اُن پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور یہی مذکورہ بالا آیت حضورؐ نے تلاوت فرمائی۔

۸۴ - یعنی دوسرے، جن کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہیں، اور اسی بنا پر جن کو تم لوگوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَءِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا

تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آبا و اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں، مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سُنتے چلے آرہے ہیں۔" کہو: ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ

خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے، اُن بیچاروں کو تو خود اپنے مستقبل کی بھی خبر نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کب قیامت کی وہ گھڑی آئے گی جب اللہ تعالیٰ اُن کو دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے گا۔

۸۵ - اُلوہیّت کے بارے میں ان لوگوں کی بنیادی غلطیوں پر مُتنبّہ کرنے کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جو ان شدید گمراہیوں میں پڑے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد یہ کسی دلیل و برہان سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خدائی میں درحقیقت کچھ دوسری ہستیاں اللہ تعالیٰ کی شریک ہیں۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر ہی نہیں کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں، یا اس کی طرف سے شک میں ہیں، یا اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں، اس لیے فکرِ عُقبٰی سے بے نیازی نے ان کے اندر سراسر ایک غیر ذمہ دارانہ رَویّہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی سنجیدگی رکھتے ہی نہیں۔ اِن کو اس کی پروا ہی نہیں ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اِن کا فلسفۂ حیات اُس حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک آخرکار مشرک اور دہریے اور موحّد اور مُشکّک سب کو مر کر مٹی ہو جانا ہے اور کسی چیز کا بھی کوئی نتیجہ نکلنا نہیں ہے۔

آخرت کا یہ مضمون اس سے پہلے کی آیت کے اِس فقرے سے نکلا ہے کہ "وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔" اُس فقرے میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ جن کو معبُود بنایا جاتا ہے ـــــ اور ان میں فرشتے، جِنّ، انبیاؑ اور اولیا سب شامل تھے ـــــ ان میں سے کوئی بھی آخرت کے وقت سے واقف نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے بعد اب عام مشرکین و کفار کے بارے میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں: اوّل یہ کہ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ آخرت کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ بے خبری اس بنا پر نہیں ہے کہ انھیں اس کی اطلاع ہی کبھی نہ دی گئی ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ جو خبر انھیں دی گئی، اس پر انھوں نے یقین نہیں کیا بلکہ اس کی صحّت میں شک کرنے لگے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے کبھی غور و خوض کر کے اُن دلائل کو جانچنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی جو آخرت کے وقوع کے بارے میں پیش کیے گئے، بلکہ اس کی طرف سے اندھے بن کر رہنے ہی کو انھوں نے ترجیح دی۔

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ

مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔[86] اے نبیؐ! اِن کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ اِن کی چالوں پر

۸۶ - اس مختصر سے فقرے میں آخرت کی دو زبردست دلیلیں بھی ہیں اور نصیحت بھی۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی آخرت کو نظر انداز کیا ہے، وہ مجرم بنے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ وہ غیر ذمہ دار بن کر رہیں، انھوں نے ظلم و ستم ڈھائے، وہ فِسق و فجور میں غرق ہوگئیں، اور اَخلاق کی تباہی نے آخر کار ان کو برباد کر کے چھوڑا۔ یہ تاریخِ انسانی کا مسلسل تجربہ، جس پر زمین میں ہر طرف تباہ شدہ قوموں کے آثار شہادت دے رہے ہیں، صاف ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے ماننے اور نہ ماننے کا نہایت گہرا تعلق انسانی رَوِیّے کی صحت اور عدمِ صحت سے ہے۔ اس کو مانا جائے تو رَوِیّہ دُرست رہتا ہے۔ نہ مانا جائے تو رویّہ غلط ہو جاتا ہے۔ یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اس کا ماننا حقیقت کے مطابق ہے، اسی لیے اس کے ماننے سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے۔ اور اس کا نہ ماننا حقیقت کے خلاف ہے، اسی وجہ سے یہ گاڑی پٹڑی سے اُتر جاتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل تجربے میں مجرم بن جانے والی قوموں کا مسلسل تباہ ہونا اس حقیقت پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ کائنات بے شعور طاقتوں کی اندھی بہری فرماں روائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانونِ مُکافات کام کر رہا ہے۔ جس کی حکومت انسانی قوموں کے ساتھ سراسر اَخلاقی بنیادوں پر معاملہ کر رہی ہے۔ جس میں کسی قوم کو بدکرداریوں کی کُھلی چھوٹ نہیں دی جاتی کہ ایک دفعہ عروج پا جانے کے بعد وہ ابدالآباد تک دادِعیش دیتی رہے اور ظلم و ستم کے ڈنکے بجائے چلی جائے۔ بلکہ ایک خاص حد کو پہنچ کر ایک زبردست ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس کو بامِ عُروج سے گرا کر قعرِ مذلّت میں پھینک دیتا ہے۔ اس حقیقت کو جو شخص سمجھ لے، وہ کبھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ یہی قانونِ مُکافات اِس دُنیوی زندگی کے بعد ایک دوسرے عالَم کا تقاضا کرتا ہے جہاں افراد کا اور قوموں کا اور بحیثیتِ مجموعی پوری نوعِ انسانی کا انصاف چُکایا جائے۔ کیونکہ محض ایک ظالم قوم کے تباہ ہو جانے سے تو انصاف کے سارے تقاضے پورے نہیں ہوگئے۔ اس سے اُن مظلوموں کی تو کوئی داد رسی نہیں ہوئی جن کی لاشوں پر انھوں نے اپنی عظمت کا قصر بنایا تھا۔ اس سے ان ظالموں کو تو کوئی سزا نہیں ملی جو تباہی کے آنے سے پہلے مزے اڑا کر جا چکے تھے۔ اس سے ان بدکاروں پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہوا جو پشت در پشت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے گمراہیوں اور بداَخلاقیوں کی میراث چھوڑتے چلے گئے تھے۔ دُنیا میں عذاب بھیج کر تو صرف اُن کی آخری نسل کے مزید ظلم کا سلسلہ توڑ دیا گیا۔ ابھی عدالت کا اصل کام تو ہُوا ہی نہیں کہ ہر ظالم کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ہر مظلوم کے نقصان کی تلافی کی جائے، اور اُن سب لوگوں کو انعام دیا جائے جو بدی کے اِس طوفان میں راستی پر قائم اور اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور عمر بھر اِس راہ میں اذیتیں سہتے رہے۔ یہ سب لازماً کسی وقت ہونا چاہیے، کیونکہ دُنیا میں قانونِ مُکافات کی مسلسل کارفرمائی کائنات کی فرماں روا حکومت کا یہ مزاج اور طریقۂ کار صاف بتا رہی ہے کہ وہ انسانی اعمال کو ان کی اَخلاقی قدر کے لحاظ سے تولتی اور ان کی جزا و سزا دیتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ۝ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۷۱
قُلۡ عَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ رَدِفَ لَكُمۡ بَعۡضُ الَّذِىۡ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ۝۷۲ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ۝۷۳

دل تنگ ہو[۸۷] ـــــ وہ کہتے ہیں کہ ”یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو“[۸۸]؟ کہو: کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو، اس کا ایک حصّہ تمھارے قریب ہی آ لگا ہو۔[۸۹] حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[۹۰]

ان دو دلیلوں کے ساتھ اس آیت میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ پچھلے مجرموں کا انجام دیکھ کر اس سے سبق لو اور انکارِ آخرت کے اُسی احمقانہ عقیدے پر اصرار نہ کیے چلے جاؤ جس نے اُنھیں مجرم بنا کر چھوڑا تھا۔

۸۷ - یعنی تم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ نہیں مانتے اور اپنی حماقت پر اصرار کر کے عذابِ الٰہی کے مستحق بننا ہی چاہتے ہیں تو تم خواہ مخواہ ان کے حال پر کُڑھ کُڑھ کر اپنی جان کیوں ہلکان کرو۔ پھر یہ حقیقت و صداقت سے لڑنے اور تمھاری اصلاحی کوششوں کو نیچا دکھانے کے لیے جو گھٹیا درجے کی چالیں چل رہے ہیں، اُن پر کبیدہ خاطر ہونے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ تمھاری پشت پر خدا کی طاقت ہے۔ یہ تمھاری بات نہ مانیں گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

۸۸ - اس سے مراد وہی دھمکی ہے جو اُوپر کی آیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس فقرے میں ہماری خبر لینے کی جو در پردہ دھمکی دی جا رہی ہے، یہ آخر کب عمل میں لائی جائے گی؟ ہم تو تمھاری بات رد بھی کر چکے ہیں اور تمھیں نیچا دکھانے کے لیے اپنی تدبیروں میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اب کیوں ہماری خبر نہیں لی جاتی؟

۸۹ - یہ شاہانہ کلام کا انداز ہے۔ قادرِ مُطلق کے کلام میں جب ”شاید“ اور ”کیا عجب“ اور ”کیا بعید ہے“ جیسے الفاظ آتے ہیں تو ان میں شک کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ ان سے شانِ بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی غالب ہے کہ اس کا کسی چیز کو چاہنا اور اس چیز کا ہو جانا گویا ایک ہی بات ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اس لیے اس کا یہ فرمانا کہ ”کیا عجب ایسا ہو“ یہ معنٰی رکھتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اگر تم سیدھے نہ ہوئے۔ ایک معمولی تھانیدار بھی اگر بستی کے کسی شخص سے کہہ دے کہ تمھاری شامت پکار رہی ہے تو اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ کجا کہ قادرِ مطلق کسی سے کہہ دے کہ تمھارا بُرا وقت کچھ دُور نہیں ہے، اور پھر وہ بے خوف رہے۔

۹۰ - یعنی یہ تو اللہ ربّ العالمین کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو قصور سرزد ہوتے ہی نہیں پکڑ لیتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس پر شکر گزار ہو کر اس مہلت کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال نہیں کرتے، بلکہ مواخذے میں دیر ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہاں کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے، اس لیے جو جی میں آئے کرتے رہو اور کسی سمجھانے والے

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعۡلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۝۷۴ وَمَا مِنۡ
غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ۝۷۵ اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ
يَقُصُّ عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَكۡثَرَ الَّذِىۡ هُمۡ فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ۝۷۶

بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں[۹۱]۔ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو[۹۲]۔

یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں[۹۳]،

کی بات مان کر نہ دو۔

۹۱- یعنی وہ اِن کی علانیہ حرکات ہی سے واقف نہیں ہے بلکہ جو شدید بغض اور کینہ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور جو چالیں یہ اپنے دلوں میں سوچتے ہیں، ان سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ اس لیے جب ان کی شامت آنے کا وقت آن پہنچے گا تو کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی جس پر ان کی خبر نہ لی جائے۔ یہ اندازِ بیان اسی طرح کا ہے جیسے ایک حاکم اپنے علاقے کے کسی بدمعاش سے کہے: مجھے تیرے سب کرتوتوں کی خبر ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باخبر ہونے کی اسے اطلاع دے رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آ جا، ورنہ یاد رکھ کہ جب پکڑا جائے گا تو تیرے ایک ایک جرم کی پوری سزا دی جائے گی۔

۹۲- یہاں کتاب سے مراد قرآن نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا وہ ریکارڈ ہے جس میں ذرّہ ذرّہ ثبت ہے۔

۹۳- اس فقرے کا تعلق مضمونِ سابق سے بھی ہے اور مضمونِ مابعد سے بھی۔ مضمونِ سابق سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اسی عالم الغیب خدا کے علم کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے اس قرآن میں اُن واقعات کی حقیقت کھولی جا رہی ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں گزرے ہیں، حالانکہ خود علمائے بنی اسرائیل کے درمیان ان کی اپنی تاریخ کے ان واقعات میں اختلاف ہے (اس کے نظائر اسی سورۂ نمل کے ابتدائی رکوعوں میں گزر چکے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے حواشی میں واضح کیا ہے)۔ اور مضمونِ مابعد سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن اختلافات کا فیصلہ فرمایا ہے، اسی طرح وہ اُس اختلاف کا بھی فیصلہ کر دے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخالفین کے درمیان برپا ہے۔ وہ کھول کر رکھ دے گا کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ چنانچہ اِن آیات کے نزول پر چند ہی سال گزرے تھے کہ فیصلہ ساری دنیا کے سامنے آ گیا۔ اُسی عرب کی سرزمین میں، اور اسی قبیلۂ قریش میں ایک متنفّس بھی ایسا نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۷ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۷۸ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝۷۹ اِنَّكَ
لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝۸۰ وَمَآ

اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔[۹۴] یقیناً (اِسی طرح) تیرا رب اِن لوگوں کے درمیان[۹۵] بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۹۶] پس اے نبیؐ! اللہ پر بھروسا رکھو، یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے،[۹۷] نہ اُن بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں،[۹۸] اور نہ

رہا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ حق پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے، نہ کہ ابوجہل اور ابولہب۔ ان لوگوں کی اپنی اولاد تک مان گئی کہ ان کے باپ غلطی پر تھے۔

۹۴- یعنی اُن لوگوں کے لیے جو اس قرآن کی دعوت قبول کر لیں اور وہ بات مان لیں جسے یہ پیش کر رہا ہے۔ ایسے لوگ اُن گمراہیوں سے بچ جائیں گے جن میں ان کی قوم مبتلا ہے۔ ان کو اس قرآن کی بدولت زندگی کا سیدھا راستہ مل جائے گا اور ان پر خدا کی وہ مہربانیاں ہوں گی جن کا تصور بھی کفارِ قریش آج نہیں کر سکتے۔ اس رحمت کی بارش کو بھی چند ہی سال بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی لوگ جو ریگ زارِ عرب کے ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور کفر کی حالت میں زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب چھاپا مار بن سکتے تھے، اس قرآن پر ایمان لانے کے بعد یکایک وہ دنیا کے پیشوا، قوموں کے امام، تہذیبِ انسانی کے استاد اور رُوئے زمین کے ایک بڑے حصے پر فرمانروا ہو گئے۔

۹۵- یعنی قریش کے کفار اور اہلِ ایمان کے درمیان۔

۹۶- یعنی نہ اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے، اور نہ اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی احتمال ہے۔

۹۷- یعنی ایسے لوگوں کو جن کے ضمیر مر چکے ہیں اور جن میں ضد اور ہٹ دھرمی اور رسم پرستی نے حق و باطل کا فرق سمجھنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں چھوڑی ہے۔

۹۸- یعنی جو تمھاری بات کے لیے صرف اپنے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس جگہ سے کترا کر نکل جاتے ہیں جہاں انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تمھاری بات ان کے کان میں نہ پڑ جائے۔

اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ
بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ
دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔[99] تم تو اپنی بات اُنھی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

اور جب ہماری بات پُوری ہونے کا وقت اُن پر آ پہنچے گا[100] تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔[101] ع

۹۹ – یعنی اِن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اِنھیں سیدھے راستے پر کھینچ لانا اور گھسیٹ کر لے چلنا تو تمھارا کام نہیں ہے۔ تم تو صرف زبان اور اپنی مثال ہی سے بتا سکتے ہو کہ یہ سیدھا راستہ ہے اور وہ راستہ غلط ہے جس پر یہ لوگ چل رہے ہیں۔ مگر جس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں اور جو دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو، اس کی رہنمائی تم کیسے کر سکتے ہو۔

۱۰۰ – یعنی قیامت قریب آ جائے گی جس کا وعدہ ان سے کیا جا رہا ہے۔

۱۰۱ – ابنِ عمرؓ کا قول ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب زمین میں کوئی نیکی کا حکم کرنے والا اور بدی سے روکنے والا باقی نہ رہے گا۔ ابنِ مَردُویہ نے ایک حدیث ابوسعید خُدریؓ سے نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہی بات انھوں نے خود حضورؐ سے سُنی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں گے تو قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک جانور کے ذریعے سے آخری مرتبہ حجت قائم فرمائے گا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک ہی جانور ہوگا یا ایک خاص قسم کی جنسِ حیوان ہوگی جس کے بہت سے افراد رُوئے زمین پر پھیل جائیں گے۔ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ کے الفاظ میں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ بہرحال جو بات وہ کہے گا وہ یہ ہوگی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان آیات پر یقین نہیں کرتے تھے جن میں قیامت کے آنے اور آخرت برپا ہونے کی خبریں دی گئی تھیں، تو لو اب اس کا وقت آن پہنچا ہے اور جان لو کہ اللہ کی آیات سچی تھیں۔ یہ فقرہ کہ ’’لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے‘‘ یا تو اس جانور کے اپنے کلام کی نقل ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کلام کی حکایت۔ اگر یہ اُسی کے الفاظ کی نقل ہے تو ’’ہماری‘‘ کا لفظ وہ اُسی طرح استعمال کرے گا جس طرح ایک حکومت کا ہر کارندہ ’’ہم‘‘ کا لفظ اس معنٰی میں بولتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے بات کر رہا ہے، نہ کہ اپنی شخصی حیثیت میں۔ دوسری صورت میں بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کلام کو چونکہ اپنے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے، اس لیے اس نے ’’ہماری آیات‘‘ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾
حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور ذرا تصوّر کرو اُس دن کا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک فوج اُن لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جُھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مُرتّب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آ جائیں گے، تو (ان کا رب ان سے) پُوچھے گا کہ "تم نے میری آیات کو جُھٹلا دیا، حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟[۱۰۲] اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟"[۱۰۳] اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا، تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔

اس جانور کے نکلنے کا وقت کون سا ہوگا؟ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ "آفتاب مغرب سے طُلوع ہوگا اور ایک روز دن دہاڑے یہ جانور نکل آئے گا۔ ان میں سے جو نشانی بھی پہلے ہو، وہ بہرحال دوسری کے قریب ہی ظاہر ہوگی۔" (مسلم) دوسری رِوایات جو مسلم، ابنِ ماجہ، تِرمذی اور مُسندِ احمد وغیرہ میں آئی ہیں، ان میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دجّال کا خُروج، دابۃ الارض کا ظہور، دُخان (دھواں)، اور آفتاب کا مغرب سے طُلوع وہ نشانیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی۔

اس جانور کی ماہیت، شکل وصورت، نکلنے کی جگہ، اور ایسی ہی دوسری تفصیلات کے متعلق طرح طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں جو باہم بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ ان چیزوں کے ذکر سے بجز ذہن کی پراگندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور ان کے جاننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں، کیونکہ جس مقصد کے لیے قرآن میں یہ ذکر کیا گیا ہے، اس سے ان تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہا کسی جانور کا انسانوں سے انسانی زبان میں کلام کرنا، تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے نُطق کی طاقت بخش سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے تو وہ ایک جانور ہی کو نُطق بخشے گا، مگر جب وہ قیامت قائم ہو جائے گی تو اللہ کی عدالت میں انسان کی آنکھ اور کان اور اس کے جسم کی کھال تک بول اُٹھے گی، جیسا کہ قرآن میں بتصریح بیان ہوا ہے: حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (حٰم السجدہ، آیات ۲۰-۲۱)

۱۰۲ – یعنی تمھارے جھٹلانے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ کسی علمی ذریعے سے تحقیق کر کے تمھیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آیات جھوٹی ہیں۔ تم نے تحقیق اور غور وفکر کے بغیر بس یوں ہی ہماری آیات کو جھٹلا دیا؟

۱۰۳ – یعنی اگر ایسا نہیں ہے تو کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم نے تحقیق کے بعد ان آیات کو جھوٹا ہی پایا تھا اور

اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِیَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِیۡ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَفَزِعَ مَنۡ
فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَ کُلٌّ اَتَوۡہُ
دٰخِرِیۡنَ ﴿۸۷﴾ وَ تَرَی الۡجِبَالَ تَحۡسَبُہَا جَامِدَۃً وَّ ہِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ

کیا ان کو سُجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سُکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟[۱۰۴] اسی میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔[۱۰۵]

اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صُور پھُونکا جائے گا اور ہَول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں[۱۰۶] ــــ سوائے اُن لوگوں کے جنھیں اللہ اس ہَول سے بچانا چاہے گا ــــ اور سب کان دبائے اس کے حُضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تُو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں،

تمھیں واقعی یہ علم حاصل ہو گیا تھا کہ حقیقتِ نفس الامری وہ نہیں ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے؟

۱۰۴ – یعنی بے شمار نشانیوں میں سے یہ دو نشانیاں تو ایسی تھیں جن کا وہ سب ہر وقت مُشاہدہ کر رہے تھے، جن کے فوائد سے ہر آن مُتمتّع ہو رہے تھے، جو کسی اندھے، بہرے اور گونگے تک سے چھُپی ہوئی نہ تھیں۔ کیوں نہ رات کے آرام اور دن کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے وقت انھوں نے کبھی سوچا کہ یہ ایک حکیم کا بنایا ہوا نظام ہے جس نے ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کا تعلق قائم کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں مقصدیت، حکمت اور منصوبہ بندی عَلانیہ نظر آ رہی ہے جو اندھے قُوائے فطرت کی صفت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت سے خداؤں کی کارفرمائی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نظام لامحالہ کسی ایک ہی ایسے خالق و مالک اور مُدبِر کا قائم کیا ہُوا ہو سکتا ہے جو زمین، چاند، سورج اور تمام دوسرے سیّاروں پر فرماں روائی کر رہا ہو۔ صرف اسی ایک چیز کو دیکھ کر وہ جان سکتے تھے کہ ہم نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعے سے جو حقیقت بتائی ہے، یہ رات اور دن کی گردش اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

۱۰۵ – یعنی یہ کوئی نہ سمجھ میں آسکنے والی بات بھی نہیں تھی۔ آخر انھی کے بھائی بند، انھی کے قبیلے اور برادری کے لوگ، انھی جیسے انسان ایسے موجود تھے جو یہی نشانیاں دیکھ کر مان گئے تھے کہ نبی جس خدا پرستی اور توحید کی طرف بلا رہا ہے وہ بالکل مطابقِ حقیقت ہے۔

۱۰۶ – نفخِ صُور پر مفصل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۴۷۔ ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ سورۂ حج، حاشیہ ۱۔ یٰسین، حواشی ۴۶ – ۴۷۔ الزُّمَر، حاشیہ ۷۹۔

Maktaba Tul Ishaat.com

صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ اِنَّہٗ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۸۸﴾ مَنۡ جَآءَ
بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیۡرٌ مِّنۡہَا ۚ وَ ہُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ یَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ﴿۸۹﴾ وَ مَنۡ جَآءَ
بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ ؕ ہَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۰﴾

مگر اُس وقت یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔[۱۰۷] جو شخص بھلائی لے کر آئے گا، اسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا[۱۰۸] اور ایسے لوگ اُس دن ہَول سے محفوظ ہوں گے۔[۱۰۹] اور جو بُرائی لیے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اَوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟[۱۰۹ الف]

۱۰۷- یعنی ایسے خدا سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ اپنی دنیا میں تم کو عقل و تمیز اور تصرُّف کے اختیارات دے کر وہ تمھارے اعمال و افعال سے بے خبر رہے گا اور یہ نہ دیکھے گا کہ اس کی زمین میں تم ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے رہے ہو۔

۱۰۸- یعنی وہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہو گا کہ جتنی نیکی اس نے کی ہوگی، اس سے زیادہ انعام اسے دیا جائے گا۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی نیکی تو وقتی تھی اور اس کے اثرات بھی دنیا میں ایک محدود زمانے کے لیے تھے، مگر اس کا اجر دائمی اور اَبدی ہو گا۔

۱۰۹- یعنی قیامت اور حشر و نشر کی وہ ہولناکیاں جو منکرینِ حق کے حواس باختہ کیے دے رہی ہوں گی، ان کے درمیان یہ لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو گا۔ وہ پہلے سے اللہ اور اس کے رسولوں کی دی ہوئی خبروں کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ قیامت قائم ہونی ہے، ایک دوسری زندگی پیش آنی ہے اور اس میں یہی سب کچھ ہونا ہے۔ اس لیے ان پر وہ بدحواسی اور گھبراہٹ طاری نہ ہو گی جو مرتے دم تک اس چیز کا انکار کرنے والوں اور اس سے غافل رہنے والوں پر طاری ہو گی۔ پھر ان کے اطمینان کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ انھوں نے اس دن کی توقع پر اس کے لیے فکر کی تھی اور یہاں کی کامیابی کے لیے کچھ سامان کر کے دنیا سے آئے تھے۔ اس لیے اُن پر وہ گھبراہٹ طاری نہ ہو گی جو ان لوگوں پر طاری ہو گی جنھوں نے اپنا سارا سرمایۂ حیات دنیا ہی کی کامیابیاں حاصل کرنے پر لگا دیا تھا اور کبھی نہ سوچا تھا کہ کوئی آخرت بھی ہے جس کے لیے کچھ سامان کرنا ہے۔ منکرین کے برعکس یہ مومنین اب مطمئن ہوں گے کہ جس دن کے لیے ہم نے ناجائز فائدوں اور لذتوں کو چھوڑا تھا، اور صعوبتیں اور مشقّتیں برداشت کی تھیں، وہ دن آ گیا ہے اور اب یہاں ہماری محنتوں کا اجر ضائع ہونے والا نہیں ہے۔

۱۰۹، الف۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ آخرت میں بدی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنی کسی نے بدی کی ہو اور نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ آدمی کے عمل سے بہت زیادہ عطا فرمائے گا۔ اس کی مزید مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو:

اِنَّمَآ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الۡبَلۡدَةِ الَّذِىۡ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
كُلُّ شَىۡءٍ‌ۖ وَّاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ﴿۹۱﴾ وَاَنۡ اَتۡلُوَا
الۡقُرۡاٰنَ‌ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمَنۡ ضَلَّ
فَقُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سَيُرِيۡكُمۡ
اٰيٰتِهٖ فَتَعۡرِفُوۡنَهَا‌ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾ ع

(اے محمدؐ! اِن سے کہو:) "مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اِس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اِسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے[۱۱۰]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سُناؤں۔" اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا۔ اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ ان سے کہو: تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، عنقریب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انھیں پہچان لو گے، اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے اُن اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔ ع

یونس، آیات ۲۶-۲۷۔ القصص، آیت ۸۴۔ العنکبوت، آیت ۷۔ سبا، آیات ۳۷-۳۸۔ المومن، آیت ۴۰۔

۱۱۰ — یہ سورت چونکہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب کہ اسلام کی دعوت ابھی صرف مکّۂ معظّمہ تک محدود تھی اور مخاطب صرف اس شہر کے لوگ تھے، اس لیے فرمایا: "مجھے اِس شہر کے رب کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔" اس کے ساتھ اس رب کی خصوصیّت یہ بیان کی گئی کہ اس نے اسے حرم بنایا ہے۔ اس سے کفارِ مکہ کو مُتنبّہ کرنا مقصود ہے کہ جس خدا کا تم پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عرب کی انتہائی بدامنی اور فساد و خوں ریزی سے لبریز سرزمین میں تمھارے اِس شہر کو امن کا گہوارہ بنا رکھا ہے، اور جس کے فضل سے تمھارا یہ شہر پورے ملکِ عرب کا مرکزِ عقیدت بنا ہوا ہے، تم اس کی ناشکری کرنا چاہو تو کرتے رہو، مگر مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ بنوں اور اسی کے آگے سرِ نیاز جھکاؤں۔ تم جنھیں معبود بنائے بیٹھے ہو، ان میں سے کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ اس شہر کو حرم بنا دیتا اور عرب کے جنگجو اور غارت گر قبیلوں سے اس کا احترام کرا سکتا۔ میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اصل محسن کو چھوڑ کر اُن کے آگے جھکوں جن کا کوئی ذرّہ برابر بھی احسان مجھ پر نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

القصص

(۲۸)

القصص

نام آیت ۲۵ کے اس فقرے سے ماخوذ ہے: وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ، یعنی وہ سورہ جس میں القصص کا لفظ آیا ہے۔ لُغت کے اعتبار سے قصص کے معنی ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لفظ باعتبارِ معنیٰ بھی اس سورہ کا عنوان ہوسکتا ہے، کیونکہ اس میں حضرت موسیٰؑ کا مفصل قصہ بیان ہُوا ہے۔

زمانۂ نُزُول سورۂ نمل کے دیباچے میں ابنِ عباسؓ اور جابر بن زید کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ سورۂ شعراء، سورۂ نمل اور سورۂ قصص یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ زبان، اندازِ بیان اور مضامین سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں سورتوں کا زمانۂ نُزُول قریب قریب ایک ہی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی ان تینوں میں قریبی تعلق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے مختلف اجزا جو اِن میں بیان کیے گئے ہیں، وہ باہم مل کر ایک پورا قصہ بن جاتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں نبوت کا منصب قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ عرض کرتے ہیں کہ ''قومِ فرعون کا ایک جرم میرے ذمہ ہے جس کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں کہ وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' پھر جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے ہاں تشریف لے جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: ''کیا ہم نے اپنے ہاں تجھے بچہ سا نہیں پالا تھا، اور تُو ہمارے ہاں چند سال رہا، پھر کر گیا جو کچھ کہ کر گیا۔'' ان دونوں باتوں کی کوئی تفصیل وہاں نہیں بیان کی گئی۔ اِس سورہ میں اُسے بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ نمل میں قصہ یکایک اس بات سے شروع ہو گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے اہل وعیال کو لے کر جا رہے تھے، اور اچانک انھوں نے ایک آگ دیکھی۔ وہاں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ یہ کیسا سفر تھا، کہاں سے وہ آرہے تھے اور کدھر جا رہے تھے۔ یہ تفصیل اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ تینوں سورتیں مل کر قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی تکمیل کر دیتی ہیں۔

موضوع اور مَباحِث اِس کا موضوع اُن شبہات واعتراضات کو رفع کرنا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر وارد کیے جا رہے تھے، اور اُن عذرات کو قطع کرنا ہے جو آپؐ پر ایمان نہ لانے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جو زمانۂ نُزُول کے حالات سے مل کر خود بخود چند حقیقتیں سامع کے ذہن نشین کر دیتا ہے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے وہ غیر محسوس طریقے سے اسباب و ذرائع

Maktaba Tul Ishaat.com

فراہم کر دیتا ہے۔ جس بچے کے ہاتھوں آخر کار فرعون کا تختہ اُلٹنا تھا، اسے اللہ نے خود فرعون ہی کے گھر میں اس کے اپنے ہاتھوں پرورش کرادیا اور فرعون یہ نہ جان سکا کہ وہ کسے پرورش کر رہا ہے۔ اُس خدا کی مَشیّت سے کون لڑ سکتا ہے، اور کس کی چالیں اس کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ نبوت کسی شخص کو کسی بڑے جشن اور زمین و آسمان سے کسی بھاری اعلان کے ساتھ نہیں دی جاتی۔ تم کو حیرت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چپکے سے یہ نبوت کہاں سے مل گئی اور بیٹھے بٹھائے یہ نبی کیسے بن گئے۔ مگر جن موسیٰ (علیہ السلام) کا تم خود حوالہ دیتے ہو کہ لَوۡلَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی ؕ (آیت ۴۸)، انھیں بھی اِسی طرح راہ چلتے نبوت مل گئی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ آج طورِ سینا کی سُنسان وادی میں کیا واقعہ پیش آ گیا۔ موسیٰؑ خود ایک لمحہ پہلے تک نہ جانتے تھے کہ انھیں کیا چیز ملنے والی ہے۔ آگ لینے چلے تھے اور پیمبری مل گئی۔

تیسرے یہ کہ جس بندے سے خدا کوئی کام لینا چاہتا ہے، وہ بغیر کسی لاؤ لشکر اور سروسامان کے اٹھتا ہے۔ کوئی اس کا مددگار نہیں ہوتا، کوئی طاقت بظاہر اس کے پاس نہیں ہوتی، مگر بڑے بڑے لاؤ لشکر اور سروسامان والے آخر کار اس کے مقابلے میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ جو نسبت آج تم اپنے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان پا رہے ہو، اس سے بہت زیادہ فرق موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کی طاقت کے درمیان تھا۔ مگر دیکھ لو کہ آخر کون جیتا اور کون ہارا۔

چوتھے یہ کہ تم لوگ بار بار موسیٰؑ کا حوالہ دیتے ہو کہ "محمدؐ کو وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔" یعنی عصا اور یدِ بیضا اور دوسرے کھلے کھلے معجزے۔ گویا تم ایمان لانے کو تو تیار بیٹھے ہو، بس انتظار ہے تو یہ کہ تمھیں وہ معجزے دکھائے جائیں جو موسیٰؑ نے فرعون کو دکھائے تھے۔ مگر تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے تھے، انھوں نے کیا کیا تھا؟ وہ انھیں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ انھوں نے کہا تو یہ کہا کہ یہ جادو ہے۔ کیونکہ وہ حق کے خلاف ہٹ دھرمی اور عِناد میں مبتلا تھے۔ اسی مرض میں آج تم مبتلا ہو۔ کیا تم اُسی طرح کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آؤ گے؟ پھر تمھیں کچھ یہ بھی خبر ہے کہ جن لوگوں نے وہ معجزے دیکھ کر حق کا انکار کیا تھا، ان کا انجام کیا ہُوا؟ آخر کار اللہ نے انھیں تباہ کر کے چھوڑا۔ اب کیا تم بھی ہٹ دھرمی کے ساتھ معجزہ مانگ کر اپنی شامت بلانا چاہتے ہو؟

یہ وہ باتیں ہیں جو کسی تصریح کے بغیر آپ سے آپ ہر اُس شخص کے ذہن میں اُتر جاتی تھیں جو مکّے کے کافرانہ ماحول میں اس قصّے کو سنتا تھا، کیونکہ اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان ویسی ہی ایک کشمکش برپا تھی جیسی اس سے پہلے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان برپا ہو چکی تھی، اور ان حالات میں یہ قصّہ سنانے کے معنی یہ تھے کہ اس کا ہر ہر جُز وقت کے حالات پر خود بخود چسپاں ہوتا چلا جائے، خواہ ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جائے جس سے معلوم ہو کہ قصّے کا کون سا جُز اِس وقت کے کس معاملے پر چسپاں ہو رہا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رُکوع سے اصل موضوع پر براہِ راست کلام شروع ہوتا ہے۔

پہلے اِس بات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ آپؐ اُمّی ہونے کے باوجود دو ہزار برس پہلے گزرا ہوا ایک تاریخی واقعہ اس تفصیل کے ساتھ من وعن سنا رہے ہیں۔ حالانکہ آپؐ کے شہر اور آپؐ کی برادری کے لوگ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کے پاس ان معلومات کے حاصل ہونے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی وہ نشان دہی کر سکیں۔

پھر آپؐ کے نبی بنائے جانے کو اُن لوگوں کے حق میں اللہ کی ایک رحمت قرار دیا جاتا ہے کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے اور اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا۔

پھر اُن کے اُس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے جو وہ بار بار پیش کرتے تھے کہ ”یہ نبی وہ معجزے کیوں نہ لایا جو اس سے پہلے موسیٰؑ لائے تھے۔“ ان سے کہا جاتا ہے کہ موسیٰؑ، جن کے متعلق تم خود مان رہے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے معجزے لائے تھے، انھی کو تم نے کب مانا ہے کہ اب اس نبی سے معجزے کا مطالبہ کرتے ہو؟ خواہشاتِ نفس کی بندگی نہ کرو تو حق اب بھی تمھیں نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس مرض میں تم مبتلا رہو تو خواہ کوئی معجزہ آ جائے، تمھاری آنکھیں نہیں کھل سکتیں۔

پھر کفارِ مکہ کو اُس واقعے پر عبرت اور شرم دلائی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا کہ باہر سے کچھ عیسائی مکہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر ایمان لے آئے، مگر مکے کے لوگ اپنے گھر کی اس نعمت سے مستفید تو کیا ہوتے، ان کے ابوجہل نے اُلٹی ان لوگوں کی کھلّم کھلّا بے عزتی کی۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اُس اصل عذر کو لیا جاتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ ماننے کے لیے وہ پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اہلِ عرب کے دینِ شرک کو چھوڑ کر اس نئے دینِ توحید کو قبول کر لیں تو یکا یک اس ملک سے ہماری مذہبی، سیاسی اور معاشی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی اور ہمارا حال یہ ہو گا کہ عرب کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے کی حیثیت کھو کر اس سرزمین میں ہمارے لیے کوئی جائے پناہ تک باقی نہ رہے گی۔ یہ چونکہ سردارانِ قریش کی حق دشمنی کا اصل محرک تھا اور باقی سارے شبہات واعتراضات محض بہانے تھے جو وہ عوام کو فریب دینے کے لیے تراشتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر آخر سورت تک مفصل کلام فرمایا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈال کر نہایت حکیمانہ طریقے سے اُن تمام بنیادی امراض کا مداوا کیا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ حق اور باطل کا فیصلہ دنیوی مفاد کے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۸۸ آیاتہا | سُوۡرَةُ الۡقَصَصِ مَکِّیَّةٌ | ۹ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی
وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ
وَ جَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً مِّنۡہُمۡ یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَہُمۡ
وَ یَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۴﴾ وَ نُرِیۡدُ اَنۡ

ط-س-م۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ہم موسیٰؑ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمھیں سناتے ہیں[1]، ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں[2]۔

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی[3] اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا[4]۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا[5]۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ

۱- تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، رکوع ۶۔ الاعراف، رکوع ۱۳ تا ۱۶۔ یونُس، رکوع ۸-۹۔ ہود، رکوع ۹۔ بنی اسرائیل، رکوع ۱۲۔ مریم، رکوع ۴۔ طٰہٰ، رکوع ۱-۴۔ المؤمنون، رکوع ۳۔ الشعراء، رکوع ۲-۴۔ النمل، رکوع ۱۔ العنکبوت، رکوع ۴۔ المومن، رکوع ۳-۵۔ الزُخرف، رکوع ۵۔ الدُّخان، رکوع ۱۔ الذّاریات، رکوع ۲۔ النازعات، رکوع ۱۔

۲- یعنی جو لوگ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں، ان کو سنانا تو بے کار ہے۔ البتہ جنھوں نے ہٹ دھرمی کا قفل اپنے دلوں پر چڑھا نہ رکھا ہو، وہ اس گفتگو کے مُخاطَب ہیں۔

۳- اصل میں لفظ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں سر اُٹھایا، باغیانہ رَوِش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت یعنی بندگی کے مقام سے اُٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ دھار لیا، ماتحت بن کر رہنے کے بجائے بالا دست بن بیٹھا، اور جبار و متکبّر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

۴- یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں

اور سب کو برابر کے حُقوق دیے جائیں، بلکہ اس نے تمدُّن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمراں گروہ ٹھیرایا جائے اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا اور لُوٹا جائے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذِمّی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حُقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان، یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اُصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ذِمّیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اُصولی حکومت میں حکمراں جماعت صرف وہی ہوسکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہوسکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے، اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اُصولوں کا منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اُس فرعونی طرزِ تفریق میں کیا وجہِ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم نسل کا کوئی فرد کبھی حکمراں گروہ میں شامل نہیں ہوسکتا۔ جس میں محکوم نسل کے لوگوں کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار، بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے، حتّٰی کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ جس میں محکوموں کے لیے کسی حق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی، تمام فوائد و منافع اور حَسَنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں، اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمراں قوم میں پیدا ہو جائے۔

۵ - بائبل میں اس کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ ہے:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسُف کو نہیں جانتا تھا۔ اور اُس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں، سو آؤ ہم اُن کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں، ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انھیں ستائیں۔ سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پِتُوم اور رَعمسیس بنائے ...... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کرایا، اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں، جو وہ ان سے کراتے تھے، تشدد کی تھیں ...... تب مصر کے بادشاہ نے عِبرانی دائیوں سے ...... باتیں کیں اور کہا کہ جب عِبرانی (یعنی اسرائیلی) عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو، تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔" (خُروج، باب ۱۔ آیت ۸-۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسفؑ کا دَور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا تھا اور قِبطیوں کے ہاتھ میں جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش

Maktaba Tul Ishaat.com

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ
نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ۝۵ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ
فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۶

مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انھیں پیشوا بنا دیں[۶] اور انھی کو وارث بنائیں[۷] اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان[۸] اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دِکھلا دیں جس کا انھیں ڈر تھا۔

کی تھی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انھیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے، تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرّف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیل کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدّت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا، پھر انھیں حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ور ہیں تو انھوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے: (يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ)۔

مگر بائبل اور قرآن، دونوں اس ذکر سے خالی ہیں کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ اُلٹ جائے گا اور اسی خطرے کو روکنے کے لیے فرعون نے اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ یا فرعون نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی گئی تھی کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں ایسا اور ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ افسانہ تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے ہمارے مفسّرین نے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا، مضمون ''موسیٰ'' اور The Talmud Selections. p 123-24)

۶ – یعنی انھیں دُنیا میں قیادت و رہنمائی کا مقام عطا کریں۔

۷ – یعنی ان کو زمین کی وراثت بخشیں اور وہ حکمران و فرمانروا ہوں۔

۸ – مغربی مستشرقین نے اس بات پر بڑی لے دے کی ہے کہ ہامان تو ایران کے بادشاہ اخسویرس یعنی خشیارشا

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا

ہم نے[9] موسیٰؑ کی ماں کو اشارہ کیا کہ "اِس کو دُودھ پلا، پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر، ہم اسے تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں[10] گے۔" آخرکار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا، تاکہ وہ ان کا دشمن

(Xerxes) کے دربار کا ایک امیر تھا، اور اس بادشاہ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے سیکڑوں برس بعد ۴۸۶ اور ۴۶۵ قبلِ مسیح میں گزرا ہے، مگر قرآن نے اسے مصر لے جا کر فرعون کا وزیر بنا دیا۔ ان لوگوں کی عقل پر تعصب کا پردہ پڑا ہُوا نہ ہو تو یہ خود غور کریں کہ آخر ان کے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کیا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ اخسویرس کے درباری ہامان سے پہلے دنیا میں کوئی شخص کبھی اس نام کا نہیں گزرا ہے۔ جس فرعون کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اگر اس کے تمام وزرا اور امرا اور اہلِ دربار کی کوئی مکمل فہرست بالکل مستند ذریعے سے کسی مستشرق صاحب کو مل گئی ہے جس میں ہامان کا نام مفقود ہے تو وہ اسے چھپائے کیوں بیٹھے ہیں؟ انھیں اس کا فوٹو فوراً شائع کر دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کی تکذیب کے لیے اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار انھیں کوئی اور نہ ملے گا۔

۹ – بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا ہے کہ انھی حالات میں ایک اسرائیلی والدین کے ہاں وہ بچہ پیدا ہو گیا جس کو دنیا نے موسیٰ علیہ السلام کے نام سے جانا۔ بائبل اور تلمود کے بیان کے مطابق یہ خاندان حضرت یعقوبؑ کے بیٹے لاوِی کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام ان دونوں کتابوں میں عمرام بتایا گیا ہے، قرآن اسی کا تلفظ عمران کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کے ہاں دو بچے ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی مریم (Miriam) نامی تھیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان سے چھوٹے حضرت ہارونؑ تھے۔ غالباً یہ فیصلہ کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو بیٹا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے، حضرت ہارونؑ کی پیدائش کے زمانے میں نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ بچ گئے۔ پھر یہ قانون جاری ہُوا اور اس خوفناک زمانے میں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔

۱۰ – یعنی پیدا ہوتے ہی دریا میں ڈال دینے کا حکم نہ تھا، بلکہ ارشاد یہ ہوا کہ جب تک خطرہ نہ ہو، بچے کو دودھ پلاتی رہو۔ جب راز فاش ہوتا نظر آئے اور اندیشہ ہو کہ بچے کی آواز سُن کر یا اور کسی طرح دشمنوں کو اس کی پیدائش کا علم ہو جائے گا، یا خود بنی اسرائیل ہی میں سے کوئی کمینہ آدمی مخبری کر بیٹھے گا، تو بے خوف وخطر اسے ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا۔ بائبل کا بیان ہے کہ پیدائش کے بعد تین مہینے تک حضرت موسیٰؑ کی والدہ ان کو چھپائے رہیں۔ تلمود اس پر اضافہ کرتی ہے کہ فرعون کی حکومت نے اس زمانے میں جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھیں جو اسرائیلی گھروں میں اپنے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸ وَ
قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ
عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

اور ان کے لیے سببِ رنج بنے[11]، واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا: ”یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا ہی بنا لیں[12]۔“ اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔

چھوٹے چھوٹے بچے لے جاتی تھیں اور وہاں کسی نہ کسی طرح ان بچوں کو رُلا دیتی تھیں، تاکہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے ہاں کوئی بچہ چھُپا رکھا ہو تو وہ بھی دوسرے بچے کی آواز سن کر رونے لگے۔ اس نئے طرزِ جاسوسی سے حضرت موسیٰؑ کی والدہ پریشان ہوگئیں اور انھوں نے اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے پیدائش کے تین مہینے بعد اسے دریا میں ڈال دیا۔ اس حد تک ان دونوں کتابوں کا بیان قرآن کے مطابق ہے۔ اور دریا میں ڈالنے کی کیفیت بھی انھوں نے وہی بتائی ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: اِقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ ”بچے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دے۔“ اسی کی تائید بائبل اور تَلمُود بھی کرتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اسے چکنی مٹی اور رال سے لیپ کر پانی سے محفوظ کر دیا، پھر اس میں حضرت موسیٰؑ کو لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ لیکن سب سے بڑی بات جو قرآن میں بیان کی گئی ہے، اس کا کوئی ذکر اسرائیلی روایات میں نہیں ہے، یعنی یہ کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمھارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمھارے پاس ہی پلٹا لائیں گے، اور یہ کہ تمھارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسول ہونے والا ہے۔

۱۱ـ یہ ان کا مقصد نہ تھا بلکہ یہ ان کے اس فعل کا انجام مقدر تھا۔ وہ اُس بچے کو اُٹھا رہے تھے جس کے ہاتھوں آخرکار انھیں تباہ ہونا تھا۔

۱۲ـ اس بیان سے جو صورتِ معاملہ صاف سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تابوت یا ٹوکرا دریا میں بہتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا جہاں فرعون کے محلات تھے، تو فرعون کے خدّام نے اسے پکڑ لیا اور لے جا کر بادشاہ اور ملکہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہ اور ملکہ خود اس وقت دریا کے کنارے سیر میں مشغول ہوں اور ان کی نگاہ اس ٹوکرے

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ لَاۤ
اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ قَالَتۡ
لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ﴿۱۱﴾

اُدھر موسیٰؑ کی ماں کا دل اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے، تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اُس نے بچے کی بہن سے کہا: اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتا نہ چلا۔[۱۳]

پر پڑی ہو اور انھی کے حکم سے وہ نکالا گیا ہو۔ اس میں ایک بچہ پڑا ہوا دیکھ کر بآسانی یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ ضرور کسی اسرائیلی کا بچہ ہے، کیونکہ وہ اُن محلّوں کی طرف سے آ رہا تھا جن میں بنی اسرائیل رہتے تھے، اور انھی کے بیٹے اس زمانے میں قتل کیے جا رہے تھے، اور انھی کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ کسی نے بچے کو چھپا کر کچھ مدت تک پالا ہے اور پھر جب زیادہ دیر چھپ نہ سکا تو اب اسے اس امید پر دریا میں ڈال دیا ہے کہ شاید اسی طرح اس کی جان بچ جائے اور کوئی اسے نکال کر پال لے۔ اسی بنا پر کچھ ضرورت سے زیادہ وفادار غلاموں نے عرض کیا کہ حضور! اسے فوراً قتل کرا دیں، یہ بھی کوئی بچۂ افعی ہی ہے۔ لیکن فرعون کی بیوی آخر عورت تھی، اور بعید نہیں کہ بے اولاد ہو۔ پھر بچہ بھی بہت پیاری صورت کا تھا، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ خود حضرت موسیٰؑ کو بتاتا ہے کہ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ ۚ (میں نے اپنی طرف سے تیرے اُوپر محبت ڈال دی تھی) یعنی تجھے ایسی موہنی صورت دی تھی کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار تجھ پر پیار آ جاتا تھا۔ اس لیے اس عورت سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا کہ اسے قتل نہ کرو بلکہ لے کر پال لو۔ یہ جب ہمارے ہاں پرورش پائے گا اور ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے تو اسے کیا خبر ہوگی کہ میں اسرائیلی ہوں۔ یہ اپنے آپ کو آلِ فرعون ہی کا ایک فرد سمجھے گا اور اس کی قابلیتیں بنی اسرائیل کے بجائے ہمارے کام آئیں گی۔

بائبل اور تَلمود کا بیان ہے کہ وہ عورت، جس نے حضرت موسیٰؑ کو پالنے اور بیٹا بنانے کے لیے کہا تھا، فرعون کی بیٹی تھی۔ لیکن قرآن صاف الفاظ میں اسے ''اِمْرَاَتُ فِرْعَوْنَ'' (فرعون کی بیوی) کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صدیوں بعد مُرتّب کی ہوئی زبانی روایات کے مقابلے میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کا بیان ہی قابلِ اعتماد ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ اسرائیلی رِوایات سے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر عربی محاورہ و استعمال کے خلاف اِمْرَاَتُ فِرْعَوْنَ کے معنیٰ ''فرعون کے خاندان کی عورت'' کیے جائیں۔

۱۳ — یعنی لڑکی نے اس طریقے سے ٹوکرے پر نگاہ رکھی کہ بہتے ہوئے ٹوکرے کے ساتھ ساتھ وہ اس کو دیکھتی ہوئی چلتی بھی رہی اور دشمن یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا کوئی تعلق اس ٹوکرے والے بچے کے ساتھ ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق

Maktaba Tul Ishaat.com

وَحَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ
بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ
تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

اور ہم نے بچّے پر پہلے ہی دُودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں[۱۴]۔ (یہ حالت دیکھ کر) اُس لڑکی نے اُن سے کہا: ”میں تمھیں ایسے گھر کا پتا بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمّہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں؟[۱۵]“ اس طرح ہم[۱۶] موسیٰؑ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچّا تھا[۱۷]، مگر اکثر لوگ اس بات

حضرت موسیٰؑ کی یہ بہن اس وقت ۱۰-۱۲ برس کی تھیں۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بھائی کا پیچھا کیا اور یہ پتا چلا لیا کہ وہ فرعون کے محل میں پہنچ چکا ہے۔

۱۴- یعنی فرعون کی بیوی جس اَنّا کو بھی دودھ پلانے کے لیے بلاتی تھی، بچہ اس کی چھاتی کو منہ نہ لگاتا تھا۔

۱۵- اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کے محل میں بھائی کے پہنچ جانے کے بعد بہن گھر نہیں بیٹھ گئی، بلکہ وہ اپنی اسی ہوشیاری کے ساتھ محل کے آس پاس چکر لگاتی رہی۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ بچہ کسی کا دودھ نہیں پی رہا ہے اور ملکۂ عالیہ پریشان ہیں کہ کوئی ایسی اَنّا ملے جو بچے کو پسند آئے، تو وہ ذہین لڑکی سیدھی محل میں پہنچ گئی اور جا کر کہا کہ میں ایک اچھی اَنّا کا پتا بتاتی ہوں جو اس بچے کو بڑی شفقت کے ساتھ پالے گی۔

اس مَقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قدیم زمانے میں ان مَمالک کے بڑے اور خاندانی لوگ بچوں کو اپنے ہاں پالنے کے بجائے عُموماً اَنّاؤں کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ اپنے ہاں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی یہ ذکر آتا ہے کہ مکّے میں وقتاً فوقتاً اطراف و نواح کی عورتیں اَنّا گیری کی خدمت کے لیے آتی تھیں اور سرداروں کے بچے دودھ پلانے کے لیے اچھے اچھے معاوضوں پر حاصل کر کے ساتھ لے جاتی تھیں۔ حضورؐ نے خود بھی حلیمۂ سعدیہ کے ہاں صحرا میں پرورش پائی ہے۔ یہی طریقہ مصر میں بھی تھا۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ کی بہن نے یہ نہیں کہا کہ میں ایک اچھی اَنّا لا کر دیتی ہوں، بلکہ یہ کہا کہ میں ایسے گھر کا پتا بتاتی ہوں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں گے اور اسے خیر خواہی کے ساتھ پالیں گے۔

۱۶- بائبل اور تَلمُود سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا نام ”موسیٰ“ فرعون کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ یہ عبرانی زبان کا نہیں بلکہ قِبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنیٰ ہیں: ”میں نے اسے پانی سے نکالا“۔ قدیم مصری زبان سے بھی حضرت موسیٰؑ کے نام کی یہ تخریج صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس زبان میں ”مُو“ پانی کو کہتے تھے اور ”اوشے“ کا مطلب تھا ”بچایا ہوا“۔

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ
وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ

رکوع ۲

کو نہیں جانتے ؏

جب موسیٰؑ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشوونما مکمل[۱۸] ہو گیا تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا،[۱۹] ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ (ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جب کہ

۱۷- اور اللہ کی اس حکیمانہ تدبیر کا فائدہ یہ بھی ہُوا کہ حضرت موسیٰؑ فی الواقع فرعون کے شاہزادے نہ بن سکے بلکہ اپنے ہی ماں باپ اور بہن بھائیوں میں پرورش پا کر انھیں اپنی اصلیت اچھی طرح معلوم ہوگئی۔ اپنی خاندانی روایات سے، اپنے آبائی مذہب سے، اور اپنی قوم سے ان کا رشتہ نہ کٹ سکا۔ وہ آلِ فرعون کے ایک فرد بننے کے بجائے اپنے دلی جذبات اور خیالات کے اعتبار سے پوری طرح بنی اسرائیل کے ایک فرد بن کر اُٹھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں: مثل الذی یعمل و یحتسب فی صنعۃ الخیر کمثل ام موسٰی ترضع ولدھا وتاخذ اجرھا۔ ''جو شخص اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرے اور اس کام میں اللہ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھے، اس کی مثال حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی سی ہے کہ انھوں نے اپنے ہی بیٹے کو دودھ پلایا اور اس کی اُجرت بھی پائی۔'' یعنی ایسا شخص اگرچہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کام کرتا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھ کر ایمان داری سے کام کرتا ہے، جس کے ساتھ بھی معاملہ کرتا ہے اس کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے، اور رزقِ حلال سے اپنے نفس اور اپنے بال بچوں کی پرورش اللہ کی عبادت سمجھتے ہوئے کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی روزی کمانے پر بھی اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ گویا روزی بھی کمائی اور اللہ سے اجر و ثواب بھی پایا۔

۱۸- یعنی جب ان کا جسمانی و ذہنی نشوونما مکمل ہو گیا۔ یہودی روایات میں اس وقت حضرت موسیٰؑ کی مختلف عمریں بتائی گئی ہیں۔ کسی نے ۱۸ سال لکھی ہے، کسی نے ۲۰ سال، اور کسی نے ۴۰ سال۔ بائبل کے نئے عہد نامے میں ۴۰ سال عمر بتائی گئی ہے۔ (اعمال ۷: ۲۳) لیکن قرآن کسی عمر کی تصریح نہیں کرتا۔ جس مقصد کے لیے قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کے لیے بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ آگے جس واقعے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے شباب کو پہنچ چکے تھے۔

۱۹- حکم سے مراد حکمت، دانائی، فہم و فراست اور قوتِ فیصلہ، اور علم سے مراد دینی اور دُنیوی علوم دونوں ہیں، کیونکہ اپنے والدین کے ساتھ ربط ضبط قائم رہنے کی وجہ سے ان کو اپنے باپ دادا (حضرت یوسف، یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام) کی تعلیمات سے بھی واقفیت حاصل ہوگئی، اور بادشاہِ وقت کے ہاں شاہزادے کی حیثیت سے پرورش

Maktaba Tul Ishaat.com

غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ

اہلِ شہر غفلت میں[۲۰] تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰؑ نے اس کو ایک گھونسا مارا[۲۱] اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰؑ نے کہا: ''یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کُن ہے[۲۲]۔'' پھر وہ کہنے لگا: ''اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے[۲۳]۔''

پانے کے باعث اُن کو وہ تمام دینوی عُلوم بھی حاصل ہوئے جو اُس زمانے کے اہلِ مصر میں مُتداول تھے۔ اس حکم اور علم کے عَطِیّے سے مراد نبوت کا عَطِیّہ نہیں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت تو اس کے کئی سال بعد عطا فرمائی گئی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور اس سے پہلے سورۂ شعراء (آیت ۲۱) میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

اِس زمانۂ شاہزادگی کی تعلیم و تربیت کے متعلق بائبل کی کتاب الاعمال میں بتایا گیا ہے کہ ''موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی اور وہ کلام اور کام میں قوت والا تھا۔'' (۷:۲۲) تَلْمُود کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں ایک خوب صورت جوان بن کر اُٹھے۔ شاہزادوں کا سا لباس پہنتے، شاہزادوں کی طرح رہتے، اور لوگ ان کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ وہ اکثر جُشَن کے علاقے میں جاتے جہاں اسرائیلیوں کی بستیاں تھیں، اور ان تمام سختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو ان کی قوم کے ساتھ قِبطی حکومت کے ملازمین کرتے تھے۔ انھی کی کوشش سے فرعون نے اسرائیلیوں کے لیے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انھوں نے فرعون سے کہا کہ دائماً مسلسل کام کرنے کی وجہ سے یہ لوگ کمزور ہو جائیں گے اور حکومت ہی کے کام کا نقصان ہوگا۔ ان کی قوت بحال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ہفتے میں ایک دن آرام کا دیا جائے۔ اسی طرح اپنی دانائی سے انھوں نے اور بہت سے ایسے کام کیے جن کی وجہ سے تمام ملکِ مصر میں ان کی شہرت ہو گئی تھی۔ (اقتباسات تَلمُود، صفحہ ۱۲۹)

۲۰ – ہو سکتا ہے کہ وہ صبح سویرے کا وقت ہو، یا گرمی میں دوپہر کا، یا سردیوں میں رات کا۔ بہرحال مراد

فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ

چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی، وہ غفور رحیم ہے[۲۴]۔ موسیٰ نے عہد کیا کہ "اے میرے رب! یہ احسان جو

یہ ہے کہ جب سڑکیں سنسان تھیں اور شہر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"شہر میں داخل ہُوا"، ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار السلطنت کے شاہی محلات عام آبادی سے باہر واقع تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ شاہی محل میں رہتے تھے، اس لیے "شہر میں نکلے" کہنے کے بجائے "شہر میں داخل ہوئے" فرمایا گیا ہے۔

۲۱ – اصل میں لفظ "وَکَزَ" استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ تھپڑ مارنے کے بھی ہیں اور گھونسا مارنے کے بھی۔ ہم نے اس خیال سے کہ تھپڑ سے موت واقع ہو جانا گھونسے کی بہ نسبت بعید تر ہے، اس کا ترجمہ گھونسا مارنا کیا ہے۔

۲۲ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھونسا کھا کر جب مصری گرا ہوگا اور اس نے دم توڑ دیا ہوگا تو کیسی سخت ندامت اور گھبراہٹ کی حالت میں یہ الفاظ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ ان کا کوئی ارادہ قتل کا نہ تھا۔ نہ قتل کے لیے گھونسا مارا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ ایک گھونسا کھاتے ہی ایک بھلا چنگا آدمی پران چھوڑ دے گا۔ اس بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کوئی شریرانہ منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ایک بڑا فساد کھڑا کرنے کے لیے مجھ سے یہ کام کرایا ہے، تاکہ ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک قبطی کو مار ڈالنے کا الزام مجھ پر عائد ہو، اور صرف میرے ہی خلاف نہیں بلکہ تمام بنی اسرائیل کے خلاف مصر میں ایک طوفانِ عظیم اُٹھ کھڑا ہو۔ اس معاملے میں بائبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کو قتلِ عَمد کا مجرم ٹھیراتی ہے۔ اس کی رِوایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے "اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔" (خُروج ۲:۱۲) یہی بات تلمُود میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اب یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغدار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی، جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا اور جسے انسان کو عدل وانصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہوسکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے دوسری قوم کے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے اور جان بُوجھ کر اسے قتل کر ڈالے۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی کو مصری کے پنجے سے چھڑانے کے لیے اسے قتل کر دینا تو روا نہ ہوسکتا تھا۔

۲۳ – مغفرت کے معنیٰ درگزر کرنے اور معاف کر دینے کے بھی ہیں، اور ستر پوشی کرنے کے بھی۔ حضرت موسیٰؑ کی دعا کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس گناہ کو (جسے تو جانتا ہے کہ میں نے عمداً نہیں کیا ہے) معاف بھی فرما دے اور اس کا پردہ بھی ڈھانک دے، تاکہ دشمنوں کو اس کا پتا نہ چلے۔

۲۴ – اس کے بھی دو مطلب ہیں، اور دونوں یہاں مراد ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قُصور معاف بھی فرما دیا

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٧﴾ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ

تو نے مجھ پر کیا ہے[25] اِس کے بعد اب مَیں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا[26]۔‘‘

دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہُوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے۔

اور حضرت موسیٰؑ کا پردہ بھی ڈھانک دیا، یعنی قبطی قوم کے کسی فرد اور قبطی حکومت کے کسی آدمی کا اُس وقت اُن کے آس پاس کہیں گزر نہ ہوا کہ وہ قتل کے اس واقعے کو دیکھ لیتا۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو خاموشی کے ساتھ موقعِ واردات سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔

۲۵ – یعنی یہ احسان کہ میرا فعل چھپا رہ گیا، اور دشمن قوم کے کسی فرد نے مجھ کو نہیں دیکھا، اور مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

۲۶ – حضرت موسیٰؑ کا یہ عہد بہت وسیع الفاظ میں ہے۔ اِس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ میں کسی مجرم فرد کا مددگار نہیں بنوں گا، بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ میری امداد و اعانت کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ ہو گی جو دنیا میں ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ابنِ جَرِیر اور متعدّد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک لیا ہے کہ اسی روز حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطعِ تعلق کر لینے کا عہد کر لیا، کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے خدا کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کسی ایمان دار آدمی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظالم سلطنت کا کل پُرزہ بن کر رہے اور اس کی حشمت و طاقت میں اضافے کا موجب بنے۔

علمائے اسلام نے بالعُموم حضرت موسیٰؑ کے اِس عہد سے یہ اِستدلال کیا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعانت سے کامل اجتناب کرنا چاہیے، خواہ وہ ظالم فرد ہو، یا گروہ، یا حکومت و سلطنت۔ مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رَباحؒ سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی اُمیّہ کی حکومت میں کوفے کے گورنر کا کاتب (سیکرٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں، وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاءؒ نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا: تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے، رزق دینے والا اللہ ہے۔

ایک اور کاتب نے عامر شَعْبِیؒ سے پوچھا: ’’اے ابوعَمرو! میں بس احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں، فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیا یہ رزق میرے لیے جائز ہے؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’ہوسکتا ہے کہ کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا جائے اور وہ تمھارے قلم سے جاری ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کا مال ناحق ضبط کیا جائے، یا کسی کا گھر گرانے کا حکم دیا جائے اور وہ تمھارے

قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا

موسیٰؑ نے کہا ”تُو تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے[۲۷]۔“ پھر جب موسیٰؑ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے[۲۸] تو وہ پکار اُٹھا[۲۹]: ”اے موسیٰؑ! کیا آج تو مجھے اُسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے، تو اس ملک میں جبّار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کے بعد ایک آدمی شہر کے

قلم سے جاری ہو۔“ پھر امام موصوف نے یہ آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب نے کہا: ”آج کے بعد میرا قلم بنی اُمیّہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہوگا۔“ امام نے کہا: ”پھر اللہ بھی تمھیں رزق سے محروم نہ فرمائے گا۔“

ضحّاک کو تو عبدالرحمٰن بن مسلم نے صرف اس خدمت پر بھیجنا چاہا تھا کہ وہ بخارا کے لوگوں کی تنخواہیں جا کر بانٹ آئیں، مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں نے کہا: آخر اس میں کیا حرج ہے؟ انھوں نے کہا: میں ظالموں کے کسی کام میں بھی مددگار نہیں بننا چاہتا۔ (روح المعانی، ج ۲۰، ص ۴۹)

امام ابوحنیفہؒ کا یہ واقعہ ان کے تمام مستند سوانح نگاروں، الموفّق المکّی، ابن البزّاز الکَرْدَری، مُلّا علی قاری وغیرہم نے لکھا ہے کہ انھی کی تلقین پر منصور کے کمانڈر انچیف حسن بن قَحْطَبہ نے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے اِستعفا دے دیا تھا کہ آج تک میں نے آپ کی سلطنت کی حمایت کے لیے جو کچھ کیا ہے، یہ اگر خدا کی راہ میں تھا تو میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں تھا تو میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید جرائم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

۲۷- یعنی تُو جھگڑالو آدمی معلوم ہوتا ہے۔ روز تیرا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ کل ایک شخص سے بِھڑ گیا تھا، آج ایک دوسرے شخص سے جا بِھڑا۔

۲۸- بائبل کا بیان یہاں قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ دوسرے دن کا جھگڑا دو اسرائیلیوں کے درمیان تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ جھگڑا بھی اسرائیلی اور مصری کے درمیان ہی تھا۔ قرینِ قیاس بھی یہی دوسرا بیان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ پہلے دن کے قتل کا راز فاش ہونے کی جو صورت آگے بیان ہو رہی ہے، وہ اسی طرح رونما ہو سکتی تھی کہ مصری قوم کے ایک شخص کو اُس واقعے کی خبر ہو جاتی۔ ایک اسرائیلی کے علم میں اس کے آجانے سے یہ امکان کم تھا کہ اپنی قوم کے پشتیبان شہزادے کے اتنے بڑے قصور کی اطلاع پاتے ہی وہ جا کر فرعونی حکومت میں اس کی مخبری کر دیتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ
اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢٠﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۡ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ
مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢١﴾ ع وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىْٓ

ع ٢ ٨ ٥

پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا [30] اور بولا: ''موسیٰؑ! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں۔'' یہ خبر سنتے ہی موسیٰؑ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دُعا کی کہ ''اے میرے رب! مجھے ظالموں سے بچا۔'' ع

(مصر سے نکل کر) جب موسیٰؑ نے مَدیَن کا رُخ کیا [31] تو اُس نے کہا: ''اُمید ہے کہ میرا رب مجھے

۲۹- یہ پکارنے والا وہی اسرائیلی تھا جس کی مدد کے لیے حضرت موسیٰؑ آگے بڑھے تھے۔ اس کو ڈانٹنے کے بعد جب آپ مصری کو مارنے کے لیے چلے تو اُس اسرائیلی نے سمجھا کہ یہ مجھے مارنے آرہے ہیں، اس لیے اس نے چیخنا شروع کر دیا اور اپنی حماقت سے کل کے قتل کا راز فاش کر ڈالا۔

۳۰- یعنی اس دوسرے جھگڑے میں جب قتل کا راز فاش ہو گیا اور اس مصری نے جا کر مخبری کر دی تب یہ واقعہ پیش آیا۔

۳۱- بائبل کا بیان اس امر میں قرآن سے متفق ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مَدیَن کا رُخ کیا تھا۔ لیکن تلمود یہ بے سروپا قصہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے، اور وہاں بادشاہ کے مُقرّب ہو گئے۔ پھر اس کے مرنے پر لوگوں نے ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس کی بیوہ سے ان کی شادی کر دی۔ ۴۰ سال انھوں نے وہاں حکومت کی۔ مگر اس پوری مدت میں اپنی حبشی بیوی سے کبھی مقاربت نہ کی۔ ۴۰ سال گزر جانے کے بعد اس عورت نے حبش کے باشندوں سے شکایت کی کہ اس شخص نے آج تک نہ تو مجھ سے زن وشَو کا تعلق رکھا ہے اور نہ کبھی حبش کے دیوتاؤں کی پرستش کی ہے۔ اس پر امرائے سلطنت نے انھیں معزول کر کے اور بہت سا مال دے کر ملک سے باحترام رخصت کر دیا۔ تب وہ حبش سے مَدیَن پہنچے اور وہ واقعات پیش آئے جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

اس قصّے کے بے سروپا ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اسی قصّے میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اُس زمانے میں اَسیریا (شمالی عراق) پر حبش کی حکومت تھی، اور اسیریا والوں کی بغاوتیں کچلنے کے لیے حضرت موسیٰؑ نے بھی اور ان کے پیش رَو بادشاہ نے بھی فوجی چڑھائیاں کی تھیں۔ اب جو شخص بھی تاریخ وجغرافیہ سے کوئی واقفیت رکھتا ہو، وہ نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ اسیریا پر حبش کا تسلط اور حبشی فوج کا حملہ یا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مصر اور فلسطین وشام پر

اَنۡ یَّهۡدِیَنِیۡ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ وَجَدَ عَلَیۡهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسۡقُوۡنَ ۬ وَوَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمُ امۡرَاَتَیۡنِ تَذُوۡدٰنِ ۚ

ٹھیک راستے پر ڈال دے گا[۳۲]"۔ اور جب وہ مَدیَن کے کنویں پر پہنچا[۳۳] تو اُس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔

اس کا قبضہ ہوتا، یا پورا ملکِ عرب اس کے زیرِ نگین ہوتا، یا پھر حبش کا بیڑا ایسا زبردست ہوتا کہ وہ بحرِ ہند اور خلیج فارس کو عبور کر کے عراق فتح کر لیتا۔ تاریخ اس ذکر سے خالی ہے کہ کبھی حبشیوں کو ان ممالک پر تسلط حاصل ہوا ہو، یا ان کی بحری طاقت اتنی زبردست رہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا علم خود اپنی تاریخ کے بارے میں کتنا ناقص تھا اور قرآن ان کی غلطیوں کی تصحیح کر کے صحیح واقعات کیسی منقّح صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن عیسائی اور یہودی مستشرقین کو یہ کہتے ذرا شرم نہیں آتی کہ قرآن نے یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے ہیں۔

۳۲- یعنی ایسے راستے پر جس سے مَیں بخیریت مَدیَن پہنچ جاؤں۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں مَدیَن فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر نہ تھی بلکہ صرف اس کے مغربی اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔ خلیج عَقَبہ کے مشرقی اور مغربی سواحل، جن پر بنی مَدیان آباد تھے، مصری اثر و اقتدار سے بالکل آزاد تھے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکلتے ہی مَدیَن کا رُخ کیا تھا، کیونکہ قریب ترین آزاد اور آباد علاقہ وہی تھا۔ لیکن وہاں جانے کے لیے انھیں گزرنا بہر حال مصر کے مقبوضہ علاقوں ہی سے تھا، اور مصر کی پولیس اور فوجی چوکیوں سے بچ کر نکلنا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایسے راستے پر ڈال دے جس سے میں صحیح وسلامت مَدیَن پہنچ جاؤں۔

۳۳- یہ مقام جہاں حضرت موسیٰؑ پہنچے تھے، عربی روایات کے مطابق خلیج عَقَبہ کے غربی ساحل پر مَقنا سے چند میل بجانبِ شمال واقع تھا۔ آج کل اسے البِدع کہتے ہیں اور وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ میں نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں تبوک سے عَقَبہ جاتے ہوئے اس جگہ کو دیکھا ہے۔ مقامی باشندوں نے مجھے بتایا کہ ہم باپ دادا سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ مَدیَن اسی جگہ واقع تھا۔ یُوسیفوس سے لے کر برٹن تک قدیم و جدید سیّاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی بالعموم مَدیَن کی جائے وقوع یہی بتائی ہے۔ اس کے قریب تھوڑے فاصلے پر وہ جگہ ہے جسے اب مَغائرِ شعیب یا مغاراتِ شعیب کہا جاتا ہے۔ اس جگہ ثمودی طرز کی کچھ عمارات موجود ہیں۔ اور اس سے تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کچھ قدیم کھنڈر ہیں جن میں دو اندھے کنویں ہم نے دیکھے۔ مقامی باشندوں نے ہمیں بتایا کہ یقین کے ساتھ تو ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن ہمارے ہاں روایات یہی ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک کنواں وہ تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بکریوں کو پانی پلایا ہے۔ یہی بات ابوالفِداء (مُتوفّی ۷۳۲ھ) نے تقویم البُلدان میں اور یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں ابو زید انصاری (مُتوفّی ۲۱۶ھ)

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ

موسیٰؑ نے اِن عورتوں سے پوچھا: ”تمھیں کیا پریشانی ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں[۳۴]۔“ یہ سُن کر موسیٰؑ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر ایک سایے کی جگہ جا بیٹھا اور بولا:

کے حوالے سے لکھی ہے کہ اس علاقے کے باشندے اسی مقام پر حضرت موسیٰؑ کے اس کنویں کی نشان دِہی کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صدیوں سے وہاں کے لوگوں میں متوارث چلی آ رہی ہے، اور اس بنا پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں جس مقام کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہے۔ مقابل کے صفحے پر اس مقام کی کچھ تصاویر مُلاحظہ ہوں۔

۳۴۔ یعنی ہم عورتیں ہیں، اِن چرواہوں سے مُزاحمت اور کشمکش کر کے اپنے جانوروں کو پانی پلانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ والد ہمارے اس قدر سِن رسیدہ ہیں کہ وہ خود یہ مَشَقّت اُٹھا نہیں سکتے۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم عورتیں ہی یہ کام کرنے نکلتی ہیں، اور جب تک سب چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے نہیں جاتے، ہم کو مجبوراً انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس سارے مضمون کو ان خواتین نے صرف ایک مختصر سے فقرے میں ادا کر دیا، جس سے ان کی حیاداری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مرد سے زیادہ بات بھی نہ کرنا چاہتی تھیں، مگر یہ بھی پسند نہ کرتی تھیں کہ یہ اجنبی ہمارے خاندان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کر لے اور اپنے ذہن میں یہ خیال کرے کہ کیسے لوگ ہیں جن کے مرد گھر بیٹھے رہے اور اپنی عورتوں کو اس کام کے لیے باہر بھیج دیا۔

ان خواتین کے والد کے متعلق ہمارے ہاں کی رِوایات میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اشارتاً و کنایتاً بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ وہ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ حالانکہ شعیب علیہ السلام کی شخصیّت قرآن میں ایک معروف شخصیت ہے۔ اگر ان خواتین کے والد وہی ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یہاں اس کی تصریح نہ کر دی جاتی۔ بلاشبہ بعض احادیث میں ان کے نام کی تصریح ملتی ہے، لیکن علامہ ابنِ جَریرؒ اور ابنِ کثیرؒ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے ابنِ عباسؓ، حسن بصری، ابوعُبَیدہ اور سعید بن جُبَیر جیسے اکابر مفسرین نے بنی اسرائیل کی رِوایات پر اعتماد کر کے ان بزرگ کے وہی نام بتائے ہیں جو تلمود وغیرہ میں آئے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسمِ شعیب کی تصریح منقول ہوتی تو یہ حضرات کوئی دوسرا نام نہ لے سکتے تھے۔

بائبل میں ایک جگہ ان بزرگ کا نام رعوایل اور دوسری جگہ یِترو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مَدین کے کاہن تھے۔ (خُروج باب ۲:۱۶-۱۸۔ باب ۳:۱۔ باب ۱۸:۵) تلمودی لٹریچر میں رعوایل، یتھرو اور حوباب تین مختلف

رَبِّ اِنِّىۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَىَّ مِنۡ خَيۡرٍ فَقِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتۡهُ اِحۡدٰٮہُمَا تَمۡشِىۡ عَلَى اسۡتِحۡيَآءٍ قَالَتۡ اِنَّ اَبِىۡ يَدۡعُوۡكَ

”پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔“ (کچھ دیر نہ گزری تھی کہ) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی[۳۵] اور کہنے لگی: ”میرے والد آپ کو بُلا رہے ہیں

نام بتائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علمائے یہود کا خیال ہے کہ یَترو ہِزایکسی لینسی کا ہم معنیٰ لقب تھا، اور اصل نام رعوایل یا حوباب تھا۔ اسی طرح لفظ کاہن (Kohen Midian) کی تشریح میں بھی علمائے یہود کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو پروہت (priest) کا ہم معنیٰ بتاتے ہیں اور بعض رئیس یا امیر (prince) کا۔

تَلمُود میں ان کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے فرعون کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی اور وہ ان کے علم اور اِصابتِ رائے پر اعتماد رکھتا تھا۔ مگر جب بنی اسرائیل کا اِستیصال کرنے کے لیے مصر کی شاہی کونسل میں مشورے ہونے لگے اور ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو انھوں نے فرعون کو اس غلط کام سے روکنے کی کوشش کی، اسے اس ظلم کے بُرے نتائج سے ڈرایا اور رائے دی کہ اگر ان لوگوں کا وجود آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو انھیں ان کے باپ دادا کے ملک کَنعان کی طرف نکال دیجیے۔ اس پر فرعون ان سے ناراض ہو گیا اور اس نے انھیں ذلّت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ اس وقت سے وہ اپنے ملک مَدیَن ہی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

ان کے مذہب کے متعلق قیاس یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ بھی دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔ کیونکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد تھے، اسی طرح وہ مِدیان بن ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ یہی تعلق غالباً اس کا موجب ہوا ہوگا کہ انھوں نے فرعون کو بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے روکا اور اس کی ناراضی مول لی۔ مفسر نَیسابوریؒ نے حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انه كان رجلا مسلما قبل الدين من شعيب (وہ ایک مسلمان آدمی تھے۔ حضرت شعیبؑ کا دین انھوں نے قبول کر لیا تھا)۔ تَلمُود میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ مِدیانیوں کی بت پرستی کو علانیہ حماقت قرار دیتے تھے، اس وجہ سے اہلِ مَدیَن ان کے مخالف ہو گئے تھے۔

۳۵- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فقرے کی یہ تشریح کی ہے: جاءت تمشي على استحياء قائلة بثوبها على وجهها ليست بسلفع من النساء دلاجة ولاجة خراجة۔ ”وہ شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اپنا منہ گھونگٹ سے چھپائے ہوئے آئی۔ ان بے باک عورتوں کی طرح دَرّانہ نہیں چلی آئی جو ہر طرف نکل جاتی اور ہر جگہ جا گھستی ہیں۔“ اس مضمون کی متعدِّد روایات سعید بن منصور، ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم اور ابن المُنذِر نے معتبر سندوں کے ساتھ حضرت عمرؓ سے نقل کی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے عہد میں حیاداری کا اسلامی تصوّر، جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

Maktaba Tul-Ishaat.com

لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ
قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا
يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾

تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں[۳۶]۔" موسیٰؑ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصّہ اسے سُنایا تو اس نے کہا: "کچھ خوف نہ کرو، اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔"

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا: "ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے، بہترین آدمی، جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو[۳۷]۔"

تعلیم و تربیت سے ان بزرگوں نے سمجھا تھا، چہرے کو اجنبیوں کے سامنے کھولے پھرنے اور گھر سے باہر بے باکانہ چلت پھرت دکھانے کے قطعاً خلاف تھا۔ حضرت عمرؓ صاف الفاظ میں یہاں چہرہ ڈھانکنے کو حیا کی علامت اور اسے اجانب کے سامنے کھولنے کو بے حیائی قرار دے رہے ہیں۔

۳۶– یہ بات بھی شرم و حیا ہی کی وجہ سے انھوں نے کہی، کیونکہ ایک غیر مرد کے پاس اکیلی جگہ آنے کی کوئی معقول وجہ بتانی ضروری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی نے اگر عورت ذات کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس کی کوئی مدد کی ہو تو اس کا بدلہ دینے کے لیے کہنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اور پھر اس بدلے کا نام سن لینے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے عالی ظرف انسان کا چل پڑنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس وقت انتہائی اضطرار کی حالت میں تھے۔ بے سروسامانی کے عالَم میں یکایک مصر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مَدیَن تک کم از کم آٹھ دن میں پہنچے ہوں گے۔ بھوک پیاس اور سفر کی تکان سے بُرا حال ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ فکر ہوگی کہ اس دیارِ غیر میں کوئی ٹھکانا میسر آئے اور کوئی ایسا ہمدرد ملے جس کی پناہ میں رہ سکیں۔ اسی مجبُوری کی وجہ سے یہ لفظ سُن لینے کے باوجود کہ اس ذرا سی خدمت کا اجر دینے کے لیے بلایا جا رہا ہے، حضرت موسیٰؑ نے جانے میں تأمُّل نہ کیا۔ انھوں نے خیال فرمایا ہوگا کہ خدا سے ابھی ابھی جو دعا میں نے مانگی ہے، اسے پورا کرنے کا یہ سامان خدا ہی کی طرف سے ہوا ہے، اس لیے اب خواہ مخواہ خودداری کا مظاہرہ کر کے اپ ب کے فراہم کردہ سامانِ میزبانی کو ٹھکرانا مناسب نہیں ہے۔

۳۷– ضروری نہیں کہ یہ بات لڑکی نے اپنے باپ سے حضرت موسیٰؑ کی پہلی ملاقات کے وقت ہی کہہ دی ہو۔ اغلب یہ ہے کہ اس کے والد نے اجنبی مسافر کو ایک دو روز اپنے پاس ٹھیرا لیا ہوگا اور اس دَوران میں کسی وقت بیٹی نے

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ
حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ
سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۲۷ قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ ؕ

اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا:[۳۸] "میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو، اور اگر دس سال پُورے کر دو تو یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم اِن شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔" موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔

باپ کو یہ مشورہ دیا ہوگا۔ اس مشورے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی کبرسنی کے باعث مجبوراً ہم لڑکیوں کو کام کے لیے نکلنا پڑتا ہے۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے کہ باہر کے کام سنبھالے۔ آپ اس شخص کو ملازم رکھ لیں۔ مضبوط آدمی ہے، ہر طرح کی مَشقّت کرے گا۔ اور بھروسے کے قابل آدمی ہے۔ محض اپنی شرافت کی بنا پر اس نے ہم عورتوں کو بے بس کھڑا دیکھ کر ہماری مدد کی، اور کبھی ہماری طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔

۳۸- یہ بھی ضروری نہیں کہ بیٹی کی بات سنتے ہی باپ نے فوراً حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہہ دی ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے بیٹی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہوگی کہ آدمی شریف سہی، مگر جوان بیٹیوں کے گھر میں ایک جوان، تندرست و توانا آدمی کو یونہی ملازم رکھ چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ جب یہ شریف، تعلیم یافتہ، مہذب اور خاندانی آدمی ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کا قصّہ سن کر انھیں معلوم ہو چکا ہوگا) تو کیوں نہ اسے داماد بنا کر ہی گھر میں رکھا جائے۔ اس رائے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے کسی مناسب وقت پر حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہی ہوگی۔

یہاں پھر بنی اسرائیل کی ایک کرم فرمائی مُلاحظہ ہو جو انھوں نے اپنے جلیل القدر نبی، اپنے سب سے بڑے محسن اور قومی ہیرو پر کی ہے۔ تلمود میں کہا گیا ہے کہ "موسیٰ رعوایل کے ہاں رہنے لگے، اور وہ اپنے میزبان کی بیٹی صفورا پر نظرِ عنایت رکھتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار انھوں نے اس سے بیاہ کر لیا۔" ایک اور یہودی روایت جو جیوش انسائیکلوپیڈیا میں نقل کی گئی ہے، یہ ہے کہ "حضرت موسیٰؑ نے جب یتھرو کو اپنا سارا ماجرا سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت تباہ ہونے کی پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے اس نے فوراً حضرت موسیٰؑ کو قید کر لیا، تاکہ انھیں فرعون کے حوالے کر کے انعام حاصل کرے۔ سات یا دس سال تک وہ اس کی قید میں رہے۔ ایک تاریک تہ خانہ تھا جس میں وہ بند تھے۔ مگر یتھرو کی بیٹی زِفورا (یا صفورا) جس سے کنویں پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، چپکے چپکے ان سے قید خانے میں ملتی رہی اور انھیں کھانا پانی

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ
وَكِيْلٌ ۝ۧ۲۸ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ
جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ

اِن دونوں مدّتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دُوں اُس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو، اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں، اللہ اس پر نگہبان ہے۔[۳۹]" ع

جب موسیٰؑ نے مدّت پوری کر دی[۴۰] اور وہ اپنے اہل وعیال کو لے کر چلا تو طُور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔[۴۱] اس نے اپنے گھر والوں سے کہا: "ٹھیرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے

بھی پہنچاتی رہی۔ ان دونوں میں شادی کی خفیہ قرارداد ہو چکی تھی۔ سات یا دس سال کے بعد زفورا نے اپنے باپ سے کہا کہ اتنی مدت ہوئی آپ نے ایک شخص کو قید میں ڈال دیا تھا اور پھر اس کی خبر تک نہ لی۔ اب تک اسے مر جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر وہ اب بھی زندہ ہو تو ضرور کوئی خدارسیدہ آدمی ہے۔ یتھرو اس کی یہ بات سن کر جب قید خانے میں گیا تو حضرت موسیٰؑ کو زندہ دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ وہ معجزے سے زندہ ہیں۔ تب اس نے زفورا سے ان کی شادی کر دی۔"

جو مغربی مستشرقین قرآنی قصّوں کے مآخذ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، انھیں کہیں یہ کھلا فرق بھی نظر آتا ہے جو قرآن کے بیان اور اسرائیلی رِوایات میں پایا جاتا ہے؟

۳۹- بعض لوگوں نے حضرت موسیٰؑ اور لڑکی کے والد کی اس گفتگو کو نکاح کا ایجاب وقبول سمجھ لیا ہے اور یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ آیا باپ کی خدمت بیٹی کے نکاح کا مہر قرار پا سکتی ہے؟ اور کیا عقدِ نکاح میں اس طرح کی خارجی شرائط شامل ہو سکتی ہیں؟ حالانکہ آیاتِ زیرِ بحث کی عبارت سے خود ہی یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ یہ عقدِ نکاح نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی بات چیت تھی جو نکاح سے پہلے تجویزِ نکاح کے سلسلے میں بالعموم دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آخر یہ نکاح کا ایجاب وقبول کیسے ہو سکتا ہے جب کہ یہ تعیُّن بھی اس میں نہ کیا گیا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں سے کون سی نکاح میں دی جا رہی ہے۔ اس گفتگو کا ماحصل تو صرف یہ تھا کہ لڑکی کے باپ نے کہا: میں اپنی لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کر دینے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آٹھ دس سال میرے ہاں رہ کر میرے گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ کیونکہ اس رشتے سے میری اصل غرض یہی ہے کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، کوئی بیٹا میرے ہاں نہیں ہے جو میری جائداد کا انتظام سنبھالے، لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں جنھیں مجبوراً باہر نکالتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ داماد میرا دست وبازو بن کر رہے، یہ ذمہ داری اگر تم سنبھالنے کے لیے تیار ہو اور شادی کے بعد ہی بیوی کو لے کر چلے جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہو، تو مَیں اپنی ایک لڑکی کا نکاح تم سے

اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَۃٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ
اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیٴِ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ مِنَ
الشَّجَرَۃِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۳۰﴾ وَ اَنۡ اَلۡقِ

کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارا ہی اُٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو۔" وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے[۴۲] پر مبارک خطے[۴۳] میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ "اے موسیٰؑ! میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک۔" اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے

کردوں گا۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت خود ایک ٹھکانے کے طالب تھے۔ انھوں نے اس تجویز کو قبول کرلیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک معاہدے کی صورت تھی جو نکاح سے پہلے فریقین میں طے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اصل عقدِ نکاح قاعدے کے مطابق ہوا ہو گا اور اس میں مہر بھی باندھا گیا ہوگا۔ اُس عقد میں خدمت کی شرط شامل ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

۴۰- حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے آٹھ کے بجائے دس سال کی مدت پوری کی تھی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: قضٰی موسٰی اتم الاجلین واطیبھما عشر سنین۔" موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے وہ مدت پوری کی جو زیادہ کامل اور ان کے خُسر کے لیے زیادہ خوش گوار تھی، یعنی دس سال۔"

۴۱- اس سفر کا رُخ طُور کی جانب ہونے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے اہل و عیال کو لے کر مصر ہی جانا چاہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ طُور اُس راستے پر ہے جو مَدیَن سے مصر کی طرف جاتا ہے۔ غالباً حضرت موسیٰؑ نے خیال کیا ہو گا کہ دس سال گزر چکے ہیں۔ وہ فرعون بھی مر چکا ہے جس کی حکومت کے زمانے میں وہ مصر سے نکلے تھے۔ اب اگر خاموشی کے ساتھ وہاں چلا جاؤں اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہ پڑوں تو شاید کسی کو میرا پتا بھی نہ چلے۔

بائبل کا بیان یہاں واقعات کی ترتیب میں قرآن کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے خسر کی بکریاں چَراتے ہوئے "بیابان کے پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک" آ نکلے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا اور انھیں رسالت کے منصب پر مامور کر کے مصر جانے کا حکم دیا۔ پھر وہ اپنے خُسر کے پاس واپس آ گئے اور ان سے اجازت لے کر اپنے بال بچوں کے ساتھ مصر روانہ ہوئے۔ (خُروج ۳:۱۔ ۴:۱۸-۲۰) اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو لے کر مَدیَن سے روانہ ہوئے اور اس سفر میں اللہ تعالیٰ کی مُخاطبَت اور منصبِ نبوت پر تقرر کا معاملہ پیش آیا۔

بائبل اور تلمود، دونوں کا مُتّفقہ بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانۂ قیامِ مَدیَن میں وہ فرعون مر چکا تھا جس کے ہاں

Maktaba Tul Ishaat.com

عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰٓى
اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ

اپنی لاٹھی۔ جونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہُوا:) "موسیٰؑ! پلٹ آ اور خوف نہ کر، تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔[۴۴] اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے۔[۴۵]

انھوں نے پرورش پائی تھی اور اب ایک دوسرا فرعون مصر کا فرماں روا تھا۔

۴۲ – یعنی اُس کنارے پر جو حضرت موسیٰؑ کے داہنے ہاتھ کی طرف تھا۔

۴۳ – یعنی اُس خطّے میں جو نورِ تجلّی سے روشن ہو رہا تھا۔

۴۴ – یہ دونوں معجزے اس وقت حضرت موسیٰؑ کو اس لیے دکھائے گئے کہ اوّل تو انھیں خود پوری طرح یقین ہوجائے کہ فی الواقع وہی ہستی ان سے مخاطب ہے جو کائنات کے پورے نظام کی خالق و مالک اور فرماں روا ہے۔ دوسرے وہ ان معجزوں کو دیکھ کر مطمئن ہوجائیں کہ جس خطرناک مشن پر انھیں فرعون کی طرف بھیجا جا رہا ہے، اس کا سامنا کرنے کے لیے وہ بالکل نہتے نہیں جائیں گے بلکہ دو زبردست ہتھیار لے کر جائیں گے۔

۴۵ – یعنی جب کبھی کوئی خطرناک موقع ایسا آئے جس سے تمھارے دل میں خوف پیدا ہو تو اپنا بازو بھینچ لیا کرو، اس سے تمھارا دل قوی ہوجائے گا اور رُعب و دہشت کی کوئی کیفیت تمھارے اندر باقی نہ رہے گی۔

بازو سے مراد غالباً سیدھا بازو ہے، کیونکہ مطلقاً ہاتھ بول کر سیدھا ہاتھ ہی مراد لیا جاتا ہے۔ بھینچنے کی دو شکلیں ممکن ہیں: ایک، یہ کہ بازو کو پہلو کے ساتھ لگا کر دبا لیا جائے۔ دوسری، یہ کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی بغل میں رکھ کر دبایا جائے۔ اغلب یہ ہے کہ پہلی شکل ہی مراد ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرا کوئی شخص یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ آدمی اپنے دل کا خوف دُور کرنے کے لیے کوئی خاص عمل کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ تدبیر اس لیے بتائی گئی کہ وہ ایک ظالم حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی لاؤ لشکر اور دنیوی ساز و سامان کے بغیر بھیجے جا رہے تھے۔ بارہا ایسے خوفناک مواقع پیش آنے والے تھے جن میں ایک اولوالعزم نبی تک دہشت سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے، تم بس یہ عمل کرلیا کرو، فرعون اپنی پوری سلطنت کا زور لگا کر بھی تمھارے دل کی طاقت کو متزلزل نہ کرسکے گا۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾
وَاَخِىْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِىْۤ ۫
اِنِّىْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ
لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا

معانقۃ ۱۱

یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے، وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔[۴۶] موسیٰؑ نے عرض کیا: "میرے آقا! میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔[۴۷] اور میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔" فرمایا: "ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سطوت بخشیں گے کہ وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمھارا اور تمھارے

۴۶- ان الفاظ میں یہ مفہوم آپ سے آپ شامل ہے کہ یہ نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اللہ کے رسول کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اور اس کے اعیانِ سلطنت کو اللہ رب العالمین کی اطاعت و بندگی کی طرف دعوت دو۔ اسی لیے یہاں اس ماموریت کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر صراحت کے ساتھ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نازعات میں فرمایا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ "فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔" اور الشعراء میں فرمایا: وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ "جب کہ پکارا تیرے رب نے موسیٰؑ کو کہ جا ظالم قوم کے پاس، فرعون کی قوم کے پاس۔"

۴۷- اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس ڈر سے میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ حضور کی طرف سے ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیے کہ میرے پہنچتے ہی کسی بات چیت اور ادائے رسالت کی نوبت آنے سے پہلے وہ لوگ مجھے الزامِ قتل میں گرفتار نہ کر لیں، کیونکہ اس صورت میں تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے مجھے اس مہم پر بھیجا جا رہا ہے۔ بعد کی عبارت سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی اس گزارش کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا کہ وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ
اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾

پیرووں کا ہی ہوگا۔"[۴۸]

پھر جب موسیٰؑ اُن لوگوں کے پاس ہماری کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔[۴۹] اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سُنیں ہی نہیں۔[۵۰]

ڈر کے مارے نبوت کا منصب قبول کرنے اور فرعون کے ہاں جانے سے انکار کرنا چاہتے تھے۔

۴۸ - اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی اس ملاقات اور گفتگو کا حال اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ طٰہٰ (آیت ۹ تا ۴۸) میں بیان ہوا ہے۔ قرآنِ مجید کے اس بیان کا جو شخص بھی اُس داستان سے مقابلہ کرے گا جو اس سلسلے میں بائبل کی کتابِ خُروج (باب ۳-۴) میں بیان کی گئی ہے، وہ اگر کچھ ذوقِ سلیم رکھتا ہو تو خود محسوس کر لے گا کہ ان دونوں میں سے کلامِ الٰہی کون سا ہے اور انسانی داستان گوئی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ نیز وہ اس معاملے میں بھی بآسانی رائے قائم کر سکے گا کہ آیا قرآن کی یہ روایت معاذ اللہ، بائبل اور اسرائیلی رِوایات کی نقل ہے، یا وہ خدا خود اصل واقعہ بیان فرما رہا ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کو باریاب فرمایا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۹)

۴۹ - اصل الفاظ ہیں: سِحْرٌ مُّفْتَرًى "افترا کیا ہُوا جادُو"۔ اس افترا کو اگر جھوٹ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لاٹھی کا اژدہا بننا اور ہاتھ کا چمک اُٹھنا، نفسِ شے میں حقیقی تغیر نہیں ہے بلکہ محض ایک نمائشی شعبدہ ہے جسے یہ شخص معجزہ کہہ کر ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور اگر اسے بناوٹ کے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ یہ شخص کسی کرتب سے ایک ایسی چیز بنا لایا ہے جو دیکھنے میں لاٹھی معلوم ہوتی ہے مگر جب یہ اسے پھینک دیتا ہے تو سانپ نظر آنے لگتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ پر بھی اس نے کوئی ایسی چیز مل لی ہے کہ اس کی بغل سے نکلنے کے بعد وہ یکایک چمک اُٹھتا ہے۔ یہ مصنوعی طِلسم اس نے خود تیار کیا ہے، اور ہمیں یقین یہ دلا رہا ہے کہ یہ معجزے ہیں جو خدا نے اسے عطا کیے ہیں۔

۵۰ - اشارہ ہے اُن باتوں کی طرف جو تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں حضرت موسیٰؑ نے پیش کی تھیں۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر ان باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ النازعات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا: هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ "کیا تو پاکیزہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہے؟ اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو خشیت اختیار کرے گا؟" سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ○ "ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں، اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے، اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ سزا ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔" اور اِنَّا رَسُوْلَا

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ

موسیٰؑ نے جواب دیا: "میرا رب اُس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے، حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔"[۵۱]

اور فرعون نے کہا: "اے اہلِ دربار! میں تو اپنے سوا تمھارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔[۵۲] ہامان! ذرا

رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ "ہم تیرے رب کے پیغمبر ہیں، تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔" انھی باتوں کے متعلق فرعون نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فرعونِ مصر سے اُوپر بھی کوئی ایسی مُقتدِر ہستی ہے جو اس کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے دربار میں بھیجے، اور جس سے ڈرنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے کہا جائے۔ یہ تو نرالی باتیں ہیں جو آج ہم ایک شخص کی زبان سے سُن رہے ہیں۔

۵۱ - یعنی تُو مجھے ساحر اور افترا پرداز قرار دیتا ہے، لیکن میرا رب میرے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس کی طرف سے رسول مقرر کیا گیا ہے، وہ کیسا آدمی ہے۔ اور آخری انجام کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں جھوٹا ہوں تو میرا انجام بُرا ہوگا اور تُو جھوٹا ہے تو پھر خوب جان لے کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہے۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ظالم کے لیے فلاح نہیں ہے۔ جو شخص خدا کا رسول نہ ہو اور جھوٹ موٹ کا رسول بن کر اپنا کوئی مفاد حاصل کرنا چاہے، وہ بھی ظالم ہے اور فلاح سے محروم رہے گا، اور جو طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر سچّے رسول کو جھٹلائے اور مکاریوں سے صداقت کو دبانا چاہے، وہ بھی ظالم ہے اور اسے کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔

۵۲ - اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ہی تمھارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات صرف ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی تھی۔ اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ میرے سوا تمھارا کوئی معبُود نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مصر کے مذہب میں بہت سے معبُودوں کی پرستش ہوتی تھی، اور خود فرعون کو جس بنا پر معبُودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا، وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآنِ مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا: وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ "اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تُو موسیٰؑ اور اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ
وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ

اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اُونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اِسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔[۵۳]"

اُس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[۵۴] اور سمجھے کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔[۵۵] آخرکار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا

قوم کو چھوٹ دے دے گا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے معبُودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاعراف، آیت ۱۲۷) اس لیے لامحالہ یہاں فرعون نے لفظ "خدا" اپنے لیے بمعنیٰ خالق و معبُود نہیں بلکہ بمعنیٰ مُطاع و حاکمِ مُطلَق استعمال کیا تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک مَیں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ میرا ہی قانون یہاں قانون مانا جائے گا۔ میری ذات ہی یہاں امر ونہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی۔ کوئی دوسرا یہاں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے۔ یہ موسیٰ کون ہے جو رب العالمین کا نمایندہ بن کر آ کھڑا ہوا ہے اور مجھے اس طرح احکام سنا رہا ہے کہ گویا اصل فرمانروا یہ ہے اور میں اس کا تابع فرمان ہوں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے دربار کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا: يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ "اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں؟" (الزُخرُف، آیت ۵۱)، اور اسی بنا پر وہ حضرت موسیٰؑ سے بار بار کہتا تھا: اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۚ "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے؟" (یونس، آیت ۷۸) اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ○ "اے موسیٰؑ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادُو کے زور سے ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟" (طٰہٰ، آیت ۵۷) اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ○ "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔" (المومن، آیت ۲۶)

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن اُن ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خودمختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمۂ قانون اور صاحبِ امر ونہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، بہرحال جب تک وہ یہ مَوقِف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں

بلکہ ہمارا حکم چلے گا، اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اُصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور اِن کو سندِ جواز عطا کرتے رہیں۔ حقائق کی سمجھ بُوجھ رکھنے والا آدمی تو معنٰی اور رُوح کو دیکھے گا، نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لیے ''اِلٰہ'' کا لفظ استعمال کیا تھا، اور یہ اسی معنٰی میں ''حاکمیت'' کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۲۱)

۵۳ - یہ اسی قسم کی ذہنیت تھی جیسی موجودہ زمانے کے رُوسی کمیونسٹ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ اسپٹنک اور لونِک چھوڑ کر دنیا کو خبر دیتے ہیں کہ ہماری اِن گیندوں کو اُوپر کہیں خدا نہیں ملا۔ وہ بے وقوف ایک مینارے پر چڑھ کر خدا کو جھانکنا چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گمراہ لوگوں کے ذہن کی پرواز ساڑھے تین ہزار برس پہلے جہاں تک تھی، آج بھی وہیں تک ہے۔ اس اعتبار سے ایک اُنگل بھر ترقی بھی وہ نہیں کر سکے ہیں۔ معلوم نہیں کس احمق نے اِن کو یہ خبر دی تھی کہ خدا پرست لوگ جس رب العالمین کو مانتے ہیں، وہ اُن کے عقیدے کی رُو سے اُوپر کہیں بیٹھا ہُوا ہے، اور اس اِتھاہ کائنات میں زمین سے چند ہزار فٹ یا چند لاکھ میل اُوپر اُٹھ کر اگر وہ اِنھیں نہ ملے تو یہ بات گویا بالکل ثابت ہو جائے گی کہ وہ کہیں موجود نہیں ہے۔

قرآن یہاں یہ نہیں کہتا کہ فرعون نے فی الواقع ایک عمارت اس غرض کے لیے بنوائی تھی اور اس پر چڑھ کر خدا کو جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بلکہ وہ اُس کے صرف اس قول کو نقل کرتا ہے۔ اِس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عملاً یہ حماقت نہیں کی تھی۔ اِن باتوں سے اس کا مدعا صرف بے وقوف بنانا تھا۔

یہ امر بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ فرعون آیا فی الواقع خداوندِ عالم کی ہستی کا منکر تھا، یا محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر دہریت کی باتیں کرتا تھا۔ اس کے اقوال اس معاملے میں اُسی ذہنی اُلجھاؤ کی نشان دہی کرتے ہیں جو رُوسی کمیونسٹوں کی باتوں میں پایا جاتا ہے۔ کبھی تو وہ آسمان پر چڑھ کر دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اُوپر دیکھ آیا ہوں، موسیٰؑ کا خدا کہیں نہیں ہے۔ اور کبھی وہ کہتا: فَلَوۡلَاۤ اُلۡقِیَ عَلَیۡهِ اَسۡوِرَةٌ مِّنۡ ذَهَبٍ اَوۡ جَآءَ مَعَهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ مُقۡتَرِنِیۡنَ ''اگر موسیٰؑ واقعی خدا کا بھیجا ہُوا ہے تو کیوں نہ اُس کے لیے سونے کے کنگن اُتارے گئے، یا اس کی اَردَلی میں ملائکہ نہ آئے؟'' یہ باتیں رُوس کے ایک سابق وزیرِ اعظم خروشچیف کی باتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں جو کبھی خدا کا انکار کرتا اور کبھی بار بار خدا کا نام لیتا اور اس کے نام کی قسمیں کھاتا تھا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے خلفا کا دورِ اقتدار گزر جانے کے بعد جب مصر میں قبطی قوم پرستی کا زور ہوا اور ملک میں اِسی نسلی و وطنی تعصُّب کی بنیاد پر سیاسی انقلاب رونما ہو گیا، تو نئے لیڈروں نے اپنے قوم پرستانہ جوش میں اُس خدا کے خلاف بھی بغاوت کر دی جس کو ماننے کی دعوت حضرت یوسفؑ اور ان کے پیرو اسرائیلی اور مصری مسلمان دیتے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ خدا کو مان کر ہم یُوسُفی تہذیب کے اثر سے نہ نکل سکیں گے، اور یہ تہذیب باقی رہی تو ہمارا سیاسی اثر بھی مستحکم نہ ہو سکے گا۔ وہ خدا کے اقرار اور مُسلِم اقتدار کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے، اس لیے ایک سے پیچھا چھڑانے کی خاطر دوسرے کا انکار ان کے نزدیک ضروری تھا، اگرچہ اس کا اقرار ان کے دل کی گہرائیوں سے کسی طرح نکالے نہ نکلتا تھا۔

۵۴ - یعنی بڑائی کا حق تو اس کائنات میں صرف اللہ رب العالمین کو ہے۔ مگر فرعون اور اس کے لشکر زمین کے ایک ذرا سے خطے میں تھوڑا سا اقتدار پا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں بڑے بس وہی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ
اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ
فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع وَلَقَدْ
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ
لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ

اور سمندر میں پھینک دیا۔[۵۶] اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انھیں جہنّم کی طرف دعوت دینے والے پیش رَو بنا دیا[۵۷] اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اِس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے[۵۸]۔ ع

پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی، لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر، ہدایت اور رحمت بنا کر، تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں۔[۵۹] (اے محمدؐ!) تم اُس وقت

۵۵ - یعنی انھوں نے اپنے آپ کو غیر مسئول سمجھ لیا اور یہ فرض کر کے خود مختارانہ کام کرنے لگے کہ انھیں جا کر کسی کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

۵۶ - ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے تکبّر کے مقابلے میں ان کی بے حقیقتی اور ہیچ میرزی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر جب وہ مہلت، جو خدا نے ان کو راہِ راست پر آنے کے لیے دی تھی، ختم ہوگئی تو انھیں اِس طرح اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۵۷ - یعنی وہ بعد کی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کر گئے ہیں کہ ظلم یوں کیا جاتا ہے، انکارِ حق پر ڈٹ جانے اور آخر وقت تک ڈٹے رہنے کی شان یہ ہوتی ہے، اور صداقت کے مقابلے میں باطل پرست لوگ ایسے ایسے ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب راستے دنیا کو دکھا کر وہ جہنّم کی طرف جا چکے ہیں، اور ان کے اَخلاف اب اُنھی کے نقشِ قدم پر چل کر اُسی منزل کے رُخ لپکے جا رہے ہیں۔

۵۸ - اصل الفاظ ہیں: قیامت کے روز وہ "مقبوحین" میں سے ہوں گے۔ اس کے کئی معنٰی ہو سکتے ہیں۔ وہ

الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَ
لٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ
مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا كُنْتَ

مغربی گوشے میں موجود نہ[۶۰] تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل[۶۱] تھے، بلکہ اس کے بعد (تمھارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا[۶۲] ہے۔ تم اہلِ مَدیَن کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سُنا رہے ہوتے[۶۳]، مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی

مردود و مطرود ہوں گے۔ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم کر دیے جائیں گے۔ ان کی بُری گت بنائی جائے گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیے جائیں گے۔

۵۹ - یعنی پچھلی نسلیں جب انبیائے سابقین کی تعلیمات سے رُوگردانی کا بُرا نتیجہ بھگت چکیں، اور ان کا آخری انجام وہ کچھ ہو چکا جو فرعون اور اس کے لشکروں نے دیکھا، تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی گئی، تاکہ انسانیت کا ایک نیا دَور شروع ہو۔

۶۰ - مغربی گوشے سے مراد جزیرہ نمائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو احکامِ شریعت دیے گئے تھے۔ یہ علاقہ حجاز کے مغربی جانب واقع ہے۔

۶۱ - یعنی بنی اسرائیل کے اُن ستر نمایندوں میں جن کو شریعت کی پابندی کا عہد لینے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بلایا گیا تھا۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۵۵ میں اُن نمایندوں کے بلائے جانے کا ذکر گزر چکا ہے، اور بائبل کی کتاب خُروج، باب ۲۴ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے)۔

۶۲ - یعنی تمھارے پاس اِن معلومات کے حُصول کا براہِ راست کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آج جو تم ان واقعات کو دو ہزار برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد اِس طرح بیان کر رہے ہو کہ گویا یہ سب تمھارا آنکھوں دیکھا حال ہے، اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے سے تم کو یہ معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔

۶۳ - یعنی جب حضرت موسیٰؑ مَدیَن پہنچے، اور جو کچھ وہاں ان کے ساتھ پیش آیا، اور دس سال گزار کر جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے، اس وقت تمھارا کہیں پتا بھی نہ تھا۔ تم اس وقت مدین کی بستیوں میں وہ کام نہیں کر رہے تھے جو آج مکے کی گلیوں میں کر رہے ہو۔ اُن واقعات کا ذکر تم کچھ اس بنا پر نہیں کر رہے ہو کہ یہ تمھارا عینی مشاہدہ ہے، بلکہ یہ علم

Maktaba Tul Ishaat.com

بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَاۤ

اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰؑ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر یہ تمھارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جارہی ہیں[۶۴]) تاکہ تم اُن لوگوں کو مُتنبّہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی مُتنبِّہ کرنے والا نہیں آیا[۶۵]، شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں

بھی تم کو ہماری وحی کے ذریعے سے ہی حاصل ہُوا ہے۔

۶۴ – یہ تینوں باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں، اس وقت مکے کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر پوری طرح تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو غیر نبی، اور معاذ اللہ، جھوٹا مدعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علما اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالَمِ بالا سے آکر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے بلکہ اُسی مکّے کے رہنے والے تھے اور آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپؐ کی بستی اور آپؐ کے قبیلے کے لوگوں سے چُھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اس وقت مکہ، اور حجاز، اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اُٹھ کر وہ بیہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ اِن سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحے کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ! تم فلاں فُلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لائے ہو، کیونکہ پورے مُلک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہوجاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ! تمھارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکّے کا بچّہ بچّہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپؐ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عِبرانی اور سُریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپؐ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپؐ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے۔ کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوئے تھے۔ مکّے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپؐ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سیکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپؐ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومیوں سے

مسلمان برسرِ پیکار ہوگئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی رَبّی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رُومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمدؐ، معاذ اللہ، سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض، اُس زمانے میں جب کہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفار و مشرکین کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا اِن معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشان دہی کی جا سکتی ہو۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن نے یہ چیلنج اِسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر مختلف قصّوں کے سلسلے میں دیا ہے۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کا قصّہ بیان کر کے فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۝ ”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے سے تمھیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے آس پاس کہیں موجود نہ تھے جب کہ وہ اپنے قرعے یہ طے کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے۔ اور نہ تم اس وقت موجود تھے جب کہ وہ جھگڑ رہے تھے۔“ (آلِ عمران، آیت ۴۴) حضرت یوسفؑ کا قصّہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۝ ”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے سے تمھیں دے رہے ہیں، تم ان کے (یعنی یوسفؑ کے بھائیوں کے) آس پاس کہیں موجود نہ تھے جب کہ انھوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ اپنی چال چل رہے تھے۔“ (یوسف، آیت ۱۰۲) اسی طرح حضرت نوحؑ کا مفصّل قصّہ بیان کر کے فرمایا: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ”یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، تمھیں اور تمھاری قوم کو اس سے پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا۔“ (ہود، آیت ۴۹) اِس چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید اپنے من جانب اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے بڑے دلائل دیتا تھا، ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک اُمّی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں، ان کے علم کا کوئی ذریعہ اُس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز اُن اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے جا رہے تھے کہ واقعی آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور آپؐ پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصور کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اُس زمانے میں اِس چیلنج کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیت رکھتا ہوگا، اور انھوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں کیا کسر اُٹھا رکھی ہوگی۔ نیز یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاذ اللہ، اِس چیلنج میں ذرا سی بھی کوئی کمزوری ہوتی تو اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے شہادتیں فراہم کرنا ہم عصر لوگوں کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

۶۵۔ عرب میں حضرت اسماعیل اور حضرت شعیب علیہما السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ تقریباً دو ہزار برس کی اس طویل مدت میں باہر کے انبیاؑ کی دعوتیں تو ضرور وہاں پہنچیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام

Maktaba-Tul-Ishaat.com

اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ
اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا
جَآءَهُمُ الۡحَـقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُوۡتِىَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى ؕ اَوَ
لَمۡ يَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ۚ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰهَرَا ۙ وَقَالُوۡۤا

ایسا نہ ہو کہ اُن کے اپنے کیے کرتُوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب اُن پر آئے تو وہ کہیں: ''اے پروردگار! تُو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے[۶۶]۔''

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے: ''کیوں نہ دیا گیا اِس کو وہی کچھ جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا[۶۷]؟'' کیا یہ لوگ اُس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰؑ کو دیا گیا تھا[۶۸]؟ انھوں نے کہا: ''دونوں جادُو ہیں[۶۹] جو ایک دُوسرے کی مدد کرتے ہیں۔'' اور کہا:

کی دعوتیں، مگر کسی نبی کی بعثتِ خاص اس سرزمین میں نہیں ہوئی تھی۔

۶۶ – اِسی چیز کو قرآنِ مجید متعدد مقامات پر رسولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسول آنا چاہیے۔ جب تک دنیا میں ایک رسول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود رہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود رہیں، کسی نئے رسول کی حاجت نہیں رہتی، اِلّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاؑ کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا گمراہیوں میں خَلط مَلط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے قابل نہ رہیں، تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرنے اور صحیح راہ بتانے کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پا سکتے تھے۔ اسی عذر کو قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے، تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کج روی کا ذمہ دار ٹھیرایا جا سکے۔

۶۷ – یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارے معجزے کیوں نہ دیے گئے جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے تھے۔ یہ بھی عصا کا اژدہا بنا کر ہمیں دکھاتے۔ ان کا ہاتھ بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا۔ جھٹلانے والوں پر ان کے اشارے سے بھی پے در پے طوفانوں اور زمین و آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا، اور یہ بھی پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام لا کر ہمیں دیتے۔

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى
مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ
هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ ط ع ۸
النصف اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

’’ہم کسی کو نہیں مانتے۔‘‘ (اے نبیؐ!) ان سے کہو: ’’اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو اِن دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو، مَیں اسی کی پیروی اختیار کروں گا۔[۶۹-۷۰]‘‘ اب اگر وہ تمھارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اُس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ ع اور (نصیحت کی) بات پے در پے ہم انھیں پہنچا چکے ہیں، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں۔[۷۱]

جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔[۷۲]

۶۸ – یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان معجزوں کے باوجود موسیٰؑ ہی پر تم کب ایمان لائے تھے جو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کا مطالبہ کر رہے ہو۔ تم خود کہتے ہو کہ موسیٰؑ کو یہ معجزے دیے گئے تھے۔ مگر پھر بھی ان کو نبی مان کر ان کی پیروی تم نے کبھی قبول نہیں کی۔ سورۂ سبا، آیت ۳۱ میں بھی کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ’’نہ ہم اِس قرآن کو مانیں گے نہ اُن کتابوں کو جو اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں۔‘‘

۶۹ – یعنی قرآن اور تورات۔

۷۰ – یعنی مجھے تو ہدایت کی پیروی کرنی ہے، بشرطیکہ وہ کسی کی من گھڑت نہ ہو، بلکہ خدا کی طرف سے حقیقی ہدایت ہو۔ اگر تمھارے پاس کوئی کتاب اللہ موجود ہے جو قرآن اور تورات سے بہتر رہنمائی کرتی ہو، تو اسے تم نے چھپا کیوں رکھا ہے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓىٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ

اور جب یہ اُن کو سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اِس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔[۷۳]" یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا[۷۴] اُس

اسے سامنے لاؤ، میں بلا تأمّل اس کی پیروی قبول کرلوں گا۔

۷۱ – یعنی جہاں تک حقِ نصیحت ادا کرنے کا تعلق ہے، ہم اس قرآن میں پیہم اسے ادا کر چکے ہیں۔ لیکن ہدایت تو اُسی کو نصیب ہوسکتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑے اور تعصّبات سے دل کو پاک کر کے سچّائی کو سیدھی طرح قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

۷۲ – اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بلکہ یہ اشارہ دراصل اُس واقعے کی طرف ہے جو اِس سورہ کے نزول کے زمانے میں پیش آیا تھا، اور اس سے اہلِ مکہ کو شرم دلانی مقصود ہے کہ تم اپنے گھر آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو، حالانکہ دُور دُور کے لوگ اس کی خبر سن کر آرہے ہیں اور اُس کی قدر پہچان کر اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

اس واقعے کو ابنِ ہِشَام اور بَیہَقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکّۂ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجدِ حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہوگئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآنِ مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انھوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستے میں جالیا اور انھیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمھارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اِس لیے بھیجا تھا کہ تم اِس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انھیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اِس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انھوں نے جواب دیا کہ "سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمھارے ساتھ جہالت بازی نہیں کرسکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بُوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" (سیرت ابنِ ہِشَام، ج ۲، ص ۳۲۔ البِدایہ والنِّہایہ، ج ۳، ص ۸۲) مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۲۳۔

۷۳ – یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اس لیے اسلام کے سوا ہمارا کوئی

اور دین نہ تھا۔ اور اب جو نبی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

یہ قول اس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور ''مسلم'' کی اصطلاح کا اطلاق محض حضورؐ کے پیرووں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاؑ کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانے میں ان سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہوئے تو صرف اُس وقت جب کہ کسی بعد کے آنے والے نبیِ صادق کو ماننے سے انھوں نے انکار کیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آئے، اُن کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ وہ جیسے مسلمان پہلے تھے، ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجّب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم بھی اس حقیقت کے اِدراک سے عاجز رہ گئے ہیں، حتیٰ کہ اس صریح آیت کو دیکھ کر بھی ان کا اطمینان نہ ہُوا۔ علامہ سُیُوطیؒ نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ مسلم کی اصطلاح صرف اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔ پھر جب یہ آیت سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ میں نے پھر خدا سے دعا کی کہ اس معاملے میں مجھے شرحِ صدر عطا کر دے۔ آخر کار اپنی رائے سے رُجوع کرنے کے بجائے انھوں نے اُس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدّد تاویلیں کر ڈالیں، جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً ان کی ایک تاویل یہ ہے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ کے معنیٰ ہیں: ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے، کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم اسلام قبول کرلیں گے۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ اس فقرے میں مُسْلِمِيْنَ کے بعد لفظ بِهٖ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے، کیونکہ اس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لائے ہوئے تھے، اس لیے تورات وانجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اس کے نُزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مسلم تھے۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کرلیں گے، اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی سے مسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرحِ صدر کا اس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن صرف اسی ایک مَقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اِس اُصولی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اصل دین صرف ''اسلام'' (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کی مخلوق کے لیے اِس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغازِ آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے، اور یہ کہ انبیا علیہم السلام ہمیشہ خود مسلم رہے ہیں، اپنے پیرووں کو انھوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور ان کے وہ سب متبعین، جنھوں نے نبوت کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مسلم ہی تھے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر صرف چند آیات مُلاحظہ ہوں:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آلِ عمران، آیت ۱۹) درحقیقت اللہ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آلِ عمران، آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ (یونس، آیت ۷۲)

میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (البقرہ، آیات ۱۳۱ تا ۱۳۳)

جب کہ اس کے رب نے اس سے کہا کہ مسلم (تابعِ فرمان) ہو جا، تو اس نے کہا: میں مسلم ہو گیا رب العالمین کے لیے۔ اور اسی چیز کی وصیت کی ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اور یعقوبؑ نے بھی، کہ اے میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے اس دین کو پسند کیا ہے، لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اس نے اپنی اولاد سے پوچھا: کس کی بندگی کرو گے تم میرے بعد؟ انھوں نے جواب دیا: ہم بندگی کریں گے آپ کے معبُود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبُود کی، اس کو اکیلا معبُود مان کر، اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ (آلِ عمران، آیت ۶۷)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسو مسلم تھا۔

حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خود دعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ (البقرہ، آیت ۱۲۸)

اے ہمارے رب! ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک اُمّت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔

حضرت لُوطؑ کے قصّے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ (الذاریات، آیت ۳۶)

ہم نے قومِ لُوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

حضرت یوسفؑ بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرتے ہیں:

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ ○ (یوسف، آیت ۱۰۱)

مجھ کو مسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور صالحوں کے ساتھ ملا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ○ (یونس، آیت ۸۴)	اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسا کرو اگر تم مسلم ہو۔

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے۔ چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے، وہ یہ ہے:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (یونس، آیت ۹۰)	میں مان گیا کہ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلموں میں سے ہوں۔

تمام انبیائے بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ (المائدہ، آیت ۴۴)	ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اسی کے مطابق وہ نبی جو مسلم تھے، اُن لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی ہو گئے تھے۔

یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا ان پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ (النمل، آیت ۴۴)	میں سلیمانؑ کے ساتھ رب العالمین کی مسلم ہو گئی۔

اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کا دین تھا:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ○ (المائدہ، آیت ۱۱۱)	اور جب کہ میں نے حواریوں پر وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر، تو انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔

اس معاملے میں اگر کوئی شک اِس بنا پر کیا جائے کہ عربی زبان کے الفاظ ’’اسلام‘‘ اور ’’مسلم‘‘ ان مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہو گی۔ کیونکہ اصل اعتبار عربی کے ان الفاظ کا نہیں بلکہ اُس معنیٰ کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات اِن آیات میں بتائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیّت یا موسویّت یا محمدیّت نہیں ہے، بلکہ انبیا اور کُتبِ آسمانی کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے، اور یہ رَویّہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالم گیر ازلی و ابدی دینِ حق کا متبع ہے۔ اس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شُعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے، ان کے لیے موسیٰ کے بعد مسیح کو، اور مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیلِ مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیا علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا

ثابت قدمی کے بدلے جو انھوں نے دکھائی [۷۵]۔ وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں [۷۶] اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں [۷۷]۔ اور جب انھوں نے بیہودہ بات سُنی [۷۸] تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے

گھس آئے یا پیدا ہو گئے، اور قومی و نسلی اور گروہی تعصّبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ان کی جہالت کی قلعی کھل گئی۔ کیونکہ انھوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آیندہ کے لیے مسلم رہنا قبول نہ کیا، بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مسلم" نہ تھے، محض ایک نبی یا بعض انبیاءؑ کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آباد اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے۔

۷۴- یعنی ایک اجر اُس ایمان کا جو وہ پہلے سیدنا عیسٰی علیہ السلام پر رکھتے تھے، اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبیِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسٰی اَشْعَریؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلثة لهم اجران، رجل من اهل الکتاب اٰمن بنبیه واٰمن بمحمد..... "تین شخص ہیں جن کو دُہرا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا۔"

۷۵- یعنی انھیں یہ دُہرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ قومی و نسلی اور وطنی و گروہی تعصّبات سے بچ کر اصل دینِ حق پر ثابت قدم رہے اور نئے نبی کی آمد پر جو سخت امتحان درپیش ہوا، اس میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ دراصل وہ مسیح پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے، اور شخصیتِ مسیحؑ کے گرویدہ نہیں بلکہ "اسلام" کے متبع تھے، اسی وجہ سے مسیحؑ کے بعد جب دوسرا نبی وہی اسلام لے کر آیا جسے مسیحؑ لائے تھے تو انھوں نے بے تکلف اس کی رہنمائی میں اسلام کا راستہ اختیار کر لیا اور اُن لوگوں کا راستہ چھوڑ دیا جو مسیحیت پر جمے رہ گئے۔

۷۶- یعنی وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں بلکہ صداقت لاتے ہیں۔ ظلم کو ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دفع کرتے ہیں۔ شرارتوں کا سامنا شرارت سے نہیں بلکہ شرافت سے کرتے ہیں۔

۷۷- یعنی وہ راہِ حق میں مالی ایثار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو کہ وہ لوگ

وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾ اِنَّكَ لَا
تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ
بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ

اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں[۷۹]۔

وہ کہتے ہیں: "اگر ہم تمھارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے[۸۰]۔"

محض حق کی تلاش میں حَبَش سے سفر کر کے مکہ آئے تھے۔ اس محنت اور صَرفِ مال سے کوئی مادّی منفعت ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ انھوں نے جب سنا کہ مکے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ خود جا کر تحقیق کریں، تاکہ اگر واقعی ایک نبی ہی خدا کی طرف سے مبعوث ہُوا ہو تو وہ اس پر ایمان لانے اور ہدایت پانے سے محروم نہ رہ جائیں۔

۷۸ - اشارہ ہے اُس بیہودہ بات کی طرف جو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے حبشی عیسائیوں کے اس وفد سے کی تھی، جس کا ذکر اُوپر حاشیہ ۷۲ میں گزر چکا ہے۔

۷۹ - سیاقِ کلام سے ظاہر ہے کہ حبشی عیسائیوں کے ایمان و اسلام کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود دراصل کفارِ مکہ کو شرم دلانا تھا۔ کہنا یہ تھا کہ بدنصیبو! ماتم کرو اپنی حالت پر کہ دوسرے کہاں کہاں سے آ کر اس نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں اور تم اس چشمۂ فیض سے، جو تمھارے اپنے گھر میں بہ رہا ہے، محروم رہے جاتے ہو۔ لیکن کہا گیا ہے اِس انداز سے کہ اے محمدؐ! صلی اللہ علیک وسلم، تم چاہتے ہو کہ میری قوم کے لوگ، میرے بھائی بند، میرے عزیز و اقارب، اِس آبِ حیات سے بہرہ مند ہوں، لیکن تمھارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ اس نعمت سے انھی لوگوں کو فیض یاب کرتا ہے جن میں وہ قبولِ ہدایت کی آمادگی پاتا ہے، تمھارے رشتہ داروں میں اگر یہ جوہر موجود نہ ہو تو انھیں یہ فیض کیسے نصیب ہوسکتا ہے۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے معاملے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا جب آخری وقت آیا تو حضورؐ نے اپنی حد تک انتہائی کوشش کی کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر ایمان لے آئیں تاکہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو، مگر انھوں نے مِلّتِ عبدالمُطَّلِب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لیکن محدثین و مفسّرین کا یہ طریقہ معلوم و معروف ہے کہ ایک آیت عہدِ نبویؐ کے جس معاملے پر چسپاں ہوتی ہے، اسے وہ آیت کی شانِ نُزول کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت اور اِسی مضمون کی اُن دوسری روایات سے جو ترمذی اور مُسندِ احمد وغیرہ میں حضرات ابو ہریرہؓ، ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ وغیرہم سے مروی ہیں، لازماً یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ سورۂ قصص کی یہ آیت ابو طالب کی وفات کے وقت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کی صداقت سب سے زیادہ اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ اگرچہ حضورؐ کی دلی خواہش تو ہر بندۂ خدا کو راہِ راست پر لانے کی تھی، لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر خاتمہ حضورؐ کو شاق ہو سکتا تھا، اور ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر سب سے زیادہ کسی شخص کی ہدایت کے آپؐ آرزومند ہو سکتے تھے، تو وہ ابو طالب تھے۔ لیکن جب ان کو بھی ہدایت دینے پر آپؐ قادر نہ ہوئے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ کسی کو ہدایت بخشنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا نبی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ کے ہاں سے یہ دولت کسی رشتہ داری و برادری کی بنا پر نہیں بلکہ آدمی کی قبولیت و استعداد اور مخلصانہ صداقت پسندی کی بنا پر عطا ہوتی ہے۔

۸۰ – یہ وہ بات ہے جو کفارِ قریش اسلام قبول نہ کرنے کے لیے عذر کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کفر و انکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔ اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ تاریخی طور پر اُس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انھیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیّت دی، وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا اَنسابِ عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا، اور اس بنا پر ان کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصَیّ بن کِلَاب کے حُسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبے کے متولی ہو گئے اور مکہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیّت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ اس لیے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ کے مُجاوِر تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مَقام حاصل تھا، اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو ان سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے رُوم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مَقام عطا کر دیا۔ اُس زمانے میں رُوم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقا کے ساتھ تھی، اس کے سارے ناکے ایران نے روک دیے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا، سو یمن پر ایران کے قبضے نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اس تجارت کو جاری رکھنے کے لیے اس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیجِ فارس کے بندرگاہوں پر پہنچائیں، اور دوسری طرف انھی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اس صورت حال نے مکّہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اس وقت قریش ہی تھے جنھیں اس کاروبار کا قریب قریب اجارہ حاصل تھا۔ لیکن عرب کی طوائف المُلُوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل و حرکت اس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں، ان کے ساتھ

اَوَلَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجۡبٰۤى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا، جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟

قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قریش اس غرض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے تمام قبائل کے ساتھ مُعاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ ان کو حصّہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور بااثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انھوں نے پھیلا رکھا تھا، جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تُجّار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

اِن حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہِ اشتعال بنی، وہ یہ تھی کہ اس دعوت کی بدولت انھیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجتوں سے شرک و بت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اِسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کُن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بُت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصوں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رُسوخ واثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری مَعاشی خوش حالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکہ ہی چھوڑ دینے پر مجبُور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انھیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں، اسے مان لو تو عرب و عجم تمھارے تابع ہو جائیں گے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، صفحہ ۳۱۶-۳۱۷) مگر انھیں اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رُسوخ ہمیں آج حاصل ہے، یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوّے ہماری بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ ان کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابعِ فرمان ہونے والا تھا، پھر اسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفا سندھ سے لے کر اسپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ
مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا
نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ
اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ

مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۸۱]

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اِترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔[۸۲]

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سُناتا۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ

۸۱ — یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مالِ تجارت اِس وادیِ غیر ذی زرع میں کھنچا چلا آ رہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمھاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اس بے آب وگیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھر اور گارے کا ایک حجرہ تعمیر کر دیا اور پکار دیا کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے، آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسّر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزارہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصّہ تمھارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمھیں بخشی ہے، اس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

۸۲ — یہ ان کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوش حالی پر تم اِترائے ہوئے ہو، اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور

اَهۡلُهَا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ
زِيۡنَتُهَا ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ
وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ كَمَنۡ مَّتَّعۡنٰهُ مَتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ هُوَ
يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ

ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔[۸۳]

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ ع بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو، کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟[۸۴]

اور (بُھول نہ جائیں یہ لوگ) اُس دن کو جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پُوچھے گا: ”کہاں ہیں

ثمود اور سبا اور مدین اور قومِ لوطؑ کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمھارے پاس اس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا، انھی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور ان کی طرح تمھاری شامت کبھی نہ آئے گی؟

۸۳ - یہ ان کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں، ان کے لوگ ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انھیں مُتنبِّہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج رَوی سے باز نہ آئے تو انھیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمھیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمھیں بھی مُتنبِّہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچاؤ گے نہیں بلکہ اُلٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمھیں اندیشہ ہے، وہ ایمان لانے سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے تم پر آئے گی۔

Maktaba-Tul-Ishaat.com

۸۴ - یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہییں:

اوّل یہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی، جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے، بہر حال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اُٹھ جانا ہے۔ اس مختصر سے عرصۂ حیات کا عیش اگر آدمی کو اس قیمت پر حاصل ہوتا ہو کہ آیندہ کی اَبدی زندگی میں وہ دائماً خستہ حال اور مبتلائے مصیبت رہے، تو کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ خسارے کا سودا نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں ایک عقل مند آدمی اِس کو ترجیح دے گا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں سے وہ بھلائیاں کما کر لے جائے جو بعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کے عیش کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اِس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر ہے اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں اسے سُرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے اَبدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آپڑے، یعنی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم کا مطالبہ بھی ہے، کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

ان دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اُوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرماتا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اس حیاتِ دنیا میں اُٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے، وہ اس کی بہ نسبت کم و کیف (quantity اور quality) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اِس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے مُتمتّع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں تمھیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لائے اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لُوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ
اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ

میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟[۸۵]" یہ قول جن پر چسپاں[۸۶] ہوگا وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ اِنھیں ہم نے اُسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے براءت کا اظہار کرتے ہیں[۸۷]۔ یہ ہماری تو بندگی نہیں کرتے تھے[۸۸]۔" پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو۔[۸۹]

۸۵ - یہ تقریر بھی اسی چوتھے جواب کے سلسلے میں ہے، اور اس کا تعلق اُوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بُت پرستی اور انکارِ نبوت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی ابدی زندگی میں اِس کا کیسا بُرا نتیجہ انھیں دیکھنا پڑے گا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو، دنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو، تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو، یا سراسر خسارے کا سودا؟

۸۶ - اِس سے مراد وہ شیاطینِ جن و اِنس ہیں جن کو دنیا میں خدا کا شریک بنایا گیا تھا، جن کی بات کے مقابلے میں خدا اور اس کے رسولوں کی بات کو رد کیا گیا تھا، اور جن کے اعتماد پر صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر زندگی کے غلط راستے اختیار کیے گئے تھے۔ ایسے لوگوں کو خواہ کسی نے الٰہ اور رب کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہرحال جب ان کی اطاعت و پیروی اُس طرح کی گئی جیسی خدا کی ہونی چاہیے تو لازماً انھیں خدائی میں شریک کیا گیا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰)

۸۷ - یعنی ہم نے زبردستی اِن کو گمراہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے نہ اِن سے بینائی اور سماعت سلب کی تھی، نہ ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں، اور نہ ایسی ہی کوئی صورت پیش آئی تھی کہ یہ تو راہِ راست کی طرف جانا چاہتے ہوں مگر ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر جبراً انھیں غلط راستے پر کھینچ لے گئے ہوں۔ بلکہ جس طرح ہم خود اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے، اسی طرح اِن کے سامنے بھی ہم نے گمراہی پیش کی اور انھوں نے اپنی مرضی سے اس کو قبول کیا۔ لہٰذا ہم ان کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ ہم اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں اور یہ اپنے فعل کے ذمہ دار۔

یہاں یہ لطیف نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سوال تو کرے گا شریک ٹھیرانے والوں سے، مگر قبل اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهُمۡ وَرَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ لَوۡ اَنَّهُمۡ
كَانُوۡا يَهۡتَدُوۡنَ ۝٦٤ وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ مَاذَآ اَجَبۡتُمُ
الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝٦٥ فَعَمِيَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ يَوۡمَئِذٍ فَهُمۡ لَا
يَتَسَآءَلُوۡنَ ۝٦٦ فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى
اَنۡ يَّكُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِيۡنَ ۝٦٧ وَرَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ
وَيَخۡتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى

یہ انھیں پکاریں گے مگر وہ اِن کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش! یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پُوچھے گا کہ ”جو رسول بھیجے گئے تھے انھیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اُس وقت کوئی جواب اِن کو نہ سُوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دُوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔

تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے، یہ انتخاب اِن لوگوں کے کرنے کا کام نہیں [90] ہے، اللہ پاک ہے اور بہت بالا تر ہے

کہ یہ کچھ بولیں، جواب دینے لگیں گے وہ جن کو شریک ٹھیرایا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عام مشرکین سے یہ سوال کیا جائے گا تو ان کے لیڈر اور پیشوا محسوس کریں گے کہ اب آ گئی ہماری شامت۔ یہ ہمارے سابق پیرو ضرور کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری گمراہی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ اس لیے پیرووں کے بولنے سے پہلے وہ خود سبقت کر کے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دیں گے۔

۸۸- یعنی یہ ہمارے نہیں بلکہ اپنے ہی نفس کے بندے بنے ہوئے تھے۔

۸۹- یعنی انھیں مدد کے لیے پکارو۔ دنیا میں تو تم نے ان پر بھروسا کر کے ہماری بات رد کی تھی۔ اب

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾
وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ

اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں[91]۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، فرماں روائی اسی کی ہے

یہاں اِن سے کہو کہ آئیں اور تمھاری مدد کریں اور تمھیں عذاب سے بچائیں۔

۹۰ - یہ ارشاد دراصل شرک کی تردید میں ہے۔ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے جو بے شمار معبود اپنے لیے بنا لیے ہیں، اور ان کو اپنی طرف سے جو اوصاف، مراتب اور مناصب سونپ رکھے ہیں، اس پر اعتراض کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے پیدا کیے ہوئے انسانوں، فرشتوں، جِنّوں اور دوسرے بندوں میں سے ہم خود جس کو جیسے چاہتے ہیں، اوصاف، صلاحیتیں اور طاقتیں بخشتے ہیں اور جو کام جس سے لینا چاہتے ہیں، لیتے ہیں۔ یہ اختیارات آخر اِن مشرکین کو کیسے اور کہاں سے مل گئے کہ میرے بندوں میں سے جس کو چاہیں مشکل کشا، جسے چاہیں گنج بخش، اور جسے چاہیں فریاد رس قرار دے لیں؟ جسے چاہیں بارش برسانے کا مختار، جسے چاہیں روزگار یا اولاد بخشنے والا، جسے چاہیں بیماری وصحّت کا مالک بنا دیں؟ جسے چاہیں میری خدائی کے کسی حصّے کا فرماں روا ٹھیرا لیں؟ اور میرے اختیارات میں سے جو کچھ جس کو چاہیں سونپ دیں؟ کوئی فرشتہ ہو یا جِنّ یا نبی یا ولی، بہرحال جو بھی ہے ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔ جو کمالات بھی کسی کو ملے ہیں، ہماری عطا و بخشش سے ملے ہیں۔ اور جو خدمت بھی ہم نے جس سے لینی چاہی ہے، لی ہے۔ اس برگزیدگی کے یہ معنیٰ آخر کیسے ہو گئے کہ یہ بندے بندگی کے مقام سے اُٹھا کر خدائی کے مرتبے پر پہنچا دیے جائیں اور خدا کو چھوڑ کر ان کے آگے سرِ نیاز جھکا دیا جائے، اِن کو مدد کے لیے پکارا جانے لگے، اِن سے حاجتیں طلب کی جانے لگیں، انھیں قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ لیا جائے، اور انھیں خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے دیا جائے؟

۹۱ - اس سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مقصد کے لیے ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص یا گروہ دنیا میں لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس گمراہی کو اس نے اختیار کیا ہے اس کی صحت پر وہ بڑے معقول وجوہ سے مطمئن ہے، اور اس کے خلاف جو دلائل دیے گئے ہیں ان سے فی الحقیقت اس کا اطمینان نہیں ہُوا ہے، اور اس گمراہی کو اس نے کسی بُرے جذبے سے نہیں بلکہ خالص نیک نیتی کے ساتھ اختیار کیا ہے، اور اس کے سامنے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں آئی ہے جس سے اس کی غلطی اس پر واضح ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی یہ بات نہیں چل سکتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ الَّيۡلَ
سَرۡمَدًا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِضِيَآءٍ‌ ؕ
اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۷۱﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ النَّهَارَ
سَرۡمَدًا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِلَيۡلٍ
تَسۡكُنُوۡنَ فِيۡهِ‌ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ
وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾
وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ

اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اے نبیؐ! اِن سے کہو: کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبُود ہے جو تمھیں روشنی لا دے؟ کیا تم سُنتے نہیں ہو؟ اِن سے پوچھو: کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبُود ہے جو تمھیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سُکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سُوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم (رات میں) سُکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انھیں پکارے گا پھر پُوچھے گا:۸۸ کہاں ہیں میرے وہ شریک

وہ صرف ظاہر ہی کو نہیں دیکھتا۔ اس کے سامنے تو آدمی کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ کُھلا ہوا ہے۔ وہ اس کے علم اور احساسات اور جذبات اور خواہشات اور نیت اور ضمیر، ہر چیز کو براہِ راست جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کس شخص کو کس کس وقت کن ذرائع سے تنبیہ ہوئی، کن کن راستوں سے حق پہنچا، کس کس طریقے سے باطل کا باطل ہونا اس پر کُھلا، اور پھر وہ اصل محرکات کیا تھے جن کی بنا پر اس نے اپنی گمراہی کو ترجیح دی اور حق سے منہ موڑا۔

تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ ع اِنَّ
قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ
مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ

جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" اور ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے[92]، پھر کہیں گے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل[93]۔" اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے، اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے۔ ع

یہ ایک واقعہ ہے[94] کہ قارون موسیٰؑ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا[95]۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اُٹھا سکتی تھی[96]۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا:

۹۲ – یعنی وہ نبی جس نے اس اُمّت کو خبردار کیا تھا، یا انبیاؑ کے پیرووں میں سے کوئی ایسا ہدایت یافتہ انسان جس نے اُس اُمّت میں تبلیغِ حق کا فریضہ انجام دیا تھا، یا کوئی ایسا ذریعہ جس سے اس اُمّت تک پیغامِ حق پہنچ چکا تھا۔

۹۳ – یعنی اپنی صفائی میں کوئی ایسی حجت پیش کرو جس کی بنا پر تمھیں معاف کیا جا سکے۔ یا تو یہ ثابت کرو کہ تم جس شرک، جس انکارِ آخرت اور جس انکارِ نبوت پر قائم تھے، وہ برحق تھا اور تم نے معقول وجوہ کی بنا پر یہ مسلک اختیار کیا تھا۔ یا یہ نہیں تو پھر کم از کم یہی ثابت کر دو کہ خدا کی طرف سے تم کو اس غلطی پر مُتنبّہ کرنے اور ٹھیک بات تم تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

۹۴ – یہ واقعہ بھی کفارِ مکہ کے اُسی عذر کے جواب میں بیان کیا جا رہا ہے جس پر آیت ۵۷ سے مسلسل تقریر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے قومی مفاد پر ضرب لگنے کا خطرہ ظاہر کیا تھا، وہ دراصل مکے کے بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار اور سرمایہ دار تھے جنھیں بین الاقوامی تجارت اور سود خواری نے قارونِ وقت بنا رکھا تھا۔ یہی لوگ اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اصل حق بس یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹو۔ اس مقصد پر جس چیز سے بھی آنچ آنے کا اندیشہ ہو، وہ سراسر باطل ہے جسے کسی حال میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف عوام الناس دولت کے ان میناروں کو آرزو بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کی غایت تمنا بس یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تَفۡرَحۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡفَرِحِیۡنَ ﴿۷۶﴾ وَ ابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰىکَ اللّٰہُ
الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ
اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ وَ لَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ

''پھول نہ جا، اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو

تھی کہ جس بلندی پر یہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں، کاش! ہمیں بھی اس تک پہنچنا نصیب ہو جائے۔ اس زر پرستی کے ماحول میں یہ دلیل بڑی وزنی سمجھی جا رہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس توحید و آخرت کی، اور جس ضابطۂ اَخلاق کی دعوت دے رہے ہیں، اسے مان لیا جائے تو قریش کی عظمت کا یہ فلک بوس قصر زمین پر آ رہے گا اور تجارتی کاروبار تو درکنار، جینے تک کے لالے پڑ جائیں گے۔

۹۵ – قارون، جس کا نام بائبل اور تَلمود میں قورح (Korah) بیان کیا گیا ہے، حضرت موسٰی علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ بائبل کی کتابِ خُروج (باب ۶، آیت ۱۸-۲۱) میں جو نسب نامہ درج ہے، اس کی رُو سے حضرت موسیٰؑ اور قارون کے والد باہم سگے بھائی تھے۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جا ملا تھا اور اس کا مُقرّب بن کر اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ موسٰی علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مُخالفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے، ان میں سے ایک یہی قارون تھا:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۙ﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَہَامٰنَ وَقَارُوۡنَ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿﴾ (المومن، آیت ۲۳-۲۴)	ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قارون اپنی قوم سے باغی ہو کر اُس دشمن طاقت کا پٹھو بن گیا تھا جو بنی اسرائیل کو جڑ بنیاد سے ختم کر دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ اور اس قومی غداری کی بدولت اس نے فرعونی سلطنت میں یہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے علاوہ مصر کی جن بڑی ہستیوں کی طرف بھیجے گئے تھے وہ دو ہی تھیں، ایک فرعون کا وزیر ہامان، اور دوسرا یہ اسرائیلی سیٹھ۔ باقی سب اَعیانِ سلطنت اور درباری ان سے کم تر درجے میں تھے جن کا خاص طور پر نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ قارون کی یہی پوزیشن سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

پسند نہیں کرتا۔" تو اُس نے کہا: "یہ سب کچھ تو مجھے اُس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔[۹۷] ــــــ کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟[۹۸] مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پُوچھے جاتے۔[۹۹]

۹۶- بائبل (گنتی، باب ۱۶) میں اس کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس میں اس شخص کی دولت کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر یہودی رِوایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ شخص غیر معمولی دولت کا مالک تھا، حتّٰی کہ اس کے خزانوں کی کُنجیاں اُٹھانے کے لیے تین سو خچر درکار ہوتے تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا، ج ۷، ص ۵۵۶) یہ بیان اگرچہ انتہائی مبالغہ آمیز ہے، لیکن اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسرائیلی روایات کی رُو سے بھی قارون اپنے وقت کا بہت بڑا دولت مند آدمی تھا۔

۹۷- اصل الفاظ ہیں: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ میں نے جو کچھ پایا ہے اپنی قابلیت سے پایا ہے، یہ کوئی فضل نہیں ہے جو استحقاق کے بجائے احسان کے طور پر کسی نے مجھ کو دیا ہو اور اب مجھے اس کا شکریہ اس طرح ادا کرنا ہو کہ جن نااہل لوگوں کو کچھ نہیں دیا گیا ہے، انھیں مَیں فضل و احسان کے طور پر اس میں سے کچھ دوں، یا کوئی خیر خیرات اس غرض کے لیے کروں کہ یہ فضل مجھ سے چھین نہ لیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک تو خدا نے یہ دولت جو مجھے دی ہے، میرے اوصاف کو جانتے ہوئے دی ہے۔ اگر میں اس کی نگاہ میں ایک پسندیدہ انسان نہ ہوتا تو یہ کچھ مجھے کیوں دیتا۔ مجھ پر اس کی نعمتوں کی بارش ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ میں اس کا محبوب ہوں اور میری روش اس کو پسند ہے۔

۹۸- یعنی یہ شخص جو بڑا عالم و فاضل اور دانا و باخبر بنا پھر رہا تھا اور اپنی قابلیت کا یہ کچھ غَرّہ رکھتا تھا، اس کے علم میں کیا یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ اُس سے زیادہ دولت و حشمت اور قوت و شوکت والے اس سے پہلے دنیا میں گزر چکے ہیں اور اللہ نے انھیں آخر کار تباہ و برباد کر کے رکھ دیا؟ اگر قابلیت اور ہنرمندی ہی دنیوی عروج کے لیے کوئی ضمانت ہے تو ان کی یہ صلاحیتیں اُس وقت کہاں چلی گئی تھیں جب وہ تباہ ہوئے؟ اور اگر کسی کو دنیوی عروج نصیب ہونا لازماً اسی بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے خوش ہے اور اس کے اعمال و اوصاف کو

Maktaba Tul Ishaat.com

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۷۹ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ
لَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝۸۰ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۗ فَمَا كَانَ لَهٗ

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پُورے ٹھاٹ میں نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے: "کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔" مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: "افسوس تمھارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"¹⁰⁰

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ

پسند کرتا ہے تو پھر اُن لوگوں کی شامت کیوں آئی؟

۹۹- یعنی مجرم تو یہی دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے لوگ ہیں۔ وہ کب مانا کرتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی بُرائی ہے۔ مگر ان کی سزا ان کے اپنے اعتراف پر منحصر نہیں ہوتی۔ انھیں جب پکڑا جاتا ہے تو ان سے پوچھ کر نہیں پکڑا جاتا کہ بتاؤ تمھارے گناہ کیا ہیں۔

۱۰۰- یعنی یہ سیرت، یہ اندازِ فکر اور یہ ثوابِ الٰہی کی بخشش صرف انھی لوگوں کے حصّے میں آتی ہے جن میں اتنا تحمل اور اتنی ثابت قدمی موجود ہو کہ حلال طریقے ہی اختیار کرنے پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں، خواہ ان سے صرف چٹنی روٹی میسّر ہو یا کروڑ پتی بن جانا نصیب ہو جائے، اور حرام طریقوں کی طرف قطعاً مائل نہ ہوں، خواہ ان سے دنیا بھر کے فائدے سمیٹ لینے کا موقع مل رہا ہو۔ اس آیت میں اللہ کے ثواب سے مراد ہے وہ رزقِ کریم جو حُدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے محنت و کوشش کرنے کے نتیجے میں انسان کو دنیا اور آخرت میں نصیب ہو۔ اور صبر سے مراد ہے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنا، لالچ اور حرص و آز کے مقابلے میں ایمان داری اور راست بازی پر ثابت قدم رہنا، صداقت و دیانت سے جو نقصان بھی ہوتا ہو یا جو فائدہ بھی ہاتھ سے جاتا ہو اسے برداشت کر لینا، ناجائز تدبیروں سے جو منفعت بھی حاصل ہو سکتی ہو اسے ٹھوکر مار دینا، حلال کی روزی خواہ بقدرِ سدِّ رمق ہی ہو اس پر قانع و مطمئن رہنا،

مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ
مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۸

نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: ”افسوس! ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے[101]۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس! ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں[102] پایا کرتے۔“

حرام خوروں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر رشک و تمنّا کے جذبات سے بے چین ہونے کے بجائے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایمان دار آدمی کے لیے اِس چمک دار گندگی کی بہ نسبت وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ نے اپنے فضل سے اس کو بخشی ہے۔ رہا یہ ارشاد کہ ”یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو“، تو اس دولت سے مراد اللہ کا ثواب بھی ہے اور وہ پاکیزہ ذہنیت بھی جس کی بنا پر آدمی ایمان و عملِ صالح کے ساتھ فاقہ کشی کر لینے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ بے ایمانی اختیار کر کے ارب پتی بن جائے۔

۱۰۱- یعنی اللہ کی طرف سے رزق کی کشادگی و تنگی جو کچھ بھی ہوتی ہے، اس کی مشیّت کی بنا پر ہوتی ہے اور اس مشیّت میں اس کی کچھ دوسری ہی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کسی کو زیادہ رزق دینے کے معنٰی لازماً یہی نہیں ہیں کہ اللہ اس سے بہت خوش ہے اور اسے انعام دے رہا ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اللہ کا نہایت مغضوب ہوتا ہے مگر وہ اسے بڑی دولت عطا کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار یہی دولت اس کے اوپر اللہ کا سخت عذاب لے آتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو اس کے معنٰی لازماً یہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے اور اسے سزا دے رہا ہے۔ اکثر نیک لوگوں پر تنگی اس کے باوجود رہتی ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں، بلکہ بارہا یہی تنگی ان کے لیے خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اُن لوگوں کی خوش حالی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو دراصل خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ
وَلَا فَسَادًا ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۸۳﴾ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ
مِّنۡهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزَى الَّذِيۡنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا
مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِىۡ فَرَضَ عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّكَ

وہ آخرت[۱۰۳] کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے[۱۰۴] اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں[۱۰۵]۔ اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے[۱۰۶]۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے، اور جو بُرائی لے کر آئے تو بُرائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے۔

اے نبیؐ! یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے[۱۰۷] وہ تمھیں ایک بہترین انجام کو

۱۰۲- یعنی ہمیں یہ غلط فہمی تھی کہ دنیوی خوش حالی اور دولت مندی ہی فلاح ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ قارون بڑی فلاح پا رہا ہے۔ مگر اب پتا چلا کہ حقیقی فلاح کسی اور ہی چیز کا نام ہے اور وہ کافروں کو نصیب نہیں ہوتی۔

قارون کے قصّے کا یہ سبق آموز پہلو صرف قرآن ہی میں بیان ہوا ہے۔ بائبل اور تلمود دونوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ان دونوں کتابوں میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو یہ شخص بھی اپنی پارٹی سمیت ان کے ساتھ نکلا، اور پھر اس نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے خلاف ایک سازش کی جس میں ڈھائی سو آدمی شامل تھے۔ آخر کار اللہ کا غضب اس پر نازل ہُوا اور یہ اپنے گھر بار اور مال اسباب سمیت زمین میں دھنس گیا۔

۱۰۳- مراد ہے جنت جو حقیقی فلاح کا مقام ہے۔

۱۰۴- یعنی جو خدا کی زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ جو سرکش و جبار اور متکبر بن کر نہیں رہتے بلکہ بندے بن کر رہتے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

۱۰۵- فساد سے مراد انسانی زندگی کے نظام کا وہ بگاڑ ہے جو حق سے تجاوز کرنے کے نتیجے میں لازماً رُونما ہوتا ہے۔ خدا کی بندگی اور اس کے قوانین کی اطاعت سے نکل کر آدمی جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سراسر فساد ہی فساد ہے۔ اسی کا ایک جُز وہ فساد بھی ہے جو حرام طریقوں سے دولت سمیٹنے اور حرام راستوں میں خرچ کرنے سے برپا ہوتا ہے۔

اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی وَ مَنۡ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ
مُّبِیۡنٍ ﴿۸۵﴾ وَ مَا كُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡكَ الۡكِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَةً

پہنچانے والا ہے۔[۱۰۸] اِن لوگوں سے کہہ دو کہ ”میرا رب خُوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کُھلی گمراہی میں کون مُبتلا ہے۔“ تم اس بات کے ہرگز اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمھارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل

۱۰۶- یعنی ان لوگوں کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں۔

۱۰۷- یعنی اس قرآن کو خلقِ خدا تک پہنچانے اور اس کی تعلیم دینے اور اس کی ہدایت کے مطابق دنیا کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے۔

۱۰۸- اصل الفاظ ہیں: لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ۔ ”تمھیں ایک معاد کی طرف پھیرنے والا ہے۔“ مَعاد کے لُغوی معنٰی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخر کار آدمی کو پلٹنا ہو۔ اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان اور عظمت کا مقام ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد جنت لی ہے۔ لیکن اسے صرف جنّت کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کیوں نہ اسے ویسا ہی عام رکھا جائے جیسا خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، تاکہ یہ وعدہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہو جائے۔ سیاقِ عبارت کا اقتضا بھی یہ ہے کہ اسے آخرت ہی میں نہیں، اِس دنیا میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر کار بڑی شان و عظمت عطا کرنے کا وعدہ سمجھا جائے۔ کفارِ مکّہ کے جس قول پر آیت ۵۷ سے لے کر یہاں تک مسلسل گفتگو چلی آ رہی ہے، اُس میں انھوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبنا چاہتے ہو۔ اگر ہم تمھارا ساتھ دیں اور اس دین کو اختیار کرلیں تو عرب کی سرزمین میں ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ! جس خدا نے اس قرآن کی عَلَم برداری کا بار تم پر ڈالا ہے، وہ تمھیں برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ تم کو اُس مرتبے پر پہنچانے والا ہے جس کا تصوّر بھی یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اور فی الواقع اللہ تعالیٰ نے چند ہی سال بعد حضوؐر کو اِس دنیا میں، اُنھی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تمام مُلکِ عرب پر ایسا مکمل اقتدار عطا کر کے دکھا دیا کہ آپؐ کی مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت وہاں نہ ٹھیر سکی اور آپؐ کے دین کے سوا کسی دین کے لیے وہاں گنجایش نہ رہی۔ عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر اس کی موجود نہ تھی کہ پورے جزیرۃ العرب پر کسی ایک شخص کی ایسی بے غلّ و غش بادشاہی قائم ہوگئی ہو کہ ملک بھر میں کوئی اس کا مدِمقابل باقی نہ رہا ہو، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو، اور لوگ صرف سیاسی طور پر ہی اس کے حلقہ بگوش نہ ہوئے ہوں بلکہ سارے دینوں کو مٹا کر اسی ایک شخص نے سب کو اپنے دین کا پیرو بھی بنا لیا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ہوئی ہے[109])، پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔[110] اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات

بعض مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سورۂ قصص کی یہ آیت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے راستے میں نازل ہوئی تھی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپؐ کو پھر مکہ واپس پہنچائے گا۔ لیکن اوّل تو اس کے الفاظ میں کوئی گنجایش اس امر کی نہیں ہے کہ ''معاد'' سے ''مکہ'' مراد لیا جائے۔ دوسرے، یہ سورت رِوایات کی رُو سے بھی اور اپنے مضمون کی داخلی شہادت کے اعتبار سے بھی ہجرتِ حبشہ کے قریب زمانے کی ہے، اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کئی سال بعد ہجرتِ مدینہ کے راستے میں اگر یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اسے کس مناسبت سے یہاں اِس سیاق وسباق میں لاکر رکھ دیا گیا۔ تیسرے، اِس سیاق وسباق کے اندر مکے کی طرف حضوؐر کی واپسی کا ذکر بالکل بے محل نظر آتا ہے۔ آیت کے یہ معنیٰ اگر لیے جائیں تو یہ کفارِ مکہ کی بات کا جواب نہیں بلکہ اُن کے عذر کو اور تقویت پہنچانے والا ہوگا۔ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ بے شک اے اہلِ مکہ! تم ٹھیک کہتے ہو، محمدؐ اس شہر سے نکال دیے جائیں گے، لیکن وہ مستقل طور پر جلاوطن نہیں رہیں گے، بلکہ آخر کار ہم انھیں اسی جگہ واپس لے آئیں گے۔ یہ روایت اگرچہ بخاری، نَسائی، ابنِ جَریر اور دوسرے محدثین نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے، لیکن یہ ہے ابنِ عباسؓ کی اپنی ہی رائے۔ کوئی حدیثِ مرفوع نہیں ہے کہ اسے ماننا لازم ہو۔

۱۰۹- یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جارہی ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انھیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی اِس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار، اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے انھیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکے کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپؐ نبوت کا پیغام لے کر اُترے، اُس سے ایک دن پہلے تک آپؐ کی زندگی کیا تھی، آپؐ کے مشاغل کیا تھے، آپؐ کی بات چیت کیا تھی، آپؐ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپؐ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں۔ یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حُقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپؐ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپؐ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپؐ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپؐ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپؐ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپؐ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپؐ سے سننے لگے۔ کبھی آپؐ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔

کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپؐ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہوسکتا تھا کہ آپؐ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح، یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپؐ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادھے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کرنے کے لیے خَلوَت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اُٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اَخلاق و تمدّن لے کر سامنے آ جانا، اتنا بڑا تغیّر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رُونما نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تدریجی ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز زندگی گزارتا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سیکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکّہ نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپؐ خود بھی نبوت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپؐ کو اس معاملے سے سابقہ پیش آ گیا، اس کا ثبوت اُس واقعے سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہُوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۂ عَلَق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپؐ غارِ حرا سے کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ ''مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔'' کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔'' وہ فوراً جواب دیتی ہیں: ''ہرگز نہیں۔ آپؐ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپؐ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' پھر وہ آپؐ کو لے کر وَرَقَہ بن نَوفَل کے پاس جاتی ہیں جو ان کے چچازاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راست باز آدمی تھے۔ وہ آپؐ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تأمّل کہتے ہیں کہ ''یہ جو آپؐ کے پاس آیا تھا، وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰؑ کے پاس آتا تھا۔ کاش! میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی۔'' آپؐ پوچھتے ہیں: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' وہ جواب دیتے ہیں: ''ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہوگئے ہوں۔''

یہ پورا واقعہ اُس حالت کی تصویر پیش کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آ جانے سے کسی سیدھے سادھے انسان پر طاری ہوسکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے

Maktaba Tul Ishaat.com

کرکر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپؐ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دَم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا، اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوئی ہوتی کہ میاں نبوت کے اُمیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو، اب پیری کی دکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپؐ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں، اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آ سکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمایش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ وَرَقہ بن نَوفَل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنُّع سے مُمیَّز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپؐ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے بھی آپؐ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسٰی علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسٰیؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حُصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش وحواس کی حالت میں علانیہ اِس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تأمُّل اس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے، بلکہ اِس سچّے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے، وہ دراصل حقیقت ہی کا مُشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (آیت ۱۶)

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمھیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر مَیں اس سے پہلے ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟

اور سورۂ شُوریٰ میں فرمایا:

بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ قف
كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾ ع

وقف لازم

جب تم پر نازل ہوں تو کفّار تمھیں اُن سے باز رکھیں۔[111] اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبُود کو نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے۔ فرماں روائی اُسی کی ہے[112] اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ع

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ (آیت ۵۲)

اے نبیؐ! تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، عنکبوت حواشی ۸۸ تا ۹۲۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۸۴۔

۱۱۰ – یعنی جب اللہ نے یہ نعمت تمھیں بے مانگے عطا فرمائی ہے تو اس کا حق اب تم پر یہ ہے کہ تمھاری ساری قوتیں اور محنتیں اِس کی علمبرداری پر، اس کی تبلیغ پر اور اسے فروغ دینے پر صَرف ہوں۔ اس میں کوتاہی کرنے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ تم نے حق کے بجائے منکرینِ حق کی مدد کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کسی کوتاہی کا اندیشہ تھا۔ بلکہ دراصل اس طرح اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے نبی کو یہ ہدایت فرما رہا ہے کہ تم اِن کے شور و غوغا اور ان کی مخالفت کے باوجود اپنا کام کرو اور اس کی کوئی پروا نہ کرو کہ دشمنانِ حق اس دعوت سے اپنے قومی مفاد پر ضرب لگنے کے کیا اندیشے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۱۱ – یعنی اُن کی تبلیغ و اشاعت سے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔

۱۱۲ – یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ فرماں روائی اسی کے لیے ہے، یعنی وہی اس کا حق رکھتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۲۹)

العنکبوت

نام

آیت ۴۱ کے فقرے مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ ''عنکبوت'' آیا ہے۔

زمانۂ نزُول

آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ سورت ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ پسِ منظر میں اُسی زمانے کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینے میں ہُوا ہے، یہ قیاس قائم کرلیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں اور باقی سورت مکّی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نِفاق کا ذکر ہے، وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم وستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہوسکتا تھا، نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اسے مکے کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ مدینۂ طَیّبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بِنا رکھی گئی ہے۔ اور یہ اندرونی شہادت، اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکے کے آخری دَور کی نہیں بلکہ اُس دَور کے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی تھی۔

موضوع ومضمون

سورت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نُزُول کا زمانہ مکّۂ معظمہ میں مسلمانوں پر بڑے مصائب وشدائد کا زمانہ تھا۔ کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت پورے زور شور سے ہو رہی تھی اور ایمان لانے والوں پر سخت ظلم وستم توڑے جا رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت ایک طرف صادق الایمان لوگوں میں عزم وہمت اور استقامت پیدا کرنے کے لیے، اور دوسری طرف ضعیف الایمان لوگوں کو شرم دلانے کے لیے نازل فرمائی۔ اس کے ساتھ کفارِ مکّہ کو بھی اس میں سخت تہدید کی گئی کہ اپنے حق میں اُس انجام کو دعوت نہ دیں جو عداوتِ حق کا طریقہ اختیار کرنے والے ہر زمانے میں دیکھتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں اُن سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بعض نوجوانوں کو اُس وقت پیش آ رہے تھے۔ مثلاً اُن کے والدین اُن پر زور ڈالتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور ہمارے دین

Maktaba Tul Ishaat.com

پر قائم رہو۔ جس قرآن پر تم ایمان لائے ہو، اس میں بھی تو یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ تو ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے مانو ورنہ تم خود اپنے ہی ایمان کے خلاف کام کرو گے۔ اس کا جواب آیت ۸ میں دیا گیا ہے۔

اِسی طرح بعض نومسلموں سے ان کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ عذاب ثواب ہماری گردن پر، تم ہمارا کہنا مانو اور اس شخص سے الگ ہو جاؤ۔ اگر خدا تمھیں پکڑے گا تو ہم خود آگے بڑھ کر کہہ دیں گے کہ صاحب! اِن بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، ان کو ہم نے ایمان چھوڑنے پر مجبُور کیا تھا، اس لیے آپ ہمیں پکڑ لیں۔ اس کا جواب آیات ۱۲-۱۳ میں دیا گیا ہے۔

جو قصّے اِس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں، اُن میں بھی زیادہ تر یہی پہلو نمایاں ہے کہ پچھلے انبیاؑ کو دیکھو، کیسی کیسی سختیاں ان پر گزریں اور کتنی کتنی مدت وہ ستائے گئے۔ پھر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔ اس لیے گھبراؤ نہیں۔ اللہ کی مدد ضرور آئے گی، مگر آزمایش کا ایک دَور گزرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دینے کے ساتھ کفارِ مکہ کو بھی ان قصّوں میں مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پکڑ ہونے میں دیر لگ رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ کبھی پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ پچھلی تباہ شدہ قوموں کے نشانات تمھارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو کہ آخر کار ان کی شامت آ کر رہی اور خدا نے اپنے نبیوں کی مدد کی۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ظلم وستم تمھارے لیے ناقابل برداشت ہو جائے تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ جہاں خدا کی بندگی کرسکو، وہاں چلے جاؤ۔

ان سب باتوں کے ساتھ کفار کی تفہیم کا پہلو بھی چھُوٹنے نہیں پایا ہے۔ توحید اور مَعاد، دونوں حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شرک کا ابطال کیا گیا ہے، اور آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلا کر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ سب نشانات اس تعلیم کی تصدیق کررہے ہیں جو ہمارا نبی تمھارے سامنے پیش کررہا ہے۔

۷ رکوعاتھا ۶۹ آیاتھا

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا

الف۔ ل۔ م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اِتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟[1] حالاں کہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں[2]۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچّے کون ہیں

۱- جن حالات میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ تھے کہ مکّۂ معظمہ میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا، اس پر آفات اور مصائب اور مظالم کا ایک طوفان ٹوٹ پڑتا تھا۔ کوئی غلام یا غریب ہوتا تو اس کو بُری طرح مارا پیٹا جاتا اور سخت ناقابلِ برداشت اذیتیں دی جاتیں۔ کوئی دکاندار یا کاریگر ہوتا تو اس کی روزی کے دروازے بند کر دیے جاتے، یہاں تک کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی۔ کوئی کسی بااثر خاندان کا آدمی ہوتا تو اس کے اپنے خاندان کے لوگ اس کو طرح طرح سے تنگ کرتے اور اس کی زندگی اجیرن کر دیتے تھے۔ اِن حالات نے مکّے میں ایک سخت خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو جانے کے باوجود ایمان لاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد جب درد ناک اذیتوں سے دوچار ہوتے تو پست ہمت ہو کر کفار کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ ان حالات نے اگرچہ راسخ الایمان صحابہؓ کے عزم وثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا تھا، لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اکثر ان پر بھی ایک شدید اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اسی کیفیت کا ایک نمونہ حضرت خبّابؓ بن اَرَتّ کی وہ روایت پیش کرتی ہے جو بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بُری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کی دیوار کے سایے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپؐ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ جوش اور جذبے سے سُرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا: تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں، ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرا چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے۔ کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آجائے۔ خدا کی قسم! یہ کام پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک شخص صنعا سے حضرموت

Maktaba Tul-Ishaat.com

تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہوگا جس کا وہ خوف کرے۔

اس اضطرابی کیفیت کو ٹھنڈے صبر و تحمل میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو سمجھاتا ہے کہ ہمارے جو وعدے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کے لیے ہیں، کوئی شخص مُجرّد زبانی دعوائے ایمان کر کے ان کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر مدعی کو لازماً آزمایشوں کی بھٹی سے گزرنا ہوگا، تاکہ وہ اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے۔ ہماری جنّت اِتنی سستی نہیں ہے، اور نہ دنیا ہی میں ہماری خاص عنایات ایسی ارزاں ہیں کہ تم بس زبان سے ہم پر ایمان لانے کا اعلان کرو اور ہم وہ سب کچھ تمھیں بخش دیں۔ ان کے لیے تو امتحان شرط ہے۔ ہماری خاطر مَشقّتیں اُٹھانی ہوں گی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہوگا۔ طرح طرح کی سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ خطرات، مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ خوف سے بھی آزمائے جاؤ گے اور لالچ سے بھی۔ ہر چیز جسے عزیز و محبوب رکھتے ہو، ہماری رضا پر اسے قربان کرنا پڑے گا، اور ہر تکلیف جو تمھیں ناگوار ہے، ہمارے لیے برداشت کرنی ہوگی۔ تب کہیں یہ بات کھلے گی کہ ہمیں ماننے کا جو دعویٰ تم نے کیا تھا، وہ سچّا تھا یا جھوٹا۔ یہ بات قرآنِ مجید میں ہر اُس مَقام پر کہی گئی ہے جہاں مصائب و شدائد کے ہُجوم میں مسلمانوں پر گھبراہٹ کا عالَم طاری ہُوا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے کی ابتدائی زندگی میں جب مَعاشی مشکلات، بیرونی خطرات، اور یہود و منافقین کی داخلی شرارتوں نے اہلِ ایمان کو سخت پریشان کر رکھا تھا، اس وقت فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ○ (البقرہ، آیت ۲۱۴)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہلِ ایمان) پر گزر چکے ہیں؟ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہِلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (تب انھیں مُژدہ سنایا گیا کہ) خبردار رہو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

اِسی طرح جنگِ اُحُد کے بعد جب مسلمانوں پر پھر مصائب کا ایک سخت دَور آیا تو ارشاد ہوا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (آلِ عمران، آیت ۱۴۲)

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے والے کون ہیں؟

قریب قریب یہی مضمون سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۷۹، سورۂ توبہ، آیت ۱۶، اور سورۂ محمد، آیت ۳۱ میں بھی بیان ہُوا ہے۔ ان ارشادات سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین فرمائی ہے کہ آزمایش ہی وہ کَسَوٹی ہے جس سے کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے، کھوٹا خود بخود اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور کھرا چھانٹ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ کے اُن انعامات سے سرفراز ہو جو صرف صادق الایمان لوگوں کا ہی حصّہ ہیں۔

۲ – یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو تمھارے ساتھ ہی پیش آرہا ہو۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہُوا ہے کہ جس نے

وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۞ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ
يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۞ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ

اور جھوٹے کون۔

اور کیا وہ لوگ جو بُری حرکتیں کر رہے ہیں[۴] یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں[۵] گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔

جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا

بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے، اسے آزمایشوں کی بھٹی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا ہے۔ اور جب دوسروں کو امتحان کے بغیر کچھ نہیں دیا گیا تو تمھاری کیا خصوصیّت ہے کہ تمھیں صرف زبانی دعوے پر نواز دیا جائے۔

۳ - اصل الفاظ ہیں: فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ضرور ہے اللہ یہ معلوم کرے۔'' اس پر ایک شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ اللہ کو تو سچّے کی سچّائی اور جھوٹے کا جھوٹ خود ہی معلوم ہے، آزمایش کر کے اسے معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ایک شخص کے اندر کسی چیز کی صرف صلاحیت اور استعداد ہی ہوتی ہے، عملاً اس کا ظہور نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ازرُوئے عدل و انصاف نہ تو وہ کسی جزا کا مستحق ہو سکتا ہے نہ سزا کا۔ مثلاً ایک آدمی میں امین ہونے کی صلاحیت ہے اور ایک دوسرے میں خائن ہونے کی صلاحیت۔ ان دونوں پر جب تک آزمایش نہ آئے اور ایک سے امانت داری کا اور دوسرے سے خیانت کا عملاً ظہور نہ ہو جائے، یہ بات اللہ کے انصاف سے بعید ہے کہ وہ محض اپنے علمِ غیب کی بنا پر ایک کو امانت داری کا انعام دے دے اور دوسرے کو خیانت کی سزا دے ڈالے۔ اس لیے وہ علمِ سابق جو اللہ کو لوگوں کے اچھے اور بُرے اعمال سے پہلے اُن کی صلاحیتوں کے بارے میں اور ان کے آیندہ طرزِ عمل کے بارے میں حاصل ہے، انصاف کی اغراض کے لیے کافی نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انصاف اِس علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا کہ فُلاں شخص چوری کا رُجحان رکھتا ہے اور چوری کرے گا یا کرنے والا ہے، بلکہ اِس علم کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ اس شخص نے چوری کر ڈالی ہے۔ اسی طرح بخششیں اور انعامات بھی اس کے ہاں اِس علم کی بنا پر نہیں دیے جاتے کہ فُلاں شخص اعلیٰ درجے کا مومن و مجاہد بن سکتا ہے یا بنے گا، بلکہ اِس علم کی بنا پر دیے جاتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اپنے عمل سے اپنا صادق الایمان ہونا ثابت کر دیا ہے اور اللہ کی راہ میں جان لڑا کر دکھا دی ہے۔ اسی لیے ہم نے آیت کے ان الفاظ کا ترجمہ ''اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے'' کیا ہے۔

۴ - اس سے مراد اگرچہ تمام وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن یہاں خاص طور پر رُوئے سُخن قریش کے اُن ظالم سرداروں کی طرف ہے جو اسلام کی مخالفت میں اور اسلام قبول کرنے والوں کو اذیتیں دینے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۵ وَمَنۡ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ
لِنَفۡسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۶ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا

مقرر کیا ہُوا وقت آنے ہی والا ہے[6]، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[7]۔ جو شخص بھی مُجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا[8]، اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے[9]۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک

میں اُس وقت پیش پیش تھے۔ مثلاً وَلید بن مُغیرہ، ابوجہل، عُتبہ، شَیبہ، عُقبہ بن ابی مُعَیط اور حَنظلہ بن وائل وغیرہ۔ سیاق و سباق خود یہاں تقاضا کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو آزمائشوں کے مقابلے میں صبر وثبات کی تلقین کرنے کے بعد ایک کلمہ زجر و توبیخ اُن لوگوں کو خطاب کر کے بھی فرمایا جائے جو ان حق پرستوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔

۵ – یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ''ہماری گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ سکیں گے۔'' اصل الفاظ ہیں: يَّسۡبِقُوۡنَا، یعنی ہم سے سبقت لے جائیں گے۔ اس کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں (یعنی اپنے رسول کے مشن کی کامیابی) وہ تو نہ ہو سکے اور جو کچھ یہ چاہتے ہیں (یعنی ہمارے رسول کو نیچا دکھانا) وہ ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ہم ان کی زیادتیوں پر انھیں پکڑنا چاہتے ہوں اور یہ بھاگ کر ہماری دست رس سے دُور نکل جائیں۔

۶ – یعنی جو شخص حیاتِ اُخروی کا قائل ہی نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ کوئی نہیں ہے جس کے سامنے ہمیں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہو، اور کوئی وقت ایسا نہیں آنا ہے جب ہم سے ہمارے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اس کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ اپنی غفلت میں پڑا رہے اور بے فکری کے ساتھ جو کچھ چاہے کرتا رہے۔ اپنا نتیجہ اپنے اندازوں کے خلاف وہ خود دیکھ لے گا۔ لیکن جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک وقت ہمیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی پانی ہے، انھیں اِس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ موت کا وقت کچھ بہت دُور ہے۔ ان کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بس قریب ہی آ لگا ہے اور عمل کی مہلت ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی وہ اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے کر سکتے ہوں کر لیں۔ طولِ حیات کے بے بنیاد بھروسے پر اپنی اصلاح میں دیر نہ لگائیں۔

۷ – یعنی اُن کو اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا چاہیے کہ ان کا سابقہ کسی شہ بے خبر سے ہے۔ جس خدا کے سامنے انھیں جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا ہے، وہ بے خبر نہیں بلکہ سمیع و علیم خدا ہے، ان کی کوئی بات بھی اس سے چُھپی ہوئی نہیں ہے۔

۸ – ''مُجاہدہ'' کے معنٰی کسی مخالف طاقت کے مقابلے میں کش مکش اور جِدّ وجُہد کرنے کے ہیں، اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشان دِہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کش مکش ہے۔ مومن کو اِس دنیا میں جو کش مکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے۔ اسے شیطان سے بھی

الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَ اِنْ

اعمال کریں گے، اُن کی بُرائیاں ہم ان سے دُور کر دیں گے اور انھیں اُن کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔[۱۰]

ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر

لڑتا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے۔ اپنے نفس سے بھی لڑتا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے۔ اپنے گھر سے لے کر آفاق تک کے اُن تمام انسانوں سے بھی لڑتا ہے جن کے نظریّات، رُجحانات، اُصولِ اَخلاق، رسم و رواج، طرزِ تمدُّن اور قوانینِ معیشت و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں۔ اور اُس ریاست سے بھی لڑتا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد رہ کر اپنا فرمان چلائے اور نیکی کے بجائے بدی کو فروغ دینے میں اپنی قوتیں صَرف کرے۔ یہ مُجاہدہ ایک دن دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیں گھنٹوں میں سے ہر لمحے کا ہے۔ اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے۔ اسی کے متعلق حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ان الرجل لیجاھد وما ضرب یوما من الدھر بسیف۔ ''آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی وہ تلوار نہ چلائے۔''

۹ – یعنی اللہ تعالیٰ اِس مجاہدے کا مطالبہ تم سے اس لیے نہیں کر رہا ہے کہ اپنی خدائی قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اسے تمھاری کسی مدد کی ضرورت ہے اور تمھاری اس لڑائی کے بغیر اس کی خدائی نہ چلے گی۔ بلکہ وہ اس لیے تمھیں اس کش مکش میں پڑنے کی ہدایت کرتا ہے کہ یہی تمھاری ترقی کا راستہ ہے۔ اسی ذریعے سے تم بدی اور گمراہی کے چکّر سے نکل کر نیکی اور صداقت کی راہ پر بڑھ سکتے ہو۔ اسی سے تم میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں خیر و صلاح کے عَلَم بردار اور آخرت میں خدا کی جنت کے حق دار بنو۔ تم یہ لڑائی لڑ کر خدا پر کوئی احسان نہ کرو گے، اپنا ہی بھلا کرو گے۔

۱۰ – ایمان سے مراد ان تمام چیزوں کو سچّے دل سے ماننا ہے جنھیں تسلیم کرنے کی دعوت اللہ کے رسول اور اس کی کتاب نے دی ہے۔ اور عملِ صالح سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ دل و دماغ کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی فکر اور اس کے خیالات اور ارادے دُرست اور پاکیزہ ہوں۔ زبان کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی برائی پر زبان کھولنے سے بچے اور جو بات بھی کرے حق و انصاف اور راستی کے مطابق کرے۔ اور اعضا و جوارح کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی میں، اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی میں بسر ہو۔ اس ایمان و عملِ صالح کے دو نتیجے بیان کیے گئے ہیں:

Maktaba Tul Ishaat.com

جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھیرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت[11] نہ کر۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔[12] اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے نیک

ایک یہ کہ آدمی کی بُرائیاں اس سے دُور کر دی جائیں گی۔

دوسرا یہ کہ اسے اس کے بہترین اعمال کی، اور اس کے اعمال سے بہتر جزا دی جائے گی۔

بُرائیاں دُور کرنے سے مراد کئی چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان لانے سے پہلے آدمی نے خواہ کیسے ہی گناہ کیے ہوں، ایمان لاتے ہی وہ سب معاف ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے کے بعد آدمی نے بغاوت کے جذبے سے نہیں بلکہ بشری کمزوری سے جو قصور کیے ہوں، اس کے نیک اعمال کا لحاظ کر کے اُن سے درگزر کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے نفس کی اصلاح آپ سے آپ ہوگی اور اس کی بہت سی کمزوریاں دُور ہو جائیں گی۔

ایمان و عملِ صالح کی جزا کے متعلق جو فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے، وہ ہے: وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ آدمی کے نیک اعمال میں سے جو اعمال سب سے زیادہ اچھے ہوں گے، ان کو ملحوظ رکھ کر اس کے لیے جزا تجویز کی جائے گی۔ دوسرے، یہ کہ آدمی اپنے عمل کے لحاظ سے جتنی جزا کا مستحق ہوگا، اس سے زیادہ اچھی جزا اسے دی جائے گی۔ یہ بات دوسرے مقامات پر بھی قرآن میں فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ (آیت ۱۶۰) ”جو نیکی لے کر آئے گا، اس کو اس سے دس گُنا اجر دیا جائے گا۔“ اور سورۂ قصص میں فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا (آیت ۸۴) ”جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کو اس سے بہتر اجر دیا جائے گا۔“ اور سورۂ نساء میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا (آیت ۴۰) ”اللہ ظلم تو ذرّہ برابر نہیں کرتا، اور اگر نیکی ہو تو اس کو کئی گُنا بڑھاتا ہے۔“

۱۱ – اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نَسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حَمْنَہ بنت سُفیان بن اُمَیّہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہُوا کہ بیٹا مسلمان ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا، میں نہ کھاؤں گی، نہ پیوں گی، نہ سایے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات

الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ
اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتۡنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ

اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔

لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر[13]۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملے میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمایش کو اللہ کے عذاب کی طرح

نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔ حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوئے ہوں جو مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان میں بھی پورے زور کے ساتھ دُہرایا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: آیت ۱۵)

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو ان کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ ''اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں۔'' اس سے معلوم ہُوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اَولیٰ رد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد ان کی خدمت کرے، ان کا ادب و احترام کرے، ان کی جائز باتوں میں ان کی اطاعت بھی کرے۔ لیکن یہ حق ان کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف ان کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔

۱۲ — یعنی یہ دنیا کی رشتہ داریاں اور ان کے حُقوق تو بس اسی دنیا کی حد تک ہیں۔ آخر کار ماں باپ کو بھی اور اولاد کو بھی اپنے خالق کے حضور پلٹ کر جانا ہے، اور وہاں ہر ایک کی باز پُرس اس کی شخصی ذمہ داری کی بنیاد پر ہونی ہے۔ اگر ماں باپ نے اولاد کو گمراہ کیا ہے تو وہ پکڑے جائیں گے۔ اگر اولاد نے ماں باپ کی خاطر گمراہی قبول کی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰهِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمۡ ؕ اَوَ

سمجھ لیا۔[14] اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہی شخص کہے گا کہ "ہم تو تمھارے ساتھ تھے۔"[15] کیا

تو اسے سزا ملے گی۔ اور اگر اولاد نے راہِ راست اختیار کی اور ماں باپ کے جائز حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی، لیکن ماں باپ نے صرف اس قصور پر اسے ستایا کہ اس نے گمراہی میں ان کا ساتھ کیوں نہ دیا، تو وہ اللہ کے مواخذے سے بچ نہ سکیں گے۔

۱۳ - اگرچہ کہنے والا ایک شخص ہے، مگر" میں ایمان لایا" کہنے کے بجائے کہہ رہا ہے: "ہم ایمان لائے"۔ امام رازیؒ نے اس میں ایک لطیف نکتے کی نشاندہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منافق اپنے آپ کو ہمیشہ زُمرۂ اہلِ ایمان میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ایمان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ بھی ویسا ہی مومن ہے جیسے دوسرے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بزدل اگر کسی فوج کے ساتھ گیا ہے اور اس فوج کے بہادر سپاہیوں نے لڑ کر دشمنوں کو مار بھگایا ہے، تو چاہے اس نے خود کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو، مگر وہ آ کر یوں کہے گا کہ ہم گئے اور ہم خوب لڑے اور ہم نے دشمن کو شکستِ فاش دے دی۔ گویا آپ بھی انھی بہادروں میں سے ہیں جنھوں نے دادِ شجاعت دی ہے۔

۱۴ - یعنی جس طرح اللہ کے عذاب سے ڈر کر کفر و معصیت سے باز آنا چاہیے، یہ شخص بندوں کی دی ہوئی تکلیفوں سے ڈر کر ایمان اور نیکی سے باز آ گیا۔ ایمان لانے کے بعد کفار کی دھمکیوں اور مار پیٹ اور قید و بند سے جب اسے سابقہ پیش آیا تو اس نے سمجھا کہ اللہ کی وہ دوزخ بھی بس اتنی ہی کچھ ہو گی جس سے مرنے کے بعد کفر کی پاداش میں سابقہ پیش آنا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عذاب تو بعد میں بھگت لوں گا، یہ نقد عذاب جو اَب مل رہا ہے اِس سے بچنے کے لیے مجھے ایمان چھوڑ کر پھر زُمرۂ کفار میں جا ملنا چاہیے، تاکہ دنیا کی زندگی تو خیریت سے گزر جائے۔

۱۵ - یعنی آج تو وہ اپنی کھال بچانے کے لیے کافروں میں جا ملا ہے اور اہلِ ایمان کا ساتھ اس نے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ دینِ حق کو فروغ دینے کے لیے وہ اپنی نکسیر تک پُھڑوانے کو تیار نہیں ہے۔ مگر جب اِس دین کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی بخشے گا تو یہ شخص فتح کے ثمرات میں حصّہ بٹانے کے لیے آ موجود ہو گا اور مسلمانوں سے کہے گا کہ دل سے تو ہم تمھارے ہی ساتھ تھے، تمھاری کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے، تمھاری جانفشانیوں اور قربانیوں کی بڑی قدر ہماری نگاہ میں تھی۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ناقابلِ برداشت اذیت یا نقصان، یا شدید خوف کی حالت میں کسی شخص کا کلمۂ کفر کہہ کر اپنے آپ کو بچا لینا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ آدمی سچے دل سے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس مخلص مسلمان میں جو بحالتِ مجبوری جان بچانے کے لیے کفر کا اظہار کرے، اور اُس مصلحت پرست انسان میں جو نظریّے کے اعتبار سے اسلام ہی کو حق جانتا اور مانتا ہو مگر ایمانی زندگی کے خطرات و مہالک دیکھ کر کفار سے جا ملے۔ بظاہر ان دونوں کی حالت ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ مگر درحقیقت جو چیز ان کے درمیان

لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ

دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؟ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔[۱۶]

یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمھاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ

زمین و آسمان کا فرق کر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ مجبوراً کفر ظاہر کرنے والا مخلص مسلمان نہ صرف عقیدے کے اعتبار سے اسلام کا گرویدہ رہتا ہے، بلکہ عملاً بھی اس کی دلی ہمدردیاں دین و اہلِ دین کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی کامیابی سے وہ خوش اور ان کو زک پہنچنے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بھی وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اور اس تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی اس پر سے اعدائے دین کی گرفت ڈھیلی ہو، وہ اپنے اہلِ دین کے ساتھ جا ملے۔ اس کے برعکس مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے، اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دینِ حق کا ساتھ دینے کے نقصانات کفار کے ساتھ جا ملنے کے فوائد سے زیادہ ہیں، تو وہ خالص عافیت اور منفعت کی خاطر دین اور اہلِ دین سے منہ موڑ لیتا ہے، کافروں سے رشتۂ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجا لانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہلِ دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کر لیتا کہ شاید کسی وقت دینِ حق ہی کا بول بالا ہو جائے۔ اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ ان کے نظریّے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہِ حق میں ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ذرہ برابر بخل نہیں کرتا، تاکہ یہ زبانی اعترافات سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ قرآنِ کریم ایک دوسرے موقع پر ان منافقین کی اسی سوداگرانہ ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (النساء، آیت ۱۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جو تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کا پلّا بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف

Maktaba Tul-Ishaat.com

خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا
مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ؗ وَ لَیُسْـَٔلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع ۱۳

اپنے اُوپر لینے والے نہیں ہیں[18]، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی[19]۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے اِن افترا پردازیوں کی باز پُرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں[20]ع

لڑنے پر قادر نہ تھے اور ہم نے پھر بھی تمھیں مسلمانوں سے بچایا؟

۱۶- یعنی اللہ آزمایش کے مواقع اسی لیے بار بار لاتا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نِفاق کا حال کھل جائے اور جس کے اندر جو کچھ بھی چھپا ہُوا ہے وہ سامنے آ جائے۔ یہی بات سورۂ آلِ عمران میں فرمائی گئی ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (آیت ۱۷۹) ”اللہ مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے جس میں تم اِس وقت ہو (کہ صادق الایمان اور منافق سب ملے جلے ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کر کے رہے گا۔“

۱۷- ان کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو زندگی بعدِ موت اور حشر و نشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔ لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی باز پرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے ہم سارا عذاب ثواب اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دینِ آبائی کی طرف واپس آ جاؤ۔ رِوایات میں متعدّد سردارانِ قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، ان سے مل کر یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان بن حرب اور اُمیّہ بن خَلَف نے ان سے مل کر بھی یہی کہا تھا۔

۱۸- یعنی اوّل تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے، کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمہ دار ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو جس وقت کفر و شرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنّم کی صورت میں سامنے آئے گا، اس وقت کس کی یہ ہمت ہے کہ دنیا میں جو وعدہ اس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور! میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنت میں بھیج دیں، اور میں جہنم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔

۱۹ - یعنی وہ خدا کے ہاں اگرچہ دوسروں کا بوجھ تو نہ اُٹھائیں گے، لیکن دُہرا بوجھ اُٹھانے سے بچیں گے بھی نہیں۔ ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا لدے گا، اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادا جائے گا۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص سے بھی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔ اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر نہ چھوڑ دے گی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے۔ چوری کی سزا تو بہرحال اسے ملے گی اور کسی اُصولِ انصاف کی رُو سے بھی یہ درست نہ ہوگا کہ اسے چھوڑ کر اِس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔ لیکن وہ پہلا چور اپنے جرم کے ساتھ اِس جرم کی سزا بھی پائے گا کہ اس نے خود چوری کی سو کی، ایک دوسرے شخص کو بھی اپنے ساتھ چور بنا ڈالا۔ قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مقام پر اس قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل، آیت ۲۵) ”تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے پورے اُٹھائیں، اور اُن لوگوں کے بوجھوں کا بھی ایک حصہ اُٹھائیں جن کو وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔“ اور اسی قاعدے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ من دعا الی ھدی کان لہ علیہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لاینقص ذٰلك من اجورھم شیئًا ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل اٰثام من تبعہ لا ینقص ذٰلك من اٰثامھم شیئًا۔ (مسلم) ”جس شخص نے راہِ راست کی طرف دعوت دی، اس کو ان سب لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملے گا جنھوں نے اس کی دعوت پر راہِ راست اختیار کی، بغیر اس کے کہ اُن کے اجروں میں کوئی کمی ہو۔ اور جس شخص نے گمراہی کی طرف دعوت دی، اس پر ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جنھوں نے اس کی پیروی کی، بغیر اس کے کہ اُن کے گناہوں میں کوئی کمی ہو۔“

۲۰ - ”افترا پردازیوں“ سے مُراد وہ جھوٹی باتیں ہیں جو کفار کے اِس قول میں چُھپی ہوئی تھیں کہ ”تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمھاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔“ دراصل وہ لوگ دو مفروضات کی بنیاد پر یہ بات کہتے تھے: ایک یہ کہ جس مذہبِ شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں وہ برحق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبِ توحید غلط ہے، اس لیے اُس سے کفر کرنے میں کوئی خطا نہیں ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ کوئی حشر نہیں ہونا ہے، اور یہ حیاتِ اُخروی کا تخیّل، جس کی وجہ سے ایک مسلمان کفر کرتے ہوئے ڈرتا ہے، بالکل بے اصل ہے۔ یہ مفروضات اپنے دل میں رکھنے کے بعد وہ ایک مسلمان سے کہتے تھے کہ اچھا اگر تمھارے نزدیک کفر کرنا ایک خطا ہی ہے، اور کوئی حشر بھی ہونا ہے جس میں اِس خطا پر تم سے باز پرس ہوگی، تو چلو تمھاری اس خطا کو ہم اپنے سر لیتے ہیں، تم ہماری ذمہ داری پر دینِ محمدؐ کو چھوڑ کر دینِ آبائی میں واپس آجاؤ۔ اس معاملے میں پھر مزید دو جھوٹی باتیں شامل تھیں: ایک، ان کا یہ خیال کہ جو شخص کسی کے کہنے پر جُرم کرے، وہ اپنے جرم کی ذمہ داری سے بَری ہوسکتا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جس کے کہنے پر اس نے جرم کیا ہے۔ دوسرا، ان کا یہ جھوٹا وعدہ کہ قیامت کے روز وہ اُن لوگوں کی ذمہ داری

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا
خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا[۲۱] اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس اُن کے درمیان رہا۔[۲۲] آخر کار اُن لوگوں کو طوفان نے آ گھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم[۲۳] تھے۔ پھر نوحؑ کو اور

واقعی اُٹھالیں گے جو ان کے کہنے پر ایمان سے کفر کی طرف پلٹ گئے ہوں۔ کیونکہ جب قیامت فی الواقع قائم ہو جائے گی اور ان کی اُمیدوں کے خلاف جہنّم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی، اُس وقت وہ ہرگز اس کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ اپنے کفر کا خمیازہ بھگتنے کے ساتھ اُن لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی پورا کا پورا اپنے اوپر لے لیں جنھیں وہ دنیا میں بہکا کر گمراہ کرتے تھے۔

۲۱ – تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، آیات ۳۳-۳۴۔ النساء، ۱۶۳۔ الأنعام، ۸۴۔ الاعراف، ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، ۷۱-۷۳۔ ہُود، ۲۵-۴۸۔ الانبیاء، ۷۶-۷۷۔ المومنون، ۲۳-۳۰۔ الفرقان، ۳۷۔ الشعراء، ۱۰۵ تا ۱۲۳۔ الصّافّات، ۷۵-۸۲۔ القمر، ۹-۱۵۔ الحاقّہ، ۱۱-۱۲۔ نوح، مکمّل۔

یہ قصّے یہاں جس مناسبت سے بیان کیے جا رہے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں ایک طرف اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اُن سب اہلِ ایمان کو آزمائش میں ڈالا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسری طرف ظالم کافروں سے فرمایا گیا ہے کہ تم اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم ہم سے بازی لے جاؤ گے اور ہماری گرفت سے بچ نکلو گے۔ انھی دو باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے یہ تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

۲۲ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد سے طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے، اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہی چیز یہاں بیان کرنی مقصود ہے۔ اہلِ ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم کو تو ابھی پانچ سات برس ہی ظلم و ستم سہتے اور ایک گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کرتے گزرے ہیں۔ ذرا ہمارے اس بندے کے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کو دیکھو جس نے مسلسل ساڑھے نو صدیوں تک ان شدائد کا مقابلہ کیا۔

حضرت نوحؑ کی عمر کے بارے میں قرآنِ مجید اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ وہ چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا۔ اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے۔ (پیدایش، باب ۷، آیت ۶۔ باب ۹، آیت ۲۸-۲۹) لیکن قرآن کے بیان کی رُو سے ان کی عمر کم از کم ایک ہزار سال ہونی چاہیے، کیونکہ ساڑھے نو سو سال تو صرف وہ مدت ہے جو نبوت پر مامور ہونے

اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَۃِ وَ جَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ اِبۡرٰهِیۡمَ اِذۡ قَالَ
لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ

کشتی والوں[۲۴] کو ہم نے بچالیا اور اُسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا۔[۲۵]
اور ابراہیمؑ کو بھیجا[۲۶] جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔[۲۷]
یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پُوج رہے ہو وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک

کے بعد سے طوفان برپا ہونے تک انھوں نے دعوت وتبلیغ میں صَرف کی۔ ظاہر ہے کہ نبوت انھیں پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی ملی ہوگی، اور طوفان کے بعد بھی وہ کچھ مدت زندہ رہے ہوں گے۔

یہ طویل عمر بعض لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن خدا کی اِس خدائی میں عجائب کی کمی نہیں ہے۔ جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے، اُس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آجاتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا اوّلاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مُطلَق ہونے کا واضح تصوّر اپنے ذہن میں رکھتا ہو، وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑسکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم وبیش عمر عطا کر دینا اُس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔

۲۳ — یعنی طوفان ان پر اس حالت میں آیا کہ وہ اپنے ظلم پر قائم تھے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر وہ طوفان آنے سے پہلے اپنے ظلم سے باز آجاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ عذاب نہ بھیجتا۔

۲۴ — یعنی ان لوگوں کو جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے اور جنھیں کشتی میں سوار ہونے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تھی۔ سُورۂ ہُود میں اس کی تصریح ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ (آیت ۴۰) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ (اے نوحؑ!) اِس کشتی میں سوار کرلے ہر قسم (کے جانوروں) میں سے ایک ایک جوڑا، اور اپنے گھر والوں کو سوائے اُن کے جنھیں ساتھ نہ لینے کا پہلے حکم دے دیا گیا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اِفۡكًا ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لَـكُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ وَاعۡبُدُوۡهُ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ اِلَيۡهِ

جھوٹ گھڑ رہے ہو[۲۸]۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمھیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اُسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف

اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور اُس کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔''

۲۵ - اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعے کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورۂ قمر میں یہ بات جس طریقے سے بیان فرمائی گئی ہے، اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا ٹکی ہے۔ سورۂ قمر میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے: وَحَمَلۡنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلۡوَاحٍ وَّدُسُرٍۙ تَجۡرِىۡ بِاَعۡيُنِنَا‌ ۚ جَزَآءً لِّمَنۡ كَانَ كُفِرَ○ وَلَقَدْ تَّرَكۡنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ○ (آیات ۱۳-۱۵) ''اور ہم نے نوحؑ کو سوار کیا تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر، وہ چل رہی تھی ہماری نگرانی میں اُس شخص کے لیے جزا کے طور پر جس کا انکار کر دیا گیا تھا، اور ہم نے اُسے چھوڑ دیا ایک نشانی بنا کر، پس ہے کوئی سبق لینے والا؟'' سورۂ قمر کی اس آیت کی تفسیر میں ابنِ جَرِیر نے قَتَادَہ کی یہ رِوایت نقل کی ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقے میں گئے ہیں تو انھوں نے کوہِ جُودی پر (اور ایک رِوایت کی رُو سے باقِردیٰ نامی بستی کے قریب) اس کشتی کو دیکھا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتیِ نوحؑ کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستانِ ارارات پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انھوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۷۔ ہُود، حاشیہ ۴۶)

۲۶ - تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، رُکوع ۱۵-۱۶-۳۵۔ آلِ عمران، ۷۔ الانعام، ۹۔ ہُود، ۷۔ ابراہیم، ۶۔ الحجر، ۴۔ مریم، ۳۔ الانبیاء، ۵۔ الشعراء، ۵۔ الصّافّات، ۳۔ الزُّخرُف، ۳۔ الذاریات، ۲۔

۲۷ - یعنی اُس کے ساتھ شرک اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈرو۔

۲۸ - یعنی تم یہ بُت نہیں گھڑ رہے ہو بلکہ ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ ان بتوں کا وجود خود ایک جھوٹ ہے۔ اور پھر تمھارے یہ عقائد کہ یہ دیویاں اور دیوتا ہیں، یا خدا کے اوتار یا اس کی اولاد ہیں، یا خدا کے مقرب اور اس کے ہاں شفیع ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کوئی شفا دینے والا اور کوئی اولاد بخشنے والا اور کوئی روزگار دلوانے والا ہے، یہ سب

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَ مَا عَلَى
الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ

تم پلٹائے جانے والے ہو۔[۲۹] اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں،[۳۰] اور رسولؐ پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔''

کیا[۳۱] اِن لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے،

جھوٹی باتیں ہیں جو تم لوگوں نے اپنے وہم و گمان سے تصنیف کر لی ہیں۔ حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ محض بُت ہیں بے جان، بے اختیار اور بے اثر۔

۲۹ – ان چند فقروں میں حضرت ابراہیمؑ نے بُت پرستی کے خلاف تمام معقول دلائل سمیٹ کر رکھ دیے ہیں۔ کسی کو معبُود بنانے کے لیے لامحالہ کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ایک معقول وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں معبُودیت کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کا خالق ہو اور آدمی اپنے وجود کے لیے اس کا رہینِ منّت ہو۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کی پرورش کا سامان کرتا ہو اور اسے رزق، یعنی متاعِ زیست بہم پہنچاتا ہو۔ چوتھی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آدمی کا مستقبل اس کی عنایات سے وابستہ ہو اور آدمی کو اندیشہ ہو کہ اس کی ناراضی مول لے کر وہ اپنا انجام خراب کر لے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان چاروں وجوہ میں سے کوئی وجہ بھی بت پرستی کے حق میں نہیں ہے، بلکہ ہر ایک خالص خدا پرستی کا تقاضا کرتی ہے۔ ''یہ محض بُت ہیں'' کہہ کر انھوں نے پہلی وجہ کو ختم کر دیا، کیونکہ جو نرا بُت ہو اس کو معبُود ہونے کا آخر کیا ذاتی استحقاق حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ ''تم اِن کے خالق ہو'' دوسری وجہ بھی ختم کر دی۔ اس کے بعد تیسری وجہ کو یہ فرما کر ختم کیا کہ وہ تمھیں کسی نوعیت کا کچھ بھی رزق نہیں دے سکتے۔ اور آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمھیں پلٹنا تو خدا کی طرف ہے نہ کہ اِن بتوں کی طرف، اس لیے تمھارا انجام اور تمھاری عاقبت سنوارنا یا بگاڑنا بھی اِن کے اختیار میں نہیں، صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ اس طرح شرک کا پورا ابطال کر کے حضرتِ والا نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ جتنے وجوہ سے بھی انسان کسی کو معبُود قرار دے سکتا ہے، وہ سب کے سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت کے مقتضی نہیں ہیں۔

۳۰ – یعنی اگر تم میری دعوتِ توحید کو اور اِس خبر کو کہ تمھیں اپنے رب کی طرف پلٹنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے بھی بہت سے نبی (مثلاً نُوح، ہُود، صالح علیہم السلام) یہی تعلیم لے کر آچکے ہیں اور ان کی قوموں نے بھی ان کو اسی طرح جھٹلایا ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ انھوں نے جھٹلا کر ان نبیوں کا کچھ بگاڑا یا اپنا انجام خراب کیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ﴿۱۹﴾ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ
فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ بَدَاَ الۡخَـلۡقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنۡشِئُ النَّشۡاَةَ الۡاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۚ‏ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡحَمُ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ
وَاِلَيۡهِ تُقۡلَبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا

پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔[۳۲] ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اُس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے، پھر اللہ بارِ دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۳۳] جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے، اُسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ

۳۱- یہاں سے لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ان کے لیے دردناک سزا ہے) تک ایک جملۂ معترضہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا سلسلہ توڑ کر اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ اس اعتراضی تقریر کی مناسبت یہ ہے کہ کفارِ مکّہ، جنھیں سبق دینے کے لیے یہ قصّہ سنایا جا رہا ہے، دو بنیادی گمراہیوں میں مبتلا تھے: ایک، شرک و بت پرستی۔ دوسرے، انکارِ آخرت۔ ان میں سے پہلی گمراہی کا رد حضرت ابراہیمؑ کی اس تقریر میں آ چکا ہے جو اُوپر نقل کی گئی ہے۔ اب دوسری گمراہی کے رد میں یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ارشاد فرما رہا ہے، تاکہ دونوں کی تردید ایک ہی سلسلۂ کلام میں ہو جائے۔

۳۲- یعنی ایک طرف بے شمار اشیا عدَم سے وجود میں آتی ہیں، اور دوسری طرف ہر نوع کے افراد کے مٹنے کے ساتھ پھر ویسے ہی افراد وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ مشرکین اس بات کو مانتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی صفتِ خلق و ایجاد کا نتیجہ ہے۔ انھیں اللہ کے خالق ہونے سے انکار نہ تھا، جس طرح آج کے مشرکین کو نہیں ہے۔ اس لیے ان کی اپنی مانی ہوئی بات پر یہ دلیل قائم کی گئی ہے کہ جو خدا تمھارے نزدیک اشیا کو عدَم سے وجود میں لاتا ہے، اور پھر ایک ہی دفعہ تخلیق کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ تمھاری آنکھوں کے سامنے مٹ جانے والی اشیا کی جگہ پھر ویسی ہی اشیا پے در پے وجود میں لاتا چلا جاتا ہے، اس کے بارے میں آخر تم نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ تمھارے مر جانے کے بعد وہ پھر تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اُٹھا کھڑا نہیں کر سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نمل، حاشیہ ۸۰)

۳۳- یعنی جب خدا کی کاریگری سے بارِ اوّل کی تخلیق کا تم خود مُشاہدہ کر رہے ہو تو تمھیں سمجھنا چاہیے

ع ۲ ۱۴

فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۲۲ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۳ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا

آسمان میں[۳۴]، اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے[۳۵] ع
جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں[۳۶] اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

پھر[۳۷] اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا:

کہ اسی خدا کی کاریگری سے بارِ دیگر بھی تخلیق ہوگی۔ ایسا کرنا اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

۳۴- یعنی تم کسی ایسی جگہ بھاگ کر نہیں جاسکتے جہاں اللہ کی گرفت سے بچ نکلو۔ خواہ تم زمین کی تہوں میں کہیں اُتر جاؤ یا آسمان کی بلندیوں میں پہنچ جاؤ، بہرحال تمھیں ہر جگہ سے پکڑ لایا جائے گا اور اپنے رب کے سامنے تم حاضر کر دیے جاؤ گے۔ یہی بات سورۂ رحمٰن میں جنّوں اور انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کے انداز میں فرمائی گئی ہے کہ تم خدا کی خدائی سے اگر نکل سکتے ہو تو ذرا نکل کر دکھاؤ، اس سے نکلنے کے لیے زور چاہیے، اور وہ زور تمھیں حاصل نہیں ہے، اس لیے تم ہرگز نہیں نکل سکتے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (آیت ۳۳)

۳۵- یعنی نہ تمھارا اپنا زور اتنا ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ، اور نہ تمھارا کوئی ولی و سرپرست یا مددگار ایسا زور آور ہے کہ خدا کے مقابلے میں تمھیں پناہ دے سکے اور اس کے مواخذے سے تمھیں بچا لے۔ ساری کائنات میں کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے، جنھوں نے احکامِ خداوندی کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے، جنھوں نے جرأت و جسارت کے ساتھ خدا کی نافرمانیاں کی ہیں اور اس کی زمین میں ظلم و فساد کے طوفان اٹھائے ہیں، ان کا حمایتی بن کر اُٹھ سکے اور خدا کے فیصلۂ عذاب کو ان پر نافذ ہونے سے روک سکے، یا خدا کی عدالت میں یہ کہنے کی ہمت کر سکے کہ یہ میرے ہیں اس لیے جو کچھ بھی انھوں نے کیا ہے اسے معاف کر دیا جائے۔

۳۶- یعنی ان کا کوئی حصّہ میری رحمت میں نہیں ہے۔ ان کے لیے کوئی گنجایش اس امر کی نہیں ہے کہ وہ میری رحمت میں سے حصّہ پانے کی اُمید رکھ سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا تو خود بخود اُن وعدوں سے فائدہ اُٹھانے کے حق سے بھی وہ دست بردار ہو گئے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں

Maktaba Tul Ishaat.com

اقۡتُلُوۡهُ اَوۡ حَرِّقُوۡهُ فَاَنۡجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ

’’قتل کر دو اِسے یا جلا ڈالو اِس کو۔‘‘[۳۸] آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا،[۳۹] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں

سے کیے ہیں۔ پھر جب انھوں نے آخرت کا انکار کیا اور یہ تسلیم ہی نہ کیا کہ انھیں کبھی اپنے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انھوں نے خدا کی بخشش و مغفرت کے ساتھ کوئی رشتۂ امید سرے سے وابستہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد جب اپنی توقعات کے خلاف وہ عالَمِ آخرت میں آنکھیں کھولیں گے اور اللہ کی اُن آیات کو بھی اپنی آنکھوں سے سچّا اور برحق دیکھ لیں گے جنھیں وہ جھٹلا چکے تھے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ رحمتِ الٰہی میں سے کوئی حصّہ پانے کے اُمیدوار ہو سکیں۔

۳۷- یہاں سے پھر سلسلۂ کلام حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کی طرف مُڑتا ہے۔

۳۸- یعنی حضرت ابراہیمؑ کے معقول دلائل کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ ان کا جواب اگر تھا تو یہ کہ کاٹ دو اُس زبان کو جو حق بات کہتی ہے، اور جینے نہ دو اُس شخص کو جو ہماری غَلَطی ہم پر واضح کرتا ہے اور ہمیں اس سے باز آنے کے لیے کہتا ہے۔ ’’قتل کر دو یا جلا ڈالو‘‘ کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پورا مجمع اس بات پر تو متفق تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ہلاک کر دیا جائے، البتہ ہلاک کرنے کے طریقے میں اختلاف تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ قتل کیا جائے، اور کچھ کی رائے یہ تھی کہ زندہ جلا دیا جائے تا کہ ہر اُس شخص کو عبرت حاصل ہو جسے آیندہ کبھی ہماری سرزمین میں حق گوئی کا جُنون لاحق ہو۔

۳۹- اس فقرے سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ آگ میں پھینک دیے گئے تھے۔ یہاں بات صرف اتنی کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے بچا لیا۔ لیکن سورۃ الانبیاء میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ آگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی اور غیر مضر ہو گئی: قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ ﴿ۙ﴾ (آیت ۶۹) ’’ہم نے کہا کہ اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔‘‘ ظاہر ہے کہ اگر اُن کو آگ میں پھینکا ہی نہ گیا ہو تو آگ کو یہ حکم دینے کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں کہ تو اُن پر ٹھنڈی ہو جا اور ان کے لیے سلامتی بن جا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اشیا کی خاصیتیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں، اور وہ جس وقت جس چیز کی خاصیّت کو چاہے بدل سکتا ہے۔ معمول کے مطابق آگ کا عمل یہی ہے کہ وہ جلائے اور ہر آتش پذیر چیز اس میں پڑ کر جل جائے۔ لیکن آگ کا یہ معمول اس کا اپنا قائم کیا ہُوا نہیں ہے بلکہ خدا کا قائم کیا ہُوا ہے۔ اور اس معمول نے خدا کو پابند نہیں کر دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی حکم نہ دے سکے۔ وہ اپنی آگ کا مالک ہے۔ کسی وقت بھی وہ اسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ جلانے کا عمل چھوڑ دے۔ کسی وقت بھی وہ اپنے ایک اشارے سے آتش کدے کو گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ غیر معمولی خَرقِ عادت اس کے ہاں روز روز نہیں ہوتے۔ کسی بڑی حکمت اور مصلحت کی خاطر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن معمولات کو، جنھیں روزمرہ دیکھنے کے ہم خوگر ہیں، اس بات

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٥﴾

اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں[۴۰]۔ اور اُس نے کہا[۴۱]: "تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبّت کا ذریعہ بنا لیا ہے[۴۲] مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دُوسرے پر لعنت کرو گے[۴۳] اور آگ تمھارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمھارا مددگار نہ ہوگا۔"

کے لیے ہرگز دلیل نہیں ٹھیرایا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اُن سے بندھ گئی ہے اور خلافِ معمول کوئی واقعہ اللہ کے حکم سے بھی نہیں ہوسکتا۔

۴۰- یعنی اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں اس بات میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاندان، قوم اور ملک کے مذہب کی پیروی کرنے کے بجائے اس علمِ حق کی پیروی کی جس کی رُو سے انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حقیقت ہے۔ اور اِس بات میں کہ وہ قوم کی ہٹ دھرمی اور اس کے شدید تعصب کی پروا کیے بغیر اس کو باطل سے باز آ جانے اور حق قبول کر لینے کے لیے پیہم تبلیغ کرتے رہے۔ اور اس بات میں کہ وہ آگ کی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے مگر حق و صداقت سے منہ موڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اور اِس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل علیہ السلام تک کو آزمایشوں سے گزارے بغیر نہ چھوڑا۔ اور اس بات میں کہ جب حضرت ابراہیمؑ اللہ کے ڈالے ہوئے امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے تب اللہ کی مدد ان کے لیے آئی اور ایسے معجزانہ طریقے سے آئی کہ آگ کا الاؤ ان کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا۔

۴۱- سلسلۂ کلام سے مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ بات آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں سے فرمائی ہوگی۔

۴۲- یعنی تم نے خدا پرستی کے بجائے بُت پرستی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کرلی ہے جو دنیوی زندگی کی حد تک تمھارا قومی شیرازہ باندھ سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی عقیدے پر بھی لوگ جمع ہوسکتے ہیں، خواہ حق ہو یا باطل۔ اور ہر اتفاق و اجتماع، چاہے وہ کیسے ہی غلط عقیدے پر ہو، باہم دوستیوں، رشتہ داریوں، برادریوں، اور دوسرے تمام مذہبی، معاشرتی و تمدّنی اور مَعاشی و سیاسی تعلقات کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۴۳- یعنی عقیدۂ باطلہ پر تمھاری یہ ہیئتِ اجتماعی آخرت میں بنی نہیں رہ سکتی۔ وہاں آپس کی محبّت،

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

وقف لازم

اُس وقت لوطؑ نے اُس کو مانا۔[44] اور ابراہیمؑ نے کہا: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں،[45] وہ زبردست

دوستی، تعاون، رشتہ داری، اور عقیدت و ارادت کے صرف وہی تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں جو دنیا میں خدائے واحد کی بندگی اور نیکی و تقویٰ پر قائم ہوئے ہوں۔ کفر و شرک اور گمراہی و بدراہی پر جُڑے ہوئے سارے رشتے وہاں کٹ جائیں گے، ساری محبّتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، ساری عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی، بیٹے اور باپ، شوہر اور بیوی، پیر اور مُرید تک ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر پکارے گا کہ اِس ظالم نے مجھے خراب کیا، اس لیے اسے دُہرا عذاب دیا جائے۔ یہ بات قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ زُخرُف میں فرمایا: اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (آیت ۶۷) ''دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے متقین کے۔'' سورۂ اعراف میں فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (آیت ۳۸) ''ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہوگا تو اپنے پاس والے گروہ پر لعنت کرتا ہُوا داخل ہوگا، حتّٰی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ہمارے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انھیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔'' اور سُورۂ احزاب میں فرمایا: وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (آیات ۶۷-۶۸) ''اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہم کو راہ سے بے راہ کر دیا، اے ہمارے رب! تو انھیں دُہری سزا دے اور ان پر سخت لعنت فرما۔''

۴۴- ترتیبِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ آگ سے نکل آئے اور انھوں نے اُوپر کے فقرے ارشاد فرمائے، اُس وقت سارے مجمع میں صرف ایک حضرت لوطؑ تھے جنھوں نے آگے بڑھ کر اُن کو ماننے اور اُن کی پیروی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر دوسرے بہت سے لوگ بھی اپنے دل میں حضرت ابراہیمؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے ہوں۔ لیکن پوری قوم اور سلطنت کی طرف سے دینِ ابراہیمؑ کے خلاف جس غضب ناک جذبے کا اظہار اُس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے ہُوا تھا، اُسے دیکھتے ہوئے کوئی دوسرا شخص ایسے خطرناک حق کو ماننے اور اس کا ساتھ دینے کی جراٴت نہ کر سکا۔ یہ سعادت صرف ایک آدمی کے حصّے میں آئی، اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ تھے، جنھوں نے آخرکار ہجرت میں بھی اپنے چچا اور چچی (حضرت سارہ) کا ساتھ دیا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ ایک شخص سوال کرسکتا ہے کہ کیا اس واقعے

الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ
النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ

ہے اور حکیم ہے۔[46] اور ہم نے اُسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ (جیسی اولاد) عنایت فرمائی[47] اور اس کی نسل میں نبوّت اور کتاب رکھ دی،[48] اور اسے دنیا میں اُس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہو گا۔[49]

اور ہم نے لُوطؑ کو بھیجا[50] جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: ''تم تو وہ فُحش کام کرتے ہو جو

سے پہلے حضرت لُوطؑ کافر و مشرک تھے اور آگ سے حضرت ابراہیمؑ کے بسلامت نکل آنے کا معجزہ دیکھنے کے بعد انھیں نعمتِ ایمان میسر آئی؟ اگر یہ بات ہے تو کیا نبوت کے منصب پر کوئی ایسا شخص بھی سرفراز ہو سکتا ہے جو پہلے مشرک رہ چکا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے حضرت لوطؑ خداوندِ عالم کو نہ مانتے ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے معبُودوں کو شریک کرتے ہوں۔ بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کی تصدیق کی اور ان کی پیروی اختیار کر لی۔ ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی کسی شخص کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت لوطؑ اس وقت ایک نوعمر لڑکے ہی ہوں اور اپنے ہوش میں ان کو پہلی مرتبہ اس موقع پر ہی اپنے چچا کی تعلیم سے واقف ہونے اور ان کی شانِ رسالت سے آگاہ ہونے کا موقع ملا ہو۔

۴۵ – یعنی اپنے رب کی خاطر ملک چھوڑ کر نکلتا ہوں، اب جہاں میرا رب لے جائے گا وہاں چلا جاؤں گا۔

۴۶ – یعنی وہ میری حمایت و حفاظت پر قادر ہے اور میرے حق میں اس کا جو فیصلہ بھی ہو گا، حکمت پر مبنی ہو گا۔

۴۷ – حضرت اسحاقؑ بیٹے تھے اور حضرت یعقوبؑ پوتے۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ کی مِدیانی شاخ میں صرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے، اور اسماعیلی شاخ میں سرکارِ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ڈھائی ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی نہیں آیا۔ اس کے برعکس نبوت اور کتاب کی نعمت حضرت عیسٰی علیہ السلام تک مسلسل اُس شاخ کو عطا ہوتی رہی جو حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلی تھی۔

۴۸ – اس میں وہ تمام انبیاؑ آ گئے جو نسلِ ابراہیمی کی سب شاخوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

ع ۳ ۱۵

تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمھارا حال یہ ہے کہ مَردوں کے پاس جاتے ہو[51]، اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو؟[52]'' پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انھوں نے کہا: ''لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔'' لوطؑ نے کہا: ''اے میرے رب! اِن مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔''ع

۴۹- مقصودِ بیان یہ ہے کہ بابل کے وہ حکمراں اور پنڈت اور پروہت جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا، اور اس کے وہ مشرک باشندے جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کہیں ان کا نام ونشان تک باقی نہیں۔ مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے جرم میں ان لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا، اور جسے آخرکار بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اُس خلیلِ رب العالمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسّر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجرِ عظیم اس کو ملے گا، وہ تو ملے گا ہی، مگر اِس دنیا میں بھی اس نے وہ عزّت پائی جو حُصولِ دنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۵۰- تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، رکوع ۱۰۔ ہود، ۷۔ الحِجر، ۴-۵۔ الانبیاء، ۵۔ الشعراء، ۹۔ النمل، ۴۔ الصّافّات، ۴۔ القمر، ۲۔

۵۱- یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے: اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ''تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں کے پاس جاتے ہو۔''

۵۲- یعنی یہ فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ عَلانِیَہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سورۂ نمل میں فرمائی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ''کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ
هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ
قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ٚ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫

اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر پہنچے[۵۳] تو انھوں نے اُس سے کہا: ”ہم اِس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں[۵۴]، اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔“ ابراہیمؑ نے کہا: ”وہاں تو لُوطؑ موجود ہے[۵۵]۔“ انھوں نے کہا: ”ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ہم اُسے، اور اُس کی بیوی کے سوا، اُس کے باقی سب گھر والوں کو بچا لیں گے۔“ اس کی

دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فُحش کاری کرتے ہو۔“

۵۳ – سورۂ ہُود اور سورۂ حِجر میں اس کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ جو فرشتے قومِ لُوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے، وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوئے اور انھوں نے آنجناب کو حضرت اسحاقؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر یہ بتایا کہ ہمیں قومِ لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۵۴ – ”اِس بستی“ کا اشارہ قومِ لوطؑ کے علاقے کی طرف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس وقت فلسطین کے شہر حَبرُون (موجودہ الخلیل) میں رہتے تھے۔ اس شہر کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر بُحَیرۂ مردار (Dead Sea) کا وہ حصّہ واقع ہے جہاں پہلے قومِ لُوطؑ آباد تھی اور اب جس پر بحیرے کا پانی پھیلا ہُوا ہے۔ یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اور حَبرُون کی بلند پہاڑیوں پر سے صاف نظر آتا ہے۔ اسی لیے فرشتوں نے اس کی طرف اشارہ کر کے حضرت ابراہیمؑ سے عرض کیا کہ ”ہم اِس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔“ (مُلاحظہ ہو: سورۂ شعراء، حاشیہ ۱۱۴)

۵۵ – سورۂ ہُود میں اس قصّے کا ابتدائی حصّہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہُوا کرتا ہے۔ پھر جب انھوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دُور ہوگئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہم قومِ لوطؑ کی طرف جا رہی ہے، تو آپ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے: (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝) مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملے میں اب کچھ نہ کہو، تمھارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ
وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ

بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔[۵۶]

پھر جب ہمارے فرستادے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ[۵۷] ہوا۔ اُنھوں نے کہا: ”نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔[۵۸] ہم تمھیں اور تمھارے گھر والوں کو

عذاب اب ٹلنے والا نہیں ہے: (يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ) اس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ اُمید باقی نہ رہی کہ قومِ لوطؑ کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا، تب انھیں حضرت لوطؑ کی فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ ”وہاں تو لوطؑ موجود ہے“، یعنی یہ عذاب اگر لوطؑ کی موجودگی میں نازل ہُوا تو وہ اور ان کے اہل وعیال اس سے کیسے محفوظ رہیں گے۔

۵۶ - اس عورت کے متعلق سورۂ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوطؑ کی وفادار نہ تھی، اسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی، ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود، عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ ہجرت کے بعد جب اُردُن کے علاقے میں آ کر آباد ہوئے ہوں گے تو انھوں نے اسی قوم میں شادی کر لی ہوگی۔ لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اَخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اُس قوم کے ساتھ ہُوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اَخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔

۵۷ - اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوب صورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ حضرت لوطؑ اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ میں اپنے اِن مہمانوں کو ٹھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیراؤں تو یہ بڑی بے مروّتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی۔ مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان مسافروں کو اپنی پناہ میں نہ لوں گا تو رات انھیں کہیں اور گزارنی پڑے گی اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا میں نے خود انھیں بھیڑیوں کے حوالے کیا۔ اس کے بعد کا قصہ یہاں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ ہود، الحِجر اور القمر میں بیان ہوئی ہیں کہ ان لڑکوں کی آمد کی خبر سن کر شہر کے بہت سے

اَهۡلَكَ اِلَّا امۡرَاَتَكَ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰٓى
اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾
وَلَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

بچالیں گے، سوائے تمھاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں، اُس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔" اور ہم نے اُس بستی کی ایک کُھلی نشانی چھوڑ دی ہے[59] اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں[60]۔

لوگ حضرت لُوطؑ کے مکان پر ہجوم کر کے آگئے اور اصرار کرنے لگے کہ وہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے ان کے حوالے کردیں۔

۵۸- یعنی ہمارے معاملے میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے فکرمند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنھیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تصریح ہے کہ جب لوگ حضرت لوطؑ کے گھر میں گھسے چلے آرہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے، تو آپ پریشان ہو کر چیخ اُٹھے کہ لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ "کاش! میرے پاس تمھیں ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی، یا کسی زور آور کی حمایت مَیں پا سکتا۔" اس وقت فرشتوں نے کہا: يٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ "اے لوط! ہم تمھارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ تم تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔"

۵۹- اس کُھلی نشانی سے مراد ہے بُحیرۂ مُردار، جسے بحرِ لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر کفارِ مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہِ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو۔ وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ (الحجر) اور وَ اِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ وَبِالَّيۡلِ. (الصّافّات)

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جارہی ہے کہ بُحیرۂ مردار کا جنوبی حصّہ ایک ہولناک زلزلے کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصّے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا
الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ
وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

اور مَدیَن کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا[۶۱]۔ اُس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخر کے اُمیدوار رہو[۶۲] اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔“ مگر انھوں نے اسے جھٹلا[۶۳] دیا۔ آخرکار ایک سخت زلزلے نے انھیں آلیا اور وہ اپنے گھر[۶۴] میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔

اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے[۶۵]۔ اُن کے اعمال کو شیطان نے اُن کے لیے خوش نما بنا دیا اور انھیں

میں قومِ لوطؑ کا مرکزی شہر سدوم (Sodom) واقع تھا۔ اس حصّے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ شُعَراء، حاشیہ ۱۱۴)

۶۰ - عملِ قومِ لوطؑ کی شرعی سزا کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۶۸۔

۶۱ - تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، رکوع ۱۱۔ ہود، ۸۔ الشعراء، ۱۰۔

۶۲ - اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آخرت کے آنے کی توقع رکھو، یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں تمھیں اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزا و سزا پانا ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کرو جس سے تم آخرت میں انجام بہتر ہونے کی اُمید کر سکو۔

۶۳ - یعنی اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ حضرت شعیبؑ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ تعلیم جو وہ دے رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اس کو نہ ماننے کا نتیجہ انھیں عذابِ الٰہی کی شکل میں بھگتنا ہوگا۔

۶۴ - گھر سے مراد وہ پورا علاقہ ہے جس میں یہ قوم رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ایک پوری قوم کا ذکر

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ
وَهَامٰنَ ۛ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ
وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا
عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ

راہِ راست سے برگشتہ کردیا، حالانکہ وہ ہوشِ گوش رکھتے تھے۔[۶۶] اور قارون وفرعون وہامان کو ہم نے ہلاک کیا۔ موسیٰؑ اُن کے پاس بیّنات لے کر آیا مگر انھوں نے زمین میں اپنی بڑائی کا زعم کیا، حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے۔[۶۷] آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی،[۶۸] اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا،[۶۹] اور کسی کو

ہور ہا ہو تو اس کا گھر اس کا مُلک ہی ہوسکتا ہے۔

۶۵ – عرب کے جن علاقوں میں یہ دونوں قومیں آباد تھیں، ان سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا۔ جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اَب اَحقاف، یمن اور حَضرَموت کے نام سے معروف ہے، قدیم زمانے میں عاد کا مسکن تھا اور اہلِ عرب اس کو جانتے تھے۔ حجاز کے شمالی حصے میں رابِغ سے عَقَبَہ تک اور مدینہ وخیبر سے تَیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہُوا ہے، اور نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوں گے۔

۶۶ – یعنی جاہل ونادان نہ تھے۔ اپنے اپنے وقت کے بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے، اور اپنی دنیا کے معاملات انجام دینے میں پوری ہوشیاری اور دانائی کا ثبوت دیتے تھے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شیطان ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور ان کی عقل سلب کر کے انھیں اپنے راستے پر کھینچ لے گیا۔ نہیں، انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر آنکھوں دیکھتے شیطان کے پیش کیے ہوئے اُس راستے کو اختیار کیا جس میں انھیں بڑی لذتیں اور منفعتیں نظر آتی تھیں، اور انبیاؑ کے پیش کیے ہوئے اس راستے کو چھوڑ دیا جو انھیں خشک اور بدمزا اور اَخلاقی پابندیوں کی وجہ سے تکلیف دہ نظر آتا تھا۔

۶۷ – یعنی بھاگ کر اللہ کی گرفت سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔ اللہ کی تدبیروں کو ناکام کر دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

۶۸ – یعنی عاد، جن پر مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک سخت ہوا کا طوفان برپا رہا۔ (سورۂ اَلحاقّہ، آیت ۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٤٠ مَثَلُ الَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ
بَيْتًا ۭ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

وقف لازم

ہم نے زمین میں دھنسا دیا[69]، اور کسی کو غرق کر دیا[70]۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کر رہے[71] تھے۔

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دُوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش! یہ لوگ

۶۹ – یعنی ثمود۔

۷۰ – یعنی قارون۔

۷۱ – یعنی فرعون اور ہامان۔

۷۲ – یہ تمام قصّے جو یہاں تک سنائے گئے ہیں، ان کا رُوئے سُخن دو طرف ہے: ایک طرف یہ اہلِ ایمان کو سنائے گئے ہیں، تاکہ وہ پست ہمت اور دل شکستہ و مایوس نہ ہوں اور مشکلات و مصائب کے سخت سے سخت طوفان میں بھی صبر و استقلال کے ساتھ حق و صداقت کا عَلَم بلند کیے رکھیں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں کہ آخرکار اس کی مدد ضرور آئے گی اور وہ ظالموں کو نیچا دکھائے گا اور کلمۂ حق کو سربلند کر دے گا۔ دوسری طرف یہ اُن ظالموں کو بھی سنائے گئے ہیں جو اپنے نزدیک تحریکِ اسلامی کا بالکل قلع قمع کر دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان کو مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ تم خدا کے حِلم اور اس کی بُردباری کا غلط مطلب لے رہے ہو۔ تم نے خدا کی خدائی کو اندھیر نگری سمجھ لیا ہے۔ تمھیں اگر بغاوت و سرکشی اور ظلم و ستم اور بد اعمالیوں پر ابھی تک نہیں پکڑا گیا ہے اور سنبھلنے کے لیے محض ازراہِ عنایت لمبی مہلت دی گئی ہے تو تم اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہاں کوئی انصاف کرنے والی طاقت سرے سے ہے ہی نہیں اور اس زمین پر جس کا جو کچھ جی چاہے بلانہایت کیے جا سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی آخرکار تمھیں جس انجام سے دوچار کر کے رہے گی وہ وہی انجام ہے جو تم سے پہلے قومِ نوحؑ اور قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ دیکھ چکی ہے، جس سے عاد و ثمود دوچار ہو چکے ہیں، اور جسے قارون و فرعون نے دیکھا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ
وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ

علم رکھتے۔[۷۳] یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔[۷۴] یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں،

۷۳ – اُوپر جتنی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شرک میں مبتلا تھیں اور اپنے معبودوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست (guardians) ہیں، ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کی پوجا پاٹ کر کے اور انھیں نذر و نیاز دے کر جب ہم ان کی سرپرستی حاصل کرلیں گے تو یہ ہمارے کام بنائیں گے اور ہم کو ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن جیسا کہ اُوپر کے تاریخی واقعات میں دکھایا گیا ہے، ان کے یہ تمام عقائد و اوہام اُس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اُس وقت کوئی دیوتا، کوئی اَوتار، کوئی ولی، کوئی رُوح اور کوئی جن یا فرشتہ، جسے وہ پوجتے تھے، ان کی مدد کو نہ آیا اور اپنی باطل توقعات کی ناکامی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے وہ سب پیوندِ خاک ہو گئے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ مشرکین کو مُتنبّہ کر رہا ہے کہ کائنات کے حقیقی مالک و فرمانروا کو چھوڑ کر بالکل بے اختیار بندوں اور سراسر خیالی معبُودوں کے اعتماد پر جو توقعات کا گھروندا تم نے بنا رکھا ہے، اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح مکڑی کا جالا ایک اُنگلی کی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح تمھاری توقعات کا یہ گھروندا بھی خدا کی تدبیر سے پہلا تصادم ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ یہ محض جہالت کا کرشمہ ہے کہ تم اوہام کے اس چکّر میں پڑے ہوئے ہو۔ حقیقت کا کچھ بھی علم تمھیں ہوتا تو تم ان بے بنیاد سہاروں پر اپنا نظامِ حیات کبھی تعمیر نہ کرتے۔ حقیقت بس یہ ہے کہ اختیارات کا مالک اس کائنات میں ایک ربُّ العالمین کے سوا کوئی نہیں ہے اور اسی کا سہارا وہ سہارا ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ، آیت ۲۵۶) ”جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے وہ مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

۷۴ – یعنی اللہ کو ان سب چیزوں کی حقیقت خوب معلوم ہے جنھیں یہ لوگ معبُود بنائے بیٹھے ہیں اور مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ طاقت کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور اسی کی تدبیر و حکمت اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: ”اللہ خوب جانتا ہے کہ اُسے چھوڑ کر جنھیں یہ لوگ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع

ع ۴ ۱۱

۲۱ الجزء

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے،[۷۵] درحقیقت اِس میں ایک نشانی ہے اہلِ ایمان کے لیے۔[۷۶] ع

(اے نبیؐ!) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمھاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو،[۷۷] یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے،[۷۸] اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔[۷۹] اللہ جانتا ہے

پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں ہیں (یعنی بے حقیقت ہیں) اور عزیز و حکیم بس وہی ہے۔''

۷۵ – یعنی کائنات کا یہ نظام حق پر قائم ہے نہ کہ باطل پر۔ اس نظام پر جو شخص بھی صاف ذہن کے ساتھ غور کرے گا، اس پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ زمین و آسمان اَوہام و تخیُّلات پر نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت پر کھڑے ہیں۔ یہاں اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ جو کچھ بھی سمجھ بیٹھے اور اپنے وہم و گمان سے جو فلسفہ بھی گھڑ لے وہ ٹھیک بیٹھ جائے۔ یہاں تو صرف وہی چیز کامیاب ہوسکتی ہے اور قرار و ثبات پا سکتی ہے جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ خلافِ واقعہ قیاسات اور مفروضات پر جو عمارت بھی کھڑی کی جائے گی، وہ آخر کار حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ نظامِ کائنات صاف شہادت دے رہا ہے کہ ایک خدا اس کا خالق ہے اور ایک ہی خدا اس کا مالک و مدبّر ہے۔ اس امرِ واقعی کے خلاف اگر کوئی شخص اس مفروضے پر کام کرتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا یہ فرض کر کے چلتا ہے کہ اس کے بہت سے خدا ہیں جو نذر و نیاز کا مال کھا کر اپنے عقیدت مندوں کو یہاں سب کچھ کرنے کی آزادی اور بخیریت رہنے کی ضمانت دے دیتے ہیں، تو حقیقت اس کے اِن مفروضات کی بدولت ذرّہ برابر بھی تبدیل نہ ہوگی، بلکہ وہ خود ہی کسی وقت ایک صدمۂ عظیم سے دوچار ہوگا۔

۷۶ – یعنی زمین و آسمان کی تخلیق میں توحید کی صداقت اور شرک و دہریت کے بُطلان پر ایک صاف شہادت موجود ہے، مگر اس شہادت کو صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو انبیا علیہم السلام کی پیش کی ہوئی تعلیمات کو

مانتے ہیں۔ ان کا انکار کر دینے والوں کو سب کچھ دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

۷۷- خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطَب تمام اہلِ ایمان ہیں۔ ان پر جو ظلم وستم اُس وقت توڑے جا رہے تھے، اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آ رہا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پچھلے چار رُکوعوں میں صبر وثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انھیں عملی تدبیر یہ بتائی جا رہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں، کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کرتی ہیں جن سے وہ باطل کی بڑی سے بڑی طغیانیوں اور بدی کے سخت سے سخت طوفانوں کے مقابلے میں نہ صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان کا منہ پھیر سکتا ہے۔ لیکن تلاوتِ قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی روح میں جذب کرتا چلا جائے، اور اس کی نماز صرف حرکاتِ بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اَخلاق وکردار کی قوتِ محرکہ بن جائے۔ نماز کے وصفِ مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں قرآن خود بیان کر رہا ہے۔ رہی تلاوت، تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی، وہ اسے کفر کی طغیانیوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ یَقْرَاُوْنَ القراٰن ولا یجاوز حناجرھم، یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ۔ ''وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، وہ دین سے اِس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔'' (بخاری، مسلم، موطّا) درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن وفکر اور اَخلاق وکردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے جس سے قرآن منع کرتا ہے، وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ مَا اٰمن بالقراٰن من استحل محارمہ۔ ''قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا۔'' (ترمذی بروایت صُہَیب رُومیؓ) ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اس کی رُوح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلے میں اور زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کیرکٹر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا رہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے، اس کا معاملہ تو اس مجرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پوزیشن کو سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے کہ القراٰن حجۃ لک او علیک۔ ''قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف۔'' (مسلم) یعنی اگر تُو قرآن کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجت ہے۔ دنیا سے آخرت تک جہاں بھی تجھ سے بازپُرس ہو، تو اپنی صفائی میں

Maktaba Tul Ishaat.com

قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے۔ اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہُوا تو نہ دنیا میں کوئی قاضیِ اسلام تجھے سزا دے سکے گا اور نہ آخرت میں داورِ محشر ہی کے ہاں اس پر تیری پکڑ ہوگی۔ لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو، اور تو نے اسے پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے، کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے منع کرتا ہے، اور پھر تُو اس کے خلاف رَویّہ اختیار کرے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجت ہے۔ یہ تیرے خدا کی عدالت میں تیرے خلاف فوجداری کا مُقدّمہ اور زیادہ مضبوط کر دے گی۔ اس کے بعد ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ جانا یا ہلکی سزا پانا تیرے لیے ممکن نہ رہے گا۔

۷۸ – یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک اہم وصف ہے جسے موقع ومحل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مکّے کے اُس ماحول میں جن شدید مزاحمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ درپیش تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں مادّی طاقت سے بڑھ کر اَخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور اس کے نَشْوونَما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشان دہی کی گئی: ایک، تلاوتِ قرآن، دوسرے، اقامتِ صلوٰۃ۔ اس کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ وہ ذریعہ ہے جس سے تم لوگ اُن بُرائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمھارے گردوپیش اہلِ عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اِس وقت مبتلا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اَخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں رکھتا کہ یہ بجائے خود اُن لوگوں کے لیے دنیا وآخرت میں نافع ہے جنھیں یہ پاکیزگی حاصل ہو، بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اُن کو اُن سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیّت کے اُس ناپاک نظام کو، جو اُن بُرائیوں کی پرورش کرتا ہے، برقرار رکھنے کے لیے اِن پاکیزہ انسانوں کے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ فَحشاء اور مُنکَر کا اطلاق جن بُرائیوں پر ہوتا ہے، انھیں انسان کی فطرت بُرا جانتی ہے، اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اُصولاً ان کو بُرا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ نُزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کُلیّے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اَخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے، بدی کے مقابلے میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے، اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو بُرائی کو بھلائی سمجھتا ہو، یا بھلائی کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر کسی ایسی تحریک کا اُٹھنا جس سے وابستہ ہوتے ہی خود اُسی معاشرے کے افراد اَخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی سیرت وکردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اَخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصّبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر اُن لوگوں کا ساتھ دیے

چلے جاتے جو خود اَخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیّت کے اُس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے جو اُن برائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادّی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اَخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کرلیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر و تُفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دے دے۔

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو پہلو ہیں: ایک اس کا وصفِ لازم ہے، یعنی یہ کہ وہ فَحشاء اور مُنکَر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصفِ مطلوب ہے، یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی فَحشاء اور مُنکَر سے رُک جائے۔ جہاں تک روکنے کا تعلق ہے، نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا، وہ تسلیم کرے گا کہ انسان کو بُرائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں، ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہوسکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے کہ تو اِس دنیا میں آزاد و خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے، حتّٰی کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اُس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔ پھر اس یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اِس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چُھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اُٹھنے کے وقت سے لے کر نماز ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا آخر کسے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوئے اذکارِ نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے، تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہوسکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے لے کر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانونِ خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعے سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے، اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے، اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبۂ اطاعت کے زیرِ اثر خفیہ اور علانیہ ہر حال میں اُس قانون کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو، اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فَحشاء و مُنکَر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریقِ تربیّت ایسا نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملے

Maktaba Tul Ishaat.com

میں اِس درجہ مؤثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رُکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اُٹھانے کی نیت رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مُترتّب ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیرِ اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہوسکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، یا جان بُوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تَغذِیہ اور نَشو و نَما ہے، لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے جزوِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً ہی قے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لاکر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجبِ تَغذِیۂ بدن نہیں ہے کیونکہ فُلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جارہا ہے، اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے، کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا، جیسے کھانا کھا کر قے کردینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو متعدِّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی ہوئی ہے۔ عمرانؓ بن حُصَینؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر فلا صلاة له ''جسے اس کی نماز نے فُحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا، اس کی نماز نہیں ہے۔'' (ابنِ ابی حاتم) ابنِ عباسؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: من لم تنهه صلٰوته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد بها من الله الّا بعدا، ''جس کی نماز نے اسے فُحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا، اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دُور کردیا'' (ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی) یہی مضمون جناب حسن بصریؒ نے بھی حضورؐ سے مرسلاً رِوایت کیا ہے۔ (ابنِ جَریر، بَیہَقی) ابنِ مسعودؓ سے حضورؐ کا یہ ارشاد مروی ہے: لا صلٰوة لمن لم يطع الصلوة وطاعة الصلوة ان تنهى عن الفحشاء والمنكر ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فَحشاء و مُنکَر سے رُک جائے۔'' (ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم) اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصری، قَتادَہ اور اَعْمَش وغیرہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں: جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں، اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فَحشاء اور مُنکَر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رُک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (رُوح المعانی)

۷۹ – اس کے کئی معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اِس سے بزرگ تر ہے۔ اُس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر اُبھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز بھی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجائے خود بہت بڑی چیز ہے۔ خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تمھیں یاد کرنا تمھارے اُس کو یاد کرنے سے

مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ
اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا

جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔

اور اہلِ کتاب[80] سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے[81] ــــــ سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں[82] ــــــ اور اُن سے کہو کہ "ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے

زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ، آیت ۱۵۲) "تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا۔" پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا تو لامحالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اِس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے جسے حضرت ابوالدّرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیۂ محترمہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے، یا زکوٰۃ دیتا ہے، یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لامحالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے، تبھی تو اس سے وہ عملِ نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی برائی کے مواقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یادِ الٰہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

۸۰ - واضح رہے کہ آگے چل کر اسی سورہ میں ہجرت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اُس وقت حَبَش ہی ایک ایسا مأمن تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جا سکتے تھے، اور حبش پر اس زمانے میں عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے اِن آیات میں مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو ان سے دین کے معاملے میں بحث وکلام کا کیا انداز اختیار کریں۔

۸۱ - یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شایستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے، تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو، اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلّغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اُتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِّمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملے میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۴۶
وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ

اور اُس چیز پر بھی جو تمھاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔[۸۳]" (اے نبیؐ!) ہم نے اِسی طرح تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے،[۸۴] اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان

کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل، آیت ۱۲۵)	دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند ونصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔
وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ (حم السجدہ، آیت ۳۴)	بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مُدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ (المومنون، آیت ۹۶)	تم بدی کو اچھے ہی طریقے سے دفع کرو، ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمھارے خلاف) بناتے ہیں۔
خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (الاعراف، آیات ۱۹۹-۲۰۰)	درگزر کی روش اختیار کرو، بھلائی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو، اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمھیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔

۸۲ – یعنی جو لوگ ظلم کا رَوِیّہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رَوِیّہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلے میں نرم وشیریں ہی نہ بنے رہنا چاہیے کہ دنیا داعیِ حق کی شرافت کو کمزوری اور مَسکَنت سمجھ بیٹھے۔ اسلام اپنے پیرووں کو شائستگی، شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ وہ ہر ظالم کے لیے نرم چارا بن کر رہیں۔

۸۳ – اِن فقروں میں اللہ تعالیٰ نے خود اُس عمدہ طریقِ بحث کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغِ حق

بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝

لاتے ہیں[۸۵]، اور اِن لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں[۸۶]، اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں[۸۷]۔

کی خدمت انجام دینے والوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمھیں بحث کرنی ہو، اُس کی گمراہی کو بحث کا نقطۂ آغاز نہ بناؤ، بلکہ بات اِس سے شروع کرو کہ حق وصداقت کے وہ کون سے اجزا ہیں جو تمھارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں۔ یعنی آغازِ کلام نِکاتِ اختلاف سے نہیں بلکہ نِکاتِ اتفاق سے ہونا چاہیے، پھر انھی مُتّفق عَلَیہ اُمور سے اِستدلال کر کے مخاطَب کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جن اُمور میں تمھارے اور اس کے درمیان اختلاف ہے، ان میں تمھارا مسلک مُتّفق عَلَیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔

اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہلِ کتاب مشرکینِ عرب کی طرح وحی و رسالت اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح اِن سب حقیقتوں کو مانتے تھے۔ اِن بُنیادی اُمور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیادِ اختلاف ہوسکتی تھی تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے ہاں آئی ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی اُنھیں دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انھیں کافر قرار دیتے۔ یہ جھگڑے کی بڑی مضبوط وجہ ہوتی۔ لیکن مسلمانوں کا مَوقِف اس سے مختلف تھا۔ وہ تمام اُن کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہلِ کتاب کے پاس موجود تھیں اور پھر اُس وحی پر ایمان لائے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ بتانا اہلِ کتاب کا کام تھا کہ کس معقول وجہ سے وہ خدا ہی کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا یہی مَوقِف ان کے سامنے پیش کرو۔ ان سے کہو کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی کو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔ اس کی طرف سے جو احکام و ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں ان سب کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے، خواہ وہ تمھارے ہاں آئی ہوں یا ہمارے ہاں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ملک اور قوم اور نسل کے بندے نہیں ہیں کہ ایک جگہ خدا کا حکم آئے تو ہم مانیں اور اُسی خدا کا حکم دوسری جگہ آئے تو ہم اس کو نہ مانیں۔ قرآنِ مجید میں یہ بات جگہ جگہ دہرائی گئی ہے اور خصوصاً اہلِ کتاب سے جہاں سابقہ پیش آیا ہے وہاں تو اسے زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۴-۱۳۶-۱۷۷-۲۸۵۔ آلِ عمران، آیت ۸۴۔ النساء، آیات ۱۳۶-۱۵۰ تا ۱۵۲-۱۶۲ تا ۱۶۴۔ الشّوریٰ، آیت ۱۳۔

۸۴ - اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جس طرح پہلے انبیاؑ پر ہم نے کتابیں نازل کی تھیں، اُسی طرح اب یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اِسی تعلیم کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے کہ ہماری پچھلی کتابوں کا انکار کر کے نہیں بلکہ اُن سب کا اقرار کرتے ہوئے اِسے مانا جائے۔

۸۵ - سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد تمام اہلِ کتاب نہیں ہیں بلکہ وہ اہلِ کتاب ہیں جن کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ

(اے نبیؐ!) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔۸۸ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے

کُتُبِ الٰہیہ کا صحیح علم و فہم نصیب ہُوا تھا، جو" چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق محض کتاب بردار قسم کے اہلِ کتاب نہیں تھے، بلکہ حقیقی معنیٰ میں اہلِ کتاب تھے۔ ان کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہوئی یہ آخری کتاب آئی تو انھوں نے کسی ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصُّب سے کام نہ لیا اور اسے بھی ویسے ہی اخلاص کے ساتھ تسلیم کر لیا جس طرح پچھلی کتابوں کو تسلیم کرتے تھے۔

۸۶- "اِن لوگوں" کا اشارہ اہلِ عرب کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق پسند لوگ ہر جگہ اس پر ایمان لا رہے ہیں، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا غیر اہلِ کتاب میں سے۔

۸۷- یہاں کافر سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے تعصبات کو چھوڑ کر حق بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، یا وہ جو اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنی بے لگام آزادیوں پر پابندیاں قبول کرنے سے جی چُراتے ہیں اور اس بنا پر حق کا انکار کرتے ہیں۔

۸۸- یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں وہی اِستِدلال ہے جو اس سے پہلے سورۂ یونس اور سورۂ قصص میں گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ یُونُس، حاشیہ ۲۱ و تفسیر سورۂ قصص، حاشیہ ۶۴ و ۱۰۹۔ اس مضمون کی مزید تشریح کے لیے تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ نحل، حاشیہ ۱۰۷ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۵، المومنون حاشیہ ۶۶، الفرقان حاشیہ ۱۲ اور الشّوریٰ حاشیہ ۸۴ کا مُطالَعہ بھی مفید ہوگا)۔

اس آیت میں اِستِدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ آپؐ کے اہلِ وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ، جن کے درمیان روزِ پیدایش سے سِنِ کہُولت کو پہنچنے تک آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ کُتُبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیائے سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدُّن و اَخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اِس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے، یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نَوِشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مُطالَعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمِّیّت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوت کا

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا
لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ
اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے[89]، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں[90] اِس کے رب کی طرف سے؟" کہو: "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔" اور کیا اِن لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی

انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجے میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔

۸۹- یعنی ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مُشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اُس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتا چلا سکتا ہے جو اُس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی، اُن کا کوئی ماخذ آپؐ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گرد و پیش کے جن مُمالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں دُور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں، وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

۹۰- یعنی معجزات، جنھیں دیکھ کر یقین آئے کہ واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے نبی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ ع قُلْ
كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٥٢﴾

جو اِنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے؟[91] درحقیقت اِس میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں[92]۔ع (اے نبیؐ!) کہو کہ ”میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔“

۹۱- یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا، کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمھاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنھوں نے دیکھے، ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمھارے سامنے ہے۔ تمھیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ تم ہر وقت اِسے دیکھ سکتے ہو۔

قرآنِ مجید کے اس بیان و اِستدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپؐ کی نبوت کے حق میں ایک طاقت ور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن رِوایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ لکھے پڑھے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، وہ اوّل تو پہلی ہی نظر میں ردّ کر دینے کے لائق ہیں، کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ بجائے خود بھی اِتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی اِستدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک، بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلحِ حُدَیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمایندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (یعنی حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمدؐ بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیے اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔

لیکن یہ روایت بَراءؓ بن عازِب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں:

(۱) بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال لعلی امحہ فقال علی ما انا بالذی

امحاہ فمحاہ رسول اللّٰہ بیدہٖ۔ ’’حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یہ الفاظ کاٹ دو۔ انھوں نے عرض کیا: میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انھیں کاٹ دیا۔‘‘

(۲) اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول اللّٰہ قال لا واللّٰہ لا امحوك ابدا فاخذ رسول اللّٰہ الکتاب فکتب ھٰذا ما قاضی علیہ محمد بن عبد اللّٰہ۔ ’’پھر علیؓ سے کہا: ’’رسول اللہ‘‘ کاٹ دو۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! میں آپؐ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے وہ تحریر لے کر لکھا: یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔‘‘

(۳) تیسری روایت انھی بَراءؓ بن عازِب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلی امح رسول اللّٰہ فقال علی واللّٰہ لا امحاہ ابدًا قال فارنیہ قال فاراہ ایاہ فمحاہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بیدہٖ۔ ’’حضورؐ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا: ’’رسول اللہ‘‘ کاٹ دو۔ انھوں نے عرض کیا: خدا کی قسم! میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انھوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیے۔‘‘

(۴) چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے: فاخذ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الکتاب ولیس یحسن یکتب فکتب ھٰذا ما قاضی محمد بن عبد اللّٰہ۔ ’’پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی، درآنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے، اور آپؐ نے لکھا: یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔‘‘

(۵) انھی بَراءؓ بن عازِب سے مسلم، کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے ’’رسول اللہ‘‘ کے الفاظ مٹا دیے۔

(۶) دوسری رِوایَت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں لکھا ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی، اور آپ نے اسے مٹا کر ابنِ عبداللہ لکھ دیا۔

رِوایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت بَراء بن عازِب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے ’’محمدؐ بن عبداللہ‘‘ کے الفاظ اپنے دستِ مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورتِ واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے ’’رسول اللہ‘‘ کا لفظ مٹانے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے اس کی جگہ اُن سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابنِ عبداللہ کے الفاظ لکھوا دیے ہوں۔ دوسری رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؓ، دوسرے محمدؐ بن مَسْلَمَہ۔ (فتح الباری، جلد ۵، ص ۲۱۷) اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا، وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔ تاہم اگر واقعہ یہی ہو کہ حضورؐ نے اپنا نام اپنے ہی دستِ مبارک سے لکھا ہو، تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ اَن پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں، باقی کوئی چیز نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ
وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ
وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿ۙ۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔[۹۳] اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آ کر رہے گا اچانک، اِس حال میں کہ انھیں خبر بھی نہ ہوگی۔ یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ جہنّم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے (اور اِنھیں پتا چلے گا) اُس روز جب کہ عذاب انھیں اُوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی، اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے۔

دوسری روایت جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، مجاہد سے ابنِ ابی شَیْبَہ اور عمر بن شبہ نے نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے)۔ لیکن اول تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے، جیسا کہ حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں: فضعیف لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہؓ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عَون بن عبداللہ کے، جن سے مجاہد نے یہ بات سنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عون بھی صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں، جنھوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انھیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعے کا علم حاصل ہُوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

۹۲- یعنی بلاشبہ اس کتاب کا نُزول اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی ہے اور یہ بندوں کے لیے بڑی پند و نصیحت پر مشتمل ہے، مگر اس کا فائدہ صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اس پر ایمان لائیں۔

۹۳- یعنی بار بار چیلنج کے انداز میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر تم رسول ہو اور ہم واقعی حق کو جھٹلا رہے ہیں تو ہم پر وہ عذاب کیوں نہیں لے آتے جس کے ڈراوے تم ہمیں دیا کرتے ہو۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ

اَے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔[۹۴] ہر متنفّس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔[۹۵] جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے[۹۶] ـــــ اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے

۹۴- یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکّے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبّت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمایش کا ہوتا ہے۔ جو سچّا مومن ہے، وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعیِ ایمان ہے، وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا، خدا پرست انسان محب قوم و وطن تو ہوسکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہوسکتا۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے، جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

۹۵- یعنی جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمھارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمھیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا، اور ایمان

Maktaba Tul Ishaat.com

صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ
رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

صبر کیا ہے[۹۷] اور جو اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں[۹۸]۔ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمھارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے[۹۹]۔

بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہُوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

۹۶ - یعنی اگر ایمان اور نیکی کے راستے پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی مرے، تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہوگی، اور نری تلافی ہی نہ ہو گی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔

۹۷ - یعنی جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہیں۔ جنھوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہے اور منہ نہیں موڑا ہے۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہیں کیا ہے۔ کفار و فُسّاق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور ان کی دولت وحشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی ہے۔

۹۸ - یعنی جنھوں نے بھروسا اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا۔ جو اسبابِ دُنیوی سے قطعِ نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے، اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ جنھوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہو گا، اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن وصالح بندوں کی اِس دنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

۹۹ - یعنی ہجرت کرنے میں تمھیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمھیں بھی دے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ

اگر تم ۱۰۱ اِن لوگوں سے پُوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سُورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے، تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں؟ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا

ٹھیک یہی بات ہے جو سیّدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمائی تھی۔ انھوں نے فرمایا:

''کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبّت، یا ایک سے مِلا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پییں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی مَیں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند مُلبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا۔ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے، یا کیا پییں گے، یا کیا پہنیں گے۔ کیونکہ اِن سب چیزوں کی تلاش میں تو غیر قومیں رہتی ہیں۔ اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم اِن سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اُس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمھیں مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو، کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔'' (متّی، باب ۶، آیات ۲۴-۳۴)

قرآن اور انجیل کے اِن ارشادات کا پَس منظر ایک ہی ہے۔ دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آ جاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالَمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطعِ نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اُٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اِس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر

Maktaba Tul Ishaat.com

عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۶۲ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۳ ع وَمَا
هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ

چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو: کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا، تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔ کہو: الحمد للہ[۱۰۱]! مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ ع

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا[۱۰۲]۔ اصل زندگی کا گھر تو

خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انھی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۱۰۰ – یہاں سے پھر کلام کا رُخ کفارِ مکہ کی طرف مڑتا ہے۔

۱۰۱ – اس مقام پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا لفظ دو معنیٰ دے رہا ہے: ایک، یہ کہ جب یہ سارے کام اللہ کے ہیں تو پھر حمد کا مستحق بھی صرف وہی ہے، دوسروں کو حمد کا استحقاق کہاں سے پہنچ گیا؟ دوسرے، یہ کہ خدا کا شکر ہے، اس بات کا اعتراف تم خود بھی کرتے ہو۔

۱۰۲ – یعنی اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے جیسے بچے تھوڑی دیر کے لیے کھیل کود لیں اور پھر اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔ یہاں جو بادشاہ بن گیا ہے، وہ حقیقت میں بادشاہ نہیں بن گیا ہے بلکہ صرف بادشاہی کا ڈراما کر رہا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اس کا یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور اسی بے سرو سامانی کے ساتھ وہ تختِ شاہی سے رخصت ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ اسی طرح زندگی کی کوئی شکل بھی یہاں مستقل اور پائدار نہیں ہے۔ جو جس حال میں بھی ہے، عارضی طور پر ایک محدود مدت کے لیے ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی کامرانیوں پر جو لوگ مرے مٹتے ہیں اور انھی کے لیے ضمیر و ایمان کی بازی لگا کر کچھ عیش و عشرت کا سامان اور کچھ شوکت و حشمت کے ٹھاٹ فراہم کر لیتے ہیں، ان کی یہ ساری حرکتیں دل کے بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اِن کھلونوں سے اگر وہ دس بیس یا ساٹھ ستر سال دل بہلا لیں اور پھر موت کے دروازے سے خالی ہاتھ گزر کر اُس عالم میں پہنچیں جہاں کی دائمی و ابدی زندگی میں ان کا یہی کھیل بلائے بے درماں ثابت ہو، تو آخر اِس طفل تسلی کا فائدہ کیا ہے؟

وقف لازم

الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۶۵ۙ
لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۶۶ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ
يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝۶۷ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

دارِ آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے[۱۰۳]۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس سے دُعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ اِنھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں، تا کہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفرانِ نعمت کریں اور (حیاتِ دنیا کے) مزے لُوٹیں[۱۰۴]۔ اچھا، عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُر امن حرم بنا دیا ہے، حالانکہ اِن کے گرد و پیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں[۱۰۵]؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر

۱۰۳– یعنی اگر یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے کہ دنیا کی موجودہ زندگی صرف ایک مہلتِ امتحان ہے، اور انسان کے لیے اصل زندگی، جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، آخرت کی زندگی ہے، تو وہ یہاں امتحان کی مدت کو اِس لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے اس کا ایک ایک لمحہ اُن کاموں میں استعمال کرتے جو اُس اَبدی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔

۱۰۴– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ انعام، حاشیہ ۲۹ و ۴۱، سورۂ یُونس، حاشیہ ۲۹ و ۳۱، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۴۔

۱۰۵– یعنی کیا اِن کے شہر مکہ کو، جس کے دامن میں انھیں کمال درجے کا امن میسّر ہے، کسی لات یا ہُبَل نے حرم بنایا ہے؟ کیا کسی دیوی یا دیوتا کی یہ قدرت تھی کہ ڈھائی ہزار سال سے عرب کی انتہائی بدامنی کے ماحول میں اس جگہ کو تمام فتنوں اور فسادوں سے محفوظ رکھتا؟ اس کی حرمت کو برقرار رکھنے والے ہم نہ تھے تو اور کون تھا؟

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع

ع ۷ ۲

جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے، جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو؟[۱۰۶] کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنّم ہی نہیں ہے؟ جو لوگ ہماری خاطر مُجاہَدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے،[۱۰۷] اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔ ع

۱۰۶- یعنی نبی نے دعوائے رسالت کیا ہے اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ اگر نبی نے اللہ کا نام لے کر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اُس سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر تم نے سچّے نبی کی تکذیب کی ہے تو پھر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

۱۰۷- ’’مُجاہَدہ‘‘ کی تشریح اسی سورۂ عنکبوت کے حاشیہ ۸ میں گزر چکی ہے۔ وہاں یہ فرمایا گیا تھا کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا، وہ اپنی ہی بھلائی کے لیے کرے گا۔ (آیت ۶) یہاں یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دنیا بھر سے کش مکش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لیے کھول دیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر انھیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر ہر موڑ پر انھیں روشنی دکھاتا ہے کہ راہِ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں۔ جتنی نیک نیتی اور خیر طلبی ان میں ہوتی ہے، اتنی ہی اللہ کی مدد اور توفیق اور ہدایت بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔

تفہیم القرآن

الروم

(۳۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

الروم

نام پہلی ہی آیت کے لفظ غُلِبَتِ الرُّوْمُ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول آغاز ہی میں جس تاریخی واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے زمانۂ نزول قطعی طور پر متعین ہوجاتا ہے۔ اس میں ارشاد ہُوا ہے کہ ''قریب کی سرزمین میں رُومی مغلوب ہو گئے ہیں۔'' اُس زمانے میں عرب سے متصل رومی مقبوضات اُردُن، شام اور فلسطین تھے اور ان علاقوں میں رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ء میں مکمل ہُوا تھا۔ اس لیے پوری صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورت اُسی سال نازل ہوئی تھی، اور یہ وہی سال تھا جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔

تاریخی پس منظر جو پیشین گوئی اس سورہ کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے، وہ قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو اِن آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Mauric) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعے سے ایران کے بادشاہ خُسرَو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اَخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہُوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہُوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حَلَب اور اَنطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اَعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقا کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہِرَقل (Heraclius) کو

ایک طاقت ور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہِرَقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے مارِیس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے، اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خُسرَو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عَزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نَسطوری اور یعقوبی وغیرہ)، ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتّٰی کہ خُسرَو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہِرَقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ اَنطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دِمَشق فتح ہُوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المَقدِس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کَنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیحؑ نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انھوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خُسرَو پرویز پر چڑھا تھا، اس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المَقدِس سے ہِرَقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

”سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام رُوئے زمین کے مالک خُسرَو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہِرَقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسا ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟“

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردُن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا

Maktaba Tul Ishaat.com

کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکّۂ معظّمہ میں ایک اوراس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیّت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے عَلَم بردار سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھربار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو رُوم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ رُوم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکّے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو، ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمھیں اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآنِ مجید کی یہ سورت نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ ”قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔“ اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں: ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اُسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مُٹھی بھر مسلمان تھے جو مکّے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف رُوم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابُلُس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انھوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خِلقِدون (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خُسرَو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ”اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔“ آخرکار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage، موجودہ تیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض، انگریز مؤرخ گِبَن کے بقول، قرآنِ مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک

حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آ جائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار، اس وقت تو کسی کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔[1]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکّہ نے ان کا خوب مذاق اُڑایا اور اُبَیّ بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بَدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اُونٹ مَیں دوں گا ورنہ دس اُونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہُوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اُونٹوں کی تعداد بڑھا کر سَو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سَو اُونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں اِدھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینۂ طیّبہ تشریف لے گئے اور اُدھر قیصر ہِرَقْل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اَسْوَد کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہُوا جہاں اُس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیا مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسْقُفِ اعظم سرجیس(Sergius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہِرَقْل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گُھس کر زَرتُشت کے مقامِ پیدائش اُرمیاہ(Clorumia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بَدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوا کی فیصلہ کُن لڑائی (۶۲۷ء) میں انھوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دَستگرد (دَسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہِرَقْل کے لشکر عین طیسفون (Ctesiphon)

1 Gibbon, Decline and Fall of the Roman Empire, Vol. II, p. 788, Modern Library, New York.

Maktaba-Tul-Ishaat.com

کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دار السلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خُسرَو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رُونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حُدَیبِیَہ واقع ہوئی، جسے قرآن ''فتحِ عظیم'' کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خُسرَو کے بیٹے قُباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر ''مقدّس صلیب'' کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المَقدِس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عُمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکّہ معظّمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہے کی گنجایش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچّی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَیّ بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اُونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انھیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انھیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جُوئے کی حُرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آ چکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

موضوع اور مضمون

اس سورہ میں کلام کا آغاز اس بات سے کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور ساری دُنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ قریب ہے، مگر چند سال نہ گزرنے پائیں گے کہ پانسا پلٹ جائے گا اور جو مغلوب ہے وہ غالب ہو جائے گا۔

اس تمہید سے یہ مضمون نکل آیا کہ انسان اپنی سطح بینی کی وجہ سے وہی کچھ دیکھتا ہے جو بظاہر اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر اس ظاہر کے پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر بینی جب دُنیا کے ذرا ذرا سے معاملات میں غلط فہمیوں اور غلط اندازوں کی موجب ہوتی ہے، اور جب کہ محض اتنی سی بات نہ جاننے کی وجہ سے کہ ''کل کیا ہونے والا ہے'' آدمی غلط تخمینے لگا بیٹھتا ہے، تو پھر بحیثیتِ مجموعی پوری زندگی کے معاملے میں ظاہر حیاتِ دُنیا پر اعتماد کر بیٹھنا اور اسی کی بنیاد پر اپنے پورے سرمایۂ حیات کو داؤں پر لگا دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

اِس طرح روم و ایران کے معاملے سے تقریر کا رُخ آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل تین رُکوعوں تک طریقے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ

آخرت ممکن بھی ہے، معقول بھی ہے، اس کی ضرورت بھی ہے، اور انسانی زندگی کے نظام کو دُرست رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ آدمی آخرت کا یقین رکھ کر اپنی موجودہ زندگی کا پروگرام اختیار کرے، ورنہ وہی غَلَطی واقع ہوگی جو ظاہر پر اعتماد کر لینے سے واقع ہُوا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں آخرت پر اِستِدلال کرتے ہوئے کائنات کے جن آثار کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے، وہ بعینہٖ وہی آثار ہیں جو توحید پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے چوتھے رکوع کے آغاز سے تقریر کا رُخ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کے لیے فطری دین اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ بالکل یکسو ہو کر خدائے واحد کی بندگی کرے۔ شرک فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان کے خلاف ہے، اسی لیے جہاں بھی انسان نے اس گمراہی کو اختیار کیا ہے وہاں فساد رُونما ہُوا ہے۔ اس موقع پر پھر اُس فسادِ عظیم کی طرف، جو اُس وقت دُنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ کی بدولت برپا تھا، اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ فساد بھی شرک کے نتائج میں سے ہے اور پچھلی انسانی تاریخ میں بھی جتنی قومیں مبتلائے فساد ہوئی ہیں، وہ سب بھی مشرک ہی تھیں۔

خاتمۂ کلام پر تمثیل کے پیرایے میں لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مُردہ پڑی ہوئی زمین خدا کی بھیجی ہوئی بارش سے یکایک جی اُٹھتی ہے اور زندگی و بہار کے خزانے اُگلنے شروع کر دیتی ہے، اسی طرح خدا کی بھیجی ہوئی وحی و نبوت بھی مُردہ پڑی ہوئی انسانیت کے حق میں ایک بارانِ رحمت ہے، جس کا نُزول اس کے لیے زندگی اور نَشوونما اور خیر و فلاح کا موجب ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤ گے تو یہی عرب کی سُونی زمین رحمتِ الٰہی سے لہلہا اُٹھے گی اور ساری بھلائی تمھارے اپنے لیے ہی ہوگی۔ اس سے فائدہ نہ اُٹھاؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، پھر پچھتانے کا کچھ حاصل نہ ہوگا اور تلافی کا کوئی موقع تمھیں میسّر نہ آئے گا۔

Maktaba-Tul-Ishaat.com

آیاتہا ۶۰ سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝١ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝٢ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ
سَيَغْلِبُوْنَ ۝٣ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ

ا۔ل۔م۔ رُومی قریب کی سرزمین میں مغلُوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔[1] اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور

۱ – ابنِ عباسؓ اور دوسرے صحابہؓ و تابعینؒ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم و ایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفارِ مکّہ کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیت اور مسیحیت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد خُسرَو پرویز نے جو خط قیصرِ روم کو لکھا تھا، اس میں صاف طور پر وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اُصولی اعتبار سے مجوسیوں کا مذہب مشرکینِ مکّہ کے مذہب سے مِلتا جُلتا تھا، کیونکہ وہ بھی توحید کے منکر تھے، دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے مشرکین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے مقابلے میں مسیحی خواہ کتنے ہی مبتلائے شرک ہو گئے ہوں، مگر وہ خدا کی توحید کو اصلِ دین مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، اور وحی و رسالت کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا دین اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین سے مشابہت رکھتا تھا، اور اسی لیے مسلمان قدرتی طور پر ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان پر مشرک قوم کا غلبہ انھیں ناگوار تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی آمد سے پہلے جو لوگ سابق نبی کو مانتے ہوں، وہ اُصولاً مسلمان ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک بعد کے آنے والے نبی کی دعوت انھیں نہ پہنچے اور وہ اس کا انکار نہ کر دیں، ان کا شمار مسلمانوں ہی میں رہتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ قصص، حاشیہ ۷۳) اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر صرف پانچ چھ برس ہی گزرے تھے، اور حضورؐ کی دعوت ابھی تک باہر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مسلمان عیسائیوں کا شمار کافروں میں نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہودی ان کی نگاہ میں کافر تھے، کیونکہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر چکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آغازِ اسلام میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہی کا برتاؤ ہُوا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص، آیات ۵۲ تا ۵۵ اور سورۂ مائدہ، آیات ۸۲ تا ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ کھلے دل سے

بَعۡدُ ؕ وَ يَوۡمَئِذٍ يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۴ لا بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ يَنۡصُرُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ
وَ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝۵ لا وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ وَلٰكِنَّ
اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۶ يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖۚ
وَ هُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝۷ اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قف
مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ

بعد میں بھی[۲]۔ اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے[۳]۔ اللہ نُصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

لوگ دُنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں[۴]۔ کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا[۵]؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں، برحق اور ایک مقرّر مدّت ہی کے لیے

دعوتِ حق کو قبول کر رہے تھے۔ پھر ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جس طرح حبش کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی واپسی کے لیے کفارِ مکّہ کے مطالبے کو ٹھکرا دیا، اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ مسلمان مجوسیوں کے مقابلے میں عیسائیوں کے خیر خواہ ہوں۔

۲ - یعنی پہلے جب ایرانی غالب آئے تو اس بنا پر نہیں کہ معاذ اللہ! خداوندِ عالَم ان کے مقابلے میں شکست کھا گیا، اور بعد میں جب رومی فتحیاب ہوں گے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا کھویا ہُوا ملک مل جائے گا۔ فرمانروائی تو ہر حال میں اللہ ہی کی ہے۔ پہلے جسے فتح نصیب ہوئی اسے بھی اللہ ہی نے فتح دی، اور بعد میں جو فتح پائے گا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے پائے گا۔ اس کی خدائی میں کوئی اپنے زور سے غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ جسے وہ اُٹھاتا ہے وہی اُٹھتا ہے، اور جسے وہ گراتا ہے وہی گرتا ہے۔

۳ - ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، سفیان ثوریؒ، سُدّیؒ وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی فتح اور جنگِ بدر میں مشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا، اس لیے مسلمانوں کو دُہری خوشی حاصل ہوئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یہی بات ایران اور روم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ ۶۲۴ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگِ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصرِ روم نے زَرتُشت کا مَولِد تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدے کو مسمار کر دیا۔

۴- یعنی اگرچہ آخرت پر دلالت کرنے والے آثار و شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس سے غفلت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن یہ لوگ اس سے خود ہی غفلت برت رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے کہ دنیوی زندگی کے اس ظاہری پردے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے ہیں اور اس کے پیچھے جو کچھ آنے والا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں، ورنہ خدا کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔

۵- یہ آخرت پر بجائے خود ایک مستقل اِستِدلال ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر یہ لوگ باہر کسی طرف نگاہ دَوڑانے سے پہلے خود اپنے وجود پر غور کرتے تو انھیں اپنے اندر ہی وہ دلائل مل جاتے جو موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کی ضرورت ثابت کرتے ہیں۔ انسان کی تین امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو زمین کی دوسری موجودات سے مُمیّز کرتی ہیں:

ایک یہ کہ زمین اور اس کے ماحول کی بے شمار چیزیں اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور ان پر تصرف کے وسیع اختیارات اس کو بخش دیے گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اِسے اپنی راہِ زندگی کے انتخاب میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایمان اور کفر، طاعت اور مَعصِیَت، نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر بھی جانا چاہے جا سکتا ہے۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط، جس طریقے کو بھی اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ہر راستے پر چلنے کے لیے اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور اس پر چلنے میں وہ خدا کے فراہم کردہ ذرائع استعمال کر سکتا ہے، خواہ وہ خدا کی اطاعت کا راستہ ہو یا اس کی نافرمانی کا راستہ۔

تیسرے یہ کہ اس میں پیدائشی طور پر اَخلاق کی حِس رکھ دی گئی ہے جس کی بنا پر وہ اختیاری اعمال اور غیر اختیاری اعمال میں فرق کرتا ہے، اختیاری اعمال پر نیکی اور بدی کا حکم لگاتا ہے، اور بداہتاً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اچھا عمل جزا کا اور بُرا عمل سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔

یہ تینوں خصوصیتیں، جو انسان کے اپنے وجود میں پائی جاتی ہیں، اِس بات کی نشان دِہی کرتی ہیں کہ کوئی وقت ایسا ہونا چاہیے جب انسان سے محاسبہ کیا جائے۔ جب اس سے پوچھا جائے کہ جو کچھ دنیا میں اس کو دیا گیا تھا، اس پر تَصَرُّف کے اختیارات کو اس نے کس طرح استعمال کیا؟ جب یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آزادیِ انتخاب کو استعمال کر کے صحیح راستہ اختیار کیا یا غلط؟ جب اس کے اختیاری اعمال کی جانچ کی جائے اور نیک عمل پر جزا اور بُرے عمل پر سزا دی جائے۔ یہ وقت لامحالہ انسان کا کارنامۂ زندگی ختم اور اس کا دفترِ عمل بند ہونے کے بعد ہی آ سکتا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ اور یہ وقت لازماً اسی وقت آنا چاہیے جب کہ ایک فرد یا ایک قوم کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا دفترِ عمل بند ہو۔ کیونکہ ایک فرد یا ایک قوم کے مر جانے پر اُن اثرات کا سلسلہ ختم

وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۸

پیدا کیا ہے۔[۶] مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں[۷]۔

نہیں ہو جاتا جو اس نے اپنے اعمال کی بدولت دنیا میں چھوڑے ہیں۔ اُس کے چھوڑے ہوئے اچھے یا بُرے اثرات بھی تو اس کے حساب میں شمار ہونے چاہییں۔ یہ اثرات جب تک مکمل طور پر ظاہر نہ ہو لیں، انصاف کے مطابق پورا محاسبہ کرنا اور پوری جزا یا سزا دینا کیسے ممکن ہے؟ اس طرح انسان کا اپنا وجود اس بات کی شہادت دیتا ہے، اور زمین میں انسان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ آپ سے آپ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ایسی ہو جس میں عدالت قائم ہو، انصاف کے ساتھ انسان کے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اور ہر شخص کو اس کے کام کے لحاظ سے جزا دی جائے۔

۶ – اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنیٰ ہوں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے، جس کا ایک ایک ذرّہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے، جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدّن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم وفنون خود اس بات پر گواہ ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے۔ ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر ایک پُتلے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدّن کا تصوُّر تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمھاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اِس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجے کی ذہنی وجسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادیِ انتخاب دے کر، اَخلاق کی حِس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمھارے حوالے کیا ہے، اس نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب، اور نیکی و بدی، اور ظلم و عدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمھارے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیا پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمھارے مرتے ہی یہ سارا دفترِ عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا بُرد کر دیا جائے گا؟

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں

Maktaba Tul Ishaat.com

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ

اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِنھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟[8] وہ اِن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، اُنھوں نے زمین کو خوب اُدھیڑا تھا

کسی چیز کے لیے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انھیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنس دانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو اَزَلی و اَبَدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالَم کے حدوث وقِدَم کی اُس بحث میں، جو ایک مدّتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادّہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیّل پر تھا کہ مادّہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیُّر کے بعد مادّہ مادّہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی وبیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالَمِ مادّی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (atomic energy) کے انکشاف نے اس پورے تخیّل کی بِساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادّہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیُولا۔ اب حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo-Dynamics) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالَمِ مادّی نہ اَزَلی ہو سکتا ہے نہ اَبَدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اُٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟

۷ – یعنی اس بات کے منکر کہ انھیں مرنے کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

۸ – یہ آخرت کے حق میں تاریخی اِستدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار دنیا میں دو چار آدمیوں ہی نے تو نہیں کیا ہے۔ انسانی تاریخ کے دوران میں کثیر التعداد انسان اس مرض میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ پوری پوری قومیں ایسی گزری ہیں جنھوں نے یا تو اس کا انکار کیا ہے، یا اس سے غافل ہو کر رہی ہیں، یا حیات بعد الموت کے متعلّق ایسے غلط عقیدے ایجاد کر لیے ہیں جن سے آخرت کا عقیدہ بے معنٰی ہو کر رہ جاتا ہے۔

وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ
فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ۹

تھا اور اُسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انھوں نے نہیں کیا ہے۔[۹][۱۰] اُن کے پاس ان کے رسولؐ روشن نشانیاں لے کر آئے۔[۱۱] پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کر رہے تھے۔[۱۲]

پھر تاریخ کا مسلسل تجرِبہ یہ بتاتا ہے کہ انکارِ آخرت جس صورت میں بھی کیا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اَخلاق بگڑے، وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر شُترِ بے مہار بن گئے، انھوں نے ظلم و فساد اور فِسق و فُجور کی حد کر دی، اور اسی چیز کی بدولت قوموں پر قومیں تباہ ہوتی چلی گئیں۔ کیا ہزاروں سال کی تاریخ کا یہ تجرِبہ، جو پے در پے انسانی نسلوں کو پیش آتا رہا ہے، یہ ثابت نہیں کرتا کہ آخرت ایک حقیقت ہے جس کا انکار انسان کے لیے تباہ کُن ہے؟ انسان کششِ ثِقل کا اسی لیے تو قائل ہوا ہے کہ تجرِبے اور مُشاہَدے سے اس نے مادّی اشیا کو ہمیشہ زمین کی طرف گرتے دیکھا ہے۔ انسان نے زہر کو زہر اسی لیے تو مانا ہے کہ جس نے بھی زہر کھایا وہ ہلاک ہوا۔ اسی طرح جب آخرت کا انکار ہمیشہ انسان کے لیے اَخلاقی بگاڑ کا موجب ثابت ہوا ہے تو کیا یہ تجرِبہ یہ سبق دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ آخرت ایک حقیقت ہے اور اس کو نظر انداز کر کے دنیا میں زندگی بسر کرنا غلط ہے؟

۹- اصل میں لفظ اَثَارُوا الْاَرْضَ استعمال ہوا ہے۔ اس کا اطلاق زراعت کے لیے ہل چلانے پر بھی ہو سکتا ہے اور زمین کھود کر زیرِ زمین پانی، نہریں، کاریزیں اور معدنیات وغیرہ نکالنے پر بھی۔

۱۰- اس میں اُن لوگوں کے اِستِدلال کا جواب موجود ہے جو محض مادّی ترقی کو کسی قوم کے صالح ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے زمین کے ذرائع کو اتنے بڑے پیمانے پر استعمال (exploit) کیا ہے، جنھوں نے دنیا میں عظیم الشان تعمیری کام کیے ہیں اور ایک شان دار تمدُّن کو جنم دیا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنّم کا ایندھن بنا دے۔ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ ''تعمیری کام'' پہلے بھی بہت سی قوموں نے بڑے پیمانے پر کیے ہیں، پھر کیا تمھاری آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ قومیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدُّن سمیت پیوندِ خاک ہو گئیں اور ان کی ''تعمیر'' کا قصرِ فلک بوس زمین پر آ رہا؟ جس خدا کے قانون نے یہاں عقیدۂ حق اور اَخلاقِ صالحہ کے بغیر محض مادّی تعمیر کی یہ قدر کی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اسی خدا کا قانون دوسرے جہان میں انھیں واصلِ بجہنّم نہ کرے؟

۱۱- یعنی ایسی نشانیاں لے کر آئے جو ان کے نبیِ صادق ہونے کا یقین دلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس سیاق و سباق میں انبیاؑ کی آمد کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف انسان کے اپنے وجود میں، اور اس سے باہر ساری کائنات کے نظام میں، اور انسانی تاریخ کے مسلسل تجرِبے میں آخرت کی شہادتیں موجود تھیں، اور دوسری

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

ع

آخر کار جن لوگوں نے بُرائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت بُرا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اُڑاتے تھے[12]ع

اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اِعادہ کرے گا[13]، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔ اور جب وہ ساعت[14] برپا ہو گی اس دن مجرم ہَک دَک رہ جائیں گے[15]،

طرف پے در پے ایسے انبیاؑ بھی آئے جن کے ساتھ ان کی نبوت کے برحق ہونے کی کھلی کھلی علامتیں پائی جاتی تھیں، اور انھوں نے انسانوں کو خبردار کیا کہ فی الواقع آخرت آنے والی ہے۔

۱۲ – یعنی اس کے بعد جو تباہی ان قوموں پر آئی وہ ان پر خدا کا ظلم نہ تھا بلکہ وہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انھوں نے اپنے اُوپر کیا۔ جو شخص یا گروہ نہ خود صحیح سوچے اور نہ کسی سمجھانے والے کے سمجھانے سے صحیح رَوِیّہ اختیار کرے، اس پر اگر تباہی آتی ہے تو وہ آپ ہی اپنے بُرے انجام کا ذمہ دار ہے۔ خدا پر اس کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ خدا نے تو اپنی کتابوں اور اپنے انبیاؑ کے ذریعے سے انسان کو حقیقت کا علم دینے کا انتظام بھی کیا ہے، اور وہ علمی و عقلی وسائل بھی عطا کیے ہیں جن سے کام لے کر وہ ہر وقت انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی کے دیے ہوئے علم کی صحت جانچ سکتا ہے۔ اِس رہنمائی اور ان ذرائع سے اگر خدا نے انسان کو محروم رکھا ہوتا اور اس حالت میں انسان کو غلط روی کے نتائج سے دو چار ہونا پڑتا تب بلاشبہ خدا پر ظلم کے الزام کی گنجایش نکل سکتی تھی۔

۱۳ – یہ بات اگرچہ دعوے کے انداز میں بیان فرمائی گئی ہے مگر اس میں خود دلیلِ دعویٰ بھی موجود ہے۔ صریح عقل اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ جس کے لیے خلق کی ابتدا کرنا ممکن ہو، اس کے لیے اسی خلق کا اعادہ کرنا بدرجۂ اَولیٰ ممکن ہے۔ خلق کی ابتدا تو ایک امرِ واقعہ ہے جو سب کے سامنے موجود ہے، اور کفار و مشرکین بھی مانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے۔ اس کے بعد ان کا یہ خیال کرنا سراسر نامعقول بات ہے کہ وہی خدا جس نے اس خلق کی ابتدا کی ہے، اس کا اعادہ نہیں کر سکتا۔

۱۴ – یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے اور اس کے حُضور پیش ہونے کی ساعت۔

۱۵ – اصل میں لفظ اِبْلَاس استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنٰی ہیں: سخت مایوسی اور صدمے کی بنا پر

وَ لَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ مِّنۡ شُرَكَآئِهِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ

ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا[۱۶] اور وہ اپنے شریکوں کے

کسی شخص کا گُم سُم ہو جانا، اُمید کے سارے راستے بند پا کر حیران و ششدر رہ جانا، کوئی حجت نہ پا کر دم بخود رہ جانا۔ یہ لفظ جب مجرم کے لیے استعمال کیا جائے تو ذہن کے سامنے اس کی یہ تصویر آتی ہے کہ ایک شخص عین حالتِ جُرم میں بھرے ہاتھوں (red-handed) پکڑا گیا ہے، نہ فرار کی کوئی راہ پاتا ہے، نہ اپنی صفائی میں کوئی چیز پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتا ہے، اس لیے زبان اس کی بند ہے اور وہ انتہائی مایوسی و دل شکستگی کی حالت میں حیران و پریشان کھڑا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں مجرمین سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے دنیا میں قتل، چوری، ڈاکے اور اسی طرح کے دوسرے جرائم کیے ہیں، بلکہ وہ سب لوگ مراد ہیں جنھوں نے خدا سے بغاوت کی ہے، اس کے رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، آخرت کی جواب دہی کے منکر یا اس سے بے فکر رہے ہیں، اور دنیا میں خدا کے بجائے دوسروں کی یا اپنے نفس کی بندگی کرتے رہے ہیں، خواہ اس بنیادی گمراہی کے ساتھ انھوں نے وہ افعال کیے ہوں یا نہ کیے ہوں جنھیں عرفِ عام میں جرائم کہا جاتا ہے۔ مزید برآں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے خدا کو مان کر، اس کے رسولوں پر ایمان لا کر، آخرت کا اقرار کر کے پھر دانستہ اپنے رب کی نافرمانیاں کی ہیں اور آخر وقت تک اپنی اس باغیانہ رَوِش پر ڈٹے رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی توقعات کے بالکل خلاف عالَمِ آخرت میں یکایک جی اُٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ یہاں تو واقعی وہ دوسری زندگی پیش آ گئی ہے جس کا انکار کر کے، یا جسے نظر انداز کر کے وہ دنیا میں کام کرتے رہے تھے، تو ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے اور وہ کیفیت ان پر طاری ہوگی جس کا نقشہ یُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

۱۶ – شُرکا کا اطلاق تین قسم کی ہستیوں پر ہوتا ہے: ایک ملائکہ، انبیاؑ، اولیا، اور شہدا و صالحین جن کو مختلف زمانوں میں مشرکین نے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے کر ان کے آگے مراسمِ عبودیت انجام دیے ہیں۔ وہ قیامت کے روز صاف کہہ دیں گے کہ تم یہ سب کچھ ہماری مرضی کے بغیر، بلکہ ہماری تعلیم و ہدایت کے سراسر خلاف کرتے رہے ہو، اس لیے ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں، ہم سے کوئی اُمید نہ رکھو کہ ہم تمھاری شفاعت کے لیے خدائے بزرگ کے سامنے کچھ عرض معروض کریں گے۔ دوسری قسم اُن اشیا کی ہے جو بے شعور یا بے جان ہیں، جیسے چاند، سورج، سیارے، درخت، پتھر اور حیوانات وغیرہ۔ مشرکین نے ان کو خدا بنایا اور ان کی پرستش کی اور ان سے دعائیں مانگیں، مگر وہ بے چارے بے خبر ہیں کہ اللہ میاں کے خلیفہ صاحب یہ ساری نیاز مندیاں ان کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بھی کوئی وہاں ان کی شفاعت کے لیے آگے بڑھنے والا نہ ہوگا۔ تیسری قسم اُن اکابر مجرمین کی ہے جنھوں نے خود کوشش کر کے، مکر و فریب سے کام لے کر، جھوٹ کے جال پھیلا کر، یا

Maktaba Tul Ishaat.com

كٰفِرِيْنَ ۝١٣ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝١٤ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝١٥ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ

منکر ہو جائیں گے۔[17] جس روز وہ ساعت برپا ہوگی، اس دن (سب انسان) الگ الگ گروہوں میں بٹ جائیں[18] گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ ایک باغ میں[19] شاداں وفرحاں رکھے جائیں گے۔[20] اور جنھوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے[21] وہ عذاب میں حاضر

طاقت استعمال کر کے دنیا میں خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائی، مثلاً شیطان، جھوٹے مذہبی پیشوا، اور ظالم و جابر حکمراں وغیرہ۔ یہ وہاں خود گرفتارِ بلا ہوں گے، اپنے اِن بندوں کی سِفارش کے لیے آگے بڑھنا تو درکنار، اُن کی تو اُلٹی کوشش یہ ہوگی کہ اپنے نامۂ اعمال کا بوجھ ہلکا کریں اور داورِ محشر کے حضور یہ ثابت کر دیں کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے خود ذمہ دار ہیں، ان کی گمراہی کا وبال ہم پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس طرح مشرکین کو وہاں کسی طرف سے بھی کوئی شَفاعت بہم نہ پہنچے گی۔

۱۷- یعنی اُس وقت یہ مشرکین خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ ہم ان کو خدا کا شریک ٹھیرانے میں غَلَطی پر تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ فی الواقع ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اس لیے جس شرک پر آج وہ دنیا میں اصرار کر رہے ہیں، اسی کا وہ آخرت میں انکار کریں گے۔

۱۸- یعنی دنیا کی وہ تمام جتھ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری، اور مَعاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اَخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے، اور ایک ایک قسم کے جرائم پیشہ لوگ اس عظیم الشان انسانی بِھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اِس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔

اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ اور اَخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک اُمّت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں، اور کفر وفسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری اُمّت ہیں، خواہ ان کا تعلّق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیّت ایک نہیں ہوسکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہوسکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک ان کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جاہلیّت کے پرستار اس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسی بات پر مُصِر ہیں کہ جتھ بندی نسل اور وطن اور زبان کی بنیادوں پر ہونی چاہیے، ان بنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں، انھیں بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اس قومیّت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیّل ابوجہل اور ابولہب اور سردارانِ قریش کا تھا، جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اِس شخص نے آ کر ہماری قوم میں تَفرِقہ ڈال دیا ہے۔ اسی پر قرآن مجید یہاں مُتنبِّہ کر رہا ہے کہ تمھاری یہ تمام جتھ بندیاں جو تم نے اس دنیا میں غلط بنیادوں پر کر رکھی ہیں، آخر کار ٹوٹ جانے والی ہیں، اور نوعِ انسانی میں مستقل تفریق اُسی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اَخلاق و کردار کی بنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دنیا کی اِس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے، ان کی راہِ زندگی آخر کیسے ایک ہوسکتی ہے؟

۱۹ – ''ایک باغ'' کا لفظ یہاں اُس باغ کی عظمت وشان کا تصوّر دلانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان کی طرح اُردو میں بھی یہ اندازِ بیان اس غرض کے لیے معروف ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی کو ایک بڑا اہم کام کرنے کو کہے اور اس کے ساتھ یہ کہے کہ تم نے یہ کام اگر کر دیا تو میں تمھیں ''ایک چیز'' دوں گا، تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ چیز عدد کے لحاظ سے ایک ہوگی، بلکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے انعام میں تم کو ایک بڑی قیمتی چیز دوں گا جسے پا کر تم نہال ہو جاؤ گے۔

۲۰ – اصل میں لفظ یُحۡبَرُوۡنَ استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں مَسَرّت، لذّت، شان وشوکت اور تکریم کے تصوّرات شامل ہیں۔ یعنی وہاں بڑی عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے، خوش وخرم رہیں گے اور ہر طرح کی لذّتوں سے شاد کام ہوں گے۔

۲۱ – یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایمان کے ساتھ تو عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں وہ شان دار انجام نصیب ہوگا، لیکن کفر کا انجام بد بیان کرتے ہوئے عملِ بد کا کوئی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفر بجائے خود آدمی کے انجام کو خراب کر دینے کے لیے کافی ہے، خواہ عمل کی خرابی اس کے ساتھ شامل ہو یا نہ ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ
لَهُ الۡحَمۡدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِيًّا وَّحِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

رکھے جائیں گے۔

پس[۲۲] تسبیح کرو اللہ کی[۲۳] جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیے حمد ہے۔ اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جب کہ تم پر ظُہر کا وقت آتا ہے۔[۲۴]

۲۲- یہ ’’پس‘‘ اس معنیٰ میں ہے کہ جب تمھیں یہ معلوم ہوگیا کہ ایمان و عملِ صالح کا انجام وہ کچھ، اور کفر و تکذیب کا انجام یہ کچھ ہے تو تمھیں یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ نیز یہ ’’پس‘‘ اس معنیٰ میں بھی ہے کہ مشرکین و کفار حیاتِ اُخروی کو ناممکن قرار دے کر اللہ تعالیٰ کو دراصل عاجز و درماندہ قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کے مقابلے میں اللہ کی تسبیح کرو اور اِس کمزوری سے اُس کے پاک ہونے کا اعلان کرو۔ اس ارشاد کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے تمام اہلِ ایمان ہیں۔

۲۳- اللہ کی تسبیح کرنے سے مراد اُن تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے، جو مشرکین اپنے شرک اور انکارِ آخرت سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس ذاتِ بے ہمتا کے پاک اور مُنَزَّہ ہونے کا اعلان و اظہار کرنا ہے۔ اِس اعلان و اظہار کی بہترین صورت نماز ہے۔ اِسی بنا پر ابنِ عباسؓ، مجاہد، قَتادَہ، ابنِ زید اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں تسبیح کرنے سے مراد نماز پڑھنا ہے۔ اس تفسیر کے حق میں یہ صریح قرینہ خود اس آیت میں موجود ہے کہ اللہ کی پاکی بیان کرنے کے لیے اِس میں چند خاص اوقات مقرر کیے گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر محض یہ عقیدہ رکھنا مقصود ہو کہ اللہ تمام عُیوب و نقائص سے مُنَزَّہ ہے، تو اس کے لیے صبح و شام اور ظہر و عصر کے اوقات کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عقیدہ تو مسلمان کو ہر وقت رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر محض زبان سے اللہ کی پاکی کا اظہار مقصود ہو، تب بھی اِن اوقات کی تخصیص کے کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ یہ اظہار تو مسلمان کو ہر موقع پر کرنا چاہیے۔ اس لیے اوقات کی پابندی کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم لامحالہ اُس کی ایک خاص عملی صورت ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ عملی صورت نماز کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

۲۴- اس آیت میں نماز کے چار اوقات کی طرف صاف اشارہ ہے: فجر، مغرب، عصر اور ظہر۔ اس کے علاوہ مزید اشارات جو قرآنِ مجید میں اوقاتِ نماز کی طرف کیے گئے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (بنی اسرائیل، آیت ۷۸)	نماز قائم کرو آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کی تاریکی تک، اور فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا اہتمام کرو۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (ہود، آیت ۱۱۴)	اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ، آیت ۱۳۰)	اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے، اور رات کی کچھ گھڑیوں میں پھر تسبیح کرو، اور دن کے کناروں پر۔

ان میں سے پہلی آیت بتاتی ہے کہ نماز کے اوقات زوالِ آفتاب کے بعد سے عشا تک ہیں، اور اس کے بعد پھر فجر کا وقت ہے۔ دوسری آیت میں دن کے دونوں سروں سے مراد صبح اور مغرب کے اوقات ہیں، اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشا کا وقت۔ تیسری آیت میں قبلِ طُلوعِ آفتاب سے مراد فجر، اور قبلِ غروب سے مراد عصر ہے۔ رات کی گھڑیوں میں مغرب اور عشا دونوں شامل ہیں۔ اور دن کے کنارے تین ہیں: ایک صبح، دوسرے زوالِ آفتاب، تیسرے مغرب۔ اس طرح قرآنِ مجید مختلف مقامات پر نماز کے اُن پانچوں اوقات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر آج دنیا بھر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض ان آیات کو پڑھ کر کوئی شخص بھی اوقاتِ نماز متعین نہ کرسکتا تھا جب تک کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلّمِ قرآن، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے قول اور عمل سے ان کی طرف رہنمائی نہ فرماتے۔

یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھیر کر منکرینِ حدیث کی اِس جسارت پر غور کیجیے کہ وہ "نماز پڑھنے" کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں، یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ "نظامِ رُبوبیّت" قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کون سا نرالا نظامِ رُبوبیّت ہے جسے یا تو طلوعِ آفتاب سے پہلے قائم کیا جاسکتا ہے یا پھر زوالِ آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کون سا نظامِ رُبوبیّت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ)۔ اور نظامِ رُبوبیّت کی آخر وہ کون سی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ، اور کہنیوں تک ہاتھ، اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لے، اور سر پر مسح کر لے، ورنہ وہ اسے قائم نہیں کرسکتا؟ (اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ)۔ اور نظامِ رُبوبیّت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جَنابت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کرلے، اسے قائم نہیں کرسکتا؟ (لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ ...... وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا)۔ اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب وغریب نظامِ رُبوبیّت کو قائم کرنے کے لیے اسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منہ پر ملنا ہوگا؟ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ)۔ اور یہ کیسا عجیب نظامِ رُبوبیّت ہے کہ اگر سفر پیش آجائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے

Maktaba Tul Ishaat.com

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ ع وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ
اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

وہ زندہ میں سے مُردے کو نکالتا ہے اور مُردے میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔[۲۵] اسی طرح تم لوگ بھی (حالتِ موت سے) نکال لیے جاؤ گے ع

اُس[۲۶] کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بَشَر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔[۲۷]

کے بجائے آدھا ہی قائم کر لے؟ (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ)۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے "نظامِ رُبوبیّت" قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں، اس کے بعد جب پہلا گروہ امام کے پیچھے "نظامِ رُبوبیت" قائم کرتے ہوئے ایک سجدہ کر لے تو وہ اُٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جائے، اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آ کر امام کے پیچھے اس "نظامِ رُبوبیّت" کو قائم کرنا شروع کر دے۔ (وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۚ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ)۔ قرآنِ مجید کی یہ ساری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں، لیکن منکرینِ حدیث ہیں کہ خود بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بالکل ہی بے باک نہ ہو جائے، وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کر سکتا جو یہ حضرات کر رہے ہیں۔ یا پھر قرآن کے ساتھ یہ کھیل وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو اور محض دھوکا دینے کے لیے قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ (اس سلسلے میں آگے حاشیہ ۵۰ بھی مُلاحظہ ہو)۔

۲۵ - یعنی جو خدا ہر آن تمھاری آنکھوں کے سامنے یہ کام کر رہا ہے، وہ آخر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے سے عاجز کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ہر وقت زندہ انسانوں اور حیوانات میں سے فُضلات (waste matter) خارج کر رہا ہے جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحہ بے جان مادّے (dead matter)

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں[۲۸] تاکہ تم ان کے پاس سُکون حاصل کرو[۲۹] اور تمھارے درمیان محبّت اور رحمت پیدا کر دی۔[۳۰] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

کے اندر زندگی کی رُوح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے، حالاں کہ بجائے خود اُن مادّوں میں، جن سے اِن زندہ ہستیوں کے جسم مرکّب ہوتے ہیں، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن یہ منظر تمھیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسر آیا اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی زندگی کے خزانے اُگلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مرجانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں۔

۲۶ — خبردار رہنا چاہیے کہ یہاں سے رکوع کے خاتمے تک اللہ تعالیٰ کی جو نشانیاں بیان کی جا رہی ہیں، وہ ایک طرف تو اُوپر کے سلسلۂ کلام کی مناسبت سے حیاتِ اُخروی کے امکان و وقوع پر دلالت کرتی ہیں، اور دوسری طرف یہی نشانیاں اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ صرف ایک خدا اس کا تنہا خالق، مدبّر، مالک اور فرماں روا ہے جس کے سوا انسانوں کا کوئی معبود نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ رُکوع اپنے مضمون کے لحاظ سے تقریرِ ماسبق اور تقریرِ مابعد، دونوں کے ساتھ مربوط ہے۔

۲۷ — یعنی انسان کا مایۂ تخلیق اِس کے سوا کیا ہے کہ چند بے جان مادّے ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کچھ کاربن، کچھ کیلشیم، کچھ سوڈیم، اور ایسے ہی چند اور عناصر۔ انھی کو ترکیب دے کر وہ حیرت انگیز ہستی بنا کھڑی کی گئی ہے جس کا نام انسان ہے اور اس کے اندر احساسات، جذبات، شعور، تعقّل اور تخیّل کی وہ عجیب قوتیں پیدا کر دی گئی ہیں جن میں سے کسی کا منبع بھی اس کے عناصرِ ترکیبی میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہی نہیں کہ ایک انسان اتفاقاً ایسا بن کھڑا ہوا ہو، بلکہ اس کے اندر وہ عجیب تولیدی قوت بھی پیدا کر دی گئی جس کی بدولت کروڑوں اور اربوں انسان وہی ساخت اور وہی صلاحیتیں لیے ہوئے بے شمار موروثی اور بے حد و حساب انفرادی خصوصیات کے حامل نکلتے چلے آرہے ہیں۔ کیا تمھاری عقل یہ گواہی دیتی ہے کہ یہ انتہائی حکیمانہ خلقت کسی صانع حکیم کی تخلیق کے بغیر آپ سے آپ ہو گئی ہے؟ کیا تم بحالتِ ہوش و حواس یہ کہہ سکتے ہو کہ تخلیقِ انسان جیسا

Maktaba Tul Ishaat.com

عظیم الشان منصوبہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اور زمین و آسمان کی بے حد و حساب قوتوں کو انسانی زندگی کے لیے سازگار کر دینا بہت سے خداؤں کی فکر و تدبیر کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا تمھارا دماغ اپنی صحیح حالت میں ہوتا ہے جب تم یہ گمان کرتے ہو کہ جو خدا انسان کو خالص عَدَم سے وجود میں لایا ہے، وہ اسی انسان کو موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟

۲۸ - یعنی خالق کا کمال حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صِنف نہیں بنائی، بلکہ اسے دو صنفوں (sexes) کی شکل میں پیدا کیا، جو انسانیت میں یکساں ہیں، جن کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا بھی یکساں ہے، مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت، مختلف ذہنی و نفسی اوصاف، اور مختلف جذبات و داعیات لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہے، ہر ایک کا جسم اور اس کے نفسیات و داعیات دوسرے کے جسمانی و نفسیاتی تقاضوں کا مکمل جواب ہیں۔ مزید برآں وہ خالقِ حکیم اِن دونوں صنفوں کے افراد کو آغازِ آفرینش سے برابر اِس تناسُب کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کی کسی قوم یا کسی خطۂ زمین میں صرف لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے ہوں، یا کہیں کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس میں کسی انسانی تدبیر کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان ذرہ برابر بھی نہ اِس معاملے میں اثر انداز ہوسکتا ہے کہ لڑکیاں مسلسل ایسی زنانہ خصوصیات اور لڑکے مسلسل ایسی مردانہ خُصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے رہیں جو ایک دوسرے کا ٹھیک جوڑ ہوں، اور نہ اِس معاملے ہی میں اس کے پاس اثر انداز ہونے کا کوئی ذریعہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدایش اس طرح مسلسل ایک تناسب کے ساتھ ہوتی چلی جائے۔ ہزار ہا سال سے کروڑوں اور اربوں انسانوں کی پیدایش میں اس تدبیر و انتظام کا اتنے متناسب طریقے سے پیہم جاری رہنا اتفاقاً بھی نہیں ہوسکتا، اور یہ بہت سے خداؤں کی مشترک تدبیر کا نتیجہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ چیز صریحاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک خالقِ حکیم، اور ایک ہی خالقِ حکیم نے اپنی غالب حکمت و قدرت سے ابتداءً مرد اور عورت کا ایک موزوں ترین ڈیزائن بنایا، پھر اس بات کا انتظام کیا کہ اس ڈیزائن کے مطابق بے حد و حساب مرد اور بے حد و حساب عورتیں اپنی الگ الگ انفرادی خصوصیات لیے ہوئے دنیا بھر میں ایک تناسُب کے ساتھ پیدا ہوں۔

۲۹ - یعنی یہ انتظام اَلل ٹَپ نہیں ہوگیا ہے بلکہ بنانے والے نے بالارادہ اِس غَرض کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس، اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے، اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ہی سکون و اطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف انسانی نسل کے برقرار رہنے کا، اور دوسری طرف انسانی تہذیب و تمدُّن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جو اُن کے باہمی اتصال و وابستگی کے بغیر مُبدَّل بہ سُکون نہیں ہوسکتا، تو انسانی نسل تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح چل جاتی، لیکن

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش،[۳۱] اور تمھاری زبانوں اور

کسی تہذیب وتمدّن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام انواعِ حیوانی کے برعکس نوعِ انسانی میں تہذیب وتمدّن کے رُونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے وہ مانگ، وہ پیاس، وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سُکون میسّر نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جُڑ کر نہ رہیں۔ یہی سُکون کی طلب ہے جس نے انھیں مل کر گھر بنانے پر مجبُور کیا۔ اسی کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدّن کا نشوونما ہوا۔ اس نشوونما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوئی ہیں مگر وہ اس کی اصلی محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک یہی اضطراب ہے جسے مرد وعورت کے وجود میں ودیعت کر کے انھیں ”گھر“ کی تاسیس پر مجبور کر دیا گیا۔ کون صاحبِ عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہو گیا ہے؟ یا بہت سے خدا یہ انتظام کر سکتے تھے کہ اس گہرے حکیمانہ مقصد کو ملحوظ رکھ کر ہزارہا برس سے مسلسل بے شمار مَردوں اور بے شمار عورتوں کو یہ خاص اضطراب لیے ہوئے پیدا کرتے چلے جائیں؟ یہ تو ایک حکیم اور ایک ہی حکیم کی حکمت کا صریح نشان ہے جسے صرف عقل کے اندھے ہی دیکھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

۳۰۔ محبت سے مراد یہاں جنسی محبت (sexual love) ہے جو مرد اور عورت کے اندر جذب وکشش کی ابتدائی محرک بنتی ہے اور پھر انھیں ایک دوسرے سے چسپاں کیے رکھتی ہے۔ اور رحمت سے مراد وہ روحانی تعلق ہے جو ازدواجی زندگی میں بتدریج اُبھرتا ہے، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد وغم خوار اور شریکِ رنج و راحت بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب جنسی محبت پیچھے جا پڑتی ہے اور بڑھاپے میں یہ جیون ساتھی کچھ جوانی سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کے حق میں رحیم وشفیق ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دو مثبت طاقتیں ہیں جو خالق نے اُس ابتدائی اضطراب کی مدد کے لیے انسان کے اندر پیدا کی ہیں جس کا ذکر اُوپر گزرا ہے۔ وہ اضطراب تو صرف سکون چاہتا ہے اور اس کی تلاش میں مرد وعورت کو ایک دوسرے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ دو طاقتیں آگے بڑھ کر ان کے درمیان مستقل رفاقت کا ایسا رشتہ جوڑ دیتی ہیں جو دو الگ ماحولوں میں پرورش پائے ہوئے اجنبیوں کو ملا کر کچھ اس طرح پیوستہ کرتا ہے کہ عمر بھر وہ زندگی کے منجدھار میں اپنی کشتی ایک ساتھ کھینچتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت ورحمت جس کا تجربہ کروڑوں انسانوں کو اپنی زندگی میں ہو رہا ہے، کوئی مادّی چیز نہیں ہے جو وزن اور پیمائش میں آ سکے، نہ انسانی جسم کے عناصرِ ترکیبی میں کہیں اس کے سرچشمے کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، نہ کسی لیبارٹری میں اس کی پیدائش اور اس کے نشوونما کے اسباب کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ایک خالقِ حکیم نے بالارادہ ایک مقصد کے لیے پوری مناسبت کے ساتھ اسے نفسِ انسانی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔[۳۲] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔

میں ودیعت کر دیا ہے۔

۳۱- یعنی اُن کا عدَم سے وجود میں آنا، اور ایک اٹل ضابطے پر ان کا قائم ہونا، اور بے شمار قوتوں کا ان کے اندر انتہائی تناسُب و توازُن کے ساتھ کام کرنا، اپنے اندر اس بات کی بہت سی نشانیاں رکھتا ہے کہ اس پوری کائنات کو ایک خالق اور ایک ہی خالق وجود میں لایا ہے، اور وہی اس عظیم الشان نظام کی تدبیر کر رہا ہے۔ ایک طرف اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ وہ ابتدائی قوت (energy) کہاں سے آئی جس نے مادّے کی شکل اختیار کی، پھر مادّے کے یہ بہت سے عناصر کیسے بنے، پھر ان عناصر کی اس قدر حکیمانہ ترکیب سے اتنی حیرت انگیز مناسبتوں کے ساتھ یہ مدہوش کُن نظامِ عالَم کیسے بن گیا، اور اب یہ نظام کروڑ ہا کروڑ صدیوں سے کس طرح ایک زبردست قانونِ فطرت کی بندش میں کسا ہوا چل رہا ہے، تو ہر غیر متعصب عقل اس نتیجے پر پہنچے گی کہ یہ سب کچھ کسی علیم و حکیم کے غالب ارادے کے بغیر محض بخت و اتفاق کے نتیجے میں نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری طرف اگر یہ دیکھا جائے کہ زمین سے لے کر کائنات کے بعید ترین سیّاروں تک سب ایک ہی طرح کے عناصر سے مرکب ہیں اور ایک ہی قانونِ فطرت ان میں کارفرما ہے، تو ہر عقل جو ہٹ دھرم نہیں ہے، بلاشبہ یہ تسلیم کرے گی کہ یہ سب کچھ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا اِس پوری کائنات کا خالق اور رب ہے۔

۳۲- یعنی باوجودیکہ تمھارے قُوائے نُطقیہ یکساں ہیں، نہ منہ اور زبان کی ساخت میں کوئی فرق ہے اور نہ دماغ کی ساخت میں، مگر زمین کے مختلف خِطّوں میں تمھاری زبانیں مختلف ہیں، پھر ایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیاں مختلف ہیں، اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ اور تلفُّظ اور طرزِ گفتگو دوسرے سے مختلف ہے۔ اِسی طرح تمھارا مادّۂ تخلیق اور تمھاری بناوٹ کا فارمولا ایک ہی ہے، مگر تمھارے رنگ اس قدر مختلف ہیں کہ قوم اور قوم تو درکنار، ایک ماں باپ کے دو بیٹوں کا رنگ بھی بالکل یکساں نہیں ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف دو ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن اسی رُخ پر آگے بڑھ کر دیکھیے تو دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوّع (variety) پائیں گے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیا کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں، اس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتّٰی کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے، حتّٰی کہ ایک درخت کے دو پتّوں میں بھی پوری مُشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز صاف بتا رہی ہے کہ یہ دنیا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جس میں خودکار مشینیں چل رہی ہوں اور کثیر پیداآوری (mass production) کے طریقے پر ہر قسم کی اشیا کا بس ایک ایک ٹھپّا ہو جس سے ڈھل ڈھل کر ایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آ رہی ہوں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا زبردست کاریگر کام کر رہا ہے

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اُس کی نشانیوں میں سے تمھارا رات اور دن کو سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔[۳۳] یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (غور سے) سُنتے ہیں۔

جو ہر ہر چیز کو پوری انفرادی توجہ کے ساتھ ایک نئے ڈیزائن، نئے نقش ونگار، نئے تناسُب اور نئے اوصاف کے ساتھ بناتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کی قوتِ ایجاد ہر آن ہر چیز کا ایک نیا ماڈل نکال رہی ہے، اور اس کی صنّاعی ایک ڈیزائن کو دوسری مرتبہ دُہرانا اپنے کمال کی توہین سمجھتی ہے۔ اس حیرت انگیز منظر کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر دیکھے گا، وہ کبھی اس احمقانہ تصور میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک دفعہ اس کارخانے کو چلا کر کہیں جا سویا ہے۔ یہ تو اس بات کا کُھلا ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت کارِ تخلیق میں لگا ہوا ہے اور اپنی خِلق کی ایک ایک چیز پر انفرادی توجہ صَرف کر رہا ہے۔

۳۳- فضل کو تلاش کرنے سے مراد رزق کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ انسان اگرچہ بالعُموم رات کو سوتا اور دن کو اپنی مَعاش کے لیے جدّوجُہد کرتا ہے، لیکن یہ کُلِّیَّۃً نہیں ہے۔ بہت سے انسان دن کو بھی سوتے اور رات کو بھی معاش کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی لیے رات اور دن کا اکٹھا ذکر کر کے فرمایا کہ ان دونوں اوقات میں تم سوتے بھی ہو اور اپنی مَعاش کے لیے دوڑ دھوپ بھی کرتے ہو۔

یہ چیز بھی اُن نشانیوں میں سے ہے جو ایک خالقِ حکیم کی تدبیر کا پتا دیتی ہیں۔ بلکہ مزید برآں یہ چیز اس بات کی نشان دِہی بھی کرتی ہے کہ وہ محض خالق ہی نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر غایت درجے رحیم وشفیق اور اس کی ضروریات اور مصلحتوں کے لیے خود اُس سے بڑھ کر فکر کرنے والا ہے۔ انسان دنیا میں مسلسل محنت نہیں کر سکتا بلکہ ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹوں کے لیے آرام درکار ہوتا ہے، تاکہ پھر چند گھنٹے محنت کرنے کے لیے اسے قوت بہم پہنچ جائے۔ اس غرض کے لیے خالقِ حکیم ورحیم نے انسان کے اندر صرف تکان کا احساس، اور صرف آرام کی خواہش پیدا کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے "نیند" کا ایک ایسا زبردست داعیہ اس کے وجود میں رکھ دیا جو اس کے ارادے کے بغیر، حتّٰی کہ اس کی مزاحمت کے باوجود، خودبخود ہر چند گھنٹوں کی بیداری ومحنت کے بعد اسے آ دبوچتا ہے، چند گھنٹے آرام لینے پر اس کو مجبور کر دیتا ہے، اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد خودبخود اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس نیند کی ماہیت وکیفیت اور اس کے حقیقی اسباب کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۲۴

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔[۳۴] اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔[۳۵] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

آج تک انسان نہیں سمجھ سکا ہے۔ یہ قطعاً ایک پیدائشی چیز ہے جو آدمی کی فطرت اور اس کی ساخت میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کا ٹھیک انسان کی ضرورت کے مطابق ہونا ہی اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ کسی حکیم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق یہ تدبیر وضع کی ہے۔ اس میں ایک بڑی حکمت و مصلحت اور مقصدیت صاف طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ مزید برآں یہی نیند اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے یہ مجبُور کُن داعیہ انسان کے اندر رکھا ہے، وہ انسان کے حق میں خود اس سے بڑھ کر خیر خواہ ہے، ورنہ انسان بالارادہ نیند کی مزاحمت کر کے اور زبردستی جاگ جاگ کر اور مسلسل کام کر کر کے اپنی قوتِ کار کو ہی نہیں، قوتِ حیات تک کو ختم کر ڈالتا۔

پھر رزق کی تلاش کے لیے ” اللہ کے فضل کی تلاش“ کا لفظ استعمال کر کے نشانیوں کے ایک دوسرے سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آدمی آخر یہ رزق تلاش ہی کہاں کر سکتا تھا اگر زمین و آسمان کی بے حد و حساب طاقتوں کو رزق کے اسباب و ذرائع پیدا کرنے میں نہ لگا دیا گیا ہوتا، اور زمین میں انسان کے لیے رزق کے بے شمار ذرائع نہ پیدا کر دیے گئے ہوتے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ رزق کی یہ تلاش اور اس کا اکتساب اُس صورت میں بھی ممکن نہ ہوتا اگر انسان کو اِس کام کے لیے مناسب ترین اعضا اور مناسب ترین جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں نہ دی گئی ہوتیں۔ پس آدمی کے اندر تلاشِ رزق کی قابلیت، اور اُس کے وجود سے باہر وسائلِ رزق کی موجودگی، صاف صاف ایک ربِّ رحیم و کریم کے وجود کا پتا دیتی ہے۔ جو عقل بیمار نہ ہو وہ کبھی یہ فرض نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے، یا یہ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ ہے، یا کوئی بے درد اندھی قوت اِس فضل و کرم کی ذمّہ دار ہے۔

۳۴- یعنی اس کی گرج اور چمک سے اُمید بھی بندھتی ہے کہ بارش ہو گی اور فصلیں تیار ہوں گی، مگر ساتھ ہی خوف بھی لاحق ہوتا ہے کہ کہیں بجلی نہ گر پڑے، یا ایسی طوفانی بارش نہ ہو جائے جو سب کچھ بہا لے جائے۔

۳۵- یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشان دہی کرتی ہے، اور دوسری طرف یہی چیز اس امر

وَ مِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَ الۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمۡ دَعۡوَةً ٭ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ٭ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ﴿۲۵﴾

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔[۳۶] پھر جونہی کہ اُس نے تمھیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔[۳۷]

پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے، اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اُس پیداوار پر ہے جو زمین سے نکلتی ہے۔ اس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیتِ بارآوری پر ہے۔ اس صلاحیت کے روبکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہِ راست زمین پر برسے، یا اس کے ذخیرے سطحِ زمین پر جمع ہوں، یا زیرِ زمین چشموں اور کنووں کی شکل اختیار کریں، یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر اس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے ردّ و بدل پر، فضائی حرارت و برودت پر، ہواؤں کی گردش پر، اور اُس بجلی پر ہے جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی اِن تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر ان سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لیے صریحاً سازگار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک اِن کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل سازگاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی، حرارت، برودت، اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے؟

۳۶ — یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ اُس کے حکم سے ایک دفعہ وجود میں آ گئے ہیں، بلکہ ان کا مسلسل قائم رہنا اور ان کے اندر ایک عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا پیہم چلتے رہنا بھی اسی کے حکم کی بدولت ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اگر اس کا حکم انھیں برقرار نہ رکھے تو یہ سارا نظام یک لخت درہم برہم ہو جائے۔

۳۷ — یعنی کائنات کے خالق و مدبر کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اُٹھانا کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہے کہ اُسے اِس کے لیے بہت بڑی تیاریاں کرنی ہوں گی، بلکہ اس کی صرف ایک پکار اِس کے لیے بالکل کافی ہو گی کہ آغازِ آفرینش سے آج تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور آیندہ پیدا ہوں گے، وہ سب ایک ساتھ زمین کے ہر گوشے سے نکل کھڑے ہوں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ
الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَلَهُ
الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ
الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾ ع ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا
مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ
تَخَافُوْنَهُمْ كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ

ع ۳ ۸ ۲

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُس کے بندے ہیں، سب کے سب اسی کے تابعِ فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر[۳۸] ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ ع

وہ تمھیں[۳۹] خود تمھاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمھارے اُن غلاموں میں سے جو تمھاری مِلکیّت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیے ہوئے مال و دولت میں تمھارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم اُن سے اُس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو؟[۴۰] ـــــ اِس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں

۳۸- یعنی پہلی مرتبہ پیدا کرنا اگر اُس کے لیے مشکل نہ تھا، تو آخر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ پہلی مرتبہ کی پیدائش میں تو تم خود جیتے جاگتے موجود ہو۔ اس لیے اس کا مشکل نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ اب یہ بالکل سیدھی سادھی عقل کی بات ہے کہ ایک دفعہ جس نے کسی چیز کو بنایا ہو، اس کے لیے وہی چیز دوبارہ بنانا نسبتاً زیادہ ہی آسان ہونا چاہیے۔

۳۹- یہاں تک توحید اور آخرت کا بیان مِلا جُلا چل رہا تھا۔ اس میں جن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ان کے اندر توحید کے دلائل بھی ہیں اور وہی دلائل یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ آخرت کا آنا غیر ممکن

لِقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ ۚ فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ‌ ؕ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾

اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ مگر یہ ظالم بے سمجھے بُوجھے اپنے تخیُّلات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اُس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو؟[۴۱] ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے خالص توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

۴۰۔ مشرکین یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین و آسمان اور اس کی سب چیزوں کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے، اُس کی مخلوقات میں سے بعض کو خدائی صفات و اختیارات میں اس کا شریک ٹھیراتے تھے، اور ان سے دعائیں مانگتے، ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے، اور مراسمِ عُبودیت بجا لاتے تھے۔ اِن بناوٹی شریکوں کے بارے میں اُن کا اصل عقیدہ اُس تَلبِیہ کے الفاظ میں ہم کو ملتا ہے جو خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ زبان سے ادا کرتے تھے۔ وہ اس موقع پر کہتے تھے: لبّیك اللّٰھم لبّیك لَا شریك لك الّا شریکا ھو لك تملکه وما ملك۔ (طَبَرانی عن ابنِ عباسؓ) ''میں حاضر ہوں، میرے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اُس شریک کے جو تیرا اپنا ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور جو کچھ اُس کی مِلکیّت ہے اس کا بھی تُو مالک ہے۔'' اللہ تعالیٰ اس آیت میں اِسی شرک کی تردید فرما رہا ہے۔ تمثیل کا منشا یہ ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال میں خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے وہ انسان، جو اتفاقاً تمھاری غلامی میں آ گئے ہیں، تمھارے تو شریک نہیں قرار پا سکتے، مگر تم نے یہ عجیب دھاندلی مچا رکھی ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو بے تکلف اُس کے ساتھ خدائی کا شریک ٹھیراتے ہو۔ اس طرح کی احمقانہ باتیں سوچتے ہوئے آخر تمھاری عقل کہاں ماری جاتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۶۲)

۴۱۔ یعنی جب کوئی شخص سیدھی سیدھی عقل کی بات نہ خود سوچے اور نہ کسی کے سمجھانے سے سمجھنے کے لیے تیار ہو، تو پھر اس کی عقل پر اللہ کی پھٹکار پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد ہر وہ چیز جو کسی معقول آدمی کو حق بات تک پہنچنے میں مدد دے سکتی ہے، وہ اس ضدی جہالت پسند انسان کو اُلٹی مزید گمراہی میں مبتلا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے ''بھٹکانے'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ راستی پسند انسان جب اللہ سے ہدایت کی توفیق طلب کرتا ہے تو اللہ اس کی طلبِ صادق کے مطابق اس کے لیے زیادہ سے زیادہ اسبابِ ہدایت پیدا فرما دیتا ہے۔ اور گمراہی پسند انسان جب گمراہ ہی ہونے پر اصرار کرتا ہے تو پھر اللہ اس کے لیے وہی اسباب

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ

پس[۴۲] (اے نبیؐ! اور نبیؐ کے پیروو!) یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین[۴۳] کی سَمت میں جما[۴۴] دو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے،[۴۵]

پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو اسے بھٹکا کر روز بروز حق سے دُور لیے چلے جاتے ہیں۔

۴۲ – یہ ”پس“ اس معنیٰ میں ہے کہ جب حقیقت تم پر کھل چکی، اور تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کائنات کا اور خود انسان کا خالق و مالک اور حاکم ذی اختیار ایک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے تو اس کے بعد لامحالہ تمھارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے۔

۴۳ – اِس دین سے مراد وہ خاص دین ہے جسے قرآن پیش کر رہا ہے، جس میں بندگی، عبادت اور طاعت کا مستحق اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جس میں اُلوہیّت اور اس کی صفات و اختیارات اور اس کے حقوق میں قطعاً کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ٹھیرایا جاتا، جس میں انسان اپنی رضا و رغبت سے اس بات کی پابندی اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی ہدایت اور اس کے قانون کی پیروی میں بسر کرے گا۔

۴۴ – ”یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس طرف جما دو“، یعنی پھر کسی اور طرف کا رُخ نہ کرو۔ زندگی کے لیے اِس راہ کو اختیار کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے راستے کی طرف التفات تک نہ ہونے پائے۔ پھر تمھاری فکر اور سوچ ہو تو مسلمان کی سی اور تمھاری پسند اور ناپسند ہو تو مسلمان کی سی۔ تمھاری قدریں اور تمھارے معیار ہوں تو وہ جو اسلام تمھیں دیتا ہے، تمھارے اَخلاق اور تمھاری سیرت و کردار کا ٹھپا ہو تو اُس طرح کا جو اسلام چاہتا ہے، اور تمھاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات چلیں تو اُس طریقے پر جو اسلام نے تمھیں بتایا ہے۔

۴۵ – یعنی تمام انسان اِس فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبُود اور مُطاعِ حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر تم کو قائم ہو جانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے، اور اگر بندگیِ غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کرو گے۔

اس مضمون کو متعدّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ما من مولود يولد الا على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه كما تنتج البهيمة بهيمة جمعاء، هل تحسون فيها من جدعاء۔ یعنی ہر بچہ جو کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اصل انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی یا یہودی یا مجوسی وغیرہ بنا ڈالتے ہیں۔

لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ

اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی[۴۶]، یہی بالکل راست اور دُرست دین[۴۷] ہے، مگر اکثر لوگ

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح و سالم جانور برآمد ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا، بعد میں مشرکین اپنے اوہامِ جاہلیت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔

مُسندِ احمد اور نَسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ ایک جنگ میں مسلمانوں نے دشمنوں کے بچوں تک کو قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: ما بال اقوام جاوزهم القتل اليوم حتى قتلوا الذُّرِّيَّة، "لوگوں کو کیا ہو گیا کہ آج وہ حد سے گزر گئے اور بچوں تک کو قتل کر ڈالا"۔ ایک شخص نے عرض کیا: کیا یہ مشرکین کے بچے نہ تھے؟ فرمایا: انما خيارکم ابناء المشرکين، "تمھارے بہترین لوگ مشرکین ہی کی تو اولاد ہیں"۔ پھر فرمایا: کل نسمة تولد على الفطرة حتي يعرب عنه لسانها فابواها يهودانها او ينصرانها، "ہر مُتنفّس فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کی زبان کُھلنے پر آتی ہے تو ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں"۔

ایک اور حدیث جو امام احمدؒ نے عِیاضؓ بن حِمار المُجاشعی سے نقل کی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے کے دوران میں فرمایا: ان ربی يقول انی خلقت عبادی حنفاء کلهم وانهم اتتهم الشياطين فاضلتهم عن دينهم وحَرَّمَتْ عليهم ما احللتُ لهم وامَرَتْهم ان يشرکوا بی ما لم انزل بِهٖ سُلطَانا، "میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آکر انھیں ان کے دین سے گمراہ کیا، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا اسے حرام کیا، اور انھیں حکم دیا کہ میرے ساتھ اُن چیزوں کو شریک ٹھیرائیں جن کے شریک ہونے پر مَیں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے"۔

۴۶ – یعنی خدا نے انسان کو اپنا بندہ بنایا ہے اور اپنی ہی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ساخت کسی کے بدلے نہیں بدل سکتی۔ نہ آدمی بندہ سے غیر بندہ بن سکتا ہے، نہ کسی غیر خدا کو خدا بنا لینے سے وہ حقیقت میں اس کا خدا بن سکتا ہے۔ انسان خواہ اپنے کتنے ہی معبود بنا بیٹھے، لیکن یہ امرِ واقعہ اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے۔ انسان اپنی حماقت اور جہالت کی بنا پر جس کو بھی چاہے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے لے اور جسے بھی چاہے اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ بیٹھے، مگر حقیقتِ نفس الامری یہی ہے کہ نہ اُلوہیت کی صفات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل ہیں نہ اس کے اختیارات، اور نہ کسی دوسرے کے پاس یہ طاقت ہے کہ انسان کی قسمت بنا سکے یا بگاڑ سکے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی نہ کی جائے"۔ یعنی اللہ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے، اس کو بگاڑنا اور مسخ کرنا درست نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا
تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ

جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہوئے [۴۸]، اور ڈرو اُس سے [۴۹] اور نماز قائم کرو [۵۰]، اور نہ ہو جاؤ اُن مشرکین میں سے جنھوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور

۴۷ – یعنی فطرتِ سلیمہ پر قائم رہنا ہی سیدھا اور صحیح طریقہ ہے۔

۴۸ – اللہ کی طرف رُجوع سے مراد یہ ہے کہ جس نے بھی آزادی و خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے انحراف کیا ہو، یا جس نے بھی بندگیِ غیر کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اصلی و حقیقی رب سے بے وفائی کی ہو، وہ اپنی اس روش سے باز آجائے اور اُسی ایک خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے جس کا بندہ حقیقت میں وہ پیدا ہُوا ہے۔

۴۹ – یعنی تمھارے دل میں اس بات کا خوف ہونا چاہیے کہ اگر اللہ کے پیدائشی بندے ہونے کے باوجود تم نے اس کے مقابلے میں خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کیا، یا اس کے بجائے کسی اور کی بندگی کی، تو اِس غداری و نمک حرامی کی سخت سزا تمھیں بھگتنی ہوگی۔ اس لیے تمھیں ایسی ہر روش سے بچنا چاہیے جو تم کو خدا کے غضب کا مستحق بناتی ہو۔

۵۰ – اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے غضب کا خوف، دونوں قلب کے افعال ہیں۔ اس قلبی کیفیت کو اپنے ظہور اور اپنے استحکام کے لیے لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے جس سے خارج میں بھی ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی طرف پلٹ آیا ہے، اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی اِس رجوع و تقویٰ کی کیفیت کو ایک عملی مُمارَست کے ذریعے سے پے در پے نَشو و نُما نصیب ہوتا چلا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اُس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد فوراً ہی اِس جسمانی عمل، یعنی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال محض خیال کی حد تک رہتا ہے، اس میں استحکام اور پائداری نہیں ہوتی۔ اُس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اُس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس عقیدہ و فکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اُس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے،

كَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ
ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً

گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن[51] ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رُجوع کر کے اُسے پکارتے ہیں[52]، پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انھیں چکھا دیتا ہے تو

اور اس میں ایمان و اسلام کا وہ پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دُہرانا ہوتا ہے، تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ مزید برآں کفار اور اہلِ ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔ اہلِ ایمان پر اِس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں، اور ایمان و اسلام سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو، اسی وقت کوئی کُھلی علامت فوراً ہی تمام اہلِ ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔ کفار پر اِس کا ظہور اِس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے، ان پر خدا کے فرمانبرداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم مکّہ معظمہ کے اُس دَور میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کفارِ قریش کے ظلم و ستم کی چکّی میں پِس رہی تھی اور اس کے بعد بھی ۹ برس تک پِستی رہی۔ اُس وقت دُور دُور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام و نشان نہیں تھا۔ اگر نماز اسلامی حکومت کے بغیر بے معنیٰ ہوتی، جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز قائم کرنا سرے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ ”نظامِ رُبوبیّت“ چلانا ہوتا، جیسا کہ منکرینِ سنّت کا دعویٰ ہے، تو اس حالت میں قرآنِ مجید کا یہ حکم دینا آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کے بعد ۹ سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اِس حکم کی تعمیل آخر کس طرح کرتے رہے؟

۵۱ – یہ اشارہ ہے اِس چیز کی طرف کہ نوعِ انسانی کا اصل دین وہی دینِ فطرت ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دین مشرکانہ مذاہب سے بتدریج ارتقا کرتا ہوا توحید تک نہیں پہنچا ہے، جیسا کہ قیاس و گمان سے ایک فلسفۂ مذہب گھڑ لینے والے حضرات سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ جتنے مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں،

Maktaba Tul Ishaat.com

إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا
فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا
كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۖ

یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں،[۵۳] تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا، مزے کرلو، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟[۵۴]

جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں،

یہ سب کے سب اُس اصلی دین میں بگاڑ آنے سے رُونما ہوئے ہیں۔ اور یہ بگاڑ اس لیے آیا ہے کہ مختلف لوگوں نے فطری حقائق پر اپنی اپنی نَو ایجاد باتوں کا اضافہ کر کے اپنے الگ دین بنا ڈالے اور ہر ایک اصل حقیقت کے بجائے اُس اضافہ شدہ چیز کا گرویدہ ہو گیا جس کی بدولت وہ دوسروں سے جُدا ہو کر ایک مستقل فرقہ بنا تھا۔ اب جو شخص بھی ہدایت پا سکتا ہے، وہ اِسی طرح پا سکتا ہے کہ اُس اصل حقیقت کی طرف پلٹ جائے جو دینِ حق کی بنیاد تھی، اور بعد کے ان تمام اضافوں سے اور ان کے گرویدہ ہونے والے گروہوں سے دامن جھاڑ کر بالکل الگ ہو جائے۔ ان کے ساتھ ربط کا جو رشتہ بھی وہ لگائے رکھے گا، وہی دین میں خلل کا موجب ہو گا۔

۵۲ – یہ اس بات کی کُھلی دلیل ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں توحید کی شہادت موجود ہے۔ اُمیدوں کے سہارے جب بھی ٹُوٹنے لگتے ہیں، ان کا دل خود ہی اندر سے پکارنے لگتا ہے کہ اصل فرمانروائی کائنات کے مالک ہی کی ہے اور اسی کی مدد ان کی بگڑی بنا سکتی ہے۔

۵۳ – یعنی پھر دوسرے معبُودوں کی نذریں اور نیازیں چڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فُلاں حضرت کے طفیل اور فُلاں آستانے کے صدقے میں ٹلی ہے۔

۵۴ – یعنی آخر کس دلیل سے ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ بلائیں خدا نہیں ٹالتا بلکہ حضرت ٹالا کرتے ہیں؟ کیا عقل اس کی شہادت دیتی ہے؟ یا کوئی کتابِ الٰہی ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ میں اپنے خدائی کے اختیارات فلاں فلاں حضرتوں کو دے چکا ہوں اور اب وہ تم لوگوں کے کام بنایا کریں گے؟

وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ اِذَا هُمۡ يَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶﴾
اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّ
فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ
وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ ۫

اور جب ان کے اپنے کیے کرتُوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں[۵۵]۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے)۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں[۵۶]۔ پس (اے مومن!) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اُس کا حق)[۵۷]۔ یہ طریقہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں،

۵۵- اُوپر کی آیت میں انسان کی جَہالت و حماقت اور اس کی ناشکری و نمک حرامی پر گرفت تھی۔ اس آیت میں اس کے چھچھورپن اور کم ظرفی پر گرفت کی گئی ہے۔ اِس تھُڑدِلے کو جب دنیا میں کچھ دولت، طاقت، عزت نصیب ہو جاتی ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اِس کا کام خوب چل رہا ہے، تو اِسے یاد نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میرے ہی کچھ سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں جو مجھے وہ کچھ میسر ہُوا جس سے دوسرے محروم ہیں۔ اس غلط فہمی میں فخر و غرور کا نشہ اس پر ایسا چڑھتا ہے کہ پھر یہ نہ خدا کو خاطر میں لاتا ہے نہ خلق کو۔ لیکن جونہی کہ اقبال نے منہ موڑا، اِس کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور بد نصیبی کی ایک ہی چوٹ اس پر دل شکستگی کی وہ کیفیت طاری کر دیتی ہے جس میں یہ ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتا ہے، حتّٰی کہ خودکُشی تک کر جاتا ہے۔

۵۶- یعنی اہلِ ایمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ کفر و شرک کا انسان کے اَخلاق پر کیا اثر پڑتا ہے، اور اس کے برعکس ایمان باللہ کے اَخلاقی نتائج کیا ہیں۔ جو شخص سچّے دل سے خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اسی کو رزق کے خزانوں کا مالک سمجھتا ہو، وہ کبھی اُس کم ظرفی میں مبتلا نہیں ہو سکتا جس میں خدا کو بھولے ہوئے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اُسے کشادہ رزق ملے تو پھولے گا نہیں، شکر کرے گا، خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور فیّاضی سے پیش آئے گا، اور خدا کا مال خدا کی راہ میں صَرف کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرے گا۔ تنگی کے ساتھ رزق ملے، یا فاقے ہی پڑ جائیں، تب بھی صبر سے کام لے گا، دیانت و امانت اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے گا،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ

اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔[۵۸] جو سُود تم دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر

اور آخر وقت تک خدا سے فضل و کرم کی آس لگائے رہے گا۔ یہ اَخلاقی بلندی نہ کسی دہریّے کو نصیب ہو سکتی ہے نہ مشرک کو۔

۵۷ – یہ نہیں فرمایا کہ رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہُوا ہے کہ یہ اُس کا حق ہے جو تجھے دینا چاہیے، اور حق ہی سمجھ کر تُو اسے دے۔ اس کو دیتے ہوئے یہ خیال تیرے دل میں نہ آنے پائے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اس پر کر رہا ہے، اور تو کوئی بڑی ہستی ہے دان کرنے والی، اور وہ کوئی حقیر مخلوق ہے تیرا دیا کھانے والی۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح تیرے ذہن نشین رہے کہ مال کے مالکِ حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ زائد مال اُن دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمایش کے لیے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے، تاکہ تیرا مالک دیکھے کہ تو ان کا حق پہچانتا اور پہنچاتا ہے یا نہیں۔

اس ارشادِ الٰہی اور اس کی اصلی رُوح پر جو شخص بھی غور کرے گا، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآنِ مجید انسان کے لیے اَخلاقی و روحانی ارتقا کا جو راستہ تجویز کرتا ہے، اس کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت (free economy) کی موجودگی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقا کسی ایسے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں ہے جہاں لوگوں کے حُقوقِ مِلکیّت ساقط کر دیے جائیں، ریاست تمام ذرائع کی مالک ہو جائے اور افراد کے درمیان تقسیمِ رزق کا پورا کاروبار حکومت کی مشینری سنبھال لے، حتّٰی کہ نہ کوئی فرد اپنے اُوپر کسی کا کوئی حق پہچان کر دے سکے، اور نہ کوئی دوسرا فرد کسی سے کچھ لے کر اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبۂ خیر سگالی پرورش کر سکے۔ اس طرح کا خالص کمیونسٹ نظامِ تمدّن و معیشت، جسے آج کل ہمارے ملک میں ”قرآنی نظامِ رُبُوبیّت“ کے پُرفریب نام سے زبردستی قرآن کے سر منڈھا جا رہا ہے، قرآن کی اپنی اسکیم کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس میں انفرادی اخلاق کے نَشْوونَما اور انفرادی سیرتوں کی تشکیل و ترقی کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اسکیم تو اُسی جگہ چل سکتی ہے جہاں افراد کچھ وسائلِ دولت کے مالک ہوں، ان پر آزادانہ تصرّف کے اختیارات رکھتے ہوں، اور پھر اپنی رضا و رغبت سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق اخلاص کے ساتھ ادا کریں۔ اِسی قسم کے معاشرے میں یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ فرداً فرداً لوگوں میں ایک طرف ہمدردی، رحم و شفقت، ایثار و قربانی اور حق شناسی و ادائے حقوق کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوں، اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لیے خیر خواہی، احسان مندی، اور جزاء الاحسان بالاحسان کے پاکیزہ جذبات نَشْوونَما پائیں، یہاں تک کہ وہ مثالی حالت پیدا ہو جائے جس میں بدی کا رکنا اور نیکی کا فروغ پانا کسی قوتِ جابرہ کی مداخلت پر موقوف نہ ہو، بلکہ لوگوں کی اپنی پاکیزگیِ نفس اور ان کے اپنے نیک ارادے اس ذمہ داری کو سنبھال لیں۔

النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ

وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا،[۵۹] اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے

۵۸- یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاح صرف مسکین اور مسافر اور رشتہ دار کا حق ادا کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز حصولِ فلاح کے لیے درکار نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اِن حقوق کو نہیں پہچانتے اور نہیں ادا کرتے، وہ فلاح پانے والے نہیں ہیں، بلکہ فلاح پانے والے وہ ہیں جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے یہ حقوق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

۵۹- قرآنِ مجید میں یہ پہلی آیت ہے جو سُود کی مذمّت میں نازل ہوئی۔ اس میں صرف اتنی بات فرمائی گئی ہے کہ تم لوگ تو سود یہ سمجھتے ہوئے دیتے ہو کہ جس کو ہم یہ زائد مال دے رہے ہیں اس کی دولت بڑھے گی، لیکن درحقیقت اللہ کے نزدیک سود سے دولت کی افزائش نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر جب مدینۂ طیبہ میں سُود کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا تو اس پر مزید یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ "اللہ سود کا مُٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔" (بعد کے احکام کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، آیت ۱۳۰۔ البقرہ، آیات ۲۷۵ تا ۲۸۱)

اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین کے دو اقوال ہیں: ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں ربٰوا سے مراد وہ سُود نہیں ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے، بلکہ وہ عَطِیّہ یا ہدیہ وتحفہ ہے جو اِس نیت سے دیا جائے کہ لینے والا بعد میں اس سے زیادہ واپس کرے گا، یا مُعطی کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے گا، یا اس کا خوشحال ہو جانا مُعطی کی اپنی ذات کے لیے نافع ہوگا۔ یہ ابنِ عباسؓ، مجاہد، ضحّاک، قتادہ، عِکرِمہ، محمد بن کَعب القُرظی اور شَعْبی کا قول ہے۔ اور غالباً یہ تفسیر ان حضرات نے اس بنا پر فرمائی ہے کہ آیت میں اِس فعل کا نتیجہ صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں اس دولت کو کوئی افزائش نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اگر معاملہ اُس سود کا ہوتا جسے شریعت نے حرام کیا ہے تو مثبت طور پر فرمایا جاتا کہ اللہ کے ہاں اس پر سخت عذاب دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں، اس سے مراد وہی معروف ربٰوا ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے حضرت حسن بصریؒ اور سُدِّی کی ہے، اور علامۂ آلُوسی کا خیال ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے، کیونکہ عربی زبان میں ربٰوا کا لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی تاویل کو مفسر نیسا بوری نے بھی اختیار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی یہی دوسری تفسیر صحیح ہے، اس لیے کہ معروف معنیٰ کو چھوڑنے کے لیے وہ دلیل کافی نہیں ہے جو اُوپر تفسیرِ اوّل کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ روم کا نُزول جس زمانے میں ہوا ہے اُس وقت قرآنِ مجید میں سود کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ اعلان اس کے کئی برس بعد ہُوا ہے۔ قرآنِ مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو بعد میں کسی وقت حرام کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے وہ پہلے سے ذہنوں کو تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ
یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ۭ ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ
شَیْءٍ ۭ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ

ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔[۶۰]

اللہ ہی[۶۱] ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمھیں رزق دیا[۶۲]، پھر وہ تمھیں موت دیتا ہے، پھر وہ تمھیں زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟[۶۳] پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ع خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ مزا چکھائے اُن کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ

شراب کے معاملے میں بھی پہلے صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ وہ پاکیزہ رزق نہیں ہے (النحل، آیت ۶۷)، پھر فرمایا کہ اس کا گناہ اس کے فائدے سے زیادہ ہے (البقرہ، ۲۱۹)، پھر حکم دیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ (النساء، ۴۳)، پھر اس کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اسی طرح یہاں سود کے متعلق صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جس سے دولت کی افزایش ہوتی ہو، بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا۔ (آلِ عمران، آیت ۱۳۰) اور سب سے آخر میں بجائے خود سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ (البقرہ، آیت ۲۷۵)

۶۰ – اس بڑھوتری کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جتنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبۂ ایثار اور جس قدر شدید طلبِ رضائے الٰہی کے ساتھ کوئی شخص راہِ خدا میں مال صَرف کرے گا، اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دے گا۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص راہِ خدا میں ایک کھجور بھی دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر اُحُد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔

۶۱ – یہاں سے پھر کفار و مشرکین کو سمجھانے کے لیے سلسلۂ کلام توحید و آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے۔

يَرْجِعُوْنَ ﴿٤١﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿٤٢﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ
لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ
يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿٤٣﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

باز آئیں[۶۴]۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی[۶۵] تھے۔ پس (اے نبیؐ!) اپنا رُخ مضبوطی کے ساتھ جما دو اِس دینِ راست کی سَمت میں، قبل اُس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی صورت اللہ کی طرف سے نہیں[۶۶] ہے۔ اُس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر[۶۷] ہے، اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے

---

۶۲ – یعنی زمین میں تمھارے رزق کے لیے جملہ وسائل فراہم کیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ رزق کی گردش سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصّہ پہنچ جائے۔

۶۳ – یعنی اگر تمھارے بنائے ہوئے معبُودوں میں سے کوئی بھی نہ پیدا کرنے والا ہے، نہ رزق دینے والا، نہ موت و زیست اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور نہ مر جانے کے بعد وہ کسی کو زندہ کر دینے پر قادر ہے، تو آخر یہ لوگ ہیں کس مرض کی دوا کہ تم نے اِنھیں معبود بنا لیا؟

۶۴ – یہ پھر اُس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت روم و ایران کے درمیان برپا تھی، جس کی آگ نے پورے شرقِ اَوسط کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ”لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی“ سے مراد وہ فِسق و فجور اور ظلم و جَور ہے جو شرک یا دہریّت کا عقیدہ اختیار کرنے اور آخرت کو نظر انداز کر دینے سے لازماً انسانی اَخلاق و کردار میں رونما ہوتا ہے۔ ”شاید کہ وہ باز آئیں“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا سے پہلے اِس دنیا میں انسانوں کو ان کے تمام اعمال کا نہیں بلکہ بعض اعمال کا بُرا نتیجہ اس لیے دکھاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھیں اور اپنے تخیُّلات کی غلطی کو محسوس کر کے اُس عقیدۂ صالحہ کی طرف رُجوع کریں جو انبیا علیہم السلام ہمیشہ سے انسان کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، جس کو اختیار کرنے کے سوا انسانی اعمال کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: التوبہ، آیت ۱۲۶۔ الرعد، ۳۱۔ السجدہ، ۲۱۔ الطّور، ۴۷۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝۴۴ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۵ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ
مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۴۶ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ

وہ اپنے ہی لیے فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں، تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے[۶۸] اور تمھیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں[۶۹] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[۷۰] اور اس کے شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے[۷۱]، پھر جنھوں نے جرم کیا[۷۲]

---

۶۵ – یعنی روم و ایران کی تباہ کُن جنگ آج کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پچھلی تاریخ بڑی بڑی قوموں کی تباہی و بربادی کے ریکارڈ سے بھری ہوئی ہے۔ اور ان سب قوموں کو جن خرابیوں نے برباد کیا اُن سب کی جڑ یہی شرک تھا جس سے باز آنے کے لیے آج تم سے کہا جا رہا ہے۔

۶۶ – یعنی جس کو نہ اللہ تعالیٰ خود ٹالے گا اور نہ اس نے کسی کے لیے ایسی کسی تدبیر کی کوئی گنجایش چھوڑی ہے کہ وہ اسے ٹال سکے۔

۶۷ – یہ ایک جامع فقرہ ہے جو تمام اُن مضرّتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو کافر کو اپنے کفر کی بدولت پہنچ سکتی ہیں۔ مضرّتوں کی کوئی مفصّل فہرست بھی اتنی جامع نہیں ہو سکتی۔

۶۸ – یعنی بارانِ رحمت کی خوش خبری دینے کے لیے۔

۶۹ – یہ ایک اور قسم کی ہواؤں کا ذکر ہے جو جہاز رانی میں مددگار ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کی بادبانی کشتیوں اور جہازوں کا سفر زیادہ تر بادِ موافق پر منحصر تھا اور بادِ مخالف ان کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اس لیے بارش

اَجۡرَمُوۡا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِىۡ يُرۡسِلُ
الرِّيٰحَ فَتُثِيۡرُ سَحَابًا فَيَبۡسُطُهٗ فِى السَّمَآءِ كَيۡفَ يَشَآءُ وَيَجۡعَلُهٗ
كِسَفًا فَتَرَى الۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ
مِنۡ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّنَزَّلَ
عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمُبۡلِسِيۡنَ ﴿۴۹﴾ فَانۡظُرۡ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰهِ

اُن سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر وہ اِن بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس کے نُزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو! اللہ کی رحمت کے اثرات

لانے والی ہواؤں کے بعد ان ہواؤں کا ذکر ایک نعمتِ خاص کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

۷۰- یعنی تجارت کے لیے سفر کرو۔

۷۱- یعنی ایک قسم کی نشانیاں تو وہ ہیں جو کائناتِ فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر آن سابقہ پیش آتا ہے، جن میں سے ایک ہواؤں کی گردش کا یہ نظام ہے جس کا اُوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو انبیا علیہم السلام معجزات کی صورت میں، کلامِ الٰہی کی صورت میں، اپنی غیر معمولی، پاکیزہ سیرت کی شکل میں، اور انسانی معاشرے پر اپنی حیات بخش تاثیرات کی شکل میں لے کر آئے۔ یہ دونوں قسم کی نشانیاں ایک ہی حقیقت کی نشان دہی کرتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جس توحید کی تعلیم انبیاؑ دے رہے ہیں، وہی برحق ہے۔ ان میں سے ہر نشانی دوسری کی مؤیّد ہے۔ کائنات کی نشانیاں انبیاؑ کے بیان کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور انبیاؑ کی لائی ہوئی نشانیاں اُس حقیقت کو کھولتی ہیں جس کی طرف کائنات کی نشانیاں اشارے کر رہی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا
مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ

کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جِلا اُٹھاتا ہے،[۷۳] یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں[۷۴] تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں۔[۷۵] (اَے نبیؐ!) تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے،[۷۶] نہ اُن بہروں کو اپنی پکار

۷۲ - یعنی جو لوگ ان دونوں نشانیوں کی طرف سے اندھے بن کر توحید سے انکار پر جمے رہے اور خدا سے بغاوت ہی کیے چلے گئے۔

۷۳ - یہاں جس انداز سے نبوت اور بارش کا ذکر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے، اس میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ نبی کی آمد بھی انسان کی اَخلاقی زندگی کے لیے ویسی ہی رحمت ہے جیسی بارش کی آمد اس کی مادّی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح آسمانی بارش کے نُزول سے مُردہ پڑی ہوئی زمین یکایک جی اُٹھتی ہے اور اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، اسی طرح آسمانی وحی کا نُزول اَخلاق و روحانیت کی ویران پڑی ہوئی دنیا کو جِلا اُٹھاتا ہے اور اس میں فضائل و محامد کے گلزار لہلہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کفار کی اپنی بدقسمتی ہے کہ خدا کی طرف سے یہ نعمت جب ان کے ہاں آتی ہے تو وہ اس کا کفران کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مژدۂ رحمت سمجھنے کے بجائے پیامِ موت سمجھ لیتے ہیں۔

۷۴ - یعنی بارانِ رحمت کے بعد جب کھیتیاں سرسبز ہو چکی ہوں اس وقت اگر کوئی ایسی سخت سرد یا سخت گرم ہوا چل پڑے جو ہری بھری فصلوں کو جلا کر رکھ دے۔

۷۵ - یعنی پھر وہ خدا کو کوسنے لگتے ہیں اور اس پر الزام رکھنے لگتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی مصیبتیں ہم پر ڈال رکھی ہیں۔ حالانکہ جب خدا نے ان پر نعمت کی بارش کی تھی، اس وقت انھوں نے شکر کے بجائے اس کی ناقدری کی تھی۔ یہاں پھر ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ جب خدا کے رسول اس کی طرف سے پیامِ رحمت لاتے ہیں تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور اس نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے کفر کی پاداش میں خدا ان پر ظالموں اور جبّاروں کو مسلّط کر دیتا ہے اور وہ جَور و ستم کی چکی میں انھیں پیستے ہیں اور جوہرِ آدمیت کا قَلع قَمع کر ڈالتے ہیں، تو وہی لوگ خدا کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور اسے الزام دیتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی ظلم سے بھری ہوئی دنیا بنا ڈالی ہے۔

الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ
ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾

ع ۳۰ ۸

قرء حفص بضم الضاد وفتحها فی الثلاثة لکن الضم مختارۃ

سُنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں۷۷، اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہِ راست دکھا سکتے ہو۷۸۔ تم تو صرف انھی کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ع

اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف کے بعد تمھیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمھیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۷۹۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

۷۶ - یہاں مُردوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر مر چکے ہیں، جن کے اندر اَخلاقی زندگی کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے، جن کی بندگیِ نفس اور ضد اور ہٹ دھرمی نے اُس صلاحیت ہی کا خاتمہ کر دیا ہے جو آدمی کو حق بات سمجھنے اور قبول کرنے کے قابل بناتی ہے۔

۷۷ - بہروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دلوں پر ایسے قفل چڑھا رکھے ہیں کہ سب کچھ سن کر بھی وہ کچھ نہیں سنتے۔ پھر جب ایسے لوگ یہ کوشش بھی کریں کہ دعوتِ حق کی آواز سرے سے ان کے کان میں پڑنے ہی نہ پائے، اور داعی کی شکل دیکھتے ہی دُور بھاگنا شروع کر دیں، تو ظاہر ہے کہ کوئی انھیں کیا سنائے اور کیسے سنائے؟

۷۸ - یعنی نبی کا کام یہ تو نہیں ہے کہ اندھوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ساری عمر راہِ راست پر چلاتا رہے۔ وہ تو راہِ راست کی طرف رہنمائی ہی کر سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کی ہِیے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہوں اور جنھیں وہ راستہ نظر ہی نہ آتا ہو جو نبی انھیں دکھانے کی کوشش کرتا ہے، ان کی رہنمائی کرنا نبی کے بس کا کام نہیں ہے۔

۷۹ - یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا، یہ ساری حالتیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ اسی کی مَشِیّت پر موقوف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ
سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝۵۵ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ؗ
فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۵۶ فَيَوْمَئِذٍ لَّا
يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۵۷

اور جب وہ ساعت برپا[۸۰] ہو گی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھیرے ہیں،[۸۱] اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے۔[۸۲] مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روزِ حشر ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔[۸۳]

ہے کہ جسے چاہے کمزور پیدا کرے اور جس کو چاہے طاقت ور بنائے، جسے چاہے بچپن سے جوانی تک نہ پہنچنے دے اور جس کو چاہے جوانا مرگ کر دے، جسے چاہے لمبی عمر دے کر بھی تندرست و توانا رکھے اور جس کو چاہے شاندار جوانی کے بعد بڑھاپے میں اس طرح ایڑیاں رگڑوائے کہ دنیا اسے دیکھ کر عبرت کرنے لگے۔ انسان اپنی جگہ جس گھمنڈ میں چاہے مبتلا ہوتا رہے، مگر خدا کے قبضۂ قدرت میں وہ اِس طرح بے بس ہے کہ جو حالت بھی خدا اس پر طاری کر دے، اسے وہ اپنی کسی تدبیر سے نہیں بدل سکتا۔

۸۰ – یعنی قیامت، جس کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے۔

۸۱ – یعنی مرنے کے وقت سے قیامت کی اُس گھڑی تک۔ ان دونوں ساعتوں کے درمیان چاہے دس بیس ہزار برس ہی گزر چکے ہوں، مگر وہ یہ محسوس کریں گے کہ چند گھنٹے پہلے ہم سوئے تھے اور اب اچانک ایک حادثے نے ہمیں جگا اُٹھایا ہے۔

۸۲ – یعنی ایسے ہی غلط اندازے یہ لوگ دنیا میں بھی لگاتے تھے۔ وہاں بھی یہ حقیقت کے

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ
جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾
كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ
اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اِس طرح ٹھپّا لگا دیتا ہے اللہ اُن لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں۔ پس (اے نبیؐ!) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچّا ہے[۸۴]، اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے[۸۵]۔ ع

اِدراک سے محروم تھے۔ اسی وجہ سے یہ حکم لگایا کرتے تھے کہ کوئی قیامت و یامت نہیں آنی، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، اور کسی خدا کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں حساب نہیں دینا۔

۸۳- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کرو“، اس لیے کہ توبہ اور ایمان اور عملِ صالح کی طرف رُجوع کرنے کے سارے مواقع کو وہ کھو چکے ہوں گے اور امتحان کا وقت ختم ہو کر فیصلے کی گھڑی آ چکی ہو گی۔

۸۴- اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو اُوپر آیت ۴۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی بیّنات کا مقابلہ تکذیب و تضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے، اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے (فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا)، اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نُصرت فرمائے (وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ)۔

۸۵- یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ، یا ان کی بہتان و افترا کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ، یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزا سے تم پست ہمّت ہو جاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ، یا ان کے دیے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ، یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کر رہے ہیں، ان کی بنا پر تم ان کے ساتھ مُصالحت کر لینے پر اُتر آؤ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوش مند، اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ، اور اپنے عزم میں اتنا راسخ، اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمھیں ڈرایا جا سکے، نہ کسی قیمت پر تمھیں خریدا جا سکے، نہ کسی فریب سے تم کو پُھسلایا جا سکے، نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمھیں اپنی راہ سے ہٹا سکے، اور نہ دین کے معاملے میں کسی لین دین کا سودا تم سے چُکایا جا سکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلامِ بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ ''یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں۔'' اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ اپنے آخری نبیؐ کو بھاری بھرکم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپؐ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی، اس نے اُسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیّتِ عُظمیٰ نے وہ انقلاب برپا کر کے دکھا دیا جسے روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری طاقت صَرف کر دی اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔

ضمیمہ ۱

بسلسلۂ سورۂ کہف، حاشیہ ۹، صفحہ ۱۲

شہرِ افسُوس (Ephesus) جس میں اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارھویں صدی قبلِ مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بُت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی، جسے ڈائنا (Diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کا عظیم الشان مندر عہدِ قدیم کے عجائباتِ عالَم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے، اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبُودوں میں شامل کرلیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہوکر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصّے کی جو تفصیلات مسیحی رِوایات کو جمع کر کے گریگوری آف ٹُورس (Gregory of Tours) نے اپنی کتاب (Meraculorum Liber) میں بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

”یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلِ مذہب کا حال سُن کر قیصر ڈِیسیس نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ قیصر پیروانِ مسیحؑ کے خون کا پیاسا ہے۔ مگر انھوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبُود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہوکر کہا کہ اپنی زبان بند کرو، ورنہ میں تمھیں ابھی قتل کرا دوں گا۔ پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا: تم ابھی بچّے ہو۔ میں تمھیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدّت میں اگر تم نے اپنا رَوِیّہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر، ورنہ تمھاری گردن مار دی جائے گی۔

اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انھوں نے پہاڑوں کی راہ لی تاکہ کسی غار میں جا چھُپیں۔ راستے میں ایک کُتّا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انھوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے، مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہُوا۔ آخرکار ایک بڑے گہرے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چھُپ گئے اور کُتّا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے، اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ ۲۵۰ عیسوی کا واقعہ ہے۔ ۱۹۷ برس بعد ۴۴۷ عیسوی میں وہ یکایک بیدار ہوئے جب قیصر تھیوڈوسیَس دوم کا عہدِ حکومت تھا، رومی سلطنت مسیحیت اختیار کر چکی تھی، اور شہرِ افسُوس کے باشندے بھی بُت پرستی ترک کر چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعدِ موت اور حشر و نشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا اور قیصر اس بات پر بہت فکرمند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکارِ آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک

Maktaba Tul Ishaat.com

روز اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اُٹھے۔

بیدار ہو کر انھوں نے آپس میں پوچھا: کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے؟ کسی نے کہا: دن بھر۔ کسی نے کہا: دن کا کچھ حصّہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ایک ساتھی جِین (Jean) کو چاندی کے چند سکّے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا کہ ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں لوگ تمھیں پہچان نہ جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتا چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبور کریں گے۔ مگر جِین جب شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدلی ہوئی ہے۔ سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دکان پر پہنچ کر اس نے کچھ روٹیاں خریدیں اور دکان دار کو چاندی کا ایک سکّہ دیا جس پر قیصر ڈِیسیس کی تصویر تھی۔ دکان دار یہ سکہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے پوچھا: یہ تمھیں کہاں سے ملا؟ جِین نے کہا: یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ حتّٰی کہ کوتوالِ شہر تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا: مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکّہ لائے ہو۔ جِین نے جواب دیا: دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے، میں کسی دفینے کو نہیں جانتا۔ کوتوال نے کہا: تمھاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانا سکّہ ہے۔ تم تو ابھی جوان لڑکے ہو، ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکّہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور کوئی راز ہے۔ جِین نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈِیسیس کو مرے زمانۂ دراز گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی، تاکہ ڈِیسیس کے ظلم سے بچے رہیں۔ جِین کی یہ بات سُن کر کوتوال بھی حیران ہو گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہو گیا کہ یہ واقعی قیصر ڈِیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ قیصر تھیوڈوسیَس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود آ کر اُن سے ملا اور اُن سے برکت لی۔ اس کے بعد یکایک یہ ساتوں آدمی غار میں جا کر لیٹے اور وفات پا گئے۔ اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی زندگی کے بعد موت برحق ہے۔ پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔“

غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی رِوایات میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصّے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انھی کو اصحابِ کہف قرار دینا بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قصّہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر کا ہے، اور قرآن ان واقعات سے بحث نہیں کرتا جو سرزمینِ عرب کے باہر پیش آئے ہیں، اس لیے اس مسیحی قصّے کو اصحابِ کہف پر چسپاں کرنا قرآن کے اُسلوب سے انحراف ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض دُرست نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں دراصل جس بات کا التزام کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کو عبرت دلانے کے لیے ان قوموں اور طاقتوں کے حالات پر کلام کیا جائے جن سے وہ واقف تھے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ سرزمینِ عرب کے حُدود میں ہوں یا اس سے باہر۔ اسی بنا پر مصر کی قدیم تاریخ قرآن میں زیرِ بحث آئی ہے، حالانکہ وہ عرب سے باہر

واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مصر کے حالات قرآن میں زیرِ بحث آسکتے تھے تو روم کے کیوں نہ آسکتے تھے؟ اہلِ عرب جس طرح مصر سے واقف تھے، اسی طرح روم سے بھی تو واقف تھے۔ رومی سلطنت کی سرحدیں عین حجاز کی شمالی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ عربوں کے تجارتی قافلے شب و روز رومی علاقوں میں جاتے تھے۔ بہت سے عرب قبائل رومیوں کے زیرِ اثر تھے۔ روم عربوں کے لیے ہرگز اجنبی ملک نہ تھا۔ سورۂ روم اس پر شاہد ہے۔ علاوہ بریں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصّہ قرآنِ مجید میں ازخود بیان نہیں فرمایا ہے بلکہ کفارِ مکہ کے پوچھنے پر اس کا ذکر کیا ہے، اور کفارِ مکہ کو اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے ایسے واقعات دریافت کرنے کا مشورہ دیا تھا جن سے اہلِ عرب قطعی ناواقف تھے۔

ضمیمہ ۲

بسلسلۂ سورہ کہف، حاشیہ ۱۷

ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار کے متعلق بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد مشہور دیوارِ چین ہے۔ حالانکہ دراصل یہ دیوار قفقاز (Caucasus) کے علاقہ داغستان میں دربند اور داریال (Darial) کے درمیان بنائی گئی تھی۔ قفقاز اُس ملک کو کہتے ہیں جو بحیرۂ اَسْوَد (Black Sea) اور بحیرۂ خَزَر (Caspian Sea) کے درمیان واقع ہے۔ اس ملک میں بحیرۂ اسود سے داریال تک تو نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان اتنے تنگ دَرّے ہیں کہ ان سے کوئی بڑی حملہ آور فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے، اس میں پہاڑ بھی زیادہ بلند نہیں ہیں اور ان میں کوہستانی راستے بھی خاصے وسیع ہیں۔ قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں اور ایرانی فرماں رواؤں کو اسی طرف سے اپنی مملکت پر شمالی حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انھی حملوں کو روکنے کے لیے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی تھی جو ۵۰ میل لمبی، ۲۹ فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ یہ دیوار ابتداءً کب کس نے بنائی تھی۔ مگر مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِّ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں، اور اس کی تعمیر کی جو کیفیت قرآنِ مجید میں بیان کی گئی ہے، اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔

ابنِ جَریر طَبَری اور ابنِ کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے، اور یاقُوت نے بھی مُعْجَم البُلدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲ھ میں سُراقہ بن عَمْرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا اور سُراقہ نے عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ کو اپنے مُقَدِّمَۃُ الجَیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب آرمینیا کے علاقے

Maktaba Tul Ishaat.com

میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرماں روا شَہر بَراز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے ایک آدمی کو سدِّ ذُوالقرنین کا مُشاہدہ اور اس علاقے کے حالات کا مُطالعہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس شخص کو پیش کر دیا۔ (طَبَری، ج ۳، ص ۲۳۵ تا ۲۳۹۔ البِدایہ والنّہایہ، ج ۷، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ مُعجَمُ البُلدان، ذکر باب الابواب)

اس واقعے کے دو سو برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷-۲۳۳ھ) نے سدِّ ذُوالقرنین کا مُشاہدہ کرنے کے لیے سلّام الترجمان کی قیادت میں ۵۰ آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں اور ابنِ کثیر نے البِدایہ والنّہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامَرّہ (سُرَّ مَنْ رَاٰی) سے تفلیس، وہاں سے السّریر، وہاں سے اللّان ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا، پھر خَزَر کے ملک میں داخل ہُوا، اور اس کے بعد دربند پہنچ کر اس نے سدّ کا مُشاہدہ کیا۔ (البِدایہ والنّہایہ، ج ۲، ص ۱۱۱۔ ج ۷، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ مُعجَم البُلدان، باب الابواب) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عام طور پر قَفقاز کی اس دیوار ہی کو سدِّ ذوالقرنین سمجھتے تھے۔

یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں متعدّد دوسرے مَقامات پر بھی اسی امر کی تصریح کی ہے۔ خَزَر کے زیرِ عنوان وہ لکھتا ہے کہ ھی بلاد الترك خلف باب الابواب المعروف بالدربند قریب من سدّ ذی القرنین۔ ”یہ ترکوں کا علاقہ ہے جو سدِّ ذُوالقرنین کے قریب باب الابواب کے پیچھے واقع ہے جسے دربند بھی کہتے ہیں۔“ اسی سلسلے میں وہ خلیفہ المقتدِر باللہ کے سفیر، احمد بن فضلان کی ایک رپورٹ نقل کرتا ہے جن میں مملکتِ خَزَر کی تفصیلی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خَزَر ایک مملکت کا نام ہے جس کا صدر مَقام اِتل ہے۔ دریائے اِتل اس شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور یہ دریا روس اور بُلغار سے آ کر بحرِ خزَر میں گرتا ہے۔

باب الابواب کے زیرِ عنوان لکھتا ہے کہ اس کو الباب اور دربند بھی کہتے ہیں۔ یہ بحرِ خَزَر کے کنارے واقع ہے۔ بلادِ کفر سے بلادِ مسلمین کی طرف آنے والوں کے لیے یہ راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ ایک زمانے میں یہ نوشیروان کی مملکت میں شامل تھا اور شاہانِ ایران اس سرحد کی حفاظت کو غایت درجہ اہمیّت دیتے تھے۔

الف

ابراہیم علیہ السلام ۷۳-۲۳۴

— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۶۹-۷۰-۷۱-۱۶۳ تا ۱۷۲-۴۹۹ تا ۵۰۹-۶۸۶ تا ۶۹۴۔(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "قرآن، اس میں قصے کس مقصد کے لیے بیان کیے گئے ہیں")

— ان کے لیے صدیق کا خطاب ۷۰

— ان کی طرف جھوٹ کی نسبت اور اس کی حقیقت ۱۶۷-۱۶۸

— ان سے حج کی ابتدا ۱۹۸

— خانہ کعبہ کی تعمیر ۲۱۷-۲۱۸

— خدا کے حکم سے حج کا طریقہ مقرر کرتے ہیں ۲۱۸

— ملت ابراہیمی پر قائم ہونے کا حکم ۲۵۴-۲۵۵

— اسلام میں ان کی اہمیت ۲۵۵

— انھوں نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کیوں کی تھی؟ ۷۰-۷۱-۵۰۵-۵۰۶

— ان کا آگ میں ڈالا جانا اور بچا لیا جانا ۶۹۱

— ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ۶۹۴

— ان کو قوم لوط پر عذاب کے فیصلے کی خبر دی جاتی ہے ۶۹۶

ابلیس

— وہ فرشتوں میں سے نہیں بلکہ جنوں میں سے تھا ۲۹-۳۰-۳۱

— وہ انسان کا ازلی دشمن ہے ۳۰

— لفظ ابلیس کے معنی ۲۹۴ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "شیطان")

اجر

— کیسے لوگ اس کے مستحق ہیں؟ ۹-۲۴-۲۱۶-۷

— اللہ کے ہاں کسی مستحق کا اجر مارا نہیں جاتا ۲۴

اللہ کی خوشنودی پیش نظر رکھ کر اس کے قانون کے حدود میں جو کام بھی کیا جائے موجب اجر ہے ۶۲

— انبیائے سابقین کے ماننے والے اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مان لیں تو دہرے اجر کے مستحق ہیں ۶۴۵-۶۴۹ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "جزا و سزا")

احکام القرآن

— عقائد کے متعلق احکام ۲۰

— جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہنے کا جواز اور اس کی شرائط ۶۷۲-۶۸۱

— اسلامی نظام جماعت سے متعلق احکام ۴۲۶

— ایک دوسرے کو سلام کرنے کا حکم ۴۲۵

— نماز کے احکام کے لیے دیکھو "نماز"

— حج کے احکام کے لیے دیکھو "حج"

— قربانی کے احکام کے لیے دیکھو "قربانی"

— قانونی احکام کے لیے دیکھو "قانون اسلام"

— استیذان کے احکام کے لیے دیکھو "استیذان"

— پردے کے احکام کے لیے دیکھو "پردہ"

— کھانے پینے کے متعلق احکام ۲۲۱-۲۲۲-۲۲۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— جھوٹ کا وسیع مفہوم اور اس کی حرمت ۲۲۲
— قسم سے متعلق احکام ۳۷۳
— استمنا بالید کی شرعی حیثیت ۲۶۵
— رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں کھانے کے متعلق ہدایات ۴۲۴
— معذور اور اپاہج کو ہر گھر سے کھانے کی اجازت ۴۲۴

آخرت

— توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ ۹۰
— اس عقیدے کی اہمیت ۵۵۵
— اس کے دلائل ۱۸۹- ۷۲۸-۷۲۹- ۷۳۴- ۷۳۵
— اس کے امکان کے دلائل ۷- ۲۰- ۲۷-۲۰۱-۲۰۳ تا ۲۰۷- ۲۹۵-۲۹۷- ۵۹۸ تا ۶۰۰- ۶۸۸-۶۸۹- ۷۳۶-۷۴۲ تا ۷۵۰-۷۶۳-۷۶۴
— اس کی ضرورت کے دلائل ۲۰۵- ۲۰۶- ۶۰۰- ۷۳۱ تا ۷۳۴
— اصحاب کہف کا قصہ اس کے وقوع کے دلائل میں سے ہے ۱۶-۱۷
— اس کا وقوع عقل اور انصاف کا تقاضا ہے ۶۰۷
— اس کے انکار کے بعد خدا کو ماننا بے معنی ہے ۲۶-۲۷
— اس کا انکار دراصل خدا کا انکار ہے ۲۰۱-۲۹۵
— اس کو نہ ماننے کے نتائج ۲۶- ۲۷- ۴۹- ۱۴۲- ۲۹۳- ۴۴۰- ۴۴۱- ۵۵۲- ۵۵۳- ۵۵۵- ۵۵۶-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۷۳۴-۷۳۵
— اس کے نہ ماننے والے وہی ہیں جو راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں ۲۹۲-۲۹۳
— اس کو نہ ماننے والے ہمیشہ انبیاؑ کو جھٹلاتے رہے ہیں ۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۵۹۲
— اس کا انکار کرنے والے اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں ۶۹۰
— اس پر ایمان لانے کے تقاضے ۶۷۶-۶۷۷
— دنیا پر آخرت کی ترجیح کے وجوہ ۶۵۴-۶۵۵-۷۱۹-۷۲۰
— اس کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں ۵۹۵-۵۹۹
— وہ اس لیے ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے ۹۰
— عالم آخرت کے تفصیلی احوال بیان کرنے کا مقصد ۴۴۱-۴۴۲
— عالم آخرت کا نقشہ ۱۲۱-۱۲۷-۲۰۵-۲۰۶-۶۰۶-۶۰۷
— وہ اسی زمین پر قائم ہوگی ۹۹
— موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت سے جہنم میں داخل ہونے تک مجرمین کے احوال ۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷
— وہاں یکایک زندہ ہو کر اٹھنے پر مجرمین کی بدحواسی ۱۲۲ تا ۱۲۵
— وہاں لوگ اپنی دنیوی زندگی کا اندازہ بہت کم لگائیں گے ۱۲۲ تا ۱۲۴-۳۰۲-۷۶۶
— وہاں کفار و مشرکین تمنا کریں گے کہ انھیں پھر دنیا میں جانے اور ایمان لانے کا موقع دیا جائے ۵۰۸-۵۰۹
— مرنے کے بعد انسان دنیا میں پھر واپس نہیں آ سکتا اور اس کی وجہ ۲۹۹-۳۰۰-۳۰۲
— وہاں تمام انسان اور شیاطین خدا کے حضور گھیر لائے جائیں گے ۲۸-۷۶
— وہاں دنیا کی ساری جتھا بندیاں ختم ہو جائیں گی ۲۹-۷۳۸-۷۶۱

-- وہاں دوستیاں کام نہ آئیں گی ۵۰۸-۵۰۹
-- وہاں انسانیت کس اصول پر تقسیم کی جائے گی؟ ۷۳۸-۷۳۹
-- وہاں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے حضور پیش ہوگا ۲۹-۷۹ تا ۸۱
-- وہاں دنیوی رشتے کٹ جائیں گے ۳۰۰-۶۹۲
-- وہاں مجرمین ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے ۶۹۲
-- وہاں مال اولاد نہیں، صرف قلب سلیم کام آئے گا ۵۰۶-۵۰۷
-- نامۂ اعمال پیش ہوں گے ۲۹
-- اعمال کا ٹھیک وزن کیا جائے گا ۱۶۲
-- انسان کے اعمال پر اس کے اپنے اعضا گواہی دیں گے ۳۷۳-۳۷۴
-- وہاں اللہ بتا دے گا کہ لوگ دنیا میں کیا کر کے آئے ہیں ۳۷۴-۴۲۷
-- وہاں منکرین آخرت کی غلطی کھل جائے گی ۲۹
-- اس روز اللہ منکرین آخرت پر کس طرح حجت قائم کرے گا؟ ۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷
-- وہاں مشرکین خود اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۷۹
-- وہاں کفار و مشرکین کے عقائد کی غلطی کھل جائے گی ۷۹
-- وہاں ظالموں پر حقیقت کھل جائے گی ۶۸
-- منکرین آخرت پچھتائیں گے ۳۰۲-۳۰۳
-- منکرین حق کو پچھتانا پڑے گا ۴۷۷
-- وہاں کسی کے ساتھ ظلم نہ ہوگا ۲۹-۱۲۷-۱۶۲-۲۸۷-۲۸۸
-- وہاں ہر شخص کے ساتھ اس کے اوصاف کے لحاظ سے معاملہ ہوگا ۱۲۷
-- وہاں ٹھیک انصاف کے ساتھ ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا ۳۷۴
-- وہاں عذاب کے مستحق کون لوگ ہوں گے؟ ۳۱-۴۹-۵۰-۱۰۷-۱۲۱-۱۲۲-۱۸۶-۱۸۸-۲۰۶-۲۸۸-۳۰۱-۳۰۲-۳۷۰-۳۷۳-۶۰۸
-- وہاں فلاح کن لوگوں کے لیے ہے؟ ۵۰-۱۸۸-۳۰۱-۳۰۲-۶۰۷-۶۵۷-۶۶۵
-- وہاں متقی مہمانوں کی طرح حاضر ہوں گے ۷۹
-- وہاں نیک اور بدلوگوں کی حالت کا فرق ۴۴۶-۴۴۷
-- وہاں عذاب اور ثواب کن باتوں پر ہے؟ ۹-۲۴
-- وہاں مشرکین سے کیا بازپرس ہوگی؟ ۵۰۷-۶۵۴ تا ۶۵۷-۶۵۹-۶۶۰
-- وہاں کی جزا و سزا کا قاعدہ ۶۶۵
-- وہاں کوئی شخص کسی کے گناہ کا بار اپنے اوپر نہ لے سکے گا ۶۸۲-۶۸۳
-- وہاں گمراہ کرنے والے اپنی گمراہی کے علاوہ دوسروں کو گمراہ کرنے کے بھی مجرم ہوں گے ۶۸۳-۶۸۴
-- وہاں کوئی شخص اس عذر کی بنا پر نہ چھوٹ سکے گا کہ وہ گمراہ لوگوں میں پیدا ہوا تھا ۶۵۸-۶۵۹
-- وہاں گمراہ لوگوں پر شہادت قائم کی جائے گی کہ انھیں حق پہنچ چکا تھا ۶۶۰
-- وہاں ظالموں کو کوئی معذرت پیش کرنے کا موقع نہ ملے گا ۷۶۶
-- وہاں مجرموں پر سخت مایوسی طاری ہوگی ۷۳۶
-- وہاں شفاعت کا قاعدہ ۱۲۶-۱۲۷
-- مشرکین کے معبودان کو جھوٹا قرار دیں گے ۴۴۲-۴۴۳-۵۵۶-۵۵۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— مشرکین کے معبود انھیں کہیں نہ ملیں گے کہ سفارش کے لیے آئیں ۷۳۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''جزا و سزا'' اور ''قیامت'')

اخلاق اور اخلاقی تعلیمات
— ۱۹-۲۰-۲۱-۵۶-۶۸-۶۹-۷۷-۷۸-۷۹-۸۶-۱۰۲-۱۱۲-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۵۸-۱۵۹-۱۹۸-۲۰۷-۲۲۲-۲۲۳-۲۴۶-۲۶۰ تا ۲۶۸-۲۸۱ تا ۲۸۷-۲۹۹-۳۱۴ تا ۳۱۷-۳۵۹-۳۶۷ تا ۳۷۳-۳۹۷-۳۹۸-۴۰۱-۴۶۱ تا ۴۷۰-۵۰۴-۵۰۵-۵۴۹-۵۸۸-۶۲۳-۶۴۹-۶۵۰-۶۶۱-۶۶۴-۶۶۵-۶۷۴ تا ۶۷۸-۶۹۲-۷۰۱-۷۱۶ تا ۷۱۸-۷۵۷ تا ۷۶۰-۷۶۷-۷۶۸

فلسفۂ اخلاق
— ۷-۸-۲۲ تا ۲۸-۱۳۰-۱۳۱-۲۸۳ تا ۲۸۵-۳۴۵-۳۷۴

ادریس علیہ السلام-۱۸۱
— ان کی شخصیت کی تحقیق اور ان کے اٹھائے جانے کا مطلب ۲۷ تا ۲۴۷

آدم علیہ السلام-۷۳-۸۶
— قصہ آدم و ابلیس ۲۹-۳۰-۱۲۹-۱۳۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قرآن، اس میں قصے کس مقصد کے لیے بیان کیے گئے ہیں'')

آزمائش
— دنیا میں انسان کی آزمائش کس چیز کے لیے ہے؟ ۱۰-۱۱-۱۳۴-۱۳۵
— کس کس طرح ہوتی ہے؟ ۱۹۳-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۶-۲۸۵-۲۹۳-۴۴۴-۴۴۵
— دنیا میں ایمان لانے والوں کی آزمائش کس لیے کی جاتی ہے؟ ۴۴۴-۴۴۵-۶۷۴-۶۷۶ تا ۶۷۶-۶۸۰ تا ۶۸۳-۶۹۲
— اہل ایمان کی آزمائش کس طرح کی جاتی ہے؟ ۱۱۲-۱۱۳ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''دنیا'')

استیذان
— اس کے احکام ۳۷۵ تا ۳۷۹
— گھر کے بچوں اور خادموں کے لیے استیذان کے احکام ۴۲۰ تا ۴۲۳

اسحاق علیہ السلام-۷۰-۱۶۹-۶۹۴

اسرائیل-۷۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'')

اسلام
— وہ تمام انبیا کا دین تھا ۹۰-۱۴۳-۱۵۴-۱۶۳-۱۸۴-۱۸۵-۲۴۹-۲۵۸-۲۵۹-۲۷۳-۲۷۷-۲۸۱ تا ۲۸۳-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۷-۵۲۱-۵۷۲-۵۷۵-۵۷۹ تا ۵۸۲-۶۴۵ تا ۶۴۹-۶۸۶-۶۹۹
— لفظ اسلام کے معنی ۱۹۲
— لفظ مسلم کے معنی ۵۷۲
— اہل ایمان کا اصل نام مسلم ہے ۱۹۸-۶۰۸
— تمام انبیا کے پیرو مسلم تھے ۶۴۵ تا ۶۴۹
— ہر نبی کے پیرو اس وقت تک مسلم قرار پاتے ہیں جب تک وہ دوسرے نبی کا انکار نہ کر دیں ۷۳۰
— اس کو ملت ابراہیمی قرار دینے کی وجہ ۲۵۵
— اس کے دین فطرت ہونے کا مطلب ۷۵۲-۷۵۳
— نوع انسانی کا اصل دین اسلام ہی تھا اور دوسرے مذاہب اس کو بگاڑ کر بنائے گئے ہیں ۷۵۴-۷۵۵
— وہ بے دلیل عقائد کو غلط سمجھتا ہے ۱۴

— اس میں قبر پرستی کی سخت ممانعت ۱۸-۱۹
— مسلمانوں کو تمام کتب آسمانی پر ایمان لانے کا حکم ۷۰۹-۷۱۰
— دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور ۱۰-۱۱
— کس قسم کے انسان اس کے نزدیک قدر کے مستحق ہیں اور کون نہیں ہیں ۲۲-۲۳
— کفار کو راضی کرنے کے لیے دین میں کوئی ترمیم نہیں کی جاسکتی ۲۲ تا ۲۴
(اس کی اخلاقی تعلیمات کے لیے دیکھو ''اخلاق''۔ اس کے قوانین کے لیے دیکھو ''قانون اسلام'')

اسلامی ریاست
— اس کے کارفرماؤں اور کارکنوں کی صفات ۲۳۴
— اس کا مقصد ۲۳۴
— اس کا اسلامی تصور ۴۸۶-۴۸۷
(اسلامی دستور کے لیے دیکھو ''قانون اسلام''، ''دستوری قانون'' اور ''بنیادی حقوق'')

اسلامی نظام جماعت
— اسلام کا تصور قومیت - ۷۳۸-۷۳۹
— لفظ امت کے معنی ۲۸۲
— قوم پرستی اور وطن پرستی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر ۷۱۶-۷۳۸-۷۳۹
— جماعتی زندگی کے متعلق احکام ۴۲۵-۴۲۶
— اصلاح معاشرہ کے لیے اسلام کا پروگرام ۳۱۴ تا ۳۱۷-۳۲۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۵۲-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۰-۳۷۵ تا ۴۰۵

اسماعیل علیہ السلام -۲-۷-۱۸۱

آسمان -۲۴۸-۲۴۹-۲۷۰-۲۹۵

اصحاب الایکہ - ان کا علاقہ اور ان کی اصلیت ۵۳۱-۵۳۲

اصحاب الرس - ۴۵۱

اصحاب کہف -۶-۷
— ان کا قصہ ۱۱ تا ۲۱
— ان کے مقام کی تحقیق ۱۱-۱۲-۱۴-۱۹
— قرآن کے علاوہ ان کے قصے کی خارجی شہادتیں ۱۲
ان کے قصے سے آدمی کو کیا سبق ملتا ہے ۱۹-۲۰
— وہ غار میں کتنے سال رہے ۲۱

اصول فقہ
— امر کے صیغوں میں کوئی حکم بیان کرنا لازماً اس کے فرض و واجب ہونے کا ہم معنی نہیں ہے ۳۹۷-۴۰۰
— شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں اور ہر حکم کی کوئی حکمت ضرور ہے ۳۷۹-۳۸۳-۳۸۸-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳
— شریعت کے احکام کس حکمت پر مبنی ہیں ۳۱۴ تا ۳۱۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو قانون اسلام: ''اصول قانون'' اور ''فلسفۂ قانون'')

اِفک
— قصہ افک کی تفصیلات ۳۱۰ تا ۳۱۴-۳۶۳ تا ۳۶۵
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہؓ کی صفائی ۳۶۳ تا ۳۷۱
— اس قضیے میں کون کون لوگ شریک ہیں؟ ۳۶۵
— قصہ افک کا اصل بانی مبانی کون تھا؟ ۳۶۷
— قصہ افک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل ۳۱۳-۳۶۷

Maktaba Tul-Ishaat.com

— قصہ افک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دراصل حضرت عائشہؓ سے بدگمان نہ تھے ۳۱۳-۳۶۸-۳۶۹

— قصہ افک میں معاملے کی اصل نوعیت ۳۶۷-۳۷۰

— قصہ افک میں خیر کا پہلو ۳۶۵-۳۶۶

اقامت دین-(دیکھو "دعوت حق")

اقامت صلوٰۃ-(دیکھو "نماز")

الحاد-اس کا برا نتیجہ ۲۱۷

— الحاد فی الحرم کا مفہوم اور اس کا گناہ ۲۱۷

اللہ-احسن الخالقین ۲۷۰

— بصیر ۲۴۶-۲۵۲-۴۴۴

— تواب-۳۵۵

— حق-۳۷۴

— حکیم ۲۳۷-۳۵۵-۳۷۰-۴۲۲-۴۲۳-۵۵۷-۵۵۸-۶۹۴-۷۰۲-۷۵۰

— حلیم-۲۴۶

— حمید-۲۴۸

— حی و قیوم-۱۲۷

— خالق-۵۰۲

— خبیر-۲۴۷

— خیر الرازقین-۲۴۶

— رب السماوات والارض-۱۳-۷۶-۱۶۵

— رب العالمین ۴۸۳-۴۸۴-۴۹۲-۵۰۱-۵۰۷-۵۱۱-۵۱۸-۵۲۱-۵۲۷-۵۳۲-۵۳۴-۵۵۸-۵۸۱-۶۳۲

— رحمٰن ۶۳-۶۵-۶۹-۷۰-۷۳-۷۴-۷۶-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۷-۱۱۶-۱۲۵-۱۲۶-۱۵۴-۱۵۹-۱۶۰-۱۹۳-۴۴۶-۴۶۰-۴۶۱-۴۷۶

— رحیم ۲۴۸-۳۷۱-۳۷۲-۴۰۳-۴۲۶-۴۳۵-۴۶۷-۴۷۹-۴۹۸-۵۰۹-۵۱۷-۵۲۰-۵۲۶-۵۲۹-۵۳۴-۵۴۴-۵۵۹-۶۲۲-۷۳۱

— رؤف-۲۴۸-۳۷۱

— سمیع ۱۴۷-۲۴۶-۲۵۲-۳۷۱-۴۲۳-۶۷۷-۷۱۷

— عالم الغیب والشہادۃ ۲۹۷-۲۹۸

— عزیز ۲۳۴-۲۵۱-۴۷۹-۴۹۸-۵۰۹-۵۱۷-۵۲۰-۵۲۶-۵۲۹-۵۳۴-۵۴۴-۵۵۸-۶۰۳-۶۹۳-۷۰۲-۷۳۱-۷۵۰

— عفوّ-۲۴۶

— علی-۲۴۷

— علیم ۱۴۷-۲۳۷-۲۴۶-۳۷۰-۳۷۱-۳۹۸-۴۲۲-۴۲۳-۵۵۷-۶۰۳-۶۷۷-۷۱۷-۷۶۵

— غفور ۳۳-۲۴۶-۳۷۲-۴۰۳-۴۲۶-۴۳۵-۴۶۷-۵۵۹-۶۲۲

— غنی ۲۴۸-۵۷۷

— قدیر-۴۵۸-۷۶۵

— قوی ۲۳۳-۲۵۱

— کبیر ۲۴۷

— کریم ۵۷۷

-- لطیف ۲۴۷
-- مقتدر ۲۸
-- واسع ۳۹۸
-- اس کی صفات عالیہ کا جامع تصور ۴۳۱
-- بڑی برکت والا ۲۷۰-۴۳۱-۴۳۹-۴۴۰
-- اسی کے لیے حمد ہے ۹-۵۸۸-۶۰۸-۶۵۸-۷۱۹-۷۴۰
-- اسی کی تسبیح اور حمد ہونی چاہیے ۴۶۰-۵۵۸-۷۴۰
-- اس کے لیے برتر صفات ہیں ۸۸
-- کائنات میں اس کی صفت سب سے برتر ہے ۷۵۰
-- اس کے لیے اچھے ہی نام ہیں ۸۸
-- اس کے کمالات وعجائب بے پایاں ہیں ۵۰
-- وہ کائنات کا نور ہے ۴۰۵
-- اس کے نور کائنات ہونے کی تشریح ۴۰۶-۴۰۸
-- وہ کسی کا محتاج نہیں ہے ۲۴۸-۶۷۷
-- وہی باقی رہنے والا ہے ۱۰۷
-- وہ زندہ ہے' مرنے والا نہیں ۴۶۰
-- اس کے سوا سب ہلاک ہونے والے ہیں ۶۷۰
-- وہ سب سے برتر ہے ۱۲۸-۳۰۳
-- وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے ۲۴۸
-- اس کو بھول لاحق نہیں ہوتی ۶۷-۹۸
-- اسی کی بارگاہ رجوع کرنے کے لائق ہے ۴۶۷-۴۶۸
-- رحم فرمانے والا (ذوالرحمۃ) ۳۳
-- مغفرت فرمانے والا ۵۰۳
-- بندوں پر بڑا فضل فرمانے والا ۶۰۱
-- وہ مضطر کی دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے ۵۹۱
-- زمین وآسمان کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے ۴۱۲
-- کائنات کی ہر چیز اس کے آگے سربسجود ہے ۲۱۱
-- وہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۷۳۱
-- وہی مدد کا سہارا ہے ۱۹۳
-- اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ۱۹-۴۶۰-۶۰۳
-- بہترین حامی ومددگار ۲۵۵
-- اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۵۰-۸۷-۸۸-۸۹-۱۲۱-۱۹۲-۲۲۵-۲۷۳-۲۷۷-۳۰۳-۵۷۰-۶۵۸-۶۷۰
-- اس کے سوا کسی اور کو معبود پکارنا بے جا بات ہے ۱۳
-- وہی عبادت کا مستحق ہے ۶۷-۷۷-۸۹-۱۸۵-۶۸۷
-- وہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو ۷۶۰
-- خدائی میں اس کا کوئی شریک نہیں ۲۹۷
-- بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ۴۳۳
-- وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا ۲۱
-- اس کا کوئی بیٹا نہیں ۹-۶۷-۲۹۷-۴۳۲
-- اس کے لیے اولاد تجویز کرنا سخت حماقت اور جہالت ہے ۴۳۳
-- اس کے سوا دوسروں کو کارساز ٹھیرانے والے جہنمی اور کافر ہیں ۴۸
-- اس کی وحدانیت کے دلائل (دیکھو "توحید")
-- کائنات اور اس کی تمام چیزوں کا خالق ۸۷-۹۶-۹۷-۱۵۱-۱۵۵ تا ۱۵۷-۱۶۱-۴۳۳-۴۶۰-۵۸۹-۷۱۸

Maktaba Tul Ishaat.com

-- اس نے زمین و آسمان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے ۷۳۱
-- اس نے بلا شرکت غیرے تخلیق کا کام کیا ہے ۳۰
-- وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۶۵۷
-- وہی تمام جانداروں کا خالق ہے ۴۱۳
-- زندگی بخشنے والا ۱۵۶
-- اس کے سوا کسی میں طاقت نہیں کہ بے جان مادے میں جان ڈالے ۱۵۳
-- وہ بے جان مادے کو زندگی بخشتا ہے اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے ۴۲۷
-- وہی انسان کا خالق ہے ۲۶- ۴۵۸- ۵۳۳- ۷۶۰
-- اسی نے انسان کو حواس اور شعور کی طاقتیں دی ہیں ۲۹۴
-- اسی نے خلق کی ابتداء کی اور وہی اس کا اعادہ کرتا ہے ۵۹۳-۶۸۸-۶۸۹-۷۵۰
-- وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے ۲۰۳
-- وہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا نکالنے والا ہے ۵۶۹
-- اس کے سوا آسمان و زمین کی مخلوق کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ۲۱
-- وہ اپنی مخلوق کے حالات و ضروریات و مصالح سے باخبر ہے ۲۴۸
-- ہر جاندار کا رزق اسی کے ذمے ہے ۷۱۷
-- وہی رزق دینے والا ہے ۱۳۹-۵۰۲-۵۹۳-۷۶۰
-- اسی سے رزق مانگنا چاہیے ۶۸۷
-- اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے ۶۸۷
-- بندے کے لیے وہی سروسامان مہیا کرتا ہے ۱۴
-- رزق کی تنگی و کشادگی اسی کے اختیار میں ہے ۶۶۴-۷۱۸-۷۱۹-۷۵۷
-- بیماریوں میں وہی شفا دینے والا ہے ۵۰۲
-- کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب اور مالک ۷۶-۸۷-۱۵۲-۲۲۷-۲۴۸-۴۲۷-۴۸۴-۶۰۸
مشرق و مغرب کا رب ۴۸۵
.... اس کے سوا کوئی رب نہیں ۲۶
-- وہ حقیقی بادشاہ ہے ۱۲۸-۳۰۳
-- وہی کائنات کا حقیقی حکمراں ہے ۲۴۷- ۴۱۲- ۴۳۲
-- کائنات کے تخت سلطنت کا مالک ۱۵۳
-- عرش عظیم کا مالک ۲۹۵-۵۷۰
-- اس کے عرش پر مستوی ہونے کا مفہوم ۴۶۰
-- آسمانوں کا مالک ۲۹۵
-- ہر چیز کے خزانوں کا مالک ۷۶
-- ہر چیز پر نگراں ۲۱۱
-- ہر چیز پر اقتدار رکھنے والا ۲۹۵
-- ہر چیز کی تقدیر مقرر کرنے والا ۴۳۳
-- رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا ۲۴۶
-- فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کے لیے ہے ۶۷۰
-- کائنات کی ساری مخلوق اس کی مملوک ہے ۷۵۰
-- سب اس کے تابع فرمان ہیں ۷۵۰
-- اول و آخر تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۷- ۶۵۸-۷۳۰-۷۳۱

-- تمام معاملات کا انجام کار اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۳۴
-- تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۲۵۲
-- وہ محض خیالی معبود نہیں بلکہ فاعل مختار ہے ۲۰۲-۲۰۳
-- اس کے فرامین بدلنے کا کسی کو حق نہیں ۲۱
-- وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، اور سب اس کے سامنے جواب دہ ہیں ۱۵۴
-- جسے وہ ذلیل کرے اسے عزت دینے والا کوئی نہیں ۲۱۱-۲۱۲
-- اس سے بھاگ کر کوئی پناہ نہیں پا سکتا ۲۱-۶۷۹-۶۹۰
-- اس کے مقابلے میں کوئی پناہ دے نہیں سکتا اور جو اس کی پناہ میں ہو اس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ۲۹۶
-- اس کی پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکتا ۱۶۰
-- اس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں ۳۳
-- اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی ۶۷۶
-- اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ۶۹۰
-- زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے ۲۴۸-۲۹۴-۵۰۲-۷۶۰
-- فتح و کامرانی اسی کے بخشنے سے حاصل ہوتی ہے ۷۳۱
-- وہ غیر محسوس طریقوں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے ۷-۸-۲۴۸
-- وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۲۰۹-۲۱۲
-- اس کے کام کرنے کے انداز نرالے ہیں ۸۵-۸۶
-- جب تک وہ نہ چاہے کسی کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا ۲۰-۲۱-۲۷
-- وہ جس چیز کا حکم دیتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے ۶۷
-- وہی آسمان سے پانی برساتا ہے ۴۵۵-۵۸۹-۷۱۹-۷۲۰
-- وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے ۴۵۵-۵۹۳
-- اسی نے زمین کی چیزیں انسان کے لیے مسخر کی ہیں ۲۴۸
-- اسی نے انسان کو زمین میں اختیارات دیے ہیں ۵۹۱
-- اسی نے انسان کو زمین میں پھیلایا ہے ۲۹۴
-- وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے ۲۴۸
-- سورج اور چاند کو اسی نے مسخر کیا ہے ۷۱۸
-- گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ۲۹۴-۴۱۳
-- وہی روشنی اور سایہ لاتا ہے ۴۵۳
-- اسی نے رات سونے کے لیے اور دن کاروبار کے لیے بنایا ۴۵۴-۴۵۵-۶۵۹
-- اسی نے زمین کو جائے قرار بنایا ہے ۵۹۰
-- وہی زمین سے درخت اگاتا ہے ۵۸۹-۷۱۹
-- اسی نے زمین میں دریا جاری کیے ۵۹۰
-- اسی کے حکم سے کشتیاں چلتی ہیں ۲۴۸
-- اسی نے میٹھے اور کھاری پانیوں کے درمیان پردے حائل کر دیے ہیں ۴۵۷-۵۹۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ ہر چیز پر قادر ہے ۲۸-۲۰۳-۲۰۵-۴۱۳-۶۸۹-۷۶۴
— اس کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ۱۱-۱۲-۱۹-۲۰
— اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں ۱۹-۲۰
— آسمان و زمین کی ہر چیز اس کے دفتر میں محفوظ ہے ۶۰۲
— آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کو جانتا ہے ۲۴۹-۲۵۰
— آسمان و زمین کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ۸۷
— وہ کائنات کے سارے بھید جانتا ہے ۴۳۵
— وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے ۲۱-۹۵
— وہ آسمان و زمین کی ہر بات سنتا اور جانتا ہے ۱۴۷-۷۱۳
— وہ ہر مخفی اور ظاہر کو جانتا ہے ۱۹۲-۲۵۲-۵۷۰-۶۱۸
— وہ دلوں کے چھپے بھید تک جانتا ہے ۶۰۲
— وہ لوگوں کی نیتوں تک سے واقف ہے ۶۸۲
— وہ ان حقیقتوں کو جانتا ہے جن کو انسان نہیں جانتا ۳۷۰
— وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۴۰۸-۴۰۹-۴۲۷-۷۱۹
— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۱۲۱-۱۵۵-۱۷۶
— غیب کا علم اسی کو ہے، دوسرا کوئی عالم الغیب نہیں ۱۹-۲۱-۱۲۶-۲۹۵
— لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اس سے باخبر ہے ۳۸۳-۴۱۲-۴۱۶
— وہ تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۲۴۹-۶۰۸-۷۰۳-۷۰۸
— وہ دنیا کی ہر چیز کی رہنمائی کرتا ہے ۵۹۱-۵۹۲
— وہ صرف پیدا ہی نہیں کرتا بلکہ ہدایت بھی کرتا ہے ۹۶-۹۷
— وہی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے ۵۰۲
— ہدایت و نصرت کے لیے وہی کافی ہے ۴۴۸
— جسے وہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ بھٹکا دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۱۳-۱۴-۱۵-۴۱۲-۷۵۱
(مزید دیکھو ”تقدیر“)
— وہ کس طرح اہل حق کی ہدایت و نصرت کرتا ہے ۴۴۸
— وہ اہل حق کے ساتھ ہوتا ہے ۹۵
— وہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے ۲۱۷
— مومنوں کا مولیٰ ۲۵۵
— اس کی بندگی کرنے والا نامراد نہیں ہو سکتا ۲۴۷
— اس کی بندگی سے منہ موڑنے والا فلاح نہیں پا سکتا ۲۴۷
— نافرمان لوگ اس کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے ۶۷۶
— جس پر اس کا غضب نازل ہو وہ گر کر رہتا ہے ۱۱۲
— وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا ۶۲۷
— وہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا ۶۶۱-۶۶۲
— وہ خائن اور کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا ۲۳۱
— وہ دنیوی خوش حالی پر اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۶۶۱

— انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے ۶۸-۱۵۴
— اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۱۵۸-۴۱۲-۶۵۹-۶۷۰-۶۷۹-۶۸۹-۷۱۶
— تمام انسان اس کے حضور پیش ہونے والے ہیں ۲۸-۲۹-۱۵۰
— آخرکار وہی زمین اور اس کی ساری چیزوں کا وارث ہوگا ۶۸-۶۹
— بندوں کے اعمال اور نیتوں کا حساب اس کے ذمے ہے ۵۱۳-۵۱۴
— وہ ہر انسان کا مکمل ریکارڈ تیار کر رہا ہے ۲۹-۹۸
— بندوں کے گناہوں سے اسی کا باخبر ہونا کافی ہے ۴۶۰
— اس کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ۴۱۰
— قیامت کے روز حقیقی بادشاہی صرف اسی کی ہوگی ۴۴۶
— اسے عذاب دینے اور معاف کرنے کے پورے اختیارات ہیں ۶۸۹
— وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا ۲۹-۲۰۷-۵۳۹-۵۴۰-۷۰۱-۷۳۵
— وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرنے والا نہیں ۲۴۶
— (اس کی ہستی کے دلائل کے لیے دیکھو ''توحید'' اور ''شرک'')

الیاس علیہ السلام - ۶۰

امانت - اس کا وسیع مفہوم ۲۶۷
— مومن کی ایک لازمی صفت ۲۶۷

امت
— اس کے معنی کی تحقیق ۲۸۲

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
— اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں سے ہے ۲۳۴

انبیاء
— دیکھو ''نبوت''

انسان
— تخلیق انسانی کے متعلق قرآن کا بیان ۲۰۱-۲۰۲-۲۶۹-۴۵۸-۷۳۰ تا ۷۳۳-۷۴۲ تا ۷۴۸-۷۶۵
— اس کی پیدائش کے آغاز ہی میں اسے دنیا کے اندر زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بتا دیا گیا تھا ۱۲۹-۱۳۰-۱۳۴
— دنیا میں مقرر کیا ہوا خلیفہ ۵۹۱
— اس کے فطری گناہ گار ہونے کا عیسائی نظریہ غلط ہے ۷۵۲-۷۵۳
— وہ فطرتاً خدائے واحد کا بندہ پیدا ہوا ہے ۷۵۲-۷۵۳
— اس کے لیے اللہ کی بندگی کے سوا دوسرا کوئی چارۂ کار نہیں ۷۶-۷۷
— زمین کی چیزیں اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں ۲۴۸
— اس کی بنیادی ضروریات ۱۳۲
— اس کی زندگی کے تین مرحلے ۹۹
— وہ آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۱۳۴-۱۳۵
— اس سے شیطان کی ازلی دشمنی ۳۰
— اس کی فطری کمزوریاں اور خوبیاں ۲۰-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۲ تا ۱۳۵-۱۵۹-۳۴۹-۷۵۵ تا ۷۵۷
— اس کو حواس اور شعور کی طاقتیں کس لیے دی گئی ہیں ۲۹۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسے کفر و ایمان کا اختیار دیا گیا ہے ۲۳
— اللہ تعالیٰ اس سے کس قسم کا ایمان چاہتا ہے ۴۷۷-۴۷۸
— نیکی کے راستے پر چلنا اس کی مقدرت سے باہر نہیں ۲۸۷
— اچھے اور برے انسانوں کا فرق ۲۵ تا ۲۷
— اس کی اصلاح کس طرح ہوسکتی ہے؟ ۹۴
— اس کی سعادت و شقاوت کا انحصار کن چیزوں پر ہے؟ ۱۲۹-۱۳۰-۱۳۴
— اس کی تباہی کس راستے میں ہے؟ ۳۰ تا ۳۳-۴۹-۷۴-۷۵
— اس کی تہذیب کی اصل بنیاد کیا ہے؟ ۷۴۳ تا ۷۴۵
— وہ اللہ کی مشیت کا تابع ہے ۲۰-۲۸
— وہ خدا کے مقابلے میں بے بس ہے ۱۶۱-۲۰۳-۲۰۴
— اس کی موت و زیست خدا کے ہاتھ میں ہے ۲۴۸
— کسی انسان کے لیے ابدی زندگی نہیں ہے ۱۵۷-۱۵۸
— سب کو خدا کی طرف پلٹنا ہے ۱۵۸-۴۱۲-۶۵۹-۶۶۸-۶۷۰-۶۷۹-۶۸۹-۷۱۶
— انسان کو جواب دہی کے لیے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے ۲۸-۲۹-۶۸-۱۵۰-۱۵۴
— ہر انسان کے اعمال کا مکمل ریکارڈ تیار ہو رہا ہے ۲۹-۹۸
— ہر انسان اپنے عمل کا بدلہ پائے گا ۵۰-۹۰-۱۰۸-۱۳۴-۱۳۶-۱۵۵-۴۱۰-۴۴۱-۴۷۰-۴۷۱-۶۰۷-۶۰۸-۶۶۵-۶۷۸-۷۶۱-۷۶۲
— اس کے اپنے وجود میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ آخرت ہونی چاہیے ۷۳۱ تا ۷۳۳

انفاق فی سبیل اللہ

— اس کی تعریف ۲۲۶
— انفاق کرنے والوں کے لیے بشارت ۲۲۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'')

آیت - آیات

— بمعنی معرفت حق کے نشانات اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں ۱۴-۵۸-۵۹-۹۹-۱۰۰-۱۳۸-۱۵۶-۱۵۹-۱۶۰-۴۱۲-۴۱۳-۴۷۹-۵۳۶-۵۳۷-۶۰۶-۶۰۸-۷۰۳-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۷-۷۶۲
— بمعنی نشان عبرت ۲۷۶-۴۵۱-۴۹۸-۵۰۹-۵۱۷-۵۲۰-۵۲۶-۵۲۹-۵۳۴-۵۸۵-۶۸۶-۶۹۴-۶۹۸
— بمعنی معجزہ ۶۳-۶۴-۶۶-۶۷-۹۱-۹۴-۹۵-۱۰۰-۱۳۹-۱۴۸-۱۸۴-۲۷۹-۲۸۰-۴۷۶-۴۸۳-۵۲۴-۵۶۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۶۷
— بمعنی آیات کتاب اللہ و بمعنی ارشادات و احکام الٰہی ۳۲-۷۷-۱۴۰-۲۰۹-۲۳۷-۲۸۵-۲۸۸-۳۰۱-۴۲۱-۴۲۳-۴۲۵-۴۵۱-۴۶۹-۵۵۴-۶۰۴-۶۰۵-۶۱۳-۶۴۰-۶۶۷-۶۹۰-۷۱۰-۷۶۵
— جاہل انسان اللہ کی نشانیوں سے حقیقت تک پہنچنے کے بجائے الٹی گمراہی اخذ کرتے ہیں ۲۰
— آیات الٰہی کا انکار کرنے والے کس طرح گمراہ ہوتے ہیں ۷۸-۷۹-۱۳۶-۱۳۷

— اللہ کی آیات کو نہ ماننے والے کافر ہیں ۷۱۰
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے ظالم ہیں ۳۰۱-۳۰۲-۷۱۲
— اللہ کی آیات کو نظر انداز کرنے کا برا نتیجہ ۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۲۸۸-۲۸۹
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے اس کی رحمت سے مایوس ہیں ۶۹۰
— اللہ کی آیات کے خلاف سعی کرنے والوں کا برا انجام ۲۳۷
— اللہ کی آیات کا مذاق اڑانے والے کس انجام سے دوچار ہوں گے ۵۰
— اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کا برا انجام ۴۹-۳۰۱

ایمان

— مومن اور کافر کا فرق ۲۶۷-۶۸۱
— مومن کی صفات ۱۹-۲۰-۲۶۰ تا ۲۶۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۵-۴۲۵-۴۲۶-۴۶۱ تا ۴۷۱-۵۵۴-۵۵۵-۶۹۲
— ایمان کے تقاضے ۳۴۳-۳۴۵-۳۴۶-۳۹۶-۳۹۷-۴۱۵-۴۱۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۸۰-۶۸۲-۷۱۶ تا ۷۱۸
— رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا ۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۵۱۱-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۶-۵۳۲
— ایمان کے اثرات انسانی سیرت پر ۱۰۵ تا ۱۰۷-۴۹۲ تا ۴۹۴-۷۵۷-۷۵۸
— ایمان اور عمل صالح کا تعلق ۲۴-۲۵-۵۰-۷۵-۸۱-۱۰۷-۱۱۲-۱۲۷-۱۸۵-۲۰۸-۲۱۳-۲۳۶-۲۴۵-۲۶۸-۴۱۶-۴۶۶-۶۵۷-۶۶۳-۶۷۷-۶۷۸
— ایمان لانے والوں کے فرائض ۲۵۳-۲۵۴
— دنیا میں ایمان لانے والوں کی آزمائش کس لیے کی جاتی ہے؟ ۴۴۴-۴۴۵-۶۷۴ تا ۶۷۶-۶۸۰ تا ۶۸۳-۶۹۲
— مومنین صالحین کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ اور اس کی شرائط ۴۱۶-۴۱۷-۴۲۰
— اہل ایمان کو اللہ نے اپنے کام کے لیے منتخب کر لیا ہے ۲۵۴
— ایمان لانے والوں کو اللہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے ۲۳۸
— مومنوں کو اللہ محبوب خلائق بنا دیتا ہے ۸۱
— کفر و ایمان کی کش مکش میں اللہ مومنوں کے ساتھ ہوتا ہے ۲۳۰ تا ۲۳۲-۷۶۳
— مومن ہی فلاح پانے والے ہیں ۲۶۰-۲۶۸
— ایمان لانے کے اثرات و نتائج ۲۴-۲۵-۷۵-۷۶-۱۰۷-۲۱۳-۲۳۶-۲۳۷-۲۴۵-۴۷۰-۴۷۱-۶۵۷-۶۷۶-۶۷۹-۶۸۰
— مومن صالح قیامت کے روز عذاب سے محفوظ رہے گا ۴۶۶
— مومن کا اجر ضائع نہ ہو گا ۱۲۷
— مومن کے عمل صالح کی ناقدری نہ کی جائے گی ۱۸۵
— ضعف ایمان کے اخلاقی نتائج ۲۰۷-۲۰۸
— ایمان نہ لانے والوں کا انجام ۲۷۹
ایوب علیہ السلام ۱۷۸ تا ۱۸۰

Maktaba Tul Ishaat.com

ب

بائبل

— اس کے حوالے ۴۳-۴۶-۵۷ تا ۶۰-۶۱-۶۲-۶۸-۷۳-۹۳-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۴-۱۲۰-۱۶۹-۱۷۳-۱۷۵-۱۸۲-۱۹۱-۲۸۱-۳۲۱-۳۲۲-۵۲۹ تا ۵۳۲-۵۶۲-۵۶۹-۵۸۱-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۷-۶۲۸-۶۳۲-۶۴۰-۶۶۱-۶۶۲-۷۱۸

— وہ خود انبیائے بنی اسرائیل کو کس طرح برے رنگ میں پیش کرتی ہے؟ (دیکھو ''بنی اسرائیل'')

— بائبل اور قرآن کے اختلافات (دیکھو ''قرآن، بائبل اور تلمود سے اس کے اختلافات'')

— اس کا یہ بیان غلط ہے کہ شیطان نے پہلے حوا کو بہکایا تھا اور حوا نے آدم کو بہکایا ۱۳۲-۱۳۵-۱۳۶

— اس میں حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کا ذکر ۱۶۷-۱۶۸

— اس کی سِفرِ ایوب کی کمزوریاں ۱۷۸ تا ۱۸۱

— اس کے محرف ہونے کے ثبوت ۱۷۸ تا ۱۸۱-۱۹۱

بت پرستی

— اس کی سخت ممانعت ۲۲۲

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شرک'')

برزخ

— وہ عالم جس میں انسان موت سے قیامت تک رہے گا ۲۹۹-۳۰۰

برکت

— معنی کی تشریح اور اللہ کے بابرکت ہونے کا مفہوم ۲۷۰-۴۳۱-۴۳۹-۴۴۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

— ایک آیت کی حیثیت سے ۵۷۲

بشارت

— کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۲۲۵-۲۳۰

بنی اسرائیل

— حضرت یوسفؑ کے بعد مصر میں ان پر کیا گزری ۶۱۴-۶۱۵

— حضرت موسیٰؑ ان کی رہائی کے لیے فرعون کے پاس بھیجے جاتے ہیں ۹۵-۴۸۳

— فرعون کے عہد میں ان کی غلامانہ حیثیت ۲۸۰-۴۸۴

— ان پر فرعون کے مظالم ۹۵-۶۱۳ تا ۶۱۵-۶۱۶ تا ۶۱۸

— ان کی یہ غلط فہمی کہ وہ اللہ کے خاص بچے ہیں ۹۵

— مصر سے ان کے خروج کی کیفیت ۱۰۸-۱۰۹-۴۹۵

— کیا وہ فرعون کے بعد مصر کے مالک ہوئے ۳۴-۴۹۶-۴۹۷

— ان کا نظامِ کہانت ۵۷

— ان کا گوسالہ پرستی میں مبتلا ہونا ۱۱۳-۱۱۷

— ان کا اخلاقی و مذہبی انحطاط ۳۲۲

— اپنے انبیا پر ان کے گھناؤنے الزامات جنھیں قرآن نے صاف کیا ہے ۱۱۵ تا ۱۱۸-۵۶۴-۵۸۲-۶۲۲-۶۳۰-۶۳۱

— قرآن ان بہت سی باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن کے درمیان ان میں اختلاف ہے ۶۰۲

— حضرت داود و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ان کا عروج ۱۷۵-۱۷۷

— بابل کی اسیری سے ان کی رہائی ۴۴-۴۶-۴۷

— حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے زمانے میں ان کی اخلاقی و دینی حالت ۵۸-۶۲ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''موسیٰ''، ''داود''، ''سلیمان''، ''یحییٰ'' اور ''عیسیٰ'' علیہم السلام)

پ

پردہ
— اس کے احکام کس ترتیب سے نازل ہوئے ہیں؟ ۳۰۶-۳۰۷-۳۱۴ تا ۳۱۷
— اس کی فرضیت کا ثبوت ۳۱۸-۳۱۹
— اس کے احکام کس مقصد کے لیے ہیں؟ ۳۲۴
— اس کے احکام ۳۷۹ تا ۳۹۶-۴۲۳
— چہرے کے پردے کا حکم ۳۸۱-۳۸۲-۳۸۶
— عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں چہرے کا پردہ رائج تھا ۳۱۱-۳۱۲-۴۲۸
— عورتوں اور مردوں کے لیے ستر کے حدود ۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵
— برہنگی کی ممانعت ۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴
— شرم گاہوں کی حفاظت کا مطلب ۳۸۲-۳۸۴
— ستر اور حجاب کا فرق ۳۸۶
— اجنبی عورت کو دیکھنے کی ممانعت ۳۸۰
— اجنبی عورت کو کن کن صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے ۳۸۲
— عورت کے لیے اجنبی مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں احکام ۳۸۳-۳۸۴
— اجنبی مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی ممانعت ۳۹۵
— عورت کے لیے رقیق اور چست کپڑے پہننے کی ممانعت ۳۸۴-۳۸۵
— زینت کے معنی ۳۸۵
— اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کی تشریح ۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷
— زینت چھپانے کا منشا کس طریقے سے پورا ہوتا ہے ۳۸۶-۳۸۷
— حد اعتدال سے زیادہ بناؤ سنگھار کرنے کی ممانعت ۳۹۶
— محرم رشتہ داروں کے متعلق احکام ۳۸۷-۳۸۸
— غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے پردے کے حدود ۳۸۸-۳۸۹
— آبرو باختہ اور بد اطوار عورتوں سے بھی شریف خواتین کو پردہ کرنا چاہیے ۳۸۹-۳۹۰
— لونڈی، غلاموں اور تابع فرمان مردوں کے سامنے پردہ کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ ۳۹۰ تا ۳۹۳
— نوعمر لڑکوں کے سامنے پردے کا مسئلہ ۳۹۲-۳۹۳
— عورت کے لیے اپنی آواز، خوشبو اور زیور کی جھنکار مردوں کو سنانے کی ممانعت ۳۹۲-۳۹۳
— غیر محرموں سے خلوت کی ممانعت ۳۹۴
— غیر محرم کے جسم سے عورت کے جسم کا چھونا ممنوع ہے ۳۹۴
— عورت کے لیے تنہا سفر کرنا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا ممنوع ہے ۳۹۴-۳۹۵
— مساجد میں نماز کے لیے عورت کے آنے کا مسئلہ ۳۹۵-۳۹۶
— سن رسیدہ عورتوں کے لیے پردے کے احکام ۴۲۳
— تبرج کے معنی ۴۲۳

Maktaba Tul Ishaat.com

ت

تسبیح

-- بمعنی نماز ۱۳۸-۴۰۹-۷۴۰
-- لفظ تسبیح کے معنی ۷۴۰
-- سبحان اللہ کا مطلب ۵۵۸
-- اللہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو ۶۷-۶۸-۱۵۴
-- اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ۱۵۳-۲۹۷-۶۵۷-۷۶۰
-- اللہ ہی کی تسبیح ہونی چاہیے اور وہی اس کا مستحق ہے ۴۶۰-۵۵۸-۷۴۰
-- اسی کی تسبیح فرشتے کرتے ہیں ۱۵۲
-- اسی کی تسبیح زمین و آسمان کی ہر چیز کرتی ہے ۴۱۲
-- حضرت داودؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح کرنا ۱۷۴

تعزیر

-- حد اور تعزیر کا فرق ۳۲۸

تقدیر

-- اس عقیدے کی معنویت ۷-۸
-- ہر چیز کی حد اور مقدار مقرر کر دی گئی ہے جس سے کوئی شے تجاوز نہیں کر سکتی ۴۳۳-۴۳۴
-- اللہ کی مشیت کے مقابلے میں انسانی تدابیر کارگر نہیں ہوتیں ۲۰-۲۱-۲۷-۲۰۹-۲۱۰-۶۷۶
-- اللہ کی مشیت کس طرح کام کرتی ہے؟ ۷-۸-۳۴-۲۲۸
-- جب تک اللہ نہ چاہے کسی کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا ۲۰-۲۱-۲۷
-- ہر شخص اور قوم کی اچھی اور بری تقدیر کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۵۸۳
-- وہی ہر چیز کی تقدیر مقرر کرنے والا ہے ۴۳۳
-- اول و آخر تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۷-۶۵۸-۷۳۰-۷۳۱
-- اللہ نے ہر ایک کے لیے فیصلے کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے ۱۳۸
-- کوئی قوم اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے پہلے نہ ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد باقی رہ سکتی ہے ۲۷۹
-- رزق کی کمی و بیشی اللہ کے اختیار میں ہے ۶۶۴-۷۱۸-۷۱۹-۷۵۷
-- زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے ۲۴۸-۲۹۴-۵۰۲-۷۶۰
-- تمام معاملات کا انجام کار اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۳۴-۲۵۲
-- جسے وہ ذلیل کر دے اسے عزت دینے والا کوئی نہیں ۲۱۱-۲۱۲
-- فتح و کامرانی اسی کے بخشنے سے حاصل ہوتی ہے ۷۳۱
-- وہ جس چیز کا حکم دے وہ ہو کر رہتی ہے ۶۷
-- اللہ کی طرف سے انسان کا آزمائش میں ڈالا جانا ۸۰-۱۱۲-۱۳۵-۱۹۱-۱۹۲-۲۷۶-۲۷۷-۲۹۹-۷۶۶
-- جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے ۲۳
-- حق کا انکار کرنے والوں پر شیاطین مسلط کر دیے جاتے ہیں ۸۰

— اللہ تعالیٰ شیاطین کو فتنہ پردازی کا موقع کیوں دیتا ہے؟ ۲۳۸-۲۳۹
— اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے ۴۰۹-۴۱۳
— اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی ہدایت نہیں پا سکتا ۱۴-۱۵
— جسے وہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ بھٹکا دے اسے کوئی راہ راست نہیں دکھا سکتا ۱۴-۱۵-۴۱۲-۷۵۱
— اپنے نور کے ادراک کی توفیق وہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۴۰۹-۴۱۰
— انسان اپنے بل بوتے پر پاک نہیں ہو سکتا، پاکیزگی اللہ ہی کے فضل سے نصیب ہوتی ہے ۳۷۱-۳۷۲
— اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ وہ ہدایت کی اہلیت رکھنے والوں کو ہدایت دیتا ہے ۴۰۹-۴۱۰
— کیسے لوگوں کو قبول ہدایت کی توفیق نہیں دی جاتی؟ ۳۲-۳۳
— کیسے لوگوں کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے؟ ۷۶۷
— اللہ ان ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا جو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں ۶۴۴
— منکرین آخرت کے لیے اللہ ان کے اعمال کو خوش نما بنا دیتا ہے ۵۵۵-۵۵۶

تقویٰ

— اس کا مطلب ۱۹۹
— وہ صرف خدا سے ہونا چاہیے ۲۸۲
— اللہ کے ہاں اصل مقبولیت اسی کی ہے ۲۲۸-۲۲۹
— اس کے تقاضے ۲۲۳-۲۲۴- ۲۷۳- ۴۸۰- ۴۸۱-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۷- ۵۱۹- ۵۲۱- ۵۲۲- ۵۲۳- ۵۲۶-۵۳۱- ۵۳۲-۶۸۶-۶۸۷-۷۵۴
— متقین کی صفات اوران کا طرز عمل ۱۶۲-۱۶۳
— متقین کے لیے بشارت ۸۱
— تقویٰ کا انجام نیک ۷۶- ۷۷- ۸۰- ۱۳۹- ۵۰۶-۶۶۵

تلمود

— اس کے حوالے ۷۳- ۶۹۲- ۵۷۶- ۶۱۵- ۶۱۶- ۶۱۹- ۶۲۱- ۶۲۷- ۶۲۸- ۶۳۲- ۶۶۱-۶۶۲
(قرآن اور تلمود کے اختلافات کے لیے دیکھو ''قرآن، بائبل اور تلمود سے اس کے اختلافات'')

توبہ

— اس کی حقیقت ۱۳۰-۱۳۳-۱۳۴-۵۵۹
— کیسے لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے؟ ۱۳۰-۱۳۳-۱۳۴
— اس کے اخلاقی، معاشرتی اور اخروی نتائج ۷۵-۱۱۲-۳۴۲-۳۴۳-۳۵۳-۳۵۴-۴۶۶ تا ۴۶۸-۵۵۹-۶۵۷
— جرائم کے معاملے میں اس کا اثر کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ ۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴
— اس سے دنیوی سزا معاف نہ ہونے کی وجہ ۳۵۴

توحید

— اس کی تشریح اور اس کی حقیقت ۹۶-۹۷
— وہی حق ہے اور شرک باطل ہے ۲۴۷
— مشرکین کے تصورِ معبود اور اسلام کے تصورِ الٰہ کا

Maktaba Tul Ishaat.com

فرق ۴۸۶-۴۸۷
— صرف اللہ ہی عبادت کا مستحق کیوں ہے؟ ۵۰۲ تا ۵۰۴
— اس بات کا ثبوت کہ توحید کا اعتقاد انسان کی فطرت میں مضمر ہے ۷۵۲-۷۵۳
— توحید کے دلائل ۳۰-۳۱-۹۷-۹۹-۱۵۲ تا ۱۵۴-۲۰۳-۲۰۴-۲۱۲-۲۵۲-۲۵۳-۲۷۰-۲۷۳ تا ۲۸۲-۲۸۳-۲۹۴ تا ۲۹۸-۴۳۳-۴۴۴-۴۵۳ تا ۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۷۹-۴۸۶-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۱ تا ۵۰۴-۵۶۹-۵۷۰-۵۸۸ تا ۵۹۸-۶۰۶-۷۰۳-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۹-۷۴۲ تا ۷۵۰-۷۵۵-۷۵۶-۷۶۲ تا ۷۶۴
(واضح رہے کہ توحید کے دلائل ہی اللہ کی ہستی کے دلائل بھی ہیں)
— عقیدۂ توحید پر ایمان لانے کے تقاضے ۳۱-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۵-۲۵۶-۲۸۵-۲۸۶
— اللہ کی ربوبیت تسلیم کرنے کے تقاضے ۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷

تورات

— اس کی تعریف ۱۶۲-۱۶۳-۶۳۹-۶۴۰
— قرآن اور تورات ایک دوسرے کے مؤید ہیں ۶۳۶-۶۴۴
— وہ کب نازل ہوئی؟ ۱۱۱-۲۸۰-۶۳۹

توکل

— اس کی حقیقت ۵۴۴-۷۱۷
— توکل صرف اس زندہ خدا پر ہونا چاہیے جو مرنے والا نہیں ۴۶۰
— وہ اس ہستی پر ہونا چاہیے جو سب پر غالب اور رحیم ہے ۵۴۴
— حق پرست انسان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ۶۰۳
— اللہ کے بھروسے پر راہ حق میں استقامت دکھانے والوں کا انجام نیک ۷۱۶-۷۱۷

ث

ثمود-۲۳۴-۴۵۱-۵۸۱ تا ۵۸۶-۶۹۹
— قوم ثمود کا علاقہ ۷۰۰
— اس کے حالات ۵۲۱ تا ۵۲۳-۵۲۶
ثواب-۲۷-۶۶۳

ج

جادو
— اس کی حقیقت ۱۰۰-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۲۹۶
— اس کی تاثیر ۴۹۲
— زمانۂ جاہلیت میں اس کے متعلق لوگوں کے تصورات ۵۲۴
— معجزے اور جادو کا فرق ۴۸۰-۴۸۱-۴۸۹-۴۹۲-۵۶۰-۵۶۱-۶۳۵
— نبی اور جادوگر کا فرق ۴۹۰-۴۹۱
— کیا ایک نبی پر جادو ہوسکتا ہے؟ ۱۰۴
جبر وقدر-(دیکھو"تقدیر")
جرم
— شرک کرنے والے مجرم ہیں ۳۱-۸۰-۸۱
— اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے والے مجرم ہیں ۱۲۱
— انبیا کی دعوت سے بے پروائی کرنے والے مجرم

ہیں ۷۶۶
— انبیا کی مخالفت کرنے والے مجرم ہیں ۴۴۵-۴۴۷-۷۶۳
— اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے مجرم ہیں ۷۳۶
— آخرت کو نہ ماننے والے مجرم ہیں ۴۴۵-۶۰۰
— گمراہ کرنے والے پیشوا مجرم ہیں ۵۰۷
— قرآن مجرموں کو سخت ناگوار گزرتا ہے ۵۳۷-۵۳۸
— مجرموں کی کبھی مدد نہ کرنی چاہیے ۶۲۳
— مجرمین کا انجام بد ۳۱-۸۰-۱۰۷-۱۲۱-۷۳۶-۷۶۳-۷۶۶
— توبہ سے جرائم کی سزا دنیا کی عدالت میں معاف نہیں کی جا سکتی ۳۵۴

جزا و سزا
— اللہ کے ہاں جزا و سزا کس قاعدے پر مبنی ہے؟ ۶۰۷-۶۷۶
— نیکیوں کی جزا دینے میں اللہ کا قانون بدی کی سزا سے مختلف ہے ۶۶۵-۶۷۸-۶۷۹
— اللہ کے ہاں قصوروار کے سوا کسی کو خطرہ نہیں ۵۵۹-۵۶۰
— اللہ کے فرامین کو بدلنے کی سخت پاداش ۲۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "اجر")

جن - ان کی حقیقت ۳۰
— حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے جانے والے جن کون تھے؟ ۱۷۷-۱۷۸-۵۶۲-۵۷۵-۵۷۶

جنت - اس کی کیفیت ۲۵-۴۷-۷۵-۴۴۱-۴۷۰-۴۷۱-۷۱۶
— جنت کی زندگی اور دنیا کی زندگی کا فرق ۱۳۲-۱۳۳-۱۳۵
— وہ اوصاف جو آدمی کو جنت کا مستحق بناتے ہیں ۲۵۸-۲۶۸
— خدا کی نافرمانی کرنے والے کے لیے جنت میں رہنا غیر ممکن ہے ۱۳۲-۱۳۳
— جنت کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۲۴-۲۵-۵۰-۷۵-۷۶-۲۴۵-۴۴۱-۴۷۰-۴۷۱-۵۰۶-۷۱۶-۷۳۸
— اس کے قیام کی ابدیت ۹-۵۰-۱۰۸-۱۸۸-۲۶۸-۴۴۱-۴۷۱-۷۱۶
— وہاں آدم وحوا کا قیام اور امتحان ۱۳۲-۱۳۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "فردوس")

جہاد فی سبیل اللہ
— اس کے معنی ۲۵۳-۲۵۴
— مجاہدہ کے معنی ۶۷۷-۶۷۸
— کفار سے جہاد کبیر کرنے کا مطلب ۴۵۷
— وہ مجاہدہ کرنے والوں ہی کے لیے مفید ہے، اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے ۶۷۷-۶۷۸
— اللہ اپنی راہ میں مجاہدہ کرنے والوں کی خود رہنمائی کرتا ہے ۷۲۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "قتال فی سبیل اللہ")

جہنم
— اس کی حقیقت و کیفیت ۲۴-۱۰۷-۱۸۸-۲۱۳-۳۰۱-۴۴۰-۴۴۱-۷۱۵
— وہ بری جائے قیام ہے ۴۶۳
— ہر انسان اس پر وارد ہو گا ۷۷-۷۸
— وہاں پیروؤں اور پیشواؤں کا ایک دوسرے سے جھگڑا ۵۰۷-۵۰۸

Maktaba Tul Ishaat.com

فرق ۴۸۶-۴۸۷

— صرف اللہ ہی عبادت کا مستحق کیوں ہے؟ ۵۰۲ تا ۵۰۴

— اس بات کا ثبوت کہ توحید کا اعتقاد انسان کی فطرت میں مضمر ہے ۵۲-۷۵۳

— توحید کے دلائل ۳۰-۳۱-۹۷-۹۹-۱۵۲ تا ۱۵۴-۲۰۳-۲۰۴-۲۱۲-۲۵۲-۲۵۳-۲۷۰ تا ۲۷۳-۲۸۲-۲۸۳-۲۹۴ تا ۲۹۸-۴۳۳-۴۴۴-۴۵۳ تا ۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۷۹-۴۸۶-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۱ تا ۵۰۴-۵۶۹-۵۷۰-۵۸۸ تا ۵۹۸-۶۰۶-۷۰۳-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۹-۷۴۲ تا ۷۵۰-۷۵۵-۷۵۶-۷۶۲ تا ۷۶۴

(واضح رہے کہ توحید کے دلائل ہی اللہ کی ہستی کے دلائل بھی ہیں)

— عقیدۂ توحید پر ایمان لانے کے تقاضے ۳۱-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۵-۲۵۶-۲۸۵-۲۸۶

— اللہ کی ربوبیت تسلیم کرنے کے تقاضے ۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷

تورات

— اس کی تعریف ۱۶۲-۱۶۳-۶۳۹-۶۴۰

— قرآن اور تورات ایک دوسرے کے مؤید ہیں ۶۳۶-۶۴۴

— وہ کب نازل ہوئی؟ ۱۱۱-۲۸۰-۶۳۹

توکل

— اس کی حقیقت ۵۴۴-۷۱۷

— توکل صرف اس زندہ خدا پر ہونا چاہیے جو مرنے والا نہیں ۴۶۰

— وہ اس ہستی پر ہونا چاہیے جو سب پر غالب اور رحیم ہے ۵۴۴

— حق پرست انسان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ۶۰۳

— اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں استقامت دکھانے والوں کا انجام نیک ۷۱۶-۷۱۷

ث

ثمود-۲۳۴-۴۵۱-۵۸۱ تا ۵۸۶-۶۹۹

— قوم ثمود کا علاقہ ۷۰۰

— اس کے حالات ۵۲۱ تا ۵۲۳-۵۲۶

ثواب-۲۷-۶۶۳

ج

جادو

— اس کی حقیقت ۱۰۰-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۲۹۶

— اس کی تاثیر ۴۹۲

— زمانہ جاہلیت میں اس سے متعلق لوگوں کے تصورات ۵۲۴

— معجزے اور جادو کا فرق ۴۸۰-۴۸۱-۴۸۹-۴۹۲-۵۶۰-۵۶۱-۶۳۵

— نبی اور جادوگر کا فرق ۴۹۰-۴۹۱

— کیا ایک نبی پر جادو ہو سکتا ہے؟ ۱۰۴

جبر و قدر-(دیکھو ''تقدیر'')

جرم

— شرک کرنے والے مجرم ہیں ۳۱-۸۰-۸۱

— اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے والے مجرم ہیں ۱۲۱

— انبیا کی دعوت سے بے پروائی کرنے والے مجرم

— قرآن مجید میں احکام کس حکمت کے ساتھ دیے گئے ہیں ۳۱۴ تا ۳۱۷
— قرآن کس طرح اپنے احکام کی مصلحتیں بیان کرتا ہے؟ ۳۷۹-۳۸۳-۳۸۸-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳
حوا- قرآن اس کی تردید کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو بہکانے میں وہ شیطان کی ایجنٹ بنیں ۱۳۲-۱۳۵-۱۳۶
حیات بعد الموت- دیکھو ''زندگی بعد موت'' اور ''آخرت''
حیات دنیا- دیکھو ''دنیا''

خ

ختم نبوت- ۱۴۴
خسران- دنیا اور آخرت میں خسران کیسے لوگوں کے لیے ہے ۲۰۷-۲۱۳
خشوع- اس کے معنی اور حقیقت ۲۶۱
خضر ۷-۸-۳۷-۳۸
— کیا وہ انسان تھے؟ ۴۰ تا ۴۲
خلافت- اس کے معنی ۴۱۸-۴۱۹-۵۹۲
— اللہ نے انسان کو زمین کی خلافت دی ہے ۵۹۱
— اس دنیا میں انسان کو صرف آزمایشی خلافت دی گئی ہے نہ کہ مستقل خلافت ۱۳۴-۱۳۵
— صرف مومنین صالحین ہی حقیقی خلافت کے حامل ہوتے ہیں ۴۱۷ تا ۴۱۹
(مزید تشریح کے لیے دیکھو ''وراثت زمین'')
— اہل ایمان کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ اور اس کی شرائط ۴۱۶-۴۱۷-۴۲۰
— رسولؐ کی اطاعت اسلامی خلافت کی لازمی شرط ہے ۴۲۰
خلفائے راشدینؓ- ان کی خلافت پر قرآن کی مہر تصدیق ۴۱۹

د

دابۃ الارض ۲۰۴-۲۰۵
داود علیہ السلام- ان کا قصہ ۱۷۳ تا ۱۷۶-۵۶۰-۵۶۱
— ان کے لیے لوہے کو نرم کیے جانے کا مطلب ۱۷۵-۱۷۶
دعا- دین میں اس کی اہمیت ۴۷۱
— اللہ مضطر کی دعا سنتا اور اس کی تکلیف رفع کرتا ہے ۵۹۱
— حرام خوری کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی ۲۸۲
— مشرک کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی جاسکتی ۵۰۵-۵۰۶
— غیر اللہ سے دعا مانگنے کی غلطی ۲۵۱
— اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنے کا برا انجام ۲۰۷-۲۰۸
دعوت حق- اس کا صحیح طریقہ (دیکھو ''حکمت تبلیغ'')
— یہ کام کرنے والا اللہ کا مددگار ہے ۲۳۳
— اس میں صبر کی اہمیت وضرورت ۷۶-۷۷-۸۶
— اس میں نماز کی اہمیت ۸۶
— اس کے لیے کس طرح کام کرنا چاہیے؟ ۴۵۷
— اس کے کارکنوں کو خدا پرستی کی راہ میں کیا کچھ کرنا چاہیے ۱۶ا۷ تا ۷۱۹
— اس کام کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

طاقت حاصل کرنے کے ذرائع ۷۰۳-۷۰۸
— وہ کن مرحلوں سے گزر کر کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے ۱۲-۱۳-۱۴-۱۶-۱۹-۳۴-۳۵-۵۲-۵۳-۵۶-۷۱-۸۱
— اس راہ میں کام کرنے والوں کو اللہ کی ہدایت و نصرت کس طرح حاصل ہوتی ہے ۴۴۸-۴۴۹-۷۲۱
داعی حق میں کیا صفات ہونی چاہییں؟ ۷۶۷-۷۶۸
— اس کو سب سے پہلے اپنے قریب ترین لوگوں کو دعوت دینی چاہیے ۵۴۱ تا ۵۴۳
— اس کو دین میں مداہنت و مصالحت پر آمادہ نہ ہونا چاہیے ۲۲ تا ۲۴
— اس کی نگاہ میں صرف ان لوگوں کی اہمیت ہونی چاہیے جو طالب حق ہوں ۲۱-۲۲
— اسے لوگوں کے معاشرتی مرتبے کو نہیں بلکہ قبول حق کی آمادگی کو دیکھنا چاہیے ۵۱۳ تا ۵۱۵
— اس کا سلوک اپنے پیروؤں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے ۵۱۳-۵۱۴-۵۴۱-۵۴۳

دنیا
— حیات دنیا کی حقیقت اور دنیوی زندگی کا اسلامی تصور ۱۰-۱۱-۲۸-۳۴
— یہ دارالجزا نہیں بلکہ دارالامتحان ہے ۲۸۴
— دنیوی زندگی دراصل وہ قوت ہے جو امتحان کے لیے انسان کو دیا گیا ہے ۸۰-۱۳۵-۱۹۳-۲۸۲
— دنیا میں زندگی بسر کرنے کا غلط طریقہ ۴۹-۵۰
— خدا کی ہدایت سے منہ موڑنے والے کی دنیا بھی خراب ہوتی ہے ۱۳۴
— دنیا کوئی کھیل کا میدان نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ نظام ہے ۱۵۱-۱۵۲
— وہ کس معنی میں لہو ولعب ہے ۷۱۹
— یہاں جو کچھ کسی کو ملتا ہے آزمایش کے لیے ملتا ہے ۱۹۱-۱۹۲
— یہاں لازماً ہر شخص اور ہر قوم کا امتحان ہو رہا ہے ۲۷۶-۲۷۷
— یہاں آدمی کا امتحان کس طرح لیا جارہا ہے ۲۹۹
— دنیا کی زندگی میں امتحان کس چیز کا ہے ۱۳۴-۱۳۵-۱۵۸-۱۵۹
— دنیا میں انسان کے امتحان کا وقت موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے ۶۶۷-۶۶۷
— یہاں کی بدحالی مغضوب خدا ہونے کی علامت نہیں ہے ۲۵۹-۲۶۰
— دنیا پرست لوگ ہمیشہ حق اور باطل کا معیار دنیا کی خوش حالی ہی کو سمجھتے رہے ہیں ۵۱۳-۵۱۶
— دنیوی نعمتوں کو نادان لوگ ہمیشہ سے مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہونے کی علامت سمجھتے رہے ہیں ۷۷-۷۸-۷۹-۶۶۲-۶۶۴
— اللہ [illegible] خوشحالی پر اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۶۶۱
— دنیوی نعمتیں اس بات کی علامت نہیں ہیں کہ نعمت پانے والا اللہ کا محبوب ہے بلکہ یہ صرف آزمایش کا سامان ہیں ۲۶-۱۳۹-۱۸۹ تا ۱۹۲-۲۵۹-۲۶۰-۲۸۳-۲۸۴
— غافل انسان دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو سے

کس طرح دھوکا کھاتے ہیں؟ ۳۴-۳۵-۴۸-۴۷-
۷۹- ۱۶۱- ۱۶۲- ۲۸۸-۴۴۳- ۵۲۰- ۵۲۱-
۵۲۲- ۵۵۶- ۶۰۱- ۶۰۲- ۶۵۱- ۶۵۲-
۶۶۳-۶۶۴-۷۲۸-۷۳۱

— نادان لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ دین حق کی پیروی اختیار کرنے سے آدمی کی دنیا برباد ہو جاتی ہے ۶۵۰

دنیا کی خوش حالی میں مست رہنے والے لوگ ہمیشہ انبیا کو جھٹلاتے رہے ہیں ۲۷۷

— دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج حق و باطل کے معیار نہیں بن سکتے ۲۸۳ تا ۲۸۵-۴۴۰-۴۴۱

— آخرت سے بے پروا ہو کر دنیوی زندگی پر مطمئن ہو جانے کا انجام ۴۹-۵۰

— دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے وجوہ ۶۵۴-۶۵۵-۷۱۹-۷۲۰

— دین کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا ترک کر دے ۲۸۲-۶۵۵-۶۶۱

— قیامت کے روز مجرموں کو اپنی دنیا کی زندگی چند روزہ محسوس ہو گی ۱۲۳-۱۲۴-۳۰۲-۷۶۶

— ہلاکت کے بعد پھر دنیا میں پلٹ کر آنا غیر ممکن ہے ۱۸۵-۱۸۶-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۲

دوزخ -دیکھو ''جہنم''

دہریت

— اس کی تردید کے دلائل کے لیے (دیکھو: ''توحید، اس کے دلائل'' اور ''شرک، اس کی تردید کے دلائل'' نیز صفحات ۵۸۹-۵۹۰-۵۹۳-۵۹۴)

— دنیا کے ازلی اور ابدی ہونے کا نظریہ باطل ہے ۷۳۳-۷۳۴

— دہریت کے اثرات انسانی اخلاق پر ۷۶۱

دین

— اسلام کے دین فطرت ہونے کا مفہوم ۷۵۲-۷۵۳

— تمام انسانوں کا دین ایک تھا اور یہ مذاہب اس کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں ۱۸۴ تا ۱۸۶-۷۵۴-۷۵۵

— خدا کی طرف سے ایک ہی دین آیا ہے اور مختلف مذاہب لوگوں کے من گھڑت ہیں ۲۵۹

— تمام انبیاء کا دین ایک ہی تھا' بعد میں لوگوں نے مختلف مذاہب بنا لیے ۲۸۲-۲۸۳

— شریعتوں کے اختلاف کے باوجود تمام انبیاء کا دین ایک ہی رہا ہے ۲۲۵-۲۲۶-۲۴۹-۲۵۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

— صرف عبادات ہی کا نام دین نہیں ہے بلکہ قانون بھی دین ہے ۳۱۹-۳۴۳

— قانون الٰہی کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ نہ کرانے والے مومن نہیں ہیں ۴۱۴-۴۱۵

— خدا کے دین میں کوئی تنگی نہیں ہے ۲۵۴

— دین میں تفرقے کی ممانعت ۷۵۴-۷۵۵

— دین کی پیروی کس طرح ہونی چاہیے؟ ۷۵۲-۷۵۴-۷۶۱

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام'')

ذ

ذبیحہ

— اس امر کی دلیل کہ صرف وہی جانور حلال ہے جسے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو ۲۱۹

Maktaba Tul Ishaat.com

ذوالقرنین - ۷-۸-۴۲ تا ۴۷
-- اس کا قصہ بیان کرنے کا مقصد ۴۷ - ۴۸
-- وہ کون تھا ۴۲-۴۴
ذوالکفل علیہ السلام ۱۸۱-۱۸۲

ر

رب
-- انسان کا رب وہی ہے جو کائنات کا رب ہے ۱۳-۱۶۵-۱۸۴-۱۸۵
رب صرف اللہ ہے ۲۶
لفظ رب کے مفہوم کی وسعت اور اللہ کے لیے ربوبیت کے مخصوص ہونے کا مطالب ۹۶-۹۷
اللہ کے سوا کسی اور کے رب نہ ہونے کی دلیل ۹۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو' اللہ')
رجم
-- ان لوگوں کے خیال کی غلطی جو شادی شدہ زانی کی سزا رجم کو خلاف قرآن قرار دیتے ہیں ۳۲۷
-- عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں سزائے رجم کی نظیریں ۳۳۵ تا ۳۳۷-۳۳۹-۳۴۲
-- تورات کے قانون میں رجم کی سزا ۳۲۲
رزق
-- اللہ اپنی ہر مخلوق کے رزق کا انتظام کرتا ہے ۱۷
-- اللہ کے رزق سے مراد رزق حلال ہے ۱۳۹
-- اسلام میں رزق حلال کی اہمیت ۲۸۲
-- اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے ۴۱۰
-- اللہ جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے ۴۶۲-۷۱۸-۷۱۹-۷۵۷
-- وہ اللہ کا فضل ہے ۴۷-۷۴۸-۷۶۲
رسالت - دیکھو' نبوت'
رسول - اس کے معنی کی تحقیق ۷۱

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو' نبوت')
رہبانیت
-- اسلام میں رہبانیت نہیں ہے ۲۸۲-۶۵۵-۶۶۱

ز

زبور-۱۸۹-۱۹۱
زکریا علیہ السلام ۵۷-۱۸۳
زکوٰۃ - اس کے معنی کی تحقیق ۲۶۳
زکوٰۃ بمعنی پاکیزگی ۶۱
-- زکوٰۃ بمعنی تزکیہ ۲۶۲-۲۶۳
زکوٰۃ مال ادا کرنے کا حکم ۲۵۵
-- اس کا ادا کرنا ایمان لانے والوں کی لازمی صفت ہے ۵۵۴
-- یہ تمام انبیا علیہم السلام کے دین میں فرض تھی ۶۲-۷۲-۱۷۰
-- اس کا انتظام اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں سے ہے ۲۳۴-۴۲۰
-- دنیا میں مستغرق ہو کر زکوٰۃ سے غفلت نہ کرنے والے ہی ہدایت پاتے ہیں ۴۰۹
-- اس سے مال گھٹتا نہیں بڑھتا ہے ۷۵۹-۷۶۰
زنا
-- اس کے گناہ اور بدی ہونے پر ہر زمانے میں عام اتفاق رہا ہے ۳۱۹-۳۲۰
-- اس کے اخلاقی و اجتماعی نقصانات ۳۱۹-۳۲۰
-- اس کی تعریف، اس کے جرم ہونے، اور اس کی سزا کے مسئلے میں اسلامی قانون اور غیر اسلامی قانون کا اختلاف ۳۲۰-۳۲۳
-- اس کے جرم ہونے کے متعلق اسلامی قانون کا نقطۂ نظر ۳۲۳-۳۲۴

— اس کے انسداد کے لیے اسلام کی اصلاحی تدابیر ۳۲۴-۳۲۵-۴۰۳-۴۰۴
— قحبہ گری کا سد باب ۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵
— اس کے متعلق اسلامی قانون کا تدریجی ارتقا ۳۲۵-۳۲۶
— اس کی حرمت ۴۶۴-۴۶۵
— اس کی سزا ۳۱۹-۳۲۰
— اس کی سخت سزا کس مصلحت سے رکھی گئی ہے ۳۲۵
— شادی شدہ زانی اور غیر شادی شدہ زانی کا فرق ۳۲۳ تا ۳۲۵
— شادی شدہ زانی کی سزا از روئے سنت ثابتہ ۳۲۶-۳۲۷
— تورات کے قانون میں رجم کی سزا ۳۲۱
— ان لوگوں کے خیال کی غلطی جو رجم کو قرآن کے خلاف قرار دیتے ہیں ۳۲۷
— کیا ذمی زانی کو رجم کی سزا دی جا سکتی ہے ۳۲۹-۳۳۰
— کس فعل پر جرم زنا کا اطلاق ہوگا اور کس پر نہیں ہوگا ۳۲۸
— فعل مباشرت سے کم تر اختلاط کی صورت میں شریعت کا حکم ۳۲۸-۳۲۹
— کس حالت میں ایک شخص کو زنا کا مجرم قرار دیا جائے گا ۳۲۹ تا ۳۳۱
— زنا بالجبر کی صورت میں جس پر جبر کیا گیا ہو وہ سزا کا مستحق نہیں ہے ۳۳۱-۴۰۳-۴۰۴
— زانی اور زانیہ پر صرف اسلامی حکومت کے تحت ہی حد جاری کی جا سکتی ہے ۳۳۱-۳۳۲
— حد زنا غیر مسلموں پر جاری ہوگی یا نہیں؟ ۳۳۲
— زانی کے لیے اقرار جرم شرعاً لازم نہیں ہے ۳۳۲
— جرم زنا کی خبر حکام تک پہنچانا شرعاً لازم نہیں ہے ۳۳۲-۳۴۶
— حکومت تک اطلاع پہنچ جانے کے بعد مجرم کو معاف نہیں کیا جا سکتا ۳۳۲
— یہ جرم قابل راضی نامہ نہیں ہے ۳۳۲
— عصمت کا معاوضہ مالی تاوان کی صورت میں ادا نہیں کیا جا سکتا ۳۳۲
— جرم زنا کی کوئی سزا ثبوت جرم کے بغیر نہیں دی جا سکتی ۳۳۳
— ثبوت جرم کے بغیر محض شبہے کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی خواہ شبہات کتنے ہی قوی ہوں ۳۳۲-۳۳۳-۳۵۷
— ثبوت جرم کی شرائط ۳۳۳
— کیا محض حمل کا پایا جانا عورت کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی شہادت یا قرینہ ہے؟ ۳۳۳
— اگر گواہوں کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا گواہوں پر قذف کا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے؟ ۳۳۴
— ملزم کا اقرار کس صورت میں قبول کیا جائے گا؟ ۳۳۵-۳۳۶
— اگر ملزم اپنے اقرار سے پھر جائے ۳۳۵-۳۳۶
— حاملہ عورت پر حد جاری کرنے کا مسئلہ ۳۳۶
— اسلامی شریعت کھوج لگا لگا کر مجرموں کو نہیں پکڑنا چاہتی ۳۲۸-۳۲۹-۳۳۲-۳۳۳-۳۵۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ سزا جو ثبوت جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو دی جائے گی ۳۳۷ تا ۳۴۶
— سزا علی الاعلان دی جانی چاہیے ۳۴۴-۳۴۵
— ضرب تازیانہ لگانے کا طریقہ اور اس کی شرائط ۳۴۰ تا ۳۴۲
— مجرم کو سزا دینے کے بعد اس کے ساتھ عزت کا برتاؤ ۳۴۲-۳۴۳
— زانی اور زانیہ کا باہم نکاح ۳۴۶
— زنا کے مقدمات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں ۳۲۸-۳۲۹-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۴-۳۳۵ تا ۳۴۱-۳۴۶-۳۵۳
— اگر مرد اپنی بیوی کو غیر شخص سے ملوث دیکھ لے تو کیا اسے قتل کر سکتا ہے؟ ۳۵۹
— جانور سے مجامعت کی سزا ۳۴۳
زندگی - اس کا آغاز پانی سے ہوا ۱۵۵-۱۵۶
زندگی بعد موت
— مردہ انسان قیامت کے روز زندہ کیے جائیں گے ۶۷-۷۶-۷۷-۹۹-۵۰۲
— دوبارہ زندہ کیے جانے کی کیفیت ۱۳۴-۱۳۵-۷۴۹
— اس کے امکان اور وقوع کے دلائل ۷-۲۰۱-۲۰۳ تا ۲۰۶-۵۹۳-۵۹۴-۶۸۸-۶۸۹
— اصحاب کہف کا قصہ اس کے وقوع کے دلائل میں سے ہے ۱۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت'' اور ''قیامت'')

س

ساعت - دیکھو ''قیامت''
سامری - ۱۱۳ تا ۱۲۱
سبا - قوم سبا کا حال ۵۶۸-۵۶۹
— ملکہ سبا کا قصہ ۵۶۸ تا ۵۸۱
سجدۂ تلاوت ۲۱۲-۲۵۲-۲۵۳-۲۶۰-۴۶۰-۵۷۰
سحر - دیکھو ''جادو''
سلیمان علیہ السلام - قصہ سلیمان علیہ السلام ۱۷۳ تا ۱۷۸-۵۶۰-۵۸۱-۵۸۲
— ان کے حالات ۵۶۲
— ان کی دعوت کیا تھی؟ ۵۷۲-۵۷۴
— گمراہ لوگوں نے ان کی طرف جادو ٹونے کو منسوب کیا ۱۴
— بکریوں کے مقدمے میں ان کا فیصلہ ۱۷۳-۱۷۴
— ان کے لیے ہوا کے مسخر ہونے کا مطلب ۱۷۶-۱۷۷
— ان کے لیے جنوں کا مسخر کیا جانا ۱۷۶-۱۷۸
— ان کو پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی تھیں ۵۶۲-۵۶۶ تا ۵۷۱
— ان کے لشکروں میں جن اور پرندے شامل تھے ۵۶۲-۵۶۳-۵۶۶-۵۶۸-۵۷۵-۵۷۶
— وادی النمل میں ان کا پہنچنا اور چیونٹیوں کا کلام سننا ۵۶۳ تا ۵۶۵-۵۶۶
— ہدہد کے غائب ہونے اور سبا کی خبر لانے کا واقعہ ۵۶۶-۵۷۱
— حضرت سلیمان اور ملکہ سبا ۵۶۸ تا ۵۸۱
— ان کے لیے ملکہ سبا کا تخت آناً فاناً لایا جانا ۵۷۴-۵۷۸
— انھوں نے یہ تخت کس غرض سے منگوایا تھا؟

۵۷۵-۵۷۹
— اس علم الکتاب کی نوعیت جس کے زور سے یہ تخت لایا گیا ۵۷۶
— وہ جن کس قسم کا تھا جس نے چند گھنٹوں میں تخت لا دینے کا دعویٰ کیا تھا ۵۷۵-۵۷۶
— ان کی سیرت کے اثرات ملکہ سبا پر ۵۷۹-۵۸۱
— یہودیوں کے گندے الزامات حضرت سلیمانؑ پر ۵۸۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "بنی اسرائیل، اپنے انبیا پر ان کے گھناؤنے الزامات")
سنت - اسلامی قانون میں اس کی اہمیت ۳۲۷
— حدیث کی روایات قرآن کی تشریح کس طرح کرتی ہیں؟ ۱۸-۲۲-۵۲ تا ۵۵-۸۴-۸۸-
۸۹-۹۰-۱۴۴ تا ۱۴۹-۱۷۴-۱۸۶-۱۸۷-
۱۹۹-۲۱۴ تا ۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۲۴-۲۲۷ تا
۲۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۵ تا ۳۳۷-
۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۴-۳۴۶-۳۵۶ تا
۳۵۹-۳۷۳-۳۷۷-۳۷۸-۳۸۰ تا
۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۲-
۳۹۳-۳۹۴ تا ۳۹۶-۳۹۹-۴۰۴-۴۴۶-
۴۴۷-۴۵۳-۴۶۷-۴۶۸-۵۰۴-۵۷۸-
۵۹۹-۶۴۹-۶۸۴-۷۰۷-۷۴۱-۷۵۲-
۷۵۳
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "حدیث")
سود - اس کی مذمت ۷۵۸ تا ۷۶۰

ش

شرک

— اس کی حقیقت اور تشریح ۲۶-۲۷-۳۱-۵۰-
۲۰۷-۲۰۸
— شرک کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے؟ ۲۸۵-۲۸۶
— اللہ کے سوا دوسروں کو عالم الغیب ماننا شرک ہے ۲۹۸
خواہش نفس کو خدا بنا لینا شرک ہے ۴۵۲-۴۵۳
شرک کی ایک مستقل قسم، شرک عملی اور اس کی تشریح ۳۱-۶۹-۷۰
— مشرکین عرب کا شرک کس نوعیت کا تھا ۲۹۵-
۲۹۶-۲۹۷-۴۶۴ تا ۴۶۷-۵۸۹-۵۹۲-
۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۵۱
— مشرکین اللہ کی ہستی کے منکر نہیں ہیں ۴۸۸-
۵۲۰
— مشرکین کے تصور معبود اور اسلام کے تصور الٰہ کا فرق ۴۸۶-۴۸۷
— انسان شیطان کے اغوا سے شرک میں مبتلا ہوتا ہے ۵۶۹-۵۷۰
— شرک کا آغاز کس طرح ہوا؟ ۷۵۴-۷۵۷
— مشرکین اللہ کی قدر نہیں پہچانتے ۲۵۱
— مشرکین کے معبودوں کی اقسام ۷۳۷-۷۳۸
— قبر پرستی سخت گمراہی ہے ۱۷-۱۸
— بت پرستی ایک گندگی ہے ۲۲۲
— شرک ایک بے وقوفی ہے ۱۱۶
— وہ حقیقت کے خلاف ہے ۲۴۷
— وہ بہت بڑا جھوٹ ہے ۲۲۲-۶۸۷
— وہ ظلم ہے ۲۵۰

Maktaba Tul Ishaat.com

-- وہ جرم ہے ۳۱-۸۰
-- وہ نمک حرامی اور احسان فراموشی ہے ۲۰۷-۷۵۶
-- وہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے ۷۵۲-۷۵۳
-- اس کے حق میں کوئی دلیل وسند نہیں ۲۵۰-۷۵۶
-- اس کی وجہ سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے ۷۶۰-۷۶۱
-- انبیا علیہم السلام کی اس سے شدید نفرت ۱۱۳ تا ۱۲۱
-- اس کے خلاف قرآن کے دلائل ۳۰-۳۱-۶۹-۷۰-۱۵۲ تا ۱۵۴-۱۶۸-۱۶۹-۲۰۷-۲۰۸-۲۵۰-۲۵۱-۲۹۴ تا ۲۹۸-۳۴۴-۴۵۸-۴۵۹-۴۹۹ تا ۵۰۱-۵۸۸ تا ۵۹۸-۶۰۸-۶۸۶ تا ۶۸۸-۶۹۲-۷۰۱-۷۰۲-۷۲۰-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۵-۷۵۶-۷۶۰-۷۶۱
-- ماں باپ کو حق نہیں ہے کہ وہ اولاد کو شرک پر مجبور کریں ۶۷۸-۶۷۹
-- آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ دنیا میں کسی کی خاطر بھی شرک کرے ۶۷۸ تا ۶۸۰
-- شرک کے اخلاقی و روحانی نتائج ۲۰۷-۲۰۸-۲۲۳-۷۵۶-۷۵۷-۷۶۱
-- شرک کے اخروی نتائج ۳۱-۱۸۷-۵۰۷-۵۰۸-۵۴۰ تا ۵۴۲
-- مشرکین سے آخرت میں کس چیز کی باز پرس ہو گی ۶۵۴ تا ۶۵۷-۶۵۹-۶۶۰
-- مشرکین کے معبود بھی ان کے ساتھ جہنم میں ڈالے جائیں گے ۱۸۷
-- مشرکین کا کوئی مددگار نہیں ۲۵۰
-- ان کے معبود کوئی طاقت نہیں رکھتے ۲۵۱
-- آخرت میں خود ان کے معبود انھیں جھوٹا قرار دیں گے ۴۴۲-۴۴۳
-- مشرکین خود اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۷۳۷-۷۳۸
-- ان کے معبود آخرت میں ان کی کوئی سفارش نہ کریں گے ۷۳۷
-- مشرک کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں ۵۰۵-۵۰۶

شریعت

-- انبیا کی شریعتیں مختلف رہی ہیں مگر دین سب کا ایک ہی ہے ۲۲۵-۲۲۶-۲۴۹-۲۵۰
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام''، ''دین اور نبوت'')

شعائر اللہ

-- ان کا احترام تقویٰ کا تقاضا ہے ۲۲۳-۲۲۴
-- قربانی کے جانور شعائر اللہ میں سے ہیں ۲۲۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قربانی'')

شعر

-- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا ۵۴۷-۵۴۸
-- شعرا کی اخلاقی کمزوریاں ۵۴۶ تا ۵۴۷
-- کس قسم کے شعرا قرآن کی مذمت سے مستثنیٰ ہیں؟ ۵۴۸-۵۴۹

شعیب علیہ السلام - ان کا قصہ ۵۳۱ تا ۵۳۴-۶۹۹
-- کیا وہ حضرت موسیٰ کے خسر تھے؟ ۶۲۷-۶۲۸
-- وہ بیک وقت دو قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے

۵۳۲-۵۳۱

شفاعت

— اس کا مشرکانہ عقیدہ اور اس کا ابطال ۲۵۲
— آخرت میں مشرکین کا عقیدۂ شفاعت غلط ثابت ہو جائے گا ۵۰۷-۵۰۸
— مشرکین کے معبودان کی کوئی سفارش نہ کریں گے ۴۳۷
— ان کے معبودان کو الٹا مجرم ٹھیرائیں گے ۴۴۲-۴۴۳
— خدا کے نافرمانوں کی شفاعت کرنے والا کوئی نہیں ۶۹۰-۶۹۲
— آخرت میں صرف وہی شفاعت کرے گا جس کو خدا اس کی اجازت دے ۱۲۶-۱۵۵
— صرف اس کے حق میں شفاعت کی جا سکے گی جس کے حق میں خدا اس کی اجازت دے ۱۲۶-۱۵۵
— بلا اجازت شفاعت کا حق کسی کو نہ ہونے کی وجہ ۱۲۶-۱۲۷-۱۵۵-۱۵۶-۲۵۲

شکر

— اللہ کی دی ہوئی طاقتوں کو اس کے منشا کے خلاف استعمال کرنا ناشکری ہے ۲۹۴
— خدا کا شکر بندے ہی کے لیے مفید ہے، خدا اس کا محتاج نہیں ۵۷۷-۵۷۸

شہید - اس کا اجر عظیم ۲۴۵-۲۴۶

شیطان - اس کا مادۂ تخلیق ۲۹-۳۱-۱۳۱
— وہ فرشتوں میں سے نہیں بلکہ جنوں میں سے تھا ۲۹ تا ۳۱
— الشیطان اور ابلیس ایک ہی شخصیت ہے ۱۳۱-۱۳۲
— وہ انسان کا ازلی دشمن ہے ۳۰-۱۲۹-۱۳۵
— وہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیتا ہے ۵۶۹-۵۷۰-۶۹۹-۷۰۰
— وہ فحش اور برائی کا حکم دیتا ہے ۲۹۹-۳۷۱
— وہ خدا کا نافرمان ہے ۷۰
— اس کی پیروی انسان کے لیے تباہ کن ہے ۳۷۱
— اس کی بندگی نہ کی جائے ۷۰
— انبیائے کرام کے کام میں رخنے ڈالنے کے لیے اس کی کوششیں ۲۳۷
— اس کی فتنہ پردازیوں کو اللہ نے کھرے اور کھوٹے کا فرق کھول دینے کا ذریعہ بنایا ہے ۲۳۸-۲۳۹
— شیاطین کی پیروی کرنے والے انسانوں کا کردار ۵۴۴-۵۴۵
— منکرین حق پر شیاطین مسلط کر دیے جاتے ہیں ۸۰
— قیامت کے روز شیطان اپنے دوستوں کا ساتھ چھوڑ دے گا ۴۴۷
— وہ اپنے لشکروں سمیت جہنم میں ڈالا جائے گا ۵۰۷
— اس کی پیروی کرنے والوں کا برا انجام ۲۰۰-۲۰۱
— شیاطین کا حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیا جانا ۱۷۶-۱۷۸

ص

صابئین - ۲۱۰

صالح علیہ السلام

— ان کا قصہ ۵۲۱ تا ۵۲۶-۵۸۱ تا ۵۸۶

صبر

— اس کے معنی ۴۷۱-۶۴۹-۶۶۳-۶۶۴-۷۱۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسلام میں اس کی اہمیت ۷۶-۷۷-۸۶-۴۷۱-۶۶۳-۶۶۴-۷۱۷

صحابہ کرامؓ

— ان کے اخلاص فی الدین کی صریح شہادتیں ۵۲ تا ۵۵-۶۹

— ان کی فضیلت ۲۵۴

— ان کے اخلاقی فضائل ۲۶۰ تا ۲۶۹- ۳۶۵- ۳۶۶-۴۶۱ تا ۴۷۰

— ان کی سیرت کا انقلاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ثبوت ہے ۲۶۰- ۲۶۸- ۲۶۹- ۲۷۵ تا ۲۸۷- ۳۶۵- ۳۶۶- ۴۶۱- ۴۶۹- ۵۴۴ تا ۵۴۷

صدقہ - دیکھو ''زکوٰۃ''

صلوٰۃ - دیکھو ''نماز''

صلیب - قدیم زمانے میں صلیب دینے کا طریقہ ۱۰۶

صور - ۳۰۰

— نفخ صور کی کیفیت ۱۲۲-۱۲۳-۶۰۶-۶۰۷

— نفخ صور انسانوں کو جمع کرنے کے لیے ۴۸

— نفخ صور کن کن مواقع پر ہوگا؟ ۱۹۹

ض

ضلالت

— اسباب ضلالت ۱۷- ۱۸- ۲۶- ۳۱- ۶۹- ۷۵- ۷۷- ۷۹- ۱۳۹- ۱۴۲- ۱۸۹ تا ۱۹۲- ۲۰۶- ۲۳۵- ۲۳۶- ۲۵۲- ۲۵۹- ۲۶۰- ۲۷۳- ۲۷۵- ۲۷۷- ۲۷۸- ۲۸۰- ۲۸۱- ۲۸۳ تا ۲۸۵- ۲۹۸- ۴۴۰- ۴۴۱- ۴۵۲- ۴۵۳- ۴۸۴- ۵۱۳- ۵۱۶- ۵۲۳- ۵۲۴- ۵۳۳- ۵۹۶- ۶۵۰- ۶۶۱- ۶۶۲- ۶۶۴- ۷۵۵-۷۵۶

— ضلال بعید کیا ہے؟ ۲۰۸

— خواہش نفس کی پیروی کرنے والا سب سے بڑا گمراہ ہے ۶۴۴

— خدا کی دی ہوئی ہدایت سے منہ موڑنے کا برا نتیجہ ۱۳۴

— گمراہوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے ۲۰۶

— ضلالت بمعنی نادانستگی ۴۸۳-۴۸۴

ط

طواف - ۲۱۸-۲۲۱

طور سینا - ۲۷۲

ظ

ظلم

— ظلم بمعنی قصور و گناہ ۱۸۳-۵۵۹-۶۲۱

— خدا کی زمین پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنے والے ظالم ہیں ۶۳۹

— خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفس کی پیروی کرنے والے ظالم ہیں ۶۴۴-۷۵۱

— فواحش کا ارتکاب کرنے والے ظالم ہیں ۶۹۶

— رہزنی کرنے والے ظالم ہیں ۶۹۶

— اللہ پر افترا کرنے والے ظالم ہیں ۱۴-۶۹۶

— حق کو جھٹلانے والے ظالم ہیں ۲۱۷

— رسولوں کی دعوت پر ایمان نہ لانے والے ظالم ہیں ۲۷۶-۲۷۹

— اللہ کے نبیوں کو جھٹلانا بہت بڑا ظلم ہے ۲۳۵- ۴۴۷-۴۵۱-۵۸۵-۷۰۱

— اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ظالم ہیں ۶۰۶

— اللہ کی آیات سے منہ موڑنے والے ظالم ہیں ۳۲
— اللہ کی نعمتوں کا جواب کفر و شرک سے دینے والے ظالم ہیں ۲۶
— شرک کرنے والے ظالم ہیں ۴۴۴-۵۸۰-۷۵۱
— اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو سرپرست بنانے والے ظالم ہیں ۳۰
— اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کرنے والے ظالم ہیں ۲۵۰
— خدائی میں شریک ہونے کا دعویٰ کرنے والے ظالم ہیں ۱۵۵
— فرعون اور اس کی قوم ظالم تھی ۴۸۰-۴۸۱
— اللہ کا انکار کرنے والے ظالم ہیں ۲۴-۷۱۲
— حقیقت کے خلاف عقیدہ رکھنے والے ظالم ہیں ۱۶۸
— حقیقت کو جھٹلانا ظلم ہے ۵۶۰
— حق کے خلاف معاندانہ روش رکھنے والے ظالم ہیں ۲۳۸
— قرآن کو انسانی تصنیف کہنا ظلم ہے ۴۳۵
— منافقین ظالم ہیں ۴۱۴-۴۱۵
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ہے ۶۳۶
— ظالموں کا برا انجام ۲۴-۳۳-۷۷-۱۲۷-۱۵۰-۲۱۷-۲۳۵-۲۳۶-۲۷۹-۶۳۹-۶۵۳-۶۵۴
— اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۲۹-۳۰-۱۲۷-۲۰۷-۲۸۷-۲۸۸-۵۳۹-۷۰۱-۷۳۵

ع

عاد - ۲۳۴-۴۵۱-۶۹۹
— ان کا قصہ ۲۷۷-۲۷۹-۵۱۷ تا ۵۲۰
— ان کا علاقہ ۷۰۰
— ان کے حالات ۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰
عبادت - اس کا وسیع مفہوم ۲۸۰
— کسی کو قانون ساز مان کر اس کے امر و نہی کی بے چون و چرا پیروی کرنا اس کی عبادت ہے ۶۹-۷۰
— خدا سے بے نیاز ہو کر کسی مخلوق کی اطاعت کرنا اس کی عبادت ہے ۶۵۶
— صرف اللہ کی عبادت ہونی چاہیے ۱۸۴-۱۸۵-۲۷۳-۲۷۷
عبداللہ بن ابی
— اسلام کے خلاف اس کی شرارتیں ۳۱۰-۳۱۲-۳۱۴-۳۶۷
— اس کا کردار ۴۰۳-۴۰۴
عذاب
— دنیا میں نزول عذاب کا قانون ۳۳-۸۶-۱۸۵-۱۸۶-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۹-۲۸۱-۵۳۹-۶۸۵-۶۸۶-۷۱۵
— خدا کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹-۲۴-۷۰-۷۸-۷۹-۹۵-۱۰۲-۱۴۹-۱۵۰-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۶-۲۴۵-۲۸۸-۳۶۶-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۳-۴۲۷-۴۴۴-۴۵۱-۴۵۲-۴۶۶-۵۱۹-۵۲۰-۵۳۸-۵۴۰-۵۴۱-۵۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۹۰-۷۳۸
— عذاب الٰہی کی شدت ۲۰۰
— وہ اچانک آتا ہے ۵۳۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کے آنے کے بعد پھر مہلت نہیں ملتی ۵۳۹
— اس سے بچ کر کوئی بھاگ نہیں سکتا ۳۳
— اس کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی ۲۴۵
— کسی کی رشتہ داری انسان کو اس سے نہیں بچا سکتی ۵۲۸-۵۲۹-۵۴۱-۵۴۲-۶۹۶-۶۹۷
— وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان اس کا مطالبہ کرے ۵۳۹
— وہ ہے ہی ڈرنے کے قابل چیز ۲۹۸

عرب

— مشرکین عرب کے اخلاقی و مذہبی تصورات ۴۶۴ تا ۴۶۵
— زمانۂ جاہلیت میں دین ابراہیمی کے آثار باقیہ ۴۶۵
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کون کون انبیا آئے تھے؟ ۵۳۵
— مشرکین عرب کا شرک کس نوعیت کا تھا (دیکھو ''شرک'')

عرش -۱۵۳-۲۹۵-۴۶۰

— اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا مطلب ۸۷

علم

— قرآن کی نگاہ میں حقیقی علم کیا ہے؟ ۴۱۱-۴۱۲-۵۶۰-۵۶۱
— علم کی ایک خاص قسم عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اور اس کی نوعیت ۵۷۶

علم غیب

— اس امر کے دلائل کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے ۵۹۵ تا ۵۹۸
— اللہ کے سوا کسی اور کو عالم الغیب ماننا شرک ہے ۲۹۸
— غیر اللہ کی طرف علم غیب کی نسبت دراصل خدائی میں اس کو شریک کرنے کی تمہید ہے ۵۹۶

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

— ان کے ایمان لانے کا واقعہ ۵۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''خلافت راشدہ'')

عمل صالح - اس کے معنی ۶۷۸

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

عہد الٰہی

— وہ عہد جو خدا نے تمام انبیا اور ان کی امتوں سے لیا ہے ۱۱۵

عیسیٰ علیہ السلام

— ان کے بارے میں اسلام کا عقیدہ ۵۵
— ان کے بے باپ پیدا ہونے کے دلائل ۵۹-۶۳-۶۴-۶۵ تا ۶۶
— ان کی پیدائش ایک معجزہ تھی ۱۸۴- ۱۸۵- ۲۸۰-۲۸۱
— ان کو باپ کے بغیر پیدا کرنے کی مصلحت ۶۶-۶۷-۶۸
— حضرت یحییٰ ان کی آمد سے پہلے زمین تیار کرتے ہیں ۶۱
— ان کی اصلی تعلیم ۶۶-۶۷-۶۸
— ان کے بارے میں عیسائیوں کے غلط عقائد کا ابطال ۶۷
— ان کے خلاف علمائے یہود کی چالیں ۳۲۲
— ان کی ابتدائی پرورش کہاں ہوئی؟ ۲۸۱

عیسائیت

— ابتدائی پیروان مسیح کے عقائد ۱۱ تا ۱۴-۱۶-۱۷
— بعد میں مسیحیت میں کس طرح گمراہیاں پیدا ہوئیں؟ ۱۷-۱۸

— اس میں حضرت مریمؑ کو مادر خدا قرار دینے کا عقیدہ کب سے شروع ہوا؟ ۱۷
— اس میں عقیدۂ آخرت پر مضبوط دلائل موجود نہیں ہیں ۱۷
— انسان کے فطری گنہ گار ہونے کا عیسائی نظریہ غلط ہے ۷۵۲-۷۵۳
— زنا کے بارے عیسائیوں کا تساہل اور اس کے وجوہ ۳۲۲-۳۲۳
— آغاز اسلام میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی کے وجوہ ۳۰۷

غ

غزوۂ احزاب - اس کا زمانہ اور حالات ۳۰۶-۳۰۷

غزوۂ بنی المصطلق
— اس کا زمانہ اور حالات ۳۰۶-۳۰۷-۳۰۹-۳۱۰

غضب - اللہ کا غضب کن لوگوں پر ہے؟ ۱۱۲-۱۱۴

غلامی
— غلاموں کے متعلق احکام ۳۸۸-۳۹۷-۳۹۹-۴۰۰ تا ۴۰۴
— لونڈی سے تمتع کی اجازت ۲۶۳-۲۶۵
— اسلام میں غلامی کا مسئلہ کس طرح حل کیا گیا؟ ۳۹۹-۴۰۲

غیب - دیکھو: ''علم غیب''

ف

فردوس - اس کے معنی کی تحقیق ۲۶۸
— اس کی کیفیت ۵۰
— اس کے مستحق کون لوگ ہیں؟ ۵۰-۲۶۸

فرشتہ - فرشتے اور جن کا فرق ۳۰
— فرشتوں کی صفات ۱۵۲-۱۵۴-۱۵۵
— ان کو آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ۲۹
— خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں بلکہ وہ محض بندے ہیں ۱۵۲-۱۵۴-۱۵۵-۲۵۲
— مشرکین ان کو خدائی میں کیوں شریک ٹھیراتے تھے؟ ۱۵۵
— رسول بمعنی فرشتہ ۷۱-۷۲
— وہ اللہ کے پیغام رساں ہیں ۲۵۲
— وہ اپنی مرضی سے کوئی وحی نہیں لا سکتے ۷۶
— ان کا انسانی شکل میں آنا ۶۲-۶۳-۶۹۷
— مجرموں کے سامنے فرشتے عذاب لے کر ہی آتے ہیں ۴۴۵-۴۴۶
— آخرت میں نیک لوگوں کا استقبال کریں گے ۱۸۸
— قیامت کے روز فرشتوں کی فوجیں نمودار ہوں گی ۴۴۶

فرعون - ۹۱-۹۳-۹۴ تا ۱۰۸-۲۷۹-۲۸۰-۷۰۰
— وہ کس معنی میں خدائی کا دعویدار تھا ۹۶-۹۷-۶۳۶-۶۳۷
— کیا وہ اللہ کی ہستی کا منکر تھا؟ ۴۸۸-۶۳۷-۶۳۸
— مصر کا قدیم مذہب اور فرعون کے مذہب سے اس کے اختلافات ۱۰۱-۱۰۲
— حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک ہی فرعون تھا یا دو تھے؟ ۴۸۳-۶۳۲-۶۳۳
— اس کے مظالم ۹۵-۶۱۳ تا ۶۱۵-۶۱۶ تا ۶۱۸
— اس کی ہٹ دھرمی ۵۶۰-۵۶۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسے خوف لاحق ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت سے مصر میں سیاسی انقلاب برپا ہو جائے گا ۴۸۹

— حضرت موسیٰ کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی چالیں کس طرح الٹی پڑیں؟ ۹۷-۹۸-۱۰۰ تا ۱۰۷-۴۹۲-۴۹۴

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'' اور ''موسیٰ علیہ السلام'')

فساد فی الارض

— خدا کی بندگی اور اس کے قوانین کی اطاعت سے نکل جانا فساد ہے ۶۶۵

— حکومت پا کر خدا کے مقابلے میں خود مختاری اختیار کرنا فساد ہے ۶۱۳

— حق ظاہر ہو جانے کے بعد اس کو ماننے سے انکار کرنا فساد ہے ۵۶۰

— ملک گیری اور مفتوح قوموں میں ذلیل اخلاق پیدا کرنا فساد ہے ۵۷۳

— رعایا کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنا اور بعض کو اٹھانا اور بعض کو دبانا فساد ہے ۶۱۳

— ہر طرح کے ناروا ہتھکنڈوں سے ناجائز مقاصد پورے کرنا فساد ہے ۵۸۴

— شتر بے مہار بن کر رہنا فساد ہے ۵۲۳-۵۲۴

— ناپ تول میں کمی کرنا فساد ہے ۵۳۳

— دولت سمیٹنا اور اسے روک رکھنا فساد ہے ۶۶۱-۶۶۲

— فواحش کا ارتکاب فساد ہے ۶۹۵

— رہزنی فساد ہے ۶۹۵

— وہ شرک کی وجہ سے برپا ہوتا ہے ۶۰-۶۱-۷۰

فسق - اس کے معنی اور حقیقت ۳۰

— کفر اختیار کرنے والا فاسق ہے ۴۱۷

— فواحش کا ارتکاب فسق ہے ۶۹۸

— رہزنی فسق ہے ۶۹۸

فلاح

— اس کا مفہوم قرآن کی زبان میں ۲۶۰-۲۶۸-۲۸۴

— کن کاموں کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے؟ ۲۵۲-۳۹۳

— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے ۲۵۸-۲۶۰-۴۱۵-۶۵۷-۷۵۸

— وہ کن لوگوں کے لیے نہیں ہے؟ ۱۶-۱۰۴-۲۸۵ تا ۲۸۷-۳۰۳-۶۳۶-۶۶۴

ق

قارون - ۷۰۰

— اس کا قصہ ۶۶۰ تا ۶۶۴

قانون اسلام - فلسفہ قانون ۳۷۰-۳۷۱-۳۷۶

اصول:

— ظالموں اور مجرموں کی مدد جائز نہیں ۶۲۳-۶۲۴

— ظالم حکومتوں کی ملازمت کا مسئلہ ۶۲۳-۶۲۴

— کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا ۶۸۲-۶۸۳

— جرم پر آمادہ کرنے والا بھی مجرم ہے ۶۸۳

— ایک غیر قانونی فعل کسی قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنا دیتا ۳۴۵

— بغاوت کے سوا کوئی جرم آدمی کو حدود قانون سے خارج نہیں کرتا ۳۴۵

— ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے گا جب تک اس کے جرم کا کوئی ثبوت نہ ہو ۳۶۷ تا ۳۷۰

— حق اللہ اور حق آدمی کا فرق ۳۵۰-۳۵۱
— سد باب ذرائع کا قاعدہ ۳۷۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اصول فقہ'')
بین الاقوامی قانون:
— جنگ کی اجازت کے متعلق پہلا حکم کن حالات میں نازل ہوا؟ ۱۹۶ تا ۱۹۸
— جنگ سے متعلق احکام ۲۳۰ تا ۲۳۴
دستوری قانون
— کس قسم کے لوگ اطاعت کے مستحق نہیں ہیں؟ ۲۳-۴۵۷-۵۲۳-۵۲۴
— اسلامی ریاست کا مقصد ۲۳۴
— اسلامی ریاست کے فرائض ۴۱۶-۴۱۷-۴۲۰
— اسلامی ریاست مجرموں کو معاف کر دینے کا اختیار نہیں رکھتی ۱۵۱- ۳۱۹- ۳۲۰- ۳۳۲- ۳۴۳-۳۴۴
— حدود شرعیہ کو نافذ کرنے کا اختیار صرف ریاست کو ہے ۳۳۱
— حدود شرعیہ میں کمی اور بیشی کرنے کا اختیار ریاست کو نہیں ہے ۳۴۴
— قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں ۳۴۴
— ذمیوں کے ساتھ اسلامی ریاست کے برتاؤ کی اصل حیثیت ۶۱۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'' اور ''قرآن، سیاسی نظام کے متعلق اس کی رہنمائی'')
بنیادی انسانی حقوق:
— نجی زندگی کے تحفظ کا حق ۳۷۶-۳۷۷
— مراسلت کی رازداری کا حق ۳۷۷
— تحفظ خود اختیاری کا حق ۳۷۷
— انسانی جان کی حرمت ۴۶۴
— قانون کی نگاہ میں سب کو یکساں ہونا چاہیے ۳۴۴-۶۱۳
— رعیت کے درمیان امتیازی سلوک ناروا ہے ۶۱۳-۶۱۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، اصول'')
قانون شہادت:
— جرم زنا کے لیے کس قسم کا ثبوت درکار ہے ۳۳۳
— زنا کی شہادت کا نصاب ۳۴۶-۳۴۷-۳۶۷
— جرم قذف میں صفائی کی شہادت ۳۵۱-۳۵۲
— قذف کے سزا یافتہ کی شہادت ناقابل قبول نہیں ۳۵۲
— ملزم کے اقرار جرم کی حیثیت ۳۳۵-۳۳۶
— قاضی اپنی شہادت کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا ۳۳۳
فوجداری قانون:
— جرم زنا کے متعلق قانون ۲۶۵-۳۱۹ تا ۳۴۵
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''زنا'')
— قذف (تہمت زنا) کا قانون ۳۴۶ تا ۳۵۵
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''قذف'')
— بیوی پر شوہر کے الزام زنا کے متعلق قانون ۳۵۵ تا ۳۶۳
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''لعان'')
— جانور سے مجامعت کی حرمت اور اس کی سزا ۲۶۵-۳۴۳
— جھوٹی شہادت کی حرمت اور اس کی سزا ۲۲۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— اگر مرد اپنی بیوی کو غیر شخص سے ملوث دیکھ لے تو کیا وہ اسے قتل کر سکتا ہے؟ ۳۵۹
— مسلم معاشرے میں جو لوگ فواحش پھیلائیں وہ مجرم ہیں اور ان کو سزا دی جانی چاہیے ۳۷۰-۳۷۱
— قصاص اور انتقام کے متعلق ہدایات ۲۴۶
— عملِ قومِ لوطؑ جرم ہے ۲۶۵
— ازالۂ حیثیت عرفی کا قانون ۳۴۸-۳۴۹
— حد اور تعزیر کا فرق ۳۲۸-۳۳۸-۳۴۸-۳۴۹
— حد کے مستحق کو معاف کر دینے کا حکومت کو اختیار نہیں ۳۳۲
— کوئی مجرم توبہ کرنے کی بنا پر سزا سے نہیں بچ سکتا ۳۵۴
— شبہے کا فائدہ ملزم کو دیا جائے گا ۳۳۳-۳۳۴-۳۴۸-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۶۱
— معاف کر دینے میں غلطی کرنا سزا دینے میں غلطی کرنے سے بہتر ہے ۳۳۴
— مجرموں کے درمیان ان کے معاشرتی مرتبے کے لحاظ سے امتیاز کرنا ممنوع ہے ۳۴۴
— مجرموں کو ضرب تازیانہ لگانے کے متعلق ہدایات ۳۴۰ تا ۳۴۲
— مجرم کو دشمنی کے جذبے سے نہیں بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے سزا دینی چاہیے ۳۴۲-۳۴۳
— اسلام کا نظریۂ سزا ۳۴۱-۳۴۵
— ذمیوں پر اسلام کا فوجداری قانون کس حد تک نافذ ہوگا ۳۳۲

دیوانی قانون:

— لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بلوغ کی عمر ۴۲۰-۴۲۲

ضابطۂ عدالت:

— فیصلے پر ایمان داری سے غلطی کرنا قابل مؤاخذہ نہیں ہے ۱۷۴
— قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر روداد مقدمہ کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا ۳۳۳
— مقدمات میں جیوری یا اسیسروں سے مدد لینا ۳۵۰
— عدالت کے سمن پر حاضر نہ ہونا جرم ہے ۴۱۴
— عدالت کے غلط فیصلے پر معقول تنقید کی جاسکتی ہے ۳۴۰

معاشی قانون:

— اوزان اور پیمانے ٹھیک رکھنے کا حکم ۵۳۲-۵۳۳
— جوئے کی حرمت ۷۲۸
— حرام مال کسی کے پاس آجائے تو کیا کرے؟ ۷۲۸

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”قرآن، معاشی زندگی کے متعلق اس کی رہنمائی“)

قوانین معاشرت:

— اولاد پر والدین کی فرمانبرداری لازم ہے مگر ان کے حکم سے خدا کی نافرمانی جائز نہیں ۶۷۸ تا ۶۸۰
— صالح اہل ایمان کے لیے بدکار مردوں اور عورتوں سے شادی بیاہ جائز نہیں ۳۴۵-۳۴۶
— ازدواجی زندگی کی اصل روح ۷۴۳
— کیا باپ کی خدمت بیٹی کا مہر قرار پا سکتی ہے؟ ۶۳۱
— منکوحہ عورت کا مہر کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا ۳۵۸

— متعہ کی شرعی حیثیت ۲۶۶-۲۶۷
— لونڈیوں سے تمتع کی اجازت ۲۶۴-۲۶۵
— عورت کو غلام سے تمتع کی اجازت نہیں ۲۶۵
— ستر عورت کے احکام ۲۶۳
— پردے کے احکام ۳۷۹ تا ۳۹۶-۴۲۳
(تفصیلات کے لیے دیکھو "پردہ")
— استیذان کے احکام ۳۷۵ تا ۳۷۹- ۴۲۰ تا ۴۲۱-۴۲۳
(تفصیلات کے لیے دیکھو "استیذان")

قتال فی سبیل اللہ

— اس کی اجازت کا پہلا حکم کن حالات میں نازل ہوا؟ ۱۹۶ تا ۱۹۸
— اس کی اولین اجازت اور اس کا مقصد ۲۳۰ تا ۲۳۴
— اس کی مصلحت ۲۳۲-۲۳۳

قذف

— اس کے احکام ۳۴۶ تا ۳۴۷
— قانون قذف کا مقصد ۳۴۷-۳۵۴
— جرم قذف کی سزا ۳۵۱-۳۵۴
— قذف کے مقدمات کی نظیریں عہد نبویؐ اور عہد خلافت راشدہ میں ۳۵۰-۳۵۳-۳۵۴
— ایک شخص کس حالت میں قذف کا مجرم ہوگا اور کس حالت میں نہیں؟ ۳۴۸ تا ۳۵۰
— قذف کا جرم قابل دست اندازیِ پولیس ہے یا نہیں؟ ۳۵۰-۳۵۱
— قابل راضی نامہ ہے یا نہیں؟ ۳۵۰-۳۵۱
— حد قذف کے مطالبے کا حق کسے ہے اور کسے نہیں ہے؟ ۳۵۱
— کسی پر عمل قوم لوط کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں؟ ۳۵۰
— اگر ایک مرد کسی عورت کے ساتھ زنا کا اقرار کرے مگر عورت انکار کر دے تو کیا مرد کو قذف کا مجرم قرار دیا جائے گا؟ ۳۴۷
— تکرار قذف کے بارے میں قانونی حکم ۳۵۴
— ایک سے زیادہ آدمیوں پر تہمت لگانے کی صورت میں قانونی حکم ۳۵۵-۳۵۶
— جرم قذف میں صفائی کی شہادت ۳۵۱-۳۵۲
— اگر زنا کے گواہوں کی شہادت عدالت میں قابل قبول ثابت نہ ہو تو کیا ان پر قذف کا مقدمہ چلایا جائے گا؟ ۳۳۴-۳۳۵
— قاذف کو معاف کر دینے کا حق کسی کو نہیں ہے ۳۵۱
— جرم قذف میں مالی تاوان دلوا کر مجرم کو نہیں چھوڑا جا سکتا ۳۵۱
— قاذف کی توبہ کس چیز پر مؤثر ہے اور کس پر مؤثر نہیں ہے ۳۵۲-۳۵۳
— بیوی پر شوہر کی طرف سے تہمت زنا عائد کیے جانے کی صورت میں قانونی حکم (دیکھو "لعان")

قرآن-اس کے نام:

— قرآن ۱۲۸- ۴۴۷-۴۴۸- ۵۵۴-۶۰۸-۶۶۷
— فرقان ۴۳۱-۴۳۲
— کتاب مبین ۴۷۶-۵۵۴-۶۱۳
— ذکر ۱۲۱-۱۴۴-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۳-۴۴۷-۴۷۶
— اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ۹-۲۱-۸۱-۸۷-۱۲۱-۱۲۸-۱۶۳-۳۱۸-۴۰۵-۴۳۱-۴۴۸-۴۵۰-۵۳۴-۵۵۶-۵۵۷-۶۱۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حیثیت بیان کرتا ہے؟ ۲۰-۲۱-۲۲-۵۰-۱۵۷-۱۵۸-۲۳۶-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۶-۴۳۸-۴۴۴-۴۵۹

— اس کے کلام الٰہی ہونے کے دلائل ۷-۳۱۷-۳۱۸-۴۷۶-۶۰۲-۶۰۳-۶۳۹ تا ۶۴۲-۷۱۱ تا ۷۱۳-۷۲۴ تا ۷۲۸

— اس کی پیشین گوئیاں جو حرف بحرف سچی ثابت ہوئیں ۶۶۵ تا ۶۶۷-۷۲۴ تا ۷۲۸-۷۳۰ تا ۷۳۲

— یہ وہ معجزہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ۱۴۰-۴۷۶

— اس کو روح الامین لے کر آیا ہے ۵۳۴-۵۳۵

— وہ صاف اور فصیح عربی زبان میں نازل ہوا ہے ۱۲۸-۵۳۴-۵۳۵

— اس کے نزول کا طریقہ ۷۶-۱۲۸-۱۲۹-۴۳۱-۴۳۲

— اس کے بتدریج نازل ہونے کی حکمت ۴۴۸ تا ۴۵۰

— اس کا انداز ترتیب ۱۲۸-۱۲۹

— مکی سورتوں کی تقسیم بلحاظ زمانہ ۶

— بعض سورتیں مکی بھی ہیں اور مدنی بھی ۱۹۶

— مکی سورتوں کا انداز بیان ۲۵۸

— آغاز اسلام میں اس کی اشاعت کس طرح ہوئی؟ ۴۴۹

— وہ کس نوعیت کی کتاب ہے؟ ۴۴۹-۴۵۰

— وہ ناقابل فہم زبان میں بات نہیں کرتا ۹-۲۸۹

— اس کی آیات صاف صاف حقیقت بتانے والی ہیں؟ ۲۰۹

— اس میں کوئی بات حق و صداقت کے خلاف نہیں ہے جسے ماننے میں کسی راستی پسند انسان کو تامل ہو ۹

— وہ انسان کی فطرت کے مطابق تعلیم پیش کرتا ہے ۲۹۱-۲۹۲

— وہ برکت والی کتاب ہے ۱۶۳

— وہ اہل ایمان کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے ۵۵۴-۶۰۳-۷۱۳

— اس کو ذکر کس معنی میں کہا گیا ہے ۱۲۱-۱۴۴-۱۶۳

— وہ کتاب مبین کس معنی میں ہے؟ ۴۷۶-۵۵۴

— اس کے نزول کا مقصد ۹-۸۱-۸۷-۱۲۸

— اس کی تلاوت کے روحانی و اخلاقی فوائد ۷۰۳ تا ۷۰۵

— اس کی تلاوت کے آداب ۵۸۸-۵۸۹

— اس کی غیر معمولی تاثیر کلام ۱۴۵-۱۴۶

— وہ دلوں کو کس طرح مسخر کرتا تھا ۸۴

— اس سے کس قسم کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۵۵۴-۵۵۵-۶۰۳-۶۰۴-۶۶۳-۷۱۳ تا ۷۱۵

— اس سے کیسے لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۶۰۳-۶۰۴

— مجرموں کو اس کی تعلیم سخت ناگوار ہوتی ہے ۵۳۷-۵۳۸

— جو کوئی اس سے منہ موڑے گا اس سے سخت باز پرس ہوگی ۱۲۱-۱۲۲

— اس کی دعوت کیا ہے؟ ۲۲۳-۲۲۵

— اس کی دعوت وہی ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی تھی ۲۸۹-۵۳۵-۵۳۷

— وہ تمام کتب آسمانی کا عطر پیش کرتا ہے ۱۴۰

— وہ کتب آسمانی کی تصدیق کے لیے آیا ہے نہ کہ تردید کے لیے ۷۰۹-۷۱۰

— وہ انبیائے بنی اسرائیل کو ان داغوں سے پاک کرتا ہے جو خود بنی اسرائیل نے ان پر لگائے ہیں ۱۱۵ تا ۱۱۸-۵۶۴-۵۸۲-۶۲۲-۶۳۰-۶۳۱

— بائبل اور تلمود سے اس کے اختلافات ۳۵-۳۶-۵۹-۶۰-۹۱-۹۲-۹۵-۱۰۹ تا ۱۱۱-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۳۲-۱۳۵-۱۳۶-۱۶۹-۱۷۰ تا ۱۷۲-۱۷۹ تا ۱۸۱-۴۸۲-۵۶۲-۵۶۴-۵۸۲-۶۱۷-۶۱۸-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۳۰-۶۳۲-۶۳۵-۶۶۵-۶۸۵

— اس کی تفسیر کے صحیح اصول ۱۱۹-۱۲۰-۱۳۰-۱۳۱-۱۹۰-۲۰۲-۲۱۴-۲۳۹ تا ۲۴۴

— اس کی تفسیر کے غلط طریقے ۱۶۹-۱۷۷-۱۷۸-۱۸۹-۱۹۲-۲۳۹ تا ۲۴۴-۲۶۴-۲۶۵-۲۸۱-۲۸۲-۳۲۷-۴۱۷ تا ۴۱۹-۴۵۹-۴۶۰-۵۶۲ تا ۵۶۴-۵۶۶ تا ۵۶۸-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۹-۷۵۸

— اس کو سمجھنے کے لیے حدیث سے مدد لینے کی ضرورت (دیکھو ''سنت'')

— منکرین حدیث کی غلط تاویلات ۷۴۱-۷۴۲-۷۵۵-۷۵۸

— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اس کی تفسیر کے غلط طریقے'')

— اس کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کیا طریقے اختیار کر رہے تھے (دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

— اس پر مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۳-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۷-۱۴۹-۱۵۰-۱۸۷-۴۳۵ تا ۴۳۷-۴۴۸ تا ۴۵۱-۵۴۰-۵۴۱

— اس کا مخصوص طرز بیان ۹۹-۱۰۷-۱۱۶-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۸-۱۶۲-۱۹۷-۲۳۶-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۷۰-۲۸۱-۲۸۳-۴۰۶-۴۳۰-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۳-۵۰۶-۵۰۷-۶۰۱-۶۰۲-۶۱۱-۶۶۷-۶۷۰-۷۱۹-۷۲۸-۷۲۹ (مزید دیکھو ''قصے بیان کرنے میں اس کا انداز بیان'')

— اس کا طرز استدلال ۷-۸-۲۰۳-۲۰۴-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۸-۲۶۹-۲۹۴-۲۹۵-۵۵۳-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۶-۶۰۰

— وہ انسان کی عقل وفکر سے اپیل کرتا ہے ۶۹-۷۰-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۴-۱۶۹-۲۳۵-۲۴۹-۲۸۹-۲۹۴-۲۹۵-۶۹۶-۳۰۳-۴۱۲-۴۱۳-۴۵۳ تا ۴۵۶-۴۸۵-۵۰۰-۵۱۳-۵۸۵-۵۸۶-۵۹۲-۵۹۵-۶۰۳-۶۰۴-۶۵۴-۶۵۹-۶۶۲-۶۹۸-۷۰۲-۷۰۳-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۳۴-۷۴۳-۷۴۶-۷۴۷-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۳-۷۵۴-۷۶۴-۷۶۵

— وہ قیاس وگمان کے بجائے دلیل علمی پر اپنے رویے کی بنیاد رکھنے کی انسان کو دعوت دیتا ہے ۹-۱۴-۲۰۰-۲۰۶-۲۹۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ مشاہدے اور تجربے سے حقیقت کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے ۹۹-۲۱۲-۲۹۴-۲۹۵-۴۱۲-۴۱۳-۴۵۳ تا ۴۵۶-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۷-۴۷۹-۵۸۹ تا ۶۰۰-۶۰۶-۶۵۹-۷۳۱ تا ۷۳۵-۷۴۲ تا ۷۵۰

— نظامِ کائنات اور تخلیق کائنات کے متعلق اس کا بیان ۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۲۴۸-۲۷۰-۲۷۱-۴۵۳ تا ۴۵۶-۴۶۰-۴۶۱-۷۰۳-۷۳۰ تا ۷۳۳-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۸-۷۴۹-۷۶۲-۷۶۳

— تخلیق انسان کے متعلق اس کا بیان (دیکھو ''انسان'')

— مذاہب کی اصلیت کے متعلق اس کا بیان (دیکھو ''اسلام'' اور ''دین'')

— اس کا فلسفۂ تاریخ ۱۲۳-۱۲۹-۱۳۰-۱۴۹-۱۵۰-۱۸۴-۱۸۵-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۹-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۹-۲۷۶-۲۷۹-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۶-۴۵۷-۴۷۴-۴۷۵-۵۰۹-۵۱۰-۵۵۲-۵۵۳-۵۸۵-۵۸۶-۶۰۰-۶۷۴-۶۷۵-۷۰۲-۷۳۴-۷۳۵

— اس کا فلسفۂ اخلاق ۷-۸-۲۲ تا ۲۸-۱۳۰-۱۳۱-۲۸۳ تا ۲۸۵-۳۴۵-۳۷۴

— اس کی اخلاقی تعلیمات (دیکھو ''اخلاق'')

— اس کا علم النفس ۲۳۵-۲۳۶-۳۷۴-۳۷۵

— تہذیب و تمدن کے متعلق اس کی رہنمائی ۵۱۸-۵۱۹-۵۲۲

— اصلاح معاشرہ کے متعلق اس کا پروگرام (دیکھو ''اسلام'')

— معاشی زندگی کے متعلق اس کی رہنمائی ۴۶۳-۴۶۴-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۲-۵۳۲-۵۳۳-۶۵۲ تا ۶۵۵-۶۶۰ تا ۶۶۴-۷۵۷ تا ۷۶۰

— سیاسی نظام کے متعلق اس کی رہنمائی ۵۱۹-۵۲۳-۵۷۳-۶۱۳-۶۳۶ تا ۶۳۹

— قصے بیان کرنے میں اس کا انداز بیان ۱۴-۱۵-۱۹-۲۰-۴۸۴-۴۸۵-۴۹۳-۴۹۴-۵۱۶-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۸-۶۱۶-۶۱۷

— اس میں قصے کس مقصد کے لیے بیان کیے گئے ہیں؟ ۶-۷-۸-۵۶-۱۴۳-۱۶۳-۱۸۳-۱۸۴-۲۵۸-۲۵۹-۴۷۵-۵۳۵-۵۵۲-۵۵۳-۶۷۳-۷۰۱

— قصہ آدمؑ و حوّا بیان کرنے کا مقصد ۲۹-۳۰-۸۶-۱۲۹-۱۳۱-۱۳۵

— قصہ نوحؑ بیان کرنے کا مقصد ۵۱۳ تا ۵۱۶-۶۸۵

— قصہ صالحؑ بیان کرنے کا مقصد ۵۸۲ تا ۵۸۵

— قصہ ابراہیمؑ بیان کرنے کا مقصد ۵۶-۶۹ تا ۷۱-۱۶۴-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۹-۶۸۹

— قصہ موسیٰ و بنی اسرائیل بیان کرنے کا مقصد ۸۵-۱۰۹ ۱۱۳-۴۸۰-۴۸۱-۴۹۵-۵۵۲

— قصہ قارون بیان کرنے کا مقصد ۶۶۰-۶۶۱

— قصہ خضر و موسیٰ بیان کرنے کا مقصد ۷-۸

— قصہ شعیبؑ بیان کرنے کا مقصد ۵۳۳

— قصہ داود و سلیمانؑ بیان کرنے کا مقصد ۱۷۳-۵۶۱

— قصہ ذوالقرنین بیان کرنے کا مقصد ۷-۸
— قصہ یحییٰ بیان کرنے کا مقصد ۵۵-۵۶-۶۳
— قصہ عیسیٰ بیان کرنے کا مقصد ۵۵-۵۶-۶۷-۶۹
— قصہ اصحاب کہف بیان کرنے کا مقصد ۶-۷-۲۳

قرآنی تمثیلات

— دنیا پرست اور خدا پرست کی تمثیل ۲۵-۲۷
— دنیا کی زندگی کی تمثیل ۲۸
— کلمات اللہ کے بے پایاں ہونے کی تمثیل ۵۰
— اللہ کے نور کائنات ہونے کی تمثیل ۴۰۵-۴۰۷-۴۰۸
— کفار و منافقین کے نور ہدایت سے محروم ہونے کی تمثیل ۴۱۰-۴۱۲
— اللہ کے سوا دوسروں کو ولی و کارساز بنانے والوں کی تمثیل ۷۰۱

قرآنی دعائیں

— اصحاب کہف کی دعا ۱۱-۱۲
— حضرت موسیٰ کی دعا فرعون کے دربار میں جانے سے پہلے ۹۲
— حضرت موسیٰ کی دعا قبطی کو قتل کرنے کے بعد ۶۲۱
— حضرت موسیٰ کی دعا مصر سے مدین جاتے ہوئے ۶۲۵
— حضرت موسیٰ کی دعا مدین پہنچ کر ۶۲۸
— اضافۂ علم کی دعا ۱۲۸
— حضرت ایوبؑ کی دعا بیماری کی حالت میں ۱۷۸
— حضرت یونسؑ کی دعا مچھلی کے پیٹ میں ۱۸۳
— شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگنے کی دعا ۲۹۹
— خدا کے صالح بندوں کی دعا ۳۰۲-۳۰۴
— عباد الرحمٰن کی دعا ۴۶۹
— حضرت ابراہیمؑ کی دعا اپنی قوم کو دعوت توحید دینے کے بعد ۵۰۳ تا ۵۰۵
— حضرت سلیمانؑ کی دعا چیونٹی کا کلام سننے کے بعد ۵۶۵

قرآنی قصے

— قصہ آدم و حوا ۲۹-۳۰-۱۲۹-۱۳۴
— قصہ نوح علیہ السلام ۱۷۲-۱۷۳-۲۷۳-۲۷۶-۵۰۹ تا ۵۱۷-۶۸۵-۶۸۶
— قصہ ہود علیہ السلام ۲۷۷ تا ۲۷۹-۵۱۷-۵۲۰
— قصہ صالح علیہ السلام ۵۲۱ تا ۵۲۶-۵۸۱ تا ۵۸۶
— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۶۹-۷۰-۷۱-۱۶۳ تا ۱۷۲-۴۹۹ تا ۵۰۹-۶۸۶ تا ۶۹۴
— قصہ لوط علیہ السلام ۱۶۹-۱۷۰-۵۲۶ تا ۵۲۹-۵۸۶-۵۸۷-۶۹۳ تا ۶۹۸
— قصہ شعیب علیہ السلام ۵۳۱ تا ۵۳۴-۶۹۹
— قصہ موسیٰ علیہ السلام ۷۱-۷۲-۸۵-۸۸ تا ۱۲۱-۲۷۹-۲۸۰-۴۸۰ تا ۴۹۸-۵۵۷ تا ۵۶۰-۶۱۰-۶۱۳ تا ۶۳۹
— قصہ خضر و موسیٰ علیہ السلام ۳۴ تا ۴۰
— قصہ قارون ۶۶۰ تا ۶۶۴
— قصہ داود علیہ السلام ۱۷۳-۱۷۶-۵۶۰-۵۶۱
— قصہ سلیمان علیہ السلام ۱۷۳ تا ۱۷۷-۵۶۰ تا ۵۸۱
— قصہ ایوب علیہ السلام ۱۷۸ تا ۱۸۰
— قصہ یونس علیہ السلام ۱۸۲-۱۸۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— قصہ یحییٰ علیہ السلام ۵۷ تا ۶۴-۱۸۳

— قصہ عیسیٰ علیہ السلام ۶۲ تا ۶۸-۱۸۴-۲۸۰-۳۲۲

— قصہ اصحاب کہف ۱۱ تا ۲۱

قربانی

— قربانی تمام شرائع الٰہیہ میں دین کا ایک حکم رہی ہے ۲۲۵

— قربانی کا حکم عام ۲۲۶ تا ۲۳۰

— اس کے دینی صالح ۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱

— اللہ کو خون اور گوشت نہیں بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے ۲۲۸

— حج کے موقع پر جانور ذبح کرنے کے احکام ۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴

— اونٹ کی قربانی کا طریقہ ۲۲۷

قرعہ اندازی

— کن صورتوں میں جائز ہے ۳۱۱

قریش

— عرب میں ان کی حیثیت ۶۵۱-۶۵۲

— مکی دور میں اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ان کی کوششیں اور ان کی ناکامی کے اسباب ۶-۷-۵۲-۵۳-۱۴۵-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۲۳۲-۲۳۳

— ان کی مخالفت اسلام کے اسباب ۲۲-۱۴۵-۴۴۰-۴۷۴-۵۸۴-۶۵۰-۶۵۲ تا ۶۶۰

— اسلام کو نہ ماننے کے لیے ان کے عذرات اور وجوہ ۵۱۳ تا ۵۱۶-۶۱۲-۶۵۰-۶۵۶ تا ۶۶۰-۶۶۰ تا ۶۶۴-۶۶۶

— دعوت اسلامی کے مقابلے میں ان کی ہٹ دھرمی ۴۳۸-۴۳۹-۴۷۴-۵۳۷-۵۳۸

— مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے ان کی چالیں ۶۸۲ تا ۶۸۴

— انھوں نے ہجرت کے بعد مسلمانوں کے لیے حج کا راستہ بند کر دیا ۱۹۶-۲۱۵-۲۲۱

— وہ خود مانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ رکھتے ہیں وہ جھوٹے ہیں ۱۴۸

قسم

— کسی برے کام کی قسم اگر آدمی نے کھا لی ہو تو اسے اس پر قائم نہ رہنا چاہیے ۳۷۲-۳۷۳

قضا و قدر

— دیکھو ''تقدیر''

قیامت

— اس سے پہلے دنیا میں رونما ہونے والے واقعات ۱۸۶-۱۸۷-۶۰۴-۶۰۵

— قیامت قائم ہونے کے دلائل ۳۴۷
(مزید دیکھو ''آخرت، اس کے دلائل'')

— اس کی کیفیت ۱۰-۱۱-۲۸-۴۸-۱۲۲-۱۲۷-۱۲۸-۱۹۹-۲۰۰-۴۴۶-۶۰۶ تا ۶۰۸

— اس دن دل الٹنے اور دیدے پتھرانے کی نوبت آجائے گی ۴۰۹-۴۱۰

— وہ اسی زمین پر قائم ہوگی ۱۲۴-۱۲۵

— اس کا وقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۸۹-۹۰

— اس کا وقت مخفی رکھنے کی مصلحت ۹۰

— وہ اچانک آئے گی ۱۶۰-۲۴۵

— وہ ضرور آ کر رہے گی ۱۶-۸۹-۲۰۳

— اسے ٹالنے کی طاقت اللہ نے کسی کو نہیں دی ۶۱۷

— تمام انسانوں کے زندہ کر کے اٹھائے جانے کا دن ۶۶-۶۷-۲۷۰-۵۰۵-۶۶۷

— مرے ہوئے انسان کس طرح یکا یک زمین سے

نکل آئیں گے ۷۴۹

— تمام انسانوں کے بیک وقت حاضر کیے جانے کا دن ۴۸-۸۱-۲۹۴-۶۰۵-۶۵۴

— اس دن بادشاہی اللہ ہی کی ہوگی ۲۴۵

— حساب اور جزا و سزا کا دن ۱۴۴-۱۶۲-۲۰۶-۵۰۳-۶۸۳

— یوم عظیم ۶۸

— وہ دن جب مجرموں سے باز پرس ہوگی ۱۲۱-۱۲۲

— اس روز دنیا پرستوں اور منکرین آخرت کے تمام اعمال بے وزن ہوں گے ۴۹

— تمام اختلافات کی حقیقت کھول دی جائے گی اور ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا ۶۸-۲۱۱-۲۴۵-۲۴۹

— گمراہ لوگ اس وقت کس حالت میں لائے جائیں گے؟ ۱۳۴ تا ۱۳۷

— کفار اپنی غفلت پر پچھتائیں گے ۱۸۶

— مجرمین ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے ۶۹۲

— ظالم کہیں سے مدد نہ پا سکیں گے ۶۳۹

— دوستیاں اور رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی ۶۹۲-۶۹۳

— منکرین آخرت کی بدحواسی اور بدانجامی ۴۴۰-۶۰۶-۶۰۷

— اس کی ہولناکیاں نیک لوگوں کو خوف زدہ نہ کریں گی ۱۸۸-۶۰۷

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت'')

ک

کافر - دیکھو ''کفر''

کعبہ

— اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے اسے تعمیر کیا ۲۱۸ تا ۲۲۱

— وہ شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا ۱۹۸

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''مکہ''

کفر

— اس کی حقیقت ۲۶

— اللہ کی آیات کو نہ ماننے والے کافر ہیں ۴۱۲

— اللہ کے لیے اولاد تجویز کرنے والے کافر ہیں ۶۷-۶۸

— ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے ۵۰۹-۵۱۰

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

— وہ بجائے خود انسان کے لیے تباہ کن ہے خواہ اس کے ساتھ عمل بد ہو یا نہ ہو ۷۳۸-۷۳۹

— کافر کو اللہ کے خلاف ایک عناد ہوتا ہے ۴۵۹-۴۶۰

— کافر ہی فاسق ہیں ۴۱۷

— اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا ۶۲۷

— کافر فلاح نہیں پا سکتے ۳۰۳-۶۶۴

— کفر کے اخلاقی و ذہنی نتائج ۲۳۱-۴۱۰-۴۱۲

— کافروں کا انجام ۴۸-۵۰-۶۷-۶۸-۱۵۹-۱۶۰-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۷-۲۴۵-۲۵۰-۲۵۱-۴۲۰-۷۱۳-۷۲۱-۷۶۱

— کفر بمعنی احسان فراموشی و ناشکری ۴۸۳-۵۷۷-۶۲۰-۷۵۶-۷۶۴

گ

گمراہی - دیکھو ''ضلالت''

گناہ - وہ بڑے بڑے گناہ جن پر سخت باز پرس ہونی ہے ۳۴۲-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۹-۳۶۹-

Maktaba Tul Ishaat.com

٣٧٣-٤٦٤

ل

لعان

— اس کے بارے میں شرعی احکام ٣٥٥ تا ٣٦٣

— قانون لعان کا مقصد اور وجوہ ٣٥٦-٣٦٠

— عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں مقدمات لعان کے نظائر ٣٥٦ تا ٣٥٩

— لعان کا ضابطہ اور قانونی نتائج ٣٥٩ تا ٣٦٣

— قذف اور لعان کا فرق ٣٥٩-٣٦٠-٣٦٢

— اگر شوہر بیوی پر تہمت لگائے اور لعان نہ کرے تو وہ حد قذف کا مستحق ہوگا؟ ٣٥٨

— اگر شوہر قسم کھالے اور عورت قسم نہ کھائے تو کیا اسے رجم کیا جائے گا؟ ٣٦١

لعنت

— خدا کی لعنت کے مستحق کیسے لوگ ہیں؟ ٣٧٣-٦٣٩

لوط علیہ السلام-٢٣٤

— ان کا قصہ ١٦٩-١٧٠-٥٢٦ تا ٥٢٩-٥٨٦-٥٨٧-٦٩٣ تا ٦٩٨

— قوم لوط ٤٥٢

— قوم لوط کا علاقہ اور اس پر عذاب کی کیفیت ٥٢٩ تا ٥٣١

م

متقی-دیکھو "تقویٰ"

مجرم-مجرمین-دیکھو "جرم"

مجوس-٢١٠

محمد صلی اللہ علیہ وسلم-نذیر ٤٣٢

— نذیر مبین ٢٣٦-٧١٢

— مبشر و نذیر ٤٥٩

— رحمۃ للعالمین ١٨٩-١٩٢

— آپؐ سے پہلے دو ہزار برس سے عرب میں کوئی نبی نہیں آیا تھا ٦٤١-٦٤٢

— آپؐ کی نبوت کا آغاز کس طرح ہوا؟ ٦٦٨-٦٦٩

— آپؐ پر نزول وحی کی کیفیت ٢٥٨

— آپؐ کی تعلیم خدا کی وحی پر مبنی ہے ٢١-٥٠-٧٥-١٢٨-١٦١-١٩٢-٧٠٣

— آپؐ خدا کے آخری نبی ہیں ١٤٤

آپؐ کی بعثت کے بعد وہی شریعت حق ہے جو آپ لائے ہیں ٢٤٩-٢٥٠

— آپؐ سراسر راہ راست پر ہیں ٢٤٩-٦٠٣

— آپؐ راہ راست کی طرف دعوت دیتے ہیں ٢٩٢

— اہل ایمان کے لیے آپؐ محض مبلغ ہی نہیں بلکہ رہنما اور حاکم بھی ہیں ٣٢٧-٣٦٠

— آپؐ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ٤٣٢

— اللہ نے ہر بستی میں ایک ایک نبی بھیجنے کے بجائے ساری دنیا کے لیے آپؐ ہی کو نبی مقرر کیا ہے ٤٥٧

— آپؐ بشر تھے ٥٠-١٥٧-٤٣٨-٤٤٤

— قریش کے لوگ آپ کو اس لیے نبی ماننے سے انکار کرتے تھے کہ وہ انسان کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے ١٤٢-١٤٤-١٤٥-٤٣٨

— آپؐ عالم الغیب نہ تھے ٣٦٣-٣٦٤-٣٦٦

— خدائی صفات و اختیارات میں آپ کا کوئی حصہ نہ تھا ٢٠-٢١

— آپؐ یہ اختیارات نہ رکھتے تھے کہ جسے چاہیں خود ہدایت دے دیں ١٠-٦٥٠-٦٥١

— آپؐ کا کام لوگوں کو ایمان بخش دینا نہیں بلکہ خبردار کر دینا تھا ۸۴- ۸۵- ۸۷- ۲۰۳- ۲۰۴-۲۰۸

— آپؐ کا کام لوگوں کو خبردار کرنا تھا، جزا و سزا دینا آپؐ کے اختیار میں نہ تھا ۴۵۹

— آپؐ کا کام لوگوں کو خبردار کرنا تھا، لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنا نہ تھا ۲۳۶

— اللہ کے ارشادات میں رد و بدل کرنے کے اختیارات آپؐ کو نہیں تھے ۲۱-۲۲

— آپؐ کے رشتہ داروں کے لیے دین میں کوئی امتیازی مقام نہیں ہے ۵۴۲-۵۴۳

— آپؐ کی نبوت کے دلائل ۷- ۳۶- ۳۷- ۵۳- ۲۶۸- ۲۶۹- ۲۸۹- ۲۹۱- ۲۹۲- ۴۵۹- ۴۷۵- ۶۱۲- ۶۳۹ تا ۶۴۲- ۶۶۶ تا ۶۷۰- ۷۱۱ تا ۷۱۳

— آپؐ کی سیرت آپؐ کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۵۴۴-۵۴۵

— صحابہ کرامؓ کی سیرتوں کا انقلاب آپؐ کی نبوت کی نمایاں دلیل ہے ۲۶۰- ۲۶۸- ۲۶۹- ۲۸۵ تا ۲۸۷- ۳۶۵- ۳۶۶- ۴۶۱ تا ۴۶۹- ۵۴۴ تا ۵۴۷

— آپؐ کو دلیل نبوت کے طور پر قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ۱۴۰- ۷۱۱ تا ۷۱۳

— اس کے وجوہ ۴۷۴- ۴۷۵- ۴۷۷- ۴۷۸- ۴۷۹- ۴۸۱- ۴۹۸- ۴۹۹- ۶۱۱- ۶۱۲- ۶۴۳- ۶۴۴

— کفار کی طرف سے بار بار معجزات کے مطالبے اور ان کا جواب ۱۴۸- ۴۴۵- ۴۷۵ تا ۴۷۹- ۴۸۱- ۴۹۸- ۴۹۹

— آپؐ کی دعوت ۸۱- ۸۲- ۱۹۲- ۲۴۹- ۴۳۲- ۵۳۵- ۶۷۰

— آپؐ کی دعوت وہی تھی جو تمام انبیا علیہم السلام کی تھی ۷- ۵۶- ۸۵- ۱۴۳- ۱۵۴- ۲۵۵- ۲۵۹

— آپؐ کے لائے ہوئے دین کی بنیادی تعلیمات (دیکھو ''اسلام'' اور ''قرآن'')

— آپؐ کے اخلاق عالیہ ۱۴۷- ۳۶۵- ۷۶۷- ۷۶۸

— آپؐ کے دشمنوں کو بھی آپؐ کی صداقت کا اعتراف تھا ۱۴۸

— آپؐ کی شخصیت اور تعلیم کا غیر معمولی اثر ۱۴۵- ۱۴۶

— کفار قریش آپؐ کو کس معنی میں جادوگر کہتے تھے ۱۴۵-۱۴۶

— آپؐ کی فتوحات کے اصل اسباب ۳۰۸- ۳۱۴- ۳۶۵

— آپؐ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے ۷۱۱ تا ۷۱۵

— اپنی قوم کو ہدایت دینے کے لیے آپؐ کی بے چینی ۱۰- ۴۷۶- ۴۷۷

— آپؐ سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو دین حق کی دعوت دیتے ہیں ۵۴۱- ۵۴۳

— مکے میں آپؐ کی اور کفار قریش کی کش مکش ۶- ۷- ۵۲- ۵۳- ۱۵۸- ۱۵۹

— کفار مکہ کی ہٹ دھرمیاں ۴۳۸- ۴۳۹- ۴۷۴- ۵۳۷- ۵۳۸

— آپؐ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے کفار قریش کی چالیں اور ان کی ناکامی کے اسباب ۶- ۷-

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۲-۵۳-۱۴۵-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۲۳۲-
۲۳۳
— کفار قریش آپؐ کے کیوں مخالف تھے؟ ۲۲-
۱۴۵-۴۴۰-۴۷۴-۵۸۴-۶۵۰ تا ۶۵۲-۶۶۰
— کفار مکہ کے آپ پر ایمان نہ لانے کے وجوہ اور
ان کے عذرات ۵۱۳ تا ۵۱۶-۶۱۲-۶۵۰ تا
۶۵۶-۶۶۰ تا ۶۶۴-۶۶۶
— مدینے میں آپؐ کے خلاف مخالفین کی چالیں
۳۰۸-۳۰۹
— آپؐ کے خلاف قدیم و جدید مخالفین کے
اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۶۴-۲۹۰-
۲۹۱-۴۳۵ تا ۴۳۹-۴۵۲-۴۵۳-۵۱۳-
۵۱۴-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶ تا
۵۴۸-۶۴۱-۶۴۲
— آپؐ کے پاس حبش سے عیسائیوں کی آمد اور ان
کا قبول اسلام ۵۳۷-۶۴۴ تا ۶۵۰

مدین-۲۳۴-۶۹۹
— اس کی طرف موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت ۸۸-
۹۴-۶۲۶ تا ۶۳۱
— اس کی جائے وقوع اور حضرت موسیٰ کے عہد میں
اس کی سیاسی حیثیت ۶۲۶-۶۲۷
— اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کا فرق ۵۳۱-
۵۳۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شعیب'' علیہ السلام)

مریم علیہا السلام ۶۲-۶۷-۱۸۴
— ان کا مرد کے بغیر حاملہ ہونا ایک معجزہ تھا ۲۸۰-۲۸۱
— عیسائیوں کا ان کو مادر خدا قرار دینا ۱۷

مذہب-دیکھو ''دین''

مسجد حرام
— اس کے حدود کیا ہیں؟ ۲۱۵-۲۱۶-۲۲۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کعبہ'' اور ''مکہ'')

مسلم
— اسلام کے پیرووں کا نام اللہ نے مسلم رکھا ہے
۲۵۵-۲۵۶
— تمام انبیا کے پیرووں کا نام مسلم تھا ۲۵۵-۲۵۶-
۶۴۵ تا ۶۴۹
— دنیا میں مسلمانوں کی اصل حیثیت اور ان کا کام
۲۵۲ تا ۲۵۶
— اہل ایمان کا اصل نام مسلم ہے ۱۹۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلام'')

مسیح-دیکھو ''عیسیٰ علیہ السلام''

مسیحی اور مسیحیت-دیکھو ''عیسائیت''

مشرک-دیکھو ''شرک''

مشرکین عرب-دیکھو ''شرک'' اور ''عرب''

مشیت الٰہی-دیکھو ''تقدیر''

معجزہ
— اس کے برحق ہونے کے دلائل ۱۹-۲۰-۶۸۶-۶۹۱
— اللہ کی طرف سے مامور ہونے کی علامت کے طور
پر انبیا کو دیا جاتا ہے ۲۷۹-۲۸۰
— معجزہ دکھانے کا مقصد ۲۳۳-۲۳۴
— معجزہ دیکھ لینے کے بعد انکار کرنے والی قوم سزا
سے نہیں بچ سکتی ۲۸۱
— حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا ۶۹۱
— وہ معجزات جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے
— لاٹھی کا سانپ بنا دیا جانا ۹۱-۱۰۴-۴۸۷-

۴۸۸-۵۵۹-۶۳۳
-- ہاتھ کا سورج کی طرح روشن ہو جانا ۹۱-۴۸۸-
۵۶۰-۶۳۳
-- عصا مارنے پر سمندر کا پھٹ جانا اور اس میں سے سوکھی سڑک نکل آنا ۱۰۸-۱۰۹-۴۹۷-۴۹۸
-- من وسلویٰ کا نزول ۱۱۱-۱۱۲
-- **وہ معجزات جو حضرت سلیمانؑ کو دیے گئے:**
-- پرندوں کی بولیوں کا علم ۵۶۲-۵۶۶ تا ۵۷۱
-- ان کے لیے جنوں کا مسخر ہونا ۵۶۲-۵۶۳-
۵۷۵-۵۷۶
-- ان کے لیے ملکہ سبا کا تخت آنا فانا لایا جانا ۵۷۴
تا ۵۷۸
-- حضرت ایوبؑ کے لیے زمین سے چشمہ نکالا جانا ۱۷۹
-- حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالا
جانا ۱۸۳
-- حضرت زکریا کے ہاں بڑھاپے میں بوڑھی بانجھ
بیوی سے اولاد پیدا ہونا ۵۸-۱۸۳
-- حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا کیا جانا ۶۲ تا ۶۷-
۲۸۰-۲۸۱
-- نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں کلام کرنا ۶۶
-- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دلیل نبوت کے طور پر صرف
قرآن کا معجزہ دیا گیا ۱۴۰-۷۱۱ تا ۷۱۳
-- حضورؐ کو حسی معجزے کے بجائے عقلی معجزہ دینے
کے وجوہ ۴۷۴-۴۷۵-۴۷۷-۴۷۸-
۴۷۹-۴۸۱-۴۹۸-۴۹۹-۶۱۱-۶۱۲-
۶۴۳-۶۴۴
-- کفار کی طرف سے بار بار معجزات کے مطالبے
اور ان کے جوابات ۱۴۸-۴۴۵-۴۷۵ تا
۴۷۹-۴۸۱-۴۹۸-۴۹۹

معیشت

-- معاشی زندگی کے متعلق قرآن کی ہدایات ۴۶۳-
۴۶۴-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۲-۵۳۲-۵۳۳-
۶۵۳ تا ۶۵۵-۶۶۰ تا ۶۶۴-۷۵۷ تا ۷۶۰
-- بخل اور اسراف کے معنی ۴۶۴

مغفرت

-- اس کے معنی ۲۳۷-۶۲۲
-- کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۱۱۲-۲۳۶-۳۷۴

مکہ

-- اس کو اللہ نے حرم بنایا ہے ۶۰۸-۶۵۲-۷۲۰
-- عرب میں اس کی اہمیت ۶۵۱-۶۵۳
-- اس کے مکانات کے کرائے اور زمین کی ملکیت کا
مسئلہ ۲۱۵-۲۱۶
-- حرم مکہ میں ظلم وزیادتی گناہ ہے ۲۱۷
-- ابتدائے عہد رسالتؐ میں مکے کا قحط ۲۵۸-
۲۹۳-۲۹۴
ملائکہ - دیکھو "فرشتہ"

منافق - منافقین

-- ان کی صفات اور طرز عمل ۲۶۷- ۳۹۷-
۴۰۵- ۴۰۶- ۴۱۴- ۴۱۵- ۴۱۶- ۴۲۷-
۶۸۰-۶۸۱
-- مومن اور منافق کا فرق ۶۷۲-۶۸۱
-- مکی دور میں منافقین کا وجود ۶۷۲-۶۷۴-
۶۸۰ تا ۶۸۲
-- مدینے میں ان کی شرارتیں ۳۰۸-۳۱۰-۳۱۴-۳۶۵
من وسلویٰ ۱۱۱-۱۱۲
موت - ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے ۷۱۶
موسیٰ علیہ السلام - ۱۶۲-۳۳۴-۴۵۰-۴۵۱-۷۰۰
-- ان کا قصہ ۳۴ تا ۴۰-۷۱-۷۲-۸۵-۸۸ تا

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۲۱-۲۷۹-۲۸۰-۴۸۰ تا ۴۹۸-۵۵۷ تا
۵۶۰-۶۱۰-۶۱۳ تا ۶۳۹
— ان کی پیدائش اور پرورش کا حال ۹۳-۹۴-
۶۱۶ تا ۶۲۰
— ان کا نام موسیٰ کیسے رکھا گیا؟ ۶۱۹
— فرعون کے گھر میں ان کی تربیت اور حیثیت
۴۸۳-۶۲۰-۶۲۱
— ان سے قتل کے واقعے کا صدور ۹۴-۴۸۲-
۴۸۳-۶۲۱-۶۲۲
— وہ قتل عمد کے مرتکب نہ تھے ۴۸۴
— ان کا مدین میں پناہ لینا ۹۴-۶۲۵ تا ۶۳۱
— کیا حضرت شعیبؑ ان کے خسر تھے؟ ۶۲۷-۶۲۸
— ان کو نبوت عطا کی جاتی ہے اور فرعون کے ہاں
جانے کا حکم دیا جاتا ہے ۸۸ تا ۹۳-۹۴-۹۵-
۲۷۹-۲۸۰-۴۸۰-۴۸۳-۵۵۷ تا ۵۶۰-
۶۳۱ تا ۶۳۳
— ان کے لیے حضرت ہارونؑ کو مددگار بنایا جاتا
ہے ۷۲-۹۲-۹۳-۴۵۰
— وہ معجزات جو ان کو دیے گئے ۹۱-۱۰۴-۱۰۸-
۱۰۹-۱۱۱-۱۱۲-۴۸۷-۴۸۸-۴۹۷-
۴۹۸-۵۵۹-۵۶۰-۶۳۳
— کیا وہ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے فرعون
کے ہاں بھیجے گئے تھے؟ ۹۵-۹۶-۴۸۳
— فرعون کے دربار میں ان کا پہنچنا اور اپنی دعوت
پیش کرنا ۹۵ تا ۹۸-۲۸۰-۴۸۴-۴۸۵-
۶۳۵-۶۳۶
— فرعون اور اس کی قوم پر ان کے معجزات کی ہیبت
۱۰۰-۴۸۶ تا ۴۸۹-۴۹۰-۴۹۵
— اس کو آپ سے سیاسی انقلاب کا خطرہ کیوں لاحق
ہوا؟ ۱۰۰-۱۰۳ تا ۱۰۷-۴۸۹
— ان کے مقابلے میں فرعون کی چالیں، اور وہ کس
طرح الٹی پڑیں؟ ۱۰۳ تا ۱۰۷-۴۹۲ تا ۴۹۴
— جادوگروں سے مقابلہ اور ان کا شکست کھا کر
ایمان لے آنا ۱۰۰-۱۰۳ تا ۱۰۷-۴۹۰ تا ۴۹۳
— نبی اور ساحر کا فرق ۴۹۰-۴۹۱
— مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلتے ہیں ۱۰۸-
۴۹۳ تا ۴۹۸
— خدائی تدبیر نے کس طرح فرعون کو ہلاک کیا
۴۹۵ تا ۴۹۸
— مصر سے نکلنے کے بعد ان کو کتاب اور شریعت عطا
کی جاتی ہے ۱۱۱-۲۸۰-۶۳۹
— فرعون کی ہلاکت کے بعد مصر میں ان کے قیام کا
کوئی ثبوت نہیں ۳۴
— سامری کا فتنہ اور بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی میں
مبتلا ہونا ۱۱۲ تا ۱۲۱
— قارون ان کا رشتہ دار تھا ۶۶۰-۶۶۱
— قصہ خضر و موسیٰ کب اور کہاں پیش آیا اور اسے
کیوں بیان کیا گیا ہے ۳۴-۳۵
— اہل عرب بالعموم حضرت موسیٰ کو انبیا میں شمار
کرتے تھے ۸۵

مومن - دیکھو ''ایمان''

مہر
— منکوحہ عورت کا مہر کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا
۳۵۸

ن

نامہ اعمال ۲۹-۷۹-۹۸-۱۳۷-۱۸۵-۲۸۷-
۲۸۸

نبوت
— لفظ نبی کے معنی ۷۱
— رسول اور نبی کا اصطلاحی فرق ۷۱
— انبیا اور رسولوں کی تعداد ۷۲
— انبیا کے انساب ۷۳

— نبوت کے حق میں عقلی دلائل ۹۷-۹۸

— تمام انبیا انسان تھے ۱۴۳-۱۴۹-۱۶۳-۱۸۳-۱۸۴-۲۷۳-۲۷۸-۲۸۰-۴۴۴

— انسانوں کے لیے انسانوں کو نبی مقرر کرنے کی مصلحت ۴۴۴-۴۴۵

— گمراہ لوگوں کو ہمیشہ یہ غلط فہمی رہی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا ۱۴۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۳۳

— جاہل انسان ہمیشہ سے بشر کو نبی اور نبی کو بشر ماننے سے انکار کرتے رہے ہیں ۲۷۳-۲۷۵-۲۷۸-۲۸۰-۲۸۱

— انبیا کا خدائی میں کوئی حصہ نہ تھا ۱۸۳-۱۸۴-۲۵۲

— نبی کا کام عذاب دینا نہیں بلکہ خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے ۳۲-۳۳-۵۳۳

— نبی کا کام لوگوں کو مومن بنا دینا نہیں ہے ۱۰-۴۱۶-۶۵۰-۶۸۸-۷۶۴

— نبی کی رشتہ داری کسی کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی ۵۲۸-۵۲۹-۵۴۱-۵۴۲-۶۹۶-۶۹۷

— نبی کے رشتہ داروں کے لیے دین میں کوئی امتیازی حیثیت نہیں ہے ۵۴۱ تا ۵۴۳

— نبی کی صداقت کیسے پرکھی جا سکتی ہے ۲۸۹-۲۹۰-۲۹۲-۴۵۹-۵۰۹-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۷-۵۱۸-۵۲۱-۵۲۶-۵۳۲

— نبی اور جادوگر کا فرق ۴۹۰-۴۹۱

— اللہ تعالیٰ نبی کیوں بھیجتا ہے ۱۴۰-۶۴۳

— اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ایک رسول کے ذریعے سے اس کو خبردار نہ کر دے ۶۵۳-۶۵۴

— نبوت انسانیت کے لیے اللہ کی رحمت ہے ۴۵۶-۴۵۷

— انسانیت کے لیے اس کی حیثیت وہی ہے جو زمین کے لیے بارش کی ہے ۷۶۳-۷۶۴

— انبیا کو وہ علم دیا جاتا ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا ۶۹-۷۰

— نبی کے کمالات وہبی ہوتے ہیں نہ کہ ذاتی ۱۷۳-۱۷۴

— نبی کو حکم اور علم عطا کرنے کا مطلب ۶۰-۱۷۲-۴۸۴-۵۰۴

— انبیا کا پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کیا جانا ۵۸-۶۳-۹۳-۹۴

— انبیا کو نبوت کس طرح دی جاتی ہے؟ ۸۵-۵۵۸

— انبیا ہمیشہ اعلیٰ درجے کی صفات سے متصف ہوتے تھے ۹۳

— انبیا کے اوصاف ۶۰-۶۱-۶۶-۶۷-۶۹-۷۰ تا ۷۳-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳

— نبی اپنی امت پر گواہ ہوتا ہے ۲۵۵

— انبیا کے کام کی حفاظت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۲۳۷

— انبیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ۱۶۳-۱۸۴

— نبی کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ۵۶۱-۵۶۲

— انبیا کی بعثت کا مقصد ۳۲-۳۳

— انبیا کس معنی میں صرف اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے ۲۸۰

— انبیا کی دعوت محدود معنی میں مذہبی نہ تھی بلکہ پورے نظام زندگی کو بدلنے کے لیے تھی ۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۵۲۳-۵۲۴

— انبیا شرک کے خلاف کتنا شدید جذبہ رکھتے تھے ۱۱۳تا۱۲۱

— نظامِ دین میں نبی کی حیثیت ۳۲۷-۴۶۱-۴۶۲

— رسول کو رسول مان لینے کا لازمی تقاضا اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اطاعت اور پیروی ہے ۴۲۵- ۴۲۶- ۴۲۷- ۵۱۱- ۵۱۷- ۵۱۸- ۵۱۹- ۵۲۱- ۵۲۲- ۵۲۳- ۵۲۶- ۵۳۲

— جو شخص نبی کی اطاعت اور پیروی نہ کرے، اس کے لیے محض نبی کو نبی مان لینا نافع نہیں ہے ۵۴۳-۵۴۴

— رسول کی اطاعت قبول کیے بغیر آدمی مومن نہیں ہوسکتا ۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶

— رسول کی اطاعت کے بغیر آدمی کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی ۷۰-۴۱۶

— رسول کی اطاعت سے منہ موڑنے والے فتنے میں مبتلا ہوکر رہتے ہیں ۴۲۷

— آخرت میں پوچھا جائے گا کہ رسولوں کی دعوت کا لوگوں نے کیا جواب دیا ۶۵۷

— نبی کی دعوت کو رد کردینے والا بہرحال پکڑا جائے گا، خواہ جلدی یا دیر میں ۱۹۲

— تمام انبیا ایک گروہ کے لوگ ہیں اور سب کا دین وہی اسلام تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرماتے ہیں، البتہ ان کی شریعتیں مختلف تھیں ۹۰-۱۴۳- ۱۵۴- ۱۶۳- ۱۸۴- ۱۸۵- ۲۴۹- ۲۵۵- ۲۵۶- ۲۷۳- ۲۷۷- ۲۸۱- ۲۸۳- ۴۹۹- ۵۰۹- ۵۱۰- ۵۷۲- ۵۷۵- ۵۷۹- ۵۸۰- ۵۸۱-۵۸۲-۶۴۵ تا ۶۴۹-۶۸۶-۶۹۹

— تمام انبیا کے پیرووں کا نام مسلم تھا (دیکھو "مسلم")

— ہر نبی کے پیرو اس وقت تک مسلم قرار پاتے ہیں جب تک وہ دوسرے نبی کا انکار نہ کردیں ۷۳۰

— ایک رسول کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے ۴۵۱- ۵۰۹-۵۱۰-۵۱۷-۵۲۱-۵۳۱

— انبیا کی امتوں میں بگاڑ کس طرح آیا ہے؟ ۱۷- ۱۸-۵۶-۶۴-۷۴-۷۵-۸۶-۱۱۳ تا ۱۲۱

— انبیا کو جھٹلانے والوں کے اوصاف ۲۷۷-۲۸۰

— مجرمین ہر زمانے میں انبیا کے دشمن رہے ہیں ۴۴۷

— ہر نبی کے آنے پر قوم میں اندرونی معرکہ برپا ہوا ہے ۵۸۲

— ہر نبی کے آنے پر قوم آزمائش میں پڑ گئی ہے ۵۸۳-۵۸۴

— مخالفین نے ہمیشہ انبیا پر اقتدار طلبی کا الزام لگایا ہے ۱۰۰-۱۰۳-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۸-۴۸۹

— انبیا کے جھٹلانے والوں کا انجام ۵۰- ۱۶۰- ۲۳۴- ۲۳۵- ۲۷۹- ۴۹۸- ۵۱۰- ۵۱۷- ۵۲۰- ۵۲۶- ۵۲۸- ۵۲۹- ۵۳۳- ۵۳۴- ۵۶۰- ۵۸۵- ۶۳۹- ۶۸۵- ۶۹۸- ۶۹۹- ۷۰۰-۷۰۱-۷۶۲-۷۶۳

نجاشی - دیکھو "ہجرت حبشہ"

نصاریٰ - ۲۱۰ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "عیسائیت")

نفاق - دیکھو "منافق"

نماز

— تمام انبیا علیہم السلام کے دین میں فرض تھی ۶۶- ۷۴-۸۹-۱۷۰

— اس کی اہمیت اسلامی نظام زندگی میں ۷۵۴-۷۵۵

— اس کا مقصد ۸۹

— اس کے اخلاقی و روحانی فوائد ۷۴- ۸۶- ۸۹- ۱۳۰-۱۴۰-۷۰۳-۷۰۴

— اس کے ترک کردینے کے اخلاقی نتائج ۷۴

— ایمان لانے والوں کی لازمی صفت اقامت صلوٰۃ ۵۵۴

— نماز قائم کرنے والوں کے لیے بشارت ۲۲۶

— نماز کی اقامت اسلامی حکومت کے بنیادی

مقاصد میں سے ہے ۲۳۴-۴۲۰

— دعوت دین کے کام میں اس سے کس قسم کی طاقت ملتی ہے ۱۳۸-۱۳۹

— پنج وقتہ نماز کی فرضیت ۲۰۷

— اقامت صلوٰۃ کا حکم ۲۵۲-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷

— نماز کے اوقات ۱۳۸-۴۲۰-۴۲۱-۷۴۰-۷۴۱

— نماز کے مسائل اور اس کے آداب ۹۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۷

جوتے پہن کر نماز پڑھنے کا جواز ۸۸-۸۹

— نماز میں خشوع و خضوع کا مسئلہ ۲۶۱

— اس کی محافظت کا مطلب اور اس کا حکم ۲۶۷

— دنیوی کاروبار میں نماز کو نہ بھولنے والے ہی ہدایت پاتے ہیں ۴۰۹

— کیا نماز میں قرآن کے بجائے اس کا ترجمہ پڑھا جا سکتا ہے ۵۳۶

— نماز کے متعلق منکرین حدیث کے غلط تصورات کی تردید ۴۱۷-۴۶۷-۷۵۵

نوح علیہ السلام ۳۷-۴۷-۲۳۴-۴۵۱

— ان کا قصہ ۲۷-۱۷۳-۲۷۳-۲۷۵-۲۷۶-۵۰۹ تا ۵۱۷-۶۸۵-۶۸۶

— ان کی طویل عمر ۶۸۵-۶۸۶

— کشتی نوح نشان عبرت کی حیثیت سے باقی رکھی گئی ۶۸۶-۶۸۷

و

وادی النمل

اس کی تحقیق ۵۶۳-۵۶۴

وراثت زمین - ۲۱۵

صالحین کو اس کے عطا کیے جانے کا مطلب ۱۲۵-

۱۸۹ تا ۱۹۲

— زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے ۱۳۵ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''خلافت'')

وحی

— حضرت نوح وحی کی رہنمائی میں کشتی بناتے ہیں ۲۷۵

— حضرت موسیٰ کی ماں پر وحی ۶۱۶

— غیر نبی کی طرف وحی کیے جانے کا مطلب ۹۳

باران رحمت سے وحی کی مشابہت ۲۴۷-۲۴۸

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

ھ

ہارون علیہ السلام ۴۲-۴۷-۱۶۲-۲۷۹-۲۸۰-۴۵۰-۴۵۱

— ان کا حضرت موسیٰ کے لیے مددگار مقرر ہونا ۹۲-۹۳-۴۸۱-۴۸۲

(تفصیلات کے لیے دیکھو ''موسیٰ علیہ السلام'')

— ان کو حضرت موسیٰ کا مددگار کس لیے بنایا گیا ۶۳۴

— بنی اسرائیل کی طرف سے ان پر گوسالہ پرستی شروع کرنے کا جھوٹا الزام اور قرآن کی طرف سے اس کی تردید ۱۱۶-۱۱۷

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'')

— ان کے خاندان کا مذہبی منصب کے لیے مخصوص کیا جانا ۵۷

ہامان - ۶۱۵-۷۰۰

ہجرت

— دین میں اس کی اہمیت ۲۱۷

— اس کے محرکات اور اس کی اخلاقی بنیادیں ۲۱۶ تا ۲۱۸

— اس کا اجر عظیم ۲۴۵-۲۴۶

ہجرت حبشہ

Maktaba Tul Ishaat.com

— کن حالات میں ہوئی؟ ۵۳- ۱۵۸-۶۷۲-
۶۷۴-۷۱۶-۷۱۷

— اس کے اثرات ونتائج ۵۲-۵۳-۵۳۷-۶۴۴
تا۶۵۰

— حبش میں عیسائیوں کے سامنے دین پیش کرنے
کے لیے ہدایات ۷۰۸تا۷۱۰

— نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار کی تقریر
۵۴-۵۵-۶۹

ہجرت مدینہ

— کن حالات میں ہوئی؟ ۲۳۲-۲۳۳

— کس طرح کفار کے لیے فتنہ بن گئی تھی ۲۳۸-
۲۳۹

ہدایت

— صرف خدا ہی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے ۶۴۴

— اللہ تعالیٰ کس طرح ہر چیز کی رہنمائی کرتا ہے؟ ۹۷

— اللہ تعالیٰ کس طرح انسان کی رہنمائی کرتا ہے؟
۵۰۲-۵۰۳

— اللہ کی ہدایت کی پیروی ہی میں انسان کی فلاح
ہے ۱۳۴

— ہدایت کے ذرائع ۲۰۶

— ہدایت اختیار کرنے والا خود اپنا بھلا کرتا ہے
۹۵-۶۰۸

— اللہ کے نور کی طرف ہدایت پانے والے کون
لوگ ہیں ۴۰۹-۴۱۰

— وہ کیسے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے؟ ۲۴۴-۲۴۵

— وہ کیسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا؟ ۳۲-۳۳-
۲۴۴-۲۴۵

— ہدایت پانے کی واحد صورت ایمان اور اتباع
رسول ہے ۴۱۶

— ہدایت میں ترقی کا مفہوم ۱۳-۷۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور
''ضلالت'')

ہدی

— ہدی کے جانور سے استفادے کا مسئلہ ۲۲۴-
۲۲۵

ہود علیہ السلام

— ان کا قصہ ۲۷۷تا۲۷۹-۵۱۷-۵۲۰

ی

یاجوج وماجوج

— اس سے مراد کون سی قومیں ہیں ۴۳-۴۴

— قیامت کے قریب ان کا ظہور ۱۸۶

یحییٰ علیہ السلام - ۵۷تا۶۲-۱۸۳

— ان کے زمانے میں یہودیوں کی اخلاقی و مذہبی
حالت ۵۸-۶۲

یعقوب علیہ السلام -۷۰-۱۶۹-۶۹۴

یوم الدین - ۵۰۳ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو
''قیامت'' اور ''آخرت'')

یونس علیہ السلام -۱۸۲-۱۸۳

یہود - ان کا ایک گروہ آخرت کا منکر تھا ۱۷

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کی تدابیر ۳۰۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'' اور
''موسیٰ علیہ السلام'')

ooo

١

٢

Maktaba Tul Ishaat.com

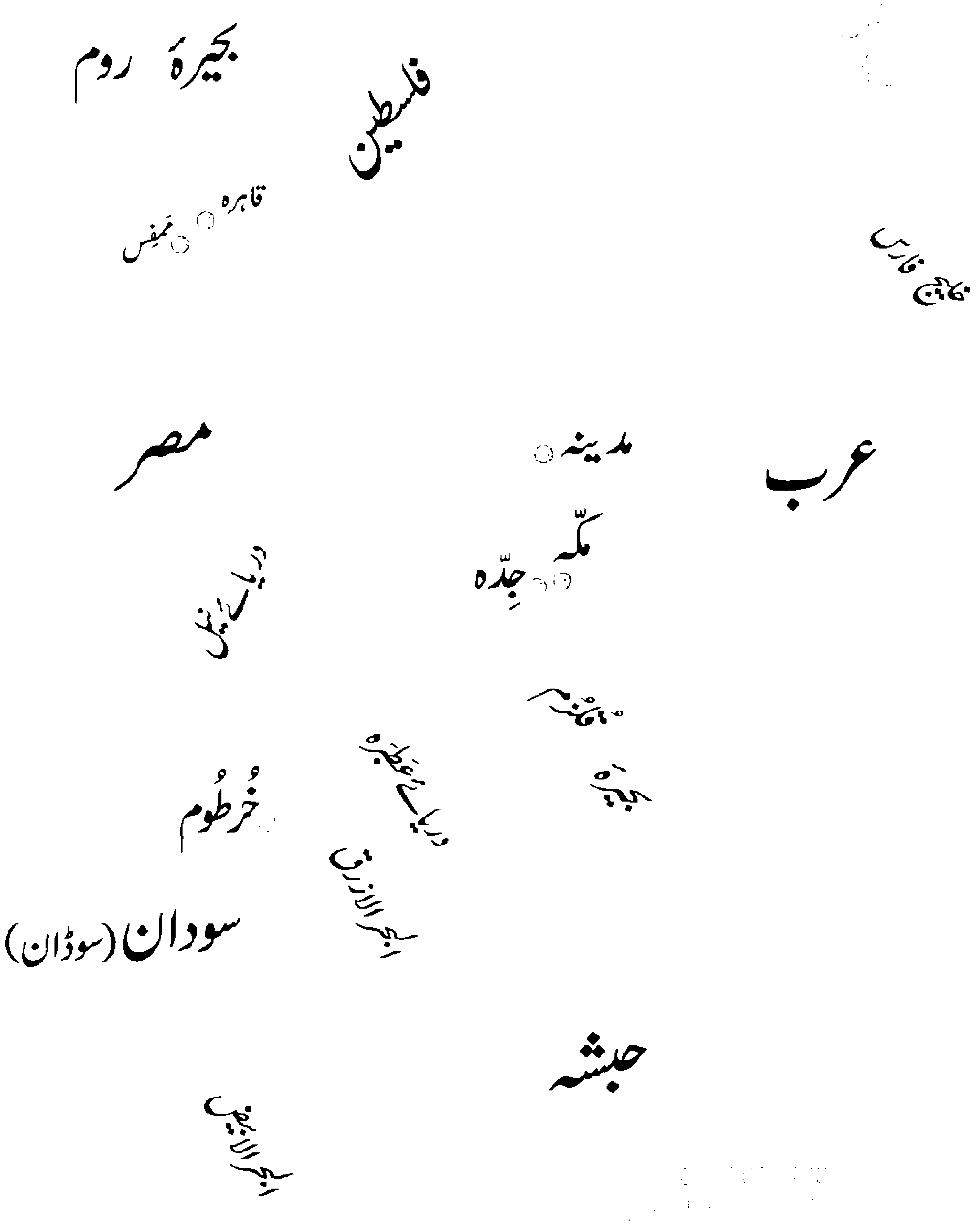

نقشہ متعلقہ صفحہ ۳۴ (جلد سوم)

نقشہ بسلسلہ قصہ ذوالقرنین

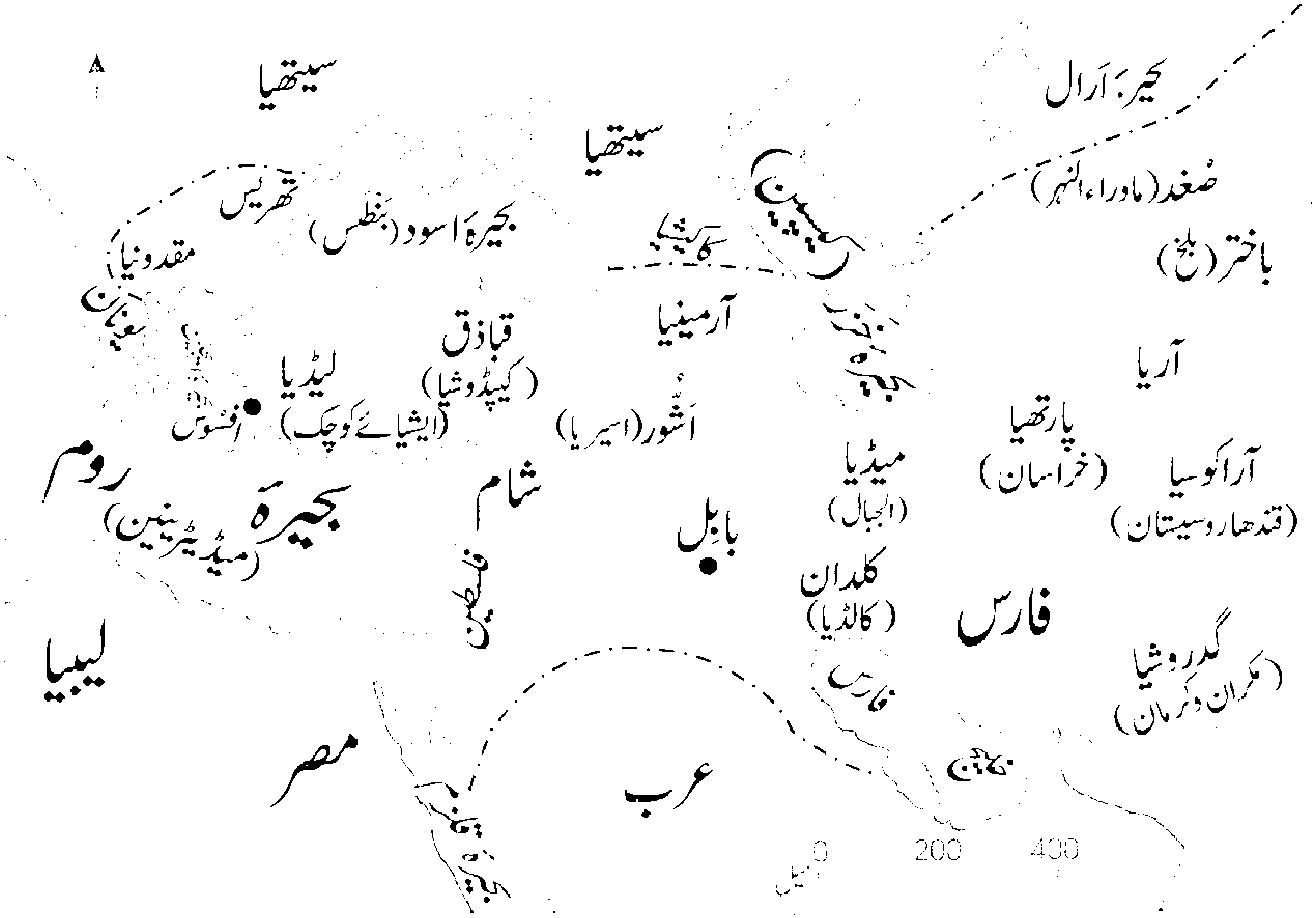

خورس اور اس کے جانشینوں کی سلطنت چھٹی صدی قبل مسیح کے آخری زمانے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

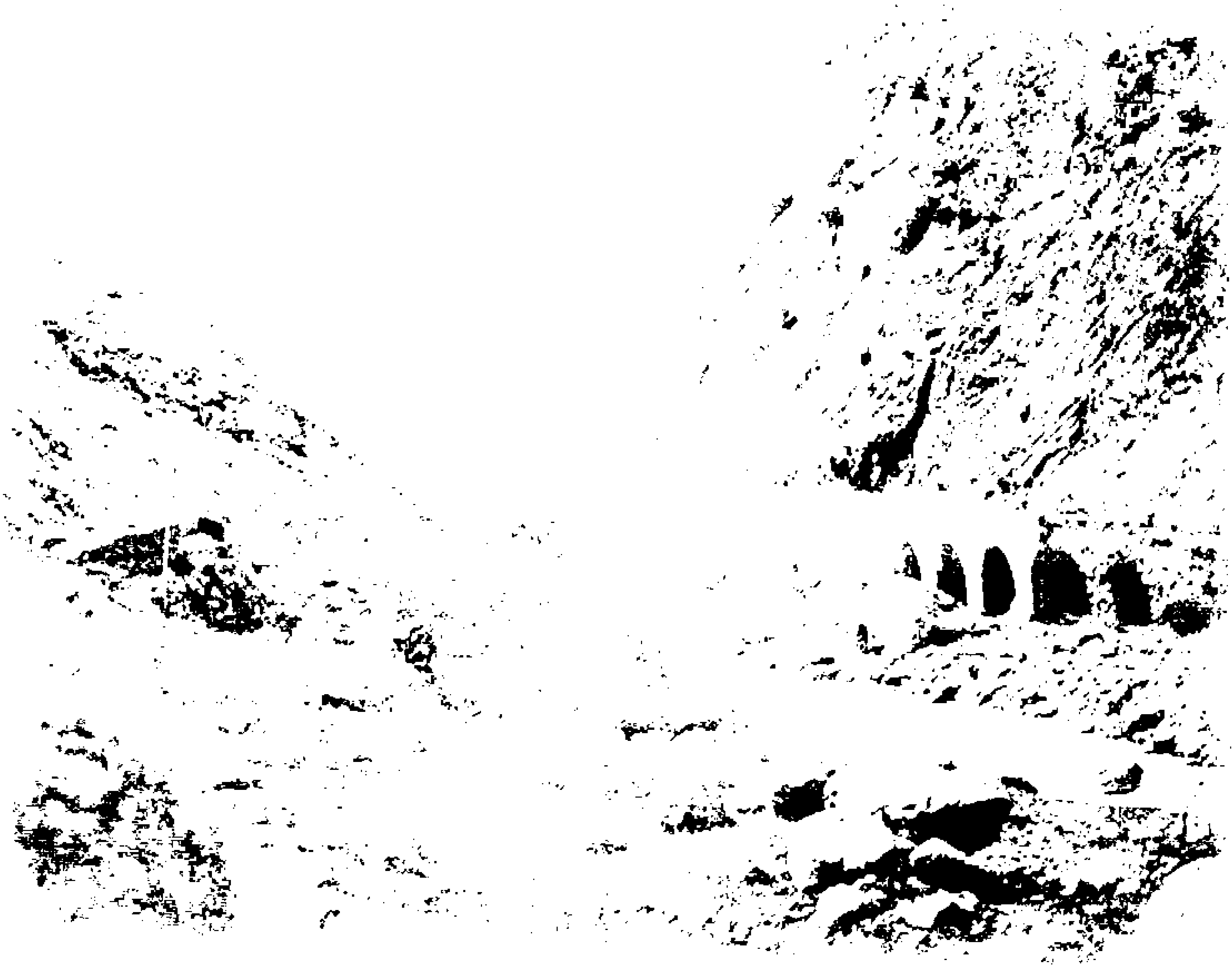

متعلقهٔ صفحه ۴۶ (جلد سوم)

نقشہ خانہ کعبہ

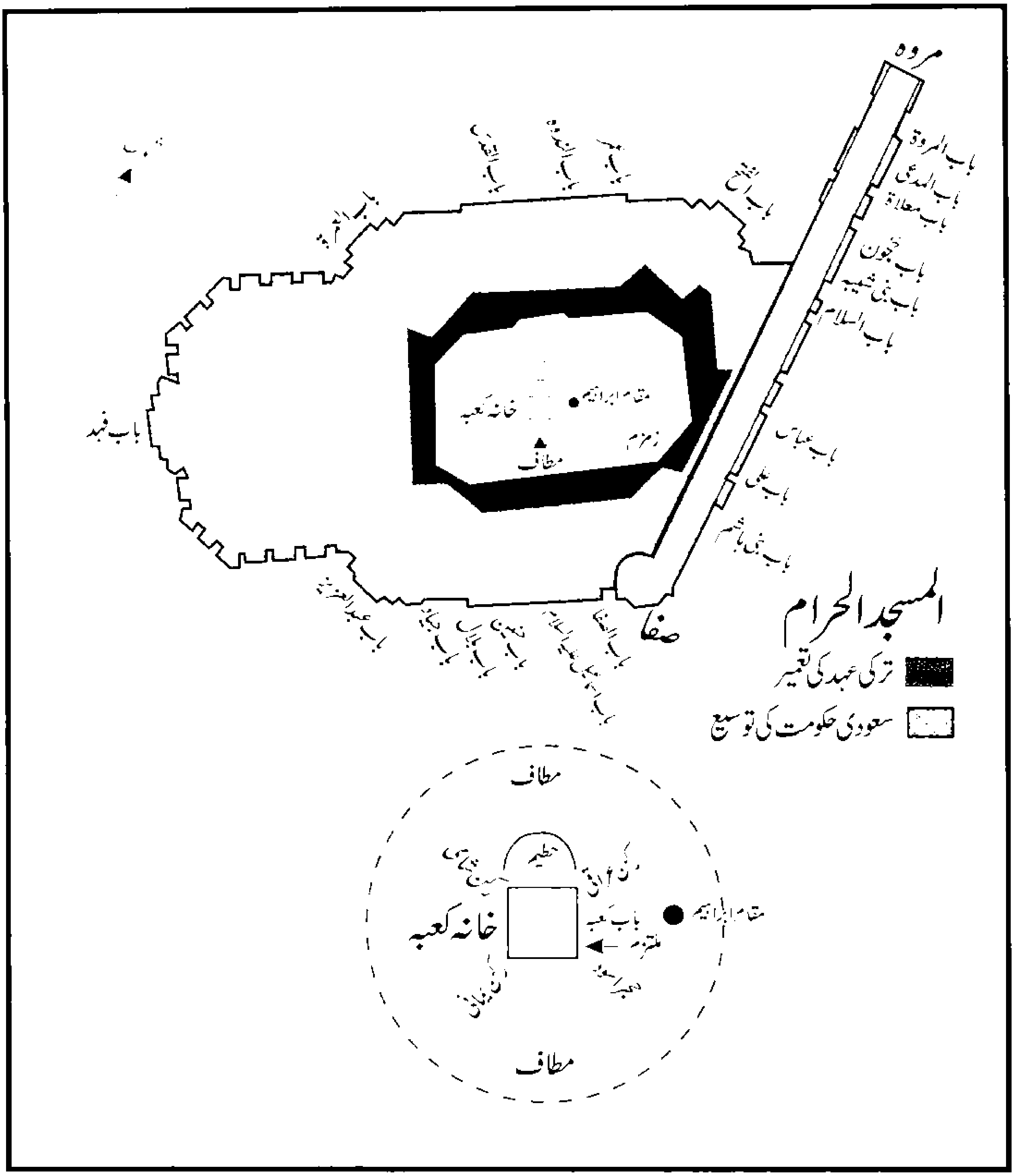

نقشہ متعلقہ صفحہ ۲۱۸ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

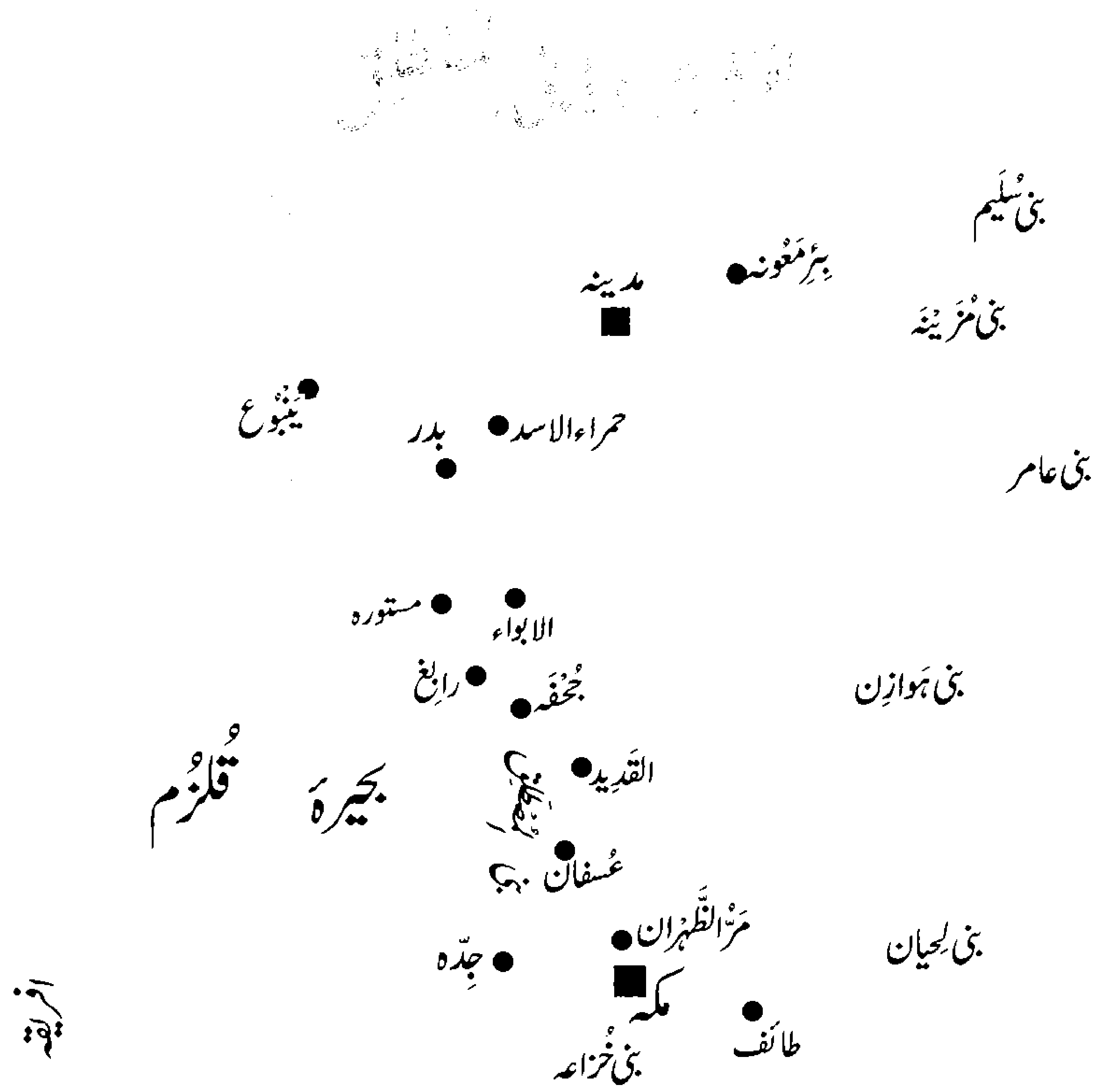

نقشہ متعلقہ صفحہ ۳۰۹ (جلد سوم)

مدائن صالح کی چند ثمودی عمارات

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

العلاء کے پہاڑ

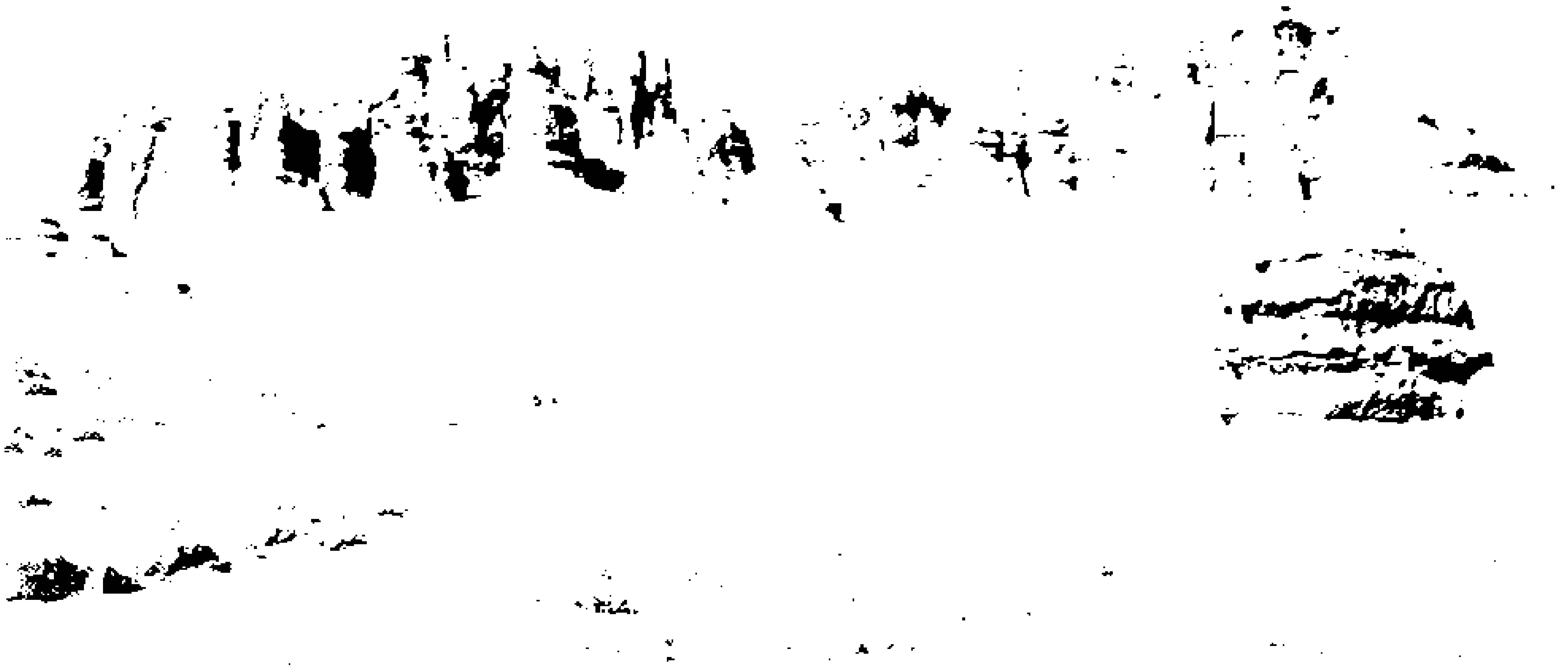

مدائن صالح کے پہاڑ

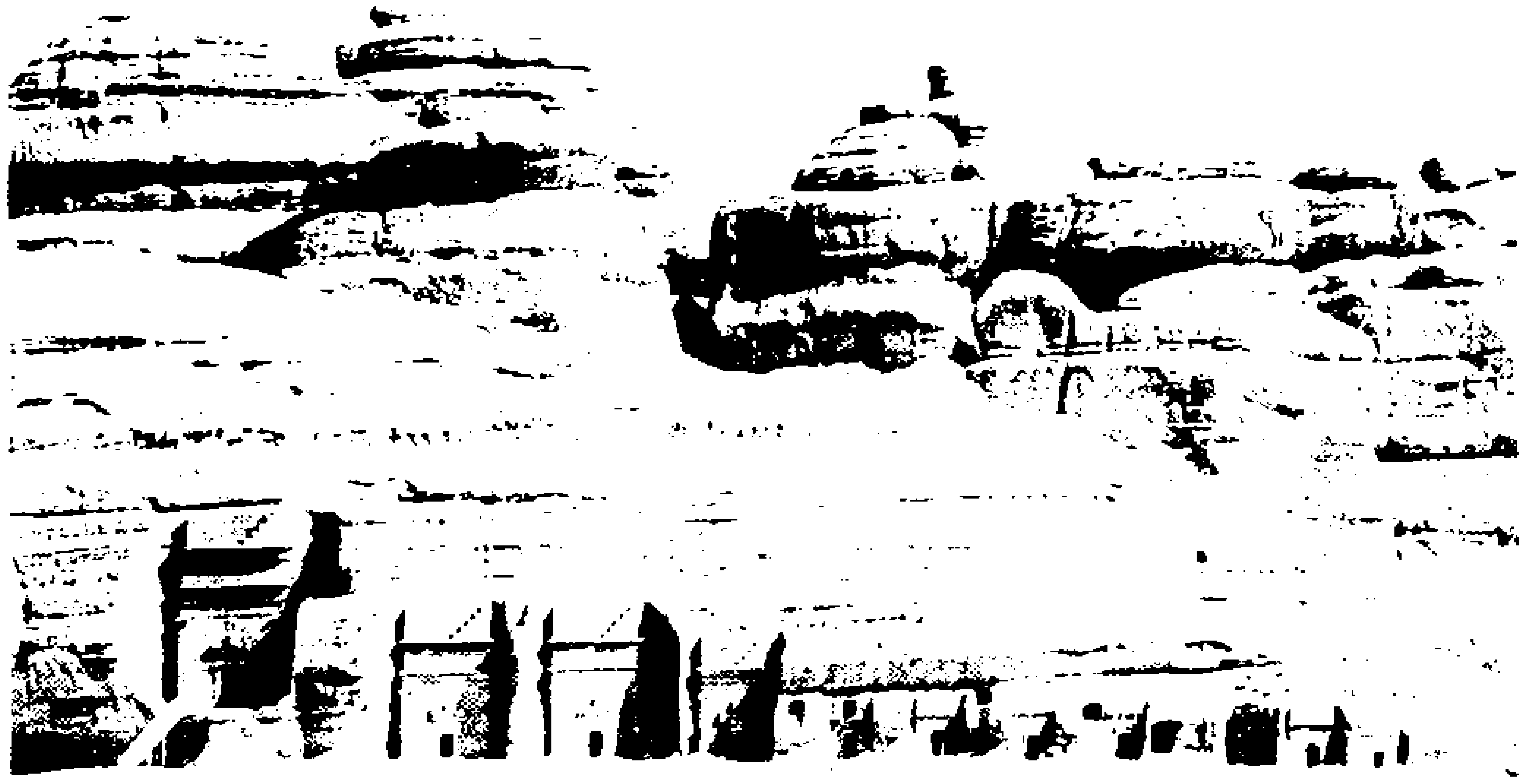

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

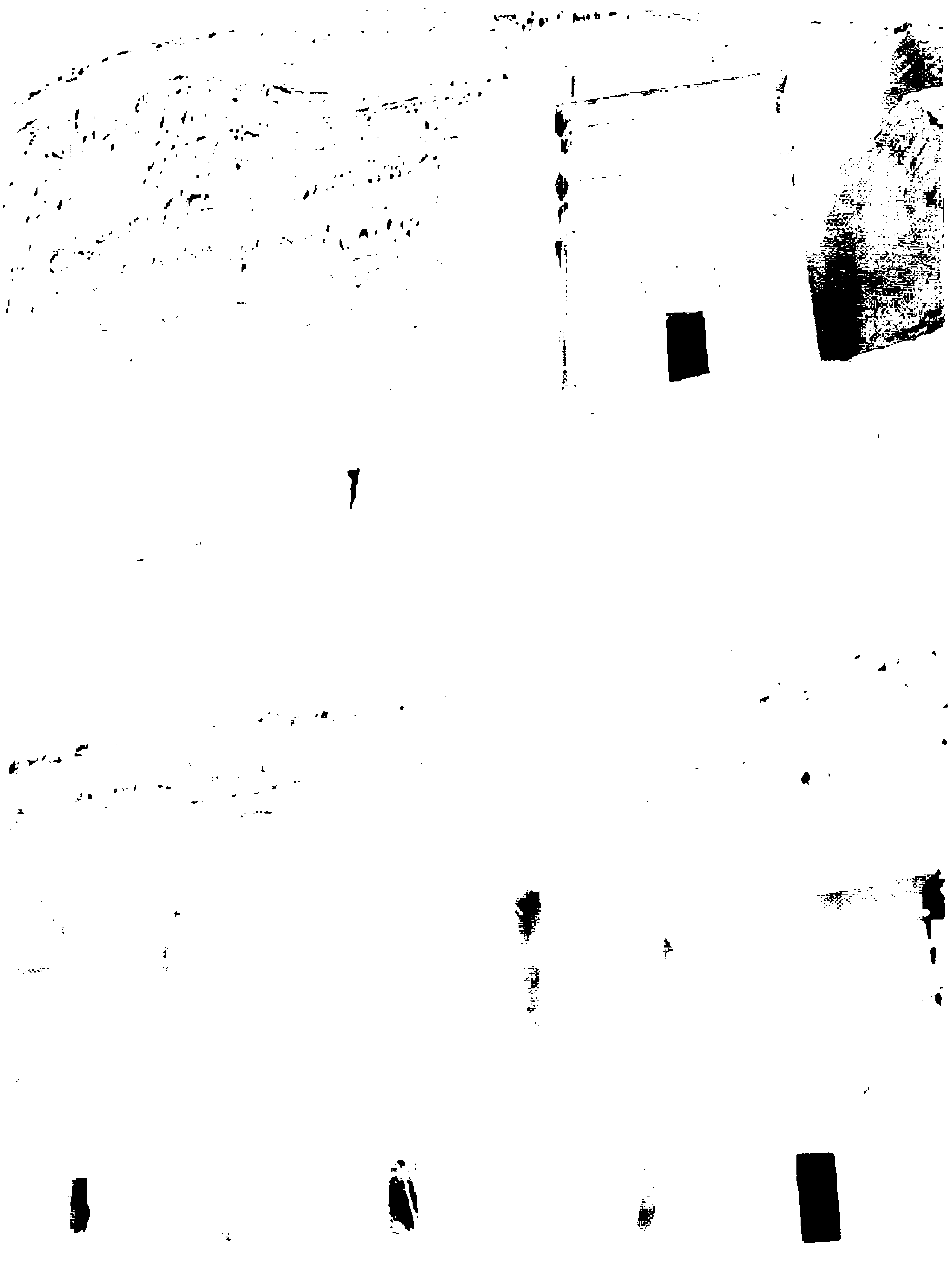

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

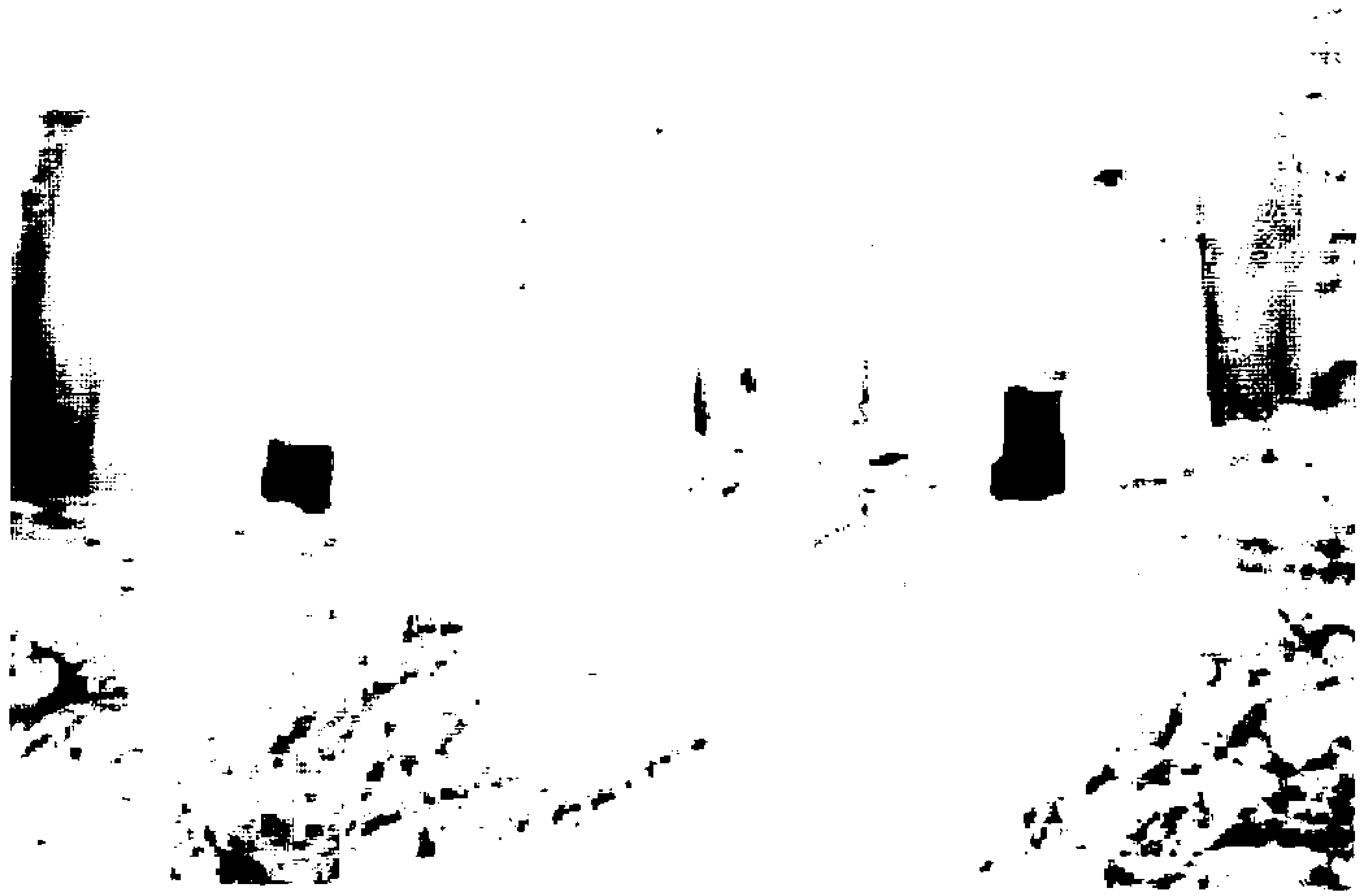

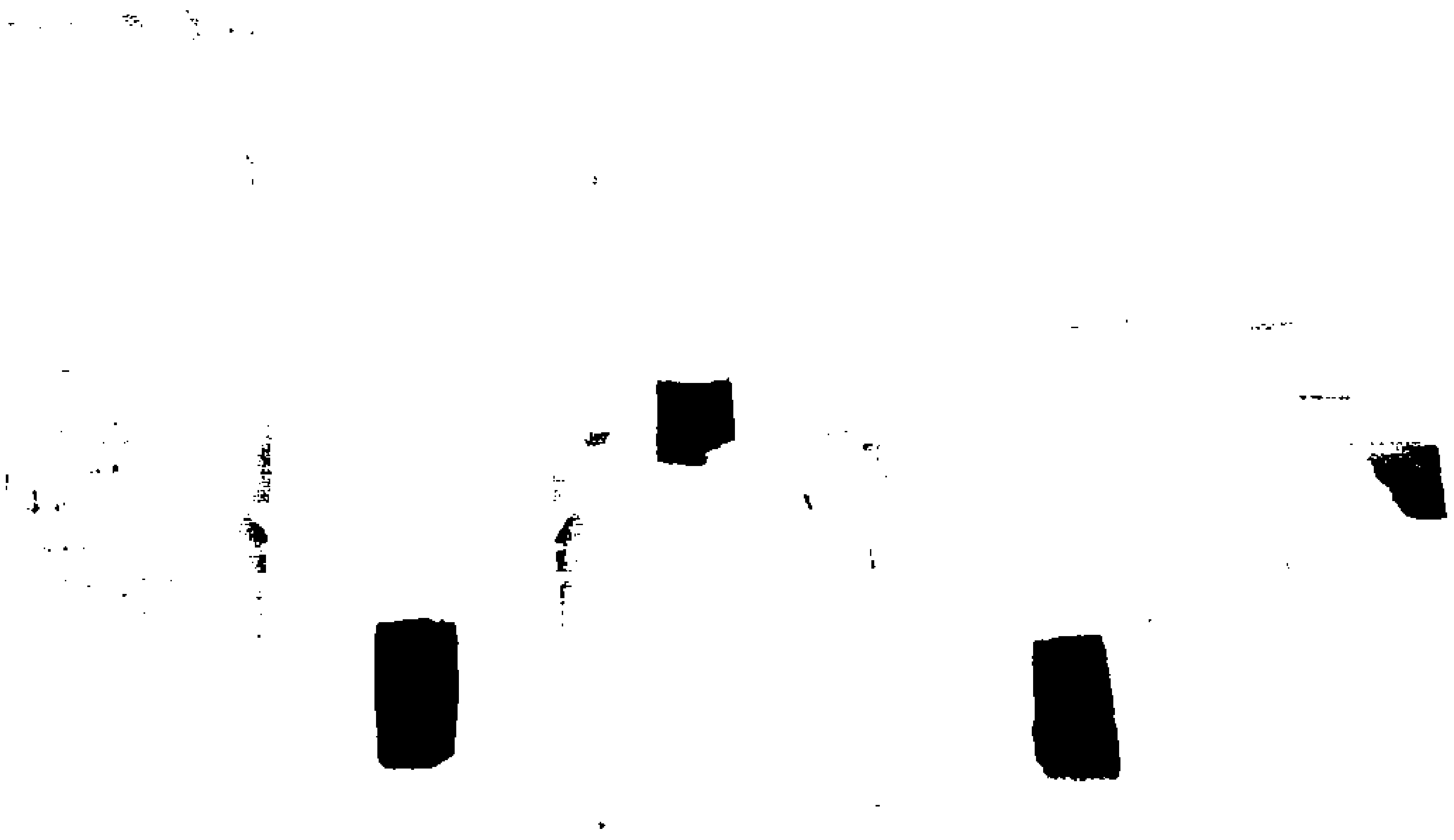

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

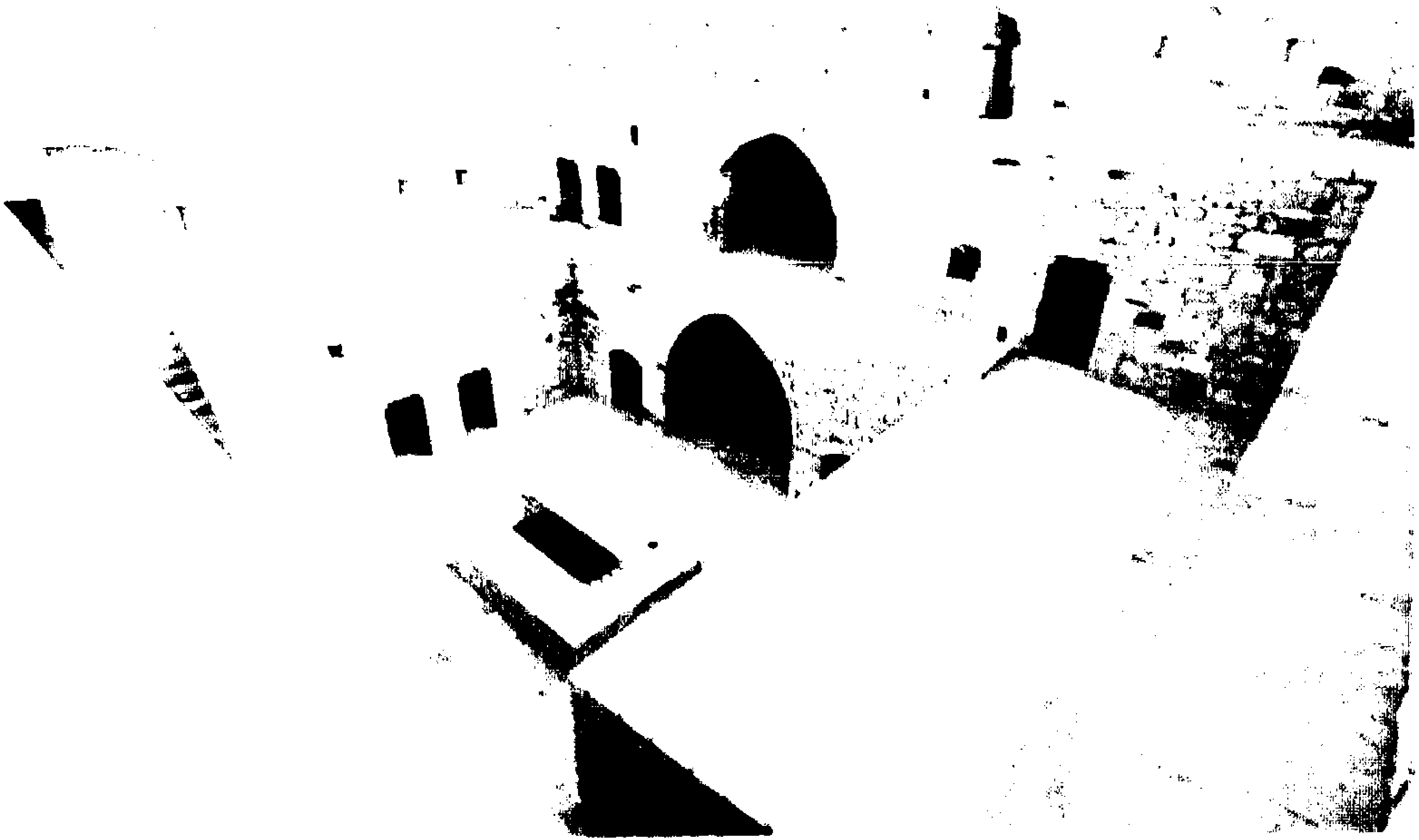

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

مدائن صالح میں ترکی عہد کی فوجی چوکی، تصویر میں ایک درمیان واقع وہ کنواں جس پر حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی

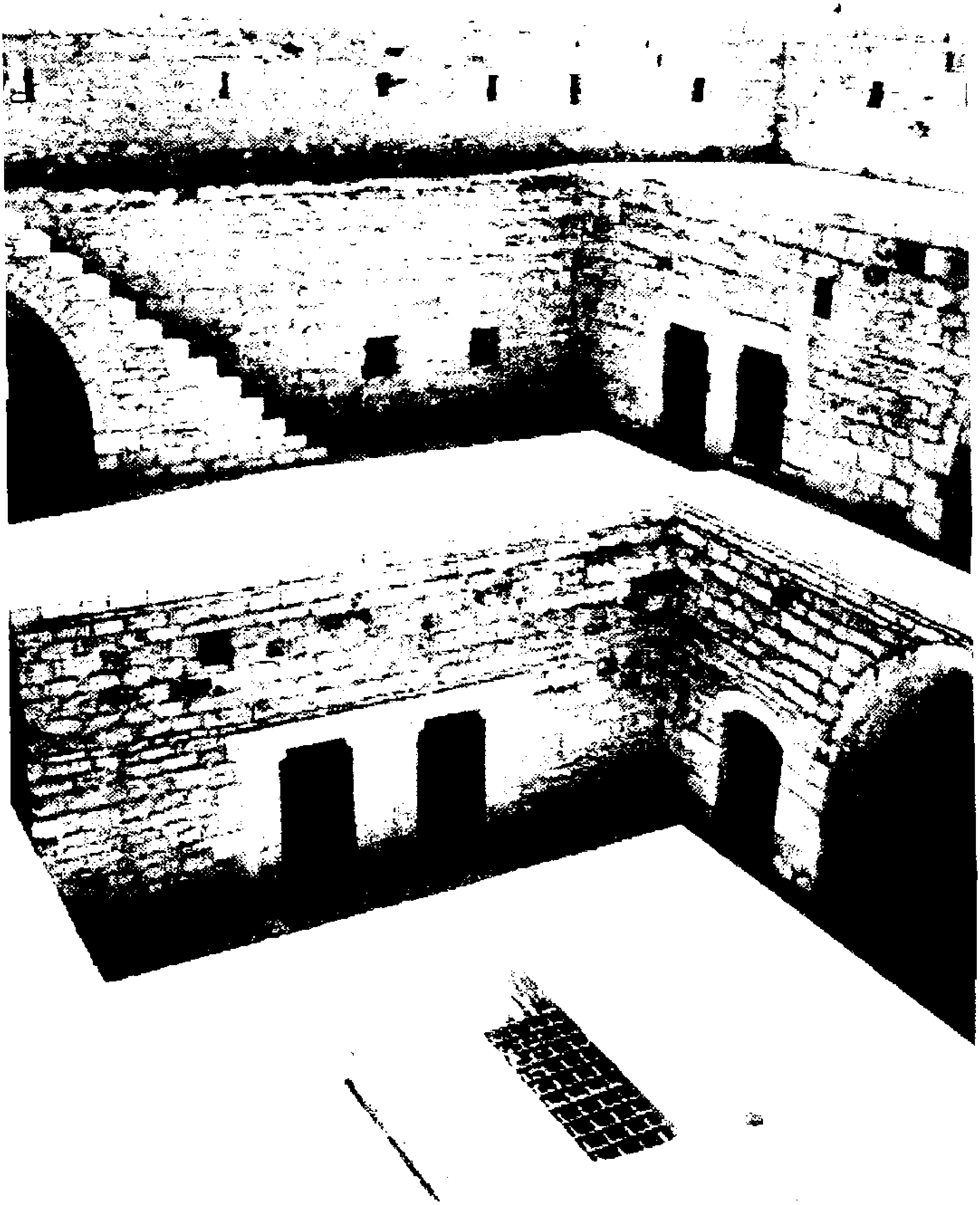

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

سینٹ [illegible] نظر آئی تھی

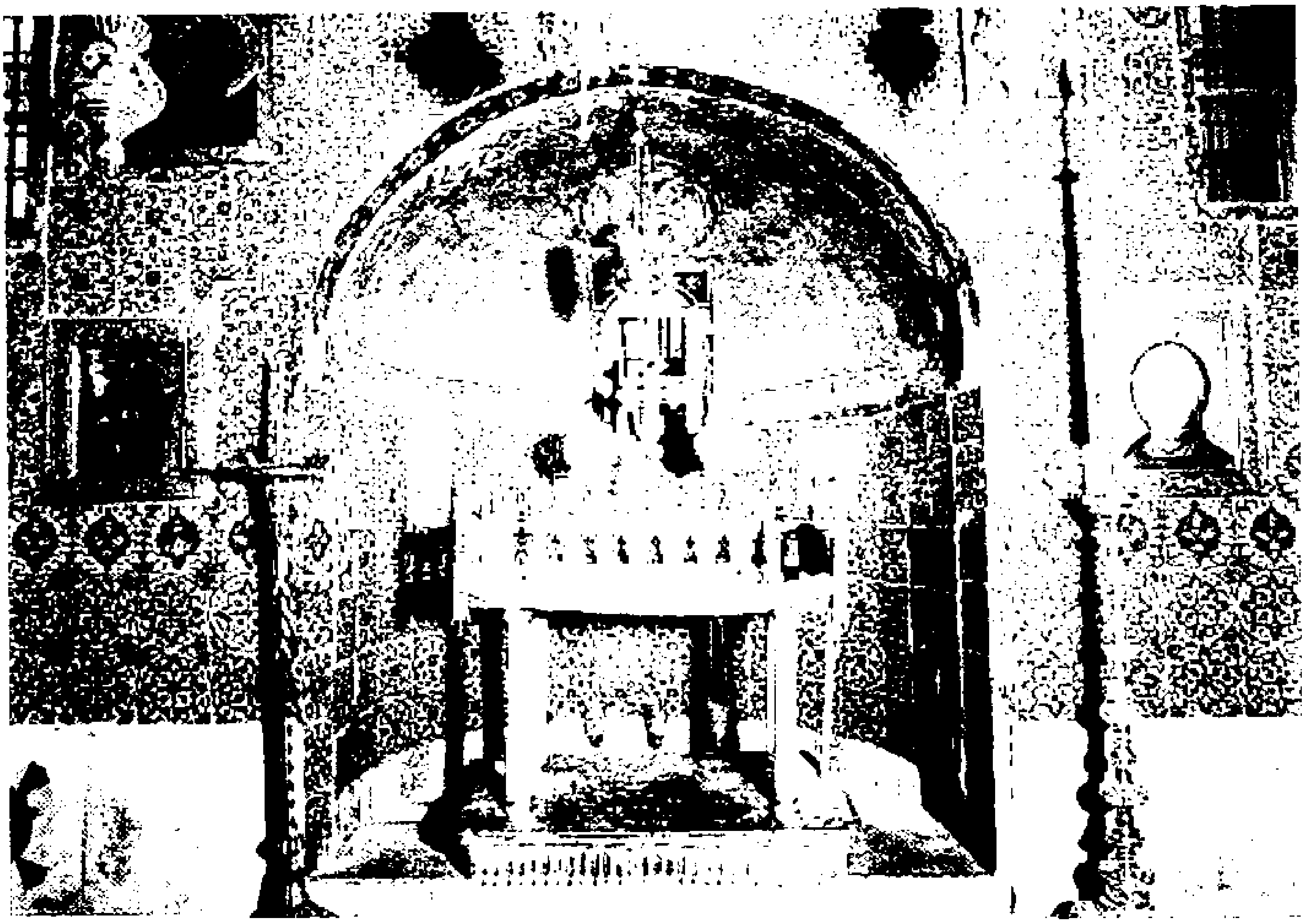

وہ درخت جس کے متعلق روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر سے اللہ تعالیٰ کی آواز آئی تھی
خانقاہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ درخت صدیوں سے ہرا بھرا دیکھا جاتا رہا ہے

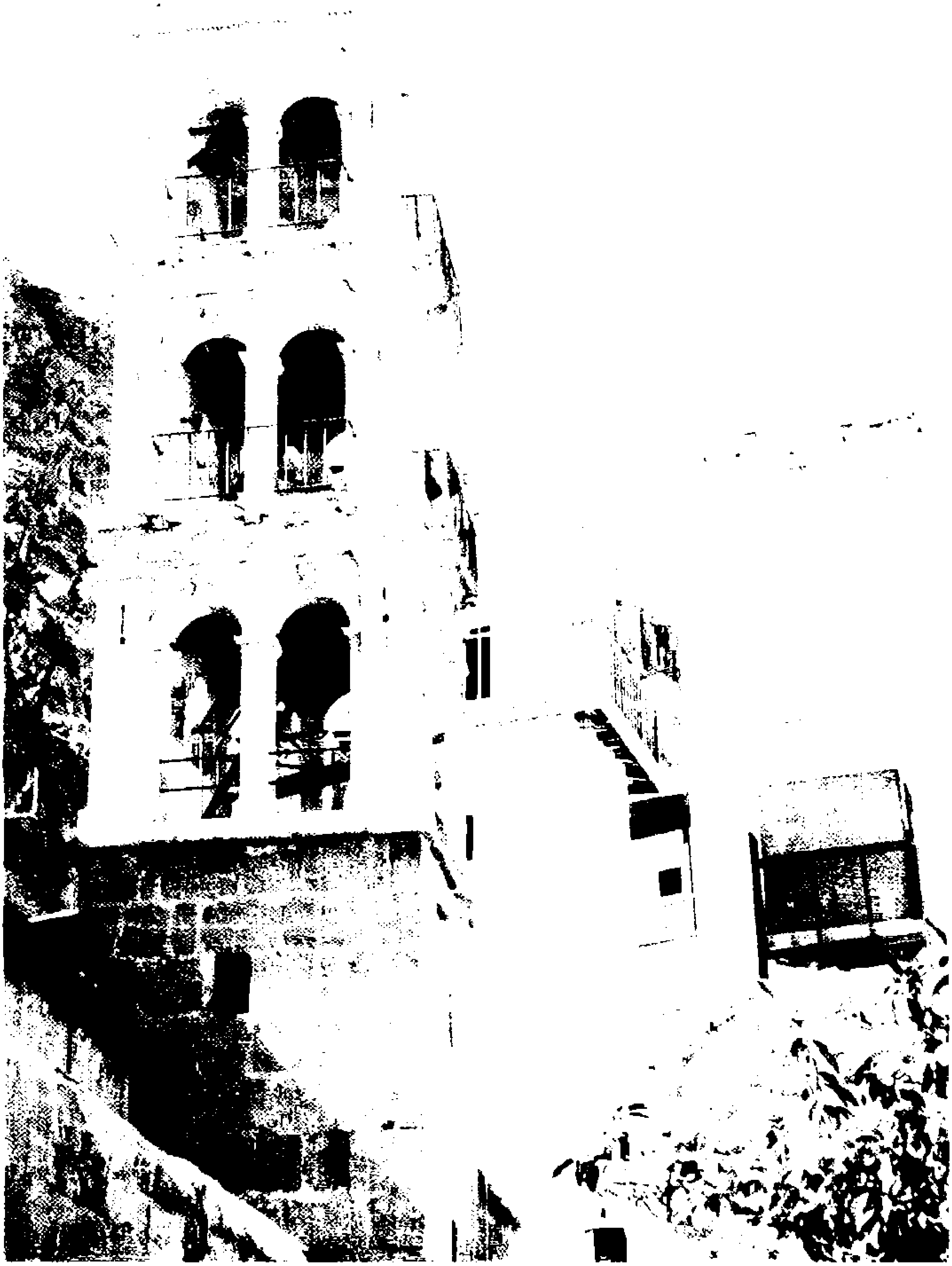

متعلقہ صفحہ ۵۵۸ (جلد سوم)

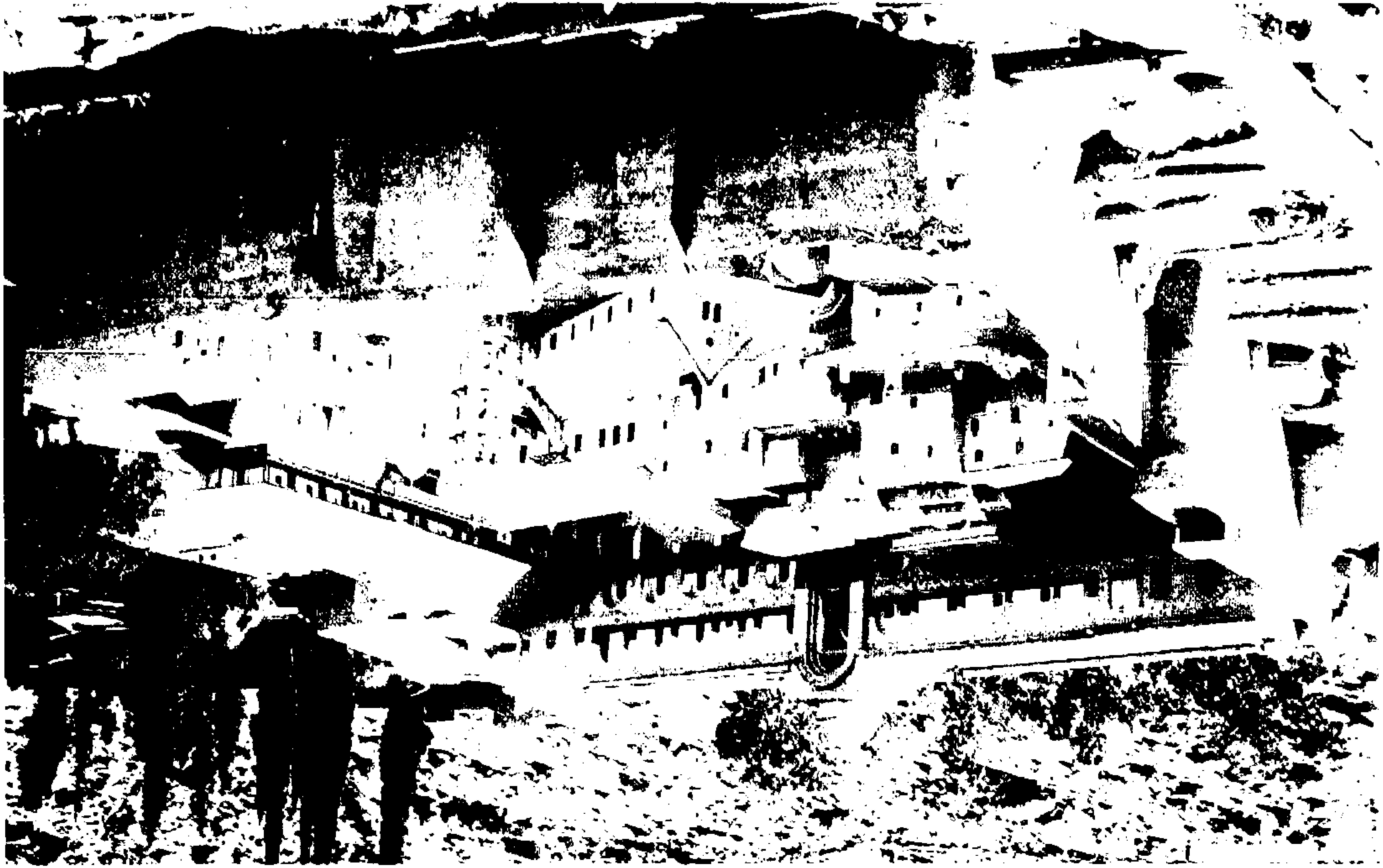

Maktaba Tul Ishaat.com

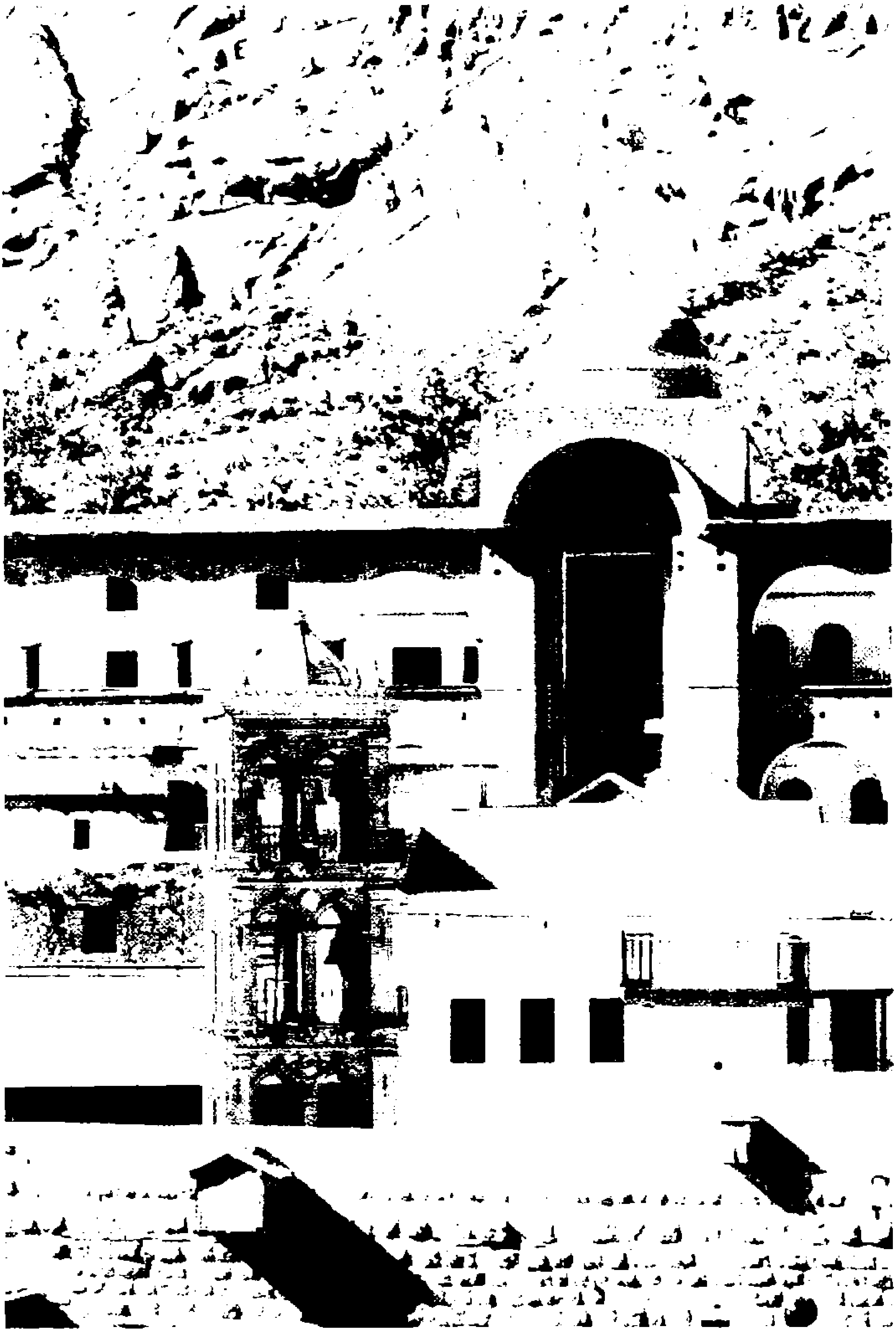

متعلقہ صفحہ ۵۵۸ (جلد سوم)

وادی مدین کے قریب مغائرِ شعیب میں واقع کنویں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کنواں وہ تھا جہاں حضرت موسیٰ نے بکریوں کو پانی پلایا تھا

متعلقہ صفحے ۲۲ (جلد سوم)

Maktaba Tul Ishaat.com

مدین کی وادی

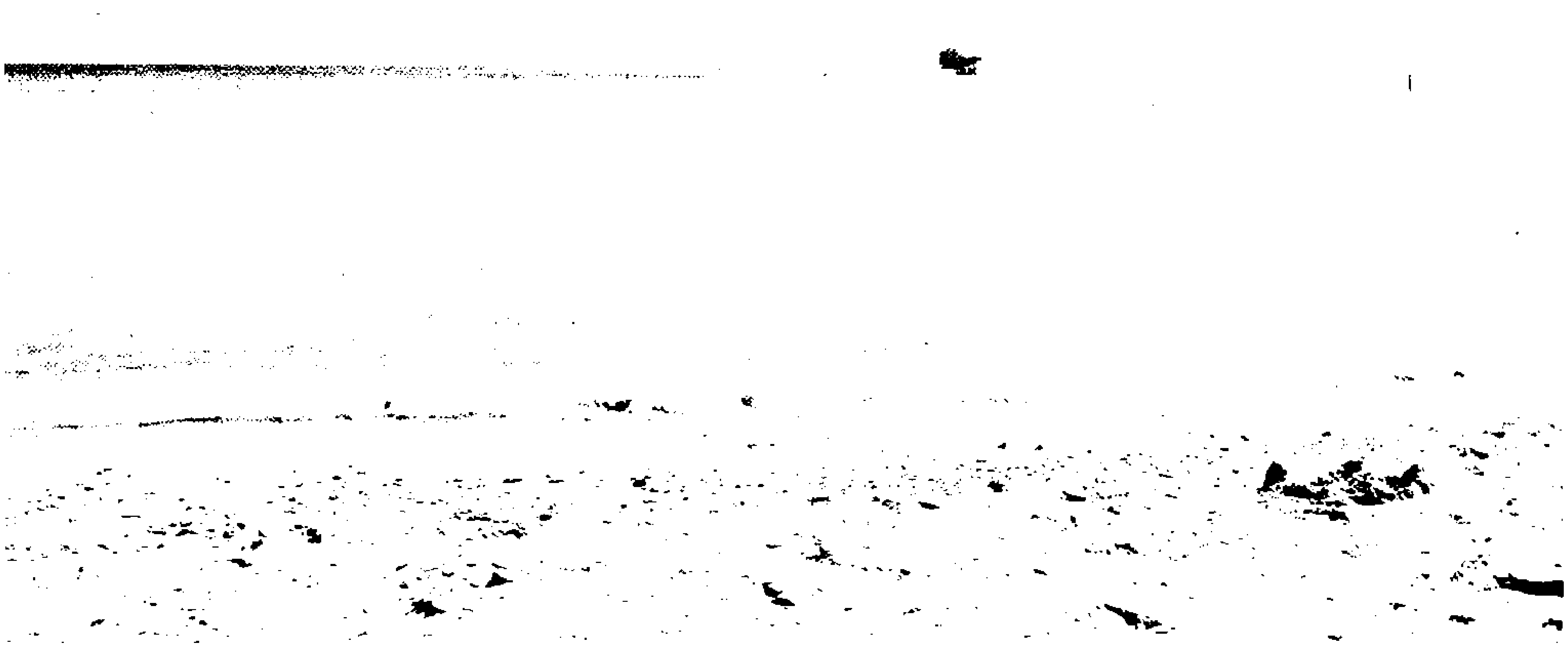

متعلقہ صفحہ ۶۲۷ (جلد سوم)

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد چہارم

سورۂ لقمان تا سورۂ الاحقاف

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ لقمان تا سورۃ الاحقاف

جلد چہارم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	لقمان	۳۱	۶
۲	السجدہ	۳۲	۳۲
۳	الاحزاب	۳۳	۵۴
۴	سبا	۳۴	۱۷۲
۵	فاطر	۳۵	۲۱۶
۶	یٰسین	۳۶	۲۴۴
۷	الصافات	۳۷	۲۷۶
۸	صٓ	۳۸	۳۱۶
۹	الزمر	۳۹	۳۵۴
۱۰	المومن	۴۰	۳۸۸
۱۱	حٰمٓ السجدہ	۴۱	۴۳۴
۱۲	الشوریٰ	۴۲	۴۷۴
۱۳	الزخرف	۴۳	۵۲۰
۱۴	الدخان	۴۴	۵۵۶
۱۵	الجاثیہ	۴۵	۵۷۶
۱۶	الاحقاف	۴۶	۵۹۶
۱۷	فہرست موضوعات		۶۲۳

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست نقشہ جات وتصاویر

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	عہد نبوی میں قبائل عرب کے علاقے	۵۷
۲	جنگ احزاب	۵۹
۳	وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں	۱۶۷
۴	حقیقی مسیح کے نزول کا مقام	۱۶۸
۵	یمن میں قوم سبا کا بنایا ہوا مشہور ڈیم ”سد مآرب“	۱۹۲ - ۱۹۳
۶	صحرائے الاحقاف	۶۱۴
۷	وادی نخلہ	۶۱۹

تفہیم القرآن

لقمان

(۳۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

لقمان

نام اس سورہ کے دوسرے رُکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ اسی مُناسَبت سے اس کا نام لقمان رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نُزول اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اسلامی دعوت کو دبانے اور روکنے کے لیے جبر و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جانے لگے تھے لیکن ابھی طوفانِ مخالفت نے پوری شدت اختیار نہ کی تھی۔ اس کی نشان دِہی آیت ۱۴-۱۵ سے ہوتی ہے جس میں نئے نئے مسلمان ہونے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ والدین کے حُقوق تو بے شک خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہیں، لیکن اگر وہ تمھیں اسلام قبول کرنے سے روکیں اور دینِ شرک کی طرف پلٹنے پر مجبُور کریں تو ان کی یہ بات ہرگز نہ مانو۔ یہی بات سورۂ عنکبوت میں بھی ارشاد ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن دونوں کے مجموعی اندازِ بیان اور مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ لقمان پہلے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کے پَس منظر میں کسی شدید مخالَفت کا نشان نہیں ملتا، اور اس کے برعکس سورۂ عنکبوت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نُزول کے زمانے میں مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم ہو رہا تھا۔

موضوع و مضمون اس سورہ میں لوگوں کو شرک کی لغویت و نامعقولیت اور توحید کی صداقت و معقولیت سمجھائی گئی ہے، اور انھیں دعوت دی گئی ہے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید چھوڑ دیں، کھلے دل سے اس تعلیم پر غور کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداوندِ عالَم کی طرف سے پیش کر رہے ہیں، اور کھلی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہر طرف کائنات میں اور خود ان کے اپنے نفس میں کیسے کیسے صریح آثار اس کی سچّائی پر شہادت دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی آواز نہیں ہے جو دنیا میں یا خود دیارِ عرب میں پہلی مرتبہ ہی اُٹھی ہو اور لوگوں کے لیے بالکل نامانوس ہو۔ پہلے بھی جو لوگ علم و عقل اور حکمت و دانائی رکھتے تھے، وہ یہی باتیں کہتے تھے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ تمھارے اپنے ہی ملک میں لقمان نامی حکیم گزر چکا ہے، جس کی حکمت و دانش کے افسانے تمھارے ہاں مشہور ہیں، جس کی ضرب الامثال اور جس کے حکیمانہ مقولوں کو تم اپنی گفتگوؤں میں نقل کرتے ہو، جس کا ذکر تمھارے شاعر اور خطیب اکثر کیا کرتے ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ وہ کس عقیدے اور کن اخلاقیات کی تعلیم دیتا تھا۔

۳۴ اٰیاتہا ۴ رکوعاتہا

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ ﴿۳﴾
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ
يُوْقِنُوْنَ ؕ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

ال م۔ یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں،[۱] ہدایت اور رحمت نیکوکار لوگوں کے لیے،[۲] جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔[۳] یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔[۴]

۱- یعنی ایسی کتاب کی آیات جو حکمت سے لبریز ہے، جس کی ہر بات حکیمانہ ہے۔

۲- یعنی یہ آیات راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں اور خدا کی طرف سے رحمت بن کر آئی ہیں، مگر اس رحمت اور ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہی لوگ ہیں جو حُسنِ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، جو نیک بننا چاہتے ہیں، جنھیں بھلائی کی جستجو ہے، جن کی صفت یہ ہے کہ برائیوں پر جب انھیں متنبہ کر دیا جائے تو ان سے رُک جاتے ہیں، اور خیر کی راہیں جب ان کے سامنے کھول کر رکھ دی جائیں تو ان پر چلنے لگتے ہیں۔ رہے بدکار اور شر پسند لوگ، تو وہ نہ اس رہنمائی سے فائدہ اُٹھائیں گے نہ اس رحمت میں سے حصہ پائیں گے۔

۳- یہ مراد نہیں ہے کہ جن لوگوں کو "نیکوکار" کہا گیا ہے وہ بس اِنھی تین صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ دراصل پہلے "نیکوکار" کا عام لفظ استعمال کر کے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ اُن تمام برائیوں سے رکنے والے ہیں جن سے یہ کتاب روکتی ہے، اور اُن سارے نیک کاموں پر عمل کرنے والے ہیں جن کا یہ کتاب حکم دیتی ہے۔ پھر اُن "نیکوکار" لوگوں کی تین اہم صفات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باقی ساری نیکیوں کا دارومدار انھی تین چیزوں پر ہے۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں، جس سے خدا پرستی و خدا ترسی ان کی مستقل عادت بن جاتی ہے۔ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے، متاعِ دنیا کی محبّت دبتی ہے اور رضائے الٰہی کی طلب اُبھرتی ہے۔ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جس سے ان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اُبھرتا ہے، جس کی بدولت وہ اس جانور کی طرح نہیں رہتے جو چراگاہ میں چھوٹا پھر رہا ہو، بلکہ اس انسان کی طرح ہو جاتے ہیں جسے یہ شعور حاصل ہو کہ میں خود مختار نہیں ہوں، کسی آقا کا بندہ ہوں اور اپنی ساری کارگزاریوں پر اپنے آقا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ

اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے[5] جو کلامِ دلفریب[6] خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے

کے سامنے مجھے جواب دِہی کرنی ہے۔ ان تین خصوصیات کی وجہ سے یہ "نیکوکار" اس طرح کے نیکوکار نہیں رہتے جن سے اتفاقاً نیکی سرزد ہو جاتی ہے اور بدی بھی اسی شان سے سرزد ہو سکتی ہے جس شان سے نیکی سرزد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ خصوصیات ان کے نفس میں ایک مستقل نظامِ فکر و اخلاق پیدا کر دیتی ہیں جس کے باعث ان سے نیکی کا صُدور با قاعدہ ایک ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے اور بدی اگر سرزد ہوتی بھی ہے تو محض ایک حادثہ کے طور پر ہوتی ہے۔ کوئی گہرے محرکات ایسے نہیں ہوتے جو ان کے نظامِ فکر و اخلاق سے ابھرتے اور ان کو اپنے اقتضائے طبع سے بدی کی راہ پر لے جاتے ہوں۔

۴ – جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس وقت کفارِ مکہ یہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے بھی تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اس دعوت کو قبول کرنے والے لوگ اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ اس لیے حَصر کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا کہ "یہی فلاح پانے والے ہیں"، یعنی یہ برباد ہونے والے نہیں ہیں جیسا کہ تم اپنے خیالِ خام میں سمجھ رہے ہو، بلکہ دراصل فلاح یہی لوگ پانے والے ہیں اور اس سے محروم رہنے والے وہ ہیں جنھوں نے اِس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کیا ہے۔

یہاں قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں وہ شخص سخت غلطی کرے گا جو فلاح کو صرف اس دنیا کی حد تک، اور وہ بھی صرف مادّی خوشحالی کے معنٰی میں لے گا۔ فلاح کا قرآنی تصور معلوم کرنے کے لیے حسبِ ذیل آیات کو تفہیم القرآن کے تشریحی حواشی کے ساتھ بغور دیکھنا چاہیے: البقرہ: آیات ۲ تا ۵۔ آلِ عمران: آیات ۱۰۲، ۱۳۰، ۲۰۰۔ المائدہ: آیات ۳۵، ۹۰۔ الانعام: ۲۱۔ الاعراف: آیات ۷، ۸، ۱۵۷۔ التوبہ: ۸۸۔ یونس: ۱۷۔ النحل: ۱۱۶۔ الحج: ۷۷۔ المومنون: ۱، ۱۱۷۔ النور: ۵۱۔ الروم: ۳۸۔

۵ – یعنی ایک طرف تو خدا کی طرف سے یہ رحمت اور ہدایت آئی ہوئی ہے جس سے کچھ لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف انھی خوش نصیب انسانوں کے پہلو بہ پہلو ایسے بدنصیب لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ کی آیات کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں۔

۶ – اصل الفاظ ہیں: "لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ" یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے۔ لغت کے اعتبار سے تو ان الفاظ میں کوئی ذم کا پہلو نہیں ہے۔ لیکن استعمال میں ان کا اطلاق بُری اور فضول اور بے ہودہ باتوں پر ہی ہوتا ہے، مثلاً گپ، خُرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے اور ناول، گانا بجانا، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

لہوالحدیث "خریدنے" کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص حدیثِ حق کو چھوڑ کر حدیثِ باطل کو اختیار کرتا ہے اور ہدایت سے منہ موڑ کر ان باتوں کی طرف راغب ہوتا ہے جن میں اس کے لیے نہ دنیا میں کوئی بھلائی ہے نہ آخرت میں۔ لیکن یہ مجازی معنٰی ہیں۔ حقیقی معنٰی اس فقرے کے یہی ہیں کہ آدمی اپنا مال صَرف کر کے کوئی بے ہودہ چیز خریدے۔ اور بکثرت روایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ ابنِ ہِشامؒ نے محمد بن اسحاقؒ کی روایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفارِ مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی چلی جا رہی تھی تو نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔

اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اُڑا دے۔[8] ایسے لوگوں کے لیے سخت

یہ شخص تمھارے درمیان بچپن سے اُدھیڑ عمر کو پہنچا ہے۔ آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمھارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا؟ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر و شاعری سے ناواقف ہیں؟ کیا لوگوں کو جنون کی کیفیات کا علم نہیں ہے؟ ان الزامات میں سے آخر کون سا الزام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چسپاں ہوتا ہے کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو اُس کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے۔ ٹھیرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ مکہ سے عراق گیا اور وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لا کر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں۔ (سیرت ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۳۲۰-۳۲۱) یہی روایت اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کی ہے۔ اور ابنِ عباسؓ نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلّط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں۔ وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالمِ مستی میں ان کو سرے سے یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انھیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

لَهْوَ الْحَدِيْثِ کی یہی تفسیر بکثرت صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے۔ عبداللہؓ بن مسعود سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا: هو والله الغناء۔ ''خدا کی قسم! اِس سے مراد گانا ہے'' (ابنِ جریر، ابنِ ابی شَیبہ، حاکم، بَیہقی) اسی سے ملتے جلتے اقوال حضرات عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ، مجاہدؒ، عِکرِمہؒ، سعید بن جُبَیرؒ، حسن بصریؒ اور مَکحُولؒ سے مروی ہیں۔ ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم اور تِرمِذی نے حضرت ابو اُمامہؓ باہلی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایحل بیع المغنیات ولاشراؤھن ولا التجارة فیھن ولا اثمانھن۔ ''مُغَنِّیہ عورتوں کا بیچنا اور خریدنا اور ان کی تجارت کرنا حلال نہیں ہے اور نہ ان کی قیمت لینا حلال ہے۔'' ایک دوسری روایت میں آخری فقرے کے الفاظ یہ ہیں: اکل ثمنھن حرام۔ ''ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔'' ایک اور روایت انھی ابو امامہؓ سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن ولا شراؤھن وثمنھن حرام۔ ''لونڈیوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا حلال نہیں، اور ان کی قیمت حرام ہے۔'' ان تینوں حدیثوں میں یہ صراحت بھی ہے کہ آیت میں مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ انھی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قاضی ابوبکر ابنُ العربیؒ ''احکام القرآن'' میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور امام مالکؒ کے حوالے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

مُّهِيْنٌ ۝٦ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ
يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٧
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝٨

ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔[9] اُسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انھیں سُنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا، مُژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، اُن کے لیے نعمت بھری جنتیں

حضرت اَنسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جلس الی قینة یسمع منھا صُبَّ فی اذنیه الاٰنُك یوم القیٰمة۔" جو شخص گانے والی لونڈی کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا گانا سنے گا قیامت کے روز اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسا ڈالا جائے گا۔" (اس سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اُس زمانے میں گانے بجانے کی "ثقافت" تمام تر، بلکہ کُلّیتاً لونڈیوں کی بدولت زندہ تھی۔ آزاد عورتیں اس وقت تک "آرٹسٹ" نہ بنی تھیں۔ اسی لیے حضورؐ نے مُغنِّیات کی بَیع و شرا کا ذکر فرمایا اور ان کی فیس کو قیمت کے لفظ سے تعبیر کیا اور گانے والی خاتون کے لیے قَینہ کا لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں لونڈی کے لیے بولا جاتا ہے۔)

۷۔ "علم کے بغیر" کا تعلق "خریدتا ہے" کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اور "بھٹکا دے" کے ساتھ بھی۔ اگر اس کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ جاہل اور نادان آدمی اس دلفریب چیز کو خریدتا ہے اور کچھ نہیں جانتا کہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ کر وہ کس تباہ کُن چیز کو خرید رہا ہے۔ ایک طرف حکمت اور ہدایت سے لبریز آیاتِ الٰہی ہیں جو مفت اسے مل رہی ہیں مگر وہ ان سے منہ موڑ رہا ہے۔ دوسری طرف یہ بے ہودہ چیزیں ہیں جو فکر و اخلاق کو غارت کر دینے والی ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کر کے انھیں حاصل کر رہا ہے۔ اور اگر اسے دوسرے فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ وہ علم کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرنے اٹھا ہے، اسے یہ شعور نہیں ہے کہ خلقِ خدا کو راہِ خدا سے بھٹکانے کی کوشش کر کے وہ کتنا بڑا مَظلِمَہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔

۸ – یعنی یہ شخص لوگوں کو قصے کہانیوں اور گانے بجانے میں مشغول کر کے اللہ کی آیات کا منہ چڑانا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کی اس دعوت کو ہنسی ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جائے۔ یہ خدا کے دین سے لڑنے کے لیے کچھ اس طرح کا نقشۂ جنگ جمانا چاہتا ہے کہ اِدھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی آیات سنانے نکلیں، اُدھر کہیں کسی خوش اَندام وخوش گلو مُغنِّیہ کا مُجرا ہو رہا ہو، کہیں کوئی چَرب زبان قصہ گو ایران توران کی کہانیاں سنا رہا ہو، اور لوگ ان ثقافتی سرگرمیوں میں غرق ہو کر اس موڈ ہی میں نہ رہیں کہ خدا اور آخرت اور اخلاق کی باتیں انھیں سنائی جا سکیں۔

۹ – یہ سزا ان کے جرم کی مناسبت سے ہے۔ وہ خدا کے دین اور اس کی آیات اور اس کے رسول کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا اس کے بدلے میں ان کو سخت ذلت کا عذاب دے گا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ
تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ

ہیں[10] جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔[11]
اُس[12] نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔[13] اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔[14] اُس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے

۱۰ – یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لیے جنت کی نعمتیں ہیں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔ اگر پہلی بات فرمائی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز تو ضرور ہوں گے مگر وہ جنتیں ان کی اپنی نہ ہوں گی۔ اس کے بجائے جب یہ فرمایا گیا کہ "ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں"، تو اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پوری پوری جنتیں ان کے حوالے کر دی جائیں گی اور وہ اُن کی نعمتوں سے اس طرح مستفید ہوں گے جس طرح ایک مالک اپنی چیز سے مستفید ہوتا ہے، نہ کہ اُس طرح جیسے کسی کو حقوقِ ملکیت دیے بغیر محض ایک چیز سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دے دیا جائے۔

۱۱ – یعنی کوئی چیز اس کو اپنا وعدہ پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، اور وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک ٹھیک حکمت اور عدل کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔ "یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے" کہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بیان کرنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو بالارادہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور نہ اس کائنات میں کوئی طاقت ایسی ہے جو اس کا وعدہ پورا ہونے میں مانع ہو سکتی ہو، اس لیے اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا کہ ایمان و عملِ صالح کے انعام میں جو کچھ اللہ نے دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ کسی کو نہ ملے۔ نیز یہ کہ اللہ کی طرف سے اس انعام کا اعلان سراسر اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہے۔ اس کے ہاں کوئی غلط بخشی نہیں ہے کہ مستحق کو محروم رکھا جائے اور غیر مستحق کو نواز دیا جائے۔ ایمان و عملِ صالح سے مُتّصف لوگ فی الواقع اس انعام کے مستحق ہیں اور اللہ یہ انعام انھی کو عطا فرمائے گا۔

۱۲ – اُوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب اصل مدّعا، یعنی تردیدِ شرک اور دعوتِ توحید پر کلام شروع ہوتا ہے۔

۱۳ – اصل الفاظ ہیں: بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ "تم خود دیکھ رہے ہو کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہیں۔" دوسرا مطلب یہ کہ "وہ ایسے ستونوں پر قائم ہیں جو تم کو نظر نہیں آتے۔" ابنِ عباسؓ اور مجاہد نے دوسرا مطلب لیا ہے، اور بہت سے دوسرے مفسرین پہلا مطلب لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علومِ طبیعی کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عالمِ افلاک میں یہ بے حد و حساب عظیم الشان تارے اور سیّارے اپنے اپنے مقام و مدار پر غیر مرئی سہاروں سے قائم کیے گئے ہیں۔ کوئی تار نہیں ہیں جنھوں نے ان کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہو۔ کوئی سلاخیں

Maktaba Tul Ishaat.com

مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ⑩ هٰذَا خَلۡقُ اللّٰهِ فَاَرُوۡنِىۡ
مَاذَا خَلَقَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ع ⑪ وَ
لَقَدۡ اٰتَيۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِكۡمَةَ اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ

ع ۱۱ / ۱۰

پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ، اِن دُوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟[۱۵] ـــــــ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں[۱۶] ع

ہم[۱۷] نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔[۱۸] جو کوئی شکر کرے اُس کا شکر اُس کے

نہیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے پر گر جانے سے روک رہی ہوں۔ صرف قانونِ جذب وکشش ہے جو اس نظام کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ تعبیر ہمارے آج کے علم کے لحاظ سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہو اور اس سے زیادہ لگتی ہوئی کوئی دوسری تعبیر اس حقیقت کی کی جاسکے۔

۱۴۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۲، سورۃ النحل، حاشیہ ۱۲۔

۱۵۔ یعنی ان ہستیوں نے جن کو تم اپنا معبُود بنائے بیٹھے ہو، جنھیں تم اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ رہے ہو، جن کی بندگی بجالانے پر تمھیں اتنا اصرار ہے۔

۱۶۔ یعنی جب یہ لوگ اللہ کے سوا اس کائنات میں کسی دوسرے کی تخلیق کی کوئی نشان دہی نہیں کر سکتے، اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے، تو ان کا غیر خالق ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرانا اور ان کے آگے سرِنیاز جھکانا، اور ان سے دعائیں مانگنا اور حاجتیں طلب کرنا، بجز اس کے کہ صریح بے عقلی ہے، اور کوئی دوسری تاویل ان کے اس احمقانہ فعل کی نہیں کی جاسکتی۔ جب تک کوئی شخص بالکل ہی نہ بہک گیا ہو اس سے اتنی بڑی حماقت سرزد نہیں ہوسکتی کہ آپ کے سامنے وہ خود اپنے معبُودوں کے غیر خالق ہونے اور صرف اللہ ہی کے خالق ہونے کا اعتراف کرے اور پھر بھی انھیں معبود ماننے پر مُصِر رہے۔ کسی کے بھیجے میں ذرّہ برابر بھی عقل ہو تو وہ لامحالہ یہ سوچے گا کہ جو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اور جس کا زمین و آسمان کی کسی شے کی تخلیق میں برائے نام بھی کوئی حصّہ نہیں ہے، وہ آخر کیوں ہمارا معبُود ہو؟ کیوں ہم اس کے آگے سجدہ ریز ہوں یا اس کی قدم بوسی و آستانہ بوسی کرتے پھریں؟ کیا طاقت اس کے پاس ہے کہ وہ ہماری فریاد رسی اور حاجت روائی کر سکے؟ بالفرض وہ ہماری دعاؤں کو سنتا بھی ہو تو ان کے جواب میں وہ خود کیا کارروائی کر سکتا ہے، جب کہ وہ کچھ بنانے کے اختیارات رکھتا ہی نہیں؟ بگڑی تو وہی بنائے گا جو کچھ بنا سکتا ہو، نہ کہ وہ جو کچھ بھی نہ بنا سکتا ہو۔

۱۷- شرک کی تردید میں ایک پُرزور عقلی دلیل پیش کرنے کے بعد اب عرب کے لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ معقول بات آج کوئی پہلی مرتبہ تمھارے سامنے پیش نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ پہلے بھی عاقل و دانا لوگ یہی بات کہتے رہے ہیں اور تمھارا اپنا مشہور حکیم، لقمان اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گیا ہے۔ اس لیے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر شرک کوئی نامعقول عقیدہ ہے تو پہلے کسی کو یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

لقمان کی شخصیت عرب میں ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے بہت مشہور تھی۔ شعرائے جاہلیّت، مثلاً اِمْرَؤُالقَیس، لَبِید، اَعْشٰی، طَرَفَہ وغیرہ کے کلام میں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کے پاس صحیفۂ لقمان کے نام سے ان کے حکیمانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ رِوایات میں آیا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے مدینے کا اوّلین شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مُتأثّر ہوا، وہ سُوَید بن صامِت تھا۔ وہ حج کے لیے مکہ گیا۔ وہاں حضورؐ اپنے قاعدے کے مطابق مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حاجیوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر دعوتِ اسلام دیتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں سُوَید نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنی تو اس نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ جو باتیں پیش کر رہے ہیں، ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ آپؐ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: مُجلّۂ لقمان۔ پھر آپؐ کی فرمایش پر اس نے اس مُجلّے کا کچھ حصہ آپؐ کو سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ بہت اچھا کلام ہے، مگر میرے پاس ایک اور کلام اس سے بھی بہتر ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے اسے قرآن سنایا، اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ بلاشبہ مُجلّۂ لقمان سے بہتر ہے۔ (سیرت ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۶۷-۶۹۔ اُسدُ الغابہ، ج ۲، صفحہ ۳۷۸) مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ شخص (سُوَید بن صامِت) مدینے میں اپنی لیاقت، بہادری، شعر و سُخَن اور شرف کی بنا پر ''کامِل'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد جب وہ مدینہ واپس ہوا تو کچھ مدت بعد جنگِ بُعاث پیش آئی اور یہ اس میں مارا گیا۔ اس کے قبیلے کے لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ حضورؐ سے ملاقات کے بعد وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

تاریخی اعتبار سے لقمان کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ جاہلیت کی تاریک صدیوں میں کوئی مُدوّن تاریخ تو موجود نہ تھی۔ معلومات کا انحصار اُن سینہ بہ سینہ روایات پر تھا جو سیکڑوں برس سے چلی آ رہی تھیں۔ ان رِوایات کی رُو سے بعض لوگ لقمان کو قومِ عاد کا ایک فرد اور یمن کا ایک بادشاہ قرار دیتے تھے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے انھی رِوایات پر اعتماد کر کے ارض القرآن میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قومِ عاد پر خدا کا عذاب آنے کے بعد اس قوم کے جو اہلِ ایمان حضرت ہودؑ کے ساتھ بچ رہے تھے، لقمان انھی کی نسل سے تھا، اور یمن میں اس قوم نے جو حکومت قائم کی تھی، یہ اس کے بادشاہوں میں سے ایک تھا۔ لیکن دوسری روایات جو بعض اکابر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی ہیں، اس کے بالکل خلاف ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ لقمان ایک حبشی غلام تھا۔ یہی قول حضرت ابوہُریرہؓ، مُجاہدؒ، عِکْرِمہؒ اور خالد الرَّبعیؒ کا ہے۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ وہ نُوبہ کا رہنے والا تھا۔ سعید بن مُسَیَّبؒ کا قول ہے کہ وہ مصر کے سیاہ رنگ لوگوں میں سے تھا۔ یہ تینوں اقوال قریب قریب متشابہ ہیں۔ کیونکہ عرب کے لوگ سیاہ رنگ لوگوں کو اس زمانے میں عموماً حَبَشی کہتے تھے، اور نوبہ اس علاقے کا نام ہے جو مصر کے جنوب اور سُودان (سوڈان) کے شمال میں واقع ہے۔ اس لیے تینوں اقوال میں ایک شخص کو مصری، نُوبی اور حبشی قرار دینا محض لفظی اختلاف ہے۔ معنیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر رَوْضُ الْاُنُف میں سُہَیلی اور مُرُوجُ الذَّہَب میں مَسعودی کے بیانات سے اس سوال پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس سُودانی غلام کی باتیں عرب میں کیسے پھیلیں۔ ان دونوں کا بیان

Maktaba Tul Ishaat.com

لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ⑫ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲

اپنے ہی لیے مفید ہے۔ اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔[19]
یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: "بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا[20]

ہے کہ یہ شخص اصلاً تو نُوبی تھا، لیکن باشندہ مَدیَن اور اَئیلہ (موجودہ عَقَبہ) کے علاقے کا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان عربی تھی اور اس کی حکمت عرب میں شائع ہوئی۔ مزید برآں سُہَیلی نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ لقمانِ حکیم اور لقمان بن عاد دو الگ الگ اشخاص ہیں۔ ان کو ایک شخصیت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ (رَوضُ الاُنُف، ج ۱، ص ۲۶۶۔ مسعودی، ج ۱، ص ۵۷)

یہاں اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ مُستشرِق دیرنبورگ (Derenbourg) نے پیرس کے کُتب خانہ کا ایک عَرَبی مخطوطہ جو "اَمثالِ لقمان الحکیم" (Fables De Loqman Le Sage) کے نام سے شائع کیا ہے وہ حقیقت میں ایک موضوع چیز ہے جس کا مُجلّۂ لقمان سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ یہ امثال تیرھویں صدی عیسوی میں کسی شخص نے مرتّب کی تھیں۔ اس کی عربی بہت ناقص ہے اور اسے پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل کسی اور زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مصنف یا مترجم نے اپنی طرف سے لقمانِ حکیم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مستشرقین اس قسم کی جعلی چیزیں نکال نکال کر جس مقصد کے لیے سامنے لاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی طرح قرآن کے بیان کردہ قصوں کو غیر تاریخی افسانے ثابت کر کے ساقط الاعتبار ٹھیرا دیا جائے۔ جو شخص بھی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "لقمان" کے عنوان پر ہیلر (B. Heller) کا مضمون پڑھے گا، اس سے ان لوگوں کی نیت کا حال مخفی نہ رہے گا۔

۱۸ – یعنی اللہ کی بخشی ہوئی اس حکمت و دانائی اور بصیرت و فرزانگی کا اوّلین تقاضا یہ تھا کہ انسان اپنے رب کے مقابلے میں شکرگزاری و احسان مندی کا رَوِیَّہ اختیار کرے نہ کہ کفرانِ نعمت اور نمک حرامی کا۔ اور اس کا یہ شکر محض زبانی جمع خرچ ہی نہ ہو بلکہ فکر اور قول اور عمل، تینوں صورتوں میں ہو۔ وہ اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین و شُعور بھی رکھتا ہو کہ مجھے جو کچھ نصیب ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ اس کی زبان اپنے خدا کے احسانات کا ہمیشہ اعتراف بھی کرتی رہے۔ اور وہ عملاً بھی خدا کی فرماں برداری کر کے، اس کی مَعصیت سے پرہیز کر کے، اس کی رضا کی طلب میں دوڑ دھوپ کر کے، اس کے دیے ہوئے انعامات کو اس کے بندوں تک پہنچا کر، اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مجاہدہ کر کے یہ ثابت کر دے کہ وہ فی الواقع اپنے خدا کا احسان مند ہے۔

۱۹ – یعنی جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر اس کے اپنے لیے نقصان دِہ ہے، اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ بے نیاز ہے، کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ کسی کا شکر اس کی خدائی میں کوئی اضافہ نہیں کر دیتا، نہ کسی کا کفر اس امرِ واقعہ کو بدل سکتا ہے کہ بندوں کو جو نعمت بھی نصیب ہے اسی کی عطا کردہ ہے۔ وہ تو آپ سے آپ محمود ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ

اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسٰنَ بِوٰلِدَيۡهِ‌ ۚ

حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"[21] ــــ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے[22]

کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے کمال و جمال اور اس کی خلاقی و رزّاقی پر شہادت دے رہا ہے اور ہر مخلوق زبانِ حال سے اس کی حمد بجالا رہی ہے۔

۲۰ – لقمان کی حکیمانہ باتوں میں سے اس خاص نصیحت کو دو مناسبتوں کی بنا پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ انھوں نے یہ نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی، اور ظاہر بات ہے کہ آدمی دنیا میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کے حق میں مخلص ہوسکتا ہے تو وہ اس کی اپنی اولاد ہی ہے۔ ایک شخص دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے، ان سے منافقانہ باتیں کرسکتا ہے، لیکن اپنی اولاد کو تو ایک بُرے سے بُرا آدمی بھی فریب دینے کی کوشش کبھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے لقمان کا اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک شرک فی الواقع ایک بدترین فعل تھا اور اسی بنا پر انھوں نے سب سے پہلے جس چیز کی اپنے لختِ جگر کو تلقین کی وہ یہ تھی کہ اس گمراہی سے اجتناب کرے۔ دوسری مناسبت اس حکایت کی یہ ہے کہ کفارِ مکہ میں سے بہت سے ماں باپ اس وقت اپنی اولاد کو دینِ شرک پر قائم رہنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید سے منہ موڑ لینے پر مجبور کر رہے تھے، جیسا کہ آگے کی آیات بتا رہی ہیں۔ اس لیے ان نادانوں کو سنایا جا رہا ہے کہ تمھاری سرزمین کے مشہور حکیم نے تو اپنی اولاد کی خیرخواہی کا حق یوں ادا کیا تھا کہ اسے شرک سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی۔ اب تم جو اپنی اولاد کو اسی شرک پر مجبور کر رہے ہو تو یہ ان کے ساتھ بدخواہی ہے یا خیرخواہی؟

۲۱ – ظلم کے اصل معنیٰ ہیں: کسی کا حق مارنا اور انصاف کے خلاف کام کرنا۔ شرک اس وجہ سے ظلمِ عظیم ہے کہ آدمی اُن ہستیوں کو اپنے خالق اور رازق اور مُنعِم کے برابر لا کھڑا کرتا ہے جن کا نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی حصّہ، نہ اس کو رزق پہنچانے میں کوئی دخل، اور نہ اُن نعمتوں کے عطا کرنے میں کوئی شرکت جن سے آدمی اس دنیا میں مُتمتّع ہو رہا ہے۔ یہ ایسی بے انصافی ہے جس سے بڑھ کر کسی بے انصافی کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ پھر آدمی پر اُس کے خالق کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی و پرستش کرے، مگر وہ دوسروں کی بندگی بجالا کر اُس کا حق مارتا ہے۔ پھر اس بندگیِ غیر کے سلسلے میں آدمی جو عمل بھی کرتا ہے اس میں وہ اپنے ذہن و جسم سے لے کر زمین و آسمان تک کی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتا ہے، حالاں کہ یہ ساری چیزیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں استعمال کرنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ پھر آدمی پر خود اس کے اپنے نفس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے ذلّت اور عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ مگر وہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کر کے اپنے آپ کو ذلیل بھی کرتا ہے اور مستحقِ عذاب بھی بناتا ہے۔ اس طرح مشرک کی پوری زندگی ایک ہرجہتی اور ہمہ وقتی ظلم بن جاتی ہے جس کا کوئی سانس بھی ظلم سے خالی نہیں رہتا۔

۲۲ – یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی پوری عبارت ایک جملہ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے لقمان کے قول کی تشریح مزید کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ
وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ النصف
بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضُعف پر ضُعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھُوٹنے میں لگے۔[۲۳] (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا[۲۴] تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے،[۲۵] اُس وقت

۲۳ – ان الفاظ سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد (رحمہم اللہ) نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچے کی مدّتِ رضاعت دو سال ہے۔ اس مدت کے اندر اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تب تو حُرمتِ رضاعت ثابت ہوگی، ورنہ بعد کی کسی رضاعت کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ امام مالکؒ سے بھی ایک رِوایت اسی قول کے حق میں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے مزید احتیاط کی خاطر ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے، اور اس کے ساتھ ہی امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر دو سال یا اس سے کم مدّت میں بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو اور اپنی غذا کے لیے بچہ دودھ کا محتاج نہ رہا ہو تو اس کے بعد کسی عورت کا دودھ پی لینے سے کوئی حرمت ثابت نہ ہوگی۔ البتہ اگر بچے کی اصل غذا دودھ ہی ہو تو دوسری غذا تھوڑی بہت کھانے کے باوجود اس زمانے کی رضاعت سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اس لیے کہ آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ بچے کو لازماً دو سال ہی دودھ پلایا جائے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ، ”مائیں بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو۔“ (آیت ۲۳۳)

ابنِ عباسؓ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور اہلِ علم نے اس پر ان سے اتفاق کیا ہے کہ حمل کی قلیل ترین مدت چھ ماہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا، ”اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کا دودھ چھوٹنا ۳۰ مہینوں میں ہوا۔“ (الاحقاف، آیت ۱۵) یہ ایک اہم قانونی نکتہ ہے جو جائز اور ناجائز ولادت کی بہت سی بحثوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲۴ – یعنی جو تیرے علم میں میرا شریک نہیں ہے۔

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

میں تمھیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔[26]

(اور لقمان[27] نے کہا تھا کہ) "بیٹا! کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اُسے نکال لائے گا۔[28] وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔[29] یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔[30]

---

۲۵ – یعنی اولاد اور والدین سب کو۔

۲۶ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ عنکبوت، حواشی ۱۱ - ۱۲

۲۷ – لقمان کے دوسرے نصائح کا ذکر یہاں یہ بتانے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ عقائد کی طرح اَخلاق کے متعلق بھی جو تعلیمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، وہ بھی عرب میں کوئی انوکھی باتیں نہیں ہیں۔

۲۸ – یعنی اللہ کے علم سے اور اس کی گرفت سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ چٹان کے اندر ایک دانہ تمھارے لیے مخفی ہو سکتا ہے، مگر اُس کے لیے عیاں ہے۔ آسمانوں میں کوئی ذرہ تم سے بعید ترین ہو سکتا ہے، مگر اللہ کے لیے وہ بہت قریب ہے۔ زمین کی تہوں میں پڑی ہوئی کوئی چیز تمھارے لیے سخت تاریکی میں ہے، مگر اس کے لیے بالکل روشنی میں ہے۔ لہٰذا تم کہیں کسی حال میں بھی نیکی یا بدی کا کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے جو اللہ سے مخفی رہ جائے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے واقف ہے، بلکہ جب محاسبہ کا وقت آئے گا تو وہ تمھاری ایک ایک حرکت کا ریکارڈ سامنے لا کر رکھ دے گا۔

۲۹ – اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ جو شخص بھی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام کرے گا اس پر مصائب کا نزول ناگزیر ہے۔ دنیا لازماً ایسے شخص کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔

۳۰ – دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اصلاحِ خلق کے لیے اُٹھنا اور اس کی مشکلات کو انگیز کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ؑ﴿۱۹﴾

ع ۲ / ۸

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر،[۳۱] نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲] اپنی چال میں اعتدال اختیار کر،[۳۳] اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔[۳۴] ع

۳۱- اصل الفاظ ہیں: لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ۔ صَعَر عربی زبان میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اُونٹ کی گردن میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اونٹ اپنا منہ ہر وقت ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا: فلان صعر خدہ، ''فلاں شخص نے اُونٹ کی طرح اپنا کَلّہ پھیر لیا'' یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھیر کر بات کی۔ اسی کے متعلق قبیلۂ تَغلب کا ایک شاعر عَمْرو بن حُیَیّ کہتا ہے:

وَ کنّا اذا الجبّار صَعَّر خَدَّہٗ　　اقمنَا له من میله فتقوّمَا

''ہم ایسے تھے کہ جب کبھی کسی جبار نے ہم سے منہ پھیر کر بات کی تو ہم نے اس کی ٹیڑھ ایسی نکالی کہ وہ سیدھا ہو گیا۔''

۳۲- اصل الفاظ ہیں: مُخْتَالٍ اور فَخُوْرٍ۔ مُخْتَالٍ کے معنیٰ ہیں: وہ شخص جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہو۔ اور فَخُوْر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بڑائی کا دوسروں پر اظہار کرے۔ آدمی کی چال میں اکڑ اور اِتراہٹ اور تَبَختُر کی شان لازماً اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے دماغ میں تکبر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو اپنی بڑائی محسوس کرائے۔

۳۳- بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل، بلکہ میانہ روی اختیار کر''، لیکن سیاقِ کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی و سستی زیرِ بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اَخلاقی حُسن و قُبح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے۔ اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہو تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے ایک قاعدۂ کُلِّیہ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اُس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تَبَختُر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت، اقتدار، حُسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبُّر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضُع اور دکھاوے

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمھارے لیے مُسخّر کر رکھی ہیں[۳۵]

کی درویشی و خدا رسیدگی کا رُوپ دھارتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دُور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو، جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مریل پن، اور نہ ریاکارانہ زُہد و انکسار۔

صحابۂ کرامؓ کا ذوق اس معاملے میں جیسا کچھ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو پکار کر فرمایا: ”سر اٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں ہے۔“ ایک اور شخص کو انھوں نے مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا: ”ظالم، ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔“ ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دین داری کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ آدمی بیماروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔ کسی مسلمان کو ایسی چال چلتے دیکھ کر انھیں خطرہ ہوتا تھا کہ یہ چال دوسروں کے سامنے اسلام کی غلط نمایندگی کرے گی اور خود مسلمانوں کے اندر افسُردگی پیدا کر دے گی۔ ایسا ہی واقعہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو پیش آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب بہت مُضمَحِل سے بنے ہوئے چل رہے ہیں۔ پوچھا: انھیں کیا ہو گیا؟ عرض کیا گیا کہ یہ قُرّا میں سے ہیں۔ (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم و عبادت میں مشغول رہنے والے۔) اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ”عمر سیّد القراء تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے، اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے تھے۔“ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۳۔ تفسیر سورۃ الفرقان، حاشیہ ۷۹)

۳۴۔ اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ آہستہ بولے اور کبھی زور سے بات نہ کرے۔ بلکہ گدھے کی آواز سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ مقصود کس طرح کے لہجے اور کس طرح کی آواز میں بات کرنے سے روکنا ہے۔ لہجے اور آواز کی ایک پستی و بلندی اور سختی و نرمی تو وہ ہوتی ہے جو فطری اور حقیقی ضروریات کے لحاظ سے ہو، مثلاً قریب کے آدمی یا کم آدمیوں سے آپ مخاطب ہوں تو آہستہ بولیں گے۔ دُور کے آدمی سے بولنا ہو یا بہت سے لوگوں سے خطاب کرنا ہو تو لامحالہ زور ہی سے بولنا ہوگا۔ ایسا ہی فرق لہجوں میں بھی موقع و محل کے لحاظ سے لازماً ہوتا ہے۔ تعریف کا لہجہ مذمّت کے لہجے سے اور اظہارِ خوشنودی کا لہجہ اظہارِ ناراضی کے لہجے سے مختلف ہونا ہی چاہیے۔ یہ چیز کسی درجے میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ نہ لقمان کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس فرق کو مٹا کر بس ہمیشہ ایک ہی طرح نرم آواز اور پست لہجے میں بات کیا کرے۔ قابلِ اعتراض جو چیز ہے، وہ تکبر کا اظہار کرنے اور دھونس جمانے اور دوسرے کو ذلیل و مرعوب کرنے کے لیے گلا پھاڑنا اور گدھے کی سی آواز میں بولنا ہے۔

۳۵۔ کسی چیز کو کسی کے لیے مسخّر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک، یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرّف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری، یہ کہ اس چیز کو ایسے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۲۰ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۲۱

اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں[۳۶] تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں[۳۷] بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب[۳۸]۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ اُنھی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟[۳۹]

ضابطے کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اُس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنٰی میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنٰی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنٰی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنٰی میں ہمارے لیے مسخر ہیں، اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنٰی میں۔

۳۶- کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں، یا جو اس کے علم میں ہیں۔ اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنھیں آدمی نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں، مگر انسان کو ان کا پتا تک نہیں ہے کہ اس کے خالق نے اس کی حفاظت کے لیے، اس کی رزق رسانی کے لیے، اس کی نشو و نما کے لیے، اور اس کی فلاح کے لیے کیا کیا سرو سامان فراہم کر رکھا ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں، اور آج تک جن نعمتوں پر سے پردہ اٹھا ہے، وہ ان نعمتوں کے مقابلے میں درحقیقت کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے اب تک پردہ نہیں اُٹھا ہے۔

۳۷- یعنی اس طرح کے مسائل میں جھگڑے اور بحثیں کرتے ہیں کہ مثلاً اللہ ہے بھی یا نہیں؟ اکیلا وہی ایک خدا ہے یا دوسرے خدا بھی ہیں؟ اس کی صفات کیا ہیں اور کیسی ہیں؟ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ وغیرہ۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے[40] اور عملاً وہ نیک[41] ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام[42] لیا، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمھیں غم میں مبتلا[43] نہ کرے، انھیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انھیں بتادیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ہم تھوڑی مدت انھیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں، پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

۳۸ – یعنی نہ تو ان کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم ہے جس سے انھوں نے براہِ راست خود حقیقت کا مُشاہدہ یا تجربہ کرلیا ہو، نہ کسی ایسے رہنما کی رہنمائی انھیں حاصل ہے جس نے حقیقت کا مُشاہدہ کر کے انھیں بتایا ہو، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ان کے پاس ہے جس پر یہ اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہوں۔

۳۹ – یعنی ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر قوم کے باپ دادا کا حق پر ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ محض یہ بات کہ یہ طریقہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق بھی ہے۔ کوئی عقل مند آدمی یہ نادانی کی حرکت نہیں کرسکتا کہ اگر اس کے باپ دادا گمراہ رہے ہوں تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے انھی کی راہ پر چلے جائے، اور کبھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہ محسوس کرے کہ یہ راہ جا کدھر رہی ہے۔

۴۰ – یعنی پوری طرح اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دے۔ اپنی کوئی چیز اس کی بندگی سے مستثنیٰ کر کے نہ رکھے۔ اپنے سارے معاملات اس کے سُپرد کر دے اور اسی کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی پوری زندگی کا قانون بنائے۔

۴۱ – یعنی ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو وہ حوالگی و سُپردگی کا اعلان کر دے مگر عملاً وہ رویّہ اختیار نہ کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمان بندے کا ہونا چاہیے۔

۴۲ – یعنی نہ اس کو اس بات کا کوئی خطرہ کہ اسے غلط رہنمائی ملے گی، نہ اس بات کا کوئی اندیشہ کہ خدا کی بندگی کر کے اس کا انجام خراب ہوگا۔

Maktaba Tul-Ishaat.com

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ

اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔
کہو: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ۔[۴۴] مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۴۵] آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے،[۴۶]
بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔[۴۷] زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب

---

۴۳ - خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ! جو شخص تمھاری بات ماننے سے انکار کرتا ہے وہ اپنے نزدیک تو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اسلام کو رَدّ کر کے اور کفر پر اصرار کر کے تمھیں زک پہنچائی ہے، لیکن دراصل اس نے زک اپنے آپ کو پہنچائی ہے۔ اس نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا کچھ بگاڑا ہے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو تمھیں پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴۴ - یعنی شکر ہے کہ تم اتنی بات تو جانتے اور مانتے ہو۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے تو پھر حمد ساری کی ساری صرف اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔ دوسری کوئی ہستی حمد کی مستحق کیسے ہوسکتی ہے جب کہ تخلیقِ کائنات میں اس کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

۴۵ - یعنی اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو خالقِ کائنات ماننے کے لازمی نتائج اور تقاضے کیا ہیں، اور کون سی باتیں اس کی نقیض پڑتی ہیں۔ جب ایک شخص یہ مانتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق صرف اللہ ہے تو لازماً اس کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ اِلٰہ اور رب بھی صرف اللہ ہی ہے، عبادت اور طاعت و بندگی کا مستحق بھی تنہا وہی ہے، تسبیح و تحمید بھی اس کے سوا کسی دوسرے کی نہیں کی جاسکتی، دعائیں بھی اس کے سوا کسی اور سے نہیں مانگی جاسکتیں، اور اپنی مخلوق کے لیے شارع اور حاکم بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ خالق ایک ہو اور معبود دوسرا، یہ بالکل عقل کے خلاف ہے، سراسر متضاد بات ہے جس کا قائل صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جہالت میں پڑا ہوا ہو۔ اسی طرح ایک ہستی کو خالق ماننا اور پھر دوسری ہستیوں میں سے کسی کو حاجت روا و مشکل کُشا ٹھیرانا، کسی کے آگے سرِ نیاز جھکانا، اور کسی کو حاکم ذی اختیار اور مُطاعِ مُطلَق تسلیم کرنا، یہ سب بھی باہم مُتَناقِض باتیں ہیں جنھیں کوئی صاحبِ علم انسان قبول نہیں کرسکتا۔

۴۶ - یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بلکہ درحقیقت وہی ان سب چیزوں کا مالک بھی ہے جو زمین اور آسمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ نے اپنی یہ کائنات بنا کر یونہی نہیں چھوڑ دی ہے کہ جو چاہے اس کا، یا اس کے کسی حصے کا مالک بن بیٹھے۔ اپنی خَلق کا وہ آپ ہی مالک ہے اور ہر چیز جو اس کائنات میں موجود ہے وہ اُس کی مِلک ہے۔ یہاں اس کے سوا کسی کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اُسے خداوندانہ اختیارات حاصل ہوں۔

۴۷ - اس کی تشریح حاشیہ ۱۹ میں گزر چکی ہے۔

اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ
النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے)، جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔[۴۸] بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جِلا اُٹھانا تو (اُس کے لیے) بس ایسا ہے جیسے ایک مُتنفّس کو (پیدا کرنا اور جِلا اُٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔[۴۹]

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اُس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے،[۵۰] سب ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہے ہیں۔[۵۱] اور (کیا تم نہیں جانتے)

۴۸ – اللہ کی باتوں سے مراد ہیں اس کے تخلیقی کام اور اس کی قدرت و حکمت کے کرشمے۔ یہ مضمون اس سے ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ کہف آیت ۱۰۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ بظاہر ایک شخص یہ گمان کرے گا کہ شاید اس قول میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آدمی تھوڑا سا غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ درحقیقت اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں ہے۔ جتنے قلم اس زمین کے درختوں سے بن سکتے ہیں، اور جتنی روشنائی زمین کے موجودہ سمندر اور ویسے ہی سات مزید سمندر فراہم کر سکتے ہیں، ان سے اللہ کی قدرت و حکمت اور اس کی تخلیق کے سارے کرشمے تو درکنار، شاید موجوداتِ عالَم کی مکمل فہرست بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ تنہا اس زمین پر جتنی موجودات پائی جاتی ہیں انھی کا شمار مشکل ہے، کجا کہ اس اتھاہ کائنات کی ساری موجودات ضبطِ تحریر میں لائی جا سکیں۔

اس بیان سے دراصل یہ تصوّر دلانا مقصود ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لایا ہے اور اَزَل سے اَبد تک اس کا سارا نظم و نسق چلا رہا ہے اس کی خدائی میں ان چھوٹی چھوٹی ہستیوں کی حیثیت ہی کیا ہے جنھیں تم معبود بنائے بیٹھے ہو۔ اس عظیم الشان سلطنت کے چلانے میں دخیل ہونا تو درکنار، اس کے کسی اَقَلّ قلیل جُز سے پوری واقفیت اور محض واقفیت تک کسی مخلوق کے بس کی چیز نہیں ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کو یہاں خداوندانہ اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصّہ بھی مل سکے جس کی بنا پر وہ دعائیں سننے اور قسمتیں بنانے اور بگاڑنے پر قادر ہو۔

۴۹ – یعنی وہ بیک وقت ساری کائنات کی آوازیں الگ الگ سُن رہا ہے اور کوئی آواز اس کی سماعت کو اس طرح مشغول

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَ اَنَّ مَا
يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الۡبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿۳۰﴾ ع ۱۱/۱۲

کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[۵۲]، اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں[۵۳]، اور (اِس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے[۵۴]۔ ع

نہیں کرتی کہ اسے سنتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ سن سکے۔ اسی طرح وہ بیک وقت ساری کائنات کو اس کی ایک ایک چیز اور ایک ایک واقعے کی تفصیل کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اور کسی چیز کے دیکھنے میں اس کی بینائی اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسے دیکھتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ دیکھ سکے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ انسانوں کے پیدا کرنے اور دوبارہ وجود میں لانے کا بھی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں اور آیندہ قیامت تک ہوں گے، ان سب کو وہ ایک آن کی آن میں پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی قدرتِ تخلیق ایک انسان کو بنانے میں اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسی وقت وہ دوسرے انسان نہ پیدا کر سکے۔ اس کے لیے ایک انسان کا بنانا اور کھربوں انسانوں کا بنا دینا یکساں ہے۔

۵۰ - یعنی رات اور دن کا پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آنا خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سورج اور چاند پوری طرح ایک ضابطے میں کَسے ہوئے ہیں۔ سورج اور چاند کا ذکر یہاں محض اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں عالَمِ بالا کی وہ نمایاں ترین چیزیں ہیں جن کو انسان قدیم زمانے سے معبُود بناتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی بہت سے انسان انھیں دیوتا مان رہے ہیں۔ ورنہ درحقیقت زمین سمیت کائنات کے تمام تاروں اور سیّاروں کو اللہ تعالیٰ نے ایک اٹل ضابطے میں کَس رکھا ہے جس سے وہ یک سرِ مُو ہٹ نہیں سکتے۔

۵۱ - یعنی ہر چیز کی جو مدّتِ عمر مقرر کر دی گئی ہے اسی وقت تک وہ چل رہی ہے۔ سورج ہو یا چاند، یا کائنات کا کوئی اور تارا یا سیارہ، ان میں سے کوئی چیز بھی نہ اَزَلی ہے نہ اَبَدی۔ ہر ایک کا ایک وقتِ آغاز ہے جس سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اور ایک وقتِ اختتام ہے جس کے بعد وہ موجود نہ رہے گی۔ اس ذکر سے مقصود یہ جتانا ہے کہ ایسی حادِث اور بے بس چیزیں آخر معبُود کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۲ - یعنی حقیقی فاعلِ مختار ہے، خلق و تدبیر کے اختیارات کا اصل مالک ہے۔

۵۳ - یعنی وہ سب محض تمھارے تخیُّلات کے آفریدہ خدا ہیں۔ تم نے فرض کر لیا ہے کہ فُلاں صاحب خدائی میں کوئی دخل رکھتے ہیں اور فُلاں حضرت کو مشکل کُشائی و حاجت روائی کے اختیارات حاصل ہیں۔ حالاں کہ فی الواقع ان میں سے کوئی صاحب بھی کچھ نہیں بنا سکتے۔

۵۴ - یعنی ہر چیز سے بالا و برتر جس کے سامنے سب پست ہیں، اور ہر چیز سے بزرگ جس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمۡ مِّنۡ اٰيٰتِهٖ ؕ
اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ۝۳۱ وَاِذَا غَشِيَهُمۡ مَّوۡجٌ
كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمۡ اِلَى الۡبَرِّ
فَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ ۝۳۲

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟[۵۵] درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔[۵۶] اور جب (سمندر میں) اِن لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے، پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اِقتصاد برتتا ہے،[۵۷] اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے۔[۵۸]

۵۵ – یعنی ایسی نشانیاں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اختیارات بالکل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کیسے ہی مضبوط اور بحری سفر کے لیے موزوں جہاز بنالے اور جہاز رانی کے فن اور اس سے تعلق رکھنے والی معلومات اور تجربات میں کتنا ہی کمال حاصل کر لے، لیکن سمندر میں جن ہولناک طاقتوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے میں وہ تنہا اپنی تدابیر کے بَل بُوتے پر بخیریت سفر نہیں کر سکتا جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اس کی نگاہِ کرم پھرتے ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ذرائع و وسائل اور کمالاتِ فن کتنے پانی میں ہیں۔ اسی طرح آدمی امن و اطمینان کی حالت میں چاہے کیسا ہی سخت دہریہ یا کتنا مشرک ہو، لیکن سمندر کے طوفان میں جب اس کی کشتی ڈولنے لگتی ہے اس وقت دہریے کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ہے، اور مشرک بھی جان لیتا ہے کہ خدا بس ایک ہی ہے۔

۵۶ – یعنی جن لوگوں میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں وہ جب ان نشانیوں سے حقیقت کو پہچان جاتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے توحید کا سبق حاصل کر کے اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتے ہیں۔ پہلی صفت، یہ کہ وہ صَبّار (بڑے صبر کرنے والے) ہوں۔ ان کے مزاج میں تلوّن نہ ہو بلکہ ثابت قدمی ہو۔ گوارا اور ناگوار، سخت اور نرم، اچھے اور بُرے، تمام حالات میں ایک عقیدۂ صالحہ پر قائم رہیں۔ یہ کمزوری ان میں نہ ہو کہ بُرا وقت آیا تو خدا کے سامنے گڑگڑانے لگے اور اچھا وقت آتے ہی سب کچھ بھول گئے، یا اس کے برعکس اچھے حالات میں خدا پرستی کرتے رہے اور مصائب کی ایک چوٹ پڑتے ہی خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ دوسری صفت یہ کہ وہ شَکُور (بڑے شکر کرنے والے) ہوں۔ نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں بلکہ نعمت کی قدر پہچانتے ہوں اور نعمت دینے والے کے لیے ایک مستقل جذبۂ شکر و سپاس اپنے دل میں جاگزیں رکھیں۔

Maktaba Tul-Ishaat.com

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳

لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا[۵۹] ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا وعدہ[۶۰] سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے[۶۱] اور نہ دھوکے باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے[۶۲]۔

۵۷ – اس کے کئی مطلب ہوسکتے ہیں۔ اقتصاد کو اگر راست رَوی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن میں سے کم ہی ایسے نکلتے ہیں جو وہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اُس توحید پر ثابت قدم رہتے ہیں جس کا اقرار انھوں نے طوفان میں گھِر کر کیا تھا اور یہ سبق ہمیشہ کے لیے ان کو راست رَو بنا دیتا ہے۔ اور اگر اقتصاد بمعنیٰ توسُّط و اعتدال لیا جائے تو اس کا ایک مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض لوگ اپنے شرک و دہریّت کے عقیدے میں اس شدت پر قائم نہیں رہتے جس پر اس تجرِبے سے پہلے تھے، اور دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ وہ وقت گزر جانے کے بعد ان میں سے بعض لوگوں کے اندر اِخلاص کی وہ کیفیت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے جو اس وقت پیدا ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ذو معنیٰ فقرہ بیک وقت ان تینوں کیفیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال فرمایا ہو۔ مدّعا غالباً یہ بتانا ہے کہ بحری طوفان کے وقت تو سب کا دماغ دُرستی پر آ جاتا ہے اور شرک و دہریّت کو چھوڑ کر سب کے سب خدائے واحد کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن خیریت سے ساحل پر پہنچ جانے کے بعد ایک قلیل تعداد ہی ایسی نکلتی ہے جس نے اس تجرِبے سے کوئی پائدار سبق حاصل کیا ہو۔ پھر یہ قلیل تعداد بھی تین قسم کے گروہوں میں بٹ جاتی ہے: ایک، وہ جو ہمیشہ کے لیے سیدھا ہو گیا۔ دوسرا، وہ جس کا کفر کچھ اعتدال پر آ گیا۔ تیسرا، وہ جس کے اندر اُس ہنگامی اِخلاص میں سے کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا۔

۵۸ – یہ دو صفات اُن دو صفتوں کے مقابلے میں ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں کیا گیا تھا۔ غدار وہ شخص ہے جو سخت بے وفا ہو اور اپنے عہد و پیمان کا کوئی پاس نہ رکھے۔ اور ناشکرا وہ ہے جس پر خواہ کتنی ہی نعمتوں کی بارش کر دی جائے وہ احسان مان کر نہ دے اور اپنے مُحسن کے مقابلے میں سرکشی سے پیش آئے۔ یہ صفات جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں وہ خطرے کا وقت ٹل جانے کے بعد بے تکلّف اپنے کفر، اپنی دہریّت اور اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ انھوں نے طوفان کی حالت میں خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کچھ نشانیاں خارج میں بھی اور خود اپنے نفس میں بھی پائی تھیں اور ان کا خدا کو پکارنا اسی وِجدانِ حقیقت کا نتیجہ تھا۔ ان میں سے جو دہریے ہیں وہ اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ وہ تو ایک کمزوری تھی جو بحالتِ اضطراب ہم سے سرزد ہو گئی، ورنہ درحقیقت خدا وُدا کوئی نہ تھا جس نے ہمیں طوفان سے بچایا ہو، ہم تو فُلاں فُلاں اسباب و ذرائع سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ رہے مشرکین، تو وہ بالعموم یہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگوں، یا دیوی دیوتاؤں

کا سایہ ہمارے سر پر تھا جس کے طفیل ہم بچ گئے۔ چنانچہ ساحل پر پہنچتے ہی وہ اپنے معبُودانِ باطل کے شکریے ادا کرنے شروع کر دیتے ہیں اور انھی کے آستانوں پر چڑھاوے چڑھانے لگتے ہیں۔ یہ خیال تک انھیں نہیں آتا کہ جب ساری اُمیدوں کے سہارے ٹوٹ گئے تھے، اس وقت اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی نہ تھا جس کا دامن انھوں نے تھاما ہو۔

۵۹ – یعنی دوست، لیڈر، پیر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ تو پھر بھی دور کا تعلق رکھنے والے ہیں، دنیا میں قریب ترین تعلق اگر کوئی ہے تو وہ اولاد اور والدین کا ہے۔ مگر وہاں حالت یہ ہوگی کہ بیٹا پکڑا گیا ہو تو باپ آگے بڑھ کر یہ نہیں کہے گا کہ اس کے گناہ میں مجھے پکڑ لیا جائے، اور باپ کی شامت آ رہی ہو تو بیٹے میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے بدلے مجھے جہنّم میں بھیج دیا جائے۔ اس حالت میں یہ توقع کرنے کی کیا گنجایش باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی دوسرا شخص وہاں کسی کے کچھ کام آئے گا۔ لہٰذا نادان ہے وہ شخص جو دنیا میں دوسروں کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، یا کسی کے بھروسے پر گمراہی اور گناہ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس مقام پر آیت ۱۵ کا مضمون بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جس میں اولاد کو تلقین کی گئی تھی کہ دُنیوی زندگی کے معاملات میں والدین کی خدمت کرنا تو بے شک برحق ہے مگر دین واعتقاد کے معاملے میں والدین کے کہنے پر گمراہی قبول کر لینا ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۶۰ – اللہ کے وعدے سے مراد یہ وعدہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور ایک روز اللہ کی عدالت قائم ہو کر رہے گی، جس میں ہر ایک کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۶۱ – دنیا کی زندگی سطح بیں انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، لہٰذا جتنا کچھ بھی تمھیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔ کوئی اپنی دولت اور طاقت اور خوش حالی کے نشے میں بدمست ہو کر اپنی موت کو بھول جاتا ہے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس کا عیش اور اس کا اقتدار لازوال ہے۔ کوئی اَخلاقی و روحانی مقاصد کو فراموش کر کے صرف مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصود بالذّات سمجھ لیتا ہے اور "معیارِ زندگی" کی بلندی کے سوا کسی دوسرے مقصد کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا خواہ نتیجے میں اس کا معیارِ آدمیت کتنا ہی پست ہوتا چلا جائے۔ کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ دنیوی خوش حالی ہی حق و باطل کا اصل معیار ہے، ہر وہ طریقہ حق ہے جس پر چل کر یہ نتیجہ حاصل ہو، اور اس کے برعکس جو کچھ بھی ہے باطل ہے۔ کوئی اسی خوش حالی کو مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت سمجھتا ہے اور یہ قاعدۂ کُلِّیہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے کہ جس کی دنیا خوب بَن رہی ہے، خواہ کیسے ہی طریقوں سے بنے، وہ خدا کا محبُوب ہے، اور جس کی دنیا خراب ہے، چاہے وہ حق پسندی و راست بازی ہی کی بدولت خراب ہو، اس کی عاقبت بھی خراب ہے۔ یہ اور ایسی ہی جتنی غلط فہمیاں بھی ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "دنیوی زندگی کے دھوکے" سے تعبیر فرمایا ہے۔

۶۲ – الغَرور (دھوکے باز) سے مراد شیطان بھی ہو سکتا ہے، کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے، انسان کا اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے، اور کوئی دوسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ کسی شخصِ خاص یا شَے خاص کا تعین کیے بغیر اس وسیع المعنیٰ لفظ کو اس کی مُطلَق صورت میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے لیے فریب خوردگی کے بنیادی اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ جس شخص نے خاص طور پر جس ذریعے سے بھی وہ اصل فریب کھایا ہو جس کے اثر سے اس کی زندگی کا رخ صحیح سَمت سے غلط سَمت میں مڑ گیا، وہی اس کے لیے الغَرور ہے۔

"اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے" کے الفاظ بھی بہت وسیع ہیں جن میں بے شمار مختلف قسم کے دھوکے آ جاتے ہیں۔ کسی کو اس کا "دھوکے باز" یہ یقین دلاتا ہے کہ خدا سرے سے ہے ہی نہیں۔ کسی کو یہ سمجھاتا ہے کہ خدا اس دنیا کو بنا کر الگ جا بیٹھا ہے اور اب

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾ ع

اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی مُتنفّس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے، اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے[۶۳] ع

یہ دنیا بندوں کے حوالے ہے۔ کسی کو اس غلط فہمی میں ڈالتا ہے کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں جن کا تقرّب حاصل کر لو تو جو کچھ بھی تم چاہو کرتے رہو، بخشش تمھاری یقینی ہے۔ کسی کو اس دھوکے میں مبتلا کرتا ہے کہ خدا تو غفورٌ رّحیم ہے، تم گناہ کرتے چلے جاؤ، وہ بخشتا چلا جائے گا۔ کسی کو جبر کا عقیدہ سمجھاتا ہے اور اس غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ تم تو مجبور ہو، بدی کرتے ہو تو خدا تم سے کراتا ہے اور نیکی سے دور بھاگتے ہو تو خدا ہی تمھیں اس کی توفیق نہیں دیتا۔ اس طرح کے نہ معلوم کتنے دھوکے ہیں جو انسان خدا کے بارے میں کھا رہا ہے، اور اگر تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو آخر کار تمام گمراہیوں اور گناہوں اور جرائم کا بنیادی سبب یہی نکلتا ہے کہ انسان نے خدا کے بارے میں کوئی نہ کوئی دھوکا کھایا ہے تب ہی اس سے کسی اعتقادی ضلالت یا اخلاقی بے راہ رَوی کا صُدور ہوا ہے۔

۶۳ — یہ آیت دراصل اس سوال کا جواب ہے جو قیامت کا ذکر اور آخرت کا وعدہ سن کر کفارِ مکہ بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے کہ آخر وہ گھڑی کب آئے گی۔ قرآنِ مجید میں کہیں ان کے اِس سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اور کہیں نقل کیے بغیر جواب دے دیا گیا ہے، کیونکہ مخاطبین کے ذہن میں وہ موجود تھا۔ یہ آیت بھی انھی آیات میں سے ہے جن میں سوال کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔

پہلا فقرہ: ”اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے“ یہ اصل سوال کا جواب ہے۔ اس کے بعد کے چاروں فقرے اس کے لیے دلیل کے طور پر ارشاد ہوئے ہیں۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کی قریب ترین دلچسپیاں وابستہ ہیں، انسان ان کے متعلق بھی کوئی علم نہیں رکھتا، پھر بھلا یہ جاننا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ ساری دنیا کے انجام کا وقت کب آئے گا۔ تمھاری خوش حالی و بدحالی کا بڑا انحصار بارش پر ہے۔ مگر اس کا سرِشتہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب، جہاں، جتنی چاہتا ہے برساتا ہے اور جب چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ تم قطعاً نہیں جانتے کہ کہاں، کس وقت کتنی بارش ہوگی اور کون سی زمین اس سے محروم رہ جائے گی، یا کس زمین پر بارش اُلٹی نقصان دِہ ہو جائے گی۔ تمھاری اپنی بیویوں کے پیٹ میں تمھارے اپنے نطفے سے حمل قرار پاتا ہے جس سے تمھاری نسل کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ مگر تم نہیں جانتے کہ کیا چیز اس پیٹ میں پرورش پا رہی ہے اور کس شکل میں کن بھلائیوں یا بُرائیوں کو لیے ہوئے وہ برآمد ہوگی۔ تم کو یہ تک پتا نہیں ہے کہ کل تمھارے ساتھ کیا کچھ پیش آنا ہے۔

ایک اچانک حادثہ تمھاری تقدیر بدل سکتا ہے، مگر ایک منٹ پہلے بھی تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تمھاری اس زندگی کا خاتمہ آخرِ کار کہاں کس طرح ہوگا۔ یہ ساری معلومات اللہ نے اپنے ہی پاس رکھی ہیں اور ان میں سے کسی کا علم بھی تم کو نہیں دیا۔ ان میں سے ایک ایک چیز ایسی ہے جسے تم چاہتے ہو کہ پہلے سے تمھیں اس کا علم ہو جائے تو کچھ اس کے لیے پیش بندی کر سکو، لیکن تمھارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ان معاملات میں اللہ ہی کی تدبیر اور اسی کی قضا پر بھروسا کرو۔ اسی طرح دنیا کے اختتام کی ساعت کے معاملے میں بھی اللہ کے فیصلے پر اعتماد کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس کا علم بھی نہ کسی کو دیا گیا ہے نہ دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں اُمورِ غیب کی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہاں تو صرف سامنے کی چند چیزیں مثالاً پیش کی گئی ہیں جن سے انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ صرف یہی پانچ اُمورِ غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ غیب نام ہی اُس چیز کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو، اور فی الحقیقت اس غیب کی کوئی حد نہیں ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۃ النمل، حاشیہ ۸۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

السجدہ

(۳۲)

السجدہ

نام

آیت ۱۵ میں سجدہ کا جو مضمون آیا ہے اسی کو سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اندازِ بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکے کا دورِ مُتوسِّط ہے، اور اس کا بھی ابتدائی زمانہ، کیونکہ اس کلام کے پس منظر میں ظلم وستم کی وہ شدت نظر نہیں آتی جو بعد کے ادوار کی سورتوں کے پیچھے نظر آتی ہے۔

موضوع اور مباحث

سورہ کا موضوع توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق لوگوں کے شبہات کو رفع کرنا اور ان تینوں حقیقتوں پر ایمان کی دعوت دینا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپس میں چرچے کر رہے تھے کہ یہ شخص عجیب عجیب باتیں گھڑ گھڑ کر سنا رہا ہے۔ کبھی مرنے کے بعد کی خبریں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مٹی میں رَل مِل جانے کے بعد تم پھر اُٹھائے جاؤ گے اور حساب کتاب ہوگا اور دوزخ ہوگی اور جنت ہوگی۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ دیوی دیوتا اور بزرگ کوئی چیز نہیں ہیں، بس اکیلا ایک خدا ہی معبود ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، آسمان سے مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ کلام جو میں تم کو سنا رہا ہوں، میرا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔ یہ عجیب افسانے ہیں جو یہ شخص ہمیں سنا رہا ہے ـــــ انھی باتوں کا جواب اِس سورہ کا موضوعِ بحث ہے۔

اس جواب میں کفار سے کہا گیا ہے کہ بلا شک وریب یہ خدا ہی کا کلام ہے اور اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نبوت کے فیض سے محروم، غفلت میں پڑی ہوئی ایک قوم کو چونکایا جائے۔ اِسے تم اِفترا کیسے کہہ سکتے ہو جب کہ اس کا مُنَزَّل مِن اللہ ہونا ظاہر وباہر ہے۔

پھر ان سے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن جن حقیقتوں کو تمھارے سامنے پیش کرتا ہے، عقل سے کام لے کر خود سوچو کہ ان میں کیا چیز اَچنبھے کی ہے۔ آسمان وزمین کے انتظام کو دیکھو، خود اپنی پیدائش اور بناوٹ پر غور کرو، کیا یہ سب کچھ اُس تعلیم کی صداقت پر شاہد نہیں ہے جو اس نبی کی زبان سے اِس قرآن میں تم کو دی جارہی ہے؟ یہ نظامِ کائنات توحید پر دلالت کر رہا ہے یا شرک پر؟ اور اس سارے نظام کو دیکھ کر اور خود اپنی پیدائش پر نگاہ ڈال کر کیا تمھاری عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ جس نے اب تمھیں پیدا کر رکھا ہے وہ پھر تمھیں پیدا نہ کر سکے گا؟

پھر عالَمِ آخرت کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے نتائج وعواقب بیان کر کے یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے کفر چھوڑ دیں اور قرآن کی اس تعلیم کو قبول کر لیں جسے مان کر خود ان کی اپنی ہی عاقبت دُرست ہوگی۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ انسان کے قصوروں پر یکایک آخری اور فیصلہ کُن

Maktaba Tul Ishaat.com

عذاب میں اسے نہیں پکڑ لیتا بلکہ اس سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں، مصیبتیں، آفات اور نقصانات بھیجتا رہتا ہے۔ ہلکی ہلکی چوٹیں لگاتا رہتا ہے تاکہ اسے تنبیہ ہو اور اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی اگر ان ابتدائی چوٹوں ہی سے ہوش میں آ جائے تو اس کے اپنے حق میں بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ دنیا میں یہ کوئی پہلا اور انوکھا واقعہ تو نہیں ہے کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے کتاب آئی ہو۔ اس سے پہلے آخر موسیٰ (علیہ السلام) پر بھی تو کتاب آئی تھی جسے تم سب لوگ جانتے ہو۔ یہ آخر کون سی ایسی بات ہے کہ اس پر تم لوگ یوں کان کھڑے کر رہے ہو۔ یقین مانو کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے آئی ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اب پھر وہی کچھ ہوگا جو موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد میں ہو چکا ہے۔ امامت و پیشوائی اب انھی کو نصیب ہوگی جو اس کتابِ الٰہی کو مان لیں گے۔ اسے ردّ کر دینے والوں کے لیے ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔

پھر کفارِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں تم جن پچھلی تباہ شدہ قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے ہو ان کا انجام دیکھ لو، کیا یہی انجام تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ آج تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چند لڑکوں اور چند غلاموں اور غریب لوگوں کے سوا کوئی نہیں سن رہا ہے اور ہر طرف سے ان پر طعن اور ملامت اور پھبتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس سے تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ چلنے والی بات نہیں ہے، چار دن چلے گی اور پھر ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ محض تمھاری نظر کا دھوکا ہے۔ کیا یہ تمھارا رات دن کا مشاہدہ نہیں ہے کہ آج ایک زمین بالکل بے آب و گیاہ پڑی ہے جسے دیکھ کر گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے پیٹ میں روئیدگی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں، مگر کل ایک ہی بارش میں وہ اس طرح پھبک اٹھتی ہے کہ اس کے چپے چپے سے نمو کی طاقتیں پھوٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔

خاتمۂ کلام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ تمھاری باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت! یہ فیصلہ کن فتح آپ کو کب نصیب ہونے والی ہے، ذرا تاریخ تو ارشاد ہو۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمھارے فیصلے کا وقت آ جائے گا اس وقت ماننا تمھارے لیے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ ماننا ہے تو اب مان لو۔ اور آخری فیصلے ہی کا انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

ترتیبہا ۳۰ سُوْرَۃُ السَّجْدَۃِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲

ال م۔ اِس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

ا ۔ قرآنِ مجید کی متعدد سُورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرے سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغازِ کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آرہا ہے۔ یہ بظاہر اُسی طرز کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو کے اس معمولی سے اعلان کے برعکس قرآنِ مجید کی کسی سورت کا آغاز جب اس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ پیغام فرماں روائے کائنات کی طرف سے آرہا ہے تو یہ محض مَصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت اِنذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ چھوٹتے ہی اتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالَم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے کہ اس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلے میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرۂ عظیم مول لیتا ہوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالَم کا کلام ہے تو اسے رد کرنے کا نتیجہ مجھ کو ابدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مُجَرَّد اپنی اس غیر معمولی نوعیت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کلام کو سنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے، بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے، اس کے منزّل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجایش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکۂ معظمہ کے اُن باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راست باز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اُس سے وہ باتیں کبھی نہ سنی تھیں جو دعوائے نبوت کے بعد یکایک اُس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہتاً جانتے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ۚ بَلۡ هُوَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰٮهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ۝۳

کیا[۲] یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟[۳] نہیں، بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے[۴] تاکہ تو متنبّہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔[۵]

تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انھیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مُدّعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خُردبین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جُل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں، اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا ربّ العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

۲- اوپر کے تمہیدی فقرے کے بعد مشرکینِ مکہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کرتے تھے۔

۳- یہ محض سوال و استفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن ساری باتوں کے باوجود، جن کی بنا پر اس کتاب کا مُنزَّل مِن اللہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھری کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ ربّ العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سروپا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم ان کو نہیں آتی؟ انھیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بے ہودہ الزام کو سُن کر کیا رائے قائم کریں گے؟

۴- جس طرح پہلی آیت میں لَا رَیۡبَ فِیۡهِ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی اِستدلال قرآن کے کلام الٰہی

ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اب اس آیت میں بھی کفارِ مکہ کے الزامِ افترا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے کہ ”یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔“ اس کی وجہ وہی ہے جو اُوپر حاشیہ نمبر ۱ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے ساتھ سب کے سامنے تھی۔ اور اس کے اثرات و نتائج بھی مکے کی اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اس کتاب کا ربّ العالمین کی طرف سے آیا ہوا حق ہونا ایسا صریح امرِ واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے الٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اسے رات کہتے ہو؟ یہ روزِ روشن تو سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کر دیں گے۔

۵ – یعنی جس طرح اِس کا حق ہونا اور من جانب اللہ ہونا قطعی و یقینی امر ہے اُسی طرح اِس کا مبنی بر حکمت ہونا اور خود تم لوگوں کے لیے خدا کی ایک رحمت ہونا بھی ظاہر ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ صد ہا برس سے تمھارے اندر کوئی پیغمبر نہیں آیا ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ تمھاری ساری قوم جہالت اور اَخلاقی پستی اور سخت پسماندگی میں مبتلا ہے۔ اس حالت میں اگر تمھیں بیدار کرنے اور راہِ راست دکھانے کے لیے ایک پیغمبر تمھارے درمیان بھیجا گیا ہے تو اس پر حیران کیوں ہوتے ہو۔ یہ تو ایک بڑی ضرورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے اور تمھاری اپنی بھلائی کے لیے کیا ہے۔

واضح رہے کہ عرب میں دینِ حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذریعے سے پہنچی تھی جو زمانۂ قبلِ تاریخ میں گزرے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضورؐ سے ڈھائی ہزار برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر جو عرب کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھیجے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ اور ان کی آمد پر بھی تقریباً دو ہزار برس گزر چکے تھے۔ یہ اتنی طویل مدت ہے کہ اس کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ اس قوم کے اندر کوئی مُتنبِّہ کرنے والا نہیں آیا۔ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قوم میں کبھی کوئی مُتنبِّہ کرنے والا نہ آیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے یہ قوم ایک مُتنبِّہ کرنے والے کی محتاج چلی آ رہی ہے۔

یہاں ایک اور سوال سامنے آ جاتا ہے جس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے آدمی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صد ہا برس تک عربوں میں کوئی نبی نہیں آیا تو اس جاہلیت کے دور میں گزرے ہوئے لوگوں سے آخر باز پرس کس بنیاد پر ہوگی؟ انھیں معلوم ہی کب تھا کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے؟ پھر اگر وہ گمراہ تھے تو اپنی اس گمراہی کے ذمہ دار وہ کیسے قرار دیے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کا تفصیلی علم چاہے اس جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کے پاس نہ رہا ہو، مگر یہ بات اُس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیا علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت اُن روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا

سے پہنچی تھیں، اور اسے قریب کی سرزمین میں آئے ہوئے انبیا حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی وہ جانتے تھے۔ عرب کی روایات میں یہ بات بھی مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانے میں اہلِ عرب کا اصل دین، دینِ ابراہیمی تھا اور بت پرستی اُن کے ہاں عمرو بن لُحَی نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بت پرستی کے رواجِ عام کے باوجود عرب کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بتوں پر قربانیاں کرنے کی علانیہ مذمت کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قُسّ بن ساعِدہ الاِیادی، اُمیّہ بن ابی الصّلت، سُوَید بن عمرو المصطلقی، وَکِیع بن سَلَمہ بن زُہیر الاِیادی، عَمرو بن جُندب الجُہنی، ابوقیس صِرمہ بن ابی انس، زید بن عَمرو بن نُفَیل، ورقہ بن نوفل، عثمان بن الحُوَیرِث، عبید اللہ بن جَحش، عامر بن الظَّرِب العَدوانی، عَلّاف بن شہاب التّمیمی، المُتلمِّس بن اُمیّۃ الکنانی، زُہیر بن ابی سُلمیٰ، خالد بن سِنان بن غَیث العَبسی، عبد اللہ القُضاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنھیں حُنفا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیل انبیا علیہم السلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ یمن میں چوتھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرحمٰن اور ربّ السماء والارض ہی کو الٰہِ واحد تسلیم کرتے تھے۔ ۳۷۸ء کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ یہ معبد "الٰہِ ذُوسَموی" یعنی الٰہِ السّماء یا ربّ السّماء کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں بنصر و ردا الھن بعل سمین وارضین (بنصر وبعون الالٰہ ربّ السّماء والارض) کے الفاظ لکھے ہیں، جو عقیدۂ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اسی دور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بخیل رحمنن (یعنی استعین بحول الرحمٰن) کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شمالِ عرب میں دریائے فرات اور قِنّسرین کے درمیان زَبد کے مقام پر ۵۱۲ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بِسْمِ الْاِلٰہ، لَاعِزَّ اِلَّا لَہٗ، لَا شُکْرَ اِلَّا لَہٗ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انبیائے سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے، اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ "تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے۔" (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۃ الفرقان، حاشیہ ۸۴)

۶ — اب مشرکین کے دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید پر کرتے تھے۔ ان کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دیوتاؤں اور بزرگوں کی معبودیت سے انکار کرتے ہیں اور ہانکے پکارے یہ دعوت دیتے ہیں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی کارساز، کوئی حاجت روا، کوئی دعائیں سننے والا اور بگڑی بنانے والا اور کوئی حاکم

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵

کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا[7]، اُس کے سوا نہ تمھارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اُس کے آگے سفارش کرنے والا، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟[8] وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی رُوداد اُوپر اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔[9]

ذی اختیار نہیں ہے۔

۷ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیت ۵۴، یونُس، آیت ۳، الرَّعد، آیت ۲۔

۸ – یعنی تمھارا اصل خدا تو خالقِ زمین و آسمان ہے۔ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ کائنات کی اس عظیم الشان سلطنت میں اُس کے سوا دوسروں کو کارساز سمجھ بیٹھے ہو۔ اس پوری کائنات کا اور اس کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی ذات کے سوا ہر دوسری چیز جو یہاں پائی جاتی ہے، مخلوق ہے۔ اور اللہ اس دنیا کو بنا دینے کے بعد کہیں جا کر سو بھی نہیں گیا ہے، بلکہ اپنی اِس سلطنت کا تخت نشین اور حاکم و فرماں روا بھی وہ آپ ہی ہے۔ پھر تمھاری عقل آخر کہاں چرنے چلی گئی ہے کہ تم مخلوقات میں سے چند ہستیوں کو اپنی قسمتوں کا مالک قرار دے رہے ہو؟ اگر اللہ تمھاری مدد نہ کرے تو ان میں سے کس کی یہ طاقت ہے کہ تمھاری مدد کر سکے؟ اگر اللہ تمھیں پکڑے تو ان میں سے کس کا یہ زور ہے کہ تمھیں چھڑا سکے؟ اگر اللہ سفارش نہ سنے تو ان میں سے کون یہ بل بُوتا رکھتا ہے کہ اس سے اپنی سِفارش منوا لے؟

۹ – یعنی تمھارے نزدیک جو ایک ہزار برس کی تاریخ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گویا ایک دن کا کام ہے جس کی اسکیم آج کارکنانِ قضاوقدر کے سُپرد کی جاتی ہے اور کل وہ اس کی رُوداد اُس کے حضور پیش کرتے ہیں، تاکہ دوسرے دن (یعنی تمھارے حساب سے ایک ہزار برس) کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ قرآنِ مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر اور بھی آیا ہے جنھیں نگاہ میں رکھنے سے اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کفارِ عرب کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کا دعویٰ لے کر سامنے آئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ وہ بار بار ہم سے کہتے ہیں کہ اگر میری اس دعوت کو تم لوگ قبول نہ کرو گے اور مجھے جھٹلا دو گے تو تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا۔ مگر کئی برس سے وہ اپنی یہ بات دُہرائے جا رہے ہیں اور آج تک عذاب نہ آیا، حالانکہ ہم ایک دفعہ نہیں، ہزاروں مرتبہ انھیں صاف صاف جھٹلا چکے ہیں۔ اُن کی یہ دھمکیاں واقعی سچّی ہوتیں تو ہم پر نہ معلوم کبھی کا عذاب آ چکا ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ سُورۂ حج میں فرماتا ہے:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ — یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ۝۶
الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ
مِنْ طِيْنٍ ۚ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ۝۸

وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا[10]، زبردست[11] اور رحیم[12]۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب[13] ہی بنائی۔ اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اُس کی نسل ایک ایسے سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے[14]،

اللّٰہُ وَعْدَہٗ ط وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (آیت ۴۷)

کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تم لوگوں کے شمار سے ہزار برس جیسا ہوا کرتا ہے۔

دوسری جگہ اسی بات کا جواب دیا گیا ہے:

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۗ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۗ (المعارج: آیات ۱-۷)

پوچھنے والا پوچھتا ہے اُس عذاب کو جو واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے، جس کو دفع کرنے والا کوئی نہیں ہے، اُس خدا کی طرف سے جو چڑھتے درجوں والا ہے (یعنی درجہ بدرجہ کام کرنے والا ہے)۔ چڑھتے ہیں اُس کی طرف ملائکہ اور روح ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔ پس اے نبی! صبرِ جمیل سے کام لو۔ یہ لوگ اسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

اِن تمام ارشادات سے جو بات ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے دنیا کی گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ تم فلاں رَوش اختیار کرو گے تو اس کا انجام تمھیں یہ کچھ دیکھنا ہوگا، تو وہ قوم سخت احمق ہوگی اگر اس کا یہ مطلب سمجھے کہ آج وہ روش اختیار کی جائے اور کل اس کے بُرے نتائج سامنے آجائیں۔ ظہورِ نتائج کے لیے دن اور مہینے اور سال تو کیا چیز ہیں، صدیاں بھی کوئی بڑی مدّت نہیں ہیں۔

۱۰ – یعنی دوسرے جو بھی ہیں ان کے لیے ایک چیز ظاہر ہے تو بے شمار چیزیں ان سے پوشیدہ ہیں۔ فرشتے ہوں یا جنّ، یا نبی اور ولی اور برگزیدہ انسان، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو سب کچھ جاننے والا ہو۔ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ اس پر ہر چیز عیاں ہے۔ جو کچھ گزر چکا ہے، جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ آنے والا ہے، سب اس پر روشن ہے۔

۱۱ – یعنی ہر چیز پر غالب۔ کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے ارادے میں مُزاحم ہو سکے اور اس کے حکم کو نافذ ہونے سے روک سکے۔ ہر شے اس سے مغلوب ہے اور کسی میں اس کے مقابلے کا بل بُوتا نہیں ہے۔

۱۲ – یعنی اس غلبے اور قوتِ قاہرہ کے باوجود وہ ظالم نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر رحیم و شفیق ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ

پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا[15] اور اس کے اندر اپنی رُوح پھونک دی،[16] اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور

۱۳ - یعنی اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد وحساب چیزیں بنائی ہیں، مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تُکی ہو۔ ہر شے اپنا ایک الگ حُسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ متناسب اور موزوں ہے۔ جو چیز جس کام کے لیے بھی اُس نے بنائی ہے، اس کے لیے موزوں ترین شکل پر، مناسب ترین صفات کے ساتھ بنائی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سننے کے لیے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں، ان کے لیے ہوا ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے، اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہییں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دہی نہیں کر سکتے، نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

۱۴ - یعنی پہلے اس نے براہِ راست اپنے تخلیقی عمل (direct creation) سے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسُل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفے سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور و تعقّل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آیندہ مزید انسانوں کی پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ آیت قرآنِ مجید کی ان آیات میں سے ہے جو انسانِ اوّل کی براہِ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈاروِن کے زمانے سے سائنس داں حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں۔ لیکن انسان کی نہ سہی، تمام انواعِ حیوانی کی نہ سہی، اوّلین جرثومۂ حیات کی براہِ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثے کے طور پر ہوئی ہے۔ حالاں کہ صرف ایک خلیّہ (cell) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثے کا نتیجہ قرار دینا اُس سے لاکھوں درجے غیر سائنٹفک بات ہے جتنا نظریۂ اِرتقا کے قائلین نظریۂ تخلیق کو ٹھیراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہِ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا، تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے، اور پھر اس کی نسل تناسُل (procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈاروِنیت کے عَلَم برداروں کی ساری سائنٹفک شاعری کے باوجود ان کے نظریۂ ارتقا میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۵۳، النساء، حاشیہ ۱، الانعام، حاشیہ ۶۳ - جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۰ - ۱۴۵، الحِجر، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۵، المومنون، حواشی ۱۲ - ۱۳)

۱۵ - یعنی ایک انتہائی باریک خُردبینی وجود سے بڑھا کر اسے پوری انسانی شکل تک پہنچایا اور اس کا جسم سارے

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَفْـِٕدَةَ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ قُلْ
يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ ع

دِل دیے[17]۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو[18]۔

اور[19] یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں[20]۔ اِن سے کہو: "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پُورا کا پُورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے[21]۔"

اعضا و جوارح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

۱۶ – روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحبِ انا ہستی، اور حاملِ خلافت ہستی بنتا ہے۔ اِس روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی مِلک ہے اور اس کی ذاتِ پاک کی طرف اس کا انتساب اُسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الحجر، حواشی ۱۷-۱۹)

۱۷ – یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ نطفے سے پیدائش کا ذکر صیغۂ غائب میں کیا جاتا رہا۔ "اس کی تخلیق کی"، "اس کی نسل چلائی"، "اس کو نک سک سے درست کیا"، "اس کے اندر روح پھونکی"، کیونکہ اُس وقت تک وہ خطاب کے لائق نہ تھا۔ پھر جب روح پھونک دی گئی تو اب اس سے فرمایا جا رہا ہے کہ "تم کو کان دیے"، "تم کو آنکھیں دیں"، "تم کو دل دیے"، کیونکہ روح پھونکے جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اُسے مخاطب کیا جائے۔

کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حصولِ علم کے ذرائع ذائقہ اور لمس اور شامہ بھی

اور شامّہ بھی ہیں، لیکن سماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے زیادہ بڑے اور اہم ذرائع ہیں، اس لیے قرآن جگہ جگہ انھی دو کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد ”دِل“ سے مراد وہ ذہن (mind) ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات کو مرتّب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی را[illegible] سے کوئی ایک راہ منتخب کرتا اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

۱۸ – یعنی یہ عظیم القدر انسانی روح اتنے بلند پایہ اوصاف کے ساتھ تم کو اس لیے تو عطا نہیں کی گئی تھی کہ تم دنیا میں جانوروں کی طرح رہو اور اپنے لیے بس وہی زندگی کا نقشہ بنالو جو کوئی حیوان بنا سکتا ہے۔ یہ آنکھیں تمھیں چشمِ بصیرت سے دیکھنے کے لیے دی گئی تھیں نہ کہ اندھے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ کان تمھیں گوشِ ہوش سے سننے کے لیے دیے گئے تھے نہ کہ بہرے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ دل تمھیں اس لیے دیے گئے تھے کہ حقیقت کو سمجھو اور صحیح راہِ فکر و عمل اختیار کرو، نہ اس لیے کہ اپنی ساری صلاحیتیں صرف اپنی حیوانیت کی پرورش کے وسائل فراہم کرنے میں صَرف کر دو، اور اس سے کچھ اونچے اُٹھو تو اپنے خالق سے بغاوت کے فلسفے اور پروگرام بنانے لگو۔ یہ بیش قیمت نعمتیں خدا سے پانے کے بعد جب تم دہریّت یا شرک اختیار کرتے ہو، جب تم خود خدا یا دوسرے خداؤں کے بندے بنتے ہو، جب تم خواہشات کے غلام بن کر جسم و نفس کی لذتوں میں غرق ہو جاتے ہو، تو گویا اپنے خدا سے یہ کہتے ہو کہ ہم ان نعمتوں کے لائق نہ تھے، ہمیں انسان بنانے کے بجائے تجھے ایک بندر، یا ایک بھیڑیا، یا ایک مگرمچھ، یا ایک کوّا بنانا چاہیے تھا۔

۱۹ – رسالت اور توحید پر کفار کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد اب اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے یعنی آخرت پر اُن کے اعتراض کو لے کر اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ آیت میں وَقَالُوْٓا کا واوِ عطف مضمونِ ماسبق سے اس پیراگراف کا تعلق جوڑتا ہے۔ گویا ترتیبِ کلام یوں ہے کہ ”وہ کہتے ہیں: محمدؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں“، ”وہ کہتے ہیں: اللہ معبودِ واحد نہیں ہے“، اور ”وہ کہتے ہیں کہ ہم مر کر دوبارہ نہ اُٹھیں گے“۔

۲۰ – اوپر کے فقرے اور اِس فقرے کے درمیان ایک داستان کی داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اتنا مُہمَل ہے کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ ان کا اعتراض جن دو اجزا پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ”ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے“ آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ ”ہم“ جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رَلتی مِلتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے ”ہم“ نکل چکا ہوتا ہے۔ اس جسم کا نام ”ہم“ نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضا کاٹے جاتے ہیں تو عُضو پر عُضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر ”ہم“ پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اس کا کوئی جز بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ ”ہم“ کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پورا جسم موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر اِس ”ہم“ کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ایک عاشق جاں نثار اپنے معشوق کے مُردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور وہ معشوق نہیں بلکہ اُس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مُقدّمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اس کا دوسرا جُز: ”کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟“ تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اِس ”ہم“، اور اس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحے کے لیے کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اس ”ہم“

Maktaba Tul Ishaat.com

کی موجودہ پیدایش اس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلا اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چُونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزا جمع ہوئے اور اس کالبُدِ خاکی میں یہ ''ہم'' براجمان ہوگیا۔ پھر اس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کالبُدِ خاکی میں سے جب ''ہم'' نکل جاتا ہے تو اس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزا زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے، وہ سب اسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اس ''ہم'' کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اسے اَز سرِنَو اس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور واقعے کی صورت میں رُونما ہو چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو اس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعدالموت اور آخرت پر اس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ ''دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔'' یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدایش کوئی بڑی ہی انوکھی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انھیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھُوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بلوہ (scot-free) یہاں سے نکل جائیں۔ پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو۔ پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

۲۱ – یعنی تمھارا وہ ''ہم'' مٹی میں رَل مِل نہ جائے گا، بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جُز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ پورا کا پورا حراست (custody) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے:

(۱) اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آ جاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کُوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آ کر باقاعدہ رُوح کو ٹھیک اُسی طرح وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری امین (official receiver) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسرِ موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اس عملے کا برتاؤ مجرم رُوح کے ساتھ کچھ اَور ہوتا ہے اور مومنِ صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (اِن تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، آیت ۹۷۔ الانعام، ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ الواقعہ، ۸۳ – ۹۴)

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ ''موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا'' اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

(۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے، وہ آدمی کی حیوانی زندگی (biological life) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا (ego) ہے جو ''مَیں'' اور ''ہم'' اور ''تم'' کے الفاظ

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا
وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ
نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ

کاش،[۲۲] تم دیکھو وہ وقت جب یہ مُجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اُس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے:) ”اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور سُن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے۔“ (جواب میں ارشاد ہوگا:) ”اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔[۲۳] مگر میری وہ بات پوری ہوگئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنّم کو جِنّوں اور انسانوں

سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری، جُوں کی تُوں (intact) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اسی سے حساب لیا جائے گا، اور اسی کو جزا و سزا دیکھنی ہوگی۔

۲۲ – اب اُس حالت کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے جب اپنے رب کی طرف پلٹ کر یہ انسانی ”اَنا“ اپنا حساب دینے کے لیے اس کے حضور کھڑی ہوگی۔

۲۳ – یعنی اِس طرح حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرا کر ہی لوگوں کو ہدایت دینا ہمارے پیشِ نظر ہوتا تو دنیا کی زندگی میں اتنے بڑے امتحان سے گزار کر تم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی، ایسی ہدایت تو ہم پہلے ہی تم کو دے سکتے تھے۔ لیکن تمھارے لیے تو آغاز ہی سے ہماری اسکیم یہ نہ تھی۔ ہم تو حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل اور حواس سے مخفی رکھ کر تمھارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ تم براہِ راست اُس کو بے نقاب دیکھنے کے بجائے کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اُس کی علامات دیکھ کر اپنی عقل سے اُس کو پہچانتے ہو یا نہیں، ہم اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے اِس حقیقت شناسی میں تمھاری جو مدد کرتے ہیں اُس سے فائدہ اٹھاتے ہو یا نہیں، اور حقیقت جان لینے کے بعد اپنے نفس پر اتنا قابو پاتے ہو یا نہیں کہ خواہشات اور اغراض کی بندگی سے آزاد ہو کر اس حقیقت کو مان جاؤ اور اس کے مطابق اپنا طرزِ عمل دُرست کر لو۔ اس امتحان میں تم ناکام ہو چکے ہو۔ اب دوبارہ اسی امتحان کا سلسلہ شروع کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ دوسرا امتحان اگر اس طرح لیا جائے کہ تمھیں وہ سب کچھ یاد ہو جو تم نے یہاں دیکھ اور سُن لیا ہے تو یہ سرے سے کوئی امتحان ہی نہ ہوگا۔ اور اگر پہلے کی طرح تمھیں خالی الذہن کر کے اور حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل رکھ کر تمھیں پھر دنیا میں پیدا کر دیا جائے اور نئے سرے سے تمھارا اُسی طرح امتحان لیا جائے جیسے پہلے لیا گیا تھا، تو نتیجہ پچھلے امتحان سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۲۸، الانعام، حواشی ۶-۱۴۱– جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲– جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۹۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا
نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا
يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ السجدۃ ۹
الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

سب سے بھر دوں گا۔[۲۴] پس اب چکھو مزا اپنی اِس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا،[۲۵] ہم نے بھی اب تمھیں فراموش کر دیا ہے۔ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔"

ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں یہ آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبّر نہیں کرتے[۲۶] سجدہ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں،[۲۷] اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے

---

۲۴ - اشارہ ہے اُس قول کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدمؑ کے وقت ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا تھا۔ سورۂ ص کے آخری رکوع میں اُس وقت کا پورا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور نسلِ آدم کو بہکانے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَالْحَقُّ ۫ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۚ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿﴾ "پس حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں کہ میں جہنّم کو بھر دوں گا تجھ سے اور اُن لوگوں سے جو انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔"

اَجْمَعِیْنَ کا لفظ یہاں اس معنیٰ میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ تمام جنّ اور تمام انسان جہنّم میں ڈال دیے جائیں گے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین اور ان شیاطین کے پیرو انسان، سب ایک ساتھ واصلِ بجہنم ہوں گے۔

۲۵ - یعنی دنیا کے عیش میں گم ہو کر تم نے اس بات کو بالکل بھلا دیا کہ کبھی اپنے رب کے سامنے بھی جانا ہے۔

۲۶ - بالفاظِ دیگر، وہ اپنے غلط خیالات کو چھوڑ کر اللہ کی بات مان لینے اور اللہ کی بندگی اختیار کر کے اس کی عبادت بجا لانے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات نہیں سمجھتے۔ نفس کی بڑائی انھیں قبولِ حق اور اطاعتِ رب سے مانع نہیں ہوتی۔

۲۷ - یعنی راتوں کو دادِ عیش دیتے پھرنے کے بجائے وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا حال اُن دنیا پرستوں

يُنْفِقُوْنَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ
جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٧ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ
فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۝١٨ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وقف غفران

اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۲۸]۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی مُتنفّس کو خبر نہیں ہے[۲۹]۔ بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اُس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو[۳۰]؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے[۳۱]۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں

کا سا نہیں ہے جنھیں دن کی محنتوں کی کُلفت دور کرنے کے لیے راتوں کو ناچ گانے اور شراب نوشی اور کھیل تماشوں کی تفریحات درکار ہوتی ہیں۔ اس کے بجائے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ دن بھر اپنے فرائض انجام دے کر جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتیں گزارتے ہیں۔ اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اسی سے اپنی ساری اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

بستروں سے پیٹھیں الگ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ راتوں کو سوتے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راتوں کا ایک حصّہ خدا کی عبادت میں صَرف کرتے ہیں۔

۲۸ – رزق سے مراد ہے رزقِ حلال۔ مالِ حرام کو اللہ تعالیٰ اپنے دیے ہوئے رزق سے تعبیر نہیں فرماتا۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو تھوڑا یا بہت پاک رزق ہم نے انھیں دیا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے تجاوز کر کے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے حرام مال پر ہاتھ نہیں مارتے۔

۲۹ – بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسندِ احمد میں متعدد طریقوں سے حضرت ابوہُریرہؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کبھی کسی کان نے سنا، نہ کوئی انسان کبھی اس کا تصور کر سکا ہے۔“ یہی مضمون تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ حضرت ابوسعید خُدریؓ، حضرت مُغیرہؓ بن شُعبہ اور حضرت سَہل بن سَعد ساعدیؓ نے بھی حضورؐ سے روایت کیا ہے جسے مسلم، احمد، ابنِ جَریر اور ترمذی نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۳۰ – یہاں مومن اور فاسق کی دو مُتقابِل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ مومن سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبودِ واحد مان کر اس قانون کی اطاعت اختیار کر لے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اس کے برعکس

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ
اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ
الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ

اُن کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں[۳۲]، ضیافت کے طور پر اُن کے اعمال کے بدلے میں۔ اور جنھوں نے فِسق اختیار کیا ہے اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اُسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اِسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا اِنھیں چکھاتے رہیں گے شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں[۳۳]۔ اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے

فاسق وہ ہے جو فسق (خُروج از طاعت، یا بالفاظِ دیگر، بغاوت، خود مختاری اور اطاعتِ غیر اللہ) کا رویّہ اختیار کرے۔

۳۱ — یعنی نہ دنیا میں ان کا طرزِ فکر و طرزِ حیات یکساں ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں ان کے ساتھ خدا کا معاملہ یکساں ہوسکتا ہے۔

۳۲ — یعنی وہ جنتیں محض ان کی سیر گاہیں نہیں ہوں گی بلکہ وہی ان کی قیام گاہیں بھی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۳۳ — ''عذابِ اکبر'' سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں دیا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں ''عذابِ ادنیٰ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ تکلیفیں ہیں جو اِسی دنیا میں انسان کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً افراد کی زندگی میں سخت بیماریاں، اپنے عزیز ترین لوگوں کی موت، المناک حادثے، نقصانات، ناکامیاں وغیرہ۔ اور اجتماعی زندگی میں طوفان، زلزلے، سیلاب، وبائیں، قحط، فسادات، لڑائیاں اور دوسری بہت سی بلائیں جو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان آفات کے نازل کرنے کی مَصلَحت یہ بیان کی گئی ہے کہ عذابِ اکبر میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی لوگ ہوش میں آجائیں اور اُس طرزِ فکر و عمل کو چھوڑ دیں جس کی پاداش میں آخرِ کار انھیں وہ بڑا عذاب بُھگتنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل بخیریت ہی نہیں رکھا ہے کہ پورے آرام و سکون سے زندگی کی گاڑی چلتی رہے اور آدمی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ اس سے

رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ذریعے سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے۔ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے۔

بالاتر کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد پر بھی اور قوموں اور ملکوں پر بھی ایسی آفات بھیجتا رہتا ہے جو اسے اپنی بے بسی کا اور اپنے سے بالاتر ایک ہمہ گیر سلطنت کی فرماں روائی کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ آفات ایک ایک شخص کو، ایک ایک گروہ کو اور ایک ایک قوم کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ اوپر تمہاری قسمتوں کو کوئی اور کنٹرول کر رہا ہے۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دے دیا گیا ہے۔ اصل طاقت اسی کارفرما اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے جب کوئی آفت تمہارے اوپر آئے تو نہ تمہاری کوئی تدبیر اسے دفع کر سکتی ہے، اور نہ کسی جنّ، یا روح، یا دیوی اور دیوتا، یا نبی اور ولی سے مدد مانگ کر تم اس کو روک سکتے ہو۔ اس لحاظ سے یہ آفات محض آفات نہیں ہیں بلکہ خدا کی تنبیہات ہیں جو انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ ان سے سبق لے کر دنیا ہی میں آدمی اپنا عقیدہ اور عمل ٹھیک کر لے تو آخرت میں خدا کا بڑا عذاب دیکھنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔

۳۴۔ ”رب کی آیات“ یعنی اُس کی نشانیوں کے الفاظ بہت جامع ہیں جن کے اندر تمام اقسام کی نشانیاں آجاتی ہیں۔ قرآنِ مجید کے جملہ بیانات کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں حسبِ ذیل چھ قسموں پر مشتمل ہیں:

(۱) وہ نشانیاں جو زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز میں اور کائنات کے مجموعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) وہ نشانیاں جو انسان کی اپنی پیدائش اور اس کی ساخت اور اس کے وجود میں پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ نشانیاں جو انسان کے وِجدان میں، اس کے لاشعور اور تحت الشعور میں، اور اس کے اخلاقی تصورات میں پائی جاتی ہیں۔

(۴) وہ نشانیاں جو انسانی تاریخ کے مسلسل تجربات میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) وہ نشانیاں جو انسان پر آفاتِ ارضی و سماوی کے نزول میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) اور ان سب کے بعد وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کے ذریعے سے بھیجیں، تاکہ معقول طریقے سے انسان کو انہی حقائق سے آگاہ کیا جائے جن کی طرف اوپر کی تمام نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں۔

یہ ساری نشانیاں پوری ہم آہنگی اور بلند آہنگی کے ساتھ انسان کو یہ بتا رہی ہیں کہ تو بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کا بندہ ہے، بلکہ تیرا خدا صرف ایک ہی خدا ہے جس کی عبادت و اطاعت کے سوا تیرے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں ہے۔ تو اس دنیا میں آزاد و خود مختار اور غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ تجھے اپنا کارنامۂ حیات ختم کرنے کے بعد اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی ہے اور اپنے عمل کے لحاظ سے جزا اور سزا پانی ہے۔ پس تیری اپنی خیر اسی میں ہے کہ تیرے خدا نے تیری رہنمائی کے لیے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے جو ہدایت بھیجی ہے اس کی پیروی کر اور خود مختاری کی روش سے باز آجا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اتنے مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا ہو، جس کی فہمائش کے لیے طرح طرح کی اتنی بے شمار نشانیاں فراہم کی گئی ہوں، اور جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، اور سوچنے سمجھنے کے لیے دل کی نعمتیں بھی دی گئی ہوں، وہ اگر ان ساری نشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ
هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝٢٤ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ

اس سے پہلے ہم موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دے چکے ہیں، لہٰذا اُسی چیز کے ملنے پر تمھیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے۔[۳۵] اُس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا،[۳۶] اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔[۳۷] یقیناً تیرا رب ہی

سمجھانے والوں کی تذکیر و نصیحت کے لیے بھی اپنے کان بند کر لیتا ہے، اور اپنے دماغ سے بھی اَوندھے فلسفے ہی گھڑنے کا کام لیتا ہے، اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ پھر اسی کا مستحق ہے کہ دنیا میں اپنے امتحان کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو تو بغاوت کی بھرپور سزا پائے۔

۳۵- خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضورؐ کی رسالت میں، اور آپؐ کے اوپر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے میں شک کر رہے تھے۔ یہاں سے کلام کا رُخ اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو آغازِ سورہ (آیات نمبر ۲ اور ۳) میں بیان ہوا تھا۔ کفارِ مکہ کہہ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر خدا کی طرف سے کوئی کتاب نہیں آئی ہے، انھوں نے اِسے خود گھڑ لیا ہے اور دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے۔ اس کا ایک جواب ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ اب اس کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اے نبیؐ! یہ نادان لوگ تم پر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے کو اپنے نزدیک بعید از امکان سمجھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دوسرا شخص بھی اگر اس کا انکار نہ کرے تو کم از کم اس کے متعلق شک ہی میں پڑ جائے۔ لیکن ایک بندے پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہونا ایک نرالا واقعہ تو نہیں ہے جو انسانی تاریخ میں آج پہلی مرتبہ ہی پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے متعدد انبیاؑ پر کتابیں نازل ہوچکی ہیں، جن میں سے مشہور ترین کتاب وہ ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی تھی۔ لہٰذا اسی نوعیت کی ایک چیز آج تمھیں دی گئی ہے تو آخر اس میں انوکھی بات کیا ہے جس پر خواہ مخواہ شک کیا جائے۔

۳۶- یعنی وہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائی گئی تھی، اور یہ کتاب اُسی طرح تم لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اس ارشاد کی پوری معنویت اس کے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے، اور کفارِ مکہ بھی اس سے ناواقف نہ تھے کہ بنی اسرائیل کئی صدی تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کیا، ان کے ذریعے سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی

يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ
يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى
الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ

قیامت کے روز اُن باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں (بنی اسرائیل) باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔[۳۸]

اور کیا اِن لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ اِن سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟[۳۹] اس میں بڑی نشانیاں ہیں، کیا یہ سُنتے نہیں ہیں؟ اور کیا اِن لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں؟ اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اُگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارا مِلتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟

قوم ہدایت پا کر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔ اس تاریخ کی طرف اشارہ کر کے اہلِ عرب سے فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے وہ کتاب بھیجی گئی تھی، اسی طرح تمھاری ہدایت کے لیے یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔

۳۷ - یعنی بنی اسرائیل کو اس کتاب نے جو کچھ بنایا اور جن مدارج پر ان کو پہنچایا، وہ محض ان کے درمیان کتاب کے آ جانے کا کرشمہ نہ تھا کہ گویا یہ کوئی تعویذ ہو جو باندھ کر اس قوم کے گلے میں لٹکا دیا گیا ہو اور اس کے لٹکتے ہی قوم نے بامِ عُروج پر چڑھنا شروع کر دیا ہو۔ بلکہ یہ ساری کرامت اُس یقین کی تھی جو وہ اللہ کی آیات پر لائے، اور اُس صبر اور ثابت قدمی کی تھی جو انھوں نے احکامِ الٰہی کی پیروی میں دکھائی۔ خود بنی اسرائیل کے اندر بھی پیشوائی انھی کو نصیب ہوئی جو ان میں سے کتاب اللہ کے سچے مومن تھے اور دُنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے نہ تھے۔ انھوں نے جب حق پرستی میں ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر نقصان اور ہر تکلیف کو برداشت کیا، اور اپنے نفس کی شہوات سے لے کر باہر کے اعدائے دین تک ہر ایک کے خلاف مُجاہدہ کا حق ادا کر دیا تب ہی وہ دنیا کے امام بنے۔ اس سے مقصود کفارِ عرب کو مُتنبِّہ کرنا ہے کہ جس طرح خدا کی کتاب کے نزول نے بنی اسرائیل کے اندر قسمتوں کے فیصلے کیے تھے، اسی طرح اب اس کتاب کا نزول تمھارے درمیان بھی قسمتوں کا فیصلہ کر دے گا۔ اب وہی لوگ امام بنیں گے جو اس کو مان کر صبر و ثبات کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے۔ اس سے منہ موڑنے والوں کی تقدیر گردش میں آ چکی ہے۔

۳۸ - یہ اشارہ ہے اُن اختلافات اور فرقہ بندیوں کی طرف جن کے اندر بنی اسرائیل ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہونے، اور اپنے راست رَو ائمہ کی پیروی چھوڑ دینے، اور دنیا پرستی میں پڑ جانے کے بعد مبتلا ہوئے۔ اس حالت کا ایک نتیجہ تو ظاہر ہے جسے ساری دُنیا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ ۝۲۷ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ
صٰدِقِيۡنَ ۝۲۸ قُلۡ يَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا يَنۡفَعُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِيۡمَانُهُمۡ
وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ۝۲۹ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَانۡتَظِرۡ اِنَّهُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ ۝۳۰

تو کیا انھیں کچھ نہیں سُوجھتا؟[40] یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچّے ہو؟“[41] ان سے کہو: ”فیصلے کے دن ایمان لانا اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنھوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملے گی۔“[42] اچھا، اِنھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔ ع

دیکھ رہی ہے کہ بنی اسرائیل ذلّت ونکبت میں گرفتار ہیں۔ دوسرا نتیجہ وہ ہے جو دنیا نہیں جانتی، اور وہ قیامت کے روز ظاہر ہو گا۔

۳۹ – یعنی کیا تاریخ کے اس مسلسل تجرِبے سے اِن لوگوں نے کوئی سبق نہیں لیا کہ جس قوم میں بھی خدا کا رسول آیا ہے، اُس کی قسمت کا فیصلہ اُس رَویّے کے ساتھ معلّق ہو گیا ہے جو اپنے رسول کے معاملے میں اُس نے اختیار کیا۔ رسول کو جھٹلا دینے کے بعد پھر کوئی قوم بچ نہیں سکی ہے۔ اُس میں سے بچے ہیں تو صرف وہی لوگ جو اس پر ایمان لائے۔ انکار کر دینے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن کر رہ گئے۔

۴۰ – سِیاق وسَباق کو نگاہ میں رکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں یہ ذکر حیات بعد الموت پر اِستِدلال کرنے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن میں بالعُموم ہوتا ہے، بلکہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بات ایک اور ہی مقصد کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اس میں دراصل ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح ایک بنجر پڑی ہوئی زمین کو دیکھ کر آدمی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ بھی کبھی لہلہاتی کِشتِ زار بن جائے گی، مگر خدا کی بھیجی ہوئی برسات کا ایک ہی ریلا اس کا رنگ بدل دیتا ہے، اسی طرح یہ دعوتِ اسلام بھی اِس وقت تم کو ایک نہ چلنے والی چیز نظر آتی ہے، لیکن خدا کی قدرت کا ایک ہی کرشمہ اس کو وہ فروغ دے گا کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔

۴۱ – یعنی تم جو کہتے ہو کہ آخرِ کار اللہ کی مدد آئے گی اور ہمیں جھٹلانے والوں پر اُس کا غضب ٹوٹ پڑے گا، تو بتاؤ وہ وقت کب آئے گا؟ کب ہمارا تمھارا فیصلہ ہو گا؟

۴۲ – یعنی یہ کون سی ایسی چیز ہے جس کے لیے تم بے چین ہوتے ہو۔ خدا کا عذاب آ گیا تو پھر سنبھلنے کا موقع تم کو نصیب نہ ہو گا۔ اس مہلت کو غنیمت جانو جو عذاب آنے سے پہلے تم کو ملی ہوئی ہے۔ عذاب سامنے دیکھ کر ایمان لاؤ گے تو کچھ حاصل نہ ہو گا۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۳۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

الاحزاب

نام آیت ۲۰ کے فقرہ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس سورت کے مضامین تین اہم واقعات سے بحث کرتے ہیں: ایک، غزوۂ احزاب جو شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ دوسرے، غزوۂ بنی قُرَیظَہ جو ذِی القَعْدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ تیسرے، حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جو اسی سال ذی القعدہ میں ہوا۔ ان تاریخی واقعات سے سورت کا زمانۂ نزول ٹھیک متعیّن ہو جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر جنگِ اُحُد (شوال ۳ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے تیراندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہوگئی تھی اس کی وجہ سے مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انھیں اُمید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو اُحُد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ جنگِ اُحُد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلۂ بنی اَسَد نے مدینۂ طَیِّبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روک تھام کے لیے سَرِیَّۂ[1] ابوسَلَمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ھ میں قبائلِ عَضَل اور قارَہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا۔ مگر رَجِیع (جدّہ اور رابغ کے درمیان) پہنچ کر وہ لوگ قبیلۂ ہُذَیل کے کفار کو ان بے بس مبلّغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا، اور دو صاحبوں (حضرت خُبَیبؓ بن عَدِی، اور حضرت زیدؓ بن الدَّثِنَّہ) کو لے جا کر مکۂ معظّمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہِ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر حضورؐ نے ایک اور تبلیغی وفد جو چالیس (یا بقولِ بعض ۷۰) انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا، نجد کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بنی سُلَیم کے قبائل عُصَیَّہ اور رِعْل اور ذَکْوان نے بئرِ مَعونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی النَّضِیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ ربیع الاوّل ۴ھ میں اُس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر ڈالی۔ پھر جُمادَی الاُولیٰ ۴ھ میں بنی غَطَفان کے دو قبیلوں، بنو ثَعْلَبہ اور بنو مُحارِب نے مدینے پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضورؐ کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا۔ اس طرح جنگِ اُحُد کی شکست سے جو ہوا اُکھڑی تھی، وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

---

1. اصطلاح میں سَرِیَّہ اُس فوجی مہم کو کہتے ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوتے تھے۔ اور غزوہ اُس جنگ یا مہم کو کہا جاتا ہے جس میں حضورؐ خود قیادت فرماتے تھے۔

لیکن وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ فدا کاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔عربوں کے مَعاشی مُقاطَعے نے اہلِ مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ گِردوپیش کے تمام مشرک قبائل چیرہ دست ہو رہے تھے۔خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مارِ آستین بنے ہوئے تھے۔ مگر ان مٹھی بھر مومنینِ صادقین نے رسولِ خدا کی قیادت میں پَے در پَے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہو گیا، بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

جنگِ احزاب سے پہلے کے غزوات ان میں سے اوّلین اقدام وہ تھا جو جنگِ اُحد کے فوراً ہی بعد کیا گیا۔ جنگ کے ٹھیک دوسرے روز، جب کہ بکثرت مسلمان زخمی تھے اور بہت سے گھروں میں عزیز ترین اقارب کی شہادت پر کُہرام برپا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی اور حضرت حمزہؓ کی شہادت پر دل فِگار تھے، حضورؐ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکرِ کفار کے تعاقُب میں چلنا ہے، تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔حضورؐ کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفارِ قریش ہاتھ آئی ہوئی فتح کا کوئی فائدہ اُٹھائے بغیر واپس تو چلے گئے ہیں، لیکن راستے میں جب کسی جگہ ٹھیریں گے تو اپنی اس حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ اس بنا پر آپؐ نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً ۶۳۰ جاں نثار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مکے کے راستے میں جب حَمراءُ الاَسَد پہنچ کر آپؐ نے تین روز تک پڑاؤ کیا تو ایک ہمدرد غیر مسلم کے ذریعے سے آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان اپنے ۲۹۷۸ آدمیوں کے ساتھ مدینے سے ۳۶ میل دُور اَلرَّوحا کے مقام پر ٹھیرا ہوا تھا اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غَلَطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے، لیکن یہ سُن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں۔ اس کارروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہو گئے، بلکہ گردوپیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اُولُوا العَزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، دیباچہ، حاشیہ ۱۲۲)

پھر جونہی کہ بنی اَسَد نے مدینے پر چھاپا مارنے کی تیاریاں شروع کیں، حضورؐ کے مُخبروں نے بروقت آپؐ کو ان کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ چڑھ کر آتے، آپؐ نے حضرت ابوسَلَمہؓ (اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے پہلے شوہر) کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پر پہنچ گئی۔ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

اس کے بعد بنی النَّضِیر کی باری آئی۔ جس روز انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اُسی روز آپؐ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینے سے نکل جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ منافقینِ مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ نے ان کو تَرّی دی کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو، میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کروں گا، بنی قُریظہ تمھاری مدد کریں گے، اور نجد سے بنی غَطفان بھی تمھاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آ کر انھوں نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ حضورؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انھوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جا سکتے ہیں، لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافاتِ مدینہ کا وہ پورا محلّہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے، ان کے باغات اور گڑھیوں اور سروسامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خَیبَر، وادی القُریٰ اور شام میں تتر بتر ہو گئے۔

پھر آپؐ نے بنی غَطفان کی طرف توجہ کی جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آپؐ چار سو کا لشکر لے کر نکلے اور ذات الرِّقاع کے مقام پر ان کو جا لیا۔ اس اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھربار اور مال اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد شعبان ۴ھ میں آپؐ ابوسفیان کے اُس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اُس نے اُحد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ پر اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے اعلان کیا تھا کہ **اِنَّ مَوْعِدَكُمْ بَدَرٌ لِلْعَامِ الْمُقْبِل** (آیندہ سال بَدر کے مقام پر ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا)، اور حضورؐ نے جواب میں ایک صحابی کے ذریعے سے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ **نَعَمْ ، هِيَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدٌ** (ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تیرے درمیان طے ہوگئی۔) اس قرارداد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپؐ ۱۵ سو صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر چلا، مگر مَرُّالظَّہران (موجودہ وادیِ فاطمہ) سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دَوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو اُحد میں اکھڑی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی کہ اب تنہا قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۱۲۴)

اس دھاک میں ایک اور واقعے نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دُوْمَۃُ الجَندَل (موجودہ الجَوف) ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپؐ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے، اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

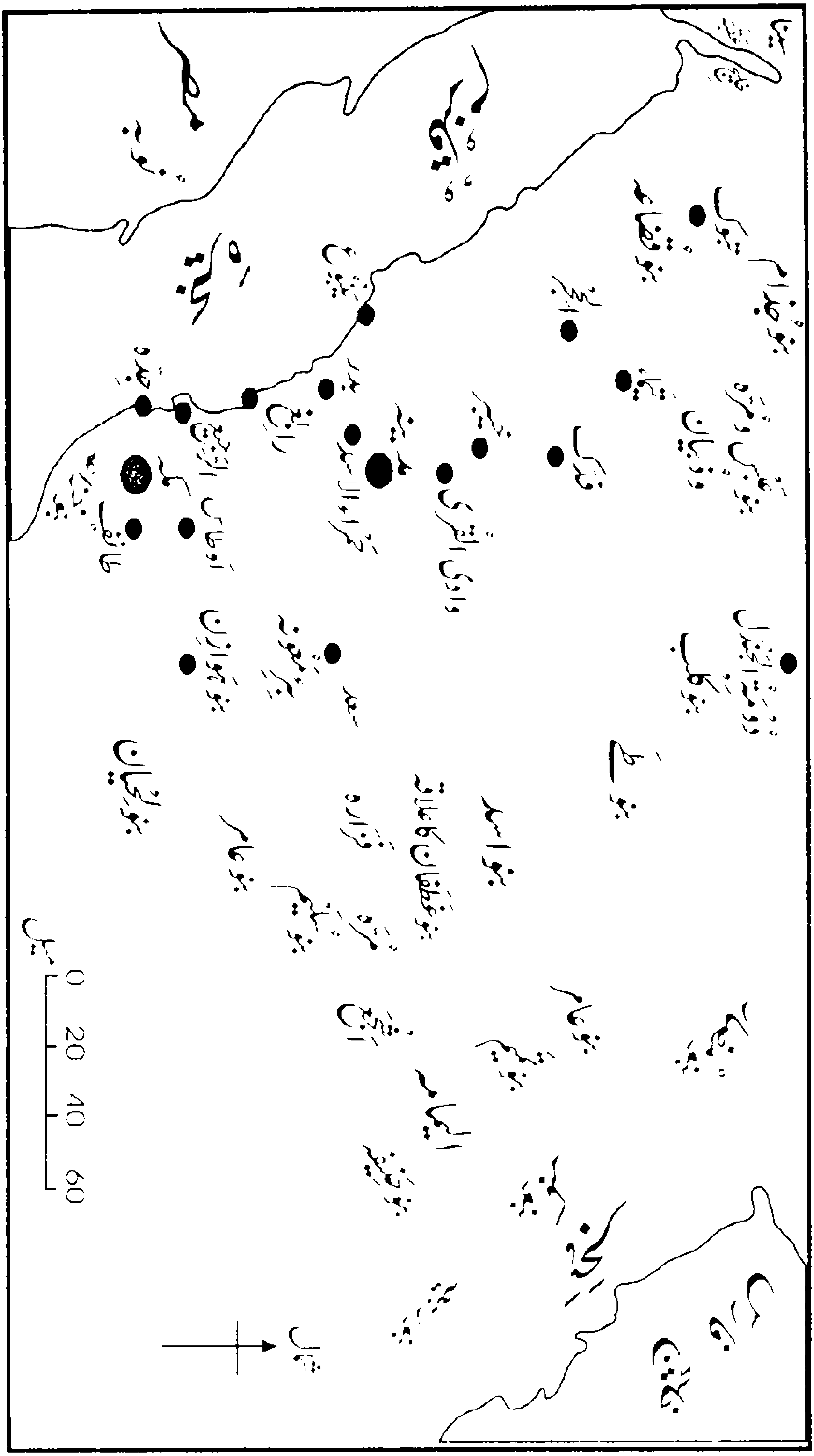

Maktaba Tul Ishaat.com

غزوۂ احزاب یہ حالات تھے جن میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اِس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جَلا وطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے دَورہ کر کے قریش اور غَطَفان اور ہُذَیل اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے شوال ۵ ھ میں قبائلِ عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہوگئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شِمال کی طرف سے بنی النَّضِیر اور بنی قَیْنُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جَلا وطن ہو کر خیبر اور وادی القُریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غَطَفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فَزارہ، مُرَّہ، اَشْجَع، سَعْد اور اَسَد وغیرہ) نے پیش قدمی کی۔ اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔

یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کُن ہوتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ طَیِّبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپؐ کے خبر رساں اور تحریکِ اسلامی کے ہمدرد اور متأثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے، آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مُطّلَع کرتے رہتے تھے۔[1] قبل اس کے کہ یہ جمِّ غفیر آپؐ کے شہر پہنچتا، آپؐ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شِمال غربی رُخ پر ایک خندق کھدوا لی اور کوہِ سَلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مُدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینے کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہوسکتا تھا۔ مشرق میں حَرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کَشی آسانی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہوسکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہلِ عرب اس طریقِ دفاع سے نا آشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی، اور وہ یہ کہ بنی قُرَیْظَہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں جو مدینۂ طَیِّبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رُو سے مدینے پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مُدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قُرَیْظَہ کی جانب

---

[1] یہ قوم پرست جتھوں کے مقابلے میں ایک نظریاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتھے صرف اپنی قوم کے افراد کی تائید و حمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن ایک اُصولی و نظریاتی تحریک اپنی دعوت سے ہر سَمت میں بڑھتی ہے اور خود ان جتھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔

نقشہ جنگِ احزاب

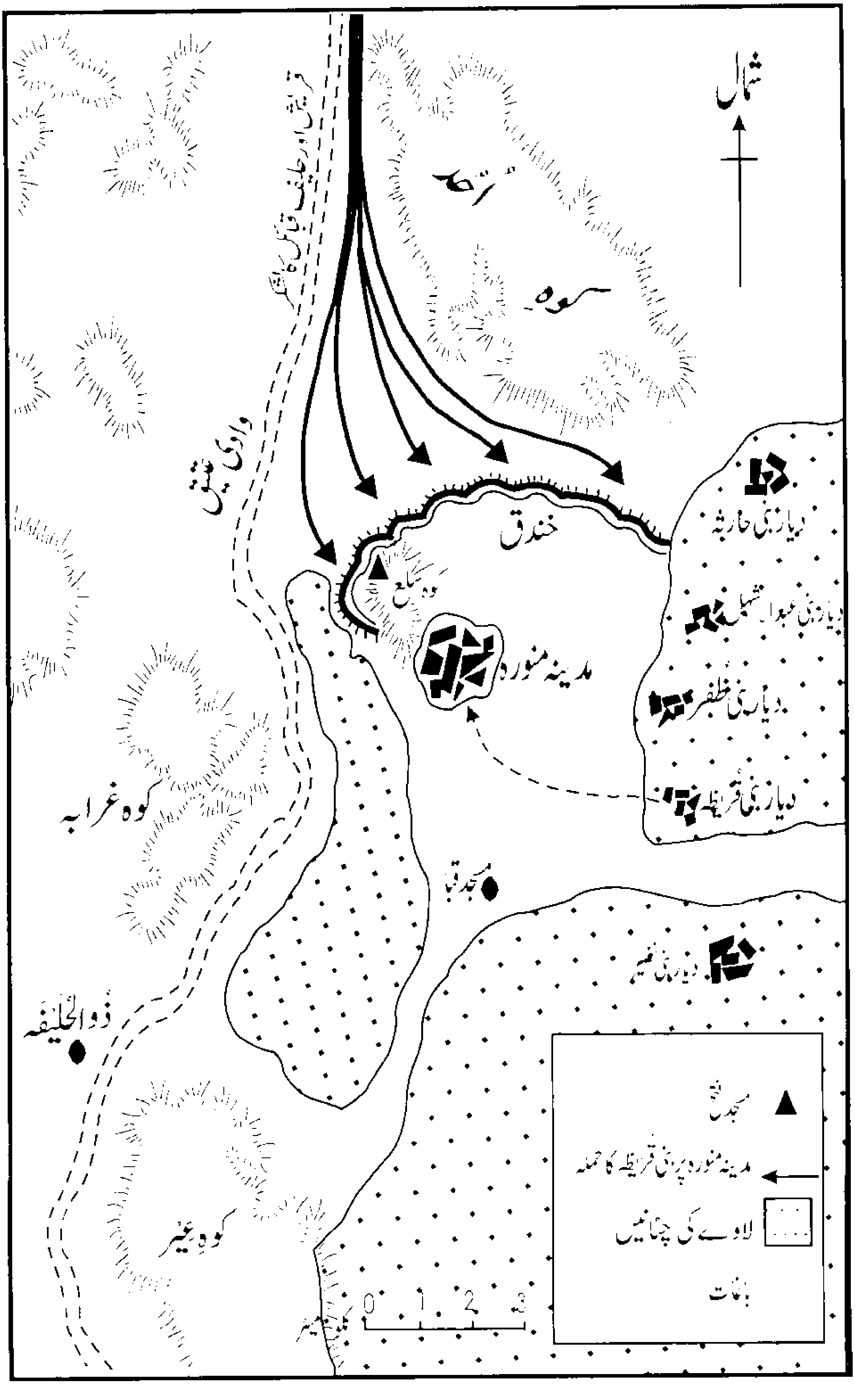

Maktaba Tul Ishaat.com

تھیں اور اُدھر مُدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اُن کی طرف سے بنی النَّضِیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطَب بنی قُرَیظَہ کے پاس بھیجا گیا، تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ابنِ اَخطَب نے ان سے کہا کہ ''دیکھو، میں اس وقت عرب کی مُتّحِدہ طاقت اِس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا''، تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اَخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قُرَیظَہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ نے فوراً انصار کے سرداروں (سَعدؓ بن عُبَادہ، سعدؓ بن مُعاذ، عبداللہؓ بن رَواحہ اور خَوّاتؓ بن جُبَیر) کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُرَیظَہ عہد پر قائم رہیں تو آ کر سارے لشکر کے سامنے عَلَی الاعلان یہ خبر سنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مُصِرّ ہوں تو صرف مجھ کو اشارتاً اس کی اطلاع دے دینا، تاکہ عام مسلمان یہ بات سن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قُرَیظَہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَّلَا عَهْدَ ''ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔'' اس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارتاً حضورؐ سے عرض کر دیا: عَضَل وقارَہ۔ یعنی قبیلہ عضل و قارہ نے رجیع کے مقام پر مبلغینِ اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قُرَیظَہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینے کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ'' ہم سے وعدے تو قیصر و کِسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے، اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔'' کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں ہمیں جا کر اُن کی حفاظت کرنی ہے۔ کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ دُرست کر لو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غَطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر

آمادہ کرنا چاہا کہ مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا ⅓ حصّہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ) سے آپؐ نے ان شرائطِ صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انھوں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! یہ آپؐ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں؟ یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اِسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپؐ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرما رہے ہیں؟'' آپؐ نے جواب دیا ''میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پِل پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔'' اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ ''اگر آپؐ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حبّہ خَراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب تو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کا شَرف ہمیں حاصل ہے، کیا اب یہ ہم سے خَراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مُسَوّدے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

اسی دَوران میں قبیلۂ غَطفان کی شاخ اَشجَع کے ایک صاحب نُعَیمؓ بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے، آپؐ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں، میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔[1] چنانچہ وہ پہلے بنی قُرَیظَہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا، اور ان سے کہا کہ قریش اور غَطفان تو محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمھیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمھارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک اِن باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قُرَیظَہ کے دل میں اُتر گئی اور انھوں نے مُتَحِدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غَطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قُرَیظَہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے مُتَحِدہ محاذ کے لیڈر بنی قُرَیظَہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قُرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں، اب ایک فیصلہ کُن لڑائی ہو جانی چاہیے، کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یک بارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قُرَیظَہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے مُتَحِدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نُعَیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے

---

[1] اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: اَلحَرْبُ خُدْعَۃٌ، یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قُریظہ نے سمجھ لیا کہ نُعیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔

اب محاصرہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے اُلٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہو گئی۔ قدرتِ خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی، اور صبح جب مسلمان اُٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا: لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا ولٰکنکم تغزونھم، یعنی ”اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔“ یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں، سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤں چل چکے تھے۔ اس میں ہار جانے کے بعد ان میں یہ ہمت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ آور ہونے کی جرأت کر سکتے۔ اب حملے (offensive) کی قوت دشمنوں سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

غزوۂ بنی قُرَیظہ خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریلؑ نے آ کر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قُریظہ کا معاملہ باقی ہے، ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ ”جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قُریظہ پر نہ پہنچ جائے۔“ اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مُقدِّمۃُ الجَیش کے طور پر بنی قُریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخرِکار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اَوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس اُمید پر حَکَم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اَوس اور بنی قُریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدّتوں سے چلے آ رہے تھے، وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینے سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قَینُقاع اور بنی النَّضِیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اَوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے

تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اِس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قُرَیظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قُرَیظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتا چلا کہ جنگِ احزاب میں حصّہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جب کہ مشرکین یک بارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجایش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملے میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

معاشرتی اصلاحات جنگِ اُحُد اور جنگِ اَحزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگر چہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن اور اطمینان نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر، اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کے قوانینِ نکاح و طلاق قریب قریب مکمل ہو گئے، وراثت کا قانون بنا، شراب اور جُوئے کو حرام کیا گیا، اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔

اس سلسلے کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا تَبَنِّیت (گود لینے یا بیٹا بنانے) کا مسئلہ تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو مُتَبَنّٰی بنا لیتے تھے وہ بالکل اُن کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مرجائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے اُن قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی رُو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے، یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ ان کی رو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتۂ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیوں کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی۔ کیونکہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدُّس پیدا کر دیا جائے،

Maktaba Tul Ishaat.com

بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدّس پر بھروسا کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانونِ نکاح و طلاق، قانونِ وراثت اور قانونِ حُرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ مُتَبنّٰی کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیّل کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیّل محض ایک قانونی حکم کے طور پر اتنی سی بات کہہ دینے سے ختم نہیں ہوسکتا تھا کہ ''منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔'' صدیوں کے جمے ہوئے تعصّبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے۔ حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان، منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خُسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے درمیان خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اس کو توڑیں۔ کیونکہ جو کام حضورؐ نے خود کیا ہو، اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اَحزاب سے کچھ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپؐ اپنے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مُطلّقہ بیوی سے خود نکاح کر لیں، اور اس حکم کی تعمیل آپؐ نے محاصرۂ بنی قُرَیظہ کے زمانے میں فرمائی۔ (غالباً تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا، اور اسی دَوران میں جنگی مصروفیات پیش آ گئی تھیں۔)

نکاحِ زینبؓ پر پروپیگنڈے کا طوفان یہ کام ہوتا تھا کہ حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یکلخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ اُحُد کے بعد اَحزاب اور بنی قُرَیظہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زَک پر زَک اُٹھاتے چلے گئے تھے اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپؐ کو زیر کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُس اَخلاقی برتری کو ختم کر سکیں گے جو ان کی طاقت اور اُن کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ یہ افسانے تراشے گئے کہ (معاذ اللہ!) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہو کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے، بیٹے کو اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچا لیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لغو تھی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک اُن کی ساری عمر آپؐ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپؐ نے خود اِصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سب مجبور ہو گئے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر

کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اُٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضورؐ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، آپؐ خود ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے، خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صُور اس زور سے پھونکا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔

پردہ کے ابتدائی احکام

یہ بات کہ دشمنوں کے تصنیف کیے ہوئے یہ افسانے مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھنے سے بھی نہ رُکے اس امر کی کھلی ہوئی علامت تھی کہ معاشرے میں شہوانیت کا عُنصر حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ خرابی اگر موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ذہن ایسی پاک ہستی کے متعلق ایسے بے سروپا اور اس قدر گھناؤنے افسانوں کی طرف ادنیٰ التفات بھی کرتے، کجا کہ زبانیں ان کو دُہرانے لگتیں۔ یہ ٹھیک موقع تھا جب کہ اسلامی معاشرے میں اُن اصلاحی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو ''حجاب'' (پردے) کے عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان اصلاحات کا آغاز اس سورہ سے کیا گیا، اور ان کی تکمیل ایک سال بعد سورۂ نور میں کی گئی، جب کہ حضرت عائشہؓ پر بہتان کا فتنہ کھڑا ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، دیباچہ)

حضورؐ کی خانگی زندگی کے معاملات

اسی زمانے میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اس کارِ عظیم میں منہمک تھی اس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا اور اس کو پریشانیوں سے بچانا، اور اس کو لوگوں کے شکوک و شبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر ان دونوں مسئلوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ ابتدائی چار سال تک تو آپؐ کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا ہی نہیں۔ ۴ھ میں بنی النَّضِیر کی جلا وطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصّہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ کی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ مگر وہ آپؐ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ اِدھر منصبِ رسالت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپؐ کے جسم اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں اور آپؐ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ سونتے ڈال رہے تھے اور آپؐ اپنی معاش کے لیے ذرہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب آپؐ کی ازواجِ مطہّراتؓ خرچ کی تنگی کے باعث آپؐ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپؐ کے ذہن پر دُہرا بار پڑ جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپؐ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ حضرت سَودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حَفصہؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ۔ اُمّ المومنین حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات اُبھرنے لگے کہ دوسروں

Maktaba Tul Ishaat.com

کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھیرا دیا گیا ہے، مگر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔

موضوع اور مباحث

یہ مسائل تھے جو سورۂ احزاب کے نزول کے زمانے میں پیش آئے تھے اور انھی پر اس سورہ میں کلام فرمایا گیا ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے، اور پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک خطبہ نہیں ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہو، بلکہ یہ متعدد احکام و فرامین اور خطبات پر مشتمل ہے جو اُس زمانے کے اہم واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور پھر یک جا جمع کر کے ایک سورت کی شکل میں مرتّب کر دیے گئے۔ اس کے حسبِ ذیل اجزا صاف طور پر مُمَیّز نظر آتے ہیں:

۱- پہلا رُکوع غزوۂ احزاب سے کچھ پہلے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس رکوع کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ مُتَبَنّٰی کے بارے میں جاہلیّت کے تصوُّرات اور اَوہام و رُسوم کو مٹایا جائے، اور آپؐ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصوُّرات رکھتے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے جب تک آپؐ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپؐ اس بنا پر سخت مُتردّد تھے اور قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپؐ نے حضرت زیدؓ کی مُطلّقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اُٹھانے کے لیے منافقین اور یہود اور مشرکین کو، جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس موقع پر رکوع اوّل کی آیات نازل ہوئیں۔

۲- رُکوع دوم وسوم میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُرَیظہ پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی کُھلی علامت ہے کہ یہ دونوں رکوع ان لڑائیوں کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

۳- چوتھے رُکوع کے آغاز سے آیت ۳۵ تک کی تقریر دو مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی وعُسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے نوٹس دیا ہے کہ دنیا اور اس کی زینت، اور خدا و رسول اور آخرت میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو۔ اگر تمھیں پہلی چیز مطلوب ہے تو صاف کہہ دو، تمھیں ایک دن کے لیے بھی اس تنگی میں مبتلا نہ رکھا جائے گا بلکہ بخوشی رخصت کر دیا جائے گا۔ اور اگر دوسری چیز پسند ہے تو صبر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ساتھ دو۔ دوسرے حصّے میں اُس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا جس کی ضرورت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن اب خود محسوس کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں اصلاح کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کرتے ہوئے ازواجِ مطہراتؓ کو حکم دیا گیا کہ تبرّجِ جاہلیّت سے پرہیز کریں، وَقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات چیت

کرنے میں سخت احتیاط ملحوظ رکھیں۔ یہ پردے کے احکام کا آغاز تھا۔

۴- آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے۔ اس میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین کی طرف سے اس نکاح پر کیے جا رہے تھے، اُن تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی، مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ ومقام کیا ہے، اور خود حضورؐ کو کفار و منافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵- آیت ۴۹ میں طلاق کے قانون کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً انھی واقعات کے سلسلے میں کسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

۶- آیت ۵۰-۵۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کا خاص ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضورؐ ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔

۷- آیت ۵۳-۵۵ میں معاشرتی اصلاح کا دوسرا قدم اٹھایا گیا۔ یہ حسبِ ذیل احکام پر مشتمل ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد و رفت پر پابندی، ملاقات اور دعوت کا ضابطہ، اَزواجِ مطہراتؓ کے بارے میں یہ قانون کہ گھروں میں صرف ان کے قریبی رشتہ دار آ سکتے ہیں، باقی رہے غیر مرد، تو انھیں اگر کوئی بات کہنی ہو یا کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں یا مانگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں یہ حکم کہ وہ مسلمانوں کے لیے ماں کی طرح حرام ہیں اور حضورؐ کے بعد بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

۸- آیت ۵۶-۵۷ میں اُن چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور آپؐ کی خانگی زندگی پر کی جارہی تھیں اور اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کی اس عیب چینی سے اپنے دامن بچائیں اور اپنے نبیؐ پر درود بھیجیں۔ نیز یہ تلقین بھی کی گئی ہے کہ نبیؐ تو درکنار، اہلِ ایمان کو تو عام مسلمانوں پر بھی تہمتیں لگانے اور الزامات عائد کرنے سے کُلّی اجتناب کرنا چاہیے۔

۹- آیت ۵۹ میں معاشرتی اصلاح کا تیسرا قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس میں تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب گھروں سے باہر نکلیں تو چادروں سے اپنے آپ کو ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلیں۔

اس کے بعد آخر سورت تک افواہ بازی کی اس مہم (Whispering Campaign) پر سخت زَجر و توبیخ کی گئی ہے جو منافقین اور سُفہا و اَرازِل نے اُس وقت برپا کر رکھی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۷۳ آیاتہا — ۹ رکوعاتہا

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

اَے نبیؐ! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔[۱] پیروی کرو اُس بات کی جس کا اشارہ تمھارے رب کی طرف سے تمھیں کیا جا رہا ہے، اللہ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔[۲] اللہ پر توکّل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔[۳]

۱ – جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یہ محسوس فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی یہی تھا کہ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیت کے رُسوم و اَوہام پر ضرب لگانے کا یہ ٹھیک موقع ہے، اب آپؐ کو خود آگے بڑھ کر اپنے منہ بولے بیٹے (زیدؓ) کی مُطلّقہ سے نکاح کر لینا چاہیے تاکہ یہ رسم قطعی طور پر ٹوٹ جائے۔ لیکن جس وجہ سے حضورؐ اس معاملے میں قدم اُٹھاتے ہوئے جھجک رہے تھے وہ یہ خوف تھا کہ اس سے کفار و منافقین کو، جو پہلے ہی آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے، آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ یہ خوف کچھ اپنی بدنامی کے اندیشے سے نہ تھا، بلکہ اس بنا پر تھا کہ اس سے اسلام کو زک پہنچے گی، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر بہت سے لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں بدگمان ہو جائیں گے، بہت سے غیر جانب دار لوگ دشمنوں میں شامل ہو جائیں گے، اور خود مسلمانوں میں سے کمزور عقل و ذہن کے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے حضورؐ یہ خیال کرتے تھے کہ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنے کی خاطر ایسا قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے جس سے اسلام کے عظیم تر مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔

۲ – تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پہلے ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اِن اندیشوں کو رفع فرما دیا۔ ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہمارے دین کی مصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے، اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے اور کون سا کام خلافِ مصلحت ہے۔ لہٰذا تم وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو کفار و منافقین کی مرضی کے مطابق ہو، بلکہ وہ کام کرو جو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ ڈرنے کے لائق ہم ہیں نہ کہ کفار و منافقین۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ
الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ
ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي

اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دِل نہیں رکھے ہیں[۵]، نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظِہار کرتے ہو تمھاری ماں بنا دیا ہے[۶]، اور نہ اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا بنایا ہے[۷]۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے، اور وہی صحیح

۳- اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور مخالفینِ اسلام سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اگر اللہ کے حکم پر عمل کر کے بدنامی کا خطرہ مول لے گا اور اپنی عزت پر دشمنوں کے حملے صبر کے ساتھ برداشت کرے گا تو اللہ سے اس کی یہ وفادارانہ خدمت چھپی نہ رہے گی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ نبیؐ کی عقیدت میں ثابت قدم رہیں گے اور جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں گے، دونوں ہی کا حال اللہ سے مخفی نہ رہے گا۔ اور کفار و منافقین اس کو بدنام کرنے کے لیے جو دَوڑ دھوپ کریں گے اس سے بھی اللہ بے خبر نہ رہے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے جس جزا یا سزا کا مستحق ہوگا، وہ اسے مل کر رہے گی۔

۴- اس فقرے کے مخاطَب پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروا نہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ساری خیر اور مصلحت اسی حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیلِ ارشاد کرنی چاہیے۔ اللہ اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اُس کے سُپرد کر دے۔ وہ رہنمائی کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کے لیے بھی، اور وہی اِس امر کا ضامن بھی ہے کہ اس کی رہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائجِ بد سے دوچار نہ ہو۔

۵- یعنی ایک آدمی بیک وقت مومن اور منافق، سچا اور جھوٹا، بدکار اور نیکوکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے سینے میں دو دل نہیں ہیں کہ ایک دل میں اخلاص ہو اور دوسرے میں خدا سے بے خوفی۔ لہٰذا ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہو سکتی ہے۔ یا تو وہ مومن ہوگا یا منافق۔ یا تو وہ کافر ہوگا یا مُسلم۔ اب اگر تم کسی مومن کو منافق کہہ دو یا منافق کو مومن، تو اس سے حقیقتِ نفس الامری نہ بدل جائے گی۔ اس شخص کی اصل حیثیت لازماً ایک ہی رہے گی۔

۶- "ظِہار" عرب کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے۔" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت

Maktaba Tul Ishaat.com

السَّبِيْلَ ۝۴ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ

طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے[8]۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں[9]۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو[10]۔

اس پر حرام ہوگئی ہے کیونکہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے ماں کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ تمھارے کہنے سے ماں بن جائے۔ (یہاں ظِہار کے متعلق شریعت کا قانون بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس کا قانون سورۂ مجادلہ، آیات ۲-۴ میں بیان کیا گیا ہے۔)

۷ — یہ اصل مقصودِ کلام ہے۔ اُوپر کے دونوں فقرے اسی تیسری بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے بطورِ دلیل ارشاد ہوئے تھے۔

۸ — اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زیدؓ بن حارثہ کہنا شروع کر دیا گیا۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زیدؓ بن حارثہ کو پہلے سب لوگ زیدؓ بن محمدؐ کہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہونے کے بعد انھیں زیدؓ بن حارثہ کہنے لگے۔ مزید برآں اس آیت کے نُزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من ادعٰی الی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام۔ ”جس نے اپنے آپ کو باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآنحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے، اس پر جنت حرام ہے۔“ اسی مضمون کی دوسری رِوایات بھی احادیث میں ملتی ہیں جن میں اس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۹ — یعنی اس صورت میں بھی یہ درست نہ ہوگا کہ کسی شخص سے خواہ مخواہ اس کا نسب ملایا جائے۔

۱۰ — مطلب یہ ہے کہ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی مُضایَقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ بھی اگر کسی کے لیے محض اخلاقاً استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اس ارادے سے یہ بات کہنا کہ جسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہا جائے اس کو واقعی وہی حیثیت دے دی جائے جو ان رشتوں کی ہے، اور اس کے لیے وہی حقوق ہوں جو اِن رشتہ

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ

اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔[11]

بلاشبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے اُن کی اپنی ذات پر مقدّم ہے،[12] اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں،[13] مگر کتاب اللہ کی رُو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ

داروں کے ہیں، اور اس کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہوں جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں، یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی۔

۱۱ - اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پہلے اس سلسلے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان کو اللہ نے معاف کیا۔ ان پر اب کوئی باز پُرس نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نادانستہ افعال پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات کی جائے جس کی ظاہری صورت ایک ممنوع فعل کی سی ہو، مگر اس میں درحقیقت اس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو، تو محض فعل کی ظاہری شکل پر اللہ تعالیٰ سزا نہ دے ڈالے گا۔

۱۲ - یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے وہ تو تمام دوسرے انسانی تعلقات سے ایک بالاتر نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی رشتہ اُس رشتے سے اور کوئی تعلق اُس تعلق سے جو نبی اور اہلِ ایمان کے درمیان ہے، ذرہ برابر بھی کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے ان کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر شفیق و رحیم اور ان کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ اُن کے ماں باپ اور ان کے بیوی بچے ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں، ان کو گمراہ کر سکتے ہیں، ان سے غلطیوں کا ارتکاب کرا سکتے ہیں، ان کو جہنّم میں دھکیل سکتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حق میں صرف وہی بات کرنے والے ہیں جس میں اُن کی حقیقی فلاح ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مار سکتے ہیں، حماقتیں کر کے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر سکتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے وہی کچھ تجویز کریں گے جو فی الواقع ان کے حق میں نافع ہو۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ آپؐ کو اپنے ماں باپ اور اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپؐ سے محبّت رکھیں، اپنی رائے پر آپؐ کی رائے کو اور اپنے فیصلے پر آپؐ کے فیصلے کو مُقدّم رکھیں، اور آپؐ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احبَّ الیہ من والدہ وولدہ والنّاس اجمعین۔ ”تم میں سے کوئی

Maktaba Tul Ishaat.com

کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کو اس کے باپ اور اولاد سے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں۔"

۱۳ – اسی خصوصیت کی بنا پر جو اُوپر مذکور ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنیٰ میں بھی ان کی ماں نہیں ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُسی طرح اُن کے لیے حرام ہیں جس طرح ان کی حقیقی مائیں حرام ہیں۔ یہ مخصوص معاملہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں اور کسی انسان کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اِس معنیٰ میں اُمّہاتِ مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان اُن کے لیے غیر محرم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ ان کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ اُن کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ایک شخص کو اپنی ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ مرتبہ تمام ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکزِ دین بنا کر سارا نظامِ دین انہی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی ہدفِ لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآنِ مجید کی یہ آیت حائل ہوگئی جس کی رُو سے ہر اُس شخص کو انھیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدّعی ہو۔ آخر کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حُضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کو چاہیں آپؐ کی زوجیت پر باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپؐ کی طرف سے طلاق دے دیں۔ ابومنصور احمد بن ابوطالب طَبَرسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یا ابا الحسن ان ھٰذا الشرف باق ما دُمنا علی طاعۃ اللہ تعالٰی فایتھن عصت اللہ تعالٰی بعدی بالخروج علیك فطلقھا من الازواج واسقطھا من شرف امھات المؤمنین (اے ابوالحسن! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دے دیجیو اور اس کو اُمّہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو۔)

اُصولِ روایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی اسی سورۂ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ اور ۵۱-۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ آیتِ تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہّراتؓ نے ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کیا تھا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو باقی نہ رہا تھا۔ اس مضمون کی تشریح آگے حاشیہ ۴۲ و ۹۳ میں ہم نے کر دی ہے۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو، اور رسولِ پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز اِفترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت

اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِکُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ
مَسۡطُوۡرًا ﴿۶﴾ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَہُمۡ وَ مِنۡکَ وَ مِنۡ
نُّوۡحٍ وَّ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ ۪ وَ اَخَذۡنَا مِنۡہُمۡ
مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ۙ﴿۷﴾ لِّیَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِیۡنَ عَنۡ صِدۡقِہِمۡ ۚ وَ اَعَدَّ

اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔[۱۴] یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

اور (اے نبیؐ!) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔[۱۵] تاکہ سچّے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچّائی کے بارے میں سوال کرے[۱۶]، اور کافروں کے لیے

وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اسے طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبّت کے مدّعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

۱۴ – اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، اُن کے ساتھ تو مسلمانوں کے تعلق کی نوعیّت سب سے الگ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات اس اُصول پر قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مُقدّم ہیں۔ کوئی خیرات اس صورت میں صحیح نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ، بال بچوں، اور بھائی بہنوں کی ضروریات تو پوری نہ کرے اور باہر خیرات کرتا پھرے۔ زکوٰۃ سے بھی آدمی کو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنی ہوگی، پھر وہ دوسرے مستحقین کو دے گا۔ میراث لازماً ان لوگوں کو پہنچے گی جو رشتے میں آدمی سے قریب تر ہوں۔ دوسرے لوگوں کو اگر وہ چاہے تو ہِبہ یا وقف یا وصیّت کے ذریعے سے اپنا مال دے سکتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وارث محروم رہ جائیں اور سب کچھ دوسروں کو دے ڈالا جائے۔ اس حکمِ الٰہی سے وہ طریقہ بھی موقوف ہو گیا جو ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے سے شروع ہوا تھا، جس کی رُو سے محض دینی برادری کے تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ وراثت تو رشتہ داری کی بنا پر ہی تقسیم ہوگی، البتہ ایک شخص ہدیے، تحفے یا وصیت کے ذریعے سے اپنے کسی دینی بھائی کی کوئی مدد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

۱۵ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پُختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپؐ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو

Maktaba Tul Ishaat.com

سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انھیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و جُہد میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآنِ مجید میں اس عہد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ، آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمھارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ!) تمھاری طرف، اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آلِ عمران، ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۔ (البقرہ، ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ...... خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الاعراف، آیات ۱۶۹-۱۷۱)

کیا اُن سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟...... مضبوطی کے ساتھ تھامو اُس چیز کو جو ہم نے تمھیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدہ، ۷)

اور اے مسلمانو! یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اُس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جب کہ تم نے کہا: ”ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔“

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شماتتِ اعدا کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیت کی رسم کو توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپؐ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے۔ میں خواہ کتنی ہی نیک نیّتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مُصلح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تأمُّل انجام دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاؑ اور اُن کی اُمتوں سے

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۟ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا
لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۟ اِذْ جَآءُوْكُمْ

ع

تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے[۱۷]۔ ع

اے[۱۸] لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں[۱۹]۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب وہ اُوپر سے

اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد جو نبی آئے آپؐ کی اُمت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپؐ کے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور آپؐ کی اُمت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کون سا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رُجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاؑ سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاؑ پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآنِ پاک کو جس شخص نے بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیا علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا اُن مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

۱۶- یعنی اللہ تعالیٰ محض عہد لے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس عہد کے بارے میں وہ سوال کرنے والا ہے کہ اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ پھر جن لوگوں نے سچائی کے ساتھ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو وفا کیا ہوگا، وہی صادق العہد قرار پائیں گے۔

۱۷- اِس رُکوع کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اسی سورہ کی آیات ۳۶-۴۱ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

۱۸- یہاں سے رکوع ۳ کے آخر تک کی آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی قُرَیظہ سے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ وَاِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَبَلَغَتِ
الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوۡنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابۡتُلِيَ
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا ۝۱۱ وَاِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ
الَّذِيۡنَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ۝۱۲ وَ
اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ يٰۤاَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَارۡجِعُوۡا ۚ

اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے[20]۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے مُنہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے[21]۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے[22] وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو! تمھارے لیے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو[23]۔"

فارغ ہو چکے تھے۔ ان دونوں رُکوعوں میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُریظہ کے واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت ان دونوں غزوات کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔

۱۹ – یہ آندھی اُسی وقت نہیں آ گئی تھی جب کہ دشمنوں کے لشکر مدینے پر چڑھ کر آئے تھے بلکہ اُس وقت آئی تھی جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا۔ نظر نہ آنے والی "فوجوں" سے مراد وہ مخفی طاقتیں ہیں جو انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کام کرتی رہتی ہیں اور انسانوں کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ انسان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں وہ اس کے حساب میں نہیں آتیں، حالانکہ اکثر حالات میں انھی مخفی طاقتوں کی کارفرمائی فیصلہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ یہ طاقتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس لیے "فوجوں" سے مراد فرشتے بھی لیے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے۔

۲۰ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے چڑھ آئے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجد اور خیبر سے چڑھ کر آنے والے اُوپر سے آئے، اور مکۂ معظّمہ کی طرف سے آنے والے نیچے سے آئے۔

۲۱ – ایمان لانے والوں سے مراد یہاں وہ سب لوگ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنے آپ کو

وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ؕ وَ مَا مع ۱۰
هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝۱۳ وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ
مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں"[۲۴] حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے،[۲۵] دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اُس وقت اِنھیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی[۲۶] تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انھیں شریکِ فتنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں میں شامل کیا تھا، جن میں سچے اہلِ ایمان بھی شامل تھے اور منافقین بھی۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے گروہ کا مجموعی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد کے تین پیراگرافوں میں منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر کے دو پیراگراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنینِ صادقین کے بارے میں ہیں۔

۲۲ – یعنی اس امر کے وعدے کہ اہلِ ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی اور آخر کار غلبہ اُنھی کو بخشا جائے گا۔

۲۳ – اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ظاہری مطلب یہ ہے کہ خندق کے سامنے کفار کے مقابلے پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، شہر کی طرف پلٹ چلو۔ اور باطنی مطلب یہ ہے کہ اسلام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جانا چاہیے تاکہ سارے عرب کی دشمنی مول لے کر ہم نے جس خطرے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے اُس سے بچ جائیں۔ منافقین اپنی زبان سے اس طرح کی باتیں اس لیے کہتے تھے کہ جو ان کے دام میں آ سکتا ہو اس کو تو اپنا باطنی مطلب سمجھا دیں، لیکن جو ان کی بات سُن کر چوکنا ہو اور اس پر گرفت کرے اس کے سامنے اپنے ظاہر الفاظ کی آڑ لے کر گرفت سے بچ جائیں۔

۲۴ – یعنی جب بنو قُرَیظہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تو ان منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے نکل بھاگنے کے لیے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے یہ کہہ کر رخصت طلب کرنی شروع کی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا ہمیں جا کر اپنے بال بچوں کی حفاظت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالانکہ اُس وقت سارے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بنی قُرَیظہ کی بدعہدی سے جو خطرہ بھی پیدا ہوا تھا، اُس سے شہر اور اس کے باشندوں کو بچانے کی تدبیر کرنا حضورؐ کا کام تھا نہ کہ فوج کے ایک ایک فرد کا۔

۲۵ – یعنی اس خطرے سے بچاؤ کا انتظام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے۔ یہ انتظام بھی دفاع کی اُس مجموعی اسکیم ہی کا ایک حصہ تھا جس پر سالارِ لشکر کی حیثیت سے حضورؐ عمل فرما رہے تھے۔ اس لیے کوئی فوری خطرہ اس وقت درپیش نہ تھا جس کی بنا پر ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی معقول ہوتا۔

۲۶ – یعنی اگر شہر میں داخل ہو کر فاتح کفار ان منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ختم کردو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ
الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ
اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾
قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْۗءًا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَاۗىِٕلِيْنَ
لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾

ہونے میں کوئی تأمُّل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی۔[۲۷]

اَے نبیؐ! ان سے کہو: اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمھارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لُوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمھیں مل سکے گا۔[۲۸] اِن سے کہو: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں۔

اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رُکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف"۔[۲۹] جو لڑائی میں حصّہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو

۲۷ – یعنی جنگِ اُحُد کے موقع پر جو کمزوری انھوں نے دکھائی تھی اس کے بعد شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے ان لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب اگر آزمائش کا کوئی موقع پیش آیا تو ہم اپنے اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو محض باتوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص بھی اُس سے کوئی عہد باندھتا ہے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی آزمائش کا موقع وہ ضرور لے آتا ہے تاکہ اس کا جھوٹ سچ کُھل جائے۔ اس لیے وہ جنگِ اُحُد کے دو ہی سال بعد اُس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سامنے لے آیا اور اُس نے جانچ کر دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے کیسا کچھ سچا عہد اُس سے کیا تھا۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾

تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں[۳۰]۔ خطرے کا وقت آ جائے تو اس طرح دِیدے پھرا پھرا کر تمھاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمھارے اِستقبال کو آ جاتے ہیں[۳۱]۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیے[۳۲] اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔[۳۳] یہ

۲۸- یعنی اِس فرار سے کچھ تمھاری عمر بڑھ نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہر حال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور رُوئے زمین کی دولت پا لو۔ بھاگ کر جیو گے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند سال ہی جیو گے اور اُتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اُٹھا سکو گے جتنا تمھارے لیے مقدّر ہے۔

۲۹- یعنی چھوڑو اس پیغمبر کا ساتھ۔ کہاں دین و ایمان اور حق و صداقت کے چکّر میں پڑے ہو؟ اپنے آپ کو خطرات اور مصائب میں مبتلا کرنے کے بجائے وہی عافیت کوشی کی پالیسی اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

۳۰- یعنی اپنی محنتیں، اپنے اوقات، اپنی فکر، اپنے مال، غرض کوئی چیز بھی وہ اُس راہ میں صَرف کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہیں جس میں مومنینِ صادقین اپنا سب کچھ جھونکے دے رہے ہیں۔ جان کھپانا اور خطرے انگیز کرنا تو بڑی چیز ہے، وہ کسی کام میں بھی کھُلے دل سے اہلِ ایمان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

۳۱- لغت کے اعتبار سے اس آیت کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ لڑائی سے جب تم کامیاب پلٹتے ہو تو وہ بڑے تپاک سے تمھارا استقبال کرتے ہیں اور چرب زبانی سے کام لے کر یہ دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے مومن ہیں اور ہم نے بھی اس کام کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے، لہٰذا ہم بھی مالِ غنیمت کے حق دار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر یہ لوگ زبان کی بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر مطالبے کرتے ہیں کہ لاؤ ہمارا حصہ، ہم نے بھی خدمات انجام دی ہیں، سب کچھ تم ہی لوگ نہ لُوٹ لے جاؤ۔

۳۲- یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد جو نمازیں انھوں نے پڑھیں، جو روزے رکھے، جو زکوٰتیں دیں، اور بظاہر جو نیک کام بھی کیے ان سب کو اللہ تعالیٰ کالعدم قرار دے دے گا اور ان کا کوئی اجر انھیں نہ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ اعمال کی ظاہری

Maktaba Tul Ishaat.com

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ
اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآىِٕكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا
قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲۰ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ

ع ۳ ۱۸

سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اُس موقع پر یہ کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمھارے حالات پُوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمھارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصّہ لیں گے۔ؑ

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا،[۳۴] ہر اُس شخص کے لیے

شکل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس ظاہر کی تہ میں ایمان اور خلوص ہے یا نہیں۔ جب یہ چیز سرے سے ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے تو یہ دکھاوے کے اعمال سراسر بے معنی ہیں۔ اِس مقام پر یہ امر گہری توجہ کا طالب ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کا اقرار کرتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوسرے نیک کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کے بارے میں صاف صاف فیصلہ دے دیا گیا ہے کہ یہ سرے سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اور یہ فیصلہ صرف اس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ کفر اور اسلام کی کشمکش میں جب کڑی آزمایش کا وقت آیا تو انھوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا، دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی اور اسلام کی حفاظت کے لیے جان، مال اور محنت صرف کرنے میں دریغ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا اصل مدار یہ ظاہری اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ آدمی کی وفاداریاں کس طرف ہیں۔ جہاں خدا اور اس کے دین سے وفاداری نہیں ہے، وہاں اقرارِ ایمان اور عبادات اور دوسری نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۳- یعنی اِن کے اعمال کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتے کہ ان کو ضائع کر دینا اللہ کو گراں گزرے۔ اور یہ لوگ کوئی زور بھی نہیں رکھتے کہ ان کے اعمال کو ضائع کرنا اُس کے لیے دشوار ہو۔

۳۴- جس سیاق و سباق میں یہ آیت ارشاد ہوئی ہے اس کے لحاظ سے رسولِ پاکؐ کے طرزِ عمل کو اس جگہ نمونے کے طور پر پیش کرنے سے مقصود اُن لوگوں کو سبق دینا تھا جنھوں نے جنگِ احزاب کے موقع پر مفاد پرستی و عافیت کوشی سے کام لیا تھا۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ایمان و اسلام اور اتباعِ رسولؐ کے مدّعی تھے۔ تم کو دیکھنا چاہیے تھا کہ جس رسول کے پیروؤں میں تم شامل ہوئے ہو اُس کا اس موقع پر کیا رَوِیّہ تھا۔ اگر کسی گروہ کا لیڈر خود عافیت کوش ہو، خود آرام طلب ہو، خود اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کو مقدّم رکھتا ہو، خطرے کے وقت خود بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہا ہو، پھر تو اس کے پیروؤں کی طرف سے اِن کمزوریوں کا اظہار معقول ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ ہر مشقّت جس کا آپؐ نے دوسروں سے مطالبہ کیا، اسے برداشت کرنے میں آپؐ خود سب کے ساتھ شریک تھے، بلکہ دوسروں سے بڑھ کر ہی آپؐ نے حصہ لیا۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اُٹھائی ہو اور آپؐ نے

كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ وَ لَمَّا رَاَ
الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ
اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

جو اللہ اور یومِ آخر کا امید وار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔[۳۵] اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ[۳۶]) جب انھوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔"[۳۷] اس واقعے نے اُن کے ایمان اور ان کی سُپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔[۳۸] ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ

نہ اٹھائی ہو۔ خندق کھودنے والوں میں آپؐ خود شامل تھے۔ بھوک اور سردی کی تکلیفیں اٹھانے میں ایک ادنیٰ مسلمان کے ساتھ آپؐ کا حصہ بالکل برابر کا تھا۔ محاصرے کے دوران میں آپؐ ہر وقت محاذِ جنگ پر موجود رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی دشمن کے مقابلے سے نہ ہٹے۔ بنی قُریظہ کی غداری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے بال بچے مبتلا تھے اُسی میں آپؐ کے بال بچے بھی مبتلا تھے۔ آپؐ نے اپنی حفاظت اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے نہ ہو۔ جس مقصدِ عظیم کے لیے آپؐ دوسروں سے قربانیوں کا مطالبہ کر رہے تھے اس پر سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر آپؐ خود اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے۔ اس لیے جو کوئی بھی آپؐ کے اتباع کا مدّعی تھا، اسے یہ نمونہ دیکھ کر اس کی پیروی کرنی چاہیے تھی۔

یہ تو موقع و محل کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم ہے۔ مگر اس کے الفاظ عام ہیں اور اس کے منشا کو صرف اسی معنی تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ صرف اسی لحاظ سے اُس کے رسول کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے، بلکہ مطلقاً اسے نمونہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر معاملے میں آپؐ کی زندگی کو اپنے لیے نمونے کی زندگی سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و کردار کو ڈھالیں۔

۳۵- یعنی اللہ سے غافل آدمی کے لیے تو یہ زندگی نمونہ نہیں ہے مگر اس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو کبھی کبھار اتفاقاً خدا کا نام لے لینے والا نہیں بلکہ کثرت سے اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے والا ہو۔ اسی طرح یہ زندگی اُس شخص کے لیے تو نمونہ نہیں ہے جو اللہ سے کوئی اُمید اور آخرت کے آنے کی کوئی توقع نہ رکھتا ہو، مگر اُس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا اُمیدوار ہو اور جسے یہ بھی خیال ہو کہ کوئی آخرت آنے والی ہے جہاں اس کی بھلائی کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا رویہ رسولِ خدا کے رویے سے کس حد تک قریب تر رہا ہے۔

۳۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل کو نمونے کے طور پر پیش فرماتا ہے تاکہ ایمان کے جھوٹے مدعیوں اور سچے دل سے رسول کی پیروی اختیار کرنے والوں کا کردار ایک دوسرے کے

Maktaba Tul Ishaat.com

مقابلے میں پوری طرح نمایاں کر دیا جائے۔ اگرچہ ظاہری اقرارِ ایمان میں وہ اور یہ یکساں تھے۔ مسلمانوں کے گروہ میں دونوں کا شمار ہوتا تھا اور نمازوں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ لیکن آزمائش کی گھڑی پیش آنے پر دونوں ایک دوسرے سے چھٹ کر الگ ہو گئے اور صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخلص وفادار کون ہیں اور محض نام کے مسلمان کون۔

۳۷۔ اس موقع پر آیت نمبر ۱۲ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ جو لوگ منافق اور دل کے روگی تھے انھوں نے دس بارہ ہزار کے لشکر کو سامنے سے اور بنی قُرَیظہ کو پیچھے سے حملہ آور ہوتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگے کہ "سارے وعدے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیے تھے محض جھوٹ اور فریب نکلے۔ کہا تو ہم سے یہ گیا تھا کہ دینِ خدا پر ایمان لاؤ گے تو خدا کی تائید تمھاری پشت پر ہو گی، عرب و عجم پر تمھارا سکہ رواں ہو گا، اور قیصر و کسریٰ کے خزانے تمھارے لیے کھل جائیں گے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ سارا عرب ہمیں مٹا دینے پر تُل گیا ہے اور کہیں سے فرشتوں کی وہ فوجیں آتی نظر نہیں آ رہیں جو ہمیں اس سیلابِ بلا سے بچا لیں۔" اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وعدوں کا ایک مطلب تو وہ تھا جو اُن جھوٹے مدّعیانِ ایمان نے سمجھا تھا۔ دوسرا مفہوم وہ ہے جو اِن صادق الایمان مسلمانوں نے سمجھا۔ خطرات اُمنڈتے دیکھ کر اللہ کے وعدے تو ان کو بھی یاد آئے، مگر یہ وعدے نہیں کہ ایمان لاتے ہی انگلی ہلائے بغیر تم دنیا کے فرماں روا ہو جاؤ گے اور فرشتے آ کر تمھاری تاج پوشی کی رسم ادا کریں گے، بلکہ یہ وعدے کہ سخت آزمائشوں سے تم کو گزرنا ہو گا، مصائب کے پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑیں گے، گراں ترین قربانیاں تمھیں دینی ہوں گی، تب کہیں جا کر اللہ کی عنایات تم پر ہوں گی اور تمھیں دنیا اور آخرت کی وہ سرفرازیاں بخشی جائیں گی جن کا وعدہ اللہ نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (البقرہ: آیت ۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں بس یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی وہ حالات تو تم پر گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد ــــ سنو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یہ کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور انھیں آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم نے اُن سب لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

۳۸۔ یعنی اس سیلابِ بلا کو دیکھ کر ان کے ایمان متزلزل ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے، اور اللہ کی فرماں برداری سے بھاگ نکلنے کے بجائے وہ اور زیادہ یقین و اطمینان کے ساتھ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان و تسلیم دراصل نفس کی ایک ایسی کیفیت ہے جو دین کے ہر حکم اور ہر مطالبے پر امتحان میں پڑ جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر ہر قدم پر آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جہاں دین یا تو کسی چیز کا حکم دیتا ہے، یا کسی چیز سے منع کرتا ہے، یا جان اور مال اور وقت اور محنت اور خواہشاتِ نفس کی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر جو

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٢٤﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ
يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا

موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔[۳۹] انھوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچّوں کو اُن کی سچّائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے، اور چاہے تو اُن کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

اللہ نے کفّار کا مُنہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یُونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور

شخص اطاعت سے انحراف کرے گا اُس کے ایمان و تسلیم میں کمی واقع ہو گی، اور جو شخص بھی حکم کے آگے سر جھکا دے گا اس کے ایمان و تسلیم میں اضافہ ہو گا۔ اگرچہ ابتداءً آدمی صرف کلمۂ اسلام کو قبول کر لینے سے مومن و مسلم ہو جاتا ہے، لیکن یہ کوئی ساکن و جامد حالت نہیں ہے جو بس ایک ہی مقام پر ٹھیری رہتی ہو، بلکہ اس میں تنزُّل اور ارتقا دونوں کے امکانات ہیں۔ خلوص اور اطاعت میں کمی اس کے تنزُّل کی موجب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص پیچھے ہٹتے ہٹتے ایمان کی اس آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے یک سرِمُو بھی تجاوز کر جائے تو مومن کے بجائے منافق ہو جائے۔ اس کے برعکس خلوص جتنا زیادہ ہو، اطاعت جتنی مکمل ہو اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے لگن اور دھن جتنی بڑھتی چلی جائے، ایمان اُسی نسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی صدیقیت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ کمی و بیشی جو کچھ بھی ہے اَخلاقی مراتب میں ہے جس کا حساب اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔ بندوں کے لیے ایمان بس ایک ہی اقرار و تصدیق ہے جس سے ہر مسلمان داخلِ اسلام ہوتا ہے اور جب تک اس پر قائم رہے، مسلمان مانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا مسلمان ہے اور یہ پاؤ، یا یہ دُگنا مسلمان ہے اور یہ تین گُنا۔ اسی طرح قانونی حُقوق میں سب مسلمان یکساں ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو ہم زیادہ مومن کہیں اور اس کے حقوق زیادہ ہوں، اور کسی کو کم مومن قرار دیں اور اس کے حقوق کم ہوں۔ اِن اعتبارات سے ایمان کی کمی و بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور دراصل اسی معنٰی میں امام ابوحنیفہؒ نے یہ فرمایا ہے کہ الایمان لایزید ولاینقص، "ایمان کم و بیش نہیں ہوتا۔" (مزید

Maktaba Tul-Ishaat.com

عَزِيزًا ۝٢٥ وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ۝٢٦
وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝٢٧ ع يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ
تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا
جَمِيلًا ۝٢٨ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ

زبردست ہے۔ پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا[40]، اللہ ان کی گڑھیوں سے انھیں اُتار لایا اور اُن کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمھیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

اے نبیؐ[41]! اپنی بیویوں سے کہو: اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ

تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۲، الانفال، حاشیہ ۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۷)

۳۹ – یعنی کوئی اللہ کی راہ میں جان دے چکا ہے اور کوئی اس کے لیے تیار ہے کہ وقت آئے تو اس کے دین کی خاطر اپنے خون کا نذرانہ پیش کر دے۔

۴۰ – یعنی یہودِ بنی قُرَیظہ۔

۴۱ – یہاں سے نمبر ۳۵ تک کی آیات جنگِ احزاب اور بنی قُرَیظہ سے مُتّصل زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ ان کا پس منظر ہم دیباچے میں مختصراً بیان کر آئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ اُس زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپؐ کی ازواج آپؐ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپؐ خاموش ہیں۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: هُنَّ حَوْلِي كَمَا تَرَى يَسْأَلْنَنِي النَّفَقَةَ ”یہ میرے گرد بیٹھی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھ سے خرچ کے لیے روپیہ طلب کر رہی ہیں۔“ اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز مانگتی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس وقت کیسی مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور کفر و اسلام کی

فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹

تم میں سے جو نیکو کار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[۴۲]

انتہائی شدید کش مکش کے زمانے میں خرچ کے لیے ازواجِ مطہراتؓ کے تقاضے مزاجِ مبارک پر کیا اثر ڈال رہے تھے۔

۴۲- اس آیت کے نُزول کے وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں: حضرت سَوْدہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ۔ ابھی حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ (احکام القرآن لابن العَرَبی، طبع مصر ۱۹۵۸ء، جلد ۳، ص ۱۳-۱۵۱۲) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا: ’’میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین کی رائے لو، پھر فیصلہ کرو‘‘۔ پھر حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے، اور یہ آیت ان کو سنادی۔ انھوں نے عرض کیا: ’’کیا اس معاملے کو میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں‘‘۔ اس کے بعد حضورؐ باقی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی، اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ (مُسْنَدِ احمد، مسلم، نَسائی)

اِصطلاح میں اس کو تخییر کہتے ہیں، یعنی بیوی کو اس امر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کرلے۔ یہ تخییر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حضورؐ کو حکم دیا تھا۔ اگر ازواجِ مطہراتؓ میں سے کوئی خاتون علیحدگی کا پہلو اختیار کرتیں تو آپ سے آپ جدا نہ ہو جاتیں بلکہ حضورؐ کے جدا کرنے سے ہوتیں، جیسا کہ آیت کے الفاظ ’’آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں‘‘ سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضورؐ پر یہ واجب تھا کہ اس صورت میں ان کو جدا کر دیتے، کیونکہ نبی کی حیثیت سے آپؐ کا یہ منصب نہ تھا کہ اپنا وعدہ پورا نہ فرماتے۔ جدا ہو جانے کے بعد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُمّہات المومنین کے زُمرے سے خارج ہو جاتیں اور ان سے کسی دوسرے مسلمان کا نکاح حرام نہ ہوتا، کیونکہ وہ دنیا اور اس کی زینت ہی کے لیے تو رسولِ پاکؐ سے علیحدگی اختیار کرتیں جس کا حق انھیں دیا گیا تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ مقصد نکاح سے محروم ہو جانے کی صورت میں پورا نہ ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف آیت کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن ازواج نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو پسند کرلیا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کے لیے باقی نہ رہا، کیونکہ تخییر کے دو ہی پہلو تھے: ایک، یہ کہ دنیا کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا کردیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا نہ کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے جو پہلو بھی کوئی خاتون اختیار کرتیں، ان کے حق میں دوسرا پہلو آپ سے آپ ممنوع ہو جاتا تھا۔

اسلامی فقہ میں تخییر دراصل تفویضِ طلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی شوہر اس ذریعے سے بیوی کو اختیار دے دیتا ہے کہ چاہے تو اس کے نکاح میں رہے ورنہ الگ ہو جائے۔ اس مسئلے میں قرآن و سنت سے اِستنباط کرکے فقہا نے جو احکام بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) یہ اختیار ایک دفعہ عورت کو دے دینے کے بعد شوہر نہ تو اسے واپس لے سکتا ہے اور نہ عورت کو اس کے استعمال سے روک سکتا ہے۔ البتہ عورت کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس اختیار کو استعمال ہی کرے۔ وہ چاہے تو شوہر کے ساتھ رہنے پر رضامندی

Maktaba Tul Ishaat.com

ظاہر کردے، چاہے علیٰحدگی کا اعلان کردے، اور چاہے تو کسی چیز کا اظہار نہ کرے اور اس اختیار کو یونہی ضائع ہو جانے دے۔

(۲) اس اختیار کے عورت کی طرف منتقل ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اول، یہ کہ شوہر نے یا تو اسے صریح الفاظ میں طلاق کا اختیار دیا ہو، یا اگر طلاق کی تصریح نہ کی ہو تو پھر اس کی نیت یہ اختیار دینے کی ہو۔ مثلاً اگر وہ کہے: ''تجھے اختیار ہے''، یا ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے''، تو اس طرح کے کِنایات میں شوہر کی نیت کے بغیر طلاق کا اختیار عورت کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ اگر عورت اس کا دعویٰ کرے اور شوہر بحلف یہ بیان دے کہ اس کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی نہ تھی تو شوہر کا بیان قبول کیا جائے گا۔ اِلّا یہ کہ عورت اس امر کی شہادت پیش کردے کہ یہ الفاظ ناچاقی اور جھگڑے کی حالت میں، یا طلاق کی باتیں کرتے ہوئے کہے گئے تھے، کیونکہ اس سیاق وسباق میں اختیار دینے کے معنٰی یہی سمجھے جائیں گے کہ شوہر کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی تھی۔ دوم، یہ کہ عورت کو معلوم ہو کہ یہ اختیار اسے دیا گیا ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو اُسے اس کی اطلاع ملنی چاہیے، اور اگر وہ موجود ہو تو اسے یہ الفاظ سننے چاہییں۔ جب تک وہ سنے نہیں، یا اسے اس کی خبر نہ پہنچے، اختیار اس کی طرف منتقل نہ ہوگا۔

(۳) اگر شوہر کسی وقت کی تعیین کے بغیر مُطلقًا اس کو اختیار دے تو عورت اس اختیار کو کب تک استعمال کر سکتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس نِشَست میں شوہر اس سے یہ بات کہے اُسی نِشَست میں عورت اپنا اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ اگر وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے اُٹھ جائے، یا کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی، تو اس کا اختیار باطل ہو جائے گا۔ یہ رائے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، جابر بن زید، عطاؒ، مجاہدؒ، شَعْبیؒ، نَخَعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام اَوزاعیؒ، سُفیان ثَوریؒ اور ابوثَورؒ کی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا اختیار اس نِشَست تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کے بعد بھی اسے استعمال کر سکتی ہے۔ یہ رائے حضرت حَسَن بصریؒ، قَتادہؒ اور زُہریؒ کی ہے۔

(۴) اگر شوہر وقت کی تعیین کردے، مثلاً کہے کہ ایک مہینے یا ایک سال تک تجھے اختیار ہے، یا اتنی مدت تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو یہ اختیار اسی مدّت تک اس کو حاصل رہے گا۔ البتہ اگر وہ کہے کہ تو جب چاہے اس اختیار کو استعمال کر سکتی ہے، تو اس صورت میں اس کا اختیار غیر محدود ہوگا۔

(۵) عورت اگر عَلیٰحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے واضح اور قطعی الفاظ میں اس کا اظہار کرنا چاہیے۔ مبہم الفاظ جن سے مدّعا واضح نہ ہوتا ہو، مؤثر نہیں ہو سکتے۔

(۶) قانوناً شوہر کی طرف سے عورت کو اختیار دینے کے تین صیغے ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ کہے ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے۔'' دوسرے، یہ کہ وہ کہے ''تجھے اختیار ہے۔'' تیسرے، یہ کہ وہ کہے ''تجھے طلاق ہے اگر تُو چاہے۔'' ان میں سے ہر ایک کے قانونی نتائج الگ الگ ہیں:

الف: ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' کے الفاظ اگر شوہر نے کہے ہوں اور عورت اس کے جواب میں کوئی صریح بات ایسی کہے جس سے ظاہر ہو کہ وہ عَلیٰحدگی اختیار کرتی ہے، تو حَنَفِیّہ کے نزدیک ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔ (یعنی اس کے بعد شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا، لیکن عدّت گزر جانے پر یہ دونوں پھر چاہیں تو باہم نکاح کر سکتے ہیں۔) اور اگر شوہر نے کہا ہو کہ ''ایک طلاق کی حد تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' تو اس صورت میں ایک طلاق رَجعی پڑے گی۔ (یعنی عدّت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔) لیکن

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا
الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰
الجزء ۲۲ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ
اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝۳۱ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ
لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح فُحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دُہرا عذاب دیا جائے گا،[۴۳] اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے[۴۴]۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی، اس کو ہم دُہرا اجر دیں[۴۵] گے اور ہم نے اس کے لیے رزقِ کریم مہیّا کر رکھا ہے۔

نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔[۴۶] اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے

اگر شوہر نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تین طلاق کی نیت کی ہو، یا اس کی تصریح کی ہو تو اس صورت میں عورت کا اختیارِ طلاق ہی کا ہم معنیٰ ہوگا، خواہ وہ بصراحت اپنے اُوپر تین طلاق وارد کرے یا صرف ایک بار کہے کہ میں نے عَلٰیحدگی اختیار کی یا اپنے آپ کو طلاق دی۔

ب: "تجھے اختیار ہے" کے الفاظ کے ساتھ اگر شوہر نے عورت کو عَلٰیحدگی کا اختیار دیا ہو اور عورت علٰیحدگی اختیار کرنے کی تصریح کر دے تو حنفیہ کے نزدیک ایک ہی طلاق بائن پڑے گی خواہ شوہر کی نیت تین طلاق کا اختیار دینے کی ہو، البتہ اگر شوہر کی طرف سے تین طلاق کا اختیار دینے کی تصریح ہو، تب عورت کے اختیارِ طلاق سے تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر شوہر نے اختیار دیتے ہوئے طلاق کی نیت کی ہو اور عورت عَلٰیحدگی اختیار کرے تو ایک طلاق رَجعی واقع ہوگی۔ امام مالکؒ کے نزدیک مدخولہ بیوی پر تین طلاقیں پڑ جائیں گی لیکن اگر غیر مدخولہ کے معاملے میں شوہر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرے تو اسے قبول کر لیا جائے گا۔

ج: "تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے" کہنے کی صورت میں اگر عورت طلاق کا اختیار استعمال کرے تو طلاق رَجعی ہو گی نہ کہ بائن۔

(۷) اگر مرد کی طرف سے علٰیحدگی کا اختیار دیے جانے کے بعد عورت اسی کی بیوی بن کر رہنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ

Maktaba Tul Ishaat.com

کی ہے، اور اسی رائے کو جُمہور فقہا نے اختیار کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مَسْرُوقؒ نے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: خیّر رسُول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نساءَه فاخترنه اکان ذٰلك طلاقًا؟ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا اور انھوں نے حضورؐ ہی کے ساتھ رہنا پسند کر لیا تھا، پھر کیا اسے طلاق شمار کیا گیا؟'' اس معاملے میں صرف حضرت علیؓ اور زیدؓ بن ثابت کی یہ رائے منقول ہوئی ہے کہ ایک طلاق رَجعی واقع ہوگی۔ لیکن دوسری رِوایت ان دونوں بزرگوں سے بھی یہی ہے کہ کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

۴۳ — اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے کسی فُحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کی ازواج کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اسی کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں، اس لیے ان کا اَخلاقی رَوِیّہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ''اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہوجائے گا۔'' (الزُّمَر، آیت ۶۵) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! حضورؐ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا، بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت اِحتراز لازم ہے۔

۴۴ — یعنی تم اس بُھلاوے میں نہ رہنا کہ نبی کی بیویاں ہونا تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے، یا تمھارے مرتبے کچھ ایسے بلند ہیں کہ اُن کی وجہ سے تمھیں پکڑنے میں اللہ کو کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔

۴۵ — گناہ پر دُہرے عذاب اور نیکی پر دُہرے اجر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں کسی بلند مرتبے پر سرفراز فرماتا ہے وہ بالعُموم لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں اور بندگانِ خدا کی بڑی تعداد بھلائی اور برائی میں انھی کی پیروی کرتی ہے۔ ان کی برائی تنہا انھی کی برائی نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے بگاڑ کی موجب بھی ہوتی ہے اور ان کی بھلائی صرف انھی کی انفرادی بھلائی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے انسانوں کی فلاح کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس لیے جب وہ بُرے کام کرتے ہیں تو اپنے بگاڑ کے ساتھ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا پاتے ہیں۔ اور جب وہ نیک کام کرتے ہیں تو انھیں اپنی نیکی کے ساتھ اس بات کی جزا بھی ملتی ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھلائی کی راہ دکھائی۔

اس آیت سے یہ اُصول بھی نکلتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ حرمت ہوگی اور جس قدر زیادہ امانت کی توقع ہوگی، وہاں اسی قدر زیادہ ہتکِ حرمت اور ارتکابِ خیانت کا جرم شدید ہوگا اور اسی قدر زیادہ اس کا عذاب سخت ہوگا۔ مثلاً مسجد میں شراب پینا اپنے گھر میں شراب پینے سے شدید تر جرم ہے اور اس کی سزا زیادہ سخت ہے۔ مُحَرَّمات سے زِنا کرنا غیر عورت سے زِنا کی بہ نسبت اشدّ ہے اور اس پر زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

۴۶ — یہاں سے آخر پیرگراف تک کی آیات وہ ہیں جن سے اسلام میں پردے کے احکام کا آغاز ہوا ہے۔ اِن آیات میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے کیا گیا ہے مگر مقصود تمام مسلمان گھروں میں اِن اصلاحات کو نافذ کرنا ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کو مخاطب کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے اس پاکیزہ طرزِ زندگی کی ابتدا ہوگی تو باقی سارے مسلمان گھرانوں کی خواتین خود اس کی تقلید کریں گی، کیونکہ یہی گھر اُن کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض لوگ صرف اس بنیاد پر کہ ان آیات کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے ہے، یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ احکام انھی کے لیے خاص ہیں۔ لیکن آگے ان آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کون سی بات ایسی ہے جو حضورؐ کی ازواج کے لیے خاص ہو اور باقی مسلمان عورتوں کے لیے مطلوب نہ ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ کا

بِالۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ الَّذِىۡ فِىۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۚ﴿۳۲﴾

بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔[۴۷]

منشا یہی ہوسکتا تھا کہ صرف ازواجِ مطہراتؓ ہی گندگی سے پاک ہوں، اور وہی اللہ ورسولؐ کی اطاعت کریں، اور وہی نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں؟ اگر یہ منشا نہیں ہوسکتا تو پھر گھروں میں چین سے بیٹھنے اور تبرّجِ جاہلیت سے پرہیز کرنے اور غیر مردوں کے ساتھ دبی زبان سے بات نہ کرنے کا حکم ان کے لیے کیسے خاص ہوسکتا ہے اور باقی مسلمان عورتیں اس سے مستثنیٰ کیسے ہوسکتی ہیں؟ کیا کوئی معقول دلیل ایسی ہے جس کی بنا پر ایک ہی سلسلۂ کلام کے مجموعی احکام میں سے بعض کو عام اور بعض کو خاص قرار دیا جائے؟

رہا یہ فقرہ کہ "تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو" تو اس سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ عام عورتوں کو تو بن ٹھن کر نکلنا چاہیے اور غیر مردوں سے خوب لگاوٹ کی باتیں کرنی چاہییں، البتہ تم ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ طرزِ کلام کچھ اس طرح کا ہے جیسے ایک شریف آدمی اپنے بچے سے کہتا ہے کہ "تم بازاری بچوں کی طرح نہیں ہو، تمھیں گالی نہ بکنی چاہیے۔" اس سے کوئی عقل مند آدمی بھی کہنے والے کا یہ مدعا اخذ نہ کرے گا کہ وہ صرف اپنے بچے کے لیے گالیاں بکنے کو برا سمجھتا ہے، دوسرے بچوں میں یہ عیب موجود رہے تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

۴۷ – یعنی ضرورت پیش آنے پر کسی مرد سے بات کرنے میں مضایقہ نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو ایسا ہونا چاہیے جس سے بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس کے لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، اس کی آواز میں دانستہ کوئی شیرینی گھلی ہوئی نہ ہو جو سننے والے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا کر دے اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمت دلائے۔ اس طرزِ گفتگو کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ یہ کسی ایسی عورت کو زیب نہیں دیتا جس کے دل میں خدا کا خوف اور بدی سے پرہیز کا جذبہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ فاسقات و فاجرات کا طرزِ کلام ہے نہ کہ مومناتِ متقیات کا۔ اس کے ساتھ اگر سورۂ نور کی وہ آیت بھی دیکھی جائے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ (اور وہ زمین پر اس طرح پاؤں مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے اس کا علم لوگوں کو ہو) تو رب العالمین کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خواہ مخواہ اپنی آواز یا اپنے زیوروں کی جھنکار غیر مردوں کو نہ سنائیں اور اگر بضرورت اجنبیوں سے بولنا پڑ جائے تو پوری احتیاط کے ساتھ بات کریں۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ نیز اگر نماز با جماعت میں کوئی عورت موجود ہو اور امام کوئی غلطی کرے تو مرد کی طرح سبحان اللہ کہنے کی اسے اجازت نہیں ہے بلکہ اس کو صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام متنبہ ہو جائے۔

اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کرسکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آکر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ

اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو[۴۸] اور سابق دَورِ جاہلیّت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔[۴۹] نماز قائم کرو،

کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (air-hostess) بنائی جائیں اور انھیں خاص طور پر مسافروں کا دل لُبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گُھل مِل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس کلچر کی گنجایش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے۔

۴۸ – اصل میں لفظ قَرْنَ استعمال ہوا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کو "قرار" سے ماخوذ بتایا ہے اور بعض نے "وَقَار" سے۔ اگر اس کو قرار سے لیا جائے تو معنیٰ ہوں گے "قرار پکڑو"، "ٹِک رہو"۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو مطلب ہوگا "سکون سے رہو"، "چین سے بیٹھو"۔ دونوں صورتوں میں آیت کا منشا یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر ہے، اس کو اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہییں، اور گھر سے باہر صرف بضرورت ہی نکلنا چاہیے۔ یہ منشا خود آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ حافظ ابوبکر بزّارؒ حضرت انسؓ سے رِوایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ساری فضیلت تو مرد لُوٹ لے گئے، وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟ جواب میں فرمایا: من قعدت منکن فی بیتها فانها تدرک عمل المجاهدین۔ "جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی، وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔" مطلب یہ ہے کہ مجاہد دل جمعی کے ساتھ اسی وقت تو خدا کی راہ میں لڑ سکتا ہے جب کہ اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہو، اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی ہو، اور اسے کوئی خطرہ اس امر کا نہ ہو کہ پیچھے وہ کوئی گُل کھلا بیٹھے گی۔ یہ اطمینان جو عورت اسے فراہم کرے گی وہ گھر بیٹھے اس کے جہاد میں برابر کی حصّہ دار ہوگی۔ ایک اور رِوایت جو بزّار اور ترمذی نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ: انّ المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان واقرب ما تكون بروحة ربها وهی فی قعر بیتها "عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔" (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ ۴۹)

قرآنِ مجید کے اس صاف اور صریح حکم کی موجودگی میں اس بات کی آخر کیا گنجایش ہے کہ مسلمان عورتیں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں، بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دَوڑتی پھریں، سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کریں، کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں، مردانہ ہسپتالوں میں نرسنگ کی خدمت انجام دیں، ہوائی جہازوں اور ریل کاروں میں "مسافر نوازی" کے لیے استعمال کی جائیں، اور تعلیم و تربیت کے لیے امریکا و انگلستان بھیجی جائیں؟ عورت کے بیرونِ خانہ سرگرمیوں کے جواز میں بڑی سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جنگِ جَمَل میں حصّہ لیا تھا۔ لیکن یہ اِستدلال جو لوگ پیش کرتے ہیں انھیں شاید معلوم نہیں ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے زوائد الزہد میں، اور ابنِ المُنذر، ابنِ ابی شَیبہ اور ابنِ سعد

نے اپنی کتابوں میں مَسْرُوقؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اِس آیت (وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ) پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹا بھیگ جاتا تھا، کیونکہ اس پر انھیں اپنی وہ غلطی یاد آ جاتی تھی جو اُن سے جنگِ جَمَل میں ہوئی تھی۔

۴۹- اس آیت میں دو اہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا سمجھنا آیت کے منشا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک تَبَرُّج، دوسرے جاہلیّتِ اُولیٰ۔

تَبَرُّج کے معنیٰ عَرَبی زبان میں نمایاں ہونے، ابھرنے اور کُھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ ہر ظاہر اور مُرتفع چیز کے لیے عرب لفظ ''بَرَج'' استعمال کرتے ہیں۔ ''بُرج'' کو بُرج اس کے ظہور و اِرتفاع کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے۔ بادبانی کشتی کے لیے ''بارجہ'' کا لفظ اسی لیے بولا جاتا ہے کہ اس کے بادبان دُور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے جب لفظ تبرّج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے: ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حُسن لوگوں کو دکھائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ یہی تشریح اس لفظ کی اکابرِ اہلِ لُغت اور اکابرِ مفسرین نے کی ہے۔ مجاہدؒ، قَتَادَہؒ اور ابنِ ابی نَجِیح کہتے ہیں: التبرّج المشی بتبختُر وتکسر وتغنج ''تبرّج کے معنیٰ ہیں ناز و ادا کے ساتھ لچکے کھاتے اور اِٹھلاتے ہوئے چلنا۔'' مقاتِل کہتے ہیں: ابداء قلائدھا وقرطھا وعنقھا ''عورت کا اپنے ہار اور اپنے بُندے اور اپنا گلا نمایاں کرنا۔'' اَلْمُبَرِّد کا قول ہے: ان تبدی من محاسنھا ما یجب علیھا سترہٗ ''یہ کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کر دے جن کو اسے چھپانا چاہیے۔'' ابوعُبَیدہ کی تفسیر ہے: ان تُخرج من محاسنھا تستدعی بہٖ شھوۃ الرِّجَال ''یہ کہ عورت اپنے جسم و لباس کے حسن کو نمایاں کرے جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔''

جاہلیّت کا لفظ قرآنِ مجید میں اس مقام کے علاوہ تین جگہ اور استعمال ہوا ہے۔ ایک، آلِ عمران کی آیت ۱۵۴ میں، جہاں اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چُرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ''اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیّت کے سے گمان رکھتے ہیں۔'' دوسرے، سورۂ مائدہ، آیت ۵۰ میں، جہاں خدا کے قانون کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنے مقدّمات کا فیصلہ کرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا: ''کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟'' تیسرے، سورۂ فتح، آیت ۲۶ میں، جہاں کفارِ مکہ کے اس فعل کو ''حَمِیّتِ جاہلیہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض تعصب کی بنا پر مسلمانوں کو عُمرہ نہ کرنے دیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوالدَّرداءؓ نے کسی شخص سے جھگڑا کرتے ہوئے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: ''تم میں ابھی تک جاہلیّت موجود ہے۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''تین کام جاہلیت کے ہیں: دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا، اور مُردوں پر نوحہ کرنا۔'' ان تمام استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرزِ عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ اور جاہلیّتِ اُولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حُسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو کیونکہ تمھارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ

زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دُور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔[۵۰] یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی اُن باتوں کو جو تمھارے گھروں میں

اس سے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دَورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بَن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حُسن کو زیب و زینت اور چُست لباسوں یا عُریاں لباسوں سے نمایاں کرنا، اور ناز و ادا سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رُو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرماؤں کے پاس آ گیا ہے جس سے اسلام کی یہ نئی روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جا رہی ہے تو بات دوسری ہے۔

۵۰ – جس سیاق و سباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور ماقبل و مابعد کی پوری تقریر میں وہی مخاطب ہیں۔ علاوہ بریں ”اہل البیت“ کا لفظ عَرَبی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم ”گھر والوں“ کا لفظ بولتے ہیں، اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے، دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کر کے ”اہلِ خانہ“ کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآنِ مجید میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل، بلکہ مقدّم ہے۔ سورۂ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سُن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں: اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ”کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اِس گھر کے لوگو! تم پر تو اللہ کی رحمت ہے اور اس کی برکتیں ہیں۔“ سورۂ قصص میں جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی انّا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ ”کیا میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتا دوں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمہ لیں؟“ پس محاورہ، اور قرآن کے استعمالات، اور خود اس آیت کا سیاق و سباق، ہر چیز اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت میں آپؐ کی ازواجِ مطہرات بھی داخل ہیں اور آپؐ کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہومِ لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بنا پر ابنِ عباسؓ اور عُروہؒ بن زبیرؓ اور عِکرمہؒ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ”اَھْلَ الْبَیْتِ“ کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہوسکتا، تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ ”گھر والوں“ کے لفظ میں آدمی کے سب اہل وعیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابنِ ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: تسألنی عن رجل کان من احبّ الناس الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کانت تحتہ ابنتہ واحبّ الناس الیہ۔ ”تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضورؐ کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔“ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضورؐ نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اھلُ بیتی فَاَذْھِبْ عنھُمُ الرّجس وطھّرھم تطھیرًا ”خدایا! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے گندگی کو دُور کردے اور انھیں پاک کردے۔“ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: میں بھی تو آپؐ کے اہلِ بیت میں سے ہوں۔ (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کرکے میرے حق میں دعا فرمائیے۔) حضورؐ نے فرمایا: ”تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔“ اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد، ابنِ جریر، حاکم، بیہقی وغیرہ محدثین نے ابوسعید خُدریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ، حضرت واثِلہؓ بن اَسقَع اور بعض دوسرے صحابہؓ سے نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحب زادوں کو اپنا اہل البیت قرار دیا۔ لہٰذا اُن لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان حضرات کو اس سے خارج ٹھیراتے ہیں۔

اسی طرح اُن لوگوں کی رائے بھی غلط ہے جو مذکورۂ بالا احادیث کی بنیاد پر ازواجِ مطہراتؓ کو اہل البیت سے خارج ٹھیراتے ہیں۔ اوّل تو جو چیز صراحتاً قرآن سے ثابت ہو اس کو کسی حدیث کے بل پر رد نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے، خود ان احادیث کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ان سے نکالا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضورؐ نے ان چاروں اصحاب کو لیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضورؐ نے ان کو اپنے ”گھر والوں“ سے خارج قرار دیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں تو اہلِ بیت میں شامل تھیں ہی، کیونکہ قرآن نے انھی کو مخاطب کیا تھا، لیکن حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہرِ قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہوجائے کہ یہ اہلِ بیت سے خارج ہیں، اس لیے آپؐ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی نہ کہ ازواجِ مطہراتؓ کے حق میں۔

ایک گروہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کو ”اہل البیت“ سے خارج کرکے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے لیے اس لفظ کو خاص کردیا، بلکہ اس پر مزید ستم یہ بھی کیا ہے کہ اس کے الفاظ ”اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے“ سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد انبیاؑ کی طرح معصوم ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ”گندگی“ سے مراد خطا اور گناہ ہے اور ارشادِ الٰہی کی رو سے یہ اہل البیت اس سے پاک کردیے گئے ہیں۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ تم سے گندگی دُور کردی گئی اور تم بالکل پاک کردیے گئے۔ بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تم سے گندگی کو دُور کرنا اور تمھیں پاک کردینا چاہتا ہے۔ سیاق وسباق بھی یہ نہیں بتاتا کہ یہاں مناقبِ اہلِ بیت بیان کرنے مقصود ہیں، بلکہ یہاں تو اہلِ بیت کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو، اس لیے کہ اللہ تمھیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۟ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ

سُنائی جاتی ہیں[۵۱]۔ بے شک اللہ لطیف[۵۲] اور باخبر ہے ؏

بالیقین[۵۳] جو مرد اور جو عورتیں مُسلم ہیں[۵۴]، مومن ہیں[۵۵]، مُطیع فرمان ہیں[۵۶]، راست باز ہیں[۵۷]،

مطلب یہ ہے کہ تم فلاں رویّہ اختیار کرو گے تو پاکیزگی کی نعمت تمھیں نصیب ہوگی ورنہ نہیں۔ تاہم اگر یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ اللہ نے ان کو معصوم کر دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو اور غسل اور تیمم کرنے والے سب مسلمانوں کو معصوم نہ مان لیا جائے کیونکہ ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ "مگر اللہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردے۔" (المائدہ، آیت ۶)

۵۱ – اصل میں لفظ وَاذْکُرْنَ استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنی ہیں: "یاد رکھو" اور "بیان کرو"۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ کی بیویو! تم کبھی اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ تمھارا گھر وہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے تمھاری ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی گھر میں لوگ جاہلیت کے نمونے دیکھنے لگیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیویو! جو کچھ تم سنو اور دیکھو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتی رہو، کیونکہ رسولؐ کے ساتھ ہر وقت کی معاشرت سے بہت سی ہدایات تمھارے علم میں ایسی آئیں گی جو تمھارے سوا کسی اور ذریعے سے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکیں گی۔

اِس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک، آیات اللہ۔ دوسرے حکمت۔ آیات اللہ سے مراد تو کتاب اللہ کی آیات ہی ہیں۔ مگر حکمت کا لفظ وسیع ہے جس میں وہ تمام دانائی کی باتیں آجاتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس لفظ کا اِطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے، مگر صرف انھی کے ساتھ اس کو خاص کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کی آیات سنانے کے علاوہ جس حکمت کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرت پاک سے اور اپنے ارشادات سے دیتے تھے وہ بھی لامحالہ اس میں شامل ہے۔ بعض لوگ محض اس بنیاد پر کہ آیت میں مَا یُتْلٰی (جو تلاوت کی جاتی ہیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیات اللہ اور حکمت سے مراد صرف قرآن ہے، کیونکہ "تلاوت" کا لفظ اصطلاحاً قرآن کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہ اِستدلال بالکل غلط ہے۔ تلاوت کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر قرآن یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دینا بعد کے لوگوں کا فعل ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۲ میں یہی لفظ جادو کے ان منتروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ "انھوں نے پیروی کی اُس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے (یعنی جسے سناتے تھے) شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اس لفظ کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے، کتاب اللہ کی آیات سنانے کے لیے اصطلاحاً مخصوص نہیں کرتا۔

۵۲ – اللہ لطیف ہے، یعنی مخفی سے مخفی باتوں تک اس کا علم پہنچ جاتا ہے۔ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ

صابر ہیں،[۵۸] اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں[۵۹]، صدقہ دینے والے ہیں[۶۰]، روزہ رکھنے والے ہیں[۶۱]، اپنی شرمگاہوں کی

۵۳ - پچھلے پیراگراف کے بعد متصلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ اُوپر ازواجِ مطہرات کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اُن کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ مسلم معاشرے کو بالعموم اپنے کردار کی اصلاح انھی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے۔

۵۴ - یعنی جنھوں نے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں، جن کے اندر اسلام کے دیے ہوئے طریق فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مُزاحمت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس کی اطاعت اور اتباع کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

۵۵ - یعنی جن کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، بادلِ ناخواستہ نہیں ہے، بلکہ دل سے وہ اسلام ہی کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے، وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے۔ جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے غلط کہہ دیا ہے ان کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے، اور جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حق کہہ دیا ہے ان کا اپنا دل و دماغ بھی اسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔ ان کے نفس اور ذہن کی حالت یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سنت سے جو حکم ثابت ہو اسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں اور اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ کسی طرح اسے بدل کر اپنی رائے کے مطابق، یا دنیا کے چلتے ہوئے طریقوں کے مطابق ڈھال بھی دیا جائے اور یہ الزام بھی اپنے سر نہ لیا جائے کہ ہم نے حکمِ خدا اور رسولؐ میں ترمیم کر ڈالی ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی صحیح کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًّا وبالاسلام دینا وبمحمدٍ رسُولا۔ (مسلم)

ایمان کا لذت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو، اور اسلام ہی اس کا دین ہو، اور محمدؐ ہی اس کے رسول ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپؐ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعًا لما جئتُ بہٖ۔ (شرحُ السُّنّۃ)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اُس چیز کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔

۵۶ - یعنی وہ محض مان کر رہ جانے والے ہی نہیں ہیں بلکہ عملاً اطاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمان داری کے ساتھ حق تو اسی چیز کو مانیں جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے مگر عملاً اس کی خلاف ورزی کریں، اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو ان سب کاموں کو بُرا ہی سمجھتے رہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب انھی کا کرتے چلے جائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً

حفاظت کرنے والے ہیں،[۶۲] اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں،[۶۳] اللہ نے ان کے لیے مغفرت

۵۷ – یعنی اپنی گفتار میں بھی سچے ہیں اور اپنے معاملات میں بھی کھرے ہیں۔ جھوٹ، فریب، بدنیتی، دغا بازی اور چھل بٹے ان کی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی زبان وہی بولتی ہے جسے اُن کا ضمیر صحیح جانتا ہے۔ وہ کام وہی کرتے ہیں جو ایمان داری کے ساتھ ان کے نزدیک راستی و صداقت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور جس سے بھی وہ کوئی معاملہ کرتے ہیں دیانت کے ساتھ کرتے ہیں۔

۵۸ – یعنی خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے اور خدا کے دین کو قائم کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں اور جن نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑے، ان کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا ان کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۵۹ – یعنی وہ تکبُّر اور استکبار اور غرورِ نفس سے خالی ہیں۔ وہ اس حقیقت کا پورا شعور و احساس رکھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور بندگی سے بالاتر ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے دل اور جسم دونوں ہی اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا خوف غالب رہتا ہے۔ ان سے کبھی وہ رَویّہ ظاہر نہیں ہوتا جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا اور خدا سے بے خوف لوگوں سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ترتیبِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِس عام خدا ترسانہ رَویّے کے ساتھ خاص طور پر ''خشوع'' سے مراد نماز ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی صدقے اور روزے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۶۰ – اس سے مراد صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ عام خیرات بھی اس میں شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے اپنے مال صَرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی مدد کرنے میں اپنی حدِ استطاعت تک وہ کوئی دریغ نہیں کرتے۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج آدمی اُن کی بستیوں میں دستگیری سے محروم نہیں رہتا۔ اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت پیش آ جائے تو اس پر اپنے مال لُٹا دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

۶۱ – اس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔

۶۲ – اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ برہنگی و عُریانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ برہنگی و عریانی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی لباس کے بغیر بالکل ننگا ہو جائے۔ بلکہ ایسا لباس پہننا بھی برہنگی ہی ہے جو اتنا رقیق ہو کہ جسم اس میں سے جھلکتا ہو، یا اتنا چست ہو کہ جسم کی ساخت اور اس کے نشیب و فراز سب اُس میں سے نمایاں نظر آتے ہوں۔

۶۳ – اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اُتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور

وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۵﴾ وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ

اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[۶۴]

کسی[۶۵] مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کسی

اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمدُللہ، اِن شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طالب گار ہو گا۔ ہر مشکل میں اس سے رُجوع کرے گا۔ ہر بُرائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہو گا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض اِن خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشو ونما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پَل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عن معاذ بن انس الجهني عن رسول الله صلی الله علیه و سلم ان رجلاً سأله ای المجاهدین اعظمُ اجرًا یا رسُول الله؟ قال اکثرهم للهِ تعالٰی ذکرًا۔ قال ایُّ الصائمین اکثر اجرا؟ قال اکثرهم لِلهِ عزّوجل ذکرًا۔ ثم ذکر الصلٰوة و الزکٰوة والحجّ والصَّدَقَة کل ذٰلك یقول رسول الله صلی الله علیه وسلم اکثرهم لِلهِ ذکرًا۔ (مُسندِ احمد)

مُعاذؓ بن اَنَس جُہَنی رِوایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ ”جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔“

۶۴ – اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قدر و قیمت کن اوصاف کی ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی قدریں (basic values) ہیں جنھیں ایک فقرے کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے۔ اِن قدروں کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان

Maktaba Tul Ishaat.com

رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ؕ۳۶

معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔[۶۶]

کوئی فرق نہیں ہے۔عمل کے لحاظ سے تو بلاشبہ دونوں صِنفوں کا دائرۂ کار الگ ہے۔مردوں کو زندگی کے کچھ شعبوں میں کام کرنا ہے اور عورتوں کو کچھ اور شعبوں میں۔لیکن اگر یہ اوصاف دونوں میں یکساں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں کا مرتبہ یکساں اور دونوں کا اجر برابر ہوگا۔اس لحاظ سے ان کے مرتبے اور اجر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ ایک نے چُولھا چکی سنبھالا اور دوسرے نے خلافت کی مَسنَد پر بیٹھ کر احکامِ شریعت جاری کیے ایک نے گھر میں بچے پالے اور دوسرے نے میدانِ جنگ میں جا کر اللہ اور اس کے دین کے لیے جان لڑائی۔

۶۵ – یہاں سے وہ آیات شروع ہوتی ہیں جو حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئی تھیں۔

۶۶ – ابنِ عباسؓ، مُجاہدؒ، قَتادہ، عِکرِمہؒ اور مُقاتِلؒ بن حیّان کہتے ہیں کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا تھا اور حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ جب حضورؐ نے یہ پیغام دیا تو حضرت زینبؓ نے کہا: انا خیر منہ نسبًا، ”میں اُس سے نسب میں بہتر ہوں۔“ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ: لا ارضاہ لنفسی وانا ایم قریش۔ ”میں اُسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی ہوں۔“ اسی طرح کا اظہارِ ناراضامندی اُن کے بھائی عبداللہ بن جَحش رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔اس لیے کہ حضرت زیدؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی (اُمَیمہ بنتِ عبدالمُطّلِب) کی صاحب زادی تھیں۔ان لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی، اور وہ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ حضورؐ کی اپنی پھوپھی زاد بہن ہے، اور اس کا پیغام آپؐ اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے دے رہے ہیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اسے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے سب خاندان والوں نے بلاتأمّل سرِ اطاعت خم کر دیا۔اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح پڑھایا، خود حضرت زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ دِرہم مَہر ادا کیا، چڑھاوے کے کپڑے دیے، اور کچھ سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے، اور اس کا اطلاق پورے اسلامی نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔اس کی رو سے کسی مسلمان فرد، یا قوم، یا ادارے، یا عدالت، یا پارلیمنٹ، یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ خود اپنی آزادیِ رائے استعمال کرے۔مسلمان ہونے کے معنیٰ ہی خدا اور رسولؐ کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔کسی شخص یا قوم کا

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ

اے نبیؐ [۶۷] ! یاد کرو وہ موقع جب تم اُس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا [۶۸] کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر"[۶۹] اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ کھولنا چاہتا تھا،

مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رویّوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً حکمِ خدا اور رسولؐ کے آگے جھک جانا ہو گا۔ اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے، خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

۶۷ – یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اُس وقت نازل ہوا جب حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کر چکے تھے اور اس پر منافقین، یہود اور مشرکین نے آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اُن دشمنوں کی تفہیم کے لیے نہیں تھے جو قصداً حضورؐ کو بدنام کرنے اور اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے جھوٹ اور بہتان اور طعن و تشنیع کی مہم چلا رہے تھے۔ بلکہ اصل مقصود مسلمانوں کو اُن کی اِس مہم کے اثرات سے بچانا اور ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے محفوظ کرنا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام منکرین کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے اگر اطمینان نصیب ہو سکتا تھا تو انھی لوگوں کو جو جانتے اور مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اِن بندگانِ حق کے متعلق اس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دشمنوں کے اعتراضات کہیں ان کے دلوں میں بھی شک اور ان کے دماغوں میں بھی اُلجھن نہ پیدا کر دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تمام امکانی شبہات کا ازالہ فرمایا، اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بتایا کہ ان حالات میں ان کا رویّہ کیا ہونا چاہیے۔

۶۸ – مراد ہیں حضرت زیدؓ، جیسا کہ آگے بصراحت بیان فرما دیا گیا ہے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کا احسان کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان کیا؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً یہاں اُن کا قصہ بیان کر دیا جائے۔ یہ دراصل قبیلۂ کَلب کے ایک شخص حارِثہ بن شَراحیل کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثَعلَبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی مَعن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچّے تھے اس وقت ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قَین بن جَسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لُوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے اُن میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عُکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انھوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خدیجہؓ کا جب نکاح ہوا تو حضورؐ نے ان کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انھیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ

تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ اس سے اپنی

تھا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتا چلا کہ ہمارا بچہ مکے میں ہے۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپؐ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انھوں نے کہا: یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بُلا کر پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا: اِن دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا، تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمھیں پوری آزادی ہے کہ چاہو اِن کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو میرے ساتھ رہو۔ انھوں نے جواب دیا: میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا: زید! کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اِس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں اُن کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زیدؓ کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے ایک لمحہ شک و تردُّد کے بغیر آپؐ سے نبوت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ۴ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا، اپنی طرف سے اُن کا مَہر ادا کیا، اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔

یہی حالات ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ اِن الفاظ میں اشارہ فرما رہا ہے کہ ’’جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا‘‘

۶۹ – یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے، اور انھوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخرِ کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں، اُن کے اپنے خاندان کے پروَردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے اِزدِواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زیدؓ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ

حاجت پوری کر چکا[۷۱] تو ہم نے اس (مُطلّقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا[۷۲] تاکہ مومنوں پر اپنے بولے بیٹوں کی

۷۰ - بعض لوگوں نے اس فقرے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے، اور آپؐ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زیدؓ ان کو طلاق دے دیں، مگر جب انھوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپؐ نے، معاذاللہ! اوپری دل سے ان کو منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔" حالاں کہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر اس سورہ کی آیات نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۷ کے ساتھ ملا کر یہ فقرہ پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت زیدؓ اور ان کی اہلیہ کے درمیان تلخی بڑھتی چلی جا رہی تھی اُسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ کر چکا تھا کہ زیدؓ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو ان کی مُطلّقہ خاتون سے آپؐ کو نکاح کرنا ہوگا لیکن چونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ عرب کی اس سوسائٹی میں منہ بولے بیٹے کی مُطلّقہ سے نکاح کرنا کیا معنی رکھتا ہے ـــــ اور وہ بھی عین اس حالت میں جب کہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپؐ کے خلاف پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا ـــــ اس لیے آپؐ اس شدید آزمائش میں پڑنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اسی بنا پر جب حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپؐ کا منشا یہ تھا کہ یہ شخص طلاق نہ دے تو میں اس بلا میں پڑنے سے بچ جاؤں، ورنہ اس کے طلاق دے دینے کی صورت میں مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر مجھ پر وہ کیچڑ اُچھالی جائے گی کہ پناہ بخدا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو اُولُوالعزمی اور رضا بالقضا کے جس بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتا تھا اُس کے لحاظ سے حضورؐ کی یہ بات اُس کو فروتر نظر آئی کہ آپؐ نے قصداً زیدؓ کو طلاق سے روکا تاکہ آپؐ اس کام سے بچ جائیں جس میں آپؐ کو بدنامی کا اندیشہ تھا، حالانکہ اللہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر وہ کام آپؐ سے لینا چاہتا تھا۔ "تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو" کے الفاظ صاف صاف اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہی بات اس آیت کی تشریح میں امام زین العابدین حضرت علیؓ بن حسینؓ نے فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے چکا تھا کہ زینبؓ آپؐ کی بیویوں میں شامل ہونے والی ہیں، مگر جب زیدؓ نے آکر ان کی شکایت آپؐ سے کی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھیں پہلے خبر دے چکا تھا کہ میں تمھارا نکاح زینبؓ سے کرنے والا ہوں۔ تم زیدؓ سے یہ بات کہتے وقت اُس بات کو چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔" (ابنِ جریر، ابنِ کثیر بحوالہ ابنِ ابی حاتم)

علامہ آلوسی نے بھی تفسیر رُوح المعانی میں اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ عتاب ہے ترک اَولیٰ پر۔ اس حالت میں اَولیٰ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے، یا زیدؓ سے فرما دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ عتاب کا ماحَصَل یہ ہے کہ تم نے زیدؓ سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو، حالانکہ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ زینبؓ تمھاری بیویوں میں شامل ہوں گی۔"

۷۱ - یعنی جب زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان کی عدت پوری ہوگئی۔ "حاجت پوری کر چکا" کے الفاظ سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَزۡوَاجِ اَدۡعِيَآئِهِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا‌ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ
مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۰﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِىِّ مِنۡ حَرَجٍ فِيۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ
لَهٗ‌ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ‌ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقۡدُوۡرَا ۙ﴿۳۱﴾ الَّذِيۡنَ يُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخۡشَوۡنَهٗ

بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں[۷۳]۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبیؐ پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو[۷۴]۔ یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاؑ کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے[۷۵]۔ (یہ اللہ کی سنت ہے اُن لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں

خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زیدؓ کی اس سے کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ اور یہ صورتِ حال محض طلاق دے دینے سے رونما نہیں ہوتی، کیونکہ عدت کے دَوران میں شوہر کو اگر کچھ دلچسپی باقی ہو تو وہ رُجوع کر سکتا ہے، اور شوہر کی یہ حاجت بھی مُطلّقہ بیوی سے باقی رہتی ہے کہ اس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا پتا چل جائے۔ اس لیے مُطلّقہ بیوی کے ساتھ اس کے سابق شوہر کی حاجت صرف اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب عدت گزر جائے۔

۷۲ - یہ الفاظ اس باب میں صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کیا تھا۔

۷۳ - یہ الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی ضرورت اور مَصلحت کی خاطر کرایا تھا جو اس تدبیر کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ عرب میں منہ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط رُسوم رائج ہو گئی تھیں، ان کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر ان کو توڑ ڈالے۔ لہٰذا یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔

۷۴ - ان الفاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو اس طرح کا نکاح محض مباح ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک فرض تھا جو اللہ نے آپؐ پر عائد کیا تھا۔

۷۵ - یعنی انبیاؑ کے لیے ہمیشہ سے یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس پر عمل کرنا ان کے لیے قضائے مُبرَم ہے جس سے کوئی مَفر اُن کے لیے نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر کوئی کام فرض کر دے تو اسے وہ کام کر کے ہی رہنا ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا اس کی مخالفت پر تُل گئی ہو۔

وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ
اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ ۙ

ع ۲

اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور محاسبے کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔[۷۶]

(لوگو) محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[۷۷] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام

۷۶ – اصل الفاظ ہیں: کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا۔ اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ ہر خوف اور خطرے کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی اور کی باز پُرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۷۷ – اس ایک فقرے میں اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

اُن کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپؐ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "محمدؐ تمھارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"، یعنی جس شخص کی مطلّقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اس کی مُطلّقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہوسکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا: "مگر وہ اللہ کے رسول ہیں"، یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمھاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حِلّت کے معاملے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النّبیین ہیں"، یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار، کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح اُن کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے، لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعے سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرایا تو پھر کوئی دوسری ہستی

Maktaba Tul Ishaat.com

سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

اس کی تسبیح کرتے رہو[۷۸]۔ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمھارے لیے دُعائے رحمت کرتے ہیں، تاکہ وہ تمھیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان[۷۹] ہے۔ جس روز وہ اس سے ملیں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا[۸۰] اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔

دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں سے کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالم گیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدُّس کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اُس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہیّت کے ہر تصور کا قلع قمع کردے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تأویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس لیے ختمِ نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم نے اِس سورہ کی تفسیر کے آخر میں ایک مفصل ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔

۷۸ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے رسولؐ پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہو اور دینِ حق کو زک پہنچانے کے لیے ذاتِ رسولؐ کو ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو، ایسی حالت میں اہلِ ایمان کا کام نہ تو یہ ہے کہ ان بے ہودگیوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں، اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں، اور نہ یہ کہ جواب میں ان سے گالم گلوچ کرنے لگیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خُصوصیّت کے ساتھ اللہ کو اور زیادہ یاد کریں۔ ''اللہ کو کثرت سے یاد کرنے'' کا مفہوم حاشیہ ۶۳ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد دائماً تسبیح کرتے رہنا ہے۔ اور تسبیح کے معنیٰ اللہ کی پاکیزگی بیان کرنے کے ہیں، نہ کہ محض دانوں والی تسبیح پھرانے کے۔

۷۹ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ کفار و منافقین کی ساری جلن اور کُڑھن اس رحمت ہی کی وجہ سے ہے جو اللہ کے اس رسول کی بدولت تمھارے اُوپر ہوئی ہے۔ اُسی کے ذریعے سے ایمان کی دولت تمھیں نصیب ہوئی، کفر و جاہلیّت کی تاریکیوں سے نکل کر تم اسلام کی روشنی میں آئے، اور تمھارے اندر یہ بلند اَخلاقی و اجتماعی اوصاف پیدا ہوئے جن کے باعث تم عَلانیَہ دوسروں سے برتر نظر آتے ہو۔ اسی کا غصہ ہے جو حاسد لوگ اللہ کے رسولؐ پر نکال رہے ہیں۔ اس حالت میں کوئی ایسا رَویّہ اختیار نہ کر بیٹھنا جس سے تم

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ

اے نبیؐ[81]! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر[82]، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر[83]، اللہ کی اجازت

خدا کی اس رحمت سے محروم ہو جاؤ۔

صلوٰۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی رحمت، مہربانی اور شفقت کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی دعائے رحمت کے ہوتے ہیں، یعنی ملائکہ انسانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ان پر فضل فرما اور اپنی عنایات سے انھیں سرفراز کر۔ ایک مفہوم يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ کا یہ بھی ہے کہ یشیع عنکم الذکر الجمیل فی عباد اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے بندوں کے درمیان ناموری عطا فرماتا ہے اور تمھیں اس درجے کو پہنچا دیتا ہے کہ خلق خدا تمھاری تعریف کرنے لگتی ہے اور ملائکہ تمھاری مدح وثنا کے چرچے کرتے ہیں۔

۸۰ - اصل الفاظ ہیں: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ "ان کا تحیہ اس سے ملاقات کے روز سلام ہوگا۔" اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ خود السّلام علیکم کے ساتھ ان کا استقبال فرمائے گا، جیسا کہ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (آیت ۵۸) دوسرے، یہ کہ ملائکہ ان کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ نحل میں ارشاد ہوا:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"جن لوگوں کی رُوحیں ملائکہ اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے، اُن سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے اُن نیک اعمال کی بدولت جو تم دنیا میں کرتے تھے۔" (آیت ۳۲) تیسرے، یہ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ یونس میں فرمایا: دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ خدایا! پاک ہے تیری ذات، ان کا تحیہ ہوگا سلام، اور اُن کی تان ٹوٹے گی اس بات پر کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔" (آیت ۱۰)

۸۱ - مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو خطاب کر کے چند کلماتِ تسکین ارشاد فرماتا ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آپ کو ہم نے یہ کچھ مراتب عالیہ بخشے ہیں، آپؐ کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ یہ مخالفین اپنے بہتان و افترا کے طوفان اُٹھا کر آپؐ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ لہٰذا آپؐ نہ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ ہوں اور نہ ان کے پروپیگنڈے کو پرِکاہ کے برابر بھی کوئی وقعت دیں۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے جائیے اور انھیں جو کچھ ان کا جی چاہے بکنے دیجیے۔ اس کے ساتھ ضمناً تمام خلق کو، جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے، بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔

۸۲ - نبیؐ کو "گواہ" بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں:

ایک قولی شہادت، یعنی یہ کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اُصولوں پر مبنی ہے، نبیؐ ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔ خدا کی ہستی اور اس کی توحید، ملائکہ کا وجود، وحی کا

Maktaba Tul Ishaat.com

نُزول، حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظہور خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے دیوانہ کہے، مگر نبی کسی کی پروا کیے بغیر اٹھے اور ہانک پکار کر کہہ دے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ جو اسے نہیں مانتے۔ اسی طرح اَخلاق اور تہذیب اور تمدّن کے جو تصورات، اقدار، اُصول اور ضابطے خدا نے اس پر منکشف کیے ہیں، انھیں اگر ساری دنیا غلط کہتی ہو اور ان کے خلاف چل رہی ہو تب بھی نبی کا کام یہ ہے کہ انھی کو عَلَی الاعلان پیش کرے اور اُن تمام خیالات اور طریقوں کو غلط قرار دے جو ان کے خلاف دنیا میں رائج ہوں۔ اسی طرح جو کچھ خدا کی شریعت میں حلال ہے نبی اس کو حلال ہی کہے خواہ ساری دنیا اسے حرام سمجھتی ہو، اور جو کچھ خدا کی شریعت میں حرام ہے نبی اس کو حرام ہی کہے، خواہ ساری دنیا اسے حلال و طیّب قرار دے رہی ہو۔

دوسرے عملی شہادت، یعنی یہ کہ نبی اپنی پوری زندگی میں اُس مسلک کا عملاً مظاہرہ کرے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ جس چیز کو وہ بُرائی کہتا ہے اُس کے ہر شائبے سے اس کی زندگی پاک ہو۔ جس چیز کو وہ بھلائی کہتا ہے اس کی اپنی سیرت میں وہ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ جس چیز کو وہ فرض کہتا ہے اسے ادا کرنے میں وہ سب سے بڑھ کر ہو۔ جس چیز کو وہ گناہ کہتا ہے اس سے بچنے میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکے۔ جس قانونِ حیات کو وہ خدا کا قانون کہتا ہے اسے نافذ کرنے میں وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس کا اپنا اخلاق و کردار اس بات پر گواہ ہو کہ وہ اپنی دعوت میں کس قدر سچّا اور کتنا مخلص ہے۔ اور اس کی ذات اس کی تعلیم کا ایسا مجسّم نمونہ ہو جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ جس دین کی طرف وہ دنیا کو بلا رہا ہے وہ کس معیار کا انسان بنانا چاہتا ہے، کیا کردار اُس میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور کیا نظامِ زندگی اُس سے برپا کرانا چاہتا ہے۔

تیسرے اُخروی شہادت، یعنی آخرت میں جب اللہ کی عدالت قائم ہو اس وقت نبی اس امر کی شہادت دے کہ جو پیغام اس کے سُپرد کیا گیا تھا وہ اس نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق واضح کر دینے میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اِسی شہادت پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ماننے والے کس جزا کے، اور نہ ماننے والے کس سزا کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کے مقام پر کھڑا کر کے اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی تھی اور وہ کیسی عظیم شخصیت ہونی چاہیے جو اس مقامِ بلند پر کھڑی ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ حق کی قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے، تبھی تو آخرت میں آپؐ یہ شہادت دے سکیں گے کہ میں نے لوگوں پر حق پوری طرح واضح کر دیا تھا، اور تبھی اللہ کی حجت لوگوں پر قائم ہوگی۔ ورنہ اگر، معاذ اللہ! آپؐ ہی سے یہاں شہادت ادا کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو نہ آپؐ آخرت میں اُن پر گواہ ہو سکتے ہیں اور نہ منکرینِ حق کے خلاف مقدّمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس شہادت کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں لوگوں کے اعمال پر شہادت دیں گے، اور اس سے وہ یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ حضورؐ تمام لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ بے دیکھے شہادت کیسے دے سکیں گے۔ لیکن قرآنِ مجید کی رُو سے یہ تاویل قطعاً غلط ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں کے اعمال پر شہادت قائم کرنے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا ہی انتظام فرمایا ہے۔ اس غرض کے لیے اُس کے فرشتے ہر شخص کا نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں

(مُلاحظہ ہو: قٓ، آیات ۱۷-۱۸۔ اور الکہف، آیت ۴۹) اور اس کے لیے وہ لوگوں کے اپنے اعضا سے بھی گواہی لے لے گا۔ (یٰسٓ ۶۵۔ حٰمٓ السجدہ ۲۰-۲۱) رہے انبیا علیہم السلام، تو ان کا کام بندوں کے اعمال پر گواہی دینا نہیں بلکہ اس بات پر گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ قرآن صاف فرماتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ (المائدہ:۱۰۹)

جس روز اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ تمھاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا، تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں، تمام غیب کی باتوں کو جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔

اور اسی سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب اُن سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال ہوگا تو وہ عرض کریں گے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدہ:۱۱۷)

میں جب تک ان کے درمیان تھا، اسی وقت تک اُن پر گواہ تھا۔ جب آپ نے مجھے اُٹھا لیا تو آپ ہی ان پر نگراں تھے۔

یہ آیات اِس باب میں بالکل صریح ہیں کہ انبیا علیہم السلام اعمالِ خَلق کے گواہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہ گواہ کس چیز کے ہوں گے؟ اس کا جواب قرآن اتنی ہی صراحت کے ساتھ یہ دیتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (البقرہ، ۱۴۳)

اور اَے مسلمانو! اِسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمتِ وَسَط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النحل، ۸۹)

اور جس روز ہم ہر اُمت میں انھی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو اُن پر گواہی دے گا اور (اے محمدؐ) تمھیں اِن لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اپنی نوعیت میں اُس شہادت سے مختلف نہ ہوگی جسے ادا کرنے کے لیے حضورؐ کی اُمت کو اور ہر اُمت پر گواہی دینے والے شہدا کو بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو ان سب کا بھی حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ گواہ صرف اس امر کی شہادت دینے کے لیے بلائے جائیں گے کہ خلق تک اس کے خالق کا پیغام پہنچ گیا تھا تو لامحالہ حضورؐ بھی اسی غرض کے لیے پیش ہوں گے۔

اسی مضمون کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن کو بخاری، مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ اور امام احمد وغیرہم نے عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، ابوالدرداؓ، انسؓ بن مالک اور بہت سے دوسرے صحابہؓ سے نقل کیا ہے، جن کا مشترک مضمون یہ ہے کہ نبیؐ قیامت کے روز اپنے بعض اصحاب کو دیکھیں گے کہ وہ لائے جا رہے ہیں، مگر وہ آپؐ کی طرف آنے کے بجائے دوسرے رُخ پر جا رہے ہوں گے یا دھکیلے جا رہے ہوں گے۔ حضورؐ اُن کو دیکھ کر عرض کریں گے کہ خدایا! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمھارے بعد انھوں نے کیا کرتوت کیے ہیں۔ یہ مضمون اتنے صحابہؓ سے اتنی کثیر سندوں کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ اس کی

Maktaba Tul Ishaat.com

دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝۴۶ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝۴۷ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ
وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۴۸

سے اُس کی طرف دعوت دینے والا[۸۴] بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہرگز نہ دبو کفّار و منافقین سے، کوئی پروانہ کرو ان کی اذیّت رسانی کی اور بھروسا کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔

صحت میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ اور اس سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے ایک ایک شخص اور اس کی ایک ایک حرکت کے شاہد قطعاً نہیں ہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ حضورؐ کے سامنے آپؐ کی اُمت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، تو وہ کسی طرح بھی اس مضمون سے متعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو اُمت کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ کب ہیں کہ حضورؐ ہر شخص کے اعمال کا عینی مشاہدہ فرما رہے ہیں۔

۸۳ – یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھیے کہ کسی شخص کا بطورِ خود ایمان و عملِ صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر و بدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اَور بات ہے اور کسی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشر و نذیر بنا کر بھیجا جانا بالکل ہی ایک دوسری بات۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصب پر مامور ہو وہ تو اپنی بشارت اور اپنے انذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا کسی کام پر بشارت دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ جس احکم الحاکمین کی طرف سے وہ بھیجا گیا ہے وہ اس کام کے پسندیدہ اور مستحقِ اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے، لہٰذا وہ یقیناً فرض یا واجب یا مستحب ہے اور اس کا کرنے والا ضرور اجر پائے گا۔ اور اس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ قادرِ مُطلق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا۔ یہ حیثیت کسی غیر مامور کی بشارت اور تنبیہ کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۸۴ – یہاں بھی ایک عام مبلّغ کی تبلیغ اور نبی کی تبلیغ کے درمیان وہی فرق ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ تو ہر مُبلّغ دیتا اور دے سکتا ہے، مگر وہ اللہ کی طرف سے اِس کام پر مامور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی اللہ کے اِذن (sanction) سے دعوت دینے اٹھتا ہے۔ اس کی دعوت نری تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کے بھیجنے والے ربّ العالمین کی فرمانروائی کا زور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے بھیجے ہوئے داعی کی مزاحمت خود اللہ کے خلاف جنگ قرار پاتی ہے، جس طرح دنیوی حکومتوں میں سرکاری کام انجام دینے والے سرکاری ملازم کی مزاحمت خود حکومت کے خلاف جنگ سمجھی جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے[۸۵] دو تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔[۸۶]

۸۵ – یہ عبارت اس باب میں صریح ہے کہ یہاں لفظِ نکاح کا اطلاق صرف عقد پر کیا گیا ہے۔ علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عَرَبی زبان میں نکاح کے اصل معنیٰ کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں معناً مشترک ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ عقدِ تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چوتھا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ وطی کے ہیں اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ثُبوت میں ہر گروہ نے کلامِ عرب سے شواہد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن راغب اصفہانیؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اصل النکاح العقد ثم استعیر للجماع ومحال ان یکون فی الاصل للجماع ثم استعیر للعقد۔ ”لفظِ نکاح کے اصل معنیٰ عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارتاً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنیٰ جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔“ اِس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عَرَبی زبان، یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقتاً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فُحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتاً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کرے۔ اس معنیٰ کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذَّب الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

جہاں تک قرآن اور سنت کا تعلق ہے، ان میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد یا تو مُجرّد عقد ہے، یا پھر وطی بعدِ عقد۔ لیکن وطی بلا عقد کے لیے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی وطی کو تو قرآن اور سنت زنا اور سفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح۔

۸۶ – یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالبًا اسی زمانے میں طلاق کا کوئی مسئلہ پیدا ہو جانے پر نازل ہوئی تھی، اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات خود مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ تقریر ماسبق کے بعد اور تقریر مابعد سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِس آیت سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- آیت میں اگرچہ ’’مومن عورتوں‘‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کتابی عورتوں کے معاملے میں قانون وہ نہیں ہے جو یہاں بیان ہوا ہے، لیکن تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ معناً یہی حکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی کسی مسلمان نے نکاح کیا ہو تو اس کی طلاق، اس کے مَہر، اس کی عدّت اور اس کو مُتعۂ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ علما کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذکر جو کیا ہے اس سے مقصود دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ضرور ہے مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۲- ’’ہاتھ لگانے‘‘ یا ’’مَس‘‘ کرنے سے مراد لغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کنایتاً مباشرت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس تنہائی میں رہا ہو، بلکہ اسے ہاتھ بھی لگا چکا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم نہ آئے۔ لیکن فقہا نے بر سبیلِ احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خَلوَتِ صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم آئے گی اور سقوطِ عدّت صرف اُس حالت میں ہو گا جب کہ خَلوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۳- طلاق قبلِ خَلوَت کی صورت میں عدّت ساقط ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حقِ رُجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر لے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس صورت میں عدّتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دس دن کی عدّت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدّت سے مراد وہ مدت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز نہ ہو۔)

۴- مَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمھارے لیے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدّت عورت پر مرد کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں: ایک، حقِ اولاد۔ دوسرے، حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا ہے کہ اس دَوران میں اُس کو رُجوع کر لینے کا حق ہے، نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدّت کے زمانے میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حُقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اَخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مُشتَبَہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پروا نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے

کہ میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اُوپر میری طرف سے کوئی عدّت واجب نہ ہوگی تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۵- فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کردو)۔اس حکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پورا کرنا ہوگا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا اور پھر خَلوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہوگا، جیسا کہ سورۂ بَقَرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہوا ہے۔اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے۔مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مہر دینے کے ساتھ مرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دُلھن بننے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا، یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اسے دیا گیا تھا تو وہ واپس نہ لے۔لیکن اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرنا واجب ہے، اور یہ ''کچھ نہ کچھ'' آدمی کی حیثیت اور مَقدِرَت کے مطابق ہونا چاہیے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔علما کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مُتعۂ طلاق دینا بہرحال واجب ہے خواہ مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔(اسلامی فقہ کی اصطلاح میں مُتعۂ طلاق اُس مال کو کہتے ہیں جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جاتا ہے۔)

۶- بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی تُھکا فضیحتی کے بغیر شریفانہ طریقے سے عَلیحدَگی اختیار کر لی جائے۔ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہِ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اسے طلاق دے اور رخصت کر دے۔یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عُیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تاکہ کوئی دوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلّق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مَصلَحت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں ''بھلے طریقے سے رخصت کرنے'' کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو تُھکا فضیحتی اور بدنامی و رُسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجایش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مَہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے، بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

۷- ابنِ عباسؓ، سعید بن المُسَیَّبؒ، حَسن بصریؒ، علی بن الحسین (زین العابدینؒ)، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے آیت کے الفاظ ''جب تم نکاح کرو پھر طلاق دے دو'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اُسی صورت میں واقع ہوتی ہے جب کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا ہو۔نکاح سے پہلے طلاق بے اثر ہے۔اس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ ''اگر میں فُلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ

اَے نبیؐ! ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں تمھاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں،۸۷

کی عورت سے، یا کسی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"، تو یہ قول لغو بے معنیٰ ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: لا طلاق لابن ادم فی ما لا یملك، "ابنِ آدم جس چیز کا مالک نہیں ہے اُس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ) اور لا طلاق قبل النکاح، "نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔" (ابنِ ماجہ) مگر فقہا کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اِس آیت اور اِن احادیث کا اطلاق صرف اِس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق ہے" یا "میں نے تجھے طلاق دی"۔ یہ قول بلاشبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مُترتّب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ "اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے" تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ دراصل وہ شخص اس امر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہوگی۔ یہ قول لغو بے اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی اُسی وقت اُس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہا کا ہے ان کے درمیان پھر اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس نوعیت کے ایقاعِ طلاق کی وسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام زُفَرؒ کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اس طرح کہے کہ "جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اس پر طلاق ہے"، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابوبکر جصّاصؒ نے یہی رائے حضرت عمرؓ، عبداللہؓ بن مسعود، ابراہیم النخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سُفیان ثَوریؒ اور عثمان اَلبَتّیؒ کہتے ہیں کہ طلاق صرف اُسی صورت میں پڑے گی جب کہنے والا یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

حسن بن صالحؒ، لَیث بن سعد اور عامر الشَّعبیؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی طلاق عُمومیّت کے ساتھ بھی پڑ سکتی ہے بشرطیکہ اس میں کسی نوع کی تخصیص ہو۔ مثلاً آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان، یا فلاں قبیلے، یا فلاں شہر یا ملک یا قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

ابنِ ابی لیلیٰ اور امام مالکؒ اوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس میں مدت کا بھی تعیُّن ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اس سال یا آیندہ دس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالکؒ اس پر اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

۸۷ – یہ دراصل جواب ہے ان لوگوں کے اعتراض کا جو کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے لوگوں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیتے ہیں، مگر خود انھوں نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ

وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ

اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری مِلکیّت میں آئیں، اور تمھاری وہ چچازاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے، اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبیؐ اسے نکاح میں لینا چاہے۔[۸۸] یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے

حضرت زینبؓ سے نکاح کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیویاں موجود تھیں۔ ایک، حضرت سَودہؓ جن سے ۳ قبلِ ہجرت میں آپؐ نے نکاح کیا تھا۔ دوسری، حضرت عائشہؓ جن سے نکاح تو ۳ قبلِ ہجرت میں ہو چکا تھا مگر ان کی رخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی تھی۔ تیسری، حضرت حَفصہؓ جن سے شعبان ۳ھ میں آپؐ کا نکاح ہوا۔ اور چوتھی، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ جنھیں حضورؐ نے شوال ۴ھ میں زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر کفار و منافقین جو اعتراض کر رہے تھے اُس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دے رہا ہے کہ اے نبیؐ! تمھاری یہ پانچوں بیویاں جنھیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو، ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز تھے تو آخر اس استثنا کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں۔

اس جواب کے بارے میں یہ بات پھر ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ ان مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جن کے دلوں میں مخالفینِ اسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں چونکہ یقین تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے، اس لیے قرآن کی ایک مُحکم آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبیؐ نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا ہے بلکہ یہ استثنا کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

۸۸ – پانچویں بیوی کو حضورؐ کے لیے حلال کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضورؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے بھی نکاح کی اجازت عطا فرمائی:

۱ – وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپؐ کی مِلکیّت میں آئیں۔ اس اجازت کے مطابق حضورؐ نے غزوۂ بنی قُرَیظہ کے سبایا میں سے حضرت ریحانہؓ، غزوۂ بنی المُصطَلِق کے سبایا میں سے حضرت جُوَیریہؓ، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صَفیہؓ اور مُقَوقِس مصر کی بھیجی ہوئی حضرت ماریہ قِبطیہؓ کو اپنے لیے مخصوص فرمایا۔ ان میں سے مُقدّم الذکر تین کو آپؐ نے آزاد

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ

نہیں ہے۔[89] ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حُدُود عائد کیے ہیں۔(تمھیں ان حُدُود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تا کہ تمھارے اُوپر کوئی تنگی نہ رہے،[90] اور

کر کے ان سے نکاح کیا تھا، لیکن حضرت ماریہؓ سے بَر بِنائے مِلکِ یمین تمتُّع فرمایا، ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

۲- آپؐ کی چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جنھوں نے ہجرت میں آپؐ کا ساتھ دیا ہو۔ آیت میں آپؐ کے ساتھ "ہجرت کرنے" کا جو ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے سفر میں آپؐ کے ساتھ رہی ہوں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضورؐ کو اختیار دیا گیا کہ اِن رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی آپؐ جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت کے مطابق آپؐ نے ۷ھ میں حضرت اُمِّ حَبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ (ضمناً اس آیت میں یہ صراحت بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملے میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی، دونوں مذہبوں سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو۔ اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی اور بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے۔)

۳- وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہِبہ کرے، یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضورؐ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور حضورؐ اسے قبول کرنا پسند فرمائیں۔ اس اجازت کی بنا پر آپؐ نے شوال ۷ھ میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا۔ لیکن آپؐ نے یہ پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر اُن کے ہِبہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس لیے آپؐ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ان کو مہر عطا فرمایا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھیں۔ مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپؐ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہ رکھا۔

۸۹- اس فقرے کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے لیے ہِبہ کرے اور وہ بلا مہر اس سے نکاح کر لے۔ اور اگر اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت بھی صرف حضورؐ کے لیے ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں جن میں اُمت کے دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن و سنت کے تتبُّع سے ایسے متعدد احکام کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لیے نمازِ تہجُّد فرض تھی اور باقی تمام امت کے لیے وہ نفل ہے۔ آپؐ کے لیے اور آپؐ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے اور کسی دوسرے کے لیے وہ حرام نہیں ہے۔ آپؐ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ کے لیے چار سے

زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپؐ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپؐ کو اجازت دی گئی، اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویاں تمام اُمت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔ مفسرین نے آپؐ کی ایک خُصوصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ آپؐ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع تھا، حالانکہ باقی امت کے لیے وہ حلال ہے۔

۹۰ - یہ وہ مَصْلَحَت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمایا۔ ’’تنگی نہ رہے‘‘ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! آپؐ کی خواہشاتِ نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھیں اس لیے آپؐ کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت دے دی گئی، تا کہ آپؐ صرف چار بیویوں تک محدود رہنے میں تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اس فقرے کا یہ مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی تھی جن کی عمر اُس وقت ۴۰ سال تھی، اور پورے ۲۵ برس تک آپؐ ان کے ساتھ نہایت خوش گوار اِزْدِواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے ایک اور سِن رسیدہ خاتون حضرت سَودَہؓ سے نکاح کیا اور پورے چار سال تک تنہا وہی آپؐ کی بیوی رہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر سے گزر جانے کے بعد یکایک حضورؐ کی خواہشاتِ نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ دراصل ’’تنگی نہ رہے‘‘ کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اُس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اوپر ڈالی تھی اور دوسری طرف ان حالات کو سمجھے جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپؐ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا، وہ بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپؐ کو کُھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا، اور چار کی قید میں آپؐ کے لیے کیا ’’تنگی‘‘ تھی۔

حضورؐ کے سُپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ ایک اَن گھڑ قوم کو جو اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ عام تہذیب و تمدُّن کے نقطۂ نظر سے بھی ناتراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم و تربیَت دے کر ایک اعلیٰ درجے کی مہذب و شایستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ مگر جو اُصولِ تمدن و تہذیب سکھانے کے لیے آپؐ مامور کیے گئے تھے اُن کی رُو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اِختلاط ممنوع تھا اور اس قاعدے کو توڑے بغیر آپؐ کے لیے عورتوں کو براہِ راست خود تربیت دینا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر عورتوں میں کام کرنے کی صرف یہی ایک صورت آپؐ کے لیے ممکن تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدّد خواتین سے آپؐ نکاح کریں، ان کو براہِ راست خود تعلیم و تربیَت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کریں، اور پھر اُن سے شہری اور بَدْوی اور جوان اور ادھیڑ اور بوڑھی، ہر قسم کی عورتوں کو دین سکھانے اور اَخلاق و تہذیب کے نئے اصول سمجھانے کا کام لیں۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی تھی کہ پرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کر دیں۔ اس خدمت کی انجام دِہی میں جاہلی نظام کے عَلَم برداروں سے جنگ ناگزیر تھی۔ اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی طرزِ زندگی اپنی مخصوص رِوایات کے ساتھ رائج تھا۔ ان حالات میں دوسری تدابیر کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سی عداوتوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥٠ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ

اللہ غفور ورحیم ہے۔تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو، اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو۔اس معاملے میں تم پر کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

جن خواتین سے آپؐ نے شادیاں کیں ان کے ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے انتخاب میں یہ مَصلَحت بھی کم و بیش شامل تھی۔حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ کے ساتھ نکاح کر کے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کر لیا۔حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اُس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالدؓ بن ولید کا تعلق تھا۔اور حضرت اُمِّ حَبِیبہؓ ابوسُفیان کی بیٹی تھیں۔ان شادیوں نے بہت بڑی حد تک اِن خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا، بلکہ اُمِّ حبیبہؓ کے ساتھ حضورؐ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلے پر نہ آیا۔حضرت صَفِیّہؓ اور رَیحانہؓ یہودی خاندانوں سے تھیں۔انھیں آزاد کر کے جب حضورؐ نے ان سے نکاح کیے تو آپؐ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔کیونکہ اُس زمانے میں عَرَبی رِوایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا، اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی۔

معاشرے کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ رُسوم کو توڑنا بھی آپؐ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔چنانچہ ایک نکاح آپؐ کو اِس مقصد کے لیے بھی کرنا پڑا، جیسا کہ اسی سورۂ احزاب میں مفصّل بیان ہو چکا ہے۔

یہ مَصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے۔تاکہ جو کارِ عظیم آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اُس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ جتنے نکاح کرنا چاہیں کر لیں۔

اِس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعدُّدِ ازدواج صرف چند خاص شخصی ضرورتوں کی خاطر ہی جائز ہے اور اُن کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہو سکتی جس کے لیے یہ جائز ہو۔ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سے زائد نکاح کیے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولادِ نرینہ نہ تھی، یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپؐ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے، یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے۔سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعدُّدِ ازدواج کو اُن چند گنی چُنی مخصوص اغراض تک، جن کا آج نام لیا جا رہا ہے، محدود نہیں رکھا، اور اللہ کے رسولؐ نے اُن کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے متعدّد نکاح کیے، تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قُیود تجویز کرے اور اُوپر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیُّل ہے کہ تعدُّدِ ازدواج بجائے خود ایک برائی ہے۔اسی تخیّل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعلِ حرام اگر کبھی حلال ہو بھی ہو سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہو سکتا ہے۔اب اس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جَعلی ٹھپّا لگانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے،

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

اِس طرح زیادہ متوقّع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی، اور جو کچھ بھی تم اُن کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔[91] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے، اور اللہ علیم و

قرآن وسنت اور پوری اُمتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

۹۱- اس آیت سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خانگی زندگی کی اُلجھنوں سے نجات دلانا تھا تاکہ آپؐ پورے سُکون کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حضورؐ کو پورے اختیارات دے دیے کہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کے ساتھ جو برتاؤ چاہیں کریں تو اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ یہ مومن خواتین آپؐ کو کسی طرح پریشان کرتیں یا آپس میں مُسابقت اور رقابت کے جھگڑے پیدا کر کے آپؐ کے لیے اُلجھنیں پیدا کرتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار پا لینے کے بعد بھی حضورؐ نے تمام ازواج کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی، اور باقاعدہ باری مقرر کر کے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔ محدثین میں سے صرف ابورَزِینؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے صرف چار بیویوں (حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ) کو باریوں کی تقسیم میں شامل کیا تھا اور باقی ازواج کے لیے کوئی باری مقرر نہ کی تھی۔ لیکن دوسرے تمام محدثین و مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں اور نہایت قوی رِوایات سے اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس اختیار کے بعد بھی حضورؐ تمام ازواج کے ہاں باری باری سے جاتے تھے اور سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابوداؤد وغیرہم حضرت عائشہؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ”اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضورؐ کا طریقہ یہی رہا کہ آپؐ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے ہاں جاتے تو اس سے اجازت لے کر جاتے تھے۔“ ابوبکر جصّاصؒ عُروہؒ بن زبیرؓ کی رِوایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باریوں کی تقسیم میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کسی روز اپنی سب بیویوں کے ہاں نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دن ہوتا تھا اس کے سوا کسی دوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے۔“ اور یہ رِوایت بھی حضرت عائشہؓ ہی کی ہے کہ جب حضورؐ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل و حرکت آپؐ کے لیے مشکل ہوگئی تو آپؐ نے سب بیویوں سے اجازت طلب کی کہ مجھے عائشہؓ کے ہاں رہنے دو، اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپؐ نے آخری زمانہ حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارا۔ ابنِ ابی حاتمؒ امام زُہریؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بیوی کو باری سے محروم کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس سے صرف حضرت سَودہؓ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے خود اپنی باری بخوشی حضرت عائشہؓ کو بخش دی تھی، کیونکہ وہ بہت سِن رسیدہ ہو چکی تھیں۔

اس مقام پر کسی کے دل میں یہ شبہ نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ اس آیت میں اپنے نبی کے ساتھ کوئی بے جا رعایت کی تھی اور ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ فرمایا تھا۔ دراصل جن عظیم مصالح کی خاطر نبیؐ کو بیویوں کی تعداد

Maktaba Tul Ishaat.com

حَلِيْمًا ﴿۵۱﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ

حلیم ہے۔[۹۲] اس کے بعد تمھارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں، اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ اُن کا حُسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو،[۹۳] البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے۔[۹۴]

کے معاملے میں عام قاعدے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، انھی مصالح کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپؐ کو خانگی زندگی کا سکون بہم پہنچایا جائے اور اُن اسباب کا سدِّ باب کیا جائے جو آپؐ کے لیے پریشان خاطری کے موجب ہو سکتے ہوں۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بزرگ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت اُن کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت و اصلاح کے اُس عظیم الشان کام میں آپؐ کی رفیقِ کار بنیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابۂ کرامؓ اپنی حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے اسی طرح ازواجِ مطہراتؓ کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو تمام ازواجِ رسولؐ نے بخوشی قبول کیا۔

۹۲ - یہ تنبیہ ہے ازواجِ مطہراتؓ کے لیے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے تنبیہ اس بات کی ہے کہ اللہ کا یہ حکم آ جانے کے بعد اگر وہ دل میں بھی کبیدہ خاطر ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی۔ اور دوسرے لوگوں کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِزدِواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اگر انھوں نے اپنے دل میں رکھی یا فکر و خیال کے کسی گوشے میں بھی کوئی وسوسہ پالتے رہے تو اللہ سے ان کی یہ چوری چھپی نہ رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ اللہ کی صفتِ حلم کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبیؐ کی شان میں گستاخی کا تخیل بھی اگرچہ سخت سزا کا مُستوجِب ہے، لیکن جس کے دل میں کبھی ایسا کوئی وسوسہ آیا ہو وہ اگر اسے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی کی اُمید ہے۔

۹۳ - اس ارشاد کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ جو عورتیں اوپر آیت نمبر ۵۰ میں حضورؐ کے لیے حلال کی گئی ہیں ان کے سوا دوسری کوئی عورت اب آپؐ کے لیے حلال نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جب آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اس بات کے لیے راضی ہو گئی ہیں کہ تنگی و ترشی میں آپؐ کا ساتھ دیں اور آخرت کے لیے دنیا کو انھوں نے تج دیا ہے، اور اس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ جو برتاؤ بھی ان کے ساتھ چاہیں کریں، تو اب آپؐ کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں۔

۹۴ - یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتُّع کی اجازت ہے اور ان کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی مضمون کی تصریح سورۂ نساء آیت ۳، سورۂ مومنون آیت ۶، اور سورۂ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صنف کی حیثیت سے بیان

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِىِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ

ع ۶

اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔[95] نہ کھانے کا وقت

کیا گیا ہے اور پھر ان کے ساتھ اِزدِواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز سورۂ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لیے چار کی حد مقرر کرتی ہے، مگر نہ اُس جگہ اللہ تعالیٰ نے مملوکہ عورتوں کے لیے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے لیے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح کرنا، یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا تو حلال نہیں ہے، البتہ مملوکہ عورتیں حلال ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کی شریعت یہ گنجایش مال دار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کے لیے دیتی ہے۔ دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اُٹھایا ہے۔ قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اُٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے، اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری کھیپ لاتا چلا جائے، تو یہ قانون کی گنجایشوں سے ناروا فائدہ اُٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہوگی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔ اسی طرح شریعت نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو، جب کہ ان کی قوم مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے یا فِدیہ دے کر اُن کو چھڑانے کے لیے تیار نہ ہو، لونڈی بنانے کی اجازتِ دی، اور جن اشخاص کی مِلکیّت میں وہ حکومت کی طرف سے دے دی جائیں اُن کو یہ حق دیا کہ ان عورتوں سے تمتّع کریں، تاکہ اُن کا وجود معاشرے کے لیے اَخلاقی فساد کا سبب نہ بن جائے۔ پھر چونکہ لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی کوئی تعداد مُعیّن نہیں ہو سکتی تھی اس لیے قانوناً اس امر کی بھی حد معیّن نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک شخص بیک وقت کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی اس بنا پر جائز رکھا گیا کہ اگر کسی لونڈی یا غلام کا نباہ ایک مالک سے نہ ہو سکے تو وہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہو سکے اور ایک ہی شخص کی دائمی ملکیت مالک و مملوک دونوں کے لیے عذاب نہ بن جائے۔ شریعت نے یہ سارے قواعد انسانی حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہولت کی خاطر بنائے تھے۔ اگر ان کو مال دار لوگوں نے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تو اس کا الزام انھی پر ہے نہ کہ شریعت پر۔

۹۵ – یہ اُس حکمِ عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال کے بعد سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا۔ قدیم زمانے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنٰہٗ ۙ وَلٰكِنۡ اِذَا دُعِيۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَلَا
مُسۡتَاۡنِسِيۡنَ لِحَدِيۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ يُؤۡذِى النَّبِىَّ فَيَسۡتَحۡىٖ

تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔[۹۶] مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔[۹۷] تمھاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں

اہلِ عرب بے تکلّف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے ملنا ہوتا تو وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پکارنے اور اجازت لے کر اندر جانے کا پابند نہ تھا۔ بلکہ اندر جا کر عورتوں اور بچّوں سے پوچھ لیتا تھا کہ صاحبِ خانہ گھر میں ہے یا نہیں۔ یہ جاہلانہ طریقہ بہت سی خرابیوں کا موجب تھا۔ اور بسا اوقات اس سے بہت گھناؤنے اخلاقی مفاسد کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ اس لیے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دُور پرے کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپؐ کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دے دیا گیا۔

۹۶ – یہ اس سلسلے کا دوسرا حکم ہے۔ جو غیر مہذّب عادات اہلِ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی دوست یا ملاقاتی کے گھر کھانے کا وقت تاک کر پہنچ جاتے۔ یا اس کے گھر آ کر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ اس حرکت کی وجہ سے صاحبِ خانہ اکثر عجیب مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ منہ پھوڑ کر کہے کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیے، تو بے مُروّتی ہے۔ کھلائے تو آخر اچانک آئے ہوئے کتنے آدمیوں کو کھلائے۔ ہر وقت ہر آدمی کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ جب جتنے آدمی بھی اس کے ہاں آ جائیں، ان کے کھانے کا انتظام فوراً کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دے دیا کہ کسی شخص کے گھر کھانے کے لیے اُس وقت جانا چاہیے جب کہ گھر والا کھانے کی دعوت دے۔ یہ حکم صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لیے خاص نہ تھا بلکہ اُس نمونے کے گھر میں یہ قواعد اسی لیے جاری کیے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں عام تہذیب کے ضابطے بن جائیں۔

۹۷ – یہ ایک اور بے ہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپس میں گفتگو کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ صاحبِ خانہ اور گھر کے لوگوں کو اس سے کیا زحمت ہوتی ہے۔ ناشایستہ لوگ اپنی اس عادت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے اور آپؐ اپنے اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے اس کو برداشت کرتے تھے۔ آخر کار حضرت زینبؓ کے ولیمے کے روز یہ حرکت اذیت رسانی کی حد سے گزر گئی۔ حضورؐ کے خادمِ خاص حضرت اَنسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ رات کے وقت ولیمے کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور ازواجِ مطہراتؓ کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؐ پھر

مِنْكُمْ ۫ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا
فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ
وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ

کہتے۔اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔[98] تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو،[99] اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے

پلٹ گئے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جا بیٹھے۔اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپؐ حضرت زینبؓ کے مکان میں تشریف لائے۔اس کے بعد ناگزیر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خود ان بُری عادات پر لوگوں کو مُتنبہ فرمائے۔حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق یہ آیات اسی موقع پر نازل ہوئی تھیں۔(مسلم، نَسائی، ابنِ جریر)

۹۸- یہی آیت ہے جس کو آیتِ حجاب کہا جاتا ہے۔بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ یا رسولؐ اللہ! آپ کے ہاں بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔کاش! آپ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کو پردہ کرنے کا حکم دے دیتے۔ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ازواجِ رسولؐ سے کہا کہ ''اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں۔'' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اِس لیے آپؐ اشارۂ الٰہی کے منتظر رہے۔آخر کار یہ حکم آ گیا کہ محرم مردوں کے سوا (جیسا کہ آگے آیت ۵۵ میں آ رہا ہے) کوئی مرد حضورؐ کے گھر میں نہ آئے، اور جس کو بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔اس حکم کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے، اور چونکہ حضورؐ کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں، انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رُو در رُو بات کرنے سے روکتی ہے، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مَصلحت یہ بتاتی ہے کہ ''تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے''، اُس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جا سکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جُمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلّف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمًا ۝۵۳ اِنۡ تُبۡدُوۡا
شَيۡـًٔـا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ۝۵۴ لَا جُنَاحَ
عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ
اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتۡ
اَيۡمَانُهُنَّ‌ ۚ وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ۝۵۵

نکاح کرو،[100] یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم[101] ہے۔

ازواجِ نبیؐ کے لیے اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے،[102] ان کے میل جول کی عورتیں[103] اور ان کے مملوک[104] گھروں میں آئیں۔(اے عورتو!) تمھیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔[105]

کہ یہ اسلام کی ''روح'' ہے جو میں نے نکال لی ہے۔آخر وہ اسلام کی کون سی روح ہے جو قرآن و سنت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے؟

۹۹- یہ اشارہ ہے اُن الزام تراشیوں کی طرف جو اس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جا رہی تھیں اور کفار و منافقین کے ساتھ بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ان میں حصہ لینے لگے تھے۔

۱۰۰- یہ تشریح ہے اُس ارشاد کی جو آغازِ سورہ میں گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہلِ ایمان کی مائیں ہیں۔

۱۰۱- یعنی اگر حضورؐ کے خلاف دل میں بھی کوئی بُرا خیال کوئی شخص رکھے گا، یا آپؐ کی ازواج کے متعلق کسی کی نیت میں بھی کوئی بُرائی چھپی ہو گی، تو اللہ تعالیٰ سے وہ چھپی نہ رہے گی اور وہ اس پر سزا پائے گا۔

۱۰۲- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور حواشی نمبر ۳۸ تا ۴۲۔اس سلسلے میں علامہ آلوسیؒ کی یہ تشریح بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آجاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہوں، خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آ جانے کے بعد اُن کے ذکر کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے۔'' (روح المعانی)

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ ۚ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ صَلُّوا۟ عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يُؤْذُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ لَعَنَهُمُ ٱللَّهُ فِى ٱلدُّنْيَا
وَٱلْءَاخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ وَٱلَّذِينَ يُؤْذُونَ ٱلْمُؤْمِنِينَ
وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ بِغَيْرِ مَا ٱكْتَسَبُوا۟ فَقَدِ ٱحْتَمَلُوا۟ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾ ع

ع ۷

اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر دُرود بھیجتے ہیں،[۱۰۶] اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر دُرود و سلام بھیجو۔[۱۰۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیّت دیتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور اُن کے لیے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر دیا ہے۔[۱۰۸] اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیّت دیتے ہیں اُنھوں نے ایک بڑے بہتان[۱۰۹] اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔ ع

۱۰۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۳۔

۱۰۴ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۴۔

۱۰۵ – اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس حکمِ قطعی کے آجانے کے بعد آیندہ کسی ایسے شخص کو گھروں میں بے حجاب آنے کی اجازت نہ دی جائے جو اِن مستثنیٰ رشتہ داروں کے دائرے سے باہر ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ خواتین کو یہ رَوِش ہرگز نہ اختیار کرنی چاہیے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں تو پردے کی پابندی کریں مگر جب وہ موجود نہ ہو تو غیر محرم مردوں کے سامنے پردہ اٹھا دیں۔ ان کا یہ فعل چاہے ان کے شوہر سے چھپا رہ جائے، خدا سے تو نہیں چھپ سکتا۔

۱۰۶ – اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ پر بے حد مہربان ہے، آپؐ کی تعریف فرماتا ہے، آپؐ کے کام میں برکت دیتا ہے، آپؐ کا نام بلند کرتا ہے اور آپؐ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپؐ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ سے غایت درجے کی محبّت رکھتے ہیں اور آپؐ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپؐ کے دین کو سربلند کرے، آپؐ کی شریعت کو فروغ بخشے اور آپؐ کو مقامِ محمود پر پہنچائے۔ سیاق و سباق پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات کس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب دشمنانِ اسلام اس دینِ مبین کے فروغ پر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے حضوؐر کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کیچڑ اچھال کر وہ آپؐ کے اُس اَخلاقی اثر کو ختم کر دیں گے جس کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کے قدم روز بروز بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات میں یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ کفار و مشرکین اور منافقین میرے نبی کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے کی جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، آخرِ کار وہ منہ کی کھائیں گے، اس لیے کہ میں اس پر مہربان ہوں اور ساری کائنات کا نظم و نسق جن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے وہ سب اس کے حامی اور ثنا خواں ہیں۔ وہ اس کی مَذمّت کر کے کیا پا سکتے ہیں جب کہ میں اس کا نام بلند کر رہا ہوں اور میرے فرشتے اس کی تعریفوں کے چرچے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اوچھے ہتھیاروں سے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جب کہ میری رحمتیں اور برکتیں اس کے ساتھ ہیں اور میرے فرشتے شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ ربّ العالمین! محمدؐ کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر اور اس کے دین کو اور زیادہ فروغ دے۔

۱۰۷- دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جن کو محمدؐ رسول اللہ کی بدولت راہِ راست نصیب ہوئی ہے، تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے احسانِ عظیم کا حق ادا کرو۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اس شخص نے تمھیں علم کی روشنی دی۔ تم اَخلاق کی پستیوں میں گرے ہوئے تھے، اس شخص نے تمھیں اُٹھایا اور اس قابل بنایا کہ آج محسودِ خلائق بنے ہوئے ہو۔ تم وحشت اور حیوانیت میں مبتلا تھے، اس شخص نے تم کو بہترین انسانی تہذیب سے آراستہ کیا۔ کفر کی دنیا اسی لیے اس شخص پر خار کھا رہی ہے کہ اس نے یہ احسانات تم پر کیے، ورنہ اس نے کسی کے ساتھ ذاتی طور پر کوئی بُرائی نہ کی تھی۔ اس لیے اب تمھاری احسان شناسی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جتنا بغض وہ اس خیرِ مجسّم کے خلاف رکھتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبّت تم اس سے رکھو، جتنی وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے گرویدہ ہو جاؤ، جتنی وہ اس کی مَذمّت کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کی تعریف کرو، جتنے وہ اس کے بدخواہ ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے خیر خواہ بنو اور اس کے حق میں وہی دعا کرو جو اللہ کے فرشتے شب و روز اس کے لیے کر رہے ہیں کہ اے ربِّ دو جہاں! جس طرح تیرے نبیؐ نے ہم پر بے پایاں احسانات فرمائے ہیں، تو بھی ان پر بے حد و بے حساب رحمت فرما، ان کا مرتبہ دُنیا میں بھی سب سے زیادہ بلند کر اور آخرت میں بھی انھیں تمام مُقرّبین سے بڑھ کر تقرّب عطا فرما۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے: ایک، صَلُّوْا عَلَيْهِ۔ دوسرے، سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

صَلٰوۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنٰی ہوتے ہیں: ایک، کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف محبّت کے ساتھ متوجہ ہونا اور اُس پر جُھکنا۔ دوسرے، کسی کی تعریف کرنا۔ تیسرے، کسی کے حق میں دعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنٰی میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اَور سے دعا کرنا قطعاً ناقابلِ تصور ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہوگا۔ لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لیے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہوگا۔ اس میں محبّت کا مفہوم بھی ہوگا، مَدح و ثنا کا مفہوم بھی اور دعائے رحمت کا مفہوم بھی۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صَلُّوْا عَلَيْهِ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح و ثنا کرو، اور اُن کے لیے دعا کرو۔

سَلٰم کا لفظ بھی دو معنٰی رکھتا ہے: ایک، ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لیے ہم اُردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں۔ دوسرے، صلح اور عدمِ مُخالفت۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کہنے کا ایک مطلب یہ ہے

کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے اُن کا ساتھ دو، اُن کی مُخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرماں بردار بن کر رہو۔

یہ حکم جب نازل ہوا تو متعدد صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! سلام کا طریقہ تو آپؐ ہمیں بتا چکے ہیں (یعنی نماز میں السّلام علیك ایّها النبی و رحمة اللّٰه و برکاتهٗ اور ملاقات کے وقت السّلام علیك یا رسول اللّٰه کہنا) مگر آپؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے لوگوں کو مختلف مواقع پر جو درود سکھائے ہیں، وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

کَعب بن عُجرہؓ: اَللّٰھُمَّ صَلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید وبارِكْ علی محمد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمید مجید۔ یہ درود تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرت کَعب بن عُجرہؓ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام احمد، ابنِ ابی شَیْبہ، عبدالرَّزّاق، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جَریر نے روایت کیا ہے۔

ابنِ عباسؓ: ان سے بھی بہت خفیف فرق کے ساتھ وہی درود مروی ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ (ابنِ جَریر)

ابوحُمَید ساعدیؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمّد وازواجه وذرّیّته کما صلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وازواجهٖ وذرّیّتهٖ کما بارکت علی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید۔ (مالک، احمد، بخاری، مسلم، نَسائی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

ابومسعود بدریؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، نَسائی، احمد، ابنِ جَریر، ابنِ حِبّان، حاکم)

ابوسعید خُدریؓ: اللّٰھمّ صَلِّ علی محمد عبدِك و رسولِك کماصلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم۔ (احمد، بخاری، نَسائی، ابنِ ماجہ)

بُرَیْدَۃ الخُزاعی: اللّٰھم اجعل صلوٰتك ورحمتك وبرکاتك علی محمد وعلی اٰل محمّدٍ کما جعلتها عَلٰی ابراھیم انك حمید مجید۔ (احمد، عبد بن حُمَید، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

ابوہُرَیرہؓ: اللّٰھُمَّ صل علی محمّد وعلی اٰل محمّدٍ وبارِك علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت و بارکت علی ابراھیم واٰل ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (نَسائی)

طلحہؓ: اللّٰھُمَّ صلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم انك حمید مجید وبارك علی محمد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم انك حمید مجید۔ (ابنِ جریر)

یہ تمام درود الفاظ کے اختلاف کے باوجود معنی میں متفق ہیں۔ ان کے اندر چند اہم نِکات ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اوّلاً، ان سب میں حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے

Maktaba Tul Ishaat.com

دُعا کرو کہ اے خدا! تو محمدؐ پر درود بھیج۔ نادان لوگ جنھیں معنیٰ کا شُعور نہیں ہے اس پر فوراً یہ اعتراض جَڑ دیتے ہیں کہ یہ تو عجیب بات ہوئی، اللہ تعالیٰ تو ہم سے فرما رہا ہے کہ تم میرے نبی پر درود بھیجو، مگر ہم الٹا اللہ سے کہتے ہیں کہ تو درود بھیج۔ حالانکہ دراصل اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ تم مجھ پر ''صلوٰۃ'' کا حق ادا کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ہی سے دعا کرو کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم حضورؐ کے مراتب بلند نہیں کر سکتے، اللہ ہی بلند کر سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے، اللہ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے رفعِ ذکر کے لیے اور آپؐ کے دین کو فروغ دینے کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کریں، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق و تائید کے بغیر اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حتّٰی کہ حضورؐ کی محبّت و عقیدت بھی ہمارے دل میں اللہ ہی کی مدد سے جاگزیں ہو سکتی ہے ورنہ شیطان نہ معلوم کتنے وساوس دل میں ڈال کر ہمیں آپؐ سے منحرف کر سکتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالك۔ لہٰذا حضورؐ پر صلوٰۃ کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ سے آپؐ پر صلوٰۃ کی دُعا کی جائے۔ جو شخص اللّٰھُمَّ صَلِّ علٰی محمدٍ کہتا ہے وہ گویا اللہ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ خدایا! تیرے نبی پر صلوٰۃ کا جو حق ہے اسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، تُو ہی میری طرف سے اس کو ادا کر اور مجھ سے اس کے ادا کرنے میں جو خدمت چاہے لے لے۔

ثانیاً، حضورؐ کی شانِ کرم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ تنہا اپنی ہی ذات کو اس دعا کے لیے مخصوص فرما لیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل اور ازواج اور ذُرّیت کو بھی آپؐ نے شامل کر لیا۔ ازواج اور ذرّیت کے معنیٰ تو ظاہر ہیں۔ رہا آل کا لفظ، تو وہ محض حضورؐ کے خاندان والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب لوگ آ جاتے ہیں جو آپؐ کے پَیرو ہوں اور آپؐ کے طریقے پر چلیں۔ عَرَبی لغت کی رو سے آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ کسی شخص کی آل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور مُتّبع ہوں، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اور کسی شخص کے اہل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے رشتہ دار ہوں، خواہ وہ اس کے ساتھی اور متبع ہوں یا نہ ہوں۔ قرآنِ مجید میں ۱۴ مقامات پر آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی آل سے مراد محض فرعون کے خاندان والے نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں اس کے ساتھی تھے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقَرہ آیات ۴۹-۵۰۔ آلِ عمران: ۱۱۔ الاعراف: ۱۳۰۔ المومن: ۴۶) پس آلِ محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نہ ہو، خواہ وہ خاندانِ رسالت ہی کا ایک فرد ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو، خواہ وہ حضورؐ سے کوئی دور کا بھی نسبی تعلق نہ رکھتا ہو، البتہ خاندانِ رسالت کے وہ افراد بدرجۂ اَولیٰ آلِ محمدؐ ہیں جو آپؐ سے نسبی تعلق بھی رکھتے ہیں اور آپؐ کے پیرو بھی ہیں۔

ثالثاً، ہر درود جو حضورؐ نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپؐ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علما نے کی ہیں، مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔ میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے (والعلم عند اللّٰہ) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو آج تک کسی پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوت اور وحی اور کتاب کو ماخذِ ہدایت مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا نبیؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جس

طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاؑ کے پیروؤں کا مَرجَع بنایا ہے، اسی طرح مجھے بھی بنا دے۔ اور کوئی ایسا شخص جو نبوت کا ماننے والا ہو، میری نبوت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے۔

یہ امر کہ حضوؐر پر دُرود بھیجنا سنّتِ اسلام ہے، جب آپؐ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے، اور خُصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد درود کے مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب آدمی تشہُّد پڑھتا ہے، اس میں صلوٰۃ علی النبی پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہؓ میں سے ابنِ مسعودؓ، ابومسعود انصاریؓ، ابنِ عمرؓ، جابرؓ بن عبداللہ، تابعین میں سے شَعبیؒ، امام محمد باقرؒ، محمد بن کعب قُرظیؒ اور مُقاتِل بن حَیّانؒ، اور فقہا میں سے اسحاق بن رَاہَوَیہؒ کا بھی یہی مسلک تھا، اور آخر میں امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور جُمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمۂ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ کی الٰہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا، اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا، وہ فریضۂ صلوٰۃ علی النبی سے سُبک دوش ہو گیا۔ اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود۔

ایک اور گروہ نماز میں اس کا پڑھنا مطلقاً واجب قرار دیتا ہے۔ مگر تشہُّد کے ساتھ اس کو مُقیّد نہیں کرتا۔

ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ہر دعا میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ کچھ اور لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب بھی حضوؐر کا نام آئے، دُرود پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک ایک مجلس میں حضورؐ کا ذکر خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے، درود پڑھنا بس ایک دفعہ واجب ہے۔

یہ اختلافات صرف وجوب کے معاملے میں ہیں۔ باقی رہی دُرود کی فضیلت، اور اس کا موجبِ اجر و ثواب ہونا، اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، تو اس پر ساری امت متفق ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کو کلام نہیں ہو سکتا جو ایمان سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو۔ درود تو فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے یہ احساس ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کی بھی ہوگی، اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ پس درحقیقت کثرتِ دُرود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من صَلّٰی عَلَیَّ صلوٰۃ لم تزل الملٰٓئکۃ تصلّی علیہ ما صلّی عَلَیَّ۔ (احمد و ابنِ ماجہ) ''جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے، ملائکہ اس پر دُرود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے۔'' من صلّی علیّ واحدۃ صلی اللّٰہ علیہ عشراً۔ (مسلم) ''جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

اولی الناس بی یوم القیامة اکثرھم علیّ صلٰوۃ (ترمذی) ”قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔“ البخیل الذی ذکرتُ عندہ فلم یصلّ علَیّ (ترمذی) بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے لیے اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ فلان، یاصلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـــــ یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ساتھ صلٰوۃ جائز ہے یا نہیں، اس میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ جس میں قاضی عِیاضؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسے مطلقاً جائز رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا اِستدلال یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود غیر انبیا پر صلٰوۃ کی متعدّد مقامات پر تصریح کی ہے۔ مثلاً اُولٰٓئِكَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ (البقرہ: ۱۵۷) خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّیۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ (التوبہ: ۱۰۳) هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡكُمۡ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (الاحزاب: ۴۳) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدّد مواقع پر لفظِ صلٰوۃ کے ساتھ غیرِ انبیا کو دُعا دی ہے۔ مثلاً ایک صحابی کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ اٰل ابی اوفٰی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی بیوی کی درخواست پر فرمایا: صلی اللّٰہ علیكِ وَعلیٰ زوجِكِ۔ جو لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتے، ان کے حق میں آپؐ فرماتے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیھم۔ حضرت سعدؓ بن عُبادہ کے حق میں آپؐ نے فرمایا، اَللّٰھم اجعل صَلٰوتك ورحمتك علیٰ اٰل سَعد بن عُبادہ۔ اور مومن کی روح کے متعلق حضوؐر نے خبر دی کہ ملائکہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں: صلی اللّٰہ علیك وعلیٰ جسدك۔ لیکن جُمہورِ امت کے نزدیک ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے تو دُرست تھا مگر ہمارے لیے درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ اہلِ اسلام کا شِعار بن چکا ہے کہ وہ صلٰوۃ وسلام کو انبیا علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں، اس لیے غیرِ انبیا کے لیے اس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل کو لکھا تھا کہ ”میں نے سنا ہے کچھ واعظین نے یہ نیا طریقہ شروع کیا ہے کہ وہ صلٰوۃ علی النبی کی طرح اپنے سرپرستوں اور حامیوں کے لیے بھی صلٰوۃ کا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میرا یہ خط پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اس فعل سے روک دو اور انھیں حکم دو کہ وہ صلٰوۃ کو انبیاؑ کے لیے مخصوص رکھیں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا پر اکتفا کریں۔“ (رُوح المعانی) اکثریت کا یہ مسلک بھی ہے کہ حضوؐر کے سوا کسی نبی کے لیے بھی ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کے الفاظ کا استعمال درست نہیں ہے۔

۱۰۸ ـــ اللہ کو اذیّت دینے سے مراد دو چیزیں ہیں: ایک، یہ کہ اس کی نافرمانی کی جائے، اس کے مقابلے میں کفر و شرک اور دَہریّت کا رَویّہ اختیار کیا جائے، اور اس کے حرام کو حلال کر لیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے رسولؐ کو اذیت دی جائے۔ کیونکہ جس طرح رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی طرح رسولؐ پر طعن خدا پر طعن ہے، رسولؐ کی مُخالفت خدا کی مخالفت ہے، اور رسولؐ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

۱۰۹ ـــ یہ آیت بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہے، یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو، یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو، وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضوؐر سے پوچھا گیا: غیبت کیا ہے؟ فرمایا: ذکرك اخاك بمَا یکرہ ”تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔“ عرض کیا گیا: اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟ فرمایا: ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہٗ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہ۔ ”اگر

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ

اَے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔[۱۱۰] یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور

اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تُو نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔" یہ فعل صرف ایک اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو جرم مُستلزِم سزا قرار دیا جائے۔

۱۱۰ – اصل الفاظ ہیں: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ جِلباب عَربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ اور اِدْنَاء کے اصل معنیٰ قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں، مگر جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صِلہ آئے تو اس میں ارخاء، یعنی اُوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین و مفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف "لپیٹ لینا" کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصود اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ يُدْنِيْنَ اِلَيْهِنَّ فرماتا۔ جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ کے معنیٰ محض لپیٹ لینے کے ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کے الفاظ یہ معنیٰ لینے میں اور زیادہ مانع ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مِن تبعیض کے لیے ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لپیٹی جائے گی تو پوری چادر لپیٹی جائے گی، نہ کہ اس کا محض ایک حصہ۔ اس لیے آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر اُن کا ایک حصہ، یا ان کا پلّو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں، جسے عُرفِ عام میں گھونگٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

یہی معنیٰ عہدِ رسالت سے قریب ترین زمانے کے اکابر مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ابنِ جَریر اور ابن المُنْذِر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے حضرت عَبِیدۃ السَّلمانی" سے اس آیت کا مطلب پوچھا۔ (یہ حضرت عَبِیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضرِ خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھیں فقہ اور قضا میں قاضی شُرَیح کا ہم پلّہ مانا جاتا تھا۔) انھوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اُٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔ ابنِ عباسؓ بھی قریب قریب یہی تفسیر کرتے ہیں۔ اُن کے جو اقوال ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کیے ہیں، ان میں وہ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلّو اوپر سے ڈال کر اپنا منہ چھپالیں اور صرف آنکھیں کھلی رکھیں۔" یہی تفسیر قَتَادہ اور سُدّی نے بھی اس آیت کی بیان کی ہے۔

عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخِ اسلام میں گزرے ہیں انھوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب

Maktaba Tul Ishaat.com

بیان کیا ہے۔ امام ابنِ جریر طَبَریؒ کہتے ہیں: یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِہِنَّ "یعنی شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں، بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں، تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔" (جامع البیان، جلد ۲۲، ص ۳۳)

علّامہ ابوبکر جصّاصؒ کہتے ہیں: "یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت سَتر اور عِفّت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ مُشتَبہ سیرت و کردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔" (احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۸)

علامہ زَمَخشَریؒ کہتے ہیں: یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِہِنَّ یعنی "وہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔" (اَلکَشّاف، جلد ۲، ص ۲۲۱)

علّامہ نظام الدین نَیشاپُوریؒ کہتے ہیں: یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِہِنَّ، یعنی اپنے اوپر چادر کا ایک حصّہ لٹکا لیں۔ اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔" (غرائب القرآن، جلد ۲۲، ص ۳۲)

امام رازیؒ کہتے ہیں: "اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، حالانکہ چہرہ سَتر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کرسکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔ اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔" (تفسیرِ کبیر، جلد ۶، ص ۵۹۱)

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: "اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو۔" یہ الفاظ اُن لوگوں کے قول کی قطعی تردید کردیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہوکر بے تکلُّف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صُلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلڑ تھیں۔ یہ لوگ تعصُّب میں اندھے ہوکر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کرکے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اِس کی کیسی سخت جواب دہی انھیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "ابراہیمؑ کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ، اور طاہرؓ وطَیّبؓ، اور زینبؓ، اور رُقیّہؓ اور اُمِّ کلثومؓ اور فاطمہؓ۔" (سیرت ابنِ ہِشام، جلد اول، ص ۲۰۲) مشہور ماہرِ علمِ اَنساب ہِشام بن محمد بن السّائب کَلبی کا بیان ہے کہ: "مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رُقیّہؓ، پھر اُمِّ کلثومؓ۔ (طَبَقاتِ ابنِ سَعد، جلد اول، ص ۱۳۳) ابنِ حَزمؒ نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی رُقیّہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ، اور ان سے چھوٹی اُمِّ کُلثومؓ۔ (ص ۳۸-۳۹) طَبَریؒ، ابنِ سَعدؒ، ابوجعفر محمد بن حبیبؒ صاحب کتابِ المُحَبَّر اور ابنِ عبدالبرّؒ صاحبِ کتاب الاِستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابوہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہِندؓ بن ابوہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عائذ مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک

فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥٩ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ
الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٦٠

نہ ستائی جائیں[111]۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے[112]۔

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے[113]، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں[114]، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمھیں اُٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔

لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضورؐ سے ہوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صُلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اُوپر مذکور ہوئے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: طَبَری، جلد ۲، ص ۴۱۱۔ طبقاتِ ابنِ سعد، جلد ۸، ص ۱۴ تا ۱۶۔ کتاب المُحَبَّر، ص ۷۸، ۷۹، ۴۵۲۔ الاِستیعاب جلد ۲، ص ۷۱۸) اِن تمام بیانات کو قرآنِ مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔

۱۱۱۔ ’’پہچان لی جائیں‘‘ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دل کی تمنّا پوری کرنے کی اُمید کر سکے۔ ’’نہ ستائی جائیں‘‘ سے مراد یہ ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس مقام پر ذرا ٹھیر کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ قرآن کا یہ حکم، اور وہ مقصدِ حکم جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے، اسلامی قانونِ معاشرت کی کیا روح ظاہر کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نور، آیت ۳۱ میں یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ عورتیں اپنی آرائش و زیبائش کو فلاں فلاں قسم کے مردوں اور عورتوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ ’’اور زمین پر پاؤں مارتی ہوئی بھی نہ چلیں کہ لوگوں کو اُس زینت کا علم ہو جو انھوں نے چھپا رکھی ہے۔‘‘ اُس حکم کے ساتھ اگر سورۂ احزاب کی اِس آیت کو ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں چادر اوڑھنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے اس کا منشا اجنبیوں سے زینت چھپانا ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ منشا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب کہ چادر بجائے خود سادہ ہو، ورنہ ایک مُزَیَّن اور جاذِبِ نظر کپڑا لپیٹ لینے سے تو یہ منشا اُلٹا اور فوت ہو جائے گا۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اُوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چُھپ جائے۔ پھر اس حکم کی علّت اللہ تعالیٰ خود یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ مناسب ترین طریقہ ہے جس سے یہ مسلمان خواتین پہچان لی جائیں گی اور اذیت سے محفوظ رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر

Maktaba Tul Ishaat.com

ہو جاتی ہے کہ یہ ہدایت اُن عورتوں کو دی جا رہی ہے جو مردوں کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی نظر بازی اور ان کے شہوانی التفات سے لذت اندوز ہونے کے بجائے اس کو اپنے لیے تکلیف دہ اور اذیت ناک محسوس کرتی ہیں، جو معاشرے میں اپنے آپ کو آبرو باختہ شمعِ انجمن قسم کی عورتوں میں شمار نہیں کرانا چاہتیں، بلکہ عفت مآب چراغِ خانہ ہونے کی حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہیں۔ ایسی شریف اور نیک خواتین سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم فی الواقع اس حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہو اور مردوں کی ہوس ناک توجہات حقیقت میں تمھارے لیے موجبِ لذت نہیں بلکہ موجبِ اذیت ہیں تو پھر اس کے لیے مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم خوب بناؤ سنگھار کر کے بجلی رات کی دلہن بن کر گھروں سے نکلو اور دیکھنے والوں کی حریص نگاہوں کے سامنے اپنا حُسن اچھی طرح نکھار نکھار کر پیش کرو، بلکہ اس غرض کے لیے تو مناسب ترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرایش و زیبایش کو چھپا کر نکلو، اپنے چہرے پر گھونگٹ ڈالو، اور اس طرح چلو کہ زیور کی جھنکار بھی لوگوں کو تمھاری طرف متوجہ نہ کرے۔ جو عورت باہر نکلنے سے پہلے بن ٹھن کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت تک گھر سے قدم نہیں نکالتی جب تک سات سنگھار نہ کر لے، اس کی غرض اس کے سوا آخر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے مردوں کے لیے اپنے آپ کو جنت نگاہ بنانا چاہتی ہے اور انھیں خود دعوتِ التفات دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتی ہے کہ دیکھنے والوں کی بھوکی نگاہیں اسے تکلیف دیتی ہیں، اس کے بعد اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ''معاشرے کی بیگم'' اور ''مقبولِ عام خاتون'' ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہونا چاہتی بلکہ عفت مآب گھر گرہستن بن کر رہنا چاہتی ہے تو یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کا قول اس کی نیت متعین نہیں کرتا بلکہ اس کی اصل نیت وہ ہوتی ہے جو اس کے عمل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا جو عورت جاذبِ نظر بن کر غیر مردوں کے سامنے جاتی ہے اس کا یہ عمل خود ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے فتنے کے طالب لوگ اس سے وہی توقعات وابستہ کرتے ہیں جو ایسی عورت سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ تم بیک وقت چراغِ خانہ اور شمعِ انجمن نہیں بن سکتی ہو۔ چراغِ خانہ بننا ہے تو اُن طور طریقوں کو چھوڑ دو جو شمعِ انجمن بننے کے لیے موزوں ہیں، اور وہ طرزِ زندگی اختیار کرو جو چراغِ خانہ بننے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف، اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا یہ تسلیم کر کے کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔

۱۱۲- یعنی پہلے جاہلیت کی حالت میں جو غلطیاں کی جاتی رہی ہیں اللہ اپنی مہربانی سے ان کو معاف کر دے گا، بشرطیکہ اب صاف صاف ہدایت مل جانے کے بعد تم اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو اور جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی نہ کرو۔

۱۱۳- ''دل کی خرابی'' سے مراد یہاں دو قسم کی خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آدمی بدنیتی، آوارگی اور بدکارانہ ذہنیت میں مبتلا ہو اور اس کے ناپاک رجحانات اس کی حرکات و سکنات سے پھوٹے پڑتے ہوں۔

۱۱۴- اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانے اور ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے آئے دن

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝٦١ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝٦٢
يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝٦٣ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ
اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۙ۝٦٤ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا

ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنّت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آرہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔[115]

لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔[116] کہو: اُس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ تمھیں کیا خبر، شاید کہ وہ قریب ہی آ لگی ہو۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار

مدینے میں اس طرح کی خبریں اڑایا کرتے تھے کہ فُلاں جگہ مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی ہے اور فُلاں جگہ مسلمانوں کے خلاف بڑی طاقت جمع ہو رہی ہے اور عنقریب مدینے پر اچانک حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کا ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ خاندانِ نبوت اور شرفائے مسلمین کی خانگی زندگی کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑتے اور پھیلاتے تھے تاکہ اس سے عوام میں بدگمانیاں پیدا ہوں اور مسلمانوں کے اَخلاقی اثر کو نقصان پہنچے۔

۱۱۵- یعنی یہ اللہ کی شریعت کا ایک مستقل ضابطہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب بھی کسی معاشرے اور ریاست کا نظام خدائی شریعت پر قائم ہوگا اُس میں ایسے لوگوں کو پہلے متنبہ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روش بدل دیں، اور پھر جب وہ باز نہ آئیں گے تو سختی کے ساتھ ان کا اِستیصال کر ڈالا جائے گا۔

۱۱۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال بالعموم کفار و منافقین کیا کرتے تھے۔ اور اس سے ان کا مقصد علم حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ دل لگی اور استہزا کے طور پر یہ بات پوچھا کرتے تھے۔ دراصل ان کو آخرت کے آنے کا یقین نہ تھا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک خالی خولی دھمکی سمجھتے تھے۔ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ اس لیے دریافت نہیں کرتے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے وہ اپنے معاملات درست کر لینے کا ارادہ رکھتے ہوں، بلکہ ان کا اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا نَصِيرًا ۝٦٥ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَٰلَيْتَنَآ
أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝٦٦ وَقَالُوا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝٦٧ رَبَّنَآ ءَاتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝٦٨ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا ع
تَكُونُوا كَالَّذِينَ ءَاذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا

نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے، اُس وقت وہ کہیں گے کہ "کاش! ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔" اور کہیں گے: "اے رب ہمارے! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کردیا۔ اے رب! ان کو دُہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر[117]۔" ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو[118]، اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے موسیٰؑ کو اذیّتیں دی تھیں، پھر اللہ نے اُن کی بنائی ہوئی باتوں سے اُس کی براءت فرمائی اور وہ

تمھیں نیچا دکھانے کے لیے یہ کچھ کیا ہے اور آج تک تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو، اب ذرا ہمیں بتاؤ تو سہی کہ آخر وہ قیامت کب برپا ہوگی جب ہماری خبر لی جائے گی۔

۱۱۷– یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: اَعراف: ۱۸۷۔ النازعات: ۴۲-۴۶۔ سبا: ۳۱۔ الملک: ۲۵-۲۷۔ المطففین، ۱۰-۱۷۔ الحجر: ۲-۳۔ الفرقان: ۲۷-۲۹۔ حٰم السجدہ: ۲۷-۲۹۔

۱۱۸– یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ قرآنِ مجید میں "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کے الفاظ سے کہیں تو سچے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے، اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیتِ مجموعی مخاطب ہے جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں، اور کہیں رُوئے سُخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر جب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعویٰ تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمھاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے ہر جگہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔

وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿٦٩﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٧٠﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧١﴾ اِنَّا
عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ
يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا

اللہ کے نزدیک باعزّت تھا۔[119] اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمھارے اعمال دُرست کر دے گا اور تمھارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے، اُس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور

۱۱۹ – دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ’’اے مسلمانو! تم یہودیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ تمھاری روش اپنے نبیؐ کے ساتھ وہ نہ ہونی چاہیے جو بنی اسرائیل کی رَوِش موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔‘‘ بنی اسرائیل خود مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ جو کچھ بھی یہ قوم بنی، انھی کی بدولت بنی۔ ورنہ مصر میں اس کا انجام ہندوستان کے شُودروں سے بھی بدتر ہوتا۔ لیکن اپنے اس مُحسنِ اعظم کے ساتھ اس قوم کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل مقامات پر صرف ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے:

کتابِ خُروج۔ ۵: ۲۰-۲۱۔ ۱۴: ۱۱-۱۲۔ ۱۶: ۲-۳۔ ۱۷: ۳-۴۔

کتابِ گنتی۔ ۱۱: ۱-۱۵۔ ۱۴: ۱-۱۰۔ ۱۶ مکمل۔ ۲۰: ۲-۵۔

قرآنِ مجید بنی اسرائیل کی اسی مُحسن کُشی کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو مُتنبّہ کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچو، ورنہ پھر اُسی انجام کے لیے تیار ہو جاؤ جو یہودی دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

یہی بات متعدّد مواقع پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کر رہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا: ’’محمدؐ نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔‘‘ یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سُن لی اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آج آپؐ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: رحمة اللہ علی موسٰی فانہٗ اُوذی باکثر من ھٰذا فصبر ’’اللہ کی رحمت ہو موسیٰؑ پر۔ انھیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں اور

Maktaba Tul Ishaat.com

جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ع

جاہل ہے۔[۱۲۰] اِس بارِ امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مَردوں اور عورتوں، اور مُشرک مَردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مَردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ؏

انھوں نے صبر کیا۔" (مُسندِ احمد، تِرمِذی، ابوداؤد)

۱۲۰ — کلام کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ "امانت" سے مراد وہی "خلافت" ہے جو قرآن مجید کی رُو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اُسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرُّف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں، اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں، اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کو "خلافت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انھی کے لیے "امانت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کے اُٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البنیان نے اپنی ذرا سی جان پر یہ بھاری بوجھ اُٹھا لیا ہے۔

زمین و آسمان کے سامنے اس بارِ امانت کا پیش کیا جانا، اور ان کا اسے اُٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا ہوسکتا ہے کہ لُغوی معنی میں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں، ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اُٹھے ہوں اور انھوں نے اپنے مالک و خالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو آپ کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں

اپنی خیر پاتے ہیں، ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اس کا حق ادا کر سکیں اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے ذہن و فکر کی استعداد کا غلط اندازہ کئے بیٹھا ہو۔

البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورت معاملہ کی غیر معمولی اہمیت کا تصور دلانے کے لیے اس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین و آسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ۵-۶ فٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ:

''میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا و رغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے، ورنہ وہ میرا انکار بھی کر سکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اس سے اس طرح چھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔ اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا، تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کر سکے۔ اس کے بعد میں ایک وقت خاص پر اس کا حساب لوں گا۔ جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے، اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرماں برداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ، تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے؟''

یہ تقریر سن کر پہلے تو ساری کائنات میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اسے اس کڑے امتحان سے معاف رکھا جائے۔ آخر کار یہ مشت استخواں اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! میں یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اونچا عہدہ مل جانے کی جو امید ہے اس کی بنا پر میں ان سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو اس آزادی و خود مختاری میں پوشیدہ ہیں۔

یہ نقشہ اپنی چشمِ تصور کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بنا رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اور دنیا کی زندگی میں اپنے ہر قدم کا انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظلوم و جہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جہول ہے، کیونکہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ لیا ہے۔ اور وہ ظلوم ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے دوسرے لوگوں کو بھی لے ڈوب رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ضمیمہ

بسلسلۂ حاشیہ نمبر ۷۷

ختمِ نبوّت

ایک گروہ، جس نے اِس دَور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، لفظ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے معنٰی ''نبیوں کی مہر'' کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاؑ بھی آئیں گے وہ آپؐ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظِ دیگر، جب تک کسی کی نبوت پر آپؐ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اِس لفظ کا یہ مفہُوم لینے کی قطعاً کوئی گنجایش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنٰی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔[1] آخر اس بات کا کیا تُک ہے کہ اُوپر سے تو نکاحِ زینبؓ پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شُکوک وشُبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمدؐ نبیوں کی مُہر ہیں، آیندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مُہر لگ کر بنے گا۔ اس سِیاق وسَباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تُکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال اُلٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اُوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپؐ یہ کام اِس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اِس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپؐ کے بعد آپؐ کی مُہر لگ کر جو انبیاؑ آتے رہیں گے، ان میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ ''خاتم النّبیّین'' کے معنی افضل النّبیّین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہُوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اُوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق وسباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار ومنافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت! کم تر درجے کے ہی سہی، بہر حال آپؐ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔ پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپؐ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

لُغت کی رُو سے خاتَم النّبیّین کے معنٰی

پس جہاں تک سیاق وسباق کا تعلق ہے، وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النّبیین کے معنٰی سلسلۂ نبوت کو

---

[1] سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے اس سورہ کے حواشی نمبر ۶۷ تا ۷۹ نگاہ میں رہنے چاہییں۔

ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اِسی معنٰی کی مقتضی ہے۔ عَرَبی لُغت اور محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنٰی مُہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنٰی ہیں فَرَغ مِنَ الْعَمَلِ، ''کام سے فارغ ہو گیا۔''

خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنٰی ہیں: ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اور اس پر مُہر لگا دی تا کہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔''

خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنٰی ہیں: ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تا کہ خط محفوظ ہو جائے۔''

خَتَمَ عَلَی الْقَلْبِ، ''دل پر مُہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔''

خِتَامُ کُلِّ مَشْرُوْبٍ، ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔''

خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیْءٍ، عاقبتہ واٰخرتہ، ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔''

خَتَمَ الشَّیْءَ بلغ اٰخرہ، ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔'' اسی معنٰی میں ختمِ قرآن بولتے ہیں اور اسی معنٰی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتَمُ الْقَوْمِ اٰخرھم، ''خاتَم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔'' (مُلاحظہ ہو: لِسان العرب، قامُوس اور اقرب الموارد[1])

---

[1] یہاں ہم نے لُغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن بات انھی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔ عربی زبان کی کوئی معتبر لُغت اُٹھا کر دیکھ لی جائے، اس میں لفظ خاتم کی یہی تشریح ملے گی۔ لیکن منکرینِ ختمِ نبوت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لُغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعرا، یا خاتم الفقہا یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اُس شخص پر ختم ہو گئے۔ حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنٰی ہرگز نہیں رکھتا کہ لُغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنٰی ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور ''آخری'' کے معنٰی میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پائے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔ کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنٰی کے بجائے کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنٰی میں بولا جاتا ہو تو وہی معنٰی اس کے اصل معنٰی بن جائیں اور لُغت کی رُو سے جو اس کے حقیقی معنٰی ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جاء خاتم القوم، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آ گیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پورا کا پورا قبیلہ آ گیا ہے حتّٰی کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آ گیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتم الشعرا، خاتم الفقہا اور خاتم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعترافِ کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں

Maktaba-Tul-Ishaat.com

اسی بنا پر تمام اہلِ لُغت اور اہلِ تفسیر نے بالاتفاق خاتم النّبیّین کے معنیٰ آخر النّبیین کے لیے ہیں۔ عربی لُغت و محاورے کی رُو سے خاتم کے معنیٰ ڈاک خانے کی مُہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مُہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

ختمِ نُبوّت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

قرآن کے سیاق و سباق اور لُغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کانت بنواسرائیل تسوسھم الانبیاء۔ کلما ھلک نبی خلفہ نبی، وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکر عن بنی اسرائیل)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاؑ کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفا ہوں گے۔

(۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بیتًا فاحسنہ واجملہ الّا موضع لبنۃ من زاویۃٍ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلّا وُضِعَتْ ھٰذہ اللبنۃ، فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔
(بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النّبیین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیّین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی آئے۔)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النّبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں: فَجِئْتُ فختمت الانبیاء، "پس میں آیا اور میں نے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا۔"

یہی حدیث انھی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔

سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فُلاں صفت اُس پر ختم ہو گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعرا کہہ دیا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النّبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النّبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعرا اور خاتم المحققین وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجے میں کیسے ہو سکتا ہے۔

مُسندِ ابوداؤد طیالسی میں یہ حدیث جابرؓ بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختم بی الانبیاء، ''میرے ذریعے سے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کیا گیا۔''

مُسندِ احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَیّؓ بن کعبؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ اور حضرت ابوہُریرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فُضِّلتُ علی الانبیاء بستٍّ، اعطیت جوامع الکلم، ونصرت بالرعب، واُحلّت لی الغنائم، وجعلت لی الارض مسجدًا وطهورًا، واُرسلتُ الی الخلق کافة، وختم بی النبیّون۔ (مسلم۔ترمذی۔ابنِ ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیا پر فضیلت دی گئی ہے: (۱) مجھے جامع مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رعب کے ذریعے سے نُصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے۔ (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے، اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جاسکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی۔) (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا۔ (۶) اور میرے اُوپر انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (ترمذی، کتاب الرُّؤیا، باب ذہاب النبوۃ۔ مُسندِ احمد، مَرویاتِ اَنسؓ بن مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا محمد وانا احمد، وانا الماحی الذی یُمحی بی الکفر، وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی، وانا العاقب الذی لیس بعدہٗ نبی۔ (بخاری ومسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی۔ ترمذی، کتاب الآداب، باب اسماء النبی۔ مُؤطا، کتاب اسماء النبی۔ المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد ہوں۔ میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں، کہ میرے ذریعے سے کفر محو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں، کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔ (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے۔) اور میں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ لم یبعث نبیًّا الاحذر امته الدجال وانا اٰخر الانبیاء وانتم اٰخر الامم وهو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

خارج فیکم لامحالۃ
(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب الدّجّال)

آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اورتم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمھارے اندر ہی نکلنا ہے۔

(۷) عن عبدالرحمٰن بن جبیر قال سمعت عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص یقول خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یومًا کالمودّع فقال انا محمّد النبی الامی ثلاثًا ولا نبی بعدی۔ (مُسنَدِ احمد، مَروِیاتِ عبداللہ بن عَمرؓو بن العاص)

عبدالرحمٰن بن جُبَیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہؓ بن عَمرؓو بن عاصؓ کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے، اس انداز سے کہ گویا آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: ''میں محمد نبیِ اُمّی ہوں۔'' پھر فرمایا: ''اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

(۸) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات۔ قیل وما المبشرات یا رسول اللّٰہ؟ قال الرؤیا الحسنۃ۔ او قال الرؤیا الصالحۃ۔
(مُسنَدِ احمد، مَروِیاتِ ابو الطفیلؓ۔ نَسائی۔ ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد کوئی نُبوّت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں۔'' عرض کیا گیا: ''وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسول اللہ؟'' فرمایا: ''اچھا خواب''، یا فرمایا ''صالح خواب۔'' (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعے سے مل جائے گا۔)

(۹) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبیّ لکان عمر بن الخطاب۔
(ترمذی، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ بن الخطّاب ہوتے۔

(۱۰) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لِعَلِیّ انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسٰی، الا انہ لانبی بعدی۔
(بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: میرے ساتھ تمھاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مُسنَدِ احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص سے رِوایت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبوۃ بعدی، ''مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔'' ابوداؤد طَیالِسیؒ، امام احمدؒ اور محمد بن اسحاقؒ نے اس سلسلے میں جو تفصیلی رِوایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مدینۂ طیّبہ کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انھوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟'' اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ''تم میرے ساتھ وہی نسبت

رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ رکھتے تھے۔" یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپؐ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ...... وانہ سیکون فی اُمّتی کذّابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ (ابوداؤد، کتاب الفتن)	ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ...... اور یہ کہ میری اُمت میں تیس کذّاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النّبیّین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب الملاحم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثوبانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں، اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من ثلاثین کلھم یزعم انہ رسول اللّٰہ، "یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

(۱۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یُکلّمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر۔ (بخاری، کتاب المناقب)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں، ان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلّمون کے بجائے محدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مُکلَّم اور محدَّث، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس امت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لانبی بعدی ولا امۃ بعد امتی۔ (بیہقی، کتاب الرؤیا، طبرانی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں۔
(۱۴) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فانی آخر الانبیاء وان مسجدی آخر المساجد۔ (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ بمسجد مکہ والمدینہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔[1]

---

[1] منکرین ختمِ نبوت اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخر المساجد فرمایا، حالانکہ وہ آخری

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجال و کذاب[1] ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند، معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہوسکتی ہے۔ رسول پاکؐ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہوسکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اُسے قبول کرنا کیا معنی قابلِ التفات بھی نہ سمجھیں؟

مسجد نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی بے شمار مسجدیں دنیا میں بنی ہیں، اسی طرح جب آپؐ نے فرمایا کہ میں آخر الانبیاء ہوں تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آپؐ کے بعد نبی آتے رہیں گے، البتہ فضیلت کے اعتبار سے آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کی مسجد آخری مسجد ہے۔ لیکن درحقیقت اسی طرح کی تاویلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ صحیح مسلم کے جس مقام پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس کے سلسلے کی تمام احادیث کو ایک نظر ہی آدمی دیکھ لے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخری مسجد کس معنی میں فرمایا ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حوالے سے جو روایات امام مسلمؒ نے نقل کی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کو عام مساجد پر فضیلت حاصل ہے، جن میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، اور اسی بنا پر صرف انھی تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کر کے جانا جائز ہے، باقی کسی مسجد کا یہ حق نہیں ہے کہ آدمی دوسری مسجدوں کو چھوڑ کر خاص طور پر اُس میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ ان میں سے پہلی مسجد، مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ دوسری مسجد، مسجد اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد، مدینہ طیبہ کی مسجدِ نبویؐ ہے جس کی بنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے میری اس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی طرف نماز کی غرض سے سفر کر کے جانا درست ہو۔

1 منکرینِ ختمِ نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "قولوا انہ خاتم الانبیاء، ولا تقولوا لا نبی بعدہٗ" یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں، مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ لیکن اول تو حضورؐ کے صاف صاف ارشادات کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی کی بات ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طرف جس روایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود نہایت ضعیف ہے۔ حدیث کی کسی معتبر کتاب میں ان کا یہ قول کسی سند کے ساتھ نقل نہیں کیا گیا ہے۔ تفسیر کی ایک کتاب درِّ منثور اور لُغتِ حدیث کی ایک کتاب تکملہ مجمع البحار میں اسے بلا سند نقل کیا گیا ہے اور اس کی سند کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ ایسی ایک ضعیف ترین روایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا اِجماع

قرآن وسنّت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرامؓ کے اِجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی رِوایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، اُن سب کے خلاف صحابۂ کرامؓ نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اِس سلسلے میں خُصوصیّت کے ساتھ مُسَیلَمۂ کذّاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُسے حضورؐ کے ساتھ شریکِ نبوت بنایا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپؐ کو لکھا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مُسَيْلمة رسول الله الى محمدٍ رسول الله	مُسَیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف!
سلام عليك فانی اُشْرِکتُ فی الامر معك۔	آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ
(طَبَری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)	نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

علاوہ بریں مؤرّخ طَبَریؒ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ مُسَیلمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی، اس میں اشھد انّ محمداً رسول اللّٰہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرارِ رسالتِ محمّدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنوحَنِیفہ نیک نیتی کے ساتھ (in good faith) اُس پر ایمان لائے تھے اور انھیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود شریکِ رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو اُن کے سامنے مُسَیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینۂ طیّبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا۔ (البِدَایۃ والنّھایۃ لابنِ کثیر، جلد ۵، ص ۵۱) مگر اس کے باوجود صحابۂ کرامؓ نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجایش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف اِرتِداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رُو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جاسکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار، ذِمّی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مُسَیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرمایا کہ اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اَسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا۔ چنانچہ انھی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصّے میں آئی جس کے بطن سے تاریخِ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حَنَفِیّہ[1] نے جنم لیا۔ (البِدَایۃ والنّھایۃ، جلد ۶، ص ۳۱۶، ۳۲۵) اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جُرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اِجماعِ صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

---

[1] حَنَفِیّہ سے مراد ہے قبیلۂ بنوحَنِیفہ کی عورت۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تمام علمائے اُمّت کا اِجماع

اجماعِ صحابہ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دَورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے اُمت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علما اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر خارج از ملّتِ اسلام ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند شواہد مُلاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ (۸۰ھ - ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا: "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امامِ اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابنِ احمد المکّی، ج ۱، ص ۱۶۱۔ مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابنِ جَرِیر طَبَرِیؒ (۲۲۴ھ - ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوة فطبع علیها فلا تفتح لاحد بعدہٗ الی قیام الساعة "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔" (تفسیر ابنِ جَرِیر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) امام طَحَاویؒ (۲۳۹ھ - ۳۲۱ھ) اپنی کتاب "عقیدۂ سَلَفِیَّہ" میں سَلَف صالحین، اور خُصوصاً امام ابوحنیفہ، امام ابویوسُف اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: "اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیا، امام الاتقیا، سَیِّدالمرسلین اور حبیبِ ربّ العالَمین ہیں، اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے۔" (شرح الطَّحاویہ فی العقیدۃ السَّلَفِیّہ، دارالمعارف مصر، صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲)

(۴) علّامہ ابنِ حَزم اَندُلُسیؒ (۳۸۴ھ - ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّوجلّ فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ، وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (اُلمحلّٰی، ج ۱، ص ۲۶)

(۵) امام غَزَّالیؒ (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں[1]:

لوفتح هٰذا الباب (ای باب انکار کون الاجماع حجة) انجر الی امور شنیعة وهو	اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجت ماننے سے انکار کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بڑی قبیح باتوں تک

[1] امام غَزّالیؒ کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرینِ ختمِ نبوت نے اس حوالے کی صحت کو بڑے زور شور سے چیلنج کیا ہے۔

قُلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ بَلْ قَالُوٓا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ

رسولؐ نے کہا: میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے[6]۔

وہ کہتے ہیں: "بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اِس کی مَن گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے[7]۔

۶ - یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (whispering campaign) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ "تم لوگ جو کچھ باتیں بناتے ہو، سب خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔" وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اُتر آیا۔

۷ - اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکے کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کی جائے، اور ہر اس شخص کو، جو مکے میں زیارت کے لیے آئے، آپؐ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپؐ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے، جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے، اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی! وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تُک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تُلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انھوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپؐ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی، وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفَیل بن عَمْرو دَوسی کا قصہ ہے، جسے ابنِ اسحاق نے خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبیؐ کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپؐ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

پس آپؐ انبیاؑ کے خاتم ہیں...... اور ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اِس آیت میں) یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔" (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) علّامہ زَمَخْشَرِی (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کَشّاف میں لکھتے ہیں: "اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جب کہ حضرت عیسٰیؑ آخر زمانے میں نازل ہوں گے؟ تو میں کہوں گا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا اس معنٰی میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسٰی علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے، اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدیہ کے پیرو اور آپؐ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ ہی کی اُمت کے ایک فرد ہیں۔" (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عِیَاضؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: "جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعوٰی کرے، یا اس بات کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کر سکتا ہے اور صفائیِ قلب کے ذریعے سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعوٰی تو نہ کرے مگر یہ دعوٰی کرے کہ اس پر وحی آتی ہے...... ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے خبر دی ہے کہ آپؐ خاتم النّبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپؐ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپؐ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے، اس کے معنٰی و مفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجایش نہیں ہے۔ لہٰذا اِن تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربِنائے اجماع بھی اور بربِنائے نقل بھی۔" (شفا، جلد ۲، ص ۲۷۰-۲۷۱)

(۹) علامہ شُہرِستانیؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب اَلمِلَل والنِّحَل میں لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جو کہے...... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسٰی علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۱۰) امام رازیؒ (۵۴۳ھ - ۶۰۶ھ) اپنی تفسیرِ کبیر میں آیتِ خاتم النّبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس سلسلہ بیان میں وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیحِ احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کر سکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی اُمت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اُس کے بعد نہیں ہے۔" (جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱۱) علامہ بَیضاویؒ (مُتوَفّٰی ۶۵۸ھ) اپنی تفسیر انوار التَّنزیل میں لکھتے ہیں: "یعنی آپؐ انبیاؑ میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاؑ کے سلسلے پر مُہر کر دی گئی۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا اس ختمِ نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔" (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۱۲) علامہ حافظ الدین النَّسَفیؒ (مُتوَفّٰی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر "مَدارِک التَّنزیل" میں لکھتے ہیں: "اور آپؐ خاتم النّبیین ہیں......

یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰؑ، تو وہ ان انبیاؑ میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ کی اُمت کے افراد میں سے ہیں۔'' (ص ۴۷۱)

(۱۳) علامہ علاء الدین بغدادی (مُتوفّی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر ''خازن'' میں لکھتے ہیں: وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، یعنی اللہ نے آپؐ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپؐ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپؐ کے ساتھ کوئی اس میں شریک...... وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (ص ۴۷۱-۴۷۲)

(۱۴) علامہ ابنِ کثیرؒ (مُتوفّی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: ''پس یہ آیت اس باب میں نصِ صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپؐ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجۂ اَولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا...... حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کیسے ہی خرقِ عادت اور شعبدے اور جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے ...... یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدّعی ہو۔'' (جلد ۳، ص ۴۹۳-۴۹۴)

(۱۵) علامہ جلال الدین سُیوطیؒ (مُتوفّی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں: ''وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسیٰؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت ہی کے مطابق عمل کریں گے۔'' (ص ۷۶۸)

(۱۶) علامہ ابنِ نُجَیمؒ (مُتوفّی ۹۷۰ھ) اُصولِ فقہ کی مشہور کتاب اَلْاَشْبَاہ وَالنَّظَائِر، کتاب السِّیَر، باب الرِّدّۃ میں لکھتے ہیں: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔'' (ص ۱۷۹)

(۱۷) مُلّا علی قاریؒ (مُتوفّی ۱۰۱۶ھ) شرحِ فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔'' (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حَقّیؒ (مُتوفّی ۱۱۳۷ھ) تفسیر رُوح البیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عاصم نے لفظ خاتَم ''ت'' کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنیٰ ہیں آلۂ ختم کے جس سے مُہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاؑ میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعے سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے ''مُہرِ پیغمبراں'' کہیں گے یعنی آپؐ سے نبوت کا دروازہ سر بمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ''ت'' کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے، یعنی آپؐ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اس کو ''مُہر کنندۂ پیغمبراں'' کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنیٰ ہی ہے...... اب آپؐ کی امت کے علما آپؐ سے صرف وِلایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپؐ کی خَتمیّت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے

Maktaba Tul Ishaat.com

بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النّبیّین ہونے میں قادح نہیں ہے، کیونکہ خاتم النّبیّین ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا......اور عیسیٰؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ ہی کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی اُمت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوں گے......اور اہلِ سُنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا: لا نبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے نَص کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اُس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجت نے حق کو باطل سے مُمیَّز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' (جلد ۲۲، ص ۱۸۸)

(۱۹) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علما نے مُرتّب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔'' (جلد ۲، ص ۲۶۳)

(۲۰) علامہ شوکانی (مُتوفّٰی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: ''جُمہور نے لفظِ خاتِم کو ''ت'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قِراءت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپؐ نے انبیا کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ ان کے لیے مہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعے سے ان کا سلسلہ سربمُہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزیّن ہوا۔'' (جلد ۴، ص ۲۷۵)

(۲۱) علامہ آلُوسی (متوفّٰی ۱۲۷۰ھ) تفسیر رُوح المعانی میں لکھتے ہیں: ''نبی کا لفظ رسول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیّین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپؐ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپؐ کے خاتمِ انبیا و رُسل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وصفِ نبوت سے آپؐ کے متصف ہونے کے بعد اب جِن واِنس میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہو گیا۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۲) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحیِ نبوت کا مدّعی ہو، اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۸) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النّبیّین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور اُمت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اسے کافر قرار دیا جائے گا۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اَندُلس تک، اور ٹُرکی سے لے کر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علما و فقہا اور محدثین و مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سِنینِ ولادت و وفات بھی دے دیے ہیں، جن سے

ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اُن میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انھیں اس لیے چھوڑ دیا کہ اُن کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اِس دَور کے مدعیِ نبوت کی ضد میں ختمِ نبوت کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے علما کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ اِن تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام مُتَّفَقَہ طور پر ''خاتم النّبیین'' کے معنیٰ ''آخری نبی'' ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا مُتَّفَق عَلَیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اُس کے دعوے کو مانے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النّبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سِیاق و سَباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابۂ کرامؓ کا اِجماع ہے، اور جسے صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مَدّعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجایش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریم نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں:

کیا اللہ کو ہمارے ایمان سے کوئی دشمنی ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اُس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اَولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس کا کُھلا کُھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیا آئیں گے اور تمھیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسولؐ، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

خطرہ ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پُرس ہی کا تو ہوسکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِعدالت لاکر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ! اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدّعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کرسکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقل مند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

اب نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآنِ مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرّر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتا چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاؑ مبعوث ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اِس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بُھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہوگئی ہو، اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے سے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدّنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بِعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث وسیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اِس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری صورت بھی ختم ہو گئی۔

پھر قرآنِ مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی۔

نئی نبوت اب اُمّت کے لیے رحمت نہیں بلکہ لعنت ہے

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہوگا۔ جو اس کو مانیں گے وہ ایک اُمت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمت ہوں گے۔ اِن دونوں امتوں کا اختلاف محض فُروعی اختلاف نہ ہوگا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو اُنھیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے مآخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے مآخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختمِ نبوت اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اِس امت کا ایک دائمی اور عالم گیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور مآخذِ ہدایت کی طرف رُجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا۔ کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دُنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعے سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے، تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دُنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمت بن سکے اور بلاضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ ''ظلّی'' ہو یا ''بُرُوزی''، اُمّتی ہو یا صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہو گا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہو گا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہو گا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو۔ مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک امت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اِجماع سے ثابت ہے، عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

''مسیحِ مَوعُود'' کی حقیقت

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں ''مسیحِ مَوعُود'' کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے اُن کے آنے سے ختمِ نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختمِ نبوت بھی برحق اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مسیحِ مَوعُود'' سے مراد عیسیٰؑ ابنِ مریم نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مثیلِ مسیح، یعنی حضرت عیسیٰؑ کے مانند ایک مسیح ہے، اور وہ فلاں شخص ہے جو آ چکا ہے۔ اُس کا ماننا عقیدۂ ختمِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اِس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے۔

احادیث در بابِ نزولِ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی هريرة قال قال رسول الله — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللّٰہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیُوْشِکَنّ ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویَضَعَ الحربَ ویُفیضَ المال حتّٰی لا یقبلہٗ احدٌ حتّٰی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرًا من الدّنیا وما فیھا (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسٰی ابنِ مریم۔ مسلم، باب بیانِ نزولِ عیسٰی۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزولِ عیسٰی۔ مُسندِ احمد، مَرْوِیاتِ ابوہریرہؓ)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اُتریں گے تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے[1]، اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دُوسری روایت میں حرب کے بجائے جِزیہ کا لفظ ہے، یعنی جزیہ ختم کر دیں گے[2]) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔

(۲) ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعۃ حتّٰی ینزل عیسٰی ابن مریم ..... ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہولیں عیسٰی ابنِ مریمؑ''......اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اُوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدّجال)

(۳) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (بخاری، کتاب احادیث الانبیا، باب نزول عیسٰی۔ مسلم، باب بیان نزولِ عیسٰی۔ مُسندِ احمد، مَروِیاتِ ابی ہریرہؓ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیسے ہو گے تم، جب کہ تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور تمھارا امام اُس وقت خود تم میں سے ہوگا[3]۔

---

[1] صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اِکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر ''لعنت'' کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاؑ کی امتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیّت یہ ہے کہ انھوں نے صرف اِس عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتّٰی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاؑ کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا، تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیرووں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

[2] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت ملّتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملّتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ و ۱۵ دلالت کر رہی ہیں۔

[3] یعنی نماز میں حضرت عیسٰیؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

(۴) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینزل عیسٰی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویمحوا الصلیب و تجمع لہ الصلٰوۃ ویعطی المال حتی لایقبل ویضع الخراج وینزل الرّوحاء فیحجّ منھا، اویعتمر، او یجمعھما۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ مَرویاتِ ابی ہُرَیرہؓ۔ مسلم، کتاب الحج، باب جواز التمتّع فی الحج والقِران)

حضرت ابو ہریرہؓ سے رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے، پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ خَراج ساقط کر دیں گے اور رَوحا[1] کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے۔[2] راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کون سی بات فرمائی تھی۔

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکرخروج الدجال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصّفوف اذا اقیمت الصّلٰوۃ فینزل عیسٰی ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدو اللّٰہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لا نذاب حتّٰی یھلك ولٰکن یقتلہ اللّٰہ بیدہٖ فیریھم دمہ فی حربتہ۔ (مِشکٰوۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، بحوالۂ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے رِوایت ہے (دجّال کے خُروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثنا میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیرِ اقامت کہی جا چکی ہو گی کہ عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے۔ اگر عیسٰی علیہ السلام اس کو اُس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گُھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔

(۶) عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لیس بینی وبینہ نبی (یعنی عیسٰی) وانہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض، ممصرتین کان رأسہ یقطر وَان لم یصبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدقِ الصلیب ویقتل الخنزیر

حضرت ابو ہریرہؓ سے رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور اُن (یعنی عیسٰی علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بہ سرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔

[1] مدینے سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

[2] واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیلِ مسیح قرار دیا گیا ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

ویضع الجزیۃ ویھلک اللّٰہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنۃ ثم یتوفی فیصلی علیہ المسلمون۔
(ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجّال۔ مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابوہُریرہؓ)

ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام مِلّتوں کو مٹا دے گا، اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔

(۷) عن جابر بن عبداللّٰہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ...... فینزل عیسٰی بن مریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم فیقول امیرھم تعال فصلِّ فیقول لا ان بعضکم علٰی بعض امراء تکرمۃ اللّٰہ ھٰذہ الامۃ۔ (مسلم، بیانِ نُزولِ عیسٰی ابنِ مریم۔ مُسنَدِ احمد بسلسلۂ مَرویّاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ...... پھر عیسیٰ ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔[1] یہ وہ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اِس اُمّت کو دی ہے۔

(۸) عن جابر بن عبداللّٰہ (فی قصۃ ابن صیّاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتلہ یا رسول اللّٰہ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یکن ھو فلست صاحبہ انما صاحبہ عیسٰی ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام، وان لا یکن فلیس لک ان تقتل رجلا من اھل العھد۔ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب قصۂ ابنِ صیّاد، بحوالہ شرح السُّنّۃ بَغَوی)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ (قصۂ ابنِ صیّاد کے سلسلے میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خطّاب نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسٰی ابن مریمؑ ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمھیں اہلِ عہد (یعنی ذِمّیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۹) عن جابر بن عبداللّٰہ (فی قصّۃ الدجّال) فاذا ھم بعیسٰی ابن مریم علیہ السلام فتقام الصلوٰۃ فیقال لہ تقدم یا روح

حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے رِوایت ہے کہ (دجّال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اُس وقت یکایک عیسٰی ابنِ مریمؑ علیہ السلام

[1] یعنی تمھارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰہ فیقول لیتقدم امامکم فلیصلِّ بکم فاذا صلی صلٰوۃ الصبح خرجوا الیہ قال فحین یری الکذاب ینماث کما ینماث الملح فی الماء فیمشی الیہ فقتلہٗ حتّٰی ان الشجر والحجر ینادی یا روح اللّٰہ ھذا الیھودیُّ، فلا یترک ممن کان یتبعہ احدا الا قتلہٗ۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ روایاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

مسلمانوں کے درمیان آ جائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے رُوح اللہ! آگے بڑھیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمھارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجّال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا: جب وہ کذّاب حضرت عیسیٰؑ کو دیکھے گا تو گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجّال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰؑ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فی قصۃ الدجّال) فبینما ھو کذٰلك اذ بعث اللّٰہ المسیح بن مریم فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق بین مھروذتین واضعًا کفیہ علٰی اجنحۃ ملکین اذا طأطأ راسہٗ قطر واذا رفعہ تحدر منہ جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسہ الا مات ونفسہ ینتھی الٰی حیث ینتھی طرفہ فیطلبہ حتّٰی یدرکہ بباب لُدٍّ فیقتلہٗ۔ (مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خُروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

حضرت نَوّاس بن سَمعان کِلابی (قصۂ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثنا میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیحؑ ابنِ مریم کو بھیج دے گا اور وہ دِمَشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی ــــ اور وہ ان کی حدِّ نظر تک جائے گی ــــ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابنِ مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد اللّٰہ بن عمر وقال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یخرج الدجال

حضرت عبداللہ بن عَمْرُوؓ بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجّال میری اُمّت

[1] واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاستِ اسرائیل کے دار السلطنت تَل اَبِیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

فی امتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یومًا او اربعین شھرًا او اربعین عامًا) فیبعث اللّٰہ عیسٰی ابن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہ ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ۔(مسلم، ذکر الدجال)

میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال[1]) رہے گا۔ پھر اللہ عیسٰیؑ ابن مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عُروہؓ بن مسعود (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۲) عن حذیفۃ بن اسید الغفاری قال اطلع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذاکر قال ما تذکرون قالوا نذکر الساعۃ قال انھا لن تقوم حتّٰی ترون قبلھا عشر اٰیات فذکر الدخان والدجال والدابۃ وطلوع الشمس من مغربھا ونزول عیسٰی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلثۃ خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرۃ العرب واٰخر ذٰلک نار تخرج من الیمن تطرد الناس الٰی محشرھم ۔ (مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعہ۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعہ)

حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا: وہ ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں: (۱) دُھواں، (۲) دجّال، (۳) دابّۃ الارض، (۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسٰیؑ ابنِ مریم کا نزول، (۶) یاجوج و ماجوج، (۷) تین بڑے خَسف[2]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں، (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں، (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

(۱۳) عن ثوبان مولٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عصابتان من امتی احرزھما اللّٰہ تعالٰی من النار۔ عصابۃ تغزو الھند، وعصابۃ تکون مع عیسٰی ابن مریم علیہ السلام۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثَوبانؓ رِوایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ”میری امت کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچالیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسٰیؑ ابن مریمؑ کے

[1] یہ حضرت عبداللہؓ بن عَمروؓ بن عاص کا اپنا قول ہے۔
[2] زمین دھنس جانا (landslide)

Maktaba Tul Ishaat.com

(نسائی، کتاب الجہاد۔ مُسندِ احمد، بسلسلۂ روایاتِ ثوبانؓ)

ساتھ ہوگا۔"

(۱۴) عن مُجمّع بن جارية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يقتل ابنُ مريم الدّجّال بباب لُدّ۔

(مُسندِ احمد۔ ترمذی، ابواب الفتن)

مُجمّعؓ بن جاریہ انصاری کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابنِ مریمؑ دجال کو لُد کے دروازے پر قتل کریں گے۔

(۱۵) عن ابی اُمامة الباهلی (فی حدیث طویل فی ذکر الدجال) فبینما امامهم قد تقدم یصلّی بهم الصبح اذ نزل علیهم عیسٰی ابن مریم فرجع ذٰلك الامام ینكص یمشی قهقرىٰ لیتقدم عیسٰی فیضع عیسٰی یده بین كتفیه ثم یقول لهٗ تقدم فصل فانها لك اقیمت فیصلّی بهم امامهم فاذا انصرف قال عیسٰی علیه السلام افتحوا الباب فیفتح ووراءه الدجال ومعه سبعون الف یهودی كلهم ذوسیف محلی وساج فاذا نظرالیه الدجال ذاب كما یذوب الملح فی الماء وینطلق هاربًا ویقول عیسٰی ان لی فیك ضربة لن تسبقنی بها فیدركه عند باب اللُّدِّ الشرقی فیهزم الله الیهود ...... وتملأ الارض من المسلم كما یملأ الاناء من الماء وتكون الكلمة واحدة فلا یعبد الا الله تعالٰی۔

(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجّال)

ابواُمامہ باہلیؓ (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا، عیسٰیؑ ابنِ مریم اُن پر اتر آئیں گے۔ امام پیچھے پلٹے گا تاکہ عیسٰیؑ آگے بڑھیں، مگر عیسٰیؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمھارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسٰی علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا۔ باہر دجال ۷۰ ہزار مُسلّح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسٰی علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی، وہ اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسٰیؑ کہیں گے: میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جاسکے گا۔ پھر وہ اسے لُد کے مشرقی دروازے پر جالیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا...... اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دنیا کا کلمہ ایک ہوجائے گا اور اللہ تعالٰی کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ...... وينزل عيسٰى ابن مريم

عثمانؓ بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے...... اور عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت

علیہ السلام عند صلوٰۃ الفجر فیقول له امیرھم یا روح اللّٰہ تقدم صلِّ، فیقول ھٰذہ الامۃ بعضھم امراء علٰی بعض فیتقدم امیرھم فیصلی، فاذا قضٰی صلٰوتہٗ اخذ عیسٰی حربتہٗ فیذھب نحو الدجال فاذا یراہ الدجال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع حربته بین شندوبته فیقتلہٗ وینھزم اصحابه لیس یومئذ شیٌٔ یواری منھم احدا حتّٰی ان الشجر لیقول یا مومن ھٰذا کافر ویقول الحجر یا مومن ھٰذا کافر۔
(مُسندِ احمد۔ طَبَرانی۔ حاکم)

اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس اُمت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسٰیؑ اپنا حربہ لے کر دجّال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا جیسے سیسا پگھلتا ہے۔ عیسٰی علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے، مگر کہیں انھیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی، حتّٰی کہ درخت پکاریں گے: اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے، اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرۃ بن جُندُب عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم (فی حدیث طویل) فیصبح فیھم عیسٰی ابن مریم فیھزمه اللّٰہ وجنودہ حتّٰی ان اجذم الحائط واصل الشجر لینادی یا مومن ھٰذا کافرٌ یستتربی فتعال اقتله۔ (مُسندِ احمد۔ حاکم)

سَمُرَہؓ بن جُندُب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسٰیؑ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا، یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن! یہ کافر میرے پیچھے چُھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

(۱۸) عن عمران بن حصین انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ظاھرین علٰی من ناوٰھم حتّٰی یاتی امر اللّٰہ تبارک وتعالٰی وینزل عیسٰی ابن مریم علیه السلام۔ (مُسندِ احمد)

عمرانؓ بن حُصَین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالٰی کا فیصلہ آ جائے اور عیسٰی ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

(۱۹) عن عائشۃؓ (فی قصّۃ الدجّال) فینزل عیسٰی علیه السلام فیقتله ثم یمکث عیسٰی علیه السلام فی الارض اربعین

حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسٰی علیہ السلام

Maktaba Tul Ishaat.com

سنة امامًا عادلاً وَحَكَمًا مُقسطًا ۔ (مُسندِ احمد)

چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔

(۲۰) عن سفينة مولٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم (في قصّة الدجّال) فينزل عيسٰى عليه السلام فيقتله الله تعالٰى عند عقبة اَفِيق ۔ (مُسندِ احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سَفِینہ (دجّال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجّال کو اَفِیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔

(۲۱) عن حذيفة (في ذكر الدجّال) فلما قاموا يصلّون نزل عيسٰى ابن مريم امامهم فصلّى بهم فلما انصرف قال هٰكذ افرجوا بيني وبين عدو الله...... ويسلط الله عليهم المسلمين فيقتلونهم حتّٰى ان الشجر والحجر لينادي يا عبدالله يا عبدالرحمٰن يا مسلم هٰذا اليهودي فاقتلهم فيفنيهم الله تعالٰى ويظهر المسلمون فيكسرون الصليب ويقتلون الخنزير ويضعون الجزية ۔ (مُستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابنِ حَجَر نے فتح الباری، جلد ۶، ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

حضرت حُذَیفہؓ بن یَمان (دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو اُن کی آنکھوں کے سامنے عیسٰیؑ ابنِ مریم اُتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے۔ پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ...... اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کر دے گا اور مسلمان انھیں خوب ماریں گے، یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے: اے عبداللہ! اے عبدالرحمٰن! اے مسلمان! یہ رہا ایک یہودی، مار اِسے۔ اس طرح اللہ ان کو فنا کر دے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے، لیکن طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

---

[1] اَفِیق، جسے آج کل فِیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلے پر طَبَرِیَّہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اُردُن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک گہرائی میں اُتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اُردُن طَبَرِیَّہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عَقَبۂ اَفِیق (افیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی ''مسیح موعود'' یا ''مثیلِ مسیح'' یا ''بروزِ مسیح'' کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اِس امر کی کوئی گنجایش ہے کہ کوئی شخص اِس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اَب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انھیں زندہ کر کے اُٹھا لانے پر قادر ہے[1] ورنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزار ہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اُسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابنِ مریم ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اَور چیز پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب مذاق ہے کہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انھی احادیث کی اس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسیٰؑ ابنِ مریم ہوں گے نہ کہ کوئی مثیلِ مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ اِن احادیث سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم کا یہ دوبارہ نزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا۔ نہ ان پر وحی نازل ہوگی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدیؐ میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ اُن کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آ کر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے۔[2] وہ صرف

---

[1] جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انھیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۹ ملاحظہ فرما لینی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو ۱۰۰ برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا: فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ۔

[2] علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (۷۲۲ھ-۷۹۲ھ) شرح عقائدِ نَسَفی میں لکھتے ہیں:

ثبت انه اٰخر الانبیاء ..... فان قیل قد روی فی الحدیث نزول عیسی علیه السلام بعدہٗ قلنا نعم لکنه یتابع محمدًا علیه السلام لان شریعته قد نسخت فلا یکون الیه وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة رسول اللّٰه علیه السلام۔ (طبع مصر، ص ۱۳۵)	یہ ثابت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں...... اگر کہا جائے کہ آپؐ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں، آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے، کیونکہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے اس لیے نہ ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہوگا کہ دجال کے فتنے کا استیصال کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انھیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسیٰ ابنِ مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آ کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اُس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے[1] اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا، اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آ کر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مُہرِ نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

اُن کا آنا بلاتشبیہ اسی نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدرِ ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دور میں کسی سابق صدر کے محض آ جانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے: ایک، یہ کہ سابق صدر آ کر پھر سے فرائضِ صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے، یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے،

اور یہی بات علامہ آلوسیؒ تفسیر رُوح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انہ علیہ السلام حین ینزل باق علی نبوتہ السابقۃ لم یعزل عنھا بحال لکنہ لایتعبد بھا لنسخھا فی حقہ وحق غیرہ وتکلیفہ باحکام ھذہ الشریعۃ اصلاً وفرعاً فلا یکون الیہ علیہ السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و حاکما من حکام ملتہ بین امتہ۔ (جلد ۲۲، ص ۳۲)

پھر عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، بہر حال اس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے، اور اب وہ اُصول اور فُروع میں اِس شریعت کی پیروی پر مکلف ہوں گے، لہٰذا اُن پر نہ اب وحی آئے گی اور نہ انھیں احکام مقرر کرنے کا اختیار ہوگا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپؐ کی اُمت میں ملّتِ محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازیؒ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتھاء الانبیاء الی مبعث محمد صلی اللہ علیہ وسلم فعند مبعثہ انتھت تلک المدۃ فلا یبعد ان یصیر (ای عیسیٰ ابن مریم) بعد نزولہ تبعاً لمحمد (تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۳۴۳)

انبیا کا دور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تھا۔ جب آپ مبعوث ہو گئے تو نبیوں کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔

[1] اگرچہ دو روایتوں (نمبر ۵ و ۲۱) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد پہلی نماز خود پڑھائیں گے،

کیونکہ یہ اُن تمام کاموں کے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنی ہوگا جو اس کے دورِ صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختمِ نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آکر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائضِ نبوت انجام دینے شروع کردیں، یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کردے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدِّباب کردیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰ ابنِ مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔

اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ اُن کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہوجائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی اُس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری اُمت ابتدا سے ان کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ عیسیٰ ابنِ مریم کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختمِ نبوت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو ان احادیث سے، اور بکثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجال، جس کے فتنۂ عظیم کا اِستیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے در پے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار بابل اور اَسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تتر بتر کردیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کردے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کردے۔ لیکن ان کی اِن توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہوکر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہوگئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیح مَوعُود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوش خبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ اُن کا لٹریچر اس آنے والے دَور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربّیوں کے ادبیات میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ اُمید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیح مَوعُود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فُرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انھیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس ملک میں پھر سے جمع کردے گا۔

لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۳، ۷، ۹، ۱۵، ۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے بڑھائیں گے۔ اسی بات کو محدثین اور مفسرین نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اب اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پس منظر میں ان کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دجّالِ اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضورؐ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا ''مسیح مَوعُود'' بن کر اُٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصّے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس داں اور ماہرینِ فُنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی یہ طاقت گردو پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی ''میراث کا ملک'' حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کُھلّم کُھلّا شائع کر رہے ہیں، اُسے مقابل کے صفحے پر مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لُبنان، پورا اُرْدُن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ، اور سعودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں جس میں مدینہ منورہ بھی شامل ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آیندہ کسی عالمگیر جنگ کی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اس موقع پر وہ دجّالِ اکبر اُن کا مسیح مَوعُود بن کر اُٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپؐ فتنۂ مسیح دجّال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اِس مسیح دجّال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مَثیلِ مسیح کو نہیں بلکہ اُس اصلی مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقا یا امریکا میں نہیں بلکہ دِمَشق میں ہوگی، کیونکہ یہی مقام اُس وقت عین محاذِ جنگ پر ہوگا۔ براہِ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دِمَشق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں، ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ مسیح دجال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گُھسے گا اور دِمَشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اس نازک موقع پر دِمَشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم صبح دَم نازل ہوں گے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے دجال پسپا ہو کر اَفِیق کی گھاٹی سے (مُلاحَظہ ہو: حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخر کار لُدّ کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ ان کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ (حدیث نمبر ۱۰، ۱۴، ۱۵) اس کے بعد یہودی چُن چُن کر قتل کیے جائیں گے اور ملّتِ یہود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (حدیث نمبر ۹، ۱۵، ۲۱) عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اظہارِ حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱، ۲، ۴، ۶)، اور تمام ملتیں ایک ہی ملت مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی۔ (حدیث نمبر ۶، ۱۵)

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ ''مسیح مَوعُود'' کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے، وہ ایک جَعَل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں

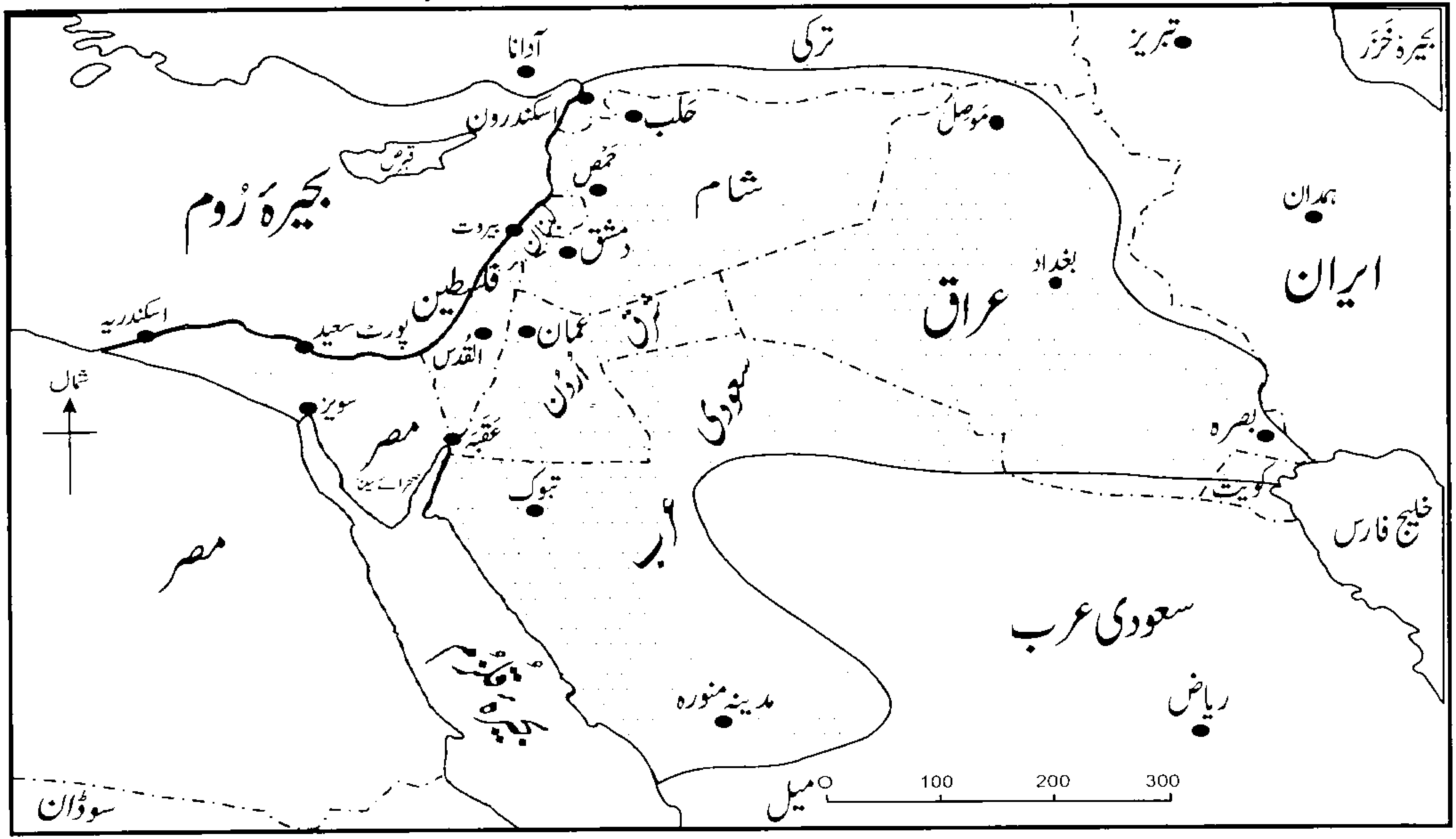

Maktaba Tul Ishaat.com

حقیقی مسیحؑ کے نُزول کا مقام

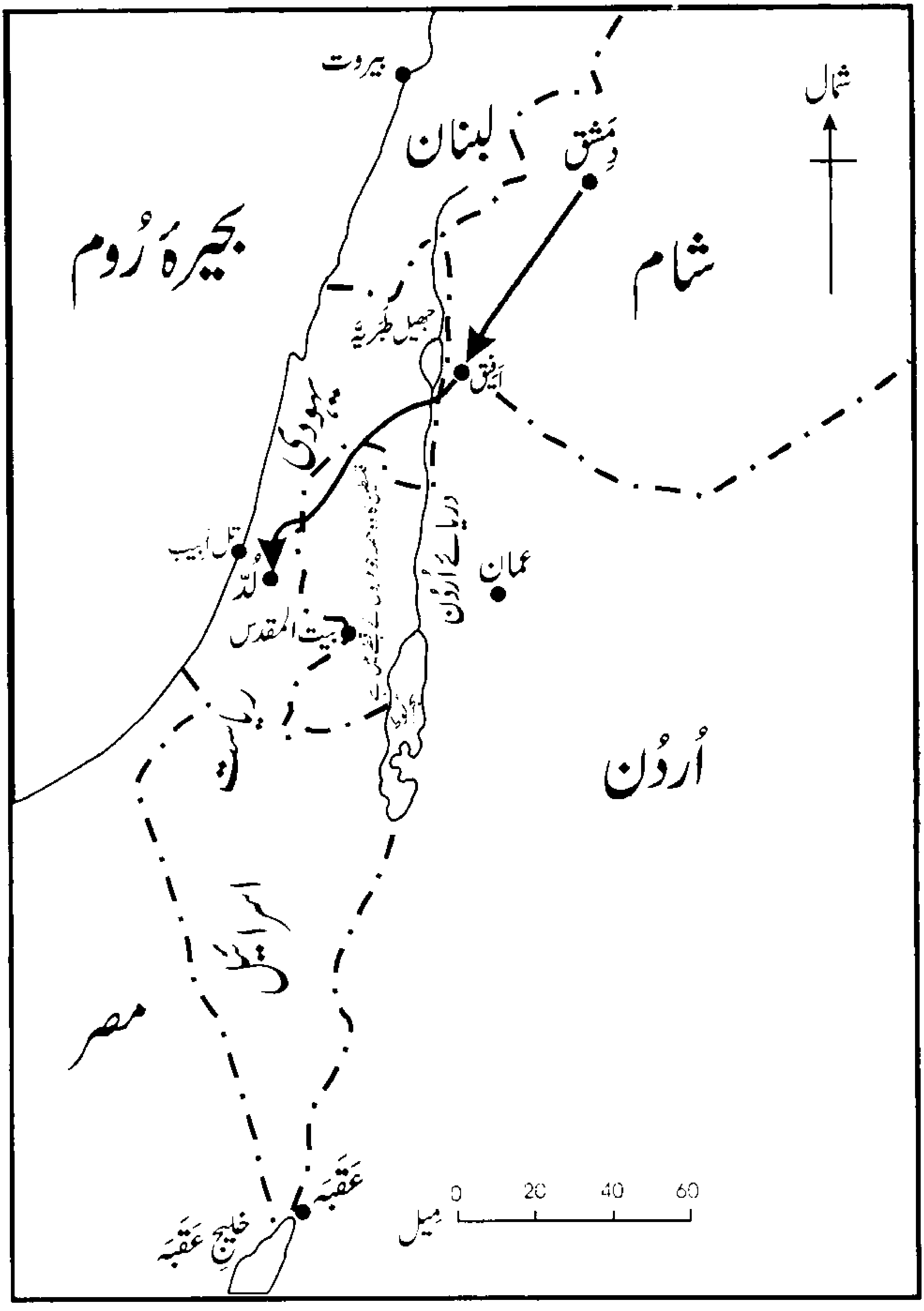

اس جعل سازی کا سب سے زیادہ مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیشین گوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں، انھوں نے خود عیسٰیؑ ابنِ مریم بننے کے لیے یہ دلچسپ تاویل فرمائی ہے:

''اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہینِ احمدیہ کے تیسرے حصّے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفتِ مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی ...... پھر ...... مریم کی طرح عیسٰیؑ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصۂ چہارم میں درج ہے، مجھے مریم سے عیسٰیؑ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھیرا۔'' (کشتی نوح، ص ۸۷، ۸۸، ۸۹)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسٰیؑ ابنِ مریم بن کر تولّد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسٰیؑ ابنِ مریم کا نُزول تو احادیث کی رُو سے دِمَشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مَقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری پُرلطف تاویل سے یوں رفع کی گئی:

''واضح ہو کہ دِمَشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دِمَشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں ...... یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سُکونت رکھتے ہیں دِمَشق سے ایک مُشابہت اور مناسبت رکھتا ہے۔'' (حاشیۂ ازالۂ اوہام، ص ۶۳ تا ۷۳)

پھر ایک اور اُلجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رُو سے ابنِ مریم کو ایک سفید مَنارہ کے پاس اترنا تھا۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آکر اپنا مَنارہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رُو سے مَنارہ وہاں ابنِ مریم کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیحِ مَوعُود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست اُلجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسٰیؑ ابنِ مریم کو لُدّ کے دروازے پر دجّال کو قتل کرنا تھا۔ اِس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لُدّ بیت المَقدِس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے۔ (ازالۂ اَوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، بتقطیع خُرد، ص ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ ''لُدّ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں ...... جب دجّال کے بے جا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے تب مسیحِ مَوعُود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔'' (ازالۂ اوہام، ص ۷۳۰) لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لُدّ سے مراد لُدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجّال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مُخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الہدیٰ، ص ۹۱)

اِن تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ (false impersenation) کا صریح ارتکاب ہے جو علی الاعلان کیا گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

سبا

(۳۴)

سبا

نام آیت ۱۵ کے فقرے لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں سبا کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے نزول کا ٹھیک زمانہ کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ مکہ کا دورِ متوسط ہے یا دورِ اوّل۔ اور اگر دورِ متوسط ہے تو غالباً اس کا ابتدائی زمانہ ہے جب کہ ظلم و ستم کی شدت شروع نہ ہوئی تھی اور ابھی صرف تضحیک و استہزاء، افواہی جنگ، جھوٹے الزامات اور وسوسہ اندازیوں سے اسلام کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

موضوع اور مضمون اس سورہ میں کفار کے اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت پر اور خود آپؐ کی نبوت پر زیادہ تر طنز و تمسخر اور بے ہودہ الزامات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ اُن اعتراضات کا جواب کہیں تو ان کو نقل کر کے دیا گیا ہے، اور کہیں تقریر سے خود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر و بیشتر تفہیم و تذکیر اور استدلال کے انداز میں ہیں، لیکن کہیں کہیں کفار کو ان کی ہٹ دھرمی کے بُرے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ اور قومِ سبا کے قصّے اس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ تمھارے سامنے تاریخ کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقتیں بخشیں اور وہ شوکت و حشمت عطا کی جو پہلے کم ہی کسی کو ملی ہے، مگر یہ سب کچھ پا کر وہ کبر و غرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے شکر گزار بندے ہی بنے رہے۔ اور دوسری طرف سبا کی قوم ہے جسے اللہ نے جب اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ پھول گئی اور آخرکار اس طرح پارہ پارہ ہوئی کہ اس کے بس افسانے ہی اب دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر خود رائے قائم کر لو کہ توحید و آخرت کے یقین اور شکرِ نعمت کے جذبے سے جو زندگی بنتی ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ زندگی جو کفر و شرک اور انکارِ آخرت و دنیا پرستی کی بنیاد پر بنتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۵۴ ## سُوۡرَةُ سَبَاٍ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِى الۡاٰخِرَةِ ‌ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ۝ يَعۡلَمُ مَا يَلِجُ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا ‌ؕ وَهُوَ الرَّحِيۡمُ الۡغَفُوۡرُ ۝۲

حمد اُس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک[1] ہے، اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد[2] ہے۔ وہ دانا اور باخبر[3] ہے۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور[4] ہے۔

۱ – حمد کا لفظ عَرَبی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنیٰ مراد ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک ہے تو لامحالہ اس کائنات میں جمال و کمال اور حکمت و قدرت اور صنّاعی و کاریگری کی جو شان بھی نظر آتی ہے اس کی تعریف کا مستحق وہی ہے۔ اور اس کائنات میں رہنے والا جس چیز سے بھی کوئی فائدہ یا لُطف و لذت حاصل کر رہا ہے اس پر خدا ہی کا شکر اسے ادا کرنا چاہیے۔ کوئی دوسرا جب ان اشیا کی مِلکیت میں شریک نہیں ہے تو اُسے نہ حمد کا استحقاق پہنچتا ہے نہ شکر کا۔

۲ – یعنی جس طرح اس دنیا کی ساری نعمتیں اُسی کی بخشش ہیں اسی طرح آخرت میں بھی جو کچھ کسی کو ملے گا اُسی کے خزانوں سے اور اسی کی عطا سے ملے گا، اس لیے وہاں بھی وہی تعریف کا مستحق بھی ہے اور شکر کا مستحق بھی۔

۳ – یعنی اس کے سارے کام کمال درجے حکمت و دانائی پر مبنی ہیں، جو کچھ کرتا ہے بالکل ٹھیک کرتا ہے۔ اور اسے اپنی ہر مخلوق کے متعلق پورا علم ہے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کیا اس کی ضروریات ہیں، کیا چیز اس کی مصلحت کے لیے مناسب ہے، کیا اس نے اب تک کیا ہے اور آگے کیا اس سے صادر ہونے والا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا سے بے خبر نہیں ہے بلکہ اسے ذرّے ذرّے کی حالت پوری طرح معلوم ہے۔

۴ – یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں اگر کوئی شخص یا گروہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود پکڑا نہیں

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۳﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ

منکرین کہتے ہیں: کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے[۵]! کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے[۶] گی۔ اُس سے ذرّہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرّے سے بڑی اور نہ اُس سے چھوٹی، سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے[۷]۔ اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں۔

جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دنیا اندھیر نگری اور اللہ تعالیٰ اس کا چوپٹ راجا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور درگزر سے کام لینا اس کی عادت ہے۔ عاصی اور خاطی کو قصور سرزد ہوتے ہی پکڑ لینا، اس کا رزق بند کر دینا، اس کے جسم کو مفلوج کر دینا، اس کو آناً فاناً ہلاک کر دینا، سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، مگر وہ ایسا کرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ قادرِ مُطلَق ہونے کے باوجود وہ نافرمان بندوں کو ڈھیل دیتا ہے، سنبھلنے کی مہلت عطا کرتا ہے، اور جب بھی وہ باز آ جائیں، معاف کر دیتا ہے۔

۵ – یہ بات وہ طنز اور تمسخر کے طور پر چندرا چندرا کر کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہ پیغمبر صاحب قیامت کے آنے کی خبر سنا رہے ہیں، مگر کچھ خبر نہیں کہ وہ آتے آتے کہاں رہ گئی۔ ہم نے اتنا کچھ انھیں جھٹلایا، اتنی گستاخیاں کیں، ان کا مذاق تک اُڑایا، مگر وہ قیامت ہے کہ کسی طرح نہیں آ چکتی۔

۶ – پروردگار کی قسم کھاتے ہوئے اس کے لیے ''عالم الغیب'' کی صفت استعمال کرنے سے خود بخود اس امر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کا وقت خدائے عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہی مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف: ۱۸۷۔ طٰہٰ: ۱۵۔ لقمان: ۳۴۔ الاحزاب: ۶۳۔ الملک: ۲۵-۲۶۔ النازعات: ۴۲ تا ۴۴۔

۷ – یہ امکانِ آخرت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ آگے آیت ۷ میں آ رہا ہے، منکرینِ آخرت جن وجوہ سے زندگی بعدِ موت کو بعید از عقل سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جب سارے انسان مر کر مٹی میں رَل مِل جائیں گے اور ان کا ذرّہ ذرّہ منتشر ہو جائے گا تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ بے شمار اجزا پھر سے اکٹھے ہوں اور ان کو جوڑ کر ہم دوبارہ اپنے انھی اجسام

Maktaba Tul Ishaat.com

أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ④ وَالَّذِينَ سَعَوْ فِي
آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ أَلِيمٌ ⑤
وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ
رَبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ⑥

اُن کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے، ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے[8]۔ اے نبیؐ! علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز وحمید کا راستہ دکھاتا ہے[9]۔

کے ساتھ پیدا کر دیے جائیں۔ اس شبہ کو یہ کہہ کر رفع کیا گیا ہے کہ ہر ذرہ جو کہیں گیا ہے، خدا کے دفتر میں اس کا اندراج موجود ہے اور خدا کو معلوم ہے کہ کیا چیز کہاں گئی ہے۔ جب وہ دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کرے گا تو اسے ایک ایک انسان کے اجزائے جسم کو سمیٹ لانے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی۔

۸ – اُوپر آخرت کے امکان کی دلیل تھی، اور یہ اُس کے وجوب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا وقت ضرور آنا ہی چاہیے جب ظالموں کو ان کے ظلم کا اور صالحوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیا جائے۔ عقل یہ چاہتی ہے اور انصاف یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو نیکی کرے اسے انعام ملے اور جو بدی کرے وہ سزا پائے۔ اب اگر تم دیکھتے ہو کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نہ ہر بد کو اس کی بدی کا اور نہ ہر نیک کو اس کی نیکی کا پورا بدلہ ملتا ہے، بلکہ بسا اوقات بدی اور نیکی کے اُلٹے نتائج بھی نکل آتے ہیں، تو تمھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ عقل اور انصاف کا یہ لازمی تقاضا کسی وقت ضرور پورا ہونا چاہیے۔ قیامت اور آخرت اُسی وقت کا نام ہے۔ اُس کا آنا نہیں بلکہ نہ آنا عقل کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔

اس سلسلے میں ایک اَور نکتہ بھی اوپر کی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ مغفرت اور رزقِ کریم ہے۔ اور جو لوگ خدا کے دین کو نیچا دکھانے کے لیے مُعاندانہ جِدّ و جُہد کریں ان کے لیے بدترین قسم کا عذاب ہے۔ اس سے خود بخود یہ ظاہر ہو گیا کہ جو شخص سچے دل سے ایمان لائے گا اس کے عمل میں اگر کچھ خرابی بھی ہو تو وہ رزقِ کریم چاہے نہ پائے مگر مغفرت سے محروم نہ رہے گا۔ اور جو شخص کافر تو ہو مگر دینِ حق کے مقابلے میں عناد و مخالفت کی روش بھی اختیار نہ کرے وہ عذاب سے تو نہ بچے گا مگر بدترین عذاب اس کے لیے نہیں ہے۔

۹ – یعنی یہ معاندین تمھارے پیش کردہ حق کو باطل ثابت کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، ان کی یہ تدبیریں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ
كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ
بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ
الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ

منکرین لوگوں سے کہتے ہیں: ''ہم بتائیں تمھیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمھارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا، اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیے جاؤ گے؟ نہ معلوم، یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے۔'' [۱۰]

نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بُری طرح بہکے ہوئے ہیں۔ [۱۱] کیا اِنھوں نے کبھی اُس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو انھیں آگے اور پیچھے سے

کامیاب نہیں ہوسکتیں، کیونکہ ان باتوں سے وہ جہلا ہی کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ ان کے فریب میں نہیں آتے۔

۱۰- قریش کے سردار اس بات کو خوب جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا تسلیم کرنا عوام الناس کے لیے سخت مشکل ہے، کیونکہ ساری قوم آپؐ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپؐ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی بعدِ موت جیسی اَنہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا: یا تو (معاذ اللہ!) یہ شخص جان بُوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سروپا تھی جتنی جھوٹ والی بات تھی۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجے کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا، ورنہ آنکھوں دیکھتے کوئی شخص جیتی مکھی کیسے نگل لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف ان کے اس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعدِ موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

۱۱- یہ ان کی بات کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نادانو! عقل تو تمھاری ماری گئی ہے کہ جو شخص حقیقتِ حال سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے اس کی بات نہیں مانتے اور سرپٹ اُس راستے پر چلے جا رہے ہو جو سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝٩ ع

گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں[12]۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رُجوع کرنے والا ہو[13]۔ ع

مگر تمھاری حماقت کی طغیانی کا عالَم یہ ہے کہ اُلٹا اس شخص کو مجنون کہتے ہو جو تمھیں بچانے کی فکر کر رہا ہے۔

۱۲ – یہ ان کی بات کا دوسرا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ کفارِ قریش جن وُجوہ سے زندگی بعدِ موت کا انکار کرتے تھے ان میں تین چیزیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں: ایک، یہ کہ وہ خدا کے محاسبے اور باز پُرس کو نہیں ماننا چاہتے تھے کیونکہ اسے مان لینے کے بعد دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی ان سے چھِن جاتی تھی۔ دوسرے، یہ کہ وہ قیامت کے وقوع اور نظامِ عالَم کے درہم برہم ہو جانے اور پھر سے ایک نئی کائنات بننے کو ناقابلِ تصور سمجھتے تھے۔ تیسرے، یہ کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سیکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں اور جن کی ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو کر زمین، ہوا اور پانی میں پراگندہ ہو چکی ہوں ان کا دوبارہ جسم و جان کے ساتھ جی اُٹھنا ان کے نزدیک بالکل بعید از امکان تھا۔ اُوپر کا جواب ان تینوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور مزید برآں اس میں ایک سخت تنبیہ بھی مضمر ہے۔ ان مختصر سے فقروں میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اس زمین و آسمان کو اگر کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہوتا تو تمھیں نظر آتا کہ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے، اور نہ یہ نظام اتفاقاً بن گیا ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے ایک قادرِ مطلق ہستی نے کمال درجے حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ ایسے ایک حکیمانہ نظام میں یہ تصور کرنا کہ یہاں کسی کو عقل و تمیز اور اختیارات عطا کرنے کے بعد اسے غیر ذمہ دار اور غیر جواب دِہ چھوڑا جا سکتا ہے، سراسر ایک لغو بات ہے۔

(۲) اس نظام کو جو شخص بھی دیدۂ بینا کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت کا آ جانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ زمین اور آسمان جن بندشوں پر قائم ہیں ان میں ایک ذرا سا اُلٹ پھیر بھی ہو جائے تو آناً فاناً قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ اور یہی نظام اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے آج یہ دنیا بنا رکھی ہے، وہ ایک دوسری دنیا پھر بنا سکتا ہے۔ اُس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہوتا تو یہی دنیا کیسے بن کھڑی ہوتی۔

(۳) تم نے آخر خالقِ ارض و سما کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے باہر خیال کر رہے ہو۔ جو لوگ مرتے ہیں ان کے جسم پارہ پارہ ہو کر خواہ کتنے ہی منتشر ہو جائیں، رہتے تو اسی زمین و آسمان کے حدود میں ہیں۔ اس سے کہیں باہر تو نہیں چلے جاتے۔ پھر جس خدا کے یہ زمین و آسمان ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ مٹی اور پانی اور ہوا میں جو چیز جہاں بھی ہے اسے وہاں سے نکال لائے۔ تمھارے جسم میں اب جو کچھ موجود ہے وہ بھی تو اُسی کا جمع کیا ہوا ہے اور اسی مٹی، ہوا اور پانی میں سے

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِىۡ مَعَهٗ وَالطَّيۡرَ ۚ
وَاَلَنَّا لَهُ الۡحَدِيۡدَ ۙ ﴿۱۰﴾ اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرۡ فِى السَّرۡدِ

ہم نے داؤدؑ کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا[۱۴]۔ (ہم نے حکم دیا کہ) اَے پہاڑو! اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا[۱۵]۔ ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا اِس ہدایت کے ساتھ کہ زِرہیں بنا اور ان کے حلقے ٹھیک انداز ے[۱۶] پر رکھ۔ (اے آلِ داؤدؑ!)

نکال کر لایا گیا ہے۔ ان اجزا کی فراہمی اگر آج ممکن ہے تو کل کیوں غیر ممکن ہو جائے گی۔

ان تین دلیلوں کے ساتھ اس کلام میں یہ تنبیہ بھی پوشیدہ ہے کہ تم ہر طرف سے خدا کی خدائی میں گھرے ہوئے ہو۔ جہاں بھی جاؤ گے یہی کائنات تم پر محیط ہو گی۔ خدا کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ تم نہیں پا سکتے۔ اور خدا کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ چاہے تمھارے قدموں کے نیچے یا سر کے اُوپر سے جو بلا چاہے تم پر نازل کر سکتا ہے۔ جس زمین کو آغوشِ مادر کی طرح تم اپنے لیے جائے سکون پاتے ہو اور اطمینان سے اس پر گھر بنائے بیٹھے ہو، تمھیں کچھ پتا نہیں کہ اس کی سطح کے نیچے کیا قوتیں کام کر رہی ہیں اور کب وہ کوئی زلزلہ لا کر اسی زمین کو تمھارے لیے مرقد بنا دیتی ہیں۔ جس آسمان کے نیچے تم اس اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہو گویا کہ یہ تمھارے گھر کی چھت ہے، تمھیں کیا معلوم کہ اسی آسمان سے کب کوئی بجلی گر پڑتی ہے، یا ہلاکت خیز بارش ہو جاتی ہے، یا اور کوئی ناگہانی آفت آ جاتی ہے۔ اس حالت میں تمھاری خدا سے یہ بے خوفی اور فکرِ عاقبت سے یہ غفلت اور ایک خیر خواہ کی نصیحت کے مقابلے میں یہ یاوہ گوئی بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ تم اپنی شامت ہی کو دعوت دے رہے ہو۔

۱۳- یعنی جو شخص کسی قسم کا تعصّب نہ رکھتا ہو، جس میں کوئی ہٹ دھرمی اور ضد نہ پائی جاتی ہو، بلکہ جو اخلاص کے ساتھ اپنے خدا سے طالبِ ہدایت ہو، وہ تو آسمان و زمین کے اس نظام کو دیکھ کر بڑے سبق لے سکتا ہے۔ لیکن جس کا دل خدا سے پھرا ہوا ہو، وہ کائنات میں سب کچھ دیکھے گا مگر حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی اسے سُجھائی نہ دے گی۔

۱۴- اشارہ ہے اُن بے شمار عنایات کی طرف جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نوازا تھا۔ وہ بَیت اللَحم کے رہنے والے قبیلۂ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ فِلِستیوں کے خلاف ایک معرکے میں جالوت جیسے گراں ڈیل دشمن کو قتل کر کے یکایک وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اسی واقعے سے ان کا عُروج شروع ہوا، یہاں تک کہ طالوت کی وفات کے بعد پہلے وہ حَبرُون (موجودہ الخلیل) میں یہودیہ کے فرماں روا بنائے گئے، پھر چند سال بعد تمام قبائلِ بنی اسرائیل نے مل کر ان کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور انھوں نے یروشلم کو فتح کر کے اسے دولتِ اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا۔ یہ انھی کی قیادت تھی جس کی بدولت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جس کے حُدود خلیج عَقبہ سے دریائے فُرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان عنایات پر مزید وہ فضلِ خداوندی ہے جو علم و حکمت، عدل و انصاف، اور خدا ترسی و بندگیِ حق کی صورت میں ان کو نصیب ہوا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ
غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ
الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ
اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۱۲ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا

نیک عمل کرو، جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو میں دیکھ رہا ہوں۔

اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک[۱۷]۔ ہم نے اُس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا[۱۸] اور ایسے جِنّ اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے[۱۹]۔ اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اُس کے لیے بناتے تھے جو کچھ

(تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۳۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷)

۱۵ – یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ انبیاء آیت ۷۹ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۱)

۱۶ – یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۰ میں گزر چکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۲)

۱۷ – یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۱ میں گزر چکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۴-۷۵)

۱۸ – بعض قدیم مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ زمین سے ایک چشمہ حضرت سلیمانؑ کے لیے پھوٹ نکلا تھا جس میں سے پانی کے بجائے پگھلا ہوا تانبا بہتا تھا۔ لیکن آیت کی دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تانبے کو پگھلانے اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بنانے کا کام اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا کہ گویا وہاں تانبے کے چشمے بہہ رہے تھے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۴-۷۵)

۱۹ – یہ جِنّ جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے، آیا یہ دہقانی اور کوہستانی انسان تھے یا واقعی وہی جِنّ تھے جو ایک پوشیدہ مخلوق کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہیں، اس مسئلے پر بھی سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۵۔ النمل، حاشیہ ۲۳-۴۵-۵۲)

يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ

وہ چاہتا، اُونچی عمارتیں، تصویریں[۲۰]، بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی

۲۰ - اصل میں لفظ تَمَاثِيْلَ استعمال ہوا ہے جو تِمْثَال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التمثال اسم للشئ المصنوع مشبها بخلق من خلق اللہ۔ (لسان العرب) ”تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔“ التمثال کل ما صور علی صورۃ غیرہ من حیوان وغیر حیوان (تفسیرِ کشاف) ”تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جان دار ہو یا بے جان۔“ اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو ”تماثیل“ بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسّمے ہی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔

غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کرلیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔ لیکن ان روایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمانؑ جس شریعتِ موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسّمے اُسی طرح حرام تھے جس طرح شریعتِ محمدیہ میں حرام ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انھوں نے آنجناب کو شرک و بت پرستی اور جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے مُتّہم کیا ہے، اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کرکے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاؑ بھی آئے ہیں وہ سب تورات کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو تورات کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب تورات کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسّمے قطعاً حرام ہیں:

”تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مُورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں، یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔“ (خروج، باب ۲۰، آیت ۴)

”تم اپنے لیے بُت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی مُورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اُسے سجدہ کرو۔“ (احبار، باب ۲۶، آیت ۱)

”تانہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مُورت اپنے لیے بنالو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اُڑنے والے پرند یا زمین کے رینگنے والے جان دار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے، ملتی ہو۔“ (اِستثنا، باب ۴، آیت ۱۶-۱۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

''لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر، جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے، اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔'' (استثنا، باب ۲۷، آیت ۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسّمے بنانے کا کام جنّوں سے لیا ہوگا۔ اور یہ بات آخر اُن یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کر لی جائے جو حضرت سلیمانؑ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔ (۱-سلاطین، باب ۱۱)

تاہم مفسرین نے تو بنی اسرائیل کی یہ روایات نقل کرنے کے ساتھ اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ شریعتِ محمدیہ میں یہ فعل حرام ہے اس لیے اب کوئی شخص حضرت سلیمانؑ کی پیروی میں تصویریں اور مجسّمے بنانے کا مجاز نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے، جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوّری و بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، قرآنِ مجید کی اس آیت کو اپنے لیے دلیل ٹھیرا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں اس کے اس فعل کا ذکر کیا ہے اور اس پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا ہے تو اسے لازماً حلال ہی ہونا چاہیے۔

ان مقلدینِ مغرب کا یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے: اول، یہ کہ لفظِ تماثیل جو قرآنِ مجید میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنیٰ میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق غیر جان دار اشیا کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے، اس لیے محض اس لفظ کے سہارے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن کی رُو سے انسانی اور حیوانی تصاویر حلال ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہایت کثیر التعداد اور قوی الاسناد اور متواتر المعنیٰ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی رُوح اشیا کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں جو ارشادات حضورؐ سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابرِ صحابہؓ سے منقول ہوئے ہیں انھیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) عن عائشة أمّ المؤمنين ان أمّ حبيبة وأمّ سلمة ذكرتا كنيسة رأينها بالحبشة فيها تصاوير فذكرتا للنبي صلى الله عليه وسلم فقال ان اولئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بَنَوا على قبره مسجدا وصوّروا فيه تلك الصور فاولئك شرار الخلق عند الله يوم القيٰمة۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ۔ مسلم، کتاب المساجد۔ نسائی، کتاب المساجد)

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت اُمّ حَبِیبہؓ اور حضرت اُمّ سَلَمہؓ نے حبش میں ایک کَنِیسہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترین خلائق قرار پائیں گے۔

(۲) عن ابی جُحَیفَة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن المصور (بخاری،

ابو جُحَیفہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔

کتاب البیوع، کتاب الطّلاق وکتاب اللباس)

(۳) عن ابی زرعه قال دخلتُ مع ابی هریرة دارًا بالمدینة فرأی اعلاها مصورًا یصور قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول ومن اظلم ممن ذهب یخلق کخلقی فلیخلقوا حبّة ولیخلقوا ذرة۔ (بخاری، کتاب اللّباس۔ مُسندِ احمد اور مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مَروان کا گھر تھا)

ابوزُرعہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوہُریرہؓ کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان کے اُوپر ایک مصور تصویریں بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں۔

(۴) عن ابی محمد الهذلی عن علی قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی جنازة فقال ایکم ینطلق الی المدینة فلا یَدَعُ بها وثنًا الا کسره ولا قبرًا الا سوّاه ولا صورة الا لطخها۔ فقال رجل انا یا رسول اللّٰه فانطلق فهاب اهل المدینة۔ فرجع۔ فقال علیؓ انا انطلق یا رسول اللّٰه۔ قال فانطلق، فانطَلَقَ ثم رجع۔ فقال یا رسول اللّٰه لم اَدَعْ بها وثنًا الا کسرته ولا قبرًا الّا سویته ولا صورة الا لطختها۔ ثم قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من عاد لصنعة شیٔ من هٰذا فقد کفر بما انزل علی محمدٌ۔ (مُسندِ احمد۔ مسلم، کتاب الجنائز اور نَسائی، کتاب الجنائز میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث منقول ہوئی ہے۔)

ابو محمد ہُذلی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ آپؐ نے فرمایا: تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینے میں کوئی بُت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس زمین کے برابر نہ کردے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا: میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ گیا مگر اہلِ مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا۔ پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا تم جاؤ۔ حضرت علیؓ گئے اور واپس آ کر انھوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو، کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کردیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: اب اگر کسی شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اس نے اُس تعلیم سے کفر کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔

(۵) عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰه

ابنِ عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

Maktaba Tul Ishaat.com

عليه وسلم...... ومن صور صورة عذب وكلف ان ينفخ فيها وليس بنافخ۔ (بخاری، کتاب التعبیر۔ ترمذی، ابواب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد)

کرتے ہیں...... اور جس شخص نے تصویر بنائی اُسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں رُوح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا۔

(۶) عن سعيد بن ابی الحسن قال كنت عند ابن عباس رضی الله عنهما اذ اتاه رجل فقال يا ابا عباس انی انسان انما معيشتی من صنعة يدی وانی اصنع هٰذه التصاوير۔ فقال ابن عباس لا احدّثك الا ما سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلّم يقول۔ سمعته يقول من صور صورةً فان الله معذبه حتّى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابدًا۔ فربا الرجل ربوةً شديدة واصفر وجهه۔ فقال ويحك ان ابيت الا ان تصنع فعليك بهٰذا الشجر كل شئ ليس فيه روح۔ (بخاری، کتاب البیوع۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد)

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو عباسؓ! میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہوں اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے۔ میں نے حضورؐ سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اُسے عذاب دے گا اور اسے نہ چھوڑے گا جب تک وہ اس میں روح نہ پھونکے، اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ یہ بات سن کر وہ شخص سخت بَرافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا: بندۂ خدا! اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز کی بنا جس میں روح نہ ہو۔

(۷) عن عبدالله بن مسعود قال سمعت النبی صلى الله عليه وسلم يقول ان اشدّ الناس عذابًا عند الله يوم القيٰمة المصوّرون۔ (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد)

عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔

(۸) عن عبدالله بن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان الذين يصنعون هٰذه الصّور يعذبون يوم القيٰمة يقال لهم احيوا ما خلقتم۔ (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔

عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

نسائی، کتاب الزینۃ۔ مُسنَدِ احمد)

(۹) عن عائشة رضی اللّٰه عنها انها اشترت نمرقة فیها تصاویر فقام النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بالباب ولم یدخل فقلت اتوب الی اللّٰه ممّا اذنبت قال ما هٰذه النمرقة قلت لتجلس علیها وتوسدها قال ان اصحاب هٰذه الصور یعذبون یوم القیٰمة یقال لهم احیوا ما خلقتم و ان الملائکة لا تدخل بیتًا فیه الصورة (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ۔ ابنِ ماجہ، کتاب التجارات۔ مُوَطّا، کتاب الاِستیذان)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا: یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپؐ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ فرمایا: ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے، اس کو زندہ کرو۔ اور ملائکہ (یعنی ملائکۂ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

(۱۰) عن عائشة قالت دخل عَلَیّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وانا متسترة بقرام فیه صورة فتلوّنَ وجهه ثم تناول الستر فهتکه ثم قال ان من اشد الناس عذابًا یوم القیٰمة الذین یشبهون بخلق اللّٰه۔ (مسلم، کتاب اللباس۔ بخاری، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی۔ آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپؐ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا: قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا، ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱۱) عن عائشة قالت قدم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من سفر وقد سترت علٰی بابی درنوکاً فیه الخیل ذوات الاجنحة فامرنی فنزعته۔ (مسلم، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا، جس میں پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ اسے اتار دو اور میں نے اتار دیا۔

(۱۲) عن جابر قال نهٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن الصورة فی البیت ونهٰی

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ گھر میں تصویر

Maktaba Tul Ishaat.com

ان یصنع ذالک (ترمذی، ابواب اللباس)

رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرما دیا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔

(۱۳) عن ابن عباس عن ابی طلحة عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا تدخل الملائکة بیتا فیہ کلب ولا صورة (بخاری، کتاب اللباس)

ابن عباسؓ ابوطلحہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملائکہ (یعنی ملائکۂ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا پلا ہوا ہو اور نہ ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو۔

(۱۴) عن عبداللّٰہ بن عمر قال وعد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم جبریل فراث علیہ حتی اشتد علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فخرج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلقیہ فشکا الیہ ما وجد فقال لہٗ إنّا لا ندخل بیتًا فیہ صورة ولا کلب۔

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا مگر بہت دیر لگ گئی اور وہ نہ آئے۔ حضورؐ کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپؐ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے۔ آپؐ نے ان سے شکایت کی تو انھوں نے کہا: ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔

(بخاری، کتاب اللباس۔ اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے متعدد صحابہ سے نقل کی ہیں۔)

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایتیں ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملے میں رخصت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابوطلحہؓ انصاری کی یہ روایت کہ جس کپڑے میں تصویر کڑھی ہوئی ہو اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے (بخاری، کتاب اللباس)، اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر جب انھوں نے گدا بنالیا تو حضورؐ نے اسے بچھانے سے منع نہ فرمایا (مسلم، کتاب اللباس)، اور سالمؒ بن عبداللہؓ بن عمرؓ کی یہ روایت کہ ممانعت اس تصویر کی ہے جو نمایاں مقام پر نصب کی گئی ہو، نہ کہ اس تصویر کی جو فرش کے طور پر بچھا دی گئی ہو۔ (مُسندِ احمد) لیکن ان میں سے کوئی حدیث بھی دراصل ان احادیث کی تردید نہیں کرتی جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اُس کا جواز ان میں سے کسی حدیث سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ احادیث صرف اِس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر تصویر بنی ہوئی ہو اور آدمی اس کو لے چکا ہو تو کیا کرے۔ اس باب میں ابوطلحہؓ انصاری والی روایت کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ بکثرت دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار کپڑا لٹکانے سے نہ صرف منع فرمایا ہے بلکہ اسے پھاڑ دیا ہے۔ نیز خود حضرت ابوطلحہؓ کا اپنا عمل جو ترمذی اور مُؤطا میں منقول ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تصویر دار پردہ لٹکانا تو درکنار، وہ ایسا فرش بچھانے میں بھی کراہت محسوس کرتے تھے جس میں تصاویر ہوں۔ رہیں حضرت عائشہؓ اور سالمؒ بن عبداللہؓ کی روایات، تو ان سے صرف اتنا جواز نکلتا ہے کہ اگر تصویر احترام کی جگہ پر نہ ہو بلکہ ذلت کے ساتھ فرش میں رکھی جائے اور اسے پامال کیا جائے تو وہ قابلِ برداشت ہے۔ ان احادیث سے آخر اُس پوری ثقافت کا جواز کیسے نکالا جا سکتا ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے آرٹ کو تہذیبِ انسانی کا قابلِ فخر کمال قرار دیتی ہے اور اسے مسلمانوں میں رواج دینا چاہتی ہے۔

تصاویر کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار اُمت کے لیے جو ضابطہ چھوڑا ہے اس کا پتا اکابرِ صحابہؓ کے اُس طرزِ عمل سے چلتا ہے جو انھوں نے اس باب میں اختیار کیا۔ اسلام میں یہ اُصول مسلّم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد اکابر صحابہؓ کا کسی طریقے پر عمل در آمد کرنا اس بات کا ثُبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضورؐ نے اُمت کو چھوڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ تصویروں کے ساتھ اس مقدّس گروہ کا کیا برتاؤ تھا:

قال عمر رضی اللّٰہ عنہ اِنّا لا ندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیھا الصُّوَر۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمھارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

کان ابن عباس یصلی فی بیعۃ الا بیعۃ فیھا تماثیل۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

ابنِ عباسؓ گرجا میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر کسی ایسے گرجا میں نہیں جس میں تصویریں ہوں۔

عن ابی الھیاج الاسدی، قال لی عَلِیٌّ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالًا الاطمستہ ولا قبرًا مشرفًا الا سویتہ ولا صورۃ الا طمستھا۔ (مسلم، کتاب الجنائز۔ نسائی، کتاب الجنائز)

ابوالہیّاج اَسدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے کہا: کیا نہ بھیجوں میں تم کو اُس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تم کوئی مجسّمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو، اور کوئی اُونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کر دو، اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

عن حنش الکنانی عن علی انہ بعث عامل شرطتہ فقال لہ اتدری علی ما ابعثک؟ علی ما بعثنی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان انحت کل صورۃ وان اسوی کل قبر۔ (مُسندِ احمد)

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا کہ تم جانتے ہو میں کس مہم پر تمھیں بھیج رہا ہوں؟ اُس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کر دوں۔

اسی ثابت شدہ اسلامی ضابطے کو فقہائے اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اسے قانونِ اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ توضیح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”ہمارے اصحاب (یعنی فقہائے احناف) اور دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ کسی جان دار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو، یا کسی دوسری غرض کے لیے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیوں کہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مُشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں

Maktaba Tul Ishaat.com

یا دیوار میں، بہرحال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جان دار کے سوا کسی دوسری چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام اُمور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی رائے امام مالکؒ، سُفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے علما کی ہے۔ قاضی عِیاضؒ کہتے ہیں کہ اس سے لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔ مگر امام مالکؒ ان کے خریدنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔" (عُمدۃ القاری، ج ۲۲، ص ۷۰۔ اسی مسلک کو امام نَوَوِیؒ نے شرح مسلم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مُلاحظہ ہو: شرح نَوَوِی، مطبوعہ مصر، ج ۱۴، ص ۸۱-۸۲)

یہ تو ہے تصویر سازی کا حکم۔ رہا دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ، تو اس کے بارے میں فقہائے اسلام کے مسالک علامہ ابنِ حَجَرؒ نے اس طرح نقل کیے ہیں:

"مالکی فقیہ ابنِ عَرَبیؒ کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر تو اِجماع ہے قطعِ نظر اس سے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی گئی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں..... ابنِ عَرَبیؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو وہ اگر اپنی حالت پر باقی رہے (یعنی آئینہ کی پرچھائیں کی طرح نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی تصویر کی طرح ثابت وقائم ہو) تو وہ بھی حرام ہے، خواہ اسے حقارت کے ساتھ رکھا گیا ہو یا نہ۔ البتہ اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہو یا اس کے اجزا الگ الگ کر دیے گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے..... امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے، مگر دیوار یا چھت میں جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا، بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی ..... ابنِ اَبی شَیبَہؒ نے عِکْرِمہؒ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ تابعین کے علما یہ رائے رکھتے تھے کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اُس کے لیے باعثِ ذلّت ہے۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اُونچی جگہ پر جو تصویر لگائی گئی ہو وہ حرام ہے اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتا ہو وہ جائز ہے۔ یہی رائے ابنِ سیرینؒ، سالمؒ بن عبداللہؒ، عِکْرِمہ بن خالدؒ اور سعید بن جُبَیرؒ سے بھی منقول ہے۔" (فتح الباری، ج ۱۰، ص ۳۰۰)

اس تفصیل سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات، صحابۂ کرامؓ کے عمل اور فقہائے اسلام کے مُتَّفقہ فتاویٰ کی رُو سے ایک مُسلَّم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی مُوشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

اس سلسلے میں چند باتیں اور بھی سمجھ لینی ضروری ہیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے:

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریقِ تصویر سازی کے لحاظ سے ہے، اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں

کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ اِستِدلال بالکل غلط ہے۔ اوّل تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برعظیم ہند و پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خِطّوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ اور اپنے متعدد اولیا کی تصاویر اور مجسّموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہییں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسّمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسّموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام وارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی، بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر اُن بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسرِ عُروج ہے۔ تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے اِستیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مُطلَقاً جان دار اشیا کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے مُتّبِع ہیں تو ہمیں عَلَی الاطلاق اس سے رُک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی عِلّتِ حکم خود تجویز کر کے اُس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دے لیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل ''بے ضرر'' قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مَفاسِد سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملے میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے عِلّتِ حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فُلاں چیز میں یہ عِلّت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بریں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دُھندلی اور مُبہَم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اُس حد کو پار کر گیا ہے، بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جان داروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیا کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خطِ امتیاز میں کسی اِشتِباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ
الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا
دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ
كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ﴿ؕ۱۴﴾

بھاری دیگیں[۲۱] ـــــــ اے آلِ داؤد! عمل کرو شکر کے طریقے پر[۲۲]، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جِنّوں کو اس کی موت کا پتا دینے والی کوئی چیز اُس گُھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کُھل گئی[۲۳] کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذِلّت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے[۲۴]۔

لیکن اگر جان داروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھیرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز و عدمِ جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اِشتِباہ باقی رہ جاتا کہ انھیں حدِ جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حدِ فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رُک جانا چاہیے۔ (مزید تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: رسائل و مسائل، حصّہ اوّل، ص ۱۵۲ تا ۱۵۵)

۲۱ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے حوض جیسے لگن اس لیے بنائے گئے تھے کہ ان میں لوگوں کے لیے کھانا نکال کر رکھا جائے اور بھاری دیگیں اس لیے بنوائی گئی تھیں کہ ان میں بیک وقت ہزاروں آدمیوں کا کھانا پک سکے۔

۲۲ – یعنی شکر گزار بندوں کی طرح کام کرو۔ جو شخص نعمت دینے والے کا احسان محض زبان سے مانتا ہو، مگر اس کی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہو، اس کا محض زبانی شکریہ بے معنی ہے۔ اصل شکر گزار بندہ وہی ہے جو زبان سے بھی نعمت کا اعتراف کرے، اور اس کے ساتھ مُنعِم کی عطا کردہ نعمتوں سے وہی کام بھی لے جو مُنعِم کی مرضی کے مطابق ہو۔

۲۳ – اصل الفاظ ہیں: تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ۔ اس فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اُوپر مَتن میں کیا ہے۔ اور

دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنّوں کا حال کھل گیا یا منکشف ہو گیا۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ خود جنّوں کو پتا چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زعم غلط ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ عام لوگ جو جنّوں کو غیب داں سمجھتے تھے، ان پر یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ کوئی علمِ غیب نہیں رکھتے۔

۲۴- موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بیٹا رُحْبعام چونکہ نالائق اور عیش پسند تھا اور خوشامدی مُصاحبوں میں گھرا ہوا تھا، اس لیے اپنے جلیل القدر والد کی وفات کے بعد وہ اُس بارِ عظیم کو نہ سنبھال سکا جو اس پر آ پڑا تھا۔ اس کی جانشینی کے تھوڑی مدت بعد ہی سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آ رہا اور گردوپیش کے جن سرحدی قبائل (یعنی جِنّوں) کو حضرت سلیمانؑ نے اپنی قوتِ قاہرہ سے خادم بنا رکھا تھا وہ سب قابو سے نکل گئے۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی قرآن کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن کے الفاظ جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ پر ایسی حالت میں موت طاری ہوئی جب کہ وہ ایک عصا کے سہارے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اس عصا کی وجہ سے ان کا بے جان جسم اپنی جگہ قائم رہا اور جنّ یہ سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں لگے رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ آخرِ کار جب عصا کو گُھن لگ گیا اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا تو اُن کا جسم زمین پر گر گیا اور اُس وقت جِنّوں کو پتا چلا کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس صاف اور صریح بیانِ واقعہ کو آخر یہ معنی پہنانے کی کیا معقول وجہ ہے کہ گُھن سے مراد حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کی نالائقی ہے، اور عصا سے مراد اُن کا اقتدار ہے، اور ان کے مُردہ جسم کے گر جانے سے مراد ان کی سلطنت کا پارہ پارہ ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے عربیِ مبین میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا؟ یہ پہیلیوں کی زبان آخر قرآنِ مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے؟ اور اس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اوّلین مخاطب تھے، یہ پہیلی کیسے بُوجھ سکتے تھے؟

پھر اس تاویل کا سب سے زیادہ عجیب حصّہ یہ ہے کہ اس میں جنّوں سے مراد وہ سرحدی قبائل لیے گئے ہیں جنھیں حضرت سلیمانؑ نے اپنی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان قبائل میں سے کون غیب دانی کا مدّعی تھا اور کس کو مشرکین غیب داں سمجھتے تھے؟ آیت کے آخری الفاظ کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر پڑھے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جنّ سے مراد یہاں لازماً کوئی ایسا گروہ ہے جو یا تو خود غیب دانی کا دعویٰ رکھتا تھا، یا لوگ اس کو غیب داں سمجھتے تھے، اور اس گروہ کے غیب سے ناواقف ہونے کا راز اس واقعے نے فاش کر دیا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کو زندہ سمجھتے ہوئے خدمت میں لگے رہے، حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قرآنِ مجید کا یہ بیان اس کے لیے کافی تھا کہ ایک ایمان دار آدمی اس کو دیکھ کر اپنے اس خیال پر نظرِ ثانی کر لیتا کہ جنّ سے مراد سرحدی قبائل ہیں۔ لیکن جو لوگ مادہ پرست دنیا کے سامنے جنّ نامی ایک پوشیدہ مخلوق کا وجود تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں وہ قرآن کی اس تصریح کے باوجود اپنی تاویل پر مُصِرّ ہیں۔

قرآن میں متعدّد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مشرکینِ عرب جِنّوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے، انھیں اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور ان سے پناہ مانگا کرتے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (الانعام: ۱۰۰) اور انھوں نے جِنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا لیا، حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ‌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ؕ

سبا[۲۵] کے لیے اُن کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی،[۲۶] دو باغ دائیں اور بائیں۔[۲۷]

وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا (الصّافات: ۱۵۸) — اور انھوں نے اللہ کے اور جنّوں کے درمیان نسبی تعلق تجویز کر لیا۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ (الجن: ٦) — اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

انھی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ جنوں کو عالم الغیب سمجھتے تھے اور غیب کی باتیں جاننے کے لیے اُن کی طرف رُجوع کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی عقیدے کی تردید کے لیے یہ واقعہ سنا رہا ہے اور اس سے مقصود کفارِ عرب کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم لوگ خواہ مخواہ جاہلیّت کے غلط عقائد پر اصرار کیے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمھارے یہ عقائد بالکل بے بنیاد ہیں۔ (مزید توضیح کے لیے آگے حاشیہ نمبر ٦٣ بھی مُلاحظہ ہو۔)

۲۵ – سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے رُکوعِ اوّل کے مضمون کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفارِ عرب آخرت کی آمد کو بعید از عقل سمجھتے تھے اور جو رسولؐ اس عقیدے کو پیش کر رہا تھا اس کے متعلق کُھلّم کُھلّا یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی عجیب باتیں کرنے والا آدمی یا تو مجنون ہو سکتا ہے، یا پھر وہ جان بُوجھ کر افترا پردازی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے چند عقلی دلائل ارشاد فرمائے جن کی تشریح ہم حواشی نمبر ۷-۸-۱۲ میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد رُکوعِ دوم میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا قصّہ اور پھر سَبا کا قصّہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جس سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ روئے زمین پر خود نوعِ انسانی کی اپنی سرگزشت قانونِ مکافات کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دُھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرماں روائی کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمتی کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس خدا کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے۔

۲۶ – یعنی اس امر کی نشانی کہ جو کچھ ان کو میسّر ہے وہ کسی کا عطیہ ہے نہ کہ ان کا اپنا آفریدہ۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی بندگی و عبادت اور شکر و سپاس کا مستحق وہ خدا ہے جس نے ان کو یہ نعمتیں دی ہیں نہ کہ وہ جن کا کوئی حصہ ان نعمتوں کی بخشش میں نہیں ہے۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی دولت لازوال نہیں ہے بلکہ جس طرح آئی ہے اسی طرح جا بھی سکتی ہے۔

۲۷ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک میں بس دو ہی باغ تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سبا کی پوری سرزمین گلزار بنی ہوئی تھی۔ آدمی جہاں بھی کھڑا ہوتا اسے اپنے دائیں جانب بھی باغ نظر آتا اور بائیں جانب بھی۔

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ
غَفُوْرٌ ۝ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ
قَلِيْلٍ ۝ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا
الْكَفُوْرَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى
ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا

کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ، اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے[28]۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا[29] اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں[30]۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔

اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں[31]۔ چلو پھرو اِن راستوں میں رات دن

۲۸ – یعنی بندگی و شکر گزاری کے بجائے انھوں نے نافرمانی و نمک حرامی کی رَوِش اختیار کر لی۔

۲۹ – اصل میں لفظ سَیْلَ الْعَرِمِ استعمال کیا گیا ہے۔ عَرِم جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی "بند" کے ہیں۔ یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کتبات موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ الفاظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ۵۴۲ء یا ۵۴۳ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر اَبرہہ نے سدِ مآرب کی مرمت کرانے کے بعد نصب کرایا تھا، اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا سَیْلُ الْعَرِم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

۳۰ – یعنی سیل العرم کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ برباد ہو گیا۔ سبا کے لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان بند باندھ باندھ کر جو نہریں جاری کی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں اور آب پاشی کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا خودرو جنگلی درختوں سے بھر گیا اور اس میں کھانے کے قابل اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تو وہ محض جھاڑی بُوٹی کے بیر تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰمِنِيْنَ ۝ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ

پورے امن کے ساتھ۔ مگر انھوں نے کہا: "اے ہمارے رب! ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے"۔[32] انھوں نے اپنے اُوپر آپ ظلم کیا۔ آخرِ کار ہم نے انھیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انھیں بالکل تتر بتّر کر ڈالا۔[33] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو۔[34] اُن کے معاملے میں ابلیس نے اپنا

۳۱- "برکت والی بستیوں" سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے قرآن مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۱۳۷۔ بنی اسرائیل، آیت ۱۔ الانبیاء، آیات ۷۱ و ۸۱)

"نمایاں بستیوں" سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہِ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

سفر کی مسافتوں کو ایک اندازے پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یمن سے شام تک کا پورا سفر مسلسل آباد علاقے میں طے ہوتا تھا جس کی ہر منزل سے دوسری منزل تک کی مسافت معلوم و متعین تھی۔ آباد علاقوں کے سفر اور غیر آباد صحرائی علاقوں کے سفر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ صحرا میں مسافر جب تک چاہتا ہے چلتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو کسی جگہ پڑاؤ کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے آباد علاقوں میں راستے کی ایک بستی سے دوسری بستی تک کی مسافت جانی بوجھی اور متعین ہوتی ہے۔ مسافر پہلے سے پروگرام بنا سکتا ہے کہ راستے کے کن کن مقامات پر وہ ٹھیرتا ہوا جائے گا، کہاں دوپہر گزارے گا اور کہاں رات بسر کرے گا۔

۳۲- ضروری نہیں ہے کہ انھوں نے زبان ہی سے یہ دعا کی ہو۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا! میں اِن نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ کے فضل سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہے کہ اے پروردگار! یہ نعمتیں ہم سے سلب کر لے کیونکہ ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔

علاوہ بریں رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (خدایا! ہمارے سفر دور دراز کر دے) کے الفاظ سے کچھ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ شاید سبا کی قوم کو اپنی آبادی کی کثرت کھلنے لگی تھی اور دوسری نادان قوموں کی طرح اس نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھ کر انسانی نسل کی افزائش کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

۳۳- یعنی سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المثل ہوگئی۔ آج بھی اہلِ عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تفرقوا ایدی سبا، "وہ تو ایسے پراگندہ ہوگئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی"۔ اللہ تعالیٰ کی

ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ
عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ
ع هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ ع

گمان صحیح پایا اور انھوں نے اُسی کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن[۳۵] تھا۔ ابلیس کو اُن پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے۔[۳۶] تیرا رب ہر چیز پر نگران[۳۷] ہے۔ ع

طرف سے جب زوالِ نعمت کا دَور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسّانیوں نے اُردُن اور شام کا رُخ کیا۔ اَوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خُزاعہ نے جدّے کے قریب تہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ ازد کا قبیلہ عُمان میں جا کر آباد ہوا۔ لَخم اور جُذام اور کِندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتّٰی کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

۳۴- اس سیاق و سباق میں صابر و شاکر سے مراد ایسا شخص یا گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے نعمتیں پا کر آپے سے باہر نہ ہو جائے، نہ خوشحالی پر پھُولے اور نہ اُس خدا کو بھول جائے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے۔ ایسا انسان اُن لوگوں کے حالات سے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے جنھوں نے عُروج و ترقی کے مواقع پا کر نافرمانی کی روش اختیار کی اور اپنے انجامِ بد سے دوچار ہو کر رہے۔

۳۵- تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قومِ سبا میں ایک عُنصر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبُودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کُتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عُنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۶۵۰ ق م کے لگ بھگ زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکتِ سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذُوسَموی یا ذُوسماوی (یعنی رب السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذسموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا گیا ہے۔ یہ عُنصر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ ۳۷۸ء کے ایک کتبے میں بھی اله ذو سموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: بنصر وردا الهن بعل سمین وارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانے کے ایک اَور کتبے میں جس کی تاریخ ۴۵۸ء ہے، اسی خدا کے لیے رحمٰن کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں: بردا رحمنن (یعنی رحمٰن کی مدد سے)۔

۳۶- یعنی ابلیس کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ اُن کا ارادہ تو خدا کی فرماں برداری کرنے کا ہو مگر وہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں نافرمانی کی راہ پر کھینچ لے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی قدرت اس کو دی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ وہ انھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

بہکائے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں۔ اور اس اِغوا کے مواقع ابلیس کو اس لیے عطا کیے گئے تاکہ آخرت کے ماننے والوں اور اس کی آمد میں شک رکھنے والوں کا فرق کھل جائے۔

دوسرے الفاظ میں یہ ارشادِ ربّانی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عقیدۂ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو اس دنیا میں انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی ضامن ہو سکتی ہو۔ اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مر کر دوبارہ اُٹھنا ہے اور اپنے خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، تو وہ لازماً گمراہ و بدراہ ہو کر رہے گا، کیونکہ اس کے اندر سرے سے وہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہی نہ ہو سکے گا جو آدمی کو راہِ راست پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی لیے شیطان کا سب سے بڑا حربہ، جس سے وہ آدمی کو اپنے پھندے میں پھانستا ہے، یہ ہے کہ وہ اسے آخرت سے غافل کرتا ہے۔ اُس کے اِس فریب سے جو شخص بچ نکلے وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ اپنی اصل دائمی زندگی کے مفاد کو دنیا کی اس عارضی زندگی کے مفاد پر قربان کر دے۔ بخلاف اس کے جو شخص شیطان کے دام میں آ کر آخرت کا منکر ہو جائے، یا کم از کم اُس کی طرف سے شک میں پڑ جائے، اُسے کوئی چیز اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ جو نقد سَودا اِس دنیا میں ہو رہا ہے اُس سے صرف اس لیے ہاتھ اُٹھا لے کہ اُس سے کسی بعد کی زندگی میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں جو شخص بھی کبھی گمراہ ہوا ہے اسی انکارِ آخرت یا شک فی الآخرۃ کی وجہ سے ہوا ہے، اور جس نے بھی راست رَوی اختیار کی ہے اس کے صحیح طرزِ عمل کی بنیاد ایمان بالآخرۃ ہی پر قائم ہوئی ہے۔

۳۷- قومِ سبا کی تاریخ کی طرف یہ اشارات جو قرآنِ مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخی ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔

تاریخ کی رُو سے ''سَبا'' جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمدؒ، ابنِ جَرِیرؒ، ابنِ ابی حاتمؒ، ابنِ عبدالبَرّؒ اور ترمذیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسبِ ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کِندہ، حِمیَر، اَزْد، اَشْعَرِیّین، مَذْحِج، اَنْمار (جس کی دو شاخیں ہیں: خَثْعَم اور بَجِیلہ)، عامِلہ، جُذَام، لَخْم اور غَسّان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شُہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ قبلِ مسیح میں اُور کے کتبات اس کا ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابِل اور اَشُّور (اَسیریا) کے کتبات میں، اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: زَبور، ۷۲: ۱۵۔ یَرمیاہ، ۶: ۲۰۔ حِزقی ایل ۲۷: ۲۲۔ ۳۸: ۱۳۔ ایّوب ۶: ۱۹) یونان و روم کے مؤرخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (۲۸۸ قبلِ مسیح) کے وقت سے مسیحؑ کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبلِ مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شُہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵-۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہوگئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی

کا پھر زور ہو گیا، اور اس نے اَلْمقہ (چاند دیوتا)، عَثتَرَ (زُہرہ) ذاتِ حَمیم اور ذاتِ بعدان (سورج دیوی)، ہوبس، حرمتم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اَلْمقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا، اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں، اور خصوصاً اَلْمقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعے پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتّب کی جا سکتی ہے۔ اِن معلومات کی رو سے اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دَور۔ اس زمانے میں مُلوکِ سبا کا لقب مُکَرِّبِ سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقرِّب کا ہم معنٰی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest-Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مآرِب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خَرِیبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دَور میں مآرِب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

(۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مُکَرِّب کا لقب چھوڑ کر مَلِک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا، جس کے معنٰی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مآرِب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مَقام سمندر سے ۳۹۰۰ فٹ کی بلندی پر صَنعا سے ۶۰ میل جانبِ مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

(۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دَور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حِمیَر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قوم سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دَور میں مآرِب کو اجاڑ کر رَیدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلۂ حِمیَر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مُدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقے میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حِمیَر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصے کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت اور یمنات کا استعمال ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضر موت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

(۴) ۳۰۰ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دور۔ یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل

Maktaba Tul Ishaat.com

خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی، تجارت برباد ہوئی، زراعت نے دم توڑا، اور آخرِ کار آزادی تک ختم ہوگئی۔ پہلے رَیدانیوں، حِمیَریوں، اور ہَمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اُٹھا کر ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہوگئی مگر مآرِب کے مشہور بند میں رَخنے پڑنے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر اُوپر قرآنِ مجید کی آیات میں کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس کے بعد اَبرَہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمّتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہوسکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہوسکا۔ ۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونُواس نے نَجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم وستم برپا کیا جس کا ذکر قرآنِ مجید میں اصحاب الاُخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حَبَش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہوگئی اور اس نے سارا ملک فتح کرلیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے اَبرَہہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی، حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل) مکۂ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآنِ مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخرِ کار ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کرلیا۔

قومِ سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا: ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انھوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظامِ آب پاشی بابِل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انھی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انھوں نے تالاب بنالیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کردیا تھا کہ قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظامِ آب پاشی کا سب سے بڑا مخزَنِ آب وہ تالاب تھا جو شہر مآرِب کے قریب کوہِ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آب پاشی تباہ ہوکر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پَر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عُود، عَنبَر، مُشک، مُر، قرفہ، قصب الذَّرِیرہ، سلیخہ اور دوسری اُن خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنھیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے: ایک بحری، دوسرا بَرّی۔ بحری تجارت کا اِجارہ ہزار سال تک انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ بحرِ احمر کی موسمی ہواؤں، زیرِ آب چٹانوں، اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے،

اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اُردُن اور مصر کے بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ برّی راستے عدن اور حضرموت سے مآرِب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدّہ، یثرب، العُلا، تبوک اور اَیلہ سے گزرتی ہوئی پیٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس برّی راستے پر، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدودِ شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز اُن کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی وحمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہوگیا۔ مشرقِ اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقت ور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اِجارہ داری کے باعث مشرق کے اموالِ تجارت کی من مانی قیمتیں وُصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرماں روا بطلیموس ثانی (۲۸۵-۲۴۶ ق م) نے اُس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سِسوسترِیس نے دریائے نیل کو بحرِ اَحمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعے سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحرِ اَحمر میں داخل ہوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہوسکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقت ور تجارتی بیڑا بحرِ اَحمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انھوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے۔ حتّٰی کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلّط قائم ہوگیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کرلیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہوگئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف برّی تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نَبطیوں نے پیٹرا سے العُلا تک بالائی حجاز اور اُردُن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۰۶ء میں رومیوں نے نَبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام واُردُن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی مُتّحِدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اُٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخرِ کار انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عُروج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سُن سُن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جارہی ہے، یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں، اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتیوں اور مواشی سے بھرا

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا

(اے نبیؐ! ۳۸ اِن مشرکین سے) کہو کہ پکار دیکھو اپنے اُن معبُودوں کو جنھیں تم اللہ کے سوا اپنا معبُود سمجھے بیٹھے ہو۔ ۳۹ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرّہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی مِلکیّت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔ اور اللہ کے حُضور کوئی شَفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجُز اُس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔ ۴۰ حتّٰی کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دُور ہوگی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے)

ہوا ہے۔ آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صَنعا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (skyscraper) تعمیر کی جو قصرِ غُمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شاملِ حال رہا۔ آخرِ کار جب انھوں نے کفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِّ قدیر کی نظرِ عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

۳۸- پچھلے دو رُکوعوں میں آخرت کے متعلق مشرکین کے غلط تصورات پر کلام فرمایا گیا تھا۔ اب تقریر کا رُخ تردیدِ شرک کے مضمون کی طرف پھر رہا ہے۔

۳۹- یعنی اللہ تو یوں اشخاص اور اقوام اور سلطنتوں کی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے، جیسا کہ ابھی تم داؤد و سلیمان علیہما السلام اور قومِ سَبا کے ذکر میں سُن چکے ہو۔ اب ذرا اپنے ان بناوٹی معبُودوں کو پکار کر دیکھ لو، کیا ان میں بھی یہ طاقت ہے کہ کسی کے اقبال کو اِدبار سے، یا اِدبار کو اقبال سے بدل سکیں؟

۴۰- یعنی کسی کا خود مالک ہونا، یا مِلکیّت میں شریک ہونا، یا مددگارِ خدا ہونا تو درکنار، ساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی جاتی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے حق میں بطورِ خود سفارش کر سکے۔ تم لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ کچھ

مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ
يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ
لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ

پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے۔[۴۱]

(اے نبیؐ!) اِن سے پوچھو: "کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟" کہو: "اللہ۔[۴۲] اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہُوا ہے۔"[۴۳] ان سے کہو: "جو قصور ہم نے

خدا کے پیارے ایسے ہیں، یا خدا کی خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ اَڑ بیٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہاں حال یہ ہے کہ اجازت لیے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جراُت نہیں کر سکتا۔ جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا۔ اور جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔ (اسلامی عقیدۂ شفاعت اور مشرکانہ عقیدۂ شفاعت کے فرق کو سمجھنے کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حواشی ۵-۲۳، ہود، حواشی ۸۴-۱۰۶، النحل، حواشی ۶۴-۷۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۶، الانبیاء، حاشیہ ۲۷، الحج، حاشیہ ۱۲۵)

۴۱ - یہاں اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سِفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اِس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلبِ اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد شافع اور مشفوع دونوں نہایت بے چینی کے عالَم میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخر کار جب اُوپر سے اجازت آ جاتی ہے اور شافع کے چہرے سے مشفوع بھانپ جاتا ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر شافع سے پوچھتا ہے: "کیا جواب آیا؟" شافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے، اجازت مل گئی ہے۔ اس بیان سے جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانو! جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اُس کے متعلق تم کس خیالِ خام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بخشوا لے گا یا کسی کی یہ مجال ہوگی کہ وہاں مچل کر بیٹھ جائے اور اللہ سے کہے کہ یہ تو میرے مُتوسّل ہیں، انھیں تو بخشنا ہی پڑے گا۔

۴۲ - سوال اور جواب کے درمیان ایک لطیف خلا ہے۔ مخاطب مشرکین تھے جو صرف یہی نہیں کہ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے بلکہ یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ رزق کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے۔ اب جو اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ بتاؤ کون تمھیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے، تو وہ مشکل میں پڑ گئے۔ اللہ کے سوا کسی اَور کا نام لیتے ہیں تو خود اپنے اور اپنی قوم کے عقیدے کے خلاف بات کہتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کی بنا پر ایسی بات کہہ بھی دیں تو ڈرتے ہیں کہ خود اپنی قوم کے لوگ ہی اس کی تردید کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور اگر تسلیم کر لیتے ہیں کہ اللہ ہی رزق

Maktaba Tul Ishaat.com

اَجۡرَمۡنَا وَلَا نُسۡـَٔلُ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلۡ يَجۡمَعُ بَيۡنَنَا رَبُّنَا
ثُمَّ يَفۡتَحُ بَيۡنَنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَهُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۶﴾ قُلۡ اَرُوۡنِىَ

کیا ہو اس کی کوئی باز پُرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔۴۴" کہو: "ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔۴۵" اِن سے کہو: "ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی وہ

دینے والا ہے تو فوراً دوسرا سوال یہ سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ دوسرے کس مرض کی دوا ہیں جنھیں تم نے خدا بنا رکھا ہے؟ رزق تو دے اللہ، اور پوجے جائیں یہ، آخر تمھاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ اس دوگونہ مشکل میں پڑ کر وہ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے، نہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا معبود رازق ہے۔ پوچھنے والا جب دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہیں بولتے، تو وہ خود اپنے سوال کا جواب دیتا ہے کہ "اللہ"۔

۴۳ – اس فقرے میں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ اوپر کے سوال و جواب کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ جو اللہ ہی کی بندگی و پرستش کرتا ہے وہ ہدایت پر ہو اور جو اس کے سوا دوسروں کی بندگی بجا لاتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہو۔ اس بنا پر بظاہر تو اس کے بعد کہنا یہ چاہیے تھا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہ ہو۔ لیکن اس طرح دوٹوک بات کہہ دینا حق گوئی کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی درست ہوتا، حکمتِ تبلیغ کے لحاظ سے دُرست نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کسی شخص کو مخاطب کر کے آپ صاف صاف گمراہ کہہ دیں اور خود اپنے برسرِ ہدایت ہونے کا دعویٰ کریں تو وہ ضد میں مبتلا ہو جائے گا اور سچائی کے لیے اس کے دل کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اللہ کے رسول چونکہ مُجرّد حق گوئی کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ ان کے سُپرد یہ کام بھی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ حکیمانہ طریقے سے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کریں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نبیؐ! اس سوال و جواب کے بعد اب تم ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ تم سب گمراہ ہو اور ہدایت پر صرف ہم ہیں۔ اس کے بجائے تلقین یہ فرمائی گئی کہ انھیں اب یوں سمجھاؤ۔ ان سے کہو: ہمارے اور تمھارے درمیان یہ فرق تو کھل گیا کہ ہم اُسی کو معبُود مانتے ہیں جو رزق دینے والا ہے، اور تم اُن کو معبود بنا رہے ہو جو رزق دینے والے نہیں ہیں۔ اب یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اور تم دونوں بیک وقت راہِ راست پر ہوں۔ اس صریح فرق کے ساتھ تو ہم میں سے ایک ہی راہِ راست پر ہو سکتا ہے، اور دوسرا لامحالہ گمراہ ٹھیرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا تمھارا اپنا کام ہے کہ دلیل کس کے برسرِ ہدایت ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے اور کون اس کی رو سے گمراہ ہے۔

۴۴ – اوپر کی بات سامعین کو پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر چکی تھی۔ اس پر مزید ایک فقرہ یہ فرما دیا گیا تا کہ وہ اور زیادہ تفکر سے کام لیں۔ اِس سے ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ہدایت اور گمراہی کے اس معاملے کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا ہم میں سے ہر ایک کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے۔ فرض کرو کہ ہم گمراہ ہیں تو اپنی اس گمراہی کا خمیازہ ہم ہی بھگتیں گے، تم پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لیے یہ ہمارے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ کوئی عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں جا رہے ہیں۔

الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً

کون ہستیاں ہیں جنھیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے۔[۴۶]" ہرگز نہیں، زبردست اور دانا تو بس وہ اللہ ہی ہے۔

اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۴۷]

یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ وہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچّے ہو؟[۴۸] کہو: تمھارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک

اِسی طرح تم کو بھی ہماری کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ہی خیر خواہی کی خاطر ایک عقیدے پر جمنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ کہیں تم کسی باطل نظریّے پر تو اپنی زندگی کی ساری پونجی نہیں لگا رہے ہو۔ اس معاملے میں اگر تم نے ٹھوکر کھائی تو تمھارا اپنا ہی نقصان ہوگا، ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔

۴۵ – یہ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے آخری اور سب سے بڑا محرک ہے جس کی طرف سامعین کی توجہ دلائی گئی ہے۔ بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی کہ اس زندگی میں ہمارے اور تمھارے درمیان حق و باطل کا اختلاف ہے اور ہم میں سے کوئی ایک ہی حق پر ہے، بلکہ اس کے آگے حقیقتِ نفس الامری یہ بھی ہے کہ ہمیں اور تمھیں، دونوں ہی کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور رب وہ ہے جو حقیقت کو بھی جانتا ہے اور ہم دونوں گروہوں کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ وہاں جا کر نہ صرف اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ ہم میں اور تم میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔ بلکہ اس مقدّمے کا فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ ہم نے تم پر حق واضح کرنے کے لیے کیا کچھ کیا اور تم نے باطل پرستی کی ضد میں آ کر ہماری مخالفت کس کس طرح کی۔

۴۶ – یعنی قبل اس کے کہ ان معبودوں کے بھروسے پر اتنا بڑا خطرہ مول لو، ذرا مجھے یہیں بتا دو کہ ان میں سے کون اتنا زور آور ہے کہ اللہ کی عدالت میں وہ تمھارا حمایتی بن کر اٹھ سکتا ہو اور تمھیں اس کی گرفت سے بچا سکتا ہو۔

۴۷ – یعنی تم صرف اِسی شہر، یا اِسی ملک، یا اِسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو۔ مگر یہ تمھارے ہم عصر اہلِ وطن تمھاری قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بِعثَت سے ان کو نوازا گیا ہے۔

یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوعِ بشَری کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں، قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ مثلاً:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام:۱۹)	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اُس کے ذریعے سے میں تم کو مُتنبّہ کروں اور ہر اس شخص کو جسے یہ پہنچے۔
قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا (الاعراف:۱۵۸)	اے نبیؐ! کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔
وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء:۱۰۷)	اور اے نبیؐ! ہم نے نہیں بھیجا تم کو، مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔
تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ (الفرقان:۱)	بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے مُتنبّہ کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (مُسندِ احمد، مَروِیّاتِ ابوموسیٰ اَشعَریؓ)	میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔
امّا انا فارسلتُ الی الناس کلھم عامۃ و کان من قبلی انما یُرْسَلُ الی قومہ۔ (مُسندِ احمد، مَروِیّاتِ عبداللہ بن عَمرُوؓ بن عاص)	میں عُمومیّت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔
و کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ (بخاری و مسلم، من حدیثِ جابرؓ بن عبداللہ)	پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔
بعثت انا والساعۃ کھاتین یعنی اصبعین (بخاری و مسلم)	میری بِعثَت اور قیامت اِس طرح ہیں، یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو اُنگلیاں اٹھائیں۔

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں۔

۴۸ – یعنی جس وقت کے متعلق ابھی تم نے کہا ہے کہ ”ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک

النصف ع ۳

وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا
الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو۔[۴۹]

یہ کافر کہتے ہیں کہ "ہم ہرگز اِس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔[۵۰]" کاش تم دیکھو اِن کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔[۵۱]"

فیصلہ کر دے گا"، وہ وقت آخر کب آئے گا؟ ایک مدت سے ہمارا اور تمھارا مُقدّمہ چل رہا ہے۔ ہم تمھیں بار بار جھٹلا چکے ہیں اور کُھلّم کُھلّا تمھاری مخالفت کیے جا رہے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ کیوں نہیں کر ڈالا جاتا؟

۴۹ – دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے تمھاری خواہشات کے تابع نہیں ہیں کہ کسی کام کے لیے جو وقت تم مقرر کرو اُسی وقت پر وہ اُس کام کو کرنے کا پابند ہو۔ اپنے معاملات کو وہ اپنی ہی صوابدید کے مطابق انجام دیتا ہے۔ تم اسے کیا سمجھ سکتے ہو کہ اللہ کی اسکیم میں نوعِ انسانی کو کب تک اس دنیا کے اندر کام کرنے کا موقع ملنا ہے، کتنے اشخاص اور کتنی قوموں کی کس کس طرح آزمائش ہونی ہے، اور کون سا وقت اِس کے لیے موزوں ہے کہ اِس دفتر کو لپیٹ دیا جائے اور تمام اولین و آخرین کو محاسبے کے لیے طلب کر لیا جائے۔ اس کام کا جو وقت اللہ ہی کی اسکیم میں مقرر ہے، اسی وقت پر یہ کام ہوگا۔ نہ تمھارے تقاضوں سے وہ وقت ایک سیکنڈ پہلے آئے گا اور نہ تمھاری التجاؤں سے وہ ایک سیکنڈ کے لیے ٹل سکے گا۔

۵۰ – مراد ہیں کفارِ عرب جو کسی آسمانی کتاب کو نہیں مانتے تھے۔

۵۱ – یعنی عوام الناس، جو آج دنیا میں اپنے لیڈروں، سرداروں، پیروں اور حاکموں کے پیچھے آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے خلاف کسی ناصح کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یہی عوام جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا تھی اور ان کے یہ رہنما انھیں کیا باور کرا رہے تھے، اور جب انھیں یہ پتا چل جائے گا کہ ان رہنماؤں کی پیروی انھیں کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے، تو یہ اپنے ان بزرگوں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بختو! تم نے ہمیں گمراہ کیا، تم ہماری ساری مصیبتوں کے ذمہ دار ہو، تم ہمیں نہ بہکاتے تو ہم خدا کے رسولوں کی بات مان لیتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ
عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا

وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: ”کیا ہم نے تمھیں اُس ہدایت سے روکا تھا جو تمھارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔“[۵۲] وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: ”نہیں، بلکہ شب و روز کی مکّاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں۔“[۵۳] آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے

۵۲ – یعنی وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس سے ہم چند انسان تم کروڑوں انسانوں کو زبردستی اپنی پیروی پر مجبور کر دیتے۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے تو ہماری سرداریوں اور پیشوائیوں اور حکومتوں کا تختہ اُلٹ سکتے تھے۔ ہماری فوج تو تم ہی تھے۔ ہماری دولت اور طاقت کا سرچشمہ تو تمھارے ہی ہاتھ میں تھا۔ تم نذرانے اور ٹیکس نہ دیتے تو ہم مفلس تھے۔ تم ہمارے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو ہماری پیری ایک دن نہ چلتی۔ تم زندہ باد کے نعرے نہ مارتے تو کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ ہوتا۔ تم ہماری فوج بن کر دنیا بھر سے ہمارے لیے لڑنے پر تیار نہ ہوتے تو ایک انسان پر بھی ہمارا بس نہ چل سکتا تھا۔ اب کیوں نہیں مانتے کہ دراصل تم خود اُس راستے پر نہ چلنا چاہتے تھے جو رسولوں نے تمھارے سامنے پیش کیا تھا۔ تم اپنی اغراض اور خواہشات کے بندے تھے اور تمھارے نفس کی یہ مانگ رسولوں کی بتائی ہوئی راہِ تقویٰ کے بجائے ہمارے ہاں پوری ہوتی تھی۔ تم حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر عیشِ دنیا کے طالب تھے اور وہ ہمارے پاس ہی تمھیں نظر آتا تھا۔ تم ایسے پیروں کی تلاش میں تھے جو تمھیں ہر طرح کے گناہوں کی کھلی چھوٹ دیں اور کچھ نذرانہ لے کر خدا کے ہاں تمھیں بخشوا دینے کی خود ذمہ داری لے لیں۔ تم ایسے پنڈتوں اور مولویوں کے طلب گار تھے جو ہر شرک اور ہر بدعت اور تمھارے نفس کی ہر دل پسند چیز کو عینِ حق ثابت کر کے تمھارا دل خوش کریں اور اپنا کام بنائیں۔ تم کو ایسے جعل سازوں کی ضرورت تھی جو خدا کے دین کو بدل کر تمھاری خواہشات کے مطابق ایک نیا دین گھڑ دیں۔ تم کو ایسے لیڈر درکار تھے جو کسی نہ کسی طرح تمھاری دنیا بنا دیں خواہ وہ قیمت بڑی سے بڑی ذلت ہو۔ تم کو ایسے رہنما مطلوب تھے جو خود بدکردار اور بددیانت ہوں اور ان کی سرپرستی میں تمھیں ہر قسم کے گناہوں اور بدکرداریوں کی چھوٹ ملی رہے۔ اس طرح ہمارے اور تمھارے درمیان برابر کے لین دین کا سودا ہوا تھا۔ اب تم کہاں یہ ڈھونگ رچانے چلے ہو کہ گویا تم بڑے معصوم لوگ تھے اور ہم نے زبردستی تمھیں بگاڑ دیا تھا۔

۵۳ – دوسرے الفاظ میں ان عوام کا جواب یہ ہوگا کہ تم اس ذمہ داری میں ہم کو برابر کا شریک کہاں ٹھیرائے دے رہے ہو۔

النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ
الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَاۤ
اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا
بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ
اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ

تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اِس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال اُن کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں؟

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے۔[۵۴] انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔[۵۵] اے نبیؐ! ان سے کہو: میرا رب جسے چاہتا

کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے اپنی چال بازیوں، فریب کاریوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے کیا طلسم باندھ رکھا تھا، اور رات دن خلقِ خدا کو پھانسنے کے لیے کیسے کیسے جتن تم کیا کرتے تھے۔ معاملہ صرف اتنا ہی تو نہیں ہے کہ تم نے ہمارے سامنے دعوت پیش کی اور ہم اس پر رِیجھ گئے۔ امرِ واقعہ یہ بھی تو ہے کہ تم شب و روز کی مکاریوں سے ہم کو بے وقوف بناتے تھے اور تم میں سے ہر شکاری روز ایک نیا جال بُن کر طرح طرح کی تدبیروں سے اللہ کے بندوں کو اس میں پھانستا تھا۔

قرآنِ مجید میں پیشواؤں اور پیروؤں کے اس جھگڑے کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ تفصیل کے لیے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: اعراف، آیات ۳۸-۳۹۔ ابراہیم: ۲۱۔ القصص: ۶۳۔ الاحزاب: ۶۶-۶۸۔ المومن: ۴۷-۴۸۔ حٰمٓ السجدہ: ۲۹۔

۵۴ - یہ بات قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر اُن خوش حال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نُفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: الانعام: ۱۲۳۔ الاعراف: ۶۰-۶۶-۷۵-۸۸-۹۰۔ ہود: ۲۷۔ بنی اسرائیل: ۱۶۔ المومنون: ۲۴-۳۳ تا ۳۸-۴۶-۴۷۔ الزُّخْرُف: ۲۳۔

۵۵ - اُن کا اِستدلال یہ تھا کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے پیارے اور پسندیدہ لوگ ہیں، جبھی تو اس نے ہم کو اُن نعمتوں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ع

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۟ ۳۶ وَمَآ
اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي
الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۳۷ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ

ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نَپا تُلا عطا کرتا ہے، مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔[۵۶] یہ تمھاری دولت اور تمھاری اولاد نہیں ہے جو تمھیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔[۵۷] یہی لوگ ہیں جن کے لیے اُن کے عمل کی دُہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔[۵۸] رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دَوڑ دھوپ

نوازا ہے جن سے تم محروم ہو، یا کم از کم ہم سے فروتر ہو۔ اگر اللہ ہم سے راضی نہ ہوتا تو یہ سروسامان اور یہ دولت و حشمت ہمیں کیوں دیتا۔ اب یہ بات ہم کیسے باور کرلیں کہ اللہ یہاں تو ہم پر نعمتوں کی بارش کر رہا ہے اور آخرت میں جا کر ہمیں عذاب دے گا۔ عذاب ہونا ہے تو ان پر ہونا ہے جو یہاں اس کی نوازشوں سے محروم ہیں۔

قرآنِ مجید میں دنیا پرستوں کی اس غلط فہمی کا بھی جگہ جگہ ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: البقرہ: ۱۲۶-۲۱۲۔ التوبہ: ۵۵-۶۹۔ ہود: ۳-۲۷۔ الرعد: ۲۶۔ الکہف: ۳۴ تا ۴۳۔ مریم: ۷۳ تا ۷۷۔ طٰہٰ: ۱۳۱۔ المومنون: ۵۵ تا ۶۱۔ الشعراء: ۱۱۱۔ القصص: ۷۶ تا ۸۳۔ الروم: ۹۔ المدثر: ۱۱ تا ۲۶۔ الفجر: ۱۵ تا ۲۰۔

۵۶ - یعنی دنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام جس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اُس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جسے اللہ کشادہ رزق دے رہا ہے وہ اُس کا محبوب ہے، اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ نہایت خوش حال ہوتے ہیں، اور بہت سے نیک اور شریف انسان، جن کے کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے، تنگ دستی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اخلاق کے لوگ ناپسند ہیں اور وہ شریر و خبیث لوگ ہی اسے بھاتے ہیں۔

۵۷ - اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سے قریب کرنے والی چیز مال اور اولاد نہیں ہے بلکہ ایمان و عملِ صالح ہے۔ دوسرے، یہ کہ مال اور اولاد صرف اُس مومنِ صالح انسان ہی کے لیے ذریعہ تقرّب بن سکتے ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت سے خدا شناس اور نیک کردار بنانے کی کوشش کرے۔

اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝۳۸ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ
يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۳۹ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝۴۰ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ

کرتے ہیں، تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

اَے نبیؐ! ان سے کہو: "میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کُھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔[59] جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اُس کی جگہ وہی تم کو اَور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔[60]

اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: "کیا یہ لوگ تمھاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟"[61] تو وہ جواب دیں گے کہ "پاک ہے آپ کی ذات،

۵۸ - اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ ان کی یہ نعمت لازوال ہوگی اور اِس اجر کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ کیونکہ جس عیش کے کبھی ختم ہو جانے کا خطرہ ہو اس سے انسان پوری طرح مطمئن ہو کر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب یہ سب کچھ چھن جائے۔

۵۹ - اس مضمون کو بتکرار بیان کرنے سے مقصود اس بات پر زور دینا ہے کہ رزق کی کمی و بیشی اللہ کی مشیّت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اس کی رضا سے۔ مشیتِ الٰہی کے تحت اچھے اور بُرے ہر طرح کے انسانوں کو رزق مل رہا ہے۔ خدا کا اقرار کرنے والے بھی رزق پا رہے ہیں اور اس کا انکار کرنے والے بھی۔ نہ رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی خدا کا پسندیدہ بندہ ہے، اور نہ اس کی تنگی اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اس کا مغضوب ہے۔ مشیت کے تحت ایک ظالم اور بے ایمان آدمی پھلتا پھولتا ہے، حالانکہ ظلم اور بے ایمانی خدا کو پسند نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس مشیت ہی کے تحت ایک سچا اور ایماندار آدمی نقصان اُٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے، حالانکہ یہ صفات خدا کو پسند ہیں۔ لہٰذا وہ شخص سخت گمراہ ہے جو مادّی فوائد و منافع کو خیر و شر کا پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اصل چیز خدا کی رضا ہے اور وہ اُن اخلاقی اوصاف سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ اگر کسی کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو یہ بلاشبہ خدا کا فضل ہے جس پر شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ایک شخص اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے خدا کا باغی و نافرمان بندہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سخت بازپُرس اور بدترین عذاب کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا

ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اِن لوگوں سے۔[۶۲] دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جِنّوں کی عبادت کرتے تھے، ان میں سے اکثر انھی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔[۶۳]" (اُس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذابِ جہنّم کا مزا جسے

۶۰ – رازق، صانع، مُوجِد، مُعطی اور ایسی ہی دوسری بہت سی صفات ایسی ہیں جو اصل میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں مگر مجازاً بندوں کی طرف بھی منسوب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم ایک شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے فُلاں شخص کے روزگار کا بندوبست کر دیا، یا اس نے یہ عَطِیّہ دیا، یا اس نے فلاں چیز بنائی یا ایجاد کی۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی جن جن کے متعلق تم گمان رکھتے ہو کہ وہ روزی دینے والے ہیں اُن سب سے بہتر روزی دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

۶۱ – قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور کے مشرکین فرشتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کے بت بناتے اور ان کی پَرَستِش کرتے رہے ہیں۔ کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی بجلی کا اور کوئی ہوا کا۔ کوئی دولت کی دیوی ہے تو کوئی علم کی اور کوئی موت و ہلاکت کی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے روز ان فرشتوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم ہی ان لوگوں کے معبود بنے ہوئے تھے؟ اِس سوال کا مطلب دریافتِ حال نہیں ہے بلکہ اس میں یہ معنٰی پوشیدہ ہیں کہ کیا تم ان کی اس عبادت سے راضی تھے؟ کیا تم نے یہ کہا تھا کہ لوگو! ہم تمہارے معبُود ہیں، تم ہماری پوجا کیا کرو؟ یا تم نے یہ چاہا تھا کہ یہ لوگ تمھاری پوجا کریں؟ قیامت میں یہ سوال صرف فرشتوں ہی سے نہیں بلکہ تمام اُن ہستیوں سے کیا جائے گا جن کی دنیا میں عبادت کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ؕ (آیت ۱۷)

جس روز اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو اور ان ہستیوں کو جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں جمع کرے گا، پھر پوچھے گا: کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟

۶۲ – یعنی وہ جواب دیں گے کہ حضور کی ذات اس سے مُنَزَّہ اور بالاتر ہے کہ کوئی دوسرا خدائی و معبُودیّت میں آپ کا شریک ہو۔ ہمارا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اِن سے اور ان کے افعال سے بری الذّمہ ہیں۔ ہم تو حضور کے

تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا
رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا
هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا
جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ
يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ

تم جُھٹلایا کرتے تھے۔

اِن لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سُنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ "یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو اُن معبُودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمھارے باپ دادا کرتے آئے ہیں"۔ اور کہتے ہیں کہ "یہ (قرآن) محض ایک جھُوٹ ہے گھڑا ہوا"۔ اِن کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ "یہ تو صریح جادو ہے"۔ حالانکہ نہ ہم نے اِن لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی مُتنبّہ کرنے والا بھیجا[۶۴] تھا۔ اِن سے پہلے

بندے ہیں۔

۶۳ – اس فقرے میں جنّ سے مراد شیاطینِ جنّ ہیں۔ فرشتوں کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ ہمارے نام لے کر، اور اپنے تخیّلات کے مطابق ہماری صورتیں بنا کر گویا ہماری عبادت کرتے تھے، لیکن دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ شیاطین کی بندگی کر رہے تھے، کیونکہ شیاطین ہی نے ان کو یہ راستہ دکھایا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا حاجت روا سمجھو اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرو۔

یہ آیت صریح طور پر اُن لوگوں کے خیال کی غلطی واضح کر دیتی ہے جو "جنّ" کو پہاڑی علاقے کے باشندوں یا دہقانوں اور صحرائیوں کے معنٰی میں لیتے ہیں۔ کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی اس آیت کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ لوگ کوہستانی اور صحرائی اور دیہاتی آدمیوں کی عبادت کیا کرتے تھے اور انھی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

اس آیت سے عبادت کے بھی ایک دوسرے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت صرف پرستش اور پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ کسی کے حکم پر چلنا اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔ حتّٰی کہ اگر آدمی کسی پر لعنت بھیجتا ہو (جیسا کہ شیطان پر بھیجتا ہے) اور پھر بھی پیروی اسی کے طریقے کی کیے جا رہا ہو تب بھی وہ اس کی عبادت

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا
رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٥﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ
تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ
جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿٤٦﴾ قُلْ

ع

گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ جو کچھ ہم نے انھیں دیا تھا اُس کے عُشرِ عَشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے ہیں۔ مگر جب انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔[۶۵] ع

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ ”میں تمھیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمھارے صاحب میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو جُنون کی ہو؟[۶۶] وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو مُتنبّہ کرنے والا ہے۔“[۶۷] ان سے کہو:

کا مرتکب ہے۔ (اس کی دوسری مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۱۴۵، المائدہ، ۹۱۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶)

۶۴ – یعنی اس سے پہلے نہ کوئی کتاب خدا کی طرف سے ایسی آئی ہے اور نہ کوئی رسول ایسا آیا ہے جس نے آ کر ان کو یہ تعلیم دی ہو کہ یہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی و پرستش کیا کریں۔ اس لیے یہ لوگ کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ سراسر جہالت کی بنا پر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ان کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

۶۵ – یعنی مکّے کے لوگ تو اُس قوت و شوکت اور اُس خوش حالی کے عُشرِ عَشیر کو بھی نہیں پہنچے ہیں جو اُن قوموں کو حاصل تھی۔ مگر دیکھ لو کہ جب انھوں نے ان حقائق کو ماننے سے انکار کیا جو انبیا علیہم السّلام نے ان کے سامنے پیش کیے تھے، اور باطل پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیاد رکھی تو آخرِ کار وہ کس طرح تباہ ہوئیں اور ان کی قوت و دولت ان کے کسی کام نہ آ سکی۔

۶۶ – یعنی اغراض اور خواہشات اور تعصّبات سے پاک ہو کر خالصتاً للہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اُس شخص کو مجنون ٹھیرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے۔ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیرِ کعبہ کے بعد حَجَرِ اَسوَد نصب کرنے کے مسئلے پر جب قبائلِ قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم تسلیم کیا تھا اور انھوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چُکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمھاری ساری قوم کو ہو چکا ہے، اب کیا بات ایسی ہو گئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟

مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ
الْغُیُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا
یُعِیْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَ اِنِ
اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾

"اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے[۶۸]۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے[۶۹]۔" ان سے کہو "میرا رب (مجھ پر) حق کا القا کرتا ہے[۷۰] اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔" کہو "حق آ گیا ہے اور اب باطل کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔" کہو: "اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے[۷۱]۔"

ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟

۶۷ – یعنی کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جُنون کا مریض ٹھیراتے ہو؟ کیا تمھارے نزدیک عقل مند وہ ہے جو تمھیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش، بہت اچھے جا رہے ہو، اور مجنون وہ ہے جو تمھیں بُرا وقت آنے سے پہلے خبردار کرے اور فساد کی جگہ صَلاح کی راہ بتائے۔

۶۸ – اصل الفاظ ہیں: مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ۔ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اُوپر ہم نے ترجمہ میں بیان کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمھاری بھلائی کے سوا میں اور کچھ نہیں چاہتا، میرا اجر بس یہی ہے کہ تم درست ہو جاؤ۔ اس مضمون کو دوسری جگہ قرآنِ مجید میں یوں ادا کیا گیا ہے:

قُلْ مَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا (الفرقان: ۵۷)	اَے نبیؐ! ان سے کہو: میں اس کام پر تم سے کوئی اجر اس کے سوا نہیں مانگتا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

۶۹ – یعنی الزام لگانے والے جو کچھ چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ فَزِعُوۡا فَلَا فَوۡتَ وَ اُخِذُوۡا مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۵۱﴾ وَّ
قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖ ۚ وَ اَنّٰی لَہُمُ التَّنَاوُشُ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۵۲﴾ وَّ قَدۡ
کَفَرُوۡا بِہٖ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ یَقۡذِفُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ مِنۡ مَّکَانٍۭ

کاش! تم دیکھو اِنھیں اُس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے، بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔[۷۲] اُس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔[۷۳] حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے۔[۷۴] اِس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دُور دُور

۷۰ – اصل الفاظ ہیں یَقْذِفُ بِالْحَقِّ۔ اس کے ایک معنٰی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعے سے وہ علمِ حق میرے اُوپر اِلقا کرتا ہے۔ اور دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ وہ حق کو غالب کر رہا ہے، باطل کے سر پر حق کی ضرب لگا رہا ہے۔

۷۱ – اس زمانے کے بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ اِستدلال کیا ہے کہ اس کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گمراہ ہو سکتے تھے، بلکہ ہو جایا کرتے تھے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خود حضورؐ ہی کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ اگر میں گمراہ ہوتا ہوں تو اپنی گمراہی کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں اور راہِ راست پر میں بس اُس وقت ہوتا ہوں جب میرا رب مجھ پر وحی (یعنی آیاتِ قرآنی) نازل کرتا ہے۔ اس غلط تاویل سے یہ ظالم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی، معاذ اللہ! ہدایت وضلالت کا مجموعہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے حضورؐ سے یہ اعتراف اس لیے کروایا تھا کہ کہیں کوئی شخص آپؐ کو بالکل ہی راہِ راست پر سمجھ کر آپؐ کی مکمل پیروی نہ اختیار کر بیٹھے۔ حالانکہ جو شخص بھی سلسلۂ کلام پر غور کرے گا وہ جان لے گا کہ یہاں ”اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں“ کے الفاظ اس معنٰی میں نہیں کہے گئے ہیں کہ معاذ اللہ! حضورؐ فی الواقع گمراہ ہو جاتے تھے، بلکہ پوری بات اس معنٰی میں کہی گئی ہے کہ ”اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں، جیسا کہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، اور میرا یہ نبوت کا دعوٰی اور میری یہ دعوتِ توحید اسی گمراہی کا نتیجہ ہے جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو، تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہی پڑے گا، اس کی ذمہ داری میں تم نہ پکڑے جاؤ گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں، جیسا کہ درحقیقت ہوں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی آتی ہے، جس کے ذریعے سے مجھے راہِ راست کا علم حاصل ہو گیا ہے۔ میرا رب قریب ہی موجود ہے اور سب کچھ سُن رہا ہے، اسے معلوم ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اس کی طرف سے ہدایت یافتہ۔“

۷۲ – یعنی قیامت کے روز ہر مجرم اس طرح پکڑا جائے گا کہ گویا پکڑنے والا قریب ہی کہیں چھپا کھڑا تھا، ذرا اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور فوراً ہی دھر لیا گیا۔

۷۳ – مراد یہ ہے کہ اُس تعلیم پر ایمان لے آئے جو رسولؐ نے دنیا میں پیش کی تھی۔

۷۴ – یعنی ایمان لانے کی جگہ تو دنیا تھی اور وہاں سے اب یہ بہت دور نکل آئے ہیں۔ عالَمِ آخرت میں پہنچ جانے

بَعِيۡدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيۡلَ بَيۡنَهُمۡ وَبَيۡنَ مَا يَشۡتَهُوۡنَ كَمَا فُعِلَ
بِاَشۡيَاعِهِمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا فِىۡ شَكٍّ مُّرِيۡبٍ ﴿۵۴﴾ ع

ع ۶ ۱۲

کی کوڑیاں لایا کرتے تھے[۷۵]۔ اُس وقت جس چیز کی یہ تمنّا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیے جائیں گے جس طرح اِن کے پیش رَو ہم مشرب محروم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بڑے گمراہ کُن شک میں پڑے ہوئے تھے[۷۶]۔ ع

کے بعد اب توبہ و ایمان کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔

۷۵ – یعنی رسولؐ اور تعلیماتِ رسولؐ اور اہلِ ایمان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے، آوازے کستے اور فقرے چُست کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ شخص ساحر ہے۔ کبھی کہتے مجنون ہے۔ کبھی توحید کا مذاق اُڑاتے اور کبھی آخرت کے تخیل پر باتیں چھانٹتے۔ کبھی یہ افسانہ تراشتے کہ رسولؐ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور کبھی ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے کہ یہ محض اپنی نادانی کی وجہ سے رسولؐ کے پیچھے لگ گئے ہیں۔

۷۶ – درحقیقت شرک اور دہریت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں، یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہونی چاہیے۔ پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیاد شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک انھیں سخت گمراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انھیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انھیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انھیں آخرت کے آنے میں شک ہوا۔ حتّٰی کہ اس شک کو انھوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر انبیاؑ کی کوئی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کی پوری مہلتِ عمل ایک غلط راستے میں کھپا دی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

فاطر

(۳۵)

فاطر

نام پہلی آیت ہی میں لفظ "فَاطِرِ" اس سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے جس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ یہ وہ سورت ہے جس میں فاطر کا لفظ آیا ہے۔ دوسرا نام "الملائکہ" بھی ہے، اور یہ لفظ بھی پہلی آیت ہی میں وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نُزُول اندازِ کلام کی اندرونی شہادت سے مُترشّح ہوتا ہے کہ اس سورت کے نزول کا زمانہ غالباً مکۂ معظمہ کا دَورِ متوسط ہے، اور اس کا بھی وہ حصہ جس میں مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بُری سے بُری چالیں چلی جا رہی تھیں۔

موضوع و مضمون کلام کا مُدّعا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کے مقابلے میں جو رَوِیّہ اس وقت اہلِ مکہ اور اُن کے سرداروں نے اختیار کر رکھا تھا اس پر ناصحانہ انداز میں اُن کو تنبیہ و ملامت بھی کی جائے اور معلّمانہ انداز میں فہمایش بھی۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نادانو! یہ نبی جس راہ کی طرف تم کو بُلا رہا ہے اس میں تمھارا اپنا بھلا ہے۔ اس پر تمھارا غصّہ، اور تمھاری مکاریاں اور چال بازیاں، اور اس کو ناکام کرنے کے لیے تمھاری تدبیریں دراصل اُس کے خلاف نہیں بلکہ تمھارے اپنے خلاف پڑ رہی ہیں۔ اس کی بات نہ مانو گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس پر غور تو کرو، آخر اس میں غلط کیا بات ہے۔ وہ شرک کی تردید کرتا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا شرک کے لیے دنیا میں کوئی معقول بنیاد موجود ہے؟ وہ توحید کی دعوت دیتا ہے۔ تم خود عقل سے کام لے کر غور کرو، کیا اللہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے سوا کہیں کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جو خدائی صفات اور اختیارات رکھتی ہو؟ وہ تم سے کہتا ہے کہ تم اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہو، بلکہ تمھیں اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اَور زندگی ہے جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کا نتیجہ دیکھنا ہوگا۔ تم خود سوچو کہ اس پر تمھارے شبہات اور اچنبھے کس قدر بے اصل ہیں۔ کیا تمھاری آنکھیں رات دن اعادۂ خلق کا مشاہدہ نہیں کر رہی ہیں؟ پھر تمھارا ہی اعادہ اُس خدا کے لیے کیوں ناممکن ہو جس نے تم کو ایک ذرا سے نطفے سے پیدا کر دیا۔ کیا تمھاری عقل یہ گواہی نہیں دیتی کہ بھلے اور بُرے کو یکساں نہ ہونا چاہیے؟ پھر تم ہی بتاؤ کہ معقول بات کیا ہے؟ یہ کہ بھلے اور بُرے کا انجام یکساں ہو، یعنی مٹّی میں ملنا اور فنا ہو جانا؟ یا یہ کہ بھلے کو بھلا اور بُرے کو بُرا

Maktaba Tul Ishaat.com

بدلہ ملے؟ اب اگر ان سراسر معقول اور مبنی برحقیقت باتوں کو تم نہیں مانتے اور جھوٹے خداؤں کی بندگی نہیں چھوڑتے اور اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار سمجھتے ہوئے شُترِ بے مہار ہی کی طرح دنیا میں جینا چاہتے ہو تو اس میں نبیؐ کا کیا نقصان ہے۔ شامت تو تمھاری اپنی ہی آئے گی۔ نبیؐ پر صرف سمجھانے کی ذمہ داری تھی، اور وہ اس نے ادا کر دی۔

سلسلۂ کلام میں بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ جب نصیحت کا حق پوری طرح ادا کر رہے ہیں تو گمراہی پر اصرار کرنے والوں کے راہِ راست قبول نہ کرنے کی کوئی ذمّے داری آپؐ کے اوپر عائد نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ آپؐ کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے، ان کے رَوِیّے پر نہ آپؐ غمگین ہوں، اور نہ انھیں راہِ راست پر لانے کی فکر میں اپنی جان گُھلائیں۔ اس کے بجائے آپؐ اپنی توجُّہات اُن لوگوں پر صَرف کریں جو بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

ایمان قبول کرنے والوں کو بھی اسی سلسلے میں بڑی بشارتیں دی گئی ہیں تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے راہِ حق میں ثابت قدم رہیں۔

آیاتہا ۴۵ ۔ سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَكِّيَّةٌ ۔ رکوعاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رَساں مقرر کرنے والا ہے[1]، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں[2]۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے[3]۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے

۱ – اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیا علیہم السلام کے درمیان پیغام رَسانی کی خدمت انجام دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ تمام کائنات میں اللہ جَلّ شانُہٗ کے احکام لے جانا اور اُن کو نافذ کرنا انھی فرشتوں کا کام ہے۔ ذکر کا مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ یہ فرشتے جن کو مشرکین دیوی اور دیوتا بنائے بیٹھے ہیں، اِن کی حیثیت اللہ وحدہٗ لاشریک کے فرماں بردار خادموں سے زائد کچھ نہیں ہے۔ جس طرح کسی بادشاہ کے خدّام اس کے احکام کی تعمیل کے لیے دوڑے پھرتے ہیں اسی طرح یہ فرشتے کائنات کے فرماں روائے حقیقی کی خدمت کے لیے اُڑے پھرتے ہیں۔ ان خادموں کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ سارے اختیارات اصل فرماں روا کے ہاتھ میں ہیں۔

۲ – ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان فرشتوں کے بازوؤں اور پروں کی کیفیت کیا ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کے بجائے وہ لفظ استعمال فرمایا ہے جو انسانی زبان میں پرندوں کے بازوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو یہ تصور ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کا یہی لفظ اصل کیفیت سے قریب تر ہے۔ دو دو اور تین تین اور چار چار بازوؤں کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف درجے کی طاقتیں عطا فرمائی ہیں اور جس سے جیسی خدمت لینی مطلوب ہے، اس کو ویسی ہی زبردست سُرعتِ رفتار اور قوتِ کار سے آراستہ فرمایا گیا ہے۔

۳ – ان الفاظ سے یہ مُترشّح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازوؤں کی انتہائی تعداد چار ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتوں کو اس سے بھی زیادہ بازو عطا فرمائے ہیں۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ کو ایک مرتبہ اس شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے جبریلؑ کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے ان کے چھ سو بازو تھے اور وہ پورے اُفق پر چھائے ہوئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ
مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ وَاِنْ

کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں[۴]۔ وہ زبردست اور حکیم ہے[۵]۔

لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انھیں یاد رکھو[۶]۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے[۷] رزق دیتا ہو؟ ــــ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں، آخر تم کہاں سے[۸] دھوکا کھا رہے ہو؟ اب اگر

(ترمذی)

۴ – اس کا مقصود بھی مشرکین کی اس غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کوئی انھیں روزگار دلانے والا اور کوئی ان کو اولاد عطا فرمانے والا اور کوئی ان کے بیماروں کو تندرستی بخشنے والا ہے۔ شرک کے یہ تمام تصوُّرات بالکل بے بنیاد ہیں اور خالص حقیقت صرف یہ ہے کہ جس قسم کی رحمت بھی بندوں کو پہنچتی ہے محض اللہ عزَّ وجَلَّ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید اور احادیث میں بکثرت مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان دَر دَر کی بھیک مانگنے اور ہر آستانے پر ہاتھ پھیلانے سے بچے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہے۔

۵ – زبردست ہے، یعنی سب پر غالب اور کامل اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ جو فیصلہ بھی وہ کرتا ہے سراسر حکمت کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی کو دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ حکمت اسی کی مقتضی ہے۔ اور کسی کو نہیں دیتا تو اس لیے نہیں دیتا کہ اسے دینا حکمت کے خلاف ہے۔

۶ – یعنی احسان فراموش نہ بنو۔ نمک حرامی نہ اختیار کرو۔ اس حقیقت کو نہ بھول جاؤ کہ تمھیں جو کچھ بھی حاصل ہے، اللہ کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فقرہ اس بات پر مُتنبّہ کر رہا ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے سوا کسی کی بندگی و پرستش کرتا ہے، یا کسی نعمت کو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کی عطا و بخشش سمجھتا ہے، یا کسی نعمت کے ملنے پر اللہ کے سوا کسی اور کا شکر بجا لاتا ہے، یا کوئی نعمت مانگنے کے لیے اللہ کے سوا کسی اور سے دعا کرتا ہے، وہ بہت بڑا احسان فراموش ہے۔

۷ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے کلام کا موقع و محل خود بھر رہا ہے۔

يُكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۗ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
الْاُمُوْرُ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ۥ وَقفة وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ

(اے نبی!) یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں[8] (تو یہ کوئی نئی بات نہیں)، تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، اور سارے معاملات آخرِ کار اللہ ہی کی طرف رُجوع ہونے والے ہیں[9]۔ لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے[10]، لہٰذا دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے[11] اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دینے پائے[12]۔ درحقیقت شیطان تمھارا دشمن ہے اس لیے تم بھی

اس کو سمجھنے کے لیے یہ نقشہ چشمِ تصوّر کے سامنے لائیے کہ تقریر مشرکین کے سامنے ہو رہی ہے۔ مقرر حاضرین سے پوچھتا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہو اور جو زمین و آسمان سے تمھاری رزق رسانی کا سامان کر رہا ہو؟ یہ سوال اُٹھا کر مقرّر چند لمحے جواب کا انتظار کرتا ہے۔ مگر دیکھتا ہے کہ سارا مجمع خاموش ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق و رازق ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاضرین کو بھی اس امر کا اقرار ہے کہ خالق و رازق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ تب مقرر کہتا ہے کہ معبود بھی پھر اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ آخر تمھیں یہ دھوکا کہاں سے لگ گیا کہ خالق و رازق تو ہو صرف اللہ، مگر معبود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

۸ – یعنی تمھاری اس بات کو نہیں مانتے کہ اللہ کے سوا عبادت کا مستحق کوئی نہیں ہے، اور تم پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ تم نبوت کا ایک جھوٹا دعویٰ لے کر کھڑے ہو گئے ہو۔

۹ – یعنی فیصلہ لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جسے وہ جھوٹا کہہ دیں وہ حقیقت میں جھوٹا ہو جائے۔ فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ آخرِ کار بتا دے گا کہ جھوٹا کون تھا اور جو حقیقت میں جھوٹے ہیں انھیں ان کا انجام بھی دکھا دے گا۔

۱۰ – وعدے سے مراد آخرت کا وعدہ ہے جس کی طرف اوپر کے اس فقرے میں اشارہ کیا گیا تھا کہ تمام معاملات آخرِ کار اللہ کے حضور پیش ہونے والے ہیں۔

۱۱ – یعنی اِس دھوکے میں کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، اس کے بعد کوئی آخرت نہیں ہے جس میں اعمال کا حساب ہونے والا ہو۔ یا اس دھوکے میں کہ اگر کوئی آخرت ہے بھی تو جو اس دنیا میں مزے کر رہا ہے وہ وہاں بھی مزے کرے گا۔

۱۲ – ”بڑے دھوکے باز“ سے مراد یہاں شیطان ہے، جیسا کہ آگے کا فقرہ بتا رہا ہے۔ اور ”اللہ کے بارے میں“ دھوکا دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو تو یہ باور کرائے کہ خدا سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈالے کہ خدا ایک دفعہ بس دنیا کو حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اب اسے اپنی بنائی ہوئی اس کائنات سے عملاً کوئی سروکار نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ﴿۶﴾
اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۷﴾ ع اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ
عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ

ع ۱۳

اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔ جو لوگ کفر کریں[۱۳] گے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔[۱۴] ع

[۱۵] (بھلا کچھ ٹھکانا ہے اُس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوش نما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو؟[۱۶] حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

اور کچھ لوگوں کو یہ چکما دے کہ خدا کائنات کا انتظام تو بے شک کر رہا ہے، مگر اس نے انسانوں کی رہنمائی کرنے کا کوئی ذمہ نہیں لیا ہے، اس لیے یہ وحی و رسالت محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلائے کہ اللہ بڑا غفورٌ رحیم ہے، تم خواہ کتنے ہی گناہ کرو، وہ بخش دے گا، اور اس کے کچھ پیارے ایسے ہیں کہ ان کا دامن تھام لو تو بیڑا پار ہے۔

۱۳ – یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی اِس دعوت کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔

۱۴ – یعنی اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور جو نیک عمل انھوں نے کیے ہوں گے ان کا محض برابر سرابر ہی اجر دے کر نہ رہ جائے گا بلکہ انھیں بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

۱۵ – اُوپر کے دو پیراگراف عوام الناس کو خطاب کر کے ارشاد ہوئے تھے۔ اب اس پیراگراف میں اُن عَلَم بردارانِ ضلالت کا ذکر ہو رہا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

۱۶ – یعنی ایک بگڑا ہوا آدمی تو وہ ہوتا ہے جو بُرا کام تو کرتا ہے مگر یہ جانتا اور مانتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ ایسا شخص سمجھانے سے بھی دُرست ہو سکتا ہے اور کبھی خود اس کا اپنا ضمیر بھی ملامت کر کے اسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صرف عادتیں ہی بگڑی ہیں، ذہن نہیں بگڑا۔ لیکن ایک دوسرا شخص ایسا ہوتا ہے جس کا ذہن بگڑ چکا ہوتا ہے، جس میں بُرے اور بھلے کی تمیز باقی نہیں رہتی، جس کے لیے گناہ کی زندگی ایک مرغوب اور تابناک زندگی ہوتی ہے، جو نیکی سے گھن کھاتا ہے اور بدی کو عین تہذیب و ثقافت سمجھتا ہے، جو صَلاح و تقویٰ کو دقیانوسیت اور فسق و فُجور کو ترقی پسندی خیال کرتا ہے، جس کی نگاہ میں ہدایت گمراہی اور گمراہی سراسر ہدایت بن جاتی ہے۔ ایسے شخص پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ وہ نہ خود اپنی حماقتوں پر مُتنبّہ

مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ

راہِ راست دِکھادیتا ہے۔ پس (اے نبیؐ!) خواہ مخواہ تمھاری جان ان لوگوں کی خاطر غم وافسوس میں نہ گُھلے۔[۱۷]

ہوتا ہے اور نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُن کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے پڑنا لا حاصل ہے۔ اسے ہدایت دینے کی فکر میں اپنی جان گُھلانے کے بجائے داعیِ حق کو ان لوگوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جن کے ضمیر میں ابھی زندگی باقی ہو اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازے حق کی آواز کے لیے بند نہ کر لیے ہوں۔

۱۷- پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان یہ ارشاد کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے'' صاف طور پر یہ معنیٰ دے رہا ہے کہ جو لوگ اس حد تک اپنے ذہن کو بگاڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور انھی راہوں میں بھٹکنے کے لیے انھیں چھوڑ دیتا ہے جن میں بھٹکتے رہنے پر وہ خود مُصِر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت سمجھا کر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کے معاملے میں صبر کر لو اور جس طرح اللہ کو ان کی پروا نہیں رہی ہے تم بھی ان کے حال پر غم کھانا چھوڑ دو۔

اِس مقام پر دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں: ایک یہ کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ عامۃ الناس نہیں تھے بلکہ مکۂ معظمہ کے وہ سردار تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر جھوٹ، ہر فریب اور ہر مکر سے کام لے رہے تھے۔ یہ لوگ درحقیقت حضورؐ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں اور آپؐ کے مقابلے میں وہ خود کن جہالتوں اور اَخلاقی خرابیوں کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھ لینے کے بعد ٹھنڈے دل سے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو نہیں چلنے دینا ہے۔ اور اس غرض کے لیے انھیں کوئی اوچھے سے اوچھا ہتھیار اور کوئی ذلیل سے ذلیل ہتھکنڈا استعمال کرنے میں باک نہ تھا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر اور آپس میں مشورے کر کر کے آئے دن ایک نیا جھوٹ تصنیف کریں اور اسے کسی شخص کے خلاف پھیلائیں وہ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو تو وہ جھوٹا جانتے ہیں اور خود ان سے تو یہ بات چُھپی ہوئی نہیں ہوتی کہ جس شخص پر انھوں نے ایک الزام لگایا ہے وہ اُس سے بَری ہے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے خلاف یہ جھوٹے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہوں، ان کے جواب میں کبھی صداقت وراست بازی سے ہٹ کر کوئی بات نہ کرے تو ان ظالموں سے یہ بات بھی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی کہ ان کا مدِّمقابل ایک سچّا اور کھرا انسان ہے۔ اس پر بھی جن لوگوں کو اپنے کرتوتوں پر ذرا شرم نہ آئے اور وہ سچائی کا مقابلہ مسلسل جھوٹ سے کرتے ہی چلے جائیں ان کی یہ رَوِش خود ہی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ اللہ کی پھٹکار ان پر پڑ چکی ہے اور ان میں بُرے بھلے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔

دوسری بات جسے اس موقع پر سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر محض اپنے رسول پاکؐ کو اُن کے معاملے کی اصل حقیقت سمجھانا ہوتا تو وہ خفیہ طور پر صرف آپؐ ہی کو سمجھا سکتا تھا۔ اس غرض کے لیے وحیِ جلی میں عَلَی الاعلان اُس کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ قرآنِ مجید میں اسے بیان کرنے اور دنیا بھر کو سُنا دینے کا مقصود دراصل عوام الناس کو مُتنبّہ کرنا تھا کہ جن لیڈروں اور پیشواؤں کے پیچھے تم آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہو وہ کیسے بگڑے ہوئے ذہن کے لوگ ہیں اور اُن کی بیہودہ حرکات کس طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ وَاللّٰهُ الَّذِيٓ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ
فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۚ كَذٰلِكَ النُّشُورُ ۝ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ
جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ ط

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس کو خوب جانتا ہے[18]۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر ہم اسے ایک اُجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی زمین کو جِلا اُٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اُٹھنا بھی اسی طرح ہوگا[19]۔

جو کوئی عزّت چاہتا ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزّت ساری کی ساری اللہ کی ہے[20]۔ اُس کے ہاں جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عملِ صالح اس کو اُوپر چڑھاتا ہے[21]۔

منہ سے پکار پکار کر بتا رہی ہیں کہ اُن پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔

۱۸ – اس فقرے میں آپ سے آپ یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ انھیں اِن کرتوتوں کی سزا دے گا۔ کسی حاکم کا کسی مجرم کے متعلق یہ کہنا کہ میں اس کی حرکتوں سے خوب واقف ہوں، صرف یہی معنیٰ نہیں دیتا کہ حاکم کو اس کی حرکتوں کا علم ہے، بلکہ اس میں یہ تنبیہ لازماً مضمر ہوتی ہے کہ میں اس کی خبر لے کر رہوں گا۔

۱۹ – یعنی یہ نادان لوگ آخرت کو بعید از امکان سمجھتے ہیں اور اسی لیے اپنی جگہ اس خیال میں مگن ہیں کہ دنیا میں یہ خواہ کچھ کرتے رہیں بہر حال وہ وقت کبھی آنا نہیں ہے جب انھیں جواب دہی کے لیے خدا کے حضور حاضر ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ محض ایک خیالِ خام ہے جس میں یہ مبتلا ہیں۔ قیامت کے روز تمام اگلے پچھلے مرے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر بالکل اُسی طرح یکایک جی اُٹھیں گے، جس طرح ایک بارش ہوتے ہی سُوکھی پڑی ہوئی زمین یکایک لہلہا اُٹھتی ہے اور مدتوں کی مری ہوئی جڑیں سرسبز و شاداب ہو کر زمین کی تہوں میں سے سر نکالنا شروع کر دیتی ہیں۔

۲۰ – یہ بات ملحوظ رہے کہ قریش کے سردار نبیؐ کے مقابلے میں جو کچھ بھی کر رہے تھے اپنی عزت اور اپنے وقار کی خاطر کر رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چل گئی تو ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی، ہمارا اثر و رسوخ مٹ جائے گا اور ہماری جو عزت سارے عرب میں بنی ہوئی ہے وہ خاک میں مل جائے گی۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے کفر و بغاوت کر کے جو عزت تم نے بنا رکھی ہے، یہ تو ایک جھوٹی عزت ہے جس کے لیے خاک ہی میں ملنا مقدر ہے۔ حقیقی عزت اور پائدار عزت جو دنیا سے لے کر عُقبیٰ تک کبھی ذلت آشنا نہیں ہو سکتی، صرف خدا کی بندگی میں ہی میسر آ سکتی ہے۔ اُس کے ہو جاؤ گے تو وہ تمھیں مل

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ
اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ
جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ

رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چال بازیاں کرتے ہیں[۲۲]، اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور اُن کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے۔

اللہ[۲۳] نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ[۲۴] سے، پھر تمھارے جوڑے بنا دیے (یعنی مرد اور عورت)۔کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔

جائے گی۔ اور اُس سے منہ موڑو گے تو ذلیل و خوار ہو کر رہو گے۔

۲۱ - یہ ہے عزت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ۔ اللہ کے ہاں جھوٹے اور خبیث اور مفسدانہ اقوال کو کبھی عُروج نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں تو صرف وہ قول عروج پاتا ہے جو سچا ہو، پاکیزہ ہو، حقیقت پر مبنی ہو، اور جس میں نیک نیتی کے ساتھ ایک صالح عقیدے اور ایک صحیح طرزِ فکر کی ترجمانی کی گئی ہو۔ پھر جو چیز ایک پاکیزہ کلمے کو عروج کی طرف لے جاتی ہے وہ قول کے مطابق عمل ہے۔ جہاں قول بڑا پاکیزہ ہو مگر عمل اس کے خلاف ہو وہاں قول کی پاکیزگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ محض زبان کے پھاگ اُڑانے سے کوئی کلمہ بلند نہیں ہوتا۔ اُسے عروج پر پہنچانے کے لیے عملِ صالح کا زور درکار ہوتا ہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید قولِ صالح اور عملِ صالح کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے صالح نہیں ہوسکتا جب تک اس کی پشت پر عقیدۂ صالحہ نہ ہو۔ اور کوئی عقیدۂ صالحہ ایسی حالت میں معتبر نہیں ہوسکتا جب تک کہ آدمی کا عمل اس کی تائید و تصدیق نہ کر رہا ہو۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کو معبود مانتا ہوں، مگر عملاً وہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے قول کی تکذیب کر دیتا ہے۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں شراب کو حرام مانتا ہوں، مگر عملاً وہ شراب پیتا ہے تو اس کا محض قول نہ خلق کی نگاہ میں مقبول ہوسکتا ہے نہ خدا کے ہاں اسے کوئی قُبولیت نصیب ہوسکتی ہے۔

۲۲ - یعنی باطل اور خبیث کلمے لے کر اُٹھتے ہیں، ان کو چالاکیوں سے، فریب کاریوں سے اور نظر فریب اِستدلالوں سے فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور اُن کے مقابلے میں کلمۂ حق کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی بُری سے بُری تدبیر استعمال کرنے سے بھی نہیں چُوکتے۔

۲۳ - یہاں سے پھر رُوئے سُخن عوام الناس کی طرف پھرتا ہے۔

۲۴ - یعنی انسان کی آفرینش پہلے براہِ راست مٹی سے کی گئی، پھر اس کی نسل نطفے سے چلائی گئی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖۗ هٰذَا عَذْبٌ
فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ

کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔[25] اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔[26] اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں۔[27] ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوش گوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔ مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو،[28] پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو،[29] اور اسی پانی میں تم

---

۲۵ - یعنی جو شخص بھی دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کے متعلق پہلے ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے دنیا میں کتنی عمر پانی ہے۔ کسی کی عمر دراز ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، اور چھوٹی ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے فیصلے کی بنا پر ہوتی ہے۔ بعض نادان لوگ اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ پہلے نوزائیدہ بچوں کی موتیں بکثرت واقع ہوتی تھیں اور اب علم طب کی ترقی نے ان اموات کو روک دیا ہے۔ اور پہلے لوگ کم عمر پاتے تھے، اب وسائلِ علاج بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عمریں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ دلیل قرآن مجید کے اس بیان کی تردید میں صرف اس وقت پیش کی جا سکتی تھی جب کہ کسی ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فلاں شخص کی عمر مثلاً دو سال لکھی تھی اور ہمارے طبی وسائل نے اُس میں ایک دن کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح کا کوئی علم اگر کسی کے پاس نہیں ہے تو وہ کسی معقول بنیاد پر قرآن کے اس ارشاد کا معارضہ نہیں کر سکتا۔ محض یہ بات کہ اعداد و شمار کی رُو سے اب بچوں کی شرحِ اموات گھٹ گئی ہے، یا پہلے کے مقابلے میں اب لوگ زیادہ عمر پا رہے ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ انسان اب اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہو گیا ہے۔ آخر اس میں کیا عقلی استبعاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے انسانوں کی عمریں مختلف طور پر مقرر فرمائی ہوں، اور یہ بھی اللہ عزّوجلّ ہی کا فیصلہ ہو کہ فلاں زمانے میں انسان کو فلاں امراض کے علاج کی قدرت عطا کی جائے گی اور فلاں دور میں انسان کو بقائے حیات کے فلاں ذرائع بخشے جائیں گے۔

۲۶ - یعنی اتنی بے شمار مخلوق کے بارے میں اتنا تفصیلی علم اور فرد فرد کے بارے میں اتنے مفصّل احکام اور فیصلے کرنا اللہ کے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

۲۷ - یعنی ایک وہ ذخیرہ جو سمندروں میں ہے۔ دوسرا وہ ذخیرہ جو دریاؤں، چشموں اور جھیلوں میں ہے۔

۲۸ - یعنی آبی جانوروں کا گوشت۔

فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ يُوْلِجُ الَّيْلَ
فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖ كُلٌّ
يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝۱۳ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا
يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝۱۴ ع

دیکھتے ہو کہ کشتیاں اُس کا سینہ چیرتی جارہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اُس کے شکر گزار بنو۔ وہ دن کے اندر رات کو اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے۔[۳۰] چاند اور سورج کو اُس نے مُسخّر کر رکھا ہے۔[۳۱] یہ سب کچھ ایک وقتِ مقرر تک چلے جارہا ہے۔ وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمھارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اُسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ ایک پرِکاہ[۳۲] کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انھیں پکارو تو وہ تمھاری دعائیں سُن نہیں سکتے اور سُن لیں تو ان کا تمھیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔[۳۳] اور قیامت کے روز وہ تمھارے شرک کا انکار کردیں گے۔[۳۴] حقیقتِ حال کی ایسی صحیح خبر تمھیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔[۳۵] ع

۲۹ – یعنی موتی، مُونگے، اور بعض دریاؤں سے ہیرے اور سونا۔

۳۰ – یعنی دن کی روشنی آہستہ آہستہ گھٹنی شروع ہوتی ہے اور رات کی تاریکی بڑھتے بڑھتے آخرِ کار پوری طرح چھا جاتی ہے۔ اسی طرح رات کے آخر میں پہلے اُفق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ روزِ روشن نکل آتا ہے۔

۳۱ – ایک ضابطے کا پابند بنا رکھا ہے۔

۳۲ – اصل میں لفظ قِطْمِیْر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ پتلی سی جھلی ہے جو کھجور کی گُٹھلی پر ہوتی ہے۔ لیکن اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مشرکین کے معبود کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اسی لیے ہم نے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا ہے۔

۳۳ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمھاری دعا کے جواب میں پکار کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمھاری دُعا قبول کی گئی یا

Maktaba Tul Ishaat.com

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ
یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ﴿۱۷﴾ وَ لَا
تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا

لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو[۳۶] اور اللہ تو غنی و حمید ہے[۳۷]۔ وہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر کوئی نئی خلقت تمھاری جگہ لے آئے، ایسا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی دُشوار نہیں[۳۸]۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا[۳۹]۔ اور اگر کوئی لدا ہُوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو

نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھاری درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اگر اپنی درخواست کسی ایسے شخص کے پاس بھیج دیتا ہے جو حاکم نہیں ہے تو اس کی درخواست رائگاں جاتی ہے، کیونکہ وہ جس کے پاس بھیجی گئی ہے اس کے ہاتھ میں سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے، نہ رَدّ کرنے کا اختیار اور نہ قبول کرنے کا اختیار۔ البتہ اگر وہی درخواست اُس ہستی کے پاس بھیجی جائے جو واقعی حاکم ہو، تو اس پر لازماً کوئی نہ کوئی کارروائی ہوگی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ قبول کرنے کی شکل میں ہو یا رَدّ کرنے کی شکل میں۔

۳۴- یعنی وہ صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ہم خدا کے شریک ہیں، تم ہماری عبادت کیا کرو۔ بلکہ ہمیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ یہ ہم کو اللہ رب العالمین کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور ہم سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی کوئی دعا ہمیں نہیں پہنچی اور ان کی کسی نذر و نیاز کی ہم تک رسائی نہیں ہوئی۔

۳۵- خبردار سے مراد اللہ تعالیٰ خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرا کوئی شخص تو زیادہ سے زیادہ عقلی استدلال سے شرک کی تردید اور مشرکین کے معبودوں کی بے اختیاری بیان کرے گا۔ مگر ہم حقیقتِ حال سے براہِ راست باخبر ہیں۔ ہم علم کی بنا پر تمھیں بتا رہے ہیں کہ لوگوں نے جن جن کو بھی ہماری خدائی میں بااختیار ٹھیرا رکھا ہے وہ سب بے اختیار ہیں۔ ان کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے جس سے وہ کسی کا کوئی کام بنا سکیں یا بگاڑ سکیں۔ اور ہم براہِ راست یہ جانتے ہیں کہ قیامت کے روز مشرکین کے یہ معبود خود ان کے شرک کی تردید کریں گے۔

۳۶- یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمھارا محتاج ہے، تم اسے خدا نہ مانو گے تو اس کی خدائی نہ چلے گی، اور تم اس کی بندگی و عبادت نہ کرو گے تو اس کا کوئی نقصان ہو جائے گا۔ نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ تمھاری زندگی ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی اگر وہ تمھیں زندہ نہ رکھے اور وہ اسباب تمھارے لیے فراہم نہ کرے جن کی بدولت تم دنیا میں زندہ رہتے ہو اور کام کر سکتے ہو۔ لہٰذا تمھیں اُس کی طاعت و عبادت اختیار کرنے کی جو تاکید کی جاتی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو اس کی احتیاج ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ اسی پر تمھاری اپنی دنیا اور آخرت کی فلاح کا انحصار ہے۔ ایسا نہ کرو گے تو اپنا ہی سب کچھ بگاڑ لو گے، خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

لَا يُحۡمَلۡ مِنۡهُ شَىۡءٌ وَّلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى ؕ اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ

اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصّہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا، چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔[۴۰] (اے نبیؐ!) تم صرف انھی لوگوں کو متنبّہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے

۳۷- ''غنی'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مُستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اور ''حمید'' سے مراد یہ ہے کہ وہ آپ سے آپ محمود ہے، کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر حمد (شکر اور تعریف) کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے۔ ان دونوں صفات کو ایک ساتھ اس لیے لایا گیا ہے کہ محض غنی تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی دولت مندی سے کسی کو نفع نہ پہنچائے۔ اس صورت میں وہ غنی تو ہوگا مگر حمید نہ ہوگا۔ حمید وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ وہ کسی سے خود تو کوئی فائدہ نہ اُٹھائے مگر اپنی دولت کے خزانوں سے دوسروں کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ان دونوں صفات میں کامل ہے، اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ محض غنی نہیں ہے، بلکہ ایسا غنی ہے جسے ہر تعریف اور شکر کا استحقاق پہنچتا ہے، کیوں کہ وہ تمھاری اور تمام موجوداتِ عالَم کی حاجتیں پوری کر رہا ہے۔

۳۸- یعنی تم کچھ اپنے بل بُوتے پر اُس کی زمین میں نہیں دندنا رہے ہو۔ اُس کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ تمھیں یہاں سے چلتا کرے اور کسی اور قوم کو تمھاری جگہ اٹھا کھڑا کرے۔ لہٰذا اپنی اوقات پہچانو اور وہ رَوِش اختیار نہ کرو جس سے آخرِ کار قوموں کی شامت آیا کرتی ہے۔ خدا کی طرف سے جب کسی کی شامت آتی ہے تو ساری کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے اور اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے روک سکے۔

۳۹- ''بوجھ'' سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

۴۰- اُوپر کے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اس کے اپنے ہی گناہ کا ذمہ دار ٹھیرائے گا۔ اور اس فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمھارا بارِ گناہ اپنے اُوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسا دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا اور کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَ
اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ۙ وَلَا الظُّلُمٰتُ
وَلَا النُّوْرُ ۝ۙ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۝ۚ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا
الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ

ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں[۴۱]۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دُھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مُردے مُساوی ہیں[۴۲]۔ اللہ جسے چاہتا ہے سُنواتا ہے، مگر (اے نبیؐ!) تم اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے

---

۴۱ – بالفاظِ دیگر ہٹ دھرم اور ہیکڑ لوگوں پر تمھاری تنبیہات کارگر نہیں ہوسکتیں۔ تمھارے سمجھانے سے تو وہی لوگ راہِ راست پر آسکتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے اور جو اپنے مالکِ حقیقی کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہیں۔

۴۲ – اِن تمثیلات میں مومن اور کافر کے حال اور مستقبل کا فرق بتایا گیا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور کچھ نہیں دیکھتا کہ کائنات کا سارا نظام اور خود اس کا اپنا وجود کس صداقت کی طرف اشارے کر رہا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ اس کے باہر اور اندر کی ہر چیز خدا کی توحید اور اس کے حضور انسان کی جواب دہی پر گواہی دے رہی ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو جاہلانہ اَوہام اور مفروضات و قیاسات کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور پیغمبر کی روشن کی ہوئی شمع کے قریب بھی پھٹکنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور پیغمبر کی پھیلائی ہوئی روشنی سامنے آتے ہی اس پر یہ بات بالکل عیاں ہوگئی ہے کہ مشرکین اور کفار اور دہریے جن راہوں پر چل رہے ہیں وہ سب تباہی کی طرف جاتی ہیں اور فلاح کی راہ صرف وہ ہے جو خدا کے رسولؐ نے دکھائی ہے۔ اب آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ دنیا میں ان دونوں کا رویّہ یکساں ہو اور دونوں ایک ساتھ ایک ہی راہ پر چل سکیں؟ اور آخر یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ دونوں کا انجام یکساں ہو اور دونوں ہی مر کر فنا ہو جائیں، نہ ایک کو بدراہی کی سزا ملے، نہ دوسرا راست رَوی کا کوئی انعام پائے؟ ''ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی نہیں ہے'' کا اشارہ اِسی انجام کی طرف ہے کہ ایک اللہ کے سایۂ رحمت میں جگہ پانے والا ہے اور دوسرا جہنّم کی تپش میں جُھلسنے والا ہے۔ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ آخرِکار دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوں گے۔ آخر میں مومن کو زندہ سے اور ہٹ دھرم کافروں کو مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی مومن وہ ہے جس کے اندر احساس و ادراک اور فہم و شعور موجود ہے اور اس کا ضمیر اُسے بھلے اور بُرے کی تمیز سے ہر وقت آگاہ کر رہا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص کُفر کے تعصب میں پوری طرح غرق

مَّنۡ فِي الۡقُبُوۡرِ ﴿۲۲﴾ اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا نَذِيۡرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ
بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ؕ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنۡ
يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ
بِالۡبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِيۡنَ

جو قبروں میں مدفون ہیں[۴۳]۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو[۴۴]۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو[۴۵]۔ اب اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ اُن کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل[۴۶] اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب[۴۷] لے کر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے

ہو چکا ہے اس کا حال اُس اندھے سے بھی بدتر ہے جو تاریکی میں بھٹک رہا ہو، اس کی حالت تو اُس مُردے کی سی ہے جس میں کوئی حس باقی نہ رہی ہو۔

۴۳ — یعنی اللہ کی مشیّت کی تو بات ہی دوسری ہے، وہ چاہے تو پتھروں کو سماعت بخش دے، لیکن رسول کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ جن لوگوں کے سینے ضمیر کے مدفن بن چکے ہوں ان کے دلوں میں اپنی بات اُتار سکے اور جو بات سننا ہی نہ چاہتے ہوں اُن کے بہرے کانوں کو صدائے حق سنا سکے۔ وہ تو انھی لوگوں کو سنا سکتا ہے جو معقول بات پر کان دھرنے کے لیے تیار ہوں۔

۴۴ — یعنی تمھارا کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گمراہیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی خدمت تمھارے سپرد نہیں کی گئی ہے۔

۴۵ — یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی اُمت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ سورۂ رعد میں فرمایا: وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ۔ (آیت ۷) سورۂ حجر میں فرمایا: وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِيۡ شِيَعِ الۡاَوَّلِيۡنَ۔ (آیت ۱۰) سورۂ نحل میں فرمایا: وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِيۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا (آیت ۳۶) سورۂ شعراء میں فرمایا: وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ۔ (آیت ۲۰۸) مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیا بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی

Maktaba Tul Ishaat.com

كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ
جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ
النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ

ع ۳ ۱۴ ۱۵

نہ مانا، ان کو میں نے پکڑ لیا، اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ع

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سُرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اِسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔[۴۸]

کے نُقوشِ قدم جب تک محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔

۴۶ – یعنی ایسے دلائل جو اس بات کی صاف شہادت دیتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

۴۷ – صحیفوں اور کتاب میں غالباً یہ فرق ہے کہ صحیفے زیادہ تر نصائح اور اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے، اور کتاب ایک پوری شریعت لے کر آتی تھی۔

۴۸ – اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی یک رنگی و یکسانی نہیں ہے۔ ہر طرف تنوُّع ہی تنوُّع ہے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے طرح طرح کے درخت نکل رہے ہیں، اور ایک درخت کے دو پھل تک اپنے رنگ، جسامت اور مزے میں یکساں نہیں ہیں۔ ایک ہی پہاڑ کو دیکھو تو اس میں کئی کئی رنگ تمھیں نظر آئیں گے اور اس کے مختلف حصوں کی مادّی ترکیب میں بڑا فرق پایا جائے گا۔ انسانوں اور جانوروں میں ایک ماں باپ کے دو بچّے تک یکساں نہ ملیں گے۔ اِس کائنات میں اگر کوئی مزاجوں اور طبیعتوں اور ذہنیتوں کی یکسانی ڈھونڈے اور وہ اختلافات دیکھ کر گھبرا اُٹھے جن کی طرف اوپر (آیات نمبر ۱۹ تا ۲۲ میں) اشارہ کیا گیا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کی کوتاہی ہے۔ یہی تنوُّع اور اختلاف تو پتا دے رہا ہے کہ اس کائنات کو کسی زبردست حکیم نے بے شمار حکمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کا بنانے والا کوئی بے نظیر خلّاق اور بے مثل صنّاع ہے جو ہر چیز کا کوئی ایک ہی نمونہ لے کر نہیں بیٹھ گیا ہے، بلکہ اس کے پاس ہر شے کے لیے نئے سے نئے ڈیزائن اور بے حد و حساب ڈیزائن ہیں۔ پھر خاص طور پر انسانی طبائع اور اَذہان کے اختلاف پر کوئی شخص غور کرے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، بلکہ درحقیقت حکمتِ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اگر تمام انسان پیدائشی طور پر اپنی اُفتادِ طبع اور اپنی خواہشات، جذبات، میلانات اور طرزِ فکر کے لحاظ

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔[49] بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔[50]

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انھیں

سے یکساں بنا دیے جاتے اور کسی اختلاف کی کوئی گنجایش نہ رکھی جاتی تو دنیا میں انسان کی قسم کی ایک نئی مخلوق پیدا کرنا ہی سرے سے لا حاصل ہو جاتا۔ خالق نے جب اس زمین پر ایک ذمہ دار مخلوق اور اختیارات کی حامل مخلوق وجود میں لانے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے کی نوعیت کا لازمی تقاضا یہی تھا کہ اس کی ساخت میں ہر قسم کے اختلافات کی گنجایش رکھی جاتی۔ یہ چیز اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ انسان کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان حکیمانہ منصوبے کا نتیجہ ہے اور ظاہر ہے کہ حکیمانہ منصوبہ جہاں بھی پایا جائے گا وہاں لازماً اس کے پیچھے ایک حکیم ہستی کارفرما ہوگی۔ حکیم کے بغیر حکمت کا وجود صرف ایک احمق ہی فرض کر سکتا ہے۔

۴۹ — یعنی جو شخص اللہ کی صفات سے جتنا زیادہ ناواقف ہوگا وہ اس سے اتنا ہی بے خوف ہوگا اور اس کے برعکس جس شخص کو اللہ کی قدرت، اس کے علم، اس کی حکمت، اس کی قہاری و جباری، اور اس کی دوسری صفات کی جتنی معرفت حاصل ہوگی، اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا۔ پس درحقیقت اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی عُلوم نہیں ہیں، بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے، قطع نظر اس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علّامۂ دہر بھی ہو تو اِس علم کے لحاظ سے جاہلِ محض ہے۔ اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خشیّت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس آیت میں لفظ ''عُلَما'' سے وہ اِصطلاحی علما بھی مراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اس آیت کے مِصداق صرف اُسی صورت میں ہوں گے جب کہ ان کے اندر خدا ترسی موجود ہو۔ یہی بات حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمائی ہے کہ لیس العلم عن کثرة الحدیث ولکن العلم عن کثرة الخشیة۔ ''علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے۔'' اور یہی بات حضرت حَسَن بصریؒ نے فرمائی ہے کہ العالم من خشی الرحمٰن بالغیب و رغب فیما رغب اللّٰہ فیہ وزھد فیما سخط اللّٰہ فیہ۔ ''عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے، جو کچھ اللہ کو پسند ہے اس کی طرف وہ راغب ہو، اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اس سے وہ کوئی دلچسپی نہ رکھے۔''

۵۰ — یعنی وہ زبردست تو ایسا ہے کہ نافرمانوں کو جب چاہے پکڑ لے، کسی میں یارا نہیں کہ اس کی پکڑ سے بچ نکلے، مگر یہ اس کی شانِ عَفو و درگزر ہے جس کی بنا پر ظالموں کو مُہلت دیے جا رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ
اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾ وَ الَّذِيْٓ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ

رزق دیا ہے اس میں سے کُھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے مُتوقّع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔ (اس تجارت میں انھوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ اُن کے اجر پورے کے پورے اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے[۵۲]۔ (اَے نبیؐ!) جو کتاب ہم نے تمھاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے اُن کتابوں کی جو اِس سے پہلے آئی تھیں[۵۳]۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے[۵۴]۔ پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنھیں ہم نے (اِس

۵۱ - اہلِ ایمان کے اس عمل کو تجارت سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ آدمی تجارت میں اپنا سرمایہ اور محنت و قابلیت اس امید پر صَرف کرتا ہے کہ نہ صرف اصل واپس ملے گا، اور نہ صرف وقت اور محنت کی اُجرت ملے گی، بلکہ کچھ مزید مُنافعہ بھی حاصل ہوگا۔ اسی طرح ایک مومن بھی خدا کی فرماں برداری میں، اس کی بندگی و عبادت میں، اور اس کے دین کی خاطر جِدّ و جُہد میں، اپنا مال، اپنے اوقات، اپنی محنتیں اور قابلیتیں اس امید پر کھپا دیتا ہے کہ نہ صرف ان سب کا پورا پورا اجر ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے مزید بہت کچھ عنایت فرمائے گا۔ مگر دونوں تجارتوں میں فرق اور بہت بڑا فرق اس بنا پر ہے کہ دنیوی تجارت میں محض نفع ہی کی امید نہیں ہوتی، گھاٹے اور دِیوالے تک کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو تجارت ایک مخلص بندہ اپنے خدا کے ساتھ کرتا ہے، اس میں کسی خسارے کا اندیشہ نہیں۔

۵۲ - یعنی مخلص اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اُس تنگ دل آقا کا سا نہیں ہے جو بات بات پر گرفت کرتا ہو اور ایک ذرا سی خطا پر اپنے ملازم کی ساری خدمتوں اور وفاداریوں پر پانی پھیر دیتا ہو۔ وہ فیّاض اور کریم آقا ہے۔ جو بندہ اس کا وفادار ہو، اس کی خطاؤں پر چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ بھی خدمت اس سے بن آئی ہو اس کی قدر فرماتا ہے۔

۵۳ - مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی نرالی بات نہیں پیش کر رہی ہے جو پچھلے انبیاؑ کی لائی ہوئی تعلیمات کے خلاف ہو، بلکہ اسی ازلی و ابدی حق کو پیش کر رہی ہے جو ہمیشہ سے تمام انبیاؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

۵۴ - اللہ کی ان صفات کو یہاں بیان کرنے کا مقصود اِس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ بندوں کے لیے خیر کس چیز میں

اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ
الْكَبِيْرُ ؕ ۝۳۲ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔[55] اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اِذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔[56] ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے۔[57] وہاں انھیں سونے کے کنگنوں اور

ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کیا اصول موزوں ہیں، اور کون سے ضابطے ٹھیک ٹھیک ان کی مَصلحت کے مطابق ہیں، اِن اُمور کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، کیونکہ بندوں کی فطرت اور اس کے تقاضوں سے وہی باخبر ہے، اور ان کے حقیقی مصالح پر وہی نگاہ رکھتا ہے۔ بندے خود اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتے جتنا ان کا خالق ان کو جانتا ہے۔ اس لیے حق وہی ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو اس نے وحی کے ذریعے سے بتا دیا ہے۔

۵۵ - مراد ہیں مسلمان، جو پوری نوعِ انسانی میں سے چھانٹ کر نکالے گئے ہیں، تاکہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُسے لے کر اٹھیں۔ اگرچہ کتاب پیش تو کی گئی ہے سارے انسانوں کے سامنے، مگر جنھوں نے آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیا وہی اس شرف کے لیے منتخب کر لیے گئے کہ قرآن جیسی کتابِ عظیم کے وارث اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسولِ عظیم کی تعلیم و ہدایت کے امین بنیں۔

۵۶ - یعنی یہ مسلمان سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، بلکہ یہ تین طبقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں:

(۱) اپنے نفس پر ظلم کرنے والے: یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان داری کے ساتھ اللہ کا رسول تو مانتے ہیں، مگر عملاً کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔ مومن ہیں مگر گناہ گار ہیں۔ مجرم ہیں مگر باغی نہیں ہیں۔ ضعیف الایمان ہیں مگر منافق اور دل و دماغ سے کافر نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ہونے کے باوجود وارثینِ کتاب میں داخل اور خدا کے چُنے ہوئے بندوں میں شامل کیا گیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ باغیوں اور منافقوں اور قلب و ذہن کے کافروں پر ان اوصاف کا اِطلاق نہیں ہو سکتا۔ تینوں دَرجات میں سے اس درجے کے اہلِ ایمان کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے امت میں کثرت انھی کی ہے۔

(۲) بیچ کی راس: یہ وہ لوگ ہیں جو اس وراثت کا حق کم و بیش ادا تو کرتے ہیں مگر پوری طرح نہیں کرتے۔ فرماں بردار بھی ہیں اور خطاکار بھی۔ اپنے نفس کو بالکل بے لگام تو انھوں نے نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے خدا کا مطیع بنانے کی اپنی حد تک کوشش کرتے ہیں، لیکن کبھی یہ اس کی باگیں ڈھیلی بھی چھوڑ دیتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی اچھے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور بُرے، دونوں طرح کے اعمال کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ یہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم اور تیسرے گروہ سے زیادہ ہیں اس لیے ان کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

(۳) نیکیوں میں سبقت کرنے والے: یہ وارثینِ کتاب میں صفِ اوّل کے لوگ ہیں۔ یہی دراصل اِس وراثت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ اتباعِ کتاب وسنت میں بھی پیش پیش ہیں، خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں بھی پیش پیش، دینِ حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں بھی پیش پیش، اور بھلائی کے ہر کام میں پیش پیش۔ یہ دانستہ مَعصِیَت کرنے والے نہیں ہیں، اور نادانستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر مُتنبِّہ ہوتے ہی ان کی پیشانیاں شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعداد اُمت میں پہلے دونوں گروہوں سے کم ہے، اس لیے ان کا آخر میں ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وراثت کا حق ادا کرنے کے معاملے میں ان کو اوّلیّت کا شرف حاصل ہے۔

''یہی بہت بڑا فضل ہے۔'' اس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکیوں میں سبقت کرنا ہی بڑا فضل ہے اور جو لوگ ایسے ہیں وہ اُمتِ مسلمہ میں سب سے افضل ہیں۔ اور اس فقرے کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کتاب اللہ کا وارث ہونا اور اس وراثت کے لیے چُن لیا جانا بڑا فضل ہے، اور خدا کے تمام بندوں میں وہ بندے سب سے افضل ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اس انتخاب میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

۵۷ – مُفسّرین میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس فقرے کا تعلق قریب ترین دونوں فقروں سے ہے، یعنی نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہی بڑی فضیلت رکھتے ہیں اور وہی اِن جنتوں میں داخل ہوں گے۔ رہے پہلے دو گروہ، تو ان کے بارے میں سکوت فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کے معاملے میں فکرمند ہوں اور اپنی موجودہ حالت سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو علامہ زَمَخشَری نے بڑے زور کے ساتھ بیان کیا ہے اور امام رازیؒ نے اس کی تائید کی ہے۔

لیکن مفسرین کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت کے یہ تینوں گروہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، خواہ مُحاسبے کے بغیر یا مُحاسبے کے بعد، خواہ ہر مواخذے سے محفوظ رہ کر یا کوئی سزا پانے کے بعد۔ اسی تفسیر کی تائید قرآن کا سیاق وسباق کرتا ہے، کیونکہ آگے چل کر وارثینِ کتاب کے بالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس کتاب کو مان لیا ہے ان کے لیے جنت ہے اور جنھوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کیا ہے ان کے لیے جہنّم۔ پھر اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابوالدرداءؓ نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ، ابنِ جَریرؒ، ابنِ ابی حاتمؒ، طَبرانیؒ، بَیہقیؒ اور بعض دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں:

فاما الذین سبقوا فاولئك الذین یدخلون الجنة بغیر حساب، واما الذین اقتصدوا فاولئك الذین یُحاسَبون حسابًا یسیرا، واما الذین ظلموا انفسهم فاولئك یُحبَسُون طول	جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں، وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے۔ اور جو بیچ کی راس رہے ہیں، ان سے مُحاسبہ ہوگا مگر ہلکا مُحاسبہ۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، تو وہ محشر کے پورے طویل عرصے میں روک رکھے جائیں گے، پھر

مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ﴿٣٤﴾

موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا، اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا،[58] یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے،[59]

المحشر ثم هم الذين يتلقاهم الله برحمته فهم الذين يقولون الحمد لله الذى اذهب عنا الحزن۔

انھی کو اللہ اپنی رحمت میں لے لے گا، اور یہی لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔

اس حدیث میں حضورؐ نے اس آیت کی پوری تفسیر خود بیان فرما دی ہے اور اہلِ ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بتا دیا ہے۔ بیچ کی راس والوں سے ''ہلکا محاسبہ'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو تو ان کے کفر کے علاوہ ان کے ہر ہر جرم اور گناہ کی جُداگانہ سزا بھی دی جائے گی، مگر اس کے برعکس اہلِ ایمان میں جو لوگ اچھے اور بُرے دونوں طرح کے اعمال لے کر پہنچیں گے ان کی نیکیوں اور ان کے گناہوں کا مجموعی محاسبہ ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہر نیکی کی الگ جزا اور ہر قصور کی الگ سزا دی جائے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اہلِ ایمان میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہوگا وہ محشر کے پورے عرصے میں روک رکھے جائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنّم میں نہیں ڈالے جائیں گے بلکہ ان کو ''تا برخاستِ عدالت'' کی سزا دی جائے گی، یعنی روزِ حشر کی پوری طویل مدّت (جو نہ معلوم کتنی صدیوں کے برابر طویل ہوگی) اُن پر اپنی ساری سختیوں کے ساتھ گزر جائے گی، یہاں تک کہ آخرکار اللہ ان پر رحم فرمائے گا اور خاتمۂ عدالت کے وقت حکم دے گا کہ اچھا، انھیں بھی جنت میں داخل کر دو۔ اِسی مضمون کے متعدّد اقوال محدثین نے بہت سے صحابہ، مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابوسعید خُدری اور حضرت براء ابنِ عازب رضی اللہ عنہم سے نقل کیے ہیں، اور ظاہر ہے کہ صحابہ ایسے معاملات میں کوئی بات اس وقت تک نہیں کہہ سکتے تھے جب تک انھوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نہ سُنا ہو۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے ''اپنے نفس پر ظلم کیا ہے'' ان کے لیے صرف ''تا برخاستِ عدالت'' ہی کی سزا ہے اور اُن میں سے کوئی جہنم میں جائے گا ہی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں متعدّد ایسے جرائم کا ذکر ہے جن کے مرتکب کو ایمان بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً جو مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے اس کے لیے جہنم کی سزا کا اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرما دیا ہے۔ اسی طرح قانونِ وراثت کی خداوندی حُدود کو توڑنے والوں کے لیے بھی قرآنِ مجید میں جہنم کی وعید فرمائی گئی ہے۔ سُود کی حرمت کا حکم آ جانے کے بعد پھر سود خواری کرنے والوں کے لیے بھی صاف صاف اعلان فرمایا گیا ہے کہ وہ اصحاب النار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور کبائر کے مرتکبین کے لیے بھی احادیث میں تصریح ہے کہ وہ جہنّم میں جائیں گے۔

۵۸ — ہر قسم کا غم۔ دنیا میں جن فکروں اور پریشانیوں میں ہم مبتلا تھے ان سے بھی نجات ملی، عُقبیٰ میں اپنے انجام کی جو

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا
یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰی
عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ
كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ۚ وَ هُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ
تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۳۷﴾ ع ۲

جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھیرا دیا،[۶۰] اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقّت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے۔[۶۱]

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے[۶۲] اُن کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔ نہ اُن کا قصّہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ اُن کے لیے جہنّم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اِس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو۔ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ”اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں، اُن اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے۔“ (انھیں جواب دیا جائے گا:) ”کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟[۶۳] اور تمھارے پاس مُتنبّہ کرنے والا بھی آ چکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔“ ع

فکر لاحق تھی وہ بھی ختم ہوئی، اور اب آگے چین ہی چین ہے، کسی رنج و اَلَم کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔

۵۹ – یعنی ہمارے قصور اُس نے معاف فرما دیے اور عمل کی جو تھوڑی سی پونجی ہم لائے تھے اس کی ایسی قدر فرمائی کہ اپنی جنت اس کے بدلے میں ہمیں عطا فرما دی۔

۶۰ – یعنی دنیا ہماری سفرِ حیات کی ایک منزل تھی جس سے ہم گزر آئے ہیں، اور میدانِ حشر بھی اس سفر کا ایک مرحلہ تھا جس سے ہم گزر لیے ہیں۔ اب ہم اُس جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے نکل کر پھر کہیں جانا نہیں ہے۔

۶۱ – بالفاظِ دیگر ہماری تمام محنتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب یہاں ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑتا جس کے انجام دینے میں ہم کو مشقّت پیش آتی ہو اور جس سے فارغ ہو کر ہم تھک جاتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۳۸ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے، وہ تو سینوں کے چھُپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے[۶۴]۔ اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اُسی پر ہے[۶۵]، اور کافروں کو اُن کا کفر اِس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا

۶۲ – یعنی اس کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔

۶۳ – اس سے مراد ہر وہ عمر ہے جس میں آدمی اس قابل ہو سکتا ہو کہ اگر وہ نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنا چاہے تو کر سکے، اور گمراہی چھوڑ کر ہدایت کی طرف رُجوع کرنا چاہے تو کر سکے۔ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے اگر کوئی شخص مر چکا ہو تو اس آیت کی رُو سے اُس پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ جو اس عمر کو پہنچ چکا ہو وہ اپنے عمل کے لیے لازماً جواب دِہ قرار پائے گا، اور پھر اس عمر کے شروع ہو جانے کے بعد جتنی مدت بھی وہ زندہ رہے اور سنبھل کر راہِ راست پر آنے کے لیے جتنے مواقع بھی اسے ملتے چلے جائیں اتنی ہی اس کی ذمہ داری شدید تر ہوتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ جو شخص بڑھاپے کو پہنچ کر بھی سیدھا نہ ہو اس کے لیے کسی عذر کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔ یہی بات ہے جو ایک حدیث میں حضرت ابو ہُریرہؓ اور حضرت سَہلؓ بن سَعد ساعِدی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی ہے کہ جو شخص کم عمر پائے اس کے لیے تو عذر کا موقع ہے، مگر ۶۰ سال اور اس سے اوپر عمر پانے والے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ (بخاری، احمد، نَسائی، ابنِ جَرِیر اور ابنِ ابی حاتم وغیرہ)

۶۴ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس نے پچھلی نسلوں اور قوموں کے گزر جانے کے بعد تم کو اُن کی جگہ اپنی زمین میں بسایا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے تمھیں زمین میں تَصَرُّف کے جو اختیارات دیے ہیں وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ تم ان چیزوں کے مالک ہو، بلکہ اس حیثیت سے ہیں کہ تم اصل مالک کے خلیفہ ہو۔

۶۵ – اگر پہلے فقرے کا یہ مطلب لیا جائے کہ تم کو پچھلی قوموں کا جانشین بنایا ہے تو اس فقرے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس نے گزشتہ قوموں کے انجام سے کوئی سبق نہ لیا اور وہی کفر کا رویہ اختیار کیا جس کی بدولت وہ قومیں تباہ ہو چکی ہیں، وہ اپنی اِس حماقت کا نتیجہ بد دیکھ کر رہے گا۔ اور اگر اس فقرے کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے زمین میں اختیارات عطا کیے ہیں تو اس فقرے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو اپنی حیثیتِ خلافت کو بھول کر خود مختار بن بیٹھا یا جس نے اصل مالک کو چھوڑ کر کسی اور کی بندگی اختیار کر لی وہ اپنی اِس باغیانہ رَوِش کا بُرا انجام دیکھ لے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٤٠﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَ

غضب اُن پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں۔

(اے نبیؐ!) ان سے کہو: "کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے اُن شریکوں[66] کو جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ، انھوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے؟" (اگر یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پُوچھو:) کیا ہم نے انھیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف سَنَد رکھتے ہوں؟[67] نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیے جارہے ہیں۔[68] حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے، اور

۶۶ - "اپنے شریک" کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا گیا ہے کہ درحقیقت وہ خدا کے شریک تو ہیں نہیں، مشرکین نے ان کو اپنے طور پر اُس کا شریک بنا رکھا ہے۔

۶۷ - یعنی کیا ہمارا لکھا ہوا کوئی پروانہ اِن کے پاس ایسا ہے جس میں ہم نے یہ تحریر کیا ہو کہ فلاں فلاں اشخاص کو ہم نے بیماروں کو تندرست کرنے، یا بے روزگاروں کو روزگار دلوانے، یا حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے اختیارات دیے ہیں، یا فلاں فلاں ہستیوں کو ہم نے اپنی زمین کے فلاں حصوں کا مختار کار بنا دیا ہے اور ان علاقوں کے لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا اب اُن کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ہمارے بندوں کو اب انھی سے دعائیں مانگنی چاہییں اور انھی کے حضور نذریں اور نیازیں چڑھانی چاہییں، اور جو نعمتیں بھی ملیں اُن پر انھی "چھوٹے خداؤں" کا شکر بجا لانا چاہیے۔ ایسی کوئی سند اگر تمھارے پاس ہے تو لاؤ اسے پیش کرو۔ اور اگر نہیں ہے تو خود ہی سوچو کہ یہ مشرکانہ عقائد اور اعمال آخر تم نے کس بنیاد پر ایجاد کر لیے ہیں۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ زمین اور آسمان میں کہیں تمھارے ان بناوٹی معبودوں کے شریکِ خدا ہونے کی کوئی علامت پائی جاتی ہے؟ تم اس کے جواب میں کسی علامت کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے اپنی کسی کتاب میں یہ فرمایا ہے، یا تمھارے پاس یا ان بناوٹی معبودوں کے پاس خدا کا دیا ہوا

لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۝ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ

اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انھیں تھامنے والا نہیں ہے[۶۹]۔ بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے[۷۰]۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آ گیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے[۷۱]۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے پاس آ گیا تو اس کی آمد نے اِن کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ اِستکبار کرنے لگے اور بُری بُری چالیں چلنے لگے حالانکہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ

کوئی پروانہ ایسا موجود ہے جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ خدا نے خود انھیں وہ اختیارات عطا فرمائے ہیں جو تم ان کی طرف منسوب کر رہے ہو؟ تم وہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اب آخر وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر تم اپنے یہ عقیدے بنائے بیٹھے ہو؟ کیا تم خدائی کے مالک ہو کہ خدا کے اختیارات جس جس کو چاہو بانٹ دو؟

۶۸ – یعنی یہ پیشوا اور پیر، یہ پنڈت اور پروہت، یہ کاہن اور واعظ، یہ مُجاور اور ان کے ایجنٹ محض اپنی دُکان چمکانے کے لیے عوام کو اُلو بنا رہے ہیں اور طرح طرح کے قصے گھڑ گھڑ کر لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلا رہے ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر فلاں فلاں ہستیوں کے دامن تھام لو گے تو دنیا میں تمھارے سارے کام بن جائیں گے اور آخرت میں تم چاہے کتنے ہی گناہ سمیٹ کر لے جاؤ، وہ اللہ سے تمھیں بخشوا لیں گے۔

۶۹ – یعنی یہ اتھاہ کائنات اللہ تعالیٰ کے قائم رکھنے سے قائم ہے۔ کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی اس کو سنبھالے ہوئے نہیں ہے۔ کائنات کو سنبھالنا تو درکنار، یہ بے بس بندے تو اپنے وجود کو سنبھالنے پر بھی قادر نہیں۔ ہر ایک اپنی پیدائش اور اپنے بقا کے لیے ہر آن اللہ جلّ شانہٗ کا محتاج ہے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ خدائی کی صفات اور اختیارات میں اس کا کوئی حصہ ہے، خالص حماقت اور فریب خوردگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا
اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ۝ وَلَوْ
يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ

اِس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی اِن کے ساتھ بھی برتا جائے؟[۷۲] یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سُنّت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔ کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِنھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر کہیں وہ لوگوں کو اُن کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی مُتنفِّس کو جیتا نہ چھوڑتا۔

۷۰ – یعنی یہ سراسر اللہ کا حلم اور اس کی چشم پوشی ہے کہ اتنی بڑی گستاخیاں اس کی جناب میں کی جا رہی ہیں اور پھر بھی وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔

۷۱ – یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے لوگ عُموماً اور قُریش کے لوگ خُصوصاً یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ اُن کے اس قول کا ذکر اس سے پہلے سورۂ انعام (آیات ۱۵۶-۱۵۷) میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ صافات (۱۶۷ تا ۱۶۹) میں بھی آ رہا ہے۔

۷۲ – یعنی اللہ کا یہ قانون اِن پر بھی جاری ہو جائے کہ جو قوم اپنے نبی کو جھٹلاتی ہے وہ تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے۔

وَ لٰكِنۡ يُّؤَخِّرُهُمۡ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيۡرًا ؏ ۴۵

ع

مگر وہ انھیں ایک مقرر وقت تک کے لیے مُہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پُورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔ ع

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

یٰسٓ

(۳۶)

یٰسٓ

نام

آغاز ہی کے دو حرفوں کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

انداز بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول یا تو مکہ کے دورِ متوسط کا آخری زمانہ ہے، یا پھر یہ زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دور کی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع و مضمون

کلام کا مدعا کفارِ قریش کو نبوتِ محمدیؐ پر ایمان نہ لانے اور ظلم و استہزا سے اس کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈرانا ہے۔ اس میں انذار کا پہلو غالب اور نمایاں ہے مگر بار بار انذار کے ساتھ استدلال سے تفہیم بھی کی گئی ہے۔

استدلال تین امور پر کیا گیا ہے:

توحید پر آثارِ کائنات اور عقلِ عام سے،

آخرت پر آثارِ کائنات، عقلِ عام اور خود انسان کے اپنے وجود سے،

اور رسالتِ محمدیؐ کی صداقت پر اس بات سے کہ آپؐ تبلیغِ رسالت میں یہ ساری مشقت محض بے غرضانہ برداشت کر رہے تھے، اور اس امر سے کہ جن باتوں کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ سراسر معقول تھیں اور انھیں قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا بھلا تھا۔

اس استدلال کی قوت پر زجر و توبیخ اور ملامت و تنبیہ کے مضامین نہایت زوردار طریقے سے بار بار ارشاد ہوئے ہیں، تاکہ دلوں کے قفل ٹوٹیں اور جن کے اندر قبولِ حق کی تھوڑی سی صلاحیت بھی ہو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ اور طبرانی وغیرہ نے معقِلؓ بن یَسار سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یٰسٓ قلب القران، یعنی یہ سورہ قرآن کا دل ہے۔ یہ اسی طرح کی تشبیہ ہے جس طرح سورۂ فاتحہ کو اُمّ القرآن فرمایا گیا ہے۔ فاتحہ کو اُمّ القرآن قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآنِ مجید کی پوری تعلیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ اور یٰسین کو قرآن کا دھڑکتا ہوا دل اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کی دعوت کو نہایت پُرزور طریقے سے پیش کرتی ہے جس سے جمود ٹوٹتا اور روح میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

انھی حضرت معقِلؓ بن یَسار سے امام احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اقرءوا سورۃ یٰس علی موتاکم "اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسین پڑھا کرو"۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ مرتے وقت مسلمان کے ذہن میں نہ صرف یہ کہ تمام اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں، بلکہ خصوصیت کے ساتھ اس کے سامنے عالمِ آخرت کا پورا نقشہ بھی آ جائے اور وہ جان لے کہ حیاتِ دنیا کی منزل سے گزر کر اب آگے کن منزلوں سے اس کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس مصلحت کی تکمیل کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر عربی داں آدمی کو سورۂ یٰسین سنانے کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی سُنا دیا جائے تاکہ تذکیر کا حق پوری طرح ادا ہو جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۳ ۵
بَدٔ ہا رکوعاتہا

سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ۞ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۞ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ عَلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۞ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۞ لِتُنْذِرَ قَوْمًا

یٰسٓ۔[۱] قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو[۲]، سیدھے راستے پر ہو،
(اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ[۳] ہے، تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو

۱ – ابنِ عباسؓ، عِکرِمہؒ، ضَحّاکؒ، حَسَن بصریؒ اور سُفیان بن عُیَینہؒ کا قول ہے کہ اس کے معنٰی ہیں: ”اے انسان“ یا ”اے شخص“۔ اور بعض مفسرین نے اسے ”یا سیّد“ کا مخفف بھی قرار دیا ہے۔ اس تاویل کی رُو سے ان الفاظ کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۲ – اس طرح کلام کا آغاز کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت میں کوئی شک تھا اور آپؐ کو یقین دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو یہ بات فرمانے کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کفارِ قریش پوری شدت کے ساتھ حضورؐ کی نبوت کا انکار کر رہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی تمہید کے بغیر تقریر کا آغاز ہی اس فقرے سے فرمایا کہ ”تم یقیناً رسولوں میں سے ہو“، یعنی وہ لوگ سخت غلط کار ہیں جو تمھاری نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر اس بات پر قرآن کی قسم کھائی گئی ہے، اور قرآن کی صِفت میں لفظِ ”حکیم“ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے نبی ہونے کا کُھلا ہوا ثبوت یہ قرآن ہے جو سراسر حکمت سے لبریز ہے۔ یہ چیز خود شہادت دے رہی ہے کہ جو شخص ایسا حکیمانہ کلام پیش کر رہا ہے وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔ کوئی انسان ایسا کلام تصنیف کر لینے پر قادر نہیں ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لوگ جانتے ہیں وہ ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے کہ یہ کلام آپؐ خود گھڑ گھڑ کر لا رہے ہیں، یا کسی دوسرے انسان سے سیکھ سیکھ کر سنا رہے ہیں۔ (اِس مضمون کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حواشی ۲۰-۲۱-۲۲-۴۴-۴۵، بنی اسرائیل، ۱۰۴-۱۰۵۔ جلد سوم، النور، دیباچہ، الشعراء، حاشیہ ۱، النمل، حاشیہ ۹۳، القصص، ۶۲-۶۳-۶۴-۱۰۲ تا ۱۰۹، العنکبوت، ۸۸ تا ۹۱، الروم، تاریخی پَس منظر، حواشی ۱-۲-۳)

۳ – یہاں قرآن کے نازل کرنے والے کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ وہ غالب اور زبردست ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ رحیم ہے۔ پہلی صفت بیان کرنے سے مقصود اس حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرنا ہے کہ یہ قرآن کسی بے زور ناصح کی نصیحت نہیں ہے جسے تم نظر انداز کر دو تو تمھارا کچھ نہ بگڑے، بلکہ یہ اُس مالکِ کائنات کا فرمان ہے جو سب پر غالب ہے، جس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کی پکڑ سے بچ جانے کی قدرت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور دوسری صفت بیان کرنے سے مقصود یہ احساس دلانا ہے کہ یہ سراسر اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمھاری ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا رسول بھیجا اور یہ کتابِ عظیم نازل کی، تاکہ تم گمراہیوں سے

مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى
اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا
فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ
اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ

جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں[۴]۔
اِن میں سے اکثر لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے[۵]۔ ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں، اس لیے وہ سر اُٹھائے کھڑے ہیں[۶]۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار اُن کے پیچھے۔ ہم نے انھیں ڈھانک دیا ہے، انھیں

بچ کر اس راہِ راست پر چل سکو جس سے تمھیں دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل ہوں۔

۴- اس آیت کے دو ترجمے ممکن ہیں۔ ایک وہ جو اُوپر متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''تم ڈراؤ ایک قوم کے لوگوں کو اُسی بات سے جس سے ان کے باپ دادا ڈرائے گئے تھے، کیونکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔'' پہلا مطلب اگر لیا جائے تو باپ دادا سے مراد زمانۂ قریب کے باپ دادا ہوں گے، کیونکہ زمانۂ بعید میں تو عرب کی سرزمین میں متعدِّد انبیاؑ آ چکے تھے۔ اور دوسرا مطلب اختیار کرنے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ قدیم زمانے میں جو پیغام انبیاؑ کے ذریعے سے اس قوم کے آباو اَجداد کے پاس آیا تھا اس کی اب پھر تجدید کرو، کیونکہ یہ لوگ اسے فراموش کر گئے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں ترجموں میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے اور معنیٰ کے لحاظ سے دونوں اپنی اپنی جگہ دُرست ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کے اسلاف پر جو زمانہ ایسا گزرا تھا جس میں کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس نہیں آیا، اُس زمانے میں اپنی گمراہی کے وہ کس طرح ذمہ دار ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی نبی دنیا میں بھیجتا ہے تو اس کی تعلیم و ہدایت کے اثرات دُور دُور تک پھیلتے ہیں اور نسلاً بعدَ نسلٍ چلتے رہتے ہیں۔ یہ آثار جب تک باقی رہیں اور نبی کے پیروؤں میں جب تک ایسے لوگ اُٹھتے رہیں جو ہدایت کی شمع روشن کرنے والے ہوں، اس وقت تک زمانے کو ہدایت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور جب اس نبی کی تعلیم کے اثرات بالکل مٹ جائیں یا ان میں مکمل تحریف ہو جائے تو دوسرے نبی کی بِعثت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت سے پہلے عرب میں حضرت ابراہیم و اسماعیل اور حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیم کے اثرات ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اس قوم میں اُٹھتے رہے تھے، یا باہر سے آتے رہے تھے جو ان اثرات کو تازہ کرتے رہتے تھے۔ جب یہ اثرات مٹنے کے قریب ہو گئے اور اصل تعلیم میں بھی تحریف ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مبعوث فرما دیا اور

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ

اب کچھ نہیں سُوجھتا[7]۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے[8]۔ تم تو اُسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔

ایسا انتظام فرمایا کہ آپؐ کی ہدایت کے آثار نہ مٹ سکتے ہیں اور نہ مُحرَّف ہو سکتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۃ السجدہ، حاشیہ نمبر ۵)

۵ – یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے اور جنھوں نے طے کر لیا تھا کہ آپؐ کی بات بہرحال مان کر نہیں دینی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ”یہ لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لیے یہ ایمان نہیں لاتے۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعے سے اِتمامِ حُجّت ہو جانے پر بھی انکار اور حق دشمنی کی رَوِش ہی اختیار کیے چلے جاتے ہیں، ان پر خود ان کی اپنی شامتِ اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انھیں توفیقِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔ اسی مضمون کو آگے چل کر اس فقرے میں کھول دیا گیا ہے کہ ”تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔“

۶ – اس آیت میں ”طوق“ سے مراد ان کی اپنی ہٹ دھرمی ہے جو ان کے لیے قبولِ حق میں مانع ہو رہی تھی۔ ”ٹھوڑیوں تک جکڑے جانے“ اور ”سر اُٹھائے کھڑے ہونے“ سے مراد وہ گردن کی اکڑ ہے جو تکبُّر اور نَخوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ان کی گردن کا طوق بنا دیا ہے، اور جس کبر و نَخوَت میں یہ مبتلا ہیں اس کی وجہ سے ان کی گردنیں اس طرح اکڑ گئی ہیں کہ اب خواہ کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آ جائے، یہ اس کی طرف التفات کر کے نہ دیں گے۔

۷ – ایک دیوار آگے اور ایک پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اسی ہٹ دھرمی اور اِستکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے کوئی سبق لیتے ہیں، اور نہ مستقبل کے نتائج پر کبھی غور کرتے ہیں۔ ان کے تعصّبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے ہیں کہ انھیں وہ کُھلے کُھلے حقائق نظر نہیں آتے جو ہر سلیم الطبع اور بے تعصب انسان کو نظر آ رہے ہیں۔

۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس حالت میں تبلیغ کرنا بے کار ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری تبلیغِ عام ہر طرح کے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا ذکر آگے کی آیت میں آ رہا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں سے جب سابقہ پیش آئے اور تم دیکھ لو کہ وہ انکار و اِستکبار اور عناد و مخالفت پر جمے ہوئے ہیں تو ان کے پیچھے نہ پڑو۔ مگر ان کی اس روش سے دل شکستہ و مایوس ہو کر اپنا کام چھوڑ بھی نہ بیٹھو، کیونکہ تمھیں نہیں معلوم کہ اسی ہجومِ خَلق کے درمیان وہ خدا کے بندے کہاں ہیں جو نصیحت قبول کرنے والے اور خدا سے ڈر کر راہِ راست پر آ جانے والے ہیں۔ تمھاری تبلیغ کا اصل مقصود اِسی دوسری قسم کے

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿١١﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا
قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾ ع ۱۸ وقف غفران
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿١٣﴾ وقف لازم

اُسے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دے دو۔

ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انھوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جارہے ہیں، اور جو کچھ آثار انھوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کررہے ہیں۔[9] ہر چیز کو ہم نے ایک کُھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔ ع

انھیں مثال کے طور پر اُس بستی والوں کا قصہ سناؤ، جب کہ اُس میں رسول آئے تھے۔[10]

انسانوں کو تلاش کرنا اور انھیں چھانٹ چھانٹ کر نکال لینا ہے۔ ہٹ دھرموں کو چھوڑتے جاؤ، اور اس قیمتی متاع کو سمیٹتے چلے جاؤ۔

۹ – اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نامۂ اعمال تین قسم کے اندراجات پر مشتمل ہے: ایک، یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی اچھا یا بُرا عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے، اپنے گردوپیش کی اشیا اور خود اپنے جسم کے اعضا پر جو نقوش (impressions) بھی انسان مُرتسم کرتا ہے وہ سب کے سب ثبت ہو جاتے ہیں، اور یہ سارے نقوش ایک وقت اس طرح اُبھر آئیں گے کہ اس کی اپنی آواز سُنی جائے گی، اس کے اپنے خیالات اور نیتوں اور ارادوں کی پوری داستان اس کی لوحِ ذہن پر لکھی نظر آئے گی، اور اس کے ایک ایک اچھے اور بُرے فعل اور اس کی تمام حرکات و سکنات کی تصویریں سامنے آجائیں گی۔ تیسرے، اپنے مرنے کے بعد اپنی آیندہ نسل پر، اپنے معاشرے پر اور پوری انسانیت پر اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے جو اثرات وہ چھوڑ گیا ہے وہ جس وقت تک اور جہاں جہاں تک کارفرما رہیں گے وہ سب اس کے حساب میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اپنی اولاد کو جو بھی اچھی یا بُری تربیت اس نے دی ہے، اپنے معاشرے میں جو بھلائیاں یا برائیاں بھی اس نے پھیلائی ہیں، اور انسانیت کے حق میں جو پھول یا کانٹے بھی وہ بو گیا ہے ان سب کا پورا ریکارڈ اس وقت تک تیار کیا جاتا رہے گا جب تک اس کی لگائی ہوئی یہ فصل دنیا میں اپنے اچھے یا بُرے پھل لاتی رہے گی۔

۱۰ – قدیم مفسرین بالعموم اس طرف گئے ہیں کہ اس بستی سے مراد شام کا شہر انطاکیہ ہے اور جن رسولوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے انھیں حضرت عیسیٰؑ نے تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں قصّے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں انطیخش اس علاقے کا بادشاہ تھا۔ لیکن یہ سارا قصّہ ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، عکرمہؒ، کعب احبارؒ اور وہب بن مُنبّہ وغیرہ بزرگوں نے عیسائیوں کی غیر مستند روایات سے اخذ کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے بالکل بے بنیاد ہے۔ انطاکیہ میں سلوقی خاندان (Seleucid Dynasty) کے ۱۳ بادشاہ انتیوکس (Antiochus) کے نام سے گزرے ہیں اور اس نام کے آخری فرماں روا

Maktaba Tul Ishaat.com

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ
اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ۝ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ

ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا: "ہم تمھاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔"

بستی والوں نے کہا: "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان[11]، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز

کی حکومت، بلکہ خود اس خاندان کی حکومت بھی ۶۵ قبلِ مسیح میں ختم ہوگئی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں انطاکیہ سمیت شام و فلسطین کا پورا علاقہ رومیوں کے زیرِنگیں تھا۔ پھر عیسائیوں کی کسی مستند روایت سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں میں سے کسی کو تبلیغ کے لیے انطاکیہ بھیجا ہو۔ اس کے برعکس بائبل کی کتابِ اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ صلیب کے چند سال بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو، نہ اللہ کے رسول نے مامور کیا ہو، وہ اگر بطورِ خود تبلیغ کے لیے نکلے ہوں تو کسی تاویل کی رُو سے بھی وہ اللہ کے رسول قرار نہیں پا سکتے۔ علاوہ بریں بائبل کے بیان کی رُو سے انطاکیہ پہلا شہر ہے جہاں کثرت سے غیر اسرائیلیوں نے دینِ مسیح کو قبول کیا اور مسیحی کلیسا کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ حالانکہ قرآن جس بستی کا ذکر یہاں کر رہا ہے وہ کوئی ایسی بستی تھی جس نے رسولوں کی دعوت کو رد کر دیا اور بالآخر عذابِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ تاریخ میں اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انطاکیہ پر ایسی کوئی تباہی نازل ہوئی ہو جسے انکارِ رسالت کی بنا پر عذاب قرار دیا جا سکتا ہو۔

ان وجوہ سے یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے۔ بستی کا تعین نہ قرآن میں کیا گیا ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں، بلکہ یہ بات بھی کسی مستند ذریعے سے معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسول کون تھے اور کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔ قرآنِ مجید جس غرض کے لیے یہ قصہ یہاں بیان کر رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے بستی کا نام اور رسولوں کے نام معلوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قصے کے بیان کرنے کی غرض قریش کے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ تم ہٹ دھرمی، تعصب اور انکارِ حق کی اُسی روش پر چل رہے ہو جس پر اُس بستی کے لوگ چلے تھے، اور اسی انجام سے دوچار ہونے کی تیاری کر رہے ہو جس سے وہ دوچار ہوئے۔

۱۱ — دوسرے الفاظ میں ان کا کہنا یہ تھا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے خدا کے بھیجے ہوئے رسول نہیں ہو سکتے۔ یہی خیال کفارِ مکہ کا بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول نہیں ہیں، کیونکہ وہ انسان ہیں:

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان: ۷)	وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔
وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ	اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ (الانبیاء: ۳)

یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے ایک بشر کے سوا آخر اور کیا ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے اس جادو کے شکار ہو جاؤ گے؟

قرآنِ مجید کفارِ مکہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جہلا اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہو سکتا اور جو رسول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ قومِ نوحؑ کے سرداروں نے جب حضرت نوحؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہا تھا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○ (المومنون: ۲۴)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا، اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی فضیلت جمائے۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا۔ ہم نے تو یہ بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سنی (کہ انسان رسول بن کر آئے)۔

قومِ عاد نے یہی بات حضرت ہودؑ کے متعلق کہی تھی:

هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

(المومنون: ۳۳-۳۴)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ کھاتا ہے وہی کچھ جو تم کھاتے ہو، اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کر لی تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

قومِ ثمود نے حضرت صالحؑ کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ:

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ۙ (القمر: ۲۴)

کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کر لیں؟

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاؑ کے ساتھ پیش آیا کہ کفار نے کہا: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا، ”تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر۔“ اور انبیاؑ نے ان کو جواب دیا کہ: اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ”واقعی ہم تمھاری طرح بشر کے سوا کچھ نہیں ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے۔“ (ابراہیم: ۱۰-۱۱)

اس کے بعد قرآنِ مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا ہے اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ

کیا انھیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آگے ان کے لیے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝۱۵ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ
اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝۱۶ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۱۷

کوئی چیز نازل نہیں کی ہے،[12] تم محض جھوٹ بولتے ہو۔"

رسولوں نے کہا: "ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔"[13]

بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا (التغابن: ۶)

اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آتے رہے مگر انھوں نے کہا: "کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟" اسی بنا پر انھوں نے کفر کیا اور منہ پھیر گئے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹۴)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو کوئی چیز انھیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے کہا: "کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟"

پھر قرآنِ مجید پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ، یا بشریّت سے بالاتر کوئی ہستی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۷-۸)

ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان: ۲۰)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹۵)

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۸ قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ

بستی والے کہنے لگے: "ہم تو تمھیں اپنے لیے فالِ بد سمجھتے ہیں[۱۴]۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔"

رسولوں نے جواب دیا: "تمھاری فالِ بد تو تمھارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے[۱۵]۔ کیا یہ باتیں تم اِس لیے کرتے ہو کہ تمھیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے

۱۲ - یہ ایک اور جہالت ہے جس میں کفارِ مکہ بھی مبتلا تھے، آج کے نام نہاد عقلیت پسند لوگ بھی مبتلا ہیں، اور قدیم ترین زمانے سے ہر زمانے کے منکرینِ وحی و رسالت اس میں مبتلا رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرے سے انسانی ہدایت کے لیے کوئی وحی نازل نہیں کرتا۔ اس کو صرف عالَمِ بالا کے معاملات سے دلچسپی ہے۔ انسانوں کا معاملہ اس نے خود انسانوں ہی پر چھوڑ رکھا ہے۔

۱۳ - یعنی ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جو پیغام تم تک پہنچانے کے لیے رب العالمین نے ہمارے سُپرد کیا ہے وہ تمھیں پہنچا دیں۔ اس کے بعد تمھیں اختیار ہے کہ مانو یا نہ مانو۔ یہ ذمہ داری ہم پر نہیں ڈالی گئی ہے کہ تمھیں زبردستی منوا کر ہی چھوڑیں۔ اور اگر تم نہ مانو گے تو تمھارے کفر میں ہم نہیں پکڑے جائیں گے بلکہ اپنے اس جرم کی جواب دہی تم کو خود ہی کرنی پڑے گی۔

۱۴ - اس سے اُن لوگوں کا مطلب یہ تھا کہ تم ہمارے لیے منحوس ہو، تم نے آ کر ہمارے معبودوں کے خلاف جو باتیں کرنی شروع کی ہیں، ان کی وجہ سے دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں، اور اب جو آفت بھی ہم پر نازل ہو رہی ہے وہ تمھاری بدولت ہی ہو رہی ہے۔ ٹھیک یہی باتیں عرب کے کفار و منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے: وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ۔ "اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمھاری بدولت ہے۔" (النساء: ۷۸) اسی لیے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ان لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ ایسی ہی جاہلانہ باتیں قدیم زمانے کے لوگ بھی اپنے انبیاؑ کے متعلق کہتے رہے ہیں۔ قومِ ثمود اپنے نبی سے کہتی تھی: اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ "ہم نے تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو منحوس پایا ہے۔" (النمل: ۴۷) اور یہی رویہ فرعون کی قوم کا بھی تھا کہ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ۔ "جب ان پر اچھی حالت آتی تو کہتے کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے، اور اگر کوئی مصیبت اُن پر آ پڑتی تو اسے موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔" (الاعراف: ۱۳۱)

۱۵ - یعنی کوئی کسی کے لیے منحوس نہیں ہے۔ ہر شخص کا نوشتۂ تقدیر اس کی اپنی ہی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ برائی دیکھتا

Maktaba Tul Ishaat.com

قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ۝ وَجَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ رَجُلٌ يَّسۡعٰى
قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝۲۰ اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡـَٔـلُكُمۡ
اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۝

الجزء ۲۳ **وَمَا لِىَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝۲۲**

لوگ ہو۔[16]"

اِتنے میں شہر کے دُور دراز گوشے سے ایک شخص دَوڑتا ہوا آیا اور بولا: "اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیَروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو اُن لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں[17]۔ آخر کیوں نہ میں اُس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا[18] ہے؟

ہے تو اپنے نصیب کی دیکھتا ہے اور بھلائی دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کے اپنے ہی نصیب کی ہوتی ہے۔ وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓٮِٕرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ، "ہر شخص کا پروانۂ خیر وشر ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے۔" (بنی اسرائیل: ۱۳)

۱۶ - یعنی دراصل تم بھلائی سے بھاگنا چاہتے ہو اور ہدایت کے بجائے گمراہی تمھیں پسند ہے، اس لیے حق اور باطل کا فیصلہ دلیل سے کرنے کے بجائے اَوہام وخُرافات کے سہارے یہ بہانے بازیاں کر رہے ہو۔

۱۷ - اس ایک فقرے میں اُس بندۂ خدا نے نبوت کی صداقت کے سارے دلائل سمیٹ کر رکھ دیے۔ ایک نبی کی صداقت دو ہی باتوں سے جانچی جا سکتی ہے: ایک، اس کا قول وفعل۔ دوسرے، اس کا بے غرض ہونا۔ اس شخص کے اِستدلال کا منشا یہ تھا کہ اول تو یہ لوگ سراسر معقول بات کہہ رہے ہیں اور ان کی اپنی سیرت بالکل بے داغ ہے۔ دوسرے، کوئی شخص اس بات کی نشان دہی نہیں کر سکتا کہ اس دین کی دعوت یہ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر دے رہے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان کی بات کیوں نہ مانی جائے۔ اس شخص کا یہ استدلال نقل کر کے قرآن مجید نے لوگوں کے سامنے ایک معیار رکھ دیا کہ نبی کی نبوت کو پرکھنا ہو تو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل بتا رہا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہیں۔ اور پھر ان کی سعی و جُہد کے پیچھے کسی ذاتی غرض کا بھی نام ونشان تک نہیں ہے۔ پھر کوئی معقول انسان اُن کی بات کو رد آخر کس بنیاد پر کرے گا۔

۱۸ - اس فقرے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ استدلال کا شاہکار ہے، اور دوسرے حصے میں حکمتِ تبلیغ کا کمال دکھایا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ کہتا ہے کہ خالق کی بندگی کرنا تو سراسر عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔ نامعقول بات اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ آدمی ان کی بندگی کرے جنھوں نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ مرنا آخر تم کو بھی ہے، اور اسی خدا کی طرف جانا ہے جس کی بندگی اختیار کرنے پر تمھیں اعتراض

ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ
شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـــًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ۞۲۳ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۞۲۴ اِنِّىۡۤ
اٰمَنۡتُ بِرَبِّكُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ۞۲۵ قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَـنَّةَ ‌ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ
قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۞۲۶ بِمَا غَفَرَ لِىۡ رَبِّىۡ وَجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ ۞۲۷

کیا میں اُسے چھوڑ کر دوسرے معبُود بنالوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ اُن کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں[19]۔ اگر میں ایسا کروں[20] تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمھارے رب پر ایمان[21] لے آیا، تم بھی میری بات مان لو۔"

(آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہو جا جنّت میں[22]۔" اُس نے کہا: "کاش! میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزّت لوگوں میں داخل فرمایا[23]۔"

ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اس سے منہ موڑ کر تم کس بھلائی کی توقع کر سکتے ہو۔

۱۹ – یعنی نہ وہ خدا کے ایسے چہیتے ہیں کہ میں صریح جرم کروں اور وہ محض اُن کی سِفارش پر مجھے معاف کر دے۔ اور نہ ان کے اندر اتنا زور ہے کہ خدا مجھے سزا دینا چاہے اور وہ اپنے بل بُوتے پر مجھے چھڑا لے جائیں۔

۲۰ – یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اگر میں ان کو معبُود بناؤں۔

۲۱ – اس فقرے میں پھر حکمتِ تبلیغ کا ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ یہ کہہ کر اُس شخص نے اُن لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ جس رب پر میں ایمان لایا ہوں وہ محض میرا ہی رب نہیں ہے بلکہ تمھارا رب بھی ہے۔ اس پر ایمان لا کر میں نے غلطی نہیں کی ہے بلکہ اس پر ایمان نہ لا کر تم ہی غلطی کر رہے ہو۔

۲۲ – یعنی شہادت نصیب ہوتے ہی اس شخص کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جونہی کہ وہ موت کے دروازے سے گزر کر دوسرے عالَم میں پہنچا، فرشتے اس کے استقبال کو موجود تھے اور انھوں نے اسے خوشخبری دے دی کہ فردوسِ بریں اس کی منتظر ہے۔ اس فقرے کی تاویل میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ قتادَہ کہتے ہیں کہ "اللہ نے اسی وقت اسے جنت میں داخل کر دیا اور وہ وہاں زندہ ہے، رزق پا رہا ہے۔" اور مُجاہِدؔ کہتے ہیں کہ "یہ بات ملائکہ نے اس سے بشارت کے طور پر کہی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد جب تمام اہلِ ایمان جنت میں داخل ہوں گے تو وہ بھی اُن کے ساتھ داخل ہوگا۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا کُنَّا
مُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۸﴾ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾
یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۣۚ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ
یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّہُمۡ
اِلَیۡہِمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿ؕ۳۱﴾ وَ اِنۡ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیۡعٌ لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿٪۳۲﴾

وقف غفران ع

اس کے بعد اُس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اُتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکا ہوا اور یکایک وہ سب بُجھ کر رہ گئے[۲۴]۔ افسوس بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آیا، اس کا وہ مذاق ہی اُڑاتے رہے۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے[۲۵]؟ ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے۔ ع

۲۳ – یہ اُس مردِ مومن کے کمالِ اخلاق کا ایک نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے اسے ابھی ابھی قتل کیا تھا اُن کے خلاف کوئی غصہ اور جذبۂ انتقام اس کے دل میں نہ تھا کہ وہ اللہ سے ان کے حق میں بددعا کرتا۔ اس کے بجائے وہ اب بھی ان کی خیرخواہی کیے جا رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے دل میں اگر کوئی تمنا پیدا ہوئی تو وہ بس یہ تھی کہ کاش! میری قوم میرے اس انجامِ نیک سے باخبر ہو جائے اور میری زندگی سے نہیں تو میری موت ہی سے سبق لے کر راہِ راست اختیار کرلے۔ وہ شریف انسان اپنے قاتلوں کے لیے بھی جہنم نہ چاہتا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ وہ ایمان لا کر جنت کے مستحق بنیں۔ اسی کی تعریف کرتے ہوئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ نصح قومہ حیًا ومیتًا "اس شخص نے جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیرخواہی کی اور مر کر بھی۔"

اس واقعے کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو درپردہ اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان بھی اسی طرح تمھارے سچے خیرخواہ ہیں جس طرح وہ مردِ مومن اپنی قوم کا خیرخواہ تھا۔ یہ لوگ تمھاری تمام ایذا رسانیوں کے باوجود تمھارے خلاف کوئی ذاتی عناد اور کوئی جذبۂ انتقام نہیں رکھتے۔ ان کی دشمنی تم سے نہیں بلکہ تمھاری گمراہی سے ہے۔ یہ تم سے صرف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ آیت بھی منجملہ ان آیات کے ہے جن سے حیاتِ برزخ کا صریح ثبوت ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ خالص عدم اور کامل نیستی کا زمانہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ اس زمانے میں

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا
فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝۳۳ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا
فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝۳۴ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝۳۵ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا

اِن لوگوں[26] کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے۔[27] ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلّہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے، تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔[28] پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟[29] پاک ہے وہ ذات[30] جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ

جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہلِ دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد اس مردِ مومن کو جنت کی بشارت کیسے دی جاتی اور وہ اپنی قوم کے لیے یہ تمنا کیسے کرتا کہ کاش وہ اس کے انجامِ نیک سے باخبر ہو جائے۔

۲۴ – ان الفاظ میں ایک لطیف طنز ہے۔ اپنی طاقت پر اُن کا گھمنڈ اور دینِ حق کے خلاف ان کا جوش و خروش گویا ایک شعلۂ جوّالا تھا جس کے متعلق اپنے زعم میں وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ان تینوں انبیا اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھسم کر ڈالے گا۔ لیکن اس شعلے کی بساط اس سے زیادہ کچھ نہ نکلی کہ خدا کے عذاب کی ایک ہی چوٹ نے اس کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔

۲۵ – یعنی ایسے مٹے کہ ان کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ جو گرا پھر نہ اٹھا۔ دنیا میں آج کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں ہے۔ ان کی تہذیب اور ان کے تمدّن ہی کا نہیں، ان کی نسلوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

۲۶ – پچھلے دو رکوعوں میں کفارِ مکہ کو انکار و تکذیب اور مخالفتِ حق کے اس رویے پر ملامت کی گئی تھی جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔ اب تقریر کا رُخ اس بنیادی نزاع کی طرف پھرتا ہے جو اُن کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش کی اصل وجہ تھی، یعنی توحید و آخرت کا عقیدہ، جسے حضورؐ پیش کر رہے تھے اور کفار ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پے در پے چند دلائل دے کر لوگوں کو دعوتِ غور و فکر دی جا رہی ہے کہ دیکھو، کائنات کے یہ آثار جو علانیہ تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا اس حقیقت کی صاف صاف نشان دہی نہیں کرتے جسے یہ نبی تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

۲۷ – یعنی اس امر کی نشانی کہ توحید ہی حق ہے اور شرک سراسر بے بنیاد ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۸ - اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”تاکہ یہ کھائیں اُس کے پھل اور وہ چیزیں جو ان کے اپنے ہاتھ بناتے ہیں“، یعنی وہ مصنوعی غذائیں جو قدرتی پیداوار سے یہ لوگ خود تیار کرتے ہیں، مثلاً روٹی، سالن، مُربّے، اچار، چٹنیاں اور بے شمار دوسری چیزیں۔

۲۹ - ان مختصر فقروں میں زمین کی روئیدگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمی شب و روز اس زمین کی پیداوار کھا رہا ہے اور اپنے نزدیک اِسے ایک معمولی بات سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ غفلت کا پردہ چاک کر کے نگاہِ غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ اس فرشِ خاک سے لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز باغوں کا اُگنا اور اس کے اندر چشموں اور نہروں کا رواں ہونا کوئی کھیل نہیں ہے جو آپ سے آپ ہوئے جا رہا ہو بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت و قدرت اور ربوبیت کارفرما ہے۔ زمین کی حقیقت پر غور کیجیے، جن مادّوں سے یہ مرکّب ہے اُن کے اندر بجائے خود کسی نَشو و نُما کی طاقت نہیں ہے۔ یہ سب مادّے فرداً فرداً بھی اور ہر ترکیب و آمیزش کے بعد بھی بالکل غیر نامی ہیں اور اس بنا پر ان کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان زمین کے اندر سے نباتی زندگی کا ظہور آخر کیسے ممکن ہوا؟ اس کی تحقیق آپ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ چند بڑے بڑے اسباب ہیں جو اگر پہلے فراہم نہ کر دیے گئے ہوتے تو یہ زندگی سرے سے وجود میں نہ آ سکتی تھی:

اوّلاً، زمین کے مخصوص خِطّوں میں اس کی اوپری سطح پر بہت سے ایسے مادّوں کی تہ چڑھائی گئی جو نباتات کی غذا بننے کے لیے موزوں ہو سکتے تھے اور اس تہ کو نرم رکھا گیا تاکہ نباتات کی جڑیں اس میں پھیل کر اپنی غذا چوس سکیں۔

ثانیاً، زمین پر مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تاکہ غذائی مادّے اس میں تحلیل ہو کر اس قابل ہو جائیں کہ نباتات کی جڑیں ان کو جذب کر سکیں۔

ثالثاً، اُوپر کی فضا میں ہوا پیدا کی گئی جو آفاتِ سماوی سے زمین کی حفاظت کرتی ہے، جو بارش لانے کا ذریعہ بنتی ہے، اور اپنے اندر وہ گیسیں بھی رکھتی ہے جو نباتات کی زندگی اور ان کے نَشو و نُما کے لیے درکار ہیں۔

رابعاً، سورج اور زمین کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا کہ نباتات کو مناسب درجۂ حرارت اور موزوں موسم مل سکیں۔

یہ چار بڑے بڑے اسباب (جو بجائے خود بے شمار ضمنی اسباب کا مجموعہ ہیں) جب پیدا کر دیے گئے تب نباتات کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ پھر یہ سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد نباتات پیدا کیے گئے اور ان میں سے ہر ایک کا تخم ایسا بنایا گیا کہ جب اسے مناسب زمین، پانی، ہوا اور موسم میسر آئے تو اس کے اندر نباتی زندگی کی حرکت شروع ہو جائے۔ مزید برآں اسی تخم میں یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ ہر نَوع کے تخم سے لازماً اسی نَوع کا بُوٹا اپنی تمام نوعی اور موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہو۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید کاریگری یہ کی گئی کہ نباتات کی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بے حد و حساب قسمیں پیدا کی گئیں اور ان کو اس طرح بنایا گیا کہ وہ اُن بے شمار اقسام کے حیوانات اور بنی آدم کی غذا، دوا، لباس، اور اَن گنت دوسری ضرورتوں کو پورا کر سکیں جنھیں نباتات کے بعد زمین پر وجود میں لایا جانے والا تھا۔

اس حیرت انگیز انتظام پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اگر ہٹ دھرمی اور تعصّب میں مبتلا نہیں ہے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صریح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ کام کر رہا ہے جس کے تحت زمین، پانی، ہوا

تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞۳۶

زمین کی نباتات میں سے ہوں، یا خود اِن کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے، یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔[۳۱]

اور موسم کی مناسبتیں نباتات کے ساتھ، اور نباتات کی مناسبتیں حیوانات اور انسانوں کی حاجات کے ساتھ انتہائی نزاکتوں اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔ کوئی ہوش مند انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی ہمہ گیر مناسبتیں محض اتفاقی حادثہ کے طور پر قائم ہو سکتی ہیں۔ پھر یہی انتظام اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ بہت سے خداؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک ہی ایسے خدا کا انتظام ہے اور ہو سکتا ہے جو زمین، ہوا، پانی، سورج، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی، سب کا خالق و رب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے خدا الگ الگ ہوتے تو آخر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور گہری حکیمانہ مناسبتیں رکھنے والا منصوبہ بن جاتا اور لاکھوں کروڑوں برس تک اتنی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہتا۔

توحید کے حق میں یہ اِستدلال پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ؟ یعنی کیا یہ لوگ ایسے احسان فراموش اور نمک حرام ہیں کہ جس خدا نے یہ سب کچھ سروسامان ان کی زندگی کے لیے فراہم کیا ہے، اس کے یہ شکر گزار نہیں ہوتے اور اس کی نعمتیں کھا کھا کر دوسروں کے شکریے ادا کرتے ہیں؟ اس کے آگے نہیں جھکتے اور ان جھوٹے معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنھوں نے ایک تنکا بھی اِن کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟

۳۰۔ یعنی ہر شائبۂ نقص و عیب سے پاک، ہر غلطی اور کمزوری سے پاک، اور اس بات سے پاک کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔ مشرکین کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے بالعُموم قرآنِ مجید میں یہ الفاظ اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ شرک کا ہر عقیدہ اپنی حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر کسی نہ کسی نقص اور کسی نہ کسی کمزوری اور عیب کا الزام ہے۔ اللہ کے لیے شریک تجویز کرنے کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ ایسی بات کہنے والا دراصل یہ سمجھتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ تنہا اپنی خدائی کا کام چلانے کے قابل نہیں ہے، یا وہ مجبور ہے کہ اپنی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کرے، یا کچھ دوسری ہستیاں آپ سے آپ ایسی طاقت ور ہیں کہ وہ خدائی کے نظام میں دخل دے رہی ہیں اور خدا ان کی مداخلت برداشت کر رہا ہے، یا معاذ اللہ! وہ انسانی بادشاہوں کی سی کمزوریاں رکھتا ہے جن کی بنا پر وزیروں، درباریوں، منہ چڑھے مُصاحبوں، اور چہیتے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک لشکر کا لشکر اسے گھیرے ہوئے ہے اور خدائی کے بہت سے اختیارات ان کے درمیان بٹ کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ جاہلانہ تصوُّرات اگر ذہنوں میں موجود نہ ہوتے تو سرے سے شرک کا خیال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام عُیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک اور مُنزَّہ ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۳۱۔ یہ توحید کے حق میں ایک اور استدلال ہے، اور یہاں پھر پیش پا اُفتادہ حقائق ہی میں سے بعض کو لے کر بتایا جا رہا ہے کہ شب و روز جن اشیا کا تم مشاہدہ کرتے اور یونہی غور و خوض کیے بغیر گزر جاتے ہو انھی کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑ تو خود انسان کا اپنا سببِ پیدائش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادہ کے اِزدِواج سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ۭ

اِن کے لیے ایک اَور نشانی رات ہے، ہم اُس کے اُوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو اِن پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔[۳۲] اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔[۳۳] یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور

چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ اُن میں تزویج کا اُصول کام کر رہا ہے۔ حتّٰی کہ بے جان مادّوں تک میں مختلف اشیا جب ایک دوسرے سے جوڑ کھاتی ہیں تب کہیں اُن سے طرح طرح کے مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ خود مادّے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے اِرتباط سے ہوئی ہے۔ یہ تزویج، جس کی بدولت یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے، حکمت وصنّاعی کی ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں رکھتی ہے اور اس کے اندر ہر دو زوجین کے درمیان ایسی مناسبتیں پائی جاتی ہیں کہ بے لاگ عقل رکھنے والا کوئی شخص نہ تو اس چیز کو ایک اتفاقی حادثہ کہہ سکتا ہے اور نہ یہ مان سکتا ہے کہ مختلف خداؤں نے ان بے شمار اَزواج کو پیدا کر کے ان کے درمیان اس حکمت کے ساتھ جوڑ لگائے ہوں گے۔ اَزواج کا ایک دوسرے کے لیے جوڑ ہونا اور ان کے اِزدِواج سے نئی چیزوں کا پیدا ہونا خود وحدتِ خالق کی صریح دلیل ہے۔

۳۲- رات اور دن کی آمد و رفت بھی انھی پیش پا اُفتادہ حقائق میں سے ہے جنھیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آ رہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے، اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک ربِّ قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جا سکتا اور رات کبھی نہیں آ سکتی جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ ہٹے۔ دن کے ہٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطے نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات اور دن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصّے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے ہٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصّے پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصّے پر ہمیشہ دن رہتا، یا شب و روز کا اُلٹ پھیر بہت تیز یا بہت سُست ہوتا، یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن نکل آتا اور کبھی رات چھا جاتی، تو ان تمام صورتوں میں اس کُرے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی، بلکہ غیر زندہ مادّوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کارفرمائی صاف دیکھ سکتا ہے جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ

چاند، اُس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سُوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے[۳۴]۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے[۳۵] اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے[۳۶]۔

خدا کا وجود اور اس کی توحید اگر کسی شخص کے نزدیک بعید از عقل ہے تو وہ خود ہی سوچ کر بتائے کہ اس کاریگری کو بہت سے خداؤں کی طرف منسوب کرنا، یا یہ سمجھنا کہ کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت کے تحت یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے، کس قدر عقل سے بعید ہونا چاہیے۔ کسی ثبوت کے بغیر محض قیاس و گمان کی بنیاد پر جو شخص یہ دوسری سراسر نامعقول توجیہات مان سکتا ہے وہ جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں نظم اور حکمت اور مقصدیت کا پایا جانا خدا کے ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ شخص کسی نظریے یا عقیدے کو قبول کرنے کے لیے کسی درجے میں بھی، کافی یا ناکافی، عقلی ثبوت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

۳۳- ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں جا کر سورج کو آخرکار ٹھیر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اسی وقت متعین کر سکتا ہے، جب کہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے۔ لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے اور نظامِ شمسی کے سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتا چلا کہ نہ صرف سورج، بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (fixed stars) کہا جاتا ہے، ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے لے کر ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانے کے ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کلومیٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ "اِسٹار" اور لفظ "سَن")

۳۴- یعنی مہینے کے دَوران میں چاند کی گردش ہر روز بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن وہ ہِلال بن کر طلوع ہوتا ہے پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد روز گھٹتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ آخرِ کار پھر اپنی ابتدائی ہِلالی شکل پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ یہ چکر لاکھوں برس سے پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند کی ان مقرر منزلوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے انسان حساب لگا کر ہمیشہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ اگر اس کی حرکت کسی ضابطے کی پابند نہ ہوتی تو یہ حساب لگانا ممکن نہ ہوتا۔

۳۵- اس فقرے کے دو مطلب لیے جا سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک، یہ کہ سورج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ چاند کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، یا خود اس کے مدار میں داخل ہو کر اس سے جا ٹکرائے۔ دوسرا، یہ کہ جو اوقات چاند کے طلوع و ظہور کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي

سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔[۳۷]

اِن کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے اِن کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں

مقرر کر دیے گئے ہیں اُن میں سورج کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور یکایک سورج اُفق پر آ جائے۔

۳۶ – یعنی ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے رات آ جائے اور جو اوقات دن کی روشنی کے لیے مقرر ہیں، اُن میں وہ اپنی تاریکیاں لیے ہوئے یکایک آ موجود ہو۔

۳۷ – فَلَكْ کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (orbit) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سَمَاء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ یہ ارشاد کہ ''سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں''، چار حقیقتوں کی نشان دِہی کرتا ہے: ایک، یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیّارے اور اَجرامِ فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے، یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے، یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ اور چوتھے، یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیّال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

ان آیات کا اصل مقصد علمِ ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد وحساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دَہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز، سورج زمین سے ۳ لاکھ گنا بڑا ہے، اور اس کے بعید ترین سیّارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۷۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ بلکہ اگر پلُوٹو کو بعید ترین سیّارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴ ارب ۶۰ کروڑ میل دُور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظامِ شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (galaxy) میں ہمارا یہ نظامِ شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (تین ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں، اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صَرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰ لاکھ لولبی سحابیوں (spiral nebulae) میں سے ایک ہے، اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰ کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائعِ مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ
نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ
مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ

سوار کر دیا،[۳۸] اور پھر اِن کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔[۳۹] ہم چاہیں تو اِن کو غرق کر دیں، کوئی اِن کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انھیں پار لگاتی اور ایک وقتِ خاص تک زندگی سے مُتمتّع ہونے کا موقع دیتی ہے۔[۴۰]
اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اُس انجام سے جو تمھارے آگے آ رہا ہے

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق بہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالَم اِسی مادّے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کارفرما ہے، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دُور دراز دنیاؤں کے مُشاہَدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرماں روا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم، جو حکمت، جو صنّاعی اور جو مناسبت اِن لاکھوں کہکشانوں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیّاروں میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحبِ عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو گیا ہے؟ اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع، اور اس مناسبت کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے؟

۳۸– بھری ہوئی کشتی سے مراد ہے حضرت نوحؑ کی کشتی۔ اور نسلِ انسانی کو اُس پر سوار کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کشتی میں بظاہر تو حضرت نوحؑ کے چند ساتھی ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر درحقیقت قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس پر سوار تھے۔ کیوں کہ طوفانِ نوحؑ میں ان کے سوا باقی پوری اولادِ آدم کو غرق کر دیا گیا تھا اور بعد کی انسانی نسل صرف انھی کشتی والوں سے چلی۔

۳۹– اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تاریخ میں پہلی کشتی جو بنی وہ حضرت نوحؑ والی کشتی تھی۔ اُس سے پہلے انسان کو دریاؤں اور سمندروں کے عُبور کرنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ اس طریقے کی تعلیم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو دی۔ اور جب اُن کی بنائی ہوئی کشتی پر سوار ہو کر اللہ کے کچھ بندے طوفان سے بچ نکلے تو آیندہ ان کی نسل نے بحری سفروں کے لیے کشتیاں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۴۰– پچھلی نشانیوں کا ذکر دلائلِ توحید کی حیثیت سے کیا گیا تھا، اور اِس نشانی کا ذکر یہ احساس دلانے کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ
اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا
مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ
لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿٤٧﴾

اور تمھارے پیچھے گزر چکا ہے[41]، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں)۔ اِن کے سامنے اِن کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف اِلتفات نہیں کرتے[42]۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمھیں عطا کیا ہے اُس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو تو یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں: ”کیا ہم اُن کو کھلائیں جنھیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو[43]۔“

فرمایا گیا ہے کہ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر تصرُّف کے جو اختیارات بھی حاصل ہیں وہ اللہ کے دیے ہوئے ہیں، اُس کے اپنے حاصل کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ان طاقتوں پر تصرف کے جو طریقے اس نے دریافت کیے ہیں وہ بھی اللہ کی رہنمائی سے اس کے علم میں آئے ہیں، اس کے اپنے معلوم کیے ہوئے نہیں ہیں۔ انسان کا اپنا بل بُوتا یہ نہ تھا کہ اپنے زور سے وہ اِن عظیم طاقتوں کو مسخر کرتا اور نہ اس میں یہ صلاحیت تھی کہ خود اَسرارِ فطرت کا پتا چلا لیتا اور ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکتا۔ پھر جن قوتوں پر بھی اللہ نے اس کو اقتدار عطا کیا ہے اُن پر اس کا قابو اسی وقت تک چلتا ہے جب تک اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے مسخر رہیں۔ ورنہ جب مرضیِ الٰہی کچھ اور ہوتی ہے تو وہی طاقتیں جو انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، اچانک اس پر پلٹ پڑتی ہیں اور آدمی اپنے آپ کو ان کے سامنے بالکل بے بس پاتا ہے۔ اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بحری سفر کے معاملے کو محض بطورِ نمونہ پیش کیا ہے۔ نوعِ انسانی پوری کی پوری طوفان میں ختم ہو جاتی اگر اللہ تعالیٰ کشتی بنانے کا طریقہ حضرت نوحؑ کو نہ سُجھا دیتا اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ اس میں سوار نہ ہو جاتے۔ پھر نوعِ انسانی کے لیے تمام رُوئے زمین پر پھیلنا اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اللہ سے کشتی سازی کے اُصولوں کا علم پا کر لوگ دریاؤں اور سمندروں کو عُبور کرنے کے لائق ہو گئے۔ مگر اُس ابتدا سے چل کر آج کے عظیم الشان جہازوں کی تعمیر تک انسان نے جتنی کچھ ترقی کی ہے اور جہاز رانی کے فن میں جتنا کچھ بھی کمال حاصل کیا ہے اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دریا اور سمندر، سب اس کے قابو میں آ گئے ہیں اور ان پر اسے مکمل غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ آج بھی خدا کا پانی خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور جب وہ چاہتا ہے انسان کو اُس کے جہازوں سمیت اس میں غرق کر دیتا ہے۔

۴۱ – یعنی جو تم سے پہلے کی قومیں دیکھ چکی ہیں۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا
صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً
وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ

یہ[۴۴] لوگ کہتے ہیں کہ "یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو[۴۵]۔" دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکا ہے جو یکایک اِنھیں عین اُس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دُنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے، اور اُس وقت یہ وصیّت تک نہ کر سکیں گے، نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے[۴۶]۔ ع پھر ایک صُور پھُونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے

۴۲ - آیات سے مراد کتاب اللہ کی آیات بھی ہیں جن کے ذریعے سے انسانوں کو نصیحت کی جاتی ہے، اور وہ آیات بھی مراد ہیں جو آثارِ کائنات اور خود انسان کے وجود اور اس کی تاریخ میں موجود ہیں جو انسان کو عبرت دلاتی ہیں، بشرطیکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو۔

۴۳ - اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کفر نے صرف ان کی عقل ہی اندھی نہیں کی ہے بلکہ ان کی اَخلاقی حِس کو بھی مُردہ کر دیا ہے۔ وہ نہ خدا کے بارے میں صحیح تفکُّر سے کام لیتے ہیں، نہ خلق کے ساتھ صحیح طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہر نصیحت کا الٹا جواب ہے۔ ہر گمراہی اور بداَخلاقی کے لیے ایک اَوندھا فلسفہ ہے۔ ہر بھلائی سے فرار کے لیے ایک گھڑا گھڑایا بہانہ موجود ہے۔

۴۴ - توحید کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان نزاع برپا تھی وہ آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے متعلق عقلی دلائل تو آگے چل کر خاتمۂ کلام پر دیے گئے ہیں، مگر دلائل دینے سے پہلے یہاں اس مسئلے کو لے کر عالَمِ آخرت کا ایک عبرتناک نقشہ اُن کے سامنے کھینچا گیا ہے تاکہ انھیں یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ انکار کر رہے ہیں وہ ان کے انکار سے ٹلنے والی نہیں ہے، بلکہ لامحالہ ایک روز اِن حالات سے انھیں دوچار ہونا ہے۔

۴۵ - اس سوال کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ لوگ فی الواقع قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اگر مثلاً ان کو یہ بتا دیا جاتا کہ وہ فُلاں سنہ میں فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو پیش آئے گی تو ان کا شک رفع ہو جاتا اور وہ اسے مان لیتے۔ دراصل اس طرح کے سوالات وہ محض کج بحثی کے لیے چیلنج کے انداز میں کرتے تھے اور اُن کا مدعا یہ کہنا تھا کہ کوئی قیامت ویامت نہیں آنی ہے، تم خواہ مخواہ ہمیں اس کے ڈراوے دیتے ہو۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ قیامت فلاں روز آئے گی، بلکہ انھیں یہ بتایا گیا کہ وہ آئے گی اور اس شان سے آئے گی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمۡ يَنۡسِلُوۡنَ ۝۵۱ قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ
مَّرۡقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۝۵۲ اِنۡ
كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ۝۵۳

وقف لازم
وقف غفران
وقف منزل

کے لیے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔[47] گھبرا کر کہیں گے: "ارے، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھا کھڑا کیا؟"[48] ـــــ "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچّی تھی۔"[49] ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔

۴۶ - یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ قیامت آہستہ آہستہ آ رہی ہے اور لوگ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آ رہی ہے۔ بلکہ وہ اس طرح آئے گی کہ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کے کاروبار چلا رہے ہیں اور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ تصور موجود نہیں ہے کہ دنیا کے خاتمے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اس حالت میں اچانک ایک زور کا کڑا کا ہوگا اور جو جہاں تھا وہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

حدیث میں حضرت عبداللہ بن عَمروؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ راستوں پر چل رہے ہوں گے، بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے، اپنی مجلسوں میں بیٹھے گفتگوئیں کر رہے ہوں گے۔ ایسے میں یکایک صُور پھونکا جائے گا۔ کوئی کپڑا خرید رہا تھا تو ہاتھ سے کپڑا رکھنے کی نوبت نہ آئے گی کہ ختم ہو جائے گا۔ کوئی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے حوض بھرے گا اور ابھی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ کوئی کھانا کھانے بیٹھے گا اور لقمہ اُٹھا کر منہ تک لے جانے کی بھی اسے مہلت نہ ملے گی۔

۴۷ - صُور کے متعلق تفصیلی کلام کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ پہلے صُور اور دوسرے صُور کے درمیان کتنا زمانہ ہوگا، اس کے متعلق کوئی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زمانہ سیکڑوں اور ہزاروں برس طویل ہو۔ حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اسرافیلؑ صُور پر منہ رکھے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پھونک مارنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخة الفَزَع، جو زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو سہما دے گا۔ دوسرا نفخة الصَّعق جسے سنتے ہی سب ہلاک ہو کر گر جائیں گے۔ پھر جب اللہ واحد صمد کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا تو زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی اور اسے عُکاظی بِساط کی طرح ایسا سپاٹ کر دیا جائے گا کہ اس میں کوئی ذرا سی سِلوٹ تک نہ رہے گی۔ پھر اللہ اپنی خلق کو بس ایک جھڑکی دے گا جسے سنتے ہی ہر شخص جس جگہ مر کر گرا تھا اسی جگہ وہ اس بدلی ہوئی زمین پر اٹھ کھڑا ہوگا، اور یہی نفخة القیام لربّ العالمین ہے۔ اسی مضمون کی تائید قرآنِ مجید کے بھی متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۵۶-۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۲-۸۳۔

۴۸ - یعنی اُس وقت انھیں یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب ایک مدتِ دراز کے بعد دوبارہ زندہ کر کے

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ
اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ
عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾
سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾
اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ

آج کسی پر[۵۰] ذرّہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمھیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے رہے تھے ـــــ آج جنّتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں[۵۱]، وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں مَسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں اُن کے لیے حاضر ہے، ربِّ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے ـــــ اور اَے مجرمو! آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ[۵۲]۔ آدم کے بچو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمھارا

اٹھائے گئے ہیں، بلکہ وہ اس خیال میں ہوں گے کہ ہم سوئے پڑے تھے، اب یکایک کسی خوفناک حادثے کی وجہ سے ہم جاگ اٹھے ہیں اور بھاگے جا رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۱۸، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸)

۴۹ – یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ جواب دینے والا کون ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر بعد خود انھی لوگوں کی سمجھ میں معاملے کی اصل حقیقت آجائے اور وہ آپ ہی اپنے دلوں میں کہیں کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر خدا کے رسول ہمیں دیتے تھے اور ہم اسے جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ ایمان ان کی غلط فہمی رفع کریں اور ان کو بتائیں کہ یہ خواب سے بیداری نہیں بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جواب قیامت کا پورا ماحول ان کو دے رہا ہو، یا فرشتے ان کو حقیقتِ حال سے مُطّلع کریں۔

۵۰ – یہ وہ خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین اور فُسّاق و مجرمین سے اُس وقت فرمائے گا جب وہ اُس کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

۵۱ – اس کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صالح اہلِ ایمان میدانِ حشر میں روک کر نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ابتدا ہی میں ان کو بلا حساب، یا ہلکی حساب فہمی کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا، کیونکہ ان کا ریکارڈ صاف ہوگا۔ انھیں دورانِ عدالت میں انتظار کی تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں جواب دہی کرنے والے

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف غفران

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾

کُھلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے؟[۵۳]

مجرموں کو بتائے گا کہ دیکھو، جن صالح لوگوں کو تم دنیا میں بے وقوف سمجھ کر ان کا مذاق اُڑاتے تھے، وہ اپنی عقلمندی کی بدولت آج جنت کے مزے لُوٹ رہے ہیں، اور تم جو اپنے آپ کو بڑا زیرک و فرزانہ سمجھ رہے تھے، یہاں کھڑے اپنے جرائم کی جواب دِہی کر رہے ہو۔

۵۲ – اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ مومنین صالحین سے الگ ہو جاؤ، کیونکہ دنیا میں چاہے تم ان کی قوم اور ان کے کنبے اور برادری کے لوگ رہے ہو، مگر یہاں اب تمھارا ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں ہے۔ اور دوسرا مفہوم یہ کہ تم آپس میں الگ الگ ہو جاؤ۔ اب تمھارا کوئی جتھا قائم نہیں رہ سکتا۔ تمھاری سب پارٹیاں توڑ دی گئیں۔ تمھارے تمام رشتے اور تعلقات کاٹ دیے گئے۔ تم میں سے ایک ایک شخص کو اب تنہا اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

۵۳ – یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے ”عبادت“ کو اطاعت کے معنیٰ میں استعمال فرمایا ہے۔ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدد مقامات پر اس مضمون کی تشریح کر چکے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ: ۱۷۰ النساء، حاشیہ ۱۴۵، الانعام، حاشیہ، ۸۷-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱، ابراہیم، حاشیہ ۳۲۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰۔ مریم: حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳) اس سلسلہ میں وہ نفیس بحث بھی قابلِ مُلاحظہ ہے جو اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ کے معنیٰ ہیں: لَا تُطِيْعُوْهُ (اس کی اطاعت نہ کرو۔) اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو محض سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرنا بھی ممنوع ہے۔ لہٰذا طاعت عبادت ہے۔“ اس کے بعد امام صاحب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر عبادت بمعنیٰ طاعت ہے تو کیا آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ میں ہم کو رسول اور اُمرا کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ: ”ان کی اطاعت، جب کہ اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اسی کی اطاعت ہوگی۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور یہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ تھی۔ امرا کی اطاعت ان کی عبادت صرف اُس صورت میں ہوگی جب کہ ایسے معاملات میں اُن کی اطاعت کی جائے جن میں اللہ نے ان کی اطاعت کا اِذن نہیں دیا ہے۔“ پھر فرماتے ہیں: ”اگر کوئی شخص تمھارے سامنے آئے اور تمھیں کسی چیز کا حکم دے تو دیکھو کہ اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں۔ موافق نہ ہو تو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے شیطان کی عبادت کی۔ اسی طرح اگر تمھارا نفس تمھیں کسی کام کے کرنے پر اُکسائے تو دیکھو کہ شرع کی رُو سے وہ کام کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اجازت نہ ہو تو تمھارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ ہے۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم اس کی عبادت کے مرتکب ہوئے۔“ آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں: ”مگر شیطان کی عبادت کے مراتب مختلف ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضا کے ساتھ اس کی زبان بھی اس کی مُوافقت کرتی ہے اور دل بھی اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعضا و جوارح سے تو آدمی ایک کام

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۲
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۶۳ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۶۴ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ
اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۶۵

مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہِ کثیر کو گمراہ کر دیا۔[۵۴] کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنّم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا۔ جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اُس کی پاداش میں اب اِس کا ایندھن بنو۔

آج ہم اِن کے منہ بند کیے دیتے ہیں، اِن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔[۵۵]

کرتا ہے مگر دل اور زبان اس کام میں شریک نہیں ہوتے۔ بعض لوگ ایک گناہ کا ارتکاب اس حال میں کرتے ہیں کہ دل اُن کا اس پر راضی نہیں ہوتا اور زبان ان کی اللہ سے مغفرت کر رہی ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم یہ بُرا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض ظاہری اعضا سے شیطان کی عبادت ہے۔ کچھ اور لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹھنڈے دل سے جرم کرتے ہیں اور زبان سے بھی اپنے اس فعل پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرتے ہیں...... یہ ظاہر و باطن دونوں میں شیطان کے عابد ہیں۔" (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵۴ - یعنی اگر تم عقل سے محروم رکھے گئے ہوتے اور پھر اپنے رب کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی بندگی کرتے تو تمھارے لیے عذر کی کوئی گنجایش تھی۔ لیکن تمھارے پاس تو خدا کی دی ہوئی عقل موجود تھی جس سے تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے تھے، اور تمھیں خدا نے پیغمبروں کے ذریعے سے مُتنبّہ بھی کر دیا تھا۔ اس پر بھی جب تم اپنے دشمن کے فریب میں آئے اور وہ تمھیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اپنی اس حماقت کی ذمہ داری سے تم کسی طرح بَری نہیں ہو سکتے۔

۵۵ - یہ حکم اُن ہیکڑ مجرموں کے معاملے میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامۂ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اچھا، اپنی بکواس بند کرو، اور دیکھو کہ تمھارے اپنے اعضائے بدن تمھارے کرتوتوں کی کیا روداد سناتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں صرف ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ مگر دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں اور ان کے جسم کی کھالیں بھی پوری داستان سنا دیں گی کہ وہ ان سے کیا کام لیتے رہے ہیں: يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى
يُبْصِرُوْنَ۝ وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا
مُضِيًّا وَّ لَا يَرْجِعُوْنَ۝ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا

ع ۴

ہم چاہیں تو اِن کی آنکھیں مُوند دیں، پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں، کہاں سے اِنھیں راستہ سُجھائی دے گا؟ ہم چاہیں تو اِنھیں اِن کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں۔[56] ع جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی ساخت کو ہم اُلٹ ہی دیتے ہیں[57]، کیا (یہ حالات دیکھ کر)

وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (النور، آیت ۲۴) حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (حٰمٓ السجدہ، آیت ۲۰) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سورۂ نور کی آیت میں فرماتا ہے کہ ان کی زبانیں گواہی دیں گی، اِن دونوں باتوں میں تطابُق کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مراد ان کا اختیارِ کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ ان کی زبانیں خود یہ داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ ہم سے اِن ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کفر بکے تھے، کیا کیا جھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے، اور کس کس موقع پر انھوں نے ہمارے ذریعے سے کیا باتیں کی تھیں۔

۵۶ – قیامت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اب انھیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ قیامت تو خیر تمھیں دُور کی چیز نظر آتی ہے، مگر ذرا ہوش میں آ کر دیکھو کہ خود اِس دنیا میں، جس کی زندگی پر تم پھولے ہوئے ہو، تم کس طرح اللہ کے دستِ قدرت میں بے بس ہو۔ یہ آنکھیں جن کی بینائی کے طفیل تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے ہو، اللہ کے ایک اشارے سے اندھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹانگیں جن کے بل پر تم یہ ساری دَوڑ دھوپ دکھا رہے ہو، اللہ کے ایک حکم سے ان پر اچانک فالج گر سکتا ہے۔ جب تک اللہ کی دی ہوئی یہ طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں، تم اپنی خودی کے زَعم میں مدہوش رہتے ہو، مگر جب ان میں سے کوئی ایک طاقت بھی جواب دے جاتی ہے تو تمھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تمھاری بساط کتنی ہے۔

۵۷ – ساخت اُلٹ دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑھاپے میں آدمی کی حالت بچوں کی سی کر دیتا ہے۔ اُسی طرح وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتا ہے۔ اُسی طرح دوسرے اُسے اُٹھاتے بٹھاتے اور سہارا دے کر چلاتے ہیں۔ اُسی طرح دوسرے اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اُسی طرح وہ اپنے کپڑوں میں اور اپنے بستر پر رفعِ حاجت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح وہ ناسمجھی کی باتیں کرتا

يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَ مَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَ مَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهٗ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ
وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الۡقَوۡلُ
عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَيۡدِيۡنَاۤ
اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ
وَ مِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ

انھیں عقل نہیں آتی؟

ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔[۵۸] یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو[۵۹] اور انکار کرنے والوں پر حُجّت قائم ہو جائے۔

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں[۶۰] میں سے اِن کے لیے مویشی پیدا کیے، اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے انھیں اس طرح اِن کے بس میں کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں، کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں، اور اُن کے اندر اِن کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔

ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں۔ غرض جس کمزوری کی حالت سے اس نے دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا، اختتامِ زندگی پر وہ اسی حالت کو پہنچ جاتا ہے۔

۵۸ – یہ اس بات کا جواب ہے کہ کفار توحید و آخرت اور زندگی بعد موت اور جنت و دوزخ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو محض شاعری قرار دے کر اپنے نزدیک بے وزن ٹھیرانے کی کوشش کرتے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۴۲)

۵۹ – زندہ سے مراد سوچنے اور سمجھنے والا انسان ہے، جس کی حالت پتھر کی سی نہ ہو کہ آپ اس کے سامنے خواہ کتنی ہی معقولیت کے ساتھ حق اور باطل کا فرق بیان کریں اور کتنی ہی دردمندی کے ساتھ اس کو نصیحت کریں، وہ نہ کچھ سنے، نہ سمجھے اور نہ اپنی جگہ سے سرکے۔

۶۰ – "ہاتھوں" کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور اِستِعارہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذ اللہ!

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

وقف لازم

پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے؟[۶۱] یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اِنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اِن کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اُلٹے اُن کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔[۶۲] اچھا، جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمھیں رنجیدہ نہ کریں، اِن کی چُھپی اور کُھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔[۶۳]

وہ ذاتِ پاک جسم رکھتی ہے اور انسانوں کی طرح ہاتھوں سے کام کرتی ہے۔ بلکہ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے، ان کی تخلیق میں کسی دوسرے کا ذرّہ برابر دخل نہیں ہے۔

۶۱ - نعمت کو مُنعِم کے سوا کسی اور کا عطیّہ سمجھنا، اس پر کسی اور کا احسان مند ہونا، اور مُنعِم کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی اُمید رکھنا یا نعمت طلب کرنا، یہ سب کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ آدمی مُنعِم کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ لہٰذا ایک مشرک اور کافر اور منافق اور فاسق انسان، محض زبان سے شکر کے الفاظ ادا کر کے خدا کا شاکر بندہ قرار نہیں پا سکتا۔ کفارِ مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ اِن جانوروں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں دوسرے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ مگر یہ سب کچھ ماننے کے باوجود جب وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر اپنے معبودوں کے شکریے بجا لاتے اور ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے اور ان سے مزید نعمتوں کی دعائیں مانگتے اور ان کے لیے قربانیاں کرتے تھے تو خدا کے لیے ان کا زبانی شکر بالکل بے معنٰی ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو کافرِ نعمت اور احسان فراموش قرار دے رہا ہے۔

۶۲ - یعنی وہ جھوٹے معبُود بے چارے خود اپنی بقا اور اپنی حفاظت اور اپنی ضروریات کے لیے ان عبادت گزاروں کے محتاج ہیں۔ یہ ان کے لشکر نہ ہوں تو اُن غریبوں کی خدائی ایک دن نہ چلے۔ یہ اُن کے حاضر باش غلام بنے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کی بارگاہیں بنا اور سجا رہے ہیں۔ یہ اُن کے لیے پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ یہ خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ بناتے ہیں۔ یہ ان کی حمایت میں لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ تب کہیں اُن کی خدائی چلتی ہے۔ ورنہ ان کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو۔ وہ اصلی خدا نہیں ہیں کہ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے، وہ اپنے زور پر آپ ساری کائنات کی فرماں روائی کر رہا ہے۔

۶۳ - خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور کُھلی اور چُھپی باتوں کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار جو آپؐ کے خلاف جھوٹ کے طوفان اٹھا رہے تھے، وہ اپنے دلوں میں جانتے، اور اپنی نجی محفلوں میں مانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ سراسر بے اصل ہیں۔ وہ لوگوں کو آپؐ کے خلاف بدگمان کرنے کے لیے آپؐ کو شاعر،

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ

کیا[64] انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟[65] اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے[66] اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔[67] کہتا ہے "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا

کاہن، ساحر، مجنون اور نہ معلوم کیا کیا کہتے تھے، مگر خود ان کے ضمیر اس بات کے قائل تھے، اور آپس میں وہ ایک دوسرے کے سامنے اقرار کرتے تھے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو محض آپؐ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے وہ گھڑ رہے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی بے ہودہ باتوں پر رنجیدہ نہ ہو۔ سچائی کا مقابلہ جھوٹ سے کرنے والے آخر کار اس دنیا میں بھی ناکام ہوں گے اور آخرت میں بھی اپنا بُرا انجام دیکھ لیں گے۔

۶۴ — اب کفار کے اُس سوال کا اِستدلالی جواب دیا جا رہا ہے جو آیت ۴۸ میں نقل کیا گیا تھا۔ اُن کا یہ سوال کہ "قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی" کچھ اس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ مرنے کے بعد انسانوں کے دوبارہ اُٹھائے جانے کو بعید از امکان، بلکہ بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے سوال کے جواب میں اِمکانِ آخرت کے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں۔

ابنِ عباسؓ، قتادہؒ اور سعید بن جُبیرؒ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ کے سرداروں میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لیے ہوئے آ گیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزا ہوا میں اُڑا کر آپؐ سے کہا: اے محمدؐ! تم کہتے ہو کہ مُردے پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اس کا جواب فوراً ان آیات کی صورت میں دیا گیا۔

۶۵ — یعنی وہ نطفہ جس میں محض ایک ابتدائی جرثومۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا، اس کو ترقی دے کر ہم نے اِس حد تک پہنچایا کہ وہ نہ صرف جانوروں کی طرح چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں شعور و تعقّل اور بحث و اِستدلال اور تقریر و خطابت کی وہ قابلیتیں پیدا ہو گئیں جو کسی حیوان کو نصیب نہیں ہیں، حتیٰ کہ اب وہ اپنے خالق کے بھی منہ آنے لگا ہے۔

۶۶ — یعنی ہمیں مخلوقات کی طرح عاجز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس طرح انسان کسی مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا، اُسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔

۶۷ — یعنی یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادّہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اس جرثومے کو پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ هِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾ قُلۡ یُحۡیِیۡهَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ
بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ﴿۷۹﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ
نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡهُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾ اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ۟ بَلٰی ٭ وَ هُوَ
الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ
کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ
وَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ ع

وقف غفران

ع ۵ ۱۲ ۴

جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" اس سے کہو: انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انھیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چُولھے روشن کرتے ہو۔[۶۸] کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اِس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جب کہ وہ ماہر خلّاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ ع

---

۶۸ - یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہرے بھرے درختوں میں وہ آتش گیر مادّہ رکھا ہے جس کی بدولت تم لکڑیوں سے آگ جلاتے ہو۔ یا پھر یہ اشارہ ہے مَرخ اور عَفار نامی اُن دو درختوں کی طرف جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو لے کر اہلِ عرب ایک دوسرے پر مارتے تھے تو ان سے آگ جھڑنے لگتی تھی۔ قدیم زمانے میں عرب کے بدو آگ جلانے کے لیے یہی چقماق استعمال کیا کرتے تھے اور ممکن ہے آج بھی کرتے ہوں۔

تفہیم القرآن

الصّٰفّٰت

(۳۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

الصّافّات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ وَالصّٰفّٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول مضامین اور طرزِ کلام سے مُترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکّی دَور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ متوسّط کے بھی آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبی و اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزا کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپؐ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدّت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفارِ مکہ کو نہایت پُرزور طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انھیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبرؐ، جس کا تم مذاق اُڑا رہے ہو، تمھارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آ جائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اُترا ہوا پاؤ گے۔ (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰-۵۰ صحابہؓ مکے میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ اِن حالات میں ظاہر اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخرِ کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت کو نصیب ہوگا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آ گیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر مختصر دل نشین دلائل دیے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، ان گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے نتائج کس قدر شان دار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاؑ کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے۔ کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اِکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سُنا کر انھیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے، اور اُسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وحمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انھیں یہ آیات سُنا کر خوش خبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انھیں سابقہ پیش آ رہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخرِ کار غلبہ انھی کو نصیب ہوگا، اور باطل کے وہ عَلَم بردار جو اِس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انھی کے ہاتھوں مغلوب ومفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی تسلّی نہ تھی، بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۱۸۲ ركوعاتہا ۵

سُوْرَۃُ الصّٰٓفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

المنزل ۶

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۳﴾
اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم! پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم
جو کلامِ نصیحت سنانے والے ہیں[۱]، تمھارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے[۲] ــــــ وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور

۱ - مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبداللہؓ بن مسعود، ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، مسروقؒ، سعید بن جُبیرؒ، عکرِمہؒ، مجاہدؒ، سُدّیؒ، ابنِ زیدؒ اور ربیعؒ بن اَنس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں ''قطار در قطار صف باندھنے'' کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے، جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں: وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔

''ڈانٹنے اور پھٹکارنے'' سے مراد بعض مفسرین کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ مفہوم بھی غلط نہیں ہے، لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار صرف لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانوں پر وہ حوادثِ طبیعی اور آفاتِ تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

''کلامِ نصیحت سنانے'' سے مراد یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امرِ حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادثِ زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اُن تعلیمات کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعے سے انبیاؑ پر نازل ہوتی ہیں، اور ان اُلہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۲ - یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے بُرے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاددہانی مختلف طریقوں سے کرائی جارہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا ''اِلٰہ'' صرف

مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾

تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں[۳] کا مالک[۴]۔
ہم نے آسمانِ[۵] دُنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے[۶]۔

ایک ہی ہے۔

''الٰہ'' کے لفظ کا اِطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ایک، وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے، وہ معبود جو فی الحقیقت اِس کا مستحق ہو کہ اُس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنٰی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ''الٰہ'' کا ترجمہ ''معبودِ حقیقی'' کیا ہے۔

۳– سورج ہمیشہ ایک ہی مَطلَع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طُلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طُلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (المعارج: ۴۰)

۴– ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرماں روا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مُربّی و پروردگار) کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اَور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اُس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلافِ عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں، تو وہ نہ اِس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے آگے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انھی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔

۵– آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دُور بین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالَم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝٨ دُحُوْرًا
وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝٩ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ
ثَاقِبٌ ۝١٠ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ

یہ شیاطین مَلاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔[۷]

اب اِن سے پُوچھو، ان کی پیدایش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟[۸]

نہیں ہوئی ہے، وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ "سماء" کسی متعیّن چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اُس کے ہم معنیٰ الفاظ عالَمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

۶ – یعنی عالَمِ بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خِطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور ہر سیّارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (Sphere) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد وحساب خِطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گُوناگوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسایے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جنّوں کے لیے بھی عالَمِ بالا کی طرف صُعُود کرنے میں مانع ہیں۔

۷ – اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا۔ جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رُجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انھیں ہر طرح کی خبریں لا لا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپؐ نے قرآنِ مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آیندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپؐ کے مخالفین نے فوراً آپؐ کے اُوپر کاہن کی پھبتی کس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالَمِ بالا سے کچھ سُن گُن لے کر ان کے پاس آ جاتا ہے اور یہ اُسے وحیِ الٰہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا
ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔[9] تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں

عالَم بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اِس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاء اعلیٰ (یعنی گروہِ ملائکہ) کی باتیں سُن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بِھنک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اُسے لے کر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اُس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲)

۸ – یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمھارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمھارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمھاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

۹ – یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔

لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانِ اوّل کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اُسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادّۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزا سے مُرکّب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخرِ کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بِنائے اِستدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمھارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمھاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا
وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ
وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ
الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ع

اور کہتے ہیں: ''یہ تو صریح جادو ہے[۱۰]، بھلا کہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟'' ان سے کہو: ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو[۱۱]۔

بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں[۱۲] گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے ـــــ ''یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے[۱۳] تھے۔''ع (حکم ہوگا:) گھیر لاؤ سب ظالموں[۱۴] اور ان کے ساتھیوں[۱۵]

---

۱۰ - یعنی عالمِ طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مُردے اُٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

۱۱ - یعنی اللہ جو کچھ بھی تمھیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمھیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔

۱۲ - یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ ''جھڑکی'' کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اس سے بَعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے: ''اُٹھ جاؤ'' اور بس آن کی آن میں وہ سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ
الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ عٰ
بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

اور اُن معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے،[16] پھر ان سب کو جہنّم کا راستہ دکھاؤ، اور ذرا انھیں ٹھیراؤ، اِن سے کچھ پوچھنا ہے۔ ”کیا ہو گیا تمھیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ ارے، آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں![17]“ اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف

۱۳ – ہوسکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہلِ ایمان کہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہوسکتا ہے کہ میدانِ حشر کا سارا ماحول اُس وقت زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خود انھی لوگوں کا دوسرا ذہن ہو، یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطَب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے۔ اب آ گئی تمھاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آ گیا۔

۱۴ – ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اِصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت وسرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

۱۵ – اصل میں لفظ ”اَزْوَاجٌ“ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہوسکتی ہیں جو اُن کی بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو انھی کی طرح باغی وسرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

۱۶ – اس جگہ معبودوں سے مراد دو قسم کے معبود ہیں: ایک، وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کریں۔ دوسرے، وہ اصنام اور شجر وحجر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انھیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنّم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انھیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنھیں دنیا میں پُوجا تو گیا ہے، مگر خود ان کا اپنا ایما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیا اور اولیا۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ اُن معبودوں میں شامل نہ ہوں گے جنھیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنّم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۷ – پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔ اور دوسرا فقرہ اُن عام حاضرین کی طرف رُخ کر کے کہا جائے گا جو اُس وقت جہنّم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اُس وقت [illegible] ہوگی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾
قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ
رَبِّنَآ ۤۖ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

مُڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے: "تم ہمارے پاس سیدھے رُخ سے آتے تھے۔[18]" وہ جواب دیں گے: "نہیں، بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ آخر کار ہم اپنے رب کے اِس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے۔[19]"

بڑے بڑے ہیکڑ مجرمین کے کَس بَل نکلے چکے ہوں گے اور کسی مُزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنّم کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہوں گے اور درباریوں میں سے کوئی "اعلیٰ حضرت" کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتحِ عالَم اور کوئی ڈکٹیٹر انتہائی ذلّت کے ساتھ چلا جا رہا ہوگا اور اس کا لشکرِ جرّار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دے گا۔ کہیں کوئی پِیر صاحب یا گُرو جی یا ہولی فادر واصلِ بجہنم ہو رہے ہوں گے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہوگی کہ حضرتِ والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کَس مپرسی کے عالَم میں جہنّم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اُٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں اُن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انھیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہو گی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں، وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے، اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غُرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبّر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ "تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے۔" یمین کا لفظ عَرَبی زبان میں متعدّد مفہومات کے لیے ... بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لیے ہم تمھارے فریب میں آ گئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝۳۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ
بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝۳۴ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ
يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۳۵ۙ وَيَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُوْنٍ ۝۳۶ۭ بَلْ جَاۗءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳۷ اِنَّكُمْ
لَذَاۗىِٕقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝۳۸ۚ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۳۹ۙ
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴۱ۙ

اِس طرح وہ سب اُس روز عذاب میں مشترک ہوں گے[۲۰]۔ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا: ”اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے“ تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے: ”کیا ہم ایک شاعرِ مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟“ حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی[۲۱]۔ (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو۔ اور تمھیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انھی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجامِ بد سے) محفوظ ہوں گے۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے[۲۲]،

۱۹ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حواشی ۵۱-۵۲-۵۳۔

۲۰ – یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیرووں کا یہ عذر مسموع ہوگا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انھیں گمراہ کیا گیا تھا۔ اور نہ پیشواؤں کی اِس معذرت کو قبول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہِ راست کے طالب نہ تھے۔

۲۱ – رسولوں کی تصدیق کے تین معنی ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک، یہ کہ اُس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اُس رسول کے ماننے والوں کے لیے اُس کے خلاف تعصّب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ تیسرے، یہ کہ وہ اُن تمام خبروں کا صحیح مصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اُس کے بارے میں دی تھیں۔

۲۲ – یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جاچکی ہیں، جس کے ملنے کا انھیں یقین ہے، جس کے متعلق انھیں یہ بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَوَاكِهُ ۚ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ

ہر طرح کی لذیذ چیزیں،[23] اور نعمت بھری جنتوں میں وہ عزت سے رکھے جائیں گے، تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ شراب[24] کے چشموں[25] سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے[26]، چمکتی ہوئی شراب،

اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لاحق نہیں ہے کہ کیا خبر، ملے یا نہ ملے۔

۲۳ – اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزا کی جگہ دوسرے اجزا غذا کے ذریعے سے فراہم کیے جائیں، کیونکہ اُس اَبدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہوں گے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے، اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لیے ”فواکہ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کے بجائے تلذُّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

۲۴ – اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے، بلکہ صرف کأس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عَرَبی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو، اسے کأس نہیں کہتے۔ کأس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

۲۵ – یعنی وہ شراب اُس قسم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلّوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ قُدرتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۂ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:
وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ۔ ”اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہوں گی۔“

۲۶ – یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کرے گا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے: وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ”اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ان کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چھپے ہوئے موتی۔“ (الطور، آیت ۲۴) وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ”اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیے گئے ہیں۔“ (الدہر، آیت ۱۹) اس کی مزید تفصیل حضرت انسؓ اور حضرت سمرۃ بن جُندب کی اُن روایات میں ملتی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ ”مشرکین کے بچے اہلِ جنت کے خادم ہوں گے۔“ (ابوداؤد طیالسی، طبرانی، بزار) یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سنِ رُشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین جنتی ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ۚ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝
وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝ۙ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ۝
فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ

جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔[۲۷] اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی،[۲۸] خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی،[۲۹] ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی۔[۳۰]

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا:

اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنتی نہ ہوں گے۔ سو اُن کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جنت کے خادم بنا دیے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری اور عُمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ رسائل و مسائل، جلد سوم، ص ۱۷۷ تا ۱۸۷)

۲۷ - یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبُو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اُترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دَورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو مُتاثّر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اس کے بُرے اثرات مُترتّب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اترتا ہے تو آدمی خُمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اَول فَول بکتا ہے اور عَرْبدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سُرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کی شراب میں سُرور تو پوری طرح ہوگا (لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ)، لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

۲۸ - یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

۲۹ - بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں نابالغی کی حالت میں مر گئیں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہل جنت کی خدمت کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہل جنت کے لیے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۰ - اصل الفاظ ہیں كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ "گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں۔" ان الفاظ

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا
مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ
مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ
كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ﴿۵۶﴾ وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۵۷﴾
اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۵۹﴾

"دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا: کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟[۳۱] کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹّی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟" یہ کہہ کر جونہی وہ جُھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا: "خدا کی قسم! تُو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔[۳۲] اچھا، تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی، وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا؟"[۳۳]

کی مختلف تعبیرات اہل تفسیر نے بیان کی ہیں۔ مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضورؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اُس جھلی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گُودے کے درمیان ہوتی ہے۔ (ابن جریر)

۳۱ – یعنی تم بھی کیسے ضعیف الاعتقاد نکلے کہ زندگی بعدِ موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھے۔

۳۲ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کی سماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمانے کی ہوگی۔ جنت میں بیٹھا ہوا ایک آدمی جب چاہتا ہے کہ کسی دیکھنے کے آلے کے بغیر بس یونہی جھک کر ایک ایسے شخص کو دیکھ لیتا ہے جو اس سے نہ معلوم کتنے ہزار میل کے فاصلے پر جہنم میں مبتلائے عذاب ہے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان کسی ٹیلیفون یا ریڈیو کے توسط کے بغیر براہِ راست کلام بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے طویل فاصلے سے بات کرتے ہیں اور ایک دوسرے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾
اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً
لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ
رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ

یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زَقّوم[۳۴] کا درخت؟ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے[۳۵]۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر[۳۶]۔ جہنّم کے لوگ اُسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد

کی بات سُنتے ہیں۔

۳۳- اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ اپنے اُس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنّتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت واستعجاب اور وفورِ مسرّت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اِس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطَب نہیں ہوتا، اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنّتی شخص اُس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کُلفتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مجھے حیاتِ جاوداں نصیب ہو چکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اُٹھتا ہے: کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں؟

۳۴- زقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزا اس کا تلخ ہوتا ہے، بُو ناگوار ہوتی ہے، اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رَس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

۳۵- یعنی منکرین یہ بات سُن کر قرآن پر طعن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزا کا ایک نیا موقع پا لیتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۝٦٨ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ
ضَآلِّيْنَ ۝٦٩ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ۝٧٠ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ
اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٧١ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝٧٢
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝٧٣ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ۝٧٤ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝٧٥ وَنَجَّيْنٰهُ ع

ان کی واپسی اُسی آتشِ دوزخ کی طرف[37] ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انھی کے نقشِ قدم پر دوڑ چلے[38]۔ حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور اُن میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ اُن تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنھیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔ ع

ہم کو[39] (اس سے پہلے) نوحؑ نے پکارا تھا[40]، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے

وہ اس پر ٹھٹھا مار کر کہتے ہیں: لو اب نئی سنو، جہنّم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اُگے گا۔

۳۶– کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زقّوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ دراصل یہ تخیلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر ہر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوب صورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں: وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں: وہ چڑیل ہے یا بُھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے: وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئتِ کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

۳۷– اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ جب بھوک پیاس سے بے تاب ہونے لگیں گے تو انھیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زقّوم کے درخت اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہو جائیں گے تو انھیں دوزخ کی طرف واپس لایا جائے گا۔

۳۸– یعنی انھوں نے خود اپنی عقل سے کام لے کر کبھی نہ سوچا کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہ دُرست بھی ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر ہولیے جس پر دوسروں کو چلتے دیکھا۔

۳۹– اس مضمون کا تعلق پچھلے رُکوع کے آخری فقروں سے ہے۔ ان پر غور کرنے سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قصّے

وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝۷۶ وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ
الْبٰقِيْنَ ۝۷۷ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۷۸ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ
فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۹ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۰ اِنَّهٗ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۱ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝۸۲ وَ اِنَّ
مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝۸۳ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝۸۴ اِذْ

وقف لازم

اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے بچالیا[41]، اور اسی کی نسل کو باقی رکھا[42]، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں[43]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔ اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا[44]۔ جب

یہاں کس غرض سے سنائے جا رہے ہیں۔

۴۰ - اس سے مراد وہ فریاد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے مدت ہائے دراز تک اپنی قوم کو دعوتِ دینِ حق دینے کے بعد آخر کار مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس فریاد کے الفاظ سورۂ قمر میں اس طرح آئے ہیں: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، ''اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب تو میری مدد کو پہنچ۔'' (آیت ۱۰)

۴۱ - یعنی اُس شدید اذیّت سے جو ایک بدکردار اور ظالم قوم کی مسلسل مخالفت سے اُن کو پہنچ رہی تھی۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اُس کربِ عظیم سے بچایا گیا، اسی طرح آخرِ کار ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو بھی اِس کربِ عظیم سے بچالیں گے جس میں اہلِ مکہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

۴۲ - اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ جو لوگ حضرت نوحؑ کی مخالفت کر رہے تھے ان کی نسل دنیا سے ناپید کر دی گئی اور حضرت نوحؑ ہی کی نسل باقی رکھی گئی۔ دوسرے، یہ کہ تمام نسلِ انسانی ختم کر دی گئی اور آگے صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد سے دنیا آباد کی گئی۔ عام طور پر مفسرین نے اِسی دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے، مگر قرآنِ مجید کے الفاظ اس معنی میں صریح نہیں ہیں، اور حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۴۳ - یعنی آج دنیا میں حضرت نوحؑ کی بُرائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد سے آج تک ہزارہا برس سے دنیا ان کا ذکرِ خیر ہی کر رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ
اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً
فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا:[45] ”یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبُود چاہتے ہو؟ آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟“[46]
پھر[47] اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی[48] اور کہا: میری طبیعت خراب ہے۔[49] چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر

۴۴ – رب کے حُضور آنے سے مراد اس کی طرف رُجوع کرنا اور سب سے منہ موڑ کر اُسی کا رخ کرنا ہے۔ اور ”قلبِ سلیم“ کے معنٰی ”صحیح سلامت دل“ کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اَخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شُکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، جس میں کوئی اینچ پینچ اور الجھاؤ نہ ہو، جو ہر قسم کے بُرے مَیلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو، جس کے اندر کسی کے لیے بغض و حسد یا بدخواہی نہ پائی جاتی ہو، جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

۴۵ – حضرت ابراہیمؑ کے اِس قصے کی مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۵۰ تا ۵۵۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶-۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۱ تا ۶۶، الشعراء، حواشی ۵۰ تا ۶۴، العنکبوت، حواشی ۲۵ تا ۴۸۔

۴۶ – یعنی اللہ تعالیٰ کو آخر تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ یہ لکڑی پتھر کے معبُود اس کے ہم جنس ہو سکتے ہیں؟ یا اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی کر کے تم اس کی پکڑ سے بچے رہ جاؤ گے؟

۴۷ – اب ایک خاص واقعے کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی تفصیلات سورۂ انبیاء (آیات ۵۱ تا ۷۳) اور سورۂ عنکبوت (آیات ۱۶ تا ۲۷) میں گزر چکی ہیں۔

۴۸ – ابن ابی حاتمؒ نے مشہور تابعی مفسر قَتَادَہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہلِ عرب نَظَرَ فِي النُّجُوْمِ (اس نے تاروں پر نگاہ ڈالی) کے الفاظ محاورے کے طور پر اس معنٰی میں بولا کرتے ہیں کہ اُس شخص نے غور کیا، یا وہ شخص سوچنے لگا۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ویسے بھی یہ بات اکثر مشاہدے میں آتی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے کوئی غور طلب معاملہ آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف، یا اوپر کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر سوچ کر جواب دیتا ہے۔

۴۹ – یہ اُن تین باتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں یہ تین جھوٹ بولے تھے۔ حالانکہ اس بات کو جھوٹ، یا خلافِ واقعہ کہنے کے لیے پہلے کسی ذریعے سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝٩١ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝٩٢
فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۝٩٣ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝٩٤ قَالَ
اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝٩٥ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٩٦ قَالُوا
ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ ۝٩٧ فَاَرَادُوْا بِهٖ

چلے گئے۔[50] اُن کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبُودوں کے مَندِر میں گُھس گیا اور بولا: ''آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں[51]؟ کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟'' اس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آکر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے۔[52] اس نے کہا: ''کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پُوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو۔'' انھوں نے آپس میں کہا: ''اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔'' انھوں نے اس کے خلاف

اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی اور انھوں نے محض بہانے کے طور پر یہ بات بنا دی تھی۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے جھوٹ آخر کس بنا پر قرار دے دیا جائے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم تفہیم القرآن جلد سوم (الانبیاء، حاشیہ ۶۰) میں کر چکے ہیں، اور مزید بحث رسائل و مسائل، جلد دوم (صفحہ ۳۵ تا ۳۹) میں کی گئی ہے۔

۵۰ - یہ فقرہ خود بخود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ صورتِ معاملہ دراصل کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کسی میلے میں جا رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان والوں نے اُن سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہوگا۔ انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی ہوگی کہ میری طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ بات بالکل ہی خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور گھر کے لوگ اُن سے کہتے کہ اچھے خاصے بھلے چنگے ہو، بلاوجہ بہانہ بنا رہے ہو۔ لیکن جب وہ اس عذر کو قبول کر کے انھیں پیچھے چھوڑ گئے تو اس سے خود ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضرور اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کو نزلہ، کھانسی، یا کوئی اور ایسی ہی نمایاں تکلیف ہوگی جس کی وجہ سے گھر والے انھیں چھوڑ جانے پر راضی ہو گئے۔

۵۱ - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مَندِر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوں گی۔

۵۲ - یہاں قصہ مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اس کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انھوں نے آکر اپنے مندر میں دیکھا کہ سارے بت ٹوٹے پڑے ہیں تو پوچھ گچھ شروع کی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان بُت پرستی کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس پر مجمع نے کہا کہ پکڑ لاؤ اُسے۔ چنانچہ ایک گروہ دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا، اور انھیں مجمع کے سامنے لے آیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنٰهُ
بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ

ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔[53]

ابراہیمؑ نے کہا[54]: "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں[55]، وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔"[56] (اس دُعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی۔[57] وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دَوڑ دُھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا: "بیٹا! میں

۵۳ - سورۂ انبیاء (آیت ۶۹) میں الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ کے لیے۔) اور سورۂ عنکبوت (آیت ۲۴) میں ارشاد ہوا ہے: فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (پھر اللہ نے اس کو آگ سے بچالیا۔) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اُس سے بسلامت نکال دیا۔ آیت کے یہ الفاظ کہ "انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انھیں نیچا دکھا دیا"، اس معنی میں نہیں لیے جاسکتے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنا چاہا تھا مگر نہ پھینک سکے۔ بلکہ مذکورۂ بالا آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے ان کا صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ میں پھینک کر انھیں ہلاک کر دینا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے، اور ان کے معجزانہ طریقے سے بچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی برتری ثابت ہوگئی اور مشرکین کو اللہ نے نیچا دکھا دیا۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے اصل مقصود قریش کے لوگوں کو اس بات پر مُتنبِّہ کرنا ہے کہ جن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو اُن کا طریقہ وہ نہ تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ وہ تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ اب اگر تم اِن کو نیچا دکھانے کے لیے وہ چالیں چلو گے جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے اُن کے ساتھ چلی تھیں تو آخر کار نیچا تم ہی دیکھو گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا تم نہیں دکھا سکتے۔

۵۴ - یعنی آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ نے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو چلتے وقت یہ الفاظ کہے۔

۵۵ - اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی خاطر نکل رہا ہوں کیونکہ اسی کا ہو جانے کی وجہ سے میری قوم میری دشمن ہوگئی ہے ورنہ کوئی دنیوی جھگڑا میرے اور اس کے درمیان نہ تھا کہ اس کی بنا پر مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہو۔ نیز یہ کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے جس کا رخ کروں۔ تن بتقدیر بس اللہ کے بھروسے پر نکل رہا ہوں۔ جدھر وہ لے جائے گا اسی طرف چلا جاؤں گا۔

۵۶ - اس دعا سے خود بخود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُس وقت بے اولاد تھے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک بیوی اور ایک بھتیجے (حضرت لوطؑ) کو لے کر

اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّآ

خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تجھے ذبح کر رہا ہوں[۵۸]، اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟[۵۹]" اُس نے کہا: "ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے[۶۰] اُسے کر ڈالیے، آپ اِن شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب

ملک سے نکلے تھے۔ اس وقت فطرتاً آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کوئی صالح اولاد عطا فرمائے جو اس غریب الوطنی کی حالت میں آپ کا غم غلط کرے۔

۵۷- اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دُعا کرتے ہی یہ بشارت دے دی گئی۔ قرآنِ مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ۔ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔" (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۹) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس بشارت کے درمیان سالہا سال کا فصل تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی (پیدائش، ۱۶:۱۶)، اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت سو برس کی۔ (۵:۲۱)

۵۸- یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انھوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اُسے ذبح کر رہے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت وہ خواب کا مطلب یہی سمجھے تھے کہ وہ صاحبزادے کو ذبح کر دیں۔ اسی بنا پر وہ ٹھنڈے دل سے بیٹا قربان کر دینے کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر خواب دکھانے میں جو باریک نکتہ اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھا تھا اُسے آگے کی آیت نمبر ۱۰۵ میں اس نے خود کھول دیا ہے۔

۵۹- صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدعا یہ نہ تھا کہ تُو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انھوں نے دعا مانگی تھی، وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کر دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اَخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔

۶۰- یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحتاً یا اشارتاً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیمؑ نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاؑ کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ﴿۱۰۳﴾ وَ نَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدۡ صَدَّقۡتَ
الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَيۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَ تَرَكۡنَا عَلَيۡهِ

اِن دونوں نے سرِتسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا[۶۱] اور ہم نے نِدا دی کہ "اَے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا[۶۲]، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں[۶۳]۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی[۶۴]"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا[۶۵]۔ اور اس کی تعریف و توصیف[۶۶]

۶۱ — یعنی حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو چت نہیں لٹایا بلکہ اوندھے منہ لٹایا تاکہ ذبح کرتے وقت بیٹے کا چہرہ دیکھ کر کہیں محبّت و شفقت ہاتھ میں لرزش پیدا نہ کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے کی طرف سے ہاتھ ڈال کر چھری چلائیں۔

۶۲ — نَحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں "اور" بمعنیٰ "تو" ہے، یعنی فقرہ یوں ہے کہ "جب ان دونوں نے سرِتسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے نِدا دی۔" لیکن ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں لفظ "جب" کا جواب محذوف ہے اور اس کو ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور ہی کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چھری چلوانے کے لیے راضی ہے، تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہوگا، اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا، اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اُس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہوگی۔

۶۳ — یعنی ہم نے تمھیں یہ تو نہیں دکھایا تھا کہ تم نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے اور اُس کی جان نکل گئی ہے، بلکہ یہ دکھایا تھا کہ تم ذبح کر رہے ہو۔ تو وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اب ہمیں تمھارے بچے کی جان لینی مطلوب نہیں ہے۔ اصل مدّعا جو کچھ تھا، وہ تمھاری اس آمادگی اور تیاری سے حاصل ہو گیا ہے۔

۶۴ — یعنی جو لوگ احسان کی رَوِش اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر آزمائشیں ہم اس لیے نہیں ڈالا کرتے کہ انھیں خواہ مخواہ تکلیفوں میں ڈالیں اور رنج و غم میں مبتلا کریں۔ بلکہ یہ آزمائشیں ان کی فضیلتوں کو اُبھارنے کے لیے اور انھیں بڑے مرتبے عطا کرنے کے لیے ان پر ڈالی جاتی ہیں، اور پھر آزمائش کی خاطر جس مخمصے میں ہم انھیں ڈالتے ہیں اس سے بخیریت اُن کو نکلوا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو، بیٹے کی قربانی کے لیے تمھاری آمادگی و تیاری ہی بس اس کے لیے کافی ہو گئی کہ تمھیں وہ مرتبہ عطا کر دیا جائے جو ہماری خوشنودی پر واقعی بیٹا قربان کر دینے والے کو مل سکتا تھا۔ اس طرح ہم نے تمھارے بچے کی جان بھی بچا دی اور تمھیں یہ

فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝١٠٨ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝١٠٩ كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ۝١١٠ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١١١ وَبَشَّرْنٰهُ
بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١١٢ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ

ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی[٦٧]

مرتبۂ بلند بھی عطا کر دیا۔

٦٥ – یعنی مقصود تمہارے ہاتھ سے تمہارے بچے کو ذبح کرا دینا نہ تھا، بلکہ اصل مقصود تمہارا امتحان لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تر تو نہیں رکھتے۔

٦٦ – ''بڑی قربانی'' سے مراد، جیسا کہ بائبل اور اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اُس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے پیش کیا، تاکہ بیٹے کے بدلے اس کو ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزندِ ابراہیمؑ جیسے صابر و جاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے ''بڑی قربانی'' قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنّت جاری کر دی کہ اُسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

٦٧ – یہاں پہنچ کر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے۔ سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائبل کی طرف سے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

> ''خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اُسے کہا: اَے ابرہام!...... تو اپنے بیٹے اِضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے مُلک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ، پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔'' (پیدائش، ۲۲: ۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ اِکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات مُلاحظہ ہوں:

> ''اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ، خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو مُلکِ کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اُس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔'' (پیدائش، ۱۶: ۱-۳)

''اور خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اُس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔'' (۱۶: ۱۱)

''اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔'' (۱۶: ۱۶)

''اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے...... اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا...... تو اُس کا نام اِضحاق رکھنا...... جو اگلے سال اِسی وقتِ مُعیّن پر سارہ سے پیدا ہوگا...... تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اور...... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابرہام ننّانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا، اور جب اُس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔'' (پیدائش، ۱۷: ۱۵-۲۵)

''اور جب اُس کا بیٹا اِضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔'' (پیدائش، ۲۱: ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اِکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہؓ و تابعینؒ کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عباسؓ بن عبد المُطّلِب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہُرَیرہؓ، قتادہؒ، عِکرِمہؒ، حَسن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، مجاہدؒ، شَعبیؒ، مَسْرُوقؒ، مَکحُولؒ، زُہریؒ، عطاؒ، مُقاتلؒ، سُدّیؒ، کعبِ اَحبارؒ، زید بن اسلمؒ وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت معاویہؓ، عِکرِمہؒ، مُجاہدؒ، یوسف بن مہرانؒ، حَسن بصریؒ، محمد بن کعب القُرظیؒ، شَعبیؒ، سعید بن المُسَیّبؒ، ضحّاکؒ، محمد بن علی بن حسینؒ (محمد الباقر)، ربیع بن اَنسؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابُل کیا جائے تو متعدِّد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول

منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ سے عکرِمہؒ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے۔ مگر انھی سے عطاء بن ابی رَباحؒ یہ بات نقل کرتے ہیں کہ زعمت الیھود انہ اسحٰق و کذبت الیھود (یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاقؑ تھے، مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔) اسی طرح حضرت حَسَن بصریؒ سے ایک رِوایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عَمرو بن عُبَیدؒ کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا، وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اِس اختلافِ رِوایات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علمائے اسلام میں سے بعض پورے جَزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابنِ جَریر اور قاضی عِیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، مثلاً ابنِ کثیرؒ۔ اور بعض مُذَبذَب ہیں، مثلاً جلال الدین سُیوطیؒ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک وشبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

۱- اُوپر قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کے لیے دُعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔ فَحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دُعا اُس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی وہ آپ کا پَہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ۔ (ابراہیم، آیت ۳۹)

۲- قرآنِ مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلامٍ عَلیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الذاریات، ۲۸) لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحِجر، ۵۳) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلام حلیم (بُردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں۔ اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا۔

۳- قرآنِ مجید میں حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ۔ (ہود، ۷۱) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابنِ جَریرؒ اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوگیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ

Maktaba Tul Ishaat.com

استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴- اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دَوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اَور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیبِ واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؑ نہ تھے، بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابنِ جریرؒ اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ "ہم نے اس کو اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔" بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

۵- معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیے میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا، اس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابنِ زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابنِ عباسؓ اور عامر شَعْبِی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں۔ (ابنِ کثیر) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکۂ معظّمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا، اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

۶- یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منٰی میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہ تھی بلکہ اُس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مَناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اُسی مقامِ منٰی میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا، حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منٰی میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاق۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمتِ مُسلِمہ میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحاقؑ کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علّامۂ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعبِ اَحبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں

ع۷

وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾

اب ان دونوں کی ذرّیت میں سے کوئی مُحسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔[۶۸] ع

مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مُندرَجات ان کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ انھیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رَطب و یابس جو وہ بیان کرتے تھے انھیں رِوایت کرنے لگے۔ حالانکہ اِس اُمت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔''

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرَظیؒ کی ایک رِوایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ۔ اُس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علما میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: ''امیر المومنین! خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے۔'' (ابنِ جَرِیر) ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا، اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر مُتعصّب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصّب کارفرما ہے۔

۶۸ – یہ فقرہ اُس پورے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا یہ قصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے دو بہت بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسرائیل، جن کے گھر سے دنیا کے دو بڑے مذہب (یہودیت اور نصرانیت) نکلے اور انھوں نے رُوئے زمین کے بہت بڑے حصّے کو حلقہ بگوش بنایا۔ دوسرے بنی اسماعیل جو نُزولِ قرآن کے وقت تمام اہلِ عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، اور اُس وقت مکۂ معظّمہ کے قبیلۂ قریش کو اُن میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا۔ نسلِ ابراہیمی کی ان دونوں شاخوں کو جو کچھ بھی عُروج نصیب ہوا وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ان دو عظیم المرتبت صاحبزادوں کے ساتھ انتساب کی بدولت ہوا، ورنہ دنیا میں نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خاندان پیدا ہوئے ہیں اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے زیادہ زرّین کارنامہ سنانے کے بعد ان دونوں گروہوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تمھیں دنیا میں یہ جو کچھ شرف نصیب ہوا ہے وہ خدا پرستی اور اخلاص و فدویت کی اُن شان دار روایات کی وجہ سے ہوا ہے جو تمھارے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام نے قائم کی تھیں۔ وہ انھیں بتاتا ہے کہ ہم نے اُن کو جو برکت عطا فرمائی اور ان پر اپنے فضل و کرم کی جو بارشیں برسائیں، یہ کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ بس یونہی ایک شخص اور اس کے دولڑکوں کو چھانٹ کر نواز دیا گیا ہو، بلکہ انھوں نے اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ اپنی وفاداری کے کچھ ثبوت دیے تھے اور ان کی بنا پر وہ اِن عنایات کے مستحق بنے تھے۔ اب تم لوگ محض اس فخر کی بنا پر کہ تم ان کی اولاد ہو، ان عنایات کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ ہم تو یہ دیکھیں گے کہ تم میں سے مُحسن کون ہے اور ظالم کون۔ پھر جو جیسا ہوگا، اُس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ نَجَّیْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ
الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَیْنٰهُمَا
الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَكْنَا
عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اِنَّ
اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور ہم نے موسیٰؑ و ہارونؑ پر احسان کیا، اُن کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات[69] دی، اُنھیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، اُن کو نہایت واضح کتاب عطا کی، انھیں راہِ راست دکھائی، اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اور الیاسؑ بھی یقیناً مُرسلین میں سے[70] تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟

۶۹ – یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

۷۰ – حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآنِ مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام، اور دوسرا سورۂ اَنعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جِلعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانے میں جِلعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اُردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یَرمُوک کے جنوب میں واقع ہے۔) بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تِشبی (Elijah the Tishbite) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسبِ ذیل ہیں:

حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رُحبُعام (Rehoboam) کی نا اہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المَقدِس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا، اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہوگئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دِگرگُوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی

تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم و ستم اور فِسق و فُجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب (Ahab) نے صَیدا (موجودہ لُبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبِل (Jezebel) سے شادی کر لی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آ کر اخی اب خود بھی مشرک ہو گیا، اس نے سامریہ میں بَعْل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بَعْل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں عَلانیہ بَعْل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی زمانہ تھا جب حضرت الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جِلْعاد سے آ کر اَخی اَب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے مُلک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا، حتّٰی کہ اَوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخرِ کار اَخی اَب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاسؑ کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انھوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ ربّ العالَمین اور بَعْل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ایک مجمعِ عام میں بَعْل کے پجاری بھی آ کر اپنے معبُود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ ربّ العالَمین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے اس کے معبُود کی سچّائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہِ کرمِل (Carmel) پر بَعْل کے ساڑھے آٹھ سو پُجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمعِ عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بَعْل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاسؑ نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بَعْل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاسؑ نے اسی مجمعِ عام میں بَعْل کے پُجاریوں کو قتل کرا دیا، اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی، یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اَخی اَب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی ایزبِل حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور اس سے قسم کھالی کہ جس طرح بَعْل کے پجاری قتل کیے گئے ہیں اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ اِن حالات میں حضرت الیاسؑ کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہِ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

> ”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک مَیں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے دَر پے ہیں۔“ (۱-سلاطین ۱۹:۱۰)

اُسی زمانے میں بیت المَقْدِس کی یہودی ریاست کے فرماں روا یہورام (Jehoram) نے اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب کی بیٹی سے شادی کر لی، اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائبل میں نقل ہوئے ہیں:

> ”خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے: اس لیے کہ تُو نہ اپنے باپ یہُوسفط کی راہوں پر اور نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّ تَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمۡ وَرَبَّ

کیا تم بَعۡل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو تمھارا اور تمھارے اگلے پچھلے

یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا، بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا ہے اور یہوداہ اور (یروشلیم) یروشلم کے باشندوں کو زناکار بنایا جیسا اَخی اَب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے، قتل بھی کیا، سو دیکھ! خداوند تیرے لوگوں کو اور تیرے بیٹوں اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض کے سبب سے سخت بیمار ہو جائے گا، یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اُس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی جائیں گی۔" (۲-تواریخ،۲۱: ۱۲-۱۵)

اس خط میں حضرت الیاسؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ لے گئے، پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاسؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے اَخی اَب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اَخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخرِ کار حضرت کی بددعا سے اَخی اَب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل ابواب مُلاحظہ ہوں: ۱-سلاطین، باب ۱۷-۱۸-۱۹-۲۱، ۲-سلاطین، باب ۱-۲، ۲-تواریخ، باب ۲۱۔

۷۱- بَعۡل کے لُغوی معنیٰ آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآنِ مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت ۱۲۷، سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنیٰ میں استعمال کرتی تھیں، اور انھوں نے ایک خاص دیوتا کو بَعۡل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا نر دیوتا بَعۡل تھا اور اس کی بیوی عَستارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بَعۡل سے مراد سورج ہے یا مُشتری، اور عَستارات سے مراد چاند ہے یا زُہرہ۔ بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابِل سے لے کر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بَعۡل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خُصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردُن میں آ کر آباد ہوئے، اور تورات کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انھوں نے اِن مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے، تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اول حضرت یُوشع بن نُون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اَخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

"اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بَعلیم کی پرستش کرنے لگے...... اور وہ خداوند کو چھوڑ کر

اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ
يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا

آبا و اجداد کا رب ہے؟" مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا ہو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز اُن بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا[۷۲]۔ اور الیاسؑ کا ذکرِ خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا[۷۳]۔ سلام ہے الیاسؑ پر[۷۴]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں

بَعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ ۲: ۱۱-۱۳)

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حِتّیوں اور اَموریوں اور فرِزّیوں اور حوِیّوں اور یبُوسیوں کے درمیان بس گئے اور اُن کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں اُن کے بیٹوں کو دینے اور اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ ۳: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بَعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گُھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بَعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمعِ کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈّے کو توڑا تھا۔ (قُضاۃ ۶: ۲۵-۳۲) اس صورتِ حال کو آخرِ کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بَعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔

۷۲ – یعنی اس سزا سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنھوں نے حضرت الیاسؑ کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے اُس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

۷۳ – حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اُس کی داستان اُوپر گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کم ہی لوگوں کو انھوں نے اُن سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہو گا۔ اُن کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاس علیہ السلام ایک بگُولے میں آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے ہیں (۲-سلاطین، باب دوم)، اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب مَلاکی میں لکھا ہے:

"دیکھو، خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیّاہ نبی کو تمھارے پاس بھیجوں گا۔" (۴: ۵)

حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی بعثت کے زمانے میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے: ایک، حضرت الیاسؑ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ
اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع

میں سے تھا۔

اور لوطؑ بھی اُنھی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔[۷۵] پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز اُن کے اُجڑے دِیار پر سے گزرتے ہو۔[۷۶] کیا تم کو عقل نہیں آتی؟ ع

دوسرے، مسیحؑ۔ تیسرے، ''وہ نبی'' (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰؑ کی نبوت شروع ہوئی اور انھوں نے لوگوں کو اِصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا: کیا تم مسیح ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم ایلیّاہ ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم ''وہ نبی'' ہو؟ انھوں نے کہا: میں وہ بھی نہیں ہوں۔ تب انھوں نے کہا: اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیّاہ ہو، نہ وہ نبی، تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یُوحنّا ۱:۱۹-۲۶)
پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غُلغُلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیّاہ نبی آ گئے ہیں۔ (مرقس ۶: ۱۴-۱۵) خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حَواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیّاہ نبی آنے والے ہیں۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ''ایلیّاہ تو آ چکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔'' اس سے حَواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰؑ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاسؑ۔ (متّی، ۱۱: ۱۴ اور متّی، ۱۷: ۱۰-۱۳)

۷۴ – اصل میں الفاظ ہیں: سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاسؑ کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہلِ عرب میں عِبرانی اَسما کے مختلف تلفُّظ رائج تھے، مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک ہی فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاسؑ کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طُورِ سینا بھی آیا ہے اور طُورِ سِینین بھی۔

۷۵ – اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

۷۶ – اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قومِ لوطؑ کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ
لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

النصف

اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔[۷۷] یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا،[۷۸] پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخرِ کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔[۷۹] اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ[۸۰] ہوتا تو روزِ قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔[۸۱]

۷۷ – یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یونُس علیہ السلام کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ یونُس اور سورۂ انبیا میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۲ تا ۸۵)

۷۸ – اصل میں لفظ اَبَقَ استعمال ہوا ہے، جو عَربی زبان میں صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جب کہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ الاباق هرب العبد من سيّده ”اِباق کے معنی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا“ (لِسان العرب)

۷۹ – ان فقروں پر غور کرنے سے جو صورتِ واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) حضرت یونُسؑ جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجایش سے زیادہ بھری ہوئی (overloaded) تھی۔

(۲) قرعہ اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اس وقت ہوئی جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لٰہذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس کا نام قرعے میں نکلے، اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

(۳) قرعے میں حضرت یونُسؑ ہی کا نام نکلا، وہ سمندر میں پھینک دیے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

(۴) اِس ابتلا میں حضرت یونُسؑ اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مقامِ ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ اس معنیٰ پر لفظ اَبَقَ بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اُوپر حاشیہ نمبر ۷۸ میں گزر چکی ہے، اور اسی معنیٰ پر لفظ مُلِیْم بھی دلالت کرتا ہے۔ مُلِیْم ایسے قصوروار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔ (يقال قد الام الرجل اذا اتي ما يلام عليه من الامر وان لم يُلَم۔ ابنِ جَریر)

۸۰ – اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام پہلے ہی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَنَبَذۡنٰهُ بِالۡعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيۡمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنۡۢبَتۡنَا عَلَيۡهِ شَجَرَةً مِّنۡ يَّقۡطِيۡنٍ ﴿۱۴۶﴾

آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا[۸۲]۔ اور اُس پر ایک بیل دار درخت[۸۳] اُگا دیا۔

خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو انھوں نے اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔ سورۂ انبیا میں ارشاد ہوا ہے: فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ۖ اِنِّيۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ۔ پس اُن تاریکیوں میں اُس نے پکارا: ”نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں قصوروار ہوں۔“

۸۱ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یُونسؑ قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونسؑ کی قبر بنا رہتا۔ مشہور مفسر قَتَادَہؒ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ (ابن جَریر)

۸۲ – یعنی جب حضرت یونسؑ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن وقانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے اُن کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونسؑ پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اِس مَقام پر بہت سے عقلیّت کے مُدّعی حضرات یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اِس نام نہاد عقلیّت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آ چکا ہے جو ان کے دعوے کی تردید کر دیتا ہے۔ اگست ۱۸۹۱ء میں ایک جہاز (Star of the East) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لیے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انھوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو، جو ۲۰ فٹ لمبی، ۵ فٹ چوڑی اور سو ٹن وزنی تھی، سخت زخمی کر دیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اُس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز وہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انھوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جِدّوجُہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہو گیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے ۶۰ گھنٹے رہا تھا۔ (اُردو ڈائجسٹ، فروری ۱۹۶۴ء) غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟

۸۳ – اصل الفاظ ہیں: شَجَرَةً مِّنۡ يَّقۡطِيۡنٍ۔ یقطین عَرَبی زبان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے، جیسے کَدُّو، تربوز، ککڑی وغیرہ۔ بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقے پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتے حضرت یونسؑ پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾

اس کے بعد ہم نے اُسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا،[84] وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقتِ خاص تک انھیں باقی رکھا۔[85]

۸۴ - "ایک لاکھ یا اس سے زائد" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونسؑ بھاگے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے ٹال دیا گیا تھا۔ اب حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لا کر باقاعدہ مسلمان ہو جائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۂ یونس، آیت ۹۸ نگاہ میں رہنی چاہیے۔

۸۵ - حضرت یونسؑ کے اس قصے کے متعلق سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں۔

مشہور مفسر قَتادَہ سورۂ یونس، آیت ۹۸ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کر چکی ہو اور عذاب آ جانے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قومِ یونسؑ مستثنیٰ ہے۔ انھوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب قریب آ گیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ ڈال دی۔" (ابنِ کثیر، جلد ۲، ص ۴۳۳)

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: "اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یُونس علیہ السلام مَوصِل کے علاقے میں نینویٰ کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے۔ حضرت یونسؑ نے ان کو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کیا اور جھٹلایا۔ حضرت یونسؑ نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آ جائے گا، اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا...... اور انھیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انھوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخرِ کار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا...... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کر لی۔" (رُوح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۷۰)

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ کی تشریح کرتے ہوئے علامۂ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: "حضرت یونُسؑ کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔" (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۷) پھر وہ حضرت یونسؑ کی دُعا کے فقرہ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: "یعنی میں قصوروار تھا کہ انبیا کے طریقے کے

Maktaba Tul Ishaat.com

خلاف، حکم آنے سے پہلے، ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دُور فرما دے۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۸)

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ ''وہ اپنی قوم پر، جب کہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا۔'' (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حاشیے میں فرماتے ہیں: ''قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکمِ الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا...... اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔''

سورۂ صافات کی آیاتِ بالا کی تشریح میں امام رازیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت یونسؑ کا قصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس قوم کو جس نے انھیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب لامحالہ نازل ہونے والا ہے، اس لیے انھوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے۔'' (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۵۸)

علّامہ آلوسیؒ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ پر لکھتے ہیں: ''اَبَق کے اصل معنٰی آقا کے ہاں سے غلام کے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونسؑ اپنے رب کے اِذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے، اس لیے اس لفظ کا اِطلاق ان پر دُرست ہوا۔'' پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: ''جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جو ان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے بڑے اور چھوٹے اور جانوروں، سب کو لے کر نکلے، اور نزولِ عذاب ان سے قریب تھا، پس انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔'' (روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۱۳۰)

مولانا شبیر احمد صاحبؒ وَهُوَ مُلِيْمٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکمِ الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کر دی۔''

پھر سورۂ القلم کی آیت فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ پر مولانا شبیر احمد صاحبؒ کا حاشیہ یہ ہے: ''یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح مکذّبین کے معاملے میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے۔'' اور اسی آیت کے فقرہ وَهُوَ مَكْظُوْمٌ پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: ''یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ جھنجلا کر شتابی عذاب کی دُعا، بلکہ پیشین گوئی کر بیٹھے۔''

مفسرین کے ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تین قصور تھے جن کی وجہ سے حضرت یونسؑ پر عتاب ہوا: ایک، یہ کہ انھوں نے عذاب کے دن کی خود ہی تعیین کر دی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ دن آنے سے پہلے ہجرت کر کے ملک سے نکل گئے، حالانکہ نبی کو اس وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑنی چاہیے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آ جائے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ
اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ
سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

پھر ذرا اِن لوگوں سے پوچھو:[۸۶] کیا (اِن کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمھارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور اِن کے لیے ہوں بیٹے[۸۷]! کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو! دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھُوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کرلیں؟ تمھیں کیا ہوگیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو۔ کیا تمھیں ہوش نہیں آتا۔ یا پھر تمھارے پاس اپنی اِن باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب، اگر تم سچّے ہو۔[۸۸]

تیسرے، یہ کہ جب اس قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو واپس نہ گئے۔

۸۶ – یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر ۱۱ سے شروع ہوا تھا جس میں کفارِ مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا: ''ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اُن چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں۔'' اب انھی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو اُن کی اِس گمراہی پر مُتنبّہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعدِ موت اور جزا وسزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اب یہ دوسرا سوال اُن کی اِس جہالت پر مُتنبّہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر جس کا چاہتے تھے، اللہ سے رشتہ جوڑ دیتے تھے۔

۸۷ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جُہَینہ، بنی سَلِمہ، خُزاعہ، بنی مُلَیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: النساء، آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷–۵۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۴۰۔ الزخرف، آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم، آیات ۲۱ تا ۲۷۔

۸۸ – یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں: یا تو ایسی بات مشاہدے کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُوْنَ ۙ۱۵۸ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ۱۵۹ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ۱۶۰ فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ۱۶۱ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ
بِفٰتِنِيْنَ ۙ۱۶۲ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ۱۶۳ وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ
مَّعْلُوْمٌ ۙ۱۶۴ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ۱۶۵ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۱۶۶

انھوں نے اللہ اور ملائکہ[۸۹] کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مُجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں (اور وہ کہتے ہیں کہ) ”اللہ اُن صفات سے پاک ہے جو اُس کے خالص بندوں کے سوا دوسرے لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس تم اور تمھارے یہ معبُود، اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اُس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جُھلسنے والا ہو[۹۰]۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے[۹۱]، اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں۔“

بنا پر کہی جا سکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتابِ الٰہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مشاہدے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جہالت و حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کر لیا جائے اور خداوندِ عالَم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔

۸۹ – اصل میں ملائکہ کے بجائے الْجِنَّة کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن بعض اکابر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں جِنّ کا لفظ اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں اَلْجِنَّة کے لفظ کو ملائکہ کے معنی میں لیا جائے۔

۹۰ – اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”پس تم اور تمھاری یہ عبادت، اس پر تم کسی کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے مگر صرف اُس کو جو......“ اس دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے گمراہو! یہ جو تم ہماری پرستش کر رہے ہو اور ہمیں اللہ ربّ العالمین کی اولاد قرار دے رہے ہو، اس سے تم ہم کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے۔ اس سے تو کوئی ایسا احمق ہی فتنے میں پڑ سکتا ہے جس کی شامت سر پر سوار ہو۔ دوسرے الفاظ میں گویا فرشتے اپنے ان پرستاروں سے کہہ رہے

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ لَقَدْ
سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾
وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾
وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش! ہمارے پاس وہ ''ذِکر'' ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے[92]۔ مگر (جب وہ آ گیا) تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب اِنھیں (اِس روش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔ اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے[93] گا۔ پس اے نبیؐ! ذرا کچھ مدّت تک اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں[94] گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟

ہیں کہ ''برد ایں دام بر مرغِ دِگر نہ۔''

۹۱ – یعنی اللہ کی اولاد ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے اس سے ذرّہ برابر تجاوُز تک کرنے کی مجال ہم نہیں رکھتے۔

۹۲ – یہی مضمون سورۂ فاطر، آیت ۴۲ میں گزر چکا ہے۔

۹۳ – اللہ کے لشکر سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اللہ کے رسول کی پیروی کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ نیز وہ غیبی طاقتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہلِ حق کی مدد فرماتا ہے۔

اس امداد اور غلبہ کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ ہر زمانے میں اللہ کے ہر نبی اور اس کے پیروؤں کو سیاسی غلبہ ہی حاصل ہو، بلکہ اس غلبے کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک سیاسی غلبہ بھی ہے۔ جہاں اس نوعیت کا اِستیلا اللہ کے نبیوں کو حاصل نہیں ہوا ہے، وہاں بھی ان کا اَخلاقی تفوّق ثابت ہو کر رہا ہے۔ جن قوموں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے وہ آخر کار برباد ہو کر رہی ہیں۔ جہالت وضلالت کے جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدّت تک زور دکھانے کے بعد آخر کار اپنی موت آپ مر گئے۔ مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی حقیقت وصداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں، وہ پہلے بھی اٹل تھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ
عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ
رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ ع ۵

جب وہ اِن کے صَحن میں آ اُترے گا تو وہ دن اُن لوگوں کے لیے بہت بُرا ہوگا جنھیں مُتنبّہ کیا جا چکا ہے۔ بس ذرا اِنھیں کچھ مدّت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے۔

پاک ہے تیرا رب، عزّت کا مالک، اُن تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ اور سلام ہے مرسلین پر، اور ساری تعریف اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے۔ ع

اور آج بھی اٹل ہیں۔ انھیں اپنی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکا ہے۔

۹۴ - یعنی کچھ زیادہ مدّت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمھاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اُسی طرح پوری ہوئی۔ اِن آیات کے نزول پر بمشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاتحانہ داخلہ اپنے شہر میں دیکھ لیا، اور پھر اس کے چند سال بعد انھی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آ گیا۔

تفہیم القرآن

صٓ

(۳۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

صٓ

نام

آغاز ہی کے حرف صٓ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، بعض رِوایات کی رُو سے یہ سورت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکۂ معظّمہ میں عَلانِیَہ دعوت کا آغاز کیا تھا اور قریش کے سرداروں میں اس پر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا زمانۂ نُزول تقریباً نبوت کا چوتھا سال قرار پاتا ہے۔ بعض دوسری رِوایات اسے حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد کا واقعہ بتاتی ہیں، اور معلوم ہے کہ وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ایک اور سلسلۂ رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کے آخری مرض کے زمانے میں وہ معاملہ پیش آیا تھا جس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اسے اگر صحیح مانا جائے تو اس کا زمانۂ نُزُول نبوت کا دسواں یا گیارھواں سال ہے۔

تاریخی پَس منظر

امام احمدؒ، نَسائیؒ، ترمذیؒ، ابنِ جَریرؒ، ابنِ ابی شَیْبہؒ، ابنِ ابی حاتمؒ اور محمد بن اسحاقؒ وغیرہ نے جو رِوایات نقل کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ اِن کا آخری وقت ہے تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چُکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے، اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش، جن میں ابوجَہل، ابوسُفیان، اُمَیّہ بن خَلَف، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المُطَّلِب، عُقْبہ بن ابی مُعَیط، عُتْبہ اور شَیْبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا: ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبُود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرُّض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبُودوں کی مَذمّت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبُودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے! یہ تمھاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمھارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انھوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: چچا جان! میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلِمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابعِ فرمان اور عجم ان کا باج گزار

ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹپٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے: تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو اِس سورت کے ابتدائی حصّے میں اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہیں۔

ابنِ سعدؒ نے طَبَقات میں یہ سارا قصہ اُسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اوپر مذکور ہوا، مگر اُن کی رِوایت کے مطابق یہ ابو طالب کے مَرَضِ وفات کا نہیں بلکہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ نے دعوتِ عام کی ابتدا کی تھی اور مکے میں پے در پے یہ خبریں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ آج فُلاں آدمی مسلمان ہوا اور کل فُلاں۔ اُس وقت سردارانِ قریش یکے بعد دیگرے کئی وفد ابو طالب کے پاس لے کر پہنچے تھے تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ سے روک دیں، اور اِنھی وفود میں سے ایک وفد کے ساتھ یہ گفتگو ہوئی تھی۔

زَمخشری، رازی، نَیسابُوری اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وفد ابو طالب کے پاس اُس وقت گیا تھا جب حضرت عمرؓ کے ایمان لانے پر سردارانِ قریش بوکھلا گئے تھے۔ لیکن کتبِ روایت میں سے کسی میں اس کا حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے اور نہ ان مفسرین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو یہ ہے سمجھ میں آنے والی بات۔ اس لیے کہ کفارِ قریش پہلے ہی یہ دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے کہ اسلام کی دعوت لے کر اُن کے درمیان سے ایک ایسا شخص اُٹھا ہے جو اپنی شرافت، بے داغ سیرت اور دانائی و سنجیدگی کے اعتبار سے ساری قوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور پھر اس کا دستِ راست ابو بکرؓ جیسا آدمی ہے جسے مکہ اور اس کے اطراف کا بچہ بچہ ایک نہایت شریف، راست باز اور ذکی انسان کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب جو انھوں نے دیکھا ہوگا کہ عمرؓ بن خطّاب جیسا جری اور صاحبِ عزم آدمی بھی ان دونوں سے جاملا ہے تو یقیناً انھیں محسوس ہوا ہوگا کہ خطرہ حدِ برداشت سے گزرتا جا رہا ہے۔

---

[1] حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک رِوایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اریدھم علٰی کلمۃ واحدۃ یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدّی الیھم بھا العجم الجزیۃ۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الٰی ان یتکلموا بکلمۃ تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک رِوایَت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مُدّعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمھارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمھاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اِس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟

Maktaba Tul Ishaat.com

موضوع اور مَباحِث اُوپر جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے، اُسی پر تبصرے سے اس سورت کا آغاز ہوا ہے۔ کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ دعوتِ اسلامی کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا تکبُّر اور حسد اور تقلیدِ اَعْمیٰ پر اصرار ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنی ہی برادری کے ایک آدمی کو خدا کا نبی مان کر اُس کی پیروی قبول کر لیں۔ یہ اُنھی جاہلانہ تخیلات پر جمے رہنا چاہتے ہیں جن پر انھوں نے اپنے قریب کے زمانے کے لوگوں کو پایا ہے، اور جب اس جہالت کے پردے کو چاک کر کے ایک شخص ان کے سامنے اصل حقیقت کو پیش کرتا ہے تو یہ اس پر کان کھڑے کرتے ہیں اور اسے عجیب بات بلکہ نرالی اور اَنہونی بات قرار دیتے ہیں۔ اِن کے نزدیک توحید اور آخرت کا تخیل محض ناقابلِ قبول ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تخیُّل ہے جس کا بس مذاق ہی اُڑایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ کے ابتدائی حصّے میں بھی اور آخری فقروں میں بھی کفار کو صاف صاف مُتنَبِّہ کیا ہے کہ جس شخص کا تم آج مذاق اُڑا رہے ہو اور جس کی رہنمائی قبول کرنے سے تم کو آج سخت انکار ہے، عنقریب وہی غالب آ کر رہے گا اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب اِسی شہرِ مکہ میں، جہاں تم اس کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو، اس کے آگے تم سب سرنگُوں نظر آؤ گے۔

پھر پےَ درپے ۹ پیغمبروں کا ذکر کر کے، جن میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا قصہ زیادہ مفصّل ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات سامعین کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے، اس کے ہاں انسان کا صحیح رَوِیَّہ ہی مقبول ہے، بے جا بات خواہ کوئی بھی کرے وہ اس پر گرفت کرتا ہے، اور اس کے ہاں وہی لوگ پسند کیے جاتے ہیں جو لغزش پر اصرار نہ کریں بلکہ اس پر مُتنَبِّہ ہوتے ہی تائب ہو جائیں اور دنیا میں آخرت کی جواب دِہی کو یاد رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔

اس کے بعد فرماں بردار بندوں اور سرکش بندوں کے اُس انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو وہ عالمِ آخرت میں دیکھنے والے ہیں، اور اس سلسلے میں کفار کو دو باتیں خاص طور پر بتائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ آج جن سرداروں اور پیشواؤں کے پیچھے جاہل لوگ اندھے بن کر ضلالت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں، کل وہی جہنّم میں اپنے پیروؤں سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے۔ دوسرے، یہ کہ آج جن اہلِ ایمان کو یہ لوگ ذلیل و خوار سمجھ رہے ہیں، کل یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ اُن کا جہنّم میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اور یہ خود اُس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

آخر میں قصۂ آدم اور ابلیس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفارِ قریش کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکنے سے جو تکبر تمھیں مانع ہو رہا ہے، وہی تکبُّر آدمؑ کے آگے جھکنے سے ابلیس کو بھی مانع ہوا تھا۔ خدا نے جو مرتبہ آدمؑ کو دیا تھا اُس پر ابلیس نے حسد کیا اور حکمِ خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو مرتبہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے اس پر تم حسد کر رہے ہو اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ جسے خدا نے رسول مقرر کیا ہے اس کی اطاعت کرو، اس لیے جو انجام ابلیس کا ہونا ہے وہی آخرِ کار تمھارا بھی ہونا ہے۔

۸۸ آیاتہا — سُوْرَةُ صٓ مَكِّيَّةٌ — ۵ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝۱ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ
وَّشِقَاقٍ ۝۲ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ
مَنَاصٍ ۝۳ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ

صٓ،[1] قسم ہے نصیحت بھرے[2] قرآن کی، بلکہ یہی لوگ، جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبّر اور ضد میں مبتلا ہیں[3]۔ اِن سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب اُن کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اُٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔

اِن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجّب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود اِنھی میں سے آ گیا[4]۔ منکرین کہنے لگے کہ

۱ – اگرچہ تمام حُروفِ مُقطّعات کی طرح ص کے مفہوم کا تعیُّن بھی مشکل ہے، لیکن ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد ہے: صادقٌ في قولہٖ، یا صَدَقَ محمّدٌ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں، جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنٰی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: میں اس پر صاد کرتا ہوں، یعنی اس کی تصدیق کرتا ہوں، یا اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔

۲ – اصل الفاظ ہیں: ذِی الذِّکْرِ۔ اس کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک، ذی شرف، یعنی قرآنِ بزرگ۔ دوسرے، ذی التذکیر، یعنی نصیحت سے لبریز قرآن، یا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا اور غفلت سے چونکانے والا قرآن۔

۳ – اگر ص کی وہ تاویل قبول کی جائے جو ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ نے بیان کی ہے تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ "قسم ہے اس قرآنِ بزرگ، یا اس نصیحت سے لبریز قرآن کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچّی بات پیش کر رہے ہیں، مگر جو لوگ انکار پر جمے ہوئے ہیں وہ دراصل ضد اور تکبر میں مبتلا ہیں"۔ اور اگر ص کو اُن حُروفِ مُقطّعات میں سے سمجھا جائے جن کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا، تو پھر قسم کا جواب محذوف ہے جس پر "بلکہ" اور اس کے بعد کا فقرہ خود روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی پوری عبارت پھر یوں ہوگی کہ "اِن منکرین کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جو دین ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اُس میں کوئی خلل ہے، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اظہارِ حق میں کوئی کوتاہی کی ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف ان کی جھوٹی شیخی، ان کی جاہلانہ نخوت اور ان کی ہَٹ دھری ہے، اور اس پر یہ نصیحت بھرا قرآن شاہد ہے جسے دیکھ کر ہر غیر متعصّب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس میں فہمایش کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے"۔

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٤﴾ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا
لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴿٥﴾ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی
اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ﴿٦﴾ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ
اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ﴿٧﴾ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ

''یہ ساحر[5] ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اِس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے[6] کہ ''چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبُودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے[8]۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملّت میں کسی سے نہیں سُنی[9]۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟''

۴ - یعنی یہ ایسے احمق لوگ ہیں کہ جب ایک دیکھا بھالا آدمی خود اِن کی اپنی جنس، اپنی قوم اور اپنی ہی بَرادری میں سے ان کو خبردار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تو ان کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی۔ حالانکہ عجیب بات اگر ہوتی تو یہ ہوتی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق بھیج دی جاتی، یا ان کے درمیان یکایک ایک اجنبی آدمی کہیں باہر سے آ کھڑا ہوتا اور نبوت کرنی شروع کر دیتا۔ اُس صورت میں تو بلا شبہ یہ لوگ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ عجیب حرکت ہمارے ساتھ کی گئی ہے، بھلا جو انسان ہی نہیں ہے وہ ہمارے حالات اور جذبات اور ضروریات کو کیا جانے گا کہ ہماری رہنمائی کر سکے، یا جو اجنبی آدمی اچانک ہمارے درمیان آ گیا ہے اس کی صداقت کو آخر ہم کیسے جانچیں اور کیسے معلوم کریں کہ یہ بھروسے کے قابل آدمی ہے یا نہیں، اس کی سیرت و کردار کو ہم نے کب دیکھا ہے کہ اس کی بات کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۵ - حضورؐ کے لیے ساحر کا لفظ وہ لوگ اس معنیٰ میں بولتے تھے کہ یہ شخص کچھ ایسا جادو کرتا ہے جس سے آدمی دیوانہ ہو کر اِس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ کسی تعلق کے کٹ جانے اور کوئی نقصان پہنچ جانے کی پروا نہیں کرتا۔ باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ چھوڑ بیٹھتا ہے۔ بیوی شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے۔ ہجرت کی نوبت آئے تو دامن جھاڑ کر وطن سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ کاروبار بیٹھ جائے اور ساری بَرادری بائیکاٹ کر دے تو اسے بھی گوارا کر لیتا ہے۔ سخت سے سخت جسمانی اذیتیں بھی انگیز کر جاتا ہے، مگر اس شخص کا کلمہ پڑھنے سے کسی طرح باز نہیں آتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵)

۶ - اشارہ ہے اُن سرداروں کی طرف جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر ابو طالب کی مجلس سے اٹھ گئے تھے۔

۷ - یعنی حضورؐ کا یہ کہنا کہ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے قائل ہو جاؤ تو عرب و عجم سب تمھارے تابعِ فرمان ہو جائیں گے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝٨ اَمْ
عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝٩ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝١٠

اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے "ذِکر" پر شک کر رہے ہیں[۱۰]، اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انھوں نے میرے عذاب کا مزا چکّھا نہیں ہے۔ کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں؟ اچھا تو یہ عالَمِ اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں[۱۱]!

۸ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، دراصل یہ دعوت اس غرض سے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابعِ فرمان ہو جائیں اور یہ ہم پر اپنا حکم چلائیں۔

۹ – یعنی قریب کے زمانے میں ہمارے اپنے بزرگ بھی گزرے ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہمارے ملک اور آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں، اور مجوسیوں سے ایران وعراق اور مشرقی عرب بھرا پڑا ہے۔ کسی نے بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ انسان بس ایک اللہ رب العالمین کو مانے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔ آخر ایک اکیلے خدا پر کون اکتفا کرتا ہے۔ اللہ کے پیاروں کو تو سب ہی مان رہے ہیں۔ اُن کے آستانوں پر جا کر ماتھے رگڑ رہے ہیں۔ نذریں اور نیازیں دے رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کہیں سے اولاد ملتی ہے۔ کہیں سے رزق ملتا ہے۔ کسی آستانے پر جو مراد مانگو بر آتی ہے۔ اُن کے تصرّفات کو ایک دنیا مان رہی ہے اور اُن سے فیض پانے والے بتا رہے ہیں کہ اِن درباروں سے لوگوں کی کس کس طرح مشکل کُشائی و حاجت روائی ہوتی ہے۔ اب اِس شخص سے ہم یہ نرالی بات سُن رہے ہیں، جو کبھی کسی سے نہ سُنی تھی، کہ ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں اور پوری کی پوری خدائی بس ایک اکیلے اللہ ہی کی ہے۔

۱۰ – بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! یہ لوگ دراصل تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ تمھاری صداقت پر تو پہلے بھی انھوں نے شک نہیں کیا تھا۔ آج یہ شک جو کیا جا رہا ہے یہ دراصل میرے "ذکر" کی وجہ سے ہے۔ مَیں نے ان کو نصیحت کرنے کی خدمت جب تمھارے سُپرد کی تو یہ اُسی شخص کی صداقت میں شک کرنے لگے جس کی راست بازی کی پہلے قسمیں کھایا کرتے تھے۔ یہی مضمون سورۂ انعام آیت ۳۳ میں بھی گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۲۱)

۱۱ – یہ کفار کے اِس قول کا جواب ہے کہ "کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا۔" اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ نبی ہم کس کو بنائیں اور کسے نہ بنائیں، اس کا فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ یہ لوگ آخر کب سے اِس فیصلے کے مختار ہو گئے۔ اگر یہ اس کے مختار بننا چاہتے ہیں تو کائنات کی فرماں روائی کے منصب پر قبضہ کرنے کے لیے عرش پر پہنچنے کی کوشش کریں تا کہ جسے یہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھیں اُس پر وحی نازل ہو اور جسے ہم مستحق سمجھتے ہیں اس پر وہ نازل نہ ہو۔ یہ مضمون

Maktaba Tul Ishaat.com

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُومٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ ⑪ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ
نُوۡحٍ وَّعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ ذُو الۡاَوۡتَادِ ⑫ وَثَمُوۡدُ وَقَوۡمُ لُوۡطٍ وَّاَصۡحٰبُ
لۡـَٔيۡكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الۡاَحۡزَابُ ⑬ اِنۡ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ
عِقَابِ ⑭ وَمَا يَنۡظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنۡ
فَوَاقٍ ⑮ وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡحِسَابِ ⑯

ع ۱۰

یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھّا ہے جو اِسی جگہ شکست کھانے والا ہے[۱۲]۔ اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور عاد، اور میخوں والا فرعون[۱۳]، اور ثمود، اور قومِ لوطؑ، اور اَیکہ والے جھُٹلا چکے ہیں۔ جتھّے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھُٹلایا اور میری عُقُوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔ع یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکا نہ ہوگا[۱۴]۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اَے ہمارے رب! یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصّہ ہمیں جلدی سے دے دے[۱۵]۔

متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے، کیونکہ کفارِ قریش بار بار کہتے تھے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی بن گئے، کیا خدا کو قریش کے بڑے بڑے سرداروں میں سے کوئی اس کام کے لیے نہ ملا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۰۔ الزُخرُف، آیات ۳۱-۳۲)

۱۲ – ''اِسی جگہ'' کا اشارہ مکۂ معظمہ کی طرف ہے۔ یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں، اِسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اُسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

۱۳ – فرعون کے لیے ''ذِی الْاَوْتَادِ'' (میخوں والا) یا تو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا میخ زمین پر ٹھکی ہوئی ہو۔ یا اس بنا پر کہ اس کے کثیر التعداد لشکر جہاں ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یا اس بنا پر کہ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اسے میخیں ٹھونک کر عذاب دیا کرتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ میخوں سے مراد اَہرامِ مصر ہوں جو زمین کے اندر میخ کی طرح ٹھکے ہوئے ہیں۔

۱۴ – یعنی عذاب کا ایک ہی کڑکا انھیں ختم کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ کسی دوسرے کڑکے کی حاجت پیش نہ آئے گی۔ دوسرا مفہوم اس فقرے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد پھر انھیں کوئی افاقہ نصیب نہ ہوگا، اتنی دیر کی بھی مُہلت نہ ملے گی جتنی دیر اُونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتنے ہوئے تھن میں دوبارہ سونتنے تک دُودھ اُترنے میں لگتی ہے۔

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾
اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ

اَے نبیؐ! صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں،[16] اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصہ بیان کرو[17] جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔[18] ہر معاملے میں اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مُسخّر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے

۱۵ – یعنی اللہ کے عذاب کا حال تو ہے وہ جو ابھی بیان کیا گیا، اور اِن نادانوں کا حال یہ ہے کہ یہ نبی سے مذاق کے طور پر کہتے ہیں کہ جس یوم الحساب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اُس کے آنے تک ہمارے معاملے کو نہ ٹالو بلکہ ہمارا حساب ابھی چُکوا دو، جو کچھ بھی ہمارے حصّے کی شامت لکھی ہے وہ فوراً ہی آ جائے۔

۱۶ – اشارہ ہے کفارِ مکہ کی اُن باتوں کی طرف جن کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ بکواس کہ یہ شخص ساحر اور کذّاب ہے، اور ان کا یہ اعتراض کہ اللہ میاں کے پاس رسول بنانے کے لیے کیا بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا، اور یہ الزام کہ اس دعوتِ توحید سے اس شخص کا مقصد کوئی مذہبی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کی نیت کچھ اور ہی ہے۔

۱۷ – اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو“۔ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس قصّے میں اِن لوگوں کے لیے ایک سبق ہے۔ اور دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ اس قصّے کی یاد خود تمھیں صبر کرنے میں مدد دے گی۔ چونکہ یہ قصّہ بیان کرنے سے دونوں ہی باتیں مقصود ہیں، اس لیے الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو دونوں مفہوموں پر دلالت کرتے ہیں۔ (حضرت داؤدؑ کے قصّے کی تفصیلات اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکی ہیں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۳۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۷-۶۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۳، النمل، حواشی ۱۸ تا ۲۰۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۱۴ تا ۱۶)

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: ذَا الۡاَیۡدِ، ”ہاتھوں والا“۔ ہاتھ کا لفظ صرف عَرَبی زبان ہی میں نہیں، دوسری زبانوں میں بھی قوت و قدرت کے لیے اِستعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے لیے جب ان کی صفت کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ ”ہاتھوں والے“ تھے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ اِن قوتوں سے بہت سی قوتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت، جس کا مظاہرہ انھوں نے جالُوت سے جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ فوجی اور سیاسی طاقت، جس سے انھوں نے گردوپیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ اَخلاقی طاقت، جس کی بدولت انھوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور اس کے حُدود کی پابندی کرتے رہے۔ اور عبادت کی طاقت، جس کا حال یہ تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور جہاد فی سبیل اللہ کی مصروفیتوں کے باوجود، صحیحین کی رِوایَت کے مطابق، وہ ہمیشہ ایک دن بیچ روزہ رکھتے تھے اور روزانہ ایک تہائی رات نماز میں گزارتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدّرداءؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ کا ذکر آتا

Maktaba Tul Ishaat.com

مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ
الْخِطَابِ ۝ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ اِذْ
دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى
بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝
اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫

وقف لازم

سمت آتے اور سب کے سب اُس کی تسبیح کی طرف متوجّہ ہو جاتے تھے۔[19] ہم نے اس کی سلطنت مضبُوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کُن بات کہنے کی صلاحیّت بخشی تھی۔[20] پھر تمھیں کچھ خبر پہنچی ہے اُن مقدّمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اُس کے بالا خانے میں گُھس آئے تھے؟[21] جب وہ داؤدؑ کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔[22] انھوں نے کہا: ”ڈریے نہیں، ہم دو فریقِ مقدّمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے،[23] اِس کے پاس ننّانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔

تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ، ”وہ سب سے زیادہ عبادت گزار آدمی تھے۔“

۱۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۱۔

۲۰ – یعنی ان کا کلام الجھا ہوا نہ ہوتا تھا کہ ساری تقریر سُن کر بھی آدمی نہ سمجھ سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جس معاملے پر بھی گفتگو کرتے، اس کے تمام بنیادی نکات کو منقّح کر کے رکھ دیتے، اور اصل فیصلہ طلب مسئلے کو ٹھیک ٹھیک متعیّن کر کے اس کا بالکل دوٹوک جواب دے دیتے تھے۔ یہ بات کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ عقل و فہم اور قادر الکلامی کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا ہوا نہ ہو۔

۲۱ – حضرت داؤدؑ کا ذکر جس غرض کے لیے اس مقام پر کیا گیا ہے اس سے مقصود دراصل یہی قصہ سنانا ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اُن کی جو صفات عالیہ بطور تمہید بیان کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ داؤد علیہ السلام، جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، کس مرتبے کے انسان تھے۔

۲۲ – گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ دو آدمی فرماں روائے وقت کے پاس اُس کی خلوت گاہ میں سیدھے راستے سے جانے کے بجائے یکایک دیوار چڑھ کر جا پہنچے تھے۔

فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ
بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ
لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ
وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩ ﴿۲۴﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا

اِس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبالیا۔[۲۴]" داؤدؑ نے جواب دیا: "اِس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملا لینے کا مطالبہ کرکے یقیناً تجھ پر ظلم کیا،[۲۵] اور واقعہ یہ ہے کہ مِل جُل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں، اور ایسے لوگ کم ہی ہیں۔" (یہ بات کہتے کہتے) داؤدؑ سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے، چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رُجوع کر لیا۔[۲۶] تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے

۲۳ - بھائی سے مراد حقیقی بھائی نہیں بلکہ دینی اور قومی بھائی ہے۔

۲۴ - آگے کی بات سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی ضروری ہے کہ اِستغاثہ کا یہ فریق یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے میری وہ ایک دُنبی چھین لی اور اپنی دُنبیوں میں ملا لی، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مجھ سے میری دُنبی مانگ رہا ہے، اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا ہے، کیونکہ یہ بڑی شخصیت کا آدمی ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ اس کا مطالبہ ردّ کر دوں۔

۲۵ - یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت داؤدؑ نے ایک ہی فریق کی بات سُن کر اپنا فیصلہ کیسے دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب مدّعی کی شکایت پر مدّعا علیہ خاموش رہا اور اس کی تردید میں کچھ نہ بولا تو یہ خود ہی اس کے اقرار کا ہم معنیٰ تھا۔ اس بنا پر حضرت داؤدؑ نے یہ رائے قائم کی کہ واقعہ وہی کچھ ہے جو مدّعی بیان کر رہا ہے۔

۲۶ - اس امر میں اختلاف ہے کہ اس مقام پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہاں سجدہ واجب نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک نبی کی توبہ ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ وجوب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں ابنِ عباسؓ سے تین روایتیں محدثین نے نقل کی ہیں۔ عِکرِمہ کی روایت یہ ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا: "یہ اُن آیات میں سے نہیں ہے جن پر سجدہ لازم ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝۲۵ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ

تقرُّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۲۷] (ہم نے اس سے کہا:) "اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے،

مگر میں نے اس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا ہے۔" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مُسندِ احمد) دوسری رِوایت جو اُن سے سعید بن جُبیرؒ نے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "سورۂ ص میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور فرمایا: داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں"، یعنی اس بات پر کہ ان کی توبہ قبول ہوئی۔ (نسائی) تیسری رِوایت جو مجاہدؒ نے ان سے نقل کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ "یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے راہِ راست دکھائی تھی، لہٰذا تم ان کے طریقے کی پیروی کرو۔" اب چونکہ حضرت داؤدؑ بھی ایک نبی تھے اور انھوں نے اس موقع پر سجدہ کیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اقتدا میں یہاں سجدہ فرمایا۔ (بخاری) یہ تین بیانات تو حضرت ابنِ عباسؓ کے ہیں۔ اور حضرت ابوسعید خُدریؓ کا بیان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبے میں سورۂ ص پڑھی اور جب آپؐ اس آیت پر پہنچے تو آپؐ نے منبر پر سے اُتر کر سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ سب حاضرین نے بھی کیا۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اسی طرح آپؐ نے یہی سورہ پڑھی تو اس آیت کو سنتے ہی لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: "یہ ایک نبی کی توبہ ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ سجدے کے لیے تیار ہو گئے ہو"___ یہ فرما کر آپؐ منبر سے اُترے اور سجدہ کیا اور سب حاضرین نے بھی کیا۔ (ابوداؤد) ان رِوایات سے اگرچہ وجوبِ سجدہ کی قطعی دلیل تو نہیں ملتی، لیکن کم از کم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اکثر سجدہ فرمایا ہے، اور سجدہ نہ کرنے کی بہ نسبت یہاں سجدہ کرنا بہرحال افضل ہے۔ بلکہ ابنِ عباسؓ کی تیسری رِوایت، جو ہم نے اوپر بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے، عَدَمِ وجوب کی بہ نسبت وجوب کے حکم کا پلڑا جھکا دیتی ہے۔

ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خَرَّ رَاكِعًا (رُکوع میں گر پڑا) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، مگر تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد خَرَّ سَاجِدًا (سجدے میں گر پڑا) ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ نماز یا غیر نماز میں آیتِ سجدہ سُن کر یا پڑھ کر آدمی سجدے کے بجائے صرف رُکوع بھی کر سکتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رُکوع کا لفظ استعمال کر کے سجدہ مراد لیا ہے تو معلوم ہوا کہ رکوع سجدے کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ فُقہائے شافعیہ میں سے امام خَطّابی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ رائے اگرچہ بجائے خود صحیح اور معقول ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے عمل میں ہم کو ایسی کوئی نظیر نہیں ملی کہ آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنے کے بجائے رُکوع ہی کر لینے پر اِکتفا کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس رائے پر عمل صرف اُس صورت میں کرنا چاہیے جب سجدہ کرنے میں کوئی اَمر مانع ہو۔ اسے معمول بنا لینا دُرست نہیں ہے، اور خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ اسے معمول بنایا جائے، بلکہ وہ صرف اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۷ - اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤدؑ سے قصور تو ضرور ہوا تھا، اور وہ کوئی ایسا قصور تھا جو دُنبیوں والے مُقدّمے سے کسی طرح کی مماثلت رکھتا تھا اِسی لیے اُس کا فیصلہ سناتے ہوئے معاً ان کو یہ خیال آیا کہ یہ میری آزمائش ہوئی ہے، لیکن اُس

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶

ع ۱۲

لہٰذا تُو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بُھول گئے[۲۸]۔" ع

قصور کی نوعیت ایسی شدید نہ تھی کہ اسے معاف نہ کیا جاتا، یا اگر معاف کیا بھی جاتا تو وہ اپنے مرتبۂ بلند سے گرا دیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہاں خود تصریح فرما رہا ہے کہ جب انھوں نے سجدے میں گر کر توبہ کی تو نہ صرف یہ کہ انھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ دنیا اور آخرت میں ان کو جو بلند مقام حاصل تھا اُس میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

۲۸ - یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندیِ دَرجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل اُن سے صادر ہوا تھا اُس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اِقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں: اول، یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اِس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے، یہ کہ اِس سِیاق وسَباق میں اس کا ذکر کس مُناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابِ مقدّس) کا مُطالَعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اُورِیاہ حِتّی (Uriah the Hittite) کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اُورِیاہ کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اُس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں تھی۔ یہ پورا قصہ بائبل کی کتابِ سموئیل دوم، باب ۱۱-۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائبل میں درج ہو چکا تھا۔ دُنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو بھی اپنی اِس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سُنتا تھا، وہ اس قصے سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا۔ انھی لوگوں کے ذریعے سے یہ دنیا میں مشہور ہوا، اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤدؑ کے خلاف اِس الزام کو دُہرایا نہ جاتا ہو۔ اس مشہور قصے میں یہ بات بھی درج ہے کہ:

"خداوند نے ناتَن کو داؤدؑ کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے پاس آ کر اس سے کہا: کسی شہر میں دو شخص تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک امیر، دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلّے تھے۔ پر اُس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے خرید کر پالا تھا، اور وہ اُس کے اور اُس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی۔ وہ اُسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالے سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی۔ اور اُس امیر کے ہاں کوئی مسافر آیا۔ سو اُس نے اُس مسافر کے لیے جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلّے میں سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اُس شخص کے لیے، جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکائی۔ تب داؤد کا غضب اُس شخص پر بشدت بھڑکا اور اُس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم! کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا، واجب القتل ہے۔ سو اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تُو ہی ہے...... تو نے حتّی اُوریاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عمّون کی تلوار سے قتل کروایا۔'' (۲۔سموئیل، باب ۱۲، فقرات ۱ تا ۹)

اس قصے اور اُس کی اِس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآنِ مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔ اصل واقعہ جو قرآنِ مجید کے مذکورۂ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اُس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر، قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمایش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے ایک فرضی مُقدّمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مُقدّمہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے سُن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلے کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اُس کا صُدور خود اُن سے اُس شخص کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رُجوع فرما لیا۔

بائبل میں اس واقعے کی وہ گھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو اُس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعے سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے مُلک کی مَلِکہ ہونی چاہیے۔ اسی خیال سے مغلوب ہو کر انھوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت انھوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ ایک شخص اگر کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف

اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات دوست ایک دوسرے کے پاسِ خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تا کہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤدؑ کو اس امر کا احساس نہ ہوا کہ ایک عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عُنصر سے خالی ہوسکتا ہے، مگر ایک فرماں روا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جائے تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہوسکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اُس تمثیلی مُقدمے کے ذریعے سے ان کو توجہ دلائی گئی تو وہ بلا تأمّل اپنی اس خواہش سے دست بردار ہوگئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی کسی خواہش اور کوشش کے بغیر اُس خاتون کا شوہر ایک جنگ میں شہید ہوگیا، اور انھوں نے اس سے نکاح کر لیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کر دی، اور یہ خُبثِ نفس اُس وقت اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہوگیا۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۵۶) اِن مُحرِّکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے، معاذ اللہ! اُورِیاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا تھا کہ وہ برہنہ نہا رہی تھی۔ انھوں نے اس کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے زِنا کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ پھر انھوں نے اُوریاہ کو بنی عمّون کے مقابلے پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر یوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کر دے جہاں وہ لازماً مارا جائے۔ اور جب وہ مارا گیا تو انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، اور اسی عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی "کتابِ مقدس" میں ثبت کر دیے ہیں، تا کہ نسلاً بعد نسلٍ اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے اُن دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے سب سے بڑے مُحسن تھے۔

قرآنِ مجید کے مفسّرین میں سے ایک گروہ نے تو اُن افسانوں کو قریب قریب جُوں کا تُوں قبول کر لیا ہے جو بنی اسرائیل کے ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں۔ اسرائیلی روایات کا صرف اتنا حصہ انھوں نے ساقط کیا ہے جس میں حضرت داؤدؑ پر زِنا کا الزام لگایا گیا تھا اور عورت کے حاملہ ہو جانے کا ذکر تھا۔ باقی سارا قصہ اُن کی نقل کردہ روایات میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح وہ بنی اسرائیل میں مشہور تھا۔ دوسرے گروہ نے سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کر دیا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے کوئی ایسا فعل صادر ہوا تھا جو دنبیوں والے مُقدّمے سے کوئی مُماثلت رکھتا ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنی طرف سے اِس قصے کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اور خود قرآن کے سیاق وسباق سے بھی وہ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ لیکن مفسّرین ہی میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک بات تک پہنچا ہے اور قرآن کے واضح اشارات سے قصے کی اصل حقیقت پا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقوال مُلاحظہ ہوں:

مَسرُوقؒ اور سعید بن جُبیرؒ، دونوں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "حضرت داؤدؑ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اُس عورت کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنی بیوی کو میرے لیے چھوڑ دے۔" (ابنِ جریر)

علامۂ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں کہ "جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کا قصہ بیان فرمایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اُس شخص سے صرف یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اُن کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔"

علامۂ ابوبکر جصاصؒ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ عورت اس شخص کی منکوحہ نہیں بلکہ صرف منطوبہ یا منسوبہ تھی، حضرت داؤدؑ نے اسی عورت سے نکاح کا پیغام دے دیا، اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کیونکہ انھوں نے اپنے مومن بھائی کے پیغام پر

Maktaba Tul Ishaat.com

پیغام دیا تھا حالانکہ ان کے گھر میں پہلے سے کئی بیویاں موجود تھیں۔ (احکام القرآن) بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن یہ بات قرآن کے بیان سے پوری مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآنِ مجید میں مُقدّمہ پیش کرنے والے کے جو الفاظ نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ: لِیْ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا ''میرے پاس بس ایک ہی دُنبی ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسے میرے حوالے کر دے۔'' یہی بات حضرت داؤدؑ نے بھی اپنے فیصلے میں ارشاد فرمائی کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ ''اس نے تیری دُنبی مانگنے میں تجھ پر ظلم کیا۔'' یہ تمثیل حضرت داؤدؑ اور اُوریاہ کے معاملے پر اسی صورت میں چسپاں ہو سکتی ہے، جب کہ وہ عورت اُس شخص کی بیوی ہو۔ پیغام پر پیغام دینے کا معاملہ ہوتا تو پھر تمثیل یوں ہوتی کہ'' میں ایک دُنبی لینا چاہتا تھا اور اس نے کہا کہ یہ بھی میرے لیے چھوڑ دے۔''

قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ احکام القرآن میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اصل واقعہ بس یہی ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص سے کہا کہ میرے لیے اپنی بیوی چھوڑ دے، اور سنجیدگی کے ساتھ یہ مطالبہ کیا..... قرآن میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ شخص ان کے اس مطالبے پر اپنی بیوی سے دست بردار ہو گیا اور حضرت داؤدؑ نے اس عورت سے اس کے بعد شادی کر لی اور حضرت سلیمانؑ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے..... جس بات پر عتاب ہوا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے ایک عورت کے شوہر سے یہ چاہا کہ وہ ان کی خاطر اسے چھوڑ دے..... یہ فعل خواہ فی الجملہ جائز ہی ہو مگر منصبِ نبوت سے بعید تھا، اسی لیے اُن پر عتاب بھی ہوا اور ان کو نصیحت بھی کی گئی۔''

یہی تفسیر اُس سیاق و سباق سے بھی مناسبت رکھتی ہے جس میں یہ قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید میں اِس مَقام پر یہ قصّہ دو اغراض کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ'' جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو۔'' یعنی تمھیں تو ساحر اور کذّاب ہی کہا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بندے داؤدؑ پر تو ظالموں نے زِنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیے، لہٰذا اِن لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اُسے برداشت کرتے رہو۔ دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو، لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہیں چھوڑتا، حتّٰی کہ جو بندے اس کے نہایت محبُوب و مقرّب ہوتے ہیں، وہ بھی اگر ایک ذرا سی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوندِ عالَم اُن سے سخت مواخذہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصّہ بیان کرو جو ایسی اور ایسی خوبیوں کا مالک تھا، مگر جب اس سے ایک بے جا بات سرزد ہو گئی تو دیکھو کہ ہم نے اسے کس طرح سرزنش کی۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی اور باقی رہ جاتی ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ تمثیل میں مُقدّمہ پیش کرنے والے نے یہ جو کہا ہے کہ اس شخص کے پاس ۹۹ دُنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے جسے یہ مانگ رہا ہے، اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید حضرت داؤدؑ کے پاس ۹۹ بیویاں تھیں اور وہ ایک عورت حاصل کر کے ۱۰۰ کا عدد پورا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دراصل تمثیل کے ہر ہر جُز کا حضرت داؤدؑ اور اُوریاہ حِتّی کے معاملے پر لفظ بلفظ چسپاں ہونا ضروری نہیں ہے۔ عام محاورے میں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝۲۷ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ

ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔[۲۹] یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنّم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متّقیوں کو ہم

دس، بیس، پچاس وغیرہ اعداد کا ذکر صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ ٹھیک تعداد بیان کرنے کے لیے۔ ہم جب کسی سے کہتے ہیں کہ دس مرتبہ تم سے فُلاں بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دس بار گن کر وہ بات کہی گئی ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارہا وہ بات کہی جا چکی ہے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ تمثیلی مُقدّمے میں وہ شخص حضرت داؤدؑ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ آپ کے پاس متعدِّد بیویاں ہیں، اور پھر بھی آپ دوسرے شخص کی ایک بیوی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات مفسر نیسابُوریؒ نے حضرت حَسَنؒ بصری سے نقل کی ہے کہ لم یکن لداؤد تسع وتسعون امرأۃ وانما ھذا مثل۔ ”حضرت داؤدؑ کی ۹۹ بیویاں نہ تھیں بلکہ یہ صرف ایک تمثیل ہے۔“

(اس قصّے پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں کی ہے۔ جو اصحاب ہماری بیان کردہ تاویل کی ترجیح کے مفصّل دلائل معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے صفحات ۲۹ تا ۴۴ مُلاحظہ فرمائیں۔)

۲۹ – یعنی محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ یہ ارشاد پچھلی تقریر کا ماحَصل بھی ہے اور آگے کے مضمون کی تمہید بھی۔ پچھلی تقریر کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان یہاں شُترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، نہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ آگے کے مضمون کی تمہید کے طور پر اس فقرے سے کلام کا آغاز کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عَبَث کا اِرتکاب کیا ہے۔ یہی بات قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر مختلف طریقوں سے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (المومنون: ۱۱۵)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے جانے والے نہیں ہو؟

Maktaba Tul Ishaat.com

كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذْ
عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ

فاجروں جیسا کر دیں؟[30] ـــــ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب[31] ہے جو (اے محمدؐ!) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

اور داوٗدؑ کو ہم نے سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا،[32] بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رُجوع کرنے والا۔ قابلِ ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے تیز رَو گھوڑے پیش کیے گئے[33] تو اس نے کہا: ''میں نے اس مال[34] کی محبّت اپنے رب کی

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿﴾
(الدخان: ۳۸-۴۰)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اس کائنات کو جو ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان کو برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ درحقیقت فیصلے کا دن اِن سب کے لیے حاضری کا وقتِ مقرر ہے۔

۳۰- یعنی کیا تمھارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمھارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مُحاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی مُحرّک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر، معاذ اللہ! ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اُٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خَلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فِسق و فُجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۳۱- برکت کے لُغوی معنی ہیں: ''افزایشِ خیر و سعادت''۔ قرآنِ مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے، اُس کی زندگی کو دُرست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے، اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ

یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔'' یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہوگئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔[۳۵] اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش

۳۲- حضرت سلیمانؑ کا ذکر اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۰۴۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۵، النمل، حواشی ۱۸ تا ۵۶، سورۂ سبا، آیات ۱۲-۱۴۔

۳۳- اصل الفاظ ہیں: اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اُچھل کود نہ کریں، اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

۳۴- اصل میں لفظ خَیْر استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں مالِ کثیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گھوڑوں کے لیے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے رکھا تھا، اس لیے انھوں نے ''خیر'' کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

۳۵- ان آیات کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ ان کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے مُعائنے اور ان کی دوڑ کے مُلاحظہ میں اس قدر مشغول ہوئے کہ نمازِ عصر بھول گئے، یا بقولِ بعض اپنا کوئی خاص وظیفہ پڑھنا بھول گئے جو وہ عصر و مغرب کے درمیان پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج چھُپ گیا۔ تب انھوں نے حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ، اور جب وہ واپس آئے تو حضرت سلیمانؑ نے تلوار لے کر ان کو کاٹنا، یا بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے اُن کو قربان کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ذکرِ الٰہی سے غفلت کے موجب بن گئے تھے۔ اس مطلب کے لحاظ سے ان آیات کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: '' تو اس نے کہا: مَیں نے اس مال کی محبّت کو ایسا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد (نمازِ عصر، یا وظیفۂ خاص) سے غافل ہوگیا، یہاں تک کہ (سورج پردۂ مغرب میں) چھپ گیا۔ (پھر اس نے حکم دیا کہ) واپس لاؤ ان (گھوڑوں) کو (اور جب وہ واپس آئے) تو لگا اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار کے) ہاتھ چلانے۔'' یہ تفسیر اگرچہ بعض اکابر مفسرین نے کی ہے، لیکن یہ اس وجہ سے قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اس میں مفسر کو تین باتیں اپنی طرف سے بڑھانی پڑتی ہیں جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اوّلاً، وہ فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی نمازِ عصر اس شغل میں چھوٹ گئی، یا ان کا کوئی خاص وظیفہ چھوٹ گیا جو وہ اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ صرف یہ ہیں: اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ '' میں نے اس مال کو اتنا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہوگیا''، لیکن ان میں نمازِ عصر یا کوئی خاص وظیفہ مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔ ثانیاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ سورج چھپ گیا، حالانکہ وہاں سورج کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ کے الفاظ پڑھ کر آدمی کا ذہن بلا تأمّل اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ کی

Maktaba Tul Ishaat.com

طرف پھرتا ہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا ہے۔ ثالثاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر خالی مسح نہیں کیا بلکہ تلوار سے مسح کیا، حالانکہ قرآن میں مَسْحًا بِالسَّیْفِ کے الفاظ نہیں ہیں، اور کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر مسح بالسیف مراد لیا جا سکے۔ ہمیں اس طریقِ تفسیر سے اُصُولی اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں دُرست ہو سکتا ہے۔ یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں کسی دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو، یا کسی صحیح حدیث میں اس اِجمال کی شرح ملتی ہو، یا اس کا اور کوئی قابلِ اعتبار ماخذ ہو، مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس اِجمال کی تفصیلات ملتی ہوں، آثارِ کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اس کی تشریح ہو رہی ہو، اور احکامِ شرعیّہ کا معاملہ ہے تو فقہِ اسلامی کے مآخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں۔ جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہاں محض بطورِ خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن کی عبارت میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

ایک گروہ نے مذکورۂ بالا ترجمہ وتفسیر سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ اور رُدُّوْهَا عَلَیَّ، دونوں کی ضمیر سورج ہی کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی جب نمازِ عصر فوت ہو گئی اور سورج پردۂ مغرب میں چھپ گیا تو حضرت سلیمانؑ نے کارکنانِ قضا وقدر سے کہا کہ پھیر لاؤ سورج کو، تاکہ عصر کا وقت واپس آ جائے اور میں نماز ادا کر لوں، چنانچہ سورج پلٹ آیا اور انھوں نے نماز پڑھ لی۔ لیکن یہ تفسیر اُوپر والی تفسیر سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ سورج کو واپس لانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے، حالانکہ حضرت سلیمانؑ کے لیے اتنا بڑا معجزہ صادر ہوا ہوتا تو وہ ضرور قابلِ ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اور اس لیے بھی کہ سورج کا غُروب ہو کر پلٹ آنا ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اگر وہ درحقیقت پیش آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ اس کے ذکر سے ہرگز خالی نہ رہتی۔ اس تفسیر کی تائید میں یہ حضرات بعض احادیث بھی پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سُورج کا غروب ہو کر دوبارہ پلٹ آنا ایک ہی دفعہ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ کئی دفعہ پیش آیا ہے۔ قصۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورج کے واپس لائے جانے کا ذکر ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی حضورؐ کے لیے وہ واپس لایا گیا۔ اور حضرت علیؓ کے لیے بھی، جب کہ حضوؐر ان کی گود میں سر رکھے سو رہے تھے اور ان کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی، حضورؐ نے سورج کی واپسی کی دعا فرمائی تھی اور وہ پلٹ آیا تھا۔ لیکن اِن روایات سے اِستدلال اُس تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے جس کی تائید کے لیے انھیں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق جو روایت بیان کی جاتی ہے اس کے تمام طُرُق اور رجال پر تفصیلی بحث کر کے ابنِ تیمیہؒ نے اسے موضوع ثابت کیا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور ابنِ جوزی کہتے ہیں کہ وہ بلا شک وشبہ موضوع ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سورج کی واپسی والی روایت بھی بعض محدثین کے نزدیک ضعیف اور بعض کے نزدیک موضوع ہے۔ رہی قصۂ معراج والی روایت، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ سے شبِ معراج کے حالات بیان فرما رہے تھے تو کفار نے آپؐ سے ثبوت طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بیت المقدس کے راستے میں فُلاں مقام پر ایک قافلہ ملا تھا جس کے ساتھ فلاں واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے پوچھا: وہ قافلہ کس روز مکہ پہنچے گا۔ آپؐ نے فرمایا: فلاں روز۔ جب وہ دن آیا تو قریش کے لوگ دن بھر قافلے کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ شام ہونے کو آ گئی۔ اس موقع پر حضورؐ نے دُعا کی کہ دن اس وقت تک غروب نہ ہو

وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رُجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بیشک تُوہی اصل داتا ہے۔"[۳۶]

جب تک قافلہ نہ آ جائے۔ چنانچہ فی الواقع سورج ڈوبنے سے پہلے وہ پہنچ گیا۔ اس واقعے کو بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس روز دن میں ایک گھنٹے کا اضافہ کر دیا گیا اور سورج اتنی دیر تک کھڑا رہا۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی روایات کیا اتنے بڑے غیر معمولی واقعے کے ثبوت میں کافی شہادت ہیں؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، سورج کا پلٹ آنا، یا گھنٹا بھر کا رہنا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں ہے۔ ایسا واقعہ اگر فی الواقع پیش آ گیا ہوتا تو دنیا بھر میں اس کی دُھوم مچ گئی ہوتی۔ بعض اخبارِ آحاد تک اس کا ذکر کیسے محدود رہ سکتا تھا؟

مفسرین کا تیسرا گروہ ان آیات کا وہی مفہوم لیتا ہے جو ایک خالی الذہن آدمی اس کے الفاظ پڑھ کر اس سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق واقعہ بس اس قدر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جب اعلیٰ درجے کے اصیل گھوڑوں کا ایک دستہ پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: یہ مال مجھے کچھ اپنی بڑائی کی غرض سے یا اپنے نفس کی خاطر محبوب نہیں ہے بلکہ اِن چیزوں سے دلچسپی کو میں اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے لیے پسند کرتا ہوں۔ پھر انھوں نے ان گھوڑوں کی دوڑ کرائی یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اُن کو واپس طلب فرمایا اور جب وہ آئے تو بقول ابنِ عباسؓ: جعل یمسح اعراف الخیل وعراقیبھا حُبًّا لھا، "حضرت اُن کی گردنوں پر اور ان کی پنڈلیوں پر محبّت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔" یہی تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ یہ قرآنِ مجید کے الفاظ سے پوری مطابقت رکھتی ہے اور مطلب کی تکمیل کے لیے اس میں ایسی کوئی بات بڑھانی نہیں پڑتی جو نہ قرآن میں ہو، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں۔

یہ بات بھی اس موقع پر نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس واقعے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے حق میں نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف کثرت سے رُجوع کرنے والا) کے تعریفی کلمات ارشاد فرمانے کے معاً بعد کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ دیکھو، وہ ہمارا ایسا اچھا بندہ تھا، بادشاہی کا سروسامان اُس کو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ ہماری خاطر پسند تھا، اپنے شاندار رسالے کو دیکھ کر دنیا پرست فرماں رواؤں کی طرح اس نے ڈینگیں نہ ماریں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی اُسے یاد آئے۔

۳۶ – سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اِس جگہ اصل مقصد یہی واقعہ بیان کرنا ہے اور پچھلی آیات اسی کے لیے بطورِ تمہید ارشاد ہوئی ہیں۔ جس طرح پہلے حضرت داؤدؑ کی تعریف کی گئی، پھر اُس واقعے کا ذکر کیا گیا جس میں وہ مبتلائے فتنہ ہو گئے تھے، یہ بتایا گیا کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ نے اپنے ایسے محبوب بندے کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہ چھوڑا، پھر ان کی یہ شان دکھائی گئی کہ فتنے پر متنبّہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ہوتے ہی وہ تائب ہو گئے اور اللہ کے آگے جھک کر انھوں نے اپنے اس فعل سے رُجوع کر لیا، اسی طرح یہاں بھی ترتیب کلام یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ بلند اور شانِ بندگی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی آزمایش میں ڈالا گیا، پھر اُن کی یہ شانِ بندگی دکھائی گئی ہے کہ جب ان کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈال دیا گیا تو وہ فوراً ہی اپنی لغزش پر مُتنبّہ ہو گئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر انھوں نے اپنی اُس بات سے رُجوع کر لیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے۔ بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ ان دونوں قصّوں سے بیک وقت دو باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک، یہ کہ اس کے بے لاگ مُحاسبے سے انبیا تک نہیں بچ سکے ہیں، تابدیگراں چہ رسد۔ دوسرے یہ کہ بندے کے لیے صحیح رویّہ قصور کر کے اکڑنا نہیں ہے بلکہ اُس کا کام یہ ہے کہ جس وقت بھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اُسی وقت وہ عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے۔ اسی رویّے کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لغزشوں کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اور زیادہ الطاف و عنایات سے نوازا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جَسَد کا لا کر ڈالا جانا اُن کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انھوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مفسرین نے چار مختلف مسلک اختیار کیے ہیں۔

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بُت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اُڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جنّ و انس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمانؑ کا سارا اقتدار چھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اور اس دَوران میں وہ شیطان سلیمانؑ بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا۔ سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس زمانے میں اُس شیطان سے حَرَمِ سلیمانی کی خواتین تک کی عِصمت محفوظ نہ رہی۔ آخرِ کار سلطنت کے اَعیان و اکابر اور عُلَما کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے سامنے توراۃ کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی، یا خود اُسی نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کو مل گئی۔ اُسے پکانے کے لیے انھوں نے اس کا پیٹ جو چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جنّ و انس سب سلام کرتے ہوئے اُن کے سامنے حاضر ہو گئے ــــــ یہ پورا افسانہ از سرتاپا خُرافات پر مشتمل ہے جنھیں نَومسلم اہلِ کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مُجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ انگشتریِ سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیا کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری اُمت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔

آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمایش حضرت سلیمانؑ کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان تھے۔ تعجب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاں ۲۰ سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شیاطین کو خطرہ ہوا کہ اگر سلیمانؑ کے بعد یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم پھر اسی غلامی میں مبتلا رہیں گے، اس لیے انھوں نے اسے قتل کر دینے کی ٹھانی۔ حضرت سلیمانؑ کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے اس لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا، تاکہ وہیں اس کی پرورش ہوتی رہے۔ یہی وہ فتنہ تھا جس میں حضرت مبتلا ہوئے تھے کہ انھوں نے اللہ پر توکل کرنے کے بجائے بادلوں کی حفاظت پر اعتماد کیا۔ اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ وہ بچہ مر کر ان کی کرسی پر آ گرا ـــــ یہ افسانہ بھی بالکل بے سروپا اور صریح قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں بھی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہوائیں اور شیاطین پہلے سے حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر تھے، حالانکہ قرآن صاف الفاظ میں ان کی تسخیر کو اس فتنے کے بعد کا واقعہ بتا رہا ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انھوں نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لا کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹، اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اِسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے، اور باعتبارِ روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہو گی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے۔ بلکہ آپؐ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطورِ مثال بیان فرمایا ہوگا، اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضورؐ خود بطورِ واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اُتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دم لیے فی گھنٹا ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا ۱۱ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہوگی؟ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر جس جَسَد کے ڈالے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچّے کی پیدائش پر حضرت سلیمانؑ کا اِستغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے اِستغفار کے ساتھ یہ دعا

Maktaba Tul Ishaat.com

فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيۡحَ تَجۡرِيۡ بِاَمۡرِهٖ رُخَآءً حَيۡثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَ

تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخّر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا،[۳۷] اور

کیوں مانگی کہ "مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔"

ایک اور تفسیر جس کو امام رازیؒ ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، یا کسی خطرے کی وجہ سے اس قدر متفکر تھے کہ گھلتے گھلتے وہ بس ہڈی اور چمڑا بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ تفسیر قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ "ہم نے سلیمان کو آزمایش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا، پھر اس نے رُجوع کیا۔" ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جسد سے مراد خود حضرت سلیمانؑ ہیں۔ ان سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمایش میں ڈالے جانے سے مراد کوئی قصور ہے جو آنجناب سے صادر ہوا تھا، اس قصور پر آپ کو تنبیہ اس شکل میں فرمائی گئی کہ آپ کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالا گیا، اور اس پر جب آپ کو اپنے قصور کا احساس ہوا تو آپ نے رُجوع فرمالیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآنِ مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی دعا کے یہ الفاظ کہ "اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو"، اگر تاریخِ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آیندہ انھی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں "فتنہ" قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت مُتنبِّہ ہوئے جب اُن کا ولی عہد رَجُبعام، ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اُٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اُن کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ ایک کُندۂ ناتراش تھا۔ تب انھوں نے اپنی اس خواہش سے رُجوع کیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے، میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔ بعد میں ان کے اَعیانِ سلطنت نے رَجُبعام کو تخت پر بٹھایا، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے شمالی فلسطین کا علاقہ لے کر الگ ہو گئے اور صرف یہوداہ کا قبیلہ بیت المَقدِس کے تخت سے وابستہ رہ گیا۔

۳۷- اس کی تشریح سورۂ انبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۷۶-۱۷۷) البتہ یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت سلیمانؑ کے لیے ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں الرِّيۡحَ عَاصِفَةً (بادِ تُند) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسی ہوا کے متعلق فرمایا گیا ہے: تَجۡرِيۡ بِاَمۡرِهٖ رُخَآءً (وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا بجائے خود تو بادِ تُند تھی، جیسی کہ بادبانی جہازوں کو چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے، مگر حضرت سلیمانؑ کے لیے وہ اس معنیٰ میں نرم بنا دی گئی تھی کہ جدھر اُن کے تجارتی بیڑوں کو سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی

الشَّیٰطِیۡنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّ اٰخَرِیۡنَ مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ ﴿۳۸﴾
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِکۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَ اِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا
لَزُلۡفٰی وَ حُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ

وقف لازم ع

شیاطین کو مسخّر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابندِ سلاسل تھے۔[38] (ہم نے اُس سے کہا:) ''یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں۔''[39] یقیناً اُس کے لیے ہمارے ہاں تقرّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[40] ع

اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو،[41] جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے

اُسی طرف وہ چلتی تھی۔

۳۸- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۵- النمل، حواشی ۲۳-۲۸-۴۵-۴۶-۴۷ ____ شیاطین سے مراد جن ہیں۔ اور ''پابندِ سلاسل شیاطین'' سے مراد وہ خدمت گار شیاطین ہیں جنھیں شرارت کی پاداش میں مُقیّد کر دیا جاتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بیڑیاں اور زنجیریں جن سے یہ شیاطین باندھے جاتے تھے، لوہے کی ہی بنی ہوئی ہوں اور قیدی انسانوں کی طرح وہ بھی لوگوں کو علانیہ بندھے ہوئے نظر آتے ہوں۔ بہرحال انھیں کسی ایسے طریقے سے مقیّد کیا جاتا تھا جس سے وہ بھاگنے اور شرارت کرنے پر قادر نہ رہتے تھے۔

۳۹- اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ یہ ہماری بے حساب بخشش ہے، تمھیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ دوسرے، یہ کہ یہ ہماری بخشش ہے، جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو، دینے یا نہ دینے پر تم سے کوئی مُحاسبہ نہ ہو گا۔ ایک اور مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ شیاطین کُلّیتاً تمھارے تصرُّف میں دے دیے گئے ہیں، اِن میں سے جسے چاہو رہا کر دو اور جسے چاہو روک رکھو، اس پر کوئی محاسبہ تم سے نہ ہو گا۔

۴۰- اس ذکر سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی اکڑ جتنی مبغوض ہے، اُس کی عاجزی کی ادا اتنی ہی محبوب ہے۔ بندہ اگر قصور کرے اور تنبیہ کرنے پر الٹا اور زیادہ اکڑ جائے تو انجام وہ ہوتا ہے جو آگے آدم و ابلیس کے قصے میں بیان ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ذرا لغزش بھی اگر بندے سے ہو جائے اور وہ توبہ کر کے عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے تو اس پر وہ نوازشات فرمائی جاتی ہیں جو داؤد و سلیمان علیہما السلام پر فرمائی گئیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اِستغفار کے بعد جو دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ بلفظ پورا کیا اور ان کو فی الواقع ایسی بادشاہی دی جو نہ اُن سے پہلے کسی کو ملی تھی، نہ اُن کے بعد آج تک کسی کو عطا کی گئی۔ ہواؤں پر تصرُّف اور جِنّوں پر حکمرانی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے جو انسانی تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی کو بخشی گئی ہے، کوئی دوسرا اس میں ان کا شریک نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ
بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝٤٢ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى
لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝٤٣ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۗ

سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے[۴۲]۔ (ہم نے اُسے حکم دیا:) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے[۴۳]۔ ہم نے اُسے اس کے اہل وعیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اُتنے ہی[۴۴] اور، اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، اور عقل وفکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر[۴۵]۔ (اور ہم نے اُس سے کہا:) تنکوں کا ایک مُٹھا لے اور اُس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ[۴۶]۔

---

۴۱ – یہ چوتھا مقام ہے جہاں حضرت ایوبؑ کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نساء، آیت ۱۶۳، سورۂ انعام، آیت ۸۴ اور سورۂ انبیاء، آیات ۸۳ – ۸۴ میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم تفسیر سورۂ انبیاء میں ان کے حالات کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۶ تا ۷۹)

۴۲ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے بیماری میں مبتلا کر دیا ہے اور میرے اُوپر مصائب نازل کر دیے ہیں، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بیماری کی شدت، مال و دولت کے ضیاع، اور اَعزّہ و اقربا کے منہ موڑ لینے سے میں جس تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہوں، اُس سے بڑھ کر تکلیف اور عذاب میرے لیے یہ ہے کہ شیطان اپنے وسوسوں سے مجھے تنگ کر رہا ہے، وہ ان حالات میں مجھے اپنے رب سے مایوس کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے اپنے رب کا ناشکرا بنانا چاہتا ہے، اور اس بات کے درپے ہے کہ میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوڑ بیٹھوں۔ حضرت ایوبؑ کی فریاد کا یہ مطلب ہمارے نزدیک دو وجوہ سے قابلِ ترجیح ہے: ایک یہ کہ قرآن مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے شیطان کو صرف وسوسہ اندازی ہی کی طاقت عطا فرمائی ہے، یہ اختیارات اس کو نہیں دیے ہیں کہ اللہ کی بندگی کرنے والوں کو بیمار ڈال دے اور انھیں جسمانی اذیتیں دے کر بندگی کی راہ سے ہٹنے پر مجبور کرے۔ دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت ایوبؑ اپنی بیماری کی شکایت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ”مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔“

۴۳ – یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مرض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔

۴۴ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری میں حضرت ایوبؑ کی بیوی کے سوا اور سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا

تھا، حتٰی کہ اولاد تک ان سے منہ موڑ گئی تھی۔ اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہا ہے کہ جب ہم نے ان کو شفا عطا فرمائی تو سارا خاندان ان کے پاس پلٹ آیا، اور پھر ہم نے ان کو مزید اولاد عطا کی۔

۴۵ – یعنی اس میں ایک صاحبِ عقل آدمی کے لیے یہ سبق ہے کہ انسان کو نہ اچھے حالات میں خدا کو بھول کر سرکش بننا چاہیے اور نہ بُرے حالات میں اس سے مایوس ہونا چاہیے۔ تقدیر کی بھلائی اور بُرائی سراسر اللہ وحدہٗ لاشریک کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہے تو آدمی کے بہترین حالات کو بدترین حالات میں تبدیل کر دے، اور چاہے تو بُرے سے بُرے حالات سے اس کو بخیریت گزار کر بہترین حالت پر پہنچا دے۔ اس لیے بندۂ عاقل کو ہر حالت میں اسی پر توکّل کرنا چاہیے اور اُسی سے آس لگانی چاہیے۔

۴۶ – اِن الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ایوبؑ نے بیماری کی حالت میں ناراض ہو کر کسی کو مارنے کی قسم کھالی تھی، (رِوایات یہ ہیں کہ بیوی کو مارنے کی قسم کھائی تھی) اور اس قسم ہی میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تجھے اتنے کوڑے ماروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرما دی اور حالتِ مرض کا وہ غصہ دور ہو گیا جس میں یہ قسم کھائی گئی تھی، تو اُن کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ قسم پوری کرتا ہوں تو خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو مارنا پڑے گا، اور قسم توڑتا ہوں تو یہ بھی ایک گناہ کا اِرتکاب ہے۔ اس مشکل سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح نکالا کہ انھیں حکم دیا، ایک جھاڑو لو جس میں اُتنے ہی تنکے ہوں جتنے کوڑے تم نے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور اس جھاڑو سے اُس شخص کو بس ایک ضرب لگا دو، تاکہ تمھاری قسم بھی پوری ہو جائے اور اسے ناروا تکلیف بھی نہ پہنچے۔

بعض فقہا اس رعایت کو حضرت ایوبؑ کے لیے خاص سمجھتے ہیں، اور بعض فقہا کے نزدیک دوسرے لوگ بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پہلی رائے ابنِ عَساکرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اور ابوبکر جَصّاصؒ نے مُجاہدؒ سے نقل کی ہے، اور امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ دوسری رائے کو امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زُفَر اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص، مثلاً اپنے خادم کو دس کوڑے مارنے کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں دسوں کوڑے ملا کر اسے صرف ایک ضرب اس طرح لگا دے کہ ہر کوڑے کا کچھ نہ کچھ حصہ اس شخص کو ضرور لگ جائے، تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زانی پر حد جاری کرنے کے معاملے میں بھی اس آیت کا بتایا ہوا طریقہ استعمال فرمایا ہے جو اتنا بیمار یا اتنا ضعیف ہو کہ سو دُرّوں کی مار برداشت نہ کر سکے۔ علّامہ ابوبکر جصاصؒ نے حضرت سعید بن سعدؓ بن عُبادہ سے رِوایت نقل کی ہے کہ قبیلۂ بنی ساعِدہ میں ایک شخص سے زِنا کا ارتکاب ہوا اور وہ ایسا مریض تھا کہ بس ہڈی اور چمڑا رہ گیا تھا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ خذوا عثکالًا فیہ مائۃ شمراخ فاضربوہ بھا ضربۃ واحدۃ، ''کھجور کا ایک ٹہنا لو جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے بیک وقت اس شخص کو مار دو۔'' (احکام القرآن) مُسندِ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ، طَبرانی، عبدالرزاق اور دوسری کُتبِ حدیث میں بھی اس کی تائید کرنے والی کئی حدیثیں موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض اور ضعیف پر حد جاری کرنے کے لیے یہی طریقہ مقرر فرمایا تھا۔ البتہ فقہا نے اس کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ ہر شاخ یا ہر تنکا کچھ نہ کچھ مجرم کو لگ جانا چاہیے، اور ایک ہی ضرب سہی، مگر وہ کسی نہ کسی حد تک مجرم کو چوٹ لگانے والی بھی ہونی چاہیے۔ یعنی محض چھو دینا کافی نہیں ہے، بلکہ مارنا ضروری ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

ہم نے اُسے صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رُجوع کرنے والا۔[۴۷]

یہاں یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک بات کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ نامناسب بات ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اس صورت میں آدمی کو وہی کام کرنا چاہیے جو بہتر ہو اور یہی اس کا کفارہ ہے۔ دوسری روایت حضورؐ سے یہ ہے کہ اس نامناسب کام کے بجائے آدمی وہ کام کرے جو اچھا ہو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے۔ یہ آیت اسی دوسری روایت کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ ایک نامناسب کام نہ کرنا ہی اگر قسم کا کفارہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ایوبؑ سے یہ نہ فرماتا کہ تم ایک جھاڑو مار کر اپنی قسم پوری کرلو، بلکہ یہ فرماتا کہ تم یہ نامناسب کام نہ کرو اور اسے نہ کرنا ہی تمھاری قسم کا کفارہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النور، حاشیہ ۲۰)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے جس بات کی قسم کھائی ہو اُسے فوراً پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ حضرت ایوبؑ نے قسم بیماری کی حالت میں کھائی تھی اور اسے پورا تندرست ہونے کے بعد کیا، اور تندرست ہونے کے بعد بھی فوراً ہی نہیں کر دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو حیلۂ شرعی کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حیلہ ہی تھا جو حضرت ایوبؑ کو بتایا گیا تھا، لیکن وہ کسی فرض سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ ایک بُرائی سے بچنے کے لیے بتایا گیا تھا۔ لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ اور بُرائی کو دفع کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے بچنے کے لیے حیلہ سازی گناہ دَرگناہ ہے۔ بلکہ اس کے ڈانڈے کفر سے جا ملتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص اِن ناپاک اغراض کے لیے حیلہ کرتا ہے وہ گویا خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال ختم ہونے سے پہلے اپنا مال کسی اور کی طرف منتقل کر دیتا ہے وہ محض ایک فرض ہی سے فرار نہیں کرتا، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس ظاہری فعل سے دھوکا کھا جائے گا اور اسے فرض سے سبکدوش سمجھ لے گا۔ جن فقہا نے اس طرح کے حیلے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احکامِ شریعت سے جان چھڑانے کے لیے یہ حیلہ بازیاں کرنی چاہییں۔ بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ کو قانونی شکل دے کر بچ نکلے تو قاضی یا حاکم اس پر گرفت نہیں کرسکتا، اُس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔

۴۷ – حضرت ایوبؑ کا ذکر اس سیاق وسباق میں یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندے جب مصائب وشدائد میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے رب سے شِکوہ سنج نہیں ہوتے بلکہ صبر کے ساتھ اس کی ڈالی ہوئی آزمایشوں کو برداشت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ اگر کچھ مدت تک خدا سے دعا مانگتے رہنے پر بلا نہ ٹلے تو پھر اس سے مایوس ہو کر دوسروں کے آستانوں پر ہاتھ پھیلانا شروع کر دیں۔ بلکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ملنا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملنا ہے، اس لیے مصیبتوں کا سلسلہ چاہے کتنا ہی دراز ہو، وہ اُسی کی رحمت کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ اُن الطاف وعنایات سے سرفراز ہوتے ہیں جن کی مثال حضرت ایوبؑ کی زندگی میں ملتی ہے۔ حتّٰی کہ اگر وہ کبھی مضطرب ہو کر کسی اَخلاقی مخمصے میں

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵
اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝۴۶ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ
الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ

اور ہمارے بندوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر کرو۔ بڑی قوّتِ عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے۔[48] ہم نے اُن کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا، اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی۔[49] یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چُنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے۔ اور اسماعیلؑ اور الیسعؑ[50] اور ذُوالکِفلؑ[51] کا ذکر کرو، یہ سب

پھنس بھی جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بُرائی سے بچانے کے لیے ایک راہ نکال دیتا ہے جس طرح اس نے حضرت ایوبؑ کے لیے نکال دی۔

۴۸ – اصل الفاظ ہیں: اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ (ہاتھوں والے اور نگاہوں والے۔) ہاتھ سے مراد، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، قوت وقدرت ہے۔ اور اِن انبیا کو صاحبِ قوت وقدرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہایت باعمل لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور معصیتوں سے بچنے کی زبردست طاقت رکھتے تھے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ نگاہ سے مراد آنکھوں کی بینائی نہیں بلکہ دل کی بصیرت ہے۔ وہ حق بیں اور حقیقت شناس لوگ تھے۔ دنیا میں اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر علم ومعرفت کی پوری روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو لوگ بدعمل اور گمراہ ہیں وہ درحقیقت ہاتھوں اور آنکھوں، دونوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ والا حقیقت میں وہی ہے جو اللہ کی راہ میں کام کرے، اور آنکھوں والا دراصل وہی ہے جو حق کی روشنی اور باطل کی تاریکی میں امتیاز کرے۔

۴۹ – یعنی ان کی تمام سرفرازیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے اندر دنیا طلبی اور دنیا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، ان کی ساری فکر وسعی آخرت کے لیے تھی، وہ خود بھی اُس کو یاد رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اُس کی یاد دلاتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مرتبے دیے جو دنیا بنانے کی فکر میں منہمک رہنے والے لوگوں کو کبھی نصیب نہ ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ لطیف نکتہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے لیے صرف الدَّار (وہ گھر، یا اصل گھر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی مطلوب ہے کہ یہ دنیا سرے سے انسان کا گھر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف ایک گزرگاہ ہے، ایک مسافر خانہ ہے جس سے آدمی کو بہرحال رخصت ہو جانا ہے۔ اصل گھر وہی آخرت کا گھر ہے۔ جو شخص اس کو سنوارنے کی فکر کرتا ہے وہی صاحبِ بصیرت ہے اور اللہ کے نزدیک لامحالہ اسی کو پسندیدہ انسان ہونا چاہیے۔ رہا وہ شخص جو اس مسافر خانے میں اپنی چند روزہ قیام گاہ کو سجانے کے لیے وہ حرکتیں کرتا ہے جن سے آخرت کا اصل گھر اُس کے لیے اُجڑ جائے، وہ عقل کا اندھا

Maktaba Tul Ishaat.com

مِّنَ الۡاَخۡيَارِ ﴿۴۸﴾ هٰذَا ذِكۡرٌ ؕ وَ اِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيۡنَ فِيۡهَا يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِفَاكِهَةٍ

نیک لوگوں میں سے تھے۔

یہ ایک ذکر تھا۔ (اب سُنو کہ) متّقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہنے والی جنّتیں جن کے دروازے اُن کے لیے کُھلے ہوں ۵۲ گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، خوب خوب فواکہ اور

ہے اور فطری بات ہے کہ ایسا آدمی اللہ کو پسند نہیں آ سکتا۔

۵۰ – قرآنِ مجید میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے: ایک سورۂ انعام، آیت ۸۶ میں۔ دوسرے اِس جگہ۔ اور دونوں مقامات پر کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ صرف انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے اکابر انبیاؑ میں سے تھے۔ دریائے اُردُن کے کنارے ایک مقام ابیل مَحُولہ (Abel Meholah) کے رہنے والے تھے۔ یہودی اور عیسائی ان کو اِلِیشَعؑ (Elisha) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام جس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا میں پناہ گزیں تھے، اُن کو چند اہم کاموں کے لیے شام و فلسطین کی طرف واپس جانے کا حکم دیا گیا، جن میں سے ایک کام یہ تھا کہ حضرت اَلْیَسَعؑ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کریں۔ اِس فرمان کے مطابق جب حضرت الیاسؑ اِن کی بستی پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ بارہ جوڑی بیل آگے لیے زمین جوت رہے ہیں اور خود بارھویں جوڑی کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے اِن کے پاس سے گزرتے ہوئے اِن پر اپنی چادر ڈال دی اور یہ کھیتی باڑی چھوڑ کر ساتھ ہو لیے۔ (۱-سلاطین، باب ۱۹، فقرات ۱۵ تا ۲۱) تقریباً دس بارہ سال یہ اُن کے زیرِ تربیت رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا تو یہ اُن کی جگہ مقرر ہوئے۔ (۲-سلاطین، باب ۲) بائبل کی کتاب ۲-سلاطین میں باب ۲ سے ۱۳ تک ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی فلسطین کی اسرائیلی سلطنت جب شرک و بُت پرستی اور اَخلاقی نجاستوں میں غرق ہوتی ہی چلی گئی تو آخرکار انھوں نے یاہُو بن یہُوسفط بن نمسی کو اُس خانوادۂ شاہی کے خلاف کھڑا کیا جس کے کرتوتوں سے اسرائیل میں یہ بُرائیاں پھیلی تھیں، اور اس نے نہ صرف بَعل پرستی کا خاتمہ کیا، بلکہ اس بدکردار خاندان کے بچّے بچّے کو قتل کر دیا۔ لیکن اس اصلاحی انقلاب سے بھی وہ برائیاں پوری طرح نہ مٹ سکیں جو اسرائیل کی رگ رگ میں اُتر چکی تھیں، اور حضرت اَلْیَسَعؑ کی وفات کے بعد تو انھوں نے طوفانی شکل اختیار کر لی، یہاں تک کہ سامریہ پر اَشُّوریوں کے پے در پے حملے شروع ہو گئے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد ۲، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷ اور تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۷۰، ۷۱)

۵۱ – حضرت ذوالکِفْلؑ کا ذکر بھی قرآنِ مجید میں دو ہی جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انبیاء۔ دوسرے یہ مقام۔ ان کے متعلق ہم اپنی تحقیق سورۂ انبیاء میں بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۱)

۵۲ – اصل الفاظ ہیں: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ان جنتوں میں وہ بے روک ٹوک پھریں گے کہیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ دوسرے، یہ کہ جنت کے دروازے کھولنے کے لیے کسی کوشش کی حاجت

كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا
تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾ هٰذَا ۚ وَ
اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾ هٰذَا ۙ
فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾ هٰذَا فَوْجٌ
مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۗ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۣ
لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۗ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ

مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سِن بیویاں[53] ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں حساب کے دِن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

یہ تو ہے مُتّقیوں کا انجام۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے، جہنّم جس میں وہ جُھلسے جائیں گے بہت ہی بُری قیام گاہ۔ یہ ہے اُن کے لیے، پس وہ مزا چکھیں کھَولتے ہوئے پانی اور پِیپ[54] لہُو اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنّم کی طرف اپنے پیروؤں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے:) "یہ ایک لشکر تمھارے پاس گُھسا چلا آ رہا ہے، کوئی خوش آمدید اِن کے لیے نہیں ہے، یہ آگ میں جُھلسنے والے ہیں"۔ وہ اُن کو جواب دیں گے: "نہیں بلکہ تم ہی جُھلسے جا رہے ہو کوئی خیر مقدم تمھارے لیے نہیں۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو، کیسی بُری ہے یہ جائے قرار"۔ پھر وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب، جس نے

نہ ہوگی بلکہ وہ مجرّد ان کی خواہش پر خود بخود کُھل جائیں گے۔ تیسرے، یہ کہ جنت کے انتظام پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ اہلِ جنت کو دیکھتے ہی ان کے لیے دروازے کھول دیں گے۔ یہ تیسرا مضمون قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر زیادہ صاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ "یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلامٌ علیکم، خوش آمدید، ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جائیے"۔ (الزُّمر: ۷۳)

۵۳ – ہم سِن بیویوں کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کی

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ۝٦١ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى
رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝٦٢ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ
الْاَبْصَارُ ۝٦٣ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ۝٦٤ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ع
وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝٦٥ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝٦٦ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝٦٧ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝٦٨

ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا اُس کو دوزخ کا دُہرا عذاب دے۔" اور وہ آپس میں کہیں گے: "کیا بات ہے، ہم اُن لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنھیں ہم دنیا میں بُرا سمجھتے تھے؟[55] ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟" بے شک یہ بات سچّی ہے، اہلِ دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) اِن سے[56] کہو: "میں تو بس خبردار کردینے والا ہوں۔[57] کوئی حقیقی معبُود نہیں مگر اللہ، جو یکتا ہے، سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اُن ساری چیزوں کا مالک جو اُن کے درمیان ہیں، زبردست اور درگزر کرنے والا۔" اِن سے کہو: "یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سُن کر تم منہ پھیرتے ہو۔[58]"

ہم رس ہوں گی۔

۵۴ – اصل میں لفظ غَسَّاق استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنیٰ اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ایک معنیٰ جسم سے نکلنے والی رطوبت کے ہیں جو پیپ، لہو، کچ لہو وغیرہ کی شکل میں ہو، اور اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ دوسرے معنیٰ انتہائی سرد چیز کے ہیں۔ اور تیسرے معنیٰ انتہائی بدبودار مُتعفّن چیز کے۔ لیکن اس لفظ کا عام استعمال پہلے ہی معنیٰ میں ہوتا ہے، اگرچہ باقی دونوں معنیٰ بھی لغت کے اعتبار سے دُرست ہیں۔

۵۵ – مراد ہیں وہ اہلِ ایمان جن کو یہ کفار دنیا میں بُرا سمجھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حیران ہو ہو کر ہر طرف دیکھیں گے کہ اس جہنّم میں ہم اور ہمارے پیشوا تو موجود ہیں مگر اُن لوگوں کا یہاں کہیں پتا نشان تک نہیں ہے جن کی ہم دنیا میں بُرائیاں کرتے تھے اور خدا، رسول، آخرت کی باتیں کرنے پر جن کا مذاق ہماری مجلسوں میں اُڑایا جاتا تھا۔

۵۶ – اب کلام کا رُخ پھر اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جس سے تقریر کا آغاز ہوا تھا۔ اس حصّے کو پڑھتے ہوئے پہلے رُکوع سے مقابلہ کرتے جائیے، تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آسکے۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ
اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ
بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

(ان سے کہو:) ”مجھے اُس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب مَلاءِ اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعے سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کُھلا کُھلا خبردار کرنے والا ہوں۔“ جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا[۵۹]: ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں[۶۰]، پھر جب میں اسے پُوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی رُوح پھُونک دوں[۶۱]

۵۷ – آیت نمبر ۴ میں فرمایا گیا تھا کہ یہ لوگ اس بات پر بڑے اچنبھے کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک خبردار کرنے والا خود ان کے درمیان سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہو میرا کام بس تمھیں خبردار کر دینا ہے۔ یعنی میں کوئی فوجدار نہیں ہوں کہ زبردستی تمھیں غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے کی طرف کھینچوں۔ میرے سمجھانے سے اگر تم نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ بے خبر ہی رہنا اگر تمھیں پسند ہے تو اپنی غفلت میں سرشار پڑے رہو، اپنا انجام خود دیکھ لو گے۔

۵۸ – یہ جواب ہے کفار کی اُس بات کا جو آیت نمبر ۵ میں گزری ہے کہ ”کیا اِس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔“ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھاؤ، مگر یہ ہے ایک حقیقت جس کی خبر میں تمھیں دے رہا ہوں، اور تمھارے ناک بھوں چڑھانے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔

اس جواب میں صرف بیانِ حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقت ہونے کی دلیل بھی اسی میں موجود ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ معبُود بہت سے ہیں جن میں سے ایک اللہ بھی ہے، تم نے سارے معبُودوں کو ختم کر کے بس ایک معبُود کیسے بنا ڈالا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ معبُودِ حقیقی صرف ایک اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، اور کائنات کی ہر چیز اس کی مِلک ہے۔ اُس کے ماسوا اس کائنات میں جن ہستیوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو اُس سے مغلوب اور اس کی مملوک نہ ہو۔ یہ مغلوب اور مملوک ہستیاں اُس غالب اور مالک کے ساتھ خدائی میں شریک کیسے ہو سکتی ہیں اور آخر کس حق کی بنا پر انھیں معبُود قرار دیا جا سکتا ہے۔

۵۹ – یہ اُس جھگڑے کی تفصیل ہے جس کی طرف اُوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور جھگڑے سے مراد شیطان کا خدا سے جھگڑا ہے جیسا کہ آگے کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ ”مَلاءِ اعلیٰ“ سے مراد فرشتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے شیطان کا مکالمہ رُو در رُو نہیں بلکہ کسی فرشتے ہی کے توسّط سے ہوا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بھی مَلاءِ اعلیٰ میں شامل تھا۔ جو قصہ یہاں بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حواشی ۳۵ تا ۵۳۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۰ تا ۱۵، الحِجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹۔ بنی اسرائیل، حواشی ۷۱ تا ۸۲۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۶ تا ۴۸، طٰہٰ، حواشی ۹۲ تا ۱۰۶۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ
اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ

توتم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔[62]" اس حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔[63] رب نے فرمایا: "اے ابلیس! تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟[64] تُو بڑا بن رہا ہے یا تُو ہے ہی کچھ اُونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟" اُس نے جواب دیا: "میں اُس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اِس کو مٹی سے۔" فرمایا:

---

۶۰ – بَشَر کے لغوی معنٰی ہیں جسمِ کثیف جس کی ظاہری سطح کسی دوسری چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ انسان کی تخلیق کے بعد تو یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن تخلیق سے پہلے اس کا ذکر لفظِ بشر سے کرنے اور اس کو مٹی سے بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ "میں مٹی کا ایک پُتلا بنانے والا ہوں جو بال و پَر سے عاری ہوگا، یعنی جس کی جِلد دوسرے حیوانات کی طرح اُون یا صُوف یا بالوں اور پَروں سے ڈھکی ہوئی نہ ہوگی۔"

۶۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱۶۔

۶۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۵۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۰۔

۶۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۷، الکہف، حاشیہ ۴۸۔

۶۴ – یہ الفاظ تخلیقِ انسانی کے شَرَف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدّام سے کوئی کام کرانا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدّام سے کرا لیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفسِ نفیس انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالٰی کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلاواسطہ بنایا ہے، اُس کے آگے جُھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

"دونوں ہاتھوں" کے لفظ سے غالبًا اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالٰی کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں: ایک، یہ کہ اسے جسمِ حیوانی عطا کیا گیا جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس میں سے ایک نوع ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے اندر وہ رُوح ڈال دی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ
الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ
اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾

”اچھا تو یہاں سے نکل جا[۶۵]، تو مردود ہے[۶۶] اور تیرے اُوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے[۶۷]۔“ وہ بولا: ”اے میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس وقت تک کے لیے مُہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا: ”اچھا، تجھے اُس روز تک کی مُہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔“ اس نے کہا: ”تیری عزّت کی قسم! میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تو نے خالص کر لیا ہے[۶۸]۔“ فرمایا: ”تو حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنّم کو تجھ سے[۶۹] اور اُن سب لوگوں سے بھر دوں گا جو اِن انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے[۷۰]۔“

---

۶۵ – یعنی اس مقام سے جہاں آدمؑ کی تخلیق ہوئی اور جہاں آدمؑ کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا اور جہاں ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا اِرتکاب کیا۔

۶۶ – اصل میں لفظ ”رَجِیْم“ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں: ”پھینکا ہوا“ یا ”مارا ہوا“۔ اور محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ سورۂ اعراف میں یہی مضمون اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ”پس تو نکل جا، تو ذلیل ہستیوں میں سے ہے۔“

۶۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یوم الجزا کے بعد اُس پر لعنت نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوم الجزا تک تو وہ اس نافرمانی کی پاداش میں مبتلائے لعنت رہے گا، اور یوم الجزا کے بعد وہ اپنے اُن کرتوتوں کی سزا بھگتے گا جو تخلیق آدمؑ کے وقت سے لے کر قیامت تک اس سے سرزد ہوں گے۔

۶۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ”میں تیرے چیدہ بندوں کو بہکاؤں گا نہیں“، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”تیرے چیدہ بندوں پر میرا بس نہ چلے گا۔“

۶۹ – ”تجھ سے“ کا خطاب صرف شخصِ ابلیس ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ پوری جنسِ شیاطین کی طرف ہے، یعنی

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝٨٦ اِنْ
هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٨٧ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝٨٨

ع ۵ ۱۴

(اے نبیؐ!) اِن سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا،[۷۱] اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔[۷۲] یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمھیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا۔[۷۳] ع

ابلیس اور اس کا وہ پورا گروہ شیاطین جو اُس کے ساتھ مل کر نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے میں لگا رہے گا۔

۷۰ - یہ پورا قصہ سردارانِ قریش کے اس قول کے جواب میں سنایا گیا ہے کہ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا، ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟'' اس کا ایک جواب تو وہ تھا جو آیات نمبر ۹ اور ۱۰ میں دیا گیا تھا کہ کیا خدا کی رحمت کے خزانوں کے تم مالک ہو، اور کیا آسمان و زمین کی بادشاہی تمھاری ہے اور یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ خدا کا نبی کسے بنایا جائے اور کسے نہ بنایا جائے؟ دوسرا جواب یہ ہے، اور اس میں سردارانِ قریش کو بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تمھارا حسد اور اپنی بڑائی کا گھمنڈ، آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس کے حسد اور گھمنڈ سے ملتا جلتا ہے۔ ابلیس نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس حق کو ماننے سے انکار کیا تھا کہ جسے وہ چاہے اپنا خلیفہ بنائے، اور تم بھی اُس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہو کہ جسے وہ چاہے اپنا رسول بنائے۔ اُس نے آدمؑ کے آگے جھکنے کا حکم نہ مانا اور تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم نہیں مان رہے ہو۔ اس کے ساتھ تمھاری یہ مُشابہت بس اس حد پر ختم نہ ہو جائے گی، بلکہ تمھارا انجام بھی پھر وہی ہو گا جو اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے، یعنی دنیا میں خدا کی لعنت، اور آخرت میں جہنم کی آگ۔

اس کے ساتھ اس قصّے کے ضمن میں دو باتیں اور بھی سمجھائی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ جو انسان بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ دراصل اپنے اُس ازلی دشمن، ابلیس کے پھندے میں پھنس رہا ہے جس نے آغازِ آفرینش سے نوعِ انسانی کو اِغوا کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انتہائی مبغوض ہے جو تکبر کی بنا پر اس کی نافرمانی کرے اور پھر اپنی اس نافرمانی کی رَوش پر اِصرار کیے چلا جائے۔ ایسے بندے کے لیے اللہ کے ہاں کوئی معافی نہیں ہے۔

۷۱ - یعنی میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے یہ تبلیغ نہیں کر رہا ہوں۔

۷۲ - یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو فی الواقع وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اطلاع کے لیے نہیں کہلوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انھی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ مکّے کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم

میں کسی شخص نے بھی کبھی اُن کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجایش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

۷۳ - یعنی جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ چند سال کے اندر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری ہو کر رہی۔ اور جو مر جائیں گے ان کو موت کے دروازے سے گزرتے ہی پتا چل جائے گا کہ حقیقت وہی کچھ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الزمر

(۳۹)

الزمر

نام اس سورہ کا نام آیات نمبر ۷۱ و ۷۳ (وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا اور وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظِ زُمَر آیا ہے۔

زمانۂ نزُول آیت نمبر ۱۰ (وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ) سے اس امر کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورت ہجرتِ حَبَشہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ بعض رِوایات میں یہ تصریح آئی ہے کہ اس آیت کا نُزول حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا تھا جب کہ انھوں نے حَبَشہ کی طرف ہجرت کا عزم کیا۔ (رُوح المعانی، جلد ۲۳، صفحہ ۲۲۶)

موضوع اور مضمون یہ پوری سورت ایک بہترین اور انتہائی مؤثر خطبہ ہے جو ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے مکۂ معظّمہ کی ظلم وتشدُّد سے بھری ہوئی اور عِناد ومخالفت سے لبریز فضا میں دیا گیا تھا۔ یہ ایک وعظ ہے جس کے مخاطب زیادہ تر کفارِ قریش ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اہلِ ایمان سے بھی خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا اصل مقصود بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان خالص اللہ کی بندگی اختیار کرے اور کسی دوسرے کی طاعت وعبادت سے اپنی خدا پرستی کو آلودہ نہ کرے۔ اِس اصل الاُصُول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زور دار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج، اور شرک کی غَلَطی اور اس پر جمے رہنے کے بُرے نتائج کو واضح کیا گیا ہے، اور لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی غلط رَوِش سے باز آ کر اپنے رب کی رحمت کی طرف پلٹ آئیں۔ اِسی سلسلے میں اہلِ ایمان کو ہِدایَت فرمائی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہوگئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو، اللہ تمھارے صبر کا اجر دے گا۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ان کفار کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دو کہ ان کا ظلم وستم کبھی تم کو اِس راہ سے پھیر سکے گا اور اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ تم میرا راستہ روکنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو، کر ڈالو، میں اپنا یہ کام جاری رکھوں گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ

آیاتہا ۷۵ رکوعاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِيْنَ

اِس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔[۱]
(اے محمدؐ!) یہ کتاب ہم نے تمھاری طرف برحق نازل کی ہے،[۲] لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔[۳] خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے۔[۴] رہے وہ لوگ جنھوں نے

۱ – یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے جس میں بس یہ بتانے پر اِکتفا کیا گیا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام نہیں ہے، جیسا کہ منکرین کہتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے خود نازل فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر کر کے سامعین کو دو حقیقتوں پر مُتنبّہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کلام کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں بلکہ اس کی اہمیت محسوس کریں۔ ایک، یہ کہ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے وہ عزیز ہے، یعنی ایسا زبردست ہے کہ اس کے ارادوں اور فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی مُزاحمت کر سکے۔ دوسرے، یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو ہدایت وہ اس کتاب میں دے رہا ہے وہ سراسر دانائی پر مبنی ہے اور صرف ایک جاہل و نادان آدمی ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ نمبر ۱)

۲ – یعنی اس میں جو کچھ ہے، حق اور سچائی ہے، باطل کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہے۔

۳ – یہ ایک نہایت اہم آیت ہے جس میں دعوتِ اسلام کے اصل مقصود کو بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے، بلکہ اس کے مفہوم و مدّعا کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بنیادی نِکات دو ہیں جنھیں سمجھے بغیر آیت کا مطلب نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک یہ کہ مطالبہ اللہ کی عبادت کرنے کا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی عبادت کا مطالبہ ہے جو دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے کی جائے۔

عبادت کا مادّہ عبد ہے۔ اور یہ لفظ ''آزاد'' کے مقابلے میں ''غلام'' اور ''مملوک'' کے لیے عَرَبی زبان میں مستعمل ہوتا ہے۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں: ایک، پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت ''لِسان العرب'' میں ہے: عَبَدَ اللّٰہَ، تَألَّہَ لَہٗ۔ وَالتَّعَبُّدُ، التَّنَسُّکُ۔ دوسرے، عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرماں برداری، جیسا کہ لسان العرب میں ہے: العبادۃ، الطاعۃ۔ ومعنی العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع۔ و کل من دان

لملك فهو عابدٌ له (وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ)- والعابد، الخاضع لربه المستسلم المنقاد لامره- عبدالطاغوت. اطاعه يعني الشيطان فيما سوّل له واغواه - اِيَّاكَ نَعْبُدُ. اى نطيع الطاعة التي يخضع معها اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ. اطيعوا ربکم- پس لغت کی ان مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پُوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چُون و چرا اطاعت، اور اس کے قانونِ شرعی کی برضا و رغبت پیروی، اور اُس کے اَمر و نہی کی دل و جان سے فرماں برداری کا بھی ہے۔

دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے:

ایک مفہُوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرّف، سیاست و فرماں روائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ چنانچہ لسان العرب ہے: دَانَ النَّاسَ، اى قهرهم على الطاعة - دِنْتُهم ، اى قهرتُهم - دِنْتُهٗ، سُسْتُهٗ وملکتُهٗ- وفي الحديث الكَيِّس من دان نفسهٗ ، اى اذلّها واستعبدها - الدّيّان ، القاضي ، الحَكَم، القهّار- ولا انت ديّاني، اى لستَ بقاهر لي فتَسُوس امري- مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ، اى في قضاء الملك-

دوسرا مفہُوم ہے اطاعت، فرماں برداری اور غلامی۔ لسان العرب میں ہے: الدين، الطاعة - دِنْتُهٗ ودِنْتُ لَهٗ، اى اطعتُهٗ - وَالدِّيْنُ لِلّٰهِ، انما هو طاعتهٗ والتعبّد لهٗ - في الحديث اُرِيدُ من قريشٍ كلمة تَدِين لهم بها العرب، اى تطيعهم وتخضع لهم - ثم دانت بعد الرباب ، اى ذلّت له واطاعتْهُ - يمرقون مِنَ الدِّيْنِ، اى انهم يخرجون من طاعة الامام المفترض الطاعة - المدين، العبد - فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ، اى غير مملوكين-

تیسرا مفہُوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ لسان العرب میں ہے: الـديـن، العـادة والشأن - يقال ما زال ذٰلك ديني وديدَني ، اى عادتي-

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنیٰ اِس آیت میں ”اُس طرزِ عمل اور اس رویّے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔“ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ”آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔“

۴ - یہ ایک امرِ واقعہ اور ایک حقیقت ہے جسے اُوپر کے مطالبے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کر کے اُس کی بندگی تم کو کرنی چاہیے کیونکہ خالص اور بے آمیز اطاعت و بندگی اللہ کا حق ہے۔ دوسرے الفاظ میں، بندگی کا مستحق کوئی دوسرا ہے ہی نہیں کہ اللہ کے ساتھ اُس کی بھی پرستش اور اُس کے احکام و قوانین کی بھی اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی خالص اور بے آمیز بندگی کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ اور اسی طرح اگر وہ اللہ کی بندگی کے ساتھ بندگیِ غیر کی آمیزش کرتا ہے تو یہ بھی حق کے سراسر خلاف ہے۔ اس آیت کی بہترین تشریح وہ حدیث ہے جو ابنِ مَرْدُوْیَہ نے یزید الرَّقاشیؒ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہم

Maktaba Tul Ishaat.com

اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وقف لازم
زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى
مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴ خَلَقَ

اُس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اِس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں[5]، اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں[6]۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو[7]۔

اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا[8]، پاک ہے وہ اِس سے (کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو)، وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب[9]۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو

اپنا مال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا نام بلند ہو، کیا اس پر ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے پوچھا: اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی ناموری دونوں کی نیت ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ تعالٰی لا یقبل الّا من اخلص لہٗ، ’’اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اُسی کے لیے نہ ہو۔‘‘ اس کے بعد حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

۵ – کفارِ مکہ کہتے تھے، اور بالعموم دنیا بھر کے مشرکین یہی کہتے ہیں کہ ہم دوسری ہستیوں کی عبادت اُن کو خالق سمجھتے ہوئے نہیں کرتے۔ خالق تو ہم اللہ ہی کو مانتے ہیں اور اصل معبود اسی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی بارگاہ بہت اُونچی ہے جس تک ہماری رسائی بھلا کہاں ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو ذریعہ بناتے ہیں تاکہ یہ ہماری دعائیں اور التجائیں اللہ تک پہنچا دیں۔

٦ – یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اتفاق واتحاد صرف توحید ہی میں ممکن ہے۔ شرک میں کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے مشرکین کبھی اس پر متفق نہیں ہوئے ہیں کہ اللہ کے ہاں رسائی کا ذریعہ آخر کون سی ہستیاں ہیں۔ کسی کے نزدیک کچھ دیوتا اور دیویاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی سب دیوتاؤں اور دیویوں پر اتفاق نہیں ہے۔ کسی کے نزدیک چاند، سورج، مریخ، مشتری اس کا ذریعہ ہیں اور وہ بھی آپس میں اس پر متفق نہیں کہ ان میں سے کس کا کیا مرتبہ ہے اور کون اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ کسی کے نزدیک وفات یافتہ بزرگ ہستیاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی بے شمار اختلافات

ہیں۔کوئی کسی بزرگ کو مان رہا ہے اور کوئی کسی اور کو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مختلف ہستیوں کے بارے میں یہ گمان نہ تو کسی علم پر مبنی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی ایسی فہرست آئی ہے کہ فُلاں فُلاں اشخاص ہمارے مُقرّبِ خاص ہیں، لہٰذا ہم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم ان کو ذریعہ بناؤ۔ یہ تو ایک ایسا عقیدہ ہے جو محض وہم اور اندھی عقیدت اور اسلاف کی بے سوچے سمجھے تقلید سے لوگوں میں پھیل گیا ہے۔اس لیے لامحالہ اس میں اختلاف تو ہونا ہی ہے۔

۷ – یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں: ایک کاذب، دوسرے کفّار۔ کاذب ان کو اس لیے فرمایا گیا کہ انھوں نے اپنی طرف سے جھوٹ موٹ یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے اور پھر یہی جھوٹ وہ دوسروں میں پھیلاتے ہیں۔ رہا کفّار، تو اس کے دو معنٰی ہیں: ایک، سخت منکرِ حق، یعنی توحید کی تعلیم سامنے آ جانے کے بعد بھی یہ لوگ اس غلط عقیدے پر مُصِر ہیں۔ دوسرے، کافرِ نعمت، یعنی نعمتیں تو یہ لوگ اللہ سے پا رہے ہیں اور شکریے اُن ہستیوں کے ادا کر رہے ہیں جن کے متعلق انھوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ نعمتیں ان کی مداخلت کے سبب سے مل رہی ہیں۔

۸ – یعنی اللہ کا بیٹا ہونا تو سرے سے ہی ناممکن ہے۔ ممکن اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی کو اللہ برگزیدہ کر لے۔اور برگزیدہ بھی جس کو وہ کرے گا، لامحالہ وہ مخلوق ہی میں سے کوئی ہوگا، کیونکہ اللہ کے سوا دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔اب یہ ظاہر ہے کہ مخلوق خواہ کتنی ہی برگزیدہ ہو جائے، اولاد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی، کیونکہ خالق اور مخلوق میں عظیم الشان جوہری فرق ہے، اور ولدیت لازماً والد اور اولاد میں جوہری اتحاد کی مقتضی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ''اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو ایسا کرتا'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ نے ایسا کرنا کبھی نہیں چاہا۔اس طرزِ بیان سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کسی کو بیٹا بنا لینا تو درکنار، اللہ نے تو ایسا کرنے کا کبھی ارادہ بھی نہیں کیا ہے۔

۹ – یہ دلائل ہیں جن سے عقیدۂ ولدیت کی تردید کی گئی ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔اور ظاہر ہے کہ اولاد کی ضرورت ناقص و کمزور کو ہوا کرتی ہے۔ جو شخص فانی ہوتا ہے وہی اس کا محتاج ہوتا ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو تاکہ اس کی نسل اور نوع باقی رہے۔اور کسی کو مُتبنّٰی بھی وہی شخص بناتا ہے جو یا تو لاوارث ہونے کی وجہ سے کسی کو وارث بنانے کی حاجت محسوس کرتا ہے، یا محبّت کے جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کو بیٹا بنا لیتا ہے۔ یہ انسانی کمزوریاں اللہ کی طرف منسوب کرنا اور ان کی بنا پر مذہبی عقیدے بنا لینا جہالت اور کم نگاہی کے سوا اور کیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ اکیلا اپنی ذات میں واحد ہے، کسی جنس کا فرد نہیں ہے۔اور ظاہر ہے کہ اولاد لازماً ہم جنس ہوا کرتی ہے۔ نیز اولاد کا کوئی تصوّر اِزدِواج کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور اِزدِواج بھی ہم جنس سے ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص سخت جاہل و نادان ہے جو اس یکتا و یگانہ ہستی کے لیے اولاد تجویز کرتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ قہار ہے۔ یعنی دنیا میں جو چیز بھی ہے اس سے مغلوب اور اس کی قاہرانہ گرفت میں جکڑی ہوئی ہے۔اس کائنات میں کوئی کسی درجے میں بھی اس سے کوئی مُماثلت نہیں رکھتا جس کی بنا پر اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہو

Maktaba Tul Ishaat.com

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ
اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۗ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۗ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ

برحق پیدا کیا ہے[۱۰]۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اُسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخّر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو، وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے[۱۱]۔ اُسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اُس جان سے اس کا جوڑا بنایا[۱۲]۔ اور اسی نے تمھارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے[۱۳]۔ وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے[۱۴]۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے[۱۵]، بادشاہی

کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

۱۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۲۶، النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۷۵

۱۱ – یعنی زبردست ایسا ہے کہ اگر وہ تمھیں عذاب دینا چاہے تو کوئی طاقت اس کی مزاحمت نہیں کر سکتی۔ مگر یہ اس کا کرم ہے کہ تم یہ کچھ گستاخیاں کر رہے ہو، اور پھر بھی وہ تم کو فوراً پکڑ نہیں لیتا بلکہ مہلت پر مہلت دیے جاتا ہے۔ اِس مقام پر عقوبت میں تعجیل نہ کرنے اور مہلت دینے کو مغفرت (درگزر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۲ – یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے حضرت آدمؑ سے انسانوں کو پیدا کر دیا اور پھر اُن کی بیوی حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ بلکہ یہاں کلام میں ترتیبِ زمان کے بجائے ترتیبِ بیان ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں تم نے آج جو کچھ کیا وہ مجھے معلوم ہے، پھر جو کچھ تم کل کر چکے ہو اُس سے بھی میں باخبر ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کا واقعہ آج کے بعد ہوا ہے۔

۱۳ – مویشی سے مراد ہیں اُونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری۔ ان کے چار نر اور چار مادہ مل کر آٹھ نر و مادہ ہوتے ہیں۔

۱۴ – تین پردوں سے مراد ہے پیٹ، رحم اور مَشِیْمَہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے)۔

۱۵ – یعنی مالک، حاکم اور پروردگار۔

الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ

اسی کی ہے[16]، کوئی معبُود اس کے سوا نہیں ہے[17]، پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟[18]
اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے[19] لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا[20]، اور اگر تم

۱۶ – یعنی تمام اختیارات کا مالک وہی ہے اور ساری کائنات میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔

۱۷ – دوسرے الفاظ میں اِستدلال یہ ہے کہ جب وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی ساری بادشاہی ہے تو پھر لازماً تمھارا اِلٰہ (معبُود) بھی وہی ہے۔ دوسرا کوئی اللہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ نہ پروردگاری میں اس کا کوئی حصہ، نہ بادشاہی میں اس کا کوئی دخل۔ آخر تمھاری عقل میں یہ بات کیسے سماتی ہے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا تو ہو اللہ، سورج اور چاند کو مسخر کرنے والا اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لانے والا بھی ہو اللہ، تمھارا اپنا اور تمام حیوانات کا خالق و رب بھی ہو اللہ، اور تمھارے معبُود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

۱۸ – یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔ ارشاد یہ ہوا ہے کہ تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو۔ یعنی کوئی دوسرا ہے جو تم کو اُلٹی پٹّی پڑھا رہا ہے اور تم اس کے بہکائے میں آکر ایسی سیدھی سی عقل کی بات بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ دوسری بات جو اس اندازِ بیان سے خود مُترشّح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ "تم" کا خطاب پھرانے والوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو اُن کے اثر میں آکر پھر رہے تھے۔ اس میں ایک لطیف مضمون ہے جو ذرا سے غور و فکر سے بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ پھرانے والے اُسی معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے اور ہر طرف اپنا کام عَلانِیَہ کر رہے تھے، اس لیے ان کا نام لینے کی حاجت نہ تھی۔ اُن کو خطاب کرنا بھی بیکار تھا، کیونکہ وہ اپنی اغراض کے لیے لوگوں کو خدائے واحد کی بندگی سے پھیرنے اور دوسروں کی بندگی میں پھانسنے اور پھانسے رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے لوگ، ظاہر ہے کہ سمجھانے سے سمجھنے والے نہ تھے، کیونکہ نہ سمجھنے ہی سے ان کا مفاد وابستہ تھا، اور سمجھنے کے بعد بھی وہ اپنے مفاد کو قربان کرنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہو سکتے تھے۔ البتہ رحم کے قابل ان عوام کی حالت تھی جو اُن کے چکمے میں آ رہے تھے۔ اُن کی کوئی غرض اس کاروبار سے وابستہ نہ تھی، اس لیے وہ سمجھانے سے سمجھ سکتے تھے۔ اور ذرا سی آنکھیں کُھل جانے کے بعد وہ یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ انھیں خدا کے آستانے سے ہٹا کر دوسرے آستانوں کا راستہ دکھاتے ہیں وہ اپنے اِس کاروبار کا فائدہ کیا اُٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والے چند آدمیوں سے رُخ پھیر کر گمراہ ہونے والے عوام کو مخاطَب کیا جا رہا ہے۔

۱۹ – یعنی تمھارے کفر سے اس کی خدائی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آ سکتی۔ تم مانو گے تب بھی وہ خدا ہے، اور نہ مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور رہے گا۔ اس کی فرماں روائی اپنے زور پر چل رہی ہے، تمھارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یاعبادی لو ان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم

Maktaba Tul Ishaat.com

تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝

شکر کرو تو اسے وہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے[21]۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا[22]۔ آخرِ کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

كانوا على افجر قلب رجل منكم ما نقص من ملكي شيئاً۔ ''اے میرے بندو! اگر تم سب کے سب اگلے اور پچھلے، انسان اور جن اپنے میں سے کسی فاجر سے فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری بادشاہی میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی۔'' (مسلم)

۲۰ – یعنی وہ اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ خود بندوں کے مفاد کی خاطر یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کفر کریں، کیونکہ کفر خود انھی کے لیے نقصان دِہ ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مَشِیّت اور چیز ہے اور رضا دوسری چیز۔ دنیا میں کوئی کام بھی اللہ کی مَشِیّت کے خلاف نہیں ہوسکتا، مگر اس کی رضا کے خلاف بہت سے کام ہو سکتے ہیں اور رات دن ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً دنیا میں جبّاروں اور ظالموں کا حکمراں ہونا، چوروں اور ڈاکوؤں کا پایا جانا، قاتلوں اور زانیوں کا موجود ہونا اسی لیے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بنائے ہوئے نظامِ قدرت میں ان برائیوں کے ظہور اور اِن اَشرار کے وجود کی گنجایش رکھی ہے۔ پھر ان کو بدی کے ارتکاب کے مواقع بھی وہی دیتا ہے اور اُسی طرح دیتا ہے جس طرح نیکوں کو نیکی کے مواقع دیتا ہے۔ اگر وہ سرے سے اِن کاموں کی گنجایش ہی نہ رکھتا اور ان کے کرنے والوں کو مواقع ہی نہ دیتا تو دنیا میں کبھی کوئی بُرائی ظاہر نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ بر بنائے مَشِیّت ہے۔ لیکن مشیت کے تحت کسی فعل کا صُدور یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اللہ کی رضا بھی اس کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص اگر حرام خوری ہی کے ذریعے سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اسی ذریعے سے اس کو رزق دے دیتا ہے۔ یہ ہے اُس کی مشیت۔ مگر مشیت کے تحت چور یا ڈاکو یا رشوت خوار کو رزق دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چوری، ڈاکے اور رشوت کو اللہ پسند بھی کرتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ یہاں فرما رہا ہے کہ تم کفر کرنا چاہو تو کرو، ہم تمھیں زبردستی اس سے روک کر مومن نہیں بنائیں گے۔ مگر ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ تم بندے ہو کر اپنے خالق و پروردگار سے کفر کرو، کیونکہ یہ تمھارے ہی لیے نقصان دِہ ہے، ہماری خدائی کا اس سے کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

۲۱ – کفر کے مقابلے میں یہاں ایمان کے بجائے شکر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ کفر درحقیقت احسان فراموشی و نمک حرامی ہے، اور ایمان فی الحقیقت شکر گزاری کا لازمی تقاضا ہے۔ جس شخص میں اللہ جَلّ شانُہٗ کے احسانات کا کچھ بھی احساس ہو وہ ایمان کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے شکر اور ایمان ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ جہاں شکر ہوگا وہاں ایمان ضرور ہوگا۔ اور اس کے برعکس جہاں کفر ہوگا وہاں شکر کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ کفر کے ساتھ شکر کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً
مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ
عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴿۸﴾
اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ

انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے[۲۳] تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتا ہے[۲۴]، پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اُس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا[۲۵] اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے[۲۶]، تاکہ اُس کی راہ سے گمراہ کرے[۲۷]۔ (اے نبیؐ!) اُس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لُطف اُٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔ (کیا اِس شخص کی رَوِش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیعِ فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور

۲۲ – مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے۔ کوئی شخص اگر دوسروں کو راضی رکھنے کے لیے، یا ان کی ناراضی سے بچنے کی خاطر کفر اختیار کرے گا تو وہ دوسرے لوگ اُس کے کفر کا وبال اپنے اُوپر نہیں اُٹھالیں گے، بلکہ اسے آپ ہی اپنا وبال بھگتنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا جس پر بھی کفر کا غلط اور ایمان کا صحیح ہونا واضح ہو جائے اس کو چاہیے کہ غلط رَوِیّہ چھوڑ کر صحیح رویہ اختیار کر لے اور اپنے خاندان یا برادری یا قوم کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق نہ بنائے۔

۲۳ – انسان سے مراد یہاں وہ کافر انسان ہے جس نے ناشکری کی رَوِش اختیار کر رکھی ہو۔

۲۴ – یعنی اُس وقت اُسے وہ دوسرے معبود یاد نہیں آتے جنھیں وہ اپنے اچھے حال میں پکارا کرتا تھا، بلکہ ان سب سے مایوس ہو کر وہ صرف اللہ ربّ العالمین کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے معبُودوں کے بے اختیار ہونے کا احساس رکھتا ہے اور اس حقیقت کا شُعور بھی اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں دبا چھپا موجود ہے کہ اصل اختیارات کا مالک اللہ ہی ہے۔

۲۵ – یعنی وہ بُرا وقت پھر اُسے یاد نہیں رہتا جس میں وہ تمام دوسرے معبُودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

۲۶ – یعنی پھر دوسروں کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ انھی کی اطاعت کرتا ہے، انھی سے دعائیں مانگتا ہے، اور انھی کے آگے نذر و نیاز پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا
ع ۱۵ يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ
اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰

اپنے رب کی رحمت سے اُمید لگاتا ہے؟ اِن سے پُوچھو: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟[28] نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) کہو کہ اَے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔[29] جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویّہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے۔[30] اور خدا کی زمین وسیع ہے،[31] صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔[32]

---

۲۷ – یعنی خود گمراہ ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فلاں حضرت یا فلاں بزرگ یا فلاں دیوی یا دیوتا کے صدقے میں ٹل گئی۔ اس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی ان معبودانِ غیر اللہ کے معتقد بن جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اسی طرح کے تجربات بیان کر کر کے عوام کی اس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

۲۸ – واضح رہے کہ یہاں مقابلہ دو قسم کے انسانوں کے درمیان کیا جا رہا ہے۔ ایک، وہ جو کوئی سخت وقت آپڑنے پر تو اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہیں اور عام حالات میں غیر اللہ کی بندگی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے، وہ جنھوں نے اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی و پرستش کو اپنا مستقل طریقہ بنا لیا ہے اور راتوں کی تنہائی میں ان کا عبادت کرنا ان کے مخلص ہونے کی دلیل ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ والوں کو اللہ تعالیٰ بے علم قرار دیتا ہے، خواہ انھوں نے بڑے بڑے کُتب خانے ہی کیوں نہ چاٹ رکھے ہوں۔ اور دوسرے گروہ والوں کو وہ عالم قرار دیتا ہے، خواہ وہ بالکل ہی اَن پڑھ کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اصل چیز حقیقت کا علم اور اس کے مطابق عمل ہے، اور اسی پر انسان کی فلاح کا انحصار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دونوں آخر یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں یہ مل کر ایک طریقے پر چلیں، اور آخرت میں دونوں ایک ہی طرح کے انجام سے دوچار ہوں؟

۲۹ – یعنی صرف مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی اختیار کرو۔ جن چیزوں کا اللہ نے حکم دیا ہے اُن پر عمل کرو، جن سے روکا ہے ان سے بچو اور دنیا میں اللہ کے مواخذے سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔

۳۰ – دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی۔ ان کی دنیا بھی سُدھرے گی اور آخرت بھی۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ
اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ
یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ﴿۱۴﴾ فَاعۡبُدُوۡا مَا
شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ
اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۵﴾

(اَے نبیؐ!) اِن سے کہو: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی بندگی کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مُسلم بنوں[۳۳]۔ کہو: اگر مَیں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ مَیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو: اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ خوب سُن رکھو! یہی کُھلا دیوالہ[۳۴] ہے۔

۳۱- یعنی اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے تنگ ہو گیا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ جہاں یہ مشکلات نہ ہوں۔

۳۲- یعنی اُن لوگوں کو جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کرلیں مگر راہِ حق سے نہ ہٹیں۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دین و ایمان کی خاطر ہجرت کر کے جَلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کریں، اور وہ بھی جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں۔

۳۳- یعنی میرا کام صرف دوسروں سے کہنا ہی نہیں ہے، خود کر کے دکھانا بھی ہے۔ جس راہ پر لوگوں کو بلاتا ہوں، اِس پر سب سے پہلے میں خود چلتا ہوں۔

۳۴- دیوالہ عُرفِ عام میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ کاروبار میں آدمی کا لگایا ہوا سارا سرمایہ ڈوب جائے اور بازار میں اُس پر دوسروں کے مطالبے اتنے چڑھ جائیں کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ یہی استعارہ کفار و مشرکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں استعمال کیا ہے۔ انسان کو زندگی، عمر، عقل، جسم، قوتیں اور قابلیتیں، ذرائع اور مواقع، جتنی چیزیں بھی دنیا میں حاصل ہیں، ان سب کا مجموعہ دراصل وہ سرمایہ ہے جسے وہ حیاتِ دنیا کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ یہ سارا سرمایہ اگر کسی شخص نے اس مفروضے پر لگا دیا کہ کوئی خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں جن کا میں بندہ ہوں، اور کسی کو مجھے حساب نہیں دینا ہے، یا محاسبہ

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۚ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ

اُن پر آگ کی چھتریاں اُوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو! میرے غضب سے بچو۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت[۳۵] کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رُجوع کر لیا اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ!) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں[۳۶]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانش مند ہیں۔ (اَے نبیؐ!) اُس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟[۳۷]

کے وقت کوئی دوسرا مجھے آ کر بچا لے گا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا اور اپنا سب کچھ ڈبو دیا۔ یہ ہے پہلا خُسران۔ دوسرا خُسران یہ ہے کہ اس غلط مفروضے پر اس نے جتنے کام بھی کیے ان سب میں وہ اپنے نفس سے لے کر دنیا کے بہت سے انسانوں اور آیندہ نسلوں اور اللہ کی دوسری بہت سی مخلوق پر عمر بھر ظلم کرتا رہا۔ اِس لیے اُس پر بے شمار مطالبات چڑھ گئے، مگر اُس کے پلّے کچھ نہیں ہے جس سے وہ ان مطالبات کا بھگتان بھگت سکے۔ اس پر مزید خُسران یہ ہے کہ وہ خود ہی نہیں ڈوبا بلکہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب اور دوستوں اور ہم قوموں کو بھی اپنی غلط تعلیم و تربیت اور غلط مثال سے لے ڈوبا۔ یہی تین خسارے ہیں جن کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ خُسرانِ مبین قرار دے رہا ہے۔

۳۵- طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حُسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوبصورتی میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ معبودانِ غیر اللہ کو طاغوت اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۸۶۔ النساء، حاشیہ ۹۱-۱۰۵۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۳۲) طاغوت کا

اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ
غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ
وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا
مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ ع ۲ ۱۶

کیا تم اُسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو؟ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے اُن کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں[۳۸] کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعے سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں، پھر وہ کھیتیاں پک کر سُوکھ جاتی ہیں، پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں، پھر آخرِ کار اللہ اُن کو بُھس بنا دیتا ہے۔ درحقیقت اِس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔[۳۹] ع اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام

لفظ یہاں طواغیت، یعنی بہت سے طاغوتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اسی لیے اَنْ یَّعْبُدُوْھَا فرمایا گیا۔ اگر واحد مراد ہوتا تو یَعْبُدُوْہُ ہوتا۔

۳۶ – اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ ہر آواز کے پیچھے نہیں لگ جاتے بلکہ ہر ایک کی بات سُن کر اس پر غور کرتے ہیں اور جو حق بات ہوتی ہے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ بات کو سُن کر غلط معنی پہنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے اچھے اور بہتر پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔

۳۷ – یعنی جس نے اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا لیا ہو اور اللہ نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اسے اب سزا دینی ہے۔

۳۸ – اصل میں لفظ یَنَابِیْعَ استعمال ہوا ہے جس کا اِطلاق ان تینوں چیزوں پر ہوتا ہے۔

۳۹ – یعنی اس سے ایک صاحبِ عقل آدمی یہ سبق لیتا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی اور اس کی زینتیں سب عارضی ہیں۔ ہر بہار

Maktaba Tul-Ishaat.com

لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ

کے لیے کھول دیا[۴۰] اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے[۴۱] (اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اِن باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے[۴۲]۔ وہ کھُلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں[۴۳] اور جس میں بار بار مضامین دُہرائے گئے ہیں۔ اُسے سُن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے

کا انجام خزاں ہے۔ ہر شباب کا انجام ضعیفی اور موت ہے۔ ہر عُروج آخرِ کار زوال دیکھنے والا ہے۔ لہٰذا یہ دنیا وہ چیز نہیں ہے جس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر آدمی خدا اور آخرت کو بھول جائے اور یہاں کی چند روزہ بہار کے مزے لُوٹنے کی خاطر وہ حرکتیں کرے جو اُس کی عاقبت برباد کر دیں۔ پھر ایک صاحبِ عقل آدمی ان مناظر سے یہ سبق بھی لیتا ہے کہ اس دنیا کی بہار اور خزاں اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے پروان چڑھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے خستہ و خراب کر دیتا ہے۔ نہ کسی کے بس میں یہ ہے کہ اللہ جسے پروان چڑھا رہا ہو اس کو وہ پھلنے پھُولنے سے روک دے، اور نہ کوئی یہ طاقت رکھتا ہے کہ جسے اللہ غارت کرنا چاہے اسے وہ خاک میں ملنے سے بچا لے۔

۴۰ – یعنی جسے اللہ نے یہ توفیق بخشی کہ ان حقائق سے سبق لے اور اسلام کے حق ہونے پر مطمئن ہو جائے۔ کسی بات پر آدمی کا شرحِ صدر ہو جانا یا سینہ کھُل جانا دراصل اِس کیفیت کا نام ہے کہ آدمی کے دل میں اُس بات کے متعلق کوئی خلجان یا تذبذب یا شک و شبہ باقی نہ رہے، اور اُسے کسی خطرے کا احساس اور کسی نقصان کا اندیشہ بھی اُس بات کو قبول اور اختیار کرنے میں مانع نہ ہو، بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ یہ فیصلہ کر لے کہ یہ چیز حق ہے لہٰذا خواہ کچھ ہو جائے مجھے اسی پر چلنا ہے۔ اس طرح کا فیصلہ کر کے جب آدمی اسلام کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف سے جو حکم بھی اسے ملتا ہے وہ اسے بکراہت نہیں بلکہ برضا و رغبت مانتا ہے۔ کتاب و سنّت میں جو عقائد و افکار اور جو اُصول و قواعد بھی اس کے سامنے آتے ہیں وہ انھیں اِس طرح قبول کرتا ہے کہ گویا یہی اس کے دل کی آواز ہے۔ کسی ناجائز فائدے کو چھوڑنے پر اسے کوئی پچھتاوا لاحق نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے وہ سرے سے کوئی فائدہ تھا ہی نہیں، اُلٹا ایک نقصان تھا جس سے بفضلِ خدا میں بچ گیا۔ اسی طرح کوئی نقصان بھی اگر راستی پر قائم رہنے کی صورت میں اسے پہنچے تو وہ اس پر افسوس نہیں کرتا بلکہ ٹھنڈے دل سے

رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾ اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا

والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہِ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے۔ اب اُس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا؟[۴۴] ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزا اُس کمائی کا

اسے برداشت کرتا ہے اور اللہ کی راہ سے منہ موڑنے کی بہ نسبت وہ نقصان اسے ہلکا نظر آتا ہے۔ یہی حال اس کا خطرات پیش آنے پر بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے کوئی دوسرا راستہ سرے سے ہے ہی نہیں کہ اس خطرے سے بچنے کے لیے اُدھر نکل جاؤں۔ اللہ کا سیدھا راستہ ایک ہی ہے جس پر مجھے بہر حال چلنا ہے۔ خطرہ آتا ہے تو آتا رہے۔

۴۱ – یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ کی صورت میں ایک نورِ علم اسے مل گیا ہے جس کے اُجالے میں وہ ہر ہر قدم پر صاف دیکھتا جاتا ہے کہ زندگی کی بے شمار پگ ڈنڈیوں کے درمیان حق کا سیدھا راستہ کون سا ہے۔

۴۲ – شرحِ صدر کے مقابلے میں انسانی قلب کی دو ہی کیفیتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ضیقِ صدر (سینہ تنگ ہو جانے اور دل بھنچ جانے) کی کیفیت جس میں کچھ نہ کچھ گنجایش اس بات کی رہ جاتی ہے کہ حق اُس میں نُفوذ کر جائے، اور دوسری قساوتِ قلب (دل کے پتھر ہو جانے) کی کیفیت جس میں حق کے لیے نُفوذ یا سرایت کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اِس دوسری کیفیت کے متعلق فرماتا ہے کہ جو شخص اس حد تک پہنچ جائے اس کے لیے پھر کامل تباہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص، خواہ دل کی تنگی ہی کے ساتھ سہی، ایک مرتبہ قبولِ حق کے لیے کسی طرح تیار ہو جائے تو اس کے لیے بچ نکلنے کا کچھ نہ کچھ امکان ہوتا ہے۔ یہ دوسرا مضمون آیت کے فحویٰ سے خود بخود نکلتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت نہیں فرمائی ہے، کیونکہ آیت کا اصل مقصود اُن لوگوں کو متنبّہ کرنا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ضد اور ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے تھے اور فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ آپ کی کوئی بات مان کر نہیں دینی ہے۔ اس پر انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ تم تو اپنی اس ہیکڑی کو بڑی قابلِ فخر چیز سمجھ رہے ہو، مگر فی الحقیقت ایک انسان کی اس سے بڑھ کر کوئی نالائقی اور بدنصیبی نہیں ہو سکتی کہ اللہ کا ذکر اور اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت سن کر وہ نرم پڑنے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو جائے۔

۴۳ – یعنی ان میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ پوری کتاب اول سے لے کر آخر تک ایک ہی مدّعا، ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظامِ فکر و عمل پیش کرتی ہے۔ اس کا ہر جُز دوسرے جُز کی اور ہر مضمون دوسرے مضمون کی تصدیق و تائید اور

Maktaba Tul Ishaat.com

كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا
لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ ۚ
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

وقف لازم

جو تم کرتے رہے [۴۵] تھے۔ اِن سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھٹلا چکے ہیں۔ آخر اُن پر عذاب ایسے رخ سے آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی میں رُسوائی کا مزا چکھایا، اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں۔ ایسا قرآن جو عربی زبان میں [۴۶] ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں [۴۷] ہے، تاکہ یہ بُرے انجام سے بچیں۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے۔

توضیح و تشریح کرتا ہے۔ اور معنیٰ و بیان، دونوں کے لحاظ سے اس میں کامل یکسانی (consistency) پائی جاتی ہے۔

۴۴ ۔ کسی ضرب کو آدمی اپنے منہ پر اُس وقت لیتا ہے جب کہ وہ بالکل عاجز و بے بس ہو۔ ورنہ جب تک وہ مُدافعت پر کچھ بھی قادر ہوتا ہے وہ اپنے جسم کے ہر حصے پر چوٹ کھاتا رہتا ہے مگر منہ پر مار نہیں پڑنے دیتا۔ اس لیے یہاں اس شخص کی انتہائی بے بسی کی تصویر یہ کہہ کر کھینچ دی گئی ہے کہ وہ سخت مار اپنے منہ پر لے گا۔

۴۵ ۔ اصل میں لفظ ''کسب'' استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآنِ مجید کی اِصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔

۴۶ ۔ یعنی یہ کسی غیر زبان میں نہیں آیا ہے کہ مکّہ اور عرب کے لوگ اسے سمجھنے کے لیے کسی مُترجِم یا شارح کے محتاج ہوں، بلکہ یہ اِن کی اپنی زبان میں ہے جسے یہ براہِ راست خود سمجھ سکتے ہیں۔

۴۷ ۔ یعنی اس میں اینچ پینچ کی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے۔ بلکہ صاف صاف سیدھی بات کہی گئی ہے جس سے ہر آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کتاب کس چیز کو غلط کہتی ہے اور کیوں، کس چیز کو صحیح کہتی ہے اور کس بنا پر، کیا منوانا چاہتی ہے اور کس چیز کا انکار کرانا چاہتی ہے، کن کاموں کا حکم دیتی ہے اور کن کاموں سے

رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ
مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ

ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خُلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟[۴۸] ــــ الحمدُ للہ،[۴۹] مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔[۵۰] (اے نبیؐ!) تمھیں بھی مرنا ہے اور اِن لوگوں کو

رو کتی ہے۔

۴۸۔ اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثّر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں، اور ہر ایک اس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو، اور وہ مالک بھی ایسے بدمزاج ہوں کہ ہر ایک اُس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اسے مہلت نہ دیتا ہو اور ان کے متضاد اَحکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تُل جاتا ہو، اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہوگی۔ اور اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تأمّل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اسے کبھی میسر نہیں آ سکتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست آتی ہے جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بُت کسے حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ انھیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، برادری میں، قوم اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں میں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، اور دنیا کے تمدّن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرۂ کار میں اس کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے، کوئی رُوٹھ جاتا ہے، کوئی نکّو بناتا ہے، کوئی مقاطعہ کرتا ہے، کوئی دیوالہ نکالتا ہے، کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اِس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے اور ہر دوسرے کی بندگی کا قِلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے۔

توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر لے اور گرد و پیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ خارجی کش مکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے، لیکن اگر اس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے داخلی امن و اطمینان لازماً میسر آ جائے گا۔ وہ نفس کی ہر اُس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان، برادری، قوم، حکومت، مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی کسی ایسے مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اسے بے حد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ لازماً پہنچیں گی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں، اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر میں اپنے رب کے حکم کے خلاف ان کی بندگی بجا لاؤں۔ یہ دل کا اطمینان اور روح کا امن و سکون دنیا کی کوئی طاقت اُس سے نہیں چھین سکتی۔ حتّٰی کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہوگا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچا لی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اِسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اَخلاق، تمدّن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم و رواج، سیاست، معیشت، غرض ہر شعبۂ زندگی کے لیے وہ اُصول اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوندِ عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے دیے ہیں۔ خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم و تربیت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر و محراب سے اسی کے خلاف آواز بلند ہو، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھیرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔ اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم و تربیت کا پورا نظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر و محراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم و رواج اُس پر قائم کر دے، اور کاروبارِ معیشت بھی اسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی و خارجی اطمینان میسر آ جاتا ہے اور مادّی و روحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگیِ رب اور بندگیِ غیر کے تقاضوں کا تصادُم قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ توحید ہی کو اپنا دین بنا لے اور تمام خطرات و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیا علیہم السلام کی کوششوں کا مدّعا یہی رہا ہے کہ ایک اُمّتِ مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن و سنت سے ناواقف اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیا علیہم السلام کی سعی و جُہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان و طاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں

ع الجزء ۲۴

مَّیِّتُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ تَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۳۱﴾ ع

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَ کَذَّبَ بِالصِّدۡقِ اِذۡ جَآءَہٗ ؕ

اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ الَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ

وَ صَدَّقَ بِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۳۳﴾ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ

رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿ۚ۳۴﴾ لِیُکَفِّرَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ اَسۡوَاَ

بھی مرنا ہے۔[51] آخرِ کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حُضور اپنا اپنا مُقدّمہ پیش کرو گے۔ع پھر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس نے اللہ پر جُھوٹ باندھا اور جب سچّائی اس کے سامنے آئی تو اُسے جُھٹلا دیا۔ کیا ایسے کافروں کے لیے جہنّم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟ اور جو شخص سچّائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔[52] انھیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔[53] یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔ تاکہ جو بدترین اعمال انھوں نے کیے تھے انھیں اللہ ان کے حساب سے

دینِ حق کو نافذ و قائم کرنا سرے سے ان کا مقصد ہی نہیں رہا ہے۔

۴۹ – یہاں الحمدللہ کی معنویت سمجھنے کے لیے یہ نقشہ ذہن میں لائیے کہ اُوپر کا سوال لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بعد مُقرّر نے سُکوت کیا، تاکہ اگر مخالفینِ توحید کے پاس اس کا کوئی جواب ہو تو دیں۔ پھر جب ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور کسی طرف سے یہ آواز نہ آئی کہ دونوں برابر ہیں، تو مقرر نے کہا: الحمدللہ۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ تم خود بھی اپنے دلوں میں ان دونوں حالتوں کا فرق محسوس کرتے ہو اور تم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ ایک آقا کی بندگی سے بہت سے آقاؤں کی بندگی بہتر ہے یا دونوں یکساں ہیں۔

۵۰ – یعنی ایک آقا کی غلامی اور بہت سے آقاؤں کی غلامی کا فرق تو خوب سمجھ لیتے ہیں مگر ایک خدا کی بندگی اور بہت سے خداؤں کی بندگی کا فرق جب سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو نادان بن جاتے ہیں۔

۵۱ – پچھلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے موقع و محل اور سیاق و سباق پر غور کر کے ہر صاحبِ فہم آدمی خود بھر سکتا ہے۔ اس میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اِس اِس طرح تم ایک صاف سیدھی بات سیدھے طریقے سے اِن لوگوں کو سمجھا رہے ہو اور یہ لوگ نہ صرف یہ کہ ہٹ دھرمی سے تمھاری بات ردّ کر رہے ہیں، بلکہ اِس کھلی صداقت کو دبانے کے لیے تمھارے درپے آزار ہیں۔ اچھا ہمیشہ نہ تمھیں رہنا ہے نہ اِنھیں۔ دونوں کو ایک دن مرنا ہے۔ انجام سب کے سامنے آجائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِیْ عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ
مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ

ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے اُن کے لحاظ سے اُن کو اجر عطا فرمائے۔[۵۴]

(اَے نبیؐ!) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اُس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔[۵۵] حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اُسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، اور جسے وہ ہدایت دے اُسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟[۵۶] اِن لوگوں سے اگر تم پوچھو

۵۲ – مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جو مقدمہ ہونا ہے اس میں سزا پانے والے کون ہوں گے، یہ بات تم آج ہی سُن لو۔ سزا لازماً انھی ظالموں کو ملنی ہے جنھوں نے یہ جھوٹے عقیدے گھڑے کہ اللہ کے ساتھ اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں کچھ دوسری ہستیاں بھی شریک ہیں، اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ان کا ظلم یہ ہے کہ جب ان کے سامنے سچائی پیش کی گئی تو انھوں نے اسے مان کر نہ دیا بلکہ اُلٹا اُسی کو جھوٹا قرار دیا جس نے سچائی پیش کی۔ رہا وہ شخص جو سچائی لایا اور وہ لوگ جنھوں نے اس کی تصدیق کی، تو ظاہر ہے کہ اللہ کی عدالت سے ان کے سزا پانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۳ – یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں فی الجنّۃ (جنت میں) نہیں بلکہ عِنْدَ رَبِّھِمْ (ان کے رب کے ہاں) کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے رب کے ہاں تو بندہ مرنے کے بعد ہی پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں پہنچ کر ہی نہیں، بلکہ مرنے کے وقت سے دُخولِ جنت تک کے زمانے میں بھی مومنِ صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی رہے گا۔ وہ عذابِ بَرزَخ سے، روزِ قیامت کی سختیوں سے، حساب کی سخت گیری سے، میدانِ حشر کی رسوائی سے، اپنی کوتاہیوں اور قصوروں پر مواخذے سے لازماً بچا جائے گا اور اللہ جلّ شانُہٗ اس کی یہ ساری خواہشات پوری فرمائے گا۔

۵۴ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ایمان لائے تھے زمانۂ جاہلیت میں ان سے اعتقادی اور اخلاقی دونوں ہی طرح کے بدترین گناہ سرزد ہو چکے تھے۔ اور ایمان لانے کے بعد انھوں نے صرف یہی ایک نیکی نہ کی تھی کہ اُس جھوٹ کو چھوڑ دیا جسے وہ پہلے مان رہے تھے اور وہ سچائی قبول کر لی جسے حضورؐ نے پیش فرمایا تھا، بلکہ مزید برآں انھوں نے اَخلاق، عبادات، اور معاملات میں بہترین اعمالِ صالحہ انجام دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے وہ بدترین اعمال جو جاہلیت میں ان سے سرزد ہوئے تھے ان کے حساب سے محو کر دیے جائیں گے، اور ان کو انعام اُن اعمال کے لحاظ سے دیا جائے گا جو ان کے نامۂ اعمال میں سب سے بہتر ہوں گے۔

مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ
ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ
اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۳۸ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ
اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ

کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ اِن سے کہو: جب حقیقت یہ ہے تو تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمھاری یہ دیویاں، جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو، مجھے اُس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچالیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، بھروسا کرنے والے اُسی پر بھروسا کرتے ہیں[57]۔ ان سے صاف کہو کہ "اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ[58]، میں اپنا کام کرتا رہوں گا، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے

۵۵ - کُفّارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے معبُودوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو اور اِن کے خلاف زبان کھولتے ہو۔ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسی زبردست باکرامت ہستیاں ہیں۔ ان کی توہین تو جس نے بھی کی وہ برباد ہوگیا۔ تم بھی اگر اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو یہ تمھارا تختہ اُلٹ دیں گے۔

۵۶ - یعنی یہ بھی ہدایت سے ان کی محرومی ہی کا کرشمہ ہے کہ ان احمقوں کو اپنے اِن معبُودوں کی طاقت و عزت کا تو بڑا خیال ہے، مگر انھیں اس بات کا خیال کبھی نہیں آتا کہ اللہ بھی کوئی زبردست ہستی ہے اور شرک کر کے اُس کی جو توہین یہ کر رہے ہیں، اُس کی بھی کوئی سزا انھیں مل سکتی ہے۔

۵۷ - ابنِ ابی حاتمؒ نے ابنِ عباسؓ سے رِوایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من احب ان یکون اقوی الناس فلیتوکل علی اللّٰہ ، ومن احب ان یکون اغنی الناس فلیکن بما فی ید اللّٰہ عزوجل اوثق منہ بما فی یدیہ ، ومن احب ان یکون اکرم الناس فلیتق اللّٰہ عزوجل۔ "جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقت ور ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے۔ اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے، اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُس پر زیادہ بھروسا رکھے، بہ نسبت اُس چیز کے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہے، اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے،

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٤٠﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ
فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾ ع اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ
تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ
الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾

جو کبھی ٹلنے والی نہیں۔'' (اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتابِ برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اُس کے بھٹکنے کا وبال اُسی پر ہوگا، تم اُن کے ذمّہ دار نہیں ہو۔[59] ع

وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت رُوحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اُس کی رُوح نیند میں قبض کر لیتا ہے،[60] پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اُسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی رُوحیں ایک وقتِ مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔[61]

اسے چاہیے کہ اللہ عزّوجلّ سے ڈرے۔''

۵۸ – یعنی مجھے زک دینے کے لیے جو کچھ تم کر رہے ہو اور کر سکتے ہو وہ کیے جاؤ، اپنی کرنی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھو۔

۵۹ – یعنی تمھارے سُپرد انھیں راہِ راست پر لے آنا نہیں ہے۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ ان کے سامنے راہِ راست پیش کر دو۔ اس کے بعد اگر یہ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۶۰ – نیند کی حالت میں روح قبض کرنے سے مراد احساس و شُعور، فہم و اِدراک اور اختیار و ارادہ کی قوتوں کو معطّل کر دینا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس پر اُردو زبان کی یہ کہاوت فی الواقع راست آتی ہے کہ سویا اور مُوا برابر۔

۶۱ – اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ موت اور زیست کس طرح اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص بھی یہ ضمانت نہیں رکھتا کہ رات کو جب وہ سوئے گا تو صبح لازماً زندہ ہی اُٹھے گا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ایک گھڑی بھر میں اُس پر کیا آفت آ سکتی ہے اور دوسرا لمحہ اُس پر زندگی کا لمحہ ہوتا ہے یا موت کا۔ ہر وقت سوتے میں یا جاگتے میں، گھر بیٹھے یا کہیں چلتے پھرتے آدمی کے جسم کی کوئی اندرونی خرابی، یا باہر سے کوئی نامعلوم آفت یکایک وہ شکل اختیار کر سکتی ہے جو اُس کے لیے پیامِ موت ثابت ہو۔ اِس طرح جو انسان خدا کے ہاتھ میں بے بس ہے وہ کیسا سخت نادان ہے اگر اُسی خدا سے غافل یا

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلۡ اَوَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَمۡلِكُوۡنَ
شَيۡـًٔـا وَّلَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝۴۳ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا ؕ لَهٗ مُلۡكُ
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝۴۴ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا
ذُكِرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ۝۴۵ قُلِ اللّٰهُمَّ

کیا اُس خدا کو چھوڑ کر اِن لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟[۶۲] ان سے کہو: کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ اُن کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو: شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔[۶۳] آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔
جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کُڑھنے لگتے ہیں، اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کِھل اُٹھتے ہیں۔[۶۴] کہو: خدایا!

منحرف ہو۔

۶۲ – یعنی ایک تو ان لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ ہستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سِفارش کسی طرح ٹل نہیں سکتی، حالانکہ ان کے سِفارشی ہونے پر نہ کوئی دلیل، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے، اور نہ خود اُن ہستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم اپنے زور سے تمھارے سارے کام بنوا دیا کریں گے۔ اس پر مزید حماقت ان لوگوں کی یہ ہے کہ اصل مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سِفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ساری نیاز مندیاں اُنھی کے لیے وقف ہیں۔

۶۳ – یعنی کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حُضور میں خود سفارشی بن کر اُٹھ ہی سکے، کجا کہ اپنی سِفارش منوا لینے کی طاقت بھی اُس میں ہو۔ یہ بات تو بالکل اللہ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے سفارش کی اجازت دے اور جسے چاہے نہ دے۔ اور جس کے حق میں چاہے کسی کو سفارش کرنے دے اور جس کے حق میں چاہے نہ کرنے دے۔ (شفاعت کے اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱، الانعام، حاشیہ ۳۲۔ جلد دوم، یونس، حواشی ۵-۲۴، ہود، حواشی ۸۴-۱۰۶، الرعد، حاشیہ ۱۹، النحل، حواشی ۶۴-۶۵-۷۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶، الانبیاء، حاشیہ ۲۷، الحج، حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، السباء، حاشیہ ۴۰۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ
بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ
الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا
يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا

آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، حاضر و غائب کے جاننے والے، تُو ہی اپنے بندوں کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اگر اِن ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روزِ قیامت کے بُرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انھوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے بُرے نتائج ان پر کھل جائیں گے، اور وہی چیز ان پر مسلّط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اُڑاتے رہے ہیں۔

یہی انسان[۶۵] جب ذرا سی مصیبت اِسے چھُو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے اپنی

۶۴ – یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مُشترک ہے، حتّٰی کہ مسلمانوں میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں: ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیا کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھِل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبّت کس سے ہے۔ علامۂ آلُوسیؒ نے تفسیر رُوح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میری یہ بات سُن کر اسے سخت غصہ آیا اور بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا: یہ شخص اولیا کا منکر ہے۔ اور

خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَاۤ اَغْنٰى
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ

طرف سے نعمت دے کر اُبھار دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے[۶۶]! نہیں، بلکہ یہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۶۷]۔ یہی بات ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی کہہ چکے ہیں، مگر جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا[۶۸]۔ پھر اپنی کمائی کے بُرے نتائج انھوں نے بُھگتے، اور ان لوگوں میں سے بھی جو ظالم ہیں وہ عنقریب اپنی کمائی کے بُرے نتائج بھگتیں گے۔ یہ ہمیں عاجز

بعض لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سُنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلدی سُن لیتے ہیں۔

۶۵ – یعنی جسے اللہ کے نام سے چڑ ہے اور اکیلے اللہ کا ذکر سُن کر جس کا چہرہ بگڑنے لگتا ہے۔

۶۶ – اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس نعمت کا اہل ہوں، اسی لیے اس نے مجھے یہ کچھ دیا ہے، ورنہ اگر اس کے نزدیک میں ایک بُرا اور بد عقیدہ اور غلط کار آدمی ہوتا تو مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو مجھے میری قابلیت کی بنا پر ملا ہے۔

۶۷ – لوگ اپنی جہالت و نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جسے کوئی نعمت مل رہی ہے وہ لازماً اس کی اہلیت و قابلیت کی بنا پر مل رہی ہے، اور اس نعمت کا ملنا اُس کے مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت یا دلیل ہے۔ حالانکہ یہاں جس کو جو کچھ بھی دیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ یہ امتحان کا سامان ہے نہ کہ قابلیت کا انعام، ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ بہت سے قابل آدمی خستہ حال ہیں اور بہت سے نا قابل آدمی نعمتوں میں کھیل رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی نعمتیں مقبولِ بارگاہ ہونے کی علامت بھی نہیں ہیں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ دنیا میں بکثرت ایسے نیک آدمی مصائب میں مبتلا ہیں جن کے نیک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور بہت سے بُرے آدمی، جن کی قبیح حرکات سے ایک دنیا واقف ہے، عیش کر رہے ہیں۔ اب کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی ایک کی مصیبت اور دوسرے کے عیش کو اس بات کی دلیل بنا سکتا ہے کہ نیک انسان کو اللہ پسند نہیں کرتا اور بد انسان کو وہ پسند کرتا ہے؟

۶۸– مطلب یہ ہے کہ جب ان کی شامت آئی تو وہ قابلیت بھی دھری رہ گئی جس کا انھیں دعویٰ تھا، اور یہ بات بھی کھل گئی کہ وہ اللہ کے مقبول بندے نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی یہ کمائی مقبولیت اور صلاحیت کی بنا پر ہوتی تو شامت کیسے آ جاتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥١﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ ع۵
اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٣﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى

کر دینے والے نہیں ہیں۔ اور کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے[۶۹]؟ اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) کہہ دو کہ اے میرے بندو[۷۰]! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایُوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفورٌ رحیم ہے[۷۱]، پلٹ آؤ اپنے رب

۶۹ – یعنی رزق کی تنگی و کشادگی اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون پر مبنی ہے جس کے مصالح کچھ اور ہیں۔ اس تقسیم رزق کا مدار آدمی کی اہلیت و قابلیت، یا اس کے محبوب و مغضوب ہونے پر ہرگز نہیں ہے۔ (اس مضمون کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۵۴-۵۷-۸۹، یونس، حاشیہ ۲۳، ہود، حاشیہ ۳-۳۳، الرعد، حاشیہ ۴۲۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۷، مریم، حاشیہ ۴۵، طٰہٰ، حواشی ۱۱۳- ۱۱۴، الانبیاء، حاشیہ ۹۹، المومنون، دیباچہ، حاشیہ ۱-۴۹-۵۰، الشعراء، حاشیہ ۸۱- ۸۴، القصص، حواشی ۹۷-۹۸-۱۰۱۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۵۴ تا ۶۰۔

۷۰ – بعض لوگوں نے ان الفاظ کی یہ عجیب تاویل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود "اے میرے بندو" کہہ کر لوگوں سے خطاب کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا سب انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک ایسی تاویل ہے جسے تاویل نہیں بلکہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف اور اللہ کے کلام کے ساتھ کھیل کہنا چاہیے۔ جاہل عقیدت مندوں کا کوئی گروہ تو اس نکتے کو سُن کر جھوم اُٹھے گا، لیکن یہ تاویل اگر صحیح ہو تو پھر پورا قرآن غلط ہوا جاتا ہے، کیونکہ قرآن تو از اوّل تا آخر انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتا ہے، اور اس کی ساری دعوت ہی یہ ہے کہ تم ایک اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بندے تھے۔ ان کو اللہ نے رب نہیں بلکہ رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اور اس لیے بھیجا تھا کہ خود بھی اُسی کی بندگی کریں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی سکھائیں۔ آخر کسی صاحبِ عقل آدمی کے دماغ میں یہ بات کیسے سما سکتی ہے کہ مکّہ معظمہ میں کفارِ قریش کے درمیان کھڑے ہو کر ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یکایک یہ اعلان کر دیا ہو گا کہ تم عبد العزّیٰ اور عبدِ شمس کے بجائے دراصل عبدِ محمدؐ ہو، اعاذنا اللہ من ذالک۔

۷۱ – یہ خطاب تمام انسانوں سے ہے، صرف اہلِ ایمان کو مخاطب قرار دینے کے لیے کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ اور جیسا کہ علامہ ابنِ کثیر نے لکھا ہے، عام انسانوں کو مخاطب کر کے یہ بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ و انابت کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، بلکہ بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی وضاحت فرما دی ہے کہ گناہوں کی معافی کی صورت

رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ
يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ
السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾
اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ

کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے، قبل اِس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمھیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کرلو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی[۷۲]، قبل اِس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے: ''افسوس میری اُس تقصیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو اُلٹا مذاق اُڑانے والوں میں شامل تھا۔'' یا کہے: ''کاش! اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متّقیوں میں سے ہوتا۔'' یا عذاب دیکھ کر کہے: ''کاش! مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں

بندگی و اطاعت کی طرف پلٹ آنا اور اللہ کے نازل کیے ہوئے پیغام کی پیروی اختیار کر لینا ہے۔ دراصل یہ آیت ان لوگوں کے لیے پیغامِ اُمید لے کر آئی تھی جو جاہلیّت میں قتل، زِنا، چوری، ڈاکے اور ایسے ہی سخت گناہوں میں غرق رہ چکے تھے، اور اس بات سے مایوس تھے کہ یہ قصور کبھی معاف ہوسکیں گے۔ اُن سے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، جو کچھ بھی تم کر چکے ہو اس کے بعد اب اگر اپنے رب کی اطاعت کی طرف پلٹ آؤ تو سب کچھ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت کی یہی تاویل ابنِ عباسؓ، قَتَادَہؒ، مجاہدؒ اور ابنِ زیدؒ نے بیان کی ہے۔ (ابنِ جَرِیر، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذِی) مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۸۴۔

۷۲- کتاب اللہ کے بہترین پہلو کی پیروی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے آدمی ان کی تعمیل کرے، جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے ان سے بچے، اور اَمثال اور قصّوں میں جو کچھ اس نے ارشاد فرمایا ہے اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ بخلاف اس کے جو شخص حکم سے منہ موڑتا ہے، مَنہیّات کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کے وعظ و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لیتا وہ کتاب اللہ کے بدترین پہلو کو اختیار کرتا ہے، یعنی وہ پہلو اختیار کرتا ہے جسے کتاب اللہ بدترین قرار دیتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَ
كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى
اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾
وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ؗ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ؗ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ
اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ

شامل ہو جاؤں۔" (اور اُس وقت اسے یہ جواب ملے کہ) "کیوں نہیں، میری آیات تیرے پاس آچکی تھیں، پھر تُو نے انھیں جُھٹلایا اور تکبّر کیا، اور تو کافروں میں سے تھا۔" آج جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ باندھے ہیں، قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہوں گے۔ کیا جہنّم میں متکبّروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے، ان کے اسبابِ کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا، ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے[۷۳]۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کُنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ع (اے نبیؐ!) اِن سے کہو: "پھر کیا اے جاہلو! تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟" (یہ بات تمھیں ان سے صاف کہہ دینی چاہیے، کیونکہ) تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاؑ کی طرف یہ وحی بھیجی

۷۳۔ یعنی اس نے دنیا کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ وہی ہر چیز کی خبر گیری اور نگہبانی کر رہا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں جس طرح اُس کے پیدا کرنے سے وجود میں آئی ہیں اُسی طرح وہ اُس کے باقی رکھنے سے باقی ہیں، اُس کے پرورش کرنے سے پھل

قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾
بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ
وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ
بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ

جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے[74] گا اور تم خسارے میں رہو گے۔ لہٰذا (اے نبیؐ!) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔

اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے[75]۔ (اس کی قدرتِ کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ) قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دستِ راست میں لپٹے ہوئے ہوں[76] گے۔ پاک اور بالاتر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[77]۔ اور اُس روز صُور پھونکا جا[78]ئے گا اور

پھول رہی ہیں، اور اس کی حفاظت و نگرانی میں کام کر رہی ہیں۔

۷۴ - یعنی شرک کے ساتھ کسی عمل کو عملِ صالح قرار نہیں دیا جائے گا، اور جو شخص بھی مشرک رہتے ہوئے اپنے نزدیک بہت سے کاموں کو نیک کام سمجھتے ہوئے کرے گا ان پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہوگا اور اس کی پوری زندگی سراسر زیاں کاری بن کر رہ جائے گی۔

۷۵ - یعنی ان کو اللہ کی عظمت و کبریائی کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہے۔ انھوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ خداوندِ عالم کا مقام کتنا بلند ہے اور وہ حقیر ہستیاں کیا شے ہیں جن کو یہ نادان لوگ خدائی میں شریک اور معبودیت کا حق دار بنائے بیٹھے ہیں۔

۷۶ - زمین و آسمان پر اللہ تعالیٰ کے کامل اقتدار و تصرف کی تصویر کھینچنے کے لیے مٹھی میں ہونے اور ہاتھ پر لپٹے ہونے کا استعارہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ جس طرح ایک آدمی کسی چھوٹی سی گیند کو مٹھی میں دبا لیتا ہے اور اس کے لیے یہ ایک معمولی کام ہے، یا ایک شخص ایک رومال کو لپیٹ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کے لیے یہ کوئی محنت طلب کام نہیں ہوتا، اسی طرح قیامت کے روز تمام انسان (جو آج اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ زمین اور آسمان اللہ کے دستِ قدرت میں ایک حقیر گیند اور ایک ذرا سے رومال کی طرح ہیں۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایات منقول ہوئی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں یہ آیت آپؐ نے تلاوت فرمائی اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں (یعنی سیاروں) کو اپنی مٹھی میں لے کر

Maktaba Tul Ishaat.com

فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ
ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَ اَشۡرَقَتِ
الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ
وَ الشُّہَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾
وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۰﴾ ع

وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سوائے اُن کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور یکا یک سب کے سب اُٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔[۷۹] زمین اپنے رب کے نُور سے چمک اُٹھے گی، کتابِ اعمال لا کر رکھ دی جائے گی، انبیا اور تمام گواہ[۸۰] حاضر کر دیے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اور ہر متنفّس کو جو کچھ بھی اُس نے عمل کیا تھا اُس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ ع

اِس طرح پھرائے گا جیسے ایک بچہ گیند پھراتا ہے، اور فرمائے گا: میں ہوں خدائے واحد، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبّار، میں ہوں کبریائی کا مالک، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں جبّار؟ کہاں ہیں متکبّر؟ یہ کہتے کہتے حضوؐر پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہمیں خطرہ ہونے لگا کہ کہیں آپؐ منبر سمیت گر نہ پڑیں۔

۷۷ – یعنی کہاں اُس کی یہ شانِ عظمت و کبریائی اور کہاں اس کے ساتھ خدائی میں کسی کا شریک ہونا۔

۷۸ – صور کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۷۳، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱، المومنون، حاشیہ ۹۴، النمل، حاشیہ ۱۰۶۔

۷۹ – یہاں صرف دو مرتبہ صُور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ سورۂ نمل میں ان دونوں سے پہلے ایک اور نفخِ صُور کا ذکر بھی آیا ہے، جسے سُن کر زمین و آسمان کی ساری مخلوق دہشت زدہ ہو جائے گی۔ (آیت ۸۷) اسی بنا پر احادیث میں تین مرتبہ نفخِ صُور واقع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک، نفخۃ الفزع، یعنی گھبرا دینے والا صُور۔ دوسرا، نفخۃ الصَعق، یعنی مار گرانے والا صُور۔ تیسرا، نفخۃ القیام لِرَبّ العالمین، یعنی وہ صور جسے پھونکتے ہی تمام انسان جی اُٹھیں گے اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنے مرقدوں سے نکل آئیں گے۔

۸۰ – گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا،

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا
فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا
بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا
اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا
وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا

(اِس فیصلے کے بعد) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تھا، جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے،[۸۱] اور اُس کے کارندے ان سے کہیں گے: ''کیا تمھارے پاس تمھارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے، جنھوں نے تم کو تمھارے رب کی آیات سُنائی ہوں اور تمھیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمھیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا؟'' وہ جواب دیں گے: ''ہاں، آئے تھے، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔'' کہا جائے گا: ''داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں، یہاں اب تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے یہ متکبّروں کے لیے۔''

اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے، انھیں گروہ در گروہ جنّت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے، اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے، تو اُس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ ''سلام ہو تم پر! بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں

اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جنّ اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضا اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب ان گواہوں میں شامل ہوں گے۔

۸۱ - یعنی جہنّم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہوں گے بلکہ ان کے پہنچنے پر کھولے جائیں گے، جس طرح مجرموں کے پہنچنے پر جیل کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور ان کے داخل ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

خٰلِدِیۡنَ ﴿۷۳﴾ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ وَ اَوۡرَثَنَا
الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۷۴﴾
وَ تَرَی الۡمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ
رَبِّہِمۡ ۚ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ قِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ ع

ع ۸ ۵

ہمیشہ کے لیے۔" اور وہ کہیں گے: "شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا،[۸۲] اب ہم جنّت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔"[۸۳] پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔[۸۴]

اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کر رہے ہوں گے، اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چُکا دیا جائے گا، اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے۔[۸۵] ع

۸۲ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۳-۱۰۶، الانبیاء، حاشیہ ۹۹۔

۸۳ - یعنی ہم میں سے ہر ایک کو جو جنت بخشی گئی ہے وہ اب ہماری مِلک ہے اور ہمیں اس میں پورے اختیارات حاصل ہیں۔

۸۴ - ہوسکتا ہے کہ یہ اہلِ جنت کا قول ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ جنت کی بات پر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ اضافہ ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۸۵ - یعنی پوری کائنات اللہ کی حمد پکار اُٹھے گی۔

تفہیم القرآن

المومن

(۴۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

المومن

نام آیت ۲۸ کے فقرے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ سورہ جس میں اُس خاص مومن کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزُول ابنِ عباسؓ اور جابر بن زیدؓ کا بیان ہے کہ یہ سورت سورۂ زُمَر کے بعد مُتّصلاً نازل ہوئی ہے اور اس کا جو مَقام قرآنِ مجید کی موجودہ ترتیب میں ہے وہی ترتیبِ نزول کے اعتبار سے بھی ہے۔

حالاتِ نزُول جن حالات میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے اُن کی طرف صاف اشارات اس کے مضمون میں موجود ہیں۔ کفارِ مکہ نے اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو طرح کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ ایک، یہ کہ ہر طرف جھگڑے اور بحثیں چھیڑ کر، طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات اُٹھا کر، اور نت نئے الزامات لگا کر قرآن کی تعلیم اور اسلام کی دعوت اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنے شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیے جائیں کہ ان کو صاف کرتے کرتے آخرِ کار حضوؐر اور اہلِ ایمان زِچ ہو جائیں۔ دوسرے، یہ کہ آپؐ کو قتل کر دینے کے لیے زمین ہموار کی جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے وہ پیہم سازشیں کر رہے تھے، اور ایک مرتبہ تو عملاً انھوں نے اس کا اقدام کر بھی ڈالا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ بن عاص کی رِوایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقبہ بن ابی مُعَیط آگے بڑھا اور اُس نے آپؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بَل دینا شروع کر دیا، تاکہ گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انھوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیقؓ اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ (کیا تم ایک شخص کو صرف اِس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے؟) تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ واقعہ سیرت ابنِ ہِشَام میں بھی منقول ہوا ہے اور نَسائی اور ابنِ ابی حاتم نے بھی اسے رِوایت کیا ہے۔

موضوع اور مَباحِث صورتِ حال کے اِن دونوں پہلوؤں کو آغازِ تقریر ہی میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے اور پھر آگے کی پوری تقریر انھی دونوں پر ایک انتہائی مؤثّر اور سبق آموز تبصرہ ہے۔

قتل کی سازشوں کے جواب میں مومنِ آلِ فرعون کا قصہ سنایا گیا ہے (آیات ۲۳ تا ۵۴) اور اِس قصے کے پیرایے میں تین گروہوں کو تین مختلف سبق دیے گئے ہیں:

۱- کفار کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرنا چاہتے ہو یہی کچھ اپنی طاقت کے بھروسے پر فرعون حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اب کیا یہ حرکتیں کر کے تم بھی اُسی انجام سے دوچار

ہونا چاہتے ہو جس سے وہ دوچار ہوا؟

۲- محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو سبق دیا گیا ہے کہ یہ ظالم بظاہر خواہ کتنے ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں، اور ان کے مقابلے میں تم خواہ کتنے ہی کمزور اور بے بس ہو، مگر تمھیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس خدا کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے تم کام کر رہے ہو اس کی طاقت ہر دوسری طاقت پر بھاری ہے۔ لہٰذا جو بڑی سے بڑی خوفناک دھمکی بھی یہ تمھیں دے سکتے ہیں، اس کے جواب میں بس خدا کی پناہ مانگ لو اور اس کے بعد بالکل بے خوف ہو کر اپنے کام میں لگ جاؤ۔ خدا پرست کے پاس ظالم کی ہر دھمکی کا بس ایک ہی جواب ہے، اور وہ ہے: اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ۔ اس طرح خدا کے بھروسے پر خطرات سے بے پروا ہو کر کام کرو گے تو آخر کار اس کی نصرت آ کر رہے گی اور آج کے فرعون بھی وہی کچھ دیکھ لیں گے جو کل کے فرعون دیکھ چکے ہیں۔ وہ وقت آنے تک ظلم و ستم کے جو طوفان بھی اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں انھیں صبر کے ساتھ تمھیں برداشت کرنا ہی ہو گا۔

۳- اِن دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی معاشرے میں موجود تھا، اور وہ اُن لوگوں کا گروہ تھا جو دلوں میں جان چکے تھے کہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ ہے اور کفارِ قریش سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ مگر یہ جان لینے کے باوجود وہ خاموشی کے ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس موقع پر اُن کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ جب حق کے دشمن عَلانیہ تمھاری آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظالمانہ اِقدام کرنے پر تُل گئے ہیں تو خیف ہے تم پر اگر اب بھی تم بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہو۔ اس حالت میں جس شخص کا ضمیر بالکل مر نہ چکا ہو اُسے تو اُٹھ کر وہ فرض انجام دینا چاہیے جو فرعون کے بھرے دربار میں اُس کے اپنے درباریوں میں سے ایک راست باز آدمی نے اُس وقت انجام دیا تھا جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ جو مَصلحتیں تمھیں زبان کھولنے سے باز رکھ رہی ہیں، یہی مصلحتیں اُس شخص کے آگے بھی راستہ روک کر کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر اُس نے اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کہہ کر ان ساری مصلحتوں کو ٹھکرا دیا، اور اس کے بعد دیکھ لو کہ فرعون اُس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

اب رہا کفار کا وہ مُجادلہ جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے مکۂ معظّمہ میں شب و روز جاری تھا، تو اس کے جواب میں ایک طرف دلائل سے توحید اور آخرت کے اُن عقائد کا برحق ہونا ثابت کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان اصل بنائے نزاع تھے، اور یہ حقیقت صاف کھول کر رکھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ کسی علم اور کسی دلیل و حُجّت کے بغیر ان سچائیوں کے خلاف خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف اُن اصل محرکات کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کی بنا پر سردارانِ قریش اس قدر سرگرمی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ بظاہر انھوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ حضورؐ کی تعلیم اور آپؐ کے دعوائے نبوت پر انھیں حقیقی اعتراضات ہیں جن کی وجہ سے وہ ان باتوں کو نہیں مان رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اُن کے لیے محض

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک جنگِ اقتدار تھی۔ آیت ۵۶ میں یہ بات کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اُن سے صاف کہہ دی گئی ہے کہ تمھارے انکار کی اصل وجہ وہ کبرُ ہے جو تمھارے دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کر لیں گے تو تمھاری بڑائی قائم نہ رہ سکے گی۔ اسی وجہ سے تم اُن کو زَک دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔

اسی سلسلے میں کفار کو پے در پے تنبیہات کی گئی ہیں کہ اگر اللہ کی آیات کے مقابلے میں مُجادَلہ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو اُسی انجام سے دوچار ہو گے جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اس سے بدتر انجام تمھارے لیے آخرت میں مقدّر ہے۔ اُس وقت تم پچھتاؤ گے، مگر اس وقت کا پچھتانا تمھارے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوگا۔

---

۸۵ آیاتہا

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ

۹ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ۝١ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝٢ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ
قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ
اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝٣ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا

ح۔م۔اِس کتاب کا نُزُول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل ہے۔کوئی معبُود اس کے سوا نہیں، اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔[1]

اللہ کی آیات میں جھگڑے[2] نہیں کرتے مگر صرف وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے[3]۔اِس کے بعد

---

۱ – یہ تقریر کی تمہید ہے جس کے ذریعے سے سامعین کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا ہے کہ یہ کلام جواُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے کسی معمولی ہستی کا کلام نہیں ہے، بلکہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ پھر پے در پے اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کی گئی ہیں جو آگے کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتی ہیں:

اوّل،یہ کہ وہ ”زبردست“ ہے، یعنی سب پر غالب ہے۔اس کا جو فیصلہ بھی کسی کے حق میں ہو، نافذ ہو کر ہی رہتا ہے۔کوئی اس سے لڑ کر جیت نہیں سکتا، نہ اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔لہٰذا اس کے فرمان سے منہ موڑ کر اگر کوئی شخص کامیابی کی توقع رکھتا ہو، اور اس کے رسول سے جھگڑا کر کے یہ اُمید رکھتا ہو کہ وہ اسے نیچا دکھا دے گا، تو یہ اس کی اپنی حماقت ہے۔ایسی توقعات کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

دوسری صفت، یہ کہ وہ ”سب کچھ جاننے والا“ ہے۔یعنی وہ قیاس وگمان کی بنا پر کوئی بات نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اس لیے ماورائے حِسّ وادراک حقیقتوں کے متعلق جو معلومات وہ دے رہا ہے، صرف وہی صحیح ہو سکتی ہیں، اور ان کو نہ ماننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی خواہ مخواہ جہالت کی پیروی کرے۔اسی طرح وہ جانتا ہے کہ انسان کی فلاح کس چیز میں ہے اور کون سے اُصول وقوانین اور احکام اس کی بہتری کے لیے ضروری ہیں۔اُس کی ہر تعلیم حکمت اور علمِ صحیح پر مبنی ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔لہٰذا اُس کی ہدایات کو قبول نہ کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی خود اپنی تباہی کے راستے پر جانا چاہتا ہے۔پھر انسانوں کی حرکات وسکنات میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی نہیں رہ سکتی حتّٰی کہ وہ ان نیتّوں اور ارادوں تک کو جانتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

جو انسانی افعال کے اصل محرک ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کسی بہانے اُس کی سزا سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

تیسری صفت یہ کہ وہ ’’گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔‘‘ یہ اُمید اور ترغیب دلانے والی صفت ہے جو اِس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ اب تک سرکشی کرتے رہے ہیں وہ مایوس نہ ہوں، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اپنی رَوِش پر نظرِ ثانی کریں کہ اگر اب بھی وہ اس رَوِش سے باز آ جائیں تو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتے ہیں۔ اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ گناہ معاف کرنا اور توبہ قبول کرنا لازماً ایک ہی چیز کے دو عنوان نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات توبہ کے بغیر بھی اللہ کے ہاں گناہوں کی معافی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک شخص خطائیں بھی کرتا رہتا ہے اور نیکیاں بھی، اور اس کی نیکیاں اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، خواہ اُسے ان خطاؤں پر توبہ و اِستغفار کرنے کا موقع نہ ملا ہو، بلکہ وہ انھیں بھول بھی چکا ہو۔ اسی طرح ایک شخص پر دنیا میں جتنی بھی تکلیفیں اور مصیبتیں اور بیماریاں اور طرح طرح کی رنج و غم پہنچانے والی آفات آتی ہیں، وہ سب اس کی خطاؤں کا بدل بن جاتی ہیں۔ اسی بنا پر گناہوں کی معافی کا ذکر توبہ قبول کرنے سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ توبہ کے بغیر خطا بخشی کی یہ رِعایت صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے اور اہلِ ایمان میں بھی صرف اُن کے لیے جو سرکشی و بغاوت کے ہر جذبے سے خالی ہوں اور جن سے گناہوں کا صُدور بشری کمزوری کی وجہ سے ہوا ہو، نہ کہ اِستکبار اور مَعصِیت پر اصرار کی بنا پر۔

چوتھی صفت، یہ کہ وہ ’’سخت سزا دینے والا‘‘ ہے۔ اس صفت کا ذکر کر کے لوگوں کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ بندگی کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ جتنا رحیم ہے، بغاوت و سرکشی کا رَویّہ اختیار کرنے والوں کے لیے اتنا ہی سخت ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ اُن تمام حدوں سے گزر جاتا ہے جہاں تک وہ اُس کے درگزر اور اُس کی خطا بخشی کا مستحق ہو سکتا ہے، تو پھر وہ اس کی سزا کا مستحق بنتا ہے، اور اس کی سزا ایسی ہولناک ہے کہ صرف ایک احمق انسان ہی اس کو قابلِ برداشت سمجھ سکتا ہے۔

پانچویں صفت، یہ کہ وہ ’’صاحبِ فضل‘‘ ہے، یعنی کشادہ دست، غنی اور فَیّاض ہے۔ تمام مخلوقات پر اس کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی ہمہ گیر بارش ہر آن ہو رہی ہے۔ بندوں کو جو کچھ بھی مل رہا ہے اُسی کے فضل و کرم سے مل رہا ہے۔

ان پانچ صفات کے بعد دو حقیقتیں واشگاف طریقے سے بیان کر دی گئی ہیں: ایک، یہ کہ معبُودِ فی الحقیقت اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، خواہ لوگوں نے کتنے ہی دوسرے جھوٹے معبود بنا رکھے ہوں۔ دوسری، یہ کہ جانا سب کو آخرِ کار اسی کی طرف ہے۔ کوئی دوسرا معبُود لوگوں کے اعمال کا حساب لینے والا اور ان کی جزا و سزا کا فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر اگر کوئی دوسروں کو معبُود بنائے گا تو اپنی اس حماقت کا خمیازہ خود بھگتے گا۔

۲ — جھگڑا کرنے سے مراد ہے: کج بحثیاں کرنا۔ مین میخ نکالنا۔ اُلٹے سیدھے اعتراضات جڑنا۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی ایک لفظ یا فقرہ لے اُڑنا اور اُس سے طرح طرح کے نکتے پیدا کر کے شبہات و الزامات کی عمارتیں کھڑی کرنا۔ کلام کے اصل مدّعا کو نظر انداز کر کے اس کو غلط معنی پہنانا تا کہ آدمی نہ خود بات کو سمجھے نہ دوسروں کو سمجھنے دے۔ یہ طرزِ اختلاف لازماً صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا اختلاف بدنیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ نیک نیت مخالف اگر بحث کرتا بھی ہے تو تحقیق کی غَرض سے کرتا ہے اور اصل مسائلِ زیرِ بحث پر گفتگو کر کے یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ ان مسائل میں اس کا اپنا نقطۂ نظر دُرست ہے یا فریقِ مخالف کا۔ اس قسم کی بحث حق معلوم کرنے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے۔ بخلاف اس کے بدنیت مخالف کا اصل مقصد سمجھنا اور سمجھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ فریقِ ثانی

يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ﴿٤﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْأَحْزَابُ
مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ ۖ وَجَادَلُوا
بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٥﴾ وَ
كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿٦﴾

وقف لازم
وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کے ملکوں میں اُن کی چلت پھرت تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے[4]۔ اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم بھی جُھٹلا چکی ہے، اور اُس کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اُسے گرفتار کرے۔ اُن سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر آخرِ کار میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ اِسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی اُن سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصلِ بجہنّم ہونے والے ہیں[5]۔

کو زک دینا اور زِچ کرنا چاہتا ہے اور بحث کے میدان میں اس لیے اُترتا ہے کہ دوسرے کی بات کسی طرح چلنے نہیں دینی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کبھی اصل مسائل کا سامنا نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اطراف ہی میں چھاپے مارتا رہتا ہے۔

۳ – "کفر" کا لفظ یہاں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، کفرانِ نعمت۔ دوسرے، انکارِ حق۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل صرف وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو اس کے احسانات کو بھول گئے ہیں اور جنھیں یہ احساس نہیں رہا ہے کہ اُسی کی نعمتیں ہیں جن کے بل پر وہ پَل رہے ہیں۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جنھوں نے حق سے منہ موڑ لیا ہے اور اسے نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کفر کرنے والے سے مراد ہر وہ شخص نہیں ہے جو مسلمان نہ ہو۔ اس لیے کہ جو غیر مسلم اسلام کو سمجھنے کی غرض سے نیک نیتی کے ساتھ بحث کرے اور تحقیق کی غرض سے وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرے جن کے سمجھنے میں اسے زحمت پیش آ رہی ہو، اگرچہ اسلام قبول کرنے سے پہلے تک اِصطِلاحًا ہوتا وہ بھی کافر ہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اُس پر وہ بات راست نہیں آتی جس کی اِس آیت میں مَذَمّت کی گئی ہے۔

۴ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک خلا ہے جسے ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ فَحوائے کلام سے یہ بات خود بخود مُترشّح ہوتی ہے کہ اللہ عزَّوجلَّ کی آیات کے مقابلے میں جو لوگ جھگڑالو پن کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، وہ سزا سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ لامحالہ ایک نہ ایک روز ان کی شامت آنی ہے۔ اب اگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر کے بھی خدا کی زمین میں اطمینان سے دندناتے پھر رہے ہیں، اور اُن کے کاروبار خوب چمک رہے ہیں، اور ان کی حکومتیں بڑی شان سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ

عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے ہیں[6]۔ وہ کہتے ہیں: ”اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر

چل رہی ہیں، اور وہ خوب دادِ عیش دے رہے ہیں، تو اِس دھوکے میں نہ پڑ جاؤ کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نکلے ہیں، یا خدا کی آیات سے جنگ کوئی کھیل ہے جسے تفریح کے طور پر کھیلا جا سکتا ہے اور اس کا کوئی بُرا نتیجہ اس کھیل کے کھلاڑیوں کو کبھی نہ دیکھنا پڑے گا۔ یہ تو دراصل ایک مُہلت ہے جو خدا کی طرف سے ان کو مل رہی ہے۔ اس مُہلت سے غلط فائدہ اُٹھا کر جو لوگ جس قدر زیادہ شرارتیں کرتے ہیں ان کی کشتی اسی قدر زیادہ بھر کر ڈوبتی ہے۔

۵ — یعنی دنیا میں جو عذاب اُن پر آیا وہ ان کی آخری سزا نہ تھی بلکہ اللہ نے یہ فیصلہ بھی ان کے حق میں کر دیا ہے کہ ان کو واصلِ بجہنّم ہونا ہے۔ ایک دوسرا مطلب اِس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کی شامت آ چکی ہے اسی طرح اب جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے حق میں بھی اللہ کا یہ فیصلہ طے شدہ ہے کہ وہ واصلِ بجہنّم ہونے والے ہیں۔

٦ — یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تسلی کے لیے ارشاد ہوئی ہے۔ وہ اُس وقت کفارِ مکہ کی زبان درازیاں اور چیرہ دستیاں، اور ان کے مقابلے میں اپنی بے بسی دیکھ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہو رہے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ اِن گھٹیا اور رذیل لوگوں کی باتوں پر تم رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، تمھارا مرتبہ تو وہ ہے کہ عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور عرش کے گرد و پیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمھارے حامی ہیں اور تمھارے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشیں کر رہے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجائے عرشِ الٰہی کے حامل اور اس کے گرد و پیش حاضر رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصور دلانے کے لیے کیا گیا ہے کہ سلطنتِ خداوندی کے عام اہل کار تو درکنار، وہ ملائکۂ مُقرّبین بھی جو اِس سلطنت کے ستون ہیں اور جنھیں فرماں روائے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے، تمھارے ساتھ گہری دلچسپی و ہمدردی رکھتے ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا گیا کہ یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا رشتہ ہی وہ اصل رشتہ ہے جس نے عرشیوں اور فرشیوں کو ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، اور اسی تعلق کی وجہ سے عرش کے قریب رہنے والے فرشتوں کو زمین پر بسنے والے اُن خاکی انسانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے جو انھی کی طرح اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ فرشتوں کے اللہ پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کفر کر سکتے تھے، مگر انھوں نے اسے چھوڑ کر ایمان اختیار کیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کا اقتدار مانتے ہیں کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہے جو انھیں حکم دینے والی ہو اور وہ اُس کے آگے سرِ اطاعت جھکاتے ہوں۔ یہی مسلک جب ایمان لانے والے انسانوں نے بھی اختیار کر لیا تو اتنے بڑے اختلافِ جنس اور بُعدِ مقام کے باوجود اُن کے اور فرشتوں کے درمیان ہم مَشرَبی کا مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔

رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ
الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ
مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ۸

چیز پر چھایا ہوا ہے[7]، پس معاف کر دے اور عذابِ دوزخ سے بچالے[8] اُن لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے[9]۔ اے ہمارے رب! اور داخل کر اُن کو ہمیشہ رہنے والی اُن جنّتوں میں جن کا تُو نے اُن سے وعدہ کیا ہے[10]، اور اُن کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (اُن کو بھی وہاں اُن کے ساتھ ہی پہنچا دے)[11]۔ تُو بلاشبہ قادرِ مطلق اور حکیم ہے۔

۷ – یعنی اپنے بندوں کی کمزوریاں اور لغزشیں اور خطائیں تجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، بے شک تُو سب کچھ جانتا ہے، مگر تیرے علم کی طرح تیرا دامنِ رحمت بھی تو وسیع ہے، اس لیے ان کی خطاؤں کو جاننے کے باوجود اِن غریبوں کو بخش دے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بربنائے رحمت اُن سب لوگوں کو بخش دے جن کو بربنائے علم تو جانتا ہے کہ انھوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے اور فی الواقع تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

۸ – معاف کرنا اور عذابِ دوزخ سے بچالینا اگرچہ صریحاً لازم و ملزوم ہیں اور ایک بات کا ذکر کر دینے کے بعد دوسری بات کہنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی، لیکن اس طرزِ بیان سے دراصل اہلِ ایمان کے ساتھ فرشتوں کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ کسی معاملے میں جس شخص کے دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے وہ جب حاکم سے گزارش کرنے کا موقع پالیتا ہے تو پھر وہ اِلحاح کے ساتھ ایک ہی درخواست کو بار بار طرح طرح سے پیش کرتا ہے اور ایک بات بس ایک دفعہ عرض کر کے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

۹ – یعنی نافرمانی چھوڑ دی ہے، سرکشی سے باز آگئے ہیں، اور فرماں برداری اختیار کر کے زندگی کے اُس راستے پر چلنے لگے ہیں جو تُو نے خود بتایا ہے۔

۱۰ – اس میں بھی وہی اِلحاح کی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی طرف اُوپر حاشیہ نمبر ۸ میں ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاف کرنا اور دوزخ سے بچالینا آپ سے آپ جنت میں داخل کرنے کو مُستلزم ہے، اور پھر جس جنت کا اللہ نے خود مومنین سے وعدہ کیا ہے، بظاہر اُسی کے لیے مومنین کے حق میں دعا کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کے دل میں جذبۂ خیر خواہی کا اتنا جوش ہے کہ وہ اپنی طرف سے ان کے حق میں کلمۂ خیر کہتے ہی چلے جاتے ہیں حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ سب مہربانیاں اُن کے ساتھ کرنے والا ہے۔

۱۱ – یعنی اُن کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے اُن کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد کو بھی ان کے ساتھ جمع کر دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ
اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ
فَتَكْفُرُوْنَ ۝۱۰ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ

اور بچادے اُن کو بُرائیوں سے[12]۔ جس کو تُو نے قیامت کے دن بُرائیوں[13] سے بچا دیا، اُس پر تُو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے۔'' ع

جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز اُن کو پکار کر کہا جائے گا: ''آج تمھیں جتنا شدید غصّہ اپنے اُوپر آرہا ہے، اللہ تم پر اُس سے زیادہ غضب ناک اُس وقت ہوتا تھا جب تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے[14]۔'' وہ کہیں گے: ''اے ہمارے رب! تُو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی[15]،

یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود بھی اُن نعمتوں کے سلسلے میں بیان فرمائی ہے جو جنت میں اہلِ ایمان کو دی جائیں گی۔ مُلاحظہ ہو: سورۂ رَعد، آیت ۲۳، اور سورۂ طور، آیت ۲۱۔ سورۂ طور والی آیت میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر ایک شخص جنت میں بلند درجے کا مستحق ہو اور اس کے والدین اور بال بچے اُس مرتبے کے مستحق نہ ہوں تو اس کو نیچے لاکر ان کے ساتھ ملانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اُن کو اُٹھا کر اُس کے درجے میں لے جائے گا۔

۱۲ – ''سیّئات'' (برائیوں) کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک، غلط عقائد اور بگڑے ہوئے اَخلاق اور بُرے اعمال۔ دوسرے، گمراہی اور اعمالِ بد کا وبال۔ تیسرے، آفات اور مصائب اور اذیتیں خواہ وہ اِس دُنیا کی ہوں، یا عالَمِ برزخ کی، یا روزِ قیامت کی۔ فرشتوں کی دُعا کا مقصود یہ ہے کہ اِن کو ہر اُس چیز سے بچا جو اِن کے حق میں بُری ہو۔

۱۳ – روزِ قیامت کی بُرائیوں سے مراد میدانِ حشر کا ہَول، سایے اور ہر قسم کی آسایشوں سے محرومی، محاسبے کی سختی، تمام خلائق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی، اور دوسری وہ تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۱۴ – یعنی کفار جب قیامت کے روز دیکھیں گے کہ انھوں نے دنیا میں شرک و دہریّت، انکارِ آخرت اور رسولوں کی مخالفت پر اپنے پورے کارنامۂ حیات کی بنیاد رکھ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے، اور اس حماقت کی بدولت اب وہ کس انجام بد سے دوچار ہوئے ہیں، تو وہ اپنی انگلیاں چبائیں گے اور جھنجلا جھنجلا کر اپنے آپ کو خود کوسنے لگیں گے۔ اُس وقت فرشتے ان سے پکار کر

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ⑪ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ
اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ⑫ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ⑬ فَادْعُوا

اب ہم اپنے قصُوروں کا اعتراف کرتے ہیں[16]، کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل[17] ہے؟" (جواب ملے گا:) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو، اِس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے، اور جب اُس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے[18]۔"

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے[19] اور آسمان سے تمھارے لیے رزق نازل کرتا ہے[20]، مگر (اِن نشانیوں کے مشاہدے سے) سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہو[21]۔ (پس اے رجوع

کہیں گے کہ آج تو تمھیں اپنے اُوپر بڑا غصہ آ رہا ہے، مگر کل جب تمھیں اس انجام سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے انبیا اور دوسرے نیک لوگ راہِ راست کی طرف دعوت دیتے تھے اور تم اُن کی دعوت کو ٹھکراتے تھے اُس وقت اللہ تعالیٰ کا غضب اس سے زیادہ تم پر بھڑکتا تھا۔

۱۵ – دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی سے مراد وہی چیز ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ، آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے کہ تم خدا کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو جب کہ تم بے جان تھے، اُس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کر دے گا۔ کفار ان میں سے پہلی تین حالتوں کا تو انکار نہیں کرتے، کیونکہ وہ مشاہدے میں آتی ہیں اور اس بنا پر نا قابلِ انکار ہیں۔ مگر آخری حالت پیش آنے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مشاہدے میں ابھی تک نہیں آئی ہے اور صرف انبیا علیہم السلام ہی نے اس کی خبر دی ہے۔ قیامت کے روز جب عملاً وہ چوتھی حالت بھی مشاہدے میں آ جائے گی تب یہ لوگ اقرار کریں گے کہ واقعی وہی کچھ پیش آ گیا جس کی ہمیں خبر دی گئی تھی۔

۱۶ – یعنی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس دوسری زندگی کا انکار کر کے ہم نے سخت غلطی کی اور اس غلط نظریے پر کام کر کے ہماری زندگی گناہوں سے لبریز ہو گئی۔

۱۷ – یعنی کیا اب اس کا کوئی امکان ہے کہ ہمارے اعترافِ گناہ کو قبول کر کے ہمیں عذاب کی اس حالت سے نکال دیا

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ

کرنے والو!) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے[22]، خواہ تمھارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

وہ بلند درجوں والا[23]، مالکِ عرش ہے[24]۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے رُوح

جائے جس میں ہم مبتلا ہو گئے ہیں۔

۱۸ – یعنی فیصلہ اب اُسی اکیلے خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی خدائی پر تم راضی نہ تھے، اور اُن دُوسروں کا فیصلے میں کوئی دخل نہیں ہے جنھیں خدائی کے اختیارات میں حصّہ دار قرار دینے پر تمھیں بڑا اصرار تھا۔ (اس مقام کو سمجھنے کے لیے سورۂ زُمَر، آیت ۴۵ اور اس کا حاشیہ ۶۴ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے۔) اس فقرے میں آپ سے آپ یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اب اِس عذاب کی حالت سے تمھارے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے، کیونکہ تم نے صرف آخرت ہی کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے خالق و پروردگار سے تم کو چِڑ تھی اور اُس کے ساتھ دوسروں کو ملائے بغیر تمھیں چین نہ آتا تھا۔

۱۹ – نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ اس کائنات کا صانع اور مُدَبِّر و منتظم ایک خدا اور ایک ہی خدا ہے۔

۲۰ – رزق سے مراد یہاں بارش ہے۔ کیونکہ انسان کو جتنی اقسام کے رزق بھی دنیا میں ملتے ہیں اُن سب کا مدار آخرِکار بارش پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بے شمار نشانیوں میں سے تنہا اِس ایک نشانی کو پیش کر کے لوگوں کو توجہ دلاتا ہے کہ صرف اِسی ایک چیز کے انتظام پر تم غور کرو تو تمھاری سمجھ میں آ جائے کہ نظامِ کائنات کے متعلق جو تصور تم کو قرآن میں دیا جا رہا ہے وہی حقیقت ہے۔ یہ انتظام صرف اُسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا جب کہ زمین اور اس کی مخلوقات اور پانی اور ہوا اور سورج اور حرارت و بُرودت سب کا خالق ایک ہی خدا ہو۔ اور یہ انتظام صرف اسی صورت میں لاکھوں کروڑوں برس تک پیہم ایک باقاعدگی سے چل سکتا ہے جب کہ وہی اَزَلی واَبَدی خدا اس کو جاری رکھے۔ اور اس انتظام کو قائم کرنے والا لازماً ایک حکیم و رحیم پروردگار ہی ہو سکتا ہے جس نے زمین میں انسان اور حیوانات اور نباتات کو جب پیدا کیا تو ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق پانی بھی بنایا اور پھر اس پانی کو باقاعدگی کے ساتھ رُوئے زمین پر پہنچانے اور پھیلانے کے لیے یہ حیرت انگیز انتظامات کیے۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خدا کا انکار کرے، یا اُس کے ساتھ کچھ دوسری ہستیوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرائے۔

۲۱ – یعنی خدا سے پھرا ہوا آدمی، جس کی عقل پر غفلت یا تعصّب کا پردہ پڑا ہوا ہو، کسی چیز کو دیکھ کر بھی کوئی سبق نہیں لے سکتا۔ اس کی حیوانی آنکھیں یہ تو دیکھ لیں گی کہ ہوائیں چلیں، بادل آئے، کڑک چمک ہوئی، اور بارش ہو گئی۔ مگر اس کا انسانی دماغ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور مجھ پر اس کے کیا حقوق ہیں۔

مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا
يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ

نازل کر دیتا ہے[۲۵]، تاکہ وہ ملاقات کے دن[۲۶] سے خبردار کر دے۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ (اُس روز پکار کر پوچھا جائے گا:) آج بادشاہی کس کی ہے[۲۷]؟ (سارا عالَم پکار اُٹھے گا:) اللہ واحد قہّار کی۔ (کہا جائے گا:) آج ہر متنفّس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کی تھی۔

۲۲ — دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کی وضاحت سورۂ زُمَر حاشیہ نمبر ۳ میں کی جا چکی ہے۔

۲۳ — یعنی تمام موجودات سے اُس کا مقام بدرجہا بلند ہے۔ کوئی ہستی بھی جو اس کائنات میں موجود ہے، خواہ وہ کوئی فرشتہ ہو یا نبی یا ولی، یا اور کوئی مخلوق، اس کا مقام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں چاہے کتنا ہی ارفع و اشرف ہو، مگر اللہ تعالیٰ کے بلند ترین مقام سے اس کے قریب ہونے تک کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کجا کہ خدائی صفات و اختیارات میں اس کے شریک ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

۲۴ — یعنی ساری کائنات کا بادشاہ و فرماں روا ہے۔ کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۱، یونس، حاشیہ ۴، الرعد، حاشیہ ۳۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲)

۲۵ — روح سے مراد وحی اور نبوت ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۳) اور یہ ارشاد کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یہ روح نازل کرتا ہے، اس معنیٰ میں ہے کہ اللہ کے فضل پر کسی کا اِجارہ نہیں ہے۔ جس طرح کوئی شخص یہ اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ فُلاں شخص کو حُسن کیوں دیا گیا اور فلاں شخص کو حافظہ یا ذہانت کی غیر معمولی قوت کیوں عطا کی گئی، اسی طرح کسی کو یہ اعتراض کرنے کا بھی حق نہیں ہے کہ منصبِ نبوت کے لیے فلاں شخص ہی کو کیوں چُنا گیا اور جسے ہم چاہتے تھے اسے کیوں نہ نبی بنایا گیا۔

۲۶ — یعنی جس روز تمام انسان اور جن اور شیاطین بیک وقت اپنے رب کے سامنے جمع ہوں گے اور ان کے اعمال کے سارے گواہ بھی حاضر ہوں گے۔

۲۷ — یعنی دنیا میں تو بہت سے برخود غلط لوگ اپنی بادشاہی و جبّاری کے ڈنکے پیٹتے رہے، اور بہت سے احمق ان کی بادشاہیاں اور کبریائیاں مانتے رہے، اب بتاؤ کہ بادشاہی فی الواقع کس کی ہے؟ اختیارات کا اصل مالک کون ہے؟ اور حکم کس کا چلتا ہے؟ یہ ایسا مضمون ہے جسے اگر کوئی شخص گوشِ ہوش سے سنے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بادشاہ یا آمرِ مُطلق بنا بیٹھا ہو، اُس کا زہرہ آب ہو جائے اور ساری جبّاریت کی ہوا اُس کے دماغ سے نکل جائے۔ اس موقع پر تاریخ کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سامانی خاندان کا

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ
الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ۬ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ ﴿۱۸﴾ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ

آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔[۲۸] اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔[۲۹] اَے نبیؐ ! ڈرا دو اِن لوگوں کو اُس دن سے جو قریب آ لگا ہے۔[۳۰] جب کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چُپ چاپ غم کے گھونٹ پیے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔[۳۱] اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے،[۳۲]

فرماں روا نصر بن احمد (۳۰۱-۳۳۱ھ) جب نیشاپور میں داخل ہوا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمایش کی کہ کارروائی کا افتتاح قرآنِ مجید کی تلاوت سے ہو۔ یہ سُن کر ایک بزرگ آگے بڑھے اور انھوں نے یہی رُکوع تلاوت کیا۔ جس وقت وہ اس آیت پر پہنچے تو نصر پر ہیبت طاری ہوگئی۔ لرزتا ہوا تخت سے اُترا، تاج سر سے اُتار کر سجدے میں گر گیا اور بولا: اے رب! بادشاہی تیری ہی ہے نہ کہ میری۔

۲۸ – یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملے میں ظلم کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک، یہ کہ آدمی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ تیسرے، یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے ڈالی جائے۔ چوتھے، یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں، یہ کہ جو کم سزا کا مستحق ہو اسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے، یہ کہ مظلوم منہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بَری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں، یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ان تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔

۲۹ – مطلب یہ ہے کہ اللہ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ وہ جس طرح کائنات کی ہر مخلوق کو بیک وقت رزق دے رہا ہے اور کسی کی رزق رسانی کے انتظام میں اُس کو ایسی مشغولیت نہیں ہوتی کہ دوسروں کو رزق دینے کی اسے فرصت نہ ملے، وہ جس طرح کائنات کی ہر چیز کو بیک وقت دیکھ رہا ہے، ساری آوازوں کو بیک وقت سُن رہا ہے، تمام چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات کی بیک وقت تدبیر کر رہا ہے، اور کوئی چیز اس کی توجہ کو اس طرح جذب نہیں کرلیتی کہ اُسی وقت وہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہ کرسکے، اُسی طرح وہ ہر ہر فرد کا بیک وقت محاسبہ بھی کرلے گا اور ایک مُقدّمے کی سَماعت کرنے میں اُسے ایسی مشغولیت لاحق نہ ہوگی کہ اُسی وقت دوسرے بے شمار مقدّمات کی سَماعت نہ کرسکے۔ پھر اس کی عدالت میں اس بنا پر بھی کوئی تاخیر نہ ہوگی کہ واقعاتِ مقدّمہ کی تحقیق اور اس کے لیے شہادتیں فراہم ہونے میں وہاں کوئی مشکل پیش آئے۔ حاکمِ عدالت براہِ راست خود تمام حقائق سے واقف ہوگا۔ ہر فریقِ مقدّمہ اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہوگا۔ اور واقعات

وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ
مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۲۰﴾ ع اَوَلَمۡ
یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا
مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ

اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چُھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔[۳۲] ع

کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت ور تھے، اور اِن سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں۔

کی کُھلی کُھلی ناقابلِ انکار شہادتیں چھوٹی سے چھوٹی جزئی تفصیلات تک کے ساتھ بلا تاخیر پیش ہو جائیں گی۔ اس لیے ہر مقدّمے کا فیصلہ جھٹ پٹ ہو جائے گا۔

۳۰– قرآنِ مجید میں لوگوں کو بار بار یہ احساس دلایا گیا ہے کہ قیامت اُن سے کچھ دُور نہیں ہے بلکہ قریب ہی لگی کھڑی ہے اور ہر لحہ آسکتی ہے۔ کہیں فرمایا: اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ (النحل: ۱) کہیں ارشاد ہوا: اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ (الانبیاء: ۱) کہیں مُتنبّہ کیا گیا: اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ (القمر: ۱) کہیں فرمایا گیا: اَزِفَتِ الۡاٰزِفَۃُ ﴿ۚ﴾ لَیۡسَ لَہَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کَاشِفَۃٌ (النجم: ۵۷-۵۸) ان ساری باتوں سے مقصود لوگوں کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ قیامت کو دور کی چیز سمجھ کر بے خوف نہ رہیں اور سنبھلنا ہے تو ایک لحہ ضائع کیے بغیر سنبھل جائیں۔

۳۱– اصل میں لفظ حَمِیۡم استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اُس کو پِٹتے دیکھ کر جوش میں آئے اور اسے بچانے کے لیے دَوڑے۔

۳۲– یہ بات بَرسَبیلِ تنزُّل، کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہو گا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فُسّاق و فُجّار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انھیں بچانے کے لیے سِفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعُموم یہ عقیدہ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اَڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور بخشوا کر ہی چھوڑیں گے اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ
اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى
بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ

مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس اُن کے رسول بیّنات[۳۴] لے کر آئے اور انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے اُن کو پکڑ لیا، یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔
ہم نے موسیٰؑ[۳۵] کو فرعون اور ہامان[۳۶] اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں سندِ ماموریت[۳۷] کے ساتھ

نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

۳۳- یعنی تمھارے معبودوں کی طرح وہ کوئی اندھا بہرا خدا نہیں ہے جسے کچھ پتا نہ ہو کہ جس آدمی کے معاملے کا وہ فیصلہ کر رہا ہے اس کے کیا کرتوت تھے۔

۳۴- بیّنات سے مراد تین چیزیں ہیں: ایک، ایسی نمایاں علامات اور نشانیاں جو اُن کے مامور من اللہ ہونے پر شاہد تھیں۔ دوسرے، ایسی روشن دلیلیں جو ان کی پیش کردہ تعلیم کے حق ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ تیسرے، زندگی کے مسائل و معاملات کے متعلق ایسی واضح ہدایات جنھیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ جان سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کوئی جھوٹا خود غرض آدمی نہیں دے سکتا۔

۳۵- حضرت موسیٰؑ کے قصے کی دوسری تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۶۴ تا ۷۶، النساء، حاشیہ ۲۰۶، المائدہ، حاشیہ ۴۲۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۳ تا ۱۱۹، یونس، حواشی ۷۲ تا ۹۴، ہود، حواشی ۱۹-۱۰۴-۱۱۱، یوسف، دیباچہ، ابراہیم، حواشی ۸ تا ۱۳، بنی اسرائیل، حواشی ۱۱۳ تا ۱۱۷۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۵۷ تا ۵۹، مریم، حواشی ۲۹ تا ۳۱، طٰہٰ، دیباچہ، حواشی ۵ تا ۷۵، المومنون، حواشی ۳۹-۴۲، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹، النمل، حواشی ۸ تا ۱۷، القصص، دیباچہ، حواشی ۱ تا ۵۷۔ جلد چہارم، احزاب، آیت ۶۹، الصّافّات، آیات ۱۱۴ تا ۱۲۲۔

۳۶- ہامان کے متعلق مخالفین کے اعتراضات کا جواب اس سے پہلے سورۂ قصص کے حواشی میں دیا جا چکا ہے۔ (جلد سوم، صفحہ ۶۱۵)

۳۷- یعنی ایسی صریح علامات کے ساتھ جن سے یہ امر مُشتبہ نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور اُن کی پشت پر اللہ ربّ العالمین کی طاقت ہے۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کون سی علامات تھیں جن کو یہاں ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی سند قرار دیا

فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا
قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ

بھیجا، مگر انھوں نے کہا "ساحر ہے کذّاب ہے۔" پھر جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے سامنے لے آیا[۳۸] تو انھوں نے کہا "جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو۔"[۳۹]

جا رہا ہے۔ اوّل تو یہی ایک عجیب بات تھی کہ جو شخص چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ملک سے فرار ہو گیا تھا اور جس کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے وہ اچانک ایک لاٹھی لیے ہوئے سیدھا فرعون کے بھرے دربار میں دَرانہ چلا آتا ہے اور دھڑلّے کے ساتھ بادشاہ اور اس کے اعیانِ سلطنت کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ وہ اسے اللہ ربّ العالمین کا نمایندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں، اور کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ اس بُری طرح غلامی کے جُوئے تلے پِس رہی تھی کہ اگر الزامِ قتل کی بنا پر اُن کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ان کی قوم بغاوت تو درکنار، احتجاج ہی کے لیے زبان کھول سکے گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور یدِ بیضا کے معجزے دیکھنے سے بھی پہلے فرعون اور اس کے اہلِ دربار محض حضرت موسیٰؑ کی آمد ہی سے مرعوب ہو چکے تھے اور پہلی نظر ہی میں انھیں محسوس ہو گیا تھا کہ یہ شخص کسی اور ہی طاقت کے بل بُوتے پر آیا ہے۔ پھر جو عظیم الشان معجزے پے در پے ان کے ہاتھ سے صادر ہوئے ان میں سے ہر ایک یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ یہ جادو کا نہیں، خدائی طاقت ہی کا کرشمہ ہے۔ آخر کس جادو کے زور سے ایک لاٹھی فی الواقع اژدہا بن سکتی ہے؟ یا ایک پورے ملک میں قحط پڑ سکتا ہے؟ یا لاکھوں مربع میل کے علاقے میں ایک نوٹس پر طرح طرح کے طوفان آ سکتے ہیں اور ایک نوٹس پر وہ ختم ہو سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کے بیان کے مطابق فرعون اور اس کی سلطنت کے تمام ذمہ دار لوگ، زبان سے چاہے انکار کرتے رہے ہوں، مگر دل اُن کے پوری طرح جان چکے تھے کہ حضرت موسیٰؑ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۶ تا ۸۹، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۲۹ تا ۵۳، الشعراء، حواشی ۲۲ تا ۴۱، النمل، حاشیہ ۱۶)

۳۸ - یعنی جب پے در پے معجزات اور نشانیاں دکھا کر حضرت موسیٰؑ نے یہ بات اُن پر پوری طرح ثابت کر دی کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور مضبوط دلائل سے اپنا برسرِ حق ہونا پوری طرح واضح کر دیا۔

۳۹ - سورۂ اعراف، آیت ۱۲۷ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا تھا کہ آخر موسیٰؑ کو یہ کھلی چھٹی کب تک دی جائے گی، اور اس نے کہا تھا کہ میں عنقریب بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دینے کا حکم دینے والا ہوں۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۳) اب یہ آیت بتاتی ہے کہ فرعون کے ہاں سے آخرِ کار یہ حکم جاری کر دیا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے حامیوں اور پیروؤں کو اتنا خوف زدہ کر دیا جائے کہ وہ ڈر کے مارے ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ

مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔[۴۰]

ایک روز[۴۱] فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا: ”چھوڑو مجھے، مَیں اِس موسیٰؑ کو قتل کیے دیتا ہوں[۴۲]، اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمھارا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد

۴۰ – اصل الفاظ ہیں: وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔ اس فقرے کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کافروں کی جو چال بھی تھی، گمراہی اور ظلم و جَور اور مُخالفتِ حق ہی کی راہ میں تھی، یعنی حق واضح ہو جانے اور دلوں میں قائل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی ضد میں بڑھتے ہی چلے گئے اور صداقت کو نیچا دکھانے کے لیے انھوں نے کوئی ذلیل سے ذلیل تدبیر اختیار کرنے میں بھی باک نہ کیا۔

۴۱ – یہاں سے جس واقعے کا بیان شروع ہو رہا ہے وہ تاریخِ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائبل اور تَلمود، دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں، اور دوسری اسرائیلی رِوایات میں بھی اس کا کوئی نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآنِ مجید ہی کے ذریعے سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش کے دَور میں ایک وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصّب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے یہ قصہ بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، اور بجائے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی شخصیت، ان کی تبلیغ، اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات سے مُتاثّر ہو کر خود فرعون کے اَعیانِ سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو اُن کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو۔ لیکن مغربی مُستشرِقین، علم و تحقیق کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود، تعصّب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون ”موسیٰ“ کا مصنف اس قصے کے متعلق لکھتا ہے:

> ”قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰؑ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پوری طرح واضح نہیں ہے۔ (سورہ ۴۰، آیت ۲۸) کیا ہمیں اس کا تقابُل اُس قصے سے کرنا چاہیے جو ہَگّادا میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ یِتھرو نے فرعون کے دربار میں عَفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟“

گویا ان مُدّعیانِ تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کیڑے ہی ڈالنے ہیں۔ اب اگر اُس کے کسی بیان پر حرف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے، اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہَگّادا میں یِتھرو کا جو قصہ حضرت موسیٰؑ کی پیدایش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے

الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ
لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ ع وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ
فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدْ

برپا کرے گا۔[۴۳]"

موسیٰؑ نے کہا: "میں نے تو ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں، جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے۔[۴۴]" ع

اس موقع پر آلِ فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چُھپائے ہوئے تھا، بول اُٹھا: "کیا تم ایک شخص کو صرف اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سُن لیا ہوگا، اور اسے لاکر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہوگا۔ یہ ہے "علمی تحقیق" کا وہ انداز جو اِن لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔

۴۲- اس فقرے میں فرعون یہ تأثّر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ گویا کچھ لوگوں نے اسے روک رکھا ہے جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کو قتل نہیں کر رہا ہے، ورنہ اگر وہ مانع نہ ہوتے تو وہ کبھی کا انھیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ حالانکہ دراصل باہر کی کوئی طاقت اسے روکنے والی نہ تھی، اس کے اپنے دل کا خوف ہی اس کو اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے سے روکے ہوئے تھا۔

۴۳- یعنی، مجھے اس سے انقلاب کا خطرہ ہے، اور اگر یہ انقلاب برپا نہ بھی کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ہے ہی کہ اس کی کارروائیوں سے ملک میں فساد رونما ہوگا، لہٰذا بغیر اس کے کہ یہ کوئی مُستلزِم سزائے موت جرم کرے، محض تحفظِ امنِ عام (maintenance of public order) کی خاطر اسے قتل کر دینا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اس شخص کی ذات سے فی الواقع امنِ عام کو خطرہ ہے یا نہیں، تو اس کے لیے صرف ہز میجسٹی کا اطمینان کافی ہے۔ سرکارِ عالی اگر مطمئن ہیں کہ یہ خطرناک آدمی ہے تو مان لیا جانا چاہیے کہ واقعی خطرناک اور گردن زدنی ہے۔

اِس مقام پر "دین بدل ڈالنے" کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے جس کے اندیشے سے فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ یہاں دین سے مراد نظامِ حکومت ہے اور فرعون کے قول کا مطلب یہ ہے کہ انی اخاف ان یغیر سلطانکم۔ (رُوح المعانی، ج ۲۴، ص ۵۶) بالفاظِ دیگر، فرعون اور اس کے خاندان کے اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر مذہب و سیاست اور تمدّن و معیشت کا جو نظام مصر میں چل رہا تھا وہ ملک کا دین تھا، اور فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے اِسی دین کے بدل جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن ہر زمانے کے مکّار حکمرانوں کی طرح اُس نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے اقتدار نکل جانے کا خوف ہے، اس لیے میں موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہتا ہوں،

Maktaba Tul Ishaat.com

جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ
وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ
ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ

وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بیّنات[۴۵] لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے[۴۶] گا، لیکن اگر وہ سچّا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذّاب[۴۷] ہو۔ اَے میری قوم کے لوگو! آج تمھیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو، لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا؟[۴۸]"

بلکہ صورتِ معاملہ کو اُس نے اِس طرح پیش کیا کہ لوگو! خطرہ مجھے نہیں، تمھیں لاحق ہے، کیونکہ موسیٰؑ کی تحریک اگر کامیاب ہوگئی تو تمھارا دین بدل جائے گا۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میں تو تمھاری فکر میں گُھلا جارہا ہوں کہ میرے سایۂ اقتدار سے محروم ہو کر تمھارا کیا بنے گا۔ لہٰذا جس ظالم کے ہاتھوں یہ سایہ تمھارے سر سے اُٹھ جانے کا اندیشہ ہے اسے قتل کر دینا چاہیے کیونکہ وہ ملک اور قوم کا دشمن ہے۔

۴۴ – یہاں دو برابر کے احتمال ہیں، جن میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس وقت دربار میں خود موجود ہوں، اور فرعون نے ان کی موجودگی میں انھیں قتل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، اور حضرت نے اُس کو اور اُس کے درباریوں کو خطاب کر کے اُسی وقت برملا یہ جواب دے دیا ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں فرعون نے اپنی حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی کسی مجلس میں یہ خیال ظاہر کیا ہو، اور اس گفتگو کی اِطّلاع آنجناب کو اہلِ ایمان میں سے کچھ لوگوں نے پہنچائی ہو، اور اسے سن کر آپؑ نے اپنے پیروؤں کی مجلس میں یہ بات ارشاد فرمائی ہو۔ اِن دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، حضرت موسیٰؑ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی دھمکی اُن کے دل میں ذرہ برابر بھی خوف کی کوئی کیفیت پیدا نہ کرسکی اور انھوں نے اللہ کے بھروسے پر اس کی دھمکی اسی کے منہ پر ماردی۔ اس واقعے کو جس موقع پر قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے، اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی یہی جواب اُن سب ظالموں کو ہے جو یوم الحساب سے بے خوف ہو کر آپؐ کو قتل کر دینے کی سازشیں کر رہے ہیں۔

۴۵ – یعنی اُس نے ایسی کُھلی کُھلی نشانیاں تمھیں دکھادی ہیں جن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

فرعون نے کہا: ”میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ اور میں اُسی راستے کی طرف تمھاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔“[۴۹]

کہ وہ تمھارے رب کا بھیجا ہوا رسول ہے۔ مومنِ آلِ فرعون کا اشارہ اُن نشانیوں کی طرف تھا جن کی تفصیلات اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۷-۸۹-۹۰-۹۱-۹۴ تا ۹۶، بنی اسرائیل، حواشی ۱۱۳ تا ۱۱۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۲۹ تا ۵۰، الشعراء، حواشی ۲۶ تا ۳۹، النمل، حاشیہ ۱۶)

۴۶ – یعنی اگر ایسی صریح نشانیوں کے باوجود تم اُسے جھوٹا سمجھتے ہو تب بھی تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ دوسرا احتمال، اور نہایت قوی احتمال یہ بھی ہے کہ وہ سچا ہو اور اس پر ہاتھ ڈال کر تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔ اس لیے اگر تم اسے جھوٹا بھی سمجھتے ہو تو اس سے تعرُّض نہ کرو۔ وہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہا ہو گا تو اللہ خود اس سے نمٹ لے گا۔ قریب قریب اسی طرح کی بات اس سے پہلے خود حضرت موسیٰؑ بھی فرعون سے کہہ چکے تھے: وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (الدُّخان: ۲۱) ”اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

یہاں یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ مومنِ آلِ فرعون نے گفتگو کے آغاز میں کھل کر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آیا ہے، بلکہ ابتداءً وہ اسی طرح کلام کرتا رہا کہ وہ بھی فرعون ہی کے گروہ کا ایک آدمی ہے اور محض اپنی قوم کی بھلائی کے لیے بات کر رہا ہے۔ مگر جب فرعون اور اس کے درباری کسی طرح راہِ راست پر آتے نظر نہ آئے تو آخر میں اُس نے اپنے ایمان کا راز فاش کر دیا، جیسا کہ پانچویں رُکوع میں اس کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

۴۷ – اس فقرے کے دو مطلب ممکن ہیں، اور غالباً مومنِ آلِ فرعون نے قصداً یہ ذو معنی بات اسی لیے کہی تھی کہ ابھی وہ کھل کر اپنے خیالات ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کی ذات میں راست رَوی جیسی خوبی اور کِذب و اِفتِرا جیسی بدی جمع نہیں ہو سکتیں۔ تم علانیہ دیکھ رہے ہو کہ موسیٰؑ ایک نہایت پاکیزہ سیرت اور کمال درجے کا بلند کردار انسان ہے۔ اب آخر یہ بات تمھارے دماغ میں کیسے سماتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اتنا بڑا جھوٹا ہو کہ اللہ کا نام لے کر نبوت کا بے بنیاد دعویٰ کر بیٹھے، اور دوسری طرف اللہ اسے اتنے اعلیٰ درجے کے اَخلاق عطا فرمائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اگر حد سے تجاوز کر کے موسیٰ علیہ السلام کی جان لینے کے درپے ہو گے اور ان پر جھوٹے الزامات عائد کر کے اپنے ناپاک منصوبے عمل میں لاؤ گے، تو یاد رکھو کہ اللہ تمھیں ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔

۴۸ – یعنی کیوں اللہ کی دی ہوئی اس نعمتِ غلبہ و اقتدار کی ناشکری کر کے اس کے غضب کو اپنے اُوپر دعوت دیتے ہو؟

۴۹ – فرعون کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ یہ راز نہیں پا سکا تھا کہ اس کے دربار کا یہ امیر دل میں مومن ہو چکا ہے۔ اسی لیے اُس نے اس شخص کی بات پر کسی ناراضی کا اظہار تو نہیں کیا، البتہ یہ واضح کر دیا کہ اس کے خیالات سننے کے بعد بھی وہ اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ
الۡاَحۡزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ
مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ یٰقَوۡمِ
اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿ۙ۳۲﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا
لَکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَ
لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ
شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰهُ
مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اُس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے، جیسا دن قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود اور اِن کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔[۵۰] اے قوم! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے، مگر اُس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے، اُسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسفؑ تمھارے پاس بیّنات لے کر آئے تھے، مگر تم اُن کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا: اب اُن کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا“[۵۱]——اِسی[۵۲] طرح اللہ اُن سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے

۵۰ – یعنی اللہ کو بندوں سے کوئی عداوت نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ انھیں ہلاک کر دے، بلکہ وہ ان پر عذاب اُسی وقت بھیجتا ہے جب کہ وہ حد سے گزر جاتے ہیں، اور اس وقت ان پر عذاب بھیجنا عین تقاضائے عدل و انصاف ہوتا ہے۔

۵۱ – یعنی تمھاری گمراہی اور پھر اس پر ہٹ دھرمی کا حال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تمھارے ملک میں

مُّرْتَابُ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ
اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ ۙ اَسْبَابَ

اور شکّی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔[۵۳] یہ رویّہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اِسی طرح اللہ ہر متکبّر و جبّار کے دل پر ٹھپّا لگا دیتا ہے۔[۵۴]

فرعون نے کہا: "اَے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں، آسمانوں

یوسف علیہ السلام آئے جن کے متعلق تم خود مانتے ہو کہ وہ بلند ترین اَخلاق کے حامل تھے، اور اس بات کا بھی تمھیں اعتراف ہے کہ انھوں نے بادشاہِ وقت کے خواب کی صحیح تعبیر دے کر تمھیں سات برس کے اُس خوفناک قحط کی تباہ کاریوں سے بچا لیا جو اُن کے دَور میں تم پر آیا تھا، اور تمھاری ساری قوم اس بات کی بھی معترف ہے کہ ان کے دَورِ حکومت سے بڑھ کر عدل و انصاف اور خیر و برکت کا زمانہ کبھی مصر کی سرزمین نے نہیں دیکھا، مگر اُن کی ساری خوبیاں جانتے اور مانتے ہوئے بھی تم نے ان کے جیتے جی ان پر ایمان لا کر نہ دیا، اور جب ان کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اب بھلا ایسا آدمی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ گویا تم ان کی خوبیوں کے معترف ہوئے بھی تو اس طرح کہ بعد کے آنے والے ہر نبی کا انکار کرنے کے لیے اسے ایک مستقل بہانہ بنا لیا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہدایت بہر حال تمھیں قبول نہیں کرنی ہے۔

۵۲ – بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آگے کے یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ نے مومنِ آلِ فرعون کے قول پر بطورِ اضافہ و تشریح ارشاد فرمائے ہیں۔

۵۳ – یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی میں اُنھی لوگوں کو پھینکا جاتا ہے جن میں یہ تین صفات موجود ہوتی ہیں۔ ایک، یہ کہ وہ اپنی بداعمالیوں میں حد سے گزر جاتے ہیں اور پھر انھیں فِسق و فُجور کی ایسی چاٹ لگ جاتی ہے کہ اصلاحِ اَخلاق کی کسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے وہ آمادہ نہیں ہوتے۔ دوسرے، یہ کہ انبیا علیہم السلام کے معاملے میں ان کا مستقل رَویّہ شک کا رَویّہ ہوتا ہے۔ خدا کے نبی ان کے سامنے خواہ کیسے ہی بیّنات لے آئیں، مگر وہ ان کی نبوت میں بھی شک کرتے ہیں اور اُن حقائق کو بھی ہمیشہ شک ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو توحید اور آخرت کے متعلق انھوں نے پیش کیے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ وہ کتاب اللہ کی آیات پر معقولیّت کے ساتھ غور کرنے کے بجائے کج بحثیوں سے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اُن کج بحثیوں کی بنیاد نہ کسی عقلی دلیل پر ہوتی

Maktaba Tul Ishaat.com

السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ
زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا كَیْدُ
فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾ وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ
اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا
مَتَاعٌ ؗ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً

ع ۹

کے راستوں تک، اور موسیٰؑ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسیٰؑ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے"[۵۵] ـــــ اس طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہِ راست سے روک دیا گیا۔ فرعون کی ساری چال بازی (اس کی اپنی) تباہی کے راستے ہی میں صرف ہوئی۔ ع

وہ شخص جو ایمان لایا تھا، بولا: "اے میری قوم کے لوگو! میری بات مانو، میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں، اے قوم! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے[۵۶]، ہمیشہ کے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے۔ جو برائی کرے گا اُس کو

ہے، نہ کسی آسمانی کتاب کی سند پر، بلکہ از اوّل تا آخر صرف ضد اور ہٹ دھرمی ہی ان کی واحد بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تین عُیوب جب کسی گروہ میں پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ اسے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے، جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں نکال سکتی۔

۵۴ – یعنی کسی کے دل پر ٹھپّا بلا وجہ نہیں لگا دیا جاتا۔ یہ لعنت کی مُہر صرف اُسی کے دل پر لگائی جاتی ہے جس میں تکبُّر اور جبّاریت کی ہوا بھر چکی ہو۔ تکبر سے مراد ہے آدمی کا جھوٹا پندار جس کی بنا پر وہ حق کے آگے سر جھکانے کو اپنی حیثیت سے گری ہوئی بات سمجھتا ہے۔ اور جبّاریت سے مراد خلقِ خدا پر ظلم ہے جس کی کُھلی چھوٹ حاصل کرنے کے لیے آدمی شریعتِ الٰہیہ کی پابندیاں قبول کرنے سے بھاگتا ہے۔

۵۵ – مومنِ آلِ فرعون کی تقریر کے دَوران میں فرعون اپنے وزیر ہامان کو مخاطب کر کے یہ بات کچھ اس انداز میں کہتا ہے کہ گویا وہ اس مومن کے کلام کو کسی التفات کے قابل نہیں سمجھتا، اس لیے متکبرانہ شان کے ساتھ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہامان سے کہتا ہے کہ ذرا میرے لیے ایک اُونچی عمارت تو بنوا، دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰؑ جس خدا کی باتیں کر رہا ہے وہ کہاں رہتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حواشی ۵۲ تا ۵۴)

۵۶ – یعنی اس دنیا کی عارضی دولت وخوشحالی پر پھول کر تم جو اللہ کو بھول رہے ہو، یہ تمھاری نادانی ہے۔

فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٤٠ وَ
يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝٤١ النصف
تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا
اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝٤٢ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ
لَهٗ دَعْوَةٌ فِى الدُّنْيَا وَلَا فِى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ
الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝٤٣ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَ

اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اُس نے بُرائی کی ہوگی۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنّت میں داخل ہوں گے، جہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔ اے قوم! آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بُلاتا ہوں، اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو! تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں، اور اس کے ساتھ اُن ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنھیں میں نہیں جانتا،[57] حالانکہ میں تمھیں اُس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ نہیں، حق یہ ہے اور اِس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بُلا رہے ہو، اُن کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے نہ آخرت میں،[58] اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، اور حد سے گزرنے والے[59] آگ میں جانے والے ہیں۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اُسے یاد کرو گے۔ اور اپنا

---

۵۷ – یعنی اُن کے شریکِ خدا ہونے کا میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے، پھر آخر آنکھیں بند کر کے میں اتنی بڑی بات کیسے مان لوں کہ خدائی میں ان کی بھی شرکت ہے اور مجھے اللہ کے ساتھ اُن کی بھی بندگی کرنی ہے۔

۵۸ – اس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ ان کو نہ دنیا میں یہ حق پہنچتا ہے اور نہ آخرت میں کہ اُن کی خدائی تسلیم کرنے کے لیے خلقِ خدا کو دعوت دی جائے۔ دوسرے، یہ کہ انھیں تو لوگوں نے زبردستی خدا بنایا ہے ورنہ وہ خود نہ اِس دنیا میں خدائی کے مُدّعی ہیں، نہ آخرت میں یہ دعویٰ لے کر اٹھیں گے کہ ہم بھی تو خدا تھے، تم نے ہمیں کیوں نہ مانا۔ تیسرے، یہ کہ اُن کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ اِس دنیا میں ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىہُ اللّٰہُ
سَیِّاٰتِ مَا مَکَرُوۡا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ ﴿ۚ۴۵﴾ اَلنَّارُ
یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ قف اَدۡخِلُوۡۤا

معاملہ مَیں اللہ کے سُپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔[۶۰]''

آخرِ کار اُن لوگوں نے جو بُری سے بُری چالیں اُس مومن کے خلاف چلیں، اللہ نے اُن سب سے اُس کو بچا لیا[۶۱]، اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے۔[۶۲] دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں، اور جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو

نہ آخرت میں، کیونکہ وہ بالکل بے اختیار ہیں اور انھیں پکارنا قطعی لاحاصل ہے۔

۵۹ - ''حد سے گزر جانے'' کا مطلب حق سے تجاوُز کرنا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے سوا دوسروں کی خدائی مانتا ہے، یا خود خدا بن بیٹھتا ہے، یا خدا سے باغی ہو کر دنیا میں خود مختاری کا رویّہ اختیار کرتا ہے، اور پھر اپنی ذات پر، خلقِ خدا پر، اور دنیا کی ہر اُس چیز پر جس سے اس کو سابقہ پیش آئے، طرح طرح کی زیادتیاں کرتا ہے، وہ حقیقت میں عقل اور انصاف کی تمام حدوں کو پھاند جانے والا انسان ہے۔

۶۰ - اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کہتے وقت اُس مومن شخص کو پورا یقین تھا کہ اس حق گوئی کی پاداش میں فرعون کی پوری سلطنت کا عتاب اس پر ٹوٹ پڑے گا اور اسے محض اپنے اعزازات اور مفادات ہی سے نہیں، اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے محض اللہ کے بھروسے پر اپنا وہ فرض انجام دے دیا جسے اس نازک موقع پر اس کے ضمیر نے اس کا فرض سمجھا تھا۔

۶۱ - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص فرعون کی سلطنت میں اتنی اہم شخصیت کا مالک تھا کہ بھرے دربار میں فرعون کے رُو در رُو یہ حق گوئی کر جانے کے باوجود عَلانیہ اس کو سزا دینے کی جرأت نہ کی جا سکتی تھی، اس وجہ سے فرعون اور اس کے حامیوں کو اسے ہلاک کرنے کے لیے خفیہ تدبیریں کرنی پڑیں، مگر ان تدبیروں کو بھی اللہ نے نہ چلنے دیا۔

۶۲ - اِس طرزِ بیان سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ مومنِ آلِ فرعون کی حق گوئی کا یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کش مکش کے بالکل آخری زمانے میں پیش آیا تھا۔ غالباً اس طویل کش مکش سے دل برداشتہ ہو کر آخرِ کار فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا ہوگا۔ مگر اپنی سلطنت کے اس بااثر شخص کی حق گوئی سے اس کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہوگا کہ موسیٰؑ کے اثرات حکومت کے بالائی طبقوں تک میں پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کے خلاف یہ انتہائی اقدام کرنے سے پہلے اُن عناصر کا پتا چلایا جائے جو سلطنت کے اُمرا اور اعلیٰ عہدے داروں میں اِس تحریک سے مُتأثّر ہو چکے ہیں، اور

اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَ اِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ
الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ

شدید تر عذاب میں داخل کرو۔[۶۳] پھر ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "ہم تمھارے تابع تھے، اب کیا یہاں تم نارِ جہنّم کی تکلیف کے کچھ حصّے سے ہم کو بچا لو گے؟"[۶۴] وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے: "ہم سب

ان کی سرکوبی کر لینے کے بعد حضرت موسیٰ پر ہاتھ ڈالا جائے۔ لیکن ابھی وہ ان تدبیروں میں لگا ہی ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم دے دیا، اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے فرعون اپنے لشکروں سمیت غرقاب ہو گیا۔

۶۳ – یہ آیت اُس عذابِ بَرزَخ کا صریح ثبوت ہے جس کا ذکر بکثرت احادیث میں عذابِ قبر کے عنوان سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہاں صاف الفاظ میں عذاب کے دو مرحلوں کا ذکر فرما رہا ہے: ایک کم تر درجے کا عذاب جو قیامت کے آنے سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون کو اب دیا جا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انھیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے دیکھ کر وہ ہر وقت ہول کھاتے رہتے ہیں کہ یہ ہے وہ دوزخ جس میں آخر کار ہمیں جانا ہے۔ اس کے بعد جب قیامت آ جائے گی تو انھیں وہ اصلی اور بڑی سزا دی جائے گی جو ان کے لیے مقدر ہے، یعنی وہ اُسی دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے جس کا نظارہ انھیں غرقاب ہو جانے کے وقت سے آج تک کرایا جا رہا ہے اور قیامت کی گھڑی تک کرایا جاتا رہے گا۔ اور یہ معاملہ صرف فرعون و آلِ فرعون کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ تمام مجرموں کو موت کی ساعت سے لے کر قیامت تک وہ انجامِ بد نظر آتا رہتا ہے جو اُن کا انتظار کر رہا ہے، اور تمام نیک لوگوں کو اُس انجامِ نیک کی حَسین تصویر دکھائی جاتی رہتی ہے جو اللہ نے اُن کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ بخاری، مسلم اور مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "ان احدکم اذا مات عُرِض علیه مقعده بالغداة والعشی، ان کان من اهل الجنة فمن اهل الجنة، وان کان من اهل النار فمن اهل النار، فیقال هٰذا مقعدك حتّٰی یبعثك اللّٰه عزوجل الیه یوم القیٰمة۔" "تم میں سے جو شخص بھی مرتا ہے اسے صبح و شام اُس کی آخری قیام گاہ دکھائی جاتی رہتی ہے، خواہ وہ جنّتی ہو یا دوزخی۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں تو اُس وقت جائے گا جب اللہ تجھے قیامت کے روز دوبارہ اُٹھا کر اپنے حضور بلائے گا۔" (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، آیت ۹۷، الانعام، ۹۳ – ۹۴۔ جلد دوم، الانفال، ۵۰، النحل، ۲۸ – ۳۲۔ جلد سوم، المومنون، ۹۹ – ۱۰۰۔ جلد چہارم، یٰسٓ، ۲۶ – ۲۷ مع حاشیہ ۲۲ – ۲۳۔ جلد پنجم، محمد، ۲۷ مع حاشیہ ۳۷)

۶۴ – یہ بات وہ اس اُمید پر نہیں کہیں گے کہ ہمارے یہ سابق پیشوا یا حاکم یا رہنمائی الواقع ہمیں عذاب سے بچا سکیں گے یا اس میں کچھ کمی کرا دیں گے۔ اُس وقت تو اُن پر یہ حقیقت کھل چکی ہو گی کہ یہ لوگ یہاں ہمارے کسی کام آنے والے نہیں ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝٤٨ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ
لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝٤٩
قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا
فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝٥٠ اِنَّا لَنَنْصُرُ ع
رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ
الْاَشْهَادُ ۝٥١ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ

یہاں ایک حال میں ہیں، اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔[65] پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنّم کے اہل کاروں سے کہیں گے: "اپنے رب سے دُعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے۔" وہ پوچھیں گے: "کیا تمھارے پاس تمھارے رسول بیّنات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟" وہ کہیں گے: "ہاں"۔ جہنّم کے اہل کار بولیں گے: "پھر تو تم ہی دُعا کرو، اور کافروں کی دُعا اکارت ہی جانے والی ہے۔"[66] ع

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دُنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں،[67] اور اُس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے،[68] جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی، اور اُن پر

مگر وہ انھیں ذلیل کرنے کے لیے ان سے کہیں گے کہ دنیا میں تو حضور بڑے طنطنے سے اپنی سرداری ہم پر چلاتے تھے، اب یہاں اِس آفت سے بھی تو ہمیں بچائیے جو آپ ہی کی بدولت ہم پر آئی ہے۔

۶۵ – یعنی ہم اور تم، دونوں ہی سزا یافتہ ہیں، اور اللہ کی عدالت سے جس کو جو سزا ملنی تھی مل چکی ہے۔ اُس کے فیصلے کو بدلنا، یا اس کی دی ہوئی سزا میں کمی بیشی کر دینا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

۶۶ – یعنی جب واقعہ یہ ہے کہ رسول تمھارے پاس بیّنات لے کر آ چکے تھے اور تم اس بنا پر سزا پا کر یہاں آئے ہو کہ تم نے اُن کی بات ماننے سے انکار (کفر) کر دیا تھا، تو اب ہمارے لیے تمھارے حق میں اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسی دعا کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تو ہونا چاہیے، اور تم اپنی طرف سے ہر معذرت کی گنجایش پہلے ہی ختم کر چکے ہو۔ اِس حالت میں تم خود دعا کرنا چاہو تو کر دیکھو۔ مگر ہم یہ پہلے ہی تمھیں بتائے دیتے ہیں کہ تمھاری طرح کفر کر کے جو لوگ یہاں آئے ہوں ان کی دُعا بالکل لاحاصل ہے۔

اللَّعۡنَةُ وَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡهُدٰى وَ
اَوۡرَثۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡكِتٰبَ ﴿ۙ۵۳﴾ هُدًى وَّ ذِكۡرٰى لِاُولِى
الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَ سَبِّحۡ

لعنت پڑے گی، اور بدترین ٹھکانا اُن کے حصّے میں آئے گا۔ آخر دیکھ لو کہ موسیٰؑ کی ہم نے رہنمائی کی[۶۹] اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی[۷۰]۔ پس اَے نبیؐ! صبر کرو[۷۱]، اللہ کا وعدہ برحق ہے[۷۲]، اپنے قصور کی معافی چاہو[۷۳] اور صبح و شام

۶۷ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الصّافّات، حاشیہ نمبر ۹۳۔

۶۸ – یعنی جب اللہ کی عدالت قائم ہوگی اور اس کے حضور گواہ پیش کیے جائیں گے۔

۶۹ – یعنی موسیٰؑ کو ہم نے فرعون کے مقابلے پر بھیج کر بس یونہی ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا، بلکہ قدم قدم پر ہم ان کی رہنمائی کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اِس ارشاد میں ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ اَے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! ایسا ہی معاملہ ہم تمھارے ساتھ بھی کریں گے۔ تم کو بھی مکّے کے شہر اور قریش کے قبیلے میں نبوت کے لیے اُٹھا دینے کے بعد ہم نے تمھارے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ یہ ظالم تمھارے ساتھ جو سُلوک چاہیں کریں، بلکہ ہم خود تمھاری پشت پر موجود ہیں اور تمھاری رہنمائی کر رہے ہیں۔

۷۰ – یعنی جس طرح موسیٰؑ کا انکار کرنے والے اِس نعمت و برکت سے محروم رہ گئے اور اُن پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل ہی کتاب کے وارث بنائے گئے، اسی طرح اب جو لوگ تمھارا انکار کریں گے وہ محروم ہو جائیں گے اور تم پر ایمان لانے والوں ہی کو یہ سعادت نصیب ہوگی کہ قرآن کے وارث ہوں اور دنیا میں ہدایت کے عَلَم بردار بن کر اُٹھیں۔

۷۱ – یعنی جو حالات تمھارے ساتھ پیش آ رہے ہیں ان کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۷۲ – اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو ابھی اُوپر کے اِس فقرے میں کیا گیا تھا کہ "ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں۔"

۷۳ – جس سیاق و سباق میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُس پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر "قصور" سے مراد بے صبری کی وہ کیفیت ہے جو شدید مخالفت کے اُس ماحول میں خُصوصیّت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی مظلومی دیکھ دیکھ کر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ آپؐ چاہتے تھے کہ جلدی سے کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جائے جس سے کفار قائل ہو جائیں، یا اللہ کی طرف سے اور کوئی ایسی بات جلدی ظہور میں آ جائے جس سے مخالفت کا یہ طوفان ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ خواہش بجائے خود کوئی گناہ نہ تھی جس پر کسی توبہ و اِستغفار کی حاجت ہوتی، لیکن جس مقامِ بلند پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو سرفراز

Maktaba Tul Ishaat.com

بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ
فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا
كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿۵۶﴾

اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۷۴] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجّت کے بغیر جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیات میں جھگڑے کر رہے ہیں، اُن کے دلوں میں کبر بھرا ہُوا ہے،[۷۵] مگر وہ اُس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔[۷۶] بس اللہ کی پناہ مانگ لو،[۷۷] وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔

فرمایا تھا، اور جس زبردست اولوالعزمی کا وہ مقام مقتضی تھا، اُس کے لحاظ سے یہ ذرا سی بے صبری بھی اللہ تعالیٰ کو آپؐ کے مرتبے سے فروتر نظر آئی، اس لیے ارشاد ہوا کہ اس کمزوری پر اپنے رب سے معافی مانگو اور چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ اپنے مَوْقِف پر قائم ہو جاؤ جیسا کہ تم جیسے عظیم المرتبت آدمی کو ہونا چاہیے۔

۷۴ – یعنی یہ حمد و تسبیح ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ کے لیے کام کرنے والوں کو اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام حمد و تسبیح کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ دائماً اللہ کو یاد کرتے رہو۔ دوسرے، یہ کہ اِن مخصوص اوقات میں نماز ادا کرو۔ اور یہ دوسرے معنٰی لینے کی صورت میں اشارہ نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف ہے جو اس سورت کے نُزول کے کچھ مدت بعد تمام اہلِ ایمان پر فرض کر دیے گئے۔ اس لیے کہ عشی کا لفظ عَرَبی زبان میں زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے ابتدائی حصے تک کے لیے بولا جاتا ہے، جس میں ظہر سے عشا تک کی چاروں نمازیں آجاتی ہیں۔ اور اِبکار صبح کی پَو پھٹنے سے طُلوعِ آفتاب تک کے وقت کو کہتے ہیں جو نمازِ فجر کا وقت ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حواشی ۵-۵۹-۶۰-۲۶۳۔ جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۱۳، الحجر، حاشیہ ۵۳، بنی اسرائیل، دیباچہ، حواشی ۱-۹۱ تا ۹۸۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱، النور، حواشی ۸۴ تا ۸۹، العنکبوت، حواشی ۷۶ تا ۷۹، الروم، حواشی ۲۴-۵۰)

۷۵ – یعنی ان لوگوں کی بے دلیل مُخالفت اور اِن کی غیر معقول کج بحثیوں کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کی آیات میں جو سچّائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں وہ اِن کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے یہ نیک نیتی کے ساتھ ان کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے ہیں، بلکہ اِن کے اِس رَوَیّے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا غُرورِ نفس یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان کے ہوتے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کر لی جائے اور بالآخر ایک روز اِنھیں خود بھی اُس شخص کی قیادت ماننی پڑے جس کے مقابلے میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کسی طرح نہ چلنے پائے، اور اس مقصد کے لیے اِنھیں کوئی ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرنے میں بھی کوئی تأمّل نہیں ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬
وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا
مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ لٰكِنَّ

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے[۷۸] مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۷۹] اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائے اور ایمان دار و صالح اور بدکار برابر ٹھیریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔[۸۰] یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، مگر

۷۶ – دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ نے بڑا بنایا ہے وہی بڑا بن کر رہے گا، اور یہ چھوٹے لوگ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخرِ کار ناکام ہو جائیں گی۔

۷۷ – یعنی جس طرح فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں اللہ واحد قہّار کی پناہ مانگ کر موسیٰ بے فکر ہو گئے تھے، اسی طرح سردارانِ قریش کی دھمکیوں اور سازشوں کے مقابلے میں تم بھی اُس کی پناہ لے لو اور پھر بے فکر ہو کر اس کا کلمہ بلند کرنے میں لگ جاؤ۔

۷۸ – اُوپر کے ساڑھے تین رُکوعوں میں سردارانِ قریش کی سازشوں پر تبصرہ کرنے کے بعد اب یہاں سے خطاب کا رُخ عوام کی طرف پھر رہا ہے اور ان کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ جن حقائق کو ماننے کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دے رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں، ان کو مان لینے ہی میں تمھاری بھلائی ہے اور نہ ماننا تمھارے اپنے لیے تباہ کُن ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آخرت کے عقیدے کو لے کر اس پر دلائل دیے گئے ہیں، کیونکہ کفار کو سب سے زیادہ اچنبھا اسی عقیدے پر تھا اور اسے وہ بعید از فہم خیال کرتے تھے۔

۷۹ – یہ امکانِ آخرت کی دلیل ہے۔ کفار کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد انسان کا دوبارہ جی اُٹھنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کوئی دشوار کام نہیں ہو سکتا۔

۸۰ – یہ وجوبِ آخرت کی دلیل ہے۔ اُوپر کے فقرے میں بتایا گیا تھا کہ آخرت ہو سکتی ہے، اس کا ہونا غیر ممکن نہیں ہے۔ اور اس فقرے میں بتایا جا رہا ہے کہ آخرت ہونی چاہیے، عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہو، اور اس کا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط
اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع

اکثر لوگ نہیں مانتے۔[۸۱]

تمھارا[۸۲] رب کہتا ہے: "مجھے پکارو، میں تمھاری دُعائیں قبول کروں[۸۳] گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنّم میں داخل ہوں[۸۴] گے۔"

خلافِ عقل وانصاف ہے۔ آخر کوئی معقول آدمی اس بات کو کیسے درست مان سکتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں اندھوں کی طرح جیتے ہیں اور اپنے بُرے اَخلاق واعمال سے خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیتے ہیں وہ اپنی اِس غلط رَوِش کا کوئی بُرا انجام نہ دیکھیں، اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو دنیا میں آنکھیں کھول کر چلتے ہیں اور ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں اپنی اِس اچھی کارگزاری کا کوئی اچھا نتیجہ دیکھنے سے محروم رہ جائیں؟ یہ بات اگر صریحاً خلافِ عقل وانصاف ہے تو پھر یقیناً انکارِ آخرت کا عقیدہ بھی عقل وانصاف کے خلاف ہی ہونا چاہیے، کیونکہ آخرت نہ ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ نیک وبد دونوں آخرکار مر کر مٹی ہو جائیں اور ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ اس صورت میں صرف عقل وانصاف ہی کا خون نہیں ہوتا بلکہ اَخلاق کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اگر نیکی اور بدی کا انجام یکساں ہے تو پھر بد بڑا عقل مند ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے سارے ارمان نکال گیا اور نیک سخت بے وقوف ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اُوپر طرح طرح کی اَخلاقی پابندیاں عائد کیے رہا۔

۸۱ – یہ وقوعِ آخرت کا قطعی حکم ہے جو اِستدلال کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف علم ہی کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے اور کلامِ وحی کے سوا کسی دوسرے کلام میں یہ بات اِس قطعیت کے ساتھ بیان نہیں ہو سکتی۔ وحی کے بغیر محض عقلی استدلال سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ آخرت ہو سکتی ہے، اور اُس کو ہونا چاہیے۔ اِس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ آخرت یقیناً ہوگی اور ہو کر رہے گی، یہ صرف اُس ہستی کے کہنے کی بات ہے جسے معلوم ہے کہ آخرت ہوگی، اور وہ ہستی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیاس واِستدلال کے بجائے خالص علم پر دین کی بنیاد اگر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی سے ہو سکتی ہے۔

۸۲ – آخرت کے بعد اب توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے جو کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دوسری بنائے نزاع تھی۔

۸۳ – یعنی دعائیں قبول کرنے اور نہ کرنے کے جملہ اختیارات میرے پاس ہیں، لہٰذا تم دوسروں سے دُعائیں نہ مانگو بلکہ مجھ سے مانگو۔ اس آیت کی روح کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ دُعا آدمی صرف اُس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع وبصیر اور فوق الفطری اقتدار (supernatural powers) کا مالک سمجھتا ہے، اور دُعا مانگنے کا مُحرِّک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالَمِ اسباب کے تحت

فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں، اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رُجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔ خَلوَت کی تنہائیوں میں پکارتا ہے۔ باآوازِ بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اِس عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اُس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے دل کی بات بھی سُن رہی ہے۔ اور اُس کو ایسی قدرتِ مُطلَقہ حاصل ہے کہ اسے پکارنے والا جہاں بھی ہو وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔ دُعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ اُس ہستی کے اندر اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو اُن خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اس سے دُعا مانگنے کا تصور تک کبھی اس کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے، اِس سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ وہ فی الواقع مالکِ اختیارات ہو جائے۔ مالکِ اختیارات ہونا تو ایک امرِ واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے وہ بہرحال مالک ہی رہے گا، خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ اور جو حقیقت میں مالک نہیں ہے، اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے، اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کوئی حصہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ بات ایک امرِ واقعی ہے کہ قادرِ مُطلَق اور مدبّرِ کائنات اور سمیع و بصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کُلّی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جو دعائیں سننے اور اُن پر قُبولیت یا عدمِ قبولیت کی صورت میں کوئی کارروائی کرنے کے اختیارات رکھتی ہو۔ اِس امرِ واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیا اور اولیا اور فرشتوں اور جِنّوں اور سیّاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرّہ برابر بھی کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ مالک مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے، بندے ہی رہیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکمِ ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں اُنھی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے، میری مراد آپ ہی بَر لائیں گے تو بَر آئے گی۔ یہ حرکت، اوّل تو بجائے خود سخت حماقت و جَہالت ہے، لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جب کہ اصل حاکمِ ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اُس کی موجودگی میں اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جا رہی ہوں۔ پھر یہ جَہالت اپنے کمال پر اُس وقت پہنچ جاتی ہے، جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جا رہی ہو، خود بار بار اُس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں، میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مجھے پکارو، تمھاری دعاؤں کا جواب دینے والا میں ہوں، انھیں قبول کرنا میرا کام ہے۔

۸۴- اس آیت میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: ایک، یہ کہ دُعا اور عبادت کو یہاں مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے فقرے میں جس چیز کو دُعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اُسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعا عین عبادت اور جانِ عبادت ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ سے دعا نہ مانگنے والوں کے لیے ''گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے، اور اُس سے منہ موڑنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی تکبُّر میں مبتلا ہے اس لیے اپنے خالق و مالک کے آگے اعترافِ عُبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں آیت کے ان دونوں مضامین کو کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ حضرت نُعمان بن بَشیرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان الدعاء هو العبادة ثم قرأ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ...... یعنی دعا عین عبادت ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (احمد، ترمِذی، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جَرِیر) حضرت اَنسؓ کی رِوایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: الدعاء مخ العبادة، ''دعا مغزِ عبادت ہے۔'' (ترمِذی) حضرت ابو ہُریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: من لم يسأل الله يغضب عليه، ''جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔'' (ترمِذی)

اس مَقام پر پہنچ کر وہ عُقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر اُلجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دُعا کے معاملے پر اِس طرح سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی بُرائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت وَمَصلَحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے وہی کچھ لازماً رونما ہو کر رہنا ہے، تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے، اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دُعا مانگے بھی تو اس کی دعا میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ قرآنِ مجید کی مذکورۂ بالا آیت اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے رفع کرتی ہے: اولاً، اللہ تعالیٰ بالفاظِ صریح فرما رہا ہے کہ ''مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔'' اس سے صاف معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح، معاذ اللہ! خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دیے ہوں اور دُعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہوگئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔ دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو، بہرحال ایک فائدے اور بہت بڑے فائدے سے وہ کسی صورت میں بھی خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگ کر اس کی آقائی و بالادستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہارِ عُبودیّت بجائے خود عبادت، بلکہ جانِ عبادت ہے، جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اُس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لیے اس نے دُعا کی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ان دونوں مضامین کی بھی پوری وضاحت ہمیں مل جاتی ہے۔ پہلے مضمون پر

حسبِ ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں:

حضرت سلمانؓ فارسی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا یرد القضاءَ الا الدعاء۔ (ترمذی) ''قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دُعا۔'' یعنی اللہ کے فیصلے کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے، مگر اللہ خود اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے، اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس سے دعا مانگتا ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من احدٍ یدعو بدعاءٍ الا اٰتاہ اللّٰہ ما سأل او کف عنہ من السوء مثلہ ما لم یدع باثم اوقطیعۃ رحمٍ۔ (ترمذی) ''آدمی جب کبھی اللہ سے دعا مانگتا ہے، اللہ اسے یا تو وہی چیز دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی یا اُسی درجے کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے۔'' اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابوسعید خُدریؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے۔ اُس میں آپؐ کا ارشاد یہ ہے کہ: ما من مسلم یدعو بدعوۃٍ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحمٍ الا اعطاہ اللّٰہ احدی ثلث، اما ان یعجل لہ دعوتہ، واما ان یدّخرھا لہٗ فی الاٰخرۃ واما ان یصرف عنہ من السوء مثلھا (مُسندِ احمد) ''ایک مسلمان جب بھی کوئی دُعا مانگتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے: یا تو اس کی وہ دُعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔ یا اُسے آخرت میں اجر دینے کے لیے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا اُسی درجے کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔''

حضرت ابوہُریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا دعا احدکم فلا یقل اللّٰھم اغفرلی ان شئت، ارحمنی ان شئت، ارزقنی ان شئت، وَلْیَعْزِم مسئلتہ۔ (بخاری) ''جب تم میں سے کوئی شخص دُعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ خدایا! مجھے بخش دے اگر تو چاہے، مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تُو چاہے، بلکہ اسے قطعیت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ خدایا! میری فُلاں حاجت پوری کر۔'' دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ان الفاظ میں آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ادعوا اللّٰہ وانتم موقنون بالاجابۃ (ترمذی) ''اللہ سے دعا مانگو، اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔''

ایک اور روایت میں حضرت ابوہُریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: یستجاب للعبد ما لم یدعُ باثم اوقطیعۃ رحم ما لم یستعجل، قیل یا رسول اللّٰہ ما الاستعجال؟ قال یقول قد دعوت وقد دعوت فلم اَرَ یُستجاب لی فیستحسر عند ذٰلک ویدع الدعاء (مسلم) ''بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے، اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا: جلد بازی کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے: میں نے بہت دعا کی، بہت دعا کی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی، اور یہ کہہ کر آدمی تھک جائے اور دعا مانگنی چھوڑ دے۔''

دوسرے مضمون کو حسبِ ذیل احادیث واضح کرتی ہیں:

حضرت ابوہُریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لیس شیٔ اکرم علی اللّٰہ من الدعاء۔ (ترمذی، ابنِ ماجہ) ''اللہ کی نگاہ میں دُعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
یَشْكُرُوْنَ ۝۶۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ۙ

رکوع ۷

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔[۸۵] وہی اللہ (جس نے تمھارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمھارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔[۸۶]

حضرت ابنِ مسعودؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: سلوا اللّٰہ من فضلہ فان اللّٰہ یحب ان یسأل (ترمذی) ”اللہ سے اس کا فضل مانگو، کیونکہ اللہ اِسے پسند فرماتا ہے کہ اُس سے مانگا جائے۔“

حضرت ابنِ عمرؓ اور حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان الدعاء ینفع ممّا نزل وممّا لم ینزل فعلیکم عباد اللّٰہ بالدعاء۔ (ترمذی، مُسندِ احمد) ”دعا بہر حال نافع ہے اُن بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور اُن کے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگانِ خدا! تم ضرور دُعا مانگا کرو۔“

حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: یسأل احدکم ربّہ حاجتہٗ کلّہ حتّٰی یسأل شسع نعلہٖ اذا انقطع (ترمذی) ”تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت خدا سے مانگنی چاہیے، حتّٰی کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دُعا کرے۔“ یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں اُن میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اُسے خدا سے مدد مانگنی چاہیے، اس لیے کہ کسی معاملے میں بھی ہماری کوئی تدبیر خدا کی توفیق و تائید کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی، اور تدبیر سے پہلے دُعا کے معنٰی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت، اپنی عاجزی اور خدا کی بالادستی کا اعتراف کر رہا ہے۔

۸۵ – یہ آیت دو اہم مضامین پر مشتمل ہے: اوّلاً، اس میں رات اور دن کو دلیلِ توحید کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ اُن کا باقاعدگی کے ساتھ آنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ زمین اور سورج پر ایک ہی خدا حکومت کر رہا ہے، اور ان کے اُلٹ پھیر کا انسان اور دوسری مخلوقاتِ ارضی کے لیے نافع ہونا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ وہی ایک خدا اِن سب اشیا کا خالق بھی ہے اور اُس نے یہ نظام کمال درجہ حکمت کے ساتھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کے لیے نافع ہو۔ ثانیاً، اِس میں خدا کے منکر اور خدا کے ساتھ شرک کرنے والے انسانوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ خدا نے رات اور دن کی شکل میں یہ کتنی بڑی نعمت اُن کو عطا کی ہے، اور وہ کتنے سخت ناشکرے ہیں کہ اُس کی اِس نعمت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شب و روز اُس سے غداری و بے وفائی کیے چلے جاتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: جلد دوم، یونس، حاشیہ ۶۵۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۷۷، النمل، حاشیہ ۱۰۴، القصص، حاشیہ ۹۱، الروم، حاشیہ ۳۶۔ جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰۔ یٰسٓ، آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ

پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے ہو؟[۸۷] اِسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔[۸۸]

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا[۸۹] اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا۔[۹۰] جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمھیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔[۹۱]

---

۸۶ – یعنی رات اور دن کے اُلٹ پھیرنے ثابت کیا کہ وہی تمھارا اور ہر چیز کا خالق ہے۔ اور یہ اُلٹ پھیر تمھاری زندگی کے لیے جو عظیم فوائد و منافع اپنے اندر رکھتا ہے، اُس سے ثابت ہوا کہ وہ تمھارا نہایت مہربان پروردگار ہے۔ اس کے بعد لامحالہ یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ تمھارا حقیقی معبود بھی وہی ہے۔ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ خالق اور پروردگار تو ہو اللہ، اور تمھارے معبود بن جائیں دوسرے۔

۸۷ – یعنی کون تم کو یہ اُلٹی پٹی پڑھا رہا ہے کہ جو نہ خالق ہیں نہ پروردگار، وہ تمھاری عبادت کے مستحق ہیں۔

۸۸ – یعنی ہر زمانے میں عوام الناس صرف اس وجہ سے اِن بہکانے والوں کے فریب میں آتے رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے حقیقت سمجھانے کے لیے جو آیات نازل کیں، لوگوں نے ان کو نہ مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُن خود غرض فریبیوں کے جال میں پھنس گئے جو اپنی دکان چمکانے کے لیے جعلی خداؤں کے آستانے بنائے بیٹھے تھے۔

۸۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، النمل، حواشی ۷۴-۷۵۔

۹۰ – یعنی تمھیں کھلی فضا میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ عالَمِ بالا کی آفات بارش کی طرح برس کر تم کو تہس نہس کر دیں، بلکہ زمین کے اُوپر ایک نہایت مستحکم سماوی نظام (جو دیکھنے والی آنکھ کو گنبد کی طرح نظر آتا ہے) تعمیر کر دیا، جس سے گزر کر کوئی تباہ کُن چیز تم تک نہیں پہنچ سکتی، حتّٰی کہ آفاق کی مہلک شعاعیں تک نہیں پہنچ سکتیں، اور اسی وجہ سے تم امن و چین کے ساتھ زمین پر جی رہے ہو۔

۹۱ – یعنی تمھارے پیدا کرنے سے پہلے تمھارے لیے اس قدر محفوظ اور پُرامن جائے قرار مہیا کی۔ پھر تمھیں پیدا کیا تو اس طرح کہ ایک بہترین جسم، نہایت موزوں اعضا اور نہایت اعلیٰ درجے کی جسمانی و ذہنی قوتوں کے ساتھ تم کو عطا کیا۔ یہ سیدھا قامت، یہ ہاتھ اور یہ پاؤں، یہ آنکھ ناک اور یہ کان، یہ بولتی ہوئی زبان اور بہترین صلاحیتوں کا مخزن دماغ تم خود بنا کر نہیں لے آئے تھے، نہ تمھاری ماں اور تمھارے باپ نے انھیں بنایا تھا، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوتا میں یہ قدرت تھی کہ انھیں بناتا۔ ان کا

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٥﴾
قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا
جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾

وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے[۹۲]۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے[۹۳]۔ ساری تعریف اللہ ربّ العالَمین ہی کے لیے ہے[۹۴]۔

اے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو اُن ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو[۹۵]۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیّنات آچکی ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ربّ العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

بنانے والا وہ حکیم و رحیم قادرِ مُطلَق تھا جس نے انسان کو وجود میں لانے کا جب فیصلہ کیا تو اسے دُنیا میں کام کرنے کے لیے ایسا بے نظیر جسم دے کر پیدا کیا۔ پھر پیدا ہوتے ہی اس کی مہربانی سے تم نے اپنے لیے پاکیزہ رزق کا ایک وسیع خوانِ یَغما بچھا ہوا پایا۔ کھانے اور پینے کا ایسا پاکیزہ سامان جو زہریلا نہیں بلکہ صحّت بخش ہے، کڑوا کسیلا اور بدمزا نہیں بلکہ خوش ذائقہ ہے، سڑا بُسا اور بدبودار نہیں بلکہ خوش رائحہ ہے، بے جان پھوک نہیں بلکہ اُن حیاتینوں اور مفید غذائی مادّوں سے مالا مال ہے جو تمھارے جسم کی پرورش اور نشوو نَما کے لیے موزوں ترین ہیں۔ یہ پانی، یہ غلّے، یہ ترکاریاں، یہ پھل، یہ دودھ، یہ شہد، یہ گوشت، یہ نمک مرچ اور مسالے، جو تمھارے تَغذیے کے لیے اس قدر موزوں اور تمھیں زندگی کی طاقت ہی نہیں، زندگی کا لُطف دینے کے لیے بھی اس قدر مناسب ہیں، آخر کس نے اس زمین پر اتنی اِفراط کے ساتھ مہیا کیے ہیں، اور کس نے یہ انتظام کیا ہے کہ غذا کے یہ بے حساب خزانے زمین سے پے در پے نکلتے چلے آئیں اور ان کی رسد کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے؟ یہ رزق کا انتظام نہ ہوتا اور بس تم پیدا کر دیے جاتے تو سوچو کہ تمھاری زندگی کا کیا رنگ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ تمھارا پیدا کرنے والا محض خالق ہی نہیں بلکہ خالقِ حکیم اور ربِّ رحیم ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، ہود، حواشی ۶-۷۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ تا ۸۳)

۹۲ - یعنی اصلی اور حقیقی زندگی اُسی کی ہے۔ اپنے بل پر آپ زندہ وہی ہے۔ اَزلی و اَبدی حیات اس کے سوا کسی کی بھی

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ
عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ
لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا
اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ

وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نُطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بُلا لیا جاتا ہے[۹۶]۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقرر وقت تک پہنچ جاؤ[۹۷]، اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو[۹۸]۔ وہی ہے زندگی دینے

نہیں ہے۔ باقی سب کی حیات عطائی ہے، عارضی ہے، موت آشنا اور فنا در آغوش ہے۔

۹۳ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ ۳-۴۔

۹۴ – یعنی کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی حمد وثنا کے گیت گائے جائیں اور جس کے شکرانے بجا لائے جائیں۔

۹۵ – یہاں پھر عبادت اور دعا کو ہم معنیٰ استعمال کیا گیا ہے۔

۹۶ – یعنی کوئی پیدا ہونے سے پہلے اور کوئی جوانی کو پہنچنے سے پہلے اور کوئی بڑھاپے کو پہنچنے سے پہلے مر جاتا ہے۔

۹۷ – وقتِ مقرر سے مراد یا تو موت کا وقت ہے، یا وہ وقت جب تمام انسانوں کو دوبارہ اُٹھ کر اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزارتا ہوا اُس ساعتِ خاص تک لے جاتا ہے جو اُس نے ہر ایک کی واپسی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اُس وقت سے پہلے ساری دنیا مل کر بھی کسی کو مارنا چاہے تو نہیں مار سکتی، اور وہ وقت آ جانے کے بعد دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی کسی کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے معنیٰ لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ ہنگامۂ ہستی اس لیے برپا نہیں کیا گیا ہے کہ تم مر کر مٹی میں مل جاؤ اور فنا ہو جاؤ، بلکہ زندگی کے اِن مختلف مرحلوں سے اللہ تم کو اس لیے گزارتا ہے کہ تم سب اُس وقت پر جو اس نے مقرر کر رکھا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہو۔

۹۸ – یعنی زندگی کے ان مختلف مراحل سے تم کو اس لیے نہیں گزارا جاتا کہ تم جانوروں کی طرح جیو اور انھی کی طرح مر جاؤ، بلکہ اس لیے گزارا جاتا ہے کہ تم اس عقل سے کام لو جو اللہ نے تمھیں عطا کی ہے اور اُس نظام کو سمجھو جس میں خود تمھارے اپنے وجود

Maktaba Tul Ishaat.com

يُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾ ع
معانقۃ ۱۳ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۫ قف فَسَوْفَ

والا، اور وہی موت دینے والا ہے۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے، اور وہ ہو جاتی ہے۔ ع

تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟[۹۹] یہ لوگ جو اِس کتاب کو اور اُن ساری کتابوں کو جھُٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں؟[۱۰۰] عنقریب

پر یہ احوال گزرتے ہیں۔ زمین کے بے جان مادّوں میں زندگی جیسی عجیب و غریب چیز کا پیدا ہونا، پھر نُطفے کے ایک خُردبینی کیڑے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کا وجود میں آنا، پھر ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل کے وقت سے وضعِ حمل تک اندر ہی اندر اُس کا اس طرح پرورش پانا کہ اُس کی جنس، اس کی شکل و صورت، اس کے جسم کی ساخت، اس کے ذہن کی خصوصیات، اور اس کی قوتیں اور صلاحیتیں سب کچھ وہیں متعیّن ہو جائیں اور ان کی تشکیل پر دنیا کی کوئی طاقت اثر انداز نہ ہو سکے، پھر یہ بات کہ جسے اِسقاطِ حمل کا شکار ہونا ہے اس کا اِسقاط ہی ہو کر رہتا ہے، جسے بچپن میں مرنا ہے وہ بچپن ہی میں مرتا ہے خواہ وہ کسی بادشاہ ہی کا بچہ کیوں نہ ہو، اور جسے جوانی یا بڑھاپے کی کسی عمر تک پہنچنا ہے وہ خطرناک سے خطرناک حالات سے گزر کر بھی، جن میں بظاہر موت یقینی ہونی چاہیے، اُس عمر کو پہنچ کر رہتا ہے، اور جسے عمر کے جس خاص مرحلے میں مرنا ہے اُس میں وہ دنیا کے کسی بہترین ہسپتال کے اندر بہترین ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہتے ہوئے بھی مر کر رہتا ہے، یہ ساری باتیں کیا اس حقیقت کی نشان دہی نہیں کر رہی ہیں کہ ہماری اپنی حیات و ممات کا سر رشتہ کسی قادرِ مُطلَق کے ہاتھ میں ہے؟ اور جب امرِ واقعہ یہی ہے کہ ایک قادرِ مُطلق ہماری موت و زیست پر حکمراں ہے تو پھر کوئی نبی یا ولی یا فرشتہ یا ستارہ اور سیّارہ آخر کیسے ہماری بندگی و عبادت کا مستحق ہو گیا؟ کسی بندے کو یہ مقام کب سے حاصل ہوا کہ ہم اس سے دعائیں مانگیں اور اپنی قسمت کے بننے اور بگڑنے کا مختار اُس کو مان لیں؟ اور کسی انسانی طاقت کا یہ منصب کیسے ہو گیا کہ ہم اس کے قانون اور اس کے امر و نہی اور اُس کے خود ساختہ حلال و حرام کی بے چُون و چرا اطاعت کریں؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹)

۹۹ – مطلب یہ ہے کہ اُوپر والی تقریر کے بعد بھی کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اِن لوگوں کی غلط بینی اور غلط روی کا اصل سرچشمہ کہاں ہے اور کہاں سے ٹھوکر کھا کر یہ اس گمراہی کے گڑھے میں گرے ہیں؟ (واضح رہے کہ یہاں ''تم'' کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو ان آیات کو پڑھے یا سنے۔)

۱۰۰ – یہ ہے اُن کے ٹھوکر کھانے کی اصل وجہ۔ اُن کا قرآن کو اور اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ ماننا

يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ فِي
الْحَمِيْمِ ۬ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ
تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ
نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ
تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

انھیں معلوم ہو جائے گا جب طوق اُن کی گردنوں میں ہوں گے، اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔[۱۰۱] پھر اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا جن کو تم شریک کرتے تھے؟[۱۰۲] وہ جواب دیں گے: ''کھوئے گئے وہ ہم سے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے۔''[۱۰۳] اِس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا مُتحقّق کر دے گا۔ اُن سے کہا جائے گا: ''یہ تمھارا انجام اِس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیرِ حق پر مگن تھے اور پھر اُس پر اِتراتے تھے۔[۱۰۴] اب جاؤ، جہنّم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے،

اور اللہ کی آیات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جھگڑالو پن سے اُن کا مقابلہ کرنا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے اُن کو بھٹکا دیا ہے اور اُن کے لیے سیدھی راہ پر آنے کے سارے امکانات ختم کر دیے ہیں۔

۱۰۱ – یعنی جب وہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی مانگیں گے تو دوزخ کے کارکن اُن کو زنجیروں سے کھینچتے ہوئے ایسے چشموں کی طرف لے جائیں گے جن سے کھولتا ہوا پانی نکل رہا ہو گا۔ اور پھر جب وہ اسے پی کر فارغ ہوں گے تو پھر وہ انھیں کھینچتے ہوئے واپس لے جائیں گے اور دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔

۱۰۲ – یعنی اگر وہ واقعی خدا یا خدائی میں شریک تھے، اور تم اِس اُمید پر ان کی عبادت کرتے تھے کہ وہ بُرے وقت پر تمھارے کام آئیں گے تو اب کیوں وہ آ کر تمھیں نہیں چُھڑاتے؟

۱۰۳ – یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم دنیا میں شرک نہیں کرتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب ہم پر یہ بات کُھل گئی ہے کہ ہم جنھیں دنیا میں پکارتے تھے، وہ کچھ بھی نہ تھے، ہیچ تھے، لاشے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ
فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا
يُرْجَعُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ
مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا
كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا

بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبّرین کا۔" پس اَے نبیؐ! صبر کرو، [105] اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمھارے سامنے ہی اِن کو اُن بُرے نتائج کا کوئی حصّہ دکھا دیں جن سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، یا (اُس سے پہلے) تمھیں دنیا سے اُٹھالیں، پلٹ کر آنا تو انھیں ہماری ہی طرف ہے۔[106]

اے نبیؐ! تم سے پہلے ہم بہت سے[107] رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اِذن کے بغیر خود کوئی نشانی[108] لے آتا۔ پھر جب

۱۰۴ – یعنی تم نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ جو چیز حق نہ تھی اُس کی تم نے پیروی کی، بلکہ تم اُس غیرِ حق پر ایسے مگن رہے کہ جب حق تمھارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے اُس کی طرف التفات نہ کیا اور اُلٹے اپنی باطل پرستی پر اتراتے رہے۔

۱۰۵ – یعنی جو لوگ جھگڑالو پن سے تمھارا مقابلہ کر رہے ہیں اور ذلیل ہتھکنڈوں سے تمھیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں، ان کی باتوں اور ان کی حرکتوں پر صبر کرو۔

۱۰۶ – یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر اُس شخص کو، جس نے تمھیں زک دینے کی کوشش کی ہے، اِسی دنیا میں اور تمھاری زندگی ہی میں سزا دے دیں۔ یہاں کوئی سزا پائے یا نہ پائے، بہرحال وہ ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ مر کر تو اسے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔ اُس وقت وہ اپنے کرتوتوں کی بھرپور سزا پالے گا۔

۱۰۷ – یہاں سے ایک اور موضوع شروع ہو رہا ہے۔ کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آپ کو اُس وقت تک خدا کا رسول نہیں مان سکتے جب تک آپ ہمارا منہ مانگا معجزہ ہمیں نہ دکھا دیں۔ آگے کی آیات میں ان کی اِسی بات کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ (جس قسم کے معجزات کا وہ لوگ مطالبہ کرتے تھے ان کے چند نمونوں کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۳، الحجر، حواشی ۴-۵، بنی اسرائیل، حواشی ۱۰۵-۱۰۶- جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۳۳)

۱۰۸ – یعنی کسی نبی نے بھی کبھی اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھایا ہے، اور نہ کوئی نبی خود معجزہ دکھانے پر قادر

جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ۠ ﴿۷۸﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِیْهَا
مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

ع ۸ ۱۳

اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا، اور اُس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے [۱۰۹] ع
اللہ ہی نے تمھارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں، تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمھارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمھارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو، وہاں تم اُن پر پہنچ سکو۔ اُن پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمھیں دکھا رہا ہے، آخر تم اُس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے [۱۱۰]

تھا۔ معجزہ تو جب بھی کسی نبی کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اُس وقت ظاہر ہوا ہے جب اللہ نے یہ چاہا کہ اس کے ہاتھ سے کوئی معجزہ کسی منکر قوم کو دکھایا جائے۔ یہ کفار کے مطالبے کا پہلا جواب ہے۔

۱۰۹ – یعنی معجزہ کبھی کھیل کے طور پر نہیں دکھایا گیا ہے۔ وہ تو ایک فیصلہ کُن چیز ہے۔ اُس کے ظاہر ہو جانے کے بعد جب کوئی قوم نہیں مانتی تو پھر اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ تم محض تماش بینی کے شوق میں معجزے کا مطالبہ کر رہے ہو، مگر تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ اس طرح دراصل تم خود تقاضے کر کر کے اپنی شامت بُلا رہے ہو۔ یہ کفار کے اس مطالبے کا دوسرا جواب ہے، اور اس کی تفصیلات اس سے پہلے قرآن میں متعدد مقامات پر گزر چکی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: جلد دوم، الحجر، حواشی ۵-۳۰، بنی اسرائیل، حواشی ۶۸-۶۹۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷-۸، الفرقان، حاشیہ ۳۳، الشعراء حاشیہ ۴۹)

۱۱۰ – مطلب یہ ہے کہ اگر تم محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لیے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں صرف یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کو ماننے کی دعوت تمھیں دے رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) وہ حق ہیں یا نہیں، تو اس کے لیے خدا کی یہ نشانیاں بہت کافی ہیں جو ہر وقت تمھارے مُشاہدے اور تجربے میں آ رہی ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کے لیے اِن نشانیوں کے ہوتے کسی اور نشانی کی کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ یہ معجزات کے مطالبے کا تیسرا جواب ہے۔ یہ جواب بھی اس سے پہلے متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے اور ہم اس کی تشریح اچھی طرح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: جلد اول، الانعام، حواشی ۲۶-۲۷۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۰۵، الرعد، حواشی ۱۵ تا ۲۰۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۳-۴-۵)

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اُونٹ اور گھوڑے، ان کو

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا

پھر کیا[111] یہ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کو اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے تعداد میں زیادہ تھے، ان سے بڑھ کر طاقتور تھے، اور زمین میں اِن سے زیادہ شاندار آثار

بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ بآسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں، اور اِن سے اُس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اِن پر سواری کرتا ہے۔ اِن سے بار برداری کا کام لیتا ہے۔ اِنھیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے۔ اِن کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی، لسّی، مکھن، گھی، کھویا، پنیر، اور طرح طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے۔ اِن کا گوشت کھاتا ہے۔ اِن کی چربی استعمال کرتا ہے۔ اِن کے اُون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اُس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اُس کی اِن بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور اِس خاص نقشے پر پیدا کر دیے تھے تاکہ وہ اُن سے فائدہ اٹھائے؟

پھر زمین کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کُرۂ زمین کے اِن خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھر اُن کے درمیان سفر و تجارت کے تعلقات کا قائم ہونا اِس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا جن کی بدولت جہاز رانی کی جا سکتی، اور زمین پر وہ سرو سامان پیدا کیا جاتا جسے استعمال کر کے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اِس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادرِ مُطلق ربِّ رحیم و حکیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور ہواؤں اور اُن تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں، اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیّاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں، آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربِّ کریم ہے۔

اِس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجیے کہ جس خدائے حکیم نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں انسان کے تصرُّف میں دی ہیں اور اس کے مفاد کے لیے یہ کچھ سرو سامان فراہم کیا ہے، کیا بسلامتیِ ہوش و حواس آپ اس کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ معاذ اللہ ایسا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پُورا ہوگا کہ وہ انسان کو یہ سب کچھ دے کر کبھی اس سے حساب نہ لے گا۔

۱۱۱ – یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اِس حصے کو پڑھتے وقت آیات ۴-۵ اور آیت ۲۱ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیں۔

فِي الْأَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ
اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ
فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ ع

چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمائی اُنھوں نے کی تھی، آخر وہ اُن کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول اُن کے پاس بیّنات لے کر آئے تو وہ اُسی علم میں مگن رہے جو ان کے اپنے پاس[۱۱۲] تھا، اور پھر اُسی چیز کے پھیر میں آگئے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اُٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہٗ لاشریک کو، اور ہم انکار کرتے ہیں اُن سب معبُودوں کا جنھیں ہم شریک ٹھیراتے تھے۔ مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان اُن کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوسکتا تھا، کیونکہ یہی اللہ کا مقرّر ضابطہ ہے، جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا[۱۱۳] ہے، اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔ ع

۱۱۲ — یعنی اپنے فلسفے اور سائنس، اپنے قانون، اپنے دُنیوی عُلوم، اور اپنے پیشواؤں کے گھڑے ہوئے مذہبی افسانوں (Mythology) اور دینیات (Theology) ہی کو انھوں نے اصل علم سمجھا، اور انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے علم کو ہیچ سمجھ کر اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔

۱۱۳ — یہ کہ توبہ اور ایمان بس اسی وقت تک نافع ہیں جب تک آدمی اللہ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آ جائے۔ عذاب آ جانے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا یا توبہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

حٰمٓ السجدہ

(۴۱)

حٰمٓ السجدہ

نام

اس سورت کا نام دو لفظوں سے مرکّب ہے۔ ایک حٰمٓ، دوسرے السّجدہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس کا آغاز حٰمٓ سے ہوتا ہے اور جس میں ایک مقام پر آیتِ سجدہ آئی ہے۔

زمانۂ نزول

معتبر روایات کی رُو سے اس کا زمانۂ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ نے مشہور تابعی محمد بن کَعب القُرظیؒ کے حوالے سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عُتبہ بن رَبِیعَہ (ابوسفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو! اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں، اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عُتبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا: ”بھتیجے! تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمھیں معلوم ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تَفرِقہ ڈال دیا، ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا، قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنٰی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو! میں کچھ تجویزیں تمھارے سامنے رکھتا ہوں، ان پر غور کرو، شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ابوالولید! آپ کہیں، میں سنوں گا۔“ اس نے کہا: ”بھتیجے! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمھارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطبا بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمھارا علاج کراتے ہیں۔“ عُتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ”ابوالولید! آپ کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے؟“ اس نے کہا: ”ہاں“۔ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا، اب میری سنو۔“ اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اسی سورت کی

Maktaba Tul Ishaat.com

تلاوت شروع کی اور عُتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت نمبر ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اُٹھا کر فرمایا: ''اے ابوالولید! میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عُتبہ اُٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دُور سے اس کو دیکھتے ہی کہا: خدا کی قسم! عُتبہ کا چہرہ بدلا ہُوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آکر بیٹھا تو لوگوں نے کہا: ''کیا سن آئے؟'' اس نے کہا: ''بخدا! میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم! نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اُٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمھاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمھاری عزت ہی ہوگی۔'' سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سنتے ہی بول اُٹھے: ''ولید کے ابا! آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔'' عتبہ نے کہا: ''میری جو رائے تھی وہ میں نے تمھیں بتا دی، اب تمھارا جو جی چاہے کرتے رہو۔'' (ابنِ ہشام، جلد ا، ص ۳۱۳-۳۱۴)

اس قصے کو متعدد دوسرے محدثین نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اِن سے کہہ دو کہ میں تمھیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) پر پہنچے تو عُتبہ نے بے اختیار آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: ''خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔'' بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ ''آپ لوگ جانتے ہیں، محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔'' (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر ابنِ کثیر، ج ۴، ص ۹۰-۹۱۔ البدایہ والنّہایہ، ج ۳، ص ۶۲)

موضوع اور مضمون عُتبہ کی اِس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، اس میں اُن بے ہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپؐ کی عقل پر حملہ تھا۔ اُس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کے نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہرحال کوئی امکان نہیں ہے، اب لامحالہ آپؐ کی اِس دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر، معاذ اللہ! آپؐ کی عقل میں فتور آگیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپؐ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا،

اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپؐ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بے ہودگیوں پر جب مخالفین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اُن کو قطعی نظر انداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو کہے۔

عُتبہ کی باتوں سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اِس سورہ میں اُس مخالفت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے کفارِ مکہ کی طرف سے اُس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بداخلاقی کے ساتھ کی جارہی تھی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے: ’’آپ خواہ کچھ کریں، ہم آپ کی کوئی بات سن کر نہ دیں گے۔ ہم نے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں۔ اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی ہے جو ہمیں اور آپ کو کبھی نہ ملنے دے گی۔‘‘

انھوں نے آپؐ کو صاف صاف نوٹس دے دیا تھا کہ آپ اپنی اِس دعوت کا کام جاری رکھیے، ہم آپ کی مخالفت میں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

انھوں نے آپؐ کو زک دینے کے لیے کام کا یہ نقشہ بنایا تھا کہ جب بھی آپؐ یا آپؐ کے پیروؤں میں سے کوئی عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کرے، فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اِس کام میں لگے ہوئے تھے کہ قرآنِ مجید کی آیات کو الٹے معنی پہنا کر عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ بات کچھ کہی جاتی تھی اور وہ اسے بناتے کچھ تھے۔ سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالتے تھے۔ سیاق وسباق سے الگ کر کے کوئی لفظ کہیں سے اور کوئی فقرہ کہیں سے لے اُڑتے اور اِس کے ساتھ اپنی طرف سے چار باتیں ملا کر نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے، تاکہ قرآن اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کی جائے۔

عجیب عجیب قسم کے اعتراضات جَڑتے تھے، جن کا ایک نمونہ اِس سورہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک عرب اگر عَرَبی زبان میں کوئی کلام سناتا ہے تو اس میں معجزے کی کیا بات ہوئی؟ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں جس کا جی چاہے ایک کلام تصنیف کر لے اور دعویٰ کر دے کہ وہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ معجزہ تو جب ہوتا کہ یہ شخص کسی دوسری زبان میں، جسے یہ نہیں جانتا، یکایک اُٹھ کر ایک فصیح وبلیغ تقریر کر ڈالتا۔ تب یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ اس کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اُوپر کہیں سے اس پر نازل ہو رہا ہے۔

اس اندھی اور بہری مخالفت کے جواب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کا ماحصَل یہ ہے:

(۱) یہ خدا ہی کا نازل کردہ کلام ہے اور عربی زبان ہی میں ہے۔ جو حقیقتیں اس میں صاف صاف کھول کر بیان کی گئی ہیں، جاہل لوگ اُن کے اندر علم کی کوئی روشنی نہیں پاتے، مگر سمجھ بُوجھ رکھنے والے اس روشنی کو دیکھ

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی رہے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے یہ کلام نازل کیا۔ کوئی اسے زحمت سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔ خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے فائدہ اٹھائیں، اور ڈرنا چاہیے اُن لوگوں کو جو اس سے منہ موڑ لیں۔

(۲) تم نے اگر اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں تو نبی کے سُپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو نہیں سننا چاہتا اُسے سنائے، اور جو نہیں سمجھنا چاہتا اس کے دل میں زبردستی اپنی بات اُتارے۔ وہ تو تمھارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ سننے والوں ہی کو سنا سکتا ہے اور سمجھنے والوں ہی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۳) تم چاہے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو، مگر حقیقت یہی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی ہے اور تم کسی دوسرے کے بندے نہیں ہو۔ تمھاری ضد سے یہ حقیقت بہرحال نہیں بدل سکتی۔ مان لو گے اور اس کے مطابق اپنا عمل دُرست کر لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی تباہی سے دوچار ہو گے۔

(۴) تمھیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ شرک اور کفر تم کس کے ساتھ کر رہے ہو؟ اُس خدا کے ساتھ جس نے یہ اتھاہ کائنات بنائی ہے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جس کی پیدا کی ہوئی برکتوں سے اس زمین میں تم فائدہ اُٹھا رہے ہو، اور جس کے مہیا کیے ہوئے رزق پر تم پَل رہے ہو۔ اُس کا شریک تم اُس کی حقیر مخلوقات کو بناتے ہو، اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضد میں آ کر منہ موڑتے ہو۔

(۵) اچھا، نہیں مانتے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم پر اُسی طرح کا عذاب اچانک ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے جیسا عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اور یہ عذاب بھی تمھارے جرم کی آخری سزا نہ ہو گا، بلکہ آگے میدانِ حشر کی بازپُرس اور جہنّم کی آگ ہے۔

(۶) بڑا ہی بدقسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطینِ جِنّ و اِنس لگ جائیں جو اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں، اس کی حماقتوں کو اُس کے سامنے خوش نُما بنا کر پیش کریں، اور اسے کبھی نہ خود صحیح بات سوچنے دیں، نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں، اور ہر ایک دوسرے کی شہ پا کر نہلے پر دہلا مار رہا ہے، مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں نے مجھے بہکایا تھا، وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انھیں پاؤں تلے روند ڈالوں۔

(۷) یہ قرآن ایک اٹل کتاب ہے۔ اسے تم اپنی گھٹیا چالوں اور اپنے جھوٹ کے ہتھیاروں سے شکست نہیں دے سکتے۔ باطل خواہ سامنے سے آئے یا درپردہ اور بالواسطہ حملہ آور ہو، اِسے زک دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

(۸) آج تمھاری اپنی زبان میں یہ قرآن پیش کیا جا رہا ہے تا کہ تم اسے سمجھ سکو، تو تم کہتے ہو کہ یہ کسی عجمی زبان میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم تمھاری ہدایت کے لیے عجمی زبان میں اسے بھیجتے تو تم ہی لوگ کہتے کہ یہ بھی عجیب مذاق ہے، عرب کی قوم کی ہدایت کے لیے عجمی زبان میں کلام فرمایا جا رہا ہے، جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھیں دراصل ہِدایت مطلوب ہی نہیں ہے۔ نہ ماننے کے لیے نت نئے بہانے تراش رہے ہو۔

(۹) کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر فی الواقع حقیقت یہی نکلی کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو اس کا انکار کر کے اور اس کی مُخالفت میں اتنی دُور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے۔

(۱۰) آج تم نہیں مان رہے ہو، مگر عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اِس قرآن کی دعوت تمام آفاق پر چھا گئی ہے اور تم خود اس سے مغلوب ہو چکے ہو۔ اُس وقت تمھیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا تھا، وہ حق تھا۔

مخالفین کو یہ جوابات دینے کے ساتھ اُن مسائل کی طرف بھی توجہ فرمائی گئی ہے جو اس شدید مُزاحمت کے ماحول میں اہلِ ایمان کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھے۔ ایمان لانے والوں کے لیے اُس وقت تبلیغ کرنا تو درکنار، ایمان کے راستے پر قائم رہنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا، اور ہر اُس شخص کی جان عذاب میں آ جاتی تھی جس کے متعلق یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی خوفناک جتھا بندی اور ہر طرف چھائی ہوئی طاقت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ اِس حالت میں اوّل تو یہ کہہ کر اُن کی ہمت بندھائی گئی کہ تم حقیقت میں بے یار و مددگار نہیں ہو، بلکہ جو شخص بھی ایک دفعہ خدا کو اپنا رب مان کر اِس عقیدے اور مسلک پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے، خدا کے فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور دنیا سے لے کر آخرت تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر یہ فرما کر ان کا حوصلہ بڑھایا گیا کہ بہترین ہے وہ انسان جو خود نیک عمل کرے، دوسروں کو خدا کی طرف بلائے، اور ڈٹ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو سوال سخت پریشان کُن بنا ہوا تھا، وہ یہ تھا کہ جب اِس دعوت کی راہ میں ایسے سنگِ گراں حائل ہیں تو اِن چٹانوں سے تبلیغ کا راستہ آخر کیسے نکالا جائے؟ اس سوال کا حل آپؐ کو یہ بتایا گیا کہ یہ نمایشی چٹانیں بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں، مگر اَخلاقِ حَسَنہ کا ہتھیار وہ ہتھیار ہے جو انھیں توڑ کر اور پگھلا کر رکھ دے گا۔ صبر کے ساتھ اس سے کام لو، اور جب کبھی شیطان اِشتعال دلا کر کسی دوسرے ہتھیار سے کام لینے پر اُکسائے تو خدا سے پناہ مانگو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۵۴ — رکوعاتہا ۶

سُوۡرَۃُ حٰمٓ السَّجۡدَۃِ مَکِّیَّۃٌ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۚ﴿۲﴾ کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ
اٰیٰتُہٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۚ

حٰ مٓ، یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔[۱]

۱ – یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے۔ آگے کی تقریر پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس تمہید میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں وہ بعد کے مضمون سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نُزول خداوندِ عالَم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سُن کر چیں بہ جَبیں ہوتے ہو تو تمھارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے ردّ کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات ردّ کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رُخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمٰن اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے صفتِ رحمت کا ذکر اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس نے اپنی رحیمی کے اِقتضا سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اِس سے مخاطبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اِس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے، یا اسے ردّ کرتا ہے، یا اس پر چیں بہ جَبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عُظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسانوں سے بے رُخی برتتا تو انھیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں، لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

فَاَعۡرَضَ اَكۡثَرُهُمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ۝ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِيۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ وَفِيۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَيۡنِنَا وَ

مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں: "جس چیز کی طرف تُو ہمیں بُلا رہا ہے، اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں،[۲] ہمارے کان بہرے ہوگئے ہیں، اور ہمارے

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اِس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گُنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اَخلاق کیا ہیں اور بُرے اَخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص ردّ کرتا ہے یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اس رویّے کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ وہ خود برسرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عَرَبی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہلِ عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانہ وہ نہیں بنا سکتے۔ (اس مقام پر آیت ۴۴ بھی پیشِ نظر ہے جس میں یہی مضمون ایک دوسرے طریقے سے بیان ہوا ہے۔ اور یہ شبہ کہ پھر غیر اہلِ عرب کے لیے تو قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے لیے ایک معقول عذر موجود ہے، اس سے پہلے ہم رفع کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُوسُف، حاشیہ ۵۔ رسائل و مسائل، حصہ اوّل، ص ۱۹ تا ۲۳)

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیُّل، ایک فلسفہ، اور ایک نمونۂ اِنشا پیش کرتی ہو، جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ہانکے پکارے تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شان دار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

۲ – یعنی اُس کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کُھلا ہوا نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝٥ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ
یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْہِ وَاسْتَغْفِرُوْہُ ؕ
وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ ۝٦ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ
بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ ۝٧ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہوگیا ہے[3]۔ تُو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے[4]۔"

اے نبیؐ! اِن سے کہو: مَیں تو ایک بشر ہوں تم جیسا[5]۔ مجھے وحی کے ذریعے سے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے[6]، لٰہذا تم سیدھے اُسی کا رُخ اختیار کرو[7] اور اس سے معافی چاہو[8]۔ تباہی ہے اُن مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے[9] اور آخرت کے منکر ہیں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے،

۳ – یعنی اس دعوت نے ہمارے اور تمھارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ اس نے ہمیں اور تمھیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا ہے۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ بن گئی ہے جو ہم کو اور تم کو جمع نہیں ہونے دیتی۔

۴ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ ہم کو تم سے اور تم کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرے، یہ کہ تم اپنی دعوت سے باز نہیں آتے تو اپنا کام کیے جاؤ، ہم بھی تمھاری مخالفت سے باز نہ آئیں گے، اور جو کچھ تمھیں نیچا دکھانے کے لیے ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

۵ – یعنی میرے بس میں یہ نہیں ہے کہ تمھارے دلوں پر چڑھے ہوئے غلاف اُتار دوں، تمھارے بہرے کان کھول دوں، اور اُس حجاب کو پھاڑ دوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان ڈال لیا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ اُسی کو سمجھا سکتا ہوں جو سمجھنے کے لیے تیار ہو، اُسی کو سنا سکتا ہوں جو سننے کے لیے تیار ہو، اور اُسی سے مل سکتا ہوں جو ملنے کے لیے تیار ہو۔

۶ – یعنی تم چاہے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو اور اپنے کان بہرے کر لو، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمھارے بہت سے خدا نہیں ہیں، بلکہ صرف ایک ہی خدا ہے جس کے تم بندے ہو۔ اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جو میں نے اپنے غور و فکر سے بنایا ہو، جس کے صحیح اور غلط ہونے کا یکساں احتمال ہو، بلکہ یہ حقیقت مجھ پر وحی کے ذریعے سے منکشف کی گئی ہے جس میں غلطی کے احتمال کا شائبہ تک نہیں ہے۔

۷ – یعنی کسی اَور کو خدا نہ بناؤ، کسی اور کی بندگی و پرستش نہ کرو، کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارو، کسی اور کے آگے سرِ تسلیم و اطاعت خم نہ کرو، کسی اَور کے رسم و رواج اور قانون و ضابطہ کو شریعت واجب الاطاعت نہ مانو۔

۸ – معافی اُس بے وفائی کی جو اَب تک تم اپنے خدا سے کرتے رہے، اُس شرک اور کفر اور نافرمانی کی جس کا ارتکاب

لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ
الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ
الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا
وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝

اُن کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے[۱۰] ؏

اَے نبیؐ! اِن سے کہو: کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اُوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے، اور اس میں برکتیں رکھ دیں[۱۱]، اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیّا کر دیا[۱۲]۔ یہ سب کام چار دن میں[۱۳] ہو گئے۔

تم سے اب تک ہوتا رہا، اور ان گناہوں کی جو خدا فراموشی کے باعث تم سے سرزد ہوئے۔

۹ – یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ عباسؓ اور ان کے جلیل القدر شاگرد عِکرِمہؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگیِ نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرا گروہ، جس میں قَتادہؒ، سُدّیؒ، حَسن بصریؒ، ضَحّاکؒ، مُقاتلؒ اور ابن السائبؒ جیسے مفسرین شامل ہیں، اس لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃِ مال ہی کے معنی میں لیتا ہے۔ اِس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

۱۰ – اصل میں اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے دو معنی اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ وہ ایسا اجر ہوگا جس میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ دوسرے یہ کہ وہ اجر احسان جتا جتا کر نہیں دیا جائے گا، جیسے کسی بخیل کا عطیہ ہوتا ہے کہ اگر وہ جی کڑا کر کے کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو بار بار اس کو جتاتا ہے۔

۱۱ – زمین کی برکتوں سے مراد وہ بے حد و حساب سر و سامان ہے جو کروڑہا کروڑ سال سے مسلسل اُس کے پیٹ سے نکلتا چلا آرہا ہے اور خُردبینی کیڑوں سے لے کر انسان تک کے بلند ترین تمدن تک کی روز افزوں ضروریات پوری کیے چلا جا رہا ہے۔ ان برکتوں میں سب سے بڑی برکتیں ہوا اور پانی ہیں، جن کی بدولت ہی زمین پر نباتی، حیوانی اور پھر انسانی زندگی ممکن ہوئی۔

۱۲ – اصل الفاظ ہیں: قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ اس فقرے کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں:

Maktaba Tul Ishaat.com

بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے ٹھیک حساب سے رکھ دیے پورے چار دنوں میں"۔ یعنی کم یا زیادہ نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں۔

ابن عباسؓ، قتادہؒ اور سُدّیؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق چار دنوں میں رکھ دیے۔ پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا"۔ یعنی جو کوئی یہ پوچھے کہ یہ کام کتنے دنوں میں ہوا، اس کا مکمل جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں ہو گیا۔

ابن زیدؒ اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے چار دنوں کے اندر رکھ دیے، ٹھیک اندازے سے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق"۔

جہاں تک قواعدِ زبان کا تعلق ہے، آیت کے الفاظ میں یہ تینوں معنی لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلے دو معنوں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیا اہمیت رکھتی ہے کہ یہ کام ایک گھنٹا کم چار دن، یا ایک گھنٹا زیادہ چار دن میں نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور کمالِ رُبوبیت اور کمالِ حکمت کے بیان میں کون سی کسر رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس تصریح کی حاجت ہو؟ اسی طرح یہ تفسیر بھی بڑی کمزور تفسیر ہے کہ "پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا"۔ آیت سے پہلے اور بعد کے مضمون میں کسی جگہ بھی کوئی قرینہ یہ نہیں بتاتا کہ اُس وقت کسی سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ سارے کام کتنے دنوں میں ہوئے، اور یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ انھی وجوہ سے ہم نے ترجمے میں تیسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زمین میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک جس جس قسم کی جتنی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا تھا، ہر ایک کی مانگ اور حاجت کے ٹھیک مطابق غذا کا پورا سامان حساب لگا کر اس نے زمین کے اندر رکھ دیا۔ نباتات کی بے شمار اقسام خشکی اور تری میں پائی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی غذائی ضروریات دوسری اقسام سے مختلف ہیں۔ جاندار مخلوقات کی بے شمار انواع ہوا اور خشکی اور تری میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ہر نوع ایک الگ قسم کی غذا مانگتی ہے۔ پھر ان سب سے جدا، ایک اور مخلوق انسان ہے جس کو محض جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بھی طرح طرح کی خوراکیں درکار ہیں۔ اللہ کے سوا کون جان سکتا تھا کہ اس کُرۂ خاکی پر زندگی کا آغاز ہونے سے لے کر اُس کے اختتام تک کس کس قسم کی مخلوقات کے کتنے افراد کہاں کہاں اور کب کب وجود میں آئیں گے، اور ان کو پالنے کے لیے کیسی اور کتنی غذا درکار ہوگی۔ اپنی تخلیقی اسکیم میں جس طرح اُس نے غذا طلب کرنے والی ان مخلوقات کو پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اسی طرح اُس نے اُن کی طلب کو پورا کرنے کے لیے خوراک کا بھی مکمل انتظام کر دیا۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصورِ اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے نام سے نکالا ہے، وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ کا ترجمہ "سب مانگنے والوں کے لیے برابر" کرتے ہیں۔ اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہٰذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے۔ کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مُساوات قائم نہیں ہوسکتی جس کا یہ "قرآنی قانون" تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنھیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا واقعی

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ

پھر وہ آسمان کی طرف متوجّہ ہوا جو اُس وقت محض دُھواں[۱۴] تھا۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا: "وجود

ان سب کے درمیان، یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مُساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں کہیں آپ کو غذا کے مُساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست براہِ راست تقسیم رزق کا انتظام کر رہی ہے، اللہ میاں خود اپنے اِس "قرآنی قانون" کی خلاف ورزی ـــــ بلکہ معاذ اللہ! بے انصافی ـــــ فرما رہے ہیں! پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ "سائلین" میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنھیں انسان پالتا ہے، اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمّے ہے۔ مثلاً بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے، گدھے، خچّر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لیے نظامِ رُبوبیّت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے، تو کیا وہ ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی مَعاشی مُساوات قائم کرے گی؟

۱۳ - اس مقام کی تفسیر میں مفسرین کو بالعُموم یہ زحمت پیش آئی ہے کہ اگر زمین کی تخلیق کے دو دن، اور اس میں پہاڑ جمانے اور برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک پیدا کرنے کے چار دن تسلیم کیے جائیں، تو آگے آسمانوں کی پیدائش دو دنوں میں ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مزید دو دن ملا کر آٹھ دن بن جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں تصریح فرمائی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق جملہ چھ دنوں میں ہوئی ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۶-۲۶۱-۲۷۱-۳۲۴۔ جلد سوم، ص ۴۶۰) اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسّرین یہ کہتے ہیں کہ یہ چار دن زمین کی تخلیق کے دو دن سمیت ہیں، یعنی دو دن تخلیقِ زمین کے اور دو دن زمین کے اندر ان باقی چیزوں کی پیدائش کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس طرح جملہ چار دنوں میں زمین اپنے سر و سامان سمیت مکمل ہوگئی۔ لیکن یہ بات قرآنِ مجید کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے، اور درحقیقت وہ زحمت بھی محض خیالی زحمت ہے جس سے بچنے کے لیے اس تاویل کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق کے دو دن دراصل اُن دو دنوں سے الگ نہیں ہیں جن میں بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات بنی ہے۔ آگے کی آیات پر غور کیجیے۔ ان میں زمین اور آسمان دونوں کی تخلیق کا یکجا ذکر کیا گیا ہے، اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے۔ ان سات آسمانوں سے پوری کائنات مراد ہے، جس کا ایک جُز ہماری یہ زمین بھی ہے۔ پھر جب کائنات کے دوسرے بے شمار تاروں اور سیّاروں کی طرح یہ زمین بھی اُن دو دنوں کے اندر مُجرّد ایک کُرے کی شکل اختیار کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ذی حیات مخلوقات کے لیے تیار کرنا شروع کیا، اور چار دنوں کے اندر اس میں وہ سب کچھ سر و سامان پیدا کر دیا جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے تاروں اور سیّاروں میں اِن چار دنوں کے اندر کیا کچھ ترقیاتی کام کیے گئے، اُن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے، کیونکہ نزولِ قرآن کے دور کا انسان تو درکنار، اِس زمانے کا آدمی بھی ان معلومات کو ہضم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

۱۴ - اس مقام پر تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ

میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔" دونوں نے کہا: "ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح۔"[15] تب اُس نے

اوّل، یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

دوم، یہ کہ دھوئیں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزا غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنس داں اسی چیز کو سحابیے (nebula) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغازِ کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادّہ جس سے کائنات بنی ہے، اسی دُخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

سوم، یہ کہ "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا" سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ پہلے اُس نے زمین بنائی، پھر اس میں پہاڑ جمانے، برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک فراہم کرنے کا کام انجام دیا، پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کائنات کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا۔ اِس غلط فہمی کو بعد کا یہ فقرہ رفع کر دیتا ہے کہ "اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجاؤ، اور انھوں نے کہا: ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح۔" اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اُس وقت کا ہو رہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا، بلکہ تخلیقِ کائنات کی ابتدا کی جا رہی تھی۔ محض لفظ ثُمَّ (پھر) کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ زمین کی پیدایش آسمان سے پہلے ہو چکی تھی۔ قرآنِ مجید میں اس امر کی متعدّد مثالیں موجود ہیں کہ ثُمَّ کا لفظ لازماً ترتیبِ زمانی ہی کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ ترتیبِ بیان کے طور پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۱۲)

قدیم زمانے کے مفسرین میں یہ بحث مدت ہائے دراز تک چلتی رہی ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ ایک گروہ اِس آیت اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ سے یہ استدلال کرتا ہے کہ زمین پہلے بنی ہے۔ دوسرا گروہ سورۂ نازعات کی آیات ۲۷ تا ۳۳ سے دلیل لاتا ہے کہ آسمان پہلے بنا ہے، کیونکہ وہاں اس امر کی تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں کسی جگہ بھی تخلیقِ کائنات کا ذکر طبیعیات یا ہیئت کے علوم سکھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ توحید و آخرت کے عقائد پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے بے شمار دوسرے آثار کی طرح زمین و آسمان کی پیدایش کو بھی غور و فکر کے لیے پیش فرمایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ بات سرے سے غیر ضروری تھی کہ تخلیقِ آسمان و زمین کی زمانی ترتیب بیان کی جاتی اور بتایا جاتا کہ زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ دونوں میں سے خواہ یہ پہلے بنی ہو یا وہ، بہر حال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے الٰہِ واحد ہونے پر گواہ ہیں، اور اس امر پر شاہد ہیں کہ ان کے پیدا کرنے والے نے یہ سارا کارخانہ کسی کھلنڈرے کے کھلونے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن کسی جگہ زمین کی پیدایش کا ذکر پہلے کرتا ہے اور کسی جگہ آسمان کی پیدایش کا۔ جہاں انسان کو خدا کی نعمتوں کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ زمین کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان سے قریب تر ہے۔ اور جہاں خدا کی عظمت اور اس کے کمالِ قدرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ آسمانوں کا ذکر پہلے کرتا ہے،

سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَاَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ٭ۖ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾

دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔[۱۶] یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

کیونکہ چرخِ گرداں کا منظر ہمیشہ سے انسان کے دل پر ہیبت طاری کرتا رہا ہے۔

۱۵ - ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریقِ تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس سے خدائی تخلیق اور انسانی صناعی کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں جماتا ہے، پھر اُس کے لیے مطلوبہ مواد جمع کرتا ہے، پھر اس مواد کو اپنے نقشے کے مطابق صورت دینے کے لیے پیہم محنت اور کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں وہ مواد، جسے وہ اپنے ذہنی نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے، مسلسل اس کی مُزاحمت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کبھی مواد کی مزاحمت کامیاب ہو جاتی ہے اور چیز مطلوبہ نقشے کے مطابق ٹھیک نہیں بنتی، اور کبھی آدمی کی کوشش غالب آ جاتی ہے اور وہ اسے اپنی مطلوبہ شکل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک درزی قمیص بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ قمیص کی صورت کا تصور اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، پھر کپڑا فراہم کر کے اُسے اپنے تصورِ قمیص کے مطابق تراشنے اور سینے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دَوران میں اُسے کپڑے کی اس مزاحمت کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ درزی کے تصور پر ڈھلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، حتّٰی کہ کبھی کپڑے کی مزاحمت غالب آ جاتی ہے اور قمیص ٹھیک نہیں بنتا، اور کبھی درزی کی کوشش غالب آ جاتی ہے اور وہ کپڑے کو ٹھیک اپنے تصور کے مطابق شکل دے دیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا طرزِ تخلیق دیکھیے۔ کائنات کا مادّہ دھوئیں کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسے وہ شکل دے جو اَب کائنات کی ہے۔ اس غرض کے لیے اُسے کسی انسان کاریگر کی طرح بیٹھ کر زمین اور چاند اور سورج اور دوسرے تارے اور سیّارے گھڑنے نہیں پڑے، بلکہ اُس نے کائنات کے اُس نقشے کو جو اس کے ذہن میں تھا بس یہ حکم دے دیا کہ وہ وجود میں آ جائے، یعنی دھوئیں کی طرح پھیلا ہوا مواد اُن کہکشانوں اور تاروں اور سیّاروں کی شکل میں ڈھل جائے جنھیں وہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مواد میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اللہ کے حکم کی مزاحمت کرتا۔ اللہ کو اسے کائنات کی صورت میں ڈھالنے کے لیے کوئی محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑی۔ اُدھر حکم ہوا اور اِدھر وہ مواد سکڑ اور سمٹ کر فرماں برداروں کی طرح اپنے مالک کے نقشے پر ڈھلتا چلا گیا، یہاں تک کہ دو دِنوں میں زمین سمیت ساری کائنات بن کر تیار ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کے طریقِ تخلیق کی اسی کیفیت کو قرآن مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۱۵، آلِ عمران، حواشی ۴۴ - ۵۳۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۳۵ - ۳۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۲۔ جلد چہارم، یٰسین، آیت ۸۲، المومن، آیت ۶۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں[17] تو اِن سے کہہ دو کہ مَیں تم کو اُسی طرح کے ایک اچانک ٹُوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہُوا تھا۔ جب خدا کے رسول اُن کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے[18] اور انھیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، تو انھوں نے کہا: "ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔"[19]

---

۱۶ – اِن آیات کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن کے حسبِ ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا: جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۲، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۳۴-۳۵، المومنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۷، الصافات، حواشی ۵-۶)

۱۷ – یعنی اِس بات کو نہیں مانتے کہ خدا اور معبُود بس وہی ایک ہے جس نے یہ زمین اور ساری کائنات بنائی ہے، اور اپنی اِس جہالت پر اصرار ہی کیے چلے جاتے ہیں کہ اُس خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی، جو حقیقت میں اس کے مخلوق و مملوک ہیں، معبود بنائیں گے اور اس کی ذات و صفات اور حُقوق و اختیارات میں انھیں اُس کا شریک ٹھیرائیں گے۔

۱۸ – اس فقرے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ ان کے پاس رسول کے بعد رسول آتے رہے۔ دوسرے، یہ کہ رسولوں نے ہر پہلو سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کسر نہ اُٹھا رکھی۔ تیسرے، یہ کہ ان کے پاس اُن کے اپنے ملک میں بھی رسول آئے اور گرد و پیش کے ملکوں میں بھی آتے رہے۔

۱۹ – یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو، اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کرلیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ "جس چیز کے لیے تم بھیجے گئے ہو" اُسے ہم نہیں مانتے محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ اُسی طرح کا طنزیہ اندازِ بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (الشُّعراء، آیت ۲۷)، "یہ رسول صاحب جو تمھارے

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا
مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ
اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۱۵ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: ''کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔'' اُن کو یہ نہ سُوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی[20] تا کہ انھیں دنیا ہی کی زندگی میں ذِلّت و رُسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں[21]، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رُسوا کن

پاس بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ یٰسٓ، حاشیہ نمبر ۱۱)

۲۰ – ''منحوس دنوں'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے، اور عذاب اس لیے آیا کہ یہ منحوس دن قومِ عاد پر آ گئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا اور بجائے خود اُن دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دُور و نزدیک کی ساری ہی قوموں پر آ جاتا۔ اس لیے صحیح مطلب یہ ہے کہ اُن ایّام میں چونکہ اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوا، اس بنا پر وہ دن قومِ عاد کے لیے منحوس تھے۔ اس آیت سے دنوں کے سَعد و نَحس پر اِستدلال کرنا دُرست نہیں ہے۔

طوفانی ہوا کے لیے ''رِیْحِ صَرصَر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے معنٰی میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت لُو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی ہوا ہے جس کے چلنے سے سخت شور برپا ہوتا ہو۔ بہر حال اس معنٰی پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ بہت تیز طوفانی ہوا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر گر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں۔ (الحاقّہ، آیت ۷) جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی، اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ (الذاریات، ۴۲) جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی، اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھِر کر آئی ہے، بارش ہو گی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝١٦ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى
الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٧ وَ
نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝١٨ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ
اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝١٩ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ

ع ۲ ۱۲

ہے، وہاں کوئی اُن کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی، مگر انھوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر اُن کے کرتوتوں کی بدولت ذلّت کا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا، اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے۔[۲۲] ع

اور ذرا اُس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے[۲۳] جائیں گے۔ اُن کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے[۲۴] گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور

اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ (الاحقاف: ۲۴-۲۵)

۲۱ – یہ ذلت و رُسوائی کا عذاب اُن کے اُس کبر و غرور کا جواب تھا جس کی بنا پر وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور خم ٹھونک ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے۔ اللہ نے ان کو اس طرح ذلیل کیا کہ اُن کی آبادی کے بڑے حصّے کو ہلاک کر دیا، اُن کے تمدّن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا، اور ان کا قلیل حصّہ جو باقی رہ گیا وہ دنیا کی اُنھی قوموں کے آگے ذلیل و خوار ہوا جن پر کبھی یہ لوگ اپنا زور جتاتے تھے۔ (عاد کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۱ تا ۵۳، ہود، حواشی ۵۴ تا ۶۶۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۳۴ تا ۳۷، الشعراء، حواشی ۸۸ تا ۹۴، العنکبوت، حاشیہ ۶۵)

۲۲ – ثمود کے قصے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷ تا ۵۹، ہود، حواشی ۶۹ تا ۷۴، الحِجر، حواشی ۴۲ تا ۴۶، بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۸۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۹۵ تا ۱۰۶، النمل، حواشی ۵۸ تا ۶۶)

۲۳ – اصل مُدعا یہ کہنا ہے کہ جب وہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ لیکن اس مضمون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ کیونکہ ان کا انجام آخرِ کار دوزخ ہی میں جانا ہے۔

اَبۡصَارُهُمۡ وَ جُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوۡا
لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ
الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيۡهِ

ان کی آنکھیں اوران کے جسم کی کھالیں ان پرگواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں[۲۵]۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے: "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی: "ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کردیا ہے[۲۶]۔ اُسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف تم

---

۲۴ - یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ایک ایک نسل اور ایک ایک پشت کا حساب کر کے اس کا فیصلہ کیے بعد دیگرے کیا جاتا رہے، بلکہ تمام اگلی پچھلی نسلیں بیک وقت جمع کی جائیں گی اور ان سب کا اکٹھا حساب کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں جو کچھ بھی اچھے اور بُرے اعمال کرتا ہے، اس کے اثرات اس کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل اپنے دَور میں جو کچھ بھی کرتی ہے، اس کے اثرات بعد کی نسلوں میں صدیوں جاری رہتے ہیں، اور اپنے اِس ورثے کے لیے وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ محاسبے اور انصاف کے لیے اِن سارے ہی آثار و نتائج کا جائزہ لینا اور ان کی شہادتیں فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے قیامت کے روز نسل پر نسل آتی جائے گی اور ٹھیرائی جاتی رہے گی۔ عدالت کا کام اُس وقت شروع ہوگا جب اگلے پچھلے سب جمع ہو جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

۲۵ - احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائے گا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضا ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اُس نے ان سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت اَنسؓ، حضرت ابوموسیٰ اَشْعَرِیؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور مسلم، نسائی، ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم، بزّار وغیرہ محدثین نے ان روایات کو نقل کیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۵۵)

یہ آیت منجملہ اُن بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالَمِ آخرت محض ایک رُوحانی عالَم نہیں ہوگا، بلکہ انسان وہاں دوبارہ اُسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب اِس دنیا میں ہیں۔ یہی نہیں، اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزا اور جواہر (atoms) جن سے اُن کے بدن اس دنیا میں مرکّب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیے جائیں گے اور وہ اپنے انھی سابق جسموں کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضا وہاں اُسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جب کہ وہ وہی اعضا ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی

Maktaba Tul Ishaat.com

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ
لَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ
كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ
اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ

واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمھیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمھارے اپنے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمھارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمھارا یہی گمان، جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمھیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے[۲۷]۔" اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)، آگ ہی

زندگی میں کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اِس مضمون پر قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی دلیلِ قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۴۹ تا ۵۱ – ۹۸۔ المومنون: ۳۵ تا ۳۸ – ۸۲ – ۸۳۔ النور: ۲۴۔ السجدہ، ۱۰۔ یٰسین: ۶۵ – ۷۸ – ۷۹۔ الصّافات: ۱۶ تا ۱۸۔ الواقعہ: ۴۷ تا ۵۰۔ النازعات: ۱۰ تا ۱۴۔

۲۶ – اس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان کے اپنے اعضائے جسم ہی قیامت کے روز گواہی نہیں دیں گے، بلکہ ہر وہ چیز بول اُٹھے گی جس کے سامنے انسان نے کسی فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ یہی بات سورۂ زلزال میں فرمائی گئی ہے کہ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۙ "زمین وہ سارے بوجھ نکال پھینکے گی جو اس کے اندر بھرے پڑے ہیں، اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اُس روز زمین اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی، (یعنی جو جو کچھ انسان نے اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اس کی ساری داستان بیان کر دے گی)۔ کیونکہ تیرا رب اسے بیان کرنے کا حکم دے چکا ہو گا۔

۲۷ – حضرت حَسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں خوب فرمایا ہے کہ ہر آدمی کا رَوِیّہ اُس گمان کے لحاظ سے مُتعیّن ہوتا ہے جو وہ اپنے رب کے متعلق قائم کرتا ہے۔ مومنِ صالح کا رَوِیّہ اس لیے درست ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے بارے میں صحیح گمان رکھتا ہے، اور کافر و منافق اور فاسق و ظالم کا رَوِیّہ اس لیے غلط ہوتا ہے کہ اپنے رب کے بارے میں اس کا گمان غلط ہوتا ہے۔ یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی جامع اور مختصر حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمھارا رب کہتا ہے: انا عند ظن عبدی بی، "میں اُس گمان کے ساتھ ہوں جو میرا بندہ مجھ سے رکھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع

ان کا ٹھکانا ہوگی، اور اگر رُجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انھیں نہ دیا جائے گا۔[۲۸] ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلّط کر دیے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوش نما بنا کر دکھاتے تھے،[۲۹] آخرِ کار اُن پر بھی وہی فیصلۂ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جِنّوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا، یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔ ع

۲۸ - اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کی طرف پلٹنا چاہیں گے تو نہ پلٹ سکیں گے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو نہ نکل سکیں گے، اور یہ بھی کہ توبہ اور معذرت کرنا چاہیں گے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

۲۹ - یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائمی سنت ہے کہ وہ بُری نیت اور بُری خواہشات رکھنے والے انسانوں کو کبھی اچھے ساتھی نہیں دلواتا، بلکہ انھیں اُن کے اپنے رُجحانات کے مطابق بُرے ساتھی ہی دلواتا ہے۔ پھر جتنے جتنے وہ بدی کی پستیوں میں گہرے اترتے جاتے ہیں، اتنے ہی بدتر سے بدتر آدمی اور شیاطین ان کے ہم نشین اور مشیر اور رفیقِ کار بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاں صاحب بذاتِ خود تو بہت اچھے ہیں، مگر انھیں ساتھی بُرے مل گئے ہیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شخص کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے۔ ایک نیک آدمی کے ساتھ اگر بُرے لوگ لگ بھی جائیں تو وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک لگے نہیں رہ سکتے۔ اور اسی طرح ایک بدنیت اور بدکردار آدمی کے ساتھ نیک اور شریف انسانوں کی رفاقت اتفاقاً واقع ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھ سکتی۔ بدآدمی فطرتاً بدوں ہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بد ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں، جس طرح غلاظت مکھیوں کو کھینچتی ہے اور مکھیاں غلاظت کی طرف کھنچتی ہیں۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ وہ آگے اور پیچھے ہر چیز اُن کو خوش نُما بنا کر دکھاتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کو یقین دلاتے تھے کہ آپ کا ماضی بھی بڑا شاندار تھا اور مستقبل بھی نہایت درخشاں ہے۔ وہ ایسی عینک اُن کی آنکھوں پر چڑھاتے تھے کہ ہر طرف ان کو ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ پر تنقید کرنے والے احمق ہیں، آپ کوئی نرالا کام تھوڑی کر رہے ہیں، دنیا میں ترقی کرنے والے وہی کچھ کرتے رہے ہیں جو آپ کر رہے ہیں، اور آگے اوّل تو کوئی آخرت ہے ہی نہیں جس میں آپ کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے، لیکن اگر وہ پیش آ ہی گئی، جیسا کہ چند نادان دعویٰ کرتے ہیں، تو جو خدا آپ کو یہاں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ
تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ
اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ
لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

یہ منکرینِ حق کہتے ہیں: ”اِس قرآن کو ہرگز نہ سنو، اور جب یہ سُنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔[30]“ اِن کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ اِنھیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اُسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اِس جُرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ”اَے ہمارے رب! ذرا ہمیں دکھا دے اُن جنّوں اور انسانوں کو جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے، تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔[31]“

نعمتوں سے نواز رہا ہے وہ وہاں بھی آپ پر انعام و اکرام کی بارش کرے گا، دوزخ آپ کے لیے نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بنی ہے جنھیں یہاں خدا نے اپنی نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

۳۰ – یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پایے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرزِ ادا کس درجہ مؤثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اِس دل کش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخرِ کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انھوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ امید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ

جن لوگوں نے[۳۲] کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے،[۳۳] یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں[۳۴] اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو،[۳۵] اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے دے دیں گے۔

۳۱ – یعنی دنیا میں تو یہ لوگ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں اور فریب دینے والے شیاطین کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مگر جب قیامت کے روز انھیں پتا چلے گا کہ یہ رہنما انھیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی لوگ انھیں کوسنے لگیں گے اور یہ چاہیں گے کہ وہ کسی طرح ان کے ہاتھ آ جائیں تو پکڑ کر انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں۔

۳۲ – یہاں تک کفار کو ان کی ہٹ دھرمی اور مخالفت حق کے نتائج پر مُتنبِّہ کرنے کے بعد اب اہلِ ایمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روئے سُخن مڑتا ہے۔

۳۳ – یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے، اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں، بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا، نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی، اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے، اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ نے اس طرح کی ہے:

حضرت اَنسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: قد قالها الناس ثم كفر اكثرهم، فمن مات عليها فهو ممن استقام۔ "بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا۔" (ابنِ جریر، نَسائی، ابنِ ابی حاتم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم يشركوا بالله شيئًا، لم يلتفتوا الى اله غيره۔ "پھر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف توجہ نہ کی۔" (ابنِ جریر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا: "خدا کی قسم! استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے، لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔" (ابنِ جریر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا۔" (کشّاف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔" (کشّاف)

Maktaba Tul Ishaat.com

تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓـؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اِس دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی،

۳۴ – فرشتوں کا یہ نُزول ضروری نہیں ہے کہ کسی محسوس صورت میں ہو اور اہلِ ایمان انھیں آنکھوں سے دیکھیں یا ان کی آواز کانوں سے سنیں۔ اگرچہ اللہ جَلّ شانُہٗ جس کے لیے چاہے فرشتوں کو عَلانِیَہ بھی بھیج دیتا ہے، لیکن بالعُموم اہلِ ایمان پر، خُصوصاً سخت وقتوں میں جب کہ دشمنانِ حق کے ہاتھوں وہ بہت تنگ ہو رہے ہوں، اُن کا نُزول غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے، اور اُن کی باتیں کان کے پردوں سے ٹکرانے کے بجائے دل کی گہرائیوں میں سکینت واطمینانِ قلب بن کر اُترتی ہیں۔ بعض مفسرین نے فرشتوں کے اِس نُزول کو موت کے وقت، یا قبر، یا میدانِ حشر کے لیے مخصوص سمجھا ہے۔ لیکن اگر اُن حالات پر غور کیا جائے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ یہاں اس معاملے کو بیان کرنے کا اصل مقصد اِس زندگی میں دینِ حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑانے والوں پر فرشتوں کے نزول کا ذکر کرنا ہے، تاکہ انھیں تسکین حاصل ہو، اور ان کی ہمت بندھے، اور ان کے دل اس احساس سے مطمئن ہو جائیں کہ وہ بے یارومددگار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے فرشتے ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ فرشتے موت کے وقت بھی اہلِ ایمان کا استقبال کرنے آتے ہیں، اور قبر (عالَمِ بَرزَخ) میں بھی وہ ان کی پذیرائی کرتے ہیں، اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز بھی ابتدائے حشر سے جنت میں پہنچنے تک وہ برابر اُن کے ساتھ لگے رہیں گے، لیکن اُن کی یہ معیّت اُسی عالَم کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اِس دنیا میں بھی وہ جاری ہے۔ سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں جس طرح باطل پرستوں کے ساتھی شیاطین و اَشرار ہوتے ہیں، اُسی طرح اہلِ ایمان کے ساتھی فرشتے ہوا کرتے ہیں۔ ایک طرف باطل پرستوں کو اُن کے ساتھی اُن کے کرتوت خوش نُما بنا کر دکھاتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ حق کو نیچا دکھانے کے لیے جو ظلم وستم اور بے ایمانیاں تم کر رہے ہو، یہی تمھاری کامیابی کے ذرائع ہیں اور انھی سے دنیا میں تمھاری سرداری محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف حق پرستوں کے پاس اللہ کے فرشتے آ کر وہ پیغام دیتے ہیں جو آگے کے فقروں میں ارشاد ہو رہا ہے۔

۳۵ – یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہلِ ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اِس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی بالادست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو، اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمھیں سہنی پڑیں، ان پر کوئی رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمھارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمھارے لیے کسی خوف کا مقام نہیں ہے، کیونکہ وہاں جنت تمھاری منتظر ہے، اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو اُن کے لیے تمھیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں ہم تمھارے ولی و رفیق ہیں۔ عالَمِ برزخ اور میدانِ حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں تمھارے لیے چین ہی چین ہے، دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے ان کا غم نہ کرو، اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے

وَ لَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَؕ ۝۳۱
نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِيۡمٍ ۝۳۲ وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ ع ۱۸
اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝۳۳ وَلَا
تَسۡتَوِى الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ
فَاِذَا الَّذِىۡ بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيۡمٌ ۝۳۴

وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا، اور ہر چیز جس کی تم تمنّا کرو گے وہ تمھاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔" ع

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔[۳۶]

اور اے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔[۳۷] یہ صفت

والا ہے اس کا خوف نہ کھاؤ، اس لیے کہ ہم تمھیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جا تا رہا ہے۔

۳۶- اہلِ ایمان کو تسکین دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بعد اب اُن کو اُن کے اصل کام کی طرف رغبت دلائی جا رہی ہے۔ گزشتہ آیت میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اِس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اُس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنّت کا مستحق بناتی ہے۔ اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اُوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا، اُسے یکا یک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے، جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی، اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ اِن حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلا شبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن

Maktaba Tul Ishaat.com

کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے عَلَم برداروں پر حرف رکھنے کی گنجایش نہ ملے۔

۳۷۔ اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے واسطے سے آپؐ کے پیرووں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا، جس میں اخلاق، انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپؐ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپؐ پر چسپاں کیے جا رہے تھے، اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج آپؐ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہُلّڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپؐ کی تاک میں لگا رہے، اور جب آپؐ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپؐ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کے توڑنے کا یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمھارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھا لائے ہوں، جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر کمزوری رکھتی ہے جو آخرِ کار اس کا بھٹا بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے، اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے عَلَم بردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار، انھیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے، جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخرِ کار وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخّر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کش مکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمھارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ

نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں[۳۸]، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں[۳۹]۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو،[۴۰]

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخرِ کار جگری دوست بن جائے گا۔ اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا، اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں، تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدۂ کُلِّیہ کو اس معنیٰ میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عَقرب کا زہریلا پن ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شرِّ مجسّم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسّم انسان کم یاب ہیں۔

۳۸ - یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت، اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سال ہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اَخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تأمّل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا، کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شُعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اُسے اُس کے مقام بلند سے نیچے اُتار لانے میں کامیاب نہ ہوسکتی ہو۔

۳۹ - یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان اِن صفات سے مُتّصِف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو، اُسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔

۴۰ - شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ، اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں، اور خصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کرا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب! بُرائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اُونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فُلاں رکیک حرکت تو آخر انھوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راست بازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے کوئی بے جا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو اُن کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنّے رہو۔ وہ بڑا دردمند و خیر خواہ بن کر تمھیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اِس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمھیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمھیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اُکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زُعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زُعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں حضرت ابوہُریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخرِ کار جنابِ صِدّیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضوؐر پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپؐ فوراً اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اُٹھ کر آپؐ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپؐ ناراض ہو گئے؟ فرمایا: ”جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمھارے ساتھ رہا اور تمھاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔“

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ
وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝۳۷

وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔[۴۱]

اللہ[۴۲] کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔[۴۳] سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے، اگر فی الواقع تم اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔[۴۴]

---

۴۱ – مخالفتوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سکون اور اطمینان کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے، وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ ہماری اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سُن رہا ہے، اور دونوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اسی اعتماد پر بندۂ مومن اپنا اور دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سُپرد کر کے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

یہ پانچواں موقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو دعوتِ دین اور اصلاحِ خلق کی یہ حکمت سکھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے کے چار مقامات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۴۹ تا ۱۵۳، النحل، ۱۲۲ – ۱۲۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۸۹ – ۹۰، العنکبوت، حواشی ۸۱ – ۸۲۔

۴۲ – اب رُوئے سُخن عوام الناس کی طرف مڑ رہا ہے اور چند فقرے ان کو حقیقت سمجھانے کے لیے ارشاد ہو رہے ہیں۔

۴۳ – یعنی یہ اللہ کے مظاہر نہیں ہیں کہ تم یہ سمجھتے ہوئے ان کی عبادت کرنے لگو کہ اللہ اِن کی شکل میں خود اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے، بلکہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں، جن پر غور کرنے سے تم کائنات کی اور اس کے نظام کی حقیقت سمجھ سکتے ہو اور یہ جان سکتے ہو کہ انبیا علیہم السلام جس توحیدِ خداوندی کی تعلیم دے رہے ہیں وہی امرِ واقعی ہے۔ سورج اور چاند سے پہلے رات اور دن کا ذکر اِس اَمر پر مُتنبّہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ رات کو سورج کا چُھپنا اور چاند کا نکل آنا، اور دن کو چاند کا چُھپنا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف طور پر یہ دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی خدا یا خدا کا مظہر نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی مجبور و لاچار بندے ہیں جو خدا کے قانون میں بندھے ہوئے گردش کر رہے ہیں۔

۴۴ – یہ جواب ہے اُس فلسفے کا جو شرک کو معقول ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ ذہین قسم کے مشرکین عُموماً بگھارا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اِن چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس کا جواب

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ۩ ﴿۳۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

السجدۃ

لیکن اگر یہ لوگ غُرور میں آ کر اپنی ہی بات پر اَڑے رہیں[۴۵] تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے رب کے مقرّب ہیں، وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے۔[۴۶] س

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہوئی ہے، پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اُٹھتی ہے اور پھُول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جِلا اُٹھاتا ہے، وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔[۴۷] یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ دیا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ہی کے عبادت گزار ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، براہِ راست خود اُسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے۔

۴۵ – ''غرور میں آ کر'' سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ تمھاری بات مان لینے میں اپنی ذلّت سمجھ کر اُسی جہالت پر اصرار کیے چلے جائیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔

۴۶ – مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام، جو اِن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے، اللہ کی توحید اور اسی کی بندگی میں رَواں دواں ہے، اور اس نظام کے منتظم فرشتے ہر آن یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اُن کا رب اِس سے پاک اور مُنزّہ ہے کہ کوئی خداوندی اور معبُودیت میں اس کا شریک ہو۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں مانتے اور ساری کائنات جس راستے پر چل رہی ہے اُس سے منہ موڑ کر شرک ہی کی راہ چلنے پر اصرار کیے جاتے ہیں، تو پڑا رہنے دو ان کو اپنی اس حماقت میں۔

اس مقام کے متعلق یہ اَمر تو مُتّفَق عَلَیہ ہے کہ یہاں سجدہ لازم آتا ہے، مگر اس اَمر میں فُقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے کہ اوپر کی دونوں آیتوں میں سے کس پر سجدہ کرنا چاہیے۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اسی قول کو امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے، اور ایک قول امام شافعیؒ سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔ لیکن حضرات ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، سعید بن المسیّبؒ، مَسرُوقؒ، قَتادہؒ، حَسن بصریؒ، ابوعبدالرحمٰن السُلَمیؒ، ابن سیرینؒ، ابراہیم نَخعیؒ اور متعدد دوسرے اکابر وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ پر سجدے کے قائل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی ہے اور شافعیوں کے ہاں بھی مُرجّح قول یہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۗ أَفَمَن يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَم مَّن يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۖ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿٤١﴾

---

[۴۸] جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں،[۴۹] وہ ہم سے کچھ چھُپے ہوئے نہیں ہیں[۵۰]۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے، یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمھاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلامِ نصیحت آیا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے،[۵۱]

---

۴۷ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳۔ جلد سوم، الحج، حواشی ۸-۹، الروم، حاشیہ ۲۸۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔

۴۸ – عوام الناس کو چند فقروں میں یہ سمجھانے کے بعد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس توحید اور آخرت کے عقیدے کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہی معقول ہے اور آثارِ کائنات اسی کے حق ہونے کی شہادت دے رہے ہیں، اب رُوئے سُخن پھر اُن مخالفین کی طرف مڑتا ہے جو پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ مخالفت پر تُلے ہوئے تھے۔

۴۹ – اصل الفاظ ہیں: يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا (ہماری آیات میں اِلحاد کرتے ہیں)۔ اِلحاد کے معنی ہیں: اِنحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں اِلحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ کفارِ مکہ قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات کو سُن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سِیاق وسباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کر کے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو! آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

۵۰ – ان الفاظ میں ایک سخت دھمکی مضمر ہے۔ حاکم ذی اقتدار کا یہ کہنا کہ فُلاں شخص جو حرکتیں کر رہا ہے وہ مجھ سے چھُپی ہوئی نہیں ہیں، آپ سے آپ یہ معنی اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

۵۱ – یعنی اَٹل ہے۔ اِس کو اُن چالوں سے شکست نہیں دی جا سکتی جو باطل پرست لوگ اِس کے خلاف چل رہے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ
حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿۴۲﴾ مَّا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن
قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ
جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ

باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے[۵۲]، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔

اَے نبیؐ! تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمھارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے[۵۳]، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے: "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟

ہیں۔ اس میں صداقت کا زور ہے، علمِ حق کا زور ہے، دلیل و حُجّت کا زور ہے، زبان اور بیان کا زور ہے، بھیجنے والے خدا کی خدائی کا زور ہے، اور پیش کرنے والے رسول کی شخصیّت کا زور ہے۔ جھوٹ اور کھوکھلے پروپیگنڈے کے ہتھیاروں سے کوئی اِسے زَک دینا چاہے تو کیسے دے سکتا ہے۔

۵۲ - سامنے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے اگر کوئی شخص اُس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آ سکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجرِبہ اور مُشاہَدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کردے کہ قرآن نے عقائد، اَخلاق، قانون، تہذیب و تمدُّن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مُدن کے باب میں انسان کو جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ کبھی باطل ثابت نہیں ہو سکتی، اور جسے باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ باطل خواہ سامنے سے آ کر حملہ آور ہو یا ہیر پھیر کے راستوں سے چھاپے مارے، بہرحال کسی طرح بھی وہ اُس دعوت کو شکست نہیں دے سکتا جسے لے کر قرآن آیا ہے۔ تمام مخالفتوں اور مخالفین کی ساری خُفیہ اور عَلانیہ چالوں کے عَلَی الرَّغم یہ دعوت پھیل کر رہے گی اور کوئی اسے زَک نہیں دے سکے گا۔

۵۳ - یعنی یہ اُس کا حِلم اور عَفو و درگزر ہی ہے کہ اس کے رسولوں کو جھٹلایا گیا، گالیاں دی گئیں، اذیتیں پہنچائی گئیں، اور پھر بھی وہ سال ہا سال تک مخالفین کو مہلت دیتا چلا گیا۔

ءَاَعۡجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ؕ قُلۡ هُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًی وَّشِفَآءٌ ؕ وَ
الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ وَّهُوَ عَلَیۡهِمۡ عَمًی ؕ اُولٰٓئِكَ
یُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۭ بَعِیۡدٍ ۟ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡكِتٰبَ
فَاخۡتُلِفَ فِیۡهِ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِیَ

ع ۱۹

کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عَرَبی۔''[54] اِن سے کہو: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹّی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دُور سے پکارا جا رہا[55] ہو۔ع اِس سے پہلے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف[56] ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو اِن اختلاف کرنے والوں کے

۵۴ – یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عَرَبی ان کی مادری زبان ہے، وہ اگر عَرَبی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام انھوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ ان کے اِس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکا یک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رومی یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب ان کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے، جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعے سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا۔ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے۔ عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

۵۵ – دُور سے جب کسی کو پکارا جاتا ہے تو اس کے کان میں ایک آواز تو پڑتی ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسی بے نظیر تشبیہ ہے جس سے ہٹ دھرم مخالفین کے نفسیات کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو شخص کسی تعصّب میں مبتلا نہیں ہوتا اس سے اگر آپ گفتگو کریں تو وہ اسے سنتا ہے، سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور معقول بات ہوتی ہے تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آپ کے خلاف نہ صرف تعصب بلکہ عناد اور بغض رکھتا ہو، اس کو آپ اپنی بات سمجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ سرے سے اس کی طرف توجہ ہی نہ کرے گا۔ آپ کی ساری بات سن کر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا کہ آپ اتنی دیر تک کیا کہتے رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی یوں محسوس ہوگا کہ جیسے آپ کی آواز اس کے کان کے پردوں سے اُچٹ کر باہر ہی باہر گزر رہی ہے، دل اور دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں پا سکی۔

۵۶ – یعنی کچھ لوگوں نے اسے مانا تھا اور کچھ مخالفت پر تُل گئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَيْنَهُمْ ۚ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

درمیان فیصلہ چُکا دیا جاتا۔[57] اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[58]

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اُسی پر ہوگا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔[59]

۵۷ – اس ارشاد کے دو مفہُوم ہیں: ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی مُہلت دی جائے گی تو اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ دوسرا مفہُوم یہ ہے کہ اگر اللہ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر لیا ہوتا کہ اختلافات کا آخری فیصلہ قیامت کے روز کیا جائے گا تو دنیا ہی میں حقیقت کو بے نقاب کر دیا جاتا اور یہ بات کھول دی جاتی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔

۵۸ – اس مختصر سے فقرے میں کفارِ مکہ کے مَرض کی پوری تشخیص کر دی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، اور اس شک نے ان کو سخت خَلجان و اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ بڑے زور شور سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا انکار کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کا یہ انکار کسی یقین کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ ان کے دلوں میں شدید تذبذب برپا ہے۔ ایک طرف ان کے ذاتی مفاد، ان کے نفس کی خواہشات، اور ان کے جاہلانہ تعصُّبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی مخالفت کریں۔ دوسری طرف ان کے دل اندر سے پکارتے ہیں کہ یہ قرآن فی الواقع ایک بے مثل کلام ہے، جس کے مانند کوئی کلام کسی ادیب یا شاعر سے کبھی نہیں سنا گیا ہے، نہ کوئی مجنون دیوانگی کے عالَم میں ایسی باتیں کر سکتا ہے، نہ کبھی شیاطین اس غرض کے لیے آ سکتے ہیں کہ لوگوں کو خدا پرستی اور نیکی و پاکیزگی کی تعلیم دیں۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وہ جھوٹا کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ خدا کے بندو! کچھ شرم کرو، کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ جب وہ ان کو مجنون کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے پکارتا ہے کہ ظالمو! کیا واقعی تم اس شخص کو دیوانہ سمجھتے ہو؟ جب وہ ان پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ حق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی کے لیے کر رہے ہیں، تو ان کا دل اندر سے ملامت کرتا ہے کہ لعنت ہے تم پر، اِس نیک نفس انسان کو بندۂ غرض کہتے ہو جسے کبھی تم نے دولت اور اقتدار اور نام و نمود کے لیے دوڑ دھوپ کرتے نہیں دیکھا ہے، جس کی ساری زندگی مفاد پرستی کے ہر شائبے سے پاک رہی ہے، جس نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے لیے کام کیا ہے، مگر کبھی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے کوئی بے جا کام نہیں کیا۔

۲۵ الجزء

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ

اُس ساعت[60] کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے[61]، وہی اُن سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں، اسی کو معلوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنا ہے[62]۔ پھر جس روز وہ اِن لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے: "ہم عرض کر چکے ہیں، آج ہم میں سے کوئی اِس کی گواہی

۵۹ – یعنی تیرا رب کبھی یہ ظلم نہیں کر سکتا کہ نیک انسان کی نیکی ضائع کر دے اور بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ نہ دے۔

۶۰ – اُس ساعت سے مراد قیامت ہے، یعنی وہ گھڑی جب بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ دیا جائے گا اور اُن نیک انسانوں کی دادرسی کی جائے گی جن کے ساتھ بدی کی گئی ہے۔

۶۱ – یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔ یہ جواب ہے کفار کے اِس سوال کا کہ ہم پر بدی کا وبال پڑنے کی جو دھمکی دی جا رہی ہے وہ آخر کب پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کو نقل کیے بغیر اُس کا جواب دیا ہے۔

۶۲ – اس ارشاد سے سامعین کو دو باتوں کا احساس دلایا گیا ہے: ایک، یہ کہ صرف ایک قیامت ہی نہیں بلکہ تمام اُمورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا جزئیات کا اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے اُس کی نگاہ سے کسی شخص کے اعمال و افعال کا چُوک جانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا کسی کو بھی اُس کی خدائی میں بے خوف ہو کر من مانی نہیں کرنی چاہیے۔ اِسی دوسرے معنی کے لحاظ سے اس فقرے کا تعلق بعد کے فقروں سے جُڑتا ہے۔ اِس ارشاد کے معاً بعد جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس پر غور کیجیے تو ترتیبِ کلام سے خود بخود یہ مضمون مُترشّح ہوتا نظر آئے گا کہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنے کی فکر میں کہاں پڑے ہو، فکر اِس بات کی کرو کہ جب وہ آئے گی تو اپنی اِن گمراہیوں کا تمھیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات ہے جو ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی تاریخ پوچھنے والے ایک شخص سے فرمائی تھی۔ صِحاح اور سُنَن اور مَسانید میں حدِّ تواتر کو پہنچی ہوئی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضوؐر سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شخص نے دُور سے پکارا: "یا محمدؐ!" آپؐ نے فرمایا: "بولو کیا کہنا ہے؟" اس نے کہا: "قیامت کب آئے گی؟" آپؐ نے جواب دیا: ویحك انها کائنة لامحالة فما اعددت لها؟ "بندۂ خدا! وہ تو بہرحال آنی ہی ہے۔ تُو نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟"

Maktaba Tul Ishaat.com

شَهِيدٍ ۝ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ وَظَنُّوا مَا لَهُم مِّن
مَّحِيصٍ ۝ لَا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ
قَنُوطٌ ۝ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ
هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي
عِندَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُم

–دینے والا نہیں ہے۔[۶۳] " اُس وقت وہ سارے معبود اِن سے گم ہو جائیں گے جنھیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے،[۶۴] اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ اِن کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا،[۶۵] اور جب کوئی آفت اِس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے، مگر جوں ہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اِسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ "میں اِسی کا مستحق ہوں،[۶۶] اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی، لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا۔" حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں، اور انھیں ہم

۶۳ – یعنی اب ہم پر حقیقت کھل چکی ہے اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہم سمجھے بیٹھے تھے وہ سراسر غلط تھا۔ اب ہمارے درمیان کوئی ایک شخص بھی اِس بات کا قائل نہیں ہے کہ خدائی میں کوئی دوسرا بھی آپ کا شریک ہے۔ "ہم عرض کر چکے ہیں" کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز بار بار ہر مرحلے میں کفار سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم خدا کے رسولوں کا کہا ماننے سے انکار کرتے رہے، اب بولو حق پر وہ تھے یا تم؟ اور ہر موقع پر کفار اس بات کا اعتراف کرتے چلے جائیں گے کہ واقعی حق وہی تھا جو انھوں نے بتایا تھا، اور غلطی ہماری تھی کہ اُس علم کو چھوڑ کر اپنی جہالتوں پر اصرار کرتے رہے۔

۶۴ – یعنی مایوسی کے عالَم میں یہ لوگ ہر طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جن کی سیوا کرتے رہے، شاید اُن میں سے کوئی مدد کو آئے اور ہمیں خدا کے عذاب سے چھڑا لے، یا کم از کم ہماری سزا ہی کم کرا دے، مگر کسی طرف کوئی مددگار بھی ان کو نظر نہ آئے گا۔

۶۵ – بھلائی سے مراد ہے خوشحالی، کشادہ رزق، تندرستی، بال بچوں کی خیر وغیرہ۔ اور انسان سے مراد یہاں نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو انبیا اور صلحا بھی آ جاتے ہیں، جو اس صفت سے مُبرّا ہیں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ بلکہ اس مقام پر

مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٠﴾ وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ
وَنَا بِجَانِبِهِۦ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَآءٍ عَرِيضٍ ﴿٥١﴾ قُلْ
أَرَءَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُم بِهِۦ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ
هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾ سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِي الْءَافَاقِ وَفِيٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ

بڑے گندے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے۔[٦٧] اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔[٦٨]

اے نبیؐ! اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اِس کا انکار کرتے رہے، تو اُس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟[٦٩]

عنقریب ہم اِن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک

وہ چھچھورا اور کم ظرف انسان مراد ہے جو بُرا وقت آنے پر گڑگڑانے لگتا ہے، اور دنیا کا عیش پاتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسانی کی اکثریت اِسی کمزوری میں مبتلا ہے، اس لیے اسے انسان کی کمزوری قرار دیا گیا ہے۔

٦٦ – یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی اہلیت کی بنا پر ملا ہے اور میرا حق یہی ہے کہ میں یہ کچھ پاؤں۔

٦٧ – یعنی ہماری اطاعت و بندگی سے منہ موڑتا ہے اور ہمارے آگے جھکنے کو اپنی توہین سمجھنے لگتا ہے۔

٦٨ – اس مضمون کی متعدد آیات اس سے پہلے قرآنِ مجید میں گزر چکی ہیں۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۵، ہود، حاشیہ ۱۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الروم، حواشی ۵۲ تا ۵۶۔ جلد چہارم، الزُّمَر، آیات ۸-۹-۴۹۔

٦٩ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض اس خطرے کی بنا پر ایمان لے آؤ کہ اگر کہیں یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا تو انکار کر کے ہماری شامت نہ آ جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سرسری طور پر بے سوچے سمجھے تم انکار کر رہے ہو، اور بات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہو، اور خواہ مخواہ کی ضد میں آ کر مخالفت پر تُل گئے ہو، یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ تم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ تمھیں اس قرآن کے خدا کی طرف سے نہ ہونے کا علم ہو گیا ہے اور تم یقین کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

کہ اِن پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے ۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا

یہ جان چکے ہو کہ خدا نے اِسے نہیں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کلامِ الٰہی ماننے سے تمھارا انکار علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان کی بنا پر ہے، جس کا صحیح ہونا اگر بادیٔ النظر میں ممکن ہے تو غلط ہونا بھی ممکن ہے۔ اب ذرا ان دونوں قسم کے امکانات کا جائزہ لے کر دیکھ لو۔ تمھارا گمان فرض کرو کہ صحیح نکلا تو تمھارے اپنے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوگا کہ ماننے والے اور نہ ماننے والے، دونوں یکساں رہیں گے، کیونکہ دونوں ہی کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے، اور آگے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں کفر و ایمان کے کچھ نتائج نکلنے والے ہوں۔ لیکن اگر فی الواقع یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور وہ سب کچھ پیش آ گیا جس کی یہ خبر دے رہا ہے، پھر بتاؤ کہ اس کا انکار کر کے اور اس کی مُخالفت میں اتنی دُور جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے؟ اس لیے تمھارا اپنا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ اس قرآن پر غور کرو۔ اور غور کرنے کے بعد بھی تم ایمان نہ لانے ہی کا فیصلہ کرتے ہو تو نہ لاؤ، مگر مخالفت پر کمر بستہ ہو کر اس حد تک آگے تو نہ بڑھ جاؤ کہ جھوٹ اور مکر و تَلبیس اور ظلم و ستم کے ہتھیار اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کرنے لگو، اور خود ایمان نہ لانے پر اکتفا نہ کر کے دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے پھرو۔

۷۰ – اس آیت کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی اکابر مفسرین نے بیان کیے ہیں:

ایک مفہوم یہ ہے کہ عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے مَمالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اُس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت اِنھیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ آج اِن سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں، وہ سراسر حق تھا۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آ جانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دَور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں، وہ محض اس معنیٰ میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہلِ ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنیٰ میں تھیں کہ یہ فتحِ مَمالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جِلَو میں ایک عظیم الشان مذہبی، اَخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدُّنی و مَعاشی انقلاب لے کر آئی تھی، جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کارو بارِ دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائلِ اخلاق فرماں رواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فُتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیل داری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اَخلاق اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اُٹھایا کہ دوسرے

معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اُس نے اَوہام وخُرافات کے چکّر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرزِ فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انھوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ ونسل اور وطن وزبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اُونچ نیچ کا امتیاز اور چھُوت چھات، قانونی حُقوق اور عملی معاشرت میں مُساوات کا فُقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حُکومت کا تنقید ومحاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سرزمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف المُلُوکی کی جگہ نظم، خوں ریزی وبد امنی کی جگہ امن، فِسق وفُجور کی جگہ تقوٰی وطہارت، ظلم وبے انصافی کی جگہ عدل، گندگی وناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم، اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوّت ومحبّت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے، انھیں دنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اُسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھائے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زوال کے دَور میں بھی اَخلاق کی جس بلندی کا مُظاہرہ کیا ہے، اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب وشائستگی کے عَلَم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقا، امریکا، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اُتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دَور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمراں رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا، اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رَوِیّہ کیا رہا، اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آفاقِ ارض وسما میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا جن سے اُن پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے، وہی برحق ہے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آفاقِ ارض وسما اور خود اپنے وجود کو تو لوگ اُس وقت بھی دیکھ رہے تھے، پھر زمانۂ مستقبل میں ان چیزوں کے اندر نشانیاں دکھانے کے کیا معنٰی؟ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی سطحی ہے جیسا اُوپر کے مفہوم پر اعتراض سطحی تھا۔ آفاقِ ارض وسما تو بے شک وہی ہیں جنھیں انسان ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے، اور انسان کا اپنا وجود بھی اُسی طرح کا ہے جیسا ہر زمانے میں دیکھا جاتا رہا ہے، مگر ان چیزوں کے اندر خدا کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں کہ انسان کبھی ان کا احاطہ نہیں کر سکا ہے، نہ کبھی کر سکے گا۔ ہر دَور میں انسان کے سامنے نئی نئی نشانیاں آتی چلی گئی ہیں اور قیامت تک آتی چلی جائیں گی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ
اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾ ع

شاہد ہے؟[۷۱] آگاہ رہو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں[۷۲]۔ سُن رکھو، وہ ہر چیز پر محیط ہے[۷۳]۔

۷۱ – یعنی کیا لوگوں کو انجامِ بد سے ڈرانے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اِس دعوتِ حق کو جھٹلانے اور زک پہنچانے کے لیے جو جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

۷۲ – یعنی اِن کے اِس رَوِیّے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کبھی اِن کو اپنے رب کے سامنے جانا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے۔

۷۳ – یعنی اُس کی گرفت سے بچ کر یہ کہیں جا نہیں سکتے، اور اُس کے ریکارڈ سے ان کی کوئی حرکت چھوٹ نہیں سکتی۔

تفہیم القرآن

الشوریٰ

(۴۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الشُّوریٰ

نام آیت ۳۸ کے فقرے وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظِ شُوریٰ آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس کے مضمون پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ حٰمٓ السجدہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ یہ ایک طرح سے بالکل اُس کا تتمّہ نظر آتی ہے۔ اِس کیفیت کو ہر وہ شخص خود محسوس کرے گا جو پہلے سورۂ حٰمٓ السجدہ کو بغور پڑھے اور پھر اس سورہ کی تلاوت کرے۔ وہ دیکھے گا کہ اُس سورت میں سردارانِ قریش کی اندھی بہری مخالفت پر بڑی کاری ضربیں لگائی گئی تھیں، تاکہ مکۂ معظّمہ اور اس کے گرد وپیش کے علاقے میں جس کسی کے اندر بھی اَخلاق، شرافت اور معقولیت کی کوئی حِس باقی ہو، وہ جان لے کہ قوم کے بڑے لوگ کس قدر بے جا طریقے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہیں، اور ان کے مقابلے میں آپؐ کی بات کتنی سنجیدہ، آپؐ کا مَوقِف کتنا معقول اور آپؐ کا رَوِیّہ کیسا شریفانہ ہے۔ اُس تنبیہ کے معاً بعد یہ سورت نازل کی گئی جس نے تفہیم کا حق ادا کر دیا اور ایسے دل نشین انداز میں دعوتِ محمدؐی کی حقیقت سمجھائی جس کا اثر قبول نہ کرنا کسی ایسے شخص کے بس میں نہ تھا جو حق پسندی کا کچھ بھی مادّہ اپنے اندر رکھتا ہو اور جاہلیت کی گمراہیوں کے عشق میں بالکل اندھا نہ ہو چکا ہو۔

موضوع اور مضمون بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمارے نبی کی پیش کردہ باتوں پر یہ کیا چہ میگوئیاں کرتے پھر رہے ہو۔ یہ باتیں کوئی نئی اور نرالی نہیں ہیں، نہ یہی کوئی نادر واقعہ ہے جو تاریخ میں پہلی ہی مرتبہ پیش آیا ہو کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے وحی آئے اور اسے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے ہدایات دی جائیں۔ ایسی ہی وحی، اِسی طرح کی ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے انبیا علیہم السلام پر پَے در پَے بھیجتا رہا ہے۔ اور نرالی، اچنبھے کے قابل بات یہ نہیں ہے کہ آسمان و زمین کے مالک کو معبُود اور حاکم مانا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس کے بندے ہو کر، اس کی خدائی میں رہتے ہوئے کسی دوسرے کی خداوندی تسلیم کی جائے۔ تم توحید پیش کرنے والے پر بگڑ رہے ہو، حالانکہ مالکِ کائنات کے ساتھ جو شرک تم کر رہے ہو، وہ ایسا جرمِ عظیم ہے کہ آسمان اُس پر پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں۔ تمھاری اس جسارت پر فرشتے حیران ہیں اور ہر وقت ڈر رہے ہیں کہ نہ معلوم کب تم پر خدا کا غضب ٹوٹ پڑے۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ نبوت پر کسی شخص کا مقرر کیا جانا، اور اس شخص کا اپنے آپ کو نبی کی

حیثیت سے پیش کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ خلقِ خدا کی قسمتوں کا مالک بنا دیا گیا ہے اور اسی دعوے کے ساتھ وہ میدان میں آیا ہے۔ قسمتیں تو اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ نبی صرف غافلوں کو چونکانے اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتانے آیا ہے۔ اُس کی بات نہ ماننے والوں کا محاسبہ کرنا اور اُنھیں عذاب دینا یا نہ دینا اللہ کا اپنا کام ہے۔ یہ کام نبی کے سُپرد نہیں کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دو کہ نبی اُس طرح کے کسی دعوے کے ساتھ آیا ہے جیسے دعوے تمھارے ہاں کے نام نہاد مذہبی پیشوا اور پیر فقیر کیا کرتے ہیں کہ جو ان کی بات نہ مانے گا، یا اُن کی شان میں گستاخی کرے گا، وہ اسے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اسی سلسلے میں لوگوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نبی تمھاری بدخواہی کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ تو ایک خیر خواہ ہے جو تمھیں خبردار کر رہا ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو اس میں تمھاری اپنی تباہی ہے۔

پھر اس مسئلے کی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر راست رَو کیوں نہ بنا دیا، اور یہ مجالِ اختلاف کیوں رکھی جس کی وجہ سے لوگ فکر و عمل کے ہر اُلٹے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی چیز کی بدولت تو یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ انسان اللہ کی اُس رحمتِ خاص کو پا سکے جو دوسری بے اختیار مخلوقات کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اُس ذی اختیار مخلوق کے لیے ہے جو جِبِلّی طور پر نہیں، شُعوری طور پر اپنے اختیار سے اللہ کو اپنا ولی (patron, guardian) بنائے۔ یہ رَوِش جو انسان اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سہارا دے کر، اس کی رہنمائی کر کے، اسے حسنِ عمل کی توفیق دے کر، اپنی رحمتِ خاص میں داخل کر لیتا ہے۔ اور جو انسان اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اُن کو ولی بناتا ہے جو درحقیقت ولی نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے، وہ اس رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کا اور ساری مخلوقات کا ولی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے نہ حقیقت میں ولی ہیں، نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ وِلایَت کا حق ادا کر سکیں۔ انسان کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے اختیار سے ولی کا انتخاب کرنے میں غلطی نہ کرے، اور اُسی کو اپنا ولی بنائے جو درحقیقت ولی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس دین کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، وہ حقیقت میں ہے کیا:

اُس کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کائنات اور انسان کا خالق، مالک اور ولیِ حقیقی ہے، اس لیے وہی انسان کا حاکم بھی ہے، اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان کو دین اور شریعت (اعتقاد و عمل کا نظام) دے اور انسانی اختلافات کا فیصلہ کر کے بتائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ دوسری کسی ہستی کو انسان کے لیے شارع (lawgiver) بننے کا سرے سے حق ہی نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر، فطری حاکمیت کی طرح تشریعی حاکمیت بھی اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان یا کوئی غیر اللہ اس حاکمیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص اللہ کی اِس حاکمیت کو نہیں مانتا تو اس کا اللہ کی محض نظری حاکمیت کو ماننا لاحاصل ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے انسان کے لیے ایک دین مقرر کیا ہے۔

وہ ایک ہی دین تھا جو ہر زمانے میں تمام انبیاؑ کو دیا جاتا رہا۔ کوئی نبی بھی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی نہیں تھا۔ وہی ایک دین اوّل روز سے نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا رہا ہے، اور سارے انبیاؑ اُسی کے پیرو اور داعی رہے ہیں۔

وہ دین کبھی محض مان کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں بھیجا گیا، بلکہ ہمیشہ اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے کہ زمین پر وہی قائم اور رائج اور نافذ ہو، اور اللہ کے ملک میں اللہ کے دین کے سوا کسی اور کے ساختہ و پرداختہ دین کا سکّہ نہ چلے۔ انبیا علیہم السلام اس دین کی محض تبلیغ پر نہیں بلکہ اُسے قائم کرنے کی خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔

نوعِ انسانی کا اصل دین یہی تھا، مگر انبیاؑ کے بعد ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ خود غرض لوگ اس کے اندر اپنی خود پسندی، خود رائی اور خودنُمائی کے باعث اپنے مفاد کی خاطر تَفرِقے برپا کر کر کے نئے نئے مذہب نکالتے رہے۔ دنیا میں یہ جتنے بھی مختلف مذہب پائے جاتے ہیں، سب اُسی ایک دین کو بگاڑ کر پیدا کیے گئے ہیں۔

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان متفرق طریقوں اور مصنوعی مذہبوں اور انسانی ساخت کے دینوں کی جگہ وہی اصل دین لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اسی کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے اگر تم اُلٹے بگڑتے ہو اور لڑنے کو دَوڑتے ہو تو یہ تمھاری نادانی ہے۔ تمھاری اس حماقت کی وجہ سے نبی اپنا کام نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ اس بات پر مامور ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ اپنے مَوقِف پر جم جائے اور اُس کام کو پورا کرے جس پر وہ مامور ہوا ہے۔ اُس سے یہ اُمید نہ رکھو کہ وہ تمھیں راضی کرنے کے لیے دین میں اُنھی اَوہام وخُرافات اور جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کے لیے کوئی گنجایش نکالے گا جن سے خدا کا دین پہلے خراب کیا جاتا رہا ہے۔

تم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو اختیار کرنا اللہ کے مقابلے میں کتنی بڑی جسارت ہے۔ تم اپنے نزدیک اسے دنیا کا معمول سمجھ رہے ہو، اور تمھیں اس میں کوئی قَباحت نظر نہیں آتی۔ مگر اللہ کے نزدیک یہ بدترین شرک اور شدید ترین جرم ہے، جس کی سخت سزا اُن سب لوگوں کو بھگتنی پڑے گی جنھوں نے اللہ کی زمین پر اپنا دین جاری کیا اور جنھوں نے اُن کے دین کی پیروی اور اطاعت کی۔

اِس طرح دین کا ایک صاف اور واضح تصور پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم لوگوں کو سمجھا کر راہِ راست پر لانے کے لیے جو بہتر سے بہتر طریقہ ممکن تھا، وہ استعمال کیا جا چکا۔ ایک طرف اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی جو نہایت دل نشین طریقے سے تمھاری اپنی زبان میں تمھیں حقیقت بتا رہی ہے، اور دوسری طرف

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی زندگیاں تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر تم جان سکتے ہو کہ اس کتاب کی رہنمائی میں کیسے انسان تیار ہوتے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم ہدایت نہ پاؤ تو پھر دنیا میں کوئی چیز تمھیں راہِ راست پر نہیں لاسکتی۔ اس کا نتیجہ تو پھر یہی ہے کہ تمھیں اُسی گمراہی میں پڑا رہنے دیا جائے جس میں تم صدیوں سے مبتلا ہو، اور اُسی انجام سے تم کو دوچار کر دیا جائے جو ایسے گمراہوں کے لیے اللہ کے ہاں مقدّر ہے۔

اِن حقائق کو بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں اختصار کے ساتھ توحید اور آخرت کے دلائل دیے گئے ہیں، دنیا پرستی کے نتائج پر مُتنبِّہ کیا گیا ہے، آخرت کی سزا سے ڈرایا گیا ہے، اور کفار کی اُن اَخلاقی کمزوریوں پر گرفت کی گئی ہے جو ہدایت سے اُن کے منہ موڑنے کا اصل سبب تھیں۔ پھر کلام کو ختم کرتے ہوئے دو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

ایک یا یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس سال میں ”کتاب“ کے تصوُّر سے بالکل خالی الذہن اور ایمان کے مسائل و مباحث سے قطعی ناواقف رہنا، اور پھر یکایک اِن دونوں چیزوں کو لے کر دنیا کے سامنے آجانا، آپؐ کے نبی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

دوسرے، یہ کہ آپؐ کا اپنی پیش کردہ تعلیم کو خدا کی تعلیم قرار دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ آپؐ خدا سے رُو دَر رُو کلام کرنے کے مُدّعی ہیں، بلکہ خدا نے یہ تعلیم تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ کو بھی تین طریقوں سے دی ہے: ایک وحی، دوسرے پردے کے پیچھے سے آواز، اور تیسرے فرشتے کے ذریعے سے پیغام۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی کہ مخالفین یہ الزام تراشی نہ کرسکیں کہ حضوؐر خدا سے رُو دَر رُو کلام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور حق پسند لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسان نبوت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہو، اُسے کن طریقوں سے ہدایات دی جاتی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۵۳ رکوعاتہا ۵

سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

ح م، ع س ق۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے[1]۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اُسی کا ہے، وہ برتر اور عظیم ہے[2]۔ قریب ہے کہ آسمان اُوپر سے پھٹ پڑیں[3]۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں

ا – افتتاحِ کلام کا یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ پسِ منظر میں وہ چہ می گوئیاں ہیں جو مکۂ معظمہ کی ہر محفل، ہر چوپال، ہر کوچہ و بازار اور ہر مکان اور دُکان میں اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور قرآن کے مضامین پر ہو رہی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ نہ معلوم یہ شخص کہاں سے یہ نرالی باتیں نکال نکال کر لا رہا ہے۔ ہم نے تو ایسی باتیں نہ کبھی سُنیں، نہ ہوتے دیکھیں۔ وہ کہتے تھے: یہ عجیب ماجرا ہے کہ باپ دادا سے جو دین چلا آ رہا ہے، ساری قوم جس دین کی پیروی کر رہی ہے، سارے ملک میں جو طریقے صدیوں سے رائج ہیں، یہ شخص ان سب کو غلط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے جو دین مَیں پیش کر رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ وہ کہتے تھے: اِس دین کو بھی اگر یہ اِس حیثیت سے پیش کرتا کہ دینِ آبائی اور رائج الوقت طریقوں میں اِسے کچھ قباحت نظر آتی ہے اور اُن کی جگہ اِس نے خود کچھ نئی باتیں سوچ کر نکالی ہیں، تو اس پر کچھ گفتگو بھی کی جا سکتی تھی، مگر وہ تو کہتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ یہ بات آخر کیسے مان لی جائے؟ کیا خدا اِس کے پاس آتا ہے؟ یا یہ خدا کے پاس جاتا ہے؟ یا اس کی اور خدا کی بات چیت ہوتی ہے؟ انھی چرچوں اور چہ می گوئیوں پر بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے مگر دراصل کفار کو سناتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ہاں، یہی باتیں اللہ عزیز و حکیم وحی فرما رہا ہے اور یہی مضامین لیے ہوئے اس کی وحی پچھلے تمام انبیا پر نازل ہوتی رہی ہے۔

وحی کے لغوی معنی ہیں: ’’اشارۂ سریع‘‘ اور ’’اشارۂ خفی‘‘، یعنی ایسا اشارہ جو سُرعت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے، باقی کسی اور شخص کو اُس کا پتا نہ چلنے پائے۔ اِس لفظ کو اِصطلاحاً اُس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بجلی کی کوند کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جائے۔

لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ

درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں؎۴۔ آگاہ رہو، حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے؎۵۔ جن لوگوں نے

ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ کے کسی کے پاس آنے یا اس کے پاس کسی کے جانے اور رُوبرو گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہوسکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرما لیتا ہے۔ اسی مضمون کا اعادہ سورت کی آخری آیات میں کیا گیا ہے، اور وہاں اسے زیادہ کھول کر بیان فرمایا گیا ہے۔

پھر یہ جو اُن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ نرالی باتیں ہیں، اس پر ارشاد ہوا ہے کہ یہ نرالی باتیں نہیں ہیں، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاؑ آئے ہیں، اُن سب کو بھی خدا کی طرف سے یہی کچھ ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔

۲ – یہ تمہیدی فقرے محض اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ارشاد نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ان کا ہر لفظ اُس پَس منظر سے گہرا ربط رکھتا ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف جو لوگ چہ می گوئیاں کر رہے تھے، ان کے اعتراضات کی اوّلین بنیاد یہ تھی کہ حضورؐ ان کو توحید کی دعوت دے رہے تھے، اور وہ اس پر کان کھڑے کر کر کے کہتے تھے کہ اگر اکیلا ایک اللہ ہی معبُود، حاجت روا اور شارع ہے تو پھر ہمارے بزرگ کیا ہوئے؟ اس پر فرمایا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے۔ مالک کے ساتھ اس کی مِلکیّت میں کسی اور کی خداوندی آخر کس طرح چل سکتی ہے؟ خُصوصاً جب کہ وہ دوسرے، جن کی خداوندی مانی جاتی ہے، یا جو اپنی خداوندی چلانا چاہتے ہیں، خود بھی اُس کے مملوک ہی ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ برتر اور عظیم ہے، یعنی اِس سے بالاتر اور بزرگ تر ہے کہ کوئی اُس کا ہم سر ہو، اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی حصہ دار بن سکے۔

۳ – یعنی یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ کسی مخلوق کا نسب خدا سے جا ملایا گیا اور اسے خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دیا گیا۔ کسی کو حاجت روا اور فریاد رس ٹھیرا لیا گیا اور اس سے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ کسی بزرگ کو دنیا بھر کا کارساز سمجھ لیا گیا اور علانیہ کہا جانے لگا کہ ہمارے حضرت ہر وقت ہر جگہ ہر شخص کی سنتے ہیں اور وہی ہر ایک کی مدد کو پہنچ کر اس کے کام بنایا کرتے ہیں۔ کسی کو اَمر و نَہی اور حلال و حرام کا مختار مان لیا گیا اور خدا کو چھوڑ کر لوگ اس کے احکام کی اطاعت اِس طرح کرنے لگے کہ گویا وہی اِن کا خدا ہے۔ خدا کے مقابلے میں یہ وہ جسارتیں ہیں جن پر اگر آسمان پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ (یہی مضمون سورۂ مریم، آیات ۸۸-۹۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے۔)

۴ – مطلب یہ ہے کہ فرشتے انسانوں کی یہ باتیں سُن سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ کیا بکواس ہے جو ہمارے رب کی شان میں کی جا رہی ہے، اور یہ کیسی بغاوت ہے جو زمین کی اس مخلوق نے برپا کر رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: سبحان اللہ! کس کی یہ حیثیت ہوسکتی ہے کہ رب العالمین کے ساتھ اُلوہیت اور حکم میں شریک ہوسکے، اور کون اُس کے سوا ہمارا اور سب بندوں کا محسن ہے کہ اُس کی حمد کے ترانے گائے جائیں اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ پھر وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایسا جُرمِ عظیم دنیا میں کیا جا رہا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝٦ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ

اُس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست[۶] بنا رکھے ہیں، اللہ ہی اُن پر نگراں ہے، تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو[۷]۔

ہاں، اِسی طرح اَے نبیؐ! یہ قرآنِ عربی ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے[۸]، تاکہ تم بستیوں کے مرکز

جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہر وقت بھڑک سکتا ہے، اس لیے وہ زمین پر بسنے والے اِن خود فراموش و خدا فراموش بندوں کے حق میں بار بار رحم کی درخواست کرتے ہیں کہ ابھی ان پر عذاب نازل نہ کیا جائے اور انھیں سنبھلنے کا کچھ اور موقع دیا جائے۔

۵ – یعنی یہ اُس کی حلیمی و رحیمی اور چشم پوشی و درگزر ہی تو ہے جس کی بدولت کفر اور شرک اور دَہریت اور فسق و فُجور اور ظلم و ستم کی انتہا کر دینے والے لوگ بھی سال ہا سال تک، بلکہ اس طرح کے پورے پورے معاشرے صدیوں تک مہلت پر مہلت پاتے چلے جاتے ہیں، اور ان کو صرف رزق ہی نہیں ملے جاتا بلکہ دنیا میں ان کی بڑائی کے ڈنکے بجتے ہیں اور زینتِ حیاتِ دُنیا کے وہ سرو سامان انھیں ملتے ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر نادان لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے۔

۶ – اصل میں لفظ ''اَوْلِيَآء'' استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبُودانِ باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں، جن کو قرآنِ مجید میں ''اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک کا تتبُّع کرنے سے لفظِ ''ولی'' کے حسبِ ذیل مفہومات معلوم ہوتے ہیں:

۱- جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے، اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین و ضوابط کی پیروی کرے۔ (النساء، آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف: ۳-۲۷ تا ۳۰)

۲- جس کی رہنمائی (guidance) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۵۷۔ بنی اسرائیل: ۹۷۔ الکہف: ۱۷-۵۰۔ الجاثیہ: ۱۹)

۳- جس کے متعلق آدمی یہ کہے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے، اور اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے، تو اُس کے عذاب سے بچا لے گا۔ (النساء: ۱۲۳-۱۷۳۔ الانعام: ۵۱۔ الرعد: ۳۷۔ العنکبوت: ۲۲۔ الاحزاب: ۶۵۔ الزمر: ۳)

۴- جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات و مصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں بر لاتا ہے، اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ (ہود: ۲۰۔ الرعد: ۱۶۔ العنکبوت: ۴۱)

بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ

أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ
فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ

(شہرِ مکہ) اور اُس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو[9]، اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو[10]، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔

اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے،

اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیتِ زیرِ تشریح بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورۂ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی و مددگار سمجھنا ہے۔

۷ – ''اللہ ہی ان پر نگراں ہے''، یعنی وہ ان کے سارے افعال دیکھ رہا ہے اور اُن کے نامۂ اعمال تیار کر رہا ہے۔ ان کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ ''تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو''، یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی قسمت تمہارے حوالے نہیں کر دی گئی ہے کہ جو تمہاری بات نہ مانے گا، اُسے تم جلا کر خاک کر دو گے، یا اُس کا تختہ اُلٹ دو گے، یا اُسے تہس نہس کر کے رکھ دو گے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے، اور آپؐ کی غلط فہمی یا بر خود غلطی کو رفع کرنے کے لیے یہ بات ارشاد ہوئی ہے۔ بلکہ اس سے مقصود کفار کو سنانا ہے۔ اگرچہ بظاہر مخاطب حضورؐ ہی ہیں، لیکن اصل مُدّعا کفار کو یہ بتانا ہے کہ اللہ کا نبی اُس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا جیسے بلند بانگ دعوے خدا رسیدگی اور رُوحانیت کے ڈھونگ رچانے والے عُموماً تمہارے ہاں کیا کرتے ہیں۔ جاہلیت کے معاشروں میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ''حضرت'' قسم کے لوگ ہر اُس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں جو ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔ بلکہ مر جانے کے بعد اُن کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزرے، یا اور کچھ نہیں تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو وہ اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ''حضرتوں'' کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے، اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے، اُن کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لیے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ اُن کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہرحال عوام میں اِسے روحانیت و خدا رسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی کو قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ اسی فریب کا طِلسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے رسولِ پاک سے فرما رہا ہے کہ بلاشبہ تم ہمارے پیغمبر ہو اور ہم نے اپنی وحی سے تمہیں سرفراز کیا ہے، مگر تمہارا کام صرف لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔ اُن کی قسمتیں تمہارے حوالے نہیں کر دی گئی ہیں۔ وہ ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ بندوں کے اعمال کو دیکھنا اور اُن کو عذاب دینا یا نہ دینا ہمارا اپنا کام ہے۔

۸ – وہی بات پھر دُہرا کر زیادہ زور دیتے ہوئے کہی گئی ہے جو آغازِ کلام میں کہی گئی تھی۔ اور ''قرآنِ عربی'' کہہ کر سامعین

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۹﴾ ع

اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔[11] کیا (یہ ایسے نادان ہیں کہ) اِنھوں نے اُسے چھوڑ کر
دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے، وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔[12] ع

کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، تمھاری اپنی زبان میں ہے۔ تم براہِ راست اسے خود سمجھ سکتے ہو۔ اس کے مضامین پر غور کر کے دیکھو کہ یہ پاک صاف اور بے غرض رہنمائی کیا خداوندِ عالَم کے سوا کسی اَور کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔

۹ – یعنی انھیں غفلت سے چونکا دو اور مُتنبّہ کر دو کہ افکار و عقائد کی جن گمراہیوں اور اخلاق و کردار کی جن خرابیوں میں تم لوگ مبتلا ہو، اور تمھاری انفرادی اور قومی زندگی جن فاسد اُصولوں پر چل رہی ہے، ان کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۰ – یعنی انھیں یہ بھی بتا دو کہ یہ تباہی و بربادی صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ آگے وہ دن بھی آتا ہے جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جمع کر کے اُن کا حساب لے گا۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنی گمراہی و بدعملی کے بُرے نتائج سے بچ بھی نکلا تو اُس دن بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور بڑا ہی بدقسمت ہے وہ جو یہاں بھی خراب ہو اور وہاں بھی اُس کی شامت آئے۔

۱۱ – یہ مضمون اس سلسلۂ کلام میں تین مقاصد کے لیے آیا ہے:

اوّلاً، اس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم اور تسلّی دینا ہے۔ اس میں حضورؐ کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ آپؐ کُفارِ مکہ کی جہالت و ضلالت اور اُوپر سے اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ دیکھ کر اس قدر زیادہ نہ کُڑھیں، اللہ کی مرضی یہی ہے کہ انسانوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہدایت چاہے اسے ہدایت ملے، اور جو گمراہ ہی ہونا پسند کرے اسے جانے دیا جائے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی مصلحت نہ ہوتی تو انبیاؑ اور کتابیں بھیجنے کی حاجت ہی کیا تھی، اس کے لیے تو اللہ جَلّ شانُہٗ کا ایک تخلیقی اشارہ کافی تھا، سارے انسان اُسی طرح مُطیعِ فرمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی، پتھر اور سب حیوانات ہیں۔ (اِس مقصد کے لیے یہ مضمون دوسرے مقامات پر بھی قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۳ تا ۲۵-۷۱)

ثانیاً، اس کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جو اِس ذہنی اُلجھن میں گرفتار تھے اور اب بھی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ فی الواقع انسانوں کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا، اور اگر عقیدہ و عمل کے یہ اختلافات، جو لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اُسے پسند نہ تھے، اور اگر اُسے پسند یہی تھا کہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کریں، تو اس کے لیے آخر وحی اور کتاب اور نبوّت کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو وہ بآسانی اس طرح کر سکتا تھا کہ سب کو مومن و مسلم پیدا کر دیتا۔ اِسی اُلجھن کا ایک شاخسانہ یہ استدلال بھی تھا کہ جب اللہ نے ایسا نہیں کیا ہے تو ضرور وہ مختلف طریقے جن پر ہم چل رہے ہیں، اس کو پسند ہیں، اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُسی کی مرضی سے کر رہے ہیں، لہٰذا اُس پر اعتراض کا کسی کو حق نہیں ہے۔ (اِس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے بھی یہ مضمون قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مُلاحظہ ہو:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي

تمہارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔[14] وہی اللہ میرا[15]

تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۸۰-۱۱۰-۱۲۳-۱۲۵۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۰۱، ہود، حاشیہ ۱۱۶، النحل، حواشی ۱۰-۳۱-۳۲)

۱۱ – اس کا مقصد اہلِ ایمان کو اُن مشکلات کی حقیقت سمجھانا ہے جو تبلیغِ دین اور اصلاحِ خلق کی راہ میں اکثر پیش آتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی آزادیِ انتخاب و ارادہ، اور اس کی بنا پر طبائع اور طریقوں کے اختلاف کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ کبھی تو کارِ اصلاح کی سُست رفتاری دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کرامتیں اور معجزات رونما ہوں، تاکہ انھیں دیکھتے ہی لوگوں کے دل بدل جائیں، اور کبھی وہ ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لے کر اصلاح کے بے جا طریقے اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (اس مقصد کے لیے بھی یہ مضمون بعض مقامات پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حواشی ۴۷ تا ۴۹، النحل ۸۹ تا ۹۷)

اِن مقاصد کے لیے ایک بڑا اہم مضمون اِن مختصر سے فقروں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ دنیا میں اللہ کی حقیقی خلافت اور آخرت میں اس کی جنت کوئی معمولی رحمت نہیں ہے جو مٹی اور پتھر اور گدھوں اور گھوڑوں کے مرتبے کی مخلوق پر ایک رحمتِ عام کی طرح بانٹ دی جائے۔ یہ تو ایک خاص رحمت اور بہت اُونچے درجے کی رحمت ہے، جس کے لیے فرشتوں تک کو موزوں نہ سمجھا گیا۔ اسی لیے انسان کو ایک ذی اختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کر کے اللہ نے اپنی زمین کے یہ وسیع ذرائع اُس کے تصرّف میں دیے، اور یہ ہنگامہ خیز طاقتیں اس کو بخشیں، تاکہ یہ اُس امتحان سے گزر سکے جس میں کامیاب ہو کر ہی کوئی بندہ اُس کی یہ رحمتِ خاص پانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ رحمت اللہ کی اپنی چیز ہے۔ اس پر کسی کا اِجارہ نہیں ہے، نہ کوئی اسے اپنے ذاتی استحقاق کی بنا پر دعوے سے لے سکتا ہے، نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اسے بزور حاصل کر سکے۔ اِسے وہی لے سکتا ہے جو اللہ کے حضور بندگی پیش کرے، اس کو اپنا ولی بنائے اور اس کا دامن تھامے۔ تب اللہ اس کی مدد اور رہنمائی کرتا ہے، اور اُسے اِس امتحان سے بخیریت گزرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے، تاکہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہو سکے۔ لیکن جو ظالم اللہ ہی سے منہ موڑ لے اور اس کے بجائے دوسروں کو اپنا ولی بنا بیٹھے، اللہ کو کچھ ضرورت نہیں پڑی ہے کہ خواہ مخواہ زبردستی اس کا ولی بنے، اور دوسرے جن کو وہ ولی بناتا ہے، سرے سے کوئی علم، کوئی طاقت اور کسی قسم کے اختیارات ہی نہیں رکھتے کہ اس کی وِلایت کا حق ادا کر کے اسے کامیاب کرا دیں۔

۱۲ – یعنی وِلایت کوئی مَن سمجھوتے کی چیز نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں اپنا ولی بنا بیٹھیں، اور وہ حقیقت میں بھی آپ کا سچا اور اصلی ولی بن جائے اور وِلایت کا حق ادا کر دے۔ یہ تو ایک امرِ واقعی ہے جو لوگوں کی خواہشات کے ساتھ بنتا اور بدلتا نہیں چلا جاتا، بلکہ جو حقیقت میں ولی ہے وہی ولی ہے، خواہ آپ اسے ولی نہ سمجھیں اور نہ مانیں، اور جو حقیقت میں ولی نہیں ہے وہ ولی نہیں ہے، خواہ آپ مرتے دم تک اسے ولی سمجھتے اور مانتے چلے جائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ صرف اللہ ہی کے ولیِ حقیقی ہونے اور دوسرے کسی کے نہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی ولی وہی ہو سکتا ہے جو موت کو حیات میں تبدیل کرتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر جیتا جاگتا انسان پیدا کیا ہے، اور جو حقِ ولایت ادا کرنے کی قدرت اور اختیارات بھی رکھتا ہے۔ وہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہو تو اسے ولی بناؤ۔ اور اگر وہ صرف اللہ ہی ہے، تو پھر اس کے سوا کسی اور کو اپنا ولی بنا لینا جہالت وحماقت اور خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۱۳ – اس پورے پیراگراف کی عبارت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، لیکن اس میں متکلّم اللہ تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا اللہ جَلَّ شانُہٗ اپنے نبی کو ہدایت دے رہا ہے کہ تم یہ اعلان کرو۔ اس طرح کے مضامین قرآنِ مجید میں کہیں تو قُلْ (اے نبی! کہو) سے شروع ہوتے ہیں، اور کہیں اس کے بغیر ہی شروع ہو جاتے ہیں، صرف اندازِ کلام بتا دیتا ہے کہ یہاں متکلّم اللہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو کلام اللہ کا ہوتا ہے اور متکلّم اہلِ ایمان ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ فاتحہ میں ہے، یا متکلّم فرشتے ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ مریم، آیت ۶۴-۶۵ میں ہے۔

۱۴ – یہ اللہ تعالیٰ کے مالکِ کائنات اور ولیِ حقیقی ہونے کا فطری اور منطقی تقاضا ہے۔ جب بادشاہی اور ولایت اُسی کی ہے تو لامحالہ پھر حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے باہمی تنازعات و اختلافات کا فیصلہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ اس کو جو لوگ صرف آخرت کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، وہ غلطی کرتے ہیں۔ کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ اللہ کی یہ حاکمانہ حیثیت اِس دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف موت کے بعد کی زندگی کے لیے ہے۔ اِسی طرح جو لوگ اِس دنیا میں صرف عقائد اور چند "مذہبی" مسائل تک اسے محدود قرار دیتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ عام ہیں، اور وہ صاف صاف عَلَی الاطلاق تمام نزاعات و اختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں۔ ان کی رُو سے اللہ جس طرح آخرت کا مالک یوم الدین ہے، اسی طرح اِس دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے۔ اور جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام و مکروہ کیا، اخلاق میں بدی و زشتی کیا ہے اور نیکی و خوبی کیا، معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے، معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت میں کون سے طریقے دُرست ہیں اور کون سے غلط۔ آخر اسی بنیاد پر تو قرآن میں یہ بات اُصولِ قانون کے طور پر ثبت کی گئی ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹) اور وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶) اور اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ (الاعراف: ۳)

پھر جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے، اُس کے اندر یہ ایک اور معنیٰ بھی دے رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اختلافات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا محض قانونی حق ہی نہیں ہے، جس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کافر و مومن ہونے کا مدار ہے، بلکہ اللہ فی الواقع عملاً بھی حق اور باطل کا فیصلہ کر رہا ہے، جس کی بدولت باطل اور اس کے پرستار آخرکار تباہ ہوتے ہیں اور حق اور اس کے پرستار سرفراز کیے جاتے ہیں، خواہ اس فیصلے کے نفاذ میں دنیا والوں کو کتنی ہی تاخیر ہوتی نظر آتی ہو۔ یہ مضمون آگے آیت ۲۴ میں بھی آ رہا ہے، اور اس سے پہلے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرّعد، حواشی ۳۲-۶۰، ابراہیم، حواشی ۲۶-۳۴ تا ۴۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۵ تا ۱۸۔ ۴۴ تا ۴۶)

عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ ۖ وَ اِلَیۡهِ اُنِیۡبُ ۝ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ
جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ
یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡهِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝ لَهٗ
مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ

رب ہے، اُسی پر میں نے بھروسا کیا، اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں[16]۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمھاری اپنی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انھی کے ہم جنس) جوڑے بنائے، اور اِس طریقے سے وہ تمھاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں[17]، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے[18]، آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے کھلا رزق

۱۵ – یعنی جو اختلافات کا فیصلہ کرنے والا اصل حاکم ہے۔

۱۶ – یہ دو فعل ہیں، جن میں سے ایک بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے اور دوسرا بصیغۂ مضارع جس میں استمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صیغۂ ماضی میں فرمایا: ''میں نے اُسی پر بھروسا کیا''، یعنی ایک دفعہ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرلیا کہ جیتے جی مجھے اسی کی مدد، اُسی کی رہنمائی، اُسی کی حمایت وحفاظت، اور اُسی کے فیصلے پر اعتماد کرنا ہے۔ پھر صیغۂ مضارع میں فرمایا: ''میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''، یعنی جو معاملہ بھی مجھے اپنی زندگی میں پیش آتا ہے، میں اُس میں اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا کرتا ہوں۔ کوئی مصیبت، تکلیف، یا مشکل پیش آتی ہے تو کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اُس سے مدد مانگتا ہوں۔ کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو اُس کی پناہ ڈھونڈتا ہوں اور اُس کی حفاظت پر بھروسا کرتا ہوں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اُس سے رہنمائی طلب کرتا ہوں اور اُسی کی تعلیم وہدایت میں اُس کا حل یا حکم تلاش کرتا ہوں۔ اور کسی سے نزاع ہوتی ہے تو اُسی کی طرف دیکھتا ہوں کہ اُس کا آخری فیصلہ وہی کرے گا، اور یقین رکھتا ہوں کہ جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہی حق ہوگا۔

۱۷ – اصل الفاظ ہیں: لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ''کوئی چیز اُس کے مانند جیسی نہیں ہے۔'' مفسرین اور اہلِ لغت میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں لفظِ مثل پر کاف (حرفِ تشبیہ) کا اضافہ محاورے کے طور پر کیا گیا ہے، جس سے مقصود محض بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے، اور عرب میں یہ طرزِ بیان رائج ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے: وقتلی کمثل جُذوع النخل۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے: ما ان کمثلھم فی الناس من احد۔ بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ ''اس جیسا کوئی نہیں'' کہنے کے بجائے ''اُس کے مثل جیسا کوئی نہیں'' کہنے میں مبالغہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال اللہ کا کوئی مثل ہوتا تو اس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا، کجا کہ خود اللہ جیسا کوئی ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ يَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۝ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى
بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ
مُوْسٰى وَ عِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ

دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[19]

اُس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔[20] یہی بات

۱۸ – یعنی بیک وقت ساری کائنات میں ہر ایک کی سُن رہا ہے اور ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

۱۹ – یہ دلائل ہیں اِس امر کے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کیوں ولی برحق ہے، اور کیوں اسی پر توکُّل کرنا صحیح ہے، اور کیوں اسی کی طرف رُجوع کیا جانا چاہیے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ تا ۸۳، الروم، حواشی ۲۵ تا ۳۱)

۲۰ – یہاں اُسی بات کو پھر زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو پہلی آیت میں ارشاد ہوئی تھی۔ اِس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں، نہ انبیاؑ میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاؑ پیش کرتے چلے آرہے ہیں، اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اوّلین پیغمبر تھے، اُس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں، پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا گیا ہے جنھیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے، اور آخر میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ انھی پانچ انبیاؑ کو اس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاؑ بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اور نمونے کے طور پر اُن پانچ جلیل القدر انبیاؑ کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے:

فرمایا کہ "شَرَعَ لَكُمْ" "مقرر کیا تمھارے لیے"۔ شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اسی اِصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی

(legislation) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (law) کا، اور شارع کا لفظ واضعِ قانون (lawgiver) کا ہم معنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریعِ خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے اُن اُصولی حقائق کا جو اُوپر آیت نمبر ۱، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے، اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے، اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اُصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے، اس لیے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون و ضابطہ بنائے، اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے۔ چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے۔

پھر فرمایا: مِّنَ الدِّيْنِ، ''از قسم دین''۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ''از آئین'' کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے، اس کی نوعیت آئین کی ہے۔ لفظِ ''دین'' کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۳ میں کر چکے ہیں، وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیش نہیں آسکتی کہ دین کے معنیٰ ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اور جب یہ لفظ طریقے کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مطاع مانے۔ اِس بنا پر اللہ کے مقرر کیے ہوئے اِس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارش (recommendation) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لیے اُن کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنیٰ بغاوت کے ہیں، اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی، اور اُسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اِس تشریع کو براہِ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دوسرے، یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی زمانے میں کسی قوم کے لیے کوئی دین مقرر کیا گیا ہو، اور کسی دوسرے زمانے میں کسی اور قوم کے لیے اُس سے مختلف اور متضاد دین بھیج دیا گیا ہو۔ خدا کی طرف سے بہت سے دین نہیں آئے ہیں، بلکہ جب بھی آیا ہے یہی ایک دین آیا ہے۔ تیسرے، یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ اُن لوگوں کی رسالت کو ماننا، جن کے ذریعے سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے، اور اُس وحی کو تسلیم کرنا جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اِس دین کا لازمی جُز ہے، اور عقل و منطق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو لازمی جز ہونا چاہیے، کیونکہ آدمی اس تشریع کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ اُس کے خدا کی طرف سے مستند (authentic) ہونے پر مطمئن نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیا کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اِس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ اِس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''قائم کنید دین را'' کیا ہے، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''قائم رکھو دین کو''۔ یہ دونوں ترجمے دُرست ہیں۔ اِقامت کے معنیٰ قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی، اور انبیا علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم

Maktaba Tul Ishaat.com

کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اُس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو۔ ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں: ایک، یہ کہ دین کو قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے، یہ کہ خود دین سے کیا مراد ہے، جسے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اِن دونوں باتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

قائم کرنے کا لفظ جب کسی مادّی یا جسمانی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بیٹھے کو اٹھانا ہوتا ہے، مثلاً کسی انسان یا جانور کو اُٹھانا۔ یا پڑی ہوئی چیز کو کھڑا کرنا ہوتا ہے، جیسے بانس یا ستون کو قائم کرنا۔ یا کسی چیز کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے بلند کرنا ہوتا ہے، جیسے کسی خالی زمین میں عمارت قائم کرنا۔ لیکن جو چیزیں مادّی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں، اُن کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد اُس چیز کی محض تبلیغ کرنا نہیں، بلکہ اس پر کما حقّہٗ عمل درآمد کرنا، اسے رواج دینا اور اسے عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنی حکومت قائم کی، تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت کی طرف دعوت دی، بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا، اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا انتظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں قائم ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انصاف کرنے کے لیے منصف مقرر ہیں اور وہ مقدمات کی سماعت کر رہے ہیں اور فیصلے دے رہے ہیں، نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں خوب خوب بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب قرآنِ مجید میں حکم دیا جاتا ہے کہ نماز قائم کرو، تو اس سے مراد نماز کی دعوت و تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہلِ ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ رائج ہو جائے۔ مسجدیں ہوں، جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو، وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں، امام اور خطیب مقرر ہوں، اور لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔ اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آ سکتی کہ انبیا علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں، اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین اُن میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے، تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اِس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آ سکتا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے، بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے، مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے، کجا کہ کوئی شخص اسے انبیا کے مشن کا مقصدِ وحید قرار دے بیٹھے۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیا علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے، اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، اس لیے انھوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں، بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اُصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں

مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے۔ اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کردی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین وشریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دینِ بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی اُمت کو خراب کردیا۔ اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کردیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی۔ قرآنِ مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے، ان میں حسبِ ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ (البینہ: آیت ۵) ''اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی راست رو ملّت کا دین ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں، حالانکہ اِن دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزا، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اُس کے اوقات، اور یہی اس کے دوسرے احکام رہے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔ لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ اِن دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ...... اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ...... (المائدہ: ۳) ''تمھارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کرلیا، اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمھارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہوچکی ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کردیا...'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (التوبہ: ۲۹) ''جنگ کرو ان لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔'' معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال وحرام

Maktaba Tul Ishaat.com

کے اُن احکام کو ماننا اور اُن کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے دیے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النور:۲) ''زانیہ عورت اور مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف:۷۶) ''یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔'' اِس سے معلوم ہوا کہ فوج داری قانون بھی دین ہے۔ اگر آدمی خدا کے فوج داری قانون پر چلے تو وہ خدا کے دین کا پیرو ہے، اور اگر بادشاہ کے قانون پر چلے تو وہ بادشاہ کے دین کا پیرو۔

یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنّم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زنا، سود خواری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عملِ قومِ لُوط، اور لین دین میں قومِ شعیبؑ کا رَوِیّہ) اُن کا سدِّباب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہیے، اس لیے کہ دین اگر جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصّہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلودفی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے، مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (النساء:۱۴) ''جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اللہ کے حُدود سے تجاوز کرے گا، اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے رُسوا کُن عذاب ہے۔'' اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدّت اور قطعیّت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً ماں بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حُرمت، چوری کی حُرمت، جُوئے کی حُرمت، جھوٹی شہادت کی حُرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیے ہیں جن کا اِجرا مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، اُن کی اِقامت کو بھی محض اس بہانے اِقامت دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو صرف اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

دراصل ساری غَلَط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر اُمّت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی) کا اُلٹا مطلب لے کر اسے یہ معنٰی پہنا دیے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر اُمت کے لیے الگ تھی، اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیا کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اِقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مَقام پر یہ آیت آئی ہے، اُس کے پورے سِیاق وسَباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی اُمت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمت کے لیے دین تھی اور اُس کے دَورِ نبوت میں اُسی کی اِقامت مطلوب تھی۔

اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دَورِ نبوت ہے، اس لیے اُمّتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دَور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزا میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا، مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے، اُنھی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامت دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے، اس کے مطابق انھیں ادا کیا جائے۔ انھی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکام شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآنِ مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیّت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اَخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصّے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جاسکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء:۱۰۵) ''اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمھیں دکھائی ہے۔'' اِس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کے جو احکام دیے گئے ہیں، وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وُصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے۔ (التوبہ:۶۰-۱۰۳) اِس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۵-۲۷۹) وہ اُسی صورت میں رُوبہ عمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اِس کتاب میں قاتل سے قِصاص لینے کا حکم (البقرہ،۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ:۳۸)، زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور: ۲-۴) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ اِن احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قِتال کا حکم (البقرہ:۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اِس کتاب میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ:۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے اُن سے جزیہ وصول کریں گے اور اُن کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مَدَنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے، مکّی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آ سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبہ واقتدار کا تھا، نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے

Maktaba Tul Ishaat.com

ذمّی بن کر رہنے کا۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۸۹-۹۹-۱۰۱۔ جلد سوم، القصص، ۱۰۴-۱۰۵، الروم، ۱ تا ۳۔ جلد چہارم، الصّافات، آیات ۱۷۱ تا ۱۷۹ (حواشی ۹۳-۹۴) ص، دیباچہ اور آیت ۱۱ مع حاشیہ ۱۲۔

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضوؐر نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مُسخّر کیا، اور اُس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اَخلاق، تہذیب وتمدّن، معیشت ومعاشرت، سیاست وعدالت اور صلح وجنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضوؐر کے اس پورے کام کو ''اقامتِ دین'' کے اُس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیاؑ سمیت آپؐ کو دیا گیا تھا، تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں: یا تو معاذ اللہ! حضوؐر پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپؐ مامور تو صرف ایمانیات اور اَخلاق کے موٹے موٹے اُصولوں کی محض تبلیغ ودعوت پر ہوئے تھے، مگر آپؐ نے اس سے تجاوز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصل قانون بنا ڈالا، جو شرائعِ انبیاؑ کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شُوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا، اور اس نے اپنے آخری نبی سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورت کی اعلان کردہ ''اقامتِ دین'' سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا)، اعاذنا اللہ من ذالک۔ ان دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے ''اِقامتِ دین'' کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اُس کے رسولؐ پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوتا ہو تو ہم ضرور اُسے معلوم کرنا چاہیں گے۔

اِقامتِ دین کا حکم دینے کے بعد، آخری بات جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ''دین میں تَفرِقہ نہ برپا کرو''، یا ''اس کے اندر متفرق نہ ہو جاؤ''۔ دین میں تَفرِقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجایش اُس میں نہ ہو، اور اصرار کرے کہ اس کی نکالی ہوئی بات کے ماننے ہی پر کفر وایمان کا مدار ہے، پھر جو ماننے والے ہوں انھیں لے کر نہ ماننے والوں سے جدا ہو جائے۔ یہ نرالی بات کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو چیز نہ تھی وہ اس میں لا کر شامل کر دی جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو بات شامل تھی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی نُصوص میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلات کر کے نرالے عقائد اور انوکھے اعمال ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی باتوں میں ردّوبدل کر کے اس کا حلیہ بگاڑا جائے، مثلاً جو چیز اہم تھی اسے غیر اہم بنا دیا جائے، اور جو چیز حد سے حدِ مباح کے درجے میں تھی اسے فرض وواجب، بلکہ اس سے بھی بڑھا کر اسلام کا رکنِ رکین بنا ڈالا جائے۔ اسی طرح کی حرکتوں سے انبیا علیہم السلام کی اُمتوں میں پہلے تفرِقہ برپا ہوا، پھر رفتہ رفتہ ان فرقوں کے مذاہب بالکل الگ مستقل ادیان بن گئے جن کے ماننے والوں میں اب یہ تصور تک باقی نہیں رہا ہے کہ کبھی ان سب کی اصل ایک تھی۔ اِس تفرِقے کا اُس جائز اور معقول اختلافِ رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور نصوص پر غور کر کے اُن سے مسائل مُستنبَط کرنے میں فطری طور پر اہلِ علم کے درمیان واقع ہوتا ہے، اور جس کے لیے خود کتاب اللہ کے الفاظ میں لغت اور محاورے اور قواعدِ زبان کے لحاظ سے گنجایش

عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ
وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

اِن مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ!) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رُجوع کرے[21]۔ لوگوں میں جو تفرقہ رُونما ہوا، وہ اِس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آچکا تھا[22]، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے[23]۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک

ہوتی ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۳۰، آلِ عمران، حواشی ۱۶-۱۷، النساء، ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، ۱۰۱، الانعام، ۱۴۱۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۱۱۷ تا ۱۲۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۹ تا ۹۱، الحج، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۷، المومنون، ۴۵ تا ۴۸، القصص، ۲۷ تا ۴۷، الروم، ۵۰-۵۱)

۲۱ - یہاں پھر وہی بات دُہرائی گئی ہے جو اس سے پہلے آیت ۸-۹ میں ارشاد ہو چکی ہے اور جس کی تشریح ہم حاشیہ نمبر ۱۱ میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ یہ بات ارشاد فرمانے کا مُدّعا یہ ہے کہ تم اِن لوگوں کے سامنے دین کی صاف شاہراہ پیش کر رہے ہو، اور یہ نادان اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اُلٹے اس پر بگڑ رہے ہیں۔ مگر انھی کے درمیان انھی کی قوم میں وہ لوگ موجود ہیں جو اللہ کی طرف رُجوع کر رہے ہیں، اور اللہ بھی انھیں کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لا رہا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ کوئی اِس نعمت کو پائے اور کوئی اس پر خار کھائے۔ مگر اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اُسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس کی طرف بڑھے۔ دُور بھاگنے والوں کے پیچھے دوڑنا اللہ کا کام نہیں ہے۔

۲۲ - یعنی تفرقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں، اس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذہب اور مدارسِ فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تفرقہ اُن میں اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے دین کے صاف صاف اُصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

۲۳ - یعنی اس تفرقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضدم ضدا، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش، اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے، ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا و رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رجوع کریں گے، اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ

وقتِ مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔[۲۴] اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اُس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[۲۵]

چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے، اس لیے اے محمدؐ! اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور

ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں اُن کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقام امتیاز نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے ان کی مَشیخت چلے، اور لوگ اُن کے گرد جمع ہوں، اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادت اور مذہبی مراسم، اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرک بنا، اور اسی نے خلقِ خدا کے ایک بڑے حصے کو دین کی صاف شاہراہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی اِن گروہوں کی باہمی بحث وجدال اور مذہبی ومعاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت اُن خوں ریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخِ انسانی سُرخ ہو رہی ہے۔

۲۴ – یعنی دنیا ہی میں عذاب دے کر ان سب لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا جو گمراہیاں نکالنے اور جان بوجھ کر ان کی پیروی کرنے کے مجرم تھے، اور صرف راہِ راست پر چلنے والے باقی رکھے جاتے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ خدا کے نزدیک حق پر کون ہیں اور باطل پر کون۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دوٹوک فیصلہ قیامت تک کے لیے ملتوی کر رکھا ہے، کیونکہ دنیا میں یہ فیصلہ کر دینے کے بعد ہی نوعِ انسان کی آزمایش بے معنی ہو جاتی ہے۔

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اور اُس کے قریبی تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انھوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شکوک اور ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا ہو گئیں۔ اس حالت میں اُن کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وجوہ تھے، جنھیں ہم اُس صورتِ حال کا مُطالعہ کر کے بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو توراۃ و انجیل کے معاملے میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے اُن کی اصل حالت پر [illegible] محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ اُن میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر و ترجمہ [illegible] جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں [illegible] باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص [illegible] نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اس کے ہاتھ میں ہے، وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے ذریعے سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر ان کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون،

اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ

جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور اِن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو،[۲۶] اور ان سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا۔[۲۷] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔[۲۸] اللہ ہی[۲۹] ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔[۳۰]

طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظامِ فکر بنا ڈالے جن کی بُھول بُھلیّوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی، اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رُجوع بھی نہ کر سکتے تھے جو حق کو باطل سے مُمیّز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔

۲۶ – یعنی ان کو راضی کرنے کے لیے اِس دین کے اندر کوئی ردّوبدل اور کمی بیشی نہ کرو۔ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اُصول پر اِن گمراہ لوگوں سے کوئی مُصالحت نہ کرو۔ اِن کے اَوہام اور تعصّبات اور جاہلانہ طور طریقوں کے لیے دین میں کوئی گنجایش محض اِس لالچ میں آ کر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح یہ دائرۂ اسلام میں آ جائیں۔ جس کو ماننا ہے، خدا کے اصلی اور خالص دین کو، جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جس جہنم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے۔ خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

۲۷ – بالفاظِ دیگر، مَیں اُن تفرقہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اُس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے۔

۲۸ – اِس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں:

ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصّب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے، میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمھارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں، اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ

اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔"

اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں[۳۱]، اُن کی حُجت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر

ہے، بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حُقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لیے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے، اور جو جُرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اِس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی اِستثنا نہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سُپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں، اور اُن بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کر دوں جو تمھاری زندگیوں میں اور تمھارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔

ان تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکّہ معظّمہ میں نہ کُھلا تھا، مگر ہجرت کے بعد کُھل گیا، اور وہ یہ ہے کہ میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں، تمھارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔

۲۹ – یعنی ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے عمل کا خود ذمہ دار و جواب دِہ ہے۔ تم اگر نیکی کرو گے تو اس کا پھل ہمیں نہیں پہنچ جائے گا، بلکہ تم ہی اس سے مُتمتّع ہو گے۔ اور ہم اگر بُرائی کریں گے تو اس کی پاداش میں تم نہیں پکڑے جاؤ گے، بلکہ ہمیں خود ہی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۹، سورۂ یونس، آیت ۴۱، سورۂ ہود، آیت ۳۵، اور سورۂ قصص، آیت ۵۵ میں اس سے پہلے ارشاد ہو چکی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۲۹۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۴۹، ہود، حاشیہ ۳۹، القصص، حاشیہ ۷۷)

۳۰ – یعنی معقول دلائل سے بات سمجھانے کا جو حق تھا، وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اب خواہ مخواہ تُو تُو مَیں مَیں کرنے سے کیا حاصل؟ تم اگر جھگڑا کرو بھی تو ہم تم سے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۳۱ – یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے، مدّتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اسے چین لینے دیا جاتا نہ محلّے اور برادری میں، جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی، جس کا مدعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اسی جاہلیت میں پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
وَالْمِيْزَانَ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ يَسْتَعْجِلُ بِهَا
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ
يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ
ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْقَوِيُّ

اس کا غضب ہے اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے[۳۲]۔ اور تمھیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو[۳۳]۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سُن لو، جو لوگ اُس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے[۳۴]۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے[۳۵]، اور وہ بڑی قوت والا

۳۲ – میزان سے مراد اللہ کی شریعت ہے، جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی کا فرق واضح کر دیتی ہے۔ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا تھا کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں۔) یہاں بتا دیا گیا کہ اِس کتابِ پاک کے ساتھ وہ میزان آ گئی ہے جس کے ذریعے سے یہ انصاف قائم کیا جائے گا۔

۳۳ – یعنی جس کو سیدھا ہونا ہے بلا تاخیر سیدھا ہو جائے۔ فیصلے کی گھڑی کو دُور سمجھ کر ٹالنا نہیں چاہیے۔ ایک سانس کے متعلق بھی آدمی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے بعد دوسرے سانس کی اُسے مُہلت ضرور ہی مل جائے گی۔ ہر سانس آخری سانس ہو سکتا ہے۔

۳۴ – اصل میں لفظ لَطِیْفٌ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم "مہربان" سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک، یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۲

الْعَزِیْزُ ﴿۱۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ
كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ
مِنْ نَّصِیْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ

اور زبردست ہے[۳۶]۔ ع جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں ہے[۳۷]۔

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنھوں نے اِن کے لیے دین کی نوعیّت رکھنے والا ایک ایسا

اُن کی دَقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اور انھیں اس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کون سی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہلِ ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں، یعنی اللہ کا یہ لطف اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

۳۵ – مطلب یہ ہے کہ اِس لطفِ عام کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سب بندوں کو سب کچھ یکساں دے دیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے خزانوں سے دے سب ہی کو رہا ہے، مگر اس عطا اور دین میں یکسانی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی چیز دی ہے، تو کسی دوسرے کو کوئی اور چیز۔ کسی کو ایک چیز زیادہ دی ہے، تو کسی اور کو کوئی دوسری چیز فراوانی کے ساتھ عطا فرما دی ہے۔

۳۶ – یعنی اس کی عطا و بخشش کا یہ نظام اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ کسی کا یہ بَل بُوتا نہیں ہے کہ اسے بدل سکے، یا زبردستی اس سے کچھ لے سکے، یا کسی کو دینے سے اس کو روک سکے۔

۳۷ – گزشتہ آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی تھیں جن کا مُشاہدہ ہم ہر وقت ہر طرف کر رہے ہیں۔ ایک، یہ کہ تمام بندوں پر اللہ کا لُطف عام ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کی عطا و بخشش اور رزق رسانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، بلکہ اُس میں فرق و تفاوُت پایا جاتا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس لُطف اور رزق رسانی میں جُزوی تفاوُت تو بے شمار ہیں، مگر ایک بہت بڑا اُصولی تفاوُت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخرت کے طالب کے لیے ایک طرح کا رزق ہے، اور دنیا کے طالب کے لیے دوسری طرح کا رزق۔

یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے جسے اِن مختصر الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے، کیونکہ یہ ہر انسان کو اپنا رَوِیّہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آخرت اور دنیا دونوں کے لیے سعی و عمل کرنے والوں کو اس آیت میں کسان سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین تیار کرنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک مسلسل عرق ریزی اور جاں فشانی کرتا ہے، اور یہ ساری محنتیں اس غرض کے لیے کرتا ہے کہ اپنی کھیتی میں جو بیج وہ بو رہا ہے اس کی فصل کاٹے اور اس کے پھل سے متمتع ہو۔ لیکن نیت اور مقصد کے فرق، اور بہت بڑی حد تک طرزِ عمل کے فرق سے

يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ

طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟[۳۸] اگر فیصلے کی بات پہلے طے نہ ہوگئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا

بھی، آخرت کی کھیتی بونے والے کسان اور دنیا کی کھیتی بونے والے کسان کے درمیان فرقِ عظیم واقع ہو جاتا ہے، اس لیے دونوں کی محنتوں کے نتائج و ثمرات بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھے ہیں، حالانکہ دونوں کے کام کرنے کی جگہ یہی زمین ہے۔

آخرت کی کھیتی بونے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا اسے نہیں ملے گی۔ دنیا تو کم یا زیادہ بہرحال اس کو ملنی ہی ہے، کیونکہ یہاں اللہ جَلّ شانُہٗ کے لُطفِ عام میں اس کا بھی حصّہ ہے، اور رزق نیک و بد سبھی کو یہاں مل رہا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے خوشخبری دنیا ملنے کی نہیں بلکہ اس بات کی سنائی ہے کہ اس کی آخرت کی کھیتی بڑھائی جائے گی، کیونکہ اُسی کا وہ طالب ہے اور اُسی کے انجام کی اُسے فکر لاحق ہے۔ اس کھیتی کے بڑھائے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس قدر زیادہ نیک نیتی کے ساتھ وہ آخرت کے لیے عملِ صالح کرتا جائے گا، اُسے اور زیادہ نیک عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور اس کا سینہ نیکیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پاک مقصد کے لیے پاک ذرائع اختیار کرنے کا جب وہ تہیہ کر لے گا تو اس کے لیے پاک ہی ذرائع میں برکت دی جائے گی، اور اللہ اس کی نوبت نہ آنے دے گا کہ اس کے لیے خیر کے سارے دروازے بند ہو کر صرف شر ہی کے دروازے کھلے رہ جائیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا میں اس کی تھوڑی نیکی بھی آخرت میں کم از کم دس گُنی تو بڑھائی ہی جائے گی، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، ہزاروں لاکھوں گُنی بھی اللہ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا۔

رہا دنیا کی کھیتی بونے والا، یعنی وہ شخص جو آخرت نہیں چاہتا اور سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کے دو نتائج صاف صاف سنا دیے ہیں: ایک، یہ کہ خواہ وہ کتنا ہی سر مارے، جس قدر دنیا وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ پوری کی پوری اسے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کا ایک حصّہ ہی ملے گا، جتنا اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے، یہ کہ اسے جو کچھ ملنا ہے بس دنیا ہی میں مل جائے گا، آخرت کی بھلائیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۸- اس آیت میں شُرَکَاءُ سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پُوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اَخلاقی اُصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدّن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اِس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ ربّ العالمین کی تشریع کے خلاف اور اس کے اِذن (sanction) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۷۰-۲۸۶،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ
مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝۲۲ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا
الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ

ہوتا۔[۳۹] یقیناً اِن ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اُس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اِن پر آ کر رہے گا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ جنّت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جنھوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اَے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں،[۴۰] البتہ قرابت کی محبّت ضرور چاہتا ہوں۔[۴۱] جو کوئی بھلائی کمائے گا، ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔

آلِ عمران، حاشیہ ۵۷، النساء، حاشیہ ۹۰، المائدہ، حواشی ۱ تا ۵- ۱۰۴-۱۰۵، الانعام، حواشی ۸۶-۸۷-۱۰۶-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱، یونس، حواشی ۶۰-۶۱، ابراہیم، حواشی ۳۰ تا ۳۲، النحل، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۶۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۹-۵۰، مریم، حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۴۱، حاشیہ ۶۳، یٰسین، آیت ۶۰، حاشیہ ۵۳)

۳۹- یعنی اللہ کے مقابلے میں یہ ایسی سخت جسارت ہے کہ اگر فیصلہ قیامت پر نہ اُٹھا رکھا گیا ہوتا تو دنیا ہی میں ہر اُس شخص پر عذاب نازل کر دیا جاتا جس نے اللہ کا بندہ ہوتے ہوئے اللہ کی زمین پر خود اپنا دین جاری کیا، اور وہ سب لوگ بھی تباہ کر دیے جاتے جنھوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسروں کے بنائے ہوئے دین کو قبول کیا۔

۴۰- "اس کام" سے مراد وہ کوشش ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کے عذاب سے بچانے اور جنت کی بشارت کا مستحق بنانے کے لیے کر رہے تھے۔

۴۱ – اصل الفاظ ہیں: اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۔ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر ”قُربیٰ“ کی محبّت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ ”قُربیٰ“ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنیٰ میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو۔“ یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالے سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، ابنِ جَریر، طَبَرانی، بَیْہَقی اور ابنِ سَعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مُجاہد، عِکْرِمہ، قَتادہ، سُدِی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضَحّاک، عطا بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ ”قُربیٰ“ کو قُرب اور تقرّب کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ”میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اِس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمھارے اندر اللہ کے قُرب کی چاہت پیدا ہو جائے۔“ یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حَسَن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قَتادہؒ سے بھی اِس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طَبَرانی کی ایک رِوایت میں ابنِ عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مَقام پر یہی مضمون اِن الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان: ۵۷) ”اِن سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔“

تیسرا گروہ ”قُربیٰ“ کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ”میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبّت کرو۔“ پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمُطّلِب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبَیرؒ اور عَمرو بن شُعَیبؒ سے منقول ہے، اور بعض رِوایات میں یہی تفسیر ابنِ عباسؓ اور حضرت علیؓ بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدّد وُجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکّۂ معظّمہ میں سورۂ شُوریٰ نازل ہوئی ہے، اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمُطّلِب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کُھلّم کُھلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمُطّلِب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدۂ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اَقرِبا میں سے آپؐ صرف بنی عبدالمُطّلِب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبّت کو انھی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو اِن سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مَقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مَقام سے اِس کارِ عظیم پر

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے۔[۴۲]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اللہ پر جھوٹا بُہتان گھڑ لیا ہے؟[۴۳] اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مُہر کر دے۔[۴۴] وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔[۴۵] وہ

یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبّت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآنِ مجید میں انبیا علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں، اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔ (یونس، ۷۲۔ ہود، ۲۹-۵۱۔ الشعراء، ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰) سورۂ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے۔ (آیت ۲۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ (الانعام: ۹۰۔ یوسف: ۱۰۴۔ المومنون: ۷۲۔ الفرقان: ۵۷۔ سبا: ۴۷۔ ص: ۸۶۔ الطور: ۴۰۔ القلم: ۴۶) اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں، اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبّت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اُوپر سے ساری تقریر اُنھی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی رُوئے سُخن اُنھی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپؐ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمھاری انجام دی ہے، اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبّت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اِسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپؐ کی جان کے درپے تھے۔

۴۲ – یعنی جان بُوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس، نیکی کی کوشش کرنے والے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ (۱) جتنی کچھ اپنی طرف سے وہ نیک بننے کی سعی کرتے ہیں، اللہ ان کو اس سے زیادہ نیک بنا دیتا ہے۔ (۲) ان کے کام میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں، اللہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے، اور (۳) جو تھوڑی سی نیک عمل کی پونجی وہ لے کر آتے ہیں، اللہ اس پر ان کی قدر افزائی کرتا ہے اور انھیں زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔

۴۳ – اِس سوالیہ فقرے میں سخت ملامت کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! کیا یہ لوگ اس قدر جری اور بے باک ہیں کہ تم جیسے شخص پر افترا، اور وہ بھی افترا علی اللہ جیسے گھناؤنے فعل کا الزام رکھتے ہوئے انھیں ذرا شرم نہیں آتی؟ یہ تم پر تہمت لگاتے ہیں کہ تم اس قرآن کو خود تصنیف کر کے جھوٹ مُوٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو؟

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ
وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ

سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔[۴۶] وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور بُرائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اُسے علم ہے۔[۴۷] وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دُعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اَور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے،

۴۴ - یعنی اتنے بڑے جھوٹ صرف وہی لوگ بولا کرتے ہیں جن کے دلوں پر مُہر لگی ہوئی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمھیں بھی اُن میں شامل کر دے۔ مگر اُس کا یہ فضل ہے کہ اُس نے تمھیں اِس گروہ سے الگ رکھا ہے۔ اس جواب میں اُن لوگوں پر شدید طنز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام رکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! ان لوگوں نے تمھیں بھی اپنی قُماش کا آدمی سمجھ لیا ہے۔ جس طرح یہ خود اپنی اغراض کے لیے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ بول جاتے ہیں، اِنھوں نے خیال کیا کہ تم بھی اُسی طرح اپنی دکان چمکانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لائے ہو۔ لیکن یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمھارے دل پر وہ مُہر نہیں لگائی ہے جو اِن کے دلوں پر لگا رکھی ہے۔

۴۵ - یعنی یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائداری نہیں بخشتا، اور آخرِ کار حق کو حق ہی کر کے دکھا دیتا ہے، اس لیے اَے نبیؐ! تم اِن جھوٹے الزامات کی ذرّہ برابر پروا نہ کرو، اور اپنا کام کیے جاؤ۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اُڑ جائے گا، اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو، اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا۔

۴۶ - یعنی اُس کو معلوم ہے کہ یہ الزامات تم پر کیوں لگائے جا رہے ہیں، اور یہ ساری تگ و دَو جو تمھیں زک دینے کے لیے کی جا رہی ہے، اس کے پیچھے درحقیقت کیا اغراض اور کیا نیتیں کام کر رہی ہیں۔

۴۷ - پچھلی آیت کے معاً بعد توبہ کی ترغیب دینے سے خود بخود یہ مضمون نکلتا ہے کہ ظالمو! سچّے نبی پر یہ جھوٹے الزامات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو اَور زیادہ خدا کے عذاب کا مستحق بناتے ہو، اب بھی اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ اور توبہ کر لو تو اللہ معاف فرما دے گا۔ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس بُرائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آ جائے، اور آیندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز یہ بھی سچّی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے، اُس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس دھبّے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے۔ لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي
الْأَرْضِ وَلَٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ
بَصِيرٌ ﴿٢٧﴾ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ
رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ﴿٢٩﴾ ع

تو ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کُھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُن پر نگاہ رکھتا ہے۔[۴۸] وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، اور وہی قابلِ تعریف ولی ہے۔[۴۹] اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدایش، اور یہ جان دار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں۔[۵۰] وہ جب چاہے انھیں اکٹھا کر سکتا ہے۔[۵۱] ع

۴۸ – جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اللہ تعالیٰ اُس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرما رہا ہے جو کفارِ مکّہ کی سرکشی میں کام کر رہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلے میں ان کی کوئی ہستی نہ تھی اور گرد و پیش کی قوموں میں وہ ایک پس ماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ قبیلے، یا بالفاظِ دیگر، بنجاروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذرا سی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوش حالی اور بڑائی نصیب تھی، اُس نے اُن کو اتنا مغرور و متکبر بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، اور ان کے سردارانِ قبائل اِس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پیشوا ہوں اور وہ ان کی پیروی کریں۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کہیں ہم اِن چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے انھیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انھیں بس اُتنا ہی دے رہے ہیں جو اِن کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔ اس معنٰی کے لحاظ سے یہ آیت دوسرے الفاظ میں وہی مضمون ادا کر رہی ہے جو سورۂ توبہ، آیات ۶۸-۷۰، الکہف، آیات ۳۲-۴۲۔ القصص، آیات ۷۵-۸۲۔ الروم، آیت ۹۔ سبا، آیات ۳۴-۳۶۔ اور المومن، آیات ۸۲-۸۵ میں بیان ہوا ہے۔

۴۹ – یہاں ولی سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولّی ہے، جس نے بندوں کی

وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ
كَثِيۡرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۖۚ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ
مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهِ الۡجَوَارِ فِى الۡبَحۡرِ كَالۡاَعۡلَامِ ؕ ﴿۳۲﴾
اِنۡ يَّشَاۡ يُسۡكِنِ الرِّيۡحَ فَيَظۡلَلۡنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهۡرِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ

تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصُوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے[۵۲]۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ــــــ اِس میں

حاجات وضروریات پوری کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔

۵۰ - یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کھلا اشارہ ہے اس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیّاروں میں بھی جان دار مخلوقات موجود ہیں۔

۵۱ - یعنی جس طرح وہ انھیں پھیلا دینے پر قادر ہے، اُسی طرح وہ انھیں جمع کر لینے پر بھی قادر ہے، لٰہذا یہ خیال کرنا غلط ہے کہ قیامت نہیں آ سکتی اور تمام اولین و آخرین کو بیک وقت اُٹھا کر اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ - واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ روئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس وقت مکّۂ معظمہ میں کفر و نافرمانی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تمھارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمھیں جیتا ہی نہ چھوڑتا، لیکن یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں (غالباً اشارہ ہے مکّہ کے قحط کی طرف) یہ محض بطورِ تنبیہ ہیں، تاکہ تم ہوش میں آؤ، اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں تم کتنے بے بس ہو، اور یہ جانو کہ جنھیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسا کر رکھا ہے، وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتیں۔

مزید توضیح کے لیے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مومنِ مخلص کا تعلق ہے، اُس کے لیے اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔ اُس پر جو تکلیفیں بھی آتی ہیں وہ سب اُس کے گناہوں اور خطاؤں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ ولا وَصَبٍ ولا همّ ولاحزن ولا اذی ولاغمّ حتی الشوکة يُشَاكُهَا اِلّا كفّر الله بها من خطاياه۔ (بخاری و مسلم) "مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۟ۙ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ يَعْفُ عَنْ
كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ
مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَا

بڑی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو[۵۳] ——— یا (اُن پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انھیں ڈبو دے، اور اُس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتا چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے[۵۴]۔

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے[۵۵]، اور جو کچھ

حتّٰی کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چُبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفّارہ بنا دیتا ہے۔" رہے وہ مصائب جو اللہ کی راہ میں اُس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے، تو وہ محض کوتاہیوں کا کفّارہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہاں ترقّیِ درجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ وہ گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتے ہیں۔

۵۳ – "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں بندگی کے رَوِیّے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بُھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے، اور بُرا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اُتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اُٹھالے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں، اور خوش حالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

۵۴ – قریش کے لوگوں کو اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں حَبَش اور افریقا کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا، اور ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحرِ احمر سے گزرتے تھے، جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، اور زیرِ آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس کیفیت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کھینچا ہے، اسے قریش کے لوگ اپنے ذاتی تجرِبات کی روشنی میں پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔

۵۵ – یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پُھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدّت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اُس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا

عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۚ﴿۳۶﴾
وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ
يَغۡفِرُوۡنَ ۚ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَاَمۡرُهُمۡ

اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔[56] وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں،[57] جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں[58] اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں،[59] جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں،[60] نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے

ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اِترانا کسی ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اس مال و دولت کی، اور خود اِس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

۵۶ – یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے، بلکہ اَبدی اور لازوال ہے۔

۵۷ – اللہ پر توکّل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکّل کے معنیٰ یہ ہیں کہ: اوّلاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اَخلاق کے جو اُصول، حلال و حرام کے جو حُدُود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیے ہیں، وہی برحق ہیں اور انھی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسا اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے، جب کہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بنا کر، اُس کے مقرر کیے ہوئے حُدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عملِ صالح کا رَوِیّہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور انھی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور اُن سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ توکّل کے معنیٰ کی اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اُس کے بغیر جو ایمان محض خالی خُولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو، اُس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکّل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

۵۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۵۳ – ۵۴، الانعام، حواشی ۱۳۰ – ۱۳۱۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۸۹، نیز سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

Maktaba Tul Ishaat.com

شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۖ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ

سے چلاتے ہیں[۶۱]، ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶۲]، اور جب ان پر زیادتی

۵۹ – یعنی وہ غُصیل اور جھلّے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خُو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، ان کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی، بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اُسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے، جسے قرآنِ مجید میں نہایت قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے۔ (آلِ عمران، آیت ۱۳۴) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۵۹) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ما انتقم رسُول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لنفسه في شئ قطّ الا ان تنتهك حرمة اللّٰهِ۔ (بخاری و مسلم) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حُرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی، تب آپؐ سزا دیتے تھے۔''

۶۰ – لفظی ترجمہ ہوگا: ''اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں''، یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

۶۱ – اِس چیز کو یہاں اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اِس کے وُجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک، یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اُس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو، اُس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو اُن کے مُعتمدٌ عَلَیہ نمایندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

دوسرے، یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے، یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو، اُن میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اُسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی

اِس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پُرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو، اُن سب کو، یا اُن کے بھروسے کے نمایندوں کو اُس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے، اور اگر نادانستہ کوئی غَلَطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمے داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وُجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اَخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اُس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداَخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اُصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں، اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریکِ مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو اُن میں کُنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا بَرادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی مُتَّفَق عَلَیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے مُعتَمَد عَلَیہ نمایندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو اُن کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحبِ رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اُسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلّط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمایندے نہیں بلکہ وہ نمایندے منتخب کریں جو اُس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اُس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے مُلَوَّث ہو، اور اس خواہش کے ساتھ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خَلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکا مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکا نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غَلَطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

دوم، یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اسے لوگوں کی رضا مندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضا مندی ان کی آزادانہ رضا مندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضا مندی درحقیقت رضا مندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم، یہ کہ سربراہِ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمایندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم، یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی، نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم، یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولا سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے"، بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اُصولِ شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مُطلَقُ العِنان اور مختارِ کل نہیں ہے بلکہ لازماً اُس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اِس اصل الأصول کی پابند ہے کہ "تمھارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"، اور "تمھارے درمیان جو نزاع بھی ہو، اس میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رُجوع کرو"۔ اس قاعدہ کُلّیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اِس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اُس پر عمل درآمد کس طریقے سے کیا جائے، تاکہ اُس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو، اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

۶۲- اس کے تین مطلب ہیں:

ایک، یہ کہ جو رزقِ حلال ہم نے انھیں دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔

دوسرے، یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سَینت کر نہیں رکھتے، بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔

الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ
اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَ لَمَنِ

کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳]۔۔۔۔[۶۴] بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے[۶۵]، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے، اُس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے[۶۶]، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۶۷]۔ اور جو لوگ

تیسرے، یہ کہ جو رزق انھیں دیا گیا ہے اُس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔

پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزقِ حلال وطیّب ہی کو ’’اپنے دیے ہوئے رزق‘‘ سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کمائے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سَینت سَینت کر رکھنے اور اس پر مار زر بن کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآنِ مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں اِنفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انھی تین وُجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہلِ ایمان کی اُن بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انھی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

۶۳ – یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جبّاروں کے لیے نرم چارا نہیں ہوتے۔ اُن کی نرم خوئی اور عفوو درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انھیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زَعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبّر کے آگے نہیں جُھکتا۔ اِس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے، جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

۶۴ – یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ ماسبق کی تشریح کے طور پر ہے۔

۶۵ – یہ پہلا اُصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی بُرائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اُس سے زیادہ بُرائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

۶۶ – یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو، وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمے ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے

Maktaba Tul Ishaat.com

انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ
عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ
عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

ع

ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں، اُن کو ملامت نہیں کی جاسکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دُوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اُولوا العزمی کے کاموں میں سے ہے[۶۸]۔ ع
جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے، اُس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے[۶۹]۔

لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

۶۷ – اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک بُرائی کے بدلے میں اُس سے بڑھ کر بُرائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اُس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا دُرست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینے انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔

۶۸ – واضح رہے کہ ان آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، یہ اصل دولت وہ نہیں ہے، بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمہارے ہی معاشرے کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

۶۹ – مطلب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن جیسی بہترین کتاب ان لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجی جو نہایت معقول اور نہایت مؤثر و دل نشین طریقے سے ان کو حقیقت کا علم دے رہی ہے اور زندگی کا صحیح راستہ بتا رہی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی ان کی رہنمائی کے لیے بھیجا، جس سے بہتر سیرت و کردار کا آدمی کبھی ان کی نگاہوں نے نہ دیکھا تھا۔ اور اس کتاب اور

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ
مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٤﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ
يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۗ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اَلَآ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿٤٥﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ
يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٦﴾

تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے: اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟[70] اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلّت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے، اور اُس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔[71] اُس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنھوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلّقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو، ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں۔ جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے، اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔

اس رسول کی تعلیم و تربیت کے نتائج بھی اللہ نے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں انھیں آنکھوں سے دکھا دیے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہدایت سے منہ موڑتا ہے تو اللہ پھر اُسی گمراہی میں اسے پھینک دیتا ہے جس سے نکلنے کا وہ خواہش مند نہیں ہے۔ اور جب اللہ ہی نے اسے اپنے دروازے سے دھتکار دیا تو اب کون یہ ذمہ لے سکتا ہے کہ اسے راہِ راست پر لے آئے گا۔

۷۰ – یعنی آج جب کہ پلٹ آنے کا موقع ہے، یہ پلٹنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کل جب فیصلہ ہو چکے گا اور سزا کا حکم نافذ ہو جائے گا، اس وقت اپنی شامت دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اب انھیں پلٹنے کا موقع ملے۔

۷۱ – انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہولناک منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ جان رہا ہوتا ہے کہ عنقریب وہ اُس بلا کے چنگل میں آنے والا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہے، تو پہلے تو ڈر کے مارے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پھر اس سے رہا نہیں جاتا۔ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بلا کیسی ہے اور ابھی اُس سے کتنی دُور ہے۔ لیکن اس کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ سر اُٹھا کر نگاہ بھر کر اسے دیکھے۔ اس لیے وہ بار بار ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ
اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

مان لو اپنے رب کی بات، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے[۷۲]۔ اُس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اور نہ کوئی تمھارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہو گا[۷۳]۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ! ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۷۴]۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اُس پر پُھول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر اُلٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے[۷۵]۔

جہنّم کی طرف جانے والوں کی اسی کیفیت کا نقشہ اِس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

۷۲ – یعنی نہ اللہ خود اُسے ٹالے گا اور نہ کسی دوسرے میں یہ طاقت ہے کہ اسے ٹال سکے۔

۷۳ – اصل الفاظ ہیں: مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ۔ اس فقرے کے کئی مفہوم اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ تم اپنے کرتوتوں میں سے کسی کا انکار نہ کر سکو گے۔ دوسرے، یہ کہ تم بھیس بدل کر کہیں چُھپ نہ سکو گے۔ تیسرے، یہ کہ تمھارے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا اُس پر تم کوئی احتجاج اور اظہارِ ناراضی نہ کر سکو گے۔ چوتھے، یہ کہ تمھارے بس میں نہ ہو گا کہ جس حالت میں تم مبتلا کیے گئے ہو اسے بدل سکو۔

۷۴ – یعنی تمھارے اُوپر یہ ذمّہ داری تو نہیں ڈالی گئی ہے کہ تم اِنھیں ضرور راہِ راست ہی پر لا کے رہو، اور نہ اس بات کی تم سے کوئی باز پُرس ہونی ہے کہ یہ لوگ کیوں راہِ راست پر نہ آئے۔

۷۵ – انسان سے مراد یہاں وہ چھچھورے اور کم ظرف لوگ ہیں جن کا اُوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ جنھیں دنیا کا کچھ رزق مل گیا ہے تو اُس پر پُھولے نہیں سماتے، اور سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو سُن کر نہیں دیتے۔ لیکن اگر کسی وقت اپنے ہی کرتوتوں کی بدولت اُن کی شامت آ جاتی ہے تو قسمت کو رونا شروع کر دیتے ہیں اور اُن ساری نعمتوں کو بھول

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ
يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۙ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ
ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے[۷۶]، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں مِلا جُلا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے[۷۷]۔

جاتے ہیں جو اللہ نے اُنھیں دی ہیں اور کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جس حالت میں وہ مبتلا ہوئے ہیں اُس میں اُن کا اپنا کیا قصور ہے۔ اِس طرح نہ خوشحالی اُن کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہے، نہ بدحالی ہی انھیں سبق دے کر راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ اُن لوگوں کے رویّے پر طنز ہے جو اُوپر کی تقریر کے مخاطب تھے۔ مگر اُن کو خطاب کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ تمھارا حال یہ ہے، بلکہ بات یوں کہی گئی کہ انسان میں عام طور پر یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور یہی اُس کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اِس سے حکمتِ تبلیغ کا یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ مخاطب کی کمزوریوں پر براہِ راست چوٹ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ عُمومی انداز میں اُن کا ذکر کرنا چاہیے، تاکہ وہ چڑ نہ جائے، اور اُس کے ضمیر میں اگر کچھ بھی زندگی باقی ہے تو ٹھنڈے دل سے اپنے عیب کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

۷۶ – یعنی کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں، وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں، حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں اور جبّاروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی ہے، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوی اور دیوتا کا اس میں کوئی حصّہ ہے، بلکہ اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بَل بُوتے پر جیت سکتا ہے، نہ اُن ہستیوں میں سے کوئی آ کر اسے بچا سکتی ہے جنھیں لوگوں نے اپنی حماقت سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔

۷۷ – یہ اللہ کی بادشاہی کے مُطلَق (absolute) ہونے کا ایک کھلا ہُوا ثبوت ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے خدا نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا، جسے خدا نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے خدا نے لڑکے ہی لڑکے دیے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اِس معاملے میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختارِکُل ہونے کا زعم کرے، یا کسی دوسری ہستی کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ
حَكِيْمٌ ۝۵۱ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ

کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے[۷۸] کہ اللہ اُس سے رُوبرُو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے[۷۹]، یا پردے کے پیچھے سے[۸۰]، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے، اور وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے[۸۱]، وہ برتر اور حکیم ہے[۸۲]۔ اور اِسی طرح (اے محمدؐ!) ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمھاری طرف

اختیارات میں دخیل سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے، جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی تغیُّر واقع نہیں ہوتا۔

۷۸ – تقریر ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کو پھر لیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوا تھا۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس سورہ کی پہلی آیت اور اس کے حاشیے پر دوبارہ ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

۷۹ – یہاں وحی سے مراد ہے اِلقا، الہام، دل میں کوئی بات ڈال دینا، یا خواب میں کچھ دکھا دینا، جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا۔ (یوسف، آیات ۴–۱۰۰۔ الصّافّات، ۱۰۲)

۸۰ – مراد یہ ہے کہ بندہ ایک آواز سنے، مگر بولنے والا اُسے نظر نہ آئے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا کہ طور کے دامن میں ایک درخت سے یکایک انھیں آواز آنی شروع ہوئی، مگر بولنے والا ان کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ (طٰہٰ، آیات ۱۱ تا ۴۸۔ النمل، آیات ۸ تا ۱۲۔ القصص، آیات ۳۰ تا ۳۵)

۸۱ – یہ وحی کے آنے کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے سے تمام کُتُبِ آسمانی انبیا علیہم السلام تک پہنچی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ "اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچاتا ہے۔" لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (پھر وہ وحی کرتا ہے اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے) اُن کی اس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاؑ کی تبلیغ کو "وحی کرنے" سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے عَلانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجایش ہے۔ لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریع اشارے کے ہیں۔ انبیاؑ کی تبلیغ پر اِس لفظ کا اِطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔

۸۲ – یعنی وہ اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کسی بشر سے رُودرُرو کلام کرے، اور اس کی حکمت اِس سے عاجز نہیں ہے کہ اپنے کسی بندے تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لیے رُوبرو بات چیت کرنے کے سوا کوئی اور تدبیر نکال لے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع

وحی کی ہے[۸۳]۔ تمھیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے[۸۴]، مگر اُس رُوح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا، جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں[۸۵]۔ ع

۸۳ - ''اِسی طرح'' سے مراد محض آخری طریقہ نہیں ہے، بلکہ وہ تینوں طریقے ہیں جو اُوپر کی آیات میں مذکور ہوئے ہیں، اور ''رُوح'' سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعے سے حضورؐ کو دی گئی۔ یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن تینوں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں:

(۱) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا ہی سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ (بخاری و مسلم) یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مُطّلَع کیا گیا ہے، اور قرآنِ مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ (الفتح، آیت ۲۷) اس کے علاوہ متعدّد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اور احادیثِ قُدسیہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(۲) معراج کے موقع پر حضورؐ کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مُشرّف فرمایا گیا۔ متعدد صحیح احادیث میں حضورؐ کو پنج وقتہ نماز کا حکم دیے جانے، اور حضورؐ کے اُس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ اور اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ویسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا دامنِ طور میں حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

(۳) رہی تیسری قسم، تو اُس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اُسے جبریلِ امین کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا ہے۔ (البقرہ: ۹۷۔ الشعراء: ۱۹۲ تا ۱۹۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

۸۴ - یعنی نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضورؐ کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپؐ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے، یا ملنی چاہیے، بلکہ آپؐ سرے سے کُتُبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اِسی طرح آپؐ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپؐ نہ شُعوری طور پر اس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہییں، اور نہ آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کُتُبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفّارِ مکہ سے بھی چُھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکۂ معظّمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سنا ہو، یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فُلاں فُلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہوسکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب وروز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں، اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انھی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد۳، حاشیہ ۱۰۹ سورۃ القصص)

۸۵ - یہ آخری تنبیہ ہے جو کفار کو دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے کہا اور تم نے سُن کر ردّ کر دیا، اِس پر بات ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے حُضور پیش ہونا ہے، اور آخرِ کار اُسی کے دربار سے یہ فیصلہ ہونا ہے کہ کس کا کیا انجام ہونا چاہیے۔

تفہیم القرآن

الزخرف

(۴۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

الزُّخرُف

نام آیت ۳۵ کے لفظ وَزُخْرُفًا سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ زُخْرُف آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہے جس میں المومن، حٰم السجدہ اور الشوریٰ نازل ہوئیں۔ یہ ایک ہی سلسلے کی سورتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نُزول اُس وقت سے شروع ہوا جب کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ شب و روز اپنی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر مشورے کر رہے تھے کہ آپؐ کو کس طرح ختم کیا جائے، اور ایک حملہ آپؐ کی جان پر ہو بھی چکا تھا۔ اس صورتِ حال کی طرف آیات ۷۹-۸۰ میں صاف اشارہ موجود ہے۔

موضوع اور مَباحِث اس سورہ میں پورے زور کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے اُن جاہلانہ عقائد و اوہام پر تنقید کی گئی ہے جن پر وہ اصرار کیے چلے جا رہے تھے، اور نہایت محکم و دل نشین طریقے سے ان کی نامعقولیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد، جس کے اندر کچھ بھی معقولیت موجود ہو، یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر یہ کیسی جہالتیں ہیں جن سے ہماری قوم بُری طرح چمٹی ہوئی ہے۔ اور جو شخص ہمیں اِن کے چکّر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

کلام کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی شرارتوں کے بَل پر یہ چاہتے ہو کہ اس کتاب کا نُزول روک دیا جائے، مگر اللہ نے کبھی اَشرار کی وجہ سے انبیاؑ کی بِعثت اور کتابوں کی تنزیل نہیں روکی ہے، بلکہ اُن ظالموں کو ہلاک کر دیا ہے جو اُس کی ہدایت کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی کچھ وہ اب بھی کرے گا۔ آگے چل کر آیات ۴۱-۴۳ اور ۷۹-۸۰ میں یہ مضمون پھر دُہرایا گیا ہے۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے، اُن کو سناتے ہوئے حضورؐ سے فرمایا گیا ہے کہ تم خواہ زندہ رہو یا نہ رہو، ان ظالموں کو ہم سزا دے کر رہیں گے۔ اور خود اُن لوگوں کو صاف صاف مُتنبّہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہمارے نبی کے خلاف ایک اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کُن قدم اٹھائیں گے۔

اِس کے بعد بتایا گیا ہے کہ وہ مذہب کیا ہے جسے یہ لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور وہ دلائل کیا ہیں جن کے بَل بُوتے پر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا، اور اِن کا اپنا اور اِن کے معبُودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ جن نعمتوں سے یہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دوسروں کو اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک کرنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔

بندوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور اولاد بھی بیٹیاں جنھیں خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہیں۔

فرشتوں کو انھوں نے دیویاں قرار دے رکھا ہے۔ اُن کے بت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے ہیں۔ اُنھیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کی عبادت کرتے ہیں اور انھی سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ آخر انھیں کیسے معلوم ہوا کہ فرشتے عورتیں ہیں؟

اِن جہالتوں پر ٹوکا جاتا ہے تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے اِن بتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں، نہ کہ وہ کام جو دنیا میں اس کی مشیّت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیّت کے تحت تو ایک بت پرستی ہی نہیں، چوری، زنا، ڈاکا، قتل، سب ہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اس دلیل سے ہر اُس بُرائی کو جائز و برحق قرار دیا جائے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے؟

پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اِس شرک کے لیے تمھارے پاس اِس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے، تو جواب دیتے ہیں کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گویا اِن کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل ہے۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام، جن کی اولاد ہونے پر ہی اِن کے سارے فخر و امتیاز کا مدار ہے، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور اُنھوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو رد کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیلِ معقول نہ دیتی ہو۔ پھر اگر ان لوگوں کو اسلاف کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف، ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

اِن سے کہا جاتا ہے کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو یہ عیسائیوں کے اِس فعل کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اُنھوں نے عیسیٰ ابن مریم کو ابنُ اللہ مانا اور اُن کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی اُمت نے شرک کیا ہے یا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ خود کسی نبی نے شرک کی تعلیم دی ہے؟ عیسیٰ ابن مریم نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو۔ اُن کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے، کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمھارا رب بھی، اسی کی تم عبادت کرو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرنے میں انھیں تأمّل ہے تو اِس بنا پر کہ ان کے پاس مال و دولت اور ریاست و وجاہت تو ہے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہمارے ہاں کسی کو نبی بنانا چاہتا تو ہمارے

Maktaba Tul Ishaat.com

دونوں شہروں (مکہ و طائف) کے بڑے آدمیوں میں سے کسی کو بناتا۔ اِسی بنا پر فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کو حقیر جانا تھا، اور کہا تھا کہ آسمان کا بادشاہ اگر مجھ زمین کے بادشاہ کے پاس کوئی ایلچی بھیجتا تو اسے سونے کے کنگن پہنا کر، فرشتوں کی ایک فوج اس کی اَرْدَلی میں دے کر بھیجتا، یہ فقیر کہاں سے آ کھڑا ہوا؟ فضیلت مجھے حاصل ہے کہ مصر کی بادشاہی میری ہے اور دریائے نیل کی نہریں میری ماتحتی میں چل رہی ہیں۔ یہ شخص میرے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے کہ نہ مال رکھتا ہے نہ اقتدار۔

اِس طرح کفار کی ایک ایک جاہلانہ بات پر تنقید کرنے اور اس کے نہایت معقول و مدلّل جوابات دینے کے بعد آخر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ نہ خدا کی کوئی اولاد ہے، نہ آسمان و زمین کے خدا الگ الگ ہیں، نہ اللہ کے ہاں کوئی ایسا شفیع ہے جو جان بُوجھ کر گمراہی اختیار کرنے والوں کو اُس کی سزا سے بچا سکے۔ اللہ کی ذات اس سے مُنزّہ ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو۔ وہی اکیلا ساری کائنات کا خدا ہے، باقی سب اس کے بندے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ خدائی صفات و اختیارات میں شریک۔ اور شَفاعت اس کے ہاں صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود حق پرست ہوں، اور اُنھی کے لیے کر سکتے ہیں جنھوں نے دنیا میں حق پرستی اختیار کی ہو۔

---

۱۹ ۷
سورۃ الزخرف مکیۃ
رکوعاتھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾ وَ اِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ﴿۴﴾

ح م۔ قسم ہے اِس واضح کتاب کی کہ ہم نے اِسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے، تاکہ تم لوگ اِسے سمجھو[1]۔ اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے[2]، ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب[3]۔

۱ – قرآن مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف ''ہم'' ہیں، نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور قسم کھانے کے لیے قرآن کی جس صفت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ''کتابِ مبین'' ہے۔ اس صفت کے ساتھ قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر خود قرآن کی قسم کھانا آپ سے آپ یہ معنی دے رہا ہے کہ لوگو! یہ کھلی کتاب تمھارے سامنے موجود ہے، اِسے آنکھیں کھول کر دیکھو، اِس کے صاف صاف غیر مُبْہَم مضامین، اِس کی زبان، اِس کا ادب، اِس کی حق و باطل کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دینے والی تعلیم، یہ ساری چیزیں اِس حقیقت کی صریح شہادت دے رہی ہیں کہ اِس کا مصنف خداوندِ عالَم کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ ''ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم اِسے سمجھو''، اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، بلکہ تمھاری اپنی زبان میں ہے، اس لیے اسے جانچنے پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں تمھیں کوئی دِقّت پیش نہیں آسکتی۔ یہ کسی عجمی زبان میں ہوتا تو تم یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم اس کے کلام الٰہی ہونے یا نہ ہونے کی جانچ کیسے کریں، جب کہ ہماری سمجھ ہی میں یہ نہیں آرہا ہے۔ لیکن اس عربی قرآن کے متعلق تم یہ عذر کیسے کر سکتے ہو۔ اس کا ایک ایک لفظ تمھارے لیے واضح ہے۔ اس کی ہر عبارت اپنی زبان اور اپنے مضمون، دونوں کے لحاظ سے تم پر روشن ہے۔ خود دیکھ لو کہ کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی دوسرے عرب کا کلام ہو سکتا ہے۔ دوسرا مطلب اس ارشاد کا یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان ہم نے عربی اس لیے رکھی ہے کہ ہم عرب قوم کو مخاطب کر رہے ہیں، اور وہ عربی زبان کے قرآن ہی کو سمجھ سکتی ہے۔ عربی میں قرآن نازل کرنے کی اِس صریح معقول وجہ کو نظر انداز کر کے جو شخص صرف اس بنا پر اِسے کلام الٰہی کے بجائے کلامِ محمدؐ قرار دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان بھی عَرَبی ہے تو وہ بڑی زیادتی کرتا ہے۔ (اِس دوسرے مطلب کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ حٰم السجدہ، آیت ۴۴ مع حاشیہ نمبر ۵۴ مُلاحظہ فرمائیں۔)

۲ – ''اُمّ الکتاب'' سے مراد ہے: ''اصل الکتاب''، یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاؑ پر نازل ہونے والی کتابیں

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۵
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝۶ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ

اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمھارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اِس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ[۵] ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بار ہا ہم نے نبی بھیجے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی

ماخوذ ہیں۔ اِسی کو سورۂ واقعہ میں كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (پوشیدہ اور محفوظ کتاب) کہا گیا ہے اور سورۂ بُروج میں اس کے لیے لوحِ محفوظ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی ایسی لوح جس کا لکھا مٹ نہیں سکتا اور جو ہر قسم کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ قرآن کے متعلق یہ فرما کر کہ یہ "اُمّ الکتاب" میں ہے، ایک اہم حقیقت پر مُتنبِّہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف انبیاؑ پر مختلف زبانوں میں کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں، مگر اُن سب میں دعوت ایک ہی عقیدے کی طرف دی گئی ہے، حق ایک ہی سچائی کو قرار دیا گیا ہے، خیر و شر کا ایک ہی معیار پیش کیا گیا ہے، اخلاق و تہذیب کے یکساں اُصول بیان کیے گئے ہیں، اور فی الجملہ ایک ہی دین ہے جسے یہ سب کتابیں لے کر آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے اور صرف عبارتیں مختلف ہیں۔ ایک ہی معنیٰ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بنیادی کتاب میں ثبت ہیں، اور جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے، اس نے کسی نبی کو مبعوث کر کے وہ معنیٰ حال اور موقع کی مناسبت سے ایک خاص عبارت اور خاص زبان میں نازل فرما دیے ہیں۔ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے بجائے کسی اور قوم میں پیدا کرنے کا ہوتا تو یہی قرآن وہ حضورؐ پر اُسی قوم کی زبان میں نازل کرتا۔ اُس میں بات اُسی قوم اور ملک کے حالات کے لحاظ سے کی جاتی، عبارتیں کچھ اور ہوتیں زبان بھی دوسری ہوتی، لیکن بنیادی طور پر تعلیم و ہدایت یہی ہوتی، اور وہ یہی قرآن ہوتا، اگرچہ قرآنِ عربی نہ ہوتا۔ اسی مضمون کو سورۂ شُعَراء میں یوں ادا کیا گیا ہے: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ...... بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (۱۹۲-۱۹۶) "یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے...... صاف صاف عَرَبی زبان میں اور یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حواشی ۱۱۹-۱۲۱)

۳ – اس فقرے کا تعلق کتابِ مُبین سے بھی ہے اور اُمّ الکتاب سے بھی۔ یعنی یہ تعریف قرآن کی بھی ہے اور اُس اصل کتاب کی بھی جس سے قرآن منقول یا ماخوذ ہے۔ اِس تعریف سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کوئی شخص اپنی نادانی سے اِس کتاب کی قدر و منزلت نہ پہچانے اور اس کی حکیمانہ تعلیم سے فائدہ نہ اُٹھائے تو یہ اُس کی اپنی بدقسمتی ہے۔ کوئی اگر اس کی حیثیت کو گرانے کی کوشش کرے اور اس کی باتوں میں کیڑے ڈالے تو یہ اس کی اپنی رذالت ہے۔ کسی کی ناقدری سے یہ بے قدر نہیں ہو سکتی اور کسی کے خاک ڈالنے سے اِس کی حکمت چھُپ نہیں سکتی۔ یہ تو بجائے خود ایک بلند مرتبہ کتاب ہے جسے اُس کی بے نظیر تعلیم اُس کی معجزانہ بلاغت اُس کی بے عیب حکمت اور اُس کے عالی شان مصنف کی شخصیت نے بلند کیا ہے۔ یہ کسی کے گرائے کیسے گر جائے گی۔ آگے چل کر آیت ۴۴ میں قُریش کو خاص طور پر اور اہلِ عرب کو بالعموم یہ بتایا گیا ہے کہ جس کتاب کی تم اِس طرح

نَبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ
بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا

نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انھوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔[۵] پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے، انھیں ہم نے ہلاک کر دیا، پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔[۶]

اگر تم اِن لوگوں سے پُوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انھیں اُسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ وہی نا جس نے تمھارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا[۷] اور اس میں تمھاری خاطر راستے

ناقدری کر رہے ہو، اُس کے نُزول نے تم کو ایک بہت بڑے شَرَف کا موقع عطا کیا ہے، جسے اگر تم نے کھو دیا تو خدا کے سامنے تمھیں سخت جواب دہی کرنی ہوگی۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۳۹)

۴ - اِس ایک فقرے میں وہ پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت سے لے کر اِن آیات کے نُزول تک پچھلے چند برس میں ہو گزری تھی۔ یہ فقرہ ہمارے سامنے یہ تصویر کھینچتا ہے کہ ایک قوم صدیوں سے سخت جہالت، پستی اور بدحالی میں مبتلا ہے۔ یکایک اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت اُس پر ہوتی ہے۔ وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اُسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام نازل کرتا ہے، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو، جاہلانہ اَوہام کے چکر سے نکلے، اور حقیقت سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرلے۔ مگر اُس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اُس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اُسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جوں جوں سال پر سال گزرتے جاتے ہیں، ان کی عداوت اور شرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اُسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس حالت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ کیا تمھاری اس نالائقی کی وجہ سے ہم تمھاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اِس درسِ نصیحت کا سلسلہ روک دیں؟ اور تمھیں اُسی پستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گرے ہوئے ہو؟ کیا تمھارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمھیں کس انجام سے دوچار کرے گا؟

۵ - یعنی یہ بے ہودگی اگر نبی اور کتاب کے بھیجنے میں مانع ہوتی تو کسی قوم میں بھی کوئی نبی نہ آتا، نہ کوئی کتاب بھیجی جاتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ

بنا دیے،[۸] تاکہ تم اپنی منزلِ مقصود کی راہ پا سکو۔[۹] جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اُتارا[۱۰]

۶ – یعنی خاص لوگوں کی بے ہودگی کا نتیجہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پوری نوعِ انسانی کو نبوت اور کتاب کی رہنمائی سے محروم کر دیا جاتا، بلکہ اِس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جو لوگ باطل پرستی کے نشے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں بدمست ہو کر انبیاؑ کا مذاق اُڑانے سے باز نہ آئے انھیں آخر کار تباہ کر دیا گیا۔ پھر جب اللہ کا قہر ٹوٹ پڑا تو جس قوت کے بَل پر یہ قریش کے چھوٹے چھوٹے سردار اکڑ رہے ہیں، اُس سے ہزاروں گُنی زیادہ طاقت رکھنے والے بھی مچھر اور پِسّو کی طرح مسل کر رکھ دیے گئے۔

۷ – دوسرے مقامات پر تو زمین کو فرش سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے لیے گہوارے کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک بچّہ اپنے پنگھوڑے میں آرام سے لیٹا ہوتا ہے، ایسے آرام کی جگہ تمھارے لیے اِس عظیم الشان کُرے کو بنا دیا جو فضا میں معلّق ہے، جو ایک ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے اپنے مَحور پر گھوم رہا ہے۔ جو ۶۶۶۰۰ میل فی گھنٹا کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جس کے پیٹ میں وہ آگ بھری ہے کہ پتھروں کو پگھلا دیتی ہے اور آتش فشانوں کی شکل میں لاوا اُگل کر کبھی کبھی تمھیں بھی اپنی شان دکھا دیتی ہے۔ مگر اِس کے باوجود تمھارے خالق نے اسے اتنا پُرسکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر سوتے ہو اور تمھیں ذرا جھٹکا تک نہیں لگتا۔ تم اس پر رہتے ہو اور تمھیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کُرہ معلّق ہے اور تم اس پر سر کے بل لٹکے ہوئے ہو۔ تم اطمینان سے اُس پر چلتے پھرتے ہو اور تمھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ بے تکلف اُسے کھودتے ہو، اُس کا سینہ چیرتے ہو، طرح طرح سے اُس کو پیٹ کر اپنا رزق اُس سے وصول کرتے ہو، حالانکہ اس کی ایک معمولی سی جھرجھری کبھی زلزلے کی شکل میں آ کر تمھیں خبر دے دیتی ہے کہ یہ کس بلا کا خوفناک دیو ہے جسے اللہ نے تمھارے لیے مُسخّر کر رکھا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۴-۷۵)

۸ – پہاڑوں کے بیچ بیچ میں دَرّے، اور پھر کوہستانی اور میدانی علاقوں میں دریا وہ قدرتی راستے ہیں جو اللہ نے زمین کی پشت پر بنا دیے ہیں۔ انسان اِنھی کی مدد سے کُرۂ زمین پر پھیلا ہے۔ اگر پہاڑی سلسلوں کو کسی شگاف کے بغیر بالکل ٹھوس دیوار کی شکل میں کھڑا کر دیا جاتا اور زمین میں کہیں دریا، ندیاں، نالے نہ ہوتے تو آدمی جہاں پیدا ہوا تھا، اسی علاقے میں مُقیّد ہو کر رہ جاتا۔ پھر اللہ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ تمام رُوئے زمین کو یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا، بلکہ اس میں قسم قسم کے ایسے امتیازی نشانات (land marks) قائم کر دیے جن کی مدد سے انسان مختلف علاقوں کو پہچانتا ہے اور ایک علاقے اور دوسرے علاقے کا فرق محسوس کرتا ہے۔ یہ دوسرا اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت انسان کے لیے زمین میں نقل و حرکت آسان ہوئی۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے کسی لق و دق صحرا میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، جہاں سیکڑوں میل تک زمین ہر قسم کے امتیازی نشانات سے خالی ہوتی ہے اور آدمی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچا ہے اور آگے کدھر جائے۔

۹ – یہ فقرہ بیک وقت دو معنی دے رہا ہے: ایک معنی یہ کہ تم اِن قدرتی راستوں اور ان نشاناتِ راہ کی مدد سے اپنا راستہ معلوم کر سکو اور اس جگہ تک پہنچ سکو جہاں جانا چاہتے ہو۔ دوسرے معنی یہ کہ اللہ جَلّ شانُہٗ کی اس کاریگری کو دیکھ کر تم ہدایت حاصل کر سکو،

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ⑪ وَالَّذِيْ
خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا

اور اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جِلا اُٹھایا، اِسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔[11] وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے،[12] اور جس نے تمھارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا، تاکہ تم

حقیقتِ نفس الامری کو پاسکو، اور یہ سمجھ سکو کہ زمین میں یہ انتظام اَلل ٹپ نہیں ہوگیا ہے، نہ بہت سے خداؤں نے مل کر یہ تدبیر کی ہے، بلکہ ایک ربِّ حکیم ہے جس نے اپنی مخلوق کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں میں یہ راستے بنائے ہیں، اور زمین کے ایک ایک خِطّے کو بے شمار طریقوں سے ایک الگ شکل دی ہے جس کی بدولت انسان ہر خِطّے کو دوسرے سے مُمیّز کرسکتا ہے۔

۱۰ – یعنی ہر علاقے کے لیے بارش کی ایک اوسط مقدار مقرر کی جو مدت ہائے دراز تک سال بہ سال ایک ہی ہموار طریقے سے چلتی رہتی ہے۔ اس میں ایسی بے قاعدگی نہیں رکھی کہ کبھی سال میں دو انچ بارش ہو اور کبھی دو سو انچ ہو جائے۔ پھر وہ اُس کو مختلف زمانوں میں اور مختلف اوقات میں جگہ جگہ پھیلا کر اس طرح برساتا ہے کہ بالعموم وہ وسیع پیمانے پر زمین کی بار آوری کے لیے نافع ہوتی ہے۔ اور یہ بھی اس کی حکمت ہی ہے کہ زمین کے بعض حصوں کو اُس نے بارش سے قریب قریب بالکل محروم کر کے بے آب و گیاہ صحرا بنادیے ہیں، اور بعض دوسرے حصوں میں وہ کبھی قحط ڈال دیتا ہے اور کبھی طوفانی بارش کر دیتا ہے، تاکہ آدمی یہ جان سکے کہ زمین کے آباد علاقوں میں بارش اور اس کی عام باقاعدگی کتنی بڑی نعمت ہے، اور یہ بھی اُس کو یاد رہے کہ اِس نظام پر کوئی دوسری طاقت حکمراں ہے جس کے فیصلوں کے آگے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ایک ملک میں بارش کے عام اوسط کو بدل سکے، یا زمین کے وسیع علاقوں پر اس کی تقسیم میں فرق ڈال سکے، یا کسی آتے ہوئے طوفان کو روک سکے، یا رُوٹھے ہوئے بادلوں کو منا کر اپنے ملک کی طرف کھینچ لائے اور انھیں برسنے پر مجبور کردے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۵۰۲-۵۰۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۱۷-۱۸)

۱۱ – یہاں پانی کے ذریعے سے زمین کے اندر روئیدگی کی پیدائش کو بیک وقت دو چیزوں کی دلیل قرار دیا گیا ہے: ایک، یہ کہ یہ کام خدائے واحد کی قدرت و حکمت سے ہو رہے ہیں، کوئی دوسرا اس کارِ خدائی میں اس کا شریک نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہوسکتی ہے اور ہوگی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹، النمل، حاشیہ ۷۳، الروم، حواشی ۲۵-۳۴-۳۵۔ جلد چہارم، سورۂ فاطر، حاشیہ ۱۹، سورۂ یٰسین، حاشیہ ۲۹)

۱۲ – جوڑوں سے مراد صرف نوعِ انسانی کے زن و مرد، اور حیوانات و نباتات کے نر و مادہ ہی نہیں ہیں، بلکہ دوسری بے شمار چیزیں بھی ہیں جن کو خالق نے ایک دوسرے کا جوڑ بنایا ہے، اور جن کے اِختلاط یا امتزاج سے دنیا میں نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً عناصر میں بعض کا بعض سے جوڑ لگتا ہے اور بعض کا بعض سے نہیں لگتا۔ جن کا جوڑ ایک دوسرے سے لگتا ہے،

Maktaba-Tul-Ishaat.com

تَرْكَبُوْنَ ۙ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ
اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا
هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

اُن کی پُشت پر چڑھو اور جب اُن پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے اِن چیزوں کو مسخر کر دیا، ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے[۱۳]، اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے[۱۴]۔"

انھی کے ملنے سے طرح طرح کی ترکیبیں واقع ہو رہی ہیں۔ یا مثلاً بجلی میں منفی اور مثبت بجلیاں ایک دوسرے کا جوڑ ہیں، اور ان کی باہمی کشش ہی دنیا میں عجیب عجیب کرشموں کی موجب بن رہی ہے۔ یہ اور دوسرے اَن گنت جوڑے، جو قسم قسم کی مخلوقات کے اندر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، ان کی ساخت، اور ان کی باہمی مناسبتوں، اور ان کے تعامل کی گوناگوں شکلوں، اور ان کے ملنے سے پیدا ہونے والے نتائج پر اگر انسان غور کرے تو اس کا دل یہ گواہی دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سارا کارخانۂ عالم کسی ایک ہی زبردست صانع حکیم کا بنایا ہوا ہے، اور اسی کی تدبیر سے یہ چل رہا ہے۔ صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کے بغیر ہوا اور ہو رہا ہے، یا اس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی دخیل کاری کا کوئی امکان ہے۔

۱۳ – یعنی زمین کی تمام مخلوقات میں سے تنہا انسان کو کشتیاں اور جہاز چلانے اور سواری کے لیے جانور استعمال کرنے کی یہ مقدرت اللہ تعالیٰ نے اس لیے تو نہیں دی تھی کہ وہ غلے کی بوریوں کی طرح ان پر لد جائے اور کبھی نہ سوچے کہ آخر وہ کون ہے جس نے ہمارے لیے بحرِ زخار میں کشتیاں دوڑانے کے امکانات پیدا کیے، اور جس نے جانوروں کی بے شمار اقسام میں سے بعض کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ ہم سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود ہمارے تابع فرمان بن جاتے ہیں، اور ہم ان پر سوار ہو کر جدھر چاہتے ہیں انھیں لیے پھرتے ہیں۔ ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا اور نعمت دینے والے کو فراموش کر دینا، دل کے مُردہ اور عقل و ضمیر کے بے حس ہونے کی علامت ہے۔ ایک زندہ اور حسّاس قلب و ضمیر رکھنے والا انسان تو ان سواریوں پر جب بیٹھے گا تو اس کا دل احساسِ نعمت اور شکرِ نعمت کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا۔ وہ پکار اٹھے گا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے میرے لیے ان چیزوں کو مسخر کیا۔ پاک ہے اس سے کہ اُس کی ذات و صفات اور اختیارات میں کوئی اس کا شریک ہو۔ پاک ہے اس کمزوری سے کہ اپنی خدائی کا کام خود چلانے سے وہ عاجز ہو اور دوسرے مددگار خداؤں کی اسے حاجت پیش آئے۔ پاک ہے اس سے کہ میں ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں۔

اس آیت کے منشا کی بہترین عملی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اذکار ہیں جو سواریوں پر بیٹھتے وقت آپؐ کی زبان مبارک پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ جب سفر پر جانے کے لیے سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ

اللہ اکبر کہتے، پھر یہ آیت پڑھتے، اور اس کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللھم انی اسألُك فی سفری ھٰذا البرَّ والتقویٰ، ومن العمل ما ترضٰی، اللھم ھَوِّن لنا السفر، واطْوِلَنا البعیدَ، اللھم انت الصاحب فی السفر، والخلیفةُ فی الاھل، اللھم اَصْحِبْنا فی سفرنا واخْلُفْنا فی اھلنا۔ (مُسنَدِ احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، دارِمی، ترمذِی)

"خدایا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس سفر میں مجھے نیکی اور تقویٰ اور ایسے عمل کی توفیق دے جو تجھے پسند ہو۔ خدایا! ہمارے لیے سفر کو آسان کر دے اور لمبی مَسافت کو لپیٹ دے۔ خدایا! تو ہی سفر کا ساتھی اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل وعیال کا نگہبان ہے۔ خدایا! ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ اور پیچھے ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر رِکاب میں پاؤں رکھا، پھر سوار ہونے کے بعد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا......، پھر تین مرتبہ الحمد للہ اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا: سُبْحٰنَکَ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ، قد ظلمتُ نفسی فاغفرلی۔ اس کے بعد آپؐ ہنس دیے۔ میں نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! آپ ہنسے کس بات پر؟ فرمایا: بندہ جب رَبِّ اغْفِرْلِیْ کہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کی یہ بات بڑی پسند آتی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا مغفرت کرنے والا کوئی اور نہیں ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذِی، نَسائی وغیرہ)

ایک صاحب ابومِجلَز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جانور پر سوار ہوا اور میں نے آیت سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا پڑھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا اس طرح کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا: پھر کیا کہوں؟ فرمایا: یوں کہو کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی، شکر ہے اُس کا کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان فرمایا، شکر ہے اس کا کہ اس نے ہمیں اُس بہترین اُمت میں داخل کیا جو خَلقِ خدا کے لیے نکالی گئی ہے، اس کے بعد یہ آیت پڑھو۔ (ابنِ جَرِیر، احکام القرآن للجصّاص)

۱۴ – مطلب یہ ہے کہ ہر سفر پر جاتے ہوئے یاد کرلو کہ آگے ایک بڑا اور آخری سفر بھی درپیش ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر سواری کو استعمال کرنے میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ شاید کوئی حادثہ اسی سفر کو آدمی کا آخری سفر بنا دے، اس لیے بہتر ہے کہ ہر مرتبہ وہ اپنے رب کی طرف واپسی کو یاد کر کے چلے، تاکہ اگر مرنا ہی ہے تو بے خبر نہ مرے۔

یہاں تھوڑی دیر ٹھیر کر ذرا اس تعلیم کے اَخلاقی نتائج کا بھی اندازہ کر لیجیے۔ کیا آپ یہ تصوُّر کر سکتے ہیں کہ جو شخص کسی سواری پر بیٹھتے وقت سمجھ بُوجھ کر پورے شُعور کے ساتھ اس طرح اللہ کو اور اس کے حضور اپنی واپسی اور جواب دِہی کو یاد کر کے چلا ہو، وہ آگے جا کر کسی فِسق وفجور یا کسی ظلم وستم کا مرتکب ہوگا؟ کیا کسی فاحشہ سے ملاقات کے لیے، یا کسی کلَب میں شراب خوری اور قمار بازی کے لیے جاتے وقت بھی کوئی شخص یہ کلمات زبان سے نکال سکتا ہے یا ان کا خیال کرسکتا ہے؟ کیا کوئی حاکم، یا سرکاری افسر، یا تاجر، جو یہ کچھ سوچ کر اور اپنے منہ سے کہہ کر گھر سے چلا ہو، اپنی جائے عمل پر پہنچ کر لوگوں کے حق مار سکتا ہے؟ کیا کوئی سپاہی بے گناہوں کا خون بہانے اور کمزوروں کی آزادی پر ڈاکا مارنے کے لیے جاتے وقت بھی اپنے ہوائی جہاز یا ٹینک پر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر لاسکتا ہے؟ اگر نہیں، تو یہی ایک چیز ہر اُس نقل وحرکت پر بند باندھ دینے کے لیے کافی ہے جو معصیت

Maktaba Tul Ishaat.com

ع۱۵

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ ؑ﴿۱۵﴾
اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِیْنَ ﴿۱۶﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ
كَظِیْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَ هُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ

(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) اِن لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جُز بنا ڈالا۱۵، حقیقت یہ ہے کہ انسان کُھلا احسان فراموش ہے۔ ع

کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمھیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اُس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس کی ولادت کا مُژدہ جب خود اِن میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۱۶۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدّعا پوری طرح

کے لیے ہو۔

۱۵ — جُز بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے کو اُس کی اولاد قرار دیا جائے، کیونکہ اولاد لامحالہ باپ کی ہم جنس اور اس کے وجود کا ایک جُز ہوتی ہے، اور کسی شخص کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُسے اللہ کی ذات میں شریک کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ کسی مخلوق کو اللہ کا جُز بنانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اُسے اُن صفات اور اختیارات کا حامل قرار دیا جائے جو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اِسی تصور کے تحت اُس سے دُعائیں مانگی جائیں، یا اُس کے آگے عُبودیّت کے مراسم ادا کیے جائیں، یا اُس کی تحریم و تحلیل کو شریعتِ واجب الاتباع ٹھیرا لیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں آدمی اُلوہیّت و رُبوبیّت کو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان بانٹتا ہے اور اس کا ایک جُز بندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

۱۶ — یہاں مشرکینِ عرب کی نامعقولیت کو پوری طرح بے نقاب کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کے بت انھوں نے عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے، اور یہی ان کی وہ دیویاں تھیں جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اوّل تو تم نے یہ جاننے اور ماننے کے باوجود، کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، اور اِس زمین کو اُسی نے تمھارے لیے گہوارہ بنایا ہے، اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، اور اُسی نے یہ جانور تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں، اُس کے ساتھ دوسروں کو معبود بنایا۔ حالانکہ جنھیں تم معبود بنا رہے ہو، وہ خدا نہیں بلکہ بندے ہیں۔ پھر مزید غضب یہ کیا کہ بعض بندوں کو صفات ہی میں نہیں بلکہ اللہ کی ذات میں بھی اُس کا شریک بنا ڈالا، اور یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں۔ اس پر بھی تم نے بس نہ کیا اور اللہ

مُبِيْنٍ ﴿١١﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ

واضح بھی نہیں کرسکتی؟[17]

انھوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں،[18] عورتیں قرار دے لیا۔

کے لیے وہ اولاد تجویز کی جسے تم خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہو۔ بیٹی گھر میں پیدا ہو جائے تو تمھارا منہ کالا ہو جاتا ہے، خون کا ساگھونٹ پی کر رہ جاتے ہو، بلکہ بعض اوقات زندہ بچی کو دفن کر دیتے ہو۔ یہ اولاد تو آئی اللہ کے حصے میں۔ اور بیٹے، جو تمھارے نزدیک فخر کے قابل اولاد ہیں، مخصوص ہو گئے تمھارے لیے؟ اس پر تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے ماننے والے ہیں۔

۱۷ – بالفاظِ دیگر، جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصے میں ڈالی، اور خم ٹھونک کر میدان میں اُترنے والی اولاد خود لے اُڑے۔

اِس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔ یہی بات احادیث سے بھی ثابت ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور نسائی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں ریشم اور دوسرے ہاتھ میں سونا لے کر فرمایا: یہ دونوں چیزیں لباس میں استعمال کرنا میری اُمت کے مردوں پر حرام ہے۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ریشم اور سونا میری اُمت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں پر حرام کیا گیا۔ علامہ ابوبکر جصّاصؒ نے احکام القرآن میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے حسبِ ذیل روایات نقل کی ہیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے صاحبزادے اُسامہ بن زیدؓ کو چوٹ لگ گئی اور خون بہنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اپنی اولاد جیسی محبت تھی۔ آپؐ ان کا خون چوس چوس کر تھوکتے جاتے اور ان کو یہ کہہ کہہ کر بہلاتے جاتے کہ اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے زیور پہناتے، اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتے۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لبس الحرير والذهب حرام على ذكور امتي وحلال لاناثها۔ "ریشمی کپڑے اور سونے کے زیور پہننا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔"

حضرت عمرؓو بن عاص کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تمھیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو ان کا حق ادا کرو، یعنی ان کی زکوٰۃ نکالو۔

حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ زیور پہننے میں مُضایقہ نہیں، بشرطیکہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو لکھا کہ تمھاری عمل داری میں جو مسلمان عورتیں رہتی ہیں، اُن کو حکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ نکالیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے عمرو بن دینار کے حوالے سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی بہنوں کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا
لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ
اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ؕ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ
فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى

کیا اُن کے جسم کی ساخت اِنھوں نے دیکھی ہے؟[19] اِن کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انھیں اس کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

یہ کہتے ہیں: ''اگر خدائے رحمٰن چاہتا (کہ ہم ان کی عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی اُن کو نہ پُوجتے۔''[20] یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض تیر تُکّے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اِس سے پہلے کوئی کتاب اِن کو دی تھی جس کی سند (اپنی اِس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہیں؟[21] نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک

نے اپنی بیٹیوں کو سونے کے زیور پہنائے تھے۔

اِن تمام رِوایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ جَصّاصؒ لکھتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے جو رِوایات عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کے حلال ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں، وہ عدمِ جواز کی رِوایات سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں۔ اور آیتِ مذکورہ بالا بھی اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ پھر اُمت کا عمل بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانے سے ہمارے زمانے (یعنی چوتھی صدی کے آخری دَور) تک یہی رہا ہے، بغیر اس کے کہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہو۔ اس طرح کے مسائل میں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی اعتراض تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔''

۱۸ – یعنی مذکر یا مؤنث ہونے سے مُبرّا ہیں۔ یہ مفہوم فَحوائے کلام سے خود بخود مُترشّح ہو رہا ہے۔

۱۹ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''کیا اُن کی پیدائش کے وقت یہ موجود تھے؟''

۲۰ – یہ اپنی گمراہی پر تقدیر سے اُن کا اِستدلال تھا جو ہمیشہ سے غلط کار لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا فرشتوں کی عبادت کرنا اسی لیے تو ممکن ہوا کہ اللہ نے ہمیں یہ کام کرنے دیا۔ اگر وہ نہ چاہتا کہ ہم یہ فعل کریں تو ہم کیسے کر سکتے تھے۔ پھر مدّت ہائے دراز سے ہمارے ہاں یہ کام ہو رہا ہے اور اللہ کی طرف سے اس پر کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو ہمارا یہ کام ناپسند نہیں ہے۔

۲۱ – مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے، وہ چونکہ اللہ کی مَشِیّت کے تحت ہو رہا ہے، اس لیے ضرور اس کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے۔ حالانکہ اگر یہ اِستدلال صحیح ہو تو دنیا میں صرف ایک شرک ہی تو نہیں

أُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا
عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ

طریقے پر پایا ہے، اور ہم انھی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔[۲۲] اِسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے، اور ہم انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔[۲۳] ہر نبی نے ان سے پوچھا: کیا تم اُسی ڈگر پر چلے جاؤ گے،

ہو رہا ہے۔ چوری، ڈاکا، قتل، زِنا، رشوت، بدعہدی، اور ایسے ہی دوسرے بے شمار جرائم بھی ہو رہے ہیں جنھیں کوئی شخص بھی نیکی اور بھلائی نہیں سمجھتا۔ پھر کیا اِسی طرزِ استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ تمام افعال حلال وطیّب ہیں، کیونکہ اللہ اپنی دنیا میں انھیں ہونے دے رہا ہے، اور جب وہ اِنھیں ہونے دے رہا ہے، تو ضرور وہ ان کو پسند بھی کرتا ہے؟ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ وہ واقعات نہیں ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں، بلکہ اللہ کی کتاب ہے جو اس کے رسول کے ذریعے سے آتی ہے اور جس میں اللہ خود بتاتا ہے کہ اسے کون سے عقائد، کون سے اعمال، اور کون سے اَخلاق پسند ہیں اور کون سے ناپسند۔ پس اگر قرآن سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب اِن لوگوں کے پاس ایسی موجود ہو جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ فرشتے بھی میرے ساتھ تمھارے معبود ہیں اور تم کو ان کی عبادت بھی کرنی چاہیے، تو یہ لوگ اس کا حوالہ دیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۷۱-۷۹-۸۰-۱۱۰-۱۲۴-۱۲۵۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۶، یونس، حاشیہ ۱۰۱، ہود، حاشیہ ۱۱۶، الرعد، حاشیہ ۴۹، النحل، حواشی ۱۰-۳۱-۹۴۔ جلد چہارم، الزُّمر، حاشیہ ۲۰، الشّوریٰ، حاشیہ ۱۱)

۲۲ - یعنی ان کے پاس کسی کتابِ الٰہی کی کوئی سند نہیں ہے، بلکہ سند صرف یہ ہے کہ باپ دادا سے یوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے، لہٰذا ہم بھی انھی کی تقلید میں فرشتوں کو دیویاں بنائے بیٹھے ہیں۔

۲۳ - یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاؑ کے مقابلے میں اٹھ کر باپ دادا کی تقلید کا جھنڈا بلند کرنے والے ہر زمانے میں اپنی قوم کے کھاتے پیتے لوگ ہی کیوں رہے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ وہی حق کی مخالفت میں پیش پیش اور قائم شدہ جاہلیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہے، اور وہی عوام کو بہکا اور بھڑکا کر انبیا علیہم السلام کے خلاف فتنے اُٹھاتے رہے؟ اس کے بنیادی وجوہ دو تھے: ایک، یہ کہ کھاتے پیتے اور خوشحال طبقے اپنی دنیا بنانے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ حق اور باطل کی، بزعمِ خویش، دُور از کار بحث میں سر کھپانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُن کی تن آسانی اور ذہنی کاہلی دین کے معاملے میں انتہائی بے فکر، اور اِس کے ساتھ عملاً قدامت پسند (conservative) بنا دیتی ہے، تاکہ جو حالت پہلے سے قائم چلی آ رہی ہے وہی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ حق ہے یا باطل، جُوں کی تُوں قائم رہے اور کسی نئے نظام کے متعلق

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ
بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾
وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

النصف ع

خواہ میں اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ تمھیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اُس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے اُن کی خبر لے ڈالی، اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ ع

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا[۲۴] کہ "تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اُس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی کرے گا[۲۵]۔" اور ابراہیمؑ یہی کلمہ[۲۶] اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا، تاکہ وہ اِس کی طرف رُجوع کریں[۲۷]۔

سوچنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔ دوسرے، یہ کہ قائم شدہ نظام سے اُن کے مفاد پوری طرح وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں، اور انبیاعلیہم السلام کے پیش کردہ نظام کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں وہ بھانپ جاتے ہیں کہ یہ آئے گا تو ان کی چودھراہٹ کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی جائے گی، اور ان کے لیے اَکلِ حرام اور فعلِ حرام کی بھی کوئی آزادی باقی نہ رہے گی۔ (مزید تفصیل لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۹۱۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۴۶-۵۳-۵۸-۷۴-۸۸-۹۲، ہود، حواشی ۳۱-۳۲-۴۱، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۸۔ جلد سوم، المؤمنون، حواشی ۲۶-۲۷-۳۵-۵۹۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۳۴، حاشیہ ۵۴)

۲۴ - تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۲۴ تا ۱۳۳، الأنعام، حواشی ۵۰ تا ۵۵۔ جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۴۶ تا ۵۳۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶-۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۴ تا ۶۶، الشعراء، حواشی ۵۰ تا ۶۲، العنکبوت، حواشی ۲۶ تا ۴۶۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۸۳ تا ۱۰۰، حواشی ۴۴ تا ۵۵۔

۲۵ - اِن الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے محض اپنا عقیدہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی دلیل بھی دے دی۔ دوسرے معبُودوں سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نہ انھوں نے پیدا کیا ہے، نہ وہ کسی معاملے میں صحیح رہنمائی کرتے ہیں، نہ کرسکتے ہیں۔ اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے تعلق جوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی انسان کی صحیح رہنمائی

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

(اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو میں نے ان کو مٹا نہیں دیا) بلکہ میں اِنھیں اور اِن کے باپ دادا کو متاعِ حیات دیتا رہا، یہاں تک کہ اِن کے پاس حق، اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول[۲۸] آ گیا۔ مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو اِنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادُو ہے[۲۹] اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔
کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا[۳۰]؟

کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔

۲۶ – یعنی یہ بات کہ خالق کے سوا کوئی معبُود ہونے کا مستحق نہیں ہے۔

۲۷ – یعنی جب بھی راہِ راست سے ذرا قدم ہٹے تو یہ کلمہ ان کی رہنمائی کے لیے موجود رہے اور وہ اسی کی طرف پلٹ آئیں۔ اس واقعے کو جس غرض کے لیے یہاں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش کی نامعقولیت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے اور انھیں اس بات پر شرم دلائی جائے کہ تم نے اسلاف کی تقلید اختیار کی بھی تو اس کے لیے اپنے بہترین اسلاف کو چھوڑ کر اپنے بدترین اسلاف کا انتخاب کیا۔ عرب میں قریش کی مشیخت جس بنا پر چل رہی تھی وہ تو یہ تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد تھے اور ان کے بنائے ہوئے کعبے کی مجاوری کر رہے تھے۔ اس لیے انھیں پیروی اُن کی کرنی چاہیے تھی، نہ کہ اپنے اُن جاہل اسلاف کی جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے طریقے کو چھوڑ کر گرد و پیش کی بت پرست قوموں سے شرک سیکھ لیا۔ پھر اس واقعے کو بیان کر کے ایک اور پہلو سے بھی ان گمراہ لوگوں کی غلطی واضح کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق و باطل کی تمیز کیے بغیر اگر آنکھیں بند کر کے باپ دادا کی تقلید کرنا درست ہوتا تو سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ یہ کام کرتے۔ مگر انھوں نے صاف صاف اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہہ دیا کہ میں تمھارے اِس جاہلانہ مذہب کی پیروی نہیں کر سکتا جس میں تم نے اپنے خالق کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو معبُود بنا رکھا ہے جو خالق نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ تقلیدِ آبائی کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ باپ دادا کی پیروی کرنے سے پہلے آدمی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے کہ وہ صحیح راستے پر ہیں بھی یا نہیں، اور اگر دلیلِ معقول سے یہ ظاہر ہو کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو ان کی پیروی چھوڑ کر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو دلیل کی رُو سے حق ہو۔

۲۸ – اصل میں رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا رسول

Maktaba Tul Ishaat.com

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾

کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اِن کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں[۳۱]۔ اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (اِن کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں[۳۲]۔

آ گیا جس کا رسول ہونا بالکل ظاہر و باہر تھا۔ جس کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور بعد کی زندگی صاف شہادت دے رہی تھی کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔

۲۹ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ صٓ، حاشیہ ۵۔

۳۰ — دونوں شہروں سے مراد مکّہ اور طائف ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اُس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے اِن مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصّے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چَرا کر جوانی گزار دی، جو اَب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکّے میں ولید بن مُغیرہ اور عُتبہ بن رَبیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعود، حبیب بن عَمرو، کِنانہ بن عبدِ عَمرو اور ابنِ عبدِ یالِیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا اِستدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بَشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآنِ مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اتر آئے تھے، بلکہ انھی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے، اور کھانے پینے سے مُبرّا نہ تھے (مُلاحظہ ہو: النحل: آیت ۴۳۔ بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵۔ یوسف: ۱۰۹۔ الفرقان: ۷-۲۰۔ الانبیاء: ۷-۸۔ الرعد: ۳۸)، تو انھوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مال دار ہو، باا ثر ہو، بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟

۳۱ — یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے جس کے اندر چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سُپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا اِن کا کام ہے کہ اللہ اپنی رحمت

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ

اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے

سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے۔)

دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بد آواز، کسی کو قوی ہیکل اور کسی کو کمزور، کسی کو ذہین اور کسی کو کُند ذہن، کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا، کسی کو سلیم الاعضا اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا بہرا، کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا، اور جس پر ہماری طرف سے اِدبار آ جاتا ہے اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالم گیر خدائی انتظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، ہر طرف تمھیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسروں سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملے میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمھارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے، اُسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حُسن، طاقت، اقتدار، اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دیے جائیں، اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

۳۲ – یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ خاص، یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو اُن کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اِس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابنِ عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے، اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے، تو یہ تمھارے اپنے ہی ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اِس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟

Maktaba Tul Ishaat.com

بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ
كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا ع
فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ
بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾

گھروں کی چھتیں، اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں، اور اُن کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنوا دیتے۔[۳۳] یہ تو محض حیاتِ دنیا کی متاع ہے، اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متّقین کے لیے ہے۔ ع

جو شخص رحمٰن کے ذکر[۳۴] سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخرکار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا: "کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تُو تو بدترین ساتھی نکلا۔"

---

۳۳ - یعنی یہ سیم و زر، جس کا کسی کو مل جانا تمھاری نگاہ میں نعمت کی انتہا اور قدر و قیمت کی معراج ہے، اللہ کی نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام انسانوں کے کفر کی طرف ڈھلک پڑنے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ ہر کافر کا گھر سونے چاندی کا بنا دیتا۔ اِس جنسِ فرومایہ کی فراوانی آخر کب سے انسان کی شرافت اور پاکیزگیِ نفس اور طہارتِ رُوح کی دلیل بن گئی؟ یہ مال تو ان خبیث ترین انسانوں کے پاس بھی پایا جاتا ہے جن کے گھناؤنے کردار کی سَڑاند سے سارا معاشرہ مُتعفّن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِسے تم نے آدمی کی بڑائی کا معیار بنا رکھا ہے۔

۳۴ - وسیع المعنیٰ لفظ ہے۔ رحمٰن کے ذکر سے مراد اس کی یاد بھی ہے، اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی، اور یہ قرآن بھی۔

وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾
اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ مَنْ كَانَ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ
نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ
بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾

اُس وقت اِن لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمھارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمھارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں[۳۵]۔

اب کیا اے نبیؐ! تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟[۳۶] اب تو ہمیں اِن کو سزا دینی ہے، خواہ تمھیں دنیا سے اُٹھالیں، یا تم کو آنکھوں سے اِن کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے اِن سے وعدہ کیا ہے، ہمیں اِن پر پوری قدرت حاصل ہے[۳۷]۔ تم بہر حال اُس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعے سے تمھارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے[۳۸] پر ہو۔

۳۵- یعنی اس امر میں تمھارے لیے تسلّی کا کوئی پہلو نہیں ہے کہ تمھیں غلط راہ پر ڈالنے والے کو سزا مل رہی ہے، کیونکہ وہی سزا گمراہی قبول کرنے کی پاداش میں تم بھی پا رہے ہو۔

۳۶- مطلب یہ ہے کہ جو سننے کے لیے تیار ہوں اور جنھوں نے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ان کی طرف توجہ کرو، اور اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی کوشش میں اپنی جان نہ کھپاؤ، نہ اس غم میں اپنے آپ کو گھلاتے رہو کہ تمھارے یہ بھائی بند کیوں راہِ راست پر نہیں آتے اور کیوں اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

۳۷- اس ارشاد کا مطلب اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے ہی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ کفارِ مکّہ یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اُن کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے تو پھر سب اچھا ہو جائے گا۔ اسی گمانِ فاسد کی بنا پر وہ شب و روز بیٹھ بیٹھ کر مشورے کرتے تھے کہ آپؐ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ اُن کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے نبیؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمھارے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم زندہ رہو گے تو تمھاری آنکھوں کے سامنے اِن کی شامت آئے گی، اُٹھا لیے جاؤ گے تو تمھارے پیچھے ان کی خبر لی جائے گی۔ شامتِ اعمال اب ان کی دامن گیر ہو چکی ہے جس سے یہ بچ نہیں سکتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً
يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے، اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔[۳۹] تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے، اُن سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ اُن کی بندگی کی جائے؟[۴۰]

ہم[۴۱] نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ[۴۲] فرعون اور اُس کے اَعیانِ سلطنت کے پاس بھیجا،

۳۸ – یعنی تم اس فکر میں نہ پڑو کہ ظلم اور بے ایمانی کے ساتھ حق کی مخالفت کرنے والے اپنے کیے کی کیا اور کب سزا پاتے ہیں، نہ اِس بات کی فکر کرو کہ اسلام کو تمھاری زندگی میں فروغ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ تمھارے لیے بس یہ اطمینان کافی ہے کہ تم حق پر ہو۔ لہٰذا نتائج کی فکر کیے بغیر اپنا فرض انجام دیتے چلے جاؤ، اور یہ اللہ پر چھوڑ دو کہ وہ باطل کا سر تمھارے سامنے نیچا کرتا ہے یا تمھارے پیچھے۔

۳۹ – یعنی اِس سے بڑھ کر کسی شخص کی کوئی خوش قسمتی نہیں ہوسکتی کہ تمام انسانوں میں سے اُس کو اللہ اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے منتخب کرے، اور کسی قوم کے حق میں بھی اس سے بڑی کسی خوش قسمتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی دوسری سب قوموں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اُس کے ہاں اپنا نبی پیدا کرے اور اُس کی زبان میں اپنی کتاب نازل کرے اور اُسے دنیا میں پیغامِ خداوندی کی حامل بن کر اُٹھنے کا موقع دے۔ اس شَرَفِ عظیم کا احساس اگر قریش اور اہلِ عرب کو نہیں ہے اور وہ اس کی ناقدری کرنا چاہتے ہیں، تو ایک وقت آئے گا جب انھیں اس کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

۴۰ – رسولوں سے پوچھنے کا مطلب اُن کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملے میں اگر تمھارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت کی طرف رُجوع کرو، اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات سکھائی تھی کہ اللہ جَلّ شانُہٗ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے؟

۴۱ – یہ قصہ یہاں تین مقاصد کے لیے بیان کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ملک اور کسی قوم میں اپنا نبی بھیج کر اسے وہ موقع عطا فرماتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اب اہلِ عرب کو اُس نے عطا فرمایا ہے، اور وہ اُس کی قدر

فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُونَ ۝ وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۬ وَأَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ وَقَالُوا يٰٓأَيُّهَ السّٰحِرُ

اور اُس نے جا کر کہا کہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اُس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی اُن کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی، اور ہم نے اُن کو عذاب میں دھر لیا، تاکہ وہ اپنی رَوِش سے باز آئیں[۴۳]۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے: اَے ساحر!

کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُس حماقت کا ارتکاب کرتی ہے جس کا ارتکاب فرعون اور اس کی قوم نے کیا تھا، تو پھر اس کا وہ انجام ہوتا ہے جو تاریخ میں نمونۂ عبرت بن چکا ہے۔ دوسرے، یہ کہ فرعون نے بھی اپنی بادشاہی اور اپنی شوکت وحشمت اور دولت وثروت پر فخر کر کے موسیٰؑ کو اسی طرح حقیر سمجھا تھا جس طرح اب کفارِ قریش اپنے سرداروں کے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ مگر خدا کا فیصلہ کچھ اور تھا، جس نے آخر بتا دیا کہ اصل میں حقیر و ذلیل کون تھا۔ تیسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق اور اس کی تنبیہات کے مقابلے میں ہیکڑی دکھانا کوئی سستا سودا نہیں ہے، بلکہ یہ سودا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس کا خمیازہ جو بھگت چکے ہیں ان کی مثال سے سبق نہ لوگے تو خود بھی ایک روز وہی خمیازہ بھگت کر رہو گے۔

۴۲ – ان سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں ہیں جنھیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں گئے تھے، یعنی عصا اور یدِ بیضا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۷ تا ۸۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۲-۱۳-۲۹-۳۰، الشعراء، حواشی ۲۶ تا ۲۹، النمل، حاشیہ ۱۶، القصص، حواشی ۴۴-۴۵)

۴۳ – اِن نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے ان کو دکھائیں، اور وہ یہ تھیں:

(۱) جادوگروں سے اللہ کے نبی کا برسرِ عام مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر ایمان لے آئے۔ تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۸ تا ۹۲۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۳۰ تا ۵۰، الشعراء، حواشی ۲۹ تا ۴۰۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے پیشگی اعلان کے مطابق مصر کی سرزمین میں شدید قحط برپا ہو گیا اور وہ ان کی دعا پر ہی دُور ہوا۔

(۳) اُن کے پیشگی اعلان کے بعد سارے ملک میں ہولناک بارشوں اور ژالہ باری اور گرج اور کڑک کے طوفان آئے جنھوں نے بستیوں اور کھیتیوں کو تباہ کر ڈالا۔ اور یہ بلا بھی اُن کی دعا سے ہی دفع ہوئی۔

(۴) پورے ملک پر ان کے اعلان کے مطابق ٹِڈی دلوں کا خوفناک حملہ ہوا، اور یہ آفت بھی اس وقت تک نہ ٹلی جب تک انھوں نے اسے ٹالنے کے لیے اللہ سے دعا نہ کی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿٥٠﴾ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ

اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے اُس کی بنا پر ہمارے لیے اُس سے دعا کر، ہم ضرور راہِ راست پر آجائیں گے۔ مگر جوں ہی کہ ہم اُن پر سے عذاب ہٹا دیتے، وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔ ایک روز فرعون نے

(۵) ملک بھر میں ان کے اعلان کے مطابق جُوئیں اور سُرسُریاں پھیل گئیں، جن سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت مبتلائے عذاب ہوئے اور دوسری طرف غلّوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ یہ عذاب بھی اُس وقت ٹلا جب حضرت موسیٰؑ سے درخواست کر کے دعا کرائی گئی۔

(۶) ملک کے گوشے گوشے میں اُن کی قبل از وقت تنبیہ کے مطابق مینڈکوں کا سیلاب اُمنڈ آیا، جس نے پوری آبادی کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ اللہ کی یہ فوج بھی حضرت موسیٰؑ کی دُعا کے بغیر واپس نہ گئی۔

(۷) ٹھیک اُن کے اعلان کے مطابق خون کا عذاب رونما ہوا جس سے تمام نہروں، کنوؤں، چشموں، تالابوں اور حوضوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی کے ذخیروں میں عُفُونت پیدا ہو گئی، اور پورے ایک ہفتے تک مصر کے لوگ صاف پانی کو ترس گئے۔ یہ آفت بھی اُس وقت ٹلی جب اس سے نجات پانے کے لیے حضرت موسیٰؑ سے دُعا کرائی گئی۔ تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۴ تا ۹۶۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۱۶-۱۷۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳۷۔

بائبل کی کتابِ خُروج، باب ۷-۸-۹-۱۰ اور ۱۲ میں بھی ان عذابوں کی مفصّل رُوداد درج ہے، مگر وہ گپ اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ویسا ہی لا کر دکھا دیا۔ مگر جب جُوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جُوئیں پیدا نہ کر سکے اور انھوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا سیلاب اُٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے، لیکن اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰؑ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دُعا کر کے اس عذاب کو دفع کرائیے۔ سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر تھے تو فرعون نے انھی کے ذریعے سے یہ عذاب کیوں نہ دُور کرا لیا؟ اور آخر یہ معلوم کیسے ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے ہیں اور جادُوگروں کے مینڈک کون سے؟ یہی سوال خون کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادُوگروں نے کس پانی کو خون بنایا، اور کیسے معلوم ہوا کہ فُلاں جگہ کا پانی جادُوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے؟ ایسی ہی باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بائبل خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کو جن لوگوں نے تصنیف کیا ہے انھوں نے اس کے اندر اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا دیا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ یہ مصنّفین کچھ تھے بھی واجبی سی عقل کے لوگ جنھیں بات گھڑنے کا سلیقہ بھی نصیب نہ تھا۔

۴۴ – فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی ہٹ دھرمی کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ خدا کے عذاب سے تنگ آ کر حضرت موسیٰؑ سے اُس کے ٹلنے کی دعا کرانا چاہتے تھے، اُس وقت بھی وہ آپ کو پیغمبر کہنے کے بجائے جادوگر ہی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ جادو کی حقیقت سے ناواقف نہ تھے، اور ان سے یہ بات چھُپی ہوئی نہ تھی کہ یہ کرشمے کسی جادُو سے رونما نہیں ہو سکتے۔ ایک جادُوگر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبے میں جو لوگ اُس کے سامنے موجود ہوں اُن کے ذہن پر ایسا اثر ڈالے جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ پانی خون بن گیا ہے، یا مینڈک اُبلے پڑ رہے ہیں، یا ٹِڈی دَل چڑھے چلے آ رہے ہیں۔ اور اس محدود رقبے کے اندر بھی کوئی پانی حقیقت میں خون نہ بن جائے گا، بلکہ اس دائرے سے نکلتے ہی پانی کا پانی رہ جائے گا۔ کوئی مینڈک فی الواقع پیدا نہ ہوگا، بلکہ اسے پکڑ کر آپ اس دائرے سے باہر لے جائیں گے تو آپ کے ہاتھ میں مینڈک کے بجائے صرف ہوا ہو گی۔ ٹِڈی دَل بھی محض خیالی دَل ہوگا، کسی کھیت کو وہ نہ چاٹ سکے گا۔ رہی یہ بات کہ ایک پورے ملک میں قحط برپا ہو جائے، یا تمام ملک کی نہریں اور چشمے اور کنویں خون سے بھر جائیں، یا ہزار ہا میل کے رقبے پر ٹِڈی دَل ٹوٹ پڑیں اور وہ لاکھوں ایکڑ کے کھیت صاف کر جائیں، یہ کام نہ آج تک کبھی کوئی جادُوگر کر سکا ہے، نہ جادُو کے زور سے کبھی یہ ہو سکتا ہے۔ ایسے جادُوگر کسی بادشاہ کے پاس ہوتے تو اسے فوج رکھنے اور جنگ کی مصیبتیں جھیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ جادو کے زور سے وہ ساری دنیا کو مُسخّر کر سکتا تھا۔ بلکہ جادُوگروں کے پاس یہ طاقت ہوتی تو وہ بادشاہوں کی ملازمت ہی کیوں کرتے؟ خود بادشاہ نہ بن بیٹھتے؟

مفسرین کو بالعموم یہ پریشانی پیش آئی ہے کہ جب عذاب سے نجات پانے کے لیے فرعون اور اس کے درباری حضرت موسیٰؑ سے دُعا کی درخواست کرتے تھے، اس وقت وہ ان کو "اے ساحر" کہہ کر کیسے خطاب کرتے تھے۔ مصیبت کے وقت مدد کی التجا کرنے والا تو خوشامد کرتا ہے نہ کہ مَذمّت۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ تاویل کی ہے کہ جادو اس زمانے کے اہلِ مصر کے نزدیک بڑا باوُقعت علم تھا، اور "اے ساحر" کہہ کر دراصل وہ حضرت موسیٰؑ کی مَذمّت نہ کرتے تھے، بلکہ اپنے نزدیک عزّت کے ساتھ وہ گویا ان کو "اے عالم" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن یہ تاویل اس بنا پر بالکل غلط ہے کہ قرآن میں دوسرے مَقامات پر جہاں جہاں بھی فرعون کے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں جن میں اس نے حضرت موسیٰؑ کو جادوگر اور ان کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہا ہے، وہاں مَذمّت اور تحقیر کا انداز صاف ظاہر ہوتا ہے، اور صریحاً یہ نظر آتا ہے کہ اس کے نزدیک جادو ایک جھوٹی چیز تھی جس کا الزام حضرت موسیٰؑ پر رکھ کر وہ آپ کو جھوٹا مدّعیِ نبوت قرار دیتا تھا۔ اس لیے یہ ماننے کے قابل بات نہیں ہے کہ یکایک اس مقام پر اس کی نگاہ میں "ساحر" ایک باعزت عالم کا لقب بن گیا ہو۔ رہا یہ سوال کہ جب دُعا کی درخواست کرتے وقت بھی وہ عَلانیہ حضرت موسیٰؑ کی توہین کرتا تھا تو آپ اُس کی درخواست قبول ہی کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آں جناب کے پیشِ نظر اللہ کے حکم سے اُن لوگوں پر حُجّت تمام کرنا تھا۔ عذاب ٹالنے کے لیے اُن کا آپ سے دعا کی درخواست کرنا خود یہ ثابت کر رہا تھا کہ اپنے دلوں میں وہ جان چکے ہیں کہ یہ عذاب کیوں آ رہے ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں، اور کون انھیں ٹال سکتا ہے۔ اس کے باوجود جب وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور عذاب ٹل جانے کے بعد راہِ راست قبول کرنے کے وعدے سے پھر جاتے تھے، تو درحقیقت وہ اللہ کے نبی کا کچھ نہ بگاڑتے تھے، بلکہ اپنے خلاف اُس مُقدّمے کو اور زیادہ مضبوط کرتے چلے جاتے تھے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اُن

Maktaba Tul Ishaat.com

فِیۡ قَوۡمِهٖ قَالَ یٰقَوۡمِ اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِیۡ
مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ اَمۡ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ مَهِیۡنٌ ۙ
وَّلَا یَكَادُ یُبِیۡنُ ۝ فَلَوۡلَاۤ اُلۡقِیَ عَلَیۡهِ اَسۡوِرَةٌ مِّنۡ ذَهَبٍ اَوۡ جَآءَ

اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا:[۴۵] ”لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟[۴۶] میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر[۴۷] ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟[۴۸] کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اُتارے گئے؟ یا فرشتوں کا

کے کُلّی اِستیصال کی شکل میں آخر کر دیا۔ ان کا آپ کو ساحر کہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ درحقیقت اپنے دل میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ عذاب ان پر جادُو کے زور سے آرہے ہیں۔ بلکہ اپنے دلوں میں وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ اللہ رب العالمین کی نشانیاں ہیں، اور پھر جان بُوجھ کر اُن کا انکار کرتے تھے۔ یہی بات ہے جو سورۂ نمل میں فرمائی گئی ہے کہ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَیۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (آیت ۱۴) ”ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے، مگر انھوں نے ظلم اور تکبُّر کی بنا پر ان نشانیوں کا انکار کیا۔“

۴۵ – غالباً پوری قوم میں پکارنے کی عملی صورت یہ رہی ہوگی کہ فرعون نے جو بات اپنے دربار میں سلطنت کے اَعیان و اکابر اور قوم کے بڑے بڑے سرداروں کو مخاطب کر کے کہی تھی، اُسی کو مُنادیوں کے ذریعے سے پورے ملک کے شہروں اور قریوں میں نشر کرایا گیا ہوگا۔ بے چارے کے پاس اُس زمانے میں یہ ذرائع نہ تھے کہ خوشامدی پریس، خانہ ساز خبر رساں ایجنسیوں اور سرکاری ریڈیو سے مُنادی کراتا۔

۴۶ – مُنادی کا یہ مضمون ہی صاف بتا رہا ہے کہ ہزمیجسٹی کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے پے در پے معجزات نے ملک کے عوام کا عقیدہ اپنے دیوتاؤں پر سے متزلزل کر دیا تھا اور فراعنہ کا باندھا ہوا وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا جس کے ذریعے سے خداؤں کا اَوتار بن کر یہ خاندان مصر میں اپنی خداوندی چلا رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر فرعون چیخ اٹھا کہ کم بختو! تمھیں آنکھوں سے نظر نہیں آتا کہ اس ملک میں بادشاہی کس کی ہے، اور دریائے نیل سے نکلی ہوئی یہ نہریں، جن پر تمھاری ساری معیشت کا انحصار ہے، کس کے حکم سے جاری ہیں؟ یہ ترقیات (developments) کے کام تو میرے اور میرے خاندان کے کیے ہوئے ہیں، اور تم گرویدہ ہو رہے ہو اس فقیر کے۔

۴۷ – یعنی جس کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ اختیار و اقتدار۔ وہی اعتراض جو کفارِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا۔

۴۸ – بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ فرعون کا اعتراض اُس لکنت پر تھا جو حضرت موسیٰؑ کی زبان میں بچپن سے

مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ

ایک دستہ اس کی اَردلی میں نہ آیا؟"[49]

اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔[50] آخرِ کار جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے اُن سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا

تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب نبوت کے منصب پر سرفراز کیا جا رہا تھا، اُس وقت انھوں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ میری زبان کی گرہ کھول دیجیے، تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں، اور اُسی وقت ان کی دوسری درخواستوں کے ساتھ یہ درخواست بھی قبول کر لی گئی تھی۔ (آیات ۲۷ تا ۳۶) پھر قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر حضرت موسیٰؑ کی جو تقریریں نقل کی گئی ہیں، وہ کمال درجے کی طلاقتِ لسانی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا فرعون کے اعتراض کی بِنا کوئی لکنت نہ تھی جو آنحضرت کی زبان میں ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص نہ معلوم کیا اُلجھی اُلجھی باتیں کرتا ہے، مابدولت کی سمجھ میں تو کبھی اس کا مدعا آیا نہیں۔

۴۹ – قدیم زمانے میں جب کسی شخص کو کسی علاقے کی گورنری، یا کسی غیر ملک کی سفارت کے منصب پر مقرر کیا جاتا تو بادشاہ کی طرف سے اس کو خِلعت عطا ہوتا تھا جس میں سونے کے کڑے یا کنگن بھی شامل ہوتے تھے، اور اس کے ساتھ سپاہیوں، چوب داروں اور خدام کا ایک دستہ بھی ہوتا تھا، تاکہ اس کا رعب اور دبدبہ قائم ہو اور اُس بادشاہ کی شان و شوکت کا اظہار ہو جس کی طرف سے وہ مامور ہو کر آ رہا ہے۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی موسیٰ علیہ السلام کو آسمان کے بادشاہ نے اِیں جناب کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا تو اِسے خِلعتِ شاہی ملا ہوتا اور فرشتوں کے پَرے کے پَرے اس کے ساتھ آئے ہوتے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ملنگ ہاتھ میں لاٹھی لیے آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

۵۰ – اس مختصر سے فقرے میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مُطلَق العِنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے کُھلّم کُھلّا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بِکتے نہیں انھیں بے دریغ کچلتا اور روندتا ہے، تو خواہ زبان سے وہ یہ بات نہ کہے، مگر اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اس ملک کے باشندوں کو عقل اور اَخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے، اور اُس نے ان کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں اِن بے وقوف، بے ضمیر اور بُزدل لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اس کی یہ تدبیریں کامیاب ہو جاتی ہیں اور ملک کے باشندے اس کے دست بستہ غلام بن جاتے ہیں، تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اُس خبیث نے جو کچھ انھیں سمجھا تھا واقعی وہ وہی کچھ ہیں۔ اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۱

اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ
مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ
هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا
عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ

غرق کر دیا، اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونۂ عبرت بنا کر رکھ دیا۔[۵۱] ع

اور جوں ہی کہ ابنِ مریمؑ کی مثال دی گئی، تمھاری قوم کے لوگوں نے اس پر غُل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبُود اچھے ہیں یا وہ؟[۵۲] یہ مثال وہ تمھارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابنِ مریمؑ اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔[۵۳] ہم چاہیں تو

کیا ہے اور باطل کیا، انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچّائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ ان مسائل کے بجائے اُن کے لیے اصل اہمیّت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے، جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبّار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قُبول کرنے، اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

۵۱ – یعنی جو اُن کے انجام سے سبق نہ لیں اور اُنھی کی رَوش پر چلیں اُن کے لیے وہ پیش رَو ہیں، اور جو سبق لینے والے ہیں اُن کے لیے نمونۂ عبرت۔

۵۲ – اس سے پہلے آیت ۴۵ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ”تم سے پہلے جو رسول ہو گزرے ہیں ان سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ اُن کی بندگی کی جائے؟“ یہ تقریر جب اہلِ مکہ کے سامنے ہو رہی تھی تو ایک شخص نے، جس کا نام رِوایات میں عبداللہ ابنُ الزِّبَعرٰی آیا ہے، اعتراض جڑ دیا کہ کیوں صاحب! عیسائی مریمؑ کے بیٹے کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں؟ پھر ہمارے معبُود کیا بُرے ہیں؟ اس پر کفار کے مجمع سے ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا اور نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ وہ مارا، پکڑے گئے، اب بولو اس کا کیا جواب ہے۔ لیکن ان کی اس بے ہودگی پر سلسلۂ کلام توڑا نہیں گیا، بلکہ جو مضمون چلا آ رہا تھا، پہلے اُسے مکمل کیا گیا، اور پھر اُس سوال کی طرف توجہ کی گئی جو معترض نے اُٹھایا تھا۔ (واضح رہے کہ اس واقعے کو تفسیر کی کتابوں میں مختلف طریقوں سے رِوایت کیا گیا ہے جن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ لیکن آیت کے سِیاق و سَباق اور اُن رِوایات پر غور کرنے کے بعد ہمارے نزدیک واقعے کی صحیح صورت وہی ہے جو ابھی ہم نے بیان کی ہے۔)

۵۳ – قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسیٰؑ کو بے باپ کے پیدا کرنا، اور پھر اُن کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو

لَجَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ مَّلٰٓئِكَةً فِى الۡاَرۡضِ يَخۡلُفُوۡنَ ۝٦٠ وَاِنَّهٗ لَعِلۡمٌ
لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ‌ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ۝٦١

تم سے فرشتے پیدا کر دیں[54] جو زمین میں تمھارے جانشین ہوں۔ اور وہ دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے[55]، پس تم اُس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو، یہی سیدھا راستہ ہے،

نہ ان سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے نہ اُن کے بعد۔ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے۔ وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ مُردے کو جلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محض اِس غیر معمولی پیدائش اور اِن عظیم معجزات کی وجہ سے اُن کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دے کر ان کی عبادت کرنا غلط ہے۔ اُن کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۲ تا ۴۴، النساء، ۱۹۰، المائدہ، حواشی ۴۰ - ۴۶ - ۱۲۷۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲، الانبیاء، حواشی ۸۸ تا ۹۰، المومنون، حاشیہ ۴۳)

۵۴ - دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض کو فرشتہ بنا دیں۔

۵۵ - اس فقرے کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قیامت کے علم کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "وہ" سے کیا چیز مراد ہے؟ حضرت حَسَن بصریؒ اور سعید بن جُبیرؒ کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن سے آدمی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ قیامت آئے گی۔ لیکن یہ تفسیر سیاق و سباق سے بالکل غیر متعلق ہے۔ سلسلۂ کلام میں کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ دوسرے مفسرین قریب قریب بالاتفاق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ ابنِ مریمؑ ہیں، اور یہی سیاق و سباق کے لحاظ سے دُرست ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آں جناب کو قیامت کی نشانی یا قیامت کے علم کا ذریعہ کس معنیٰ میں فرمایا گیا ہے؟ ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عِکرِمہؒ، قَتادہؒ، سُدّیؒ، ضَحّاکؒ، ابو العالیہؒ اور ابو مالکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کا نُزولِ ثانی ہے جس کی خبر بکثرت احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قیامت اب قریب ہے۔ لیکن اِن بزرگوں کی جلالتِ قدر کے باوجود یہ ماننا مشکل ہے کہ اِس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی کو قیامت کی نشانی یا اس کے علم کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ بعد کی عبارت یہ معنیٰ لینے میں مانع ہے۔ اُن کا دوبارہ آنا تو قیامت کے علم کا ذریعہ صرف اُن لوگوں کے لیے بن سکتا ہے جو اُس زمانہ میں موجود ہوں یا اُس کے بعد پیدا ہوں۔ کفارِ مکہ کے لیے آخر وہ کیسے ذریعۂ علم قرار پا سکتا تھا کہ اُن کو خطاب کر کے یہ کہنا صحیح ہوتا کہ "پس تم اس میں شک نہ کرو"۔ لہٰذا ہمارے نزدیک صحیح تفسیر وہی ہے جو بعض دوسرے مفسرین نے کی ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُن کے مٹی سے پرندہ بنانے اور مُردے جِلانے کو قیامت کے اِمکان کی ایک دلیل قرار دیا گیا ہے، اور ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ جو خدا باپ کے بغیر بچہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى
بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ
تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾

ایسا نہ ہو شیطان تم کو اُس سے روک دے[۵۶] کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور جب عیسیٰؑ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ ”میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض اُن باتوں کی حقیقت کھول دُوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ اُسی کی تم عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے[۵۷]۔“ مگر (اُس کی اِس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا[۵۸]، پس تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔

پیدا کر سکتا ہے، اور جس خدا کا ایک بندہ مٹی کے پُتلے میں جان ڈال سکتا اور مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے، اُس کے لیے آخر تم اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں اور تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے۔

۵۶ – یعنی قیامت پر ایمان لانے سے روک دے۔

۵۷ – یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو دوسرے تمام انبیاؑ کی دعوت تھی اور اب جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو بلا رہے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۵ تا ۴۸، النساء، حواشی، ۲۱۳ – ۲۱۷ – ۲۱۸، المائدہ، حواشی ۱۰۰ – ۱۳۰۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۱ تا ۲۳)

۵۸ – یعنی ایک گروہ نے اُن کا انکار کیا تو مُخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ اُن پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور ان کو اپنے نزدیک سُولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے اُن کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غُلوّ کر کے ان کو خدا بنا بیٹھا، اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گُتھی بنا جسے سلجھاتے سُلجھاتے اُس میں بے شمار فرقے بن گئے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، حواشی ۳۹ – ۴۰ – ۱۰۱ – ۱۳۰)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾
اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ يٰعِبَادِ
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ
تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا
مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾ وَ
تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ

ع ۶

کیا یہ لوگ اب بس اِسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک اِن پر قیامت آ جائے اور انھیں خبر بھی نہ ہو؟ وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے[۵۹]۔ اُس روز اُن لوگوں سے، جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے، کہا جائے گا کہ "اے میرے بندو! آج تمھارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمھاری بیویاں[۶۰]، تمھیں خوش کر دیا جائے گا۔" اُن کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے، اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی۔ ان سے کہا جائے گا: "تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے۔ تم اِس جنت کے وارث اپنے اُن اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمھارے لیے

۵۹ - دوسرے الفاظ میں صرف وہ دوستیاں باقی رہ جائیں گی جو دنیا میں نیکی اور خدا ترسی پر قائم ہیں، دوسری تمام دوستیاں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، اور آج گمراہی، ظلم و ستم اور معصیت میں جو لوگ ایک دوسرے کے یار و مددگار بنے ہوئے ہیں، کل قیامت کے روز وہی ایک دوسرے پر الزام ڈالنے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں بار بار جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص اِسی دنیا میں اچھی طرح سوچ لے کہ کن لوگوں کا ساتھ دینا اِس کے لیے مفید ہے اور کن کا ساتھ تباہ کن۔

۶۰ - اصل میں ازواج کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بیویوں کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُوْنَ ۝۷۳ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ
جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝۷۴ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝۷۵ وَمَا
ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۶ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ
عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝۷۷ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝۷۸ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا
مُبْرِمُوْنَ ۝۷۹ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى

یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنھیں تم کھاؤ گے۔" رہے مجرمین، تو وہ ہمیشہ جہنّم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے، کبھی اُن کے عذاب میں کمی نہ ہوگی، اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کرتے رہے۔ وہ پکاریں گے: "اے مالک[61]! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے تو اچھا ہے۔" وہ جواب دے گا: "تم یوں ہی پڑے رہو گے، ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے تھے، مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔[62]"

کیا اِن لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے[63]؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں۔ کیا اِنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اِن کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں

بھی جو کسی شخص کے ہم مشرب، ہم جولی اور ہم جماعت ہوں۔ یہ وسیع المعنیٰ لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس کے مفہوم میں دونوں داخل ہو جائیں۔ اہلِ ایمان کی مومن بیویاں بھی اُن کے ساتھ ہوں گی اور ان کے مومن دوست بھی جنت میں اِن کے رفیق ہوں گے۔

۶۱ – مالک سے مراد ہے جہنّم کا داروغہ، جیسا کہ فحوائے کلام سے خود ظاہر ہو رہا ہے۔

۶۲ – یعنی ہم نے حقیقت تمھارے سامنے کھول کر رکھ دی، مگر تم حقیقت کے بجائے افسانوں کے دلدادہ تھے اور سچائی تمھیں سخت ناگوار تھی۔ اب اپنے اِس احمقانہ انتخاب کا انجام دیکھ کر بلبلاتے کیوں ہو؟ ہوسکتا ہے کہ یہ داروغۂ جہنّم ہی کے جواب کا ایک حصّہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کا جواب "تم یوں ہی پڑے رہو گے" پر ختم ہوگیا ہو اور یہ دوسرا فقرہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ پہلی صورت میں داروغۂ جہنّم کا یہ قول کہ "ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے تھے" ایسا ہی ہے جیسے حکومت کا کوئی افسر حکومت کی طرف سے بولتے ہوئے "ہم" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہماری حکومت نے یہ کام کیا

وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝٨٠ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا
اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝٨١ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ
الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝٨٢ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا
يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝٨٣ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ
اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝٨٤ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٨٥

اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔

اِن سے کہو: "اگر واقعی رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا۔[64]" پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا، عرش کا مالک، اُن ساری باتوں سے جو یہ لوگ اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اچھا، اِنھیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا اِنھیں خوف دلایا جا رہا ہے۔

وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا، اور وہی حکیم و علیم ہے۔[65] بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اُس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔[66] اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔[67]

یا یہ حکم دیا۔

۶۳ – اشارہ ہے اُن باتوں کی طرف جو سرداران قریش اپنی خفیہ مجلسوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی فیصلہ کُن قدم اُٹھانے کے لیے کر رہے تھے۔

۶۴ – مطلب یہ ہے کہ میرا کسی کو خدا کی اولاد نہ ماننا، اور جنھیں تم اس کی اولاد قرار دے رہے ہو ان کی عبادت سے انکار کرنا کسی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر نہیں ہے۔ مَیں جس بنا پر اس سے انکار کرتا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ کوئی خدا کا بیٹا یا بیٹی نہیں ہے اور تمھارے یہ عقائد حقیقت کے خلاف ہیں۔ ورنہ میں تو خدا کا ایسا وفادار بندہ ہوں کہ اگر بالفرض حقیقت یہی ہوتی تو تم سے پہلے مَیں بندگی میں سر جھکا دیتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ

اُس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں، وہ کسی شَفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔[۶۸]

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ خود کہیں گے کہ

۶۵ - یعنی آسمان اور زمین کے خدا الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ اُسی کی حکمت اِس پورے نظامِ کائنات میں کارفرما ہے، اور وہی تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔

۶۶ - یعنی اُس کی ہستی اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ کوئی خدائی میں اُس کا شریک ہو اور اس عظیم کائنات کی فرماں روائی میں کچھ بھی دخل رکھتا ہو۔ زمین و آسمان میں جو بھی ہیں، خواہ وہ انبیاؑ ہوں یا اولیا، فرشتے ہوں یا جِن یا ارواح، ستارے ہوں یا سیّارے، سب اُس کے بندے اور غلام اور تابعِ فرمان ہیں۔ اُن کا کسی خدائی صِفت سے مُتَّصِف یا خدائی اختیار کا حامل ہونا قطعی ناممکن ہے۔

۶۷ - یعنی دنیا میں تم خواہ کسی کو اپنا حامی و سرپرست بناتے پھرو، مگر مرنے کے بعد تمھارا سابقہ اُسی ایک خدا سے پڑنا ہے اور اُسی کی عدالت میں تم کو اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے۔

۶۸ - اس فقرے کے کئی مفہوم ہیں:

ایک، یہ کہ لوگوں نے جن جن کو دنیا میں معبود بنا رکھا ہے وہ سب اللہ کے حضور شَفاعت کرنے والے نہیں ہیں۔ ان میں سے جو گمراہ و بدراہ تھے، وہ تو خود وہاں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ البتہ وہ لوگ ضرور دوسروں کی شَفاعت کرنے کے قابل ہوں گے جنھوں نے علم کے ساتھ (نہ کہ بے جانے بُوجھے) حق کی شہادت دی تھی۔

دوسرے، یہ کہ جنھیں شفاعت کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، وہ بھی صرف اُن لوگوں کی شفاعت کر سکیں گے جنھوں نے دنیا میں جان بُوجھ کر (نہ کہ غفلت و بے خبری کے ساتھ) حق کی شہادت دی ہو۔ کسی ایسے شخص کی شفاعت نہ وہ خود کریں گے، نہ کرنے کے مجاز ہوں گے جو دنیا میں حق سے برگشتہ رہا تھا، یا بے سمجھے بُوجھے اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ بھی کہتا رہا اور دوسرے الٰہوں کی بندگی بھی کرتا رہا۔

تیسرے، یہ کہ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اُس نے جن کو معبُود بنا رکھا ہے وہ لازماً شفاعت کے اختیارات رکھتے ہیں، اور انھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا زور حاصل ہے کہ جسے چاہیں بخشوالیں، قطعِ نظر اس سے کہ اس کے اعمال و عقائد کیسے ہی ہوں، تو وہ غلط کہتا ہے۔ یہ حیثیت اللہ کے ہاں کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ جو شخص کسی کے لیے ایسی شفاعت کے اختیارات کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اگر علم کی بنا پر اس بات کی مبنی برحقیقت شہادت دے سکتا ہو تو ہمت کر کے آگے آئے، لیکن اگر وہ ایسی شہادت دینے کی پوزیشن

اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾

وقف لازم ع ۲۲ ۱۴

اللہ نے۔[٦٩] پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں؟ قسم ہے رسولؐ کے اِس قول کی کہ اے رب!
یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں[٧٠] دیتے۔
اچھا، اَے نبیؐ! اِن سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمھیں[٧١]، عنقریب اِنھیں
معلوم ہو جائے گا۔

میں نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو خواہ مخواہ سنی سنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم و گمان کی بنیاد پر ایسا ایک عقیدہ گھڑ لینا سراسر لغو، اور اس خیالی بھروسے پر اپنی عاقبت کو خطرے میں ڈال لینا قطعی حماقت ہے۔

اس آیت سے ضمناً دو بڑے اہم اُصول بھی مُستنبط ہوتے ہیں: اوّلاً، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے بغیر حق کی شہادت دینا چاہے دنیا میں معتبر ہو، مگر اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ دنیا میں تو جو شخص کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے گا، ہم اس کو مسلمان مان لیں گے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرتے رہیں گے، جب تک وہ کھلم کھلا کفرِ صریح کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اللہ کے ہاں صرف وہی شخص اہلِ ایمان میں شمار ہوگا جس نے اپنی بساطِ علم و عقل کی حد تک یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو کہ وہ کس چیز کا انکار اور کس چیز کا اقرار کر رہا ہے۔

ثانیاً، اس سے قانونِ شہادت کا یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ گواہی کے لیے علم شرط ہے۔ گواہ جس واقعے کی گواہی دے رہا ہو، اس کا اگر اُسے علم نہیں ہے تو اس کی گواہی بے معنیٰ ہے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ آپؐ نے ایک گواہ سے فرمایا کہ: اِذا رأیت مثل الشمس فاشهد والافدع (احکام القرآن للجصّاص) ''اگر تو نے واقعہ کو خود اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا ہے جیسے تو سورج کو دیکھ رہا ہے تو گواہی دے ورنہ رہنے دے۔''

٦٩ - اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اگر تم اِن سے پوچھو کہ خود اِن کو کس نے پیدا کیا ہے، تو کہیں گے کہ اللہ نے۔ دوسرے، یہ کہ اگر تم اِن سے پوچھو کہ اِن کے معبُودوں کا خالق کون ہے، تو یہ کہیں گے کہ اللہ۔

٧٠ - یہ قرآن مجید کی نہایت مشکل آیات میں سے ہے جس میں نحو کا یہ نہایت پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَقِيْلِهٖ میں واؤ کیسا ہے اور اس لفظ کا تعلق اُوپر کے سلسلۂ کلام میں کس چیز کے ساتھ ہے۔ مفسرین نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے، مگر کوئی تشفی بخش بات مجھے اُن کے ہاں نہیں ملی۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح بات وہی ہے جو شاہ عبد القادر صاحبؒ کے ترجمے سے مُترشح ہوتی ہے، یعنی اس میں واو عطف کا نہیں بلکہ قسمیہ ہے، اور اس کا تعلق فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ سے ہے، اور قِيْلِهٖ کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے، جس پر يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ کا فقرہ صریح

Maktaba Tul Ishaat.com

دلالت کر رہا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ:

> قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ ”اے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے“، کیسی عجیب ہے اِن لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور پھر بھی خالق کو چھوڑ کر مخلوق ہی کی عبادت پر اصرار کیے جاتے ہیں۔

رسول کے اِس قول کی قَسَم کھانے کا مدّعا یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ رَوِش صاف ثابت کیے دے رہی ہے کہ فی الواقع یہ ہٹ دھرم ہیں، کیونکہ ان کے رَوِیّے کا غیر معقول ہونا ان کے اپنے اعتراف سے ظاہر ہے، اور ایسا غیر معقول رَوِیّہ صرف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جو نہ ماننے کا فیصلہ کیے بیٹھا ہو۔ بالفاظِ دیگر یہ قسم اس معنیٰ میں ہے کہ بالکل ٹھیک کہا رسول نے، فی الواقع یہ مان کر دینے والے لوگ نہیں ہیں۔

۷۱ – یعنی ان کی سخت باتوں اور تضحیک و اِستہزا پر نہ ان کے لیے بدُعا کرو اور نہ ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہو، بس سلام کر کے ان سے الگ ہو جاؤ۔

تفہیم القرآن

الدخان

(۴۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

الدخان

نام

آیت نمبر ۱۰: يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ کے لفظ دُخان کو اس سورت کا عنوان بنایا گیا ہے، یعنی یہ وہ سورت ہے جس میں لفظِ دُخان وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اِس کا زمانۂ نُزول بھی کسی معتبر رِوایت سے معلوم نہیں ہوتا، مگر مضامین کی اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ بھی اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ زُخرُف اور اس سے پہلے کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں، البتہ یہ اُن سے کچھ مُتأخّر ہے۔ تاریخی پَس منظر یہ ہے کہ جب کفارِ مکہ کی مخالفانہ رَوِش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا! یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضوؐر کا خیال یہ تھا کہ جب اِن لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انھیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دُعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اُٹھے۔ آخر کار بعض سردارانِ قریش، جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے خاص طور پر ابوسُفیان کا نام لیا ہے، حضوؐر کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ اپنی قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کے لیے اللہ سے دُعا کریں۔ یہی موقع ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

موضوع اور مَباحِث

اس موقع پر کفارِ مکہ کی فہمایش اور تنبیہ کے لیے جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا، اس کی تمہید چند اہم مباحث پر مشتمل ہے:

اوّل، یہ کہ تم لوگ اس قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھنے میں غَلَطی کر رہے ہو۔ یہ کتاب تو اپنی ذات میں خود اِس امر کی بَیِّن شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوندِ عالَم کی کتاب ہے۔

دوسرے، یہ کہ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں بھی غلطی کر رہے ہو۔ تمھارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہو گئی ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر تمھارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

تیسرے، یہ کہ تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اِس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے۔ حالانکہ اِس رسول کی بِعثَت اور اس کتاب کی تنزیل اُس ساعتِ خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انھیں بدل ڈالے، نہ وہ کسی جہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو۔ وہ تو اُس فرماں روائے کائنات کے پختہ اور اٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع و علیم اور حکیم ہے۔ اُن سے لڑنا

کوئی کھیل نہیں ہے۔

چوتھے، یہ کہ اللہ کو تم خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو، اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے باوجود تمھیں دوسروں کو معبُود بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمھارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آرہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص شُعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی و موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہوسکتا کہ معبُود ہونے کے مستحق اُس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہوسکتے ہیں۔ تمھارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کرکے اسی کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ۔ حقیقت میں تو اُن کا رب بھی اکیلا وہی خدا تھا جو تمھارا رب ہے، اور اُنھیں بھی اسی ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمھیں کرنی چاہیے۔

پانچویں، یہ کہ اللہ کی رُبوبیت و رحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمھارا پیٹ پالے، بلکہ یہ بھی ہے کہ تمھاری رہنمائی کا انتظام کرے۔ اِسی رہنمائی کے لیے اُس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اُس قحط کے معاملے کو لیا گیا ہے جو اُس وقت درپیش تھا۔ جیسا کہ ہم اُوپر بیان کرچکے ہیں، یہ قحط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِستِدعا پر آیا تھا، اور حضورؐ نے اس کے لیے دُعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی، شاید کہ پھر حرفِ نصیحت ان پر کارگر ہو۔ یہ توقع اس وقت کسی حد تک پوری ہوتی نظر آرہی تھی، کیونکہ بڑے بڑے ہیکڑ دشمنانِ حق کال کے مارے پکار اُٹھے تھے کہ پروردگار! یہ عذاب ہم پر سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اِس پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے یہ لوگ کہاں سبق لینے والے ہیں۔ اِنھوں نے جب اُس رسول کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کی زندگی سے، جس کے کردار سے اور جس کے کام اور کلام سے عَلانِیَہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے، تو اب محض ایک قحط اِن کی غفلت کیسے دُور کردے گا۔ دوسری طرف کفار کو مخاطَب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو کہ یہ عذاب تم پر سے ٹال دیا جائے تو تم ایمان لے آؤ گے۔ ہم اِس عذاب کو ہٹائے دیتے ہیں، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں کتنے سچّے ہو۔ تمھارے سر پر تو شامت کُھل رہی ہے۔ تم ایک بڑی ضرب مانگ رہے ہو، ہلکی چوٹوں سے تمھارا دماغ دُرست نہیں ہوگا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو بھی ٹھیک یہی آزمایش پیش آئی تھی جس سے اب کفارِ قریش کے سرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ اُن کے پاس بھی ایسا ہی ایک معزّز رسول آیا تھا۔ انھوں نے بھی وہ صریح علامات اور نشانیاں دیکھ لی تھیں جن سے اُس کا مامور من اللہ ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بھی نشانی پر نشانی دیکھتے چلے گئے مگر اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ آخرِ کار رسول

Maktaba Tul Ishaat.com

کی جان لینے کے درپے ہو گئے، اور نتیجہ وہ کچھ دیکھا جو ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا موضوع آخرت کا لیا گیا ہے جس سے کفارِ مکہ کو شدت کے ساتھ انکار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ کر آتے نہیں دیکھا ہے، تم اگر دوسری زندگی کے دعوے میں سچّے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس کے جواب میں عقیدۂ آخرت کی دو دلیلیں مختصر طور پر دی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ اس عقیدے کا انکار ہمیشہ اَخلاق کے لیے تباہ کُن ثابت ہوتا رہا ہے۔ دوسرے، یہ کہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، بلکہ ایک حکیمانہ نظام ہے، اور حکیم کا کوئی کام عَبَث نہیں ہوتا۔ پھر کفار کے اس مطالبے کا کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ کام روز روز ہر ایک کے مطالبے پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے جب وہ تمام نوعِ انسانی کو بیک وقت جمع کرے گا اور اپنی عدالت میں ان کا مُحاسبہ فرمائے گا۔ اُس وقت کی اگر کسی کو فکر کرنی ہو تو کرلے، کیونکہ وہاں کوئی نہ اپنے زور پر بچ سکے گا نہ کسی کے بچائے بچے گا۔

اللہ کی اس عدالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں مجرم قرار پائیں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جو وہاں سے کامیاب ہو کر نکلیں گے وہ کیا انعام پائیں گے۔ پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ قرآن صاف سیدھی زبان میں اور تمھاری اپنی زبان میں نازل کر دیا گیا ہے، اب اگر تم سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور انجامِ بد ہی دیکھنے پر مُصِر ہو تو انتظار کرو، ہمارا نبی بھی منتظر ہے، جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت پر سامنے آجائے گا۔

آیاتها ۵۹ سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا ع ۱۲
كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ
عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ

ح۔م۔ قسم ہے اِس کتابِ مُبین کی کہ ہم نے اِسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبّہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے[1]۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ[2] ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے[3]۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے، تیرے رب کی رحمت کے طور پر[4]۔ یقیناً

---

۱ – کتابِ مُبین کی قسم کھانے کا مطلب سورۂ زُخرُف حاشیہ نمبر ۱ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں بلکہ ''ہم'' ہیں، اور اس کا ثبوت کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، خود یہ کتاب ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد مزید بات یہ فرمائی گئی کہ وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی جس میں اسے نازل کیا گیا۔ یعنی نادان لوگ، جنھیں اپنی بھلائی برائی کا شُعور نہیں ہے، اس کتاب کی آمد کو اپنے لیے بَلائے ناگہانی سمجھ رہے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے لیے اور تمام نوعِ انسانی کے لیے وہ ساعت بڑی ہی سعید تھی جب ''ہم'' نے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے یہ کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس رات میں قرآن نازل کرنے کا مطلب بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ نُزولِ قرآن کا سلسلہ اُس رات شروع ہوا۔ اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآن اُمّ الکتاب سے منتقل کر کے حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، اور پھر وہ حالات و وقائع کے مطابق حسبِ ضرورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال تک نازل کیا جاتا رہا۔ صحیح صورتِ معاملہ کیا ہے، اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اُس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ پھر یہ بات بھی قرآنِ مجید ہی میں بتا دی گئی ہے کہ وہ ماہِ رَمضان کی ایک رات تھی: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرہ: ۱۸۵)

۲ – اصل میں لفظ ''اَمرِ حَکِیم'' استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنی ہیں: ایک، یہ کہ وہ حکم سراسر حکمت پر مبنی

Maktaba Tul Ishaat.com

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا

وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے،^۵ آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اُس چیز کا رب جو آسمان و زمین

ہوتا ہے، کسی غلطی یا خامی کا اُس میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں۔

۳ – سورۂ قدر میں یہی مضمون اِس طرح بیان کیا گیا ہے: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ، ''اُس رات ملائکہ اور جبریل اپنے رب کے اِذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اُترتے ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شاہی نظم و نسق میں یہ ایک ایسی رات ہے جس میں وہ افراد اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے، اور پھر وہ انھی فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ بعض مفسرین کو، جن میں حضرت عِکرِمَہؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، یہ شبہ لاحق ہوا ہے کہ یہ نصفِ شعبان کی رات ہے، کیونکہ بعض احادیث میں اِسی رات کے متعلق یہ بات منقول ہوئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ لیکن ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، مُجاہدؒ، قَتادہؒ، حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، ابنِ زیدؒ، ابو مالکؒ، ضَحّاکؒ اور دوسرے بہت سے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رمضان کی وہی رات ہے جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے، اس لیے کہ قرآنِ مجید خود اس کی تصریح کر رہا ہے، اور جہاں قرآن کی صراحت موجود ہو، وہاں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ ''عثمان بن محمد کی جو رِوایت امام زُہریؒ نے شعبان سے شعبان تک قسمتوں کے فیصلے ہونے کے متعلق نقل کی ہے وہ ایک مُرسَل رِوایت ہے، اور ایسی روایات نُصوص کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتیں۔'' قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ کہتے ہیں کہ ''نصف شعبان کی رات کے متعلق کوئی حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے، نہ اس کی فضیلت کے بارے میں اور نہ اس امر میں کہ اُس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔'' (احکام القرآن)

۴ – یعنی یہ کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجنا نہ صرف حکمت کا تقاضا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی تھا، کیونکہ وہ رب ہے اور رُبوبیت صرف اسی بات کی متقاضی نہیں ہے کہ بندوں کے جسم کی پرورش کا سامان کیا جائے، بلکہ اس بات کی بھی متقاضی ہے کہ علم صحیح سے ان کی رہنمائی کی جائے، حق و باطل کے فرق سے اُن کو آگاہ کیا جائے، اور انھیں تاریکی میں بھٹکتا نہ چھوڑ دیا جائے۔

۵ – اِس سِیاق و سَباق میں اللہ تعالیٰ کی اِن دو صفات کو بیان کرنے سے مقصود لوگوں کو اِس حقیقت پر مُتنَبِّہ کرنا ہے کہ صحیح علم صرف وہی دے سکتا ہے، کیونکہ تمام حقائق کو وہی جانتا ہے۔ ایک انسان تو کیا، سارے انسان مل کر بھی اگر اپنے لیے کوئی راہِ حیات متعین کریں تو اس کے حق ہونے کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ پوری نوعِ انسانی یکجا ہو کر بھی ایک سمیع و علیم نہیں بنتی۔ اُس کے بس میں یہ ہے ہی نہیں کہ اُن تمام حقائق کا احاطہ کرے جن کا جاننا ایک صحیح راہ حیات متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہی سمیع و علیم ہے، اس لیے وہی یہ بتا سکتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا، حق کیا ہے اور باطل کیا، خیر کیا ہے اور شر کیا۔

وقف لازم

بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۞ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ
رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۞ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۞

کے درمیان ہے، اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔[۶] کوئی معبُود اُس کے سوا نہیں ہے۔[۷] وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔[۸] تمھارا رب اور تمھارے اُن اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں۔[۹] (مگر فی الواقع اِن لوگوں کو یقین نہیں ہے) بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں۔[۱۰]

۶ – اہلِ عرب خود اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب (مالک و پروردگار) ہے۔ اس لیے ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم بے سوچے سمجھے محض زبان ہی سے یہ اقرار نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں واقعی اُس کی پروردگاری کا شعور اور اس کے مالک ہونے کا یقین ہے، تو تمھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ (۱) انسان کی رہنمائی کے لیے کتاب اور رسول کا بھیجنا اس کی شانِ رحمت و پروردگاری کا عین تقاضا ہے، اور (۲) مالک ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا حق اور مملوک ہونے کی حیثیت سے یہ تمھارا فرض ہے کہ اس کی طرف سے جو ہدایت آئے اسے مانو، اور جو حکم آئے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دو۔

۷ – معبُود سے مراد ہے حقیقی معبُود، جس کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت (بندگی و پرستش) کی جائے۔

۸ – یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر تم کو جیتا جاگتا انسان بنایا، اور جو اس امر کے کُلّی اختیارات رکھتا ہے کہ جب تک چاہے تمھاری اِس زندگی کو باقی رکھے اور جب چاہے اسے ختم کر دے، اس کی تم بندگی نہ کرو، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرو، یا اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کرنے لگو۔

۹ – اِس میں ایک لطیف اشارہ ہے اِس امر کی طرف کہ تمھارے جن اسلاف نے اس کو چھوڑ کر دوسرے معبُود بنائے، ان کا رب بھی حقیقت میں وہی تھا۔ انھوں نے اپنے اصلی رب کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے کوئی صحیح کام نہ کیا تھا کہ اُن کی تقلید کرنے میں تم حق بجانب ہو اور ان کے فعل کو اپنے مذہب کے دُرست ہونے کی دلیل ٹھیرا سکو۔ اُن کو لازم تھا کہ وہ صرف اُسی کی بندگی کرتے، کیونکہ وہی ان کا رب تھا۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو تمھیں لازم ہے کہ سب کی بندگی چھوڑ کر اسی ایک کی بندگی اختیار کرو، کیونکہ وہی تمھارا رب ہے۔

۱۰ – اِس مختصر سے فقرے میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دہریے ہوں یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساعتیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو، اس میں کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دہریہ اپنے انکارِ خدا میں بظاہر خواہ کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گزرتا ہے کہ خاک کے ایک ذرّے سے لے کر کہکشانوں تک اور گھاس کی ایک پتّی سے لے کر انسان کی تخلیق تک یہ حیرت انگیز، حکمت سے لبریز نظام کسی صانع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح ایک مشرک اپنے شرک میں خواہ کتنا ہی گہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی

Maktaba Tul Ishaat.com

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ
هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲
اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ۝۱۳ ثُمَّ تَوَلَّوْا
عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا

وقف لازم

اچھا، انتظار کرو اُس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ) ”پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔“ اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسولِ مُبین آگیا[11]، پھر بھی یہ اُس کی طرف مُلتفت نہ ہوئے اور کہا کہ ”یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے[12]۔“ ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں،

نہ کبھی اس کا دل بھی یہ پکار اُٹھتا ہے کہ جنھیں میں معبود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اِس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہو جائے، نہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں اپنے شرک اور اپنی دَہریت میں کامل یقین و اطمینان حاصل رہے۔ اِس کے بجائے اُن کا دین درحقیقت شک پر قائم ہوتا ہے، خواہ اُس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ شک ان کے اندر بے چینی کیوں نہیں پیدا کرتا، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ یقین کی اطمینان بخش بنیاد انھیں مل سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے، جس کی فکر میں وہ اپنے دل اور دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح، ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے، جن پر سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی وہ غور و فکر میں صرف نہیں کر سکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں۔ انکار و دَہریت کی بحثیں ہیں تو تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں، اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔

۱۱ – رسولِ مُبین کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ اس کا رسول ہونا اس کی سیرت، اُس کے اخلاق و کردار اور اُس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

۱۲ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اسے بجّوں پر چڑھالیا، وہ در پردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آکر عام لوگوں کے سامنے انھیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ ان ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور تنبیہ و تعلیمات کو اڑا دیتے

اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝

تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔[۱۳]

تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ ان معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پایے کا آدمی ہے، اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضورؐ کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ در پردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپؐ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲)

۱۳ – اِن آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے مشہور شاگرد مَسرُوقؒ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ پڑھی، پھر کہنے لگا: جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کر دے گا، مگر اہلِ ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہو گیا ہو۔ اُس کی یہ بات سُن کر ہم حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہؓ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سُن کر گھبرا کے اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مُردار تک کھا گئے۔ اُس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اُسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابوسفیان نے آ کر حضورؐ سے کہا کہ آپؐ تو صلۂ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپؐ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا! ہم پر سے یہ عذاب دُور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعے کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگِ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ روایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ مَسرُوقؒ سے نقل کی ہے۔ اور مَسرُوقؒ کے علاوہ ابراہیم نَخَعیؒ، قَتادہؒ، عاصمؒ اور عامرؒ کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اِس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لیے اس امر میں کوئی شک

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں رہتا کہ حضرتِ موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قَتادَہ، ابوالعالیہ، مُقاتِل، ابراہیم النَّخَعی، ضَحّاک اور عَطِیّۃَ العوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری طرف حضرت علیؓ، ابنِ عمرؓ، ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، زید بن علیؓ اور حَسَن بصریؒ جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اُسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اِس تفسیر کو اُن رِوایات سے ملتی ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضوؐر برآمد ہوئے اور فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہو لیں گی: سورج کا مغرب سے طُلوع ہونا، دھواں، دابّہ، یاجوج وماجوج کا خُروج، عیسٰی ابنِ مریمؑ کا نُزول، زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، اور عدن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی۔ (مسلم) اسی کی تائید ابو مالک اشعریؓ کی وہ رِوایت کرتی ہے جسے ابنِ جَرِیر اور طَبَرانی نے نقل کیا ہے، اور ابوسعید خُدریؓ کی رِوایت جسے ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں رِوایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھویں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضوؐر نے فرمایا ہے کہ وہ دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہوگا، اور کافر کی نس نس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر مَنْفَذ سے نکلے گا۔

اِن دونوں تفسیروں کا تعارُض اُوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہو سکتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی تفسیر کا تعلق ہے، یہ اَمرِ واقعہ ہے کہ مکّۂ معظّمہ میں حضوؐر کی دعا سے سخت قحط رُونما ہوا تھا جس سے کفار کے چھکّے بہت کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اور انھوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضوؐر سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اِس واقعے کی طرف قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۲۹۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۷۷، یُونس، حواشی ۱۴-۱۵-۲۹۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۲) ان آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اُسی صورتِ حال کی طرف ہے۔ کفار کا یہ کہنا کہ ''پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس رسولِ مُبین آ گیا، پھر بھی یہ اس کی طرف مُلتفِت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔'' پھر یہ فرمانا کہ ''ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔'' یہ ساری باتیں اُسی صورت میں راست آ سکتی ہیں جب کہ واقعہ حضوؐر ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اِطلاق بعید اَز فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابنِ مسعودؓ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا یہ حصّہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ''دھواں'' بھی اُسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ یہ بات قرآنِ مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آ گیا اور لوگوں پر چھا گیا۔ وہاں تو کہا گیا ہے کہ ''اچھا تو اُس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔'' بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمھیں کی گئی ہے اُس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت

وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا
اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾

ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اِسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ اُن کے پاس ایک نہایت شریف رسُول [۱۴] آیا اور اس نے کہا:[۱۵] "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو،[۱۶] میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔[۱۷] اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمھارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں۔[۱۸] اور میں اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اِس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔

کا انتظار کرو، اُس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمھیں پتا چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔ پس جہاں تک دھویں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرینِ کبار میں سے جنھوں نے حضرت ابنِ مسعودؓ کی تائید کی انھوں نے پوری بات کی تائید کر دی، اور جنھوں نے ان کی تردید کی انھوں نے پوری بات کی تردید کر دی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کون سا حصّہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

۱۴ – اصل میں "رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابلِ تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

۱۵ – یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سال ہا سال کے دَوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انھوں نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے کہی تھیں، ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۳ تا ۹۷، یونس، حواشی ۷۲ تا ۹۳۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۸ الف تا ۵۲، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹، النمل، حواشی ۸ تا ۱۷، القصص، حواشی ۴۶ تا ۵۶۔ جلد چہارم، المومن، آیات ۲۳ تا ۴۶، الزُّخرف، ۴۶ تا ۵۶ مع حواشی)

۱۶ – اصل میں اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اُوپر ہم نے کیا ہے، اور اس کے لحاظ سے یہ اُس مطالبے کا ہم معنی ہے جو سورۂ اَعراف (آیت ۱۰۵)، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشّعراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو۔" دوسرا ترجمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے، یہ ہے کہ "اللہ کے بندو! میرا حق ادا کرو، یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمھارے اُوپر میرا حق ہے۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاِنۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا لِیۡ فَاعۡتَزِلُوۡنِ ۝۲۱ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ
مُّجۡرِمُوۡنَ ۝۲۲ فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَيۡلًا اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ۝۲۳ وَاتۡرُكِ الۡبَحۡرَ

اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔[19]" آخرِ کار اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔[20] (جواب دیا گیا:) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو[21] لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔[22] سمندر کو اس کے حال پر

بعد کا یہ فقرہ کہ "میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں" اِس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۷ – یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کرسکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے، وہی بے کم و کاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اُس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی۔)

۱۸ – دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو، یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو، وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور مَیں اُسی کے رسول کی حیثیت سے انھیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں اس میں شک ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمھارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اِس سند سے مراد کوئی ایک معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیامِ مصر تک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کو سال ہا سال تک دکھاتے رہے۔ جس سند کو بھی اُن لوگوں نے جھٹلایا، اُس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرُف، حواشی نمبر ۴۲-۴۳)

۱۹ – یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اَڑا ہوا تھا، مگر یہ دیکھ کر کہ اِن نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز متأثر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں پہلے تو اس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۂ زُخرُف، آیات ۵۱-۵۳ میں گزر چکی ہے (ملاحظہ ہو: حواشی سورۂ زُخرُف ۴۵ تا ۴۹)، پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخرِ کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کر دینے پر آمادہ ہوگیا۔ اُس وقت آں جناب نے وہ بات کہی جو سورۂ مومن، آیت ۲۷ میں گزر چکی ہے کہ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤۡمِنُ بِيَوۡمِ الۡحِسَابِ "میں نے پناہ لی اپنے رب اور تمھارے رب کی ہر اُس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔" یہاں حضرت موسیٰؑ اپنی اُسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمھارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ ربّ العالمین کی پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔ میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو۔ مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اِس کا بہت بُرا انجام دیکھو گے۔

رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝۲۵ وَّ
زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۫ وَ
اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ

کھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے[۲۳]۔" کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے، اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اِن چیزوں کا وارث بنا دیا[۲۴]۔ پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین[۲۵]، اور

۲۰ – یہ حضرت موسیٰ کی آخری رپورٹ ہے جو اُنھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی۔ "یہ لوگ مجرم ہیں" یعنی اِن کا مجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کوئی گنجایش اِن کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاحِ حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ صادر فرمائیں۔

۲۱ – یعنی اُن سب لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے، اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنھوں نے حضرت موسیٰ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے مُتأثر ہو کر اہلِ مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یوسف، حاشیہ ۶۸)

۲۲ – یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳، الشعراء، حواشی ۳۹ تا ۴۷)

۲۳ – یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار اُتر چکے تھے، اور چاہتے تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اُسے پھر ویسا ہی کر دیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اس کا لشکر اُس راستے سے گزر کر نہ آ جائے جو معجزے سے بنا تھا۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کو اسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو، تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اِس راستے میں اُتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائے گا اور یہ پوری فوج غرق کر دی جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۳ - ۵۴، الشعراء، حاشیہ ۴۷)

۲۴ – حضرت حَسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آلِ فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور اس سرزمین کے وارث ہوئے ہوں۔ یہی اختلاف بعد کے مفسرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۲۹

مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ
الْمُهِيْنِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ وَ لَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ

ذرا سی مُہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔[25] اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلّت کے عذاب، فرعون[26] سے نجات دی، جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اُونچے درجے کا آدمی تھا،[27] اور ان کی حالت جانتے ہوئے اُن کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی،[28] اور انھیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح

۲۵ – یعنی جب وہ حکمراں تھے تو اُن کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے، اُن کی حمد وثنا کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی۔ خوشامدیوں کے جمگھٹے ان کے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے، ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالَم اُن کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیر بار ہے اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں، مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہ تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے نہ خلقِ خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مشیّتِ الٰہی سے ان کی رسّی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دَلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گزر گئے تو اس طرح اُٹھا کر پھینک دیے گئے جیسے کُوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۲۶ – یعنی فرعون بجائے خود اُن کے لیے ذلّت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذابِ مجسّم کے شاخسانے تھے۔

۲۷ – اس میں ایک لطیف طنز ہے کفارِ قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حدِ بندگی سے تجاوُز کر جانے والوں میں تمھارا مرتبہ اور مَقام ہی کیا ہے۔ بڑے اُونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر خدائی کا رُوپ دھارے بیٹھا تھا۔ اُسے جب خس وخاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ قہرِ الٰہی کے آگے ٹھیر سکو۔

۲۸ – یعنی بنی اسرائیل کی خوبیاں اور کمزوریاں، دونوں اللہ پر عیاں تھیں۔ اُس نے بے دیکھے بھالے اُن کا انتخاب اندھا دُھند نہیں کر لیا تھا۔ اُس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں اُن میں سے اِس قوم کو جب اُس نے اپنے پیغام کا حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا عَلَم بردار بنانے کے لیے چُنا تو اس بنا پر چُنا کہ اُس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے یہی اس کے لیے موزوں تر تھی۔

بَلٰٓـؤٌا مُّبِيۡنٌ ﴿۳۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوۡلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اِنۡ هِىَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰى
وَمَا نَحۡنُ بِمُنۡشَرِيۡنَ ﴿۳۵﴾ فَاۡتُوۡا بِاٰبَآٮِٕنَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمۡ
خَيۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ ۫ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا
مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا

آزمایش تھی۔[۲۹]

یہ لوگ کہتے ہیں: "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کے بعد ہم دوبارہ اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں[۳۰]۔ اگر تم سچے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو[۳۱]۔" یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم[۳۲] اور اُس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اِسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے[۳۳]۔ یہ آسمان و زمین اور اِن کے درمیان کی چیزیں

۲۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۶۴ تا ۸۵، النساء، حواشی ۱۸۲ تا ۱۹۹، المائدہ، حواشی ۴۲ تا ۴۷۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۷ تا ۱۳۲۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۶ تا ۷۴۔

۳۰ – یعنی پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ '' پہلی موت'' کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا، تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔

۳۱ – اِن کا اِستدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اُٹھا لاؤ، تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آ جائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مُہمل تھی۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

۳۲ – تُبَّع قبیلۂ حِمْیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کِسریٰ، قیصر، فرعون وغیرہ القاب مختلف ممالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ یہ لوگ قومِ سبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵ قبلِ مسیح میں اِن کو سبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ حکمراں رہے۔ عرب میں صدیوں تک اِن کی عظمت کے افسانے زبان زدِ خلائق

Maktaba Tul Ishaat.com

لَعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى

ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۳۴]
اِن سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے،[۳۵] وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے

رہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ نمبر ۳۷)

۳۳ — یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اَخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ’’یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفارِ مکہ تو اس خوشحالی اور شوکت وحشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبَّع کی قوم، اور اس سے پہلے سَبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دُنیوی شان و شوکت اَخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بُوتے پر ان سے بچ جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حواشی ۲۵-۳۶)

۳۴ — یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے، وہ دراصل اِس کارخانۂ عالَم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اِسی بنا پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یوں ہی مٹی میں رَل مِل جائے گا، اور اُس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالقِ حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ اِستدلال قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر کیا گیا ہے، اور ہم اس کی مفصل تشریح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اول، الانعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یُونُس، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۶-۱۷، المومنون، حواشی ۱۰۱-۱۰۲، الروم، حواشی ۴ تا ۱۰)

۳۵ — یہ اُن کے اِس مطالبے کا جواب ہے کہ ’’اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچّے ہو‘‘۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مُقدّمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقتِ مقرر پر ہی ہوگا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے،

عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ
الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ معانقۃ ۲
خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ
مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾

کسی عزیز قریب[۳۶] کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انھیں کوئی مدد پہنچے گی، سوائے اِس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے[۳۷]۔ ع

زقّوم[۳۸] کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ[۳۹] جیسا، پیٹ میں اِس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ "پکڑو اِسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اِس کو جہنّم کے بیچوں بیچ، اور اُنڈیل دو اِس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔

مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

۳۶- اصل میں لفظ "مولیٰ" استعمال کیا گیا ہے جو عَرَبی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو، یا دوستی کا، یا کسی اور قسم کا۔

۳۷- ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اُس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی، نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کُلّی اختیارات اس حاکمِ حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بُوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس کے مُقدّمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا، وہ بہرحال بے کم وکاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اُس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔

۳۸- زقّوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافّات، حاشیہ ۳۴۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾
فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ
فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔“

خدا ترس لوگ امن کی جگہ[۴۰] میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا[۴۱] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں[۴۲] ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں[۴۳] گے۔ وہاں موت کا مزا وہ کبھی نہ چکھیں گے،

۳۹ – اصل میں لفظ ”اَلْمُھْل“ استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنی ہیں: پگھلی ہوئی دھات، پیپ، لہو، پگھلا ہوا تارکول، لاوا، تیل کی تلچھٹ۔ یہ مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اگر زَقّوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تلچھٹ سے مشابہ ہوگا۔

۴۰ – امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ کوئی غم، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مشقّت اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔“ (مسلم بروایتِ ابو ہُریرہؓ و ابو سعید خُدریؓ)

۴۱ – اصل میں سُندُس اور اِستَبرَق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سُندُس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ اور اِستَبرَق فارسی لفظ ستبر کا مُعرَّب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۴۲ – اصل الفاظ ہیں: حُوْرٌ عِیْنٌ۔ حُور جمع ہے حَورا کی، اور حَورا عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ اور عِین جمع ہے عَینا کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۲۶ و ۲۹)

۴۳ – ”اطمینان سے“ طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں گے، بے فکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کر دی جائے گی۔ دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو درکنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اس اطمینان سے طلب نہیں کر سکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا۔ کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے

إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۚ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا
مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾ ع

بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنّم کے عذاب سے بچا دے گا،[۴۴] یہی بڑی کامیابی ہے۔

اَے نبیؐ! ہم نے اِس کتاب کو تمھاری زبان میں سہل بنا دیا ہے، تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔[۴۵] ع

پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال کرتا ہے اُس کی قیمت بہرحال اُس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے۔ جنت میں مال اللہ کا ہوگا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہوگی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو گا، نہ بعد میں بِل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

۴۴- اس آیت میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں:

ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنّم سے بچائے جانے کا ذکر خاص طور پر الگ فرمایا گیا ہے، حالاں کہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ سے آپ اس امر کو مُستلزم ہے کہ وہ جہنّم میں جانے سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرماں برداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جب کہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس بُرے انجام سے بچ گیا ہے۔

دوسری قابلِ توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اگرچہ آدمی کو انعام اس کے اپنے حُسنِ عمل ہی پر ملے گا، لیکن اوّل تو حُسنِ عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آ سکتا ہے، وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہو سکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جا سکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اُس کی خدمات کو قبول فرما لے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بِینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اُتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے جنت جیت لینے کا دعوٰی کر سکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اعملوا وسدّدوا وقاربوا واعلموا انّ احدًا لن یُدخلهُ عمله الجنّة۔ "عمل کرو اور اپنی حدِ استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو

Maktaba Tul Ishaat.com

محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کرا دے گا۔" لوگوں نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ کا عمل بھی؟" فرمایا: وَلَا اَنَا اِلَّآ اَنْ یتغمّدنی اللہ بِرَحْمَتِہٖ، "ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤں گا، اِلّا یہ کہ مجھے میرا رب اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔"

۴۵ - یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے، اور یہ بھی منتظر ہیں کہ دیکھیں تمہاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن

الجاثیہ

(۴۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

الجاثیہ

نام آیت ۲۸ کے فقرے وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظ جاثیہ آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس سورت کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر روایت میں بیان نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے مضامین سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۂ دُخان کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین میں ایسی مشابہت ہے جس سے یہ دونوں توأم نظر آتی ہیں۔

موضوع اور مَباحِث اس کا موضوع توحید و آخرت کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دینا اور اُس رَوِیّے پر اُن کو مُتنبّہ کرنا ہے جو انھوں نے قرآن کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔

کلام کا آغاز توحید کے دلائل سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انسان کے اپنے وجود سے لے کر زمین و آسمان تک ہر طرف پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ اُٹھا کر دیکھو، ہر چیز اُسی توحید کی شہادت دے رہی ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ یہ طرح طرح کے حیوانات، یہ شب و روز، یہ بارشیں اور ان سے اُگنے والی نباتات، یہ ہوائیں، اور یہ انسان کی اپنی پیدایش، اِن ساری چیزوں کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر دیکھے اور کسی تعصب کے بغیر اپنی عقل کو سیدھے طریقے سے اِستعمال کر کے اِن پر غور کرے تو یہ نشانیاں اسے اس امر کا یقین دلانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کی خدائی میں چل رہی ہے، بلکہ ایک ہی خدا نے اِسے بنایا ہے، اور وہی اکیلا اس کا مدبّر اور فرماں روا ہے۔ البتہ اُس شخص کی بات دُوسری ہے جو نہ ماننے کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو، یا شکوک و شبہات ہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ اُسے دنیا میں کہیں سے بھی یقین و ایمان کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر دوسرے رُکوع کی ابتدا میں پھر فرمایا گیا ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنی چیزوں سے کام لے رہا ہے، اور جو بے حد و حساب اشیا اور قوتیں اِس کائنات میں اُس کے مفاد کی خدمت کر رہی ہیں، وہ آپ سے آپ کہیں سے نہیں آ گئی ہیں، نہ دیویوں اور دیوتاؤں نے انھیں فراہم کیا ہے، بلکہ وہ ایک ہی خدا ہے جس نے یہ سب کچھ اپنے پاس سے اس کو بخشا اور اس کے لیے مسخّر کر دیا ہے۔ کوئی شخص صحیح غور و فکر سے کام لے تو اس کی اپنی عقل ہی پکار اُٹھے گی کہ وہی خدا انسان کا محسن ہے،

اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان اُس کا شکر گزار ہو۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کو اُس ہٹ دھرمی، اِستکبار، اِستہزا اور اصرار علی الکفر پر سخت ملامت کی گئی ہے جس سے وہ قرآن کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے، اور انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی، جس کی بدولت وہ تمام اقوامِ عالم پر فضیلت کے مستحق ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جب اِس نعمت کی ناقدری کی اور دین میں اختلاف کر کے اسے کھو دیا، تو اب یہ دولت تمھارے ہاں بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ انسان کو دکھاتا ہے۔ جو لوگ اپنی جہالت وحماقت سے اس کو ردّ کریں گے وہ اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے۔ اور خدا کی تائید و رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو اِس کی پیروی قبول کر کے تقویٰ کی رَوِش پر قائم ہو جائیں۔

اِسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ خدا سے بے خوف لوگ تمھارے ساتھ جو بے ہودگیاں کر رہے ہیں، اُن پر درگزر اور تحمل سے کام لو۔ تم صبر کرو گے تو خدا خود اِن سے نمٹے گا اور تمھیں اِس صبر کا اجر عطا فرمائے گا۔

پھر عقیدۂ آخرت کے متعلق کفار کے جاہلانہ خیالات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اِس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ ہم گردشِ ایام سے بس اُسی طرح مرتے ہیں جس طرح ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جائے۔ موت کے بعد کوئی رُوح باقی نہیں رہتی جسے قبض کیا جاتا ہو اور پھر کسی وقت دوبارہ لا کر انسانی جسم میں پھونک دیا جائے۔ اِس چیز کا اگر تمھیں دعویٰ ہے تو ہمارے مرے ہوئے آباواجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پے در پے چند دلائل ارشاد فرمائے ہیں:

ایک، یہ کہ تم یہ بات کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہو، بلکہ محض گمان کی بنیاد پر اتنا بڑا حکم لگا بیٹھے ہو۔ کیا فی الواقع تمھیں یہ علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اور روحیں قبض نہیں کی جاتیں بلکہ فنا ہو جاتی ہیں؟

دوسرے، یہ کہ تمھارے اس دعوے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ بس یہ ہے کہ تم نے کسی مرنے والے کو اُٹھ کر دنیا میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ کیا یہ بات اتنا بڑا دعویٰ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مرنے والے پھر کبھی نہیں اٹھیں گے؟ کیا تمھارے تجربے اور مشاہدے میں کسی چیز کا نہ آنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ تمھیں اُس چیز کے نہ ہونے کا علم حاصل ہے؟

تیسرے، یہ کہ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ نیک اور بد، فرماں بردار اور نافرمان، ظالم اور مظلوم، آخرکار سب یکساں کر دیے جائیں، کسی بھلائی کا کوئی اچھا نتیجہ اور کسی بُرائی کا کوئی بُرا نتیجہ نہ نکلے،

Maktaba Tul Ishaat.com

نہ کسی مظلوم کی دادرسی ہو اور نہ کوئی ظالم اپنے کیے کی سزا پائے، بلکہ سب ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ خدا کی اس کائنات کے متعلق جس نے یہ تصور قائم کیا ہے، اُس نے بڑا ہی غلط تصور قائم کیا ہے۔ اِس تصور کو ظالم اور بدکار لوگ تو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے افعال کا بُرا نتیجہ نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن خدا کی یہ خدائی اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک برحق نظام ہے، جس میں نیک و بد کو بالآخر یکساں کر دینے کا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

چوتھے، یہ کہ انکارِ آخرت کا عقیدہ اخلاق کے لیے سخت تباہ کُن ہے۔ اس کو اختیار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کے بندے بنے ہوئے ہیں، اور اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں بندگیِ نفس کی کھلی چھوٹ مل جائے۔ پھر جب وہ اِس عقیدے کو اختیار کر لیتے ہیں تو یہ انھیں گمراہ سے گمراہ تر کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی اَخلاقی حِس بالکل مُردہ ہو جاتی ہے اور ہدایت کے تمام دروازے اُن کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ دلائل دینے کے بعد اللہ تعالیٰ پورے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ جس طرح تم آپ سے آپ زندہ نہیں ہو گئے ہو، بلکہ ہمارے زندہ کرنے سے زندہ ہوئے ہو، اسی طرح تم آپ سے آپ نہیں مر جاتے، بلکہ ہمارے موت دینے سے مرتے ہو، اور ایک وقت یقیناً ایسا آنا ہے جب تم سب بیک وقت جمع کیے جاؤ گے۔ اس بات کو اگر آج تم اپنی جَہالت و نادانی سے نہیں مانتے تو نہ مانو، جب وہ وقت آ جائے گا تو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اپنے خدا کے حُضور پیش ہو اور تمھارا پورا نامۂ اعمال بے کم و کاست تیار ہے جو تمھارے ایک ایک کرتوت کی شہادت دے رہا ہے۔ اُس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عقیدۂ آخرت کا یہ انکار اور اُس کا یہ مذاق جو تم اُڑا رہے ہو، تمھیں کس قدر مہنگا پڑا ہے۔

آیاتہا ۳۷ سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ

ح م۔ اِس کتاب کا نُزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔[2]

اور تمھاری اپنی پیدائش میں، اور اُن حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے، بڑی نشانیاں ہیں

۱ – یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے جس میں سامعین کو دو باتوں سے خبردار کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر نازل ہو رہی ہے۔ دوسرے، یہ کہ اسے وہ خدا نازل کر رہا ہے جو زبردست بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کا زبردست ہونا اِس بات کا متقاضی ہے کہ انسان اس کے فرمان سے سرتابی کی جرأت نہ کرے، کیونکہ نافرمانی کر کے وہ اُس کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اور اُس کا حکیم ہونا اِس کا متقاضی ہے کہ انسان پورے اطمینان کے ساتھ برضا و رغبت اُس کی ہدایات اور اس کے احکام کی پیروی کرے، کیونکہ اُس کی کسی تعلیم کے غلط یا نامناسب یا نقصان دہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۲ – تمہید کے بعد اصل تقریر کا آغاز اِس طرح کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پسِ منظر میں اہلِ مکہ کے وہ اعتراضات ہیں جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم پر کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر محض ایک شخص کے کہنے سے ہم اتنی بڑی بات کیسے مان لیں کہ جن بزرگ ہستیوں کے آستانوں سے آج تک ہماری عقیدتیں وابستہ رہی ہیں وہ سب ہیچ ہیں اور خدائی بس ایک خدا کی ہے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس حقیقت کو ماننے کی دعوت تمھیں دی جا رہی ہے، اس کی سچائی کے نشانات سے تو سارا عالم بھرا پڑا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے اندر اور تمھارے باہر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، جو شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ساری کائنات ایک خدا اور ایک ہی خدا کی تخلیق ہے، اور وہی اکیلا اس کا مالک، حاکم اور مدبر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ آسمان و زمین میں نشانیاں کس چیز کی ہیں۔ اس لیے کہ سارا جھگڑا ہی اُس وقت اِس بات پر چل رہا تھا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خداؤں اور معبودوں کو بھی ماننے پر اصرار کر رہے تھے، اور قرآن کی دعوت یہ تھی کہ ایک خدا کے سوا نہ کوئی خدا ہے نہ معبود۔ لہٰذا بے کہے یہ بات آپ ہی آپ موقع و محل سے ظاہر ہو رہی تھی کہ نشانیوں سے مراد توحید کی صداقت اور شرک کے بُطلان کی نشانیاں ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ

اُن لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں۔[۳] اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں،[۴] اور اُس رزق میں[۵] جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جِلا اُٹھاتا ہے،[۶] اور ہواؤں کی گردش میں[۷]

پھر یہ جو فرمایا کہ "یہ نشانیاں ایمان لانے والوں کے لیے ہیں"، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بجائے خود تو یہ نشانیاں سارے ہی انسانوں کے لیے ہیں، لیکن انھیں دیکھ کر صحیح نتیجے پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو ایمان لانے کے لیے تیار ہوں۔ غفلت میں پڑے ہوئے لوگ، جو جانوروں کی طرح جیتے ہیں، اور ہٹ دھرم لوگ، جو نہ ماننے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں، ان کے لیے اِن نشانیوں کا ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ چمن کی رونق اور اس کا حُسن و جمال تو آنکھوں والے کے لیے ہے۔ اندھا کسی رونق اور کسی حُسن و جمال کا اِدراک نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے چمن کا وجود ہی بے معنیٰ ہے۔

۳ – یعنی جو لوگ انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں، یا جنھوں نے شک ہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا اپنے لیے پسند کر لیا ہے اُن کا معاملہ تو دوسرا ہے، مگر جن لوگوں کے دل کے دروازے یقین کے لیے بند نہیں ہوئے ہیں، وہ جب اپنی پیدایش پر، اور اپنے وجود کی ساخت پر، اور زمین میں پھیلے ہوئے انواع و اقسام کے حیوانات پر غور کی نگاہ ڈالیں گے تو انھیں بے شمار علامات ایسی نظر آئیں گی جنھیں دیکھ کر یہ شبہ کرنے کی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے گی کہ شاید یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر بن گیا ہو، یا شاید اس کے بنانے میں ایک سے زیادہ خداؤں کا دخل ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۵ تا ۲۷۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۷ تا ۹۔ جلد سوم، الحج، حواشی ۵ تا ۹، المومنون، حواشی ۱۲–۱۳، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الشعراء، حواشی ۵۷–۵۸، النمل، حاشیہ ۸۰، الروم، حواشی ۲۵ تا ۳۲، ۷۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۴ تا ۱۸، یٰسٓ آیات ۷۱ تا ۷۳، الزمر، آیت ۶، المومن، حواشی ۹۷–۹۸–۱۱۰)

۴ – رات اور دن کا یہ فرق و اختلاف اس اعتبار سے بھی نشانی ہے کہ دونوں پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں، اور اس اعتبار سے بھی کہ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، اور اِس اعتبار سے بھی کہ ایک مدّت تک بڑی تدریج کے ساتھ دن چھوٹا اور رات بڑی ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ پھر ایک وقت جا کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں، پھر بتدریج دن بڑا اور رات چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے، پھر ایک وقت جا کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کے فرق و اختلاف جو رات اور دن میں پائے جاتے ہیں اور ان سے جو عظیم حکمتیں وابستہ ہیں، وہ اس بات کی صریح علامت ہیں کہ سورج اور زمین اور موجوداتِ زمین کا خالق ایک ہی ہے، اور اِن دونوں کُروں کو ایک ہی زبردست اقتدار نے قابو میں کر رکھا ہے، اور وہ کوئی اندھا بہرا بے حکمت اقتدار نہیں ہے، بلکہ ایسا حکیمانہ اقتدار ہے جس نے یہ اٹل حساب قائم کر کے اپنی زمین کو زندگی کی اُن بے شمار انواع کے لیے موزوں جگہ بنا دیا ہے جو نباتات، حیوانات اور انسان کی شکل میں اُس نے یہاں پیدا کی ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۶۵۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۱۰۴، القصص، حاشیہ ۹۲۔ جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰–۵۱، یٰسٓ، آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۵ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ
فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ
اَثِیْمٍ ۝۷ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَیْهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ

بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنھیں ہم تمھارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟[8]

تباہی ہے ہر اُس جھوٹے بد اعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں، اور وہ اُن کو سنتا ہے، پھر پُورے اِستکبار کے ساتھ اپنے کفر پر اِس طرح اَڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے

---

۵ - رزق سے مراد یہاں بارش ہے، جیسا کہ بعد کے فقرے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔

۶ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۷، الفرقان، حواشی ۶۲ تا ۶۵، الشعراء، حاشیہ ۵، النمل، حواشی ۷۳-۷۴، الروم، حواشی ۳۵-۷۳۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۲۶ تا ۳۱۔

۷ - ہواؤں کی گردش سے مراد مختلف اوقات میں زمین کے مختلف حصوں پر اور مختلف بلندیوں پر مختلف ہوائیں چلنا ہے، جن سے موسموں کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین کے اُوپر ایک وسیع کُرۂ ہوائی پایا جاتا ہے جس کے اندر وہ تمام عناصر موجود ہیں جو زندہ مخلوقات کو سانس لینے کے لیے درکار ہیں، اور ہوا کے اسی لحاف نے زمین کی آبادی کو بہت سی آفاتِ سماوی سے بچا رکھا ہے۔ اِس کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ یہ ہوا محض بالائی فضا میں بھر کر نہیں رہ گئی ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے چلتی رہتی ہے۔ کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کبھی گرم۔ کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چلنے لگتی ہے۔ کبھی ہلکی چلتی ہے تو کبھی تیز، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی خشک ہوا چلتی ہے اور کبھی مرطوب۔ کبھی بارش لانے والی ہوا چلتی ہے اور کبھی اس کو اُڑا لے جانے والی چل پڑتی ہے۔ یہ طرح طرح کی ہوائیں کچھ یوں ہی اندھا دُھند نہیں چلتیں، بلکہ اِن کا ایک قانون اور ایک نظام ہے جو شہادت دیتا ہے کہ یہ انتظام کمال درجہ حکمت پر مبنی ہے اور اس سے بڑے بڑے اہم مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ پھر اس کا بڑا گہرا تعلق اُس سردی اور گرمی سے ہے جو زمین اور سورج کے درمیان بدلتی ہوئی مناسبتوں کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور مزید برآں اس کا نہایت گہرا تعلق موسمی تغیُّرات اور بارشوں کی تقسیم سے بھی ہے۔ یہ ساری چیزیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کسی اندھی فطرت نے اتفاقاً یہ انتظامات نہیں کر دیے ہیں، نہ سورج اور زمین اور ہوا اور پانی اور نباتات اور حیوانات کے الگ الگ مدبّر ہیں، بلکہ لازماً ایک ہی خدا ان سب کا خالق ہے اور اسی کی حکمت نے ایک مقصدِ عظیم

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٨﴾ وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا
اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ

اُن کو سُنا ہی نہیں ۹۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مُژدہ سُنادو۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اُن کا مذاق بنالیتا ہے ۱۰۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلّت کا عذاب ہے۔ ان کے آگے

کے لیے یہ انتظام قائم کیا ہے، اور اسی کی قدرت سے یہ پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک مقرر قانون پر چل رہا ہے۔

۸ – یعنی جب اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت پر خود اللہ ہی کے بیان کیے ہوئے یہ دلائل سامنے آجانے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اب کیا چیز ایسی آسکتی ہے جس سے انھیں دولتِ ایمان نصیب ہو جائے۔ اللہ کا کلام تو وہ آخری چیز ہے جس کے ذریعے سے کوئی شخص یہ نعمت پا سکتا ہے۔ اور ایک اَن دیکھی حقیقت کا یقین دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو معقول دلائل ممکن ہیں، وہ اس کلام پاک میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی انکار ہی کرنے پر تُلا ہوا ہو تو انکار کرتا رہے۔ اس کے انکار سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔

۹ – بالفاظِ دیگر، فرق اور بہت بڑا فرق ہے اُس شخص میں جو نیک نیتی کے ساتھ اللہ کی آیات کو کھلے دل سے سنتا اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرتا ہے، اور اس شخص میں جو انکار کا پیشگی فیصلہ کر کے سنتا ہے اور کسی غور و فکر کے بغیر اپنے اسی فیصلے پر قائم رہتا ہے جو اِن آیات کو سننے سے پہلے وہ کر چکا تھا۔ پہلی قسم کا آدمی اگر آج اِن آیات کو سُن کر ایمان نہیں لا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کافر رہنا چاہتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مزید اطمینان کا طالب ہے۔ اس لیے اگر اس کے ایمان لانے میں دیر بھی لگ رہی ہے تو یہ بات عین متوقع ہے کہ کل کوئی دوسری آیت اس کے دل میں اُتر جائے اور وہ مطمئن ہو کر مان لے۔ لیکن دوسری قسم کا آدمی کبھی کوئی آیت سُن کر بھی ایمان نہیں لاسکتا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی آیاتِ الٰہی کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہے۔ اِس حالت میں بالعُموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن کے اندر تین صفات موجود ہوتی ہیں: ایک، یہ کہ وہ جھوٹے ہوتے ہیں، اس لیے صداقت ان کو اپیل نہیں کرتی۔ دوسرے، یہ کہ وہ بدعمل ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایسی تعلیم و ہدایت کو مان لینا انھیں سخت ناگوار ہوتا ہے جو ان پر اَخلاقی پابندیاں عائد کرتی ہو۔ تیسرے، یہ کہ وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، ہمیں کوئی کیا سکھائے گا، اس لیے اللہ کی جو آیات انھیں سنائی جاتی ہیں، ان کو وہ سرے سے کسی غور و فکر کا مستحق ہی نہیں سمجھتے اور ان کے سننے کا حاصل بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو نہ سننے کا تھا۔

۱۰ – یعنی اُسی ایک آیت کا مذاق اُڑانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ تمام آیات کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ مثلاً جب وہ سنتا ہے کہ قرآن میں فُلاں بات بیان ہوئی ہے تو اسے سیدھے معنیٰ میں لینے کے بجائے پہلے تو اس میں کوئی ٹیڑھ تلاش کر کے نکال لاتا ہے تاکہ اسے مذاق کا موضوع بنائے، پھر اس کا مذاق اُڑانے کے بعد کہتا ہے: اجی ان کے کیا کہنے ہیں، وہ تو روز ایک سے ایک نرالی بات سنا رہے ہیں، دیکھو فُلاں آیت میں انھوں نے یہ دلچسپ بات کہی ہے، اور فُلاں آیت کے لطائف کا تو جواب

جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِي عَنْهُم مَّا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِن دُونِ
اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠﴾ هَٰذَا هُدًى ۖ وَالَّذِينَ
كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ ﴿١١﴾ اللَّهُ الَّذِي
سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

ع ۱ ۱۷

جہنم ہے۔[11] جو کچھ بھی انھوں نے دنیا میں کمایا ہے، اس میں سے کوئی چیز اُن کے کسی کام نہ آئے گی، نہ اُن کے وہ سرپرست ہی اُن کے لیے کچھ کر سکیں گے جنھیں اللہ کو چھوڑ کر انھوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے۔[12] اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

یہ قرآن سراسر ہدایت ہے، اور اُن لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا۔ ع

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخّر کیا، تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اُس میں چلیں[13] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[14] اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے

ہی نہیں ہے۔

۱۱ – اصل الفاظ ہیں: مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ۔ وراء کا لفظ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو، خواہ وہ آگے ہو یا پیچھے۔ اس لیے دوسرا ترجمہ ان الفاظ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ان کے پیچھے جہنم ہے۔" اگر پہلے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بے خبر منہ اٹھائے اِس راہ پر دَوڑے جا رہے ہیں اور انھیں احساس نہیں ہے کہ آگے جہنم ہے جس میں وہ جا کر گرنے والے ہیں۔ دوسرے معنٰی لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی اِس شرارت میں مشغول ہیں، اور انھیں پتا نہیں ہے کہ جہنم ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

۱۲ – یہاں ولی کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، وہ دیویاں اور دیوتا اور زندہ یا مُردہ پیشوا جن کے متعلق مشرکین نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو شخص اُن کا متوسّل ہو، وہ خواہ دنیا میں کچھ ہی کرتا رہے، خدا کے ہاں اس کی پکڑ نہ ہو سکے گی، کیونکہ اُن کی مداخلت اُسے خدا کے غضب سے بچا لے گی۔ دوسرے، وہ سردار اور لیڈر اور امراء و حکّام جنھیں خدا سے بے نیاز ہو کر لوگ اپنا رہنما اور مُطاع بناتے ہیں، اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں، اور انھیں خوش کرنے کے لیے خدا کو ناخوش کرنے میں تامّل نہیں کرتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جَمِيۡعًا مِّنۡهُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۝۱۳ قُلْ لِّلَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا يَغۡفِرُوۡا لِلَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجۡزِىَ قَوۡمًۢا بِمَا
كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝۱۴ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا ۚ

مسخّر کر دیا،[15] سب کچھ اپنے پاس سے[16]۔۔۔۔ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔[17]

اَے نبیؐ! ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے،[18] اُن کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں، تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔[19] جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا، اور جو بُرائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔

یہ آیت ایسے سب لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ جب اس رَوِش کے نتیجے میں جہنم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو ان دونوں قسم کے سرپرستوں میں سے کوئی بھی انھیں بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۃ الشُوریٰ، حاشیہ ۶)

۱۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۳۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۶۹۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۵۵، المومن، حاشیہ ۱۱۰، الشُوریٰ، حاشیہ ۵۴۔

۱۴ – یعنی سمندر میں تجارت، ماہی گیری، غوّاصی، جہاز رانی اور دوسرے ذرائع سے رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

۱۵ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۴۴۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۳۵۔

۱۶ – اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اللہ کا یہ عَطِیّہ دنیا کے بادشاہوں کا سا عَطِیّہ نہیں ہے جو رعیّت سے حاصل کیا ہوا مال رعیّت ہی میں سے کچھ لوگوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ کائنات کی یہ ساری نعمتیں اللہ کی اپنی پیدا کردہ ہیں اور اس نے اپنی طرف سے یہ انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ دوسرے، یہ کہ نہ ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں کوئی اللہ کا شریک، نہ انھیں انسان کے لیے مسخّر کرنے میں کسی اور ہستی کا کوئی دخل، تنہا اللہ ہی اُن کا خالق بھی ہے اور اسی نے اپنی طرف سے وہ انسان کو عطا کی ہیں۔

۱۷ – یعنی اِس تسخیر میں اور ان چیزوں کو انسان کے لیے نافع بنانے میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں اِس حقیقت کی طرف کھلا کھلا اشارہ کر رہی ہیں کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک کائنات کی تمام اشیا اور قوتوں کا خالق و مالک اور مدبّر و منتظم ایک ہی خدا ہے جس نے اُن کو ایک قانون کا تابع بنا رکھا ہے۔ اور وہی خدا انسان کا رب ہے جس نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے اِن تمام اشیا اور قوتوں کو انسان کی زندگی، اس کی معیشت، اس کی آسایش، اس کی

ترقی اور اس کی تہذیب وتمدن کے لیے ساز گار و مددگار بنایا ہے۔ اور تنہا وہی خدا انسان کی عُبودیّت اور شکر گزاری اور نیاز مندی کا مستحق ہے، نہ کہ کچھ دوسری ہستیاں جن کا نہ ان اشیا اور قوتوں کے پیدا کرنے میں کوئی حصّہ، نہ انھیں انسان کے لیے مسخّر کرنے اور نافع بنانے میں کوئی دخل۔

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: اَلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جو لوگ اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے۔'' لیکن عربی محاورے میں ایسے مواقع پر ایام سے مراد محض دن نہیں بلکہ وہ یادگار دن ہوتے ہیں جن میں اہم تاریخی واقعات پیش آئے ہوں۔ مثلاً ایام العرب کا لفظ تاریخ عرب کے اہم واقعات اور قبائلِ عرب کی اُن بڑی بڑی لڑائیوں کے لیے بولا جاتا ہے جنھیں بعد کی نسلیں صدیوں تک یاد کرتی رہی ہیں۔ یہاں ایام اللہ سے مراد کسی قوم کے وہ بُرے دن ہیں جب اللہ کا غضب اس پر ٹوٹ پڑے اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں وہ تباہ کر کے رکھ دی جائے۔ اِسی معنٰی کے لحاظ سے ہم نے اس فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے''، یعنی جن کو یہ خیال نہیں ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے اِن افعال پر ہماری شامت آئے گی، اور اسی غفلت نے اُن کو ظلم وستم پر دلیر کر دیا ہے۔

۱۹ – مفسرین نے اس آیت کے دو مطلب بیان کیے ہیں، اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجایش ہے۔

ایک یہ کہ اہلِ ایمان اِس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں، تاکہ اللہ اُن کو اپنی طرف سے اُن کے صبر وحلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہِ خدا میں جو اذیتیں انھوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس گروہ سے درگزر کریں، تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اُسے دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اُس وقت تک تھا جب تک مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ پھر جب اس کی اجازت آگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ دُرست نہیں ہے۔ ''درگزر'' کا لفظ اس معنٰی میں کبھی نہیں بولا جاتا کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو اس سے درگزر کرے، بلکہ اس موقع پر صبر، تحمّل اور برداشت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر جب یہاں درگزر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہلِ ایمان انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنھیں خدا سے بے خوفی نے اَخلاق و آدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اِس حکم کا کوئی تعارُض اُن آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اُس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے۔ اور عفو و درگزر کا حکم اُن عام حالات کے لیے ہے جن میں اہلِ ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انھیں اپنی زبان وقلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مَقامِ بلند سے نیچے اُتر کر اُن پست اَخلاق لوگوں سے اُلجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بے ہودگی کا جواب دینے پر نہ اُتر آئیں۔ جب تک شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مُدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات اِن حُدود سے گزرتی نظر آئے، وہاں چپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سُپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود اُلجھیں گے تو اللہ اُن سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَ
الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۱۶﴾ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ
بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی
شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡہَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ الَّذِیۡنَ

پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے۔

اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم[20] اور نبوت عطا کی تھی۔ اُن کو ہم نے عمدہ سامانِ زِیست سے نوازا، دنیا بھر کے لوگوں پر انھیں فضیلت عطا[21] کی، اور دین کے معاملے میں انھیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف اُن کے درمیان رونما ہوا، وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آ جانے کے بعد ہوا، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔[22] اللہ قیامت کے روز اُن معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد اب اے نبیؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔[23] لہٰذا تم اسی پر چلو اور اُن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو

نمٹنے کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا۔ درگزر سے کام لیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

۲۰ – حکم سے مراد تین چیزیں ہیں: ایک، کتاب کا علم و فہم اور دین کی سمجھ۔ دوسرے، کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت۔ تیسرے، معاملات میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

۲۱ – یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کر دی، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لیے چُن لیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کے حامل ہوں اور خدا پرستی کے علَم بردار بن کر اٹھیں۔

۲۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۳۰، آلِ عمران، حواشی ۱۷-۱۸۔ جلد چہارم، الشّوریٰ، حواشی ۲۲-۲۳۔

لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ
بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ
وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا
السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً
مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲ ۱۸ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمھارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتے[۲۴]۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے، اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں[۲۵]۔

کیا[۲۶] وہ لوگ جنھوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں[۲۷]۔ اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۲۸]، اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفّس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا[۲۹]۔

---

۲۳ – مطلب یہ ہے کہ جو کام پہلے بنی اسرائیل کے سُپرد کیا گیا تھا وہ اب تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ انھوں نے علم پانے کے باوجود اپنی نفسانفسی سے دین میں ایسے اختلافات برپا کیے، اور آپس میں ایسی گروہ بندیاں کر ڈالیں جن سے وہ اس قابل نہ رہے کہ دنیا کو خدا کے راستے پر بلا سکیں۔ اب اُسی دین کی صاف شاہراہ پر تمھیں کھڑا کیا گیا ہے تاکہ تم وہ خدمت انجام دو جسے بنی اسرائیل چھوڑ بھی چکے ہیں اور ادا کرنے کے اہل بھی نہیں رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، الشُّوریٰ، آیات ۱۳ تا ۱۵، مع حواشی ۲۰ تا ۲۶)

۲۴ – یعنی اگر تم انھیں راضی کرنے کے لیے اللہ کے دین میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرو گے تو اللہ کے مواخذے سے وہ تمھیں نہ بچا سکیں گے۔

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اور یہ شریعت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے وہ روشنی پیش کرتی ہے...

Maktaba Tul Ishaat.com

اور باطل کا فرق نمایاں کرنے والی ہے۔ مگر اس سے ہدایت وہی لوگ پاتے ہیں جو اس کی صداقت پر یقین لائیں، اور انھی کے حق میں یہ رحمت ہے۔

۲۶ – توحید کی دعوت کے بعد اب یہاں سے آخرت پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

۲۷ – یہ آخرت کے برحق ہونے پر اَخلاقی اِستدلال ہے۔ اَخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے، اور بُرے اپنی برائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو، تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زِشتی کی تمیز ہی بے معنیٰ ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ چلتے ہیں، وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی ان کے عیش کو مُنَغّص کر دینے والا ہے۔ لیکن خداوندِ عالَم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومنِ صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گُل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اُوپر اَخلاق کی پابندیاں لگائے رہا، حق والوں کے حق ادا کرتا رہا، ناجائز فائدوں اور لذّتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا، اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں، نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا، جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا، سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حواشی ۹-۱۰، ہود، حاشیہ ۱۰۶، النحل، حاشیہ ۳۵۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹، النمل، حاشیہ ۸۶، الروم، حواشی ۶ تا ۸۔ جلد چہارم، سورۂ صٓ، آیت ۲۸، حاشیہ ۳۰)

۲۸ – یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے، بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انھیں غلط طریقے سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہوگی، نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۱، ابراہیم، حاشیہ ۲۶، النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۷۵، الروم، حاشیہ ۶)

۲۹ – اس سیاق و سباق میں اِس فقرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر نیک انسانوں کو ان کی نیکی کا اجر نہ ملے، اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہ دی جائے، اور مظلوموں کی کبھی دادرسی نہ ہو تو یہ ظلم ہوگا۔ خدا کی خدائی میں ایسا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا کے ہاں ظلم کی یہ دوسری صورت بھی کبھی رُونما نہیں ہو سکتی کہ کسی نیک انسان کو اس کے استحقاق سے کم اجر دیا جائے،

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ

پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا،[۳۰] اور اللہ نے علم کے باوجود[۳۱] اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟[۳۲] اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟

یا کسی بد انسان کو اس کے استحقاق سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

۳۰- خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہش کا بندہ بن کر رہ جائے۔ جس کام کو اس کا دل چاہے اسے کر گزرے، خواہ خدا نے اسے حرام کیا ہو، اور جس کام کو اس کا دل نہ چاہے اسے نہ کرے، خواہ خدا نے اسے فرض کر دیا ہو۔ جب آدمی اِس طرح کسی کی اطاعت کرنے لگے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس کا معبود خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کی وہ اس طرح اطاعت کر رہا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ زبان سے اس کو اپنا الٰہ اور معبود کہتا ہو یا نہ کہتا ہو، اور اس کا بُت بنا کر اس کی پوجا کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ اس لیے کہ ایسی بے چُون و چَرا اطاعت ہی اُس کے معبُود بن جانے کے لیے کافی ہے، اور اس عملی شرک کے بعد ایک آدمی صرف اِس بنا پر شرک کے جرم سے بَری نہیں ہوسکتا کہ اس نے اپنے اس مُطاع کو زبان سے معبُود نہیں کہا ہے اور سجدہ اس کو نہیں کیا ہے۔ اِس آیت کی یہی تشریح دوسرے اکابر مفسرین نے بھی کی ہے۔ ابنِ جریرؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اس نے اپنی خواہشِ نفس کو معبُود بنا لیا۔ جس چیز کی نفس نے خواہش کی، اس کا ارتکاب کر گزرا۔ نہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام کیا، نہ اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال کیا۔'' ابوبکر جصّاصؒ اس کے معنٰی یہ بیان کرتے ہیں کہ ''وہ خواہشِ نفس کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جیسے کوئی خدا کی اطاعت کرے۔'' زمخشریؒ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ''وہ خواہشِ نفس کا نہایت فرماں بردار ہے۔ جدھر اس کا نفس اسے بلاتا ہے اسی طرف وہ چلا جاتا ہے، گویا کہ وہ اس کی بندگی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے خدا کی بندگی کرے۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۵۶۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳، یٰسٓ، حاشیہ ۵۳، الشوریٰ، حاشیہ ۳۸)

۳۱- اصل الفاظ ہیں: اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ ایک مطلب ان الفاظ کا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص عالم ہونے کے باوجود اللہ کی طرف سے گمراہی میں پھینکا گیا، کیونکہ وہ خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا تھا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ نے اپنے اِس علم کی بنا پر کہ وہ اپنے نفس کی خواہش کو اپنا خدا بنا بیٹھا ہے، اسے گمراہی میں پھینک دیا۔

۳۲- اللہ کے کسی کو گمراہی میں پھینک دینے اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دینے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دینے کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر اس کتاب میں کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۰-۱۶، الانعام، حواشی ۱۷-۲۷۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۰، التوبہ، حواشی ۸۹-۹۳، یونُس، حاشیہ ۱۷، الرعد، حاشیہ ۴۴، ابراہیم، حواشی ۶-۷-۴۰،

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا
وَ مَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا
یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ

کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟[۳۳]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے، اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔'' درحقیقت اِس معاملے میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں[۳۴]۔ اور جب ہماری واضح آیات انھیں سنائی جاتی ہیں[۳۵] تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا

النحل، حاشیہ ۱۱۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۱۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۸۴۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۸، حواشی ۱۶-۱۷، المومن، حاشیہ ۵۴۔

۳۳- جس سیاق وسباق میں یہ آیت آئی ہے اُس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اِس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگیٔ نفس اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی برائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انھیں تأمّل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق وانصاف کا کوئی احترام ان کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو برائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اِسی بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل ودماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب وروز اپنی اغراض وخواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑ بُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اَخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رَوِیّہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔

۳۴- یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے ان کو تحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، اور یہ بات بھی انھیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی روح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی ہے بلکہ آدمی محض گردشِ ایام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے

اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ
ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ

نہیں ہوتی کہ اُٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچّے ہو۔[۳۶] اَے نبیؐ! اِن سے کہو: اللہ ہی تمھیں زندگی بخشتا ہے، پھر وہی تمھیں موت دیتا ہے،[۳۷] پھر وہی تم کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں

اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ ”ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں“، لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ”ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔“ اسی طرح علمی طریقے پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی روح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے، بلکہ وہ محض اُس طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رک جائے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم کی حد تک زندگی بعدِ موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ رُوح واقع ہونے یا گردشِ ایّام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل اس مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہش کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ ان کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عدم نہیں بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔

۳۵- یعنی وہ آیات جن میں آخرت کے امکان پر مضبوط عقلی دلائل دیے گئے ہیں، اور جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس کا ہونا عین حکمت و انصاف کا تقاضا ہے اور اس کے نہ ہونے سے یہ سارا نظامِ عالَم بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔

۳۶- دوسرے الفاظ میں اُن کی اس حجت کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی اُن سے یہ کہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہوگی تو اسے لازماً قبر سے ایک مُردہ اُٹھا کر ان کے سامنے لے آنا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ یہ نہیں مان سکتے کہ مرے ہوئے انسان کسی وقت از سرِ نَو زندہ کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں۔ حالانکہ یہ بات سرے سے کسی نے بھی ان سے نہیں کہی تھی کہ اِس دنیا میں متفرق طور پر وقتاً فوقتاً مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جاتا رہے گا۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ بیک وقت تمام انسانوں کو از سرِ نَو زندہ کرے گا اور ان سب کے اعمال کا محاسبہ کر کے جزا اور سزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

۳۷- یہ جواب ہے اُن کی اس بات کا کہ موت گردشِ ایّام سے آپ ہی آپ آ جاتی ہے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ نہ تمھیں زندگی اتفاقاً ملتی ہے، نہ تمھاری موت خود بخود واقع ہو جاتی ہے۔ ایک خدا ہے جو تمھیں زندگی دیتا ہے اور وہی اسے سلب کرتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۹

فِيهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ
جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ

کوئی شک نہیں[۳۸]، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۳۹] ع زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے[۴۰]، اور جس روز قیامت کی گھڑی آ کھڑی ہوگی، اُس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔

اُس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے[۴۱]۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ اُن سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمھارے اُوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے، جو کچھ بھی تم کرتے تھے اُسے ہم لکھواتے جا رہے تھے[۴۲]۔" پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے، انھیں ان کا

۳۸ — یہ جواب ہے ان کی اس بات کا کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اب نہیں ہوگا، اور متفرق طور پر نہیں ہوگا، بلکہ ایک دن سب انسانوں کے جمع کرنے کے لیے مقرر ہے۔

۳۹ — یعنی جہالت اور قصورِ فکر و نظر ہی لوگوں کے انکارِ آخرت کا اصل سبب ہے، ورنہ حقیقت میں تو آخرت کا ہونا نہیں بلکہ اس کا نہ ہونا بعید از عقل ہے۔ کائنات کے نظام اور خود اپنے وجود پر کوئی شخص صحیح طریقے سے غور کرے تو اسے خود محسوس ہو جائے گا کہ آخرت کے آنے میں کسی شک کی گنجایش نہیں۔

۴۰ — سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس فقرے سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو خدا اس عظیم الشان کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، اس کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں ہے کہ جن انسانوں کو وہ پہلے پیدا کر چکا ہے انھیں دوبارہ وجود میں لے آئے۔

۴۱ — یعنی وہاں میدانِ حشر کا ایسا ہول اور عدالتِ الٰہی کا ایسا رعب طاری ہوگا کہ بڑے بڑے ہیکڑ لوگوں کی اکڑ بھی ختم ہو جائے گی اور عاجزی کے ساتھ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

۴۲ — لکھوانے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نہیں ہے کہ کاغذ پر قلم سے لکھوایا جائے۔ انسانی اقوال و افعال کو

رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ
فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ
بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، اور یہی صریح کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن سے کہا جائے گا: "کیا میری آیات تم کو نہیں سُنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبّر کیا[۴۳] اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں[۴۴] ہے۔" اُس وقت اُن پر ان کے اعمال کی بُرائیاں کھل[۴۵] جائیں گی اور وہ اُسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ

ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدّد دوسری صورتیں اِسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آجائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز، اور اس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم و کاست اس کے سامنے لا رکھے گا۔

۴۳ – یعنی اپنے گھمنڈ میں تم نے یہ سمجھا کہ اللہ کی آیات کو مان کر مطیع فرمان بن جانا تمھاری شان سے فروتر ہے، اور تمھارا مقام بندگی کے مقام سے بہت اونچا ہے۔

۴۴ – اس سے پہلے آیت ۲۴ میں جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے وہ آخرت کا قطعی اور کُھلا انکار کرنے والے تھے۔ اور یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس کا یقین نہیں رکھتے، اگرچہ گمان کی حد تک اس کے امکان سے منکر نہیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کے

Maktaba Tul Ishaat.com

يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٣٣ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ
هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٣٤ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ
اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا
يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝٣٥ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٣٦ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣٧ ع

مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ ''آج ہم بھی اُسی طرح تمھیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمھارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمھارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمھیں دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو۔[۴۶]''

پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور آسمانوں میں بڑائی اُسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے۔ ع

احساس سے خالی ہوگا، اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر کے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویے کو دُرست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار، دونوں اُسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ رَوِش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ رَوِش آخرت کی بد انجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔

۴۵ — یعنی وہاں ان کو پتا چل جائے گا کہ اپنے جن طور طریقوں اور عادات و خصائل اور اعمال و مشاغل کو وہ دنیا میں بہت خوب سمجھتے تھے، وہ سب ناخوب تھے۔ اپنے آپ کو غیر جواب دِہ فرض کر کے انھوں نے ایسی بنیادی غلطی کر ڈالی جس کی وجہ سے ان کا پورا کارنامۂ حیات ہی غلط ہو کر رہ گیا۔

۴۶ — یہ آخری فقرہ اس انداز میں ہے جیسے کوئی آقا اپنے کچھ خادموں کو ڈانٹنے کے بعد دوسروں سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اچھا، اب اِن نالائقوں کی یہ سزا ہے۔

تفہیم القرآن

الاحقاف

(۴۶)

Maktaba Tul Ishaat.com

الاحقاف

نام

آیت ۲۱ کے فقرے اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول

ایک تاریخی واقعے سے متعین ہو جاتا ہے جس کا ذکر آیات ۲۹-۳۲ میں آیا ہے۔ ان آیات میں جنّوں کے آنے اور قرآن سُن کر واپس جانے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے، وہ حدیث و سیرت کی مُتّفق عَلَیہ رِوایات کی رو سے اُس وقت پیش آیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکۂ معظّمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نَخلہ کے مَقام پر ٹھیرے تھے، اور تمام معتبر تاریخی رِوایات کے مطابق آپؐ کے طائف تشریف لے جانے کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے، لہٰذا یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سورت ۱۰ نبوی کے آخر، یا ۱۱ نبوی کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی۔

تاریخی پَس منظر

۱۰ نبوی حضوؐر کی حیاتِ طیّبہ میں انتہائی سختی کا سال تھا۔ تین برس سے قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر بنی ہاشم اور مسلمانوں کا مکمل مُقاطعہ کر رکھا تھا، اور حضوؐر اپنے خاندان اور اپنے اصحاب کے ساتھ شِعْبِ ابی طالب[1] میں محصور تھے۔ قریش کے لوگوں نے ہر طرف سے اِس محلّے کی ناکا بندی کر رکھی تھی جس سے گزر کر کسی قسم کی رسد اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ صرف حج کے زمانے میں یہ محصورین نکل کر کچھ خریداری کر سکتے تھے، مگر ابولہب جب بھی ان میں سے کسی کو بازار کی طرف، یا کسی تجارتی قافلے کی طرف جاتے دیکھتا، پکار کر تاجروں سے کہہ دیتا کہ جو چیز یہ خریدنا چاہیں اس کی قیمت اتنی زیادہ بتاؤ کہ یہ نہ خرید سکیں، پھر وہ چیز میں تم سے خرید لوں گا اور تمھارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ متواتر تین سال کے اس مُقاطعے نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، اور ان پر ایسے ایسے سخت وقت گزر گئے تھے جن میں بسا اوقات گھاس اور پتّے کھانے کی نوبت آجاتی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ محاصرہ اِس سال ٹوٹا ہی تھا کہ حضوؐر کے چچا ابو طالب، جو دس سال سے آپؐ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، وفات پا گئے، اور اس سانحے پر بمشکل ایک مہینا گزرا تھا کہ آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ بھی انتقال فرما گئیں، جن کی ذات آغازِ نبوت سے لے کر اس وقت تک آپؐ کے لیے وجہِ سُکون و تسلّی بنی رہی تھی۔ ان پے در پے صدموں اور تکلیفوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال کو عام الحُزن

---

1. شِعْبِ ابی طالب مکۂ معظّمہ کے ایک محلّے کا نام تھا جس میں بنی ہاشم رہا کرتے تھے۔ شِعْب عَرَبی زبان میں گھاٹی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلّہ کوہِ ابوقُبَیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا، اور ابو طالب بنی ہاشم کے سردار تھے، اس لیے اسے شِعْبِ ابی طالب کہا جاتا تھا۔ مکۂ معظّمہ میں جو مکان آج مَقامی رِوایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مَقامِ پیدائش کی حیثیت سے معروف ہے، اسی کے قریب یہ گھاٹی واقع تھی۔ اب اسے شِعْبِ علی یا شِعْبِ بنی ہاشم کہتے ہیں۔

(رنج وغم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے سے زیادہ آپؐ کو تنگ کرنے لگے۔ حتّٰی کہ آپؐ کا گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔ اسی زمانے کا یہ واقعہ ابنِ ہِشام نے بیان کیا ہے کہ ایک روز قریش کے اوباشوں میں سے ایک شخص نے سرِ بازار آپؐ کے سر پر مٹی پھینک دی۔

آخرِ کار آپؐ اس ارادے سے طائف تشریف لے گئے کہ بنی ثَقِیف کو اسلام کی طرف دعوت دیں، اور اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو انھیں کم از کم اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ آپؐ کو اپنے ہاں چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دے دیں۔ آپؐ کو اُس وقت کوئی سواری تک میسر نہ تھی۔ مکہ سے طائف تک کا سارا سفر آپؐ نے پیدل طے کیا۔ بعض رِوایات کی رُو سے آپؐ تنہا تشریف لے گئے تھے، اور بعض روایات کے مطابق آپؐ کے ساتھ صرف حضرت زیدؓ بن حارِثہ تھے۔ وہاں پہنچ کر چند روز آپؐ نے قیام کیا اور ثَقِیف کے سرداروں اور معزّزین میں سے ایک ایک کے پاس جا کر بات کی۔ مگر اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی کوئی بات نہ مانی، بلکہ آپؐ کو صاف صاف نوٹس دے دیا کہ ان کے شہر سے نکل جائیں، کیونکہ ان کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں آپؐ کی تبلیغ ان کے نوجوانوں کو "بگاڑ" نہ دے۔ مجبُوراً آپؐ کو طائف چھوڑ دینا پڑا۔ جب آپؐ وہاں سے نکلنے لگے تو ثَقِیف کے سرداروں نے اپنے ہاں کے لفنگوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف دُور تک آپؐ پر آوازے کستے، گالیاں دیتے اور پتھر مارتے چلے گئے، یہاں تک کہ آپؐ زخموں سے چُور ہو گئے اور آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ اس حالت میں آپؐ طائف کے باہر ایک باغ کی دیوار کے سایے میں بیٹھ گئے اور اپنے رب سے عرض کیا:

"خداوندا! میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے دُرشتی کے ساتھ پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جو مجھ پر قابو پالے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اُجالا اور دنیا اور آخرت کے معاملات کو دُرست کرتا ہے، مجھے اِس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔" (ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۶۲)

دل شکستہ و غمگین پلٹ کر جب آپؐ قَرنُ المنازِل کے قریب پہنچے تو محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک بادل سا چھایا ہوا ہے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو جبریل علیہ السلام سامنے تھے۔ انھوں نے پکار کر کہا: "آپؐ کی

Maktaba Tul Ishaat.com

قوم نے جو کچھ آپؐ کو جواب دیا ہے اللہ نے اسے سُن لیا، اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپؐ جو حکم دینا چاہیں اِسے دے سکتے ہیں۔'' پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپؐ کو سلام کر کے عرض کیا: ''آپؐ فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑ اِن لوگوں پر اُلٹ دوں۔'' آپؐ نے جواب دیا: ''نہیں، بلکہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ اِن کی نسل سے وہ لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کریں گے۔'' (بخاری، بدء الخلق، ذکر الملائکہ۔ مسلم، کتاب المغازی۔ نسائی، البعوث)

اس کے بعد آپؐ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھیر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکّہ واپس جاؤں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ اِنھی ایام میں ایک روز رات کو آپؐ نماز میں قرآنِ مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنّوں کے ایک گروہ کا اُدھر سے گزر ہوا، انھوں نے قرآن سنا، ایمان لائے، واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ خوشخبری سنائی کہ انسان چاہے آپؐ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جنّ اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

موضوع اور مَباحِث یہ حالات تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ جو شخص بھی ایک طرف اِن حالاتِ نُزول کو دیکھے گا اور دوسری طرف اس سورت کو بغور پڑھے گا، اسے اِس امر میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ فی الواقع یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے بلکہ ''اِس کا نُزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔'' اس لیے کہ اوّل سے آخر تک پوری سورت میں کہیں اُن انسانی جذبات و تأثّرات کا ایک ادنیٰ شائبہ تک نہیں پایا جاتا جو اِن حالات سے گزرنے والے انسان کے اندر فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہوتا، جنھیں پے در پے صدمات اور مصائب کے بے پناہ ہُجوم اور طائف کے تازہ ترین چرکے نے خستہ حالی کی انتہا کو پہنچا دیا تھا، تو اِس سورہ میں کہیں تو اُن کیفیات کا عکس نظر آتا جو اُس وقت آپؐ کے دل پر گزر رہی تھیں۔ اُوپر ہم نے حضوؐر کی جو دُعا نقل کی ہے، اسے دیکھیے۔ وہ آپؐ کا اپنا کلام ہے۔ اس کا لفظ لفظ ان کیفیات سے لبریز ہے۔ مگر یہ سورت جو اُسی زمانے اور اِنھی حالات میں آپؐ ہی کی زبان مبارک سے ادا ہوئی ہے، اُن کے ہر اثر سے قطعی خالی ہے۔

سورت کا موضوع کفار کو اُن گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے، بلکہ بڑے اصرار اور غرور واستکبار کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے، اور اُلٹا اُس شخص کو ہدفِ ملامت بنا رہے تھے جو انھیں اِن گمراہیوں سے نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔ ان کے نزدیک دنیا کی حیثیت محض ایک بے مقصد کھلونے کی تھی، اور اس کے اندر اپنے آپ کو وہ غیر جواب دِہ مخلوق سمجھ رہے تھے۔ توحید کی دعوت ان کے خیال میں باطل تھی، اور انھیں اصرار تھا کہ اُن کے معبُود واقعی خدا کے شریک ہیں۔ وہ قرآن کے متعلق یہ ماننے کو تیار

نہ تھے کہ یہ خداوندِ عالَم کا کلام ہے۔ رسالت کا ایک عجیب جاہلانہ تصوُّر ان کے ذہن میں تھا، اور اس کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کو جانچنے کے لیے وہ طرح طرح کے نرالے معیار تجویز کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام کے برحق نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ ان کے شُیوخ اور بڑے بڑے قبائلی سردار اور ان کی قوم کے بُوجھ بُجھکّڑ اسے نہیں مان رہے ہیں، اور صرف چند نوجوان، چند غریب لوگ اور چند غلام ہی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ قیامت، اور زندگی بعدِ موت، اور جزا و سزا کی باتوں کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھتے تھے، اور ان کا خیال یہ تھا کہ اِن چیزوں کا وقوع خارج از اِمکان ہے۔

اِس سورت میں بالاختصار انھی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مُدلّل تردید کی گئی ہے اور کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم اگر عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے تعصُّب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو رد کر دو گے تو آپ اپنا ہی انجام خراب کرو گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۳۵ سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الجزء ۲۶

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳

ح۔مٓ۔اِس کتاب کا نُزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔[1]

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق، اور ایک مدّتِ خاص کے تعیّن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔[2] مگر یہ کافر لوگ اُس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے۔[3]

۱ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۃ الزُمَر، حاشیہ ۱، اور سورۃ الجاثیہ، حاشیہ ۱۔ اس کے ساتھ سورۃ السجدہ، حاشیہ نمبر ۱ بھی نگاہ میں رہے تو اس تمہید کی روح سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

۲ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۱، ابراہیم، حاشیہ ۲۳، الحِجر، حاشیہ ۴۷، النّحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۵ تا ۱۷، المومنون، حاشیہ ۱۰۲، العنکبوت، حواشی ۷۵-۷۶۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۵۱، الدخان، حاشیہ ۳۴، الجاثیہ، حاشیہ ۲۸۔

۳ - یعنی واقعی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نظامِ کائنات ایک بے مقصد کھلونا نہیں بلکہ ایک با مقصد حکیمانہ نظام ہے جس میں لازماً نیک و بد اور ظالم و مظلوم کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہونا ہے، اور کائنات کا موجودہ نظام دائمی و اَبدی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خاص عمر مقرر ہے جس کے خاتمے پر اسے لازماً دَرہم برہم ہو جانا ہے، اور خدا کی عدالت کے لیے بھی ایک وقت طے شدہ ہے جس کے آنے پر وہ ضرور قائم ہونی ہے، لیکن جن لوگوں نے خدا کے رسول اور اس کی کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ان حقائق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب اُنھیں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان حقیقتوں سے خبردار کر کے خدا کے رسول نے اُن کے ساتھ کوئی برائی کی ہے، حالانکہ یہ ان کے ساتھ بہت بڑی بھلائی ہے کہ اس نے محاسبے اور بازپُرس کا وقت آنے سے پہلے اُن کو نہ صرف یہ بتا دیا کہ وہ وقت آنے والا ہے، بلکہ یہ بھی ساتھ ساتھ بتا دیا کہ اُس وقت ان سے کن اُمور کی بازپُرس ہو

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ

اے نبیؐ! اِن سے کہو: ''کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انھوں نے کیا پیدا کیا ہے، یا آسمانوں کی تخلیق وتدبیر میں ان کا کیا حصّہ ہے۔ اِس سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیّہ (اِن عقائد کے ثبوت میں) تمھارے پاس ہو تو وہی لے آؤ، اگر تم سچے ہو[۴]۔'' آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا

گی تاکہ وہ اس کے لیے تیاری کرسکیں۔

آگے کی تقریر سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ انسان کی سب سے بڑی بنیادی غَلَطی وہ ہے جو وہ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کے تعیُّن میں کرتا ہے۔ اس معاملے میں سہل انگاری سے کام لے کر کسی گہرے اور سنجیدہ فکر وتحقیق کے بغیر ایک سرسری یا سُنا سُنایا عقیدہ بنا لینا ایسی عظیم حماقت ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کے پورے رَوِیّے کو، اور اَبَدالآباد تک کے لیے اس کے انجام کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن جس وجہ سے آدمی اس خطرناک سہل انگاری میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ لیتا ہے، اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ خدا کے بارے میں جو عقیدہ بھی میں اختیار کرلوں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یا تو مرنے کے بعد سرے سے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں مجھے کسی بازپُرس سے سابقہ پیش آئے، یا اگر ایسی کوئی زندگی ہو اور وہاں بازپُرس بھی ہو تو جن ہستیوں کا دامن میں نے تھام رکھا ہے وہ مجھے انجامِ بد سے بچالیں گی۔ یہی احساسِ ذمہ داری کا فُقدان آدمی کو مذہبی عقیدے کے انتخاب میں غیر سنجیدہ بنا دیتا ہے، اور اسی بنا پر وہ بڑی بےفکری کے ساتھ دہریّت سے لے کر شرک کی انتہائی نامعقول صورتوں تک طرح طرح کے لغو عقیدے خود گھڑتا ہے، یا دوسروں کے گھڑے ہوئے عقیدے قبول کر لیتا ہے۔

۴ – چونکہ مخاطب ایک مشرک قوم کے لوگ ہیں، اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ احساسِ ذمہ داری کے فُقدان کی وجہ سے وہ کس طرح بےسوچے سمجھے ایک نہایت غیر معقول عقیدے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات ماننے کے ساتھ بہت سی دوسری ہستیوں کو معبود بنائے ہوئے تھے، ان سے دعائیں مانگتے تھے، ان کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے، اُن کے آگے ماتھے رگڑتے اور نذر و نیاز پیش کرتے تھے، اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات انھیں حاصل ہیں۔ انھی ہستیوں کے متعلق ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ انھیں آخر کس بنیاد پر تم نے اپنا معبود مان رکھا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو معبودیت میں حصہ دار قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں: یا تو آدمی کو خود کسی ذریعۂ علم سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَضَلُّ مِمَّنۡ يَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَنۡ لَّا يَسۡتَجِيۡبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ

انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے،[5] بلکہ اِس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے اُن کو پکار رہے ہیں،[6] اور جب تمام انسان جمع کیے

یہ معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے بنانے میں واقعی اس کا بھی کوئی حصہ ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے آپ یہ فرمایا ہو کہ فلاں صاحب بھی خدائی کے کام میں میرے شریک ہیں۔ اب اگر کوئی مشرک نہ یہ دعویٰ کرسکتا ہو کہ اُسے اپنے معبُودوں کے شریکِ خدا ہونے کا براہِ راست علم حاصل ہے، اور نہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب میں یہ دکھا سکے کہ خدا نے خود کسی کو اپنا شریک قرار دیا ہے، تو لامحالہ اس کا عقیدہ قطعی بے بنیاد ہی ہوگا۔

اس آیت میں ''پہلے آئی ہوئی کتاب'' سے مراد کوئی ایسی کتاب ہے جو قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہو، اور علم کے ''بقیہ'' سے مراد قدیم زمانے کے انبیاؑ اور صُلَحا کی تعلیمات کا کوئی ایسا حصہ ہے جو بعد کی نسلوں کو کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے پہنچا ہو۔ ان دونوں ذرائع سے جو کچھ بھی انسان کو ملا ہے، اُس میں کہیں شرک کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ تمام کُتبِ آسمانی بالاتفاق وہی توحید پیش کرتی ہیں جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے۔ اور عُلومِ اوّلین کے جتنے نُقوش بھی بچے کھچے موجود ہیں، ان میں بھی کہیں اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ کسی نبی یا ولی یا مردِ صالح نے کبھی لوگوں کو خدا کے سوا کسی اور کی بندگی و عبادت کرنے کی تعلیم دی ہو۔ بلکہ اگر کتاب سے مراد کتابِ الٰہی، اور بقیۂ علم سے مراد انبیاؑ و صُلَحا کا چھوڑا ہوا علم نہ بھی لیا جائے، تو دنیا کی کسی علمی کتاب اور دینی یا دنیوی علوم کے کسی ماہر کی تحقیقات میں بھی آج تک اس امر کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین یا آسمان کی فُلاں چیز کو خدا کے سوا فلاں بزرگ یا دیوتا نے پیدا کیا ہے، یا انسان جن نعمتوں سے اس کائنات میں مُتمتّع ہو رہا ہے ان میں سے فلاں نعمت خدا کے بجائے فلاں معبُود کی آفریدہ ہے۔

۵ - جواب دینے سے مراد جوابی کارروائی کرنا ہے، نہ کہ الفاظ میں بآواز جواب دینا یا تحریر کی شکل میں لکھ کر بھیج دینا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ان معبُودوں سے فریاد یا اِستغاثہ کرے، یا ان سے کوئی دعا مانگے، تو چونکہ ان کے ہاتھ میں کوئی طاقت اور کوئی اختیار نہیں ہے، اس لیے وہ اس کی درخواست پر کوئی کارروائی نفی یا اثبات کی شکل میں نہیں کر سکتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، الزُمر، حاشیہ نمبر ۳۳)

قیامت تک جواب نہ دے سکنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ دنیا باقی ہے اس وقت تک تو معاملہ صرف اسی حد پر رہے گا کہ اِن کی دعاؤں کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہ ملے گا، لیکن جب قیامت آ جائے گی تو اس سے آگے بڑھ کر معاملہ یہ پیش آئے گا کہ وہ معبُود اپنے اِن عابدوں کے اُلٹے دشمن ہوں گے، جیسا کہ آگے کی آیت میں آ رہا ہے۔

٦ - یعنی ان تک اِن پکارنے والوں کی پکار سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے اُس کو سنتے ہیں،

رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ
فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ
بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، اور یہی صریح کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن سے کہا جائے گا: "کیا میری آیات تم کو نہیں سُنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبّر کیا[۴۳] اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں[۴۴] ہے۔" اُس وقت اُن پر ان کے اعمال کی بُرائیاں کھل[۴۵] جائیں گی اور وہ اُسی چیز کے پھیر میں آ جائیں گے جس کا وہ

ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدّد دوسری صورتیں اِسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آ جائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات وسکنات میں سے ایک ایک چیز، اور اس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم وکاست اس کے سامنے لا رکھے گا۔

۴۳ – یعنی اپنے گھمنڈ میں تم نے یہ سمجھا کہ اللہ کی آیات کو مان کر مطیع فرمان بن جانا تمھاری شان سے فروتر ہے، اور تمھارا مقام بندگی کے مقام سے بہت اونچا ہے۔

۴۴ – اس سے پہلے آیت ۲۴ میں جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے وہ آخرت کا قطعی اور کُھلا انکار کرنے والے تھے۔ اور یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس کا یقین نہیں رکھتے، اگرچہ گمان کی حد تک اس کے امکان سے منکر نہیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کے

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِیۡ مِنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا ؕ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ ؕ كَفٰی بِہٖ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ ؕ

ان سے کہو: "اگر میں نے اِسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے، جو باتیں تم بناتے ہو اللہ اُن کو خوب جانتا ہے، میرے اور تمھارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے[۱۰]،

خبر کہ یہ لوگ ہماری عبادت کرتے تھے۔ اپنی اس گمراہی کے یہ خود ذمہ دار ہیں۔ اس کا خمیازہ انھی کو بھگتنا چاہیے۔ ہمارا اس گناہ میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

۸ – اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کی آیات کفارِ مکہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ صاف یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کلام کی شان انسانی کلام سے بدرجہا بلند ہے۔ ان کے کسی شاعر، کسی خطیب، اور کسی بڑے سے بڑے ادیب کے کلام کو بھی قرآن کی بے مثل فصاحت و بلاغت، اس کی وجد آفرین خطابت، اس کے بلند مضامین اور دلوں کو برما دینے والے اندازِ بیان سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام کی شان بھی وہ نہ تھی جو خدا کی طرف سے آپؐ پر نازل ہونے والے کلام میں نظر آتی تھی۔ جو لوگ بچپن سے آپؐ کو دیکھتے چلے آرہے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کی زبان اور قرآن کی زبان میں کتنا عظیم فرق ہے، اور ان کے لیے یہ باور کرنا ممکن نہ تھا کہ ایک آدمی جو چالیس پچاس برس سے شب و روز ان کے درمیان رہتا ہے، وہ یکایک کسی وقت بیٹھ کر ایسا کلام گھڑ لیتا ہے جس کی زبان میں اُس کی اپنی جانی پہچانی زبان سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز ان کے سامنے حق کو بالکل بے نقاب کر کے لے آتی تھی۔ مگر وہ چونکہ اپنے کفر پر اَڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لیے اس صریح علامت کو دیکھ کر سیدھی طرح اس کلام کو کلامِ وحی مان لینے کے بجائے یہ بات بناتے تھے کہ یہ کوئی جادو کا کرشمہ ہے۔ (ایک اور پہلو جس کے لحاظ سے وہ قرآن کو جادو قرار دیتے تھے، اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص، حاشیہ ۵)

۹ – اس سوالیہ طرزِ بیان میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اتنے بے حیا ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن خود گھڑ لانے کا الزام رکھتے ہیں؟ حالانکہ اِنھیں خوب معلوم ہے کہ یہ اُن کا تصنیف کردہ کلام نہیں ہوسکتا، اور ان کا اِسے سحر کہنا خود اس امر کا صریح اعتراف ہے کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے، جس کا کسی انسان کی تصنیف ہونا ان کے اپنے نزدیک بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰ – چونکہ ان کے الزام کا محض بے اصل اور سراسر ہٹ دھرمی پر مبنی ہونا بالکل ظاہر تھا، اس لیے اس کی تردید میں دلائل پیش کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ پس یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اگر واقعی میں نے خود ایک کلام تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب کرنے کا جُرمِ عظیم کیا ہے، جیسا کہ تم الزام رکھتے ہو، تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے تم نہ آؤ گے، لیکن اگر یہ خدا ہی کا کلام ہے

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٨﴾ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ
اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ
وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ

اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔[۱۱]"

ان سے کہو: "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمھارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، مَیں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔[۱۲]" اے نبیؐ! ان سے کہو: "کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام

اور تم جھوٹے الزامات رکھ رکھ کر اسے ردّ کر رہے ہو، تو اللہ تم سے نمٹ لے گا۔ حقیقت اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے، اور جھوٹ سچ کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ بالکل کافی ہے۔ ساری دنیا اگر کسی کو جھوٹا کہے اور اللہ کے علم میں وہ سچا ہو، تو آخری فیصلہ لازماً اسی کے حق میں ہوگا۔ اور ساری دنیا اگر کسی کو سچّا کہہ دے، مگر اللہ کے علم میں وہ جھوٹا ہو، تو آخرِ کار وہ جھوٹا ہی قرار پائے گا۔ لہٰذا الٹی سیدھی باتیں بنانے کے بجائے اپنے انجام کی فکر کرو۔

۱۱- اس مقام پر یہ فقرہ دو معنیٰ دے رہا ہے: ایک یہ کہ فی الواقع یہ اللہ کا رحم اور اس کا درگزر ہی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ زمین میں سانس لے رہے ہیں جنھیں خدا کے کلام کو افترا قرار دینے میں کوئی باک نہیں، ورنہ کوئی بے رحم اور سخت گیر خدا اس کائنات کا مالک ہوتا تو ایسی جسارتیں کرنے والوں کو ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوتا۔ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ ظالمو! اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو خدا کی رحمت کا دروازہ تمھارے لیے کھلا ہوا ہے، اور جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے وہ معاف ہو سکتا ہے۔

۱۲- اس ارشاد کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اس شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اَرْدَلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے، اور ہر اس شخص پر عذاب کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے، اور پھر اسے یوں ہی مکّے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے

Maktaba Tul Ishaat.com

عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی
مِثۡلِہٖ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ع

اللہ ہی کی طرف سے ہوا اور تم نے اِس کا انکار کر دیا (تو تمھارا کیا انجام[13] ہو گا)؟ اور اِس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے[14]۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔'' ع

رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آ جائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسّر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپؐ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنٰی رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو، اس کے ایک اشارے پر پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کِشت زاروں میں تبدیل ہو جائیں، اس کو تمام ما کان و ما یکون کا علم ہو، اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

یہی باتیں ہیں جن کا جواب اِن فقروں میں دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر فقرے کے اندر معانی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

فرمایا، اِن سے کہو: ''میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں''۔ یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمھیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں، اور میں اُن سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو، یا کھاتا پیتا نہ ہو، یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ اترا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہوا اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے، اور کس نے خدا کی طرف بلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کون سا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو، یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آ رہے ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان کے جواب میں یہ بھی کہو: ''میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمھارے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے۔'' یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمھارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے۔ جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے، بس اُسی کو میں جانتا ہوں۔ اِس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے آخر کب دعویٰ کیا تھا، اور کون سا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتائے، یا یہ بتائے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتائے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا۔

آخر میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو: "میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔" یعنی میں خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہوں کہ وہ عجیب وغریب معجزے تمھیں دکھاؤں جن کے مطالبے تم مجھ سے آئے دن کرتے رہتے ہو۔ مجھے جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے راہِ راست پیش کروں، اور جو لوگ اسے قبول نہ کریں انھیں بُرے انجام سے خبردار کر دوں۔

۱۳ – یہ وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے ایک دوسرے طریقے سے سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، تفسیر سورۂ مذکور، حاشیہ ۶۹۔

۱۴ – مفسرین کے ایک بڑے گروہ نے اس گواہ سے مراد حضرت عبداللہؓ بن سَلام کو لیا ہے جو مدینۂ طیبہ کے مشہور یہودی عالم تھے اور ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ یہ واقعہ چونکہ مدینہ میں پیش آیا تھا، اس لیے اِن مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت مَدَنی ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کا یہ بیان ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہؓ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی تھی (بخاری، مسلم، نَسائی، ابنِ جَریر)، اور اسی بنا پر ابنِ عباسؓ، مجاہد، قَتادَہ، ضَحّاک، ابنِ سیرین، حَسَن بصری، ابنِ زید اور عَوف بن مالک اَلْاَشْجَعی جیسے متعدد اکابر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ مگر دوسری طرف عِکْرِمَہ اور شَعْبِی اور مَسْرُوق کہتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ پوری سورت مکّی ہے۔ ابنِ جَریر طَبَریؒ نے بھی اِسی قول کو ترجیح دی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اُوپر سے سارا سلسلۂ کلام مشرکینِ مکہ کو مخاطَب کرتے ہوئے چلا آ رہا ہے اور آگے بھی سارا خطاب اُنھی سے ہے، اِس سیاق وسباق میں یکایک مدینے میں نازل ہونے والی ایک آیت کا آ جانا قابلِ تصوُّر نہیں ہے۔ بعد کے جن مفسرین نے اس دوسرے قول کو قبول کیا ہے، وہ حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کی رِوایت کو ردّ نہیں کرتے، بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت چونکہ عبداللہؓ بن سَلام کے ایمان لانے پر بھی چسپاں ہوتی ہے، اس لیے حضرت سعدؓ نے قُدما کی عادت کے مطابق یہ فرما دیا کہ یہ ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب وہ ایمان لائے اس وقت انھی کے بارے میں یہ نازل ہوئی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس آیت کے ٹھیک ٹھیک مصداق ہیں اور ان کے قبولِ ایمان پر یہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔

بظاہر یہی دوسرا قول زیادہ صحیح اور معقول محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس "گواہ" سے مراد کون ہے۔ جن مفسرین نے اِس دوسرے قول کو اختیار کیا ہے، ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد موسیٰ ہیں۔ لیکن بعد کا یہ فقرہ کہ "وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے" اس تفسیر کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ زیادہ صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو مُفسّر نیسابُوریؒ اور ابن کثیرؒ نے بیان کی ہے کہ یہاں گواہ سے مراد کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کا ایک عام آدمی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ قرآن مجید جو تعلیم تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے یہ کوئی انوکھی چیز بھی نہیں ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ تمھارے ہی سامنے پیش کی گئی ہو اور تم یہ عذر کر سکو کہ ہم یہ نرالی باتیں کیسے مان لیں جو نوعِ انسانی کے سامنے کبھی آئی ہی نہ تھیں۔ اس سے پہلے یہی تعلیمات اسی طرح وحی کے ذریعے سے بنی اسرائیل کے سامنے تورات اور دوسری کُتُبِ آسمانی کی شکل میں آ چکی ہیں، اور ان کا ایک عام آدمی ان کو مان چکا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ
اِلَیْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ ⑪
وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ
مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے[۱۵]۔ چونکہ اِنھوں نے اُس سے ہدایت نہ پائی، اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے[۱۶]۔ حالانکہ اِس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے، اور یہ کتاب اُس کی تصدیق کرنے والی زبانِ عربی میں آئی ہے، تاکہ ظالموں کو متنبّہ کر دے[۱۷] اور نیک روِش اختیار کرنے والوں کو

اور یہ بھی تسلیم کر چکا ہے کہ اللہ کی وحی اِن تعلیمات کے نُزول کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تم لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وحی اور یہ تعلیمات ناقابلِ فہم چیزیں ہیں۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ تمھارا غُرور و تکبّر اور بے بنیاد گھمنڈ ایمان لانے میں مانع ہے۔

۱۵ – یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شُیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند ناتجرِبہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجے کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ، جو دانا اور جہاں دیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو ردّ کر دیں۔ اِس پُرفریب اِستدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور بھاگو۔

۱۶ – یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں، وہ ضرور ضلالت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسے "نیا جھوٹ" کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیا علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں، اور تمام کُتُبِ آسمانی جو اہلِ کتاب کے پاس موجود ہیں، انھی عقائد اور انھی ہدایات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ اسے "پُرانا جھوٹ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے اِن حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آ رہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصّے میں آ گئی ہے۔

لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ
ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ

بشارت دے دے۔ یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اُس پر جم گئے، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۱۸]۔ ایسے سب لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اپنے اُن اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اُس کی ماں نے مشقت اُٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقّت اُٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دُودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے[۱۹]۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو

۱۷ – یعنی اُن لوگوں کو انجام بد سے خبردار کر دے جو اللہ سے کفر اور غیر اللہ کی بندگی کر کے اپنے اُوپر اور حق و صداقت پر ظلم کر رہے ہیں، اور اپنی اس گمراہی کی وجہ سے اَخلاق اور اعمال کی اُن برائیوں میں مبتلا ہیں جن سے انسانی معاشرہ طرح طرح کے مظالم اور بے انصافیوں سے بھر گیا ہے۔

۱۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ نمبر ۳۳ تا ۳۵۔

۱۹ – یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن ماں کا حق اپنی اہمیّت میں اس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیفیں اُٹھاتی ہے۔ یہی بات اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، مُسندِ احمد اور امام بخاریؒ کی ادب المُفرَد میں وارد ہوئی ہے کہ ایک صاحب نے حضورؐ سے پوچھا: کس کا حق خدمت مجھ پر زیادہ ہے؟ فرمایا: تیری ماں کا۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔ حضورؐ کا یہ ارشاد ٹھیک ٹھیک اِس آیت کی ترجمانی ہے، کیونکہ اس میں بھی ماں کے تہرے حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (۱) اس کی ماں نے اسے مَشقّت اُٹھا کر پیٹ میں رکھا۔ (۲) مَشقّت اُٹھا کر ہی اس کو جنا۔ (۳) اور اس کے

Maktaba Tul Ishaat.com

حمل اور دودھ چھڑانے میں ۳۰ مہینے لگ گئے۔

اس آیت، اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۴، اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ سے ایک اور قانونی نکتہ بھی نکلتا ہے، جس کی نشان دہی ایک مقدمے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے کی اور حضرت عثمانؓ نے اسی کی بنا پر اپنا فیصلہ بدل دیا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک شخص نے قبیلۂ جُہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور شادی کے چھ ہی مہینے بعد اس کے ہاں صحیح و سالم بچہ پیدا ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت عثمانؓ کے سامنے لاکر یہ معاملہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس عورت کو زانیہ قرار دے کر حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے یہ قصہ سنا تو فوراً حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا: یہ آپ نے کیا فیصلہ کر دیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ نکاح کے چھ مہینے بعد اس نے زندہ سلامت بچہ جن دیا، کیا یہ اس کے زانیہ ہونے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں۔ پھر انھوں نے قرآنِ مجید کی مذکورۂ بالا تینوں آیتیں ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں اُس باپ کے لیے جو رضاعت کی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔'' سورۂ لقمان میں فرمایا: ''اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔'' اور سورۂ احقاف میں فرمایا: ''اس کے حمل اور اس کا دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگے۔'' اب اگر تیس مہینوں میں سے رضاعت کے دو سال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدت، جس میں زندہ سلامت بچہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے۔ لہٰذا جس عورت نے نکاح کے چھ مہینے بعد بچہ جنا ہو، اسے زانیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کا یہ اِستدلال سُن کر حضرت عثمانؓ نے فرمایا: اس بات کی طرف میرا ذہن بالکل نہ گیا تھا۔ پھر آپ نے عورت کو واپس بلوایا اور اپنا فیصلہ بدل دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کے اِستدلال کی تائید حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی کی، اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اپنے فیصلے سے رُجوع فرمالیا۔ (ابنِ جریر، احکام القرآن للجصاص، ابنِ کثیر)

ان تینوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) جو عورت نکاح کے بعد چھ مہینے سے کم مدت میں صحیح و سالم بچہ جنے (یعنی وہ اِسقاط نہ ہو بلکہ وضعِ حمل ہو) وہ زانیہ قرار پائے گی اور اس کے بچے کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

(۲) جو عورت نکاح کے چھ مہینے بعد یا اس سے زیادہ مدت میں زندہ سلامت بچہ جنے، اس پر زنا کا الزام محض اس ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا، نہ اس کے شوہر کو اس پر تہمت لگانے کا حق دیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کا شوہر بچے کے نسب سے انکار کر سکتا ہے۔ بچہ لازماً اسی کا مانا جائے گا، اور عورت کو سزا نہ دی جائے گی۔

(۳) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس عمر کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں قرار نہیں پائے گی، اور نہ وہ احکامِ حرمتِ رضاعت اس پر مترتب ہوں گے جو سورۂ نساء آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں امام ابوحنیفہ نے برسبیلِ احتیاط دو سال کے بجائے ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے، تاکہ حرمتِ رضاعت جیسے نازک مسئلے میں خطا کر جانے کا احتمال باقی نہ رہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ لقمان،

قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی
وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ
اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ
عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْۤ اَصْحٰبِ

اس نے کہا: ''اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں، اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو[20]، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سُکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابعِ فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔'' اس طرح کے لوگوں سے ہم اُن کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور اُن کی بُرائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں[21]۔ یہ جنتی لوگوں

حاشیہ نمبر ۲۳)

اس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبّی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نشو و نما پا کر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے، کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور ایک بچے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اس کی نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے، دونوں کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجایش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتیٰ کہ خود حاملہ عورت اور اُسے بارور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم سے کم قانونی مدت کے تعیّن میں چند روز کی مزید گنجایش رکھی جائے۔

۲۰ – یعنی مجھے ایسے نیک عمل کی توفیق دے جو اپنی ظاہری صورت میں بھی ٹھیک ٹھیک تیرے قانون کے مطابق ہو، اور حقیقت میں بھی تیرے ہاں مقبول ہونے کے لائق ہو۔ ایک عمل اگر دنیا والوں کے نزدیک بڑا اچھا ہو، مگر خدا کے قانون کی پیروی اس میں نہ کی گئی ہو، تو دنیا کے لوگ چاہے اس پر کتنی ہی داد دیں، خدا کے ہاں وہ کسی داد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک عمل ٹھیک ٹھیک شریعت کے مطابق ہوتا ہے اور بظاہر اس کی شکل میں کوئی کسر نہیں ہوتی، مگر نیت کی خرابی، ریا، خود پسندی، فخر و غرور، اور دنیا طلبی اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے، اور وہ بھی اس قابل نہیں رہتا کہ اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

۲۱ – یعنی دنیا میں انھوں نے جو بہتر سے بہتر عمل کیا ہے، آخرت میں ان کا درجہ اُسی کے لحاظ سے مقرر کیا جائے گا، اور ان کی لغزشوں، کمزوریوں اور خطاؤں پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک کریم النفس اور قدر شناس آقا

Maktaba Tul Ishaat.com

الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ الَّذِیْ قَالَ
لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ
قَبْلِیْ ۚ وَ هُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ
فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ
عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ
وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ

میں شامل ہوں گے، اُس سچّے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: "اُف! تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد پھر قبر سے نکالا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (اُن میں سے تو کوئی اُٹھ کر نہ آیا)۔" ماں اور باپ اللہ کی دُہائی دے کر کہتے ہیں: "ارے بدنصیب! مان جا، اللہ کا وعدہ سچّا ہے۔" مگر وہ کہتا ہے: "یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔" یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ اِن سے پہلے جنّوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اِسی قُماش کے) ہو گزرے ہیں، انھی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں[۲۲]۔ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں،

اپنے خدمت گزار اور وفادار ملازم کی قدر اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی کسی ایسی خدمت کے لحاظ سے کرتا ہے جس میں اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، جاں نثاری و وفاشعاری کا کمال کر دکھایا ہو۔ اور ایسے خادم کے ساتھ وہ یہ معاملہ نہیں کیا کرتا کہ اس کی ذرا ذرا سی کوتاہیوں پر گرفت کر کے اس کی ساری خدمات پر پانی پھیر دے۔

۲۲ – یہاں دو طرح کے کردار آمنے سامنے رکھ کر گویا سامعین کے سامنے یہ خاموش سوال رکھ دیا گیا ہے کہ بتاؤ، ان دونوں میں سے کون سا کردار بہتر ہے۔ اُس وقت یہ دونوں ہی کردار معاشرے میں عملاً موجود تھے، اور لوگوں کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ پہلی قسم کا کردار کہاں پایا جاتا ہے اور دوسری قسم کا کہاں۔ یہ جواب ہے سردارانِ قریش کے اِس قول کا کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ چند نوجوان اور چند غلام اس معاملے میں ہم سے بازی نہ لے جا سکتے تھے۔ اِس جواب کے آئینے میں ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ ماننے والوں کا کردار کیا ہے اور نہ ماننے والوں کا کیا۔

وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝١٩ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ
بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝٢٠ ع وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ
اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

ع ۲

تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔[۲۳] پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لُطف تم نے اُٹھا لیا، اب جو تکبّر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں، اُن کی پاداش میں آج تم کو ذلّت کا عذاب دیا جائے گا۔"[۲۴] ع

ذرا اِنھیں عاد کے بھائی (ہودؑ) کا قصّہ سناؤ، جب کہ اُس نے اَحقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا ــــ اور ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی

۲۳ – یعنی نہ اچھے لوگوں کی نیکیاں اور قربانیاں ضائع ہوں گی، نہ بُرے لوگوں کو ان کی واقعی بُرائی سے بڑھ کر سزا دی جائے گی۔ نیک آدمی اگر اپنے اجر سے محروم رہ جائے، یا اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجر پائے تو یہ بھی ظلم ہے، اور بُرا آدمی اپنے کیے کی سزا نہ پائے، یا جتنا کچھ قصور اس نے کیا ہے اس سے زیادہ سزا پا جائے تو یہ بھی ظلم ہے۔

۲۴ – ذلّت کا عذاب اُس تکبّر کی مناسبت سے ہے جو انھوں نے کیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رسول پر ایمان لا کر غریب اور فقیر مومنوں کے گروہ میں شامل ہو جانا ان کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ جس چیز کو چند غلاموں اور بے نَوا انسانوں نے مانا ہے، اسے ہم جیسے بڑے لوگ مان لیں گے تو ہماری عزت کو بٹّا لگ جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں ذلیل و خوار کرے گا اور اُن کے غُرور کو خاک میں ملا کر رکھ دے گا۔

۲۵ – چونکہ سردارانِ قریش اپنی بڑائی کا زعم رکھتے تھے اور اپنی ثروت و مَشیخت پر پھُولے نہ سماتے تھے، اس لیے یہاں ان کو قومِ عاد کا قصہ سنایا جا رہا ہے، جس کے متعلق عرب میں مشہور تھا کہ قدیم زمانے میں وہ اس سرزمین کی سب سے زیادہ طاقتور قوم تھی۔

اَحقاف حِقف کی جمع ہے، اور اس کے لغوی معنی ہیں: ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ

Maktaba Tul Ishaat.com

پہنچے ہوں۔ لیکن اِصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الرّبعُ الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ نقشے میں اس کا مقام مُلاحظہ ہو:

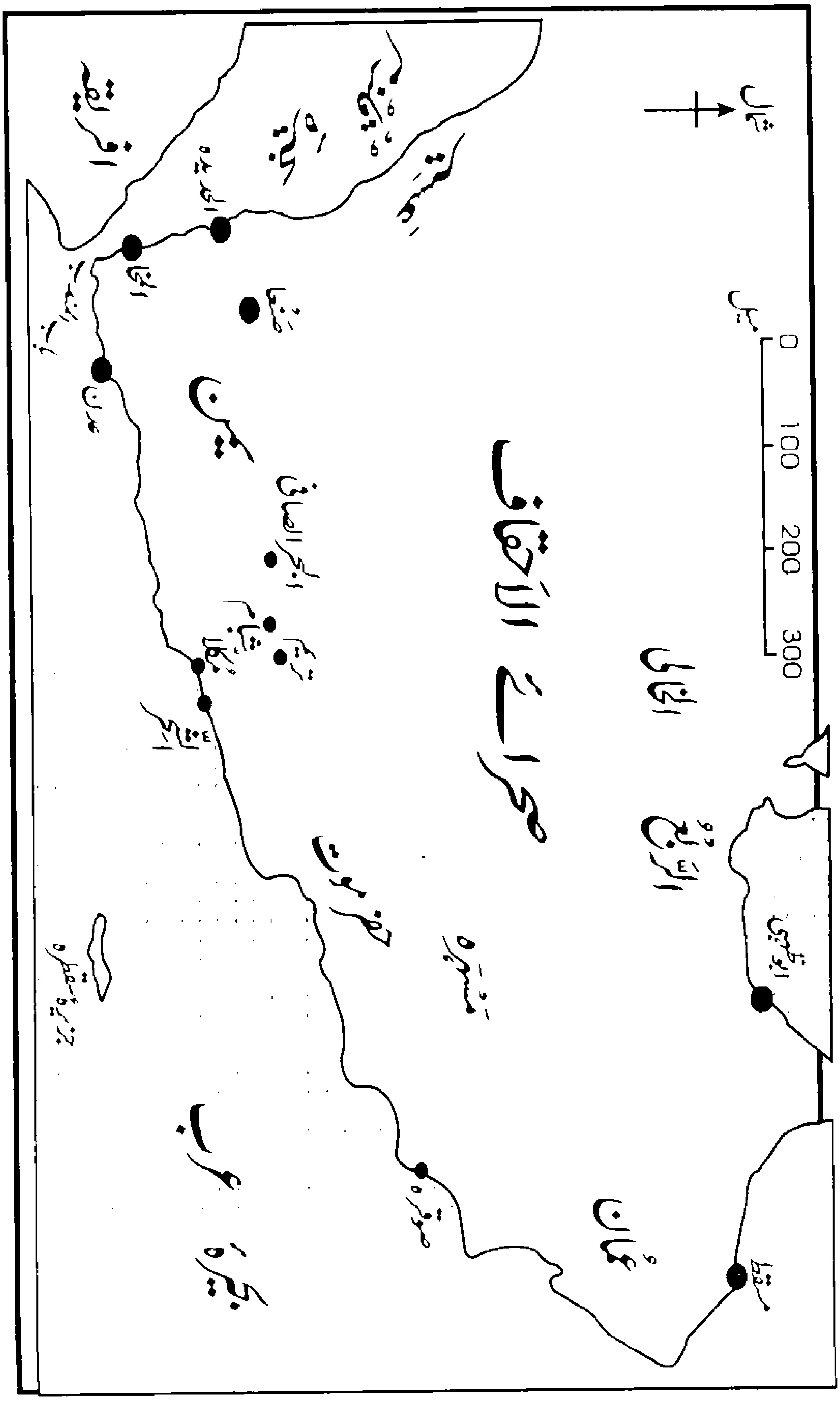

خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ

آتے رہے ۔۔۔۔۔کہ ’’ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔‘‘ انھوں نے کہا: ’’کیا تو اِس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبُودوں سے برگشتہ کردے؟ اچھا تو لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے،

ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عُمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا، اور قرآنِ مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا، جہاں سے نکل کر وہ گردوپیش کے مَمالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھاگئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقے میں آباد تھے۔ موجودہ شہر مُکلّا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حَضرَموت میں ایک مَقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہودؑ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبرِ ہودؑ کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۱۵ شعبان کو وہاں عُرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رُجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مَقامی رِوایات اِسی علاقے کو قومِ عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حَضرَمَوت میں متعدّد خرابے (ruins) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کرسکتا کہ کبھی یہاں ایک شان دار تمدُّن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا، اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لَق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حَضرَموت کی شمالی سطحِ مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدّو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدّو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دُور سے ایک شاقُول اس میں پھینکا تو وہ ۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا، اور اُس رسّی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ مفصّل معلومات کے لیے مُلاحظہ ہو۔

——Arabia and The Isles Harold Ingrams, London, 1946.

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۖ وَ
اُبَلِّغُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾
فَلَمَّا رَاَوۡهُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِيَتِهِمۡ ۙ قَالُوۡا هٰذَا عَارِضٌ
مُّمۡطِرُنَا ؕ بَلۡ هُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِهٖ ؕ رِيۡحٌ فِيۡهَا عَذَابٌ
اَلِيۡمٌ ۙ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَىۡءٍۢ بِاَمۡرِ رَبِّهَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا يُرٰٓى اِلَّا
مَسٰكِنُهُمۡ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدۡ

اگر واقعی تو سچّا ہے۔" اس نے کہا کہ "اِس کا علم تو اللہ کو ہے،[26] میں صرف وہ پیغام تمھیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔"[27] پھر جب انھوں نے اُس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے: "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا" ـــــ "نہیں،[28] بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔" آخرِ کار اُن کا حال یہ ہوا کہ اُن کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اِس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔[29] ان کو ہم نے

---The Unveiling of Arabia, R.H. Kirnan, London. 1937.

---The Empty Quarter, Philby. London. 1933.

۲۶ – یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ تم پر عذاب کب آئے گا۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ تم پر کب عذاب نازل کیا جائے اور کب تک تمھیں مہلت دی جائے۔

۲۷ – یعنی تم اپنی نادانی سے میری اس تنبیہ کو مذاق سمجھ رہے ہو اور کھیل کے طور پر عذاب کا مطالبہ کیے جاتے ہو۔ تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ خدا کا عذاب کیا چیز ہوتا ہے اور تمھاری حرکات کی وجہ سے وہ کس قدر تمھارے قریب آ چکا ہے۔

۲۸ – یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ اُن کو یہ جواب کس نے دیا۔ کلام کے انداز سے خود بخود یہ مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ وہ جواب تھا جو اصل صورتِ حال نے عملاً ان کو دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ یہ بادل ہے جو ان کی وادیوں کو سیراب کرنے آیا ہے، اور حقیقت میں تھا وہ ہوا کا طوفان جو انھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے بڑھا چلا آ رہا تھا۔

مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ
اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ
مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ
الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا

وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے[30]۔ اُن کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل، سب کچھ دے رکھے تھے، مگر نہ وہ کان اُن کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے[31]، اور اُسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ع

تمھارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے اُن کو سمجھایا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنھیں اللہ کو چھوڑ کر انھوں نے تقرّب اِلی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا[32]؟ بلکہ وہ تو ان سے

۲۹ – قومِ عاد کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۱ تا ۵۶، ہود، حواشی ۵۴ تا ۶۵۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۳۴ تا ۳۷، الشعراء، حواشی ۸۸ تا ۹۴، العنکبوت، حاشیہ ۶۵۔ جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۲۰-۲۱۔

۳۰ – یعنی مال، دولت، طاقت، اقتدار، کسی چیز میں بھی تمھارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تمھارا دائرۂ اقتدار تو شہرِ مکہ کے حُدود سے باہر کہیں بھی نہیں، اور وہ زمین کے ایک بڑے حصّے پر چھائے ہوئے تھے۔

۳۱ – اس مختصر سے فقرے میں ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ خدا کی آیات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو حقیقت کا صحیح فہم و اِدراک بخشتی ہیں۔ یہ فہم و اِدراک انسان کو حاصل ہو تو وہ آنکھوں سے ٹھیک دیکھتا ہے، کانوں سے ٹھیک سنتا ہے، اور دل و دماغ سے ٹھیک سوچتا اور صحیح فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب وہ آیاتِ الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اُسے نگاہِ حق شناس نصیب نہیں ہوتی، کان رکھتے ہوئے بھی وہ ہر کلمۂ نصیحت کے لیے بہرا ہوتا ہے، اور دل و دماغ کی جو نعمتیں خدا نے اسے دی ہیں ان سے اُلٹی سوچتا اور ایک سے ایک غلط نتیجہ اخذ کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک

Maktaba Tul Ishaat.com

عَنۡهُمۡ ۚ وَذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝۲۸ وَاِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَيۡكَ
نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوۡهُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا ۚ

کھوئے گئے، اور یہ تھا اُن کے جھوٹ اور اُن بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے۔
(اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم جِنّوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں[۳۳]۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انھوں نے آپس میں کہا: خاموش

کہ اس کی ساری قوتیں خود اس کی اپنی ہی تباہی میں صَرف ہونے لگتی ہیں۔

۳۲- یعنی اُن ہستیوں کے ساتھ عقیدت کی ابتدا تو انھوں نے اس خیال سے کی تھی کہ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں، ان کے وسیلے سے خدا کے ہاں ہماری رسائی ہوگی۔ مگر بڑھتے بڑھتے انھوں نے خود انھی ہستیوں کو معبود بنا لیا، انھی کو مدد کے لیے پکارنے لگے، انھی سے دعائیں مانگنے لگے، اور انھی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحبِ تصرُّف ہیں، ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے۔ اِس گمراہی سے ان کو نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے ان جھوٹے خداؤں کی بندگی پر اَڑے رہے اور اصرار کیے چلے گئے کہ ہم اللہ کے بجائے انھی کا دامن تھامے رہیں گے۔ اب بتاؤ، ان مشرک قوموں پر جب ان کی گمراہی کی وجہ سے اللہ کا عذاب آیا تو ان کے وہ فریاد رس اور مشکل کشا معبود کہاں مر رہے تھے؟ کیوں نہ اس بُرے وقت میں وہ ان کی دست گیری کو آئے؟

۳۳- اس آیت کی تفسیر میں جو روایات حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، زِرّ بن حُبَیشؒ، مجاہدؒ، عِکرِمہؒ اور دوسرے بزرگوں سے منقول ہیں، وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جِنّوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ، جس کا اس آیت میں ذکر ہے، بطنِ نَخلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابنِ اسحاق، ابونُعَیم اصفہانی اور واقدی کا بیان ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مایوس ہو کر مکۂ معظمہ کی طرف واپس ہوئے تھے۔ راستے میں آپؐ نے نَخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشا یا فجر یا تہجُّد کی نماز میں آپؐ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جِنّوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، اور وہ آپؐ کی قراءت سننے کے لیے ٹھیر گیا۔ اس کے ساتھ تمام رِوایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس موقع پر جِنّ حضورؐ کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپؐ نے ان کی آمد کو محسوس فرمایا تھا، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یا تو الزَّیمہ تھا، یا السَّیل الکبیر، کیونکہ یہ دونوں مقام وادیِ نَخلہ میں واقع ہیں، دونوں جگہ پانی اور سرسبزی موجود ہے، اور طائف سے آنے والوں کو اگر اس وادی میں پڑاؤ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ انھی دونوں میں سے کسی جگہ ٹھیر سکتے ہیں۔ نقشے میں ان مقامات کا موقع مُلاحظہ ہو:

(نقشہ اگلے صفحے پر ہے)

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا
سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي
إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٣٠﴾ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَ
آمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣١﴾

ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انھوں نے جا کر کہا: "اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف[۳۴]۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں عذابِ الیم سے بچادے[۳۵] گا۔"

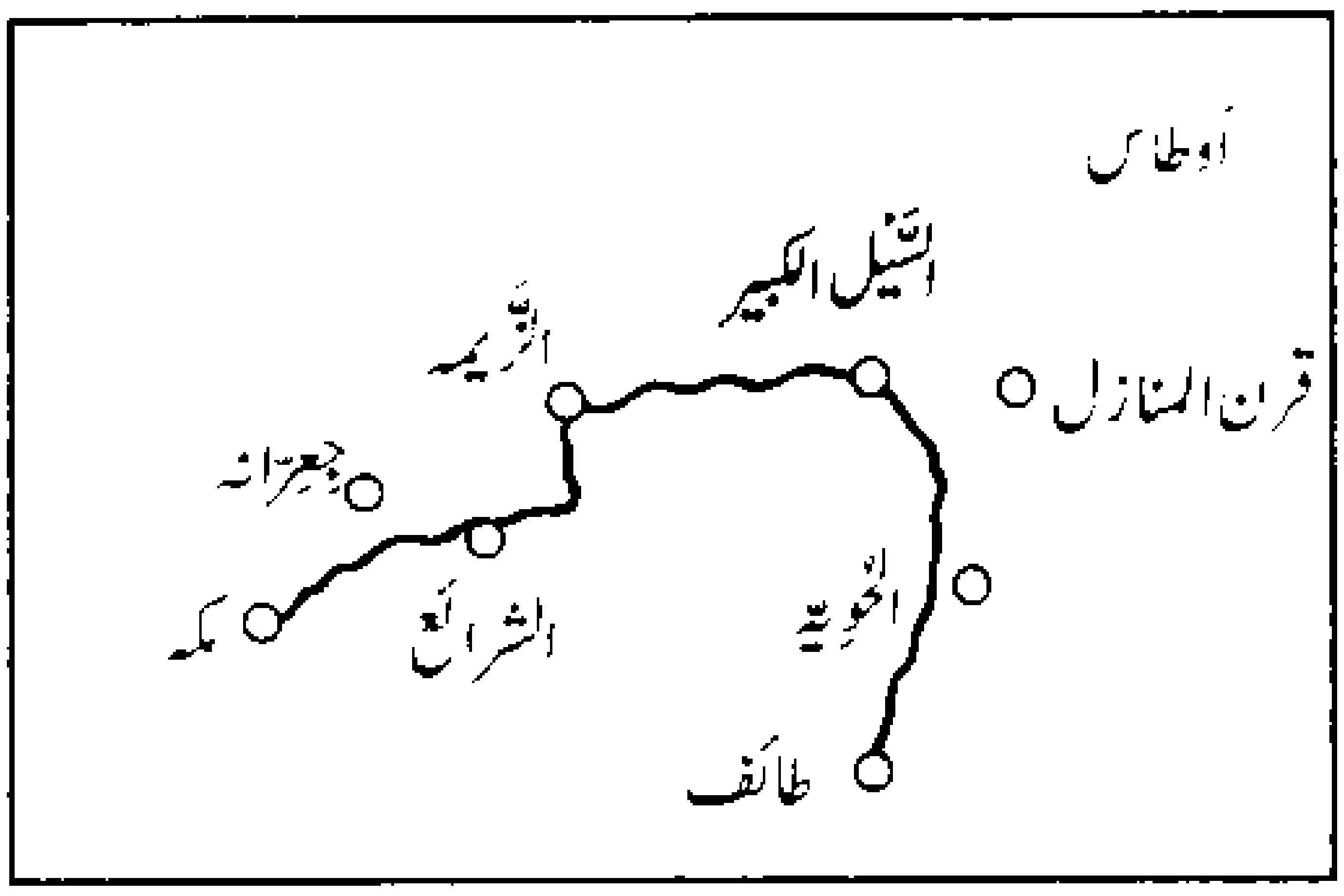

۳۴- اس سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰؑ اور کتبِ آسمانی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ دیتے چلے آرہے ہیں، اس لیے وہ اِس کتاب، اور اس کے لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

۳۵- معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد جنوں کے پے در پے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے اور آپؐ سے ان کی رُو در رُو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو روایات کُتبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں، ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکۂ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

ان میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپؐ پر کوئی حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپؐ کو حِرا کی طرف سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ
لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمْ
يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ
يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ

اور[36] جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے، وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بُوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زِچ کر دے، اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور کیا اِن لوگوں کو یہ سُجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے ہوئے جو نہ تھکا، وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو جِلا اٹھائے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اُس وقت اِن سے پوچھا جائے گا:

آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ ایک جِنّ مجھے بلانے آیا تھا، میں نے اس کے ساتھ آ کر یہاں جِنّوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا۔ (مسلم، مُسندِ احمد، ترمِذی، ابوداؤد)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہی کی ایک اور رِوایت ہے کہ ایک مرتبہ مکّے میں حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جِنّوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ میں آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکہ کے بالائی حصّے میں ایک جگہ حضورؐ نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپؐ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپؐ کے درمیان حائل ہیں۔ (ابنِ جَریر۔ بَیہَقی، دلائل النبوۃ۔ ابونُعیم اصفہانی، دلائل النبوۃ)

ایک اور موقع پر بھی رات کے وقت حضرت عبداللہؓ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور مکۂ معظّمہ میں حَجُون کے مقام پر جِنّوں کے ایک مُقدّمے کا آپؐ نے فیصلہ فرمایا۔ اس کے سال ہا سال بعد ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا: حَجُون کے مقام پر جِنّوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا، وہ ان لوگوں سے بہت مشابہ تھا۔ (ابنِ جَریر)

۳۶ – ہو سکتا ہے کہ یہ فقرہ بھی جِنّوں ہی کے قول کا حصّہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اُن کے قول پر اللہ تعالیٰ کی

اَلَيۡسَ هٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا
كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا
تَسۡتَعۡجِلْ لَّهُمۡ ؕ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا
سَاعَةً مِّنۡ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ ع

”کیا یہ حق نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے: ”ہاں، ہمارے رب کی قسم! (یہ واقعی حق ہے)۔“ اللہ فرمائے گا: ”اچھا تو اب عذاب کا مزا چکھو، اپنے اُس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔“

پس اَے نبیؐ! صبر کرو جس طرح اُولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو[۳۷]۔ جس روز یہ لوگ اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انھیں خوف دلایا جا رہا ہے، تو اِنھیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟ ع

طرف سے اضافہ ہو۔ فَحوائے کلام سے دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس محسوس ہوتی ہے۔

۳۷- یعنی جس طرح تمھارے پیش رَو انبیاؑ اپنی قوم کی بے رُخی، مخالفت، مزاحمت اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں کا مقابلہ سال ہا سال تک مسلسل صبر اور اَن تھک جِدّ و جُہد کے ساتھ کرتے رہے اسی طرح تم بھی کرو، اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ یا تو یہ لوگ جلدی سے ایمان لے آئیں، یا پھر اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فہرست موضوعات

الف

ابراہیم علیہ السلام

— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۲۹۱ تا ۳۰۱ - ۵۳۴ - ۵۳۵
— آپ کی وہ خصوصیت جس میں کوئی نبی آپ کا شریک نہیں ۱۲۶ - ۱۲۷
— آپ کے پاکیزہ اوصاف ۲۹۱ - ۳۴۳
— آپ کی طرف جھوٹ کی نسبت اور اس کی حقیقت ۲۹۲ - ۲۹۳
— آپ کا سب سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنا ۲۹۱ - ۵۳۴
— آپ کا جھوٹے معبودوں کے بارے میں اپنے باپ اور اپنی قوم سے خطاب ۲۹۲ - ۵۳۴
— آپ کا اپنی قوم کے بتوں کو توڑنا ۲۹۳
— آپ کا آگ سے بچایا جانا ۲۹۳ - ۲۹۴
— آپ کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶
— آپ حضرت نوحؑ کے طریقے پر چلنے والے تھے ۲۹۱
— اپنے ملک سے آپ کی ہجرت ۲۹۴
— آپ بے اولاد تھے، اولاد کے لیے آپ کی دعا اور پہلے بیٹے کی بشارت ۲۹۴ - ۲۹۵
— بیٹے کی قربانی کا واقعہ ۲۹۴ تا ۳۰۱
— ''بڑی قربانی'' فدیے میں دے کر بچے چھڑا لیا گیا ۲۹۶
— آپ کا خواب دراصل وحی اور ایک حکم تھا ۲۹۵
— یہ بحث کہ آپ نے قربانی حضرت اسماعیل کی پیش کی تھی یا حضرت اسحاق کی ۲۹۷ تا ۳۰۱
— آپ کو حضرت اسحاق کی بشارت ۲۹۷
— آپ کو اور حضرت اسحاق کو برکت دی گئی ۲۹۷
— آپ کلمہ حق اپنی اولاد کے لیے چھوڑ گئے لیکن انھوں نے غیر اللہ کی بندگی شروع کر دی ۵۳۴ - ۵۳۵
— آپ تقلید آبائی کے نہیں بلکہ تقلید حق کے قائل تھے ۵۲۱ - ۵۳۴ - ۵۳۵
— آپ سے اور تمام انبیاؑ سے عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵

ابلیس

— قصہ آدم و ابلیس ۳۴۷ تا ۳۵۰
— گمراہ انسان اس کی توقعات پوری کرتا ہے ۱۹۳ - ۱۹۴
— اس کو انسان پر یہ اقتدار حاصل نہیں کہ زبردستی اسے اپنے راستے پر کھینچ کر لے جائے ۱۹۴ - ۱۹۵
— انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے پر وہ کافروں میں سے ہو گیا ۳۴۸
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''شیطان'')

اجر

— نیکی کا اس سے [illegible] ۱۲۰ - ۲۲۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۲۸ - ۳۴۳ - ۳۶۲ - ۳۱۵ - ۴۲۱ - ۴۴۴ - ۵۱۱

— اجر عظیم کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۴-۹۴-۹۷
— دہرا اجر کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۷-۸۸
— اجر کریم کن لوگوں کے لیے ہے ۱۰۴
— بے حساب اجر کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳-۳۶۴
— نیکوکاروں کو اجر دینے سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ۳۷۲-۳۷۳
— نیکی کا اجر بے حساب ملے گا بشرطیکہ آدمی مؤمن ہو ۴۱۱
— مرد اور عورت سب کے لیے ایمان اور عمل صالح کا اجر یکساں ہے ۴۱۱

احسان

— معنی و تشریح ۸۴-۸۵
— نیکی کی حقیقت ۷-۸-۲۱
— نیکی کا راستہ نجات کا راستہ ہے ۴۱۱
— اللہ تعالیٰ نیکی میں خوبی کا اضافہ کر دیتا ہے ۵۰۰
— نیکی ہی انسان کے درجات بلند کرتی ہے ۲۲۳
— نیکی انسان اپنے لیے ہی کرتا ہے اور برائی کا خمیازہ بھی وہ خود ہی بھگتے گا ۵۸۴
— محسنین کون ہیں ۷-۸۴-۸۵-۶۰۹
— قرآن محسنین کو بشارت دیتا ہے ۶۰۸-۶۰۹
— محسنین کا انجام نیک ۲۹۱- ۲۹۶- ۳۰۲-۳۰۵-۳۷۲-۳۷۳-۴۱۱-۵۰۰

احکام القرآن

— ۱۲ تا ۱۸-۲۱-۴۵-۴۶-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۳-۸۰-۸۱-۸۴-۸۵-۸۷ تا ۸۹-۹۰ تا ۹۷-۹۸-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۹-۱۱۲ تا ۱۱۹-۱۱۹ تا ۱۲۲-۱۲۳-۱۲۹ تا ۱۳۱-۱۳۴-۱۳۵- ۱۷۹- ۱۸۹- ۱۹۲- ۱۹۳- ۲۲۸-۲۲۹-۲۳۲-۲۳۳-۲۵۳-۲۶۶-۲۶۷-۲۷۳- ۳۲۶- ۳۲۷- ۳۵۵- ۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۹-۳۹۸-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۵- ۴۱۶- ۴۱۸- ۴۲۴- ۴۴۱- ۴۵۴-۴۵۶ تا ۴۵۹-۴۶۰-۴۶۵-۴۸۳ تا ۴۸۵-۴۸۶-۴۹۴-۴۹۵-۵۰۰-۵۰۷ تا ۵۱۲-۵۵۳-۵۷۳-۵۸۴-۵۸۶-۵۸۷-۶۰۹-۶۲۱
(تفصیلات کے لیے دیکھو: ''اسلامی ریاست''، ''جہاد''، ''اخلاق اور اخلاقی تعلیمات''، ''حکمتِ تبلیغ''، ''اسلامی نظامِ معاشرت''، ''قانونِ اسلام'')

آخرت

— دین میں عقیدۂ آخرت کی اہمیت ۱۷۴- ۱۷۵-۱۷۶-۱۷۸-۱۹۴-۱۹۵-۲۱۶
— اس کے دلائل ۳۷ تا ۴۱- ۱۷۵-۱۹۱-۲۷۲-۲۷۳- ۲۸۰- ۲۸۱- ۲۸۲- ۳۳۱- ۳۳۲-۳۶۶- ۴۰۱ و ۴۰۲- ۴۱۴- ۴۱۷- ۴۱۸-۴۲۹- ۴۳۰- ۴۶۱- ۵۲۷- ۵۵۸-۵۶۹-۵۷۰- ۵۷۷ و ۵۷۸- ۵۸۷-۵۸۸-۵۹۰ تا ۵۹۲-۶۰۰-۶۲۰
— اس کے امکان کے دلائل ۲۳-۲۴-۴۱-۴۳-۱۷۴-۲۲۳-۴۱۷
— وقوعِ آخرت پر اخلاقی استدلال ۵۸۷
— وقوعِ آخرت کا قطعی فیصلہ ۴۱۷-۴۱۸
— اس کے برپا کیے جانے کا مقصد ۱۷۴- ۱۷۵
— کائنات کے موجودہ نظام کے لیے ایک مدت مقرر ہے ۲۲۶-۶۰۰
— آخرت کا وقوع عقل و انصاف کا تقاضا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۱۵-۶۲۵-۶۶۲-۵۱۷
— اس کا آنا یقینی ہے ۲۱-۲۷-۲۲۰-۴۱۷-
۶۰۱-۶۱۰
— اس کا وقت طے شدہ ہے ۵۰۷
— اللہ کا وعدہ برحق اور سچا ہے۔ آخرت کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے ۲۱-۵۹۳-۶۱۲
— آخرت کے واقع ہونے کی اطلاع دے کر انسان کے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی گئی ہے ۶۰۰
— راست باز اور گمراہ لوگوں کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۲۲۹-۵۸۷
— اس کو یاد رکھنے اور اس کے لیے سعی و کوشش کرنے کے ثمرات ونتائج ۳۴۳
— آخرت کی کامیابی ہی عظیم الشان کامیابی ہے اور انسان کو اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے ۲۸۹-۳۹۶
— آخرت کی زندگی ہی بہتر اور پائدار ہے ۵۰۷
— عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج ۵۲۸-۵۲۹
— اس کو نہ ماننے کے اخلاقی نتائج ۱۹۴-۱۹۵-۲۹۱-۳۲۷-۳۷۲-۴۰۵-۴۷۱-۴۹۷-۵۷۱-۵۹۰-۵۹۳-۶۰۱-۶۱۳
— انسان سے اخلاقی ضرورت رکھنے کے لیے آخرت کا عقیدہ ناگزیر ہے ۵۰۷
— [illegible] ۵۹۳-۵۹۴
— [illegible] ۵۹۳-۵۹۴
— [illegible] انسان کا اپنا ہی نقصان [illegible] ہے ۵۷۵-۵۱۵
— منکرین آخرت دراصل شک میں مبتلا ہیں ۱۹۴-۲۱۴-۵۲۷
— منکرین آخرت گمان اور خواہشات نفس کی بنا پر نہ کہ یقین و دلیل کی بنیاد پر ایک عقیدہ بنا لیتے ہیں ۵۹۰-۵۹۱
— تمام دلائل کے جواب میں منکرین آخرت کی آخری حجت کیا ہوتی ہے ۵۹۰-۵۹۱
— منکرین آخرت جہالت اور افلاس فکر ونظر میں مبتلا ہیں ۵۹۲
— منکرین آخرت پر ان کے اعمال کی برائی کھل جائے گی ۳۷۷-۵۹۳
— منکرین آخرت کو آخرت میں اللہ اسی طرح بھلا دے گا جس طرح انھوں نے آخرت کو بھلا دیا ہے ۴۵-۵۹۴
— منکرین آخرت کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۵۹۴
— منکرین آخرت پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے اور وہ گھاٹے میں رہ جانے والے ہیں ۶۱۲
— منکرین آخرت اسی دنیا کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں ۵۶۹-۵۹۰
— منکرین آخرت مذاق کے طور پر آخرت کی تاریخ اور وقت پوچھتے ہیں ۲۸-۲۹-۱۳۳-۲۶۴
— منکرین آخرت کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو دوبارہ ہماری بوسیدہ ہڈیوں کو کیسے جمع کیا جائے گا ۴۱ تا ۴۴-۱۶۷-۲۰۲-۲۰۳-۲۸۲-۲۸۸
— منکرین آخرت کا یہ مطالبہ کہ ہمارے باپ دادا کو واپس لاؤ ۲۸۲-۵۶۹-۵۹۰-۵۹۱
— آخرت پر منکرین کے اعتراضات ۱۶۷
— منکرین آخرت کا استدلال ۲۱-۴۳-۱۶۷-

۵۶۹-۵۷۷-۵۹۰-۵۹۱-۶۱۲
— ان کے استدلال کا جواب ۴۱ تا ۴۴-۵۷۰
— انکارِ آخرت کے اصل محرکات ۴۱-۴۳-۴۴-۱۷۷-۴۶۷-۵۷۸-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۶۱۳
— اس کا انکار سخت گمراہی ہے ۱۷۶-۳۲۷
— اس کا انکار کفر ہے ۳۳۱-۶۲۰-۶۲۱
— اس کا انکار بدنصیبی ہے ۶۱۲
— منکرین آخرت کا انجام ۴۵-۲۱۳-۲۱۴-۳۳۱-۴۴۱-۵۹۴-۶۲۰-۶۲۱
— دنیا پرستوں کی یہ غلط فہمی کہ جو یہاں مزے کر رہا ہے وہ آخرت میں بھی مزے کرے گا ۲۰۶-۳۹۳-۴۰۱و۴۰۲-۴۶۷و۴۶۸
— انکارِ آخرت کی غیر معقولیت ۲۸
— آخرت پر ایمان لانے والے اس سے ڈرتے ہیں اور منکرین آخرت اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں ۴۹۷
— آخرت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والے گمراہ ترین لوگ ہیں ۴۹۷
— آخرکار سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے ۱۷-۲۱-۲۲۹-۲۷۳-۳۶۱-۳۷۶-۳۹۱-۴۱۱-۴۲۸-۴۹۶-۵۵۱-۵۵۲-۵۸۶
— تمام معاملات کے فیصلے کا ایک وقت مقرر ہے ۳۹۷-۴۹۷-۵۱۷-۵۷۰
— اللہ نے اختلافات کے آخری فیصلے کا وقت پہلے ہی سے مقرر کر رکھا ہے ۱۷۷-۲۶۴-۲۶۵-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۹-۵۸۶
— آخرت میں تمام اختلافات کا فیصلہ کر دیا جائے گا ۵۰-۲۰۱-۳۵۷-۳۷۷-۴۶۴
— آخرت میں فیصلہ ہونے والا اگر نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں عذاب بھیج دیتا ۴۹۴-۴۹۹
— آخرت کو ہر وقت اپنے سے قریب سمجھنا چاہیے ۴۹۷
— حساب کا دن ۳۲۷-۳۴۵-۴۰۵
— جزا و سزا کا دن ۲۸۲-۳۴۹
— بہت بڑا دن ۳۶۴
— اس روز اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کرے گا ۲۶-۲۰۲-۲۵۵-۲۶۵-۳۹۹-۴۸۱-۴۸۲-۴۹۶-۵۵۸-۵۹۱-۶۰۲
— وہاں اگلی پچھلی نسلوں کا حساب ایک ساتھ ہو گا ۴۴۹-۴۵۰
— اس روز اللہ تعالیٰ بہت جلدی حساب لے لے گا ۴۰۰
— اس روز ایک گروہ کو جنت میں اور ایک کو دوزخ میں جانا ہے ۴۸۱
— وہاں دنیا کی زندگی ایک گھڑی بھر سے زیادہ معلوم نہ ہوگی ۲۶۵-۶۲۱
— انسان کا اصل گھر آخرت ہی کا گھر ہے ۳۴۳-۴۱۰
— آخرت کی ناکامی ہی اصل ناکامی ہے ۳۶۴
— آخرت کی خوش خبری کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۵
— آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری اوصاف ۵۰۷
— آخرت کے برپا ہونے کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۲-۳۸۳ تا ۳۸۵-۳۹۹ تا ۴۰۱-۴۴۹ تا ۴۵۲
— وہ اچانک برپا ہوگی ۵۴۹
— وہاں کی زندگی نہ صرف جسمانی ہوگی بلکہ جسم بھی یہی ہوگا جس میں انسان یہاں کام کرتا رہا ہے ۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۲۶۸-۲۶۹-۴۵۰-۴۵۱
— آخرت محض روحانی عالم نہیں ہے ۴۵۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہاں سماعت اور بینائی کی قوتیں اس دنیا سے مختلف ہوں گی ۲۱۱
— وہاں کے عذاب کی سختی ۳۷۷
— رسوا کن اور کبھی نہ ٹلنے والا عذاب ۳۷۴-۳۷۵
— آخرت کے روز بڑی ضرب لگائی جائے گی ۵۶۳
— وہ وقت قریب ہی آ لگا ہے ۴۰۰-۴۰۱
— وہاں عذاب الٰہی پر کفار کوئی احتجاج نہ کر سکیں گے ۵۱۴
— کفار جس حالت میں مبتلا ہوں گے اسے نہ وہ خود بدل سکیں گے نہ اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کی مدد کر سکے گا ۵۱۳-۵۱۴
— کفار پر آخرت میں لعنت پڑی ہوگی اور وہاں ان کے لیے بدترین ٹھکانا ہے ۴۱۵
— وہاں اصل گھاٹے میں رہنے والے کون ہیں ۳۶۴-۳۶۵-۴۳۱-۵۹۲
— وہاں کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۲۸۵-۳۰۵-۵۴۸
— وہاں اہل ایمان کو کیا اجر دیا جائے ۴۶-۴۱۴
— وہاں خوف وحزن سے کون محفوظ ہوں گے ۵۴۹
— وہاں کیسے لوگوں کو امن نصیب ہوگا ۴۶۲
— دنیا و آخرت کی بھلائی کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳
— وہاں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک ہوگا ۲۳۳ تا ۲۳۷
— وہاں بچوں کی حیثیت کیا ہوگی ۲۸۶-۲۸۷
— وہ ایمان لانے اور عمل کرنے کی جگہ نہیں بلکہ اعمال کا نتیجہ دیکھنے کی جگہ ہے ۵۱-۲۱۳
— وہاں انھی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو دنیا میں کیے گئے ہوں گے ۲۸۵-۳۶۸
— اس روز انسان کے اعمال کی حقیقت کھول دی جائے گی ۱۶-۱۷-۳۶۱
— وہاں سب اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے ۳۹۹
— اس روز اللہ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی ۳۹۹
— اس روز کفار بھیس بدل کر بھی کہیں نہ چھپ سکیں گے ۵۱۴
— اس روز سارا عالم اللہ واحد القہار کی بادشاہی کا اقرار کرلے گا ۳۹۹
— اس روز زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی ۳۸۳
— اس روز پوری کائنات اللہ کی حمد پکار اٹھے گی ۳۸۵
— اس روز معلوم ہوجائے گا کہ بادشاہی اللہ ہی کی ہے ۳۹۹
— اس روز ہر متنفس کو اپنے کسب کا بدلہ مل جائے گا ۳۹۹-۵۸۷
— اس روز اچھے اور برے انسانوں سے کیا سلوک ہوگا ۳۴۴ تا ۳۴۶-۵۷۱ تا ۵۷۳
— اس روز انسان اپنے کرتوتوں کے نتائج دیکھ لے گا ۳۷۷
— وہاں بڑے بڑے ہیکڑ لوگ گھٹنوں کے بل آ رہیں گے ۲۸۳-۵۹۲
— وہاں مجرم چاہیں گے کہ انھیں دنیا میں واپس بھیج کر ایک اور موقع دیا جائے ۴۴-۲۳۷-۳۸۰-۳۸۱-۵۱۳
— ان کی اس خواہش کا جواب ۲۳۷-۳۸۱
— کفار پوچھیں گے کہ عذاب سے کیسے بچیں ۳۹۷
— وہاں انسان کو رجوع کا کوئی موقع نہ دیا جائے گا

۲۱۳-۴۵۲-۵۱۴

— وہاں ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ۵۳۹

— وہاں انسان کی توبہ اور معذرت قبول نہ ہوگی ۵۱-۴۱۴-۵۹۴

— مجرمین سزا پا کر رہیں گے، خواہ آہ و زاری کریں یا صبر کر کے بیٹھ رہیں ۴۵۲

— وہاں مجرمین کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہوگا ۲۳۷-۴۰۰-۴۴۹-۵۱۴-۵۹۴

— وہاں اللہ کے رحم کے سوا کوئی چیز انسان کو عذاب سے بچانے والی نہیں ہے ۵۷۱

— آخرت کو نہ اللہ ٹالے گا نہ کوئی اور ٹال سکتا ہے ۵۱۴

— وہاں مجرمین کے اولیا ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے ۳۸۳-۵۸۴

— مشرکوں کے الٰہوں اور ان کے اولیا کی کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱ (نیز دیکھو ''ولی'')

— وہاں مجرموں کا کوئی ایسا شفیع نہ ہوگا جس کی بات اللہ مانی جائے ۳۷۶-۴۰۰-۴۰۱

— وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا ۲۶-۴۷-۲۰۹-۲۲۷-۲۲۸-۲۸۳-۵۷۰-۵۷۱

— وہاں گمراہ اپنے پیشواؤں پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے لیے دوہرے عذاب کا مطالبہ کریں گے ۱۳۴

— وہاں گمراہ یہ چاہیں گے کہ ان کے گمراہ کرنے والے پیشواؤں کے حوالے کر دیے جائیں تو وہ ان کو پاؤں تلے روند ڈالیں [illegible]

— وہاں [illegible]

[illegible] ۵۹۵

— وہاں مجرمین [illegible]

[illegible] ۵۱۴

— وہاں [illegible]

جائیں گے ۲۶۶-۲۶۷

— وہاں مجرمین اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر نہ کر سکیں گے ۵۱۴

— وہاں سب نافرمان اور ان کے معبود گھیر لائے جائیں گے اور جہنم واصل کیے جائیں گے ۲۸۳-۲۸۵-۴۴۹

— وہاں پیشوا اور پیرو عذاب میں مشترک ہوں گے ۲۸۵

— وہاں پیرو اپنے پیشواؤں کو کوسیں گے ۳۴۵-۳۴۶

— وہاں گمراہ پیشوا اور پیرو ایک دوسرے کو مجرم ٹھیرائیں گے ۲۰۴ تا ۲۰۶-۲۸۳-۲۸۴-۴۱۳-۴۱۴

— شیطان اور اس کے پیرووں کا آپس میں جھگڑا ۵۳۸-۵۳۹

— شیطان اور اس کے پیرو عذاب میں مشترک ہوں گے ۵۳۹

— مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۲۲۷-۲۶۶-۲۶۷

— وہاں مشرکین کے معبود اپنے پرستاروں سے براءت کا اظہار کریں گے ۲۰۸-۲۰۹-۲۲۶-۲۲۷-۶۰۳

— وہاں کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا ۲۲۷-۲۲۸-۳۶۱

— وہاں مجرمین پر ان کے اعمال کی برائی کھل جائے گی اور وہ اس کا اعتراف کریں گے ۳۴۵-۵۹۳

— وہاں [illegible] ۲۳۲-۲۳۳-۳۳

— وہاں [illegible]

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہاں ہر شخص سے اس کے اپنے عمل کی بازپرس ہوگی ۲۰۰-۲۰۱

— وہاں کس چیز کی بازپرس ہوتی ہے ۲۰۸-۲۰۹

— وہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا اور کسی پر کسی دوسرے کا بوجھ نہیں لادا جائے گا ۲۶-۲۲۷-۴۹۵-۴۹۶

— وہاں مجرموں کو ان کے عمل کے مطابق سزا دی جائے گی ۲۸۵

— وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا ۲۶۶-۳۸۳-۵۹۲-۶۱۳

— وہاں ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے متعین ہوگا ۶۱۴

— وہاں باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے ۵۹۲

— وہاں اہلِ ایمان کا استقبال کس طرح ہوگا ۱۰۴-۱۰۵

— وہاں جزا و سزا کس قاعدے پر مبنی ہوگی ۲۰۶-۲۰۷-۲۸۵

— وہاں مومن اور فاسق کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۴۶-۴۷

— وہاں اللہ کی عدالت میں فیصلہ کس طرح ہوگا ۳۸۳-۴۰۱-۵۷۰-۵۷۱

— وہاں کسی پر ظلم نہ ہوگا ۲۶۶-۲۸۳-۴۰۰-۶۱۳

— وہاں کس طرح خدا کی عدالت میں ملزموں کی پیشی ہوگی ۴۴

— مشرکین اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے مگر وہ ان پر آ کر رہے گا ۵۰۰

— جب ظالم جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے زمین میں گڑے جا رہے ہوں گے ۵۱۳

— کفار خوف زدہ آنکھوں سے جہنم کی طرف دیکھیں گے ۵۱۳

— کفار کا انجام دیکھ کر مومن بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا ہے ۵۱۳

— وہاں لوگوں کے اعمال پر کس کس طرح شہادت قائم کی جائے گی ۱۷-۱۰۶-۱۰۷-۳۸۳-۳۸۴-۴۱۴-۵۹۲

— انبیا گواہی کے لیے حاضر کیے جائیں گے ۳۸۳

— نامۂ اعمال کی پیشی (دیکھو نامۂ اعمال)

— وہاں مجرموں کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے ۲۶۸-۲۶۹-۴۴۹-۴۵۰

— وہاں ہر وہ چیز بول اٹھے گی جس کے سامنے یا جس پر انسان نے کوئی کام کیا ہوگا ۴۵۰-۴۵۱

— ان انسانوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی طلب کی جائے گی جو نامۂ اعمال کے صحیح ہونے کا انکار کریں گے ۲۶۸-۴۵۰

— وہاں آدمی اپنے کسی جرم کا انکار نہ کر سکے گا ۵۱۴

— وہاں حق کی طرف بلانے والوں اور منکرین حق کا مقدمہ پیش ہوگا ۳۷۲

— وہاں تمام معاملات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا ۲۰۱-۲۰۲-۲۸۳

— وہاں کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور حق کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا ۳۸۵

— وہاں برائی کا بدلہ اتنا ہی ملے گا جتنی برائی کسی نے کی ہوگی ۴۱۰-۴۱۱

— نیکی کا اجر بے حساب ملے گا بشرطیکہ آدمی مومن ہو ۴۱۱

— وہاں مجرمین کی حالت کا نقشہ ۲۸۳-۲۸۴-۴۴۰

— وہاں سزا پانے والے کون ہوں گے اور اس سے بچنے والے کون ۲۹۰-۳۷۲-۳۷۳

۴۱۱-۴۲۸-۴۹۶ ۵۲۸-۵۵۱-۵۸۶

— وہ جب چاہے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے ۵۰۳

— وہ ہمیشہ مبنی برحقیقت بات کہتا ہے ۱۹-۳۰۹

— وہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ۱۲۱

— وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت اور عدل کے مطابق کرتا ہے ۱۱

— اس کا انصاف بے لاگ ہے ۸۷-۸۸-۳۰-۳۰۷-۳۰۸-۳۲۵-۳۳۰-۳۳۳-۳۳۵-۳۳۶-۳۶۴-۳۷۸-۴۶۵

— وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ۴۰۹

— وہ مجرموں اور ظالموں سے انتقام لے کر رہتا ہے ۴۹

— وہ ظالموں سے انتقام لینے والا ہے ۳۷۳

— اس کا غضب کیسے لوگوں پر بھڑکتا ہے ۴۰۹-۴۹۷

— اس کے غضب کے مستحق کیسے لوگ ہیں اور کیوں ہیں ۳۹۶-۳۹۸

— اس کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ۴۰۰

— بندوں کو ان کے اعمال کی سزا دینا اسی کا کام ہے ۴۸۰-۴۸۱

— تمام معاملات کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہے ۲۱-۲۰۱-۲۲۰

— تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۲۱-۵۱۷-۵۱۸

— اس سے [illegible] ۳۶۵

— اس [illegible] ہے ۱۳

— غیب [illegible] ۲۳۱-۴۶۶

— اللہ کے علم غیب کی چند مثالیں اور تشریح ۲۸-۲۹-۴۶۶

— وہ کائنات کی ہر مخفی اور کھلی چیز کو جانتا ہے ۱۷-۳۹-۲۳۸-۳۷۷

— وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۲۱-۱۱۷-۲۳۸-۳۶۱-۴۰۱-۵۰۳

— کوئی اس سے کچھ نہیں چھپا سکتا ۱۷

— وہ لوگوں کی تمام حرکات دیکھ رہا ہے اور ان کی کوئی حرکت اس سے مخفی نہیں ۴۶۲-۴۷۱-۵۰۳-۵۰۴

— آدمی خواہ کوئی بات ظاہر کرے یا چھپائے اللہ کو اس کا علم ہے ۱۲۲-۴۷۱

— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۳۹-۱۰۳-۱۷۳-۲۲۴-۳۹۴-۳۹۵-۴۶۶-۴۸۶

— اللہ کی صفات کا جامع بیان ۳۹۱

— اس کی قدرت اور اس کا علم تمام جزئیات پر حاوی ہے ۲۲۵

— اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے ۲۴-۵۰۴

— بندوں کے ہر کام سے باخبر ہے ۴۸-۶۹

— وہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ۴۰۰

— وہ اپنے بندوں کی روش پر نگاہ رکھتا ہے ۵۰۴

— تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۲۴-۷۵-۲۲۳

— وہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے ۱۲۲

— قیامت کا علم اسی کو ہے ۵۵۱

— اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ۶۱۶

— اس کی صحیح معرفت حاصل ہونے کے ذرائع ۲۰-۲۱

— وہ اسی کو راہ راست دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے اور وہ جسے چاہے اپنا کر لیتا ہے ۴۹۳

— وہ جسے چاہے گمراہی میں ڈالے اور جسے چاہے راہ راست دکھائے ۲۲۱-۲۲۲

(تفصیل کے لیے دیکھو "ضلالت" اور "تقدیر")

— اس کی مشیت اور اس کی رضا میں فرق ۳۶۱

— اللہ کے کسی شخص کے سینے کو اسلام کے لیے کھولنے

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کی سزا پر اجماع ہے ۱۴۵
(نیز دیکھو ''قانونِ اسلام، فوجداری قوانین'')

آزمائش

— اللہ کی طرف سے انسان کی آزمائش کس کس طرح ہوتی ہے ۷۸-۸۲-۸۳- ۱۹۴- ۳۷۷-۳۷۸
— اہلِ ایمان کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۲۹۶-۲۹۷
— دنیا میں افراد اور قوموں کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۵۶۵- ۵۶۸- ۵۶۹

ازواجِ مطہراتؓ

— ان کے نام اور ان کی تعداد ۱۱۳-۱۱۴
— ان کا صدقِ ایمانی ۸۵
— ان کی زندگی مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ بنائی گئی تھی ۸۷تا۸۹
— یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیمات لوگوں تک پہنچائیں جو آپؐ کی گھر کی زندگی میں ان کو حاصل ہوتی تھیں ۹۴
— ان کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل ۱۱۷
— وہ تمام مسلمانوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں ۷۱-۷۲
— وہ مسلمانوں پر حرام کر دی گئیں ۶۷-۱۲۱-۱۲۲
— ان کو اللہ کے رسولؐ کی رفاقت اور زینتِ دنیا میں سے کسی ایک کو اپنے لیے پسند کر لینے کا اختیار دیا گیا جسے ''تخییر'' کہتے ہیں ۶۵-۸۴
— تخییر کے بعد جن ازواج مطہراتؓ نے حضورؐ کی رفاقت قبول کی ان کو طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو نہ رہا تھا ۸۵-۱۱۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

استکبار- دیکھو ''تکبر'' اور ''اخلاق''

اسحاق علیہ السلام

— آپؑ کی پیدائش کی بشارت ۲۹۷
— آپؑ کے امتیازی اوصاف ۲۹۹-۳۴۳
— یہ بحث کہ حضرت ابراہیمؑ نے قربانی حضرت اسماعیلؑ کی پیش کی تھی یا حضرت اسحاق کی ۲۹۷ تا ۳۰۱
— بنی اسرائیل حضرت اسحاق کی اولاد ہیں ۳۰۱

اسلام

— اس کی حقیقت اور اس کی روح ۲۱- ۷۹- ۲۷۷-۲۹۶-۳۵۴-۳۵۵-۳۶۴-۳۷۹- ۳۸۰-۴۲۴
— وہ دنیا میں غالب ہو کر رہنے کے لیے آیا ہے ۳۱۶-۳۱۷-۴۷۶
— اس کی عالم گیریت ۲۰۲-۲۰۳
— نظامِ اسلامی کی قوت جاذبہ ۲۱
— اس کی بنیادی قدریں ۹۷
— مسلم کسے کہتے ہیں ۹۴- ۹۵- ۵۴۹
— ''مسلم'' کی اقسام ۲۳۴
— اطاعت خدا اور اطاعتِ رسولؐ کا حکم ۹۲
— جس نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ۱۳۵
— دعوت اسلام کا اصل مقصود ۲۴۵- ۲۴۶- ۳۴۴- ۳۴۶- ۳۵۴- ۳۵۵- ۳۵۶- ۳۶۴- ۳۷۰- ۳۷۱- ۴۴۱- ۴۷۵- ۴۷۶- ۴۸۰ تا ۴۸۲- ۴۸۶ تا ۴۹۲
— اسلام کا مقصد محض انفرادی ایمان وطاعت نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی میں دینِ حق کا نفاذ ہے

۳۷۱-۳۷۲

— اسلام نے ان برائیوں کی طرف توجہ کی جن کی اصلاح میں دوسرے تمام نظام یا تو ناکام ہو چکے تھے یا انھیں ان کی فکر ہی نہ تھی ۴۷۰

— وہ حیرت انگیز انقلاب جو اسلام نے انسانی زندگی میں برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰

— تبلیغ اسلام کی اہمیت ۴۵۶-۴۵۷

— وہ صفات جو اسلام کے مبلغین میں ہونی چاہئیں ۴۵۶ تا ۴۶۰ (نیز دیکھو ''حکمت تبلیغ'')

— اسلام کا تصور رواداری ۴۹۵-۴۹۶

— دین اسلام کو فرقہ بندی سے بچانے کی تدابیر ۴۹۳-۴۹۴-۵۸۶-۵۸۷

— اگر ہم فرقہ بندی کرنے والوں کو خوش کرنے کے لیے اسلام میں کوئی رد و بدل کریں تو اللہ تعالیٰ کے مواخذے سے ہمیں کوئی نہ بچا سکے گا ۵۸۷ (نیز دیکھو ''فرقہ بندی'')

— قانونی مسلمان اور حقیقی مسلمان کا فرق ۵۵۳

— سچے مسلمان کی صفات ۳۶۷-۳۶۸ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

— اسلام میں کسی کو شرح صدر حاصل ہونے کا مطلب ۳۶۷-۳۶۸

— اسلام ایک نور ہے جس سے آدمی کو زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ نظر آتا ہے ۳۶۷-۳۶۸

— تمام انبیا کی لائی کتابوں پر ایمان لانا اسلام میں ضروری ہے ۴۹۵

— اسلام کے نزدیک وہ لوگ گمراہ ہیں جو اپنی عقل کے فیصلوں ہی کو صحیح جانتے ہیں اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے خیال میں صحیح ہو اور دین کی پیروی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۵۸۹

— اسلام کے نزدیک وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کر کے باپ دادا کے طریقے پر چلتے رہتے ہیں ۵۳۳-۵۳۴-۵۳۹

— اسلام کے نزدیک وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو دین کو مانتے تو ہیں لیکن پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں ۵۸۶

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان''، ''دین''، ''قرآن''، ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''نبوت'')

اسلامی اخلاق

دیکھو ''اخلاق''، ''قرآن، اس کا فلسفہ اخلاق'' اور ''اس کی اخلاقی تعلیمات''

اسلامی ریاست

— اس میں حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے ۳۲۶-۳۲۷

— اس ریاست کا مقصد وجود ۴۸۶

— اس کے اصول ۹۷-۹۸-۴۹۵-۵۰۸ تا ۵۱۰

— مسلمان فرماں روا کے اوصاف ۲۲۶-۳۲۷-۳۳۵-۳۳۶-۵۰۸

— اسلامی ریاست میں شوریٰ کی اہمیت، اس کا حکم اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰

— اسلامی ریاست میں اسلام کے دشمنوں کو پنپنے کا موقع ہرگز نہیں دیا جا سکتا ۱۳۱-۱۳۳

— مطلق العنان فرماں رواؤں کے کردار کی قرآنی تصویر ۵۴۵-۵۴۶

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''خلافت'' اور ''قانون اسلام''، ''دستوری قانون'')

اسلامی قانون: (دیکھو ''قانون اسلام'')

اسلامی نظام معاشرت

— اس میں انسانی مساوات ۶۴-۶۵-۹۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس میں رشتہ داروں کے حقوق دوسروں پر مقدم ہیں ۱۷

— اس میں عورت کا صحیح مقام ۱۹-۵۰-۹۱-۹۲

— مسلم معاشرے میں اسلام کے دشمنوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا ۱۳۱-۱۳۳

— منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپ کی نسبت سے پکارو، یہی منصفانہ بات ہے ۷۰

— اگر کسی کے باپ کا نام معلوم نہ ہو تو وہ دینی بھائی اور رفیق ہے ۷۰

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام''، ''معاشرتی قوانین'')

اسماعیل علیہ السلام - ۳۴۳

— ان کی پیدائش ۲۹۴-۲۹۵

— ان کی قربانی کا واقعہ ۲۹۴ تا ۳۰۱

— ان کے امتیازی اوصاف ۲۹۴-۲۹۵-۲۹۹

— وہ ذبیح تھے یا حضرت اسحاق ۲۹۷ تا ۳۰۱

— وہ نیک بندوں میں سے تھے ۳۴۳

— ان کی تعریف وتوصیف ہمیشہ رہے گی ۲۹۶-۲۹۷

— بنی اسرائیل کا بنی اسماعیل سے حسد ۳۰۱

آسمان

— معنی وتشریح ۲۷۹-۲۸۰-۴۲۳

— آسمان دنیا کا مطلب ۲۷۹

— سما اور فلک کا فرق ۲۶۱

— آسمان کا غیر مرئی سہاروں پر قائم ہونا ۱۱-۱۲

— ساتوں آسمانوں میں سے ہر ایک میں اس کا قانون وحی کیا گیا ہے ۴۴۶

— آسمان وزمین بنانے میں کتنے دن لگے ۴۴۴-۴۴۶

— یہ بحث کہ آسمان پہلے بنایا گیا یا زمین؟ ۴۴۵

— آسمان وزمین کا ذکر قرآن میں توحید کے دلائل کے طور پر ہے۔ قرآن کوئی طبیعت یا علم ہیئت کی کتاب نہیں ہے ۲۶۱-۴۴۵

— آسمان بمعنی ''کائنات'' ۴۴۴-۴۴۵

— آسمان تاروں سے متحرک شے نہیں ہے بلکہ تارے آسمانوں میں تیر رہے ہیں ۲۶۱

— تاروں کو آسمان کی زینت بنایا گیا ہے ۲۷۹

— آسمانوں سے ایک خاص مقدار میں زمین پر پانی اتارا گیا ۵۲۶

— اللہ تعالیٰ کے آسمان سے رزق اتارنے کا مفہوم ۳۹۷-۳۹۸

— شیاطین سے آسمان کے محفوظ کیے جانے کا مطلب ۲۷۹-۲۸۰

— آسمانوں کی تخلیق وتدبیر میں اللہ کی قدرت کے کرشمے اور توحید وآخرت کے دلائل ۱۱-۱۹-۲۲-۲۷-۱۷۳-۱۷۶ تا ۱۷۸-۲۰۰-۲۱۹-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۹ تا ۲۶۲-۲۷۳-۲۷۹-۲۸۰-۳۳۱-۳۵۹-۳۸۱-۴۱۷-۴۲۳-۴۴۴-۴۴۶-۴۸۵-۵۰۴-۵۱۵-۵۲۶-۵۵۱-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۹-۵۸۳-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰-۶۲۰

اسوۂ حسنہ

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے ۸۰-۸۱

(تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

اصحاب الایکہ - ۳۲۲

اصحابِ یاسین

— ان کا قصہ ۲۴۸ تا ۲۵۵

اصولِ تفسیر - (دیکھو ''قرآن، اس کی تفسیر کے صحیح

اصول" اور "اس کی تفسیر کے غلط طریقے")

اصولِ فقہ

— فقہائے اسلام نے قرآن سے کس طرح قانونی احکام مستنبط کیے ہیں ۱۶- ۸۵ تا ۸۷- ۸۸- ۹۸- ۹۹- ۱۰۹ تا ۱۱۳- ۴۸۳- ۴۸۴- ۶۱۰

— شریعت کا قانون کس طرح غیرضروری بندشوں کو ختم کرتا ہے ۶۹- ۷۰- ۱۰۱- ۱۰۲

— شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں ۸۷- ۸۹- ۱۰۱- ۱۰۲- ۱۱۴ تا ۱۱۶- ۱۱۹- ۱۲۰- ۱۸۷ تا ۱۸۹- ۶۰۹ تا ۶۱۱ (نیز دیکھو "شریعت")

اقامتِ دین

— دینِ حق کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے والوں کے لیے فرشتے بھیجے جاتے ہیں ۱۰۴- ۴۵۵

— دین کے صحیح معنی ۴۸۹- ۴۹۰

— اسی دین کو قائم کرنے کا حکم ۴۸۶- ۴۹۳

— اقامتِ دین کی راہ میں پیش آنے والی تکالیف اللہ کے ہاں انسان کا درجہ بلند کرتی ہیں ۵۰۶

— اسلامی انقلاب میں کامیابی کا ملنا یا نہ ملنا اہم نہیں بلکہ اصل اہمیت اس کی ہے کہ آدمی حق کے لیے جان لڑا دے ۵۳۹- ۵۴۰

— مومن اگر کسی علاقے میں احکامِ الٰہی کی پابندی نہ کر سکے تو اللہ کی زمین وسیع ہے، وہ ہجرت کر جائے، اور اس راہ میں تکالیف اٹھانے والے کے لیے بڑا اجر ہے ۳۶۳

— مومن کا کام مایوس ہونا نہیں خواہ باطل کیسا ہی بالادست ہو ۴۵۴- ۴۵۵

— مومن نرم چارا نہیں بلکہ لوہے کے چنے ہیں ۵۱۱

— اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے کام کرنے کی حکمت ۴۵۶ تا ۴۶۰

— اللہ کا وعدہ یہ نہیں ہے کہ ایمان لاتے ہی تم دنیا کے فرماں روا ہو جاؤ گے بلکہ یہ ہے کہ سخت آزمائشوں اور امتحانوں کے بعد منزلِ مراد ملے گی ۸۱-۸۲

— ایک اصولی اور نظریاتی تحریک کو قوم پرست جتھوں پر اخلاقی فوقیت حاصل ہوتی ہے ۵۸

— مسلمانوں کو کب تک دنیا کی امامت حاصل نہیں ہو سکتی ۴۹- ۵۰

— دعوتِ حق کی لوگوں کو چلتی ہوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن اللہ اس تحریک کو ایسا فروغ دے گا کہ عقل دنگ رہ جائے گی ۵۰- ۵۱

— دعوتِ حق کی راہ میں کام کرنے والوں کو ایک ہی ذریعہ تقویت بخشتا ہے ۱۰۳- ۱۰۴
(نیز دیکھو "دعوتِ حق"، "دین"، "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" اور "نبوت")

اقامتِ صلوٰۃ - دیکھو "نماز"

اقسام القرآن

— قرآن میں قسمیں کس غرض کے لیے اور کس معنی میں کھائی گئی ہیں ۲۴۵- ۲۷۸- ۳۱۹- ۵۲۳- ۵۵۳- ۵۵۴- ۵۵۹

آل

— معنی اور تشریح ۱۲۶

— آلِ فرعون ۴۰۵- ۴۱۲- ۴۱۳

اللہ

— احسن الخالقین ۳۰۴

— بصیر ۲۳- ۲۳۳- ۴۰۱- ۴۱۶- ۴۸۵

— حکیم ۱۱- ۲۳- ۶۸- ۱۷۳- ۲۰۲- ۲۱۹- ۳۵۵- ۳۹۵- ۴۶۳- ۴۷۸- ۵۱۶- ۵۵۱-

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۷۹-۵۹۴-۶۰۰
حلیم ۱۱۸-۲۴۰
حمید ۱۴-۲۲-۱۷۵-۲۲۷-۴۶۳-۵۰۴
لطیف ۱۷-۹۴-۴۹۷
خبیر ۱۷-۲۸-۶۸-۹۴-۱۷۳-۲۲۶-۲۳۳
وکیل ۶۸-۱۰۸-۳۸۱
حفیظ ۱۹۴
خیر الرازقین-۲۰۸
رب العالمین ۳۴-۲۹۲-۳۱۴-۳۸۵-۴۲۴-۴۴۲-۵۴۱-۵۹۴
رحمٰن ۲۴۷-۲۵۱-۲۵۴-۲۶۵-۴۳۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۸-۵۵۱
رحیم ۳۹-۷۱-۸۳-۱۱۶-۱۳۱-۱۳۶-۱۷۳-۲۴۵-۲۶۶-۳۷۹-۴۳۹-۴۵۶-۴۷۹-۵۷۱-۶۰۵
رفیع الدرجات ۳۹۸
سمیع ۲۳-۲۱۲-۴۰۱-۴۱۶-۴۶۰-۴۸۵-۵۶۰
شکور ۲۳۳-۲۳۶-۵۰۲
عالم الغیب والشہادہ ۳۹-۱۷۴-۳۷۷
عزیز ۱۱-۲۳-۳۹-۸۴-۱۵۷-۱۷۵-۲۰۲-۲۱۹-۲۳۲-۲۴۵-۲۵۹-۳۲۱-۳۴۶-۳۵۵-۳۵۹-۳۷۳-۳۹۱-۳۹۵-۴۱۱-۴۴۶-۴۷۸-۴۹۸-۵۲۵-۵۷۱-۵۷۹-۵۹۴-۶۰۰
علام الغیوب-۲۱۲
علیم ۲۸-۶۸-۱۱۷-۲۰۱-۲۴۱-۲۵۹-۲۷۳-۳۹۱-۴۴۶-۴۶۰-۴۸۶-۵۱۵-۵۲۵-۵۵۱-۵۶۰
علی ۲۴-۲۰۰-۳۹۷-۴۷۸-۵۱۶
عظیم ۴۷۸
غفار ۳۴۶-۳۵۹-۴۱۱
غفور ۷۱-۸۳-۱۱۶-۱۳۱-۱۳۶-۱۷۳-۱۹۲-۲۳۱-۲۳۳-۲۳۶-۲۴۰-۳۷۹-۴۵۶-۴۷۹-۵۰۲-۶۰۵
غنی ۱۴-۲۲-۲۲۷-۳۶۰
قدیر ۸۴-۲۱۸-۲۶۱-[illegible]-۶۲۰
قوی ۸۳-۴۰۲-۴۹۷
قہار ۳۴۶-۳۵۷-۳۹۹
کبیر ۲۳-۲۰۰-۳۹۷
وہاب ۳۲۱-۳۳۵
مقتدر ۵۳۹
رقیب ۱۱۹
حسیب ۱۰۳
خلاق ۲۷۳
ولی ۴۸۲-۵۰۴
واحد (یکتا) ۳۴۶-۳۵۷-۳۹۹-۴۴۱
وحدہٗ لاشریک ۴۳۱
رب ۲۶۵-۳۱۴-۳۶۱-۳۰۲-۴۲۲-۴۱۳
اللہ کے اسمائے گرامی قرآن میں یوں ہی بیان نہیں کر دیے گئے بلکہ سیاق و سباق سے ان کا گہرا تعلق ہے ۱۱-۱۴-۲۳-۲۲-۳۹-۶۸-۶۹-۷۱-۹۴-۱۰۳-۱۱۷-۱۱۸-۱۲۲-۱۲۳-۱۳۱-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۱۹-۲۲۷-۲۲۸-۲۳۲-۲۳۳-۲۴۰-۳۵۵-۳۵۷-۳۵۸-

۳۵۹-۳۹۱-۳۹۲-۴۶۰-۴۷۱-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۲-۵۰۲-۵۱۲-۵۶۰-۵۷۹-۶۰۵
— مومنوں اور کافروں سب کا رب ۴۹۵
— سب سے بالا و برتر ہے ۵۵۱
— بڑی برکت والا ۳۷-۴۲۴
— توبہ قبول کرنے والا ۳۹۱-۳۹۲-۵۰۳
— گناہ معاف کرنے والا ۳۹۱-۳۹۲
— بہت درگزر کرنے والا ۲۳۳-۴۶۳-۵۰۳
— سخت سزا دینے والا ۳۹۱-۳۹۲-۴۰۲-۴۶۳
— بھلائی کی قدر کرنے والا ۲۳۳
— بڑا فضل فرمانے والا ۳۹۱-۴۲۲
— کھلی اور چھپی ہر بات کو جاننے والا ۲۷۱
— عزت کا مالک ۳۴۳
— ان سب باتوں سے پاک جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ۳۱۴
— حق بات ہی کہنے والا ۳۴۹
— اللہ ہی حق ہے ۲۴
— انتقام لینے والا ۳۷۳
— اصل اور حقیقی زندگی اسی کی ہے ۴۲۴-۴۲۵
— وہ ہر عیب اور نقص اور کمزوری سے پاک ہے ۳۱۴
— کائنات میں بڑائی اسی کے لیے ہے ۵۹۴
— اسی کے لیے حمد ہے ۱۷۳-۲۱۸-۳۱۴-۳۸۵-۴۲۴-۵۹۴
— وہ خود محمود ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے ۱۴-۲۲
— اسی نے آسمانوں اور زمین کو تھام رکھا ہے ۲۳۹
— وہی دن کو رات میں اور رات کو دن میں تبدیل کرتا ہے ۲۳-۲۲۶-۳۵۹
— ساری کائنات کا خالق ۳۷۷-۴۲۲-۴۲۳-۴۴۲ تا ۴۴۶-۴۶۰-۵۸۷-۶۰۰-۶۲۰
— کائنات کا مالک اور پروردگار ۴۲۴-۵۶۰-۵۹۴
— عرش کا مالک ہے ۳۹۸-۵۵۱
— اس کا عرش پر جلوہ فرما ہونا ۳۸
— تمام چیزوں کا خالق ۱۱-۱۲-۳۷-۲۷۰-۳۵۹-۳۷۷-۳۸۱-۴۲۲
— اس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی ۳۹
— انسان کا خالق ۴۱۹-۴۲۳-۴۲۴
— اس کی شانِ خلاقی ۲۳۱-۲۳۲-۲۷۳-۴۴۶
— اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے ۲۲-۳۳۱-۳۵۷-۵۷۰-۵۸۷-۵۸۸
— کائنات کو اس نے برحق اور ایک مدتِ خاص کے لیے پیدا کیا ہے ۶۰۰
— وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ لوگ اس کو خدا مانیں ۳۶۰-۳۶۱
— سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ۲۲۷
— کائنات میں کوئی قوت اسے عاجز کرنے والی نہیں ۲۴۱-۳۷۸-۳۷۹
— کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ۴۸۵
— کائنات کی ہر چیز کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں ۳۸۱-۴۸۵
— ہر چیز کے خزانوں کا مالک ۳۸۱-۴۸۵
— آسمانوں اور زمین اور ان کی ہر چیز اور سارے مشرقوں کا مالک ۲۷۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— پوری کائنات اس کے دست قدرت میں ہے ۳۸۲
— وہی ساری کائنات کا مالک و منتظم اور فرماں روا ہے ۲۲-۱۷۳-۲۱۸-۲۷۸-۲۷۹-۳۴۶-۳۵۹-۳۷۶-۴۷۸-۵۱۷-۵۵۱-۵۶۰-۵۶۱-۵۹۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''کائنات'')
— وہی پوری نوع انسانی کا مالک اور رب ہے ۳۰۴-۳۰۵-۴۲۴-۴۹۴-۵۶۱
— بندوں کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے عاجز کرسکیں ۵۰۵
— ہر چیز پر قادر ۸۴-۲۱۸-۲۷۳-۴۶۱-۴۸۲-۵۱۵-۶۲۰
— ہر چیز پر نگران ۱۱۹-۱۹۴-۲۱۲-۳۸۱
— سارے معاملات کا آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۱
— تمام چیزوں کے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں ۲۴-۲۵-۲۱۸-۲۱۹-۲۷۳
— زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے ۳۷۵-۴۲۵-۴۲۶-۴۸۲-۵۶۱-۵۹۱
— وہ سب پر غالب ہے ۲۱۹-۳۹۱
— کائنات کی کوئی طاقت اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی ۱۱-۳۹-۲۱۹-۳۵۵-۳۵۶-۳۶۵-۵۵۹-۵۶۰
— وہی آسمان کا خدا بھی ہے اور زمین کا خدا بھی ۵۱۵
— اس نے [illegible] ایک قوم کو [illegible] دوسری قوم [illegible] نہیں ۲۲-۲۲۸
— اس کے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکتا ۳۶۵-۶۰۲
— اس کی ڈالی ہوئی مصیبت کوئی دفع نہیں کرسکتا ۳۷۴
— اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہیں سکتا ۷۸-۲۰۲-۲۰۸
— وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور وہ مہربانی کرنا چاہے تو اس کی رحمت کو بھی کوئی نہیں روک سکتا ۸۷-۲۱۸-۲۱۹-۳۷۴
— وہی فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کسے نہ نوازے ۵۳۶
— وہ حق کو حق کر دکھاتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے ۴۸۴-۵۰۲
— وہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جن کو اس کے سوا پکارا جاتا ہے ۲۴
— عزت اور ذلت ساری کی ساری اسی کے اختیار میں ہے ۲۲۳-۳۱۴
— اس کے ہاں عزت حاصل کرنے کا ذریعہ ۲۳-۲۲۴
— اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا ۵۰۵-۵۱۳
— وہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے ۲۱۸-۲۱۹-۴۹۷
— اس پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے نبی اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو مانا جائے ۴۸۷
— یہ فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے کہ کس کو نبی بنائے اور کسے نہ بنائے ۳۲۱
— اس نے تمام انبیائے کرام سے پختہ عہد لیا ۷۳-۷۴
— اس کی قدرت اور حکمت کے کرشمے ۲۳-۲۱۵-۲۲۶-۲۳۱-۲۳۲-۲۷۳
— وہی جسے چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے روزی دیتا ہے ۵۵
— وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۵۱۵
— وہی انسان کا رازق ہے ۴۲۳-۴۲۴
— وہ لوگوں کو ایک حساب سے رزق دیتا ہے ۵۰۴

— وہ اپنے تمام بندوں پر مہربان ہے لیکن اس کی دین میں فرق و تفاوت ہے ۴۹۷

— دنیا میں زندگی بسر کرنے کے تمام ذرائع کی تقسیم وہی کرتا ہے ۵۳۷

— رزق کی تنگی و کشادگی اسی کے اختیار میں ہے ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۳۷۹-۴۸۵-۴۸۶

— متشابہات کی حقیقی تفسیر ۴۴۲-۴۴۴

— وہی کائنات کی تدبیر کر رہا ہے ۳۸

— وہ کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک ہے ۳۹۸-۵۵۱

— کائنات میں بادشاہی اسی کی ہے ۲۲۶-۳۵۹-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۹-۴۰۰-۵۱۵-۵۵۱-۵۹۲

— اس کے واحد و قہار ہونے پر آخرت میں بیک زبان تمام عالم گواہی دے گا ۳۹۹

— وہ آخرت ہی کا مالک یوم الدین نہیں ہے، دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے ۴۸۳-۴۸۴

— لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے ۳۷۷

— اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے ۳۸-۳۹

— وہ بتدریج کام کرتا ہے ۳۹-۴۲۵

— اس کا ہر کام بس اس کے صرف ایک حکم سے پورا ہوتا ہے ۳۷۲-۴۲۶-۴۲۶

— اسی نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو مسخر کیا ہے ۹

— اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ۲۳-۲۴-۲۲۶

— اس کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی ۱۰۲-۱۳۳-۲۴۱

— اس کے لیے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا کچھ مشکل نہیں ہے ۲۳-۲۴-۴۳-۲۴۸-۴۵۰-۴۵۱-۴۶۱

— اس کا اقرار انسان کے نفس میں موجود ہے ۲۲-۳۷۷-۳۷۸

— وہ ہر دعا مانگنے والے سے قریب ہے ۲۱۲

— دعائیں سننے اور ان کا جواب دینے کا اختیار اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ۴۱۸-۴۲۰

— وہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۱۱-۳۶۶

— اس کا وعدہ برحق ہے ۴۱۵-۴۲۸

— اس کا انسان پر یہ حق ہے کہ انسان اسی کی بندگی کرے ۳۵۵

— لوگوں کے کفر سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۱۴

— اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنی چاہیے ۶۱۵

— اس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ۲۱۹-۲۸۵-۳۴۶-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۲-۴۲۴-۵۶۱

— اس کو چھوڑ کر ہی انسان کسی غیر اللہ کو اپنا ولی بنا سکتا ہے ۳۷۴-۴۷۹-۴۸۰

— اس کے سوا کوئی اور الٰہ ہو نہیں سکتا اور وہی ایک حقیقی معبود ہے ۲۷۸-۲۷۹

— اسی کی بندگی کرنا سیدھا راستہ ہے ۵۴۸

— اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا جہالت ہے ۲۸۱

— وہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو ۳۸۲

— وہ اس سے پاک اور بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو ۳۱۲-۳۵۷-۳۵۸-۵۵۱

— اس کی طرف اولاد منسوب کرنے کے عقیدے کی تردید ۳۵۷-۳۵۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کے سوا انسان کا اور تمام مخلوقات کا کوئی ولی نہیں ہے ۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۴۷۵-۴۸۲
(لفظ ''ولی'' کی تشریح کے لیے دیکھو ''ولی'')
— وہی اپنے بندوں کا نگہبان ہے ۴۱۲
— اس کی یاد سے غافل ہونے کے اخلاقی نتائج ۵۳۸
— خوف اسی سے ہونا چاہیے ۶۸
— اسی کے محاسبے سے ڈرنا چاہیے ۱۰۳
— اسی پر توکل کرنا چاہیے ۶۸-۱۰۸-۳۷۴
— ہر خوف و خطر کے مقابلے میں وہی کافی ہے ۱۰۳
— اپنے آپ کو اس کے حوالے کر کے انسان ہر خطرے سے مامون ہو جاتا ہے ۲۱
— اس کو ہر شکر اور تعریف کا استحقاق پہنچتا ہے ۲۲۷-۲۲۸
— وہ تو انسانوں پر فضل فرمانے والا ہے لیکن اکثر لوگ پھر بھی شکر ادا نہیں کرتے ۴۲۲
— وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ۱۴-۳۶۱
— وہی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے ۶۹-۷۰
— وہی بہتر جانتا ہے کہ مصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے ۶۸-۲۳۳-۲۳۴
— اس کے فیصلے سراسر حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جن میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے ۵۵۹-۵۶۰
— راہ راست پر چلنے والے بندوں کی حمایت کے لیے وہی کافی ہے ۳۷۳-۳۷۴
— وہ اپنی مخلوق پر رحیم و شفیق ہے ۳۹-۴۹۷-۴۹۸
— وہ کس کس طرح اہل ایمان کی مدد کرتا ہے ۵۷
— اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے ۳۷۹
— وہ بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۴۶۵-۴۶۶
— وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۴۰۸-۵۸۷
— وہ مومنوں کے حق میں بہت رحیم ہے ۹۷
— اس کا قانونِ مغفرت ۳۸۰-۳۹۷
— اس کی شان حلیمی و غفاری ۲۴۱
— یہ اس کی شان حلیمی و رحیمی ہے کہ باغی انسانوں کو رزق دیے جاتا ہے اور مہلت پر مہلت دیتا ہے ۴۷۹-۴۸۰
— وہ لوگوں سے درگزر کرتا ہے ورنہ ان کے کرتوت ایسے ہیں کہ انھیں زندہ نہ چھوڑا جاتا ۲۴۱-۲۴۲
— وہ حق پہچاننے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی تکالیف کے ذریعے سے متنبہ کرتا رہتا ہے ۳۲-۳۳-۴۶۴
— وہ قصور کرنے والوں کو فوراً نہیں پکڑتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے ۱۷۳-۲۳۹-۲۴۰
— وہ انسان کے بہت سے قصوروں سے تو ویسے ہی درگزر فرما جاتا ہے ۵۰۵
— قصورواروں کو اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے ۳۷۹
— اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۳۹۴
— اس کے ہاں تقرب کا ذریعہ کیا ہے؟ ۲۰۷-۲۲۳
— انسان پر اس کے احسانات ۲۰-۲۲۵-۲۰۰-۶۰۰
— اس نے اپنی کھلی اور چھپی تمام نعمتیں انسان پر تمام کر دی ہیں ۲۰-۲۶۹-۲۰۰-۲
— اس سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس ضرور ہونی ہے ۸۷
— اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۱۷-۲۱-۲۲۹-۲۷۳-۳۶۱-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-

۴۱۱-۴۲۸-۴۹۶-۵۲۸-۵۵۱-۵۸۲
— وہ جب چاہے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے ۵۰۲
— وہ ہمیشہ مبنی بر حقیقت بات کہتا ہے ۱۹-۳۰۹
— وہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ۱۲۱
— وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت اور عدل کے مطابق کرتا ہے ۱۱
— اس کا انصاف بے لاگ ہے ۸۷-۸۸-۳۰۰-۳۰۷-۳۰۸-۳۲۵-۳۳۰-۳۳۳-۳۳۵-۳۳۶-۳۶۴-۳۷۸-۴۶۵
— وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ۴۰۹
— وہ مجرموں اور ظالموں سے انتقام لے کر رہتا ہے ۴۹
— وہ ظالموں سے انتقام لینے والا ہے ۳۷۴
— اس کا غضب کیسے لوگوں پر بھڑکتا ہے ۴۰۹-۴۹۷
— اس کے غضب کے مستحق کیسے لوگ ہیں اور کیوں ہیں ۳۹۶-۳۹۸
— اس کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ۴۰۰
— بندوں کو ان کے اعمال کی سزا دینا اسی کا کام ہے ۴۸۰-۴۸۱
— تمام معاملات کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہے ۲۱-۲۰۱-۲۲۰
— تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۲۱-۵۱۷-۵۱۸
— اس سے فیصلے میں غلطی نہیں ہوتی ۳۶۵
— اس [illegible] ہے ۱۳
— غیب کا علم اسی کو ہے ۲۳۸-۲۶۶
— اللہ کے علم غیب کی چند مثالیں اور تشریح ۲۸-۲۹-۲۶۶
— وہ کائنات کی ہر مخفی اور کھلی چیز کو جانتا ہے ۱۷-۳۹-۲۳۸-۳۷۷
— وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۲۱-۱۱۷-۲۳۸-۳۶۱-۴۰۱-۵۰۳
— [illegible] اس سے کچھ نہیں چھپ سکتا ۱۷
— وہ لوگوں کی تمام حرکات دیکھ رہا ہے اور ان کی کوئی حرکت اس سے مخفی نہیں ۲۶۲-۴۷۱-۵۰۳-۵۰۴
— آدمی خواہ کوئی بات ظاہر کرے یا چھپائے اللہ کو اس کا علم ہے ۱۲۲-۴۷۱
— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۳۹-۱۰۳-۱۷۳-۲۲۴-۲۹۴-۳۹۵-۴۶۶-۴۸۶
— اللہ کی صفات کا جامع بیان ۳۹۱
— اس کی قدرت اور اس کا علم تمام جزئیات پر حاوی ہے ۲۲۵
— اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے ۴۴-۵۰۴
— بندوں کے ہر کام سے باخبر ہے ۴۸-۶۹
— وہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ۴۰۰
— وہ اپنے بندوں کی روش پر نگاہ رکھتا ہے ۵۰۴
— تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۴۴-۷۵-۲۲۳
— وہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے ۱۲۲
— قیامت کا علم اسی کو ہے ۵۵۱
— اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ۶۱۶
— اس کی صحیح معرفت حاصل ہونے کے ذرائع ۲۰-۲۱
— وہ اسی کو راہ راست دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے اور وہ جسے چاہے اپنا کر لیتا ہے ۴۹۳
— وہ جسے چاہے گمراہی میں ڈالے اور جسے چاہے راہ راست دکھائے ۲۲۱-۲۲۲
(تفصیل کے لیے دیکھو "ضلالت" اور "تقدیر")
— اس کی مشیت اور اس کی رضا میں فرق ۳۶۱
— اللہ کے کسی شخص کے سینے کو اسلام کے لیے کھولنے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور کسی کے لیے تنگ کرنے کا مطلب ۳۶۷
ـــ اس پر جھوٹ باندھنے والوں کے منہ کالے ہوں گے ۳۸۱
ـــ اس کی قدرت کاملہ کی عظمت ۳۸۲-۳۸۳
ـــ وہ اپنی نشانیاں دکھاتا ہے مگر کون لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۲۵-۱۷۷-۳۴۰-۳۷۵-۳۷۹-۳۹۷-۵۰۶-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۴
ـــ وہ حد سے گزرنے پر ہی عذاب بھیجتا ہے ۴۰۸ (تفصیل کے لیے دیکھو ''عذاب'')
ـــ اللہ کی تخلیق اور انسان کی صناعی میں واضح فرق ہے ۴۴۶
ـــ اس نے تمام انسانوں کو ایک امت کیوں نہ بنا دیا؟ ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳
ـــ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے ۴۸۲
ـــ اس کے مقابلے میں کوئی حامی و ناصر نہیں ہے ۵۰۵
ـــ اس کے سوا کوئی حامی و مددگار نہیں اور نہ اس کی مرضی کے خلاف کسی کی سفارش چل سکتی ہے ۳۸ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شفاعت'')
ـــ سمندروں کے سینے پر چلنے والے ان پہاڑ نما جہازوں کو وہ جب چاہے روک دے اور جب چاہے انھیں ڈبو دے ۵۰۵-۵۰۶
ـــ اس پر بھروسا ایمان کا لازمی تقاضا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف ہے ۲۱-۳۷۴-۴۸۵-۵۰۷
ـــ وہ ''خیر و برکت والی رات'' کو ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کرتا ہے ۵۵۹
ـــ اللہ کو اذیت دینے کا مطلب ۱۲۳-۱۲۸

الٰہ
ـــ معنی و تشریح ۲۷۹-۵۶۱
ـــ اللہ کے سوا کسی اور کے الٰہ نہ ہونے کی وجہ ۲۱۹-۲۷۹-۳۵۷ تا ۳۶۰
ـــ الوہیت کے معنی میں پادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے ۳۹۹
ـــ صرف ایک اللہ ہی الٰہ ہے ۲۷۸-۲۷۹
ـــ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ۲۱۹-۲۸۵-۳۴۶-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۲-۴۲۴-۵۶۱
ـــ انسان کا الٰہ ایک ہی ہے ۴۴۱
ـــ اللہ ہی آسمان کا الٰہ بھی ہے اور زمین کا الٰہ بھی ۵۵۱
ـــ انسان جس کی بھی بے چون و چرا اطاعت کرے وہ اس کا الٰہ ہے ۵۸۹
ـــ اللہ کے سوا لوگوں نے دوسرے جو الٰہ بنا رکھے ہیں وہ بے چارے ان کی مدد تو کیا کریں گے، ان کی پرستش کرنے والے تو الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں ۲۷۱
ـــ یہ جھوٹے الٰہ جو اللہ کے شریک ٹھیرائے جاتے ہیں نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں ۱۹۹
ـــ جھوٹے الٰہوں نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا ہے ۱۲
ـــ اللہ کے سوا جو الٰہ تقرب الی اللہ کے لیے بنائے گئے ہیں وہ کسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ۶۱۷
ـــ اللہ کے سوا جن کو بھی الٰہ بنایا جاتا ہے ان کی حیثیت یہ ہے کہ اگر خدائے رحمٰن کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت کسی کام نہیں آ سکتی اور نہ وہ اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکتے ہیں ۲۵۴
ـــ جھوٹے الٰہوں کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کی دلیل ۲۹۲

ـــ مشرکین کے الٰہوں کی آخرت میں کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱

الحاد

ـــ اللہ کی آیات کو غلط معنی پہنانا ۴۶۲

الیاس علیہ السلام

ـــ ان کا قصہ ۳۰۲ تا ۳۰۶
ـــ ان کے متعلق بنی اسرائیل کے عقائد ۳۰۵-۳۰۶
ـــ ان کے اوصاف اور اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ ۳۰۲-۳۰۵

ام الکتاب

ـــ معنی وتشریح ۵۲۳-۵۲۴

امانت

ـــ اس کا وہ بارگراں جو انسان پر ڈالا گیا ہے ۱۳۵-۱۳۷ (تفصیل کے لیے دیکھو ''انسان'' اور ''خلافت'')

امتحان - (دیکھو ''آزمائش'')

امثال القرآن

ـــ قرآن میں طرح طرح کی مثالیں کس لیے دی گئی ہیں ۳۶۹
ـــ کلمات اللہ کے بے حدوحساب ہونے کی تمثیل ۲۲-۲۳
ـــ تمام انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا ایسا ہے جیسے ایک انسان کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا ۲۳
ـــ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے متکبروں کی آواز کے لیے گدھے کی آواز کی مثال ۱۸
ـــ حیات بعد موت کے لیے زمین کی مثال کہ سوکھی پڑی تھی لیکن بارش پڑتے ہی اس میں جان پڑ گئی ۵۰-۵۱-۲۲۳-۲۵۶-۴۶۱
ـــ اللہ کی عظمت کے لیے آسمان پھٹ پڑنے کی مثال ۴۷۸
ـــ ایک سعادت مند بیٹے اور نالائق بیٹے کی مثال ۶۰۹ تا ۶۱۲
ـــ بحری جہازوں کی مثال ۵۰۵-۵۰۶
ـــ ''اندھے اور بینا'' اور ''صالح و بدکار'' کی مثال ۴۱۷
ـــ ہٹ دھرم کافروں کی تمثیل ۲۴۶-۲۴۷
ـــ حوران جنت کی مثال ۲۸۷
ـــ زقوم کے شگوفوں کی تمثیل ۲۸۹-۲۹۰-۵۷۱
ـــ مشرک اور موحد کی تمثیل ۳۷۰
ـــ ہٹ دھرم مخالفین حق کی تمثیل ۴۶۴
ـــ آخرت اور دنیا کے لیے کام کرنے والوں کی تمثیل ۴۹۸-۴۹۹
ـــ دل اور آنکھوں پر پردہ اور کانوں پر مہر کی مثال ۲۲۱- ۲۲۲- ۴۰۸- ۴۰۹- ۵۰۲- ۵۰۳- ۵۸۹- ۶۱۷
ـــ مومن اور کافر کے حال و مستقبل کو واضح کرنے والی تمثیل ۲۲۹
ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہٹ دھرم مخالفین کی مثال ۲۴۶-۲۴۷
ـــ دعوت حق کے فروغ کی مثال ۵۰-۵۱

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

ـــ اس کے لیے صبر کی ضرورت ۱۷

انبیا

ـــ عرب میں مبعوث ہونے والے انبیا ۳۶
ـــ انبیائے سابقین کی تعلیمات کے وہ اثرات جو عرب میں محفوظ تھے ۳۷
ـــ انبیائے کرام کی دعوت کا اولین مخالف قوموں کا خوش حال طبقہ تھا ۲۰۶-۵۳۴
ـــ انبیا کا کام یہ تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہر حکم پر

Maktaba Tul Ishaat.com

شامل کرتی ہیں ۱۰۳-۳۶۲

— انبیا علیہم السلام بندوں کے اعمال پر گواہ نہیں ہیں بلکہ اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے اللہ کا پیغام ان تک صحیح پہنچا دیا ہے ۱۰۱

(تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

انتقام

— کسی کی زیادتی کا انتقام لینے کے حدود اور اس کے قواعد ۵۱۱-۵۱۲

انجیل

— اس کو ماننے والے خود اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴-۴۹۵

(تفصیلات کے لیے دیکھو ''بائبل'')

انسان

— تخلیق انسانی سے متعلق قرآن کا بیان ۳۹ تا ۴۲-۲۲۴-۲۷۲-۲۸۱-۳۴۷-۳۴۸-۳۵۹-۴۲۳-۴۲۵-۴۲۶

— انسان کے لیے اس کی اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جو زمین میں پھیلائے گئے ہیں نشانیاں ہیں ۵۷۹

— جانوروں کی طرح انسان کی جنس میں سے بھی اس کے لیے جوڑے بنائے گئے ہیں تاکہ سلسلۂ تناسل جاری ہو ۴۸۵

— اللہ تعالیٰ کا انسان میں ''اپنی'' روح پھونکنا کس معنی میں ہے ۴۰-۴۱

— انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ۳۴۸

— زمین و آسمان کی تمام چیزیں انسان کے لیے مسخر ہیں ۱۹-۵۲۸-۵۸۳-۵۸۴

— اس کے لیے زمین و آسمان کی چیزیں کس معنی میں مسخر کی گئی ہیں ۱۹-۲۰

— اس کے آگے فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا گیا ۳۴۷-

۳۴۹

— ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا اور قرآن ۴۰

— انسان کو ماں کے پیٹ میں تین پردوں کے اندر پرورش کیا گیا ۳۵۹

— موجودہ نسلِ انسانی وہ ہے جو طوفانِ نوح سے بچائی گئی تھی ۲۶۱

— انسانی زندگی کے مراحل ۲۳۷-۳۹۶-۳۹۷-۴۲۵

— انسان کی بڑھاپے میں کیا حالت ہوتی ہے ۲۶۹-۲۷۰-۴۲۵

— انسان کی پیدائش کا مقصد ۴۲۵

— انسانی زندگی کے لیے اس زمین میں اللہ کے پیدا کردہ موافق حالات بھی توحید کی دلیل ہیں ۴۳۰

— وہ عمر جس میں انسان پوری طرح اپنے اعمال کا ذمہ دار ہو جاتا ہے اور جس کے بعد اپنی گنہگاری کے لیے اس کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوسکتا ۲۳۷-۲۳۸-۶۰۹

— وہ اصل انسان کون سا ہے جسے خلافت سونپی گئی تھی اور جس کو اپنا حساب دینا ہے ۴۱ تا ۴۴-۱۳۵ تا ۱۳۷-۲۳۸-۳۲۶

— دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اس کی فضیلت ۳۴۸-۴۸۳

— اسے کفر اور ایمان کے انتخاب میں آزاد کس لیے چھوڑا گیا ہے ۱۳۵ تا ۱۳۷-۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳

— وہ دنیا میں غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں ہے ۱۷۷-۳۶۱-۳۶۲-۵۵۰

— اس کو آخرکار پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے ۱۶-۲۱-۲۵۵-۲۷۳-۳۶۱-۴۲۸-۵۲۸-۵۸۶

— وہ ایک وقتِ مقرر کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا مقدمہ اللہ کے حضور پیش ہوگا ۳۷۲ تا ۳۷۵

— کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

۲۶-۲۲۷-۲۲۸
— وہ اپنی نیکی و بدی کا خود ذمہ دار ہے۴۶۵-۵۸۴
— وہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے ہی کرتا ہے اور بھٹکتا ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے۱۴-۳۷۵
— وہ اپنے اعمال کے برے نتائج سے بچ نہیں سکتا ۳۷۸
— وہ اپنے قول وعمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۲۰۰-۲۰۱-۴۹۵-۴۹۶-۵۳۲-۵۸۴-۵۸۶
— اس کا پورا نامہ اعمال ثبت کیا جا رہا ہے۱۷-۲۴۸
— وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ اسے جانتا ہے ۲۴-۲۸۳-۴۶۲
— اس کے لیے اصل ناکامی کیا ہے۳۶۴-۳۶۵
— اس کے لیے اصل خسارہ کیا ہے۵۱۳
— اس کے خسارے میں پڑنے کی اصل وجہ۴۵۱-۴۵۲
— قوانینِ فطرت کے متعلق اس کا علم اور فطرت کی طاقتوں پر اس کا اقتدار سب کچھ اللہ کا بخشا ہوا ہے۲۶۲-۲۶۳
— اس پر خدا کے احسانات ۲۰- ۲۶۹- ۲۷۰- ۴۲۲ تا ۴۲۴- ۶۰۰
(دیکھو "اللہ" انسان پر اس کے احسانات)
— اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکمت و دانائی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کا شکرگزار ہو۱۲
— انسان اتنی نعمتیں پانے کے باوجود کم ہی شکرگزار ہوتا ہے۴۱-۱۸۹
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے یہ احسانات ہیں اور انسان کا حال یہ ہے کہ بغیر علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے۲۰
— انسان احسان فراموش ہے۵۳۰
— جو لوگ اپنی خواہشاتِ نفس کو خدا بنا لیں وہ علم کے باوجود گمراہی میں پھینکے جاتے ہیں اور ان کے دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۵۸۹
— انسان کی حقیر ابتدا اور خدا کے مقابلے میں اس کی جسارتیں ۲۷۲
— اس کے کرتوت بہت برے ہیں مگر اللہ درگزر فرماتا ہے۲۴۱-۲۴۲
— وہ پوری طرح اللہ کی گرفت میں ہے ۱۷۷-۱۷۸
— اللہ کی قدرت کے آگے اس کی بے بسی ۲۶۹-۵۰۵-۵۰۶
— اس کے علم کی نارسائی ۲۸-۲۹
— اس کا حقیقی معبود ایک ہی ہے ۲۷۸-۲۷۹-۴۴۱
— وہ اپنے خالق کو چھوڑ کر خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مستحق عذاب بھی ٹھیراتا ہے ۱۵
— اس کا رب صرف اللہ ہے۴۲۴
— جو انسان اللہ کی بندگی قبول کرے اس نے فی الواقع بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا۲۱
— اس کی زندگی اللہ کی رحمت پر منحصر ہے۲۶۲-۲۶۳
— دنیا میں اس کی اصل حیثیت اور اس کے لیے صحیح راہ عمل ۴۷ تا ۴۹- ۱۳۵ تا ۱۳۷- ۲۳۸- ۳۶۳
— اللہ کی عبادت اس کی فطرت کا تقاضا ہے ۲۷۹
— انسان کی فطرت میں کفر نہیں ہے۲۲
— وہ خود اللہ کی بندگی کا محتاج ہے ۲۲۷
— اس پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرے ۳۵۵ تا ۳۵۷
— اس کے لیے سیدھا راستہ صرف اللہ کی بندگی ہے ۲۶۷
— اس کو تو ان لوگوں کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہوں ۱۶
— اس کو اللہ تعالیٰ حق پہچاننے کی مہلت دیتا ہے۴۶۴
— اللہ اسے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کے ذریعے متنبہ کرتا رہتا ہے۳۲-۳۳-۴۷-۴۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ خدا کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے لیے صحیح راہِ حیات متعین نہیں کرسکتا ۵٦٠
— اس کو ہدایت میسر آنا سراسر اللہ کا فضل ہے ۲۸۸
— اس کے بگڑنے کی بنیادی وجہ خدا سے غفلت اور آخرت میں شک ہے ۳۵٠-۴۷۱
— ضروری نہیں کہ انسان کے برے اعمال کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو کیونکہ آخرت میں تو تمام برے اثرات سامنے آنے ہی ہیں ۴۲۸
— اس کے لیے دینِ حق ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے ۴۷۵-۴۷٦
— اس کو علم کے خلاف کوئی عقیدہ نہ رکھنا چاہیے ۱٦
— اس کو کون کون سے عوامل گمراہ کرتے ہیں ۲٦ تا ۲۸
— اس کے مبتلائے ضلالت ہونے کے اسباب (دیکھو ''ضلالت، اس کے اسباب'')
— دوسروں کی خاطر غلط رویہ اختیار کرنا اس کے لیے تباہ کن ہے ۳٦۲
— اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کے تعین میں سہل انگاری سے کام لیتا ہے ٦٠۱
— انسان کا رویہ اس گمان سے متعین ہوتا ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھتا ہے ۴۵۱
— انسان کے ''ظالم اور جاہل'' ہونے سے کیا مراد ہے؟ ۱۳۷
— انسانوں میں سے عقل رکھنے والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ۳٦۳-۴۱۵
— غور و فکر کرنے والے انسانوں کے لیے نشانیاں ۳۴٠-۳۷۵-۵۸۴
— ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ۳۷۹-۵۷۹
— اللہ کی طرف رجوع کرنے والے کے لیے نشانی ۱۷۷-۳۹۷
— صبر و شکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ۲۵-۵٠٦
— عقل رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ۵۸۱
— یقین لانے والوں کے لیے نشانیاں ۵۸٠
— علم رکھنے والوں کے لیے قرآن ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہے ۴۳۹
— انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے اپنے وجود میں ایسی نشانیاں دکھائے گا کہ اس پر کھل جائے کہ قرآن برحق ہے ۳۲-۴۷٠
— اللہ کے ہاں انسانوں کے درجات ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں ٦۱۳
— انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا ۲۴۸-۴۵٠-۴۵۱
— موت سے انسان کی صرف طبیعی زندگی ختم ہوتی ہے، اس کی روح باقی رہتی ہے ۴۳
— انسان کو اس کے اعمال کی حیثیت آخرت میں بتا دی جائے گی ۱٦-۱۷
— آخرت ہی انسان کا اصل گھر ہے ۳۴۳
— انسان کے لیے دنیا کی حیثیت کیا ہے؟ ۳۴۳
— انسان کو یہاں جو کچھ دیا گیا ہے وہ دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہے ۵٠٦
— خوش حالی میں پھولنا اور مصیبت میں خدا کو یاد کرنا انسان کی بڑی کمزوری ہے ۳۷۷-۳۷۸
— اس کی یہ کمزوری کہ خوش حالی میں مغرور اور مصیبت پڑنے پر مایوس اور خدا کا ناشکرا بن جاتا ہے ۲۵ تا ۲۷-۳٦۲-۳٦۳-۳۷۷-۳۷۸-۴٦۷-۴٦۸-۵۱۴
— ہر انسان کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے ۴۵۲

— گمراہ دوست انسان کو بھٹکائے پھرتے ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ وہ راہ راست پر ہے ۵۳۸
— انسانی طبائع اور افکار و اطوار کا اختلاف عین تقاضائے فطرت ہے ۲۳۱-۲۳۲
— انسانوں کے درمیان اختلاف کا فیصلہ کرنا اللہ ہی کا کام ہے ۳۷۷-۴۸۴-۴۸۸
— انسانوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں بلکہ ایک دوسرے کا محتاج رکھا گیا ہے ۵۳۷
— انسان کے پچھلے گناہوں کا کفارہ مستقبل میں اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنا ہے ۳۸۰
— انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدائشی راست رو اور ایک ہی امت کیوں نہ بنا دیا ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳
— انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے ۴۸۲
— اللہ کی دوسری مخلوقات پر انسان کی فضیلت کے وجوہ ۴۸۳
— انسانی حواس میں سے اہم ترین حواس جن کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے ۴۱-۴۲
— انسانی صناعی اور خدائی تخلیق کا واضح فرق ۴۶۶
— انسان کی معلومات بہت محدود ہیں ۲۸-۲۹
— دنیا میں انسان کا امتحان کس طرح ہو رہا ہے ۴۴ (نیز دیکھو ''آزمائش'')
— زندہ انسان وہی ہے جس کا دل اور ضمیر زندہ ہو ۲۷۰
— انسان سے شیطان کی ازلی دشمنی ۲۲۰-۳۴۸-۳۴۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ابلیس'' اور ''شیطان'')
— انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی چالیں ۱۹۴-۲۲۰
— شیطان اس کا کھلا دشمن ہے ۲۲۰-۲۲۱-۲۶۶-۲۶۷-۵۴۸
— وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بناتا ہے ۲۲۰-۲۲۱-۳۴۹-۳۵۰
— شیطان کے فریب سے بچنے کے لیے اس کو اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے ۴۵۸-۴۵۹-۵۰۶
— اس پر شیطان کے مسلط ہونے کے اسباب و نتائج ۵۳۸-۵۳۹
— اللہ ہر انسان اور ہر قوم کو سنبھلنے کے لیے ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے ۲۴۱-۲۴۲
— دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر انسان غلط رویہ اختیار کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل تباہ کرتا ہے ۱۳۵ تا ۱۳۷
— اللہ جب چاہے کسی قوم کو تباہ کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لا سکتا ہے ۲۲۷-۲۲۸
— انسان کی عمر کی کمی بیشی اللہ کے ہاں لکھی ہوئی ہے ۲۲۵
— اس کی عمر کا تعین اللہ کے اختیار میں ہے ۴۲۵-۴۲۶

انفاق فی سبیل اللہ

— اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایسی تجارت ہے جس میں کوئی خسارہ نہیں ہے ۲۳۳
— اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اہل ایمان کی صفت ہے ۴۵-۴۶-۵۰۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'' اور ''قرآن، اس کا معاشی تصور'')

اہل البیت

— ان سے کون مراد ہیں؟ ۹۲-۹۳
— اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کی تفسیر ۵۰۰ تا ۵۰۲
— اہل بیت سے گندگی دور کر دینے کا مطلب ۹۳-۹۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— کیا اہل بیت معصوم ہیں؟ ۹۳
— اہل بیت کی ذمہ داری ۹۴

اہلِ کتاب-۸۴

— وہ خود اپنی دینی کتابوں کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴-۴۹۵
— ان میں بت پرستی کیسے شروع ہوئی ۱۸۱
— وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے قسمیں کھاتے تھے کہ رسول آیا تو ہم اطاعت کریں گے ۲۴۰-۳۱۳

آیات

— آیاتِ الٰہی کی چھ بڑی قسمیں ۴۷
— آیت (بمعنی معرفت حق کے نشانات اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں) ۲۵-۴۸-۵۰-۱۷۴-۱۹۱-۱۹۳-۲۵۶-۲۵۹-۲۶۱-۲۶۳-۲۸۱-۳۷۵+۳۷۹-۳۹۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۸ تا ۴۷۱-۵۰۴-۵۰۵-۵۴۰-۵۴۱-۵۶۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۳-۵۸۴
(تفصیل کے لیے دیکھو ''قرآن، وہ تلاش حق کے کن طریقوں کی نشان دہی کرتا ہے'')
— اللہ کی نشانیوں کا انکار کرنے والا غدار اور ناشکرا ہے ۲۵-۲۶
— اللہ کی نشانیوں سے کیسے لوگ سبق لیتے ہیں ۲۵-۱۷۷-۱۷۸-۳۴۰-۳۷۵-۳۷۹-۳۹۷-۵۰۶-۵۷۱-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲
— اللہ کی نشانیوں سے کون لوگ صحیح علم حاصل کرسکتے ہیں ۵۸۴
— اللہ کی نشانیوں کے منکر بڑے ظالم لوگ ہیں اور اللہ ان سے انتقام لے کر رہے گا ۴۷-۴۸
— آیت (بمعنی معجزہ و علامت نبوت) ۴۰۲-۴۲۸-۵۴۰-۵۴۱-۵۶۸
— کوئی رسول اپنے اختیار سے معجزہ دکھانے کی طاقت نہیں رکھتا ۴۲۸
— معجزہ اللہ ہی کے اذن سے رونما ہوتا ہے ۴۲۸
— معجزہ تماشا دکھانے کے لیے نہیں بلکہ فیصلہ کردینے کے لیے رونما ہوتا ہے ۴۲۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''معجزہ'')
— آیت (بمعنی آیات کتاب اللہ اور بمعنی ارشادات و احکام الٰہی) ۷-۱۰-۴۵-۴۹-۹۲-۱۷۵-۲۶۳-۳۸۱-۳۸۳-۳۹۱-۴۰۹-۴۱۶-۴۲۳-۴۲۶-۴۴۸-۴۵۳-۴۶۲-۴۶۳-۵۰۶-۵۴۹-۵۸۱-۵۹۰-۵۹۳-۵۹۴-۶۰۳-۶۱۷
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والوں کا انجام بد ۴۴۸-۴۵۳-۵۸۳
— اللہ کی آیات کو زک دینے کی کوشش کا انجام ۱۷۵
— اللہ کی آیات کے مقابلے میں کج بحثی کرنے کا انجام بد ۳۹۱ تا ۳۹۳-۴۲۶-۴۲۷
— کتاب اللہ کا مقابلہ استکبار اور استہزا سے کرنے والوں کا انجام ۵۸۱ تا ۵۸۳-۵۹۳-۵۹۴
— اللہ کی آیات کا مقابلہ کج بحثیوں سے کرنے والوں کا انجام ۴۱۶-۵۰۶
— اللہ کی آیات کے مقابلے میں جھگڑا کرنے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں ۴۰۹-۵۸۱
— اللہ کی آیات کو نہ ماننے کا نتیجہ گمراہی ہے ۴۲۳
— اللہ کی آیات کے خلاف کوشش کرنے والوں کے لیے عذاب ہے ۲۰۷-۲۰۸

— اللہ کی آیات کو غلط معنی پہنانے (الحاد) کے نتائج ۴۶۲
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والوں کی عقل ماری جاتی ہے ۶۱۷

ایکہ: (دیکھو "اصحاب الایکہ")

ایمان

— مومن کی تعریف ۴۶-۹۴-۹۵
— مومن کی صفات ۷- ۲۵- ۴۵- ۴۶- ۸۰ تا ۸۳- ۹۴ تا ۹۷- ۱۰۲- ۱۰۳- ۱۳۵- ۲۲۸- ۲۲۹- ۲۳۲- ۲۳۳- ۲۴۷- ۳۱۲- ۳۶۲- ۳۶۳- ۳۶۵- ۳۶۶- ۳۶۷- ۳۶۸- ۳۸۱- ۴۰۹- ۴۴۱- ۴۴۹- ۴۵۶ تا ۴۶۰- ۴۹۷- ۵۰۷ تا ۵۱۱- ۵۴۹- ۶۰۹
— مومن و فاسق برابر نہیں ہو سکتے ۴۶
— مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے ۲۲۹- ۳۳۱- ۳۳۲- ۳۶۳- ۳۶۶- ۳۶۷- ۵۸۷
— صداقت ایمانی کا معیار ۷۹- ۸۰- ۹۷- ۹۸
— آدمی کے صادق الایمان ہونے کی علامات ۸۱ تا ۸۳
— مومن سے اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے ۳۳۶
— مومنین کو اللہ نے توبہ کیے بغیر بھی خطا بخشی کی رعایت دی ہے ۳۹۲
— مومنین پر دنیا میں آنے والی تکلیفیں اور مصیبتیں ان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں ۵۰۵-۵۰۶
— اللہ تعالیٰ مومنوں کے اعمال میں سے بہترین کے مطابق جزا دے گا اور ان کی برائیوں سے درگزر فرمائے گا ۳۷۳-۶۱۱
— مومن کو کفار و منافقین کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے ۱۰۸
— اللہ کے حکم پر دل میں بھی آدمی کبیدہ خاطر ہو تو اس پر گرفت ہوگی ۱۱۸
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دل میں بھی کوئی وسوسہ ہو تو وہ قابل گرفت ہے ۱۱۸
— اہلِ ایمان کا نبی سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟ ۷۱- ۷۲- ۱۳۴- ۱۳۵
— ان کا کام نبی کی اطاعت کرنا ہے ۸۷- ۹۲- ۹۷- ۹۸- ۱۳۵
— مومنوں کو قرآن کا وارث بنایا گیا ہے ۲۳۳-۲۳۴
— ایمان کی اہمیت ۴۹-۵۰
— ایمان کے تقاضے ۲۱- ۹۷- ۹۸- ۱۰۳- ۱۰۴- ۱۰۵- ۱۲۳- ۱۲۸- ۱۳۵- ۲۷۷- ۳۶۳- ۴۵۴- ۴۵۶- ۴۵۷- ۴۸۵- ۵۰۷ تا ۵۱۱- ۶۰۹
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے تقاضے ۹۲- ۹۷- ۹۸- ۱۰۴- ۱۱۸- ۱۲۰- ۱۲۱- ۱۲۲- ۱۲۳- ۱۲۴- ۱۲۷- ۱۳۵
— ایمان اللہ کی احسان مندی کا لازمی تقاضا ہے ۳۶۱
— اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرے ۳۶۳
— ایمان لانا اسی وقت تک نافع ہے جب تک حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آجاتی ۲۱۳- ۴۵۲- ۵۱۴
— عذاب الٰہی کو آتے دیکھ کر ایمان لانا بے کار ہے ۵۱- ۳۱۹- ۳۲۲- ۴۳۱
— عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان کے نافع ہونے کی واحد مثال ۳۰۹
— خدا کے ہاں اسی شخص کا ایمان معتبر ہے جو شعور کے ساتھ کلمہ توحید کی شہادت دے ۵۵۲- ۵۵۳
— ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کا مطلب ۸۱ تا ۸۳
— قانونی حقوق میں اہل ایمان سب برابر ہیں ۸۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— مومن کے لیے قرآن شفا اور ہدایت ہے ۴٦۴

— تمام کتب آسمانی پر ایمان لانا ضروری ہے ۴۲٦-۴۹۵

— اہل ایمان کی نصرت کے لیے اللہ کے وعدوں کا صحیح مطلب ۸۱-۸۲

— اللہ دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کی مدد کرتا ہے ۳۱۳-۳۱۴

— اللہ کا یہ وعدہ برحق ہے ۴۱۵

— مومن اور کافر اور منافق کا فرق ۲۲۹-۲۳۴

— مومن اور کافر کے حال اور مستقبل کا فرق ۲۲۹

— مومن اور فاسق کا فرق ۴٦-۴۷

— اہل ایمان کا انجام نیک ۵۰۷

— مومن صالح کا انجام نیک ۴٦-۴۷-۳۷۲-۳۷۳-۴۱۱-۴٦۲-۵۴۹

— مومنین کے اجر کا سلسلہ ٹوٹنے والا نہیں ہے ۱۰۸-۴۴۱

— فرمانبردار مومن ہی حقیقت میں علم رکھتا ہے ۳٦۲-۳٦۳

— مومن صالح اور مفسد کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۳۳۱

— مومن صالح اور بدکار انسان نہ دنیا میں ایک جیسے ہوسکتے ہیں نہ آخرت میں ۵۸۷

— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی فضیلت، ان کے طبقات اور آخرت میں ان کا انجام ۲۳۳-۲۳۷

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۱۰-۱۷۴-۲۰۷-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۴-۴۱۱-۴۴۱-۵۰۰-۵۰۳-۵۰۴-۵۸۷-۵۹۲

— صرف ایمان ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ہے ٦۱۹

— ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح نافع نہیں ہے ۷۹-۴۱۱

— ایمان و عمل صالح کے ثمرات ۱۰-۴۵-۴٦-۸۳-۹۴-۹۷-۱۰۴-۱۰۸-۱۷۴-۱۷۵-۲۰۷-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۴-۲۳۲-۲۳۳-۲۹۱-۲۹۷-۳۰۲-۳۰۵-۳۰٦-۳۰۹-۳۷۳-۴۴۹-۴۵۴ تا ۴۵٦-۵۰۰-۵۰۳-۵۹۳-٦۰۹

— ایمان اور عمل صالح کے اخلاقی نتائج ۳۲۵

— اہل ایمان کے لیے اللہ کی ہدایات ۱۳۵

— اہل ایمان پر اللہ کی عنایات ۱۰۴

— اللہ مومن پر مہربان ہے ۱۳٦

— اہل ایمان کے حق میں فرشتے دعا کرتے ہیں ۱۰۴-۱۰۵-۳۹۴ تا ۳۹٦

— اہل ایمان میں سے دین حق کے لیے کام کرنے والوں پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے ۴۵۵

— فرشتوں اور مومنوں کے درمیان ایمان کا رشتہ ہے ۳۹۴

— اہل ایمان کے ساتھ ان کے صالح والدین، صالح اولاد اور صالح بیویوں کو جنت میں یکجا کر دیا جائے گا ۳۹۵

— اہل ایمان کے لیے جنت کا وعدہ ۱۱-۴۵۴-۴۵۵-٦۰۹

— کسی مومن کو بے قصور اذیت دینا گناہ ہے ۱۲۳

— یہ مسئلہ کہ گناہ گار مومن جہنم میں جائیں گے یا نہیں؟ ۲۳۵-۲۳٦

— وہ مقامات جہاں ''الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' سے مراد صرف صادق الایمان لوگ ہی نہیں ہیں ۷٦-۷۷-۱۳۴

— مومن اگر کسی علاقے میں احکام الٰہی کی پابندی نہ کرسکے تو اسے ہجرت کر جانی چاہیے ۳٦۳

— مومن کا کام مایوس ہونا نہیں، چاہے باطل کی قوتیں کتنی ہی بالا دست ہوں ۴۵۴-۴۵۵
— مومن باطل کا مقابلہ کرتے ہیں نہ کہ دب جاتے ہیں ۵۱۱

ایوب علیہ السلام

— ان کا قصہ ۳۳۹ تا ۳۴۲

ب

بائبل

— حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کے معاملے میں اس کی تضاد بیانی ۲۹۷-۲۹۸
— اس کا حضرت موسیٰ کی زندگی کے اہم ترین واقعے سے خالی ہونا ۴۰۴
— قصہ حضرت موسیٰ میں بائبل اور قرآن کے بیان کا فرق ۵۴۲
— بنی اسرائیل کے شرک اور انبیا پر ان کے ظلم کی شہادتیں ۳۰۳-۳۰۵
— اس میں نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ۳۰۵-۳۰۶
— اس میں حضرت داوٗدؑ پر زنا کا جھوٹا الزام ۳۲۷-۳۲۹
— بنی اسرائیل کے شرک اور اخلاقی زوال پر اس کی شہادت ۳۴۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انجیل''، ''اہل کتاب''، ''بنی اسرائیل''، ''تورات''، ''موسیٰ علیہ السلام'' اور ''عیسیٰ علیہ السلام'')

برزخ

— حیات برزخ کا ثبوت ۲۵۴ تا ۲۵۶
— حیات برزخ میں بھی اللہ مومنین سے اچھا معاملہ کرتا ہے ۳۷۲
— عذابِ قبر (یعنی عذاب برزخ) کا ثبوت ۴۱۲
— عذابِ برزخ کی کیفیت ۴۱۲-۴۱۳

برکت

— معنی وتشریح ۳۳۲-۳۴۲
— قرآن میں برکت والی سرزمین سے مراد شام و فلسطین ہے ۱۹۲-۱۹۳

بشر

— معنی وتشریح ۲۹۷-۳۴۷-۳۴۸
— بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے، اس لیے اللہ انبیا کو پیغام پہنچانے کے دوسرے طریقے اختیار کرتا ہے ۵۱۶
— بشریت انبیا (دیکھو ''نبوت'')

بعل

— شرقِ اوسط کے مشرکین کا سب سے بڑا دیوتا ۳۰۴-۳۰۵

بنی اسرائیل

— ان کی مختصر تاریخ ۴۹-۳۰۲ تا ۳۰۵
— وہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں ۳۰۱
— ان کو کتاب اللہ کا وارث بنایا گیا ۴۱۵
— ان کو ''کتاب''، ''حکم'' اور ''نبوت'' دی گئی ۵۸۶
— دین کے معاملے میں ان کو واضح ہدایات دی گئی تھیں ۵۸۶
— جب تک انھوں نے اللہ کی آیات پر ایمان رکھا انھیں دنیا کی امامت حاصل رہی ۴۹-۵۰
— امامت کا منصب ان سے سلب کر کے اب امت محمدیہ کو دیا گیا ہے ۵۸۶
— ان کا فرعون کی غلامی سے نجات پانا ۳۰۲-۵۲۸
— کیا وہ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کے وارث

Maktaba Tul Ishaat.com

ہوئے تھے؟ ۵۶۷-۵۶۸
— اللہ نے کس بنا پر ان کو توحید کی علم برداری کے لیے منتخب کیا تھا؟ ۵۶۸
— ان کو اللہ نے اپنی کن نعمتوں سے نوازا تھا اور وہ کیوں ان سے محروم ہوئے؟ ۵۸۶-۵۸۷
— حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کا سلوک ۱۳۴-۱۳۵
— انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیوں کیا؟ ۱۶۵
— حضرت سلیمان علیہ السلام سے ان کی عداوت ۱۸۰-۱۸۱
— اپنے انبیا کے ساتھ ان کا سلوک ۱۳۴-۱۳۵-۳۰۳-۳۰۴
— ان کا داود علیہ السلام پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا ۳۲۷ تا ۳۲۹
— حضرت سلیمانؑ پر ان کی تہمتیں ۳۳۶
— حضرت الیسع کے دور میں ان کا اخلاقی زوال ۳۴۴
— حضرت موسیٰ کے بعد ان کا بگاڑ ۵۰-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵
— حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بگاڑ ۳۰۲ تا ۳۰۵
— ان کے گمراہ ہونے کی وجہ ۵۸۶-۵۸۷
— ان کے گمراہ کن اختلافات کا قیامت کو فیصلہ کیا جائے گا ۵۰-۵۸۶
— ان کو ایسی نشانیاں دکھائی گئیں جو ان کے لیے صریح آزمائش تھیں ۵۶۸-۵۶۹
— ’’بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ‘‘ کے متعلق تفسیری بحث‘‘ ۶۰۶ تا ۶۰۸
— ان کو کتاب اللہ کی رہنمائی نے کس حالت سے نکال کر کس درجے تک پہنچایا؟ ۴۹-۵۰

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’یہود‘‘)
بنو قریظہ - (دیکھو ’’غزوۂ بنی قریظہ‘‘)

بنی النضیر
— وہی مدینے پر عرب قبائل کے متفقہ حملے کے محرک تھے ۱۵
— مدینے سے ان کا اخراج ۵۰-۵۱-۵۵-۵۶

بہتان
— معنی اور تشریح ۱۲۳-۱۲۸-۱۲۹-۵۰۳
— غیبت اور بہتان کا فرق ۱۲۸-۱۲۹

بینات
— معنی اور تشریح ۲۰۳-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۲۴-۲۳۱
— وہ بینات جو انبیا لائے ۲۰۶-۲۱۴-۵۲۸

پ
پردہ: ۸۷ تا ۱۲۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’قوانین اسلام، معاشرتی قوانین‘‘)

ت
تبرج
— معنی اور تشریح ۹۱ (نیز دیکھو ’’پردہ‘‘)
تبع - ۵۶۹-۵۷۰

تبنیت
— متبنیٰ بنانے کی رسم نے معاشرے میں خرابی اور قانونی مشکلات پیدا کر دی تھیں ۶۳-۶۶-۱۰۰-۱۰۲
— محض قانونی حکم سے صدیوں پرانی اس رسم کا ٹوٹنا محال تھا، اس لیے ضروری ہوا کہ حضورؐ خود اس کو توڑیں ۶۴-۱۰۰-۱۰۳
— آپ اس رسم کو توڑنے میں ہچکچا رہے تھے ۶۶-

۶۸-۷۴-۱۰۱

— اس شش و پنج کے بارے میں اللہ کا ارشاد ۹۹-۱۰۰

— یہ رسم آپؐ نے اللہ کے حکم سے توڑی ۱۰۱-۱۰۲

تخییر - ۸۵ تا ۸۸

تسبیح

— معنی اور تشریح ۴۵- ۱۰۴- ۲۰۸- ۲۰۹- ۲۵۶- ۲۵۸- ۵۲۸

تصویر

— شریعتِ الٰہی میں تصاویر اور مجسموں کی حرمت ۱۸۰ تا ۱۸۹

— تورات میں تصویر کشی کی ممانعت ۱۸۰-۱۸۱

— فوٹو کا حکم ۱۸۷- ۱۸۸

— تصویر کا جواز پیش کرنے والوں کے دلائل اور ان کی غلطی ۱۸۱- ۱۸۵- ۱۸۷ تا ۱۸۹

تعددِ ازواج

— اس کا جواز ''ناگزیر شخصی ضروریات'' کے ساتھ مقید نہیں ہے ۱۱۶

تقدیر

— بمعنی منصوبہ اور مقرر ضابطہ ۲۵۹

— کائنات کی تدبیر کا منصوبہ ۴۴۶

— وہ خاص ساعت جس میں اللہ قسمتوں کے فیصلے فرماتا ہے ۵۵۶-۵۵۹-۵۶۰

— تقدیر کے باوجود اللہ سے دعا مانگنا نافع ہے ۴۱۸-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۵۰۳

— دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے ۴۲۰-۴۲۱

— انسان کی پیدائشی قسمت جس کو بدلنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی میں نہیں ۵۳۷

— اللہ نے اختلافات کے فیصلے کا وقت مقرر کر رکھا ہے ۴۶۴- ۴۶۵- ۴۹۳- ۴۹۴

— اللہ کی مشیت اور اس کی رضا کا فرق ۲۰۸- ۳۶۰- ۳۶۱- ۵۲۱- ۵۳۲- ۵۳۳

— اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں جنھیں کوئی بدل نہیں سکتا ۵۵۶-۵۵۹-۵۶۰

— تم اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ کوئی طاقت اللہ کے ضابطے کو بدل سکتی ہے ۱۳۳-۲۴۱

— تقسیم رزق سراسر اللہ کے اختیار میں ہے ۵۳۶

— رزق کی تقسیم میں اللہ کا طریقہ ۴۹۷- ۴۹۸- ۵۰۴-۵۳۶-۵۳۸

— اللہ کی تقسیم رزق کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے ۴۹۸

— رزق کی کمی بیشی اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۲۰۶- ۲۰۷- ۲۰۸- ۳۷۹- ۴۸۵

— کائنات کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں ۳۸۱- ۴۸۵

— ہر شخص کی عمر میں کمی بیشی اللہ کے ہاں لکھی ہوئی ہے ۲۲۵- ۴۲۵- ۴۳۶

— کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اسے موت کس سرزمین پر آنی ہے ۲۷- ۲۸

— زندگی اور موت اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۴۲۵- ۴۲۶

— اللہ جس کو جیسی اور جتنی چاہے اولاد دیتا ہے ۵۱۵

— اللہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے ۴۹۷

— اللہ اپنے عطیوں کی تقسیم اپنے بندوں میں کس طرح کر رہا ہے ۵۳۶- ۵۳۷

— اللہ اپنے تمام بندوں پر مہربان ہے لیکن اس کی عطا و بخشش میں فرق و تفاوت ہے ۴۹۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ ہی کی توفیق سے آدمی کو اسلام میں شرح صدر حاصل ہوتا ہے ۳۶۶-۳۶۷
— اللہ کی مدد کے بغیر کوئی شخص شیطان کی چالوں سے نہیں بچ سکتا ۴۵۸-۴۵۹
— اللہ بگڑے ہوئے لوگوں پر شیاطین اور ائمۂ شر مسلط کر دیتا ہے ۴۵۲-۵۳۸
— انسان کو با اختیار بنا کر امتحان کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے ۴۴-۱۳۵ تا ۱۳۷
— اللہ کی توفیق کے بغیر انسان دنیا کے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۴۸۱-۴۸۳
— کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے ۲۷-۲۸
— انسان کی کوئی تدبیر اللہ کی توفیق اور اس کے اذن کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی ۵۰۷
— اللہ کی توفیق کے بغیر انسان کا کوئی ارادہ عمل میں نہیں آ سکتا ۶۱۱
— اپنی گمراہی کے حق میں تقدیر کو دلیل بنانا جہالت ہے ۲۶۳-۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳
— لوگوں کا تقدیر سے غلط استدلال ۲۶۳-۴۲۰
— آدمی اللہ کے اذن ہی سے نیکی کے راستے پر چل سکتا ہے ۲۳۴
— اللہ نے انسان کو کفر و ایمان کے انتخاب میں آزاد کس لیے چھوڑا ہے ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳
— آدمی اپنے اچھے اور برے عمل اور ہدایت یا ضلالت اختیار کرنے کا خود ذمہ دار ہے ۲۳۷-۲۳۸-۳۷۵-۳۷۸-۴۶۵-۵۸۴-۶۱۷
— اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ پیدائشی طور پر تمام انسانوں کو ایک امت بنا دے ۴۴-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳
— اللہ کے کسی کو گمراہی میں ڈالنے کا مطلب ۲۲۱-۲۲۲-۵۸۹
— اللہ جسے گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ راست نہیں دکھا سکتا ۵۱۲-۵۱۳-۵۸۹
— اللہ کیسے لوگوں کے کانوں اور دلوں پر مہر لگاتا اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے؟ ۲۲۱-۲۲۲-۴۰۹-۴۱۰-۵۰۲-۵۰۳-۵۸۹-۶۱۷
— کیسے لوگوں کے دلوں پر ٹھپا لگا دیا جاتا ہے ۴۰۹-۴۱۰
— کیسے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا جاتا ہے ۴۰۸-۴۰۹-۴۲۷-۵۱۲-۵۳۸-۵۸۹-۶۲۰
— کیسے لوگوں کو نیکی اور ایمان کی توفیق نہیں دی جاتی ۲۴۶-۲۴۷
— اللہ جسے چاہے ہدایت دے ۲۲۱-۲۲۲-۵۱۷
— کیسے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے ۳۵۷-۳۶۷-۳۶۸-۳۷۳-۳۷۴-۴۰۶-۴۰۹-۴۱۰-۴۴۹-۴۶۴-۵۸۹-۶۰۶-۶۰۸
— کیسے لوگوں کو ہدایت بخشی جاتی ہے؟ ۳۶۵-۳۶۷-۳۶۸
— کیسے لوگوں کو اللہ کی طرف سے ہدایت ملتی ہے اور کیسے لوگوں کو نہیں ملتی؟ ۴۷۵-۴۸۳-۴۹۳
— باطل مذہبوں کی پیدائش کا ذمہ دار اللہ نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہے ۴۹۳-۴۹۴
— دنیا میں انسان پر ڈالے جانے والے بہت سے مصائب کی حقیقت ۵۰۵-۵۰۶
— کوئی کسی کے لیے منحوس نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے ہی نصیب کی برائی دیکھتا ہے ۲۵۲
— انسان پر جو مصیبت بھی آتی ہے، اس کے اپنے

ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے ۵۰۵
— اللہ نے ثمود کو راہِ راست پیش کی مگر انھوں نے خود اندھا رہنا پسند کیا ۴۴۹
— دوزخیوں سے متعلق اللہ کا ارشاد کہ ''انھوں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا، ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا ہے'' ۵۰۵
— اللہ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۴۰۰-۴۶۵-۵۵۰-۵۸۷
— انسان کے اپنے ہی اعمال پر جزا و سزا مرتب ہو گی ۳۹۹-۵۵۰-۵۸۷-۵۹۲
— انسان کو حسنِ عمل کی طرف دعوت ۳۷۹-۳۸۰-۶۱۹
— اللہ اپنے بندوں کے کفر کو پسند نہیں کرتا ۳۶۰
— قضا و قدر پر جو اشارات قرآن میں ہیں وہ انسان میں قناعت، توکل علی اللہ، صبر و استقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خوفی پیدا کرنے کے لیے ہیں ۲۲۷-۴۸۵-۴۸۶
— بہت سے کافر جان بوجھ کر گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ۳۷۰

تقلید

— اندھی تقلید اہم ترین اسباب ضلالت میں سے ہے ۳۰-۱۳۴-۲۹۰
— مشرکین عرب کا تقلید آبائی پر اصرار ۵۳۲ تا ۵۳۵
— [illegible] جس کی تقلید کی جانی چاہیے [illegible]
— [illegible] ۵۱۲-۵۱۸
— رسول کی تقلید (پیروی) ہی سیدھے راستے تک پہنچنے کا ذریعہ ہے ۲۵۳
— حضرت ابراہیمؑ نے تقلید آبائی کے بجائے تقلید حق کا مسلک اختیار کیا ۵۲۱-۵۳۴
— صحیح مسلک تصدیق حق ہے نہ کہ تقلید آبائی ۵۳۵

تقوی

— معنی و تشریح ۳۶۳
— اللہ سے ڈرنے ہی کا نام تقوی ہے ۵۴۸
— انسان کا ازلی تقاضا ۳۶۳
— سچائی لانے والے اور سچائی کی تصدیق کرنے والے ہی متقی ہیں ۳۷۲
— تقوی کے تقاضے ۸۷ تا ۸۹-۱۱۲-۱۳۵-۳۰۲-۳۰۴
— اس کا تقاضا ہے کہ کفار و منافقین کی اطاعت نہ کی جائے ۶۸
— اس کا تقاضا ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے ۵۴۸
— متقین کے لیے اللہ کا وعدہ ۳۶۶
— اللہ ہی متقین کا ولی ہے ۵۸۷
(لفظ ولی کی تشریح کے لیے دیکھو ''ولی'')
— متقین کا انجام نیک ۳۴۴-۳۶۶-۳۸۱-۵۴۹-۵۶۱
— تقوی کے نتائج ۱۳۵-۴۴۹
— متقیوں اور فاسقوں کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۳۳۱-۳۳۲
— حضورؐ کو سب سے پہلے خود تقوی اختیار کرنے کا حکم تھا ۳۶۴

تکبر

— معنی و تشریح ۴۲۷-۴۲۸
— تکبر کے مظاہر اور اس کی مذمت ۱۸-۱۹
— اللہ کی آیات کی پیروی کو اپنی شان سے فروتر سمجھنا ۴۰۹-۴۱۰-۵۹۳
— کتاب اور رسولؐ کی پیروی کو اپنی شان سے فروتر سمجھنا ۳۸۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— اپنے عقائد پر اصرار کرنے کی بات بنتا ہے ۳۶۱

— نفس کا تکبر ایمان لانے میں مانع ہوتا ہے ۶۰۲-۶۰۸

— انکار آخرت کی وجہ تکبر ہے ۴۰۵-۵۹۳-۶۱۳

— اللہ کی بندگی سے منہ موڑنا ۴۱۸-۴۲۰

— فرعون متکبر تھا ۴۰۵

— تکبر کے اخلاقی نتائج ۴۰۹-۴۱۰

— "تکبر" اور "کفر" کا لزوم ۱۸۱- ۳۸۴- ۴۰۵-۴۰۹-۴۱۶-۴۲۷-۴۲۸

— متکبرین کا انجام بد ۳۸۴-۴۲۷-۴۲۸-۶۱۳

— مومن تکبر نہیں کرتے ۴۵

تلمود

— اس کی بے سروپا روایات ۳۳۶

— اس کا حضرت موسیٰ کی زندگی کے اہم ترین واقعے سے خالی ہونا ۴۰۴ (نیز دیکھو "بائبل")

توبہ

— معنی و تشریح ۵۰۳

— اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے ۱۳۶-۳۹۱

— اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے ۵۰۳

— "توبہ قبول کرنا" اور "گناہ معاف کرنا" دونوں ہم معنی نہیں ہیں ۳۹۲

— توبہ کے بغیر بخشش کی روایت صرف مومنین کے لیے ہے ۳۹۲

توحید

— اس کی تشریح اور اس کی حقیقت ۴۹۳-۶۱۰- ۶۱۲-۶۱۷

— توحید اور شرک میں فرق ۴۰۷-۴۱۳

— اس کے دلائل ۱۱-۱۲-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵- ۳۲-۳۷-۳۸ تا ۴۱-۴۷-۴۹-۱۷۳- ۱۹۹-۲۰۰-۲۱۶-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴ تا ۲۲۶-۲۳۱-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۳-۲۵۴- ۲۵۶ تا ۲۶۲-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۹-۳۰۴- ۳۰۵-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۲- ۳۷۰-۳۷۶-۳۷۷-۳۹۸-۴۰۱-۴۱۸- ۴۲۲ تا ۴۲۶-۴۳۰-۴۴۲ تا ۴۴۴-۴۶۰- ۴۶۱-۴۷۸-۴۷۹-۴۹۲-۴۹۳ تا ۴۹۶-۴۹۵- ۴۸۲-۵۰۳-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۸-۵۰۹- ۵۲۵ تا ۵۲۸-۵۳۳-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۵- ۵۶۰ تا ۵۶۲-۵۶۶-۵۶۹-۵۷۰ تا ۵۷۳-۵۸۱ تا ۵۸۵

— (توحید کے دلائل کی تعداد کی حیثیت کے دلائل ہیں اس لیے ہم نے ان کا الگ عنوان قائم نہیں کیا)۔

— اللہ کی حکمت اور اس کی شان خلاقی پر دلالت کرنے والی نشانیاں ۲۳۱

— عقیدۂ توحید انسان کو بے چوں قبول کرنا چاہیے ۱۹-۲۰

— وہ دین حق کی اصل بنیاد ہے ۵۷۴

— اس کو اختیار کرنا حقیقت کے عین مطابق ہے ۲۹

— اس کی صداقت کا نقش ہر انسان کے نفس میں موجود ہے ۲۵-۲۲-۳۷-۳۸۱-۵۶۱

— عقیدۂ توحید کے نتائج ۳۵-۳۹۸-۴۴۱- ۴۵۷-۴۶۰-۵۷۶-۶۱۳-۶۱۶-۶۱۸- ۶۱۷-۵۹۱-۶۰۵

— [illegible]

— [illegible]

— انسانوں کے اندر اتفاق و اتحاد صرف توحید ہی کے اعتقاد میں ممکن ہے ۳۵۷

— تمام انبیا توحید ہی کی تعلیم دیتے رہے ہیں ۳۸۱-۴۴۷

— عقیدۂ توحید کو اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ دنیا میں غالب ہو کر رہنا ہے ۳۱۶-۳۱۷

— صرف توحید ہی کی پیروی کر کے آدمی اللہ کی رحمت کا مستحق ہو سکتا ہے ۴۸۱-۴۸۳

— توحید پر استقامت کی صورت میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے مدد کرتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں مومن کے ساتھی ہوں گے ۴۵۴-۴۵۵

تورات

— وہ اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو عطا کی گئی ۴۹-۴۱۵-۴۶۴-۶۰۸

— اس کی تعلیم نہایت واضح تھی ۳۰۲

— وہ رحمت اور ہدایت بن کر آئی تھی ۶۰۸

— وہ اہلِ دانش کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۱۵

— بنی اسرائیل اس کے وارث بنائے گئے تھے ۴۹-۴۱۵

— جب تک بنی اسرائیل نے اس پر ایمان رکھا اور صبر و استقامت سے جمے رہے انھیں دنیا کی امامت حاصل رہی ۴۹-۵۰

— اس کے ماننے والے خود اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴-۴۹۵

— اس میں تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی حرمت ۱۸۰-۱۸۱

— تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کے پیرو تھے ۱۸۰

— قرآن وہی تعلیم لایا ہے جو تورات میں آئی تھی ۶۰۸

— اس کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی تھی جس طرح قرآن کی کی گئی ۴۶۴ (نیز دیکھو ''بائبل'')

توکل

— اس کے معنی اور اس کی حقیقت ۶۸-۶۹-۵۰۷

— اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ۶۸-۱۰۸

— اللہ ہی پر توکل کیوں کرنا چاہیے ۳۷۳-۳۷۴

— توکل علی اللہ کا اخلاقی نتیجہ ۳۷۳-۳۷۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۱۲-۴۱۶-۴۶۰-۴۸۵-۵۶۵-۵۶۶

— دین میں توکل علی اللہ کی اہمیت ۵۰۷

ث

ثمود - ۴۰۸

— ان پر اچانک عذاب آیا ۴۴۷

— ان پر نزولِ عذاب کی وجہ ۳۲۲-۴۴۷-۴۴۹

— حق کے انکار کے لیے ان کی حجتیں ۴۴۷

— ان میں سے صاحبِ ایمان لوگ بچا لیے گئے ۴۴۹

ج

جادو

— معجزے اور جادو کا فرق ۴۰۳

جاہلیت

— معنی اور تشریح ۹۱

جدال

— کج بحثی اور بحث برائے تحقیق کا فرق ۳۹۱-۳۹۳

— اللہ کی آیات کے مقابلے میں کج بحثی کا انجام ۳۹۱-۳۹۳

جزا و سزا

— اللہ کا بے لاگ قانون جزا و سزا ۸۷-۸۸-۳۰۶-۳۰۷ تا ۳۱۱-۳۲۵-۳۳۰-۳۶۴-۵۸۶-۵۸۷

— نیکی کی جزا اور بدی کی سزا کے معاملے میں اللہ کا ضابطہ ۲۰۶-۲۰۷-۲۶۶-۲۸۵-۴۱۰-۴۱۱-۴۵۳-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— کائنات کی تخلیق کے برحق ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس میں قانونِ مکافات ہو ۵۸۷-۵۸۸
— دنیا کی موجودہ زندگی میں بھی اللہ کا قانون مکافات کام کر رہا ہے ۵۰- ۱۲۳- ۱۳۳- ۱۹۲- ۱۹۳- ۲۳۰- ۲۳۱- ۲۴۱- ۲۵۵- ۲۵۶- ۲۹۰- ۲۹۱- ۳۰۶- ۳۱۹- ۳۲۲- ۳۶۳- ۳۶۹- ۳۷۸- ۳۷۹- ۳۸۰- ۳۹۳- ۴۰۱- ۴۰۲- ۴۰۸- ۴۱۲- ۴۱۳- ۴۲۸- ۴۲۹- ۴۳۰- ۴۳۱- ۴۴۷ تا ۴۴۹- ۴۵۰- ۴۵۱- ۵۰۵- ۵۰۶- ۵۲۵- ۵۳۴- ۵۴۱- ۵۴۵- ۵۴۶- ۵۶۵ تا ۵۶۸- ۶۱۶- ۶۱۷
— بہت سے قصوروں کی سزا دنیا میں نہیں دی جاتی ۵۰۵-۵۰۶
— انسان کو سزا اس کے اپنے عمل کی ملتی ہے ۳۹۹-۵۵۰
— انسان کو جزا و سزا اس کے عمل کے لحاظ سے ملتی ہے ۵۹۲-۶۰۹
— ہر ایک کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے ۶۱۲
— انسان کو سزا اس وقت دی جائے گی جب اس پر حجت پوری ہو چکی ہو گی ۵۵۰
— مومنِ صالح اور بدکار انسانوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا ۵۸۷-۵۸۸
— موت کے بعد اور قیامت سے پہلے بھی جزا و سزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۴۱۲
(نیز دیکھو ''برزخ'')
— جزا و سزا میں ظلم کی مختلف صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ ۴۰۰
— مومن کے اعمال کی جو کچھ جزا اللہ تعالیٰ نے مہیا کر رکھی ہے کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا ۴۶

جن

— ان کی حقیقت ۱۷۹-۱۹۰-۱۹۱
— جن اور انسان دو الگ قسم کی مخلوق ہیں ۴۵۲-۴۵۳-۶۱۲
— گمراہ انسان ان کی بندگی بجالاتے ہیں ۲۰۹
— وہ کیسے جن تھے جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۱۷۹- ۱۸۹ تا ۱۹۱- ۳۳۹
— مشرکینِ عرب جنوں کو اللہ کا شریک اور غیب داں سمجھتے تھے ۱۹۰-۱۹۱
— ان کا دائرۂ عمل زمین اور اس کے ماحول تک محدود ہے ۲۷۹-۲۸۰
— جنوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن سن کر ایمان لانا اور اپنی قوم میں تبلیغ اسلام کرنا ۵۹۶- ۵۹۸- ۶۱۸ تا ۶۲۰
— آپؐ کو جنوں کے قرآن سننے کا علم نہیں ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے بعد میں وحی کے ذریعے سے آپ کو اس سے مطلع کیا ۶۱۸
— یہ جن حضرت موسیٰ اور تورات پر پہلے سے ایمان رکھتے تھے ۶۱۹
— بعد میں جنوں کے وفود رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آنحضورؐ کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتے رہے ۶۱۹- ۶۲۰
— جنوں میں بھی انسانوں کی طرح منکرینِ آخرت موجود ہیں اور انھیں بھی اس حرکت کی سزا دی جائے گی ۶۱۲
— ''جن'' بمعنی ''فرشتہ'' ۳۱۲

جنت

— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۱۰- ۴۷- ۲۰۷- ۲۳۴- ۲۸۵- ۲۸۶- ۳۴۴- ۳۶۶- ۳۸۴- ۴۱۱- ۴۵۴ تا ۴۵۶- ۵۰۰- ۵۰۷- ۵۴۹- ۵۷۲- ۶۰۹- ۶۱۱ تا ۶۱۲
— اس کی نعمتوں کی کیفیت اور تفصیلات ۲۰۷-

۲۳۴ تا ۲۳۷-۲۶۶-۲۸۵ تا ۲۸۷-۳۴۴-
۳۶۶-۵۰۰-۵۴۹-۵۷۲-۵۷۳
— وہاں مومن جو چاہے گا اسے ملے گا اور اس کی ہر تمنا پوری ہوگی ۴۵۶-۵۰۰-۵۷۲
— اس کا دوام ۱۱-۲۰۷-۲۰۸-۲۳۴-۲۳۷-
۳۴۴-۳۴۵-۳۶۶-۳۸۴-۳۸۵-
۳۹۵-۴۱۱-۴۴۲-۴۵۶
— جنت کا اجر بہتر اور پائدار ہے ۵۰۷
— اس کی نعمتوں کی حیثیت ۱۱
— جنت کا کھانا غذا کے طور پر نہیں، صرف لذت کے لیے ہوگا ۲۸۶
— حور و غلمان کی تشریح ۲۷۶-۲۸۷-۵۷۲
— اس کی شراب کی کیفیت ۲۸۶-۲۸۷
— اہلِ جنت زمین کے وارث ہوں گے ۳۸۵
— جنت میں اہلِ جنت جہاں چاہیں گے اپنا گھر بنائیں گے ۳۸۵
— جنت میں اہل جنت کے داخلے کا منظر ۳۸۴
— جنت کے منتظم اہلِ جنت کا کس طرح استقبال کریں گے ۳۸۴
— جنتیوں پر اللہ تعالیٰ بھی سلام بھیجتا ہے ۱۰۵-۲۶۶
— وہاں انسان کو حیات جاوداں ملے گی ۱۱-۲۸۸-
۲۸۹-۳۹۵-۵۴۹-۵۷۲-۵۷۳-۶۰۹
— وہاں نہ کوئی مشقت ہوگی نہ اہل جنت کو کبھی تکان لاحق ہوگی ۲۳۷
— جنت کے دروازوں کی کیفیت ۳۴۴-۳۸۴
— شہید کے لیے جنت کی بشارت ۲۵۴
— اہل جنت کی باہم گفتگو ۲۸۷
— اہل جنت اور اہل دوزخ کی باہمی گفتگو ۲۸۸
— مومن جنت میں داخل ہوکر اللہ کا شکر ادا کریں گے ۲۳۶-۲۸۸-۳۸۵-۳۹۶
— وہاں صالح لوگوں کو ان کے صالح والدین، صالح اولاد اور صالح بیویوں کے ساتھ یکجا کر دیا جائے گا ۳۴۵-۳۹۵-۳۹۶-۵۴۹
— دنیا میں کیے ہوئے اعمال کی وجہ سے جنت ملے گی ۴۶-۴۷-۵۴۹-۶۰۹
— جنت کا ملنا صریح کامیابی ہے ۵۷۳-۵۹۵
— کوئی شخص اللہ کے فضل کے بغیر محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت نہیں پاسکتا ۵۰۰-۵۷۳
— مومنین صالحین کو جنت عطا کرنا اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۳۴۵-۳۶۶-۳۹۵

جنگ (دیکھو''جہاد'' اور''قانون اسلام''،''قانون صلح و جنگ'')

جنگ احد - (دیکھو''غزوۂ احد'')

جنگ احزاب - (دیکھو''غزوۂ احزاب'')

جنگ بنی قریظہ - (دیکھو''غزوۂ قریظہ'')

جہاد فی سبیل اللہ
— اس سے جی چرانے والے منافق ہیں ۷۶-۸۰ تا ۸۲
— عورتوں کا جہاد کیا ہے؟ ۹۰
— اندرونی دشمنوں کے استیصال کے لیے جہاد ۱۳۱
— اندرونی دشمنوں (منافقوں) کا جرم ۷۶-۷۷
— جنگ میں دشمن کو دھوکا دینا جائز ہے ۶۱-۶۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''قانون اسلام، قانون صلح و جنگ'')

جہنم
— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۴۴-۴۵-۴۷-
۱۱۳-۱۳۶-۲۰۹-۲۳۷-۲۶۸-۲۸۳-
۲۸۸-۲۸۹-۳۱۲-۳۳۱-۳۴۵-۳۴۹-

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۶۲-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۲-۳۸۱-۳۸۴-
۳۹۳-۴۱۱-۴۱۸-۴۲۶-۴۲۷-۴۴۹-
۴۵۳-۴۶۲-۵۱۳-۵۵۰-۵۷۱-۵۹۳-
۵۹۴-۶۱۳-۶۲۰-۶۲۱
— کافروں کو جہنم کی سزا کیوں دی جائے گی ۳۹۷-۴۲۷-۵۵۰
— اس کے عذاب کی کیفیت ۲۰-۴۷-۱۳۳-
۲۳۷-۲۸۹-۲۹۰-۳۴۵-۳۶۵-۳۶۸-
۳۸۱-۴۲۷-۴۴۶-۴۶۸-۵۱۳-۵۴۸-
۵۵۰-۵۷۱-۵۸۱تا۵۸۳-۶۱۳
— اس کا دوام ۴۵-۱۳۳-۱۳۴-۲۳۷-۴۲۷-
۴۲۸-۴۵۳-۵۱۳-۵۵۰
— کفار اس میں ہمیشہ کے لیے داخل کیے جائیں گے ۳۸۴
— اللہ کا یہ قول کہ میں شیطان اور اس کے پیروؤں سے جہنم کو بھر دوں گا ۴۴-۴۵-۳۴۹
— اس میں مشرکین کے ساتھ ان کے جھوٹے معبود بھی ڈالے جائیں گے ۲۸۳
— وہاں کفار سے طنزاً ان کے جعلی معبودوں کے متعلق سوال کیا جائے گا ۴۲۷
— وہاں کفار اپنے پیشواؤں کو کوسیں گے ۱۳۴
— وہاں پیشواؤں اور پیروؤں کا باہمی جھگڑا ۲۰۵-
۲۸۴-۳۴۵-۳۴۶-۴۱۳-۴۱۴
— وہاں کفار یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ جن اہلِ ایمان کو وہ دنیا میں برا سمجھتے تھے وہ جہنم میں نہیں ہیں ۳۴۶
— اس میں کافروں کے داخلے کا منظر ۳۸۴
— وہ کفار پر مسلط کر دی جائے گی ۳۷۷
— اس کے منتظم فرشتوں اور اہلِ جہنم کی گفتگو ۳۸۴-۴۱۴-۵۵۰
— وہاں عذاب میں کمی نہ ہوگی اور مجرمین اس میں مایوس پڑے رہیں گے ۵۵۰
— کفار جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی زندگی کے خاتمے کی دعا کریں گے ۵۵۰
— وہاں مجرموں کی کوئی دعا قبول نہ ہوگی ۴۱۴
— کافروں کو نہ جہنم سے نکالا جائے گا اور نہ معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا ۵۹۴
— وہاں مجرموں کے لیے کھانے کا کیا سامان ہوگا ۲۸۹-۳۴۵-۵۷۱
— ان کے پینے کے لیے کیا سامان ہوگا ۴۲۷
— کافروں کو بتایا جائے گا کہ تم بڑے عزت دار بنے پھرتے تھے، لو اب یہ ہی وہ چیز ہے جس کے آنے میں تم شک کرتے تھے ۵۷۱-۵۷۲
— جہنم اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی ۴۵۳
— جہنم انجام ہے کافروں کی دنیا میں نافرمانیوں اور ناحق تکبر کا ۴۵-۶۱۳
— دوزخیوں نے خود ہی اپنے آپ کو جہنم کے قابل ثابت کیا ۵۵۰
— یہ مسئلہ کہ آیا گنہگار مومن جہنم میں جائیں گے یا نہیں ۲۳۵-۲۳۶
— کافروں کے آگے جہنم ہے ۵۸۲
— دوزخی جب کبھی باہر نکلنا چاہیں گے دوبارہ اس میں دھکیل دیے جائیں گے ۴۷
— ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا ۱۳۴

ح

حبط اعمال-
— اس کے وجوہ ۷۹-۸۰
— شرک آدمی کے تمام اعمال ضائع کر دیتا ہے ۳۸۲

حجاب

— آیت حجاب ۱۲۱
(تفصیل کے لیے دیکھو" قانون اسلام")

حدیث
— احادیث کو جانچنے میں روایت استعمال کرنے کا صحیح طریقہ ۷۲- ۷۳- ۱۴۳- ۱۴۴- ۳۳۴- ۳۳۵- ۳۳۷- ۳۳۸
— اللہ نے خود روایتِ حدیث کا حکم دیا ہے ۹۲ تا ۹۴
— اللہ سنت رسول کو حکمت سے تعبیر فرماتا ہے ۹۲-۹۴
— حدیث کس طرح قرآن کی تشریح کرتی ہے ۹- ۱۰- ۴۶- ۷۰- ۷۱- ۷۲- ۹۰- ۹۱- ۹۵- ۹۷- ۱۰۷- ۱۰۸- ۱۱۲- ۱۲۵- ۱۲۷- ۱۲۸- ۱۳۵- ۱۳۶- ۱۴۰ تا ۱۴۳- ۱۵۴ تا ۱۶۲- ۱۸۱ تا ۱۸۵- ۲۰۳- ۲۱۸- ۲۳۵- ۲۳۶- ۲۶۵- ۲۸۶- ۲۸۷- ۳۲۳- ۳۲۴- ۳۴۱- ۳۴۲- ۳۵۶- ۳۵۷- ۳۶۰- ۳۶۱- ۳۷۴- ۳۸۲- ۳۸۳- ۴۱۳- ۴۲۰ تا ۴۴۲- ۴۵۰- ۴۵۱- ۴۵۴- ۴۵۹- ۴۶۶- ۵۰۵- ۵۰۶- ۵۰۸- ۵۲۸- ۵۵۳- ۵۷۲- ۵۷۳- ۶۰۹

حکم
— معنی اور تشریح ۵۸۶

حکمت
— دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر گزار ہو ۱۲-۱۴
— حکمت سے مراد سنت رسولؐ ۹۲-۹۴

حکمت تبلیغ
— ۲۰۰ تا ۲۰۲- ۲۴۷- ۲۴۸- ۲۵۳- ۲۵۴- ۴۳۵- ۴۳۶- ۴۵۶ تا ۴۶۰- ۴۸۲- ۴۸۳- ۴۹۵- ۴۹۶- ۵۱۵- ۵۳۹- ۵۵۳- ۵۵۴- ۵۷۷

حلال وحرام- (دیکھو" قانون اسلام")

حمد
— معنی وتشریح ۱۷۳

حنیف
— حنفا سے مراد عرب کے وہ لوگ ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں بھی توحید کے قائل تھے ۳۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو"عرب")

حور- (دیکھو"جنت")

خ

ختم نبوت- ۲۰۳
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھولنے کے لیے قادیانیوں کی غلط تاویلات ۷۴- ۷۵
— آیت خاتم النّبیین کی مفصل تشریح ۱۰۳- ۱۰۴- ۱۳۸ تا ۱۵۴
— مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ بغاوت کی بنا پر نہیں بلکہ نبوت کے جھوٹے دعوے کی بنا پر کی گئی تھی ۱۴۵
— ختم نبوت کا معاملہ کس قدر اہم ہے ۱۵۱-۱۵۲
— نئی نبوت کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے ۱۵۲-۱۵۳
— اب نئی نبوت امت کے لیے رحمت نہیں لعنت ہے ۱۵۳-۱۵۴
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ ثانی سے مہر ختم نبوت کے ٹوٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۱۶۴- ۱۶۵

خسران
— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۳۸۱- ۳۸۲- ۵۹۲- ۶۱۲
— انسان کے خسارے میں پڑنے کی اصل وجہ ۴۵۱-۴۵۲
— انسان کے لیے اصل گھاٹے کا سودا کیا ہے؟ ۳۶۴- ۳۶۵- ۵۱۳

خشوع
— معنی وتشریح ۹۵-۹۶

خلافت
— امامت سے مراد خلافت ۱۳۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ نے زمین میں انسان کو خلافت عطا کی ۱۳۵-۲۳۸
— انسانی خلافت کی حقیقت ۱۳۵ تا ۱۳۷-۴۸۳
— حکومت کے فرائض ۳۲۶-۳۲۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''امانت''، ''اسلامی ریاست'' اور ''قانونِ اسلام''، ''دستوری قانون'')

خواب - انبیا کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵

د

داود علیہ السلام
— ان کا قصہ ۳۲۳ تا ۳۳۱
— ان کو اللہ تعالیٰ نے کیا غیر معمولی طاقتیں عطا کی تھیں ۱۷۸-۳۲۳-۳۲۴
— ان کے حالات ۱۷۸
— دنبیوں کے مقدمے کا واقعہ اور اس کی تحقیق ۳۲۴ تا ۳۳۱
— ان پر زنا کی جھوٹی تہمت ۳۲۷ تا ۳۲۹
— کیا ان کی ننانوے بیویاں تھیں؟ ۳۳۰-۳۳۱
— ان کی صفات عالیہ ۳۲۳
— ان کے لیے تقرب کا مقام اور بہترین انجام ہے ۳۲۶
— پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی ۳۲۳-۳۲۴
— ان کو مضبوط سلطنت، حکمت اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی گئی تھی ۳۲۴
— ان کو حکمرانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایات ۳۲۷
— لوہا ان کے لیے نرم کیا گیا تھا، اس سے آپ کیا کیا کام لیتے تھے ۱۷۸

دجال - ۱۵۴ تا ۱۶۹

درود
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم اور اس کی تشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸
— درود کے متعلق لوگوں کے شبہات و اعتراضات اور ان کا جواب ۱۲۵ تا ۱۲۷
— غیر انبیا کے لیے درود کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۲۷-۱۲۸

دعا
— غیر اللہ سے دعا اور استمداد شرک ہے ۲۳۹-۴۰۱-۴۱۹-۴۲۴
— اللہ دعائیں قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے مزید دیتا ہے ۵۰۳
— دعا صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے ۳۹۸-۴۱۸-۴۲۴
— دعائیں قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کے جملہ اختیارات اللہ ہی کے پاس ہیں ۴۱۸
— دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے ۴۲۰-۴۲۱
— اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود دعائیں سننے والا نہیں ہے ۲۲۶-۲۲۷-۴۱۹
— مشرکین کے معبودوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ کون ان سے دعا کر رہا ہے ۶۰۲-۶۰۳
— اللہ کے سوا دوسروں سے دعائیں مانگنے والے جہنم میں جائیں گے ۴۱۸-۴۲۰
— غیر اللہ کو پکارنا دنیا اور آخرت دونوں میں لاحاصل ہے ۴۱۱
— دعائیں سننے اور ان پر کوئی کارروائی کرنے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ۴۱۹-۶۰۲
— اللہ سے دعا مانگنے کے آداب ۴۲۱
— عبادت اور دعا ہم معنی ہیں ۴۱۸- ۴۲۰ تا ۴۲۲-۴۲۴
— دعا کے مسئلے پر مفصل بحث ۴۱۸ تا ۴۲۲
— قرآنی دعائیں ۵۲۸-۶۱۱
— کیسے لوگوں کی دعا قبول کی جاتی ہے ۵۰۳

دعوتِ حق
— اس کا صحیح طریقہ ۲۰۰ تا ۲۰۲-۲۱۷

(نیز دیکھو "حکمتِ تبلیغ" اور "اقامتِ دین")

دل

— قرآن کی زبان میں دل سے کیا مراد ہے ۴۱-۴۲

دنیا

— وہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر وجود میں نہیں آئی ہے ۲۳۱-۲۳۲

— دنیوی زندگی دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے لیے انسان کو دیا گیا ہے ۴۴-۴۵-۲۳۷-۲۳۸

— حیاتِ دنیا کی حقیقت ۲۶-۲۰۷-۳۴۳-۳۶۶-۳۶۷-۴۱۰-۵۰۶

— دنیا کی زندگی آخرت میں ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہ محسوس ہوگی ۶۲۱

— اس کے مصائب کی اخلاقی حیثیت ۵۰۵-۵۰۶

— دنیا کی موجودہ زندگی میں بھی اللہ کا قانونِ مکافات کام کر رہا ہے (دیکھو "جزا و سزا")

— صرف دنیا چاہنے والے، اور آخرت کے لیے کوشش کرنے والے کی سعی اور اس کے نتائج کا فرق ۳۸۱-۴۹۸-۴۹۹

— دنیا و آخرت کی کامیابی کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳

— خدا کے نافرمان اپنے حصے کی نعمتیں دنیا ہی میں پا لیتے ہیں، آخرت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ۶۱۳

— دنیوی زندگی میں آدمی کا امتحان کس طرح لیا جا رہا ہے ۳۷۸ (نیز دیکھو "آزمائش")

— انسان دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو سے کس کس طرح دھوکا کھاتا ہے ۲۶-۲۷-۳۸-۳۹-۲۲۰-۳۹۳-۳۹۴-۵۸۳-۵۹۴-۶۱۶

— دھوکا کھانے والوں کا انجام ۵۹۴

— دنیا کی کمائی کفار کے کسی کام نہ آئے گی ۵۸۳

— دنیا کے مال و متاع کی حقیقت ۵۰۶-۵۳۷-۵۳۸

— دنیوی نعمتیں اس بات کی علامت نہیں کہ نعمت پانے والا اللہ کا محبوب ہے ۲۰۶-۲۰۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۶۷

— دنیا کی دولت انسانی فضل و شرف کا معیار نہیں ہے ۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸

— اس خیال کی غلطی کہ ایمان داری اور راست بازی اختیار کرنے سے آدمی کی دنیا برباد ہو جاتی ہے ۳۶۳

— دنیا کی زندگی میں جو کچھ دیا جا رہا ہے، انسان کو امتحان کے طور پر دیا جا رہا ہے ۲۰۷-۳۷۸

— دنیا کے مادی وسائل خدا کی پکڑ سے انسان کو نہیں بچا سکتے ۲۱۱

— دنیا میں چھوٹے چھوٹے عذاب انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ۴۷-۴۸

— دنیا کے ذرائع کی تقسیم میں اللہ کی پوشیدہ حکمت ۵۳۶ تا ۵۳۸

دوزخ - (دیکھو "جہنم")

دہریت - (دیکھو "توحید" اور "شرک")

دین

— معنی و تشریح ۳۵۵-۳۵۶-۴۰۴ تا ۴۰۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۹۸-۴۹۹

— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی حقیقت ۴۷۵-۴۷۶

— اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا حکم ۳۵۵-۳۶۴-۳۸۴-۳۹۷-۳۹۸-۴۲۴

— دینِ خالص اللہ کا حق ہے ۳۵۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— مشرکینِ عرب تک مصیبت کے وقت دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی سے دعا مانگنے لگتے تھے ۴۵
— دین میں تفرقہ برپا کرنے کا مطلب اور اس کی ممانعت ۴۸۶-۴۹۲
اس میں تفرقہ رونما ہونے کی وجہ ۴۹۳-۴۹۴-۵۸۶-۵۸۷
— دینِ حق ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے ۴۷۶-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷
— دین میں بگاڑ رونما ہونے کی وجہ ۴۷-۴۹۲ تا ۴۹۵
— انسان کا اصل دین ایک ہی تھا اور دوسرے مذاہب اس میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے ۴۷۶-۴۹۲ تا ۴۹۵-۵۸۶-۵۸۷
— کسی کو راضی کرنے کے لیے دین میں تغیر نہیں کیا جا سکتا ۴۷۶-۴۹۵
— اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو ماننا بدترین شرک ہے ۴۷۶-۴۹۸
— یہ حرکت کرنے والوں کے لیے درد ناک عذاب ہے ۵۰۰
— دین کو قائم کرنے کا مطلب ۴۸۷-۴۸۸
— دین کو ''قائم کرنے'' اور ''قائم رکھنے'' ہی کے لیے تمام انبیاؑ آئے ۴۸۷
— دینِ حق صرف مان لینے کے لیے نہیں بلکہ زمین میں قائم اور نافذ ہونے کے لیے آیا ہے ۳۱۶-۳۱۷-۴۷۶-۴۸۶ تا ۴۹۲
— دین چند مذہبی امور اور عقائد و عبادات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ پورے نظامِ زندگی پر حاوی ہے ۴۸۸ تا ۴۹۲
— دین کو محدود رکھنے کے خطرناک نتائج ۴۸۹
— ''دین'' کے معاملے میں کس طرح غلط فہمی پیدا ہوئی ۴۹۰
— ''دین'' کو محدود کرنے کے خلاف سب سے بڑی دلیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ہے ۴۹۲
— دین کے معاملے میں بنی اسرائیل کو واضح ہدایات دی گئیں ۵۸۶
— امتِ محمدیہ کو بھی دین کے معاملے میں صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا گیا ۵۸۶
— دینِ حق کے مقابلے میں کفار کی حجت بازیاں اور جھگڑے باطل ہیں ۴۹۶
— دین کی بنیاد اگر قیاس و گمان کے بجائے علم پر رکھنی ہو تو پھر اس کا ذریعہ وحیِ الٰہی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ۴۱۸
— ''دین'' بمعنی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ اور اس کی حاکمیت کے آگے تسلیم و اطاعت ۳۵۵-۳۶۴-۴۲۴
— ''دین'' بمعنی قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور نظامِ فکر و عمل ۴۹۸
— ''دین'' بمعنی محاسبہ و جزائے اعمال ۲۸۲-۳۴۹
— دین ایک جامع اصطلاح بمعنی نظامِ زندگی جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرے ۴۰۴-۴۸۶

ذ

ذکر
— اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب ۹۶-۹۷-۱۰۳-۱۰۴
— ذکر بمعنی نصیحت ۳۶۷
— اللہ کا ذکر سن کر جس کا دل اور سخت ہو جائے اس کے لیے تباہی ہے ۳۶۷

ذوالکفل علیہ السلام - ۳۴۳

ر

رب۔
— معنی وتشریح ۳۵۹

رب العالمین۔ دیکھو"اللہ" اور "الٰہ"

رزق
— "رزق" یعنی جنت کی نعمتیں ۲۸۵
— "رزق" بمعنی بارش ۳۹۷-۳۹۸
— رزقِ کریم ۸۷
— طیباتِ رزق سے کیا مراد ہے ۴۲۳-۴۲۴
— رزق کی تقسیم کا خدائی انتظام ۴۹۷-۴۹۸-۵۰۴-۵۳۶-۵۳۷
— رزق کی تقسیم کا انتظام کن مصلحتوں کے تحت ہو رہا ہے ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۳۷۹-۵۰۴-۵۳۶ تا ۵۳۸
— اللہ کے رزق سے مراد رزقِ حلال ہے ۴۵-۴۶-۵۱۱
— اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرنے کا مطلب ۴۵-۵۰۸-۵۱۰-۵۱۱
— اللہ کی شانِ رزاقی ۲۰۸-۴۴۲-۴۴۳
— رزق کی تنگی وکشادگی اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۴۸۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "تقدیر")

رسالت، رسول۔ (دیکھو "نبوت")

روح
— بمعنی وحی ۳۹۸-۵۱۶
— انسان میں روح پھونکے جانے کا مطلب ۴۱
— روح کو موت کے وقت اللہ ہی قبض کرتا ہے ۳۷۵
— روح کا نیند میں قبض کیا جانا ۳۷۵
— روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے ۴۳

روزہ
— روزہ تمام شریعتوں کا جز رہا ہے ۴۹۰-۴۹۱
— روزے کا حکم ۹۵-۹۶

ز

زکوٰۃ
— اس کے ادا کرنے کا حکم ۹۲
— اس کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ ۴۴۱
— دین میں اس کی اہمیت ۷
— زکوٰۃ اگرچہ تمام شریعتوں کا جز رہی ہے لیکن اس کے احکام تمام شریعتوں میں الگ رہے ہیں ۴۸۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "انفاق فی سبیل اللہ" اور "قرآن، اس کا معاشی تصور")
— زقوم ۲۸۹-۵۷۱

زمین۔ اس کو دو دن میں بنایا گیا ۴۴۲
— اس کی تخلیق وتدبیر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے اور توحید وآخرت کے دلائل ۱۱-۱۲-۱۹-۲۲-۲۳-۳۷-۳۸-۵۰-۱۷۳-۱۷۶-۱۷۷-۲۰۰-۲۱۹-۲۲۳-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۶ تا ۲۵۹-۲۷۳-۳۳۱-۳۵۹-۳۶۶-۳۸۱-۴۱۷-۴۲۳-۴۴۲ تا ۴۴۵-۴۶۱-۴۸۵-۵۰۴-۵۱۵-۵۲۵ تا ۵۲۷-۵۵۱-۵۵۲-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۹ تا ۵۸۱-۵۸۳-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰
— اس میں انسانی زندگی کے لیے اللہ کے پیدا کردہ موافق حالات بھی توحید کی دلیل ہیں ۴۳۰
— بے جان زمین میں کس طرح جان دار نباتات پیدا ہوتے ہیں ۲۵۷
— زمین پر پانی کے دو ذخیروں کی الگ الگ خاصیتیں اور فوائد ہیں ۲۲۵-۲۲۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس میں پہاڑوں کے جمانے جانے کی حکمت ۱۱-۴۴۲
— زمین کی برکتوں سے کیا مراد ہے؟ ۴۴۲
— اللہ نے زمین پہلے بنائی یا آسمان؟ ۴۴۵
— زمین کوانسان کے لیے گہوارہ بنایا گیا ۵۲۵

زندگی بعد موت

— ایک روز یقیناً مردوں کو زندہ کیا جائے گا ۲۴۸
— اس کے منکر جہنم میں جائیں گے ۲۸۸
— مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے ۲۳-۲۵۴ تا ۲۵۶
— قیامت کے روز مردوں کے جی اٹھنے کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶
— قیامت کے روز انسان اسی طرح زندہ ہوکر زمین سے نکل کھڑے ہوں گے جیسے بارش سے روئیدگی نکلتی ہے ۲۲۳
— قیامت کے روز انسان اپنے موجودہ جسم کے ساتھ دوبارہ اٹھایا جائے گا ۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷
— اس کے امکان اور وقوع کے دلائل ۲۳-۴۱-۴۲-۴۳-۲۲۳-۲۷۲-۲۷۳-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۴۶۱-۵۲۷
— قیامت کے روز صور کی آواز پر سب اٹھ کھڑے ہوں گے ۳۸۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''برزخ''، ''حشر''، ''قیامت'')

زیدؓ بن حارثہ

— ان کے مفصل حالات ۹۹
— ان کے ساتھ حضرت زینبؓ کا نکاح اسلامی نظام معاشرت میں انسانی مساوات کا بہترین مظاہرہ تھا ۶۴-۶۵-۹۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ'')

زینبؓ ام المومنین

— ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ۹۴
— یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا ۱۰۱
— اس حکم نکاح کی مصلحت اور وجہ ۱۰۱-۱۰۲
— ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر معترضین کے اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۹۸-۱۰۴-۱۱۲-۱۱۳
— ان کو حضرت زیدؓ سے نکاح سخت ناگوار تھا اور صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے انھوں نے قبول کیا تھا ۹۸-۱۰۰
— حضرت زیدؓ نے کس وجہ سے ان کو طلاق دی ۱۰۰
(نیز دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

س

سبا

— قوم سبا کا قصہ ۱۹۱ تا ۱۹۹

سجدہ

— کسی کو سجدہ کرنا اس کی عبادت کرنے کا ہم معنی ہے ۴۶۰
— غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت ۴۶۰
— سجدۂ تلاوت کی آیت ۴۵-۳۲۵-۴۶۱
— آیت سجدہ پڑھنے اور سننے والا صرف رکوع بھی کرسکتا ہے ۳۲۶
سحر- (دیکھو ''جادو'')

سریہ-

— سریہ اور غزوہ کا فرق ۵۴

سلام-

— معنی وتشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنے کا مطلب ۱۲۳ تا ۱۲۸
— غیر انبیا کے لیے صلوٰۃ و سلام کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات - ۱۲۸
— تمام رسولوں پر سلام - ۳۰۵-۳۱۴
— آخرت میں مومنین کا استقبال سلام سے ہو گا ۱۰۴-۱۰۵

سلیمان علیہ السلام

— ان کا قصہ ۱۷۹ تا ۱۸۹- ۳۳۳ تا ۳۳۹
— ان کے بعد بنی اسرائیل کا بگاڑ ۳۰۲ تا ۳۰۵
— ان کے عمل سے تصاویر اور مجسموں کے جواز پر استدلال غلط ہے ۱۸۰- ۱۸۱ (تفصیل کے لیے دیکھو "تصویر")
— ان سے بنی اسرائیل کی عداوت ۱۸۰-۱۸۱
— ان پر بنی اسرائیل کی تہمتیں ۳۳۶
— ان کی والدہ پر بنی اسرائیل کی تہمت ۳۲۷- ۳۲۹
— ان کے سامنے گھوڑوں کے پیش کیے جانے کا واقعہ اور اس کی حقیقت ۳۳۲ تا ۳۳۵
— ان کی آزمائش ۳۳۳- ۳۳۵ تا ۳۳۸
— ان کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالنے کا واقعہ اور اس کی حقیقت ۳۳۵ تا ۳۳۸
— وہ غیر معمولی قوتیں جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی تھیں ۳۳۸- ۳۳۹
— وہ جن جو ان کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۱۷۹- ۱۸۹ تا ۱۹۱- ۳۳۹
— ان کے لیے ہوا بھی مسخر کی گئی تھی ۳۳۸
— ان پر اللہ تعالیٰ کی وہ خاص عنایات جن میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے ۳۳۹
— وہ اللہ کے بہترین بندے اور کثرت سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے ۳۳۲
— ان کے لیے تقرب کا مقام اور بہترین انجام ہے ۳۳۹
— ان کی دعا ۳۳۵
— انگشتری سلیمان محض ایک افسانہ ہے ۳۳۶

سماعِ موتیٰ

— اس کی حقیقت ۶۰۳

سنت - (دیکھو "حدیث")

ش

شاہد - (دیکھو "شہادت")

شب برات

— نصف شعبان کی رات کے متعلق یہ غلط فہمی کہ وہی قسمتوں کے فیصلے کرنے کی رات ہے ۵۶۰

شراب

— اس کے نقصانات ۲۸۷
— جنت کی شراب اور دنیا کی شراب کا فرق ۲۸۶- ۲۸۷

شرع

— معنی و تشریح ۴۸۶
— وہ اللہ کی میزان ہے جو انصاف قائم کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے ۴۹۷
— تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے ۴۹۸- ۴۹۹

شرک

— شرک اور توحید میں فرق ۳۷۰- ۳۷۱
— اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنی چاہیے ۳۵۵- ۳۶۴- ۴۲۴
— اس کے سوا کسی سے دعا مانگنا شرک ہے ۴۱۸- ۴۲۰- ۴۲۴
— اس کے سوا دوسروں کو مدد کے لیے پکارنا باطل اور شرک ہے ۲۴- ۲۳۹- ۴۰۱- ۴۲۴- ۴۲۷
— شرک کی بدترین اور مکمل ترین صورتیں ۴۱۹- ۴۷۶
— شرک کی بنیاد یقین پر نہیں بلکہ شک پر ہے ۲۱۴- ۵۶۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— شرک کی نامعقولیت ۲۷۹
— مشرکین ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں ۲۳۹-۲۴۰
— انسان جس کی بھی بے چون و چرا عبادت کرے اس کو وہ دراصل اپنا معبود بناتا ہے ۵۸۹
— اللہ کے ہاں کسی کو ذریعۂ تقرب سمجھ کر اس کی بندگی کرنا بھی شرک ہے ۳۵۷-۶۱۷-۶۱۸
— کسی کو اللہ کی اولاد قرار دینا شرک ہے ۵۳۰
— اللہ کی طرف اولاد منسوب کرنے کے عقیدے کی تردید ۳۵۷-۳۵۸
— اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرنے والوں کی حماقت ۵۳۰
— مشرکینِ عرب کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا ۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰ تا ۵۳۲
— غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو ماننا بدترین شرک ہے ۴۷۶-۴۹۸-۵۰۰
— اللہ کے سوا کسی کو ولی بنانا شرک ہے ۴۸۰
(نیز دیکھو ''ولی'')
— اللہ کے بجائے دوسروں کو اپنا ولی بنا کر آدمی اللہ کی رحمت سے محروم ہوجاتا ہے ۴۸۱-۴۸۳
— مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں ان کی آخرت میں کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱
— کسی نبی اور کسی کتابِ الٰہی نے شرک کی تعلیم نہیں دی ۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۴۰-۶۰۱-۶۰۲
— اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی مختلف صورتیں ۵۳۰
— مشرکین اپنے شرک کی کیا توجیہیں کرتے ہیں ۳۵۷-۶۱۷-۶۱۸
— شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ ۵۵۲
(نیز دیکھو ''شفاعت'')
— مشرک انسان دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتا ہے ۳۶۲
— جنھیں اللہ کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے ان کی شرکت کا کوئی علمی ثبوت نہیں ہے ۴۱۱
— مشرکین کے اس فلسفے کا ابطال کہ اپنے معبودوں کو سجدہ کر کے وہ دراصل ان کے خالق کو سجدہ کرتے ہیں ۴۶۰-۴۶۱
— مشرکینِ عرب خود مانتے تھے کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ ہی ہے ۵۵۲
— وہ مانتے تھے کہ اللہ ہی کائنات کا خالق ہے ۲۲-۳۷۳-۳۷۴-۵۲۵
— وہ مانتے تھے کہ رزق دینے والا اللہ ہے ۲۰۰-۲۰۱
— وہ مانتے تھے کہ کائنات کا مالک و پروردگار اللہ ہی ہے ۵۶۱
— مشرکین کے معبودوں نے نہ زمین میں کچھ پیدا کیا ہے نہ آسمان و زمین کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے ۱۲-۲۳۹-۶۰۱
— مشرکین کے معبودوں کی اقسام ۲۸۳-۶۰۳
— مشرکین کی اصل گمراہی کیا ہے ۲۲
— شرک کی خلاف قرآن کے دلائل ۱۱-۱۲-۱۳-۱۵-۲۲-۲۳-۲۴-۳۲-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۴-۲۱۶-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴ تا ۲۲۶-۲۲۷-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۳-۲۵۴-۲۹۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۱۱-۳۱۲-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۲-۳۷۶-۳۸۲-۴۰۱-۴۱۱-۴۲۲ تا ۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۴۲-۴۶۰-۵۱۵-۵۴۳-۵۵۱-۵۵۲ تا ۵۵۴-۵۵۷-۵۶۰ تا ۵۶۲-۶۰۱-۶۰۲-۶۱۷-۶۱۸
(شرک کی تردید کے دلائل دہریت کی تردید کے دلائل بھی ہیں، اس لیے ان کا عنوان ہم نے الگ قائم نہیں کیا)

— شرک کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ۲۳۹
— اس کو اختیار کرنے میں آدمی کا اپنا نقصان ہے ۲۱۹
— انسان کو کسی کی خاطر بھی شرک نہ کرنا چاہیے ۱۶
— شرک محض جھوٹ ہے ۳۵۷-۳۵۸
— شرک ظلم عظیم ہے ۱۵
— شرک کرنے والے ''کاذب'' اور ''کافر'' ہیں ۳۵۸
— جو شخص اللہ کی قدر پہچانتا ہے وہ کبھی شرک نہیں کرسکتا ۳۸۲
— وہ اللہ کی ناشکری ہے ۲۷۰-۳۵۷-۳۵۸-۵۳۰
— شرک کا ہر عقیدہ دراصل اللہ پر کسی نقص کا الزام ہے ۲۵۸
— شرک کیسا جرمِ عظیم ہے ۴۷۸-۴۷۹
— مشرکین کے معبود ان کی مدد کرنے کے بجائے خود ان کی خدمت کے محتاج ہیں ۲۷۱
— مشرکین اللہ کی نسبت اپنے معبودوں سے زیادہ محبت رکھتے ہیں ۳۷۶-۳۷۷
— مشرکین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ناگوار گزرتی تھی ۴۹۳
— مشرکین سے ان کے جعلی معبودوں کی بابت استفسار کیا جائے گا ۴۲۷-۴۶۶-۴۶۷
— مشرکین کے معبود قیامت تک ان کی دعاؤں کا جواب نہیں دے سکتے بلکہ وہ بے خبر ہیں کہ کوئی ان کو پکار رہا ہے ۲۰۲-۲۰۳
— قیامت کے روز مشرکین کے معبود ان سے براءت کا اظہار کریں گے ۴۶۷-۶۰۳
— خدا کا عذاب دیکھ لینے کے بعد مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کرتے ہیں ۴۷۱
— آخرت میں مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۴۲۷-۴۶۶-۴۶۷
— وہاں مجرمین ان سفارشیوں کو کہیں نہ پائیں گے جن کے بھروسے پر وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے ۴۶۷
— مشرکین کے اولیا آخرت میں ان کے کسی کام نہ آئیں گے ۵۸۳-۵۸۴
— وہاں مشرکین خود مان لیں گے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے ۴۶۶-۴۶۷
— شرک کی فطرت ہی یہ ہے کہ اس میں لوگ کبھی متفق نہیں ہوسکتے ۳۵۷-۳۵۸
— شرک کے ساتھ کوئی عمل صالح نہیں ہوسکتا ۳۸۲
— مشرک اپنے کسی عمل پر اجر کا مستحق نہیں ہوسکتا ۳۸۲
— انسانی زندگی پر شرک کے اثرات ۳۷۰-۳۷۱
— اس کا لازمی نتیجہ جہنم کی آگ ہے ۴۱۱
— اس کے نتائج آخرت میں ۲۰۹
— شرک کا انجامِ بد ۲۸۳ تا ۲۸۵-۳۰۵-۳۹۷
— مشرکین کا انجامِ بد ۱۳۶-۴۲۷-۴۴۱-۴۴۷ تا ۴۵۲-۴۶۸-۵۰۰-۵۳۴
— آخرت میں مشرکین کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے ۴۶۷
— مشرکین کے معبودوں سے متعلق آلِ فرعون کے مومن کا بیان ۴۱۱
— شرک کی اصل وجہ انکارِ آخرت ہے ۳۷۶-۴۴۱
— ان مشرکین کے لیے تباہی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں ۴۴۱
— مشرکین آخرت میں اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے لیکن وہ آ کر رہے گا ۵۰۰
— اللہ اس شرک سے بالاتر ہے جو مشرکین کرتے

Maktaba Tul Ishaat.com

ہیں ۳۸۲
— شرک خدا کے مقابے میں ایسی جسارت ہے کہ جس پر اگر آسمان پھٹ پڑیں تو بعید نہیں ۴۷۸
— انسانی شرک کے جواب میں اللہ تعالیٰ سے فرشتے درگزر کرنے کی درخواست کرتے ہیں ۴۷۸-۴۷۹
— شرک کا حکم اگر والدین دیں تو اسے نہ ماننا چاہیے ۱۶

شریعت

— شریعتِ اسلام دنیا کے تمام انسانوں کے لیے بصیرت کی روشنی ہے لیکن جو اس کی صداقت پر ایمان لائے وہی اس سے ہدایت پاسکتا ہے اور اسی کے لیے وہ رحمت ہے ۵۸۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کو دین کے معاملے میں صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا گیا ہے ۵۸۶-۵۸۷
— کیا اللہ کی بھیجی ہوئی مختلف شریعتیں باہم متضاد ہیں؟ ۴۹۰-۴۹۱ (نیز دیکھو ''اصول فقہ'')

شفاعت

— اس کا مشرکانہ عقیدہ اور اس کا ابطال ۲۵۴-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۵۵۲
— اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرسکتا ۳۸-۱۹۹-۲۰۰
— شفاعت کے متعلق اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق ۲۰۰-۳۷۶
— آخرت میں کون سفارش کرسکے گا اور کس کی کرسکے گا؟ ۵۵۲

شک

— اس سے کس طرح گمراہی کا آغاز ہوتا ہے ۴۹-
۱۹۴-۲۱۴-۴۹۷-۵۴۷

شکر

— معنی وتشریح اور اس کے تقاضے ۱۴-۲۵-۴۱-۴۲-۱۸۹-۱۹۳-۱۹۴-۲۷۱-۵۰۶
— اللہ کی نعمتوں سے متمتع ہونے کا لازمی تقاضا ۳۸۲-۴۲۲-۵۸۳
— دین میں شکر کی اہمیت ۲۵-۱۹۳-۱۹۴-۵۰۶
— ناشکری کیا ہے؟ ۲۱۹
— شرک اللہ کی ناشکری ہے ۵۳۰
— کفر اللہ کی ناشکری ہے ۳۶۱
— اللہ کی نعمتیں کھا کر اللہ ہی کی بندگی سے منہ موڑنا ناشکری ہے ۲۵۶-۲۵۸
— اللہ اس کو پسند کرتا ہے کہ انسان شکر کا رویہ اختیار کرے ۳۶۱
— اللہ کا شکر ادا کرنا خود شکر کرنے والے ہی کے لیے مفید ہے ۱۲-۱۴-۳۶۱
— ناشکری کی سزا انسان کو کیسے دی جاتی ہے؟ ۱۹۲-۱۹۳

شہادت

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس معنی میں شاہد ہیں ۱۰۵تا۱۰۹
— دوسرے انبیا کس معنی میں گواہ ہیں؟ ۱۰۷
— آخرت میں لوگوں کے اعمال پر کس کس طرح شہادت قائم کی جائے گی؟ ۱۰۶-۱۰۷-۲۶۸-۲۶۹-۳۸۳-۳۸۴-۴۱۴-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۵۱۴-۵۹۲
— حق کی شہادت کا مفہوم ۵۵۳
— شہید کے لیے جنت کی بشارت ۲۵۴
— شہید بمعنی گواہ ۱۰۵-۱۲۲-۴۷۱-۶۰۴
(قانونِ شہادت کے لیے دیکھو ''قانونِ اسلام'')

شوریٰ

— اسلامی نظامِ زندگی میں شوریٰ کی اہمیت، اس کا حکم اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰

شیطان

— وہ مردود ہے ۳۴۹
— اس کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے ۳۴۸
— اس کی پہنچ عالمِ بالا تک نہیں ہے ۲۷۹-۲۸۰
— اس کو قیامت تک انسانوں کو بہکانے کے لیے مہلت دی جاتی ہے ۳۴۹
— اس کو انسان پر کوئی اقتدار عطا نہیں کیا گیا ہے ۳۴۰
— وہ انسان کا دشمن ہے ۲۲۰- ۲۶۶- ۲۶۷- ۳۴۸- ۳۴۹- ۵۴۸
— وہ انسان کو جہنم کا مستحق بنانا چاہتا ہے ۲۲۰-۲۲۱
— انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اس کی چالیں ۱۹۴-۲۲۰
— اس کے فریب سے بچنے کے لیے اللہ ہی سے پناہ مانگنی چاہیے ۴۵۸- ۴۵۹
— وہ انسان کا بدترین ساتھی ہے ۵۳۸
— وہ آدمی کو قیامت پر ایمان لانے سے روکتا ہے ۵۴۸
— آخرت میں انسان اس کی پیروی کرنے پر پچھتائے گا ۵۳۸
— آخرت میں شیطان اور اس کے پیرو انسان یکساں مبتلائے عذاب ہوں گے ۳۴۹- ۵۳۸- ۵۳۹
— اس کی پیروی کرنے والا دراصل خدا کے بجائے اس کی عبادت کرتا ہے ۲۶۶- ۲۶۷
— اللہ کے چیدہ بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا ۳۴۹
— کیسے لوگوں پر اس کا بس چلتا ہے ۵۳۸
— اس کی پیروی کرنے والے انسانوں کے لیے جہنم ہے ۳۴۹
— دعوتِ حق کو ناکام کرنے کے لیے اس کی چالیں ۴۵۹
— شیاطینِ جن ۲۰۹- ۲۱۰
— وہ شیاطین جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۳۳۹
— وہ حضرت ایوبؑ کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے ۳۴۰
— یومِ آخر تک شیطان لعنت زدہ ہے اور عذابِ الٰہی کا مستحق ۳۴۹
— جہنم کو شیطان اور اس کے پیروؤں سے بھر دیا جائے گا ۳۴۹- ۳۵۰

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ابلیس'' اور ''انسان'')

ص

صبر

— معنی و تشریح ۲۵- ۵۰- ۹۵- ۹۶- ۱۹۳- ۱۹۴- ۳۶۳- ۳۶۴- ۴۵۸- ۴۵۹- ۵۰۶- ۵۴۷- ۵۴۸- ۶۲۱
— دین میں اس کی اہمیت ۱۷- ۲۵- ۴۹- ۵۰- ۹۵- ۹۶- ۱۹۳- ۱۹۴- ۴۱۵- ۴۲۸- ۴۵۸- ۵۰۶- ۵۱۲- ۶۲۱
— صبر کرنا اولوالعزمی کا کام ہے ۵۱۲
— اس کی برکات اور نتائج ۴۵۸- ۴۵۹
— راہِ خدا میں مصائب برداشت کرنے والوں کا اجر ۳۶۳- ۳۶۴
— عدمِ تحمل اور بے جا اشتعال شیطان کی اکساہٹ کا نتیجہ ہوتا ہے ۴۵۸- ۴۵۹
— حضرت ایوبؑ کا صبر ۳۳۹ تا ۳۴۳

صحابۂ کرامؓ

— ان کا خلوص اور ان کی جان نثاریاں ۵۵- ۶۰- ۶۱- ۶۲- ۶۳- ۸۱ تا ۸۳

Maktaba Tul Ishaat.com

صحیفہ- کتاب اور صحیفہ کا فرق ۲۳۱

صدقہ

— اس کے معنی ۹۵-۹۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'')

صراطِ مستقیم

— صراطِ مستقیم کیا ہے ۲۶۶-۲۶۷-۴۴۱-۵۴۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے ۵۱۷
— سیدھے راستے پر کون لوگ ہیں ۷-۸

صلوٰۃ

— بمعنی دعائے رحمت ۱۰۴-۱۰۵-۱۲۳-۱۲۴
— بمعنی رحمت و مہربانی ۱۰۴-۱۰۵-۱۲۳-۱۲۴
(صلوٰۃ بمعنی نماز کے لیے دیکھو ''نماز'' اور بمعنی درود کے لیے دیکھو ''درود'')

صور

— نفخِ صور کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۳۸۲-۳۸۳

ض

ضلالت

— اللہ جسے گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ راست نہیں دکھا سکتا ۵۱۲-۵۱۳-۵۸۹
— ضلالت اختیار کرنا انسان کی اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ہے ۳۷۵
— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸-۳۷۳-۴۰۸
— کیسے لوگ گمراہ ہیں ۱۲-۹۸-۶۲۰
— اللہ کیسے لوگوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے ۴۰۸-۴۰۹-۴۲۷-۵۱۲-۵۱۳-۵۳۸-۵۸۹
— اللہ کے کسی کو گمراہی میں پھینک دینے کا مطلب ۲۲۱-۲۲۲-۵۸۹
— کیسے لوگ ہدایت سے محروم رہتے ہیں ۴۱۰-۴۴۹
— ضلالت و ہدایت کے معاملے میں تقدیر کو بہانہ بنانے کی مذمت ۲۶۳-۵۳۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''تقدیر'')
— اسبابِ ضلالت ۸-۹-۱۰-۲۰-۲۱-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۴۲-۱۳۴-۱۷۶-۱۹۴-۱۹۵-۲۰۴ تا ۲۰۶-۲۴۹ تا ۲۵۲-۲۵۳-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۶ تا ۲۶۸-۲۹۰-۳۱۱-۳۲۷-۳۶۰-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۷-۴۰۴-۴۰۸ تا ۴۱۰-۴۲۳-۴۲۶ تا ۴۲۸-۴۳۱-۴۵۱-۴۵۲-۴۶۴-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۱-۴۷۶-۴۹۷-۵۰۴-۵۱۴-۵۱۵-۵۲۱-۵۳۲ تا ۵۳۸-۵۴۴-۵۴۵-۵۵۷-۵۶۱-۵۶۲-۵۷۶-۵۸۰-۵۸۲-۵۸۹-۵۹۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۶-۶۰۸-۶۱۷-۶۱۸
— خدا اور رسول کی نافرمانی صریح ضلالت ہے ۹۸
— دلیل کے بغیر محض دوسروں کی تقلید میں کوئی عقیدہ اختیار کرنا ضلالت ہے ۵۵۲-۵۵۳
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''علم'')
— برائی کو خوبی سمجھنا انتہائی گمراہی ہے ۲۲۱-۲۲۲-۴۱۰
— گمراہی کا سب سے بڑا سبب ۵۸۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور ''ہدایت'')

ط

طاغوت

— معنی و تشریح ۳۶۵
— طاغوت کی بندگی سے اجتناب اور صرف اللہ کی بندگی پر ہی انسان کی نجات منحصر ہے ۳۶۵

ظ

ظلم- ظالم- ظالمین

— معنی اور حقیقت ۱۵-۲۸۲-۲۸۳-۳۰۱-۴۰۰-
۴۶۵-۴۶۶-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۸-۶۰۹
— حق کو نہ ماننا ظلم ہے ۲۳۷
— کبرِ نفس کی بنا پر ایمان لانے سے انکار کرنا ظلم ہے ۶۰۶
— کسی دلیل کے بغیر کوئی عقیدہ اختیار کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا ظلم ہے ۲۳۹-۲۴۰
— حقیقت کے خلاف عقیدہ رکھنا ظلم ہے ۱۲
— شرک کس بنا پر ظلمِ عظیم ہے ۱۵
— اللہ کی یاد سے غفلت اور شیطان کی پیروی ظلم ہے ۵۳۸-۵۳۹
— خدا کی ناشکری کرنا ظلم ہے ۱۹۳
— غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کا ماننا ظلم ہے ۴۹۸ تا ۵۰۰
— گمراہی پر ہٹ دھرمی ظلم ہے ۳۶۸
— اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانا ظلم ہے ۴۸۱-۴۸۲ (تشریح کے لیے دیکھو "ولی")
— ظالم کون لوگ ہیں ۲۸۳-۵۱۲-۵۸۷
— سب سے بڑا ظالم کون ہے اور اس کا انجام کیا ہے ۴۷-۳۷۲
— ظالم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے ۵۸۷
— اللہ کی آیت سے نصیحت قبول نہ کرنے والے ظالم ہیں ۴۷
— شرک کرنے والے ظالم ہیں ۲۰۹
— جان بوجھ کر حق سے منہ موڑنے والے ظالموں کا انجام ۵۱۲-۵۱۳
— لوگوں پر ظلم کرنے والوں کا انجام ۵۱۲-۵۱۳
— آخرت میں ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۳۷
— جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور سچائی کو جھٹلائے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ۳۷۲
— حضرت عیسیٰ کی مخالفت کرنے والے، اور ان کی عقیدت میں غلو کرنے والے، دونوں گروہ ظالم ہیں ۵۴۸
— ظالم اللہ کی رحمت سے محروم ہیں ۴۸۱-۴۸۲
— ظالموں کا کوئی ولی و مددگار نہیں ہے ۴۸۲
— اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ۵۱۱
— اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ۶۰۶
— قرآن ظالموں کے لیے تنبیہ ہے ۶۰۸-۶۰۹
— ظالموں کا انجامِ بد ۵۰۰-۵۳۹-۵۴۸
— جو شخص ظلم کا بدلہ لے وہ قابلِ ملامت نہیں بلکہ ظلم کرنے والا قابلِ ملامت ہے ۵۱۲

ظہار - (دیکھو "قانونِ اسلام")

ع

عائشہ ام المومنینؓ
— آپؓ پر بعض اہلِ تشیع کا بے جا طعن ۲۷
— جنگِ جمل میں شرکت پر ان کا افسوس ۹۰

عاد - ۳۲۲-۴۰۸-۴۴۷
— قدیم عرب کی قوموں میں وہ سب سے زیادہ طاقت ور قوم تھی ۹۱۳
— ان کا اصل وطن احقاف تھا اور یہیں سے وہ پھیلے ۶۱۵
— انھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت سے جہالت برتی ۴۴۷-۶۱۵-۶۱۶
— ان کا قصہ ۶۱۳ تا ۶۱۷
— ان پر نزولِ عذاب کی وجہ ۳۲۲-۴۴۷-۴۴۸-۶۱۶
— ان کے عذاب کی کیفیت ۴۴۸-۴۴۹-۶۱۶
— ان پر اچانک عذاب آیا ۴۴۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ اسی عذاب کے پھیر میں آ گئے تھے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۶۱۷

عبادت

— معنی وتشریح ۳۵۵
— دعا اور عبادت ہم معنی ہیں ۴۱۸-۴۲۰-۴۲۴
— انسان جس کی بھی بے چون و چرا عبادت کرے اس کو وہ اپنا معبود بناتا ہے ۵۸۹
— کسی کو سجدہ کرنا اس کی عبادت کرنے کا ہم معنی ہے ۴۶۰
— اطاعتِ غیر اللہ کے لیے لفظِ عبادت کے استعمال کی مثالیں ۲۰۹-۲۱۱
— عبادت بمعنی ''غلامی و بندگی'' ۳۶۵
— عبادت بمعنی ''اطاعت'' ۲۶۶ تا ۲۶۸-۲۸۳
— عبادت بمعنی پرستش ۲۰۸- ۲۰۹- ۳۵۷- ۴۲۴-۶۰۳
— عبادت بمعنی ''غلامی و اطاعت و پرستش'' ۲۶۷-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۷-۴۶۰-۵۴۸-۶۱۵
— انسان کو ایک ہی اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے ۲۷۹-۳۸۲-۴۴۷
— عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہے ۳۵۵-۳۵۶
— اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے ۶۱۵
— غیر اللہ کی عبادت کیوں نہیں کرنی چاہیے؟ ۴۶۰
— اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب ۳۵۶
— اللہ کی عبادت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے ۲۷۹
— خالق کی بندگی کرنا سراسر عقل و فطرت کا تقاضا ہے ۲۵۳
— اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا جہالت ہے ۳۸۱
— صرف اللہ کی بندگی کرنا ہی سیدھا راستہ ہے ۲۶۷-۵۴۸
— اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے ۴۱۸

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''توحید''، ''دعا'' اور ''شرک'')

عدت - (دیکھو: ''قانونِ اسلام''، ''قانون نکاح و طلاق'')

عدل

— معنی اور تشریح ۴۹۵-۴۹۶

عذاب

— لوگوں کے مبتلائے عذاب ہونے کی اصل وجہ ۳۹۶-۳۹۸
— جب خدا کا عذاب آ جاتا ہے تو پھر مہلت نہیں ملتی ۵۱-۲۱۳-۳۱۹-۳۲۲
— عذاب سے پہلے حق جاننے کے لیے کافی مہلت دی جاتی ہے ۴۶۴
— خدا کا عذاب اچانک آتا ہے ۳۲۲-۳۸۰-۴۴۷
— دنیا میں عذاب کیسے لوگوں پر آتا ہے ۱۰-۳۲۲-۴۰۸-۴۳۱-۴۴۷ تا ۴۴۹-۵۴۱-۵۴۵-۵۴۶
— آخرت کے عذاب اکبر سے پہلے دنیا میں عذاب ادنیٰ ۴۷
— دنیا میں قوموں پر عذاب آنے کی وجہ ۵۰-۱۹۲-۱۹۳-۲۱۱-۲۳۱-۲۴۱-۲۵۵-۲۵۶-۲۹۰-۲۹۱-۳۰۶-۳۱۹-۳۲۲-۳۶۹-۳۷۸-۳۸۰-۳۹۳-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۸-۴۱۲-۴۱۳-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۴۷ تا ۴۴۹-۴۹۸ تا ۵۰۰-۵۲۵-۵۳۳-۵۳۴-۵۶۵ تا ۵۶۸-۶۱۶-۶۱۷
— قوموں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب خدا کی نشانیاں ہیں ۳۰۶-۴۰۱
— قوموں پر آنے والے دنیوی عذاب ان کے گناہوں کی اصل سزا نہیں ہیں ۳۹۳
— کافروں کے لیے عذاب کے دو مرحلے ہیں ۴۱۳

— قوموں پر جب عذاب آیا تو ان کے جعلی معبود کچھ کام نہ آئے ۶۱۷

— وہ عذاب جو دنیا میں آزمائش کے طور پر ڈالا جاتا ہے ۵۶۲-۵۶۳

— خدا کا عذاب ایسے رخ سے آتا ہے جدھر آدمی کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا ۳۶۹

— اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ۳۶۵-۳۶۶-۳۱۰-۴۰۱-۵۱۳-۶۲۰

— اللہ اسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے جو اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیتی ہے ۴۰۸

— اللہ کے عذاب سے کیسے لوگ بچتے ہیں؟ ۴۴۹

— کسی کے مرتبے کی بلندی اس کو عذاب سے نہیں بچا سکتی ۸۷-۸۸

— خدا کا عذاب دیکھ کر ایمان لانا نافع نہیں ہوتا ۵۱-۴۳۱

— عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان کے نافع ہونے کی واحد مثال ۳۰۹

— آخرت کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹-۱۰-۲۰-۲۱-۴۵-۴۷ تا ۴۹-۷۵-۱۲۳-۱۳۶-۱۷۵-۱۷۶-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۲۱-۲۲۴-۲۳۷-۲۴۶-۲۴۷-۲۸۵-۳۱۴-۳۲۷-۳۶۴-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۷-۳۸۴-۴۵۲-۴۵۳-۴۶۷-۴۶۸-۴۹۷-۴۹۸ تا ۵۰۰-۵۰۳-۵۰۴-۵۱۲-۵۱۳-۵۲۵-۵۳۹-۵۴۸-۵۵۰-۵۷۱-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۵-۶۲۱

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جہنم، کیسے لوگوں کے لیے ہے'')

— دہرا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۷-۸۸

— آخرت کے عذاب کی کیفیت ۳۶۸-۳۶۹

— آخرت کے عذاب کی سختی ۳۷۷

— دردناک عذاب ۷۵-۵۰۰-۵۸۲-۵۸۳

— دردناک دن کا عذاب ۵۴۸

— ذلت والا عذاب ۱۲۳-۵۸۲-۶۱۳

— آگ کا عذاب ۴۷

— بڑا عذاب ۴۷-۵۸۳

— حق کے مخالفوں کے لیے وہ رسوا کن عذاب ہے جو ٹلنے والا نہیں ۳۷۴-۳۷۵-۵۸۲

— خدا کے عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کی جائے ۳۸۰

— صرف ایمان ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ہے ۶۱۹

— دنیوی عذابوں کی کیفیت ۲۵۵-۴۰۸

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''جزا و سزا'')

عذابِ قبر- (دیکھو ''برزخ'')

عرب

— جاہلیت میں ان کی حالت ۲۴۶

— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب عقیدۂ توحید سے بالکل ناآشنا نہ تھے ۳۶-۳۷-۱۹۴

— عرب کا اصل دین ''دینِ ابراہیمی'' تھا بعد میں انھوں نے بت پرستی اختیار کی ۳۷-۵۳۴-۵۳۵

— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے انبیا ۳۶-۲۴۶

— عربوں میں شرک و بت پرستی کا آغاز کب ہوا ۳۷-۳۷۱

— ان کے جاہلانہ خیالات اور عقائد ۲۱۰-۳۱۱-۵۲۱-۵۳۰-۵۳۲-۵۳۳

— مشرکینِ عرب خود جانتے تھے کہ رزق دینے والا اللہ ہے ۲۰۰-۲۰۱

— وہ مانتے تھے کہ کائنات کا خالق اللہ ہی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۷۳-۳۷۴-۵۲۵
— وہ یہ بھی مانتے تھے کہ صرف ان کا ہی نہیں، ان کے معبودوں کا خالق بھی اللہ ہی ہے ۵۵۲
— وہ اللہ ہی کو کائنات کا مالک و پروردگار تسلیم کرتے تھے ۵۶۱
— وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے ۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰ تا ۵۳۲
— عورتوں کے متعلق زمانۂ جاہلیت میں ان کا نقطۂ نظر ۵۳۰
— وہ کسی آسمانی کتاب کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۲۰۴
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے وہ خود ایک نبی مانگ رہے تھے ۲۴۰-۲۴۱-۳۱۳
— عہدِ نبویؐ میں قبائلِ عرب کے علاقے ۵۷
— عرب میں صدیوں سے کوئی نبی نہیں آیا تھا ۳۵
(مزید تفصیل کے لیے ''قریش'')

عرش - ۳۸۵-۳۹۸-۵۵۱
— اس پر اللہ کا جلوہ فرما ہونا ۳۸

علم
— قرآن میں علم سے مراد کون سا علم ہے ۲۳۲
— علم رکھنے والے ہی خدا سے ڈرتے ہیں ۲۳۲
— علم کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرنا بڑی غلطی ہے ۹-۱۰-۵۸۶-۵۸۷
— بے جانے بوجھے کسی کو معبود مان بیٹھنا غلط ہے ۱۶
— علم کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑا کرنا غلط ہے ۲۰-۲۱
— باپ دادا کی اندھی تقلید گمراہی کی موجب ہے ۲۰-۲۱-۵۳۲-۵۳۳
— اصل علم حقیقت کا علم ہے اور اس سے محرومی جہالت ہے ۳۶۳
— علم کے بغیر کوئی عقیدہ اختیار کرنا صحیح نہیں ہے ۴۱۱-۵۷۷
— دلیل کے بغیر محض قیاس و گمان پر کوئی عقیدہ اختیار کرنا غلط ہے ۵۹۰-۶۰۱-۶۰۲
— غیبی حقائق کا علم صرف وحی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے ۴۱۷-۴۱۸
— رسولوں کے لائے ہوئے علم کے مقابلے میں اپنے دنیوی علوم میں مگن رہنا تباہی کا موجب ہے ۴۳۱
— علمی دلیل کے بغیر محض دوسروں کی تقلید میں کوئی عقیدہ اختیار کرنا غلط ہے ۱۶-۱۷-۲۰-۲۱-۲۹۰-۴۱۱-۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۵-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۷
— انسان کو وہ علم حاصل نہیں ہے جس سے وہ خدا کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے لیے صحیح راہِ حیات متعین کر لے ۵۶۰

علم غیب
— (دیکھو ''اللہ، غیب کا علم اللہ ہی کو ہے'')

عمل صالح
— معنی و تشریح ۶۱۱
— ایمان کے ساتھ اس کا تعلق ۱۰
— اس کے نتائج ۱۰
— اس کی اہمیت ۴۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

عورت
— جاہلیت میں عورتوں کے متعلق اہل عرب کا نقطۂ نظر ۵۳۰
— اسلامی نظامِ معاشرت میں اس کا صحیح مقام ۸۹ تا ۹۲-۱۲۱-۱۲۲-۱۳۱-۱۳۲

— عورتوں کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں کے لیے حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شرکت کو جواز بنانا صحیح نہیں ہے ۹۰-۹۱
— عورت کا جہاد کیا ہے ۹۰
— نیکی میں اس کا اجر مردوں کے برابر ہے ۹۴-۹۶ تا ۹۸-۴۱۱
— عورت بھی مرد کی طرح سزا و جزا کی مستحق ہے ۱۳۶
— عورتوں کے لیے زیورات کے استعمال کا جواز ۵۳۱-۵۳۲
— عورت کو بلاضرورت غیر مردوں سے بات کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے ۸۹-۹۰

عہد و پیمان

— اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس ضرور ہونی ہے ۷۳-۷۵-۷۸

عیسیٰ علیہ السلام

— ان کا قصہ ۵۴۶ تا ۵۴۸
— ان کی پیدائش ایک معجزہ تھی ۵۴۶
— وہ معجزے جو خدا نے ان کو عطا کیے تھے ۵۴۶-۵۴۷
— وہ صریح نشانیاں اور حکمت لے کر آئے ۵۴۸
— ان کے معاملے میں عیسائیوں اور یہودیوں میں اختلاف ۵۴۸
— ان کی مخالفت کرنے والے، اور ان کی عقیدت میں غلو کرنے والے، دونوں گروہ ظالم اور مستحق عذاب ہیں ۵۴۸
— ان کی آمد ثانی کا مسئلہ اور اس کے بارے میں قادیانیوں کی غلط تاویلات ۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۴ تا ۱۶۹
— حضرت عیسیٰ کے نزول کے بارے میں احادیث کا بیان ۱۵۴ تا ۱۶۲-۱۶۶
— ان کا نزولِ ثانی ایک نئے پیغمبر کی حیثیت سے نہ ہوگا بلکہ وہ ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے ۱۶۳-۱۶۴
— ان کے نزولِ ثانی پر تمام ملتوں کے اختلاف ختم ہو کر سب ملتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے ۱۵۵-۱۵۶-۱۶۰
— بنی اسرائیل نے ان کا انکار کیوں کیا؟ ۱۶۵
— وہ بنی اسرائیل کے لیے نمونہ بنائے گئے تھے ۵۴۶
— انھوں نے ان اختلافات کی حقیقت کھولی جو بنی اسرائیل میں برپا تھے ۵۴۸
— انھوں نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ اللہ سے ڈریں اور ان کی اطاعت کریں ۵۴۸
— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶-۵۴۷-۵۴۸
— ان سے پختہ عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵
— وہ قیامت کی نشانی کس معنی میں تھے ۵۴۷

عیسائیت

— اس کی بنیادی گمراہی ۱۵۵-۵۴۸
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آ کر اس کی تردید کریں گے ۱۵۵
— عیسائیوں کے شرک سے مشرکین عرب کا استدلال ۵۴۶
— عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے انحراف ۵۴۷-۵۴۸
— عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کی صاف صاف تعلیمات کے باوجود آپس میں اختلافات پیدا کیے، ان کے اس ظلم کی سزا دردناک دن کا عذاب ہے ۵۴۸
— حضرت عیسیٰ کے معجزات اور ان کی معجزانہ پیدائش کی بنا پر ان کو الوہیت کا درجہ دینا جہالت کا فعل ہے ۵۴۶-۵۴۷-۵۵۱
— اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو عیسائی کرتے ہیں ۵۵۱

Maktaba Tul Ishaat.com

غ

غزوۂ احزاب

— غزوہ اور سریہ کا فرق ۵۴
— اس غزوہ کے اسباب اور اس کی تاریخ ۵۴ تا ۶۲
— غزوۂ احزاب نے کھوٹے کھرے کو الگ الگ کر دیا ۶۰-۶۷-۸۱ تا ۸۳
— اس پر قرآن کا تبصرہ ۷۵ تا ۸۳
— اس تبصرے کا زمانۂ نزول ۷۵-۶۷
— غزوۂ احزاب کے موقع پر انصارِ مدینہ کی جان نثاری ۶۱
— اللہ کے وہ مخفی لشکر جنھوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کی مدد کی ۶۲-۷۵-۶۷

غزوۂ احد - اس کے اثراتِ مابعد ۵۴
— ان مشکل حالات میں حضورؐ کا تدبر ۵۵

غزوۂ بنی قریظہ

— اس کی تاریخ ۵۴-۵۸-۶۰ تا ۶۳
— بنی قریظہ کے خلاف جنگ کے وجوہ ۵۸-۶۰-۶۲-۶۳-۷۵-۶۷
— بنی قریظہ اور قریش میں کس طرح پھوٹ ڈالی گئی ۶۱-۶۲
— اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ کو بنی قریظہ نے خود ہی حکم بنایا تھا ۶۲
— بنی قریظہ کا محاصرہ حکم خداوندی کے تحت ہوا تھا ۶۲
— غزوۂ بنی قریظہ پر قرآن کا تبصرہ ۸۴

غزوۂ بنی النضیر - دیکھو "بنی النضیر"

غلامی

— اسلامی نظام معاشرت میں غلامی کی حیثیت ۶۴-۶۵
— لونڈی سے بر بنائے ملک تمتع کی اجازت ۱۱۳-۱۱۴
— تمتع کی اجازت کسی تعداد کی قید سے متقید نہیں ہے اور اس کے وجوہ ۱۱۸-۱۱۹
— اس کو کن حالات میں کن وجوہ سے جائز رکھا گیا ہے ۱۱۹
— غلاموں کی خرید و فروخت کن حالات اور کن وجوہ سے جائز رکھی گئی ہے ۱۱۹

غلمان - (دیکھو "جنت")

غنیمت - ۷۹-۸۴

غیبت

— اس کے معنی اور بہتان اور غیبت کا فرق ۱۲۸

ف

فاسق - (دیکھو "فسق")

فرشتہ

— مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا ۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰ تا ۵۳۲
— فرشتے خود اس شرک کی تردید کرتے ہیں ۳۱۲
— وہ آخرت میں اپنی عبادت کرنے والوں سے اظہار بیزاری کریں گے ۳۸۵
— فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے ۳۱۱
— ملائکہ پرستی کی سند کسی آسمانی کتاب میں نہیں دی گئی ۵۳۳
— فرشتوں کو عورت اور اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں کو آخرت میں اپنے اس فعل کی جواب دہی کرنی ہوگی ۵۳۲
— مشرکین ہر زمانے میں ان کو معبود بناتے رہے ہیں ۲۰۸-۲۰۹
— ان کی حقیقت اور ان کا کام ۴۳-۲۱۸-۲۷۸-۲۸۱-۳۱۱-۳۱۲
— عرش کے حامل فرشتے ۳۹۴
— عرش کے گرد و پیش رہنے والے فرشتے ۳۹۴

— وہ زمین والوں کی باغیانہ جسارتیں دیکھ کر اللہ سے درگزر کی درخواست کرتے ہیں ۴۷۸-۴۷۹
— فرشتوں کا قول کہ مومن نہیں بلکہ کافر ہی بھٹکائے جا سکتے ہیں ۳۱۲
— وہ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں ۳۹۴-۴۶۱-۴۷۸
— وہ خود جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے اور وہ صف بستہ خدمت گار اور رب العٰلمین کی تسبیح کرنے والے ہیں ۳۱۲
— وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ۳۹۴
— وہ اللہ کے مقرب ہیں ۴۶۱
— وہ کارکنان قضا و قدر ہیں جو اللہ کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں ۳۸-۳۹
— وہ اللہ کے بندے ہیں ۵۳۱
— وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پر وحی آنے کا ذریعہ ہیں ۵۱۶
— وہ اہل ایمان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں ۱۰۵-۳۹۴ تا ۳۹۶
— وہ مومنین کو جنت کی بشارت دیتے ہیں ۴۵۴
— وہ دنیا و آخرت میں کس کس طرح اہل ایمان کی رفاقت کرتے ہیں ۴۵۴-۴۵۵
— ان سے اولین انسان کو سجدہ کرایا گیا ۳۴۸
— انسان کی تخلیق کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور ابلیس میں مکالمہ فرشتوں کے توسط سے ہوا تھا ۳۴۷
— ''ملاءِ اعلیٰ'' سے مراد فرشتے ہیں ۳۴۷
— آخرت میں وہ عرش کے گرد حمد و تسبیح کریں گے ۳۸۵
— وہ فرشتے جو انسان کا نامۂ اعمال ثبت کر رہے ہیں ۵۵۱
— جہنم کا منتظم فرشتہ ۵۵۰
— رسول بمعنی فرشتہ ۵۵۱
— ''جن'' بمعنی فرشتہ ۳۱۲
— موت کا فرشتہ (دیکھو ''ملک الموت'')

فرعون

— میخوں والا فرعون ۳۲۲
— قصہ فرعون و موسیٰ علیہ السلام ۴۰۲-۴۱۳-۵۴۰ تا ۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۹
— وہ اللہ کو دیکھنے کے لیے ہامان کو ایک بلند عمارت بنانے کا حکم دیتا ہے ۴۰۹-۴۱۰
— اس کی سیاسی چالیں جن کی پیروی اب تک کی جا رہی ہے ۴۰۴ تا ۴۰۶-۵۴۵
— فرعون کی چال بازیاں اس کے اپنے لیے تباہی کی باعث ہوئیں ۴۱۰
— اس نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن اس کی چال اکارت گئی ۴۰۳-۴۰۴
— اس کا حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کرنا ۴۰۴
— اس کے وہ الزامات جو اس نے قتل کی سزا دینے کے لیے حضرت موسیٰ پر لگائے تھے ۴۰۴-۴۰۵
— اس کو حضرت موسیٰ سے یہ خطرہ تھا کہ وہ اس کی ''سیاسی خدائی'' ختم کر کے رکھ دیں گے ۴۰۴
— وہ فوق الفطرت خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا دعویدار تھا ۵۴۴
— حضرت موسیٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ رب العالمین کے سوا کوئی بھی کسی نوعیت کی خدائی نہیں رکھتا ۵۶۵
— اس کو حضرت موسیٰ پر ہاتھ ڈالنے سے کیا چیز روک رہی تھی ۴۰۵
— اس کی اپنی قوم کا ایک مومن بھرے دربار میں حضرت موسیٰ کی حمایت کرتا ہے ۴۰۵ تا ۴۱۲
— اس کے لیے اس کے برے عمل خوش نما بنا دیے

Maktaba Tul Ishaat.com

گئے اور اسے راہِ راست سے روک دیا گیا ۴۱۰
— وہ اپنی دولت و ثروت اور عزت و جاہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کو حقیر سمجھتا تھا ۵۴۱-۵۴۴
— اس نے اور اس کے اعیانِ سلطنت نے اللہ کی نشانیوں کا مذاق اڑایا ۵۴۰-۵۴۱
— اللہ نے اس کو اور اس کی قوم کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھائیں ۵۴۱
— اسے اور اس کی قوم کو ہوش میں لانے کے لیے سات عذاب پے در پے نازل کیے گئے مگر وہ سیدھی راہ پر نہ آئے ۵۴۱-۵۴۲
— کیا جادوگر بھی ایسے عذاب لا سکتے تھے؟ ۵۴۴
— فرعون کی ہٹ دھرمی اور بوکھلاہٹ ۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵
— فرعون کی قوم فاسق تھی اس لیے اس نے فرعون کی اطاعت کی ۵۴۵-۵۴۶
— فرعون اور آلِ فرعون کا انجام ۴۱۲-۴۱۳-۵۴۵-۵۴۶
— اس کا انجام باعث عبرت تھا ۵۶۷
— اس پر کوئی آنکھ نہ روئی بلکہ سب نے اس طرح اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو پہلو سے نکل گیا ۵۶۸-۵۶۹
— آل فرعون کی غرقابی کے بعد ان کا جانشین کسے بنایا گیا؟ ۵۶۷
— فرعون کی قوم کو کن لوگوں کا پیش رو قرار دیا گیا ہے؟ ۵۴۶
— فرعون کا حضرت موسیٰ کو ''اے ساحر'' کہنے سے متعلق تفسیری مباحث ۵۴۳-۵۴۴
— فرعون کا حضرت موسیٰ پر یہ اعتراض کہ یہ شخص تمھارا ''دین بدل ڈالنا'' چاہتا ہے، کس معنی میں تھا؟ ۴۰۵
— فرعون کو اعتراض تھا کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ سونے کے کنگن اور فرشتوں کے دستے کیوں نہیں اتارے گئے؟ ۵۴۴-۵۴۵
— وہ حد سے گزر جانے والوں میں بھی اونچے درجے کا مجرم تھا ۵۶۸
— اس کا اصل قصور ۵۴۵

فرقہ بندی

— اس کا آغاز کیسے ہوتا ہے ۴۹۳-۵۸۶-۵۸۷
— وہ ظلم ہے اور تفرقے برپا کرنے والوں کے لیے دردناک دن کا عذاب ہے ۵۴۸
— اللہ تعالیٰ تمام اختلافات کا فیصلہ قیامت کے روز کردے گا ۵۸۶
— دین اسلام کو فرقہ بندی سے بچانے کے لیے تدابیر و ہدایات ۵۸۶-۵۸۷
— اگر ہم فرقہ بندوں کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام میں رد و بدل کریں گے تو ہمیں خدا کے مواخذے سے کوئی نہ بچا سکے گا ۵۸۷
— فرقہ بندی کرنے والے ظالم ہیں ۵۸۷

فسق

— فاسقین کون ہیں؟ ۴۷-۴۴۵-۴۴۶
— فاسق قوم سے کیا مراد ہے؟ ۵۴۵-۵۴۶
— فاسقوں کا انجام بد ۴۷-۳۴۵-۶۱۳-۶۲۱
— فاسق و فاجر اور متقی برابر نہیں ہو سکتے ۴۶-۳۳۱-۳۳۲

فلاح

— اس کا مفہوم قرآن کی زبان میں ۸
— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے اور کن کے لیے نہیں

ہے ۷-۸ (نیز دیکھو ’’اخلاق‘‘)

فلک - معنی اور تشریح ۲٦۱

— آسمان اور فلک کا فرق ۲٦۱

(نیز دیکھو ’’آسمان‘‘)

ق

قادیانیت - (دیکھو ’’ختمِ نبوت‘‘ اور ’’عیسیٰ علیہ السلام‘‘)

— قادیانیوں کی نت نئی تاویلات پر ایک نظر ۱٦۹

قارون - ۴۰۲

قانونِ اسلام

— اصولِ قانون اور اصولی احکام

— شارع اور حاکم صرف اللہ ہے ۳۹۷-۴۸۳-۴۸۴-۴۸٦-۴۸۷-۴۹۸-۴۹۹

— اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کو صرف ایمان و عقائد اور چند مذہبی مسائل تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۴۸۴-۴۸۸ تا ۴۹۰

— اللہ کے فیصلوں اور احکام کو ماننے یا نہ ماننے پر کفر و اسلام کا دارومدار ہے ۴۸۴

— اللہ ہی قانون دینے والا ہے اور یہ قرآن اس کا قانون ہے ۴۸٦-۴۸۷

— اللہ کی تشریعات کی نوعیت آئین کی ہے ۴۸۷

— حکم صرف اللہ کے لیے ہے ۲۲٦-۳۹۷

— اس کے حکم کے بغیر کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے ۴۹۸-۴۹۹

— نبی کے احکام بحیثیتِ نبی اور بحیثیتِ انسان میں اصولی فرق ٦۱

— قانونی حقوق میں تمام اہل ایمان برابر ہیں ۸۳

— کوئی شخص کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا ۲۲۷-۲۲۸

— ہر شخص پر صرف اس کے ذاتی عمل کی ذمہ داری ہے ۳٦۱

— اسلامی قانون میں حیلوں کے جواز کی صحیح نوعیت ۳۴۰ تا ۳۴۲

— ناجائز حیلوں سے گناہ کو قانونی شکل دے کر آدمی قاضی کی گرفت سے بچ سکتا ہے مگر خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتا ۳۴۲

— نادانستہ فعل پر گرفت نہیں ہے، گرفت اسی بات پر ہے جو آدمی جان بوجھ کر بالارادہ کرے ۷۰

— کسی حکم سے پہلے جو کام اس کے خلاف ہوا ہو اس پر گرفت نہیں ہے ۱۳۱-۱۳۲

— کسی مسلمان کو خدا اور رسول کے مقابلے میں آزادیِ رائے استعمال کرنے کا حق نہیں ہے ۹۷-۹۹

— شریعت میں وہ سنت معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں مقرر فرمائی ہو اور جس پر صحابہؓ کا عمل ہو ۱۸٦

— اسلامی شریعت حلال و حرام کے درمیان واضح حد کھینچتی ہے، ان کے حدود کو مبہم نہیں چھوڑتی ۱۸۸-۱۸۹

— قانونِ اسلام میں کس طرح ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے ٦۱۱

— ’’عدل‘‘ اسلامی قانون کی بنیاد ۴۹۵

قانونِ صلح و جنگ اور بین الاقوامی قانون

— دوسروں کی زیادتی کا انتقام لینے کے بارے میں حدود و قواعد ۵۱۱-۵۱۲

— جنگ میں کس قسم کی چالیں جائز ہیں ٦۱-٦۲

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘)

Maktaba Tul Ishaat.com

تمدن و معاشرت اور تہذیب و ثقافت سے متعلق احکام

— اسلامی قانونِ معاشرت کی روح اور مقاصد ۱۳۱
— مغنیہ عورتوں کا گانا سننا حرام ہے ۹-۱۰
— تصاویر اور مجسموں کی حرمت ۱۸۰ تا ۱۸۹
— عورتوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا حرام ہے ۹
— عورتوں کے لیے زیور کے استعمال کا جواز ۵۳۱-۵۳۲
— مخلوط تعلیم اور مخلوط مجالس وغیرہ کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے ۸۹-۹۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۳۱-۱۳۲
— متبنّٰی کو حقیقی اولاد کی حیثیت حاصل نہیں ہے ۶۳-۶۴-۶۵
— کسی شخص کا نسب اس کے حقیقی باپ کے سوا کسی دوسرے شخص سے ملانا ممنوع ہے ۶۷
— پردے کے احکام ۶۵-۶۶-۶۷ تا ۹۲-۱۱۹ تا ۱۲۲-۱۲۹ تا ۱۳۲
— کن کن سے پردہ کرنے کا حکم نہیں ہے ۱۲۲-۱۲۳
— آیت حجاب، اس کا سبب نزول اور اس کی تشریح ۱۲۱-۱۲۲
— پردے کے احکام کی اصل غرض ۱۲۱-۱۲۲-۱۲۹-۱۳۱-۱۳۲
— چہرے کے پردے کا حکم ۱۲۹ تا ۱۳۲
— معاشرے میں میل جول کے احکام ۱۱۹ تا ۱۲۱
— زنا کی سزا دینے میں اسلام کس قدر احتیاط ملحوظ رکھتا ہے ۶۱۰-۶۱۱
— والدین کے حقوق ۱۵-۱۶-۶۰۹

قانونِ معیشت

— گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت ممنوع ہے ۹
— زیور کی زکوٰۃ کا حکم ۵۳۱
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "قرآن، اس کا معاشی نقطہ نظر")

قانونِ میراث

— حمل کی قلیل ترین مدت ۱۶-۶۱۰-۶۱۱
— متبنّٰی وارث نہیں ہو سکتا ۶۳-۶۴-۶۹
— میراث میں رشتہ دار ہی ایک دوسرے کے حق دار ہیں ۷۱-۷۳

دستوری قانون

— حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ۳-۲۷-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷
— انسانی حکومت حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہو کر ہی حاکم حقیقی کی خلافت (نیابت) قرار پا سکتی ہے ۳۲۶-۳۲۷
— شارع و قانون ساز صرف اللہ ہے ۴۹۸-۴۹۹
— مسلمانوں کی عدلیہ اور مقننہ کو لازماً خدا اور رسول کے احکام کی پابندی کرنی ہوگی ۹۷ تا ۹۹
— اللہ کی قانونی حاکمیت ۳۵۵-۳۶۴-۵۸۶-۵۸۷
— شوریٰ کا حکم، اس کی اہمیت اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰
— حکومت کے فرائض ۳۲۶-۳۲۷
— اختلافات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کو کرنا ہے ۴۸۳
— اولی الامر کی صفات
(۱) فاجر و فاسق نہیں بلکہ نیکو کار اور متقی پرہیزگار ہوں ۳۳۱-۳۳۲
(۲) معاملہ فہم اور دانا ہوں ۳۲۴
(۳) ذی علم ہوں ۳۶۳

(۴) خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرتے ہوئے حق کے ساتھ حکومت کریں ۳۲۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو" اسلامی ریاست")

قانونِ شہادت

— شہادت وہی معتبر ہے جو علم پر مبنی ہو ۵۵۲-۵۵۳

ضابطۂ عدالت

— حاکمِ عدالت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا ہے ۶۱۰

فوجداری قانون

— فوجداری قانون بھی دین کا حصہ ہے ۴۹۰
— حمل کی قلیل ترین مدت جس سے کم مدت میں اگر کوئی عورت نکاح کے بعد بچہ جنے تو وہ زانیہ شمار ہوگی ۱۶-۶۱۰-۶۱۱
— ارتداد کی سزا پر اجماع ۱۴۵
— مرتد اور باغی کے درمیان قانونی فرق ۱۴۵
— جھوٹی افواہیں پھیلا کر ملک کے نظام میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش مستلزم سزا ہے ۱۳۱-۱۳۳
— کن حالات میں جلاوطنی کی سزا دی جا سکتی ہے ۱۳۱-۱۳۳
— بوڑھے اور بیمار پر ضرب تازیانہ کی حد جاری کرنے کا طریقہ ۳۴۱
— کسی شخص پر جھوٹا الزام لگانا مستلزم سزا ہے ۱۲۳-۱۲۸-۱۲۹

قانون نکاح و طلاق

— رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت جس کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ۱۶-۶۰۹-۶۱۰
— نکاح کے اصطلاحی معنی ۱۰۹
— منہ بولے رشتے سے کوئی حرمت قائم نہیں ہوتی ۶۳-۶۴-۱۰۱-۱۰۲
— ظہار سے بیوی حرام نہیں ہوتی ۶۹-۷۰
— تخییر کا مفہوم اور اس کا قانون ۸۵ تا ۸۸
— خلوت سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں عدت نہیں ہے ۱۱۰
— خلوت سے پہلے شوہر کے مرجانے کی صورت میں عدت ساقط نہیں ہوتی ۱۱۰
— "طلاق قبل خلوت" کی صورت میں مرد کو رجوع کا حق باقی نہیں رہتا ۱۱۰
— خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں مہر اور متعہ طلاق کا حکم ۱۱۱
— طلاق کے بعد بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب ۱۱۱
— طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کے ساتھ معلق کرنا خدائی تشریع کی حکمت کے بالکل خلاف ہے ۱۱۱-۱۱۲
— طلاق قبل نکاح کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۱۱-۱۱۲
— شریعت طلاق کا کلی اختیار مرد کو دیتی ہے ۱۱۱
— عدت عورت پر شوہر کا حق ہے ۱۰۱-۱۰۲
— عدت، صرف شوہر ہی کا حق نہیں ہے بلکہ حق اللہ اور حق اولاد بھی اس میں شامل ہے ۱۱۰
— مرد کے مرنے یا طلاق کی صورت میں عدت ساقط نہیں ہوتی خواہ طرفین اس پر رضامند ہوں ۱۱۰-۱۱۱
— وہ مصالح جن کی بنا پر عدت لازم کی گئی ہے ۱۱۰-۱۱۱
— مسلمان مرد کی اہل کتاب بیوی کے معاملے میں طلاق، عدت اور مہر کے احکام ۱۱۰
— اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا مسلمان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے ۱۱۰
— منکوحہ بیویوں کے علاوہ لونڈی سے بر بنائے

Maktaba Tul Ishaat.com

ملک تمتع کی اجازت ۱۱۳-۱۱۴

— لونڈیوں سے تمتع کی اجازت کسی قید سے مقید نہیں ہے، اور اس کے وجوہ ۱۱۸-۱۱۹

— چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں حلال ہیں ۱۱۴

— تعددِ ازواج کا جواز ''ناگزیر شخصی ضروریات'' کے ساتھ مقید نہیں ہے ۱۱۶-۱۱۹

— کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلامہر نکاح کرلے ۱۱۴

— اسلامی شریعت اور عیسائی و یہودی شریعتوں کے احکام نکاح میں فرق ۱۱۴

قرآن

— اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ۳۴-۳۵-۲۴۵-۳۵۵-۳۶۷-۳۷۵-۳۹۱-۴۳۹-۴۴۱-۴۵۳-۴۶۳-۴۸۰-۴۹۷-۵۵۹-۵۷۹-۶۰۰

— وہ اس خاص ساعت میں نازل کیا گیا جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرماتا ہے ۵۵۶-۵۵۹-۵۶۰

— اس کے ایک رات میں نازل کیے جانے کا مطلب ۵۵۹

— وہ کون سی رات تھی جس میں قرآن نازل ہوا ۵۵۹-۵۶۰

— اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے نازل کیا ہے ۲۴۳-۳۵۵-۳۷۵-۴۴۱-۴۸۰-۴۹۷-۵۳۹

— آپؐ کی ذات ہی میں اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل موجود تھی ۳۴-۳۵

— اسے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں نازل کیا ۳۶۹-۴۳۹-۴۸۰-۵۲۳-۶۰۸

— اس کو اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں ۵۷۳

— اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے ۳۶۹

— وہ ایک نعمت ہے صاف پڑھی جانے والی تاکہ انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے ۲۷۰

— اس شبہے کا جواب کہ عربی قرآن غیر عرب لوگوں کے لیے کیسے ہدایت بن سکتا ہے ۴۴۰

— قرآن کو عجمی قرآن کیوں نہ بنایا گیا، اعتراض اور جواب ۴۶۳-۴۶۴

— اس کے عربی زبان میں نازل کیے جانے کی حکمت ۳۶-۳۶۹-۴۳۹-۴۴۰-۵۲۳

— وہ ایک زبردست کتاب ہے ۴۳۷

— وہ اٹل کتاب ہے جس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوسکتی ۴۶۲-۴۶۳

— اس کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل ۳۴-۳۵-۳۶-۴۷ تا ۴۹-۵۰۲-۵۰۳-۵۲۳-۵۹۷-۵۹۸

— وہ آپ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ۵۵۶-۵۵۹

— وہ اللہ کے نزدیک بڑی بلند مرتبہ کتاب ہے ۵۲۳-۵۲۴

— حکمت سے لبریز کتاب ۷-۳۶-۲۴۵-۵۲۳-۵۲۴

— حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ۶۱۹

— غفلت سے چونکانے والی کتاب ۳۱۹

— وہ ''ذکر'' ہے ۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۵۰

— بڑی برکت والی کتاب ۳۳۲

— نصیحت بھرا قرآن ۳۱۹

— قرآنِ مبین ۵۲۳-۵۵۹

— بہترین کلام ۳۳۶-۳۶۷

— کیسے لوگ اس سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں؟ ۷

— مومنینِ صالحین پر اس کا اثر ۳۶۷

— اس کا نزول اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے ۳۶-۲۴۵-۴۳۹-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۹-۵۶۰

— اس کا نزول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے لیے بڑا اشرف ہے ۵۴۰
— اس کی آمد اہلِ عرب کی قسمت کا فیصلہ کر دینے والی تھی ۵۰
— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی دلیل ہے ۴۴۵
— وہ اس ہستی کا نازل کردہ ہے جس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ۲۴۵
— اس کا یہ دعویٰ کہ وہ منزل من اللہ ہے، انسان کے لیے کیا چیلنج پیش کرتا ہے ۳۴
— وہ کس غرض کے لیے آیا ہے ۳۲-۳۵-۳۶-۲۴۵-۲۷۰-۳۳۲-۳۵۵-۴۸۱-۴۹۱-۵۵۹-۶۰۸-۶۰۹
— وہ ایک ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ دکھاتا ہے ۵۷۷-۵۸۶-۵۸۷
— وہ سراسر ہدایت ہے ۳۵-۳۶۸-۵۸۳
— وہ انسان کے لیے بصیرت کی روشنیاں لے کر آیا ہے ۵۸۷
— وہ تمام انسانوں کے لیے برحق کتاب ہے ۳۷۵
— وہ بنی نوع انسان کو انجامِ بد سے بچانا چاہتا ہے ۳۶۹
— تمام انسانوں کو اس کی پیروی کی دعوت ۳۷۹-۳۸۰
— وہ حق ہے جس کے مقابلے میں باطل کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوسکتی ۲۱۲-۴۳۷-۴۶۳
— وہ سراسر حق ہے اور حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے ۳۵-۱۷۵-۲۳۳-۳۵۵-۳۷۵-۴۷۰-۴۹۷-۵۳۵
— اللہ تعالیٰ لوگوں کو آفاق اور ان کے اپنے نفس میں ایسی نشانیاں دکھائے گا جن سے ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ قرآن حق ہے ۲۰۸-۴۶۹
— اس کی دعوت پر انسان کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے ۴۶۸-۴۶۹-۶۰۶-۶۰۷
— وہ دلائل جن کی بنا پر آدمی کو اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا چاہیے ۳۲-۳۵۵-۳۸۹-۴۳۹-۵۵۹-۵۶۰-۵۷۹
— اس کے ذریعے سے انسان کو ہدایت مل سکتی ہے ۲۳۳-۳۶۸
— وہ خدا کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۱۷۵
— اس کی وارث ہونے والی امت کا شرف اور اس کا انجام ۲۳۳ تا ۲۳۷
— اس کے مضامین میں مکمل یکسانی ہے ۳۶۷-۳۶۸
— اس میں مضامین کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ۳۶۷
— وہ کسی اینچ پیچ کے بغیر صاف صاف حقائق بیان کرتا ہے ۳۶۹-۴۳۹-۴۴۰-۵۳۲
— وہ جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے ۳۲
— اس میں ہر طرح کی مثالیں دے کر لوگوں کو حقیقت سمجھائی گئی ہے ۳۶۹-۳۷۹
— خدا کے عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت یہ ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے ۳۸۰
— وہ ماننے والوں کو بشارت دیتا ہے اور منکرین کو انجامِ بد سے ڈراتا ہے ۴۳۹-۴۴۰
— وہ ظالموں کے لیے تنبیہ اور نیکوکاروں کے لیے بشارت ہے ۶۰۸-۶۰۹
— وہ تاریخِ بنی اسرائیل کے ان اہم واقعات کو بیان کرتا ہے جنھیں خود بنی اسرائیل فراموش کر گئے تھے ۴۰۴ (نیز دیکھو "بائبل" اور "تلمود")

Maktaba Tul Ishaat.com

— قرآن اور دیگر آسمانی کتب کے بیان میں صریح اختلاف جو مخالفین کے ان اعتراضات کا خاتمہ کرتا ہے کہ قرآن کو پچھلی کتابوں سے نقل کر لیا گیا ہے ۱۸۰-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۷ تا ۳۰۱-۳۲۷ تا ۳۳۱-۳۳۳ تا ۳۳۸-۵۴۲-۵۴۳

— قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی ۴۶۴-۵۷۷

— وہ وہی تعلیم لے کر آیا ہے جو پہلے انبیا لائے تھے ۶۰۶-۶۰۷

— وہ وہی تعلیم لایا ہے جو تورات لائی تھی ۶۰۸

— وہ وہی تعلیم لے کر آیا ہے جو تمام کتبِ آسمانی لائی تھیں ۳۳-۵۲۳-۵۲۴

— وہ تمام کتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۳-۶۱۹

— وہ ان اختلافات کا فیصلہ کر دیتا ہے جو اہلِ کتاب نے تورات اور انجیل میں پیدا کر دیے تھے ۴۹۴-۴۹۵

— کفارِ مکہ اسے سن کر کس طرح متاثر ہوتے تھے ۴۳۴-۴۳۵

— وہ ان منکرین حق کو مطمئن نہیں کر سکتا جو ہٹ دھرم ہیں ۹۹-۱۱۳-۲۲۹-۲۳۲

— منکرین کا اس سے انکار تکبر و ضد کی وجہ سے ہے نہ کہ دلیل کی بنا پر ۳۱۹

— کفار مکہ اسے جادو کیوں کہتے تھے ۲۱۰-۵۳۵-۶۰۳-۶۰۴

— اس پر کفارِ مکہ کا اعتراض کہ یہ چونکہ ایک عرب پر عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے کلامِ اللہ نہیں ہے ۴۳۶-۴۶۴-۵۲۳

— اس اعتراض کا جواب ۴۳۸-۴۶۳-۴۶۴-۵۲۳

— اس کے خلاف سردارانِ قریش کا یہ استدلال کہ اگر قرآن حق ہوتا تو قوم کے بڑے لوگ اس پر ایمان لاتے ۶۰۸-۶۱۲

— کفارِ مکہ کا یہ الزام کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف کر لیا ہے اور اس کا جواب ۳۴-۳۵-۵۰۲-۵۰۳-۵۱۲-۶۰۳-۶۰۴

— قرآن پر قریش کے اس اعتراض کا جواب کہ خدا کی کتاب انسان پر کس طرح نازل ہوگئی ۴۹

— اس کا انکار کرنے والے کافر ہیں ۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱

— اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دینے والے کافر ہیں ۵۰۲-۵۰۳

— اس پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں ۲۰۴

— باطل پرستوں کی کوئی چال اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۴۶۲-۴۶۳

— اس کو زک دینے کے لیے کفار مکہ کی تدبیریں ۸-۹-۱۰-۳۸۸-۴۳۶-۴۵۳-۴۵۶-۴۵۷-۴۶۲-۴۶۴-۴۹۶-۵۵۰-۵۵۱

— اس کے مقابلے میں کفار مکہ کی ہٹ دھرمی ۴۳۶-۴۳۷-۴۴۰-۴۴۱
(نیز دیکھو "قریش")

— اس کی تلاوت اہلِ ایمان کی لازمی صفات میں سے ہے ۲۳۲

— اس کو پڑھنے اور اس کی پیروی کرنے کے ثمرات و نتائج ۳۳۲-۳۳۳

— اس کی پیروی کا صحیح طریقہ ۳۸۰

— اس کی پیروی کرنے والے خدا کی تائید و رحمت سے نوازے جائیں گے ۵۷۷

— جن منافقین کو اس کی پیروی نہ کرنی ہو ان کے

لیے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ اس کو ماننے سے انکار کردیں ۱۲۱

— بدنصیب ہے وہ جس کا دل اسے پڑھ کر اور سخت ہو جائے ۳۶۷-۳۶۸

— اس سے کیسے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۲۴۷-۲۷۰-۴۳۹-۴۴۰

— اللہ سے ڈرنے والے اس سے کیا اثر لیتے ہیں؟ ۳۶۷-۳۶۸

— وہ کن لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے؟ ۷-۵۸۷-۵۸۸

— وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے ۴۶۴

— وہ ایمان نہ لانے والوں کے لیے کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے ۴۶۴

— اس کے خلاف کوشش کرنے والوں کا انجامِ بد ۴۵۳

— اس کو جھٹلانے والوں کا انجامِ بد ۴۲۶-۴۲۷-۴۸۲-۴۸۳

— اس کو رد کرنے والے تباہی سے دوچار ہوں گے ۵۷۷

— اس کا مقابلہ استکبار اور استہزا سے کرنے والوں کا انجامِ بد ۵۸۱ تا ۵۸۳

— اس کے بہترین پہلو کی پیروی کی جانی چاہیے ۳۶۵-۳۸۰

— وہ بنیادی طور پر علم طبیعیات یا علمِ ہیئت کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں آثارِ کائنات کا ذکر محض توحید کے دلائل کے طور پر کیا گیا ہے ۴۴۵

— اس نے انسانی زندگی میں کیا عظیم الشان انقلاب برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰

— وہ قولِ صالح اور عملِ صالح کو لازم و ملزوم کے طور پر پیش کرتا ہے ۲۲۴

— وہ اپنے پیرووں کو مغلوبانہ زندگی نہیں بلکہ اسلام کی حکومت قائم کرنے کا حکم دیتا ہے ۴۹۱

— وہ ''دین'' کا غلبہ چاہتا ہے اور یہ مضمون مکی اور مدنی دونوں سورتوں میں ہے ۴۹۱

— وہ ''ام الکتاب'' میں ثبت ہے ۵۲۳

— اس کے ساتھ رسول بھیجنا نہ صرف حکمت بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی ہے ۵۵۹

— اس کی تفسیر کے صحیح اصول ۳۳۳ تا ۳۳۸-۵۴۷-۵۶۴-۵۶۵-۵۸۵-۶۰۷

— تفسیر القرآن بالقرآن ۱۶-۳۸-۳۹-۴۴-۴۷-۸۲-۹۴-۱۰۵-۱۰۷-۱۹۰-۱۹۱-۲۰۳-۲۰۹-۲۱۲-۲۳۰-۲۴۹ تا ۲۵۱-۲۵۲-۲۶۸-۲۶۹-۲۸۶-۲۹۹-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۵-۴۰۱-۴۵۱-۴۸۴-۴۸۹ تا ۴۹۲-۵۲۴-۵۴۰-۵۴۴-۵۵۹-۵۶۰

(حدیث کس طرح قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اس کے لیے دیکھو 'حدیث'')

— اس کے الفاظ سے زائد مطلب لینا کس صورت میں صحیح ہے ۳۳۴

— اس کی تفسیر کے غلط طریقے ۵۷-۲۱۳-۳۷۹-۴۴۳-۴۴۴-۴۸۸ تا ۴۹۲-۵۰۱-۵۰۲-۵۱۶-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵

— اس کا طرزِ استدلال ۷-۱۱-۱۲-۱۳

— توحید کے بارے میں اس کا طرزِ استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''توحید، اس کے دلائل'')

— آخرت پر اس کا طرزِ استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''آخرت، اس کے دلائل'')

— رسالت محمدیؐ پر اس کا استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کی نبوت کے دلائل'')

— اس کا مخصوص طرزِ بیان ۲۸-۲۹-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۵۰-۵۱-۸۷-۸۸-۱۳۵-۱۳۶-۱۷۲-۲۰۰-۲۰۱-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۳-

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۷۰-۳۹۱-۳۹۳-۴۲۵-۴۸۳-۴۸۴-
۵۴۶-۵۵۰-۵۶۵
— مکی سورتوں کا زمانۂ نزول متعین کرنے کا طریقہ
۶-۳۲-۱۷۲-۲۱۶-۲۷۶-۵۵۶
— کسی واقعے کو شانِ نزول قرار دینے کا مطلب ۶۰۷
— نظامِ کائنات اور تخلیقِ کائنات کے متعلق اس کا
بیان ۱۱-۱۲-۱۹-۲۲-۲۳-۳۷-۳۸-۳۹-
۱۳۵ تا ۱۳۷-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۷-۲۱۸-
۲۲۵-۲۲۶-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۹-۲۴۰-
۲۴۱-۲۵۶ تا ۲۶۲-۲۷۸-۲۸۰-۳۳۱-
۳۵۹-۳۶۰-۳۸۱-۴۲۲ تا ۴۲۶-۴۴۲-
۴۴۶-۵۰۴-۵۰۵-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کائنات'')
— اس کا تصورِ زمان و مکان ۳۸-۳۹
— تخلیقِ انسان سے متعلق اس کا بیان (دیکھو ''انسان'')
— اس کا فلسفۂ تاریخ ۳۸-۳۹-۵۰-۵۱-۱۷۲-
۱۹۱-۱۹۳-۱۹۴-۲۳۸-۲۴۱-۲۵۵-۲۷۶-
۲۷۸-۳۹۳-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۶-۴۰۸-
۴۳۰-۴۳۱-۴۴۷ تا ۴۴۹-۵۲۴ تا ۵۲۶-
۵۴۰-۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰
— اس کا فلسفۂ اخلاق ۱۳۶-۱۳۷-۲۰۶-۲۰۷-
۲۰۸-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۸-۲۲۹-۴۵۶ تا ۴۶۰-
۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۵-
۵۴۶-۵۵۲-۵۶۹-۵۷۰-۵۸۷ تا ۵۹۰
— اس کی اخلاقی تعلیمات ۷-۸-۱۸-۴۵-
۴۶-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۸-۱۱۹-۱۲۰-
۱۳۵-۲۲۳-۳۰۱-۳۲۳-۳۳۶-۳۳۹-
۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۵۰-۳۷۳-۳۷۴-
۳۸۱-۳۸۹-۴۵۶ تا ۴۶۰-۴۹۵-۴۹۶-
۵۰۷ تا ۵۱۲-۵۲۸-۵۲۹-۵۴۵-۵۴۶-
۵۴۹-۵۸۴ تا ۵۸۶-۶۰۹-۶۱۱-۶۱۲
— اس کا علم النفس ۱۸-۲۵ تا ۲۸-۸۹-۱۷۷-
۱۷۸-۲۲۱-۲۲۲-۳۶۲-۳۷۷-۴۵۶ تا
۴۶۰-۴۶۴-۴۶۷-۴۶۸-۵۴۵-
۵۴۶-۵۶۱-۵۶۲-۵۸۹-۵۹۰-۶۱۷
— اس کی پیشین گوئیاں ۵۰-۵۱-۲۷۶-۲۷۷-
۳۱۳-۳۱۴-۳۱۸-۳۲۲-۴۶۸ تا ۴۷۰
— وہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے کن ذرائع کی نشان
دہی کرتا ہے ۲۵-۳۲-۱۹۱-۲۵۶ تا ۲۶۲-
۲۶۹-۲۷۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۶۶-۳۶۷-
۳۷۵-۳۹۷-۳۹۸-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۹-
۴۳۰-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۸ تا ۴۷۰-۵۰۴-
۵۰۵-۵۰۶-۵۲۵ تا ۵۲۸-۵۳۲-۵۷۶-
۵۷۹ تا ۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۶
— اس کا فلسفۂ معیشت ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۳۷۹-
۵۳۶-۵۳۸
— خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ
۲۳۲-۲۳۳
— شخصی ملکیت کا اثبات ۲۷۰
— ''سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ'' کی صحیح تفسیر ۴۴۲ تا ۴۴۶
— زر پرستی اور حرصِ مال کی مذمت ۲۰۶
— انفاق فی سبیل اللہ یا زکوٰۃ و صدقہ کی اہمیت ۷-
۹۲-۲۳۳-۵۰۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انفاق فی سبیل اللہ''،
''زکوٰۃ'' اور قانونِ اسلام، قانون معیشت'')
— اس کے خلاف مغربی مستشرقین کا تعصب ۱۴-۴۰۴
— اس میں قسمیں کس غرض کے لیے کھائی گئی ہیں
۲۴۵-۲۷۸-۳۱۹-۵۲۳-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۹
— اس میں قصے کس غرض کے لیے بیان کیے گئے
ہیں ۱۵-۱۷۲-۲۴۹-۲۷۷-۲۹۳-۳۱۸-
۳۳۵-۳۸۸

— قصۂ آدم و ابلیس بیان کرنے کا مقصد ۳۱۸-۳۵۰
— قصۂ ہود علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۶۱۳-۶۱۷
— قصۂ لقمان بیان کرنے کا مقصد ۶-۱۳-۱۴-۱۷
— قصۂ ابراہیم بیان کرنے کا مقصد ۲۷۷-۲۹۴-۳۰۱-۵۳۵
— قصۂ اصحاب یاسین بیان کرنے کا مقصد ۲۴۹
— قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۳۸۸- ۳۸۹- ۴۰۵-۴۰۶- ۴۱۶-
۴۱۷-۵۲۱-۵۲۲-۵۴۰-۵۴۱-۵۵۷
— قصۂ داود علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۱۷۲-
۳۲۳-۳۳۰-۳۳۹
— قصۂ سلیمان علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد
۱۹۱-۳۳۶-۳۳۹
— قوم سبا کا قصہ بیان کرنے کا مقصد ۱۷۲-۱۹۱
— قصۂ ایوب علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۳۴۲
— قصۂ عیسیٰ علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۵۴۶
— قرآن کی نگاہ میں کامیابی اور ناکامی کا معیار
۲۸۹-۳۶۴-۳۹۶-۵۹۲-۵۹۳
(نیز دیکھو ''خسران'' اور ''فلاح'')

قرآنی تمثیلات - (دیکھو ''امثال القرآن'')

قرآنی دعائیں - ۵۲۸-۶۱۱ (دیکھو ''دعا'')

قرآنی قصے

— قصۂ آدم و ابلیس ۳۴۷ تا ۳۵۰
— قصۂ نوح علیہ السلام ۲۹۰-۲۹۱
— قصۂ ہود علیہ السلام ۶۱۳-۶۱۷
— قصۂ لقمان ۱۲ تا ۱۸
— قصۂ ابراہیم علیہ السلام ۲۹۱ تا ۳۰۱-۵۳۴-۵۳۵
— قصۂ لوط علیہ السلام ۳۰۶
— قصۂ الیاس علیہ السلام ۳۰۲ تا ۳۰۶

— قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام ۴۰۲ تا ۴۱۳ - ۵۴۰
تا ۵۴۲-۵۶۵-۵۶۹
— قصۂ یونس علیہ السلام ۳۰۷ تا ۳۱۰
— قصۂ داود علیہ السلام ۱۷۸-۳۲۳ تا ۳۳۱
— قصۂ سلیمان علیہ السلام ۳۳۲-۳۳۹
— قصۂ قوم سبا ۱۹۱ تا ۱۹۹
— قصۂ اصحاب یاسین ۲۴۸ تا ۲۵۵
— قصۂ ایوب علیہ السلام ۳۳۹ تا ۳۴۲
— قصۂ عیسیٰ علیہ السلام ۵۴۶ تا ۵۴۸

قربانی

— عیدالاضحیٰ کی قربانی سنت ابراہیمی کی یادگار ہے
۲۹۶-۲۹۷

قریش

— زمانۂ جاہلیت میں ان کے گمراہانہ عقائد ۵۲۰-
۵۲۱-۵۳۰-۵۳۲-۵۹۸-۵۹۹
— وہ سرے سے وحی و رسالت ہی کے منکر تھے ۲۵۱-۲۵۲
— ان کا اپنے شرک پر عیسائیوں کے شرک سے استدلال ۵۴۶
— وہ حضرت ابراہیمؑ سے اپنے تعلق پر فخر کرتے تھے لیکن انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے چھوڑے ہوئے کلمۂ حق کو چھوڑ کر بت پرست قوموں کی پیروی اختیار کر لی ۵۳۴-۵۳۵
— وہ اپنے اسلاف میں سے بہترین کو چھوڑ کر گمراہ ترین اسلاف کی پیروی میں لگ گئے ۵۳۵
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کے لیے ان کی حجتیں ۲۱۰- ۴۳۶- ۴۶۲- ۵۰۲- ۵۰۳-
۵۲۳-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۸-۶۱۲
— وہ قرآن مجید کو جادو قرار دیتے تھے ۲۱۰- ۵۳۵-
۶۰۳-۶۰۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے تھے ۳۴-۳۵
— ان کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کہ قرآن کو محمدؐ کی تصنیف قرار دے رہے ہو، کیا کبھی سوچا بھی ہے کہ حقیقت کھلنے پر تمھارا کیا انجام ہو گا ۴۶۸-۶۰۵-۶۰۶
— وہ نہ خود قرآن سنتے تھے اور نہ دوسروں کو سننے دیتے تھے ۴۵۳
— ان کو قرآن جیسے شرف کی ناقدری کی جواب دہی کرنی ہوگی ۵۴۰
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے جھوٹے اتہامات ۲۱۱-۲۱۲-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۵-۳۱۹ تا ۳۲۱-۴۱۶-۴۳۴-۵۶۲-۵۶۳
— ان سردارانِ قریش کی اخلاقی حالت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے ۲۲۱-۲۲۲-۴۶۴-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۶
— قریش کی مخالفت کے اصل وجوہ ۲۲۳-۳۱۸-۳۸۹-۴۳۴-۴۶۵-۵۰۴-۵۲۱-۵۲۲-۵۳۵-۵۳۶
— قرآن میں اللہ تعالیٰ قریش کی حالت کا کیا نقشہ کھینچتا ہے ۲۴۶-۲۴۷-۵۶۲-۵۶۳
— قریش کا انکار شک، تکبر، ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا نہ کہ یقین محکم اور دلیل کی بنا پر ۳۱۹-۴۶۴-۴۶۹-۴۷۱
— قریش کو ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت ۵۳۹-۵۷۷
— حضورؐ پر ان کا یہ اعتراض کہ آپ نے سب خداؤں کی جگہ ایک ہی خدا بنالیا ہے ۳۲۰-۳۴۶-۳۴۷
— وہ آپؐ کی دعوت نہ ماننے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے ۴۳۵
— ان کے کھاتے پیتے لوگ آپؐ کے اولین مخالف تھے ۵۳۳-۵۳۴
— وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے کیا وجوہ بیان کرتے تھے ۳۱۸-۳۱۹-۳۲۱
— وہ کس طرح مسلمان ہونے والوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے ۲۲۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')
— ان کا حضورؐ پر یہ الزام کہ آپ اقتدار کے طالب ہیں اور اپنی سرداری قائم کرنا چاہتے ہیں ۳۲۰
— سردارانِ قریش کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے لائق نہ سمجھنا اور اللہ کی طرف سے اس کا جواب ۳۲۱-۳۲۲
— قریش کا اعتراض کہ نبی ہمارے درمیان ہی سے کیوں آیا ۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱
— قریش کا اعتراض کہ ہمارے درمیان سے کیا ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی رہ گئے تھے جنھیں نبی بنانے کے لیے چنا گیا ۳۲۰-۳۲۱
— قریش کا اعتراض کہ جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں وہ ہم نے کبھی نہیں سنا ۳۲۰
— قریش کے اس اعتراض کا جواب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ اللہ تعالیٰ نے مکہ و طائف کے کسی امیر کو کیوں نہ نبوت دی ۵۳۵-۵۳۶
— قریش دولت و جاہ کو بڑائی تصور کرتے تھے ۵۳۸
— جس طرح فرعون اپنی دولت وعزت کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو حقیر جانتا تھا اسی طرح قریش بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حقیر سمجھتے تھے ۵۴۱-۵۵۴
— قرآن کی دعوت کے مقابلے میں ان کی ہٹ دھرمی ۴۳۶-۴۳۷-۴۴۰-۴۴۳-۴۶۴-۵۶۲-۵۶۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ان کی تدبیریں ۸-۹-۱۰-

۳۲ - ۳۸۸ - ۴۳۶ - ۴۵۳ - ۴۵۶ - ۴۵۷-
۴۶۲-۴۹۶-۵۵۰-۵۵۱

— قریش کی تدبیروں کے ناکام ہونے کی پیشین گوئی ۳۱۳-۳۱۴-۴۳۷-۴۳۸

— آنحضورؐ کو قتل کرنے کے لیے ان کی سازشیں ۳۸۸-۴۳۶-۵۳۹

— وہ قرآن کو سن کر کس طرح متاثر ہوتے تھے ۴۳۴-۴۳۵

— وہ حضورؐ کی شخصیت کا وزن کیا کچھ محسوس کرتے تھے ۳۱۷

— وہ آپ کی مخالفت پر دل ہی دل میں پشیمان تھے ۴۶۵

— وہ خود جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۹-۱۷۶-۲۷۱-۴۳۵

— وہ اپنے دلوں میں آپ کی صداقت کے معترف تھے ۴۳۵

— ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصالحت کی کوششیں ۳۱۶-۳۱۷-۴۳۴-۴۳۵

— ان کا ابوطالب کے پاس جا کر آپؐ کی شکایت کرنا ۳۱۶

— حضورؐ کا ان سے یہ کہنا کہ جو کلمہ میں لایا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمھارے تابع ہو جائیں گے ۳۱۶-۳۱۷

— ان کے اندر ایک مصلحت پرست گروہ بھی تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حق پر جانتا تھا مگر ساتھ نہیں دے رہا تھا ۳۸۹

— اسلام قبول کرنے والوں پر ان کے مظالم ۴۵۶-۴۵۸-۴۹۶

— مکی زندگی کے آخری دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے مظالم ۵۹۶-۵۹۷

— مکہ کا وہ قحط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر رونما ہوا ۵۵۶-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴

— قریش بڑھ بڑھ کر اس لیے باتیں کرتے تھے کہ انھوں نے خدا کا عذاب دیکھا نہیں تھا ۳۲۱

— وہ عذاب دیکھنے کی جلدی مچاتے تھے اور طنزاً قیامت سے پہلے ہی عذاب میں سے اپنا حصہ مانگتے تھے ۳۲۲-۵۴۹

— وہ کہتے تھے کہ ہم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیے جا رہے ہیں آخر عذاب کیوں نہیں آتا؟ ۳۸-۳۹-۵۰-۵۱

— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جعلی معبودوں سے ڈراتے تھے ۳۷۳

— وہ مانتے تھے کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا خالق ہے ۵۲۵

— ان کو بیٹیوں کی پیدایش بہت ناگوار گزرتی تھی مگر اللہ کے لیے وہ بیٹیاں تجویز کرتے تھے ۳۱۱-۵۳۰

— ان کے پاس اپنی ملائکہ پرستی کے لیے کوئی سند سوائے باپ دادا کے عمل کے نہ تھی ۵۳۳

— ان کو اللہ تعالیٰ متاع حیات دیتا رہا حالانکہ وہ مشرک تھے لیکن اللہ نے ان کے لیے حق اور رسول بھیجا تو انھوں نے اس کو جادو قرار دیا ۵۳۵

— شرک کی تردید میں حضرت عیسیٰ کی مثال پر قریش کا مذاق اڑانا ۵۴۶

— قریش آخرت کے منکر تھے، ان کی دلیل اور جواب ۵۶۹-۵۷۰

— ان کی حرکتوں سے مسلمانوں کو درگزر کرنے کی ہدایت تاکہ اللہ خود ہی قریش کو ان کی کمائی کا بدلہ دے ۵۸۴

— ان کا حضورؐ سے کہنا کہ جو کچھ بھی دعوت تم دیتے ہو اس کی طرف سے ہمارا دل بند ہے اور کان بہرے ہیں، تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا ۴۴۰-۴۴۱

— وہ بہت سے معبودوں کے ساتھ اللہ کو بھی معبود تسلیم کرتے تھے مگر اللہ کو معبودِ واحد ماننے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ان کو انکار تھا ۳۲۰-۳۴۶-۳۴۷

— ان کا اعتراض کہ کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ یہ کام تو فرشتوں کے کرنے کا ہے ۳۳-۲۴۹تا۲۵۱-۴۴۷

قسم

— اس کے توڑنے کا کفارہ ۳۴۲

— قسم فوراً پوری کردینا ضروری نہیں ہے ۳۴۲
(نیز دیکھو ''اقسام القرآن'')

قضا وقدر - (دیکھو ''تقدیر'')

قنوت: معنی وتشریح ۹۴-۹۵

قیامت

— علامات قیامت ۵۴۷-۵۶۴-۵۶۵

— قیامت کی علامات از روئے حدیث ۱۵۹

— وہ قریب آ لگی ہے ۴۰۰

— وہ تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیے جانے کا دن ہے ۲۰۸-۵۹۱

— وہ کس لیے آئے گی؟ ۱۷۴-۱۷۵

— وہ آ کر رہے گی ۱۷۴

— اللہ کا وعدۂ قیامت برحق ہے ۵۹۳

— اس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۴۱۷-۵۹۱-۵۹۳

— اس کا برپا ہونا ہر وقت ممکن ہے ۱۷۷-۴۱۸

— اس کا وقت آنے پر کوئی طاقت اسے ٹال نہیں سکتی ۵۱۴

— وہ اچانک آئے گی ۲۶۴-۲۶۵-۵۴۹

— اس کا وقت مقرر ہے ۲۰۲-۲۰۴-۵۷۰

— اس کا وقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۲۸-۱۳۳-۱۷۴-۳۴۹-۴۶۶-۵۵۱

— وہ کس طرح برپا ہوگی ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۲-۳۲۲-۳۸۲-۳۸۳-۵۶۲

— اس روز یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ساری کائنات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے ۳۸۲

— اس روز مجرمین کس طرح پکڑ لیے جائیں گے ۲۱۳

— اس روز کفار کے منہ کالے ہوں گے ۳۸۱

— اس روز کفار کی حالت زار ۴۰۰

— تمام اختلافات کی حقیقت اس روز کھول دی جائے گی اور فیصلہ کر دیا جائے گا ۵۰-۵۸۶

— اس روز اللہ مجرمین سے انتقام لے گا ۵۶۳

— اس کے آنے کی تاریخ کفار کس غرض سے پوچھتے تھے؟ ۲۸-۲۹-۳۳-۱۳۳-۱۷۴-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۶۴

— کفار کے مطالبۂ قیامت کا جواب ۲۰۲-۲۰۴

— معترضین بار بار اس کے قیام کا تقاضا کیوں کرتے تھے؟ ۱۷۴

— اللہ کی سب سے بڑی رحمت یہ ہے کہ روزِ قیامت کی سختیوں سے آدمی بچ جائے ۳۹۶

— روزِ قیامت کی سختیاں ۳۹۶

— اس کے عذاب سے بچنے کے لیے انسان کو کیا کرنا چاہیے ۳۷۷

— اس پر ایمان لانے میں شیطان مانع ہے ۵۴۸

— اس پر ایمان لانا ہی سیدھا راستہ ہے ۵۴۷-۵۴۸

— اس روز کون شفاعت کر سکے گا؟ ۱۹۹-۲۰۰

— اس روز نہ باپ بیٹے کی جگہ بدلہ دے گا اور نہ بیٹا باپ کی جگہ ۲۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شفاعت'')

— اس روز کفار آپس میں جھگڑیں گے ۳۷۲

— جو روزِ قیامت کی سختی سے بچ گیا اس پر اللہ کا بڑا رحم ہے ۳۹۶
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت'' اور ''زندگی بعد موت'')

ک

کافر - (دیکھو "کفر")

کائنات

— کائنات کا مالک اللہ ہے۲۲-۳۴۶-۳۷۶-۴۷۸
— اس کا خالق اللہ ہے ۳۷۷-۴۲۵
— اس کو پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام تھا۴۲۵
— کافر بھی یہ مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اللہ ہی ہے۳۷۴
— کائنات کو برحق پیدا کیا گیا ہے ۳۳۱-۳۵۷-۵۷۰-۵۸۷-۵۸۸
— کائنات میں سب کچھ نہ اتفاقاً پیدا ہوا ہے نہ اتفاقاً چل رہا ہے بلکہ اس کو ایک زبردست حکیم نے علم و حکمت کے ساتھ بنایا ہے اور یہ ایک قانون کے تحت چل رہی ہے ۴۵-۲۳۱-۲۵۶ تا ۲۶۲
— کفار ہی یہ گمان کرتے ہیں کہ کائنات کو فضول اور بے مقصد بنایا گیا ہے ۳۳۱-۳۳۲
— یہ اللہ ہی کا منصوبہ ہے جس کے مطابق کائنات وجود میں آئی اور اس میں مخلوقات کو پیدا کیا گیا۴۴۶
— کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا گیا ۳۷-۴۴۲ تا ۴۴۶
— کائنات بناتے ہوئے اللہ تھک نہیں گیا جیسا کہ بائبل کا بیان ہے۶۲۰
— کائنات میں زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں کے اندر بھی زندگی موجود ہے۵۰۴-۵۰۵
— کائنات میں سورج، چاند، تارے، سیارے تمام متحرک ہیں ہر ایک کا اپنا ایک مدار ہے، آسمانوں کے ساتھ تارے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ آسمانوں کے اندر تارے تیر رہے ہیں ۲۶۱
— کائنات کو ایک مقرر مدت کے لیے بنایا گیا ہے ۲۲۶-۶۰۰
— سورج اور چاند کو مسخر کیا گیا ہے اور سب ایک مقررہ وقت تک کے لیے چلے جا رہے ہیں ۲۳-۲۴-۲۵۹-۳۵۹
— انسان کے لیے کائنات کو کس معنی میں مسخر کیا گیا ہے۱۹-۲۰-۵۸۷
— کائنات کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں ۳۸۱
— کائنات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۵۹۲
— کائنات میں اللہ کی نشانیاں ۳۹۷-۳۹۸
— کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہے ۳۸
— تدبیرِ کائنات کے کام کی روداد اللہ کے حضور پیش ہوتی ہے ۳۸
— کائنات کی کوئی چیز اللہ کے مشابہ نہیں ہے ۴۸۵
— کائنات کا ذکر جہاں کہیں بھی قرآن میں آیا ہے، توحید کے دلائل کے طور پر آیا ہے نہ کہ قرآن کوئی علمِ طبعیات یا علمِ ہیئت کی کتاب ہے۴۴۵
— آفاقِ ارض و سما اور انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ قرآن کے برحق ہونے کے دلائل دکھائے گا ۴۲۳-۴۷۰
— کائنات کے لیے صرف لفظ "آسمان" کا استعمال ۴۴۴-۴۴۵
— کائنات موجودہ صورت گری سے پہلے مادے کی ابتدائی شکل میں تھی اور بے شکل منتشر الاجزا غبار کی صورت میں فضا کے اندر پھیلی ہوئی تھی ۴۴۵

کتاب

— اللہ کی رضا معلوم کرنے کا اصل ذریعہ اللہ کی کتاب ہے۵۳۲
— اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان ضروری ہے ۴۲۶-۴۹۵
— تمام کتبِ آسمانی کو ماننا کیوں ضروری ہے؟ ۴۸۷
— صرف پچھلی کتابوں پر ایمان ہی کافی نہیں ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

بلکہ قرآن پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ۳۷۵
— اللہ کی کتابوں کو جھٹلانے والوں کا انجامِ بد ۴۲۶-۴۲۷
— ام الکتاب کیا ہے ۵۲۳-۵۲۴
— پچھلے انبیاؑ کی لائی ہوئی کتابوں میں کس طرح تحریف ہوئی ۴۹۴-۴۹۵
— صحیفہ اور کتاب کا فرق ۲۳۱
— کتاب کا نزول اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے ۵۷۷
— کتاب کے ساتھ رسول بھیجنا حکمت کا تقاضا بھی ہے اور رحمت کا تقاضا بھی ۵۵۹
— اللہ کی کسی کتاب میں غیر اللہ کی بندگی کی تعلیم نہیں دی گئی ۲۱۰-۲۱۱-۵۳۲
— قرآن سمیت تمام کتبِ آسمانی کی تعلیم ایک ہی تھی ۵۲۳-۵۲۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آیت'' اور ''قرآن'')

کسب

— معنی اور تشریح ۳۶۹

کفر

— معنی اور تشریح ۳۸۱-۳۹۳
— کفر بمعنی کفرانِ نعمت ۱۴
— کافر گمراہ اور ظالم ہیں ۱۲
— کافر تکبر میں مبتلا ہیں ۴۲۷-۴۲۸
— کفر دراصل تکبر کی وجہ سے ہے اور تکبر کا سبب انکار آخرت ہے ۳۸۱-۳۸۴-۴۰۹-۴۱۶-۴۲۷-۴۲۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تکبر'')
— دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیرانا کفر ہے ۳۹۷-۴۴۲
— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننا کفر ہے ۲۰۴-۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱-۵۰۲-۵۰۳
— اللہ کی کتاب اور اس کی آیات کا انکار کفر ہے ۳۸۱-۴۵۳
— قرآن کی مخالفت کفر ہے ۴۵۳
— قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دینا کفر ہے ۵۰۲-۵۰۳
— آخرت کا انکار کفر ہے ۳۳۱-۶۲۰-۶۲۱
— انبیاؑ کی دعوت کے منکر کافر ہیں ۴۰۲
— اللہ کی آیات میں جھگڑے پیدا کرنا کفر ہے اور اس کا انجام بہت برا ہے ۷۵-۳۹۱ تا ۳۹۳-۴۶۲
— مومن اور کافر کا فرق ۲۲۹
— کافر کی نشانیاں ۲۵-۲۶۲-۲۶۳-۳۲۴-۴۶۲-۵۸۱-۶۰۳
— مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے ۳۳۱-۳۶۷
— کفر درحقیقت اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی ہے ۳۶۱
— کفر درحقیقت جہالت ہے ۳۶۳
— کافروں کی اطاعت و پیروی نہ کی جائے ۶۸
— کفر بجائے خود موجبِ عذاب ہے، اعمال خواہ نیک ہوں یا بد ۵۰۳-۵۰۴-۵۹۲-۵۹۳
— کفر کے ساتھ اگر بدعملی کی شدت نہ ہو تو عذاب میں بھی شدت نہ ہوگی ۱۷۴-۱۷۵
— اللہ کا ذکر سن کر جس کا دل اور سخت ہو جائے اس کے لیے تباہی ہے ۳۶۷
— کافروں اور دہریوں کا کفر کسی علم و یقین کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض گمراہ کن شک کی بنیاد پر ہے ۲۱۳-۲۱۴-۴۰۹-۴۱۶
— جو لوگ کفر کرتے ہیں عنقریب انھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی ۵۵۱-۵۵۳
— کافروں کا کفر اللہ کے لیے نہیں، خود ان کے لیے نقصان دہ ہے ۱۴-۲۱-۲۲-۳۶۰

— اللہ خود لوگوں کی بھلائی کے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اس سے کفر کریں ورنہ لوگوں کے کفر کرنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ۳۶۰-۳۶۱

— اللہ کو لوگوں کا کفر کس قدر ناپسند ہے ۳۶۰-۳۹۶-۳۹۷

— ایک اللہ کا ذکر سننا کافروں کو ناگوار ہوتا ہے اور دوسرے معبودوں کا ذکر سن کر وہ خوش ہو جاتے ہیں ۳۷۶-۳۹۷

— کافروں کو ان کے کفر اور برے اعمال کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا ۲۶۸-۳۶۸-۳۸۱

— کفار کو سزا ملنی ہی ہے خواہ اس دنیا میں ملے یا آخرت میں ۵۳۹

— کفار کے دنیا میں ظاہری عیش و آرام سے مومنوں کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے ۳۹۳-۴۳۱

— اللہ کو محض خالق کائنات مان لینے سے کافر کا کفر ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ اللہ کو ماننے کے جو تقاضے ہیں انھیں وہ پورا نہیں کرتا ۲۲-۳۷۴

— کافروں کا یہ گمان غلط ہے کہ زمین و آسمان (کائنات) کو فضول پیدا کیا گیا ہے اور ان سے ان کے اعمال کی باز پرس کبھی نہیں ہونی ہے ۳۳۱

— کفار کا یہ قول کہ ”اللہ ہمیں ہدایت بخشتا تو ہم بھی متقی ہوتے“ ۳۸۰-۳۸۱

— کفار کا یہ قول کہ ”اگر ہدایت آجائے تو ہم سب سے پہلے اس کے ماننے والے ہوں گے“ ۲۴۰-۳۱۳

— کفار کا یہ قول کہ ”کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے، ہماری رہنمائی کے لیے تو فرشتے آنے چاہئیں ۲۴۹ تا ۲۵۱-۴۴۷

— کفار کے سامنے آخرت میں جو کچھ پیش آئے گا اس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا ۳۷۷

— کفار کی آنکھوں پر پٹی ہے اور کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے دور سے کسی کو آواز دی جاتی ہو ۴۶۴

— کافروں کو خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا ۱۳۳-۱۳۴

— آخر کار کافر ہی گھاٹے میں رہیں گے ۲۳۸-۲۳۹-۳۸۱-۳۸۲

— کافر اپنے حصے کی نعمتیں دنیا ہی میں پا لیتے ہیں، آخرت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ۶۱۳

— آخرت میں کفار خود اپنی حماقت پر اپنے آپ کو کوسیں گے اور اپنی گمراہی کا خود اقرار کریں گے ۳۹۶-۳۹۷-۴۲۷

— اللہ نے کفار پر جہنم کا فیصلہ چسپاں کر دیا ہے ۳۹۳

— کفار کو جہنم میں کیوں ڈالا جائے گا ۳۹۷-۴۲۷

— کفار محض اللہ تعالیٰ کی حلیمی و رحیمی کی وجہ سے دنیا میں مہلت پا رہے ہیں ۴۸۰

— عدالت آخرت میں کفار کی پیشی کا منظر ۴۴۹-۴۵۰

— آخرت میں کفار کو مومنین سے الگ کر دیا جائے گا ۲۶۶

— کفار کا ٹھکانا آگ ہے ۴۵۰-۴۵۱

— کفار کی غلط فہمی کہ اول تو آخرت ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ہمارے لیے وہاں بھی عیش و آرام ہے ۴۶۷-۴۶۸

— کفار نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حقیقت کھلنے پر ان کا کیا انجام ہوگا ۴۶۸-۶۰۵-۶۰۶

— کفار کے جہنم میں داخلے کا منظر ۳۸۴

— کفار کا انجام بد ۱۰-۲۱-۷۵-۱۳۳-۱۳۴-۲۰۶-۲۱۳-۲۱۴-۲۲۱-۲۳۰-۲۳۱ تا ۲۳۷-۲۳۹-۲۶۸-۳۳۱-۳۳۷-۳۶۲-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۹-۳۷۲-۳۸۱-۳۸۴-۳۹۳-۳۹۷-۴۰۲-۴۱۱-۴۲۶-۴۲۷-۴۳۱-۴۳۵-۴۴۹-۴۶۷-۴۶۸-۵۰۳-۵۰۴-

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۸۳-۵۹۳-۵۹۴-۶۱۳-۶۲۰-۶۲۱

— کفار خسارے میں پڑ گئے ہیں ۴۵۱-۴۵۲
— کافروں کے کفر پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوتا ہے ۳۹۶
— کفار اس بڑائی کو نہیں پہنچ سکتے جس کا وہ گھمنڈ کرتے ہیں ۴۱۶
— کفار کو راہِ راست پر لانے کے لیے جو طریقے بھی بہترین ہو سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ سب اختیار کیے ہیں ۴۷۶-۴۷۷
— ان کافروں سے کیا معاملہ ہوگا جن کے علاقے میں ایک طویل مدت سے کوئی پیغمبر نہیں آیا ۳۶-۳۷-۲۴۶
— کفار کے بے دلیل عقیدے ان کے نامۂ اعمال میں ثبت کر لیے گئے ہیں اور انھیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی ۵۳۲
— کفار ہمیشہ سے باپ دادا کے عمل کو اپنے مذہب کے حق میں دلیل بناتے رہے ہیں ۲۰-۲۹۰-۵۳۳-۵۳۴

کفارِ عرب - (دیکھو ''عرب'')

کفارِ مکہ - (دیکھو ''قریش'')

کفارہ - (دیکھو ''قسم'')

گ

گمراہی - (دیکھو ''ضلالت'')

گناہ

— نادانستہ خطا سرزد ہو جانے پر کوئی گرفت نہیں ہے البتہ اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا ارادہ دل سے کیا گیا ہو ۷۰

ل

لعنت

— خدا کی لعنت کے مستحق کیسے لوگ ہیں ۱۲۳-۱۳۱-۱۳۵-۴۱۵

لقمان

— عرب میں ان کی شہرت ۶
— ان کے حالات اور نصائح ۱۲ تا ۱۸
— ان کو حکمت دی گئی تھی ۱۲
— کلام لقمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعریفی کلمات ۱۳

لوط علیہ السلام

— ان کا قصہ ۳۰۶
— قومِ لوط اور اس پر عذاب کی وجہ ۳۲۲
— حضرت لوطؑ کی بیوی کے سوا ان کے گھر کے سب افراد عذابِ الٰہی آنے پر بچا لیے گئے ۳۰۶

لیلۃ القدر

— وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا ۵۵۹-۵۶۰
— اللہ تعالیٰ خیرو برکت والی اس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کرتا ہے ۵۵۹

م

ماریہ قبطیہ

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے بربنائے ملک ان سے تمتع فرمایا تھا ۱۱۳-۱۱۴

متبنّٰی - (دیکھو ''تبنیت'')

متقی - متقین (دیکھو ''تقویٰ'')

متکبر - متکبرین (دیکھو ''تکبر'')

محسن - (دیکھو ''نیکی'' اور ''احسان'')

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

— رسول مبین ۵۳۵-۵۶۲
— آپؐ پر قرآن اللہ نے نازل کیا ہے ۳۴-۳۵-۲۴۵-۳۳۲-۳۵۵-۳۷۵-۳۹۱-۴۴۱-۴۵۳-۴۸۰-۴۹۷-۵۵۹-۵۷۹-۶۰۰
— قرآن کا نزول آپؐ کے لیے بھی اور آپؐ کی

قوم کے لیے بھی شرف ہے ۵۴۰

— آپؐ تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نذیر و بشیر بنا کر بھیجے گئے تھے ۱۰۵-۲۰۲-۲۰۳-۲۱۱-۲۳۰-۳۵۰

— آپؐ کو اللہ کی طرف دعوت دینے والا بنایا گیا تھا ۱۰۸

— آپؐ صرف انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جنوں کی رہنمائی کے لیے بھی مبعوث ہوئے تھے ۵۹۶-۵۹۸-۶۱۸ تا ۶۲۰

— آپؐ کی اطاعت کا حکم ۸۷-۹۳-۹۷-۹۸-۱۳۵

— اللہ کی نگاہ میں آپؐ کا مرتبہ ۱۲۳-۱۲۴-۱۲۸

— آپؐ سیدھے راستے پر تھے ۴۴۵-۵۳۹

— آپؐ سچائی لے کر آئے تھے ۳۷۲

— آپؐ رسولوں میں سے تھے ۴۴۵

— آپؐ کوئی نرالے رسول نہ تھے ۶۰۵

— اللہ نے آپؐ کو دین کی صاف شاہراہ پر قائم کیا ہے ۵۸۶

— اللہ کے حکم سے آپؐ نے ان اختلافات کا دروازہ بند کر دیا جو تورات و انجیل میں پیدا کر دیے گئے تھے ۴۹۴-۴۹۵

— آپؐ اللہ کے سیدھے راستے کی طرف بلاتے تھے ۵۱۷

— آپؐ حق لے کر آئے تھے ۲۳۰-۲۸۵-۵۳۵

— آپؐ کا ذریعۂ علم وحی تھا ۲۱۲-۳۴۷-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۱-۴۷۸-۴۸۶-۵۱۶

— آپؐ کو اللہ تعالیٰ کن کن طریقوں سے تعلیم دیتا تھا ۴۷۷-۵۱۶-۵۱۷

— آپؐ کی ذات میں ایمان والوں کے لیے بہترین نمونہ ہے ۸۰-۸۱

— آپؐ کے ساتھ اہلِ ایمان کا کیا تعلق ہونا چاہیے ۷۱-۷۴-۱۰۴-۱۱۸-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۷

— آپؐ کے خلاف اگر کسی کے دل میں بھی وسوسہ ہو تو اس پر گرفت ہوگی ۱۱۸-۱۲۲

— آپؐ اور آپؐ پر ایمان لانے والے عذاب سے محفوظ ہیں ۳۷۲

— آپؐ کے مخالفین کو اللہ سزا دے گا ۵۳۹

— آپؐ کو نہ ماننے والے کافر ہیں ۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱-۳۸۴-۴۱۴

— آپؐ کو تکلیف پہنچانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ۱۲۱

— آپؐ کی نبوت کے دلائل ۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۴۹-۲۴۵-۲۵۲-۲۵۳-۳۵۰-۴۷۷-۵۱۷-۵۱۸

— آپؐ نبوت ملنے سے پہلے نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے ۵۱۷

— بعثت سے پہلے آپؐ کی پوری زندگی اس بات کی گواہ تھی کہ آپؐ جھوٹے مدعی نبوت نہیں ہو سکتے ۲۱۱-۳۵۰

— بائبل میں آپؐ کی نبوت کی شہادت ۳۰۵-۳۰۶

— آپؐ کو کس منصبِ عظیم پر اللہ نے مامور فرمایا ہے ۱۰۵ تا ۱۰۸

— آپؐ کی دعوت کیا تھی ۳۵۴-۳۵۵-۳۶۴-۴۴۱-۴۷۵

— آپؐ کی بعثت کس مقصد کے لیے ہوئی تھی ۲۱۱-۲۱۲-۲۴۵-۲۴۶-۳۴۴-۳۶۴-۴۸۰ تا ۴۸۲

— آپؐ کے لائے ہوئے دین کی حقیقت ۴۷۵-۴۷۶

— آپؐ کے لائے ہوئے دین کی بنیادی تعلیمات (دیکھو "اسلام")

— آپؐ کی بعثت اللہ کی رحمت تھی ۵۵۹-۵۶۰

— آپؐ کے ذریعے سے حق پہنچا دیا گیا، اب نافرمانوں کے سوا کوئی اور نہ بھٹکے گا ۶۲۱

— آپؐ کی بعثت سے پہلے صدیوں سے عرب میں کوئی نبی نہیں آیا تھا ۳۶-۲۴۶-۲۴۷

— آپؐ کی آمد سے پہلے اہل عرب خود ایک نبی مانگ رہے تھے ۲۴۰-۲۴۱-۳۱۳

— پچھلے انبیاؑ کے بعد آپؐ کے مبعوث کیے جانے

Maktaba Tul Ishaat.com

کی وجہ ۴۹۴
— آپؐ تمام انبیا کی لائی ہوئی کتابوں کو ماننے پر مامور تھے ۴۹۵
— آپؐ پچھلے تمام انبیاؑ کی تصدیق کرتے تھے ۲۸۵
— آپؐ کی دعوت و تعلیم وہی تھی جو پہلے انبیاؑ کی تھی ۳۸۱-۳۸۲-۴۶۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۱-۴۸۵-۴۸۶-۵۲۳-۵۲۴-۶۱۴-۶۱۵
— آپؐ دین میں باختیارِ خود کوئی رد و بدل کر لینے کے مجاز نہ تھے ۴۹۵- ۵۸۶-۵۸۷
— آپؐ تمام انسانوں کے درمیان انصاف پر مامور تھے ۴۹۵-۴۹۶
— آپؐ وحیِ الٰہی کی پیروی پر مامور تھے ۵۳۹-۶۰۵-۶۰۶
— آپؐ کا کام صرف حق پہنچا دینا تھا، کسی کے حق قبول نہ کرنے کی ذمہ داری آپؐ پر نہ تھی ۲۳۰-۳۷۵-۵۱۴
— آپؐ کا کام لوگوں کو حقیقت سے خبردار کرنا تھا ۲۱۲-۳۴۶-۶۰۵-۶۰۷
— آپؐ کی ذمہ داری یہ نہ تھی کہ لوگوں کو راست رو بنا دیں ۲۱۱-۳۷۵-۵۱۴
— آپؐ دوسروں کو جس چیز کی دعوت دیتے تھے اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتے تھے ۳۶۴
— آپؐ نے کبھی جاہلیت کے طریقوں کی پیروی نہیں کی ۲۳-۲۱۱
— آپؐ اپنی دعوتِ حق پر لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہ تھے ۳۵۰-۵۰۰ تا ۵۰۲
— آپؐ نبوت کے کام میں بالکل بے غرض تھے ۲۱۲
— "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" کی صحیح تفسیر ۵۰۱-۵۰۲
— سردارانِ قریش سے آپؐ کا ارشاد کہ اگر تم میری دعوت مان لو تو عرب و عجم کے حکمران ہو جاؤ گے ۳۱۶
— مشرکینِ عرب پر آپؐ کے غالب آنے کی پیشین گوئی ۳۱۳-۳۱۴-۳۱۸-۳۲۲
— آپؐ کی دعوت کے دنیا پر چھا جانے کی پیشین گوئی ۴۶۸ تا ۴۷۰ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "قرآن، اس کی پیشین گوئیاں")
— کفار کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اور اس کے جوابات ۴۲۸ تا ۴۳۰-۶۰۵-۶۰۶
— وہ حکمت جو دعوتِ دین کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے آپؐ کو سکھائی گئی ۴۵۴-۴۵۶-۴۶۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "حکمت تبلیغ" اور "دعوت حق")
— آپؐ اللہ کی طرف سے حق کی تعلیم اور ہدایت پاتے تھے ۲۱۲
— آپؐ بذاتِ خود عالم الغیب نہ تھے ۳۴۷-۶۰۵
— آپؐ کو بذریعۂ وحی صرف وہ حقائق بتائے گئے تھے جو نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے ضروری تھے ۳۴۷
— آپؐ کی بشریت ۴۴۱ (نیز دیکھو "نبوت")
— آپؐ فوق البشری طاقتوں کے مالک نہ تھے ۶۰۵-۶۰۶
— آپؐ خود کسی کو ہدایت بخش دینے پر قادر نہ تھے ۲۲۸ تا ۲۳۰-۵۳۹
— آپؐ کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ خدا کے عذاب سے کسی کو بچا لیں ۳۶۵-۳۶۶
— آپؐ کا کام لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنا نہ تھا بلکہ غافلوں کو بیدار کرنا تھا ۴۷۴- ۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱
— بندوں کے اعمال کی نگرانی اور ان کا محاسبہ آپؐ کے سپرد نہیں کیا گیا تھا، یہ کام اللہ نے اپنے ہاتھ ہی میں رکھا ہے ۴۸۰-۴۸۱-۵۱۴
— آپؐ کے گواہ ہونے کا مفہوم ۱۰۵ تا ۱۰۹
— آپؐ سے اور دوسرے انبیا سے کس چیز کا عہد لیا گیا تھا ۷۳ تا ۷۵
— آپؐ کے اخلاق کریمانہ ۵۹-۱۰۰-۱۲۰- ۱۲-۲۵۵

— آپؐ بحیثیتِ قاضی ۴۹۵-۴۹۶
— آپؐ بحیثیتِ حاکم وفرماں روا ۹۷-۹۸
— آپؐ کے کمالات بحیثیتِ فوجی قائد ۵۵-۵۶-۵۸-۷۷-۸۰-۸۱
— آپؐ کے کمالات بحیثیتِ مدبر ۵۵-۵۶-۶۰-۶۱-۶۲
— آپؐ حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے والے تھے ۵۳۵
— آپؐ کتاب ہی نہیں حکمت بھی لائے تھے ۹۲-۹۴
— آپؐ کے احکام بحیثیتِ نبی اور بحیثیتِ انسان میں اصولی فرق ۶۱
— آپؐ کی امت کی فضیلت، اس کے طبقات اور آخرت میں اس کا انجام ۲۳۳ تا ۲۳۷
— آغازِ نبوت میں قریش کن غلط فہمیوں میں مبتلا تھے ۳۲-۳۳-۳۸-۳۹
— مکہ کے ان سرداروں کی اخلاقی حالت جو آپؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے ۲۲۱-۲۲۲
— آپؐ کے خلاف ان کے الزامات، اعتراضات اور شبہات ۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۴۳۴-۵۳۵-۵۶۲-۵۶۳-۶۰۳-۶۰۴
— کفارِ قریش خود جانتے تھے کہ وہ آپؐ پر جو الزامات لگاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۹-۱۶۷-۱۷۱
— کفارِ مکہ کی طرف سے آپؐ پر کہانت کا الزام اور اس کا جواب ۲۸۰-۲۸۱
— کفارِ مکہ آپؐ کی باتوں کو جادو کس معنی میں کہتے تھے ۲۸۲-۳۲۰-۵۳۵-۶۰۳
— کفارِ مکہ کا آپؐ کو شاعر کہنا ۲۷۰-۲۸۵
— کفارِ مکہ کا آپؐ کو مجنون کہنا ۱۶۷-۲۱۱-۲۸۵
— سردارانِ قریش کی آپؐ سے مصالحت کی بات چیت ۳۱۶-۳۱۷-۴۳۴-۴۳۵
— مشرکین کو آپؐ کی دعوت سخت ناگوار گزرتی تھی ۴۹۳
— آپؐ سے کفار کا حسد اور بغض حضرت آدمؑ سے شیطان کے حسد اور بغض جیسا تھا ۳۵۰
— اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ اے نبی تم بھی انتظار کرو اور یہ کفار بھی منتظر رہیں کہ کس کا کیا انجام ہوتا ہے ۵۷۳-۵۷۴
— جو کوئی آپؐ کی دعوت کو نہ مانے گا، اس کا انجام ۶۲۰
— آپؐ کا بھروسا اللہ ہی پر تھا اور مصیبت میں آپؐ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے ۴۸۵
— کفارِ مکہ آپؐ کی شخصیت کا وزن پوری طرح محسوس کرتے تھے ۳۱۷
— وہ اپنے دلوں میں آپؐ کی صداقت کے معترف تھے ۴۳۵
— آپؐ کی مخالفت کرنے والے کفار کی ذہنی حالت ۴۶۵
— کفارِ قریش کو کیا چیز آپؐ پر ایمان لانے سے روک رہی تھی ۲۲۳-۲۲۴-۳۱۸-۳۸۹-۴۱۶-۴۳۴-۴۶۵-۵۰۴-۵۲۱-۵۲۲-۵۳۵-۵۳۶
— وہ آپؐ کی بات نہ ماننے کے کیا وجوہ بیان کرتے تھے ۳۱۹-۳۲۱
— وہ آپؐ کو اس لیے نبی ماننے سے انکار کرتے تھے کہ آپؐ بشر ہیں ۲۴۹ تا ۲۵۱
— ان کو اس بات پر تعجب تھا کہ خود ان کی اپنی قوم کا آدمی نبی کیسے ہوگیا ۳۱۹
— وہ دراصل آپؐ کو نہیں بلکہ اللہ کے پیغام کو جھٹلا رہے تھے ۳۲۱
— سردارانِ قریش کا آپؐ کو نبوت کے لائق نہ سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ۳۲۱-۳۲۲
— آپؐ کو صبر کے ساتھ مکی زندگی کے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین ۳۲۳-۴۱۵-۴۲۸-۶۲۱
— وہ اولین مسلمان جو آپؐ کی دعوت سنتے ہی کسی

Maktaba Tul Ishaat.com

شک وشبہ کے بغیر ایمان لے آئے ۱۰۰
— مکی زندگی کے آخری دور میں آپؐ کے مصائب ۵۹۶ تا ۵۹۸
— طائف کا سفر ۵۹۷
— طائف سے واپسی پر آپؐ کی رقت انگیز دعا ۵۹۷
— اس حالت میں بھی آپؐ دشمنوں کے لیے بددعا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ۵۹۸
— آپؐ کا کفار مکہ کو چیلنج کہ میں اپنا کام جاری رکھوں گا تمھیں جو کچھ کرنا ہے کرلو ۳۷۴
— آپؐ کی دعوت کو زک دینے کے لیے قریش کی تدبیریں ۸-۹- ۱۰- ۳۸۸- ۴۳۶- ۴۵۳- ۴۵۶- ۴۵۷- ۴۶۲- ۴۶۴- ۴۹۶- ۵۵۰- ۵۵۱
— آپؐ کے خلاف تدبیریں کرنے والوں کا انجام ۴۵۳
— آپؐ پر کفار مکہ کا یہ الزام کہ آپؐ نے قرآن خود تصنیف کرلیا ہے اور اس کا جواب ۳۴- ۳۵- ۵۰۲- ۵۰۳- ۵۶۲- ۶۰۳- ۶۰۴
— آپؐ کو قتل کرنے کے لیے ان کی سازشیں ۳۸۸- ۴۳۶
— آپؐ کے مقابلے میں کفار مکہ کی ہٹ دھرمی کا جواب ۴۳۷- ۴۴۱- ۴۶۴- ۵۶۲- ۵۶۳
— آپؐ کی طرف سے کفار کے اتہامات کا جواب ۲۱۲- ۲۱۳
— آخرت کا عقیدہ پیش کرنے پر کس طرح آپؐ کا مذاق اڑایا گیا ۱۷۶
— آپؐ سے اللہ کا وعدہ کہ وہ آپؐ کے جھٹلانے والوں کو ضرور سزا دے گا ۴۲۸
— آپؐ کی دعا پر مکہ میں قحط برپا ہونا ۵۵۶- ۵۶۲- ۵۶۳- ۵۶۴
— سرداران قریش کی آپؐ سے درخواست کہ قحط دور کرنے کے لیے دعا فرمائیں ۵۵۶- ۵۶۳
— اپنی قوم کو ہدایت دینے کے لیے آپؐ کی بے چینی ۲۲۲
— ہجرت حبشہ ۳۵۴
— مدینہ کے ابتدائی دور میں آپؐ کی معاشی تنگ حالی ۶۵- ۶۶- ۸۴
— آپؐ کی کثرتِ ازواج کے وجوہ ۱۱۲ تا ۱۱۸
— آپؐ کے لیے چار بیویوں کی قید نہ ہونے کے وجوہ ۶۵- ۶۶- ۱۱۲- ۱۱۲ تا ۱۱۶
— آپؐ کو اجازت تھی کہ جس بیوی سے جو چاہیں سلوک کریں ۱۱۶- ۱۱۷
— ازواجِ مطہرات سے آپؐ کا عدل ۱۱۷- ۱۱۸
— آپؐ کی ازواجِ کے نام اور ان کی تعداد ۱۱۳- ۱۱۴
— آپؐ کی ازواج مطہرات امت کے لیے حرام کردی گئی ہیں ۶۷- ۱۲۱- ۱۲۲
— آپؐ کی ازواج امت کی مائیں ہیں ۷۱- ۷۲
— حضرت زینبؓ سے نکاح کا حکم آپؐ کو کیوں دیا گیا تھا ۶۴- ۶۶- ۱۰۱- ۱۰۲
— حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے پر آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان ۶۴- ۶۵
— آپؐ کے خلاف مغربی مستشرقین کا اندھا تعصب ۴۰۴
— آپؐ کو حضرت زینبؓ سے نکاح میں کیوں تامل تھا؟ ۶۸- ۷۴- ۱۰۰- ۱۰۱
— شماتتِ اعدا کے اندیشے سے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح میں تامل کرنے پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ۱۰۰- ۱۰۱
— آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا تھا ۱۰۱
— یہ نکاح آپؐ پر فرض تھا ۱۰۲
— آپؐ کی خانگی زندگی کے معاملات پر بھی براہِ

راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی قائم تھی ۶۵-۶۶
— آپؐ کی صاحبزادیوں کی تعداد ۱۳۰-۱۳۱
— وہ مملوکہ خاتون جن سے آپؐ نے بربنائے ملک تمتع فرمایا ۱۱۳-۱۱۴
— وہ خاص امور جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے احکام عام مسلمانوں کے احکام سے مختلف تھے ۱۰۲-۱۱۴ تا ۱۱۷
— تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہراتؓ نے آپؐ کی رفاقت قبول کر لی تھی ان کو طلاق دینے کا آپؐ کو اختیار نہ تھا ۸۵-۱۱۸
— آپؐ کا گھر مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا اور مسلمانوں کے گھروں میں جو اصلاحات نافذ کرنی ہوتی تھیں وہ پہلے آپؐ کے گھر میں نافذ کی جاتیں ۱۱۹ تا ۱۲۱
— آپؐ پر درود و سلام بھیجنے کا حکم اور اس کی تشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸
— غیر انبیاؑ کے لیے صلوٰۃ و سلام کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۲۸
— اللہ تعالیٰ اور فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں ۱۲۳
— درود میں آپؐ کی آل کو شامل کرنے کا مطلب ۱۲۶
— اللہ نے آپؐ کو شعر کی تعلیم نہیں دی نہ شاعری آپؐ کے لیے زیبا تھی ۲۶۹
— آپؐ بھی انسانوں کی طرح موت سے ہم کنار ہونے والے تھے ۳۷۱-۳۷۲
— آپؐ کی نصرت کے لیے اللہ کا وعدہ ۴۱۴-۴۱۵
— صبر کی طاقت حاصل کرنے کے لیے آپؐ کو نماز کی تلقین ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ کا وہ "قصور" جس کی معافی چاہنے کے لیے اللہ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ کس طرح اپنے صحابہؓ کی تربیت فرماتے تھے ۴۵۹
— وہ حیرت انگیز انقلاب جو آپؐ کی دعوت نے دنیا میں برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰
— آپؐ کو کن باتوں میں دوسرے انبیاؑ پر فضیلت حاصل ہے ۱۴۱
— آپؐ کا بنی نوع انسان پر کتنا بڑا احسان ہے ۱۲۴
— مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں ۳۷۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "ختم نبوت"، "قرآن"، "قریش" اور "نبوت")

مدینہ-
(دیکھو "محمد صلی اللہ علیہ وسلم"، "منافقین" اور "یہود")

مسلم - (دیکھو "اسلام")

مرتد - (دیکھو "قانون اسلام، قانون فوجداری")

مسیح - (دیکھو "عیسیٰ علیہ السلام")

مسیحِ موعود
— ایک یہودی عقیدہ اور اس کی حقیقت ۱۵۴ تا ۱۶۹

مسیحی، مسیحیت - (دیکھو "عیسائیت")

مستشرقین
— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کا اندھا تعصب ۴۰۴
— قرآن کے خلاف ان کی چالیں ۱۴

مشرک، مشرکین - (دیکھو "شرک")

مشرکینِ عرب - (دیکھو "شرک" اور "عرب")

مشیتِ الٰہی - (دیکھو "تقدیر")

معبود
— معبودوں کی دو قسمیں ۲۸۳
— کون سے معبود جہنم میں ڈالے جائیں گے ۲۸۳

Maktaba Tul Ishaat.com

(تفصیل کے لیے دیکھو ''الٰہ'')

معجزہ، معجزات

— معجزے کا ثبوت کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے ۳۳۴-۳۳۵
— معجزے اور جادو کا فرق ۴۰۳
— حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا ۲۹۳-۲۹۴
— حضرت ایوبؑ کے لیے زمین سے چشمہ نکالا جانا ۳۴۰
— وہ معجزات جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے ۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵-۵۶۵ تا ۵۶۷
— وہ معجزات جو حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے فرعون اور اس کی قوم کو دکھائے گئے ۵۴۱-۵۴۲
— حضرت یونسؑ کے قصے میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی قدرت کے کرشمے ۳۰۷-۳۰۸
— وہ معجزات جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا کیے گئے ۵۴۶-۵۴۷
— قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزے کا مطالبہ اور اس کا جواب ۴۲۸ تا ۴۳۰-۶۰۵-۶۰۶
— معجزہ کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ فیصلہ کن چیز ہے اور اس کے بعد پھر عذاب ہی آتا ہے ۴۲۹
(نیز دیکھو ''آیت بمعنی معجزہ'')

مغفرت

— مغفرت کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹۴-۹۷-۱۳۵-۱۷۵-۲۲۱-۲۴۸-۲۵۴-۳۷۹-۳۸۰-۶۰۵
— سرکشی چھوڑ کر اطاعت کی طرف آنے والے کے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں ۳۷۹
— بعض حالات میں توبہ کے بغیر بھی مغفرت ہو سکتی ہے ۳۹۲

ملائکہ - (دیکھو ''فرشتہ'')

ملک الموت

— انسانوں کی روح قبض کرنے والا فرشتہ ۴۱
— روحیں قبض کرنے والا صرف ایک ہی فرشتہ نہیں بلکہ بہت سے فرشتے اس کے ماتحت کام کرتے ہیں ۴۳

منافقین

— ان کی صفات اور ان کا طرزِ عمل ۷۶-۸۰ تا ۸۲
— منافقت کیا چیز ہے ۱۳۱-۱۳۲
— منافق اور مشرک کی سزا ۱۳۶
— مدینہ میں منافقین کا کردار ۵۵-۵۶-۶۰-۶۴-۷۶ تا ۸۰-۹۹-۱۳۱
— منافقین کی اطاعت و پیروی نہ کی جائے ۶۸
— اندرونی دشمنوں (منافقین) کے ساتھ سخت برتاؤ کا حکم ۱۳۱
— مومن اور منافق کا فرق ۲۲۹-۲۳۴

منکرینِ حدیث

— منکرین حدیث کے دلائل کا ابطال:
(۱) جنوں کے بارے میں ۲۱۰
(۲) حضرت سلیمانؑ کے جنوں کے بارے میں ۱۹۰-۱۹۱
(۳) اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں ۴۴۴-۴۴۵
(۴) وحی کے بارے میں ۵۱۴

موت

— اس کی حقیقت ۴۱-۴۳-۴۴
— مرتے وقت ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صالح کی حیثیت سے جا رہا ہے یا مجرم کی حیثیت سے ۴۳
— موت خود بخود نہیں بلکہ اللہ کے روح قبض کرنے سے واقع ہوتی ہے ۴۳-۳۷۵

موسیٰ علیہ السلام ۴۹-۷۳-۴۱۵-۴۶۴-۶۰۸

— ان کا قصہ ۴۰۲ تا ۴۱۳-۵۴۰ تا ۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۹
— ان کے اوصاف ۵۶۵-۵۶۶
— ان پر سلام ۳۰۲

— اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ ۱۳۴-۱۳۵

— ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایات ۳۰۲

— ان کو راہ راست دکھائی گئی اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا گیا ۳۰۲

— ان کو ہدایت اللہ ہی کی طرف سے ملی تھی ۴۱۵

— ان سے کس بات کا پختہ عہد لیا گیا تھا ۴۳ تا ۷۵

— ان کو اللہ نے کتاب و نصرت عطا فرمائی تھی ۴۹-۳۰۲-۴۱۵-۴۶۴

— وہ بینات لائے تھے ۴۰۶

— وہ نشانیاں جو آپؑ کے نبی ہونے پر صریح دلالت کر رہی تھیں ۳۰۲-۳۰۳

— وہ معجزات جو ان کو دلیلِ نبوت کے طور پر دیے گئے ۵۶۵-۵۶۶

— وہ معجزات جو ان کی دعا پر فرعون اور آلِ فرعون کو ہدایت دینے کے لیے ظاہر ہوئے ۵۴۱-۵۴۲

— وہ معجزہ جو مصر سے خروج کے وقت رونما ہوا ۵۶۶-۵۶۷

— جن بھی ان پر ایمان رکھتے تھے ۶۱۹

— ان کی دعوت کیا تھی ۵۶۵

— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶

— ان کی تعلیم وہی تھی جو قرآن کی تعلیم ہے ۶۰۸

— ان کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا ۴۰۲

— ان کو اللہ نے اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا ۵۴۰

— ان کا فرعون سے مطالبہ کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالے کرو ۵۶۵

— فرعون کا ان کے قتل کا ارادہ ظاہر کرنا اور ان کا جواب ۴۰۴-۴۰۵-۵۶۵

— فرعون کے وہ الزامات جو اس نے قتل کی سزا دینے کے لیے آپ پر لگائے ۴۰۳-۴۰۴

— فرعون کے مقابلے میں ان کو قدم قدم پر اللہ کی رہنمائی حاصل تھی ۴۱۵

— فرعون کی اپنی قوم کا ایک مومن بھرے دربار میں ان کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے ۴۰۵ تا ۴۱۲

— اللہ نے ان کو اور حضرت ہارونؑ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے نجات عطا فرمائی ۳۰۲-۵۶۸

— فرعون اور آلِ فرعون کے رویے کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ان کی فریاد ۵۶۶

— ان کو ہجرت کا حکم اور فرعون کا غرق ہونا ۵۶۶-۵۶۷

— بنی اسرائیل کا ان کو اذیتیں دینا ۳۴-۱۳۵

— اللہ نے ان تہمتوں سے ان کی براءت فرمائی جو بنی اسرائیل ان پر لگاتے تھے ۱۳۴-۱۳۵

— وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھے ۱۳۵

— مصر میں ان کی دعوت کے اثرات ۴۱۲-۴۱۳

— ان کے بعد بنی اسرائیل کا بگاڑ ۵۰-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵

— کیا فرعون نے حضرت موسیٰ پر لکنت کا طنز کیا تھا؟ ۵۴۴-۵۴۵

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'' اور ''فرعون'')

موسیقی

— اس کے متعلق شرعی احکام ۹-۱۰

مومن - (دیکھو ''ایمان'')

مومنِ آلِ فرعون

— اس کا قصہ ۴۰۵ تا ۴۱۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''موسیٰ علیہ السلام'')

میزان

— اللہ کی طرف سے میزان نازل کیے جانے کا مطلب ۴۹۷

Maktaba Tul Ishaat.com

ن

نامۂ اعمال

— اس میں کیا کچھ ثبت کیا جارہا ہے ۲۴۸
— آخرت میں ہر انسان کا نامۂ اعمال پیش ہوگا ۳۸۳
— قیامت کے دن ہر انسان کو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے کے لیے طلب کیا جائے گا ۵۹۲
— انسان کا پورا نامۂ اعمال خدا کے فرشتے ثبت کر رہے ہیں ۵۵۱
— اللہ ہر ایک کا نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے ۵۹۲-۵۹۳
— یہی نامۂ اعمال آخرت میں ٹھیک ٹھیک شہادت دے گا ۵۹۲
— انسان کا اپنا ہی کیا دھرا اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوگا ۵۹۲

نبوت

— وہ کسبی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۱۵۲-۵۱۷-۵۱۸
— وہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے ۵۳۶-۵۳۷
— نبی کی بعثت اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے ۵۵۷-۵۵۹ تا ۵۶۱
— نبوت اور رسالت کا فرق ۱۴۹-۱۵۰
— ”نذیر“ بمعنی رسول ۵۳۳
— نبوت کے متعلق لوگوں کے جاہلانہ تصورات اور ان کی تردید ۶۰۵ تا ۶۰۷
— کن حالات میں نبی کی بعثت ضروری ہوتی ہے ۲۴۶
— وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا علیہم السلام سے لیا ہے ۳ تا ۵۷
— کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو ۲۳۰
— ہر قوم کے لیے ایک نبی آنے کا صحیح مفہوم ۲۳۰-۲۳۱
— نبی اسی قوم کا آدمی ہونا چاہیے جس میں وہ مبعوث ہو ۳۱۹-۳۲۰-۳۸۴-۴۲۰
— نبوت کا تسلیم کرنا ہمیشہ سے دینِ حق کا لازمی جز رہا ہے ۴۸۷
— تمام رسولوں پر ایمان ضروری ہے ۴۸۶
— نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ۴۸۷
— یہ فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے کہ کسے اپنا نبی بنائے ۳۲۱-۳۹۸-۳۹۹-۵۳۶-۵۳۷
— قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر ہے اور بعض رسولوں کا نہیں ہے ۴۲۸
— اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انبیا ہی کے واسطے سے اپنی شریعت بھیجی ہے ۴۸۷
— کسی قوم میں رسول اور کتاب کا آنا اس کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہوتا ہے ۴۹ تا ۵۱
— ایک وقت میں تین نبی بھیجنے کی واحد مثال ۲۴۹
— انبیا علیہم السلام جنوں کے لیے بھی نبی تھے ۶۱۹
— ہر زمانے کے منکرین نے انبیا کا اس لیے انکار کیا کہ وہ انسان کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۲۴۹-۴۴۷-۵۳۶
— انسانوں کی ہدایت کے لیے ہمیشہ انسان ہی نبی بنائے گئے ہیں ۵۳۶
— ہر زمانے کے منکرینِ انبیاؑ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو نبی ہے وہ بشر نہیں ہوسکتا اور جو بشر ہے وہ نبی نہیں ہوسکتا ۲۴۹ تا ۲۵۱-۴۴۷-۵۴۴-۵۴۵
— انبیاؑ کا ذریعہ علم وحی ہے ۲۳۳-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۱ (تشریح کے لیے دیکھو ”وحی“)
— انبیاء کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵

— نبی کو نبوت پر سرفراز ہونے اور وحی نازل ہونے سے پہلے وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو نبوت اور نزول وحی کے بعد ہوتا ہے ۵۱۷-۵۱۸

— نبی غیب داں نہیں ہوتا ۶۱۶

— کوئی نبی اپنے اختیار سے معجزہ نہیں دکھا سکتا ۴۲۸

— لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا ۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱

— لوگوں پر عذاب لے آنا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا ۶۱۵-۶۱۶

— نبی کی رشتہ داری کسی کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی ۸۷-۸۸-۳۰۶

— نبی خود بھی اگر قصور کرے تو سزا سے نہیں بچ سکتا ۳۰۷ تا ۳۱۰-۳۲۵-۳۳۰-۳۶۴-۵۸۶-۵۸۷

— انبیا علیہم السلام بھی آزمائشوں سے نہیں بچے ہیں ۲۳۰-۳۳۳ تا ۳۳۶

— نبی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ خدا کے عذاب سے کسی کو بچا لے ۳۶۵-۳۶۶

— اللہ نبی سے رو در رو کلام نہیں کرتا ۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۵۱۶

— نبی تک اللہ کا پیغام پہنچنے کے طریقے ۲۳۳-۵۱۶

— تمام انبیا پر وحی آتی رہی ہے ۴۷۸-۴۷۹

— انبیا علیہم السلام کی کوششوں کا اصل مقصد انسانی زندگی میں کس قسم کی اصلاح کرنا تھا ۳۷۰-۳۷۱

— انبیا کی بعثت کا مقصد ۳۷۱-۳۸۱-۳۹۹-۳۷۶ تا ۳۹۲-۶۱۶

(مزید تشریح کے لیے دیکھو ''اسلام'' اور ''دین'')

— نبی کا کام ان حقیقتوں کو کھولنا ہے جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ۵۴۸

— انبیا کی شریعتوں کے اختلاف کی حقیقت ۴۹۰-۴۹۱

— اللہ تعالیٰ نے کبھی دشمنان حق کی شرارتوں کی وجہ سے انبیا کی بعثت کا سلسلہ بند نہیں کیا ۵۲۴ تا ۵۲۶

— نبی کی صداقت کن باتوں سے پہچانی جاتی ہے ۲۵۲-۲۵۳-۴۰۶-۴۰۷-۵۰۲

— انبیا علیہم السلام کے اوصاف ۳۴۳

— اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ۶۲۱

— نبی کا کام ہے کہ سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرے ۱۰۰-۱۰۲

— نبی کا فرض ہے کہ اللہ کا حکم بجا لانے میں کسی کی پروا نہ کرے ۱۰۲

— اللہ سے ڈرنا اور اس کے احکام کی تعمیل کرنا سب سے پہلے نبی کا کام ہوتا ہے ۳۶۴

— اللہ کے بھیجے ہوئے انبیا کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایت دینے والی کتاب لے کر آئے ۲۳۰

— نبی کے کام بحیثیت نبی اور بحیثیت انسان کے درمیان اصولی فرق ۶۱

— نبی کی ذمہ داری کس حد تک ہے ۲۱۷-۲۲۸-۲۳۰-۲۵۱-۲۹۰-۵۱۴

— نبی ان لوگوں کو ہدایت نہیں دے سکتا جو خود ہدایت نہ چاہتے ہوں ۲۲۸ تا ۲۳۰-۵۹۳

— وہ بینات کیا تھیں جو اللہ کے رسول لے کر آئے ۴۰۲-۴۰۶-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۴-۵۴۸

— کسی نبی نے غیر اللہ کی بندگی کی تعلیم نہیں دی ۲۱۰-۲۱۱

— انبیا اللہ کی طرف سے کیا چیز لے کر آتے ہیں ۲۳۰

— تمام انبیا علیہم السلام کتاب ہی نہیں لائے بلکہ حکمت بھی لائے ۹۲-۹۴-۳۲۴-۵۴۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— تمام انبیاء کی تعلیم و دعوت ایک ہی تھی ۳۸۱-۴۴۷-۵۲۳-۵۲۴

— تمام انبیاء کی تعلیم وہی تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں ۳۸۱-۳۸۲-۴۱۴-۴۶۹ تا ۴۷۶-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۶-۴۸۷-۶۱۵

— انبیاء نے اپنی قوموں کو کس کس طرح سے برے انجام سے ڈرایا ۳۰۲ تا ۳۰۴

— انبیاء کی امتوں میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ ۴۷۶-۴۹۲ تا ۴۹۵

— خدا کی اطاعت کے ساتھ نبی کی اطاعت کا حکم ۹۲-۹۷-۹۸-۱۳۴-۱۳۵

— خدا سے ڈرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے ۵۴۸

— اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی کس طرح مدد فرماتا رہا ہے ۲۹۰-۲۹۱-۳۰۲

— اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے رسولوں کی مدد کرتا ہے ۳۱۳-۴۱۴

— اللہ کا یہ وعدہ برحق ہے ۴۱۵

— انبیاء کو غلبہ عطا کرنے کا صحیح مفہوم ۳۱۳-۳۱۴

— کسی کو نبی ماننے اور نہ ماننے سے کتنا بڑا بنیادی اختلاف واقع ہوتا ہے ۱۵۳-۱۵۴

— اسلام میں منصبِ نبوت کی اہمیت ۱۵۱

— نبوت کی پیروی قبول کرنے یا نہ کرنے ہی پر آخرت میں انسان کے انجام کا فیصلہ ہوگا ۲۲۷-۴۱۴

— نبی کو ماننے والے ہی خدا کی سزا سے بچ سکتے ہیں ۳۰۵

— آخرت میں انبیا علیہم السلام گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گے ۱۰۵ تا ۱۰۷-۳۸۳

— رسولوں کے لائے ہوئے علم کے مقابلے میں اپنے دنیوی علوم پر مگن رہنا تباہی کا موجب ہے ۴۳۱

— تمام انبیا کی مخالفت ہمیشہ ایک ہی طرح کی جاتی رہی ہے ۲۲۰-۲۳۰-۲۴۸ تا ۲۵۳-۴۶۳-۴۶۴-۵۲۴-۵۲۵

— ہمیشہ خوش حال طبقے نے انبیا کا مذاق اڑایا ہے ۲۰۶-۵۳۳-۵۳۴

— انبیا کی دعوت کے خلاف کفار کی ہمیشہ یہی دلیل رہی ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے وہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے ۵۳۴

— رسولوں کے خلاف دشمنانِ حق کی ساری چالیں آخرکار ناکام رہیں ۳۹۳

— انبیا کے جھٹلانے والوں کا برا انجام ۲۱۱-۲۳۰-۲۳۱-۲۵۴-۲۹۰-۳۰۵-۳۱۳-۳۲۲-۳۶۹-۳۸۴-۴۰۲-۴۲۶-۴۲۷-۵۲۵-۵۲۶-۵۳۴-۵۴۱-۵۴۵-۵۴۶-۶۲۰

— اللہ کی یہ ناقابلِ تبدیل سنت ہے کہ جو قوم اپنے نبی کو جھٹلاتی ہے وہ تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے ۲۴۱

— رسولوں پر اللہ تعالیٰ کا سلام ۱۹۷-۲۹۱-۳۰۲-۳۰۵-۳۱۴-۵۱۴

— نبی اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے ۱۰۲-۱۰۳

— نبی کی تبلیغ و بشارت اور غیر نبی کی تبلیغ و بشارت میں بنیادی فرق ۱۰۸

— نئے نبی کا تقرر کن حالات میں کیا جاتا ہے ۱۵۲

— نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی (دیکھو "ختم نبوت")

نصاریٰ - (دیکھو "عیسائیت")

نفاق (دیکھو "منافق")

نکاح

— اس کے لغوی معنوں میں اختلاف ۱۰۹

— قرآن و سنت میں نکاح کا لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے ۱۰۹

(نیز دیکھو "قانونِ اسلام۔ قانونِ نکاح و طلاق")

نماز

— اس کے قائم کرنے کا حکم ۱۷-۹۰-۹۲

— اس کو قائم کرنے کا مطلب ۴۸۸

— اقامتِ صلوٰۃ اہل ایمان کی لازمی صفات میں سے ہے ۲۳۲-۵۰۷

— دین میں اس کی اہمیت ۷-۲۲۹

— اس سے ہر مومن کو راہِ خدا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے ۴۱۶

— اقامتِ صلوٰۃ کے ثمرات ونتائج ۲۳۲-۲۳۳

— نماز کے اوقات ۴۱۶

— نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم ۱۲۷

— نماز اگرچہ تمام شریعتوں کا جز رہی ہے لیکن اس کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں ۴۸۹

نوح علیہ السلام ۳-۷-۲۹۳-۴۰۸

— ان کا قصہ ۲۹۰-۲۹۱

— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶

— وہ اللہ کے مخلص بندوں میں سے تھے ۲۹۱

— حضرت ابراہیم ان ہی کے پیرو تھے ۲۹۱

— قوم نوح ۳۰۳

— طوفانِ نوح کے بعد وہ موجودہ نسلِ انسانی کے اولین پیغمبر تھے ۴۸۶

— موجودہ انسان ان لوگوں کی اولاد ہیں جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیے گئے تھے ۲۶۱-۲۶۲-۲۹۰-۲۹۱

— ان کی کشتی ہی بنی نوع انسان کی اولین کشتی تھی اور یہیں سے کشتی سازی کا رواج ہوا ۲۶۲

— ان کا خدا کو مدد کے لیے پکارنا ۲۹۰

— ان کے لیے تمام دنیا میں سلام اور تعریف ہے ۲۹۱

— ان سے پختہ عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵

نیکی - (دیکھو "احسان")

و

وراثت

— اہل جنت زمین کے وارث ہوں گے ۳۸۴

(قانونِ وراثت کے لیے دیکھو "قانون اسلام")

وحی

— معنی وتشریح ۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۵۱۶

— اللہ کے طبعی احکام پر بھی لفظ وحی کا اطلاق ہوتا ہے ۴۴۶

— قرآن وحی کیا گیا ہے ۳۳۳-۵۳۹

— نبی کا ذریعہ علم ۴۴۱

— انبیاء کا علم عام انسانی علوم سے وحی کی بدولت ہی ممتاز ہوتا ہے ۵۱۶-۵۱۷

— ماورائے حس و ادراک امور میں وحی ہی ایک قطعی اور یقینی ذریعہ علم ہے ۴۱۸

— انبیا کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵-۵۱۷

— وحی کے لیے لفظ "روح" کا استعمال ۵۱۶

— انبیا پر وحی آنے کے مختلف طریقے ۴۷۷-۵۱۶

— وہ ایک نور ہے جس سے اللہ اپنے رسولوں کی رہنمائی کرتا ہے ۵۱۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ جس پر چاہتا ہے وحی نازل کرتا ہے ۳۹۸-۳۹۹
— کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اللہ سے رو در رو بات کرے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ انبیا کو علم دینے کے لیے دوسرے طریقے اختیار فرماتا ہے ۵۱۶
— آسمانوں میں ان کا قانون وحی کیا گیا ہے ۴۴۶

ولی
— معنی و تشریح ۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱-۵۰۴-۵۸۳
— اللہ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے ۱۹۹-۲۳۹-۲۴۰-۳۵۷-۳۶۰-۳۷۶-۴۰۰-۶۰۱-۶۰۲
— اللہ کے مقابلے میں کوئی ولی و سرپرست انسان کے کام نہیں آسکتا ۲۵۴-۵۸۳-۵۸۷-۶۲۰
— اللہ کے سوا انسان کا کوئی ولی نہیں ہوسکتا ۴۷۵-۴۸۲ تا ۴۸۴
— اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانا شرک ہے اور یہ حرکت کرنے والے کاذب اور کافر ہیں ۳۵۸-۴۸۰
— اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا دراصل اس کی عبادت کرنا ہے ۴۲۰-۴۲۴
— دوسروں سے دعا مانگنا حقیقت نہیں بدل سکتا کیونکہ ان کو معبود بنا لینے سے انھیں کسی قسم کے اختیارات حاصل نہیں ہوسکتے ۴۱۹
— اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا حد درجے کی گستاخی اور حماقت ہے اور اس کا انجام دوزخ کا عذاب ہے ۴۱۹-۴۲۰

ہ

ہارون علیہ السلام
— ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایات ۳۰۲
— وہ نبوت کے کام میں حضرت موسیٰ کے ساتھی اور مددگار تھے ۳۰۲

ہامان ۴۰۲-۴۰۹

ہجرت - اس کا مقصد ۳۵۴
— اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کرنے والوں کا اجر ۳۶۳-۳۶۴
— ہجرت حبشہ ۳۵۴

ہدایت
— اس کے ذرائع ۲۰-۲۱-۲۵-۲۳۲
— اللہ کی رضا معلوم ہونے کا ذریعہ صرف اللہ کی کتاب ہے ۵۲۱
— انسان کی ہدایت کے لیے اللہ کیا طریقے استعمال فرماتا ہے ۳۲-۳۳-۴۷ تا ۴۹
— انسان کو صحیح رہنمائی صرف اللہ کی نازل کردہ تعلیم ہی سے مل سکتی ہے ۲۳۳-۲۳۴
— انسان کو ہدایت نصیب ہونا سراسر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے ۲۸۸
— انسان کے صحیح راستے پر قائم رہنے کا انحصار کن امور پر ہے ۱۹۴-۱۹۵
— ہدایت کیسے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۴۹۳-۵۰۶
— کیسے لوگ اس سے محروم رہتے ہیں ۳۵۷-۳۶۷-۳۶۸-۴۰۶-۵۸۹-۶۰۱
— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸-۳۷۳-۴۰۸-۵۱۲-۵۱۳-۵۸۹
— جسے اللہ ہدایت بخشے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا ۳۷۳
— جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸-۴۰۸
— اللہ جسے چاہے ہدایت دے ۲۲۱-۲۲۲-۵۱۷
— کیسے لوگ قرآن سے ہدایت حاصل کرسکتے ہیں ۷-۵۸۷
— ہدایت پانے والے کون ہیں اور کون نہیں ہیں

۷-۲۲۸-۲۳۰-۳۶۵-۳۶۶

— ہدایت اختیار کرنے والا خود اپنا بھلا کرتا ہے ۳۵۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور ''ضلالت'')

ہود علیہ السلام
— ان کا قصہ ۶۱۳ تا ۶۱۷

ی

یثرب - ۶۷

الیسع علیہ السلام
— ان کے حالات ۳۴۳-۳۴۴

یعقوب علیہ السلام - ۳۴۳

یوسف علیہ السلام
— مصر میں ان کے وہ اثرات جو صدیوں تک قائم رہے ۴۰۸-۴۰۹

یوشع بن نون علیہ السلام
حضرت موسیٰ کے خلیفہ اول ۳۰۳

یونس علیہ السلام
— وہ رسولوں میں سے تھے ۳۰۷
— ان کا قصہ ۳۰۷ تا ۳۱۰
— ان پر عتاب کی وجہ ۳۰۷-۳۰۹-۳۱۰
— ان کا مچھلی کے پیٹ میں جانا اور پھر اس سے نکلنا ۳۰۷-۳۰۸
— ان کی قوم کا ایمان عذاب الٰہی آ جانے کے بعد کیوں قبول کیا گیا ۳۰۹-۳۱۰

یہود
— ان کے علما نے بنی اسماعیل سے حسد کی بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیا ۳۰۱
— حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے عہد میں وہ تین آنے والوں کے منتظر تھے ۳۰۵-۳۰۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں ان کی گمراہی ۵۴۸
— ان کے ہاں مسیح موعود کے عقیدے کی حقیقت ۱۶۵
— دجال یہودیوں ہی میں سے ہوگا ۱۶۵-۱۶۶
— یہودیوں کی مجوزہ مملکت اسرائیل ۱۶۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اہل کتاب'' اور ''بنی اسرائیل'')

Maktaba Tul Ishaat.com

قوس کی شکل میں بنا ہوا مشہور [illegible]

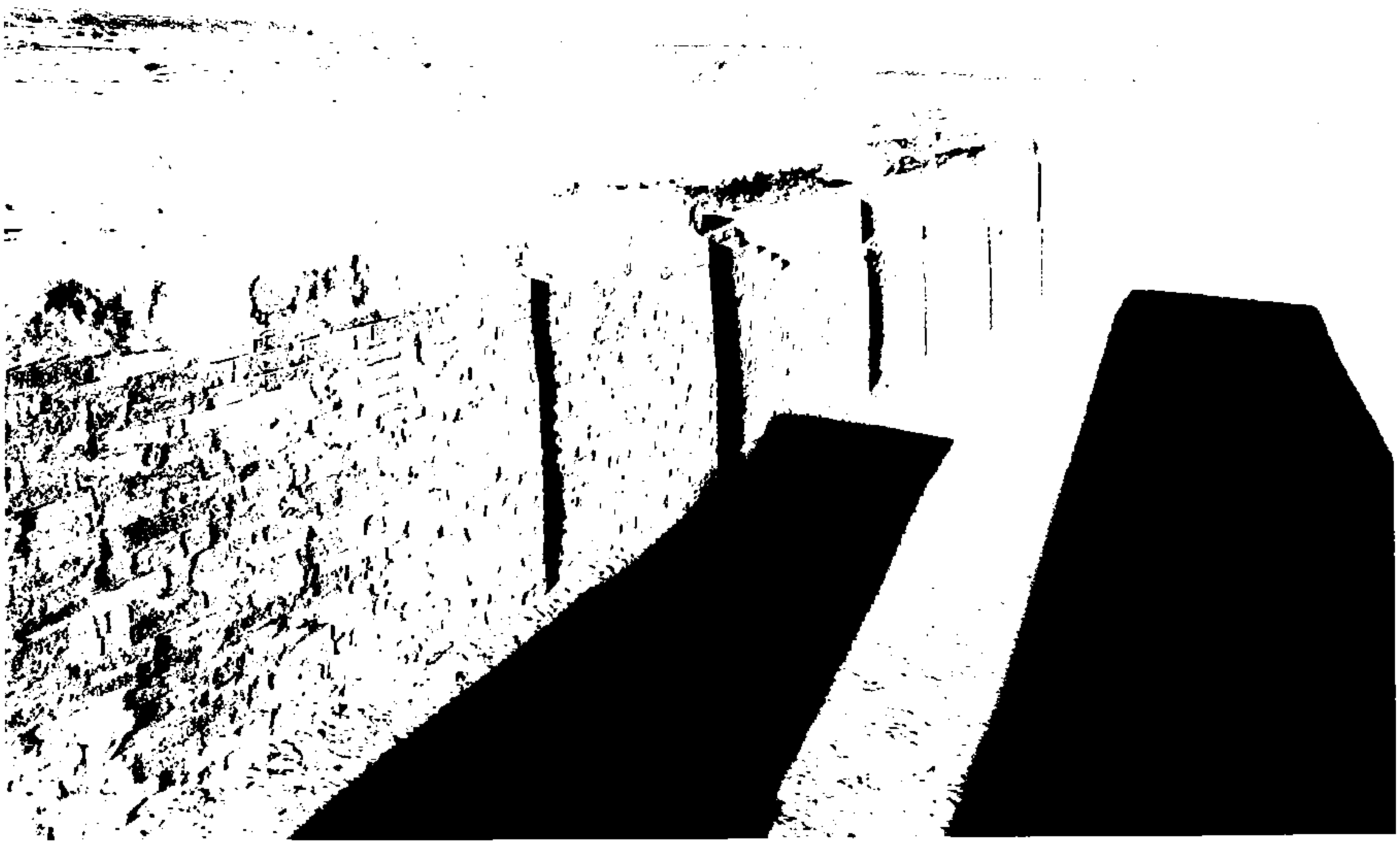

(جلد چہارم) متعلقہ صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳

متعلقہ صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳ (جلد چہارم)

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد پنجم

سورۂ محمد تا سورۂ التحریم

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ محمد تا سورۃ الطّلاق

جلد پنجم

ادارۂ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	محمد	۴۷	۶
۲	الفتح	۴۸	۳۴
۳	الحجرات	۴۹	۶۸
۴	قٓ	۵۰	۱۰۶
۵	الذاریات	۵۱	۱۳۰
۶	الطور	۵۲	۱۶۰
۷	النجم	۵۳	۱۸۸
۸	القمر	۵۴	۲۲۶
۹	الرحمٰن	۵۵	۲۴۴
۱۰	الواقعہ	۵۶	۲۷۴
۱۱	الحدید	۵۷	۲۹۸
۱۲	المجادلہ	۵۸	۳۳۶
۱۳	الحشر	۵۹	۳۷۰
۱۴	الممتحنہ	۶۰	۴۲۰
۱۵	الصف	۶۱	۴۵۲
۱۶	الجمعہ	۶۲	۴۸۲
۱۷	المنافقون	۶۳	۵۰۸
۱۸	التغابن	۶۴	۵۲۴
۱۹	الطلاق	۶۵	۵۵۰
۲۰	فہرست موضوعات		۵۸۵

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

محمد

(۴۷)

محمد

نام آیت نمبر ۲ کے فقرے وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور مشہور نام "قِتال" بھی ہے، جو آیت نمبر ۲۰ کے فقرے وَذُکِرَ فِیْھَا الْقِتَالُ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اِس کے مضامین یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں اُس وقت نازل ہوئی تھی جب جنگ کا حکم تو دیا جا چکا تھا مگر ابھی جنگ عملاً شروع ہوئی نہ تھی۔ اس کے مفصّل دلائل آگے حاشیہ ۸ میں ملیں گے۔

تاریخی پس منظر جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے، اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں خاص طور پر اور عرب کی سرزمین میں بالعموم ہر جگہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر مدینہ طیبہ کے دارالامان میں جمع ہو گئے تھے، مگر کفارِ قریش یہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی ہر طرف سے کفار کے نرغے میں گھری ہوئی تھی اور وہ اسے مٹا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اِس حالت میں دو ہی چارۂ کار باقی رہ گئے تھے: یا تو وہ دینِ حق کی دعوت و تبلیغ ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیروی تک سے دست بردار ہو کر جاہلیت کے آگے سپر ڈال دیں، یا پھر مرنے مارنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ہمیشہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ عرب کی سرزمین میں اسلام کو رہنا ہے یا جاہلیت کو۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو اُسی عزیمت کی راہ دکھائی جو اہلِ ایمان کے لیے ایک ہی راہ ہے۔ اُس نے پہلے سورۂ حج (آیت ۳۹) میں ان کو جنگ کی اجازت دی، اور پھر سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۰) میں اس کا حکم دے دیا۔ مگر اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ اِن حالات میں جنگ کے معنی کیا ہیں۔ مدینے میں اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جمعیّت تھی، جو پورے ایک ہزار مردانِ جنگی بھی فراہم کرنے کے قابل نہ تھی، اور اس سے کہا جا رہا تھا کہ سارے عرب کی جاہلیّت سے ٹکرا جانے کے لیے تلوار لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر لڑائی کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی، وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی ایک ایسی بستی مشکل ہی سے فراہم کر سکتی تھی جس کے اندر سیکڑوں بے خانماں مہاجر ابھی پوری طرح بسے بھی نہ تھے، اور چاروں طرف سے اہلِ عرب نے معاشی مُقاطَعَہ کر کے اُس کی کمر توڑ رکھی تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

موضوع اور مضمون یہ حالات تھے جن میں یہ سورت نازل فرمائی گئی۔ اس کا موضوع اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے تیار کرنا اور ان کو اِس سلسلے میں ابتدائی ہدایات دینا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ قِتال بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں ترتیب وار حسبِ ذیل مضامین ارشاد ہوئے ہیں:

آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اِس وقت دو گروہوں کے درمیان مقابلہ درپیش ہے۔ ایک گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ حق کو ماننے سے انکار کر چکا ہے اور اللہ کے راستے میں سدِّراہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور دوسرے گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ اُس حق کو مان گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا دوٹوک فیصلہ یہ ہے کہ پہلے گروہ کی تمام سعی و عمل کو اس نے رائگاں کر دیا، اور دوسرے گروہ کے حالات دُرست کر دیے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ابتدائی جنگی ہدایات دی گئی ہیں، ان کو اللہ کی مدد اور رہنمائی کا یقین دلایا گیا ہے، ان کو اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے پر بہترین اجر کی اُمید دلائی گئی ہے، اور انھیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ راہِ حق میں ان کی کوششیں رائگاں نہ جائیں گی، بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک وہ ان کا اچھے سے اچھا پھل پائیں گے۔

پھر کفار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی تائید و رہنمائی سے محروم ہیں۔ ان کی کوئی تدبیر اہلِ ایمان کے مقابلے میں کارگر نہ ہوگی، اور وہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہت بُرا انجام دیکھیں گے۔ انھوں نے اللہ کے نبی کو مکے سے نکال کر یہ سمجھا کہ انھیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ دراصل یہ کام کر کے انھوں نے اپنی تباہی کو خود اپنے اُوپر دعوت دے دی۔

اس کے بعد منافقین کی طرف رُوئے سُخن پھرتا ہے، جو جنگ کا حکم آنے سے پہلے تو بڑے مسلمان بنے پھرتے تھے، مگر یہ حکم آ جانے کے بعد ان کے ہوش اُڑ گئے تھے، اور وہ اپنی عافیت کی فکر میں کفار سے سازباز کرنے لگے تھے، تاکہ اپنے آپ کو جنگ کے خطرات سے بچالیں۔ ان کو صاف صاف خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کے معاملے میں منافقت اختیار کرنے والوں کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ یہاں تو بنیادی سوال، جس پر تمام مُدّعیانِ ایمان کی آزمائش ہو رہی ہے، یہ ہے کہ آدمی حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ؟ اس کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں یا کفر اور کفار کے ساتھ؟ وہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کو عزیز رکھتا ہے یا اُس حق کو جس پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے؟ اِس آزمائش میں جو شخص کھوٹا نکلتا ہے، وہ مومن ہی نہیں ہے، کجا کہ اس کی نماز اور اس کا روزہ اور اس کی زکوٰۃ خدا کے ہاں کسی اجر کی مستحق ہو۔

پھر مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور اُن کے سروسامان کی فراوانی دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، اُن کے آگے صلح کی پیش کش کر کے کمزوری کا اظہار

نہ کریں، جس سے اُن کی جرأتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں اور زیادہ بڑھ جائیں، بلکہ اللہ کے بھروسے پر اُٹھیں اور کفر کے اِس پہاڑ سے ٹکرا جائیں۔ اللہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ وہی غالب رہیں گے اور یہ پہاڑ ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

آخر میں مسلمانوں کو اِنفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ اُس وقت مسلمانوں کی مَعاشی حالت بہت پتلی تھی، مگر سامنے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ عرب میں اسلام اور مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے کی اہمیّت ونزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے دین کو کفر کے غلبے سے بچانے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنی جانیں بھی لڑائیں اور جنگی تیاری میں اپنے مالی وسائل بھی پوری اِمکانی حد تک کھپا دیں۔ اس لیے مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اِس وقت جو شخص بھی بخل سے کام لے گا، وہ دراصل اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا، بلکہ خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے خطرے میں ڈال لے گا۔ اللہ تو انسانوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے دین کی خاطر قربانیاں دینے سے ایک گروہ اگر جی چُرائے گا تو اللہ اسے ہٹا کر دُوسرا گروہ اس کی جگہ لے آئے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۳۸ سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَّدَنِيَّةٌ رکوعاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ①

جن لوگوں نے کُفر کیا[1] اور اللہ کے راستے سے روکا،[2] اللہ نے ان کے اعمال کو رائگاں کر دیا۔[3]

۱ – یعنی اُس تعلیم و ہدایت کو ماننے سے انکار کر دیا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پیش فرما رہے تھے۔

۲ – اصل میں صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ صَدّ عربی زبان میں لازم اور مُتعدّی، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اِن الفاظ کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خود اللہ کے راستے پر آنے سے باز رہے، اور یہ بھی کہ انھوں نے دوسروں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔

دوسروں کو خدا کی راہ سے روکنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اِس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم و ستم ڈھائے کہ اُن کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کے لیے ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہو جائے۔ تیسری صورت یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے دین اور اہلِ دین کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے جس سے لوگ اِس دین سے بدگمان ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ہر کافر اس معنیٰ میں خدا کی راہ سے روکنے والا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کفر کے طریقے پر پرورش کرتا ہے اور پھر اس کی آیندہ نسل کے لیے دینِ آبائی کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگِ گراں ہے، کیونکہ وہ اپنی تعلیم و تربیت سے، اپنے اجتماعی نظام اور رسم و رواج سے، اور اپنے تعصّبات سے دینِ حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

۳ – اصل الفاظ ہیں: اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ۔ اُن کے اعمال کو بھٹکا دیا، گمراہ کر دیا، ضائع کر دیا۔ یہ الفاظ بڑے وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ توفیق سلب کر لی کہ اُن کی کوششیں اور محنتیں صحیح راستے میں صَرف ہوں۔ اب وہ جو کچھ بھی کریں گے، غلط مقاصد کے لیے غلط طریقوں ہی سے کریں گے، اور ان کی تمام سعی و جُہد ہدایت کے بجائے ضلالت ہی کی راہ میں صَرف ہو گی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنے نزدیک وہ خیر کے کام سمجھ کر کرتے رہے ہیں، مثلاً خانۂ کعبہ کی نگہبانی، حاجیوں کی خدمت، مہمانوں کی ضیافت، رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی، اور ایسے ہی دوسرے کام جنھیں عرب میں مذہبی خدمات اور مَکارِمِ اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ضائع کر دیا۔ اُن کا کوئی اجر و ثواب اُن کو نہ ملے گا، کیونکہ جب وہ اللہ کی توحید اور صرف

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ اَصۡلَحَ بَالَهُمۡ ۲
ذٰلِکَ بِاَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا اتَّبَعُوا الۡبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اُس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے[۴]— اور وہ سراسر حق ہے اُن کے رب کی طرف سے — اللہ نے ان کی بُرائیاں اُن سے دُور کر دیں[۵] اور ان کا حال دُرست کر دیا[۶]۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے

اُسی کی عبادت کا طریقہ اختیار کرنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اِس راہ پر آنے سے روکتے ہیں، تو ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کو روکنے اور اپنے کافرانہ مذہب کو عرب میں زندہ رکھنے کے لیے جو کوششیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کر رہے ہیں، اللہ نے ان کو رائگاں کر دیا۔ ان کی ساری تدبیریں اب محض ایک تیرِ بے ہدف ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے مقصد کو ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔

۴ — اگرچہ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کہنے کے بعد اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ ایمان لانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر نازل ہونے والی تعلیمات پر ایمان لانا آپ سے آپ شامل ہے، لیکن اس کا الگ ذکر خاص طور پر یہ جتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہو جانے کے بعد کسی شخص کا خدا اور آخرت اور پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کو ماننا بھی اُس وقت تک نافع نہیں ہے جب تک کہ وہ آپؐ کو اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ مان لے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری تھی کہ ہجرت کے بعد اب مدینہ طیبہ میں اُن لوگوں سے بھی سابقہ در پیش تھا جو ایمان کے دوسرے تمام لوازم کو تو مانتے تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے۔

۵ — اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جاہلیت کے زمانے میں جو گناہ ان سے سرزد ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب ان کے حساب سے ساقط کر دیے۔ اب اُن گناہوں پر کوئی باز پُرس ان سے نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عقائد اور خیالات اور اَخلاق اور اعمال کی جن خرابیوں میں وہ مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ اُن سے دُور کر دیں۔ اُن کے ذہن بدل گئے، اُن کے عقائد اور خیالات بدل گئے، اُن کی عادتیں اور خصلتیں بدل گئیں، ان کی سیرتیں اور ان کے کردار بدل گئے۔ اب اُن کے اندر جاہلیت کی جگہ ایمان ہے، اور بدکرداریوں کی جگہ عملِ صالح۔

۶ — اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پچھلی حالت کو بدل کر آیندہ کے لیے اللہ نے ان کو صحیح راستے پر ڈال دیا اور ان کی زندگیاں سنوار دیں۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ جس کمزوری و بے بسی اور مظلومی کی حالت میں وہ اب

Maktaba Tul Ishaat.com

اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۤ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڔ ۚ

مع ۱۲

اُس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اِس طرح اللہ لوگوں کو اُن کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے۔[7]

پس جب اِن کافروں سے تمھاری مُڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد (تمھیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرلو، تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔[8]

تنگ جتلا تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُس سے نکال دیا ہے۔ اب اُس نے ایسے حالات ان کے لیے پیدا کر دیے ہیں جن میں وہ ظلم سہنے کے بجائے ظالموں کا مقابلہ کریں گے، محکوم ہو کر رہنے کے بجائے اپنی زندگی کا نظام خود آزادی کے ساتھ چلائیں گے، اور مغلوب ہونے کے بجائے غالب ہو کر رہیں گے۔

۷ – اصل الفاظ ہیں: كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ۔ اس فقرے کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ”اس طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں دیتا ہے۔“ لیکن اس لفظی ترجمے سے اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس طرح فریقین کو ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک بتائے دیتا ہے۔ ایک فریق باطل کی پیروی پر مُصِر ہے، اس لیے اللہ نے اس کی ساری سعی و عمل کو لا حاصل کر دیا ہے۔ اور دوسرے فریق نے حق کی پیروی اختیار کی ہے اس لیے اللہ نے اُس کو بُرائیوں سے پاک کر کے اس کے حالات دُرست کر دیے ہیں۔

۸ – اِس آیت کے الفاظ سے بھی، اور جس سیاق و سباق میں یہ آئی ہے اُس سے بھی، یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لڑائی کا حکم آجانے کے بعد اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ ”جب کافروں سے تمھاری مُڈبھیڑ ہو“ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ابھی مُڈبھیڑ ہوئی نہیں ہے اور اس کے ہونے سے پہلے یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب وہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔

آگے آیت ۲۰ کے الفاظ اِس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ سورت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب سورۂ حج کی آیت ۳۹، اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۰ میں لڑائی کا حکم آچکا تھا اور اس پر خوف کے مارے مدینے کے منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ جیسے اُن پر موت چھا گئی ہو۔

اِس کے علاوہ سورۂ اَنفال کی آیات ۶۷-۶۹ بھی اِس بات پر شاہد ہیں کہ یہ آیت جنگِ بدر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ:

''کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دُشمنوں کو اچھی طرح کُچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نَوِشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے، اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے، اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے۔''

اس عبارت اور خُصوصاً اس کے خط کشیدہ فقروں پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس موقع پر عِتاب جس بات پر ہوا تھا، وہ یہ تھی کہ جنگِ بدر میں دُشمنوں کو اچھی طرح کُچل دینے سے پہلے مسلمان دشمن کے آدمیوں کو قید کرنے میں لگ گئے تھے، حالانکہ جنگ سے پہلے جو ہدایت سورۂ محمد میں ان کو دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ''جب تم اُن کو اچھی طرح کُچل دو، تب قیدیوں کو مضبوط باندھو'' تاہم، چونکہ سورۂ محمد میں مسلمانوں کو قیدیوں سے فِدیہ لینے کی اجازت فی الجملہ دی جا چکی تھی، اس لیے جنگِ بدر کے قیدیوں سے جو مال لیا گیا اسے اللہ نے حلال قرار دیا اور مسلمانوں کو اس کے لینے پر سزا نہ دی۔ ''اگر اللہ کا نَوِشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا'' کے الفاظ اس امر کی طرف صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس واقعے سے پہلے فدیہ لینے کی اجازت کا فرمان قرآن میں آ چکا تھا، اور ظاہر ہے کہ قرآن کے اندر سورۂ محمد کی اِس آیت کے سوا کوئی دوسری آیت ایسی نہیں ہے جس میں یہ فرمان پایا جاتا ہو۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ آیت سورۂ اَنفال کی مذکورۂ بالا آیت سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ اَنفال، حاشیہ ۴۹)

یہ قرآنِ مجید کی پہلی آیت ہے جس میں قوانینِ جنگ کے متعلق ابتدائی ہدایات دی گئی ہیں۔ اِس سے جو احکام نکلتے ہیں، اور اِس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے جس طرح عمل کیا ہے، اور فقہا نے اس آیت اور سنّت سے جو اِستنباطات کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جنگ میں مسلمانوں کی فوج کا اصل ہدف دشمن کی جنگی طاقت کو توڑ دینا ہے، یہاں تک کہ اس میں لڑنے کی سکت نہ رہے اور جنگ ختم ہو جائے۔ اس ہدف سے توجہ ہٹا کر دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کرنے میں نہ لگ جانا چاہیے۔ قیدی پکڑنے کی طرف توجہ اُس وقت کرنی چاہیے جب دشمن کا اچھی طرح قَلع قَمع کر دیا جائے اور میدانِ جنگ میں اس کے کچھ آدمی باقی رہ جائیں۔ اہلِ عرب کو یہ ہدایت آغاز ہی میں اس لیے دے دی گئی کہ وہ کہیں فدیہ حاصل کرنے، یا غلام فراہم کرنے کے لالچ میں پڑ کر جنگ کے اصل ہدفِ مقصود کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔

(۲) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں، اُن کے بارے میں فرمایا گیا کہ تمھیں اختیار ہے، خواہ ان پر احسان کرو، یا ان سے فدیے کا معاملہ کرلو۔ اِس سے عام قانون یہ نکلتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حَسن بصریؒ، عطاؒ

Maktaba Tul Ishaat.com

اور حمّاد بن ابی سلیمانؒ، قانون کے اِس عُموم کو لیتے ہیں، اور یہ اپنی جگہ بالکل دُرست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو قتل لڑائی کی حالت میں کیا جا سکتا ہے۔ جب لڑائی ختم ہوگئی اور قیدی ہمارے قبضے میں آ گیا تو اسے قتل کرنا درست نہیں ہے۔ ابن جَریرؒ اور ابوبکر جصّاصؒ کی روایت ہے کہ حَجّاج بن یُوسُف نے جنگی قیدیوں میں سے ایک قیدی کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ انھوں نے انکار کر دیا اور یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ ہمیں قید کی حالت میں کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ امام محمدؒ نے السِّیَرُ الکبیر میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ عبداللہؓ بن عامر نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک جنگی قیدی کے قتل کا حکم دیا تھا، اور انھوں نے اسی بنا پر اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا۔

(۳) مگر چونکہ اس آیت میں قتل کی صاف مُمانَعت بھی نہیں کی گئی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منشا یہ سمجھا اور اسی پر عمل بھی فرمایا کہ اگر کوئی خاص وجہ ایسی ہو جس کی بنا پر اسلامی حکومت کا فرماں روا کسی قیدی یا بعض قیدیوں کو قتل کرنا ضروری سمجھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ یہ عام قاعدہ نہیں ہے، بلکہ قاعدۂ عام میں ایک اِستِثْنا ہے جسے بضرورت ہی استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے ۷۰ قیدیوں میں سے صرف عُقْبَہ بن ابی مُعَیط اور نَضْر بن الحارِث کو قتل کیا۔ جنگ اُحُد کے قیدیوں میں سے صرف ابوعَزَّہ شاعر کو قتل فرمایا۔ بنی قُرَیْظَہ نے چونکہ اپنے آپ کو حضرت سعدؓ بن مُعاذ کے فیصلے پر حوالے کیا تھا، اور ان کے اپنے تسلیم کردہ حَکَم کا فیصلہ یہ تھا کہ ان کے مَردوں کو قتل کر دیا جائے، اس لیے آپؐ نے ان کو قتل کرا دیا۔ جنگِ خیبر میں جو لوگ گرفتار ہوئے، ان میں سے صرف کِنانہ ابنِ ابی الحُقَیق قتل کیا گیا، کیونکہ اس نے بدعہدی کی تھی۔ فتحِ مکّہ کے بعد آپؐ نے تمام اہلِ مکّہ میں سے صرف چند خاص اشخاص کے متعلق حکم دیا کہ ان میں سے جو بھی پکڑا جائے، وہ قتل کر دیا جائے۔ اِن مُستثنیات کے سوا حضورؐ کا عام طریقہ اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا کبھی نہیں رہا۔ اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی تھا۔ ان کے زمانے میں بھی قتلِ اسیرانِ جنگ کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، اور ہر مثال میں قتل کسی خاص وجہ سے کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بھی اپنے پورے زمانۂ خلافت میں صرف ایک جنگی قیدی کو قتل کیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ اسی بنا پر جُمہور فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی حکومت اگر ضرورت سمجھے تو اسیر کو قتل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے۔ ہر فوجی اِس کا مجاز نہیں ہے کہ جس قیدی کو چاہے قتل کر دے۔ البتہ اگر قیدی کے فرار ہونے کا یا اُس سے کسی خطرناک شرارت کا اندیشہ ہو جائے تو جس شخص کو بھی اِس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے وہ اسے قتل کر سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں فقہائے اسلام نے تین تصریحات اور بھی کی ہیں: ایک یہ کہ اگر قیدی اسلام قبول کر لے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قیدی صرف اُسی وقت تک قتل کیا جا سکتا ہے جب تک وہ حکومت کی تحویل میں ہو۔ تقسیم یا بیع کے ذریعے سے اگر وہ کسی شخص کی مِلک میں جا چکا ہو تو پھر اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرے یہ کہ قیدی کو قتل کرنا ہو تو بس سیدھی طرح قتل کر دیا جائے، عذاب دے دے کر نہ مارا جائے۔

(۴) جنگی قیدیوں کے بارے میں عام حکم جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یا اُن پر احسان کرو، یا فدیے کا معاملہ کر لو۔

احسان میں چار چیزیں شامل ہیں: ایک یہ کہ قید کی حالت میں اُن سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قتل یا دائمی قید کے بجائے ان کو غلام بنا کر افرادِ مسلمین کے حوالے کر دیا جائے۔ تیسرے، یہ کہ جِزْیہ لگا کر ان کو ذِمّی بنا لیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کو بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔

فدیے کا معاملہ کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ مالی معاوضہ لے کر انھیں چھوڑا جائے۔ دوسرے یہ کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ تیسرے، یہ کہ اپنے اُن آدمیوں سے جو دشمن کے قبضے میں ہوں، اُن کا تبادلہ کر لیا جائے۔

ان سب مختلف صورتوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے مختلف اوقات میں حسبِ موقع عمل فرمایا ہے۔ خدا کی شریعت نے اسلامی حکومت کو کسی ایک ہی شکل کا پابند نہیں کر دیا ہے۔ حکومت جس وقت جس طریقے کو مناسب ترین پائے، اُس پر عمل کر سکتی ہے۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ ایک جنگی قیدی جب تک حکومت کی قید میں رہے، اُس کی غذا اور لباس، اور اگر وہ بیمار یا زخمی ہو تو اس کا علاج، حکومت کے ذمے ہے۔ قیدیوں کو بھوکا ننگا رکھنے، یا ان کو عذاب دینے کا کوئی جواز اسلامی شریعت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حسنِ سلوک اور فیّاضانہ برتاؤ کی ہدایت بھی کی گئی ہے، اور عملاً بھی اس کی نظیریں سنّت میں ملتی ہیں۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہؓ کے گھروں میں بانٹ دیا اور ہدایت فرمائی کہ اِسْتَوْصُوْا بِالْاُسَارٰی خَیْرًا، ''اِن قیدیوں کے ساتھ اچھا سُلوک کرنا۔'' اُن میں سے ایک قیدی، ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا تھا، وہ صبح شام مجھ کو روٹی کھلاتے تھے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ ایک اور قیدی سُہَیْل بن عَمْرو کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ بڑا آتش بیان مُقرِّر ہے، آپؐ کے خلاف تقریریں کرتا رہا ہے، اس کے دانت تڑوا دیجیے۔ حضورؐ نے جواب دیا: ''اگر میں اس کے دانت تڑواؤں تو اللہ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں۔'' (سیرت ابنِ ہِشام) یَمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال جب گرفتار ہو کر آئے تو جب تک وہ قید میں رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمدہ کھانا اور دودھ ان کے لیے مہیا کیا جاتا رہا۔ (ابنِ ہِشام) یہی طرزِ عمل صحابۂ کرامؓ کے دَور میں بھی رہا۔ جنگی قیدیوں سے بُرے سُلوک کی کوئی نظیر اُس دَور میں نہیں ملتی۔

(۶) قیدیوں کے معاملے میں یہ شکل اسلام نے سرے سے اپنے ہاں رکھی ہی نہیں ہے کہ ان کو ہمیشہ قید رکھا جائے اور حکومت اُن سے جبری محنت لیتی رہے۔ اگر اُن کے ساتھ یا ان کی قوم کے ساتھ تبادلۂ اسیرانِ جنگ یا فدیے کا کوئی معاملہ طے نہ ہو سکے تو اُن کے معاملے میں احسان کا طریقہ یہ رکھا گیا ہے کہ انھیں غلام بنا کر افراد کی مِلکیّت میں دے دیا جائے، اور اُن کے مالکوں کو ہِدایت کی جائے کہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس طریقے پر عمل کیا گیا ہے، صحابۂ کرامؓ کے عہد میں بھی یہ جاری رہا ہے، اور فقہائے اسلام بالاتفاق اِس کے جواز کے قائل ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ جو شخص قید میں آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو اور پھر کسی

Maktaba Tul Ishaat.com

طرح گرفتار ہو جائے، وہ تو آزاد کر دیا جائے گا، مگر جو شخص قید ہونے کے بعد اسلام قبول کرے، یا کسی شخص کی ملکیت میں دے دیے جانے کے بعد مسلمان ہو، تو یہ اسلام اس کے لیے آزادی کا سبب نہیں بن سکتا۔ مُسنَدِ احمد، مسلم اور ترمِذی میں حضرت عمرانؓ بن حُصَین کی روایت ہے کہ بنی عُقَیل کا ایک شخص گرفتار ہو کر آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ قُلْتَهَا وَاَنْتَ تَمْلِكُ اَمْرَكَ اَفْلَحْتَ كُلَّ الْفَلَاحِ۔ "اگر یہ بات تو نے اُس وقت کہی ہوتی جب تو آزاد تھا تو یقیناً فلاح پا جاتا۔" یہی بات حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے کہ اِذَا اَسْلَمَ الْاَسِيْرُ فِيْ اَيْدِي الْمُسْلِمِيْنَ فَقَدْ اَمِنَ مِنَ الْقَتْلِ وَهُوَ رَقِيْقٌ "جب قیدی مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد مسلمان ہو تو وہ قتل سے تو محفوظ ہو جائے گا، مگر غلام رہے گا۔" اسی بنا پر فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قید ہونے کے بعد مسلمان ہونے والا غلامی سے نہیں بچ سکتا۔ (السِّیَرُ الکبیر، امام محمدؒ) اور یہ بات سراسر معقول بھی ہے۔ اگر ہمارا قانون یہ ہوتا کہ جو شخص بھی گرفتار ہونے کے بعد اسلام قبول کر لے گا وہ آزاد کر دیا جائے گا، تو آخر وہ کون سا نادان قیدی ہوتا جو کلمہ پڑھ کر رہائی نہ حاصل کر لیتا۔

(۷) قیدیوں کے ساتھ احسان کی تیسری صورت اسلام میں یہ رکھی گئی ہے کہ جزیہ لگا کر ان کو دارالاسلام کی ذمّی رعایا بنا لیا جائے، اور وہ اسلامی مملکت میں اُسی طرح آزاد ہو کر رہیں جس طرح مسلمان رہتے ہیں۔ امام محمدؒ السِّیَرُ الکبیر میں لکھتے ہیں کہ "ہر وہ شخص جس کو غلام بنانا جائز ہے، اُس پر جزیہ لگا کر اُسے ذمّی بنا لینا بھی جائز ہے۔" اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: "مسلمانوں کے فرماں روا کو یہ حق ہے کہ اُن پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج لگا کر انھیں اصلاً آزاد قرار دے دے۔" اس طریقے پر بالعموم اُن حالات میں عمل کیا گیا ہے جب کہ قید ہونے والے لوگ جس علاقے کے باشندے ہوں، وہ مفتوح ہو کر اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا ہو۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کے معاملے میں یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا، اور پھر حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق اور دوسرے علاقوں کی فتح کے بعد بڑے پیمانے پر اس کی پیروی کی۔ ابوعُبَید نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ عراق کی فتح کے بعد اُس علاقے کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "اے امیرالمومنین! پہلے اہلِ ایران ہم پر مسلط تھے۔ اُنھوں نے ہم کو بہت ستایا، بڑا بُرا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا، اور طرح طرح کی زیادتیاں ہم پر کرتے رہے۔ پھر جب خدا نے آپ لوگوں کو بھیجا تو ہم آپ کی آمد سے بڑے خوش ہوئے اور آپ کے مقابلے میں نہ کوئی مُدافعت ہم نے کی، نہ جنگ میں کوئی حصّہ لیا۔ اب ہم نے سنا ہے کہ آپ ہمیں غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "تم کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جاؤ، یا جزیہ قبول کر کے آزاد رہو۔" ان لوگوں نے جزیہ قبول کر لیا اور وہ آزاد چھوڑ دیے گئے۔ ایک اور جگہ اِسی کتاب میں ابوعُبَید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اَشعَریؓ کو لکھا کہ "جنگ میں جو لوگ پکڑے گئے ہیں، ان میں سے ہر کاشت کار اور کسان کو چھوڑ دو۔"

(۸) احسان کی چوتھی صورت یہ ہے کہ قیدی کو بلا کسی فدیے اور معاوضے کے یوں ہی رہا کر دیا جائے۔ یہ ایک خاص رعایت ہے، جو اسلامی حکومت صرف اُسی حالت میں کر سکتی ہے جب کہ کسی خاص قیدی کے حالات اِس کے متقاضی ہوں، یا توقع ہو کہ یہ رعایت اُس قیدی کو ہمیشہ کے لیے ممنونِ احسان کر دے گی، اور وہ دشمن سے دوست

یا کافر سے مومن بن جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دشمن قوم کے کسی شخص کو اس لیے چھوڑ دینا کہ وہ پھر ہم سے لڑنے آجائے، کسی طرح بھی تقاضائے مَصلحت نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے فقہائے اسلام نے بالعموم اس کی مُخالفت کی ہے، اور اس کے جواز کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ "اگر امام مسلمین قیدیوں کو، یا ان میں سے بعض کو بطورِ احسان چھوڑ دینے میں مَصلحت پائے تو ایسا کرنے میں مضایقہ نہیں ہے۔" (السِّیَرالکبیر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اِس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں، اور قریب قریب سب میں مَصلحت کا پہلو نمایاں ہے۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق آپؐ نے فرمایا: لَوْ کَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِیٍّ حَیًّا ثُمَّ کَلَّمَنِیْ فِیْ ھٰٓؤُلَآءِ النَّتْنٰی لَتَرَکْتُھُمْ لَہٗ (بخاری، ابوداؤد، مُسنَدِ احمد) "اگر مُطْعِم بن عَدِی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے اِن گھناؤنے لوگوں کے بارے میں بات کرتا تو میں اُس کی خاطر انھیں یوں ہی چھوڑ دیتا۔" یہ بات حضورؐ نے اس لیے فرمائی تھی کہ آپؐ جب طائف سے مکّہ معظمہ واپس ہوئے تھے، اُس وقت مُطْعِم ہی نے آپؐ کو اپنی پناہ میں لیا تھا، اور اُس کے لڑکے ہتھیار باندھ کر اپنی حفاظت میں آپؐ کو حرم میں لے گئے تھے۔ اس لیے آپؐ اُس کے احسان کا بدلہ اِس طرح اُتارنا چاہتے تھے۔

بخاری، مسلم اور مُسنَدِ احمد کی رِوایت ہے کہ یَمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضورؐ نے ان سے پوچھا: "ثُمامہ! تمھارا کیا خیال ہے؟" انھوں نے کہا: "اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون کچھ قیمت رکھتا ہے، اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایسے شخص پر کریں گے جو احسان ماننے والا ہے، اور اگر آپ مال لینا چاہتے ہیں تو مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔" تین دن تک آپؐ ان سے یہی بات پوچھتے رہے اور وہ یہی جواب دیتے رہے۔ آخر کو آپؐ نے حکم دیا کہ ثُمامہ کو چھوڑ دو۔ رہائی پاتے ہی وہ قریب کے ایک نخلستان میں گئے، نہا دھو کر واپس آئے، کلِمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے اور عرض کیا کہ "آج سے پہلے کوئی شخص میرے لیے آپ سے اور کوئی دین آپ کے دین سے بڑھ کر مبغوض نہ تھا، مگر اب کوئی شخص اور کوئی دین مجھے آپ سے اور آپ کے دین سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔" پھر وہ عُمرے کے لیے مکّے گئے اور وہاں قریش کے لوگوں کو نوٹس دے دیا کہ آج کے بعد کوئی غلّہ تمھیں یمامہ سے نہ پہنچے گا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور مکّے والوں کو حضورؐ سے التجا کرنی پڑی کہ یمامہ سے ہمارے غلّے کی رسد بند نہ کرائیں۔

بنی قُرَیظہ کے قیدیوں میں سے آپؐ نے زَبِیر بن باطا اور عَمرو بن سعد (یا ابنِ سُعدیٰ) کی جان بخشی کی۔ زَبِیر کو اس لیے چھوڑا کہ اُس نے جاہلیت کے زمانے میں جنگِ بُعاث کے موقع پر حضرت ثابتؓ بن قَیس انصاری کو پناہ دی تھی، اس لیے آپؐ نے اس کو حضرت ثابتؓ کے حوالے کر دیا، تاکہ اس کے احسان کا بدلہ ادا کریں۔ اور عَمرو بن سعد کو اس لیے چھوڑا کہ جب بنی قُرَیظہ حضورؐ کے ساتھ بدعہدی کر رہے تھے، اُس وقت یہی شخص اپنے قبیلے کو غدّاری سے منع کر رہا تھا۔ (کتاب الاموال لابی عُبَید)

غزوۂ بنی المُصطَلِق کے بعد جب اُس قبیلے کے قیدی لائے گئے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے، اُس وقت حضرت جُوَیرِیہؓ جس شخص کے حصے میں آئی تھیں، اُس کو اُن کا معاوضہ ادا کر کے آپؐ نے انھیں رہا کرایا اور پھر اُن سے خود نکاح

Maktaba Tul Ishaat.com

کرلیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے یہ کہہ کر اپنے اپنے حصّے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا کہ یہ ''اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہو چکے ہیں۔'' اس طرح سو خاندانوں کے آدمی رہا ہو گئے۔ (مُسندِ احمد، طبقاتِ ابنِ سعد، سیرت ابنِ ہشام)

صلحِ حُدَیبیہ کے موقع پر مکّے کے ۸۰ آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انھوں نے آپؐ کے کیمپ پر اچانک شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے اور حضورؐ نے سب کو چھوڑ دیا، تاکہ اس نازک موقع پر یہ معاملہ لڑائی کا موجب نہ بن جائے۔ (مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ترمذی، مُسندِ احمد)

فتحِ مکّہ کے موقع پر آپؐ نے چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے تمام اہلِ مکّہ کو بطورِ احسان معاف کر دیا، اور جنھیں مستثنیٰ کیا تھا اُن میں سے بھی تین چار کے سوا کوئی قتل نہ کیا گیا۔ سارا عرب اِس بات کو جانتا تھا کہ اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے تھے۔ اس کے مقابلے میں فتح پا کر جس عالی حوصلگی کے ساتھ حضورؐ نے ان لوگوں کو معاف فرمایا، اس سے اہلِ عرب کو یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ ان کا سابقہ کسی جبّار سے نہیں، بلکہ ایک نہایت رحیم و شفیق اور فیّاض رہنما سے ہے۔ اسی بنا پر فتحِ مکّہ کے بعد پُورے جزیرۃ العرب کو مسخّر ہونے میں دو سال سے زیادہ دیر نہ لگی۔

جنگِ حُنَین کے بعد جب قبیلۂ ہَوازِن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے حاضر ہوا تو سارے قیدی تقسیم کیے جا چکے تھے۔ حضورؐ نے سب مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا: یہ لوگ تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس دے دیے جائیں۔ تم میں سے جو کوئی بخوشی اپنے حصّے میں آئے ہوئے قیدی کو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے وہ اِس طرح چھوڑ دے، اور جو معاوضہ لینا چاہے اس کو ہم بیت المال میں آنے والی پہلی آمدنی سے معاوضہ دے دیں گے۔ چنانچہ چھ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے، اور جن لوگوں نے معاوضہ لینا چاہا، انھیں حکومت کی طرف سے معاوضہ دے دیا گیا۔ (بخاری، ابوداؤد، مُسندِ احمد، طبَقات ابنِ سعد) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم ہو چکنے کے بعد حکومت قیدیوں کو خود رہا کر دینے کی مجاز نہیں رہتی، بلکہ یہ کام اُن لوگوں کی رضامندی سے، یا ان کو معاوضہ دے کر کیا جا سکتا ہے جن کی مِلکیّت میں قیدی دیے جا چکے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرامؓ کے دَور میں بھی بطورِ احسان قیدیوں کو رہا کرنے کی نظیریں مسلسل ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اَشْعَث بن قَیس کِندی کو رہا کیا، اور حضرت عمرؓ نے ہُرمُزان کو اور مناذِر اور میسان کے قیدیوں کو آزادی عطا کی۔ (کتاب الاموال لِابی عُبَید)

(۹) مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صرف جنگِ بدر کے موقع پر ملتی ہے، جب کہ فی قیدی ایک ہزار سے ۴ ہزار تک کی رقمیں لے کر ان کو رہا کیا گیا۔ (طبَقاتِ ابنِ سعد، کتاب الاموال) صحابۂ کرامؓ کے دَور میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور فقہائے اسلام نے بالعُموم اس کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم روپیا لے کر دشمن کے ایک آدمی کو چھوڑ دیں تاکہ وہ پھر ہمارے خلاف تلوار اُٹھائے۔ لیکن چونکہ قرآن میں فدیہ لینے کی اجازت دی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس پر عمل بھی کیا ہے، اس لیے ایسا کرنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔ امام محمدؒ السِّیَر الکبیر میں کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اس کی ضرورت پیش آئے تو

ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴

یہ ہے تمھارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی اُن سے نمٹ لیتا، مگر (یہ طریقہ اُس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے آزمائے[9]۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا[10]۔

وہ مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔

(۱۰) کوئی خدمت لے کر چھوڑنے کی مثال بھی جنگِ بدر کے موقع پر ملتی ہے۔ قریش کے قیدیوں میں سے جو لوگ مالی فدیہ دینے کے قابل نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے حضورؐ نے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ (مُسْنَدِ احمد، طبقاتِ ابنِ سعد، کتاب الاموال)

(۱۱) قیدیوں کے تبادلے کی متعدد مثالیں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر بھیجا اور اس میں چند قیدی گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک نہایت خوبصورت عورت بھی تھی جو حضرت سَلَمہؓ بن اَکْوَع کے حصے میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باصرار اس کو حضرت سَلَمہؓ سے مانگ لیا، اور پھر اسے مکّہ بھیج کر اس کے بدلے کئی مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا۔ (مسلم، ابوداؤد، طَحاوی، کتاب الاموال لِاَبی عُبَید، طبقاتِ ابنِ سعد) حضرت عمرانؓ بن حُصَینؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلۂ ثَقِیف نے مسلمانوں کے دو آدمیوں کو قید کر لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ثَقِیف کے حلیف قبیلے، بنی عُقَیل کا ایک آدمی مسلمانوں کے پاس گرفتار ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کو طائف بھیج کر اس کے بدلے ان دونوں مسلمانوں کو رہا کرا لیا۔ (مسلم، ترمذی، مُسْنَدِ احمد)

فقہا میں سے امام ابو یُوسف، امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تبادلۂ اسیران کو جائز رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول یہ ہے کہ تبادلہ نہیں کرنا چاہیے، مگر دوسرا قول ان کا بھی یہی ہے کہ تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جو قیدی مسلمان ہو جائے، اسے تبادلے میں کفّار کے حوالے نہ کیا جائے۔

اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کے معاملے میں ایک ایسا وسیع ضابطہ بنایا ہے جس کے اندر ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں اِس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی گنجایش ہے۔ جو لوگ قرآنِ مجید کی اس آیت کا بس یہ مختصر سا مطلب لے لیتے ہیں کہ جنگ میں قید ہونے والوں کو "یا تو بطورِ احسان چھوڑ دیا جائے، یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے"، وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ کتنے مختلف پہلو رکھتا ہے، اور مختلف زمانوں میں وہ کتنے مسائل پیدا کرتا رہا ہے اور آیندہ کر سکتا ہے۔

۹- یعنی اللہ تعالیٰ کو اگر محض باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی ہوتی تو وہ اس کام کے لیے تمھارا محتاج نہ تھا۔ یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا

وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا، اور ان کو اُس جنّت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے[11]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے[12] گا اور تمھارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے، تو اُن کے لیے ہلاکت ہے[13]، اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اُس چیز کو ناپسند کیا جسے

کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان چشم زدن میں کرسکتا تھا۔ مگر اُس کے پیشِ نظر تو یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو حق پرست ہوں وہ باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلے میں مجاہدہ کریں، تاکہ جس کے اندر جو کچھ اوصاف ہیں وہ اِس امتحان سے نکھر کر پُوری طرح نمایاں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے کردار کے لحاظ سے جس مقام اور مرتبے کا مستحق ہو، وہ اس کو دیا جائے۔

۱۰- مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں کسی کے مارے جانے کے معنٰی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آدمی اپنی جان سے گیا اور اس کی ذات کی حد تک اُس کا کیا کرایا سب ملیا میٹ ہوگیا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ شہدا کی قربانیاں خود اُن کے لیے نہیں بلکہ صرف اُنھی لوگوں کے لیے نافع ہیں جو اُن کے بعد اِس دنیا میں زندہ رہیں اور اُن کی قربانیوں سے یہاں مُتمتّع ہوں، تو وہ غلط سمجھتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود شہید ہونے والوں کے لیے بھی یہ زیاں کا نہیں بلکہ نفع کا سودا ہے۔

۱۱- یہ ہے وہ نفع جو راہِ خدا میں جان دینے والوں کو حاصل ہوگا۔ اس کے تین مراتب بیان فرمائے گئے ہیں: ایک یہ کہ اللہ اُن کی رہنمائی فرمائے گا۔ دوسرے یہ کہ ان کا حال دُرست کر دے گا۔ تیسرے یہ کہ ان کو اُس جنّت میں داخل کرے گا جس سے وہ پہلے ہی ان کو واقف کرا چکا ہے۔ رہنمائی کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اِس مقام پر جنّت کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ حالت دُرست کرنے سے مراد یہ ہے کہ جنّت میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کو خِلعتوں سے آراستہ کر کے وہاں لے جائے گا اور ہر اُس آلائش کو دُور کر دے گا جو دنیا کی زندگی میں اُن کو لگ گئی تھی۔ اور تیسرے مرتبے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں پہلے ہی ان کو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتایا جا چکا ہے کہ وہ جنّت

مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۹﴾ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا
كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ
اَمۡثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوۡلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَاَنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ
لَا مَوۡلٰى لَهُمۡ ﴿۱۱﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ع ۱۱/۵

اللہ نے نازل کیا ہے،[14] لہٰذا اللہ نے اُن کے اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ اُن لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے اُن کا سب کچھ اُن پر اُلٹ دیا، اور ایسے ہی نتائج اِن کافروں کے لیے مقدّر ہیں۔[15] یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔[16] ع ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ اُن جنّتوں

کیسی ہے جو اللہ نے ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ اُس جنّت میں جب وہ پہنچیں گے تو بالکل اپنی جانی پہچانی چیز میں داخل ہوں گے، اور ان کو معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کے دینے کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا وہی اُن کو دی گئی ہے، اُس میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

۱۲ – اللہ کی مدد کرنے کا ایک سیدھا سادھا مفہوم تو یہ ہے کہ اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جان و مال سے جہاد کیا جائے۔ لیکن اس کا ایک غامض مفہوم بھی ہے جس کی ہم اس سے پہلے تشریح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، تفسیر آلِ عمران، حاشیہ ۵۰)

۱۳ – اصل الفاظ ہیں: فَتَعۡسًا لَّهُمۡ۔ تعس ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرنے کو کہتے ہیں۔

۱۴ – یعنی انھوں نے اپنی پُرانی جاہلیت کے اَوہام و تخیّلات اور رسم و رواج اور اَخلاقی بگاڑ کو ترجیح دی اور اُس تعلیم کو پسند نہ کیا جو اللہ نے ان کو سیدھا راستہ بتانے کے لیے نازل کی تھی۔

۱۵ – اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جس تباہی سے وہ کافر دوچار ہوئے، ویسی ہی تباہی اب اِن کافروں کے لیے مقدر ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نہیں مان رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تباہی صرف دنیا کے عذاب پر ختم نہیں ہو گئی ہے، بلکہ یہی تباہی اُن کے لیے آخرت میں بھی مقدر ہے۔

۱۶ – جنگِ اُحد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر چند صحابہؓ کے ساتھ ایک گھاٹی میں ٹھیرے ہوئے تھے، اُس وقت ابوسفیان نے نعرہ لگایا: لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَكُمۡ۔ ”ہمارے پاس عُزّٰی ہے اور تمھارا کوئی عُزّٰی نہیں ہے۔“ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: اسے جواب دو: اَللّٰهُ مَوۡلَانَا وَلَا مَوۡلٰى لَكُمۡ۔ ”ہمارا حامی و ناصر اللہ ہے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ
یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ
هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِكَ الَّتِیْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا
نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ
وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ

میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لُوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں[17]، اور اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہے۔

اَے نبیؐ! کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمھاری اُس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمھیں نکال دیا ہے۔ اُنھیں ہم نے اِس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا[18]۔

بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو، وہ اُن لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے اُن کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں؟[19] پرہیزگاروں کے لیے جس جنّت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی

تمھارا حامی و ناصر کوئی نہیں۔" حضورؐ کا یہ جواب اِسی آیت سے ماخوذ تھا۔

۱۷ – یعنی جس طرح جانور کھاتا ہے اور کچھ نہیں سوچتا کہ یہ رزق کہاں سے آیا ہے، کس کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اس رزق کے ساتھ میرے اُوپر رازق کے کیا حُقوق عائد ہوتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ بھی بس کھائے جا رہے ہیں، چرنے چُگنے سے آگے کسی چیز کی انھیں کوئی فکر نہیں ہے۔

۱۸ – رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے سے نکلنے کا بڑا رنج تھا۔ جب آپؐ ہجرت پر مجبور ہوئے تو شہر سے باہر نکل کر آپؐ نے اُس کی طرف رخ کر کے فرمایا تھا: "اے مکہ! تو دنیا کے تمام شہروں میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اور خدا کے تمام شہروں میں مجھے سب سے بڑھ کر تجھ سے محبّت ہے۔ اگر مشرکوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں تجھے چھوڑ کر کبھی نہ نکلتا۔" اسی پر ارشاد ہوا ہے کہ اہلِ مکّہ تمھیں نکال کر اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ حرکت کر کے انھوں نے اپنی شامت بلائی ہے۔ آیت کا اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ ضرور ہجرت سے متصل ہی نازل ہوئی ہوگی۔

مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ
مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ

ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی [20] نہریں بہ رہی ہوں گی ایسے دُودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا، [21] نہریں بہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی، [22] نہریں بہ رہی ہوں گی صاف شفّاف شہد کی۔ [23] اُس میں اُن کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور اُن کے رب کی طرف سے بخشش۔ [24] (کیا وہ شخص جس کے حصّے میں یہ جنّت آنے والی ہے) اُن لوگوں کی طرح ہوسکتا ہے جو جہنّم میں ہمیشہ

۱۹ – یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اور اس کے پیروؤں کو جب خدا کی طرف سے ایک صاف اور سیدھا راستہ مل گیا ہے اور پُوری بصیرت کی روشنی میں وہ اس پر قائم ہو چکے ہیں، تو اب وہ اُن لوگوں کے ساتھ چل سکیں جو اپنی پرانی جاہلیت کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، جو اپنی ضلالتوں کو ہدایت اور اپنی بدکرداریوں کو خوبی سمجھ رہے ہیں، جو کسی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنی خواہشات کی بنا پر یہ فیصلے کرتے ہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اب تو نہ اِس دنیا میں ان دونوں گروہوں کی زندگی ایک جیسی ہوسکتی ہے اور نہ آخرت میں ان کا انجام یکساں ہوسکتا ہے۔

۲۰ – اصل الفاظ ہیں: مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ۔ آسِن اُس پانی کو کہتے ہیں جس کا مزا اور رنگ بدلا ہوا ہو، یا جس میں کسی طرح کی بُو پیدا ہوگئی ہو۔ دنیا میں دریاؤں اور نہروں کے پانی عموماً گدلے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ریت، مٹی اور بسا اوقات طرح طرح کی نباتات کے مل جانے سے ان کا رنگ اور مزا بدل جاتا ہے، اور کچھ نہ کچھ بُو بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے جنّت کے دریاؤں اور نہروں کے پانی کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ وہ غیر آسِن ہوگا۔ یعنی وہ خالص، صاف ستھرا پانی ہوگا۔ کسی قسم کی آمیزش اس میں نہ ہوگی۔

۲۱ – حدیثِ مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ "وہ جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہوا دُودھ نہ ہوگا۔" یعنی اللہ تعالیٰ یہ دُودھ چشموں کی شکل میں زمین سے نکالے گا اور نہروں کی شکل میں اسے بہا دے گا۔ ایسا نہ ہوگا کہ جانوروں کے تھنوں سے اس کو نچوڑا جائے اور پھر جنّت کی نہروں میں ڈال دیا جائے۔ اس قدرتی دُودھ کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا"، یعنی اُس کے اندر وہ ذرا سی بِساند بھی نہ ہوگی جو جانور کے تھن سے نکلے ہوئے ہر دُودھ میں ہوتی ہے۔

۲۲ – حدیثِ مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ اس شراب کو "انسانوں نے اپنے قدموں سے روند کر نہ نچوڑا ہوگا"، یعنی وہ دنیا کی شرابوں کی طرح پھلوں کو سڑا کر اور قدموں سے روند کر کشید کی ہوئی نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے بھی چشموں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ
حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ
اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾

رہیں گے اور جنھیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟

اِن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمھاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو اُن لوگوں سے، جنھیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے، پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی اِنھوں نے کیا کہا تھا؟[۲۵] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپّا لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔[۲۶]

کی شکل میں پیدا کرے گا اور نہروں کی شکل میں بہا دے گا۔ پھر اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ”وہ پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی“، یعنی دنیا کی شرابوں کی طرح وہ تلخ اور بُودار نہ ہوگی، جسے کوئی بڑے سے بڑا شراب کا رسیا بھی کچھ نہ کچھ منہ بنائے بغیر نہیں پی سکتا۔ سورۂ صافات میں اس کی مزید تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کے پینے سے نہ جسم کو کوئی ضرر ہوگا، نہ عقل خراب ہوگی (آیت ۴۷)۔ اور سورۂ واقعہ میں فرمایا گیا ہے کہ اس سے نہ دورانِ سر لاحق ہوگا، نہ آدمی بہکے گا۔ (آیت ۱۹) اس سے معلوم ہوا کہ وہ شراب نشہ آور نہ ہوگی، بلکہ محض لذّت و سرور بخشنے والی ہوگی۔

۲۳ – حدیثِ مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ ”وہ مکھیوں کے پیٹ سے نکلا ہوا شہد نہ ہوگا“ یعنی وہ بھی چشموں سے نکلے گا اور نہروں میں بہے گا۔ اسی لیے اس کے اندر موم اور چھتّے کے ٹکڑے اور مری ہوئی مکھیوں کی ٹانگیں ملی ہوئی نہ ہوں گی، بلکہ وہ خالص شہد ہوگا۔

۲۴ – جنّت کی اِن نعمتوں کے بعد اللہ کی طرف سے مغفرت کا ذکر کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ان ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کوتاہیاں اُن سے ہوئی تھیں ان کا ذکر تک جنّت میں کبھی اُن کے سامنے نہ آئے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دے گا، تاکہ جنّت میں وہ شرمندہ نہ ہوں۔

۲۵ – یہ اُن کفار و منافقین اور منکرین اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر بیٹھتے تھے اور آپؐ کے ارشادات، یا قرآنِ مجید کی آیات سنتے تھے، مگر چونکہ اُن کا دل اُن مضامین سے دُور تھا جو آپؐ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتے تھے، اس لیے سب کچھ سُن کر بھی وہ کچھ نہ سنتے تھے، اور باہر نکل کر مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ ابھی ابھی آپؐ کیا فرما رہے تھے۔

۲۶ – یہ تھا وہ اصل سبب جس کی وجہ سے ان کے دل کے کان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے لیے

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ
اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ
اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ

رہے وہ لوگ جنھوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے[۲۷] اور انھیں اُن کے حصّے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے[۲۸]۔ اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک اِن پر آ جائے[۲۹]؟ اُس کی علامات تو آ چکی ہیں[۳۰]۔ جب وہ خود آ جائے گی تو اِن کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟

پس اَے نبیؐ! خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو

بہرے ہوگئے تھے۔ وہ اپنی خواہشات کے بندے تھے، اور حضورؐ جو تعلیمات پیش فرما رہے تھے وہ ان کی خواہشات کے خلاف تھیں، اس لیے اگر وہ کبھی آپؐ کی مجلس میں آ کر بتکلّف آپؐ کی طرف کان لگاتے بھی تھے تو ان کے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔

۲۷ – یعنی وہی باتیں، جن کو سُن کر کفار و منافقین پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی آپؐ کیا فرما رہے تھے، ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے مزید ہدایت کی مُوجِب ہوتی ہیں، اور جس مجلس سے وہ بدنصیب اپنا وقت ضائع کر کے اُٹھتے ہیں، اُسی مجلس سے یہ خوش نصیب لوگ علم و عرفان کا ایک نیا خزانہ حاصل کر کے پلٹتے ہیں۔

۲۸ – یعنی جس تقویٰ کی اہلیّت وہ اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق انھیں عطا فرما دیتا ہے۔

۲۹ – یعنی جہاں تک حق واضح کرنے کا تعلق ہے، وہ تو دلائل سے، قرآن کے معجزانہ بیان سے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک سے، اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کے انقلاب سے، انتہائی روشن طریقے پر واضح کیا جا چکا ہے۔ اب کیا ایمان لانے کے لیے یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ قیامت اِن کے سامنے آ کھڑی ہو؟

۳۰ – قیامت کی علامات سے مراد وہ علامات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی آمد کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ ان میں سے ایک اہم علامت خدا کے آخری نبی کا آ جانا ہے جس کے بعد پھر قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسندِ احمد میں حضرت اَنَسؓ، حضرت سَہلؓ بن سَعد ساعِدی اور حضرت بُریدہؓ کی روایات منقول ہیں کہ حضورؐ نے اپنی انگشتِ شہادت اور بیچ کی اُنگلی کھڑی کر کے فرمایا: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔ ”میری بِعثت اور قیامت اِن دو اُنگلیوں کی طرح ہیں۔“ یعنی جس طرح ان دو اُنگلیوں کے درمیان کوئی اور اُنگلی نہیں ہے، اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی بھی مبعوث ہونے والا نہیں ہے۔ میرے بعد اب بس قیامت ہی آنے والی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ
وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ
اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى

اپنے قُصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی[۳۱]۔ اللہ تمھاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمھارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔

جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سُورت کیوں نہیں نازل کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے)۔ مگر جب ایک محکم سُورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی، وہ تمھاری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو[۳۲]۔ افسوس

۳۱- اسلام نے جو اَخلاق انسان کو سکھائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے رب کی بندگی و عبادت بجا لانے میں، اور اس کے دین کی خاطر جان لڑانے میں، خواہ اپنی حد تک کتنی ہی کوشش کرتا رہا ہو، اس کو کبھی اِس زَعم میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نے کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھتے رہنا چاہیے کہ میرے مالک کا مجھ پر جو حق تھا وہ میں ادا نہیں کر سکا ہوں، اور ہر وقت اپنے قصور کا اعتراف کر کے اللہ سے یہی دعا کرتے رہنا چاہیے کہ تیری خدمت میں جو کچھ بھی کوتاہی مجھ سے ہوئی ہے اس سے درگزر فرما۔ یہی اصل روح ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ ''اے نبیؐ! اپنے قصور کی معافی مانگو۔'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع جان بُوجھ کر کوئی قصور کیا تھا۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا سے بڑھ کر جو بندہ اپنے رب کی بندگی بجا لانے والا تھا، اس کا منصب بھی یہ نہ تھا کہ اپنے کارنامے پر فخر کا کوئی شائبہ تک اس کے دل میں راہ پائے، بلکہ اس کا مقام بھی یہ تھا کہ اپنی ساری عظیم القدر خدمات کے باوجود اپنے رب کے حضور اعترافِ قصور ہی کرتا رہے۔ اسی کیفیت کا اثر تھا جس کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بکثرت اِستِغفار فرماتے رہتے تھے۔ ابوداؤد، نَسائی اور مُسندِ احمد کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ ''میں ہر روز سو بار اللہ سے اِستِغفار کرتا ہوں۔''

۳۲- مطلب یہ ہے کہ جن حالات سے اُس وقت مسلمان گزر رہے تھے، اور کفار کا جو رَویّہ اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر جنگ کا حکم آنے سے پہلے ہی اہلِ ایمان کی عام رائے یہ تھی کہ اب ہمیں جنگ کی

لَهُمْ ۚ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۚ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۚ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ

اُن کے حال پر۔ (اُن کی زبان پر ہے) اطاعت کا اقرار اور اچھی اچھی باتیں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا، اُس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچّے نکلتے تو انھی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اِس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم اُلٹے منہ پھر گئے[۳۳] تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟[۳۴] یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی

اجازت مل جانی چاہیے۔ بلکہ وہ بے چینی کے ساتھ اللہ کے فرمان کا انتظار کر رہے تھے اور بار بار پوچھتے تھے کہ ہمیں اِن ظالموں سے لڑنے کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا؟ مگر جو لوگ مُنافقت کے ساتھ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے، ان کا حال مومنوں کے حال سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنی جان و مال کو خدا اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے تھے اور اس کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جنگ کے حکم نے آتے ہی ان کو اور سچّے اہلِ ایمان کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔ جب تک یہ حکم نہ آیا تھا، ان میں اور عام اہلِ ایمان میں بظاہر کوئی فرق و امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ نماز وہ بھی پڑھتے تھے اور یہ بھی۔ روزے رکھنے میں بھی انھیں تأمّل نہ تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام انھیں قبول تھا۔ مگر جب اسلام کے لیے جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو ان کے نِفاق کا حال کھل گیا اور نمایشی ایمان کا وہ لبادہ اُتر گیا جو انھوں نے اُوپر سے اوڑھ رکھا تھا۔ سورۂ نساء میں ان کی اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ انسانوں سے اِس طرح ڈر رہے ہیں جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔ کہتے ہیں: خدایا! یہ لڑائی کا حکم ہمیں کیوں دے دیا؟ ہمیں ابھی اور کچھ مہلت کیوں نہ دی؟'' (آیت: ۷۷)

۳۳- اصل الفاظ ہیں: اِنْ تَوَلَّيْتُمْ۔ ان کا ایک ترجمہ وہ ہے جو ہم نے اُوپر متن میں کیا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ''اگر تم لوگوں کے حاکم بن گئے۔''

۳۴- اس ارشاد کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگر اِس وقت تم اسلام کی مُدافعت سے جی چُراتے ہو، اور اُس عظیم الشان اصلاحی انقلاب کے لیے جان و مال کی بازی لگانے سے منہ موڑتے ہو جس کی کوشش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کر رہے ہیں، تو اس کا نتیجہ آخر اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم پھر اُسی جاہلیّت کے نظام کی طرف پلٹ جاؤ جس میں تم لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے ہو، اپنی اولاد تک کو زندہ دفن کرتے رہے ہو، اور خدا کی زمین

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ
عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

اور ان کو اندھا اور بہرا بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟[۳۵] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اُس سے پھر گئے، اُن کے لیے شیطان نے اِس روش کو سہل بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ اُن کے لیے دراز کر رکھا ہے۔

کو ظلم و فساد سے بھرتے رہے ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری سیرت و کردار کا حال یہ ہے کہ جس دین پر ایمان لانے کا تم نے اقرار کیا تھا، اس کے لیے تمھارے اندر کوئی اخلاص اور کوئی وفاداری نہیں ہے، اور اس کی خاطر کوئی قربانی دینے کے لیے تم تیار نہیں ہو، تو اِس اخلاقی حالت کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ تمھیں اقتدار عطا کر دے اور دنیا کے معاملات کی باگیں تمھارے ہاتھ میں آ جائیں تو تم سے ظلم و فساد اور برادر کُشی کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔

یہ آیت اِس امر کی صراحت کرتی ہے کہ اسلام میں قطعِ رحمی حرام ہے۔ دوسری طرف مثبت طریقے سے بھی قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کو بڑی نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے اور صلۂ رحمی کا حکم دیا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ: ۸۳-۱۷۷، النساء: ۸-۳۶، النحل: ۹۰، بنی اسرائیل: ۲۶، النور: ۲۲) رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار، خواہ وہ دُور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذَوِی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو، اس کا حق آدمی پر اُتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطعِ رحمی کرنا اُتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلۂ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو، اُس سے دریغ نہ کرے۔ اور قطعِ رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ بُرا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اس سے قصداً پہلوتہی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِسی آیت سے اِستِدلال کر کے اُمِّ وَلَد کی بَیع کو حرام قرار دیا تھا اور صحابۂ کرامؓ نے اس سے اتفاق فرمایا تھا۔ حاکم نے مُستَدرَک میں حضرت بُرَیدہؓ سے یہ رِوایت نقل کی ہے کہ ایک روز میں حضرت عمرؓ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ یکایک محلّے میں شور مچ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک لونڈی فروخت کی جارہی ہے اور اس کی لڑکی رو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُسی وقت انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ جو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، کیا اس میں آپ حضرات کو قطعِ رحمی کا بھی کوئی جواز ملتا ہے؟ سب نے کہا: نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں ماں کو بیٹی سے جُدا کیا جا رہا ہے؟ اس سے بڑی قطعِ رحمی اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لوگوں نے کہا: آپ کی رائے میں اس کو روکنے کے لیے جو صورت مناسب ہو، وہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ
الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ

اِسی لیے انھوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمھاری مانیں گے۔[۳۶] اللہ اُن کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی رُوحیں قبض کریں گے اور اِن کے مُنہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انھیں لے جائیں گے؟[۳۷] یہ اسی لیے تو ہوگا کہ انھوں نے اُس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے

اختیار فرمائیں۔ اِس پر حضرت عمرؓ نے تمام بِلادِ اسلامیہ کے لیے یہ فرمانِ عام جاری کر دیا کہ کسی ایسی لونڈی کو فروخت نہ کیا جائے جس سے اس کے مالک کے ہاں اولاد پیدا ہو چکی ہو، کیونکہ یہ قطعِ رحمی ہے اور یہ حلال نہیں ہے۔

۳۵- یعنی یا تو یہ لوگ قرآنِ مجید پر غور نہیں کرتے، یا غور کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اس کی تعلیمات اور اس کے معانی و مطالب ان کے دلوں میں اُترتے نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر وہ قفل چڑھے ہوئے ہیں جو ایسے حق ناشناس دلوں کے لیے مخصوص ہیں۔

۳۶- یعنی ایمان کا اقرار کرنے اور مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جانے کے باوجود وہ اندر ہی اندر دشمنانِ اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور ان سے وعدے کرتے رہے کہ بعض معاملات میں ہم تمھارا ساتھ دیں گے۔

۳۷- یعنی دنیا میں تو یہ طرزِ عمل انھوں نے اس لیے اختیار کر لیا کہ اپنے مفادات کی حفاظت کرتے رہیں اور کفر و اسلام کی جنگ کے خطرات سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں، لیکن مرنے کے بعد یہ خدا کی گرفت سے بچ کر کہاں جائیں گے؟ اُس وقت تو ان کی کوئی تدبیر فرشتوں کی مار سے ان کو نہ بچا سکے گی۔

یہ آیت بھی اُن آیات میں سے ہے جو عذابِ برزخ (یعنی عذابِ قبر) کی تصریح کرتی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت ہی کفار و منافقین پر عذاب شروع ہو جاتا ہے، اور یہ عذاب اُس سزا سے مختلف چیز ہے جو قیامت میں ان کے مُقدّمے کا فیصلہ ہونے کے بعد اُن کو دی جائے گی۔ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: النساء: آیت ۹۷، الانعام: ۹۳-۹۴، الانفال: ۵۰، النحل: ۲۸-۳۲، المومنون: ۹۹-۱۰۰، یٰسین: ۲۶-۲۷ (مع حاشیہ ۲۲، ۲۳)، المومن: ۴۶ (مع حاشیہ ۶۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَ لَوْ نَشَآءُ
لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَ اللّٰهُ
يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ
وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

اور اُس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اِسی بنا پر اُس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیے۔[۳۸] ع

کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انھیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور اُن کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے اندازِ کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے، تاکہ تمھارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جب کہ ان پر راہِ راست

۳۸- اعمال سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جو مسلمان بن کر وہ انجام دیتے رہے۔ ان کی نمازیں، ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ، غرض وہ تمام عبادتیں اور وہ ساری نیکیاں جو اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے اعمالِ خیر میں شمار ہوتی تھیں، اِس بنا پر ضائع ہو گئیں کہ انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ اور اُس کے دین اور ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا رویّہ اختیار نہ کیا، بلکہ محض اپنے دنیوی مفاد کے لیے دشمنانِ دین کے ساتھ ساز باز کرتے رہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کا موقع آتے ہی اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کی فکر میں لگ گئے۔

یہ آیات اِس معاملے میں بالکل ناطق ہیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں جس شخص کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ ہوں، یا کفر اور کفار کے ساتھ ہوں، اس کا ایمان ہی سرے سے معتبر نہیں ہے، کجا کہ اس کا کوئی عمل

لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝۳۲ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝۳۳
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ
كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝۳۴ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ
وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۵

واضح ہو چکی تھی، درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا۔[۳۹] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو۔[۴۰] کفر کرنے والوں اور راہِ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔ پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔[۴۱] تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے اور تمھارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

خدا کے ہاں مقبول ہو۔

۳۹- اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جن کاموں کو انھوں نے اپنے نزدیک نیک سمجھ کر کیا ہے، اللہ ان سب کو ضائع کر دے گا اور آخرت میں اُن کا کوئی اجر بھی وہ نہ پا سکیں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ جو تدبیریں بھی وہ اللہ اور اس کے رسُولؐ کے دین کا راستہ روکنے کے لیے کر رہے ہیں، وہ سب ناکام و نامراد ہو جائیں گی۔

۴۰- بالفاظِ دیگر، اعمال کے نافع اور نتیجہ خیز ہونے کا سارا انحصار اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت پر ہے۔ اطاعت سے منحرف ہو جانے کے بعد کوئی عمل بھی عملِ خیر نہیں رہتا کہ آدمی اس پر کوئی اجر پانے کا مستحق ہو سکے۔

۴۱- یہاں یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ ارشاد اُس زمانے میں فرمایا گیا ہے جب صرف مدینے کی چھوٹی سی بستی میں چند سو مہاجرین و انصار کی ایک مٹھی بھر جمعیّت اسلام کی عَلَم برداری کر رہی تھی اور اس کا مقابلہ محض قریش کے طاقتور قبیلے ہی سے نہیں بلکہ پُورے ملکِ عرب کے کفار و مشرکین سے تھا۔ اس حالت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمت ہار کر اِن دشمنوں سے صلح کی درخواست نہ کرنے لگو، بلکہ سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کبھی صلح کی بات چیت کرنی ہی نہ چاہیے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں صلح کی سلسلۂ جنبانی کرنا درست نہیں ہے جب اُس کے معنی اپنی کمزوری کے اظہار کے ہوں اور اُس سے دشمن اور زیادہ

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَ إِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا
يُؤْتِكُمْ أُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ إِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا
فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ
لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ
فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ

یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے[۴۲]۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی رَوِش پر چلتے رہو تو اللہ تمھارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمھارے مال تم سے نہ مانگے گا[۴۳]۔ اگر کہیں وہ تمھارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمھارے کھوٹ اُبھار لائے گا[۴۴]۔ دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اِس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بُخل کر رہے ہیں، حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔

دلیر ہو جائیں۔ مسلمانوں کو پہلے اپنی طاقت کا لوہا منوا لینا چاہیے، اس کے بعد وہ صلح کی بات چیت کریں تو مضایقہ نہیں۔

۴۲ – یعنی آخرت کے مقابلے میں اِس دنیا کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ چند روز کا دل بہلاوا ہے۔ یہاں کی کامرانی و ناکامی کوئی حقیقی اور پائدار چیز نہیں ہے جسے کوئی اہمیت حاصل ہو۔ اصل زندگی آخرت کی ہے جس کی کامیابی کے لیے انسان کو فکر کرنی چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، تفسیر سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۱۰۲)

۴۳ – یعنی وہ غنی ہے، اسے اپنی ذات کے لیے تم سے لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی راہ میں تم سے کچھ خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمھاری ہی بھلائی کے لیے کہتا ہے۔

۴۴ – یعنی اتنی بڑی آزمایش میں وہ تمھیں نہیں ڈالتا جس سے تمھاری کمزوریاں اُبھر آئیں۔

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۳۸ ع ۴

اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمھاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے ع

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الفتح

(۴۸)

الفتح

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا سے ماخوذ ہے۔ یہ محض اس سورت کا نام ہی نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی اس کا عنوان ہے، کیونکہ اس میں اُس فتحِ عظیم پر کلام کیا گیا ہے جو صلحِ حُدَیبیَہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائی تھی۔

زمانۂ نزُول روایات اس پر متفق ہیں کہ اس کا نُزول ذی القعدہ ۶ھ میں اُس وقت ہوا تھا جب آپؐ کُفّارِ مکّہ سے صلحِ حُدَیبیہ کا معاہدہ کرنے کے بعد مدینۂ منورہ کی طرف واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

تاریخی پس منظر جن واقعات کے سلسلے میں یہ سورت نازل ہوئی، ان کی ابتدا اِس طرح ہوتی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحابؓ کے ساتھ مکّۂ معظمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عُمرہ ادا فرمایا ہے۔ پیغمبر کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب و خیال نہ ہوسکتا تھا۔ وہ تو وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور آگے چل کر آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے خود توثیق کر دی ہے کہ یہ خواب ہم نے اپنے رسول کو دکھایا تھا۔ اس لیے درحقیقت یہ نرا خواب نہ تھا، بلکہ ایک الٰہی اشارہ تھا، جس کی پیروی کرنا حضورؐ کے لیے ضروری تھا۔

بظاہر اَسباب اِس ہدایت پر عمل کرنے کی کوئی صورت ممکن نظر نہ آتی تھی۔ کفارِ قریش نے ۶ سال سے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا، اور اس پُوری مدت میں کسی مسلمان کو انھوں نے حج اور عُمرے تک کے لیے حُدودِ حرم کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ اب آخر یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ کی ایک جمعیّت کے ساتھ مکّے میں داخل ہونے دیں گے۔ عُمرے کا احرام باندھ کر جنگی ساز و سامان ساتھ لیے ہوئے نکلنا گویا خود لڑائی کو دعوت دینا تھا، اور غیر مسلّح جانے کے معنی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کے تھے۔ اِن حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس اشارے پر عمل کیا جائے تو کیسے۔

مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اُس کا رب جو حکم بھی اس کو دے، وہ بے کھٹکے اس پر عمل کر گزرے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تأمّل اپنا خواب صحابۂ کرامؓ کو سُنا کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آس پاس کے قبائل میں بھی آپؐ نے اعلانِ عام کرا دیا کہ ہم عُمرے کے لیے جا رہے ہیں، جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آ جائے۔ جن لوگوں کی نگاہ ظاہری اسباب پر تھی، انھوں نے سمجھا کہ یہ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اُن

Maktaba Tul Ishaat.com

میں سے کوئی آپؐ کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مگر جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچّا ایمان رکھتے تھے انھیں اس امر کی کوئی پروا نہ تھی کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے لیے بس یہ کافی تھا کہ اللہ کا اشارہ ہے اور اس کا رسول تعمیلِ حکم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز ان کو رسولِ خدا کا ساتھ دینے سے نہ روک سکتی تھی۔ چودہ سو صحابی حضورؐ کی معیّت میں اس نہایت خطرناک سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ذِی القَعدہ ۶ ھ کے آغاز میں یہ مبارک قافلہ مدینے سے روانہ ہوا۔ ذُوالحُلَیفہ[1] پہنچ کر سب نے عُمرے کا اِحرام باندھا، قربانی کے لیے ۷۰ اُونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں ہَدْی کی علامت کے طور پر قَلادے پڑے ہوئے تھے۔ پَرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار رکھ لی، جس کی تمام زائرینِ حرم کو عرب کے معروف قاعدے کے مطابق اجازت تھی، اور اس کے سوا کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا۔ اس طرح یہ قافلہ لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی طرف چل پڑا۔

اُس وقت مکّہ اور مدینہ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، عرب کا بچّہ بچّہ اس کو جانتا تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو شوال ۵ ھ میں قریش نے قبائلِ عرب کی مُتّحِدہ طاقت کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی تھی اور غزوۂ اَحزاب کا مشہور معرکہ پیش آ چکا تھا۔ اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِتنے بڑے قافلے کے ساتھ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو پُورے عرب کی نگاہیں اِس عجیب سفر کی طرف مرکوز ہو گئیں، اور لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ قافلہ لڑنے کے لیے نہیں جا رہا ہے، بلکہ ماہِ حرام میں، اِحرام باندھ کر، ہَدْی کے اُونٹ ساتھ لیے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرنے جا رہا ہے اور قطعی طور پر غیر مسلّح ہے۔

قریش کے لوگوں کو حضورؐ کے اِس اقدام نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ ذی القَعدہ کا مہینا اُن حرام مہینوں میں سے تھا جو صدہا برس سے عرب میں حج و زیارت کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اِس مہینے میں جو قافلہ اِحرام باندھ کر حج یا عُمرے کے لیے جا رہا ہو، اُسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا، حتّٰی کہ کسی قبیلے سے اُس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مُسلّمہ قوانین کی رُو سے وہ اپنے علاقے سے اس کے گزرنے میں مانع نہ ہو سکتا تھا۔ قریش کے لوگ اِس اُلجھن میں پڑ گئے کہ اگر ہم مدینے کے اِس قافلے پر حملہ کر کے اسے مکّۂ معظّمہ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو پورے ملک میں اس پر شور مچ جائے گا۔ عرب کا ہر شخص پکار اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمام قبائلِ عرب یہ سمجھیں گے کہ ہم خانۂ کعبہ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ہر قبیلہ اِس تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ آیندہ کسی کو حج اور عمرہ کرنے دینا یا نہ کرنے دینا اب ہماری مرضی پر موقوف ہے، جس سے بھی ہم ناراض ہوں گے اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے سے اسی طرح روک دیں گے جس طرح آج مدینے کے اِن زائرین کو روک رہے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہوگی جس سے سارا عرب ہم سے منحرف ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ مقام مدینے سے مکّے کی جانب تقریباً ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اب اسے بئرِ علی کہتے ہیں، اور مدینے کے حاجی اِسی مقام سے حج اور عُمرے کا اِحرام باندھتے ہیں۔

کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ بخیریت اپنے شہر میں داخل ہو جانے دیتے ہیں تو پُورے ملک میں ہماری ہوا اکھڑ جائے گی، اور لوگ کہیں گے کہ ہم محمدؐ سے مرعوب ہو گئے۔ آخر کار بڑی کشش و پنچ کے بعد اُن کی جاہلانہ حمیت ہی اُن پر غالب آ کر رہی، اور انھوں نے اپنی ناک کی خاطر یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی اس قافلے کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی کَعب کے ایک شخص کو مُخبِر کی حیثیت سے آگے بھیج رکھا تھا، تاکہ وہ قریش کے ارادوں اور ان کی نقل و حرکت سے آپؐ کو بروقت مُطّلع کرتا رہے۔ جب آپؐ عُسفان[1] پہنچے تو اُس نے آ کر آپؐ کو اطلاع دی کہ قریش کے لوگ پُوری تیاری کے ساتھ ذی طُویٰ[2] کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اور خالد بن ولید کو انھوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کُراعُ الغَمیم[3] کی طرف آگے بھیج دیا ہے تاکہ وہ آپؐ کا راستہ روکیں۔ قریش کی چال یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُن کو اشتعال دلائیں، اور پھر اگر لڑائی ہو جائے تو پورے ملک میں یہ مشہور کر دیں کہ یہ لوگ دراصل آئے تھے لڑنے کے لیے، مگر بہانہ انھوں نے عُمرے کا کیا تھا اور اِحرام محض دھوکا دینے کے لیے باندھ رکھا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع پاتے ہی فوراً راستہ بدل دیا اور ایک نہایت دشوار گزار راستے سے سخت مَشقّت اُٹھا کر حُدَیبِیَہ[4] کے مقام پر پہنچ گئے جو عین حَرم کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں بنی خُزاعہ کا سردار بُدَیل بن وَرقا اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، صرف بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہی بات اِن لوگوں نے جا کر قریش کے سرداروں کو بتا دی اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اِن زائرینِ حَرم کا راستہ نہ روکیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر اَڑے رہے اور انھوں نے اَحابِیش[5] کے سردار حُلَیس بن عَلقَمہ کو حضورؐ کے پاس بھیجا، تاکہ وہ آپؐ کو واپس جانے پر آمادہ کرے۔ سردارانِ قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی بات نہ مانیں گے تو وہ ان سے ناراض ہو کر پلٹے گا اور پھر اَحابِیش کی پوری طاقت ہمارے ساتھ ہو گی۔ مگر جب اس نے آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام بند ہے، ہَدْی کے اُونٹ سامنے کھڑے ہیں

---

[1] یہ مقام مدینہ سے مکّہ کے راستے پر، مکّہ سے تقریباً دو دن کی مَسافت پر واقع ہے۔ (یعنی اونٹ کی سواری پر یہاں سے مکّہ پہنچنے میں دو دن لگتے ہیں۔)

[2] مکّے سے باہر عُسفان کے راستے پر ایک مقام۔

[3] عُسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر، مکّے کی جانب۔

[4] یہ مقام جِدّہ سے مکّہ جانے والی سڑک پر ٹھیک اُس جگہ واقع ہے جہاں سے حُدودِ حرم شروع ہوتی ہیں۔ اب اسے شُمَیسی کہتے ہیں۔ مکّے سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۳ میل ہے۔

[5] یہ اطرافِ مکہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا جس سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جن کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ حضورؐ سے کوئی بات کیے بغیر مکّے کی طرف پلٹ گیا اور اس نے جا کر قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ بیت اللہ کی عظمت مان کر اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اگر تم ان کو روکو گے تو اَحابیش اِس کام میں تمھارا ساتھ ہرگز نہ دیں گے۔ ہم تمھارے حلیف اس لیے نہیں بنے ہیں کہ تم حُرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس میں تمھاری حمایت کریں۔

پھر قریش کی طرف سے عُرْوَہ بن مسعود ثَقَفی آیا اور اس نے اپنے نزدیک بڑی اُونچ نیچ سمجھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپؐ مکّے میں داخل ہونے کے ارادے سے باز آ جائیں، مگر آپؐ نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بنی خُزاعہ کے سردار کو دیا تھا کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے بن کر ایک دینی فریضہ بجا لانے کے لیے آئے ہیں۔ واپس جا کر عُرْوَہ نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ مَیں قیصر و کسریٰ اور نَجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں، مگر خدا کی قسم! میں نے اصحابِ محمدؐ کو جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فدائی دیکھا ہے، ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا۔ اِن لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مَل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمھارا مقابلہ کس سے ہے۔

اس دوران میں، جب کہ ایلچیوں کی آمد و رفت اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ جاری تھا، قریش کے لوگ بار بار یہ کوشش کرتے رہے کہ چپکے سے حضورؐ کے کیمپ پر چھاپے مار کر صحابہؓ کو اشتعال دلائیں اور کسی نہ کسی طرح اُن سے کوئی ایسا اقدام کرا لیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ مگر ہر مرتبہ صحابہؓ کے صبر و ضبط اور حضورؐ کی حکمت و فراست نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام کر دیا۔ ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ صحابہؓ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپؐ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تَنْعِیم[1] کی طرف سے ۸۰ آدمی عین نمازِ فجر کے وقت آئے اور انھوں نے اچانک چھاپا مار دیا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے، مگر حضورؐ نے انھیں بھی رہا کر دیا۔ اِس طرح قریش کو اپنی ہر چال اور ہر تدبیر میں ناکامی ہوتی چلی گئی۔

آخر کار حضورؐ نے خود اپنی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مکّہ بھیجا اور ان کے ذریعے سے سردارانِ قریش کو یہ پیغام دیا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کے لیے ہدی ساتھ لے کر آئے ہیں، طواف اور قربانی کر کے واپس چلے جائیں گے۔ مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکّہ ہی میں روک لیا۔ اس دوران

---

1 یہ مکّے کے قریب حُدودِ حرم سے باہر ایک مقام ہے۔ مکّے کے لوگ بالعموم عُمرہ کرنے کی خاطر اسی مقام پر جا کر احرام باندھتے ہیں اور پھر واپس آ کر عمرہ ادا کرتے ہیں۔

میں یہ خبر اُڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں، اور ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر سچی ہے۔ اب مزید تحمّل کا کوئی موقع نہ تھا۔ مکے میں داخلے کی بات تو دوسری تھی، اس کے لیے طاقت کا استعمال ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ مگر جب نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ گئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اِس بات پر بیعت لی کہ اب یہاں سے ہم مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موقع کی نزاکت نگاہ میں ہو تو آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بیعت نہ تھی۔ مسلمان صرف ۱۴ سو تھے اور کسی سامانِ جنگ کے بغیر آئے تھے۔ اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دُور، عین مکّہ کی سرحد پر ٹھیرے ہوئے تھے، جہاں دشمن اپنی پُوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور گرد و پیش سے اپنے حامی قبیلوں کو لا کر بھی انھیں گھیرے میں لے سکتا تھا۔ اس کے باوجود ایک شخص کے سوا پورا قافلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مرنے مارنے کی بیعت کرنے کے لیے بلا تأمّل آمادہ ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے اخلاصِ ایمانی اور راہِ خدا میں ان کی فدائیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ یہی وہ بیعت ہے جو بیعتِ رضوان کے نام سے تاریخِ اسلام میں مشہور ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر غلط تھی۔ حضرت عثمانؓ خود بھی واپس آ گئے اور قریش کی طرف سے سُہَیل بن عَمْرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اب قریش اپنی اِس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ حضورؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو سرے سے مکے میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپ اِس سال واپس چلے جائیں، آیندہ سال آپ عمرے کے لیے آ سکتے ہیں۔ طویل گفت و شنید کے بعد جن شرائط پر صلح نامہ لکھا گیا، وہ یہ تھیں:

(۱) دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی، اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا عَلانیہ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

(۲) اس دَوران میں قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا اسے آپؐ واپس کر دیں گے، اور آپؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا اسے وہ واپس نہ کریں گے۔

(۳) قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اِس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اِس کا اختیار ہو گا۔

(۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال واپس جائیں گے اور آیندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن مکّے میں ٹھیر سکتے ہیں، بشرطیکہ پَرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار لے کر آئیں، اور کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِن تین دنوں میں اہلِ مکّہ اُن کے لیے شہر خالی کر دیں گے (تا کہ کسی تصادُم کی نوبت نہ آئے)۔ مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جس وقت اس معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں، مسلمانوں کا پورا لشکر سخت مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مَصلَحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنھیں نگاہ میں رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ کسی کی نظر اتنی دُور رَس نہ تھی کہ اس صلح کے نتیجے میں جو خیرِ عظیم رونما ہونے والی تھی، اسے دیکھ سکے۔ کفارِ قریش اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے، اور مسلمان اِس پر بے تاب تھے کہ ہم آخر دب کر یہ ذلیل شرائط کیوں قبول کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبّر تک کا یہ حال تھا کہ وہ کہتے ہیں: مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ نہ پائی تھی، مگر اس موقع پر میں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بے چین ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا: ''کیا حضورؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر آخر ہم اپنے دین کے معاملے میں یہ ذلّت کیوں اختیار کریں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''اے عمر! وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔'' پھر اُن سے صبر نہ ہوا۔ جا کر یہی سوالات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیے، اور حضورؐ نے بھی ان کو ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ مدّتوں اس گفتگو پر نادم رہے جو انھوں نے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی اور صدقات و نوافل ادا کرتے رہے، تا کہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔

سب سے زیادہ دو باتیں اس مُعاہدے میں لوگوں کو بُری طرح کَھل رہی تھیں۔ ایک، شرط نمبر ۲، جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ یہ صریح نامُساوی شرط ہے۔ اگر مکّے سے بھاگ کر آنے والوں کو ہم واپس کریں تو مدینے سے بھاگ کر جانے والے کو وہ کیوں نہ واپس کریں؟ حضورؐ نے اِس پر فرمایا: جو ہمارے ہاں سے بھاگ کر اُن کے پاس چلا جائے، وہ آخر ہمارے کس کام کا ہے؟ اللہ اسے ہم سے دُور ہی رکھے۔ اور جو اُن کے ہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آ جائے، اسے اگر ہم واپس کر دیں گے تو اللہ اس کے لیے خلاصی کی کوئی اور صورت پیدا فرما دے گا۔ دوسری چیز جو لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی، وہ چوتھی شرط تھی۔ مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ماننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمام عرب کے سامنے گویا ہم ناکام واپس جا رہے ہیں۔ مزید برآں یہ سوال بھی دلوں میں خلش پیدا کر رہا تھا کہ حضورؐ نے تو خواب میں یہ دیکھا تھا کہ ہم مکّے میں طواف کر رہے ہیں، مگر یہاں تو ہم طواف کیے بغیر واپس جانے کی شرط مان رہے ہیں۔ حضورؐ نے اس پر لوگوں کو سمجھایا کہ خواب میں آخر اِسی سال طواف کرنے کی صراحت تو نہ تھی۔ شرائطِ صلح کے مطابق اِس سال نہیں تو اگلے سال اِن شاء اللہ طواف ہو گا۔

جلتی پر تیل کا کام جس واقعے نے کیا، وہ یہ تھا کہ عین اُس وقت جب صلح کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سُہیل بن عَمرو کے اپنے صاحبزادے ابوجَندَل، جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفّارِ مکّہ نے ان کو قید کر رکھا تھا،

کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر تشدّد کے نشانات تھے۔ انھوں نے حضورؐ سے فریاد کی کہ مجھے اِس حبس بے جا سے نجات دلائی جائے۔ صحابۂ کرامؓ کے لیے یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر سُہَیل بن عَمْرو نے کہا کہ صلح نامے کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی ہو، شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں، اس لیے اس لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حجت تسلیم فرمالی اور ابو جَنْدَل ظالموں کے حوالے کر دیے گئے۔

صلح سے فارغ ہو کر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اب یہیں قربانی کر کے سر منڈواؤ اور اِحرام ختم کر دو۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حضورؐ نے تین مرتبہ حکم دیا، مگر صحابہؓ پر اُس وقت رنج و غم اور دل شکستگی کا ایسا شدید غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی۔ حضورؐ کے پُورے دَورِ رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ صحابہؓ کو حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ نہ پڑیں۔ حضورؐ کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے اپنے خیمے میں جا کر اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپؐ بس خاموشی کے ساتھ تشریف لے جا کر خود اپنا اُونٹ ذبح فرمائیں اور حجّام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیں۔ اس کے بعد لوگ خود بخود آپؐ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آپؐ کے فعل کو دیکھ کر لوگوں نے بھی قربانیاں کر لیں، سر منڈوا لیے یا بال ترشوا لیے اور اِحرام سے نکل آئے۔ مگر دل اُن کے غم سے کٹے جا رہے تھے۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ حُدَیبیہ کی صلح کو اپنی شکست اور ذلّت سمجھتا ہوا مدینے کی طرف واپس جا رہا تھا، اُس وقت ضَجْنان[1] کے مقام پر (یا بقولِ بعض کُراعُ الغَمِیم کے مقام پر) یہ سورت نازل ہوئی، جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ صلح جس کو وہ شکست سمجھ رہے ہیں، دراصل فتحِ عظیم ہے۔ اس کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا: آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر یہ سورت آپؐ نے تلاوت فرمائی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کو بلا کر اسے سُنایا، کیونکہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ تھے۔

اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے، مگر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ اِس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کُھلتے چلے گئے، یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی۔

۱- اس میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت محض قریش اور قبائلِ عرب کے خلاف

---

[1] مکّے سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

Maktaba Tul Ishaat.com

خُروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ ان کو برادری باہر (outlaw) سمجھتے تھے۔ اب خود قریش ہی نے آپؐ سے معاہدہ کر کے سلطنتِ اسلامی کے مقبوضات پر آپؐ کا اقتدار مان لیا اور قبائلِ عرب کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ اِن دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ مُعاہَدات کر لیں۔

۲- مسلمانوں کے لیے زیارتِ بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے آپ سے آپ گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آرہے تھے، بلکہ عرب کے مُسلَّمہ ادیان میں سے ایک ہے، اور دوسرے عربوں کی طرح اس کے پیرو بھی حج و عمرہ کے مَناسِک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اہلِ عرب کے دلوں کی وہ نفرت کم ہو گئی جو قریش کے پروپیگنڈے سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

۳- دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسّر آ گیا اور انھوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اِس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلحِ حُدَیبِیَہ سے پہلے پُورے ۱۹ سال میں اُتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے اس کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔ یہ اِسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حُدَیبِیَہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ صرف ۱۴ سو آدمی آئے تھے، یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکّے پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمرکاب تھا۔

۴- قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجرا سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدّن بنا دیں۔ یہی وہ نعمتِ عُظمٰی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں فرمایا کہ ”آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، دیباچہ سورۂ مائدہ، اور حاشیہ ۱۵)

۵- قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شِمالِ عرب اور وسطِ عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخّر کر لیا۔ صلحِ حُدَیبِیَہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہو گیا، اور اس کے بعد فَدَک، وادی القُریٰ، تَیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیرِ نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسطِ عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے تابعِ فرمان ہو گئے۔ اس طرح حُدَیبِیَہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازُن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو اُس صلح سے حاصل ہوئیں جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ جو چیز اِس صلح میں مسلمانوں کو ناگوار ہوئی تھی اور جسے قریش نے اپنی جیت

سمجھا تھا، وہ یہ تھی کہ مکّہ سے بھاگ کر مدینہ جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر مکّہ جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا۔ مگر تھوڑی ہی مدّت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر اُلٹا پڑا اور تجرِبے نے بتا دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُوررس نے اِس کے کن نتائج کو دیکھ کر یہ شرط قبول کی تھی۔ صلح کے کچھ دنوں بعد مکّے سے ایک مسلمان ابوبَصیرؓ قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور حضورؐ نے مُعاہَدے کے مطابق انھیں اُن لوگوں کے حوالے کر دیا جو ان کی گرفتاری کے لیے مکّے سے بھیجے گئے تھے۔ مگر مکّہ جاتے ہوئے راستے میں وہ پھر ان کی گرفت سے بچ نکلے اور ساحلِ بحرِ اَحمر کے اُس راستے پر جا بیٹھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس کے بعد جس مسلمان کو بھی قریش کی قید سے بھاگ نکلنے کا موقع ملتا، وہ مدینہ جانے کے بجائے ابوبَصیرؓ کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا، یہاں تک کہ ۷۰ آدمی وہاں جمع ہوگئے اور انھوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مار مار کر ان کا ناطِقہ تنگ کر دیا۔ آخر کار قریش نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں، اور حُدَیْبِیَہ کے معاہدے کی وہ شرط آپ سے ساقط ہوگئی۔

یہ تاریخی پَس منظر نگاہ میں رکھ کر اِس سورہ کو پڑھا جائے تو اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۹ آیاتھا ۴ رکوعاتھا

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝١ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ
مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢

اے نبیؐ! ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی،[۱] تاکہ اللہ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے[۲] اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے[۳] اور تمھیں سیدھا راستہ دکھائے[۴]

۱- صلح حُدَیبیہ کے بعد جب فتح کا یہ مُژدہ سنایا گیا تو لوگ حیران تھے کہ آخر اس صلح کو فتح کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ایمان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو مان لینے کی بات تو دوسری تھی، مگر اس کے فتح ہونے کا پہلو کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سُن کر پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں۔ (ابنِ جَرِیر) ایک اور صحابی حاضر ہوئے اور انھوں نے بھی یہی سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اِیْ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ اِنَّہٗ لَفَتْحٌ، ”قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، یقیناً یہ فتح ہے۔“ (مُسندِ احمد، ابوداؤد) مدینہ پہنچ کر ایک اور صاحب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”یہ کیسی فتح ہے؟ ہم بیت اللہ جانے سے روک دیے گئے، ہماری قربانی کے اُونٹ بھی آگے نہ جا سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حُدَیبیہ ہی میں رُک جانا پڑا، اور اس صلح کی بدولت ہمارے دو مظلوم بھائیوں (ابوجندلؓ اور ابوبصیرؓ) کو ظالموں کے حوالے کر دیا گیا۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ”بڑی غلط بات کہی گئی ہے یہ۔ حقیقت میں تو یہ بہت بڑی فتح ہے۔ تم مشرکوں کے عین گھر پر پہنچ گئے اور انھوں نے آیندہ سال عمرہ کرنے کی درخواست کر کے تمھیں واپس جانے پر راضی کیا۔ انھوں نے تم سے خود جنگ بند کر دینے اور صلح کر لینے کی خواہش کی، حالانکہ ان کے دلوں میں تمھارے لیے جیسا کچھ بغض ہے، وہ معلوم ہے۔ اللہ نے تم کو ان پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ کیا وہ دن بھول گئے جب اُحد میں تم بھاگے جا رہے تھے اور میں تمھیں پیچھے سے پکار رہا تھا؟ کیا وہ دن بھول گئے جب جنگِ احزاب میں ہر طرف سے دشمن چڑھ آئے تھے اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے؟“ (بَیہقی بروایتِ عُروہؓ بن زبیرؓ) مگر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ اس صلح کا فتح ہونا بالکل عیاں ہوتا چلا گیا اور ہر خاص و عام پر یہ بات پوری طرح کھل گئی کہ فی الواقع اسلام کی فتح کا آغاز صلحِ حُدَیبیہ ہی سے ہوا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت جابر بن عبداللہؓ، اور حضرت بَراءؓ بن عازِب، تینوں حضرات سے قریب قریب ایک ہی معنیٰ میں یہ قول منقول ہوا ہے کہ ”لوگ فتحِ مکّہ کو فتح کہتے ہیں، حالانکہ ہم اصل فتح حُدَیبیہ کو سمجھتے ہیں۔“ (بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ جَرِیر)

۲- جس موقع و محل پر یہ فقرہ ارشاد ہوا ہے، اسے نگاہ میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں جن کوتاہیوں

سے درگزر کرنے کا ذکر ہے، ان سے مراد وہ خامیاں ہیں جو اسلام کی کامیابی و سربلندی کے لیے کام کرتے ہوئے اُس سعی و جُہد میں رہ گئی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں پچھلے ۱۹ سال سے مسلمان کر رہے تھے۔ یہ خامیاں کسی انسان کے علم میں نہیں ہیں، بلکہ انسانی عقل تو اُس جِدّ و جُہد میں کوئی نَقص تلاش کرنے سے قطعی عاجز ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کمال کا جو بلند ترین معیار ہے، اس کے لحاظ سے اُس میں کچھ ایسی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کو اتنی جلدی مشرکینِ عرب پر فیصلہ کُن فتح حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان خامیوں کے ساتھ اگر تم جِدّ و جُہد کرتے رہتے تو عرب کے مُسَخَّر ہونے میں ابھی عرصۂ دراز درکار تھا، مگر ہم نے ان ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگزر کر کے محض اپنے فضل سے اُن کی تلافی کر دی، اور حُدَیبیہ کے مقام پر تمھارے لیے اُس فتح و ظفر کا دروازہ کھول دیا جو معمول کے مطابق تمھاری اپنی کوششوں سے نصیب نہ ہو سکتی تھی۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کسی مقصد کے لیے ایک جماعت جو کوشش کر رہی ہو، اُس کی خامیوں کے لیے اُس جماعت کے قائد و رہنما ہی کو مُخاطَب کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ خامیاں قائد کی ذاتی خامیاں ہیں۔ دراصل وہ اُس جِدّ و جُہد کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو پُوری جماعت بحیثیتِ مجموعی کر رہی ہوتی ہے۔ مگر خطاب قائد سے کیا جاتا ہے کہ آپ کے کام میں یہ کمزوریاں ہیں۔

تاہم چونکہ روئے سُخَن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، اور فرمایا یہ گیا ہے کہ اللہ نے آپؐ کی ہر اگلی پچھلی کوتاہی کو معاف فرما دیا، اس لیے اِن عام الفاظ سے یہ مضمون بھی نکل آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کے رسولِ پاکؐ کی تمام لَغزشیں (جو آپؐ کے مقامِ بلند کے لحاظ سے لغزشیں تھیں) بخش دی گئیں۔ اسی بنا پر جب صحابۂ کرامؓ حضورؐ کو عبادت میں غیر معمولی مَشَقَّتیں اُٹھاتے ہوئے دیکھتے تھے تو عرض کرتے تھے کہ آپؐ کے تو سب اگلے پچھلے قصور معاف ہو چکے ہیں، پھر آپؐ اپنی جان پر اتنی سختی کیوں اٹھاتے ہیں؟ اور آپؐ جواب میں فرماتے تھے: افلا اکون عبدًا شکورًا "کیا میں ایک شکر گزار بندہ نہ بنوں؟" (احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد)

۳- نعمت کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنی جگہ ہر خوف، ہر مُزاحمت اور ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تمدّن و تہذیب اور اسلامی قوانین و احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں، اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے کہ وہ دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کر سکیں۔ کفر و فسق کا غلبہ، جو بندگیِ رب کی راہ میں مانع اور اعلائے کلمۃُ اللہ کی سعی میں مُزاحم ہو، اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، جسے قرآن "فتنہ" قرار دیتا ہے۔ اِس فتنے سے خلاصی پا کر جب ان کو ایک ایسا دار الاسلام میسّر آ جائے جس میں اللہ کا پُورا دین بے کم و کاست نافذ ہو، اور اس کے ساتھ ان کو ایسے ذرائع و وسائل بھی بہم پہنچ جائیں جن سے وہ خدا کی زمین پر کفر و فسق کی جگہ ایمان و تقویٰ کا سکّہ رواں کر سکیں، تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اِتمام ہے۔ یہ نعمت چونکہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت حاصل ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ ہی کو مُخاطَب کر کے فرمایا کہ ہم تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دینا چاہتے تھے، اس لیے یہ فتح ہم نے تم کو عطا کر دی۔

۴- اِس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب آپؐ کو فتح و کامرانی کا راستہ دکھانا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ③ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ
فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْۤا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ
جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ④

اور تم کو زبردست نُصرت بخشے۔[۵] وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی،[۶] تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں۔[۷] زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔[۸] (اُس نے یہ کام اِس لیے کیا ہے)

ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حُدَیْبِیَہ کے مقام پر صلح کا یہ معاہدہ کرا کے آپؐ کے لیے وہ راہ ہموار کر دی اور وہ تدبیر آپؐ کو سُجھا دی جس سے آپؐ اسلام کی مُزاحمت کرنے والی تمام طاقتوں کو مغلوب کر لیں۔

۵۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''تم کو بے مثل نُصرت بخشے''۔ اصل میں لفظ نَصْرًا عَزِيْزًا استعمال ہوا ہے۔ عزیز کے معنیٰ زبردست کے بھی ہیں اور بے نظیر، بے مثل اور نادر کے بھی۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اس صلح کے ذریعے سے اللہ نے آپؐ کی ایسی مدد کی ہے جس سے آپؐ کے دشمن عاجز ہو جائیں گے۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی کبھی کسی کی مدد کا ایسا عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر جو چیز لوگوں کو محض ایک صلح نامہ، اور وہ بھی دب کر کیا ہوا صلح نامہ نظر آتی ہے، وہی ایک فیصلہ کُن فتح بن جانے والی ہے۔

۶۔ ''سکینت'' عربی زبان میں سُکون و اطمینان اور ثباتِ قلب کو کہتے ہیں، اور یہاں اللہ تعالیٰ مومنوں کے دل میں اُس کے نازل کیے جانے کو اُس فتح کا ایک اہم سبب قرار دے رہا ہے جو حُدَیْبِیَہ کے مقام پر اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ اُس وقت کے حالات پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ کس قسم کی سکینت تھی جو اس پُورے زمانے میں مسلمانوں کے دلوں میں اُتاری گئی اور کیسے وہ اِس فتح کا سبب بنی۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عُمرے کے لیے مکّۂ معظّمہ جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا، اگر مسلمان اُس وقت خوف زدگی میں مبتلا ہو جاتے اور منافقین کی طرح یہ سوچنے لگتے کہ یہ تو صریحاً موت کے منہ میں جانا ہے، یا جب راستے میں یہ اطلاع ملی کہ کفارِ قریش لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں، اُس وقت اگر مسلمان اس گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتے کہ ہم کسی جنگی ساز و سامان کے بغیر دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے، اور اِس بنا پر ان کے اندر بھگدڑ مچ جاتی، تو ظاہر ہے کہ وہ نتائج کبھی رُونما نہ ہوتے جو حُدَیْبِیَہ میں رُونما ہوئے۔ پھر جب حُدَیْبِیَہ کے مقام پر کفار نے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکا، اور جب انھوں نے چھاپے اور شبخون مار مار کر مسلمانوں کو اِشتعال دلانے کی کوشش کی، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی، اور جب ابوجَندَلؓ مظلومیت کی تصویر بنے ہوئے مجمعِ عام میں آ کھڑے ہوئے، ان میں سے ہر موقع ایسا تھا کہ اگر مسلمان اشتعال میں آ کر اُس نظم و ضبط کو توڑ ڈالتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم

لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا

تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو⁹ ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنّتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے

کیا تھا تو سارا کام خراب ہو جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن شرائط پر صلح نامہ طے کرنے لگے جو مسلمانوں کی پُوری جماعت کو سخت ناگوار تھیں، اُس وقت اگر وہ حضورؐ کی نافرمانی کرنے پر اُتر آتے تو حُدَیبیہ کی فتحِ عظیم شکستِ عظیم میں تبدیل ہو جاتی۔ اب یہ سراسر اللہ ہی کا فضل تھا کہ ان نازک گھڑیوں میں مسلمانوں کو رسولِ پاکؐ کی رہنمائی پر، دینِ حق کی صداقت پر اور اپنے مشن کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نصیب ہوا۔ اسی کی بنا پر انھوں نے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے، سب گوارا ہے۔ اسی کی بنا پر وہ خوف، گھبراہٹ، اشتعال، مایوسی، ہر چیز سے محفوظ رہے۔ اسی کی بدولت ان کے کیمپ میں پُورا نظم وضبط برقرار رہا۔ اور اسی کی وجہ سے انھوں نے شرائطِ صلح پر سخت کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہی وہ سکینت تھی جو اللہ نے مومنوں کے دلوں میں اُتاری تھی، اور اسی کی یہ برکت تھی کہ عُمرے کے لیے نکلنے کا خطرناک ترین اقدام بہترین کامیابی کا مُوجب بن گیا۔

۷ - یعنی ایک ایمان تو وہ تھا جو اِس مہم سے پہلے اُن کو حاصل تھا، اور اُس پر مزید ایمان اُنھیں اِس وجہ سے حاصل ہوا کہ اس مہم کے سلسلے میں جتنی شدید آزمایشیں پیش آتی چلی گئیں، اُن میں سے ہر ایک میں وہ اخلاص، تقویٰ اور اطاعت کی رَوِش پر ثابت قدم رہے۔ یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک جامد و ساکن حالت نہیں ہے، بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی ہے اور تنزّل بھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سے مرتے دم تک مومن کو زندگی میں قدم قدم پر ایسی آزمایشوں سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جن میں اس کے لیے یہ سوال فیصلہ طلب ہوتا ہے کہ آیا وہ اللہ کے دین کی پیروی میں اپنی جان، مال، جذبات، خواہشات، اوقات، آسایشوں اور مفادات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ ایسی ہر آزمایش کے موقع پر اگر وہ قربانی کی راہ اختیار کر لے تو اس کے ایمان کو ترقی اور بالیدگی نصیب ہوتی ہے، اور اگر منہ موڑ جائے تو اس کا ایمان ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے جب وہ ابتدائی سرمایۂ ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے لیے ہوئے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ انفال، حاشیہ ۲۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۳۸)

۸ - مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پاس تو ایسے لشکر ہیں جن سے وہ کفّار کو جب چاہے تَہس نَہس کر دے، مگر اس نے کچھ جان کر اور حکمت ہی کی بنا پر یہ ذمہ داری اہلِ ایمان پر ڈالی ہے کہ وہ کفّار کے مقابلے میں جِدّ وجُہد اور کش مکش کر کے اللہ کے دین کا بول بالا کریں۔ اسی سے ان کے لیے درجات کی ترقی اور آخرت کی کامیابیوں کا دروازہ کھلتا ہے، جیسا کہ آگے کی آیت بتا رہی ہے۔

۹ - قرآنِ مجید میں بالعُموم اہلِ ایمان کے اجر کا ذکر مجموعی طور پر کیا جاتا ہے، مردوں اور عورتوں کو اجر ملنے کی الگ الگ تصریح نہیں کی جاتی۔ لیکن یہاں چونکہ یکجائی ذکر پر اکتفا کرنے سے یہ گمان پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید یہ اجر صرف مردوں کے لیے ہو،

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ
فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ
الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ
وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾

نہریں بہ رہی ہوں گی اور اُن کی بُرائیاں اُن سے دُور کر دے[10] ــــ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے ــــ اور اُن منافق مَردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق بُرے گمان رکھتے ہیں[11]۔ بُرائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے[12]، اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنّم مہیّا کر دی جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کے متعلق الگ صراحت کر دی کہ وہ بھی اس اجر میں مومن مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جن خدا پرست خواتین نے اپنے شوہروں، بیٹوں، بھائیوں اور باپوں کو اِس خطرناک سفر پر جانے سے روکنے اور آہ وفغاں سے اُن کے حوصلے پست کرنے کے بجائے ان کی ہمّت افزائی کی، جنھوں نے ان کے پیچھے ان کے گھر، ان کے مال، ان کی آبرو اور ان کے بچّوں کی محافظ بن کر انھیں اِس طرف سے بے فکر کر دیا، جنھوں نے اِس اندیشے سے بھی کوئی واویلا نہ مچایا کہ چودہ سو صحابیوں کے یک لخت چلے جانے کے بعد کہیں گرد وپیش کے کفّار ومنافقین شہر پر نہ چڑھ آئیں، وہ یقیناً گھر بیٹھنے کے باوجود جہاد کے اجر میں اپنے مَردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہونی ہی چاہییے تھیں۔

۱۰ - یعنی بَشَری کمزوریوں کی بنا پر جو کچھ بھی قصور ان سے سرزد ہوگئے ہوں انھیں معاف کر دے، جنّت میں داخل کرنے سے پہلے اُن قصوروں کے ہر اثر سے اُن کو پاک کر دے، اور جنت میں وہ اس طرح داخل ہوں کہ کوئی داغ ان کے دامن پر نہ ہو جس کی وجہ سے وہ وہاں شرمندہ ہوں۔

۱۱ - اطرافِ مدینہ کے منافقین کو تو اِس موقع پر یہ گمان تھا، جیسا کہ آگے آیت ۱۲ میں بیان ہوا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اِس سفر سے زندہ واپس نہ آسکیں گے۔ رہے مکّے کے مشرکین اور ان کے ہم مَشرَب کفّار، تو وہ اس خیال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو عُمرے سے روک کر وہ گویا آپؐ کو زک دینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ان دونوں گروہوں نے یہ جو کچھ بھی سوچا تھا، اس کی تہ میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ بدگمانی کام کر رہی تھی کہ وہ اپنے نبی کی مدد نہ کرے گا اور حق وباطل کی اس کشمکش میں باطل کو حق کا بول نیچا کرنے کی کھلی چھوٹ دے دے گا۔

۱۲ - یعنی جس انجامِ بد سے وہ بچنا چاہتے تھے اور جس سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ تدبیریں کی تھیں، اسی کے پھیر میں

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾
اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۸﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۹﴾

زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔[۱۳]

اَے نبیؐ! ہم نے تم کو شہادت دینے والا،[۱۴] بشارت دینے والا اور خبردار کردینے والا[۱۵] بنا کر بھیجا ہے، تاکہ اَے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اُس کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۱۶]

وہ آ گئے اور ان کی وہی تدبیریں اُس انجام کو قریب لانے کا سبب بن گئیں۔

۱۳ – یہاں اِس مضمون کو ایک دوسرے مقصد کے لیے دُہرایا گیا ہے۔ آیت ۴ میں اُسے اِس غرض کے لیے بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلے میں لڑنے کا کام اپنے فوق الفطری لشکروں سے لینے کے بجائے مومنین سے اس لیے لیا ہے کہ وہ ان کو نوازنا چاہتا ہے۔ اور یہاں اس مضمون کو دوبارہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو سزا دینا چاہے، اس کی سرکوبی کے لیے وہ اپنے بے شمار لشکروں میں سے جس کو چاہے استعمال کرسکتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنی تدبیروں سے وہ اُس کی سزا کو ٹال سکے۔

۱۴ – شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے شاہد کا ترجمہ "اظہارِ حق کنندہ" فرمایا ہے اور دوسرے مترجمین اس کا ترجمہ "گواہی دینے والا" کرتے ہیں۔ شہادت کا لفظ ان دونوں مفہومات پر حاوی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ احزاب، حاشیہ ۸۲)

۱۵ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ احزاب، حاشیہ ۸۳۔

۱۶ – بعض مفسّرین نے تُعَزِّرُوْهُ اور تُوَقِّرُوْهُ کی ضمیروں کا مَرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "تم رسول کا ساتھ دو اور اس کی تعظیم و توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو"۔ لیکن ایک ہی سلسلۂ کلام میں ضمیروں کے دو الگ الگ مرجع قرار دینا، جب کہ اس کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، دُرست نہیں معلوم ہوتا۔ اسی لیے مفسّرین کے ایک دوسرے گروہ نے تمام ضمیروں کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی کو قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک عبارت کا مطلب یہ ہے کہ "تم اللہ کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد صرف صبح و شام ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت تسبیح کرتے رہنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں:

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ
اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ
اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۧ ۝۱۰ ع ۹

اَے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے [۱۷]، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا [۱۸]۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا، اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے [۱۹]، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا ؏

''فلاں بات کا شہرہ مشرق ومغرب میں پھیلا ہوا ہے''، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف مشرق اور مغرب کے لوگ اس بات کو جانتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔

۱۷- اشارہ ہے اُس بیعت کی طرف جو مکۂ معظمہ میں حضرت عثمانؓ کے شہید ہو جانے کی خبر سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے حُدَیبیہ کے مقام پر لی تھی۔ بعض رِوایات کی رُو سے یہ بیعت علی الموت تھی، اور بعض رِوایات کے مطابق بیعت اِس بات پر لی گئی تھی کہ ہم میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ پھیریں گے۔ پہلی بات حضرت سَلَمہؓ بن اَکْوَع سے مروی ہے، اور دوسری حضراتِ ابنِ عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ اور مَعْقِلؓ بن یَسار سے۔ مآل دونوں کا ایک ہی ہے۔ صحابہؓ نے رسولِ پاکؐ کے ہاتھ پر بیعت اس بات کی کی تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا معاملہ اگر صحیح ثابت ہوا تو وہ سب یہیں اور اسی وقت قریش سے نمٹ لیں گے، خواہ نتیجے میں وہ سب کٹ ہی کیوں نہ مریں۔ اِس موقع پر چونکہ یہ امر ابھی یقینی نہیں تھا کہ حضرت عثمانؓ واقعی شہید ہو چکے ہیں یا زندہ ہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے خود اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت فرمائی، اور اس طرح ان کو یہ شَرَفِ عظیم حاصل ہوا کہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک کو ان کے ہاتھ کا قائم مَقام بنا کر انھیں اس بیعت میں شریک فرمایا۔ حضورؐ کا اُن کی طرف سے خود بیعت کرنا لازماً یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ حضورؐ کو ان پر پُوری طرح یہ اعتماد تھا کہ اگر وہ موجود ہوتے تو یقیناً بیعت کرتے۔

۱۸- یعنی جس ہاتھ پر لوگ اس وقت بیعت کر رہے تھے وہ شخصِ رسول کا ہاتھ نہیں بلکہ اللہ کے نمائندے کا ہاتھ تھا، اور یہ بیعت رسول کے واسطے سے درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو رہی تھی۔

۱۹- اس مَقام پر ایک لطیف نکتہ نگاہ میں رہنا چاہیے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کی رُو سے یہاں عٰهَدَ عَلَيۡهِ اللّٰهَ پڑھا جانا چاہیے تھا، لیکن اس عام قاعدے سے ہٹ کر اس جگہ عَلَيۡهُ اللّٰهَ پڑھا جاتا ہے۔ علامہ آلُوسیؒ نے اس غیر معمولی اِعراب کے دو وجوہ بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ اس خاص موقع پر اُس ذات کی بزرگی اور جلالتِ شان کا اظہار مقصود ہے

سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا
فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۱﴾

اَے نبیؐ! بدوی عربوں[20] میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، اب وہ آ کر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچّوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لیے مغفرت کی دُعا فرمائیں۔" یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں[21]۔ ان سے کہنا: "اچھا، یہی بات ہے تو کون تمھارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمھارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے[22]۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو)

جس کے ساتھ یہ عہد استوار کیا جا رہا تھا، اس لیے یہاں عَلَیْہِ کے بجائے عَلَیْہُ ہی زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے یہ کہ عَلَیْہِ میں ہ دراصل ھُوَ کی قائم مقام ہے اور اس کا اصلی اِعراب پیش ہی تھا نہ کہ زیر۔ لہٰذا یہاں اس کے اصلی اِعراب کو باقی رکھنا وفائے عہد کے مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۲۰ – یہ اَطرافِ مدینہ کے اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھیں عُمرے کی تیاری شروع کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی، مگر وہ ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود صرف اس لیے اپنے گھروں سے نہ نکلے تھے کہ انھیں اپنی جان عزیز تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلم، مُزَینَہ، جُہَینَہ، غِفار، اَشْجَع، دِیل وغیرہ قبائل کے لوگ تھے۔

۲۱ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ تمھارے مدینہ پہنچنے کے بعد یہ لوگ اپنے نہ نکلنے کے لیے جو عذر اب پیش کریں گے وہ محض ایک جھوٹا بہانہ ہوگا، ورنہ ان کے دل جانتے ہیں کہ وہ دراصل کیوں بیٹھ رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کا اللہ کے رسولؐ سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا محض زبانی جمع خرچ ہوگا۔ اصل میں وہ نہ اپنی اس حرکت پر نادم ہیں، نہ انھیں یہ احساس ہے کہ انھوں نے رسولؐ کا ساتھ نہ دے کر کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اور نہ ان کے دل میں مغفرت کی کوئی طلب ہے۔ اپنے نزدیک تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس خطرناک سفر پر نہ جا کر بڑی عقلمندی کی ہے۔ اگر انھیں واقعی اللہ اور اس کی مغفرت کی کوئی پروا ہوتی تو وہ گھر بیٹھے ہی کیوں رہتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِیْهِمْ
اَبَدًا وَّ زُیِّنَ ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ
قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ

بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسولؐ اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمھارے دلوں کو بہت بھلا لگا[۲۳] اور تم نے بہت بُرے گمان کیے اور تم سخت بد[۲۴] باطن لوگ ہو۔"

اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں، ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر رکھی ہے[۲۵]۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے۔ جسے چاہے

۲۲ – یعنی اللہ کا فیصلہ تو اُس علم کی بنا پر ہوگا جو وہ تمھارے عمل کی حقیقت کے متعلق رکھتا ہے۔ اگر تمھارا عمل سزا کا مستحق ہو اور میں تمھارے لیے مغفرت کی دعا کر دوں تو میری یہ دعا تمھیں اللہ کی سزا سے نہ بچا وے گی۔ اور اگر تمھارا عمل سزا کا مستحق نہ ہو اور میں تمھارے حق میں اِستِغفار نہ کروں تو میرا اِستِغفار نہ کرنا تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچاوے گا۔ اختیار میرا نہیں بلکہ اللہ کا ہے، اور اس کو کسی کی زبانی باتیں دھوکا نہیں دے سکتیں۔ اس لیے تمھارے ظاہری قول کو مَیں سچ مان بھی لُوں اور اس بنا پر تمھارے حق میں دعائے مغفرت بھی کر دوں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۲۳ – یعنی تم اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ رسولؐ اور اس کا ساتھ دینے والے اہلِ ایمان جس خطرے کے منہ میں جا رہے ہیں، اس سے تم نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ تمھاری نگاہ میں یہ بڑی دانش مندی کا کام تھا۔ اور تمھیں اس بات پر بھی خوش ہوتے ہوئے کوئی شرم نہ آئی کہ رسولؐ اور اہلِ ایمان ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جس سے وہ بچ کر نہ آئیں گے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی تم اس پر مضطرب نہ ہوئے، بلکہ اپنی یہ حرکت تمھیں بہت اچھی معلوم ہوئی کہ تم نے اپنے آپ کو رسولؐ کے ساتھ اس خطرے میں نہیں ڈالا۔

۲۴ – اصل الفاظ ہیں: كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا۔ بُور جمع ہے بائر کی۔ اور بائر کے دو معنی ہیں۔ ایک، فاسد، بگڑا ہوا آدمی، جو کسی بھلے کام کے لائق نہ ہو، جس کی نیت میں فساد ہو۔ دوسرے، ہالک، بد انجام، تباہی کے راستے پر جانے والا۔

۲۵ – یہاں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر اور ایمان سے خالی قرار دیتا ہے جو اللہ اور اس کے دین کے معاملے میں مخلص نہ ہوں اور آزمایش کا وقت آنے پر دین کی خاطر اپنی جان و مال اور اپنے مفاد کو خطرے میں ڈالنے سے جی چُرا جائیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ وہ کفر نہیں ہے جس کی بنا پر دنیا میں کسی شخص یا گروہ کو خارج از اسلام قرار دے دیا جائے، بلکہ وہ

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾
سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا
ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے، اور وہ غفور و رحیم ہے۔[۲۶]

جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔[۲۷] یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔[۲۸] اِن سے

کفر ہے جس کی بنا پر آخرت میں وہ غیر مومن قرار پائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے نُزول کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو، جن کے بارے میں یہ نازل ہوئی تھی، خارج از اسلام قرار نہیں دیا، اور نہ ان سے وہ معاملہ کیا جو کفار سے کیا جاتا ہے۔

۲۶ – اُوپر کی شدید تنبیہ کے بعد اللہ کے غَفور و رحیم ہونے کا ذکر اپنے اندر نصیحت کا ایک لطیف پہلو رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اب بھی اپنی غیر مخلصانہ رَوِش کو چھوڑ کر تم لوگ اخلاص کی راہ پر آجاؤ تو اللہ کو تم غفور و رحیم پاؤ گے۔ وہ تمھاری پچھلی کوتاہیوں کو معاف کر دے گا، اور آیندہ تمھارے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کے تم اپنے خلوص کی بنا پر مستحق ہو گے۔

۲۷ – یعنی عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ، جو آج خطرے کی مہم پر تمھارے ساتھ جانے سے جی چُرا گئے تھے، تمھیں ایک ایسی مہم پر جاتے دیکھیں گے جس میں ان کو آسان فتح اور بہت سے اموالِ غنیمت کے حُصول کا امکان نظر آئے گا، اور اس وقت یہ خود دوڑے آئیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ یہ وقت صلحِ حُدَیبیہ کے تین ہی مہینے بعد آ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے فتح کر لیا۔ اس وقت ہر شخص کو یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ قریش سے صلح ہو جانے کے بعد اب خَیبَر ہی کے نہیں، بلکہ تیما، فَدَک، وادی القُریٰ، اور شمالی حجاز کے دوسرے یہودی بھی مسلمانوں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور یہ ساری بستیاں پکے پھل کی طرح اسلامی حکومت کی گود میں آ گریں گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن آیات میں پیشگی خبردار کر دیا کہ اطرافِ مدینہ کے یہ موقع پرست لوگ اِن آسان فتوحات کو حاصل ہوتے دیکھ کر ان میں حصّہ بٹا لینے کے لیے آ کھڑے ہوں گے، مگر تم انھیں صاف جواب دے دینا کہ ان میں حصّہ لینے کا موقع تمھیں ہرگز نہ دیا جائے گا، بلکہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو خطرات کے مقابلے میں سرفروشی کے لیے آگے بڑھے تھے۔

۲۸ – اللہ کے فرمان سے مراد یہ فرمان ہے کہ خیبر کی مہم پر حضورؐ کے ساتھ صرف اُنھی لوگوں کو جانے کی اجازت دی جائے گی جو حُدَیبیہ کی مہم پر آپؐ کے ساتھ گئے تھے اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خیبر کے اموالِ غنیمت انھی

Maktaba Tul Ishaat.com

لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا كَذٰلِكُمۡ قَالَ اللّٰهُ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ بَلۡ
تَحۡسُدُوۡنَنَا ؕ بَلۡ كَانُوۡا لَا يَفۡقَهُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵﴾ قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِيۡنَ
مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ
تُقَاتِلُوۡنَهُمۡ اَوۡ يُسۡلِمُوۡنَ ۚ فَاِنۡ تُطِيۡعُوۡا يُؤۡتِكُمُ اللّٰهُ اَجۡرًا حَسَنًا ۚ

صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے، اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔"[29] یہ کہیں گے کہ "نہیں، بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔" (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ اِن پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمھیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بُلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔[30] اُس وقت اگر تم نے حکمِ جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمھیں اچھا اجر دے گا،

کے لیے مخصوص فرما دیے تھے، جیسا کہ آگے آیت ۱۸ میں بصراحت ارشاد ہوا ہے۔

۲۹ - "اللہ پہلے یہ فرما چکا ہے" کے الفاظ سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس آیت سے پہلے کوئی حکم اس مضمون کا آیا ہوا ہوگا جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اور چونکہ اس سورہ میں اِس مضمون کا کوئی حکم اِس آیت سے پہلے نہیں ملتا، اس لیے انھوں نے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اسے تلاش کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ سورۂ توبہ کی آیت ۸۳ انھیں مل گئی جس میں یہی مضمون ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ آیت اِس کی مصداق نہیں ہے، کیونکہ وہ غزوۂ تبوک کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی، جس کا زمانۂ نزول سورۂ فتح کے زمانۂ نُزول سے تین سال بعد کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس آیت کا اشارہ خود اِسی سورہ کی آیات ۱۸-۱۹ کی طرف ہے، اور اللہ کے پہلے فرما چکنے کا مطلب اِس آیت سے پہلے فرمانا نہیں ہے، بلکہ مُخَلَّفِین کے ساتھ اِس گفتگو سے پہلے فرمانا ہے۔ مُخَلَّفِین کے ساتھ یہ گفتگو، جس کے متعلق یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگی ہدایات دی جا رہی ہیں، خیبر کی مہم پر جانے کے وقت ہونے والی تھی، اور یہ پُوری سورت، جس میں آیات ۱۸-۱۹ بھی شامل ہیں، اُس سے تین مہینے پہلے حُدَیبیہ سے پلٹتے وقت راستے میں نازل ہو چکی تھی۔ سلسلۂ کلام کو غور سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو یہ ہدایت دے رہا ہے کہ جب تمھارے مدینہ واپس ہونے کے بعد یہ پیچھے رہ جانے والے لوگ آ کر تم سے یہ عُذرات بیان کریں تو ان کو یہ جواب دینا، اور خیبر کی مہم پر جاتے وقت جب وہ تمھارے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کریں تو اُن سے یہ کہنا۔

۳۰ - اصل الفاظ ہیں: اَوۡ يُسۡلِمُوۡنَ۔ اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اِسلام قبول

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ ع

النصف ع

اور اگر تم پھر اُسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔ اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں۔[۳۱] جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اور جو منہ پھیرے گا، اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔'' ع

کرلیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرلیں۔

۳۱- یعنی جس آدمی کے لیے شریکِ جہاد ہونے میں واقعی کوئی صحیح عذر مانع ہو اُس پر تو کوئی گرفت نہیں، مگر ہٹے کٹے لوگ اگر بہانے بنا کر بیٹھ رہیں تو ان کو اللہ اور اس کے دین کے معاملے میں مخلص نہیں مانا جا سکتا اور انھیں یہ موقع نہیں دیا جا سکتا کہ مسلم معاشرے میں شامل ہونے کے فوائد تو سمیٹتے رہیں، مگر جب اسلام کے لیے قربانیاں دینے کا وقت آئے تو اپنی جان و مال کی خیر منائیں۔

اِس مقام پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ شریعت میں جن لوگوں کو شریکِ جہاد ہونے سے معاف رکھا گیا ہے، وہ دو قسم کے لوگ ہیں: ایک، وہ جو جسمانی طور پر جنگ کے قابل نہ ہوں، مثلاً کم سن لڑکے، عورتیں، مجنون، اندھے، ایسے مریض جو جنگی خدمات انجام نہ دے سکتے ہوں، اور ایسے معذور جو ہاتھ یا پاؤں بیکار ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہ لے سکیں۔ دوسرے، وہ لوگ جن کے لیے کچھ اور معقول اسباب سے شاملِ جہاد ہونا مشکل ہو، مثلاً غلام، یا وہ لوگ جو لڑنے کے لیے تو تیار ہوں، مگر ان کے لیے آلاتِ جنگ اور دوسرے ضروری وسائل فراہم نہ ہو سکیں، یا ایسے قرض دار جنھیں جلدی سے جلدی اپنا قرض ادا کرنا ہو اور قرض خواہ انھیں مہلت نہ دے رہا ہو، یا ایسے لوگ جن کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک زندہ ہو اور وہ اس کا محتاج ہو کہ اولاد اس کی خبر گیری کرے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ والدین اگر مسلمان ہوں تو اولاد کو ان کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہ جانا چاہیے، لیکن اگر وہ کافر ہوں تو ان کے روکنے سے کسی شخص کا رُک جانا جائز نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے[۳۲] تھے۔

۳۲- یہاں پھر اُسی بیعت کا ذکر ہے جو حُدَیبیہ کے مقام پر صحابۂ کرامؓ سے لی گئی تھی۔ اس بیعت کو بیعتِ رِضوان کہا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ وہ اُن لوگوں سے راضی ہو گیا جنھوں نے اس خطرناک موقع پر جان کی بازی لگا دینے میں ذرہ برابر تأمّل نہ کیا اور رسولؐ کے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کر کے اپنے صادق الایمان ہونے کا صریح ثبوت پیش کر دیا۔ وقت وہ تھا کہ مسلمان صرف ایک ایک تلوار لیے ہوئے آئے تھے۔ صرف چودہ سو کی تعداد میں تھے۔ جنگی لباس میں بھی نہ تھے، بلکہ احرام کی چادریں باندھے ہوئے تھے۔ اپنے جنگی مُستقر (مدینہ) سے ڈھائی سو میل دُور تھے، اور دشمن کا گڑھ، جہاں سے وہ ہر قسم کی مدد لا سکتا تھا، صرف ۱۳ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے لیے اِن لوگوں کے اندر خلوص کی کچھ بھی کمی ہوتی تو وہ اس انتہائی خطرناک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ جاتے اور اسلام کی بازی ہمیشہ کے لیے ہر جاتی۔ ان کے اپنے اخلاص کے سوا کوئی خارجی دباؤ ایسا نہ تھا جس کی بنا پر وہ اس بیعت کے لیے مجبور ہوتے۔ ان کا اُس وقت خدا کے دین کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ وہ اپنے ایمان میں صادق و مخلص اور خدا اور رسولؐ کی وفاداری میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سندِ خوشنودی عطا فرمائی۔ اور اللہ کی سندِ خوشنودی عطا ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص ان سے ناراض ہو، یا ان پر زبانِ طعن دراز کرے تو اس کا معارضہ اُن سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے۔ اس پر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس وقت اللہ نے اِن حضرات کو یہ خوشنودی کی سند عطا کی تھی، اُس وقت تو یہ مخلص تھے مگر بعد میں یہ خدا اور رسولؐ کے بے وفا ہو گئے، وہ شاید اللہ سے یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ اُسے یہ آیت نازل کرتے وقت اُن کے مستقبل کی خبر نہ تھی، اس لیے محض اُس وقت کی حالت دیکھ کر اُس نے یہ پروانہ انھیں عطا کر دیا، اور غالباً اِسی بے خبری کی بنا پر اسے اپنی کتابِ پاک میں بھی درج فرما دیا، تاکہ بعد میں بھی، جب یہ لوگ بے وفا ہو جائیں، ان کے بارے میں دنیا یہ آیت پڑھتی رہے اور اُس خدا کے علمِ غیب کی داد دیتی رہے جس نے، معاذ اللہ، ان بیوفاؤں کو یہ پروانۂ خوشنودی عطا کیا تھا۔

جس درخت کے نیچے یہ بیعت ہوئی تھی اس کے متعلق حضرت نافعؒ مولیٰ ابن عمرؓ کی یہ روایت عام طور پر مشہور ہو گئی ہے کہ لوگ اُس کے پاس جا جا کر نمازیں پڑھنے لگے تھے، حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور اس درخت کو کٹوا دیا۔ (طَبَقاتِ ابنِ سعد، ج ۲، ص ۱۰۰) لیکن متعدد روایات اس کے خلاف بھی ہیں۔ ایک روایت خود حضرت نافعؒ ہی سے طَبَقاتِ ابنِ سعد میں یہ منقول ہوئی ہے کہ بیعتِ رضوان کے کئی سال بعد صحابۂ کرامؓ نے اس درخت کو تلاش کیا، مگر اسے پہچان نہ سکے اور اس امر میں اختلاف ہو گیا کہ وہ درخت کون سا تھا۔ (ص ۱۰۵) دوسری روایت بخاری و مسلم اور طَبَقاتِ ابنِ سعد میں حضرت سعید بن المُسَیَّبؒ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضا کے لیے گئے تو ہم اس درخت کو بھول چکے تھے، تلاش کرنے پر بھی ہم اسے نہ پا سکے۔ تیسری

فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ عَلَیۡہِمۡ وَ اَثَابَہُمۡ
فَتۡحًا قَرِیۡبًا ۙ﴿۱۸﴾ وَّ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً یَّاۡخُذُوۡنَہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا
حَکِیۡمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً تَاۡخُذُوۡنَہَا فَعَجَّلَ
لَکُمۡ ہٰذِہٖ وَ کَفَّ اَیۡدِیَ النَّاسِ عَنۡکُمۡ ۚ وَ لِتَکُوۡنَ اٰیَۃً

ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی[۳۳]، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی، اور بہت سا مالِ غنیمت انھیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے[۳۴]۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنھیں تم حاصل کرو گے[۳۵]۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمھیں عطا کر دی[۳۶] اور لوگوں کے ہاتھ تمھارے خلاف اُٹھنے سے روک دیے[۳۷]، تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی

روایت ابنِ جَریر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں جب حُدَیبِیَہ کے مقام سے گزرے تو انھوں نے دریافت کیا کہ وہ درخت کہاں ہے جس کے نیچے بیعت ہوئی تھی۔ کسی نے کہا فلاں درخت ہے، اور کسی نے کہا فُلاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: چھوڑو، اس تکلّف کی کیا حاجت ہے۔

۳۳- یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصدِ عظیم کے لیے ٹھنڈے دل سے پُورے سُکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرے کے منہ میں جھونک دیتا ہے اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہر حال کرنے کا ہے، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔

۳۴- یہ اشارہ ہے خیبر کی فتح اور اس کے اموالِ غنیمت کی طرف۔ اور یہ آیت اس امر کی تصریح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص فرما دیا تھا جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے، اُن کے سوا کسی کو اس فتح اور ان غنائم میں شریک ہونے کا حق نہ تھا۔ اسی بنا پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفر ۷ھ میں خیبر پر چڑھائی کرنے کے لیے نکلے تو آپؐ نے صرف انھی کو اپنے ساتھ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں حضورؐ نے حَبَش سے واپس آنے والے مہاجرین اور بعض دَوسی اور اَشعَری صحابیوں کو بھی اموالِ خیبر میں سے کچھ حصّہ عطا فرمایا، مگر وہ یا تو خُمس میں سے تھا، یا اصحابِ رضوان کی رضامندی سے دیا گیا۔ کسی کو حق کے طور پر اس مال میں حصّہ دار نہیں بنایا گیا۔

۳۵- اس سے مراد وہ دوسری فتوحات ہیں جو خیبر کے بعد مسلمانوں کو مسلسل حاصل ہوتی چلی گئیں۔

۳۶- اس سے مراد ہے صلحِ حُدَیبِیَہ جس کو سورت کے آغاز میں فتحِ مبین قرار دیا گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا
عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَ لَوْ
قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ
لَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ

بن جائے[۳۸] اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمھیں ہدایت بخشے[۳۹]۔ اِس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے[۴۰]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ کافر لوگ اگر اِس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے[۴۱]۔ یہ اللہ کی سنّت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے[۴۲]، اور تم اللہ کی سنّت میں کوئی

۳۷- یعنی کفارِ قریش کو یہ ہمّت اس نے نہ دی کہ وہ حُدَیبِیَہ کے مقام پر تم سے لڑ جاتے، حالانکہ تمام ظاہری حالات کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے، اور جنگی نقطۂ نظر سے تمھارا پلّا ان کے مقابلے میں بہت کمزور نظر آتا تھا۔ مزید برآں اس سے مراد یہ بھی ہے کہ کسی دشمن طاقت کو اس زمانے میں مدینے پر بھی حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی، حالانکہ چودہ سو مردانِ جنگی کے نکل جانے کے بعد مدینے کا محاذ بہت کمزور ہو گیا تھا اور یہود و مشرکین اور منافقین اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔

۳۸- نشانی اس بات کی کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں ثابت قدم رہتا ہے اور اللہ کے بھروسے پر حق اور راستی کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اُسے اللہ کس کس طرح اپنی تائید و نصرت سے نوازتا ہے۔

۳۹- یعنی تمھیں مزید بصیرت اور یقین حاصل ہو، اور آیندہ تم اسی طرح اللہ اور رسولؐ کی اطاعت پر قائم رہو اور اللہ کے اعتماد پر راہِ حق میں پیش قدمی کرتے چلے جاؤ، اور یہ تجربات تمھیں یہ سبق سکھا دیں کہ خدا کا دین جس اِقدام کا تقاضا کر رہا ہو، مومن کا کام یہ ہے کہ خدا کے بھروسے پر وہ اِقدام کر ڈالے، اِس حَیص بَیص میں نہ لگ جائے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کی طاقتوں کا زور کتنا ہے۔

۴۰- اغلب یہ ہے کہ یہ اشارہ فتحِ مکّہ کی طرف ہے۔ یہی رائے قَتَادَہؒ کی ہے اور اسی کو ابنِ جَرِیرؒ نے ترجیح دی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو مکّہ تمھارے قابو میں نہیں آیا ہے، مگر اللہ نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے اور حُدَیبِیَہ کی اس فتح کے نتیجے میں وہ بھی تمھارے قبضے میں آجائے گا۔

اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ
مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ
مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ

تبدیلی نہ پاؤ گے۔ وہی ہے جس نے مکّے کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمھیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجدِ حرام سے روکا اور ہَدی کے اُونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔[۴۳] اگر (مکّے میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنھیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انھیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے گئی) تا کہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل

---

۴۱ – یعنی حُدَیبیَہ میں جنگ کو اللہ نے اس لیے نہیں روکا کہ وہاں تمھارے شکست کھا جانے کا امکان تھا، بلکہ اس کی مَصلحت کچھ دوسری تھی، جسے آگے کی آیتوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ مَصلحت مانع نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس مقام پر جنگ ہو جانے دیتا تو یقیناً کفار ہی کو شکست ہوتی اور مکّۂ معظّمہ اسی وقت فتح ہو جاتا۔

۴۲ – اس جگہ اللہ کی سنّت سے مراد یہ ہے کہ جو کفّار اللہ کے رسول سے جنگ کرتے ہیں، اللہ اُن کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور اپنے رسول کی مدد فرماتا ہے۔

۴۳ – یعنی جس خُلوص اور بے نفسی کے ساتھ تم لوگ دینِ حق کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر آمادہ ہو گئے تھے، اور جس طرح بے چُون و چَرا رسولؐ کی اطاعت کر رہے تھے، اللہ اسے بھی دیکھ رہا تھا، اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کفار سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہیں اور اسی وقت تمھارے ہاتھوں سے ان کی سرکوبی کرا دی جاتی۔ لیکن اس کے باوجود ایک مَصلحت تھی جس کی بنا پر اللہ نے تمھارے ہاتھ ان سے اور ان کے ہاتھ تم سے روک دیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَوۡ تَزَیَّلُوۡا لَعَذَّبۡنَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۲۵﴾

کر لے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہلِ مکّہ میں سے) جو کافر تھے، ان کو ہم ضرور سخت سزا[۴۴] دیتے۔

۴۴- یہ تھی وہ مَصلَحت جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حُدَیبیہ میں جنگ نہ ہونے دی۔ اس مَصلَحت کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ مکّۂ معظمہ میں اُس وقت بہت سے مسلمان مرد وزن ایسے موجود تھے جنھوں نے یا تو اپنا ایمان چھپا رکھا تھا، یا جن کا ایمان معلوم تھا، مگر وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکتے تھے اور ظلم وستم کے شکار ہو رہے تھے۔ اس حالت میں اگر جنگ ہوتی اور مسلمان کفار کو رگیدتے ہوئے مکّۂ معظمہ میں داخل ہوتے، تو کفّار کے ساتھ ساتھ یہ مسلمان بھی نادانستگی میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارے جاتے، جس سے مسلمانوں کو اپنی جگہ بھی رنج وافسوس ہوتا اور مشرکینِ عرب کو بھی یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ یہ لوگ تو لڑائی میں خود اپنے دینی بھائیوں کو بھی مارنے سے نہیں چُوکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان بے بس مسلمانوں پر رحم کھا کر، اور صحابۂ کرام کو رنج اور بدنامی سے بچانے کی خاطر اس موقع پر جنگ کو ٹال دیا۔ دوسرا پہلو اس مَصلَحت کا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قریش کو ایک خوں ریز جنگ میں شکست دلوا کر مکّہ فتح کرانا نہ چاہتا تھا، بلکہ اس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ دو سال کے اندر ان کو ہر طرف سے گھیر کر اِس طرح بے بس کر دے کہ وہ کسی مزاحمت کے بغیر مغلوب ہو جائیں، اور پھر پُورا کا پُورا قبیلہ اسلام قبول کر کے اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے، جیسا کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ہوا۔

اس مقام پر یہ فقہی بحث پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہماری اور کافروں کی جنگ ہو رہی ہو اور کافروں کے قبضے میں کچھ مسلمان مرد، عورتیں، بچّے اور بوڑھے ہوں جنھیں وہ ڈھال بنا کر سامنے لے آئیں، یا کافروں کے جس شہر پر ہم چڑھائی کر رہے ہوں وہاں کچھ مسلمان آبادی بھی موجود ہو، یا کافروں کا کوئی جنگی جہاز ہماری زد میں ہو اور اس کے اندر کافروں نے کچھ مسلمانوں کو بھی رکھ چھوڑا ہو، تو کیا ایسی صورت میں ہم ان پر گولا باری کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں مختلف فقہا نے جو فیصلے دیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس حالت میں گولا باری نہیں کرنی چاہیے، اور اس کے لیے وہ اِسی آیت کو دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچانے کے لیے ہی تو حُدَیبیہ میں جنگ کو روک دیا۔ (احکام القرآن لِابنُ العَرَبی) لیکن فی الواقع یہ ایک کمزور دلیل ہے۔ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ ایسی حالت میں حملہ کرنا حرام وناجائز ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں مسلمانوں کو بچانے کے لیے حملے سے اجتناب کیا جا سکتا ہے جب کہ اجتناب سے یہ خطرہ نہ ہو کہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، یا ان پر ہمارے فتح یاب ہونے کے مواقع باقی نہ رہیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یُوسفؒ، امام زُفرؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ان حالات میں گولا باری کرنا بالکل جائز ہے، حتّٰی کہ اگر کفار مسلمانوں کے بچّوں کو ڈھال بنا کر سامنے لا کھڑا کریں تب بھی اُن پر گولی چلانے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اور جو مسلمان اس حالت میں مارے جائیں، اُن کے خون کا کوئی کفّارہ اور کوئی دِیَت مسلمانوں پر واجب نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصّاص۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ

(یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیّت بٹھالی[45] تو

کتاب السّیر للامام محمد، باب قطع الماء عن اہل الحرب)

امام سُفیان ثوریؒ بھی اس حالت میں گولا باری کو جائز رکھتے ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ جو مسلمان اس حالت میں مارے جائیں، ان کی دِیَت تو نہیں، البتہ کفّارہ مسلمانوں پر واجب ہے۔ (احکام القرآن للجصّاص)

امام اَوزاعیؒ اور لیث بن سعد کہتے ہیں کہ اگر کفار مسلمانوں کو ڈھال بنا کر سامنے لے آئیں تو ان پر گولی نہیں چلانی چاہیے۔ اسی طرح اگر ہمیں معلوم ہو کہ ان کے جنگی جہاز میں خود ہمارے قیدی بھی موجود ہیں، تو اس حالت میں اس کو غرق نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ہم ان کے کسی شہر پر حملہ کریں اور ہمیں معلوم ہو کہ اس شہر میں مسلمان بھی موجود ہیں، تو اس پر گولا باری کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ امر یقینی نہیں ہے کہ ہمارا گولا مسلمانوں ہی پر جا کر گرے گا، اور اگر کوئی مسلمان اس گولا باری کا شکار ہو جائے تو یہ ہماری طرف سے بالقصد مسلمان کا قتل نہ ہوگا، بلکہ نادانستگی میں ایک حادثہ ہوگا۔ (احکام القرآن للجصّاص)

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر اس حالت میں گولا باری کرنا ناگزیر نہ ہو تو مسلمانوں کو ہلاکت سے بچانے کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ اگرچہ اس صورت میں گولا باری کرنا حرام نہیں ہے، مگر مکروہ ضرور ہے۔ لیکن اگر فی الواقع اس کی ضرورت ہو، اور اندیشہ ہو کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفار کے لیے جنگی حیثیت سے مفید اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوگا تو پھر گولا باری کرنا جائز ہے۔ مگر اس حالت میں بھی مسلمانوں کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ مزید برآں امام شافعیؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر معرکۂ قتال میں کفار کسی مسلمان کو ڈھال بنا کر آگے کریں اور کوئی مسلمان اسے قتل کر دے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ قاتل کو معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہے، اور دوسری صورت یہ کہ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ پہلی صورت میں دِیَت اور کفارہ دونوں واجب ہیں، اور دوسری صورت میں صرف کفّارہ واجب ہے۔ (مُغنی المُحتاج)

۴۵- جاہلانہ حمیّت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص محض اپنی ناک کی خاطر یا اپنی بات کی پچ میں جان بُوجھ کر ایک ناروا کام کرے۔ کفارِ مکّہ خود جانتے اور مانتے تھے کہ ہر شخص کو حج اور عمرے کے لیے بیت اللہ کی زیارت کا حق حاصل ہے، اور کسی کو اس مذہبی فریضے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔ یہ عرب کا قدیم ترین مُسلَّم آئین تھا۔ لیکن اپنے آپ کو سراسر ناحق پر اور مسلمانوں کو بالکل برسرِ حق جاننے کے باوجود انھوں نے محض اپنی ناک کی خاطر مسلمانوں کو عمرے سے روکا۔ خود مشرکین میں سے جو راستی پسند تھے، وہ بھی یہ کہہ رہے تھے کہ جو لوگ اِحرام باندھ کر ہَدْی کے اُونٹ ساتھ لیے ہوئے عمرہ کرنے آئے ہیں، ان کو روکنا ایک بے جا حرکت ہے۔ مگر قریش کے سردار صرف اِس خیال سے مُزاحمت پر اَڑے رہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بڑی جمعیّت کے ساتھ مکّے میں داخل ہوگئے تو تمام عرب میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہی ان کی حمیّتِ جاہلیہ تھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ
كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ
عَلِيْمًا ۝۲۶ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ ع ۳
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ

اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی[۴۶] اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اُس کے زیادہ حق دار اور اُس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ع

فی الواقع اللہ نے اپنے رسولؐ کو سچّا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک حق کے مطابق تھا۔[۴۷] اِن شاءَ اللہ[۴۸] تم ضرور مسجدِ حرام میں پُورے امن کے ساتھ داخل ہو گے،[۴۹] اپنے سر منڈواؤ گے

۴۶ – یہاں سکینت سے مراد ہے صبر اور وقار، جس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے کفّارِ قریش کی اس جاہلانہ حمیّت کا مقابلہ کیا۔ وہ ان کی اس ہٹ دھرمی اور صریح زیادتی پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر نہ ہوئے، اور اِن کے جواب میں کوئی بات انھوں نے ایسی نہ کی جو حق سے متجاوز اور راستی کے خلاف ہو، یا جس سے معاملہ بخیر وخوبی سلجھنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جائے۔

۴۷ – یہ اُس سوال کا جواب ہے جو بار بار مسلمانوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب تو یہ دیکھا تھا کہ آپؐ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے، پھر یہ کیا ہوا کہ ہم عمرہ کیے بغیر واپس جا رہے ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ خواب میں اِسی سال عمرہ ہونے کی تصریح تو نہ تھی، مگر اس کے باوجود ابھی تک کچھ نہ کچھ خلش دلوں میں باقی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود یہ وضاحت فرمائی کہ وہ خواب ہم نے دکھایا تھا، اور وہ بالکل سچّا تھا، اور وہ یقیناً پُورا ہو کر رہے گا۔

۴۸ – یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے وعدے کے ساتھ "اِن شاءَ اللہ" کے الفاظ جو استعمال فرمائے ہیں، اس پر ایک معترض یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب یہ وعدہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرما رہا ہے تو اس کو اللہ کے چاہنے سے مشروط کرنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ الفاظ اس معنیٰ میں استعمال نہیں ہوئے ہیں کہ اگر اللہ نہ چاہے گا تو اپنا یہ وعدہ پُورا نہ کرے گا، بلکہ دراصل ان کا تعلّق اُس پَس منظر سے ہے جس میں یہ وعدہ فرمایا گیا ہے۔ کفارِ مکّہ نے جس زعم کی بنا پر مسلمانوں کو عمرے سے روکنے کا یہ سارا کھیل کھیلا تھا، وہ یہ تھا کہ جس کو ہم عمرہ کرنے دینا چاہیں گے وہ عمرہ کر سکے گا، اور جب ہم اسے کرنے دیں گے اسی وقت وہ کر سکے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ان کی مشیّت پر نہیں بلکہ ہماری مشیّت پر موقوف ہے۔ اِس سال عمرے کا

وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ
ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝۲۷ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ ؕ

اور بال ترشواؤ گے،[50] اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس لیے وہ خواب پُورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُس کو پُوری جنسِ دین پر غالب کر دے، اور اِس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔[51]

نہ ہو سکنا اس لیے نہیں ہوا کہ کفارِ مکّہ نے یہ چاہا تھا کہ وہ نہ ہو، بلکہ یہ اس لیے ہوا کہ ہم نے اس کو نہ ہونے دینا چاہا تھا۔ اور آیندہ یہ عمرہ اگر ہم چاہیں گے تو ہو گا، خواہ کفار چاہیں یا نہ چاہیں۔ اس کے ساتھ ان الفاظ میں یہ معنیٰ بھی پوشیدہ ہیں کہ مسلمان بھی جو عمرہ کریں گے تو اپنے زور سے نہیں کریں گے، بلکہ اس بنا پر کریں گے کہ ہماری مشیّت یہ ہوگی کہ وہ عمرہ کریں۔ ورنہ ہماری مشیّت اگر اس کے خلاف ہو تو ان کا یہ بل بُوتا نہیں ہے کہ خود عمرہ کر ڈالیں۔

۴۹ – یہ وعدہ اگلے سال ذی القعدہ ۷ھ میں پُورا ہوا۔ تاریخ میں یہ عمرہ ”عمرۃ القضاء“ کے نام سے مشہور ہے۔

۵۰ – یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عمرے اور حج میں سر منڈوانا لازم نہیں ہے، بلکہ بال ترشوانا بھی جائز ہے۔ البتہ سر منڈوانا افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے بیان فرمایا ہے اور بال ترشوانے کا ذکر بعد میں کیا ہے۔

۵۱ – اس مقام پر یہ بات ارشاد فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ حُدَیبیہ میں جب معاہدۂ صلح لکھا جانے لگا تھا، اس وقت کفارِ مکّہ نے حضورؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ ”رسول اللہ“ کے الفاظ لکھنے پر اعتراض کیا تھا، اور ان کے اصرار پر حضورؐ نے خود معاہدے کی تحریر میں سے یہ الفاظ مٹا دیے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہمارے رسول کا رسول ہونا تو ایک حقیقت ہے، جس میں کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کو اگر کچھ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ اس کے حقیقت ہونے پر صرف ہماری شہادت کافی ہے۔ اُن کے انکار کر دینے سے یہ حقیقت بدل نہیں جائے گی، بلکہ اُن کے علَی الرَّغم اُس ہدایت اور اُس دینِ حق کو پُوری جنسِ دین پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا، جسے لے کر یہ رسول ہماری طرف سے آیا ہے، خواہ یہ منکرین اسے روکنے کے لیے کتنا ہی زور مار کر دیکھ لیں۔

”پُوری جنسِ دین“ سے مراد زندگی کے وہ تمام نظام ہیں جو ”دین“ کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس کی مفصّل تشریح ہم اس سے پہلے

Maktaba Tul Ishaat.com

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ٘ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفّار پر سخت[۵۲] اور آپس میں رحیم ہیں[۵۳]۔ تم جب دیکھو گے اُنھیں رُکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سُجُود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں[۵۴]۔ یہ ہے ان کی صفت

تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُمَر، حاشیہ ۳، اور تفسیر سورۂ شُوریٰ حاشیہ ۲۰ میں کر چکے ہیں۔ یہاں جو بات اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کا مقصد محض اِس دین کی تبلیغ نہ تھا، بلکہ اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام نظاماتِ زندگی پر غالب کر دینا تھا۔ دوسرے الفاظ میں آپؐ یہ دین اس لیے نہیں لائے تھے کہ زندگی کے سارے شعبوں پر غلبہ تو ہو کسی دینِ باطل کا، اور اُس کی قہرمانی کے تحت یہ دین اُن حدود کے اندر سکڑ کر رہے جن میں دینِ غالب اِسے جینے کی اجازت دے دے، بلکہ اسے آپؐ اس لیے لائے تھے کہ زندگی کا غالب دین یہ ہو، اور دوسرا کوئی دین اگر جیے بھی تو اُن حُدود کے اندر جیے جن میں یہ اسے جینے کی اجازت دے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُمَر، حاشیہ ۴۸)

۵۲ – اصل الفاظ ہیں: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ عَرَبی زبان میں کہتے ہیں: فُلَانٌ شَدِيْدٌ عَلَيْهِ ”فلاں شخص اُس پر شدید ہے“، یعنی اُس کو رام کرنا اور اپنے مطلب پر لانا اُس کے لیے مشکل ہے۔ کفّار پر اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ دُرُشتی اور تُند خوئی سے پیش آتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت، اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفّار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ انھیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ نرم چارا نہیں ہیں کہ کافر انھیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں۔ انھیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انھیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا۔ کافروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ انھیں اُس مقصدِ عظیم سے ہٹا دیں جس کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھے ہیں۔

۵۳ – یعنی اُن کی سختی جو کچھ بھی ہے، دشمنانِ دین کے لیے ہے، اہلِ ایمان کے لیے نہیں ہے۔ اہلِ ایمان کے مقابلے میں وہ نرم ہیں، رحیم و شفیق ہیں، ہمدرد و غمگسار ہیں۔ اُصول اور مقصد کے اتحاد نے ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے محبّت اور ہم رنگی و سازگاری پیدا کر دی ہے۔

التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ

تورات میں[۵۵]۔ اور انجیل میں اُن کی مثال یُوں دی گئی ہے[۵۶] کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی،

۵۴- اس سے مراد پیشانی کا وہ گٹّا نہیں ہے جو سجدے کرنے کی وجہ سے بعض نمازیوں کے چہرے پر پڑ جاتا ہے۔ بلکہ اِس سے مراد خدا ترسی، کریم النفسی، شرافت اور حُسنِ اَخلاق کے وہ آثار ہیں جو خدا کے آگے جُھکنے کی وجہ سے فطرتاً آدمی کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انسان کا چہرہ ایک کُھلی کتاب ہوتا ہے، جس کے صفحات پر آدمی کے نفس کی کیفیّات بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک متکبر انسان کا چہرہ ایک متواضع اور منکسر المزاج آدمی کے چہرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک بد اَخلاق آدمی کا چہرہ ایک نیک نفس اور خوش خُلق آدمی کے چہرے سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ ایک لفنگے اور بدکار آدمی کی صورت اور ایک شریف اور پاکباز آدمی کی صورت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ساتھی تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی ایک آدمی بیک نظر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہ خیر الخلائق ہیں، کیونکہ خدا پرستی کا نُور ان کے چہروں پر چمک رہا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ جب صحابۂ کرامؓ کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیحؑ کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے، یہ تو اُسی شان کے لوگ نظر آتے ہیں۔

۵۵- غالباً یہ اشارہ کتابِ اِستثنا، باب ۳۳، آیات ۲-۳ کی طرف ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمدِ مبارک کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ کے صحابہؓ کے لیے "قُدسیوں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اگر صحابۂ کرامؓ کی کوئی صفت تورات میں بیان ہوئی تھی تو وہ اب موجودہ مُحرّف تورات میں نہیں ملتی۔

۵۶- یہ تمثیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک وعظ میں بیان ہوئی ہے جسے بائبل کے عہد نامۂ جدید میں اِس طرح نقل کیا گیا ہے:

> "اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اِس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتّی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیّار دانے، پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے، کیونکہ کاٹنے کا وقت آ پہنچا...... وہ رائی کے دانے کے مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر جب بو دیا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے، اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایے میں بسیرا کر سکتے ہیں۔" (مرقس، باب ۴، آیات ۲۶ تا ۳۲۔ اس وعظ کا آخری حصہ انجیلِ متّی، باب ۱۳، آیات ۳۱-۳۲ میں بھی ہے)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع

ع ۴

پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے، تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اِس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔[۵۷] ع

۵۷ – ایک گروہ اس آیت میں مِنْھُمْ کی مِنْ کو تبعیض کے معنٰی میں لیتا ہے اور آیت کا ترجمہ یہ کرتا ہے کہ ''ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔'' اس طرح یہ لوگ صحابہؓ پر طعن کا راستہ نکالتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے صحابہؓ میں سے بہت سے لوگ مومن و صالح نہ تھے۔ لیکن یہ تفسیر اِسی سورت کی آیات ۴-۵-۱۸ اور ۲۶ کے خلاف پڑتی ہے، اور خود اِس آیت کے ابتدائی فقروں سے بھی مُطابقت نہیں رکھتی۔ آیات ۴-۵ میں اللہ تعالیٰ نے اُن تمام صحابہؓ کے دلوں میں سکینت نازل کیے جانے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے جو حُدَیبیہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے، اور بلا اِستثنا ان سب کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔ آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے حق میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے جنھوں نے درخت کے نیچے حضورؐ سے بیعت کی تھی، اور اس میں بھی کوئی اِستثنا نہیں ہے۔ آیت ۲۶ میں بھی حضورؐ کے تمام ساتھیوں کے لیے مومنین کا لفظ استعمال کیا ہے، ان کے اُوپر اپنی سکینت نازل کرنے کی خبر دی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ لوگ کلمۂ تقویٰ کی پابندی کے زیادہ حق دار اور اِس کے اہل ہیں۔ یہاں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان میں سے جو مومن ہیں صرف انھی کے حق میں یہ خبر دی جا رہی ہے۔ پھر خود اس آیت کے بھی ابتدائی فقروں میں جو تعریف بیان کی گئی ہے، وہ ان سب لوگوں کے لیے ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ بھی آپؐ کے ساتھ ہیں، وہ ایسے اور ایسے ہیں۔ اس کے بعد یکایک آخری فقرے پر پہنچ کر یہ ارشاد فرمانے کا آخر کیا موقع ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ مومن و صالح تھے اور کچھ نہ تھے۔ اس لیے یہاں مِنْ کو تبعیض کے معنٰی میں لینا نظمِ کلام کے خلاف ہے۔ درحقیقت یہاں مِنْ بیان کے لیے ہے جس طرح آیت فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (بتوں کی گندگی سے بچو) میں مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ لازماً بیان ہی کے لیے ہے، ورنہ آیت کے معنٰی یہ ہو جائیں گے کہ ''بتوں میں سے جو ناپاک ہیں ان سے پرہیز کرو''، اور اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ بت پاک بھی قرار پائیں گے، جن کی پرستش سے پرہیز لازم نہ ہوگا۔

تفہیم القرآن

الحجرات

(۴۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

الحُجُرات

نام آیت ۴ کے فقرے اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظ "الحُجُرات" آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول یہ بات رِوایات سے بھی معلوم ہوتی ہے اور سورت کے مضامین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ سورت مختلف مواقع پر نازل شدہ احکام وہدایات کا مجموعہ ہے، جنھیں مضمون کی مناسبت سے یک جا کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں رِوایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر احکام مدینۂ طیّبہ کے آخری دَور میں نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً آیت ۴ کے متعلق مفسّرین کا بیان ہے کہ یہ بنی تمیم کے بارے میں نازل ہوئی تھی جن کے وفد نے آ کر اَزواجِ مُطہّراتؓ کے حجروں کے باہر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا شروع کر دیا تھا، اور تمام کُتُبِ سیرت میں اس وفد کی آمد کا زمانہ ۹ ہجری بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ۶ کے متعلق حدیث کی بکثرت رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وَلید بن عُقبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المُصطَلِق سے زکوٰۃ وُصول کر کے لانے کے لیے بھیجا تھا، اور یہ بات معلوم ہے کہ وَلید بن عُقبہ فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے ہیں۔

موضوع اور مَباحِث اس سورہ کا موضوع مسلمانوں کو اُن آداب کی تعلیم دینا ہے جو اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہیں۔

ابتدائی پانچ آیتوں میں اُن کو وہ ادب سکھایا گیا ہے جو انھیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے معاملے میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

پھر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ہر خبر پر یقین کر لینا اور اس پر کوئی کارروائی کر گزرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی اطلاع ملے تو غور سے دیکھنا چاہیے کہ خبر ملنے کا ذریعہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ قابلِ اعتماد نہ ہو تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے تحقیق کر لینا چاہیے کہ خبر صحیح ہے یا نہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

پھر مسلمانوں کو اُن بُرائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور

جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا مذاق اُڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، ایک دوسرے کے بُرے بُرے نام رکھنا، بدگمانیاں کرنا، دوسروں کے حالات کی کھوج کُرید کرنا، لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی بُرائیاں کرنا، یہ وہ افعال ہیں جو بجائے خود بھی گناہ ہیں اور معاشرے میں بگاڑ بھی پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نام بنام ان کا ذکر فرما کر انھیں حرام قرار دے دیا ہے۔

اس کے بعد اُن قومی اور نسلی امتیازات پر ضرب لگائی گئی ہے جو دنیا میں عالمگیر فساد کے موجب ہوتے ہیں۔ قوموں اور قبیلوں اور خاندانوں کا اپنے شَرَف پر فخر و غرور، اور دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنا، اور اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے دوسروں کو گرانا، اُن اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت دنیا ظلم سے بھر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر سی آیت میں یہ فرما کر اِس بُرائی کی جڑ کاٹ دی ہے کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے ہیں، اور قوموں اور قبیلوں میں اُن کا تقسیم ہونا تعارف کے لیے ہے نہ کہ تفاخُر کے لیے، اور ایک انسان پر دوسرے انسان کی فوقیت کے لیے اَخلاقی فضیلت کے سوا اور کوئی جائز بنیاد نہیں ہے۔

آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اصل چیز ایمان کا زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ سچّے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ کو ماننا، عملاً فرماں بردار بن کر رہنا، اور خلوص کے ساتھ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کھپا دینا ہے۔ حقیقی مومن وہی ہیں جو یہ رَوِش اختیار کریں۔ رہے وہ لوگ جو دل کی تصدیق کے بغیر محض زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور پھر ایسا رَوِیّہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا اسلام قبول کر کے انھوں نے کوئی احسان کیا ہے، تو دنیا میں ان کا شمار مسلمانوں میں ہو سکتا ہے، معاشرے میں ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اللہ کے ہاں وہ مومن قرار نہیں پا سکتے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۸ ۲
آیاتھا رکوعاتھا

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا
اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ
بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو[1] اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے[2]۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے ساتھ اُونچی آواز سے بات کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دُوسرے سے کرتے ہو[3] کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو[4]۔

۱ – یہ ایمان کا اوّلین اور بنیادی تقاضا ہے۔ جو شخص اللہ کو اپنا رب اور اللہ کے رسولؐ کو اپنا ہادی و رہبر مانتا ہو، وہ اگر اپنے اِس عقیدے میں سچّا ہے تو اس کا یہ رَوِیّہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اپنی رائے اور خیال کو اللہ اور رسولؐ کے فیصلے پر مقدّم رکھے، یا معاملات میں آزادانہ رائے قائم کرے اور اُن کے فیصلے بطورِ خود کر ڈالے، بغیر اس کے کہ اسے یہ معلوم کرنے کی فکر ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اُن معاملات میں کوئی ہدایت دی ہے یا نہیں، اور دی ہے تو وہ کیا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے کہ اَے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ''پیش قدمی نہ کرو''، یعنی ان سے آگے بڑھ کر نہ چلو، پیچھے چلو۔ مقدّم نہ بنو، تابع بن کر رہو۔ یہ ارشاد اپنے حکم میں سورۂ اَحزاب کی آیت ۳۶ سے ایک قدم آگے ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا کہ جس معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو، اس کے بارے میں کسی مومن کو خود کوئی الگ فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنے معاملات میں پیش قدمی کر کے بطورِ خود فیصلے نہیں کر لینے چاہییں، بلکہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سُنّت میں ان کے متعلق کیا ہدایات ملتی ہیں۔

یہ حکم مسلمانوں کے محض انفرادی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے جملہ اجتماعی معاملات پر بھی اس کا اطلاق

ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ اسلامی آئین کی بنیادی دفعہ ہے جس کی پابندی سے نہ مسلمانوں کی حکومت آزاد ہوسکتی ہے، نہ ان کی عدالت اور نہ پارلیمنٹ۔ مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ ماجہ میں یہ روایت صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت معاذؓ بن جَبَل کو یمن کا حاکم عدالت بنا کر بھیج رہے تھے تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ "تم کس چیز کے مطابق فیصلے کرو گے؟" انھوں نے عرض کیا: "کتاب اللہ کے مطابق۔" آپؐ نے پوچھا: "اگر کتاب اللہ میں کسی معاملے کا حکم نہ ملے تو کس چیز کی طرف رُجوع کرو گے؟" انھوں نے کہا: "سُنّتِ رسولؐ اللہ کی طرف۔" آپؐ نے فرمایا: "اگر اس میں بھی کچھ نہ ملے؟" انھوں نے عرض کیا: "پھر میں خود اجتہاد کروں گا۔" اس پر حضورؐ نے اُن کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "شکر ہے اُس خدا کا جس نے اپنے رسول کے نمایندے کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔" یہ اپنے اجتہاد پر کتاب اللہ وسنّتِ رسولؐ کو مقدم رکھنا اور ہدایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اُن کی طرف رجوع کرنا ہی وہ چیز ہے جو ایک مسلمان جج اور ایک غیر مسلم جج کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ اسی طرح قانون سازی کے معاملے میں یہ بات قطعی طور پر مُتّفَق عَلَیہ ہے کہ اوّلین ماخذِ قانون خدا کی کتاب ہے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ پُوری اُمّت کا اِجماع تک ان دونوں کے خلاف یا ان سے آزاد نہیں ہوسکتا، کجا کہ افرادِ اُمّت کا قیاس واجتہاد۔

۲۔ یعنی اگر کبھی تم نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے بے نیاز ہو کر خود مختاری کی رَوِش اختیار کی یا اپنی رائے اور خیال کو ان کے حکم پر مقدّم رکھا، تو جان رکھو کہ تمھارا سابقہ اس خدا سے ہے جو تمھاری سب باتیں سن رہا ہے اور تمھاری نیتوں تک سے واقف ہے۔

۳۔ یہ وہ ادب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو سکھایا گیا تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ حضورؐ کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہلِ ایمان آپؐ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں۔ کسی شخص کی آواز آپؐ کی آواز سے بلند تر نہ ہو۔ آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے لوگ یہ بھول نہ جائیں کہ وہ کسی عام آدمی یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ سے مخاطب ہیں۔ اس لیے عام آدمیوں کے ساتھ گفتگو اور آپؐ کے ساتھ گفتگو میں نمایاں فرق ہونا چاہیے، اور کسی کو آپؐ سے اُونچی آواز میں کلام نہ کرنا چاہیے۔

یہ ادب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لیے سکھایا گیا تھا اور اس کے مُخاطَب وہ لوگ تھے جو حضورؐ کے زمانے میں موجود تھے، مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے جب آپؐ کا ذکر ہو رہا ہو، یا آپؐ کا کوئی حکم سنایا جائے، یا آپؐ کی احادیث بیان کی جائیں۔ اس کے علاوہ اس آیت سے یہ ایما بھی نکلتا ہے کہ لوگوں کو اپنے سے بزرگ تر اشخاص کے ساتھ گفتگو میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کا اپنے بزرگوں کے سامنے اُس طرح بولنا جس طرح وہ اپنے دوستوں یا عام آدمیوں کے سامنے بولتا ہے، دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں ان کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے اور وہ ان میں اور عام آدمیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔

۴۔ اِس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ذاتِ رسولؐ کی عظمت کا کیا مقام ہے۔ رسولِ پاکؐ کے سوا کوئی شخص، خواہ بجائے خود کتنا ہی قابلِ احترام ہو، بہر حال یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کے ساتھ بے ادبی خدا کے ہاں اُس سزا کی

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾ إِنَّ
الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَلَوْ
أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ

جو لوگ رسولِ خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں، وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے،[۵] اُن کے لیے مغفرت ہے اور اجرِ عظیم۔

اَے نبیؐ! جو لوگ تمھیں حُجروں کے باہر سے پُکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمھارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انھی کے لیے بہتر تھا،[۶] اللہ درگزر کرنے والا اور

مستحق ہو جو حقیقت میں کفر کی سزا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک بدتمیزی ہے، خلافِ تہذیب حرکت ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں ذرا سی کمی بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کا احترام دراصل اُس خدا کا احترام ہے جس نے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، اور آپؐ کے احترام میں کمی کے معنیٰ خدا کے احترام میں کمی کے ہیں۔

۵ – یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آزمایشوں میں پُورے اُترے ہیں اور ان آزمایشوں سے گزر کر جنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے دلوں میں فی الواقع تقویٰ موجود ہے، وہی لوگ اللہ کے رسولؐ کا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس ارشاد سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جو دل رسولؐ کے احترام سے خالی ہے وہ درحقیقت تقویٰ سے خالی ہے، اور رسولؐ کے مقابلے میں کسی کی آواز کا بلند ہونا محض ایک ظاہری بدتہذیبی نہیں ہے، بلکہ باطن میں تقویٰ نہ ہونے کی علامت ہے۔

۶ – حضورؐ کے عہدِ مبارک میں جن لوگوں نے آپؐ کی صحبت میں رہ کر اسلامی آداب وتہذیب کی تربیت پائی تھی، وہ تو آپؐ کے اوقات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ ان کو پُورا احساس تھا کہ آپؐ اللہ کے کام میں کس قدر مصروف زندگی بسر فرماتے ہیں، اور ان تھکا دینے والی مصروفیتوں کے دوران میں لازماً کچھ وقت آپؐ کے آرام کے لیے اور کچھ وقت آپؐ کی اہم مشغولیتوں کے لیے، اور کچھ وقت اپنی خانگی زندگی کے معاملات کی طرف توجہ کرنے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ آپؐ سے ملاقات کے لیے اُسی وقت حاضر ہوتے تھے جب آپؐ باہر تشریف فرما ہوں، اور اگر کبھی

رَّحِيْمٌ ۝٥ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا
اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝٦

رحیم ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔[۸]

وہ آپؐ کو مجلس میں موجود نہ پاتے تو بیٹھ کر آپؐ کے برآمد ہونے کا انتظار کرتے تھے اور کسی شدید ضرورت کے بغیر آپؐ کو باہر تشریف لانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ لیکن عرب کے اُس ماحول میں، جہاں عام طور پر لوگوں کو کسی شائستگی کی تربیت نہ ملی تھی، بارہا ایسے اَن گھڑ لوگ بھی آپؐ سے ملاقات کے لیے آجاتے تھے جن کا تصوّر یہ تھا کہ دعوت الی اللہ اور اصلاحِ خلق کا کام کرنے والے کو کسی وقت بھی آرام لینے کا حق نہیں ہے، اور انھیں حق ہے کہ رات دن میں جب چاہیں اس کے پاس آدھمکیں، اور اس کا فرض ہے کہ جب بھی وہ آجائیں وہ اُن سے ملنے کے لیے مستعد رہے۔ اس قُماش کے لوگوں میں عُموماً اور اطرافِ عرب سے آنے والوں میں خُصوصاً بعض ایسے ناشایستہ لوگ بھی ہوتے تھے جو آپؐ سے ملاقات کے لیے آتے تو کسی خادم سے اندر اطلاع کرانے کی زحمت بھی نہ اُٹھاتے تھے، بلکہ ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کا چکّر کاٹ کر باہر ہی سے آپؐ کو پُکارتے پھرتے تھے۔ اس طرح کے متعدّد واقعات احادیث میں صحابۂ کرامؓ نے روایت کیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ان حرکات سے سخت تکلیف ہوتی تھی، مگر اپنے طبعی حِلم کی وجہ سے آپؐ اسے برداشت کیے جا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں مداخلت فرمائی اور اس ناشایستہ طرزِ عمل پر ملامت کرتے ہوئے لوگوں کو یہ ہدایت دی کہ جب وہ آپؐ سے ملنے کے لیے آئیں اور آپؐ کو موجود نہ پائیں تو پکار پکار کر آپؐ کو بُلانے کے بجائے صبر کے ساتھ بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کریں جب آپؐ خود ان سے ملاقات کے لیے باہر تشریف لائیں۔

۷ – یعنی اب تک جو کچھ ہُوا سو ہُوا، آیندہ اس غَلَطی کا اعادہ نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ پچھلی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا اور اپنے رحم و کرم کی بنا پر ان لوگوں سے کوئی مؤاخذہ نہ کرے گا جو اُس کے رسولؐ کو اس طرح اذیت دیتے رہے ہیں۔

۸ – اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت وَلید بن عُقبہ بن ابی مُعَیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلۂ بنی المُصطَلِق جب مسلمان ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَلید بن عُقبہ کو بھیجا تاکہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لائیں۔ یہ اُن کے علاقے میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہلِ قبیلہ سے ملے بغیر مدینہ واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی کہ انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے

Maktaba Tul Ishaat.com

تھے۔ حضورؐ یہ خبر سُن کر سخت ناراض ہوئے اور آپؐ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک دستہ روانہ کریں۔ بعض رِوایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے وہ دستہ روانہ کر دیا تھا، اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپؐ روانہ کرنے والے تھے۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی المُصْطَلِق کے سردار حارث بن ضِرار (اُمُّ المومنین حضرت جُوَیریہؓ کے والد) اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور انھوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں، کجا کہ زکوٰۃ دینے سے انکار اور ان کے قتل کے ارادے کا کوئی سوال پیدا ہو، ہم ایمان پر قائم ہیں اور ادائے زکوٰۃ سے ہمیں ہرگز انکار نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس قصّے کو امام احمدؒ، ابنِ ابی حاتمؒ، طَبَرانی اور ابنِ جَرِیر نے حضرات عبداللہ بن عباسؓ، حارث بن ضِرار، مجاہد، قَتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، یزید بن رُومان، ضحّاک اور مُقاتِل بن حَیّان سے نقل کیا ہے۔ حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی رِوایت میں یہ پُورا قصّہ بیان تو اسی طرح ہوا ہے، مگر اس میں ولید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔

اس نازک موقع پر، جب کہ ایک بے بنیاد خبر پر اعتماد کر لینے کی وجہ سے ایک عظیم غلطی ہوتے ہوتے رہ گئی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اُصولی ہدایت دی کہ جب کوئی اہمیّت رکھنے والی خبر، جس پر کوئی بڑا نتیجہ مُترتّب ہوتا ہو، تمھیں ملے تو اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ اگر وہ کوئی فاسق شخص ہو، یعنی جس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ اس کی بات اعتماد کے لائق نہیں ہے، تو اس کی دی ہوئی خبر پر عمل کرنے سے پہلے تحقیق کر لو کہ امرِ واقعہ کیا ہے۔ اس حکمِ ربّانی سے ایک اہم شرعی قاعدہ نکلتا ہے جس کا دائرۂ اطلاق بہت وسیع ہے۔ اس کی رُو سے مسلمانوں کی حکومت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی کارروائی ایسے مخبروں کی دی ہوئی خبروں کی بنا پر کر ڈالے جن کی سیرت بھروسے کے لائق نہ ہو۔ اسی قاعدے کی بنا پر محدّثین نے علمِ حدیث میں جَرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا، تاکہ اُن لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں جن کے ذریعے سے بعد کی نسلوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچی تھیں، اور فقہا نے قانونِ شہادت میں یہ اُصول قائم کیا کہ کسی ایسے معاملے میں جس سے کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہو، یا کسی انسان پر کوئی حق عائد ہوتا ہو، فاسق کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ اس امر پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ عام دنیوی معاملات میں ہر خبر کی تحقیق اور خبر لانے والے کے لائقِ اعتماد ہونے کا اطمینان کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ آیت میں لفظ نَبَأ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ہر خبر پر نہیں ہوتا بلکہ اہمیت رکھنے والی خبر پر ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہا کہتے ہیں کہ عام معاملات میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں جاتے ہیں اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اندر سے کوئی آ کر کہتا ہے کہ آ جاؤ۔ آپ اس کے کہنے پر اندر جا سکتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اِذن کی اطلاع دینے والا فاسق ہو یا صالح۔ اسی طرح اہلِ علم کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جن لوگوں کا فسق جھوٹ اور بدکرداری کی نوعیت کا نہ ہو، بلکہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر وہ فاسق قرار پاتے ہوں، اُن کی شہادت بھی قبول کی جا سکتی ہے اور رِوایت بھی۔ محض ان کے عقیدے کی خرابی ان کی شہادت یا رِوایت قبول کرنے میں مانع نہیں ہے۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۸﴾

خوب جان رکھو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسولؐ موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ[9]۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبّت دی اور اس کو تمھارے لیے دل پسند بنا دیا، اور کفر و فِسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رَو ہیں[10] اور اللہ علیم و حکیم ہے[11]۔

۹- یہ بات سِیاق و سَباق سے بھی مُترشّح ہوتی ہے، اور متعدّد مفسّرین نے بھی اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ بنی المُصْطَلِق کے معاملے میں ولید بن عُقْبہ کی دی ہوئی اطلاع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے خلاف فوجی اقدام کرنے میں مُتأمّل تھے، مگر بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ ان پر فوراً چڑھائی کر دی جائے۔ اس پر اُن لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی کہ تم اِس بات کو بھول نہ جاؤ کہ تمھارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، جو تمھارے مصالح کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تمھارا یہ چاہنا کہ اہم معاملات میں جو رائے تمھیں مناسب نظر آتی ہے، آپؐ اُسی پر عمل کیا کریں، سخت بے جا جسارت ہے۔ اگر تمھارے کہنے پر عمل کیا جانے لگے تو بکثرت مواقع پر ایسی غلطیاں ہوں گی جن کا خمیازہ خود تم کو بھگتنا پڑے گا۔

۱۰- مطلب یہ ہے کہ پُوری جماعتِ مومنین اُس غَلَطی کی مرتکب نہیں ہوئی جس کا صُدور اُن چند لوگوں سے ہوا جو اپنی خام رائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چلانا چاہتے تھے۔ اور جماعتِ مومنین کے راہِ راست پر قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل و احسان سے ایمان کی رَوِش کو ان کے لیے محبُوب و دل پسند بنا دیا ہے اور کفر و فسق اور نافرمانی کی رَوِش سے انھیں متنفر کر دیا ہے۔ اس آیت کے دو حصّوں میں رُوئے سُخن دو الگ الگ گروہوں کی طرف ہے۔ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ کا خطاب پُوری جماعتِ صحابہؓ سے نہیں بلکہ اُن خاص اصحاب سے ہے جو بنی المُصْطَلِق پر چڑھائی کر دینے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ اور لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ کا خطاب عام صحابہؓ سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی رائے پر اصرار کرنے کی جسارت کبھی نہ کرتے تھے، بلکہ آپؐ کی رہنمائی پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیشہ اطاعت کی رَوِش پر قائم رہتے تھے، جو ایمان کا تقاضا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جنھوں نے اپنی رائے پر اصرار کیا تھا وہ ایمان کی محبّت سے خالی تھے۔ بلکہ اس سے جو بات مُترشّح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کے اِس تقاضے کی طرف

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ
فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى

اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں[۱۲] تو ان کے درمیان صلح[۱۳] کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دُوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو[۱۴] یہاں تک

سے اُن کو ذُہول ہو گیا تھا، جس کے باعث انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اپنی رائے پر اصرار کرنے کی غلطی کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کو اِس غلطی پر، اور اس کے بُرے نتائج پر متنبہ فرمایا، اور پھر یہ بتایا کہ صحیح ایمانی رَوِش وہ ہے جس پر صحابہؓ کی عام جماعت قائم ہے۔

۱۱- یعنی اللہ کا یہ فضل و احسان کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے۔ یہ نعمتِ عُظمیٰ جس کو بھی وہ دیتا ہے، حکمت کی بنا پر اور اِس علم کی بنا پر دیتا ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے۔

۱۲- یہ نہیں فرمایا کہ ’’جب اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑیں‘‘، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ ’’اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں‘‘۔ ان الفاظ سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ آپس میں لڑنا مسلمانوں کا معمول نہیں ہے اور نہیں ہونا چاہیے۔ نہ اُن سے یہ امر متوقع ہے کہ وہ مومن ہوتے ہوئے آپس میں لڑا کریں گے۔ البتہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اس صورت میں وہ طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ علاوہ بریں گروہ کے لیے بھی ’’فرقہ‘‘ کے بجائے ’’طائفہ‘‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عَرَبی زبان میں فرقہ بڑے گروہ کے لیے اور طائفہ چھوٹے گروہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات مُترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ حالت ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی بڑی جماعتوں کا مبتلا ہو جانا متوقع نہیں ہونا چاہیے۔

۱۳- اِس حکم کے مُخاطَب وہ تمام مسلمان ہیں جو ان دونوں گروہوں میں شامل نہ ہوں، اور جن کے لیے اُن کے درمیان صلح کی کوشش کرنا ممکن ہو۔ دوسرے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کی اپنی مِلّت کے دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہوں اور وہ بیٹھے ان کی لڑائی کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ یہ افسوس ناک صورتِ حال جب بھی پیدا ہو، تمام اہلِ ایمان کو اس پر بے چین ہو جانا چاہیے اور ان کے باہمی معاملات کی اصلاح کے لیے جس کے بس میں جو کوشش بھی ہو، وہ اسے صَرف کر ڈالنی چاہیے۔ فریقین کو لڑائی سے باز رہنے کی تلقین کی جائے، انھیں خدا سے ڈرایا جائے، بااثر لوگ فریقین کے ذمّہ دار آدمیوں سے جا کر ملیں، نزاع کے اسباب معلوم کریں، اور اپنی حد تک ہر وہ کوشش کریں جس سے ان کے درمیان مُصالحت ہو سکتی ہو۔

۱۴- یعنی مسلمانوں کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ زیادتی کرنے والے کو زیادتی کرنے دیں اور جس پر زیادتی کی جا رہی ہو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں، یا اُلٹا زیادتی کرنے والے کا ساتھ دیں۔ بلکہ ان کا فرض یہ ہے کہ اگر لڑنے والے فریقین

تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔[15] پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔[16]

میں صلح کرانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں، تو پھر یہ دیکھیں کہ حق پر کون ہے اور زیادتی کرنے والا کون۔ جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیں، اور جو زیادتی کرنے والا ہو اس سے لڑیں۔ اس لڑائی کا چونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس لیے یہ واجب ہے اور جہاد کے حکم میں ہے۔ اس کا شمار اُس فتنے میں نہیں ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْمَاشِيْ وَالْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ (اُس میں کھڑا رہنے والا چلنے والے سے، اور بیٹھ جانے والا کھڑا رہنے والے سے بہتر ہے)۔ کیونکہ اُس فتنے سے مراد تو مسلمانوں کی وہ باہمی لڑائی ہے جس میں فریقین عصبیت اور حمیتِ جاہلیہ اور طلبِ دنیا کے لیے لڑ رہے ہوں اور دونوں میں سے کوئی بھی حق پر نہ ہو۔ رہی یہ لڑائی جو زیادتی کرنے والے گروہ کے مقابلے میں برسرِ حق گروہ کی حمایت کے لیے لڑی جائے، تو یہ فتنے میں حصہ لینا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ تمام فقہا کا اس کے وجوب پر اتفاق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں اس کے واجب ہونے پر کوئی اختلاف نہ تھا۔ (احکام القرآن للجصاص) بلکہ بعض فقہا تو اسے جہاد سے بھی افضل قرار دیتے ہیں، اور اُن کا اِستدلال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا زمانہ خلافت کفار سے جہاد کرنے کے بجائے باغیوں سے لڑنے میں صَرف کر دیا۔ (رُوح المعانی) اس کے واجب نہ ہونے پر اگر کوئی شخص اس بات سے استدلال کرے کہ حضرت علیؓ کی ان لڑائیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے حصہ نہیں لیا تھا، تو وہ غلطی پر ہے۔ ابنِ عمرؓ خود فرماتے ہیں کہ مَا وَجَدْتُّ فِيْ نَفْسِيْ مِنْ شَيْءٍ مَا وَجَدْتُّ مِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اَنِّيْ لَمْ اُقَاتِلْ هٰذِهِ الْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ كَمَا اَمَرَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى (المُستدرَک للحاکم، کتاب معرفۃ الصّحابہ، باب الدفع عمن قعدوا عن بیعۃ علیؓ) "مجھے اپنے دل میں کسی بات پر اتنی زیادہ کھٹک محسوس نہیں ہوئی جتنی اِس آیت کی وجہ سے ہوئی کہ میں نے اللہ کے حکم کے مطابق اس باغی گروہ سے جنگ نہ کی۔"

زیادتی کرنے والے گروہ سے "قِتال" کرنے کا حکم لازماً یہی معنیٰ نہیں رکھتا کہ اس کے خلاف ہتھیاروں سے جنگ کی جائے اور ضرور اس کو قتل ہی کیا جائے۔ بلکہ اس سے مراد اُس کے خلاف طاقت کا استعمال ہے، اور اصل مقصود اُس کی زیادتی کا ازالہ ہے۔ اس مقصد کے لیے جس طاقت کا استعمال ناگزیر ہو اسے استعمال کرنا چاہیے، اور جتنی طاقت کا استعمال کافی ہو، نہ اس سے کم استعمال کرنی چاہیے نہ اس سے زیادہ۔

اس حکم کے مُخاطب وہ لوگ ہیں جو طاقت استعمال کر کے زیادتی کا ازالہ کرنے پر قادر ہوں۔

۱۵- اس سے معلوم ہوا کہ یہ لڑائی باغی (زیادتی کرنے والے گروہ) کو بغاوت (زیادتی) کی سزا دینے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اُسے اللہ کے حکم کی طرف پلٹنے پر مجبور کرنے کے لیے ہے۔ اللہ کے حکم سے مراد یہ ہے کہ کتاب اللہ و سنّتِ رسولؐ اللہ کی رُو سے جو بات حق ہو، اسے یہ باغی گروہ قبول کر لینے پر آمادہ ہو جائے اور جو طرزِ عمل اِس میزانِ حق کی رُو

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۹ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[۱۷] مومن تو ایک دُوسرے کے

سے زیادتی قرار پاتا ہے اس کو چھوڑ دے۔ جونہی کہ کوئی باغی گروہ اس حکم کی پیروی پر راضی ہو جائے، اس کے خلاف طاقت کا استعمال بند ہو جانا چاہیے، کیونکہ یہی قِتال کا مقصود اور اس کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد مزید دست درازی کرنے والا خود زیادتی کا مرتکب ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ کتاب اللہ وسنّتِ رسولؐ اللہ کی رُو سے ایک نِزاع میں حق کیا ہے اور زیادتی کیا، تو لامحالہ اس کو طے کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو امّت میں علم اور بصیرت کے لحاظ سے اس کی تحقیق کرنے کے اہل ہوں۔

۱۶ – محض صلح کرا دینے کا حکم نہیں ہے، بلکہ عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرانے کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ صلح کوئی قابلِ قدر چیز نہیں ہے جو حق اور باطل کے فرق کو نظر انداز کر کے محض لڑائی روکنے کے لیے کرائی جائے، اور جس میں برسرِ حق گروہ کو دبا کر زیادتی کرنے والے گروہ کے ساتھ بے جا رعایت برتی جائے۔ صلح وہی صحیح ہے جو انصاف پر مبنی ہو۔ اسی سے فساد ٹلتا ہے، ورنہ حق والوں کو دبانے اور زیادتی کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے کہ خرابی کے اصل اسباب جُوں کے تُوں باقی رہتے ہیں، بلکہ ان میں اور اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سے بار بار فساد برپا ہونے کی نوبت پیش آتی ہے۔

۱۷ – یہ آیت مسلمانوں کی باہمی جنگ کے بارے میں شرعی قانون کی اصل بنیاد ہے۔ ایک حدیث کے سوا، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے، اس قانون کی کوئی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت میں نہیں ملتی، کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان جنگ کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی کہ آپؐ کے عمل اور قول سے اُس کے احکام کی تفصیلات معلوم ہوتیں۔ بعد میں اِس قانون کی مستند تشریح اُس وقت ہوئی جب حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خود مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ اُس وقت چونکہ بکثرت صحابۂ کرامؓ موجود تھے، اس لیے ان کے عمل اور ان کے بیان کردہ احکام سے اسلامی قانون کے اِس شعبے کا مفصّل ضابطہ مرتّب ہوا۔ خُصوصیّت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اُسوہ اِس معاملے میں تمام فقہا کا اصل مَرجَع ہے۔ ذیل میں ہم اس ضابطے کا ایک ضروری خلاصہ درج کرتے ہیں:

(۱) مسلمانوں کی باہمی جنگ کی کئی صورتیں ہیں جن کے حکم الگ الگ ہیں:

(الف) لڑنے والے دونوں گروہ کسی مسلمان حکومت کی رعایا ہوں۔ اس صورت میں ان کے درمیان صلح کرانا، یا یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے زیادتی کرنے والا کون ہے، اور طاقت سے اس کو حق کی طرف رُجوع پر مجبُور کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔

(ب) لڑنے والے فریقین دو بہت بڑے طاقت ور گروہ ہوں، یا دو مسلمان حکومتیں ہوں، اور دونوں کی لڑائی دنیا کی خاطر ہو۔ اس صورت میں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اس فتنے میں حصّہ لینے سے قطعی اجتناب کریں،

اور فریقین کو خدا کا خوف دلا کر جنگ سے باز رہنے کی نصیحت کرتے رہیں۔

(ج) لڑنے والے وہ فریقین جن کا اوپر (ب) میں ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک حق پر ہو اور دوسرا زیادتی کر رہا ہو، اور نصیحت سے اصلاح پر آمادہ نہ ہو رہا ہو۔ اس صورت میں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف برسرِ حق فریق کا ساتھ دیں۔

(د) فریقین میں سے ایک گروہ رعیّت ہو اور اس نے حکومت، یعنی مسلم حکومت کے خلاف خُروج کیا ہو۔ فقہا اپنی اصطلاح میں اسی خُروج کرنے والے گروہ کے لیے "باغی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

(۲) باغی، یعنی حکومت کے خلاف خُروج کرنے والے گروہ بھی متعدِّد اقسام کے ہو سکتے ہیں:

(الف) وہ جو محض فساد برپا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے اِس خروج کے لیے اُن کے پاس کوئی شرعی تاویل نہ ہو۔ ان کے خلاف حکومت کی جنگ بالاتفاق جائز ہے اور اس کا ساتھ دینا اہلِ ایمان پر واجب ہے، قطعِ نظر اس سے کہ حکومت عادل ہو یا نہ ہو۔

(ب) وہ جو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے خُروج کریں، اور ان کے پاس کوئی شرعی تاویل نہ ہو، بلکہ ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ ظالم و فاسق ہیں۔ اس صورت میں اگر حکومت عادل ہو تب تو اس کا ساتھ دینا بلاکلام واجب ہے۔ لیکن اگر وہ عادل نہ بھی ہو تو اُس حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے لڑنا واجب ہے جس کے ذریعے سے فی الحال مملکت کا نظم قائم ہے۔

(ج) وہ جو کسی شرعی تاویل کی بنا پر حکومت کے خلاف خُروج کریں، مگر ان کی تاویل باطل اور ان کا عقیدہ فاسد ہو، مثلاً خوارج۔ اس صورت میں بھی، مسلم حکومت، خواہ وہ عادل ہو یا نہ ہو، ان سے جنگ کرنے کا جائز حق رکھتی ہے اور اس کا ساتھ دینا واجب ہے۔

(د) وہ جو ایک عادل حکومت کے خلاف خروج کریں، جب کہ اس کے سربراہ کی امارت جائز طور پر قائم ہو چکی ہو۔ اس صورت میں خواہ اُن کے پاس کوئی شرعی تاویل ہو یا نہ ہو، بہرحال ان سے جنگ کرنے میں حکومت حق بجانب ہے اور اس کا ساتھ دینا واجب۔

(ھ) وہ جو ایک ظالم حکومت کے خلاف خُروج کریں جس کی امارت جبراً قائم ہوئی ہو اور جس کے اُمَرا فاسق ہوں، اور خروج کرنے والے عدل اور حُدود اللہ کی اِقامت کے لیے اُٹھے ہوں اور ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ خود صالح لوگ ہیں۔ اس صورت میں اُن کو "باغی" یعنی زیادتی کرنے والا گروہ قرار دینے اور ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دینے میں فقہا کے درمیان سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے، جسے مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

جُمہور فقہا اور اہل الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نَسق اُس کے انتظام میں چل رہا ہو، وہ خواہ عادل ہو یا ظالم، اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو،

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے خلاف خُروج کرنا حرام ہے، اِلّا یہ کہ وہ کفرِ صریح کا ارتکاب کرے۔ امام سَرَخسیؒ لکھتے ہیں کہ ”جب مسلمان ایک فرمانروا پر مجتمع ہوں اور اس کی بدولت ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں، ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی جنگ کی طاقت رکھتا ہو، اُس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اُس فرمانروا کے ساتھ مل کر خروج کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے۔“ (المبسوط، باب الخوارج) امام نَوَوِیؒ شرحِ مسلم میں کہتے ہیں کہ ”ائمہ، یعنی مسلمان فرمانرواؤں کے خلاف خُروج اور قِتال حرام ہے، خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔“ اِس پر امام نَوَوِیؒ اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں۔

لیکن اس پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ فقہائے اسلام کا ایک بڑا گروہ، جس میں اکابر اہلِ علم شامل ہیں، خروج کرنے والوں کو صرف اُس صورت میں ”باغی“ قرار دیتا ہے جب کہ وہ امام عادل کے خلاف خروج کریں۔ ظالم و فاسق اُمَرا کے خلاف صلحا کے خروج کو وہ قرآنِ مجید کی اصطلاح کے مطابق ”بغاوت“ کا مصداق نہیں ٹھیراتے، اور نہ ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ظالم اُمَرا کے خلاف قِتال کے معاملے میں اہلِ علم کو معلوم ہے۔ ابوبکر جَصّاصؒ احکام القرآن میں صاف لکھتے ہیں کہ امام صاحب اس قِتال کو نہ صرف جائز، بلکہ سازگار حالات میں واجب سمجھتے تھے۔ (جلد اوّل، ص ۸۱۔ جلد دوم، ص ۳۹) بنی اُمیّہ کے خلاف زید بن علیؒ کے خُروج میں انھوں نے نہ صرف خود مالی مدد دی، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ (الجصّاص، ج ۱، ص ۸۱) منصور کے خلاف نفسِ زَکیہؒ کے خُروج میں وہ پُوری سرگرمی کے ساتھ نفسِ زَکیہؒ کی حمایت کرتے رہے، اور اس جنگ کو انھوں نے کفّار کے خلاف جہاد سے افضل قرار دیا۔ (الجصّاص، ج ۱، ص ۸۱۔ مناقبِ ابی حنیفہؒ لِلکَرْدَری، ج ۲، ص ۷۱-۷۲) پھر فُقہائے حَنَفِیّہ کا بھی مُتّفَقہ مسلک وہ نہیں ہے جو امام سَرَخسیؒ نے بیان کیا ہے۔ ابنِ ہُمامؒ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ اَلْبَاغِیْ فِیْ عُرْفِ الْفُقَھَاءِ الْخَارِجُ عَنْ طَاعَةِ اِمَامِ الْحَقِّ ”فقہا کے عُرف میں باغی وہ ہے جو امامِ حق کی اطاعت سے نکل جائے۔“ حنابلہ میں سے ابنِ عقیل اور ابن الجوزیؒ امامِ غیر عادل کے خلاف خروج کو جائز ٹھیراتے ہیں اور اس پر حضرت حسینؓ کے خُروج سے اِستدلال کرتے ہیں۔ (الانصاف، ج ۱۰، باب قِتال اہل البغی) امام شافعیؒ کتاب الاُمّ میں باغی اس شخص کو قرار دیتے ہیں جو امامِ عادل کے خلاف جنگ کرے۔ (ج ۴، ص ۱۳۵) امام مالکؒ کا مسلک المُدَوَّنَہ میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ ”خُروج کرنے والے اگر امامِ عادل کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکلیں تو ان کے خلاف مُقاتلہ کیا جائے۔“ (جلد اوّل، ص ۴۰۷) قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ احکام القرآن میں اُن کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ”جب کوئی شخص عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے امامِ عادل کے خلاف خروج کرے تو اس کو دفع کرنا واجب ہے، رہا کسی دوسری قسم کا امام، تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اللہ کسی دوسرے ظالم کے ذریعے سے اس کو سزا دے گا اور پھر کسی تیسرے ظالم کے ذریعے سے ان دونوں کو سزا دے گا۔“ ایک اور قول امام مالکؒ کا انھوں نے یہ نقل کیا ہے: ”جب ایک امام سے بیعت کی جا چکی ہو اور پھر اُس کے بھائی اُس کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اگر وہ امامِ عادل ہو۔ رہے یہ ہمارے زمانے کے

ائمہ، تو اِن کے لیے کوئی بیعت نہیں ہے، کیونکہ اِن کی بیعت زبردستی لی گئی ہے۔" پھر مالکی علما کا جو مسلک سُحنُون کے حوالے سے قاضی صاحب نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ "جنگ تو صرف امامِ عادل کے ساتھ مل کر کی جائے گی، خواہ پہلا امام عادل ہو یا وہ شخص جس نے اس کے خلاف خروج کیا ہو۔ لیکن اگر دونوں عادل نہ ہوں تو دونوں سے الگ رہو، البتہ اگر تمھاری اپنی جان پر حملہ کیا جائے یا مسلمان ظلم کے شکار ہو رہے ہوں تو مُدافعت کرو۔" یہ مسالک نقل کرنے کے بعد قاضی ابوبکرؒ کہتے ہیں: لَا نُقَاتِلُ اِلَّا مَعَ اِمَامٍ عَادِلٍ يُقَدِّمُهٗ اَهْلُ الْحَقِّ لِاَنْفُسِهِمْ۔ "ہم جنگ نہیں کریں گے مگر اُس امام عادل کے ساتھ جسے اہلِ حق نے اپنی امامت کے لیے آگے بڑھایا ہو۔"

(۳) خُروج کرنے والے اگر قلیل التعداد ہوں اور ان کی پشت پر کوئی بڑی جماعت نہ ہو، نہ وہ کچھ زیادہ جنگی سروسامان رکھتے ہوں، تو اُن پر قانونِ بغاوت کا اِطلاق نہ ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ عام قانونِ تعزیرات کے مطابق برتاؤ کیا جائے گا، یعنی وہ قتل کریں گے تو ان سے قِصاص لیا جائے گا، اور مال کا نقصان کریں گے تو اس کا تاوان ان پر عائد ہوگا۔ قانونِ بغاوت کا اطلاق صرف اُن باغیوں پر ہوتا ہے جو کوئی بڑی طاقت رکھتے ہوں، اور کثیر جمعیّت اور جنگی سروسامان کے ساتھ خروج کریں۔

(۴) خُروج کرنے والے جب تک محض اپنے فاسد عقائد، یا حکومت اور اس کے سربراہ کے خلاف باغیانہ اور معاندانہ خیالات کا اظہار کرتے رہیں، ان کو قتل یا قید نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ ان کے خلاف صرف اُس وقت کی جائے گی جب وہ عملاً مسلّح بغاوت کر دیں اور خوں ریزی کی ابتدا کر بیٹھیں۔ (المبسوط، باب الخوارج۔ فتح القدیر، باب البغاۃ۔ احکام القرآن للجصّاص)

(۵) باغیوں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے اُن کو قرآنِ مجید کی ہدایت کے مطابق دعوت دی جائے گی کہ وہ بغاوت کی رَوِش چھوڑ کر عدل کی راہ اختیار کریں۔ اگر ان کے کچھ شبہات و اعتراضات ہوں تو انھیں سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس پر بھی وہ باز نہ آئیں اور مُقاتلہ کا آغاز ان کی طرف سے ہو جائے، تب ان کے خلاف تلوار اُٹھائی جائے گی۔ (فتح القدیر۔ احکام القرآن للجصّاص)

(۶) باغیوں سے لڑائی میں جن ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے گا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد پر مبنی ہیں جسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے حاکم، بزّار اور الجصّاص نے نقل کیا ہے: "حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے پوچھا: "اے ابنِ اُمِّ عَبْد! جانتے ہو اِس اُمّت کے باغیوں کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔" فرمایا: "ان کے زخمیوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا، ان کے اسیر کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کے بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا، اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔" اس ضابطے کا دوسرا ماخذ، جس پر تمام فقہائے اسلام نے اعتماد کیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول اور عمل ہے۔ آپ نے جنگِ جَمَل میں فتحیاب ہونے کے بعد اعلان کیا کہ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرو، زخمی پر حملہ نہ کرو، گرفتار ہو جانے والوں کو قتل نہ کرو، جو ہتھیار ڈال دے اس کو امان دو، لوگوں کے گھروں میں نہ گھسو، اور عورتوں پر دست درازی نہ کرو، خواہ وہ تمھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

گالیاں ہی کیوں نہ دے رہی ہوں۔ آپ کی فوج کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مخالفین کو اور ان کے بال بچّوں کو غلام بنا کر تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر غضب ناک ہو کر آپ نے فرمایا: ’’تم میں سے کون اُمُّ المومنین عائشہؓ کو اپنے حصے میں لینا چاہتا ہے؟‘‘

(۷) باغیوں کے اموال کا حکم، جو حضرت علیؓ کے اُسوۂ حَسَنہ سے ماخوذ ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا کوئی مال، خواہ وہ ان کے لشکر میں ملا ہو یا ان کے پیچھے ان کے گھروں پر ہو، اور وہ خواہ زندہ ہوں یا مارے جا چکے ہوں، بہرحال اسے نہ مالِ غنیمت قرار دیا جائے گا اور نہ فوج میں تقسیم کیا جائے گا۔ البتہ جس مال کا نقصان ہو چکا ہو، اس کا کوئی ضِمان لازم نہیں آتا۔ جنگ ختم ہونے اور بغاوت کا زور ٹوٹ جانے کے بعد اُن کے مال اُنھی کو واپس دے دیے جائیں گے۔ ان کے اسلحے اور سواریاں جنگ کی حالت میں اگر ہاتھ آ جائیں تو انھیں اُن کے خلاف استعمال کیا جائے گا، مگر فاتحین کی مِلکیّت بنا کر مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا، اور اگر ان سے پھر بغاوت کا اندیشہ نہ ہو تو ان کی یہ چیزیں بھی واپس دے دی جائیں گی۔ صرف امام ابو یُوسُفؒ کی رائے یہ ہے کہ حکومت اسے غنیمت قرار دے گی۔ (المَبسُوط۔ فتح القدیر۔ الجَصّاص)

(۸) ان کے گرفتار شدہ لوگوں کو یہ عہد لے کر کہ وہ پھر بغاوت نہ کریں گے، رہا کر دیا جائے گا۔ (المَبسُوط)

(۹) باغی مقتولوں کے سر کاٹ کر گشت کرانا سخت مکروہ فعل ہے، کیونکہ یہ مُثلہ ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رومی بِطْرِیق کا سر کاٹ کر لایا گیا تو آپ نے اس پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہمارا کام رومیوں اور ایرانیوں کی پیروی کرنا نہیں ہے۔ یہ معاملہ جب کفار تک سے کرنا روا نہیں ہے، تو مسلمانوں کے ساتھ تو یہ بدرجۂ اَولیٰ ممنوع ہونا چاہیے۔ (المَبسُوط)

(۱۰) جنگ کے دوران میں باغیوں کے ہاتھوں جان و مال کا جو نقصان ہوا ہو، جنگ ختم ہونے اور امن قائم ہو جانے کے بعد اس کا کوئی قِصاص اور ضِمان اُن پر عائد نہ ہوگا۔ نہ کسی مقتول کا بدلہ ان سے لیا جائے گا اور نہ کسی مال کا تاوان اُن پر ڈالا جائے گا، تاکہ فتنے کی آگ پھر نہ بھڑک اُٹھے۔ صحابۂ کرامؓ کی باہمی لڑائیوں میں یہی ضابطہ ملحوظ رکھا گیا تھا۔ (المَبسُوط۔ الجَصّاص۔ احکام القرآن لِابنُ العَرَبی)

(۱۱) جن علاقوں پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا ہو اور وہاں انھوں نے اپنا نظم و نَسَق قائم کر کے زکوٰۃ اور دوسرے محصولات وُصول کر لیے ہوں، حکومت اُن علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد لوگوں سے ازسرِنَو اس زکوٰۃ اور اُن محصولات کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ اگر باغیوں نے یہ اموال شرعی طریقے پر صَرف کر دیے ہوں تو عنداللہ بھی وہ ادا کرنے والوں پر سے ساقط ہو جائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے غیر شرعی طریقے پر تصرُّف کیا ہو، تو یہ ادا کرنے والوں کے اور ان کے خدا کے درمیان معاملہ ہے۔ وہ خود چاہیں تو اپنی زکوٰۃ دوبارہ ادا کر دیں۔ (فتح القدیر۔ الجَصّاص۔ ابن العربی)

(۱۲) باغیوں نے اپنے زیرِ تصرُّف علاقے میں جو عدالتیں قائم کی ہوں، اگر ان کے قاضی اہلِ عدل میں سے ہوں اور

اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝١٠ ع

ع ۱۳

بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو دُرست کرو [۱۸] اور اللہ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ ع

شریعت کے مطابق انھوں نے فیصلے کیے ہوں، تو وہ برقرار رکھے جائیں گے، اگرچہ ان کے مقرّر کرنے والے بغاوت کے مُجرم ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ اگر ان کے فیصلے غیر شرعی ہوں اور بغاوت فرو ہونے کے بعد وہ حکومت کی عدالتوں کے سامنے لائے جائیں، تو وہ نافذ نہیں کیے جائیں گے۔ علاوہ بریں باغیوں کی قائم کی ہوئی عدالتوں کی طرف سے کوئی وارنٹ یا پروانۂ امر حکومت کی عدالتوں میں قبول نہ کیا جائے گا۔ (المبسوط۔ الجصّاص)

(۱۳) باغیوں کی شہادت اسلامی عدالتوں میں قابلِ قبول نہ ہوگی، کیونکہ اہلِ عدل کے خلاف جنگ کرنا فِسق ہے۔ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ جب تک وہ جنگ نہ کریں اور اہلِ عدل کے خلاف عملاً خُروج کے مرتکب نہ ہوں، ان کی شہادت قبول کی جائے گی، مگر جب وہ جنگ کر چکے ہوں تو پھر میں ان کی شہادت قبول نہ کروں گا۔ (الجصّاص)

ان احکام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفّار کے خلاف جنگ اور مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کے قانون میں کیا فرق ہے۔

۱۸- یہ آیت دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتی ہے، اور یہ اِسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اُخوّت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس حکم کی اہمیّت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا ہے جن سے اس کی پُوری روح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

حضرت جَریرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی: ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا۔ تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔ (بخاری، کتاب الایمان)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فِسق ہے اور اُس سے جنگ کرنا کفر۔'' (بخاری، کتاب الایمان۔ مُسندِ احمد میں اسی مضمون کی رِوایت حضرت سعید بن مالک نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے۔)

حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔'' (مسلم، کتاب البرّ والصِّلہ۔ ترمذِی، ابواب البرّ والصِّلہ)

حضرت ابوسعید خُدرِیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اُس پر

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ

اے[19] لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دُوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دُوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں[20]۔

ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔" (مُسْنَدِ احمد)

حضرت سَہلؓ بن سعد ساعدی آپؐ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "گروہِ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسے سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اُسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصّے کا درد محسوس کرتا ہے۔" (مُسْنَدِ احمد) اسی سے ملتا جُلتا مضمون ایک اور حدیث میں ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا ہے: "مومنوں کی مثال آپس کی محبّت، وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم و شفقت کے معاملے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عُضو کو بھی تکلیف ہو تو سارا جسم اس پر بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ "مومن ایک دوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے۔" (بخاری، کتاب الادب۔ ترمذی، ابواب البرّ والصِّلہ)

۱۹۔ پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ضروری ہدایات دینے کے بعد اہلِ ایمان کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ دین کے مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اُن کو خدا سے ڈرتے ہوئے اپنے آپس کے تعلقات کو دُرست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب آگے کی دو آیتوں میں اُن بڑی بڑی برائیوں کے سدّباب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعُموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر حملہ، ایک دوسرے کی دل آزاری، ایک دوسرے سے بدگمانی، اور ایک دوسرے کے عیُوب کا تجسُّس، درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جن سے آپس کی عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر ان سے بڑے بڑے فتنے رونما ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو احکام آگے کی آیتوں میں دیے گئے ہیں اور ان کی جو تشریحات احادیث میں ملتی ہیں، ان کی بنا پر ایک مفصّل قانونِ ہتکِ عزت (law of libel) مرتّب کیا جا سکتا ہے۔ مغربی قوانینِ ہتکِ عزت اس معاملے میں اتنے ناقص ہیں کہ ایک شخص ان کے تحت دعویٰ کر کے اپنی عزت کچھ اَور کھو آتا ہے۔ اسلامی قانون اس کے برعکس ہر شخص کی ایک بنیادی عزت کا قائل ہے، جس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے،

لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ‌ؕ بِئۡسَ الِاسۡمُ
فُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ‌ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَتُبۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱﴾

پس میں ایک دُوسرے پر طعن نہ کرو[21] اور نہ ایک دُوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو[22]۔ یمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بُری بات ہے[23]۔ جو لوگ اس رَوِش سے ز نہ آئیں، وہی ظالم ہیں۔

ع نظر اس سے کہ حملہ واقعیت پر مبنی ہو یا نہ ہو، اور جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کی کوئی "حیثیتِ عُرفی" ہو یا نہ ہو۔ مُجرّد بات کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی تذلیل کی ہے، اسے مجرم بنا دینے کے لیے کافی ہے، اِلّا یہ کہ اس تذلیل کا ؤئی شرعی جواز ثابت کر دیا جائے۔

۲۰ – مذاق اُڑانے سے مراد محض زبان ہی سے کسی کا مذاق اُڑانا نہیں ہے، بلکہ کسی کی نقل اتارنا، اس کی رف اشارے کرنا، اس کی بات پر یا اس کے کام یا اس کی صورت یا اس کے لباس پر ہنسنا، یا اس کے کسی نَقص یا عیب ں طرف لوگوں کو اس طرح توجّہ دلانا کہ دوسرے اس پر ہنسیں، یہ سب بھی مذاق اڑانے میں داخل ہیں۔ اصل مُمانعت س چیز کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی کسی نہ کسی طور پر تضحیک کرے، کیونکہ اس تضحیک میں لازماً اپنی بڑائی ر دوسرے کی تذلیل و تحقیر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو اَخلاقاً سخت معیوب ہیں، اور مزید برآں اس سے دوسرے نص کی دل آزاری بھی ہوتی ہے، جس سے معاشرے میں فساد رُونما ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس فعل کو حرام کیا گیا ہے۔

مَردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے لیے عورتوں کا مذاق اڑانا، یا ورتوں کے لیے مَردوں کا مذاق اڑانا جائز ہے۔ دراصل جس وجہ سے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ سلام سرے سے مخلوط سوسائٹی ہی کا قائل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی تضحیک عُموماً بے تکلّف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے، ور اسلام میں یہ گنجایش رکھی ہی نہیں گئی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔ س لیے اس بات کو ایک مُسلم معاشرے میں قابلِ تصوُّر نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک مجلس میں مرد کسی عورت کا مذاق اڑائیں گے یا عورتیں کسی مرد کا مذاق اڑائیں گی۔

۲۱ – اصل میں لفظ لَمۡز استعمال ہوا ہے، جس کے اندر طعن و تشنیع کے علاوہ متعدِّد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں، مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کَسنا، الزام دھرنا، اعتراض جَڑنا، عیب چینی کرنا اور کُھلّم کُھلّا یا زیرِ لب یا اشاروں سے کسی کو نشانۂ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال بھی چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں، اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی کی بلاغت یہ ہے کہ لَا يَلۡمِزۡ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا (ایک دوسرے پر طعن نہ کرو) کہنے

Maktaba Tul Ishaat.com

کے بجائے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنے اوپر طعن نہ کرو) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں، جن سے خود بخود یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرنے والا دراصل خود اپنے آپ کو مطعون کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کی زبان دوسروں کے خلاف بدگوئی کے لیے اس وقت تک نہیں کُھلتی جب تک اس کے دل میں برے جذبات کا لاوا خوب پک کر پھوٹ پڑنے کے لیے تیار نہ ہو گیا ہو۔ اس طرح اِن جذبات کی پرورش کرنے والا دوسروں سے پہلے اپنے نفس کو تو بدی کا آشیانہ بنا چکتا ہے۔ پھر جب وہ دوسروں پر چوٹ کرتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ خود اپنے اُوپر چوٹیں کرنے کے لیے دوسروں کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی شرافت کی بنا پر اس کے حملوں کو ٹال جائے۔ مگر اس نے تو اپنی طرف سے یہ دروازہ کھول ہی دیا کہ وہ شخص بھی اس پر حملہ آور ہو جس کو اس نے اپنی زبان کے تیروں کا ہدف بنایا ہے۔

۲۲ - اس حکم کا منشا یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے نام سے نہ پکارا جائے یا ایسا لقب نہ دیا جائے جو اس کو ناگوار ہو اور جس سے اس کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کو فاسق یا منافق کہنا، کسی کو لنگڑا یا اندھا یا کانا کہنا، کسی کو اس کے اپنے یا اس کی ماں یا باپ یا خاندان کے کسی عیب یا نقص سے مُلقّب کرنا، کسی کو مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے سابق مذہب کی بنا پر یہودی یا نصرانی کہنا، کسی شخص یا خاندان یا برادری یا گروہ کا ایسا نام رکھ دینا جو اس کی مَذمّت اور تذلیل کا پہلو رکھتا ہو۔ اس حکم سے صرف وہ القاب مُستثنیٰ ہیں جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے تو بدنُما ہیں، مگر ان سے مَذمّت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان لوگوں کی پہچان کا ذریعہ بن جاتے ہیں جن کو ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر محدّثین نے اسماء الرِّجال میں سلیمان الاَعْمَش (چُندھے سلیمان) اور واصل الاَحْدَب (کُبڑے واصل) جیسے القاب کو جائز رکھا ہے۔ ایک نام کے کئی آدمی موجود ہوں اور ان میں سے کسی خاص شخص کی پہچان اُس کے کسی خاص لقب ہی سے ہوتی ہو تو وہ لقب استعمال کیا جا سکتا ہے، اگرچہ وہ بجائے خود بُرا ہو۔ مثلاً عبداللہ نام کے کئی آدمی ہوں اور ایک اُن میں سے نابینا ہو، تو آپ اس کی پہچان کے لیے نابینا عبداللہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے القاب بھی اس حکم کے تحت نہیں آتے جن میں بظاہر تنقیص کا پہلو نکلتا ہے مگر درحقیقت وہ محبّت کی بنا پر رکھے جاتے ہیں اور خود وہ لوگ بھی جنھیں ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے، انھیں پسند کرتے ہیں، جیسے ابوہُرَیرہ اور ابوتُراب۔

۲۳ - یعنی ایک مومن کے لیے یہ بات سخت شرمناک ہے کہ مومن ہونے کے باوجود وہ بدزبانی اور شُہدے پَن میں نام پیدا کرے۔ ایک کافر اگر اس لحاظ سے مشہور ہو کہ وہ لوگوں کا مذاق خوب اُڑاتا ہے، یا پھبتیاں خوب کستا ہے، یا بُرے بُرے نام خوب تجویز کرتا ہے، تو یہ انسانیت کے لحاظ سے خواہ اچھی شہرت نہ ہو، کم از کم اس کے کفر کو تو زیب دیتی ہے۔ مگر ایک آدمی اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد ایسے ذلیل اوصاف میں شہرت حاصل کرے تو یہ ڈوب مرنے کے لائق بات ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔[۲۴] تجسُّس نہ کرو۔[۲۵] اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔[۲۶] کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے

۲۴- مطلقاً گمان کرنے سے نہیں روکا گیا ہے، بلکہ بہت زیادہ گمان سے کام لینے اور ہر طرح کے گمان کی پیروی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اس حکم کو سمجھنے کے لیے ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ گمان کی کتنی قسمیں ہیں اور ہر ایک کی اخلاقی حیثیت کیا ہے:

ایک قسم کا گمان وہ ہے جو اَخلاق کی نگاہ میں نہایت پسندیدہ اور دین کی نظر میں مطلوب اور محمود ہے، مثلاً اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان سے نیک گمان اور اُن لوگوں کے ساتھ حُسنِ ظن جن سے آدمی کا میل جول ہو اور جن کے متعلق بدگمانی کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

دوسری قسم کا گمان وہ ہے جس سے کام لینے کے سوا عملی زندگی میں کوئی چارہ نہیں ہے۔ مثلاً عدالت میں اِس کے بغیر کام نہیں چل سکتا کہ جو شہادتیں حاکمِ عدالت کے سامنے پیش ہوں، ان کو جانچ کر وہ غالب گمان کی بنا پر فیصلہ کرے، کیونکہ معاملے کی حقیقت کا براہِ راست علم اُس کو نہیں ہو سکتا، اور شہادتوں کی بنیاد پر جو رائے قائم ہوتی ہے، وہ زیادہ تر یقین پر نہیں بلکہ ظنِّ غالب پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح بکثرت معاملات میں، جہاں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور حقیقت کا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہوتا، انسان کے لیے گمان کی بنیاد پر ایک رائے قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

گمان کی ایک تیسری قسم وہ ہے جو اگرچہ ہے تو بدگمانی، مگر جائز نوعیت کی ہے اور اس کا شمار گناہ میں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کی سیرت و کردار میں یا اس کے معاملات اور طور طریقوں میں ایسی واضح علامات پائی جاتی ہوں جن کی بنا پر وہ حُسنِ ظن کا مستحق نہ ہو اور اس سے بدگمانی کرنے کے لیے معقول وجوہ موجود ہوں۔ ایسی حالت میں شریعت کا مطالبہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی سادہ لوحی برت کر ضرور اُس سے حُسنِ ظن ہی رکھے۔ لیکن اِس جائز بدگمانی کی آخری حد یہ ہے کہ اس کے امکانی شر سے بچنے کے لیے بس احتیاط سے کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ اس سے آگے بڑھ کر محض گمان کی بنا پر اُس کے خلاف کوئی کارروائی کر بیٹھنا دُرست نہیں ہے۔

چوتھی قسم کا گمان جو درحقیقت گناہ ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی کسی شخص سے بلا سبب بدگمانی کرے، یا دوسروں کے متعلق رائے قائم کرنے میں ہمیشہ بدگمانی ہی سے ابتدا کیا کرے، یا ایسے لوگوں کے معاملے میں بدظنی سے کام لے جن کا

Maktaba Tul Ishaat.com

ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ نیک اور شریف ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی گناہ ہے کہ ایک شخص کے کسی قول یا فعل میں بُرائی اور بھلائی کا یکساں احتمال ہو اور ہم محض سُوءِ ظن سے کام لے کر اُس کو بُرائی ہی پر محمول کریں۔ مثلاً کوئی بھلا آدمی کسی محفل سے اُٹھتے ہوئے اپنے جوتے کے بجائے کسی اور کا جُوتا اُٹھالے، اور ہم یہ رائے قائم کرلیں کہ ضرور اس نے جوتا چُرانے ہی کی نیت سے یہ حرکت کی ہے۔ حالانکہ یہ فعل بُھولے سے بھی ہوسکتا ہے، اور اچھے احتمال کو چھوڑ کر بُرے احتمال کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ بدگمانی کے سوا نہیں ہے۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گمان بجائے خود کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں وہ پسندیدہ ہے، بعض حالات میں ناگزیر ہے، بعض حالات میں ایک حد تک جائز اور اُس سے آگے ناجائز ہے، اور بعض حالات میں بالکل ہی ناجائز ہے۔ اسی بنا پر یہ نہیں فرمایا گیا کہ گمان سے یا بدگمانی سے مطلقاً پرہیز کرو، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ بہت زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو۔ پھر حکم کا منشا واضح کرنے کے لیے مزید بات یہ فرمائی گئی ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اس تنبیہ سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کبھی آدمی گمان کی بنا پر کوئی رائے قائم کر رہا ہو یا کسی اقدام کا فیصلہ کرنے لگے تو اسے اچھی طرح جانچ تول کر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ میں جو گمان کر رہا ہوں کہیں وہ گناہ تو نہیں ہے؟ کیا فی الواقع اس گمان کی ضرورت ہے؟ کیا اس گمان کے لیے میرے پاس معقول وجوہ ہیں؟ کیا اس گمان کی بنا پر جو طرزِ عمل مَیں اختیار کر رہا ہوں وہ جائز ہے؟ یہ احتیاط لازماً ہر وہ شخص کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہو۔ اپنے گمان کو مُطلَقُ العِنان بنا کر رکھنا صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو خدا سے بے خوف اور آخرت کی باز پرس سے بے فکر ہیں۔

۲۵ – یعنی لوگوں کے راز نہ ٹٹولو۔ ایک دوسرے کے عیب نہ تلاش کرو۔ دوسروں کے حالات اور معاملات کی ٹوہ نہ لگاتے پھرو۔ یہ حرکت خواہ بدگمانی کی بنا پر کی جائے، یا بدنیتی سے کسی کو نقصان پہنچانے کی خاطر کی جائے، یا محض اپنا اِستِعجاب (curiosity) دُور کرنے کے لیے کی جائے، ہر حال میں شرعاً ممنوع ہے۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے جن حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اُن کی کھوج کُرید کرے، اور پردے کے پیچھے جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کس میں کیا عیب ہے اور کس کی کون سی کمزوریاں چُھپی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے نجی خُطوط پڑھنا، دو آدمیوں کی باتیں کان لگا کر سننا، ہمسایوں کے گھر میں جھانکنا، اور مختلف طریقوں سے دوسروں کی خانگی زندگی یا ان کے ذاتی معاملات کی ٹٹول کرنا ایک بڑی بداَخلاقی ہے، جس سے طرح طرح کے فساد رونما ہوتے ہیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے خطبے میں تجسُّس کرنے والوں کے متعلق فرمایا:

يَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ قَلْبَهٗ لَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنَّهٗ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَّبِعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ يَّتَّبِعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ فِيْ بَيْتِهٖ ۔ (ابوداؤد)	اَے لوگو جو زبان سے ایمان لے آئے ہو مگر ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اُترا ہے، مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی کھوج نہ لگایا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب ڈھونڈنے کے درپے ہوگا اللہ اس کے عُیوب کے درپے ہو جائے گا، اور اللہ جس

کے درپے ہو جائے اُسے اُس کے گھر میں رُسوا کر کے چھوڑتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

اِنَّكَ اِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَهُمْ اَوْ كِدْتَ اَنْ تُفْسِدَهُمْ ـ (ابوداؤد)

تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو گے تو اُن کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے۔

ایک اور حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے:

اِذَا ظَنَنْتُمْ فَلَا تُحَقِّقُوْا ـ (احکام القرآن للجصّاص)

جب کسی شخص کے متعلق تمھیں کوئی بُرا گمان ہو جائے تو اس کی تحقیق نہ کرو۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ رَاٰى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ اَحْيَا مَوْؤُدَةً ـ (الجصّاص)

جس نے کسی کا کوئی مخفی عیب دیکھ لیا اور اس پر پردہ ڈال دیا تو یہ ایسا ہے جیسے کسی نے ایک زندہ گاڑی ہوئی بچی کو موت سے بچا لیا۔

تجسُّس کی مُمانعت کا یہ حکم صرف افراد ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ اسلامی حکومت کے لیے بھی ہے۔ شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سُپرد کیا ہے، اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کر کے لوگوں کی چھپی ہوئی بُرائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے، بلکہ اسے صرف اُن برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیے جو ظاہر ہو جائیں۔ رہیں مخفی خرابیاں، تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے بلکہ تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت، اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سُنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا: ''اے دشمنِ خدا! کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟'' اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین! جلدی نہ کیجیے۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیے ہیں۔ اللہ نے تجسُّس سے منع کیا تھا، اور آپ نے تجسُّس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لیے بغیر نہ جاؤ، اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔'' یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انھوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔ (مکارِمُ الاَخلاق لابی بکر محمد بن جعفر الخرائطی) اس سے معلوم ہوا کہ افراد ہی کے لیے نہیں، خود اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتا چلائے اور پھر انھیں پکڑے۔ یہی بات ایک حدیث

Maktaba Tul Ishaat.com

میں بھی ارشاد ہوئی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَا ابْتَغَی الرِّیْبَةَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ۔ (ابوداؤد)	حکمران جب لوگوں کے اندر شُبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ ان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس حکم سے مُستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں تجسُّس کی فی الحقیقت ضرورت ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رَوِیّے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آ رہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جُرم کا ارتکاب کرنے والا ہے، تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے۔ یا مثلاً کسی شخص کے ہاں کوئی شادی کا پیغام بھیجے، یا اس کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کرنا چاہے، تو وہ اپنے اطمینان کے لیے اس کے حالات کی تحقیق کر سکتا ہے۔

۲۶- غیبت کی تعریف یہ ہے کہ "آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے۔" یہ تعریف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت جسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے، اس میں حضورؐ نے غیبت کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے:

ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَکْرَهُ ۔ قِیْلَ اَفَرَأَیْتَ اِنْ کَانَ فِیْٓ اَخِیْ مَآ اَقُوْلُ؟ قَالَ اِنْ کَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔	غیبت یہ ہے کہ "تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو۔" عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا: اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تُو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔

ایک دوسری رِوایت، جو امام مالکؒ نے مُؤطّا میں حضرت مُطَّلِب بن عبداللہ سے نقل کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ رَجُلًا سَئَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا الْغِیْبَةُ؟ فَقَالَ اَنْ تَذْکُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَا یَکْرَهُ اَنْ یَّسْمَعَ ۔ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنْ کَانَ حَقًّا ؟ قَالَ اِذَا قُلْتَ بَاطِلًا فَذٰلِكَ الْبُهْتَانُ۔	ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سُنے تو اسے ناگوار ہو۔" اس نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اگرچہ میری بات حق ہو؟ آپ نے جواب دیا: اگر تیری بات باطل ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے، اور اس کے واقعی عُیوب بیان کرنا غیبت۔ یہ فعل خواہ صریح الفاظ میں کیا جائے یا اشارہ وکنایہ میں، بہرصورت حرام ہے۔ اسی طرح یہ فعل خواہ آدمی کی زندگی میں کیا جائے یا اس کے مرنے کے بعد، دونوں صورتوں میں اس کی حرمت یکساں ہے۔ ابوداؤد

کی روایت ہے کہ ماعز بن مالک اسلمی کو جب زِنا کے جرم میں رجم کی سزا دے دی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ چلتے ایک صاحب کو اپنے دوسرے ساتھی سے یہ کہتے سُن لیا کہ "اِس شخص کو دیکھو، اللہ نے اِس کا پردہ ڈھانک دیا تھا، مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک یہ کُتّے کی موت نہ مار دیا گیا۔" کچھ دُور آگے جا کر راستے میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی۔ حضورؐ رُک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بُلا کر فرمایا: "اُتریے اور اس گدھے کی لاش تناول فرمایئے۔" ان دونوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اسے کون کھائے گا؟" فرمایا: فَمَا نِلْتُمَا مِنْ عِرْضِ اَخِیْکُمَا اٰنِفًا اَشَدُّ مِنْ اَکْلٍ مِّنْہُ - "ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے، وہ اِس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بُری تھی۔"

اس حُرمت سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی شخص کے پیٹھ پیچھے، یا اس کے مرنے کے بعد اس کی بُرائی بیان کرنے کی کوئی ایسی ضرورت لاحق ہو جو شریعت کی نگاہ میں ایک صحیح ضرورت ہو، اور وہ ضرورت غیبت کے بغیر پُوری نہ ہو سکتی ہو، اور اُس کے لیے اگر غیبت نہ کی جائے تو غیبت کی بہ نسبت زیادہ بڑی بُرائی لازم آتی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس اِستثنا کو اُصولاً یوں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ مِنْ اَرْبَی الرِّبَا الْاِسْتِطَالَۃَ فِیْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَیْرِ حَقٍّ - (ابوداؤد) بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزّت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔

اس ارشاد میں "ناحق" کی قید یہ بتاتی ہے کہ "حق" کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہے۔ پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طرزِ عمل میں ہم کو چند نظیریں ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "حق" سے مُراد کیا ہے اور کس قسم کے حالات میں غیبت بقدرِ ضرورت جائز ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک بدّو آ کر حضورؐ کے پیچھے نماز میں شامل ہوا اور نماز ختم ہوتے ہی یہ کہتا ہوا چل دیا کہ "خدایا! مجھ پر رحم کر اور محمدؐ پر، اور ہم دونوں کے سوا کسی کو اس رحمت میں شریک نہ کر۔" حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: اَتَقُوْلُوْنَ ھُوَ اَضَلُّ اَمْ بَعِیْرُہٗ؟ اَلَمْ تَسْمَعُوْا اِلٰی مَا قَالَ؟ "تم لوگ کیا کہتے ہو، یہ شخص زیادہ نادان ہے یا اس کا اونٹ؟ تم نے سُنا نہیں کہ یہ کیا کہہ رہا تھا؟" (ابوداؤد) یہ بات حضورؐ کو اُس کے پیٹھ پیچھے کہنی پڑی، کیونکہ وہ سلام پھیرتے ہی جا چکا تھا۔ اس نے چونکہ حضورؐ کی موجودگی میں ایک بہت غلط بات کہہ دی تھی، اور آپؐ کا اس پر خاموش رہ جانا کسی شخص کو اِس غلط فہمی میں ڈال سکتا تھا کہ ایسی بات کہنا کسی درجے میں جائز ہو سکتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ آپؐ اس کی تردید فرمائیں۔

ایک خاتون فاطمہ بنتِ قیس کو دو صاحبوں نے نکاح کا پیغام دیا۔ ایک حضرت معاویہؓ، دوسرے حضرت ابوالجہم۔ انھوں نے آ کر حضورؐ سے مشورہ طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "معاویہ مفلس ہیں اور ابوالجہم بیویوں کو بہت مارتے پیٹتے ہیں۔" (بخاری و مسلم) یہاں ایک خاتون کے لیے مستقبل کی زندگی کا مسئلہ درپیش تھا اور حضورؐ سے انھوں نے مشورہ طلب کیا تھا، اِس حالت میں آپؐ نے ضروری سمجھا کہ دونوں صاحبوں کی جو کمزوریاں

Maktaba Tul Ishaat.com

آپؐ کے علم میں ہیں وہ انھیں بتا دیں۔

ایک روز حضورؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے آ کر ملاقات کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اپنے قبیلے کا بہت بُرا آدمی ہے۔ پھر آپؐ باہر تشریف لے گئے اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ بات کی۔ گھر میں واپس تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: ''آپؐ نے تو اس سے بڑی اچھی طرح گفتگو فرمائی، حالانکہ باہر جاتے وقت آپؐ نے اس کے متعلق وہ کچھ فرمایا تھا۔'' جواب میں آپؐ نے فرمایا: اِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَنْ وَّدَعَهُ (اَوْ تَرَكَهُ) النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِهٖ۔ ''خدا کے نزدیک قیامت کے روز بدترین مقام اُس شخص کا ہوگا جس کی بدزبانی سے ڈر کر لوگ اس سے ملنا جُلنا چھوڑ دیں۔'' (بخاری و مسلم) اس واقعے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے اُس شخص کے متعلق بُری رائے رکھنے کے باوجود اس کے ساتھ اچھی طرح بات چیت تو اس لیے کی کہ آپؐ کا اَخلاق اسی کا تقاضا کرتا تھا۔ لیکن آپؐ کو یہ اندیشہ ہوا کہ آپؐ کے گھر والے آپؐ کو اُس سے مہربانی برتتے دیکھ کر کہیں اسے آپؐ کا دوست نہ سمجھ لیں اور بعد میں کسی وقت وہ اس کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے، اس لیے آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو خبردار کر دیا کہ وہ اپنے قبیلے کا بہت بُرا آدمی ہے۔

ایک موقع پر حضرت ابوسُفیانؓ کی بیوی ہِندؓ بنتِ عُتبہ نے آ کر حضورؐ سے عرض کیا کہ ''ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہیں، مجھے اور میرے بچوں کو اتنا نہیں دیتے جو ضروریات کے لیے کافی ہو۔'' (بخاری و مسلم) بیوی کی طرف سے شوہر کی غیر موجودگی میں یہ شکایت اگرچہ غیبت تھی، مگر حضورؐ نے اس کو جائز رکھا، کیونکہ مظلوم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ظلم کی شکایت کسی ایسے شخص کے پاس لے جائے جو اس کو رفع کرا سکتا ہو۔

سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن نظیروں سے استفادہ کر کے فقہا و محدثین نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ ''غیبت صرف اُس صورت میں جائز ہے جب کہ ایک صحیح (یعنی شرعاً صحیح) غرض کے لیے اس کی ضرورت ہو اور وہ ضرورت اس کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو۔'' پھر اسی قاعدے پر بنا رکھتے ہوئے علما نے غیبت کی حسبِ ذیل صورتیں جائز قرار دی ہیں:

(۱) ظالم کے خلاف مظلوم کی شکایت ہر اُس شخص کے سامنے جس سے وہ یہ توقع رکھتا ہو کہ وہ ظلم کو دفع کرنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔

(۲) اصلاح کی نیت سے کسی شخص یا گروہ کی بُرائیوں کا ذکر ایسے لوگوں کے سامنے جن سے یہ اُمید ہو کہ وہ اُن برائیوں کو دُور کرنے کے لیے کچھ کر سکیں گے۔

(۳) اِستِفتا کی غرض سے کسی مفتی کے سامنے صورتِ واقعہ بیان کرنا، جس میں کسی شخص کے کسی غلط فعل کا ذکر آ جائے۔

(۴) لوگوں کو کسی شخص یا اشخاص کے شر سے خبردار کرنا، تاکہ وہ اس کے نقصان سے بچ سکیں۔ مثلاً راویوں، گواہوں اور مصنفین کی کمزوریاں بیان کرنا بالاتفاق جائز ہی نہیں واجب ہے، کیونکہ اس کے بغیر شریعت کو غلط

روایتوں کی اشاعت سے، عدالتوں کو بے انصافی سے، اور عوام یا طالبانِ علم کو گمراہیوں سے بچانا ممکن نہیں ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص کسی سے شادی بیاہ کا رشتہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی کے پڑوس میں مکان لینا چاہتا ہو، یا کسی سے شرکت کا معاملہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی کو اپنی امانت سونپنا چاہتا ہو اور آپ سے مشورہ لے تو آپ کے لیے واجب ہے کہ اس کا عیب وصواب اسے بتا دیں، تاکہ ناواقفیت میں وہ دھوکا نہ کھائے۔

(۵) ایسے لوگوں کے خلاف علی الاعلان آواز بلند کرنا اور ان کی برائیوں پر تنقید کرنا جو فِسق و فُجور پھیلا رہے ہوں، یا بدعات اور گمراہیوں کی اشاعت کر رہے ہوں، یا خلقِ خدا کو بے دینی اور ظلم و جَور کے فتنوں میں مبتلا کر رہے ہوں۔

(۶) جو لوگ کسی بُرے لقب سے اس قدر مشہور ہو چکے ہوں کہ وہ اُس لقب کے سوا کسی اور لقب سے پہچانے نہ جا سکتے ہوں، اُن کے لیے وہ لقب استعمال کرنا بغرضِ تعریف نہ کہ بغرضِ تنقیص۔

(تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: فتح الباری، جلد ۱۰، ص ۳۶۲۔ شرح مسلم للنّوَوِی، باب تحریم الغیبۃ۔ ریاض الصّالحین، باب مایُبَاح من الغیبۃ۔ احکام القرآن للجَصّاص و رُوح المعانی، تفسیر آیہ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا)

ان مستثنیٰ صورتوں کے ماسوا پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقاً حرام ہے۔ یہ بدگوئی اگر سچّی ہو تو غیبت ہے، جھوٹی ہو تو بہتان ہے، اور دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے ہو تو چُغلی ہے۔ شریعت ان تینوں چیزوں کو حرام کرتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کے سامنے کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائی جا رہی ہو تو وہ اس کو خاموشی سے نہ سنے بلکہ اس کی تردید کرے، اور اگر کسی جائز شرعی ضرورت کے بغیر کسی کی واقعی برائیاں بیان کی جا رہی ہوں تو اس فعل کے مرتکبین کو خدا سے ڈرائے اور اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَا مِنِ امْرِئٍ يَخْذُلُ امْرَأً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ تُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهٗ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوَاطِنَ يُحِبُّ فِيْهَا نُصْرَتَهٗ، وَمَا مِنِ امْرِئٍ يَنْصُرُ امْرَأً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ وَيُنْتَهَكُ فِيْهِ مِنْ حُرْمَتِهٖ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيْ مَوَاطِنَ يُحِبُّ فِيْهَا نُصْرَتَهٗ۔ (ابوداؤد)

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو، تو اللہ عزّوجلّ اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔

رہا غیبت کرنے والا، تو جس وقت بھی اُسے احساس ہو جائے کہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے یا کر چکا ہے، اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اس حرام فعل سے رُک جائے۔ اس کے بعد دوسرا فرض اس پر یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ

جو اپنے مَرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے[۲۷] گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھِن کھاتے ہو۔

عائد ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی مرے ہوئے آدمی کی غیبت کی ہو تو اس کے حق میں کثرت سے دعائے مغفرت کرے۔ اگر کسی زندہ آدمی کی غیبت کی ہو اور وہ خلافِ واقعہ بھی ہو تو اُن لوگوں کے سامنے اس کی تردید کرے جن کے سامنے وہ پہلے یہ بہتان تراشی کر چکا ہے۔ اور اگر سچّی غیبت کی ہو تو آیندہ پھر کبھی اس کی برائی نہ کرے، اور اُس شخص سے معافی مانگے جس کی اُس نے بُرائی کی تھی۔ علما کا ایک گروہ کہتا ہے کہ معافی صرف اُس صورت میں مانگنی چاہیے جب کہ اُس شخص کو اس کا علم ہو چکا ہو، ورنہ صرف توبہ پر اکتفا کرنا چاہیے، کیونکہ اگر وہ شخص بے خبر ہو اور غیبت کرنے والا معافی مانگنے کی خاطر اسے جا کر یہ بتائے کہ میں نے تیری غیبت کی تھی تو یہ چیز اس کے لیے اذیّت کی موجب ہو گی۔

۲۷- اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس فعل کے انتہائی گھناؤنا ہونے کا تصوُّر دلایا ہے۔ مُردار کا گوشت کھانا بجائے خود نفرت کے قابل ہے، کجا کہ وہ گوشت بھی کسی جانور کا نہیں بلکہ انسان کا ہو، اور انسان بھی کوئی اور نہیں، خود اپنا بھائی ہو۔ پھر اس تشبیہ کو سوالیہ انداز میں پیش کر کے اور زیادہ مؤثّر بنا دیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص اپنے ضمیر سے پوچھ کر خود فیصلہ کرے کہ آیا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے لیے تیار ہے؟ اگر نہیں ہے اور اُس کی فطرت اِس چیز سے گھِن کھاتی ہے تو آخر وہ کیسے یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے ایک مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرے جہاں وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا اور جہاں اس کو یہ خبر تک نہیں ہے کہ اس کی بے عزّتی کی جا رہی ہے؟ اِس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غیبت کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ اُس شخص کی دل آزاری نہیں ہے جس کی غیبت کی گئی ہو، بلکہ کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی بُرائی کرنا بجائے خود حرام ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اُس کو اس کا علم ہو یا نہ ہو اور اس کو اِس فعل سے اذیّت پہنچے یا نہ پہنچے۔ ظاہر ہے کہ مرے ہوئے آدمی کا گوشت کھانا اس لیے حرام نہیں ہے کہ مُردے کو اُس سے تکلیف ہوتی ہے۔ مُردہ بے چارہ تو اِس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کی لاش بھنبوڑ رہا ہے۔ مگر یہ فعل بجائے خود ایک نہایت گھناؤنا فعل ہے۔ اسی طرح جس شخص کی غیبت کی گئی ہو، اس کو بھی اگر کسی ذریعے سے اس کی اطلاع نہ پہنچے تو وہ عمر بھر اس بات سے بے خبر رہے گا کہ کہاں کس شخص نے کب اس کی عزت پر کن لوگوں کے سامنے حملہ کیا تھا، اور اس کی وجہ سے کس کس کی نظر میں وہ ذلیل و حقیر ہو کر رہ گیا۔ اِس بے خبری کی وجہ سے اُسے اِس غیبت کی سرے سے کوئی اذیّت نہ پہنچے گی، مگر اس کی عزت پر بہر حال اس سے حرف آئے گا، اس لیے یہ فعل اپنی نوعیت میں مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے مختلف نہیں ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا
خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دُوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے[۲۸]۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے[۲۹]۔

---

۲۸ – پچھلی آیات میں اہلِ ایمان کو خطاب کر کے وہ ہدایات دی گئی تھیں جو مسلم معاشرے کو خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اب اِس آیت میں پُوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن، اور قومیت کا تعصُّب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور میں انسان بالعُموم انسانیّت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے، جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا، اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اَخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں اِن کی بِنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے، اور کہیں ایک جُغرافی خِطّے میں یا ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے، وہ صرف اِس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنھیں اِس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبّت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں، مذہب ایجاد کیے گئے ہیں، قوانین بنائے گئے ہیں، اَخلاقی اُصول وضع کیے گئے ہیں، قوموں اور سلطنتوں نے اِس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اِس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حُقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اِسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شُودروں کو انتہائی ذلّت کے گڑھے میں پھینک

Maktaba Tul Ishaat.com

دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقا اور امریکا میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے، ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے بَرِّ اعظم امریکا میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقا کی کمزور قوموں پر اپنا تسلُّط قائم کر کے جو برتاؤ اُن کے ساتھ کیا، اس کی تہ میں بھی یہی تصوّر کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حُدُود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مباح ہے اور انھیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لُوٹیں، غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے، اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خُصوصیّت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیّت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصوّر پچھلی جنگِ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے، انھیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کُن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآنِ مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالٰی نے تمام انسانوں کو مُخاطَب کر کے تین نہایت اہم اُصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمھاری پُوری نَوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمھاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں، وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں، جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اِس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اُس تفرِقے اور اُونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زَعْمِ باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمھارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادّۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادّے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادّے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریقِ پیدائش الگ الگ ہوں۔ اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں، جن سے دنیا کے مختلف خِطّوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمھارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پُوری رُوئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آ جائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خِطّوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خَدّوخال، زبانیں اور طرزِ بُود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے، اور ایک خِطّے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دُور دراز خِطّوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اُونچ اور نیچ، شریف اور کمین،

برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوّق جمائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مُرتّب کیا تھا، وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اِسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے تھے۔ مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارُف کا ذریعہ بنایا تھا، اُسے تفاخُر اور تنافُر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عُدوان تک پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اَخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہے، ان کا مادّۂ پیدائش اور طریقِ پیدائش ایک ہی ہے، اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے، جس میں اُس کے اپنے ارادہ و انتخاب اور اس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اِس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، بُرائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ اور جس کا حال اِس کے برعکس ہو، وہ بہرحال ایک کم تر درجے کا انسان ہے، چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عَیْبَةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَتَكَبُّرَهَا ۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ، اَلنَّاسُ رَجُلَانِ ، بَرٌّ تَقِیٌّ كَرِیْمٌ عَلَى اللّٰهِ، وَفَاجِرٌ شَقِیٌّ هَیِّنٌ عَلَى اللّٰهِ ۔ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَخَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ ۔ (بَیْہَقی فی شُعَبُ الایمان، ترمذی)	شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیّت کا عیب اور اس کا تکبّر دُور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک، نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے۔ دوسرا، فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔

حجّۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰاَيُّهَا النَّاسُ ، اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَّلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَّلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى ، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ– (بیہقی)

لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ، میں نے تمھیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں یا رسولؐ اللہ! فرمایا: اچھا تو جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے:

كُلُّكُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ وَلَيَنْتَهِيَنَّ قَوْمٌ يَفْخَرُوْنَ بِاٰبَائِهِمْ اَوْ لَيَكُوْنَنَّ اَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجُعْلَانِ – (بزّار)

تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آبا و اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں، ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْئَلُكُمْ عَنْ اَحْسَابِكُمْ وَلَا عَنْ اَنْسَابِكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ـ (ابنِ جریر)

اللہ قیامت کے روز تمھارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ– (مسلم۔ابنِ ماجہ)

اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے مال نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں، بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہلِ ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی ہے، جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں، جس میں اُونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصّب کا کوئی تصوّر نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان، خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مُساویانہ حُقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مُساوات اور وحدت کے اُصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے، اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا

یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لائے"۔[30] اِن سے کہو، تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ "ہم مطیع ہو گئے"۔[31]

پائی جاتی نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے رُوئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک اُمّت بنا دیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا بھی ضروری ہے۔ شادی بیاہ کے معاملے میں اسلامی قانون کُفو کو جو اہمیّت دیتا ہے، اس کو بعض لوگ اس معنٰی میں لیتے ہیں کہ کچھ برادریاں شریف اور کچھ کمین ہیں اور ان کے درمیان مناکحت قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی قانون کی رُو سے ہر مسلمان مرد کا ہر مسلمان عورت سے نکاح ہو سکتا ہے، مگر اِزدِواجی زندگی کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ زوجین کے درمیان عادات، خصائل، طرزِ زندگی، خاندانی رِوایات اور مَعاشی و معاشرتی حالات میں زیادہ سے زیادہ مطابقت ہو، تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکیں۔ یہی کفاءت کا اصل مقصد ہے۔ جہاں مرد اور عورت کے درمیان اس لحاظ سے بہت زیادہ بُعد ہو، وہاں عمر بھر کی رفاقت نبھ جانے کی کم ہی توقع ہو سکتی ہے، اس لیے اسلامی قانون ایسے جوڑ لگانے کو ناپسند کرتا ہے، نہ اِس بنا پر کہ فریقین میں سے ایک شریف اور دوسرا کمین ہے، بلکہ اس بنا پر کہ حالات میں زیادہ بَیّن فرق و اختلاف ہو تو شادی بیاہ کا تعلق قائم کرنے میں اِزدِواجی زندگیوں کے ناکام ہو جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

۲۹ - یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ کون فی الواقع ایک اعلیٰ درجے کا انسان ہے اور کون اوصاف کے لحاظ سے ادنیٰ درجے کا ہے۔ لوگوں نے بطورِ خود اعلیٰ اور ادنیٰ کے جو معیار بنا رکھے ہیں، یہ اللہ کے ہاں چلنے والے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جس کو دنیا میں بہت بلند مرتبے کا آدمی سمجھا گیا ہو وہ اللہ کے آخری فیصلے میں کم ترینِ خلائق قرار پائے، اور ہو سکتا ہے کہ جو یہاں بہت حقیر سمجھا گیا ہو وہ وہاں بڑا اُونچا مرتبہ پائے۔ اصل اہمیّت دنیا کی عزت و ذلّت کی نہیں، بلکہ اُس ذلت و عزت کی ہے جو خدا کے ہاں کسی کو نصیب ہو۔ اس لیے انسان کو ساری فکر اس امر کی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اندر وہ حقیقی اوصاف پیدا کرے جو اسے اللہ کی نگاہ میں عزّت کے لائق بنا سکتے ہوں۔

۳۰ - اِس سے مراد تمام بدوی نہیں ہیں بلکہ یہاں ذکر چند خاص بدوی گروہوں کا ہو رہا ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر محض اِس خیال سے مسلمان ہو گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی ضرب سے محفوظ بھی رہیں گے اور اسلامی فُتوحات کے فوائد سے مُتمتّع بھی ہوں گے۔ یہ لوگ حقیقت میں سچے دل سے ایمان نہیں لائے تھے، محض زبانی اقرارِ ایمان کر کے انھوں نے مَصلحتاً اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرا لیا تھا۔ اور اُن کی اِس باطنی حالت کا راز اُس وقت فاش ہو جاتا تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر طرح طرح کے مطالبے کرتے تھے اور اپنا حق اس طرح جتاتے تھے کہ گویا انھوں نے اسلام قبول کر کے آپؐ پر بڑا احسان کیا ہے۔ رِوایات میں متعدِد قبائلی

Maktaba Tul Ishaat.com

گروہوں کے اس رویّے کا ذکر آیا ہے، مثلاً مُزَینَہ، جُہَینَہ، اَسلَم، اَشجَع، غِفار وغیرہ۔ خاص طور پر بنی اَسَد بن خُزَیمہ کے متعلق ابنِ عباسؓ اور سعید بن جُبیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خشک سالی کے زمانے میں وہ مدینہ آئے اور مالی مدد کا مطالبہ کرتے ہوئے بار بار انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ''ہم بغیر لڑے بھڑے مسلمان ہوئے ہیں، ہم نے آپؐ سے اُس طرح جنگ نہیں کی جس طرح فُلاں اور فُلاں قبیلوں نے جنگ کی ہے۔'' اِس سے اُن کا صاف مطلب یہ تھا کہ اللہ کے رسولؐ سے جنگ نہ کرنا اور اسلام قبول کر لینا ان کا ایک احسان ہے جس کا معاوضہ اُنھیں رسولؐ اور اہلِ ایمان سے ملنا چاہیے۔ اطرافِ مدینہ کے بَدوِی گروہوں کا یہی وہ طرزِ عمل ہے جس پر اِن آیات میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اِس تبصرے کے ساتھ سورۂ توبہ، آیات ۹۰ تا ۱۱۰، اور سورۂ فتح، آیات ۱۱ تا ۱۷ کو ملا کر پڑھا جائے تو بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

۳۱- اصل میں قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''کہو ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔'' ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ قرآنِ مجید کی زبان میں ''مومن'' اور ''مسلم'' دو متقابل اصطلاحیں ہیں، مومن وہ ہے جو سچّے دل سے ایمان لایا ہو، اور مسلم وہ ہے جس نے ایمان کے بغیر محض ظاہر میں اسلام قبول کر لیا ہو۔ لیکن درحقیقت یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اِس جگہ ایمان کا لفظ قلبی تصدیق کے لیے اور اسلام کا لفظ محض ظاہری اطاعت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مگر یہ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی دو مستقل اور باہم مُتَقابل اصطلاحیں ہیں۔ قرآن کی جن آیات میں اسلام اور مسلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کا تَتَبُّع کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی اِصطِلاح میں ''اسلام'' اُس دینِ حق کا نام ہے جو اللہ نے نَوعِ انسانی کے لیے نازل کیا ہے، اُس کے مفہوم میں ایمان اور اطاعتِ امر دونوں شامل ہیں، اور ''مسلم'' وہ ہے جو سچّے دل سے مانے اور عملاً اطاعت کرے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات مُلاحَظہ ہوں:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ — یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ (آلِ عمران: ۱۹)

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ — اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے، اُس کا وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ (آلِ عمران: ۸۵)

وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ — اور میں نے تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔ (المائدہ: ۳)

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ — اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ (الأنعام: ۱۲۵)

ظاہر ہے کہ اِن آیات میں ''اسلام'' سے مراد اطاعتِ بلا ایمان نہیں ہے۔ پھر دیکھیے، جگہ جگہ اس مضمون کی آیات آتی ہیں:

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ — اے نبیؐ! کہو: مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اسلام

وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِيۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا
يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا
بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾

ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسُول کی فرماں برداری اختیار کرلو تو وہ تمھارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچّے لوگ ہیں۔

اَسۡلَمَ۔ (الأنعام:۱۴)	لانے والا میں ہوں۔
فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ (آلِ عمران:۲۰)	پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو انھوں نے ہدایت پالی۔
يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا۔	تمام انبیاؑ جو اسلام لائے تھے، تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ (المائدہ:۴۴)

کیا یہاں اور اس طرح کے بیسیوں دوسرے مقامات پر اسلام قبول کرنے یا اسلام لانے کا مطلب ایمان کے بغیر اطاعت اختیار کرلینا ہے؟ اسی طرح ''مسلم'' کا لفظ بار بار جس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، اس کے لیے نمونے کے طور پر حسبِ ذیل آیات مُلاحظہ ہوں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ○ (آلِ عمران:۱۰۲)	اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔
هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِيۡ هٰذَا۔	اس نے تمھارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اِس کتاب میں بھی۔ (الحج:۷۸)
مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ (آلِ عمران:۶۷)	ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یک سُو مُسلم تھا۔
رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ	(تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی دُعا) اے ہمارے

Maktaba Tul Ishaat.com

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ
قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ
لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع

ع ۲/۱۴

اے نبیؐ! اِن (مدّعیانِ ایمان) سے کہو: کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ اِنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اِن سے کہو: اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہِدایت دی، اگر تم واقعی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اس کی نگاہ میں ہے۔ع

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ (البقرہ: ۱۲۸)	رب! اور ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی اُمت پیدا کر جو تیری مُسلم ہو۔
يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (البقرہ: ۱۳۲)	(حضرت یعقوبؑ کی وصیت اپنی اولاد کو) اے میرے بچّو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ پس تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مُسلم ہو۔

ان آیات کو پڑھ کر آخر کون یہ خیال کر سکتا ہے کہ ان میں مُسلم سے مراد وہ شخص ہے جو دل سے نہ مانے، بس ظاہری طور پر اسلام قبول کر لے؟ اس لیے یہ دعویٰ کرنا قطعی غلط ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں اسلام سے مراد اطاعت بلا ایمان ہے، اور مسلم قرآن کی زبان میں محض بظاہر اسلام قبول کر لینے والے کو کہتے ہیں۔ اِسی طرح یہ دعویٰ کرنا بھی غلط ہے کہ ایمان اور مومن کے الفاظ قرآنِ مجید میں لازماً سچے دل سے ماننے ہی کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ بلاشبہ اکثر مقامات پر یہ الفاظ اسی مفہوم کے لیے آئے ہیں، لیکن بکثرت مقامات ایسے بھی ہیں جہاں یہ الفاظ ظاہری اقرارِ ایمان کے

لیے بھی استعمال کیے گئے ہیں، اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا کہہ کر اُن سب لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے جو زبانی اقرار کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوئے ہوں، قطعِ نظر اس سے کہ وہ سچے مومن ہوں، یا ضعیف الایمان، یا محض منافق۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے صرف چند کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، آیت ۱۵۶، النساء: ۱۳۶، المائدہ: ۵۴، الانفال: ۲۰-۲۷، التوبہ: ۳۸، الحدید: ۲۸، الصّف: ۲۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

قٓ

(۵۰)

قٓ

نام آغاز ہی کے حرف "ق" سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس کا افتتاح حرفِ "ق" سے ہوتا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ ٹھیک کس زمانے میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اِس کا زمانۂ نزول مکۂ معظّمہ کا دوسرا دور ہے، جو نبوت کے تیسرے سال سے شروع ہو کر پانچویں سال تک رہا۔ اس دَور کی خصوصیات ہم سورۂ انعام کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔ اُن خصوصیات کے لحاظ سے اندازے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورت پانچویں سال میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ کفار کی مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی، مگر ابھی ظلم وستم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

موضوع اور مَباحِث معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عیدین کی نمازوں میں اس سورت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ایک خاتون اُمّ ہِشامؓ بنتِ حارثہ، جو حضورؐ کی پڑوسن تھیں، بیان کرتی ہیں کہ مجھے سورۂ ق یاد ہی اس طرح ہوئی کہ میں جمعے کے خطبوں میں اکثر آپؐ کی زبانِ مبارک سے اس کو سنتی تھی۔ بعض اور روایات میں آیا ہے کہ فجر کی نماز میں بھی آپؐ بکثرت اس کو پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کی نگاہ میں یہ ایک بڑی اہم سورت تھی، اس لیے آپؐ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بار بار اس کے مضامین پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔

اس اہمیّت کی وجہ سورت کو بغور پڑھنے سے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ پوری سورت کا موضوع آخرت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکۂ معظّمہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا آپؐ کی جس بات پر ہوا، وہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ تو بالکل اَنہونی بات ہے، عقل باور نہیں کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارا ذرہ ذرہ زمین میں منتشر ہو چکا ہو تو اِن پراگندہ اجزا کو ہزار ہا برس گزرنے کے بعد پھر سے اکٹھا کر کے ہمارا یہی جسم ازسرِنو بنا دیا جائے اور ہم زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تقریر نازل ہوئی۔ اس میں بڑے مختصر طریقے سے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک طرف آخرت کے امکان اور اس کے وقوع پر دلائل دیے گئے ہیں، اور دوسری طرف لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم خواہ تعجب کرو، یا بعید از عقل سمجھو، یا جھٹلاؤ، بہرحال اس سے حقیقت

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں بدل سکتی۔ حقیقت، اور قطعی اٹل حقیقت یہ ہے کہ تمھارے جسم کا ایک ایک ذرّہ جو زمین میں منتشر ہوتا ہے، اُس کے متعلق اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس حال میں کس جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ اِس کے لیے کافی ہے کہ یہ تمام منتشر ذرّات پھر جمع ہو جائیں اور تم کو اُسی طرح دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے جیسے پہلے بنایا گیا تھا۔ اِسی طرح تمھارا یہ خیال کہ تم یہاں شُترِ بے مہار بنا کر چھوڑ دیے گئے ہو اور کسی کے سامنے تمھیں جواب دِہی نہیں کرنی ہے، ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست خود بھی تمھارے ہر قول و فعل سے، بلکہ تمھارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے، اور اس کے فرشتے بھی تم میں سے ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے تمام حرکات و سکنات کا ریکارڈ محفوظ کر رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو ایک پُکار پر تم بالکل اُسی طرح نکل کھڑے ہو گے جس طرح بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی زمین سے نباتات کی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اُس وقت یہ غفلت کا پردہ جو آج تمھاری عقل پر پڑا ہوا ہے، تمھارے سامنے سے ہٹ جائے گا اور تم اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لو گے جس کا آج انکار کر رہے ہو۔ اُس وقت تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ تم دنیا میں غیر ذمّہ دار نہیں تھے بلکہ ذمّہ دار اور جواب دِہ تھے۔ جزا و سزا، عذاب و ثواب اور جنّت و دوزخ جنھیں آج فسانۂ عجائب سمجھ رہے ہو، اُس وقت یہ ساری چیزیں تمھاری مشہود حقیقتیں ہوں گی۔ حق سے عناد کی پاداش میں اُسی جہنّم کے اندر پھینکے جاؤ گے جسے آج عقل سے بعید سمجھتے ہو، اور خدائے رحمٰن سے ڈر کر راہِ راست کی طرف پلٹ آنے والے تمھاری آنکھوں کے سامنے اُسی جنّت میں جائیں گے جس کا ذکر سُن کر آج تمھیں تعجب ہو رہا ہے۔

---

۴۵ آیاتہا — سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ — ۳ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ
فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا
تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ

ق، قسم ہے قرآنِ مجید[1] کی ـــــ بلکہ اِن لوگوں کو تعجّب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود اِنھی میں سے اِن کے پاس آگیا[2]۔ پھر منکرین کہنے لگے: "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہوجائیں گے (تو دوبارہ اُٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید[3] ہے۔" (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے، وہ سب ہمارے

---

۱ — "مجید" کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، بلند مرتبہ، باعظمت، بزرگ اور صاحب عزت وشَرف۔ دوسرے، کریم، کثیر العطا، بہت نفع پہنچانے والا۔ قرآن کے لیے یہ لفظ اِن دونوں معنوں میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ قرآن اِس لحاظ سے عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اُس کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے، اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ۔ جس وقت وہ نازل ہوا تھا، اُس وقت بھی انسان اس کے مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے اور آج بھی عاجز ہیں۔ اس کی کوئی بات کبھی کسی زمانے میں غلط ثابت نہیں کی جاسکی ہے نہ کی جاسکتی ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس کا مقابلہ کرسکتا ہے، نہ پیچھے سے حملہ آور ہوکر اسے شکست دے سکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ کریم ہے کہ انسان جس قدر زیادہ اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی قدر زیادہ وہ اس کو رہنمائی دیتا ہے، اور جتنی زیادہ اُس کی پیروی کرے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے فوائد ومنافع کی کوئی حد نہیں ہے جہاں جا کر انسان اس سے بے نیاز ہوسکتا ہو، یا جہاں پہنچ کر اس کی نفع بخشی ختم ہوجاتی ہو۔

۲ — یہ فقرہ بلاغت کا بہترین نمونہ ہے جس میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر الفاظ میں سمو دیا گیا ہے۔ قرآن کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اُسے بیان نہیں کیا گیا۔ اس کا ذکر کرنے کے بجائے بیچ میں ایک لطیف خلا چھوڑ کر آگے کی بات "بلکہ" سے شروع کر دی گئی ہے۔ آدمی ذرا غور کرے اور اُس پَس منظر کو بھی نگاہ میں رکھے جس میں

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ

علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے[۴]۔

بلکہ اِن لوگوں نے تو جس وقت حق اِن کے پاس آیا، اُسی وقت اُسے صاف جُھٹلا دیا۔

یہ بات فرمائی گئی ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قسم اور بلکہ کے درمیان جو خلا چھوڑ دیا گیا ہے، اس کا مضمون کیا ہے۔ اس میں دراصل قسم جس بات پر کھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ''اہلِ مکّہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے کسی معقول بنیاد پر انکار نہیں کیا ہے، بلکہ اِس سراسر غیر معقول بنیاد پر کیا ہے کہ ان کی اپنی ہی جنس کے ایک بشر، اور ان کی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کا خدا کی طرف سے خبردار کرنے والا بن کر آ جانا اُن کے نزدیک سخت قابلِ تعجب بات ہے۔ حالانکہ تعجب کے قابل بات اگر ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ خدا اپنے بندوں کی بھلائی اور بُرائی سے بے پروا ہو کر انھیں خبردار کرنے کا کوئی انتظام نہ کرتا، یا انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی غیر انسان کو بھیجتا، یا عربوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی چینی کو بھیج دیتا۔ اس لیے انکار کی یہ بنیاد تو قطعی نامعقول ہے، اور ایک صاحبِ عقلِ سلیم یقیناً یہ ماننے پر مجبُور ہے کہ خدا کی طرف سے بندوں کو خبردار کرنے کا انتظام ضرور ہونا چاہیے اور اِسی شکل میں ہونا چاہیے کہ خبردار کرنے والا خود اُنھی لوگوں میں سے کوئی شخص ہو جن کے درمیان وہ بھیجا گیا ہو۔'' اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جنھیں خدا نے اِس کام کے لیے بھیجا ہے، تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی اور شہادت کی حاجت نہیں، یہ عظیم و کریم قرآن، جسے وہ پیش کر رہے ہیں، اس بات کا ثبوت دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِس تشریح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں قرآن کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں اور ان کی رسالت پر کفّار کا تعجب بے جا ہے۔ اور قرآن کے ''مجید'' ہونے کو اِس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

۳ – یہ ان لوگوں کا دوسرا تعجّب تھا۔ پہلا اور اصل تعجب زندگی بعدِ موت پر نہ تھا، بلکہ اس پر تھا کہ انھی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اُٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ مَیں خدا کی طرف سے تمھیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس کے بعد مزید تعجب انھیں اِس پر ہوا کہ وہ شخص انھیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا، وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد از سرِنَو زندہ کیے جائیں گے، اور ان سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی جائے گی۔

۴ – یعنی یہ بات اگر اِن لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ اِن کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اِس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اُس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے جسم کے اجزا، جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آیندہ بکھرتے چلے جائیں گے، ان کو جمع کرنا کسی طرح

فَهُمْ فِیْۤ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ۝۵ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ
بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا

اِسی وجہ سے اب یہ اُلجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔[5]

اچھا،[6] تو کیا اِنھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا،[7] اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔[8] اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں

ممکن نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جُز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہِ راست اس کو جانتا ہے، اور مزید برآں اس کا پُورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے، جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھوٹا ہُوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہو گا اسی وقت آناً فاناً اُس کے فرشتے اِس ریکارڈ کی طرف رُجوع کر کے ایک ایک ذرّے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر انھوں نے دنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہو گی جیسی اِس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہو گا جو اِس دنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفّار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنیٰ تھا کہ زمین تمھارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے، وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرہ ذرہ کا ریکارڈ موجود ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۲۵)

۵۔ اس مختصر سے فقرے میں بھی ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں نے صرف تعجب کرنے اور بعید از عقل ٹھیرانے پر ہی اکتفانہ کیا، بلکہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ حق پیش کی، اُسی وقت بلا تامّل اُسے قطعی جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا تھا اور یہی ہوا کہ اِنھیں اِس دعوت اور اس کے پیش کرنے والے رسولؐ کے معاملے میں کسی ایک مَوقِف پر قرار نہیں ہے۔ کبھی اُس کو شاعر کہتے ہیں تو کبھی کاہن اور کبھی مجنون۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادُوگر ہے، اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی نے اِس پر جادُو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے خود یہ چیز بنا لایا ہے، اور کبھی یہ الزام تراشتے ہیں کہ اِس کے پسِ پُشت کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کلام گھڑ گھڑ کر اسے دیتے ہیں۔ یہ متضاد باتیں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے مَوقِف میں بالکل اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اِس اُلجھن میں یہ ہرگز نہ پڑتے اگر جلد بازی کر کے نبی کو پہلے ہی قدم پر جھٹلا نہ دیتے، اور بلا فکر و تامّل ایک پیشگی فیصلہ صادر کر دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ یہ دعوت کون پیش کر رہا ہے، کیا بات کہہ رہا ہے، اور اس کے لیے دلیل کیا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اِن کے لیے اجنبی نہ تھا۔ کہیں سے اچانک اِن کے درمیان نہ آ کھڑا ہوا تھا۔ اِن کی اپنی ہی قوم کا فرد تھا۔ اِن کا اپنا دیکھا بھالا آدمی تھا۔ یہ اُس کی سیرت و کردار اور اُس کی قابلیت سے ناواقف نہ تھے۔ ایسے آدمی کی طرف سے جب

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک بات پیش کی گئی تھی تو چاہیے اسے فوراً قبول نہ کرلیا جاتا، مگر وہ اِس کی مستحق بھی تو نہ تھی کہ سنتے ہی اسے رد کر دیا جاتا۔ پھر وہ بات بے دلیل بھی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے دلائل پیش کر رہا تھا۔ چاہیے تھا کہ اس کے دلائل کھلے کانوں سے سُنے جاتے اور تعصّب کے بغیر ان کو جانچ کر دیکھا جاتا کہ وہ کہاں تک معقول ہیں۔ لیکن یہ رَوِش اختیار کرنے کے بجائے جب اِن لوگوں نے ضد میں آ کر ابتدا ہی میں اُسے جُھٹلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ تو اِنھوں نے اپنے لیے خود بند کرلیا اور ہر طرف بھٹکتے پھرنے کے بہت سے راستے کھول لیے۔ اب یہ اپنی ابتدائی غَلَطی کو نباہنے کے لیے دس متضاد باتیں تو بنا سکتے ہیں مگر اِس ایک بات کو سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ نبی سچّا بھی ہوسکتا ہے اور اس کی پیش کردہ بات حقیقت بھی ہوسکتی ہے۔

۶ — اوپر کی پانچ آیتوں میں کفارِ مکّہ کے مَوقِف کی نامعقولیت واضح کرنے کے بعد اب بتایا جا رہا ہے کہ آخرت کی جو خبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس کی صحّت کے دلائل کیا ہیں۔ اس مَقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کفار جن دو باتوں پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے، ان میں سے ایک، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے برحق ہونے کی دو دلیلیں ابتدا ہی میں دی جا چکی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ تمھارے سامنے قرآنِ مجید پیش کر رہے ہیں جو اُن کے نبی ہونے کا کُھلا ہُوا ثبوت ہے۔ دوم یہ کہ وہ تمھاری اپنی ہی جنس اور قوم اور برادری کے آدمی ہیں۔ اچانک آسمان سے یا کسی دوسری سرزمین سے نہیں آ گئے ہیں کہ تمھارے لیے ان کی زندگی اور سیرت و کردار کو جانچ کر یہ تحقیق کرنا مشکل ہو کہ وہ قابلِ اعتماد آدمی ہیں یا نہیں، اور یہ قرآن اُن کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، اس لیے اُن کے دعوائے نبوت پر تمھارا تعجب بے جا ہے۔ یہ اِستِدلال تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے دو مختصر اشاروں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، کیونکہ جس زمانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود مکّہ میں کھڑے ہو کر اُن لوگوں کو قرآن سُنا رہے تھے، جو بچپن سے جوانی اور اَدھیڑ عمر تک آپؐ کی ساری زندگی دیکھے ہوئے تھے، اُس وقت اِن اشاروں کی پُوری تفصیل ماحول کے ہر شخص پر آپ ہی واضح تھی۔ اس لیے اس کو چھوڑ کر اب تفصیلی اِستِدلال اُس دوسری بات کی صداقت پر کیا جا رہا ہے جس کو وہ لوگ عجیب اور عقل سے بعید کہہ رہے تھے۔

۷ — یہاں آسمان سے مراد وہ پُورا عالَمِ بالا ہے جسے انسان شب و روز اپنے اُوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے۔ جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں۔ جسے آدمی بَرَہنہ آنکھ ہی سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اگر دُوربین لگا لے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اُس کے سامنے آتی ہے جو ناپیدا کنار ہے، کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گُنے بڑے بڑے عظیم الشان سیّارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجے زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پُورا نظامِ شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں (galaxy) کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ تنہا اِسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم ۳ ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں، اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتا دے رہا ہے۔ اِن لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی

وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ۟ۙ

پہاڑ جمائے اور اُس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں۔[9] یہ ساری چیزیں

روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اُس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اَب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدے میں آئی ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اِس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کرسکتے۔ ہوسکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اُس پوری کائنات کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اِس عظیم کارگاہِ ہَستی و بُود کو جو خدا وجود میں لایا ہے، اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوانِ ناطق، جس کا نام انسان ہے، اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اِسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا، تو یہ اِس کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی!

۸ – یعنی اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظامِ کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اِتنی چُست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں ہے، اور اِس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ منبع ۳ ج ۲۹۵ (Source 3c 295) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں، وہ ۴ ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے اِن شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا اگر زمین اور اُس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے دراصل یہ سوال آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے کہ میری کائنات کے اِس نظام میں جب تم ایک ذرا سے رخنے کی نشان دِہی بھی نہیں کرسکتے تو میری قدرت میں اس کمزوری کا تصور کہاں سے تمھارے دماغ میں آ گیا کہ تمھاری مہلتِ امتحان ختم ہو جانے کے بعد تم سے حساب لینے کے لیے میں تمھیں پھر زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنا چاہوں تو نہ کرسکوں گا۔

یہ صرف امکانِ آخرت ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ توحید کا ثبوت بھی ہے۔ چار ارب سال نوری (light years) کی مَسافت سے اِن شعاعوں کا زمین تک پہنچنا، اور یہاں انسان کے بنائے ہوئے آلات کی گرفت میں آنا صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کہکشاں سے لے کر زمین تک کی پُوری دنیا مسلسل ایک ہی مادے سے بنی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی قوتیں اس میں کارفرما ہیں، اور کسی فرق و تفاوُت کے بغیر وہ سب ایک ہی طرح کے قوانین پر کام کر رہی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعاعیں نہ یہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور نہ اُن آلات کی گرفت میں آسکتی تھیں جو انسان نے زمین اور اُس کے ماحول میں کام کرنے والے قوانین کا فہم حاصل کر کے بنائے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا اِس پُوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و مدبّر ہے۔

۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۲-۱۳-۱۴۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾ وَ نَزَّلْنَا مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿۹﴾
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ
وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اُس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رُجوع کرنے والا ہو۔ اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلّے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بر تہ لگتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اِس پانی سے ہم ایک مُردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں۔[10] (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اِسی طرح ہوگا۔[11]

جلد چہارم، الزُّخرُف، حاشیہ ۷۔

۱۰۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳۔۷۴۔۸۱، الروم، حواشی ۲۵۔۳۳۔۳۵۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۲۹۔

۱۱۔ اِستدلال یہ ہے کہ جس خدا نے زمین کے اِس کُرے کو زندہ مخلوقات کی سُکونت کے لیے موزوں مقام بنایا، اور جس نے زمین کی بے جان مٹی کو آسمان کے بے جان پانی کے ساتھ ملا کر اتنی اعلیٰ درجے کی نباتی زندگی پیدا کر دی جسے تم اپنے باغوں اور کھیتوں کی شکل میں لہلہاتے دیکھ رہے ہو، اور جس نے اِس نباتات کو انسان و حیوان سب کے لیے رزق کا ذریعہ بنا دیا، اُس کے متعلق تمہارا یہ گمان کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، سراسر بے عقلی کا گمان ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھتے ہو کہ ایک علاقہ بالکل خشک اور بے جان پڑا ہوا ہے۔ بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے اندر سے یکایک زندگی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، مدّتوں کی مری ہوئی جڑیں یک لخت جی اُٹھتی ہیں، اور طرح طرح کے حشرات الارض زمین کی تہوں سے نکل کر اچھل کُود شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا کُھلا ہوا ثبوت ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ناممکن نہیں ہے۔ اپنے اِس صریح مشاہدے کو جب تم نہیں جُھٹلا سکتے، تو اس بات کو کیسے جھٹلاتے ہو کہ جب خدا چاہے گا، تم خود بھی اُسی طرح زمین سے نکل آؤ گے جس طرح نباتات کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عرب کی سرزمین میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بسا اوقات پانچ پانچ برس بارش نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ مدّت گزر جاتی ہے اور آسمان سے ایک قطرہ تک نہیں ٹپکتا۔ اتنے طویل زمانے

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾
وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ
وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَيِيْنَا
بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ ع

ان سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور اصحاب الرّس[12]، اور ثمود، اور عاد، اور فرعون[13]، اور لُوط کے بھائی، اور اَیکہ والے، اور تُبّع کی قوم[14] کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں[15]۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا[16]، اور آخر کار میری وعید اُن پر چسپاں ہو گئی[17]۔

کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں[18]۔ ع

تک تپتے ہوئے ریگستانوں میں گھاس کی جڑوں اور حشرات الارض کا زندہ رہنا قابلِ تصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود جب وہاں کسی وقت تھوڑی سی بارش بھی ہو جاتی ہے تو گھاس نکل آتی ہے اور حشرات الارض جی اُٹھتے ہیں۔ اس لیے عرب کے لوگ اِس اِستدلال کو اُن لوگوں کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنھیں اتنی طویل خشک سالی کا تجربہ نہیں ہوتا۔

۱۲ – اس سے پہلے سُورۂ فرقان، آیت ۳۸ میں اصحاب الرّس کا ذکر گزر چکا ہے، اور دوسری مرتبہ اب یہاں ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاؑ کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے، کوئی تفصیل ان کے قصّے کی بیان نہیں کی گئی ہے۔ عرب کی رِوایات میں الرّس کے نام سے دو مقام معروف ہیں۔ ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں۔ ان میں نجد کا الرّس زیادہ مشہور ہے اور اشعارِ جاہلیت میں زیادہ تر اُسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ تعیُّن کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرّس اِن دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے قصّے کی بھی کوئی قابلِ اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنویں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآنِ مجید میں جس طرح اُن کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں اہلِ عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصّے سے واقف تھے اور بعد میں یہ رِوایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

۱۳ – قومِ فرعون کے بجائے صرف فرعون کا نام لیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی قوم پر اِس طرح مسلّط تھا کہ اس کے مقابلے

Maktaba Tul Ishaat.com

میں قوم کی کوئی آزادانہ رائے اور عزیمت باقی نہیں رہی تھی۔ جس گمراہی کی طرف وہ جاتا تھا، قوم اس کے پیچھے گھسٹتی چلی جاتی تھی۔ اس بنا پر پُوری قوم کی گمراہی کا ذمہ دار تنہا اُس شخص کو قرار دیا گیا۔ جہاں قوم کے لیے رائے اور عمل کی آزادی موجود ہو، وہاں اپنے اعمال کا بوجھ وہ خود اُٹھاتی ہے۔ اور جہاں ایک آدمی کی آمریّت نے قوم کو بے بس کر رکھا ہو، وہاں وہی ایک آدمی پُوری قوم کے گناہوں کا بار اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فردِ واحد پر یہ بوجھ لَد جانے کے بعد قوم سُبکدوش ہو جاتی ہے۔ نہیں، قوم پر اِس صورت میں اِس اَخلاقی کمزوری کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اُس نے کیوں اپنے اُوپر ایک آدمی کو اس طرح مسلّط ہونے دیا۔ اِسی چیز کی طرف سورۂ زُخرُف، آیت ۵۴ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ ”فرعون نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُخرُف، حاشیہ ۵۰)

۱۴- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سَبا، حاشیہ ۳۷، سورۂ دُخان، حاشیہ ۲۲۔

۱۵- یعنی ان سب نے اپنے رسولوں کی رسالت کو بھی جھٹلایا اور ان کی دی ہوئی اِس خبر کو بھی جھٹلایا کہ تم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جاؤ گے۔

۱٦- اگرچہ ہر قوم نے صرف اُس رسول کو جھٹلایا جو اُس کے پاس بھیجا گیا تھا، مگر چونکہ وہ اُس خبر کو جھٹلا رہی تھی جو تمام رسول بالاتفاق پیش کرتے رہے ہیں، اس لیے ایک رسول کو جھٹلانا درحقیقت تمام رسولوں کو جھٹلا دینا تھا۔ علاوہ بریں اِن قوموں میں سے ہر ایک نے محض اپنے ہاں آنے والے رسول ہی کی رسالت کا انکار نہ کیا تھا، بلکہ وہ سرے سے یہی بات ماننے کے لیے تیّار نہ تھیں کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آ سکتا ہے، اس لیے وہ نفسِ رسالت کی منکر تھیں اور ان میں سے کسی کا جُرم بھی صرف ایک رسول کی تکذیب تک محدود نہ تھا۔

۱۷- یہ آخرت کے حق میں تاریخی اِستدلال ہے۔ اس سے پہلے کی ٦ آیتوں میں امکانِ آخرت کے دلائل دیے گئے تھے، اور اب اِن آیات میں عرب اور اس کے گردو پیش کی قوموں کے تاریخی انجام کو اِس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ آخرت کا جو عقیدہ تمام انبیا علیہم السّلام پیش کرتے رہے ہیں، وہی حقیقت کے عین مطابق ہے، کیونکہ اس کا انکار جس قوم نے بھی کیا، وہ شدید اَخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو کر رہی اور آخر کار خدا کے عذاب نے آ کر اس کے وجود سے دنیا کو پاک کیا۔ آخرت کے انکار اور اخلاق کے بگاڑ کا یہ لُزوم، جو تاریخ کے دوران میں مسلسل نظر آ رہا ہے، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انسان فی الواقع اس دنیا میں غیر ذمہ دار اور غیر جواب دِہ بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ اسے لازماً اپنی مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اسی لیے تو جب کبھی وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر دنیا میں کام کرتا ہے، اس کی پُوری زندگی تباہی کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ کسی کام سے اگر پے در پے غلط نتائج برآمد ہوتے چلے جائیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ کام حقیقت سے متصادم ہو رہا ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ
اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ
عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا
لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ

ہم نے[۱۹] انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب[۲۰] ہیں، (اور ہمارے اِس براہِ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو[۲۱]۔ پھر دیکھو، وہ موت کی جاں کنی حق لے کر آ پہنچی،[۲۲]

۱۸ ــ یہ آخرت کے حق میں عقلی اِستدلال ہے۔ جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اِس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظّم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدایش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اُس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پُوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اب یہ امرِ واقعہ کہ ہم اِس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالَم نہ بنا سکے گا، اور موت کے بعد وہ ہمیں دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا؟

۱۹ ــ آخرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے اس آخرت کو مانو یا اس کا انکار کرو، بہرحال اس کو آنا ہے، اور یہ ایک ایسا امرِ واقعہ ہے جو تمھارے انکار کے باوجود پیش آ کر رہے گا۔ انبیاؑ کی پیشگی تنبیہ کو مان کر اُس وقت کے لیے پہلے سے تیاری کر لو گے تو اپنا بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی اپنی شامت بلاؤ گے۔ تمھارے نہ ماننے سے آخرت آتے آتے رُک نہیں جائے گی اور خدا کا قانونِ عدل معطّل نہ ہو جائے گا۔

۲۰ ــ یعنی ہماری قدرت اور ہمارے علم نے انسان کو اندر اور باہر سے اِس طرح گھیر رکھا ہے کہ اُس کی رگِ گردن بھی اُس سے اُتنی قریب نہیں ہے جتنا ہمارا علم اور ہماری قدرت اس سے قریب ہے۔ اُس کی بات سننے کے لیے ہمیں کہیں سے چل کر نہیں آنا پڑتا، اُس کے دل میں آنے والے خیالات تک کو ہم براہِ راست جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر اسے پکڑنا ہو گا

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ

یہ وہی چیز ہے جس سے تُو بھاگتا تھا۔[۲۳] اور پھر صُور پھُونکا گیا، یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف

تو ہم کہیں سے آ کر اس کو نہیں پکڑیں گے، وہ جہاں بھی ہے، ہر وقت ہماری گرفت میں ہے، جب چاہیں گے اسے دھر لیں گے۔

۲۱ – یعنی ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات وسکنات اور اس کے خیالات کو جانتے ہیں، دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اس کا کوئی قول وفعل ان کے ریکارڈ سے نہیں چھُوٹتا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہو گی، اُس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اس پر شہادت دینے کے لیے دو گواہ بھی موجود ہوں گے، جو اُس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لا کر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہوگا، اس کا ٹھیک ٹھیک تصوّر کرنا تو ہمارے لیے مشکل ہے، مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں، انھیں دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا اور کام کرتا ہے، اُس میں ہر طرف اُس کی آوازیں، اُس کی تصویریں اور اُس کی حرکات وسکنات کے نُقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں، اور ان میں سے ہر چیز کو بعینہٖ اُنھی شکلوں اور آوازوں میں دوبارہ اِس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرّہ برابر فرق نہ ہو۔ انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے فرشتے نہ اِن آلات کے محتاج ہیں، نہ اِن قُیود سے مقیّد۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد وپیش کی ہر چیز اُن کی ٹیپ اور اُن کی فلم ہے جس پر وہ ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جُوں کی تُوں ثبت کر سکتے ہیں اور قیامت کے روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اُس کی اپنی آواز میں اُس کی وہ باتیں سنوا سکتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتا تھا، اور اس کی اپنی آنکھوں سے اس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں جن کی صحّت سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دے دے گا، بلکہ عدل کی تمام شرائط پُوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اسی لیے دنیا میں ہر شخص کے اقوال وافعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے، تاکہ اس کی کارگزاریوں کا پُورا ثبوت ناقابلِ انکار شہادتوں سے فراہم ہو جائے۔

۲۲ – حق لے کر آ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ موت کی جانکنی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے وہ حقیقت کھُلنی شروع ہو جاتی ہے جس پر دنیا کی زندگی میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ اِس مقام سے آدمی وہ دوسرا عالَم صاف دیکھنے لگتا ہے جس کی خبر انبیا علیہم السّلام نے دی تھی۔ یہاں آدمی کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آخرت بالکل برحق ہے، اور یہ حقیقت بھی اس کو معلوم ہو جاتی ہے کہ زندگی کے اِس دوسرے مرحلے میں وہ نیک بخت کی حیثیت سے داخل ہو رہا ہے یا

الْوَعِيْدِ ۝٢٠ وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۝٢١
لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ
فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝٢٢ وَ قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝٢٣

دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اِس حال میں آگیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔[25] اِس چیز کی طرف سے تُو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔[26] اُس کے ساتھی نے عرض کیا: یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے۔[27]

بدبخت کی حیثیت سے۔

۲۳- یعنی یہ وہی حقیقت ہے جس کو ماننے سے تو کنّی کتراتا تھا۔ تو چاہتا تھا کہ دنیا میں بے نتھے بیل کی طرح چھوٹا پھرے اور مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں تجھے اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ اسی لیے آخرت کے تصوّر سے تو دُور بھاگتا تھا اور کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ کبھی یہ عالَم بھی برپا ہونا ہے۔ اب دیکھ لے، یہ وہی دوسرا عالَم تیرے سامنے آ رہا ہے۔

۲۴- اس سے مراد وہ نفخ صُور ہے جس کے ساتھ ہی تمام مرے ہوئے لوگ دوبارہ حیاتِ جسمانی پا کر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حواشی ۴۶-۴۷، الزُّمَر، حاشیہ ۷۹۔

۲۵- اغلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہی دو فرشتے ہیں جو دنیا میں اُس شخص کے قول و عمل کا ریکارڈ مُرتّب کرنے کے لیے مامور رہے تھے۔ قیامت کے روز جب صُور کی آواز بلند ہوتے ہی ہر انسان اپنے مَرقَد سے اُٹھے گا تو فوراً وہ دونوں فرشتے آ کر اسے اپنے چارج میں لے لیں گے۔ ایک اسے عدالت گاہِ خداوندی کی طرف ہانکتا ہوا لے چلے گا، اور دوسرا اس کا نامۂ اعمال ساتھ لیے ہوئے ہوگا۔

۲۶- یعنی اب تو تجھے خوب نظر آ رہا ہے کہ وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جس کی خبر خدا کے نبی تجھے دیتے تھے۔

۲۷- بعض مفسّرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے آیت نمبر ۲۱ میں "گواہی دینے والا" فرمایا گیا ہے۔ وہ کہے گا کہ یہ اس شخص کا نامۂ اعمال میرے پاس تیار ہے۔ کچھ دوسرے مفسّرین کہتے ہیں کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ عرض کرے گا کہ یہ شخص جس کو میں نے اپنے قابو میں کر کے جہنّم کے لیے تیار کیا تھا، اب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مگر سیاق و سباق سے زیادہ مناسبت رکھنے والی تفسیر وہ ہے جو

Maktaba Tul Ishaat.com

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
مُّرِيبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ
الشَّدِيدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ فِي

حکم دیا گیا: ''پھینک دو جہنّم میں[۲۸] ہر کٹّے کافر کو[۲۹] جو حق سے عِناد رکھتا تھا، خیر کو روکنے والا[۳۰] اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا،[۳۱] شک میں پڑا ہوا تھا[۳۲] اور اللہ کے ساتھ کسی دُوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ڈال دو اُسے سخت عذاب میں۔''[۳۳] اُس کے ساتھی نے عرض کیا: ''خداوندا! میں نے اِس کو سرکش نہیں بنایا

قتادہؒ اور ابنِ زیدؒ سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ساتھی سے مراد ہانک کر لانے والا فرشتہ ہے، اور وہی عدالتِ الٰہی میں پہنچ کر عرض کرے گا کہ یہ شخص جو میری سُپردگی میں تھا، سرکار کی پیشی میں حاضر ہے۔

۲۸ – اصل الفاظ ہیں: اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ ''پھینک دو جہنّم میں تم دونوں''۔ سلسلۂ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ حکم اُن دونوں فرشتوں کو دیا جائے گا جنھوں نے مَرقَد سے اٹھتے ہی مجرم کو گرفتار کیا تھا اور لا کر عدالت میں حاضر کر دیا تھا۔

۲۹ – اصل میں لفظ ''کَفَّار'' استعمال ہوا ہے جس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، سخت ناشُکرا۔ دوسرے، سخت منکرِ حق۔

۳۰ – خیر کا لفظ عربی زبان میں مال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بھلائی کے لیے بھی۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے کسی کا حق ادا نہ کرتا تھا، نہ خدا کا نہ بندوں کا۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ بھلائی کے راستے سے خود ہی رُک جانے پر اِکتفانہ کرتا تھا، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ دنیا میں خیر کے لیے سدِّ راہ بنا ہوا تھا۔ اپنی ساری قوتیں اس کام میں صَرف کر رہا تھا کہ نیکی کسی طرح پھیلنے نہ پائے۔

۳۱ – یعنی اپنے ہر کام میں اَخلاق کی حدیں توڑ دینے والا تھا۔ اپنے مفاد اور اپنی اغراض اور خواہشات کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔ حرام طریقوں سے مال سمیٹتا اور حرام راستوں میں صَرف کرتا تھا۔ لوگوں کے حُقوق پر دست درازیاں کرتا تھا۔ نہ اس کی زبان کسی حد کی پابند تھی، نہ اس کے ہاتھ کسی ظلم اور زیادتی سے رُکتے تھے۔ بھلائی کے راستے میں صرف رکاوٹیں ڈالنے ہی پر بس نہ کرتا تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بھلائی اختیار کرنے والوں کو ستاتا تھا اور بھلائی کے لیے کام کرنے والوں پر ستم ڈھاتا تھا۔

۳۲ – اصل میں لفظ ''مُرِیْب'' استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، شک کرنے والا۔ دوسرے، شک میں ڈالنے والا۔ اور دونوں ہی معنیٰ یہاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود شک میں پڑا ہوا تھا اور دوسروں کے دلوں میں شکوک

ضَلٰلٍۭ بَعِيۡدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخۡتَصِمُوۡا لَدَىَّ وَ قَدۡ قَدَّمۡتُ اِلَيۡكُمۡ
بِالۡوَعِيۡدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَىَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۲۹﴾ ع

ع ۲ ۱۴ ۱۷

بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا"[۳۴] جواب میں ارشاد ہوا: "میرے حضور جھگڑا نہ کرو، مَیں تم کو پہلے ہی انجامِ بد سے خبردار کر چکا تھا۔[۳۵] میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی[۳۶] اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں۔"[۳۷] ع

ڈالتا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ اور آخرت اور ملائکہ اور رسالت اور وحی، غرض دین کی سب صداقتیں مشکوک تھیں۔ حق کی جو بات بھی انبیاؑ کی طرف سے پیش کی جاتی تھی، اُس کے خیال میں وہ قابلِ یقین نہ تھی۔ اور یہی بیماری وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو لگاتا پھرتا تھا۔ جس شخص سے بھی اس کو سابقہ پیش آتا، اُس کے دل میں وہ کوئی نہ کوئی شک اور کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتا۔

۳۳- اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات گن کر بتا دی ہیں جو انسان کو جہنّم کا مستحق بنانے والی ہیں: (۱) انکارِ حق، (۲) خدا کی ناشکری، (۳) حق اور اہلِ حق سے عناد، (۴) بھلائی کے راستے میں سدِّ راہ بننا، (۵) اپنے مال سے خدا اور بندوں کے حقوق ادا نہ کرنا، (۶) اپنے معاملات میں حدود سے تجاوز کرنا، (۷) لوگوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنا، (۸) دین کی صداقتوں پر شک کرنا، (۹) دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالنا، اور (۱۰) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدائی میں شریک ٹھیرانا۔

۳۴- یہاں فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور یہ بات بھی اندازِ بیان ہی سے مترشح ہوتی ہے کہ وہ شخص اور اُس کا شیطان، دونوں خدا کی عدالت میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حضور! یہ ظالم میرے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اِسی نے آخرکار مجھے گمراہ کر کے چھوڑا، اِس لیے سزا اِس کو ملنی چاہیے۔ اور شیطان جواب میں کہتا ہے کہ سرکار! میرا اِس پر کوئی زور تو نہیں تھا کہ یہ سرکش نہ بننا چاہتا ہو اور میں نے زبردستی اس کو سرکش بنا دیا ہو۔ یہ کم بخت تو خود نیکی سے نفور اور بدی پر فریفتہ تھا۔ اسی لیے انبیاؑ کی کوئی بات اِسے پسند نہ آئی اور میری ترغیبات پر یہ پھسلتا چلا گیا۔

۳۵- یعنی تم دونوں ہی کو مَیں نے متنبّہ کر دیا تھا کہ تم میں سے جو بہکائے گا وہ کیا سزا پائے گا، اور جو بہکے گا اُسے کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میری اس تنبیہ کے باوجود جب تم دونوں اپنے اپنے حصّے کا جرم کرنے سے باز نہ آئے تو اب جھگڑا کرنے سے حاصل کیا ہے۔ بہکنے والے کو بہکنے کی اور بہکانے والے کو بہکانے کی سزا تو اب لازماً ملنی ہی ہے۔

۳۶- یعنی فیصلے بدلنے کا دستور میرے ہاں نہیں ہے۔ تم کو جہنّم میں پھینک دینے کا جو حکم میں دے چکا ہوں،

Maktaba Tul Ishaat.com

يَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امۡتَلَاۡتِ وَتَقُوۡلُ هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ ۝۳۰

وہ دن جب کہ ہم جہنّم سے پُوچھیں گے: ”کیا تُو بھر گئی؟“ اور وہ کہے گی: ”کیا اور کچھ ہے؟“[۳۸]

وہ اب واپس نہیں لیا جا سکتا۔ اور نہ اُس قانون ہی کو بدلا جا سکتا ہے جس کا اعلان میں نے دنیا میں کر دیا تھا کہ گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے کی کیا سزا آخرت میں دی جائے گی۔

۳۷- اصل میں لفظ ”ظَلَّامٍ“ استعمال ہوا ہے جس کے معنٰی بہت بڑے ظالم کے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مَیں اپنے بندوں کے حق میں ظالم تو ہوں مگر بہت بڑا ظالم نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں خالق اور رب ہو کر اپنی ہی پرورَدہ مخلوق پر ظلم کروں تو بہت بڑا ظالم ہوں گا۔ اس لیے میں سرے سے کوئی ظلم بھی اپنے بندوں پر نہیں کرتا۔ یہ سزا جو میں تم کو دے رہا ہوں، یہ ٹھیک ٹھیک وہی سزا ہے جس کا مستحق تم نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے۔ تمھارے استحقاق سے رَتّی بھر بھی زیادہ سزا تمھیں نہیں دی جا رہی ہے۔ میری عدالت بے لاگ انصاف کی عدالت ہے۔ یہاں کوئی شخص کوئی ایسی سزا نہیں پا سکتا جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو اور جس کے لیے اس کا استحقاق بالکل یقینی شہادتوں سے ثابت نہ کر دیا گیا ہو۔

۳۸- اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ”میرے اندر اب مزید آدمیوں کی گنجایش نہیں ہے۔“ دوسرے یہ کہ ”اور جتنے مجرم بھی ہیں انھیں لے آیئے۔“ پہلا مطلب لیا جائے تو اس ارشاد سے تصوّر یہ سامنے آتا ہے کہ مجرموں کو جہنّم میں اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہے کہ اس میں ایک سُوئی کی بھی گنجایش نہیں رہی، حتّٰی کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تُو بھر گئی تو وہ گھبرا کر چیخ اٹھی کہ کیا ابھی اور آدمی بھی آنے باقی ہیں؟ دوسرا مطلب لیا جائے تو یہ تصوّر ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جہنم کا غیظ اِس وقت مجرموں پر کچھ اِس بُری طرح بھڑکا ہوا ہے کہ وہ ھَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ کا مطالبہ کیے جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ آج کوئی مجرم اس سے چھُوٹنے نہ پائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہنّم سے اللہ تعالیٰ کے اِس خطاب اور اس کے جواب کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ محض مجازی کلام ہے؟ یا فی الواقع جہنّم کوئی ذی روح اور ناطق چیز ہے جسے مُخاطَب کیا جا سکتا ہو اور وہ بات کا جواب دے سکتی ہو؟ اِس معاملے میں درحقیقت کوئی بات قطعیّت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مجازی کلام ہو اور محض صورتِ حال کا نقشہ کھینچنے کے لیے جہنّم کی کیفیّت کو سوال و جواب کی شکل میں بیان کیا گیا ہو، جیسے کوئی شخص یُوں کہے کہ مَیں نے موٹر سے پوچھا: تو چلتی کیوں نہیں؟ اُس نے جواب دیا: میرے اندر پٹرول نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل ممکن ہے کہ یہ کلام مبنی برحقیقت ہو۔ اس لیے کہ دنیا کی جو چیزیں ہمارے لیے جامد و صامت ہیں، اُن کے متعلق ہمارا یہ گمان کرنا دُرست نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ویسی ہی جامد و صامت ہوں گی۔ خالق اپنی ہر مخلوق سے کلام کر سکتا ہے اور اس کی ہر مخلوق اُس کے کلام کا جواب دے سکتی ہے، خواہ ہمارے لیے اس کی زبان کتنی ہی ناقابلِ فہم ہو۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿٣١﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ
لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿٣٢﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ
بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿٣٤﴾ لَهُمْ

اور جنّت متّقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دُور نہ ہوگی۔[39] ارشاد ہوگا: "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا[40] اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا،[41] جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا،[42] اور جو دلِ گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔[43] داخل ہو جاؤ جنّت میں سلامتی کے ساتھ۔"[44] وہ دن حیاتِ ابدی کا دن ہوگا۔ وہاں ان کے لیے

۳۹ – یعنی جوں ہی کسی شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ کی عدالت سے یہ فیصلہ ہوگا کہ وہ متّقی اور جنّت کا مستحق ہے، فی الفور وہ جنّت کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اُسے کوئی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی کہ پاؤں سے چل کر یا کسی سواری میں بیٹھ کر سفر کرتا ہوا وہاں جائے اور فیصلے کے وقت اور دُخولِ جنّت کے درمیان کوئی وقفہ ہو۔ بلکہ اِدھر فیصلہ ہوا اور اُدھر متّقی جنّت میں داخل ہو گیا۔ گویا وہ جنت میں پہنچایا نہیں گیا ہے بلکہ خود جنّت ہی اُٹھا کر اس کے پاس لے آئی گئی ہے۔ اس سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالَمِ آخرت میں زمان و مکان کے تصوّرات ہماری اِس دنیا کے تصوّرات سے کس قدر مختلف ہوں گے۔ جلدی اور دیر اور دُوری اور نزدیکی کے وہ سارے مفہومات وہاں بے معنی ہوں گے جن سے ہم اس دنیا میں واقف ہیں۔

۴۰ – اصل میں لفظ "اَوّاب" استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس نے نافرمانی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کا راستہ چھوڑ کر طاعت اور اللہ کی رضا جوئی کا راستہ اختیار کر لیا ہو، جو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہے، اور ہر اُس چیز کو اختیار کر لے جو اللہ کو پسند ہے، جو راہِ بندگی سے ذرا قدم ہٹتے ہی گھبرا اٹھے اور توبہ کر کے بندگی کی راہ پر پلٹ آئے، جو کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اُس کی طرف رُجوع کرنے والا ہو۔

۴۱ – اصل میں لفظ "حفیظ" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "حفاظت کرنے والا"۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اللہ کے حدود اور اس کے فرائض اور اس کی حُرمتوں اور اس کی سُپرد کی ہوئی امانتوں کی حفاظت کرے، جو اُن حُقوق کی نگہداشت کرے جو اللہ کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں، جو اُس عہد و پیمان کی نگہداشت کرے جو ایمان لا کر اُس نے اپنے رب سے کیا ہے، جو اپنے اوقات اور اپنی قوتوں اور محنتوں اور کوششوں کی پاسبانی کرے کہ ان میں سے کوئی چیز غلط کاموں میں ضائع نہ ہو، جو توبہ کر کے اس کی حفاظت کرے اور اسے پھر نہ ٹوٹنے دے، جو ہر وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

اپنا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ کہیں میں اپنے قول یا فعل میں اپنے رب کی نافرمانی تو نہیں کر رہا ہوں۔

۴۲ – یعنی باوجود اس کے کہ رحمٰن اُس کو کہیں نظر نہ آتا تھا اور اپنے حواس سے کسی طرح بھی وہ اس کو محسوس نہ کر سکتا تھا، پھر بھی وہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس کے دل پر دوسری محسوس طاقتوں اور علانیہ نظر آنے والی زور آور ہستیوں کے خوف کی بہ نسبت اُس اَن دیکھے رحمٰن کا خوف زیادہ غالب تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رحمٰن ہے، اس کی رحمت کے بھروسے پر وہ گناہ گار نہیں بنا، بلکہ ہمیشہ اس کی ناراضی سے ڈرتا ہی رہا۔ اِس طرح یہ آیت مومن کی دو اہم اور بنیادی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک، یہ کہ وہ محسوس نہ ہونے اور نظر نہ آنے کے باوجود خدا سے ڈرتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ خدا کی صفتِ رحمت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود گناہوں پر جَری نہیں ہوتا۔ یہی دو خوبیاں اسے اللہ کے ہاں قدر کا مستحق بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ اِس میں ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے امام رازیؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ عَرَبی زبان میں ڈر کے لیے خوف اور خَشیَت، دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، جن کے مفہوم میں ایک باریک فرق ہے۔ خوف کا لفظ بالعُموم اُس ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی طاقت کے مقابلے میں اپنی کمزوری کے احساس کی بنا پر آدمی کے دل میں پیدا ہو۔ اور خَشیَت اُس ہیبت کے لیے بولتے ہیں جو کسی کی عظمت کے تصوّر سے آدمی کے دِل پر طاری ہو۔ یہاں خوف کے بجائے خَشیَت کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے دل میں اللہ کا ڈر محض اس کی سزا کے خوف ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ کی عظمت و بزرگی کا احساس اُس پر ہر وقت ایک ہیبت طاری کیے رکھتا ہے۔

۴۳ – اصل الفاظ ہیں: ”قلبِ مُنیب“ لے کر آیا ہے۔ مُنیب اِنابت سے ہے، جس کے معنیٰ ایک طرف رُخ کرنے اور بار بار اُسی کی طرف پلٹنے کے ہیں۔ جیسے قُطب نُما کی سُوئی ہمیشہ قطب ہی کی طرف رُخ کیے رہتی ہے، اور آپ خواہ کتنا ہی ہِلائیں جُلائیں، وہ ہر پھر کر پھر قطب ہی کی سَمت میں آ جاتی ہے۔ پس قلبِ مُنیب سے مراد ایسا دل ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک اللہ کی طرف مڑ گیا، اور پھر زندگی بھر جو احوال بھی اُس پر گزرے ان میں وہ بار بار اسی کی طرف پلٹتا رہا۔ اِسی مفہوم کو ہم نے دلِ گرویدہ کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں اصلی قدر اُس شخص کی ہے جو محض زبان سے نہیں بلکہ پُورے خلوص کے ساتھ سچّے دل سے اُسی کا ہو کر رہ جائے۔

۴۴ – اصل الفاظ ہیں: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ۔ سلام کو اگر سلامتی کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے رنج اور غم اور فکر اور آفات سے محفوظ ہو کر اس جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ اور اگر اسے سلام ہی کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ آؤ اس جنّت میں اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے تم کو سلام ہے۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات بتا دی ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص جنت کا مستحق ہوتا ہے، اور وہ ہیں: (۱) تقویٰ، (۲) رُجوع اِلی اللہ، (۳) اللہ سے اپنے تعلق کی نگہداشت، (۴) اللہ کو دیکھے بغیر اور اس کی رحیمی پر یقین رکھنے کے باوجود اس سے ڈرنا، اور (۵) قلبِ مُنیب لیے ہوئے اللہ کے ہاں پہنچنا، یعنی مرتے دم تک اِنابت کی رَوِش پر قائم رہنا۔

مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿٣٥﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ
قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿٣٧﴾
وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ

وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے۔[۴۵]

ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انھوں نے چھان مارا تھا۔[۴۶] پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟[۴۷] اِس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات کو سُنے۔[۴۸]

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا[۴۹]

۴۵ — یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی، مگر اس پر مزید ہم اُنھیں وہ کچھ بھی دیں گے جس کا کوئی تصوّر تک ان کے ذہن میں نہیں آیا ہے کہ وہ اس کے حاصل کرنے کی خواہش کریں۔

۴۶ — یعنی صرف اپنے ملک ہی میں وہ زور آور نہ تھیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہ جا گھُسی تھیں اور ان کی تاخت کا سلسلہ رُوئے زمین پر دُور دُور تک پہنچا ہوا تھا۔

۴۷ — یعنی جب خدا کی طرف سے ان کی پکڑ کا وقت آیا تو کیا ان کی وہ طاقت اُن کو بچا سکی؟ اور کیا دنیا میں پھر کہیں ان کو پناہ مل سکی؟ اب آخر تم کس بھروسے پر یہ اُمید رکھتے ہو کہ خدا کے مقابلے میں بغاوت کر کے تمھیں کہیں پناہ مل جائے گی؟

۴۸ — بالفاظِ دیگر جو یا تو خود اپنی گرہ کی اتنی عقل رکھتا ہو کہ صحیح بات سوچے، یا نہیں تو غفلت اور تعصّب سے اتنا پاک ہو کہ جب دوسرا کوئی شخص اسے حقیقت سمجھائے تو وہ کھلے کانوں سے اس کی بات سنے۔ یہ نہ ہو کہ سمجھانے والے کی آواز کان کے پردے پر سے گزر رہی ہے اور سننے والے کا دماغ کسی اور طرف مشغول ہے۔

۴۹ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ
اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾

اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔[۵۰] پس اَے نبیؐ! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طُلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے، اور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔[۵۱]

اور سنو، جس دن مُنادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پُکارے[۵۲] گا،

۵۰ – یعنی امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ پُوری کائنات ہم نے چھ دن میں بنا ڈالی ہے اور اُس کو بنا کر ہم تھک نہیں گئے ہیں کہ اُس کی تعمیرِ نو کرنا ہمارے بس میں نہ رہا ہو۔ اب اگر یہ نادان لوگ تم سے زندگی بعدِ موت کی خبر سُن کر تمھارا مذاق اڑاتے ہیں اور تمھیں دیوانہ قرار دیتے ہیں تو اس پر صبر کرو۔ ٹھنڈے دل سے اِن کی ہر بے ہُودہ بات کو سنو اور جس حقیقت کے بیان کرنے پر تم مامور کیے گئے ہو، اسے بیان کرتے چلے جاؤ۔

اِس آیت میں ضمناً ایک لطیف طنز یہود و نصاریٰ پر بھی ہے جن کی بائبل میں یہ افسانہ گھڑا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ (پیدائش ۲:۲) اگرچہ اب مسیحی پادری اس بات سے شرمانے لگے ہیں اور انھوں نے کتابِ مقدس کے اُردو ترجمے میں ”آرام کیا“ کو ”فارغ ہوا“ سے بدل دیا ہے۔ مگر کنگ جیمز کی مستند انگریزی بائبل میں and He rested on the seventh day کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ اور یہی الفاظ اُس ترجمے میں بھی پائے جاتے ہیں جو ۱۹۵۴ء میں یہودیوں نے فلیڈلفیا سے شائع کیا ہے۔ عربی ترجمے میں بھی فَاسْتَرَاحَ فِی الْيَوْمِ السَّابِعِ کے الفاظ ہیں۔

۵۱ – یہ ہے وہ ذریعہ جس سے آدمی کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ دعوتِ حق کی راہ میں اُسے خواہ کیسے ہی دل شکن اور رُوح فرسا حالات سے سابقہ پیش آئے، اور اس کی کوششوں کا خواہ کوئی ثمرہ بھی حاصل ہوتا نظر نہ آئے، پھر بھی وہ پُورے عزم کے ساتھ زندگی بھر کلمۂ حق بلند کرنے اور دنیا کو خیر کی طرف بلانے کی سعی جاری رکھے۔ رب کی حمد اور اس کی تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے، اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے۔ ”طُلوعِ آفتاب سے پہلے“ فجر کی نماز ہے۔ ”غُروبِ آفتاب سے پہلے“ دو نمازیں ہیں: ایک ظہر، دوسری عصر۔ ”رات کے وقت“ مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں، اور تیسری تہجّد بھی رات کی تسبیح میں شامل

ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۹۱ تا ۹۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱، الرُّوم، حواشی ۲۳-۲۴) رہی وہ تسبیح جو" سجود سے فارغ ہونے کے بعد" کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، تو اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ بھی ہوسکتا ہے اور فرض کے بعد نفل ادا کرنا بھی۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرات ابو ہریرہؓ، ابنِ عباسؓ، شَعْبیؒ، مجاہدؒ، عِکرِمہؒ، حَسن بصریؒ، قَتادہؒ، ابراہیم نَخَعیؒ اور اَوزاعیؒ اس سے مراد نماز مغرب کے بعد کی دو رکعتیں لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن العاص اور ایک رِوایت کے بموجب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہ خیال ہے کہ اس سے مراد ذِکر بعد الصلوٰۃ ہے۔ اور ابنِ زیدؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد بھی نوافل ادا کیے جائیں۔

صَحِیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! مال دار لوگ تو بڑے درجے لُوٹ لے گئے۔" حضورؐ نے فرمایا: "کیا ہوا؟" انھوں نے عرض کیا: "وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تمھیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے، بجز اُن کے جو وہی عمل کریں جو تم کرو گے؟ وہ عمل یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو۔" کچھ مدت کے بعد اُن لوگوں نے عرض کیا کہ "ہمارے مال دار بھائیوں نے بھی یہ بات سن لی ہے اور وہ بھی یہی عمل کرنے لگے ہیں۔" اس پر آپؐ نے فرمایا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ ایک رِوایت میں ان کلمات کی تعداد ۳۳-۳۳ کے بجائے دس دس بھی منقول ہوئی ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ہدایت فرمائی تھی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کہا کریں اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہیں۔ بعد میں ایک انصاری نے عرض کیا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی کہتا ہے: اگر تم ۲۵-۲۵ مرتبہ یہ تین کلمے کہو اور پھر ۲۵ مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔" حضورؐ نے فرمایا: "اچھا اِسی طرح کیا کرو۔" (احمد، نَسائی، دارِمی)

حضرت ابو سعید خُدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر جب پلٹتے تھے تو میں نے آپؐ کو یہ الفاظ کہتے سُنا ہے: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (احکام القرآن للجصّاص)

اس کے علاوہ بھی ذکر بعد الصلوٰۃ کی متعدِد صورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں۔ جو حضرات قرآنِ مجید کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیں وہ مشکوٰۃ، باب الذکر بعد الصّلوٰۃ میں سے کوئی ذکر جو اُن کے دل کو سب سے زیادہ اچھا لگے، چھانٹ کر یاد کرلیں اور اس کا التزام کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بتائے ہوئے ذکر سے بہتر اور کون سا ذکر ہوسکتا ہے۔ مگر یہ خیال رکھیں کہ ذکر سے اصل مقصود چند مخصوص الفاظ کو زبان سے گزار دینا نہیں ہے، بلکہ اُن معانی کو ذہن میں تازہ اور مستحکم کرنا ہے جو ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے جو ذکر بھی کیا جائے، اس کے معنٰی اچھی طرح سمجھ لینے چاہییں اور پھر معنٰی کے استحضار کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝۴۲ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۝۴۳ۙ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ۝۴۴

جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سُن رہے ہوں گے،[۵۳] وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہماری طرف ہی اُس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔[۵۴]

۵۲ - یعنی جو شخص جہاں مرا پڑا ہوگا، یا جہاں بھی دنیا میں اس کی موت واقع ہوئی تھی، وہیں خدا کے مُنادی کی آواز اُس کو پہنچے گی کہ اُٹھو اور چلو اپنے رب کی طرف اپنا حساب دینے کے لیے۔ یہ آواز کچھ اِس طرح کی ہوگی کہ رُوئے زمین کے چپّے چپّے پر جو شخص بھی زندہ ہو کر اُٹھے گا، وہ محسوس کرے گا کہ پکارنے والے نے کہیں قریب ہی سے اس کو پُکارا ہے۔ ایک ہی وقت میں پُورے کُرۂ ارض پر ہر جگہ یہ آواز یکساں سنائی دے گی۔ اس سے بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالَمِ آخرت میں زمان و مکان کے اعتبارات ہماری موجودہ دنیا کی بہ نسبت کس قدر بدلے ہوئے ہوں گے اور کیسی قوتیں کس طرح کے قوانین کے مطابق وہاں کارفرما ہوں گی۔

۵۳ - اصل الفاظ ہیں: يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ۔ اس کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ سب لوگ امرِ حق کی پکار کو سُن رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سُن رہے ہوں گے۔ پہلے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ لوگ اُسی امرِ حق کی پکار کو اپنے کانوں سے سُن رہے ہوں گے جس کو دنیا میں وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، جس سے انکار کرنے پر انھیں اصرار تھا، اور جس کی خبر دینے والے پیغمبروں کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ آوازۂ حشر سُنیں گے، انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی وہم نہیں ہے بلکہ واقعی یہ آوازۂ حشر ہی ہے، کوئی شبہ انھیں اس امر میں نہ رہے گا کہ جس حشر کی انھیں خبر دی گئی تھی، وہ آ گیا ہے اور یہ اُسی کی پکار بلند ہو رہی ہے۔

۵۴ - یہ جواب ہے کُفّار کی اُس بات کا جو آیت ۳ میں نقل کی گئی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر خاک ہو چکے ہوں اُس وقت ہمیں پھر سے زندہ کر کے اُٹھا کھڑا کیا جائے، یہ واپسی تو بعید از عقل و امکان ہے۔ اُن کی اِسی بات کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ حشر، یعنی سب اگلے پچھلے انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کر لینا

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝۴۵ ع

اَے نبیؐ! جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انھیں ہم خوب جانتے ہیں،[55] اور تمھارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے[56]۔ ع

ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔ ہمارے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کس شخص کی خاک کہاں پڑی ہے۔ ہمیں یہ جاننے میں بھی کوئی دقت نہیں پیش آئے گی کہ ان بکھرے ہوئے ذرات میں سے زید کے ذرات کون سے ہیں اور بکر کے ذرات کون سے۔ ان سب کو الگ الگ سمیٹ کر ایک ایک آدمی کا جسم پھر سے بنا دینا، اور اُس جسم میں اُسی شخصیت کو از سرِ نَو پیدا کر دینا جو پہلے اس میں رہ چکی تھی، ہمارے لیے کوئی بڑا محنت طلب کام نہیں ہے، بلکہ ہمارے ایک اشارے سے یہ سب کچھ آناً فاناً ہو سکتا ہے۔ وہ تمام انسان جو آدمؑ کے وقت سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہیں، ہمارے ایک حکم پر بڑی آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں۔ تمھارا چھوٹا سا دماغ اسے بعید سمجھتا ہو تو سمجھا کرے۔ خالقِ کائنات کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔

۵۵- اِس فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی بھی ہے اور کفّار کے لیے دھمکی بھی۔ حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں اُن کی قطعاً پروا نہ کرو، ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور اِن سے نمٹنا ہمارا کام ہے۔ کفّار کو متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نبی پر جو فقرے تم کس رہے ہو، وہ تمھیں بہت مہنگے پڑیں گے۔ ہم خود ایک ایک بات سن رہے ہیں اور اس کا خمیازہ تمھیں بھگتنا پڑے گا۔

۵۶- اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جبراً لوگوں سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس سے روک دیا۔ بلکہ دراصل یہ بات حضورؐ کو مخاطب کر کے کفّار کو سنائی جا رہی ہے۔ گویا ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارا نبی تم پر جبّار بنا کر تو نہیں بھیجا گیا ہے۔ اُس کا کام زبردستی تمھیں مومن بنانا نہیں ہے کہ تم نہ ماننا چاہو اور وہ جبراً تم سے منوائے۔ اس کی ذمہ داری تو بس اتنی ہے کہ جو متنبّہ کرنے سے ہوش میں آ جائے، اُسے قرآن سُنا کر حقیقت سمجھا دے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو نبی تم سے نہیں نمٹے گا بلکہ ہم تم سے نمٹیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الذّٰرِیٰت

(۵۱)

الذّٰریٰت

نام پہلے ہی لفظ وَ الذّٰرِیٰتِ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ سُورت جس کی ابتدا لفظ الذّاریات سے ہوتی ہے۔

زمانۂ نُزُول مضامین اور اندازِ بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ تکذیب و استہزا اور جھوٹے الزامات سے تو بڑے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا، مگر ابھی ظلم و تشدّد کی چکّی چلنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ بھی اُسی دَور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے جس میں سورۂ ق نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مَباحِث اس کا بڑا حصّہ آخرت کے موضوع پر ہے، اور آخر میں توحید کی دعوت پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو اس بات پر بھی مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بات نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ تصورات پر اصرار کرنا خود انھی قوموں کے لیے تباہ کُن ثابت ہوا ہے جنھوں نے یہ رَوِش اختیار کی ہے۔

آخرت کے متعلق جو بات اس سورہ کے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت پُرمعنیٰ فقروں میں بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مآل و انجام کے بارے میں لوگوں کے مختلف اور متضاد عقیدے خود اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ اِن میں سے کوئی عقیدہ بھی علم پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ہر ایک نے قیاسات دوڑا کر اپنی جگہ جو نظریہ قائم کر لیا، اُسی کو وہ اپنا عقیدہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے سمجھا کہ زندگی بعدِ موت نہیں ہوگی۔ کسی نے اس کو مانا تو تناسُخ کی شکل میں مانا۔ کسی نے حیاتِ اُخروی اور جزا و سزا کو تسلیم کیا تو جزائے اعمال سے بچنے کے لیے طرح طرح کے سہارے تجویز کر لیے۔ اتنے بڑے اور اہم ترین بنیادی مسئلے پر، جس کے بارے میں آدمی کی رائے کا غلط ہو جانا اُس کی پوری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کے مستقبل کو برباد کر ڈالتا ہے، علم کے بغیر محض قیاسات کی بِنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا ایک تباہ کُن حماقت ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہ کر ساری عمر جاہلانہ غفلت میں گزار دے اور مرنے کے بعد اچانک ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جس کے لیے اُس نے قطعاً کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ایسے مسئلے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو آخرت کے متعلق جو علم خدا کی طرف سے اُس کا نبی دے رہا ہے اُس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور زمین و آسمان کے نظام اور خود اپنے وجود پر نگاہ ڈال کر کھُلی آنکھوں سے دیکھے کہ کیا اُس علم کے صحیح ہونے کی

Maktaba Tul Ishaat.com

شہادت ہر طرف موجود نہیں ہے؟ اس سلسلے میں ہوا اور بارش کے انتظام کو، زمین کی ساخت اور اُس کی مخلوقات کو، انسان کے اپنے نفس کو، آسمان کی تخلیق کو، اور دنیا کی تمام اشیا کے جوڑوں کی شکل میں بنائے جانے کو آخرت کی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور انسانی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح ایک قانونِ مُکافات کا مقتضی نظر آ رہا ہے۔

اس کے بعد بڑے مختصر انداز میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمھارے خالق نے تم کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ تمھارے بناوٹی معبُودوں کی طرح نہیں ہے جو تم سے رزق لیتے ہیں اور تمھاری مدد کے بغیر جن کی خدائی نہیں چل سکتی۔ وہ ایسا معبُود ہے جو سب کا رزّاق ہے، کسی سے رزق لینے کا محتاج نہیں، اور جس کی خدائی خود اُس کے اپنے بل بُوتے پر چل رہی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انبیا علیہم السّلام کا مقابلہ جب بھی کیا گیا ہے، کسی معقول بنیاد پر نہیں بلکہ اُسی ضد اور ہٹ دھرمی اور جاہلانہ غُرور کی بنیاد پر کیا گیا ہے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی جا رہی ہے، اور اس کی محرک بجز سرکشی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اِن سرکشوں کی طرف التفات نہ کریں اور اپنی دعوت وتذکیر کا کام کیے جائیں، کیونکہ وہ ان لوگوں کے لیے چاہے نافع نہ ہو، مگر ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔ رہے وہ ظالم جو اپنی سرکشی پر مُصِرّ رہیں، تو ان سے پہلے اِسی رَوِش پر چلنے والے اپنے حصّے کا عذاب پا چکے ہیں، اور اِن کے حصّے کا عذاب تیار ہے۔

آیاتھا ۶۰ سُوْرَۃُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾
فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو گرد اُڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھانے والی ہیں، پھر سُبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں،[۱] حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمھیں خوف دلایا جا رہا ہے،[۲] وہ سچّی ہے اور جزائے اعمال

۱ - اس امر پر تمام مفسّرین کا اتفاق ہے کہ الذّٰرِيٰتِ سے مراد پراگندہ کرنے والی اور گرد و غبار اڑانے والی ہوائیں ہیں، اور اَلْحٰمِلٰتِ وِقْرًا، (بھاری بوجھ اُٹھانے والیوں) سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو سمندروں سے لاکھوں کروڑوں گیلن پانی کے بخارات بادلوں کی شکل میں اُٹھا لیتی ہیں۔ یہی تفسیر حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور مجاہدؒ، سعید بن جُبَیرؒ، حَسن بصریؒ، قَتَادہؒ اور سُدِّیؒ وغیرہ حضرات سے منقول ہے۔

۲ - اَلْجٰرِيٰتِ يُسْرًا اور اَلْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے، یا یہ مفہوم لینا جائز رکھا ہے کہ ان دونوں سے مراد بھی ہوائیں ہی ہیں، یعنی یہی ہوائیں پھر بادلوں کو لے کر چلتی ہیں اور پھر رُوئے زمین کے مختلف حصّوں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، جہاں جتنا حکم ہوتا ہے، پانی تقسیم کرتی ہیں۔ دوسرے گروہ نے اَلْجٰرِيٰتِ يُسْرًا سے مراد سُبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیاں لی ہیں، اور اَلْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا سے مراد وہ فرشتے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُس کی مخلوقات کے نصیب کی چیزیں اُن میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک رِوایت کی رُو سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں فقروں کا یہ مطلب بیان کر کے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُنا ہوتا تو میں اِسے بیان نہ کرتا۔ اِسی بنا پر علامہ آلُوسیؒ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اِس کے سوا اِن فقروں کا کوئی اور مطلب لینا جائز نہیں ہے اور جن لوگوں نے کوئی دوسرا مفہوم لیا ہے انھوں نے بے جا جسارت کی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس رِوایت کی سند ضعیف ہے اور اِس کی بنیاد پر قطعیّت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع حضورؐ ہی نے اِن فقروں کی یہ تفسیر فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحابہ و تابعین کی ایک مُعتَدبِہٖ جماعت سے یہی دوسری تفسیر منقول ہے، لیکن مفسّرین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے پہلی تفسیر بھی بیان کی ہے اور سلسلۂ کلام سے وہ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور مولانا محمود حسن صاحبؒ نے بھی اپنے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ

ضرور پیش آنی ہے۔[4]

قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی،[5] (آخرت کے بارے میں) تمھاری بات ایک دوسرے سے

ترجموں میں پہلا مفہوم ہی لیا ہے۔

۴- اصل میں لفظ تُوۡعَدُوۡنَ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اگر وَعد سے ہو تو اس کا مطلب ہو گا "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"، اور وَعید سے ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ "جس چیز کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے"۔ زبان کے لحاظ سے دونوں مطلب یکساں دُرست ہیں۔ لیکن موقع و محل کے ساتھ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ مُخاطَب وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک اور فِسق و فُجور میں غرق تھے اور یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کبھی اُن کو محاسبے اور جزائے اعمال سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اسی لیے ہم نے تُوۡعَدُوۡنَ کو وعدے کے بجائے وَعید کے معنیٰ میں لیا ہے۔

۴- یہ ہے وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے۔ اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ جس بے نظیر نظم اور باقاعدگی کے ساتھ بارش کا یہ عظیم الشان ضابطہ تمھاری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، اور جو حکمت اور مصلحتیں اِس میں صریح طور پر کارفرما نظر آتی ہیں، وہ اس بات پر گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کوئی بے مقصد اور بے معنیٰ گھروندا نہیں ہے جس میں لاکھوں کروڑوں برس سے ایک بہت بڑا کھیل بس یُونہی اَلَل ٹَپ ہوئے جا رہا ہو، بلکہ یہ درحقیقت ایک کمال درجے کا حکیمانہ نظام ہے جس میں ہر کام کسی مقصد اور کسی مَصلَحت کے لیے ہو رہا ہے۔ اِس نظام میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہاں انسان جیسی ایک مخلوق کو عقل، شُعُور، تمیز اور تَصَرُّف کے اختیارات دے کر، اُس میں نیکی و بدی کی اَخلاقی حِس پیدا کر کے، اور اُسے ہر طرح کے اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کاموں کے مواقع دے کر، زمین میں تُرکتازیاں کرنے کے لیے محض فضول اور لایعنی طریقے سے چھوڑ دیا جائے، اور اُس سے کبھی یہ بازپُرس نہ ہو کہ دل و دماغ اور جسم کی جو قوتیں اس کو دی گئی تھیں، دنیا میں کام کرنے کے لیے جو وسیع ذرائع اس کے حوالے کیے گئے تھے، اور خدا کی بے شمار مخلوقات پر تَصَرُّف کے جو اختیارات اُسے دیے گئے تھے، اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ جس نظامِ کائنات میں سب کچھ بامقصد ہے، اُس میں صرف انسان جیسی عظیم مخلوق کی تخلیق کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے؟ جس نظام میں ہر چیز مبنی بر حکمت ہے، اُس میں تنہا ایک انسان ہی کی تخلیق کیسے فضول اور عَبَث ہو سکتی ہے؟ مخلوقات کی جو اقسام عقل و شُعُور نہیں رکھتیں، ان کی تخلیق کی مَصلَحت تو اِسی عالَمِ طبیعی میں پُوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی مدتِ عمر ختم ہونے کے بعد ضائع کر دی جائیں تو یہ عین معقول بات ہے، کیونکہ انھیں کوئی اختیارات دیے ہی نہیں گئے ہیں کہ ان سے محاسبے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ مگر عقل و شُعُور اور اختیارات رکھنے والی مخلوق، جس کے افعال محض عالَمِ طبیعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ اَخلاقی نوعیت بھی رکھتے ہیں، اور جس کے اَخلاقی نتائج پیدا کرنے والے اعمال کا سلسلہ محض زندگی کی آخری ساعت تک ہی

نہیں چلتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس پر اخلاقی نتائج مُتَرتَّب ہوتے رہتے ہیں، اُسے صرف اُس کا طبیعی کام ختم ہو جانے کے بعد نباتات وحیوانات کی طرح کیسے ضائع کیا جا سکتا ہے؟ اُس نے تو اپنے اختیار وارادہ سے جو نیکی یا بدی بھی کی ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک مبنی برحق وانصاف جزا اس کو لازماً ملنی ہی چاہیے، کیونکہ یہ اُس مَصلحت کا بنیادی تقاضا ہے جس کے تحت دوسری مخلوقات کے برعکس اس کو ایک ذی اختیار مخلوق بنایا گیا ہے۔ اُس سے محاسبہ نہ ہو، اس کے اَخلاقی اعمال پر جزا وسزا نہ ہو، اور اس کو بھی بے اختیار مخلوقات کی طرح عمرِ طبیعی ختم ہونے پر ضائع کر دیا جائے، تو لامحالہ اس کی تخلیق سراسر عبث ہوگی، اور ایک حکیم سے فعلِ عَبَث کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اِس کے علاوہ آخرت اور جزا وسزا کے وقوع پر اِن چار مظاہرِ کائنات کی قسم کھانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ منکرینِ آخرت زندگی بعدِ موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم جب مر کر خاک میں رَل مِل جائیں گے اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہو جائے گا تو کیسے ممکن ہے کہ یہ سارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہو جائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے۔ اس شبہے کی غَلَطی اُن چاروں مظاہرِ کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے جنھیں آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں رُوئے زمین کے اُن تمام ذخائرِ آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے۔ اس عمل سے پانی کے بے حد وحساب قطرے اُڑ جاتے ہیں اور اپنے مَخزن میں باقی نہیں رہتے۔ مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہَوا میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہَوا اُن قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے، اُس کو کثیف بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے، اُن بادلوں کو لے کر رُوئے زمین کے مختلف حصّوں میں پھیل جاتی ہے، اور خدا کی طرف سے جو وقت مقرر ہے، ٹھیک اُسی وقت ایک ایک قطرے کو اُسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا، زمین پر واپس پہنچا دیتی ہے۔ یہ منظر جو آئے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں اور ان انسانوں کو اسی شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے جس میں وہ پہلے موجود تھے۔ یہ اجزا خواہ مٹی میں ہوں، یا پانی میں، یا ہوا میں، بہر حال رہتے اِسی زمین اور اِس کے ماحول ہی میں ہیں۔ جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اُسی ہوا کے ذریعے سے سمیٹ لاتا ہے اور انھیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے، اس کے لیے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزا کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟

۵ - اصل میں لفظ ذَاتِ الْحُبُكِ استعمال ہوا ہے۔ حُبُک راستوں کو بھی کہتے ہیں۔ اُن لہروں کو بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریگستان کی ریت اور ٹھیرے ہوئے پانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور گھونگھر والے بالوں میں جو لٹیں سی بن جاتی ہیں اُن کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں آسمان کو حُبُک والا یا تو اِس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ آسمان پر اکثر طرح طرح کی شکلوں والے بادل چھائے رہتے ہیں، جن میں ہوا کے اثر سے بار بار تغیّر ہوتا ہے، اور کبھی کوئی شکل نہ خود قائم رہتی ہے نہ کسی دوسری شکل سے مشابہ ہوتی ہے۔ یا اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ رات کے وقت آسمان پر جب تارے بکھرے ہوتے ہیں تو آدمی دیکھتا ہے کہ ان کی بہت سی مختلف شکلیں ہیں اور کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مُّخْتَلِفٍ ﴿٨﴾ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴿٩﴾ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿١٠﴾
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿١١﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٢﴾
يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿١٣﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ

مختلف ہے۔[۶] اُس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پِھرا ہُوا ہے۔[۷]
مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے،[۸] جو جہالت میں غرق اور غفلت میں
مدہوش ہیں۔[۹] پُوچھتے ہیں: آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا؟ وہ اُس روز آئے گا جب یہ لوگ
آگ پر تپائے جائیں گے۔[۱۰] (اِن سے کہا جائے گا:) اب چکھو مزا اپنے فتنے کا۔[۱۱] یہ وہی چیز ہے

۶ – اِس اختلافِ اقوال پر متفرق شکلوں والے آسمان کی قسم تشبیہ کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یعنی جس طرح آسمان کے بادلوں اور تاروں کے جُھرمٹوں کی شکلیں مختلف ہیں اور ان میں کوئی مُطابقت نہیں پائی جاتی، اسی طرح آخرت کے متعلق تم لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو اور ہر ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا اَزَلی و اَبدی ہے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہوسکتی۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ نظام حادِث ہے اور ایک وقت میں یہ جا کر ختم بھی ہوسکتا ہے، مگر انسان سمیت جو چیز بھی فنا ہوگئی، پھر اس کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی اعادے کو ممکن مانتا ہے، مگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے اچھے اور بُرے نتائج بھگتنے کے لیے بار بار اِسی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ کوئی جنّت اور جہنّم کا بھی قائل ہے، مگر اس کے ساتھ تناسُخ کو بھی ملاتا ہے، یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ گناہ گار جہنّم میں بھی جا کر سزا بھگتتا ہے اور پھر اِس دنیا میں بھی سزا پانے کے لیے جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود ایک عذاب ہے، جب تک انسان کے نفس کو مادّی زندگی سے لگاؤ باقی رہتا ہے، اُس وقت تک وہ اِس دنیا میں مر مر کر پھر جنم لیتا رہتا ہے، اور اس کی حقیقی نجات (نِروان) یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو جائے۔ کوئی آخرت اور جنّت و جہنّم کا قائل ہے، مگر کہتا ہے کہ خدا نے اپنے اِکلوتے بیٹے کو صلیب پر موت دے کر انسان کے اَزَلی گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے، اور اُس بیٹے پر ایمان لا کر آدمی اپنے اعمالِ بد کے بُرے نتائج سے بچ جائے گا۔ کچھ دوسرے لوگ آخرت اور جزا و سزا، ہر چیز کو مان کر بعض ایسے بزرگوں کو شفیع تجویز کر لیتے ہیں جو اللہ کے ایسے پیارے ہیں، یا اللہ کے ہاں ایسا زور رکھتے ہیں کہ جو اُن کا دامن گرفتہ ہو، وہ دنیا میں سب کچھ کر کے بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ اِن بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی اِس عقیدے کے ماننے والوں میں اتفاق نہیں ہے، بلکہ ہر ایک گروہ نے اپنے الگ الگ شفیع بنا رکھے ہیں۔ یہ اختلافِ اقوال خود ہی اِس امر کا ثبوت ہے کہ وحی و رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنے اور اِس دنیا کے انجام پر جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے، علم کے بغیر قائم کی ہے۔ ورنہ اگر انسان کے پاس اِس معاملے میں فی الواقع براہِ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے

مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ ہوتے۔

۷- اصل الفاظ ہیں: یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ۔ اس فقرے میں عَنْهُ کی ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہیں: ایک، جزائے اعمال۔ دوسرے، قولِ مختلف۔ پہلی صورت میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "جزائے اعمال کو تو ضرور پیش آنا ہے، تم لوگ اُس کے بارے میں طرح طرح کے مختلف عقیدے رکھتے ہو، مگر اُس کو ماننے سے وہی شخص برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۔" دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ "اِن مختلف اقوال سے وہی شخص گمراہ ہوتا ہے جو دراصل حق سے برگشتہ ہے۔"

۸- ان الفاظ میں قرآنِ مجید ایک اہم حقیقت پر انسان کو متنبّہ کر رہا ہے۔ قیاس و گمان کی بنا پر کوئی اندازہ کرنا یا تخمینہ لگانا، دنیوی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو کسی حد تک چل سکتا ہے، اگرچہ علم کا قائم مقام پھر بھی نہیں ہو سکتا، لیکن اتنا بڑا بنیادی مسئلہ کہ ہم اپنی پُوری زندگی کے اعمال کے لیے کسی کے سامنے ذِمہ دار و جواب دہ ہیں یا نہیں، اور ہیں تو کس کے سامنے، کب اور کیا جواب دہی ہمیں کرنی ہوگی، اور اُس جواب دہی میں کامیابی و ناکامی کے نتائج کیا ہوں گے، یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اِس کے متعلق آدمی محض اپنے قیاس و گمان کے مطابق ایک اندازہ قائم کر لے اور پھر اسی جُوئے کے داؤں پر اپنا تمام سرمایۂ حیات لگا دے۔ اس لیے کہ یہ اندازہ اگر غلط نکلے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی نے اپنے آپ کو بالکل تباہ و برباد کر لیا۔ مزید برآں یہ مسئلہ سرے سے اُن مسائل میں سے ہے ہی نہیں جن کے بارے میں آدمی محض قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہو۔ کیونکہ قیاس اُن اُمور میں چل سکتا ہے جو انسان کے دائرۂ محسوسات میں شامل ہوں، اور یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا کوئی پہلو بھی محسوسات کے دائرے میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ اِس کے بارے میں کوئی قیاسی اندازہ صحیح ہو سکے۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر آدمی کے لیے اِن ماورائے حِس و اِدراک مسائل کے بارے میں رائے قائم کرنے کی صحیح صورت کیا ہے، تو اس کا جواب قرآنِ مجید میں جگہ جگہ یہ دیا گیا ہے، اور خود اِس سورہ سے بھی یہی جواب مُترشّح ہوتا ہے کہ [۱] انسان براہِ راست خود حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا، حقیقت [۲] کا علم اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعے سے دیتا ہے، اور [۳] اُس علم کی صحت کے متعلق آدمی اپنا اطمینان اِس طریقے سے کر سکتا ہے کہ زمین اور آسمان اور خود اُس کے اپنے نفس میں جو بے شمار نشانیاں موجود ہیں، اُن پر غائر نگاہ ڈال کر دیکھے اور پھر بے لاگ طرز پر سوچے کہ یہ نشانیاں آیا اُس حقیقت کی شہادت دے رہی ہیں جو نبی بیان کر رہا ہے، یا اُن مختلف نظریات کی تائید کرتی ہیں جو دوسرے لوگوں نے اس کے بارے میں پیش کیے ہیں؟ خدا اور آخرت کے متعلق علمی تحقیق کا یہی ایک طریقہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی اپنے قیاسی اندازوں پر چلا، وہ مارا گیا۔

۹- یعنی انھیں کچھ پتا نہیں ہے کہ اپنے اِن غلط اندازوں کی وجہ سے وہ کس انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ اِن اندازوں کی بنا پر جو راستہ بھی کسی نے اختیار کیا ہے، وہ سیدھا تباہی کی طرف جاتا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہے وہ سرے سے کسی جواب دہی کی تیاری ہی نہیں کر رہا ہے اور اس خیال میں مگن ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی، حالانکہ اچانک وہ وقت آ جائے گا جب اس کی توقعات کے بالکل خلاف دوسری زندگی میں اُس کی آنکھیں کھلیں گی اور اسے معلوم ہوگا

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ یہاں اس کو اپنے ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ جو شخص اِس خیال میں ساری عمر کھپا رہا ہے کہ مر کر پھر اِسی دنیا میں واپس آؤں گا، اُسے مرتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ اب واپسی کے سارے دروازے بند ہیں، کسی نئے عمل سے پچھلی زندگی کے اعمال کی تلافی کا اب کوئی موقع نہیں، اور آگے ایک اور زندگی ہے جس میں ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی دنیوی زندگی کے نتائج دیکھنے اور بھگتنے ہیں۔ جو شخص اِس امید میں اپنے آپ کو ہلاک کیے ڈالتا ہے کہ نفس اور اس کی خواہشات کو جب پُوری طرح ماردوں گا تو فنائے محض کی شکل میں مجھے عذابِ ہستی سے نجات مل جائے گی، وہ موت کے دروازے سے گزرتے ہی دیکھ لے گا کہ آگے فنا نہیں بلکہ بقا ہے، اور اسے اب اِس امر کی جواب دہی کرنی ہے کہ کیا تجھے وجود کی نعمت اسی لیے دی گئی تھی کہ تو اسے بنانے اور سنوارنے کے بجائے مٹانے میں اپنی ساری محنتیں صَرف کر دیتا؟ اسی طرح جو شخص کسی ابن اللہ کے کَفّارہ بن جانے یا کسی بزرگ ہستی کے شفیع بن جانے پر بھروسا کر کے عمر بھر خدا کی نافرمانیاں کرتا رہا، اُسے خدا کے سامنے پہنچتے ہی پتا چل جائے گا کہ یہاں نہ کوئی کسی کا کَفّارہ ادا کرنے والا ہے اور نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اپنے زور سے یا اپنی محبوبیت کے صدقے میں کسی کو خدا کی پکڑ سے بچالے۔ پس یہ تمام قیاسی عقیدے درحقیقت ایک افیون ہیں جس کی پینک میں یہ لوگ بے سُدھ پڑے ہوئے ہیں اور انھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ خدا اور انبیاؑ کے دیے ہوئے صحیح علم کو نظر انداز کر کے اپنی جس جہالت پر یہ مگن ہیں، وہ انھیں کدھر لیے جا رہی ہے۔

۱۰- کفار کا یہ سوال کہ روزِ جزا کب آئے گا، علم حاصل کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ طعن اور استہزا کے طور پر تھا، اس لیے اُن کو جواب اِس انداز سے دیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کو بدکرداریوں سے باز آنے کی نصیحت کرتے ہوئے اس سے کہیں کہ ایک روز اِن حرکات کا بُرا نتیجہ دیکھو گے، اور وہ اس پر ایک ٹھٹھا مار کر آپ سے پوچھے کہ حضرت! آخر وہ دن کب آئے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہ سوال اُس بُرے انجام کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی نصیحتوں کا مذاق اڑانے کے لیے ہو گا۔ اس لیے اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ وہ اُس روز آئے گا جب تمھاری شامت آئے گی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آخرت کے مسئلے پر اگر کوئی منکرِ آخرت سنجیدگی کے ساتھ بحث کر رہا ہو تو وہ اُس کے موافق ومخالف دلائل پر تو بات کر سکتا ہے، مگر جب تک اس کا دماغ بالکل ہی خراب نہ ہو چکا ہو، یہ سوال وہ کبھی نہیں کر سکتا کہ بتاؤ، وہ آخرت کس تاریخ کو آئے گی۔ اُس کی طرف سے یہ سوال جب بھی ہو گا، طنز اور تمسخر کے طور پر ہی ہو گا۔ اس لیے کہ آخرت کے آنے کی تاریخ بیان کرنے اور نہ کرنے کا کوئی اثر بھی اصل بحث پر نہیں پڑتا۔ کوئی شخص نہ اِس بنا پر آخرت کا انکار کرتا ہے کہ اس کی آمد کا سال، مہینا اور دن نہیں بتایا گیا ہے، اور نہ یہ سُن کر اُس کی آمد کو مان سکتا ہے کہ وہ فُلاں سال فُلاں مہینے کی فُلاں تاریخ کو آئے گی۔ تاریخ کا تعیّن سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ کسی منکر کو اقرار پر آمادہ کر دے، کیونکہ اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے آخر کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ اُس روز واقعی آخرت برپا ہو جائے گی۔

۱۱- فتنے کا لفظ یہاں دو معنی دے رہا ہے: ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے اِس عذاب کا مزا چکھو۔ دوسرے معنی یہ کہ اپنے اُس فتنے کا مزا چکھو جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا تھا۔ عربی زبان میں اس لفظ کے اِن دونوں مفہوموں کی

كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶﴾

جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے[۱۲]۔ البتہ مُتّقی لوگ[۱۳] اُس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو کچھ اُن کا رب انھیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے[۱۴]۔ وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے،

یکساں گنجایش ہے۔

۱۲ – کفّار کا یہ پوچھنا کہ ”آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا“ اپنے اندر خود یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟ جب ہم اُس کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے جُھٹلانے کی سزا ہمارے لیے لازم ہو چکی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ اسی لیے جہنّم کی آگ میں جب وہ تپ رہے ہوں گے، اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ اِس فقرے سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اس نے تم سے نافرمانی کا ظہور ہوتے ہی تمھیں فوراً نہ پکڑ لیا اور سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے وہ تم کو ایک لمبی مہلت دیتا رہا۔ مگر تم ایسے احمق تھے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا یہ مطالبہ کرتے رہے کہ یہ وقت تم پر جلدی لے آیا جائے۔ اب دیکھ لو کہ وہ کیا چیز تھی جس کے جلدی آ جانے کا مطالبہ تم کر رہے تھے۔

۱۳ – اِس سیاق و سباق میں لفظ مُتّقی صاف طور پر یہ معنٰی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر آخرت کو مان لیا، اور وہ رَوِیّہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اُخروی کی کامیابی کے لیے انھیں بتایا گیا تھا، اور اُس رَوِش سے اجتناب کیا جس کے متعلق اُنھیں بتا دیا گیا تھا کہ یہ خدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

۱۴ – اگرچہ اصل الفاظ ہیں: اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ، اور ان کا لفظی ترجمہ صرف یہ ہے کہ ”لے رہے ہوں گے جو کچھ اُن کے رب نے اُن کو دیا ہوگا“، لیکن موقع و محل کی مناسبت سے اِس جگہ ”لینے“ کا مطلب محض ”لینا“ نہیں بلکہ خوشی خوشی لینا ہے، جیسے کچھ لوگوں کو ایک سخی داتا مُٹھیاں بھر بھر کر انعام دے رہا ہو اور وہ لپک لپک کر اسے لے رہے ہوں۔ جب کسی شخص کو اس کی پسند کی چیز دی جائے تو اس لینے میں آپ سے آپ بخوشی قبول کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (التوبہ: ۱۰۴) ”کیا لوگ نہیں جانتے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے۔“ اس جگہ صدقات لینے سے مراد محض ان کو وصول کرنا نہیں بلکہ پسندیدگی کے ساتھ ان کو قبول کرنا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ
يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾

راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔[15] پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے،[16] اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔[17]

۱۵ – مفسّرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ، کم یا زیادہ، ابتدائے شب میں یا وسطِ شب میں یا آخرِ شب میں، جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صَرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابنِ عباسؓ، انَس بن مالکؓ، محمد الباقر، مطرف بن عبداللہ، ابوالعالیہ، مجاہد، قَتادہ، ربیع بن انَس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصہ اللہ جَلّ شانہٗ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصریؒ، اَحنَف بن قیسؒ اور ابنِ شِہاب زُہریؒ کا ہے، اور بعد کے مفسّرین و مترجمین نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ اور موقع و محل کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔ اِسی لیے ہم نے ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

۱۶ – یعنی وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فِسق و فُجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی اِستِغفار کا خیال تک اُنھیں نہ آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے، اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے رب کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی کا جو حق ہم پر تھا، اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوئی۔ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کے الفاظ میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ یہ رَوِش انھی کو زیبا تھی۔ وہی اِس شانِ عُبودیت کے اہل تھے کہ اپنے رب کی بندگی میں جان بھی لڑائیں اور پھر اُس پر پھُولنے اور اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں۔ یہ اُن بے شرم گناہ گاروں کا رَوِیّہ نہ ہو سکتا تھا جو گناہ بھی کرتے تھے اور اُوپر سے اکڑتے بھی تھے۔

۱۷ – بالفاظِ دیگر، ایک طرف اپنے رب کا حق وہ اِس طرح پہچانتے اور ادا کرتے تھے، دوسری طرف بندوں کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا۔ جو کچھ بھی اللہ نے ان کو دیا تھا، خواہ تھوڑا یا بہت، اُس میں وہ صرف اپنا اور اپنے بال بچّوں ہی کا حق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو یہ احساس تھا کہ ہمارے اِس مال میں ہر اُس بندۂ خدا کا حق ہے جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ وہ بندوں کی مدد خیرات کے طور پر نہیں کرتے تھے کہ اُس پر اُن سے شکریے کے طالب ہوتے اور اُن کو اپنا زیرِ بار احسان ٹھیراتے، بلکہ وہ اِسے اُن کا حق سمجھتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ پھر اُن کی یہ خدمتِ خلق صرف انھی لوگوں تک محدود نہ تھی جو خود سائل بن کر اُن کے پاس مدد مانگنے کے لیے آتے، بلکہ جس کے متعلق بھی ان کے علم میں یہ بات آ جاتی تھی کہ وہ اپنی روزی پانے سے محروم رہ گیا ہے، اس کی مدد کے لیے وہ خود بے چین ہو جاتے تھے۔ کوئی یتیم بچہ جو بے سہارا

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے،[18] اور خود تمھارے اپنے وجود میں ہیں۔[19] کیا

رہ گیا ہو، کوئی بیوہ جس کا کوئی سر دھرا نہ ہو، کوئی معذور جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکتا ہو، کوئی شخص جس کا روزگار چھوٹ گیا ہو یا جس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو، کوئی شخص جو کسی آفت کا شکار ہو گیا ہو اور اپنے نقصان کی تلافی خود نہ کر سکتا ہو، غرض کوئی حاجت مند ایسا نہ تھا جس کی حالت ان کے علم میں آئی ہو اور وہ اس کی دستگیری کر سکتے ہوں، اور پھر بھی انھوں نے اس کا حق مان کر اس کی مدد کرنے سے دریغ کیا ہو۔

یہ تین صفات ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو متقی اور مُحسن قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ انھی صفات نے ان کو جنّت کا مستحق بنایا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت پر ایمان لا کر انھوں نے ہر اُس رَوِش سے پرہیز کیا جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے اُخروی زندگی کے لیے تباہ کُن بتایا تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کی بندگی کا حق اپنی جان لڑا کر ادا کیا اور اُس پر فخر کرنے کے بجائے اِستغفار ہی کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کے بندوں کی خدمت اُن پر احسان سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا فرض اور اُن کا حق سمجھ کر کی۔

اس مقام پر یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اُس سے مُراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعاً اُن پر فرض کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحبِ اِستطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے، بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ اور زید بن اسلمؒ وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اِس ارشادِ الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک متقی و مُحسن انسان کبھی اِس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندوں کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے میں اُس سے بالکل سُبکدوش ہو چکا ہوں، اب میں نے اس بات کا کوئی ٹھیکا نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی متقی و مُحسن ہوتا ہے، وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اُس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے، اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے، اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں؟ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو، وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا، بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

۱۸۔ نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آخرت کے امکان اور اس کے وجوب و لُزوم کی شہادت دے رہی ہیں۔ زمین کا اپنا وجود اور اس کی ساخت، اس کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر اور ایک خاص زاویے پر رکھا جانا، اُس پر حرارت اور روشنی کا انتظام، اُس پر مختلف موسموں کی آمد و رفت، اس کے اُوپر ہوا اور پانی کی فراہمی، اس کے پیٹ میں طرح طرح کے بے شمار خزانوں کا مہیا کیا جانا، اس کی سطح پر ایک زرخیز چھلکا چڑھایا جانا، اس میں قسم قسم کی بے حد و حساب

Maktaba Tul Ishaat.com

نباتات کا اُگایا جانا، اُس کے اندر خشکی اور تری اور ہوا کے جانوروں کی بے شمار نسلیں جاری کرنا، اس میں ہر نوع کی زندگی کے لیے مناسب حالات اور موزوں خوراک کا انتظام کرنا، اُس پر انسان کو وجود میں لانے سے پہلے وہ تمام ذرائع و وسائل فراہم کر دینا جو تاریخ کے ہر مرحلے میں اس کی روز افزوں ضروریات ہی کا نہیں بلکہ اس کی تہذیب و تمدُّن کے ارتقا کا ساتھ بھی دیتے چلے جائیں، یہ اور دوسری اَن گنت نشانیاں ایسی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والا جس طرف بھی زمین اور اس کے ماحول میں نگاہ ڈالے، وہ اس کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔ جو شخص یقین کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہو، اس کی بات تو دوسری ہے۔ وہ ان میں اَور سب کچھ دیکھ لے گا، بس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی ہی نہ دیکھے گا۔ مگر جس کا دل تعصُّب سے پاک اور سچّائی کے لیے کُھلا ہوا ہے، وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہرگز یہ تصوّر قائم نہ کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ ہے جو کئی ارب سال پہلے کائنات میں اچانک برپا ہوا تھا، بلکہ اسے یقین آ جائے گا کہ یہ کمال درجے کی حکیمانہ صنعت ضرور ایک قادرِ مُطلَق اور دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے، اور وہ خدا جس نے یہ زمین بنائی ہے، نہ اِس بات سے عاجز ہو سکتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے، اور نہ ایسا نادان ہو سکتا ہے کہ اپنی زمین میں عقل و شُعُور رکھنے والی ایک مخلوق کو اختیارات دے کر بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دے۔ اختیارات کا دیا جانا آپ سے آپ محاسبے کا تقاضا کرتا ہے، جو اگر نہ ہو تو حکمت اور انصاف کے خلاف ہوگا۔ اور قدرتِ مُطلَقہ کا پایا جانا خود بخود اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کا کام ختم ہونے کے بعد اس کا خالق جب چاہے محاسبے کے لیے اس کے تمام افراد کو زمین کے ہر گوشے سے، جہاں بھی وہ مرے پڑے ہوں، اٹھا کر لا سکتا ہے۔

۱۹- یعنی باہر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں، خود اپنے اندر دیکھو تو تمھیں اِسی حقیقت پر گواہی دینے والی بے شمار نشانیاں مل جائیں گی۔ کس طرح ایک خُرد بینی کیڑے اور ایسے ہی ایک خُرد بینی انڈے کو ملا کر ماں کے ایک گوشۂ جسم میں تمھاری تخلیق کی بِنا ڈالی گئی۔ کس طرح تمھیں اُس تاریک گوشے میں پرورش کر کے بتدریج بڑھایا گیا۔ کس طرح تمھیں ایک بے نظیر ساخت کا جسم اور حیرت انگیز قوتوں سے مالا مال نفس عطا کیا گیا۔ کس طرح تمھاری بناوٹ کی تکمیل ہوتے ہی شکمِ مادر کی تنگ و تاریک دنیا سے نکال کر تمھیں اِس وسیع و عریض دنیا میں اِس شان کے ساتھ لایا گیا کہ ایک زبردست خود کار مشین تمھارے اندر نصب ہے جو روزِ پیدایش سے جوانی اور بڑھاپے تک سانس لینے، غذا ہضم کرنے، خون بنانے اور رگ رگ میں اس کو دوڑانے، فضلات خارج کرنے، تحلیل شدہ اجزائے جسم کی جگہ دوسرے اجزا تیار کرنے، اور اندر سے پیدا ہونے والی یا باہر سے آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے اور نقصانات کی تلافی کرنے، حتّٰی کہ تھکاوٹ کے بعد تمھیں آرام کے لیے سُلا دینے تک کا کام خود بخود کیے جاتی ہے، بغیر اس کے کہ تمھاری توجُّہات اور کوششوں کا کوئی حصّہ زندگی کی اِن بنیادی ضروریات پر صَرف ہو۔ ایک عجیب دماغ تمھارے کاسۂ سر میں رکھ دیا گیا ہے، جس کی پیچیدہ تہوں میں عقل، فکر، تخیُّل، شُعُور، تمیز، ارادہ، حافظہ، خواہش، احساسات و جذبات، مَیلانات و رُجحانات، اور دوسری ذہنی قوتوں کی ایک انمول دولت بھری پڑی ہے۔ بہت سے ذرائعِ علم تم کو دیے گئے ہیں جو آنکھ، ناک، کان اور پُورے جسم کی کھال سے تم کو ہر نوعیت کی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان اور گویائی کی طاقت تم کو دے دی گئی ہے، جس کے ذریعے

سے تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور پھر تمھارے وجود کی اس پُوری سلطنت پر تمھاری اَنا کو ایک رئیس بنا کر بٹھا دیا گیا ہے کہ ان تمام قوتوں سے کام لے کر رائیں قائم کرو اور یہ فیصلہ کرو کہ تمھیں کن راہوں میں اپنے اوقات، محنتوں اور کوششوں کو صَرف کرنا ہے، کیا چیز رَدّ کرنی ہے اور کیا قبول کرنی ہے، کس چیز کو اپنا مقصود بنانا ہے اور کس کو نہیں بنانا۔

یہ ہستی بنا کر جب تمھیں دنیا میں لایا گیا تو ذرا دیکھو کہ یہاں آتے ہی کتنا سروسامان تمھاری پرورش، نشوونما، اور ترقی و تکمیلِ ذات کے لیے تیار تھا، جس کی بدولت تم زندگی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اپنے اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔

اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے زمین میں تم کو ذرائع دیے گئے، مواقع فراہم کیے گئے، بہت سی چیزوں پر تم کو تصرُّف کی طاقت دی گئی۔ بہت سے انسانوں کے ساتھ تم نے طرح طرح کے معاملات کیے۔ تمھارے سامنے کفرو ایمان، فسق و طاعت، ظلم و انصاف، نیکی و بدی، حق و باطل کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں، اور ان راہوں میں سے ہر ایک کی طرف بلانے والے اور ہر ایک کی طرف لے جانے والے اسباب موجود تھے۔ تم میں سے جس نے جس راہ کو بھی انتخاب کیا اپنی ذمہ داری پر کیا، کیونکہ فیصلہ و انتخاب کی طاقت اُس کے اندر ودیعت تھی۔ ہر ایک کے اپنے ہی انتخاب کے مطابق اُس کی نیتوں اور ارادوں کو عمل میں لانے کے جو مواقع اس کو حاصل ہوئے، ان سے فائدہ اُٹھا کر کوئی نیک بنا اور کوئی بد، کسی نے ایمان کی راہ اختیار کی اور کسی نے کفرو شرک یا دہریّت کی راہ لی، کسی نے اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکا اور کوئی بندگیِ نفس میں سب کچھ کر گزرا، کسی نے ظلم کیا اور کسی نے ظلم سہا، کسی نے حُقوق ادا کیے اور کسی نے حُقوق مارے، کسی نے مرتے دم تک دنیا میں بھلائی کی اور کوئی زندگی کی آخری ساعت تک بُرائیاں کرتا رہا، کسی نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے جان لڑائی، اور کوئی باطل کو سربلند کرنے کے لیے اہلِ حق پر دست درازیاں کرتا رہا۔

اب کیا کوئی شخص جس کی حِسّے کی آنکھیں بالکل ہی پھوٹ نہ گئی ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی ایک ہستی زمین پر اتفاقاً وجود میں آ گئی ہے؟ کوئی حکمت اور کوئی منصوبہ اس کے پیچھے کار فرما نہیں ہے؟ زمین پر اُس کے ہاتھوں یہ سارے ہنگامے جو برپا ہو رہے ہیں، سب بے مقصد ہیں اور بے نتیجہ ہی ختم ہو جانے والے ہیں؟ کسی بھلائی کا کوئی ثمرہ اور کسی بدی کا کوئی پھل نہیں ہے؟ کسی ظلم کی کوئی داد اور کسی ظالم کی کوئی باز پُرس نہیں ہے؟ اِس طرح کی باتیں ایک عقل کا اندھا تو کہہ سکتا ہے، یا پھر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے سے قسم کھائے بیٹھا ہے کہ تخلیقِ انسان کے پیچھے کسی حکیم کی حکمت کو نہیں ماننا ہے۔ مگر ایک غیر متعصب صاحبِ عقل آدمی یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کو جس طرح، جن قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اِس دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور جو حیثیت اس کو یہاں دی گئی ہے، وہ یقیناً ایک بہت بڑا حکیمانہ منصوبہ ہے، اور جس خدا کا یہ منصوبہ ہے، اُس کی حکمت لازماً یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پُرس ہو، اور اس کی قدرت کے بارے میں یہ گمان کرنا ہرگز دُرست نہیں ہو سکتا کہ جس انسان کو وہ ایک خُردبینی خلیے سے شروع کر کے اس مرتبے تک پہنچا چکا ہے، اسے پھر وجود میں نہ لا سکے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ فِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ وَ مَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾ فَوَ رَبِّ
السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ع هَلۡ
اَتٰىکَ حَدِیۡثُ ضَیۡفِ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۴﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا وقف لازم

ع ۲۴/۱۸

تم کو سُوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمھارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[۲۰]۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی! یہ بات حق ہے، ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو۔ ع

اے[۲۱] نبیؐ! ابراہیمؑ کے معزّز مہمانوں کی حکایت بھی تمھیں پہنچی ہے[۲۲]؟ جب وہ اُس کے ہاں

۲۰- آسمان سے مراد یہاں عالَمِ بالا ہے۔ رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور مَا تُوۡعَدُوۡنَ سے مراد قیامت، حشر و نشر، محاسبہ و باز پُرس، جزا و سزا، اور جنت و دوزخ ہیں، جن کے رُونما ہونے کا وعدہ تمام کُتبِ آسمانی میں اور اِس قرآن میں کیا جاتا رہا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ عالَمِ بالا ہی سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ تم میں سے کس کو کیا کچھ دنیا میں دیا جائے، اور وہیں سے یہ فیصلہ بھی ہونا ہے کہ تمھیں باز پُرس اور جزائے اعمال کے لیے کب بلایا جائے۔

۲۱- اب یہاں سے رُکوعِ دوم کے اختتام تک انبیا علیہم السّلام اور بعض گزشتہ قوموں کے انجام کی طرف پے در پے مختصر اشارات کیے گئے ہیں جن سے دو باتیں ذہن نشین کرانی مقصود ہیں:

ایک یہ کہ انسانی تاریخ میں خدا کا قانونِ مُکافات برابر کام کرتا رہا ہے، جس میں نیکو کاروں کے لیے انعام اور ظالموں کے لیے سزا کی مثالیں مسلسل پائی جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ دنیا کی اس زندگی میں بھی انسان کے ساتھ اس کے خالق کا معاملہ صرف قوانینِ طبیعی (physical law) پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اَخلاقی قانون (moral-law) اس کے ساتھ کارفرما ہے۔ اور جب سلطنتِ کائنات کا مزاج یہ ہے کہ جس مخلوق کو جسمِ طبیعی میں رہ کر اَخلاقی اعمال کا موقع دیا گیا ہو، اُس کے ساتھ حیوانات و نباتات کی طرح محض طبیعی قوانین پر معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کے اخلاقی اعمال پر اخلاقی قانون بھی نافذ کیا جائے، تو یہ بات بجائے خود اس حقیقت کی صاف نشان دہی کرتی ہے کہ اِس سلطنت میں ایک وقت ایسا ضرور آنا چاہیے جب اِس طبیعی دنیا میں انسان کا کام ختم ہو جانے کے بعد خالص اَخلاقی قانون کے مطابق اس کے اخلاقی اعمال کے نتائج پُوری طرح برآمد ہوں، کیونکہ اس طبیعی دنیا میں وہ مکمل طور پر برآمد نہیں ہو سکتے۔

عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵ فَرَاغَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ
فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝۲۶ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۷
فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸

آئے تو کہا: آپ کو سلام ہے۔ اُس نے کہا: ”آپ لوگوں کو بھی سلام ہے ___ کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۔“[۲۳] پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا،[۲۴] اور ایک موٹا تازہ بچھڑا[۲۵] لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اُس نے کہا: ”آپ حضرات کھاتے نہیں؟“ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔[۲۶] انھوں نے کہا: ”ڈریے نہیں!“ اور اُسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مُژدہ سُنایا۔[۲۷]

دوسری بات جو اِن تاریخی اشارات سے ذہن نشین کرائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جن قوموں نے بھی انبیا علیہم السلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رَوِیّہ توحید، رسالت اور آخرت کے انکار پر قائم کیا، وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اَخلاق جو انبیاؑ کے ذریعے سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی باز پُرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی بر حقیقت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا رَوِیّہ متعین کیا ہے، وہ آخر کار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔

۲۲ — یہ قصّہ قرآنِ مجید میں تین مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۵۰۹ تا ۵۱۱۔ جلد سوم، ص ۶۹۶۔

۲۳ — سِیاق وسَباق کو دیکھتے ہوئے اس فقرے کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے خود اُن مہمانوں سے فرمایا کہ آپ حضرات سے کبھی پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا، آپ شاید اِس علاقے میں نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے سلام کا جواب دے کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دل میں کہا، یا گھر میں ضیافت کا انتظام کرنے کے لیے جاتے ہوئے اپنے خادموں سے فرمایا کہ یہ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں، پہلے کبھی اِس علاقے میں اِس شان اور وضع قطع کے لوگ دیکھنے میں نہیں آئے۔

۲۴ — یعنی اپنے مہمانوں سے یہ نہیں کہا کہ میں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں، بلکہ انھیں بٹھا کر خاموشی سے ضیافت کا انتظام کرنے چلے گئے، تاکہ مہمان تکلُّفاً یہ نہ کہیں کہ اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔

۲۵ — سورۂ ہود میں عِجْلٍ حَنِيْذٍ (بھنے ہوئے بچھڑے) کے الفاظ ہیں۔ یہاں بتایا گیا کہ آپ نے خوب چھانٹ کر موٹا تازہ بچھڑا بھنوایا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۰﴾

الجزء ۲۷ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ

یہ سُن کر اُس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی: ”بوڑھی، بانجھ!“[۲۸] انھوں نے کہا: ”یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے، وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔“[۲۹]

ابراہیمؑ نے کہا: ”اے فرستادگانِ الٰہی! کیا مُہم آپ کو درپیش ہے؟“[۳۰] انھوں نے کہا: ”ہم ایک

۲۶- یعنی جب ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھے تو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اس خوف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اجنبی مسافروں کا کسی کے گھر جا کر کھانے سے پرہیز کرنا قبائلی زندگی میں اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ وہ کسی بُرے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ اُن کے اِس اجتناب ہی سے حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں، اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا بڑے غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے، اس لیے آپ کو خوف لاحق ہوا کہ کوئی خوفناک معاملہ درپیش ہے جس کے لیے یہ حضرات اس شان سے تشریف لائے ہیں۔

۲۷- سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السّلام کی پیدائش کا مُژدہ تھا، اور اس میں یہ بشارت بھی دی گئی تھی کہ حضرت اسحاقؑ سے اُن کو حضرت یعقوب علیہ السّلام جیسا پوتا نصیب ہو گا۔

۲۸- یعنی ایک تو میں بوڑھی، اُوپر سے بانجھ۔ اب میرے ہاں بچّہ ہو گا؟ بائبل کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو سال، اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی۔ (پیدائش، ۱۷:۱۷)

۲۹- اس قصّے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس بندے نے اپنے رب کی بندگی کا حق دنیا میں ٹھیک ادا کیا تھا، اس کے ساتھ عُقبیٰ میں تو جو معاملہ ہو گا سو ہو گا، اِسی دنیا میں اُس کو یہ انعام دیا گیا کہ عام قوانینِ طبیعت کی رُو سے جس عمر میں اس کے ہاں اولاد پیدا نہ ہو سکتی تھی، اور اس کی سن رسیدہ بیوی تمام عمر بے اولاد رہ کر اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی، اُس وقت اللہ نے اسے نہ صرف اولاد دی بلکہ ایسی بے نظیر اولاد دی جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہے جس کی نسل میں مسلسل چار انبیا پیدا ہوئے ہوں۔ وہ صرف حضرت ابراہیمؑ ہی تھے جن کے ہاں تین پشت تک نبوت چلتی رہی، اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السّلام جیسے جلیل القدر نبی اُن کے گھرانے سے اُٹھے۔

۳۰- چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا کسی بڑے اہم کام کے لیے ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ان کی آمد کا مقصد پوچھنے کے لیے خَطْب کا لفظ استعمال فرمایا۔ خَطْب عَرَبی زبان میں کسی معمولی کام کے لیے نہیں بلکہ

إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ﴿٣٣﴾
مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴿٣٤﴾ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٥﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ
الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٦﴾ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ

مُجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں[۳۱]، تاکہ اُس پر پکّی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں[۳۲]" ــــــ پھر[۳۳] ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو اُس بستی میں مومن تھے، اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا[۳۴]۔ اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے

کسی امرِ عظیم کے لیے بولا جاتا ہے۔

۳۱- مراد ہے قومِ لُوط۔ اُس کے جرائم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ صرف "مجرم قوم" کا لفظ ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس سے مراد کون سی قوم ہے۔ اس سے پہلے قرآنِ مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۵۱ تا ۵۳، ۳۵۵ تا ۳۵۹، ۵۱۰ تا ۵۱۵۔ جلد سوم، ص ۱۷۰، ۵۲۶ تا ۵۳۰، ۵۸۶-۵۸۷، ۵۹۴، ۵۹۸۔ جلد چہارم، الصّافّات، ص ۳۰۶۔

۳۲- یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔ سورۂ ہُود اور الحِجر میں اس عذاب کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اُن کی بستیوں کو تلپٹ کر دیا گیا اور اُوپر سے پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے۔ اس سے یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ شدید زلزلے کے اثر سے پورا علاقہ اُلٹ دیا گیا، اور جو لوگ زلزلے سے بچ کر بھاگے، ان کو آتش فشاں مادّے کے پتھروں کی بارش نے ختم کر دیا۔

۳۳- بیچ میں یہ قصّہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے پاس سے یہ فرشتے کس طرح حضرت لُوطؑ کے ہاں پہنچے اور وہاں اُن کے اور قومِ لُوط کے درمیان کیا کچھ پیش آیا۔ یہ تفصیلات سورۂ ہُود، الحِجر اور العنکبوت میں گزر چکی ہیں۔ یہاں صرف اُس آخری وقت کا ذکر کیا جا رہا ہے جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے والا تھا۔

۳۴- یعنی پُوری قوم میں، اور اُس کے پُورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ تنہا حضرت لُوط علیہ السّلام کا گھر تھا۔ باقی پُوری قوم فسق و فُجور میں ڈوبی ہوئی تھی، اور اُس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَلِيْمَ ﴿٣٧﴾ وَ فِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ

ڈرتے ہوں۔[35]

اور (تمہارے لیے نشانی ہے) موسیٰؑ کے قصّے میں۔ جب ہم نے اُسے صریح سند کے ساتھ فرعون

نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جا سکا۔

اس آیت میں تین اہم مضامین بیان ہوئے ہیں:

ایک یہ کہ اللہ کا قانونِ مُکافات اُس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابلِ لحاظ بھلائی موجود رہے۔ بُرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عُنصُر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بدی کو روکنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو، تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے اور اُس قوم کی مُہلت میں اضافہ کرتا رہتا ہے جو ابھی خیر سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔ مگر جب حالت یہ ہو جائے کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آ چکے ہوں، انھیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر ہوش مند مالک اپنے سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ''مسلمان'' صرف اُسی اُمت کا نام نہیں ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیرو ہے، بلکہ آپؐ سے پہلے کے تمام انبیاؑ اور ان کے پیرو بھی مسلمان ہی تھے۔ ان کے ادیان الگ الگ نہ تھے کہ کوئی دینِ ابراہیمی ہو اور کوئی موسوی اور کوئی عیسوی۔ بلکہ وہ سب مُسلم تھے اور ان کا دین یہی اسلام تھا۔ قرآنِ مجید میں یہ حقیقت جگہ جگہ اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس میں کسی اِشتِباہ کی گنجایش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات مُلاحظہ ہوں: البقرہ: ۱۲۸، ۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳- آلِ عمران: ۶۷- المائدہ: ۴۴، ۱۱۱- یونس: ۷۲، ۸۴- یوسف: ۱۰۱- الاعراف: ۱۲۶- النمل: ۳۱، ۴۲، ۴۴-

تیسرے یہ کہ ''مومن'' اور ''مسلم'' کے الفاظ اِس آیت میں بالکل ہم معنیٰ استعمال ہوئے ہیں۔ اس آیت کو اگر سورۂ حُجُرات کی آیت ۱۴ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی پُوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ''مومن'' اور ''مسلم'' قرآنِ مجید کی دو ایسی مستقل اصطلاحیں ہیں جو ہر جگہ ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوئی ہیں، اور ''مسلم'' لازماً اُسی شخص کو کہتے ہیں جو ایمان کے بغیر محض بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ حُجُرات، حاشیہ ۳۱)

۳۵- اس نشانی سے مُراد بُحَیرۂ مردار (Dead sea) ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم الشان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قومِ لُوط کے بڑے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اُوپر بحیرۂ مردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اِس بُحَیرے کا وہ حصّہ جو ''اللِّسان'' نامی چھوٹے سے

مُّبِيْنٍ ۝۳۸ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹
فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ۝۴۰

کے پاس بھیجا [۳۶] تو وہ اپنے بَل بُوتے پر اکڑ گیا اور بولا: "یہ جادُوگر ہے [۳۷] یا مجنون ہے۔" آخرکار ہم نے اُسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا، اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔ [۳۸]

جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے، اور قدیم بُحَیرۂ مُردار کے جو آثار اِس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں، وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اِس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جنوب کا حصّہ پہلے اِس بُحَیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے، اور یہی تاریخی طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لُوطؑ کا زمانہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللِّسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں ۲۰ ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس سے متّصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بُحَیرے میں غرق ہو چکا ہے۔ بُحَیرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے، اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں، اور زمین میں گندھک، رال، کول تار اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنّم پھٹ پڑی ہو گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشُّعَراء، حاشیہ ۱۱۴)

۳۶- یعنی ایسے صریح معجزات اور ایسی کُھلی کُھلی علامات کے ساتھ بھیجا جن سے یہ امر مُشتبہ نہ رہا تھا کہ آپ خالقِ ارض وسما کی طرف سے مامور ہو کر آئے ہیں۔

۳۷- یعنی کبھی اُس نے آپؑ کو ساحر قرار دیا، اور کبھی کہا کہ یہ شخص مجنون ہے۔

۳۸- اس چھوٹے سے فقرے میں تاریخ کی ایک پُوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ذرا چشمِ تصوّر کے سامنے یہ نقشہ لے آیئے کہ فرعون اُس وقت دنیا کے سب سے بڑے مرکزِ تہذیب وتمدن کا عظیم فرمانروا تھا، جس کی شوکت وسَطوت سے گردوپیش کی ساری قومیں خوف زدہ تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ وہ جب اپنے لشکروں سمیت اچانک ایک روز غرقاب ہوا ہو گا تو صرف مصر ہی میں نہیں، آس پاس کی تمام قوموں میں اِس واقعے کی دھوم مچ گئی ہو گی۔ مگر اس پر بجز اُن لوگوں کے جن کے اپنے قریبی رشتہ دار غرق ہوئے تھے، باقی کوئی نہ تھا جو اُن کے اپنے ملک میں، یا دنیا کی دوسری قوموں میں ماتم کرتا یا ان کا مرثیہ کہتا، یا کم از کم یہی کہنے والا ہوتا کہ افسوس! کیسے اچھے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ
أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ﴿۴۲﴾ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ
تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ

اور (تمھارے لیے نشانی ہے) عاد میں، جب کہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی، اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔[۳۹]

اور (تمھارے لیے نشانی ہے) ثمود میں، جب اُن سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو۔[۴۰] مگر اس تنبیہ پر بھی انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے دیکھتے دیکھتے

لوگ تھے جو اِس حادثے کے شکار ہو گئے۔ اس کے بجائے، چونکہ دنیا اُن کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی تھی، اس لیے ان کے عبرت ناک انجام پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا، ہر زبان نے ان پر ملامت کی پھٹکار برسائی، اور جس نے بھی اس خبر کو سُنا، وہ پکار اُٹھا کہ یہ ظالم اِسی انجام کے مستحق تھے۔ سورۂ دُخان میں اِسی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ، ''پھر نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین۔'' (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ دُخان، حاشیہ ۲۵)

۳۹- اس ہَوا کے لیے لفظ عَقِیْم استعمال ہُوا ہے جو بانجھ عورت کے لیے بولا جاتا ہے، اور لُغت میں اس کے اصل معنٰی یابِس (خشک) کے ہیں۔ اگر اسے لُغوی معنٰی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ایسی سخت گرم و خشک ہوا تھی کہ جس چیز پر سے وہ گزر گئی، اُسے سُکھا کر رکھ دیا۔ اور اگر اسے محاورے کے مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ بانجھ عورت کی طرح وہ ایسی ہَوا تھی جو اپنے اندر کوئی نفع نہ رکھتی تھی۔ نہ خوشگوار تھی، نہ بارش لانے والی، نہ درختوں کو بار آور کرنے والی، اور نہ اُن فائدوں میں سے کوئی فائدہ اُس میں تھا جن کے لیے ہوا کا چلنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ صرف بے خیر اور خشک ہی نہ تھی، بلکہ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی، جس نے لوگوں کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخ دیا، اور یہ مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی، یہاں تک کہ قومِ عاد کے پُورے علاقے کو اس نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰم السجدہ، حواشی ۲۰-۲۱۔ الاحقاف، حواشی ۲۵ تا ۲۸)

۴۰- مفسّرین میں اس امر پر اختلاف ہے کہ اِس سے مراد کون سی مُہلت ہے۔ حضرت قَتادۃ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ سورۂ ہُود کی اُس آیت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ثمود کے لوگوں نے جب حضرت صالحؑ کی اُونٹنی کو ہلاک کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کر دیا گیا کہ تین دن تک مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا۔ بخلاف اس کے

الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا
مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ع وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ

ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب[۴۱] نے اُن کو آ لیا۔ پھر نہ اُن میں اُٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے[۴۲]۔

اور ان سب سے پہلے ہم نے نوحؑ کی قوم کو ہلاک کیا، کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے۔ ع

آسمان[۴۳] کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اِس کی قدرت رکھتے ہیں[۴۴]۔ زمین کو ہم نے

حضرت حَسَن بصریؒ کا خیال ہے کہ یہ بات حضرت صالح علیہ السّلام نے اپنی دعوت کے آغاز میں اپنی قوم سے فرمائی تھی، اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم توبہ و ایمان کی راہ اختیار نہ کرو گے تو ایک خاص وقت تک ہی تم کو دنیا میں عیش کرنے کی مُہلت نصیب ہو سکے گی اور اس کے بعد تمھاری شامت آ جائے گی۔ ان دونوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بعد کی آیت فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (پھر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی) یہ بتاتی ہے کہ جس مُہلت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، وہ سرتابی سے پہلے دی گئی تھی اور انھوں نے سرتابی اس تنبیہ کے بعد کی۔ اس کے برعکس سورۂ ہود والی آیت میں تین دن کی جس مُہلت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ان ظالموں کی طرف سے آخری اور فیصلہ کُن سرتابی کا ارتکاب ہو جانے کے بعد دی گئی تھی۔

۴۱- قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اسے رَجْفَہ (دہلا دینے والی اور ہلا مارنے والی آفت) کہا گیا ہے۔ کہیں اس کو صَیْحَہ (دھماکے اور کڑکے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں اس کے لیے طَاغِیَہ (انتہائی شدید آفت) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اسی کو صَاعِقَہ کہا گیا ہے، جس کے معنی بجلی کی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کے بھی ہیں اور سخت کڑک کے بھی۔ غالباً یہ عذاب ایک ایسے زلزلے کی شکل میں آیا تھا جس کے ساتھ خوفناک آواز بھی تھی۔

۴۲- اصل الفاظ ہیں: مَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ۔ اِنتصار کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے حملے سے بچانا۔ اور دوسرے معنی ہیں حملہ کرنے والے سے بدلہ لینا۔

۴۳- آخرت کے حق میں تاریخی دلائل پیش کرنے کے بعد اب پھر اُسی کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾

بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔[۴۵] اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں،[۴۶] شاید کہ تم اس سے سبق لو۔[۴۷] پس دَوڑو اللہ کی طرف، میں تمھارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا

۴۴ - اصل الفاظ ہیں: وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۔ مُوسِع کے معنی طاقت و مَقدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری مَقدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصوّر تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آ گیا کہ ہم تمھیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں، بلکہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں، اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ ایسی زبردست خلّاق ہستی کو آخر تم نے اعادۂ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟

۴۵ - اس کی تشریح حاشیہ ۱۸ میں گزر چکی ہے۔ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۷۴۔ جلد چہارم تفسیر سورۂ یٰسین، حاشیہ ۲۹۔ الزُّخرُف، حواشی ۷ تا ۱۰۔

۴۶ - یعنی دنیا کی تمام اشیا تزویج کے اُصول پر بنائی گئی ہیں۔ یہ سارا کارخانۂ عالَم اِس قاعدے پر چل رہا ہے کہ بعض چیزوں کا بعض چیزوں سے جوڑ لگتا ہے، اور پھر اُن کا جوڑ لگنے ہی سے طرح طرح کی ترکیبات وجود میں آتی ہیں۔ یہاں کوئی شے بھی ایسی منفرد نہیں ہے کہ دوسری کوئی شے اس کا جوڑ نہ ہو، بلکہ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۱۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۱۲)

۴۷ - مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کا تزویج کے اُصول پر بنایا جانا، اور دنیا کی تمام اشیا کا زوج زوج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وُجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے۔ اگر تم غور کرو تو اس سے خود تمھاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے، اور کوئی چیز اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی، تو دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جوڑ ہو سکتی ہے؟ اِس کا جوڑا لازماً آخرت ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ قطعاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

آگے کے مضمون کو سمجھنے کے لیے اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ یہاں تک ساری بحث آخرت کے موضوع پر چلی آ رہی ہے، لیکن اِسی بحث اور انھی دلائل سے توحید کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بارش کا انتظام، زمین کی ساخت، آسمان کی تخلیق، انسان کا اپنا وجود، کائنات میں قانونِ تزویج کی حیرت انگیز کارفرمائی، یہ ساری چیزیں جس طرح آخرت کے امکان و وجوب پر گواہ ہیں، اُسی طرح یہی اس بات کی شہادت بھی دے رہی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ ایک خدائے حکیم و قادرِ مُطلق ہی اس کا خالق اور مالک اور مُدبّر ہے۔ اس لیے آگے انھی دلائل کی بنیاد

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ﴿۵۱﴾
كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ
مَجْنُوْنٌ ۚ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۚ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ

ہوں۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دُوسرا معبُود، مَیں تمھارے لیے اُس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں[۴۸]۔

یونہی ہوتا رہا ہے، اِن سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسُول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون[۴۹]۔ کیا اِن سب نے آپس میں اِس پر کوئی سمجھوتا کرلیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں[۵۰]۔ پس اے نبیؐ! ان سے رُخ پھیر لو،

پر توحید کی دعوت پیش کی جارہی ہے۔ علاوہ بریں آخرت کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا سے بغاوت کا رَوِیّہ چھوڑ کر اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ وہ خدا سے اُسی وقت تک پھرا رہتا ہے جب تک وہ اِس غفلت میں مبتلا رہتا ہے کہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال کا کوئی حساب مجھے کسی کو دینا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی جس وقت بھی رفع ہو جائے، اس کے ساتھ ہی فوراً آدمی کے ضمیر میں یہ احساس اُبھر آتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار سمجھ کر وہ بڑی بھاری غلطی کر رہا تھا، اور یہ احساس اُسے خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اِسی بنا پر آخرت کے دلائل ختم کرتے ہی معاً بعد یہ فرمایا گیا: ”پس دوڑو اللہ کی طرف“۔

۴۸ – یہ فقرے اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہیں، مگر ان میں متکلّم اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا بات دراصل یُوں ہے کہ اللہ اپنے نبی کی زبان سے یہ کہلوا رہا ہے کہ دوڑو اللہ کی طرف، میں تمھیں اُس کی طرف سے خبردار کرتا ہوں۔ اِس طرزِ کلام کی مثال قرآن کی اوّلین سورت، یعنی سورۂ فاتحہ میں موجود ہے، جس میں کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر متکلّم کی حیثیت سے بندے عرض کرتے ہیں: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ جس طرح وہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ ”اے اہلِ ایمان! تم اپنے رب سے یوں دعا مانگو“، مگر فحوائے کلام سے خود بخود یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ ایک دعا ہے جو اللہ اپنے بندوں کو سکھا رہا ہے، اُسی طرح یہاں بھی یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ”اے نبیؐ! تم اِن لوگوں سے کہو“، مگر فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ توحید کی ایک دعوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ اِس طرزِ کلام کی اور بھی متعدّد نظیریں قرآنِ مجید میں موجود ہیں جن میں کلام تو اللہ ہی کا ہوتا ہے مگر متکلّم کہیں فرشتے ہوتے ہیں اور کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس امر کی تصریح کے بغیر کہ یہاں متکلّم کون ہے، سیاقِ عبارت

Maktaba Tul Ishaat.com

سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ اپنا یہ کلام کس کی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ مریم: ۶۴-۶۵۔ الصّافّات: ۱۵۹ تا ۱۶۷۔ الشُّوریٰ: ۱۰۔

۴۹ – یعنی آج پہلی مرتبہ ہی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی زبان سے آخرت کی خبر اور توحید کی دعوت سُن کر لوگ اُسے ساحر اور مجنون کہہ رہے ہیں۔ رسالت کی پُوری تاریخ گواہ ہے کہ جب سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے رسول آنے شروع ہوئے ہیں، آج تک جاہل لوگ اِسی ایک حماقت کا پُوری یکسانی کے ساتھ اِعادہ کیے چلے جا رہے ہیں۔ جس رسول نے بھی آ کر خبردار کیا کہ تم بہت سے خداؤں کے بندے نہیں ہو بلکہ صرف ایک ہی خدا تمھارا خالق و معبُود اور تمھاری قسمتوں کا مالک و مختار ہے، جاہلوں نے شور مچا دیا کہ یہ جادُوگر ہے جو اپنے اَفسُوں سے ہماری عقلوں کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ جس رسول نے بھی آ کر خبردار کیا کہ تم غیر ذمّہ دار بنا کر دنیا میں نہیں چھوڑ دیے گئے ہو، بلکہ اپنا کارنامۂ حیات ختم کرنے کے بعد تمھیں اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضر ہو کر اپنا حساب دینا ہے اور اس حساب کے نتیجے میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانی ہے، نادان لوگ چیخ اُٹھے کہ یہ پاگل ہے، اِس کی عقل ماری گئی ہے، بھلا مرنے کے بعد ہم کہیں دوبارہ بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟

۵۰ – یعنی یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہزار ہا برس تک ہر زمانے میں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کا دعوتِ انبیاؑ کے مقابلے میں ایک ہی رَوِیّہ اختیار کرنا اور ایک ہی طرح کی باتیں اُن کے خلاف بنانا کچھ اِس بنا پر تو نہ ہو سکتا تھا کہ ایک کانفرنس کر کے اِن سب اگلی اور پچھلی نسلوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہو کہ جب کوئی نبی آ کر یہ دعوت پیش کرے تو اس کا یہ جواب دیا جائے۔ پھر اُن کے رَوِیّے کی یہ یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی یہ مسلسل تکرار کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ طُغیان و سرکشی اِن سب کا مشترک وصف ہے۔ چونکہ ہر زمانے کے جاہل لوگ خدا کی بندگی سے آزاد اور اُس کے محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں شُترِ بے مہار کی طرح جینے کے خواہاں رہے ہیں، اس لیے اور صرف اِسی لیے جس نے بھی اُن کو خدا کی بندگی اور خدا ترسانہ زندگی کی طرف بلایا، اس کو وہ ایک ہی لگا بندھا جواب دیتے رہے۔

اِس ارشاد سے ایک اور اہم حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ضلالت اور ہدایت، نیکی اور بدی، ظلم اور عدل، اور ایسے ہی دوسرے اعمال کے جو محرکات نفسِ انسانی میں بالطبع موجود ہیں، اُن کا ظہور ہمیشہ ہر زمانے میں اور زمین کے ہر گوشے میں ایک ہی طرح ہوتا ہے، خواہ ذرائع و وسائل کی ترقی سے اس کی شکلیں بظاہر کتنی ہی مختلف نظر آتی ہوں۔ آج کا انسان خواہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعے سے لڑے، اور قدیم زمانے کا انسان چاہے پتھروں اور لاٹھیوں سے لڑتا ہو، مگر انسانوں کے درمیان جنگ کے بنیادی محرکات میں سرِ مُو فرق نہیں آیا ہے۔ اِسی طرح آج کا ملحد اپنے اِلحاد کے لیے دلائل کے خواہ کتنے ہی انبار لگاتا رہے، اُس کے اِس راہ پر جانے کے محرکات بعینہٖ وہی ہیں جو آج سے ۶ ہزار برس پہلے کے کسی مُلحد کو اِس طرف لے گئے تھے، اور بنیادی طور پر وہ اپنے اِستدلال میں بھی اپنے سابق پیشواؤں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

فَمَآ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾ وَّ ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۵﴾

تم پر کچھ ملامت نہیں[۵۱]۔ البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے[۵۲]۔

۵۱- اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک داعیِ حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت صاف صاف پیش کر دے اور اس کے شبہات و اعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمّے تھا، اس سے وہ سُبکدوش ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ و خیال پر جما رہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعیِ حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضروری نہیں کہ وہ اُسی شخص کے پیچھے پڑا رہے، اُسی سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اُس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ داعی اپنا فرض ادا کر چکا۔ وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں مبتلا رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کر کے یہ قاعدہ اس لیے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ، آپؐ اپنی تبلیغ میں بے جا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعیِ حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکتا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑالو پن کے آثار دیکھ کر اُن سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے، تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ واہ صاحب! آپ اچھے دعوتِ حق کے عَلَم بَردار ہیں، ہم آپ سے بات سمجھنے کے لیے بحث کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہماری طرف التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ اُن کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی بحثا بحثی میں داعی کو اُلجھانا اور محض اس کی تضیِیعِ اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلامِ پاک میں بالفاظِ صریح یہ فرما دیا کہ ”ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو، اُن سے بے التفاتی کرنے پر تمھیں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔“ اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپؐ لے کر آئے ہیں، اس کی رُو سے تو آپؐ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں، پھر آپؐ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

۵۲- اس آیت میں تبلیغ کا دوسرا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل مقصد اُن سعید روحوں تک ایمان کی نعمت پہنچانا ہے جو اس نعمت کی قدر شناس ہوں اور اُسے خود حاصل کرنا چاہیں۔ مگر داعی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید روحیں کہاں ہیں۔ اس لیے اُس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوتِ عام

Maktaba Tul Ishaat.com

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ
مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ﴿٥٧﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ

میں نے جنّ اور انسانوں کو اِس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔[۵۳] میں اُن سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔[۵۴] اللہ تو خود ہی رزّاق ہے،

کا سلسلہ برابر جاری رکھے، تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں، وہاں اس کی آواز پہنچ جائے۔ یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں۔ انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے۔ اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لا کھڑا کرنا اس کے پیشِ نظر ہونا چاہیے۔ بیچ میں اولادِ آدم کا جو فضول عُنصُر اس کو ملے اُس کی طرف اُسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اُسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنسِ کاسد ہے۔ اُس کے کساد و فساد کا تجربہ ہو جانے کے بعد اُسے پھر اپنا قیمتی وقت اِس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ اُس کی تذکیر سے نفع اُٹھانے والے لوگ نہیں ہیں اور ان پر اپنی قوت صَرف کرنے سے نقصان اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔

۵۳- یعنی میں نے اِن کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ میری بندگی تو اِن کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں اِن کا خالق ہوں۔ دوسرے کسی نے جب اِن کو پیدا نہیں کیا ہے تو اُس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اُس کی بندگی کریں، اور اِن کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اِن کا خالق تو ہوں میں، اور یہ بندگی کرتے پھریں دوسروں کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جنّوں اور انسانوں ہی کا خالق تو نہیں ہے بلکہ سارے جہان اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے، پھر یہاں صرف جنّوں اور انسانوں ہی کے متعلق کیوں فرمایا گیا کہ میں نے ان کو اپنے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟ حالانکہ مخلوقات کا ذرہ ذرہ اللہ ہی کی بندگی کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جنّ اور انسان ایسی مخلوق ہیں جن کو یہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہیں تو کریں، ورنہ وہ بندگی سے منہ بھی موڑ سکتے ہیں اور اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری جتنی مخلوقات بھی اس دنیا میں ہیں، وہ اِس نوعیت کی کوئی آزادی نہیں رکھتیں۔ اُن کے لیے سرے سے کوئی دائرۂ اختیار ہے ہی نہیں کہ وہ اس میں اللہ کی بندگی نہ کریں یا کسی اور کی بندگی کر سکیں۔ اس لیے یہاں صرف جنّوں اور انسانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے حُدود میں اپنے خالق کی اطاعت و عُبودیت سے مُنہ موڑ کر، اور خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے خود اپنی فطرت سے لڑ رہے ہیں، اُن کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ خالق کے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں، اور ان کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ جو آزادی انہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں، بلکہ اِس آزادی کے حُدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اُسی

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ

بڑی قوت والا اور زبردست ۵۵۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ۵۶، ان کے حصّے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے

طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح اُن کے جسم کا رونگٹا رونگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حُدُود میں اُس کی بندگی کر رہا ہے۔

عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز، روزے اور اِسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنٰی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے لے کہ جنّ اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہُوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے، مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پُورا مفہُوم یہ ہے کہ جنّ اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرمانبرداری اور نیاز مندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجا لانا، کسی اور سے تقوٰی کرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳۔ الزُّمَر، حاشیہ ۲۔ الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

ایک اور بات جو ضمنی طور پر اس آیت سے صاف ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جنّ انسانوں سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اِس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو دعوٰی کرتے ہیں کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو قرآن میں جنّ کہا گیا ہے۔ اِسی حقیقت پر قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی ناقابلِ انکار شہادت بہم پہنچاتی ہیں: الانعام: ۱۰۰-۱۲۸۔ الاعراف: ۳۸-۱۷۹۔ ہود: ۱۱۹۔ الحِجر: ۲۷ تا ۳۳۔ بنی اسرائیل: ۸۸۔ الکہف: ۵۰۔ السجدہ: ۱۳۔ سبا: ۴۱۔ صٓ: ۷۵-۷۶۔ حٰمٓ السجدہ: ۲۵۔ الاحقاف: ۱۸۔ الرحمٰن: ۱۵-۳۹-۵۶۔ (اس مسئلے پر مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۲۱۔ النمل، حاشیہ ۲۳ و ۴۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۲۴)

۵۴ — یعنی میری کوئی غرض جنّوں اور انسانوں سے اَٹکی ہوئی نہیں ہے کہ یہ میری عبادت کریں گے تو میری خدائی چلے گی اور یہ میری بندگی سے منہ موڑ لیں گے تو میں خدا نہ رہوں گا۔ میں اِن کی عبادت کا محتاج نہیں ہوں، بلکہ میری عبادت کرنا خود ان کی اپنی فطرت کا تقاضا ہے، اسی کے لیے یہ پیدا کیے گئے ہیں، اور اپنی فطرت سے لڑنے میں اِن کا اپنا نقصان ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں"، اِس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ خدا سے برگشتہ لوگ دنیا میں جن جن کی بندگی بجا لا رہے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے اِن بندوں کے محتاج ہیں۔ یہ اُن کی خدائی نہ چلائیں تو ایک دن بھی وہ نہ چلے۔ وہ اِن کے رازق نہیں بلکہ اُلٹے یہ اُن کو رزق پہنچاتے ہیں۔ وہ اِن کو نہیں کھلاتے بلکہ اُلٹے یہ اُن کو کھلاتے ہیں۔ وہ اِن کی جان کے محافظ نہیں بلکہ اُلٹے یہ اُن کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کے لشکر یہ ہیں جن کے بل پر اُن کی خدائی چلتی ہے۔ جہاں بھی اِن جھوٹے خداؤں کی حمایت کرنے والے بندے نہ رہے، یا بندوں نے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا، وہاں ان کے سب ٹھاٹ پڑے رہ گئے اور دنیا کی آنکھوں نے اُن کی کَس مپُرسی کا حال دیکھ لیا۔ سارے معبودوں میں اکیلا ایک اللہ جَلّ شانُہٗ ہی وہ حقیقی معبُود ہے جس کی خدائی اپنے بل بُوتے پر چل رہی ہے، جو اپنے بندوں سے کچھ لیتا نہیں بلکہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اَصۡحٰبِهِمۡ فَلَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ
يَّوۡمِهِمُ الَّذِيۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع

ع ۳ ۱۴ ۲

جیسا اِنھی جیسے لوگوں کو اُن کے حصّے کا مل چکا ہے، اس کے لیے یہ لوگ جلدی نہ مچائیں۔[۵۷]
آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لیے اُس روز جس کا انھیں خوف دلایا جا رہا ہے۔ ع

وہی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے۔

۵۵- اصل میں لفظ ”متین“ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: مضبوط اور غیر متزلزل، جسے کوئی ہلا نہ سکتا ہو۔

۵۶- ظلم سے مراد یہاں حقیقت اور صداقت پر ظلم کرنا، اور خود اپنی فطرت پر ظلم کرنا ہے۔ سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ یہاں ظلم کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو خداوندِ عالَم کے سوا دوسروں کی بندگی کر رہے ہیں، جو آخرت کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں غیر ذمّہ دار سمجھ رہے ہیں، اور اُن انبیاؑ کو جھٹلا رہے ہیں جنھوں نے ان کو حقیقت سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے۔

۵۷- یہ جواب ہے کفّار کے اس مطالبے کا کہ وہ یوم الجزا کہاں آتے آتے رہ گیا ہے، آخر وہ آ کیوں نہیں جاتا۔

تفہیم القرآن

الطُّور

(۵۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الطُّور

نام پہلے ہی لفظ ''وَالطُّوْرِ'' سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول مضامین کی اندرونی شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی مکّۂ معظّمہ کے اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ ذاریات نازل ہوئی تھی۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ تو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نُزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعتراضات اور الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، مگر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ظلم وستم کی چکّی زور شور سے چلنی شروع ہو گئی تھی۔

موضوع اور مَباحِث اس کے پہلے رُکوع کا موضوع آخرت ہے۔ سورۂ ذاریات میں اس کے امکان اور وجوب اور وقوع کے دلائل دیے جا چکے تھے، اس لیے یہاں اُن کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے، البتہ آخرت کی شہادت دینے والے چند حقائق و آثار کی قسم کھا کر پُورے زور کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی اور کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے برپا ہونے سے روک دے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آئے گی تو اس کے جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوگا، اور اسے مان کر تقویٰ کی رَوِش اختیار کر لینے والے کس طرح اللہ کے انعامات سے سرفراز ہوں گے۔

اس کے بعد دوسرے رُکوع میں سردارانِ قریش کے اُس رَویّے پر تنقید کی گئی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ آپؐ کو کبھی کاہن، کبھی مجنون اور کبھی شاعر قرار دے کر عوام الناس کو آپؐ کے خلاف بہکاتے تھے، تاکہ لوگ آپؐ کے لائے ہوئے پیغام کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ کریں۔ وہ آپؐ کی ذات کو اپنے حق میں ایک بلائے ناگہانی سمجھتے تھے اور عَلانیہ کہتے تھے کہ کوئی آفت اِن پر نازل ہو جائے تو ہمارا اِن سے پیچھا چھُوٹے۔ وہ آپؐ پر الزام لگاتے تھے کہ یہ قرآن آپؐ خود گھڑ گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کر رہے ہیں اور یہ معاذ اللہ، ایک فریب ہے جو آپؐ نے بنا رکھا ہے۔ وہ بار بار طنز کرتے تھے کہ خدا کو نبوت کے لیے ملے بھی تو بس یہ صاحب ملے۔ وہ آپؐ کی دعوت و تبلیغ سے ایسی بیزاری کا اظہار کرتے تھے جیسے آپؐ کچھ مانگنے کے لیے اُن کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے آپؐ سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ وہ آپس میں بیٹھ بیٹھ کر سوچتے تھے کہ آپؐ کے خلاف کیا چال ایسی چلی جائے جس سے آپؐ کی اِس دعوت کا خاتمہ ہو جائے۔ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے انھیں اِس امر کا کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کیسے جاہلانہ عقائد میں مبتلا ہیں جن کی تاریکی سے

لوگوں کو نکالنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بے غرضانہ اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِسی رویّے پر تنقید کرتے ہوئے پے درپے کچھ سوالات کیے ہیں جن میں سے ہر سوال یا تو اُن کے کسی اعتراض کا جواب ہے، یا اُن کی کسی جہالت پر تبصرہ۔ پھر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو آپؐ کی نبوت کا قائل کرنے کے لیے کوئی معجزہ دکھانا قطعی لاحاصل ہے، کیونکہ یہ ایسے ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ انھیں خواہ کچھ بھی دکھا دیا جائے، یہ اُس کی کوئی تاویل کر کے ایمان لانے سے گریز کر جائیں گے۔

اس رُکوع کے آغاز میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اِن مخالفین و مُعاندین کے الزامات و اعتراضات کی پروا کیے بغیر اپنی دعوت و تذکیر کا کام مسلسل جاری رکھیں، اور آخر میں بھی آپؐ کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ صبر کے ساتھ اِن مزاحمتوں کا مقابلہ کیے چلے جائیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ جائے۔ اِس کے ساتھ آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں اُٹھا کر اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ وہ برابر آپؐ کی نگہبانی کر رہا ہے۔ جب تک اُس کے فیصلے کی گھڑی نہ آئے، آپؐ سب کچھ برداشت کرتے رہیں اور اپنے رب کی حمد و تسبیح سے وہ قوت حاصل کرتے رہیں جو ایسے حالات میں اللہ کا کام کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتھا ۴۹ سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالطُّوْرِ ۝١ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝٢ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝٣ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝٤

قسم ہے طُور کی[۱]، اور ایک ایسی کُھلی کتاب کی جو رقیق جِلد میں لکھی ہوئی[۲] ہے، اور آباد گھر کی[۳]،

۱ – طُور کے اصل معنیٰ پہاڑ کے ہیں، اور الطُّور سے مراد وہ خاص پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

۲ – قدیم زمانے میں جن کتابوں اور تحریروں کو زمانۂ دراز تک محفوظ رکھنا ہوتا تھا، انھیں کاغذ کے بجائے ہرن کی کھال پر لکھا جاتا تھا۔ یہ کھال خاص طور پر لکھنے ہی کے لیے رقیق جِلد یا جِھلّی کی شکل میں تیار کی جاتی تھی اور اِصطِلاح میں اسے رَقّ کہا جاتا تھا۔ اہلِ کتاب بالعُموم تورات، زَبُور، انجیل اور صُحُفِ انبیاؑ کو اِسی رَقّ پر لکھا کرتے تھے، تاکہ طویل مدّت تک محفوظ رہ سکیں۔ یہاں کُھلی کتاب سے مراد یہی مجموعۂ کُتُبِ مقدّسہ ہے جو اہلِ کتاب کے ہاں موجود تھا۔ اُسے ''کُھلی کتاب'' اِس لیے کہا گیا ہے کہ وہ نایاب نہ تھا، پڑھا جاتا تھا، اور بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

۳ – ''آباد گھر'' سے مراد حضرت حَسَن بصریؒ کے نزدیک بیت اللہ، یعنی خانۂ کعبہ ہے جو کبھی حج اور عُمرہ اور طواف و زیارت کرنے والوں سے خالی نہیں رہتا۔ اور حضرت علیؓ، ابنِ عباسؓ، عِکرِمہ، مجاہد، قَتادہ، ضَحّاک، ابنِ زَید اور دوسرے مفسّرین اس سے مراد وہ بیتِ معمور لیتے ہیں جس کا ذکر معراج کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جس کی دیوار سے آپؐ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو ٹیک لگائے دیکھا تھا۔ مجاہد، قَتادہ اور ابنِ زَید کہتے ہیں کہ جس طرح خانۂ کعبہ اہلِ زمین کے لیے خدا پرستوں کا مرکز و مَرجَع ہے، اُسی طرح ہر آسمان میں اُس کے باشندوں کے لیے ایسا ہی ایک کعبہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کے لیے ایسی ہی مرکزیّت رکھتا ہے۔ انھی میں سے ایک کعبہ وہ تھا جس کی دیوار سے ٹیک لگائے حضرت ابراہیم علیہ السّلام معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آئے تھے، اور اُس سے حضرت ابراہیمؑ کی مناسبت فطری تھی، کیونکہ آپ ہی زمین والے کعبے کے بانی ہیں۔ اِس تشریح کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ دوسری تفسیر حضرت حَسَن بصریؒ کی تفسیر کے خلاف نہیں پڑتی، بلکہ دونوں کو ملا کر ہم یُوں سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں قَسَم صرف زمین ہی کے کعبے کی نہیں کھائی گئی ہے، بلکہ اس میں اُن تمام کعبوں کی قَسَم بھی شامل ہے جو ساری کائنات میں موجود ہیں۔

وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ
لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾

اور اُونچی چھت کی[4]، اور موجزن سمندر[5] کی، کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے،
جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں[6]۔ وہ اُس روز واقع ہوگا جب آسمان بُری طرح ڈگمگائے گا

---

۴ – اُونچی چھت سے مراد آسمان ہے جو زمین پر ایک قُبّے کی طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہاں یہ لفظ پُورے عالَم بالا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ق، حاشیہ ۷)

۵ – اصل میں لفظ اَلْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ استعمال ہوا ہے۔ اس کے متعدد معنیٰ بیان کیے گئے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اس کو "آگ سے بھرے ہوئے" کے معنیٰ میں لیا ہے۔ بعض اس کو فارغ اور خالی کے معنیٰ میں لیتے ہیں، جس کا پانی زمین میں اُتر کر غائب ہو گیا ہو۔ بعض اسے محبُوس کے معنیٰ میں لیتے ہیں، اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ سمندر کو روک کر رکھا گیا ہے، تاکہ اس کا پانی زمین میں اُتر کر غائب بھی نہ ہو جائے اور خشکی پر چھا بھی نہ جائے کہ زمین کے سب باشندے اس میں غرق ہو جائیں۔ بعض اسے مخلوط کے معنیٰ میں لیتے ہیں، جس کے اندر میٹھا اور کھاری، گرم اور سرد ہر طرح کا پانی آ کر مل جاتا ہے۔ اور بعض اس کو لبریز اور موجزن کے معنیٰ میں لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو معنیٰ تو موقع و محل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ سمندر کی یہ دونوں کیفیات کہ اُس کی تہ پھٹ کر اُس کا پانی زمین کے اندر اُتر جائے اور وہ آگ سے بھر جائے، قیامت کے وقت ظاہر ہوں گی، جیسا کہ سورۂ تکویر، آیت ۶، اور سورۂ اِنفطار، آیت ۳ میں بیان ہوا ہے۔ یہ آیندہ رونما ہونے والی کیفیات اِس وقت موجود نہیں ہیں کہ اُن کی قسم کھا کر آج کے لوگوں کو آخرت کے وقوع کا یقین دلایا جائے۔ اس لیے اِن دو معنوں کو ساقط کر کے یہاں البحر المسجور کو محبُوس، مخلوط، اور لبریز و موجزن کے معنیٰ ہی میں لیا جا سکتا ہے۔

۶ – یہ ہے وہ حقیقت جس پر اِن پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ رب کے عذاب سے مراد آخرت ہے۔ چونکہ یہاں اُس پر ایمان لانے والے مُخاطَب نہیں ہیں بلکہ اُس کا انکار کرنے والے مُخاطَب ہیں، اور اُن کے حق میں اُس کا آنا عذاب ہی ہے، اس لیے اُس کو قیامت یا آخرت یا روزِ جزا کہنے کے بجائے "رب کا عذاب" کہا گیا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس کے وقوع پر وہ پانچ چیزیں کس طرح دلالت کرتی ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔

طُور وہ جگہ ہے جہاں ایک دبی اور پِسی ہوئی قوم کو اُٹھانے اور ایک غالب و قاہر قوم کو گرانے کا فیصلہ کیا گیا، اور یہ فیصلہ قانونِ طبیعی (physical law) کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانونِ اخلاقی (moral law) اور قانونِ مُکافات (law of retribution) کی بنیاد پر تھا۔ اس لیے آخرت کے حق میں تاریخی اِستدلال کے طَور پر طُور کو

Maktaba Tul Ishaat.com

بطور ایک علامت کے پیش کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل جیسی ایک بے بس قوم کا اُٹھایا جانا اور فرعون جیسے ایک زبردست فرمانروا کا اپنے لشکروں سمیت غرق کر دیا جانا، جس کا فیصلہ ایک سُنسان رات میں کوہِ طُور پر کیا گیا تھا، انسانی تاریخ میں اِس امر کی ایک نمایاں ترین مثال ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح انسان جیسی ایک ذی عقل و ذی اختیار مخلوق کے معاملے میں اَخلاقی محاسبے اور جزائے اعمال کا تقاضا کرتا ہے، اور اس تقاضے کی تکمیل کے لیے ایک ایسا یوم الحساب ضروری ہے جس میں پوری نَوعِ انسانی کو اکٹھا کر کے اس کا محاسبہ کیا جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ذاریات، حاشیہ ۲۱)

کُتُبِ مقدّسہ کے مجموعے کی قسم اِس بنا پر کھائی گئی ہے کہ خداوندِ عالَم کی طرف سے دنیا میں جتنے بھی انبیاؑ آئے اور جو کتابیں بھی وہ لائے، اُن سب نے ہر زمانے میں وہی ایک خبر دی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، یعنی یہ کہ تمام اگلے پچھلے انسانوں کو ایک دن اَز سرِ نَو زندہ ہو کر اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا اور سزا پانی ہے۔ کوئی کتاب آسمانی کبھی ایسی نہیں آئی ہے جو اس خبر سے خالی ہو، یا جس نے انسان کو اُلٹی یہ اطلاع دی ہو کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اور انسان بس مر کر مٹی ہو جانے والا ہے، جس کے بعد نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب۔

بیتِ معمور کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ خاص طور پر اہلِ عرب کے لیے اُس زمانے میں خانۂ کعبہ کی عمارت ایک ایسی کُھلی نشانی تھی جو اللہ کے پیغمبروں کی صداقت پر اور اِس حقیقت پر کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کی حکمتِ بالغہ و قدرتِ قاہرہ اُن کی پشت پر ہے، صریح شہادت دے رہی تھی۔ اِن آیات کے نُزول سے ڈھائی ہزار برس پہلے بے آب و گیاہ اور غیر آباد پہاڑوں میں ایک شخص کسی لاؤ لشکر اور سرو سامان کے بغیر آتا ہے اور اپنی ایک بیوی اور ایک شِیر خوار بچے کو بالکل بے سہارا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پھر کچھ مدّت بعد وہی شخص آ کر اس سُنسان جگہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ایک گھر بناتا ہے اور پکار دیتا ہے کہ لوگو! آؤ اور اس گھر کا حج کیا کرو۔ اِس تعمیر اور اِس پکار کو یہ حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہی گھر تمام اہلِ عرب کا مرکز بن جاتا ہے، اُس پکار پر عرب کے ہر گوشے سے لوگ لبّیک لبّیک کہتے ہوئے کھنچے چلے آتے ہیں، ڈھائی ہزار برس تک یہ گھر ایسا امن کا گہوارہ بنا رہتا ہے کہ اِس کے گرد و پیش سارے ملک میں کُشت و خون کا بازار گرم ہوتا ہے، مگر اس کے حُدُود میں آ کر کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمّت نہیں ہوتی، اور اسی گھر کی بدولت عرب کو ہر سال چار مہینے ایسے امن کے میسّر آ جاتے ہیں جن میں قافلے اطمینان سے سفر کرتے ہیں، تجارت چمکتی ہے اور بازار لگتے ہیں۔ پھر اُس گھر کا یہ دبدبہ تھا کہ اس پُوری مدّت میں کوئی بڑے سے بڑا جبّار بھی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکا، اور جس نے یہ جراَت کی وہ اللہ کے غضب کا ایسا شکار ہوا کہ عبرت بن کر رہ گیا۔ یہ کرشمہ اِن آیات کے نُزول سے صرف ۴۵ ہی برس پہلے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور اس کے دیکھنے والے بہت سے آدمی اُس وقت مکّۂ معظّمہ میں زندہ موجود تھے جب یہ آیات اہلِ مکّہ کو سنائی جا رہی تھیں۔ اس سے بڑھ کر کیا چیز اس بات کی دلیل ہو سکتی تھی کہ خدا کے پیغمبر ہوائی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اُن کی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ اُن کی زبان پر وہ حقائق

جاری ہوتے ہیں جن تک دوسروں کی عقل نہیں پہنچ سکتی۔ وہ بظاہر ایسے کام کرتے ہیں جن کو ایک وقت کے لوگ دیکھیں تو دیوانگی سمجھیں اور صدیوں بعد کے لوگ انھی کو دیکھ کر ان کی بصیرت پر دنگ رہ جائیں۔ اِس شان کے لوگ جب بالاتفاق ہر زمانے میں یہ خبر دیتے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی اور حشر ونشر ہوگا تو اِسے دیوانوں کی بڑ سمجھنا خود دیوانگی ہے۔

اُونچی چھت (آسمان) اور موجزن سمندر کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں، اور اسی حکمت وقدرت سے آخرت کا امکان بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کا وقوع و وجوب بھی۔ آسمان کی دلالت پر ہم اس سے پہلے تفسیر سورۂ ق، حاشیہ ۷ میں کلام کر چکے ہیں۔ رہا سمندر، تو جو شخص بھی انکار کا پیشگی فیصلہ کیے بغیر اُس کو نگاہِ غور سے دیکھے گا، اس کا دل یہ گواہی دے گا کہ زمین پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کا فراہم ہو جانا بجائے خود ایک ایسی کاریگری ہے جو کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اُس کے ساتھ اِتنی بے شمار حکمتیں وابستہ ہیں کہ اتفاقاً ایسا حکیمانہ نظام قائم ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس میں بے حد وحساب حیوانات پیدا کیے گئے ہیں جن میں سے ہر نوع کا نظامِ جسمانی ٹھیک اُس گہرائی کے لیے موزوں بنایا گیا ہے جس کے اندر اُسے رہنا ہے۔ اس کے پانی کو نمکین بنا دیا گیا ہے، تاکہ روزانہ کروڑوں جانور جو اس میں مرتے ہیں اُن کی لاشیں سڑ نہ جائیں۔ اِس کے پانی کو ایک خاص حد پر اس طرح روک رکھا گیا ہے کہ نہ تو وہ زمین کے شگافوں سے گزر کر اس کے پیٹ میں اُتر جاتا ہے اور نہ خشکی پر چڑھ کر اسے غرق کر دیتا ہے، بلکہ لاکھوں کروڑوں برس سے وہ اسی حد پر رُکا ہوا ہے۔ اِسی عظیم ذخیرۂ آب کے موجود اور برقرار رہنے سے زمین کے خشک حصّوں پر بارش کا انتظام ہوتا ہے، جس میں سورج کی گرمی اور ہواؤں کی گردش اِس کے ساتھ پوری باقاعدگی کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اسی کے غیر آباد نہ ہونے اور طرح طرح کی مخلوقات اس میں پیدا ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہوا ہے کہ انسان اس سے اپنی غذا اور اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں کثیر مقدار میں حاصل کر رہا ہے۔ اسی کے ایک حد پر رُکے رہنے سے وہ برِّاعظم اور جزیرے قائم ہیں جن پر انسان بس رہا ہے۔ اور اسی کے چند اٹل قواعد کی پابندی کرنے سے یہ ممکن ہوا ہے کہ انسان اس میں جہاز رانی کر سکے۔ ایک حکیم کی حکمت اور ایک قادرِ مُطلَق کی زبردست قدرت کے بغیر اس انتظام کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ انسان اور زمین کی دوسری مخلوقات کے مفاد سے سمندر کے اِس انتظام کا یہ گہرا تعلق بس اَلل ٹپ ہی قائم ہو گیا ہے۔ اب اگر فی الواقع یہ اس امر کی ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ ایک خدائے حکیم وقادر نے انسان کو زمین پر آباد کرنے کے لیے دوسرے بے شمار انتظامات کے ساتھ یہ بحرِ شور بھی اِس شان کا پیدا کیا ہے تو وہ شخص سخت احمق ہوگا جو اُس حکیم سے اِس نادانی کی توقع رکھے کہ وہ اِس سمندر سے انسان کی کھیتیاں سیراب کرنے اور اس کے ذریعے سے انسان کو رزق دینے کا انتظام تو کر دے گا مگر اس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ تو نے میرا رزق کھا کر اُس کا حق کیسے ادا کیا، اور وہ اِس سمندر کے سینے پر اپنے جہاز دوڑانے کی قدرت تو انسان کو عطا کر دے گا مگر اُس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ یہ جہاز تُو نے حق اور راستی کے ساتھ دوڑائے تھے یا اِن کے ذریعے سے دنیا میں ڈاکے مارتا پھرتا تھا۔ اسی طرح یہ تصوُّر کرنا بھی ایک بہت بڑی کُند ذہنی ہے کہ جس

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى وقف لازم
نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴

اور پہاڑ اُڑے اُڑے پھریں گے۔[8] تباہی ہے اُس روز اُن جھٹلانے والوں کے لیے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجّت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں[9]۔ جس دن انھیں دھکّے مار مار کر نارِ جہنّم کی طرف لے چلا جائے گا، اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ "یہ وہی آگ ہے جسے تم جُھٹلایا کرتے تھے،

قادرِ مُطلَق کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ اِس عظیم الشان سمندر کی تخلیق ہے، جس نے فضا میں گھومنے والے اِس معلّق کُرے پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کو تھام رکھا ہے، جس نے نمک کی اتنی بڑی مقدار اِس میں گھول دی ہے، جس نے طرح طرح کی اَن گنت مخلوقات اس میں پیدا کی ہیں اور ان سب کی رزق رسانی کا انتظام اِسی کے اندر کر دیا ہے، جو ہر سال اربوں ٹن پانی اِس میں سے اُٹھا کر ہوا کے دوش پر لے جاتا ہے اور کروڑوں مربع میل کے خشک علاقوں پر اُسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ برساتا رہتا ہے، وہ انسان کو ایک دفعہ پیدا کر دینے کے بعد ایسا عاجز ہو جاتا ہے کہ پھر اُسے پیدا کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

۷ – اصل الفاظ ہیں: تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا۔ مَور عربی زبان میں گھومنے، اَونٹنے، پھڑکنے، جھُوم جھُوم کر چلنے، چکّر کھانے اور بار بار آگے پیچھے حرکت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے دن آسمان کی جو حالت ہوگی، اسے اِن الفاظ میں بیان کر کے یہ تصوّر دلایا گیا ہے کہ اُس روز عالَمِ بالا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دیکھنے والا جب آسمان کی طرف دیکھے گا تو اُسے یوں محسوس ہوگا کہ وہ جما جمایا نقشہ جو ہمیشہ ایک ہی شان سے نظر آتا تھا، بگڑ چکا ہے اور ہر طرف ایک اضطراب برپا ہے۔

۸ – دوسرے الفاظ میں زمین کی وہ گرفت جس نے پہاڑوں کو جما رکھا ہے، ڈھیلی پڑ جائے گی اور وہ اپنی جڑوں سے اُکھڑ کر فضا میں اس طرح اُڑنے لگیں گے جیسے بادل اُڑے پھرتے ہیں۔

۹ – مطلب یہ ہے کہ نبی سے قیامت اور آخرت اور جنّت و دوزخ کی خبریں سُن کر انھیں مذاق کا موضوع بنا رہے ہیں، اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرنے کے بجائے محض تفریحاً ان پر باتیں چھانٹ رہے ہیں۔ آخرت پر ان کی بحثوں کا مقصود حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں ہے، بلکہ ایک کھیل ہے جس سے یہ دل بہلاتے ہیں اور انھیں کچھ ہوش نہیں ہے کہ فی الواقع یہ کس انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا
تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶ اِنَّ
الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۝۱۷ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ
عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۱۸ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ مُتَّكِـِٕيْنَ

اب بتاؤ یہ جادُو ہے یا تمھیں سوجھ نہیں رہا ہے؟[۱۰] جاؤ اب جھلسو اِس کے اندر، تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے یکساں ہے، تمھیں ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔

متقی لوگ[۱۱] وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، لُطف لے رہے ہوں گے اُن چیزوں سے جو اُن کا رب اُنھیں دے گا، اور اُن کا رب اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔[۱۲] (ان سے کہا جائے گا:) کھاؤ اور پیو مزے سے[۱۳] اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے

۱۰- یعنی دنیا میں جب رسول تمھیں اِس جہنم کے عذاب سے ڈراتے تھے تو تم کہتے تھے کہ یہ محض الفاظ کی جادُوگری ہے جس سے ہمیں بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ اب بولو، یہ جہنّم جو تمھارے سامنے ہے، یہ اُسی جادُو کا کرشمہ ہے یا اب بھی تمھیں نہ سُوجھا کہ واقعی اُسی جہنّم سے تمھارا پالا پڑ گیا ہے جس کی خبر تمھیں دی جارہی تھی؟

۱۱- یعنی وہ لوگ جنھوں نے انبیاؑ کی دی ہوئی خبر پر ایمان لا کر دنیا ہی میں اپنا بچاؤ کر لیا اور اُن افکار و اعمال سے پرہیز کیا جن سے انسان جہنّم کا مستحق بنتا ہے۔

۱۲- کسی شخص کے داخلِ جنّت ہونے کا ذکر کر دینے کے بعد پھر دوزخ سے اس کے بچائے جانے کا ذکر کرنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی۔ مگر قرآنِ مجید میں متعدِد مقامات پر یہ دونوں باتیں الگ الگ اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ ارشاد کہ ”اللہ نے ان کو عذابِ دوزخ سے بچالیا“ دراصل اشارہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا اللہ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہے، ورنہ بشری کمزوریاں ہر شخص کے عمل میں ایسی ایسی خامیاں پیدا کر دیتی ہیں کہ اگر اللہ اپنی فیّاضی سے اُن کو نظر انداز نہ فرمائے اور سخت محاسبے پر اُتر آئے تو کوئی بھی گرفت سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اسی لیے جنت میں داخل ہونا اللہ کی جتنی بڑی نعمت ہے، اس سے کچھ کم نعمت یہ نہیں ہے کہ آدمی دوزخ سے بچالیا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰ وَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ
اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِیٴٍۢ بِمَا كَسَبَ

تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حُوریں اُن سے بیاہ دیں گے۔[14] جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں ان کے نقشِ قدم پر چلی ہے، ان کی اُس اولاد کو بھی ہم (جنّت میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔[15] ہر شخص اپنے کسب کے

۱۳ – یہاں ”مزے سے“ کا لفظ اپنے اندر بڑا وسیع مفہُوم رکھتا ہے۔ جنّت میں انسان کو جو کچھ ملے گا، کسی مشقّت اور محنت کے بغیر ملے گا۔ اس کے ختم ہو جانے یا اس کے اندر کمی واقع ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ اس کے لیے انسان کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ وہ عین اس کی خواہش اور اس کے دل کی پسند کے مطابق ہوگا۔ جتنا چاہے گا اور جب چاہے گا، حاضر کر دیا جائے گا۔ مہمان کے طور پر وہ وہاں مقیم نہ ہوگا کہ کچھ طلب کرتے ہوئے شرمائے، بلکہ سب کچھ اس کے اپنے گزشتہ اعمال کا صلہ اور اس کی اپنی پچھلی کمائی کا ثمرہ ہوگا۔ اس کے کھانے اور پینے سے کسی مرض کا خطرہ بھی نہ ہوگا۔ وہ بھوک مٹانے اور زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ صرف لذّت حاصل کرنے کے لیے ہوگا، اور آدمی جتنی لذت بھی اُس سے اُٹھانا چاہے، اٹھا سکے گا، بغیر اس کے کہ اس سے کوئی سُوءِ ہضم لاحق ہو۔ اور وہ غذا کسی قسم کی غلاظت پیدا کرنے والی بھی نہ ہوگی۔ اس لیے دنیا میں ”مزے سے“ کھانے پینے کا جو مفہُوم ہے، جنّت میں مزے سے کھانے پینے کا مفہُوم اس سے بدرجہا زیادہ وسیع اور اعلیٰ و ارفع ہے۔

۱۴ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ الصّافات، حواشی ۲۶-۲۹۔ الدُّخان، حاشیہ ۴۲۔

۱۵ – یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد آیت ۲۳، اور سورۂ مومن آیت ۸ میں بھی گزر چکا ہے، مگر یہاں اُن دونوں مقامات سے بھی زیادہ ایک بڑی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ سورۂ رعد والی آیت میں صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ اہلِ جنت کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کی بیویوں میں سے جو جو افراد بھی صالح ہوں گے، وہ سب ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور سورۂ مومن میں ارشاد ہوا تھا کہ فرشتے اہلِ ایمان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی اولاد اور ازواج اور آبا میں سے جو صالح ہوں، انھیں بھی جنت میں ان سے ملا دے۔ یہاں ان دونوں آیتوں سے زائد جو بات فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اولاد کسی نہ کسی درجۂ ایمان میں بھی اپنے آبا کے نقشِ قدم کی پیروی کرتی رہی ہو، تو خواہ اپنے عمل کے لحاظ سے وہ اُس مرتبے کی مستحق نہ ہو جو آبا کو اُن کے بہتر ایمان و عمل کی

رَهِيْنٌ ﴿٢١﴾ وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢٢﴾

عوض رہن ہے[16]۔ ہم اُن کو ہر طرح کے پھل اور گوشت[17]، جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا، خُوب دیے چلے جائیں گے۔

بنا پر حاصل ہوگا، پھر بھی یہ اولاد اپنے آبا کے ساتھ ملا دی جائے گی۔ اور یہ ملانا اُس نوعیت کا نہ ہوگا جیسے وقتاً فوقتاً کوئی کسی سے جا کر ملاقات کرلیا کرے، بلکہ اس کے لیے اَلْحَقْنَا بِهِمْ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ جنّت میں اُن کے ساتھ ہی رکھے جائیں گے۔ اس پر مزید یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اولاد سے ملانے کے لیے آبا کا درجہ گھٹا کر انھیں نیچے نہیں اُتارا جائے گا، بلکہ آبا سے ملانے کے لیے اولاد کا درجہ بڑھا کر انھیں اُوپر پہنچا دیا جائے گا۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ارشاد اُس بالغ اولاد کے بارے میں ہے جس نے سنِّ رُشد کو پہنچ کر اپنے اختیار اور ارادے سے ایمان لانے کا فیصلہ کیا ہو اور جو اپنی مرضی سے اپنے صالح بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلی ہو۔ رہی ایک مومن کی وہ اولاد جو سنِ رُشد کو پہنچنے سے پہلے ہی مرگئی ہو، تو اس کے معاملے میں کفر و ایمان اور طاعت و مَعصِیَت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے تو ویسے ہی جنّت میں جانا ہے اور اس کے آبا کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے انھی کے ساتھ رکھا جانا ہے۔

۱۶ – یہاں ''رہن'' کا استعارہ بہت معنٰی خیز ہے۔ ایک شخص اگر کسی سے کچھ قرض لے اور قرض دینے والا اپنے حق کی ادائیگی کے لیے ضمانت کے طور پر اس کی کوئی چیز اپنے پاس رہن رکھ لے، تو جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے اس وقت تک فکِّ رہن نہیں ہوسکتا، اور اگر مدّتِ مقررہ گزر جانے پر بھی وہ فکِّ رہن نہ کرائے تو شئے مَرہُونہ ضبط ہو جاتی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان معاملے کی نوعیت کو یہاں اِسی صورتِ معاملہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ خدا نے انسان کو جو سروسامان، جو طاقتیں اور صلاحیتیں اور جو اختیارات دنیا میں عطا کیے ہیں، وہ گویا ایک قرض ہے جو مالک نے اپنے بندے کو دیا ہے، اور اِس قرض کی ضمانت کے طور پر بندے کا نفس خدا کے پاس رہن ہے۔ بندہ اِس سروسامان اور اِن قوتوں اور اختیارات کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اگر وہ نیکیاں کمائے جن سے یہ قرض ادا ہو سکتا ہو تو وہ شئے مَرہُونہ، یعنی اپنے نفس کو چھُڑا لے گا، ورنہ اسے ضبط کرلیا جائے گا۔ پچھلی آیت کے معاً بعد یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے کہ مومنینِ صالحین خواہ بجائے خود کتنے ہی بڑے مرتبے کے لوگ ہوں، ان کی اولاد کا فکِّ رہن اِس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ وہ خود اپنے کسب سے اپنے نفس کو چھُڑائے۔ باپ دادا کی کمائی اولاد کو نہیں چھڑا سکتی۔ البتہ اولاد اگر کسی درجے کے بھی ایمان اور اتباعِ صالحین سے اپنے آپ کو چھُڑا لے جائے تو پھر یہ اللہ کا فضل اور اس کا کرم ہے کہ جنّت میں وہ اس کو نیچے کے مرتبوں سے اُٹھا کر اُونچے مراتب میں باپ دادا کے ساتھ لے جا کر ملا دے۔ باپ دادا کی نیکیوں کا یہ فائدہ تو اولاد کو مل سکتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے کسب سے اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق بنا لے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ باپ دادا کی خاطر اسے جنّت میں پہنچا دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اس آیت سے نکلتی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَ يَطُوْفُ
عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ

وہاں وہ ایک دُوسرے سے جامِ شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے، جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکرداری۔[18] اور اُن کی خدمت میں وہ لڑکے دَوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انھی کے لیے مخصوص ہوں[19] گے، ایسے خوبصورت جیسے چُھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دُوسرے سے (دُنیا میں

کہ کم درجے کی نیک اولاد کا بڑے درجے کے نیک آبا سے لے جا کر ملا دیا جانا دراصل اُس اولاد کے کسب کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اُن آبا کے کسب کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے عمل سے اِس فضل کے مستحق ہوں گے کہ ان کے دل خوش کرنے کے لیے ان کی اولاد کو ان سے لا ملایا جائے۔ اسی وجہ سے اللہ اُن کے درجے گھٹا کر انھیں اولاد کے پاس نہیں لے جائے گا، بلکہ اولاد کے درجے بڑھا کر اُن کے پاس لے جائے گا، تاکہ اُن پر خدا کی نعمتوں کے اِتمام میں یہ کسر باقی نہ رہ جائے کہ اپنی اولاد سے دُوری ان کے لیے باعث اذیّت ہو۔

۱۷- اس آیت میں اہلِ جنّت کو مطلقاً ہر قسم کا گوشت دیے جانے کا ذکر ہے، اور سورۂ واقعہ آیت ۲۱ میں فرمایا گیا ہے کہ پرندوں کے گوشت سے ان کی تواضع کی جائے گی۔ اس گوشت کی نوعیت ہمیں ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ مگر جس طرح قرآن کی بعض تصریحات اور بعض احادیث میں جنت کے دودھ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہوا نہ ہوگا، اور جنت کے شہد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ مکھیوں کا بنایا ہوا نہ ہوگا، اور جنت کی شراب کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ پھلوں کو سڑا کر کشید کی ہوئی نہ ہوگی، بلکہ اللہ کی قدرت سے یہ چیزیں چشموں سے نکلیں گی اور نہروں میں بہیں گی، اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنت کا گوشت بھی جانوروں کا ذبیحہ نہ ہوگا بلکہ یہ بھی قُدرتی طور پر پیدا ہوگا۔ جو خدا زمین کے مادّوں سے براہِ راست دُودھ اور شہد اور شراب پیدا کر سکتا ہے، اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ انھی مادّوں سے ہر طرح کا لذیذ ترین گوشت پیدا کر دے جو جانوروں کے گوشت سے بھی اپنی لذّت میں بڑھ کر ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۵۔ جلد پنجم، تفسیر سورۂ محمد، حواشی ۲۱ تا ۲۳)

۱۸- یعنی وہ شراب نشہ پیدا کرنے والی نہ ہوگی کہ اسے پی کر وہ بدمست ہوں اور بے ہودہ بکواس کرنے لگیں، یا گالم گلوچ اور دھول دھپّے پر اُتر آئیں، یا اُس طرح کی فحش حرکات کرنے لگیں جیسی دنیا کی شراب پینے والے کرتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۷)

۱۹- یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ غِلْمَانُهُمْ نہیں فرمایا بلکہ غِلْمَانٌ لَّهُمْ فرمایا ہے۔ اگر غِلْمَانُهُمْ فرمایا جاتا تو اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ دنیا میں اُن کے جو خادم تھے وہی جنت میں بھی ان کے خادم بنا دیے جائیں گے، حالانکہ دنیا کا جو شخص بھی جنت میں جائے گا اپنے استحقاق کی بنا پر جائے گا، اور کوئی وجہ نہیں کہ جنت میں پہنچ کر وہ اپنے اُسی آقا کا خادم

عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْۤ اَهْلِنَا
مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾
اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾ ع
فَذَكِّرْ فَمَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ ط

گزرے ہوئے) حالات پُوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے[20]، آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جُھلسا دینے والی ہوا[21] کے عذاب سے بچا لیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اُسی سے دُعائیں مانگتے تھے، وہ واقعی بڑا ہی مُحسن اور رحیم ہے۔ ع

پس اے نبیؐ! تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون[22]۔

بنا دیا جائے جس کی خدمت وہ دنیا میں کرتا رہا تھا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی خادم اپنے عمل کی وجہ سے اپنے مخدوم کی بہ نسبت زیادہ بلند مرتبہ جنت میں پائے۔ اِس لیے غِلْمَانٌ لَّهُمْ فرما کر اِس گمان کی گنجایش باقی نہیں رہنے دی گئی۔ یہ لفظ اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ یہ وہ لڑکے ہوں گے جو جنت میں اُن کی خدمت کے لیے مخصوص کر دیے جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۶)

۲۰ – یعنی ہم وہاں عیش میں منہمک اور اپنی دنیا میں مگن ہو کر غفلت کی زندگی نہیں گزار رہے تھے، بلکہ ہر وقت ہمیں یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس پر خدا کے ہاں ہماری پکڑ ہو۔ یہاں خاص طور پر اپنے گھر والوں کے درمیان ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جس وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اپنے بال بچوں کو عیش کرانے اور ان کی دنیا بنانے کی فکر ہے۔ اسی کے لیے وہ حرام کماتا ہے، دوسروں کے حُقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے، اور طرح طرح کی ناجائز تدبیریں کرتا ہے۔ اِسی بنا پر اہلِ جنت آپس میں کہیں گے کہ خاص طور پر جس چیز نے ہمیں عاقبت کی خرابی سے بچایا، وہ یہ تھی کہ اپنے بال بچوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں اُن کو عیش کرانے اور ان کا مستقبل شان دار بنانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اِس بات کی تھی کہ ہم اُن کی خاطر وہ طریقے نہ اختیار کر بیٹھیں جن سے ہماری آخرت برباد ہو جائے، اور اپنی اولاد کو بھی ایسے راستے پر نہ ڈال جائیں جو اُن کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا دے۔

۲۱ – اصل میں لفظ سَمُوْم استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ سخت گرم ہوا کے ہیں۔ اس سے مراد لُو کی وہ لپٹیں ہیں جو دوزخ سے اُٹھ رہی ہوں گی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۲- اُوپر آخرت کی تصویر پیش کرنے کے بعد اب تقریر کا رُخ کفّارِ مکّہ کی اُن ہٹ دھرمیوں کی طرف پھر رہا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہاں خطاب بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل آپؐ کے واسطے سے یہ باتیں کفّارِ مکّہ کو سنانی مقصود ہیں۔ اُن کے سامنے جب آپؐ قیامت، اور حشر و نشر، اور حساب و کتاب، اور جزا و سزا، اور جنّت و جہنّم کی باتیں کرتے تھے، اور اِن مضامین پر مشتمل قرآنِ مجید کی آیات اِس دعوے کے ساتھ اُن کو سناتے تھے کہ یہ خبریں اللہ کی طرف سے میرے پاس آئی ہیں اور یہ اللہ کا کلام ہے جو مجھ پر وحی کے ذریعے سے نازل ہوا ہے، تو اُن کے سردار اور مذہبی پیشوا اور اَوباش لوگ آپؐ کی اِن باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ نہ خود غور کرتے تھے، نہ یہ چاہتے تھے کہ عوام اِن کی طرف توجہ کریں۔ اس لیے وہ آپؐ کے اُوپر کبھی یہ فقرہ کستے تھے کہ آپؐ کاہن ہیں، اور کبھی یہ کہ آپؐ مجنون ہیں، اور کبھی یہ کہ آپؐ شاعر ہیں، اور کبھی یہ کہ آپؐ خود اپنے دل سے یہ نرالی باتیں گھڑتے ہیں اور محض اپنا رنگ جمانے کے لیے اِنھیں خدا کی نازل کردہ وحی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اس طرح کے فقرے کس کر وہ لوگوں کو آپؐ کی طرف سے بدگمان کر دیں گے اور آپؐ کی ساری باتیں ہوا میں اُڑ جائیں گی۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اَے نبیؐ! واقعی حقیقت تو وہی کچھ ہے جو سورت کے آغاز سے یہاں تک بیان کی گئی ہے۔ اب اگر یہ لوگ اِن باتوں پر تمھیں کاہن اور مجنون کہتے ہیں تو پروا نہ کرو اور بندگانِ خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنے کا کام کرتے چلے جاؤ، کیونکہ خدا کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون۔

''کاہن'' عَرَبی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنیٰ میں بولا جاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیّت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔ کاہنوں کا دعویٰ تھا، اور اُن کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں، یا ارواح اور شیاطین اور جِنّوں سے ان کا خاص تعلق ہے، جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اِنھی اغراض کے لیے لوگ اُن کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر و نیاز لے کر انھیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے، تاکہ لوگ ان کی طرف رُجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ مُقفّٰی اور مُسَجَّع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنّم کے ساتھ بولتے تھے، اور بالعموم ایسے گول مول فقرے استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔ قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام صرف اِس بنا پر لگا دیا کہ آپؐ اُن حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں، اور آپؐ کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے ایک فرشتہ آ کر آپؐ پر وحی نازل کرتا ہے، اور خدا کا جو کلام آپؐ پیش کر رہے تھے وہ بھی مُقفّٰی تھا۔ لیکن عرب میں کوئی شخص بھی اُن کے اِس الزام سے دھوکا نہ کھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور

أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ۞ قُلْ
تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ۞ أَمْ تَأْمُرُهُمْ

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایّام کا انتظار کر رہے
ہیں؟[۲۳] اِن سے کہو: اچھّا، انتظار کرو، مَیں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں[۲۴]۔ کیا اِن کی عقلیں اِنھیں

ان کی وضع قطع اور ان کی زبان اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس مقصد کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں، اُن کے مُسَجَّع فقرے کیسے ہوتے ہیں اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم کے رائج الوقت عقائد کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اُٹھتا اور شب و روز اس کی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اس کی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہانت کا یہ الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپؐ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب کا کوئی کُند ذہن سے کُند ذہن آدمی بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔

اِسی طرح آپؐ پر جنون کا الزام بھی کفارِ مکّہ محض اپنے دل کی تسلّی کے لیے لگاتے تھے، جیسے موجودہ زمانے کے بعض بے شرم مغربی مصنّفین اسلام کے خلاف اپنے بُغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے یہ دعوے کرتے ہیں کہ معاذ اللہ، حضورؐ پر صَرَع (epilepsy) کے دَورے پڑتے تھے، اور انھی دَوروں کی حالت میں جو کچھ آپؐ کی زبان سے نکلتا تھا اسے لوگ وحی سمجھتے تھے۔ ایسے بے ہودہ الزامات کو کسی صاحبِ عقل آدمی نے نہ اُس زمانے میں قابلِ اعتنا سمجھا تھا، نہ آج کوئی شخص قرآن کو پڑھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و رہنمائی کے حیرت انگیز کارنامے دیکھ کر یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ صَرَع کے دَوروں کا کرشمہ ہے۔

۲۳ – یعنی ہم منتظر ہیں کہ اس شخص پر کوئی آفت آئے اور کسی طرح اِس سے ہمارا پیچھا چھُوٹے۔ غالبًا اُن کا خیال یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمارے معبُودوں کی مخالفت اور اُن کی کرامات کا انکار کرتے ہیں، اس لیے یا تو معاذ اللہ، اِن پر ہمارے کسی معبود کی مار پڑے گی، یا کوئی دل چلا اِن کی یہ باتیں سن کر آپے سے باہر ہو جائے گا اور انھیں قتل کر دے گا۔

۲۴ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تمھاری یہ آرزو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ میں بھی منتظر ہوں کہ شامت میری آتی ہے یا تمھاری۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ
لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾

ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں؟[۲۵]
کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے[۲۶]۔ اگر یہ اپنے اِس قول میں سچے ہیں تو اِسی شان کا ایک کلام بنا لائیں[۲۷]۔

۲۵ – اِن دو فقروں میں مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کی ہوا نکال کر انھیں بالکل بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ اِستدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قریش کے سردار اور مشائخ بڑے عقل مند بنے پھرتے ہیں، مگر کیا اِن کی عقل یہی کہتی ہے کہ جو شخص شاعر نہیں ہے اُسے شاعر کہو، جسے ساری قوم ایک دانا آدمی کی حیثیت سے جانتی ہے اُسے مجنون کہو، اور جس شخص کا کہانت سے کوئی دُور دراز کا تعلق بھی نہیں ہے اسے خواہ مخواہ کاہن قرار دو۔ پھر اگر عقل ہی کی بنا پر یہ لوگ حکم لگاتے تو کوئی ایک حکم لگاتے۔ بہت سے متضاد حکم تو ایک ساتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک شخص آخر بیک وقت شاعر، مجنون اور کاہن کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ مجنون ہے تو نہ کاہن ہوسکتا ہے نہ شاعر۔ کاہن ہے تو شاعر نہیں ہوسکتا، اور شاعر ہے تو کاہن نہیں ہوسکتا، کیونکہ شعر کی زبان اور اس کے موضوعات بحث الگ ہوتے ہیں اور کہانت کی زبان اور اس کے مضامین الگ۔ ایک ہی کلام کو بیک وقت شعر بھی کہنا اور کہانت بھی قرار دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہوسکتا جو شعر اور کہانت کا فرق جانتا ہو۔ پس یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ متضاد باتیں عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد اور ہٹ دھرمی سے کی جارہی ہیں، اور قوم کے یہ بڑے بڑے سردار عناد کے جوش میں اندھے ہوکر محض بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں جنھیں کوئی سنجیدہ انسان قابلِ اعتنا نہیں سمجھ سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۰۴۔ یُونس، حاشیہ ۳۔ بنی اسرائیل، حواشی ۵۳ - ۵۴۔ جلد سوم، الشُّعراء، حواشی ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۴۰ - ۱۴۲ - ۱۴۳ - ۱۴۴)

۲۶ – دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود اُن کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپؐ کا کلام نہیں ہوسکتا، اور دوسرے وہ لوگ بھی جو اہلِ زبان ہیں، نہ صرف یہ کہ اِسے سُن کر صاف محسوس کرلیتے ہیں کہ یہ انسانی کلام سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، بلکہ اُن میں سے جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے وہ کبھی یہ گمان نہیں کرسکتا کہ یہ واقعی آپؐ ہی کا کلام ہے۔ پس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کو آپؐ کی تصنیف قرار دینے والے دراصل ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اس لیے وہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے گھڑ رہے ہیں، جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم،

یونس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲۔ القصص، حاشیہ ۶۴۔ العنکبوت، حاشیہ ۸۸-۸۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱ تا ۴۔ حٰم السجدہ، حاشیہ ۵۴۔ الاحقاف، حاشیہ ۸ تا ۱۰)

۲۷- یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اِس پائے کا کوئی کلام لاکر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو۔ یہ چیلنج نہ صرف قریش کو، بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سب سے پہلے اِس آیت میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تین مرتبہ مکۂ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینۂ منورہ میں اسے دُہرایا گیا۔ (ملاحظہ ہو: یونس، آیت ۳۸۔ ہود: ۱۳۔ بنی اسرائیل: ۸۸۔ البقرہ: ۲۳) مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اُس وقت ہمّت کر سکا، نہ اُس کے بعد آج تک کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلے میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اِس چیلنج کی حقیقی نوعیّت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے اسٹائل میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہومر، رُومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور، اقبال، سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اُتار کر انھی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ کا مطلب قرآن کے اسٹائل میں اُس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد اسٹائل میں مماثلت نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اِس پائے اور اس شان اور اِس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اُن خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدِمقابل قرار پا سکے جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے:

۱- جس زبان میں قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، اُس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمّل ترین نمونہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہُوا نہیں ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے، موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین اندازِ بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے، جس سے تکرار کی بدنُمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جَڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا موثّر ہے کہ کوئی زبان داں آدمی اسے سُن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا، حتّٰی کہ منکر اور مخالف کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ ۱۴ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے، جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی عربی زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ ۱۴ صدیاں گزر جانے پر بھی اِس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اتنی مدّت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک اِملا، اِنشا، محاورے، قواعدِ

Maktaba Tul Ishaat.com

زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہُوا ہے۔ اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مُستَعمَل ہے۔ اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے، اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو ۱۴ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اِس شان کی ہے؟

۲- یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اَخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اِتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا، اور پھر اُس قوم نے اُٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے، ۱۴ سو برس سے اس کے اِن اثرات کا سلسلہ جاری ہے، اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳- جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے، جس کا دائرہ اَزَل سے اَبَد تک پُوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبّر کون ہے؟ کیا اُس کی صفات ہیں، کیا اُس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اُس نے یہ پُورا نظامِ عالم قائم کیا ہے۔ وہ اِس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مُشَخَّص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مَقام اور یہ اُس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس مَقام اور اِس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پُوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے، اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعے سے اُس کو معلوم ہو سکتا ہے، اور کس طرح ہر زمانے میں اُس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی، بلکہ اُس راستے پر چلنے کے لیے ایک پُورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے، جس میں عقائد، اَخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدّن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پُوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اِس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اِس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالَم میں رُونما ہونے والے ہیں۔ وہ اِس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا

عالَم برپا ہونے کی نہایت مفصّل کیفیت بیان کرتی ہے، اِس تغیّر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے، دوسرے عالَم کا پُورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے، اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن اُمور کی اُس سے باز پُرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اس کا پُورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اُس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اِس کتاب میں کیا گیا ہے، وہ اِس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اِس کا مصنف حقیقت کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اُس کی نگاہ اَزَل سے اَبَد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اُس پر عیاں ہیں، کائنات پُوری کی پُوری اُس کے سامنے ایک کُھلی کتاب کی طرح ہے، نوعِ انسانی کے آغاز سے اُس کے خاتمے تک ہی نہیں بلکہ خاتمے کے بعد اُس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اُس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے، اور قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جو تصوّرِ کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے، وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور عُلومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اُس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا مَنطِقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے، وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ ۱۴ سو سال سے رُوئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجرِبے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اِس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴- یہ کتاب پُوری کی پُوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی، بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی، اُن کے حالات اور ان کی ضروریات کے مطابق اِس کے اجزا اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزا اُس مکمل کتاب کی صورت میں مُرتّب کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیے گئے جسے ''قرآن'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جُملے اس کے طبع زاد نہیں ہیں، بلکہ خداوندِ عالَم کی طرف سے اس پر نازل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں خود اُس رہنما کے طبع زاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی پُوری تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطورِ خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلّمِ اَخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ

Maktaba Tul Ishaat.com

فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مُقنّن کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں، وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں، ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیّل اور سلسلۂ فکر کار فرما نظر آئے، اس نے اوّل روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو، آخری دن تک اُسی بنیاد پر وہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جُز دوسرے اجزا سے کامل مطابقت رکھتا ہو، اور اس مجموعے کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پُورا نقشہ موجود تھا، اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اِس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلّاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

۵- جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جُملے جاری ہوئے تھے، وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف اِن کو سنانے کے لیے نہیں آ جاتا تھا اور انھیں سنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اِس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اُس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اُسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں اُن کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی دان لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اُس کے ہم زبان لوگ اُس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اِس کتاب کی زبان اور اس کا اسٹائل اُس رہنما کی زبان اور اُس کے اسٹائل سے بہت مختلف ہے، حتّٰی کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اِس کتاب کی کوئی عبارت آ جاتی ہے، وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر رہا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سال ہا سال تک دو قطعی مختلف اسٹائلوں میں کلام کرنے کا تکلّف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اسٹائل دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنّع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے۔ لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسٹائل کچھ ہو اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسٹائل بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶- وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دَوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدّد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عُسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی اسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح، دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنھوں نے اس پر ظلم توڑے تھے، اس

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ
رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ

کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہ خود اپنے خالق ہیں؟ یا زمین اور آسمانوں کو اِنھوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔[۲۸]
کیا تیرے رب کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں؟ یا اُن پر اِنھی کا حکم چلتا ہے؟[۲۹]
کیا اِن کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالَمِ بالا کی سُن گُن لیتے ہیں؟ اِن میں سے

کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اِن تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات، ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اُس رہنما نے اِن مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا، اُس میں اُن جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر اِن مختلف حالات میں جو کلام اس کی زبان سے سنا گیا، وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

۷۔ جو وسیع اور جامع علم اِس کتاب میں پایا جاتا ہے، وہ اُس زمانے کے اہلِ عرب اور اہلِ روم و یونان و ایران تو درکنار، اِس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس اور علوم عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعے میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتا چلتا ہے کہ اُس شعبۂ علم کے آخری مسائل کیا ہیں، اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کتاب میں اُن مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے، بلکہ اُن تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ۱۴ سو برس پہلے ریگستانِ عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اُس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدّد وجوہ ہیں، لیکن صرف اِن چند وُجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا، اُس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے اور

Maktaba Tul Ishaat.com

مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿٣٩﴾

جس نے سُن گُن لی ہو، وہ لائے کوئی کُھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لیے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لیے ہیں بیٹے؟[۳۰]

اِن شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔

۲۸- اِس سے پہلے جو سوالات چھیڑے گئے تھے، وہ کفّارِ مکّہ کو یہ احساس دلانے کے لیے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کو جُھٹلانے کے لیے جو باتیں وہ بنا رہے ہیں، وہ کس قدر غیر معقول ہیں۔ اب اِس آیت میں ان کے سامنے یہ سوال رکھا گیا ہے کہ جو دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، آخر اُس میں وہ بات کیا ہے جس پر تم لوگ اس قدر بگڑ رہے ہو۔ وہ یہی تو کہہ رہے ہیں کہ اللہ تمھارا خالق ہے اور اُسی کی تم کو بندگی کرنی چاہیے۔ اِس پر تمھارے بگڑنے کی آخر کیا معقول وجہ ہے؟ کیا تم خود بن گئے ہو، کسی بنانے والے نے تمھیں نہیں بنایا؟ یا اپنے بنانے والے تم خود ہو؟ یا یہ وسیع کائنات تمھاری بنائی ہوئی ہے؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے اور تم خود مانتے ہو کہ تمھارا خالق بھی اللہ ہی ہے اور اِس کائنات کا خالق بھی وہی ہے، تو اُس شخص پر تمھیں غصہ کیوں آتا ہے جو تم سے کہتا ہے کہ وہی اللہ تمھاری بندگی و پرستش کا مستحق ہے؟ غصّے کے لائق بات یہ ہے یا یہ کہ جو خالق نہیں ہیں اُن کی بندگی کی جائے اور جو خالق ہے اُس کی بندگی نہ کی جائے؟ تم زبان سے یہ اقرار تو ضرور کرتے ہو کہ اللہ ہی تمھارا اور کائنات کا خالق ہے، لیکن اگر تمھیں واقعی اِس بات کا یقین ہوتا تو اُس کی بندگی کی طرف بلانے والے کے پیچھے اِس طرح ہاتھ دھو کر نہ پڑ جاتے۔

یہ ایسا زبردست چُبھتا ہوا سوال تھا کہ اِس نے مشرکین کے عقیدے کی چُولیں ہِلا دیں۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ جُبَیرؓ بن مُطعِم جنگِ بدر کے بعد قریش کے قیدیوں کی رہائی پر بات چیت کرنے کے لیے کفّارِ مکّہ کی طرف سے مدینہ آئے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور اُس میں سورۂ طُور زیرِ تلاوت تھی۔ اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ جب حضورؐ اس مَقام پر پہنچے تو میرا دل میرے سینے سے اُڑا جاتا تھا۔ بعد میں اُن کے مسلمان ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس روز یہ آیات سُن کر اسلام ان کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

۲۹- یہ کفّارِ مکّہ کے اِس اعتراض کا جواب ہے کہ آخر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کیوں رسول بنائے گئے۔ اِس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو عبادتِ غیر اللہ کی گمراہی سے نکالنے کے لیے بہرحال کسی نہ کسی کو تو رسول مقرر کیا جانا ہی تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہے کہ خدا اپنا رسول کس کو بنائے اور کس کو نہ بنائے؟ اگر یہ لوگ خدا کے بنائے ہوئے رسول کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یا تو خدا کی خدائی کا مالک یہ اپنے آپ کو سمجھ بیٹھے ہیں، یا پھر ان کا زَعم یہ ہے کہ اپنی خدائی کا مالک تو خدا ہی ہو مگر اُس میں حکم اِن کا چلے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٠﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤١﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ

کیا تم اِن سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں[۳۱]؟

کیا اِن کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اُس کی بنا پر یہ لکھ رہے ہوں[۳۲]؟

کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں[۳۳]؟ (اگر یہ بات ہے) تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال

۳۰۔ اِن مختصر فقروں میں ایک بڑے مفصّل اِستدلال کو سمو دیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر تمھیں رسُول کی بات ماننے سے انکار ہے تو تمھارے پاس خود حقیقت کو جاننے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کیا تم میں سے کوئی شخص عالَمِ بالا میں پہنچا ہے اور اللہ تعالیٰ، یا اُس کے فرشتوں سے اُس نے براہِ راست یہ معلوم کر لیا ہے کہ وہ عقائد بالکل حقیقت کے مطابق ہیں جن پر تم لوگ اپنے دین کی بنا رکھے ہوئے ہو؟ یہ دعویٰ اگر کسی کو ہے تو وہ سامنے آئے اور بتائے کہ اُسے کب اور کیسے عالَمِ بالا تک رسائی حاصل ہوئی ہے اور کیا علم وہ وہاں سے لے کر آیا ہے۔ اور اگر یہ دعویٰ تم نہیں رکھتے تو پھر خود ہی غور کرو کہ اِس سے زیادہ مضحکہ انگیز عقیدہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم اللہ رب العالمین کے لیے اولاد تجویز کرتے ہو، اور اولاد بھی لڑکیاں، جنھیں تم خود اپنے لیے باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہو؟ علم کے بغیر اس قسم کی صریح جہالتوں کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہو، اور خدا کی طرف سے جو شخص علم کی روشنی تمھارے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی جان کے دشمن ہوئے جاتے ہو۔

۳۱۔ سوال کا اصل رُوئے سُخن کفار کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رسول تم سے کوئی غرض رکھتا اور اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا تو اس سے تمھارے بھاگنے کی کم از کم ایک معقول وجہ ہوتی۔ مگر تم خود جانتے ہو کہ وہ اپنی اِس دعوت میں بالکل بے غرض ہے اور محض تمھاری بھلائی کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے اُس کی بات سننے تک کے روادار نہیں ہو؟ اس سوال میں ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ ساری دنیا کے بناوٹی پیشواؤں اور مذہبی آستانوں کے مجاوروں کی طرح عرب میں بھی مشرکین کے پیشوا اور پنڈت اور پروہت کُھلا کُھلا مذہبی کاروبار چلا رہے تھے۔ اِس پر یہ سوال اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ایک طرف یہ مذہب کے تاجر ہیں جو علانیہ تم سے نذریں، نیازیں اور ہر مذہبی خدمت کی اُجرتیں وصول کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص کامل بے غرضی کے ساتھ، بلکہ اپنے تجارتی کاروبار کو برباد کر کے تمھیں نہایت معقول دلائل سے دین کا سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ صریح بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اِس سے بھاگتے اور اُن کی طرف دوڑتے ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمَكِيْدُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾

اُلٹی ہی پڑے گی۔[۳۴]

کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔[۳۵]

۳۲- یعنی رسول تمھارے سامنے جو حقائق پیش کر رہا ہے، ان کو جھٹلانے کے لیے آخر تمھارے پاس وہ کون سا علم ہے جسے تم اس دعوے کے ساتھ پیش کر سکو کہ پردۂ ظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کو تم براہِ راست جانتے ہو؟ کیا واقعی تمھیں یہ علم ہے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ وہ سب بھی خدائی صفات و اختیارات رکھتے ہیں جنھیں تم نے معبود بنا رکھا ہے؟ کیا واقعی تم نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑکیاں ہیں اور نعوذ باللہ، خدا کے ہاں پیدا ہوئی ہیں؟ کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ کوئی وحی نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی ہے، نہ خدا کی طرف سے کسی بندے کے پاس آ سکتی ہے؟ کیا واقعی تمھیں اس بات کا علم ہے کہ کوئی قیامت برپا نہیں ہونی ہے، اور مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی، اور کوئی عالَم آخرت قائم نہ ہوگا جس میں انسان کا محاسبہ ہو اور اسے جزا و سزا دی جائے؟ اگر اس طرح کے کسی علم کا تمھیں دعویٰ ہے تو کیا تم یہ لکھ کر دینے کے لیے تیار ہو کہ اِن اُمور کے متعلق رسول کے بیانات کی تکذیب تم اِس بنا پر کر رہے ہو کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر تم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو رسول بیان کر رہا ہے؟ اس مقام پر ایک شخص یہ شبہ ظاہر کر سکتا ہے کہ اس کے جواب میں اگر وہ لوگ ہٹ دھرمی کے ساتھ یہ بات لکھ کر دے دیتے تو کیا یہ اِستدلال بے معنیٰ نہ ہو جاتا؟ لیکن یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ ہٹ دھرمی کی بنا پر وہ لکھ بھی دیتے تو جس معاشرے میں یہ چیلنج برسرِ عام پیش کیا گیا تھا، اس کے عام لوگ اندھے تو نہ تھے۔ ہر شخص جان لیتا کہ یہ لکھا سراسر ہٹ دھرمی کے ساتھ دیا گیا ہے، اور درحقیقت رسول کے بیانات کو جھٹلانے کی بنیاد یہ ہرگز نہیں ہے کہ کسی کو اُن کے خلافِ واقعہ ہونے کا علم حاصل ہے۔

۳۳- اشارہ ہے اُن تدبیروں کی طرف جو کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زک دینے اور آپؐ کو ہلاک کرنے کے لیے آپس میں بیٹھ بیٹھ کر سوچا کرتے تھے۔

۳۴- یہ قرآن کی صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے۔ مکی دَور کے ابتدائی زمانے میں، جب مٹھی بھر بے سروسامان مسلمانوں کے سوا بظاہر کوئی طاقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھی، اور پوری قوم آپؐ کے خلاف برسرِ پیکار تھی، اسلام اور کفر کا مقابلہ ہر دیکھنے والے کو انتہائی نامُساوی مقابلہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی شخص بھی اُس وقت یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ چند سال کے بعد یہاں کفر کی بِساط بالکل اُلٹ جانے والی ہے۔ بلکہ ظاہر بین نگاہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ قریش اور سارے عرب کی مخالفت آخرکار اس دعوت کا خاتمہ کر کے چھوڑے گی۔ مگر اس حالت میں پوری تحدّی کے ساتھ کفار

وَ اِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡکُوۡمٌ ﴿۴۴﴾
فَذَرۡہُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ فِیۡہِ یُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾ یَوۡمَ لَا
یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِیۡنَ
ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِکَ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾

یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے ہوئے دیکھ لیں تو کہیں گے: "یہ بادل ہیں جو اُمڈے چلے آ رہے ہیں"[۳۶]۔ پس اے نبیؐ! اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس میں یہ مار گرائے جائیں گے، جس دن نہ اِن کی اپنی کوئی چال اِن کے کسی کام آئے گی نہ کوئی اِن کی مدد کو آئے گا۔ اور اُس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لیے ایک عذاب ہے، مگر اِن میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔[۳۷]

سے یہ صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اس دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جو تدبیریں بھی تم کرنا چاہو، کر کے دیکھ لو۔ وہ سب اُلٹی تمھارے ہی خلاف پڑیں گی اور تم اِسے شکست دینے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکو گے۔

۳۵- یعنی امرِ واقعہ یہ ہے کہ جن کو اِنھوں نے الٰہ بنا رکھا ہے وہ حقیقت میں الٰہ نہیں ہیں، اور شرک سراسر ایک بے اصل چیز ہے۔ اس لیے جو شخص توحید کی دعوت لے کر اُٹھا ہے اس کے ساتھ سچائی کی طاقت ہے، اور جو لوگ شرک کی حمایت کر رہے ہیں وہ ایک بے حقیقت چیز کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس لڑائی میں شرک آخر کیسے جیت جائے گا۔

۳۶- اس ارشاد سے مقصود ایک طرف سردارانِ قریش کی ہٹ دھرمی کو بے نقاب کرنا، اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو تسلی دینا ہے۔ حضورؐ اور صحابۂ کرامؓ کے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اِن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جائے جس سے اِن کو نبوتِ محمدیہ کی صداقت معلوم ہو جائے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ یہ خواہ کوئی معجزہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، بہرحال یہ اس کی تاویل کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے کفر پر جمے رہنے کا بہانہ ڈھونڈ نکالیں گے، کیونکہ ان کے دل ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قرآنِ مجید میں متعدِّد دوسرے مقامات پر بھی اُن کی اس ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ اَنعام میں فرمایا: "اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مُردے اِن سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم اِن کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے، تب بھی یہ ماننے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲

اے نبیؐ! اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو،[۳۸] تم ہماری نگاہ میں ہو۔[۳۹] تم جب اُٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو،[۴۰] رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو،[۴۱] اور ستارے جب پلٹتے ہیں اُس وقت بھی۔[۴۲] ع

والے نہ تھے۔" (آیت ۱۱۱) اور سورۂ حِجر میں فرمایا: "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے، پھر بھی یہ لوگ یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں، بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے۔" (آیت ۱۵)

۳۷- یہ اُسی مضمون کا اعادہ ہے جو سورۂ السجدہ، آیت ۲۱ میں گزر چکا ہے کہ "اُس بڑے عذاب سے پہلے ہم اِسی دنیا میں کسی نہ کسی چھوٹے عذاب کا مزا انھیں چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ اپنی باغیانہ روش سے باز آ جائیں۔" یعنی دنیا میں وقتاً فوقتاً شخصی اور قومی مصیبتیں نازل کر کے ہم انھیں یہ یاد دلاتے رہیں گے کہ اُوپر کوئی بالاتر طاقت ان کی قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے اور کوئی اس کے فیصلوں کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مگر جو لوگ جہالت میں مبتلا ہیں، انھوں نے نہ پہلے کبھی ان واقعات سے سبق لیا ہے نہ آیندہ کبھی لیں گے۔ وہ دنیا میں رونما ہونے والے حوادث کے معنیٰ نہیں سمجھتے، اس لیے ان کی ہر وہ تاویل کرتے ہیں جو حقیقت کے فہم سے اِن کو اور زیادہ دُور لے جانے والی ہو، اور کسی ایسی تاویل کی طرف اُن کا ذہن کبھی مائل نہیں ہوتا جس سے اپنی دہریّت یا اپنے شرک کی غلطی ان پر واضح ہو جائے۔ یہی بات ہے جو ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے کہ اِنَّ الْمُنَافِقَ اِذَا مَرِضَ ثُمَّ اُعْفِیَ کَانَ کَالْبَعِیْرِ عَقَلَہٗ اَھْلُہٗ ثُمَّ اَرْسَلُوْہُ فَلَمْ یَدْرِلِمَ عَقَلُوْہُ وَلَمْ یَدْرِ لِمَ اَرْسَلُوْہُ (ابوداؤد، کتاب الجنائز)۔ یعنی "منافق جب بیمار پڑتا ہے اور پھر اچھا ہو جاتا ہے تو اس کی مثال اُس اُونٹ کی سی ہوتی ہے جسے اس کے مالکوں نے باندھا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں باندھا ہے، اور جب کھول دیا تو وہ کچھ نہ سمجھا کہ کیوں کھول دیا ہے۔" (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۴۵۔ النمل، حاشیہ ۶۶۔ العنکبوت، حاشیہ ۷۲-۷۳)

۳۸- دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پر ڈٹے رہو۔

۳۹- یعنی ہم تمھاری نگہبانی کر رہے ہیں۔ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے۔

۴۰- اس ارشاد کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور بعید نہیں کہ وہ سب ہی مراد ہوں۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ جب بھی تم کسی مجلس سے اُٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح کر کے اُٹھو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے، اور آپ نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کسی مجلس سے اُٹھتے وقت اللہ کی حمد و تسبیح

کر لیا کریں، اس سے ان تمام باتوں کا کفّارہ ادا ہو جاتا ہے جو اس مجلس میں ہوئی ہوں۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کے واسطے سے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا ہو اور اُس میں خوب قیل و قال ہوئی ہو، وہ اگر اُٹھنے سے پہلے یہ الفاظ کہے تو اللہ ان باتوں کو معاف کر دیتا ہے جو وہاں ہوئی ہوں: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْكَ۔ ''خداوندا! میں تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبُود نہیں ہے، میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں۔''

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو کر اپنے بستر سے اُٹھو تو اپنے رب کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود عمل فرماتے تھے اور اپنے اصحاب کو آپؐ نے یہ تعلیم دی تھی کہ نیند سے جب بیدار ہوں تو یہ الفاظ کہا کریں: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (مُسندِ احمد، بخاری بَروایت عُبادہؓ بن الصّامت)

تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ اسی حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی کہ نماز کی ابتدا تکبیرِ تحریمہ کے بعد اِن الفاظ سے کی جائے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول تھا کہ آپؐ ہمیشہ اپنے خطبوں کا آغاز حمد و ثنا سے فرمایا کرتے تھے۔

مفسر ابنِ جَریرؒ نے اس کا ایک اور مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تم دوپہر کو قیلُولہ کر کے اُٹھو تو نماز پڑھو، اور اس سے مراد نمازِ ظہر ہے۔

۴۱ – اس سے مراد مغرب و عشا اور تہجد کی نمازیں بھی ہیں، اور تلاوتِ قرآن بھی، اور اللہ کا ذکر بھی۔

۴۲ – ستاروں کے پلٹنے سے مراد رات کے آخری حصّے میں ان کا غروب ہونا اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے پر ان کی روشنی کا ماند پڑ جانا ہے۔ یہ نمازِ فجر کا وقت ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

النجم

(۵۳)

النجم

نام پہلے ہی لفظ وَالنَّجْمِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی مضمون کے لحاظ سے سورت کا عنوان نہیں ہے، بلکہ محض علامت کے طور پر اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ اَوَّلُ سُوْرَةٍ اُنْزِلَتْ فِیْهَا سَجْدَةٌ اَلنَّجْمُ (پہلی سورت جس میں آیتِ سجدہ نازل ہوئی، النجم ہے)۔ اس حدیث کے جو اجزا اَسْوَد بن یزید، ابواسحاق اور زُہَیر بن مُعاویہ کی روایات میں حضرت ابنِ مسعودؓ سے منقول ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی وہ پہلی سورت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ایک مجمعِ عام میں (اور ابنِ مَرْدُوَیہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سنایا تھا۔ مجمع میں کافر اور مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپؐ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے، اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے، سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمَیَّہ بن خَلَف کو دیکھا کہ اس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اُٹھا کر اپنی پیشانی سے لگا لی اور کہا کہ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ بعد میں میری آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کفر کی حالت میں قتل ہوا۔

اس واقعے کے دوسرے عینی شاہد حضرت مُطَّلِبؓ بن ابی وَدَاعَہ ہیں، جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نَسائی اور مُسْنَدِ احمد میں ان کا اپنا بیان یہ نقل ہوا ہے کہ جب حضورؐ نے سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ فرمایا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا، اور اسی کی تلافی اب میں اس طرح کرتا ہوں کہ اس سورت کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اس سے پہلے رجب ۵ نبوی میں صحابہ کرامؓ کی ایک مختصر سی جماعت حَبَش کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ پھر جب اُسی سال رمضان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مجمعِ عام میں سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی اور کافر و مومن سب آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے، تو حَبَش کے مہاجرین تک یہ قصہ اس شکل میں پہنچا کہ کفارِ مکّہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اِس خبر کو سُن کر اُن میں سے کچھ لوگ شوال ۵ نبوی میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ظلم کی چکی اسی طرح چل رہی ہے جس طرح پہلے چل رہی تھی۔ آخرکار دوسری ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی، جس میں پہلی ہجرت سے بھی زیادہ لوگ مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح یہ بات قریب قریب یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ سورت رمضان ۵ نبوی میں نازل ہوئی ہے۔

تاریخی پس منظر زمانۂ نُزول کی اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ابتدائے بعثت کے بعد سے پانچ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نجی صحبتوں اور مخصوص مجلسوں ہی میں اللہ کا کلام سنا سنا کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے رہے تھے۔ اس پوری مدت میں آپؐ کو کبھی کسی مجمعِ عام میں قرآن سنانے کا موقع نہ مل سکا تھا، کیونکہ کفار کی سخت مُزاحمت اس میں مانع تھی۔ اُن کو اس امر کا خوب اندازہ تھا کہ آپؐ کی شخصیت اور آپؐ کی تبلیغ میں کس بلا کی کشش، اور قرآنِ مجید کی آیات میں کس غضب کی تاثیر ہے۔ اس لیے وہ کوشش کرتے تھے کہ اس کلام کو نہ خود سنیں، نہ کسی کو سننے دیں، اور آپؐ کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا کر محض اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے آپؐ کی دعوت کو دبا دیں۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو وہ جگہ جگہ یہ مشہور کرتے پھر رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہک گئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف ان کا یہ مستقل طریقِ کار تھا کہ جہاں بھی آپؐ قرآن سنانے کی کوشش کریں وہاں شور مچا دیا جائے، تاکہ لوگ یہ جان ہی نہ سکیں کہ وہ بات کیا ہے جس کی بنا پر آپؐ کو گمراہ اور بہکا ہوا آدمی قرار دیا جا رہا ہے۔

ان حالات میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں، جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہو گئے، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ خطبہ جاری ہوا جو سورۂ نجم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کلام کی شدتِ تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپؐ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش ہی نہ رہا، اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ فرمایا تو وہ بھی سجدے میں گر گئے۔ بعد میں انھیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی، اور لوگوں نے بھی انھیں اس پر مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے نہ صرف کان لگا کر سنا بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ بھی کر گزرے۔ آخرکار انھوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کے بعد محمدؐ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے: تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى، وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)، اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمدؐ ہمارے طریقے پر واپس آ گئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی

یہ سوچ سکتا تھا کہ اس پوری سورت کے سِیاق و سَباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے جو اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے سنے ہیں۔ (تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، حواشی ۹۶ تا ۱۰۱)

موضوع اور مضمون

تقریر کا موضوع کفارِ مکہ کو اُس رَوِیّے کی غلطی پر مُتنَبِّہ کرنا ہے جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔

کلام کا آغاز اس طرح فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہکے اور بھٹکے ہوئے آدمی نہیں ہیں، جیسا کہ تم ان کے متعلق مشہور کرتے پھر رہے ہو، اور نہ اسلام کی یہ تعلیم اور دعوت انھوں نے خود اپنے دل سے گھڑ لی ہے، جیسا کہ تم اپنے نزدیک سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خالص وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔ جن حقیقتوں کو وہ تمھارے سامنے بیان کرتے ہیں، وہ ان کے اپنے قیاس و گمان کی آفریدہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔ انھوں نے اس فرشتے کو خود دیکھا ہے جس کے ذریعے سے ان کو یہ علم دیا جاتا ہے۔ انھیں اپنے رب کی عظیم نشانیوں کا براہِ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سوچ کر نہیں، دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ ان سے تمھارا جھگڑنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا آنکھوں والے سے اُس چیز پر جھگڑے جو اسے نظر نہیں آتی اور آنکھوں والے کو نظر آتی ہے۔

اس کے بعد علی الترتیب تین مضامین ارشاد ہوئے ہیں:

اوّلاً، سامعین کو سمجھایا گیا ہے کہ جس دین کی تم پیروی کر رہے ہو اس کی بنیاد محض گمان اور من مانے مفروضات پر قائم ہے۔ تم نے لات اور مَنات اور عُزّٰی جیسی چند دیویوں کو معبود بنا رکھا ہے، حالانکہ اُلُوہیّت میں برائے نام بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے رکھا ہے، حالانکہ خود اپنے لیے تم بیٹی کو عار سمجھتے ہو۔ تم نے اپنے نزدیک یہ فرض کر لیا ہے کہ تمھارے یہ معبُود اللہ تعالیٰ سے تمھارے کام بنوا سکتے ہیں، حالانکہ تمام ملائکۂ مُقرّبین مل کر بھی اللہ سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے۔ اس طرح کے عقائد جو تم نے اختیار کر رکھے ہیں، ان میں سے کوئی عقیدہ بھی کسی علم اور دلیل پر مبنی نہیں ہے، بلکہ کچھ خواہشات ہیں جن کی خاطر تم بعض اوہام کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ ایک بہت بڑی بنیادی غَلَطی ہے جس میں تم لوگ مبتلا ہو۔ دین وہی صحیح ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ اور حقیقت لوگوں کی خواہشات کی تابع نہیں ہوا کرتی کہ جسے وہ حقیقت سمجھ بیٹھیں وہی حقیقت ہو جائے۔ اُس سے مُطابَقت کے لیے قیاس و گمان کام نہیں دیتا، بلکہ اس کے لیے علم درکار ہے۔ وہ علم تمھارے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو تم اس سے منہ موڑتے ہو اور اُلٹا اُس شخص کو گمراہ ٹھیراتے ہو جو تمھیں صحیح بات بتا رہا ہے۔ اس غلطی میں تمھارے مبتلا ہونے کی اصل وجہ

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ ہے کہ تمھیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، بس دنیا ہی تمھاری مطلوب بنی ہوئی ہے۔ اس لیے نہ تمھیں علمِ حقیقت کی کوئی طلب ہے، نہ اِس بات کی کوئی پروا کہ جن عقائد کی تم پیروی کر رہے ہو وہ حق کے مطابق ہیں یا نہیں۔

ثانیاً، لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی ساری کائنات کا مالک و مختار ہے۔ راست رَو وہ ہے جو اس کے راستے پر ہو، اور گمراہ وہ جو اس کی راہ سے ہٹا ہوا ہو۔ گمراہ کی گمراہی اور راست رَو کی راست روی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک کے عمل کو وہ جانتا ہے اور اس کے ہاں لازماً بُرائی کا بدلہ بُرا اور بھلائی کا بدلہ بھلا مل کر رہنا ہے۔ اصل فیصلہ اِس پر نہیں ہونا کہ تم اپنے زَعم میں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو اور اپنی زبان سے اپنی پاکیزگی کے کتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہو، بلکہ فیصلہ اس پر ہونا ہے کہ خدا کے علم میں تم متقی ہو یا نہیں۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو تو اس کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے وہ درگزر فرمائے گا۔

ثالثاً، دینِ حق کے وہ چند بنیادی اُمور لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو قرآنِ مجید کے نُزول سے صد ہا برس پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بیان ہو چکے تھے، تاکہ لوگ اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا اور نرالا دین لے آئے ہیں، بلکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ وہ اُصولی حقائق ہیں جو ہمیشہ سے خدا کے نبی بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھی صحیفوں سے یہ بات بھی نقل کر دی گئی ہے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوح اور قومِ لوط کی تباہی اتفاقی حوادث کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُسی ظلم و طُغیان کی پاداش میں اُن کو ہلاک کیا تھا جس سے باز آنے پر کفّارِ مکّہ کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہے ہیں۔

یہ مضامین ارشاد فرمانے کے بعد تقریر کا خاتمہ اس بات پر کیا گیا ہے کہ فیصلے کی گھڑی قریب آ لگی ہے جسے کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔ اُس گھڑی کے آنے سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید کے ذریعے سے تم لوگوں کو اُسی طرح خبردار کیا جا رہا ہے جس طرح پہلے لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا۔ اب کیا یہی وہ بات ہے جو تمھیں انوکھی لگتی ہے؟ جس کی تم ہنسی اُڑاتے ہو؟ جسے تم سننا نہیں چاہتے اور شور مچاتے ہو، تاکہ کوئی اور بھی اسے نہ سننے پائے؟ اپنی اس نادانی پر تمھیں رونا نہیں آتا؟ باز آ جاؤ اپنی اِس رَوِش سے، جھک جاؤ اللہ کے سامنے اور اُسی کی بندگی کرو۔

یہی وہ مؤثّر خاتمۂ کلام تھا جسے سُن کر کٹّے سے کٹّے منکرین بھی ضبط نہ کر سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کلامِ الٰہی کے یہ فقرے ادا کر کے سجدہ کیا تو وہ بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

---

۶۲ آیاتہا

سُوْرَۃُ النَّجْمِ مَکِّیَّۃٌ

۳ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَ مَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾

قسم ہے تارے[۱] کی جب کہ وہ غروب ہوا، تمھارا رفیق[۲] نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے[۳]۔

۱- اصل میں لفظ ''النَّجْم'' استعمال ہوا ہے۔ ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ اور سُفیان ثَوریؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ثُریّا (Pleiades) ہے۔ ابنِ جَریر اور زَمَخشری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ عَرَبی زبان میں جب مُطلقاً النجم کا لفظ بولا جاتا ہے تو عُموماً اس سے ثریا ہی مراد لیا جاتا ہے۔ سُدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد زُہرہ (Venus) ہے۔ اور ابوعبیدہ نَحْوِی کا قول ہے کہ یہاں النجم بول کر جنسِ نُجوم مراد لی گئی ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ جب صبح ہوئی اور سب ستارے غروب ہو گئے۔ موقع ومحل کے لحاظ سے ہمارے نزدیک یہ آخری قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

۲- مراد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مُخاطَب ہیں قریش کے لوگ۔ اصل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: صَاحِبُکُمْ (تمھارا صاحب) ''صاحب'' عربی زبان میں دوست، رفیق، ساتھی، پاس رہنے والے اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے کو کہتے ہیں۔ اس مقام پر آپؐ کا نام لینے یا ''ہمارا رسول'' کہنے کے بجائے ''تمھارا صاحب'' کہہ کر آپؐ کا ذکر کرنے میں بڑی گہری معنویت ہے۔ اس سے قریش کے لوگوں کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ جس شخص کا تم سے ذکر کیا جا رہا ہے، وہ تمھارے ہاں باہر سے آیا ہوا کوئی اجنبی آدمی نہیں ہے کہ اس سے تمھاری پہلے کی کوئی جان پہچان نہ ہو۔ تمھاری اپنی قوم کا آدمی ہے۔ تمھارے ساتھ ہی رہتا بستا ہے۔ تمھارا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے، کیا ہے، کس سیرت و کردار کا انسان ہے، کیسے اس کے معاملات ہیں، کیسی اس کی عادات وخصائل ہیں، اور آج تک تمھارے درمیان اس کی زندگی کیسی رہی ہے۔ اس کے بارے میں منہ پھاڑ کر کوئی کچھ کہہ دے تو تمھارے اندر ہزاروں آدمی اس کے جاننے والے موجود ہیں جو خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بات اس شخص پر چسپاں ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

۳- یہ ہے وہ اصل بات جس پر غروب ہونے والے تارے یا تاروں کی قسم کھائی گئی ہے۔ بھٹکنے سے مراد ہے کسی شخص کا راستہ نہ جاننے کی وجہ سے کسی غلط راستے پر چل پڑنا، اور بہکنے سے مراد ہے کسی شخص کا جان بُوجھ کر غلط راستہ اختیار کر لینا۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تمھارے جانے پہچانے آدمی ہیں، ان پر تم لوگوں کا یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ گمراہ یا بدراہ ہو گئے ہیں۔ درحقیقت وہ نہ بھٹکے ہیں نہ بہکے ہیں۔ اس بات پر تاروں کے غروب ہونے کی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ عَلَّمَهٗ

وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے[۴]۔ اُسے

قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جب تارے نکلے ہوئے ہوں، ایک شخص اپنے گردوپیش کی اشیا کو صاف نہیں دیکھ سکتا اور مختلف اشیا کی دھندلی شکلیں دیکھ کر ان کے بارے میں غلط اندازے کر سکتا ہے۔ مثلاً اندھیرے میں دُور سے کسی درخت کو دیکھ کر اسے بھوت سمجھ سکتا ہے۔ کوئی رسّی پڑی دیکھ کر اُسے سانپ سمجھ سکتا ہے۔ ریت سے کوئی چٹان اُبھری دیکھ کر یہ خیال کر سکتا ہے کہ کوئی درندہ بیٹھا ہے۔ لیکن جب تارے ڈوب جائیں اور صبحِ روشن نمودار ہو جائے تو ہر چیز اپنی اصلی شکل میں آدمی کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس وقت کسی چیز کی اصلیت کے بارے میں کوئی اِشتِباہ پیش نہیں آتا۔ ایسا ہی معاملہ تمھارے ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے کہ ان کی زندگی اور شخصیت تاریکی میں چھپی ہوئی نہیں ہے بلکہ صبحِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمھارا یہ "صاحب" ایک نہایت سلیم الطبع اور دانا و فرزانہ آدمی ہے۔ اس کے بارے میں قریش کے کسی شخص کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ گمراہ ہو گیا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ کمال درجے کا نیک نیت اور راست باز انسان ہے۔ اُس کے متعلق تم میں سے کوئی شخص کیسے یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ جان بُوجھ کر نہ صرف خود ٹیڑھی راہ اختیار کر بیٹھا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اسی ٹیڑھے راستے کی طرف دعوت دینے کے لیے کھڑا ہو گیا ہے۔

۴ – مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کی وجہ سے تم اُس پر یہ الزام لگاتے ہو کہ وہ گمراہ یا بدراہ ہو گیا ہے، وہ اس نے اپنے دل سے نہیں گھڑلی ہیں، نہ ان کی محرک اس کی اپنی خواہشِ نفس ہے، بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس پر وحی کے ذریعے سے نازل کی گئی ہیں اور کی جا رہی ہیں۔ اس کا خود نبی بننے کو جی نہیں چاہا تھا کہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اُس نے دعوائے نبوت کر دیا ہو، بلکہ خدا نے جب وحی کے ذریعے سے اس کو اس منصب پر مامور کیا تب وہ تمھارے درمیان تبلیغِ رسالت کے لیے اُٹھا اور اس نے تم سے کہا کہ میں تمھارے لیے خدا کا نبی ہوں۔ اِسی طرح اسلام کی یہ دعوت، توحید کی یہ تعلیم، آخرت اور حشر و نشر اور جزائے اعمال کی یہ خبریں، کائنات و انسان کے متعلق یہ حقائق، اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے یہ اُصول، جو وہ پیش کر رہا ہے، یہ سب کچھ بھی اس کا اپنا بنایا ہوا کوئی فلسفہ نہیں ہے، بلکہ خدا نے وحی کے ذریعے سے اس کو اِن باتوں کا علم عطا کیا ہے۔ اسی طرح یہ قرآن جو وہ تمھیں سناتا ہے، یہ بھی اس کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کا کلام ہے جو وحی کے ذریعے سے اس پر نازل ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ "آپؐ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، بلکہ جو کچھ آپؐ کہتے ہیں وہ ایک وحی ہے جو آپؐ پر نازل کی جاتی ہے"، آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والی کن کن باتوں سے متعلق ہے؟ آیا اس کا اِطلاق اُن ساری باتوں پر ہوتا ہے جو آپؐ بولتے تھے، یا بعض باتوں پر

اس کا اِطلاق ہوتا ہے اور بعض باتوں پر نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک قرآنِ مجید کا تعلق ہے، اُس پر تو اس ارشاد کا اِطلاق بدرجۂ اَولیٰ ہوتا ہے۔ رہیں وہ دوسری باتیں جو قرآن کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتی تھیں، تو وہ لامحالہ تین ہی قسموں کی ہوسکتی تھیں:

ایک قسم کی باتیں وہ تھیں جو آپؐ تبلیغِ دین اور دعوت الی اللہ کے لیے کرتے تھے، یا قرآنِ مجید کے مضامین، اس کی تعلیمات اور اس کے احکامات وہدایات کی تشریح کے طور پر کرتے تھے، یا قرآن ہی کے مقصد ومُدّعا کو پورا کرنے کے لیے وعظ ونصیحت فرماتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اُن کے متعلق ظاہر ہے کہ یہ شبہ کرنے کی سرے سے کوئی گنجایش نہیں ہے کہ یہ باتیں معاذ اللہ، آپؐ اپنے دل سے گھڑتے تھے۔ اِن اُمور میں تو آپؐ کی حیثیت درحقیقت قرآن کے سرکاری ترجمان، اور اللہ تعالیٰ کے نمایندۂ مجاز کی تھی۔ یہ باتیں اگرچہ اُس طرح لفظاً لفظاً آپؐ پر نازل نہیں کی جاتی تھیں جس طرح قرآن آپؐ پر نازل کیا جاتا تھا، مگر یہ لازماً تھیں اُسی علم پر مبنی جو وحی کے ذریعے سے آپؐ کو دیا گیا تھا۔ اِن میں اور قرآن میں فرق صرف یہ تھا کہ قرآن کے الفاظ اور مَعانی سب کچھ اللہ کی طرف سے تھے، اور اِن دوسری باتوں میں معانی ومطالب وہ تھے جو اللہ نے آپؐ کو سکھائے تھے اور اُن کو ادا آپؐ اپنے الفاظ میں کرتے تھے۔ اِسی فرق کی بنا پر قرآن کو وحیِ جَلی، اور آپؐ کے اِن دوسرے ارشادات کو وحیِ خَفی کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم کی باتیں وہ تھیں جو آپؐ اِعلائے کلمۃ اللہ کی جِدّوجُہد اور اِقامتِ دین کی خدمات کے سلسلے میں کرتے تھے۔ اس کام میں آپؐ کو مسلمانوں کی جماعت کے قائد ورہنما کی حیثیت سے مختلف نوعیت کے بے شمار فرائض انجام دینے ہوتے تھے، جن میں بسا اوقات آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ بھی لیا ہے، اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی رائے بھی مانی ہے، اُن کے دریافت کرنے پر کبھی کبھی یہ صراحت بھی فرمائی ہے کہ یہ بات میں خدا کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے کے طور پر کہہ رہا ہوں، اور متعدِّد بار ایسا بھی ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنے اجتہاد سے کوئی بات کی ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف ہِدایت آ گئی ہے۔ اس نوعیت کی جتنی باتیں بھی آپؐ نے کی ہیں، ان میں سے بھی کوئی ایسی نہ تھی اور قطعاً نہ ہوسکتی تھی جو خواہشِ نفس پر مبنی ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا وہ وحی پر مبنی تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بجز اُن باتوں کے جن میں آپؐ نے خود تصریح فرمائی ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے نہیں ہیں، یا جن میں آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ طلب فرمایا ہے اور ان کی رائے قُبول فرمائی ہے، یا جن میں آپؐ سے کوئی قول وفعل صادر ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف ہدایت نازل فرما دی ہے، باقی تمام باتیں اُسی طرح وحیِ خَفی پر مبنی تھیں جس طرح پہلی نوعیت کی باتیں۔ اس لیے کہ دعوتِ اسلامی کے قائد ورہنما اور جماعتِ مومنین کے سردار اور حکومتِ اسلامی کے فرمانروا کا جو منصب آپؐ کو حاصل تھا، وہ آپؐ کا خود ساختہ یا لوگوں کا عطا کردہ نہ تھا، بلکہ اُس پر آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے، اور اِس منصب کے فرائض کی ادائیگی میں آپؐ جو کچھ کہتے اور کرتے تھے اس میں آپؐ کی حیثیت مرضیِ الٰہی کے نمایندے کی تھی۔ اس معاملے میں آپؐ نے جو باتیں اپنے اجتہاد سے کی ہیں، ان میں بھی آپؐ کا اجتہاد اللہ کو پسند تھا اور علم کی اُس روشنی سے ماخوذ تھا جو اللہ نے آپؐ کو دی تھی۔ اسی لیے جہاں آپؐ کا اجتہاد ذرا بھی اللہ کی پسند سے ہٹا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

شَدِيْدُ الْقُوٰىۙ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍؕ فَاسْتَوٰىۙ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ

زبردست قوّت والے نے تعلیم دی[5] ہے جو بڑا صاحبِ حکمت[6] ہے۔ وہ سامنے آ کھڑا ہوا جب کہ وہ

وہاں فوراً وحیِ جلی سے اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ آپؐ کے بعض اجتہادات کی یہ اصلاح بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے باقی تمام اجتہادات عین مرضیِ الٰہی کے مطابق تھے۔

تیسری قسم کی باتیں وہ تھیں جو آپؐ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے زندگی کے عام معاملات میں کرتے تھے، جن کا تعلق فرائضِ نبوّت سے نہ تھا، جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے بھی کرتے تھے اور نبی ہونے کے بعد بھی کرتے رہے۔ اس نوعیت کی باتوں کے متعلق سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُن کے بارے میں کفار سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ کفار نے اُن کی بنا پر آپؐ کو گمراہ اور بدراہ نہیں کہا تھا، بلکہ پہلی دو قسم کی باتوں پر وہ یہ الزام لگاتے تھے۔ اس لیے وہ سرے سے زیرِ بحث ہی نہ تھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں یہ آیت ارشاد فرماتا۔ لیکن اس مقام پر ان کے خارج از بحث ہونے کے باوجود یہ امرِ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کوئی بات اپنی زندگی کے اِس نجی پہلو میں بھی کبھی خلافِ حق نہیں نکلتی تھی، بلکہ ہر وقت ہر حال میں آپؐ کے اقوال و افعال اُن حُدود کے اندر محدود رہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبرانہ اور متّقیانہ زندگی کے لیے آپؐ کو بتا دی تھیں۔ اس لیے درحقیقت وحی کا نور اُن میں بھی کارفرما تھا۔ یہی بات ہے جو بعض صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ مُسندِ احمد میں حضرت ابوہُریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا: لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا، "میں کبھی حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔" کسی صحابی نے عرض کیا: فَاِنَّكَ تُدَاعِبُنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، "یا رسولؐ اللہ! کبھی کبھی آپؐ ہم لوگوں سے ہنسی مذاق بھی تو کر لیتے ہیں۔" فرمایا: اِنِّيْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا، "فی الواقع میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔" مُسندِ احمد اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص کی رِوایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مَیں جو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنتا تھا وہ لکھ لیا کرتا تھا، تاکہ اسے محفوظ کر لوں۔ قریش کے لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہنے لگے: "تم ہر بات لکھتے چلے جاتے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں، کبھی غصّے میں بھی کوئی بات فرما دیتے ہیں۔" اس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ بعد میں اس بات کا ذکر میں نے حضورؐ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنِّيْ اِلَّا الْحَقُّ، "تم لکھے جاؤ، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی ہے۔"

(اس مسئلے پر مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب تفہیمات، حصۂ اوّل، مضمون "رسالت اور اس کے احکام")

۵ – یعنی کوئی انسان اس کو سکھانے والا نہیں ہے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، بلکہ یہ علم اُس کو ایک فوق البشر ذریعے سے حاصل ہو رہا ہے۔ "زبردست قوت والے" سے مراد بعض لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن مفسّرین کی عظیم اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السّلام ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عائشہؓ،

حضرت ابوہُریرہؓ، قتادہ، مجاہد، اور ربیع بن اَنس سے بھی قول منقول ہے۔ ابنِ جَریر، ابنِ کثیر، رازی اور آلُوسی وغیرہ حضرات نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولانا اشرف علی صاحبؒ نے بھی اپنے ترجموں میں اسی کی پیروی کی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ خود قرآنِ مجید کی دوسری تصریحات سے بھی یہی ثابت ہے۔ سورۂ تکویر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ (آیات ۱۹ تا ۲۳) ''درحقیقت یہ ایک بزرگ فرشتے کا بیان ہے جو زبردست قوت والا ہے، مالکِ عرش کے ہاں بڑا درجہ رکھتا ہے، اس کا حکم مانا جاتا ہے اور وہاں وہ معتبر ہے۔ تمھارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں ہے، وہ اس فرشتے کو آسمان کے کُھلے کنارے پر دیکھ چکا ہے۔'' پھر سورۂ بقرہ کی آیت ۹۷ میں اس فرشتے کا نام بھی بیان کر دیا گیا ہے جس کے ذریعے سے یہ تعلیم حضورؐ کے قلب پر نازل کی گئی تھی: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ان تمام آیات کو اگر سورۂ نجم کی اِس آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس امر میں کسی شک کی گنجایش نہیں رہتی کہ یہاں زبردست قوت والے معلّم سے مراد جبریلِ امین ہی ہیں، نہ کہ اللہ تعالیٰ۔ اس مسئلے پر مفصّل بحث آگے آ رہی ہے۔

اس مقام پر بعض حضرات یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ جبریلِ امین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معلّم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ وہ استاد ہیں اور حضورؐ شاگرد، اور اس سے حضورؐ پر جبریلؑ کی فضیلت لازم آئے گی۔ لیکن یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ جبریلؑ اپنے کسی ذاتی علم سے حضورؐ کو تعلیم نہیں دیتے تھے جس سے آپؐ پر ان کی فضیلت لازم آئے، بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے آپؐ تک علم پہنچانے کا ذریعہ بنایا تھا اور وہ محض واسطۂ تعلیم ہونے کی حیثیت سے مجازاً آپؐ کے معلّم تھے۔ اس سے ان کی افضلیت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے پانچ وقت کی نمازیں فرض ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے صحیح اوقات بتانے کے لیے جبریل علیہ السّلام کو آپؐ کے پاس بھیجا اور انھوں نے دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں آپؐ کو پڑھائیں۔ یہ قصہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مُوطّا وغیرہ کُتُبِ حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ بیان ہوا ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں کہ آپؐ مقتدی تھے اور جبریل نے امام بن کر آپؐ کو نماز پڑھائی تھی، لیکن اس طرح محض تعلیم کی غرض سے ان کا امام بنایا جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ آپؐ سے افضل تھے۔

۶ - اصل میں لفظ ذُوْ مِرَّةٍ استعمال فرمایا گیا ہے۔ ابنِ عباسؓ اور قتادہؒ اس کو خوبصورت اور شاندار کے معنی میں لیتے ہیں۔ مجاہد، حَسَن بصری، ابنِ زید اور سُفیان ثَوری کہتے ہیں کہ اس کے معنی طاقت ور کے ہیں۔ سعید بن مُسَیّب کے نزدیک اس سے مراد صاحبِ حکمت ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَّلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ۔ اس ارشاد میں ذُومِرّہ کو آپؐ نے تندرست اور صحیح القُویٰ کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ عربی محاورے میں یہ لفظ نہایت صائب الرائے اور عاقل و دانا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں جبریل علیہ السلام کے لیے یہ جامع لفظ اسی لیے منتخب فرمایا ہے کہ ان میں عقلی اور جسمانی، دونوں طرح کی قوتوں کا کمال

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ
اَدْنٰى ۝۹ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝۱۰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ

بالائی اُفُق[7] پر تھا، پھر قریب آیا اور اُوپر معلّق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔[8] تب اُس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اُسے پہنچانی تھی۔[9] نظر نے جو کچھ

پایا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں کوئی لفظ ان تمام معنوں کا جامع نہیں ہے، اس وجہ سے ہم نے ترجمے میں اس کے صرف ایک معنٰی کو اختیار کیا ہے، کیونکہ جسمانی قوتوں کے کمال کا ذکر اس سے پہلے کے فقرے میں آ چکا ہے۔

۷ - اُفُق سے مراد ہے آسمان کا مشرقی کنارا جہاں سے سورج طُلوع ہوتا ہے اور دن کی روشنی پھیلتی ہے۔ اسی کو سورۂ تکویر کی آیت ۲۳ میں اُفقِ مُبین کہا گیا ہے۔ دونوں آیتیں صراحت کرتی ہیں کہ پہلی مرتبہ جبریل علیہ السلام جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آئے اُس وقت وہ آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئے تھے۔ اور متعدِّد معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اپنی اصلی صورت میں تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ آگے چل کر ہم وہ تمام روایات نقل کریں گے جن میں یہ بات بیان کی گئی ہے۔

۸ - یعنی آسمان کے بالائی مشرقی کنارے سے نمودار ہونے کے بعد جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ آپؐ کے اُوپر آ کر فضا میں معلّق ہو گئے۔ پھر وہ آپؐ کی طرف جھکے اور اس قدر قریب ہو گئے کہ آپؐ کے اور ان کے درمیان صرف دو کمانوں کے برابر یا کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ عام طور پر مفسّرین نے قَابَ قَوْسَيْنِ کے معنٰی "بقدرِ دو قوس" ہی بیان کیے ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے قوس کو ذراع (ہاتھ) کے معنٰی میں لیا ہے اور كَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں کے درمیان صرف دو ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ فاصلہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم تھا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ، فاصلے کی مقدار کے تعیُّن میں اللہ تعالیٰ کو کوئی شک لاحق ہو گیا ہے۔ دراصل یہ طرزِ بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ تمام کمانیں لازماً ایک ہی ناپ کی نہیں ہوتیں، اور ان کے حساب سے کسی فاصلے کو جب بیان کیا جائے گا تو مقدارِ فاصلہ میں ضرور کمی بیشی ہو گی۔

۹ - اصل الفاظ ہیں: فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى۔ اس فقرے کے دو ترجمے ممکن ہیں: ایک یہ کہ "اس نے وحی کی اُس کے بندے پر جو کچھ بھی وحی کی۔" اور دوسرا یہ کہ "اس نے وحی کی اپنے بندے پر جو کچھ بھی وحی کی۔" پہلا ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ جبریلؑ نے وحی کی اللہ کے بندے پر جو کچھ بھی اس کو وحی کرنی تھی۔ اور دوسرا ترجمہ کیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے وحی کی جبریلؑ کے واسطے سے اپنے بندے پر جو کچھ بھی اس کو وحی کرنی تھی۔ مفسّرین نے یہ دونوں معنٰی بیان

مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً
اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾

دیکھا، دل نے اُس میں جھوٹ نہ ملایا۔[10] اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟

اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی کے پاس اُس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنّت الماویٰ ہے۔[11]

کہے ہیں۔ مگر سیاق و سباق کے ساتھ زیادہ مناسبت پہلا مفہوم ہی رکھتا ہے اور وہی حضرت حَسَن بصریؒ اور ابنِ زیدؒ سے منقول ہے۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عَبْدِہٖ کی ضمیر اَوْحٰی کے فاعل کی طرف پھرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے پھر سکتی ہے جب کہ آغازِ سورت سے یہاں تک اللہ کا نام سرے سے آیا ہی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں ضمیر کا مَرْجَع کسی خاص شخص کی طرف سیاقِ کلام سے صاف ظاہر ہو رہا ہو وہاں ضمیر آپ سے آپ اسی کی طرف پھرتی ہے، خواہ اس کا ذکر پہلے نہ آیا ہو۔ اس کی متعدد نظیریں خود قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ "ہم نے اُس کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔" یہاں قرآن کا سرے سے کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔ مگر سیاقِ کلام خود بتا رہا ہے کہ ضمیر کا مَرْجَع قرآن ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے: وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ "اگر اللہ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑنے لگے تو اس کی پیٹھ پر کسی جان دار کو نہ چھوڑے۔" یہاں آگے پیچھے زمین کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔ مگر سیاقِ کلام سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ "اس کی پیٹھ" سے مراد زمین کی پیٹھ ہے۔ سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا ہے: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ "ہم نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ شاعری اس کو زیب دیتی ہے"۔ یہاں پہلے یا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ مگر سیاقِ کلام بتا رہا ہے کہ ضمیروں کے مَرْجَع آپ ہی ہیں۔ سورۂ رحمٰن میں فرمایا: كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ "وہ سب کچھ جو اس پر ہے، فانی ہے۔" آگے پیچھے کوئی ذکر زمین کا نہیں ہے۔ مگر عبارت کا انداز ظاہر کر رہا ہے کہ علیھا کی ضمیر اسی کی طرف پھرتی ہے۔ سورۂ واقعہ میں ارشاد ہوا: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً "ہم نے ان کو خاص طور پر پیدا کیا ہوگا۔" آس پاس کوئی چیز نہیں ہے جس کی طرف ھُنَّ کی ضمیر پھرتی نظر آتی ہو۔ یہ فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد خواتینِ جنّت ہیں۔ پس چونکہ اَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ کا یہ مطلب بہرحال نہیں ہو سکتا کہ جبریلؑ نے اپنے بندے پر وحی کی، اس لیے لازماً اس کے معنی یہی لیے جائیں گے کہ جبریلؑ نے اللہ کے بندے پر وحی کی، یا پھر یہ کہ اللہ نے جبریلؑ کے واسطے سے اپنے بندے پر وحی کی۔

۱۰- یعنی یہ مشاہدہ جو دن کی روشنی میں اور پوری بیداری کی حالت میں کھلی آنکھوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، اس پر اُن کے دل نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظر کا دھوکا ہے، یا یہ کوئی جنّ یا شیطان ہے جو مجھے نظر آ رہا ہے، یا میرے سامنے

Maktaba Tul Ishaat.com

کوئی خیالی صورت آ گئی ہے اور میں جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ بلکہ ان کے دل نے ٹھیک ٹھیک وہی کچھ سمجھا جو اُن کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اُنھیں اس امر میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا کہ فی الواقع یہ جبریل ہیں اور جو پیغام یہ پہنچا رہے ہیں وہ واقعی خدا کی طرف سے وحی ہے۔

اس مَقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے عجیب اور غیر معمولی مُشاہَدے کے بارے میں قطعاً کوئی شک لاحق نہ ہوا اور آپؐ نے پورے یقین کے ساتھ جان لیا کہ آپؐ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ واقعی حقیقت ہے، کوئی خیالی ہیُولیٰ نہیں ہے اور کوئی جنّ یا شیطان بھی نہیں ہے؟ اس سوال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کے پانچ وجوہ ہماری سمجھ میں آتے ہیں:

ایک یہ کہ وہ خارجی حالات جن میں مشاہدہ ہوا تھا، اِس کی صحّت کا یقین دلانے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ اندھیرے میں، یا مراقبے کی حالت میں، یا خواب میں، یا نیم بیداری کی حالت میں نہیں ہوا تھا، بلکہ صبح روشن طُلوع ہو چکی تھی، آپؐ پوری طرح بیدار تھے، کھلی فضا میں اور دن کی پوری روشنی میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر ٹھیک اُسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی شخص دنیا کے دوسرے مناظر دیکھتا ہے۔ اِس میں اگر شک کی گنجایش ہو تو ہم دن کے وقت دریا، پہاڑ، آدمی، مکان، غَرَض جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، وہ سب بھی پھر مشکوک اور محض نظر کا دھوکا ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آپؐ کی اپنی داخلی حالت بھی اُس کی صحّت کا یقین دلانے والی تھی۔ آپؐ پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں تھے۔ پہلے سے آپؐ کے ذہن میں اِس طرح کا سرے سے کوئی خیال نہ تھا کہ آپؐ کو ایسا کوئی مشاہدہ ہونا چاہیے یا ہونے والا ہے۔ ذہن اِس فکر سے اور اس کی تلاش سے بالکل خالی تھا۔ اور اس حالت میں اچانک آپؐ کو اِس معاملے سے سابقہ پیش آیا۔ اس پر یہ شک کرنے کی کوئی گنجایش نہ تھی کہ آنکھیں کسی حقیقی منظر کو نہیں دیکھ رہی ہیں بلکہ ایک خیالی ہیُولیٰ سامنے آ گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو ہستی ان حالات میں آپؐ کے سامنے آئی تھی، وہ ایسی عظیم، ایسی شاندار، ایسی حسین اور اس قدر منور تھی کہ نہ آپؐ کے وہم وخیال میں کبھی اس سے پہلے ایسی ہستی کا تصوّر آیا تھا جس کی وجہ سے آپؐ کو یہ گمان ہوتا کہ وہ آپؐ کے اپنے خیال کی آفریدہ ہے، اور نہ کوئی جنّ یا شیطان اِس شان کا ہو سکتا ہے کہ آپؐ اسے فرشتے کے سوا اور کچھ سمجھتے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے جبریلؑ کو اس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔“ (مُسْنَدِ احمد) ایک دوسری رِوایت میں ابنِ مسعودؓ مزید تشریح کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السّلام کا ایک ایک بازو اتنا عظیم تھا کہ اُفُق پر چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ (مُسْنَدِ احمد) اللہ تعالیٰ خود ان کی شان کو شَدِیۡدُ الۡقُوٰی اور ذُوۡ مِرَّۃٍ کے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے۔

چوتھے یہ کہ جو تعلیم وہ ہستی دے رہی تھی وہ بھی اس مشاہدے کی صحّت کا اطمینان دلانے والی تھی۔ اس کے ذریعے سے اچانک جو علم، اور تمام کائنات کے حقائق پر حاوی علم آپؐ کو ملا، اُس کا کوئی تصوّر پہلے سے آپؐ کے ذہن میں نہ تھا کہ آپؐ اُس پر یہ شبہ کرتے کہ یہ میرے اپنے ہی خیالات ہیں جو مُرتَّب ہو کر میرے سامنے آ گئے ہیں۔ اسی طرح اُس علم پر یہ شک کرنے

کی بھی کوئی گنجایش نہ تھی کہ شیطان اس شکل میں آ کر آپؐ کو دھوکا دے رہا ہے۔ کیونکہ شیطان کا یہ کام آخر کب ہوسکتا ہے اور کب اس نے یہ کام کیا ہے کہ انسان کو شرک و بت پرستی کے خلاف توحیدِ خالص کی تعلیم دے؟ آخرت کی باز پرس سے خبردار کرے؟ جاہلیت اور اس کے طور طریقوں سے بیزار کرے؟ فضائلِ اَخلاق کی طرف دعوت دے؟ اور ایک شخص سے یہ کہے کہ نہ صرف تُو خود اس تعلیم کو قبول کر بلکہ ساری دنیا سے شرک اور ظلم اور فسق و فُجور کو مٹانے اور ان برائیوں کی جگہ توحید اور عدل اور تقویٰ کی بھلائیاں قائم کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو؟

پانچویں اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو اپنی نبوت کے لیے چُن لیتا ہے تو اس کے دل کو شکوک و شبہات اور وساوس سے پاک کر کے یقین و اِذعان سے بھر دیتا ہے۔ اس حالت میں اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، اور اس کے کان جو کچھ سنتے ہیں، اس کی صحت کے متعلق کوئی ادنیٰ سا تردُّد بھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ ہر اُس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر منکشف کی جاتی ہے، خواہ وہ کسی مشاہدے کی شکل میں ہو جو اسے آنکھوں سے دکھایا جائے، یا الہامی علم کی شکل میں ہو جو اس کے دل میں ڈالا جائے، یا پیغامِ وحی کی شکل میں ہو جو اس کو لفظ بلفظ سنایا جائے۔ ان تمام صورتوں میں پیغمبر کو اس امر کا پورا شُعور ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے قطعی محفوظ و مامون ہے اور جو کچھ بھی اُس تک کسی شکل میں پہنچ رہا ہے وہ ٹھیک ٹھیک اس کے رب کی طرف سے ہے۔ تمام خداداد احساسات کی طرح پیغمبر کا یہ شُعور و احساس بھی ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں۔ جس طرح مچھلی کو اپنے تیراک ہونے کا، پرندے کو اپنے پرندہ ہونے کا، اور انسان کو اپنے انسان ہونے کا احساس بالکل خداداد ہوتا ہے اور اس میں غلط فہمی کا کوئی شائبہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح پیغمبر کو اپنے پیغمبر ہونے کا احساس بھی خداداد ہوتا ہے، اس کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ وسوسہ نہیں آتا کہ شاید اسے پیغمبر ہونے کی غلط فہمی لاحق ہوگئی ہے۔

۱۱- یہ جبریل علیہ السّلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ملاقات کا ذکر ہے جس میں وہ آپؐ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس ملاقات کا مَقام ’’سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی‘‘ بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے قریب ’’جنت الماویٰ‘‘ واقع ہے۔

سِدرَہ عَربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں، اور مُنتَہیٰ کے معنیٰ ہیں: آخری سِرا۔ ’’سِدرۃ المنتہیٰ‘‘ کے لُغوی معنیٰ ہیں: ’’وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سِرے پر واقع ہے۔‘‘ علامہ آلُوسیؒ نے رُوح المعانی میں اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اِلَیْھَا یَنْتَھِیْ عِلْمُ کُلِّ عَالِمٍ وَّمَا وَرَاءَ ھَا لَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا اللّٰہُ۔ ’’اس پر ہر عالِم کا علم ختم ہو جاتا ہے، آگے جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔‘‘ قریب قریب یہی تشریح ابنِ جریرؒ نے اپنی تفسیر میں، اور ابنِ اَثیرؒ نے ’’اَلنّہایہ فی غریبِ الحدیث والاثر‘‘ میں کی ہے۔ ہمارے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ اس عالَمِ مادّی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے اور اس کی حقیقی نوعیت و کیفیت کیا ہے۔ یہ کائناتِ خداوندی کے وہ اَسرار ہیں جن تک ہمارے فہم کی رسائی نہیں ہے۔ بہر حال وہ کوئی ایسی ہی چیز ہے جس کے لیے انسانی زبان کے الفاظ میں ’’سِدرہ‘‘ سے زیادہ موزوں لفظ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ
وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

اُس وقت سِدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا[12]۔ نگاہ نہ چُندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی[13] اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں[14]۔

''جنّتُ الماوٰی'' کے لغوی معنٰی ہیں: ''وہ جنت جو قیام گاہ بنے''۔ حضرت حَسَن بصریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی جنّت ہے جو آخرت میں اہلِ ایمان وتقویٰ کو ملنے والی ہے، اور اسی آیت سے انھوں نے یہ اِستدلال کیا ہے کہ وہ جنّت آسمان میں ہے۔ قَتَادَہؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ جنّت ہے جس میں شہدا کی ارواح رکھی جاتی ہیں، اس سے مراد وہ جنّت نہیں ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے۔ ابنِ عباسؓ بھی یہی کہتے ہیں اور اس پر وہ یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ آخرت میں جو جنّت اہلِ ایمان کو دی جائے گی، وہ آسمان میں نہیں ہے بلکہ اُس کی جگہ یہی زمین ہے۔

۱۲ – یعنی اس کی شان اور اس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ وہ ایسی تجلّیات تھیں کہ نہ انسان ان کا تصوّر کر سکتا ہے اور نہ کوئی انسانی زبان اس کے وصف کی متحمل ہے۔

۱۳ – یعنی ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ تحمّل کا حال یہ تھا کہ ایسی زبردست تجلّیات کے سامنے بھی آپؐ کی نگاہ میں کوئی چکاچوندھ پیدا نہ ہوئی اور آپؐ پُورے سُکون کے ساتھ اُن کو دیکھتے رہے۔ دوسری طرف آپؐ کے ضبط اور یکسوئی کا کمال یہ تھا کہ جس مقصد کے لیے آپؐ کو بلایا گیا تھا، اسی پر آپؐ اپنے ذہن اور اپنی نگاہ کو مرکوز کیے رہے اور جو حیرت انگیز مناظر وہاں تھے اُن کو دیکھنے کے لیے آپؐ نے ایک تماشائی کی طرح ہر طرف نگاہیں دوڑانی نہ شروع کر دیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو ایک عظیم وجلیل بادشاہ کے دربار میں حاضری کا موقع ملتا ہے اور وہاں وہ کچھ شان وشوکت اس کے سامنے آتی ہے جو اس کی چشمِ تصوّر نے بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب اگر وہ شخص کم ظرف ہو تو وہاں پہنچ کر بھونچکا رہ جائے گا، اور اگر آدابِ حُضوری سے ناآشنا ہو تو مقامِ شاہی سے غافل ہو کر دربار کی سجاوٹ کا نظّارہ کرنے کے لیے ہر طرف مڑمڑ کر دیکھنے لگے گا۔ لیکن ایک عالی ظرف، ادب آشنا اور فرض شناس آدمی نہ تو وہاں پہنچ کر مبہوت ہوگا اور نہ دربار کا تماشا دیکھنے میں مشغول ہو جائے گا، بلکہ وہ پُورے وقار کے ساتھ حاضر ہوگا اور اپنی ساری توجّہ اُس مقصد پر مرتکز رکھے گا جس کے لیے دربارِ شاہی میں اس کو طلب کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی خوبی ہے جس کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے۔

۱۴ – یہ آیت اِس امر کی تصریح کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ اس کی عظیم الشان آیات کو دیکھا تھا۔ اور چونکہ سیاق وسَباق کی رُو سے یہ دوسری ملاقات بھی اُسی ہستی سے ہوئی تھی جس سے پہلی ملاقات ہوئی، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اُفُقِ اعلیٰ پر جس کو آپؐ نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ بھی اللہ نہ تھا، اور دوسری مرتبہ

سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی کے پاس جس کو دیکھا وہ بھی اللہ نہ تھا۔ اگر آپؐ نے اِن مواقع میں سے کسی موقع پر بھی اللہ جَلَّ شانُہٗ کو دیکھا ہوتا تو یہ اِتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اُس کی تصریح کر دی جاتی۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی اور انھیں جواب دیا گیا تھا کہ لَنْ تَرٰىنِيْ "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔" (الاعراف: ۱۴۳) اب یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ شرف، جو حضرت موسیٰؑ کو عطا نہیں کیا گیا تھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا جاتا تو اس کی اہمیت خود ایسی تھی کہ اسے صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ حضورؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا، بلکہ واقعۂ معراج کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ بنی اسرائیل میں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے بندے کو اس لیے لے گئے تھے کہ "اُس کو اپنی نشانیاں دکھائیں" (لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا)، اور یہاں سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی پر حاضری کے سلسلے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ "اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں" (لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى)۔

اِن وجوہ سے بظاہر اِس بحث کی کوئی گنجایش نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن دونوں مواقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا جبریل علیہ السّلام کو؟ لیکن جس وجہ سے یہ بحث پیدا ہوئی، وہ یہ ہے کہ اِس مسئلے پر احادیث کی رِوایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ترتیب وار اُن احادیث کو درج کرتے ہیں جو اس سلسلے میں مختلف صحابۂ کرامؓ سے منقول ہوئی ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ کی روایات:

بخاری، کتاب التفسیر میں حضرت مَسْرُوقؒ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا: "اماں جان! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" انھوں نے جواب دیا: "تمھاری اس بات سے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تم یہ کیسے بھول گئے کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کا اگر کوئی شخص دعویٰ کرے تو جھوٹا دعویٰ کرے گا۔" (ان میں سے پہلی بات حضرت عائشہؓ نے یہ فرمائی کہ) "جو شخص تم سے یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ جھوٹ کہتا ہے۔" پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیتیں پڑھیں: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (نگاہیں اُس کو نہیں پا سکتیں)، اور مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر یا تو وحی کے طور پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ ایک فرشتہ بھیجے اور وہ اس پر اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ وہ چاہے)۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا: "لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السّلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا۔"

اس حدیث کا ایک حصّہ بخاری، کتاب التوحید، باب ۴ میں بھی ہے۔ اور کتاب بَدءِ الخلق میں مَسْرُوقؒ کی جو روایت امام بخاریؒ نے نقل کی ہے اُس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ کی یہ بات سُن کر عرض کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى؟ اس پر انھوں نے فرمایا: "اس سے مراد جبریلؑ ہیں۔ وہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انسانی شکل میں آیا کرتے تھے، مگر اِس موقع پر وہ اپنی اصلی شکل میں آپ

Maktaba Tul Ishaat.com

کے پاس آئے اور سارا اُفُق اُن سے بھر گیا۔"

مُسلم، کتاب الایمان، باب فی ذکر سِدْرَۃ المنتہیٰ میں حضرت عائشہؓ سے مَسْرُوقؒ کی یہ گفتگو زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل ہوئی ہے اور اس کا سب سے اہم حصّہ یہ ہے: حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا، وہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افترا کرتا ہے۔" مَسْرُوقؒ کہتے ہیں کہ میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یہ بات سُن کر میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے عرض کیا: ام المومنین! جلدی نہ فرمائیے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ وَ لَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ؟ اور لَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰی؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: "اِس امّت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے کو دریافت کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا: اِنَّمَا هُوَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، لَمْ اَرَهُ عَلٰى صُوْرَتِهِ الَّتِيْ خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَ هَاتَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ، رَاَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِّنَ السَّمَآءِ سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔" وہ تو جبریل علیہ السّلام تھے۔ میں نے اُن کو اُن کی اُس اصلی صورت میں، جس پر اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے، اِن دو مواقع کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ ان دو مواقع پر مَیں نے ان کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا، اور ان کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔"

ابنِ مَرْدُوْیہ نے مَسْرُوقؒ کی اس رِوایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے، وہ یہ ہیں: "حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا کہ کیا آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ حضورؐ نے جواب دیا: نہیں، میں نے تو جبریلؑ کو آسمان سے اُترتے دیکھا تھا۔"

(۲) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایات:

بخاری، کتاب التفسیر، مُسلم، کتاب الایمان اور ترمذی، ابواب التفسیر میں زِرّ بن حُبَیْشؒ کی رِوایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی تفسیر یہ بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو اِس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔

مُسلم کی دوسری رِوایات میں مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اور لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى کی بھی یہی تفسیر زِرّ بن حُبَیْشؒ نے عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے۔

مُسْنَدِ احمد میں ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ تفسیر زِرّ بن حُبَیْش کے علاوہ عبدالرحمٰن بن یزید اور ابووائل کے واسطے سے بھی منقول ہوئی ہے، اور مزید برآں مُسْنَدِ احمد میں زِرّ بن حُبَیْشؒ کی دو رِوایتیں اور نقل ہوئی ہیں جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود وَ لَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ جِبْرِيْلَ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عَلَيْهِ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریلؑ کو سِدْرَۃُ المنتہیٰ کے پاس دیکھا، ان کے چھ سو بازو تھے۔" اسی مضمون کی روایت امام احمدؒ نے شقیق بن سَلَمَہ سے بھی نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی زبان سے یہ سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ فرمایا تھا کہ میں نے جبریل علیہ السّلام کو اِس صورت میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ سے عطاء بن ابی رَباحؒ نے آیت لَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً اُخۡرٰى کا مطلب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ رَاٰى جِبۡرِيۡلَ عَلَيۡهِ السَّلَامُ۔ "حضورؐ نے جبریل علیہ السّلام کو دیکھا تھا۔" (مسلم، کتاب الایمان)

(۴) حضرت ابوذرؓ غفاری سے عبداللہ بن شقیق کی دو رِوایتیں امام مسلمؒ نے کتاب الایمان میں نقل کی ہیں۔ ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "کیا آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" حضورؐ نے جواب دیا: نُوۡرٌ اَنّٰى اَرَاهُ۔ اور دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب آپؐ نے یہ دیا کہ رَاَيۡتُ نُوۡرًا۔ حضورؐ کے پہلے ارشاد کا مطلب ابن القیمؒ نے زادالمعاد میں یہ بیان کیا ہے کہ "میرے اور رُؤیتِ رب کے درمیان نور حائل تھا۔" اور دوسرے ارشاد کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نُور دیکھا۔"

نَسائی اور ابنِ ابی حاتم نے حضرت ابوذرؓ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دل سے دیکھا تھا، آنکھوں سے نہیں دیکھا۔"

(۵) حضرت ابوموسٰی اَشعریؓ سے امام مسلمؒ کتاب الایمان میں یہ رِوایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ما انتھٰی الیہ بصر من خلقہ۔ "اللہ تعالیٰ تک اس کی مخلوق میں سے کسی کی نگاہ نہیں پہنچی۔"

(۶) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایات

مُسلم کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰى، وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً اُخۡرٰى کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ اپنے دل سے دیکھا۔" یہ روایت مُسندِ احمد میں بھی ہے۔

ابنِ مَرۡدُوۡیَہ نے عَطاء بن ابی رَباحؒ کے حوالے سے ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

نَسائی میں عِکرِمہ کی روایت ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا: اتعجبون ان تکون الخلة لابراھیم والکلام لموسٰی والرؤیة لمحمد؟ "کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے خلیل بنایا، موسٰی علیہ السلام کو کلام سے سرفراز کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رُؤیت کا شرف بخشا۔" حاکم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ترمذی میں شَعۡبیؒ کی روایت ہے کہ ابنِ عباسؓ نے ایک مجلس میں فرمایا: "اللہ نے اپنی رُؤیت اور اپنے کلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسٰی علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ موسٰی علیہ السلام سے اس نے دو مرتبہ کلام کیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اس کو دیکھا۔" ابنِ عباسؓ کی اسی گفتگو کو سُن کر مَسۡرُوقؒ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے تھے اور ان سے پوچھا تھا: "کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" انھوں نے فرمایا: "تم نے وہ بات کہی ہے جسے سُن کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔" اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور مَسۡرُوقؒ کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جسے ہم اُوپر حضرت عائشہؓ کی رِوایات میں نقل کر آئے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ترمذی ہی میں دوسری روایات جو ابنِ عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں، ان میں سے ایک میں وہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ دوسری میں فرماتے ہیں، دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اور تیسری میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ آپ نے اللہ کو دل سے دیکھا تھا۔

مُسندِ احمد میں ابنِ عباسؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم رأیت ربی تبارك وتعالیٰ۔ "میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھا۔" دوسری روایت میں وہ کہتے ہیں: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال اتانی ربّی اللیلة فی احسن صورة،احسبه یعنی فی النوم۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آج رات میرا رب بہترین صورت میں میرے پاس آیا" میں سمجھتا ہوں کہ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ خواب میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔"

طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عباسؓ سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا، ایک مرتبہ آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل سے۔

(۷) محمد بن کَعْب القُرَظیؒ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا: "آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟" حضورؐ نے جواب دیا: "میں نے اس کو دو مرتبہ اپنے دل سے دیکھا۔" (ابنِ ابی حاتم) اِس روایت کو ابنِ جَرِیرؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میں نے اس کو آنکھ سے نہیں بلکہ دل سے دو مرتبہ دیکھا ہے۔"

(۸) حضرت اَنَسؓ بن مالک کی ایک روایت، جو قصۂ معراج کے سلسلے میں شریک بن عبداللہ کے حوالے سے امام بخاریؒ نے کتاب التوحید میں نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ آتے ہیں: حتّٰی جَاۤءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰى وَدَنَا الجبّار ربّ العزة فتدلّٰی، حتّٰی کان منه قاب قوسین او ادنٰی فاوحی اللّٰہ فیما اوحٰی الیه خمسین صلٰوة۔ یعنی "جب آپؐ سِدْرَۃُ المنتہٰی پر پہنچے تو اللہ رب العزت آپؐ کے قریب آیا اور آپؐ کے اُوپر معلّق ہو گیا، یہاں تک کہ آپؐ کے اور اس کے درمیان بقدر دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ گیا، پھر اللہ نے آپ پر جو اُمور وحی فرمائے ان میں سے ایک ۵۰ نمازوں کا حکم تھا۔" لیکن علاوہ اُن اعتراضات کے جو اس روایت کی سند اور مضمون پر امام خَطّابیؒ، حافظ ابنِ حَجَرؒ، ابنِ حَزمؒ اور حافظ عبدالحقؒ صاحبُ الجمع بین الصحیحین نے کیے ہیں، سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید دو الگ الگ رُؤیتوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ایک ابتداءً اُفقِ اعلیٰ پر ہوئی تھی اور پھر اس میں دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کا معاملہ پیش آیا تھا، اور دوسری سِدْرَۃُ المنتہٰی کے پاس واقع ہوئی تھی۔ لیکن یہ روایت ان دونوں رُؤیتوں کو خلط ملط کر کے ایک رُؤیت بنا دیتی ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید سے متعارض ہونے کی بنا پر اِس کو تو کسی طرح قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہیں وہ دوسری روایات جو ہم نے اُوپر نقل کی ہیں، تو ان میں سب سے زیادہ وزنی روایتیں وہ ہیں جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عائشہؓ سے منقول ہوئی ہیں، کیونکہ ان دونوں نے بالاتفاق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا ہے کہ ان دونوں مواقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ جبریل علیہ السّلام کو دیکھا تھا، اور یہ روایات

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾
اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾

اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اِس لات، اور اِس عُزّٰی، اور تیسری ایک اور دیوی مَنات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا؟[۱۵] کیا بیٹے تمھارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لیے؟[۱۶] یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی!

قرآنِ مجید کی تصریحات اور اشارات سے پُوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ مزید برآں ان کی تائید حضورؐ کے اُن ارشادات سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اَشعَریؓ نے آپؐ سے نقل کیے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو رِوایات کُتُبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں، ان میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ کسی میں وہ دونوں رُوَیتوں کو عَینی کہتے ہیں، کسی میں دونوں کو قلبی قرار دیتے ہیں، کسی میں ایک کو عَینی اور دوسری کو قلبی بتاتے ہیں، اور کسی میں عَینی رُوئیت کی صاف صاف نفی کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی رِوایت بھی ایسی نہیں ہے جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی ارشاد نقل کر رہے ہوں۔ اور جہاں انھوں نے خود حضورؐ کا ارشاد نقل کیا ہے، وہاں اوّل تو قرآنِ مجید کی بیان کردہ ان دونوں رُوَیتوں میں سے کسی کا بھی ذکر نہیں ہے، اور مزید برآں ان کی ایک رِوایت کی تشریح دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے کسی وقت بحالتِ بیداری نہیں بلکہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ اس لیے درحقیقت اِن آیات کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب رِوایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح محمد بن کَعب القُرَظیؒ کی روایات بھی، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کرتی ہیں، لیکن ان میں اُن صحابۂ کرامؓ کے ناموں کی کوئی تصریح نہیں ہے جنھوں نے حضورؐ سے یہ بات سنی۔ نیز اُن میں سے ایک میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ نے عَینی رُوئیت کی صاف صاف نفی فرما دی تھی۔

۱۵ – مطلب یہ ہے کہ جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دے رہے ہیں، اُس کو تو تم لوگ گمراہی اور بدراہی قرار دیتے ہو، حالانکہ یہ علم ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور اللہ ان کو آنکھوں سے وہ حقائق دکھا چکا ہے جن کی شہادت وہ تمھارے سامنے دے رہے ہیں۔ اب ذرا تم خود دیکھو کہ جن عقائد کی پیروی پر تم اصرار کیے چلے جا رہے ہو وہ کس قدر غیر معقول ہیں، اور اِن کے مقابلے میں جو شخص تمھیں سیدھا راستہ بتا رہا ہے، اس کی مخالفت کر کے آخر تم کس کا نقصان کر رہے ہو۔ اس سلسلے میں خاص طور پر اُن تین دیویوں کو بطورِ مثال لیا گیا ہے جن کو مکّہ، طائف، مدینہ اور نواحِ حجاز کے لوگ سب سے زیادہ پُوجتے تھے۔ ان کے بارے میں سوال کیا گیا ہے کہ کبھی تم نے عقل سے کام لے کر سوچا بھی کہ زمین و آسمان کی خدائی کے معاملات میں اِن کا کوئی ادنیٰ سا دخل بھی ہو سکتا ہے؟ یا خداوندِ عالَم سے واقعی ان کا کوئی رشتہ ہو سکتا ہے؟

لات کا اِستھان طائف میں تھا اور بنی ثَقِیف اس کے اِس حد تک معتقد تھے کہ جب اَبْرَہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر

Maktaba Tul Ishaat.com

خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لیے مکّہ پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا، اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اِس معبود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اُس ظالم کو مکّے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہلِ عرب کی طرح ثقیف کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنیٰ میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ جریر طَبَریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ اَللّٰھۃُ تھا جسے اللّات کر دیا گیا۔ زَمَخشَری کے نزدیک یہ لَوٰی یَلْوِی سے مُشتَق ہے، جس کے معنیٰ مڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے، اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابنِ عباسؓ اس کو لاتّ بہ تشدیدِ تا پڑھتے ہیں اور اسے لَتَّ یَلِتُّ سے مُشتَق قرار دیتے ہیں، جس کے معنیٰ مَسَلنے اور تھیڑنے کے ہیں۔ اُن کا اور مجاہدؒ کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو سَتّو پلاتا اور کھانے کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اس کا اِستھان بنالیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابنِ عباسؓ اور مجاہدؒ جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے: ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآنِ مجید اِن تینوں کو دیویاں بتا رہا ہے، اور اس روایت کی رُو سے لات مرد تھا، نہ کہ عورت۔

عُزّٰی عزت سے ہے اور اس کے معنیٰ عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا اِستھان مکّہ اور طائف کے درمیان وادیِ نَخلہ میں حراض کے مقام پر واقع تھا (نَخلہ کی جائے وقوع کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ۳۳)۔ بنی ہاشم کے حلیف قبیلۂ بنی شَیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبے کی طرح اس کی طرف بھی ہَدی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابنِ ہِشام کی روایت ہے کہ ابو اُحَیحَہ جب مرنے لگا تو ابولہب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابولہب نے کہا: ”کیوں روتے ہو ابو اُحَیحَہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔“ اس نے کہا: ”خدا کی قسم! میں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عُزّٰی کی پُوجا کیسے ہوگی۔“ ابولہب بولا: ”اس کی پُوجا نہ تمھاری زندگی میں تمھاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمھارے بعد اسے چھوڑا جائے گا۔“ ابو اُحَیحَہ نے کہا: ”اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔“

مَناۃ کا اِستھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدَید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر خُزاعہ اور اَوس اور خَزرَج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حُجّاج طوافِ بیت اللہ اور عرفات اور مِنیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مَناۃ کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں، اور جو لوگ اِس دوسرے ”حج“ کی نیت کر لیتے، وہ صفا اور مَروَہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔

إِنْ هِيَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ
اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَمَا تَهْوَى
ٱلْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ ٱلْهُدَىٰٓ ﴿۲۳﴾ أَمْ

دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اِن کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی[۱۷]۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مُرید بنے ہوئے ہیں[۱۸]۔ حالانکہ اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آچکی[۱۹] ہے۔ کیا

۱۶ – یعنی اِن دیویوں کو تم نے اللہ رب العالمین کی بیٹیاں قرار دے لیا اور یہ بیہودہ عقیدہ ایجاد کرتے وقت تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے لیے تو تم بیٹی کی پیدائش کو ذلّت سمجھتے ہو اور چاہتے ہو کہ تمھیں اولادِ نرینہ ملے، مگر اللہ کے لیے تم اولاد بھی تجویز کرتے ہو تو بیٹیاں!

۱۷ – یعنی تم جن کو دیوی اور دیوتا کہتے ہو، وہ نہ دیویاں ہیں اور نہ دیوتا، نہ ان کے اندر اُلوہیت کی کوئی صفت پائی جاتی ہے، نہ خدائی کے اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصّہ انھیں حاصل ہے۔ تم نے بطورِ خود ان کو خدا کی اولاد اور معبود اور خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے۔ خدا کی طرف سے کوئی سند ایسی نہیں آئی ہے جسے تم اپنے ان مفروضات کے ثبوت میں پیش کر سکو۔

۱۸ – بالفاظِ دیگر، اُن کی گمراہی کے بنیادی وجوہ دو ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی چیز کو اپنا عقیدہ اور دین بنانے کے لیے علمِ حقیقت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے، بلکہ محض قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس پر اس طرح ایمان لے آتے ہیں کہ گویا وہی حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے یہ رَوِیّہ دراصل اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ اُن کا دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبُود ہو جو دنیا میں اُن کے کام تو بناتا رہے اور آخرت اگر پیش آنے والی ہی ہو تو وہاں انھیں بخشوانے کا ذمّہ بھی لے لے، مگر حرام و حلال کی کوئی پابندی اُن پر نہ لگائے اور اَخلاق کے کسی ضابطے میں ان کو نہ کَسے۔ اسی لیے وہ انبیاءؑ کے لائے ہوئے طریقے پر خدائے واحد کی بندگی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اِن خود ساختہ معبُودوں اور معبُودنیوں کی عبادت ہی اُن کو پسند آتی ہے۔

۱۹ – یعنی ہر زمانے میں انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن گمراہ لوگوں کو حقیقت بتاتے رہے ہیں، اور اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر ان کو بتا دیا ہے کہ کائنات میں دراصل خدائی کس کی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۵

لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰہِ الۡاٰخِرَۃُ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ وَ کَمۡ مِّنۡ
مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ
اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ
بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۷﴾ وَ مَا لَہُمۡ

انسان جو کچھ چاہے، اس کے لیے وہی حق[20] ہے؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔ ع

آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، اُن کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اُس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سُننا چاہے اور اس کو پسند کرے[21]۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں[22]، حالانکہ اس معاملے

۲۰ – اس آیت کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا انسان کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے معبُود بنا لے؟ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ کیا انسان اِن معبُودوں سے اپنی مرادیں پا لینے کی جو تمنا رکھتا ہے، وہ کبھی پوری ہوسکتی ہے؟

۲۱ – یعنی تمام فرشتے مل کر بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہوسکتی، کجا کہ تمھارے اِن بناوٹی معبُودوں کی شَفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ فرشتے بھی اُس کے حضور کسی کی سِفارش کرنے کی اُس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انھیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں اُن کی سفارش سننے پر راضی نہ ہو۔

۲۲ – یعنی ایک حماقت تو اُن کی یہ ہے کہ اِن بے اختیار فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ سے سفارش تک کرنے کا یارا نہیں رکھتے، اُنھوں نے معبُود بنا لیا ہے۔ اس پر مزید حماقت یہ کہ وہ انھیں عورتیں سمجھتے ہیں اور ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ ان ساری جہالتوں میں ان کے مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کو نہیں مانتے۔ اگر وہ آخرت کے ماننے والے ہوتے تو کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کر سکتے تھے۔ انکارِ آخرت نے انھیں انجام سے بے فکر بنا دیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو ماننے یا نہ ماننے، یا ہزاروں خدا مان بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ اِن میں سے کسی عقیدے کا بھی کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نکلتا نظر نہیں آتا۔ منکرینِ خدا ہوں یا مشرکین یا مُوَحِّدین، سب کی کھیتیاں پکتی بھی ہیں اور جلتی بھی ہیں۔ سب بیمار بھی ہوتے ہیں اور تندرست بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر طرح کے اچھے اور بُرے حالات سب پر گزرتے ہیں۔ اس لیے اُن کے نزدیک یہ کوئی بڑا اہم اور سنجیدہ معاملہ نہیں ہے کہ آدمی کسی کو معبُود مانے یا نہ مانے،

بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْــًٔا ۚ﴿۲۸﴾ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ۬ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ

کا کوئی علم انھیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں،[۲۳] اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

پس اَے نبیؐ! جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے،[۲۴] اور دُنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو[۲۵] ــــــ اِن لوگوں کا[۲۶] مَبلَغِ علم بس یہی کچھ ہے،[۲۷]

یا جتنے اور جیسے چاہے معبود بنالے۔ حق اور باطل کا فیصلہ جب اُن کے نزدیک اِسی دنیا میں ہونا ہے، اور اُس کا مدار اِسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج پر ہے، تو ظاہر ہے کہ یہاں کے نتائج نہ کسی عقیدے کے حق ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں، نہ کسی دوسرے عقیدے کے باطل ہونے کا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے ایک عقیدے کو اختیار کرنا اور دوسرے عقیدے کو رَدّ کر دینا محض ایک من کی موج کا معاملہ ہے۔

۲۳- یعنی ملائکہ کے متعلق یہ عقیدہ انھوں نے کچھ اس بنا پر اختیار نہیں کیا ہے کہ انھیں کسی ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں، بلکہ انھوں نے محض اپنے قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لی ہے اور اس پر یہ آستانے بنائے بیٹھے ہیں، جن سے مرادیں مانگی جا رہی ہیں اور نذریں اور نیازیں اِن پر چڑھائی جا رہی ہیں۔

۲۴- ذِکر کا لفظ یہاں کئی معنیٰ دے رہا ہے۔ اس سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے، محض نصیحت بھی مراد ہو سکتی ہے، اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا ذکر سننا ہی جسے گوارا نہیں ہے۔

۲۵- یعنی اُس کے پیچھے نہ پڑو اور اُسے سمجھانے پر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ کیونکہ ایسا شخص کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو گا جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو، جو دنیا کے مادّی فائدوں سے بلندتر مقاصد اور اقدار کی طرف بلاتی ہو، اور جس میں اصل مطلوب آخرت کی ابدی فلاح و کامرانی کو قرار دیا جا رہا ہو۔ اس قسم کے مادہ پرست اور خدا بیزار انسان پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے توجّہ اُن لوگوں کی طرف کرو جو خدا کا ذکر سننے کے لیے تیار ہوں اور دنیا پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔

۲۶- یہ جملۂ مُعترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر پچھلی بات کی تشریح کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۷- یعنی یہ لوگ دنیا اور اس کے فوائد سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں، اس لیے اِن پر محنت صَرف کرنا لاحاصل ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۙ وَهُوَ أَعْلَمُ
بِمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿٣٠﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الربع
الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ﴿٣١﴾
الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۚ

یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اُس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے، اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے[۲۸] ۔۔۔۔ تاکہ[۲۹] اللہ بُرائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور اُن لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنھوں نے نیک رَوِیّہ اختیار کیا ہے، جو بڑے بڑے گناہوں[۳۰] اور کُھلے کُھلے قبیح افعال[۳۱] سے پرہیز کرتے ہیں، اِلّا یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد[۳۲] ہو جائے۔

۲۸ – بالفاظِ دیگر، کسی آدمی کے گمراہ یا برسرِ ہدایت ہونے کا فیصلہ نہ اِس دنیا میں ہوتا ہے نہ اِس کا فیصلہ دنیا کے لوگوں کی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی زمین و آسمان کا مالک ہے، اور اسی کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے لوگ جن مختلف راہوں پر چل رہے ہیں، اُن میں سے ہدایت کی راہ کون سی ہے اور ضلالت کی راہ کون سی۔ لہٰذا تم اس بات کی کوئی پروا نہ کرو کہ یہ مشرکینِ عرب اور یہ کفارِ مکہ تم کو بہکا اور بھٹکا ہوا آدمی قرار دے رہے ہیں اور اپنی جاہلیّت ہی کو حق اور ہدایت سمجھ رہے ہیں۔ یہ اگر اپنے اِسی زَعمِ باطل میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو انھیں مگن رہنے دو۔ اِن سے بحث و تکرار میں وقت ضائع کرنے اور سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۹ – یہاں سے پھر وہی سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔ گویا جملۂ مُعترضہ کو چھوڑ کر سلسلۂ عبارت یُوں ہے: ”اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے۔“

۳۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۵۳۔

۳۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۱۳۰۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۸۹۔

۳۲ – اصل الفاظ ہیں: اِلَّا اللَّمَمَ۔ عربی زبان میں لَمَمْ کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار، یا اُس کے خفیف سے اثر، یا اُس کے محض قُرب، یا اُس کے ذرا دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: اَلَمَّ بِالْمَكَانِ، وہ شخص فلاں جگہ تھوڑی دیر ہی ٹھیرا، یا تھوڑی دیر کے لیے ہی وہاں گیا۔ اَلَمَّ بِالطَّعَامِ، اس کا تھوڑا سا کھانا کھایا۔ بِهٖ لَمَمٌ، اس کا دماغ ذرا سا کھسکا ہوا ہے، یا اس میں کچھ جُنون کی لٹک ہے۔ یہ لفظ اس معنٰی میں بولتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک فعل کا ارتکاب تو نہیں کیا مگر ارتکاب کے قریب تک پہنچ گیا۔ فَرّاء کا قول ہے کہ میں نے عربوں کو اس طرح

کے فقرے بولتے سنا ہے: ضربه ما لمم القتل، فلاں شخص نے اُسے اتنا مارا کہ بس مار ڈالنے کی کسر رہ گئی۔ اور اَلَمّ یفعل، قریب تھا کہ فلاں شخص یہ فعل کر گزرتا۔ شاعر کہتا ہے: اَلَمّت فحیّت ثم قامت فودّعت، ''وہ بس ذرا کی ذرا آئی، سلام کیا، اُٹھی اور رخصت ہوگئی۔''

ان استعمالات کی بنا پر اہلِ تفسیر میں سے بعض نے لمم سے مراد چھوٹے گناہ لیے ہیں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے۔ بعض اسے کچھ دیر کے لیے گناہ میں مبتلا ہونے اور پھر اس سے باز آجانے کے معنیٰ میں لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی گناہ کا خیال، یا اس کی خواہش، یا اس کا ارادہ تو کرے مگر عملاً کوئی اقدام نہ کرے۔ اس سلسلے میں صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

زید بن اسلمؒ اور ابنِ زیدؒ کہتے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مَعاصی ہیں جن کا ارتکاب اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں لوگ کر چکے تھے، پھر اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اسے چھوڑ دیا۔

ابنِ عباسؓ کا دوسرا قول یہ ہے، اور یہی حضرت ابوہُریرہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عَمْرو بن عاص، مجاہدؒ، حَسَن بصریؒ اور ابوصالحؒ کا قول بھی ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ یا کسی فحش فعل میں کچھ دیر کے لیے، یا احیاناً مبتلا ہو جانا اور پھر اُسے چھوڑ دینا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور مَسْرُوقؒ اور شَعِبیؒ فرماتے ہیں، اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی معتبر رِوایات میں یہ قول منقول ہوا ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جانا اور اس کے ابتدائی مدارج تک طے کر گزرنا مگر آخری مرحلے پر پہنچ کر رُک جانا ہے۔ مثلاً کوئی شخص چوری کے لیے جائے، مگر چُرانے سے باز رہے۔ یا اجنبیہ سے اختلاط کرے، مگر زنا کا اقدام نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ، عِکرِمہؒ، قَتَادہؒ اور ضَحّاکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں جن کے لیے دنیا میں بھی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اور آخرت میں بھی جن پر عذاب دینے کی کوئی وعید نہیں فرمائی گئی ہے۔

سعید بن المُسَیَّبؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے گناہ کا خیال دل میں آنا مگر عملاً اس کا ارتکاب نہ کرنا۔

یہ حضراتِ صحابہؓ و تابعینؒ کی مختلف تفسیریں ہیں جو رِوایات میں منقول ہوئی ہیں۔ بعد کے مفسّرین اور ائمہ وفقہا کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ آیت اور سورۂ نساء کی آیت ۳۱ صاف طور پر گناہوں کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کرتی ہیں: ایک کبائر، دوسرے صغائر۔ اور یہ دونوں آیتیں انسان کو اُمّید دلاتی ہیں کہ اگر وہ کبائر اور فواحش سے پرہیز کرے تو اللہ تعالیٰ صغائر سے درگزر فرمائے گا۔ اگرچہ بعض اکابر علما نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کوئی مَعصِیَت چھوٹی نہیں ہے، بلکہ خدا کی معصیت بجائے خود کبیرہ ہے۔ لیکن جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے، کبائر اور صغائر کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جن ذرائعِ معلومات سے احکامِ شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُم مِّنَ
الْأَرْضِ وَإِذْ أَنتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ ۖ فَلَا تُزَكُّوا
أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ﴿٣٢﴾ أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ﴿٣٣﴾
وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ﴿٣٤﴾ أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ﴿٣٥﴾
أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ﴿٣٧﴾

بلاشبہ تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے[33]۔ وہ تمھیں اُس وقت سے خوب جانتا ہے جب اُس نے زمین سے تمھیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے۔ع

پھر اَے نبیؐ! تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو راہِ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رُک گیا[34]۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے[35]؟ کیا اُسے اُن باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰؑ کے صحیفوں اور اُس ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا[36]؟

وہ سب اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں فرق کیا ہے اور کس قسم کے گناہ صغیرہ اور کس قسم کے کبیرہ ہیں، تو اس معاملے میں جس بات پر ہمارا اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ ”ہر وہ فعل گناہِ کبیرہ ہے جسے کتاب وسنّت کی کسی نصِّ صریح نے حرام قرار دیا ہو، یا اُس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہو، یا اُس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو، یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو، یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو۔“ اس نوعیت کے گناہوں کے ماسوا جتنے افعال بھی شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں، وہ سب صغائر کی تعریف میں آتے ہیں۔ اسی طرح کبیرہ کی محض خواہش یا اس کا ارادہ بھی کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے۔ حتّٰی کہ کسی بڑے گناہ کے ابتدائی مراحل طے کر جانا بھی اُس وقت تک گناہِ کبیرہ نہیں ہے جب تک آدمی اس کا ارتکاب نہ کر گزرے۔ البتہ گناہِ صغیرہ بھی ایسی حالت میں کبیرہ ہو جاتا ہے جب کہ وہ دین کے اِستخفاف اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اِستکبار کے جذبے سے کیا جائے، اور اس کا مرتکب اُس شریعت

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰىۙ ۳۸ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ ۳۹

"یہ کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا دُوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا،[۳۷]

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے،[۳۸]

کو کسی اعتنا کے لائق نہ سمجھے جس نے اسے ایک بُرائی قرار دیا ہے۔

۳۳- یعنی صغائر کے مرتکب کا معاف کر دیا جانا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ صغیرہ گناہ، گناہ نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ تنگ نظری اور خوردہ گیری کا معاملہ نہیں فرماتا۔ بندے اگر نیکی اختیار کریں، اور کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں، تو وہ اُن کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت نہ فرمائے گا اور اپنی رحمتِ بے پایاں کی وجہ سے ان کو ویسے ہی معاف کر دے گا۔

۳۴- اشارہ ہے وَلید بن مُغیرہ کی طرف جو قریش کے بڑے سرداروں میں سے ایک تھا۔ ابنِ جَریر طَبَریؒ کی روایت ہے کہ یہ شخص پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مگر جب اس کے ایک مشرک دوست کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہونے کا ارادہ کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ تم دینِ آبائی کو نہ چھوڑو، اگر تمھیں عذابِ آخرت کا خطرہ ہے تو مجھے اتنی رقم دے دو، میں ذمّہ لیتا ہوں کہ تمھارے بدلے وہاں کا عذاب میں بھگت لوں گا۔ ولید نے یہ بات مان لی اور خدا کی راہ پر آتے آتے اُس سے پھر گیا، مگر جو رقم اس نے اپنے مشرک دوست کو دینی طے کی تھی، وہ بھی بس تھوڑی سی دی اور باقی روک لی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود کفّارِ مکّہ کو یہ بتانا تھا کہ آخرت سے بے فکری اور دین کی حقیقت سے بے خبری نے اُن کو کیسی جہالتوں اور حماقتوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۳۵- یعنی کیا اسے معلوم ہے کہ یہ رَوِش اس کے لیے نافع ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے کوئی اس طرح بھی بچ سکتا ہے؟

۳۶- آگے اُن تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں نازل ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں سے مراد توراۃ ہے۔ رہے حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے، تو وہ آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں، اور یہود و نصاریٰ کی کُتُبِ مقدّسہ میں بھی اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر صُحُفِ ابراہیمؑ کی تعلیمات کے بعض اجزا نقل کیے گئے ہیں، ایک یہ مقام، دوسرے سورۃ الاعلیٰ کی آخری آیات۔

۳۷- اِس آیت سے تین بڑے اُصول مُستنبط ہوتے ہیں: ایک یہ کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمّہ دار ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے فعل کی ذمّہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی، اِلّا یہ کہ اُس فعل کے صُدور میں اس کا اپنا کوئی حصّہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی تو کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمّہ داری اپنے اُوپر نہیں لے سکتا، نہ اصل مجرم کو اس بنا پر چھوڑ

Maktaba Tul Ishaat.com

جا سکتا ہے کہ اس کی جگہ سزا بھگتنے کے لیے کوئی اور آدمی اپنے آپ کو پیش کر رہا ہے۔

۳۸- اس ارشاد سے بھی تین اہم اُصول نکلتے ہیں: ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا، اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا، اِلّا یہ کہ اُس عمل میں اُس کا اپنا کوئی حصّہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔

اِن تین اُصولوں کو بعض لوگ دنیا کے مَعاشی معاملات پر غلط طریقے سے منطبق کر کے اِن سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی (earned income) کے سوا کسی چیز کا جائز مالک نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات قرآنِ مجید ہی کے دیے ہوئے متعدّد قوانین اور احکام سے ٹکراتی ہے۔ مثلاً قانونِ وراثت، جس کی رُو سے ایک شخص کے ترکے میں سے بہت سے افراد حصہ پاتے ہیں اور اس کے جائز وارث قرار پاتے ہیں، درآں حالے کہ یہ میراث ان کی اپنی محنت کی کمائی نہیں ہوتی، بلکہ ایک شیر خوار بچّے کے متعلق تو کسی کھینچ تان سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں اس کی محنت کا بھی کوئی حصّہ تھا۔ اسی طرح احکامِ زکوٰۃ و صدقات، جن کی رُو سے ایک آدمی کا مال دوسروں کو محض ان کے شرعی و اَخلاقی استحقاق کی بنا پر ملتا ہے اور وہ اس کے جائز مالک ہوتے ہیں، حالانکہ اس مال کے پیدا کرنے میں ان کی محنت کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ اس لیے قرآن کی کسی ایک آیت کو لے کر اس سے ایسے نتائج نکالنا جو خود قرآن ہی کی دوسری تعلیمات سے متصادم ہوتے ہوں، قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔

بعض دوسرے لوگ ان اُصولوں کو آخرت سے متعلق مان کر یہ سوالات اُٹھاتے ہیں کہ آیا ان اُصولوں کی رُو سے ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے لیے کسی صورت میں بھی نافع ہو سکتا ہے؟ اور کیا ایک شخص اگر دوسرے شخص کے لیے یا اُس کے بدلے کوئی عمل کرے تو وہ اس کی طرف سے قبول کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے عمل کے اجر کو دوسرے کی طرف منتقل کر سکے؟ اِن سوالات کا جواب اگر نفی میں ہو تو ایصالِ ثواب اور حجِ بدل وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے کے حق میں دعائے اِستِغفار بھی بے معنیٰ ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ دعا بھی اُس شخص کا اپنا عمل نہیں ہے جس کے حق میں دعا کی جائے۔ مگر یہ انتہائی نقطۂ نظر مُعتزِلہ کے سوا اہلِ اسلام میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔ صرف وہ اِس آیت کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ایک شخص کی سعی دوسرے کے لیے کسی حال میں بھی نافع نہیں ہو سکتی۔ بخلاف اس کے، اہلِ سنّت ایک شخص کے لیے دوسرے کی دعا کے نافع ہونے کو تو بالاتفاق مانتے ہیں، کیونکہ وہ قرآن سے ثابت ہے، البتہ ایصالِ ثواب اور نیابتاً دوسرے کی طرف سے کسی نیک کام کے نافع ہونے میں ان کے درمیان اُصولاً نہیں بلکہ صرف تفصیلات میں اختلاف ہے۔

(۱) ایصالِ ثواب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کر کے اللہ سے دعا کرے کہ اس کا اجر و ثواب کسی دوسرے شخص کو عطا فرما دیا جائے۔ اس مسئلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خالص بدنی عبادات، مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا، البتہ مالی عبادات، مثلاً صدقہ، یا مالی و بدنی مرکّب عبادات، مثلاً حج کا ثواب دوسرے کو پہنچ سکتا ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے نافع نہ ہو، مگر چونکہ احادیثِ صحیحہ کی رُو سے صدقہ کا ثواب پہنچایا جا سکتا ہے اور حجِ بدل بھی کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم اِسی نوعیت کی عبادات تک ایصالِ ثواب

کی صحت تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے حَنَفِیَّہ کا مسلک یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہبہ کرسکتا ہے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا تلاوتِ قرآن یا ذکر یا صدقہ یا حج وعُمرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس طرح مزدوری کر کے مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میرے بجائے فلاں شخص کو دے دی جائے، اسی طرح وہ کوئی نیک عمل کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرسکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کر دیا جائے۔ اس میں بعض اقسام کی نیکیوں کو مُستثنیٰ کرنے اور بعض دوسری اقسام کی نیکیوں تک اسے محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ یہی بات بکثرت احادیث سے بھی ثابت ہے:

بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ ماجہ، طَبَرانی (فی الاوسط)، مُستدرَک اور ابنِ ابی شَیبہ میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہُریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابورافعؓ، حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور حُذیفہؓ بن اَسید الغِفاری کی مُتفقہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مینڈھے لے کر ایک اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربان کیا اور دوسرا اپنی اُمّت کی طرف سے۔

مسلم، بخاری، مُسندِ احمد، ابوداؤد اور نَسائی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر انھیں بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ ضرور صدقہ کرنے کے لیے کہتیں۔ اب اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے لیے اجر ہے؟ فرمایا: ہاں۔

مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن العاص کی روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیّت میں سو اُونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تھی۔ ان کے چچا ہِشام بن العاص نے اپنے حصّے کے پچاس اُونٹ ذبح کر دیے۔ حضرت عَمروؓ بن العاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں کیا کروں؟ حضورؐ نے فرمایا: ”اگر تمھارے باپ نے توحید کا اقرار کر لیا تھا تو تم ان کی طرف سے روزہ رکھو یا صدقہ کرو، وہ ان کے لیے نافع ہوگا۔“

مُسندِ احمد، ابوداؤد، نَسائی اور ابنِ ماجہ میں حضرت حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ حضرت سعدؓ بن عُبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اسی مضمون کی متعدِّد دوسری روایات بھی حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ سے بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، نَسائی، ترمِذی، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میّت کی طرف سے صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے میّت کے لیے نافع بتایا ہے۔

دارِقُطنی میں ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا: ”میں اپنے والدین کی خدمت ان کی زندگی میں تو کرتا ہوں، ان کے مرنے کے بعد کیسے کروں؟“ فرمایا: ”یہ بھی ان کی خدمت ہی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد تُو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھے، اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لیے بھی روزے رکھے۔“ ایک دوسری روایت دارِقُطنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ”جس شخص کا قبرستان پر گزر ہو اور وہ گیارہ مرتبہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھ کر اس کا اجر مرنے والوں کو بخش دے تو جتنے مُردے ہیں اتنا ہی اجر عطا کر دیا جائے گا۔“

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ کثیر روایات جو ایک دوسری کی تائید کر رہی ہیں، اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصالِ ثواب نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ہر طرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہو سکتا ہے اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں چار باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

ایک یہ کہ ایصال اُسی عمل کے ثواب کا ہو سکتا ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے اور قواعدِ شریعت کے مطابق کیا گیا ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کے لیے یا شریعت کے خلاف جو عمل کیا جائے اس پر خود عمل کرنے والے ہی کو کسی قسم کا ثواب نہیں مل سکتا، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں صالحین کی حیثیت سے مہمان ہیں، اُن کو تو ثواب کا ہدیہ یقیناً پہنچے گا، مگر جو وہاں مُجرم کی حیثیت سے حوالات میں بند ہیں، انھیں کوئی ثواب پہنچنا متوقع نہیں ہے۔ اللہ کے مہمانوں کو ہدیہ تو پہنچ سکتا ہے، مگر امید نہیں کہ اللہ کے مجرم کو تحفہ پہنچ سکے۔ اُس کے لیے اگر کوئی شخص کسی غلط فہمی کی بنا پر ایصالِ ثواب کرے گا تو اس کا ثواب ضائع نہ ہو گا بلکہ مجرم کو پہنچنے کے بجائے اصل عامل ہی کی طرف پلٹ آئے گا۔ جیسے منی آرڈر اگر مُرسَل اِلَیہ کو نہ پہنچے تو مُرسِل کو واپس مل جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ممکن ہے مگر ایصالِ عذاب ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی نیکی کر کے کسی دوسرے کے لیے اجر بخش دے اور وہ اس کو پہنچ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی گناہ کر کے اس کا عذاب کسی کو بخشے اور وہ اسے پہنچ جائے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ نیک عمل کے دو فائدے ہیں: ایک، اس کے وہ نتائج جو عمل کرنے والے کی اپنی روح اور اس کے اخلاق پر مترتّب ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ اللہ کے ہاں بھی جزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے، اس کا وہ اجر جو اللہ تعالیٰ بطورِ انعام اسے دیتا ہے۔ ایصالِ ثواب کا تعلّق پہلی چیز سے نہیں ہے بلکہ صرف دوسری چیز سے ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ورزش کر کے کُشتی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے جو طاقت اور مہارت اس میں پیدا ہوتی ہے، وہ بہرحال اس کی ذات ہی کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے کی طرف وہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اِسی طرح اگر وہ کسی دربار کا ملازم ہے اور پہلوان کی حیثیت سے اس کے لیے ایک تنخواہ مقرر ہے تو وہ بھی اسی کو ملے گی، کسی اور کو نہ دے دی جائے گی۔ البتہ جو انعامات اس کی کارگزاری پر خوش ہو کر اس کا سرپرست اسے دے، اس کے حق میں وہ درخواست کر سکتا ہے کہ وہ اس کے استاد، یا ماں باپ، یا دوسرے محسنوں کو اُس کی طرف سے دے دیے جائیں۔ ایسا ہی معاملہ اعمالِ حَسَنہ کا ہے کہ ان کے روحانی فوائد قابلِ انتقال نہیں ہیں، اور ان کی جزا بھی کسی کو منتقل نہیں ہو سکتی، مگر ان کے اجر و ثواب کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے کسی عزیز قریب یا اس کے کسی مُحسن کو عطا کر دیا جائے۔ اِسی لیے اِس کو ایصالِ جزا نہیں بلکہ ایصالِ ثواب کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک شخص کی سعی کے کسی اور شخص کے لیے نافع ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ آدمی یا تو دوسرے کی خواہش اور اِیما کی بنا پر اس کے لیے کوئی نیک عمل کرے، یا اس کی خواہش اور اِیما کے بغیر اُس کی طرف سے کوئی ایسا عمل کرے جو

دراصل واجب تو اُس کے ذمّے تھا مگر وہ خود اسے ادا نہ کر سکا۔ اِس کے بارے میں فقہائے حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں: ایک خالص بدنی، جیسے نماز۔ دوسری خالص مالی، جیسے زکوٰۃ۔ اور تیسری مالی و بدنی مرکّب، جیسے حج۔ ان میں سے پہلی قسم میں نیابت نہیں چل سکتی، مثلاً ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص نیابتاً نماز نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری قسم میں نیابت ہو سکتی ہے، مثلاً بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ شوہر دے سکتا ہے۔ تیسری قسم میں نیابت صرف اُس حالت میں ہو سکتی ہے جب کہ اصل شخص، جس کی طرف سے کوئی فعل کیا جا رہا ہے، اپنا فریضہ خود ادا کرنے سے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر عاجز ہو، مثلاً حجّ بدل ایسے شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو خود حج کے لیے جانے پر قادر نہ ہو اور نہ یہ اُمید ہو کہ وہ کبھی اس کے قابل ہو سکے گا۔ مالکیہ اور شافعیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ البتہ امام مالکؒ حِجّ بدل کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر باپ نے وصیّت کی ہو کہ اُس کا بیٹا اُس کے بعد اُس کی طرف سے حج کرے تو وہ حِجّ بدل کر سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ مگر احادیث اس معاملے میں بالکل صاف ہیں کہ باپ کا ایما یا وصیّت ہو یا نہ ہو، بیٹا اس کی طرف سے حِجّ بدل کر سکتا ہے۔

ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ قبیلۂ خَثْعَم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے باپ کو فریضۂ حج کا حکم ایسی حالت میں پہنچا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے، اُونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا۔ آپؐ نے فرمایا: فَحُجِّیْ عَنْہُ ”تو اس کی طرف سے تُو حج کر لے۔“ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نَسائی) قریب قریب اسی مضمون کی روایت حضرت علیؓ نے بھی بیان کی ہے۔ (احمد، ترمذی)

حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ قبیلۂ خَثْعَم ہی کے ایک مرد کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے بھی اپنے بوڑھے باپ کے متعلق یہی سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا: ”کیا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا ہے؟“ اس نے عرض کیا: ”جی ہاں“۔ فرمایا: اَرَأَیْتَ لَوْ کَانَ عَلٰی اَبِیْكَ دَیْنٌ فَقَضَیْتَہٗ عَنْہُ اَکَانَ یَجْزِیْ ذٰلِكَ عَنْہُ؟ ”تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اُس کو ادا کر دے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟“ اس نے عرض کیا: ”جی ہاں“۔ فرمایا: فَاحْجُجْ عَنْہُ۔ ”بس اسی طرح تُو اس کی طرف سے حج بھی کر لے۔“ (احمد، نَسائی)

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ قبیلۂ جُہَینَہ کی ایک عورت نے آ کر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی مر گئی، اب کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ”تیری ماں پر اگر قرض ہوتا تو کیا تُو اس کو ادا نہ کر سکتی تھی؟ اسی طرح تم لوگ اللہ کا حق بھی ادا کرو، اور اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد پُورے کیے جائیں۔“ (بخاری، نَسائی) بخاری اور مُسْنَدِ احمد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایک مرد نے آ کر اپنی بہن کے بارے میں وہی سوال کیا جو اُوپر مذکور ہوا ہے اور حضورؐ نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔

ان رِوایات سے مالی و بدنی مرکّب عبادات میں نیابت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ رہیں خالص بدنی عبادات، تو بعض احادیث ایسی ہیں جن سے اِس نوعیت کی عبادات میں بھی نیابت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ابنِ عباسؓ کی یہ رِوایت کہ قبیلۂ جُہَینَہ کی ایک عورت نے حضورؐ سے پوچھا: ”میری ماں نے روزے کی نذر مانی تھی اور وہ پوری کیے بغیر مر گئی، کیا میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱

اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی[39] اور اس کی پُوری جزا اسے دی جائے گی،

اس کی طرف سے روزہ رکھ سکتی ہوں؟" حضورؐ نے فرمایا: "اس کی طرف سے روزہ رکھ لے۔" (بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ابوداؤد) اور حضرت بُرَیدَہؓ کی یہ روایت کہ ایک عورت نے اپنی ماں کے متعلق پوچھا کہ اُس کے ذمے ایک مہینے (یا دوسری روایت کے مطابق دو مہینے) کے روزے تھے، کیا میں یہ روزے ادا کر دوں؟ آپؐ نے اس کو بھی اس کی اجازت دے دی۔ (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور حضرت عائشہؓ کی روایت کہ حضورؐ نے فرمایا: مَنْ مَّاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهٗ، "جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی وہ روزے رکھ لے۔" (بخاری، مسلم، احمد۔ بزّار کی روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: فَلْيَصُمْ عَنْهُ وَلِيُّهٗ اِنْ شَآءَ، یعنی اس کا ولی اگر چاہے تو اس کی طرف سے یہ روزے رکھ لے)۔ اِنھی احادیث کی بنا پر اصحاب الحدیث اور امام اَوزاعیؒ اور ظاہریّہ اس کے قائل ہیں کہ بدنی عبادات میں بھی نیابت جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ اور امام زید بن علیؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جا سکتا، اور امام احمد، امام لَیث اور اسحاق بن رَاہوَیہ کہتے ہیں کہ صرف اُس صورت میں ایسا کیا جا سکتا ہے جب کہ مرنے والے نے اس کی نذر مانی ہو اور وہ اسے پورا نہ کر سکا ہو۔ مانعین کا اِستِدلال یہ ہے کہ جن احادیث سے اِس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے، اُن کے راویوں نے خود اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ ابنِ عباسؓ کا فتویٰ نَسائی نے اِن الفاظ میں نقل کیا ہے کہ لَا يُصَلِّ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا يَصُمْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ، "کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے۔" اور حضرت عائشہؓ کا فتویٰ عبدالرزاق کی رِوایت کے مطابق یہ ہے کہ لَا تَصُوْمُوْا عَنْ مَوْتٰكُمْ وَاَطْعِمُوْا عَنْهُمْ، "اپنے مُردوں کی طرف سے روزہ نہ رکھو بلکہ کھانا کھلاؤ۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی عبدالرزاق نے یہی بات نقل کی ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً بدنی عبادات میں نیابت کی اجازت تھی، مگر آخری حکم یہی قرار پایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ احادیث نقل کی ہیں، وہ خود اُن کے خلاف فتویٰ دیتے۔

اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نیابتاً کسی فریضے کی ادائیگی صرف اُنھی لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جو خود ادائے فرض کے خواہش مند ہوں اور معذوری کی وجہ سے قاصر رہ گئے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قصداً حج سے مجتنب رہا اور اُس کے دل میں اِس فرض کا احساس تک نہ تھا، اُس کے لیے خواہ کتنے ہی حجِ بدل کیے جائیں، وہ اس کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کا قرض جان بُوجھ کر مار کھایا اور مرتے دم تک اس کا کوئی ارادہ قرض ادا کرنے کا نہ تھا۔ اس کی طرف سے خواہ بعد میں پائی پائی ادا کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ قرض مارنے والا ہی شمار ہو گا۔ دوسرے کے ادا کرنے سے سُبکدوش صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی میں ادائے قرض کا خواہش مند ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کر سکا ہو۔

وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰىۙ﴿۴۲﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰىۙ﴿۴۳﴾
وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْيَاۙ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
وَ الْاُنْثٰىۙ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى﴿۴۶﴾ وَ اَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ
الْاُخْرٰىۙ﴿۴۷﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰىۙ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰىۙ﴿۴۹﴾

اور یہ کہ آخرکار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے،[۳۹]
اور یہ کہ اُسی نے ہنسایا اور اُسی نے رُلایا،[۴۰]
اور یہ کہ اُسی نے موت دی اور اُسی نے زندگی بخشی،
اور یہ کہ اُسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے،[۴۱]
اور یہ کہ دُوسری زندگی بخشنا بھی اُسی کے ذمّے ہے،[۴۲]
اور یہ کہ اُسی نے غنی کیا اور جائداد بخشی،[۴۳]
اور یہ کہ وہی شِعریٰ کا رب ہے،[۴۴]

۳۹ – یعنی آخرت میں لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی اور یہ دیکھا جائے گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے۔ یہ فقرہ چونکہ پہلے فقرے کے معاً بعد ارشاد ہوا ہے اس لیے اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ پہلے فقرے کا تعلق آخرت کی جزا و سزا ہی سے ہے اور اُن لوگوں کی بات صحیح نہیں ہے جو اسے اِس دنیا کے لیے ایک معاشی اُصول بنا کر پیش کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی کسی آیت کا ایسا مطلب لینا صحیح نہیں ہو سکتا جو سیاق و سباق کے بھی خلاف ہو اور قرآن کی دوسری تصریحات سے بھی متصادم ہو۔

۴۰ – یعنی خوشی اور غم، دونوں کے اسباب اُسی کی طرف سے ہیں۔ اچھی اور بُری قسمت کا سرِرشتہ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو اگر راحت دمسرّت نصیب ہوئی ہے تو اُسی کے دینے سے ہوئی ہے۔ اور کسی کو مصائب و آلام سے سابقہ پیش آیا ہے تو اُسی کی مشیّت سے پیش آیا ہے۔ کوئی دوسری ہستی اِس کائنات میں ایسی نہیں ہے جو قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں کسی قسم کا دخل رکھتی ہو۔

۴۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حواشی ۲۷ تا ۳۰۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۷۔

۴۲ – اُوپر کی دونوں آیتوں کے ساتھ ملا کر اس آیت کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ترتیبِ کلام سے خود بخود

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَاِۨ الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ

اور یہ کہ اُسی نے عادِ اُولیٰ کو ہلاک کیا، اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا، اور اُن سے پہلے قومِ نوحؑ کو تباہ کیا کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم و سرکش لوگ، اور اَوندھی گرنے والی بستیوں کو

حیات بعد الموت کی دلیل بھی برآمد ہو رہی ہے۔ جو خدا موت دینے اور زندگی بخشنے پر قدرت رکھتا ہے، اور جو خدا نُطفے کی حقیری بُوند سے انسان جیسی مخلوق پیدا کرتا ہے، بلکہ ایک ہی مادّۂ تخلیق و طریقِ پیدائش سے عورت اور مرد کی دو الگ صِنفیں پیدا کر دکھاتا ہے، اس کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

۴۳- اصل میں لفظ اَقْنٰی استعمال ہُوا ہے، جس کے مختلف معنیٰ اہلِ لُغت اور مفسّرین نے بیان کیے ہیں۔ قَتَادَہؒ کہتے ہیں کہ ابنِ عباسؓ نے اس کے معنیٰ اَرْضٰی (راضی کر دیا) بتائے ہیں۔ عِکْرِمَہؒ نے ابنِ عباسؓ سے اس کے معنیٰ قَنَّعَ (مطمئن کر دیا) نقل کیے ہیں۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ آدمی کی حاجت سے زیادہ جو کچھ بھی اس کو دیا جائے وہ اِقناء ہے۔ ابوعُبَیدہ اور دوسرے متعدّد اہلِ لغت کا قول ہے کہ اَقْنٰی قُنْیَۃٌ سے مُشتَق ہے، جس کے معنیٰ ہیں: باقی اور محفوظ رہنے والا مال، جیسے مکان، اراضی، باغات، مواشی وغیرہ۔ اِن سب سے الگ مفہوم ابنِ زیدؒ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اَقْنٰی یہاں اَفْقَرَ (فقیر کر دیا) کے معنیٰ میں ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے جس کو چاہا غنی کیا اور جسے چاہا فقیر کر دیا۔

۴۴- شِعْریٰ آسمان کا روشن ترین تارا ہے جسے مرزم الجوزا، الکَلْبُ الاکبر، الکلب الجبار، الشِّعری العَبُور وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کو Sirius اور Dog Star اور Canis Majoris کہتے ہیں۔ یہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے، مگر زمین سے اس کا فاصلہ آٹھ سالِ نوری سے بھی زیادہ ہے، اس لیے یہ سورج سے چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہلِ مصر اس کی پرستش کرتے تھے، کیونکہ اس کے طُلوع کے زمانے میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اُسی کے طلوع کا فیضان ہے۔ جاہلیت میں اہلِ عرب کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارہ لوگوں کی قسمتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ عرب کے معبُودوں میں شامل تھا، اور خاص طور پر قریش کا ہمسایہ قبیلہ خُزَاعَہ اس کی پرستش کے لیے مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری قسمتیں شِعریٰ نہیں بناتا، بلکہ اُس کا رب بناتا ہے۔

۴۵- عادِ اُولیٰ سے مراد ہے قدیم قومِ عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم جب حضرت ہودؑ کو جھٹلانے کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوئی تو صرف وہ لوگ باقی بچے جو اُن پر ایمان لائے تھے۔ ان کی نسل کو تاریخ میں عادِ اُخریٰ یا عادِ ثانیہ کہتے ہیں۔

أَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾
هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُوْلٰى ﴿۵۶﴾ أَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا

اُٹھا پھینکا، پھر چھا دیا اُن پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھا دیا۔[۴۶]
پس[۴۷] اے مُخاطب! اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تُو شک کرے[۴۸] گا؟"
یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے[۴۹]۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے[۵۰]، اللہ کے

---

۴۶ — اَوندھی گرنے والی بستیوں سے مراد قومِ لُوط کی بستیاں ہیں۔ اور "چھا دیا اُن پر جو کچھ چھا دیا" سے مراد غالبًا بحرِ مُردار کا پانی ہے جو ان کی بستیوں کے زمین میں دھنس جانے کے بعد اُن پر پھیل گیا تھا اور آج تک وہ اس علاقے پر چھایا ہوا ہے۔

۴۷ — بعض مفسّرین کے نزدیک یہ فقرہ بھی صُحُفِ ابراہیمؑ اور صُحُفِ موسیٰؑ کی عبارت کا ایک حصّہ ہے۔ اور بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى پر وہ عبارت ختم ہو گئی، یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے پہلا قول ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بعد کی یہ عبارت کہ "یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے"، اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس سے پہلے کی تمام عبارت پچھلی تنبیہات میں سے ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں ارشاد ہوئی تھیں۔

۴۸ — اصل میں لفظ تَتَمَارٰى استعمال ہوا ہے، جس کے معنی شک کرنے کے بھی ہیں اور جھگڑنے کے بھی۔ خطاب ہر سامع سے ہے۔ جو شخص بھی اِس کلام کو سن رہا ہو، اُس کو مُخاطَب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں پیغمبروں سے جھگڑا کرنے کا جو انجام انسانی تاریخ میں ہو چکا ہے، کیا اُس کے بعد بھی تُو اِسی حماقت کا ارتکاب کرے گا؟ پچھلی قوموں نے یہی تو شک کیا تھا کہ جن نعمتوں سے ہم اِس دنیا میں مستفید ہو رہے ہیں، یہ خدائے واحد کی نعمتیں ہیں، یا کوئی اور بھی اِن کے مہیّا کرنے میں شریک ہے، یا یہ کسی کی فراہم کی ہوئی نہیں ہیں بلکہ آپ سے آپ فراہم ہو گئی ہیں۔ اِسی شک کی بنا پر انھوں نے انبیاء علیہم السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ انبیاءؑ ان سے کہتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں تمھیں خدا نے، اور اکیلے ایک ہی خدا نے عطا کی ہیں، اس لیے اُسی کا تمھیں شکرگزار ہونا چاہیے اور اُسی کی تم کو بندگی بجا لانی چاہیے۔ مگر وہ لوگ اِس کو نہیں مانتے تھے اور اِسی بات پر انبیاءؑ سے جھگڑتے تھے۔ اب کیا تجھے تاریخ میں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ قومیں اپنے اِس شک اور اس جھگڑے کا کیا انجام دیکھ چکی ہیں؟ کیا تُو بھی وہی شک اور وہی جھگڑا کرے گا جو دوسروں کے لیے تباہ کُن ثابت ہو چکا ہے؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوحؑ کے لوگ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝۵۸ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝۵۹
وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝۶۰ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝۶۱ فَاسْجُدُوْا
لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝۶۲ ع ۳ السجدۃ

سوا کوئی اُس کو ہٹانے والا نہیں[۵۱]۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہارِ تعجب کرتے ہو؟[۵۲] ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟[۵۳] اور گا بجا کر انھیں ٹالتے ہو؟[۵۴] جُھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا لاؤ[۵۵] ع سجدہ

تھے اور قومِ لُوط خود حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مبتلائے عذاب ہوئی تھی، اس لیے اِس عبارت کے صُحُفِ ابراہیمؑ کا ایک حصّہ ہونے میں کوئی اِشکال نہیں ہے۔

۴۹- اصل الفاظ ہیں: هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى۔ اِس فقرے کی تفسیر میں مفسّرین کے تین اقوال ہیں: ایک یہ کہ نذیر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ تیسرے یہ کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کا انجام ہے جس کا حال اُوپر کی آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ سیاقِ کلام کے لحاظ سے ہمارے نزدیک یہی تیسری تفسیر قابلِ ترجیح ہے۔

۵۰- یعنی یہ خیال نہ کرو کہ سوچنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے، کیا جلدی ہے کہ ان باتوں پر ہم فوراً ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انھیں ماننے کا بلا تاخیر فیصلہ کر ڈالیں۔ نہیں، تم میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے لیے زندگی کی کتنی مہلت باقی ہے۔ ہر وقت تم میں سے ہر شخص کی موت بھی آ سکتی ہے، اور قیامت بھی اچانک پیش آ سکتی ہے۔ اس لیے فیصلے کی گھڑی کو دُور نہ سمجھو۔ جس کو بھی اپنی عاقبت کی فکر کرنی ہے وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جائے۔ کیونکہ ہر سانس کے بعد یہ ممکن ہے کہ دوسرا سانس لینے کی نوبت نہ آئے۔

۵۱- یعنی فیصلے کی گھڑی جب آ جائے گی تو نہ تم اسے روک سکو گے اور نہ تمھارے معبُودانِ غیر اللہ میں سے کسی کا یہ بل بُوتا ہے کہ وہ اس کو ٹال سکے۔ ٹال سکتا ہے تو اللہ ہی ٹال سکتا ہے، اور وہ اسے ٹالنے والا نہیں ہے۔

۵۲- اصل میں لفظ هٰذَا الْحَدِيْثِ استعمال ہوا ہے، جس سے مراد وہ ساری تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے قرآنِ مجید میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور تعجب سے مُراد وہ تعجُّب ہے جس کا اظہار آدمی کسی انوکھی اور ناقابلِ یقین بات کو سُن کر کیا کرتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں، وہ یہی کچھ تو ہے جو تم نے سُن لی۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم کان کھڑے کرتے ہو اور حیرت سے اِس طرح منہ تکتے ہو کہ گویا کوئی بڑی عجیب اور نرالی باتیں تمھیں سنائی جا رہی ہیں؟

۵۳ - یعنی بجائے اس کے کہ تمھیں اپنی جہالت و گمراہی پر رونا آتا، تم لوگ اُلٹا اِس صداقت کا مذاق اُڑاتے ہو جو تمھارے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

۵۴ - اصل میں لفظ سٰمِدُوْنَ استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنٰی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ابنِ عباسؓ، عِکرِمہ اور ابوعُبَیدہ نَحْوی کا قول ہے کہ یمنی زبان میں سُمُود کے معنٰی گانے بجانے کے ہیں اور آیت کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکّہ قرآن کی آواز کو دبانے اور لوگوں کی توجّہ دوسری طرف ہٹانے کے لیے زور زور سے گانا شروع کر دیتے تھے۔ دوسرے معنٰی ابنِ عباسؓ اور مجاہدؒ نے یہ بیان کیے ہیں کہ السّمود البَرْطَمَة وهي رفع الراس تكبرا، كانوا يمرّون على النبي صلى الله عليه وسلم غضابا مبرطمين۔ یعنی سُمُود تکبّر کے طور پر سر نیوڑھانے کو کہتے ہیں۔ کفارِ مکّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے جب گزرتے تھے تو غصّے کے ساتھ منہ اُوپر اُٹھائے ہوئے نکل جاتے تھے۔ راغب اَصفہانی نے مُفردات میں بھی یہی معنٰی اختیار کیے ہیں، اور اسی معنٰی کے لحاظ سے سٰمِدُوْنَ کا مفہوم قَتَادَہؒ نے غافِلون اور سعید بن جُبَیرؒ نے مُعرِضون بیان کیا ہے۔

۵۵ - امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک اس آیت پر سجدہ کرنا لازم ہے۔ امام مالکؒ اگرچہ خود اس کی تلاوت کر کے سجدے کا التزام فرماتے تھے (جیسا کہ قاضی ابوبکر ابن العَرَبی نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے)، مگر ان کا مسلک یہ تھا کہ یہاں سجدہ کرنا لازم نہیں ہے۔ ان کی اس رائے کی بِنا حضرت زیدؓ بن ثابت کی یہ روایت ہے کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پڑھی اور حضورؐ نے سجدہ نہ کیا۔'' (بخاری، مسلم، احمد، ترمِذی، ابوداؤد، نَسائی) لیکن یہ حدیث اس آیت پر سجدہ لازم ہونے کی نفی نہیں کرتی، کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ حضورؐ نے اُس وقت کسی وجہ سے سجدہ نہ فرمایا ہو اور بعد میں کر لیا ہو۔ دوسری روایات اس باب میں صریح ہیں کہ اس آیت پر التزاماً سجدہ کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، ابنِ عباسؓ اور مُطّلِبؓ بن ابی وَدَاعہ کی مُتّفَق عَلَیہ روایات یہ ہیں کہ حضورؐ نے جب پہلی مرتبہ حرم میں یہ سورت تلاوت فرمائی تو آپؐ نے سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ مسلم و کافر سب سجدے میں گر گئے۔ (بخاری، احمد، نَسائی) ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔ (بَیہقی، ابنِ مَرْدُوْیہ) سَبُرَۃ الجُہَنی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فجر کی نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور پھر اُٹھ کر سورۂ زلزال پڑھی اور رُکوع کیا۔ (سعید بن منصور) خود امام مالکؒ نے بھی مُؤطّا، باب ما جاء فی سجود القرآن میں حضرت عمرؓ کا یہ فعل نقل کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

القمر

(۵۴)

القمر

نام پہلی ہی آیت کے فقرے وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظ ''القمر'' آیا ہے۔

زمانۂ نزُول اِس میں شقّ القمر کے واقعے کا ذکر آیا ہے جس سے اِس کا زمانۂ نزُول متعیّن ہو جاتا ہے۔ محدّثین و مفسّرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے مکّۂ معظمہ میں منیٰ کے مقام پر پیش آیا تھا۔

موضوع اور مضمون اِس میں کفارِ مکّہ کو اُس ہٹ دھرمی پر متنبّہ کیا گیا ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھی تھی۔ شق القمر کا حیرت انگیز واقعہ اِس بات کا صریح نشان تھا کہ وہ قیامت جس کے آنے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، فی الواقع برپا ہو سکتی ہے، اور اُس کی آمد کا وقت قریب آلگا ہے۔ چاند جیسا عظیم الشان کُرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے پھٹا تھا۔ اس کے دونوں ٹکڑے الگ ہو کر ایک دوسرے سے اتنی دُور چلے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا تھا۔ پھر آن کی آن میں وہ دونوں پھر مل گئے تھے۔ یہ اس بات کا کُھلا ثبوت تھا کہ نظامِ عالَم اَزَلی و اَبَدی اور غیر فانی نہیں ہے۔ وہ دَرہم بَرہم ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے ستارے اور سیّارے پھٹ سکتے ہیں، بکھر سکتے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکرا سکتے ہیں، اور وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کا نقشہ قیامت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے قرآن میں کھینچا گیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ یہ اِس امر کا پتا بھی دے رہا تھا کہ نظامِ عالَم کے درہم برہم ہونے کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ وقت قریب ہے جب قیامت برپا ہو گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حیثیت سے لوگوں کو اس واقعے کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا: ''دیکھو اور گواہ رہو۔'' مگر کفّار نے اسے جادُو کا کرشمہ قرار دیا اور اپنے انکار پر جمے رہے۔ اسی ہٹ دھرمی پر اِس سورہ میں اُنھیں ملامت کی گئی ہے۔

کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ نہ سمجھانے سے مانتے ہیں، نہ تاریخ سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ آنکھوں سے صریح نشانیاں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ اُسی وقت مانیں گے جب قیامت فی الواقع برپا ہو جائے گی اور قبروں سے نکل کر یہ داوَرِ محشر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے بعد اُن کے سامنے قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لُوط اور آلِ فرعون کا حال مختصر الفاظ میں بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تنبیہات کو جھٹلا کر یہ قومیں کس درد ناک عذاب سے دوچار ہوئیں، اور ایک ایک قوم کا قصّہ بیان کرنے کے بعد بار بار یہ بات دُہرائی گئی ہے کہ یہ قرآن نصیحت کا آسان ذریعہ ہے، جس سے اگر کوئی قوم سبق لے کر راہِ راست پر آ جائے تو اُن عذابوں کی نوبت نہیں آ سکتی جو اِن قوموں پر نازل ہوئے۔ اب آخر یہ کیا حماقت ہے کہ اس آسان ذریعے سے نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی اِسی پر اصرار کرے کہ عذاب دیکھے بغیر نہ مانے گا۔

اِس طرح پچھلی قوموں کی تاریخ سے عبرت ناک مثالیں دینے کے بعد کفّارِ مکّہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جس طرزِ عمل پر دوسری قومیں سزا پا چکی ہیں، وہی طرزِ عمل اگر تم اختیار کرو تو آخر تم کیوں نہ سزا پاؤ گے؟ کیا تمھارے کچھ سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ تمھارے ساتھ دوسروں سے مختلف معاملہ کیا جائے؟ یا کوئی خاص معافی نامہ تمھارے پاس لکھا ہوا آ گیا ہے کہ جس جُرم پر دوسرے پکڑے گئے ہیں، وہی تم کرو گے تو تمھیں نہ پکڑا جائے گا؟ اور اگر تم اپنی جمعیّت پر پُھولے ہوئے ہو تو عنقریب تمھاری یہ جمعیّت شکست کھا کر بھاگتی نظر آئے گی، اور اس سے زیادہ سخت معاملہ تمھارے ساتھ قیامت کے روز ہو گا۔

آخر میں کفار کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت لانے کے لیے کسی بڑی تیاری کی حاجت نہیں ہے۔ اُس کا بس ایک حکم ہوتے ہی پلک جھپکاتے وہ برپا ہو جائے گی۔ مگر ہر چیز کی طرح نظامِ عالَم اور نوعِ انسانی کی بھی ایک تقدیر ہے۔ اِس تقدیر کے لحاظ سے جو وقت اِس کام کے لیے مقرر ہے، اُسی وقت پر وہ ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی چیلنج کرے، اُس کو قائل کرنے کے لیے قیامت لا کھڑی کی جائے۔ اُس کو آتے نہ دیکھ کر تم سرکشی اختیار کرو گے تو اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ بھگتو گے۔ تمھارا کچّا چٹّھا خدا کے ہاں تیار ہو رہا ہے، جس میں تمھاری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ثبت ہونے سے رہ نہیں گئی ہے۔

---

۳ رکوعاتہا

سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ

۵۵ آیاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا[۱]۔ مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں

۱- یعنی چاند کا پھٹ جانا اِس بات کی علامت ہے کہ وہ قیامت کی گھڑی، جس کے آنے کی تم لوگوں کو خبر دی جاتی رہی ہے، قریب آ لگی ہے اور نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کا آغاز ہوگیا ہے۔ نیز یہ واقعہ کہ چاند جیسا ایک عظیم کُرہ شق ہو کر دو ٹکڑے ہوگیا، اس امر کا کُھلا ثبوت ہے کہ جس قیامت کا تم سے ذکر کیا جا رہا ہے، وہ برپا ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب چاند پھٹ سکتا ہے تو زمین بھی پھٹ سکتی ہے، تاروں اور سیاروں کے مدار بھی بدل سکتے ہیں، اور اَفلاک کا یہ سارا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز اَزلی و اَبدی اور دائم و مستقل نہیں ہے کہ قیامت برپا نہ ہوسکے۔

بعض لوگوں نے اس فقرے کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''چاند پھٹ جائے گا''۔ لیکن عربی زبان کے لحاظ سے چاہے یہ مطلب لینا ممکن ہو، عبارت کا سیاق و سباق اس معنی کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتا ہے۔ اوّل تو یہ مطلب لینے سے پہلا فقرہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ چاند اگر اس کلام کے نُزول کے وقت پھٹا نہیں تھا، بلکہ وہ آیندہ کبھی پھٹنے والا ہے، تو اُس کی بنا پر یہ کہنا بالکل مُہمَل بات ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ آخر مستقبل میں پیش آنے والا کوئی واقعہ اُس کے قُرب کی علامت کیسے قرار پا سکتا ہے کہ اسے شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک معقول طرزِ استدلال ہو۔ دوسرے، یہ مطلب لینے کے بعد جب ہم آگے کی عبارت پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اِس کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ آگے کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ لوگوں نے اُس وقت کوئی نشانی دیکھی تھی جو امکانِ قیامت کی صریح علامت تھی، مگر انھوں نے اسے جادُو کا کرشمہ قرار دے کر جُھٹلا دیا، اور اپنے اِس خیال پر جمے رہے کہ قیامت کا آنا ممکن نہیں ہے۔ اِس سیاق و سباق میں اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے الفاظ اُسی صورت میں ٹھیک بیٹھ سکتے ہیں جب کہ ان کا مطلب ''چاند پھٹ گیا'' ہو۔ ''پھٹ جائے گا'' کے معنی میں ان کو لے لیا جائے تو بعد کی ساری بات بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ سلسلۂ کلام میں اس فقرے کو رکھ کر دیکھ لیجیے، آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ اس کی وجہ سے ساری عبارت بے معنی ہو گئی ہے:

''قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادُو ہے۔ اِنھوں نے جُھٹلا دیا اور اپنی خواہشات

Maktaba Tul Ishaat.com

نفس کی پیروی کی۔"

پس حقیقت یہ ہے کہ شقّ القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی رِوایات پر اُس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ رِوایات سے اس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔ یہ رِوایات بخاری، مسلم، تِرْمِذِی، احمد، ابوعُوانہ، ابوداؤد طَیالِسی، عبدالرزّاق، ابنِ جَرِیر، بَیْہَقی، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیہ اور ابونُعَیم اَصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ، حضرت اَنَسؓ بن مالک اور حضرت جُبَیرؓ بن مُطْعِم سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت حُذَیفہؓ اور حضرت جُبَیرؓ بن مُطْعِم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباسؓ) کی پیدایش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی اَنَسؓ بن مالک) اُس وقت بچّے تھے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ انھوں نے ایسے سِن رسیدہ صحابیوں سے سُن کر ہی اسے روایت کیا ہوگا جو اس واقعے کا براہِ راست علم رکھتے تھے۔

تمام روایات کو جمع کرنے سے اِس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طُلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جُڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مِنٰی میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو۔ کفّار نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادُو کر دیا تھا، اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمدؐ ہم پر جادو کر سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ اُن سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انھوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انھوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت اَنَسؓ سے مروی ہیں، ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شقّ القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اوّل تو صحابہؓ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت اَنَسؓ کی بھی بعض روایات میں مَرَّتَیْنِ (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں، اور بعض میں فِرقتین اور شقّتین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآنِ مجید صرف ایک ہی اِنشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصّے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہوگیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضورؐ کے گریبان میں داخل ہو کر آپؐ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعے کی حقیقی نوعیّت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفّارِ مکّہ کے مطالبے

پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قُربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علمائے اسلام کا ایک بڑا گروہ اِسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اُن کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبے پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری میں ابنِ حجرؒ کہتے ہیں کہ "یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے، ان میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبے پر ہوا تھا۔" (باب انشقاق القمر) ایک روایت ابونُعَیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کُتُبِ حدیث میں ابنِ عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، دونوں اِس واقعے کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت حُذَیفہؓ، حضرت جُبَیرؓ بن مُطْعِم، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا یہ معجزہ اُن کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید خود بھی اس واقعے کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قُربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اِس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔

معترضین اِس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں: اوّل تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سیکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا، اور علمِ نُجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ دَور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کُرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دُور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آ ملیں۔ رہا دوسرا اعتراض، تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظے کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مُنعَطِف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اُس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پُوری رُوئے زمین پر اُسے دیکھا

Maktaba Tul Ishaat.com

يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝٢ وَ كَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ
وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝٣ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ

مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔[۲] انھوں نے (اس کو بھی) جھٹلا دیا اور اپنی خواہشاتِ نفس ہی کی پیروی کی۔[۳] ہر معاملے کو آخرکار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے۔[۴]
اِن لوگوں کے سامنے (پچھلی قوموں کے) وہ حالات آ چکے ہیں جن میں سرکشی سے باز

بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا، وہ اسے ثبت کر لیتے، اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالا بار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اُس رات وہاں کے ایک راجا نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علمِ نجوم کی کتابیں اور جنتریاں، تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اُس حالت میں ضروری تھا جب کہ چاند کی رفتار، اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی، اس لیے قدیم زمانے کے اہلِ تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعے کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔

۲- اصل الفاظ ہیں: سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ معاذ اللہ، شب و روز کی جادوگری کا جو سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چلا رکھا ہے، یہ جادو بھی اسی میں سے ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ پکا جادو ہے، بڑی مہارت سے دکھایا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ جس طرح اور جادو گزر گئے ہیں، یہ بھی گزر جائے گا، اس کا کوئی دیرپا اثر رہنے والا نہیں ہے۔

۳- یعنی جو فیصلہ انھوں نے قیامت کو نہ ماننے کا کر رکھا ہے، اِس نشانی کو دیکھ کر بھی یہ اُسی پر جمے رہے۔ قیامت کو مان لینا چونکہ اِن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف تھا، اِس لیے صریح مشاہدے کے بعد بھی یہ اُسے تسلیم کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

۴- مطلب یہ ہے کہ یہ سلسلہ بلا نہایت نہیں چل سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں حق کی طرف بلاتے رہیں، اور تم ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے باطل پر جمے رہو، اور اُن کا حق پر ہونا اور تمھارا باطل پر ہونا کبھی ثابت نہ ہو۔ تمام معاملات آخرکار ایک انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں، اِسی طرح تمھاری اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس کشمکش کا بھی لامحالہ ایک انجام ہے جس پر یہ پہنچ کر رہے گی۔ ایک وقت لازماً ایسا آنا ہے جب علی الاعلان یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ حق

مُزۡدَجَرٌ ۙ﴿۴﴾ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ ۙ﴿۵﴾ فَتَوَلَّ
عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ ۙ﴿۶﴾ خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ
يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۙ﴿۷﴾
مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

رکھنے کے لیے کافی سامانِ عبرت ہے اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجۂ اَتم پُورا کرتی ہے۔ مگر تنبیہات اِن پر کارگر نہیں ہوتیں۔ پس اَے نبیؐ! اِن سے رُخ پھیر لو۔^۵ جس روز پکارنے والا ایک سخت ناگوار^۶ چیز کی طرف پکارے گا، لوگ سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ^۷ اپنی قبروں^۸ سے اِس طرح نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹِڈّیاں ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے، اور وہی منکرین (جو دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے) اُس وقت کہیں گے کہ یہ دن تو بڑا کٹھن ہے۔

پر تھے اور تم سراسر باطل کی پیروی کر رہے تھے۔ اِسی طرح حق پرست اپنی حق پرستی کا، اور باطل پرست اپنی باطل پرستی کا نتیجہ بھی ایک دن ضرور دیکھ کر رہیں گے۔

۵ - بالفاظِ دیگر اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو۔ جب اِنھیں زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھایا جا چکا ہے، اور انسانی تاریخ سے مثالیں دے کر بھی بتا دیا گیا ہے کہ انکارِ آخرت کے نتائج کیا ہیں اور رسولوں کی بات نہ ماننے کا کیا عبرت ناک انجام دوسری قومیں دیکھ چکی ہیں، پھر بھی یہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے، تو اِنھیں اِسی حماقت میں پڑا رہنے دو۔ اب یہ اُسی وقت مانیں گے جب مرنے کے بعد قبروں سے نکل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ وہ قیامت واقعی برپا ہو گئی جس سے قبل از وقت خبردار کر کے راہِ راست اختیار کر لینے کا مشورہ اِنھیں دیا جا رہا تھا۔

۶ - دوسرا مطلب اَنجانی چیز بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ایسی چیز جو کبھی اُن کے سان گمان میں بھی نہ تھی، جس کا کوئی نقشہ اور کوئی تصوّر ان کے ذہن میں نہ تھا، جس کا کوئی اندازہ ہی وہ نہ کر سکتے تھے کہ یہ کچھ بھی کبھی پیش آ سکتا ہے۔

۷ - اصل الفاظ ہیں: خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ ۔ یعنی اُن کی نگاہیں خُشوع کی حالت میں ہوں گی۔ اِس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُن پر خوف زدگی طاری ہو گی۔ دوسرے یہ کہ ذلّت اور ندامت اُن سے جھلک رہی ہو گی، کیونکہ قبروں سے نکلتے ہی اِنھیں محسوس ہو جائے گا کہ یہ وہی دوسری زندگی ہے جس کا ہم انکار کرتے تھے،

Maktaba Tul Ishaat.com

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ
وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾ فَفَتَحْنَآ
اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا
فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ
وَّدُسُرٍ ﴿١٣﴾ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾

اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم جُھٹلا چکی ہے[9]۔ اُنھوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے، اور وہ بُری طرح جِھڑکا گیا[10]۔ آخرکار اُس نے اپنے رب کو پُکارا کہ "میں مغلوب ہو چکا، اب تُو اِن سے انتقام لے۔" تب ہم نے مُوسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا[11]، اور یہ سارا پانی اُس کام کو پُورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدّر ہو چکا تھا، اور نوحؑ کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں[12] والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اُس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی تھی[13]۔

جس کے لیے کوئی تیاری کر کے ہم نہیں آئے ہیں، جس میں اب مجرم کی حیثیت سے ہمیں اپنے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ گھبرائے ہوئے اُس ہولناک منظر کو دیکھ رہے ہوں گے جو اُن کے سامنے ہوگا، اُس سے نظر ہٹانے کا انھیں ہوش نہ ہوگا۔

۸۔ قبروں سے مراد وہی قبریں نہیں ہیں جن میں کسی شخص کو زمین کھود کر باقاعدہ دفن کیا گیا ہو۔ بلکہ جس جگہ بھی کوئی شخص مرا تھا، یا جہاں بھی اس کی خاک پڑی ہوئی تھی، وہیں سے وہ محشر کی طرف پکارنے والے کی ایک آواز پر اُٹھ کھڑا ہوگا۔

۹۔ یعنی اِس خبر کو جُھٹلا چکی ہے کہ آخرت برپا ہونی ہے جس میں انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، اُس نبی کی نبوت کو جُھٹلا چکی ہے جو اپنی قوم کو اِس حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا، اور نبی کی اُس تعلیم کو جُھٹلا چکی ہے جو یہ بتاتی تھی کہ آخرت کی باز پُرس میں کامیاب ہونے کے لیے لوگوں کو کیا عقیدہ اور کیا عمل اختیار کرنا چاہیے اور کس چیز سے بچنا چاہیے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

اُس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا[۱۴]، پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟ دیکھ لو، کیسا تھا میرا عذاب، اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اِس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے[۱۵]، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

۱۰ – یعنی ان لوگوں نے محض نبی کی تکذیب ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اُلٹا اسے دیوانہ قرار دیا، اس کو دھمکیاں دیں، اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی، اسے ڈانٹ ڈپٹ کر صداقت کی تبلیغ سے باز رکھنے کی کوشش کی، اور اس کا جینا دُوبھر کر دیا۔

۱۱ – یعنی اللہ کے حکم سے زمین اِس طرح پھوٹ بہی کہ گویا وہ زمین نہ تھی بلکہ بس چشمے ہی چشمے تھے۔

۱۲ – مراد ہے وہ کشتی جو طوفان کی آمد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق حضرت نوحؑ نے بنالی تھی۔

۱۳ – اصل الفاظ ہیں: جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ، یعنی "یہ سب کچھ اُس شخص کی خاطر بدلہ لینے کے لیے کیا گیا جس کا کفر کیا گیا تھا"۔ کفر اگر انکار کے معنیٰ میں ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ "جس کی بات ماننے سے انکار کیا گیا تھا"۔ اور اگر اسے کفرانِ نعمت کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ "جس کا وجود ایک نعمت تھا مگر اُس کی ناقدری کی گئی تھی"۔

۱۴ – یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اِس عقوبت کو ایک نشانِ عبرت بنا کر چھوڑ دیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قابلِ ترجیح معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کشتی کو نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ ایک بلند و بالا پہاڑ پر اُس کا موجود ہونا سیکڑوں ہزاروں برس تک لوگوں کو خدا کے غضب سے خبردار کرتا رہا اور انھیں یاد دلاتا رہا کہ اِس سرزمین پر خدا کی نافرمانی کرنے والوں کی کیسی شامت آئی تھی اور ایمان لانے والوں کو کس طرح اُس سے بچایا گیا تھا۔ امام بخاریؒ، ابنِ ابی حاتم، عبدالرزّاق اور ابنِ جَرِیرؒ نے قَتادہؒ سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ مسلمانوں کی فتح عراق والجزیرہ کے زمانے میں یہ کشتی جُودی پر (اور ایک روایت کے مطابق باقَردیٰ نامی بستی کے قریب) موجود تھی اور ابتدائی دَور کے اہلِ اسلام نے اس کو دیکھا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی ہوائی جہازوں سے پرواز کرتے ہوئے بعض لوگوں نے اِس علاقے کی ایک چوٹی پر ایک کشتی نما چیز پڑی دیکھی ہے جس پر شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ سفینۂ نوح ہے، اور اسی بنا پر وقتاً فوقتاً اس کی تلاش کے لیے مہمّات جاتی رہی ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۷، ہود، حاشیہ ۴۶۔ جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۲۵)

۱۵ – بعض لوگوں نے يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ کے الفاظ سے یہ غلط مطلب نکال لیا ہے کہ قرآن ایک آسان

Maktaba Tul Ishaat.com

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿١٨﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ

عاد نے جھٹلایا، تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا اُن پر بھیج دی[16]، جو لوگوں کو اُٹھا اُٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی

کتاب ہے، اِسے سمجھنے کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں، حتّٰی کہ عربی زبان تک سے واقفیت کے بغیر جو شخص چاہے اِس کی تفسیر کر سکتا ہے، اور حدیث و فقہ سے بے نیاز ہو کر اُس کی آیات سے جو احکام چاہے مُستنبَط کر سکتا ہے۔ حالانکہ جس سیاق و سَباق میں یہ الفاظ آئے ہیں، اُس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ارشاد کا مدّعا لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ نصیحت کا ایک ذریعہ تو ہیں وہ عبرتناک عذاب جو سرکش قوموں پر نازل ہوئے، اور دوسرا ذریعہ ہے یہ قرآن جو دلائل اور وعظ و تلقین سے تم کو سیدھا راستہ بتا رہا ہے۔ اُس ذریعے کے مقابلے میں نصیحت کا یہ ذریعہ زیادہ آسان ہے۔ پھر کیوں تم اِس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور عذاب ہی دیکھنے پر اصرار کیے جاتے ہو؟ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اپنے نبی کے ذریعے سے یہ کتاب بھیج کر وہ تمھیں خبردار کر رہا ہے کہ جن راہوں پر تم لوگ جا رہے ہو وہ کس تباہی کی طرف جاتی ہیں اور تمھاری خیر کس راہ میں ہے۔ نصیحت کا یہ طریقہ اِسی لیے تو اختیار کیا گیا ہے کہ تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے تمھیں اُس سے بچا لیا جائے۔ اب اُس سے زیادہ نادان اور کون ہو گا جو سیدھی طرح سمجھانے سے نہ مانے اور گڑھے میں گر کر ہی یہ تسلیم کرے کہ واقعی یہ گڑھا تھا۔

۱۶ – یعنی ایک ایسے دن جس کی نحوست کئی روز تک مسلسل جاری رہی۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیت ۱۶ میں فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور سورۂ اَلحاقّہ، آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ہوا کا یہ طوفان مسلسل سات رات اور آٹھ دن جاری رہا۔ مشہور یہ ہے کہ جس دن یہ عذاب شروع ہوا وہ بُدھ کا دن تھا۔ اسی سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بُدھ کا دن منحوس ہے اور کوئی کام اس دن شروع نہ کرنا چاہیے۔ بعض نہایت ضعیف احادیث بھی اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں، جن سے اِس دن کی نحوست کا عقیدہ عوام کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔ مثلاً ابنِ مَرْدُوْیَہ اور خطیب بغدادی کی یہ روایت کہ اٰخر اربعاء فی الشھر یوم نحس مستمر (مہینے کا آخری بدھ منحوس ہے جس کی نحوست مسلسل جاری رہتی ہے)۔ ابنِ جَوزیؒ اسے موضوع کہتے ہیں۔ ابنِ رجبؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ سَخاوِیؒ کہتے ہیں کہ جتنے طریقوں سے یہ منقول ہوئی ہے، وہ سب واہی ہیں۔ اسی طرح طَبرانی کی اس روایت کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یوم الاربعاء یوم نحس مستمر (بدھ کا دن پیہم نحوست کا دن ہے)۔ بعض اور روایات میں یہ باتیں بھی مروی ہیں کہ بدھ کو سفر نہ کیا جائے، لین دین نہ کیا جائے، ناخن نہ کٹوائے جائیں، مریض کی عیادت نہ کی جائے، اور یہ کہ جُذام اور برص اِسی روز شروع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ان پر کسی عقیدے

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝۲۰ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۲۱ وَ
لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۲۲ كَذَّبَتْ
ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝۲۳ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا
لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۲۴ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا

ع ۲۲ ۸

جیسے وہ جڑ سے اُکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔ پس دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اِس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ ع

ثمود نے تنبیہات کو جُھٹلایا اور کہنے لگے: "ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے، کیا اب ہم اُس کے پیچھے چلیں؟[۱۷] اِس کا اتباع ہم قبول کرلیں تو اِس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟

کی بِنا نہیں رکھی جا سکتی۔ محقق مُناوی کہتے ہیں: توقي الاربعاء على جهة الطيرة وظن اعتقاد المنجمين حرام شديد التحريم، اذ الايام كلها لله تعالى، لا تنفع ولا تضر بذاتها، "بدفالی کے خیال سے بدھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑنا اور نجومیوں کے سے اعتقادات اس باب میں رکھنا حرام، سخت حرام ہے، کیونکہ سارے دن اللہ کے ہیں، کوئی دن بذاتِ خود نہ نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان۔" علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں: "سارے دن یکساں ہیں، بدھ کی کوئی تخصیص نہیں۔ رات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جو کسی کے لیے اچھی اور کسی دوسرے کے لیے بُری نہ ہو۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کسی کے لیے موافق اور کسی کے لیے ناموافق حالات پیدا کرتا رہتا ہے"۔

۱۷- بالفاظِ دیگر، حضرت صالحؑ کی پیروی سے ان کا انکار تین وجوہ سے تھا: ایک یہ کہ وہ بشر ہیں، انسانیت سے بالاتر نہیں ہیں کہ ہم اُن کی بڑائی مان لیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہماری اپنی ہی قوم کے ایک فرد ہیں، ہم پر ان کی فضیلت کی کوئی وجہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ اکیلے ہیں، ہمارے عام آدمیوں میں سے ایک آدمی ہیں، کوئی بڑے سردار نہیں ہیں جس کے ساتھ کوئی بڑا جتھا ہو، لاؤ لشکر ہو، خدم و حشم ہوں، اور اس بنا پر ہم ان کی بڑائی تسلیم کرلیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نبی یا تو کوئی فوق البشر ہستی ہو، یا اگر وہ انسان ہی ہو تو ہمارے اپنے ملک اور قوم میں پیدا نہ ہوا ہو، بلکہ کہیں اُوپر سے اُتر کر آئے یا باہر سے بھیجا جائے، اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اُسے کوئی رئیس ہونا چاہیے، جس کی غیر معمولی شان و شوکت

Maktaba Tul Ishaat.com

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ
الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ
وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ
مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ

نہیں، بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔[18]" (ہم نے اپنے پیغمبر سے کہا:) "کل ہی اِنھیں معلوم ہوا جاتا ہے کہ کون پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ ہم اُونٹنی کو اِن کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ اِن کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اِن کو جتا دے کہ پانی اِن کے اور اُونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔[19]" آخر کار اُن لوگوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اُس نے اِس کام کا بیڑا اُٹھایا اور اُونٹنی کو مار ڈالا۔[20] پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب

کی وجہ سے یہ مان لیا جائے کہ رہنمائی کے لیے خدا کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی ہے۔ یہی وہ جہالت تھی جس میں کفارِ مکّہ مبتلا تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ماننے سے ان کا انکار بھی اسی بنیاد پر تھا کہ آپؐ بشر ہیں، عام آدمیوں کی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، کل ہمارے ہی درمیان پیدا ہوئے اور آج یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ مجھے خدا نے نبی بنایا ہے۔

۱۸ – اصل میں لفظ اَشِرٌ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ایسا خود پسند اور برخود غلط شخص جس کے دماغ میں اپنی بڑائی کا سودا سما گیا ہو اور اس بنا پر وہ ڈینگیں مارتا ہو۔

۱۹ – یہ تشریح ہے اِس ارشاد کی کہ "ہم اُونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔" وہ فتنہ یہ تھا کہ یکایک ایک اُونٹنی لا کر ان کے سامنے کھڑی کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن تم سب لوگ اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے پانی لے سکو گے۔ اُس کی باری کے دن تم میں سے کوئی شخص کسی چشمے اور کنویں پر نہ خود پانی لینے کے لیے آئے، نہ اپنے جانوروں کو پلانے کے لیے لائے۔ یہ چیلنج اُس شخص کی طرف سے دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ خود کہتے تھے کہ یہ کوئی لاؤ لشکر نہیں رکھتا، نہ کوئی بڑا جتھا اس کی پُشت پر ہے۔

۲۰ – اِن الفاظ سے خود بخود یہ صورت حال مُترشّح ہوتی ہے کہ وہ اُونٹنی ایک مدّت تک اُن کی بستیوں میں دندناتی پھری۔ اس کی باری کے دن کسی کو پانی پر آنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ آخر کار اپنی قوم کے ایک من چلے سردار کو انھوں نے پکارا کہ تُو بڑا جری اور بے باک آدمی ہے، بات بات پر آستینیں چڑھا کر مارنے اور مرنے کے لیے تیار

وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ
الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾
كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۢ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ
لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ
شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾

اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اُن پر بس ایک ہی دھماکا چھوڑا اور وہ باڑے والے کی رَوندی ہوئی باڑھ کی طرح بُھس ہو کر رہ گئے۔[۲۱] ہم نے اِس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے، اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

لُوط کی قوم نے تنبیہات کو جُھٹلایا اور ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا اس پر بھیج دی۔ صرف لُوط کے گھر والے اُس سے محفوظ رہے۔ اُن کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال دیا۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اُس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے۔ لُوط نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا، مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اُڑاتے رہے۔

ہو جاتا ہے، ذرا ہمّت کر کے اِس اُونٹنی کا قصہ بھی پاک کر دکھا۔ اُن کے بڑھاوے چڑھاوے دینے پر اُس نے یہ مہم سر کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا اور اُونٹنی کو مار ڈالا۔ اِس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ وہ لوگ اس اُونٹنی سے سخت مرعوب تھے، ان کو یہ احساس تھا کہ اس کی پُشت پر کوئی غیر معمولی طاقت ہے، اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ ڈرتے تھے، اور اِسی بنا پر محض ایک اُونٹنی کو مار ڈالنا، ایسی حالت میں بھی جب کہ اُس کے پیش کرنے والے پیغمبر کے پاس کوئی فوج نہ تھی جس کا انھیں ڈر ہوتا، اُن کے لیے ایک بڑی مہم سر کرنے کا ہم معنٰی تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۵۸۔ جلد سوم، الشُّعَراء، حاشیہ ۱۰۴-۱۰۵)

۲۱ – جو لوگ مویشی پالتے ہیں وہ اپنے جانوروں کے باڑے کو محفوظ کرنے کے لیے لکڑیوں اور جھاڑیوں کی ایک باڑھ بنا دیتے ہیں۔ اِس باڑھ کی جھاڑیاں رفتہ رفتہ سُوکھ کر جھڑ جاتی ہیں اور جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر اُن کا بُرادہ بن جاتا ہے۔ قومِ ثمود کی کُچلی ہوئی بوسیدہ لاشوں کو اسی بُرادے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا
عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾
فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

ع ۲

پھر انھوں نے اُسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آخر کار ہم نے اُن کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزا۔[۲۲] صبح سویرے ہی ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا۔ چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میری تنبیہات کا۔ ہم نے اِس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے، پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ ع

اور آلِ فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئی تھیں، مگر انھوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ آخر کو ہم نے انھیں پکڑا جس طرح کوئی زبردست قدرت والا پکڑتا ہے۔

۲۲ – اس قصے کی تفصیلات سورۂ ہود (آیات ۷۷ تا ۸۳) اور سورۂ حِجر (آیات ۶۱ تا ۷۴) میں گزر چکی ہیں۔ خلاصہ ان کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ فرمایا تو چند فرشتوں کو نہایت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں مہمان کے طور پر بھیج دیا۔ ان کی قوم کے لوگوں نے جب دیکھا کہ اُن کے ہاں ایسے خوبصورت مہمان آئے ہیں تو وہ ان کے گھر پر چڑھ دوڑے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے ان کے حوالے کر دیں۔ حضرت لوطؑ نے ان کی بے انتہا منت ساجت کی کہ وہ اس ذلیل حرکت سے باز رہیں، مگر وہ نہ مانے اور گھر میں گھس کر زبردستی مہمانوں کو نکال لینے کی کوشش کی۔ اس آخری مرحلے پر یکایک ان کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ پھر فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا کہ وہ اور ان کے گھر والے صبح ہونے سے پہلے اس بستی سے نکل جائیں، اور ان کے نکلتے ہی اس قوم پر ایک ہولناک عذاب نازل ہوگیا۔ بائبل میں بھی یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ”تب وہ اُس مرد یعنی لُوطؑ پر پل پڑے اور نزدیک آئے، تاکہ کواڑ توڑ ڈالیں۔ لیکن اُن مَردوں (یعنی فرشتوں) نے اپنے ہاتھ بڑھا کر لوطؑ کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور ان مَردوں کو جو گھر

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾
اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ
يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ
اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ
يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾

وقف لازم

کیا تمھارے کُفّار کچھ اُن لوگوں سے بہتر ہیں؟[۲۳] یا آسمانی کتابوں میں تمھارے لیے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا اِن لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں، اپنا بچاؤ کرلیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔[۲۴] بلکہ اِن سے نمٹنے کے لیے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔ یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مُبتلا ہیں اور اِن کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے، اُس روز اِن سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنّم کی لپٹ کا مزا۔

کے دروازے پر تھے، کیا چھوٹے کیا بڑے، اندھا کر دیا۔ سو وہ دروازہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔" (پیدائش، ۱۹:۹-۱۱)

۲۳- خطاب ہے قریش کے لوگوں سے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں آخر کیا خوبی ہے، کون سے لعل تمھارے لٹکے ہوئے ہیں کہ جس کفر اور تکذیب اور ہٹ دھرمی کی رَوِش پر دوسری قوموں کو سزا دی جا چکی ہے، وہی روش تم اختیار کرو تو تمھیں سزا نہ دی جائے؟

۲۴- یہ صریح پیش گوئی ہے جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی کہ قریش کی جمعیت، جس کی طاقت کا اُنھیں بڑا زَعم تھا، عنقریب مسلمانوں سے شکست کھا جائے گی۔ اُس وقت کوئی شخص یہ تصور تک نہ کرسکتا تھا کہ مستقبل قریب میں یہ انقلاب کیسے ہوگا۔ مسلمانوں کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ ان میں سے ایک گروہ ملک چھوڑ کر حَبَش میں پناہ گزین ہو چکا تھا، اور باقی ماندہ اہلِ ایمان شِعْبِ ابی طالب میں محصور تھے، جنھیں قریش کے مقاطعے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ
كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْیَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَ كُلُّ
شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَ كُلُّ صَغِیْرٍ وَّ كَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے[۲۵]، اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکاتے وہ عمل میں آ جاتا ہے[۲۶]۔ تم جیسے بہت سوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں[۲۷]، پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ جو کچھ اِنھوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے[۲۸]۔

اور محاصرے نے بھوکوں مار دیا تھا۔ اس حالت میں کون یہ سمجھ سکتا تھا کہ سات ہی برس کے اندر نقشہ بدل جانے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد عِکرِمَہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: جب سورۂ قمر کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں حیران تھا کہ آخر یہ کون سی جمعیت ہے جو شکست کھائے گی؟ مگر جب جنگِ بدر میں کفار شکست کھا کر بھاگ رہے تھے، اُس وقت مَیں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زرہ پہنے ہوئے آگے کی طرف جھپٹ رہے ہیں اور آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں کہ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ، تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ تھی وہ ہزیمت جس کی خبر دی گئی تھی۔ (ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم)

۲۵ – یعنی دنیا کی کوئی چیز بھی اَلل ٹَپ نہیں پیدا کر دی گئی ہے، بلکہ ہر چیز کی ایک تقدیر ہے جس کے مطابق وہ ایک مقرر وقت پر بنتی ہے، ایک خاص شکل اختیار کرتی ہے، ایک خاص حد تک نَشو ونُما پاتی ہے، ایک خاص مدت تک باقی رہتی ہے، اور ایک خاص وقت پر ختم ہو جاتی ہے۔ اِسی عالمگیر ضابطے کے مطابق خود اِس دنیا کی بھی ایک تقدیر ہے جس کے مطابق ایک وقتِ خاص تک یہ چل رہی ہے اور ایک وقتِ خاص ہی پر اِسے ختم ہونا ہے۔ جو وقت اِس کے خاتمے کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، نہ اُس سے ایک گھڑی پہلے یہ ختم ہو گی، نہ اس کے ایک گھڑی بعد یہ باقی رہے گی۔ یہ نہ ازَلی وابَدی ہے کہ ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ قائم رہے، اور نہ کسی بچے کا کھلونا ہے کہ جب تم کہو اُسی وقت وہ اسے توڑ پھوڑ کر دکھا دے۔

۲۶ – یعنی قیامت برپا کرنے کے لیے ہمیں کوئی بڑی تیاری نہیں کرنی ہو گی اور نہ اسے لانے میں کوئی بڑی مدت صَرف ہو گی۔ ہماری طرف سے بس ایک حکم صادر ہونے کی دیر ہے۔ اُس کے صادر ہوتے ہی پلک جھپکاتے وہ برپا ہو جائے گی۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍۙ۝۵۴ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ۠۝۵۵ ع ۳

نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے، سچّی عزّت کی جگہ، بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب ؏

۲۷ – یعنی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کسی خدائے حکیم و عادل کی خدائی نہیں بلکہ کسی اندھے راجا کی چوپٹ نگری ہے جس میں آدمی جو کچھ چاہے کرتا پھرے، کوئی اس سے باز پُرس کرنے والا نہیں ہے، تو تمھاری آنکھیں کھولنے کے لیے انسانی تاریخ موجود ہے، جس میں اِسی روش پر چلنے والی قومیں پے در پے تباہ کی جاتی رہی ہیں۔

۲۸ – یعنی یہ لوگ اس غلط فہمی میں بھی نہ رہیں کہ اِن کا کیا دھرا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ نہیں، ہر شخص، ہر گروہ اور ہر قوم کا پُورا پُورا ریکارڈ محفوظ ہے اور اپنے وقت پر وہ سامنے آ جائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الرحمٰن

(۵۵)

الرّحمٰن

نام پہلے ہی لفظ کو اِس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جو لفظ ''الرحمٰن'' سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم اس نام کو سورت کے مضمون سے بھی گہری مناسبت ہے، کیونکہ اِس میں شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے مظاہر و ثمرات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول علمائے تفسیر بالعموم اِس سورت کو مکّی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عِکرِمہؒ اور قتادہؒ سے یہ قول منقول ہے کہ یہ سورت مدنی ہے، لیکن اوّل تو اِنھی بزرگوں سے بعض دوسری رِوایات اِس کے خلاف بھی منقول ہوئی ہیں، دوسرے اس کا مضمون مدنی سورتوں کی بہ نسبت مکّی سورتوں سے زیادہ مشابہ ہے، بلکہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ مکّے کے بھی ابتدائی دَور کی معلوم ہوتی ہے۔ اور مزید برآں متعدّد معتبر روایات سے اِس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ ہی میں ہجرت سے کئی سال قبل نازل ہوئی تھی۔

مُسندِ احمد میں حضرت اَسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہما کی رِوایت ہے کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں خانۂ کعبہ کے اُس گوشے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا جس میں حَجَرِ اَسْوَد نصب ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کہ ابھی فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جس چیز کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو) کا فرمانِ الٰہی نازل نہیں ہوا تھا۔ مشرکین اس نماز میں آپؐ کی زبان سے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کے الفاظ سُن رہے تھے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت سورۂ الحِجر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

بَزّار، ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، دارقُطنی (فی الافراد)، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور الخطیب (فی التاریخ) نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ رحمٰن خود تلاوت فرمائی، یا آپؐ کے سامنے یہ سورت پڑھی گئی۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ ''کیا وجہ ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سُن رہا ہوں جیسا جِنّوں نے اپنے رب کو دیا تھا؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''وہ کیا جواب تھا؟'' آپؐ نے فرمایا کہ ''جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پڑھتا تو جِنّ اُس کے جواب میں کہتے جاتے تھے کہ لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِعْمَةِ رَبِّنَا نُكَذِّبُ، ''ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

اِسی سے ملتا جلتا مضمون ترمذی، حاکم اور حافظ ابوبکر بزّار نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے نقل کیا ہے۔ اُن کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب لوگ سورۂ رحمٰن کو سُن کر خاموش رہے تو حضورؐ نے فرمایا: لقد قراءتھا علی الجنّ لیلۃ الجنّ فکانوا احسن مردودًا منکم، کنت کلما اتیت علی قولہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ قالوا لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِّعَمِکَ رَبَّنَا نکذب فلک الحمد، یعنی ''میں نے یہ سورت اُس رات جِنّوں کو سنائی تھی جس میں وہ قرآن سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ اِس کا جواب تم سے بہتر دے رہے تھے۔ جب میں اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد پر پہنچتا تھا کہ اَے جنّ و اِنس! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، حمد تیرے ہی لیے ہے۔''

اِس رِوایَت سے معلوم ہوا کہ سورۂ اَحقاف (آیات ۲۹-۳۲) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جِنّوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اُس موقع پر حضورؐ نماز میں سورۂ رحمٰن تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے جب آپؐ سفرِ طائف سے واپسی پر نَخلَہ میں کچھ مدّت ٹھیرے تھے۔ اگرچہ بعض دوسری روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ جِن آپؐ سے قرآن سُن رہے ہیں، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ خبر دی کہ وہ آپؐ کی تلاوت سُن رہے تھے، لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو جِنّوں کی سماعتِ قرآن پر مُطّلع فرمایا تھا، اُسی طرح اللہ تعالیٰ ہی نے آپؐ کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ سورۂ رحمٰن سنتے وقت وہ اس کا کیا جواب دیتے جا رہے تھے۔

اِن روایات سے تو صرف اِسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ رحمٰن سورۂ حِجر اور سورۂ اَحقاف سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد ایک اور رِوایت ہمارے سامنے آتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ ابنِ اسحاقؒ حضرت عُروَہؒ بن زُبیرؓ سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابۂ کرامؓ نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو عَلانِیَہ بآوازِ بلند قرآن پڑھتے نہیں سنا ہے، ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلامِ پاک سنا ڈالے؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے کہا: ''میں یہ کام کرتا ہوں۔'' صحابہؓ نے کہا: ''ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو، تاکہ اگر قریش کے لوگ اُس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔'' حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: ''مجھے یہ کام کر ڈالنے دو، میرا محافظ اللہ ہے۔'' پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جب کہ قریش کے سردار وہاں اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے مَقامِ ابراہیم پر پہنچ کر پُورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہؓ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر جب

انھیں پتا چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر تھپڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہؓ نے پروا نہ کی۔ پِٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ان کے دَم میں دَم رہا، قرآن سنائے چلے گئے۔ آخر کار جب وہ اپنا سُوجا ہوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا: ''ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔'' انھوں نے جواب دیا: ''آج سے بڑھ کر یہ خدا کے دُشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے، تم کہو تو کل پھر انھیں قرآن سناؤں۔'' سب نے کہا: ''بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سننا چاہتے تھے، وہ تم نے انھیں سنا دیا۔'' (سیرت ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۳۳۶)

موضوع اور مضمون

قرآنِ مجید کی یہ ایک ہی سورت ہے جس میں انسان کے ساتھ زمین کی دوسری بااختیار مخلوق، جِنّوں کو بھی براہِ راست خطاب کیا گیا ہے، اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات، اُس کے بے حد و حساب احسانات، اس کے مقابلے میں اُن کی عاجزی و بے بسی اور اُس کے حضور اُن کی جواب دِہی کا احساس دلا کر اُس کی نافرمانی کے انجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے اور فرماں برداری کے بہترین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآنِ پاک میں متعدّد مقامات پر ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح جِنّ بھی ایک ذی اختیار اور جواب دِہ مخلوق ہیں جنھیں کفر و ایمان اور طاعت و عِصیان کی آزادی بخشی گئی ہے، اور اُن میں بھی انسانوں ہی کی طرح کافر و مومن اور مطیع و سرکش پائے جاتے ہیں، اور اُن کے اندر بھی ایسے گروہ موجود ہیں جو انبیا علیہم السلام اور کُتُبِ آسمانی پر ایمان لائے ہیں، لیکن یہ سورت اس امر کی قطعی صراحت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید کی دعوت جِنّ اور اِنس دونوں کے لیے ہے اور حضورؐ کی رسالت صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔

سورت کے آغاز میں تو خطاب کا رُخ انسانوں کی طرف ہی ہے، کیونکہ زمین کی خلافت انھی کو حاصل ہے، خدا کے رسول انھی میں سے آئے ہیں، اور خدا کی کتابیں اُنھی کی زبانوں میں نازل کی گئی ہیں، لیکن آگے چل کر آیت ۱۳ سے انسان اور جِنّ دونوں کو یکساں مُخاطَب کیا گیا ہے اور ایک ہی دعوت دونوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔

سورت کے مضامین چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک خاص ترتیب سے ارشاد ہوئے ہیں:

آیت ۱ سے ۴ تک یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ اِس قرآن کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ عین اُس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اِس تعلیم سے نوعِ انسانی کی ہِدایت کا سامان کرے، کیونکہ انسان کو ایک ذی عقل و شُعور مخلوق کی حیثیت سے اُسی نے پیدا کیا ہے۔

آیت ۵-۶ میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا سارا نظام اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں چل رہا ہے اور زمین و

Maktaba Tul Ishaat.com

آسمان کی ہر چیز اس کی تابعِ فرمان ہے۔ یہاں کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی خدائی چل رہی ہو۔

آیت ۷-۹ میں ایک دوسری اہم حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اِس پورے نظام کو ٹھیک ٹھیک توازُن کے ساتھ عدل پر قائم کیا ہے اور اِس نظام کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اِس میں رہنے والے اپنے حُدودِ اختیار میں بھی عدل ہی پر قائم ہوں اور توازُن نہ بگاڑیں۔

آیت ۱۰ سے ۲۵ تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائب وکمالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی اُن نعمتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جن سے انسان اور جن مُتمتّع ہورہے ہیں۔

آیت ۲۶ سے ۳۰ تک انسان اور جن دونوں کو یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ اِس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی غیر فانی اور لازوال نہیں ہے، اور چھوٹے سے بڑے تک کوئی موجود ایسا نہیں جو اپنے وجود اور ضروریاتِ وجود کے لیے خدا کا محتاج نہ ہو۔ زمین سے لے کر آسمانوں تک شب و روز جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اُسی کی کارفرمائی سے ہو رہا ہے۔

آیت ۳۱ سے ۳۶ تک اِن دونوں گروہوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم سے بازپُرس کی جائے گی۔ اِس باز پُرس سے بچ کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ خدا کی خدائی تمھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اُس سے نکل کر بھاگ جانا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ اگر تم اِس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ اُس سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔

آیات ۳۷-۳۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بازپرس قیامت کے روز ہونے والی ہے۔

آیت ۳۹ سے ۴۵ تک اُن مجرم انسانوں اور جنوں کا انجام بتایا گیا ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے رہے ہیں۔

اور آیت ۴۶ سے آخر سورت تک تفصیل کے ساتھ وہ انعامات بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں اُن نیک انسانوں اور جِنّوں کو عطا کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں خدا ترسی کی زندگی بسر کی ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کام کیا ہے کہ ہمیں ایک روز اپنے رب کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

یہ پُوری تقریر خطابت کی زبان میں ہے۔ ایک پُرجوش اور نہایت بلیغ خطبہ ہے جس کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایک ایک عجوبے، اور اس کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت، اور اس کی سلطانی و قہّاری کے مظاہر میں سے ایک ایک مظہر، اور اس کی جزا وسزا کی تفصیلات میں سے ایک ایک چیز کو بیان کر کے بار بار جنّ و اِنس سے سوال کیا گیا ہے کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ آگے چل کر ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ آلاء ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس کو اس خطبے میں مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، اور جنّ واِنس سے یہ سوال ہر جگہ موقع ومحل کے لحاظ سے اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

۷۸ ایاتھا

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِیَّۃٌ

۳ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝۴

رحمٰن نے اِس قرآن کی تعلیم دی ہے۔[۱] اُسی نے انسان کو پیدا کیا[۲] اور اسے بولنا سکھایا۔[۳]

۱ – یعنی اس قرآن کی تعلیم کسی انسان کی طبع زاد نہیں ہے بلکہ اس کا معلّم خود خدائے رحمٰن ہے۔ اس مقام پر یہ بات بیان کرنے کی حاجت نہیں تھی کہ اللہ نے قرآن کی یہ تعلیم کس کو دی ہے، کیونکہ لوگ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سُن رہے تھے، اس لیے مقتضائے حال سے کلام کا یہ مُدّعا آپ سے آپ ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

آغاز اس فقرے سے کرنے کا پہلا مقصد تو یہی بتانا ہے کہ حضورؐ خود اِس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ اِس تعلیم کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ مزید برآں دوسرا ایک مقصد اور بھی ہے جس کی طرف لفظ ”رحمٰن“ اشارہ کر رہا ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہی کہنی ہوتی کہ یہ تعلیم اللہ کی طرف سے ہے، نبی کی طبع زاد نہیں ہے تو اللہ کا اسم ذات چھوڑ کر کوئی اسم صفت استعمال کرنے کی حاجت نہ تھی، اور اسم صفت ہی استعمال کرنا ہوتا تو محض اِس مضمون کو ادا کرنے کے لیے اسمائے الٰہیہ میں سے کوئی اسم بھی اختیار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب یہ کہنے کے بجائے کہ اللہ نے، یا خالق نے، یا رزّاق نے یہ تعلیم دی ہے، فرمایا یہ گیا کہ اس قرآن کی تعلیم رحمٰن نے دی ہے، تو اس سے خود بخود یہ مضمون نکل آیا کہ بندوں کی ہدایت کے لیے قرآنِ مجید کا نازل کیا جانا سراسر اللہ کی رحمت ہے۔ وہ چونکہ اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان ہے، اس لیے اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ تمھیں تاریکی میں بھٹکتا چھوڑ دے، اور اُس کی رحمت اِس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن بھیج کر تمھیں وہ علم عطا فرمائے جس پر دنیا میں تمھاری راست روی اور آخرت میں تمھاری فلاح کا انحصار ہے۔

۲ – بالفاظِ دیگر، چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے، اور خالق ہی کی یہ ذمّہ داری ہے کہ اپنی مخلوق کی رہنمائی کرے اور اُسے وہ راستہ بتائے جس سے وہ اپنا مقصدِ وجود پُورا کر سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی اِس تعلیم کا نازل ہونا محض اُس کی رحمانیت ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ اُس کے خالق ہونے کا بھی لازمی اور فطری تقاضا ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی رہنمائی نہ کرے گا تو اور کون کرے گا؟ اور خالق ہی رہنمائی نہ کرے تو اور کون کر سکتا ہے؟ اور خالق کے لیے اس سے بڑا عیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو وہ وجود میں لائے، اسے اپنے وجود کا مقصد پورا کرنے کا طریقہ نہ سکھائے؟ پس درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی تعلیم کا انتظام ہونا عجیب بات نہیں ہے، بلکہ یہ انتظام اگر اس کی طرف سے نہ ہوتا تو قابلِ تعجب ہوتا۔ پُوری کائنات میں جو چیز بھی اُس نے بنائی ہے، اُس کو محض

Maktaba Tul Ishaat.com

پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو وہ موزوں ترین ساخت دی ہے جس سے وہ نظامِ فطرت میں اپنے حصے کا کام کرنے کے قابل ہو سکے، اور اُس کام کو انجام دینے کا طریقہ اُسے سکھایا ہے۔ خود انسان کے اپنے جسم کا ایک ایک رونگٹا اور ایک ایک خَلِیَہ (cell) وہ کام سیکھ کر پیدا ہوا ہے جو اُسے انسانی جسم میں انجام دینا ہے۔ پھر آخر انسان بجائے خود اپنے خالق کی تعلیم و رہنمائی سے بے نیاز یا محروم کیسے ہو سکتا تھا؟ قرآنِ مجید میں اس مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا ہے۔ سورۂ لَیل (آیت ۱۲) میں فرمایا: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى "رہنمائی کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔" سورۂ نَحل (آیت ۹) میں ارشاد ہوا: وَعَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ "یہ اللہ کے ذمے ہے کہ سیدھا راستہ بتائے اور ٹیڑھے راستے بہت سے ہیں۔" سورۂ طٰہٰ (آیات ۴۷-۵۰) میں ذکر آتا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی زبان سے پیغامِ رسالت سُن کر حیرت سے پوچھا کہ آخر وہ تمھارا رب کون سا ہے جو میرے پاس رسول بھیجتا ہے، تو حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی اور پھر اس کی رہنمائی کی"، یعنی وہ طریقہ سکھایا جس سے وہ نظامِ وجود میں اپنے حصے کا کام کر سکے۔ یہی وہ دلیل ہے جس سے ایک غیر متعصّب ذہن اِس بات پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ انسان کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں اور کتابوں کا آنا عین تقاضائے فطرت ہے۔

۳- اصل میں لفظ "بیان" استعمال ہوا ہے۔ اس کے ایک معنٰی تو اظہارِ مافی الضمیر کے ہیں، یعنی بولنا اور اپنا مطلب و مُدّعا بیان کرنا۔ اور دوسرے معنٰی ہیں: فرق و امتیاز کی وضاحت، جس سے مراد اِس مقام پر خیر و شر اور بھلائی اور بُرائی کا امتیاز ہے۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا فقرہ اُوپر کے اِستِدلال کو مکمل کر دیتا ہے۔ بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری ارضی مخلوقات سے مُمَیَّز کرتا ہے۔ یہ محض قوتِ گویائی ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے عقل و شُعور، فہم و اِدراک، تمیز و ارادہ اور دوسری ذہنی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں، جن کے بغیر انسان کی قوتِ ناطقہ کام نہیں کر سکتی۔ اس لیے بولنا دراصل انسان کے ذی شُعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے۔ اور یہ امتیازی وصف جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تعلیم کی نوعیت بھی وہ نہیں ہو سکتی جو بے شُعور اور بے اختیار مخلوق کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اِسی طرح انسان کا دوسرا اہم ترین امتیازی وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک اَخلاقی حِس (moral sense) رکھ دی ہے جس کی وجہ سے وہ فطری طور پر نیکی اور بدی، حق اور ناحق، ظلم اور انصاف، بجا اور بے جا کے درمیان فرق کرتا ہے، اور یہ وِجدان اور احساس انتہائی گمراہی و جہالت کی حالت میں بھی اُس کے اندر سے نہیں نکلتا۔ ان دونوں امتیازی خُصوصیات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی شُعوری و اختیاری زندگی کے لیے تعلیم کا طریقہ اُس پیدائشی طریقِ تعلیم سے مختلف ہو جس کے تحت مچھلی کو تیرنا اور پرندے کو اُڑنا، اور خود انسانی جسم کے اندر پلک کو جھپکنا، آنکھ کو دیکھنا، کان کو سننا، اور معدے کو ہضم کرنا سکھایا گیا ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کے اِس شعبے میں استاد اور کتاب اور مدرسے اور تبلیغ و تلقین اور تحریر و تقریر اور بحث و اِستِدلال جیسے ذرائع ہی کو وسیلۂ تعلیم مانتا ہے، اور پیدائشی علم و شعور کو کافی نہیں سمجھتا۔ پھر یہ بات آخر

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶

سُورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں[۴] اور تارے[۵] اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔[۶]

کیوں عجیب ہو کہ انسان کے خالق پر اُس کی رہنمائی کی جو ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، اُسے ادا کرنے کے لیے اُس نے رسول اور کتاب کو تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے؟ جیسی مخلوق ویسی ہی اُس کی تعلیم۔ یہ سراسر ایک معقول بات ہے۔ ''بیان'' جس مخلوق کو سکھایا گیا ہو، اس کے لیے ''قرآن'' ہی ذریعۂ تعلیم ہو سکتا ہے، نہ کہ کوئی ایسا ذریعہ جو اُن مخلوقات کے لیے موزوں ہے جنھیں بیان نہیں سکھایا گیا ہے۔

۴ ـ یعنی ایک زبردست قانون اور ایک اٹل ضابطہ ہے جس سے یہ عظیم الشان سیّارے بندھے ہوئے ہیں۔ انسان وقت اور دن اور تاریخوں اور فصلوں اور موسموں کا حساب اِسی وجہ سے کر رہا ہے کہ سورج کے طلوع و غروب اور مختلف منزلوں سے اس کے گزرنے کا جو قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے، اُس میں کوئی تغیّر رُونما نہیں ہوتا۔ زمین پر بے حد و حساب مخلوق زندہ ہی اس وجہ سے ہے کہ سورج اور چاند کو ٹھیک ٹھیک حساب کر کے زمین سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے اور اس فاصلے میں کمی و بیشی صحیح ناپ تول سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہوتی ہے۔ ورنہ زمین سے ان کا فاصلہ کسی حساب کے بغیر بڑھ یا گھٹ جائے تو یہاں کسی کا جینا ہی ممکن نہ رہے۔ اسی طرح زمین کے گرد چاند اور سورج کے درمیان حرکات میں ایسا مکمل تناسُب قائم کیا گیا ہے کہ چاند ایک عالمگیر جنتری بن کر رہ گیا ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ہر رات ساری دنیا کو قمری تاریخ بتا دیتی ہے۔

۵ ـ اصل میں لفظ اَلنَّجْمُ استعمال ہوا ہے، جس کے معروف اور مُتَبادِر معنٰی تارے کے ہیں۔ لیکن لُغتِ عرب میں یہ لفظ ایسے پودوں اور بیل بُوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا، مثلاً ترکاریاں، خربوزے، تربوز وغیرہ۔ مفسّرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں یہ لفظ کس معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبیرؒ، سُدِّیؒ اور سُفیان ثَوریؒ اس کو بے تنے والی نباتات کے معنٰی میں لیتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد لفظ اَلشَّجَرُ (درخت) استعمال فرمایا گیا ہے، اور اُس کے ساتھ یہی معنٰی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے مجاہدؒ، قَتَادَہؒ اور حَسَن بصریؒ کہتے ہیں کہ ''نجم'' سے مراد یہاں بھی زمین کے بُوٹے نہیں بلکہ آسمان کے تارے ہی ہیں، کیونکہ یہی اس کے معروف معنٰی ہیں، اس لفظ کو سُن کر سب سے پہلے آدمی کا ذہن اسی معنٰی کی طرف جاتا ہے، اور شمس و قمر کے بعد تاروں کا ذکر بالکل فطری مناسبت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مفسرین و مترجمین کی اکثریت نے اگرچہ پہلے معنٰی کو ترجیح دی ہے، اور اُس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن ہمارے نزدیک حافظ ابنِ کثیرؒ کی یہ رائے صحیح ہے کہ زبان اور مضمون دونوں کے لحاظ سے دوسرا مفہوم زیادہ قابلِ ترجیح نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بھی نجوم اور شجر کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر آیا ہے، اور وہاں نجوم کو تاروں کے سوا اور کسی معنٰی میں نہیں لیا جا سکتا۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝٧ اَلَّا تَطْغَوْا فِي
الْمِيْزَانِ ۝٨ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝٩

آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی[7]۔ اِس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو[8]۔

وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ...... (الحج: ۱۸) یہاں نُجوم کا ذکر شمس و قمر کے ساتھ ہے اور شجر کا ذکر پہاڑوں اور جانوروں کے ساتھ، اور فرمایا گیا ہے کہ یہ سب اللہ کے آگے سجدہ ریز ہیں۔

۶ – یعنی آسمان کے تارے اور زمین کے درخت، سب اللہ تعالیٰ کے مطیعِ فرمان اور اس کے قانون کے پابند ہیں، جو ضابطہ اُن کے لیے بنا دیا گیا ہے اس سے یک سرِ مُو تجاوُز نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کائنات کا سارا نظام اللہ تعالیٰ کا آفریدہ ہے اور اسی کی اطاعت میں چل رہا ہے۔ زمین سے لے کر آسمانوں تک نہ کوئی خود مختار ہے، نہ کسی اور کی خدائی اِس جہان میں چل رہی ہے، نہ خدا کی خدائی میں کسی کا کوئی دخل ہے، اور نہ کسی کا یہ مقام ہے کہ اسے معبُود بنایا جائے۔ سب بندے اور غلام ہیں، آقا تنہا ایک ربِّ قدیر ہے۔ لہٰذا توحید ہی حق ہے جس کی تعلیم یہ قرآن دے رہا ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو شخص بھی شرک یا کفر کر رہا ہے، وہ دراصل کائنات کے پُورے نظام سے برسرِ پیکار ہے۔

۷ – قریب قریب تمام مفسّرین نے یہاں میزان (ترازو) سے مراد عدل لیا ہے، اور میزان قائم کرنے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اس پُورے نظام کو عدل پر قائم کیا ہے۔ یہ بے حد وحساب تارے اور سیّارے جو فضا میں گھوم رہے ہیں، یہ عظیم الشان قوتیں جو اس عالَم میں کام کر رہی ہیں، اور یہ لاتعداد مخلوقات اور اشیا جو اس جہان میں پائی جاتی ہیں، اِن سب کے درمیان اگر کمال درجے کا عدل و توازُن نہ قائم کیا گیا ہوتا تو یہ کارگاہِ ہستی ایک لمحے کے لیے بھی نہ چل سکتی تھی۔ خود اِس زمین پر کروڑوں برس سے ہوا اور پانی اور خشکی میں جو مخلوقات موجود ہیں، اُنھی کو دیکھ لیجیے۔ اُن کی زندگی اسی لیے تو برقرار ہے کہ ان کے اسبابِ حیات میں پُورا پُورا عدل اور توازُن پایا جاتا ہے، ورنہ اِن اسباب میں ذرہ برابر بھی بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو یہاں زندگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

۸ – یعنی چونکہ تم ایک متوازن کائنات میں رہتے ہو جس کا سارا نظام عدل پر قائم کیا گیا ہے، اس لیے تمھیں بھی عدل پر قائم ہونا چاہیے۔ جس دائرے میں تمھیں اختیار دیا گیا ہے اُس میں اگر تم بے انصافی کرو گے، اور جن حق داروں کے حقوق تمھارے ہاتھ میں دیے گئے ہیں اگر تم ان کے حق مارو گے تو یہ فطرتِ کائنات سے تمھاری بغاوت ہوگی۔ اس کائنات کی فطرت ظلم و بے انصافی اور حق ماری کو قبول نہیں کرتی۔ یہاں ایک بڑا ظلم تو درکنار، ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حصے کی ایک تولہ بھر چیز بھی مار لیتا ہے تو میزانِ عالَم میں خلل برپا کر دیتا ہے ـــــ یہ قرآن کی تعلیم کا

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۖ وَّالنَّخْلُ
ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿١١﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾

زمین[9] کو اس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا[10]۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں طرح طرح کے غلّے ہیں جن میں بھُوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی[11]۔

دوسرا اہم حصّہ ہے جو اِن تین آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی تعلیم ہے توحید۔ اور دوسری تعلیم ہے عدل۔ اِس طرح چند مختصر فقروں میں لوگوں کو بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے خدائے رحمٰن نے جو قرآن بھیجا ہے وہ کیا تعلیم لے کر آیا ہے۔

۹ – اب یہاں سے آیت ۲۵ تک اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں اور اُس کے اُن احسانات اور اُس کی قدرت کے اُن کرشموں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے انسان اور جِنّ دونوں مُتَمَتَّع ہو رہے ہیں، اور جن کا فطری اور اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ کفر و ایمان کا اختیار رکھنے کے باوجود خود اپنی مرضی سے بَطَوع و رغبت اپنے رب کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کریں۔

۱۰ – اصل الفاظ ہیں: زمین کو "اَنام" کے لیے وضع کیا۔ وضع کرنے سے مراد ہے: تالیف کرنا، بنانا، تیار کرنا، رکھنا، ثبت کرنا۔ اور اَنام عربی زبان میں خلق کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس میں انسان اور دوسری سب زندہ مخلوقات شامل ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں: کل شیءٍ فیہ الرّوح، اَنام میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کے اندر روح ہے۔ مجاہدؒ اس کے معنیٰ بیان کرتے ہیں: خلائق۔ قتادہؒ، ابنِ زیدؒ اور شَعبیؒ کہتے ہیں کہ سب جان دار اَنام ہیں۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اِنس و جِنّ دونوں اِس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہی معنیٰ تمام اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اِس آیت سے زمین کو ریاست کی مِلکیّت بنانے کا حکم نکالتے ہیں، وہ ایک فضول بات کہتے ہیں۔ یہ باہر کے نظریّات لا کر قرآن میں زبردستی ٹھونسنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے، جس کا ساتھ نہ آیت کے الفاظ دیتے ہیں نہ سیاق و سباق۔ اَنام صرف انسانی معاشرے کو نہیں کہتے بلکہ زمین کی دوسری مخلوقات بھی اس میں شامل ہیں۔ اور زمین کو اَنام کے لیے وضع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سب کی مشترک مِلکیّت ہو۔ اور سیاقِ عبارت بھی یہ نہیں بتا رہا ہے کہ کلام کا مدّعا اس جگہ کوئی معاشی ضابطہ بیان کرنا ہے۔ یہاں تو مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس زمین کو اِس طرح بنایا اور تیار کر دیا کہ یہ قسم قسم کی زندہ مخلوقات کے لیے رہنے بسنے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ آپ سے آپ ایسی نہیں ہو گئی ہے۔ خالق کے بنانے سے ایسی بنی ہے۔ اُس نے اپنی حکمت سے اس کو ایسی جگہ رکھا اور ایسے حالات اُس میں پیدا کیے جن سے یہاں زندہ انواع کا رہنا ممکن ہوا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ – ۷۴ – ۷۷ – جلد چہارم، یٰسٓ، حواشی ۲۹ – ۳۲ – المومن، حواشی ۹۰ – ۹۱ – حٰمٓ السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۳ – الزُّخرف، حواشی ۷ تا ۱۰ – الجاثیہ، حاشیہ ۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ
صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ

پس اے جِنّ وانس! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں[۱۲] کو جھٹلاؤ گے؟[۱۳]

انسان کو اُس نے ٹھیکری جیسے سُوکھے سڑے ہوئے گارے سے بنایا[۱۴] اور جنّ کو آگ کی لَپَٹ سے

۱۱ – یعنی آدمیوں کے لیے دانہ اور جانوروں کے لیے چارا۔

۱۲ – اصل میں لفظ آلاء استعمال ہوا ہے، جسے آگے کی آیتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اِس کا مفہُوم مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اس لیے آغاز ہی میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس لفظ میں معنٰی کی کتنی وُسعت ہے اور اس میں کیا کیا مفہومات شامل ہیں۔

آلاء کے معنٰی اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے بالعُموم ''نعمتوں'' کے بیان کیے ہیں۔ تمام مترجمین نے بھی یہی اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اور یہی معنٰی ابنِ عباسؓ، قَتَادَہؒ اور حَسَن بصریؒ سے منقول ہیں۔ سب سے بڑی دلیل اس معنٰی کے صحیح ہونے کی یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جِنّوں کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ وہ اس آیت کو سُن کر بار بار لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِّعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ کہتے تھے۔ لہٰذا زمانۂ حال کے بعض محققین کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ آلاء نعمتوں کے معنٰی میں سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے معنٰی اس لفظ کے قدرت اور عجائبِ قدرت یا کمالاتِ قدرت ہیں۔ ابنِ جَرِیر طَبَریؒ نے ابنِ زید کا قول نقل کیا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا کے معنٰی ہیں: فَبِاَیِّ قُدْرَۃِ اللّٰہِ۔ ابنِ جَرِیرؒ نے خود بھی آیات ۳۷-۳۸ کی تفسیر میں ''آلاء'' کو قدرت کے معنٰی میں لیا ہے۔ امام رازیؒ نے بھی آیات ۱۴-۱۵-۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے: ''یہ آیات بیانِ [نعم]ت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ قدرت کے لیے ہیں۔'' اور آیات ۲۲-۲۳ کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں: ''یہ اللہ تعالیٰ کے [عجا]ئبِ قدرت کے بیان میں ہے، نہ کہ نعمتوں کے بیان میں۔''

اس کے تیسرے معنٰی ہیں: خوبیاں، اوصافِ حمیدہ اور کمالات وفضائل۔ اس معنٰی کو اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے [بیا]ن نہیں کیا ہے، مگر اشعارِ عرب میں یہ لفظ کثرت سے اس معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ نابغہ کہتا ہے:

هم الملوك وابناء الملوك لهم   فضلٌ على الناس فی الاٰلاء والنِّعَمِ

''وہ بادشاہ اور شاہزادے ہیں۔ اُن کو لوگوں پر اپنی خوبیوں اور نعمتوں میں فضیلت حاصل ہے۔''

مُہلہِل اپنے بھائی کُلَیب کے مرثیے میں کہتا ہے:

الحزم والعزم كانا من طبائعه   ما كلّ اٰلائه يا قوم اُحصيها

''حزم اور عزم اس کے اوصاف میں سے تھے۔ لوگو! میں اس کی ساری خوبیاں شمار نہیں کر رہا ہوں۔''

فضالہ بن زید العَدوانی غریبی کی بُرائیاں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غریب اچھا کام بھی کرے تو بُرا بنتا ہے اور:

وتحمد اٰلاء البخیل المدرھم

"مال دار بخیل کے کمالات کی تعریف کی جاتی ہے۔"

اَجْدَع ہمدانی اپنے گھوڑے کُمَیت کی تعریف میں کہتا ہے:

ورضیت اٰلاء الکمیت فمن یبع فرسًا فلیس جوادنا بمباع

"مجھے کُمَیت کے عمدہ اوصاف پسند ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی گھوڑے کو بیچتا ہے تو بیچے، ہمارا گھوڑا بِکنے والا نہیں ہے۔"

حَماسہ کا ایک شاعر، جس کا نام ابوتمام نے نہیں لیا ہے، اپنے ممدوح ولید بن اَدھم کے اقتدار کا مرثیہ کہتا ہے:

اذا ما امرؤا اثنٰی باٰلاء میتٍ فلا یبعد اللّٰہ الولید بن ادھما

"جب بھی کوئی شخص کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کرے تو خدا نہ کرے کہ ولید بن اَدھم اس موقع پر فراموش ہو۔"

فما کان مفراحًا اذا الخیر مسّہٗ ولا کان منّانًا اذا ھو انعما

"اس پر اچھے حالات آتے تو پھولتا نہ تھا اور کسی پر احسان کرتا تو جتاتا نہ تھا۔"

طَرَفہ ایک شخص کی تعریف میں کہتا ہے:

کامل یجمع اٰلاء الفتٰی نَبِہٌ سیّد ساداتٍ خِضَمّ

"وہ کامل اور جوانمردی کے اوصاف کا جامع ہے۔ شریف ہے، سرداروں کا سردار، دریا دل"۔

اِن شواہد و نظائر کو نگاہ میں رکھ کر ہم نے لفظ "آلاء" کو اس کے وسیع معنیٰ میں لیا ہے اور ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اُس کے جو معنیٰ مناسب تر نظر آئے ہیں وہی ترجمے میں درج کر دیے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ایک ہی جگہ "آلاء" کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور ترجمے کی مجبوریوں سے ہم کو اس کے ایک ہی معنیٰ اختیار کرنے پڑے ہیں، کیونکہ اُردو زبان میں کوئی لفظ اتنا جامع نہیں ہے کہ وہ ان سارے مفہومات کو بیک وقت ادا کر سکے۔ مثلاً اِس آیت میں زمین کی تخلیق اور اس میں مخلوقات کی رزق رسانی کے بہترین انتظامات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کے کن کن "آلاء" کو جھٹلاؤ گے۔ اس موقع پر "آلاء" صرف نعمتوں کے معنیٰ ہی میں نہیں ہے، بلکہ اللہ جَلّ شانُہٗ کی قدرت کے کمالات اور اُس کی صفاتِ حمیدہ کے معنیٰ میں بھی ہے۔ یہ اُس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے اِس کُرۂ خاکی کو اِس عجیب طریقے سے بنایا کہ اُس میں بے شمار اقسام کی زندہ مخلوقات رہتی ہیں اور طرح طرح کے پھل اور غلّے اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ اُس کی صفاتِ حمیدہ ہی ہیں کہ اُس نے اِن مخلوقات کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

یہاں ان کی پرورش اور رزق رسانی کا بھی انتظام کیا، اور انتظام بھی اِس شان کا کہ ان کی خوراک میں نری غذائیت ہی نہیں ہے بلکہ لذتِ کام و دَہن اور ذوقِ نظر کی بھی اَن گنت رعایتیں ہیں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے صرف ایک کمال کی طرف بطورِ نمونہ اشارہ کیا گیا ہے کہ کھجور کے درختوں میں پھل کس طرح غلافوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اِس ایک مثال کو نگاہ میں رکھ کر ذرا دیکھیے کہ کیلے، انار، سنترے، ناریل اور دوسرے پھلوں کے پیکنگ میں آرٹ کے کیسے کیسے کمالات دکھائے گئے ہیں، اور یہ طرح طرح کے غلّے اور دالیں اور حبُوب، جو ہم بے فکری کے ساتھ پکا پکا کر کھاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو کیسی کیسی نفیس بالوں اور خوشوں کی شکل میں پیک کر کے اور نازک چھلکوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔

۱۳ – جُھٹلانے سے مراد وہ متعدّد رَوِیّے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کے کرشموں اور اس کی صفاتِ حمیدہ کے معاملے میں لوگ اختیار کرتے ہیں، مثلاً:

بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ اِن ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مادّے کے اتفاقی ہیجان کا نتیجہ ہے، یا ایک حادثہ ہے جس میں کسی حکمت اور صنّاعی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ کھلی تکذیب ہے۔

بعض دوسرے لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اِن چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، مگر اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے ہیں، اُس کی نعمتوں کا شکریہ دوسروں کو ادا کرتے ہیں، اور اس کا رزق کھا کر دوسروں کے گُن گاتے ہیں۔ یہ تکذیب کی ایک اور شکل ہے۔ ایک آدمی جب تسلیم کرلے کہ آپ نے اُس پر فلاں احسان کیا ہے، اور پھر اُسی وقت آپ کے سامنے کسی ایسے شخص کا شکریہ ادا کرنے لگے جس نے درحقیقت اس پر وہ احسان نہیں کیا ہے، تو آپ خود کہہ دیں گے کہ اس نے بدترین احسان فراموشی کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اس کی یہ حرکت اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ آپ کو نہیں بلکہ اس شخص کو اپنا محسن مان رہا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کر رہا ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو ساری چیزوں کا خالق اور تمام نعمتوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، مگر اِس بات کو نہیں مانتے کہ انھیں اپنے خالق و پروردگار کے احکام کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ احسان فراموشی اور انکارِ نعمت کی ایک اور صورت ہے، کیونکہ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے، وہ نعمت کو ماننے کے باوجود نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتا ہے۔

کچھ اور لوگ زبان سے نہ نعمت کا انکار کرتے ہیں نہ نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتے ہیں، مگر عملاً اُن کی زندگی اور ایک مُنکر و مکذّب کی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا۔ یہ تکذیب بالقول نہیں بلکہ تکذیب بالفعل ہے۔

۱۴ – تخلیقِ انسانی کے ابتدائی مراتب جو قرآنِ مجید میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی سلسلہ وار ترتیب مختلف مقامات کی تصریحات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے: (۱) تُراب، یعنی مٹی یا خاک۔ (۲) طِین، یعنی گارا جو مٹی میں

نَّارٍ ۝١٥ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝١٦ رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ
وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ۝١٧ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝١٨

پیدا کیا[15]۔ پس اے جِنّ و اِنس! تم اپنے رب کے کن کن عجائبِ قدرت[16] کو جھٹلاؤ گے؟

دونوں مشرق اور دونوں مغرب، سب کا مالک و پروردگار وہی ہے[17]۔ پس اے جِنّ و اِنس! تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں[18] کو جھٹلاؤ گے؟

ملا کر بنایا جاتا ہے۔ (۳) طِینِ لازِب، لیس دار گارا، یعنی وہ گارا جس کے اندر کافی دیر تک پڑے رہنے کے باعث لیس پیدا ہو جائے۔ (۴) حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ، وہ گارا جس کے اندر بُو پیدا ہو جائے۔ (۵) صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کَالْفَخَّارِ، یعنی وہ سڑا ہوا گارا جو سُوکھنے کے بعد پکّی ہوئی مٹی کے ٹھیکرے جیسا ہو جائے۔ (۶) بَشَر جو مٹی کی اِس آخری صورت سے بنایا گیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روح پھونکی، جس کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، اور جس کی جنس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا گیا۔ (۷) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ۔ پھر آگے اس کی نسل ایک حقیر پانی جیسے سَت سے چلائی گئی، جس کے لیے دوسرے مقامات پر نُطفہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اِن مدارج کے لیے قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل آیات کو ترتیب وار مُلاحظہ کیجیے: كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ۔ (آلِ عمران:۵۹) بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ (السجدہ:۷) اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ۔ (الصّافات:۱۱) چوتھا اور پانچواں مرتبہ آیتِ زیرِ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے، اور اس کے بعد کے مراتب اِن آیات میں بیان کیے گئے ہیں: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ (صٓ:۷۱-۷۲) خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء:۱) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (السجدہ:۸) فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (الحج:۵)

۱۵- اصل الفاظ ہیں: مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ نار سے مراد ایک خاص نوعیت کی آگ ہے، نہ کہ وہ آگ جو لکڑی یا کوئلا جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مارِج کے معنی ہیں: خالص شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہلا انسان مٹی سے بنایا گیا، پھر تخلیق کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے اُس کے کالبُدِ خاکی نے گوشت پوست کے زندہ بشر کی شکل اختیار کی اور آگے اس کی نسل نطفے سے چلی، اُسی طرح پہلا جِنّ خالص آگ کے شعلے، یا آگ کی لپَٹ سے پیدا کیا گیا، اور بعد میں اس کی ذُرّیّت سے جِنّوں کی نسل پیدا ہوئی۔ اُس پہلے جِنّ کی حیثیت جِنّوں کے معاملے میں وہی ہے جو آدم علیہ السّلام کی حیثیت انسانوں کے معاملے میں ہے۔ زندہ بشر بن جانے کے بعد حضرت

Maktaba Tul Ishaat.com

آدمؑ اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں کے جسم کو اُس مٹی سے کوئی مناسبت باقی نہ رہی جس سے اِن کو پیدا کیا گیا تھا۔ اگرچہ اب بھی ہمارا جسم پورا کا پورا زمین ہی کے اجزا سے مرکب ہے، لیکن اِن اجزا نے گوشت پوست اور خون کی شکل اختیار کر لی ہے اور جان پڑنے کے بعد وہ تودۂ خاک کی بہ نسبت ایک بالکل ہی مختلف چیز بن گیا ہے۔ ایسا ہی معاملہ جِنّوں کا بھی ہے۔ اُن کا وجود بھی اصلاً ایک آتشیں وجود ہی ہے، لیکن جس طرح ہم محض تودۂ خاک نہیں ہیں، اسی طرح وہ بھی محض شعلۂ آتش نہیں ہیں۔

اِس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ جِنّ مُجرّد رُوح نہیں ہیں بلکہ ایک خاص نوعیت کے مادّی اجسام ہی ہیں، مگر چونکہ وہ خالص آتشیں اجزا سے مرکّب ہیں، اس لیے وہ خاکی اجزا سے بنے ہوئے انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ اِسی چیز کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ ”شیطان اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں تم اُس کو نہیں دیکھتے۔“ (الاعراف: ۲۷) اسی طرح جِنّوں کا سریع الحرکت ہونا، ان کا بآسانی مختلف شکلیں اختیار کر لینا، اور اُن مقامات پر غیر محسوس طریقے سے نفوذ کر جانا جہاں خاکی اجزا سے بنی ہوئی چیزیں نفوذ نہیں کر سکتیں، یا نفوذ کرتی ہیں تو اُن کا نفوذ محسوس ہو جاتا ہے، یہ سب اُمور بھی اسی وجہ سے ممکن اور قابلِ فہم ہیں کہ وہ فی الاصل آتشیں مخلوق ہیں۔

دوسری بات اِس سے یہ معلوم ہوئی کہ جِنّ نہ صرف یہ کہ انسان سے بالکل الگ نوعیت کی مخلوق ہیں، بلکہ ان کا مادۂ تخلیق ہی انسان، حیوان، نباتات اور جمادات سے قطعی مختلف ہے۔ یہ آیت صریح الفاظ میں اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی ثابت کر رہی ہے جو جِنّوں کو انسانوں ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ مٹی سے انسان کو اور آگ سے جِنّ کو پیدا کرنے کا مطلب دراصل دو قسم کے لوگوں کی مزاجی کیفیت کا فرق بیان کرنا ہے۔ ایک قسم کے انسان منکسر المزاج ہوتے ہیں، اور وہی سچّے معنوں میں انسان ہیں، اور دوسری قسم کے انسان آتش کے پرکالے اور شعلہ مزاج ہوتے ہیں، جنھیں آدمی کے بجائے شیطان کہنا زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ لیکن یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔ اُوپر حاشیہ ۱۴ میں ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ قرآنِ مجید مٹی سے انسان کے پیدا کیے جانے کا مطلب کتنی وضاحت کے ساتھ خود بیان کرتا ہے۔ کیا ان ساری تفصیلات کو پڑھ کر کوئی معقول آدمی یہ معنٰی لے سکتا ہے کہ اِن ساری باتوں کا مقصد محض اچھے انسانوں کے منکسر المزاج ہونے کی تعریف بیان کرنا ہے؟ پھر آخر یہ بات کسی صحیح العقل آدمی کے ذہن میں کیسے آ سکتی ہے کہ انسان کی تخلیق سڑی ہوئی مٹی کے سُوکھے گارے سے کرنے، اور جِنّ کی تخلیق خالص آگ کے شعلے سے کرنے کا مطلب ایک ہی نوعِ انسانی کے دو مختلف المزاج افراد یا گروہوں کی جداگانہ اَخلاقی خصوصیات کا فرق ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ذاریات، حاشیہ ۵۳)

۱۶ — یہاں موقع کی مناسبت سے ”آلاء“ کے معنٰی ”عجائبِ قدرت“ زیادہ موزوں ہیں، لیکن اس میں نعمت کا پہلو بھی موجود ہے۔ مٹی سے انسان جیسی، اور آگ کے شعلے سے جِنّ جیسی حیرت انگیز مخلوقات کو وجود میں لے

آنا جس طرح خدا کی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے، اسی طرح ان دونوں مخلوقوں کے لیے یہ بات ایک عظیم نعمت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ صرف وجود بخشا، بلکہ ہر ایک کی ساخت ایسی رکھی اور ہر ایک کے اندر ایسی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرما دیں جن سے یہ دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ اگرچہ جِنّوں کے متعلق ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں، مگر انسان تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو انسانی دماغ دینے کے ساتھ مچھلی یا پرندے یا بندر کا جسم دے دیا جاتا تو کیا اُس جسم کے ساتھ وہ اِس دماغ کی صلاحیتوں سے کوئی کام لے سکتا تھا؟ پھر کیا یہ اللہ کی نعمتِ عظمیٰ نہیں ہے کہ جن قوتوں سے اس نے انسان کے دماغ کو سرفراز فرمایا تھا، ان سے کام لینے کے لیے موزوں ترین جسم بھی عطا فرمایا؟ یہ ہاتھ، یہ پاؤں، یہ آنکھیں، یہ کان، یہ زبان اور یہ قامتِ راست ایک طرف، اور یہ عقل و شعور، یہ فکر و خیال، یہ قوتِ ایجاد و قوتِ اِستدلال، اور یہ صنّاعی و کاریگری کی صلاحیتیں دوسری طرف، اِن دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ بنانے والے نے اِن کے درمیان غایت درجے کی مناسبت رکھی ہے، جو اگر نہ ہوتی تو دنیا میں انسان کا وجود بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا۔ پھر یہی چیز اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حمیدہ پر بھی دلالت کرتی ہے۔ آخر علم، حکمت، رحمت اور کمال درجے کی قوتِ تخلیق کے بغیر اِس شان کے انسان اور جنّ کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ اتفاقی حوادث اور خود بخود کام کرنے والے اندھے بہرے قوانینِ فطرت تخلیق کے یہ معجزے کیسے دکھا سکتے ہیں؟

۱۷۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں سے مراد جاڑے کے چھوٹے سے چھوٹے دن اور گرمی کے بڑے سے بڑے دن کے مشرق و مغرب بھی ہو سکتے ہیں، اور زمین کے دونوں نصف کُروں کے مشرق و مغرب بھی۔ جاڑے کے سب سے چھوٹے دن میں سورج ایک نہایت تنگ زاویہ بنا کر طُلوع و غُروب ہوتا ہے، اور اس کے برعکس گرمی کے سب سے بڑے دن میں وہ انتہائی وسیع زاویہ بناتے ہوئے نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہر روز اس کا مَطْلَع اور مغرب مختلف ہوتا رہتا ہے، جس کے لیے ایک دوسرے مقام پر قرآن میں رَبُّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ (المعارج:۴۰) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح زمین کے ایک نصف کُرے میں جس وقت سورج طُلوع ہوتا ہے، اُسی وقت دوسرے نصف کُرے میں وہ غروب ہوتا ہے۔ یوں بھی زمین کے دو مشرق اور دو مغرب بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں مشرقوں اور مغربوں کا رب کہنے کے کئی معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ اسی کے حکم سے سورج کے طُلوع و غروب اور سال کے دوران میں ان کے مسلسل بدلتے رہنے کا یہ نظام قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا وہی ہے، ورنہ ان دونوں کے رب الگ الگ ہوتے تو زمین پر سورج کے طلوع و غروب کا یہ باقاعدہ نظام کیسے قائم ہو سکتا تھا اور دائماً کیسے قائم رہ سکتا تھا؟ تیسرے یہ کہ ان دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک و پروردگار وہی ہے، ان کے درمیان رہنے والی مخلوقات اُسی کی مِلک ہیں، وہی ان کو پال رہا ہے، اور اِسی پرورش کے لیے اُس نے زمین پر سورج کے ڈوبنے اور نکلنے کا یہ حکیمانہ نظام قائم کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ
وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٣﴾

دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی اُن کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔[19] پس اَے جنّ واِنس! تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟

اِن سمندروں سے موتی اور مونگے[20] نکلتے ہیں۔[21] پس اے جنّ واِنس! تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟[22]

۱۸ – یہاں بھی اگرچہ موقع و محل کے لحاظ سے ''آلاء'' کا مفہوم ''قدرت'' زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی ''نعمت'' اور ''صفاتِ حمیدہ'' کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔ یہ بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کے طُلوع و غروب کا یہ قاعدہ مقرر کیا، کیونکہ اس کی بدولت فصلوں اور موسموں کے وہ تغیُّرات باقاعدگی سے رونما ہوتے ہیں جن سے انسان و حیوان اور نباتات سب کے بے شمار مَصالح وابستہ ہیں۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رُبوبیّت اور حکمت ہی تو ہے کہ اُس نے جن مخلوقات کو زمین پر پیدا کیا تھا، ان کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی قدرت سے یہ انتظامات کر دیے۔

۱۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فُرقان، حاشیہ ۶۸۔

۲۰ – اصل میں لفظ مَرجان استعمال ہوا ہے۔ ابنِ عباسؓ، قَتَادَہ، ابنِ زید اور ضَحّاک رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اِس سے مراد چھوٹے موتی ہیں۔ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عَرَبی میں مونگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۱ – اصل الفاظ ہیں: یَخْرُجُ مِنْھُمَا، ''ان دونوں سمندروں سے نکلتے ہیں۔'' معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ موتی اور مونگے تو صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، پھر یہ کیسے کہا گیا کہ میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں سے یہ چیزیں نکلتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندروں میں میٹھا اور کھاری دونوں طرح کا پانی جمع ہو جاتا ہے، اس لیے خواہ یہ کہا جائے کہ دونوں کے مجموعے سے یہ چیزیں نکلتی ہیں، یا یہ کہا جائے کہ وہ دونوں پانیوں سے نکلتی ہیں، بات ایک ہی رہتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مزید تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ اِن چیزوں کی پیدایش سمندر میں

النصف وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ع ۱۵

اور یہ جہاز اُسی کے ہیں[۲۳] جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اُونچے اُٹھے ہوئے ہیں۔ پس اے جنّ و اِنس! تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟[۲۴] ع

[۲۵] ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی

اُس جگہ ہوتی ہے جہاں اُس کی تہ سے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور ان کی پیدائش و پرورش میں دونوں طرح کے پانیوں کے اجتماع کا کچھ دخل ہے۔ بحرَین میں جہاں قدیم ترین زمانے سے موتی نکالے جا رہے ہیں، وہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ خلیج کی تہ میں میٹھے پانی کے چشمے موجود ہیں۔

۲۲ – یہاں بھی اگرچہ ''آلاء'' میں قدرت کا پہلو نمایاں ہے، لیکن نعمت اور اوصافِ حمیدہ کا پہلو بھی مخفی نہیں ہے۔ یہ خدا کی نعمت ہے کہ سمندر سے یہ قیمتی چیزیں برآمد ہوتی ہیں، اور یہ اس کی شانِ رُبُوبیّت ہے کہ جس مخلوق کو اس نے ذوقِ جمال اور شوقِ زینت بخشا تھا، اس کے ذوق و شوق کی تسکین کے لیے طرح طرح کی حَسین چیزیں اس نے اپنی دنیا میں پیدا کر دیں۔

۲۳ – یعنی اُسی کی قدرت سے بنے ہیں۔ اُسی نے انسان کو یہ صلاحیت بخشی کہ سمندروں کو پار کرنے کے لیے جہاز بنائے۔ اُسی نے زمین پر وہ سامان پیدا کیا جس سے جہاز بن سکتے ہیں۔ اور اُسی نے پانی کو اُن قواعد کا پابند کیا جن کی بدولت غضب ناک سمندروں کے سینے پر پہاڑ جیسے جہازوں کا چلنا ممکن ہوا۔

۲۴ – یہاں ''آلاء'' میں نعمت و احسان کا پہلو نمایاں ہے، مگر اُوپر کی تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت اور صفاتِ حَسَنہ کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔

۲۵ – یہاں سے آیت ۳۰ تک جنّ و اِنس کو دو حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے:

ایک یہ کہ نہ تم خود لافانی ہو اور نہ وہ سروسامان لازوال ہے جس سے تم اس دنیا میں مُتمتّع ہو رہے ہو۔ لافانی اور لازوال تو صرف اُس خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے جس کی عظمت پر یہ کائنات گواہی دے رہی ہے اور جس کے کرم سے تم کو یہ کچھ نعمتیں نصیب ہوئی ہیں۔ اب اگر تم میں سے کوئی شخص ہم چومن دیگرے نیست کے گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ محض اس کی کم ظرفی ہے۔ اپنے ذرا سے دائرۂ اختیار میں کوئی بے وقوف کبریائی کے ڈنکے بجا لے، یا چند بندے جو اُس کے ہتّے چڑھیں، اُن کا خدا بن بیٹھے، تو یہ دھوکے کی ٹٹّی کتنی دیر کھڑی رہ سکتی ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں جس زمین کی حیثیت ایک مٹر کے دانے برابر بھی نہیں ہے، اُس کے ایک کونے میں دس بیس یا

Maktaba Tul Ishaat.com

ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾
يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿٢٩﴾

باقی رہنے والی ہے۔ پس اَے جِنّ و اِنس! تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟[۲۶] زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب اپنی حاجتیں اُسی سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔[۲۷]

پچاس ساٹھ برس جو خدائی اور کبریائی چلے اور پھر قصّۂ ماضی بن کر رہ جائے، وہ آخر کیا خدائی اور کیا کبریائی ہے جس پر کوئی پھُولے۔

دوسری اہم حقیقت، جس پر ان دونوں مخلوقوں کو مُتنبِّہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کے سوا دوسری جن ہستیوں کو بھی تم معبود و مشکل کُشا اور حاجت روا بناتے ہو، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیا و اولیا، یا چاند اور سورج، یا اور کسی قسم کی مخلوق، ان میں سے کوئی تمھاری کسی حاجت کو پورا نہیں کر سکتا۔ وہ بیچارے تو خود اپنی حاجات و ضروریات کے لیے اللہ کے محتاج ہیں۔ ان کے ہاتھ تو خود اس کے آگے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خود اپنی مشکل کُشائی بھی اپنے بل بُوتے پر نہیں کر سکتے تو تمھاری مشکل کُشائی کیا کریں گے۔ زمین سے آسمانوں تک اِس ناپیدا کنار کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، تنہا ایک خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ کارفرمائی میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے کہ وہ کسی معاملے میں کسی بندے کی قسمت پر اثر انداز ہو سکے۔

۲۶ – یہاں موقع و محل خود بتا رہا ہے کہ ’’آلاء‘‘ کا لفظ کمالات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فانی مخلوقات میں سے جو کوئی بھی کبریائی کے زُعم میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنی جھوٹی خدائی کو لازوال سمجھ کر اینٹھتا اور اکڑتا ہے، وہ اگر زبان سے نہیں تو اپنے عمل سے ضرور رب العالمین کی عظمت و جلالت کو جھٹلاتا ہے۔ اُس کا غرور بجائے خود اللہ کی کبریائی کی تکذیب ہے۔ جو دعویٰ بھی وہ کسی کمال کا اپنی زبان سے کرتا ہے یا جس کا اِدّعا اپنے نفس میں رکھتا ہے، وہ اصل صاحبِ کمال کے مقام و منصب کا انکار ہے۔

۲۷ – یعنی ہر وقت اِس کارگاہِ عالَم میں اُس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ کسی کو مار رہا ہے اور کسی کو جِلا رہا ہے۔ کسی کو اُٹھا رہا ہے اور کسی کو گرا رہا ہے۔ کسی کو شفا دے رہا ہے اور کسی کو بیماری میں مبتلا کر رہا ہے۔ کسی ڈوبتے کو بچا رہا ہے اور کسی تیرتے کو ڈبو رہا ہے۔ بے شمار مخلوقات کو طرح طرح سے رزق دے رہا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا خالق ہر بار اُسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۳۰ سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ ۝۳۱

پس اَے جنّ و اِنس! تم اپنے رب کی کن کن صفاتِ حمیدہ کو جھٹلاؤ گے؟[28]

اے زمین کے بوجھو![29] عنقریب ہم تم سے باز پُرس کرنے کے لیے فارغ ہوئے جاتے ہیں،[30]

۲۸- یہاں ”آلاء“ کا مفہوم اَوصاف ہی زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ ہر شخص جو کسی نوعیت کا شرک کرتا ہے، دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کی تکذیب کرتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ فُلاں حضرت نے میری بیماری دُور کر دی، اصل میں یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اللہ شافی نہیں ہے بلکہ وہ حضرت شافی ہیں۔ کسی کا یہ کہنا کہ فلاں بزرگ کی عنایت سے مجھے روزگار مل گیا، حقیقت میں یہ کہنا ہے کہ رازق اللہ نہیں ہے بلکہ وہ بزرگ رازق ہیں۔ کسی کا یہ کہنا کہ فُلاں آستانے سے میری مراد بر آئی، گویا دراصل یہ کہنا ہے کہ دنیا میں حکم اللہ کا نہیں بلکہ اُس آستانے کا چل رہا ہے۔ غرض ہر مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ قول آخری تجزیے میں صفاتِ الٰہی کی تکذیب ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ شرک کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ آدمی دوسروں کو سمیع و بصیر، عالم الغیب، فاعلِ مختار، قادر و مُتصَرِّف اور اُلوہیّت کے دوسرے اوصاف سے مُتَّصِف قرار دے رہا ہے اور اس بات کا انکار کر رہا ہے کہ اکیلا اللہ ہی اِن صفات کا مالک ہے۔

۲۹- اصل میں لفظ ثَقَلَان استعمال ہوا ہے جس کا مادّہ ثِقْل ہے۔ ثِقل کے معنیٰ بوجھ کے ہیں، اور ثَقَل اُس بار کو کہتے ہیں جو سواری پر لدا ہوا ہو۔ ثَقَلَین کا لفظی ترجمہ ہوگا: ”دو لدے ہوئے بوجھ“۔ اِس جگہ یہ لفظ جنّ و اِنس کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں زمین پر لدے ہوئے ہیں، اور چونکہ اُوپر سے خطاب اُن انسانوں اور جنّوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے جو اپنے رب کی طاعت و بندگی سے منحرف ہیں، اور آگے بھی آیت ۴۵ تک وہی مُخاطَب ہیں، اِس لیے اُن کو اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے، گویا خالق اپنی مخلوق کے اِن دونوں نالائق گروہوں سے فرما رہا ہے کہ اَے وہ لوگو جو میری زمین پر بار بنے ہوئے ہو، عنقریب میں تمھاری خبر لینے کے لیے فارغ ہوا جاتا ہوں۔

۳۰- اس کا یہ مطلب نہیں کہ اِس وقت اللہ تعالیٰ ایسا مشغول ہے کہ اسے اِن نافرمانوں سے باز پُرس کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اوقات نامہ مقرر کر رکھا ہے، جس کے مطابق پہلے وہ ایک مُعَیَّن مدّت تک اِس دنیا میں انسانوں اور جنّوں کی نسلوں پر نسلیں پیدا کرتا رہے گا اور اُنھیں دنیا کی اِس امتحان گاہ میں لا کر کام کرنے کا موقع دے گا۔ پھر ایک مخصوص ساعت میں امتحان کا یہ سلسلہ یک لخت بند کر دیا جائے گا اور تمام جنّ و اِنس جو اُس وقت موجود ہوں گے، بیک وقت ہلاک کر دیے جائیں گے۔ پھر ایک اور ساعت نوعِ انسانی اور نوعِ جن، دونوں سے باز پُرس کرنے کے لیے اُس کے ہاں طے شدہ ہے، جب اُن کے اوّلین و آخرین کو از سرِ نو زندہ کر کے بیک وقت جمع کیا جائے گا۔ اِس اوقات نامے کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

(پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھُٹلاتے ہو[۳۱]۔ اے گروہِ جِنّ و اِنس! اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے[۳۲]۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم

کہ ابھی ہم پہلے دَور کا کام کر رہے ہیں اور دوسرے دَور کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، کجا کہ تیسرے دَور کا کام اِس وقت شروع کر دیا جائے۔ مگر تم گھبراؤ نہیں، عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے جب ہم تمھاری خبر لینے کے لیے فارغ ہو جائیں گے۔ یہ عدمِ فراغت اس معنٰی میں نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک کام نے ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ دوسرے کام کی فرصت وہ نہیں پا رہا ہے۔ بلکہ اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مختلف کاموں کے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہو اور اُس کی رُو سے جس کام کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، اُس کے بارے میں وہ کہے کہ میں سرِدست اُس کے لیے فارغ نہیں ہوں۔

۳۱۔ یہاں ''آلاء'' کو قدرتوں کے معنٰی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ دونوں معنٰی ایک ایک لحاظ سے مناسب نظر آتے ہیں۔ ایک معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تم ہماری نعمتوں کی ناشکریاں کر رہے ہو اور کفر، شرک، دہریّت، فسق اور نافرمانی کے مختلف رَویّے اختیار کر کے طرح طرح کی نمک حرامیاں کیے چلے جاتے ہو، مگر کل جب باز پُرس کا وقت آئے گا اس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہماری کس کس نعمت کو تم اتفاقی حادثہ، یا اپنی قابلیت کا ثمرہ، یا کسی دیوی دیوتا یا بزرگ ہستی کی مہربانی کا کرشمہ ثابت کرتے ہو۔ دوسرے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تم قیامت اور حشر و نشر اور حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا مذاق اڑاتے ہو اور اپنے نزدیک اس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، مگر جب ہم باز پُرس کے لیے تم کو گھیر لائیں گے اور وہ سب کچھ تمھارے سامنے آ جائے گا جس کا آج تم انکار کر رہے ہو، اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہماری کس کس قدرت کو تم جھٹلاتے ہو۔

۳۲۔ زمین اور آسمانوں سے مراد ہے کائنات، یا بالفاظِ دیگر، خدا کی خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ جس باز پُرس کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے، اُس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو، بہر حال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اُس سے بچنے کے لیے تمھیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہوگا اور اِس کا

تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٤﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا
تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٨﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿٣٩﴾

جھٹلاؤ گے؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شُعلہ اور دھواں[۳۳] چھوڑ دیا جائے گا، جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اے جنّ و اِنس! تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے؟
پھر (کیا بنے گی اُس وقت) جب آسمان پھٹے گا اور لال چمڑے کی طرح سُرخ ہو جائے[۳۴] گا؟[۳۵] اے جنّ و اِنس! (اُس وقت) تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟
اُس روز کسی انسان اور کسی جِنّ سے اُس کا گناہ پُوچھنے کی ضرورت نہ[۳۶] ہوگی، پھر (دیکھ لیا

بل بُوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے دل میں رکھتے ہو تو اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔

۳۳- اصل میں شُواظ اور نُحاس کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ شُواظ اُس خالص شُعلے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دھواں نہ ہو۔ اور نُحاس اُس خالص دھوئیں کو کہتے ہیں جس میں شعلہ نہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے انسانوں اور جنّوں پر اُس حالت میں چھوڑی جائیں گی جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باز پُرس سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کریں۔

۳۴- یہ روزِ قیامت کا ذکر ہے۔ آسمان کے پھٹنے سے مُراد ہے: بندشِ افلاک کا کُھل جانا، اَجرامِ سماوی کا منتشر ہو جانا، عالَمِ بالا کے نظم کا درہم برہم ہو جانا۔ اور یہ جو فرمایا کہ آسمان اُس وقت لال چمڑے کی طرح سُرخ ہو جائے گا، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس ہنگامۂ عظیم کے وقت جو شخص زمین سے آسمان کی طرف دیکھے گا، اُسے یوں محسوس ہوگا کہ جیسے سارے عالَمِ بالا پر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔

۳۵- یعنی آج تم قیامت کو ناممکن قرار دیتے ہو، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمھارے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کے برپا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مگر جب وہ برپا ہو جائے گی اور اپنی آنکھوں سے تم وہ سب کچھ دیکھ لو گے جس کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے، اُس وقت تم اللہ کی کس کس قدرت کا انکار کرو گے؟

۳۶- اِس کی تشریح آگے کا یہ فقرہ کر رہا ہے کہ ”مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے“۔ مطلب یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ
فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ وقف لازم
بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ ع

جائے گا کہ) تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو[۳۷]۔ مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے اور انھیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اُس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (اُس وقت کہا جائے گا:) یہ وہی جہنّم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔ اُسی جہنّم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں[۳۸] گے۔ پھر اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ[۳۹] گے؟ ع

ہے کہ اُس عظیم الشان مجمع میں، جہاں تمام اوّلین و آخرین اکٹھے ہوں گے، یہ پوچھتے پھرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کون کون لوگ مجرم ہیں، نہ کسی انسان یا جن سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ مجرموں کے اُترے ہوئے چہرے اور اُن کی خوف زدہ آنکھیں اور اُن کی گھبرائی ہوئی صورتیں اور اُن کے چھوٹتے ہوئے پسینے خود ہی یہ راز فاش کر دینے کے لیے کافی ہوں گے کہ وہ مجرم ہیں۔ پولیس کے گھیرے میں اگر ایک ایسا مجمع آجائے جس میں بے گناہ اور مجرم، دونوں قسم کے لوگ ہوں، تو بے گناہوں کے چہرے کا اطمینان اور مجرموں کے چہروں کا اضطراب بیک نظر بتا دیتا ہے کہ اس مجمع میں مجرم کون ہے اور بے گناہ کون۔ دنیا میں یہ کُلّیہ بسا اوقات اس لیے غلط ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی پولیس کے بے لاگ انصاف پسند ہونے پر لوگوں کو بھروسا نہیں ہوتا، بلکہ بار بار اس کے ہاتھوں مجرموں کی بہ نسبت شریف لوگ زیادہ پریشان ہوتے ہیں، اس لیے یہاں یہ ممکن ہے کہ اِس پولیس کے گھیرے میں آکر شریف لوگ مجرموں سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو جائیں۔ مگر آخرت میں، جہاں ہر شریف آدمی کو اللہ تعالیٰ کے انصاف پر کامل اعتماد ہوگا، یہ گھبراہٹ صرف انھی لوگوں پر طاری ہوگی جن کے ضمیر خود اپنے مجرم ہونے سے آگاہ ہوں گے اور جنھیں میدانِ حشر میں پہنچتے ہی یقین ہو جائے گا کہ اب اُن کی وہ شامت آگئی ہے جسے ناممکن یا مُشتبہ سمجھ کر وہ دنیا میں جرائم کرتے رہے تھے۔

۳۷- جرم کی حقیقی بنیاد قرآن کی نگاہ میں یہ ہے کہ بندہ جو اپنے رب کی نعمتوں سے متمتّع ہو رہا ہے، اپنے نزدیک

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

اور ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو،[40] دو باغ ہیں[41]۔ اپنے رب کے

یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ نعمتیں کسی کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ آپ سے آپ اسے مل گئی ہیں، یا یہ کہ یہ نعمتیں خدا کا عطیہ نہیں بلکہ اس کی اپنی قابلیت یا خوش نصیبی کا ثمرہ ہیں، یا یہ کہ یہ ہیں تو خدا کا عطیہ مگر اُس خدا کا اپنے بندے پر کوئی حق نہیں ہے، یا یہ کہ خدا نے خود یہ مہربانیاں اُس پر نہیں کی ہیں بلکہ یہ کسی دوسری ہستی نے اُس سے کروا دی ہیں۔ یہی وہ غلط تصوُّرات ہیں جن کی بنا پر آدمی خدا سے بے نیاز اور اُس کی اطاعت و بندگی سے آزاد ہو کر دنیا میں وہ افعال کرتا ہے جن سے خدا نے منع کیا ہے اور وہ افعال نہیں کرتا جن کا اس نے حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہر جرم اور ہر گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے احسانات کی تکذیب ہے، قطعِ نظر اس سے کہ کوئی شخص زبان سے ان کا انکار کرتا ہو یا اقرار۔ مگر جو شخص فی الواقع تکذیب کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں تصدیق موجود ہوتی ہے، وہ اِحیاناً کسی بشری کمزوری سے کوئی قصور کر بیٹھے تو اس پر اِستغفار کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز اُسے مکذِّبین میں شامل ہونے سے بچالیتی ہے۔ اِس کے سوا باقی تمام مجرم درحقیقت اللہ کی نعمتوں کے مکذِّب اور اس کے احسانات کے منکر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ جب تم لوگ مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہو جاؤ گے، اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ تم ہمارے کس کس احسان کا انکار کرتے ہو۔ سورۂ تکاثُر میں یہی بات اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ، اُس روز ضرور تم سے اُن نعمتوں کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی جو تمھیں دی گئی تھیں۔ یعنی پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں ہم نے تمھیں دی تھیں یا نہیں؟ اور انھیں پا کر تم نے اپنے محسن کے ساتھ کیا رَوِیّہ اختیار کیا؟ اور اُس کی نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا؟

۳۸۔ یعنی جہنّم میں بار بار پیاس کے مارے ان کا بُرا حال ہوگا، بھاگ بھاگ کر پانی کے چشموں کی طرف جائیں گے، مگر وہاں کھولتا ہوا پانی ملے گا، جس کے پینے سے کوئی پیاس نہ بجھے گی۔ اِس طرح جہنّم اور ان چشموں کے درمیان گردش کرنے ہی میں اُن کی عمریں بیت جائیں گی۔

۳۹۔ یعنی کیا اُس وقت بھی تم اِس کا انکار کر سکو گے کہ خدا قیامت لا سکتا ہے، تمھیں موت کے بعد دوسری زندگی دے سکتا ہے، تم سے باز پُرس بھی کر سکتا ہے، اور یہ جہنّم بھی بنا سکتا ہے جس میں آج تم سزا پا رہے ہو۔

۴۰۔ یعنی جس نے دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی ہو، جسے ہمیشہ یہ احساس رہا ہو کہ میں دنیا میں غیر ذمّہ دار شُترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہوں، بلکہ ایک روز مجھے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ عقیدہ جس شخص کا ہو، وہ لامحالہ خواہشاتِ نفس کی بندگی سے بچے گا۔ اَندھا دُھند ہر راستے پر نہ چل کھڑا ہوگا۔ حق و باطل، ظلم و انصاف، پاک و ناپاک اور حلال و حرام میں تمیز کرے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٧﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿٤٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٩﴾
فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿٥٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥١﴾

کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

اور جان بُوجھ کر خدا کے احکام کی پیروی سے منہ نہ موڑے گا۔ یہی اُس جزا کی اصل علّت ہے جو آگے بیان کی جارہی ہے۔

۴۱ – جنت کے اصل معنیٰ باغ کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں کہیں تو اُس پورے عالَم کو، جس میں نیک لوگ رکھے جائیں گے، جنت کہا گیا ہے، گویا کہ وہ پُورا کا پُورا ایک باغ ہے۔ اور کہیں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے جنّتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس بڑے باغ میں بے شمار باغات ہوں گے۔ اور یہاں تعیُّن کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ ہر نیک شخص کو اُس بڑی جنّت میں دو دو جنّتیں دی جائیں گی جو اسی کے لیے مخصوص ہوں گی، جن میں اس کے اپنے قصر ہوں گے، جن میں وہ اپنے متعلّقین اور خدّام کے ساتھ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ رہے گا، جن میں اس کے لیے وہ کچھ سروسامان فراہم ہوگا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۴۲ – یہاں سے آخر تک ''آلاء'' کا لفظ نعمتوں کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے اور قدرتوں کے معنیٰ میں بھی۔ اور ایک پہلو اس میں صفاتِ حمیدہ کا بھی ہے۔ اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو اس سلسلۂ بیان میں اِس فقرے کو بار بار دُہرانے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جھٹلانا چاہتے ہو تو جھٹلاتے رہو، خدا ترس لوگوں کو تو ان کے رب کی طرف سے یہ نعمتیں ضرور مل کر رہیں گی۔ دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمھارے نزدیک اللہ کا جنّت بنانے پر قادر ہونا اور اس میں یہ نعمتیں اپنے نیک بندوں کو عطا کرنا غیر ممکن ہے تو ہوتا رہے، اللہ یقیناً اس کی قدرت رکھتا ہے اور وہ یہ کام کر کے رہے گا۔ تیسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تم نیکی اور بدی کی تمیز سے عاری سمجھتے ہو۔ تمھارے نزدیک وہ اتنی بڑی دنیا تو بنا بیٹھا ہے مگر اس میں خواہ کوئی ظلم کرے یا انصاف، حق کے لیے کام کرے یا باطل کے لیے، شر پھیلائے یا خیر، اُسے اِس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ نہ ظالم کو سزا دینے والا ہے، نہ مظلوم کی دادرسی کرنے والا۔ نہ خیر کا قدر شناس ہے نہ شر سے نَفور۔ پھر وہ تمھارے خیال میں عاجز بھی ہے۔ زمین و آسمان تو وہ بنا لیتا ہے، مگر ظالموں کی سزا کے لیے جہنم اور حق کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کے لیے جنّت بنا دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ اُس کے اوصافِ حمیدہ کی یہ تکذیب آج تم جتنی چاہو کرلو۔ کل جب وہ ظالموں کو جہنّم میں جھونک دے گا اور حق پرستوں کو جنّت میں یہ کچھ نعمتیں دے گا، کیا اُس وقت بھی تم اس کے اِن اوصاف کو جھٹلا سکو گے؟

فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴿۵۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ فُرُشٍ بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ۚ وَجَنَى
الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۵۵﴾ فِيهِنَّ
قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿۵۶﴾

دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں[۴۳]۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنّتی لوگ ایسے فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے جن کے اَستر دبیز ریشم کے ہوں[۴۴] گے، اور باغوں کی ڈالیاں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اِن نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں[۴۵] گی جنھیں اِن جنّتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھُوا نہ ہو گا۔[۴۶]

۴۳ – اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں باغوں کے پھلوں کی شان نرالی ہوگی۔ ایک باغ میں جائے گا تو ایک شان کے پھل اس کی ڈالیوں میں لدے ہوئے ہوں گے۔ دوسرے باغ میں جائے گا تو اس کے پھلوں کی شان کچھ اور ہی ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِن میں سے ہر باغ میں ایک قسم کے پھل معروف ہوں گے جن سے وہ دنیا میں بھی آشنا تھا، خواہ مزے میں وہ دنیا کے پھلوں سے کتنے ہی فائق ہوں، اور دوسری قسم کے پھل نادر ہوں گے جو دنیا میں کبھی اُس کے خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے۔

۴۴ – یعنی جب اُن کے اَستر اِس شان کے ہوں گے تو اندازہ کرلو کہ اَبرے کس شان کے ہوں گے۔

۴۵ – یہ عورت کی اصل خوبی ہے کہ وہ بے شرم اور بے باک نہ ہو بلکہ نظر میں حیا رکھتی ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنّت کی نعمتوں کے درمیان عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے اُن کے حسن و جمال کی نہیں بلکہ ان کی حیاداری اور عفت مآبی کی تعریف فرمائی ہے۔ حسین عورتیں تو مخلوط کلبوں اور فلمی نگار خانوں میں بھی جمع ہوجاتی ہیں، اور حُسن کے مقابلوں میں تو چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک حسین عورت لائی جاتی ہے، مگر صرف ایک بدذوق اور بدقوارہ آدمی ہی اُن سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ کسی شریف آدمی کو وہ حسن اپیل نہیں کرسکتا جو ہر بدنظر کو دعوتِ نظارہ دے اور ہر آغوش کی زینت بننے کے لیے تیار ہو۔

۴۶ – اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خواہ کوئی عورت کنواری مرگئی ہو یا کسی کی بیوی رہ چکی ہو، جوان مری ہو یا بوڑھی ہوکر دنیا سے رخصت ہوئی ہو، آخرت میں جب یہ سب نیک خواتین جنّت میں داخل ہوں گی تو جوان اور کنواری بنادی جائیں گی، اور وہاں ان میں سے جس خاتون کو بھی کسی نیک مرد کی رفیقۂ حیات بنایا جائے گا، وہ جنّت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ
الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ
الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے[۴۷]۔ پھر اے جنّ و انس! اپنے رب کے کن کن اوصافِ حمیدہ کا تم انکار کرو گے[۴۸]؟

اپنے اُس شوہر سے پہلے کسی کے تصرّف میں آئی ہوئی نہ ہو گی۔

اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جنّت میں نیک انسانوں کی طرح نیک جنّ بھی داخل ہوں گے، اور وہاں جس طرح انسان مَردوں کے لیے انسان عورتیں ہوں گی، اسی طرح جنّ مردوں کے لیے جنّ عورتیں بھی ہوں گی۔ دونوں کی رفاقت کے لیے اُنھی کے ہم جنس جوڑے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو گا کہ اُن کا جوڑ کسی ناجنس مخلوق سے لگا دیا جائے جس سے وہ فطرتاً مانوس نہیں ہو سکتے۔ آیت کے یہ الفاظ کہ ''اُن سے پہلے کسی انسان یا جنّ نے ان کو نہ چھُؤا ہو گا''، اس معنٰی میں نہیں ہیں کہ وہاں عورتیں صرف انسان ہوں گی اور اُن کو اُن کے شوہروں سے پہلے کسی انسان یا جنّ نے نہ چھُؤا ہو گا، بلکہ اِن کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہاں جنّ اور انسان، دونوں جنسوں کی عورتیں ہوں گی، سب حیادار اور اچھوتی ہوں گی، نہ کسی جنّ عورت کو اس کے جنّتی شوہر سے پہلے کسی جنّ مرد نے ہاتھ لگایا ہو گا اور نہ کسی انسان عورت کو اس کے جنّتی شوہر سے پہلے کسی انسان مرد نے مُلَوّث کیا ہو گا۔

۴۷ - یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر دنیا میں عمر بھر اپنے نفس پر پابندیاں لگائے رہے ہوں، حرام سے بچتے اور حلال پر اکتفا کرتے رہے ہوں، فرض کو فرض جان کر اپنے فرائض بجا لاتے رہے ہوں، حق کو حق مان کر تمام حق داروں کے حُقوق ادا کرتے رہے ہوں، اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقّتیں برداشت کر کے خیر کی حمایت کرتے رہے ہوں، اللہ اُن کی یہ ساری قربانیاں ضائع کر دے اور انھیں کبھی ان کا اجر نہ دے؟

۴۸ - ظاہر بات ہے کہ جو شخص جنّت اور اس کے اجر و ثواب کا منکر ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفاتِ حسنہ کا انکار کرتا ہے۔ وہ اگر خدا کو مانتا بھی ہے تو اس کے متعلق بہت بُری رائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ ایک چوپٹ راجا ہے جس کی اندھیر نگری میں نیکی کرنا گویا اُسے دریا میں ڈال دینا ہے۔ وہ یا تو اُسے اندھا اور بہرا سمجھتا ہے،

وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِۚ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۙ ﴿۶۳﴾
مُدْهَآمَّتٰنِۚ ﴿۶۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۚ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ

اور اُن دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں[۴۹] گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ گھنے سرسبز و شاداب باغ[۵۰]۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے

جسے کچھ خبر ہی نہیں کہ اس کی خدائی میں کون اُس کی رضا کی خاطر جان، مال، نفس اور محنتوں کی قربانیاں دے رہا ہے۔ یا اس کے نزدیک وہ بے حس اور ناقدر شناس ہے، جسے بھلے اور بُرے کی کچھ تمیز نہیں۔ یا پھر اس کے خیالِ ناقص میں وہ عاجز و درماندہ ہے، جس کی نگاہ میں نیکی کی قدر چاہے کتنی ہی ہو، مگر اس کا اجر دینا اُس کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جب آخرت میں نیکی کا نیک بدلہ تمھاری آنکھوں کے سامنے دے دیا جائے گا، کیا اُس وقت بھی تم اپنے رب کے اوصافِ حمیدہ کا انکار کر سکو گے۔

۴۹ – اصل الفاظ ہیں: وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ۔ دُوْن کا لفظ عربی زبان میں تین مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، کسی اُونچی چیز کے مقابلے میں نیچے ہونا۔ دوسرے، کسی افضل و اشرف چیز کے مقابلے میں کم تر ہونا۔ تیسرے، کسی چیز کے ماسوا یا اس کے علاوہ ہونا۔ اِس اختلافِ معنیٰ کی بنا پر اِن الفاظ میں ایک احتمال یہ ہے کہ ہر جنّتی کو پہلے کے دو باغوں کے علاوہ یہ دو باغ اور دیے جائیں گے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ دو باغ اُوپر کے دونوں باغوں کی بہ نسبت مقام یا مرتبے میں فروتر ہوں گے۔ یعنی پہلے دو باغ یا تو بلندی پر ہوں گے اور یہ اُن سے نیچے واقع ہوں گے، یا پہلے دو باغ بہت اعلیٰ درجے کے ہوں گے اور یہ ان کے مقابلے میں کم تر درجے کے ہوں گے۔ اگر پہلے احتمال کو اختیار کیا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ دو مزید باغ بھی انھی جنّتیوں کے لیے ہیں جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے احتمال کو اختیار کرنے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ پہلے دو باغ مُقرّبین کے لیے ہیں اور یہ دو باغ اصحاب الیمین کے لیے۔ اِس دوسرے احتمال کو جو چیز تقویت پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ واقعہ میں نیک انسانوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک سابقین، جن کو مُقرّبین بھی کہا گیا ہے، دوسرے اصحاب الیمین، جن کو اصحاب المَیْمَنَۃ کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے لیے دو جنّتوں کے اوصاف الگ الگ ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ مزید برآں اس احتمال کو وہ حدیث بھی تقویت پہنچاتی ہے جو حضرت ابو موسیٰ اَشعریؓ سے اُن کے صاحبزادے ابوبکر نے رِوایت کی ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دو جنّتیں سابقین، یا مُقرّبین کے لیے ہوں گی جن کے برتن اور آرائش کی ہر چیز سونے کی ہو گی، اور دو جنّتیں تابعین، یا اصحاب الیمین کے لیے ہوں گی جن کی ہر چیز چاندی کی ہو گی۔ (فتح الباری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ رحمٰن)

۵۰ – ان باغوں کی تعریف میں لفظ مُدْهَآمَّتٰنِ استعمال فرمایا گیا ہے۔ مُدْهَآمَّہ ایسی گھنی سرسبزی

Maktaba Tul Ishaat.com

نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ
نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِیْهِنَّ
خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ
مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

فواروں کی طرح اُبلتے ہوئے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اُن میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اِن نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوب صورت بیویاں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ خیموں میں ٹھیرائی ہوئی حُوریں[۵۱]۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

کو کہتے ہیں جو انتہائی شادابی کے باعث سیاہی مائل ہو گئی ہو۔

۵۱ – حُور کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۸-۲۹، اور تفسیر سورۂ دُخان، حاشیہ ۴۲۔ خیموں سے مراد غالباً اُس طرح کے خیمے ہیں جیسے اُمرا اور رُؤسا کے لیے سیر گاہوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنّت کی بیویاں ان کے ساتھ اُن کے قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے، جن میں حوریں اُن کے لیے لُطف ولذّت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوبصورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اب حوروں کا ذکر الگ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُن بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔ اس قیاس کو مزید تقویت اُس حدیث سے حاصل ہوتی ہے جو حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ”یا رسولَ اللہ! دنیا کی عورتیں بہتر ہیں یا حُوریں؟“ حضورؐ نے جواب دیا: ”دنیا کی عورتوں کو حُوروں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو اَبرے کو اَستر پر ہوتی ہے۔“ میں نے پوچھا: ”کس بنا پر؟“ فرمایا: ”اس لیے کہ اِن عورتوں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں اور عبادتیں کی ہیں۔“ (طَبَرانی) اِس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کی بیویاں تو وہ خواتین ہوں گی جو دنیا میں ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ اپنے ایمان وحسنِ عمل کے نتیجے میں داخلِ جنت ہوں گی اور بذاتِ خود جنّت کی نعمتوں کی مستحق ہوں گی۔ یہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق یا تو اپنے سابق شوہروں کی بیویاں بنیں گی اگر وہ بھی جنّتی ہوں، یا پھر اللہ تعالیٰ کسی دوسرے جنّتی سے ان کو بیاہ دے گا جب کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت پسند کریں۔ رہیں حُوریں، تو وہ اپنے کسی حُسنِ عمل کے نتیجے میں خود اپنے استحقاق کی بنا پر جنّتی نہیں بنیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جنّت

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي
الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع

ع ۳

اِن جنّتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جِنّ نے اُن کو نہ چھوا ہوگا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ وہ جنّتی سبز قالینوں اور نفیس و نادر فرشوں[۵۲] پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

بڑی برکت والا ہے تیرے ربِّ جلیل و کریم کا نام ؏

کی دوسری نعمتوں کی طرح انھیں بھی اہلِ جنّت کے لیے ایک نعمت کے طور پر جوان اور حسین و جمیل عورتوں کی شکل دے کر جنّتیوں کو عطا کر دے گا، تاکہ وہ ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن بہرحال یہ جنّ و پری کی قسم کی مخلوق نہ ہوں گی، کیونکہ انسان کبھی صحبتِ ناجنس سے مانوس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ یہ وہ معصوم لڑکیاں ہوں گی جو نابالغی کی حالت میں فوت ہوگئیں اور اُن کے والدین جنّت کے مستحق نہ ہوئے کہ وہ اُن کی ذرّیت کی حیثیّت سے جنّت میں اُن کے ساتھ رکھی جائیں۔

۵۲ - اصل میں لفظ عَبْقَرِیٌّ استعمال ہوا ہے۔ عرب جاہلیّت کے افسانوں میں جنوں کے دارالسلطنت کا نام عَبْقَر تھا، جسے ہم اُردو میں پرستان کہتے ہیں۔ اُسی کی نسبت سے عرب کے لوگ ہر نفیس و نادر چیز کو عَبْقَری کہتے تھے، گویا وہ پرستان کی چیز ہے جس کا مقابلہ اِس دنیا کی عام چیزیں نہیں کرسکتیں۔ حتّٰی کہ اُن کے محاورے میں ایسے آدمی کو بھی عَبْقَری کہا جاتا تھا جو غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ہو، جس سے عجیب و غریب کارنامے صادر ہوں۔ انگریزی میں لفظ genius بھی اسی معنیٰ میں بولا جاتا ہے، اور وہ بھی genii سے ماخوذ ہے جو جنّ کا ہم معنیٰ ہے۔ اسی لیے یہاں اہلِ عرب کو جنّت کے سروسامان کی غیر معمولی نفاست و خوبی کا تصور دلانے کے لیے عبقری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الواقعہ

(۵۶)

الواقعہ

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَۃُ کو اس سُورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سورتوں کی جو ترتیبِ نُزول بیان کی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر الواقعہ اور اس کے بعد الشُّعراء۔ (الاِتقان للسُّیُوطی) یہی ترتیب عِکرِمہ نے بھی بیان کی ہے۔ (بَیْہَقی، دلائل النُّبوۃ)

اس کی تائید اُس قصّے سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابنِ ہِشامؒ نے ابنِ اسحاقؒ سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورۂ طٰہٰ پڑھی جا رہی تھی۔ اُن کی آہٹ سُن کر اِن لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیے۔ حضرت عمرؓ پہلے تو بہنوئی پر پل پڑے، اور جب بہن اُن کو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کو سخت ندامت ہوئی اور انھوں نے کہا: ”اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے۔ دیکھوں تو سہی، اُس میں کیا لکھا ہے۔“ بہن نے کہا: ”آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں، وانہٗ لا یمسّھا الا الطاھر۔“ اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔“ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت سورۂ واقعہ نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اسی میں آیت لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ وارد ہوئی ہے۔ اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ ہجرتِ حبشہ کے بعد ۵ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون

اِس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفّارِ مکّہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابلِ یقین قرار دیتے تھے، وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جِلا اٹھائے جائیں گے اور اُن کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہ گار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالَمِ واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اِس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آ جائے گا، اُس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اُسے آتے آتے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اُس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے: ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے، وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہِ کبیرہ پر جمے رہے۔ اِن تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۵۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۵۷ سے ۷۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے در پے

Maktaba Tul Ishaat.com

دلائل دیے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفّار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ اِن دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اُس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اُس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اِس سوال پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیے ہوئے سامانِ زیست پر پَل رہا ہے، اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجالانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لا سکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں اُن کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بدنصیبو! یہ عظیم الشان نعمت تمھارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصّہ اِس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اِسے جھٹلاتے ہو اور اِس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹی بے اعتنائی برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اِس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دست رَس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اِسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں، حالانکہ لوحِ محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعے سے یہ پہنچتی ہے، اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرّہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی لن ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس وقت تُو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبُوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تُو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اُوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زَعم دُرست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے، تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پلٹا کیوں نہیں لاتا؟ جس طرح تو اِس معاملے میں بے بس ہے، اُسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے، موت کے بعد ہر مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مُقرّبین میں سے ہو تو مُقرّبین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا۔ اور جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مقدر ہے۔

آیاتہا ۹۶ سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رکوع ۱

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ
رَّافِعَةٌ ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جُھٹلانے والا نہ[1] ہوگا۔ وہ تہ و بالا کردینے والی آفت[2] ہوگی۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جا[3]ئے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ

۱ — اِس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکّے کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نئی نئی اسلام کی دعوت سُن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انھیں سب سے زیادہ عجیب اور بعید از عقل و امکان نظر آتی تھی، وہ یہ تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالَم برپا ہوگا جس میں سب اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات سُن کر حیرت سے اُن کے دِیدے پھٹے کے پھٹے رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں گے؟ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اُٹھیں گے؟ مرنے کے بعد دوسری زندگی، اور پھر اُس میں بہشت کے باغ اور جہنم کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش رکھتے ہوئے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چہ میگوئیاں اُس وقت مکے میں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ اِس پَس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا، اُس وقت کوئی اُسے جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اِس ارشاد میں قیامت کے لیے ”واقعہ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ قریب قریب وہی ہیں جس کے لیے اُردو زبان میں ہونی شُدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں، یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آ کر ہی رہنا ہے۔ پھر اس کے پیش آنے کو ”وَقْعَة“ کہا گیا ہے، جو عربی زبان میں کسی بڑے حادثے کے اچانک برپا ہو جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے رُک جانا اور اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہوگا، یا بالفاظِ دیگر، کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کوئی مُتنفّس اُس وقت یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

۲ — اصل الفاظ ہیں: خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ، ”گرانے والی اور اٹھانے والی“۔ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

بَسًّاۙ۝۵ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّاۙ۝۶ وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا
ثَلٰثَةًؕ۝۷ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِؕ۝۸
وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِؕ۝۹ وَ السّٰبِقُوْنَ
السّٰبِقُوْنَۚۙ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَۚ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۝۱۲

کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔

تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے[۴]:

دائیں بازو والے[۵]، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔

اور بائیں بازو والے[۶]، تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا ٹھکانا۔

اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں[۷]۔ وہی تو مُقرّب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنّتوں میں رہیں گے۔

وہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اُوپر اور اُوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھانے والی اور اُٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی، یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزّت و ذلّت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا۔ جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے، اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

۳- یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے، بلکہ پُوری کی پُوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو یک لخت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لرز کر رہ جائے گی۔

۴- خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنھیں یہ کلام سنایا جا رہا تھا، یا جو اَب اِسے پڑھیں یا سُنیں، لیکن دراصل پوری نوعِ انسانی اِس کی مخاطَب ہے۔ تمام انسان جو اوّل روزِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہیں، وہ سب آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

۵- اصل میں لفظ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَہ استعمال ہوا ہے۔ مَیْمَنہ عربی قاعدے کے مطابق یَمین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنٰی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور یُمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنٰی ہیں فالِ نیک۔ اگر اس کو یمین سے ماخوذ مانا جائے تو اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَة کے معنٰی ہوں گے: "سیدھے ہاتھ والے"۔ لیکن اس سے لُغوی معنٰی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہلِ عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا تھا، اُسے

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ؕ﴿۱۴﴾ عَلٰى
سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ

اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔[8] مرصّع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔

مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے: فُلانٌ مِنّی بالیمین، ''وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے''۔ اُردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دستِ راست اِس معنٰی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔ اور اگر اس کو یُمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنٰی ہوں گے: خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

۶ – اصل میں لفظ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ استعمال ہوا ہے۔ مَشْئَمَة، شُؤم سے ہے جس کے معنٰی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں۔ اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شُوْمٰی کہا جاتا ہے۔ اُردو میں شُومیِ قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہلِ عرب شِمال (بائیں ہاتھ) اور شُؤم (فالِ بد) کو ہم معنٰی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلّت کا نشان تھا۔ سفر کو جاتے ہوئے اگر پرندہ اُڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف جاتا تو وہ اُس کو بُری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنٰی یہ تھے کہ وہ اسے کم تر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں، تو کہا جاتا کہ فُلَانٌ مِنِّیْ بِالشِّمَال، ''وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے''۔ اُردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے: یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ سے مراد ہیں بدبخت لوگ، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلّت سے دوچار ہوں گے اور دربارِ الٰہی میں بائیں طرف کھڑے کیے جائیں گے۔

۷ – سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسول کی پکار پر سب سے پہلے لبّیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو، یا اِنفاق فی سبیل اللہ کا، یا خدمتِ خلق کا، یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا، غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور بُرائی مٹانے کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے، اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین، اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا: ''جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایے میں جگہ پائیں گے؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے''۔ فرمایا: الذین اعطوا الحق قبلوہ، واذا سُئِلوہ بذلوہ، وحکموا الناس کحکمھم لانفسھم، ''وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ

اُن کی مجلسوں میں اَبَدی لڑکے[9] شرابِ چشمۂ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لیے دَوڑتے پھرتے ہوں گے، جسے پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔[10] اور وہ اُن کے سامنے طرح طرح

حق پیش کیا گیا انھوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انھوں نے ادا کر دیا، اور دوسروں کے معاملے میں ان کا فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملے میں تھا۔" (مُسنَد احمد)

۸ – مفسّرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اوّلین اور آخرین یعنی اگلوں اور پچھلوں سے مُراد کون ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السّلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت تک جتنی اُمّتیں گزری ہیں وہ اوّلین ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت کے بعد قیامت تک کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بِعْثَتِ محمدی سے پہلے ہزارہا برس کے دوران میں جتنے انسان گزرے ہیں اُن کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور حضورؐ کی بِعْثَت کے بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے اُن کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں اوّلین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ یعنی آپؐ کی اُمّت میں ابتدائی دَور کے لوگ اوّلین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہر نبی کی اُمّت کے اوّلین و آخرین ہیں، یعنی ہر نبی کے ابتدائی پیروؤں میں سابقین بہت ہوں گے اور بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ اِن تینوں مفہوموں کے حامل ہیں اور بعید نہیں کہ یہ تینوں ہی صحیح ہوں، کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ ایک اور مطلب بھی اِن الفاظ سے نکلتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دَور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسُب زیادہ ہوگا اور بعد کے دَور میں ان کا تناسُب کم نکلے گا۔ اس لیے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کرنے والوں کی تعداد اُسی رفتار سے نہیں بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دَور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں، لیکن بحیثیتِ مجموعی دنیا کی آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسُب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

۹ – اِس سے مراد ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اُن کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھیری رہے گی۔ حضرت علیؓ اور حضرت حَسَن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ دنیا کے وہ بچے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اِس لیے نہ ان کی کچھ نیکیاں ہوں گی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہوں گی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مراد صرف وہی اہلِ دنیا ہو سکتے ہیں جن کو جنت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنینِ صالحین، تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں یہ ضمانت دی ہے کہ اُن کی ذرّیّت ان کے ساتھ جنّت میں لا ملائی جائے گی۔ (الطُّور، آیت ۲۱) اسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو

مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ حُوْرٌ
عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چُن لیں، اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں[۱۱]۔ اور ان کے لیے خوب صورت آنکھوں والی حُوریں ہوں گی، ایسی حَسین جیسے چھُپا کر رکھے ہوئے موتی[۱۲]۔ یہ سب کچھ اُن اعمال کی جزا کے طور پر انھیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سُنیں گے[۱۳]۔ جو بات بھی ہو گی ٹھیک ہو گی[۱۴]۔

ابوداؤد طیالسی، طَبَرانی اور بزّار نے حضرت اَنَسؓ اور حضرت سَمُرَہؓ بن جُندُب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہلِ جنّت کے خادم ہوں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۶۔ جلد پنجم، الطُّور، حاشیہ ۱۹)

۱۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۷۔ جلد پنجم، سورۂ محمد، حاشیہ ۲۲۔ الطُّور، حاشیہ ۱۸۔

۱۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۱۷۔

۱۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۸-۲۹۔ الدُّخان، حاشیہ ۴۲۔ جلد پنجم، الرحمٰن، حاشیہ ۵۱۔

۱۳ – یہ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے، جسے قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی، یاوہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، گالی، لاف وگزاف، طنز وتمسخُر اور طعن وتشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوں گے۔ وہ بدزبان اور بدتمیز لوگوں کی سوسائٹی نہ ہو گی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالیں۔ وہ شریف اور مُہذّب لوگوں کا معاشرہ ہو گا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی شائستگی اور مذاقِ سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو جنّت میں نجات پانے کی اُمید دلائی گئی ہے۔

۱۴ – اصل الفاظ ہیں: اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔ بعض مفسّرین و مترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہاں ہر

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ﴿ؕ۲۷﴾ فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ﴿ۙ۲۸﴾
وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿ۙ۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴿ۙ۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ﴿ۙ۳۱﴾ وَّ فَاکِہَۃٍ
کَثِیۡرَۃٍ ﴿ۙ۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ ﴿ۙ۳۳﴾ وَّ فُرُشٍ
مَّرۡفُوۡعَۃٍ ﴿ؕ۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰہُنَّ اِنۡشَآءً ﴿ۙ۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ﴿ۙ۳۶﴾

اور دائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں[15]، اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں، اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں[16]، اور اُونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں باکرہ بنا دیں گے،[17]

طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قولِ سلیم، یعنی ایسی گفتگو جو عُیوبِ کلام سے پاک ہو، جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ sane استعمال ہوتا ہے۔

۱۵ – یعنی ایسی بیریاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہوں گے۔ ایک شخص تعجّب کا اظہار کر سکتا ہے کہ بیر ایسا کون سا نفیس پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوشخبری سنائی جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر، خود اِس دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور بیر جتنے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے جنّت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہوں گے، یعنی ایسی بہترین قسم کے ہوں گے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

۱۶ – اصل الفاظ ہیں: لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ۔ لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہوں گے کہ موسم گزر جانے کے بعد نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہو گا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا، اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے، لگاتار پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اور لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو گی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہو گا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

۱۷ – اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خواتین ہیں جو اپنے ایمان و عملِ صالح کی بنا پر جنّت میں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ

عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ ع
وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾
فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾

اپنے شوہروں کی عاشق[18] اور عمر میں ہم سِن۔[19] یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لیے ہے۔ع وہ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت۔

اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بدنصیبی کا کیا پُوچھنا۔ وہ لُو کی لپَیٹ اور کھَولتے ہوئے پانی اور کالے دُھوئیں کے سایے میں ہوں گے، جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔

ان سب کو وہاں جوان بنا دے گا، خواہ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوب صورت بنا دے گا، خواہ دنیا میں وہ حسین رہی ہوں یا نہ رہی ہوں۔ باکرہ بنا دے گا، خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچّوں والی ہو کر۔ ان کے شوہر بھی اگر ان کے ساتھ جنّت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور جنّتی سے ان کو بیاہ دے گا۔ اس آیت کی یہی تشریح متعدِّد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ شمائلِ ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بُڑھیا نے حضورؐ سے عرض کیا: ''میرے حق میں جنّت کی دُعا فرمائیں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''جنت میں کوئی بُڑھیا داخل نہ ہوگی۔'' وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ ''اُسے بتاؤ، وہ بڑھاپے کی حالت میں داخلِ جنت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انھیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دیں گے۔'' ابنِ ابی حاتم نے حضرت سَلَمہؓ بن یزید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا: ''اِس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں، خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ۔'' طَبَرانی میں حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنّت کی عورتوں کے متعلق قرآنِ مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضورؐ سے دریافت فرماتی ہیں۔ اس سلسلے میں حضورؐ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ھن اللّواتی قبضن فی دار الدنیا عجائز رمصًا شمطًا خلقھن اللہ بعد الکبر فجعلھن عذاریٰ ''یہ وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں۔ بوڑھی پھونس، آنکھوں میں چیپڑ، سر کے بال سفید۔ اس بڑھاپے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کر دے گا۔'' حضرت اُمِّ سَلَمہؓ پوچھتی ہیں: ''اگر کسی عورت کے دنیا میں کئی شوہر رہ چکے ہوں اور وہ سب جنّت میں جائیں تو وہ ان میں سے کس کو ملے گی؟'' حضورؐ فرماتے ہیں: انھا تُخیَّر فتختار احسنھم خلقا فتقول یا رب ان ھٰذا کان احسن خلقًا معی فزوجنیھا، یا ام سلمه! ذھب حسن الخلق بخیر الدنیا والاخرۃ۔ ''اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چُن لے، اور وہ اُس شخص کو چُنے گی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اَخلاق کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اَے رب!

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى
الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿٤٦﴾ وَ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا
وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٤٧﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ اِنَّ
الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ

یہ وہ لوگ ہوں گے جو اِس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہِ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔[20] کہتے تھے: ”کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اُٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟“ اے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہو: یقیناً اگلے اور پچھلے، سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر

اس کا برتاؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا، اس لیے مجھے اسی کی بیوی بنا دے۔ اے اُمِّ سَلَمہ! حسنِ اَخلاق دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی لُوٹ لے گیا ہے۔“ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ رحمٰن، حاشیہ ۵۱)

۱۸ – اصل میں لفظ عُرُبًا استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے مُراد ایسی عورت ہے جو طرح دار ہو، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے لبریز ہو، اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۱۹ – اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سِن ہوں گی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی، یعنی تمام جنّتی عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں گی اور ہمیشہ اسی عمر کی رہیں گی۔ بعید نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں بیک وقت صحیح ہوں، یعنی یہ خواتین خود بھی ہم سِن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سِن بنا دیے جائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ یدخل اهل الجنة الجنة جردا مردا بیضا جعادا مکحلین ابناء ثلاث وثلاثین۔ ”اہلِ جنّت جب جنّت میں داخل ہوں گے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہوں گے۔ مَسیں بھیگ رہی ہوں گی مگر ڈاڑھی نہ نکلی ہو گی۔ گورے چٹے ہوں گے۔ گُٹھے ہوئے بدن ہوں گے۔ آنکھیں سُرمگیں ہوں گی۔ سب کی عمریں ۳۳ سال کی ہوں گی۔“ (مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابی ہریرہؓ) قریب قریب یہی مضمون ترمذی میں حضرت مُعاذؓ بن جَبَل اور حضرت ابو سعید خُدریؓ سے بھی مروی ہے۔

۲۰ – یعنی خوش حالی نے اُن پر اُلٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اُلٹے کافرِ نعمت ہو گئے تھے۔ اپنی لذّاتِ نفس میں منہمک ہو کر خدا کو بھول گئے تھے اور گناہِ عظیم پر مُصِرّ تھے۔ ”گناہِ عظیم“ کا لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد کفر و شرک اور دہریّت بھی ہے اور اَخلاق و اعمال کا ہر بڑا گناہ بھی۔

مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمۡ اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ ۙ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوۡنَ
مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ۚ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوۡنَ
عَلَيۡهِ مِنَ الۡحَمِيۡمِ ۚ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡهِيۡمِ ؕ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمۡ يَوۡمَ
الدِّيۡنِ ؕ﴿۵۶﴾ نَحۡنُ خَلَقۡنٰكُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا
تُمۡنُوۡنَ ؕ﴿۵۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ نَحۡنُ

کیا جا چکا ہے۔ پھر اَے گمراہو اور جھُٹلانے والو! تم شجرِ زقّوم[۲۱] کی غذا کھانے والے ہو۔ اُسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اُوپر سے کَھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اُونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے بائیں والوں کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔

ہم نے تمھیں[۲۲] پیدا کیا ہے، پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے[۲۳]؟ کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچّہ تم بناتے ہو، یا اس کے بنانے والے ہم ہیں[۲۴]؟ ہم نے

۲۱ – زقّوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۳۴۔

۲۲ – یہاں سے آیت ۷۴ تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں، ان میں بیک وقت آخرت اور توحید، دونوں پر اِستدلال کیا گیا ہے۔ چونکہ مکّے کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے اِن دونوں بنیادی اجزا پر معترض تھے، اس لیے یہاں دلائل اِس انداز سے دیے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توحید کی صداقت کا بھی۔

۲۳ – یعنی اِس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمھارے رب اور معبود ہیں، اور ہم تمھیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

۲۴ – اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑا اہم سوال انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اِسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہوا ہے، تو اسے نہ قرآن کی تعلیم توحید میں کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیم آخرت میں۔ انسان آخر اِسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس نُطفے میں بچہ پیدا کرنے کی، اور لازماً انسان ہی کا بچّہ پیدا کرنے کی صلاحیت آپ سے آپ پیدا ہوگئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کی ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہے؟ اور کیا یہ مرد کے، یا عورت کے، یا دنیا کی کسی طاقت کے اختیار میں ہے کہ اِس نطفے سے حمل کا استقرار کرے؟ پھر استقرارِ حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ

Maktaba Tul Ishaat.com

قَدَّرۡنَا بَيۡنَكُمُ الۡمَوۡتَ وَ مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ ﴿٦٠﴾ عَلٰۤى
اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَكُمۡ وَ نُنۡشِئَكُمۡ فِىۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٦١﴾
وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿٦٢﴾

تمھارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے[25]، اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمھیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے[26]۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے[27]؟

میں بچّے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش، اور ہر بچّے کی الگ صورت گری، اور ہر بچّے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسُب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیّت کا انسان بن کر اُٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی اور کا کام ہے؟ کیا اِس میں کسی اور کا ذرّہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟ کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ انبیاؑ اور اولیا کرتے ہیں جو خود اِسی طرح پیدا ہوئے ہیں؟ یا سورج اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام ہیں؟ یا وہ فطرت (nature) کرتی ہے جو بجائے خود کوئی علم، حکمت، ارادہ اور اختیار نہیں رکھتی؟ پھر کیا یہ فیصلہ کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو یا لڑکا؟ خوبصورت ہو یا بدصورت؟ طاقتور ہو یا کمزور؟ اندھا، بہرا، لنگڑا لُولا ہو یا صحیح الاعضاء؟ ذہین ہو یا کُند ذہن؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بُری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اُسے عروج پر لے جائیں، یا زوال کی طرف دھکیل دیں؟ اگر کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریّت کی بنیاد پر اِن سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اِن کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پُورا کا پُورا خدا کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پرداختہ اِس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؟ یا اُس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجا لائے؟

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملے میں بھی فیصلہ کُن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کیڑے سے ہوتی ہے جو طاقت ور خُردبین کے بغیر نظر تک نہیں آ سکتا۔ یہ کیڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیر سا خُردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خَلیّہ (cell) بن جاتا ہے جو حیاتِ انسانی کا نقطۂ آغاز ہے، اور یہ خَلیّہ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خُردبین کے بغیر اس کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ذرا سے خَلیّے کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحمِ مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے، اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خود ہی اسے دھکیل کر دنیا میں اُودھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔

تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اِس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے، وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اِن انسانوں کو دوبارہ کسی اور طرح پیدا نہ کر سکے گا۔

۲۵ — یعنی تمھاری پیدائش کی طرح تمھاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مر جانا ہے، اور کسے پیدا ہوتے ہی مر جانا ہے، اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدّر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی، اور اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے، نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے، نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعے سے، کہاں، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

۲٦ — یعنی جس طرح ہم اِس سے عاجز نہ تھے کہ تمھیں تمھاری موجودہ شکل و ہیئت میں پیدا کریں، اُسی طرح ہم اِس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و ہیئت میں، کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کر دیں۔ آج تم کو ہم اِس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمھارا نطفہ قرار پاتا ہے اور تم ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچے کی صورت میں برآمد ہوتے ہو۔ یہ طریقِ تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک لگا بندھا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں، یا نہ عمل میں لا سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمھیں اُسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمھاری بینائی، سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم نے کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اُسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیں گے، یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھ اور سن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سُن سکتے۔ آج تمھاری کھال اور تمھارے ہاتھ پاؤں اور تمھاری آنکھوں میں کوئی گویائی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمھارا ہر عضو اور تمھارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمھارا جینا اور مرنا بھی ہمارے ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمھاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں، جس کے تحت تمھیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو، جس سے زائد عذاب اگر تمھیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمھارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں، جس کے تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک بھگت سکو گے جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتے، اور کسی سخت سے سخت عذاب سے بھی تمھیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے، کبھی بیمار نہ ہو، کبھی اُس پر بڑھاپا نہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بڑھاپا ہمارے بنائے ہوئے قوانینِ حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمھاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾

کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے ہو، اِن سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا اُن کے اُگانے والے ہم ہیں؟[28]

مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی و تندرستی لازوال ہو۔

۲۷- یعنی تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کی صُلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رِحمِ مادر میں، جو قبر سے کچھ کم تاریک نہ تھا، تمھیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا۔ کس طرح ایک ذرّۂ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے، اور عقل و شُعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تدبیر و تسخیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مُردوں کو دوبارہ جِلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو، تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز رونما ہو رہا ہے، اسی کی قدرت سے زندگی بعدِ موت اور حشر و نشر اور جنّت و دوزخ کا معجزہ بھی رُونما ہو سکتا ہے؟

۲۸- اُوپر کا سوال لوگوں کو اِس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساختہ و پرداختہ ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال اُنھیں اِس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو، وہ بھی اللہ ہی تمھارے لیے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح تمھاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اِس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تمھارا باپ تمھاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے، اسی طرح تمھارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی میں بیج ڈال دے۔ زمین، جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے، تمھاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اِس زمین کو روئیدگی کی صلاحیت تم نے نہیں بخشی ہے۔ اس میں وہ مادّے، جن سے تمھاری غذا کا سامان بہم پہنچتا ہے، تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو، اُن کو نشوونُما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیّت کہ ہر بیج سے اُسی نوع کا درخت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے، تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اُوپر جس ہوا، پانی، حرارت، بُرودت اور موسمی کیفیّت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی تمھاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اُسی کے لانے سے آئے ہو، اور اسی کے رزق سے پل رہے ہو، تو تم کو اُس کے مقابلے میں خود مختاری کا، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر اِستدلال تو توحید کے حق میں ہے، مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اس پر اگر آدمی تھوڑا سا مزید غور کرے تو اِسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مُردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب کسان اُس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کونپلیں

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝۶۵ اِنَّا
لَمُغْرَمُوْنَ ۝۶۶ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝۶۷ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ
تَشْرَبُوْنَ ۝۶۸ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ
الْمُنْزِلُوْنَ ۝۶۹ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۰

ہم چاہیں تو اِن کھیتیوں کو بُھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چَٹّی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھُوٹے ہوئے ہیں۔

کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اِسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اِس کے برسانے والے ہم ہیں؟[۲۹] ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں[۳۰]، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟[۳۱]

پھوٹتی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شانِ بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مُردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کر اُٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے، یعنی انسانوں کی زندگی بعدِ موت۔

۲۹ – یعنی تمھاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں، تمھاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی، جو تمھاری زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے، تمھارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے اُن کا پانی بھاپ بن کر اُٹھتا ہے۔ ہم نے اُس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ایک خاص درجۂ حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جائے۔ ہماری ہوائیں اسے لے کر اُٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسُب سے تقسیم ہو کر زمین کے مختلف خطّوں پر پھیلتے ہیں، تاکہ جس خطّۂ زمین کے لیے پانی کا جو حصّہ مقرر کیا گیا ہے وہ اُس کو پہنچ جائے۔ اور ہم بالائی فضا میں وہ بُرودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تمھیں صرف وجود میں لا کر ہی نہیں رہ گئے ہیں، بلکہ تمھاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے۔ پھر ہماری تخلیق سے وجود میں آ کر، ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمھیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلے میں خود مختار بنو، یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجا لاؤ؟

۳۰ – اس فقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں، ان میں سے ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں، جب

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَرَءَيۡتُمُ النَّارَ الَّتِىۡ تُوۡرُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ
نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ﴿۷۲﴾ نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ ﴿۷۳﴾

کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سُلگاتے ہو، اِس کا درخت[۳۲] تم نے پیدا کیا ہے، یا اِس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اُس کو یاد دہانی کا ذریعہ[۳۳] اور حاجت مندوں[۳۴] کے لیے سامانِ زیست بنایا ہے؟

وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزا کو لے کر ہوا میں اُڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اُٹھتیں، ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام رُوئے زمین کو زمینِ شور بنا دیتی۔ نہ انسان اُس پانی کو پی کر جی سکتا تھا، نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اُگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت، جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آب رسانی و آب پاشی کی خدمت انجام دیتا ہے، اِس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ وَدِیعت کرنے والے نے پانی میں اِس کو خوب سوچ سمجھ کر بالارادہ اِس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اُس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پا سکتی تھی، وہ اُس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا، اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی درکار تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اُڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔

۳۱- بالفاظِ دیگر، کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اِس بارش کو دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے، اور کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اُٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسنا ایک فطری چکر ہے جو آپ سے آپ چلے جا رہا ہے، اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اُس خدا کا اپنے اُوپر یہ حق نہیں مانتا کہ اُسی کے آگے سرِ اطاعت جھکائے؟ خدا کی اِتنی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفر و شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

۳۲- درخت سے مُراد یا تو وہ درخت ہیں جن سے آگ جلانے کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے، یا مَرخ اور عَفار نامی وہ دو درخت ہیں جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو ایک دوسرے پر مار کر قدیم زمانے میں اہلِ عرب آگ جھاڑا کرتے تھے۔

۳۳- اِس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اُس

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾ فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ
النُّجُومِ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿٧٦﴾ إِنَّهُۥ لَقُرْءَانٌ
كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِى كِتَٰبٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾

پس اے نبیؐ! اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو[۳۵]۔ ع

پس نہیں[۳۶]، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے[۳۹]،
کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے[۳۷]، ایک محفوظ کتاب میں ثبت[۳۸]، جسے مُطَہَّرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔

کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان نے حیوانات کی طرح کچی غذائیں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے نئے دروازے کھُلتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلائی جا سکے، اور وہ آتش پذیر مادّے پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا قُفل ہی نہ کھلتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ اُس کا خالق کوئی پروردگارِ حکیم ہے جس نے اُسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں وہ سروسامان بھی پیدا کر دیا جس سے اُس کی یہ قابلیتیں رُوبعمل آ سکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو تنہا ایک آگ ہی اسے یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں مُتمتّع ہو رہا ہے۔

۳۴- اصل میں لفظ مُقْوِیْن استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنیٰ اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض اسے صحرا میں اُترے ہوئے مسافروں کے معنیٰ میں لیتے ہیں۔ بعض اس کے معنیٰ بھوکے آدمی کے لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مُراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو، یا روشنی کا، یا تپش کا۔

۳۵- یعنی اُس کا مبارک نام لے کر یہ اظہار و اعلان کرو کہ وہ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو کُفّار و مشرکین اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو کفر و شرک کے ہر عقیدے اور منکرینِ آخرت کے ہر اِستدلال میں مضمر ہیں۔

۳۶- یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ یہاں قرآن کے مِن جانبِ اللہ ہونے پر قسم کھانے سے پہلے لفظِ لَا کا استعمال خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ لوگ اِس کتابِ پاک کے متعلق کچھ باتیں بنا رہے تھے جن کی تردید کرنے کے لیے یہ قسم کھائی جا رہی ہے۔

۳۷- تاروں اور سیّاروں کے مواقع سے مراد اُن کے مقامات، اُن کی منزلیں اور اُن کے مدار ہیں۔ اور قرآن کے بلند پایہ کتاب ہونے پر اُن کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالَمِ بالا میں اَجرامِ فلکی کا نظام جیسا مُحکَم اور مضبوط ہے، ویسا ہی مضبوط

Maktaba Tul Ishaat.com

اور محکم یہ کلام بھی ہے۔ جس خدا نے وہ نظام بنایا ہے، اُسی خدا نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے۔ کائنات کی بے شمار کہکشانوں (galaxies) اور اُن کہکشانوں کے اندر بے حد وحساب تاروں (stars) اور سیّاروں (planets) میں جو کمال درجے کا ربط و نظم قائم ہے، درآنحالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کمال درجے کا مربوط و منظم ضابطۂ حیات پیش کرتی ہے، جس میں عقائد کی بنیاد پر اَخلاق، عبادات، تہذیب و تمدّن، معیشت و معاشرت، قانون و عدالت، صلح و جنگ، غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصّل ہدایات دی گئی ہیں، اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری چیز سے بے جوڑ نہیں ہے، درآنحالیکہ یہ نظامِ فکر متفرّق آیات اور مختلف مواقع پر دیے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح خدا کے باندھے ہوئے عالَمِ بالا کا نظم اٹل ہے جس میں کبھی ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اِس کتاب میں بھی جو حقائق بیان کیے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ بھی اٹل ہیں، ان کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا۔

۳۸- اس سے مراد ہے لوحِ محفوظ۔ اُس کے لیے ''کتابِ مَّکْنُون'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: ایسا نَوِشتہ جو چھپا کر رکھا گیا ہے، یعنی جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ اُس محفوظ نَوِشتے میں قرآن کے ثبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے جانے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس نَوِشتۂ تقدیر میں ثبت ہو چکا ہے جس کے اندر کسی ردّ و بدل کا امکان نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر مخلوق کی دست رَس سے بالاتر ہے۔

۳۹- یہ تردید ہے کفّار کے اُن الزامات کی جو وہ قرآن پر لگایا کرتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاہن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کلام آپؐ پر جِن اور شیاطین اِلقا کرتے ہیں۔ اِس کا جواب قرآنِ مجید میں متعدِد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ شُعَراء میں ارشاد ہُوا ہے: وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ ''اِس کو لے کر شیاطین نہیں اُترے ہیں، نہ یہ کلام اُن کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اِس کی سَماعت تک سے دُور رکھے گئے ہیں۔'' (آیات ۲۱۰ تا ۲۱۲) اسی مضمون کو یہاں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اسے مُطَہَّرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا''، یعنی شیاطین کا اِسے لانا، یا اس کے نُزول کے وقت اس میں دخل انداز ہونا تو درکنار، جس وقت یہ لوحِ محفوظ سے نبی پر نازل کیا جاتا ہے اُس وقت مُطَہَّرین، یعنی پاک فرشتوں کے سوا کوئی قریب پھٹک بھی نہیں سکتا۔ فرشتوں کے لیے مُطَہَّرین کا لفظ اس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کے ناپاک جذبات اور خواہشات سے پاک رکھا ہے۔

اس آیت کی یہی تفسیر اَنَسؓ بن مالک، ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبَیر، عِکْرِمَہ، مجاہد، قَتادَہ، ابو العالیہ، سُدّی، ضَحّاک اور ابنِ زید نے بیان کی ہے، اور نظمِ کلام کے ساتھ بھی یہی مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ سلسلۂ کلام خود یہ بتا رہا ہے کہ توحید اور آخرت کے متعلق کفّارِ مکّہ کے غلط تصوّرات کی تردید کرنے کے بعد اب قرآنِ مجید کے بارے میں اُن کے جھوٹے گمانوں کی تردید کی جارہی ہے اور مواقعِ نُجوم کی قسم کھا کر یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، اللہ تعالیٰ کے محفوظ نَوِشتے میں ثبت ہے، جس میں کسی مخلوق کی دراندازی کا کوئی امکان نہیں، اور نبی پر یہ ایسے طریقے سے نازل ہوتی ہے کہ

پاکیزہ فرشتوں کے سوا کوئی اسے چھو تک نہیں سکتا۔

بعض مفسّرین نے اس آیت میں لَا کو نہی کے معنیٰ میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "کوئی ایسا شخص اسے نہ چھُوئے جو پاک نہ ہو"، یا "کسی ایسے شخص کو اسے نہ چھُونا چاہیے جو ناپاک ہو"۔ اور بعض دوسرے مفسّرین اگرچہ لَا کو نفی کے معنیٰ میں لیتے ہیں اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "اس کتاب کو مُطَہّرین کے سوا کوئی نہیں چھوتا"، مگر اُن کا کہنا یہ ہے کہ یہ نفی اُسی طرح نہی کے معنیٰ میں ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا)۔ اِس میں اگرچہ خبر دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان پر ظلم نہیں کرتا، لیکن دراصل اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ مسلمان مسلمان پر ظلم نہ کرے۔ اسی طرح اس آیت میں اگرچہ فرمایا یہ گیا ہے کہ پاک لوگوں کے سوا قرآن کو کوئی نہیں چھوتا، مگر اس سے حکم یہ نکلتا ہے کہ جب تک کوئی شخص پاک نہ ہو، وہ اس کو نہ چھوئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر آیت کے سِیاق وسَباق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سیاق وسباق سے الگ کر کے تو اِس کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے، مگر جس سلسلۂ کلام میں یہ وارد ہوئی ہے، اس میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع نظر نہیں آتا کہ "اِس کتاب کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہ چھوئے"۔ کیونکہ یہاں تو کفّار مُخاطَب ہیں اور ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اللہ ربّ العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے، اس کے بارے میں تمھارا یہ گمان قطعی غلط ہے کہ اسے شیاطین نبی پر اِلقا کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ شرعی حکم بیان کرنے کا آخر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص طہارت کے بغیر اس کو ہاتھ نہ لگائے؟ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ آیت یہ حکم دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے، مگر فَحوائے کلام اِس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کتاب کو صرف مطہّرین ہی چھو سکتے ہیں، اُسی طرح دنیا میں بھی کم از کم وہ لوگ جو اِس کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، اِسے ناپاکی کی حالت میں چھونے سے اجتناب کریں۔

اس مسئلے میں جو رِوایات ملتی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) امام مالکؒ نے مُؤَطّا میں عبداللہ بن ابی بکر محمد بن عَمْرو بن حَزْم کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تحریری احکام عَمْرُوؓ بن حَزْم کے ہاتھ یمن کے رُؤسا کو لکھ کر بھیجے تھے، ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ لَا یَمَسُّ القراٰنَ اِلَّا طاھِرٌ (کوئی شخص قرآن کو نہ چھوئے مگر طاہر)۔ یہی بات ابوداؤد نے مَراسیل میں امام زُہریؒ سے نقل کی ہے کہ انھوں نے ابوبکر محمد بن عَمْرو بن حَزْم کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تحریر دیکھی تھی، اس میں یہ حکم بھی تھا۔

(۲) حضرت علیؓ کی روایت، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ان رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یکن یحجزہ عن القراٰن شیء لیس الجنابۃ۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی چیز قرآن کی تلاوت سے نہ روکتی تھی، سوائے جنابت کے۔" (ابوداؤد، نَسائی، تِرمِذی)

(۳) ابنِ عمرؓ کی روایت، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تقرأ الحائض

Maktaba Tul Ishaat.com

والجنب شیئاً من القراٰن۔ ”حائضہ اور جُنبی قرآن کا کوئی حصّہ نہ پڑھے۔“ (ابوداؤد، ترمذی)

(۴) بخاری کی روایت، جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم ہرقل کو جو نامۂ مبارک بھیجا تھا اس میں قرآنِ مجید کی یہ آیت بھی لکھی ہوئی تھی کہ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ......

صحابہؓ و تابعینؒ سے اس مسئلے میں جو مسالک منقول ہیں وہ یہ ہیں:

حضرت سلمان فارسیؓ وضو کے بغیر قرآن پڑھنے میں مضایقہ نہیں سمجھتے تھے، مگر ان کے نزدیک اس حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہ تھا۔ یہی مسلک حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بھی تھا۔ اور حضرت حَسَن بصریؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ بھی وضو کے بغیر مُصحَف کو ہاتھ لگانا مکروہ سمجھتے تھے۔ (احکام القرآن للجصّاص) عطاء اور طاؤس اور شَعْبی اور قاسم بن محمد سے بھی یہی بات منقول ہے۔ (المُغنی لِابنِ قُدامہ) البتہ قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر اس میں دیکھ کر پڑھنا، یا اس کو یاد سے پڑھنا ان سب کے نزدیک بے وضو بھی جائز تھا۔

جَنابت اور حیض و نفاس کی حالت میں قرآن پڑھنا حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت حَسَن بصری، حضرت ابراہیم نَخَعی اور امام زُہری کے نزدیک مکروہ تھا۔ مگر ابنِ عباسؓ کی رائے یہ تھی اور اسی پر ان کا عمل بھی تھا کہ قرآن کا جو حصّہ پڑھنا آدمی کا معمول ہو، وہ اسے یاد سے پڑھ سکتا ہے۔ حضرت سعید بن المُسَیَّب اور سعید بن جُبَیر سے اس مسئلے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ”کیا قرآن اس کے حافظے میں محفوظ نہیں ہے؟ پھر اس کے پڑھنے میں کیا حرج ہے؟“ (المُغنی، اور المُحلّٰی لِابنِ حَزم)

فقہا کے مسالک اس مسئلے میں حسبِ ذیل ہیں:

مسلکِ حَنَفی کی تشریح امام علاء الدین الکاشانی نے بَدائع الصَّنائع میں یوں کی ہے: ”جس طرح بے وضو نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اُسی طرح قرآنِ مجید کو ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ غلاف کے اندر ہو تو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے۔ غلاف سے مراد بعض فقہا کے نزدیک جِلد ہے اور بعض کے نزدیک وہ خَریطہ یا لفافہ یا جُزدان ہے جس کے اندر قرآن رکھا جاتا ہے اور اس میں سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ اِسی طرح تفسیر کی کتابوں کو بھی بے وضو ہاتھ نہ لگانا چاہیے، نہ کسی ایسی چیز کو جس میں قرآن کی کوئی آیت لکھی ہوئی ہو۔ البتہ فقہ کی کتابوں کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے، اگرچہ مستحب یہی ہے کہ ان کو بھی بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے، کیونکہ ان میں بھی آیاتِ قرآنی بطورِ اِستِدلال درج ہوتی ہیں۔ بعض فقہائے حَنَفِیّہ اس بات کے قائل ہیں کہ مُصحَف کے صرف اُس حصّے کو بے وضو ہاتھ لگانا دُرست نہیں ہے جہاں قرآن کی عبارت لکھی ہوئی ہو، باقی رہے حواشی، تو خواہ وہ سادہ ہوں یا ان میں بطورِ تشریح کچھ لکھا ہوا ہو، ان کو ہاتھ لگانے میں مضایقہ نہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ حواشی بھی مُصحَف ہی کا ایک حصہ ہیں اور ان کو ہاتھ لگانا مُصحَف ہی کو ہاتھ لگانا ہے۔ رہا قرآن پڑھنا، تو وہ وضو کے بغیر جائز ہے۔“ فتاویٰ عالمگیری میں بچوں کو اِس حکم سے مُستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے قرآنِ مجید بچوں کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے، خواہ وہ وضو سے ہوں یا بے وضو۔

تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَنۡتُمۡ
مُّدۡهِنُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۸۲﴾

یہ ربُّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو،[۴۰] اور اِس نعمت میں اپنا حصّہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اِسے جھُٹلاتے ہو؟[۴۱]

مسلکِ شافعیؒ کو امام نَوَوِیؒ نے المِنہاج میں اس طرح بیان کیا ہے: ”نماز اور طواف کی طرح مُصْحَف کو ہاتھ لگانا اور اس کے کسی ورق کو چھُونا بھی وضو کے بغیر حرام ہے۔ اسی طرح قرآن کی جلد کو چھُونا بھی ممنوع ہے۔ اور اگر قرآن کسی خریطے، غلاف یا صندوق میں ہو، یا درسِ قرآن کے لیے اس کا کوئی حصّہ تختی پر لکھا ہوا ہو تو اس کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ البتہ قرآن کسی کے سامان میں رکھا ہو، یا تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہوا ہو، یا کسی سکّے میں اس کا کوئی حصّہ درج ہو تو اسے ہاتھ لگانا حلال ہے۔ بچّہ اگر بے وضو ہو تو وہ بھی قرآن کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اور بے وضو آدمی اگر قرآن پڑھے تو لکڑی یا کسی اور چیز سے وہ اس کا ورق پلٹ سکتا ہے۔“

مالکیہ کا مسلک جو الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں نقل کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جُمہور فقہا کے ساتھ وہ اس امر میں متفق ہیں کہ مُصْحَف کو ہاتھ لگانے کے لیے وضو شرط ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم کے لیے وہ استاد اور شاگرد دونوں کو اس سے مُستثنٰی کرتے ہیں۔ بلکہ حائضہ عورت کے لیے بھی وہ بغرضِ تعلیم مُصْحَف کو ہاتھ لگانا جائز قرار دیتے ہیں۔ ابنِ قُدامہؒ نے المُغْنی میں امام مالکؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جنابت کی حالت میں تو قرآن پڑھنا ممنوع ہے، مگر حیض کی حالت میں عورت کو قرآن پڑھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ایک طویل مدت تک اگر ہم اسے قرآن پڑھنے سے روکیں گے تو وہ بھول جائے گی۔

حنبلی مذہب کے احکام جو ابنِ قُدامہؒ نے نقل کیے ہیں، یہ ہیں کہ ”جنابت کی حالت میں اور حیض و نفاس کی حالت میں قرآن یا اس کی کسی پُوری آیت کو پڑھنا جائز نہیں ہے، البتہ بسم اللہ، الحمد للہ وغیرہ کہنا جائز ہے، کیونکہ اگرچہ یہ بھی کسی نہ کسی آیت کے اجزا ہیں، مگر ان سے تلاوتِ قرآن مقصود نہیں ہوتی۔ رہا قرآن کو ہاتھ لگانا، تو وہ کسی حال میں وضو کے بغیر جائز نہیں، البتہ قرآن کی کوئی آیت کسی خط، یا فقہ کی کسی کتاب، یا کسی اور تحریر کے سلسلے میں درج ہو تو اسے ہاتھ لگانا ممنوع نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن اگر کسی چیز میں رکھا ہوا ہو تو اسے وضو کے بغیر اٹھایا جا سکتا ہے۔ تفسیر کی کتابوں کو ہاتھ لگانے کے لیے بھی وضو شرط نہیں ہے۔ نیز بے وضو آدمی کو اگر کسی فوری ضرورت کے لیے قرآن کو ہاتھ لگانا پڑے تو وہ تیمّم کر سکتا ہے۔“ الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں مسلکِ حنبلی کا یہ مسئلہ بھی درج ہے کہ بچّوں کے لیے تعلیم کی غرض سے بھی وضو کے بغیر قرآن کو ہاتھ لگانا درست نہیں ہے اور یہ ان کے سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ قرآن ان کے ہاتھ میں دینے سے پہلے انھیں وضو کرائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝٨٣ وَ اَنْتُمْ حِيْنَىٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝٨٤ وَ
نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝٨٥ فَلَوْ لَآ اِنْ
كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝٨٦ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٨٧ فَاَمَّآ اِنْ
كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝٨٨ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝٨٩ وَ اَمَّآ
اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝٩٠ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ ۝٩١ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝٩٢

اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اِس خیال میں سچّے ہو، تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اُس وقت اُس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اُس وقت تمھاری بہ نسبت ہم اُس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقرّبین میں سے ہو تو اس کے لیے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنّت ہے۔ اور اگر وہ اصحابِ یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یُوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے! تُو اصحاب الیمین میں سے ہے۔ اور اگر وہ جُھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو

ظاہریّہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کو ہاتھ لگانا ہر حال میں جائز ہے، خواہ آدمی بے وضو ہو، یا جنابت کی حالت میں ہو، یا عورت حیض کی حالت میں ہو۔ ابنِ حزم نے المحلّٰی (جلد اوّل، صفحہ ٧٧ تا ٨٤) میں اس مسئلے پر مفصّل بحث کی ہے، جس میں انھوں نے اس مسلک کی صحت کے دلائل دیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ فقہا نے قرآن پڑھنے اور اُس کو ہاتھ لگانے کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے۔

۴٠ - اصل الفاظ ہیں: اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۔ اِدْهَان کے معنٰی ہیں: کسی چیز سے مُداہنت برتنا، اس کو اہمیّت نہ دینا، اس کو سنجیدہ توجہ کے قابل نہ سمجھنا۔ انگریزی میں (to take lightly) کے الفاظ اس مفہوم سے قریب تر ہیں۔

۴١ - امام رازیؒ نے تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں لفظ ”رزق“ معاش کے معنٰی میں ہو۔ چونکہ کفارِ قریش قرآن کی دعوت کو اپنے معاشی مفاد کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہ

فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ﴿٩٤﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿٩٥﴾
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٩٦﴾

ع ۳ ۱۶

تو اس کی تواضع کے لیے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنّم میں جھونکا جانا۔
یہ سب کچھ قطعی حق ہے، پس اے نبیؐ! اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔[۴۲] ع

دعوت اگر کامیاب ہوگئی تو ہمارا رزق مارا جائے گا، اس لیے اِس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اس قرآن کی تکذیب کو اپنے پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے۔ تمھارے نزدیک حق اور باطل کا سوال کوئی اہمیّت نہیں رکھتا، اصل اہمیّت تمھاری نگاہ میں روٹی کی ہے اور اس کی خاطر حق کی مخالفت کرنے اور باطل کا سہارا لینے میں تمھیں کوئی تامُّل نہیں۔

۴۲۔ حضرت عُقبہؓ بن عامر جُہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو، یعنی رُکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہا کرو۔ اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے سجدے میں رکھو، یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى کہا کرو۔ (مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان، حاکم) اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا جو طریقہ مقرر فرمایا ہے، اس کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا تک قرآنِ پاک کے اشاروں سے ماخوذ ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الحَدِید

(۵۷)

الحدید

نام

آیت ۲۵ کے فقرے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے اور اس کے مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ غالباً یہ جنگِ اُحُد اور صلح حُدَیبیَہ کے درمیان کسی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ وہی زمانہ تھا جب مدینے کی مختصری اسلامی ریاست کو ہر طرف سے کفّار نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور سخت بے سروسامانی کی حالت میں اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پُورے عرب کی طاقت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اِس حالت میں اسلام کو اپنے پیروؤں سے صرف جانی قربانی ہی درکار نہ تھی بلکہ مالی قربانی بھی درکار تھی، اور اس سورت میں اِسی قربانی کے لیے پُرزور اپیل کی گئی ہے۔ اس قیاس کو آیت ۱۰ مزید تقویت پہنچاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جماعت کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ فتح کے بعد جو لوگ اپنے مال خرچ کریں گے اور خدا کی راہ میں جنگ کریں گے، وہ اُن لوگوں کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جو فتح سے پہلے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ اور اسی کی تائید حضرت انسؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کیا ہے۔ وہ آیت اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ کے متعلق فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے آغاز سے ۱۷ برس بعد اہلِ ایمان کو جھنجوڑنے والی یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حساب سے اس کا زمانۂ نزول ۴ھ اور ۵ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع اِنفاق فی سبیل اللہ کی تلقین ہے۔ اسلام کی تاریخ کے اس نازک ترین دَور میں، جب کہ عرب کی جاہلیت سے اسلام کا فیصلہ کُن معرکہ برپا تھا، یہ سورت اِس غرض کے لیے نازل فرمائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو خاص طور پر مالی قربانیوں کے لیے آمادہ کیا جائے اور یہ بات اُن کے ذہن نشین کرائی جائے کہ ایمان محض زبانی اقرار اور کچھ ظاہری اعمال کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے دین کے لیے مخلص ہونا اس کی اصل روح اور حقیقت ہے۔ جو شخص اِس رُوح سے خالی ہو اور خدا اور اس کے دین کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور مفاد کو عزیز تر رکھے، اس کا اقرارِ ایمان کھوکھلا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت خدا کے ہاں نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں، تاکہ سامعین کو اچھی طرح یہ احساس ہو جائے کہ کس عظیم ہستی کی طرف سے اُن کو مُخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد حسبِ ذیل

Maktaba Tul Ishaat.com

مضامین سلسلہ وار ارشاد ہوئے ہیں:

—— ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی راہِ خدا میں مال صَرف کرنے سے پہلوتہی نہ کرے۔ ایسا کرنا صرف ایمان ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔ کیونکہ یہ مال دراصل خدا ہی کا مال ہے جس پر تم کو خلیفہ کی حیثیت سے تَصَرُّف کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ کل یہی مال دوسروں کے پاس تھا، آج تمھارے پاس ہے، اور کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ آخرکار اسے خدا ہی کے پاس رہ جانا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا وارث ہے۔ تمھارے کام اِس مال کا کوئی حصّہ اگر آ سکتا ہے تو صرف وہ جسے تم اپنے زمانۂ تَصَرُّف میں خدا کے کام پر لگا دو۔

—— خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا اگرچہ ہر حال میں قابلِ قدر ہے، مگر اِن قربانیوں کی قدر و قیمت مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ایک موقع وہ ہوتا ہے جب کفر کی طاقت بڑی زبردست ہو اور ہر وقت یہ خطرہ ہو کہ کہیں اسلام اس کے مقابلے میں مغلوب نہ ہو جائے۔ دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب کفر و اسلام کی کشمکش میں اسلام کی طاقت کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اہلِ ایمان کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں فتح نصیب ہو رہی ہو۔ یہ دونوں حالتیں اپنی اہمیّت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ اس لیے جو قربانیاں اِن مختلف حالتوں میں دی جائیں، وہ بھی اپنی قیمت میں برابر نہیں ہیں۔ جو لوگ اسلام کے ضعف کی حالت میں اُس کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائیں اور مال صرف کریں، اُن کے درجے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کے غلبے کی حالت میں اُس کو مزید فروغ دینے کے لیے جان و مال قربان کریں۔

—— راہِ حق میں جو مال بھی صَرف کیا جائے، وہ اللہ کے ذمّے قرض ہے، اور اللہ اسے نہ صرف یہ کہ کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا، بلکہ اپنی طرف سے مزید اجر بھی عنایت فرمائے گا۔

—— آخرت میں نُور اُنھی اہلِ ایمان کو نصیب ہوگا جنھوں نے راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کیا ہو۔ رہے وہ منافق جو دنیا میں اپنے ہی مفاد کو دیکھتے رہے اور جنھیں اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی کہ حق غالب ہوتا ہے یا باطل، وہ خواہ دنیا کی اِس زندگی میں مومنوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں، مگر آخرت میں ان کو مومنوں سے الگ کر دیا جائے گا، نُور سے وہ محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

—— مسلمانوں کو اُن اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جانا چاہیے جن کی عمریں دنیا پرستی میں بیت گئی ہیں اور جن کے دل زمانۂ دراز کی غفلتوں سے پتھر ہوگئے ہیں۔ وہ مومن ہی کیا جس کا دل خدا کے ذکر سے نہ پگھلے اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے نہ جھکے۔

—— اللہ کے نزدیک صدّیق اور شہید صرف وہ اہلِ ایمان ہیں جو اپنا مال کسی جذبۂ ریا کے بغیر صدقِ دل سے اس کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔

—— دنیا کی زندگی محض چند روز کی بہار اور ایک متاعِ غرور ہے۔ یہاں کا کھیل کود، یہاں کی دلچسپیاں،

یہاں کی آرایش و زیبایش، یہاں کی بڑائیوں پر فخر، اور یہاں کا دھن دولت، جس میں لوگ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوششیں کرتے ہیں، سب کچھ ناپائدار ہے۔ اس کی مثال اُس کھیتی کی سی ہے جو پہلے سرسبز ہوتی ہے، پھر زرد پڑ جاتی ہے، اور آخر کار بُھس بن کر رہ جاتی ہے۔ پائدار زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے جہاں بڑے نتائج نکلنے والے ہیں۔ تمھیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو یہ کوشش جنت کی طرف دوڑنے میں صَرف کرو۔

—— دنیا میں راحت اور مصیبت جو بھی آتی ہے، اللہ کے پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے کے مطابق آتی ہے۔ مومن کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ مصیبت آئے تو ہمت نہ ہار بیٹھے، اور راحت آئے تو اِترا نہ جائے۔ یہ تو ایک منافق اور کافر کا کردار ہے کہ اللہ اس کو نعمت بخشے تو وہ اپنی جگہ پھُول جائے، فخر جتانے لگے، اور اُسی نعمت دینے والے خدا کے کام میں خرچ کرتے ہوئے خود بھی تنگ دلی دکھائے اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا مشورہ دے۔

—— اللہ نے اپنے رسول کھلی کھلی نشانیوں اور کتاب اور میزانِ عدل کے ساتھ بھیجے تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور اس کے ساتھ لوہا بھی نازل کیا تاکہ حق قائم کرنے اور باطل کا سر نیچا کرنے کے لیے طاقت استعمال کی جائے۔ اس طرح اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اُس کے دین کی حمایت و نُصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کی خاطر جان لڑا دیں۔ یہ مواقع اللہ نے تمھاری اپنی ہی ترقی و سرفرازی کے لیے پیدا کیے ہیں، ورنہ اللہ اپنے کام کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔

—— اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے انبیا آتے رہے، جن کی دعوت سے کچھ لوگ راہِ راست پر آئے اور اکثر فاسق بنے رہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام آئے، جن کی تعلیم سے لوگوں میں بہت سی اخلاقی خوبیاں پیدا ہوئیں، مگر ان کی اُمّت نے رہبانیت کی بدعت اختیار کر لی۔ اب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے۔ اُن پر جو لوگ ایمان لائیں گے اور خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے، اللہ اُن کو اپنی رحمت کا دُہرا حصّہ دے گا اور انھیں وہ نُور بخشے گا جس سے دنیا کی زندگی میں وہ ہر ہر قدم پر ٹیڑھے راستوں کے درمیان سیدھی راہ صاف دیکھ کر چل سکیں گے۔ اہلِ کتاب چاہے اپنے آپ کو اللہ کے فضل کا ٹھیکے دار سمجھتے رہیں، مگر اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، اُسے اختیار ہے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔

یہ ہے اُن مضامین کا خلاصہ جو اس سورت میں ایک ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان ہوئے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۹ اٰیاتھا

سُوۡرَۃُ الۡحَدِیۡدِ مَدَنِیَّۃٌ

۴ رکوعاتھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾

اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے[1]، اور وہی زبردست دانا ہے[2]۔

۱ – یعنی ہمیشہ کائنات کی ہر چیز نے اِس حقیقت کا اظہار و اعلان کیا ہے کہ اُس کا خالق و پروردگار ہر عیب اور نقص اور کمزوری اور خطا اور برائی سے پاک ہے۔ اُس کی ذات پاک ہے، اس کی صفات پاک ہیں، اس کے افعال پاک ہیں، اور اس کے احکام بھی، خواہ وہ تکوینی احکام ہوں یا شرعی، سراسر پاک ہیں۔ یہاں سَبَّحَ صیغۂ ماضی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض دوسرے مقامات پر یُسَبِّحُ صیغۂ مُضارِع استعمال ہوا ہے، جس میں حال اور مستقبل دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیشہ اپنے خالق و رب کی پاکی بیان کرتا رہا ہے، آج بھی کر رہا ہے، اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

۲ – اصل الفاظ ہیں: ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ۔ لفظ ھُوَ کو پہلے لانے سے خود بخود حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ عزیز اور حکیم ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی ایسی ہستی ہے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ عزیز کے معنیٰ ہیں: ایسا زبردست اور قادر و قاہر جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جس کی مزاحمت کسی کے بس میں نہیں ہے، جس کی اطاعت ہر ایک کو کرنی ہی پڑتی ہے، خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، جس کی نافرمانی کرنے والا اُس کی پکڑ سے کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا۔ اور حکیم کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تخلیق، اس کی تدبیر، اس کی فرمانروائی، اس کے احکام، اس کی ہدایات، سب حکمت پر مبنی ہیں۔ اُس کے کسی کام میں نادانی اور حماقت و جہالت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس مقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ قرآنِ کریم میں کم ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ عزیز کے ساتھ قوی، مُقتَدِر، جبّار اور ذُو انتقام جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن سے محض اُس کے اقتدارِ مُطلَق کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ صرف اُن مواقع پر ہوا ہے جہاں سلسلۂ کلام اِس بات کا متقاضی تھا کہ ظالموں اور نافرمانوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جائے۔ اِس طرح کے چند مقامات کو چھوڑ کر باقی جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں اس کے ساتھ حکیم، علیم، رحیم، غفور، وہّاب اور حمید میں سے کوئی لفظ ضرور لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہو جسے بے پناہ طاقت حاصل ہو مگر اس کے ساتھ وہ نادان ہو، جاہل ہو، بے رحم ہو، درگزر اور معاف کرنا جانتی ہی نہ ہو، بخیل ہو، اور بد سیرت ہو تو اس کے اقتدار کا نتیجہ ظلم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ جس شخص کو دوسروں پر بالاتری حاصل ہے، وہ یا تو اپنی طاقت کو نادانی اور جہالت کے ساتھ

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ

زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے، زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، اور ہر چیز پر

استعمال کر رہا ہے، یا وہ بے رحم اور سنگدل ہے، یا بخیل اور تنگ دل ہے، یا بدخُو اور بدکردار ہے۔ طاقت کے ساتھ اِن بُری صفات کا اجتماع جہاں بھی ہو، وہاں کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کی صِفتِ عزیز کے ساتھ اس کے حکیم و علیم اور رحیم و غفور اور حمید و وہّاب ہونے کا ذکر لازماً کیا گیا ہے، تاکہ انسان یہ جان لے کہ جو خدا اِس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے، وہ ایک طرف تو ایسا کامل اقتدار رکھتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے روک نہیں سکتا، مگر دوسری طرف وہ حکیم بھی ہے، اس کا ہر فیصلہ سراسر دانائی پر مبنی ہوتا ہے۔ علیم بھی ہے، جو فیصلہ بھی کرتا ہے ٹھیک ٹھیک علم کے مطابق کرتا ہے۔ رحیم بھی ہے، اپنے بے پناہ اقتدار کو بے رحمی کے ساتھ استعمال نہیں کرتا۔ غفور بھی ہے، اپنے زیردستوں کے ساتھ خُردہ گیری کا نہیں بلکہ چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کرتا ہے۔ وہّاب بھی ہے، اپنی رعیّت کے ساتھ بخیلی کا نہیں بلکہ بے انتہا فیّاضی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ اور حمید بھی ہے، تمام قابلِ تعریف صفات و کمالات اس کی ذات میں جمع ہیں۔

قرآن کے اِس بیان کی پُوری اہمیت وہ لوگ زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو حاکمیت (sovereignty) کے مسئلے پر فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ قانون کی بحثوں سے واقف ہیں۔ حاکمیّت نام ہی اِس چیز کا ہے کہ صاحبِ حاکمیّت غیر محدود اقتدار کا مالک ہو، کوئی داخلی و خارجی طاقت اُس کے حکم اور فیصلے کو نفاذ سے روکنے، یا اُس کو بدلنے، یا اُس پر نظرِ ثانی کرنے والی نہ ہو، اور کسی کے لیے اُس کی اطاعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ اِس غیر محدود اقتدار کا تصوّر کرتے ہی انسانی عقل لازماً یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا اقتدار جس کو بھی حاصل ہو، اسے بے عیب اور علم و حکمت میں کامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر اِس اقتدار کا حامل نادان، جاہل، بے رحم، اور بدخُو ہو تو اس کی حاکمیت سراسر ظلم و فساد ہوگی۔ اِسی لیے جن فلسفیوں نے کسی انسان، یا انسانی ادارے، یا انسانوں کے مجموعے کو حاکمیت کا حامل قرار دیا ہے، ان کو یہ فرض کرنا پڑا ہے کہ وہ غلطی سے مُبرّا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ نہ تو غیر محدود حاکمیت فی الواقع کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہو سکتی ہے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی بادشاہ، یا پارلیمنٹ، یا قوم، یا پارٹی کو ایک محدُود دائرے میں جو حاکمیت حاصل ہو، اُسے وہ بے عیب اور بے خطا طریقے سے استعمال کر سکے۔ اِس لیے کہ ایسی حکمت جس میں نادانی کا شائبہ نہ ہو، اور ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پر حاوی ہو، سرے سے پوری نوعِ انسانی ہی کو حاصل نہیں ہے، کجا کہ وہ انسانوں میں سے کسی شخص یا ادارے یا قوم کو نصیب ہو جائے۔ اور اِسی طرح انسان جب تک انسان ہے، اس کا خودغرضی، نفسانیت، خوف، لالچ، خواہشات، تعصب اور جذباتی رضا و رغبت اور محبّت و نفرت سے بالکل پاک اور بالاتر ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ اِن حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھ کر غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ قرآن اپنے اِس بیان میں درحقیقت حاکمیت کا بالکل صحیح اور مکمل تصوّر پیش کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”عزیز“ یعنی اقتدارِ مُطلَق کا حامل اِس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے، اور اِس غیر محدُود اقتدار کے ساتھ وہی ایک ہستی

Maktaba Tul Ishaat.com

شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ

قدرت رکھتا ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی،[۳] اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔[۴] اُس کے علم میں ہے جو کچھ

ایسی ہے جو بے عیب ہے، حکیم و علیم ہے، رحیم و غفور ہے اور حمید و وہاب ہے۔

۳- یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ تھا، اور جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا۔ وہ سب ظاہروں سے بڑھ کر ظاہر ہے، کیونکہ دنیا میں جو کچھ بھی ظہور ہے اُسی کی صفات اور اسی کے افعال اور اسی کے نُور کا ظُہور ہے۔ اور وہ ہر مخفی سے بڑھ کر مخفی ہے، کیونکہ حواس سے اس کی ذات کو محسوس کرنا تو درکنار، عقل و فکر و خیال تک اس کی کُنہ و حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ اِس کی بہترین تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دُعا کے یہ الفاظ ہیں جنھیں امام احمد، مسلم، ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حافظ ابو یعلیٰ مَوصلی نے اپنی مُسنَد میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے:

انت الاوّل فلیس قبلك شیء	تو ہی پہلا ہے، کوئی تجھ سے پہلے نہیں
وانت الاٰخر فلیس بعدك شیء	تو ہی آخر ہے، کوئی تیرے بعد نہیں
وانت الظاهر فلیس فوقك شیء	تو ہی ظاہر ہے، کوئی تجھ سے اُوپر نہیں
وانت الباطن فلیس دونك شیء	تو ہی باطن ہے، کوئی تجھ سے مخفی تر نہیں

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید میں اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے لیے خُلود اور اَبدی زندگی کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کے ساتھ یہ بات کیسے نبھ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر ہے، یعنی جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا؟ اس کا جواب خود قرآنِ مجید ہی میں موجود ہے کہ کُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (القصص: ۸۸) یعنی ”ہر چیز فانی ہے اللہ کی ذات کے سوا“۔ دوسرے الفاظ میں ذاتی بقا کسی مخلوق کے لیے نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز باقی ہے یا باقی رہے تو وہ اللہ کے باقی رکھنے ہی سے باقی ہے اور اس کے باقی رکھنے ہی سے باقی رہ سکتی ہے، ورنہ بذاتِ خود اُس کے سوا سب فانی ہیں۔ جنت اور دوزخ میں کسی کو خلود اس لیے نہیں ملے گا کہ وہ بجائے خود غیر فانی ہے، بلکہ اس لیے ملے گا کہ اللہ اس کو حیاتِ اَبدی عطا فرمائے گا۔ یہی معاملہ فرشتوں کا بھی ہے کہ وہ بذاتِ خود غیر فانی نہیں ہیں۔ جب اللہ نے چاہا تو وہ وجود میں آئے، اور جب تک وہ چاہے اُسی وقت تک وہ موجود رہ سکتے ہیں۔

۴- یعنی کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور فرمانروا بھی وُہی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم،

فِي الْأَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ
فِيْهَاؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۴ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۵ يُوْلِجُ الَّيْلَ
فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِؕ وَ هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۶

زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے[۵]۔ وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو[۶]۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کیے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور دلوں کے چھُپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔

الاعراف، حواشی ۴۱ - ۴۲۔ یونس، حاشیہ ۴۔ الرعد، حواشی ۲ تا ۵۔ جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۵ – بالفاظِ دیگر، وہ محض کلّیات ہی کا عالم نہیں ہے بلکہ جزئیات کا علم بھی رکھتا ہے۔ ایک ایک دانہ جو زمین کی تہوں میں جاتا ہے، ایک ایک پتّی اور کونپل جو زمین سے پھُوٹتی ہے، بارش کا ایک ایک قطرہ جو آسمان سے گرتا ہے، اور بخارات کی ہر مقدار جو سمندروں اور جھیلوں سے اُٹھ کر آسمان کی طرف جاتی ہے، اس کی نگاہ میں ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کون سا دانہ زمین میں کس جگہ پڑا ہے، تبھی تو وہ اسے پھاڑ کر اس میں سے کونپل نکالتا ہے اور اسے پرورش کر کے بڑھاتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ بخارات کی کتنی کتنی مقدار کہاں کہاں سے اُٹھی ہے اور کہاں پہنچی ہے، تبھی تو وہ ان سب کو جمع کر کے بادل بناتا ہے اور زمین کے مختلف حصّوں پر بانٹ کر ہر جگہ ایک حساب سے بارش برساتا ہے۔ اِسی پر اُن دوسری تمام چیزوں کی تفصیلات کو قیاس کیا جاسکتا ہے جو زمین میں جاتی اور اس سے نکلتی ہیں، اور آسمان کی طرف چڑھتی اور اس سے نازل ہوتی ہیں۔ ان سب پر اللہ کا علم حاوی نہ ہوتو ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ تدبیر اور ہر ایک کا انتہائی حکیمانہ طریقے سے انتظام کیسے ممکن ہے۔

۶ – یعنی کسی جگہ بھی تم اُس کے علم، اُس کی قدرت، اُس کی فرمانروائی اور اس کی تدبیر و انتظام سے باہر نہیں ہو۔ زمین میں، ہوا میں، پانی میں، یا کسی گوشۂ تنہائی میں، جہاں بھی تم ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو۔ وہاں تمھارا زندہ ہونا بجائے خود اِس کی علامت ہے کہ اللہ اُسی جگہ تمھاری زندگی کا سامان کر رہا ہے۔ تمھارا دل اگر دھڑک رہا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسُولؐ پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ

تمھارے پھیپھڑے اگر سانس لے رہے ہیں، تمھاری سماعت اور بینائی اگر کام کر رہی ہے تو یہ سب کچھ اِسی وجہ سے ہے کہ اللہ کے انتظام سے تمھارے جسم کے سب کَل پُرزے چل رہے ہیں۔ اور اگر کسی جگہ بھی تمھیں موت آتی ہے تو اِسی وجہ سے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری بقا کا انتظام ختم کر کے تمھیں واپس بُلا لینے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

۷ – یہ خطاب غیر مسلموں سے نہیں ہے، بلکہ بعد کی پوری تقریر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ مخاطَب وہ مسلمان ہیں جو کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے، مگر ایمان کے تقاضے پُورے کرنے اور مومن کا سا طرزِ عمل اختیار کرنے سے پہلوتہی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت دینے کے ساتھ ہی فوراً اُن سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے مَصارف میں دل کھول کر اپنا حصّہ ادا کرو، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم میں سے جو فتح سے پہلے جہاد اور اِنفاق فی سبیل اللہ کرے گا، اُس کا درجہ اُن لوگوں سے بلند تر ہو گا جو بعد میں یہ خدمات انجام دیں گے۔ غیر مسلم کو دعوتِ ایمان دینے کی صورت میں تو پہلے اُس کے سامنے ایمان کے ابتدائی تقاضے پیش کیے جاتے ہیں نہ کہ انتہائی۔ اس لیے فَحوائے کلام کے لحاظ سے یہاں اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کو سچّے دل سے مانو اور وہ طرزِ عمل اختیار کرو جو اخلاص کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

۸ – اس مقام پر خرچ کرنے سے مُراد عام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا نہیں ہے، بلکہ آیت ۱۰ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں اِس سے مُراد اُس جِدّ و جُہد کے مصارف میں حصہ لینا ہے جو اُس وقت کفر کے مقابلے میں اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں برپا تھی۔ خاص طور پر دو ضرورتیں اُس وقت ایسی تھیں جن کے لیے اسلامی حکومت کو مالی مدد کی سخت حاجت درپیش تھی۔ ایک، جنگی ضروریات۔ دوسرے، اُن مظلوم مسلمانوں کو سہارا دینا جو کفّار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر عرب کے ہر حصّے سے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے اور آ رہے تھے۔ مخلص اہلِ ایمان ان مصارف کو پُورا کرنے کے لیے اپنی ذات پر اتنا بوجھ برداشت کر رہے تھے جو ان کی طاقت اور وسعت سے بہت زیادہ تھا، اور اِسی چیز کی داد اُن کو آگے آیات ۱۰-۱۲-۱۸ اور ۱۹ میں دی گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے گروہ میں بکثرت اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ایسے موجود تھے جو کفر و اسلام کی اس کشمکش کو محض تماشائی بن کر دیکھ رہے تھے اور اِس بات کا انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ جس چیز پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں، اس کے کچھ حُقوق بھی ان کی جان و مال پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی دوسری قسم کے لوگ اِس آیت کے مخاطَب ہیں۔ اُن سے کہا جا رہا ہے کہ سچّے مومن بنو اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَ مَا لَكُمْ

بنایا ہے۔[9] جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے[10] ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے

۹ – اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی یہاں مُراد بھی ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جو مال تمھارے پاس ہے، یہ دراصل تمھارا ذاتی مال نہیں بلکہ اللہ کا بخشا ہوا مال ہے۔ تم بذاتِ خود اِس کے مالک نہیں ہو، اللہ نے اپنے خلیفہ کی حیثیت سے یہ تمھارے تصرُّف میں دیا ہے۔ لہٰذا مال کے اصل مالک کی خدمت میں اِسے صَرف کرنے سے دریغ نہ کرو۔ نائب کا یہ کام نہیں ہے کہ مالک کے مال کو مالک ہی کے کام میں خرچ کرنے سے جی چُرائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مال نہ ہمیشہ سے تمھارے پاس تھا، نہ ہمیشہ تمھارے پاس رہنے والا ہے۔ کل یہ کچھ دوسرے لوگوں کے پاس تھا، پھر اللہ نے تم کو اُن کا جانشین بنا کر اِسے تمھارے حوالے کیا، پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ تمھارے پاس نہ رہے گا اور کچھ دوسرے لوگ اِس پر تمھارے جانشین بن جائیں گے۔ اِس عارضی جانشینی کی تھوڑی سی مدّت میں، جب کہ یہ تمھارے قبض و تصرُّف میں ہے، اسے اللہ کے کام میں خرچ کرو، تاکہ آخرت میں اس کا مستقل اور دائمی اجر تمھیں حاصل ہو۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ترمِذی کی رِوایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کے ہاں ایک بکری ذبح کر کے اُس کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ آپؐ گھر میں تشریف لائے تو پوچھا: ”بکری میں سے کیا باقی رہا؟“ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِيَ اِلَّا كَتِفُهَا ”ایک شانے کے سوا کچھ نہیں بچا۔“ فرمایا: بَقِيَ كلّها غير كتفها ”ایک شانے کے سوا ساری بکری بچ گئی۔“ یعنی جو کچھ خدا کی راہ میں صرف ہوا، وہی دراصل باقی رہ گیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: ”یا رسولؐ اللہ! کس صدقے کا اجر سب سے زیادہ ہے؟“ فرمایا: اَنْ تَصَدَّقَ وانت صحيح شحيح تخشى الفقر و تأمل الغنٰى، ولا تُمْهِل حتّٰى اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان كذا ولفلان كذا وقد كان لفلان۔ ”یہ کہ تو صدقہ کرے اس حال میں کہ تو صحیح و تندرست ہو، مال کی کمی کے باعث اُسے بچا کر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو اور اسے کسی کام میں لگا کر زیادہ کما لینے کی اُمید رکھتا ہو۔ اُس وقت کا انتظار نہ کر کہ جب جان نکلنے لگے تو تُو کہے کہ یہ فلاں کو دیا جائے اور یہ فُلاں کو۔ اُس وقت تو یہ مال فلاں کو جانا ہی ہے۔“ (بخاری و مسلم) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: يقول ابن اٰدم مالي مالي، وهل لك من مالك الا ما اكلت فافنيت، اولبست فابليت، اوتصدقت فامضيت؟ وما سوٰى ذٰلك فذاهب و تاركه للناس۔ ”آدمی کہتا ہے: میرا مال، میرا مال۔ حالانکہ تیرے مال میں سے تیرا حصّہ اُس کے سوا کیا ہے جو تُو نے کھا کر ختم کر دیا، یا پہن کر پُرانا کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا؟ اُس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے اور تو اسے دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔“ (مسلم)

۱۰ – یہاں پھر جہاد میں مال خرچ کرنے کو ایمان کا لازمی تقاضا اور اخلاص فی الایمان کی ضروری علامت قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ حقیقی اور مخلص مومن وہی ہے جو ایسے موقع پر مال صرف کرنے سے جی نہ چُرائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ
مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ
اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ
بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ رسول تمھیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے[11] اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے[12] اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے، تاکہ تمھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین

۱۱ – یعنی تم یہ غیر ایمانی رَوِش اِس حالت میں اختیار کر رہے ہو کہ اللہ کا رسولؐ خود تمھارے درمیان موجود ہے اور دعوتِ ایمانی تمھیں کسی دُور دراز واسطے سے نہیں بلکہ براہِ راست اللہ کے رسولؐ کی زبان سے پہنچ رہی ہے۔

۱۲ – بعض مفسّرین نے اِس عہد سے مُراد اللہ کی بندگی کا وہ عہد لیا ہے جو ابتدائے آفرینش میں آدم علیہ السّلام کی پُشت سے اُن کی ذُرِّیّت کو نکال کر لیا گیا تھا۔ اور بعض دوسرے مفسّرین نے اس سے مُراد وہ عہد لیا ہے جو ہر انسان کی فطرت اور اس کی فطری عقل میں اللہ کی بندگی کے لیے موجود ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا وہ شُعُوری عہد ہے جو ہر مسلمان ایمان لا کر اپنے رب سے باندھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک دوسری جگہ اِس عہد کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (المائدہ:۷)	یاد رکھو اُس نعمت کو جو اللہ نے تم کو عطا کی ہے اور اُس عہد و پیمان کو جو اللہ نے تم سے لیا ہے، جب کہ تم نے کہا: "ہم نے سُنا اور اطاعت قبول کی۔" اور اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔

حدیث میں حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ:

بَايَعْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم على السّمع والطاعة فى النشاط والكسل وعلى النفقة فى العسر و اليسر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ ہم چُستی اور سُستی، ہر حال میں سَمع و طاعت پر قائم رہیں گے، خوش حالی اور تنگ حالی،

وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ
اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ
اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا

اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۳]۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں[۱۴]۔ جو کچھ

وعلی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر وعلی ان نقول فی اللّٰہ تعالٰی ولا نخاف لَوْمَةَ لَائِمٍ (مُسندِ احمد)

دونوں حالتوں میں راہِ خدا پر خرچ کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے منع کریں گے، اللہ کی خاطر حق بات کہیں گے، اور اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

۱۳ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ مال تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے، ایک دن تمھیں لازماً اِسے چھوڑ کر ہی جانا ہے اور اللہ ہی اِس کا وارث ہونے والا ہے، پھر کیوں نہ اپنی زندگی میں اِسے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو، تاکہ اللہ کے ہاں اس کا اجر تمھارے لیے ثابت ہو جائے۔ نہ خرچ کرو گے تب بھی یہ اللہ ہی کے پاس واپس جا کر رہے گا، البتہ فرق یہ ہوگا کہ اُس پر تم کسی اجر کے مستحق نہ ہو گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے تم کو کسی فقر اور تنگ دستی کا اندیشہ لاحق نہ ہونا چاہیے، کیونکہ جس خدا کی خاطر تم اسے خرچ کرو گے، وہ زمین و آسمان کے سارے خزانوں کا مالک ہے، اُس کے پاس تمھیں دینے کو بس اُتنا ہی کچھ نہ تھا جو اس نے آج تمھیں دے رکھا ہے، بلکہ کل وہ تمھیں اس سے بہت زیادہ دے سکتا ہے۔ یہی بات ایک دوسری جگہ اس طرح فرمائی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ (سبا: ۳۹)

اَے نبیؐ! ان سے کہو کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو، اس کی جگہ وہی مزید رزق تمھیں دیتا ہے، اور وہ بہترین رازق ہے۔

۱۴ – یعنی اجر کے مستحق تو دونوں ہی ہیں، لیکن ایک گروہ کا رُتبہ دوسرے گروہ سے لازماً بلند تر ہے، کیونکہ اُس نے زیادہ سخت حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاطر وہ خطرات مول لیے جو دوسرے گروہ کو درپیش نہ تھے۔ اس نے ایسی حالت میں مال

Maktaba Tul Ishaat.com

ع۱۰

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ
لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى

تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے[15] ع

کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اُس کے لیے بہترین اجر ہے[16] اُس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور

خرچ کیا جب دُور دُور کہیں یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ کبھی فتوحات سے اِس خرچ کی تلافی ہو جائے گی، اور اُس نے ایسے نازک دَور میں کفّار سے جنگ کی جب ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن غالب آ کر اسلام کا نام لینے والوں کو پیس ڈالیں گے۔ مفسّرین میں سے مجاہد، قَتَادہ اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں جس چیز کے لیے لفظ "فتح" استعمال کیا گیا ہے، اس کا اِطلاق فتحِ مکّہ پر ہوتا ہے، اور عامر شَعْبِیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صُلحِ حُدَیبِیہ ہے۔ پہلے قول کو اکثر مفسّرین نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے قول کی تائید میں حضرت ابو سعید خُدریؓ کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے صُلحِ حُدَیبِیہ کے زمانے میں فرمایا: "عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جن کے اعمال کو دیکھ کر تم لوگ اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے، مگر لو کان لاحدھم جبل من ذھب فانفقه ما ادرك مُدّ احدكم ولا نصيفه۔" ان میں سے کسی کے پاس پہاڑ برابر بھی سونا ہو اور وہ سارا کا سارا خدا کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ تمھارے دو رُطل بلکہ ایک رُطل خرچ کرنے کے برابر بھی نہ پہنچ سکے گا۔" (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابو نُعَیم اَصْفَہانی) نیز اس کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت اَنسؓ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دورانِ نزاع میں حضرت خالدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا: "تم لوگ اپنی پچھلی خدمات کی بنا پر ہم سے دوں کی لیتے ہو۔" یہ بات جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: "اُس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم لوگ اُحُد کے برابر، یا پہاڑوں کے برابر سونا بھی خرچ کرو تو اِن لوگوں کے اعمال کو نہ پہنچ سکو گے۔" اس سے اِستدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں فتح سے مراد صُلحِ حُدَیبِیہ ہے، کیونکہ حضرت خالدؓ اسی صلح کے بعد ایمان لائے تھے اور فتحِ مکّہ میں شریک تھے۔ لیکن اس خاص موقع پر فتح سے مراد خواہ صُلحِ حُدَیبِیہ لی جائے یا فتحِ مکّہ، بہر حال اِس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درجات کا یہ فرق بس اسی ایک فتح پر ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ اُصولاً اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی اسلام پر ایسا کوئی وقت آ جائے جس میں کفر اور کفّار کا پلڑا بہت بھاری ہو اور بظاہر اسلام کے غلبے کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے ہوں، اُس وقت جو لوگ اسلام کی حمایت میں جانیں لڑائیں اور مال خرچ کریں، اُن کے مرتبے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو کفر و اسلام کی کشمکش کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جانے کے بعد قربانیاں دیں۔

۱۵ – یعنی اللہ جس کو جو اجر اور مرتبہ بھی دیتا ہے، یہ دیکھ کر دیتا ہے کہ کس نے کن حالات میں کس جذبے کے

نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ بُشۡرٰٮكُمُ الۡيَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۚ‏ ﴿۱۲﴾

اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دَوڑ رہا ہوگا۔[۱۷] (ان سے کہا جائے گا کہ) "آج بشارت ہے تمھارے لیے"، جنّتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی ہے بڑی کامیابی۔

ساتھ کیا عمل کیا ہے۔ اُس کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کا درجہ اور اس کے عمل کا اجر پُوری باخبری کے ساتھ متعیّن کرتا ہے۔

۱۶ – یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ آدمی اگر اس کے بخشے ہوئے مال کو اُسی کی راہ میں صرف کرے تو اسے وہ اپنے ذمّے قرض قرار دیتا ہے، بشرطیکہ وہ قرضِ حَسَن (اچھا قرض) ہو، یعنی خالص نیت کے ساتھ کسی ذاتی غرض کے بغیر دیا جائے، کسی قسم کی ریاکاری اور شہرت و ناموری کی طلب اُس میں شامل نہ ہو، اُسے دے کر کسی پر احسان نہ جتایا جائے، اُس کا دینے والا صرف اللہ کی رضا کے لیے دے اور اُس کے سوا کسی کے اجر اور کسی کی خوشنودی پر نگاہ نہ رکھے۔ اس قرض کے متعلق اللہ کے دو وعدے ہیں: ایک یہ کہ وہ اس کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس پر اپنی طرف سے بہترین اجر بھی عطا فرمائے گا۔

حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضورؐ کی زبانِ مبارک سے لوگوں نے اس کو سُنا تو حضرت ابوالدَّحداح انصاریؓ نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟" حضورؐ نے جواب دیا: "ہاں، اے ابوالدَّحداح"۔ انھوں نے کہا: "ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔" آپؐ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے آپؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔" حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اُس باغ میں کھجور کے ۶ سو درخت تھے، اُسی میں ان کا گھر تھا، وہیں ان کے بال بچّے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کرکے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا: "دَحداح کی ماں! نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔" وہ بولیں: "تم نے نفع کا سودا کیا دَحداح کے باپ!"، اور اسی وقت اپنا سامان اور اپنے بچّے لے کر باغ سے نکل گئیں۔ (ابنِ ابی حاتم) اِس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل اُس وقت کیا تھا، اور اِسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرضِ حَسَن ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اُوپر سے اجرِ کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

۱۷ – اس آیت اور بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں نور صرف مومنینِ صالحین کے لیے مخصوص ہوگا، رہے کفّار و منافقین اور فُسّاق و فُجّار، تو وہ وہاں بھی اُسی طرح تاریکی میں بھٹک رہے ہوں گے جس طرح دنیا میں بھٹکتے رہے تھے۔ وہاں روشنی جو کچھ بھی ہوگی، صالح عقیدے اور صالح عمل کی ہوگی۔ ایمان کی صداقت اور سیرت و کردار کی پاکیزگی

Maktaba Tul Ishaat.com

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ

اُس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمھارے نُور سے کچھ فائدہ اُٹھائیں۔[18] مگر ان سے کہا جائے گا: پیچھے ہٹ جاؤ، اپنا نور کہیں اور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اُس دروازے کے اندر رحمت ہوگی

ہی نور میں تبدیل ہو جائے گی، جس سے نیک بندوں کی شخصیت جگمگا اُٹھے گی۔ جس شخص کا عمل جتنا تابندہ ہوگا، اُس کے وجود کی روشنی اتنی ہی زیادہ تیز ہوگی، اور جب وہ میدانِ حشر سے جنّت کی طرف چلے گا تو اس کا نور اُس کے آگے آگے دوڑ رہا ہوگا۔ اِس کی بہترین تشریح قَتَادَہؒ کی وہ مُرسَل رِوایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینے سے عدن تک کی مَسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا، اور کسی کا نور مدینے سے صَنعا تک، اور کسی کا اس سے کم، یہاں تک کہ کوئی مومن ایسا بھی ہوگا جس کا نُور اس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔“ (ابنِ جَرِیر) بالفاظِ دیگر، جس کی ذات سے دنیا میں جتنی بھلائی پھیلی ہوگی، اس کا نُور اتنا ہی تیز ہوگا، اور جہاں جہاں تک دنیا میں اس کی بھلائی پہنچی ہوگی، میدانِ حشر میں اتنی ہی مسافت تک اس کے نُور کی شعاعیں دوڑ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک سوال آدمی کے ذہن میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ آگے آگے نور کا دوڑنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر نور کا صرف دائیں جانب دوڑنا کیا معنیٰ؟ کیا ان کے بائیں جانب تاریکی ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنے دائیں ہاتھ پر روشنی لیے ہوئے چل رہا ہو تو اس سے روشن تو بائیں جانب بھی ہوگی، مگر امرِ واقعہ یہی ہوگا کہ روشنی اس کے دائیں ہاتھ پر ہے۔ اس بات کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابوذرؓ اور ابوالدّرداء نے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اعرفھم بنورھم الذی یسعٰی بین ایدیھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم۔ ”میں اپنی اُمّت کے صالحین کو وہاں ان کے اُس نور سے پہچانوں گا جو اُن کے آگے اور ان کے دائیں اور بائیں دوڑ رہا ہوگا۔“ (حاکم، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

۱۸- مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جب جنّت کی طرف جا رہے ہوں گے تو روشنی ان کے آگے ہوگی اور پیچھے منافقین اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ اُس وقت وہ اُن اہلِ ایمان کو جو دنیا میں اُن کے ساتھ ایک ہی مُسلم معاشرے میں رہتے تھے، پکار پکار کر کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف پلٹ کر دیکھو تاکہ ہمیں بھی کچھ روشنی مل جائے۔

قَبْلِهِ الْعَذَابُ ۝١٣ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ
وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ

اور باہر عذاب[19]۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے[20]؟ مومن جواب دیں گے: ہاں، مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا[21]، موقع پرستی کی[22]، شک میں پڑے رہے[23]، اور جھُوٹی توقعات

۱۹- اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت اس دروازے سے جنّت میں داخل ہو جائیں گے اور دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ دروازے کے ایک طرف جنّت کی نعمتیں ہوں گی، اور دوسری طرف دوزخ کا عذاب۔ منافقین کے لیے اُس حدِ فاصل کو پار کرنا ممکن نہ ہو گا جو اُن کے اور جنّت کے درمیان حائل ہو گی۔

۲۰- یعنی کیا ہم تمھارے ساتھ ایک ہی مسلم معاشرے میں شامل نہ تھے؟ کیا ہم کلمہ گو نہ تھے؟ کیا تمھاری طرح ہم بھی نمازیں نہ پڑھتے تھے؟ روزے نہ رکھتے تھے؟ حج اور زکوٰۃ ادا نہ کرتے تھے؟ کیا تمھاری مجلسوں میں ہم شریک نہ ہوتے تھے؟ تمھارے ساتھ ہمارے شادی بیاہ اور رشتہ داری کے تعلقات نہ تھے؟ پھر آج ہمارے اور تمھارے درمیان یہ جدائی کیسی پڑ گئی؟

۲۱- یعنی مسلمان ہو کر بھی تم مخلص مسلمان نہ بنے، ایمان اور کفر کے درمیان لٹکتے رہے، کفر اور کفار سے تمھاری دلچسپیاں کبھی ختم نہ ہوئیں، اور اسلام سے تم نے کبھی اپنے آپ کو پُوری طرح وابستہ نہ کیا۔

۲۲- اصل الفاظ ہیں: تَرَبَّصْتُمْ ۔ تَرَبُّص عربی زبان میں انتظار کرنے اور موقع کی تلاش میں ٹھیرے رہنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص دو راستوں میں سے کسی ایک پر جانے کا قطعی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اِس فکر میں کھڑا ہو کہ جدھر جانا مفید ہوتا نظر آئے اسی طرف چل پڑے، تو کہا جائے گا کہ وہ تَرَبُّص میں مبتلا ہے۔ منافقین نے کفر و اسلام کی کشمکش کے اُس نازک دَور میں یہی رَویّہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ نہ کھل کر کفر کا ساتھ دے رہے تھے، نہ پُورے اطمینان کے ساتھ اپنی طاقت اسلام کی نصرت و حمایت میں صرف کر رہے تھے۔ بس اپنی جگہ بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ اِس قوت آزمائی میں آخر کار پلڑا کدھر جھکتا ہے، تاکہ اسلام کامیاب ہوتا نظر آئے تو اس کی طرف جھک جائیں اور اُس وقت مسلمانوں کے ساتھ کلمہ گوئی کا تعلق ان کے کام آئے، اور کفر کو غلبہ حاصل ہو تو اس کے حامیوں سے جا ملیں اور اسلام کی طرف سے جنگ میں کسی قسم کا حصّہ نہ لینا اُس وقت ان کے حق میں مفید ثابت ہو۔

۲۳- اس سے مراد مختلف قسم کے شکوک ہیں جو ایک منافق کو لاحق ہوتے ہیں، اور وہی اس کی منافقت کا اصل سبب ہوا کرتے ہیں۔ اسے خدا کی ہستی میں شک ہوتا ہے، رسول کی رسالت میں شک ہوتا ہے، قرآن کے کتاب اللہ ہونے میں شک ہوتا ہے، آخرت اور وہاں کی باز پُرس اور جزا و سزا میں شک ہوتا ہے، اور اس امر میں شک ہوتا ہے کہ حق اور باطل کا یہ جھگڑا واقع کوئی حقیقت بھی رکھتا ہے یا یہ سب محض ڈھکوسلے ہیں اور اصل چیز بس یہ ہے کہ خوش باش دے کہ زندگانی ایں است۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا
يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ
مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ

تمھیں فریب دیتی رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا،[۲۴] اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز[۲۵] تمھیں اللہ کے معاملے میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُن لوگوں سے جنھوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔[۲۶] تمھارا ٹھکانا جہنّم ہے، وہی تمھاری خبر گیری کرنے والی ہے،[۲۷] اور یہ بدترین انجام ہے۔

کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں،[۲۸] اور وہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں

کوئی شخص جب تک ان شکوک میں مبتلا نہ ہو وہ کبھی منافق نہیں ہو سکتا۔

۲۴- اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تم کو موت آ گئی اور مرتے دم تک تم اس فریب سے نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اسلام کو غلبہ نصیب ہو گیا اور تم تماشا دیکھتے رہ گئے۔

۲۵- مُراد ہے شیطان۔

۲۶- یہاں اس امر کی تصریح ہے کہ آخرت میں منافق کا انجام وہی ہو گا جو کافر کا ہو گا۔

۲۷- اصل الفاظ ہیں: هِيَ مَوْلٰىكُمْ، ''دوزخ ہی تمھاری مَولیٰ ہے''۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہی تمھارے لیے موزوں جگہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کو تو تم نے اپنا مَولیٰ بنایا نہیں کہ وہ تمھاری خبر گیری کرے، اب تو دوزخ ہی تمھاری مَولیٰ ہے، وہی تمھاری خوب خبر گیری کرے گی۔

۲۸- یہاں پھر ''ایمان لانے والوں'' کے الفاظ تو عام ہیں مگر ان سے مُراد تمام مسلمان نہیں بلکہ مسلمانوں کا وہ خاص گروہ ہے جو ایمان کا اقرار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں شامل ہو گیا تھا اور اس کے باوجود اسلام کے درد سے اس کا دل خالی تھا۔ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کفر کی تمام طاقتیں اسلام کو مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہیں، چاروں طرف سے اُنھوں نے اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پر نرغہ کر رکھا ہے، عرب کی سرزمین میں جگہ جگہ مسلمان تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے ہیں، ملک کے

اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ
كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾

پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدّت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟[۲۹] خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں، شاید کہ تم عقل سے کام لو۔[۳۰]

گوشے گوشے سے مظلوم مسلمان سخت بے سروسامانی کی حالت میں پناہ لینے کے لیے مدینے کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں، مخلص مسلمانوں کی کمر ان مظلوموں کو سہارا دیتے دیتے ٹوٹی جا رہی ہے، اور دشمنوں کے مقابلے میں بھی یہی مخلص مومن سربکف ہیں، مگر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ایمان کا دعویٰ کرنے والا یہ گروہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اِس پر اُن لوگوں کو شرم دلائی جا رہی ہے کہ تم کیسے ایمان لانے والے ہو؟ اسلام کے لیے حالات نزاکت کی اِس حد کو پہنچ چکے ہیں، کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ کا ذکر سُن کر تمھارے دل پگھلیں اور اس کے دین کے لیے تمھارے دلوں میں ایثار و قربانی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو؟ کیا ایمان لانے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اللہ کے دین پر بُرا وقت آئے اور وہ اس کی ذرا سی ٹیس بھی اپنے دل میں محسوس نہ کریں؟ اللہ کے نام پر انھیں پکارا جائے اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں؟ اللہ اپنی نازل کردہ کتاب میں خود چندے کی اپیل کرے، اور اسے اپنے ذمے قرض قرار دے، اور صاف صاف یہ بھی سُنا دے کہ ان حالات میں جو اپنے مال کو میرے دین سے عزیز تر رکھے گا وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہوگا، اِس پر بھی ان کے دل نہ خدا کے خوف سے کانپیں، نہ اس کے حکم کے آگے جھکیں؟

۲۹ — یعنی یہود و نصاریٰ تو اپنے انبیاؑ کے سیکڑوں برس بعد آج تمھیں اِس بے حسی اور رُوح کی مُردنی اور اَخلاق کی پستی میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ کیا تم اِتنے گئے گزرے ہو کہ ابھی رسول تمھارے سامنے موجود ہے، خدا کی کتاب نازل ہو رہی ہے، تمھیں ایمان لائے کچھ زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا ہے، اور ابھی سے تمھارا حال وہ ہو رہا ہے جو صدیوں تک خدا کے دین اور اس کی آیات سے کھیلتے رہنے کے بعد یہود و نصاریٰ کا ہوا ہے؟

۳۰ — یہاں جس مناسبت سے یہ بات ارشاد ہوئی ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر نبوت اور کتاب کے نُزول کو بارش کی برکات سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ انسانیت پر اس کے وہی اثرات مترتّب ہوتے ہیں جو زمین پر بارش کے ہُوا کرتے ہیں۔ جس طرح مُردہ پڑی ہوئی زمین بارانِ رحمت کا ایک چھینٹا پڑتے ہی لہلہا اُٹھتی ہے، اسی طرح جس مُلک میں اللہ کی رحمت سے ایک نبی مبعوث ہوتا ہے اور وحی و کتاب کا نزول شروع ہوتا ہے، وہاں مری ہوئی انسانیت

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ

مَردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات[۳۱] دینے والے ہیں اور جنھوں نے اللہ کو قرضِ حَسَن دیا ہے، اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بہترین اجر ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں[۳۲] وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق[۳۳] اور شہید ہیں[۳۴]، اُن کے لیے اُن کا اجر اور

یکایک جی اُٹھتی ہے۔ اُس کے وہ جوہر کھُلنے لگتے ہیں جنھیں زمانہ ہائے دراز سے جاہلیّت نے پیوندِ خاک کر رکھا تھا۔ اُس کے اندر سے اَخلاقِ فاضلہ کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور خیرات وحَسَنات کے گلزار لہلہانے لگتے ہیں۔ اِس حقیقت کی طرف جس غرض کے لیے یہاں اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ضعیف الایمان مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنی حالت پر غور کریں۔ نبوت اور وحی کے بارانِ رحمت سے انسانیت جس شان سے ازسرِ نو زندہ ہو رہی تھی اور جس طرح اس کا دامن برکات سے مالا مال ہو رہا تھا، وہ ان کے لیے کوئی دُور کی داستان نہ تھی۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے صحابۂ کرامؓ کے پاکیزہ معاشرے میں اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ رات دن اس کا تجربہ اُن کو ہو رہا تھا۔ جاہلیّت بھی اپنے تمام مفاسد کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی، اور اسلام سے پیدا ہونے والے مَحاسن بھی اُن کے مقابلے میں اپنی پُوری بہار دکھا رہے تھے۔ اس لیے ان کو تفصیل کے ساتھ یہ باتیں بتانے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس یہ اشارہ کر دینا کافی تھا کہ مُردہ زمین کو اللہ اپنے بارانِ رحمت سے کس طرح زندگی بخشتا ہے، اس کی نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی گئی ہیں، اب تم خود عقل سے کام لے کر اپنی حالت پر غور کر لو کہ اس نعمت سے تم کیا فائدہ اُٹھا رہے ہو۔

۳۱- صَدَقہ اُردو زبان میں تو بہت ہی بُرے معنوں میں بولا جاتا ہے، مگر اسلام کی اصطلاح میں یہ اُس عَطِیّے کو کہتے ہیں جو سچے دل اور خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، جس میں کوئی ریاکاری نہ ہو، کسی پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لیے دے کہ وہ اپنے رب کے لیے عُبودیّت کا سچّا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ لفظ صِدق سے ماخوذ ہے، اس لیے صداقت عین اس کی حقیقت میں شامل ہے۔ کوئی عَطِیّہ اور کوئی صَرفِ مال اُس وقت تک صَدَقہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تہ میں اِنفاق فی سبیل اللہ کا خالص اور بے کھوٹ جذبہ موجود نہ ہو۔

۳۲- یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ صادق الایمان لوگ ہیں جن کا طرزِ عمل جھوٹے مُدّعیانِ ایمان اور ضعیف الایمان لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ جو اُس وقت ایک دوسرے سے بڑھ کر مالی قربانیاں دے رہے تھے اور اللہ کے دین کی خاطر جانیں لڑا رہے تھے۔

۳۳- یہ صِدق کا مبالغہ ہے۔ صادق سچّا، اور صِدّیق نہایت سچّا۔ مگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ صِدق محض سچّے اور مطابقِ حقیقت قول کو نہیں کہتے، بلکہ اس کا اطلاق صرف اُس قول پر ہوتا ہے جو بجائے خود بھی سچّا ہو اور جس کا قائل بھی سچّے دل سے اُس حقیقت کو مانتا ہو جسے وہ زبان سے کہہ رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تو یہ بات بجائے خود عین حقیقت کے مطابق ہے، کیونکہ آپؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں، لیکن وہ شخص اپنے اِس قول میں صادق صرف اُسی وقت کہا جائے گا جب کہ اس کا اپنا عقیدہ بھی یہی ہو کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لہٰذا صِدق کے لیے ضروری ہے کہ قول کی مطابقت حقیقت کے ساتھ بھی ہو اور قائل کے ضمیر کے ساتھ بھی۔ اسی طرح صدق کے مفہوم میں وفا اور خلوص اور عملی راست بازی بھی شامل ہے۔ صادق الوعد (وعدے کا سچّا) اس شخص کو کہیں گے جو عملاً اپنا وعدہ پُورا کرتا ہو اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا ہو۔ صَدِیق (سچّا دوست) اسی کو کہا جائے گا جس نے آزمایش کے مواقع پر دوستی کا حق ادا کیا ہو اور کبھی آدمی کو اس سے بے وفائی کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ جنگ میں صادق فی القتال (سچّا سپاہی) صرف وہی شخص کہلائے گا جو جان توڑ کر لڑا ہو اور جس نے اپنے عمل سے اپنی بہادری ثابت کر دی ہو۔ پس صِدق کی حقیقت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قائل کا عمل اُس کے قول سے مطابقت رکھتا ہو۔ قول کے خلاف عمل کرنے والا صادق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بنا پر تو آپ اُس شخص کو جھوٹا واعظ کہتے ہیں جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ اب غور کرنا چاہیے کہ یہ تعریف جب صِدق اور صادق کی ہے تو مبالغے کے صیغے میں کسی کو صدّیق کہنے کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کے معنٰی لازماً ایسے راست باز آدمی کے ہیں جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو، جو کبھی حق اور راستی سے نہ ہٹا ہو، جس سے یہ توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو کہ وہ کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہے گا، جس نے کسی بات کو مانا ہو تو پُورے خلوص کے ساتھ مانا ہو، اُس کی وفاداری کا حق ادا کیا ہو، اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہو کہ وہ فی الواقع ویسا ہی ماننے والا ہے جیسا ایک ماننے والے کو ہونا چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۹۹)

۳۴- اس آیت کی تفسیر میں اکابر مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ عباسؓ، مَسرُوق، ضحّاک، مُقاتل بن حیّان وغیرہ کہتے ہیں کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ پر ایک جملہ ختم ہو گیا۔ اُس کے بعد وَ الشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ ایک الگ مستقل جُملہ ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، وہی صِدّیق ہیں۔ اور شُہدا کے لیے اُن کے رب کے ہاں اُن کا اجر اور اُن کا نُور ہے۔" بخلاف اس کے مجاہدؒ اور متعدّد دوسرے مفسّرین اس پُوری عبارت کو ایک ہی جملہ مانتے ہیں اور ان کی تفسیر کے لحاظ سے ترجمہ وہ ہوگا جو اُوپر ہم نے متن میں کیا ہے۔ دونوں تفسیروں میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پہلے گروہ نے شہید کو مقتول فی سبیل اللہ کے معنٰی میں لیا ہے، اور یہ دیکھ کر کہ ہر مومن اس معنٰی میں شہید نہیں ہوتا، انھوں نے وَ الشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ کو ایک الگ جملہ قرار دے دیا ہے۔ مگر دوسرا گروہ شہید کو مقتول فی سبیل اللہ کے معنٰی میں نہیں بلکہ حق کی گواہی دینے والے کے معنٰی میں لیتا ہے، اور اس لحاظ سے ہر مومن شہید ہے۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری تفسیر قابلِ ترجیح ہے اور قرآن و حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ نُوۡرُہُمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ
الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۹﴾ ع اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ
وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ
اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ
حُطَامًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ

اُن کا نُور ہے [35]۔ اور جن لوگوں نے کُفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جُھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں ع

خُوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمھارا آپس میں ایک دُوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دُوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی۔ پھر وہ بُھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اِس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ (البقرہ: ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک متوسط اُمّت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔
ہُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِیۡ ہٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚۖ (الحج: ۷۸)	اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔

حدیث میں حضرت براءؓ بن عازب کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے یہ فرماتے سُنا: مؤمنوا امتی شھدآء، "میری اُمّت کے مومن شہید ہیں"، پھر حضورؐ نے سورۂ حدید کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (ابن جریر) ابن مَردُویہ نے اسی معنیٰ میں حضرت ابوالدَّرداءؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من فرّ بدینہ من ارضٍ مخافۃ الفتنۃ علی نفسہ ودینہ کتب عند اللہ صدیقا فاذا مات قبضہ اللہ شھیدًا ثم تلا ھٰذہ الاٰیۃ "جو شخص اپنی جان اور اپنے دین کو فتنے سے بچانے کے لیے کسی سرزمین سے نکل جائے، وہ اللہ کے ہاں

رِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى
مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ

اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔[۳۶] دَوڑو اور ایک دُوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو[۳۷] اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین

صدیق لکھا جاتا ہے، اور جب وہ مرتا ہے تو اللہ شہید کی حیثیت سے اس کی رُوح قبض فرماتا ہے"، پھر یہ بات ارشاد فرمانے کے بعد حضورؐ نے یہی آیت پڑھی۔ (شہادت کے اس مفہوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴۔ النساء، حاشیہ ۹۹۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۲)

۳۵- یعنی ان میں سے ہر ایک جس مرتبے کے اجر اور جس درجے کے نُور کا مستحق ہوگا، وہ اس کو ملے گا۔ وہ اپنا اپنا اجر اور اپنا اپنا نُور پائیں گے۔ اُن کے لیے ان کا حصّہ آج ہی سے محفوظ ہے۔

۳۶- اس مضمون کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے: سورۂ آلِ عمران، آیات ۱۴-۱۵، یونس: ۲۴-۲۵، ابراہیم: ۱۸، الکہف: ۴۵-۴۶، النور: ۳۹۔ اِن سب مقامات پر جو بات انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی دراصل ایک عارضی زندگی ہے۔ یہاں کی بہار بھی عارضی ہے اور خزاں بھی عارضی۔ دل بہلانے کا سامان یہاں بہت کچھ ہے، مگر درحقیقت وہ نہایت حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں، جنھیں اپنی کم ظرفی کی وجہ سے آدمی بڑی چیز سمجھتا ہے اور اِس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ انھی کو پالینا گویا کامیابی کے منتہا تک پہنچ جانا ہے۔ حالانکہ جو بڑے سے بڑے فائدے اور لطف و لذّت کے سامان بھی یہاں حاصل ہونے ممکن ہیں، وہ بہت حقیر اور صرف چند سال کی حیاتِ مستعار تک محدود ہیں، اور ان کا حال بھی یہ ہے کہ تقدیر کی ایک ہی گردش خود اِسی دنیا میں ان سب پر جھاڑو پھیر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس آخرت کی زندگی ایک عظیم اور ابدی زندگی ہے۔ وہاں کے فائدے بھی عظیم اور مستقل ہیں اور نقصان بھی عظیم اور مستقل۔ کسی نے اگر وہاں اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی پالی تو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ نعمت نصیب ہوگئی جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت و حکومت بھی ہیچ ہے۔ اور جو وہاں خدا کے عذاب میں گرفتار ہوگیا، اس نے اگر دنیا میں وہ سب کچھ بھی پالیا ہو جسے وہ اپنے نزدیک بڑی چیز سمجھتا تھا، تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بڑے خسارے کا سودا کر کے آیا ہے۔

۳۷- اصل میں لفظ سَابِقُوْٓا استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم محض "دوڑو" کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ مُسابقت کے معنی مقابلے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کی دولت اور لذّتیں اور فائدے سمیٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی جو کوشش کر رہے ہو، اسے چھوڑ کر اِس چیز کو ہدفِ مقصود بناؤ اور اِس کی طرف دوڑنے میں بازی جیت لے جانے کی کوشش کرو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا

جیسی ہے[۳۸]، جو مہیّا کی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔
یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔
کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمھارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے[۳۹] ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔[۴۰] ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔[۴۱]
(یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمھیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمھیں

۳۸- اصل الفاظ ہیں: عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ بعض مفسّرین نے عرض کو چوڑائی کے معنیٰ میں لیا ہے۔ لیکن دراصل یہاں یہ لفظ وسعت و پہنائی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ''عرض'' صرف چوڑائی ہی کے لیے نہیں بولا جاتا جو طول کا مدِّمقابل ہے، بلکہ اسے مجرّد وسعت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ، ''انسان پھر لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔'' (حٰمٓ السجدہ:۵۱) اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اس ارشاد سے مقصود جنت کا رقبہ بتانا نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت کا تصوّر دلانا ہے۔ یہاں اس کی وسعت آسمان و زمین جیسی بتائی گئی ہے، اور سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے: سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ (آیت:۱۳۳) ''دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت ساری کائنات ہے، جو مہیّا کی گئی ہے متّقی لوگوں کے لیے۔'' ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے کچھ ایسا تصوّر ذہن میں آتا ہے کہ جنت میں ایک انسان کو جو باغ اور محلات ملیں گے، وہ تو صرف اُس کے قیام کے لیے ہوں گے، مگر درحقیقت پُوری کائنات اُس کی سیر گاہ ہوگی۔ کہیں وہ بند نہ ہوگا۔ وہاں اس کا حال اِس دنیا کی طرح نہ ہوگا کہ چاند جیسے قریب ترین سیارے تک پہنچنے کے لیے بھی وہ برسوں پاپڑ بیلتا رہا اور اِس ذرا سے سفر کی مشکلات کو رفع کرنے میں اسے بے تحاشا وسائل صرف کرنے پڑے۔ وہاں ساری کائنات اس کے لیے کُھلی ہوگی، جو کچھ چاہے گا اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لے گا، اور جہاں چاہے گا بے تکلّف جا سکے گا۔

بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۙ ﴿۲۳﴾ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ

عطا فرمائے اس پر پھُول نہ جاؤ۔[۴۲] اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بُخل کرتے ہیں اور دُوسروں کو بُخل کرنے پر اکساتے ہیں[۴۳]۔ اب اگر کوئی رُوگردانی کرتا ہے تو اللہ

۳۹- ''اُس کو'' کا اشارہ مصیبت کی طرف بھی ہو سکتا ہے، زمین کی طرف بھی، نفس کی طرف بھی، اور فحوائے کلام کے لحاظ سے مخلوقات کی طرف بھی۔

۴۰- کتاب سے مراد ہے نَوِشتۂ تقدیر۔

۴۱- یعنی اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کی تقدیر پہلے سے لکھ دینا اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۴۲- اس سلسلۂ بیان میں یہ بات جس غرض کے لیے فرمائی گئی ہے، اسے سمجھنے کے لیے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جو اِس سورت کے نُزول کے وقت اہلِ ایمان کو پیش آ رہے تھے۔ ہر وقت دشمنوں کے حملے کا خطرہ، پے در پے لڑائیاں، دائماً محاصرے کی سی کیفیت، کفّار کے مَعاشی مقاطعے کی وجہ سے سخت بدحالی، عرب کے گوشے گوشے میں ایمان لانے والوں پر کفار کا ظلم وستم، یہ کیفیات تھیں جن سے مسلمان اُس وقت گزر رہے تھے۔ کفّار اِن کو مسلمانوں کے مخذول اور راندۂ درگاہ ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے۔ منافقین اِنھیں اپنے شکوک وشبہات کی تائید میں استعمال کرتے تھے۔ اور مخلص اہلِ ایمان اگرچہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اِن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے، مگر بعض اوقات مصائب کا ہجوم ان کے لیے بھی انتہائی صبر آزما ہو جاتا تھا۔ اس پر مسلمانوں کو تسلّی دینے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر کوئی مصیبت بھی معاذ اللہ تمھارے رب کی بے خبری میں نازل نہیں ہو گئی ہے۔ جو کچھ پیش آ رہا ہے، یہ سب اللہ کی طے شدہ اسکیم کے مطابق ہے، جو پہلے سے اس کے دفتر میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ اور اِن حالات سے تمھیں اس لیے گزارا جا رہا ہے کہ تمھاری تربیت پیشِ نظر ہے۔ جو کارِ عظیم اللہ تعالیٰ تم سے لینا چاہتا ہے، اس کے لیے یہ تربِیَت ضروری ہے۔ اس سے گزارے بغیر تمھیں کامیابی کی منزل پر پہنچا دیا جائے تو تمھاری سیرت میں وہ خامیاں باقی رہ جائیں گی جن کی بدولت نہ تم عظمت واقتدار کی ثقیل خوراک ہضم کر سکو گے اور نہ باطل کی طوفان خیز موجوں کے تھپیڑے سہ سکو گے۔

۴۳- یہ اشارہ ہے اُس سیرت کی طرف جو خود مُسلم معاشرے کے منافقین میں اُس وقت سب کو نظر آ رہی تھی۔ ظاہری اقرارِ ایمان کے لحاظ سے اُن میں اور مُخلص مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن اخلاص کے فُقدان کی وجہ سے وہ اُس تربیت میں شامل نہ ہوئے تھے جو مُخلصین کو دی جا رہی تھی، اس لیے ان کا حال یہ تھا کہ جو ذرا سی خوش حالی اور مَشیخت اُن کو عرب کے ایک معمولی قصبے میں میسّر آئی ہوئی تھی، وہی اُن کے چھوٹے سے ظرف کو پُھلائے دے رہی تھی، اُسی پر وہ پھٹے پڑتے تھے، اور دل کی تنگی اِس درجے کی تھی کہ جس خدا پر ایمان لانے اور جس رسول کے پیرو ہونے اور جس دین کو ماننے کا دعویٰ

Maktaba Tul Ishaat.com

الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ

بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔[۴۴]

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں[۴۵]، اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے مَنافع ہیں[۴۶]۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ

کرتے تھے، اس کے لیے خود ایک پیسا تو کیا دیتے، دوسرے دینے والوں کو بھی یہ کہہ کر روکتے تھے کہ کیوں اپنا پیسا اِس بھاڑ میں جھونک رہے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مصائب کی بھٹّی گرم نہ کی جاتی تو اس کھوٹے مال کو، جو اللہ کے کسی کام کا نہ تھا، زرِ خالص سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا، اور اُس کو الگ کیے بغیر کچے پکّے مسلمانوں کی ایک مخلوط بِھیڑ کو دنیا کی امامت کا وہ منصبِ عظیم نہ سونپا جا سکتا تھا جس کی عظیم الشان برکات کا مشاہدہ آخر کار دنیا نے خلافتِ راشدہ میں کیا۔

۴۴ – یعنی یہ کلماتِ نصیحت سننے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے دین کے لیے خلوص، فرمانبرداری اور ایثار و قربانی کا طریقہ اختیار نہیں کرتا اور اپنی اُسی کج روی پر اَڑا رہنا چاہتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے، تو اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں۔ وہ غنی ہے، اس کی کوئی حاجت اِن لوگوں سے اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اور وہ ستودہ صفات ہے، اُس کے ہاں اچھی صفات رکھنے والے لوگ ہی مقبول ہو سکتے ہیں، بدکردار لوگ اُس کی نگاہِ التفات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

۴۵ – اس مختصر سے فقرے میں انبیا علیہم السلام کے مشن کا پُورا لُبِّ لُباب بیان کر دیا گیا ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں خدا کے جتنے رسول بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے، وہ سب تین چیزیں لے کر آئے تھے:

(۱) بیّنات، یعنی کھلی کھلی نشانیاں، جو واضح کر رہی تھیں کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں، بنے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔ روشن دلائل، جو اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی تھے کہ جس چیز کو وہ حق کہہ رہے ہیں وہ واقعی حق ہے، اور جس چیز کو وہ باطل قرار دے رہے ہیں وہ واقعی باطل ہے۔ واضح ہدایات، جن میں کسی اشتباہ کے بغیر صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ عقائد، اَخلاق، عبادات اور معاملات میں لوگوں کے لیے راہِ راست کیا ہے جسے وہ اختیار کریں، اور غلط راستے کون سے ہیں جن سے وہ اجتناب کریں۔

ع ۱۹

مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ ع

کون اُس کو دیکھے بغیر اس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے ۴۷ ع

(۲) کتاب، جس میں وہ ساری تعلیمات لکھ دی گئی تھیں جو انسان کی ہدایت کے لیے درکار تھیں، تا کہ لوگ رہنمائی کے لیے اُس کی طرف رُجوع کر سکیں۔

(۳) میزان، یعنی وہ معیارِ حق و باطل جو ٹھیک ٹھیک ترازُو کی تول تول کر یہ بتا دے کہ افکار، اخلاق اور معاملات میں اِفراط و تفریط کی مختلف انتہاؤں کے درمیان انصاف کی بات کیا ہے۔

اِن تین چیزوں کے ساتھ انبیا علیہم السّلام کو جس مقصد کے لیے بھیجا گیا،وہ یہ تھا کہ دنیا میں انسان کا رَویّہ اور انسانی زندگی کا نظام، فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، عدل پر قائم ہو۔ ایک طرف ہر انسان اپنے خدا کے حُقوق، اپنے نفس کے حقوق اور اُن تمام بندگانِ خدا کے حقوق، جن سے اُس کو کسی طور پر سابقہ پیش آتا ہے، ٹھیک ٹھیک جان لے اور پُورے انصاف کے ساتھ اُن کو ادا کرے۔ اور دوسری طرف اجتماعی زندگی کا نظام ایسے اُصولوں پر تعمیر کیا جائے جن سے معاشرے میں کسی نوعیت کا ظلم باقی نہ رہے، تمدّن و تہذیب کا ہر پہلو اِفراط و تفریط سے محفوظ ہو، حیاتِ اجتماعی کے تمام شعبوں میں صحیح صحیح توازُن قائم ہو، اور معاشرے کے تمام عناصر انصاف کے ساتھ اپنے حُقوق پائیں اور اپنے فرائض ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر، انبیا علیہم السلام کی بِعثت کا مقصود عدلِ انفرادی بھی تھا اور عدلِ اجتماعی بھی۔ وہ ایک ایک فرد کی شخصی زندگی میں بھی عدل قائم کرنا چاہتے تھے، تا کہ اس کے ذہن، اس کی سیرت، اس کے کردار اور اس کے برتاؤ میں توازُن پیدا ہو۔ اور انسانی معاشرے کے پُورے نظام کو بھی عدل پر قائم کرنا چاہتے تھے، تا کہ فرد اور جماعت دونوں ایک دوسرے کی روحانی، اَخلاقی اور مادّی فلاح میں مانع و مزاحم ہونے کے بجائے معاون و مددگار ہوں۔

۴۶ - ''لوہا اُتارنے'' کا مطلب زمین میں لوہا پیدا کرنا ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ قرآن میں فرمایا: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزُّمَر:۶) ''اُس نے تمھارے لیے مویشیوں کی قسم کے آٹھ نر و مادہ اُتارے۔'' چونکہ زمین میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں آیا ہے، خود بخود نہیں بن گیا ہے، اس لیے ان کے پیدا کیے جانے کو قرآنِ مجید میں نازل کیے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انبیا علیہم السّلام کے مشن کو بیان کرنے کے معاً بعد یہ فرمانا کہ ''ہم نے لوہا نازل کیا، جس میں بڑا زور اور لوگوں کے لیے منافع ہیں''، خود بخود اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی طاقت ہے، اور کلام کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُولوں کو قیامِ عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اُس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوّت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اُسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اُس کی مزاحمت کرنے والوں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ
وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ (۲۶) ثُمَّ قَفَّيْنَا

ہم[۴۸] نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور اُن دونوں کی نسل میں نبوّت اور کتاب رکھ دی۔[۴۹] پھر ان کی
اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے۔[۵۰] اُن کے بعد ہم نے پے در پے

کا زور توڑا جا سکے۔

۴۷ – یعنی اللہ کو اِس مدد کی ضرورت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے، اپنی طاقت سے یہ کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ طریقِ کار اس نے انسانوں کی آزمائش کے لیے اختیار فرمایا ہے اور اِسی آزمائش سے گزر کر انسان اپنی ترقی اور فلاح کی راہ پر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اللہ تو ہر وقت یہ قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے اپنے ایک اشارے سے تمام کافروں کو مغلوب کر دے اور اپنے رسولوں کو اُن پر غلبہ و تسلّط عطا فرما دے۔ مگر اِس میں پھر رسولوں پر ایمان لانے والوں کا کیا کمال ہو گا جس کی بنا پر وہ کسی انعام کے مستحق ہوں؟ اسی لیے اللہ نے اس کام کو اپنی غالب قدرت سے انجام دینے کے بجائے طریقِ کار یہ اختیار فرمایا کہ اپنے رسولوں کو بیّنات اور کتاب اور میزان دے کر انسانوں کے درمیان مبعوث کر دیا۔ ان کو اس بات پر مامور فرمایا کہ لوگوں کے سامنے عدل کا راستہ پیش کریں اور ظلم و جور اور بے انصافی سے باز آ جانے کی اُن کو دعوت دیں۔ انسانوں کو اِس امر کا پُورا اختیار دے دیا کہ ان میں سے جو چاہے رسولوں کی دعوت قبول کرے اور جو چاہے اسے ردّ کر دے۔ قبول کرنے والوں کو پکارا کہ آؤ، اِس عدل کے نظام کو قائم کرنے میں میرا اور میرے رسولوں کا ساتھ دو اور اُن لوگوں کے مقابلے میں جان توڑ جدّوجُہد کرو جو ظلم و جور کے نظام کو باقی رکھنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہیں جو انصاف کی بات کو ردّ کرتے ہیں، اور کون ہیں جو انصاف کے مقابلے میں بے انصافی قائم رکھنے کے لیے اپنی جان لڑاتے ہیں، اور کون ہیں جو انصاف کی بات قبول کر لینے کے بعد اُس کی حمایت اور اُس کی خاطر جدّوجُہد کرنے سے جی چُراتے ہیں، اور کون ہیں جو اَن دیکھے خدا کی خاطر دنیا میں اِس حق کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اِس امتحان سے جو لوگ کامیاب ہو کر نکلیں گے، انھی کے لیے آیندہ ترقیوں کے دروازے کھُلیں گے۔

۴۸ – اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو رسول بیّنات اور کتاب اور میزان لے کر آئے تھے، ان کے ماننے والوں میں کیا بگاڑ پیدا ہوا۔

۴۹ – یعنی جو رسول بھی اللہ کی کتاب لے کر آئے، وہ حضرت نوحؑ کی، اور ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے۔

۵۰ – یعنی نافرمان ہو گئے، اللہ کی اطاعت کے دائرے سے نکل گئے۔

عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيۡنَا بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ ۙ وَجَعَلۡنَا فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَ رَهۡبَانِيَّةَ اۨبۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ

اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو مبعوث کیا اور اُس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی اُن کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔[۵۱] اور رہبانیت[۵۲] انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی[۵۳]

۵۱– اصل الفاظ ہیں: رافت اور رحمت۔ یہ دونوں لفظ قریب قریب ہم معنیٰ ہیں، مگر جب یہ ایک ساتھ بولے جاتے ہیں تو رافت سے مراد وہ رقیق القلبی ہوتی ہے جو کسی کو تکلیف و مصیبت میں دیکھ کر ایک شخص کے دل میں پیدا ہو۔ اور رحمت سے مراد وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ اس کی مدد کی کوشش کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام چونکہ نہایت رقیق القلب اور خلقِ خدا کے لیے رحیم و شفیق تھے، اس لیے ان کی سیرت کا یہ اثر ان کے پیرووں میں سرایت کر گیا کہ وہ اللہ کے بندوں پر ترس کھاتے تھے اور ہمدردی کے ساتھ ان کی خدمت کرتے تھے۔

۵۲– اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیت بھی۔ اس کا مادّہ رَہب ہے، جس کے معنیٰ خوف کے ہیں۔ رَہبانیّت کا مطلب ہے: مسلکِ خوف زدگی، اور رُہبانیت کے معنیٰ ہیں: مسلکِ خوف زدگان۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو، یا دنیا کے فتنوں کا خوف، یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا، یا گوشہ ہائے عُزلت میں جا بیٹھنا۔

۵۳– اصل الفاظ ہیں: اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ۔ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہم نے اُن پر اس رہبانیّت کو فرض نہیں کیا تھا، بلکہ جو چیز اُن پر فرض کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ یہ رہبانیّت ہماری فرض کی ہوئی نہ تھی، بلکہ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے اسے خود اپنے اُوپر فرض کر لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ رہبانیّت ایک غیر اسلامی چیز ہے اور یہ کبھی دینِ حق میں شامل نہیں رہی ہے۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کہ لَا رَهۡبَانِيَّةَ فِي الۡاِسۡلَامِ، ”اسلام میں کوئی رہبانیّت نہیں۔“ (مُسندِ احمد) ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا: رهبانية هٰذه الامّة الجهاد فی سبیل اللّٰه، ”اِس اُمت کی رہبانیّت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ (مُسندِ احمد، مُسندِ ابی یَعلیٰ) یعنی اِس اُمت کے لیے روحانی ترقی کا راستہ ترکِ دنیا نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے، اور یہ اُمت فتنوں سے ڈر کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نہیں بھاگتی بلکہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡهُمۡ اَجۡرَهُمۡ ۚ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾

اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔[۵۴] اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے اُن کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

راہِ خدا میں جہاد کر کے اُن کا مقابلہ کرتی ہے۔ بخاری و مسلم کی مُتَّفَق عَلَیْہ روایت ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک صاحب نے کہا: "میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔" دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔" تیسرے نے کہا: "میں کبھی شادی نہ کروں گا اور عورت سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا: اما واللہ انی لأخشاکم للہ واتقاکم لہٗ لکنی اصوم وأفطر وأصلّی وارقُد واتزوج النساء، فمن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔ "خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اُس سے تقویٰ کرتا ہوں۔ مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس کو میرا طریقہ پسند نہ ہو اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔" حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوما شددوا فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھُمْ فی الصّوامع والدیار۔ "اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے یہی تشدُّد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی پھر اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو، وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود ہیں۔" (ابوداؤد)

۵۴ – یعنی وہ دُہری غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک غلطی یہ کہ اپنے اُوپر وہ پابندیاں عائد کیں جن کا اللہ نے کوئی حکم نہ دیا تھا۔ اور دوسری غلطی یہ کہ جن پابندیوں کو اپنے نزدیک اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھ کر خود اپنے اُوپر عائد کر بیٹھے تھے اُن کا حق ادا نہ کیا اور وہ حرکتیں کیں جن سے اللہ کی خوشنودی کے بجائے اُلٹا اس کا غضب مول لے بیٹھے۔

اِس مقام کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے ایک نظر مسیحی رہبانیّت کی تاریخ پر ڈال لینی چاہیے:

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے ناآشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیّت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیُّلات اُس کے اندر موجود تھے جو اِس چیز کو جنم دیتے ہیں۔ ترک و تجرید کو اَخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرُّد کو تقدُّس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خانہ داری کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی اور رہبانیت

ایک وبا کی طرح مسیحیّت میں پھیلنی شروع ہوئی۔ تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیّت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی، اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علما نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے عِفّت پر اتنا زور دیا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا، خواہ وہ نکاح ہی کی صورت میں ہو۔ انھوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دین دار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی اَملاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اَخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مُفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذّت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترکِ لذّات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قَلع قَمع کر دینا اَخلاق کا مقصود بن گیا، اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا آدمی کی روحانیت کا کمال اور اُس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے یہ کہ مسیحیّت جب کامیابی کے دَور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اُس بُرائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیا پرستی نے قدیم معبُودوں کی جگہ لے لی۔ ہورَس (Horus) اور آئسِس (Isis) کے مجسّموں کی جگہ مسیحؑ اور مریمؑ کے بُت پوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری و غیب گوئی، جن بھوت بھگانے کے عمل، سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔ اسی طرح چونکہ عوام اُس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھَٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصوّر مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصّوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصّل شریعت اور کوئی واضح سنّت موجود نہ تھی۔ شریعتِ موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علما کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے مُتأثّر ہو کر اور کچھ خود اپنے رُجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انھی بدعتوں میں سے ایک تھی۔ مسیحی مذہب کے علما اور ائمّہ نے اُس کا فلسفہ اور اُس کا طریقِ کار بدھ مذہب کے بھِکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری فقرا (anchorites) سے، ایران کے مانویّوں سے، اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اِشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیۂ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ، اور تقرّب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اِس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی (یعنی نُزُولِ قرآن کے زمانے) تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیّت کے اکابر علما، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں، سینٹ اَتھاناسیوس، سینٹ باسِل، سینٹ گریگوری نازیانزین، سینٹ کرائی سُوسٹَم، سینٹ اَیمبرُوز، سینٹ جیرُوم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم، سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست عَلَم بردار تھے۔ انھی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ اَینتھنی (St.Anthony) تھا جو ۲۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فَیُّوم کے علاقے میں پَسپِیر کے مقام پر (جو اَب دَیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحرِ احمر کے ساحل پر قائم کی، جسے اب دَیر مار اَنطُونیُوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اُسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔ اِس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہوگئیں، جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک اور مسیحی ولی پاخومِیُوس نمودار ہُوا، جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین و راہبات کے لیے بنائیں۔ اِس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقا و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اوّل اوّل اِس رہبانیت کے معاملے میں سخت اُلجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترکِ دنیا اور تجرّد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا، مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھیرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اَتھاناسِیُوس (مُتوفّٰی ۳۷۳ء)، سینٹ باسِل (مُتوفّٰی ۳۷۹ء)، سینٹ آگسٹائن (مُتوفّٰی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (مُتوفّٰی ۶۰۹ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

اِس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جنھیں ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیّتیں دینا۔ اس معاملے میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ عیسائی اولیا کے تذکروں میں اِن لوگوں کے جو کمالات بیان کیے گئے ہیں، وہ کچھ اس قسم کے ہیں: اسکندریہ کا سینٹ مَکارِیُوس ہر وقت اپنے جسم پر ۸۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ ۶ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے بَرَہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یُوسِیبِیُوس نے پیر سے بھی بڑھ کر ریاضت کی۔ وہ ۱۵۰ پونڈ کا بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا اور ۳ سال تک ایک خشک کنویں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابِیُوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینا بھر پانی میں بھیگ کر بدبُودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بِیسارِیون ۴۰ دن تک خار دار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور ۴۰ سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخُومیوس نے ۱۵ سال، اور ایک رِوایَت کے مطابق ۵۰ سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پُوری مدّت میں وہ نہ کبھی بیٹھا نہ لیٹا۔ آرام کے لیے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا صرف وہ تبرّک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لیے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سِیمیُون اِسٹائلائٹ (۳۹۰ء - ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے، ہر ایسٹر سے پہلے پُورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پُورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنویں میں جا رہتا تھا۔ آخر کار اُس نے شمالی شام کے قَلْعَہِ سِیمان کے قریب ۶۰ فٹ بلند ایک ستون بنوایا جس کا بالائی حصّہ صرف تین فُٹ کے گھیر میں تھا اور اُوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اِس ستون پر اس نے پُورے تیس سال گزار دیے۔ دھوپ، بارش،

سردی، گرمی سب اُس پر گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہ اُترتا تھا۔ اس کے مُرید سیڑھی لگا کر اس کو کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک رسّی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا، یہاں تک کہ رسّی اس کے گوشت میں پیوست ہو گئی، گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اُٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا: ”کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے۔“ مسیحی عوام دُور دُور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔

اس دَور کے عیسائی اولیا کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں، وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ کسی ولی کی تعریف یہ تھی کہ ۳۰ سال تک وہ بالکل خاموش رہا اور کبھی اسے بولتے نہ دیکھا گیا۔ کسی نے اپنے آپ کو ایک چٹان سے باندھ رکھا تھا۔ کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور گھاس پھوس کھا کر گزارا کرتا۔ کوئی بھاری بوجھ ہر وقت اُٹھائے پھرتا۔ کوئی طوق و سلاسل سے اپنے اعضا جکڑے رکھتا۔ کچھ حضرات جانوروں کے بھٹوں، یا خشک کنوؤں، یا پُرانی قبروں میں رہتے تھے۔ اور کچھ دوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے۔ ایسے ہی ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ مَیں نے خود کوہِ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پُوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے جس میں کہیں اولیا کی کھوپڑیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، کہیں پاؤں کی ہڈیاں، اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں۔ اور ایک ولی کا تو پُورا ڈھانچا ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا۔

(۲) ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔ سینٹ اَتھاناسیوس بڑی عقیدت کے ساتھ سینٹ اَینتُھنی کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخلِ مسیحیت ہوا، پُورے ۵۰ سال اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سِلوِیا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانونیٹ کی ۱۳۰ راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے، اور غسل کا تو نام سن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

(۳) اِس رہبانیت نے اِزدِواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بے دردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام مذہبی تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرُّد سب سے بڑی اَخلاقی قدر ہے، اور عفّت کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ روحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذّت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اُس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنٰی تھے، حتّٰی کہ مَسَرّت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کی مترادف تھی۔ سینٹ باسِل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انھی تصوّرات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مَردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیرُوم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ ”جو عورت مسیحؑ کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے، وہ مسیحؑ کی دُلھن ہے اور اُس عورت کی ماں کو خدا، یعنی مسیحؑ کی ساس(mother in law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔“ ایک اور مقام پر سینٹ جیرُوم کہتا ہے کہ ”عِفّت کی کلھاڑی سے اِزدِواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اوّلین کام ہے۔“ ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اُس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوش گوار اِزدِواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیحیّت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا، اس لیے نکاح کے رشتے میں رہتے ہوئے میاں اور بیوی ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے تھے۔ سینٹ نائلس(St. Nilus) دو بچّوں کا باپ تھا۔ جب اس پر رہبانیّت کا دَورہ پڑا تو اس کی بیوی روتی رہ گئی اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔ سینٹ اَمّون (St. Ammon) نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی دُلھن کو اِزدِواجی تعلق کی نجاست پر وعظ سنایا اور دونوں نے بالاتفاق طے کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ سینٹ ابراہام شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہی حرکت سینٹ ایلیکسِس (St.Alekces) نے کی۔ اس طرح کے واقعات سے عیسائی اولیا کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حُدود میں اِن انتہا پسندانہ تصوّرات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اُس زمانے میں ایک پادری کے لیے مجرّد ہونا لازم نہ تھا۔ اگر اُس نے پادری کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے شادی کر رکھی ہو تو وہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا، البتہ تقرر کے بعد شادی کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ نیز کسی ایسے شخص کو پادری مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس نے کسی بیوہ یا مُطلّقہ سے شادی کی ہو، یا جس کی دو بیویاں ہوں، یا جس کے گھر میں لونڈی ہو۔ رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پُوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو، اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گِھناؤنی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل(Council of Gengra) آخری مجلس تھی جس میں اِس طرح کے خیالات کو خلافِ مذہب ٹھیرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدّت بعد ۳۸۶ء کی رومن سیناڈ(Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ اِزدِواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائریکیس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے، اُس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔ سینٹ جیرُوم، سینٹ ایمبروز اور سینٹ آگسٹائن جیسے اکابر علما نے بڑے زور شور سے اس فیصلے کی حمایت کی، اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مغربی کلیسا میں یہ پُوری شدّت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اس دَور میں متعدِّد کونسلیں اِن شکایات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئیں کہ جو لوگ پہلے سے شادی شُدہ تھے، وہ مذہبی خدمات پر مقرر ہونے کے بعد بھی اپنی بیویوں کے ساتھ ”ناجائز“ تعلقات رکھتے ہیں۔ آخر کار ان کی اصلاح کے لیے یہ قواعد بنائے گئے کہ وہ کھلے مقامات پر سوئیں، اپنی بیویوں سے کبھی علیحدگی میں نہ ملیں، اور اُن کی ملاقات کے وقت کم از کم دو آدمی موجود ہوں۔

سینٹ گریگوری ایک پادری کی تعریف میں لکھتا ہے کہ ۴۰ سال تک وہ اپنی بیوی سے الگ رہا، حتّٰی کہ مرتے وقت جب اس کی بیوی اس کے قریب گئی تو اس نے کہا: ”عورت! دُور ہٹ جا!“

(۴) سب سے زیادہ دردناک باب اِس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی محبّت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبّت، اور باپ کے لیے اولاد کی محبّت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی اِن سارے تعلقات کو توڑ دے۔ مسیحی اولیا کے تذکروں میں اس کے ایسے ایسے دل دوز واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک راہب ایواگریس (Evagrius) سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اِن خطوں کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبّت کے جذبات نہ جاگ اُٹھیں۔ اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سِفارشی خُطوط لے کر اُس خانقاہ میں پہنچیں جس میں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں۔ مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ سینٹ مارکُس (St. Marcus) کی ماں اس سے ملنے کے لیے اُس کی خانقاہ میں گئی اور خانقاہ کے شیخ (Abbot) کی خوشامدیں کر کے اس کو راضی کیا کہ وہ بیٹے کو ماں کے سامنے آنے کا حکم دے۔ مگر بیٹا کسی طرح ماں سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ آخرکار اس نے شیخ کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ بھیس بدل کر ماں کے سامنے گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح نہ ماں نے بیٹے کو پہچانا، نہ بیٹے نے ماں کی شکل دیکھی۔ ایک اور ولی سینٹ پوئمن (St. Poemen) اور اس کے ۶ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتا معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دُور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حُجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں باہر بیٹھ کر رونے لگی اور اس نے چیخ چیخ کر کہا: ”میں اِس بڑھاپے میں اتنی دُور چل کر صرف تمھیں دیکھنے آئی ہوں، تمھارا کیا نقصان ہوگا اگر میں تمھاری شکلیں دیکھ لوں۔ کیا میں تمھاری ماں نہیں ہوں؟“ مگر ان ولیوں نے دروازہ نہ کھولا اور ماں سے کہہ دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سیمیون اِسٹائلائٹس (St. Simeon Stylites) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دُور و نزدیک پھیل گئے تو اُس کو پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بےچاری اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ پر پہنچی۔ مگر وہاں کسی عورت کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے لاکھ منت سماجت کی کہ ”بیٹا! یا تو اُسے اندر بلا لے یا باہر نکل کر اسے اپنی صورت دکھا دے۔“ مگر اس ”ولی اللہ“ نے صاف انکار کر دیا۔ تین رات اور تین دن وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑی رہی اور آخرکار وہیں لیٹ کر اس نے جان دے دی۔ تب ولی صاحب نکل کر آئے، ماں کی لاش پر آنسو بہائے اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ایسی ہی بےدردی ان ولیوں نے بہنوں کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ برتی۔ ایک شخص میوٹیس (Mutius) کا قصہ لکھا ہے کہ وہ خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سال کے اِکلوتے بیٹے کو لے کر

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک خانقاہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دل سے نکال دے۔ اس لیے پہلے تو بیٹے کو اُس سے جُدا کر دیا گیا۔ پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اُس معصوم بچے پر کی جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے۔ جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی تیار ہو گیا تو عین اُس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبۂ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو، اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہییں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "اگرچہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگرچہ تیری ماں اپنے دودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے، اگرچہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لیے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور باپ کے جسم کو روند کر ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملے میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے۔" سینٹ گریگوری لکھتا ہے کہ "ایک نوجوان راہب ماں باپ کی محبت دل سے نہ نکال سکا اور ایک رات چُپکے سے بھاگ کر اُن سے مل آیا۔ خدا نے اس قصور کی سزا اُسے یہ دی کہ خانقاہ واپس پہنچتے ہی وہ مر گیا۔ اس کی لاش زمین میں دفن کی گئی تو زمین نے اسے قبول نہ کیا۔ بار بار قبر میں ڈالا جاتا اور زمین اسے نکال کر پھینک دیتی۔ آخر کار سینٹ بینیڈکٹ نے اُس کے سینے پر تبرک رکھا، تب قبر نے اسے قبول کیا۔" ایک راہبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تین دن عذاب میں اس لیے مبتلا رہی کہ وہ اپنی ماں کی محبت دل سے نہ نکال سکی تھی۔ ایک ولی کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کے ساتھ بے دردی نہیں برتی۔

(۵) اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انھیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا، ان کے مقابلے میں یہ ظلم وستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰-۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے، اور اس آگ میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب ہی پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اِس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرین (Arian) فرقے کے بشپ نے اَتھاناسیوُس کی پارٹی پر حملہ کیا، اس کی خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں، ان کو ننگا کر کے خاردار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے، تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا، حتّٰی کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریُس (Arius) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرِل (St.Cyril) کے مرید راہبوں نے ہنگامۂ عظیم برپا کیا، یہاں تک کہ مخالف فرقے کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے، اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ۳۶۶ء میں پوپ لِبیریُس (Liberius) کی

وفات پر دو گروہوں نے پاپائی کے لیے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ دونوں کے درمیان سخت خون ریزی ہوئی۔ حتّٰی کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے ۱۳۷ لاشیں نکالی گئیں۔

(۶) اس ترک و تجرید اور فقر و درویشی کے ساتھ دولتِ دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ روم کا بِشَپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹ باٹ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جِیرُوم اپنے زمانے (چوتھی صدی کے آخری دَور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بِشَپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی (نُزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جس کسی سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو جائے، اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی جس سے فرار اُن کا طُرّۂ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی مُوجِب ہوئی، وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کُشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہوگئی، تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے، اور انھوں نے ترکِ دنیا کے بھیس میں جلبِ دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبینِ دنیا اُن سے مات کھا گئے۔

(۷) عِفّت کے معاملے میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی، اور جب شکست کھائی تو بُری طرح کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کُشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے، اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ اِیواگریس (St. Evagrius) بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے اُن راہبوں کے ضبطِ نفس کا ذکر کرتا ہے جو ”اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کرتے تھے، اور اُن کی دِید سے، ان کے لَمس سے، حتّٰی کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اُوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی۔“ غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا، مگر نفس کُشی کی مشق کے لیے اِس طرح کے غسل بھی کر لیے جاتے تھے۔ آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری (مُتوفّٰی ۳۹۶ء) لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈّا بن گیا ہے۔ انسانی فطرت کبھی اُن لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اُس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اُس سے لڑ کر بالآخر بداَخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری، اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنُما ترین داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بِشَپ لکھتا ہے کہ ”اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شاید چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔“ قُرونِ مُتوَسِّطہ کے مصنّفین کی کتابیں اِن شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداَخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں، اُن کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں مُحرّمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلافِ وضعِ فطری

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ،[۵۵] اللہ تمھیں اپنی رحمت کا دُہرا حصّہ عطا فرمائے گا اور تمھیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے،[۵۶]

جرائم تک پھیل گئے ہیں، اور کلیساؤں میں اعترافِ گناہ (confession) کی رسم بدکرداری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان تفصیلات سے صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید یہاں رہبانیت کی بدعت ایجاد کرنے اور پھر اس کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے مسیحیت کے کس بگاڑ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۵۵ – اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب اُن لوگوں سے ہے جو حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ، تمھیں اِس پر دُہرا اجر ملے گا، ایک اجر ایمان برعیسٰیؑ کا، اور دوسرا اجر ایمان بر محمدؐ کا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ اُن سے ارشاد ہو رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپؐ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ، بلکہ صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور ایمان لانے کا حق ادا کرو۔ اِس پر تمھیں دُہرا اجر ملے گا۔ ایک اجر کفر سے اسلام کی طرف آنے کا، اور دوسرا اجر اسلام میں اخلاص اختیار کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کا۔ پہلی تفسیر کی تائید سورۂ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۴ کرتی ہیں، اور مزید برآں اس کی تائید حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی ہیں جن کے لیے دُہرا اجر ہے۔ ان میں سے ایک ہے رجل مّن اھل الکتاب اٰمن بنبیّہ واٰمن بمحمّدٍ۔ ''اہلِ کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے سابق نبی پر ایمان رکھتا تھا اور پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی ایمان لے آیا'' (بخاری و مسلم) دوسری تفسیر کی تائید سورۂ سبا کی آیت ۳۷ کرتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ مومنین صالحین کے لیے دو گُنا اجر ہے۔ دلیل کے اعتبار سے دونوں تفسیروں کا وزن مُساوی ہے۔ لیکن آگے کے مضمون پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفسیر ہی اِس مقام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، بلکہ درحقیقت اِس سورت کا پورا مضمون از اوّل تا آخر اِسی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔ شروع سے اِس سورت کے مخاطَب وہی لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر کے داخلِ اسلام ہوئے تھے، اور پُوری سورت میں انھی کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ محض زبان کے مومن نہ بنیں بلکہ اخلاص کے ساتھ سچّے دل سے ایمان لائیں۔

۵۶ – یعنی دنیا میں علم و بصیرت کا وہ نور عطا فرمائے گا جس کی روشنی میں تم کو قدم قدم پر صاف نظر آتا رہے گا کہ زندگی کے مختلف معاملات میں جاہلیّت کی ٹیڑھی راہوں کے درمیان اسلام کی سیدھی راہ کون سی ہے۔ اور آخرت میں وہ نور بخشے گا جس کا ذکر آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ۚ ۲۸ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ
الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ
بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ۧ ۲۹ ع ۴ ۲۰

اور تمھارے قصور معاف کر دے گا،[57] اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ (تم کو یہ رَوِش اختیار کرنی چاہیے) تاکہ اہلِ کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر اُن کا کوئی اجارہ نہیں ہے، اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور وہ بڑے فضل والا ہے۔ ع

۵۷ - یعنی ایمان کے تقاضے پُورے کرنے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود بَشَری کمزوریوں کی بنا پر جو قصور بھی تم سے سرزد ہو جائیں ان سے درگزر فرمائے گا، اور وہ قُصور بھی معاف کرے گا جو ایمان لانے سے پہلے جاہلیت کی حالت میں تم سے سرزد ہوئے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

المجادلہ

(۵۸)

المجادلہ

نام اس سورت کا نام المجَادَلہ بھی ہے اور المجَادِلہ بھی۔ یہ نام پہلی ہی آیت کے لفظ تُجَادِلُکَ سے ماخوذ ہے۔ چونکہ سورت کے آغاز میں اُن خاتون کا ذکر آیا ہے جنھوں نے اپنے شوہر کے ظِہار کا قَضِیَّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے بار بار اصرار کیا تھا کہ آپؐ کوئی ایسی صورت بتائیں جس سے اُن کی اور ان کے بچوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس اصرار کو لفظِ مُجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے یہی اِس سورت کا نام قرار دیا گیا۔ اس کو اگر مُجادَلہ پڑھا جائے تو اس کے معنٰی ہوں گے: ''بحث وتکرار''۔ اور مُجادِلہ پڑھا جائے تو معنٰی ہوں گے: ''بحث وتکرار کرنے والی''۔

زمانۂ نُزُول کسی روایت میں اِس امر کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ مُجادَلہ کا یہ واقعہ کب پیش آیا تھا۔ مگر ایک علامت اِس سورہ کے مضمون میں ایسی ہے جس کی بنا پر یہ بات تعیُّن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اِس کا زمانہ غزوۂ اَحزاب (شوال ۵ ھ) کے بعد کا ہے۔ سورۂ اَحزاب میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کے حقیقی بیٹا ہونے کی نفی کرتے ہوئے صرف یہ ارشاد فرما کر چھوڑ دیا تھا کہ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ (اور اللہ نے تمھاری اُن بیویوں کو، جن سے تم ظِہار کرتے ہو، تمھاری مائیں نہیں بنا دیا ہے)۔ مگر اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ظِہار کرنا کوئی گناہ یا جُرم ہے، اور نہ یہ بتایا گیا تھا کہ اس فعل کا شرعی حکم کیا ہے۔ بخلاف اِس کے، اِس سورہ میں ظہار کا پُورا قانون بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفصَّل احکام اُس مُجمَل ہِدایت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

موضوع اور مَباحِث اِس سورت میں مسلمانوں کو اُن مختلف مسائل کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں جو اُس وقت درپیش تھے۔

آغازِ سورت سے آیت ۶ تک ظِہار کے شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو پُوری سختی کے ساتھ مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے بعد بھی جاہلیّت کے طریقوں پر قائم رہنا اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنا، یا ان کی پابندی سے انکار کرنا، یا ان کے مقابلے میں خود اپنی مرضی سے کچھ اور قاعدے اور قوانین بنا لینا، قطعی طور پر ایمان کے منافی حرکت ہے، جس کی سزا دنیا میں بھی ذلّت و رُسوائی ہے اور آخرت میں بھی اس پر سخت باز پُرس ہونی ہے۔

آیات ۷ تا ۱۰ میں منافقین کی اِس رَوِش پر گرفت کی گئی ہے کہ وہ آپس میں خفیہ سرگوشیاں کر کے

Maktaba Tul Ishaat.com

طرح طرح کی شرارتوں کے منصوبے بناتے تھے، اور ان کے دلوں میں جو بغض چھپا ہوا تھا، اس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کی طرح ایسے طریقے سے سلام کرتے تھے جس سے دُعا کے بجائے بددُعا کا پہلو نکلتا تھا۔ اِس سلسلے میں مسلمانوں کو تسلّی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ سرگوشیاں تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اس لیے تم اللہ کے بھروسے پر اپنا کام کرتے رہو۔ اور اس کے ساتھ ان کو یہ اَخلاقی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ سچے اہلِ ایمان کا کام گناہ اور ظلم و زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کے لیے سرگوشیاں کرنا نہیں ہے، وہ اگر آپس میں بیٹھ کر تخلیے میں کوئی بات کریں بھی تو وہ نیکی اور تقویٰ کی بات ہونی چاہیے۔

آیت ۱۱ تا ۱۳ میں مسلمانوں کو مجلسی تہذیب کے کچھ آداب سکھائے گئے ہیں اور بعض ایسے معاشرتی عُیوب کو دُور کرنے کے لیے ہِدایات دی گئی ہیں جو پہلے بھی لوگوں میں پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی مجلس میں اگر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہوں اور باہر سے کچھ لوگ آ جائیں تو پہلے سے بیٹھے ہوئے اصحاب اِتنی سی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ذرا سمٹ کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کے لیے گنجایش پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے کھڑے رہ جاتے ہیں، یا دہلیز میں بیٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا واپس چلے جاتے ہیں، یا یہ دیکھ کر کہ مجلس میں ابھی کافی گنجایش موجود ہے، حاضرین کے اُوپر سے پھاندتے ہوئے اندر گھُستے ہیں۔ یہ صورتِ حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اکثر پیش آتی رہتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ اپنی مجلسوں میں خود غرضی اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا کریں، بلکہ بعد کے آنے والوں کو کھُلے دل سے جگہ دے دیا کریں۔

اسی طرح ایک عیب لوگوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں (خُصوصاً کسی اہم شخصیت کے ہاں) جاتے ہیں تو جم کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس بات کا کچھ خیال نہیں کرتے کہ ضرورت سے زیادہ اُس کا وقت لینا اُس کے لیے باعثِ زحمت ہوگا۔ اگر وہ کہے کہ حضرت اب تشریف لے جایئے، تو بُرا مانتے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر اُٹھ جائے تو بداَخلاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ اِشارے کِنایے سے اُن کو بتائے کہ اب کچھ دوسرے ضروری کاموں کے لیے اُس کو وقت ملنا چاہیے تو سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں۔ لوگوں کے اِس طرزِ عمل سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سابقہ پیش آتا تھا، اور آپؐ کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے شوق میں اللہ کے بندے اس بات کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ وہ بہت زیادہ قیمتی کاموں کا نقصان کر رہے ہیں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ تکلیف دہ عادت چھڑانے کے لیے حکم دیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کے لیے کہا جائے تو اُٹھ جایا کرو۔

ایک اور عیب لوگوں میں یہ بھی تھا کہ ایک ایک آدمی آ کر خواہ مخواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیے میں بات کرنے کی خواہش کرتا تھا یا مجلسِ عام میں یہ چاہتا تھا کہ آپؐ کے قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں آپؐ سے بات کرے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی تکلیف دہ تھی اور دوسرے لوگ جو مجلس میں موجود ہوتے، ان کو بھی ناگوار ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو شخص بھی آپؐ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے، وہ پہلے

صدقہ دے۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگوں کو اِس بُری عادت پر مُتنبّہ کیا جائے، تاکہ وہ اسے چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ پابندی بس تھوڑی دیر تک باقی رکھی گئی، اور جب لوگوں نے اپنا طرزِ عمل دُرست کرلیا تو اسے منسوخ کر دیا گیا۔

آیت ۱۴ سے آخر سورہ تک مُسلم معاشرے کے لوگوں کو، جن میں مخلص اہلِ ایمان اور منافقین اور مذبذبین سب ملے جُلے تھے، بالکل دوٹوک طریقے سے بتایا گیا ہے کہ دین میں آدمی کے مخلص ہونے کا معیار کیا ہے۔ ایک قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اسلام کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں، اپنے مفاد کی خاطر اُس دین سے غدّاری کرنے میں کوئی تأمّل نہیں کرتے جس پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات اور وسوسے پھیلا کر اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ پر آنے سے روکتے ہیں، مگر چونکہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہیں، اس لیے ان کا جھوٹا اقرارِ ایمان اُن کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔ دوسری قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اللہ کے دین کے معاملے میں کسی اور کا لحاظ تو درکنار، خود اپنے باپ، بھائی، اولاد اور خاندان تک کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جو خدا اور رسولؐ اور اس کے دین کا دشمن ہے، اس کے لیے ان کے دل میں کوئی محبّت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں صاف فرما دیا ہے کہ پہلی قسم کے لوگ چاہے کتنی ہی قسمیں کھا کھا کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلائیں، درحقیقت وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں، اور اللہ کی پارٹی میں شامل ہونے کا شرف صرف دوسری قسم کے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ وہی سچّے مومن ہیں۔ انھی سے اللہ راضی ہے۔ فلاح وہی پانے والے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۲ آیاتہا

سُوۡرَۃُ الۡمُجَادَلَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

۳ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الجزء ۲۸

قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا وَ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی
اللّٰہِ ٭ۖ وَ اللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۱﴾
اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ

اللہ نے سُن لی[۱] اُس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سُن رہا ہے[۲]، وہ سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے۔

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظِہار کرتے ہیں[۳] ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں،

---

۱ – یہاں سننے سے مُراد محض سُن لینا نہیں ہے، بلکہ فریاد رسی کرنا ہے، جیسے ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں: ''اللہ نے دُعا سُن لی'' اور اس سے مراد دعا قبول کر لینا ہوتا ہے۔

۲ – عام طور پر مترجمین نے اس مقام پر ''مُجادلہ کر رہی تھی''، ''فریاد کر رہی تھی''، اور ''اللہ سُن رہا تھا'' ترجمہ کیا ہے، جس سے پڑھنے والے کا ذہن یہ مفہوم اخذ کرتا ہے کہ وہ خاتون اپنی شکایت سنا کر چلی گئی ہوں گی اور بعد میں کسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آئی ہو گی، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عورت کی بات ہم نے سُن لی جو تم سے تکرار اور ہم سے فریاد کر رہی تھی، اور ہم اُس وقت تم دونوں کی بات سُن رہے تھے۔ لیکن اِس واقعے کے متعلق جو روایات احادیث میں آئی ہیں، ان میں سے اکثر میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس وقت وہ خاتون اپنے شوہر کے ظِہار کا قصّہ سُنا سُنا کر بار بار حضورؐ سے عرض کر رہی تھیں کہ اگر ہم دونوں کی جدائی ہو گئی تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گی اور میرے بچے تباہ ہو جائیں گے، عین اُسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس بنا پر ہم نے اس کو ترجیح دی ہے کہ ترجمہ حال کے صیغوں میں کیا جائے۔

یہ خاتون جن کے معاملے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، قبیلۂ خزرج کی خولہؓ بنت ثَعلَبہ تھیں، اور ان کے شوہر اَوسؓ بن صامت انصاری، قبیلۂ اَوس کے سردار حضرت عُبادہؓ بن صامت کے بھائی تھے۔ ان کے ظِہار کا قصّہ آگے چل کر ہم تفصیل کے ساتھ نقل کریں گے۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اِن صحابیہ کی فریاد کا بارگاہِ الٰہی میں مسموع ہونا اور فوراً ہی وہاں سے ان کی فریاد رسی

کے لیے فرمانِ مبارک نازل ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھا جس کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ میں ان کو ایک خاص قدر و منزلت حاصل ہو گئی تھی۔ ابنِ ابی حاتم اور بَیْہَقِی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کچھ اصحاب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عورت ملی اور اس نے ان کو روکا۔ آپ فوراً رُک گئے۔ سر جُھکا کر دیر تک اس کی بات سنتے رہے، اور جب تک اس نے بات ختم نہ کر لی، آپ کھڑے رہے۔ ساتھیوں میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: ''امیر المومنین! آپ نے قریش کے سرداروں کو اِس بڑھیا کے لیے اتنی دیر روکے رکھا۔'' فرمایا: ''جانتے بھی ہو، یہ کون ہے؟ یہ خَولہؓ بنتِ ثَعْلَبہ ہے۔ یہ وہ عورت ہے جس کی شکایت سات آسمانوں پر سُنی گئی۔ خدا کی قسم! اگر یہ رات تک مجھے کھڑا رکھتی تو میں کھڑا رہتا، بس نمازوں کے اوقات پر اس سے معذرت کر دیتا۔'' ابنِ عبدالبرؒ نے اِستیعاب میں قَتَادہؒ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ خاتون راستے میں حضرت عمرؓ کو ملیں تو آپ نے اِن کو سلام کیا۔ یہ سلام کا جواب دینے کے بعد کہنے لگیں: ''اوہو، اے عمر! ایک وقت تھا جب میں نے تم کو بازارِ عُکاظ میں دیکھا تھا۔ اُس وقت تم عُمَیر کہلاتے تھے۔ لاٹھی ہاتھ میں لیے بکریاں چَراتے پھرتے تھے۔ پھر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ تم عمرؓ کہلانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تم امیر المومنین کہے جانے لگے۔ ذرا رعیّت کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے اس کے لیے دُور کا آدمی بھی قریبی رشتہ دار کی طرح ہوتا ہے اور جو موت سے ڈرتا ہے، اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اُسی چیز کو کھو دے گا جسے بچانا چاہتا ہے۔'' اس پر جارُود عَبدِی، جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے، بولے: ''اے عورت! تو نے امیر المومنینؓ کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔'' حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اِنھیں کہنے دو۔ جانتے بھی ہو یہ کون ہیں؟ اِن کی بات تو سات آسمانوں کے اُوپر سُنی گئی تھی، عمرؓ کو تو بدرجۂ اَولیٰ سُننی چاہیے۔'' امام بخاریؒ نے بھی اپنی تاریخ میں اختصار کے ساتھ اس سے ملتا جُلتا قصّہ نقل کیا ہے۔

۳- عرب میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی تھی کہ شوہر اور بیوی میں لڑائی ہوتی تو شوہر غصّے میں آ کر کہتا: اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ۔ اِس کے لُغوی معنیٰ تو یہ ہیں کہ ''تُو میرے اُوپر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ''، لیکن اس کا اصل مفہُوم یہ ہے کہ ''تجھ سے مباشرت کرنا میرے لیے ایسا ہے جیسے میں اپنی ماں سے مباشرت کروں۔'' اِس زمانے میں بھی بہت سے نادان لوگ بیوی سے لڑ کر اس کو ماں، بہن، بیٹی سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی گویا اب اسے بیوی نہیں بلکہ اُن عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو اس کے لیے حرام ہیں۔ اِسی فعل کا نام ظِہار ہے۔ ظَہر عربی زبان میں استعارے کے طور پر سواری کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً سواری کے جانور کو ظَہر کہتے ہیں، کیونکہ اس کی پیٹھ پر آدمی سوار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ لوگ بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرنے کے لیے کہتے تھے کہ تجھے ظَہر بنانا میرے اُوپر ایسا حرام ہے جیسے اپنی ماں کو ظَہر بنانا، اس لیے یہ کلمات زبان سے نکالنا اُن کی اِصطِلاح میں ''ظِہار'' کہلاتا تھا۔ جاہلیّت کے زمانے میں اہلِ عرب کے ہاں یہ طلاق، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید قطعِ تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک اس کے معنیٰ یہ تھے کہ شوہر اپنی بیوی سے نہ صرف اِزدِواجی رشتہ توڑ رہا ہے، بلکہ اسے ماں کی طرح اپنے اُوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ عرب کے نزدیک طلاق کے بعد تو رُجوع کی گنجایش ہو سکتی تھی، مگر ظِہار کے بعد رُجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲

ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے۔[۴] یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھُوٹی بات کہتے ہیں،[۵] اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔[۶]

۴- یہ ظِہار کے متعلق اللہ تعالیٰ کا پہلا فیصلہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص مُنہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے تشبیہ دے دیتا ہے تو اس کے ایسا کہنے سے بیوی ماں نہیں ہو سکتی، نہ اس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ ماں کا ماں ہونا تو ایک حقیقی امرِ واقعہ ہے، کیونکہ اس نے آدمی کو جنا ہے۔ اسی بنا پر اُسے اَبَدی حُرمت حاصل ہے۔ اب آخر وہ عورت جس نے اس کو نہیں جنا ہے، محض منہ سے کہہ دینے پر اس کی ماں کیسے ہو جائے گی، اور اس کے بارے میں عقل، اَخلاق، قانون، کسی چیز کے اعتبار سے بھی وہ حُرمت کیسے ثابت ہو گی جو اِس امرِ واقعی کی بنا پر جننے والی ماں کے لیے ہے۔ اس طرح یہ بات ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے جاہلیّت کے اُس قانون کو منسوخ کر دیا جس کی رُو سے ظہار کرنے والے شوہر سے اس کی بیوی کا نکاح ٹوٹ جاتا تھا اور وہ اس کے لیے ماں کی طرح قطعی حرام سمجھ لی جاتی تھی۔

۵- یعنی بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا اوّل تو ایک نہایت ہی بیہودہ اور شرمناک بات ہے، جس کا تصوّر بھی کسی شریف آدمی کو نہ کرنا چاہیے، کجا کہ وہ اسے زبان سے نکالے۔ دوسرے یہ جھوٹ بھی ہے۔ کیونکہ ایسی بات کہنے والا اگر یہ خبر دے رہا ہے کہ اس کی بیوی اس کے لیے اب ماں ہو گئی ہے تو جھوٹی خبر دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اپنا یہ فیصلہ سنا رہا ہے کہ آج سے اس نے اپنی بیوی کو ماں کی سی حُرمت بخش دی ہے تو بھی اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے، کیونکہ خدا نے اسے یہ اختیارات نہیں دیے ہیں کہ جب تک چاہے ایک عورت کو بیوی کے حکم میں رکھے، اور جب چاہے اسے ماں کے حکم میں کر دے۔ شارع وہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جننے والی ماں کے ساتھ مادری کے حکم میں دادی، نانی، ساس، دودھ پلانے والی عورت اور اَزواجِ نبیؐ کو شامل کیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس حکم میں اپنی طرف سے کسی اور عورت کو داخل کر دے، کجا کہ اُس عورت کو جو اس کی بیوی رہ چکی ہے ـــــــ اِس ارشاد سے یہ دوسرا قانونی حکم نکلا کہ ظہار کرنا ایک بڑا گناہ اور حرام فعل ہے، جس کا مُرتکب سزا کا مستحق ہے۔

۶- یعنی یہ حرکت تو ایسی ہے کہ اس پر آدمی کو بہت ہی سخت سزا ملنی چاہیے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اُس نے اوّل تو ظِہار کے معاملے میں جاہلیّت کے قانون کو منسوخ کر کے تمھاری خانگی زندگی کو تباہی سے بچا لیا، دوسرے اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے وہ سزا تجویز کی جو اِس جُرم کی ہلکی سے ہلکی سزا ہو سکتی تھی، اور سب سے بڑی مہربانی یہ ہے کہ سزا کسی ضرب یا قید کی شکل میں نہیں بلکہ چند ایسی عبادات اور نیکیوں کی شکل میں تجویز کی جو تمھارے نفس کی اصلاح کرنے والی اور تمھارے معاشرے میں بھلائی پھیلانے والی ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام میں بعض جرائم

وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظِہار کریں پھر اپنی اُس بات سے رُجوع کریں جو انھوں نے کہی تھی[8]،

اور گناہوں پر جو عبادات بطورِ کفّارہ مقرر کی گئی ہیں، وہ نہ محض سزا ہیں کہ عبادت کی رُوح سے خالی ہوں اور نہ محض عبادت ہیں کہ سزا کی اذیّت کا کوئی پہلو اُن میں نہ ہو، بلکہ ان میں یہ دونوں پہلو جمع کر دیے گئے ہیں، تاکہ آدمی کو اذیّت بھی ہو اور ساتھ ساتھ وہ ایک نیکی اور عبادت کر کے اپنے گناہ کی تلافی بھی کر دے۔

۷- یہاں سے ظِہار کے قانونی حکم کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ظِہار کے وہ واقعات نگاہ میں رہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں پیش آئے تھے، کیونکہ اسلام میں ظِہار کا مفصّل قانون اِنھی آیات اور اُن فیصلوں سے ماخوذ ہے جو اِن آیات کے نُزول کے بعد حضورؐ نے پیش آمدہ واقعات میں صادر فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیان کے مطابق اسلام میں ظِہار کا پہلا واقعہ اَوسؓ بن صامت انصاری کا ہے، جن کی بیوی خَولہؓ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ محدّثین نے اس واقعے کی جو تفصیلات متعدّد راویوں سے نقل کی ہیں، اُن میں فُرُوعی اختلافات تو بہت سے ہیں، مگر قانونی اہمیت رکھنے والے ضروری اجزا قریب قریب مُتّفَق عَلَیہ ہیں۔ خلاصہ ان رِوایات کا یہ ہے کہ حضرت اَوسؓ بن صامت بڑھاپے میں کچھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے، اور بعض روایات کی رُو سے ان کے اندر کچھ جُنون کی سی لٹک بھی پیدا ہو گئی تھی، جس کے لیے راویوں نے کَانَ بِہٖ لَمَمٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لَمَمٌ عربی زبان میں دیوانگی کو نہیں کہتے بلکہ اُس طرح کی ایک کیفیت کو کہتے ہیں جسے ہم اُردو زبان میں ''غصّے میں پاگل ہو جانے'' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِس حالت میں وہ پہلے بھی متعدّد مرتبہ اپنی بیوی سے ظِہار کر چکے تھے، مگر اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیوی سے لڑ کر ان سے پھر اِس حرکت کا صُدُور ہو گیا۔ اس پر ان کی اہلیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا قصّہ آپؐ سے بیان کر کے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کیا میری اور میرے بچّوں کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے رخصت کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟ حضورؐ نے جو جواب دیا، وہ مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ بعض رِوایات میں الفاظ یہ ہیں کہ ''ابھی تک اِس مسئلے میں مجھے کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔'' اور بعض میں یہ الفاظ ہیں کہ ''میرا خیال یہ ہے کہ تم اُس پر حرام ہو گئی ہو'' اور بعض میں یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''تم اس پر حرام ہو گئی ہو۔'' اس جواب کو سُن کر وہ نالہ و فریاد کرنے لگیں۔ بار بار انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ انھوں نے طلاق کے الفاظ تو نہیں کہے ہیں، آپؐ کوئی صورت ایسی بتائیں جس سے میں اور میرے بچّے اور میرے بوڑھے شوہر کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔ مگر ہر مرتبہ حضورؐ ان کو وہی جواب دیتے رہے۔ اتنے میں آپؐ پر نُزُولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے کہا (اور بعض رِوایات کی رُو سے ان کے شوہر کو بلا کر ان سے فرمایا) کہ ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی، تو فرمایا: دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنے ہوں گے۔ انھوں نے عرض کیا کہ اَوس کا حال تو یہ ہے کہ دن میں تین مرتبہ کھائیں

Maktaba Tul Ishaat.com

پیتیں نہیں تو ان کی بینائی جواب دینے لگتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا دینا پڑے گا۔ انھوں نے عرض کیا: وہ اتنی مَقدِرَت نہیں رکھتے، اِلاّ یہ کہ آپؐ مدد فرمائیں۔ تب آپؐ نے انھیں اِتنی مقدار میں سامانِ خوراک عطا فرمایا جو ۶۰ آدمیوں کی دو وقت کی غذا کے لیے کافی ہو۔ اس کی مقدار مختلف رِوایات میں مختلف بیان کی گئی ہے، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ جتنی مقدار حضورؐ نے عطا فرمائی، اُتنی ہی خود حضرت خَولہؓ نے اپنے شوہر کو دی تا کہ وہ کفّارہ ادا کر سکیں۔ (ابنِ جَریر، مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ابی حاتم)

ظِہار کا دوسرا واقعہ سَلَمہؓ بن صَخر بیاضی کا ہے۔ اِن صاحب پر اعتدال سے کچھ زیادہ شَہوَت کا غلبہ تھا۔ رمضان آیا تو انھوں نے اس اندیشے سے کہ کہیں روزے کی حالت میں دن کے وقت بے صبری نہ کر بیٹھیں، رمضان کے اختتام تک کے لیے بیوی سے ظِہار کر لیا۔ مگر اپنی اس بات پر قائم نہ رہ سکے اور ایک رات بیوی کے پاس چلے گئے۔ پھر نادم ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ایک غلام آزاد کرو۔ انھوں نے کہا: میرے پاس تو اپنی بیوی کے سوا کوئی نہیں جسے آزاد کر دوں۔ فرمایا: دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ انھوں نے عرض کیا کہ روزوں ہی میں تو صبر نہ کر سکنے کی وجہ سے اِس مصیبت میں پھنسا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ انھوں نے کہا: ہم تو اس قدر غریب ہیں کہ رات بے کھائے سوئے ہیں۔ اس پر آپؐ نے بنی زُرَیق کے مُحَصِّلِ زکوٰۃ سے ان کو اِتنا سامانِ خوراک دلوایا کہ ۶۰ آدمیوں میں بانٹ دیں اور کچھ اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لیے بھی رکھ لیں۔ (مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، ترمذی)

تیسرا واقعہ نام کی تصریح کے بغیر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظِہار کیا اور پھر کفّارہ ادا کرنے سے پہلے ہی اس سے مباشرت کر لی۔ بعد میں حضورؐ سے مسئلہ پوچھا تو آپؐ نے حکم دیا کہ اس سے الگ رہو جب تک کفّارہ ادا نہ کر دو۔ (ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ماجہ)

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا کہ اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس پر آپؐ نے غصّے سے فرمایا: ''یہ تیری بہن ہے؟'' مگر آپؐ نے اسے ظِہار قرار نہیں دیا۔ (ابوداؤد)

یہ چار معتبر واقعات ہیں جو مُستند ذرائع سے احادیث میں ملتے ہیں اور انھی کی مدد سے قرآنِ مجید کے اس حکم کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو آگے کی آیتوں میں بیان ہوا ہے۔

۸ – اصل الفاظ ہیں: یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''پلٹیں اُس بات کی طرف جو انھوں نے کہی''۔ لیکن عربی زبان اور محاورے کے لحاظ سے اِن الفاظ کے معنٰی میں بڑا اختلاف واقع ہوگیا ہے:

ایک مفہوم ان کا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ظِہار کے الفاظ منہ سے نکل جانے کے بعد پھر ان کا اعادہ کریں۔ ظاہریّہ اور بُکَیر بن الاَشَجّؒ اور یحییٰ بن زیاد الفَرّاءؒ اِسی کے قائل ہیں، اور عطاء بن ابی رَباحؒ سے بھی ایک قول اِسی کی تائید میں منقول ہوا ہے۔ ان کے نزدیک ایک دفعہ کا ظِہار تو معاف ہے، البتہ آدمی اُس کی تکرار کرے تب اس پر کفّارہ لازم آتا ہے۔ لیکن یہ تفسیر دو وجوہ سے صریحاً غلط ہے: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ظِہار کو بیہودہ اور جھوٹی بات قرار دے کر اس کے لیے سزا تجویز فرمائی ہے۔ اب کیا یہ بات قابلِ تصوّر ہے کہ ایک مرتبہ جھوٹی اور بے ہودہ بات آدمی کہے تو معاف ہو اور دوسری مرتبہ کہے تو سزا

فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝۳ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ

تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دُوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اِس سے تم کو نصیحت کی[9] جاتی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر[10] ہے۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے در پے روزے رکھے

کا مستحق ہو جائے؟ دوسری وجہ اس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظِہار کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا اس نے ایک بار ظِہار کیا ہے یا دو بار۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جو لوگ زمانۂ جاہلیّت میں یہ حرکت کرنے کے عادی تھے، وہ اگر اسلام میں اس کا اعادہ کریں تو اس کی یہ سزا ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ ظِہار کرنا بجائے خود مُستوجبِ سزا ہو اور جو شخص بھی اپنی بیوی کے لیے ظِہار کے الفاظ منہ سے نکالے اس پر کفّارہ لازم آ جائے، خواہ وہ اس کے بعد بیوی کو طلاق دے دے، یا اس کی بیوی مر جائے، یا اس کا کوئی ارادہ اپنی بیوی سے تعلّقِ زن و شَو رکھنے کا نہ ہو۔ فقہا میں سے طاؤس، مجاہد، شَعْبی، زُہری، سُفیان ثَوری اور قَتادَہ کا یہی مسلک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظِہار کے بعد اگر عورت مر جائے تو شوہر اس وقت تک اس کی میراث نہیں پا سکتا جب تک کفّارہ ادا نہ کر دے۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ظِہار کے الفاظ زبان سے نکالنے کے بعد آدمی پلٹ کر اُس بات کا تدارُک کرنا چاہے جو اس نے کہی ہے۔ بالفاظِ دیگر عَادَ لِمَا قَالَ کے معنٰی ہیں: کہنے والے نے اپنی بات سے رُجوع کر لیا۔

چوتھا مفہُوم یہ ہے کہ جس چیز کو آدمی نے ظِہار کر کے اپنے لیے حرام کیا تھا، اسے پلٹ کر پھر اپنے لیے حلال کرنا چاہے۔ بالفاظِ دیگر عَادَ لِمَا قَالَ کے معنٰی یہ ہیں کہ جو شخص تحریم کا قائل ہو گیا تھا، وہ اب تحلیل کی طرف پلٹ آیا۔

اکثر و بیشتر فقہا نے انھی دو مفہُوموں میں سے کسی ایک کو ترجیح دی ہے۔

۹ – بالفاظِ دیگر، یہ حکم تمھاری تادیب کے لیے دیا جا رہا ہے، تاکہ مسلم معاشرے کے لوگ جاہلیت کی اِس بُری عادت کو چھوڑ دیں اور تم میں سے کوئی شخص اِس بیہودہ حرکت کا ارتکاب نہ کرے۔ بیوی سے لڑنا ہے تو بھلے آدمیوں کی طرح لڑو۔ طلاق ہی دینا ہو تو سیدھی طرح طلاق دے دو۔ یہ آخر کیا شرافت ہے کہ آدمی جب بیوی سے لڑے تو اسے ماں بہن بنا کر ہی چھوڑے۔

۱۰ – یعنی اگر آدمی گھر میں چپکے سے بیوی کے ساتھ ظِہار کر بیٹھے اور پھر کفّارہ ادا کیے بغیر میاں اور بیوی کے درمیان حسبِ سابق زوجیّت کے تعلّقات چلتے رہیں، تو چاہے دنیا میں کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہو، اللہ کو تو بہرحال اس کی خبر ہوگی۔ اللہ کے مواخذے سے بچ نکلنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ

قبل اس کے کہ دونوں ایک دُوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے[11]۔

۱۱- یہ ہے ظِہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم۔ فقہائے اسلام نے اس آیت کے الفاظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں، اور اسلام کے اُصولِ عامّہ سے اس مسئلے میں جو قانون اخذ کیا ہے، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱- ظِہار کا یہ قانون عربِ جاہلیت کے اُس رواج کو منسوخ کرتا ہے جس کی رُو سے یہ فعل نکاح کے رشتے کو توڑ دیتا تھا اور عورت شوہر کے لیے اَبَداً حرام ہو جاتی تھی۔ اسی طرح یہ قانون اُن تمام قوانین اور رواجوں کو بھی منسوخ کرتا ہے جو ظِہار کو بے معنی اور بے اثر سمجھتے ہوں اور آدمی کے لیے اس بات کو جائز رکھتے ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو ماں یا مُحَرَّمات سے تشبیہ دے کر بھی اُس کے ساتھ حسبِ سابق زن و شَو کا تعلق جاری رکھے، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں ماں اور دوسری مُحَرَّمات کی حرمت ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ انسان ان کے اور بیوی کے درمیان مشابہت کا خیال بھی کرے، کجا کہ اس کو زبان پر لائے۔ اِن دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلامی قانون نے اس معاملے میں جو مَوقِف اختیار کیا ہے، وہ تین بنیادوں پر قائم ہے: ایک یہ کہ ظِہار سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ عورت بدستور شوہر کی بیوی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ظِہار سے عورت وقتی طور پر شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ حرمت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک شوہر کفّارہ ادا نہ کر دے، اور یہ کہ صرف کفّارہ ہی اِس حرمت کو رفع کر سکتا ہے۔

۲- ظِہار کرنے والے شخص کے بارے میں یہ امر مُتَّفَق عَلَیْہِ ہے کہ اُس شوہر کا ظِہار معتبر ہے جو عاقل و بالغ ہو اور بحالتِ ہوش و حواس ظِہار کے الفاظ زبان سے ادا کرے۔ بچّے اور مجنون کا ظِہار معتبر نہیں ہے۔ نیز ایسے شخص کا ظِہار بھی معتبر نہیں جو اِن الفاظ کو ادا کرتے وقت اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو، مثلاً سوتے میں بڑبڑائے، یا کسی نوعیت کی بے ہوشی میں مبتلا ہو گیا ہو۔ اس کے بعد حسبِ ذیل اُمور میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے:

الف- نشے کی حالت میں ظِہار کرنے والے کے متعلق ائمۂ اربعہ سمیت فقہا کی عظیم اکثریت یہ کہتی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نشہ آور چیز جان بُوجھ کر استعمال کی ہو تو اس کا ظِہار اس کی طلاق کی طرح قانوناً صحیح مانا جائے گا، کیونکہ اس نے یہ حالت اپنے اُوپر خود طاری کی ہے۔ البتہ اگر مرض کی وجہ سے اس نے کوئی دوا پی ہو اور اس سے نشہ لاحق ہو گیا ہو، یا پیاس کی شدّت میں وہ جان بچانے کے لیے شراب پینے پر مجبور ہوا ہو، تو اس طرح کے نشے کی حالت میں اس کے ظِہار و طلاق کو نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اَحناف اور شَوافع اور حَنابلہ کی رائے یہی ہے، اور صحابہؓ کا عام مسلک بھی یہی تھا۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ کا قول یہ ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق و ظِہار معتبر نہیں ہے۔ احناف میں سے امام طَحاویؒ اور کَرخیؒ اِس قول کو ترجیح دیتے ہیں، اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسے نشے کی حالت میں ظِہار معتبر ہو گا جس میں آدمی بالکل بہک نہ گیا ہو، بلکہ وہ مربوط اور مرتّب کلام کر رہا ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ب۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ظِہار صرف اُس شوہر کا معتبر ہے جو مسلمان ہو۔ ذِمّیوں پر ان احکام کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ قرآنِ مجید میں اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، جن کا خطاب مسلمانوں سے ہے، اور تین قسم کے کَفّاروں میں سے ایک کفارہ قرآن میں روزہ بھی تجویز کیا گیا ہے، جو ظاہر ہے کہ ذِمّیوں کے لیے نہیں ہوسکتا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک یہ احکام ذِمّی اور مسلمان، دونوں کے ظِہار پر نافذ ہوں گے، البتہ ذِمّی کے لیے روزہ نہیں ہے۔ وہ یا غلام آزاد کرے، یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ج۔ کیا مرد کی طرح عورت بھی ظِہار کرسکتی ہے؟ مثلاً اگر وہ شوہر سے کہے کہ تُو میرے لیے میرے باپ کی طرح ہے، یا میں تیرے لیے تیری ماں کی طرح ہوں، تو کیا یہ بھی ظِہار ہوگا؟ ائمۂ اربعہ کہتے ہیں کہ یہ ظِہار نہیں ہے اور اس پر ظِہار کے قانونی احکام کا سرے سے اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآنِ مجید نے صریح الفاظ میں یہ احکام صرف اُس صورت کے لیے بیان کیے ہیں جب کہ شوہر بیویوں سے ظِہار کریں (اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ) اور ظِہار کرنے کے اختیارات اُسی کو حاصل ہوسکتے ہیں جسے طلاق دینے کا اختیار ہے۔ عورت کو شریعت نے جس طرح یہ اختیار نہیں دیا کہ شوہر کو طلاق دے دے، اُسی طرح اُسے یہ اختیار بھی نہیں دیا کہ اپنے آپ کو شوہر کے لیے حرام کرلے۔ یہی رائے سُفیان ثَوری، اسحاق بن رَاہَوَیہ، ابوثَور اور لَیث بن سعد کی ہے کہ عورت کا ایسا قول بالکل بے معنٰی اور بے اثر ہے۔ امام ابویُوسُفؒ کہتے ہیں کہ یہ ظِہار تو نہیں ہے، مگر اِس سے عورت پر قَسَم کا کفارہ لازم آئے گا، کیونکہ عورت کا ایسے الفاظ کہنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے۔ امام احمد بن حَنبلؒ کا مسلک بھی ابنِ قُدامہ نے یہی نقل کیا ہے۔ امام اَوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اگر شادی سے پہلے عورت نے یہ بات کہی ہو کہ میں اُس شخص سے شادی کروں تو وہ میرے لیے ایسا ہے جیسے میرا باپ، تو یہ ظِہار ہوگا، اور اگر شادی کے بعد کہے تو یہ قَسَم کے معنٰی میں ہوگا، جس سے کفارۂ یمین لازم آئے گا۔ بخلاف اس کے حَسَن بصری، زُہری، ابراہیم نَخَعی اور حَسَن بن زیاد لُؤلُؤی کہتے ہیں کہ یہ ظِہار ہے اور ایسا کہنے سے عورت پر کفارۂ ظِہار لازم آئے گا، البتہ عورت کو یہ حق نہ ہوگا کہ کفارہ دینے سے پہلے شوہر کو اپنے پاس آنے سے روک دے۔ ابراہیم نَخَعیؒ اس کی تائید میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ کی صاحبزادی عائشہ سے حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے مُصعَب نے نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے اسے ردّ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہہ دیے کہ اگر میں ان سے نکاح کروں تو هُوَ عَلَیَّ كَظَهْرِ اَبِیْ (وہ میرے اُوپر ایسے ہوں جیسے میرے باپ کی پیٹھ)۔ کچھ مدت بعد وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہوگئیں۔ مدینہ کے علما سے اس کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو بہت سے فقہا نے، جن میں متعدد صحابہؓ بھی شامل تھے، یہ فتویٰ دیا کہ عائشہ پر کفارۂ ظِہار لازم ہے۔ اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد ابراہیم نَخَعی اپنی یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر عائشہ یہ بات شادی کے بعد کہتیں تو کفّارہ لازم نہ آتا، مگر انھوں نے شادی سے پہلے یہ کہا تھا جب انھیں نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا، اس لیے کفارہ ان پر واجب ہوگیا۔

۳۔ جو عاقل و بالغ آدمی ظِہار کے صریح الفاظ بحالتِ ہوش و حواس زبان سے ادا کرے، اس کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ اس نے غصّے میں، یا مذاق میں، یا پیار سے ایسا کہا، یا یہ کہ اس کی نیت ظِہار کی نہ تھی۔ البتہ جو الفاظ اس معاملے میں صریح نہیں ہیں، اور جن میں مختلف معنوں کا احتمال ہے، ان کا حکم الفاظ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ آگے چل کر

Maktaba Tul Ishaat.com

ہم بتائیں گے کہ ظِہار کے صریح الفاظ کون سے ہیں اور غیر صریح کون سے۔

۴- یہ امر مُتَّفَق عَلَیْہِ ہے کہ ظِہار اُس عورت سے کیا جا سکتا ہے جو آدمی کے نکاح میں ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا غیر عورت سے بھی ظِہار ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں مختلف مسالک یہ ہیں:

حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ غیر عورت سے اگر آدمی یہ کہے کہ ”میں تجھ سے نکاح کروں تو میرے اُوپر تو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ“، تو جب بھی وہ اس سے نکاح کرے گا، کفارہ ادا کیے بغیر اسے ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ یہی حضرت عمرؓ کا فتویٰ ہے۔ اُن کے زمانے میں ایک شخص نے ایک عورت سے یہ بات کہی اور بعد میں اس سے نکاح کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اُسے کفارۂ ظِہار دینا ہو گا۔

مالکیہ اور حنابلہ بھی یہی بات کہتے ہیں، اور وہ اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اگر عورت کی تخصیص نہ کی گئی ہو بلکہ کہنے والے نے یوں کہا ہو کہ تمام عورتیں میرے اُوپر ایسی ہیں، تو جس سے بھی وہ نکاح کرے گا اسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفّارہ دینا ہو گا۔ یہی رائے سعید بن المُسَیَّب، عُروہ بن زبیر، عطاء بن ابی رَباح، حَسَن بصری اور اسحاق بن راہَوَیہ کی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ نکاح سے پہلے ظِہار بالکل بے معنٰی ہے۔ ابنِ عباسؓ اور قتادہؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

۵- کیا ظِہار ایک خاص وقت تک کے لیے ہو سکتا ہے؟ حنفی اور شافعی کہتے ہیں کہ اگر آدمی نے کسی خاص وقت کی تعیین کر کے ظِہار کیا ہو تو جب تک وہ وقت باقی ہے، بیوی کو ہاتھ لگانے سے کفارہ لازم آئے گا، اور اس وقت کے گزر جانے پر ظِہار غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اس کی دلیل سَلَمہ بن صَخر بَیاضی کا واقعہ ہے، جس میں انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان کے لیے ظِہار کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ وقت کی تعیین بے معنٰی ہے۔ بخلاف اس کے، امام مالکؒ اور ابنِ ابی لیلٰیؒ کہتے ہیں کہ ظِہار جب بھی کیا جائے گا، ہمیشہ کے لیے ہو گا اور وقت کی تخصیص غیر مؤثر ہو گی، کیونکہ جو حرمت واقع ہو چکی ہے وہ وقت گزر جانے پر آپ سے آپ ختم نہیں ہو سکتی۔

۶- مشروط ظِہار کیا گیا ہو تو جس وقت بھی شرط کی خلاف ورزی ہو گی، کفارہ لازم آ جائے گا۔ مثلاً آدمی بیوی سے یہ کہتا ہے کہ ”اگر میں گھر میں آؤں تو میرے اُوپر تُو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ“۔ اس صورت میں وہ جب بھی گھر میں داخل ہو گا، کفّارہ ادا کیے بغیر بیوی کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔

۷- ایک بیوی سے کئی مرتبہ ظِہار کے الفاظ کہے گئے ہوں تو حنفی اور شافعی کہتے ہیں کہ خواہ ایک ہی نِشَست میں ایسا کیا گیا ہو یا متعدد نِشَستوں میں، بہر حال جتنی مرتبہ یہ الفاظ کہے گئے ہوں اُتنے ہی کفارے لازم آئیں گے، اِلّا یہ کہ کہنے والے نے ایک دفعہ کہنے کے بعد اِس قول کی تکرار محض اپنے پہلے قول کی تاکید کے لیے کی ہو۔ بخلاف اس کے، امام مالکؒ اور امام احمد بن حَنبَلؒ کہتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی مرتبہ اس قول کی تکرار کی گئی ہو، قطعِ نظر اس سے کہ اعادے کی نیت ہو یا تاکید کی، کفّارہ ایک ہی لازم ہو گا۔ یہی قول شَعْبِی، طاؤس، عطاء بن ابی رَباح، حسن بصری اور اَوزاعی رحمہم اللہ کا ہے۔ حضرت علیؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر تکرار ایک نِشَست میں کی گئی ہو تو ایک ہی کفارہ ہو گا، اور مختلف نِشَستوں میں ہو تو جتنی نِشَستوں میں کی گئی ہو، اُتنے ہی کفّارے دینے ہوں گے۔ قَتادَہ اور عَمرو بن دینار کی رائے بھی یہی ہے۔

۸- دو یا زائد بیویوں سے بیک وقت اور بیک لفظ ظِہار کیا جائے، مثلاً اُن کو مخاطَب کر کے شوہر کہے کہ تم میرے اُوپر

ایسی ہو جیسے میری ماں کی پیٹھ، تو حَنَفِیَّہ اور شافِعِیّہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کو حلال کرنے کے لیے الگ الگ کفارے دینے ہوں گے۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عُروَہؒ بن زبیرؒ، طاؤس، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، سفیان ثَوری اور ابن شہاب زُہری کی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں سب کے لیے ایک ہی کفارہ لازم ہوگا۔ رَبیعہ، اَوزاعی، اسحاق بن راہَوَیہ اور ابوثَور کی بھی یہی رائے ہے۔

۹- ایک ظِہار کا کفارہ دینے کے بعد اگر آدمی پھر ظِہار کر بیٹھے تو یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ پھر کفارہ دیے بغیر بیوی اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔

۱۰- کفّارہ ادا کرنے سے پہلے اگر بیوی سے تعلّقِ زن وشو قائم کر بیٹھا ہو تو ائمۂ اربعہ کے نزدیک اگرچہ یہ گناہ ہے، اور آدمی کو اس پر اِستِغفار کرنا چاہیے، اور پھر اس کا اِعادہ نہ کرنا چاہیے، مگر کفارہ اسے ایک ہی دینا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جن لوگوں نے ایسا کیا تھا، ان سے آپؐ نے یہ تو فرمایا تھا کہ اِستِغفار کرو اور اُس وقت تک بیوی سے الگ رہو جب تک کفارہ ادا نہ کردو، مگر یہ حکم آپؐ نے نہیں دیا تھا کہ کفارۂ ظِہار کے علاوہ اِس پر اُنھیں کوئی اور کفارہ بھی دینا ہوگا۔ حضرت عَمروؓ بن عاص، قَبِیصَہ بن ذُؤَیب، سعید بن جُبَیر، زُہری اور قَتادَہ کہتے ہیں کہ اس پر دو کفارے لازم ہوں گے۔ اور حسن بصری اور ابراہیم نَخَعی کی رائے یہ ہے کہ تین کفارے دینے ہوں گے۔ غالباً اِن حضرات کو وہ احادیث نہ پہنچی ہوں گی جن میں اِس مسئلے پر حضورؐ کا فیصلہ بیان ہوا ہے۔

۱۱- بیوی کو کس سے تشبیہ دینا ظِہار ہے؟ اِس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے:

عامر شَعبی کہتے ہیں کہ صرف ماں سے تشبیہ ظِہار ہے، اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ ماں کی بھی صرف پیٹھ سے تشبیہ ظِہار ہے، باقی اور کسی بات پر اِس حکم کا اِطلاق نہیں ہوتا۔ مگر فقہائے اُمّت میں سے کسی گروہ نے بھی اُن سے اِس معاملے میں اتفاق نہیں کیا ہے، کیونکہ قرآن نے ماں سے تشبیہ کو گناہ قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ نہایت بیہودہ اور جھوٹی بات ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن عورتوں کی حُرمت ماں جیسی ہے، ان کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا بے ہودگی اور جھوٹ میں اس سے کچھ مختلف نہیں ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کا حکم وہی نہ ہو جو ماں سے تشبیہ کا حکم ہے۔

حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ اس حکم میں تمام وہ عورتیں داخل ہیں جو نسب، یا رضاعت، یا اِزدِواجی رشتے کی بنا پر آدمی کے لیے ابداً حرام ہیں۔ مگر وقتی طور پر جو عورتیں حرام ہوں اور کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں، وہ اس میں داخل نہیں ہیں، جیسے بیوی کی بہن، اس کی خالہ، اس کی پھوپھی، یا غیر عورت جو آدمی کے نکاح میں نہ ہو۔ اَبدی مُحَرَّمات میں سے کسی عورت کے کسی ایسے عُضو کے ساتھ تشبیہ دینا جس پر نظر ڈالنا آدمی کے لیے حلال نہ ہو، ظِہار ہوگا۔ البتہ بیوی کے ہاتھ، پاؤں، سر، بال، دانت وغیرہ کو ابداً حرام عورت کی پیٹھ سے، یا بیوی کو اُس کے سر، ہاتھ، پاؤں جیسے اجزائے جسم سے تشبیہ دینا ظِہار نہ ہوگا، کیونکہ ماں بہن کے اِن اعضا پر نگاہ ڈالنا حرام نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ تیرا ہاتھ میری ماں کے ہاتھ جیسا ہے، یا تیرا پاؤں میری ماں کے پاؤں جیسا ہے، ظِہار نہیں ہے۔

شافعیہّ کہتے ہیں کہ اس حکم میں صرف وہی عورتیں داخل ہیں جو ہمیشہ حرام تھیں اور ہمیشہ حرام رہیں، یعنی ماں، بہن، بیٹی وغیرہ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مگر وہ عورتیں اِس میں داخل نہیں ہیں جو کبھی حلال رہ چکی ہوں، جیسے رضاعی ماں، بہن، ساس اور بہو، یا کسی وقت حلال ہوسکتی ہوں، جیسے سالی۔ اِن عارضی یا وقتی حرام عورتوں کے ماسوا اَبدی حُرمت رکھنے والی عورتوں میں سے کسی کے اُن اعضا کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا ظِہار ہوگا جن کا ذکر بغرضِ اظہارِ اکرام و توقیر عادتاً نہیں کیا جاتا۔ رہے وہ اعضا جن کا اظہار اکرام و توقیر کے لیے کیا جاتا ہے، تو ان سے تشبیہ صرف اُس صورت میں ظِہار ہوگی جب کہ یہ بات ظِہار کی نیت سے کہی جائے۔ مثلاً بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لیے میری ماں کی آنکھ یا جان کی طرح ہے، یا ماں کے ہاتھ، پاؤں یا پیٹ کی طرح ہے، یا ماں کے پیٹ یا سینے سے بیوی کے پیٹ یا سینے کو تشبیہ دینا، یا بیوی کے سر، پیٹھ یا ہاتھ کو اپنے لیے ماں کی پیٹھ جیسا قرار دینا، یا بیوی کو یہ کہنا کہ تو میرے لیے میری ماں جیسی ہے، ظِہار کی نیت سے ہو تو ظِہار ہے، اور عزت کی نیت سے ہو تو عزت ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ہر عورت جو آدمی کے لیے حرام ہو، اُس سے بیوی کو تشبیہ دینا ظِہار ہے، حتّٰی کہ بیوی سے یہ کہنا بھی ظِہار کی تعریف میں آتا ہے کہ تو میرے اُوپر فُلاں غیر عورت کی پیٹھ جیسی ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ ماں اور اَبدی مُحرَّمات کے کسی عضو سے بیوی کو یا بیوی کے کسی عضو کو تشبیہ دینا ظِہار ہے، اور اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اعضا ایسے ہوں جن پر نظر ڈالنا حلال نہ ہو، کیونکہ ماں کے کسی عضو پر بھی اُس طرح کی نظر ڈالنا جیسی بیوی پر ڈالی جاتی ہے، حلال نہیں ہے۔

حنابلہ اس حکم میں تمام اُن عورتوں کو داخل سمجھتے ہیں جو ابداً حرام ہوں، خواہ وہ پہلے کبھی حلال رہ چکی ہوں، مثلاً ساس، یا دُودھ پلانے والی ماں۔ رہیں وہ عورتیں جو بعد میں کسی وقت حلال ہوسکتی ہوں (مثلاً سالی)، تو اُن کے معاملے میں امام احمدؒ کا ایک قول یہ ہے کہ ان سے تشبیہ بھی ظِہار ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے تشبیہ ظِہار نہیں ہے۔ نیز حنابلہ کے نزدیک بیوی کے کسی عضو کو محرَّمات کے کسی عضو سے تشبیہ دینا ظِہار کی تعریف میں آجاتا ہے۔ البتہ بال، ناخن، دانت جیسے غیر مستقل اجزائے جسم اِس حکم سے خارج ہیں۔

۱۲- اس امر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ بیوی سے یہ کہنا کہ "تو میرے اُوپر میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے" صریح ظِہار ہے، کیونکہ اہلِ عرب میں یہی ظِہار کا طریقہ تھا اور قرآنِ مجید کا حکم اِسی کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ البتہ اس امر میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ دوسرے الفاظ میں سے کون سے ایسے ہیں جو صریح ظِہار کے حکم میں ہیں، اور کون سے ایسے ہیں جن کے ظِہار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ قائل کی نیت پر کیا جائے گا۔

حَنَفِیہ کے نزدیک ظِہار کے صریح الفاظ وہ ہیں جن میں صاف طور پر حلال عورت (بیوی) کو حرام عورت (یعنی مُحرَّماتِ اَبدیہ میں سے کسی عورت) سے تشبیہ دی گئی ہو، یا تشبیہ ایسے عضو سے دی گئی ہو جس پر نظر ڈالنا حلال نہیں ہے، جیسے یہ کہنا کہ تو میرے اُوپر ماں یا فلاں حرام عورت کے پیٹ یا ران جیسی ہے۔ ان کے سوا دوسرے الفاظ میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ اگر کہے کہ "تو میرے اُوپر حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ" تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ صریح ظِہار ہے، لیکن امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ظِہار کی نیت ہو تو ظِہار ہے اور طلاق کی نیت ہو تو طلاق۔ اگر کہے کہ "تو میری ماں جیسی ہے یا میری ماں کی طرح ہے" تو حنفیہ کا عام فتویٰ یہ ہے کہ ظِہار کی نیت سے ظِہار ہے، طلاق کی نیت سے طلاقِ بائن، اور اگر کوئی نیت نہ ہو تو بے معنی ہے۔ لیکن امام محمدؒ کے نزدیک یہ قطعی ظِہار ہے۔ اگر بیوی کو ماں، یا بہن، یا بیٹی کہہ کر پکارے تو یہ سخت بیہودہ بات ہے، جس پر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصّے کا اظہار فرمایا تھا، مگر اسے ظِہار نہیں قرار دیا۔ اگر کہے کہ ''تو میرے اُوپر ماں کی طرح حرام ہے'' تو یہ ظِہار کی نیّت سے ظِہار ہے، طلاق کی نیت سے طلاق، اور کوئی نیت نہ ہو تو ظِہار ہے۔ اگر کہے کہ ''تو میرے لیے ماں کی طرح یا ماں جیسی ہے'' تو نیّت پُوچھی جائے گی۔ عزت اور توقیر کی نیّت سے کہا ہو تو عزّت اور توقیر ہے۔ ظِہار کی نیّت سے کہا ہو تو ظِہار ہے۔ طلاق کی نیت سے کہا ہو تو طلاق ہے۔ کوئی نیّت نہ ہو اور یوں ہی یہ بات کہہ دی ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بے معنیٰ ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر ظِہار کا تو نہیں مگر قسم کا کفارہ لازم آئے گا، اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ ظِہار ہے۔

شافعیّہ کے نزدیک ظِہار کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے تُو میرے نزدیک، یا میرے ساتھ، یا میرے لیے ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔ یا تُو میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ یا تیرا جسم، یا تیرا بدن، یا تیرا نفس میرے لیے میری ماں کے جسم یا بدن یا نفس کی طرح ہے۔ اِن کے سوا باقی تمام الفاظ میں قائل کی نیت پر فیصلہ ہو گا۔

حنابلہ کے نزدیک ہر وہ لفظ جس سے کسی شخص نے بیوی کو یا اس کے مستقل اعضا میں سے کسی عضو کو کسی ایسی عورت سے جو اس کے لیے حرام ہے، یا اُس کے مستقل اعضا میں سے کسی عضو سے صاف صاف تشبیہ دی ہو، ظِہار کے معاملے میں صریح مانا جائے گا۔

مالکیّہ کا مسلک بھی قریب قریب یہی ہے، البتہ تفصیلات میں اُن کے فتوے الگ الگ ہیں۔ مثلاً کسی شخص کا بیوی سے یہ کہنا کہ ''تو میرے لیے میری ماں جیسی ہے، یا میری ماں کی طرح ہے'' مالکیوں کے نزدیک ظِہار کی نیت سے ہو تو ظِہار ہے، طلاق کی نیت سے ہو تو طلاق، اور کوئی نیّت نہ ہو تو ظِہار ہے۔ حنبلیوں کے نزدیک یہ بشرطِ نیت صرف ظِہار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص بیوی سے کہے کہ ''تو میری ماں ہے'' تو مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ ظِہار ہے اور حنابلہ کہتے ہیں کہ یہ بات اگر جھگڑے اور غصّے کی حالت میں کہی گئی ہو تو ظِہار ہے، اور پیار محبّت کی بات چیت میں کہی گئی ہو تو گو یہ بہت ہی بُری بات ہے، لیکن ظِہار نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کہے: ''تجھے طلاق ہے، تُو میری ماں کی طرح ہے''، تو حنابلہ کے نزدیک یہ طلاق ہے نہ کہ ظِہار، اور اگر کہے: ''تو میری ماں کی طرح ہے، تجھے طلاق ہے''، تو ظِہار اور طلاق دونوں واقع ہو جائیں گے۔ یہ کہنا کہ ''تو میرے اُوپر ایسی حرام ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ'' مالکیہ اور حنابلہ دونوں کے نزدیک ظِہار ہے، خواہ طلاق ہی کی نیت سے یہ الفاظ کہے گئے ہوں، یا نیت کچھ بھی نہ ہو۔

الفاظِ ظِہار کی اِس بحث میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فقہا نے اس باب میں جتنی بحثیں کی ہیں، وہ سب عربی زبان کے الفاظ اور محاورات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانیں بولنے والے نہ عربی زبان میں ظِہار کریں گے، نہ ظِہار کرتے وقت عربی الفاظ اور فقروں کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ زبان سے ادا کریں گے۔ اس لیے کسی لفظ یا فقرے کے متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ ظِہار کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں، تو اسے اس لحاظ سے نہیں جانچنا چاہیے کہ وہ فقہا کے بیان کردہ الفاظ میں سے کس کا صحیح ترجمہ ہے، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قائل نے بیوی کو جنسی (sexual) تعلق کے لحاظ سے مُحرّمات میں سے کسی کے ساتھ صاف صاف تشبیہ دی ہے، یا اس کے الفاظ میں دوسرے مفہومات کا بھی احتمال ہے؟ اس کی نمایاں ترین مثال خود وہ فقرہ ہے جس کے متعلق تمام فقہا اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ عرب میں ظِہار کے لیے وہی بولا جاتا تھا

Maktaba Tul Ishaat.com

اور قرآنِ مجید کا حکم اُسی کے بارے میں نازل ہوا ہے، یعنی اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ (تُو میرے اُوپر میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے)۔ غالبًا دنیا کی کسی زبان میں، اور کم از کم اُردو کی حد تک تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِس زبان میں کوئی ظہار کرنے والا ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا جو اس عربی فقرے کا لفظی ترجمہ ہوں۔ البتہ وہ اپنی زبان کے ایسے الفاظ ضرور استعمال کر سکتا ہے جن کا مفہوم ٹھیک وہی ہو جسے ادا کرنے کے لیے ایک عرب یہ فقرہ بولا کرتا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ "تجھ سے مباشرت میرے لیے ایسی ہے جیسے اپنی ماں سے مباشرت"، یا جیسے بعض جُہلا بیوی سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ "تیرے پاس آؤں تو اپنی ماں کے پاس جاؤں"۔

۱۳- قرآنِ مجید میں جس چیز کو کفّارہ لازم آنے کا سبب قرار دیا گیا ہے، وہ محض ظِہار نہیں ہے بلکہ ظِہار کے بعد "عَوْد" ہے۔ یعنی اگر آدمی صرف ظِہار کر کے رہ جائے اور عَود نہ کرے تو اس پر کفارہ لازم نہیں آتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عَود کیا ہے جو کفّارے کا مُوجِب ہے؟ اس بارے میں فقہا کے مسالک یہ ہیں:

حَنفِیّہ کہتے ہیں کہ عَود سے مراد مباشرت کا ارادہ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض ارادے اور خواہش پر کفارہ لازم آ جائے، حتّٰی کہ اگر آدمی ارادہ کر کے رہ جائے اور عملی اقدام نہ کرے تب بھی اسے کفارہ دینا پڑے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شخص اُس حرمت کو رفع کرنا چاہے جو اس نے ظِہار کر کے بیوی کے ساتھ تعلقِ زن و شَو کے معاملے میں اپنے اُوپر عائد کر لی تھی، وہ پہلے کفّارہ دے، کیونکہ یہ حُرمت کَفّارے کے بغیر رفع نہیں ہو سکتی۔

امام مالکؒ کے اِس معاملے میں تین قول ہیں، مگر مالکیہ کے ہاں اُن کا مشہور ترین اور صحیح ترین قول اُس مسلک کے مطابق ہے جو اُوپر حنفیہ کا بیان ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظِہار سے جس چیز کو اُس نے اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا، وہ بیوی کے ساتھ مباشرت کا تعلق تھا۔ اُس کے بعد عَود یہ ہے کہ وہ اُس کے ساتھ یہی تعلق رکھنے کے لیے پلٹے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک بھی ابنِ قُدامہؒ نے قریب قریب وہی نقل کیا ہے جو اُوپر دونوں اماموں کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظِہار کے بعد مباشرت کے حلال ہونے کے لیے کفّارہ شرط ہے۔ ظِہار کرنے والا جو شخص اسے حلال کرنا چاہے، وہ گویا تحریم سے پلٹنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے حکم دیا گیا کہ اسے حلال کرنے سے پہلے کفّارہ دے، ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی شخص ایک غیر عورت کو اپنے لیے حلال کرنا چاہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اسے حلال کرنے سے پہلے نکاح کرے۔

امام شافعیؒ کا مسلک اِن تینوں سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کا اپنی بیوی سے ظِہار کرنے کے بعد اُسے حسبِ سابق بیوی بنائے رکھنا، یا بالفاظِ دیگر، اسے بیوی کی حیثیت سے روکے رکھنا عَود ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے ظِہار کیا، اُسی وقت گویا اُس نے اپنے لیے یہ بات حرام کر لی کہ اُسے بیوی بنا کر رکھے۔ لہٰذا اگر اس نے ظِہار کرتے ہی فوراً اسے طلاق نہ دی اور اِتنی دیر تک اُسے روکے رکھا جس میں وہ طلاق کے الفاظ زبان سے نکال سکتا تھا، تو اس نے عَود کر لیا اور اس پر کفارہ واجب ہو گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سانس میں ظِہار کرنے کے بعد اگر آدمی دوسرے ہی سانس میں طلاق نہ دے دے تو کفّارہ لازم آ جائے گا، خواہ بعد میں اُس کا فیصلہ یہی ہو کہ اِس عورت کو بیوی بنا کر نہیں رکھنا ہے، اور اُس کا کوئی ارادہ اس کے ساتھ تعلقِ زن و شَو رکھنے کا نہ ہو۔ حتّٰی کہ چند منٹ غور کر کے وہ بیوی کو طلاق بھی دے ڈالے تو امام شافعیؒ کے مسلک کی رُو سے کفارہ اس کے ذمّے لازم رہے گا۔

۱۴- قرآن کا حکم ہے کہ ظِہار کرنے والا کفّارہ دے قبل اس کے کہ زوجین ایک دوسرے کو ”مَسّ“ کریں۔ ائمۂ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اِس آیت میں مَس سے مراد چھُونا ہے، اس لیے کفارے سے پہلے صرف مباشرت ہی حرام نہیں ہے بلکہ شوہر کسی طرح بھی بیوی کو چھُو نہیں سکتا۔ شافعیہ شہوت کے ساتھ چھُونے کو حرام کہتے ہیں، حنابلہ ہر طرح کے تلذُّذ کو حرام قرار دیتے ہیں، اور مالکیہ لذّت کے لیے بیوی کے جسم پر بھی نظر ڈالنے کو ناجائز ٹھیراتے ہیں اور ان کے نزدیک صرف چہرے اور ہاتھوں پر نظر ڈالنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

۱۵- ظِہار کے بعد اگر آدمی بیوی کو طلاق دے دے تو رَجعی طلاق ہونے کی صورت میں رُجوع کر کے بھی وہ کفارہ دیے بغیر اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ بائن ہونے کی صورت میں اگر اس سے دوبارہ نکاح کرے تب بھی اسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفارہ دینا ہوگا۔ حتّٰی کہ اگر تین طلاق دے چکا ہو، اور عورت دوسرے آدمی سے نکاح کرنے کے بعد بیوہ یا مُطلّقہ ہو چکی ہو، اور اس کے بعد ظِہار کرنے والا شوہر اس سے از سرِ نو نکاح کر لے، پھر بھی کفارے کے بغیر وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ اسے ماں یا مُحرّمات سے تشبیہ دے کر اپنے اُوپر ایک دفعہ حرام کر چکا ہے، اور یہ حُرمت کفّارے کے بغیر رفع نہیں ہو سکتی۔ اِس پر ائمۂ اربعہ کا اتفاق ہے۔

۱۶- عورت کے لیے لازم ہے کہ جس شوہر نے اس کے ساتھ ظِہار کیا ہے اسے ہاتھ نہ لگانے دے جب تک وہ کفارہ ادا نہ کرے۔ اور چونکہ تعلقِ زن و شو عورت کا حق ہے، جس سے ظِہار کر کے شوہر نے اسے محروم کیا ہے، اس لیے اگر وہ کفارہ نہ دے تو بیوی عدالت کی طرف رُجوع کر سکتی ہے۔ عدالت اس کے شوہر کو مجبور کرے گی کہ وہ کفارہ دے کر حُرمت کی وہ دیوار ہٹائے جو اس نے اپنے اور اُس کے درمیان حائل کر لی ہے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو عدالت اسے ضرب یا قید یا دونوں طرح کی سزائیں دے سکتی ہے۔ یہ بات بھی چاروں مذاہبِ فقہ میں مُتّفَق عَلَیہ ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مذہبِ حنفی میں عورت کے لیے صرف یہی ایک چارۂ کار ہے، ورنہ ظِہار پر خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے، عورت کو اگر عدالت اِس مشکل سے نہ نکالے تو وہ تمام عمر معلّق رہے گی، کیونکہ ظِہار سے نکاح ختم نہیں ہوتا، صرف شوہر کا حقِ تمتُّع سلب ہوتا ہے۔ مالکی مذہب میں اگر شوہر عورت کو ستانے کے لیے ظِہار کر کے معلّق چھوڑ دے تو اس پر اِیلا کے احکام جاری ہوں گے، یعنی وہ چار مہینے سے زیادہ عورت کو روک کر نہیں رکھ سکتا۔ (احکامِ اِیلا کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۲۴۵ تا ۲۴۷) شافعیہ کے نزدیک اگرچہ ظِہار میں احکامِ اِیلا تو صرف اُس وقت جاری ہو سکتے ہیں جب کہ شوہر نے ایک مدّتِ خاص کے لیے ظِہار کیا ہو اور وہ مدّت چار مہینے سے زیادہ ہو، لیکن چونکہ مذہبِ شافعی کی رُو سے شوہر پر اُسی وقت کفارہ واجب ہو جاتا ہے جب وہ عورت کو بیوی بنا کر رکھے رہے، اس لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ کسی طویل مدت تک اس کو معلّق رکھے۔

۱۷- قرآن اور سنّت میں تصریح ہے کہ ظِہار کا پہلا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے۔ اس سے آدمی عاجز ہو تب دو مہینے کے روزوں کی شکل میں کفارہ دے سکتا ہے۔ اور اس سے بھی عاجز ہو تب ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے۔ لیکن اگر تینوں کفّاروں سے کوئی شخص عاجز ہو تو چونکہ شریعت میں کفّارے کی کوئی اور شکل نہیں رکھی گئی ہے، اس لیے اُسے اُس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک وہ ان میں سے کسی ایک پر قادر نہ ہو جائے۔ البتہ سنّت سے یہ ثابت ہے کہ ایسے شخص کی مدد کی جانی چاہیے،

Maktaba Tul Ishaat.com

تاکہ وہ تیسرا کفّارہ ادا کر سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال سے ایسے لوگوں کی مدد فرمائی ہے جو اپنی غَلَطی سے اِس مشکل میں پھنس گئے تھے اور تینوں کَفّاروں سے عاجز تھے۔

۱۸- قرآنِ مجید کفارے میں رَقَبَہ آزاد کرنے کا حکم دیتا ہے، جس کا اِطلاق لونڈی اور غلام دونوں پر ہوتا ہے، اور اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ شِیر خوار بچہ بھی اگر غلامی کی حالت میں ہو تو اسے آزاد کر دینا کفارے کے لیے کافی ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مومن اور کافر، دونوں قسم کے غلام آزاد کیے جا سکتے ہیں یا صرف مومن غلام ہی آزاد کرنا ہو گا۔ حَنَفِیَہ اور ظاہر یّہ کہتے ہیں کہ غلام خواہ مومن ہو یا کافر، اس کا آزاد کر دینا کفّارۂ ظِہار کے لیے کافی ہے، کیونکہ قرآن میں مطلق رَقَبَہ کا ذکر ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ مومن ہی ہونا چاہیے۔ بخلاف اس کے شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ اس کے لیے مومن کی شرط لگاتے ہیں، اور انھوں نے اس حکم کو اُن دوسرے کَفّاروں پر قیاس کیا ہے جن میں رَقَبَہ کے ساتھ قرآنِ مجید میں مومن کی قید لگائی گئی ہے۔

۱۹- غلام نہ پانے کی صورت میں قرآن کا حکم ہے کہ ظِہار کرنے والا مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے قبل اس کے کہ زوجین ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اس فرمانِ الٰہی پر عمل کرنے کی تفصیلات مختلف فقہی مذاہب میں حسبِ ذیل ہیں:

الف - اس امر پر اتفاق ہے کہ مہینوں سے مُراد ہِلالی مہینے ہیں۔ اگر طُلوعِ ہِلال سے روزوں کا آغاز کیا جائے تو دو مہینے پورے کرنے ہوں گے۔ اگر بیچ میں کسی تاریخ سے شروع کیا جائے تو حَنَفِیَہ اور حَنابِلہ کہتے ہیں کہ ۶۰ روزے رکھنے چاہییں۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ پہلے اور تیسرے مہینے میں مجموعی طور پر ۳۰ روزے رکھے اور بیچ کا ہِلالی مہینا خواہ ۲۹ کا ہو یا ۳۰ کا، اُس کے روزے رکھ لینے کافی ہیں۔

ب - حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ روزے ایسے وقت شروع کرنے چاہییں جب کہ بیچ میں نہ رمضان آئے نہ عیدین نہ یوم النحر اور ایّامِ تَشریق، کیونکہ کفارے کے روزے رکھنے کے دوران میں رمضان کے روزے رکھنے اور عیدین اور یوم النحر اور ایّامِ تَشریق کے روزے چھوڑنے سے دو مہینے کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے پڑیں گے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ بیچ میں رمضان کے روزے رکھنے اور حرام دنوں کے روزے نہ رکھنے سے تسلسل نہیں ٹوٹتا۔

ج - دو مہینوں کے دوران میں خواہ آدمی کسی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑے یا بلا عذر، دونوں صورتوں میں حَنَفِیَہ اور شافعیہ کے نزدیک تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے۔ یہی رائے امام محمد باقرؒ، ابراہیم نَخَعیؒ، سعید بن جُبَیرؒ اور سُفیان ثَوریؒ کی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مرض یا سفر کے عذر سے بیچ میں روزہ چھوڑا جا سکتا ہے اور اس سے تسلسل نہیں ٹوٹتا، البتہ بلا عذر روزہ چھوڑ دینے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا اِستِدلال یہ ہے کہ کفارے کے روزے رمضان کے فرض روزوں سے زیادہ مُؤکّد نہیں ہیں۔ جب اُن کو عذر کی بنا پر چھوڑا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اِن کو نہ چھوڑا جا سکے۔ یہی قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصری، عطاء بن ابی رَباح، سعید بن المُسَیَّب، عَمْرو بن دِینار، شَعْبی، طاؤس، مجاہد، اسحاق بن راھَوَیہ، ابوعُبَید اور ابوثَور رحمہم اللہ کا ہے۔

د - دو مہینوں کے دوران میں اگر آدمی اُس بیوی سے مباشرت کر بیٹھے جس سے اس نے ظِہار کیا ہو، تو تمام ائمہ کے نزدیک

اس سے تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے، کیونکہ ہاتھ لگانے سے پہلے دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۰- قرآن اور سنت کی رُو سے تیسرا کفارہ (یعنی ۶۰ مسکینوں کا کھانا) وہ شخص دے سکتا ہے جو دوسرے کفّارے (دو مہینے کے مسلسل روزوں) کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اِس حکم پر عمل درآمد کرنے کے لیے فقہا نے جو تفصیلی احکام مرتّب کیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

الف۔ ائمۂ اربعہ کے نزدیک روزوں پر قادر نہ ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی یا تو بڑھاپے کی وجہ سے قادر نہ ہو، یا مرض کے سبب سے، یا اِس سبب سے کہ وہ مسلسل دو مہینے تک مباشرت سے پرہیز نہ کرسکتا ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ اس دوران میں کہیں بے صبری نہ کر بیٹھے۔ اِن تینوں عذرات کا صحیح ہونا اُن احادیث سے ثابت ہے جو اَوسؓ بن صامت انصاری اور سلَمہؓ بن صَخر بیاضی کے معاملے میں وارد ہوئی ہیں۔ البتہ مرض کے معاملے میں فقہا کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ مرض کا عُذر اُس صورت میں صحیح ہوگا جب کہ یا تو اس کے زائل ہونے کی اُمید نہ ہو، یا روزوں سے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر روزوں سے ایسی شدید مَشقّت لاحق ہوتی ہو جس سے آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ دو مہینے کے دوران میں کہیں سلسلہ منقطع نہ کرنا پڑے، تو یہ عُذر بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی کا گمانِ غالب یہ ہو کہ وہ مستقبل میں روزہ رکھنے کے قابل ہو سکے گا تو انتظار کرلے، اور اگر گمانِ غالب اِس قابل نہ ہوسکنے کا ہو تو مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ روزے سے مرض بڑھ جانے کا اندیشہ بالکل کافی عُذر ہے۔

ب۔ کھانا صرف اُن مساکین کو دیا جاسکتا ہے جن کا نفقہ آدمی کے ذمے واجب نہ ہوتا ہو۔

ج۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ کھانا مسلمان اور ذِمّی، دونوں قسم کے مساکین کو دیا جاسکتا ہے، البتہ حربی اور مُستامَن کُفّار کو نہیں دیا جاسکتا۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ صرف مسلمان مساکین ہی کو دیا جاسکتا ہے۔

د۔ یہ امر مُتّفق عَلَیہ ہے کہ کھانا دینے سے مراد دو وقت کا پیٹ بھر کھانا دینا ہے۔ البتہ کھانا دینے کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ دو وقت کی شکم سیری کے قابل غلّہ دے دینا، یا کھانا پکا کر دو وقت کھلا دینا، دونوں یکساں صحیح ہیں، کیونکہ قرآنِ مجید میں اِطعام کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی خوراک دینے کے بھی ہیں اور کھلانے کے بھی۔ مگر مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ پکا کر کھلانے کو صحیح نہیں سمجھتے، بلکہ غلّہ دے دینا ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ غلّہ دینے کی صورت میں یہ امر مُتّفق عَلَیہ ہے کہ وہ غلّہ دینا چاہیے جو اُس شہر یا علاقے کے لوگوں کی عام غذا ہو۔ اور سب مسکینوں کو برابر دینا چاہیے۔

ھ۔ حنفیہ کے نزدیک اگر ایک ہی مسکین کو ۶۰ دن تک کھانا دیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے، البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک ہی دن اُسے ۶۰ دنوں کی خوراک دے دی جائے۔ لیکن باقی تینوں مذاہب ایک مسکین کو دینا صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ۶۰ ہی مساکین کو دینا ضروری ہے۔ اور یہ بات چاروں مذاہب میں جائز نہیں ہے کہ ۶۰ آدمیوں کو ایک وقت کی خوراک اور دوسرے ۶۰ آدمیوں کو دوسرے وقت کی خوراک دی جائے۔

و۔ یہ بات چاروں مذاہب میں سے کسی میں جائز نہیں ہے کہ آدمی ۳۰ دن کے روزے رکھے اور ۳۰ مسکینوں کو کھانا دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا

یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ[12]۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے[13]۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسُولؐ کی مخالفت کرتے ہیں[14] وہ اسی طرح ذلیل و

دو کفارے جمع نہیں کیے جا سکتے۔ روزے رکھنے ہوں تو پورے دو مہینوں کے مسلسل رکھنے چاہییں۔ کھانا کھلانا ہو تو ۶۰ مسکینوں کو کھلایا جائے۔

ز- اگرچہ قرآنِ مجید میں کفارۂ طعام کے متعلق یہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں کہ یہ کفارہ بھی زوجین کے ایک دوسرے کو چھُونے سے پہلے ادا ہونا چاہیے، لیکن فَحوائے کلام اس کا مقتضی ہے کہ اِس تیسرے کفّارے پر بھی اِس قید کا اطلاق ہوگا۔ اسی لیے ائمۂ اربعہ نے اِس کو جائز نہیں رکھا ہے کہ کفارۂ طعام کے دوران میں آدمی بیوی کے پاس جائے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جو شخص ایسا کر بیٹھے، اس کے متعلق حنابلہ یہ حکم دیتے ہیں کہ اسے ازسرِنو کھانا دینا ہوگا۔ اور حنفیہ اس معاملے میں رعایت کرتے ہیں، کیونکہ اس تیسرے کفارے کے معاملے میں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کی صراحت نہیں ہے، اور یہ چیز رعایت کی گنجایش دیتی ہے۔

یہ احکام فقہ کی حسبِ ذیل کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں: فقہ حنفی: ہدایہ، فتح القدیر، بدائع الصنائع، احکام القرآن للجصّاص۔ فقہ شافعی: المنہاج للنّووی مع شرح مُغنی المحتاج، تفسیرِ کبیر۔ فقہ مالکی: حاشیۃ الدُّسوقی علی الشرح الکبیر، بدایۃ المجتہد، احکام القرآن لابنِ عربی۔ فقہ حنبلی: المُغنی لابنِ قُدامہ۔ فقہ ظاہری: المُحلّٰی لابنِ حزم۔

۱۲- یہاں ''ایمان لانے'' سے مراد سچّے اور مخلص مومن کا سا رَوِیّہ اختیار کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ آیت کے مخاطَب کفار و مشرکین نہیں ہیں، بلکہ مسلمان ہیں، جو پہلے ہی ایمان لائے ہوئے تھے۔ اُن کو شریعت کا ایک حکم سنانے کے بعد یہ فرمانا کہ ''یہ حکم تم کو اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ''، صاف طور پر یہ معنٰی رکھتا ہے کہ جو شخص خدا کے اِس حکم کو سننے کے بعد بھی جاہلیّت کے پُرانے رواجی قانون کی پیروی کرتا رہے، اُس کا یہ طرزِ عمل ایمان کے منافی ہوگا۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ جب زندگی کے کسی معاملے میں اس کے لیے ایک قانون مقرر کر دے، تو وہ اس کو چھوڑ کر دنیا کے کسی دوسرے قانون کی پیروی کرے، یا اپنے نفس کی خواہشات پر عمل کرتا رہے۔

۱۳- یہاں کافر سے مراد منکرِ خدا و رسالت نہیں ہے، بلکہ وہ شخص ہے جو خدا و رسولؐ کو ماننے کا اقرار و اظہار کرنے کے بعد بھی وہ طرزِ عمل اختیار کرے جو ایک کافر کے کرنے کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ دراصل کافروں کا کام ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم سننے کے بعد بھی اپنی مرضی چلاتے رہیں، یا جاہلیت کے طریقوں ہی کی پیروی کرتے رہیں۔ ورنہ سچّے دل سے ایمان لانے والا تو کبھی یہ رَوِیّہ اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی بات سورۂ آلِ عمران میں بھی حج کی فرضیت کا

كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۭ وَ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۵ۚ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا
عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ۭ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۶ۧ

ع

خوار کردیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل وخوار کیے جا چکے ہیں[15]۔ ہم نے صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں، اور کافروں کے لیے ذلّت کا عذاب ہے[16]۔ اُس دن (یہ ذلّت کا عذاب ہونا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اُٹھائے گا اور انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ بُھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گِن گِن کر محفوظ کر رکھا ہے[17] اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے۔ ع

حکم دینے کے بعد فرمائی گئی ہے کہ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ "اور جو کفر کرے (یعنی اِس حکم کی اطاعت نہ کرے) تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔" اِن دونوں مقامات پر "کفر" کا لفظ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ جو شخص بھی ظِہار کرنے کے بعد کفّارہ ادا کیے بغیر بیوی سے تعلق رکھے، یا یہ سمجھے کہ ظِہار ہی سے بیوی کو طلاق ہوگئی ہے، یا استطاعت کے باوجود حج نہ کرے، اُسے قاضیِ شرع کافر و مرتد ٹھیرا دے اور سب مسلمان اسے خارج از اسلام قرار دے دیں۔ بلکہ یہ اس معنیٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے لوگوں کا شمار مومنین میں نہیں ہے جو اُس کے احکام کو قول یا عمل سے رد کر دیں اور اِس امر کی کوئی پروا نہ کریں کہ اُن کے رب نے اُن کے لیے کیا حُدود مقرر کی ہیں، کن چیزوں کو فرض کیا ہے، کن چیزوں کو حلال کیا ہے اور کیا چیزیں حرام کر دی ہیں۔

۱۴ – مخالفت کرنے سے مراد اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کو نہ ماننا اور ان کے بجائے کچھ دوسری حدیں مقرر کر لینا ہے۔ ابن جَریر طبریؒ اِس آیت کی تفسیر یہ کرتے ہیں: ای یخالفون فی حدودہ وفرائضہ فیجعلون حدودًا غیر حدودہ۔ "یعنی وہ لوگ جو اللہ کی حدود اور اس کے فرائض کے معاملے میں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اُس کی مقرر کی ہوئی حدوں کی جگہ دوسری حدیں تجویز کر لیتے ہیں۔" بَیضاویؒ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے: ای یعادونھما ویشاقونھما اویضعون اویختارون حدودًا غیر حدودھما۔ "یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ سے مخاصمت اور جھگڑا کرتے ہیں، یا ان کی مقرر کی ہوئی حدوں کے سوا دوسری حدیں خود وضع کر لیتے ہیں، یا دوسروں کی وضع کردہ حدوں کو اختیار کرتے ہیں۔" آلوسیؒ نے روح المعانی میں بیضاوی کی اس تفسیر سے اتفاق کرتے ہوئے شیخ الاسلام سعد اللہ چلپی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس آیت میں اُن بادشاہوں اور حُکّامِ سُوء کے لیے سخت وعید ہے جنھوں نے شریعت کی مقرر کردہ حدود کے خلاف بہت سے احکام وضع کر لیے ہیں اور ان

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ

کیا[18] تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ

کا نام قانون رکھا ہے۔" اس مقام پر علامۂ آلوسیؒ شرعی قوانین کے مقابلے میں وضعی قوانین کی آئینی (یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے آئینی) حیثیت پر مفصّل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُس شخص کے کفر میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے جو اِس قانون کو مستحسن اور شریعت کے مقابلے میں افضل قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ زیادہ حکیمانہ اور قوم کے لیے زیادہ مناسب و موزوں ہے، اور جب کسی معاملے میں اُس سے کہا جائے کہ شریعت کا حکم اِس کے بارے میں یہ ہے تو اس پر غصّے میں بھڑک اٹھتا ہے، جیسا کہ ہم نے بعض ان لوگوں کو دیکھا ہے جن پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔"

۱۵ - اصل میں لفظ کَبْت استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں: رُسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، راندۂ درگاہ کر دینا، دھکے دے کر نکال دینا، تذلیل کرنا۔ ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت اور اس کے احکام سے بغاوت کا جو انجام پچھلے انبیاؑ کی اُمّتیں دیکھ چکی ہیں، اُس سے وہ لوگ ہرگز نہ بچ سکیں گے جو اَب مسلمانوں میں سے وہی رَوِش اختیار کریں۔ اُنھوں نے بھی جب خدا کی شریعت کے خلاف خود قوانین بنائے، یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کو اختیار کیا، تب اللہ کے فضل اور اس کی نظرِ عنایت سے وہ محروم ہوئے، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی ایسی گمراہیوں، بدکرداریوں اور اخلاقی و تمدّنی برائیوں سے لبریز ہوتی چلی گئی جنھوں نے بالآخر دنیا ہی میں ان کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑا۔ یہی غلطی اگر اب اُمّتِ محمدیہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مقبولِ بارگاہ بنی رہے اور اللہ اسے ذلّت کے گڑھے میں گرنے سے بچائے چلا جائے۔ اللہ کو نہ اپنے پچھلے رسولوں کی اُمت سے کوئی عداوت تھی، نہ اِس رسول کی اُمّت سے اس کا کوئی مخصوص رشتہ ہے۔

۱۶ - سِیاقِ عبارت پر غور کرنے سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ یہاں اِس رَوِش کی دو سزاؤں کا ذکر ہے: ایک، کَبْت، یعنی وہ خواری و رسوائی جو اِس دنیا میں ہوئی اور ہو گی۔ دوسرے، عذابِ مُہین، یعنی ذلّت کا وہ عذاب جو آخرت میں ہونے والا ہے۔

۱۷ - یعنی اُن کے بھول جانے سے معاملہ رفت گزشت نہیں ہو گیا ہے۔ اُن کے لیے خدا کی نافرمانی اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی ایسی معمولی چیز ہو سکتی ہے کہ اُس کا ارتکاب کر کے اسے یاد تک نہ رکھیں، بلکہ اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز ہی نہ سمجھیں کہ اس کی کچھ پروا اُنھیں ہو۔ مگر خدا کے نزدیک یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اُس کے ہاں ان کا ہر کرتوت نوٹ ہو چکا ہے۔ کس شخص نے، کب، کہاں، کیا حرکت کی، اُس حرکت کے بعد اُس کا اپنا ردِّعمل کیا تھا، اور اس کے کیا نتائج، کہاں کہاں، کس کس شکل میں برآمد ہوئے، یہ سب کچھ اس کے دفتر میں لکھ لیا گیا ہے۔

۱۸ - یہاں سے آیت ۱۰ تک مسلسل منافقین کے اُس طرزِ عمل پر گرفت کی گئی ہے جو انھوں نے اُس وقت مُسلم معاشرے

مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَآ
اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ
يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا

تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو[19]۔ خُفیہ بات کرنے والے، خواہ اِس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں، اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے[20]۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنھیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے

میں اختیار کر رکھا تھا۔ وہ بظاہر مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے، مگر اندر ہی اندر انھوں نے اہلِ ایمان سے الگ اپنا ایک جتھا بنا رکھا تھا۔ مسلمان جب بھی انھیں دیکھتے، یہی دیکھتے کہ وہ آپس میں سر جوڑے کُھسر پُسر کر رہے ہیں۔ اِنھی خفیہ سرگوشیوں میں وہ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور فتنے برپا کرنے اور ہراس پھیلانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتے اور نئی نئی افواہیں گھڑتے تھے۔

۱۹ – سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں دو اور تین کے بجائے تین اور پانچ کا ذکر کس مصلحت سے کیا گیا ہے؟ پہلے دو اور پھر چار کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ مفسّرین نے اس کے بہت سے جوابات دیے ہیں، مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ طرزِ بیان دراصل قرآنِ مجید کی عبارت کے ادبی حُسن کو برقرار رکھنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو عبارت یوں ہوتی: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوَى اثْنَيْنِ اِلَّا هُوَ ثَالِثُهُمْ وَلَا ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ۔ اس میں نَجْوَى اثْنَيْنِ بھی کوئی خوبصورت ترکیب نہ ہوتی اور ثَالِث اور ثَلٰثَةٍ کا یکے بعد دیگرے آنا بھی حلاوت سے خالی ہوتا۔ یہی قباحت اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ کے بعد وَلَآ اَرْبَعَةٍ کہنے میں بھی تھی۔ اس لیے تین اور پانچ سرگوشی کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد دوسرے فقرے میں اِس خلا کو یہ کہہ کر بھر دیا گیا کہ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ، سرگوشی کرنے والے خواہ تین سے کم ہوں یا پانچ سے زیادہ، بہر حال اللہ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

۲۰ – یہ معیّت درحقیقت اللہ جَلّ شانُہٗ کے علیم و خبیر، اور سمیع و بصیر، اور قادرِ مُطلَق ہونے کے لحاظ سے ہے، نہ کہ معاذ اللہ، اس معنٰی میں کہ اللہ کوئی شخص ہے جو پانچ اشخاص کے درمیان ایک چھٹے شخص کی حیثیت سے کسی جگہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ دراصل اس ارشاد سے لوگوں کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی محفوظ مقامات پر خفیہ

Maktaba Tul Ishaat.com

عَنۡهُ وَ يَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِيَتِ
الرَّسُوۡلِ ۡ وَ اِذَا جَآءُوۡكَ حَيَّوۡكَ بِمَا لَمۡ يُحَيِّكَ
بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوۡلُوۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ لَوۡ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا
نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝۸

انھیں منع کیا گیا تھا؟[21] یہ لوگ چھُپ چھُپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں اور جب تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں اُس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے،[22] اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔[23] اُن کے لیے جہنّم ہی کافی ہے۔ اُسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی بُرا انجام ہے اُن کا۔

مشورہ کر رہے ہوں۔ ان کی بات دنیا بھر سے چھُپ سکتی ہے مگر اللہ سے نہیں چھُپ سکتی، اور وہ دنیا کی ہر طاقت کی گرفت سے بچ سکتے ہیں، مگر اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

۲۱ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت کے نُزول سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو اِس رَوِش سے منع فرما چکے تھے، اس پر بھی جب وہ باز نہ آئے تب براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمانِ عتاب نازل ہوا۔

۲۲ – یہ یہود اور منافقین کا مشترک رویّہ تھا۔ متعدّد روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے السام علیك یا ابا القاسم کہا۔ یعنی السّلام علیک کا تَلَفُّظ کچھ اس انداز سے کیا کہ سُننے والا سمجھے سلام کہا ہے، مگر دراصل انھوں نے سام کہا تھا، جس کے معنٰی موت کے ہیں۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا: وعلیکم۔ حضرت عائشہؓ سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کہا: موت تمھیں آئے اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑے۔ حضورؐ نے انھیں تنبیہ فرمائی کہ اے عائشہ! اللہ کو بدزبانی پسند نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپؐ نے سنا نہیں کہ انھوں نے کیا کہا؟ حضورؐ نے فرمایا: اور تم نے نہیں سنا کہ میں نے انھیں کیا جواب دیا؟ میں نے ان سے کہہ دیا: ''اور تم پر بھی'' (بخاری، مسلم، ابنِ جَریر، ابن ابی حاتم) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ منافقین اور یہود، دونوں نے سلام کا یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ (ابنِ جَریر)

۲۳ – یعنی وہ اپنے نزدیک اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول نہ ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ رسول ہوتے تو جس وقت ہم انھیں اِس طریقے سے سلام کرتے، اُسی وقت ہم پر عذاب آ جاتا۔ اب چونکہ کوئی عذاب نہیں آتا، حالانکہ ہم شب و روز یہ حرکت کرتے رہتے ہیں، لہٰذا یہ رسول نہیں ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ
مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اُس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمھیں حشر میں پیش ہونا ہے[۲۴]۔ کانا پُھوسی تو ایک شیطانی کام ہے، اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اُس سے رنجیدہ ہوں، حالانکہ بے اِذنِ خدا وہ انھیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا

۲۴ — اس سے معلوم ہوا کہ نجویٰ (آپس میں راز کی بات کرنا) بجائے خود ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا انحصار اُن لوگوں کے کردار پر ہے جو ایسی بات کریں، اور اُن حالات پر ہے جن میں ایسی بات کی جائے، اور اُن باتوں کی نوعیت پر ہے جو اِس طریقے سے کی جائیں۔ جن لوگوں کا اخلاص، جن کی راست بازی، جن کے کردار کی پاکیزگی معاشرے میں معلوم و معروف ہو، اُنھیں کسی جگہ سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر کسی کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ آپس میں کسی شرارت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ شر اور بدکرداری کے لیے معروف ہوں، اُن کی سرگوشیاں ہر شخص کے دل میں یہ کھٹک پیدا کر دیتی ہیں کہ ضرور کسی نئے فتنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اِسی طرح اتفاقاً کبھی دو چار آدمی باہم کسی معاملے پر سرگوشی کے انداز میں بات کر لیں تو یہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے اپنا ایک جتھا بنا رکھا ہو اور ان کا مستقل وتیرہ یہی ہو کہ ہمیشہ جماعتِ مسلمین سے الگ ان کے درمیان کُھسر پُسر ہوتی رہتی ہو، تو یہ لازماً خرابی کا پیش خیمہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کا کم سے کم نقصان یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں میں پارٹی بازی کی بیماری پھیلتی ہے۔ اِن سب سے بڑھ کر جو چیز نجویٰ کے جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ کرتی ہے، وہ اُن باتوں کی نوعیت ہے جو نجویٰ میں کی جائیں۔ دو آدمی اگر اس لیے باہم سرگوشی کرتے ہیں کہ کسی جھگڑے کا تصفیہ کرانا ہے، یا کسی کا حق دلوانا ہے، یا کسی نیک کام میں حصہ لینا ہے، تو یہ کوئی بُرائی نہیں ہے، بلکہ کارِ ثواب ہے۔ اس کے برعکس اگر یہی نجویٰ دو آدمیوں کے درمیان اِس غرض کے لیے ہو کہ کوئی فساد ڈلوانا ہے، یا کسی کا حق مارنا ہے، یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ غرض بجائے خود ایک بُرائی ہے اور اس کے لیے نجویٰ بُرائی پر بُرائی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سلسلے میں آدابِ مجلس کی جو تعلیم دی ہے، وہ یہ ہے کہ اذا کنتم ثلاثة فلا یتناجی اثنان دون صاحبهما فان ذالك یحزنهٗ۔ ”جب تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آدمی آپس میں کُھسر پُسر نہ کریں،

Maktaba Tul Ishaat.com

الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي
الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا

رکھنا چاہیے۔[25]

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلسوں میں کُشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو، اللہ تمھیں کُشادگی بخشے گا۔[26] اور جب تم سے کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جایا کرو۔[27]

کیونکہ یہ تیسرے آدمی کے لیے باعثِ رنج ہوگا۔'' (بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ترمذی، ابوداؤد) دوسری حدیث میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: فلا یتناجی اثنان دون الثالث الا باذنه ذٰلك یحزنهٗ۔'' دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں، مگر تیسرے سے اجازت لے کر، کیونکہ یہ اس کے لیے باعثِ رنج ہوگا۔'' (مسلم) اِسی ناجائز سرگوشی کی تعریف میں یہ بات بھی آتی ہے کہ دو آدمی تیسرے شخص کی موجودگی میں کسی ایسی زبان میں بات کرنے لگیں جسے وہ نہ سمجھتا ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ ناجائز بات یہ ہے کہ وہ اپنی سرگوشی کے دوران میں کسی کی طرف اِس طرح دیکھیں یا اشارے کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُن کے درمیان موضوعِ بحث وہی ہے۔

۲۵ – یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کچھ لوگوں کی سرگوشیاں دیکھ کر یہ شبہ بھی ہو جائے کہ وہ اُسی کے خلاف کی جا رہی ہیں، تب بھی اسے اتنا رنجیدہ نہ ہونا چاہیے کہ محض شبہ ہی شبہ پر کوئی جوابی کارروائی کرنے کی فکر میں پڑ جائے، یا اپنے دل میں اِس پر کوئی غم، یا کینہ، یا غیر معمولی پریشانی پرورش کرنے لگے۔ اُس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ اعتماد اس کے قلب میں ایسی قوت پیدا کر دے گا کہ بہت سے فضول اندیشوں اور خیالی خطروں سے اس کو نجات مل جائے گی اور وہ اشرار کو اُن کے حال پر چھوڑ کر پُورے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہے گا۔ اللہ پر توکّل کرنے والا مومن نہ تھُڑدِلا ہوتا ہے کہ ہر اندیشہ و گمان اس کے سُکون کو غارت کر دے، نہ کم ظرف ہوتا ہے کہ غلط کار لوگوں کے مقابلے میں آپے سے باہر ہو کر خود بھی خلافِ انصاف حرکتیں کرنے لگے۔

۲۶ – اس کی تشریح سورہ کے دیباچے میں کی جا چکی ہے۔ بعض مفسّرین نے اِس حکم کو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس تک محدود سمجھا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تمام مجلسوں کے لیے یہ ایک عام ہدایت ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اہلِ اسلام کو جو آداب سکھائے ہیں، ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب کسی مجلس میں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے ہوں اور بعد میں مزید کچھ لوگ آئیں، تو یہ تہذیب پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں ہونی چاہیے کہ وہ خود نئے آنے والوں کو جگہ دیں اور حتی الامکان کچھ سکڑ اور سمٹ کر ان کے لیے کشادگی پیدا کریں، اور اتنی شائستگی بعد کے آنے والوں میں ہونی چاہیے کہ وہ زبردستی ان کے اندر نہ گھُسیں اور کوئی شخص کسی کو اُٹھا کر اس کی جگہ بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یقیم الرجل الرجل من مجلسه

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ
الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ

تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا، [۲۸] اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم رسولؐ سے تخلیے میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو، [۲۹] یہ

فیجلس فیه ولکن تفسحوا وتوسعوا۔ ”کوئی شخص کسی کو اُٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے، بلکہ تم لوگ خود دوسروں کے لیے جگہ کشادہ کرو۔“ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم) اور حضرت عبداللہ بن عَمرُوؓ بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا یحل لرجل ان یفرق بین اثنین الا باذنھما ”کسی شخص کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان اُن کی اجازت کے بغیر دھس جائے۔“ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی)

۲۷ – عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دیر تک بیٹھے رہتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ آخر وقت تک بیٹھے رہیں۔ اس سے بسا اوقات حضورؐ کو تکلیف ہوتی تھی، آپؐ کے آرام میں بھی خلل پڑتا تھا اور آپؐ کے کاموں کا بھی حرج ہوتا تھا۔ اِس پر یہ حکم نازل ہوا کہ جب تم لوگوں سے کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جاؤ۔ (ابنِ جَریر و ابنِ کثیر)

۲۸ – یعنی یہ نہ سمجھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دوسروں کو جگہ دینے کی خاطر اگر تم آپؐ سے کچھ دُور جا بیٹھے تو تمھارا درجہ گر گیا، یا اگر مجلس برخاست کر کے تمھیں اُٹھ جانے کے لیے کہا گیا تو تمھاری کچھ ذلّت ہوگئی۔ رفعِ درجات کا اصل ذریعہ ایمان اور علم ہے، نہ یہ کہ کس کو مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھنے کا موقع ملا، اور کون زیادہ دیر تک آپؐ کے پاس بیٹھا۔ کوئی شخص اگر آپؐ کے قریب بیٹھ گیا تو اس کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ اسے بڑا مرتبہ مل گیا۔ بڑا مرتبہ تو اُسی کا رہے گا جس نے ایمان اور علم کی دولت زیادہ پائی ہے۔ اسی طرح کسی شخص نے اگر زیادہ دیر تک بیٹھ کر اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دی تو اس نے اُلٹا جہالت کا کام کیا۔ اس کے درجے میں محض یہ بات کوئی اضافہ نہ کر دے گی کہ اسے دیر تک آپؐ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ اُس سے بدرجہا زیادہ بلند مرتبہ اللہ کے ہاں اُس کا ہے جس نے آپؐ کی صحبت سے ایمان اور علم کا سرمایہ حاصل کیا اور وہ اَخلاق سیکھے جو ایک مومن میں ہونے چاہییں۔

۲۹ – حضرت عبداللہ بن عباسؓ اِس حکم کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ باتیں (یعنی تخلیے کی درخواست کر کے) پوچھنے لگے تھے، حتّٰی کہ انھوں نے حضورؐ کو تنگ کر دیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے نبی پر سے

Maktaba Tul Ishaat.com

خَیْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾
ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ
فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا
الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

تمھارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیے میں گفتگو کرنے سے پہلے تمھیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو ——— اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا ——— تو نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے[۳۰] ع

یہ بوجھ ہلکا کر دے۔ (ابنِ جَرِیر) زید بن اسلمؒ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شخص بھی علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کرتا، آپؐ اسے ردّ نہ فرماتے تھے۔ جس کا جی چاہتا، آ کر عرض کرتا کہ میں ذرا الگ بات کرنا چاہتا ہوں، اور آپؐ اسے موقع دے دیتے، یہاں تک کہ بہت سے لوگ ایسے معاملات میں بھی آپؐ کو تکلیف دینے لگے جن میں الگ بات کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ زمانہ وہ تھا جس میں سارا عرب مدینے کے خلاف برسرِ جنگ تھا۔ بعض اوقات کسی شخص کی اس طرح کی سرگوشی کے بعد شیطان لوگوں کے کان میں یہ پھونک دیتا تھا کہ یہ فلاں قبیلے کے حملہ آور ہونے کی خبر لایا تھا، اور اس سے مدینے میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف لوگوں کی اس حرکت کی وجہ سے منافقین کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کانوں کے کچّے ہیں، ہر ایک کی سُن لیتے ہیں۔ اِن وُجوہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو آپؐ سے خَلوت میں بات کرنا چاہے، وہ پہلے صدقہ دے۔ (احکام القرآن لابن العَرَبی) قَتادہؒ کہتے ہیں کہ دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کے لیے بھی بعض لوگ حضورؐ سے خَلوت میں بات کرتے تھے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ حکم آیا تو حضورؐ نے مجھ سے پوچھا: کتنا صدقہ مقرر کیا جائے؟ کیا ایک دینار؟ میں نے عرض کیا: یہ لوگوں کی مَقدِرت سے زیادہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: نصف دینار؟ میں نے عرض کیا: لوگ اس کی مَقدِرت بھی نہیں رکھتے۔ فرمایا: پھر کتنا؟ میں نے عرض کیا: بس ایک جَو برابر سونا۔ فرمایا: انك لزهید، یعنی تم نے تو بڑی کم مقدار کا مشورہ دیا۔ (ابنِ جَرِیر، تِرمِذی، مُسنَد ابو یَعلیٰ) ایک دوسری روایت میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں: قرآن کی یہ ایک ایسی آیت ہے جس

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ مَا هُمۡ
مِّنۡكُمۡ وَلَا مِنۡهُمۡ ۙ وَيَحۡلِفُوۡنَ عَلَى الۡكَذِبِ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴﴾
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾
اِتَّخَذُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ جُنَّةً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَلَهُمۡ عَذَابٌ
مُّهِيۡنٌ ﴿۱۶﴾ لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ

کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنھوں نے دوست بنایا ہے ایک ایسے گروہ کو جو اللہ کا مغضوب ہے؟[31] وہ نہ تمھارے ہیں نہ اُن کے،[32] اور وہ جان بُوجھ کر جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں[33]۔ اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے، بڑے ہی بُرے کرتُوت ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں،[34] اِس پر ان کے لیے ذلّت کا عذاب ہے۔ اللہ سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔

پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا۔ اِس حکم کے آتے ہی مَیں نے صدقہ پیش کیا اور ایک مسئلہ آپؐ سے پوچھ لیا۔ (ابنِ جریر، حاکم، ابن المُنذِر، عَبد بن حُمَید)

۳۰- یہ دوسرا حکم اُوپر کے حکم کے تھوڑی مدّت بعد ہی نازل ہو گیا اور اِس نے صدقے کے وجوب کو منسوخ کر دیا۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ صدقے کا یہ حکم کتنی دیر رہا۔ قَتادہؒ کہتے ہیں کہ ایک دن سے بھی کم مدّت تک باقی رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ مُقاتِل بن حَیّان کہتے ہیں: دس دن تک رہا۔ یہ زیادہ سے زیادہ اس حکم کے بقا کی مدّت ہے جو کسی روایت میں بیان ہوئی ہے۔

۳۱- اشارہ ہے مدینے کے یہودیوں کی طرف جنھیں منافقین نے دوست بنا رکھا تھا۔

۳۲- یعنی مخلصانہ تعلق اُن کا نہ اہلِ ایمان سے ہے نہ یہود سے۔ دونوں کے ساتھ انھوں نے محض اپنی اغراض کے لیے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔

۳۳- یعنی اِس بات پر کہ وہ ایمان لائے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و پیشوا مانتے ہیں اور اسلام و اہلِ اسلام کے وفادار ہیں۔

۳۴- مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے ایمان اور اپنی وفاداری کی قسمیں کھا کر مسلمانوں کی گرفت سے بچے رہتے

Maktaba Tul Ishaat.com

شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝١٧ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ
اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى
شَیْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝١٨ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ
فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝١٩ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ
فِی الْاَذَلِّيْنَ ۝٢٠ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

وہ دوزخ کے یار ہیں، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس روز اللہ ان سب کو اُٹھائے گا، وہ اس کے سامنے بھی اُسی طرح قَسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھاتے ہیں،[۳۵] اور اپنے نزدیک یہ سمجھیں گے کہ اس سے ان کا کچھ کام بن جائے گا۔ خوب جان لو! وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ شیطان اُن پر مسلّط ہو چکا ہے اور اُس نے خدا کی یاد اُن کے دل سے بُھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو! شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ یقیناً ذلیل ترین مخلوقات میں سے ہیں وہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ مَیں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔[۳۶] فی الواقع اللہ

ہیں، اور دوسری طرف اسلام اور اہلِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف ہر طرح کے شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں، تاکہ لوگ یہ سمجھ کر اسلام قبول کرنے سے باز رہیں کہ جب گھر کے بھیدی یہ خبریں دے رہے ہیں تو ضرور اندر کچھ دال میں کالا ہو گا۔

۳۵ – یعنی یہ صرف دنیا ہی میں اور صرف انسانوں ہی کے سامنے جھوٹی قسمیں کھانے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ قیامت میں خود اللہ جَلّ شانُہٗ کے سامنے بھی یہ جھوٹی قسمیں کھانے سے باز نہ رہیں گے۔ جھوٹ اور فریب اِن کے اندر اتنا گہرا اُتر چکا ہے کہ مر کر بھی یہ ان سے نہ چھُوٹے گا۔

۳۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۹۳۔

قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۱﴾ لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ
یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَہُمۡ
اَوۡ اِخۡوَانَہُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ

زبردست اور زور آور ہے۔

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبّت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی، یا اُن کے اہلِ خاندان[۳۷]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت

۳۷- اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک بات اُصولی ہے، اور دوسری امرِ واقعی کا بیان۔ اُصولی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دینِ حق پر ایمان اور اعدائے دین کی محبّت، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں، جن کا ایک جگہ اجتماع کسی طرح قابلِ تصوّر نہیں ہے۔ یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ ایمان اور دشمنانِ خدا و رسول کی محبّت ایک دل میں جمع ہو جائیں، بالکل اُسی طرح جیسے ایک آدمی کے دل میں اپنی ذات کی محبّت اور اپنے دشمن کی محبّت بیک وقت جمع نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ایمان کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس نے ایسے لوگوں سے محبّت کا رشتہ بھی جوڑ رکھا ہے جو اسلام کے مخالف ہیں، تو یہ غلط فہمی تمھیں ہرگز لاحق نہ ہونی چاہیے کہ شاید وہ اپنی اِس رَوِش کے باوجود ایمان کے دعوے میں سچا ہو۔ اِسی طرح جن لوگوں نے اسلام اور مخالفینِ اسلام سے بیک وقت رشتہ جوڑ رکھا ہے، وہ خود بھی اپنی پوزیشن پر اچھی طرح غور کر لیں کہ وہ فی الواقع کیا ہیں، مومن ہیں یا منافق؟ اور فی الواقع کیا ہونا چاہتے ہیں، مومن بن کر رہنا چاہتے ہیں یا منافق؟ اگر ان کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے اور وہ کچھ بھی یہ احساس اپنے اندر رکھتے ہیں کہ اَخلاقی حیثیت سے منافقت انسان کے لیے ذلیل ترین رَوِیّہ ہے، تو انھیں بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش چھوڑ دینی چاہیے۔ ایمان تو اُن سے دو ٹوک فیصلہ چاہتا ہے۔ مومن رہنا چاہتے ہیں تو ہر اُس رشتے اور تعلق کو قربان کر دیں جو اسلام کے ساتھ اُن کے تعلق سے متصادم ہوتا ہو۔ اسلام کے رشتے سے کسی اور رشتے کو عزیز تر رکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ ایمان کا جھوٹا دعویٰ چھوڑ دیں۔

یہ تو ہے اُصولی بات۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اصول بیان کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ اِس امرِ واقعی کو بھی مدّعیانِ ایمان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش فرما دیا ہے کہ جو لوگ سچّے مومن تھے اُنھوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے تمام اُن رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ اُن کے تعلق میں حائل ہوئے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو بدر و اُحُد کے معرکوں میں سارا عرب دیکھ چکا تھا۔ مکّے سے جو صحابۂ کرامؓ ہجرت کر کے آئے تھے، وہ صرف خدا اور اس کے دین کی خاطر خود

Maktaba Tul Ishaat.com

الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ یُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۲۲ ع

ع ۳

کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو! اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔ ع

اپنے قبیلے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے لڑ گئے تھے۔ حضرت ابوعُبَیدہؓ نے اپنے باپ عبداللہ بن جرّاح کو قتل کیا۔ حضرت مُصْعَبؓ بن عُمَیر نے اپنے بھائی عُبَید بن عُمَیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مُغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عُبَیدہؓ بن الحارث نے عُتْبَہ، شَیْبَہ اور ولید بن عُتْبَہ کو قتل کیا، جو اُن کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسیرانِ جنگِ بدر کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔ اسی جنگِ بَدر میں حضرت مُصْعَبؓ بن عُمَیر کے سگے بھائی ابوعزیز بن عُمَیر کو ایک انصاری پکڑ کر باندھ رہا تھا۔ حضرت مُصْعَبؓ نے دیکھا تو پکار کر کہا: ''ذرا مضبوط باندھنا، اِس کی ماں بڑی مالدار ہے، اس کی رہائی کے لیے وہ تمھیں بہت سا فدیہ دے گی۔'' ابوعزیز نے کہا: ''تم بھائی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو؟'' حضرت مُصْعَبؓ نے جواب دیا: ''اِس وقت تم میرے بھائی نہیں ہو بلکہ یہ انصاری میرا بھائی ہے جو تمھیں گرفتار کر رہا ہے۔'' اسی جنگِ بدر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص گرفتار ہو کر آئے اور ان کے ساتھ رسول کی دامادی کی بنا پر قطعاً کوئی امتیازی سلوک نہ کیا گیا جو دوسرے قیدیوں سے کچھ بھی مختلف ہوتا۔ اِس طرح عالَمِ واقعہ میں دنیا کو یہ دکھایا جا چکا تھا کہ مخلص مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہوا کرتا ہے۔

دَیلَمی نے حضرت مُعاذؓ کی رِوایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا نقل کی ہے کہ اللّٰھم لا تجعل لفاجر (وفی روایۃٍ لفاسق) عَلَیَّ یدًا ولا نعمۃ فیودّہٗ قلبی فانی وجدت فیما اُوحیت اِلیّ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ ''خدایا! کسی فاجر (اور ایک روایت میں فاسق) کا میرے اُوپر کوئی احسان نہ ہونے دے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی محبت پیدا ہو۔ کیونکہ تیری نازل کردہ وحی میں یہ بات بھی میں نے پائی ہے کہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھنے والوں کو تم اللہ اور رسولؐ کے مخالفوں سے محبّت کرتے نہ پاؤ گے۔''

تفہیم القرآن

الحشر

(۵۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

الحشر

نام

دوسری آیت کے فقرے اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ ''الحشر'' آیا ہے۔

زمانۂ نزول

بخاری و مسلم میں حضرت سعید بن جُبَیرؒ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سورۂ حشر کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ غزوۂ بنی نَضِیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی جس طرح سورۂ اَنفال غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت سعید بن جُبَیرؒ کی دوسری روایت میں ابنِ عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ قل سُوْرَۃ النَّضِیر یعنی یوں کہو کہ یہ سورۂ نَضِیر ہے۔ یہی بات مجاہد، قَتادَہ، زُہری، ابنِ زید، یزید بن رُومان، محمد بن اسحاق وغیرہ حضرات سے بھی مروی ہے۔ ان سب کا مُتَّفَقہ بیان یہ ہے کہ اِس میں جن اہلِ کتاب کے نکالے جانے کا ذکر ہے، ان سے مراد بنی النَّضِیر ہی ہیں۔ یزید بن رُومان، مجاہد اور محمد بن اسحاق کا قول یہ ہے کہ از اوّل تا آخر یہ پُوری سورت اِسی غزوے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ غَزوہ کب واقع ہوا تھا؟ امام زُہریؒ نے اِس کے متعلق عُروَہؒ بن زُبیرؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ جنگِ بدر کے چھ مہینے بعد ہوا ہے۔ لیکن ابنِ سعد، ابنِ ہِشام اور بَلاذُری اسے ربیع الاوّل ۴ ہجری کا واقعہ بتاتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ تمام رِوایات اس امر میں متفق ہیں کہ یہ غزوہ بِئرِ مَعُونہ کے سانحے کے بعد پیش آیا تھا، اور یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بِئرِ مَعُونہ کا سانحہ جنگِ اُحُد کے بعد رُونما ہوا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔

تاریخی پَس منظر

اِس سورہ کے مضامین کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مدینۂ طَیِّبہ اور حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ اِس کے بغیر آدمی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں جان سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار اُن کے مختلف قبائل کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس کے حقیقی اسباب کیا تھے۔

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انھوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کَتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ اور عرب سے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنّفین نے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آ کر وہ اپنے بقیہ اَبنائے مِلّت سے بچھڑ گئے تھے، اور دنیا کے یہودی سرے سے اُن کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے عِبرانی تہذیب، زبان، حتّٰی کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حِجاز کے آثارِ قدیمہ میں جو کَتبات ملے ہیں، اُن میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہودِ عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی رِوایات پر ہے جو اہلِ عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصّہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

حِجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے آخر عہد میں یہاں آ کر آباد

ہوئے تھے۔ اس کا قصّہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عَمالِقَہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آ کر فرمانِ نبی کی تعمیل کی، مگر عَمالِقَہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا، اسے انھوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اُس وقت حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کے جانشینوں نے اِس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عَمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعتِ موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اِس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا، اور اسے مجبُوراً یثرِب واپس آ کر یہیں بس جانا پڑا۔ (کتاب الاَغانی، ج ۱۹، ص ۹۴) اس طرح یہودی گویا اس بات کے مُدّعی تھے کہ وہ ۱۲ سو برس قبلِ مسیح سے یہاں آباد ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے گھڑا تھا کہ اہلِ عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی نسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی رِوایت کے مطابق ۵۸۷ قبلِ مسیح میں ہوئی جب کہ بابل کے بادشاہ بُختِ نَصَّر نے بیت المَقدِس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتّر بتّر کر دیا تھا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اُس زمانے میں ہمارے متعدّد قبائل آ کر وادی القُریٰ، تَیماء اور یثرِب میں آباد ہو گئے تھے۔ (فُتُوحُ البُلدان، البلاذُری) لیکن اِس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

درحقیقت جو بات ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا، اور پھر ۱۳۲ء میں انھیں اس سرزمین سے بالکل نکال باہر کیا، اُس دَور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حِجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آ کر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مَقامات دیکھے، وہاں ٹھیر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سُود خواری کے ذریعے سے اُن پر قبضہ جما لیا۔ اَیلَہ، مَقنا، تبوک، تَیماء، وادی القُریٰ، فَدَک اور خیبر پر اُن کا تسلُّط اُسی دَور میں قائم ہوا۔ اور بنی قُرَیظَہ، بنی نَضِیر، بنی بَہدَل اور بنی قَینُقاع بھی اُسی دور میں آ کر یثرِب پر قابض ہوئے۔

یثرِب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نَضِیر اور بنی قُرَیظَہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں (Cohens یا Priests) کے طبقے میں سے تھے، انھیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا، اور ان کو اپنی مِلّت میں مذہبی سیادت حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینے میں آ کر آباد ہوئے، اُس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انھوں نے دبا لیا اور عملاً اِس سرسبز و شاداب مَقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اُس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سَبا کے دوسرے رُکوع میں گزر چکا ہے۔ اِس سیلاب کی وجہ سے قومِ سَبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے غَسّانی شام میں، لَخمی حِیرَہ (عراق) میں، بنی خُزاعہ جدّہ و مکّہ کے درمیان، اور اَوس و خَزرَج یثرِب میں جا کر آباد ہوئے۔ یثرِب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے، اس لیے انھوں

Maktaba Tul Ishaat.com

نے اوّل اوّل اَوس وخَزرَج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چارونا چار بنجر زمینوں پر بس گئے، جہاں اُن کو قُوتِ لایمُوت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ آخرکار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسّانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لا کر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اَوس وخَزرَج کو یثرب پر پُورا غلبہ حاصل ہو گیا۔ یہودیوں کے دو بڑے قبیلے، بنی نَضیر اور بنی قُریظَہ، شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبُور ہو گئے۔ تیسرے قبیلے بنی قَینُقاع کی چونکہ اِن دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بَن تھی، اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا، مگر یہاں رہنے کے لیے اُسے قبیلۂ خَزرَج کی پناہ لینی پڑی۔ اور اُس کے مقابلے میں بنی نَضیر و بنی قُریظَہ نے قبیلۂ اَوس کی پناہ لی، تاکہ اطرافِ یثرِب میں امن کے ساتھ رہ سکیں۔ ذیل کے نقشے سے واضح ہو گا کہ اِس نئے انتظام کے ماتحت یثرِب اور اس کے نواح میں یہودی بستیاں کہاں کہاں تھیں۔

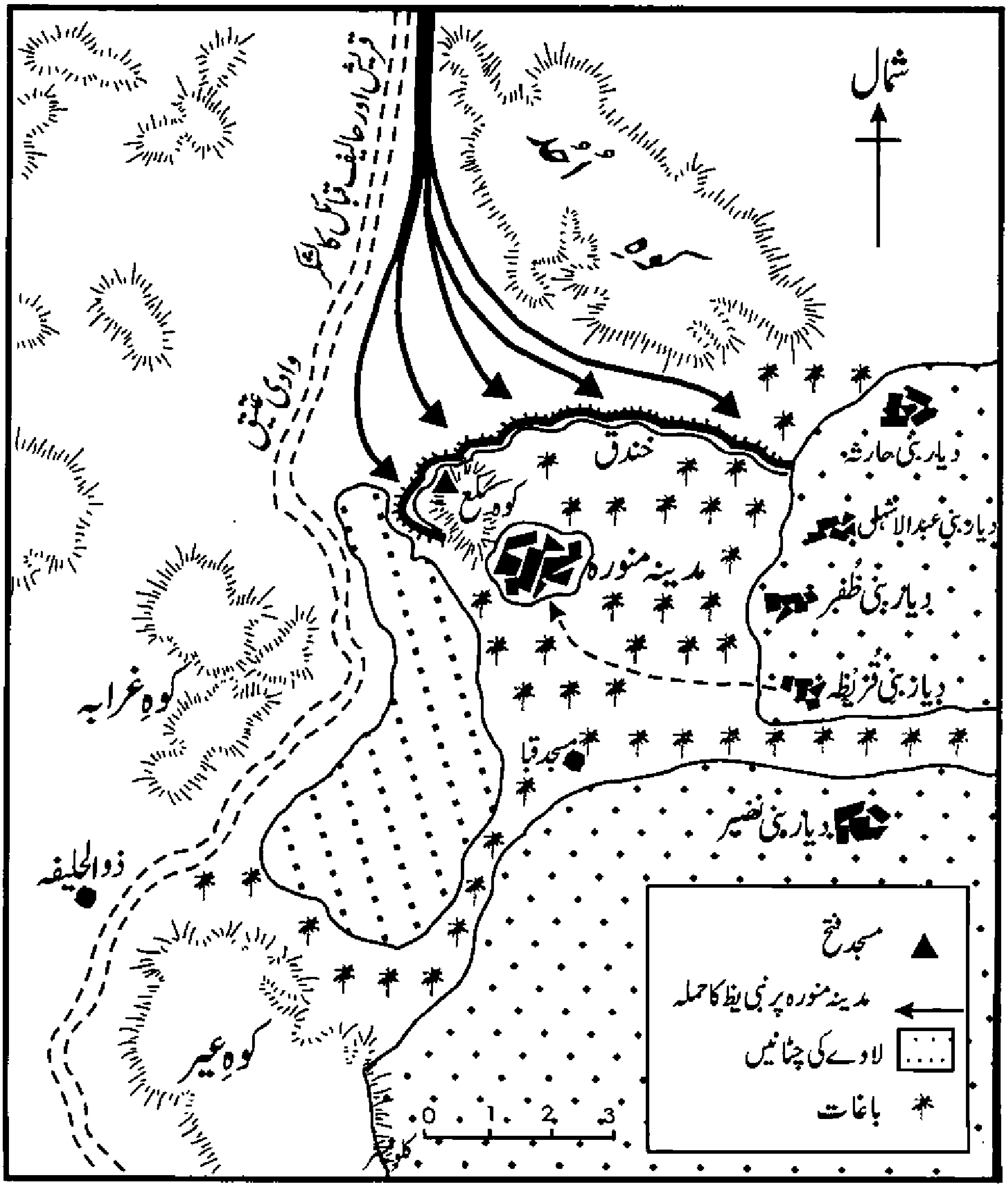

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے، آغازِ ہجرت تک، حجاز میں عُموماً اور یثرِب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدّوخال یہ تھے:

___ زبان، لباس، تہذیب، تمدُّن، ہر لحاظ سے انھوں نے پُوری طرح عربیّت کا رنگ اختیار کر لیا تھا، حتّٰی کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے۔ ۱۲ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے، ان میں سے بنی زَعُوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گِنے چُنے علما کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانہ جاہلیّت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے، ان کی زبان اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انھیں مُمیّز کرتی ہو۔ اُن کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن اِن ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے، اور انھوں نے شدّت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیّت انھوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

___ ان کی اِس عربیت کی وجہ سے مغربی مُستَشرِقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے، یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو، یا ان کے علما نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہلِ عرب کو دینِ یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہلِ عرب کو وہ اُمّی (gentiles) کہتے تھے، جس کے معنٰی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان اُمّیوں کو وہ انسانی حُقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں، اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال و طَیّب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا، عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ انھیں دینِ یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایاتِ عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغِ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اِسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی، بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علما نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادُوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا، جس کی وجہ سے عربوں پر اُن کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

___ معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے، اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ اِن وُجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلّے کی درآمد اور یہاں سے چھواروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ مرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر انھی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی ان کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ مَے خانے بھی انھوں نے قائم کر رکھے تھے، جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قَینُقاع زیادہ تر سنار اور لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بَنج بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سود خواری کا تھا، جس کے جال میں انھوں نے گردوپیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا، اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنھیں قرض لے لے کر ٹھاٹ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرحِ سُود پر قرضے دیتے، اور پھر سُود در سُود کا چکر چلاتے تھے، جس کی گرفت میں آ جانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اِس طرح انھوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا، مگر اِس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعُموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

— ان کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لیں۔ لیکن دوسری طرف ان کے مفاد ہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں، اور انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں، کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے، وہ اُن بڑی بڑی جائدادوں اور باغات اور سرسبز زمینوں پر انھیں قابض نہ رہنے دیں گے جو انھوں نے اپنی منافع خوری اور سُود خواری سے پیدا کی تھیں۔ مزید برآں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقت ور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے، تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر بارہا انھیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لینا پڑتا تھا، بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا تھا، جس کے حلیفانہ تعلقات فریقِ مخالف سے ہوتے تھے۔ یَثرِب میں بنی قُریظَہ اور بنی نَضِیر اَوس کے حلیف تھے، اور بنی قَینُقاع خَزرَج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اَوس اور خَزرَج کے درمیان جو خوں ریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہوئی تھی، اُس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نَبرد آزما ہوئے تھے۔

یہ حالات تھے جب مدینے میں اسلام پہنچا، اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ آپؐ نے اس ریاست کو قائم کرتے ہی جو اوّلین کام کیے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ اَوس اور خَزرَج اور مہاجرین کو ملا کر ایک بَرادری بنائی، اور دوسرا یہ تھا کہ اس مسلم معاشرے اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی کسی کے حُقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ سب مُتَّحِدہ دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کے چند اہم فقرے یہ ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات

میں کن اُمور کی پابندی قبول کی تھی:

ان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم، وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھٰذہ الصحیفۃ، وان بینھم النصح والنصیحۃ والبرّ دون الاثم، وانہ لم یاثم امرؤٌ بحلیفہ، وان النصر للمظلوم، وان الیھود ینفقون مع المؤمنین ما داموا محاربین، وان یثرب حرام جوفھا لاھل ھٰذہ الصحیفۃ .... وانہ ما کان بین اھل ھٰذہ الصحیفۃ من حَدَثٍ او اشتجار یخاف فسادہ فان مردّہ الی اللّٰہ عزوجل والی محمد رسول اللّٰہ .... وانہ لا تجار قریش ولا من نصرھا، وان بینھم النصر علی من دھم یثرب ۔ علی کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قِبَلَھم (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۴۷ تا ۱۵۰)

یہ کہ یہودی اپنا خرچ اُٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکا حملہ آور کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوں گے، اور یہ کہ وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کے درمیان نیکی وحق رسانی کا تعلق ہوگا نہ کہ گناہ اور زیادتی کا، اور یہ کہ کوئی اپنے حلیف کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا، اور یہ کہ مظلوم کی حمایت کی جائے گی، اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اُس کے مصارف اٹھائیں گے، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکا پر یثرب میں کسی نوعیت کا فتنہ وفساد کرنا حرام ہے، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکا کے درمیان اگر کوئی ایسا قضیہ یا اختلاف رونما ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق محمد رسولؐ اللہ کریں گے......اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی، اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکائے معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے...... ہر فریق اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔

یہ ایک قطعی اور واضح معاہدہ تھا جس کی شرائط یہودیوں نے خود قبول کی تھیں۔ لیکن بہت جلد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رَوِش کا اظہار شروع کر دیا اور ان کا عناد روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ اس کے بڑے بڑے وُجوہ تین تھے:

ایک یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک رئیسِ قوم دیکھنا چاہتے تھے جو اُن کے ساتھ بس ایک سیاسی معاہدہ کر کے رہ جائے اور صرف اپنے گروہ کے دنیوی مفاد سے سروکار رکھے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ آپؐ تو اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں (جس میں خود اُن کے اپنے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل تھا) اور معصیت چھوڑ کر اُن احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنے اور اُن اَخلاقی حُدود کی پابندی کرنے کی طرف بلا رہے ہیں جن کی طرف خود ان کے انبیاؑ بھی دنیا کو بلاتے رہے ہیں۔ یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

چیز ان کو سخت ناگوار تھی۔ اُن کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ عالمگیر اُصولی تحریک اگر چل پڑی تو اس کا سیلاب ان کی جامد مذہبیت اور ان کی نسلی قومیت کو بہالے جائے گا۔

دوسرے یہ کہ اَوس وخَزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر، اور یہ دیکھ کر کہ گرد وپیش کے عرب قبائل میں سے جو لوگ اسلام کی اِس دعوت کو قبول کر رہے ہیں، وہ سب مدینے کی اِس اسلامی برادری میں شامل ہو کر ایک ملّت بنتے جا رہے ہیں، انھیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ صدیوں سے اپنی سلامتی اور اپنے مفادات کی ترقی کے لیے انھوں نے عرب قبیلوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی، وہ اب اِس نئے نظام میں نہ چل سکے گی، بلکہ اب ان کو عربوں کی ایک مُتّحِدہ طاقت سے سابقہ پیش آئے گا، جس کے آگے ان کی چالیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

تیسرے یہ کہ معاشرے اور تمدّن کی جو اصلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، اس میں کاروبار اور لین دین کے تمام ناجائز طریقوں کا سدِّ باب شامل تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سُود کو بھی آپؐ ناپاک کمائی اور حرام خوری قرار دے رہے تھے، جس سے انھیں خطرہ تھا کہ اگر عرب پر آپؐ کی فرمانروائی قائم ہو گئی تو آپؐ اسے قانوناً ممنوع کر دیں گے۔ اِس میں ان کو اپنی موت نظر آتی تھی۔

ان وجوہ سے انھوں نے حضورؐ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنا لیا۔ آپؐ کو زک دینے کے لیے کوئی چال، کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تأمُّل نہ تھا۔ وہ آپؐ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے، تاکہ لوگ آپؐ سے بدگمان ہو جائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک وشبہات اور وسوسے ڈالتے تھے، تاکہ وہ اِس دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جاتے تھے، تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جا سکیں۔ فتنے برپا کرنے کے لیے منافقین سے ساز باز کرتے تھے۔ ہر اُس شخص اور گروہ اور قبیلے سے رابطہ پیدا کرتے تھے جو اسلام کا دشمن ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور ان کو آپس میں لڑا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ اَوس اور خَزرج کے لوگ خاص طور پر اُن کے ہدف تھے، جن سے اُن کے مدت ہائے دراز کے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ جنگِ بُعاث کے تذکرے چھیڑ چھیڑ کر وہ اُن کو پُرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے، تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اُخوّت کا وہ رشتہ تار تار ہو جائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا۔ مسلمانوں کو مالی حیثیت سے تنگ کرنے کے لیے بھی وہ ہر قسم کی دھاندلیاں کرتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا پہلے سے لین دین تھا، ان میں سے جوں ہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اگر اس سے کچھ لینا ہوتا تو تقاضے کر کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتے، اور اگر اسے کچھ دینا ہوتا تو اس کی رقم مار کھاتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ جب ہم نے تم سے معاملہ کیا تھا اس وقت تمھارا دین

کچھ اور تھا، اب چونکہ تم نے اپنا دین بدل دیا ہے، اس لیے ہم پر تمھارا کوئی حق باقی نہیں ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تفسیر طَبَری، تفسیر نیسابُوری، تفسیرِ طَبْرَسی اور تفسیر روح المعانی میں سورۂ آلِ عمران، آیت ۷۵ کی تشریح کرتے ہوئے نقل کی گئی ہیں۔

معاہدے کے خلاف یہ کُھلی کُھلی معاندانہ رَوِش تو جنگِ بَدر سے پہلے ہی وہ اختیار کر چکے تھے۔ مگر جب بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اُٹھے، اور اُن کے بُغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے فتحِ اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینے میں یہ افواہیں اڑانی شروع کر دی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، اور مسلمانوں کو شکستِ فاش ہوئی، اور اب ابوجہل کی قیادت میں قریش کا لشکر مدینے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ لیکن جب نتیجہ ان کی اُمیدوں اور تمناؤں کے خلاف نکلا تو وہ غم اور غصے کے مارے پھٹ پڑے۔ بنی نَضیر کا سردار کَعب بن اشرف چیخ اُٹھا کہ "خدا کی قسم! اگر محمدؐ نے اِن اشرافِ عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اُس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔" پھر وہ مکّہ پہنچا اور بدر میں جو سردارانِ قریش مارے گئے تھے، اُن کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکّہ والوں کو انتقام پر اکسایا۔ پھر مدینہ واپس آ کر اس نے اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفا کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہارِ عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اُس کی شرارتوں سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاوّل ۳ھ میں محمدؓ بن مَسْلَمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔ (ابنِ سعد، ابنِ ہِشام، تاریخِ طَبَری)

یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگِ بدر کے بعد کُھلّم کُھلّا اپنا معاہدہ توڑ دیا، بنی قَینُقاع تھا۔ یہ لوگ خود شہرِ مدینہ کے اندر ایک محلّے میں آباد تھے اور چونکہ یہ سنار، لوہار اور ظُروف ساز تھے، اس لیے اِن کے بازار میں اہلِ مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلّح تھا۔ سات سو مردانِ جنگی ان کے اندر موجود تھے۔ اور ان کو اس بات کا بھی زُعم تھا کہ قبیلۂ خَزْرَج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے، اور خَزْرَج کا سردار عبداللہ بن اُبَی اُن کا پُشتیبان تھا۔ بدر کے واقعے سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انھوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والے مسلمانوں کو ستانا، اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز اِن کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو برسرِعام برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلّے میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر کے آپؐ نے ان کو راہِ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ مگر انھوں نے جواب دیا: "اے محمدؐ! تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے، اس لیے تم نے انھیں مار لیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔'' یہ گویا صاف صاف اعلانِ جنگ تھا۔ آخرکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوّال (اور بروایتِ بعض ذی القعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلّے کا محاصرہ کر لیا۔ صرف پندرہ روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے تمام قابلِ جنگ آدمی باندھ لیے گئے۔ اب عبداللہ بن اُبَیّ اُن کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپؐ انھیں معاف کر دیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی درخواست قبول کر کے یہ فیصلہ فرما دیا کہ بنی قَینُقاع اپنا سب مال، اسلحہ، اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینے سے نکل جائیں۔ (ابنِ سعد، ابنِ ہِشام، تاریخِ طَبَری)

اِن دو سخت اقدامات (یعنی بنی قَینُقاع کے اِخراج اور کَعب بن اشرف کے قتل) سے کچھ مدّت تک یہودی اتنے خوف زدہ رہے کہ انھیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد شوال ۳ھ میں قریش کے لوگ جنگِ بدر کا بدلہ لینے کے لیے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینے پر چڑھ کر آئے، اور اِن یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کے لیے نکلے ہیں، اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں، تو انھوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اِس طرح کی کہ مدینے کی مدافعت میں آپؐ کے ساتھ شریک نہ ہوئے، حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکۂ اُحُد میں مسلمانوں کو نقصانِ عظیم پہنچا تو ان کی جرأتیں اور بڑھ گئیں، یہاں تک کہ بنی نَضِیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک سازش کی، جو عین وقت پر ناکام ہو گئی۔ اِس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ بِئرِ معونہ کے سانحے (صفر ۴ھ) کے بعد عَمْروؓ بن اُمَیَّہ ضَمْری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غَلَطی سے بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا، جو دراصل ایک معاہد قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، مگر عَمْروؓ نے ان کو دشمن قبیلے کے آدمی سمجھ لیا تھا۔ اس غلطی کی وجہ سے ان کا خون بہا مسلمانوں پر واجب آ گیا تھا، اور چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدے میں بنی نَضِیر بھی شریک تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہؓ کے ساتھ خود ان کی بستی میں تشریف لے گئے، تاکہ خون بہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔ وہاں انھوں نے آپؐ کو چکنی چُپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اُس مکان کی چھت پر سے آپؐ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرا دے جس کی دیوار کے سایے میں آپؐ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اِس تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بروقت خبردار کر دیا، اور آپؐ فوراً وہاں سے اُٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا تاخیر یہ اَلٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غدّاری کرنی چاہی تھی، وہ میرے علم میں آ گئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر مدینے سے نکل جاؤ،

اس کے بعد اگر تم یہاں ٹھیرے رہے تو جو شخص بھی تمھاری بستی میں پایا جائے گا، اس کی گردن مار دی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن اُبَیّ نے اُن کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمھاری مدد کروں گا، اور بنی قُرَیظَہ اور بنی غَطفان بھی تمھاری مدد کو آئیں گے، تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس جھوٹے بھروسے پر انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اَلٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے، آپؐ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ اس پر ربیع الاوّل ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا، اور صرف چند روز کے محاصرے کے بعد (جس کی مدّت بعض رِوایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آئی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے کے لیے راضی ہو گئے کہ اسلحے کے سوا جو کچھ بھی وہ اپنے اُونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے، لے جائیں گے۔ اِس طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینے کی سرزمین خالی کرا لی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھیر گئے۔ باقی شام اور خیبر کی طرف نکل گئے۔

یہی واقعہ ہے جس سے اِس سورہ میں بحث کی گئی ہے۔

موضوع اور مضامین

سورت کا موضوع، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، جنگِ بنی نَضِیر پر تبصرہ ہے۔ اس میں بحیثیتِ مجموعی چار مضامین بیان ہوئے ہیں:

۱- پہلی چار آیتوں میں دنیا کو اُس انجام سے عبرت دلائی گئی ہے جو ابھی ابھی بنی نَضِیر نے دیکھا تھا۔ ایک بڑا قبیلہ، جس کے افراد کی تعداد اُس وقت مسلمانوں کی تعداد سے کچھ کم نہ تھی، جو مال و دولت میں مسلمانوں سے بہت بڑھا ہوا تھا، جس کے پاس جنگی سامان کی بھی کمی نہ تھی، جس کی گڑھیاں بڑی مضبوط تھیں، صرف چند روز کے محاصرے کی تاب بھی نہ لا سکا اور بغیر اس کے کہ کسی ایک آدمی کے قتل کی بھی نوبت آئی ہوتی، وہ اپنی صدیوں کی جمی جمائی بستی چھوڑ کر جلاوطنی قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ مسلمانوں کی طاقت کا کرشمہ نہیں تھا، بلکہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے نبرد آزما ہوئے تھے، اور جو لوگ اللہ کی طاقت سے ٹکرانے کی جرأت کریں، وہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

۲- آیت ۵ میں قانونِ جنگ کا یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگی ضروریات کے لیے دشمن کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے، وہ فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی۔

۳- آیت ۶ سے ۱۰ تک یہ بتایا گیا ہے کہ اُن مَمالک کی زمینوں اور جائدادوں کا بندوبست کس طرح کیا جائے جو جنگ یا صلح کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے زیرِنگیں آئیں۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مفتوحہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا، اس لیے یہاں اس کا قانون بیان کر دیا گیا۔

۴- آیت ۱۱ تا ۱۷ تک منافقین کے اُس رَوِیّے پر تبصرہ کیا گیا ہے جو انھوں نے جنگِ بنی نَضِیر

Maktaba Tul Ishaat.com

کے موقع پر اختیار کیا تھا، اور اُن اسباب کی نشان دِہی کی گئی ہے جو درحقیقت ان کے اِس رَوِیّے کی تہ میں کام کر رہے تھے۔

۵- آخری رُکوع پُورا کا پُورا ایک نصیحت ہے، جس کے مخاطَب وہ تمام لوگ ہیں جو ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہوں، مگر ایمان کی اصل روح سے خالی رہیں۔ اس میں اُن کو بتایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل تقاضا کیا ہے، تقویٰ اور فِسق میں حقیقی فرق کیا ہے، جس قرآن کو ماننے کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں اس کی اہمیت کیا ہے، اور جس خدا پر ایمان لانے کا وہ اقرار کرتے ہیں وہ کن صفات کا حامل ہے۔

آیاتہا ۲۴ رکوعاتہا ۳

سُوْرَةُ الْحَشْرِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ

انزلت النبی علیہ السلام

اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہی غالب اور حکیم ہے۔[۱]

وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں[۲] اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا۔[۳] تمھیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی گڑھیاں

۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ الحدید، حاشیہ ۱ و ۲۔ بنی نَضِیر کے اخراج پر تبصرہ شروع کرنے سے پہلے یہ تمہیدی فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود ذہن کو یہ حقیقت سمجھنے کے لیے تیار کرنا ہے کہ اس طاقت ور یہودی قبیلے کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا، وہ مسلمانوں کی طاقت کا نہیں بلکہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔

۲ – اصل الفاظ ہیں: لِاَوَّلِ الْحَشْرِ۔ حشر کے معنٰی ہیں: منتشر افراد کو اکٹھا کرنا، یا بکھرے ہوئے اشخاص کو جمع کر کے نکالنا۔ اور لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کے معنٰی ہیں: پہلے حشر کے ساتھ، یا پہلے حشر کے موقع پر۔ اب رہا یہ سوال کہ اس جگہ اوّلِ حشر سے مراد کیا ہے؟ تو اس میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد بنی نَضِیر کا مدینے سے اخراج ہے، اور اس کو اُن کا پہلا حشر اِس معنٰی میں کہا گیا ہے کہ اُن کا دوسرا حشر حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا جب یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا گیا، اور آخری حشر قیامت کے روز ہوگا۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد مسلمانوں کی فوج کا اجتماع ہے جو بنی نَضِیر سے جنگ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ اور لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کے معنٰی یہ ہیں کہ ابھی مسلمان اُن سے لڑنے کے لیے جمع ہی ہوئے تھے اور کُشت و خون کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ جلا وطنی کے لیے تیار ہو گئے۔ بالفاظِ دیگر، یہاں یہ الفاظ باوّلِ وہلہ کے معنٰی میں استعمال ہوئے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''در اوّل جمع کردنِ لشکر''۔ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے: ''پہلے ہی بِھیڑ ہوتے''۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا مفہوم ہی اِن الفاظ کا متبادر مفہوم ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ

انھیں اللہ سے بچالیں گی۔[۴] مگر اللہ ایسے رُخ سے اُن پر آیا جدھر اُن کا خیال بھی نہ گیا تھا۔[۵] اُس نے

۳- اس مقام پر ایک بات آغاز ہی میں سمجھ لینی چاہیے، تاکہ بنی نَضِیر کے اِخراج کے معاملے میں کوئی ذہنی اُلجھن پیدا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی نَضِیر کا باقاعدہ تحریری معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کو انھوں نے رد نہیں کیا تھا کہ معاہدہ ختم ہو جاتا۔ لیکن جس وجہ سے ان پر چڑھائی کی گئی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی خلاف ورزیاں کرنے کے بعد آخر کار ایک صریح فعل ایسا کیا تھا جو نَقضِ عہد کا ہم معنیٰ تھا۔ وہ یہ کہ انھوں نے دوسرے فریقِ معاہدہ، یعنی مدینے کی اسلامی ریاست کے صدر کو قتل کرنے کی سازش کی تھی، اور وہ کچھ اِس طرح کُھل گئی تھی کہ جب اُن کو نَقضِ معاہدہ کا الزام دیا گیا تو وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دس دن کا نوٹس دے دیا کہ اس مدت میں مدینہ چھوڑ کر نکل جاؤ، ورنہ تمھارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ نوٹس قرآنِ مجید کے اِس حکم کے ٹھیک مطابق تھا کہ ”اگر تم کو کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو عَلانِیَہ اس کے آگے پھینک دو۔“ (الانفال: ۵۸) اسی لیے ان کے اخراج کو اللہ تعالیٰ اپنا فعل قرار دے رہا ہے، کیونکہ یہ ٹھیک قانونِ الٰہی کے مطابق تھا۔ گویا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ نے نکالا۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اخراج کو اپنا فعل قرار دیا ہے، آگے کی آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔

۴- اِس ارشاد کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ بنی نَضِیر صدیوں سے یہاں جمے ہوئے تھے۔ مدینے کے باہر ان کی پُوری آبادی یکجا تھی، جس میں ان کے اپنے قبیلے کے سوا کوئی دوسرا عُنصر موجود نہ تھا۔ انھوں نے پُوری بستی کو قَلْعَہ بند کر رکھا تھا، اور ان کے مکانات بھی گڑھیوں کی شکل میں بنے ہوئے تھے، جس طرح عُموماً قبائلی علاقوں میں، جہاں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہو، بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی اُس وقت کے مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھی۔ اور خود مدینے کے اندر بہت سے منافقین اُن کی پشت پر تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ لوگ لڑے بغیر صرف محاصرے ہی سے بدحواس ہو کر یوں اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح خود بنی نَضِیر کے بھی وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ کوئی طاقت ان سے چھ دن کے اندر یہ جگہ چھڑا لے گی۔ اگرچہ بنی قَینُقاع ان سے پہلے نکالے جا چکے تھے اور اپنی شجاعت پر ان کا سارا زعم دھرا کا دھرا رہ گیا تھا، لیکن وہ مدینے کے ایک محلے میں آباد تھے اور ان کی اپنی کوئی الگ قَلْعَہ بند بستی نہ تھی، اس لیے بنی نَضِیر یہ سمجھتے تھے کہ اُن کا مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بخلاف اس کے وہ اپنی محفوظ بستی اور اپنی مضبوط گڑھیوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی انھیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دس دن کے اندر مدینے سے نکل جانے کا نوٹس دیا تو انھوں نے بڑے دھڑلّے کے ساتھ جواب دے دیا کہ ہم نہیں نکلیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کر لیجیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر یہ بات کس بنا پر فرمائی کہ ”وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں

انھیں اللہ سے بچالیں گی؟'' کیا واقعی بنی نَضِیر یہ جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے؟ اور کیا یہ جانتے ہوئے بھی اُن کا یہ خیال تھا کہ اُن کی گڑھیاں اُنھیں اللہ سے بچالیں گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر اُس شخص کے ذہن میں اُلجھن پیدا کرے گا جو یہودی قوم کی نفسیات اور ان کی صدہا برس کی روایات کو نہ جانتا ہو۔ عام انسانوں کے متعلق کوئی یہ گمان نہیں کرسکتا کہ وہ شعوری طور پر یہ جانتے بھی ہوں کہ مقابلہ اللہ سے ہے اور پھر بھی ان کو یہ زعم لاحق ہو جائے کہ اُن کے قلعے اور ہتھیار انھیں اللہ سے بچالیں گے۔ اس لیے ایک ناواقف آدمی اس جگہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی یہ تاویل کرے گا کہ بنی نَضِیر بظاہر اپنے قلعوں کا استحکام دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حملے سے بچ جائیں گے، مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کا مقابلہ اللہ سے تھا اور اُس سے اُن کے قلعے اُنھیں نہ بچا سکتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہودی اِس دنیا میں ایک ایسی عجیب قوم ہے جو جانتے بوجھتے اللہ کا مقابلہ کرتی رہی ہے، اللہ کے رسولوں کو یہ جانتے ہوئے اس نے قتل کیا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور فخر کے ساتھ سینہ ٹھونک کر اس نے کہا ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا۔ اِس قوم کی رِوایات یہ ہیں کہ اُن کے مُورثِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے اللہ تعالیٰ کی رات بھر کُشتی ہوتی رہی اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا: اب مجھے جانے دے، تو انھوں نے کہا: مَیں تجھے نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا: یعقوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا ''کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔'' مُلاحظہ ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمۂ کُتُبِ مقدّسہ (The Holy Scriptures) شائع کردہ: جیوش پبلی کیشن سوسائٹی آف امریکا، ۱۹۵۴ء۔ کتاب پیدائش، باب ۳۲، آیات ۲۴ تا ۲۸۔ عیسائیوں کے ترجمۂ بائبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے۔ یہودی ترجمے کے حاشیے میں ''اسرائیل'' کے معنیٰ لکھے گئے ہیں: He who striveth with God، یعنی'' جو خدا سے زور آزمائی کرے''۔ اور سائیکلو پیڈیا آف بِبلیکل لٹریچر میں عیسائی علما نے ''اسرائیل'' کے معنیٰ کی تشریح یہ کی ہے: wrestler with God ''خدا سے کُشتی لڑنے والا''۔ پھر بائبل کی کتاب ہوسیع میں حضرت یعقوبؑ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ''وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کُشتی لڑا۔ ہاں، وہ فرشتے سے کُشتی لڑا اور غالب آیا۔'' (باب ۱۲، آیت ۴) اب ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل آخر اُن حضرت اسرائیلؑ کے صاحبزادے ہی تو ہیں جنھوں نے اُن کے عقیدے کے مطابق خدا سے زور آزمائی کی تھی اور اس سے کُشتی لڑی تھی۔ اُن کے لیے آخر کیا مشکل ہے کہ خدا کے مقابلے میں یہ جانتے ہوئے بھی ڈٹ جائیں کہ مقابلہ خدا سے ہے۔ اسی بنا پر تو انھوں نے خود اپنے اعترافات کے مطابق خدا کے نبیوں کو قتل کیا، اور اسی بنا پر انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنے زعم میں صلیب پر چڑھایا اور خم ٹھونک کر کہا: إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (ہم نے مسیح عیسیٰ ابنِ مریم رسول اللہ کو قتل کیا)، لہٰذا یہ بات ان کی روایات کے خلاف نہ تھی کہ انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے ان کے خلاف جنگ کی۔ اگر ان کے عوام نہیں تو اُن کے رَبّی اور اَحبار تو خوب جانتے تھے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے متعدّد شواہد خود قرآن میں موجود ہیں۔ (تفصیل کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

فِیْ قُلُوْبِہِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَہُمْ بِاَیْدِیْہِمْ وَ اَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۙ
فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ ۝۲ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمُ الْجَلَآءَ
لَعَذَّبَہُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَ لَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِکَ

اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ پس عبرت حاصل کرو اَے دیدۂ بینا رکھنے والو[۷]!

اگر اللہ نے اُن کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انھیں عذاب دے ڈالتا[۸]، اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ

مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۷۹-۹۵۔ النساء، حاشیہ ۱۹۰-۱۹۱۔ جلد چہارم، الصّافات، حاشیہ ۷۰-۷۳)

۵ – اللہ کا اُن پر آنا اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ اللہ کسی اور جگہ تھا اور پھر وہاں سے اُن پر حملہ آور ہوا۔ بلکہ یہ مجازی کلام ہے۔ اصل مُدّعا یہ تصوّر دلانا ہے کہ اللہ سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ اِس خیال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اُن پر صرف اِسی شکل میں بَلا لے کر آ سکتا ہے کہ ایک لشکر کو سامنے سے اُن پر چڑھا کر لائے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس بلا کو تو ہم اپنی قلعہ بندیوں سے روک لیں گے۔ لیکن اس نے ایسے راستے سے اُن پر حملہ کیا جدھر سے کسی بَلا کے آنے کی وہ کوئی توقع نہ رکھتے تھے۔ اور وہ راستہ یہ تھا کہ اس نے اندر سے اُن کی ہمت اور قوتِ مقابلہ کو کھوکھلا کر دیا، جس کے بعد نہ اُن کے ہتھیار کسی کام آ سکتے تھے نہ اُن کے مضبوط گڑھ۔

۶ – یعنی تباہی دو طرح سے ہوئی: باہر سے مسلمانوں نے محاصرہ کر کے ان کی قلعہ بندیوں کو توڑنا شروع کیا، اور اندر سے خود انھوں نے پہلے تو مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے جگہ جگہ پتھروں اور لکڑیوں کی رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس غرض کے لیے اپنے گھروں کو توڑ توڑ کر ملبا جمع کیا۔ پھر جب ان کو یقین ہو گیا کہ انھیں یہاں سے نکلنا ہی پڑے گا تو انھوں نے اپنے گھروں کو، جنھیں کبھی بڑے شوق سے بنایا اور سجایا تھا، اپنے ہی ہاتھوں برباد کرنا شروع کر دیا، تاکہ وہ مسلمانوں کے کام نہ آ سکیں۔ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے اس شرط پر صلح کی کہ ہماری جانیں بخش دی جائیں اور ہمیں اجازت دی جائے کہ ہتھیاروں کے سوا جو کچھ بھی ہم یہاں سے اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں، تو چلتے ہوئے وہ اپنے دروازے اور کھڑکیاں اور کھونٹیاں تک اُکھاڑ لے گئے حتّٰی کہ بعض لوگوں نے شہتیر اور لکڑی کی چھتیں تک اپنے اُونٹوں پر لاد لیں۔

۷- اس واقعے میں عبرت کے کئی پہلو ہیں، جن کی طرف اِس مختصر سے بلیغ فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ یہودی آخر پچھلے انبیاؑ کی اُمّت ہی تو تھے۔ خدا کو مانتے تھے، کتاب کو مانتے تھے، پچھلے انبیاؑ کو مانتے تھے، آخرت کو مانتے تھے۔ اس لحاظ سے دراصل وہ سابق مسلمان تھے۔ لیکن جب انھوں نے دین اور اَخلاق کو پسِ پشت ڈال کر محض اپنی خواہشاتِ نفس اور دنیوی اغراض و مقاصد کی خاطر کھلی کھلی حق دشمنی اختیار کی اور خود اپنے عہد و پیمان کا بھی کوئی پاس نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ التفات ان سے پھر گئی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کو ان سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی۔ اس لیے سب سے پہلے تو خود مسلمانوں کو ان کے انجام سے عبرت دلائی گئی ہے کہ کہیں وہ بھی اپنے آپ کو یہودیوں کی طرح خدا کی چہیتی اولاد نہ سمجھ بیٹھیں اور اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ خدا کے آخری نبیؐ کی اُمّت میں ہونا ہی بجائے خود ان کے لیے اللہ کے فضل اور اس کی تائید کی ضمانت ہے، جس کے بعد دین و اَخلاق کے کسی تقاضے کی پابندی ان کے لیے ضروری نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ دنیا بھر کے اُن لوگوں کو بھی اس واقعے سے عبرت دلائی گئی ہے جو جان بُوجھ کر حق کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر اپنی دولت و طاقت اور اپنے ذرائع و وسائل پر یہ اعتماد کرتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گی۔ مدینے کے یہودی اس سے ناواقف نہ تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم یا قبیلے کی سربلندی کے لیے نہیں اٹھے ہیں، بلکہ ایک اُصولی دعوت پیش کر رہے ہیں، جس کے مخاطب سارے انسان ہیں اور ہر انسان، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کس نسل یا ملک سے تعلق رکھتا ہے، اس دعوت کو قبول کر کے اُن کی اُمّت میں بلا امتیاز شامل ہو سکتا ہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے حَبَش کے بلالؓ، روم کے صُہَیبؓ اور فارس کے سَلمانؓ کو اُمّتِ مسلمہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اہلِ خاندان کو حاصل تھی۔ اس لیے اُن کے سامنے یہ کوئی خطرہ نہ تھا کہ قریش اور اَوس اور خزرج ان پر مسلّط ہو جائیں گے۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ آپؐ جو اُصولی دعوت پیش فرما رہے ہیں، وہ بعینہٖ وہی ہے جو خود ان کے اپنے انبیاؑ پیش کرتے رہے ہیں۔ آپؐ کا یہ دعویٰ نہ تھا کہ میں ایک نیا دین لے کر آیا ہوں جو پہلے کبھی کوئی نہ لایا تھا اور تم اپنا دین چھوڑ کر میرا یہ دین مان لو۔ بلکہ آپؐ کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ وہی دین ہے جو ابتدائے آفرینش سے خدا کے تمام انبیاؑ لاتے رہے ہیں، اور اپنی تَورات سے وہ خود اِس کی تصدیق کر سکتے تھے کہ فی الواقع یہ وہی دین ہے، اِس کے اُصولوں میں دینِ انبیا کے اصولوں سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی بنا پر تو قرآنِ مجید میں ان سے کہا گیا تھا کہ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ (ایمان لاؤ میری نازل کردہ اُس تعلیم پر جو تصدیق کرتی ہے اُس تعلیم کی جو تمھارے پاس پہلے سے موجود ہے، اور سب سے پہلے تم ہی اس کے کافر نہ بن جاؤ)۔ پھر اُن کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کس سیرت و اَخلاق کے انسان ہیں، اور آپؐ کی دعوت قبول کر کے لوگوں کی زندگیوں میں کیسا عظیم انقلاب برپا ہوا ہے۔ انصار تو مدّتِ دراز سے اُن کے قریب ترین پڑوسی تھے۔ اسلام لانے سے پہلے اُن کی جو حالت تھی اسے بھی یہ لوگ دیکھ چکے تھے، اور اسلام لانے کے بعد ان کی جو حالت ہوگئی وہ بھی ان کے سامنے موجود تھی۔ پس دعوت اور داعی اور دعوت قبول کرنے کے نتائج، سب کچھ ان پر عیاں تھے۔ لیکن یہ ساری باتیں دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی انھوں نے محض اپنے نسلی تعصبات اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر اُس چیز کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی

Maktaba Tul Ishaat.com

بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

انھوں نے اللہ اور اس کے رسُولؐ کا مقابلہ کیا، اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اِذن سے تھا[9] اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے[10]۔

جس کے حق ہونے میں کم از کم ان کے لیے شک کی گنجایش نہ تھی۔ اس دانستہ حق دشمنی کے بعد وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کے قلعے انھیں خدا کی پکڑ سے بچالیں گے۔ حالانکہ پُوری انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کی طاقت جس کے مقابلے میں آ جائے، وہ پھر کسی ہتھیار سے نہیں بچ سکتا۔

۸ - دنیا کے عذاب سے مراد ہے ان کا نام و نشان مٹا دینا۔ اگر وہ صلح کر کے اپنی جانیں بچانے کے بجائے لڑتے تو ان کا پُوری طرح قلع قمع ہو جاتا۔ ان کے مرد مارے جاتے اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے لونڈی غلام بنا لیے جاتے جنھیں فدیہ دے کر چھڑانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

۹ - یہ اشارہ ہے اِس معاملے کی طرف کہ مسلمانوں نے جب محاصرہ شروع کیا تو بنی نَضِیر کی بستی کے اطراف میں جو نخلستان واقع تھے، ان کے بہت سے درختوں کو انھوں نے کاٹ ڈالا یا جلا دیا، تاکہ محاصرہ بآسانی کیا جا سکے، اور جو درخت فوجی نقل و حرکت میں حائل نہ تھے، ان کو کھڑا رہنے دیا۔ اس پر مدینے کے منافقین اور بنی قُریظَہ اور خود بنی نَضِیر نے شور مچا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فساد فی الارض سے منع کرتے ہیں، مگر یہ دیکھ لو، ہرے بھرے پھل دار درخت کاٹے جا رہے ہیں۔ یہ آخر فساد فی الارض نہیں تو کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ تم لوگوں نے جو درخت کاٹے اور جن کو کھڑا رہنے دیا، ان میں سے کوئی فعل بھی ناجائز نہیں ہے، بلکہ دونوں کو اللہ کا اذن حاصل ہے۔ اس سے یہ شرعی مسئلہ نکلتا ہے کہ جنگی ضروریات کے لیے جو تخریبی کارروائی ناگزیر ہو، وہ فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی، بلکہ فساد فی الارض یہ ہے کہ کسی فوج پر جنگ کا بھوت سوار ہو جائے اور وہ دشمن کے مُلک میں گھس کر کھیت، مویشی، باغات، عمارات، ہر چیز کو خواہ مخواہ تباہ و برباد کرتی پھرے۔ اس معاملے میں عام حکم تو وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوجوں کو شام کی طرف روانہ کرتے وقت دیا تھا کہ پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، فصلوں کو خراب نہ کرنا، اور بستیوں کو ویران نہ کرنا۔ یہ قرآنِ مجید کی اِس تعلیم کے عین مطابق تھا کہ اس نے مُفسد

انسانوں کی مذمّت کرتے ہوئے اُن کے اِس فعل پر زَجر و توبیخ کی ہے کہ ”جب وہ اقتدار پالیتے ہیں تو فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرتے پھرتے ہیں۔“ (البَقَرہ:۲۰۵) لیکن جنگی ضروریات کے لیے خاص حکم یہ ہے کہ اگر دشمن کے خلاف لڑائی کو کامیاب کرنے کی خاطر کوئی تخریب ناگزیر ہو تو وہ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ قطعوا منھا ما کان موضعًا للقتال، ”مسلمانوں نے بنی نَضِیر کے درختوں میں سے صرف وہ درخت کاٹے تھے جو جنگ کے مقام پر واقع تھے۔“ (تفسیر نَیسابُوری) فقہائے اسلام میں سے بعض نے معاملے کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بنی نَضِیر کے درخت کاٹنے کا جواز صرف اِسی واقعے کی حد تک مخصوص تھا، اس سے یہ عام جواز نہیں نکلتا کہ جب کبھی جنگی ضروریات داعی ہوں، دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلایا جا سکے۔ امام اَوزاعی، لَیث اور ابوثَور اسی طرف گئے ہیں۔ لیکن جُمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، البتہ محض تخریب و غارت گری کے لیے یہ فعل جائز نہیں ہے۔

ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ قرآنِ مجید کی یہ آیت مسلمانوں کو تو مطمئن کر سکتی تھی، لیکن جو لوگ قرآن کو کلام اللہ نہیں مانتے تھے، انھیں اپنے اعتراض کے جواب میں یہ سُن کر کیا اطمینان ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں فعل اللہ کے اِذن کی بنا پر جائز ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت مسلمانوں ہی کو مطمئن کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، کفار کو مطمئن کرنا سرے سے اس کا مقصود ہی نہیں ہے۔ چونکہ یہود اور منافقین کے اعتراض کی وجہ سے، یا بطورِ خود، مسلمانوں کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوگئی تھی کہ کہیں ہم فساد فی الارض کے مرتکب تو نہیں ہو گئے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ محاصرے کی ضرورت کے لیے کچھ درختوں کو کاٹنا، اور جو درخت محاصرے میں حائل نہ تھے ان کو نہ کاٹنا، یہ دونوں ہی فعل قانونِ الٰہی کے مطابق دُرست تھے۔

محدّثین کی نقل کردہ رِوایات میں اس امر پر اختلاف ہے کہ آیا ان درختوں کے کاٹنے اور جلانے کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، یا مسلمانوں نے بطورِ خود یہ کام کیا اور بعد میں اس کا شرعی مسئلہ حضورؐ سے دریافت کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے خود اس کا حکم دیا تھا۔ (بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ جَریر) یہی یزید بن رُومانؒ کی روایت بھی ہے۔ (ابنِ جَریر) بخلاف اس کے مجاہد اور قَتادَہ کی روایت یہ ہے کہ مسلمانوں نے بطورِ خود یہ درخت کاٹے تھے، پھر ان میں اس مسئلے پر اختلاف ہوا کہ یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہوئے اور بعض نے اس سے منع کیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر دونوں کے فعل کی تصویب کر دی۔ (ابنِ جَریر) اسی کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت کرتی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اس بات پر خلش پیدا ہوئی کہ ہم میں سے بعض نے درخت کاٹے ہیں اور بعض نے نہیں کاٹے، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہیے کہ ہم میں سے کس کا فعل اجر کا مستحق ہے اور کس کے فعل پر مواخذہ ہوگا۔ (نَسائی) فقہا میں سے جن لوگوں نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے، وہ اس سے یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا، جس کی توثیق بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحیِ جلی سے فرمائی، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ کا حکم موجود نہ ہوتا تھا،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اور جو مال اللہ نے اُن کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے[11]، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اُونٹ دوڑائے ہوں، بلکہ اللہ اپنے رسُولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلّط عطا فرما دیتا ہے،

ان میں حضورؐ اجتہاد پر عمل فرماتے تھے۔ دوسری طرف جن فقہا نے دوسری رِوایت کو ترجیح دی ہے، وہ اس سے یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دو گروہوں نے اپنے اپنے اجتہاد سے دو مختلف رائیں اختیار کی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کی توثیق فرما دی، لہٰذا اگر نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کر کے اہلِ علم مختلف رائیں قائم کریں تو باوجود اس کے کہ ان کی آرا ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی، مگر اللہ کی شریعت میں وہ سب حق پر ہوں گے۔

۱۰ – یعنی اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ ان درختوں کو کاٹنے سے بھی ان کی ذلّت وخواری ہو اور نہ کاٹنے سے بھی۔ کاٹنے میں ان کی ذلّت وخواری کا پہلو یہ تھا کہ جو باغ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے اور جن باغوں کے وہ مدت ہائے دراز سے مالک چلے آ رہے تھے، اُن کے درخت اُن کی آنکھوں کے سامنے کاٹے جا رہے تھے اور وہ کاٹنے والوں کو کسی طرح نہ روک سکتے تھے۔ ایک معمولی کسان اور باغبان بھی اپنے کھیت یا باغ میں کسی دوسرے کے تصرُّف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر اُس کے سامنے اس کا کھیت یا اس کا باغ کوئی برباد کر رہا ہو تو وہ اس پر کٹ مرے گا۔ اور اگر وہ اپنی جائداد میں دوسرے کی دست درازی نہ روک سکے تو یہ اس کی انتہائی ذلّت اور کمزوری کی علامت ہو گی۔ لیکن یہاں ایک پُورا قبیلہ، جو صدیوں سے بڑے دھڑلّے کے ساتھ اِس جگہ آباد تھا، بے بسی کے ساتھ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہمسایے اس کے باغوں پر چڑھ آئے ہیں اور اس کے درختوں کو برباد کر رہے ہیں، مگر وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس کے بعد اگر وہ مدینے میں رہ بھی جاتے تو ان کی کوئی آبرو باقی نہ رہتی۔ رہا درختوں کو نہ کاٹنے میں ذلّت کا پہلُو، تو وہ یہ تھا کہ جب وہ مدینے سے نکلے تو اُن کی آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ کل تک جو ہرے بھرے باغ ان کی مِلکیّت میں تھے، وہ آج مسلمانوں کے قبضے میں جا رہے ہیں۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اُن کو پوری طرح اُجاڑ کر جاتے اور ایک سالم درخت بھی مسلمانوں کے قبضے میں نہ جانے دیتے۔ مگر بے بسی کے ساتھ وہ سب کچھ جُوں کا تُوں چھوڑ کر باحسرت و یاس نکل گئے۔

۱۱ – اب اُن جائدادوں اور املاک کا ذکر ہو رہا ہے جو پہلے بنی نَضِیر کی مِلک تھیں اور ان کی جلاوطنی کے بعد اسلامی حکومت کے قبضے میں آئیں۔ ان کے متعلق یہاں سے آیت ۱۰ تک اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک علاقہ فتح ہو کر اسلامی مقبوضات میں شامل ہوا، اور آگے بہت سے علاقے فتح ہونے والے تھے، اس لیے فتوحات کے آغاز ہی میں اراضیِ مفتوحہ کا قانون بیان فرما دیا گیا۔ اِس جگہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ (جو کچھ پلٹا دیا اُن سے اللہ نے اپنے رسول کی طرف) کے الفاظ استعمال

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۶ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ
الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ
وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱۲]۔ جو کچھ بھی اللہ اِن بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے، وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے[۱۳]، تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے[۱۴]۔

کیے ہیں۔ ان الفاظ سے خود بخود یہ معنیٰ نکلتے ہیں کہ یہ زمین اور وہ ساری چیزیں جو یہاں پائی جاتی ہیں، دراصل اُن لوگوں کا حق نہیں ہیں جو اللہ جَلّ شانُہٗ کے باغی ہیں۔ وہ اگر اُن پر قابض و مُتصرّف ہیں تو یہ حقیقت میں اِس طرح کا قبضہ و تصرّف ہے جیسے کوئی خائن ملازم اپنے آقا کا مال دبا بیٹھے۔ ان تمام اموال کا اصل حق یہ ہے کہ یہ ان کے حقیقی مالک، اللہ رب العالمین کی اطاعت میں اس کی مرضی کے مطابق استعمال کیے جائیں، اور ان کا یہ استعمال صرف مومنینِ صالحین ہی کر سکتے ہیں۔ اس لیے جو اموال بھی ایک جائز و برحق جنگ کے نتیجے میں کفّار کے قبضے سے نکل کر اہلِ ایمان کے قبضے میں آئیں، ان کی حقیقی حیثیت یہ ہے کہ اُن کا مالک انھیں اپنے خائن ملازموں کے قبضے سے نکال کر اپنے فرماں بردار ملازموں کی طرف پلٹا لایا ہے۔ اسی لیے ان املاک کو اسلامی قانون کی اِصطِلاح میں فَے (پلٹا کر لائے ہوئے اموال) قرار دیا گیا ہے۔

۱۲- یعنی اِن اموال کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ جو فوج میدانِ جنگ میں دشمن سے نبرد آزما ہوئی ہے، اُس نے لڑ کر اِن کو جیتا ہو اور اس بنا پر اُس فوج کا یہ حق ہو کہ یہ اموال اس میں تقسیم کر دیے جائیں، بلکہ اِن کی اصل نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے رسولوں کو، اور اُس نظام کو جس کی نمایندگی یہ رسول کرتے ہیں، ان پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان کا مسلمانوں کے قبضے میں آنا براہِ راست لڑنے والی فوج کے زورِ بازو کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُس مجموعی قوت کا نتیجہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول اور اس کی اُمّت اور اس کے قائم کردہ نظام کو عطا فرمائی ہے۔ اس لیے یہ اموال مالِ غنیمت سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہیں، اور لڑنے والی فوج کا یہ حق نہیں ہے کہ غنیمت کی طرح اِن کو بھی اس میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس طرح شریعت میں غنیمت اور فَے کا حکم الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ غنیمت کا حکم سورۂ اَنفال، آیت ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے پانچ حصّے کیے جائیں، چار حصّے لڑنے والی فوج میں تقسیم کر دیے جائیں، اور ایک حصّہ بیت المال میں داخل کر کے اُن مصارف میں صَرف کیا جائے جو اُس آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور فَے کا حکم یہ ہے کہ اسے فوج میں تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ وہ پُوری کی پُوری اُن مصارف کے لیے مخصوص کر دی جائے جو آگے کی

Maktaba Tul Ishaat.com

آیات میں بیان ہو رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے اموال میں فرق فَمَآ اَوۡجَفۡتُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ خَیۡلٍ وَّلَا رِکَابٍ (تم نے اس پر اپنے گھوڑے اور اُونٹ نہیں دوڑائے ہیں) کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ گھوڑے اور اُونٹ دوڑانے سے مراد ہے جنگی کارروائی (warlike operations)۔ لہٰذا جو مال براہِ راست اس کارروائی سے ہاتھ آئے ہوں، وہ غنیمت ہیں۔ اور جن اموال کے حُصول کا اصل سبب یہ کارروائی نہ ہو وہ سب فَے ہیں۔

یہ مُجمَل فرق جو غنیمت اور فَے کے درمیان اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے، اس کو اور زیادہ کھول کر فقہائے اسلام نے اس طرح بیان کیا ہے کہ غنیمت صرف وہ اموالِ منقولہ ہیں جو جنگی کارروائیوں کے دوران میں دشمن کے لشکروں سے حاصل ہوں۔ اُن کے ماسوا دشمن مُلک کی زمینیں، مکانات اور دوسرے اموالِ منقولہ و غیر منقولہ غنیمت کی تعریف سے خارج ہیں۔ اس تشریح کا ماخذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ خط ہے جو انھوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کو فتحِ عراق کے بعد لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ فانظر ما اجلبوا به عليك في العسكر من كراعٍ او مالٍ فاقسمه بين من حضر من المسلمين واترك الاَرَضِين والانهار لعُمّالها ليكون ذٰلك في اعطيات المسلمين۔ ''جو مال متاع فوج کے لوگ تمھارے لشکر میں سمیٹ لائے ہیں، اس کو اُن مسلمانوں میں تقسیم کر دو جو جنگ میں شریک تھے، اور زمینیں اور نہریں اُن لوگوں کے پاس چھوڑ دو جو ان پر کام کرتے ہیں، تاکہ ان کی آمدنی مسلمانوں کی تنخواہوں کے کام آئے۔'' (کتاب الخَراج لابی یُوسُف، صفحہ ۲۴۔ کتاب الاموال لابی عُبَید صفحہ ۵۹۔ کتاب الخَراج لیحیٰی بن آدم، صفحات ۲۷-۲۸-۴۸) اسی بنیاد پر حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ''جو کچھ دشمن کے کیمپ سے ہاتھ آئے وہ اُن کا حق ہے جنھوں نے اس پر فتح پائی، اور زمین مسلمانوں کے لیے ہے۔'' (یحیٰی بن آدم، صفحہ ۲۷) اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ''جو کچھ دشمن کے لشکروں سے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور جو متاع اور اسلحہ اور جانور وہ اپنے کیمپ میں سمیٹ لائیں وہ غنیمت ہے اور اسی میں سے پانچواں حصہ نکال کر باقی چار حصے فوج میں تقسیم کیے جائیں گے۔'' (کتاب الخَراج، صفحہ ۱۸) یہی رائے یحیٰی بن آدمؒ کی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب الخراج میں بیان کی ہے۔ (صفحہ ۲۷) اس سے بھی زیادہ جو چیز غنیمت اور فَے کے فرق کو واضح کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ جنگِ نہاوَند کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا تھا اور مفتوحہ علاقہ اسلامی حکومت میں داخل ہو گیا تھا، ایک صاحب، سائب بن اَقرَع کو قلعہ میں جواہر کی دو تھیلیاں ملیں۔ اُن کے دل میں یہ اُلجھن پیدا ہوئی کہ آیا یہ مالِ غنیمت ہے جسے فوج میں تقسیم کیا جائے، یا اس کا شمار اب فَے میں ہے جسے بیت المال میں داخل ہونا چاہیے؟ آخر کار انھوں نے مدینہ حاضر ہو کر معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا اور انھوں نے فیصلہ فرمایا کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ غنیمت صرف وہ اموالِ منقولہ ہیں جو دورانِ جنگ میں فوج کے ہاتھ آئیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اموالِ غیر منقولہ کی طرح اموالِ منقولہ بھی فَے کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ امام ابو عُبَیدؒ اس واقعے کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ما نيل من اهل الشرك عَنْوةً قسرًا والحرب قائمة فهو الغنيمة، وما نيل منهم بعد ما تضع الحرب اوزارها وتصير الدار دار الاسلام فهو فَيْءٌ يكون للناس عامًا ولا خمس فيه۔ ''جو مال دشمن سے بزور ہاتھ لگے، جب کہ ابھی جنگ ہو رہی ہو، وہ غنیمت ہے، اور جنگ ختم ہونے کے بعد جب ملک دار الاسلام بن گیا ہو،

اُس وقت جو مال ہاتھ لگے وہ فَے ہے، جسے عام باشندگانِ دارالاسلام کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ اس میں خُمس نہیں ہے۔" (کتاب الاموال، صفحہ ۲۵۴)

غنیمت کو اس طرح محُدود کرنے کے بعد باقی جو اموال و املاک اور اراضی، کفار سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوں وہ دو بڑی اقسام پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں: ایک وہ جو لڑ کر فتح کیے جائیں، جن کو اسلامی فقہ کی زبان میں عَنْوَۃً فتح ہونے والے مُمالک کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، خواہ وہ صلح اپنی جگہ پر مسلمانوں کی فوجی طاقت کے دباؤ یا رُعب اور ہیبت ہی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ اور اِسی قسم میں وہ سب اموال بھی آجاتے ہیں جو عَنْوَۃً فتح ہونے کے سوا کسی دوسری صورت سے مسلمانوں کے قبضے میں آئیں۔ فقہائے اسلام کے درمیان جو کچھ بحثیں پیدا ہوئی ہیں، وہ صرف پہلی قسم کے اموال کے بارے میں پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی ٹھیک ٹھیک شرعی حیثیت کیا ہے، کیونکہ وہ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ کی تعریف میں نہیں آتے۔ رہے دوسری قسم کے اموال، تو ان کے بارے میں یہ بات مُتّفَق عَلَیہ ہے کہ وہ فَے ہیں، کیونکہ ان کا حکم صاف صاف قرآنِ مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔ آگے چل کر ہم قسمِ اوّل کے اموال کی شرعی حیثیت پر تفصیلی کلام کریں گے۔

۱۳ – پچھلی آیت میں صرف اتنی بات ارشاد ہوئی تھی کہ ان اموال کو حملہ آور فوج میں غنائم کی طرح تقسیم نہ کرنے کی وجہ کیا ہے، اور کیوں ان کا شرعی حکم غنائم سے الگ ہے۔ اب اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان اموال کے حق دار کون کون ہیں۔

ان میں سب سے پہلا حصّہ اللہ اور رسولؐ کا ہے۔ اِس حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عمل کیا، اُس کی تفصیل مالک بن اَوس بن حَدَثان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رِوایت سے یہ نقل کی ہے کہ حضورؐ اس حصّے میں سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نَفَقہ لے لیتے تھے اور باقی آمدنی جہاد کے لیے اسلحہ اور سواری کے جانور فراہم کرنے پر خرچ فرماتے تھے۔ (بخاری، مسلم، مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی وغیرہ) حضورؐ کے بعد یہ حصّہ مسلمانوں کے بیت المال کی طرف منتقل ہو گیا، تاکہ یہ اُس مشن کی خدمت پر صَرف ہو جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے سُپرد کیا تھا۔ امام شافعیؒ سے یہ رائے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ خاص کے لیے جو حصّہ تھا، وہ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلیفہ کے لیے ہے، کیونکہ آپؐ اس کے مستحق اپنے منصبِ امامت کی بنا پر تھے نہ کہ منصبِ رسالت کی بنا پر۔ مگر فقہائے شافعیہ کی اکثریت کا قول اس معاملے میں وہی ہے جو جمہور کا قول ہے، کہ یہ حصّہ اب مسلمانوں کے دینی و اجتماعی مصالح کے لیے ہے، کسی شخصِ خاص کے لیے نہیں ہے۔

دوسرا حصّہ رشتہ داروں کا ہے، اور ان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں، یعنی بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب۔ یہ حصہ اِس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے حُقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اُن رشتہ داروں کے حُقوق بھی ادا فرما سکیں جو آپؐ کی مدد کے محتاج ہوں، یا آپ جن کی مدد کرنے کی ضرورت محسوس فرمائیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ بھی ایک الگ اور مستقل حصّے کی حیثیت سے باقی نہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

جو کچھ رسُولؐ تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رُک جاؤ۔

رہا، بلکہ مسلمانوں کے دوسرے مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کے ساتھ بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب کے محتاج لوگوں کے حُقوق بھی بیت المال کے ذمّے عائد ہوگئے، البتہ اس بنا پر ان کا حق دوسروں پر فائق سمجھا گیا کہ زکوٰۃ میں اُن کا حصّہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پہلے دو حصّے ساقط کر کے صرف باقی تین حصّے (یتامیٰ، مساکین وابن السَّبیل) فَے کے حق داروں میں شامل رہنے دیے گئے، پھر اسی پر حضرت علی کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہٗ نے اپنے زمانے میں عمل کیا۔ محمد بن اسحاقؒ نے امام محمد باقرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اگرچہ حضرت علیؓ کی ذاتی رائے وہی تھی جو ان کے اہلِ بیت کی رائے تھی (کہ یہ حصّہ حضورؐ کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے) لیکن انھوں نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کے خلاف عمل کرنا پسند نہ فرمایا۔ حسن بن محمد بن حَنَفِیَّہؒ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے بعد ان دونوں حصوں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصّے اور ذَوِی القُربیٰ کے حصّے) کے متعلق اختلافِ رائے ہوگیا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ پہلا حصّہ حضورؐ کے خلیفہ کو ملنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ دوسرا حصّہ حضورؐ کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ دوسرا حصّہ خلیفہ کے رشتہ داروں کو دیا جانا چاہیے۔ آخر کار اس بات پر اجماع ہوگیا کہ یہ دونوں حصّے جہاد کی ضروریات پر صَرف کیے جائیں۔ عطاء بن سائبؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد میں حضورؐ کا حصّہ اور رشتہ داروں کا حصہ بنی ہاشم کو بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہائے حَنَفِیَّہ کی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں وہی عمل صحیح ہے جو خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں جاری تھا۔ (کتاب الخَراج لابی یُوسُف، صفحہ ۱۹ تا ۲۱) امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہاشمی و مُطّلِبی ہونا ثابت ہو، یا عام طور پر معلوم و معروف ہو، اُن کے غنی و فقیر، دونوں طرح کے اشخاص کو فَے میں سے مال دیا جاسکتا ہے۔ (مُغنی المحتاج) حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ صرف اُن کے محتاج لوگوں کی اِس مال سے مدد کی جا سکتی ہے، البتہ ان کا حق دوسروں پر فائق ہے۔ (روح المعانی) امام مالکؒ کے نزدیک اس معاملے میں حکومت پر کوئی پابندی نہیں ہے، جس مَد میں جس طرح مناسب سمجھے صَرف کرے، مگر اَولیٰ یہ ہے کہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مقدّم رکھے۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی علی الشرح الکبیر)

باقی تین حصّوں کے بارے میں فقہا کے درمیان کوئی بحث نہیں ہے۔ البتہ امام شافعیؒ اور ائمۂ ثلاثہ کے درمیان اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک فَے کے جملہ اموال کو پانچ برابر کے حصّوں میں تقسیم کر کے اُن میں سے ایک حصّہ مذکورۂ بالا مصارف پر اس طرح صَرف کیا جانا چاہیے کہ اس کا $\frac{1}{5}$ مصالحِ مسلمین پر، $\frac{1}{5}$ بنی ہاشم و بنی المُطّلِب پر، $\frac{1}{5}$ یتامیٰ پر، $\frac{1}{5}$ مساکین پر، اور $\frac{1}{5}$ مسافروں پر صرف کیا جائے۔ بخلاف اِس کے امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ اس تقسیم کے قائل نہیں ہیں، اور ان کی رائے یہ ہے کہ فَے کا پُورا مال مصالحِ مسلمین کے لیے ہے۔ (مُغنی المحتاج)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ

اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔[15] (نیز وہ مال) اُن غریب مہاجرین کے لیے ہے

۱۴- یہ قرآنِ مجید کی اہم ترین اُصولی آیات میں سے ہے جس میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی مَعاشی پالیسی کا یہ بنیادی قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پُورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ مال صرف مال داروں ہی میں گھومتا رہے، یا امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ قرآنِ مجید میں اس پالیسی کو صرف بیان ہی کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اِسی مقصد کے لیے سُود حرام کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، اموالِ غنیمت میں سے خُمس نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، صدقاتِ نافلہ کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے، مختلف قسم کے کفّاروں کی ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جن سے دولت کے بہاؤ کا رُخ معاشرے کے غریب طبقات کی طرف پھیر دیا جائے، میراث کا ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں پھیل جائے، اَخلاقی حیثیت سے بُخل کو سخت قابلِ مذمّت اور فیّاضی کو بہترین صفت قرار دیا گیا ہے، خوش حال طبقوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے جسے خیرات نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ہی انھیں ادا کرنا چاہیے، اور اسلامی حکومت کی آمدنی کے ایک بہت بڑے ذریعے، یعنی فَے کے متعلق یہ قانون مقرر کر دیا گیا ہے کہ اس کا ایک حصّہ لازماً معاشرے کے غریب طبقات کو سہارا دینے کے لیے صرف کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اسلامی حکومت کے ذرائعِ آمدنی کی اہم ترین مدّات دو ہیں: ایک زکوٰۃ، دوسری فَے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے پُورے زائد از نصاب سرمایے، مواشی، اموالِ تجارت اور زرعی پیداوار سے وصول کی جاتی ہے، اور وہ زیادہ تر غریبوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اور فَے میں جزیہ و خراج سمیت وہ تمام آمدنیاں شامل ہیں جو غیر مسلموں سے حاصل ہوں، اور ان کا بھی بڑا حصّہ غریبوں ہی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ کُھلا ہوا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کا نظام، اور بحیثیتِ مجموعی، ملک کے تمام مالی اور مَعاشی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا چاہیے کہ دولت کے ذرائع پر مال دار اور با اثر لوگوں کی اِجارہ داری قائم نہ ہو، اور دولت کا بہاؤ نہ غریبوں سے امیروں کی طرف ہونے پائے، نہ وہ امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے۔

۱۵- سلسلۂ بیان کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اموالِ بنی نَضِیر کے انتظام، اور اسی طرح بعد کے اموالِ فَے کی تقسیم کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ فرمائیں، اسے بے چُون وچَرا تسلیم کر لو، جو کچھ حضورؐ کسی کو دیں وہ اسے لے لے، اور جو کسی کو نہ دیں وہ اس پر کوئی احتجاج یا مطالبہ نہ کرے۔ لیکن چونکہ حکم کے الفاظ عام ہیں، اس لیے یہ صرف اموالِ فَے کی تقسیم تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ تمام معاملات میں مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔ اس منشا کو یہ بات اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ ''جو کچھ رسول تمھیں دے'' کے مقابلے میں ''جو کچھ نہ دے'' کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے گئے ہیں، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ ''جس چیز سے وہ تمھیں روک دے (یا منع کر دے) اس سے

Maktaba Tul Ishaat.com

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں[16]۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی

رُک جاؤ''۔ اگر حکم کا مقصود صرف اموالِ فَے کی تقسیم کے معاملے تک اطاعت کو محدود کرنا ہوتا تو ''جو کچھ دے'' کے مقابلے میں ''جو کچھ نہ دے'' فرمایا جاتا۔ منع کرنے یا روک دینے کے الفاظ اس موقع پر لانا خود یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ حکم کا مقصود حضورؐ کے امر و نہی کی اطاعت ہے۔ یہی بات ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اذا امرتکم بامر فائتوا منه ما استطعتم وما نهیتکم عنه فاجتنبوه۔ ''جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک ممکن ہو، اس پر عمل کرو۔ اور جس بات سے روک دوں، اس سے اجتناب کرو'' (بخاری، مسلم) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں فیشن کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' اس تقریر کو سن کر ایک عورت ان کے پاس آئی اور اس نے عرض کیا: یہ بات آپ نے کہاں سے اخذ کی ہے؟ کتاب اللہ میں تو یہ مضمون کہیں میری نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: تو نے اگر اللہ کی کتاب پڑھی ہوتی تو یہ بات ضرور تجھے اس میں مل جاتی۔ کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی کہ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ؟ اس نے عرض کیا: ہاں، یہ آیت تو میں نے پڑھی ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس فعل سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے ایسا فعل کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ عورت نے عرض کیا: اب میں سمجھ گئی۔ (بخاری، مسلم، مُسنَدِ احمد، مُسنَدِ ابنِ ابی حاتم)

۱۶ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اُس وقت مکۂ معظمہ اور عرب کے دوسرے علاقوں سے صرف اِس بنا پر نکال دیے گئے تھے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنی النَّضِیر کا علاقہ فتح ہونے سے پہلے تک اِن مہاجرین کے لیے گزر بسر کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ اب حکم دیا گیا کہ یہ مال جو اِس وقت ہاتھ آیا ہے، اور آیندہ جو اموال بھی فَے کے طور پر ہاتھ آئیں، اُن میں عام مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کے ساتھ ساتھ اِن لوگوں کا حق بھی ہے، اُن سے ایسے سب لوگوں کو سہارا دیا جانا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی خاطر ہجرت پر مجبور ہو کر دارالاسلام میں آئیں۔ اس حکم کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی النَّضِیر کی جائدادوں کا ایک حصہ مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور وہ نخلستان جو انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کے لیے دے رکھے تھے، اُن کو واپس کر دیے گئے۔ لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ فَے میں مہاجرین کا یہ حصّہ صرف اُسی زمانے کے لیے تھا۔ درحقیقت اس آیت کا منشا یہ ہے کہ قیامت تک جو لوگ بھی مسلمان ہونے کی وجہ سے جلاوطن ہو کر کسی مسلم مملکت کے حُدود میں پناہ لینے پر مجبور ہوں، ان کو بسانا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنانا اُس ملک کی اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، اور اسے زکوٰۃ کے علاوہ اموالِ فَے میں سے بھی اس مَد پر خرچ کرنا چاہیے۔

وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَ
الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ
اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى
اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ

چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسُولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔ (اور وہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے۔[۱۷] یہ اُن لوگوں سے محبّت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسُوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔[۱۸] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے

۱۷- مراد ہیں انصار۔ یعنی فَے میں صرف مہاجرین ہی کا حق نہیں ہے، بلکہ پہلے سے جو مسلمان دارالاسلام میں آباد ہیں، وہ بھی اس میں سے حصّہ پانے کے حق دار ہیں۔

۱۸- یہ تعریف ہے مدینۂ طیّبہ کے انصار کی۔ مہاجرین جب مکّہ اور دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے اُن کے شہر میں آئے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ پیش کش کی کہ ہمارے باغ اور نخلستان حاضر ہیں، آپؐ انھیں ہمارے اور اِن مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ تو باغبانی نہیں جانتے، یہ اُس علاقے سے آئے ہیں جہاں باغات نہیں ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے اِن باغوں اور نخلستانوں میں کام تم کرو اور پیداوار میں سے حصّہ اِن کو دو؟ انھوں نے کہا: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (بخاری، ابنِ جَرِیر) اس پر مہاجرین نے عرض کیا: ہم نے کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جو اس درجہ ایثار کرنے والے ہوں۔ یہ کام خود کریں گے اور حصّہ ہم کو دیں گے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ سارا اجر یہی لُوٹ لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، جب تک تم اِن کی تعریف کرتے رہو گے اور اِن کے حق میں دعائے خیر کرتے رہو گے، تم کو بھی اجر ملتا رہے گا۔ (مُسنَدِ احمد) پھر جب بنی النَّضِیر کا علاقہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بندوبست کی ایک شکل یہ ہے کہ تمھاری املاک اور یہودیوں کے چھوڑے ہوئے باغات اور نخلستانوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے، اور پھر اس پُورے مجموعے کو تمھارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ تم اپنی جائدادیں اپنے پاس رکھو اور یہ متروکہ اراضی مہاجرین میں بانٹ دی جائیں۔ انصارؓ نے عرض کیا: یہ جائدادیں

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

وہی فلاح پانے والے ہیں۔[19] (اور وہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے) جو اِن اگلوں کے بعد آئے ہیں،[20]

آپؐ اِن میں بانٹ دیں، اور ہماری جائدادوں میں سے بھی جو کچھ آپؐ چاہیں اِن کو دے سکتے ہیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ پکار اُٹھے: جزاکم اللّٰہ یا معشر الانصار خیرًا (یحیٰی بن آدم۔ بَلاذُری) اس طرح انصار کی رضامندی سے یہودیوں کے چھوڑے ہوئے اموال مہاجرین ہی میں تقسیم کیے گئے، اور انصار میں سے صرف حضرت ابودُجانہؓ، حضرت سَہلؓ بن حُنَیف اور (بروایتِ بعض) حضرت حارثؓ بن الصِّمّہ کو حصہ دیا گیا، کیونکہ یہ حضرات بہت غریب تھے۔ (بَلاذُری۔ ابنِ ہِشام۔ روح المعانی) اسی ایثار کا ثبوت انصار نے اُس وقت دیا جب بَحرَین کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس علاقے کی مفتوحہ اراضی انصار کو دی جائیں، مگر انھوں نے عرض کیا کہ ہم اس میں سے کوئی حصہ نہ لیں گے جب تک اتنا ہی ہمارے مہاجر بھائیوں کو نہ دیا جائے۔ (یحیٰی بن آدم) انصار کا یہی وہ ایثار ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔

١٩ – ”بچ گئے“ نہیں فرمایا گیا، بلکہ ”بچا لیے گئے“ ارشاد ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی توفیق اور اس کی مدد کے بغیر کوئی شخص خود اپنے زورِ بازو سے دل کی تونگری نہیں پا سکتا۔ یہ خدا کی وہ نعمت ہے جو خدا ہی کے فضل سے کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ شُحّ کا لفظ عربی زبان میں کنجوسی اور بُخل کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر جب اس لفظ کو نفس کی طرف منسوب کر کے شُحِّ نفس کہا جائے تو یہ تنگ نظری، تنگ دلی، کم حوصلگی، اور دل کے چھوٹے پن کا ہم معنیٰ ہو جاتا ہے، جو بخل سے وسیع تر چیز ہے، بلکہ خود بخل کی بھی اصل جڑ وہی ہے۔ اِسی صفت کی وجہ سے آدمی دوسرے کا حق ماننا اور ادا کرنا تو درکنار، اُس کی خوبی کا اعتراف تک کرنے سے جی چُراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں سب کچھ اسی کو مل جائے، اور کسی کو کچھ نہ ملے۔ دوسروں کو خود دینا تو کجا، کوئی دوسرا بھی اگر کسی کو کچھ دے تو اس کا دل دُکھتا ہے۔ اس کی حرص کبھی اپنے حق پر قانع نہیں ہوتی، بلکہ وہ دوسروں کے حُقوق پر دست درازی کرتا ہے، یا کم از کم دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے گرد و پیش دنیا میں جو اچھی چیز بھی ہے اُسے اپنے لیے سمیٹ لے، اور کسی کے لیے کچھ نہ چھوڑے۔ اسی بنا پر قرآن میں اِس بُرائی سے بچ جانے کو فلاح کی ضمانت قرار دیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اُن بدترین انسانی اوصاف میں شمار کیا ہے جو فساد کی جڑ ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اتقوا الشح فان الشح اھلك من قبلكم، حملھم علیٰ ان سفکوا دماءھم و استحلوا محارمھم (مسلم، مُسنَدِ احمد، بَیہقی، بخاری فی الادب) حضرت عبداللہ بن عَمروؓ کی روایت میں الفاظ یہ ہیں: امرھم بالظلم فظلموا وامرھم بالفجور فَفَجَرُوْا وامرھم بالقطیعة فقطعوا۔ (مُسنَدِ احمد، ابوداؤد، نَسائی) یعنی ”شُحّ سے بچو، کیونکہ شُحّ ہی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اسی نے اُن کو ایک دوسرے کے خون بہانے اور دوسروں کی حُرمتوں کو اپنے لیے حلال کر لینے پر اکسایا۔ اس نے ان کو ظلم پر آمادہ کیا اور انھوں نے ظلم کیا، فُجور کا حکم دیا اور انھوں نے فُجور کیا، قطعِ رحمی

کرنے کے لیے کہا اور انھوں نے قطعِ رحمی کی۔" حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "ایمان اور شُحِّ نفس کسی کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔" (ابنِ ابی شَیْبَہ، نسائی، بَیْہَقی فی شُعَبِ الایمان، حاکم) حضرت ابوسعید خُدریؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دو خصلتیں ہیں جو کسی مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں: بُخل اور بدخُلقی۔" (ابوداؤد، ترمِذی، بخاری فی الادب) اسلام کی اِسی تعلیم کا ثمرہ ہے کہ افراد سے قطعِ نظر، مسلمان بحیثیتِ قوم دنیا میں آج بھی سب سے بڑھ کر فیاض اور فراخ دل ہیں۔ جو قومیں ساری دنیا میں تنگ دلی اور بخیلی کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں، خود انھی میں سے نکلے ہوئے لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اپنے ہم نسل غیر مسلموں کے سایہ بسایہ رہتے ہیں۔ دونوں کے درمیان دل کی فراخی وتنگی کے اعتبار سے جو صریح فرق پایا جاتا ہے، اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ یہ اسلام کی اَخلاقی تعلیم کا فیض ہے جس نے مسلمانوں کے دل بڑے کر دیے ہیں۔

۲۰ - یہاں تک جو احکام ارشاد ہوئے ہیں، ان میں یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ فَے میں اللہ اور رسول، اور اقربائے رسول، اور یتامٰی اور مساکین اور ابن السّبیل، اور مہاجرین اور انصار، اور قیامت تک آنے والی مسلمان نسلوں کے حُقوق ہیں۔ قرآنِ پاک کا یہی وہ اہم قانونی فیصلہ ہے جس کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق، شام اور مصر کے مفتوحہ مَمالک کی اراضی اور جائدادوں کا اور ان مَمالک کی سابق حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کی املاک کا نیا بندوبست کیا۔ یہ مَمالک جب فتح ہوئے تو بعض ممتاز صحابۂ کرامؓ نے، جن میں حضرت زبیر، حضرت بلال، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ شامل تھے، اصرار کیا کہ اِن کو اُن افواج میں تقسیم کر دیا جائے جنھوں نے لڑ کر انھیں فتح کیا ہے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ یہ اموال فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ کی تعریف میں نہیں آتے، بلکہ اِن پر تو مسلمانوں نے اپنے گھوڑے اور اُونٹ دوڑا کر انھیں جیتا ہے، اس لیے بجز اُن شہروں اور علاقوں کے، جنھوں نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کی ہے، باقی تمام مفتوحہ مَمالک غنیمت کی تعریف میں آتے ہیں اور ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ ان کی اراضی اور ان کے باشندوں کا پانچواں حصّہ بیت المال کی تحویل میں دے دیا جائے، اور باقی چار حصّے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں۔ لیکن یہ رائے اس بنا پر صحیح نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جو علاقے لڑ کر فتح کیے گئے تھے، ان میں سے کسی کی اراضی اور باشندوں کو بھی حضورؐ نے غنائم کی طرح خُمس نکالنے کے بعد فوج میں تقسیم نہیں فرمایا تھا۔ آپؐ کے زمانے کی دو نمایاں ترین مثالیں فتحِ مکّہ اور فتحِ خیبر کی ہیں۔ ان میں سے مکّۂ معظمہ کو تو آپؐ نے جُوں کا تُوں اُس کے باشندوں کے حوالے فرما دیا۔ رہا خیبر، تو اس کے متعلق حضرت بُشَیر بن یَسار کی روایت ہے کہ آپؐ نے اس کے ۳۶ حصّے کیے، اور ان میں سے ۱۸ حصّے اجتماعی ضروریات کے لیے وقف کر کے باقی ۱۸ حصّے فوج میں تقسیم فرما دیے۔ (ابوداؤد، بَیْہَقی، کتاب الاموال لابی عُبَید، کتاب الخَراج لیحییٰ بن آدم، فُتوح البُلدان للبَلاذُری، فتح القدیر لابن ہُمام) حضورؐ کے اس عمل سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اراضیِ مفتوحہ کا حکم، اگرچہ وہ لڑ کر ہی فتح ہوئی ہوں، غنیمت کا نہیں ہے، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ حضورؐ مکّہ کو تو بالکل ہی اہلِ مکّہ کے حوالے فرما دیتے، اور خیبر میں سے پانچواں حصّہ نکالنے کے بجائے اس کا پُورا نصف حصّہ اجتماعی ضروریات کے لیے بیت المال کی

Maktaba Tul Ishaat.com

تحویل میں لے لیتے۔ پس سنّت سے جو بات ثابت تھی، وہ یہ کہ عَنْوَۃً فتح ہونے والے مُمالک کے معاملے میں امامِ وقت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے ان کے بارے میں جو فیصلہ بھی مناسب ترین ہو کرے۔ وہ ان کو تقسیم بھی کر سکتا ہے، اور اگر کوئی غیر معمولی نوعیت کسی علاقے کی ہو، جیسی مکّۂ معظّمہ کی تھی، تو اس کے باشندوں کے ساتھ وہ احسان بھی کر سکتا ہے جو حضورؐ نے اہلِ مکّہ کے ساتھ کیا۔

مگر حضورؐ کے زمانے میں چونکہ فتوحات کی کثرت نہ ہوئی تھی، اور مختلف اقسام کے مفتوحہ مُمالک کا الگ الگ حکم کُھل کر لوگوں کے سامنے نہ آیا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بڑے بڑے مُمالک فتح ہوئے تو صحابۂ کرامؓ کو اِس اُلجھن سے سابقہ پیش آیا کہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے علاقے آیا غنیمت ہیں یا فَے۔ مصر کی فتح کے بعد حضرت زُبیرؓ نے مطالبہ کیا کہ اقسمھا کما قسم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیبر، ''اس پُورے علاقے کو اُسی طرح تقسیم کر دیجیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا تھا۔'' (ابوعُبَید) شام اور عراق کے مفتوحہ علاقوں کے متعلق حضرت بلالؓ نے اصرار کیا کہ اقسم الاَرَضِین بین الذین افتتحوھا کما تقسم غنیمۃ العسکر، ''تمام اراضی کو فاتح فوجوں کے درمیان اُسی طرح تقسیم کر دیجیے جس طرح مالِ غنیمت تقسیم کیا جاتا ہے۔'' (کتاب الخَراج، ابو یوسُف) دوسری طرف حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ دعھم یکونوا مادۃً للمسلمین۔ ''اِن زمینوں کو ان کے کاشتکاروں کے پاس رہنے دیجیے، تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے ذریعۂ آمدنی بنے رہیں۔'' (ابو یوسُف، ابوعُبَید) اسی طرح حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کی رائے یہ تھی کہ ''اگر آپ نے تقسیم کیا تو اس کے نتائج بہت بُرے ہوں گے۔ اس تقسیم کی بدولت بڑی بڑی جائدادیں اُن چند لوگوں کے قبضے میں چلی جائیں گی جنھوں نے یہ علاقے فتح کیے ہیں۔ پھر یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور ان کی جائدادیں ان کے وارثوں کے پاس رہ جائیں گی، جن میں بسا اوقات کوئی ایک ہی عورت ہو گی، یا کوئی ایک مرد ہو گا، لیکن آنے والی نسلوں کے لیے کچھ نہ رہے گا جس سے اُن کی ضروریات پوری ہوں اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے مَصارف بھی پُورے کیے جا سکیں۔ لہٰذا آپ ایسا بندوبست کریں جس میں موجودہ اور آیندہ نسلوں کے مفاد کا یکساں تحفظ ہو۔'' (ابوعُبَید، ص ۵۹۔ فتح الباری، ج ۶، ص ۱۳۸) حضرت عمرؓ نے حساب لگا کر دیکھا کہ اگر سوادِ عراق کو تقسیم کیا جائے تو فی کس کیا حصّہ پڑے گا۔ معلوم ہوا کہ دو تین فلّاح فی کس کا اوسط پڑتا ہے۔ (ابو یوسف، ابوعُبید) اس کے بعد انھوں نے شرحِ صدر کے ساتھ یہ رائے قائم کر لی کہ ان علاقوں کو تقسیم نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے تقسیم کا مطالبہ کرنے والے مختلف اصحاب کو جو جوابات دیے، وہ یہ تھے:

تریدون ان یاتی اٰخر الناس لیس لھم شیءٌ۔ (ابوعُبَید)	کیا آپ چاہتے ہیں کہ بعد کے لوگ اس حالت میں آئیں کہ ان کے لیے کچھ نہ ہو؟
—— فکیف بمن یاتی من المسلمین فیجدون الارض بعلوجھا قد اقتسمت وورثت عن الآباء وحیزت؟ ما	اُن مسلمانوں کا کیا بنے گا جو بعد میں آئیں گے اور حالت یہ پائیں گے کہ زمین اپنے کسانوں سمیت بٹ چکی ہے اور باپ دادا سے لوگوں نے وراثت میں

هٰذا برائي ۔ (ابو یوسف)	سنبھال لی ہے؟ یہ ہرگز مناسب نہیں ہے۔
ــــ فما لمن جاء بعدكم من المسلمين واخاف ان قسمته تفاسدوا بينكم في المياه ۔ (ابوعُبَید)	تمھارے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے کیا رہے گا؟ اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں اسے تقسیم کر دوں تو تم پانی پر آپس میں لڑو گے۔
ــــ لولا اٰخر الناس ما فتحت قرية الا قسمتها كما قسم رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر (بخاری، مُوَطّا، ابوعُبَید)	اگر بعد میں آنے والوں کا خیال نہ ہوتا تو جو علاقہ بھی میں فتح کرتا، اسے تقسیم کر دیتا، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا۔
ــــ لا، هٰذا عين المال، ولكني احبسُهٗ فيما يجري عليهم وعلى المسلمين ۔ (ابوعُبَید)	نہیں، یہ تو عین المال (real estate) ہے۔ میں اسے روک رکھوں گا، تاکہ فاتح فوجوں اور عام مسلمانوں سب کی ضروریات اس سے پوری ہوتی رہیں۔

لیکن ان جوابات سے لوگ مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ ظلم کر رہے ہیں۔ آخر کار حضرت عمرؓ نے مجلسِ شُوریٰ کا اجتماع منعقد کیا اور اس کے سامنے یہ معاملہ رکھا۔ اس موقع پر جو تقریر آپ نے کی، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"میں نے آپ لوگوں کو صرف اِس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ اُس امانت کے اُٹھانے میں میرے ساتھ شریک ہوں جس کا بار آپ کے معاملات کو چلانے کے لیے میرے اُوپر رکھا گیا ہے۔ میں آپ ہی لوگوں میں سے ایک فرد ہوں، اور آپ وہ لوگ ہیں جو آج حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جو چاہے میری رائے سے اتفاق کرے، اور جو چاہے اختلاف کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔ آپ کے پاس کتاب اللہ ہے، جو ناطق بالحق ہے۔ خدا کی قسم! میں نے اگر کوئی بات کہی ہے، جسے میں کرنا چاہتا ہوں، تو اس سے میرا مقصد حق کے سوا کچھ نہیں ہے...... آپ اُن لوگوں کی بات سُن چکے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ ظلم کر رہا ہوں اور ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں اِس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی ظلم کا ارتکاب کروں۔ میں بڑا شقی ہوں گا اگر ظلم کر کے کوئی ایسی چیز، جو فی الواقع اُن کی ہو، اُنھیں نہ دوں اور کسی دوسرے کو دے دُوں۔ مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کِسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی اور علاقہ فتح ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں کے مال اور اُن کی زمینیں اور ان کے کسان، سب ہمارے قبضے میں دے دیے ہیں۔ ہماری فوجوں نے جو غنائم حاصل کیے تھے، وہ تو میں خُمس نکال کر ان میں بانٹ چکا ہوں، اور ابھی جو غنائم تقسیم نہیں ہوئے ہیں، میں ان کو بانٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہوں۔ البتہ زمینوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ انھیں اور اُن کے کسانوں کو تقسیم نہ کروں، بلکہ ان پر خَراج اور کسانوں پر جزیہ لگا دوں، جسے وہ ہمیشہ ادا کرتے رہیں، اور یہ اِس وقت کے عام مسلمانوں اور لڑنے والی فوجوں اور مسلمانوں کے بچّوں کے لیے اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے فَے ہو۔ کیا آپ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہماری اِن سرحدوں کے لیے لازماً ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کی حفاظت کرتے رہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہ بڑے بڑے ملک، شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر، اِن سب میں فوجیں رہنی چاہییں اور ان کو پابندی سے تنخواہیں ملنی چاہییں؟ اگر میں اِن زمینوں کو ان کے کسانوں سمیت تقسیم کر دوں تو یہ مصارف کہاں سے آئیں گے؟"

یہ بحث دو تین دن چلتی رہی۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار حضرت عمرؓ اُٹھے اور انھوں نے فرمایا کہ مجھے کتاب اللہ سے ایک حُجّت مل گئی ہے جو اس مسئلے کا فیصلہ کر دینے والی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورۂ حشر کی یہی آیات وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ سے لے کر رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ تک پڑھیں، اور ان سے یہ اِستدلال کیا کہ اللہ کی عطا کردہ اِن املاک میں صرف اِس زمانے کے لوگوں کا ہی حصّہ نہیں ہے، بلکہ بعد کے آنے والوں کو بھی اللہ نے ان کے ساتھ شریک کیا ہے، پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اِس فَے کو، جو سب کے لیے ہے، ہم اِن فاتحین میں تقسیم کر دیں اور بعد والوں کے لیے کچھ نہ چھوڑیں؟ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ، "تاکہ یہ مال تمھارے مال داروں ہی میں چکّر نہ لگاتا رہے۔" لیکن اگر میں اسے فاتحین میں تقسیم کر دوں تو یہ تمھارے مال داروں ہی میں چکّر لگاتا رہے گا اور دوسروں کے لیے کچھ نہ بچے گا۔ یہ دلیل تھی جس نے سب کو مطمئن کر دیا اور اس بات پر اجماع ہو گیا کہ ان تمام مفتوحہ علاقوں کو عامۂ مسلمین کے لیے فَے قرار دیا جائے، جو لوگ ان اراضی پر کام کر رہے ہیں انھی کے ہاتھوں میں انھیں رہنے دیا جائے، اور ان پر خَراج اور جزیہ لگا دیا جائے۔ (کتاب الخَراج لابی یوسف، صفحہ ۲۳ تا ۲۷ و ۳۵۔ احکام القرآن للجَصّاص)

اس فیصلے کے مطابق اراضیِ مفتوحہ کی اصل حیثیت یہ قرار پائی کہ مُسلم ملّت بحیثیتِ مجموعی ان کی مالک ہے، جو لوگ پہلے سے اِن زمینوں پر کام کر رہے تھے، اُن کو ملّت نے اپنی طرف سے بطورِ کاشتکار برقرار رکھا ہے، وہ اِن اراضی پر اسلامی حکومت کو ایک مقررہ لگان ادا کرتے رہیں گے، نسلاً بعد نسلٍ یہ کاشتکارانہ حُقوق اُن کی میراث میں منتقل ہوتے رہیں گے اور وہ ان حقوق کو فروخت بھی کر سکیں گے، مگر زمین کے اصل مالک وہ نہ ہوں گے، بلکہ مسلم ملّت ان کی مالک ہوگی۔ امام ابوعُبَیدؒ نے اپنی کتاب الاموال میں اس قانونی پوزیشن کو اس طرح بیان کیا ہے:

اقر اھل السواد فی ارضیھم وضرب علی رؤسھم الجزیۃ وعلی اَرَضیھم الطسق۔ (ص ۷۵)	حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق کے لوگوں کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھا، اور ان کے افراد پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر ٹیکس لگا دیا۔

اذا اقرّ الامام اهل العَنْوة فی ارضهم تواز ثوھا وتبایعوھا ۔ (ص ۸۴)	امام (یعنی اسلامی حکومت کا فرمانروا) جب مفتوحہ مَمالک کے لوگوں کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھے، تو وہ ان اراضی کو میراث میں بھی منتقل کرسکیں گے اور بیع بھی کرسکیں گے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں شَعْبیؒ سے پوچھا گیا: کیا سوادِ عراق کے لوگوں سے کوئی معاہدہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ معاہدہ تو نہیں ہے، مگر جب ان سے خَراج لینا قبول کرلیا گیا تو یہ ان کے ساتھ معاہدہ ہوگیا۔ (ابو عُبید، ص ۴۹۔ ابو یوسف، ص ۲۸)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عُتْبہ بن فَرْقَد نے فُرات کے کنارے ایک زمین خریدی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا: تم نے یہ زمین کس سے خریدی ہے؟ انھوں نے کہا: اس کے مالکوں سے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس کے مالک تو یہ لوگ ہیں (یعنی مہاجرین وانصار) رأیٰ عمر ان اصل الارض للمسلمین، ''عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کے اصل مالک مسلمان ہیں۔'' (ابو عُبَید، ص ۷۴)

اس فیصلے کی رُو سے مَمالکِ مفتوحہ کے جو اموال مسلمانوں کی اجتماعی مِلکیّت میں قرار دیے گئے، وہ یہ تھے:

(۱) وہ زمینیں اور علاقے جو کسی صلح کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے قبضے میں آئیں۔

(۲) وہ فدیہ یا خَراج یا جِزیہ جو کسی علاقے کے لوگوں نے جنگ کے بغیر ہی مسلمانوں سے امان حاصل کرنے کے لیے ادا کرنا قبول کیا ہو۔

(۳) وہ اراضی اور جائدادیں جن کے مالک انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(۴) وہ جائدادیں جن کے مالک مارے گئے اور کوئی مالک باقی نہ رہا۔

(۵) وہ اراضی جو پہلے سے کسی کے قبضے میں نہ تھیں۔

(۶) وہ اراضی جو پہلے سے لوگوں کے قبضے میں تھیں، مگر ان کے سابق مالکوں کو برقرار رکھ کر ان پر جِزیہ و خراج عائد کردیا گیا۔

(۷) سابق حکمراں خاندانوں کی جاگیریں۔

(۸) سابق حکومتوں کی املاک۔

(تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: بَدائع الصَّنائع، ج ۷، ص ۱۱۶-۱۱۸۔ کتاب الخَراج، یحیٰی بن آدم، ص ۲۲-۶۴۔ مُغنِی المحتاج، ج ۳، ص ۹۳۔ حاشیۃ الدُسُوقی علی الشرح الکبیر، ج ۲، ص ۱۹۰۔ غایۃ المُنتہیٰ، ج ۱، ص ۴۶۷-۴۷۱)

یہ چیزیں چونکہ صحابۂ کرامؓ کے اتفاق سے فَے قرار دی گئی تھیں، اس لیے فقہائے اسلام کے درمیان بھی ان کے فَے قرار دیے جانے پر اُصولاً اتفاق ہے۔ البتہ اختلاف چند اُمور میں ہے، جنھیں ہم مختصراً ذیل

Maktaba Tul Ishaat.com

میں بیان کرتے ہیں:

حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ مفتوحہ مَمالک کی اراضی کے معاملے میں اسلامی حکومت (فقہا کی اصطلاح میں اِمام) کو اختیار ہے، چاہے تو ان میں سے خُمس لے کر باقی فاتح فوج میں تقسیم کر دے، اور چاہے تو ان کو سابق مالکوں کے قبضے میں رہنے دے اور ان کے مالکوں پر جِزیہ اور زمینوں پر خراج عائد کر دے۔ اِس صورت میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وقف للمسلمین قرار پائیں گی۔ (بَدائع الصَّنائع، احکام القرآن للجَصّاص، شرح العِنایہ علی الہدایہ، فتح القدیر) یہی رائے عبداللہ بن مبارکؒ نے امام سُفیان ثَوریؒ سے بھی نقل کی ہے۔ (یحییٰ بن آدم، کتاب الاموال لابی عُبَید)

مالکیہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے محض فتح کر لینے ہی سے یہ اراضی خود بخود وقف علی المسلمین ہو جاتی ہیں۔ ان کو وقف کرنے کے لیے نہ امام کے فیصلے کی ضرورت ہے اور نہ مجاہدین کو راضی کرنے کی۔ علاوہ بریں مالکیہ کے ہاں مشہور قول یہ ہے کہ صرف اراضی ہی نہیں، مفتوحہ علاقوں کے مکان اور عمارات بھی حقیقتاً وقف علی المسلمین ہیں، البتہ اسلامی حکومت ان پر کرایہ عائد نہیں کرے گی۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی)

حَنابِلہ اس حد تک حنفیوں سے متفق ہیں کہ اراضی کو فاتحین میں تقسیم کرنا، یا مسلمانوں پر وقف کر دینا امام کے اختیار میں ہے۔ اور اس امر میں مالکیوں سے اتفاق کرتے ہیں کہ مفتوحہ مَمالک کے مکان بھی اگرچہ وقف میں شامل ہوں گے مگر ان پر کرایہ عائد نہ کیا جائے گا۔ (غایۃ المُنتَہیٰ۔ یہ مذہبِ حنبلی کے مفتیٰ بہِ اقوال کا مجموعہ ہے اور دسویں صدی سے اس مذہب میں فتویٰ اِسی کتاب کے مطابق دیا جاتا ہے)۔

شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ مفتوحہ علاقے کے تمام اموالِ منقولہ غنیمت ہیں، اور تمام اموالِ غیر منقولہ (اراضی اور مکانات) کو فَے قرار دیا جائے گا۔ (مُغنی المحتاج)

بعض فقہا کہتے ہیں کہ عَنْوۃً فتح ہونے والے مَمالک کی اراضی کو اگر امام وقف علی المسلمین کرنا چاہے تو لازم ہے کہ وہ پہلے فاتح فوجوں کی رضامندی حاصل کرے۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق کی فتح سے پہلے جَریرؓ بن عبداللہ البَجَلی سے، جن کے قبیلے کے لوگ جنگِ قادسیہ میں شریک ہونے والی فوج کا چوتھائی حصّہ تھے، یہ وعدہ کیا تھا کہ مفتوحہ علاقے کا چوتھائی حصّہ ان کو دیا جائے گا۔ چنانچہ ۲-۳ سال تک یہ حصّہ ان کے پاس رہا۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ لولا انی قاسم مسئول لکنتم علیٰ ما جُعل لکم، واری الناس قد کثروا فاریٰ ان تردّہ علیھم، "اگر میں تقسیم کے معاملے میں ذمہ دار اور جواب دہ نہ ہوتا تو جو کچھ تمھیں دیا جا چکا ہے، وہ تمھارے پاس ہی رہنے دیا جاتا۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی کثرت ہو گئی ہے، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ تم اسے عام لوگوں کو واپس کر دو۔" حضرت جَریرؓ نے اس بات کو قبول کر لیا اور حضرت عمرؓ نے ان کو اس پر ۸۰ دینار بطورِ انعام دیے۔ (کتاب الخَراج لابی یوسف، کتاب الاموال لابی عُبید) اس سے وہ یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فاتحین کو راضی کرنے کے بعد مفتوحہ علاقوں کو وقف علی المسلمین قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن جُمہور فقہا نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ تمام مَمالکِ مفتوحہ کے معاملے میں تمام فاتحین سے اس طرح کی کوئی رضامندی

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠﴾ ع

جو کہتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے اُن سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی بُغض نہ رکھ، اَے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔[۲۱]“ ع

نہیں لی گئی تھی، اور صرف حضرت جریرؓ بن عبداللہ کے ساتھ یہ معاملہ صرف اس لیے کیا گیا تھا کہ فتح سے پہلے، قبل اس کے کہ اراضیِ مفتوحہ کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ ہوتا، حضرت عمرؓ ان سے ایک وعدہ کر چکے تھے، اس لیے وعدے کی پابندی سے بَراءَت حاصل کرنے کے لیے آپ کو انھیں راضی کرنا پڑا۔ اسے کوئی عام قانون قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فقہا کا ایک اور گروہ کہتا ہے کہ وقف قرار دے دینے کے بعد بھی حکومت کو یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ کسی وقت ان اراضی کو پھر سے فاتحین میں تقسیم کر دے۔ اس کے لیے وہ اِس رِوایت سے اِستدلال کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: لولا ان یضرب بعضکم وجوہ بعض لقسمت السواد بینکم، ”اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم ایک دوسرے سے لڑو گے، تو میں سواد کا علاقہ تمھارے درمیان تقسیم کر دیتا۔“ (کتاب الخراج لابی یوسف، کتاب الاموال لابی عُبَید) لیکن جُمہور فقہا نے اس رائے کو بھی قبول نہیں کیا ہے اور وہ اس پر متفق ہیں کہ جب ایک مرتبہ مفتوحہ علاقے کے لوگوں پر جزیہ وخراج عائد کر کے اُنھیں اُن کی زمینوں پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہو، تو اس کے بعد بھی یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا۔ رہی وہ بات جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہے، تو اس پر ابوبکر جَصّاصؒ نے احکام القرآن میں تفصیلی بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ رِوایت صحیح نہیں ہے۔

۲۱ – اس آیت میں اگرچہ اصل مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ فَے کی تقسیم میں حاضر و موجود لوگوں کا ہی نہیں، بعد میں آنے والے مسلمانوں اور ان کی آیندہ نسلوں کا حصّہ بھی ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس میں ایک اہم اَخلاقی درس بھی مسلمانوں کو دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے بُغض نہ ہونا چاہیے، اور مسلمانوں کے لیے صحیح رَوِش یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں، نہ یہ کہ وہ اُن پر لعنت بھیجیں اور تبرّا کریں۔ مسلمانوں کو جس رشتے نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے، وہ دراصل ایمان کا رشتہ ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ایمان کی اہمیت دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ہو تو لامحالہ وہ ان سب لوگوں کا خیرخواہ ہوگا جو ایمان کے رشتے سے اس کے بھائی ہیں۔ ان کے لیے بدخواہی اور بُغض اور نفرت اس کے دل میں اسی وقت جگہ پا سکتی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

جب کہ ایمان کی قدر اس کی نگاہ میں گھٹ جائے اور کسی دوسری چیز کو وہ اس سے زیادہ اہمیت دینے لگے۔ لہٰذا یہ عین ایمان کا تقاضا ہے کہ ایک مومن کا دل کسی دوسرے مومن کے خلاف نفرت و بغض سے خالی ہو۔ اس معاملے میں بہترین سبق ایک حدیث سے ملتا ہے، جو نسائی نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تین دن مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمھارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہلِ جنّت میں سے ہے، اور ہر بار وہ آنے والے شخص انصار میں سے ایک صاحب ہی ہوتے۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ بن عاص کو جستجو پیدا ہوئی کہ آخر یہ کیا عمل ایسا کرتے ہیں جس کی بنا پر حضورؐ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے تین روز مسلسل ان کے ہاں جا کر رات گزارتے رہے، تاکہ ان کی عبادت کا حال دیکھیں۔ مگر ان کی شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز اُنھیں نظر نہ آئی۔ ناچار انھوں نے خود ہی ان سے پُوچھ لیا کہ بھائی! آپ کیا عمل ایسا کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے حضورؐ سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سُنی ہے؟ انھوں نے کہا: میری عبادت کا حال تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے جو شاید اس کی موجب بنی ہو، اور وہ یہ ہے کہ لا اجد فی نفسی غِلًّا لاحد من المسلمین، ولا احسدہ علی خیرٍ اعطاہ اللّٰہ تعالٰی ایّاہ۔ ’’میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کپَٹ نہیں رکھتا اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے عطا کی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔‘‘

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اگر کسی دوسرے مسلمان کے قول یا عمل میں کوئی غلطی پاتا ہو تو وہ اسے غلط نہ کہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہرگز نہیں ہے کہ مومن غَلطی بھی کرے تو اس کو صحیح کہا جائے، یا اس کی غلط بات کو غلط نہ کہا جائے۔ لیکن کسی چیز کو دلیل کے ساتھ غلط کہنا اور شائستگی کے ساتھ اُسے بیان کر دینا اور چیز ہے، اور بغض و نفرت، مَذمّت و بدگوئی اور سَبّ وشَتم بالکل ہی ایک دوسری چیز۔ یہ حرکت زندہ معاصرین کے حق میں کی جائے تب بھی ایک بڑی بُرائی ہے، لیکن مرے ہوئے اسلاف کے حق میں اس کا ارتکاب تو اور زیادہ بڑی بُرائی ہے، کیونکہ وہ نفس ایک بہت ہی گندا نفس ہوگا جو مرنے والوں کو بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اور ان سب سے بڑھ کر شدید بُرائی یہ ہے کہ کوئی شخص اُن لوگوں کے حق میں بدگوئی کرے جنھوں نے انتہائی سخت آزمایشوں کے دَور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق ادا کیا تھا اور اپنی جانیں لڑا کر دنیا میں اسلام کا وہ نور پھیلایا تھا جس کی بدولت آج ہمیں نعمتِ ایمان میسّر ہوئی ہے۔ اُن کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے، اُن میں اگر ایک شخص کسی فریق کو حق پر سمجھتا ہو اور دوسرے فریق کا مَوقف اس کی رائے میں صحیح نہ ہو، تو وہ یہ رائے رکھ سکتا ہے اور اسے معقولیت کے حُدود میں بیان بھی کر سکتا ہے۔ مگر ایک فریق کی حمایت میں ایسا غُلُو کہ دوسرے فریق کے خلاف دل بغض و نفرت سے بھر جائے اور زبان وقلم سے بدگوئی کی تَراوِش ہونے لگے، ایک ایسی حرکت ہے جو کسی خدا ترس انسان سے سرزد نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی صریح تعلیم کے خلاف یہ حرکت جو لوگ کرتے ہیں، وہ بالعُموم اپنے اس فعل کے لیے یہ عذر بیان کرتے ہیں کہ قرآن مومنین کے خلاف بغض رکھنے سے منع کرتا ہے، اور ہم جن کے خلاف بغض رکھتے ہیں وہ مومن نہیں بلکہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

تم[۲۲] نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنھوں نے منافقت کی رَوِش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہلِ کتاب

منافق تھے۔ لیکن یہ الزام اُس گناہ سے بھی بدتر ہے جس کی صفائی میں یہ بطورِ عذر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی یہی آیات، جن کے سلسلۂ بیان میں اللہ تعالیٰ نے بعد کے آنے والے مسلمانوں کو اپنے سے پہلے گزرے ہوئے اہلِ ایمان سے بُغض نہ رکھنے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کی تعلیم دی ہے، اُن کے اس اِلزام کی تردید کے لیے کافی ہیں۔ اِن آیات میں یکے بعد دیگرے تین گروہوں کو فَے کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ اوّل مہاجرین، دوسرے انصار، تیسرے اُن کے بعد آنے والے مسلمان۔ اور اِن بعد کے آنے والے مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم سے پہلے جن لوگوں نے ایمان لانے میں سبقت کی ہے، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ ظاہر ہے کہ اس سِیاق وسَباق میں سابقین بالایمان سے مراد مہاجرین وانصار کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اِسی سورۂ حشر کی آیات ۱۱ تا ۱۷ میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ منافق کون لوگ تھے۔ اِس سے یہ بات بالکل ہی کُھل جاتی ہے کہ منافق وہ تھے جنھوں نے غزوۂ بنی نضیر کے موقع پر یہودیوں کی پیٹھ ٹھونکی تھی، اور ان کے مقابلے میں مومن وہ تھے جو اس غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل تھے۔ اِس کے بعد کیا ایک مسلمان، جو خدا کا کچھ بھی خوف دل میں رکھتا ہو، یہ جسارت کرسکتا ہے کہ اُن لوگوں کے ایمان کا انکار کرے جن کے ایمان کی شہادت اللہ تعالیٰ نے خود دی ہے؟

امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے اس آیت سے اِستدلال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فَے میں اُن لوگوں کا کوئی حصّہ نہیں ہے جو صحابۂ کرامؓ کو بُرا کہتے ہیں۔ (احکام القرآن لابن العربی، غایۃ المُنتہیٰ) لیکن حَنفِیّہ اور شافعیہ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کو فَے میں حصّہ دار قرار دیتے ہوئے ہر ایک کے ایک نمایاں وصف کی تعریف فرمائی ہے، مگر ان میں سے کوئی تعریف بھی بطورِ شرط نہیں ہے کہ وہ شرط اس گروہ میں پائی جاتی ہو تو اسے حصّہ دیا جائے ورنہ نہیں۔ مہاجرین کے متعلق فرمایا کہ ’’وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔‘‘ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس مہاجر میں یہ صفت نہ پائی جائے، وہ فَے میں سے حصّہ پانے کا حق دار نہیں ہے۔ انصار کے متعلق فرمایا کہ ’’وہ مہاجرین سے مَحبّت کرتے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے، اس کے لیے اپنے دلوں میں کوئی طلب نہیں پاتے، خواہ وہ خود تنگ دست ہوں۔‘‘ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ فَے میں کسی ایسے انصاری کا کوئی حق نہیں جو مہاجرین سے مَحبّت نہ رکھتا ہو اور جو کچھ اُن کو دیا جا رہا ہو، اسے خود حاصل کرنے کا خواہش مند ہو۔ لہٰذا تیسرے گروہ کا یہ وصف کہ ’’اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے حق میں وہ دعائے مغفرت کرتا ہے اور اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ کسی مومن کے لیے اس کے دل میں بُغض نہ ہو‘‘، یہ بھی فَے میں حق دار ہونے کی شرط نہیں ہے بلکہ ایک اچھے وصف کی تعریف اور اس امر کی تلقین ہے کہ اہلِ ایمان کا رَوِیّہ دوسرے اہلِ ایمان کے ساتھ اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے مومنین کے معاملے میں کیا ہونا چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ
فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ
قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا
يُنْصَرُوْنَ ۝۱۲ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

بھائیوں سے کہتے ہیں: ”اگر تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے، اور تمھارے معاملے میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے، اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔“ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے، اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ اُن کی ہرگز مدد نہ کریں گے، اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ اِن کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمھارا خوف ہے،[۲۳]

۲۲ – اس پُورے رُکوع کے اندازِ بیان سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نَضِیر کو مدینے سے نکل جانے کے لیے دس دن کا نوٹس دیا تھا اور اُن کا محاصرہ شروع ہونے میں کئی دن باقی تھے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنی نَضِیر کو یہ نوٹس دیا تو عبداللہ بن اُبَیّ اور مدینے کے دوسرے منافق لیڈروں نے اُن کو یہ کہلا بھیجا کہ ہم دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کو آئیں گے، اور بنی قُرَیظَہ اور بنی غَطفان بھی تمھاری حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے، لہٰذا تم مسلمانوں کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ اور ہرگز ان کے آگے ہتھیار نہ ڈالو۔ یہ تم سے لڑیں گے تو ہم تمھارے ساتھ لڑیں گے، اور تم یہاں سے نکالے گئے تو ہم بھی نکل جائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ پس ترتیبِ نُزول کے اعتبار سے یہ رُکوع پہلے کا نازل شُدہ ہے اور پہلا رُکوع اس کے بعد نازل ہوا ہے جب بنی نَضِیر مدینے سے نکالے جا چکے تھے۔ لیکن قرآنِ مجید کی ترتیب میں پہلے رکوع کو مقدّم اور دوسرے کو مؤخر اس لیے کیا گیا ہے کہ اہم تر مضمون پہلے رکوع ہی میں بیان ہوا ہے۔

۲۳ – یعنی ان کے کھل کر میدان میں نہ آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مسلمان ہیں، ان کے دل میں خدا کا خوف ہے اور اس بات کا کوئی اندیشہ انھیں لاحق ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جب یہ اہلِ ایمان کے مقابلے میں کافروں

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝١٣ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝١٤ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ

اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بُوجھ نہیں رکھتے[24]۔ یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کُھلے میدان میں) تمھارا مقابلہ نہ کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر، یا دیواروں کے پیچھے چُھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم اِنھیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دُوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں[25]۔ اِن کا یہ حال اِس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ یہ اُنھی لوگوں کے مانند

کی حمایت کریں گے تو خدا کے ہاں اس کی باز پُرس ہو گی۔ بلکہ انھیں جو چیز تمھارا سامنا کرنے سے روکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تمھاری محبّت اور جانبازی اور فدا کاری کو دیکھ کر اور تمھاری صفوں میں زبردست اتحاد دیکھ کر اِن کے دل بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم اگرچہ مٹھی بھر لوگ ہو، مگر جس جذبۂ شہادت نے تمھارے ایک ایک شخص کو سرفروش مجاہد بنا رکھا ہے اور جس تنظیم کی بدولت تم ایک فولادی جتھا بن گئے ہو، اُس سے ٹکرا کر یہودیوں کے ساتھ یہ بھی پاش پاش ہو جائیں گے۔ اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اگر کسی کے دل میں خدا سے بڑھ کر کسی اور کا خوف ہو تو یہ دراصل خوفِ خدا کی نفی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص دو خطروں میں سے ایک کو کم تر اور دوسرے کو شدید تر سمجھتا ہو، وہ پہلے خطرے کی پروا نہیں کرتا اور اسے تمام تر فکر صرف دوسرے خطرے سے بچنے ہی کی ہوتی ہے۔

۲۴۔ اِس چھوٹے سے فقرے میں ایک بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جو شخص سمجھ بُوجھ رکھتا ہو، وہ تو یہ جانتا ہے کہ اصل میں ڈرنے کے قابل خدا کی طاقت ہے نہ کہ انسانوں کی طاقت۔ اس لیے وہ ہر ایسے کام سے بچے گا جس پر اسے خدا کے مواخذے کا خطرہ ہو، قطعِ نظر اس سے کہ کوئی انسانی طاقت مواخذہ کرنے والی ہو یا نہ ہو، اور ہر وہ فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو گا جو خدا نے اس پر عائد کیا ہو، خواہ ساری دنیا کی طاقتیں اس میں مانع و مزاحم ہوں۔ لیکن ایک ناسمجھ آدمی کے لیے چونکہ خدا کی طاقت غیر محسوس اور انسانی طاقتیں محسوس ہوتی ہیں، اس لیے تمام معاملات میں وہ اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ خدا کے بجائے انسانی طاقتوں کے لحاظ سے کرتا ہے۔ کسی چیز سے بچے گا تو اس لیے نہیں کہ خدا کے ہاں اس کی پکڑ ہونے والی ہے، بلکہ اس لیے کہ سامنے کوئی انسانی طاقت اس کی خبر لینے کے لیے موجود ہے۔ اور کسی کام کو کرے گا تو وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے، یا اُس پر وہ خدا کے

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۚ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

ہیں جو اِن سے تھوڑی ہی مدّت پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں[۲۶] اور اِن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اِن کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بَرِیُ الذِّمّہ ہوں، مجھے تو اللہ رب العالَمین سے ڈر لگتا ہے۔[۲۷]

اجر کا امیدوار ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ کوئی انسانی طاقت اس کا حکم دینے والی یا اس کو پسند کرنے والی ہے اور وہ اس کا اجر دے گی۔ یہی سمجھ اور ناسمجھی کا فرق دراصل مومن اور غیر مومن کی سیرت و کردار کو ایک دوسرے سے مُمَیّز کرتا ہے۔

۲۵ - یہ منافقین کی دوسری کمزوری کا بیان ہے۔ پہلی کمزوری یہ تھی کہ وہ بزدل تھے، خدا سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے تھے اور اہلِ ایمان کی طرح کوئی بلند تر نصب العین ان کے سامنے نہ تھا جس کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینے کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہوتا۔ اور دوسری کمزوری یہ تھی کہ منافقت کے سوا کوئی قدرِ مشترک ان کے درمیان نہ تھی جو ان کو ملا کر ایک مضبوط جتھا بنا دیتی۔ ان کو جس چیز نے جمع کیا تھا، وہ صرف یہ تھی کہ اپنے شہر میں باہر کے آئے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و فرمانروائی چلتے دیکھ کر ان سب کے دل جل رہے تھے، اور اپنے ہی ہم وطن انصاریوں کو مہاجرین کی پذیرائی کرتے دیکھ کر ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے۔ اِس حسد کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ سب مل جُل کر اور آس پاس کے دشمنانِ اسلام سے ساز باز کر کے اِس بیرونی اثر و اقتدار کو کسی طرح ختم کر دیں۔ لیکن اس منفی مقصد کے سوا کوئی مثبت چیز اُن کو ملانے والی نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک سردار کا جتّھا الگ تھا۔ ہر ایک اپنی چودھراہٹ چاہتا تھا۔ کوئی کسی کا مخلص دوست نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے اِتنا بغض و حسد تھا کہ جسے وہ اپنا مشترک دشمن سمجھتے تھے، اُس کے مقابلے میں بھی وہ نہ آپس کی دشمنیاں بُھول سکتے تھے، نہ ایک دوسرے کی جڑ کاٹنے سے باز رہ سکتے تھے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بنی نَضِیر سے پہلے ہی منافقین کی اندرونی حالت کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کو بتا دیا کہ اِن کی طرف سے فی الحقیقت کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا تمھیں یہ خبریں سُن سُن کر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ جب تم بنی نَضِیر کا محاصرہ کرنے کے لیے نکلو گے تو یہ منافق سردار دو ہزار کا لشکر لے کر پیچھے سے تم پر حملہ کر دیں گے

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَاۤ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا
قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

ع ۵

پھر دونوں کا انجام یہ ہونا ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنّم میں جائیں، اور ظالموں کی یہی جزا ہے۔ ع

اَے [28] لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے [29]۔ اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ یقیناً تمھارے اُن سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اور ساتھ ساتھ بنی قُرَیظہ اور بنی غَطفان کو بھی تم پر چڑھا لائیں گے۔ یہ سب محض لاف زنیاں ہیں جن کی ہوا آزمائش کی پہلی ساعت آتے ہی نکل جائے گی۔

۲۶- اشارہ ہے کفّارِ قریش اور یہود بنی قَینُقاع کی طرف، جو اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے سروسامان کے باوجود اِنھی کمزوریوں کے باعث مسلمانوں کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت سے شکست کھا چکے تھے۔

۲۷- یعنی یہ منافقین بنی نَضِیر کے ساتھ وہی معاملہ کر رہے ہیں جو شیطان انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ آج یہ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ تم مسلمانوں سے لڑ جاؤ اور ہم تمھارا ساتھ دیں گے۔ مگر جب وہ واقعی لڑ جائیں گے تو یہ دامن جھاڑ کر اپنے سارے وعدوں سے بری الذّمہ ہو جائیں گے اور پلٹ کر بھی نہ دیکھیں گے کہ ان پر کیا گزری ہے۔ ایسا ہی معاملہ شیطان ہر کافر سے کرتا ہے، اور ایسا ہی معاملہ اُس نے کفّارِ قریش کے ساتھ جنگِ بَدر میں کیا تھا، جس کا ذکر سورۂ اَنفال، آیت ۴۸ میں آیا ہے۔ پہلے تو وہ اُن کو بڑھاوے چڑھاوے دے کر بدر میں مسلمانوں کے مقابلے پر لے آیا اور اُس نے اُن سے کہا کہ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں ہے اور میں تمھاری پُشت پر ہوں)، مگر جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ اُلٹا پھر گیا اور کہنے لگا کہ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ (میں تم سے بری الذّمہ ہوں، مجھے وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو تمھیں نظر نہیں آتا، مجھے تو اللہ سے ڈر لگتا ہے۔)

۲۸- قرآنِ مجید کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی منافق مسلمانوں کے نِفاق پر گرفت کی جاتی ہے تو ساتھ ساتھ انھیں نصیحت بھی کی جاتی ہے، تاکہ ان میں سے جس کے اندر بھی ابھی کچھ ضمیر کی زندگی باقی ہے، وہ اپنی اِس رَوِش پر نادم ہو اور خدا سے ڈر کر اُس گڑھے سے نکلنے کی فکر کرے جس میں نفس کی بندگی نے اسے گرا دیا ہے۔ یہ پُورا رُکوع اسی نصیحت پر مشتمل ہے۔

۲۹- کل سے مراد آخرت ہے۔ گویا دنیا کی یہ پُوری زندگی ''آج'' ہے اور ''کل'' وہ یومِ قیامت ہے جو اِس

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بُھول گئے تو اللہ نے اُنھیں خود اپنا نفس بُھلا دیا۔[۳۰] یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں جانے والے اور جنّت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنّت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔[۳۱]

آج کے بعد آنے والا ہے۔ یہ اندازِ بیان اختیار کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے انسان کو یہ سمجھایا ہے کہ جس طرح دنیا میں وہ شخص سخت نادان ہے جو آج کے لُطف و لذّت پر اپنا سب کچھ لُٹا بیٹھتا ہے اور نہیں سوچتا کہ کل اُس کے پاس کھانے کو روٹی اور سر چھپانے کو جگہ بھی باقی رہے گی یا نہیں، اسی طرح وہ شخص بھی اپنے پاؤں پر خود کلھاڑی مار رہا ہے جو اپنی دنیا بنانے کی فکر میں ایسا منہمک ہے کہ اپنی آخرت سے بالکل غافل ہو چکا ہے، حالانکہ آخرت ٹھیک اُسی طرح آنی ہے جس طرح آج کے بعد کل آنے والا ہے، اور وہاں وہ کچھ نہیں پا سکتا اگر دنیا کی موجودہ زندگی میں اُس کے لیے کوئی پیشگی سامان فراہم نہیں کرتا۔ اِس کے ساتھ دوسرا حکیمانہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں ہر شخص کو آپ ہی اپنا محتسب بنایا گیا ہے۔ جب تک کسی شخص میں خود اپنے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا نہ ہو جائے، اس کو سرے سے یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، وہ آخرت میں اس کے مستقبل کو سنوارنے والا ہے یا بگاڑنے والا۔ اور جب اس کے اندر یہ حس بیدار ہو جائے تو اسے خود ہی اپنا حساب لگا کر یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اپنے وقت، اپنے سرمایے، اپنی محنت، اپنی قابلیتوں اور اپنی کوششوں کو جس راہ میں صَرف کر رہا ہے، وہ اسے جنّت کی طرف لے جا رہی ہے یا جہنّم کی طرف۔ یہ دیکھنا اس کے اپنے ہی مفاد کا تقاضا ہے، نہ دیکھے گا تو آپ ہی اپنا مستقبل خراب کرے گا۔

۳۰ – یعنی خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے۔ جب آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کسی کا بندہ ہے تو لازماً وہ دنیا میں اپنی ایک غلط حیثیت متعین کر بیٹھتا ہے اور اُس کی ساری زندگی اِسی بنیادی غلط فہمی کے باعث غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِسی طرح جب وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے تو وہ اُس ایک کی بندگی تو نہیں کرتا جس کا وہ درحقیقت بندہ ہے، اور اُن بہت سوں کی بندگی کرتا رہتا ہے جن کا وہ فی الواقع بندہ نہیں ہے۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ هُوَ
اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ

یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں۔
وہ اللہ ہی ہے [۳۲] جس کے سوا کوئی معبود نہیں [۳۳]، غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا [۳۴]، وہی رحمٰن

یہ پھر ایک عظیم اور ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو اُس کی ساری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان کا اصل مقام دنیا میں یہ ہے کہ وہ بندہ ہے، آزاد و خود مختار نہیں ہے۔ اور صرف ایک خدا کا بندہ ہے، اُس کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں ہے۔ جو شخص اِس بات کو نہیں جانتا، وہ حقیقت میں خود اپنے آپ کو نہیں جانتا۔ اور جو شخص اِس کو جاننے کے باوجود کسی لمحے بھی اِسے فراموش کر بیٹھتا ہے، اُسی لمحے کوئی ایسی حرکت اُس سے سرزد ہو سکتی ہے جو کسی منکر یا مُشرک، یعنی خود فراموش انسان ہی کے کرنے کی ہوتی ہے۔ صحیح راستے پر انسان کے ثابت قدم رہنے کا پُورا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے خدا یاد رہے۔ اس سے غافل ہوتے ہی وہ اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے، اور یہی غفلت اسے فاسق بنا دیتی ہے۔

۳۱- اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی کبریائی اور اس کے حُضور بندے کی ذمہ داری و جواب دِہی کو صاف صاف بیان کر رہا ہے، اُس کا فہم اگر پہاڑ جیسی عظیم مخلوق کو بھی نصیب ہوتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کو کس ربِّ قدیر کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے تو وہ بھی خوف سے کانپ اُٹھتا۔ لیکن حیرت کے لائق ہے اُس انسان کی بے حسی اور بے فکری جو قرآن کو سمجھتا ہے اور اس کے ذریعے سے حقیقتِ حال جان چکا ہے اور پھر بھی اس پر نہ کوئی خوف طاری ہوتا ہے، نہ کبھی اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جو ذمہ داریاں اس پر ڈالی گئی ہیں، ان کے بارے میں وہ اپنے خدا کو کیا جواب دے گا۔ بلکہ قرآن کو سُن کر یا پڑھ کر وہ اِس طرح غیر متأثر رہتا ہے کہ گویا وہ ایک بے جان و بے شُعور پتھر ہے، جس کا کام سننا اور دیکھنا اور سمجھنا ہے ہی نہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۱۲۰)

۳۲- ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا جس کی طرف سے یہ قرآن تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، جس نے یہ ذمہ داریاں تم پر ڈالی ہیں، اور جس کے حُضور بالآخر تمھیں جواب دِہ ہونا ہے، وہ کیسا خدا ہے اور کیا اس کی صفات ہیں۔ اُوپر کے مضمون کے بعد متصلاً صفاتِ الٰہی کا یہ بیان خود بخود انسان کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اُس کا سابقہ کسی معمولی ہستی سے نہیں ہے بلکہ اُس عظیم و جلیل ہستی سے ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ اس مقام پر یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں اگرچہ جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات بے نظیر طریقے سے بیان کی گئی ہیں جن سے ذاتِ الٰہی کا نہایت واضح تصور حاصل ہوتا ہے، لیکن دو مقامات ایسے ہیں جن میں صفاتِ باری تعالیٰ کا جامع ترین بیان پایا

Maktaba Tul Ishaat.com

الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ

اور رحیم ہے[۳۵]۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے[۳۶] نہایت مقدّس،[۳۷]

جاتا ہے۔ ایک، سورۂ بقرہ میں آیت الکرسی (آیت ۲۵۵)۔ دوسرے، سورۂ حشر کی یہ آیات۔

۳۳۔ یعنی جس کے سوا کسی کی یہ حیثیت اور مقام اور مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی بندگی و پرستش کی جائے۔ جس کے سوا کوئی خدائی کی صفات و اختیارات رکھتا ہی نہیں کہ اسے معبود ہونے کا حق پہنچتا ہو۔

۳۴۔ یعنی جو کچھ مخلوقات سے پوشیدہ ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ ان پر ظاہر ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اُس کے علم سے اِس کائنات میں کوئی شے بھی پوشیدہ نہیں۔ ماضی میں جو کچھ گزر چکا ہے، حال میں جو کچھ موجود ہے، اور مستقبل میں جو کچھ ہوگا، ہر چیز اُس کو براہِ راست معلوم ہے۔ کسی ذریعۂ علم کا وہ محتاج نہیں ہے۔

۳۵۔ یعنی وہی ایک ہستی ایسی ہے جس کی رحمت بے پایاں ہے، تمام کائنات پر وسیع ہے، اور کائنات کی ہر چیز کو اس کا فیض پہنچتا ہے۔ سارے جہان میں کوئی دوسرا اِس ہمہ گیر اور غیر محدود رحمت کا حامل نہیں ہے۔ دوسری جس ہستی میں بھی صفتِ رحم پائی جاتی ہے، اس کی رحمت جُزوی اور محدود ہے، اور وہ بھی اُس کی ذاتی صفت نہیں ہے، بلکہ خالق نے کسی مصلحت اور ضرورت کی خاطر اسے عطا کی ہے۔ جس مخلوق کے اندر بھی اس نے کسی دوسری مخلوق کے لیے جذبۂ رحم پیدا کیا ہے، اس لیے پیدا کیا ہے کہ ایک مخلوق کو وہ دوسری مخلوق کی پرورش اور خوش حالی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بجائے خود اُسی کی رحمتِ بے پایاں کی دلیل ہے۔

۳۶۔ اصل میں لفظ اَلْمَلِكُ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بادشاہ وہی ہے۔ نیز مطلقاً اَلْمَلِكُ کا لفظ استعمال کرنے سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقے یا مخصوص مملکت کا نہیں بلکہ سارے جہان کا بادشاہ ہے۔ پُوری کائنات پر اس کی سلطانی و فرمانروائی محیط ہے۔ ہر چیز کا وہ مالک ہے۔ ہر شے اس کے تصرّف اور اقتدار اور حکم کی تابع ہے۔ اور اس کی حاکمیت (sovereignty) کو محدود کرنے والی کوئی شے نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے اِن سارے پہلوؤں کو پُوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿﴾ (الروم: ۲۶)	زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، اس کے مملوک ہیں، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ: ۵)	آسمان سے زمین تک وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿﴾ (الحدید: ۵)	زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اسی کی ہے، اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات رُجوع کیے جاتے ہیں۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (الفرقان:۲)	بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔
بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (یٰسین: ۸۳)	ہر چیز کی سلطانی وفرماں روائی اسی کے ہاتھ میں ہے۔
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (البروج:۱۶)	جس چیز کا ارادہ کرے، اُسے کر گزرنے والا۔
لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (الانبیاء: ۲۳)	جو کچھ وہ کرے، اس پر وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، اور سب جواب دہ ہیں۔
وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (الرعد:۴۱)	اور اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے والا نہیں ہے۔
وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المومنون:۸۸)	اور وہ پناہ دیتا ہے اور کوئی اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دے سکتا۔
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آلِ عمران:۲۶)	کہو: خدایا! مُلک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے مُلک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ان توضیحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی حاکمیت کے کسی محدود یا مجازی مفہوم میں نہیں بلکہ اُس کے پُورے مفہوم میں، اس کے مکمل تصور کے لحاظ سے حقیقی بادشاہی ہے۔ بلکہ درحقیقت حاکمیت جس چیز کا نام ہے، وہ اگر کہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں ہی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور جہاں بھی اس کے ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی ذات ہو، یا کوئی طبقہ یا گروہ یا خاندان ہو، یا کوئی قوم ہو، اسے فی الواقع کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے، کیونکہ حاکمیت سرے سے اُس حکومت کو کہتے ہی نہیں ہیں جو کسی کا عَطِیّہ ہو، جو کبھی ملتی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو، جسے کسی دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو، جس کا قیام و بقا عارضی و وقتی ہو، اور جس کے دائرۂ اقتدار کو بہت سی دوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں۔

لیکن قرآنِ مجید صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا بادشاہ ہے، بلکہ بعد کے فقروں میں یہ تصریح کرتا ہے کہ وہ ایسا بادشاہ ہے جو قُدُّوس ہے، سلام ہے، مومن ہے، مُہَیمِن ہے، عزیز ہے، جبّار ہے، مُتکبّر ہے، خالق ہے، باری ہے، اور مصوِّر ہے۔

۳۷- اصل میں لفظ قُدُّوس استعمال ہوا ہے جو مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ قدس ہے۔ قدس کے معنیٰ ہیں: تمام بُری صفات سے پاکیزہ اور مُنزّہ ہونا۔ اور قُدُّوس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بدرجہا بالا و برتر ہے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب، یا نقص، یا کوئی قبیح صفت پائی جائے۔ بلکہ وہ ایک پاکیزہ ترین ہستی ہے جس کے بارے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ

سراسر سلامتی[۳۸]، امن دینے والا[۳۹]، نگہبان[۴۰]، سب پر غالب[۴۱]، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا[۴۲]، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا[۴۳]۔

کسی بُرائی کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قُدُّوسیّت درحقیقت حاکمیّت کے اوّلین لوازم میں سے ہے۔ انسان کی عقل اور فطرت یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ حاکمیّت کی حامل کوئی ایسی ہستی ہو جو شریر اور بدخُلق اور بدنیّت ہو۔ جس میں قبیح صفات پائی جاتی ہوں۔ جس کے اقتدار سے اس کے محکوموں کو بھلائی نصیب ہونے کے بجائے بُرائی کا خطرہ لاحق ہو۔ اسی بنا پر انسان جہاں بھی حاکمیّت کو مرکوز قرار دیتا ہے، وہاں قدوسیّت نہیں بھی ہوتی تو اسے موجود فرض کر لیتا ہے، کیونکہ قدوسیّت کے بغیر اقتدارِ مُطلَق ناقابلِ تصور ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا درحقیقت کوئی مقتدرِ اعلیٰ بھی قدوس نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ شخصی بادشاہی ہو، یا جُمہور کی حاکمیت، یا اشتراکی نظام کی فرماں روائی، یا انسانی حکومت کی کوئی دوسری صورت، بہرحال اس کے حق میں قدوسیّت کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔

۳۸ — اصل میں لفظ السَّلٰم استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں سلامتی۔ کسی کو سلیم، یا سالم کہنے کے بجائے سلامتی کہنے سے خود بخود مبالغے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کو حَسین کہنے کے بجائے حُسن کہا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ سراپا حُسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو السَّلٰم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سراسر سلامتی ہے۔ اس کی ذات اِس سے بالاتر ہے کہ کوئی آفت، یا کمزوری، یا خامی اس کو لاحق ہو، یا کبھی اس کے کمال پر زوال آئے۔

۳۹ — اصل میں لفظ الْمُؤْمِنُ استعمال ہوا ہے، جس کا مادّہ امن ہے۔ امن کے معنیٰ ہیں: خوف سے محفوظ ہونا۔ اور مؤمن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ تعالیٰ کو اس معنیٰ میں مؤمن کہا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔ اس کی خلق اِس خوف سے بالکل محفوظ ہے کہ وہ کبھی اس پر ظلم کرے گا، یا اس کا حق مارے گا، یا اس کا اجر ضائع کرے گا، یا اس کے ساتھ اپنے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ پھر چونکہ اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کس کو امن دینے والا ہے، بلکہ مطلقاً الْمُؤْمِنُ کہا گیا ہے، اس لیے اس سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ اس کا امن ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کے لیے ہے۔

۴۰ — اصل میں لفظ الْمُهَيْمِنُ استعمال ہوا ہے، جس کے تین معنیٰ ہیں: ایک، نگہبانی اور حفاظت کرنے والا۔ دوسرے، شاہد، جو دیکھ رہا ہو کہ کون کیا کرتا ہے۔ تیسرے، قائم بامورِ الخلق، یعنی جس نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات پُوری کرنے کا ذمہ اُٹھا رکھا ہو۔ یہاں بھی چونکہ مطلقاً لفظ الْمُهَيْمِنُ استعمال کیا گیا ہے، اور اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا کہ وہ کس کا نگہبان و محافظ، کس کا شاہد، اور کس کی خبر گیری کی ذمہ داری اُٹھانے والا ہے، اس لیے اِس اطلاق سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ تمام مخلوقات کی نگہبانی و حفاظت کر رہا ہے، سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہے، اور کائنات کی ہر مخلوق کی خبر گیری، اور پرورش، اور ضروریات کی فراہمی کا اس نے

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ
لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ
وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۲۴﴾ ع

پاک ہے اللہ اُس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔[۴۴] وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔[۴۵] اس کے لیے بہترین نام ہیں۔[۴۶] ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اُس کی تسبیح کر رہی ہے،[۴۷] اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔[۴۸] ع

ذمہ اُٹھا رکھا ہے۔

۴۱ – اصل میں لفظ اَلْعَزِیْزُ استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ہے ایسی زبردست ہستی جس کے مقابلے میں کوئی سر نہ اٹھا سکتا ہو، جس کے فیصلوں کی مزاحمت کرنا کسی کے بس میں نہ ہو، جس کے آگے سب بے بس اور بے زور ہوں۔

۴۲ – اصل میں لفظ اَلْجَبَّارُ استعمال ہوا ہے، جس کا مادّہ جبر ہے۔ جبر کے معنی ہیں: کسی شے کو طاقت سے دُرست کرنا، کسی چیز کی بزور اصلاح کرنا۔ اگرچہ عربی زبان میں کبھی جبر محض اصلاح کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور کبھی صرف زبردستی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کا حقیقی مفہوم اصلاح کے لیے طاقت کا استعمال ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو جبّار اس معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کائنات کا نظم بزور دُرست رکھنے والا اور اپنے ارادے کو، جو سراسر حکمت پر مبنی ہے، جبراً نافذ کرنے والا ہے۔ علاوہ بریں لفظِ جبّار میں عظمت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عربی زبان میں کھجور کے اُس درخت کو جبّار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کے پھل توڑنا کسی کے لیے آسان نہ ہو۔ اسی طرح کوئی کام جو بڑا عظیم الشان ہو، عملِ جبّار کہلاتا ہے۔

۴۳ – اصل میں لفظ اَلْمُتَکَبِّرُ استعمال ہوا ہے، جس کے دو مفہوم ہیں: ایک وہ جو فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر خواہ مخواہ بنے۔ دوسرے وہ جو حقیقت میں بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے۔ انسان ہو یا شیطان، یا کوئی اور مخلوق، چونکہ بڑائی فی الواقع اس کے لیے نہیں ہے، اس لیے اُس کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا ایک جھوٹا اِدّعا اور بدترین عیب ہے۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ حقیقت میں بڑا ہے اور بڑائی فی الواقع اسی کے لیے ہے، اور کائنات کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر و ذلیل ہے، اس لیے اس کا بڑا ہونا اور بڑا ہی ہو کر رہنا کوئی اِدّعا اور تصنّع نہیں بلکہ ایک امرِ واقعی ہے، ایک بُری صفت نہیں بلکہ ایک خوبی ہے جو اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۴ - یعنی اس کے اقتدار اور اختیارات اور صفات میں، یا اس کی ذات میں، جو لوگ بھی کسی مخلوق کو اس کا شریک قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت ایک بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِس سے پاک ہے کہ کسی معنیٰ میں بھی کوئی اس کا شریک ہو۔

۴۵ - یعنی پوری دنیا اور دنیا کی ہر چیز تخلیق کے ابتدائی منصوبے سے لے کر اپنی مخصوص صورت میں وجود پذیر ہونے تک بالکل اُسی کی ساختہ پرداختہ ہے۔ کوئی چیز بھی نہ خود وجود میں آئی ہے، نہ اتفاقاً پیدا ہوگئی ہے، نہ اس کی ساخت و پرداخت میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر کوئی دخل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے فعلِ تخلیق کو تین الگ مراتب میں بیان کیا گیا ہے جو یکے بعد دیگرے واقع ہوتے ہیں۔ پہلا مرتبہ خَلق ہے، جس کے معنیٰ تقدیر یا منصوبہ سازی کے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انجینیر ایک عمارت بنانے سے پہلے یہ ارادہ کرتا ہے کہ اسے ایسی اور ایسی عمارت فُلاں خاص مقصد کے لیے بنانی ہے، اور اپنے ذہن میں اس کا نقشہ (design) سوچتا ہے کہ اِس مقصد کے لیے زیرِ تجویز عمارت کی تفصیلی صورت اور مجموعی شکل یہ ہونی چاہیے۔ دوسرا مرتبہ ہے برء، جس کے اصل معنیٰ ہیں: جدا کرنا، چاک کرنا، پھاڑ کر الگ کرنا۔ خالق کے لیے باری کا لفظ اس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے کہ وہ اپنے سوچے ہوئے نقشے کو نافذ کرتا اور اُس چیز کو، جس کا نقشہ اس نے سوچا ہے، عَدَم سے نکال کر وجود میں لاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے انجینیر نے عمارت کا جو نقشہ ذہن میں بنایا تھا، اس کے مطابق وہ ٹھیک ناپ تول کر کے زمین پر خط کشی کرتا ہے، پھر بنیادیں کھودتا ہے، دیواریں اُٹھاتا ہے اور تعمیر کے سارے عملی مراحل طے کرتا ہے۔ تیسرا مرتبہ تصویر ہے، جس کے معنیٰ ہیں: صورت بنانا، اور یہاں اس سے مراد ہے ایک شے کو اس کی آخری مکمل صورت میں بنا دینا۔ ان تینوں مراتب میں اللہ تعالیٰ کے کام اور انسانی کاموں کے درمیان سرے سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ انسان کا کوئی منصوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو سابق نمونوں سے ماخوذ نہ ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ہر منصوبہ بے مثال اور اس کی اپنی ایجاد ہے۔ انسان جو کچھ بھی بناتا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ مادّوں کو جوڑ جاڑ کر بناتا ہے۔ وہ کسی چیز کو عَدَم سے وجود میں نہیں لاتا، بلکہ جو کچھ موجود ہے اسے مختلف طریقوں سے ترکیب دیتا ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تمام اشیا کو عَدَم سے وجود میں لایا ہے اور وہ مادّہ بھی بجائے خود اس کا پیدا کردہ ہے جس سے اس نے یہ دنیا بنائی ہے۔ اسی طرح صورت گری کے معاملے میں بھی انسان مُوجِد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورتوں کا نقّال اور بھونڈا نَقّال ہے۔ اصل مُصَوِّر اللہ تعالیٰ ہے، جس نے ہر جنس، ہر نوع، اور ہر فرد کی صورت لاجواب بنائی ہے اور کبھی ایک صورت کی ہو بہو تکرار نہیں کی ہے۔

۴۶ - ناموں سے مراد اسمائے صفات ہیں۔ اور اس کے لیے بہترین نام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے وہ اسمائے صفات موزوں نہیں ہیں جن سے کسی نوعیت کے نَقص کا اظہار ہوتا ہو، بلکہ اس کو اُن ناموں سے یاد کرنا چاہیے جو اُس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار کرتے ہوں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے یہ اسمائے حُسنیٰ بیان کیے

گئے ہیں، اور حدیث میں اُس ذاتِ پاک کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، جنھیں ترمذی اور ابنِ ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت سے بالتفصیل نقل کیا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اگر آدمی ان اسما کو بغور پڑھے تو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ دنیا کی کسی دوسری زبان میں اگر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہو تو کون سے الفاظ اس کے لیے موزوں ہوں گے۔

۴۷ – یعنی زبانِ قال یا زبانِ حال سے یہ بیان کر رہی ہے کہ اس کا خالق ہر عیب اور نَقص اور کمزوری اور غَلَطی سے پاک ہے۔

۴۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ حدید، حاشیہ ۲۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الممتحنہ

(۶۰)

الممتحنہ

نام اِس سورہ کی آیت ۱۰ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں، ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔ اس کا تلفُّظ مُمتَحَنَہ بھی کیا جاتا ہے اور مُمتَحِنَہ بھی۔ پہلے تلفّظ کے لحاظ سے معنی ہیں: ''وہ عورت جس کا امتحان لیا جائے''۔ اور دوسرے تلفظ کے لحاظ سے معنیٰ ہیں: ''امتحان لینے والی سورت''۔

زمانۂ نُزُول اس میں دو ایسے معاملات پر کلام فرمایا گیا ہے جن کا زمانہ تاریخی طور پر معلوم ہے۔ پہلا معاملہ حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلْتَعَہ کا ہے جنھوں نے فتحِ مکّہ سے کچھ مدت پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعے سے قریش کے سرداروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارادے کی اطلاع بھیجی تھی کہ آپؐ اُن پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور دوسرا معاملہ اُن مسلمان عورتوں کا ہے جو صلحِ حُدَیْبِیَہ کے بعد مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے لگی تھیں اور ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شرائطِ صلح کی رُو سے مسلمان مَردوں کی طرح کیا اِن عورتوں کو بھی کفار کے حوالے کر دیا جائے؟ ان دو معاملات کے ذکر سے یہ بات قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ صلحِ حُدَیْبِیَہ اور فتحِ مکّہ کے درمیانی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ اِن کے علاوہ ایک تیسرا معاملہ بھی ہے جس کا ذکر سورت کے آخر میں آیا ہے، اور وہ یہ کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپؐ ان سے کن باتوں کا عہد لیں۔ اِس حصّے کے متعلق بھی قیاس یہی ہے کہ یہ بھی فتحِ مکّہ سے کچھ پہلے نازل ہوا ہے، کیونکہ فتحِ مکّہ کے بعد قریش کے مردوں کی طرح اُن کی عورتیں بھی بہت بڑی تعداد میں بیک وقت داخلِ اسلام ہونے والی تھیں اور اسی موقع پر یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ اجتماعی طور پر اُن سے عہد لیا جائے۔

موضوع اور مَباحِث اس سورت کے تین حصّے ہیں:

پہلا حصّہ آغازِ سورہ سے آیت ۹ تک چلتا ہے اور سورت کے خاتمے پر آیت ۱۳ بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلْتَعَہ کے اِس فعل پر سخت گرفت کی گئی ہے کہ انھوں نے محض اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے دشمنوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی، جسے اگر بروقت ناکام نہ کر دیا گیا ہوتا تو فتحِ مکّہ کے موقع پر بڑا کُشت و خون ہوتا، مسلمانوں کی بھی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوتیں، قریش کے بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

بہت سے وہ لوگ مارے جاتے جو بعد میں اسلام کی عظیم خدمات انجام دینے والے تھے، وہ تمام فوائد بھی ضائع ہو جاتے جو مکّہ کو پُرامن طریقے سے فتح کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے، اور اتنے عظیم نقصانات صرف اِس وجہ سے ہوتے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اپنے بال بچوں کو جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اِس شدید غَلَطی پر تنبیہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی مومن کو کسی حال میں اور کسی غرض کے لیے بھی اسلام کے دشمن کافروں کے ساتھ مَحبّت اور دوستی کا تعلق نہ رکھنا چاہیے، اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو کفر و اسلام کی کشمکش میں کفّار کے لیے مفید ہو۔ البتہ جو کافر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عملاً دشمنی اور ایذا رسانی کا برتاؤ نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ احسان کا رَوِیّہ اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا حصّہ آیات ۱۰-۱۱ پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک اہم معاشرتی مسئلے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو اُس وقت بڑی پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔ مکّے میں بہت سی مسلمان عورتیں ایسی تھیں جن کے شوہر کافر تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاتی تھیں۔ اِسی طرح مدینے میں بہت سے مسلمان مرد ایسے تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور وہ مکّے ہی میں رہ گئی تھیں۔ اُن کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اُن کے درمیان رشتۂ اِزدِواج باقی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ فرما دیا کہ مسلمان عورت کے لیے کافر شوہر حلال نہیں ہے، اور مسلمان مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ مشرک بیوی کو اپنے نکاح میں رکھے۔ یہ فیصلہ بڑے اہم قانونی نتائج رکھتا ہے، جن کی تفصیل ہم آگے اپنے حواشی میں بیان کریں گے۔

تیسرا حصّہ آیت ۱۲ پر مشتمل ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں، اُن سے آپؐ اُن بڑی بڑی بُرائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو جاہلیّتِ عرب کے معاشرے میں عورتوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں، اور اِس بات کا اقرار کرائیں کہ آیندہ وہ بھلائی کے اُن تمام طریقوں کی پیروی کریں گی جن کا حکم اللہ کے رسولؐ کی طرف سے ان کو دیا جائے۔

---

۱۳ ایاتہا

سُوْرَۃُ الْمُمْتَحِنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ
يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ
خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖۗ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ
بِالْمَوَدَّةِ ۖۗ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ

اے[1] لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں، اور اُن کی روش یہ ہے کہ رسولؐ کو اور خود تم کو صرف اِس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چُھپا کر اُن کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چُھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو مَیں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا

۱- مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز ہی میں اُس واقعے کی تفصیلات بیان کر دی جائیں جس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، تاکہ آگے کا مضمون سمجھنے میں آسانی ہو۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے اور ابن عباسؓ، مجاہد، قَتَادہ، عُروہ بن زُبیر وغیرہ حضرات کی مُتَّفَقہ روایت بھی یہی ہے کہ اِن آیات کا نُزول اُس وقت ہوا تھا جب مشرکینِ مکّہ کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بَلْتَعہ کا خط پکڑا گیا تھا۔

قصّہ یہ ہے کہ جب قریش کے لوگوں نے صلحِ حُدَیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّۂ معظّمہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مگر چند مخصوص صحابہؓ کے سوا کسی کو یہ نہ بتایا کہ آپ کس مہم پر جانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں مکّۂ معظّمہ سے ایک عورت آئی جو پہلے بنی عبد المُطّلب کی لونڈی تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام

Maktaba Tul Ishaat.com

کرتی تھی۔ اس نے آ کر حضورؐ سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کچھ مالی مدد مانگی۔ آپؐ نے بنی عبدالمُطّلِب اور بنی المُطّلِب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری کر دی۔ جب وہ مکّہ جانے لگی تو حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلْتَعَہ اس سے ملے اور اس کو چپکے سے ایک خط بعض سردارانِ مکّہ کے نام دیا اور دس دینار دیے، تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور چُھپا کر یہ خط اُن لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینے سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس پر مُطّلع فرما دیا۔ آپؐ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مِقدادؓ بن اَسْود کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ، روضۂ خاخ کے مَقام پر (مدینے سے ۱۲ میل بجانبِ مکّہ) تم کو ایک عورت ملے گی، جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو، اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اس کو قتل کر دینا۔ یہ حضرات جب اس مقام پر پہنچے تو عورت وہاں موجود تھی۔ انھوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے تلاشی لی، مگر کوئی خط نہ ملا۔ آخر کو انھوں نے کہا: خط ہمارے حوالے کر، ورنہ ہم برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اپنی چوٹی میں سے وہ خط نکال کر انھیں دے دیا، اور یہ اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ (مختلف رِوایات میں خط کے الفاظ مختلف نقل ہوئے ہیں، مگر مدّعا سب کا یہی ہے۔) حضورؐ نے حضرت حاطِبؓ سے پوچھا: ''یہ کیا حرکت ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''آپؐ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اِس بنا پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقربا مکّہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلے کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکّے میں ہیں، ان کو تو ان کا قبیلہ بچا لے گا، مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جو میرے اہل و عیال کو بچانے والا ہو۔ اس لیے میں نے یہ خط اِس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں۔'' (حضرت حاطِبؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن کی رِوایت یہ ہے کہ اُس وقت حضرت حاطِبؓ کے بچّے اور بھائی مکّہ میں تھے، اور خود حضرت حاطِبؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں بھی وہیں تھیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطِبؓ کی یہ بات سُن کر حاضرین سے فرمایا: قد صدقکم، ''حاطب نے تم سے سچّی بات کہی ہے''، یعنی ان کے اِس فعل کا اصل محرک یہی تھا، اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اِس کا محرک نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، اِس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔'' حضورؐ نے فرمایا: ''اس شخص نے جنگِ بدر میں حصّہ لیا ہے۔ تمھیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کیا۔'' (اس آخری فقرے کے الفاظ مختلف رِوایات میں مختلف ہیں۔ کسی میں ہے: قد غفرت لکم، میں نے تمھاری مغفرت کر دی۔ کسی میں ہے: انی غافر لکم، میں تمھیں بخش دینے والا ہوں۔ اور کسی میں ہے: سَاَغفر لکم، میں تمھیں بخش دوں گا۔ یہ بات سُن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انھوں نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ

مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ۞ اِنۡ يَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ
اَعۡدَآءً وَّيَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ
تَكۡفُرُوۡنَ ۞ؕ لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ

معانقۃ ۱۲ السماء الوقف علی القیٰمۃ ۱۲

کرے، وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اُن کا رَوِیَّہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابُو پا جائیں تو تمھارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمھیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ[2]۔ قیامت کے دن نہ تمھاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمھاری اولاد[3]۔

ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ اُن کثیر التعداد روایات کا خلاصہ ہے جو متعدِّد معتبر سندوں سے بخاری، مسلم، احمد، ابوداوٗد، ترمذِی، نَسائی، ابنِ جریر طَبَری، ابنِ ہِشام، ابنِ حِبّان اور ابنِ ابی حاتم نے نقل کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستند روایت وہ ہے جو خود حضرت علیؓ کی زبان سے ان کے کاتب (سکریٹری) عبیداللہ بن ابی رافع نے سنی اور ان سے حضرت علیؓ کے پوتے حسن بن محمد بن حَنَفِیّہ نے سن کر بعد کے راویوں تک پہنچائی۔ ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حاطِبؓ کا یہ عذر سُن کر ان کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن کسی ذریعے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھیں کوئی سزا دی گئی۔ اسی لیے علمائے اُمت نے یہی سمجھا ہے کہ حضرت حاطِبؓ کا عذر قبول کر کے انھیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

۲- یہاں تک جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اور آگے اِسی سلسلے میں جو کچھ آ رہا ہے، اگرچہ اُس کے نُزول کا موقع حضرت حاطِبؓ ہی کا واقعہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تنہا اُنھی کے مُقدّمے پر کلام فرمانے کے بجائے تمام اہلِ ایمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ درس دیا ہے کہ کفر و اسلام کا جہاں مقابلہ ہو، اور جہاں کچھ لوگ اہلِ ایمان سے اُن کے مسلمان ہونے کی بنا پر دشمنی کر رہے ہوں، وہاں کسی شخص کا کسی غرض اور کسی مَصلَحت سے بھی کوئی ایسا کام کرنا جس سے اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہو اور کفر و کفّار کے مفاد کی خدمت ہوتی ہو، ایمان کے منافی حرکت ہے۔ کوئی شخص اگر اسلام کی بدخواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو، اور بدنیّتی سے نہیں بلکہ محض اپنی کسی شدید ترین ذاتی مصلحت کی خاطر ہی یہ کام کرے، پھر بھی یہ فعل کسی مومن کے کرنے کا نہیں ہے، اور جس نے بھی یہ کام کیا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔

۳- یہ اشارہ ہے حضرت حاطِبؓ کی طرف۔ انھوں نے اپنی ماں، اپنے بھائی اور اپنی اولاد کو جنگ کے موقع پر دشمنوں کی ایذا سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اِس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے جن کی خاطر اتنے بڑے قُصُور کا ارتکاب کر ڈالا، وہ قیامت کے روز تمھیں بچانے کے لیے نہیں آئیں گے۔ کسی کی یہ ہمت نہیں ہوگی کہ خدا کی عدالت میں آگے بڑھ کر یہ کہے کہ ہمارے باپ، یا ہمارے بیٹے، یا ہمارے بھائی نے ہماری خاطر یہ گناہ کیا تھا، اس لیے اس کے بدلے کی سزا ہمیں دے دی جائے۔ اُس وقت ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، اپنے اعمال ہی کے خمیازے سے بچنے کا

Maktaba Tul Ishaat.com

يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ‌ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۳

اُس روز اللہ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا[۴]، اور وہی تمھارے اعمال کا دیکھنے والا ہے[۵]۔

سوال ہر شخص کے لیے بلائے جان بن رہا ہوگا، کجا کہ کوئی کسی دوسرے کے حصے کا خمیازہ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار ہو۔ یہی بات ہے جو قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر زیادہ صریح الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ”اُس روز مجرم یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی، اپنی حمایت کرنے والے خاندان اور دنیا بھر کے لوگوں کو بھی اگر فدیے میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکتا ہو تو انھیں بھینٹ چڑھا دے اور خود چھوٹ جائے۔“ (المعارج، آیات ۱۱ تا ۱۴) دوسری جگہ فرمایا: ”اُس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ہر ایک اپنے ہی حال میں ایسا گرفتار ہوگا جس میں اسے کسی کا ہوش نہ ہوگا۔“ (عَبَس، ۳۴ تا ۳۷)

۴- یعنی دنیا کے تمام رشتے، تعلقات اور رابطے وہاں توڑ دیے جائیں گے۔ جتھوں اور پارٹیوں اور خاندانوں کی شکل میں لوگوں کا محاسبہ نہ ہوگا، بلکہ ایک ایک فرد اپنی ذاتی حیثیت میں پیش ہوگا اور ہر ایک کو اپنا ہی حساب دینا پڑے گا۔ اِس لیے دنیا میں کسی شخص کو بھی کسی قرابت یا دوستی یا جتھّا بندی کی خاطر کوئی ناجائز کام نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اپنے کیے کی سزا اُس کو خود ہی بھگتنی ہوگی، اس کی ذاتی ذمّہ داری میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا۔

۵- حضرت حاطِبؓ کے اس مُقدّمے سے، جس کی تفصیل اُوپر ہم نے نقل کی ہے، اور اِن آیات سے جو اس واقعے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، حسبِ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) قطعِ نظر اس سے کہ کرنے والے نے کس نیت سے کیا، بجائے خود یہ فعل صریحاً ایک جاسوسی کا فعل تھا، اور جاسوسی بھی بڑے نازک موقع پر سخت خطرناک نوعیت کی تھی کہ حملے سے پہلے بے خبر دشمن کو خبردار کیا گیا تھا۔ پھر معاملہ شُبہے کا بھی نہ تھا، بلکہ مُلزَم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پکڑ لیا گیا، تھا جس کے بعد کسی ثبوت کی حاجت نہ تھی۔ حالات بھی زمانۂ امن کے نہیں، زمانۂ جنگ کے تھے۔ مگر اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطِبؓ کو صفائی کا موقع دیے بغیر نظر بند نہیں کر دیا۔ اور صفائی کا موقع بھی اُن کو بند کمرے میں نہیں بلکہ کھُلی عدالت میں برسرِ عام دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسے قوانین اور قواعد و ضوابط کی کوئی گنجایش نہیں ہے جن کی رُو سے کسی حالت میں حُکّام کو یہ حق پہنچتا ہو کہ کسی شخص کو محض اپنے علم یا شُبہے کی بنا پر قید کر دیں۔ اور بند کمرے میں خفیہ طریقے پر مُقدّمہ چلانے کا طریقہ بھی اسلام میں نہیں ہے۔

(۲) حضرت حاطِبؓ نہ صرف مہاجرین میں سے تھے بلکہ اہلِ بدر میں شامل تھے، جنھیں صحابہؓ کے اندر بھی ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ مگر اس کے باوجود ان سے اتنا بڑا جُرم سرزد ہوگیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اِس شدّت کے ساتھ گرفت فرمائی جسے اُوپر کی آیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ احادیث میں بھی اُن کا قصّہ پُوری تفصیل کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور مفسّرین میں سے بھی شاید ہی کوئی ہو جس نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہ من جملہ ان بہت سے شواہد کے ہے

جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ بے خطا نہیں تھے، اُن سے بھی بشری کمزوریوں کی بنا پر خطائیں سرزد ہو سکتی تھیں اور عملاً ہوئیں، اور اُن کے احترام کی جو تعلیم اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے، کم از کم اُس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی غلط کام سرزد ہوا ہو تو اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کا تقاضا یہ ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اُن کا ذکر کرتا اور نہ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور محدثین و مفسّرین اپنی رِوایات میں ان کی تفصیلات بیان کرتے۔

(۳) حضرت حاطبؓ کے مُقدّمے میں حضرت عمرؓ نے جس رائے کا اظہار کیا، وہ اُن کے فعل کی ظاہری صورت کے لحاظ سے تھا۔ اُن کا اِستدلال یہ تھا کہ یہ فعل ایسا ہے جو صریحاً اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی نوعیت رکھتا ہے، اس لیے حاطب منافق اور واجب القتل ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اِس نقطۂ نظر کو ردّ فرما دیا اور اسلامی شریعت کا اصل نقطۂ نظر یہ بتایا کہ محض فعل کی ظاہری شکل پر ہی فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس شخص سے وہ صادر ہوا ہے، اس کی پچھلی زندگی اور مجموعی سیرت کیا شہادت دیتی ہے اور قرائن کس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ فعل کی شکل بلاشبہ جاسوسی کی ہے۔ مگر کیا اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ فاعل کا آج تک کا رَوِیّہ یہی بتا رہا ہے کہ یہ شخص یہ کام اللہ اور رسولؐ اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی نیت سے کر سکتا تھا؟ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی۔ کیا خلوص کے بغیر وہ اتنی بڑی قربانی کر سکتا تھا؟ اس نے جنگِ بدر جیسے نازک موقع پر، جب کہ دشمنوں کی تین گُنی اور بہت زیادہ مسلّح طاقت سے مقابلہ درپیش تھا، ایمان کی خاطر اپنی جان لڑائی۔ کیا ایسے آدمی کا اخلاص مُشتَبَہ ہو سکتا ہے؟ یا اُس کے بارے میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں کفّارِ قریش کی طرف کوئی ادنیٰ سا میلان بھی موجود ہے؟ وہ اپنے فعل کی صاف صاف وجہ یہ بتا رہا ہے کہ مکے میں اُس کے بال بچّوں کو خاندان اور قبیلے کا وہ تحفظ حاصل نہیں ہے جو دوسرے مہاجرین کو حاصل ہے، اس لیے اس نے ان کو جنگ کے موقع پر کفار کی ایذا رسانی سے بچانے کی خاطر یہ کام کیا ہے۔ حقائق اس کی تائید کرتے ہیں کہ فی الواقع مکّے میں اس کا کوئی قبیلہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ واقعی اس کے بال بچے وہاں موجود ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اُس کے اِس بیان کو جھوٹا سمجھا جائے اور یہ رائے قائم کی جائے کہ اس کے اِس فعل کا اصل محرک یہ نہ تھا بلکہ خیانت ہی کا ارادہ اُس کے اندر پایا جاتا تھا۔ بلاشبہ ایک مخلص مسلمان کے لیے نیک نیّتی سے بھی یہ حرکت جائز نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دشمنوں کو مسلمانوں کے جنگی منصوبوں کی خبر بہم پہنچائے، لیکن مخلص کی غلطی اور منافق کی غداری میں بڑا فرق ہے۔ محض نوعیتِ فعل کی بنا پر دونوں کی ایک ہی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا اِس مُقدّمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ، اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ مُمتَحِنَہ کی اِن آیات میں اس کی تائید فرمائی۔ اُوپر کی تینوں آیات کو غور سے پڑھیے تو صاف محسوس ہوگا کہ ان میں حضرت حاطبؓ پر عتاب تو ضرور فرمایا گیا ہے، مگر یہ عتاب اُس طرز کا ہے جو ایک مومن کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ وہ جو ایک منافق کے لیے ہوا کرتا ہے۔ مزید برآں اُن کے لیے کوئی مالی یا جسمانی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے، بلکہ عَلانِیَہ سخت زَجر و تَوبیخ کر کے چھوڑ دیا گیا

Maktaba Tul Ishaat.com

ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلم معاشرے میں ایک خطا کار مومن کی عزت کو بٹّا لگ جانا اور اس کے اعتماد پر حرف آ جانا بھی اس کے لیے ایک بڑی سزا ہے۔

(۴) بدری صحابہؓ کی فضیلت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''تمھیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو مُلاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کر دیا''، اس کے معنیٰ یہ نہ تھے کہ بدری صحابیوں کو سات خون معاف ہیں، اور انھیں کُھلی چھُٹی ہے کہ دنیا میں جو گناہ اور جو جُرم بھی کرنا چاہیں کرتے رہیں، مغفرت کی اُن کو پیشگی ضمانت حاصل ہے۔ یہ مطلب نہ حضورؐ کا تھا، نہ صحابہؓ نے کبھی اِس ارشاد کا یہ مطلب لیا، نہ کسی بدری صحابی نے یہ بشارت سُن کر اپنے آپ کو ہر گناہ کرنے کے لیے آزاد سمجھا، اور نہ اسلامی شریعت میں اس کی بنا پر ایسا کوئی قاعدہ بنایا گیا کہ بدری صحابی سے اگر کوئی جرم سرزد ہو تو اسے کوئی سزا نہ دی جائے۔ دراصل جس موقع و محل میں یہ بات فرمائی گئی تھی اُس پر، اور خود اُن الفاظ پر جو آپؐ نے استعمال فرمائے ہیں، اگر غور کیا جائے تو اِس ارشاد کا صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اہلِ بدر نے اللہ اور اس کے دین کے لیے اخلاص اور سرفروشی و جانبازی کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہوں تو یہ بھی اِس خدمت اور اللہ کے کرم کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید از امکان نہیں ہے، لہٰذا ایک بدری پر خیانت اور منافقت کا شبہ نہ کرو، اور اپنے جرم کا جو سبب وہ خود بیان کر رہا ہے اسے قبول کر لو۔

(۵) قرآنِ مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کا کُفّار کے لیے جاسوسی کر بیٹھنا بجائے خود اِس بات کا فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ مرتد ہو گیا ہے، یا ایمان سے خارج ہے، یا منافق ہے۔ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے اگر کچھ دوسرے قرائن و شواہد موجود ہوں تو بات الگ ہے، ورنہ اپنی جگہ یہ فعل صرف ایک جرم ہے، کفر نہیں ہے۔

(۶) قرآنِ مجید کی اِن آیات سے یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمان کے لیے کفّار کی جاسوسی کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، خواہ اس کی یا اس کے قریب ترین عزیزوں کی جان و مال کو کیسا ہی خطرہ لاحق ہو۔

(۷) حضرت عمرؓ نے جب حضرت حاطبؓ کو جاسوسی کے جرم میں قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو حضورؐ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ جرم مُستوجِبِ قتل نہیں ہے، بلکہ اجازت دینے سے انکار اس بنا پر کیا کہ حاطبؓ کا بدری ہونا ان کے مخلص ہونے کا صریح ثبوت ہے اور ان کا یہ بیان صحیح ہے کہ انھوں نے دشمنوں کی خیر خواہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے بال بچوں کو ہلاکت کے خطرے سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اس سے فقہا کے ایک گروہ نے یہ اِستِدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کے لیے عام قانون یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے، اِلّا یہ کہ بہت وزنی وُجوہ اُسے کم تر سزا دینے یا محض ملامت کر کے چھوڑ دینے کے لیے موجود ہوں۔ مگر فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہا کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان جاسوس کو تعزیر دی جائے گی، مگر اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام اَوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اسے جسمانی عُقوبت اور طویل قید کی سزا دی جائے گی۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُۥٓ ۚ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ ۖ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ

تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا: ”ہم تم سے اور تمھارے اِن معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو، قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا[۶] اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ لیکن مالکی فقہا کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہیں۔ اَشْہَب کہتے ہیں کہ امام کو اس معاملے میں وسیع اختیارات حاصل ہیں، جرم اور مجرم کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے سکتا ہے۔ ایک قول امام مالکؒ اور ابن القاسم کا بھی یہی ہے۔ ابن الماجشُون اور عبدالملک بن حبیب کہتے ہیں کہ اگر مجرم نے جاسوسی کی عادت ہی بنا لی ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ ابنِ وَہب کہتے ہیں کہ جاسوس کی سزا تو قتل ہی ہے، مگر وہ اس فعل سے تائب ہو جائے تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ سَحْنُون کہتے ہیں کہ اس کی توبہ صحیح ہے یا محض فریب، اِس کا علم آخر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے اسے قتل ہی کیا جانا چاہیے۔ ابن القاسم کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ اور اَصْبَغ کہتے ہیں کہ حَربی جاسُوس کی سزا قتل ہے، مگر مسلم اور ذمّی جاسوس کو قتل کے بجائے عُقوبت دی جائے گی، اِلّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں دشمنوں کی کھلی کھلی مدد کر رہا ہو۔ (احکام القرآن، ابن العربی۔ عُمدۃ القاری۔ فتح الباری)

(۸) حدیثِ مذکور سے اِس امر کا جواز بھی نکلتا ہے کہ تفتیشِ جرم کے لیے اگر ضرورت پڑے تو مُلزم مرد ہی نہیں، عورت کے کپڑے بھی اُتارے جا سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مِقدادؓ نے اگرچہ اس عورت کو برہنہ نہیں کیا تھا، لیکن انھوں نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ خط حوالے نہ کرے گی تو وہ اسے برہنہ کر کے اس کی تلاشی لیں گے۔ ظاہر ہے اگر یہ فعل جائز نہ ہوتا تو یہ تین جلیل القدر صحابی اس کی دھمکی نہیں دے سکتے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا ہے کہ انھوں نے ضرور واپس جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مہم کی رُوداد سنائی ہوگی۔ حضورؐ نے اگر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہوتا تو وہ ضرور منقول ہوتا۔ اسی لیے فقہا نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (عُمدۃ القاری)

۶ — یعنی ہم تمھارے کافر ہیں، نہ تمھیں حق پر مانتے ہیں نہ تمھارے دین کو۔ اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا طاغوت سے کفر ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ ”پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے، اس نے درحقیقت مضبوط سہارا تھام لیا، جو ٹوٹنے والا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍؕ رَبَّنَا

جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔" مگر ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا (اِس سے مستثنیٰ ہے) کہ "میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا، اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے۔" (اور ابراہیمؑ واصحابِ ابراہیمؑ کی دُعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب!

نہیں ہے۔" (البقرہ:۲۵۶)

۷- دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات تو قابلِ تقلید ہے کہ انھوں نے اپنی کافر و مشرک قوم سے صاف صاف بیزاری اور قطعِ تعلق کا اعلان کر دیا، مگر اُن کی یہ بات تقلید کے قابل نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنے مشرک باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا اور عملاً اس کے حق میں دعا کی۔ اس لیے کہ کافروں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا اِتنا تعلق بھی اہلِ ایمان کو نہ رکھنا چاہیے۔ سورۂ توبہ (آیت ۱۱۳) میں اللہ تعالیٰ کا صاف صاف ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى۔ "نبی کا یہ کام نہیں ہے اور نہ اُن لوگوں کو یہ زیبا ہے جو ایمان لائے ہیں کہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں، خواہ وہ اُن کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔" پس کوئی مسلمان اِس دلیل سے اپنے کافر عزیزوں کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ یہ کام حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ خود حضرت ابراہیمؑ نے یہ کام کیسے کیا؟ اور کیا وہ اس پر قائم بھی رہے؟ اس کا جواب قرآنِ مجید میں ہم کو پُوری تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ اُن کے باپ نے جب اُن کو گھر سے نکال دیا تو چلتے وقت انھوں نے کہا تھا: سَلٰمٌ عَلَيْكَۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْؕ "آپ کو سلام ہے، میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا" (مریم:۴۷) اِسی وعدے کی بنا پر انھوں نے دو مرتبہ اس کے حق میں دُعا کی۔ ایک دُعا کا ذکر سورۂ ابراہیم (آیت ۴۱) میں ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ "اے ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو اور سب مومنوں کو اُس روز معاف کر دیجیو جب حساب لیا جانا ہے۔" اور دوسری دُعا سورۂ شُعراء (آیت ۸۶، ۸۷) میں ہے: وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۙ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۙ "میرے باپ کو معاف فرما دے کہ وہ گمراہوں میں سے تھا، اور مجھے اُس دن رُسوا نہ کر جب سب لوگ زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔" لیکن بعد میں جب اُن کو یہ احساس ہوگیا کہ اپنے جس باپ کی مغفرت کے لیے وہ دعا کر رہے ہیں وہ تو اللہ کا دشمن تھا، تو انھوں نے اس سے تبرّی کی اور اس کے ساتھ ہمدردی و محبت کا یہ تعلق بھی توڑ لیا:

عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۝۴ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝۵

تیرے ہی اُوپر ہم نے بھروسا کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رُجوع کر لیا اور تیرے ہی حُضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنادے[8]۔ اور اے ہمارے رب! ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، بے شک تُو ہی زبردست اور دانا ہے۔“

وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۝ (التوبہ: ۱۱۴)

اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اِس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھا کہ ایک وعدہ تھا جو اس نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن تھا تو اس نے اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیمؑ ایک رقیق القلب اور نرم خُو آدمی تھا۔

اِن آیات پر غور کرنے سے یہ اُصولی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاؑ کا صرف وہی عمل قابلِ تقلید ہے جس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے ہوں۔ رہے ان کے وہ اعمال جن کو انھوں نے بعد میں خود چھوڑ دیا ہو، یا جن پر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں قائم نہ رہنے دیا ہو، یا جن کی ممانعت اللہ کی شریعت میں وارد ہو چکی ہو، وہ قابلِ تقلید نہیں ہیں، اور کوئی شخص اِس حجت سے اُن کے ایسے اعمال کی پیروی نہیں کر سکتا کہ یہ فُلاں نبی کا عمل ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو آدمی کے ذہن میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے۔ آیتِ زیرِ بحث میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے جس قول کو قابلِ تقلید نمونہ ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اس کے دو حصّے ہیں: ایک حصّہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے باپ سے کہا: ”میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا“ اور دوسرا حصّہ یہ کہ ”میرے بس میں کچھ نہیں ہے کہ اللہ سے آپ کو معافی دلوا دوں۔“ ان میں سے پہلی بات کا قابلِ تقلید نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر دوسری بات میں کیا خرابی ہے کہ اسے بھی نمونۂ قابلِ تقلید ہونے سے مستثنیٰ کر دیا گیا؟ حالانکہ وہ بجائے خود حق بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول اِستثنا میں اس وجہ سے داخل ہوا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے ایک کام کا وعدہ کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ اس سے زیادہ تیرے لیے کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس میں ہوتا تو وہ شخص اس کی خاطر وہ بھی کرتا۔ یہ بات اُس آدمی کے ساتھ اُس شخص کے ہمدردانہ تعلق کو اور بھی زیادہ شدّت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کا یہ دوسرا قول بھی استثنا میں شامل کیے جانے کا مستحق تھا، اگرچہ اس

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا
اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶ ع
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ
مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

انھی لوگوں کے طرزِ عمل میں تمھارے لیے اور ہر اُس شخص کے لیے اچھّا نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخر کا اُمیدوار ہو۔[9] اِس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔[ع۱]

بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمھارے اور اُن لوگوں کے درمیان محبّت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔[11] اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔

کا یہ مضمون بجائے خود برحق تھا کہ اللہ سے کسی کی مغفرت کروا دینا ایک نبی تک ۔ کے اختیار سے باہر ہے۔ علامۂ آلوسیؒ نے بھی رُوح المعانی میں اس سوال کا یہی جواب دیا ہے۔

۸- کافروں کے لیے اہلِ ایمان کے فتنہ بننے کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں، جن سے ہر مومن کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کافر اُن پر غالب آ جائیں اور اپنے غلبے کو اِس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں اور اہلِ ایمان برسرِ باطل، ورنہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اِن لوگوں کو خدا کی رضا حاصل ہوتی اور پھر بھی ہمیں اِن پر غلبہ حاصل ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اہلِ ایمان پر کافروں کا ظلم و ستم اُن کی حدِ برداشت سے بڑھ جائے اور آخر کار وہ اُن سے دب کر اپنے دین و اخلاق کا سودا کرنے پر اُتر آئیں۔ یہ چیز دنیا بھر میں مومنوں کی جگ ہنسائی کی موجب ہوگی اور کافروں کو اس سے دین اور اہلِ دین کی تذلیل کا موقع ملے گا۔ تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دینِ حق کی نمایندگی کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کے باوجود اہلِ ایمان اُس اَخلاقی فضیلت سے محروم رہیں جو اِس مَقام کے شایانِ شان ہے، اور دنیا کو اُن کی سیرت و کردار میں بھی وہی عُیوب نظر آئیں جو جاہلیت کے معاشرے میں عام طور پر پھیلے ہوئے ہوں۔ اس سے کافروں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ اس دین میں آخر وہ کیا خوبی ہے جو اِسے ہمارے کفر پر شرف عطا کرتی ہو؟ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حاشیہ ۸۳)

۹- یعنی جو اس بات کی توقع رکھتا ہو کہ ایک روز اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، اور اس چیز کا اُمیدوار ہو کہ

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ
يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ
قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى
اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۱۲]۔ وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اِخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں[۱۳]۔

اللہ اسے اپنے فضل سے نوازے اور روزِ آخر میں اسے سُرخروئی نصیب ہو۔

۱۰۔ یعنی اللہ کو ایسے ایمان لانے والوں کی کوئی حاجت نہیں ہے جو اس کے دین کو ماننے کا دعویٰ بھی کریں اور پھر اس کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ اس کی خدائی اِس کی محتاج نہیں ہے کہ یہ لوگ اسے خدا مانیں۔ اور وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ اس کا محمود ہونا اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ یہ اس کی حمد کریں۔ یہ اگر ایمان لاتے ہیں تو اللہ کے کسی فائدے کے لیے نہیں، اپنے فائدے کے لیے لاتے ہیں۔ اور انھیں ایمان کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی طرح اللہ کے دشمنوں سے محبت اور دوستی کے رشتے توڑ نہ لیں۔

۱۱۔ اُوپر کی آیات میں مسلمانوں کو اپنے کافر رشتہ داروں سے قطعِ تعلّق کی جو تلقین کی گئی تھی، اس پر سچّے اہلِ ایمان اگرچہ بڑے صبر کے ساتھ عمل کر رہے تھے، مگر اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور قریب ترین عزیزوں سے تعلق توڑ لینا کیسا سخت کام ہے اور اس سے اہلِ ایمان کے دلوں پر کیا کچھ گزر رہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے

Maktaba Tul Ishaat.com

ان کو تسلّی دی کہ وہ وقت دُور نہیں ہے جب تمھارے یہی رشتہ دار مسلمان ہو جائیں گے اور آج کی دشمنی کل پھر محبّت میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب یہ بات فرمائی گئی تھی، اُس وقت کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ نتیجہ کیسے رونما ہوگا۔ مگر ان آیات کے نُزول پر چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ مکّہ فتح ہوگیا، قریش کے لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے، اور مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس چیز کی انھیں اُمید دلائی گئی تھی، وہ کیسے پُوری ہوئی۔

۱۲– اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شُبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیک برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے، مگر کیا انصاف بھی صرف اُنھی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اِس سِیاق و سَباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمھارے ساتھ عداوت نہیں برتتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دشمن اور غیر دشمن کو ایک درجے میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سا سلوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمھیں اُن لوگوں کے ساتھ سخت رَوِیَہ اختیار کرنے کا حق ہے جنھوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظلم توڑے، اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبُور کیا، اور نکالنے کے بعد بھی تمھارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اِس ظلم میں کوئی حصّہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اور رشتے اور بَرادری کے لحاظ سے اُن کے جو حُقوق تم پر عائد ہوتے ہیں، انھیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔

۱۳– سابقہ آیات میں کفار سے جس ترکِ تعلق کی ہدایت کی گئی تھی، اس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ اُن کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ اُس کی اصل وجہ ان کا کفر نہیں، بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ رَوِش ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے، اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنھوں نے کبھی اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اَسماء بنتِ ابی بکرؓ اور ان کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی قُتَیلَہ بنتِ عبدالعُزّٰی کافرہ تھیں اور ہجرت کے بعد مکّے ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ انھی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلحِ حُدَیبیَہ کے بعد جب مدینہ اور مکّہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کُھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفہ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اَسماءؓ کی اپنی رِوایت یہ ہے کہ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ’’اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں ان سے صلۂ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟‘‘ حضورؐ نے جواب دیا: ’’اس سے صلۂ رحمی کرو۔‘‘ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم) حضرت اَسماءؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن زُبیرؓ اس واقعے کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اَسماءؓ نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جب اللہ اور اس کے رسولؐ کی اجازت مل گئی تب وہ ان سے ملیں۔ (مُسندِ احمد، ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم) اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں باپ کی خدمت کرنا اور اپنے کافر بھائی بہنوں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کرلو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفّار کی طرف واپس نہ کرو۔[۱۴] نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفّار ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے

اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے جب کہ وہ دشمنِ اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذِمّی مساکین پر صدقات بھی صَرف کیے جاسکتے ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص، رُوح المعانی)

۱۴۔ اس حکم کا پَس منظر یہ ہے کہ صلحِ حُدَیبِیَہ کے بعد اوّل اوّل تو مسلمان مرد مکّہ سے بھاگ کر مدینہ آتے رہے اور انھیں معاہدے کی شرائط کے مطابق واپس کیا جاتا رہا۔ پھر مسلمان عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور سب سے پہلے اُمِّ کُلثومؓ بنتِ عُقبہ بن ابی مُعَیط ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔ کفّار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا اور اُمِّ کلثومؓ کے دو بھائی ولید بن عُقبہ اور عُمارہ بن عُقبہ انھیں واپس لے جانے کے لیے مدینے پہنچ گئے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا حُدَیبِیَہ کے معاہدے کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسی سوال کا یہاں جواب دیا ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوں اور یہ اطمینان کرلیا جائے کہ واقعی وہ ایمان ہی کی خاطر ہجرت کر کے آئی ہیں، کوئی اور چیز انھیں نہیں لائی ہے، تو انھیں واپس نہ کیا جائے۔

اس مَقام پر احادیث کی روایتِ بالمعنیٰ سے ایک بڑی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے جسے حل کرنا ضروری ہے۔ صلحِ حُدَیبِیَہ کی شرائط کے متعلق احادیث میں جو روایتیں ہمیں ملتی ہیں، وہ اکثر و بیشتر بالمعنیٰ روایات ہیں۔ زیرِ بحث شرط کے متعلق ان میں سے کسی رِوایَت کے الفاظ یہ ہیں: من جاء منکم لم نردہ علیکم ومن جاءکم منا رددتموہ علینا۔ ”تم میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہ کریں گے، اور ہم میں سے جو تمھارے پاس جائے گا اسے تم واپس کرو گے۔“ کسی میں یہ الفاظ ہیں: من اتی رسول اللّٰہ من اصحابہ بغیر اذن ولیہ ردہ علیہ۔ ”رسولؐ اللہ کے پاس اُن کے اصحاب میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا، اسے وہ واپس کر دیں گے۔“ اور کسی میں ہے: من اتی محمدًا من قریش بغیر اذن ولیّہ ردّہ علیھم

Maktaba Tul Ishaat.com

’’قریش میں سے جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جائے گا، اسے وہ قریش کو واپس کر دیں گے۔‘‘ اِن روایات کا طرزِ بیان خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان میں معاہدے کی اِس شرط کو اُن الفاظ میں نقل نہیں کیا گیا ہے جو اصل معاہدے میں لکھے گئے تھے، بلکہ راویوں نے ان کا مفہوم خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ بکثرت روایات اِسی نوعیت کی ہیں، اس لیے عام طور پر مفسّرین و محدّثین نے اس سے یہی سمجھا کہ معاہدہ عام تھا جس میں عورت مرد سب داخل تھے، اور عورتوں کو بھی اس کی رُو سے واپس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد جب اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا کہ مومن عورتیں واپس نہ کی جائیں تو اِن حضرات نے اِس کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں مومن عورتوں کی حد تک معاہدہ توڑ دینے کا فیصلہ فرما دیا۔ مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جس کو اِس آسانی کے ساتھ قبول کرلیا جائے۔ اگر معاہدہ فی الواقع بلاتخصیصِ مرد و زن سب کے لیے عام تھا تو آخر یہ کیسے جائز ہوسکتا تھا کہ ایک فریق اُس میں یک طرفہ ترمیم کر دے، یا اس کے کسی جُز کو بطورِ خود بدل ڈالے؟ اور بالفرض ایسا کیا بھی گیا تھا تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قریش کے لوگوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قریش والے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ایک ایک بات پر گرفت کرنے کے لیے خار کھائے بیٹھے تھے۔ انھیں اگر یہ بات ہاتھ آجاتی کہ آپؐ شرائطِ معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کر گزرے ہیں تو وہ زمین و آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ لیکن ہمیں کسی روایت میں اِس کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ انھوں نے قرآن کے اِس فیصلے پر ذرّہ برابر بھی چُون و چَرا کی ہو۔ یہ ایسا سوال تھا جس پر غور کیا جاتا تو معاہدے کے اصل الفاظ کی جستجو کر کے اِس پیچیدگی کا حل تلاش کیا جاتا، مگر بہت سے لوگوں نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی، اور بعض حضرات (مثلاً قاضی ابوبکر ابنِ عَرَبیؒ) نے توجہ کی بھی تو انھوں نے قریش کے اعتراض نہ کرنے کی یہ توجیہ کر نے میں تأمّل نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ معجزہ اِس معاملے میں قریش کی زبان بندی کر دی تھی۔ تعجب ہے کہ اس توجیہ پر ان حضرات کا ذہن کیسے مطمئن ہُوا۔

اصل بات یہ ہے کہ معاہدۂ صلح کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ کفّارِ قریش کی طرف سے تھی، اور ان کی جانب سے ان کے نمایندے سُہیل بن عمرو نے جو الفاظ معاہدے میں لکھوائے تھے وہ یہ تھے: علی ان لا یاتیك منا رجل و ان کان علی دینك الا رددته الینا۔ ’’اور یہ کہ تمھارے پاس ہم میں سے کوئی مرد بھی آئے، اگرچہ وہ تمھارے دین ہی پر ہو، تم اسے ہماری طرف واپس کرو گے۔‘‘ معاہدے کے یہ الفاظ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ میں قوی سند کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سُہَیل نے رَجُل کا لفظ شخص کے معنیٰ میں استعمال کیا ہو، لیکن یہ اُس کی ذہنی مُراد ہوگی۔ معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا، وہ رَجُل ہی تھا، جو عربی زبان میں مرد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب اُمِّ کُلثومؓ بنتِ عُقبہ کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (امام زُہریؒ کی رِوایت کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ کان الشرط فی الرجال دون النساء۔ ’’شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں۔‘‘ (احکام القرآن، ابنِ عَرَبیؒ۔ تفسیر کبیر، امام رازیؒ) اُس وقت تک خود قریش کے لوگ بھی اس غلط فہمی

میں تھے کہ معاہدے کا اطلاق ہر طرح کے مہاجرین پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب حضورؐ نے ان کو معاہدے کے اِن الفاظ کی طرف توجہ دلائی تو وہ دم بخود رہ گئے اور انھیں ناچار اس فیصلے کو ماننا پڑا۔

معاہدے کی اِس شرط کے لحاظ سے مسلمانوں کو حق تھا کہ جو عورت بھی مکّہ چھوڑ کر مدینے آتی، خواہ وہ کسی غرض سے آتی، اسے واپس دینے سے انکار کر دیتے۔ لیکن اسلام کو صرف مومن عورتوں کی حفاظت سے دلچسپی تھی، ہر طرح کی بھاگنے والی عورتوں کے لیے مدینۂ طَیِّبَہ کو پناہ گاہ بنانا مقصود نہ تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں، ان سے پُوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کرلو کہ وہ واقعی ایمان لے کر آئی ہیں، اور جب اس کا اطمینان ہو جائے تو ان کو واپس نہ کرو۔ چنانچہ اس ارشادِ الٰہی پر عمل درآمد کرنے کے لیے جو قاعدہ بنایا گیا، وہ یہ تھا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آتی تھیں ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا وہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتی ہیں، اور صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر نکل کر آئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ شوہر سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہوں؟ یا ہمارے ہاں کے کسی مرد کی محبّت ان کو لے آئی ہو؟ یا کوئی اور دنیوی غرض ان کے اس فعل کی محرک ہوئی ہو؟ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب جو عورتیں دے دیتی تھیں، صرف ان کو روک لیا جاتا تھا، باقی سب کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ (ابنِ جَریر بحوالہ ابنِ عباسؓ، قَتَادَہ، مجاہد، عِکرِمَہ، ابنِ زید)

اِس آیت میں قانونِ شہادت کا بھی ایک اُصولی ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی مزید توضیح اُس طریقِ کار سے ہوگئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس پر عمل درآمد کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں: ایک یہ کہ ہجرت کرنے والی جو عورتیں اپنے آپ کو مومن ہونے کی حیثیت سے پیش کریں، ان کے ایمان کی جانچ کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کے ایمان کی حقیقت کو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تمھارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ایمان لائی ہیں۔ تیسرے یہ کہ جانچ پڑتال سے جب تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انھیں واپس نہ کرو۔ پھر اس حکم کے مطابق ان عورتوں کے ایمان کی جانچ کرنے کے لیے جو طریقہ حضورؐ نے مقرر فرمایا، وہ یہ تھا کہ ان عورتوں کے حلفیہ بیان پر اعتماد کیا جائے اور ضروری جرح کر کے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ اُن کی ہجرت کا محرک ایمان کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس سے اوّل تو یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کو حقیقت کا علم حاصل ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف وہ علم کافی ہے جو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہم ایک شخص کے حلفیہ بیان پر اعتماد کریں گے، تاوقتیکہ کوئی صریح قرینہ اس کے کاذب ہونے پر دلالت نہ کر رہا ہو۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی اپنے عقیدے اور ایمان کے متعلق خود جو خبر دے رہا ہو، ہم اسے قبول کریں گے اور اِس بات کی کھوج میں نہ پڑیں گے کہ فی الواقع اُس کا وہی عقیدہ ہے جو وہ بیان کر رہا ہے، اِلّا یہ کہ کوئی صریح علامت ہمارے سامنے ایسی ظاہر ہو جائے جو اس کی تردید کر رہی ہو۔ اور چوتھی بات یہ کہ ایک شخص کے جن ذاتی حالات کو دوسرا کوئی نہیں جان سکتا، اُن میں اُسی کے بیان پر بھروسا کیا جائے گا، مثلاً طلاق اور عدّت کے معاملات میں عورت کے حیض اور طُہر کے متعلق اس کا اپنا بیان ہی معتبر ہوگا،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اٰتُوۡهُمۡ مَّاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اَنۡ تَنۡكِحُوۡهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ؕ وَ لَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ وَسۡـئَلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ وَلۡيَسۡـئَلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ ذٰلِكُمۡ حُكۡمُ اللّٰهِ ؕ

جو مہر اُن کو دیے تھے وہ انھیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم اُن کے مہر اُن کو ادا کر دو[۱۵]۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انھیں وہ واپس مانگ لیں[۱۶]۔ یہ اللہ کا حکم ہے،

خواہ وہ جھوٹ بولے یا سچ۔ اِنھی قواعد کے مطابق علم حدیث میں بھی اُن روایات کو قبول کیا جائے گا جن کے راویوں کا ظاہر حال ان کے راست باز ہونے کی شہادت دے رہا ہو، اِلّا یہ کہ کچھ دوسرے قرائن ایسے موجود ہوں جو کسی روایت کے قبول میں مانع ہوں۔

۱۵ - مطلب یہ ہے کہ اُن کے کافر شوہروں کو اُن کے جو مہر واپس کیے جائیں گے وہی اِن عورتوں کے مہر شمار نہ ہوں گے، بلکہ اب جو مسلمان بھی ان میں سے کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے وہ اُس کا مہر ادا کرے اور اس سے نکاح کر لے۔

۱۶ - اِن آیات میں چار بڑے اہم حکم بیان کیے گئے ہیں، جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

اوّل یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے، وہ اپنے کافر شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لیے حلال رہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دار الکفر سے دار الاسلام میں ہجرت کر کے آئے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے، اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا مہر دے کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جائے، اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر رہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

چوتھے یہ کہ اگر دار الکفر اور دار الاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دار الکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دار الاسلام میں ہجرت کر آئی ہوں، ان کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیے جائیں، اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں

جو دارالکفر میں رہ گئی ہوں، ان کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔

ان احکام کا تاریخی پَس منظر یہ ہے کہ آغازِ اسلام میں بکثرت مرد ایسے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا مگر ان کی بیویاں مسلمان نہ ہوئیں، اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مسلمان ہو گئیں مگر ان کے شوہروں نے اسلام قبول نہ کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص غیر مسلم تھے اور کئی سال تک غیر مسلم رہے۔ ابتدائی دَور میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اس کا کافر شوہر اور مسلمان مرد کے لیے اس کی مشرک بیوی حلال نہیں ہے۔ اس لیے ان کے درمیان اِزدِواجی رشتہ برقرار رہے۔ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک یہ صورتِ حال رہی کہ بہت سی عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر آئیں اور ان کے کافر شوہر دارالکفر میں رہے۔ اور بہت سے مسلمان مرد ہجرت کر کے آ گئے اور ان کی کافر بیویاں دارالکفر میں رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے درمیان رشتۂ اِزدِواج قائم رہا۔ اس سے خاص طور پر عورتوں کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی، کیونکہ مرد تو دوسرے نکاح بھی کر سکتے تھے، مگر عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک سابق شوہروں سے ان کا نکاح فسخ نہ ہو جائے، وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکیں۔ صلحِ حُدَیبِیَہ کے بعد جب یہ آیات نازل ہوئیں تو انھوں نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے اِزدِواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آیندہ کے لیے ان کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔ فقہائے اسلام نے اس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے:

ایک، وہ حالت جس میں زوجین دارالاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

دوسرے، وہ حالت جس میں زوجین دارالکفر میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

تیسرے، وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر دارالاسلام میں ہجرت کر کے آ جائے اور دوسرا دارالکفر میں کافر رہے۔

چوتھے، وہ حالت جس میں مسلم زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے۔

ذیل میں ہم اِن چاروں حالتوں کے متعلق فقہا کے مسالک الگ الگ بیان کرتے ہیں:

(۱) پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے، تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لیے اہلِ کتاب بیوی جائز ہے۔ یہ امر تمام فقہا کے درمیان مُتّفق عَلَیہ ہے۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہلِ کتاب میں سے ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے، تو حَنَفِیّہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، نہ قبول کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خَلْوت ہو چکی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہو گی، اور خَلْوت نہ ہوئی ہو تو اس کو مہر پانے کا حق نہ ہو گا، کیونکہ فُرقت اُس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ (اَلْمَبْسُوط، ہِدایہ، فتح القدیر) امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اگر زوجین کے

Maktaba Tul Ishaat.com

درمیان خَلوَت نہ ہوئی ہو تو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہَر ہو جائے گی، اور اگر خَلوَت ہو چکی ہو تو عورت تین مرتبہ ایّامِ ماہواری آنے تک اس کے نکاح میں رہے گی، اِس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار ایّام سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذِمّیوں کو اُن کے مذہب سے تعرُّض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے، اس کی بنا پر یہ دُرست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ ایک ذمّی عورت کے مذہب سے تعرُّض تو اس صورت میں ہو گا جب کہ اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اُس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرُّض نہیں ہے کہ تُو اسلام قبول کر لے تو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی، ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی نظیر پیش بھی آ چکی ہے۔ عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کافر رہی۔ حضرت علیؓ نے اس کے سامنے اسلام پیش فرمایا۔ اور جب اس نے انکار کیا تب آپ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔ (اَلْمَبْسُوط) امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خَلوَت نہ ہو چکی ہو تو مرد کے اسلام لاتے ہی اس کی کافر بیوی اس سے فوراً جدا ہو جائے گی، اور اگر خَلوَت ہو چکی ہو تو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، اور اس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی۔ (اَلْمُغْنی لابنِ قُدامہ)

اور اگر اسلام عورت نے قبول کیا ہو اور مرد کافر رہے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہو یا غیر اہلِ کتاب میں سے، تو حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کر لے تو عورت اس کے نکاح میں رہے گی، انکار کر دے تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے، عورت اس کی بیوی تو رہے گی مگر اس کو مقاربت کا حق نہ ہو گا۔ شوہر کے انکار کی صورت میں تفریق طلاقِ بائن کے حکم میں ہو گی۔ اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہو تو عورت نصف مہر پانے کی حق دار ہو گی، اور خلوت ہو چکی ہو تو عورت پورا مہر بھی پائے گی اور عدّت کا نَفَقہ بھی۔ (اَلْمَبْسُوط، ہدایہ، فتح القدیر) امام شافعیؒ کے نزدیک خَلوَت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت ہونے کی صورت میں عدّت ختم ہونے تک عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی۔ اس مدّت کے اندر وہ اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدّت گزرتے ہی جُدائی واقع ہو جائے گی۔ لیکن مرد کے معاملے میں بھی امام شافعیؒ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملے میں اُوپر منقول ہوئی کہ اس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں متعدّد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عورت نے اسلام قبول کر لیا اور مرد سے اسلام لانے کے لیے کہا گیا، اور جب اس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرا دی گئی۔ مثلاً بنی تَغلِب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے مرد سے کہا: یا تو تُو اسلام قبول کر لے ورنہ مَیں تم دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ اس نے انکار کیا اور آپ نے تفریق

کی ڈگری دے دی۔ بَہرُالمَلِک کی ایک نومسلم زمیندارنی کا مُقدّمہ اُن کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے معاملے میں بھی انھوں نے حکم دیا کہ اس کے شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ قبول کر لے تو بہتر، ورنہ دونوں میں تفریق کرا دی جائے۔ یہ واقعات صحابۂ کرامؓ کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصّاص، المبسوط، فتح القدیر) امام مالکؒ کی رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ اگر خلوَت سے پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ فوراً تفریق کرا دی جائے۔ اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور اس کے بعد عورت اسلام لائی ہو تو زمانۂ عدّت ختم ہونے تک انتظار کیا جائے، اس مدّت میں شوہر اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدّت گزرتے ہی فُرقت واقع ہو جائے گی۔ امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہو جانا بہرحال فوری تفریق کا موجب ہے، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ (المُغنی)

(۲) دارالکفر میں اگر عورت مسلمان ہو جائے اور مرد کافر رہے، یا مرد مسلمان ہو جائے اور اس کی بیوی (جو عیسائی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو) اپنے مذہب پر قائم رہے، تو حَنَفِیّہ کے نزدیک خواہ اُن کے درمیان خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، تفریق واقع نہ ہو گی جب تک عورت کو تین مرتبہ ایّامِ ماہواری نہ آ جائیں، یا اس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ یہ مدّت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ اس معاملے میں بھی خلوت اور عَدَم خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فُرقت ہو جائے گی، اور اگر خلوت ہو جانے کے بعد دین کا اختلاف رُونما ہُوا ہو تو عدّت کی مدّت ختم ہونے تک ان کا نکاح باقی رہے گا۔ اِس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدّت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہو جائے گا۔ (المبسوط، فتح القدیر، احکام القرآن للجصّاص)

(۳) جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین کے ساتھ اختلافِ دار بھی واقع ہو جائے، یعنی ان میں سے کوئی ایک دارالکفر میں کافر رہے اور دوسرا دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائے، اس کے متعلق حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہو تو اسے فوراً دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہے، اس پر کوئی عدّت نہیں ہے، البتہ مقاربت کے لیے اس کے شوہر کو اِستِبرائے رحم کی خاطر ایک مرتبہ ایّامِ ماہواری آ جانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور اگر وہ حاملہ ہو تب بھی نکاح ہو سکتا ہے، مگر مقاربت کے لیے وضعِ حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ امام ابو یُوسُفؒ اور امام محمدؒ نے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ سے صرف اتنا اختلاف کیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت پر عدّت لازم ہے، اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ (المبسوط، ہِدایہ، احکام القرآن للجصّاص) امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اختلافِ دار کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل چیز صرف اختلافِ دین ہے۔ یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دارالاسلام میں زوجین کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں۔ (المُغنی) امام شافعیؒ اپنی مذکورۂ بالا

Maktaba Tul Ishaat.com

رائے کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملے میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑ کر اس کے حقِ زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہو تو اختلافِ دار کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اِس قصد کی بنا پر فوراً فُرقت واقع ہو جائے گی۔ (المبسوط وہدایہ)

لیکن قرآنِ مجید کی زیرِ بحث آیت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں صحیح ترین رائے وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے ظاہر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کر کے آنے والی مومن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے، اور انھی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے اُن کافر شوہروں کے لیے حلال نہیں رہیں جنھیں وہ دارالکفر میں چھوڑ آئی ہیں، اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کرلیں۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اپنی اُن کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو جو دارالکفر میں رہ گئی ہیں، اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگ لو جو تم نے ان عورتوں کو دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلافِ دین ہی کے احکام نہیں ہیں، بلکہ اِن احکام کو جس چیز نے یہ خاص شکل دے دی ہے، وہ اختلافِ دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح اُن کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو اُن سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جاسکتی تھی، اور وہ بھی اِس طرح کہ اِس اجازت میں عدّت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ اسی طرح اگر لَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ کا حکم آجانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ انھیں طلاق دے دو۔ مگر یہاں اُس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نُزول کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت طلحہؓ اور بعض دوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔ مگر یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اُن کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا، اور ان بیویوں کے ساتھ تعلقِ زوجیت کا انقطاع اُن کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں اُن کے نکاح میں باقی رہ جاتیں۔

اس کے جواب میں عہدِ نبویؐ کے تین واقعات کی نظیریں پیش کی جاتی ہیں، جن کو اس امر کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ اِن آیات کے نُزول کے بعد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اختلافِ دار کے باوجود مومن اور کافر زوجین کے درمیان نکاح کا تعلق برقرار رکھا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ فتحِ مکہ سے ذرا پہلے ابوسفیان مَرُّالظَّہران (موجودہ وادیِ فاطمہ) کے مقام پر لشکرِ اسلام میں آئے اور یہاں انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور اُن کی بیوی ہند مکّے میں کافر رہیں۔ پھر فتحِ مکّہ کے بعد ہند نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدیدِ نکاح کے بغیر ہی اُن کو سابق نکاح پر برقرار رکھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد عِکرِمَہ بن ابی جہل اور حَکیم بن حِزَام مکّے سے فرار ہوگئے اور ان کے پیچھے دونوں کی بیویاں مسلمان ہوگئیں۔ پھر انھوں نے حضورؐ سے اپنے شوہروں کے لیے امان لے لی اور جا کر اُن کو لے آئیں۔ دونوں اصحاب نے حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے بھی سابق نکاحوں کو برقرار رکھا۔ تیسرا واقعہ حضورؐ کی اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا ہے جو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئی تھیں اور ان کے شوہر ابوالعاص

بحالتِ کفر مکّہ ہی میں مقیم رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ ماجہ میں ابنِ عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ وہ ۸ھ میں مدینے آکر مسلمان ہوئے اور حضورؐ نے تجدیدِ نکاح کے بغیر سابق نکاح ہی پر صاحبزادی کو ان کی زوجیت میں رہنے دیا۔ لیکن ان میں سے پہلے دو واقعے تو درحقیقت اختلافِ دار کی تعریف ہی میں نہیں آتے، کیونکہ اختلافِ دار اِس چیز کا نام نہیں ہے کہ ایک شخص عارضی طور پر ایک دار سے دوسرے دار کی طرف چلا گیا یا فرار ہوگیا، بلکہ یہ اختلاف صرف اُس صورت میں واقع ہوتا ہے جب کوئی آدمی ایک دار سے منتقل ہوکر دوسرے دار میں آباد ہو جائے، اور اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق ’’قومیّت‘‘ (nationality) کا فرق واقع ہو جائے۔ رہا سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ، تو اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت ابنِ عباسؓ کی ہے جس کا حوالہ اُوپر دیا گیا ہے، اور دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص کی ہے، جس کو امام احمد، ترمذی اور ابنِ ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی کو جدید نکاح اور جدید مہر کے ساتھ پھر ابوالعاصؓ ہی کی زوجیت میں دے دیا۔ اس اختلافِ روایت کی صورت میں اوّل تو یہ نظیر اُن حضرات کے لیے قطعی دلیل نہیں رہتی جو اختلافِ دار کی قانونی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرے، اگر وہ ابنِ عباسؓ ہی کی رِوایت کے صحیح ہونے پر اصرار کریں تو یہ اُن کے مسلک کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ اُن کے مسلک کی رُو سے تو جن میاں بیوی کے درمیان اختلافِ دین واقع ہوگیا ہو اور وہ باہم خلوت کر چکے ہوں، اُن کا نکاح عورت کو صرف تین مرتبہ ایّامِ ماہواری آنے تک باقی رہتا ہے، اِس دوران میں دوسرا فریق اسلام قبول کر لے تو زوجیت قائم رہتی ہے، ورنہ تیسری بار ایّام آتے ہی نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن حضرت زینبؓ کے جس واقعے سے وہ اِستدلال کرتے ہیں، اس میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، حضرت زینبؓ کی ہجرت کے چھ سال بعد ابوالعاصؓ ایمان لائے تھے، اور ان کے ایمان لانے سے کم از کم دو سال پہلے قرآن میں وہ حکم نازل ہو چکا تھا جس کی رُو سے مسلمان عورت مشرکین پر حرام کر دی گئی تھی۔

(۴) چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔

اگر زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حَنابلہ کہتے ہیں کہ خَلوَت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً، اور خلوت کے بعد ہو تو عدّت کی مدّت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالتِ اسلام میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کا نکاح فسخ ہو جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو فتنۂ ارتداد برپا ہوا تھا، اس میں ہزارہا آدمی مرتد ہوئے، پھر مسلمان ہوگئے، اور صحابۂ کرامؓ نے کسی کو بھی تجدیدِ نکاح کا حکم نہیں دیا، اس لیے ہم صحابہؓ کے مُتّفقہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلافِ قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مرتد ہونے کی صورت میں ان کے نکاح نہیں ٹوٹتے۔ (المبسوط، ہِدایہ، فتح القدیر، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

Maktaba Tul Ishaat.com

يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ
اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ
مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر تمھاری کافر بیویوں کے مَہروں میں سے کچھ تمھیں کفّار سے واپس نہ ملے اور پھر تمھاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کو اُتنی رقم ادا کر دو جو اُن کے دیے ہوئے مَہروں کے برابر ہو۔[۱۷] اور اُس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

اگر شوہر مرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے، تو حَنَفِیَہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا، خواہ ان کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خَلْوَت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوا ہو تو زمانۂ عدّت تک باقی رہے گا، اِس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے گی، ورنہ عدّت ختم ہوتے ہی اس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شدہ شمار کیا جائے گا، یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدّت گزارنی نہ ہوگی۔ چاروں فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ خَلْوَت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہو تو عورت کو نصف مہر، اور خلوت کے بعد پیش آیا تو پُورا مَہر پانے کا حق ہوگا۔

اور اگر عورت مرتد ہو گئی ہو تو حَنَفِیَہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اِس صورت میں بھی نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دَور میں علمائے بَلْخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فُرقَت واقع نہیں ہوتی، اور اِس سے ان کا مقصد اِس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی اِس سے ملتا جُلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرائن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیٰحدگی حاصل کرنے کے لیے بطورِ حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فُرقَت واقع نہ ہوگی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں بھی قانون وہی ہے جو مرد کے ارتداد کی صورت میں ہے، یعنی خَلْوَت سے پہلے مرتد ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خَلْوَت کے بعد ہو تو زمانۂ عدّت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا، اِس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رشتہ برقرار رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی نکاح وقتِ ارتداد سے فسخ شمار ہوگا۔ مہر کے بارے میں یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ خلوت سے پہلے اگر عورت مرتد ہوئی ہے تو اسے

کوئی مہر نہ ملے گا، اور اگر خلوَت کے بعد اس نے ارتداد اختیار کیا ہو تو وہ پورا مہر پائے گی۔ (المبسوط، ہدایہ، فتح القدیر، المُغنی، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۱۷۔ اس معاملے کی دو صورتیں تھیں اور اس آیت کا انطباق دونوں صورتوں پر ہوتا ہے:

ایک صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے مُعاہدانہ تعلقات تھے ان سے مسلمانوں نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے ہماری طرف آ گئی ہیں، اُن کے مہر ہم واپس کر دیں گے، اور ہمارے آدمیوں کی جو کافر بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کے مہر تم واپس کر دو۔ لیکن انھوں نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ امام زُہریؒ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان اُن عورتوں کے مہر واپس دینے کے لیے تیار ہو گئے جو مشرکین کے پاس مکّے میں رہ گئی تھیں، مگر مشرکوں نے اُن عورتوں کے مہر واپس دینے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے پاس ہجرت کر کے آ گئی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مہاجر عورتوں کے جو مہر تمھیں مشرکین کو واپس کرنے ہیں وہ ان کو بھیجنے کے بجائے مدینے ہی میں جمع کر لیے جائیں، اور جن لوگوں کو مشرکین سے اپنے دیے ہوئے مہر واپس لینے ہیں اُن میں سے ہر ایک کو اتنی رقم دے دی جائے جو اُسے کفار سے وصول ہونی چاہیے تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات نہ تھے، اُن کے علاقوں سے بھی متعدِد آدمی اسلام قبول کر کے دار الاسلام میں آ گئے تھے اور اُن کی کافر بیویاں وہاں رہ گئی تھیں۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی مسلمان ہو کر ہجرت کر آئی تھیں اور ان کے کافر شوہر وہاں رہ گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ دار الاسلام ہی میں اَدلے کا بدلہ چُکا دیا جائے۔ جب کفار سے کوئی مہر واپس نہیں ملنا ہے تو انھیں بھی کوئی مہر واپس نہ کیا جائے۔ اِس کے بجائے جو عورت اِدھر آ گئی ہے، اس کے بدلے کا مہر اُس شخص کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی اُدھر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر اِس طرح حساب برابر نہ ہو سکے، اور جن مسلمانوں کی بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کے وصول طلب مہر ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کے مہروں سے زیادہ ہوں، تو حکم دیا گیا کہ اُس مالِ غنیمت سے باقی رقمیں ادا کر دی جائیں جو کفّار سے لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہوں۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس شخص کے حصّے کا مہر وصول طلب رہ جاتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ اس کے نقصان کی تلافی مالِ غنیمت سے کر دی جائے۔ (ابنِ جریر) اسی مسلک کو عطاء، مجاہد، زُہری، مَسرُوق، ابراہیم نَخَعی، قَتَادہ، مُقاتِل اور ضحّاک نے اختیار کیا ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے مہر کفّار کی طرف رہ گئے ہوں، ان کا بدلہ کفار سے ہاتھ آئے ہوئے مجموعی مالِ غنیمت میں سے ادا کیا جائے، یعنی تقسیم غنائم سے پہلے ان لوگوں کے فوت شدہ مہر ان کو دے دیے جائیں اور اس کے بعد تقسیم ہو، جس میں وہ لوگ بھی دوسرے سب مجاہدین کے ساتھ برابر کا حصّہ پائیں۔ بعض فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف اموالِ غنیمت ہی نہیں، اموالِ فَے میں سے بھی ایسے لوگوں کے نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اہلِ علم کے ایک بڑے گروہ نے اس مسلک کو قبول نہیں کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ

اے نبیؐ! جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں[18] اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں[19] گی، زِنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی،[20] اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں[21] گی، اور کسی امرِ معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں[22] گی، تو ان سے بیعت لے[23] لو اور اُن کے حق میں اللہ سے دُعائے مغفرت کرو،

۱۸ – جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ آیت فتحِ مکّہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مکّہ فتح ہوا تو قریش کے لوگ جُوق دَر جُوق حضورؐ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ آپؐ نے مَردوں سے کوہِ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمرؓ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور اُن باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔ (ابنِ جَریر بروایتِ ابنِ عباسؓ۔ ابنِ ابی حاتم بروایتِ قَتادہ) پھر مدینہ واپس تشریف لے جا کر آپؐ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا۔ (ابنِ جَریر، ابنِ مَردُوَیہ، بزّار، ابنِ حِبّان، بروایتِ اُمِّ عَطِیہَ انصاریہؓ) عید کے روز بھی مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپؐ عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبے کے دوران میں آپؐ نے یہ آیت تلاوت کر کے اِن باتوں کا عہد لیا جو اس آیت میں مذکور ہوئی ہیں۔ (بخاری، بروایتِ ابنِ عباسؓ) اِن مواقع کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں، جن کا ذکر متعدّد احادیث میں آیا ہے۔

۱۹ – مکّۂ معظمہ میں جب عورتوں سے بیعت لی جا رہی تھی اُس وقت حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہِندؓ بنتِ عُتبہ نے اس حکم کی تشریح دریافت کرتے ہوئے حضورؐ سے عرض کیا: ''یارسولؐ اللہ! ابوسُفیان ذرا بخیل آدمی ہیں، کیا میرے اُوپر اِس میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے بچّوں کی ضروریات کے لیے ان سے پُوچھے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لیا کروں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، مگر بس معروف کی حد تک۔'' یعنی بس اُتنا مال لے لو جو فی الواقع جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ (احکام القرآن، ابنِ عَرَبی)

۲۰ - اس میں اِسقاطِ حمل بھی شامل ہے، خواہ وہ جائز حمل کا اِسقاط ہو یا ناجائز حمل کا۔

۲۱ - اس سے دو قسم کے بہتان مراد ہیں: ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کی تہمتیں لگائے اور اس طرح کے قصّے لوگوں میں پھیلائے، کیونکہ عورتوں میں خاص طور پر اِن باتوں کے چرچے کرنے کی بیماری پائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک عورت بچہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو یقین دلائے کہ یہ تیرا ہی ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو عورت کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ گُھسا لائے جو اُس خاندان کا نہیں ہے، اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور اللہ اُسے کبھی جنت میں داخل نہ کرے گا۔"

۲۲ - اِس مختصر سے فقرے میں دو بڑے اہم قانونی نِکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی قید لگائی گئی ہے، حالانکہ حضورؐ کے بارے میں اِس امر کے کسی ادنیٰ شبہے کی گنجایش بھی نہ تھی کہ آپؐ کبھی مُنکَر کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانونِ خداوندی کے حُدود سے باہر جا کر نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جب خدا کے رسولؐ تک کی اطاعت معروف کی شرط سے مشروط ہے، تو پھر کسی دوسرے کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مشروط اطاعت کا حق پہنچے اور اس کے کسی ایسے حکم یا قانون یا ضابطے اور رسم کی پیروی کی جائے جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو۔ اِس قاعدے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف۔ "اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے۔" (مسلم، ابوداؤد، نَسائی) یہی مضمون اکابرِ اہلِ علم نے اس آیت سے مُستَنبَط کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمھاری نافرمانی نہ کریں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی تک کی اطاعت کو اس شرط سے مشروط کیا ہے تو کسی اور شخص کے لیے یہ کیسے سزاوار ہو سکتا ہے کہ معروف کے سوا کسی معاملے میں اس کی اطاعت کی جائے۔" (ابنِ جَریر)

امام ابوبکر جَصّاصؒ لکھتے ہیں:

> "اللہ کو معلوم تھا کہ اُس کا نبی کبھی معروف کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیتا، پھر بھی اس نے اپنے نبی کی نافرمانی سے منع کرتے ہوئے معروف کی شرط لگا دی، تا کہ کوئی شخص کبھی اس امر کی گنجایش نہ نکال سکے کہ ایسی حالت میں بھی سلاطین کی اطاعت کی جائے جب کہ اُن کا حکم اللہ کی اطاعت میں نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ من اطاع مخلوقًا فی معصیة الخالق سلّط اللّٰہ علیه ذٰلك المخلوق، یعنی جو شخص خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس پر

Maktaba Tul Ishaat.com

اُسی مخلوق کو مسلط کر دیتا ہے۔" (احکام القرآن)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

"یہ ارشاد اُن جاہلوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اُولی الامر کی اطاعت مُطلَقاً لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول کی اطاعت پر بھی معروف کی قید لگا دی ہے، حالانکہ رسول کبھی معروف کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔ اس سے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ خالق کی معصیت میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔" (رُوح المعانی)

پس درحقیقت یہ ارشاد اسلام میں قانون کی حکمرانی (rule of law) کا سنگِ بنیاد ہے۔ اُصولی بات یہ ہے کہ ہر کام جو اسلامی قانون کے خلاف ہو، جُرم ہے، اور کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسے کسی کام کا کسی کو حکم دے۔ جو شخص بھی خلافِ قانون حکم دیتا ہے وہ خود مجرم ہے، اور جو شخص اس حکم کی تعمیل کرتا ہے وہ بھی مُجرم ہے۔ کوئی ماتحت اِس عذر کی بنا پر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے افسرِ بالا نے اسے ایک ایسے فعل کا حکم دیا تھا جو قانون میں جُرم ہے۔

دوسری بات جو آئینی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ اس آیت میں پانچ منفی احکام دینے کے بعد مثبت حکم صرف ایک ہی دیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ تمام نیک کاموں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام کی اطاعت کی جائے گی۔ جہاں تک بُرائیوں کا تعلّق ہے، وہ بڑی بڑی بُرائیاں گِنا دی گئیں جن میں زمانۂ جاہلیّت کی عورتیں مبتلا تھیں اور ان سے باز رہنے کا عہد لے لیا گیا، مگر جہاں تک بھلائیوں کا تعلق ہے اُن کی کوئی فہرست دے کر عہد نہیں لیا گیا کہ تم فُلاں فُلاں اعمال کرو گی، بلکہ صرف یہ عہد لیا گیا کہ جس نیک کام کا بھی حضورؐ حکم دیں گے، اس کی پیروی تمھیں کرنی ہوگی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نیک اعمال صرف وہی ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں دیا ہے تو عہد اِن الفاظ میں لیا جانا چاہیے تھا کہ "تم اللہ کی نافرمانی نہ کرو گی" یا یہ کہ "تم قرآن کے احکام کی نافرمانی نہ کرو گی"۔ لیکن جب عہد اِن الفاظ میں لیا گیا کہ "جس نیک کام کا حکم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دیں گے، تم اس کی خلاف ورزی نہ کرو گی"، تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے حضورؐ کو وسیع ترین اختیارات دیے گئے ہیں اور آپؐ کے تمام احکام واجب الاطاعت ہیں، خواہ وہ قرآن میں موجود ہوں یا نہ ہوں۔

اِسی آئینی اختیار کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیعت لیتے ہوئے اُن بہت سی بُرائیوں کے چھوڑنے کا عہد لیا جو اُس وقت عرب معاشرے کی عورتوں میں پھیلی ہوئی تھیں، اور متعدّد ایسے احکام دیے جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اس کے لیے حسبِ ذیل احادیث مُلاحظہ ہوں:

ابنِ عباسؓ، اُمِّ سَلَمہؓ اور اُمِّ عَطِیّہؓ انصاریہ وغیرہ کی روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ نہ کریں گی۔ یہ روایات بخاری، مسلم، نَسائی اور ابنِ جَریر نے نقل کی ہیں۔

ابنِ عباسؓ کی ایک روایت میں یہ تفصیل ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لیے مامور کیا اور حکم دیا کہ ان کو نوحہ کرنے سے منع کریں، کیونکہ زمانۂ جاہلیّت میں عورتیں مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے کپڑے پھاڑتی تھیں، منہ نوچتی تھیں، بال کاٹتی تھیں اور سخت واویلا مچاتی تھیں۔ (ابنِ جریر)

زید بن اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں کو اس سے منع کیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے اپنے منہ نوچیں اور گریبان پھاڑیں اور واویلا کریں اور شعر گا گا کر بَین کریں۔ (ابنِ جریر) اسی کی ہم معنیٰ ایک روایت ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جریر نے ایک ایسی خاتون سے نقل کی ہے جو بیعت کرنے والیوں میں شامل تھیں۔

قَتَادَہ اور حَسَن بصری رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ جو عہد حضورؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں سے لیے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ غیر محرم مَردوں سے بات نہ کریں گی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت میں اس کی یہ وضاحت ہے کہ غیر مردوں سے تخلیے میں بات نہ کریں گی۔ قَتَادَہؒ نے مزید وضاحت یہ کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُن کر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عَوف نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم گھر پر نہیں ہوتے اور ہمارے ہاں کوئی صاحب ملنے آجاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: میری مراد یہ نہیں ہے۔ یعنی عورت کا کسی آنے والے سے اتنی بات کہہ دینا ممنوع نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ (یہ روایات ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے نقل کی ہیں)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خالہ اُمَیمَہؓ بنت رُقَیقَہ سے حضرت عبداللہؓ بن عَمرو بن العاص نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ عہد لیا کہ نوحہ نہ کرنا اور جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کر کے اپنی نمائش نہ کرنا۔ (مُسندِ احمد، ابنِ جریر)

حضورؐ کی ایک خالہ سلمیٰؓ بنتِ قَیس کہتی ہیں کہ مَیں انصار کی چند عورتوں کے ساتھ بیعت کے لیے حاضر ہوئی تو آپؐ نے قرآن کی اِس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا، پھر فرمایا: ولا تغششن ازواجکن ''اپنے شوہروں سے دھوکے بازی نہ کرنا۔'' جب ہم واپس ہونے لگیں تو ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ جا کر حضورؐ سے پوچھو: شوہروں سے دھوکے بازی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ مَیں نے جا کر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: تاخذ ماله فتحابی غیره ''یہ کہ تو اُس کا مال لے اور دوسروں پر لُٹائے۔'' (مُسندِ احمد)

اُمِّ عَطِیہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے بیعت لینے کے بعد ہمیں حکم دیا کہ ہم عیدین کی جماعت میں حاضر ہوا کریں گی، البتہ جمعہ ہم پر فرض نہیں ہے، اور جنازوں کے ساتھ جانے سے ہمیں منع فرما دیا۔ (ابنِ جریر)

جو لوگ حضورؐ کے اِس آئینی اختیار کو آپؐ کی حیثیتِ رسالت کے بجائے حیثیتِ امارت سے متعلق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؐ چونکہ اپنے وقت کے حکمراں بھی تھے، اس لیے اپنی اِس حیثیت میں آپؐ نے جو احکام دیے وہ صرف آپؐ کے زمانے تک ہی واجب الاطاعت تھے، وہ بڑی جہالت کی بات کہتے ہیں۔ اُوپر کی سُطور میں ہم نے حضورؐ کے جو احکام نقل کیے ہیں، ان پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ ان میں عورتوں کی اصلاح کے لیے جو ہدایات آپؐ نے دی ہیں، وہ اگر محض حاکمِ وقت ہونے کی حیثیت سے ہوتیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پُوری دنیا کے مسلم معاشرے کی عورتوں میں یہ اصلاحات کیسے رائج ہو سکتی تھیں؟ آخر دنیا کا وہ کون سا حاکم ہے جس کو یہ مرتبہ حاصل ہو کہ ایک مرتبہ اس کی زبان سے ایک حکم صادر

Maktaba Tul Ishaat.com

ہو اور رُوئے زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں، وہاں کے مسلم معاشرے میں ہمیشہ کے لیے وہ اصلاح رائج ہوجائے جس کا حکم اُس نے دیا ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ حشر، حاشیہ ۱۵)

۲۳ – معتبر اور متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ مَردوں کی بیعت سے مختلف تھا۔ مردوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والے آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کرتے تھے۔ لیکن عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے آپؐ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ مختلف دوسرے طریقے اختیار فرمائے۔ اس کے بارے میں جو روایات منقول ہوئی ہیں، وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "خدا کی قسم! بیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ سے چُھوا تک نہیں ہے۔ آپؐ عورت سے بیعت لیتے ہوئے بس زبانِ مبارک سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ مَیں نے تجھ سے بیعت لی۔" (بخاری، ابنِ جَریر)

اُمَیمہؓ بنت رُقَیقَہ کا بیان ہے کہ مَیں اور چند عورتیں حضورؐ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئیں اور آپؐ نے قرآن کی اِس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ جب ہم نے کہا: "ہم معروف میں آپؐ کی نافرمانی نہ کریں گی" تو آپؐ نے فرمایا: فیما استطعتُنّ واطقتُنّ، "جہاں تک تمھارے بس میں ہو اور تمھارے لیے ممکن ہو۔" ہم نے عرض کیا: "اللہ اور اس کا رسولؐ ہمارے لیے خود ہم سے بڑھ کر رحیم ہیں۔" پھر ہم نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! ہاتھ بڑھائیے تاکہ ہم آپؐ سے بیعت کریں۔" آپؐ نے فرمایا: "مَیں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، بس مَیں تم سے عہد لوں گا۔" چنانچہ آپؐ نے عہد لے لیا۔ ایک اور روایت میں ان کا بیان ہے کہ آپؐ نے ہم میں سے کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا۔ (مُسندِ احمد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم)

ابوداؤد نے مَراسیل میں شَعبیؒ کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضورؐ کی طرف بڑھائی گئی۔ آپؐ نے بس اسے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا: "میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔" یہی مضمون ابنِ ابی حاتم نے شَعبی سے، عبدالرزّاق نے ابراہیم نَخَعی سے اور سعید بن منصور نے قیس بن ابی حازم سے نقل کیا ہے۔

ابنِ اسحاق نے مَغازی میں اَبان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے، اور پھر اسی برتن میں عورت بھی اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ عید کا خطبہ دینے کے بعد آپؐ مردوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے وہاں اپنی تقریر میں قرآنِ مجید کی یہ آیت پڑھی، پھر عورتوں سے پوچھا: "تم اس کا عہد کرتی ہو؟" مجمع میں سے ایک عورت نے جواب دیا: "ہاں، یا رسولؐ اللہ!"

ایک روایت میں، جسے ابنِ حِبّان، ابنِ جَریر اور بزّار وغیرہ نے نقل کیا ہے، اُمِّ عَطِیّہ انصاریہؓ کا یہ بیان ملتا ہے کہ "حضورؐ نے گھر کے باہر سے ہاتھ بڑھایا اور ہم نے اندر سے ہاتھ بڑھائے"، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتوں نے آپؐ سے مصافحہ بھی کیا ہو، کیونکہ حضرت اُمِّ عَطِیّہؓ نے مصافحے کی تصریح نہیں کی ہے۔ غالبًا اس موقع پر صورت یہ

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ
مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع

النصف ع ۷

یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے، جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں۔[۲۴] ع

رہی ہوگی کہ عہد لیتے وقت آپؐ نے باہر سے ہاتھ بڑھایا ہوگا اور اندر سے عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھ آپؐ کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیے ہوں گے، بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ آپؐ کے ہاتھ سے مَس ہو۔

۲۴ - اصل الفاظ ہیں: قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ۔ اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ آخرت کی بھلائی اور اس کے ثواب سے اُسی طرح مایوس ہیں جس طرح زندگی بعدِ موت سے انکار کرنے والے اِس بات سے مایوس ہیں کہ اُن کے جو عزیز رشتہ دار قبروں میں جا چکے ہیں، وہ کبھی پھر زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔ یہ معنیٰ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حَسَن بصری، قَتَادہ اور ضَحّاک رحمہم اللہ نے بیان کیے ہیں۔ دوسرے معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آخرت کی رحمت و مغفرت سے اُسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر ہر خیر سے مایوس ہیں، کیونکہ انھیں اپنے مبتلائے عذاب ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔ یہ معنیٰ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، اور حضرات مجاہد، عِکْرِمہ، ابنِ زید، کَلْبی، مُقاتِل اور منصور رحمہم اللہ سے منقول ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الصَّف

(۶۱)

الصَّف

نام چوتھی آیت کے فقرے یُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ ''صف'' آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر روایت سے اِس کا زمانۂ نُزُول معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً جنگِ اُحُد کے متّصل زمانے میں نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ اس کے بین السُّطور میں جن حالات کی طرف اشارہ محسوس ہوتا ہے، وہ اُسی دَور میں پائے جاتے تھے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع ہے: مسلمانوں کو ایمان میں اخلاص اختیار کرنے اور اللہ کی راہ میں جان لڑانے پر اُبھارنا۔ اس میں ضعیف الایمان مسلمانوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے، اور اُن لوگوں کو بھی جو ایمان کا جھوٹا دعویٰ کر کے اسلام میں داخل ہو گئے تھے، اور اُن کو بھی جو مخلص تھے۔ بعض آیات کا خطاب پہلے دونوں گروہوں سے ہے، بعض میں صرف منافقین مخاطب ہیں، اور بعض کا رُوئے سُخن صرف مخلصین کی طرف ہے۔ اندازِ کلام سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں کون مخاطَب ہے۔

آغاز میں تمام ایمان لانے والوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں وہ لوگ جو کہیں کچھ اور کریں کچھ، اور نہایت محبوب ہیں وہ لوگ جو راہِ حق میں لڑنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہوں۔

پھر آیت ۵ سے ۷ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت کے لوگوں کو مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ اپنے رسولؐ اور اپنے دین کے ساتھ تمھاری رَوِش وہ نہ ہونی چاہیے جو موسیٰ علیہ السّلام اور عیسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے اختیار کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو وہ خدا کا رسول جاننے کے باوجود جیتے جی تنگ کرتے رہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے کھُلی کھُلی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود وہ ان کو جھٹلانے سے باز نہ آئے۔ نتیجہ اِس کا یہ ہُوا کہ اُس قوم کے مزاج کا سانچا ہی ٹیڑھا ہو کر رہ گیا اور اس سے ہدایت کی توفیق سلب ہو گئی۔ یہ کوئی ایسی قابلِ رشک حالت نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوم اس میں مبتلا ہونے کی تمنّا کرے۔

پھر آیت ۸-۹ میں پُوری تحدّی کے ساتھ اعلان کیا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافقین اللہ کے اِس نُور کو بُجھانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لیں، یہ پُوری آب و تاب کے

Maktaba Tul Ishaat.com

ساتھ دنیا میں پھیل کر رہے گا، اور مشرکین کو خواہ کتنا ہی ناگوار ہو، رسولِ برحق کا لایا ہوا دین ہر دوسرے دین پر غالب آ کر رہے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۰-۱۳ میں اہلِ ایمان کو بتایا گیا ہے کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے دل سے ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ آخرت میں اس کا ثمرہ خدا کے عذاب سے نجات، گناہوں کی مغفرت، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنّت کا حُصول ہے، اور دُنیا میں اس کا انعام خدا کی تائید و نصرت اور فتح و ظفر ہے۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تلقین کی گئی ہے کہ جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں اُن کا ساتھ دیا تھا، اُسی طرح وہ بھی ''انصار اللہ'' بنیں، تاکہ کافروں کے مقابلے میں اُن کو بھی اُسی طرح اللہ کی تائید حاصل ہو جس طرح پہلے ایمان لانے والوں کو حاصل ہوئی تھی۔

آیاتہا ۱۴ رکوعاتہا ۲

سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝١ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٢ كَبُرَ
مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٣ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہ غالب اور حکیم ہے۔[1]

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔[2] اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں

---

۱ - یہ اِس خطبے کی مختصر تمہید ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ الحدید، حاشیہ ۱-۲۔ کلام کا آغاز اِس تمہید سے اِس لیے کیا گیا ہے کہ آگے جو کچھ فرمایا جانے والا ہے، اس کو سننے یا پڑھنے سے پہلے آدمی یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور اِس سے بالاتر ہے کہ اس کی خدائی کا چلنا کسی کے ایمان اور کسی کی مدد اور قربانیوں پر موقوف ہو۔ وہ اگر ایمان لانے والوں کو ایمان میں خلوص اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ صداقت کا بول بالا کرنے کے لیے جان و مال سے جہاد کرو، تو یہ سب کچھ اُن کے اپنے ہی بھلے کے لیے ہے۔ ورنہ اُس کے ارادے اُس کے اپنے ہی زور اور اس کی اپنی ہی تدبیر سے پُورے ہو کر رہتے ہیں، خواہ کوئی بندہ اُن کی تکمیل میں ذرہ برابر بھی سعی نہ کرے، بلکہ ساری دنیا مل کر اُن کی مزاحمت پر تُل جائے۔

۲ - اس ارشاد کا ایک مدّعا تو عام ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ایک مدّعا خاص ہے جو بعد والی آیت کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلا مدّعا یہ ہے کہ ایک سچّے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے۔ جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے، اور کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ، یہ انسان کی اُن بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں، کجا کہ ایک ایسا شخص اِس اَخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص میں اِس صفت کا پایا جانا اُن علامات میں سے ہے جو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اٰیة المنافق ثلاث (زاد مسلم وان صام وصلّٰی و زعم انه مسلم) اذا حدّث کذب واذا وعد اخلف واذا اُئتمِنَ خَانَ (بخاری ومسلم)

منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اُس کی خلاف ورزی کرے، اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کر گزرے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے:

اربع من کن فیه کان منافقًا خالصًا ومن کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها ، اذا اُئتمِنَ خان، واذا حدّث کذب، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر۔ (بخاری ومسلم)

چار صفتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک صفت ان میں سے پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے۔ یہ کہ جب امانت اس کے سُپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بولے تو جھوٹ بولے، اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کر جائے، اور جب لڑے تو اَخلاق و دیانت کی حدیں توڑ ڈالے۔

فقہائے اسلام کا اِس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کرے (مثلاً کسی چیز کی نذر مانے)، یا بندوں سے کوئی معاہدہ کرے، یا کسی سے کوئی وعدہ کرے، تو اسے وفا کرنا لازم ہے، اِلّا یہ کہ وہ کام بجائے خود گناہ ہو جس کا اس نے عہد یا وعدہ کیا ہو۔ اور گناہ ہونے کی صورت میں وہ فعل تو نہیں کرنا چاہیے جس کا عہد یا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کی پابندی سے آزاد ہونے کے لیے کَفّارۂ یمین ادا کرنا چاہیے جو سورۂ مائدہ آیت ۸۹ میں بیان کیا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصّاص وابنِ عَرَبی)

یہ تو ہے اِن آیات کا عام مدّعا۔ رہا وہ خاص مدّعا جس کے لیے اِس موقع پر یہ آیات ارشاد فرمائی گئی ہیں، تو وہ بعد والی آیت کو ان کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ مقصود اُن لوگوں کو ملامت کرنا ہے جو اسلام کے لیے سرفروشی و جانبازی کے لمبے چوڑے وعدے کرتے تھے، مگر جب آزمایش کا وقت آتا تھا تو بھاگ نکلتے تھے۔ ضعیف الایمان لوگوں کی اِس کمزوری پر قرآنِ مجید میں کئی جگہ گرفت کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء، آیت ۷۷ میں فرمایا: ’’تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے، یا اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ کہتے ہیں: خدایا! یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی۔‘‘ اور سورۂ محمد، آیت ۲۰ میں فرمایا:

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں[۳]۔

"جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے)، مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمھاری طرف اِس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔" جنگِ اُحُد کے موقع پر یہ کمزوریاں خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آئیں جن کی طرف سورۂ آلِ عمران میں تیرھویں رکوع سے سترھویں رکوع تک مسلسل اشارات کیے گئے ہیں۔

مفسّرین نے ان آیات کی شانِ نزول میں اُن کمزوریوں کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں جن پر یہاں گرفت کی گئی ہے۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جہاد فرض ہونے سے پہلے مسلمانوں میں کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ کاش! ہمیں وہ عمل معلوم ہو جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو ہم وہی کریں۔ مگر جب بتایا گیا کہ وہ عمل ہے جہاد، تو ان پر اپنی اُس بات کو پُورا کرنا بہت شاق ہو گیا۔ مُقاتل بن حَیّان کہتے ہیں کہ اُحُد کی جنگ میں اِن لوگوں کو آزمائش سے سابقہ پیش آیا اور یہ حضورؐ کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ابنِ زیدؒ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلاتے تھے کہ آپؐ کو دشمنوں کے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلیں گے۔ مگر جب وقت آیا تو ان کے وعدے جھوٹے نکلے۔ قَتادہ اور ضحّاک کہتے ہیں کہ بعض لوگ جنگ میں شریک ہوتے بھی تھے تو کوئی کارنامہ انجام نہ دیتے تھے، مگر آ کر یہ ڈینگیں مارتے تھے کہ ہم یُوں لڑے اور ہم نے یُوں مارا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ملامت کی ہے۔

۳۔ اِس سے اوّل تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے وہی اہلِ ایمان سرفراز ہوتے ہیں جو اس کی راہ میں جان لڑانے اور خطرے سہنے کے لیے تیار ہوں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کو جو فوج پسند ہے، اس میں تین صفات پائی جانی چاہییں: ایک یہ کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر اللہ کی راہ میں لڑے، اور کسی ایسی راہ میں نہ لڑے جو فی سبیل اللہ کی تعریف میں نہ آتی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ بدنظمی و انتشار میں مبتلا نہ ہو، بلکہ مضبوط تنظیم کے ساتھ صف بستہ ہو کر لڑے۔ تیسری یہ کہ دشمنوں کے مقابلے میں اُس کی کیفیت "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کی سی ہو۔ پھر یہ آخری صفت بجائے خود اپنے اندر معنیٰ کی ایک دنیا رکھتی ہے۔ کوئی فوج اُس وقت تک میدانِ جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک اُس میں حسبِ ذیل صفات پیدا نہ ہو جائیں:

—— عقیدے اور مقصد میں کامل اتفاق، جو اس کے سپاہیوں اور افسروں کو آپس میں پُوری طرح متحد کر دے۔

—— ایک دوسرے کے خلوص پر اعتماد، جو کبھی اِس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا کہ سب فی الواقع اپنے مقصد میں مخلص اور ناپاک اغراض سے پاک ہوں۔ ورنہ جنگ جیسی سخت آزمائش کسی کا کھوٹ چھپا نہیں رہنے دیتی، اور اعتماد ختم ہو جائے تو فوج کے افراد ایک دوسرے پر بھروسا کرنے کے بجائے اُلٹا ایک دوسرے پر شک کرنے لگتے ہیں۔

—— اَخلاق کا ایک بلند معیار، جس سے اگر فوج کے افسر اور سپاہی نیچے گر جائیں تو ان کے دلوں میں نہ ایک دوسرے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

اور یاد کرو موسیٰؑ کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ "اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے اذیّت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟"[۴] پھر جب انھوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے، اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔[۵]

کی محبت پیدا ہو سکتی ہے نہ عزت، اور نہ وہ آپس میں متصادم ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

—— اپنے مقصد کا ایسا عشق اور اسے حاصل کرنے کا ایسا پختہ عزم جو پُوری فوج میں سرفروشی و جانبازی کا ناقابلِ تسخیر جذبہ پیدا کر دے اور وہ میدانِ جنگ میں واقعی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائے۔

یہی تھیں وہ بنیادیں جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں ایک ایسی زبردست عسکری تنظیم اُٹھی جس سے ٹکرا کر بڑی بڑی قوتیں پاش پاش ہو گئیں اور صدیوں تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہ ٹھیر سکی۔

۴- قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کو اللہ کا نبی اور اپنا مُحسن جاننے کے باوجود کس کس طرح تنگ کیا اور کیسی کیسی بے وفائیاں اُن کے ساتھ کیں۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۵۱-۵۵-۶۰-۶۷ تا ۷۱۔ النساء، ۱۵۳۔ المائدہ ۲۰ تا ۲۶۔ الاعراف ۱۳۸ تا ۱۴۱-۱۴۸ تا ۱۵۱۔ طٰہٰ ۸۶ تا ۹۸۔ بائبل میں خود یہودیوں کی اپنی بیان کردہ تاریخ بھی اِس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ صرف بطورِ نمونہ چند واقعات کے لیے دیکھیے: خُروج ۵:۲۰-۲۱، ۱۴:۱۱-۱۲، ۱۶: ۲-۳، ۱۷: ۳-۴- گنتی ۱۱:۱-۱۵، ۱۴: ۱-۱۰، ۱۶ مکمل، ۲۰: ۱-۵۔ یہاں اِن واقعات کی طرف اشارہ مسلمانوں کو خبردار کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ وہ رَوِش اختیار نہ کریں جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی کے ساتھ اختیار کی تھی، ورنہ وہ اُس انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔

۵- یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو لوگ خود ٹیڑھی راہ چلنا چاہیں، انھیں وہ خواہ مخواہ سیدھی راہ چلائے، اور جو لوگ اس کی نافرمانی پر تُلے ہوئے ہوں، اُن کو زبردستی ہدایت سے سرفراز فرمائے۔ اِس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا، بلکہ خود اس شخص یا قوم کی طرف سے ہوتا ہے۔ البتہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو گمراہی پسند کرے، وہ اس کے لیے راست روی کے نہیں بلکہ گمراہی کے اسباب ہی

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

اور یاد کرو عیسٰی ابنِ مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ ”اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف[۶]

فراہم کرتا ہے، تاکہ جن جن راہوں میں وہ بھٹکنا چاہے، بھٹکتا چلا جائے۔ اللہ نے تو انسان کو انتخاب کی آزادی (freedom of choice) عطا فرما دی ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہر انسان کا اور انسانوں کے ہر گروہ کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کرنا چاہتا ہے یا نہیں، اور راہِ راست پسند کرتا ہے یا ٹیڑھے راستوں میں سے کسی پر جانا چاہتا ہے۔ اس انتخاب میں کوئی جبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ اگر کوئی اطاعت اور ہدایت کی راہ منتخب کرے تو اللہ اسے جبراً گمراہی و نافرمانی کی طرف نہیں دھکیلتا، اور اگر کسی کا فیصلہ یہ ہو کہ اسے نافرمانی ہی کرنی ہے اور راہِ راست اختیار نہیں کرنی، تو اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ اسے مجبور کر کے طاعت و ہدایت کی راہ پر لائے۔ لیکن یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ جو شخص جس راستے کو بھی اپنے لیے منتخب کرے، اس پر وہ عملاً ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک اللہ اُس کے لیے وہ اسباب و ذرائع فراہم اور وہ حالات پیدا نہ کر دے جو اُس پر چلنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ یہی اللہ کی وہ ”توفیق“ ہے جس پر انسان کی ہر سعی کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار ہے۔ اب اگر کوئی شخص بھلائی کی توفیق سرے سے چاہتا ہی نہیں، بلکہ اُلٹی بُرائی کی توفیق چاہتا ہے تو اس کو وہی ملتی ہے۔ اور جب اسے بُرائی کی توفیق ملتی ہے تو اسی کے مطابق اس کی ذہنیت کا سانچا ٹیڑھا اور اس کی سعی و عمل کا راستہ کج ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کے اندر سے بھلائی کو قبول کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی معنٰی ہیں اِس ارشاد کے کہ ”جب انھوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔“ اس حالت میں یہ بات اللہ کے قانون کے خلاف ہے کہ جو خود گمراہی چاہتا ہے اور گمراہی کی طلب ہی میں سرگرم ہے اور اُسی میں آگے بڑھنے کے لیے اپنی ساری فکر و سعی صرف کر رہا ہے، اُسے جبراً ہدایت کی طرف موڑ دیا جائے، کیونکہ ایسا کرنا اُس آزمائش اور امتحان کے منشا کو فوت کر دے گا جس کے لیے دُنیا میں انسان کو انتخاب کی آزادی دی گئی ہے، اور اس طرح کی ہدایت پا کر اگر آدمی سیدھا چلے تو کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس پر وہ کسی اجر اور جزائے خیر کا مستحق ہو۔ بلکہ اِس صورت میں تو جسے زبردستی ہدایت نہ ملی ہو اور اس بنا پر وہ گمراہی میں پڑا رہ گیا ہو، وہ بھی کسی سزا کا مستحق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ پھر تو اُس کے گمراہ رہنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر آجاتی ہے اور وہ آخرت میں باز پُرس کے موقع پر یہ حجت پیش کر سکتا ہے کہ جب آپ کے ہاں زبردستی ہدایت دینے کا قاعدہ موجود تھا تو آپ نے مجھے اِس عنایت سے کیوں محروم رکھا؟ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ ”اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ یعنی جن لوگوں نے اپنے لیے خود فسق و نافرمانی کی راہ انتخاب کر لی ہے، ان کو وہ اطاعت و فرماں برداری کی راہ پر چلنے کی توفیق نہیں دیا کرتا۔

۶ — یہ بنی اسرائیل کی دوسری نافرمانی کا ذکر ہے۔ ایک نافرمانی وہ تھی جو انھوں نے اپنے دَورِ عُروج کے آغاز میں کی۔ اور دوسری نافرمانی یہ ہے جو اِس دَور کے آخری اور قطعی اختتام پر انھوں نے کی، جس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر خدا کی پھٹکار پڑ گئی۔ مدّعا اِن دونوں واقعات کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے رسول کے ساتھ بنی اسرائیل کا

Maktaba Tul Ishaat.com

اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوۡرٰىةِ

اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے،

ساطرزِ عمل اختیار کرنے کے نتائج سے خبردار کیا جائے۔

۷- اِس فقرے کے تین معنٰی ہیں اور تینوں صحیح ہیں:

ایک یہ کہ میں کوئی الگ اور نرالا دین نہیں لایا ہوں، بلکہ وہی دین لایا ہوں جو موسٰی علیہ السّلام لائے تھے۔ میں تورات کی تردید کرتا ہوا نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں، جس طرح ہمیشہ سے خدا کے رسول اپنے سے پہلے آئے ہوئے رسولوں کی تصدیق کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم میری رسالت کو تسلیم کرنے میں تأمُّل کرو۔

دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ مَیں اُن بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق تورات میں موجود ہیں۔ لہٰذا بجائے اِس کے کہ تم میری مخالفت کرو، تمھیں تو اِس بات کا خیر مَقدَم کرنا چاہیے کہ جس کے آنے کی خبر پچھلے انبیاؑ نے دی تھی وہ آ گیا۔

اور اِس فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے تیسرے معنٰی یہ نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی اُن کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اِس تیسرے معنٰی کے لحاظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اِس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسٰی علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔ اُس میں وہ فرماتے ہیں:

> ”خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورِب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے، اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظّارہ ہو، تاکہ مَیں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اُسے حکم دُوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو، جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لُوں گا۔“ (اِستِثنا، باب ۱۸، آیات ۱۵-۱۹)

یہ تورات کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہوسکتی۔ اس میں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد سنا رہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کے ”بھائیوں“ سے مراد خود اُسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہوسکتا، بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہوسکتی

ہے جس کے ساتھ اُس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ ’’میں تمھارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا‘‘۔ لہٰذا ’’بنی اسرائیل کے بھائیوں‘‘ سے مراد لامحالہ بنی اسماعیل ہی ہو سکتے ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر اُن کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں، جن کے ذکر سے بائبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اِس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا، وہ حضرت موسیٰؑ کے مانند ہوگا۔ اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل صورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے، کیونکہ اِس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اِس سے مراد محض وصفِ نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصف اُن تمام انبیاءؑ میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے ہیں، اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اِس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہِ مماثلت، جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اِس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپؐ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے، وہ شریعتِ موسوی کے پیرو تھے، ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اِس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے اِن الفاظ سے ملتی ہے کہ ’’یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورِب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظّارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا‘‘۔ اس عبارت میں حورِب سے مُراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی مرتبہ احکامِ شریعت دیے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آیندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورِب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اُن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائبل میں بھی۔ (ملاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۵۵-۵۶-۶۳۔ الاعراف، آیات ۱۵۵-۱۷۱۔ بائبل، کتابِ خُروج، ۱۹: ۱۷-۱۸) اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری یہ درخواست قبول کر لی ہے، اُس کا ارشاد ہے کہ مَیں اُن کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں مَیں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یعنی آیندہ شریعت دینے کے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہ کیے جائیں گے جو حورِب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے، بلکہ اب جو نبی اِس منصب پر مامور کیا جائے گا، اُس کے منہ میں بس اللہ کا کلام ڈال دیا جائے گا اور وہ اسے خلقِ خدا کو سنا دے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہے کی گنجایش رہ جاتی ہے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ

اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ ۸

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اِس کا مِصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت موسیٰؑ کے بعد مستقل شریعت صرف آپؐ ہی کو دی گئی، اُس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورِب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا، اور کسی وقت بھی احکامِ شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔

۸ – یہ قرآنِ مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانتِ مُجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

۱ – اِس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی ”احمد“ بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنیٰ ہیں: ایک، وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد طَیالِسی میں حضرت ابوموسیٰ اَشعَریؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: انا محمد وانا احمد والحاشر...... ”میں محمد ہوں، اور میں احمد ہوں، اور میں حاشر ہوں............“ اِسی مضمون کی روایات حضرت جُبَیرؓ بن مُطعِم سے امام مالک، بخاری، مُسلم، دارمی، ترمذِی اور نَسائی نے نقل کی ہیں۔ حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی صحابہؓ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حَسّانؓ بن ثابت کا شعر ہے:

صلی الالٰہ ومن یحف بعرشه   والطیبون علی المبارك احمد

”اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمد پر دُرود بھیجا ہے۔“

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضورؐ کا نامِ مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پُورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں آپؐ کا یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچّوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام اُن کو قرار دیا تھا؟

۲ – انجیلِ یُوحنّا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے: ایک مسیح، دوسرے ایلیّاہ (یعنی حضرت الیاسؑ کی آمدِ ثانی)، اور تیسرے ”وہ نبی“۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اور یُوحنّا (حضرت یحییٰ علیہ السّلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوِی یہ پوچھنے کو اُس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے، تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا، بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا: پھر کون ہے؟ کیا تو اِیلیّاہ ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں ہوں۔ کیا تُو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا: پھر تُو ہے کون؟...... اس نے کہا: میں، جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو...... انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تُو نہ مسیح ہے، نہ اِیلیّاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (باب ۱، آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اِس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا، یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "جس کی خبر تورات میں دی گئی ہے۔" مزید برآں اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا، کیونکہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام سے یہ سوالات کیے گئے تو انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو؟

۳- اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیلِ یُوحنّا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ اَبد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی، کیونکہ نہ اُسے دیکھتی ہے اور نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو، کیونکہ وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے اور تمھارے اندر ہو گا۔" (۱۴: ۱۶-۱۷)

"مَیں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القُدس، جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ مَیں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔" (۱۴: ۲۵-۲۶)

"اِس کے بعد مَیں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (۱۴: ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی روحِ حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔" (۱۵: ۲۶)

"لیکن مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" (۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے، مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

یعنی رُوحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا،
لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس
لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمھیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے، وہ سب میرا ہے۔ اس لیے
میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمھیں خبریں دے گا۔" (۱۶: ۱۲-۱۵)

۴- ان عبارتوں کے معنیٰ متعیّن کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السّلام اور ان کے ہم عصر اہلِ فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُریانی (Syriac) کہا جاتا ہے۔ مسیحؑ کی پیدائش سے دو ڈھائی سو برس پہلے ہی سُلُوقی (Seleucide) اقتدار کے زمانے میں اِس علاقے سے عبرانی رخصت ہو چکی تھی اور سُریانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوقی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکارِ دربار میں رسائی پا کر، یا رسائی حاصل کرنے کی خاطر یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سُریانی کی ایک خاص بولی (dialect) استعمال کرتے تھے، جس کے لہجے اور تلفُّظات اور محاورات دِمَشق کے علاقے میں بولی جانے والی سُریانی سے مختلف تھے، اور اس ملک کے عوام یونانی سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب ۷۰ء میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل تیتُس (Titus) نے اہلِ یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا، وہ لامحالہ سُریانی زبان ہی میں ہو گا۔

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے بعد اِس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ اُن تک حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے اقوال و اعمال کی تفصیلات سُریانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعے سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی رِوایات کی شکل میں پہنچی تھیں، اور اِن سُریانی روایات کو انھوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیلِ یُوحنّا تو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے ایک صدی بعد غالبًا ایشیائے کوچک کے شہر اِفِسُس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اُس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداءً یہ لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے جتنے یونانی مُسَوّدات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ ردّ و بدل ہوئے ہوں گے۔ اس معاملے کو جو چیز خاص طور پر مُشتبَہ بنا دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تَغیُّر و تَبدُّل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ایڈیشن ۱۹۴۶ء) کے مضمون "بائبل" کا مصنف لکھتا ہے:

"اناجیل میں ایسے نمایاں تغیُّرات دانستہ کیے گئے ہیں، جیسے مثلاً بعض پُوری پُوری عبارتوں کو کسی دوسرے
ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا...... یہ تغیُّرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں

جنھیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا، اور وہ اپنے آپ کو اِس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اُس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں...... بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے، اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔“

اِس صورتِ حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال ہمیں ملتے ہیں، وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوئے ہیں اور ان کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا ہے۔

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُریانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اس کی جگہ لی۔ ان سُریانی بولنے والے اہلِ فلسطین کے ذریعے سے عیسائی رِوایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علما کو حاصل ہوئیں، وہ اُن لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر ہونی چاہییں جنھیں سُریانی سے یونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُریانی الفاظ اُن کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

۵- اِن ناقابلِ انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیلِ یُوحنّا کی مذکورۂ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں، جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ ”دنیا کا سردار“ (سرورِ عالَم) ہو گا، ”اَبد تک“ رہے گا، ”سچّائی کی تمام راہیں دکھائے گا“، اور خود اُن کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ کی) ”گواہی دے گا“۔ یُوحنّا کی ان عبارتوں میں ”رُوح القُدُس“ اور ”سچّائی کی رُوح“ وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدعا کو خَبط کرنے کی پُوری کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے، وہ کوئی رُوح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے، جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر، اور قیامت تک باقی رہنے والی ہو گی۔ اُس شخصِ خاص کے لیے اُردو ترجمے میں ”مددگار“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور یُوحنّا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ Paracletus تھا۔ مگر اُس کے معنیٰ متعین کرنے میں خود عیسائی علما کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں Paraclete کے کئی معنیٰ ہیں: کسی جگہ کی طرف بُلانا، مدد کے لیے پکارنا، اِنذار و تنبیہ، ترغیب، اکسانا، التجا کرنا، دعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ ہینی مفہوم میں یہ معنیٰ دیتا ہے: تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمت افزائی کرنا۔ بائبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے، ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنیٰ بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اوراِجن (Origen) نے کہیں اس کا ترجمہ consolator کیا ہے اور کہیں deprecator۔ مگر دوسرے مفسّرین نے ان دونوں ترجموں کو ردّ کر دیا، کیونکہ اوّل تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنیٰ نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ teacher کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنیٰ بھی اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ترتولیان اور آگسٹائن نے لفظ advocate کو ترجیح دی ہے، اور بعض اور لوگوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

assistant، comforter اور consoler وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ ''پیریکلیٹس'')

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ Periclytos موجود ہے جس کے معنی ہیں: ''تعریف کیا ہوا''۔ یہ لفظ بالکل ''محمد'' کا ہم معنی ہے، اور تلفّظ میں اس کے اور Paracletus کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلّف ردّ و بدل کر لینے کے خُوگر رہے ہیں، انھوں نے یُوحنّا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے اِملا میں یہ ذرا سا تغیّر کر دیا ہو۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یُوحنّا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جا سکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کون سا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

۷- لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یُوحنّا نے یونانی زبان میں دراصل کون سا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا، اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان، جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں، فلسطین کی سُریانی تھی، اس لیے انھوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا، وہ لامحالہ کوئی سُریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل سُریانی لفظ ہمیں ابنِ ہِشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اس کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاقؒ کے حوالے سے ابنِ ہِشامؒ نے یُحَنَّس (یُوحنّا) کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷، اور باب ۱٦ آیت ۱ کا پُورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی ''فارقلیط'' کے بجائے سُریانی زبان کا لفظ مُنْحَمَنّا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاقؒ یا ابن ہشامؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ ''مُنْحَمَنّا کے معنی سُریانی میں محمد اور یونانی میں بَرقلیطُس ہیں۔'' (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۲۴۸)

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصفِ اوّل سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابنِ اسحاقؒ نے ۷٦۸ء میں اور ابنِ ہشام نے ۸۲۸ء میں وفات پائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُریانی بولتے تھے، اور ان دونوں کے لیے اپنے مُلک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اُس زمانے میں یُونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ سُریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کون سا لفظ ہے۔ اب اگر ابنِ اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سُریانی لفظ مُنْحَمَنّا استعمال ہوا ہے، اور ابنِ اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ ''محمد'' اور یونانی میں ''بَرقلیطُس'' ہے، تو اس امر میں کسی شک کی گنجایش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسٰیؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپؐ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یُوحنّا کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ Periclytos استعمال ہوا تھا، جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت Paracletus سے بدل دیا۔

۸- اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی یہ روایت ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں تو اُس نے کہا: مَرْحَبًا بِكُمْ وَبِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ، اَشْهَدُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّهُ الَّذِيْ نَجِدُ فِي الْاِنْجِيْلِ وَاَنَّهُ الَّذِيْ بَشَّرَ بِهٖ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ۔ (مُسندِ احمد) یعنی ’’مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں، اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے دی تھی۔‘‘ یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس نبی کی ایسی صاف نشان دہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تأمّل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اِس روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعۂ معلومات یہی انجیلِ یُوحنّا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اُس وقت موجود تھا۔

۹- حقیقت یہ ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئیوں کو نہیں، خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلَّم اناجیل (Canonical Gospels) قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ وہ انجیلِ برناباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصّحت (apocryphal) کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چُھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے کُتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہُوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہو گیا تھا۔ مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ دوسرا ایک نسخہ اِسی اطالوی ترجمے سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا، جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مُقدِّمے میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتا نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، جس سے عیسائیوں نے محض تعصّب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے، جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اِس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مُقدِمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طَبَری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابنِ حَزم اور دوسرے مصنّفین، جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیلِ برناباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کُتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں، ان کی بہترین فہرستیں ابنِ ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کَشفُ الظُّنُون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیلِ برناباس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گِلاسِیَس اوّل (Gelasius) کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کُن (heretical) کتابوں کی جو فہرست مرتّب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعے سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، اُن میں انجیلِ برناباس (Evangelium Barnabe) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کون سا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟ یہ بات تو خود عیسائی علما نے تسلیم کی ہے کہ شام، اسپین، مصر وغیرہ مَمالک کے ابتدائی مسیحی کلیسا میں ایک مدّت تک برناباس کی انجیل رائج رہی ہے اور چھٹی صدی میں اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ قبل اس کے کہ اِس انجیل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بشارتیں نقل کی جائیں، اس کا مختصر تعارف کرا دینا ضروری ہے، تاکہ اس کی اہمیّت معلوم ہو جائے اور یہ بھی سمجھ میں آ جائے کہ عیسائی حضرات اس سے اتنے ناراض کیوں ہیں۔

بائبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کا صحابی نہ تھا۔ اور اُن میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرتؑ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں، ان کا کوئی حوالہ انھوں نے نہیں دیا ہے، جس سے یہ پتا چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور وہ اقوال سُنے ہیں جنھیں وہ بیان کر رہا ہے، یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے انجیلِ برناباس کا مصنف کہتا ہے کہ میں مسیحؑ کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر وقت تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں، اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اِس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے

رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں، ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے۔

یہ برناباس کون تھا؟ بائبل کی کتابِ اعمال میں بڑی کثرت سے اِس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قُبرُص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیّت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیح کی مدد واعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب دینِ مسیحؑ میں داخل ہوا، اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے، اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنّف وہی برناباس ہے یا کوئی اور۔ متّی اور مَرقُس نے حواریوں (Apostles) کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک تُوما، جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون قنانی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لُوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہو گا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے تُوما کا نام داخل کیا گیا ہے، تاکہ اُس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیّرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے، تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اُن چاروں سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربُوط بھی ہے اور اِس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصّل اور مؤثّر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی رُوح اور اَخلاقِ فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُرزور اور مدلّل اور مفصّل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایے میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں، ان کا عُشرِ عَشِیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبُور ہو گا کہ یہ کوئی جَعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیلِ اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں اُن تضادات کا نام ونشان بھی نہیں ہے جو اناجیلِ اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اس انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تمام پچھلے انبیاؑ اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

صاف کہتے ہیں کہ انبیا علیہم السّلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاؑ کو چھوڑتا ہے، وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاؑ نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاؑ میں سے وہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاؑ کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر کے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

۱۱- عیسائی جس وجہ سے انجیلِ برناباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضورؐ کی پیدایش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو ردّ کر چکے تھے۔ ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملے میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے اُن کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسٰیؑ کو ''مسیح'' تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے، اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اِس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں، اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اِس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اِس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا، جس کے عقائد اور اُصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اِس شخص نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی، بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیرووں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اِس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا، اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی، بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اِس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (Gentile) دُنیا قبول کر لے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعتِ یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام وحلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا، جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتّٰی کہ اس نے مسیحؑ کی اُلوہیّت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدایشی گناہ کا کفّارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا، کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیرووں نے اِن بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ

کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اِس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھیر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحؑ کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیا (Nicaea) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیّت کا مُسلَّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیَس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں، جو اِس عقیدے کے خلاف ہوں، مردُود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھیرائی جائیں جو اِس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعے سے معتبر و مسلَّم کتابوں کے ایک مجموعے کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمیسیس (Damasius) کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیَس (Gelasius) نے اس مجموعے کو مسلَّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مرتَّب کر دی جو غیر مسلَّم تھیں۔ حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ اُن میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعے میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیلِ برناباس اِن غیر مسلَّم کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیّت کے اِس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ ”اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آ کر یسُوع کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھیراتے ہیں، اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکا کھانے والا پولوس بھی ہے۔“ وہ بتاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ دنیا میں موجود تھے، اُس زمانے میں اُن کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ چھوت بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ سخت پریشان ہوئے۔ اُنھوں نے بار بار نہایت شدّت کے ساتھ اپنے متعلق اِس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے شاگردوں کو پُورے یہودیہ میں اس عقیدے کی تردید کے لیے بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صادر ہوتے تھے، تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آ جائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں، وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلے میں وہ حضرت عیسیٰؑ کی مفصّل تقریریں نقل کرتا ہے، جن میں انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اِس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اِس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید برآں وہ اِس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السّلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریُوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجنابؑ کو اُٹھا لے گئے، اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام۔ اِس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پُوری توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نُزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اُس کے اِن بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اُسے ردّ کر چکے تھے۔

۱۲- اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیلِ برناباس درحقیقت اناجیلِ اربعہ سے زیادہ معتبر انجیل ہے، مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اِس انجیل کے ذریعے سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع اُن کو ملا تھا، اسے محض ضد کی بنا پر انھوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پُورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برناباس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام سے روایت کی ہیں۔ ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں، کہیں ”رسول اللہ“ کہتے ہیں، کہیں آپؐ کے لیے ”مسیح“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں ”قابلِ تعریف“ (admirable) کہتے ہیں، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کے ہم معنٰی ہیں۔ ہمارے لیے اُن ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے، کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سِیاق وسَباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتّب ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم محض بطورِ نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

> ”تمام انبیاؑ جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا، جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انھوں نے اِبہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیاؑ اور مقدس ہستیوں کا نور آئے گا جو انبیاؑ کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا، کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے۔“ (باب ۱۷)

> ”فریسیوں اور لاویوں نے کہا: اگر تو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں تو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسُوع نے جواب دیا: جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے، وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے، ورنہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو اُس خدا کے رسول کے موزے کے بند یا اس کی جُوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا، تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو۔“ (باب ۴۲)

> ”بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان انبیاؑ کی باتیں اُن لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن

کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خدا گویا اس کو اپنے ہاتھ کی مُہر دے دے گا، یہاں تک کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دے گا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قَلع قَمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا۔" اِس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ (باب ۴۳)

"اس لیے مَیں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی، کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خَشیّت اور مَحبّت، حَزم اور وَرع کی رُوح سے آراستہ ہے۔ وہ فیّاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی رُوح سے مزیّن ہے، جو اس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گُنی پائی ہے جنھیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ روح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے۔ اس کی روح کو دیکھنے ہی سے خدا نے اُن کو نبوّت دی۔ اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری رُوح سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اَے محمدؐ! خدا تمھارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمھاری جُوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پالُوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا۔" (باب ۴۴)

"(میرے جانے سے) تمھارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ میں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ خدا ہمارا خالق، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، وہی تمھاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں، تو اِس وقت مَیں دنیا میں اُس رسولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا...... اِندریاس نے کہا: اُستاد! ہمیں اس کی نشانی بتا دے، تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسُوع نے جواب دیا: وہ تمھارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمھارے کچھ سال بعد آئے گا جب کہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اُس وقت اللہ دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا، جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہوگا، جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعے سے خدا کی معرفت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بُت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اُس کی بڑی خوشی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے...... وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاؑ کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی۔" (باب ۷۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

”خدا کا عہد یروشلم میں، مَعْبَدِ سلیمان کے اندر کیا گیا تھا نہ کہ کہیں اور۔ مگر میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اس کی صحیح عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچّی نماز کو قبول فرمائے گا...... میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی۔“ (باب ۸۳)

”(یسُوع نے سردار کاہن سے کہا) زندہ خدا کی قسم! جس کے حُضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیمؑ سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ ”تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی“ (پیدایش، ۲۲:۱۸)۔ مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ ناپرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اُس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ بمشکل ۳۰ صاحبِ ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا، جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کرلیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اِس کی باتوں کو مانے۔“ (باب ۹۶)

”سردار کاہن نے پوچھا: کیا خدا کے اُس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسُوعؑ نے جواب دیا: اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچّے نبی نہیں آئیں گے، مگر بہت سے جھوٹے نبی آجائیں گے، جن کا مجھے بڑا غم ہے۔ کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے اُن کو اُٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے۔“ (باب ۹۷)

”سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پُکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسُوعؑ نے جواب دیا: اس مسیح کا نام ”قابلِ تعریف“ ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی، اس وقت اُس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا: ”اے محمدؐ! انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر مَیں جنّت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اُس کو تجھے تحفے کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی، اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی۔ جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچّی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے، مگر

تیرا دین نہیں ٹلے گا۔ سو اُس کا مبارک نام محمدؐ ہے۔" (باب ۹۷)

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریُوتی نکلا) مجھے ۳۰ سِکّوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اُوپر اُٹھا لے گا اور اُس غدار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ مَیں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی۔ مگر جب محمدؐ، خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دُور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اُس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اِس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ مَیں زندہ ہوں اور اُس ذلّت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" (باب ۱۱۳)

"(شاگردوں سے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کہا:) بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤدؑ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داؤدؑ کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا۔ کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔" (باب ۱۲۴)

اِن صاف اور مفصل پیشین گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں: ایک یہ کہ اِن میں، اور انجیلِ برناباس کی متعدّد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف اِنھی عبارتوں میں نہیں بلکہ اِس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل عربی نام "محمدؐ" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاؑ کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد کی آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کہا گیا ہے۔

پہلے شُبہے کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیلِ برناباس ہی میں نہیں بلکہ لُوقا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ لُوقا کے الفاظ یہ ہیں: "اُس نے اُن سے کہا: لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا کہ خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا۔" (۹: ۲۰-۲۱) غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے، اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا، اس لیے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں، بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شُبہے کا جواب یہ ہے کہ برناباس کا جو اطالوی ترجمہ اِس وقت دنیا میں موجود ہے، اس کے اندر تو حضورؐ

Maktaba Tul Ishaat.com

کا نام بے شک محمد لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ در ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیلِ برناباس سُریانی زبان میں ہوگی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جاسکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ مُنْحَمَنَّا استعمال کیا ہوگا، جیسا کہ ہم ابنِ اسحاق کے دیے ہوئے انجیلِ یُوحَنّا کے حوالے سے بتا چکے ہیں۔ پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیشین گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے، وہ بالکل لفظ "محمد" کا ہم معنیٰ ہے، آپؐ کا یہی اسمِ گرامی لکھ دیا ہوگا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پوری انجیلِ برناباس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہے کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے، جسے قرآنِ مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اِس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی اُن کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ "مسیح" استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپؐ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ انجیلِ برناباس آپؐ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مَل کر اُسے متبرک (consecrate) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل مَلنے کے اس فعل کو مسح کہتے تھے، اور جس پر یہ مَلا جاتا تھا اسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت گاہ کے ظروف اِسی طریقے سے مسح کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں کو کہانت (priesthood) کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوت کے لیے نامزد کیے جاتے تو انھیں مسح کیا جاتا۔ چنانچہ بائبل کی رُو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارونؑ کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے۔ حضرت موسیٰؑ کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤدؑ بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، مَلکِ صَدَق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت اَلْیَسَعْ نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تیل مَل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا ہی مسیح ہونے کا ہم معنیٰ بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے: ۱-سلاطین، باب ۱۹ [آیات ۱۵-۱۶] میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حَزَائیل کو مسح کر کہ اَرام (دِمَشق) کا بادشاہ ہو، اور نِمسی کے بیٹے یاہُو کو مسح کر کہ اسرائیل کا بادشاہ ہو، اور الیشع (اَلْیَسَعْ) کو مسح کر کہ تیری جگہ نبی ہو۔ ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔ بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریت کا فیصلہ سنا دینا ہی گویا انھیں مسح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی تصوّر کے مطابق لفظِ مسیح درحقیقت "مامور من اللہ" کا ہم معنیٰ تھا اور اسی معنیٰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ
اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ
اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸

مگر جب وہ ان کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا: یہ تو صریح دھوکا ہے۔[9] "اب بھلا اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھُوٹے بہتان باندھے،[10] حالانکہ اسے اسلام (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے) کی دعوت دی جا رہی ہو؟[11] ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ لوگ اپنے مُنہ کی پُھونکوں سے اللہ کے نور کو بُجھانا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نُور کو پُورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[12]

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔ (لفظ "مسیح" کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سائیکلو پیڈیا آف بِبلیکل لٹریچر، لفظ "مسّیاہ")

۹ – اصل میں لفظ سِحْرٌ استعمال ہوا ہے۔ سِحْر یہاں جادُو کے نہیں بلکہ دھوکے اور فریب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی لغت میں جادُو کی طرح اس کے یہ معنی بھی معروف ہیں۔ کہتے ہیں: سَحَرَهٗ ای خَدَعَهٗ "اس نے فلاں شخص پر سِحر کیا، یعنی اس کو فریب دیا"۔ دل چھین لینے والی آنکھ کو عین ساحرۃ کہا جاتا ہے، یعنی "ساحر آنکھ"۔ جس زمین میں ہر طرف سَراب ہی سَراب نظر آئے، اس کو ارض ساحرۃ کہتے ہیں۔ چاندی کو مُلمّع کر کے سونے جیسا کر دیا جائے تو کہتے ہیں: سُحرت الفضّۃُ۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ نبی، جس کے آنے کی بشارت عیسٰی علیہ السّلام نے دی تھی، اپنے نبی ہونے کی تین نشانیوں کے ساتھ آ گیا تو بنی اسرائیل اور اُمّتِ عیسٰی نے اُس کے دعوائے نبوت کو صریح فریب قرار دیا۔

۱۰ – یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نبی کو جھوٹا مدّعی قرار دے، اور اللہ کے اُس کلام کو جو اس کے نبی پر نازل ہو رہا ہو، نبی کا اپنا گھڑا ہوا کلام ٹھیرائے۔

۱۱ – یعنی اوّل تو سچّے نبی کو جھوٹا مدّعی کہنا ہی بجائے خود کچھ کم ظلم نہیں ہے، کجا کہ اس پر مزید ظلم یہ کیا جائے کہ بُلانے والا تو خدا کی بندگی و اطاعت کی طرف بُلا رہا ہو، اور سُننے والا جواب میں اسے گالیاں دے اور اس کی دعوت

Maktaba Tul Ishaat.com

هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ
عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَ لَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝٩ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ع
هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝١٠

وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پُورے کے پُورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[۱۳] ع

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، مَیں بتاؤں تم کو وہ تجارت[۱۴] جو تمھیں عذابِ الیم سے بچا دے؟

کو زک دینے کے لیے جھُوٹ اور بہتان اور افترا پردازیوں کے ہتھکنڈے استعمال کرے۔

۱۲ – یہ بات نگاہ میں رہے کہ یہ آیات ۳ ہجری میں جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی تھیں، جب کہ اسلام صرف شہر مدینہ تک محدُود تھا، مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سارا عرب اِس دین کو مٹا دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اُحُد کے معرکے میں جو زک مسلمانوں کو پہنچی تھی، اس کی وجہ سے اُن کی ہوا اکھڑ گئی تھی، اور گردوپیش کے قبائل اُن پر شیر ہوگئے تھے۔ اِن حالات میں فرمایا گیا کہ اللہ کا یہ نُور کسی کے بُجھائے بُجھ نہ سکے گا، بلکہ پُوری طرح روشن ہو کر اور دنیا بھر میں پھیل کر رہے گا۔ یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اللہ کے سوا اُس وقت اور کون یہ جان سکتا تھا کہ اسلام کا مستقبل کیا ہے؟ انسانی نگاہیں تو اُس وقت یہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جسے بجھا دینے کے لیے بڑے زور کی آندھیاں چل رہی ہیں۔

۱۳ – ''مشرکین'' کو ناگوار ہو، یعنی اُن لوگوں کو جو اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگیاں ملاتے ہیں، اور اللہ کے دین میں دوسرے دینوں کی آمیزش کرتے ہیں۔ جو اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ پُورا کا پُورا نظامِ زندگی صرف ایک خدا کی اطاعت اور ہدایت پر قائم ہو۔ جنھیں اس بات پر اصرار ہے کہ جس جس معبُود کی چاہیں گے بندگی کریں گے، اور جن جن فلسفوں اور نظریات پر چاہیں گے اپنے عقائد و اَخلاق اور تہذیب وتمدُّن کی بنیاد رکھیں گے۔ ایسے سب لوگوں کے عَلَی الرَّغم یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کا رسول اُن کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے، بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ جو ہدایت اور دینِ حق وہ اللہ کی طرف سے لایا ہے، اسے پُورے دین، یعنی نظامِ زندگی کے ہر شعبے پر غالب کر دے۔ یہ کام اُسے بہرحال کر کے رہنا ہے۔ کافر اور مشرک مان لیں تو، اور نہ مانیں تو، اور مُزاحمت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں تو، رسولؐ کا یہ مشن ہر حالت میں پُورا ہو کر رہے گا۔ یہ اعلان اس سے پہلے قرآن میں دو جگہ ہو چکا ہے۔ ایک، سورۂ توبہ آیت ۳۳ میں۔ دوسرے، سورۂ فتح آیت ۲۸ میں۔ اب تیسری مرتبہ اسے یہاں دُہرایا جا رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ
مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۙ﴿۱۲﴾ وَ اُخْرٰى
تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر[۱۵]، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو[۱۶]۔ اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور اَبدی قیام کی جنّتوں میں بہترین گھر تمھیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی[۱۷]۔ اور وہ دُوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمھیں دے گا، اللہ کی طرف سے نُصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح[۱۸]۔ اے نبیؐ! اہلِ ایمان کو اِس کی بشارت دے دو۔

۳۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۵۱)

۱۴۔ تجارت وہ چیز ہے جس میں آدمی اپنا مال، وقت، محنت اور ذہانت و قابلیت اس لیے کھپاتا ہے کہ اس سے نفع حاصل ہو۔ اسی رعایت سے یہاں ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کو تجارت کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس راہ میں اپنا سب کچھ کھپاؤ گے تو وہ نفع تمھیں حاصل ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہی مضمون سورۂ توبہ، آیت ۱۱۱ میں ایک اور طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۰۶)

۱۵۔ ایمان لانے والوں سے جب کہا جائے کہ ایمان لاؤ، تو اس سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ مخلص مسلمان بنو۔ ایمان کے محض زبانی دعوے پر اکتفا نہ کرو، بلکہ جس چیز پر ایمان لائے ہو، اس کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

۱۶۔ یعنی یہ تجارت تمھارے لیے دنیا کی تجارتوں سے زیادہ بہتر ہے۔

۱۷۔ یہ اس تجارت کے اصل فوائد ہیں جو آخرت کی اَبدی زندگی میں حاصل ہوں گے۔ ایک، خدا کے عذاب سے

Maktaba Tul Ishaat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ
بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

ع ۲

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے حواریوں[۱۹] کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے میں) میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"[۲۰]۔ اُس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دُوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی اُن کے دُشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے[۲۱]۔ ع

محفوظ رہنا۔ دوسرے، گناہوں کی معافی۔ تیسرے، خدا کی اُس جنّت میں داخل ہونا جس کی نعمتیں لازوال ہیں۔

۱۸– دنیا میں فتح و کامرانی بھی اگرچہ اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، لیکن مومن کے لیے اصل اہمیت کی چیز یہ نہیں ہے بلکہ آخرت کی کامیابی ہے۔ اسی لیے جو نتیجہ دنیا کی اِس زندگی میں حاصل ہونے والا ہے اُس کا ذکر بعد میں کیا گیا، اور جو نتیجہ آخرت میں رُونما ہونے والا ہے اس کے ذکر کو مقدم رکھا گیا۔

۱۹– حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ساتھیوں کے لیے بائبل میں عُموماً لفظ "شاگرد" استعمال کیا گیا ہے، لیکن بعد میں ان کے لیے "رسول" (apostles) کی اصطلاح عیسائیوں میں رائج ہوگئی، اِس معنی میں نہیں کہ وہ خدا کے رسول تھے، بلکہ اِس معنی میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کو اپنی طرف سے مبلغ بنا کر اطرافِ فلسطین میں بھیجا کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں یہ لفظ پہلے سے اُن لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا جو ہیکل کے لیے چندہ جمع کرنے بھیجے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں قرآن کی اصطلاح "حواری" اِن دونوں مسیحی اصطلاحوں سے بہتر ہے۔ اس لفظ کی اصل "حَوَر" ہے، جس کے معنیٰ سفیدی کے ہیں۔ دھوبی کو حواری کہتے ہیں، کیونکہ وہ کپڑے دھو کر سفید کر دیتا ہے۔ خالص اور بے آمیز چیز کو بھی حواری کہا جاتا ہے۔ جس آٹے کو چھان کر بُھوسی نکال دی گئی ہو اسے حُوّاریٰ کہتے ہیں۔ اسی معنیٰ میں خالص دوست اور بے غرض حامی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ابنِ سِیدہ کہتا ہے: "ہر وہ شخص جو کسی کی مدد کرنے میں مبالغہ کرے، وہ

اس کا حواری ہے۔" (لسان العرب)

۲۰ - یہ آخری مقام ہے جہاں قرآنِ مجید میں ان لوگوں کو اللہ کا مددگار کہا گیا ہے جو خلقِ خدا کو دین کی طرف بلانے اور اللہ کے دین کو کفر کے مقابلے میں غالب کرنے کی جدّ وجُہد کریں۔ اس سے پہلے یہی مضمون سورۂ آلِ عمران، آیت ۵۲، سورۂ حج، آیت ۴۰، سورۂ محمد، آیت ۷، سورۂ حدید، آیت ۲۵، اور سورۂ حشر، آیت ۸ میں گزر چکا ہے، اور ان آیات کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۵۰، جلد سوم، الحج، حاشیہ ۸۴، جلد پنجم، سورۂ محمد، حاشیہ ۱۲، اور سورۂ حدید، حاشیہ ۴۷ میں کر چکے ہیں، نیز سورۂ محمد، حاشیہ ۹ میں بھی اس مسئلے کے ایک گوشے پر واضح روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگوں کے ذہن میں یہ اُلجھن پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادرِ مُطلَق ہے، تمام خَلق سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، تو کوئی بندہ آخر اللہ کا مددگار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس اُلجھن کو رفع کرنے کے لیے ہم یہاں اس مسئلے کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں۔

دراصل ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ رب العالمین، معاذ اللہ، کسی کام کے لیے اپنی کسی مخلوق کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کی آزادی بخشی ہے، اس میں وہ لوگوں کو اپنی قوتِ قاہرہ سے کام لے کر بجبر مومن و مطیع نہیں بناتا، بلکہ اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے تذکیر و تعلیم اور تفہیم و تلقین کا طریقہ اختیار فرماتا ہے۔ اِس تذکیر و تعلیم کو جو شخص برضا و رغبت قبول کر لے وہ مومن ہے، جو عملاً مطیعِ فرمان بن جائے وہ مسلم و قانت اور عابد ہے، جو خدا ترسی کا رَویّہ اختیار کر لے وہ متقی ہے، جو نیکیوں کی طرف سبقت کرنے لگے وہ محسن ہے، اور اس سے مزید ایک قدم آگے بڑھ کر جو اِسی تذکیر و تعلیم کے ذریعے سے بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے اور کفر و فسق کی جگہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کرنے کے لیے کام کرنے لگے، اسے اللہ تعالیٰ خود اپنا مددگار قرار دیتا ہے، جیسا کہ آیاتِ مذکورۂ بالا میں کئی جگہ بالفاظِ صریح ارشاد ہوا ہے۔ اگر اصل مقصود اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کے دین کا مددگار کہنا ہوتا تو اَنۡصَارُ اللّٰہِ کے بجائے اَنۡصَارُ دِیۡنِ اللّٰہِ فرمایا جاتا، یَنۡصُرُوۡنَ اللّٰہَ کے بجائے یَنۡصُرُوۡنَ دِیۡنَ اللّٰہِ فرمایا جاتا، اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ کے بجائے اِنۡ تَنۡصُرُوۡا دِیۡنَ اللّٰہِ فرمایا جاتا۔ جب ایک مضمون کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے کئی مقامات پر ایک ہی طرزِ بیان اختیار فرمایا ہے تو یہ اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ اصل مقصود ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار ہی کہنا ہے۔ مگر یہ "مددگاری" نعوذ باللہ، اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں جس کے لیے وہ ان کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس معنیٰ میں ہے کہ یہ لوگ اُسی کام میں حصّہ لیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنی قوتِ قاہرہ کے ذریعے سے کرنے کے بجائے اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے کرنا چاہتا ہے۔

۲۱ - مسیحؑ پر ایمان نہ لانے والوں سے مراد یہودی، اور ایمان لانے والوں سے مراد عیسائی اور مسلمان، دونوں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسیحؑ کے منکرین پر غلبہ عطا فرمایا۔ اس بات کو یہاں بیان کرنے سے مقصود مسلمانوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ جس طرح پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے ان کا انکار کرنے والوں پر غالب آ چکے ہیں، اسی طرح اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے آپؐ کا انکار کرنے والوں پر غالب آئیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الجُمُعَہ

(٦٢)

الجُمُعَہ

نام آیت ۹ کے فقرے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اِس سورہ میں نمازِ جمعہ کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، لیکن ''جُمعہ'' بحیثیتِ مجموعی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ دوسری سُورتوں کے ناموں کی طرح یہ نام بھی علامت ہی کے طور پر ہے۔

زمانۂ نُزُول پہلے رُکوع کا زمانۂ نُزول ۷ھ ہے، اور غالبًا یہ فتحِ خیبر کے موقع پر یا اس کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔ بُخاری، مُسلم، ترمذی، نَسائی اور ابنِ جَریر نے حضرت ابوہُریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جب یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ صلحِ حُدَیبیَہ کے بعد اور فتحِ خیبر سے پہلے ایمان لائے تھے۔ اور خیبر کی فتح ابنِ ہِشام کے بقول مُحرّم، اور ابنِ سعد کے بقول جُمادِی الاُولیٰ ۷ھ میں ہوئی ہے۔ پس قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہودیوں کے اِس آخری گڑھ کو فتح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائی ہوں گی، یا پھر ان کا نُزول اس وقت ہُوا ہوگا جب خیبر کا انجام دیکھ کر شمالی حجاز کی تمام یہودی بستیاں اسلامی حکومت کی تابعِ فرمان بن گئی تھیں۔

دوسرا رُکوع ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، اور اِس رکوع کی آخری آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اِقامتِ جمعہ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد لازمًا کسی ایسے زمانے ہی میں پیش آیا ہوگا جب لوگوں کو دینی اجتماعات کے آداب کی پُوری تربیت ابھی نہیں ملی تھی۔

موضوع اور مضامین جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اِس سورہ کے دو رُکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی لیے دونوں کے موضوع الگ ہیں اور مخاطب بھی الگ۔ اگرچہ ان کے درمیان ایک نوع کی مناسبت ہے، جس کی بنا پر انھیں ایک سُورہ میں جمع کیا گیا ہے، لیکن مناسبت سمجھنے سے پہلے ہمیں دونوں کے موضوعات کو الگ الگ سمجھ لینا چاہیے۔

پہلا رُکوع اُس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام

Maktaba Tul Ishaat.com

کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے پچھلے چھ سال کے دوران میں انھوں نے کی تھیں۔ پہلے مدینے میں ان کے تین تین طاقت ور قبیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے، اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پُوری طرح تباہ ہوگیا اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے، مگر غزوۂ اَحزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڑھ خیبر رہ گیا تھا، جہاں مدینے سے نکلے ہوئے یہودیوں کی بھی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ اِن آیات کے نُزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہوگیا، اور یہودیوں نے خود درخواست کر کے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کرلیا۔ اِس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ وادی القُریٰ، فَدَک، تَیما، تبوک، سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اُسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار، جس کا نام سننا تک انھیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اِس سورہ میں ایک مرتبہ پھر اُن کو خطاب فرمایا، اور غالبًا یہ آخری خطاب تھا جو قرآنِ مجید میں ان سے کیا گیا۔ اِس میں انھیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

(۱) تم نے اِس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اُس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ ''اُمّی'' کہتے ہو۔ تمھارا زَعمِ باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمھاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمھاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے، کیونکہ یہ منصب تمھاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور ''اُمّیوں'' میں کبھی کوئی رسول نہیں آ سکتا۔ لیکن اللہ نے انھی اُمّیوں میں سے ایک رسول اُٹھایا ہے جو تمھاری آنکھوں کے سامنے اُس کی کتاب سُنا رہا ہے، نُفوس کا تزکیہ کر رہا ہے، اور اُن لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے دے۔ اُس کے فضل پر تمھارا اجارہ نہیں ہے کہ جسے تم دلوانا چاہو اسی کو وہ دے، اور جسے تم محروم رکھنا چاہو اسے وہ محروم رکھے۔

(۲) تم کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی، نہ ادا کی۔ تمھارا حال اُس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کس چیز کا بار اُٹھائے ہوئے ہے۔ بلکہ تمھاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بُوجھ نہیں رکھتا، مگر تم سمجھ بُوجھ رکھتے ہو اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور اس پر تمھارا زَعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمھارے نام لکھ دی گئی ہے۔ گویا تمھاری رائے

یہ ہے کہ خواہ تم اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو، بہر حال اللہ اِس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمھارے سوا کسی کو نہ بنائے!

(۴) تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمھیں اگر یقین ہوتا کہ اُس کے ہاں تمھارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمھیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلّت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو۔ تمھاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو، اور تمھارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مرو گے تو اللہ کے ہاں اُس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔

یہ ہے پہلے رُکوع کا مضمون۔ اس کے بعد دوسرا رُکوع، جو کئی سال پہلے نازل ہوا تھا، اِس سورہ میں لا کر اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سَبت کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمعہ عطا فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مُتنبِّہ فرمانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جمعے کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سَبت کے ساتھ کیا تھا۔ یہ رکوع اُس وقت نازل ہُوا تھا جب مدینہ میں ایک روز عین نمازِ جمعہ کے وقت ایک تجارتی قافلہ آیا اور اس کے ڈھول تاشوں کی آواز سُن کر ۱۲ آدمیوں کے سوا تمام حاضرین مسجدِ نبویؐ سے قافلے کی طرف دوڑ گئے، حالانکہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس پر یہ حکم دیا گیا کہ جمعے کی اذان ہونے کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت اور ہر دوسری مصروفیت حرام ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اُس وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑیں۔ البتّہ جب نماز ختم ہو جائے تو انھیں حق ہے کہ اپنے کاروبار چلانے کے لیے زمین میں پھیل جائیں۔ احکامِ جمعہ کے بارے میں یہ رُکوع ایک مستقل سورت بھی بنایا جا سکتا تھا، اور کسی دوسری سُورت میں بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے خاص طور پر اسے یہاں اُن آیات کے ساتھ لا کر ملایا گیا جن میں یہودیوں کو اُن کے انجامِ بد کے اسباب پر مُتنبِّہ کیا گیا ہے۔ اِس کی حکمت ہمارے نزدیک وہی ہے جو اُوپر ہم نے بیان کی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۱۱ — سُوْرَۃُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ — رکوعاتہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ
الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ـــــ بادشاہ ہے، قُدُّوس ہے، زبردست اور حکیم ہے۔[۱]

وہی ہے جس نے اُمّیوں[۲] کے اندر ایک رسول خود اُنھی میں سے اُٹھایا، جو اُنھیں

۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ حدید، حواشی ۱، ۲۔ الحشر، حواشی ۳۶، ۳۷، ۴۱۔ آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔ عرب کے یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات اور کارناموں میں رسالت کی صریح نشانیاں بچشمِ سر دیکھ لینے کے باوجود، اور اِس کے باوجود کہ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے آپؐ کے آنے کی صریح بشارت دی تھی جو آپؐ کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہوتی تھی، صرف اِس بنا پر آپؐ کا انکار کر رہے تھے کہ اپنی قوم اور نسل سے باہر کے کسی شخص کی رسالت مان لینا انھیں سخت ناگوار تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے ہم صرف اسی کو مانیں گے۔ دوسری کسی تعلیم کو، جو کسی غیر اسرائیلی نبی کے ذریعے سے آئے، خواہ وہ خدا ہی کی طرف سے ہو، تسلیم کرنے کے لیے وہ قطعی تیار نہ تھے۔ آگے کی آیتوں میں اِسی رَوِیّے پر انھیں ملامت کی جا رہی ہے، اس لیے کلام کا آغاز اس تمہیدی فقرے سے کیا گیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی یہ پُوری کائنات اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ اُن تمام نَقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جن کی بنا پر یہودیوں نے اپنی نسلی برتری کا تصوّر قائم کر رکھا ہے۔ وہ کسی کا رشتہ دار نہیں ہے۔ جانب داری (favouritism) کا اس کے ہاں کوئی کام نہیں۔ اپنی ساری مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ یکساں عدل اور رحمت اور رُبوبیّت کا ہے۔ کوئی خاص نسل اور قوم اُس کی چہیتی نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ کرے، بہر حال اس کی نوازشیں اُسی کے لیے مخصوص رہیں، اور کسی دوسری نسل یا قوم سے اس کو عداوت نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتی ہو تو وہ اس کی عنایات سے محروم رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ بادشاہ ہے، یعنی دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات کو محدُود کرنے والی نہیں ہے۔ تم بندے اور رعیت ہو۔ تمھارا یہ منصب کب سے ہو گیا کہ تم یہ طے کرو کہ وہ تمھاری ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر کسے بنائے اور کسے نہ بنائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ قُدُّوس ہے۔

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ

اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۳]۔

یعنی اِس سے بدرجہا مُنزّہ اور پاک ہے کہ اُس کے فیصلے میں کسی خطا اور غلطی کا امکان ہو۔ غلطی تمھاری سمجھ بُوجھ میں ہوسکتی ہے۔ اُس کے فیصلے میں نہیں ہوسکتی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو مزید صفتیں بیان فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ زبردست ہے، یعنی اس سے لڑکر کوئی جیت نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو کچھ کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے، اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دُنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کرسکتا۔

۲ — یہاں اُمّی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا ہے، اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو یہودی حقارت کے ساتھ اُمّی کہتے ہیں اور اپنے مقابلے میں ذلیل سمجھتے ہیں، اُنھی میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اُٹھایا ہے۔ وہ خود نہیں اُٹھ کھڑا ہوا ہے، بلکہ اس کا اُٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے، جس کی قوت سے لڑکر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآنِ مجید میں ”اُمّی“ کا لفظ متعدّد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنیٰ ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہلِ کتاب کے مقابلے میں اُن لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا: قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ (آلِ عمران:۲۰) ”اہلِ کتاب اور اُمّیوں سے پوچھو: کیا تم نے اسلام قبول کیا؟“ یہاں اُمّیوں سے مُراد مشرکینِ عرب ہیں، اور ان کو اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہلِ کتاب کے اَن پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا: وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ (البقرہ:۷۸) ”اِن یہودیوں میں کچھ لوگ اُمّی ہیں، کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے، بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں۔“ اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مُراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔ مثلاً فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آلِ عمران:۷۵) یعنی ”اُن کے اندر یہ بددیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اُمّیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔“ یہی تیسرے معنیٰ ہیں جو آیتِ زیرِ بحث میں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان کے لفظ گوئیم کا ہم معنیٰ ہے، جس کا ترجمہ انگریزی بائبل میں Gentiles کیا گیا ہے، اور اس سے مراد تمام غیر یہودی یا غیر اسرائیلی لوگ ہیں۔

لیکن اس یہودی اصطلاح کی اصل معنویت محض اس کی اِس تشریح سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دراصل عبرانی زبان کا لفظ گوئیم ابتداءً محض اقوام کے معنیٰ میں بولا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کے لیے مخصوص کردیا، پھر اس کے اندر یہ معنیٰ پیدا کردیے کہ یہودیوں کے سوا باقی تمام اقوام ناشایستہ،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا

حالانکہ اِس سے پہلے وہ کُھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔[۴] اور (اس رُسول کی بِعثَت) اُن دوسرے لوگوں

بدمذہب، ناپاک اور ذلیل ہیں، حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح Barbarian سے بھی بازی لے گیا، جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ربّیوں کے لٹریچر میں گوئیم اس قدر قابلِ نفرت لوگ ہیں کہ ان کو انسانی بھائی نہیں سمجھا جاسکتا، ان کے ساتھ سفر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اگر ان میں سے کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنے والا مسیح تمام گوئیم کو ہلاک کر دے گا اور جلا کر خاکستر کر ڈالے گا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ٦۴)

۳- قرآنِ مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں، اور ہر جگہ ان کے بیان کی غرض مختلف ہے۔ البقرہ آیت ۱۲۹ میں ان کا ذکر اہلِ عرب کو یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ آنحضورؐ کی بِعثَت، جسے وہ اپنے لیے زحمت و مصیبت سمجھ رہے تھے، درحقیقت ایک بڑی نعمت ہے، جس کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السّلام اپنی اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ البقرہ، آیت ۱۵۱ میں انھیں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان حضورؐ کی قدر پہچانیں اور اُس نعمت سے پُورا پُورا فیض حاصل کریں جو حضورؐ کی بِعثَت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا فرمائی ہے۔ آلِ عمران، آیت ۱٦۴ میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے اِن کا اِعادہ کیا گیا ہے کہ وہ کتنا بڑا احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے درمیان اپنا رسول بھیج کر کیا ہے، اور یہ لوگ کتنے نادان ہیں کہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اب چوتھی مرتبہ انھیں اِس سورہ میں دُہرایا گیا ہے، جس سے مقصود یہودیوں کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری آنکھوں کے سامنے جو کام کر رہے ہیں، وہ صریحاً ایک رسول کا کام ہے۔ وہ اللہ کی آیات سنا رہے ہیں، جن کی زبان، مضامین، اندازِ بیان، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ فی الواقع وہ اللہ ہی کی آیات ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، اُن کے اَخلاق اور عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں، اور ان کو اعلیٰ درجے کے اَخلاقی فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاؑ کرتے رہے ہیں۔ پھر وہ صرف آیات ہی سنانے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ہر وقت اپنے قول اور عمل سے اور اپنی زندگی کے نمونے سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کا منشا سمجھا رہے ہیں اور اُن کو اُس حکمت و دانائی کی تعلیم دے رہے ہیں جو انبیاؑ کے سوا آج تک کسی نے نہیں دی ہے۔ یہی سیرت اور کردار اور کام ہی تو انبیاؑ کا وہ نمایاں وصف ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ جس کا رسولِ برحق ہونا اُس کے کارناموں سے عَلانیَہ ثابت ہو رہا ہے، اس کو ماننے سے تم نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اللہ نے اسے تمھاری قوم کے بجائے اُس قوم میں سے اُٹھایا جسے تم اُمّی کہتے ہو۔

۴- یہ حضورؐ کی رسالت کا ایک اور ثبوت ہے جو یہودیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ

يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ‌ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ

کے لیے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔⁵ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔⁶ یہ اس کا فضل ہے، جسے

صدیوں سے عرب کی سرزمین میں آباد تھے اور اہلِ عرب کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدّنی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے چھپا ہُوا نہ تھا۔ اُن کی اُس سابق حالت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ چند سال کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و رہنمائی میں اس قوم کی جیسی کایا پلٹ گئی ہے اُس کے تم عینی شاہد ہو۔ تمھارے سامنے وہ حالت بھی ہے جس میں یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے مبتلا تھے۔ وہ حالت بھی ہے جو اسلام لانے کے بعد ان کی ہو گئی، اور اِسی قوم کے اُن لوگوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے۔ کیا یہ کھلا کھلا فرق، جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، تمھیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کے سوا کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا؟ بلکہ اس کے سامنے تو پچھلے انبیاؑ تک کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔

۵ – یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف عرب قوم تک محدود نہیں ہے، بلکہ دنیا بھر کی اُن دوسری قوموں اور نسلوں کے لیے بھی ہے جو ابھی آ کر اہلِ ایمان میں شامل نہیں ہوئی ہیں مگر آگے قیامت تک آنے والی ہیں۔ اصل الفاظ ہیں: وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ''دوسرے لوگ اُن میں سے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔'' اس میں لفظ مِنۡهُمۡ (ان میں سے) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ دوسرے لوگ اُمّیوں میں سے، یعنی دنیا کی غیر اسرائیلی قوموں میں سے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے ہوں گے جو ابھی اہلِ ایمان میں شامل نہیں ہوئے ہیں مگر بعد میں آ کر شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح یہ آیت من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہے اور اَبد تک کے لیے ہے۔ قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات جہاں اس مضمون کی صراحت کی گئی ہے، حسبِ ذیل ہیں: الانعام، آیت ۱۹۔ الاعراف: ۱۵۸۔ الانبیاء: ۱۰۷۔ الفرقان: ۱۔ سَبا: ۲۸۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سَبا، حاشیہ ۴۷)

۶ – یعنی یہ اُسی کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایسی ناتراشیدہ اُمّی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبی پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اِس درجے انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر اَبدی اُصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوعِ انسانی مل کر ایک اُمّت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اُصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی پسماندہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہین سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مکمل طور پر کایا پلٹ دے، اور پھر ایسے جامع اُصول دنیا کو دے دے جن پر ساری نوعِ انسانی ایک اُمّت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر و ہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے، اِس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اِس پر اگر کسی بے وقوف کا دل دُکھتا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا
التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ
مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۵ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ

چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انھوں نے اس کا بار نہ اُٹھایا[7]، اُن کی مثال اُس گدھے[8] کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اِس سے بھی زیادہ بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھُٹلا دیا ہے[9]۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اِن سے کہو: ”اَے لوگو جو یہُودی بن گئے ہو[10]، اگر تمھیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو

تو ڈھکتا رہے۔

۷ – اس فقرے کے دو معنٰی ہیں: ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام معنٰی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ اس کا حق ادا کیا۔ خاص معنٰی یہ ہیں کہ حاملِ توراۃ گروہ ہونے کی حیثیت سے جن کا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اُس رسول کا ساتھ دیتے جس کے آنے کی صاف صاف بشارت توراۃ میں دی گئی تھی، مگر انھوں نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور توراۃ کی تعلیم کے تقاضے کو پُورا نہ کیا۔

۸ – یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اُوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور اِن سے کیا چاہتی ہے۔

۹ – یعنی ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بُوجھ نہیں رکھتا اس لیے معذور ہے۔ مگر یہ سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں، توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں، اس کے معنٰی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اُس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو توراۃ کی رُو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قُصوروار نہیں ہیں بلکہ جان بُوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔

۱۰ – یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ ”اَے یہودیو“ نہیں کہا ہے بلکہ ”اَے وہ لوگو جو یہودی بن گئے ہو“ یا ” جنھوں نے

لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾

چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو[11] تو موت کی تمنّا کرو اگر تم اپنے اِس زعم میں سچّے ہو[12]۔“

یہودیت اختیار کر لی ہے“ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دین جو موسٰی علیہ السّلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاؑ لائے تھے، وہ تو اسلام ہی تھا۔ ان انبیاؑ میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اِس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السّلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کرلی، جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اَسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ اُن اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام ونشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔ اس کے بعد صرف یہوداہ، اور اس کے ساتھ بِن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے ”یہود“ ہی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربّیوں اور اَحبار نے اپنے اپنے خیالات ونظریات اور رُجحانات کے مطابق عقائد اور رُسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچا صدہا برس میں تیار کیا، اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچا چوتھی صدی قبلِ مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی رَبّانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عُنصر اس میں شامل ہے، اور اس کا حُلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ مجید میں اکثر مقامات پر ان کو الَّذِيْنَ هَادُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی ”اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو“۔ ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنھوں نے یہودیّت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں ”اے بنی اسرائیل“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور جہاں مذہبِ یہود کے پیرووں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں الَّذِيْنَ هَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

۱۱ – قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر اُن کے اس دعوے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (البقرہ:۱۱۱) ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی، اگر ہم کو سزا ملے گی بھی تو بس چند روز۔ (البقرہ:۸۰، آلِ عمران:۲۴) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ (المائدہ:۱۸) ایسے ہی کچھ دعوے خود یہودیوں کی اپنی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ کم ازکم یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ مخلوق (chosen people) کہتے ہیں اور اس زُعم میں مبتلا ہیں کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے جو کسی دوسرے انسانی گروہ سے نہیں ہے۔

۱۲ – یہ بات قرآنِ مجید میں دوسری مرتبہ یہودیوں کو خطاب کر کے کہی گئی ہے۔ پہلے سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا تھا: ”اِن سے کہو: اگر آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے اللہ کے ہاں مخصوص ہے تو پھر تم موت

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ

لیکن یہ ہرگز اس کی تمنّا نہ کریں گے اپنے کرتُوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں[۱۳]، اور اللہ اِن ظالموں کو خُوب جانتا ہے۔ اِن سے کہو: "جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمھیں آ کر رہے گی۔

کی تمنّا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچّے ہو۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنّا نہ کریں گے اپنے اُن کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ تم تمام انسانوں سے بڑھ کر، حتّٰی کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر اُن کو کسی نہ کسی طرح جینے کا حریص پاؤ گے۔ ان میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس جیے، حالانکہ وہ لمبی عمر پائے تب بھی اسے یہ چیز عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ ان کے سارے کرتُوت اللہ کی نظر میں ہیں۔" (آیات ۹۴ تا ۹۶) اب اسی بات کو پھر یہاں دُہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض تکرار نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ والی آیات میں یہ بات اُس وقت کہی گئی تھی جب یہودیوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی۔ اور اِس سورت میں اِس کا اعادہ اُس وقت کیا گیا ہے جب ان کے ساتھ متعدِّد معرکے پیش آنے کے بعد عرب میں آخری اور قطعی طور پر ان کا زور توڑ دیا گیا۔ اِن معرکوں نے، اور ان کے اس انجام نے وہ بات تجربے اور مشاہدے سے ثابت کر دی جو پہلے سورۂ بقرہ میں کہی گئی تھی۔ مدینے اور خیبر میں یہودی طاقت بلحاظِ تعداد مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھی، اور بلحاظِ وسائل ان سے بہت زیادہ تھی۔ پھر عرب کے مشرکین اور مدینے کے منافقین بھی اُن کی پُشت پر تھے اور مسلمانوں کو مٹانے پر تُلے ہوئے تھے۔ لیکن جس چیز نے اِس نامُساوی مقابلے میں مسلمانوں کو غالب اور یہودیوں کو مغلوب کیا وہ یہ تھی کہ مسلمان راہِ خدا میں مرنے سے خائف تو درکنار، تہِ دل سے اُس کے مشتاق تھے اور سر ہتھیلی پر لیے ہوئے میدانِ جنگ میں اُترتے تھے۔ کیونکہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ خدا کی راہ میں لڑ رہے ہیں، اور وہ اس بات پر بھی کامل یقین رکھتے تھے کہ اس راہ میں شہید ہونے والے کے لیے جنّت ہے۔ اِس کے برعکس یہودیوں کا حال یہ تھا کہ وہ کسی راہ میں بھی جان دینے کے لیے تیار نہ تھے، نہ خدا کی راہ میں، نہ قوم کی راہ میں، نہ خود اپنی جان اور مال اور عزّت کی راہ میں۔ انھیں صرف زندگی درکار تھی، خواہ وہ کیسی ہی زندگی ہو۔ اِسی چیز نے ان کو بزدل بنا دیا تھا۔

۱۳ – بالفاظِ دیگر ان کا موت سے یہ فرار بے سبب نہیں ہے۔ وہ زبان سے خواہ کیسے ہی لمبے چوڑے دعوے کریں، مگر ان کے ضمیر خوب جانتے ہیں کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہے، اور آخرت میں اُن حرکتوں کے کیا نتائج نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے جو وہ دنیا میں کر رہے ہیں۔ اسی لیے ان کا نفس خدا کی عدالت کا سامنا کرنے سے جی چُراتا ہے۔

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۝ ع ٨ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے، اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔" ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جُمعے[14] کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو،[15] یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر

۱۴- اِس فقرے میں تین باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں: ایک یہ کہ اِس میں نماز کے لیے مُنادی کرنے کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی ایسی نماز کی مُنادی کا ذکر ہے جو خاص طور پر صرف جُمعے کے دن ہی پڑھی جانی چاہیے۔ تیسرے یہ کہ اِن دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ تم نماز کے لیے مُنادی کرو، اور جمعے کے روز ایک خاص نماز پڑھا کرو، بلکہ اندازِ بیان اور سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ نماز کی مُنادی اور جُمعے کی مخصوص نماز، دونوں پہلے سے جاری تھیں، البتہ لوگ یہ غلطی کر رہے تھے کہ جمعے کی مُنادی سُن کر نماز کے لیے دوڑنے میں تساہُل برتتے تھے اور خرید و فروخت کرنے میں لگے رہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت صرف اِس غرض کے لیے نازل فرمائی کہ لوگ اِس مُنادی اور اِس خاص نماز کی اہمیّت محسوس کریں اور فرض جان کر اس کی طرف دوڑیں۔ ان تینوں باتوں پر اگر غور کیا جائے تو ان سے یہ اُصولی حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ ایسے احکام بھی دیتا تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوئے، اور وہ احکام بھی اُسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہونے والے احکام۔ نماز کی مُنادی وہی اذان ہے جو آج ساری دنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے۔ مگر قرآن میں کسی جگہ نہ اس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں، نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں دو جگہ صرف اُس کی توثیق کی گئی ہے، ایک اِس آیت میں، دوسرے سورۂ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔ اِسی طرح جُمعے کی یہ خاص نماز جو آج ساری دنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اِس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے نہ وقت اور طریقِ ادا بتایا گیا ہے۔ یہ طریقہ بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت صرف اُس کی اہمیت اور اس کے وجوب کی شدّت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام

Maktaba Tul Ishaat.com

صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ دراصل سنّت کا نہیں، خود قرآن کا منکر ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے جُمعے کے بارے میں چند اُمور اور بھی جان لینے چاہییں:

——— جُمعہ دراصل ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ زمانۂ جاہلیّت میں اہلِ عرب اِسے یومِ عَرُوبَہ کہا کرتے تھے۔ اسلام میں جب اس کو مسلمانوں کے اجتماع کا دن قرار دیا گیا تو اس کا نام جُمعہ رکھا گیا۔ اگرچہ مؤرّخین کہتے ہیں کہ کَعب بن لُؤَیّ یا قُصَیّ بن کِلاب نے بھی اِس دن کے لیے یہ نام استعمال کیا تھا، کیونکہ اِس روز وہ قریش کے لوگوں کا اجتماع کیا کرتا تھا (فتح الباری)، لیکن اس کے اس فعل سے قدیم نام تبدیل نہیں ہوا، بلکہ عام اہلِ عرب اسے عَرُوبہ ہی کہتے تھے۔ نام کی حقیقی تبدیلی اس وقت ہوئی جب اسلام میں اس دن کا یہ نیا نام رکھا گیا۔

——— اسلام سے پہلے ہفتے کا ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کرنے اور اس کو شِعارِ مِلّت قرار دینے کا طریقہ اہلِ کتاب میں موجود تھا۔ یہودیوں کے ہاں اس غرض کے لیے سَبت (ہفتہ) کا دن مقرر کیا گیا تھا، کیونکہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی تھی۔ عیسائیوں نے اپنے آپ کو یہودیوں سے مُمیّز کرنے کے لیے اپنا شِعارِ مِلّت اتوار کا دن قرار دیا۔ اگرچہ اس کا کوئی حکم نہ حضرت عیسٰیؑ نے دیا تھا، نہ انجیل میں کہیں اس کا ذکر آیا ہے، لیکن عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب پر جان دینے کے بعد حضرت عیسٰیؑ اِسی روز قبر سے نکل کر آسمان کی طرف گئے تھے۔ اسی بنا پر بعد کے عیسائیوں نے اسے اپنی عبادت کا دن قرار دے لیا اور پھر ۳۲۱ء میں رومی سلطنت نے ایک حکم کے ذریعے سے اس کو عام تعطیل کا دن مقرر کر دیا۔ اسلام نے ان دونوں مِلّتوں سے اپنی مِلّت کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ دونوں دن چھوڑ کر جُمعے کو اجتماعی عبادت کے لیے اختیار کیا۔

——— حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جُمعے کی فرضیت کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہجرت سے کچھ مدت پہلے مکّۂ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ لیکن اُس وقت آپ اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ مکّہ میں کوئی اجتماعی عبادت ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے اُن لوگوں کو، جو آپؐ سے پہلے ہجرت کر کے مدینۂ منوّرہ پہنچ چکے تھے، یہ حکم لکھ بھیجا کہ وہاں جُمعہ قائم کریں۔ چنانچہ ابتدائی مہاجرین کے سردار حضرت مُصعَبؓ بن عُمَیر نے ۱۲ آدمیوں کے ساتھ مدینے میں پہلا جمعہ پڑھا۔ (طَبَرانی، دارقُطنی) حضرت کَعبؓ بن مالک اور ابنِ سیرینؒ کی روایت یہ ہے کہ اس سے بھی پہلے مدینہ کے انصار نے بطورِ خود (قبل اِس کے کہ حضورؐ کا حکم ان کو پہنچا ہوتا) آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن مل کر اجتماعی عبادت کریں گے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے یہودیوں کے سَبت اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جُمعے کا دن انتخاب کیا، اور پہلا جمعہ حضرت اَسعَدؓ بن زُرارہ نے بنی بَیاضہ کے علاقے میں پڑھا، جس میں ۴۰ آدمی شریک ہوئے۔ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان، عبد بن حُمَید، عبدالرزّاق، بَیہقی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذوق خود اُس وقت یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ایسا ایک دن ہونا چاہیے جس میں زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر اجتماعی عبادت کریں، اور یہ بھی اسلامی ذوق ہی کا تقاضا تھا کہ وہ دن ہفتے اور اتوار سے الگ ہو، تاکہ مسلمانوں کا شِعارِ مِلّت یہود و نصاریٰ کے شِعارِ مِلّت سے الگ رہے۔ یہ صحابۂ کرامؓ کی اسلامی ذہنیت کا ایک

عجیب کرشمہ ہے کہ بسا اوقات ایک حکم آنے سے پہلے ہی اُن کا ذوق کہہ دیتا تھا کہ اسلام کی رُوح فلاں چیز کا تقاضا کر رہی ہے۔

—— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو اوّلین کام کیے، ان میں سے ایک جُمعے کی اقامت بھی تھی۔ مکّۂ معظمہ سے ہجرت کر کے آپؐ پیر کے روز قُبا پہنچے، چار دن وہاں قیام فرمایا، پانچویں روز جُمعے کے دن وہاں سے مدینے کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں بنی سالم بن عَوف کے مقام پر تھے کہ نمازِ جمعہ کا وقت آ گیا، اُسی جگہ آپؐ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ (ابنِ ہِشام)

—— اس نماز کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال کے بعد کا وقت مقرر فرمایا تھا، یعنی وہی وقت جو ظُہر کی نماز کا وقت ہے۔ ہجرت سے پہلے حضرت مُصعَبؓ بن عُمَیر کو جو تحریری حکم آپؐ نے بھیجا تھا، اس میں آپؐ کا ارشاد یہ تھا کہ فاذا مال النھار عن شطرہ عند الزوال من یوم الجمعۃ فتقربوا الی اللّٰہ تعالٰی برکعتین (دارقُطنی) ''جب جُمعے کے روز دن نصف النہار سے ڈھل جائے تو دو رکعت نماز کے ذریعے سے اللہ کے حضور تقرّب حاصل کرو۔'' یہی حکم ہجرت کے بعد آپؐ نے قولاً بھی دیا اور عملاً بھی اِسی وقت پر آپؐ جُمعے کی نماز پڑھاتے رہے۔ حضرت اَنَسؓ، حضرت سَلَمَہؓ بن اَکْوَع، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت زُبیرؓ بن العَوّام، حضرت سَہلؓ بن سعد، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عَمّار بن یاسر اور حضرت بِلالؓ سے اس مضمون کی روایات کُتُبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں کہ حضورؐ جُمعے کی نماز زوال کے بعد ادا فرمایا کرتے تھے۔ (مُسنَدِ احمد، بخاری، مُسلم، ابوداؤد، نَسائی، تِرمِذی)

—— یہ امر بھی آپؐ کے عمل سے ثابت ہے کہ اس روز آپؐ ظہر کی نماز کے بجائے جُمعے کی نماز پڑھاتے تھے، اِس نماز کی صرف دو رکعتیں ہوتی تھیں، اور اس سے پہلے آپؐ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ یہی فرق جُمعے کی نماز اور عام دنوں کی نمازِ ظہر میں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: صلوٰۃ المسافر رکعتان، وصلوٰۃ الفجر رکعتان، وصلوٰۃ الجمعۃ رکعتان، تمام غیر قصرٍ علٰی لسان نبیکم صلی اللّٰہ علیہ وسلم وانما قصرت الجمعۃ لاجل الخطبۃ۔ (احکام القرآن للجَصّاص) ''تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے حکم کی رُو سے مسافر کی نماز دو رکعت ہے، فجر کی نماز دو رکعت ہے، اور جمعہ کی نماز دو رکعت ہے۔ یہ پُوری نماز ہے، قصر نہیں ہے۔ اور جُمعے کو خطبے کی خاطر ہی مختصر کیا گیا ہے۔''

—— جس اذان کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد وہ اذان ہے جو خطبے سے پہلے دی جاتی ہے، نہ کہ وہ اذان جو خطبے سے کافی دیر پہلے لوگوں کو یہ اطلاع دینے کے لیے دی جاتی ہے کہ جُمعے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ حدیث میں حضرت سائبؓ بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان ہوتی تھی، اور وہ امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی یہی عمل ہوتا رہا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دَور میں جب آبادی بڑھ گئی تو اُنھوں نے پہلے ایک اور اذان دلوانی شروع کر دی جو مدینے کے بازار میں ان کے مکان زَورا پر دی جاتی تھی۔ (بخاری، ابوداؤد، نَسائی، طَبَرانی)

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۵- اس حکم میں ذکر سے مراد خطبہ ہے، کیونکہ اذان کے بعد پہلا عمل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے وہ نماز نہیں بلکہ خطبہ تھا، اور نماز آپؐ ہمیشہ خطبے کے بعد ادا فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جُمعے کے روز ملائکہ ہر آنے والے کا نام اُس کی آمد کی ترتیب کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں۔ فاذا خرج الامام حضرت الملئکة یستمعون الذکر۔ ''جب امام خطبہ دینے کے لیے نکلتا ہے تو وہ نام لکھنے بند کر دیتے ہیں اور ذکر (یعنی خطبہ) سننے میں لگ جاتے ہیں۔'' (مُسندِ احمد، بخاری، مُسلم، ابوداؤد، ترمذِی، نَسائی) اِس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ذکر سے مُراد خطبہ ہے۔ خود قرآن کا بیان بھی اِسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پہلے فرمایا: فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ ''خدا کے ذکر کی طرف دوڑو۔'' پھر آگے چل کر فرمایا: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ۔ ''جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جُمعے کے روز عمل کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ذکر اللہ اور پھر نماز۔ مفسّرین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ ذکر سے مراد یا تو خطبہ ہے، یا پھر خطبہ اور نماز دونوں۔

خطبے کے لیے ''ذکر اللہ'' کا لفظ استعمال کرنا خود یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اس میں وہ مضامین ہونے چاہییں جو اللہ کی یاد سے مناسبت رکھتے ہوں۔ مثلاً اللہ کی حمد و ثنا، اس کے رسولؐ پر دُرود و صلوٰۃ، اس کے احکام اور اس کی شریعت کے مطابق عمل کی تعلیم و تلقین، اس سے ڈرنے والے نیک بندوں کی تعریف وغیرہ۔ اسی بنا پر زَمَخشری نے کَشّاف میں لکھا ہے کہ خُطبے میں ظالم حکمرانوں کی مدح و ثنا، یا ان کا نام لینا اور ان کے لیے دعا کرنا، ذکر اللہ سے کوئی دُور کی مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ تو ذکر الشیطان ہے۔

''اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھاگتے ہوئے آؤ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلدی سے جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ اُردو زبان میں بھی ہم دوڑ دھوپ کرنا، بھاگ دوڑ کرنا، سرگرم کوشش کے معنٰی میں بولتے ہیں، نہ کہ بھاگنے کے معنٰی میں۔ اسی طرح عربی میں بھی سعی کے معنٰی بھاگنے ہی کے نہیں ہیں۔ قرآن میں اکثر مقامات پر سعی کا لفظ کوشش اور جِدّوجُہد کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ـ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا - فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ـ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا۔ مفسّرین نے بھی بالاتفاق اس کو اہتمام کے معنٰی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک سعی یہ ہے کہ آدمی اذان کی آواز سُن کر فوراً مسجد پہنچنے کی فکر میں لگ جائے۔ اور معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے، حدیث میں بھاگ کر نماز کے لیے آنے کی صاف ممانعت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی ہو تو اس کی طرف سُکون و وقار کے ساتھ چل کر آؤ، بھاگتے ہوئے نہ آؤ۔ پھر جتنی نماز بھی مل جائے اس میں شامل ہو جاؤ، اور جتنی چھُوٹ جائے اسے بعد میں پورا کر لو۔'' (صِحاح سِتّہ) حضرت ابوقتادہ انصاریؓ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ہم حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کہ یکایک لوگوں کے بھاگ بھاگ کر چلنے کی آواز آئی۔ نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے ان لوگوں سے پوچھا: ''یہ کیسی آواز تھی؟'' ان لوگوں نے عرض کیا: ''ہم نماز میں شامل ہونے کے لیے بھاگ کر آ رہے تھے۔'' فرمایا: ''ایسا نہ کیا کرو، نماز کے لیے جب بھی آؤ، پورے سُکون کے ساتھ آؤ۔ جتنی مل جائے اس کو امام کے ساتھ پڑھ لو،

جتنی چھوٹ جائے وہ بعد میں پوری کر لو۔" (بخاری، مُسلم)

"خرید و فروخت چھوڑ دو" کا مطلب صرف خرید و فروخت ہی چھوڑنا نہیں ہے، بلکہ نماز کے لیے جانے کی فکر اور اہتمام کے سوا ہر دوسری مصروفیت چھوڑ دینا ہے۔ بَیع کا ذکر خاص طور پر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جمعے کے روز تجارت خوب چمکتی تھی، آس پاس کی بستیوں کے لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے۔ تاجر بھی اپنا مال لے لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ لوگ بھی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے میں لگ جاتے تھے۔ لیکن ممانعت کا حکم صرف بَیع تک محدود نہیں ہے، بلکہ دوسرے تمام مشاغل بھی اس کے تحت آ جاتے ہیں، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف ان سے منع فرما دیا ہے، اس لیے فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جُمعے کی اذان کے بعد بَیع اور ہر قسم کا کاروبار حرام ہے۔

یہ حکم قطعی طور پر نمازِ جمعہ کے فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل تو اذان سُنتے ہی اس کے لیے دوڑنے کی تاکید بجائے خود اس کی دلیل ہے۔ پھر بَیع جیسی حلال چیز کا اس کی خاطر حرام ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فرض ہے۔ مزید برآں ظہر کی فرض نماز کا جمعے کے روز ساقط ہو جانا اور نمازِ جمعہ کا اس کی جگہ لے لینا بھی اس کی فرضیت کا صریح ثبوت ہے۔ کیونکہ ایک فرض اسی وقت ساقط ہوتا ہے جب کہ اس کی جگہ لینے والا فرض اس سے زیادہ اہم ہو۔ اسی کی تائید بکثرت احادیث کرتی ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کی سخت ترین تاکید کی ہے اور اسے صاف الفاظ میں فرض قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے نہیں آتے۔" (مُسندِ احمد، بخاری) حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے جمعے کے خطبے میں حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے: "لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آ جائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپّا لگا دے گا اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔" (مُسندِ احمد، مُسلم، نَسائی) حضرت ابو الجعدؓ ضَمری، حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور حضرت عبداللہؓ بن ابی اَوفیٰ کی روایات میں حضورؐ کے جو ارشادات منقول ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی حقیقی ضرورت اور جائز عذر کے بغیر، محض بے پروائی کی بنا پر مسلسل تین جمعے چھوڑ دے، اللہ اس کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔" بلکہ ایک روایت میں تو الفاظ یہ ہیں کہ "اللہ اس کے دل کو منافق کا دل بنا دیتا ہے۔" (مُسندِ احمد، ابوداؤد، نَسائی، ترمذی، ابنِ ماجہ، دارمی، حاکم، ابنِ حِبّان، بَزّار، طَبَرانی فی الکبیر) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: "آج سے لے کر قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے۔ جو شخص اسے ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑے، خدا اس کا حال دُرست نہ کرے، نہ اسے برکت دے۔ خوب سُن رکھو! اس کی نماز نماز نہیں، اس کی زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں، اس کا حج حج نہیں، اس کا روزہ روزہ نہیں، اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں، جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ پھر جو توبہ کر لے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے۔" (ابنِ ماجہ، بزّار) اسی سے قریب المعنیٰ ایک روایت طَبَرانی نے اَوسط میں ابنِ عمرؓ سے نقل کی ہے۔ علاوہ بریں بکثرت روایات ہیں جن میں حضورؐ نے جمعہ کو بالفاظِ صریح، فرض اور حقِّ واجب قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "جمعہ ہر اُس شخص پر فرض ہے جو اس کی اذان سُنے۔" (ابوداؤد، دارقُطنی) حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور ابوسعید

Maktaba Tul Ishaat.com

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰

تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔[16] اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو،[17] شاید کہ تمھیں فلاح نصیب[18] ہو جائے۔

خُدریؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے خطبے میں فرمایا: ''جان لو کہ اللہ نے تم پر نمازِ جمعہ فرض کی ہے۔'' (بَیْہَقی) البتہ آپؐ نے عورت، بچے، غلام، مریض اور مسافر کو اس فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حضرت حَفصہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''جمعے کے لیے نکلنا ہر بالغ پر واجب ہے۔'' (نَسائی) حضرت طارقؓ بن شہاب کی روایت میں آپؐ کا ارشاد یہ ہے کہ ''جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ سوائے غلام، عورت، بچے اور مریض کے۔'' (ابوداؤد، حاکم) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں: ''جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس پر جمعہ فرض ہے، اِلّا یہ کہ عورت ہو، یا مسافر ہو، یا غلام ہو، یا مریض ہو۔'' (دارقُطنی، بَیْہَقی) قرآن و حدیث کی انھی تصریحات کی وجہ سے جمعے کی فرضیّت پر پوری اُمّت کا اجماع ہے۔

۱۶ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمعے کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جانا اور تلاشِ رزق کی دوڑ دھوپ میں لگ جانا ضروری ہے۔ بلکہ یہ ارشاد اجازت کے معنیٰ میں ہے۔ چونکہ جمعے کی اذان سُن کر سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا، اس لیے فرمایا گیا کہ نماز ختم ہو جانے کے بعد تمھیں اجازت ہے کہ منتشر ہو جاؤ اور اپنے جو کاروبار بھی کرنا چاہو کرو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حالتِ اِحرام میں شکار کی ممانعت کرنے کے بعد فرمایا: وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (المائدہ: ۲) ''جب احرام کھول چکو تو شکار کرو۔'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد شکار پر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی۔ چاہو تو شکار کر سکتے ہو۔ یا مثلاً سورۂ نساء میں ایک سے زائد نکاح کی اجازت فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ فَانْكِحُوْا بصیغۂ امر ہے، مگر کسی نے بھی اس کو حکم کے معنیٰ میں نہیں لیا ہے۔ اس سے یہ اُصولی مسئلہ نکلتا ہے کہ صیغۂ امر ہمیشہ وجوب ہی کے معنیٰ میں نہیں ہوتا، بلکہ کبھی یہ اجازت اور کبھی استحباب کے معنیٰ میں بھی ہوتا ہے۔ یہ بات قرائن سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں یہ حکم کے معنیٰ میں ہے اور کہاں اجازت کے معنیٰ میں، اور کہاں اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ کو ایسا کرنا پسند ہے، لیکن یہ مراد نہیں ہوتی کہ یہ فعل فرض و واجب ہے۔ خود اسی فقرے کے بعد متصلاً دُوسرے ہی فقرے میں ارشاد ہوا ہے: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ''اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔'' یہاں بھی صیغۂ امر موجود ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ استحباب کے معنیٰ میں ہے نہ کہ وجوب کے معنیٰ میں۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ قرآن میں یہودیوں کے سَبْت اور عیسائیوں کے اتوار کی طرح جمعہ کو عام تعطیل کا دن قرار نہیں دیا گیا ہے، لیکن اس امر سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جمعہ ٹھیک اُسی طرح مسلمانوں کا شعارِ ملّت ہے جس طرح ہفتہ اور اتوار یہودیوں اور عیسائیوں کے شِعارِ ملّت ہیں۔ اور اگر ہفتے میں کوئی ایک دن عام تعطیل کے لیے مقرر کرنا

ایک تمدّنی ضرورت ہو، تو جس طرح یہودی اس کے لیے فطری طور پر ہفتے کو اور عیسائی اتوار کو منتخب کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان (اگر اس کی فطرت میں کچھ اسلامی حِس موجود ہو) لازماً اس غرض کے لیے جمعہ ہی کو منتخب کرے گا۔ بلکہ عیسائیوں نے تو دوسرے ایسے ملکوں پر بھی اپنے اتوار کو مسلّط کرنے میں تأمّل نہ کیا جہاں عیسائی آبادی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی۔ یہودیوں نے جب فلسطین میں اپنی اسرائیلی ریاست قائم کی تو اوّلین کام جو انھوں نے کیا، وہ یہ تھا کہ اتوار کے بجائے ہفتے کو چھُٹّی کا دن مقرر کیا۔ قبلِ تقسیم کے ہندوستان میں برطانوی ہند اور مسلمان ریاستوں کے درمیان نمایاں فرق یہ نظر آتا تھا کہ مُلک کے ایک حصّے میں اتوار کی چھُٹّی ہوتی تھی اور دوسرے حصّے میں جمعہ کی۔ البتہ جہاں مسلمانوں کے اندر اسلامی حِس موجود نہیں ہوتی، وہاں وہ اپنے ہاتھ میں اقتدار آنے کے بعد بھی اتوار ہی کو سینے سے لگائے رہتے ہیں، جیسا کہ ہم پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ جب بے حسی طاری ہوتی ہے تو جمعے کی چھُٹّی منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی رائج کی جاتی ہے، جیسا کہ مصطفیٰ کمال نے ترکی میں کیا۔

۱۷- یعنی اپنے کاروبار میں لگ کر بھی اللہ کو بھولو نہیں، بلکہ ہر حال میں اس کو یاد رکھو اور اس کا ذکر کرتے رہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ اَحزاب، حاشیہ ۶۳)

۱۸- قرآنِ مجید میں متعدِد مقامات پر ایک ہدایت یا ایک نصیحت یا ایک حکم دینے کے بعد لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (شاید کہ تم فلاح پا جاؤ) اور لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (شاید کہ تم پر رحم کیا جائے) کے الفاظ ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس طرح کے مواقع پر شاید کا لفظ استعمال کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو، معاذ اللہ، کوئی شک لاحق ہے، بلکہ یہ دراصل شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مہربان آقا اپنے ملازم سے کہے کہ تم فُلاں خدمت انجام دو، شاید کہ تمھیں ترقی مل جائے۔ اس میں ایک لطیف وعدہ پوشیدہ ہوتا ہے، جس کی اُمید میں ملازم دل لگا کر بڑے شوق کے ساتھ وہ خدمت انجام دیتا ہے۔ کسی بادشاہ کی زبان سے کسی ملازم کے لیے یہ فقرہ نکل جائے تو اس کے گھر خوشی کے شادیانے بج جاتے ہیں۔

یہاں چونکہ جمعے کے احکام ختم ہو گئے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذاہبِ اربعہ میں قرآن، حدیث، آثارِ صحابہؓ، اور اسلام کے اُصولِ عامّہ سے جو احکامِ جمعہ مرتّب کیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ دے دیا جائے۔

حَنَفِیّہ کے نزدیک جمعے کا وقت وہی ہے جو ظہر کا وقت ہے۔ نہ اس سے پہلے جمعہ ہو سکتا ہے نہ اس کے بعد۔ بیع کی حُرمت پہلی اذان ہی سے شروع ہو جاتی ہے، نہ کہ اُس دوسری اذان سے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے، کیونکہ قرآن میں اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ کے الفاظ مطلقاً ارشاد ہوئے ہیں۔ اس لیے زوال کے بعد جب جمعے کا وقت شروع ہو جائے، اُس وقت جو اذان بھی نمازِ جمعہ کے لیے دی جائے، لوگوں کو اُسے سُن کر خرید و فروخت چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن اگر کسی شخص نے اُس وقت خرید و فروخت کر لی ہو تو وہ بیع فاسد یا فسخ نہ ہو جائے گی، بلکہ یہ صرف ایک گناہ ہو گا۔ جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ صرف مصرِ جامع میں ہو سکتا ہے، اور مصرِ جامع کی معتبر تعریف یہ ہے کہ وہ شہر جس میں بازار ہوں، قیامِ امن کا انتظام موجود ہو، اور آبادی اتنی ہو کہ اگر اس کی بڑی سے بڑی مسجد میں بھی نمازِ جُمعہ کے مکلّف سب لوگ جمع ہو جائیں تو اس میں سما نہ سکیں۔ جو لوگ

Maktaba Tul Ishaat.com

شہر سے باہر رہتے ہوں، ان پر جمعہ اُس صورت میں آ کر پڑھنا فرض ہے جب کہ ان تک اذان کی آواز پہنچتی ہو، یا وہ زیادہ سے زیادہ شہر سے ۶ میل کے فاصلے پر ہوں۔ نماز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں ہو۔ وہ کھلے میدان میں بھی ہوسکتی ہے، اور ایسے میدان میں بھی ہوسکتی ہے جو شہر کے باہر ہو مگر اس کا ایک حصّہ شمار ہوتا ہو۔ نمازِ جمعہ صرف اُس جگہ ہوسکتی ہے جہاں ہر شخص کے لیے شریک ہونے کا اِذنِ عام ہو۔ کسی بند جگہ، جہاں ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ ہو، خواہ کتنے ہی آدمی جمع ہو جائیں، جمعہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ صحتِ جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں کم از کم (بقول ابوحنیفہؒ) امام کے سوا تین آدمی، یا (بقول ابو یُوسُفؒ و محمدؒ) امام سمیت دو آدمی ایسے موجود ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ جن عُذرات کی بنا پر ایک شخص سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں: آدمی حالتِ سفر میں ہو، یا ایسا بیمار ہو کہ چل کر نہ آ سکتا ہو، یا دونوں ٹانگوں سے معذور ہو، یا اندھا ہو (مگر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اندھے پر سے صرف اس وقت جمعہ کی فرضیت ساقط ہوتی ہے جب کہ وہ کوئی ایسا آدمی نہ پاتا ہو جو اسے چلا کر لے جائے)، یا کسی ظالم سے اس کو جان اور آبرو کا، یا ناقابلِ برداشت مالی نقصان کا خطرہ ہو، یا سخت بارش اور کیچڑ پانی ہو، یا آدمی قید کی حالت میں ہو۔ قیدیوں اور معذوروں کے لیے یہ بات مکروہ ہے کہ وہ جمعے کے روز ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ جن لوگوں کا جمعہ چُھوٹ گیا ہو، اُن کے لیے بھی ظہر کی نماز جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے۔ خطبہ صحّتِ جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جمعے کی نماز خطبے کے بغیر نہیں پڑھی ہے، اور وہ لازماً نماز سے پہلے ہونا چاہیے، اور دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے لیے جب امام منبر کی طرف جائے، اُس وقت سے اختتامِ خطبہ تک ہر قسم کی بات چیت ممنوع ہے، اور نماز بھی اُس وقت نہیں پڑھنی چاہیے، خواہ امام کی آواز اُس مقام تک پہنچتی ہو یا نہ پہنچتی ہو جہاں کوئی شخص بیٹھا ہو۔ (ہدایہ، فتح القدیر، احکام القرآن للجصّاص، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، عُمدۃ القاری)

شافعیّہ کے نزدیک جمعے کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔ بیع کی حُرمت اور سعی کا وجوب اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دوسری اذان ہو (یعنی وہ اذان جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے)۔ تاہم اگر کوئی شخص اس وقت بیع کر لے تو وہ فسخ نہیں ہوتی۔ جمعہ ہر اُس بستی میں ہوسکتا ہے جس کے مستقل باشندوں میں ۴۰ ایسے آدمی موجود ہوں جن پر نمازِ جمعہ فرض ہے۔ بستی سے باہر کے اُن لوگوں پر جمعے کے لیے حاضر ہونا لازم ہے جن تک اذان کی آواز پہنچ سکتی ہو۔ جمعہ لازماً بستی کے حُدود میں ہونا چاہیے، مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں پڑھا جائے۔ جو لوگ صحرا میں خیموں کے اندر رہتے ہوں، ان پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ صحتِ جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں امام سمیت کم از کم ۴۰ ایسے آدمی شریک ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ جن عُذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعے کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں: سفر کی حالت میں ہو، یا کسی مقام پر چار دن یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو، بشرطیکہ سفر جائز نوعیت کا ہو۔ ایسا بوڑھا یا مریض ہو کہ سواری پر بھی جمعے کے لیے نہ جا سکتا ہو۔ اندھا ہو اور کوئی ایسا آدمی نہ پاتا ہو جو اسے نماز کے لیے لے جائے۔ جان یا مال یا آبرو کا خوف لاحق ہو۔ قید کی حالت میں ہو،

بشرطیکہ اس کی قید اس کے اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے دوران میں خاموش رہنا مسنون ہے، مگر بات کرنا حرام نہیں ہے۔ جو شخص امام سے اتنا قریب بیٹھا ہو کہ خطبہ سُن سکتا ہو اس کے لیے بولنا مکروہ ہے، لیکن وہ سلام کا جواب دے سکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سُن کر بآوازِ بلند دُرود پڑھ سکتا ہے۔ (مُغنی المحتاج، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

مالکیہ کے نزدیک جمعے کا وقت زوال سے شروع ہو کر مغرب سے اِتنے پہلے تک ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے خطبہ اور نماز ختم ہو جائے۔ بیع کی حُرمت اور سعی کا وجوب دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر بیع واقع ہو تو وہ فاسد ہے اور فسخ ہو گی۔ جمعہ صرف اُن بستیوں میں ہو سکتا ہے جن کے باشندے وہاں مستقل طور پر گھر بنا کر رہتے ہوں، اور جاڑے گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں، اور ان کی ضروریات اُسی بستی میں فراہم ہوتی ہوں، اور اپنی تعداد کی بنا پر وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہوں۔ عارضی قیام گاہوں میں، خواہ کتنے ہی لوگ ہوں اور خواہ وہ کتنی ہی مدت ٹھیریں، جمعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جس بستی میں جمعہ قائم کیا جاتا ہو، اس سے تین میل کے فاصلے تک رہنے والے لوگوں پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ نمازِ جمعہ صرف ایسی مسجد میں ہو سکتی ہے جو بستی کے اندر یا اس سے متصل ہو اور جس کی عمارت بستی کے عام باشندوں کے گھروں سے کم تر درجے کی نہ ہو۔ بعض مالکیوں نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مسجد مُسقّف ہونی چاہیے اور اس میں پنج وقتہ نماز کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ لیکن مالکیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ کسی مسجد میں صحتِ جمعہ کے لیے اس کا مُسقّف ہونا شرط نہیں ہے، اور ایسی مسجد میں بھی جمعہ ہو سکتا ہے جو صرف نمازِ جمعہ کے لیے بنائی گئی ہو اور پنج وقتہ نماز کا اس میں اہتمام نہ ہو۔ جمعے کی نماز صحیح ہونے کے لیے جماعت میں امام کے سوا کم از کم ۱۲ ایسے آدمیوں کا موجود ہونا ضروری ہے جن پر جمعہ فرض ہو۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص پر سے جمعے کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں: سفر کی حالت میں ہو، یا بحالتِ سفر کسی جگہ چار دن سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایسا مریض ہو کہ مسجد آنا اس کے لیے دشوار ہو۔ اس کی ماں یا باپ یا بیوی یا بچہ بیمار ہو، یا وہ کسی ایسے اجنبی مریض کی تیمارداری کر رہا ہو جس کا اور کوئی تیماردار نہ ہو، یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار سخت بیماری میں مبتلا ہو یا مرنے کے قریب ہو۔ اس کے ایسے مال کو، جس کا نقصان قابلِ برداشت نہ ہو، خطرہ لاحق ہو، یا اسے اپنی جان یا آبرو کا خطرہ ہو، یا وہ مار یا قید کے خوف سے چُھپا ہوا ہو بشرطیکہ وہ اس معاملے میں مظلوم ہو۔ سخت بارش اور کیچڑ پانی یا سخت گرمی یا سردی مسجد تک پہنچنے میں مانع ہو۔ دو خطبے نماز سے پہلے لازم ہیں، حتّٰی کہ اگر نماز کے بعد خطبہ ہو تو نماز کا اِعادہ ضروری ہے۔ اور یہ خطبے لازماً مسجد کے اندر ہونے چاہییں۔ خطبے کے لیے جب امام منبر کی طرف بڑھے اس وقت سے نفل پڑھنا حرام ہے، اور جب خطبہ شروع ہو تو بات کرنا بھی حرام ہے، خواہ آدمی خطبے کی آواز نہ سُن رہا ہو۔ لیکن اگر خطیب اپنے خطبے میں ایسی لَغو باتیں کرے جو نظامِ خطبہ سے خارج ہوں، یا کسی ایسے شخص کو گالیاں دے جو گالی کا مستحق نہ ہو، یا کسی ایسے شخص کی تعریفیں شروع کر دے جس کی تعریف جائز نہ ہو، یا خطبے سے غیر متعلق کوئی چیز پڑھنے لگے، تو لوگوں کو اُس پر احتجاج کرنے کا حق ہے۔ نیز

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ

اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمھیں

خطبے میں بادشاہِ وقت کے لیے دُعا مکروہ ہے، اِلّا یہ کہ خطیب کو اپنی جان کا خطرہ ہو۔ خطیب لازماً وہی شخص ہونا چاہیے جو نماز پڑھائے۔ اگر خطیب کے سوا کسی اور نے نماز پڑھائی تو وہ باطل ہوگی۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی علی الشرح الکبیر، احکام القرآن ابنِ عَرَبی، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

حَنابلہ کے نزدیک جمعے کی نماز کا وقت صبح کو سُورج کے بقدرِ یک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہونے تک ہے۔ لیکن زوال سے پہلے جمعہ صرف جائز ہے، اور زوال کے بعد واجب اور افضل۔ بیع کی حُرمت اور سعی کے وجوب کا وقت دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو بیع ہو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی۔ جمعہ صرف اُس جگہ ہوسکتا ہے جہاں ۴۰ ایسے آدمی، جن پر جمعہ فرض ہو، مستقل طور پر گھروں میں (نہ کہ خیموں میں) آباد ہوں، یعنی جاڑے اور گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ اس غرض کے لیے بستی کے گھروں اور محلّوں کے باہم متصل یا متفرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ان سب کے مجموعے کا نام ایک ہو تو وہ ایک ہی بستی ہے، خواہ اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہوں۔ ایسی بستی سے جو لوگ تین میل کے اندر رہتے ہوں، ان پر جمعے کے لیے حاضر ہونا فرض ہے۔ جماعت میں امام سمیت ۴۰ آدمیوں کی شرکت ضروری ہے۔ نماز کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ مسجد ہی میں ہو۔ کُھلے میدان میں بھی ہوسکتی ہے۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعے کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں: مسافر ہو اور جمعے کی بستی میں چار دن یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایسا مریض ہو کہ سواری پر آنا بھی اس کے لیے مشکل ہو۔ اندھا ہو، اِلّا یہ کہ خود راستہ ٹٹول کر آ سکتا ہو۔ کسی دوسرے شخص کے سہارے آنا اندھے کے لیے واجب نہیں ہے۔ سخت سردی یا سخت گرمی یا سخت بارش اور کیچڑ نماز کی جگہ پہنچنے میں مانع ہو۔ کسی ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے چُھپا ہُوا ہو۔ جان یا آبرو کا خطرہ یا ایسے مالی نقصان کا خوف ہو جو قابلِ برداشت نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے دوران میں اُس شخص کے لیے بولنا حرام ہے جو خطیب سے اتنا قریب ہو کہ اس کی آواز سُن سکتا ہو۔ البتہ دُور کا آدمی جس تک خطیب کی آواز نہ پہنچتی ہو، بات کر سکتا ہے۔ خطیب خواہ عادل ہو یا غیر عادل، لوگوں کو خطبے کے دوران میں چپ رہنا چاہیے۔ اگر جمعے کے روز عید ہو جائے تو جو لوگ عید پڑھ چکے ہوں، ان پر سے جمعے کا فرض ساقط ہے۔ اس مسئلے میں حنابلہ کا مسلک ائمۂ ثلاثہ کے مسلک سے مختلف ہے۔ (غایۃ المُنتَہٰی، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

اس امر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ جس شخص پر جمعہ فرض نہیں ہے، وہ اگر نمازِ جمعہ میں شریک ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اس کے لیے پھر ظہر پڑھنا فرض نہیں رہتا۔

قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱﴾ ع ۱۲

کھڑا چھوڑ دیا۔[19] ان سے کہو: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔[20] اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔[21] ع

۱۹ — یہ ہے وہ واقعہ جس کی وجہ سے اُوپر کی آیات میں جمعہ کے احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس کا قصّہ جو کُتُبِ حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابو مالک، اور حضرات حَسَن بصری، ابنِ زید، قَتَادَہ اور مُقاتِل بن حَیّان سے منقول ہوا ہے، یہ ہے کہ مدینۂ طیّبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اس نے ڈھول تاشے بجانے شروع کیے، تاکہ بستی کے لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں سُن کر لوگ بے چین ہو گئے اور ۱۲ آدمیوں کے سوا باقی سب بَقیع کی طرف دوڑ گئے جہاں قافلہ اُترا ہوا تھا۔ اس قصّے کی روایات میں سب سے زیادہ معتبر روایت حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ہے، جسے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوعُوانہ، عبد بن حُمَید، ابویَعلیٰ وغیرہم نے متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اس میں اضطراب صرف یہ ہے کہ کسی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ نماز کی حالت میں پیش آیا تھا، اور کسی میں یہ ہے کہ یہ اس وقت پیش آیا جب حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ لیکن حضرت جابرؓ اور دوسرے صحابہؓ و تابعینؒ کی تمام روایات کو جمع کرنے سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دورانِ خطبہ کا واقعہ ہے، اور حضرت جابرؓ نے جہاں یہ کہا ہے کہ یہ نمازِ جمعہ کے دوران میں پیش آیا، وہاں دراصل انھوں نے خطبے اور نماز کے مجموعے پر نمازِ جمعہ کا اطلاق کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس وقت ۱۲ مَردوں کے ساتھ سات عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ (ابنِ مَرْدُوْیَہ) قَتَادَہؒ کا بیان ہے کہ ۱۲ مردوں کے ساتھ ایک عورت تھی۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم) دارقُطنی کی ایک روایت میں ۴۰ افراد، اور عبد بن حُمَید کی روایت میں ۷ نفر بیان کیے گئے ہیں۔ اور فَرّاء نے ۸ نفر لکھے ہیں۔ لیکن یہ سب ضعیف روایات ہیں۔ اور قَتَادَہ کی یہ روایت بھی ضعیف ہے کہ اس طرح کا واقعہ تین مرتبہ پیش آیا تھا۔ (ابنِ جَرِیر) معتبر روایت حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ہے، جس میں باقی رہ جانے والوں کی تعداد ۱۲ بتائی گئی ہے۔ اور قَتَادَہ کی ایک روایت کے سوا باقی تمام صحابہؓ و تابعینؒ کی رِوایات اِس پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا۔ باقی رہ جانے والوں کے متعلق مختلف روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عمّار بن یاسرؓ، حضرت سالمؓ مَولیٰ حُذَیفہ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ شامل تھے۔ حافظ ابویَعلیٰ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں

Maktaba Tul Ishaat.com

بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگ اس طرح نکل کر چلے گئے اور صرف بارہ اصحاب باقی رہ گئے تو اُن کو خطاب کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی نفسی بیدہٖ لوتتابعتم حتی لم یبق منکم احد لسال بکم الوادی نارًا، ''اگر تم سب چلے جاتے اور ایک بھی باقی نہ رہتا تو یہ وادی آگ سے بہ نکلتی۔'' اسی سے ملتا جُلتا مضمون ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے، اور ابنِ جَرِیر نے قَتادَہ سے نقل کیا ہے۔

شیعہ حضرات نے اس واقعے کو بھی صحابہؓ پر طعن کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی اتنی بڑی تعداد کا خطبے اور نماز کو چھوڑ کر تجارت اور کھیل تماشے کی طرف دَوڑ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن یہ ایک سخت بے جا اعتراض ہے جو صرف حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ واقعہ ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں پیش آیا تھا۔ اُس وقت ایک طرف تو صحابہؓ کی اجتماعی تربیت ابتدائی مراحل میں تھی، اور دوسری طرف کفارِ مکہ نے اپنے اثر سے مدینۂ طیّبہ کے باشندوں کی سخت مَعاشی ناکا بندی کر رکھی تھی، جس کی وجہ سے مدینے میں اشیائے ضرورت کمیاب ہو گئی تھیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اُس وقت مدینے میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے اور قیمتیں بہت چڑھی ہوئی تھیں۔ (ابنِ جَرِیر) اس حالت میں جب ایک تجارتی قافلہ آیا تو لوگ اس اندیشے سے کہ کہیں ہمارے نماز سے فارغ ہوتے ہوتے سامان فروخت نہ ہو جائے، گھبرا کر اس کی طرف دوڑ گئے۔ یہ ایک ایسی کمزوری اور غلطی تھی جو اس وقت اچانک تربیت کی کمی اور حالات کی سختی کے باعث رونما ہو گئی تھی۔ لیکن جو شخص بھی اِن صحابہؓ کی وہ قربانیاں دیکھے گا جو اس کے بعد انھوں نے اسلام کے لیے کیں، اور یہ دیکھے گا کہ عبادات اور معاملات میں ان کی زندگیاں کیسے زبردست تقویٰ کی شہادت دیتی ہیں، وہ ہرگز یہ الزام رکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ ان کے اندر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا کوئی مرض پایا جاتا تھا، اِلّا یہ کہ اس کے اپنے دل میں صحابہؓ سے بُغض کا مرض پایا جاتا ہو۔

تاہم یہ واقعہ جس طرح صحابہؓ کے معترضین کی تائید نہیں کرتا، اُسی طرح اُن لوگوں کے خیالات کی تائید بھی نہیں کرتا جو صحابہؓ کی عقیدت میں غُلُوّ کر کے اِس طرح کے دعوے کرتے ہیں کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، یا ہوئی بھی ہو تو اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ان کی غلطی کا ذکر کرنا اور اسے غلطی کہنا اُن کی توہین ہے، اور اس سے ان کی عزّت و وَقعت دلوں میں باقی نہیں رہتی، اور اس کا ذکر اُن آیات و احادیث کے خلاف ہے جن میں صحابہؓ کے مغفور اور مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔ یہ ساری باتیں سراسر مبالغہ ہیں جن کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس غلطی کا ذکر کیا ہے جو صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد سے صادر ہوئی تھی۔ اُس کتاب میں کیا ہے جسے قیامت تک ساری اُمّت کو پڑھنا ہے۔ اور اُسی کتاب میں کیا ہے جس میں ان کے مغفور اور مقبولِ بارگاہ ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔ پھر حدیث و تفسیر کی تمام کتابوں میں صحابہؓ سے لے کر بعد کے اکابرِ اہلِ سنّت تک نے اس غلطی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ کیا اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر اُنھی صحابہؓ کی وَقعت دلوں سے نکالنے کے لیے کیا ہے جن کی وَقعت

وہ خود دلوں میں قائم فرمانا چاہتا ہے؟ اور کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ اور تابعین اور محدّثین و مفسّرین نے اس قصّے کی ساری تفصیلات اُس شرعی مسئلے سے ناواقفیت کی بنا پر بیان کر دی ہیں جو یہ غالی حضرات بیان کیا کرتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع سورۂ جمعہ پڑھنے والے اور اس کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کے دلوں سے صحابہؓ کی وَقعت نکل گئی ہے؟ اگر ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو وہ سب بے جا اور مبالغہ آمیز باتیں ہیں جو احترامِ صحابہؓ کے نام سے بعض لوگ کیا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کوئی آسمانی مخلوق نہ تھے بلکہ اِسی زمین پر پیدا ہونے والے انسانوں میں سے تھے۔ وہ جو کچھ بھی بنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تَربیَت سے بنے۔ یہ تربیَت بتدریج سال ہا سال تک ان کو دی گئی۔ اس کا جو طریقہ قرآن و حدیث میں ہم کو نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب کبھی ان کے اندر کسی کمزوری کا ظہور ہوا، اللہ اور اس کے رسولؐ نے بر وقت اس کی طرف توجہ فرمائی، اور فوراً اُس خاص پہلو میں تعلیم و تربیَت کا ایک پروگرام شروع ہو گیا جس میں وہ کمزوری پائی گئی تھی۔ اِسی نمازِ جمعہ کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب قافلۂ تجارت والا واقعہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ کا یہ رُکوع نازل فرما کر اس پر تنبیہ کی اور جمعے کے آداب بتائے۔ پھر اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل اپنے خطباتِ مبارکہ میں فرضیتِ جمعہ کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین فرمائی، جس کا ذکر ہم حاشیہ ۱۵ میں کر آئے ہیں، اور تفصیل کے ساتھ اُن کو آدابِ جمعہ کی تعلیم دی۔ چنانچہ احادیث میں یہ ساری ہدایات ہم کو بڑی واضح صورت میں ملتی ہیں۔

حضرت ابو سعید خُدرِیؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”ہر مسلمان کو جمعے کے روز غسل کرنا چاہیے، دانت صاف کرنے چاہئیں، جو اچھے کپڑے اُس کو میسّر ہوں پہننے چاہئیں، اور اگر خوشبو میسّر ہو تو لگانی چاہیے۔“ (مُسْنَدِ احمد بخاری، مُسلم، ابوداؤد، نَسائی) حضرت سَلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان جمعے کے روز غسل کرے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو پاک صاف کرے، سر میں تیل لگائے یا جو خوشبو گھر میں موجود ہو وہ لگائے، پھر مسجد جائے اور دو آدمیوں کو ہٹا کر ان کے بیچ میں نہ گھُسے، پھر جتنی کچھ اللہ توفیق دے اتنی نماز (نفل) پڑھے، پھر جب امام بولے تو خاموش رہے، اُس کے قصور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک معاف ہو جاتے ہیں۔“ (بخاری، مُسْنَدِ احمد) قریب قریب اِسی مضمون کی روایات حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت نُبَیْشَۃُ الہُذَلیؓ نے بھی حضورؐ سے نقل کی ہیں۔ (مُسْنَدِ احمد، بخاری، مُسلم، ابوداؤد، ترمِذی، طَبَرانی) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ”جب امام خطبہ دے رہا ہو، اُس وقت جو شخص بات کرے وہ اس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں، اور جو شخص اُس سے کہے کہ ”چُپ رہ!“ اس کا بھی کوئی جمعہ نہیں ہوا۔“ (مُسْنَدِ احمد) حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”اگر تم نے جمعے کے روز خطبے کے دوران میں بات کرنے والے شخص سے کہا: ”چُپ رہ!“ تو تم نے بھی لغو حرکت کی۔ (بخاری، مُسلم، نَسائی، ترمِذی، ابوداؤد) اسی سے ملتی جلتی

Maktaba Tul Ishaat.com

روایات امام احمد، ابوداؤد اور طَبَرانی نے حضرت علیؓ اور حضرت ابوالدَّرداءؓ سے نقل کی ہیں۔ اس کے ساتھ آپؐ نے خطیبوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ لمبے لمبے خطبے دے کر لوگوں کو تنگ نہ کریں۔ آپؐ خود جمعے کے روز مختصر خطبہ ارشاد فرماتے اور نماز بھی زیادہ لمبی نہ پڑھاتے تھے۔ حضرت جابرؓ بن سَمُرہ کہتے ہیں کہ حضورؐ طویل خطبہ نہیں دیتے تھے۔ وہ بس چند مختصر کلمات ہوتے تھے۔ (ابوداؤد) حضرت عبداللہؓ بن ابی اَوفیٰ کہتے ہیں کہ آپؐ کا خطبہ نماز کی بہ نسبت کم ہوتا تھا اور نماز اس سے زیادہ طویل ہوتی تھی۔ (نَسائی) حضرت عمّار بن یاسرؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبے کا مختصر ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ دین کی سمجھ رکھتا ہے۔'' (مُسنَدِ احمد، مُسلم) تقریباً یہی مضمون بَزّار نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کیا ہے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کس طرح لوگوں کو جمعے کے آداب سکھائے، یہاں تک کہ اس نماز کی وہ شان قائم ہوئی جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم کی اجتماعی عبادت میں نہیں پائی جاتی۔

۲۰ – یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ صحابہؓ سے جو غلطی ہوئی تھی، اس کی نوعیت کیا تھی۔ اگر معاذ اللہ، اس کی وجہ ایمان کی کمی اور آخرت پر دنیا کی دانستہ ترجیح ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب اور زَجر و تَوبیخ کا انداز کچھ اور ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی خرابی وہاں نہ تھی، بلکہ جو کچھ ہوا تھا تربیت کی کمی کے باعث ہوا تھا، اس لیے پہلے معلّمانہ انداز میں جمعے کے آداب بتائے گئے، پھر اُس غلطی پر گرفت کر کے مربیانہ انداز میں سمجھایا گیا کہ جمعے کا خطبہ سننے اور اس کی نماز ادا کرنے پر جو کچھ تمھیں خدا کے ہاں ملے گا، وہ اِس دنیا کی تجارت اور کھیل تماشوں سے بہتر ہے۔

۲۱ – یعنی اِس دنیا میں مجازاً جو بھی رزق رسانی کا ذریعہ بنتے ہیں، ان سب سے بہتر رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس طرح کے فقرے قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر آئے ہیں۔ کہیں اللہ تعالیٰ کو احسن الخالقین کہا گیا ہے، کہیں خیر الغافرین، کہیں خیر الحاکمین، کہیں خیر الرّاحمین، کہیں خیر النّاصرین۔ ان سب مقامات پر مخلوق کی طرف رزق، تخلیق، مغفرت، رحم اور نصرت کی نسبت مجازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف حقیقی۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بھی دنیا میں تم کو تنخواہ، اُجرت یا روٹی دیتے نظر آتے ہیں، یا جو لوگ بھی اپنی صنعت و کاریگری سے کچھ بناتے نظر آتے ہیں، یا جو لوگ بھی دوسروں کے قُصور معاف کرتے اور دوسروں پر رحم کھاتے اور دوسروں کی مدد کرتے نظر آتے ہیں، اللہ ان سب سے بہتر رازق، خالق، رحیم، غفور اور مددگار ہے۔

تفہیم القرآن

المنافقون

(٦٣)

Maktaba Tul Ishaat.com

المنافقون

نام پہلی آیت کے فقرے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس سُورت کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں منافقین ہی کے طرزِ عمل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، یہ سورت غزوۂ بنی المُصْطَلِق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یا تو دورانِ سفر میں نازل ہوئی ہے، یا حضورؐ کے مدینۂ طیبہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اس کا نُزول ہوا ہے۔ اور ہم سورۂ نُور کے دیباچے میں یہ بات تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ غزوۂ بنی المُصْطَلِق شعبان ۶ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس طرح اِس کی تاریخِ نُزُول ٹھیک ٹھیک متعیّن ہو جاتی ہے۔

تاریخی پَس منظر جس خاص واقعے کے بارے میں یہ سُورت نازل ہوئی ہے، اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مدینے کے منافقین کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ جو واقعہ اُس موقع پر پیش آیا تھا، وہ محض ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ اُس کے پیچھے ایک پُورا سلسلۂ واقعات تھا جو بالآخر اِس نوبت تک پہنچا۔

مدینۂ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اَوس اور خَزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت و سیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دیں، حتّٰی کہ اس کے لیے تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔ یہ قبیلۂ خَزرج کا رئیس عبد اللہ بن اُبَیّ بن سَلُول تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ خَزرَج میں اس کی بزرگی بالکل مُتَّفَقٌ عَلَیْہ تھی، اور اَوس و خَزرَج اِس سے پہلے کبھی ایک شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے۔ (ابنِ ہِشَام، ج ۲، ص ۲۳۴)

اس صورتِ حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے با اثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعت عَقَبۂ ثانیہ کے موقع پر جب رسولؐ اللہ کو مدینۂ طیبہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی، اُس وقت حضرت عباسؓ بن عُبادَہ بن نَضلہ انصاری اِس دعوت کو صرف اِس مصلحت سے مؤخر کرنا چاہتے تھے کہ عبد اللہ بن اُبَیّ بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے، تاکہ مدینہ بالاتفاق اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا، اس نے اِس مَصلَحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکا، جن میں دونوں قبیلوں کے ۷۵ آدمی شامل

تھے، ہر خطرہ مول لے کر حضورؐ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۸۹) اِس واقعے کی تفصیلات ہم سورۂ اَنفال کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد جب حضورؐ مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبَیّ بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اُن بہت سے حامیوں کے ساتھ، جن میں دونوں قبیلوں کے شُیوخ اور سردار شامل تھے، داخلِ اسلام ہو گیا، حالانکہ دل اِن سب کے جل رہے تھے، اور خاص طور پر ابنِ اُبَیّ کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھِن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعے کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبداللہ بن اُبَیّ اُٹھ کر کہتا کہ ”حضرات! یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں، جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے، لہٰذا آپ اِن کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سُنیں اور اِن کی اطاعت کریں۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۳، ص ۱۱۱) دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کُھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور گروہ اہلِ ایمان سے سخت بُغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابنِ اُبَیّ نے آپؐ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپؐ نے حضرت سعدؓ بن عُبَادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو اُنھوں نے عرض کیا: ”یا رسولؐ اللہ! اس شخص کے ساتھ نرمی برتیے۔ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاجِ شاہی تیار کر رہے تھے، اب یہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۲۳۷-۲۳۸)

جنگِ بدر کے بعد جب یہودِ بنی قَینُقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر چڑھائی کی تو یہ شخص اُن کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کی زِرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ ”یہ سات سو مردانِ جنگی، جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپؐ اُنھیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک آپؐ میرے اِن حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۳، ص ۵۱-۵۲)

جنگِ اُحُد کے موقع پر اس شخص نے صریح غدّاری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے اُلٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی، اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِن ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اِس واقعے کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے، اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریکِ کار تھے۔ اِسی بنا پر جنگِ اُحُد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا: ”بیٹھ جاؤ، تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔“ مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ عَلانِیَہ اِس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کُودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا: ”یہ کیا حرکت کر رہے ہو، واپس چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِستِغفار کی درخواست کرو۔“ اس نے بگڑ کر جواب دیا: ”مَیں ان سے کوئی اِستِغفار نہیں کرانا چاہتا۔“ (ابنِ ہِشَام، ج ۳، ص ۱۱۱)

پھر ۴ھ میں غزوۂ بنی النَّضِیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ اِن یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمھاری مدد کریں گے، اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود کھول دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کے دوسرے رُکوع میں گزر چکا ہے۔

لیکن اُس کی اور اُس کے ساتھیوں کی اِتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے، وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتھّا اس کے ساتھ تھا۔ اَوس اور خَزرَج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اُس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوۂ اُحُد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے اِن دشمنوں سے بھی جنگ مُول لے لی جاتی۔ اسی بنا پر اُن کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدّت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے نہ ہمت کہ عَلانِیَہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لیتے، یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ کھلّم کھلّا مل کر میدان میں آ جاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے، مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی آیات ۱۲-۱۴ میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان بنے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے۔

نمازیں پڑھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے وہ لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں، جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو اُن نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے، اور فتنہ پردازی کے اُن مواقع سے بھی فائدہ اُٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انھیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھی منافقین کو غزوۂ بنی المُصطَلِق کی مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اُٹھا دیے جو مسلمانوں کی جمعیّت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآنِ پاک کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اہلِ ایمان کو جو بہترین تربیَت ملی تھی، اُس کی بدولت اِن دونوں فتنوں کا بروقت قَلع قَمع ہو گیا اور یہ منافقین اُلٹے خود ہی رُسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ اور دوسرا فتنہ یہ ہے جس کا اِس سورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس واقعے کو بخاری، مسلم، احمد، نَسائی، تِرمِذی، بَیْہَقی، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ، عبدالرزّاق، ابنِ جَریر طَبَری، ابنِ سعد اور محمد بن اسحاق نے بکثرت سندوں سے نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں اُس مہم کا نام نہیں لیا گیا ہے جس میں یہ پیش آیا تھا، اور بعض میں اسے غزوۂ تبوک کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر مَغازی اور سِیَر کے علما اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ غَزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ صورتِ واقعہ تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے:

بنی المُصطَلِق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکرِ اسلام اُس بستی میں ٹھیرا ہوا تھا جو مُرَیسیع نامی کنویں پر آباد تھی کہ یکایک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا نام جَہجَاہ بن مسعود غِفاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور اُن کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے، اور دوسرے صاحب سِنان بن وَبَر الجُہَنی[1] تھے جن کا قبیلہ خَزرَج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا۔ زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جَہجَاہ نے سِنان کے ایک لات رسید کر دی، جسے اپنی قدیم یمنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سِنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا، اور جَہجَاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابنِ اُبَیّ نے اِس جھگڑے کی خبر سُنتے ہی اَوس اور خَزرَج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ اُدھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے۔ قریب تھا کہ

---

1. دونوں اصحاب کے نام مختلف رِوایات میں مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے یہ نام ابنِ ہِشام کی روایت سے لیے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بات بڑھ جاتی اور اُسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اُسے شکست دے کر ابھی اُسی کے علاقے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ شور سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے اور آپؐ نے فرمایا: ما بالُ دعوی الجاھلیة؟ ما لکم ولدعوة الجاھلیة؟ دعوھا فانھا مُنْتِنَة۔ "یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اِسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے[1]۔" اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سِنان نے جَہجاہ کو معاف کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نِفاق تھا، عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس پہنچا اور اِن لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ "اب تک تو تم سے اُمیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافعت کر رہے تھے، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلے میں اِن کنگلوں[2] کے مددگار بن گئے ہو۔" ابنِ اُبَیّ پہلے ہی کَھول رہا تھا۔ اِن باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھا۔ کہنے لگا: "یہ سب کچھ تمھارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے اِن لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، ان پر اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی حریف بن گئے۔

---

[1] یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو اِس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے اِسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی اگر اپنے جھگڑے میں لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہیں تو وہ کہیں: "مسلمانو! آؤ اور ہماری مدد کرو" یا یہ کہ "لوگو! ہماری مدد کے لیے آؤ"۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے قبیلے، یا برادری، یا نسل و رنگ، یا علاقے کے نام پر لوگوں کو پکارتا ہے تو یہ جاہلیت کی پکار ہے، اور اس پکار پر لبیک کہہ کر آنے والے اگر یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اور حق و انصاف کی بنا پر مظلوم کی حمایت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروہ کے آدمی کی حمایت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں تو یہ جاہلیت کا فعل ہے جس سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گندی اور گھناؤنی چیز قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تمھارا اِس جاہلیت کی پکار سے کیا واسطہ؟ تم اسلام کی بنیاد پر ایک مِلّت بنے تھے، اب یہ انصار اور مہاجر کے نام پر تمھیں کیسے پکارا جا رہا ہے، اور اس پکار پر تم کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ علامہ سُہَیلیؒ نے رَوضُ الاُنُف میں لکھا ہے کہ فقہائے اسلام نے کسی جھگڑے یا اختلاف میں جاہلیت کی پکار بلند کرنے کو ایک فوجداری جُرم قرار دیا ہے۔ ایک گروہ اس کی سزا پچاس ضرب تازیانہ قرار دیتا ہے، دوسرا گروہ دس ضرب تجویز کرتا ہے، اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کی سزا حالات کی مناسبت سے دی جانی چاہیے۔ بعض حالات میں صرف زَجر و تَوبیخ کافی ہے، بعض دوسرے حالات میں ایسی پکار بلند کرنے والے کو قید کرنا چاہیے، اور اگر یہ زیادہ شر انگیز ہو تو اس کے مرتکب کو سزائے تازیانہ دینی چاہیے۔

[2] مدینے کے منافقین اُن تمام لوگوں کو جو اسلام قبول کر کر کے مدینے میں آ رہے تھے، "جلابیب" کہا کرتے تھے۔ لُغوی معنیٰ تو اس لفظ کے گلیم پوش یا موٹے جھوٹے کپڑے پہننے والے کے ہیں، مگر اصل مفہوم جس میں وہ لوگ غریب مہاجرین کی تذلیل کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے، کنگلے کے لفظ سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

ہماری اور اِن قریش کے کنگلوں (یا اصحابِ محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کُتّے کو کھلا پلا کر موٹا کر، تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم! مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزّت والا ہے، وہ ذلیل کو نکال دے گا۔"

مجلس میں اتفاق سے حضرت زیدؓ بن اَرقَم بھی موجود تھے جو اُس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سُن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا، اور اُن کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے جو کچھ سنا تھا، مِن وعَن دُہرا دیا۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شاید تم ابنِ اُبَیّ سے ناراض ہو۔ ممکن ہے تم سے سُننے میں کچھ غلطی ہوگئی ہو۔ ممکن ہے تمھیں شبہ ہو گیا ہو کہ ابنِ اُبَیّ یہ کہہ رہا ہے۔" مگر زیدؓ نے عرض کیا: "نہیں حضوؐر، خدا کی قسم! مَیں نے اس کو یہ باتیں کہتے سُنا ہے۔" اس پر حضوؐر نے ابنِ اُبَیّ کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مُکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضوؐر! لڑکے کی بات ہے۔ شاید اسے وہم ہو گیا ہو۔ یہ ہمارا شیخ اور بزرگ ہے۔ اِس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زیدؓ کو بھی ملامت کی اور وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضوؐر زیدؓ کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن اُبَیّ کو بھی، اس لیے آپؐ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے آ کر عرض کیا: "مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں۔ یا اگر مجھے یہ اجازت دینا مناسب خیال نہیں فرماتے تو خود انصار ہی میں سے مُعاذ بن جَبَلؓ، یا عَبّادؓ بن بِشر، یا سعدؓ بن مُعاذ، یا محمدؓ بن مَسْلَمَہ کو حکم دیجیے[2] کہ وہ اسے قتل کر دیں۔" مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کر رہا ہے۔" اس کے بعد آپؐ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل ۳۰ گھنٹے چلتے رہے، یہاں تک کہ لوگ تھک کر چُور ہو گئے۔ پھر آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر ٹکاتے ہی سو گئے۔ یہ آپؐ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مُرَیسیع کے کنویں پر پیش آیا تھا، اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو

---

[1] فقہا نے اِس سے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ ایک شخص کی بُری بات دوسرے شخص تک پہنچانا اگر کسی دینی، اَخلاقی یا ملّی مصلحت کے لیے ہو تو یہ چُغلی کی تعریف میں نہیں آتا۔ شریعت میں جس چُغل خوری کو حرام کیا گیا ہے، وہ فساد کی غرض سے اور لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لیے چُغلی کھانا ہے۔

[2] مختلف روایات میں مختلف انصاری بزرگوں کے نام آئے ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ آپ ان میں سے کسی شخص سے یہ خدمت لے لیں اگر مجھ سے اس لیے یہ کام لینا مناسب خیال نہیں فرماتے کہ میں مہاجر ہوں، میرے ہاتھوں اس کے مارے جانے سے فتنے بھڑک اُٹھنے کا امکان ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ہو جائیں۔ راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اُسَیدؓ بن حُضَیر آپ سے ملے اور عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! آج آپؐ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لیے موزوں نہ تھا اور آپؐ کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تم نے سُنا نہیں کہ تمھارے اُن صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟'' انھوں نے پوچھا: ''کون صاحب؟'' فرمایا: ''عبداللہ بن اُبَیّ''۔ انھوں نے پوچھا: ''اس نے کیا کہا؟'' فرمایا: ''اس نے کہا ہے کہ مدینے پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔'' انھوں نے عرض کیا:

''یا رسولؐ اللہ، خدا کی قسم! عزت والے تو آپؐ ہیں اور ذلیل وہ ہے، آپؐ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں۔''

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابنِ اُبَیّ کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابنِ اُبَیّ سے کہا: ''جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگو۔'' مگر اس نے تڑخ کر جواب دیا: ''تم نے کہا کہ اُن پر ایمان لاؤ۔ مَیں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں۔'' ان باتوں سے اس کے خلاف مومنینِ انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اُس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینۂ طیّبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن اُبَیّ کے صاحبزادے، جن کا نام بھی عبداللہؓ ہی تھا، تلوار سُونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے: ''آپ نے کہا تھا کہ مدینے واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم! آپ مدینے میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اجازت نہ دیں۔'' اس پر ابنِ اُبَیّ چیخ اُٹھا: ''خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینے میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔'' لوگوں نے یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی اور آپؐ نے فرمایا: ''عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے۔'' عبداللہؓ نے کہا: ''اُن کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔'' اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''کیوں عمر! اب تمھارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اُس کو قتل کرنے کی اجازت دیجیے اُس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑکنے لگتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل تک کیا جا سکتا ہے۔'' حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''خدا کی قسم! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی[1]۔''

[1] اس سے دو اہم شرعی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے: ایک یہ کہ جو طرزِ عمل ابنِ اُبَیّ نے اختیار کیا تھا، اگر کوئی شخص مُسلم ملّت میں رہتے ہوئے اُس طرح کا رویّہ اختیار کرے تو وہ قتل کا مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قانوناً کسی شخص کے مستحقِ قتل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرور اسے قتل ہی کر دیا جائے۔ ایسے کسی فیصلے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کا قتل کسی عظیم تر فتنے کا مُوجِب تو نہ بن جائے گا۔ حالات سے آنکھیں بند کر کے قانون کا اندھا دُھند استعمال بعض اوقات اُس مقصد کے خلاف بالکل اُلٹا

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ سُورت، اغلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

نتیجہ پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے قانون استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک منافق اور مفسد آدمی کے پیچھے کوئی قابلِ لحاظ سیاسی طاقت موجود ہو تو اسے سزا دے کر مزید فتنوں کو سر اُٹھانے کا موقع دینے سے بہتر یہ ہے کہ حکمت اور تدبُّر کے ساتھ اُس اصل سیاسی طاقت کا اِستیصال کر دیا جائے جس کے بل پر وہ شرارت کر رہا ہو۔ یہی مَصلَحت تھی جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبَیّ کو اُس وقت بھی سزا نہ دی جب آپ اسے سزا دینے پر قادر تھے، بلکہ اُس کے ساتھ برابر نرمی کا سلوک کرتے رہے، یہاں تک کہ دو تین سال کے اندر مدینے میں منافقین کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایاتہا ۱۱ سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِیَّۃٌ رکوعاتہا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وقف لازم

اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ وَ اللّٰہُ
یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ۚ﴿۱﴾
اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ

اے نبیؐ! جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔“ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسولؐ ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں[۱]۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے[۲] اور اِس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے اور دنیا کو روکتے ہیں[۳]۔

۱- یعنی جو بات وہ زبان سے کہہ رہے ہیں، وہ ہے تو بجائے خود سچّی، لیکن چونکہ اُن کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جسے وہ زبان سے ظاہر کر رہے ہیں، اس لیے اپنے اِس قول میں وہ جھوٹے ہیں کہ وہ آپؐ کے رسولؐ ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شہادت دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے: ایک وہ اصل بات جس کی شہادت دی جائے۔ دوسرے اُس بات کے متعلق شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ۔ اب اگر بات بجائے خود بھی سچّی ہو، اور شہادت دینے والے کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کو وہ زبان سے بیان کر رہا ہو، تو ہر لحاظ سے وہ سچا ہو گا۔ اور اگر بات اپنی جگہ جھوٹی ہو، لیکن شہادت دینے والا اُسی کے حق ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو، تو ہم ایک لحاظ سے اُس کو سچا کہیں گے، کیونکہ وہ اپنا عقیدہ بیان کرنے میں صادق ہے، اور ایک دوسرے لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے، کیونکہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ بجائے خود غلط ہے۔ اس کے برعکس اگر بات اپنی جگہ سچّی ہو لیکن شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ اس کے خلاف ہو، تو ہم اِس لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کہ وہ صحیح بات کی شہادت دے رہا ہے، اور اِس لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کہ اس کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مومن اگر اسلام کو برحق کہے تو وہ ہر لحاظ سے سچّا ہے۔ لیکن ایک یہودی اپنی یہودیت پر قائم رہتے ہوئے اس دین کو اگر برحق کہے تو بات اس کی سچّی ہو گی مگر شہادت اُس کی جھوٹی قرار دی جائے گی، کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اِس دین کو باطل کہے، تو ہم کہیں گے کہ بات اس کی جھوٹی ہے، مگر شہادت وہ اپنے عقیدے کے مطابق سچّی دے رہا ہے۔

سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٢ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٣ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ
اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ

کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا اس لیے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے[۴]۔

انھیں دیکھو تو اِن کے جُثّے تمھیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سُنتے رہ[۵] جاؤ۔ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کُندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چُن کر رکھ دیے گئے ہوں[۶]۔

۲- یعنی اپنے مسلمان اور مومن ہونے کا یقین دلانے کے لیے جو قسمیں وہ کھاتے ہیں، اُن سے وہ ڈھال کا کام لیتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے غصے سے بچے رہیں اور ان کے ساتھ مسلمان وہ برتاؤ نہ کر سکیں جو کُھلے کُھلے دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔

اِن قسموں سے مراد وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو وہ بالعموم اپنے ایمان کا یقین دلانے کے لیے کھایا کرتے تھے، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو اپنی کسی منافقانہ حرکت کے پکڑے جانے پر وہ کھاتے تھے، تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین دلائیں کہ وہ حرکت انھوں نے منافقت کی بنا پر نہیں کی تھی، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو عبداللہ بن اُبَیّ نے حضرت زیدؓ بن اَرقم کی دی ہوئی خبر کو جھٹلانے کے لیے کھائی تھیں۔ اِن سب احتمالات کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس قول کو قسم قرار دیا ہو کہ ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' اس آخری احتمال کی بنا پر فقہا کے درمیان یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ کوئی شخص ''مَیں شہادت دیتا ہوں'' کے الفاظ کہہ کر کوئی بات بیان کرے تو آیا اسے قسم یا حلف (oath) قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب (امام زُفرؒ کے سوا) اور امام سُفیان ثَوریؒ اور امام اَوزاعیؒ اسے حلف (شرعی اصطلاح میں یمین) قرار دیتے ہیں۔ امام زُفرؒ کہتے ہیں کہ یہ حلف نہیں ہے۔ امام مالک سے دو قول مروی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مطلقاً حلف ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اس نے ''شہادت دیتا ہوں'' کے الفاظ کہتے وقت نیّت یہ کی ہو کہ ''خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں''، یا ''خدا کو گواہ کر کے میں شہادت دیتا ہوں'' تو اس صورت میں یہ حلفیہ بیان ہوگا ورنہ نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر کہنے والا یہ الفاظ بھی کہے کہ میں ''خدا کو گواہ کر کے شہادت دیتا ہوں'' تب بھی اس کا یہ بیان حلفیہ بیان نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ یہ الفاظ اس نے حلف اُٹھانے کی نیّت سے کہے ہوں۔ (احکام القرآن للجصّاص، احکام القرآن لابن العربی)

۳- صَدّ کا لفظ عربی زبان میں لازم بھی ہے اور متعدّی بھی۔ اس لیے صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے معنی یہ

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ اس راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں دونوں معنٰی درج کر دیے ہیں۔ پہلے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن قسموں کے ذریعے سے مسلمانوں کے اندر اپنی جگہ محفوظ کر لینے کے بعد وہ اپنے لیے ایمان کے تقاضے پُورے نہ کرنے اور خدا و رسُولؐ کی اطاعت سے پہلُوتہی کرنے کی آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن جھوٹی قسموں کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، مسلمان بن کر مسلمانوں کی جماعت میں اندر سے رخنے ڈالتے ہیں، مسلمانوں کے اَسرار سے واقف ہو کر دشمنوں کو اُن کی خبریں پہنچاتے ہیں، اسلام سے غیر مسلموں کو بدگمان کرنے اور سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈالنے کے لیے وہ وہ حَربے استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک مسلمان بنا ہوا منافق ہی استعمال کر سکتا ہے، کھلا کھلا دشمنِ اسلام اُن سے کام نہیں لے سکتا۔

۴ - اس آیت میں ایمان لانے سے مراد ایمان کا اقرار کر کے مسلمانوں میں شامل ہونا ہے۔ اور کفر کرنے سے مراد دل سے ایمان نہ لانا اور اُسی کفر پر قائم رہنا ہے جس پر وہ اپنے ظاہری اقرارِ ایمان سے پہلے قائم تھے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ جب انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر سیدھے سیدھے ایمان یا صاف صاف کفر کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ منافقانہ رَوِش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی اور ان سے یہ توفیق سلب کر لی گئی کہ وہ ایک سچّے اور بے لاگ اور شریف انسان کا سا رَوِیّہ اختیار کریں۔ اب ان کی سمجھ بُوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ ان کی اَخلاقی حِس مر چکی ہے۔ انھیں اس راہ پر چلتے ہوئے کبھی یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ شب و روز کا جھوٹ اور یہ ہر وقت کا مکر و فریب اور یہ قول و فعل کا دائمی تضاد، کیسی ذلیل حالت ہے جس میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔

یہ آیت من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اللہ کی طرف سے کسی کے دل پر مُہر لگانے کا مطلب بالکل واضح طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان منافقین کی یہ حالت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی تھی اس لیے ایمان ان کے اندر اُتر ہی نہ سکا اور وہ مجبوراً منافق بن کر رہ گئے۔ بلکہ اس نے ان کے دلوں پر یہ مُہر اس وقت لگائی جب انھوں نے اظہارِ ایمان کرنے کے باوجود کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب ان سے مخلصانہ ایمان اور اس سے پیدا ہونے والے اَخلاقی رویّے کی توفیق سلب کر لی گئی، اور اُس منافقت اور منافقانہ اَخلاق ہی کی توفیق انھیں دے دی گئی جسے انھوں نے خود اپنے لیے پسند کیا تھا۔

۵ - حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبَیّ بڑے ڈیل ڈَول کا، تندرست، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینے کے رئیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔ ان کے جُثّۂ بُشرے کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر کوئی یہ گمان تک نہ کر سکتا تھا کہ بستی کے یہ معززین اپنے کردار کے لحاظ سے اتنے ذلیل ہوں گے۔

۶ - یعنی یہ جو دیواروں کے ساتھ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، یہ انسان نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے کُندے ہیں۔ اُن کو لکڑی

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قٰتَلَهُمُ
اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ
اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵

ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔[7] یہ پکے دشمن ہیں،[8] ان سے بچ کر رہو،[9] اللہ کی مار ان پر![10] یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں۔[11]

اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسولؐ تمھارے لیے مغفرت کی دُعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رُکتے ہیں۔[12]

سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا کہ یہ اَخلاق کی رُوح سے خالی ہیں جو اصل جوہرِ انسانیت ہے۔ پھر انھیں دیوار سے لگے ہوئے کُندوں سے تشبیہ دے کر یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ بالکل ناکارہ ہیں۔ کیونکہ لکڑی بھی اگر کوئی فائدہ دیتی ہے تو اُس وقت جب کہ وہ کسی چھت میں، یا کسی دروازے میں، یا کسی فرنیچر میں لگ کر استعمال ہو رہی ہو۔ دیوار سے لگا کر کُندے کی شکل میں جو لکڑی رکھ دی گئی ہو وہ کوئی فائدہ بھی نہیں دیتی۔

۷ – اس مختصر سے فقرے میں ان کے مجرم ضمیر کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ چونکہ وہ اپنے دلوں میں خوب جانتے تھے کہ وہ ایمان کے ظاہری پردے کی آڑ میں منافقت کا کیا کھیل کھیل رہے ہیں، اس لیے انھیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب ان کے جرائم کا راز فاش ہو، یا ان کی حرکتوں پر اہلِ ایمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ان کی خبر لے ڈالی جائے۔ بستی میں کسی طرف سے بھی کوئی زور کی آواز آتی یا کہیں کوئی شور بلند ہوتا تھا تو وہ سہم جاتے اور یہ خیال کرتے تھے کہ آ گئی ہماری شامت۔

۸ – دوسرے الفاظ میں کھلے دشمنوں کی بہ نسبت یہ چھپے ہوئے دشمن زیادہ خطرناک ہیں۔

۹ – یعنی ان کے ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ ہر وقت خیال رکھو کہ یہ کسی وقت بھی دغا دے سکتے ہیں۔

۱۰ – یہ بددعا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں اِس فیصلے کا اعلان ہے کہ وہ اس کی مار کے مستحق ہو چکے ہیں، ان پر اس کی مار پڑ کر رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے لُغوی معنیٰ میں استعمال نہ فرمائے ہوں بلکہ عربی محاورے کے مطابق لعنت اور پھٹکار اور مذمّت کے لیے استعمال کیے ہوں، جیسے اُردو میں ہم کسی کی بُرائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ستیاناس اُس کا، کیسا خبیث آدمی ہے۔ اس لفظ ''ستیاناس'' سے مقصود اس کی خباثت کی شدّت ظاہر کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے حق میں بددعا کرنا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝۶

اے نبیؐ! تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انھیں معاف نہ کرے گا،[۱۳] اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں[۱۴] دیتا۔

۱۱ – یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کو ایمان سے نفاق کی طرف اُلٹا پھرانے والا کون ہے۔ اس کی تصریح نہ کرنے سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اُن کی اِس اَوندھی چال کا کوئی ایک محرّک نہیں ہے بلکہ بہت سے محرّکات اس میں کارفرما ہیں۔ شیطان ہے۔ بُرے دوست ہیں۔ ان کے اپنے نفس کی اغراض ہیں۔ کسی کی بیوی اس کی محرّک ہے۔ کسی کے بچے اس کے محرّک ہیں۔ کسی کی برادری کے اَشرار اس کے محرّک ہیں۔ کسی کو حسد اور بُغض اور تکبّر نے اس راہ پر ہانک دیا ہے۔

۱۲ – یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ رسولؐ کے پاس اِستغفار کے لیے نہ آئیں، بلکہ یہ بات سُن کر غرور اور تمکنت کے ساتھ سر کو جھٹکا دیتے ہیں اور رسولؐ کے پاس آنے اور معافی طلب کرنے کو اپنی توہین سمجھ کر اپنی جگہ جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ان کے مومن نہ ہونے کی کُھلی علامت ہے۔

۱۳ – یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اُس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ ”تم چاہے ان کے لیے اِستغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دُعائے مغفرت کرو گے تو اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا“ (التوبہ: ۸۰) آگے چل کر پھر فرمایا: ”اگر ان میں سے کوئی مرجائے تو اس کی نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ اِن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہونے کی حالت میں مرے ہیں۔“ (التوبہ: ۸۴)

۱۴ – اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فِسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسولؐ بھی مغفرت کی دُعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر جھٹک کر غرور کے ساتھ اس دعوت کو ردّ کر دے، تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہِ راست پر لائے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۷ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

ع ۱/۸ ۱۴

یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسُولؐ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزّت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔[15] حالانکہ عزّت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے،[16] مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔ ع
اَے لوگو جو ایمان لائے ہو،[17] تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔[18]

۱۵ – حضرت زیدؓ بن اَرقَم کہتے ہیں کہ جب میں نے عبداللہ بن اُبَیّ کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا، اور اس نے آ کر صاف انکار کر دیا اور اس پر قسم کھا گیا، تو انصار کے بڑے بوڑھوں نے اور خود میرے اپنے چچا نے مجھے بہت ملامت کی، حتّٰی کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ حضورؐ نے بھی مجھے جھوٹا اور عبداللہ بن اُبَیّ کو سچا سمجھا ہے۔ اس چیز سے مجھے ایسا غم لاحق ہوا جو عمر بھر کبھی نہیں ہوا اور میں دل گرفتہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر ہنستے ہوئے میرا کان پکڑا اور فرمایا: ”لڑکے کا کان سچّا تھا، اللہ نے اِس کی خود تصدیق فرما دی۔“ (ابنِ جَریر۔ ترمِذی میں بھی اس سے ملتی جُلتی روایت موجود ہے)۔

۱۶ – یعنی عزت اللہ کے لیے بالذات مخصوص ہے، اور رسولؐ کے لیے بربنائے رسالت، اور مومنین کے لیے بربنائے ایمان۔ رہے کُفّار و فُسّاق و منافقین، تو حقیقی عزّت میں سرے سے ان کا کوئی حصّہ ہی نہیں ہے۔

۱۷ – اب تمام اُن لوگوں کو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، قطعِ نظر اس سے کہ سچّے مومن ہوں یا محض زبانی اقرارِ ایمان کرنے والے، عام خطاب کر کے ایک کلمۂ نصیحت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ یہ بات اس سے پہلے ہم کئی

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۹﴾ وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا
رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ
لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ
الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ لَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَ اللّٰہُ
خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱﴾ ع

جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اُس وقت وہ کہے کہ ”اے میرے رب! کیوں نہ تُو نے مجھے تھوڑی سی مُہلت اَور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔“ حالانکہ جب کسی کی مُہلتِ عمل پُوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مزید مُہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع

مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے کبھی تو سچّے اہلِ ایمان کو خطاب کیا جاتا ہے، اور کبھی اس کے مخاطَب منافقین ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زبانی اقرارِ ایمان کرنے والے ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ہر طرح کے مسلمان بالعُموم اس سے مراد ہوتے ہیں۔ کلام کا موقع و محل یہ بتا دیتا ہے کہ کہاں کون سا گروہ ان الفاظ کا مخاطب ہے۔

۱۸- مال اور اولاد کا ذکر تو خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان زیادہ تر انھی کے مفاد کی خاطر ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر منافقت، یا ضعفِ ایمان، یا فِسق و نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے، ورنہ درحقیقت مراد دُنیا کی ہر وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے اندر اِتنا مشغول کر لے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جائے۔ یہ یادِ خدا سے غفلت ہی ساری خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر انسان کو یہ یاد رہے کہ وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور وہ خدا اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے، اور اس کے سامنے جا کر ایک دن اسے اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے، تو وہ کبھی کسی گمراہی و بدعملی میں مبتلا نہ ہو، اور بشری کمزوری سے اس کا قدم اگر کسی وقت پھسل بھی جائے تو ہوش آتے ہی وہ فوراً سنبھل جائے۔

تفہیم القرآن

التَّغَابُن

(۶۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

التغابن

نام آیت ۹ کے فقرے ذٰلِکَ یَوۡمُ التَّغَابُنِ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورت جس میں لفظ تَغَابُن آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول مُقاتِل اور کَلْبی کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصّہ مکّی ہے اور کچھ مدنی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عطاء بن یَسارؒ کہتے ہیں کہ ابتدا سے آیت ۱۳ تک مکّی ہے اور آیت ۱۴ سے آخر سُورت تک مدنی۔ مگر مفسّرین کی اکثریت پُوری سورت کو مدنی قرار دیتی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے اِس کا زمانۂ نُزول متعین کیا جاسکتا ہو، لیکن مضمونِ کلام پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبًا یہ مدینۂ طیِبہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس میں کچھ رنگ مکّی سورتوں کا سا اور کچھ مدنی سورتوں کا سا پایا جاتا ہے۔

موضوع اور مضمون اس سُورہ کا موضوع ایمان و طاعت کی دعوت اور اَخلاقِ حَسنہ کی تعلیم ہے۔ کلام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلی چار آیتوں کا خطاب تمام انسانوں سے ہے، پھر آیت ۵ سے ۱۰ تک اُن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو قرآن کی دعوت کو نہیں مانتے، اور اس کے بعد آیت ۱۱ سے آخر تک کی آیات کا رُوئے سُخَن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اِس دعوت کو مانتے ہیں۔

تمام انسانوں کو خطاب کر کے چند مختصر فقروں میں انھیں چار بنیادی حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے:

اوّل یہ کہ یہ کائنات، جس میں تم رہتے ہو، بے خدا نہیں ہے، بلکہ اس کا خالق اور مالک اور فرمانروا ایک ایسا قادرِ مُطلَق خدا ہے جس کے کامل اور بے عیب ہونے کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں ہے، بلکہ اِس کے خالق نے اِسے سراسر برحق پیدا کیا ہے۔ یہاں اِس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ایک فضول تماشا ہے جو عَبَث ہی شروع ہوا اور عَبَث ہی ختم ہوجائے گا۔

تیسرے یہ کہ تمھیں جس بہترین صورت کے ساتھ خدا نے پیدا کیا ہے اور پھر جس طرح کفر و ایمان کا اختیار تم پر چھوڑ دیا ہے، یہ کوئی لاحاصل اور لایعنی کام نہیں ہے کہ تم خواہ کفر اختیار کرو یا ایمان، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ دراصل خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے اس اختیار کو کس طرح

استعمال کرتے ہو۔

چوتھے یہ کہ تم غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ نہیں ہو۔ آخر کار تمھیں اپنے خالق کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور اُس ہستی سے تمھیں سابقہ پیش آنا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے واقف ہے، جس سے تمھاری کوئی بات پوشیدہ نہیں، جس پر دلوں کے چھُپے ہوئے خیالات تک روشن ہیں۔

کائنات اور انسان کی حقیقت کے بارے میں یہ چار بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد کلام کا رُخ اُن لوگوں کی طرف مڑتا ہے جنھوں نے کُفر کی راہ اختیار کی ہے، اور اُنھیں تاریخ کے اِس منظر کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو پُوری انسانی تاریخ میں مسلسل نظر آتا ہے کہ قوموں پر قومیں اُٹھتی ہیں اور بالآخر تباہی سے دوچار ہوتی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے اِس منظر کی ہزار توجیہیں کرتا رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اصل حقیقت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب صرف دو تھے:

ایک یہ کہ اُس نے جن رسولوں کو اُن کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا، اُن کی بات ماننے سے انھوں نے انکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ خود ہی اپنے فلسفے گھڑ گھڑ کر ایک گمراہی سے دوسری گمراہی میں بھٹکتی چلی گئیں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے آخرت کے عقیدے کو بھی ردّ کر دیا اور اپنے زُعم میں یہ سمجھ لیا کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اِس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے جس میں ہمیں اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہو۔ اِس چیز نے ان کے پُورے رَوِیّہِ زندگی کو بگاڑ کر رکھ دیا اور ان کے اَخلاق و کردار کی گندگی اس حد تک بڑھتی چلی گئی کہ آخر کار خدا کے عذاب ہی نے آ کر دنیا کو ان کے وجود سے پاک کیا۔

تاریخِ انسانی کے یہ دو سبق آموز حقائق بیان کر کے منکرینِ حق کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ہوش میں آئیں اور اگر پچھلی قوموں کا سا انجام نہیں دیکھنا چاہتے تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اُس نورِ ہدایت پر ایمان لے آئیں جو اللہ نے قرآنِ مجید کی صورت میں نازل فرمایا ہے۔ اِس کے ساتھ اُن کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آخر کار وہ دن آنے والا ہے جب تمام اوّلین و آخرین ایک جگہ جمع کیے جائیں گے اور تم میں سے ہر ایک کا غبن سب کے سامنے کُھل جائے گا۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام انسانوں کی قسمت کا فیصلہ اِسی بنیاد پر کیا جائے گا کہ ایمان وعملِ صالح کی راہ کس نے اختیار کی تھی، اور کفر و تکذیب کی راہ پر کون چلا تھا۔ پہلا گروہ اَبدی جنّت کا حق دار ہوگا اور دوسرے گروہ کے حصے میں دائمی جہنّم آئے گی۔

اِس کے بعد ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کو مخاطب کر کے چند اہم ہدایات اُنھیں دی

Maktaba Tul Ishaat.com

جاتی ہیں:

ایک یہ کہ دنیا میں جو مصیبت بھی آتی ہے، اللہ کے اِذن سے آتی ہے۔ ایسے حالات میں جو شخص ایمان پر ثابت قدم رہے، اللہ اُس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے، ورنہ گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو کر جو آدمی ایمان کی راہ سے ہٹ جائے، اس کی مصیبت تو اللہ کے اذن کے بغیر دُور نہیں ہوسکتی، البتہ وہ ایک اور مصیبت، جو سب سے بڑی مصیبت ہے، مُول لے لیتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کا دل اللہ کی ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مومن کا کام صرف ایمان لے آنا ہی نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد اسے عملاً اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اطاعت سے اگر وہ رُوگردانی اختیار کرے گا تو اپنے نقصان کا وہ خود ذمّہ دار ہو گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پہنچا کر بری الذّمہ ہو چکے ہیں۔

تیسرے یہ کہ مومن کا اعتماد اپنی طاقت یا دنیا کی کسی طاقت پر نہیں بلکہ صرف اللہ پر ہونا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ مومن کے لیے اُس کا مال اور اُس کے اہل وعیال ایک بہت بڑی آزمایش ہیں، کیونکہ زیادہ تر انھی کی محبّت انسان کو ایمان و طاعت کی راہ سے منحرف کرتی ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان کو اپنے اہل وعیال سے ہوشیار رہنا چاہیے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کے حق میں راہِ خدا کے رہزن نہ بننے پائیں، اور انھیں اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے تاکہ اُن کا نفس زر پرستی کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

پانچویں یہ کہ ہر انسان اپنی استطاعت کی حد تک ہی مکلّف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کام کرے۔ البتہ مومن کو جس بات کی کوشش کرنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اپنی حد تک خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے میں وہ کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے اور اس کی گفتار، کردار اور معاملات اس کی اپنی کوتاہی کے باعث حُدُوداللہ سے متجاوز نہ ہو جائیں۔

---

۱۸ ۲
آیاتہا رکوعاتہا

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے[1]۔ اسی کی بادشاہی ہے[2] اور اسی کے لیے تعریف ہے[3] اور وہ ہر چیز پر قادر ہے[4]۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا،

۱- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ الحدید، حاشیہ ۱۔ بعد کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات خود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کلام کا آغاز اِس فقرے سے کیوں کیا گیا ہے۔ آگے کائنات اور انسان کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ ہی اس کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے۔ اور اس نے یہ کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں بنائی ہے۔ اور انسان یہاں غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو کچھ چاہے کرتا پھرے، کوئی اس سے باز پُرس کرنے والا نہ ہو۔ اور اِس کائنات کا فرمانروا کوئی شہِ بے خبر نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں جو کچھ ہو رہا ہو، اُس کا کوئی علم اُسے نہ ہو۔ اِس مضمون کی بہترین تمہید وہی ہو سکتی تھی جو اِس مختصر سے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے اِس تمہید کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں کی انتہائی وسعتوں تک جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے، اگر تم عقل کے اندھے نہیں ہو تو تمھیں صاف محسوس ہو گا کہ ایک ذرّے سے لے کر عظیم ترین کہکشانوں تک ہر چیز نہ صرف خدا کے وجود پر گواہ ہے بلکہ اس بات کی گواہی بھی دے رہی ہے کہ اُس کا خدا ہر عیب اور نقص اور کمزوری اور غلطی سے پاک ہے۔ اُس کی ذات و صفات، اور اس کے افعال و احکام میں کسی عیب و خطا، یا کسی کمزوری اور نقص کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں بھی کوئی احتمال ہوتا تو یہ کمال درجہ حکیمانہ نظام وجود ہی میں نہ آ سکتا تھا، کجا کہ اَزَل سے اَبَد تک ایسے اٹل طریقے سے چل سکتا۔

۲- یعنی یہ پُوری کائنات تنہا اُسی کی سلطنت ہے۔ وہ صرف اِس کو بنا کر اور ایک دفعہ حرکت دے کر نہیں رہ گیا ہے، بلکہ وہی عملاً اِس پر ہر آن حکومت کر رہا ہے۔ اِس حکومت و فرمانروائی میں کسی دوسرے کا قطعاً کوئی دخل یا حصہ نہیں ہے۔ دوسروں کو اگر عارضی طور پر اور محدود پیمانے پر اِس کائنات میں کسی جگہ تصرُّف یا ملکیت یا حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں تو وہ اُن کے ذاتی اختیارات نہیں ہیں جو اُنھیں اپنے زور پر حاصل ہوئے ہوں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں، جب تک اللہ چاہے وہ انھیں حاصل رہتے ہیں، اور جب چاہے وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲﴾

پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن[5]، اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو[6]۔

انھیں سلب کرسکتا ہے۔

۳- بالفاظِ دیگر وہی اکیلا تعریف کا مستحق ہے، دوسری جس ہستی میں بھی کوئی قابلِ تعریف خوبی پائی جاتی ہے وہ اسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ اور اگر حمد کو شکر کے معنیٰ میں لیا جائے تو شکر کا بھی اصل مستحق وہی ہے، کیونکہ ساری نعمتیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ساری مخلوقات کا حقیقی محسن اُس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری کسی ہستی کے کسی احسان کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں تو اس بنا پر کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی نعمت اُس کے ہاتھوں ہم تک پہنچائی، ورنہ وہ خود نہ اس نعمت کا خالق ہے، نہ اللہ کی توفیق کے بغیر وہ اس نعمت کو ہم تک پہنچا سکتا تھا۔

۴- یعنی وہ قادرِ مُطلَق ہے۔ جو کچھ کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ کوئی طاقت اس کی قدرت کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔

۵- اس کے چار مفہوم ہیں اور چاروں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

ایک یہ کہ وہی تمھارا خالق ہے، پھر تم میں سے کوئی اس کے خالق ہونے کا انکار کرتا ہے اور کوئی اِس حقیقت کو مانتا ہے۔ یہ مفہوم پہلے اور دوسرے فقرے کو ملا کر پڑھنے سے متبادر ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسی نے تم کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ تم کفر اختیار کرنا چاہو تو کرسکتے ہو، اور ایمان لانا چاہو تو لا سکتے ہو۔ ایمان و کفر میں سے کسی کے اختیار کرنے پر بھی اس نے تمھیں مجبور نہیں کیا ہے۔ اس لیے اپنے ایمان و کفر، دونوں کے تم خود ذمہ دار ہو۔ اس مفہوم کی تائید بعد کا یہ فقرہ کرتا ہے کہ ”اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو“۔ یعنی اس نے یہ اختیار دے کر تمھیں امتحان میں ڈالا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتے ہو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اس نے تو تم کو فطرتِ سلیمہ پر پیدا کیا تھا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ تم سب ایمان کی راہ اختیار کرتے، مگر اِس صحیح فطرت پر پیدا ہونے کے بعد تم میں سے بعض لوگوں نے کفر اختیار کیا جو اُن کی خِلقت و آفرینش کے خلاف تھا، اور بعض نے ایمان کی راہ اختیار کی جو ان کی فطرت کے مطابق تھی۔ یہ مضمون اِس آیت کو سورۂ روم کی آیت ۳۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ”یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین پر جما دو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت نہ بدلی جائے، یہی بالکل راست اور دُرست دین ہے۔“ اور اِسی مضمون پر وہ متعدّد احادیث روشنی ڈالتی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ فرمایا ہے کہ ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور بعد میں خارج سے کفر و شرک اور گمراہی اُس پر عارض ہوتی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، تفسیر سورۂ روم، حواشی ۴۲ تا ۴۷) اس مقام پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ
وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا
تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④

اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمھاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخرکار تمھیں پلٹنا ہے[7]۔ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے۔ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو[8] سب اس کو معلوم ہے، اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے[9]۔

کُتُبِ آسمانی نے کبھی انسان کے پیدایشی گنہگار ہونے کا وہ تصوّر پیش نہیں کیا ہے جسے ڈیڑھ ہزار سال سے عیسائیت نے اپنا بنیادی عقیدہ بنا رکھا ہے۔ آج خود کیتھولک علما یہ کہنے لگے ہیں کہ بائبل میں اِس عقیدے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک مشہور جرمن عالم ریورینڈ ہربرٹ ہاگ (Haag) اپنی تازہ کتاب Is Original Sin in Scripture میں لکھتا ہے کہ ابتدائی دَور کے عیسائیوں میں کم از کم تیسری صدی تک یہ عقیدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ انسان پیدایشی گنہگار ہے، اور جب یہ خیال لوگوں میں پھیلنے لگا تو دو صدیوں تک عیسائی اہلِ علم اس کی تردید کرتے رہے۔ مگر آخرکار پانچویں صدی میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی مَنطِق کے زور سے اِس بات کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں شامل کر دیا کہ ''نوعِ انسانی نے آدمؑ کے گناہ کا وبال وراثت میں پایا ہے اور مسیحؑ کے کفّارے کی بدولت نجات پانے کے سوا انسان کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔''

چوتھا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی تم کو عَدَم سے وجود میں لایا۔ تم نہ تھے اور پھر ہو گئے۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ اگر تم اس پر سیدھے اور صاف طریقے سے غور و فکر کرتے اور یہ دیکھتے کہ وجود ہی وہ اصل نعمت ہے جس کی بدولت تم دنیا کی باقی دوسری نعمتوں سے مُتمتّع ہو رہے ہو، تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے خالق کے مقابلے میں کفر و بغاوت کا رَوِیّہ اختیار نہ کرتا۔ لیکن تم میں سے بعض نے سوچا ہی نہیں، یا غلط طریقے سے سوچا اور کفر کی راہ اختیار کر لی، اور بعض نے ایمان کا وہی راستہ اختیار کیا جو فکرِ صحیح کا تقاضا تھا۔

۶ – اس فقرے میں ''دیکھنے'' کا مطلب محض دیکھنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جیسے تمھارے اعمال ہیں، ان کے مطابق تم کو جزا یا سزا دی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی حاکم اگر کسی شخص کو اپنی ملازمت میں لے کر یہ کہے کہ ''میں دیکھتا ہوں تم کس طرح کام کرتے ہو'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک طرح کام کرو گے تو تمھیں انعام اور ترقی سے نوازوں گا، ورنہ تم سے سخت مواخذہ کروں گا۔

۷ – اس آیت میں تین باتیں علی الترتیب بیان کی گئی ہیں جن کے درمیان ایک بہت گہرا مَنطِقی ربط ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ نے یہ کائنات برحق پیدا کی ہے۔ ’’برحق‘‘ کا لفظ جب خبر کے لیے بولا جاتا ہے تو مُراد ہوتی ہے سچّی خبر۔ حکم کے لیے بولا جاتا ہے تو مطلب ہوتا ہے مبنی بر عدل و انصاف حکم۔ قول کے لیے بولا جاتا ہے تو مقصود ہوتا ہے راست اور دُرست قول۔ اور جب کسی فعل کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو مراد ایسا فعل ہوتا ہے جو حکیمانہ اور معقول ہو، نہ کہ لایعنی اور فضول۔ اب یہ ظاہر ہے کہ خَلق ایک فعل ہے، اس لیے تخلیقِ کائنات کو برحق کہنے کا مطلب لامحالہ یہ ہے کہ یہ کائنات کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی گئی ہے، بلکہ یہ ایک خالقِ حکیم کا نہایت سنجیدہ کام ہے۔ اِس کی ہر چیز اپنے پیچھے ایک معقول مقصد رکھتی ہے، اور یہ مقصدیت اِس میں اتنی نمایاں ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عقل انسان کسی چیز کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لے تو یہ جان لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا کہ ایسی ایک چیز کے پیدا کرنے کا معقول اور مبنی بر حکمت مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں انسان کی ساری سائنٹفک ترقی اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جس چیز کی نوعیت کو بھی انسان نے غور و فکر اور تحقیق و تجسُّس سے سمجھ لیا، اس کے بارے میں یہ بات بھی اسے آخر کار معلوم ہو گئی کہ وہ کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے، اور اُس مقصد کو سمجھ کر ہی انسان نے وہ بے شمار چیزیں ایجاد کر لیں جو آج انسانی تمدُّن میں استعمال ہو رہی ہیں۔ یہ بات ہرگز ممکن نہ ہوتی اگر یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا ہوتی جس میں کوئی حکمت اور مقصدیت کارفرما نہ ہوتی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۱۔ ابراہیم، حاشیہ ۲۶۔ النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۱۵-۱۶۔ المومنون، حاشیہ ۱۰۲۔ العنکبوت، حاشیہ ۷۵۔ الروم، حاشیہ ۶۔ جلد چہارم، الدُّخان، حاشیہ ۳۴۔ الجاثیہ، حاشیہ ۲۸)

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ اِس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ صورت سے مراد محض انسان کا چہرہ نہیں ہے، بلکہ اس سے مُراد اُس کی پوری جسمانی ساخت ہے، اور وہ قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں جو اِس دنیا میں کام کرنے کے لیے آدمی کو عطا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حیثیتوں سے انسان کو زمین کی مخلوقات میں سب سے بہتر بنایا گیا ہے، اور اسی بنا پر وہ اس قابل ہوا ہے کہ اُن تمام موجودات پر حکمرانی کرے جو زمین اور اس کے گرد و پیش میں پائی جاتی ہیں۔ اُس کو کھڑا قد دیا گیا ہے۔ اس کو چلنے کے لیے مناسب ترین پاؤں دیے گئے ہیں۔ اس کو کام کرنے کے لیے موزوں ترین ہاتھ دیے گئے ہیں۔ اس کو ایسے حواس اور ایسے آلاتِ علم دیے گئے ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر طرح کی معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس کو سوچنے اور سمجھنے اور معلومات کو جمع کر کے اُن سے نتائج اخذ کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا ذہن دیا گیا ہے۔ اس کو ایک اَخلاقی حِس اور قوتِ تمیز دی گئی ہے، جس کی بنا پر وہ بھلائی اور بُرائی اور صحیح اور غلط میں فرق کرتا ہے۔ اُس کو ایک قوتِ فیصلہ دی گئی ہے جس سے کام لے کر وہ اپنی راہِ عمل کا خود انتخاب کرتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ اپنی کوششوں کو کس راستے پر لگائے اور کس پر نہ لگائے۔ اس کو یہاں تک آزادی دے دی گئی ہے کہ چاہے تو اپنے خالق کو مانے اور اس کی بندگی کرے ورنہ اس کا انکار کر دے، یا جن جن کو چاہے اپنا خدا بنا بیٹھے، یا جسے خدا مانتا ہو اس کے خلاف بھی بغاوت کرنا چاہے تو

کر گزرے۔ اِن ساری قوتوں اور اِن سارے اختیارات کے ساتھ اُسے خدا نے اپنی پیدا کردہ بے شمار مخلوقات پر تصرّف کرنے کا اقتدار دیا ہے اور وہ عملاً اِس اقتدار کو استعمال کر رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، المؤمن، حاشیہ ۹۱)

ان دو باتوں سے، جو اُوپر بیان کی گئی ہیں، بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر وہ تیسری بات خود بخود نکلتی ہے جو آیت کے تیسرے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے کہ ''اُسی کی طرف آخرکار تمھیں پلٹنا ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایسے ایک حکیمانہ اور بامقصد نظامِ کائنات میں ایسی ایک بااختیار مخلوق پیدا کی گئی ہے تو حکمت کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسے یہاں شُترِ بے مُہار کی طرح غیر ذمّہ دار بنا کر چھوڑ دیا جائے، بلکہ لازماً اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مخلوق اُس ہستی کے سامنے جواب دہ ہو جس نے اُسے اِن اختیارات کے ساتھ اپنی کائنات میں یہ مقام و مرتبہ عطا کیا ہے۔ ''پلٹنے'' سے مُراد اِس آیت میں محض پلٹنا نہیں ہے بلکہ جواب دِہی کے لیے پلٹنا ہے، اور بعد کی آیات میں صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ واپسی اِس زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ہوگی، اور اِس کا اصل وقت وہ ہوگا جب پُوری نوعِ انسانی کو از سرِنَو زندہ کر کے بیک وقت محاسبے کے لیے اکٹھا کیا جائے گا، اور اُس محاسبے کے نتیجے میں جزا و سزا اِس بنیاد پر ہوگی کہ آدمی نے خدا کے دیے ہوئے اختیارات کو صحیح طریقے سے استعمال کیا یا غلط طریقے سے۔ رہا یہ سوال کہ یہ جواب دِہی دنیا کی موجودہ زندگی میں کیوں نہیں ہوسکتی؟ اور اس کا صحیح وقت مرنے کے بعد دوسری زندگی ہی کیوں ہے؟ اور یہ کیوں ضروری ہے کہ یہ جواب دِہی اُس وقت ہو جب پُوری نوعِ انسانی اِس دنیا میں ختم ہو جائے اور تمام اوّلین و آخرین کو بیک وقت دوبارہ زندہ کر کے اکٹھا کیا جائے؟ آدمی ذرا بھی عقل سے کام لے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بھی سراسر معقول ہے اور حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ محاسبہ دوسری زندگی ہی میں ہو اور سب انسانوں کا ایک ساتھ ہو۔ اِس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے پُورے کارنامۂ حیات کے لیے جواب دہ ہے۔ اس لیے اس کی جواب دہی کا صحیح وقت لازماً وہی ہونا چاہیے جب اس کا کارنامۂ حیات مکمل ہو چکا ہو۔ اور دوسری وجہ اِس کی یہ ہے کہ انسان اُن تمام اثرات و نتائج کے لیے ذمّہ دار ہے جو اس کے افعال سے دوسروں کی زندگی پر مترتّب ہوئے ہوں، اور وہ اثرات و نتائج اُس کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کے بعد مدت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا صحیح محاسبہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب پُوری نوعِ انسانی کا کارنامۂ حیات ختم ہو جائے اور تمام اوّلین و آخرین بیک وقت جواب دِہی کے لیے جمع کیے جائیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰۔ یونُس، حواشی ۱۰-۱۱۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵۔ النحل، حاشیہ ۳۵۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ النمل، حاشیہ ۲۷۔ الروم، حواشی ۵-۶۔ جلد چہارم، صٓ، حواشی ۲۹-۳۰۔ المؤمن، حاشیہ ۸۰۔ الجاثیہ، حواشی ۲۷ تا ۲۹)

۸ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''جو کچھ تم چھُپ کر کرتے ہو اور جو کچھ تم عَلانیہ کرتے ہو''۔

۹ – یعنی وہ انسان کے صرف اُن اعمال ہی سے واقف نہیں ہے جو لوگوں کے علم میں آجاتے ہیں بلکہ ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو سب سے مخفی رہ جاتے ہیں۔ مزید برآں وہ محض اعمال کی ظاہری شکل ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ یہ بھی جانتا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ وَ
لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتۡ تَّاۡتِيۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا

کیا تمھیں اُن لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اِس سے پہلے کُفر کیا اور پھر اپنی شامتِ اعمال کا مزا چکھ لیا؟ اور آگے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے[۱۰]۔ اِس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کُھلی کُھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے[۱۱]، مگر اُنھوں نے کہا:

ہے کہ انسان کے ہر عمل کے پیچھے کیا ارادہ اور کیا مقصد کار فرما تھا، اور جو کچھ اس نے کیا کس نیّت سے کیا اور کیا سمجھتے ہوئے کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر انسان غور کرے تو اسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انصاف صرف آخرت ہی میں ہو سکتا ہے اور صرف خدا ہی کی عدالت میں صحیح انصاف ہونا ممکن ہے۔ انسان کی عقل خود یہ تقاضا کرتی ہے کہ آدمی کو اُس کے ہر جُرم کی سزا ملنی چاہیے، لیکن آخر یہ بات کون نہیں جانتا کہ دنیا میں اکثر و بیشتر جرائم یا تو چُھپے رہ جاتے ہیں، یا اُن کے لیے کافی شہادت بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مجرم چُھوٹ جاتا ہے، یا جُرم کُھل بھی جاتا ہے تو مجرم اتنا بااثر اور طاقتور ہوتا ہے کہ اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ پھر انسان کی عقل یہ بھی چاہتی ہے کہ آدمی کو محض اِس بنا پر سزا نہیں ملنی چاہیے کہ اس کے فعل کی صورت ایک مجرمانہ فعل کی سی ہے، بلکہ یہ تحقیق ہونا چاہیے کہ جو فعل اس نے کیا ہے بالارادہ سوچ سمجھ کر کیا ہے، اس کے ارتکاب کے وقت وہ ایک ذمّہ دار عامل کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، اس کی نیّت فی الواقع ارتکابِ جُرم ہی کی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ جُرم ہے۔ اسی لیے دنیا کی عدالتیں مُقدّمات کا فیصلہ کرنے میں اِن اُمور کی تحقیق کرتی ہیں اور اِن کی تحقیق کو اُصولِ انصاف کا تقاضا مانا جاتا ہے۔ مگر کیا واقعی دنیا میں کوئی ذریعہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے اِن کی ٹھیک ٹھیک تحقیق ہو سکے جو ہر شبہے سے بالاتر ہو؟ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے گہرا منطقی ربط رکھتی ہے کہ ”اُس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے۔“ برحق پیدا کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں صحیح اور کامل عدل ہو۔ یہ عدل لازماً اُسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب کہ عدل کرنے والے کی نگاہ سے انسان جیسی ذمّہ دار مخلوق کا نہ صرف یہ کہ کوئی فعل چُھپا نہ رہ جائے بلکہ وہ نیّت بھی اس سے مخفی نہ رہے جس کے ساتھ کسی شخص نے کوئی فعل کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو اس طرح کا عدل کر سکے۔ اب اگر کوئی شخص اللہ اور آخرت کا انکار کرتا ہے تو وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہم ایک ایسی کائنات میں رہتے ہیں جو فی الحقیقت انصاف سے خالی ہے، بلکہ جس میں سرے سے انصاف کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس احمقانہ تخیّل پر جس شخص کی عقل اور جس کا قلب و ضمیر مطمئن ہو وہ بڑا ہی بے شرم ہے اگر وہ اپنے آپ کو ترقی پسند یا عقلیّت پسند سمجھتا ہو اور اُن لوگوں کو تاریک خیال یا

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۞

"کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟"[12] اس طرح انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا، اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔[13]

رَجعت پسند سمجھے جو کائنات کے اِس انتہائی معقول (rational) تصوّر کو قبول کرتے ہیں جسے قرآن پیش کر رہا ہے۔

۱۰ – یعنی دنیا میں انھوں نے شامتِ اعمال کا جو مزا چکھا وہ ان کے جرائم کی نہ اصل سزا تھی نہ پُوری سزا۔ اصلی اور پُوری سزا تو ابھی آخرت میں اُن کو بھگتنی ہے۔ لیکن دُنیا میں جو عذاب ان پر آیا، اس سے لوگ یہ سبق لے سکتے ہیں کہ جن قوموں نے بھی اپنے رب کے مقابلے میں کُفر کا رَوِیّہ اختیار کیا، وہ کس طرح بگڑتی چلی گئیں اور آخر کس انجام سے دوچار ہوئیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف حاشیہ ۵-۶۔ ہُود، حاشیہ ۱۰۵)

۱۱ – اصل میں لفظ "بَیِّنات" استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ بَیِّن عربی زبان میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بالکل ظاہر اور واضح ہو۔ انبیا علیہم السّلام کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ بَیِّنات لے کر آتے رہے، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ ایک تو وہ ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں۔ دوسرے، وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے، نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ تیسرے، ان کی تعلیم میں کوئی ابہام نہ تھا، بلکہ وہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، جائز کیا ہے اور ناجائز کیا، کس راہ پر انسان کو چلنا چاہیے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے۔

۱۲ – یہ تھی ان کی تباہی کی اوّلین اور بنیادی وجہ۔ نوعِ انسانی کو دنیا میں صحیح راہِ عمل اِس کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی تھی کہ اُس کا خالق اُسے صحیح علم دے، اور خالق کی طرف سے علم دیے جانے کی عملی صورت اِس کے سوا کچھ نہ ہوسکتی تھی کہ وہ انسانوں ہی میں سے بعض افراد کو علم عطا کر کے دوسروں تک اسے پہنچانے کی خدمت سپُرد کرے۔ اِس غرض کے لیے اُس نے انبیاؑ کو بَیِّنات کے ساتھ بھیجا، تاکہ لوگوں کے لیے اُن کے برحق ہونے میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہے۔ مگر انھوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بَشَر خدا کا رسول ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے ہدایت پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ یٰسین، حاشیہ ۱۱) اس معاملے میں گمراہ انسانوں کی جہالت و نادانی کا یہ عجیب کرشمہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بشر کی رہنمائی قبول کرنے میں تو انھوں نے کبھی تامُّل نہیں کیا ہے، حتّٰی کہ انھی کی رہنمائی میں لکڑی اور پتھر کے بتوں تک کو معبُود بنایا، خود انسانوں کو خدا اور خدا کا اَوتار اور خدا کا بیٹا تک مان لیا، اور گمراہ کُن لیڈروں کی اندھی پیروی میں ایسے

Maktaba Tul Ishaat.com

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷

مُنکرین نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔[14] ان سے کہو: ”نہیں، میرے رب کی قسم! تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے،[15] پھر ضرور تمھیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے،[16] اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔[17]“

ایسے عجیب مسلک اختیار کر لیے جنھوں نے انسانی تہذیب وتمدّن اور اَخلاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ مگر جب خدا کے رسول اُن کے پاس حق لے کر آئے اور انھوں نے ہر ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر بے لاگ سچّائی ان کے سامنے پیش کی تو انھوں نے کہا: ”کیا اب بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟“ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ بشر اگر گمراہ کرے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ راہِ راست دکھاتا ہے تو اس کی رہنمائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

۱۳ – یعنی جب انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے اِستِغنا برتا تو پھر اللہ کو بھی اس کی کچھ پروا نہ رہی کہ وہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ اللہ کی کوئی غرض تو اُن سے اٹکی ہوئی نہ تھی کہ وہ اسے خدا مانیں گے تو وہ خدا رہے گا ورنہ خدائی کا تخت اُس سے چِھن جائے گا۔ وہ نہ اُن کی عبادت کا محتاج تھا، نہ ان کی حمد و ثنا کا۔ وہ تو ان کی اپنی بھلائی کے لیے انھیں راہِ راست دکھانا چاہتا تھا۔ مگر جب وہ اُس سے منہ پھیر گئے تو اللہ بھی اُن سے بے پروا ہو گیا۔ پھر نہ ان کو ہدایت دی، نہ ان کی حفاظت اپنے ذمے لی، نہ ان کو مہالک میں پڑنے سے بچایا، اور نہ انھیں اپنے اُوپر تباہی لانے سے روکا، کیونکہ وہ خود اس کی ہدایت اور ولایت کے طالب نہ تھے۔

۱۴ – یعنی ہر زمانے میں منکرینِ حق دوسری جس بنیادی گمراہی میں مبتلا رہے ہیں، اور جو بالآخر ان کی تباہی کی موجب ہوئی، وہ یہ تھی۔ اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ لیکن اِن نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے، حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

۱۵ – یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا: وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔ ”وہ پوچھتے ہیں: کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو: میرے رب کی قسم! یہ یقیناً حق ہے اور تم اتنا بل بُوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظُہور میں آنے سے روک دو۔“ (آیت ۵۳) پھر سورۂ سَبا میں فرمایا: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ”منکرین کہتے ہیں: کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے! کہو: قسم ہے

میرے رب کی! وہ تم پر آ کر رہے گی۔'' (آیت ۳)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اِس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُخاطَب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجرِبے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ یہ شخص کبھی عمر بھر جھوٹ نہیں بولا ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپؐ کے خلاف کیسے ہی بُہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچّا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اسے کامل یقین نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپؐ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرماتے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیرِ نبی کے درمیان فرق کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک غیرِ نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے، ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اَغلب تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مَقام سے بالاتر ہے۔ اس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی اِستدلال سے وہ اِس نتیجے پر پہنچا ہو کہ آخرت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہوگی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے، ایک فلسفی اِس پر قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار، فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ ''ہونا چاہیے'' سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ''ہے اور یقیناً ہے'' کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

۱۶- یہ وہ مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا جائے گا، اور اِسی میں اِس سوال کا جواب بھی ہے کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اگر وہ بحث آدمی کی نگاہ میں ہو جو سورت کے آغاز سے آیت ۴ تک کی گئی ہے، تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اِس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو، اور جسے اِس کائنات میں بہت سی چیزوں پر تصرُّف کا اِقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کُفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اِس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی بُرائیاں خود اپنی ذمّہ داری پر کی ہوں، اس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور بُرے کی بُرائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اِس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے، وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے: یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت، مگر یہاں انسان جیسی بااختیار مخلوق کو غیر ذمّہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِیْرٌ ۝۸ یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ

پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اُس کے رسولؐ پر، اور اُس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے۔[18] جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (اِس کا پتا تمھیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔[19] وہ دن ہوگا ایک دُوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا۔[20]

یہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کارفرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے، کیونکہ مبنی برحکمت کائنات میں ایک بااختیار مخلوق کا غیر ذمّہ دار ہونا صریحاً خلافِ عدل وحکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اِس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کرسکتا کہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر ممکن کیسے ہوا اور اس کے ذہن میں عدل وانصاف کا تصوّر کہاں سے آگیا؟ بے عقلی سے عقل کی پیدایش اور بے عدلی سے عدل کا تصوّر برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے، یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

۱۷ - یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی، اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اِتنا بڑا نظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لیے اِس دنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دُشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دُشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور ان کا حساب لے۔

۱۸ - یعنی جب یہ واقعہ ہے اور پُوری انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ قوموں کی تباہی کا اصل موجب اُن کا رسولوں کی بات نہ ماننا اور آخرت کا انکار کرنا تھا، تو اُسی غلط رَوِش پر چل کر اپنی شامت بلانے پر اصرار نہ کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ اور قرآن کی پیش کردہ ہدایت پر ایمان لے آؤ۔ یہاں سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ روشنی سے مراد قرآن ہے۔ جس طرح روشنی خود نمایاں ہوتی ہے اور گردوپیش کی اُن تمام چیزوں کو نمایاں کر دیتی ہے جو پہلے تاریکی میں چھُپی ہوئی تھیں، اسی طرح قرآن ایک ایسا چراغ ہے جس کا برحق ہونا بجائے خود روشن ہے، اور اس کی روشنی میں انسان ہر اُس مسئلے کو سمجھ سکتا ہے جسے سمجھنے کے لیے اس کے اپنے ذرائعِ علم وعقل کافی نہیں ہیں۔ یہ چراغ جس شخص کے پاس ہو، وہ فکر وعمل کی بے شمار پُرپیچ راہوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ صاف صاف دیکھ سکتا ہے اور عمر بھر صراطِ مستقیم پر اس طرح چل سکتا ہے کہ ہر قدم پر اُسے یہ معلوم ہوتا رہے کہ گمراہیوں کی طرف لے جانے والی

پگ ڈنڈیاں کدھر کدھر جا رہی ہیں، اور ہلاکت کے گڑھے کہاں کہاں آ رہے ہیں، اور سلامتی کی راہ ان کے درمیان کون سی ہے۔

۱۹ – اجتماع کے دن سے مراد ہے قیامت، اور سب کو اکٹھا کرنے سے مُراد ہے تمام اُن انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کرنا جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہوں۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں جگہ جگہ کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہُود میں فرمایا: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ، ''وہ ایک ایسا دن ہوگا جس میں سب انسان جمع ہوں گے، اور پھر جو کچھ بھی اُس روز ہوگا سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا'' (آیت ۱۰۳) اور سورۂ واقعہ میں فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ ۙ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ○ ''ان سے کہو کہ تمام پہلے گزرے ہوئے اور بعد میں آنے والے لوگ یقیناً ایک مقرر دن کے وقت جمع کیے جانے والے ہیں'' (آیت ۴۹-۵۰)

۲۰ – اصل میں لفظ یَوْمُ التَّغَابُنِ استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ میں اتنی وسعت ہے کہ اُردو زبان تو کیا، کسی دوسری زبان کے بھی ایک لفظ، بلکہ ایک فقرے میں اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآنِ مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ پُرمعنیٰ نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابُن غبن سے ہے، جس کا تلفُّظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی۔ غَبْن زیادہ تر خرید و فروخت اور لین دین کے معاملے میں بولا جاتا ہے اور ''غَبَن'' رائے کے معاملے میں۔ لیکن کبھی کبھی اِس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد معنیٰ بیان کیے گئے ہیں: غَبَنُوا خَبَرَ النَّاقَةِ، ''اُن لوگوں کو پتا نہیں چلا کہ اُن کی اُونٹنی کہاں گئی''۔ غَبَنَ فُلَانًا فِي الْبَيْعِ، ''اُس نے فُلاں شخص کو خرید و فروخت میں دھوکا دے دیا''۔ غَبَنَ فُلَانًا، ''اس نے فلاں شخص کو گھاٹا دے دیا''۔ غَبِنْتُ مِنْ حَقِّيْ عِنْدَ فُلَانٍ، ''فلاں شخص سے اپنا حق وصول کرنے میں مجھ سے بھول ہوگئی''۔ غَبِيْن، ''وہ شخص جس میں ذہانت کی کمی ہو اور جس کی رائے کمزور ہو''۔ مَغْبُوْن، ''وہ شخص جو دھوکا کھا جائے''۔ الغبن، الغفلة، النسیان، فوت الحظ، ان یبخس صاحبك فی معاملة بینك وبینه لضرب من الاخفاء، ''غبن کے معنیٰ ہیں: غفلت، بُھول، اپنے حصّے سے محروم رہ جانا، ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملے میں دوسرے کو نقصان دینا''۔ امام حسن بصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو بیع میں دھوکا دے رہا ہے تو فرمایا: هٰذا یغبن عقلك ''یہ شخص تجھے بیوقوف بنا رہا ہے''۔

اِس سے جب لفظ تغابُن بنایا جائے تو اُس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ تَغَابَنَ الْقَوْمُ کے معنیٰ ہیں: بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا۔ یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا جانا۔ یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا اور اُس کا اپنے حصے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اُٹھا لے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اب اِس بات پر غور کیجیے کہ آیت میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ، ''وہ دن ہوگا تَغَابُن کا۔'' اِن الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب و روز تغابُن ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن یہ تغابُن ظاہری اور نظرفریب ہے، اصلی اور حقیقی تغابُن نہیں ہے۔ اصل تغابُن قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں جا کر پتا چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کما لے گیا۔ اصل میں کس کا حصّہ کسے مل گیا اور کون اپنے حصّے سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالا نکال دیا، اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لُوٹ لیے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

مفسّرین نے يَوْمُ التَّغَابُنِ کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے متعدِد مطلب بیان کیے ہیں، جو سب کے سب صحیح ہیں اور اس کے معنٰی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اُس روز اہلِ جنّت اہلِ دوزخ کا وہ حصّہ مار لے جائیں گے جو اُن کو جنّت میں ملتا اگر وہ جنّتیوں کے سے کام کر کے آئے ہوتے، اور اہلِ دوزخ جنّتیوں کا وہ حصّہ لُوٹ لیں گے جو اُنھیں دوزخ میں ملتا اگر انھوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کیے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری کی وہ حدیث کرتی ہے جو انھوں نے کتاب الرّقاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''جو شخص بھی جنّت میں جائے گا اُسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اُسے دوزخ میں ملتا اگر وہ بُرا عمل کرتا، تاکہ وہ اور زیادہ شکرگزار ہو۔ اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اُسے جنّت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کیا ہوتا، تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو۔''

بعض اور مفسّرین کہتے ہیں کہ اُس روز ظالم کی اُتنی نیکیاں مظلوم لُوٹ لے جائے گا جو اس کے ظلم کا بدلہ ہو سکیں، یا مظلوم کے اُتنے گُناہ ظالم پر ڈال دیے جائیں گے جو اس کے حق کے برابر وزن رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے روز آدمی کے پاس کوئی مال و زر تو ہوگا نہیں کہ وہ مظلوم کا حق ادا کرنے کے لیے کوئی ہرجانہ یا تاوان دے سکے۔ وہاں تو بس آدمی کے اعمال ہی ایک زرِ مبادلہ ہوں گے۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا ہو، وہ مظلوم کا حق اِسی طرح ادا کر سکے گا کہ اپنے پلّے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا ہو اُن میں سے اُس کا تاوان ادا کرے، یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اُوپر لے کر اس کا جُرمانہ بُھگتے۔ یہ مضمون بھی متعدِد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے منقول ہے۔ بخاری، کتاب الرّقاق میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''جس شخص کے ذمّے اپنے کسی بھائی پر کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اُسے چاہیے کہ یہیں اس سے سُبکدوش ہو لے، کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے ہی نہیں۔ وہاں اُس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی، یا اگر اس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔'' اسی طرح مُسندِ احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن اُنیس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''کوئی جنّتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اس وقت تک نہ جا سکے گا

جب تک کہ اُس ظلم کا بدلہ نہ چُکا دیا جائے جو اس نے کسی پر کیا ہو، حتّٰی کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہوگا۔" ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جب کہ قیامت میں ہم ننگے بُچّے ہوں گے؟ فرمایا: "اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چُکانا ہوگا۔" مُسلم اور مُسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا: "جانتے ہو مُفلِس کون ہوتا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا: "ہم میں سے مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال متاع کچھ نہ ہو۔" فرمایا: "میری اُمّت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو، مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی، اور کسی پر بُہتان لگایا تھا، اور کسی کا مال مار کھایا تھا، اور کسی کا خون بہایا تھا، اور کسی کو مارا پِیٹا تھا۔ پھر ان سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں۔ اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چُکایا جا سکے تو ان میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیے گئے، اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا۔" ایک اور حدیث میں، جسے مُسلم اور ابوداؤد نے حضرت بُریدہؓ سے نقل کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ "کسی مجاہد کے پیچھے اگر کسی شخص نے اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے معاملے میں خیانت کی تو قیامت کے روز وہ اُس مجاہد کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور اس کو کہا جائے گا کہ اِس کی نیکیوں میں سے جو کچھ تُو چاہے لے لے۔" پھر حضورؐ نے ہماری طرف متوجّہ ہو کر فرمایا: "پھر تمھارا کیا خیال ہے؟" یعنی تم کیا اندازہ کرتے ہو کہ وہ اُس کے پاس کیا چھوڑ دے گا؟

بعض اور مفسّرین نے کہا ہے کہ تغابُن کا لفظ زیادہ تر تجارت کے معاملے میں بولا جاتا ہے۔ اور قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اُس رَوِیّے کو، جو کافر اور مومن اپنی دنیا کی زندگی میں اختیار کرتے ہیں، تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مومن اگر نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر اطاعت اختیار کرتا ہے اور اپنی جان، مال اور محنتیں خدا کے راستے میں کھپا دیتا ہے، تو گویا وہ گھاٹے کا سودا چھوڑ کر ایک ایسی تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے جو آخر کار نفع دینے والی ہے۔ اور ایک کافر اگر اطاعت کی راہ چھوڑ کر خدا کی نافرمانی اور بغاوت کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے، تو گویا وہ ایک ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور آخر کار وہ اس کا خسارہ اُٹھانے والا ہے۔ دونوں کا نفع اور نقصان قیامت کے روز ہی کُھلے گا۔ دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ مومن سراسر گھاٹے میں رہے اور کافر بڑے بڑے فائدے حاصل کرتا رہے۔ مگر آخرت میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نفع کا سودا کس نے لیا ہے اور نقصان کا سودا کس نے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ، آیات ۱۶-۱۷۵-۲۰۷، آلِ عمران: ۷۷-۱۷۷، النساء: ۷۴، التوبہ: ۱۱۱، النحل: ۹۵، فاطر: ۲۹، الصّف: ۱۰۔

ایک اور صورت تغابُن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبّت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد، ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور اُن کے پیرو، چوروں اور ڈاکوؤں کے جتّھے، رشوت خور اور ظالم افسروں اور

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ

جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے[۲۱]، اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

ملازمین کے گٹھ جوڑ، بے ایمان تاجروں، صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ، گمراہی اور شرارت و خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں، اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی عَلَم بردار حکومتیں اور قومیں، سب کا باہمی ساز باز اِسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اِس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاوُن چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو اُن پر یکایک یہ بات کُھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ، بھائی، بیوی، شوہر، اولاد، دوست، رفیق، لیڈر، پیر، مُرید، یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا، وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت و محبت، عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے، ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمّہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ یہ مضمون بھی قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے، جس کی چند مثالیں حسبِ ذیل آیات میں دیکھی جا سکتی ہیں: البقرہ: ۱۶۷، الاعراف: ۳۷ تا ۳۹، ابراہیم: ۲۱-۲۲، المومنون: ۱۰۱، العنکبوت: ۱۲-۱۳-۲۵، لقمان: ۳۳، الاحزاب: ۶۷-۶۸، سَبا: ۳۱ تا ۳۳، فاطر: ۱۸، الصّافّات: ۲۷ تا ۳۳، صٓ: ۵۹ تا ۶۱، حٰم السجدہ: ۲۹، الزُّخرُف: ۶۷، الدُّخان: ۴۱، المعارج: ۱۰ تا ۱۴، عَبَس: ۳۴ تا ۳۷۔

۲۱ – اللہ پر ایمان لانے سے مراد محض یہ مان لینا نہیں ہے کہ اللہ موجود ہے، بلکہ اُس طریقے سے ایمان لانا مُراد ہے جس طرح اللہ نے خود اپنے رسولؐ اور اپنی کتاب کے ذریعے سے بتایا ہے۔ اس ایمان میں ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب آپ سے آپ شامل ہے۔ اسی طرح نیک عمل سے مراد بھی ہر وہ عمل نہیں ہے جسے آدمی نے خود نیکی سمجھ کر یا انسانوں کے کسی خود ساختہ معیارِ اَخلاق کی پیروی کرتے ہوئے اختیار کر لیا ہو، بلکہ اس سے مراد وہ عملِ صالح ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق ہو۔ لہٰذا کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسولؐ اور کتاب کے واسطے کے بغیر اللہ کو ماننے اور نیک عمل کرنے کے وہ نتائج ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ قرآنِ مجید کا جو شخص بھی سوچ سمجھ کر مطالعہ کرے گا، اُس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ قرآن کی رُو سے اِس طرح کے کسی ایمان کا نام ایمان باللہ، اور کسی عمل کا نام عملِ صالح سرے سے ہے ہی نہیں۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٩﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٠﴾ ع
مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ
يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ

یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے[22] وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔ ع

کوئی[23] مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اِذن ہی سے آتی ہے[24]۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے[25]، اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے[26]۔ اللہ کی اطاعت کرو اور

۲۲ – یہ الفاظ خود کفر کے مفہوم کو واضح کر دیتے ہیں۔ کتاب اللہ کی آیات کو اللہ کی آیات نہ ماننا، اور اُن حقائق کو تسلیم نہ کرنا جو ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں، اور اُن احکام کی پیروی سے انکار کر دینا جو اُن میں ارشاد ہوئے ہیں، یہی کفر ہے، اور اس کے نتائج وہ ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔

۲۳ – اب رُوئے سُخن اہلِ ایمان کی طرف ہے۔ اِس سلسلۂ کلام کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے سخت مصائب کا زمانہ تھا۔ مکّہ سے برسوں ظلم سہنے کے بعد اہلِ ایمان اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ اور مدینے میں جن حق پرستوں نے ان کو پناہ دی تھی، اُن پر دُہری مصیبت آ پڑی تھی۔ ایک طرف اُنھیں سیکڑوں مہاجرین کو سہارا دینا تھا جو عرب کے مختلف حصّوں سے اُن کی طرف چلے آ رہے تھے، اور دوسری طرف پُورے عرب کے اعدائے اسلام اُن کے درپے آزار ہو گئے تھے۔

۲۴ – یہ مضمون سورۂ الحدید، آیات ۲۲-۲۳ میں بھی گزر چکا ہے اور وہاں حواشی ۳۹ تا ۴۲ میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ جن حالات میں اور جس مقصد کے لیے یہ بات وہاں فرمائی گئی تھی، اُسی طرح کے حالات میں اُسی مقصد کے لیے اِسے یہاں دُہرایا گیا ہے۔ جو حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کرنی مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ نہ مصائب خود آ جاتے ہیں، نہ دنیا میں کسی کی یہ طاقت ہے کہ اپنے اختیار سے جس پر جو مصیبت چاہے نازل کر دے۔ یہ تو سراسر اللہ کے اِذن پر موقوف ہے کہ کسی پر کوئی مصیبت نازل ہونے دے یا نہ ہونے دے۔ اور اللہ کا اِذن بہر حال کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے، جسے انسان نہ جانتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔

۲۵ – یعنی مصائب کے ہجوم میں جو چیز انسان کو راہِ راست پر قائم رکھتی ہے اور کسی سخت سے سخت حالت

Maktaba Tul Ishaat.com

میں بھی اس کے قدم ڈگمگانے نہیں دیتی، وہ صرف ایمان باللہ ہے۔ جس کے دل میں ایمان نہ ہو، وہ آفات کو یا تو اتفاقات کا نتیجہ سمجھتا ہے، یا دنیوی طاقتوں کو اُن کے لانے اور روکنے میں مؤثّر مانتا ہے، یا اُنھیں ایسی خیالی طاقتوں کا عمل سمجھتا ہے جنھیں انسانی اَوہام نے نفع وضرر پہنچانے پر قادر فرض کر لیا ہے، یا خدا کو فاعلِ مختار مانتا تو ہے مگر صحیح ایمان کے ساتھ نہیں مانتا۔ اِن تمام مختلف صورتوں میں آدمی کم ظرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک خاص حد تک تو وہ مصیبت سہ لیتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ ہر آستانے پر جھک جاتا ہے۔ ہر ذلت قبول کر لیتا ہے۔ ہر کمینہ حرکت کر سکتا ہے۔ ہر غلط کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خدا کو گالیاں دینے سے بھی نہیں چُوکتا۔ حتّیٰ کہ خودکشی تک کر گزرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص یہ جانتا اور سچّے دل سے مانتا ہو کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اِس کائنات کا مالک و فرمانروا ہے، اور اسی کے اِذن سے مصیبت آتی اور اسی کے حکم سے ٹل سکتی ہے، اُس کے دل کو اللہ صبر وتسلیم اور رضا بقضا کی توفیق دیتا ہے، اس کو عزم اور ہمت کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتا ہے، تاریک سے تاریک حالات میں بھی اس کے سامنے اللہ کے فضل کی اُمید کا چراغ روشن رہتا ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی آفت بھی اس کو اتنا پست ہمت نہیں ہونے دیتی کہ وہ راہِ راست سے ہٹ جائے، یا باطل کے آگے سر جُھکا دے، یا اللہ کے سوا کسی اور کے در پر اپنے درد کا مداوا ڈھونڈنے لگے۔ اس طرح ہر مصیبت اس کے لیے مزید خیر کے دروازے کھول دیتی ہے اور کوئی مصیبت بھی حقیقت میں اس کے لیے مصیبت نہیں رہتی بلکہ نتیجے کے اعتبار سے سراسر رحمت بن جاتی ہے، کیونکہ خواہ وہ اُس کا شکار ہو کر رہ جائے یا اس سے بخیریت گزر جائے، دونوں صورتوں میں وہ اپنے رب کی ڈالی ہوئی آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلتا ہے۔ اسی چیز کو ایک مُتَّفَق عَلَیہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے: عجبًا للمؤمن، لا یقضی اللّٰہُ لہ قضاءً الا کان خیرًا لہٗ، ان اصَابَتْہ ضَرّاء صبر، فکان خیرًا لہٗ ، وان اصابتْہ سرّاء شکر، فکان خیرًا لہ، ولیس ذالك لِاَحدٍ الّا المؤمن۔ ”مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ اس کے حق میں جو فیصلہ بھی کرتا ہے، وہ اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ مصیبت پڑے تو صبر کرتا ہے، اور وہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ خوشحالی میسّر آئے تو شکر کرتا ہے، اور وہ بھی اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔“

۲۶ — اِس سلسلۂ کلام میں اس ارشاد کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون شخص واقعی ایمان رکھتا ہے اور کس شان کا ایمان رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے علم کی بنا پر اُسی قلب کو ہدایت بخشتا ہے جس میں ایمان ہو، اور اُسی شان کی ہدایت بخشتا ہے جس شان کا ایمان اس میں ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے مومن بندوں کے حالات سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ اس نے ایمان کی دعوت دے کر، اور اِس ایمان کے ساتھ دنیا کی شدید آزمائشوں میں ڈال کر اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مومن پر دنیا میں کیا کچھ گزر رہی ہے اور وہ کن حالات میں اپنے ایمان کے تقاضے کس طرح پُورے کر رہا ہے۔ اس لیے

اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾
اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ
فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رسولؐ کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر تم اطاعت سے مُنہ موڑتے ہو تو ہمارے رسولؐ پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمّہ داری نہیں ہے[27]۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، لہٰذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے[28]۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و

اطمینان رکھو کہ جو مصیبت بھی اللہ کے اِذن سے تم پر نازل ہوتی ہے، اللہ کے علم میں ضرور اس کی کوئی عظیم مصلحت ہوتی ہے اور اس کے اندر کوئی بڑی خیر پوشیدہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ اپنے مومن بندوں کا خیرخواہ ہے، بلاوجہ انھیں مصائب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔

۲۷ – سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اچھے حالات ہوں یا بُرے حالات، ہر حال میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت پر قائم رہو۔ لیکن اگر مصائب کے ہجوم سے گھبرا کر تم اطاعت سے منہ موڑ گئے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ ہمارے رسولؐ پر صرف یہ ذمّہ داری تھی کہ راہِ راست تم کو ٹھیک ٹھیک بتا دے، سو اُس کا حق رسولؐ نے ادا کر دیا ہے۔

۲۸ – یعنی خدائی کے سارے اختیارات تنہا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی دوسرا سرے سے یہ اختیار رکھتا ہی نہیں ہے کہ تمھاری اچھی یا بُری تقدیر بنا سکے۔ اچھا وقت آ سکتا ہے تو اُسی کے لائے آ سکتا ہے، اور بُرا وقت ٹل سکتا ہے تو اُسی کے ٹالے ٹل سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص سچے دل سے اللہ کو خدائے واحد مانتا ہو، اُس کے لیے اِس کے سوا سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا کرے اور دنیا میں ایک مومن کی حیثیت سے اپنا فرض اِس یقین کے ساتھ انجام دیتا چلا جائے کہ خیر بہرحال اُسی راہ میں ہے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس راہ میں کامیابی نصیب ہوگی تو اللہ ہی کی مدد اور تائید و توفیق سے ہوگی، کوئی دوسری طاقت مدد کرنے والی نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

رحیم ہے۔[29] تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔[30]

اور اس راہ میں اگر مشکلات و مصائب اور خطرات و مہالک سے سابقہ پیش آئے گا تو اُن سے بھی وہی بچائے گا، کوئی دوسرا بچانے والا نہیں ہے۔

۲۹ – اس آیت کے دو مفہُوم ہیں: ایک مفہُوم کے لحاظ سے اس کا اطلاق اُن بہت سی مشکلات پر ہوتا ہے جو خدا کی راہ پر چلنے میں بکثرت اہلِ ایمان مردوں کو اپنی بیویوں سے اور عورتوں کو اپنے شوہروں سے، اور والدین کو اپنی اولاد سے پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد کو ایسی بیوی اور ایک عورت کو ایسا شوہر ملے جو ایمان اور راست رَوی میں پُوری طرح ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہوں، اور پھر دونوں کو اولاد بھی ایسی میسّر ہو جو عقیدہ و عمل اور اَخلاق و کردار کے اعتبار سے ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ ورنہ بالعُموم ہوتا یہ ہے کہ شوہر اگر نیک اور ایمان دار ہے تو بیوی اور اولاد اُسے ایسی ملتی ہے جو اس کی دیانت و امانت اور راست بازی کو اپنے حق میں بدقسمتی سمجھتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ شوہر اور باپ اُن کی خاطر جہنّم مول لے اور ان کے لیے حرام و حلال کی تمیز چھوڑ کر ہر طریقے سے عیش و طَرَب اور فِسق و فُجور کے سامان فراہم کرے۔ اور اس کے برعکس بسا اوقات ایک نیک مومن عورت کو ایسے شوہر سے سابقہ پیش آتا ہے جسے اس کی پابندیِ شریعت ایک آنکھ نہیں بھاتی، اور اولاد بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی گمراہی اور بدکرداری سے ماں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ پھر خُصوصیّت کے ساتھ جب کفر و دین کی کش مکش میں ایک انسان کے ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی خاطر نقصانات برداشت کرے، طرح طرح کے خطرات مول لے، ملک چھوڑ کر ہجرت کر جائے، یا جہاد میں جا کر اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دے، تو سب سے بڑھ کر اس کی راہ میں اس کے اہل و عیال ہی رکاوٹ بنتے ہیں۔

دوسرے مفہُوم کا تعلق اُن مخصوص حالات سے ہے جو اِن آیات کے نُزول کے زمانے میں بکثرت مسلمانوں کو پیش آ رہے تھے اور آج بھی ہر اُس شخص کو پیش آتے ہیں جو کسی غیر مسلم معاشرے میں اسلام قبول کرتا ہے۔ اُس وقت مکۂ معظمہ میں اور عرب کے دوسرے حصّوں میں عُموماً یہ صورت پیش آتی تھی کہ ایک مرد ایمان لے آیا ہے، مگر بیوی بچے نہ صرف اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ خود اُس کو اسلام سے پھیر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور ایسے ہی حالات سے اُن خواتین کو سابقہ پیش آتا تھا جو اپنے خاندان میں اکیلی اسلام قبول کرتی تھیں۔

یہ دونوں قسم کے حالات جن اہلِ ایمان کو درپیش ہوں، انھیں خطاب کرتے ہوئے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

سب سے پہلے انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ دنیوی رشتے کے لحاظ سے اگرچہ یہ لوگ وہ ہیں جو انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، لیکن دین کے لحاظ سے یہ تمھارے ''دشمن'' ہیں۔ یہ دشمنی خواہ اِس حیثیت سے ہو کہ وہ تمھیں نیکی سے روکتے اور بدی کی طرف مائل کرتے ہوں، یا اِس حیثیت سے کہ وہ تمھیں ایمان سے روکتے اور کفر کی طرف

کھینچتے ہوں، یا اس حیثیت سے کہ ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہوں اور تمھارے ذریعے سے اگر کوئی بات بھی مسلمانوں کے جنگی رازوں کے متعلق ان کے علم میں آ جائے تو اسے اسلام کے دشمنوں تک پہنچا دیتے ہوں، اِس سے دشمنی کی نوعیت وکیفیت میں تو فرق ہوسکتا ہے، لیکن بہرحال یہ ہے دشمنی ہی، اور اگر تمھیں ایمان عزیز ہو تو اِس لحاظ سے تمھیں ان کو دشمن ہی سمجھنا چاہیے، اُن کی مَحبّت میں گرفتار ہو کر کبھی اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ تمھارے اور ان کے درمیان ایمان وکفر، یا طاعت ومعصیت کی دیوار حائل ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ ان سے ہوشیار رہو۔ یعنی ان کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کرلو۔ ان کی مَحبّت کو کبھی اپنے دل میں اس حد تک نہ بڑھنے دو کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ تمھارے تعلق اور اسلام کے ساتھ تمھاری وفاداری میں حائل ہو جائیں۔ ان پر کبھی اتنا اعتماد نہ کرو کہ تمھاری بے احتیاطی سے مسلمانوں کی جماعت کے اَسرار اُنھیں معلوم ہو جائیں اور وہ دشمنوں تک پہنچیں۔ یہ وہی بات ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ یُؤتیٰ برجلٍ یوم القیٰمۃ فیقالُ اکل عیالہ حَسَنَاتِہٖ۔ ’’ایک شخص قیامت کے روز لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اِس کے بال بچے اِس کی ساری نیکیاں کھا گئے۔‘‘

آخر میں فرمایا گیا کہ ’’اگر تم عَفو ودرگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور ورحیم ہے۔‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی دشمنی سے تمھیں صرف اس لیے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم ان سے ہوشیار رہو اور اپنے دین کو ان سے بچانے کی فکر کرو۔ اس سے آگے بڑھ کر اس تنبیہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بیوی بچوں کو مارنے پیٹنے لگو، یا ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، یا ان کے ساتھ تعلقات میں ایسی بدمزگی پیدا کرلو کہ تمھاری اور ان کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ جائے۔ یہ اس لیے کہ ایسا کرنے کے دو نقصانات بالکل واضح ہیں: ایک یہ کہ اس سے بیوی بچوں کی اصلاح کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے معاشرے میں اسلام کے خلاف اُلٹی بدگمانیاں پیدا ہوسکتی ہیں، اور گردوپیش کے لوگوں کی نگاہ میں مسلمان کے اَخلاق وکردار کی یہ تصویر بنتی ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی وہ خود اپنے گھر میں اپنے بال بچوں تک کے لیے سخت گیر اور بدمزاج بن جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائے اسلام میں جب لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے، تو ان کو ایک مشکل اُس وقت پیش آتی تھی جب ان کے والدین کافر ہوتے تھے اور وہ ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اِس نئے دین سے پھر جائیں۔ اور دوسری مشکل اُس وقت پیش آتی جب ان کے بیوی بچے (یا عورتوں کے معاملے میں اُن کے شوہر اور بچے) کفر پر قائم رہتے اور دینِ حق کی راہ سے انھیں پھیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی صورت کے متعلق سورۂ عنکبوت (آیت ۸) اور سورۂ لقمان (آیات ۱۴-۱۵) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ دین کے معاملے میں والدین کی بات ہرگز نہ مانو، البتہ دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتے رہو۔ دوسری صورت کا حکم یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اپنے دین کو تو اپنے بال بچّوں سے بچانے کی فکر ضرور کرو، مگر ان کے ساتھ سخت گیری کا برتاؤ نہ کرو، بلکہ نرمی اور عَفو ودرگزر سے کام لو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، آیات

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ ۱۶

لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو [۳۱]، اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔ [۳۲]

۲۳-۲۴۔ جلد پنجم، المجادلہ، حاشیہ ۳۷۔ الممتحنہ، حواشی ۱ تا ۳۔ المنافقون، حاشیہ ۱۸)

۳۰- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الانفال، حاشیہ ۲۳۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جسے طَبَرانی نے حضرت ابو مالک اَشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ ''تیرا اصل دشمن وہ نہیں ہے جسے اگر تُو قتل کر دے تو تیرے لیے کامیابی ہے اور وہ تجھے قتل کر دے تو تیرے لیے جنّت ہے، بلکہ تیرا اصل دشمن، ہو سکتا ہے کہ تیرا اپنا وہ بچّہ ہو جو تیری ہی صُلب سے پیدا ہوا ہے، پھر تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ مال ہے جس کا تُو مالک ہے۔'' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اور سورۂ اَنفال میں بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر تم مال اور اولاد کے فتنے سے اپنے آپ کو بچا لے جاؤ اور اُن کی محبّت پر اللہ کی محبّت کو غالب رکھنے میں کامیاب رہو، تو تمھارے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔

۳۱- قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ، ''اللہ سے ایسا ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔'' (آلِ عمران: ۱۰۲) دوسری جگہ فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، ''اللہ کسی مُتنفّس کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مُکلّف قرار نہیں دیتا۔'' (البقرہ: ۲۸۶) اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ''جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔'' ان تینوں آیتوں کو ملا کر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت وہ معیار ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جس تک پہنچنے کی ہر مومن کو کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری آیت یہ اُصولی بات ہمیں بتاتی ہے کہ کسی شخص سے بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اللہ کے دین میں آدمی بس اُتنے ہی کا مُکلّف ہے جس کی وہ مَقدِرَت رکھتا ہو۔ اور یہ آیت ہر مومن کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی حد تک تقویٰ کی کوشش میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ جہاں تک بھی اس کے لیے ممکن ہو، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے چاہییں اور اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ اس معاملے میں اگر وہ خود تساہُل سے کام لے گا تو مواخذے سے نہ بچ سکے گا۔ البتہ جو چیز اس کی مَقدِرَت سے باہر ہو گی (اور اس کا فیصلہ اللہ ہی بہتر کر سکتا ہے کہ کیا چیز کس کی مَقدِرَت سے واقعی باہر تھی) اُس کے معاملے میں اُس سے باز پُرس نہ کی جائے گی۔

۳۲- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الحشر، حاشیہ ۱۹۔

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَكُمۡ وَ يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ
شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ۙ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَ الشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾ ع ۲

اگر تم اللہ کو قرضِ حَسَن دو تو وہ تمھیں کئی گُنا بڑھا کر دے گا[۳۳] اور تمھارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا، اللہ بڑا قدردان اور بُردبار ہے[۳۴]، حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے، زبردست اور دانا ہے۔ع

۳۳۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۶۷۔ المائدہ، حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۶۔

۳۴۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، فاطر، حواشی ۵۲-۵۹۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۴۲۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الطّلاق

(۶۵)

الطّلاق

نام اِس سُورہ کا نام ہی الطّلاق نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں طلاق ہی کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اسے سُورۃ النساءِ القُصْریٰ بھی کہا ہے، یعنی چھوٹی سورۂ نساء۔

زمانۂ نُزُول حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے صراحت فرمائی ہے، اور سُورت کے مضمون کی اندرونی شہادت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ اِس کا نُزول لازماً سورۂ بقرہ کی اُن آیات کے بعد ہوا ہے جن میں طلاق کے احکام پہلی مرتبہ دیے گئے تھے۔ اگرچہ یہ تعیُّن کرنا مشکل ہے کہ اس کا ٹھیک زمانۂ نُزول کیا ہے، لیکن بہرحال روایات سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب سورۂ بقرہ کے احکام کو سمجھنے میں لوگ غلطیاں کرنے لگے، اور عملاً بھی اُن سے غلطیوں کا صُدُور ہونے لگا، تب اللہ تعالیٰ نے اُن کی اصلاح کے لیے یہ ہدایات نازل فرمائیں۔

موضوع اور مضمون اِس سُورہ کے احکام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن ہدایات کو پھر سے ذہن میں تازہ کرلیا جائے جو طلاق اور عدت کے متعلق اِس سے پہلے قرآنِ مجید میں بیان ہوچکی ہیں:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ (البقرہ:۲۲۹) ’’طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے۔‘‘

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ ...... وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ؕ (البقرہ: ۲۲۸) ’’اور مُطَلَّقہ عورتیں (طلاق کے بعد) تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں ...... اور اُن کے شوہر اس مدت میں اُن کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لینے کے حق دار ہیں اگر وہ اصلاح پر آمادہ ہوں۔‘‘

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ ...... (البقرہ:۲۳۰) ’’پھر اگر وہ (تیسری بار) اُس کو طلاق دے دے تو اِس کے بعد وہ اُس کے لیے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ اس عورت کا نکاح کسی اور سے ہو جائے......‘‘

اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَكُمۡ عَلَيۡهِنَّ

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ (الاحزاب: ۴۹) ’’جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔‘‘

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ (البقرہ: ۲۳۴) ’’اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں چار مہینے دس دن تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔‘‘

ان آیات میں جو قواعد مقرر کیے گئے تھے وہ یہ تھے:

(۱) ایک مرد زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے سکتا ہے۔

(۲) ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدّت کے اندر شوہر کو رُجوع کا حق رہتا ہے اور عدّت گزر جانے کے بعد وہی مرد و عورت پھر نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اِس کے لیے تحلیل کی کوئی شرط نہیں ہے۔ لیکن اگر مرد تین طلاق دے دے تو عدّت کے اندر رُجوع کا حق ساقط ہو جاتا ہے، اور دوبارہ نکاح بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عورت کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو جائے اور وہ کبھی اپنی مرضی سے اس کو طلاق نہ دے دے۔

(۳) مدخولہ عورت، جس کو حیض آتا ہو، اُس کی عدّت یہ ہے کہ اُسے طلاق کے بعد تین مرتبہ حیض آ جائے۔ ایک طلاق یا دو طلاق کی صورت میں اِس عدّت کے معنٰی یہ ہیں کہ عورت ابھی تک اُس شخص کی زوجیّت میں ہے اور وہ عدّت کے اندر اُس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مرد تین طلاق دے چکا ہو تو یہ عدّت رُجوع کی گنجایش کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اس لیے ہے کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے عورت کسی اور شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔

(۴) غیر مدخولہ عورت، جسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے، اُس کے لیے کوئی عدّت نہیں ہے۔ وہ چاہے تو طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔

(۵) جس عورت کا شوہر مر جائے اس کی عدّت چار مہینے دس دن ہے۔

اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ سورۂ طلاق اِن قواعد میں سے کسی قاعدے کو منسوخ کرنے یا اُس میں ترمیم کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ دو مقاصد کے لیے نازل ہوئی ہے:

ایک یہ کہ مرد کو طلاق کا جو اختیار دیا گیا ہے، اسے استعمال کرنے کے ایسے حکیمانہ طریقے بتائے جائیں جن سے حتی الامکان علیحدگی کی نوبت نہ آنے پائے، اور علیحدگی ہو تو بدرجۂ آخر ایسی حالت میں ہو جب کہ باہمی موافقت کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہوں۔ کیونکہ خدا کی شریعت میں طلاق کی گنجایش صرف ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر رکھی گئی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اِس بات کو سخت ناپسند فرماتا ہے کہ

ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جو ازدواجی تعلق قائم ہو چکا ہو، وہ پھر کبھی ٹوٹ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مَا احَلّ اللّٰہ شیئًا ابغضَ الیہ من الطلاق "اللہ نے کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کیا ہے جو طلاق سے بڑھ کر اُسے ناپسند ہو۔" (ابوداؤد) اور ابغض الحلال الی اللّٰہ عزّوجلّ الطلاق "تمام حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔" (ابوداؤد)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے احکام کے بعد جو مزید مسائل جواب طلب باقی رہ گئے تھے، ان کا جواب دے کر اسلام کے عائلی قانون کے اِس شعبے کی تکمیل کر دی جائے۔ اس سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن مدخُولہ عورتوں کو حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا جنھیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، طلاق کی صورت میں ان کی عدّت کیا ہوگی۔ اور جو عورت حاملہ ہو، اسے اگر طلاق دے دی جائے، یا اس کا شوہر مر جائے، تو اس کی عدّت کی مدت کیا ہے۔ اور مختلف قسم کی مطلّقہ عورتوں کے نفقہ اور سکونت کا انتظام کس طرح ہوگا، اور جس بچے کے والدین طلاق کے ذریعے سے الگ ہو چکے ہوں اس کی رضاعت کا انتظام کس طرح کیا جائے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۲ آیاتہا — سُوْرَۃُ الطَّلَاقِ مَدَنِیَّۃٌ — ۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

اَے نبیؐ! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو اُنھیں اُن کی عدّت کے لیے طلاق دیا کرو[۱]۔

۱ – یعنی تم لوگ طلاق دینے کے معاملے میں یہ جلد بازی نہ کیا کرو کہ جوں ہی میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا، فوراً ہی غصّے میں آ کر طلاق دے ڈالی، اور نکاح کا جھٹکا اِس طرح کیا کہ رُجوع کی گنجایش بھی نہ چھوڑی۔ بلکہ جب تمھیں بیویوں کو طلاق دینا ہو تو اُن کی عدت کے لیے دیا کرو۔ عدت کے لیے طلاق دینے کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد بھی ہیں:

ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ عدّت کا آغاز کرنے کے لیے طلاق دو، یا بالفاظِ دیگر اُس وقت طلاق دو جس سے اُن کی عدّت شروع ہوتی ہو۔ یہ بات سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۸ میں بتائی جا چکی ہے کہ جس مدخُولہ عورت کو حیض آتا ہو، اس کی عدت طلاق کے بعد تین مرتبہ حیض آنا ہے۔ اِس حکم کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو عدت کا آغاز کرنے کے لیے طلاق دینے کی صورت لازماً یہی ہو سکتی ہے کہ عورت کو حالتِ حیض میں طلاق نہ دی جائے، کیونکہ اُس کی عدت اُس حیض سے شروع نہیں ہو سکتی جس میں اسے طلاق دی گئی ہو، اور اس حالت میں طلاق دینے کے معنیٰ یہ ہو جاتے ہیں کہ اللہ کے حکم کے خلاف عورت کی عدّت تین حیض کے بجائے چار حیض بن جائے۔ مزید برآں اس حکم کا تقاضا یہ بھی ہے کہ عورت کو اُس طُہر میں طلاق نہ دی جائے جس میں شوہر اُس سے مباشرت کر چکا ہو، کیونکہ اِس صورت میں طلاق دیتے وقت شوہر اور بیوی دونوں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا مباشرت کے نتیجے میں کوئی حمل قرار پا گیا ہے یا نہیں۔ اِس وجہ سے عدّت کا آغاز نہ اس مفروضے پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ عدّت آیندہ حیضوں کے اعتبار سے ہوگی اور نہ اِسی مفروضے پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ حاملہ عورت کی عدّت ہوگی۔ پس یہ حکم بیک وقت دو باتوں کا مقتضی ہے: ایک یہ کہ حیض کی حالت میں طلاق نہ دی جائے۔ دوسرے یہ کہ طلاق یا تو اُس طُہر میں دی جائے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو، یا پھر اُس حالت میں دی جائے جب کہ عورت کا حاملہ ہونا معلوم ہو۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ طلاق پر یہ قیدیں لگانے میں بہت بڑی مَصلَحتیں ہیں۔ حیض کی حالت میں طلاق نہ دینے کی مصلحت یہ ہے کہ یہ وہ حالت ہوتی ہے جس میں عورت اور مرد کے درمیان مباشرت ممنوع ہونے کی وجہ سے ایک طرح کا بُعد پیدا ہو جاتا ہے، اور طبّی حیثیت سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ اس حالت میں عورت کا مزاج معمول پر نہیں رہتا۔ اس لیے اگر اُس وقت دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا

ہو جائے تو عورت اور مرد دونوں اُسے رفع کرنے کے معاملے میں ایک حد تک بے بس ہوتے ہیں، اور جھگڑے سے طلاق تک نوبت پہنچانے کے بجائے اگر عورت کے حیض سے فارغ ہونے تک انتظار کر لیا جائے تو اِس امر کا کافی امکان ہوتا ہے کہ عورت کا مزاج بھی معمول پر آ جائے اور دونوں کے درمیان فطرت نے جو طبعی کشش رکھی ہے، وہ بھی اپنا کام کر کے دونوں کو پھر سے جوڑ دے۔ اِسی طرح جس طُہر میں مباشرت کی جا چکی ہو، اُس میں طلاق کے ممنوع ہونے کی مَصلحت یہ ہے کہ اُس زمانے میں اگر حمل قرار پا پائے تو مرد اور عورت، دونوں میں سے کسی کو بھی اُس کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے وہ وقت طلاق دینے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ حمل کا علم ہو جانے کی صورت میں تو مرد بھی دس مرتبہ سوچے گا کہ جس عورت کے پیٹ میں اس کا بچہ پرورش پا رہا ہے، اسے طلاق دے یا نہ دے، اور عورت بھی اپنے اور اپنے بچّے کے مستقبل کا خیال کر کے شوہر کی ناراضی کے اسباب دُور کرنے کی پُوری کوشش کرے گی۔ لیکن اندھیرے میں بے سوچے سمجھے تیر چلا بیٹھنے کے بعد اگر معلوم ہو کہ حمل قرار پا چکا تھا، تو دونوں کو پچھتانا پڑے گا۔

یہ تو ہے ’’عدّت کے لیے‘‘ طلاق دینے کا پہلا مطلب، جس کا اِطلاق صرف اُن مدخُولہ عورتوں پر ہوتا ہے جن کو حیض آتا ہو اور جن کے حاملہ ہونے کا امکان ہو۔ اب رہا اس کا دوسرا مطلب، تو وہ یہ ہے کہ طلاق دینا ہو تو عدّت تک کے لیے طلاق دو، یعنی بیک وقت تین طلاق دے کر ہمیشہ کی علیٰحدگی کے لیے طلاق نہ دے بیٹھو، بلکہ ایک، یا حد سے حد دو طلاقیں دے کر عدّت تک انتظار کرو، تاکہ اس مدت میں ہر وقت تمھارے لیے رُجوع کی گنجایش باقی رہے۔ اس مطلب کے لحاظ سے یہ حکم اُن مدخُولہ عورتوں کے معاملے میں بھی مفید ہے جن کو حیض آتا ہو، اور اُن کے معاملے میں بھی مفید ہے جن کو حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، یا جن کا طلاق کے وقت حاملہ ہونا معلوم ہو۔ اِس فرمانِ الٰہی کی پیروی کی جائے تو کسی شخص کو بھی طلاق دے کر پچھتانا نہ پڑے، کیونکہ اس طرح طلاق دینے سے عدت کے اندر رُجوع بھی ہوسکتا ہے، اور عدت گزر جانے کے بعد بھی یہ ممکن رہتا ہے کہ سابق میاں بیوی پھر باہم رشتہ جوڑنا چاہیں تو ازسرِنو نکاح کر لیں۔

فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کے یہی معنٰی اکابر مفسّرین نے بیان کیے ہیں۔ ابنِ عباسؓ اِس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ’’طلاق حیض کی حالت میں نہ دے، اور نہ اُس طُہر میں دے جس کے اندر شوہر مباشرت کر چکا ہو، بلکہ اسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ حیض سے فارغ ہو کر وہ طاہر ہو جائے۔ پھر اسے ایک طلاق دے دے۔ اس صورت میں اگر وہ رجوع نہ بھی کرے اور عدّت گزر جائے تو وہ صرف ایک ہی طلاق سے جدا ہو گی۔‘‘ (ابنِ جَریر) حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں: ’’عدّت کے لیے طلاق یہ ہے کہ طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دی جائے۔‘‘ یہی تفسیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عطاء، مجاہد، مَیمون بن مَہران، مُقاتل بن حَیّان اور ضحّاک رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ (ابنِ کثیر) عِکرِمہ اس کا مطلب بیان کرتے ہیں: ’’طلاق اِس حالت میں دے کہ عورت کا حاملہ ہونا معلوم ہو، اور اس حالت میں نہ دے کہ وہ اس سے مباشرت کر چکا ہو اور کچھ پتا نہ ہو کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے یا نہیں۔‘‘ (ابنِ کثیر)

Maktaba Tul Ishaat.com

حضرت حسن بصریؒ اور ابنِ سیرینؒ، دونوں کہتے ہیں: "طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دی جائے، یا پھر اُس حالت میں دی جائے جب کہ حمل ظاہر ہو چکا ہو۔" (ابنِ جَریر)

اِس آیت کے منشا کو بہترین طریقے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس موقع پر واضح فرمایا تھا جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی۔ اس واقعے کی تفصیلات قریب قریب حدیث کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، اور وہی درحقیقت اس معاملے میں قانون کی ماخذ ہیں۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ جب حضرت عبداللہؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تو حضرت عمرؓ نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ سُن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ "اُس کو حکم دو کہ بیوی کی طرف رُجوع کر لے اور اسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے یہاں تک کہ وہ طاہر ہو، پھر اُسے حیض آئے اور اُس سے بھی فارغ ہو کر وہ پاک ہو جائے، اس کے بعد اگر وہ اسے طلاق دینا چاہے تو طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دے۔ یہی وہ عدّت ہے جس کے لیے طلاق دینے کا اللہ عزّوجلّ نے حکم دیا ہے۔" ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "یا تو طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دے، یا پھر ایسی حالت میں دے جب کہ اس کا حمل ظاہر ہو چکا ہو۔"

اس آیت کے منشا پر مزید روشنی چند اور احادیث بھی ڈالتی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ سے منقول ہیں۔ نَسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر غصّے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اَیُلْعَبُ بکتابِ اللّٰہِ وَاَنَا بَیْنَ اظہرکم؟ "کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جا رہا ہے حالانکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں؟" اس حرکت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غصّے کی کیفیت دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا: کیا مَیں اسے قتل نہ کر دوں؟ عبدالرزّاق نے حضرت عُبادہؓ بن الصّامِت کے متعلق روایت نقل کی ہے کہ ان کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے ڈالیں۔ انھوں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: بانت منہ بثلاث فی معصیۃ اللّٰہ تعالٰی، وبقی تسع مأۃ وسبع وتسعون ظُلْمًا وعُدْوانًا، ان شاء اللّٰہ عذّبہ، وان شاء غفر لہٗ۔ "تین طلاقوں کے ذریعے سے تو اللہ کی نافرمانی کے ساتھ وہ عورت اس سے جدا ہو گئی، اور ۹۹۷ ظلم اور عُدوان کے طور پر باقی رہ گئے، جن پر اللہ چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قصّے کی جو تفصیل دارقُطنی اور ابن ابی شَیْبَہ میں روایت ہوئی ہے، اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بیوی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے پوچھا: "اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا پھر بھی مَیں رجوع کر سکتا تھا؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: لا، کانت تبین منك وكانت معصیۃً "نہیں، وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور یہ فعل مَعصِیَت ہوتا۔" ایک روایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ اذًا قد عصیت ربك وبانت منك امرأتك۔ "اگر تم ایسا کرتے تو اپنے رب کی نافرمانی کرتے اور تمھاری بیوی تم سے جُدا ہو جاتی۔"

صحابۂ کرامؓ سے اس بارے میں جو فتاویٰ منقول ہیں وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِنھی ارشادات سے مطابَقت رکھتے ہیں۔ مُؤطّا میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے کہا: ''میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دے ڈالی ہیں۔'' ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''پھر اس پر تمھیں کیا فتویٰ دیا گیا؟'' اس نے عرض کیا: ''مجھ سے کہا گیا ہے کہ عورت مجھ سے جدا ہوگئی۔'' آپ نے فرمایا: صدقوا، هو مثل ما يقولون۔ ''لوگوں نے سچ کہا، مسئلہ یہی ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' عبدالرزّاق نے عَلْقَمہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ابنِ مسعودؓ سے کہا: ''میں نے اپنی بیوی کو ۹۹ طلاقیں دے ڈالی ہیں۔'' انھوں نے فرمایا: ثلاث يبيّنها وسائرهن عدوان۔ ''تین طلاقیں اسے جُدا کرتی ہیں، باقی سب زیادتیاں ہیں۔'' وَکیع بن الجَرّاح نے اپنی سُنَن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ، دونوں کا یہی مسلک نقل کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ سے ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ میں اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے بیٹھا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: بانت منك بثلاث۔ ''وہ تین طلاقوں سے تجھ سے جدا ہوگئی۔'' ایسا ہی واقعہ حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے جواب دیا: بانت منك بثلاث واقسم سائرهن على نسائك۔ ''تین طلاقوں سے تو وہ تجھ سے جدا ہوگئی، باقی طلاقوں کو اپنی دوسری عورتوں پر تقسیم کرتا پھر۔'' ابوداؤد اور ابنِ جَریر نے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ مجاہدؒ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ ابنِ عباسؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ مَیں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے بیٹھا ہوں۔ ابنِ عباسؓ سُن کر خاموش رہے، حتّٰی کہ میں نے خیال کیا شاید یہ اس کی بیوی کو اس کی طرف پلٹا دینے والے ہیں۔ پھر انھوں نے فرمایا: ''تم میں سے ایک شخص پہلے طلاق دینے میں حماقت کا ارتکاب کر گزرتا ہے، اس کے بعد آ کر کہتا ہے: ''یا ابن عباس! یا ابن عباس!'' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا، اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا، اور تو نے اللہ سے تقویٰ نہیں کیا۔ اب میں تیرے لیے کوئی راستہ نہیں پاتا۔ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جُدا ہوگئی۔'' ایک اور روایت جسے مؤطّا اور تفسیر ابنِ جَریر میں کچھ لفظی فرق کے ساتھ مجاہدؒ ہی سے نقل کیا گیا ہے، اس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں، پھر ابنِ عباسؓ سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: ''تین طلاقوں سے تو وہ تجھ سے جُدا ہوگئی، باقی ۹۷ سے تُو نے اللہ کی آیات کو کھیل بنایا۔'' یہ مُؤطّا کے الفاظ ہیں۔ ابنِ جَریر میں ابنِ عباسؓ کے جواب کے الفاظ یہ ہیں: ''تُو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی اور تُو نے اللہ کا خوف نہیں کیا کہ وہ تیرے لیے اِس مشکل سے نکلنے کوئی راستہ پیدا کرتا۔'' امام طَحاوِیؒ نے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص ابنِ عباسؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا ''میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔'' انھوں نے جواب دیا: اِنَّ عمك عصى الله فَاَثِم واطاع الشيطان فلم يجعل له مخرجًا۔ ''تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا ارتکاب کیا اور شیطان کی پیروی کی۔ اللہ نے اس کے لیے اِس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔'' ابوداؤد اور مؤطّا میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خَلوَت سے پہلے تین طلاقیں دے دیں، پھر اس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہا اور فتویٰ پوچھنے نکلا

Maktaba Tul Ishaat.com

حدیث کے راوی محمد بن اِیاس بن بُکَیر کہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ ابن عباس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کے پاس گیا۔ دونوں کا جواب یہ تھا: انّك ارسلت من يدك ما كان من فضل۔ ’’تیرے لیے جو گنجایش تھی تُو نے اسے اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔‘‘ زَمَخشَری نے کَشّاف میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جو شخص بھی ایسا آتا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں، اسے وہ مارتے تھے اور اس کی طلاقوں کو نافذ کر دیتے تھے۔ سعید بن منصور نے یہی بات صحیح سند کے ساتھ حضرت اَنسؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں صحابۂ کرامؓ کی عام رائے، جسے ابنِ ابی شَیْبہؒ اور امام محمدؒ نے ابراہیم نَخَعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، یہ تھی کہ ان الصّحابة رضی اللّٰه عنهم كانوا يستحبون ان يطلقها واحدة ثم يتركها حتى تحيض ثلاثة حيض۔ ’’صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند کرتے تھے کہ آدمی بیوی کو صرف ایک طلاق دے دے اور اس کو چھوڑے رکھے، یہاں تک کہ اسے تین حیض آجائیں۔‘‘ یہ ابنِ ابی شَیْبہ کے الفاظ ہیں۔ اور امام محمدؒ کے الفاظ یہ ہیں: كانوا يستحبون ان لا تزيدوا في الطلاق على واحدة حتى تنقضي العدّة۔ ’’اُن کو یہ طریقہ پسند تھا کہ طلاق کے معاملے میں ایک سے زیادہ نہ بڑھیں یہاں تک کہ عدّت پُوری ہو جائے۔‘‘

ان احادیث و آثار کی مدد سے قرآنِ مجید کی مذکورۂ بالا آیت کا منشا سمجھ کر فقہائے اسلام نے جو مفصّل قانون مرتّب کیا ہے، اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

(۱) حَنفِیّہ طلاق کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں: اَحْسَن، حَسَن اور بِدْعی۔ اَحْسَن طلاق یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو ایسے طُہر میں جس کے اندر اس نے مجامعت نہ کی ہو، صرف ایک طلاق دے کر عدّت گزر جانے دے۔ حَسَن یہ ہے کہ ہر طُہر میں ایک ایک طلاق دے۔ اس صورت میں تین طُہروں میں تین طلاق دینا بھی سنّت کے خلاف نہیں ہے، اگرچہ بہتر یہی ہے کہ ایک ہی طلاق دے کر مدّت گزر جانے دی جائے۔ اور طلاقِ بدعت یہ ہے کہ آدمی بیک وقت تین طلاق دے دے، یا ایک ہی طُہر کے اندر الگ الگ اوقات میں تین طلاق دے، یا حیض کی حالت میں طلاق دے، یا ایسے طُہر میں طلاق دے جس میں وہ مباشرت کر چکا ہو۔ ان میں سے جو فعل بھی وہ کرے گا گناہگار ہوگا۔ یہ تو ہے حکم ایسی مدخُولہ عورت کا جسے حیض آتا ہو۔ رہی غیر مدخُولہ عورت، تو اسے سنّت کے مطابق طُہر اور حیض دونوں حالتوں میں طلاق دی جاسکتی ہے۔ اور اگر عورت ایسی مدخُولہ ہو جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا ابھی آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، تو اسے مباشرت کے بعد بھی طلاق دی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کے حاملہ ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اور عورت حاملہ ہو تو مباشرت کے بعد اسے بھی طلاق دی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا حاملہ ہونا پہلے ہی معلوم ہے۔ لیکن ان تینوں قسم کی عورتوں کو سُنّت کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک مہینے بعد طلاق دی جائے، اور اَحْسَن یہ ہے کہ صرف ایک طلاق دے کر عدّت گزر جانے دی جائے۔ (ہِدایہ، فتح القدیر، احکام القرآن للجصّاص، عُمدۃ القاری)

امام مالکؒ کے نزدیک بھی طلاق کی تین قسمیں ہیں: سُنّی، بِدْعی مکروہ، اور بِدعی حرام۔ سُنّت کے مطابق طلاق یہ

ہے کہ مدخولہ عورت کو جسے حیض آتا ہو، طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر صرف ایک طلاق دے کر عدّت گزر جانے دی جائے۔ بِدْعی مکروہ یہ ہے کہ ایسے طُہر کی حالت میں طلاق دی جائے جس میں آدمی مباشرت کر چکا ہو، یا مباشرت کیے بغیر ایک طُہر میں ایک سے زیادہ طلاقیں دی جائیں، یا عدّت کے اندر الگ الگ طُہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، یا بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں۔ اور بِدْعی حرام یہ ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دی جائے۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی علی الشرح الکبیر، احکام القرآن لابن العَرَبی)

امام احمد بن حَنْبَلؒ کا معتبر مذہب یہ ہے جس پر جُمہور حَنابِلَہ کا اتفاق ہے: مدخولہ عورت جس کو حیض آتا ہو، اسے سُنّت کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر اسے طلاق دی جائے، پھر اسے چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔ لیکن اگر اسے تین طُہروں میں تین الگ الگ طلاقیں دی جائیں، یا ایک ہی طُہر میں تین طلاقیں دے دی جائیں، یا بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں، یا حیض کی حالت میں طلاق دی جائے، یا ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں مباشرت کی گئی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہو، تو یہ سب طلاقِ بدعت اور حرام ہیں۔ لیکن اگر عورت غیر مدخولہ ہو، یا ایسی مدخولہ ہو جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، یا حاملہ ہو، تو اس کے معاملے میں نہ وقت کے لحاظ سے سنّت و بدعت کا کوئی فرق ہے نہ تعداد کے لحاظ سے۔ (الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخِلاف علیٰ مذہبِ احمد بن حنبلؒ)

امام شافعیؒ کے نزدیک طلاق کے معاملے میں سنت اور بدعت کا فرق صرف وقت کے لحاظ سے ہے نہ کہ تعداد کے لحاظ سے۔ یعنی مدخُولہ عورت جس کو حیض آتا ہو اسے حیض کی حالت میں طلاق دینا، یا جو حاملہ ہو سکتی ہو اُسے ایسے طُہر میں طلاق دینا جس میں مباشرت کی جا چکی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا ہو، بدعت اور حرام ہے۔ رہی طلاقوں کی تعداد، تو خواہ بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں، یا ایک ہی طُہر میں دی جائیں، یا الگ الگ طُہروں میں دی جائیں، بہرحال یہ سنّت کے خلاف نہیں ہے۔ اور غیر مدخُولہ عورت، یا ایسی عورت جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا حیض آیا ہی نہ ہو، یا جس کا حاملہ ہونا ظاہر ہو چکا ہو، اس کے معاملے میں سنّت اور بدعت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ (مُغنی المحتاج)

(۲) کسی طلاق کے بدعت، مکروہ، حرام یا گناہ ہونے کا مطلب ائمۂ اربعہ کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ واقع ہی نہ ہو۔ چاروں مذاہب میں طلاق، خواہ حیض کی حالت میں دی گئی ہو، یا بیک وقت تین طلاقیں دے دی گئی ہوں، یا ایسے طُہر میں طلاق دی گئی ہو جس میں مباشرت کی جا چکی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا ہو، یا کسی اور ایسے طریقے سے دی گئی ہو جسے کسی امام نے بدعت قرار دیا ہے، بہرحال واقع ہو جاتی ہے، اگرچہ آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔ لیکن بعض دوسرے مجتہدین نے اس مسئلے میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا ہے۔

سعید بن المُسَیَّبؒ اور بعض دوسرے تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سنّت کے خلاف حیض کی حالت میں طلاق دے، یا بیک وقت تین طلاق دے دے، اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔ یہی رائے امامیّہ کی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اور اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ ممنوع اور بدعتِ مُحرّمہ ہے اس لیے یہ غیر مؤثّر ہے۔ حالانکہ اُوپر جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں، ان میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں رُجوع کا حکم دیا۔ اگر یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوئی تھی تو رجوع کا حکم دینے کے کیا معنیٰ؟ اور یہ بھی بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے اور اکابر صحابہؓ نے ایک سے زیادہ طلاق دینے والے کو اگرچہ گناہ گار قرار دیا ہے، مگر اس کی طلاق کو غیر مؤثّر قرار نہیں دیا۔

طاؤس اور عِکرِمہ کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے، اور اِسی رائے کو امام ابنِ تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے۔ اُن کی اِس رائے کا ماخذ یہ روایت ہے کہ ابوالصّہباء نے ابنِ عباسؓ سے پُوچھا: ''کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دَور میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہاں''۔ (بخاری و مسلم)، اور مسلم، ابوداؤد اور مُسندِ احمد میں ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد، اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگ ایک ایسے معاملے میں جلد بازی کرنے لگے ہیں جس میں اُن کے لیے سوچ سمجھ کر کام کرنے کی گنجایش رکھی گئی تھی۔ اب کیوں نہ ہم ان کے اس فعل کو نافذ کر دیں؟ چنانچہ انھوں نے اسے نافذ کر دیا۔''

لیکن یہ رائے کئی وُجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اوّل تو متعدّد روایات کے مطابق ابنِ عباسؓ کا اپنا فتویٰ اس کے خلاف تھا جیسا کہ ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں۔ دوسرے، یہ بات اُن احادیث کے بھی خلاف پڑتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ سے منقول ہوئی ہیں، جن میں بیک وقت تین طلاق دینے والے کے متعلق یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ اس کی تینوں طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں۔ یہ احادیث بھی ہم نے اُوپر نقل کر دی ہیں۔ تیسرے، خود ابنِ عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مجمع میں تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا اعلان فرمایا تھا، لیکن نہ اُس وقت، نہ اُس کے بعد کبھی صحابہؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف کا اظہار کیا۔ اب کیا یہ تصوُّر کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ سنّت کے خلاف کسی کام کا فیصلہ کر سکتے تھے؟ اور سارے صحابہؓ اس پر سُکوت بھی اختیار کر سکتے تھے؟ مزید برآں رُکانہ بن عبدِیَزید کے قصّے میں ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، امام شافعیؒ، دارمی اور حاکم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رُکانہ نے جب ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حلف دے کر پوچھا کہ ان کی نیّت ایک ہی طلاق دینے کی تھی؟ (یعنی باقی دو طلاقیں پہلی طلاق پر زور دینے کے لیے ان کی زبان سے نکلی تھیں، تین طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے جُدا کر دینا مقصود نہ تھا) اور جب انھوں نے یہ حلفیہ بیان دیا تو آپؐ نے ان کو رُجوع کا حق دے دیا۔ اس سے اِس معاملے کی اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ ابتدائی دَور میں کس قسم

کی طلاقوں کو ایک کے حکم میں رکھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر شارحینِ حدیث نے ابنِ عباسؓ کی روایت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ابتدائی دَور میں چونکہ لوگوں کے اندر دینی معاملات میں خیانت قریب قریب مفقود تھی، اس لیے تین طلاق دینے والے کے اِس بیان کو تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ اُس کی اصل نیت ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دو طلاقیں محض پہلی طلاق پر زور دینے کے لیے اُس کی زبان سے نکلی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ لوگ پہلے جلد بازی کر کے تین تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں اور پھر تاکید کا بہانہ کرتے ہیں، تو انھوں نے اِس بہانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ امام نَوَوِیؒ اور امام سُبکیؒ نے اِسے ابنِ عباسؓ والی روایت کی بہترین تاویل قرار دیا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ خود ابوالصَّہباء کی اُن روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے جو ابنِ عباسؓ کے قول کے بارے میں اُن سے مروی ہیں۔ مسلم اور ابوداؤد اور نسائی نے انھی ابوالصَّہبا سے ایک دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ان کے دریافت کرنے پر ابنِ عباسؓ نے فرمایا: ''ایک شخص جب خَلْوَت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دَور میں اس کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا۔'' اس طرح ایک ہی راوی نے ابنِ عباسؓ سے دو مختلف مضمونوں کی روایتیں نقل کی ہیں اور یہ اختلاف دونوں روایتوں کو کمزور کر دیتا ہے۔

(۳) حیض کی حالت میں طلاق دینے والے کو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رُجوع کا حکم دیا تھا، اس لیے فقہا کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ حکم کس معنٰی میں ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اَوزاعی، ابنِ ابی لیلیٰ، اسحاق بن راہَوَیہ اور ابوثَور رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو رجوع کا حکم تو دیا جائے گا مگر رجوع پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ (عُمدۃ القاری) ہِدایہ میں حَنفِیّہ کا مذہب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس صورت میں رجوع کرنا نہ صرف مستحب بلکہ واجب ہے۔ مُغنی المحتاج میں شافعیہ کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ جس نے حیض میں طلاق دی ہو اور تین طلاقیں نہ دے ڈالی ہوں، اس کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ رجوع کرے، اور اُس کے بعد والے طُہر میں طلاق نہ دے، بلکہ اس کے گزرنے کے بعد جب دوسری مرتبہ عورت حیض سے فارغ ہو تب طلاق دینا چاہے تو دے، تاکہ حیض میں دی ہوئی طلاق سے رجوع محض کھیل کے طور پر نہ ہو۔ الانصاف میں حَنابِلَہ کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ اس حالت میں طلاق دینے والے کے لیے رُجوع کرنا مستحب ہے۔ لیکن امام مالکؒ اور اُن کے اصحاب کہتے ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا جرم قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔ عورت خواہ مطالبہ کرے یا نہ کرے، بہرحال حاکم کا یہ فرض ہے کہ جب کسی شخص کا یہ فعل اس کے علم میں آئے تو وہ اسے رجوع پر مجبور کرے اور عدّت کے آخری وقت تک اس پر دباؤ ڈالتا رہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے قید کر دے۔ پھر بھی انکار کرے تو اسے مارے۔ اس پر بھی نہ مانے تو حاکم خود فیصلہ کر دے کہ ''میں نے تیری بیوی تجھ پر واپس کر دی۔'' اور حاکم کا یہ فیصلہ رجوع ہوگا جس کے بعد مرد کے لیے اُس عورت سے مباشرت کرنا جائز ہوگا، خواہ اس کی نیت رجوع کی ہو یا نہ ہو، کیونکہ حاکم کی نیّت اُس کی نیّت کی قائم مَقام ہے۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی) مالکیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس

Maktaba Tul Ishaat.com

شخص نے طَوعاً وَکَرہاً حیض میں دی ہوئی طلاق سے رُجوع کرلیا ہو، وہ اگر طلاق ہی دینا چاہے تو اس کے لیے مستحب طریقہ یہ ہے کہ جس حیض میں اس نے طلاق دی ہے، اس کے بعد والے طُہر میں اسے طلاق نہ دے، بلکہ جب دوبارہ حیض آنے کے بعد وہ طاہر ہو اُس وقت طلاق دے۔ طلاق سے متّصل والے طُہر میں طلاق نہ دینے کا حکم دراصل اس لیے دیا گیا ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے والے کا رجوع صرف زبانی کلامی نہ ہو بلکہ اُسے طُہر کے زمانے میں عورت سے مباشرت کرنی چاہیے۔ پھر جس طُہر میں مباشرت کی جا چکی ہو اس میں طلاق دینا چونکہ ممنوع ہے، لہٰذا طلاق دینے کا صحیح وقت اس کے بعد والا طُہر ہی ہے۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی)

(۴) رَجعی طلاق دینے والے کے لیے رجوع کا موقع کس وقت تک ہے؟ اس میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف اس سوال پر پیدا ہوا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے مراد تین حیض ہیں یا تین طُہر؟ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک قَرء سے مُراد طُہر ہے، اور یہ رائے حضرت عائشہ، ابنِ عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ حَنفِیّہ کا مذہب یہ ہے کہ قَرء سے مراد حیض ہے، اور امام احمد بن حنبلؒ کا معتبر مذہب بھی یہی ہے۔ یہ رائے چاروں خلفائے راشدین، عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اُبَیّ بن کَعب، مُعاذ بن جَبَل، ابوالدَّرداء، عُبادہ بن صامِت اور ابوموسیٰ اَشعَری رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ امام محمدؒ نے مؤطا میں شَعْبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۳ صحابیوں سے ملے ہیں، اور ان سب کی رائے یہی تھی۔ اور یہی رائے بکثرت تابعین نے بھی اختیار کی ہے۔

اس اختلاف کی بنا پر شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک تیسرے حیض میں داخل ہوتے ہی عورت کی عدّت ختم ہوجاتی ہے، اور مرد کا حقِ رُجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اگر طلاق حیض کی حالت میں دی گئی ہو، تو اس حیض کا شمار عدّت میں نہ ہوگا، بلکہ چوتھے حیض میں داخل ہونے پر عدّت ختم ہوگی۔ (مُغنی المحتاج، حاشیۃ الدُّسُوقی) حَنفِیّہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر تیسرے حیض میں دس دن گزرنے پر خون بند ہو تو عورت کی عدّت ختم ہو جائے گی، خواہ عورت غسل کرے یا نہ کرے۔ اور اگر دس دن سے کم میں خون بند ہو جائے تو عدّت اُس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک عورت غسل نہ کر لے، یا ایک نماز کا پُورا وقت نہ گزر جائے۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جب عورت تیمُّم کر کے نماز پڑھ لے، اس وقت مرد کا حقِ رُجوع ختم ہوگا، اور امام محمدؒ کے نزدیک تیمُّم کرتے ہی حقِ رُجوع ختم ہو جائے گا۔ (ہِدایہ) امام احمدؒ کا معتبر مذہب، جس پر جُمہور حنابلہ کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کر لے، مرد کا حقِ رجوع باقی رہے گا۔ (الانصاف)

(۵) رجوع کس طرح ہوتا ہے اور کس طرح نہیں ہوتا؟ اِس مسئلے میں فقہا کے درمیان یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو رَجْعی طلاق دی ہو، وہ عدّت ختم ہونے سے پہلے جب چاہے رجوع کرسکتا ہے، خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ قرآنِ مجید (سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۸) میں فرمایا گیا ہے: وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ

فِیْ ذٰلِكَ، ''اُن کے شوہر اس مدّت کے اندر اُنھیں واپس لے لینے کے پُوری طرح حق دار ہیں۔'' اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدّت گزرنے سے پہلے تک اُن کی زوجیت برقرار رہتی ہے اور وہ انھیں قطعی طور پر چھوڑ دینے سے پہلے واپس لے سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر رجوع کوئی تجدیدِ نکاح نہیں ہے کہ اس کے لیے عورت کی رضا ضروری ہو۔ اس حد تک اتفاق کے بعد آگے رجوع کے طریقے میں فقہا کی رائے مختلف ہو گئی ہے۔

شافعیہ کے نزدیک رجوع صرف قول ہی سے ہوسکتا ہے، عمل سے نہیں ہوسکتا۔ اگر آدمی زبان سے یہ نہ کہے کہ میں نے رجوع کیا تو مباشرت یا اختلاط کا کوئی فعل، خواہ رجوع کی نیّت ہی سے کیا گیا ہو، رجوع قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ اِس صورت میں عورت سے ہر قسم کا استمتاع حرام ہے، چاہے وہ بلاشہوت ہی ہو۔ لیکن مُطَلَّقۂ رَجْعِیَّہ سے مباشرت کرنے پر حدّ نہیں ہے، کیونکہ علما کا اس کے حرام ہونے پر اتفاق نہیں ہے۔ البتہ جو اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو، اسے تعزیر دی جائے گی۔ مزید برآں شافعی مسلک کی رو سے مُطَلَّقۂ رَجْعِیَّہ کے ساتھ مباشرت کرنے پر بہرحال مَہرِ مثل لازم آتا ہے، خواہ اس کے بعد آدمی رجوع بالقول کرے یا نہ کرے۔ (مُغنی المحتاج)

مالکیہ کہتے ہیں کہ رجوع قول اور فعل، دونوں سے ہوسکتا ہے۔ اگر رجوع بالقول میں آدمی صریح الفاظ استعمال کرے، تو خواہ اس کی نیت رجوع کی ہو یا نہ ہو، رجوع ہو جائے گا، بلکہ اگر وہ مذاق کے طور پر بھی رجوع کے صریح الفاظ کہہ دے تو وہ رجوع قرار پائیں گے۔ لیکن اگر الفاظ صریح نہ ہوں تو وہ صرف اُس صورت میں رجوع قرار دیے جائیں گے جب کہ وہ رجوع کی نیّت سے کہے گئے ہوں۔ رہا رجوع بالفعل، تو کوئی فعل خواہ وہ اختلاط ہو، یا مباشرت، اس وقت تک رجوع قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک وہ رجوع کی نیت سے نہ کیا گیا ہو۔ (حاشیۃ الدُّسوقی، احکام القرآن لابن العَرَبی)

حنفیہ اور حنابلہ کا مسلک رجوع بالقول کے معاملے میں وہی ہے جو مالکیہ کا ہے۔ رہا رجوع بالفعل، تو مالکیہ کے برعکس اِن دونوں مذاہب کا فتویٰ یہ ہے کہ شوہر اگر عدت کے اندر مُطَلَّقۂ رَجْعِیَّہ سے مباشرت کر لے، تو وہ آپ سے آپ رجوع ہے، خواہ رجوع کی نیت ہو یا نہ ہو۔ البتہ دونوں کے مسلک میں فرق یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اختلاط کا ہر فعل رجوع ہے، خواہ وہ مباشرت سے کم کسی درجے کا ہو، اور حنابلہ محض اختلاط کو رجوع نہیں مانتے۔ (ہِدایہ، فتح القدیر، عُمدۃ القاری، الانصاف)

(٦) طلاقِ سُنّت اور طلاقِ بدعت کے نتائج کا فرق یہ ہے کہ ایک طلاق یا دو طلاق دینے کی صورت میں اگر عدّت گزر بھی جائے تو مُطَلَّقہ عورت اور اس کے سابق شوہر کے درمیان باہمی رضامندی سے پھر نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر آدمی تین طلاق دے چکا ہو تو نہ عدّت کے اندر رجوع ممکن ہے اور نہ عدّت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کیا جاسکتا ہے، اِلّا یہ کہ اُس عورت کا نکاح کسی اور شخص سے ہو، وہ نکاح صحیح نوعیت کا ہو، دوسرا شوہر اُس عورت سے مباشرت بھی کر چکا ہو، پھر یا تو وہ اسے طلاق دے دے یا مر جائے۔ اس کے بعد اگر عورت اور اس کا سابق شوہر باہمی رضامندی کے ساتھ از سرِ نو نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ احادیث

Maktaba Tul Ishaat.com

وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ

اور عدّت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو[۲]، اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے۔ (زمانۂ عدّت میں) نہ تم اُنھیں اُن کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں[۳]، اِلّا یہ کہ وہ کسی صریح بُرائی کی مرتکب ہوں[۴]۔ یہ

کی اکثر کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا، اور اُس دوسرے شوہر کے ساتھ اس کی خلوت بھی ہوئی، مگر مباشرت نہیں ہوئی، پھر اس نے اسے طلاق دے دی، اب کیا اس عورت کا اپنے سابق شوہر سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: لا، حتّٰی یذوق الاٰخر من عسیلتها ما ذاق الاوّل۔ ''نہیں، جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے اُسی طرح لُطف اندوز نہ ہو چکا ہو جس طرح پہلا شوہر ہوا تھا۔'' رہا سازشی نکاح، جس میں پہلے سے یہ طے شدہ ہو کہ عورت کو سابق شوہر کے لیے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اس سے نکاح کرے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا، تو امام ابو یُوسفؒ کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے تحلیل تو ہو جائے گی، مگر یہ فعل مکروہِ تحریمی ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لعن اللّٰه المحلل والمحلل له، ''اللہ نے تحلیل کرنے والے اور تحلیل کرانے والے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' (ترمذی، نسائی) حضرت عُقبہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا: الا اخبرکم بالتیس المستعار؟ ''کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ کرایے کا سانڈ کون ہوتا ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: ''ضرور ارشاد فرمائیں۔'' فرمایا: هو المحلل، لعن اللّٰه المحلل والمحلل له۔ ''وہ تحلیل کرنے والا ہے۔ خدا کی لعنت ہے تحلیل کرنے والے پر بھی اور اس شخص پر بھی جس کے لیے تحلیل کی جائے۔'' (ابنِ ماجہ، دار قُطنی)

۲ – اس حکم کا خطاب مَردوں سے بھی ہے اور عورتوں سے بھی اور ان کے خاندان والوں سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ طلاق کو کھیل نہ سمجھ بیٹھو کہ طلاق کا اہم معاملہ پیش آنے کے بعد یہ بھی یاد نہ رکھا جائے کہ کب طلاق دی گئی ہے، کب عدّت شروع ہوئی اور کب اس کو ختم ہونا ہے۔ طلاق ایک نہایت نازک معاملہ ہے جس سے عورت اور مرد اور اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جب طلاق دی جائے تو اس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے، اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ کس حالت میں عورت

کو طلاق دی گئی ہے، اور حساب لگا کر دیکھا جائے کہ عدّت کا آغاز کب ہوا ہے، کب تک وہ باقی ہے، اور کب وہ ختم ہو گئی۔ اِسی حساب پر اِن اُمور کا فیصلہ موقوف ہے کہ شوہر کو کب تک رجوع کا حق ہے، کب تک اسے عورت کو گھر میں رکھنا ہے، کب تک اُس کا نفقہ دینا ہے، کب تک وہ عورت کا وارث ہو گا اور عورت اس کی وارث ہو گی، کب عورت اس سے جُدا ہو جائے گی اور اسے دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر یہ معاملہ کسی مُقدّمے کی صورت اختیار کر جائے تو عدالت کو بھی صحیح فیصلہ کرنے کے لیے طلاق کی صحیح تاریخ اور وقت اور عورت کی حالت معلوم ہونے کی ضرورت ہو گی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مدخولہ اور غیر مدخولہ، حاملہ اور غیر حاملہ، بے حیض اور باحیض، رَجعِیَّہ اور غیر رجعِیَّہ عورتوں کے معاملے میں طلاق سے پیدا شدہ مسائل کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔

۳- یعنی نہ مرد غصّے میں آ کر عورت کو گھر سے نکال دے، اور نہ عورت خود ہی بگڑ کر گھر چھوڑ دے۔ عدّت تک گھر اُس کا ہے۔ اُسی گھر میں دونوں کو رہنا چاہیے، تاکہ باہم موافقت کی کوئی صورت اگر نکل سکتی ہو تو اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ طلاق اگر رَجعی ہو تو کسی وقت بھی شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف مائل ہو سکتی ہے، اور بیوی بھی اختلاف کے اسباب کو دُور کر کے شوہر کو راضی کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ دونوں ایک گھر میں موجود رہیں گے تو تین مہینے تک، یا تین حیض آنے تک، یا حمل کی صورت میں وضعِ حمل تک اِس کے مواقع بارہا پیش آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر مرد جلد بازی کر کے اسے نکال دے، یا عورت ناسمجھی سے کام لے کر میکے جا بیٹھے، تو اس صورت میں رُجوع کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں اور بالعُموم طلاق کا انجام آخرکار مستقل علیحدگی ہو کر رہتا ہے۔ اسی لیے فقہا نے یہاں تک کہا ہے کہ طلاقِ رَجعی کی صورت میں جو عورت عدت گزار رہی ہو، اُسے بناؤ سنگھار کرنا چاہیے تاکہ شوہر اس کی طرف مائل ہو۔ (ہدایہ، الانصاف)

فقہا کے درمیان اس امر میں اتفاق ہے کہ مُطَلَّقۂ رَجعِیَّہ کو عدّت کے زمانے میں سُکونت اور نَفقے کا حق ہے، اور عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے جائے، اور مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اسے گھر سے نکالے۔ اگر مرد اسے نکالے گا تو گناہ گار ہو گا، اور عورت اگر خود نکلے گی تو گناہ گار بھی ہو گی اور نَفقہ و سُکونت کے حق سے بھی محروم ہو جائے گی۔

۴- اس کے متعدّد مطلب مختلف فقہا نے بیان کیے ہیں۔ حضرت حَسَن بصری، عامر شَعْبی، زید بن اسلم، ضَحّاک، مجاہد، عِکْرِمَہ، ابنِ زید، حَمّاد اور لَیث کہتے ہیں کہ اس سے مراد بدکاری ہے۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بدزبانی ہے، یعنی یہ کہ طلاق کے بعد بھی عورت کا مزاج دُرستی پر نہ آئے، بلکہ وہ عدّت کے زمانے میں شوہر اور اس کے خاندان والوں سے جھگڑتی اور بدزبانی کرتی رہے۔ قَتادَہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نُشوز ہے، یعنی عورت کو نُشوز کی بنا پر طلاق دی گئی ہو اور عدّت کے زمانے میں بھی وہ شوہر کے مقابلے پر سرکشی کرنے سے باز نہ آئے۔ عبداللہ بن عمرؓ، سُدِّی، ابن السّائب اور ابراہیم نَخَعی کہتے ہیں کہ اس سے مراد عورت کا گھر سے نکل جانا ہے، یعنی ان کی رائے میں طلاق کے بعد عدّت کے زمانے میں عورت کا گھر چھوڑ کر نکل جانا بجائے خود فاحشة مبينة (صریح برائی کا ارتکاب) ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ فَاِذَا بَلَغْنَ

اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔ تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ (موافقت کی) کوئی صُورت پیدا کر دے۔[5] پھر جب وہ اپنی (عدّت کی)

اور یہ ارشاد کہ" وہ نہ خود نکلیں اِلّا یہ کہ صریح برائی کی مرتکب ہوں" کچھ اس طرح کا کلام ہے جیسے کوئی کہے کہ" تم کسی کو گالی نہ دو اِلّا یہ کہ بدتمیز بنو"۔ اِن چار اقوال میں سے پہلے تین قولوں کے مطابق" اِلّا یہ" کا تعلق" ان کو گھروں سے نہ نکالو" کے ساتھ ہے، اور اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ بدچلنی یا بدزبانی یا نُشوز کی مرتکب ہوں تو انھیں نکال دینا جائز ہوگا۔ اور چوتھے قول کی رُو سے اِس کا تعلق" اور نہ وہ خود نکلیں" کے ساتھ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نکلیں گی تو صریح بُرائی کی مرتکب ہوں گی۔

۵ – یہ دونوں فقرے اُن لوگوں کے خیال کی بھی تردید کرتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے یا بیک وقت تین طلاق دے دینے سے کوئی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی، اور اُن لوگوں کی رائے کو بھی غلط ثابت کر دیتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاق ایک ہی طلاق کے حکم میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بِدْعی طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، یا تین طلاق ایک ہی طلاقِ رَجعی کے حکم میں ہیں، تو یہ کہنے کی آخر ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ جو اللہ کی حُدود، یعنی سنّت کے بتائے ہوئے طریقے کی خلاف ورزی کرے گا، وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا، اور تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے؟ یہ دونوں باتیں تو اُسی صورت میں با معنیٰ ہو سکتی ہیں جب کہ سنّت کے خلاف طلاق دینے سے واقعی کوئی نقصان ہوتا ہو جس پر آدمی کو پچھتانا پڑے، اور تین طلاق بیک وقت دے بیٹھنے سے رُجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو طلاق واقع ہی نہ ہو اس سے حُدود اللہ پر کوئی تعدّیِ نہیں ہوتی جو اپنے نفس پر ظلم قرار پائے، اور جو طلاق بہر حال رَجعی ہی ہو اس کے بعد تو لازماً موافقت کی صورت باقی رہتی ہے، پھر یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

اس مقام پر ایک مرتبہ پھر سورۂ بقرہ کی آیات ۲۲۸ تا ۲۳۰ اور سورۂ طلاق کی زیرِ بحث آیات کے باہمی تعلق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ سورۂ بقرہ میں طلاق کا نصاب تین بتایا گیا ہے، جن میں سے دو کے بعد رجوع کا حق، اور عدّت گزر جانے کے بعد بلا تحلیل دوبارہ نکاح کر لینے کا حق باقی رہتا ہے، اور تیسری طلاق دے دینے سے یہ دونوں حق ساقط ہو جاتے ہیں۔ سورۂ طلاق کی یہ آیات اِس حکم میں کسی ترمیم و تنسیخ کے لیے نازل نہیں ہوئی ہیں،

اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ

مدّت کے خاتمے پر پہنچیں تو یا انھیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو، یا بھلے طریقے پر اُن سے جُدا ہو جاؤ۔[۶] اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحبِ عدل ہوں۔ اور (اے گواہ بننے والو!) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔

بلکہ یہ بتانے کے لیے نازل ہوئی ہیں کہ بیویوں کو طلاق دینے کے جو اختیارات مَردوں کو دیے گئے ہیں، اُن کو استعمال کرنے کی دانش مندانہ صورت کیا ہے جس کی پیروی اگر کی جائے تو گھر بگڑنے سے بچ سکتے ہیں، طلاق دے کر پچھتانے کی نوبت پیش نہیں آ سکتی، موافقت پیدا ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع باقی رہتے ہیں، اور اگر بالآخر علیحدگی ہو بھی جائے تو یہ آخری چارہ کار کھلا رہتا ہے کہ پھر مل جانا چاہیں تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نادانی کے ساتھ اپنے اِن اختیارات کو غلط طریقے سے استعمال کر بیٹھے تو وہ اپنے اُوپر خود ظلم کرے گا اور تلافی کے تمام مواقع کھو بیٹھے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو تین سو روپے دے اور کہے کہ یہ تمھاری مِلکیّت ہیں، اِن کو تم اپنی مرضی سے خرچ کرنے کے مختار ہو۔ پھر وہ اسے نصیحت کرے کہ اپنے اِس مال کو جو میں نے تمھیں دے دیا ہے، اِس طرح احتیاط کے ساتھ برمحل اور بتدریج استعمال کرنا، تاکہ تم اس سے صحیح فائدہ اُٹھا سکو، ورنہ میری نصیحت کے خلاف تم بے احتیاطی کے ساتھ اسے بے موقع خرچ کرو گے، یا ساری رقم بیک وقت خرچ کر بیٹھو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے اور پھر مزید کوئی رقم میں تمھیں برباد کرنے کے لیے نہیں دوں گا۔ یہ ساری نصیحت ایسی صورت میں بے معنٰی ہو جاتی ہے جب کہ باپ نے پوری رقم سرے سے اس کے ہاتھ میں چھوڑی ہی نہ ہو، وہ بے موقع خرچ کرنا چاہے تو رقم اس کی جیب سے نکلے ہی نہیں، یا پورے تین سو خرچ کر ڈالنے پر بھی ایک سو ہی اس کے ہاتھ سے نکلیں اور دو سو بہرحال اس کی جیب میں پڑے رہیں۔ صورتِ معاملہ اگر یہی ہو تو اس نصیحت کی آخر حاجت کیا ہے؟

۶ – یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدّت ختم ہونے سے پہلے پہلے فیصلہ کر لو کہ آیا عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا ہے یا نہیں۔ رکھنا ہو تو نباہنے کی غرض سے رکھو، اِس غرض سے نہ رکھو کہ اُس کو ستانے کے لیے رجوع کر لو اور پھر طلاق دے کر اس کی عدّت لمبی کرتے رہو۔ اور اگر رخصت کرنا ہو تو شریف آدمیوں کی طرح کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر رخصت کرو، مَہر یا اس کا کوئی حصّہ باقی ہو تو ادا کر دو، اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ مُتعۂ طلاق کے طور پر دو، جیسا کہ سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۱ میں ارشاد ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن،

Maktaba Tul Ishaat.com

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۵ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۲ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے، ہر اُس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۸۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے۹ گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۱۰۔

جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۶)

۷- ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد طلاق پر بھی گواہ بنانا ہے اور رجوع پر بھی۔ (ابنِ جریر) حضرت عمرانؓ بن حُصَین سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور پھر اس سے رجوع کر لیا، مگر نہ طلاق پر کسی کو گواہ بنایا نہ رُجوع پر۔ انھوں نے جواب دیا: ''تم نے طلاق بھی سنّت کے خلاف دی اور رجوع بھی سنت کے خلاف کیا۔ طلاق اور رجوع دونوں پر گواہ بناؤ اور آیندہ ایسا نہ کرنا'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ) لیکن فقہائے اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ طلاق اور رَجعت اور فُرقت پر گواہ بنانا، اِن افعال کی صحّت کے لیے شرط نہیں ہے کہ اگر گواہ نہ بنایا جائے تو نہ طلاق واقع ہو، نہ رجوع صحیح ہو اور نہ فُرقت، بلکہ یہ حکم اِس احتیاط کے لیے دیا گیا ہے کہ فریقین میں سے کوئی بعد میں کسی واقعے کا انکار نہ کر سکے، اور نزاع پیدا ہونے کی صورت میں بآسانی فیصلہ ہو سکے، اور شکوک و شبہات کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔ یہ حکم بالکل ایسا ہی ہے جیسے فرمایا: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ''جب تم آپس میں بیع کا کوئی معاملہ طے کرو تو گواہ بنا لو۔'' (البقرہ: ۲۸۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیع پر گواہ بنانا فرض ہے اور اگر گواہ نہ بنایا جائے تو بیع صحیح نہ ہوگی، بلکہ یہ ایک حکیمانہ ہدایت ہے جو نزاعات کا سدِّباب کرنے کے لیے دی گئی ہے اور اس پر عمل کرنے ہی میں بہتری ہے۔ اِسی طرح طلاق اور رجوع کے معاملے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ ان میں سے ہر فعل گواہیوں کے بغیر بھی قانوناً درست ہو جاتا ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جو فعل بھی کیا جائے، اُسی وقت یا اُس کے بعد دو صاحبِ عدل آدمیوں کو اُس پر گواہ بنا لیا جائے۔

۸- یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ اُوپر جو ہدایات دی گئی ہیں وہ نصیحت کی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ قانون کی۔ آدمی سنت کے خلاف طلاق دے بیٹھے، عدّت کا شمار محفوظ نہ رکھے، بیوی کو بلا عذرِ معقول گھر سے نکال دے، عدّت کے خاتمے پر رجوع کرے تو عورت کو ستانے کے لیے کرے اور رخصت کرے تو لڑائی جھگڑے کے ساتھ کرے، اور طلاق، رجوع، مُفارقت، کسی چیز پر بھی گواہ نہ بنائے، تو اس سے طلاق اور رجوع اور مُفارقت کے قانونی نتائج میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی نصیحت کے خلاف عمل کرنا اس بات کی دلیل ہوگا کہ اس کے دل میں اللہ

وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۝۳ وَ الّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ

جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پُورا کر کے رہتا ہے[11]۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔

اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملے میں

اور روزِ آخر پر صحیح ایمان موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک سچّے مومن کو اختیار نہ کرنا چاہیے۔

۹ – سیاقِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا مطلب سنّت کے مطابق طلاق دینا، عدّت کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا، بیوی کو گھر سے نہ نکالنا، عدّت کے اختتام پر عورت کو روکنا ہو تو نباہ کرنے کی نیّت سے رجوع کرنا اور علیٰحدگی ہی کرنی ہو تو بھلے آدمیوں کی طرح اس کو رخصت کر دینا، اور طلاق، رجوع یا مُفارَقَت، جو بھی ہو، اس پر دو عادل آدمیوں کو گواہ بنا لینا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو اِس طرح تقویٰ سے کام لے گا، اس کے لیے ہم کوئی مَخرَج (یعنی مشکلات سے نکلنے کا راستہ) نکال دیں گے۔ اِس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو شخص اِن اُمور میں تقویٰ سے کام نہ لے گا وہ اپنے لیے خود ایسی الجھنیں اور مشکلات پیدا کر لے گا جن سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہ مل سکے گا۔

ان الفاظ پر غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک طلاقِ بِدعی سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور جو لوگ بیک وقت یا ایک ہی طُہر میں دی ہوئیں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں، ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر طلاقِ بِدعی واقع ہی نہ ہو تو سرے سے کوئی اُلجھن پیش نہیں آتی جس سے نکلنے کے لیے کسی مَخرَج کی ضرورت ہو۔ اور اگر تین طلاق اکٹھی دے بیٹھنے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہو، تب بھی مَخرَج کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں آخر وہ پیچیدگی کیا ہے جس سے نکلنے کے لیے کسی راستے کی حاجت پیش آئے؟

۱۰ – مراد یہ ہے کہ عدّت کے دوران میں مُطَلَّقہ بیوی کو گھر میں رکھنا، اُس کا خرچ برداشت کرنا، اور رخصت کرتے ہوئے اس کو مَہر یا مُتعۂ طلاق دے کر رخصت کرنا بلاشبہ آدمی پر مالی بار ڈالتا ہے۔ جس عورت سے آدمی دل برداشتہ ہو کر تعلقات منقطع کر لینے پر آمادہ ہو چکا ہو، اس پر مال خرچ کرنا تو اسے ضرور ناگوار ہو گا۔ اور اگر آدمی تنگ دست بھی ہو تو یہ خرچ اسے اور زیادہ کھلے گا۔ لیکن اللہ سے ڈرنے والے آدمی کو یہ سب کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ اڵّٰٓـِٔیْ

اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمھیں معلوم ہو کہ) ان کی عدّت تین مہینے ہے[12]۔ اور یہی حکم اُن کا ہے

برداشت کرنا چاہیے۔ تمھارا دل تنگ ہو تو ہو، اللہ کا ہاتھ رزق دینے کے لیے تنگ نہیں ہے۔ اُس کی ہدایت پر چل کر مال خرچ کرو گے تو وہ ایسے راستوں سے تمھیں رزق دے گا جدھر سے رزق ملنے کا تم گمان بھی نہیں کر سکتے۔

۱۱ - یعنی کوئی طاقت اللہ کے حکم کو نافذ ہونے سے روکنے والی نہیں ہے۔

۱۲ - یہ اُن عورتوں کا حکم ہے جن کو حیض آنا قطعی بند ہو چکا ہو اور کبرِسنّی کی وجہ سے وہ سِنِ ایاس میں داخل ہو چکی ہوں۔ اُن کی عدت اُس روز سے شمار ہو گی جس روز انھیں طلاق دی گئی ہو۔ اور تین مہینوں سے مراد تین قمری مہینے ہیں۔ اگر قمری مہینے کے آغاز میں طلاق دی گئی ہو تو بالاتفاق رُؤیتِ ہِلال کے لحاظ سے عدّت شمار ہو گی، اور اگر مہینے کے بیچ میں کسی وقت طلاق دی گئی ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۳۰ دن کا مہینا قرار دے کر ۳ مہینے پورے کرنے ہوں گے۔ (بدائع الصّنائع)

رہیں وہ عورتیں جن کے حیض میں کسی نوع کی بے قاعدگی ہو، ان کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافات ہیں۔

حضرت سعید بن المُسَیَّب کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت کو طلاق دی گئی ہو، پھر ایک دو مرتبہ حیض آنے کے بعد اس کا حیض بند ہو گیا ہو، وہ ۹ مہینے انتظار کرے۔ اگر حمل ظاہر ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ ۹ مہینے گزرنے کے بعد وہ مزید تین مہینے عدّت گزارے، پھر وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کے لیے حلال ہو گی۔

ابنِ عباسؓ، قَتَادہ اور عِکرِمَہ کہتے ہیں کہ جس عورت کو سال بھر حیض نہ آیا ہو، اس کی عدّت تین مہینے ہے۔

طاؤس کہتے ہیں کہ جس عورت کو سال میں ایک مرتبہ حیض آئے، اس کی عدت تین حیض ہے۔ یہی رائے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے۔

امام مالکؒ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حَبان نامی تھے جنھوں نے اپنی بیوی کو ایسے زمانے میں طلاق دی جب کہ وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اس پر ایک سال گزر گیا مگر انھیں حیض نہ آیا۔ پھر وہ صاحب انتقال کر گئے۔ مُطلَّقہ بیوی نے وراثت کا دعویٰ کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے سامنے مُقدّمہ پیش ہوا۔ انھوں نے حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں بزرگوں کے مشورے سے حضرت عثمانؓ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت وارث ہے۔ دلیل یہ تھی کہ نہ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اور نہ ان لڑکیوں میں

لَمْ يَحِضْنَ ۚ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ

جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو[۱۳]۔ اور حاملہ عورتوں کی عدّت کی حد یہ ہے کہ اُن کا وضعِ حمل ہو جائے[۱۴]۔

سے ہے جن کو ابھی حیض نہیں آیا، لہٰذا وہ شوہر کے مرنے تک اپنے اُس حیض پر تھی جو اُسے پہلے آیا تھا اور اس کی عدّت باقی تھی۔

حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ جس عورت کا حیض بند ہو گیا ہو، مگر اس کا بند ہونا سنِّ ایاس کی وجہ سے نہ ہو کہ آیندہ اس کے جاری ہونے کی اُمید نہ رہے، اس کی عدّت یا تو حیض ہی سے ہو گی اگر وہ آیندہ جاری ہو، یا پھر اُس عمر کے لحاظ سے ہو گی جس میں عورتوں کو حیض آنا بند ہو جاتا ہے، اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد وہ تین مہینے عدّت گزار کر نکاح سے آزاد ہو گی۔ یہی قول امام شافعیؒ، امام ثوری اور امام لَیث کا ہے۔ اور یہی مذہب حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کا ہے۔

امام مالکؒ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کو اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت پہلے ۹ مہینے گزارے گی۔ اگر اس دوران میں حیض جاری نہ ہو تو پھر وہ تین مہینے اُس عورت کی سی عدّت گزارے گی جو حیض سے مایوس ہو چکی ہو۔ ابن القاسم نے امام مالکؒ کے مسلک کی توضیح یہ کی ہے کہ ۹ مہینے اُس روز سے شمار ہوں گے جب آخری مرتبہ اس کا حیض ختم ہوا تھا، نہ کہ اُس روز سے جب اسے طلاق دی گئی۔ (یہ تمام تفصیلات احکام القرآن للجَصّاص اور بدائع الصّنائع للکاسانی سے ماخوذ ہیں)۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی عورت جس کی عدّت حیض کے اعتبار سے شروع ہوئی تھی، عدّت کے دوران میں آئسہ ہو جائے تو اسے حیض والی عورتوں کے بجائے آئسہ عورتوں والی عدّت گزارنی ہو گی۔ اور اگر اس کو حیض آنا بند ہو جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ وہ کیوں بند ہو گیا ہے تو پہلے وہ حمل کے شُبہے میں ۹ مہینے گزارے گی اور پھر اسے تین مہینے عدّت کے پورے کرنے ہوں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ حیض کیوں بند ہوا ہے، مثلاً کوئی بیماری ہو، یا دودھ پلا رہی ہو، یا ایسا ہی کوئی اور سبب ہو، تو وہ اُس وقت تک عدّت میں رہے گی جب تک یا تو حیض آنا شروع نہ ہو جائے اور عدّت حیضوں کے لحاظ سے شمار ہو سکے، یا پھر وہ آئسہ ہو جائے اور آئسہ عورتوں کی سی عدّت گزار سکے۔ (الانصاف)

۱۳- حیض خواہ کم سِنّی کی وجہ سے نہ آیا ہو، یا اس وجہ سے کہ بعض عورتوں کو بہت دیر میں حیض آنا شروع ہوتا ہے، اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر نہیں آتا، بہرحال تمام صورتوں میں ایسی عورت کی عدّت وہی ہے جو آئسہ عورت کی عدّت ہے، یعنی طلاق کے وقت سے تین مہینے۔

اس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کی تصریح کے مطابق عدّت کا سوال اُس عورت کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خَلوَت کر چکا ہو، کیونکہ خَلوَت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدّت ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

ہی نہیں۔ (الاحزاب: ۴۹) اس لیے ایسی لڑکیوں کی عدّت بیان کرنا جنھیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خَلوَت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو، اسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا۔

جس لڑکی کو ایسی حالت میں طلاق دی گئی ہو کہ اسے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، اور پھر عدّت کے دوران میں اس کو حیض آ جائے، تو وہ پھر اُسی حیض سے عدّت شروع کرے گی اور اس کی عدّت حائضہ عورتوں جیسی ہوگی۔

۱۴ - اِس امر پر تمام اہلِ علم کا اجماع ہے کہ مُطَلَّقہ حاملہ کی عدّت وضعِ حمل تک ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا یہی حکم اُس عورت کا بھی ہے جس کا شوہر زمانۂ حمل میں وفات پا گیا ہو؟ یہ اختلاف اس وجہ سے ہوا ہے کہ سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۴ میں اُس عورت کی عدّت ۴ مہینے دس دن بیان کی گئی ہے جس کا شوہر وفات پا جائے، اور وہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ حکم آیا تمام بیوہ عورتوں کے لیے عام ہے یا اُن عورتوں کے لیے خاص ہے جو حاملہ نہ ہوں۔

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اِن دونوں آیتوں کو ملا کر یہ اِستنباط کرتے ہیں کہ حاملۂ مُطَلَّقہ کی عدّت تو وضعِ حمل تک ہی ہے، مگر بیوہ حاملہ کی عدّت آخر الاَجَلَین ہے، یعنی مُطَلَّقہ کی عدت اور حاملہ کی عدّت میں سے جو زیادہ طویل ہو، وہی اس کی عدّت ہے۔ مثلاً اگر اس کا بچہ ۴ مہینے دس دن سے پہلے پیدا ہو جائے تو اسے چار مہینے دس دن پورے ہونے تک عدّت گزارنی ہوگی۔ اور اگر اس کا وضعِ حمل اس وقت تک نہ ہو تو پھر اس کی عدّت اُس وقت پوری ہوگی جب وضعِ حمل ہو جائے۔ یہی مذہب اِمامیّہ کا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ سورۂ طلاق کی یہ آیت سورۂ بقرہ کی آیت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس لیے بعد کے حکم نے پہلی آیت کے حکم کو غیر حاملہ بیوہ کے لیے خاص کر دیا ہے اور ہر حاملہ کی عدت وضعِ حمل تک مقرر کر دی ہے، خواہ وہ مُطَلَّقہ ہو یا بیوہ۔ اِس مسلک کی رُو سے عورت کا وضعِ حمل چاہے شوہر کی وفات کے فوراً بعد ہو جائے یا ۴ مہینے دس دن سے زیادہ طول کھینچے، بہرحال بچہ پیدا ہوتے ہی وہ عدّت سے باہر ہو جائے گی۔ اس مسلک کی تائید حضرت اُبَیؓ بن کَعب کی یہ روایت کرتی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: جب سورۂ طلاق کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا یہ مُطَلَّقہ اور بیوہ دونوں کے لیے ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: ہاں۔ دوسری روایت میں حضورؐ نے مزید تصریح فرمائی: اجل کل حامل ان تضع ما فی بطنھا، ”ہر حاملہ عورت کی عدت کی مدّت اس کے وضعِ حمل تک ہے۔“ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم۔ ابنِ حَجَر کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کی سند میں کلام کی گنجایش ہے، لیکن چونکہ یہ متعدِّد سندوں سے نقل ہوئی ہے، اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے)۔ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کی مضبوط تائید سُبَیعَۂ اَسلَمِیَّہ کے واقعے سے ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں

پیش آیا تھا۔ وہ بحالتِ حمل بیوہ ہوئی تھیں اور شوہر کی وفات کے چند روز بعد (بعض روایات میں ۲۰ دن، بعض میں ۲۳ دن، بعض میں ۲۵ دن، بعض میں ۳۵ دن، اور بعض میں ۴۰ دن بیان ہوئے ہیں) اُن کا وضعِ حمل ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کے معاملے میں فتویٰ پوچھا گیا تو آپؐ نے ان کو نکاح کی اجازت دے دی۔ اِس واقعے کو بخاری و مسلم نے کئی طریقوں سے حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے روایت کیا ہے۔ اِسی واقعے کو بخاری، مسلم، امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابنِ ماجہ نے مختلف سندوں کے ساتھ حضرت مِسْوَرؓ بن مَخْرمہ سے بھی روایت کیا ہے۔ مسلم نے خود سُبَیْعَہ اَسلَمِیَّہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت سعدؓ بن خَوْلہ کی بیوی تھی۔ حَجَّۃُ الوداع کے زمانے میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا جب کہ میں حاملہ تھی۔ وفات کے چند روز بعد میرے ہاں بچّہ پیدا ہو گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ تم چار مہینے دس دن سے پہلے نکاح نہیں کر سکتیں۔ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فتویٰ دیا کہ تم وضعِ حمل ہوتے ہی حلال ہو چکی ہو، اب چاہو تو دوسرا نکاح کر سکتی ہو۔ اس روایت کو بخاریؒ نے بھی مختصراً نقل کیا ہے۔

صحابہؓ کی کثیر تعداد سے یہی مسلک منقول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، عبدالرزّاق، ابنِ ابی شَیْبَہ اور ابن المُنذِر رحمہم اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حاملہ بیوہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: اس کی عدّت وضعِ حمل تک ہے۔ اس پر انصار میں سے ایک صاحب بولے کہ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر شوہر ابھی دفن بھی نہ ہوا ہو بلکہ اس کی لاش اس کے بستر پر ہی ہو اور اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہو جائے، تو وہ دوسرے نکاح کے لیے حلال ہو جائے گی۔ یہی رائے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابومسعودؓ بدری اور حضرت عائشہؓ کی ہے، اور اسی کو ائمۂ اربعہ اور دوسرے اکابر فقہا نے اختیار کیا ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر حاملہ کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچّے ہوں تو آخری بچے کی ولادت پر عدّت ختم ہو گی۔ بچہ خواہ مُردہ ہی پیدا ہو، اس کی ولادت سے عدّت ختم ہو جائے گی۔ اِسقاطِ حمل کی صورت میں اگر دائیاں اپنے فن کی رُو سے یہ کہیں کہ یہ محض خون کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ اس میں آدمی کی صورت پائی جاتی تھی، یا یہ رَسولی نہ تھی بلکہ آدمی کی اصل تھی، تو ان کا قول قبول کیا جائے گا اور عدّت ختم ہو جائے گی۔ (مُغْنِی المحتاج) حَنابلہ اور حَنفِیَّہ کا مسلک بھی اِس کے قریب قریب ہے، مگر اِسقاط کے معاملے میں ان کا مذہب یہ ہے کہ جب تک انسانی بناوٹ ظاہر نہ پائی جائے، محض دائیوں کے اِس بیان پر کہ یہ آدمی ہی کی اصل ہے، اعتماد نہیں کیا جائے گا اور اس سے عدّت ختم نہ ہو گی۔ (بدائع الصَّنائع، الانصاف) لیکن موجودہ زمانے میں طبّی تحقیقات کے ذریعے سے یہ معلوم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی کہ جو چیز ساقط ہوئی ہے، وہ واقعی انسانی حمل کی نوعیت رکھتی تھی یا کسی رَسولی یا جمے ہوئے خون کی قسم سے تھی، اس لیے اب جہاں ڈاکٹروں سے رائے حاصل کرنا ممکن ہو، وہاں یہ فیصلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو اِسقاطِ حمل کہا جاتا ہے، وہ واقعی اِسقاط تھا یا نہیں اور اس سے عدّت ختم ہوئی یا نہیں۔ البتہ جہاں ایسی طبّی تحقیق ممکن نہ ہو، وہاں حنابلہ اور حنفیہ کا مسلک ہی زیادہ مبنی بر احتیاط ہے اور جاہل

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾ ذٰلِكَ اَمْرُ
اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ
وَ يُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴿۵﴾ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ
مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ

جو شخص اللہ سے ڈرے اُس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی بُرائیوں کو اس سے دُور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔[۱۵]

اُن کو (زمانۂ عدّت میں) اُسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمھیں میسّر ہو۔ اور انھیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔[۱۶]

دائیوں پر اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے۔

۱۵ – یہ اگرچہ ایک عُمومی نصیحت ہے جس کا اطلاق انسانی زندگی کے تمام حالات پر ہوتا ہے، لیکن اِس خاص سیاق و سباق میں اسے ارشاد فرمانے کا مقصد مسلمانوں کو خبردار کرنا ہے کہ اُوپر جو احکام بیان کیے گئے ہیں، اُن سے خواہ تمھارے اُوپر کتنی ہی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑتا ہو، بہرحال خدا سے ڈرتے ہوئے اُن کی پیروی کرو، اللہ تمھارے کام آسان کرے گا، تمھارے گناہ معاف کرے گا اور تمھیں بڑا اجر دے گا۔ ظاہر ہے کہ جن مُطَلَّقہ عورتوں کی عدّت تین مہینے مقرر کی گئی ہے ان کا زمانۂ عدّت اُن عورتوں کی بہ نسبت طویل تر ہو گا جن کی عدّت تین حیض مقرر کی گئی ہے۔ اور حاملہ عورت کا زمانۂ عدّت تو اس سے بھی کئی مہینے زیادہ ہوسکتا ہے۔ اِس پورے زمانے میں عورت کی سُکونت اور اس کے نفقے کی ذمہ داری اُٹھانا، جب کہ آدمی اسے چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکا ہو، لوگوں کو ناقابلِ برداشت بارمحسوس ہو گا۔ لیکن جو بار اللہ سے ڈرتے ہوئے، اللہ کے احکام کی پیروی میں اٹھایا جائے، اللہ کا وعدہ ہے کہ اپنے فضل سے وہ اس کو ہلکا کر دے گا اور اس کی اِتنی بھاری جزا دے گا جو دنیا میں اٹھائے ہوئے اِس تھوڑے سے بار کی بہ نسبت بہت زیادہ گراں قدر ہو گی۔

۱۶ – اس امر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ مُطَلَّقہ کو اگر رَجعی طلاق دی گئی ہو تو شوہر پر اس کی سکونت اور اس کے نفقے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو، تو خواہ اسے

رَجعی طلاق دی گئی ہو یا قطعی طور پر الگ کر دینے والی، بہر حال اس کے وضعِ حمل تک اس کی سکونت اور اس کے نفقے کا ذمہ دار شوہر ہوگا۔ اس کے بعد اختلاف اس امر میں ہوا ہے کہ آیا غیر حاملہ مُطَلَّقہ مَبْتُوتَہ (یعنی جسے قطعی طور پر الگ کر دینے والی طلاق دی گئی ہو) سکونت اور نفقہ دونوں کی حق دار ہے؟ یا صرف سُکونت کا حق رکھتی ہے؟ یا دونوں میں سے کسی کی بھی حق دار نہیں ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ سکونت اور نفقہ دونوں کی حق دار ہے۔ یہ رائے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت علیؓ بن حسینؓ (امام زین العابدین)، قاضی شُریحؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ کی ہے۔ اسی کو حَنفِیّہ نے اختیار کیا ہے، اور امام سُفیان ثَوری اور حسن بن صالح کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کی تائید دارُقُطنی کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المطلقة ثلاثا لها السکنٰی والنفقة، ''جس عورت کو تین طلاقیں دی جا چکی ہوں، اس کے لیے زمانۂ عدت میں سکونت اور نفقے کا حق ہے۔'' اس کی مزید تائید اُن رِوایات سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ فاطمہؓ بنتِ قَیس کی حدیث کو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر ردّ کر دیا تھا کہ ہم ایک عورت کے قول پر اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبیؐ کی سنّت کو ترک نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے علم میں لازماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ہو گی کہ ایسی عورت کے لیے نفقہ اور سکونت کا حق ہے۔ بلکہ ابراہیم نَخَعی کی ایک روایت میں تو یہ تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ بنتِ قَیس کی حدیث کو ردّ کرتے ہوئے فرمایا تھا: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم یقول لها السکنٰی والنّفقة، ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایسی عورت کے لیے سکونت کا حق بھی ہے اور نفقے کا بھی۔'' امام ابوبکر جَصّاص احکام القرآن میں اِس مسئلے پر مفصّل بحث کرتے ہوئے اِس مسلک کے حق میں پہلی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ، ''ان کو اُن کی عدّت کے لیے طلاق دو۔'' اس فرمانِ الٰہی کا اطلاق اُس شخص پر بھی تو ہوتا ہے جو دو طلاق پہلے دے کر رُجوع کر چکا ہو اور اب اُسے صرف ایک ہی طلاق دینے کا حق باقی ہو۔ دوسری دلیل اُن کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دینے کا جب یہ طریقہ بتایا کہ ''آدمی یا تو ایسے طُہر میں طلاق دے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو، یا ایسی حالت میں طلاق دے جب کہ عورت کا حاملہ ہونا ظاہر ہو چکا ہو'' تو اس میں آپ نے پہلی، دوسری، یا آخری طلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''ان کو اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو'' ہر قسم کی طلاق سے متعلق مانا جائے گا۔ تیسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ حاملہ مُطَلَّقہ خواہ رَجعِیّہ ہو یا مَبْتُوتہ، اس کی سکونت اور اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔ اور غیر حاملہ رَجعِیّہ کے لیے بھی یہ دونوں حقوق واجب ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سکونت اور نفقے کا وجوب دراصل حمل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ دونوں قسم کی عورتیں شرعاً شوہر کے گھر میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اب اگر یہی حکم مَبْتُوتہ غیر حاملہ کے بارے میں بھی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سکونت اور اس کا نفقہ مرد کے ذمّے نہ ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مُطَلَّقۂ مَبتُوتہ کے لیے سکونت کا حق تو ہے مگر نفقے کا حق نہیں ہے۔ یہ مسلک سعید بن المُسَیَّب، سلیمان بن یَسار، عطاء، شَعبی، اوزاعی، لَیث اور ابوعُبَید رحمہم اللہ کا ہے، اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن مُغنی المحتاج میں امام شافعیؒ کا مسلک اس سے مختلف بیان ہوا ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ مُطَلَّقۂ مَبتُوتہ کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقے کا۔ یہ مسلک حسن بصری، حمّاد، ابن ابی لیلیٰ، عَمرو بن دینار، طاؤس، اسحاق بن راہَوَیہ اور ابوثَور کا ہے۔ ابنِ جَریرؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ امام احمد بن حَنبلؒ اور اِمامیّہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور مُغنی المحتاج میں شافعیہ کا مسلک بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ تجب سکنٰی لمعتدةٍ طلاقٍ حائلٍ اوحاملٍ ولا بائنٍ...... والحائل البائن لا نفقة لها ولا کسوة۔ ’’طلاق کی بنا پر جو عورت عدّت گزار رہی ہو، اس کے لیے سکونت کا حق واجب ہے، خواہ وہ حاملہ ہو یا نہ ہو، مگر بائنہ کے لیے واجب نہیں ہے...... اور غیر حاملہ بائنہ کے لیے نہ نفقہ ہے اور نہ کپڑا۔‘‘ اِس مسلک کا اِستِدلال ایک تو قرآنِ مجید کی اِس آیت سے ہے کہ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا، ’’تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔‘‘ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ بات مطلّقۂ رَجعِیّہ کے حق ہی میں دُرست ہوسکتی ہے، نہ کہ مَبتُوتہ کے حق میں۔ اس لیے مطلّقہ کو گھر میں رکھنے کا حکم بھی رَجعِیّہ ہی کے لیے خاص ہے۔ دوسرا استدلال فاطمہؓ بنتِ قَیس کی حدیث سے ہے، جسے کُتُبِ حدیث میں بکثرت صحیح سندوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

یہ فاطمہؓ بنتِ قَیس اَلفِہرِیَّہ اوّلین مہاجرات میں سے تھیں، بڑی عاقلہ سمجھی جاتی تھیں، اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے موقع پر اصحابِ شُوریٰ کا اجتماع اِنھی کے ہاں ہوا تھا۔ یہ پہلے ابوعَمرو بن حَفص بن المُغیرہ اَلمَخزُومی کے نکاح میں تھیں، پھر ان کے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دے کر الگ کر دیا، اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کا نکاح حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے کیا۔ اِن کا قصّہ یہ ہے کہ اِن کے شوہر ابوعَمرو پہلے اِن کو دو طلاق دے چکے تھے۔ پھر جب حضرت علیؓ کے ساتھ وہ یمن بھیجے گئے تو انھوں نے وہاں سے باقی ماندہ تیسری طلاق بھی ان کو بھیج دی۔ بعض رِوایات میں یہ ہے کہ ابوعَمرو ہی نے اپنے رشتہ داروں کو پیغام بھیجا تھا کہ عدّت کے زمانے میں اِن کو گھر میں رکھیں اور ان کا خرچ برداشت کریں۔ اور بعض میں یہ ہے کہ اِنھوں نے خود نفقہ وسُکونت کے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ بہرحال جو صورت بھی ہو، شوہر کے رشتہ داروں نے ان کا حق ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ دعویٰ لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ نہ تمھارے لیے نَفقہ ہے نہ سُکونت۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: انما النفقة والسکنٰی للمرأة علٰی زوجها ما کانت لهٗ علیها رجعة، فاذا لم یکن له علیها رجعة فلا نفقة و لا سکنٰی۔ ’’عورت کا نفقہ اور اس کی سکونت تو شوہر پر اس صورت میں واجب ہے جب کہ شوہر کو اس پر رجوع کا حق ہو۔ مگر جب رجوع کا حق

نہ ہو تو نہ نفقہ ہے نہ سکونت۔'' (مُسندِ احمد) طَبَرانی اور نَسائی نے بھی قریب قریب یہی روایت نقل کی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: فاذا کانت لا تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ فلا نفقة ولا سکنٰی۔ ''لیکن جب وہ اُس کے لیے اُس وقت تک حلال نہ ہو جب تک اُس کے سوا کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے، تو پھر اس کے لیے نہ نفقہ ہے نہ سکونت۔'' یہ حکم بیان کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہلے اُمِّ شَرِیکؓ کے گھر میں عدّت گزارنے کا حکم دیا، اور بعد میں فرمایا کہ تم ابنِ اُمِّ مَکتُومؓ کے ہاں رہو۔

لیکن اس حدیث کو جن لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے اُن کے دلائل یہ ہیں:

اوّلاً، اُن کو شوہر کے رشتہ داروں کا گھر چھوڑنے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ بہت تیز زبان تھیں اور شوہر کے رشتہ دار اُن کی بدمزاجی سے تنگ تھے۔ سعید بن المُسَیَّب کہتے ہیں کہ ''ان خاتون نے اپنی حدیث بیان کر کے لوگوں کو فتنے میں ڈال دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ زبان دراز تھیں، اس لیے ان کو ابنِ اُمِّ مَکتُومؓ کے ہاں رکھا گیا۔'' (ابوداؤد) دوسری روایت میں سعید بن المُسَیَّب کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے شوہر کے رشتہ داروں سے زبان درازی کی تھی اس لیے انھیں اس گھر سے منتقل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ (جَصّاص) سلیمان بن یَسار کہتے ہیں: ''ان کا گھر سے نکلنا دراصل بدمزاجی کی وجہ سے تھا۔'' (ابوداؤد)

ثانیاً، ان کی روایت کو حضرت عمرؓ نے اُس زمانے میں رد کر دیا تھا جب بکثرت صحابہؓ موجود تھے اور اس معاملے کی پوری تحقیقات ہو سکتی تھیں۔ ابراہیم نَخَعی کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کو فاطمہؓ کی یہ حدیث پہنچی تو انھوں نے فرمایا: لسنا بتارکی اٰیة فی کتاب اللّٰہ وقول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم لقول امرأة لعلّها اوھمت سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم یقول لها السکنٰی والنفقة۔ ''ہم کتاب اللہ کی ایک آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ایک عورت کے قول کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے، جسے شاید کچھ وہم ہوا ہے۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مبتُوتہ کے لیے سکونت کا حق بھی ہے اور نفقہ کا بھی۔'' (جَصّاص) ابو اسحاق کہتے ہیں کہ میں اَسوَد بن یزید کے پاس کوفے کی مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں شَعْبی نے فاطمہؓ بنتِ قَیس کی حدیث کا ذکر کیا۔ اس پر حضرت اَسوَد نے شَعْبی کو کنکریاں کھینچ ماریں اور کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب فاطمہؓ کی یہ روایت پیش کی گئی تھی تو انھوں نے کہا تھا: ''ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنّت کو ایک عورت کے قول کی وجہ سے رد نہیں کر سکتے، معلوم نہیں اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ اس کے لیے نفقہ اور سکونت ہے۔ اللہ کا حکم ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ۔'' یہ روایت باختلافِ الفاظ مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نَسائی میں منقول ہوئی ہے۔

ثالثاً، مَروان کے زمانۂ حکومت میں جب مُطلّقۂ مَبتُوتہ کے متعلق ایک نزاع چل پڑی تھی، حضرت عائشہؓ نے فاطمہؓ بنتِ قَیس کی روایت پر سخت اعتراضات کیے تھے۔ قاسم بن محمدؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: ''کیا آپ کو فاطمہ کا قصّہ معلوم نہیں ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''فاطمہ کی حدیث کا ذکر نہ کرو تو اچھا ہے۔'' (بخاری)

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ

اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اُس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضعِ حمل نہ ہو جائے۔[۱۷]

بخاری نے دوسری روایت جو نقل کی ہے، اس میں حضرت عائشہؓ کے الفاظ یہ ہیں: ”فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے، وہ خدا سے ڈرتی نہیں؟“ تیسری روایت میں حضرت عُروۃؒ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ”فاطمہ کے لیے یہ حدیث بیان کرنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔“ حضرت عُروۃؒ ایک اور روایت میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فاطمہؓ پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا: ”وہ دراصل ایک خالی مکان میں تھیں جہاں کوئی مُونس نہ تھا، اس لیے ان کی سلامتی کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گھر بدل دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔“

رابعاً، ان خاتون کا نکاح بعد میں اُسامہ بن زیدؓ سے ہوا تھا، اور محمد بن اُسامہ کہتے ہیں کہ جب کبھی فاطمہؓ اِس حدیث کا ذکر کرتیں، میرے والد، جو چیز بھی ان کے ہاتھ لگتی، اُٹھا کر ان پر دے مارتے تھے۔ (جصّاص) ظاہر ہے کہ حضرت اُسامہؓ کے علم میں سنّت اس کے خلاف نہ ہوتی تو وہ اِس حدیث کی روایت پر اتنی ناراضی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

۱۷- یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ مطلّقہ، خواہ رَجعیّہ ہو یا مَبْتُوتہ، اگر حاملہ ہو تو وضعِ حمل تک اس کی سکونت اور اس کے نَفقے کا ذمّہ دار شوہر ہے۔ البتہ اختلاف اُس صورت میں ہے جب کہ حاملہ کا شوہر مر گیا ہو، قطعِ نظر اِس سے کہ وہ طلاق دینے کے بعد مرا ہو، یا اس نے کوئی طلاق نہ دی ہو اور عورت زمانۂ حمل میں بیوہ ہو گئی ہو۔ اس معاملے میں فقہا کے مسالک یہ ہیں:

(۱) حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے کہ شوہر کے مجموعی ترکے میں اُس کا نَفقہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، قاضی شُرَیح، ابو العالیہ، شَعْبی اور ابراہیم نَخَعی سے بھی یہی قول منقول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ایک قول اِسی کی تائید میں ہے۔ (آلُوسی، جصّاص)

(۲) ابنِ جَریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ اُس پر اُس کے پیٹ کے بچے کے حصّے میں سے خرچ کیا جائے اگر میّت نے کوئی میراث چھوڑی ہو۔ اور اگر میراث نہ چھوڑی ہو تو میّت کے وارثوں کو اُس پر خرچ کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (البقرہ، آیت ۲۳۳)

(۳) حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن المُسَیّب اور حضرت عطاء بن ابی رَباح کہتے ہیں کہ مُتوفّٰی شوہر کے مال میں اس کے لیے کوئی نَفقہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک تیسرا قول یہی منقول ہوا ہے۔ (جصّاص) اِس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کے ترکے میں سے اس کو جو میراث کا حصّہ ملا ہو اس سے وہ اپنا خرچ پُورا کر سکتی ہے، لیکن شوہر کے مجموعی ترکے پر اس کا نفقہ عائد نہیں ہوتا جس کا

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ
وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ؕ﴿۶﴾ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ
سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ
اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿۷﴾ ع

پھر اگر وہ تمھارے لیے (بچّے کو) دُودھ پلائیں تو ان کی اُجرت انھیں دو، اور بھلے طریقے سے (اُجرت کا معاملہ) باہمی گفت وشنید سے طے کرلو۔[18] لیکن اگر تم نے (اُجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچّے کو کوئی اور عورت دُودھ پلالے گی۔[19] خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق نفقہ دے، اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اُسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اُس سے زیادہ کا وہ اُسے مکلّف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔ ع

بار تمام وارثوں پر پڑے۔

(۴) ابنِ ابی لیلٰی کہتے ہیں کہ اُس کا نفقہ مُتوفّٰی شوہر کے مال میں اُسی طرح واجب ہے جس طرح اُس کے مال میں کسی کا قرض واجب ہوتا ہے۔ (جصّاص) یعنی مجموعی ترکے میں سے جس طرح قرض ادا کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کا نفقہ بھی ادا کیا جائے۔

(۵) امام ابوحنیفہؒ، امام ابویُوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زُفرؒ کہتے ہیں کہ میّت کے مال میں اس کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقے کا۔ کیونکہ موت کے بعد میّت کی کوئی مِلکیّت ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد تو وہ وارثوں کا مال ہے۔ اُن کے مال میں حاملہ بیوہ کا نفقہ کیسے واجب ہوسکتا ہے؟ (ہدایہ، جصّاص) یہی مسلک امام احمدؒ بن حنبل کا ہے۔ (الانصاف)

(۶) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے، البتہ اسے سکونت کا حق ہے۔ (مُغنی المحتاج) ان کا اِستِدلال حضرت ابوسعید خُدریؓ کی بہن فُرَیعَہ بنتِ مالک کے اِس واقعے سے ہے کہ ان کے شوہر جب قتل کر دیے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ شوہر کے گھر ہی میں عدّت گزاریں۔ (ابوداؤد، نَسائی، ترمِذی) مزید برآں ان کا اِستِدلال دارقُطنی کی اِس روایت سے ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لیس للحامل المتوفی عنها زوجها نفقة۔

Maktaba Tul Ishaat.com

’’بیوہ حاملہ کے لیے کوئی نَفقہ نہیں ہے۔‘‘ یہی مسلک امام مالکؒ کا بھی ہے۔ (حاشیۃ الدُّسوقی)

۱۸ – اِس ارشاد سے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ عورت اپنے دُودھ کی مالک ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ اس کی اُجرت لینے کی مجاز نہیں ہوسکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب وہ وضعِ حمل ہوتے ہی اپنے سابق شوہر کے نکاح سے باہر ہوگئی تو بچے کو دُودھ پلانے پر وہ قانوناً مجبور نہیں ہے، بلکہ باپ اگر اُس سے دُودھ پلوانا چاہے اور وہ بھی راضی ہو تو وہ اُسے دودھ پلائے گی اور اس پر اُجرت لینے کی حق دار ہوگی۔ تیسرے یہ کہ باپ بھی قانوناً مجبور نہیں ہے کہ بچّے کی ماں ہی سے اُس کو دُودھ پلوائے۔ چوتھے یہ کہ بچے کا نَفقہ باپ پر عائد ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ بچے کو دُودھ پلانے کی اوّلین حق دار ماں ہے اور دوسری عورت سے رضاعت کا کام اُسی صورت میں لیا جاسکتا ہے جب کہ ماں خود اس پر راضی نہ ہو، یا اس کی ایسی اُجرت مانگے جس کا ادا کرنا باپ کی مَقدِرَت میں نہ ہو۔ اسی سے چھٹا قاعدہ یہ نکلتا ہے کہ اگر دوسری عورت کو بھی وہی اُجرت دینی پڑے جو بچّے کی ماں مانگتی ہو تو ماں کا حق اَولیٰ ہے۔

فقہا کی آرا اس مسئلے میں یہ ہیں:

ضَحّاک کہتے ہیں کہ ’’بچے کی ماں اسے دُودھ پلانے کی زیادہ حق دار ہے۔ مگر اسے اختیار ہے کہ چاہے دُودھ پلائے یا نہ پلائے۔ البتہ اگر بچہ دوسری عورت کی چھاتی قبول نہ کرے تو ماں کو اسے دُودھ پلانے پر مجبُور کیا جائے گا۔‘‘ اسی سے مِلتی جُلتی رائے قَتادہ اور ابراہیم نَخَعی اور سُفیان ثَوری کی ہے۔ ابراہیم نَخَعی یہ بھی کہتے ہیں کہ ’’اگر دوسری عورت رضاعت کے لیے نہ مل رہی ہو تب بھی ماں کو اسے دُودھ پلانے پر مجبُور کیا جائے گا۔‘‘ (ابنِ جَرِیر)

ہِدایہ میں ہے: ’’اگر ماں باپ کی علیحدگی کے وقت چھوٹا بچہ دُودھ پیتا ہو تو ماں پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہی اسے دُودھ پلائے۔ البتہ اگر دوسری عورت نہ ملتی ہو تو وہ رضاعت پر مجبُور کی جائے گی۔ اور اگر باپ یہ کہے کہ میں بچّے کی ماں کو اُجرت دے کر اس سے دُودھ پلوانے کے بجائے دوسری عورت سے اُجرت پر یہ کام لوں گا، اور ماں دوسری عورت ہی کے برابر اُجرت مانگ رہی ہو، یا بلا اُجرت ہی اِس خدمت کے لیے راضی ہو، تو اِس صورت میں ماں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔ اور اگر بچّے کی ماں زیادہ اُجرت مانگ رہی ہو تو باپ کو اس پر مجبُور نہیں کیا جائے گا۔‘‘

۱۹ – اس میں ماں اور باپ، دونوں کے لیے عتاب کا ایک پہلُو ہے۔ اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی تلخیوں کی بنا پر، جن کے باعث بالآخر طلاق تک نوبت پہنچی تھی، دونوں بھلے طریقے سے آپس میں بچے کی رضاعت کا معاملہ طے نہ کریں تو یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ عورت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تُو زیادہ اُجرت مانگ کر مرد کو تنگ کرنے کی کوشش کرے گی تو بچّے کی پرورش کچھ تیرے ہی اُوپر موقوف نہیں ہے، کوئی دوسری عورت اسے دُودھ پلا لے گی۔ اور مرد کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تو ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اسے تنگ کرنا چاہے گا تو یہ بھلے آدمیوں کا سا کام نہ ہوگا۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ بَقَرہ، آیت ۲۳۳ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا
شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ
عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۛۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ
ذِكْرًا ۙ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ

کتنی[20] ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسُولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بُری طرح سزا دی۔ انھوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور اُن کا انجامِ کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے، اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو اے صاحبِ عقل لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمھاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے، ایک ایسا رسُول[21] جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سُناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔[22]

۲۰ - اب مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور اس کی کتاب کے ذریعے سے جو احکام اُن کو دیے گئے ہیں، اُن کی اگر وہ نافرمانی کریں گے تو دنیا اور آخرت میں کس انجام سے دوچار ہوں گے، اور اگر اطاعت کی راہ اختیار کریں گے تو کیا جزا پائیں گے۔

۲۱ - مفسّرین میں سے بعض نے نصیحت سے مراد قرآن لیا ہے، اور رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نصیحت سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، یعنی آپ کی ذات ہمہ تن نصیحت تھی۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ پہلی تفسیر کی رُو سے فقرہ یوں بنانا پڑے گا کہ ''ہم نے تمھاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے اور ایک ایسا رسول بھیجا ہے۔'' قرآن کی عبارت میں اس تبدیلی کی آخر ضرورت کیا ہے جب کہ اس کے بغیر ہی عبارت نہ صرف پوری طرح بامعنیٰ ہے بلکہ زیادہ پُر معنیٰ بھی ہے۔

۲۲ - یعنی جہالت کی تاریکیوں سے علم کی روشنی میں نکال لائے۔ اِس ارشاد کی پُوری اہمیّت اُس وقت

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ
خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ

جوکوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اللہ اُسے ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے۔

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی اُنھی کے مانند۔[۲۳] ان کے درمیان حکم

سمجھ میں آتی ہے جب انسان طلاق، عدّت اور نفقات کے متعلق دنیا کے دوسرے قدیم اور جدید عائلی قوانین کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بار بار کی تبدیلیوں اور نت نئی قانون سازیوں کے باوجود آج تک کسی قوم کو ایسا معقول اور فطری اور معاشرے کے لیے مفید قانون میسّر نہیں آسکا ہے جیسا اِس کتاب اور اِس کے لانے والے رسولؐ نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے ہم کو دیا تھا اور جس پر کسی نظرِ ثانی کی ضرورت نہ کبھی پیش آئی نہ پیش آسکتی ہے۔ یہاں اِس تقابلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ اس کا محض ایک مختصر سا نمونہ ہم نے اپنی کتاب ''حُقوق الزّوجین'' کے آخری حصّے میں درج کیا ہے۔ لیکن جو اصحابِ علم چاہیں، وہ دنیا کے مذہبی اور لادینی قوانین سے قرآن وسنّت کے اِس قانون کا مقابلہ کر کے خود دیکھ لیں۔

۲۳ - ''اُنھی کے مانند'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اُتنی ہی زمینیں بھی بنائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدّد آسمان اُس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدّد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور ''زمین کی قسم سے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین جس پر انسان رہتے ہیں، اپنی موجودات کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے، اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہیں جو اپنی اپنی آبادیوں کے لیے فرش اور گہوارہ ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو قرآن میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ جان دار مخلوقات صرف زمین ہی پر نہیں ہیں، عالَم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشّوریٰ، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰) بالفاظِ دیگر، آسمان میں یہ جو بے شمار تارے اور سیّارے نظر آتے ہیں، یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ زمین کی طرح ان میں بھی بکثرت ایسے ہیں جن میں دنیائیں آباد ہیں۔

قدیم مفسّرین میں سے صرف ابنِ عباسؓ ایک ایسے مفسّر ہیں جنھوں نے اُس دَور میں اِس حقیقت کو بیان کیا تھا

بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠﴿۱۲﴾

ع ۲ ۱۸

نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جارہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ ع

جب آدمی اِس کا تصوّر تک کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ کائنات میں اس زمین کے سوا کہیں اور بھی ذی عقل مخلوق بستی ہے۔ آج اِس زمانے کے سائنس دانوں تک کو اِس کے امرِ واقعہ ہونے میں شک ہے، کجا کہ ۱۴ سو برس پہلے کے لوگ اِسے بآسانی باور کر سکتے۔ اسی لیے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما عام لوگوں کے سامنے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں اس سے لوگوں کے ایمان متزلزل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ مجاہد کہتے ہیں کہ اُن سے جب اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: "اگر میں اس کی تفسیر تم لوگوں سے بیان کروں تو تم کافر ہو جاؤ گے اور تمھارا کفر یہ ہوگا کہ اسے جھٹلاؤ گے۔" قریب قریب یہی بات سعید بن جُبَیر سے بھی منقول ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا: "کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ اگر میں تمھیں اس کا مطلب بتاؤں تو تم کافر نہ ہو جاؤ گے۔" (ابنِ جَرِیر، عَبد بن حُمَید) تاہم ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم اور حاکم نے، اور شُعَب الایمان اور کتاب الاسماء والصفات میں بَیہقی نے ابوالضُّحٰی کے واسطے سے باختلافِ الفاظ ابنِ عباسؓ کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ فی کلِّ ارضٍ نبیٌّ کنبیّکم وادمُ کاٰدمَ ونوحٌ کنوحٍ وابراھیمُ کابراھیمَ وعیسٰی کعیسٰی۔ "اُن میں سے ہر زمین میں نبی ہے تمھارے نبیؐ جیسا، اور آدم ہے تمھارے آدمؑ جیسا، اور نوح ہے تمھارے نوحؑ جیسا، اور ابراہیم ہے تمھارے ابراہیمؑ جیسا، اور عیسٰی ہے تمھارے عیسٰیؑ جیسا۔" اس رِوایت کو ابنِ حَجرؒ نے فتح الباری میں اور ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے۔ اور امام ذَہبیؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے البتہ میرے علم میں ابوالضُّحٰی کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا ہے، اس لیے یہ بالکل شاذ روایت ہے۔ بعض دوسرے علما نے اسے کِذب اور موضوع قرار دیا ہے اور مُلّا علی قاریؒ نے اس کو موضوعاتِ کبیر (ص ۱۹) میں موضوع کہتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ ابنِ عباسؓ ہی کی روایت ہے تب بھی اسرائیلیات میں سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے رد کرنے کی اصل وجہ لوگوں کا اِسے بعید از عقل و فہم سمجھنا ہے، ورنہ بجائے خود اس میں کوئی بات بھی خلافِ عقل نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ آلُوسی اپنی تفسیر میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کو صحیح ماننے میں نہ عقلاً کوئی چیز مانع ہے نہ شرعاً۔ مراد یہ ہے کہ ہر زمین میں ایک مخلوق ہے جو ایک اصل کی طرف اُسی طرح راجع ہوتی ہے جس طرح بنی آدم ہماری زمین میں آدم علیہ السلام کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور ہر زمین میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اپنے ہاں دوسروں کی بہ نسبت اُسی طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

ممتاز ہیں جس طرح ہمارے ہاں نوح اور ابراہیم علیہما السّلام ممتاز ہیں۔'' آگے چل کر علّامہ موصوف کہتے ہیں: ''ممکن ہے کہ زمینیں سات سے زیادہ ہوں اور اسی طرح آسمان بھی صرف سات ہی نہ ہوں۔ سات کے عدد پر، جو عددِ تام ہے، اکتفا کرنا اِس بات کو مُستلزم نہیں کہ اس سے زائد کی نفی ہو۔'' پھر بعض احادیث میں ایک ایک آسمان کی درمیانی مَسافت جو پانچ پانچ سو برس بیان کی گئی ہے اس کے متعلق علّامہ موصوف کہتے ہیں کہ هو من باب التقریب لِلْافْهَام، یعنی اس سے مراد ٹھیک ٹھیک مَسافت کی پیمایش بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود بات کو اِس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ لوگوں کی سمجھ سے قریب تر ہو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حال میں امریکا کے رانڈ کارپوریشن (Rand Corporation) نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں (galaxy) میں واقع ہے، صرف اُسی کے اندر تقریباً ۶۰ کروڑ ایسے سیّارے پائے جاتے ہیں جن کے طبعی حالات ہماری زمین سے بہت کچھ ملتے جُلتے ہیں اور امکان ہے کہ ان کے اندر بھی جان دار مخلوق آباد ہو۔ (اکانومسٹ، لندن، مورخہ ۲۶ جولائی ۶۹ء)

فہرست موضوعات

الف

ابراہیم، علیہ السلام

-- ان کے ہاں فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا اور بیٹے کی بشارت دینا ۱۴۳-۱۴۴

-- ان کو سو سال کی عمر میں بیٹا عطا کیا گیا ۱۴۵

-- ان جیسی بے نظیر اولاد اللہ نے کسی کو نہ دی جس میں کئی پشتوں تک نبوت کا سلسلہ چلتا رہا ۱۴۵

-- ان کی اولاد کو کتاب اور نبوت سے نوازا گیا ۳۲۳

-- ان کی اولاد میں حق پرستوں کے ساتھ بہت سے فاسقین بھی پیدا ہوئے ۳۲۳

-- ان کی اور ان کے ساتھیوں کی زندگی مسلمانوں کے لیے بہترین اسوہ ہے ۴۲۸-۴۳۱

-- انھوں نے صاف صاف اپنی قوم کے معبودوں سے بیزاری کا اظہار کیا اور اپنی کافر قوم سے بالکل قطع تعلق کر لیا ۴۲۸

-- ان کا اپنے کافر باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا اور پھر اسے ترک کر دینا ۴۲۹-۴۳۰

-- انھوں نے اللہ کے بھروسے پر پوری دنیا کی مخالفت کی پروا نہ کی ۴۳۰

-- انھوں نے وفا کا حق ادا کر دیا ۲۱۳

-- انھوں نے کفار کے مقابلے میں اللہ سے مدد کی درخواست کی ۴۳۰

-- معراج کے موقع پر ان کا حضورؐ اکرم کو نظر آنا ۱۶۲

-- صحف ابراہیمؑ کے حوالے ۲۱۳-۲۲۰

-- حضرت ابراہیمؑ اور اصحاب ابراہیمؑ کی دعا ۴۲۹-۴۳۰

ابلیس

-- دیکھو ”شیطان“

ابوبکر صدیقؓ

-- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کمال درجہ اعتماد ۳۹

اجتہاد

-- جن معاملات میں اللہ کا حکم نہ آیا ہوتا ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے تھے ۳۸۷-۳۸۸

-- نیک نیتی پر مبنی اجتہاد میں اہل علم کی رائیں مختلف بھی ہوں تب بھی اللہ کی شریعت میں وہ سب حق پر ہیں ۳۸۸

-- کوئی اجتہاد قرآن وسنت سے آزاد نہیں ہو سکتا ۷۰-۷۱

Maktaba Tul Ishaat.com

اجر

— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۳۱-۴۶-۴۹-۵۳-۶۵-۷۲-۳۰۶-۳۰۹-۳۱۵-۳۲۵-۵۴۴-۵۷۳

— اللہ کے ہاں فرماں بردار بندوں کے اجر میں کبھی کمی نہیں کی جاتی ۱۰۱

اجماع

— کتاب و سنت کے خلاف یا اس سے آزاد کسی اجماع کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے ۷۱

احسان

— احسان (نیکی) کا بدلہ احسان ہی ہے ۲۶۹

احکام القرآن

— ۱۱-۲۴-۲۵-۳۰-۳۱-۴۸-۵۴-۶۲-۷۰-۷۲-۷۳-۷۶-۷۷-۷۸-۸۳-۸۴-۸۵-۸۷-۱۲۵-۱۲۸-۱۳۸-۱۳۹-۱۵۳-۱۵۴-۱۸۴-۲۱۴-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۳-۲۵۱-۲۹۰-۲۹۶-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۵-۳۳۴-۳۳۹-۳۴۱-۳۴۲ تا ۳۴۵-۳۶۰-۳۶۱ تا ۳۶۳-۳۸۸ تا ۳۹۶-۴۰۹-۴۱۰-۴۳۲-۴۳۴-۴۳۷-۴۴۳-۴۴۵-۴۵۰-۴۵۴-۴۵۶-۴۷۶-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۶-۴۹۲ تا ۴۹۷-۵۲۱-۵۲۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۶-۵۴۷-۵۵۳-۵۶۳-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۸ تا ۵۷۰-۵۷۳-۵۷۷-۵۷۸

— یہ اس خدا کے احکام ہیں، جو بندوں کے معاملات میں علم اور حکمت کی بنا پر فیصلہ کرتا ہے ۴۳۷-۴۴۳

— احکام الٰہی کی پابندی ہی انسان کے لیے بہتر ہے ۲۶

— اسلامی ریاست اور اسلامی نظم جماعت سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست''، ''اسلامی نظم جماعت'' اور ''اسلامی قومیت''۔ قانونی احکام کے لیے دیکھو ''قانون اسلام''۔ جنگ سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''جنگ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ''۔ اخلاق سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'' اور ''قرآن، اس کا فلسفہ اخلاق''۔ دعوت و تبلیغ سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''حکمت تبلیغ'' اور ''دعوت حق''۔ تمدن و معاشرت سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرت'' اور ''قانون اسلام، قانون معاشرت''۔ معاشی معاملات سے متعلق احکام کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، قانون معیشت''۔

آخرت

— اس کے برحق ہونے کی دلائل ۱۱۰ تا ۱۱۴-۱۴۳-۱۴۴-۲۷۵-۲۸۴ تا ۲۹۰-۵۲۹-۵۳۱

— وجوب آخرت پر تاریخی استدلال ۱۱۴-۱۱۵-۱۲۴-۱۴۴-۱۵۰-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶

— آخرت کے حق میں عقلی استدلال ۱۱۳-۱۱۴-۱۱۶-۱۳۲ تا ۱۳۵-۱۴۰ تا ۱۴۳-۱۵۱-۱۶۲ تا ۱۶۶-۴۰۹-۴۱۰-۵۳۲-۵۳۵-۵۳۶

— آخرت پر اخلاقی استدلال ۱۱۵-۱۴۴

— آخرت پہ آفاقی استدلال ۱۱۰ تا ۱۱۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۳۳ تا ۱۳۵-۱۵۰ تا ۱۵۲-۱۶۵-۲۲۸

— اللہ تعالیٰ کے لیے آخرت برپا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ۵۳۴-۵۳۶

— آخرت کا برپا ہونا کیوں ضروری ہے؟ ۱۳۳-

۱۳۴-۲۱۱-۲۱۹-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۵
— آخرت کا انکار کرنے سے اس کا آنا رک نہ جائے گا ۱۱۶
— قرآن میں آخرت کے برحق ہونے پر مختلف اشیاء کی قسمیں کس مناسبت سے کھائی گئی ہیں ۱۳۲-۱۳۳-۱۶۲تا۱۶۶-۵۳۴-۵۳۵
— آخرت ضرور واقع ہوگی اور کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں ہے ۱۶۳
— آخرت ایک بنیادی مسئلہ ہے جس کے متعلق محض قیاس وگمان کی بنا پر کوئی عقیدہ قائم کر لینا انسان کے لیے تباہ کن ہے ۱۳۶
— انسان اس مسئلے پر محض قیاس کی بنا پر کبھی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا کیونکہ اس مسئلے کا کوئی پہلو بھی انسان کے محسوسات میں شامل نہیں ہے ۱۳۶
— اس ماورائے حس وادراک مسئلے پر رائے قائم کرنے کے لیے قرآن کیا طریقہ بتاتا ہے ۱۳۶
— آخرت کے متعلق منکرین کے نظریات اور ان کا ابطال ۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۲۷-۱۲۸-۱۳۰-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۲۷۴-۲۷۶-۲۸۳-۲۸۴-۵۳۴تا۵۳۶
— منکرین آخرت کے دعوے باہم متضاد ہیں اور پھر ان کے استدلال کی نہ کوئی عقلی بنیاد ہے نہ علمی ۱۳۰-۱۳۵-۵۳۴
— منکرین آخرت کے نظریات سے وہی شخص گمراہ ہو سکتا ہے جو حق سے برگشتہ ہو گیا ہو ۱۳۵
— منکرین آخرت کی سمجھ میں عقیدہ آخرت نہ آنے کی اصل علت کیا ہے؟ ۱۰۹-۱۱۰-۱۱۷-۱۱۸
— منکرین آخرت صرف دنیا کی زندگی کے طالب ہوتے ہیں ۲۱۰
— آخرت کو ماننے یا نہ ماننے میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ونقصان مضمر ہے ۱۱۶
— منکرین آخرت غفلت وگمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ۱۱۸-۲۰۹
— منکرین آخرت اللہ کی صفات حسنہ کے منکر ہیں ۲۶۹-۲۷۰
— آخرت میں اس امرِ حق کو سب دیکھ رہے ہوں گے جس کا اب انکار کیا جاتا ہے ۱۲۷
— منکرین آخرت کو دھکے مار مار کر جہنم میں داخل کیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے، اب بتاؤ یہ جادو ہے یا تمھیں سوجھ نہیں رہا ہے ۱۶۶-۱۶۷
— آخرت کے متعلق تمام قیاسی عقیدے دراصل افیون ہیں جس کی پینک میں لوگ مدہوش پڑے ہیں ۱۳۶-۱۳۷
— منکرین آخرت بجائے اس کے کہ اپنی جہالت و گمراہی پر روئیں، آخرت کی صداقت کو ہنسی مذاق میں ٹالنا چاہتے ہیں ۲۲۳-۲۲۴
— آخرت کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے انجام میں فرق ۱۶۰
— منکرین آخرت کے لیے قیامت کا دن بڑا کٹھن ہوگا ۲۳۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— منکرین آخرت کو مرتے ہی آخرت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی ۱۱۷-۱۱۸-۱۳۶-۱۳۷

— حق سے پھرے ہوئے لوگوں کے سوا آخرت سے کوئی انکار نہیں کرتا ۱۳۵

— انکار آخرت، گناہ عظیم ہے ۲۸۳

— منکر آخرت قوموں کا انجام ۱۱۴- ۱۱۵- ۲۲۱- ۲۲۲-۲۲۷-۲۳۳ تا ۲۳۹

— منکر آخرت افراد کا انجام ۱۶۶-۲۸۴

— آخرت کے آنے کی تاریخ دریافت کرنے والوں کو جواب ۱۳۵-۱۳۷-۱۵۷

— آخرت میں پوری نوع انسانی تین گروہوں میں بانٹ دی جائے گی: سابقین، دائیں بازو والے اور بائیں بازو والے ۲۷۷ تا ۲۹۵

— سابقین کے لیے نعمتیں ۲۷۸ تا ۲۸۰- ۲۹۵

— دائیں بازو والوں کے لیے نعمتیں ۲۸۱-۲۸۲- ۲۹۵

— بائیں بازو والوں کا انجام بد ۲۸۲ تا ۲۸۴- ۲۹۵-۲۹۶

— آخرت میں عدل کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے مجرموں کو سزا دی جائے گی ۱۱۷-۱۶۷

— وہاں لوگوں کے اعمال کی پوری جانچ پڑتال ہوگی ۲۱۹-۲۲۰

— وہاں لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمال انھیں بتائے جائیں گے ۳۵۶

— وہاں انسان کے اسی دنیوی جسم میں جان ڈالی جائے گی ۱۱۰

— وہاں کے برے انجام سے نہ مال بچا سکتا ہے نہ اولاد اور نہ باپ دادا کا عمل ۱۶۸-۱۶۹-۱۸۳- ۳۶۵

— وہاں جھوٹی قسموں سے کام نہ چلے گا ۳۶۵

— وہاں کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے ۴۸

— وہاں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ کی خوشنودی اور مغفرت بھی ۳۱۷-۳۱۸

— وہاں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی ۵۳۶-۵۳۸-۵۳۹

— آخرت کے لیے تیاری کرنے کا حکم ۴۰۹

— خوف آخرت جنت کے مستحق افراد کی صفت ہے ۱۷۱-۲۶۶

— آخرت کی نعمتیں ۱۲۲- ۱۳۸- ۱۶۷ تا ۱۷۱- ۲۴۲- ۲۶۵ تا ۲۷۲- ۲۷۷ تا ۲۸۲- ۲۹۵- ۲۹۶- ۳۱۰- ۴۷۸- ۴۷۹- ۵۳۸- ۵۴۰- ۵۴۱-۵۸۰-۵۸۱

— آخرت میں کفار و منافقین اور مجرمین کے ساتھ کیا سلوک ہوگا ۱۱۹-۱۲۱-۱۳۵-۱۳۶-۱۶۶- ۱۶۷- ۱۸۳- ۲۴۰- ۲۶۴- ۲۶۵- ۲۸۲- ۲۸۳- ۲۸۴- ۳۱۱ تا ۳۱۳- ۵۲۰- ۵۳۸- ۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۷۹

— آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں لوگوں کو چھوٹے چھوٹے عذابوں کے ذریعے سے متنبہ کیا جاتا ہے ۱۸۳-۱۸۴

— آخرت کی جزا و سزا سے انسان بچ کر بھاگ نہیں سکتا ۲۶۳-۲۶۴

— کفار آخرت سے بالکل مایوس ہیں ۴۵۰

— وہاں اہل ایمان کو نور نصیب ہوگا ۲۹۹- ۳۱۰-

۳۱۱-۳۱۷-۳۳۳
— وہاں مومن کی مغفرت ہوگی اور منکر کو عذاب ملے گا ۳۱۷-۳۱۸-۵۳۸
— وہاں مومنین کو عزت اور کفار کو ذلت ملے گی ۲۷۷
— وہاں مجرم اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے ۲۶۴-۲۶۵
— وہاں ایک فرشتہ ہر مجرم کو ہانک کر لانے والا ہوگا اور ایک اس پر گواہی دینے والا ۱۱۸
— وہاں شیطان اور اس کے پیروؤں کے درمیان جھگڑا ۱۱۹-۱۲۰
— اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یوم آخرت سے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے ۱۲۰
— اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یوم آخرت سے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے ۱۲۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حشر''، ''زندگی بعد موت''، ''قیامت''، ''جزا و سزا''، ''جنت''، ''جہنم'' اور ''عذاب'')

اخلاقی تعلیمات

— اللہ کسی مغرور انسان کو پسند نہیں کرتا ۳۲۰
— اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۸۷-۴۳۲-۴۳۳
— اللہ کو دو رنگی اور منافقت سخت ناپسند ہے ۴۵۴ تا ۴۵۶-۵۲۰
— خفیہ سرگوشیوں کی ممانعت ۳۳۷-۳۵۸-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲
— اللہ ظالموں اور فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا ۴۵۷-۴۷۶-۴۸۹-۵۲۰
— آداب مجلس کی تعلیم ۷۰ تا ۷۳-۳۳۷-۳۳۸-۳۶۰ تا ۳۶۲
— مسلمان بد خلق اور بخیل نہیں ہو سکتا ۳۱-۳۹۷
— مسلمانوں کو کفار سے دوستی نہ رکھنی چاہیے ۳۶۶-۴۲۱
— غیر معاند کفار سے دوستانہ تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں ۴۳۳
— عہد شکنی کی ممانعت ۴۹
— لوگوں کے راز ٹٹولنے کی ممانعت ۸۷ تا ۹۰
— مسلمانوں کے دو گروہوں میں جھگڑا ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ۷۶ تا ۸۷
— مسلمانوں کے باہمی تعلقات عدل و انصاف پر مبنی ہونے چاہییں ۷۸-۸۳-۸۴
— مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑانا چاہیے ۸۴-۸۵
— آپس میں ایک دوسرے پر طعن کرنا اور ایک دوسرے کے برے نام رکھنا منع ہے ۸۵-۸۶
— بہت گمان کرنے کی ممانعت ۸۷-۸۸
— غیبت کی ممانعت ۸۷-۹۰ تا ۹۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''غیبت'')
— کسی زندہ یا مردہ مسلمان کے لیے دل میں بغض نہ رکھنا چاہیے ۴۰۳-۴۰۴
— اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنے اور فخر جتانے کی ممانعت ۳۲۰
— ٹھیک ٹھیک تولنے اور ڈنڈی نہ مارنے کا حکم ۲۵۱
— کسی مومن بھائی کی غلطی پر گرفت کرنی ہو تو

Maktaba Tul Ishaat.com

شائستگی کے ساتھ کرنی چاہیے ۴۰۴
— جو حق بات کہی جائے اس پر عمل بھی کرنا چاہیے ۴۵۴-۴۵۵
— اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ تقویٰ پر قائم رہیں خواہ مخالف کیسا ہی جاہلانہ رویہ اختیار کرلے ۶۱

اذان (دیکھو ''نماز'')

ارتداد
— ارتداد کی صورت میں عائلی قانون کے مسائل ۴۴۱ تا ۴۴۴۔ (تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق'')

آزمائش
— اللہ ہر شخص کی آزمائش کرتا ہے ۲۹
— اللہ کس طرح آزمائش میں ڈال کر مومن کو منافق سے ممیز کرتا ہے ۱۸-۲۶-۲۷-۲۹
— اللہ مخلص اہل ایمان کو ان کی مقدرت سے زیادہ سخت آزمائش میں نہیں ڈالتا ۳۱-۵۷۸
— اللہ کس طرح مومن کے ایمان کی آزمائش کرتا ہے ۴۶-۵۲ تا ۵۴-۳۲۱ تا ۳۲۳-۵۴۴
— قوم ثمود کے لیے حضرت صالحؑ کی اونٹنی ایک آزمائش تھی ۲۳۷

اسحاق، علیہ السلام
— ان کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ذی علم بیٹے کے پیدا ہونے کی خوش خبری دے دی تھی ۱۴۴-۱۴۵

اسلام
— اسلام اور مسلم کے معنی ۱۰۰
— اسلام اور ایمان کا فرق ۹۹ تا ۱۰۳-۱۴۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دعوت دینے والے پہلے نبی نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء نے بھی اسلام ہی کی تعلیم دی تھی ۱۴۷-۴۷۶
— تمام انبیاء کی امتیں مسلمان ہی تھیں ۱۴۷
— کسی قوم پر اللہ کی نعمت کی تکمیل یہ ہے کہ وہ پوری طرح اسلام پر عمل کرنے کے قابل ہوجائے ۴۳-۴۴
— اسلام اپنی تعلیمات و احکام کو صرف بیان ہی کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کو عملاً نافذ کیا جائے ۹۸-۳۲۱-۳۲۲
— اسلام کا مقصود عدل کا قیام ہے ۱۵۷
— اسلام مساوات بین الناس کی تعلیم دیتا ہے ۷۸-۸۳-۹۵
— وہ رنگ ونسل و وطن کے امتیازات مٹا کر تمام نوع انسانی کی ایک عالم گیر برادری اخلاق و دینی بنیادوں پر قائم کرتا ہے ۸۳-۹۵ تا ۹۹-۴۲۸-۴۲۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی قومیت'')
— وہ خاندان اور رشتہ داروں کے تمام تعلقات میں محبت کو حرام قرار دیتا ہے اگر ایک رشتہ دار مومن ہو اور دوسرا کافر ۳۶۶
— اسلام صلہ رحمی چاہتا ہے اور قطع رحمی کو حرام کرتا ہے ۲۷
— اسلام کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنانا چاہتا ۱۲۸

-- کوئی شخص اسلام قبول کر کے اللہ اور رسول پر کوئی احسان نہیں کرتا ۱۰۲
-- نام کے مسلمان جو اخلاص اور وفاداری سے عاری ہوں اسلام کے لیے بالکل بیکار ہیں ۲۷
-- اسلام میں رہبانیت نہیں ہے ۳۲۴ تا ۳۳۳
-- اسلام سختی کے بجائے نرمی اور آسانی پیدا کرتا ہے ۳۲۵
-- اسلام اللہ کا نور ہے، یہ پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا ۴۷۶
-- اسلام دنیا میں غالب ہو کر رہنے کے لیے آیا ہے ۶۲-۴۷۷

اسلامی ریاست

-- مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اسلامی ریاست قائم فرمائی تھی ۳۷۴-۳۷۵
-- اسلامی ریاست کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی میں عدل و انصاف قائم ہو اور ظلم و جور ختم ہو جائے ۳۲۱
-- اسلامی ریاست میں مساوات بین الناس ۷۸-۸۳-۹۵
-- اسلامی ریاست کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے چھپے ہوئے عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور انھیں سزا دے ۸۹-۹۰
-- حکومت کے فرائض کیا ہیں؟ ۸۷
-- اسلامی ریاست کو لازمی طور پر ملک کے معاشی و مالی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا ہوگا کہ دولت پر صرف مال دار طبقے ہی کی اجارہ داری نہ ہو جائے ۳۸۹-۳۹۲-۳۹۳
-- جو لوگ بھی مسلمان ہونے کی وجہ سے ستائے جائیں اور اسلامی حکومت میں پناہ لینے پر مجبور ہوں، ان کو بسانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے ۳۹۴
-- اسلام نے اولی الامر کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر لازم نہیں کی ہے ۴۴۵-۴۴۶
-- اولی الامر کی صفات (دیکھو 'اولی الامر')
-- اسلامی ریاست کے دستور میں فلاح عامہ ۱۳۹
-- دستور اسلامی میں مقام رسول ۳۹۲-۳۹۳
-- اسلامی ریاست کے لیے جائز نہیں ہے کہ تحقیق کیے بغیر محض مخبروں کی دی ہوئی خبروں کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرے ۷۴
-- اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے خدا اور رسول کے احکام کی مخالفت کرنا واجب القتل جرم ہے ۵۱۴
-- (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام: اصول قانون، دستوری قانون'')

اسلامی قومیت

-- تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں ۹۵
-- انسانوں کو قبیلوں اور گروہوں میں بانٹنے کی اصل مصلحت کیا ہے ۹۷
-- نسل اور خاندان کی حقیقت کیا ہے ۹۵ تا ۹۹
-- انسانوں کے درمیان قبیلوں اور برادریوں کا فرق فطری ہے مگر اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر تعصبات اور امتیازات قائم ہوں ۹۶
-- اسلام نے رنگ، وطن و نسل کے تعلق کو نہیں بلکہ صرف ایمان کا تعلق کو بنائے قومیت قرار دیا ہے ۴۲۸-۴۲۹

Maktaba Tul Ishaat.com

— مسلمانوں کے درمیان نسل و وطن کے تعصب کو جب عبداللہ ابن ابی (رئیس المنافقین) نے ابھارنا چاہا تو قرآن میں اس کی اس حرکت پر کیسی سخت گرفت کی گئی ۵۲۱
— ایمان کے رشتے کے مقابلے میں قریب ترین رشتہ داریاں بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ۳۶۶-۴۰۳-۴۰۴-۵۴۳
— مسلم قومیت کے افراد کا باہمی تعلق رنگ وقوم کے اختلافات سے بالاتر ہے اور دین کے دائرے سے باہر جو لوگ ہیں ان سے مسلمانوں کا تعلق قومیت کا تعلق نہیں ہے ۶۳-۷۸-۸۳-۸۴
— قرآن کے نزدیک انسانوں کے گروہ صرف دو ہیں: حزب اللہ اور حزب الشیطان ۳۶۵ تا ۳۶۷
— ان دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے بیر پڑ گیا ہے ۴۲۸-۴۲۹
— اللہ کی پارٹی والے شیطان کی پارٹی والوں سے کبھی محبت کا تعلق نہیں رکھ سکتے ۳۶۶-۴۲۱
— مسلمانوں کا متحد ہو کر راہ حق میں کام کرنا اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے ۴۵۶-۴۹۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلام'' اور ''اسلامی نظم جماعت'')

اسلامی معاشرہ

— مسلمانوں کے معاشرے کو فساد اور خرابیوں سے بچانے کے لیے اہم ہدایات ۷۶ تا ۹۴-۴۴۵-۴۴۶
— اسلامی معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا کوئی تصور نہیں ہے ۸۵
— اسلامی معاشرہ مساوات کے اعلیٰ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے ۷۸-۸۳-۹۵-۳۸۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی نظم جماعت'')

اسلامی نظم جماعت

— مسلمانوں کے باہمی تعلقات کس طرح کے ہونے چاہییں ۷۸-۸۳- ۳۹۵ تا ۳۹۷-۴۰۳-۴۰۵
— اسلامی نظام میں رسول کا مقام ۷۰ تا ۷۲
— غیر مسلموں سے تعلقات کا قانون ۴۳۲-۴۳۳
— مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی کی صورت میں کیا کرنا چاہیے ۷۶ تا ۸۳
— دو مسلمان گروہوں کے درمیان لڑائی کی صورت میں باقی افراد معاشرہ کا فرض کیا ہے ۷۶-۷۷-۵۱۲
— عدل کی حمایت میں باغیوں اور ظالموں کے خلاف لڑنا وہ فتنہ نہیں ہے جسے اسلام میں مذموم قرار دیا گیا ہے ۷۷
— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی قومیت'' اور ''اسلامی معاشرہ'')

آسمان

— اس کی تخلیق و تدبیر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ۱۱۰ تا ۱۱۴-۱۲۴-۱۵۰-۱۵۱-۲۵۱-۳۰۳-۵۸۱ تا ۵۸۳
— آسمانوں اور زمین کے درمیان اللہ ہی کا حکم جاری ہوتا ہے ۵۸۱-۵۸۲
— آسمان بمعنی پورا عالم بالا (کائنات) ۱۱۰-۱۴۳-۱۶۳ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کائنات'')
— آسمان کی حقیقت ۱۱۱-۱۳۴-۵۸۱

— آسمان کی مختلف شکلیں ۱۴۳
— آسمان میں انسانوں کی روزی ہونے کا مطلب ۱۴۳
— قیامت کے روز آسمان ڈگمگائے گا ۱۶۳-۱۶۶
— قیامت کے روز آسمان پھٹ جائے گا اور سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا ۲۶۴
اصحاب الایکہ - ۱۱۴
اصحاب الرس - ۱۱۴
اصطلاحات قرآنی (دیکھو "قرآن")
اصول تفسیر - (دیکھو "قرآن، اس کی تفسیر کے صحیح اور غلط اصول")
اصول فقہ
— شریعت نے نہ صرف یہ کہ خود بے جا قیود عائد نہیں کی ہیں بلکہ ان سے انسان کو نجات دلائی ہے ۳۳۹-۳۴۱-۴۴۵
— شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کی حکمت ۳۴۱-۳۴۲
— شریعت کے قوانین کی حکمت ۱۵-۱۶-۱۷-۳۴۱-۳۴۵-۳۶۲-۳۶۳-۳۹۸-۳۹۹-۴۲۸-۴۳۸-۵۳۳-۵۳۴-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶
— شریعت کے بہت سے احکام اگرچہ حکم کے الفاظ میں ہوتے ہیں لیکن سیاق و سباق بتاتا ہے کہ وہ نصیحت و ہدایت ہیں ۵۶۷
— فقہا کے درمیان اختلاف کی نوعیت ۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵-۴۲۷-۴۲۸-۴۴۰-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۴-۵۷۷-۵۸۰
— فقہائے اسلام نے قرآن و سنت اور اسلام کے اصول عامہ سے کس طرح اسلام کا قانون مدون کیا ہے ۱۲-۱۳-۱۵-۱۷-۱۸-۴۹-۵۰-۵۹-۶۰-۷۳-۷۴-۷۵-۸۰-۸۱-۹۲-۹۳-۱۲۳-۱۳۲-۱۴۹-۱۵۰-۲۹۳ تا ۲۹۵-۳۴۵ تا ۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۶۲-۳۸۷-۳۹۰ تا ۳۹۲-۴۰۲-۴۰۳-۴۲۷-۴۲۸-۴۳۸ تا ۴۴۳-۴۴۴-۴۵۰-۴۵۵-۴۵۶-۴۹۸ تا ۵۰۱-۵۳۸-۵۳۹-۵۵۴-۵۵۷ تا ۵۶۳-۵۶۴-۵۶۷-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۱-۵۸۲
اصول قانون - (دیکھو "قانون اسلام، اصول")
اقامت دین - (دیکھو "دعوت حق" اور "دین")
اقامت صلوٰۃ - (دیکھو "نماز")
اقسام القرآن
— قرآن میں قسمیں کس لیے کھائی گئی ہیں ۵۳۵
— حضورؐ کی رسالت کے لیے مختلف چیزوں کی قسمیں ۱۰۸-۱۰۹-۱۹۲-۱۹۳
— آخرت کے برحق ہونے پر اللہ کی قسم ۵۳۴
— آخرت کے برحق ہونے پر مختلف چیزوں کی قسمیں ۱۳۲-۱۳۳-۱۴۳-۱۶۲ تا ۱۶۶
— قرآن کے برحق و بلند پایہ ہونے پر تاروں کے مواقع کی قسم ۲۹۰-۲۹۱
آلاء
— عربی زبان و ادب میں اس کے مختلف معانی

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۵۳-۲۵۵

اللہ

— اس کی ہستی کے دلائل وہی ہیں جو توحید کے دلائل ہیں (دیکھو 'توحید')
— اس کی صفات کا جامع ترین بیان ۴۱۱ تا ۴۱۵
— اس کے لیے بہترین نام ہیں ۴۱۵-۴۱۷
— اس کے ننانوے نام حدیث میں بیان کیے گئے ہیں ۴۱۷
— رب العالمین-۲۹۴-۴۰۸
— رب عظیم-۲۹۰-۲۹۶
— خیر الرازقین-۵۰۲
— ذوالقوۃ-۱۵۶
— سلام-۴۱۴
— مومن-۴۱۴
— مہیمن-۴۱۴
— ملک-۴۱۲-۴۸۵-۵۲۷
— قدوس-۴۱۲-۴۱۳-۴۸۵
— جبار-۴۱۴
— متکبر-۴۱۴-۴۱۵
— باری-۴۱۵
— مصور-۴۱۵
— مقتدر-۲۳۹-۲۴۱
— ملیک-۲۴۲
— البر-۱۷۱
— رازق-۱۵۵-۵۰۲
— خالق-۴۱۵-۵۲۷
— قوی-۳۲۲-۳۶۶
— خبیر ۵۰-۳۰۹-۳۴۴-۳۶۲-۳۶۳-۴۰۹-۵۲۲-۵۳۶
— غنی ۳۱-۳۲۱-۴۳۱-۵۳۳
— علیم ۴۵-۶۱-۷۰-۷۵-۱۰۲-۱۴۵-۳۰۳-۳۰۴-۳۵۸-۴۴۳-۵۲۹-۵۴۱-۵۸۱
— حکیم ۴۵-۴۸-۵۶-۷۵-۱۴۵-۳۰۱-۳۸۱-۴۱۵-۴۳۰-۴۴۳-۴۵۴-۴۸۵-۴۸۸-۵۴۷
— عزیز ۴۸-۵۶-۲۳۹-۳۰۱-۳۲۲-۳۶۶-۳۸۱-۴۱۴-۴۱۵-۴۳۰-۴۵۴-۴۸۵-۴۸۸-۵۴۷
— عفو-۳۴۱
— غفور ۵۲-۷۲-۱۰۱-۳۳۴-۳۴۱-۳۶۳-۴۳۱-۴۵۰-۵۴۳
— رحیم ۵۲-۷۳-۹۵-۱۰۱-۱۷۱-۳۰۷-۳۳۴-۳۶۳-۴۰۳-۴۱۲-۴۳۱-۴۵۰-۵۴۴
— قدیر ۵۷-۳۰۳-۳۸۹-۴۳۱-۵۲۷-۵۸۲
— سمیع ۷۰-۳۳۹
— بصیر ۳۰۴-۳۳۹-۴۲۵-۵۲۸
— تواب-۹۵
— رؤف ۳۰۷-۴۰۳
— رحمٰن ۲۴۸-۴۱۱-۴۱۲
— حمید ۳۲۱-۴۳۱-۵۳۳

— حلیم - ۵۴۷

شکور - ۵۴۷

— متین - ۱۵۶

— اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر قرآن میں ہر جگہ سیاق و سباق کی مناسبت سے کیا گیا ہے ۴۵-۴۸-۵۲-۶۲-۷۰-۷۳-۷۵-۹۵-۱۵۶-۱۵۷-۲۴۸-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۹-۳۱۰-۳۲۱-۳۴۱-۳۴۴-۴۱۱ تا ۴۱۶-۴۳۱-۴۳۲-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۸-۵۰۵-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۴-۵۴۲-۵۴۳

— وہ حقیقی معبود ہے ۱۵۲-۲۰۸

(مزید تشریح کے لیے دیکھو ''الٰہ'')

— اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ۲۴-۴۱۱-۴۱۲-۵۴۳

— اس نے انسانوں اور جنوں کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے ۱۳۱-۱۵۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''عبادت'')

— وہ عرش پر جلوہ فرما ہے ۳۰۳

— کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے ۴۱۵-۴۱۷-۴۵۴-۴۸۵-۵۲۷

— وہی مقتدر اعلیٰ ہے ۳۰۲-۴۱۲-۴۱۳

— وہ بڑا معاف کرنے والا ہے ۹۵-۳۴۱-۵۲۷

— وہ سخت سزا دینے والا ہے ۲۳۹-۳۸۶-۳۹۳

اس کا غضب کیسے لوگوں پر ہے ۴۷-۴۵۰

— وہ بڑے فضل والا ہے ۳۱۹-۳۲۰-۳۳۴-۴۸۹

— وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے ۳۳۴-۴۸۸-۴۸۹

— وہ انسان کا خالق ہے ۲۴۸

— اس نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے ۵۲۹ تا ۵۳۱

— وہ زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے ۵۸۱

— وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۵۷-۶۱-۶۲-۳۰۲-۳۰۳-۳۸۹-۴۳۱-۵۰۰-۵۲۷

— وہ غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے ۴۱۱-۴۱۲-۴۲۲-۴۹۲-۵۲۹-۵۴۷

— وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۷۰-۷۱

— وہ ہر وقت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے ۳۰۳-۳۰۴-۳۵۸

— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے اور کچھ بھی اس سے چھپ نہیں سکتا ۲۵-۲۸-۵۸-۹۹-۱۰۷-۱۰۹-۱۲۸-۱۶۶-۲۱۳-۳۰۴-۳۵۶ تا ۳۵۸-۵۲۹

— خفیہ سرگوشی کرنے والے جب آپس میں کھسر پسر کرتے ہیں تو اللہ ان کے درمیان موجود ہوتا ہے ۳۵۷-۳۵۸

— اس کا علم اور اس کی قدرت غیر محدود ہے ۱۰۹

— وہ انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کے دل کا حال تک جانتا ہے ۵۶-۱۱۶-۳۰۴-۵۲۹

— وہ ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے جنین کو بھی جانتا ہے ۲۱۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہی اول وہی آخر وہی ظاہر اور وہی باطن ہے ۳۰۳
— اللہ وہ کچھ جانتا ہے جو دوسرے نہیں جانتے ۶۲
— وہ کلیات ہی کا نہیں جزئیات کا علم بھی رکھتا ہے ۳۰۳-۳۰۴
— وہ لوگوں کے تمام اعمال سے باخبر ہے ۲۹-۵۰-۳۰۴-۳۰۹-۳۴۴-۳۵۶-۴۰۹-۴۲۵-۵۵۲-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۶
— وہ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۱۲۰-۱۲۱
— اس کی طرف بندوں کو دوڑنے کا حکم ۱۵۱
— اس سے ڈرنے کا حکم ۸۳- ۹۵- ۳۶۰-۳۹۳-۴۰۹-۴۴۳-۵۶۳-۵۸۰
— اس سے ڈرنے والوں کے لیے بڑا اجر ہے ۵۷۳
— جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے کشادگی پیدا کردیتا ہے ۵۶۷-۵۷۳
— جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کی برائیاں دور کردیتا ہے ۵۷۳
— اللہ سے ڈرنے کا حکم انسان کی حد استطاعت تک ہی ہے ۵۴۱
— اس سے بڑھ کر کسی اور کا خوف کرنا خوف خدا کی نفی کے مترادف ہے ۴۰۶-۴۰۷
— اس سے بڑھ کر کسی اور کا خوف رکھنے والے ناسمجھ ہیں ۴۰۷
— جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لیے کافی ہے ۵۶۸
— اس کی رحمت و مغفرت بہت وسیع ہے ۲۱۳
— اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت ۳۶۰- ۴۳۰- ۵۴۳
— اللہ کسی کو اس کی مقدرت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا ۵۷۸
— جو اللہ پر بھروسہ کرکے اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلے، اللہ اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے ۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۳
— ایمان لانے والون کا مولیٰ (حامی و ناصر) اللہ ہی ہے ۲۰
— وہ مومنین سے راضی ہے ۳۶۷
— وہ بڑا قدر دان ہے ۵۴۷
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات (دیکھو ''انسان'')
— وہ آسمانوں اور زمین کے تمام لشکروں کا مالک ہے ۴۵-۴۸
— وہ اگر کسی کو سزا دینا چاہے تو اپنے لشکروں میں سے جس لشکر سے چاہے کام لے سکتا ہے ۴۸
— وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے ۱۵۶
— اس نے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں بنایا ۱۲۴-۳۰۳
— وہی آسمان سے پانی برساتا ہے ۲۸۸
— وہی کھیتیاں اگاتا ہے ۲۸۷
— اسی نے انسانوں کے فائدے کے لیے آگ روشن کی ۲۸۹
— وہ رات اور دن کو گھٹاتا بڑھاتا ہے ۳۰۴
— اس نے دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا ۲۵۹-۲۶۰

— مشرکین کے ''معبودوں'' کا خالق بھی وہی ہے ۲۲۰
— آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اس کے خزانوں کا وہی مالک ہے ۵۱- ۲۱۱- ۳۰۲- ۵۲۱-۳۰۸-۳۰۴
— وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک و پروردگار ہے ۲۵۶- ۲۵۸
— زمین اور آسمانوں کو اس نے برحق پیدا کیا ہے ۵۲۹
— وہ کائنات کی ہر شے کی حاجتیں ہر آن نئی شان سے پوری کر رہا ہے ۲۶۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کائنات'')
— وہ غنی ہے اور سب اس کے محتاج ہیں ۳۱- ۳۲۱- ۴۳۱-۵۳۳-۵۳۴
— وہ کسی سے رزق کا طالب نہیں ۱۵۵-۱۵۶
— وہی تمام مخلوقات کا رازق ہے ۱۵۶
— اللہ کے رہنمائی فرمانے اور حال درست کر دینے کا مطلب ۹-۱۰-۱۹-۲۰
— اللہ کس معنی میں اہل ایمان کو اپنا مددگار قرار دیتا ہے ۱۹- ۲۰- ۳۲۲- ۳۲۳- ۳۹۵- ۴۷۹-۴۸۰
— اللہ کو قرض دینے کا مطلب ۳۱۰
— جو اس کو قرض دے اسے وہ کئی گنا بدلہ دیتا ہے ۳۰۹-۵۴۷
— اللہ کے خود اپنے وعدے پر ''ان شاء اللہ'' فرمانے کا مطلب ۶۱
— وہ کسی کام میں ایسا مصروف نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کام کے لیے اسے وقت نہ ملے ۲۶۲- ۲۶۳
— اس کے ہاں فیصلے بدلنے کا دستور نہیں ہے ۱۲۰
— اس کی سنت کسی کے بدلے نہیں بدل سکتی ۵۷- ۵۸
— اس کو کبھی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوتی ۱۲۵
— اس کی ذات جلیل و کریم کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے ۲۶۰- ۲۶۱
— وہ ازل سے ابد تک کے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کرنے کی قدرت رکھتا ہے ۱۰۸ تا ۱۱۰
— وہ دنیا و آخرت کا مالک ہے ۲۰۹
— وہی موت اور زندگی دینے والا ہے ۱۲۷- ۲۲۰- ۳۰۲
— سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے ۱۲۷- ۲۲۰- ۴۳۰-۴۹۲-۵۲۹-۵۳۱
— موت کے بعد وہی دوبارہ زندگی دینے والا ہے ۳۲۰-۳۱۴-۳۵۶-۳۶۵
— اس نے انسانوں اور جنوں کے حساب کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے ۲۶۲
— وہی موت کے بعد زمین کو زندگی بخشتا ہے ۳۱۴
— اس کا حکم آناً فاناً پورا ہو جاتا ہے ۳۴۱
— موت کے بعد زندہ کر دینا اللہ کے لیے بڑا آسان ہے ۵۳۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''قیامت'' اور ''زندگی بعد موت'')
— وہ ایسے راستے سے رزق دیتا ہے جدھر انسان کا گمان تک نہیں جا سکتا ۵۶۷
— وہ مجرموں پر اپنا غضب ایسے راستہ سے نازل کرتا ہے جدھر ان کا خیال تک نہیں جا سکتا ۳۸۲
— اس کے عمل تخلیق کی سرعت ۲۴۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس کے فعل تخلیق کے تین مراتب ۴۱۵-۴۱۶
— اللہ کا راستہ کیا ہے اور اس راستے سے روکنے کی مختلف صورتیں کیا ہیں-۹
— اللہ کی راہ سے روکنے والوں کی سزا ۲۹۱-۳۰
— اسے اختیار ہے جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۵۱-۵۲
— وہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا فیصلہ کر لے تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی ۵۰
— وہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے اور کوئی طاقت اس کو روکنے والی نہیں ہے ۵۶۸
— جسے وہ سزا دینا چاہے اسے نبی کا استغفار بھی سزا سے نہیں بچا سکتا ۵۰-۵۲۰
— اس کی رحمت و مغفرت بہت وسیع ہے ۲۱۳
— لوگوں کے ہدایت پانے سے اس کی کوئی غرض اٹکی ہوئی نہیں ہے ۵۳۴
— اس نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے ۱۵۱-۲۲۰
— اسی نے نر اور مادہ کے جوڑے پیدا کیے ہیں ۲۲۰
— مال و دولت وہی دینے والا ہے ۲۲۰
— تنگی اور خوش حالی اسی کے اختیار میں ہے ۵۴۱
— راحت و رنج اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۲۰-۳۳۰
— وہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے ۵۸
— اس کے بارے میں برے گمان رکھنے والوں کا انجام ۴۷
— مومنین اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور اللہ کی پارٹی ہی فلاح پائے گی ۳۶۷
— تمام معاملات کے فیصلے اسی کی طرف سے ہوتے ہیں ۳۰۴
— وہی بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے ۴۴۳
— اس نے بندوں کی رہنمائی کا انتظام کیا ہے ۲۴۸-۲۴۹
— اسی نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور پیدا کیا ہے ۲۴۹
— اس نے اپنے رسول کتابوں اور میزان عدل کے ساتھ بھیجے ہیں ۳۰۰-۳۲۱
— تمام معاملات کے فیصلے اسی کی طرف سے ہوتے ہیں ۳۰۴
— اس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہی غالب ہوں گے ۳۶۵-۳۶۷
— عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین ہی کے لیے ہے ۵۲۱
— اس کو فراموش کرنے والے خود فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۴۱۰
— اس کی اطاعت لازمہ ایمان ہے ۳۰-۵۴-۱۰۱-۳۶۳-۵۴۱
— اس کے لیے بیٹیاں تجویز کرنا مشرکین کی جہالت ہے ۱۸۰-۲۰۶-۲۰۸
— وہ شرک سے پاک ہے ۱۸۲-۴۱۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شرک'')
— اس نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے ۲۴۱-۵۶۸
— اس نے پوری کائنات کے نظام کو توازن اور عدل کے ساتھ قائم کیا ہے ۲۴۷-۴۱۶
— اس کے ہاں ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جاتی ہے ۲۴۱

-- اس کی خدائی سے نکل کر کوئی بھاگ نہیں سکتا ۲۶۳

-- وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی دادرسی کرے گا ۲۶۷

-- وہ برے لوگوں کو برائی کا اور اچھے لوگوں کو اچھائی کا بدلہ دے گا ۲۱۱

-- اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا ۳۹

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شفاعت'')

-- ہر جرم اور گناہ دراصل اس کے احسانات کی تکذیب ہے ۲۶۶

-- وہ اپنے بندوں کو تاریکی سے نکال کر نور میں لاتا ہے ۳۰۷-۵۸۰

-- اس پر ایمان انبیاء کی تعلیم میں سب سے مقدم ہے ۳۰۷

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

-- اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ۲۶۴

الٰہ

-- اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے ۲۴-۱۵۲-۱۸۲-۴۱۱-۴۱۲-۵۴۳

-- اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنانے والے کافر ہیں اور ان کا انجام برا ہے ۱۱۹

-- اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۱۵۶-۲۲۱-۲۶۱

-- لوگوں کے ان خود ساختہ معبودوں کا رب بھی اللہ ہی ہے ۲۲۱

الیاس، علیہ السلام

-- مسیح کے زمانے میں بنی اسرائیل حضرت الیاس ؑ کی آمد کے منتظر تھے ۴۶۱-۴۶۲

امثال القرآن

-- دیکھو ''قرآنی تمثیلات''

ام سلمہؓ ام المومنین

-- ان کی بیدار مغزی - ۴۰

انجیل

-- حضرت عیسیٰؑ کو عطا کی گئی ۳۲۴

-- موجودہ انجیلوں کی اصل حیثیت اور ان کی تفصیلی تاریخ ۴۶۳-۴۶۴-۴۶۶

-- انجیل میں تورات کی تحریف کا تذکرہ - ۴۷

-- اس میں صحابہ کرام کی تمثیل - ۶۴

-- انجیل یوحنا میں حضور اکرمؐ سے متعلق بشارتیں ۴۶۰-۴۶۱

-- انجیل یوحنا میں ''وہ نبی'' کی پیشین گوئی کا کیا مطلب ہے ۴۶۱-۴۶۵

-- حضرت عیسیٰؑ کی زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جس کو سریانی کہا جاتا ہے ۴۶۳

-- بائبل کی چاروں انجیلیں ان لوگوں نے لکھیں جو یونانی بولتے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے بہت عرصہ بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے ۴۶۳-۴۶۷

-- انجیل کی روایات کے بارے میں پہلی تین ہجری صدیوں کے مسلمان علماء کی معلومات عیسائی علماء کی نسبت زیادہ معتبر ہیں ۴۶۵

-- فارقلیط کے معنی کی تحقیق سیرۃ ابن ہشام میں

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۶۵
— انجیل کے اولین نسخے کن مشکوک حالات میں لکھے گئے ۴۶۳
— انجیل برناباس ۴۶۶ تا ۴۷۶
— انجیل برناباس موجودہ بائبل کی چاروں انجیلوں سے زیادہ معتبر ہے ۴۶۶
— برناباس کون تھا؟ ۴۶۸
— انجیل برناباس کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے اولین بارہ صحابیوں میں سے ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے حکم کے مطابق اس نے انجیل برناباس تصنیف کی ہے ۴۶۷
— انجیل برناباس کی خصوصیات ۴۶۸
— انجیل برناباس سے عیسائی کیوں ناراض ہیں ۴۶۹ تا ۴۷۱
— انجیل برناباس کو چھپانے کے لیے عیسائیوں کا اہتمام ۴۶۶
— انجیل برناباس کا مصنف اس انجیل کا مقصد تصنیف کیا بیان کرتا ہے ۴۷۰
— انجیل برنابس کس طرح عیسائیوں کے موجودہ گمراہانہ عقائد کی تردید کرتی ہے ۴۷۰-۴۷۱
— انجیل برناباس میں حضور اکرمؐ کی آمد سے متعلق حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئیاں ۴۷۱ تا ۴۷۴
— ان پیش گوئیوں سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ ۴۷۴-۴۷۵
— انجیل برناباس کسی مسلمان کی تصنیف نہیں ہوسکتی ۴۶۷-۴۷۵

انسان

— اس کو اللہ تعالیٰ نے بہترین صورت پر اعلیٰ قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ دوسری مخلوقات سے اشرف تخلیق کیا ہے ۵۲۹ تا ۵۳۱
— اس کی تخلیق سے متعلق قرآن کا بیان ۹۵-۹۶-۱۱۶-۱۴۲-۲۱۳-۲۲۰-۲۴۸-۲۵۳-۲۵۵-۲۵۶-۲۸۴-۲۸۵-۵۲۹
— انسان کے بطور حادثہ اتفاقاً پیدا ہو جانے کا احمقانہ خیال ۱۷۹-۱۸۰
— تخلیق انسان کا مقصد ۱۵۵
— انسان کے لیے خود اس کی اپنی پیدائش میں توحید و آخرت کے دلائل موجود ہیں ۱۴۰ تا ۱۴۲-۲۸۴ تا ۲۸۶
— آخرت کو ماننے یا نہ ماننے کا اثر خود انسان کی زندگی پر کیا پڑتا ہے ۱۱۶
— انسان کو آخرکار اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے ۱۲۷-۲۲۰-۴۳۰-۴۹۲-۵۲۹-۵۳۱
— انسان ایک فانی مخلوق ہے ۲۶۰-۲۶۱
— اس کو ایک دن موت سے لازماً ہمکنار ہونا ہے ۱۱۶-۲۸۵
— اس کی موت کا وقت اللہ نے مقرر کیا ہے ۲۸۵
— انسان دنیا میں ایک خاص قانون فطرت کے تحت کام کر رہا ہے مگر آخرت میں قانون فطرت کچھ دوسرا بھی ہوسکتا ہے ۲۸۵-۲۸۶
— انسان بطور خود حقیقت کو نہیں پا سکتا ۱۷۹-۱۸۰
— اس کو حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ

نے کیا طریقہ اختیار فرمایا ہے ۱۳۶
— اللہ کی طرف سے آئے ہوئے علم کی صحت کے بارے میں انسان کس طرح اپنی تسلی کرسکتا ہے؟ ۱۳۶
— انسان جس چیز کو بھی حق سمجھ بیٹھے وہی حق نہیں ہے ۲۰۹
— حقیقت کا علم نہ رکھتے ہوئے محض گمان کی پیروی انسان کو حق سے دور کر دیتی ہے کیونکہ گمان و حقیقت کی جگہ کام نہیں دے سکتا ۲۱۰
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ۱۹-۲۳-۳۰-۴۵-۵۶-۷۵-۹۵-۱۱۰ تا ۱۱۳-۱۳۳-۱۶۳-۲۱۱-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۱ تا ۲۵۳-۲۶۰ تا ۲۶۳-۲۸۷-۳۰۵-۳۰۷-۴۷۶-۴۷۸-۴۸۵ تا ۴۸۷-۴۹۷-۵۳۰-۵۳۶-۵۸۰
— اللہ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کو جھٹلانا کیا معنی رکھتا ہے ۲۵۵-۲۶۶
— انسان کو دنیا میں جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے وہ فانی ہے ۲۶۰
— انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے مسیحی تصور کی تردید ۵۲۷-۵۲۹
— انسان کو اختیارات، ذرائع اور مواقع عطا کر کے اور حق و باطل میں سے کسی ایک راہ کے انتخاب کی آزادی دے کر اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے ۱۴۲-۴۵۷-۴۵۸-۴۸۵-۵۲۸-۵۳۰
— اس کو عقل و شعور اور فہم و ادراک کی قوتیں دی گئیں جن کی وجہ سے وہ فطری طور پر نیکی و بدی اور حق و ناحق میں فرق کرسکتا ہے ۲۴۸-۲۴۹
— اللہ ہی نے انسان کو بولنا سکھایا ہے ۲۴۸
— انسان کی زبردست قوتیں اور صلاحیتیں عطیہ الٰہی ہیں ۲۵۸-۵۳۰
— انسان کو اللہ نے پیدا کیا، پھر کوئی مومن بن گیا اور کوئی کافر ۵۲۷ تا ۵۲۹
— اللہ انسان کو اس وقت بھی جانتا ہے جب وہ ابھی رحم مادر میں ہوتا ہے ۲۱۳
— انسان کے اعمال پر اللہ کی نظر ہے ۱۰۲-۵۲۸
— اللہ انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں کو بھی جانتا ہے ۱۱۶
— انسان کے دائیں بائیں دو کاتب فرشتے اس کی ہر بات ثبت کر رہے ہیں ۱۱۶
— اس کے گرد و پیش کی ہر چیز پر اس کا عمل ثبت ہو رہا ہے ۱۱۷ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نامہ اعمال'')
— نوع انسانی میں تفرقے اور فساد کو روکنے کے لیے قرآن نے کیا اصول پیش کیے ہیں ۹۵ تا ۹۷
— انسان اور جنوں کو اللہ تعالیٰ کا چیلنج کہ اگر وہ اس کی خدائی کے حدود سے نکل سکتے ہوں تو نکل کر دکھائیں ۲۶۳
— انسان کا قبیلوں اور برادریوں میں بٹنا ایک فطری امر ہے لیکن اس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ قوموں میں تعصبات اور امتیازات ہوں ۹۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— انسان اور انسان کے درمیان فضیلت کی اصل بنیاد ''تقویٰ'' ہے۹۵-۹۷
— اس کا اللہ کی عبادت واطاعت سے منہ موڑنا اپنی فطرت سے لڑنا ہے۱۵۵-۱۵۶
— اس کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا گیا جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان لایا جائے ۵۲۷-۵۲۹
— خوش حالی اور بدحالی میں مختلف انسانوں کے مختلف طرزِ عمل ۲۸۳-۲۸۸
انسان پر جو مصیبت بھی نازل ہوتی ہے اللہ کے اذن سے نازل ہوتی ہے اور پہلے سے طے شدہ اسکیم کے مطابق آتی ہے۳۱۹-۳۲۰-۵۴۱
— انسان کو مخاطب کر کے کائنات کی چار بنیادی حقیقتوں کا بیان۵۲۴-۵۲۵
— انسان کو کائنات میں دلائل خداوندی کے مشاہدے کی دعوت دی جاتی ہے۱۱۰
— ان دلائل اور نشانیوں سے کون لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۱۱۲-۱۱۳-۱۲۴-۱۴۰-۱۴۱
— انسان کے ساتھ اس کے خالق کا معاملہ صرف قانون طبیعی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اخلاقی قوانین بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں۱۴۳
— انسان اور اس کے خالق کے درمیان دنیوی زندگی میں معاملہ کی نوعیت ۱۶۹
— انسان کا بڑائی و کبریائی کا زعم بجائے خود اللہ کی صفات کا انکار ہے۲۶۱
— اس کی مہلت عمل ختم ہو جانے کے بعد اللہ ہرگز اسے مزید مہلت نہیں دیتا ۵۲۲

انصار

— ان کی اعلیٰ صفات پر قرآن میں ان کی تعریف ۳۹۵
— وہ مہاجرین کو خود اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے ۳۹۵-۳۹۶
— ان کا فے میں حصہ مقرر کیا گیا ۳۹۵۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''صحابہ کرام'' اور ''ہجرت'')

انصاف

— انصاف قائم کرنے کا حکم ۳۲۱
— انصاف کرو، انصاف کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے۴۷۸-۴۳۲
— انصاف کے ساتھ ٹھیک تولنے کا حکم ۲۵۱
— دشمن اور غیر دشمن کافر کو ایک ہی درجہ میں رکھنا انصاف نہیں ہے ۴۳۲-۴۳۳ (مزید دیکھو ''عدل'')

انفاق فی سبیل اللہ

— اس کا حکم اور اس کی فضیلت ۲۹۸-۳۰۵-۳۰۶
— اگر مسلمان اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کریں گے تو وہ ان کی جگہ کسی اور قوم کو اٹھائے گا ۳۲
— اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین ۳۰۷-۳۰۸-۴۷۸-۵۲۲-۵۴۶
— اللہ اہل ایمان کی بھلائی ہی کے لیے ان کو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین فرماتا ہے ۳۱-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۹-۵۴۶
— یہ اشارہ کہ مومنین کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی سائل اور محروم کا حق ہے ۱۳۹-۱۴۰
— کفر و اسلام کی جنگ میں مال خرچ کرنے کا حکم ۸-۲۹۹-۳۰۵

— مال و جان کی قربانی کس حالت میں زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہے ۲۹۹-۳۰۸-۵۲۲
— اصل قابل قدر انفاق وہ ہے جو تندرستی کی حالت میں کیا جائے نہ کہ وہ جو زندگی سے مایوس ہونے کے بعد کیا جائے ۳۰۶-۵۲۲
— انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کی تحسین ۳۰۸-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۵-۳۱۷
اس سے پہلوتہی ایمان کی کمزوری ہے ۳۰۵
— اس سے اجتناب کرنے والے دل کی تنگی میں مبتلا ہیں ۵۴۷
— اس معاملے میں جو لوگ دل کی تنگی سے بچا لیے گئے انھی کے لیے فلاح ہے ۳۹۵-۳۹۶-۵۴۶
— وہ مغفرت کا موجب ہے ۵۴۷
— انفاق کرنے والوں کے لیے جنت کی بشارت ۳۱۰
— انفاق کرنے والوں کے لیے اجر کا وعدہ ۳۰۶-۳۰۹-۳۱۵
— انفاق فی سبیل اللہ کو اللہ نے اپنے ذمہ قرض قرار دیا ہے ۳۰۹-۳۱۰-۳۱۵-۵۴۷
— اللہ کے ہاں اس کا بدلہ کئی گنا ملے گا ۳۰۹-۳۱۰-۳۱۵-۵۴۷

اولی الامر

— مسلمانوں کے لیے اولی الامر کی صفات ۹۵
— ان کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت سے مشروط ہے ۴۴۶-۴۴۷ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'' اور ''قانون اسلام، دستوری قانون'')

اہل کتاب

— اہل کتاب کی اخلاقی پستی ۳۱۴
— وہ اللہ کے نور (دعوت رسولؐ اللہ) کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے تھے مگر اللہ کا فیصلہ تھا کہ یہ نور پھیل کر رہے گا خواہ کفار کو کتنا ہی ناگوار گزرے ۴۷۶
— ان کے دل پتھر ہو گئے اور انھوں نے فسق کی راہ اختیار کر لی ۳۱۴
— اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے ۳۳۴
— ان میں سے جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں ان کے لیے دوہرا اجر ہے ۳۳۳
— انھوں نے حضورؐ کو جھٹلایا حالانکہ آپؐ اسلام کی طرف دعوت دینے والے تھے ۴۷۶
— حضورؐ پر ایمان نہ لانے والے اہل کتاب کو کافر قرار دیا گیا ۳۸۱-۴۰۵-۴۷۶
— اہل کتاب پر آپؐ کے غلبہ کا اشارہ ۴۷۹-۴۸۰

آیت - آیات

— آیات بمعنی معرفت حق کے نشانات اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں ۵۶-۱۴۰-۲۰۱-۲۲۸-۲۳۴-۲۳۹-۳۱۴
— اللہ کی ان نشانیوں کو جھٹلانے والوں کا انجام ۲۳۹
— آیات بمعنی آیات کتاب اللہ و بمعنی ارشادات و احکام الٰہی ۳۰۷-۳۱۷-۳۵۶-۴۸۶-۴۸۹-۵۴۱-۵۸۰
— اللہ کی ان آیات کو جھٹلانے والوں کا انجام ۳۱۷
— آیت بمعنی نشان عبرت ۱۴۶-۲۳۴
— اللہ کی آیات سے کیسے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۱۱۲-۱۱۳-۱۲۴-۱۴۰-۱۴۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— زمین میں اللہ کی آیات کی موجودگی ۱۴۰-۱۴۱
وجودِ انسانی میں آیات کی موجودگی ۱۴۰ تا ۱۴۲
— ہلاکت قوم لوط اور کشتی نوح اللہ کی آیات میں سے ہیں ۱۴۶-۲۳۴

ایصال ثواب - دیکھو ''ثواب''

ایمان

— ایمان لانے سے کیا مراد ہے ۳۵۵
— ایمان اور کفر کا فرق ۱۰-۱۱-۵۱
— ایمان اور مومن، اسلام اور مسلم کے معنی کا فرق ۱۰۰ تا ۱۰۳ -۱۴۷ -۳۱۳ -۳۱۴ -۳۳۳- ۳۵۵-۴۰۹-۴۵۴-۵۲۱
— ایمان کے تقاضے ۷- ۸- ۱۰- ۱۱- ۱۹- ۲۹- ۳۰- ۳۱- ۴۸- ۵۴- ۶۱- ۶۳ تا ۶۵- ۷۰- ۷۲- ۷۸- ۸۳- ۸۵- ۱۰۱- ۱۳۹- ۱۵۵- ۲۱۱- ۲۲۳- ۲۵۱- ۲۹۹- ۳۰۵ تا ۳۰۹- ۳۱۵- ۳۱۷- ۳۳۳- ۳۵۵- ۳۶۶- ۳۹۲- ۳۹۳- ۴۰۳- ۴۰۴- ۴۰۹- ۴۲۲- ۴۲۸- ۴۴۳- ۴۴۵- ۴۵۰- ۴۵۴- ۴۵۶- ۴۷۸- ۴۷۹- ۵۲۱- ۵۲۲- ۵۲۶- ۵۳۶- ۵۴۰- ۵۴۳ تا ۵۴۵- ۵۴۶
— صداقت ایمانی کا معیار اور اخلاص فی الایمان کی علامات ۱۰- ۱۸- ۳۱- ۴۹- ۵۳- ۵۶- ۶۳- ۷۰- ۷۵- ۷۸- ۸۳- ۱۰۱- ۱۰۲- ۱۲۲- ۱۲۸- ۱۳۸- ۱۷۱- ۲۱۱- ۲۴۲- ۲۶۶- ۳۰۶- ۳۱۳- ۳۱۸- ۳۳۸- ۳۶۲- ۳۶۶- ۳۶۷- ۳۹۴- ۳۹۵- ۴۲۸- ۴۲۹- ۴۷۹- ۵۲۱- ۵۴۴- ۵۶۵- ۵۸۰
— کفر و اسلام کی جنگ کو اللہ نے اہل ایمان کی ترقی درجات کا ذریعہ بنایا ہے ۴۵-۴۶
— صداقت ایمانی رکھنے والوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ ایمان ثبت کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے روح عطا کر کے ان کو قوت بخشتا ہے ۳۶۶-۳۶۷
— اللہ کا یہ احسان ہے کہ کسی کو نعمت ایمان عطا کرے ۱۰۲
— اللہ کسی کے ایمان کا محتاج نہیں، وہ مومنین سے اخلاص فی الایمان کا مطالبہ انھی کے بھلے کے لیے کرتا ہے ۴۵۴
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ تعلیمات کو ماننا لازمہ ایمان ہے ۱۰-۳۳۳
— ایمان کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی طاقت ور دشمن سے اسلام کا مقابلہ پیش آئے ۵۲ تا ۵۴
— صفات المومنین ۱۰- ۲۳- ۲۴- ۶۳ تا ۶۵- ۱۰۱- ۱۲۲- ۱۲۳- ۱۳۸- ۱۳۹- ۱۵۴- ۱۷۱- ۲۱۱- ۲۶۶- ۳۱۳- ۳۶۰- ۳۶۲- ۳۶۶- ۳۹۴ تا ۳۹۶- ۴۰۳ تا ۴۰۵- ۴۳۱- ۴۴۵- ۴۵۴- ۴۵۶- ۵۲۱
— نصیحت اسی وقت کارگر ہوتی ہے جب دل میں ایمان موجود ہو ۱۵۴
— اہل ایمان اللہ کے نزدیک شہداء اور صدیقین ہیں ۳۱۵
— مومنین کی صفات کو اللہ کس طرح آزماتا اور نکھارتا ہے ۱۸
— مومن اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کبھی

دوستی نہیں کر سکتا ۳۶۶-۴۲۲-۴۲۴-۴۵۰

— اللہ کس طرح ان اہل ایمان کی مدد کرتا ہے جو ایمان میں ثابت قدم رہتے ہیں اور نتائج کی پروا کیے بغیر ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں ۵۷

— زبانی ایمان اللہ کے ہاں اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک عمل سے اس کا ثبوت نہ دیا جائے ۳۵۵-۳۵۶-۵۴۰

— کفر و اسلام کی جنگ میں مومن کبھی کفر کا ساتھ نہیں دے سکتا ۴۲۴

— اللہ ایمان لانے والوں کا مولیٰ ہے ۲۰

— اللہ اہل ایمان کے ساتھ ہے ۲۰-۳۰

— وہ مومنین سے راضی ہے ۳۶۷

— تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں ۷۸-۸۳

— مومنین کے درمیان سب سے اہم رشتہ ایمان کا ہے ۴۰۳-۴۰۴

— مومن آپس میں نرم اور کفار کے لیے سخت ہیں ۶۳

— مومن اور کافر کبھی یکساں نہیں ہو سکتے ۲۱-۲۲

— مومنین کو ہدایت کہ مل کر بیٹھو تو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو ۳۶۰

— مومن مال اور اولاد کو اللہ کی محبت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتا ۵۲۶

— مومنین کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے ۳۶۱-۵۴۳

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اللہ'')

— مومن کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے ۵۲۶

— مومن حدود اللہ سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا ۵۲۶

— ایک سچے مومن کے قول و فعل میں مطابقت ہونی چاہیے ۴۵۴

— مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنے کسی مومن بھائی کے خلاف نفرت اور بغض دل میں رکھے ۴۰۴

— مومنین کو پہلے گزرے ہوئے مومنوں سے بغض نہ رکھنے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کی تعلیم ۴۰۳-۴۰۵

— کسی مسلمان کی غلطی پر اسے متنبہ کرنا ایمان کے منافی نہیں ہے ۴۰۴

— مومنین کے دلوں پر سکینت نازل فرمائی گئی تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایک اور ایمان بڑھالیں ۴۵-۴۶

— مومنین کے درمیان اگر جنگ ہو جائے تو اس کے بارے میں قانون کیا ہے ۷۸ تا ۸۳

— مومنین کے باہمی تعلقات سے متعلق قرآن کی ہدایات (دیکھو ''اسلامی نظم جماعت'')

— ایمان پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ۵۲۸

— وہ مقامات جہاں الذین اٰمنوا سے مراد صرف صادق الایمان لوگ ہی نہیں ہیں ۳۱۳-۳۱۴-۳۳۳-۴۰۹-۴۵۴-۵۲۱

— اہل ایمان کی یہ صفت ہے کہ وہ تمام شکوک سے پاک ہو کر دین پر پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں ۱۰۱

— ایمان لانے والوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کس معنی میں کیا گیا ہے؟ ۳۵۵-۴۷۸

مومنین کا کام اس دنیا میں اللہ کی مغفرت اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے

Maktaba Tul Ishaat.com

آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے ۳۱۸
— مومنوں کے کفار کے لیے فتنہ بن جانے کی کیا صورتیں ہیں؟ ۴۳۰-۴۳۱
— اہل ایمان کی قربانیوں کو اللہ ضائع نہیں کرے گا ۳۰
— مومن بے دیکھے خدا سے ڈرتا ہے ۱۲۳
— مومنین کو دنیا میں نور عطا کرنے کا وعدہ جس کی روشنی میں وہ سیدھے راستے پر چلنے کے قابل ہوں گے ۳۳۳
— مومن مردوں اور عورتوں کو روز قیامت میں نور عطا کیا جائے گا ۳۰۹ تا ۳۱۱
— ایمان اور تقویٰ کا اجر ۳۱ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''تقویٰ'')
— مومن مردوں اور عورتوں کا اجر ۱۰- ۲۵- ۳۱- ۴۶- ۴۷- ۳۰۹
— مومنین کے لیے جنت کی خوش خبری ۳۱۰- ۳۱۹- ۳۶۷- ۴۷۸- ۵۴۰- ۵۴۱
— مومنین کے ایمان کے امتحان کی صورت ۵۲ تا ۵۴
— مومن اللہ کی صفت رحمت سے واقف ہونے کے باوجود گناہوں پر جری نہیں ہوتا ۱۲۳
— مومن ہو کر کسی شخص کا فسق میں نام پیدا کرنا ڈوب مرنے کا مقام ہے ۸۵-۸۶
— مومنین کے دل حق کے سامنے جھک جاتے ہیں اور اللہ کا ذکر سن کر پگھلنے لگتے ہیں ۱۰- ۳۱۳
— مومنین کو آخرت کے لیے اعمال صالح کا زاد راہ فراہم کرنے کا حکم ۴۰۹
— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۱۰- ۲۰- ۳۱- ۶۵- ۵۲۶- ۵۴۰- ۵۸۰- ۵۸۱
— اللہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کی برائیاں دور کرتا ہے اور ان کا حال درست کرتا ہے ۱۰
— ایمان ہی عقائد و اعمال کی خرابیوں کو عمل صالح میں تبدیل کر دیتا ہے ۱۰
— ایمان اور عمل صالح سے گناہ جھڑ جاتے ہیں ۵۴۰
— ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا لزوم ۴۷۸
— ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کا لزوم ۳۰۶
— مومن اور منافق کا فرق ۳۳۸- ۳۶۶
— ایمان باللہ ۴۸- ۵۱- ۱۰۱- ۱۲۲- ۳۰۵- ۳۰۷- ۳۱۵- ۳۱۹- ۳۵۵- ۳۶۶- ۴۲۲- ۴۲۹- ۴۴۳- ۵۳۶- ۵۶۷- ۵۸۱
— اللہ پر ایمان بالغیب کی اہمیت ۱۲۲- ۱۲۳- ۳۲۲
— ایمان بالرسل ۴۸- ۵- ۱۰۱- ۳۰۵- ۳۱۵- ۳۱۹- ۳۳۳- ۳۵۵- ۵۳۶
— آخرت پر ایمان ۲۰۹- ۳۶۶- ۵۶۷
— قرآن پر ایمان ۱۰- ۵۳۶
— تمام کتب آسمانی پر ایمان ۳۲۱
— ایمان باللہ میں کیا کیا معنی شامل ہیں ۵۴۰
— ایمان اور تنگ دلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۳۹۷
— ایمان باللہ ہی مصائب میں انسان کو راستہ دکھاتا ہے ۵۴۱- ۵۴۲
— ایمان باللہ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ طاغوت سے کفر کیا جائے ۴۲۸
— اللہ پر اس طرح ایمان لانا چاہیے جس طرح رسول اور کتاب نے بتایا ہے ۵۴۰- ۵۸۱

— ایمان باللہ اور ایمان بالرسل کا تعلق غیر منفک ہے ۳۵۵-۵۸۰

— اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والوں کا مقام ۳۱۵

— تمام انبیاء کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ۱۰-۳۳۳-۵۸۰

— رسولوں پر ایمان نہ لانے والوں کا انجام ۵۸۰

— ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں قرآن کا بیان ۲۰۹-۲۱۰

— ایمان لانے والوں کے بارے میں قرآن کا بیان ۳۳۳-۳۳۴-۴۷۸

— ایمان کوئی جامد و ساکن حالت نہیں ہے بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی ہے اور تنزل بھی ۴۵-۴۶

— اگر کوئی ایمان لایا ہے تو اللہ اور رسول پر اس نے کوئی احسان نہیں کیا ہے ۹۹

— ایمان لاکر احسان جتانے والوں کو قرآن کا جواب ۱۰۱-۱۰۲

— ایمان کی دولت اگر کسی کو حاصل ہے تو سراسر اللہ کے فضل و احسان کی بدولت ہے ۷۵

— انسان کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان لایا جائے ۵۲۷ تا ۵۲۹

— کن لوگوں کا ایمان معتبر نہیں ہے ۲۹

— ایمان لاکر مسلمان شعوری طور پر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا عہد کرتا ہے ۳۰۷-۳۰۸

— اہل ایمان کے لیے رحمت کا دہرا حصہ ۳۳۲

— مومنین کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرنی ہے ورنہ ان کے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے ۳۰

— ایمان لانے کے نتائج دنیا اور آخرت میں ۱۰-۱۱-۲۰-۲۱-۳۱۵-۳۱۶-۳۳۳-۳۳۴-۴۵۳-۵۴۱

— اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید ۶۱-۳۳۳-۳۶۰-۳۹۳-۴۰۹-۴۴۳-۵۶۳

— مومنین اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کبھی دوستی نہیں رکھتے ۳۶۶-۴۲۲-۴۲۴-۴۵۰

— دنیا میں قانونی طور پر کسی کے مومن ہونے کی جانچ کیسے کی جاسکتی ہے ۴۳۴-۴۳۶

— اللہ مومنین سے راضی ہوا اور مومنین اللہ سے راضی ہوئے ۳۶

— اہل ایمان کے اقربا بھی اگر اہل ایمان ہوں تو جنت میں وہ سب اکٹھے کر دیے جائیں گے ۱۶۸-۱۶۹

— مومنین اللہ کی جماعت ہیں ۳۶۷

— مومن ہی کامیاب ہیں ۳۶۷-۴۵۳-۴۷۸

— مومن ہی کا یہ کام ہے کہ تقویٰ پر قائم رہے خواہ مخالف فریق کیسا ہی بے جا رویہ اختیار کرے ۶۱

— مومنین کے لیے عزت ہے ۵۲۱

— ایمان سے نصرت اور فتح خداوندی حاصل ہوتی ہے ۴۷۸

— اہل ایمان کو دنیا میں کیا روش اختیار کرنی چاہیے ۴۸

— اللہ کس معنی میں اہل ایمان کو اپنا مددگار قرار دیتا ہے؟ ۱۹-۲۰-۳۲۲-۳۲۳-۳۹۵-۴۷۹-۴۸۰

— اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اللہ اور رسولوں پر ایمان ضروری ہے ۴۷۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— مومنین کے لیے ضروری ہدایات ۵۲۵-۵۲۶-
۵۴۱ تا ۵۴۷
— مومنین حب الٰہی میں مال و اولاد کو رکاوٹ نہیں
بننے دیتے ۳۶۶-۴۲۲-۴۲۴-۵۲۲-۵۴۴
— اہل ایمان کو اللہ کے سامنے سمع و طاعت کا نمونہ
بن جانے کا حکم ۵۴۶

ب

باطل

— باطل کی پیروی کفر ہے ۱۰
— باطل کی پیروی کرنے والوں کو اللہ ان کی حیثیت
بتا دے گا ۱۱
— باطل گروہ کی سعی و عمل آخر کار رائیگاں جائے گی
۷-۹
— باطل کو اللہ چاہے تو خود مٹا دے لیکن وہ یہ خدمت
اہل ایمان لوگوں سے لینا چاہتا ہے ۱۸

بائبل

— اس کے حوالے ۱۲۵- ۱۴۵- ۲۳۸- ۲۳۹-
۴۵۹ تا ۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴
— بائبل کے اس بیان کی تردید کہ کائنات کی تخلیق
کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ تھک گیا تھا اور اسے
آرام کر لینے کی ضرورت پیش آئی ۱۲۵
— بائبل کے تراجم کس طرح وقتاً فوقتاً بدلے جاتے
رہے ہیں ۱۲۵۔ (نیز دیکھو ''انجیل'' اور ''تورات'')

بت پرستی

— عربوں کی بت پرستی ۲۰۶-۲۰۷-۲۲۱
— لات کا استھان طائف میں تھا ۲۰۶
— بنو ثقیف نے لات کو معبود بنا رکھا تھا ۲۰۶-۲۰۷
— لفظ لات کی تشریح ۲۰۷
— عزیٰ، قریش کی خاص دیوی ۲۰۷
— عزیٰ کے معنی ۲۰۷
— مناۃ کا محل وقوع ۲۰۷
— مناۃ کا حج کیا جاتا تھا ۲۰۷
— شعریٰ کی تشریح ۲۲۱
— بت پرستوں کے پاس اپنے فعل کے لیے کوئی سند
نہیں جس باپ دادا کا عمل اور اپنے وہم و گمان
اور خواہشات نفس کی پیروی ہے ۲۰۸

بخل

— بخل کرنے والے اپنے آپ ہی سے بخل کرتے
ہیں ۳۱
— بخل کی مذمت ۳۲۰-۳۹۶
— بخیلوں کو اللہ پسند نہیں کرتا ۳۲۰
— مسلمان بد خلق اور بخیل نہیں ہوتا ۳۹۷۔ (مزید
تفصیلات کے لیے دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'')

بدر

— جنگ بدر میں قرآن کی پیشگوئی پوری ہوئی
۲۴۰-۲۴۱
— جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی یہود مدینہ
کے لیے سوہان روح بن گئی ۳۷۷
— اہل بدر کی مغفرت اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے ۴۲۳
— اہل بدر کی مغفرت کا صحیح مفہوم ۴۲۷
— بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر اللہ تعالیٰ کے
عتاب کی اصل وجہ ۱۲
— بدر کے قیدیوں سے کیا سلوک کیا گیا ۱۳-۱۶-۱۷

برزخ

— عذاب قبر یعنی برزخ کا عذاب ۲۸

بشارت

— جنت کی بشارت کن لوگوں کے لیے ہے ۳۱۰-۳۶۶-۳۶۷

— ایمان لانے والوں کے لیے بشارت ۴۷۸

بشر

— کفار مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کرنے سے اس لیے انکار تھا کہ آپ بشر تھے ۱۰۹

— ہر زمانے کے کفار نے اپنے عہد کے نبی کو ماننے سے اسی لیے انکار کیا کہ وہ بشر کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۱۰۹-۲۳۶-۵۳۳-۵۳۴ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

بنی اسرائیل

— فرعون کے مقابلے میں ان کی سرفرازی ۱۶۴

— انھوں نے حضرت موسیٰ کو نبی مانتے ہوئے اذیتیں دیں ۴۵۷

— انھوں نے حضرت عیسیٰ کو جان بوجھ کر جھٹلایا اور ہمیشہ کے لیے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑ گئی ۴۵۸-۴۷۶

— ان میں سے کچھ لوگ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے اور باقی کفر میں پڑ گئے ۴۷۹

— انھوں نے ٹیڑھ اختیار کی اور اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا ۴۵۷-۴۵۸

— بنی اسرائیل میں ''وہ نبی'' کے نام سے کس کی آمد کا شہرہ تھا؟ ۴۶۱ تا ۴۶۳ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انجیل''، ''اہل کتاب''، ''انجیل'' اور ''یہود'')

بنی نضیر

— دیکھو ''غزوۂ بنی نضیر''

بہتان

— بہتان، غیبت اور چغلی کا فرق ۹۰-۹۳

— بہتان کی حرمت ۴۴۵-۴۴۶

— اللہ پر بہتان باندھنے والا سب سے بڑا ظالم ہے ۴۷۶

بیت اللہ

— وہ ہر وقت آباد و معمور رہتا ہے ۱۶۲

بیعت رضوان - دیکھو ''صلح حدیبیہ''

بینات

— معنی و تشریح ۳۲۱-۵۳۳

— وہ رسولوں کو دی گئیں ۳۲۱

ت

تبع

— اس کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور آخرت کا انکار کیا ۱۱۴-۱۱۵

تسبیح

— تسبیح کی تاکید ۴۸-۱۲۵-۱۸۴-۲۹۰-۲۹۶

— اوقات تسبیح ۴۸-۱۲۵-۱۸۵

— تسبیح سے مراد نماز ۱۲۵-۱۲۶-۱۸۵

— صحابہ کو حضورؐ نے تسبیح کی تاکید بھی کی اور تعلیم بھی دی ۱۲۶-۱۸۵

— تسبیح مسنونہ ۱۲۶-۱۸۵

— زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ۳۰۱-۳۸۱-۴۱۵-۴۵۴-۴۸۵-۵۲۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ مشرکین کے شرک سے پاک ہے ۲۱۵-۲۱۶

تقدیر

— مسئلہ تقدیر کا جامع و مختصر بیان ۴۵۷-۴۵۸
— مسئلہ تقدیر قرآن میں کس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے ۳۱۹-۳۲۰
— انسان کو دنیا میں اختیارات، وسیع ذرائع و مواقع اور انتخاب کی آزادی دے کر امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے ۱۴۲-۱۵۳
— انسان کو عقل و شعور اور فہم و ادراک کی قوتیں دے کر اللہ نے خیر و شر میں امتیاز کرنے کے قابل بنایا ہے ۲۴۸-۲۴۹-۵۲۸-۵۲۹
— انسان پر جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذان سے آتی ہے اور اس کا مقصد امتحان ہوتا ہے ۳۱۹-۳۲۰-۵۴۰
— اللہ چاہے تو دین حق کے دشمنوں کو خود ہی ختم کر دے لیکن اس نے حق و باطل کی کش مکش کا سلسلہ مومنین و کفار کے امتحان کے لیے جاری کیا ہے ۴۵-۴۸
— انسان کو کس طرح آزمائش میں ڈالا گیا ہے ۲۹
— انسان کا کام اپنے آپ کو اہل ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے اور اللہ کا کام توفیق دینا ہے ۲۴
— کفر کا راستہ اختیار کرنے والوں کو اللہ غلط کاموں ہی کی توفیق دیتا ہے ۹
— جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھرتا ہے اسے پھر شیطان ہر گمراہی میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے ۲۷
— کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ خود اس کی اور شیطان کی طرف سے ہوتا ہے ۴۵۷
— ہدایت و ضلالت اور دیگر تمام اعمال کے محرکات انسان کے نفس میں بالطبع موجود ہوتے ہیں ۱۵۳
— اللہ کے کسی شخص سے ہدایت کی توفیق سلب کرنے کا مطلب ۹
— اللہ تعالیٰ کے کسی سے ضلالت کو دور کر دینے کا مطلب ۱۰
— اللہ کیسے لوگوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتا ہے ۲۳-۲۴-۵۱۷
— اللہ کیسے لوگوں کے اعمال بد ان کے لیے خوش نما بنا دیتا ہے ۲۱
— اللہ کیسے لوگوں کی ہدایت کی طرف سے اندھا اور بہرا کر دیتا ہے ۲۶-۲۷
— اللہ کیسے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے ۲۴-۴۵۷-۴۵۸
— اللہ کیسے لوگوں کو تقویٰ عطا فرماتا ہے ۲۴
— کیسے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے ۴۵۷-۴۵۸-۴۷۶-۴۸۹-۵۲۰
— کیسے لوگوں کو اللہ قرآن سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا ۲۷-۲۸
— ہدایت کسی پر جبراً نہیں ٹھونسی جاتی ۱۲۸
— انسان کو اللہ نے فطرت سلیمہ پر پیدا کیا اور پھر کسی نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور کسی نے ایمان کا ۵۲۷تا۵۲۹

— اللہ جسے راست روی کی نعمت عطا کرتا ہے اپنے علم اور حکمت کی بنا پر کرتا ہے ۷۵-۷۶
— یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ کسی کے دل میں طاعت و ایمان کی محبت اور کفر و فسوق سے نفرت پیدا کر دے ۷۵-۷۶-۱۰۱-۱۰۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "ضلالت" اور "ہدایت")
— اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کیا ہے ۱۲-۲۴۱-۵۶۸
— ہر مخلوق کا نوشتہ تقدیر لکھ دینا اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۳۱۹-۳۲۰
— ہر چیز کا وقوع اللہ کی مشیت پر موقوف ہے ۶۱-۶۲
— اللہ نفع یا نقصان پہچانا چاہے تو کوئی اس کے فیصلے کو روکنے والا نہیں ۵۰
— اللہ ہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے ۱۲۷-۳۰۲
— عالم بالا میں فیصلہ ہوتا ہے کہ انسان کو کیا رزق دیا جائے ۱۴۳
— خوشی اور غم دونوں صورتیں اللہ کی طرف سے ہیں ۲۲۰
— اللہ جسے چاہے غنی کر دے اور جسے چاہے فقیر کر دے ۲۲۰-۲۲۱
— کوئی دن منحوس نہیں ہوتا ۲۳۵-۲۳۶

تقلید

— باپ دادا کی اندھی تقلید بڑے اسباب ضلالت میں سے ہے ۲۰۸
— کیسے لوگ صحیح نمونہ تقلید ہیں ۴۲۸-۴۳۱-۴۳۲
— انبیاء علیہم السلام کا کون سا فعل قابل تقلید ہے اور کون سا نہیں ہے ۴۲۹-۴۳۰

تقویٰ

— متقین کی نمایاں خصوصیات ۱۲۲-۱۳۸ تا ۱۴۰-۱۶۷
— متقین کے لیے جنت کا وعدہ ۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۳۸-۱۶۷-۱۶۸-۲۴۲
— ایمان اور تقویٰ کا اجر ۳۱
— تقویٰ اور فسق کا فرق ۳۸۰-۴۰۹-۴۱۰
— تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ۸۳-۹۵-۳۶۰-۳۹۳-۴۰۹-۴۴۳-۵۴۶-۵۶۳-۵۸۰
— جو تقویٰ اختیار کرے گا اس کے لیے اللہ کشادگی پیدا کر دے گا ۵۶۷-۵۷۳
— اللہ جانتا ہے کہ کون کس درجہ کا متقی ہے ۲۱۳
— اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو ۹۵-۹۷-۲۴۲
— جس تقویٰ کی اہلیت آدمی میں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ویسا ہی تقویٰ اسے عطا کرتا ہے ۲۴
— تقویٰ کے تقاضے ۷۰-۷۲-۸۳-۹۵
— جو دل رسول کے احترام سے خالی ہے وہ تقویٰ سے خالی ہے ۷۲
— اہل ایمان کا کام یہی ہے کہ وہ تقویٰ پر قائم رہیں خواہ مخالف کیسا ہی جاہلانہ رویہ اختیار کرے ۶۱
— تقویٰ کرنے والوں پر اللہ رحم کرے گا ۸۳

توبہ

— اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے ۹۵

Maktaba Tul Ishaat.com

توحید

— دعوت توحید ۱۵۱-۱۵۲
— دلائل توحید ۱۱۰ تا ۱۱۴- ۱۵۰- ۱۵۱- ۲۵۰- ۲۵۱- ۲۸۴ تا ۲۹۰- ۲۹۵۔ (توحید کے دلائل ہی اللہ کی ہستی کے دلائل بھی ہیں)

تورات

— اس میں صحابہ کرامؓ کے اوصاف کا بیان ۶۴
— اس میں حضور اکرمؐ کی بعثت کی بشارت ۴۵۹- ۴۶۰
— یہودیوں نے نبوت محمدیؐ کا انکار کر کے تورات کی صریح خلاف ورزی کی ۴۸۵

توکل

— جو اللہ پر توکل کرے اللہ اس کے لیے کافی ہے ۵۶۸

ث

ثمود

— قصہ قوم ثمود ۲۳۶ تا ۲۳۹
— ثمود نے انبیاء کی تکذیب کس وجہ سے کی ۲۳۶
— ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور آخرت کا انکار کیا ۱۱۴-۲۳۶-۲۳۷
— حضرت صالح علیہ السلام پر ان کے الزامات ۲۳۶-۲۳۷
— انھیں ایک خاص وقت تک سنبھلنے کی مہلت دی گئی لیکن وہ اللہ کے حکم سے سرتابی کرنے پر مصر رہے ۱۴۹-۱۵۰
— حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی ان کے لیے کن معنوں میں فتنہ بنائی گئی ۲۳۶-۲۳۷
— ان پر عذاب الٰہی کا نزول ۱۴۹- ۱۵۰- ۲۲۱- ۲۳۷
— یہ قوم حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکی تھی ۲۲۲

ثواب

— ایصال ثواب کا مسئلہ ۲۱۵ تا ۲۱۹
— ایصال ثواب تو ہوسکتا ہے مگر ایصال عذاب ممکن نہیں ہے ۲۱۷
— اعمال حسنہ کے روحانی فوائد نہیں بلکہ ان کا اجر ہی قابل انتقال ہے ۲۱۷
— کون کون سی عبادات اور نیکیوں کا ثواب متوفی کو مل سکتا ہے ۲۱۷ تا ۲۱۹

ج

جاسوس: دیکھو ''قانون اسلام، قانون صلح و جنگ''

جاہلیت

— ایمان لے آنے سے جاہلیت کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں ۱۰

جبریل علیہ السلام

— بحیثیت معلم رسولؐ ۱۹۵
— ان کے معلم رسول ہونے پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۱۹۶
— حضور اکرمؐ نے دو دفعہ ان کی اصلی شکل میں انھیں دیکھا ۱۹۵-۱۹۷-۲۰۰-۲۰۳
— اس مشاہدے کو نظر کا دھوکا یا شیطان کی چال نہیں کہا جاسکتا ۱۹۸-۱۹۹
— حضور اکرمؐ اور ان کے درمیان صرف دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا تھا ۱۹۷
— ان کی تجلیات کا ذکر ۱۹۹-۲۰۱

— ان کی صفات ۱۹۵ تا ۱۹۷

جبر و قدر: دیکھو ''قدر''

جرم

— مجرمین کا برا انجام ۲۴۰-۲۶۵

— قیامت کے روز مجرمین اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے ۲۶۵

جزا و سزا

— اللہ کا بے لاگ قانون جزا و سزا ۹-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۴۷-۴۹-۵۱-۵۳-۵۴-۶۵-۷۰-۷۲-۱۰۱-۱۱۹-۱۲۲-۱۳۲-۱۳۳-۱۵۶-۱۵۷-۱۶۸-۱۶۹-۲۰۹-۲۱۱-۲۱۴-۲۱۹-۲۳۸-۲۴۲-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۹-۲۷۷ تا ۲۸۴-۲۹۵-۲۹۶-۳۰۶-۳۱۵-۳۱۷-۳۳۳-۳۵۶-۴۷۸-۵۲۰-۵۲۲-۵۸۰-۵۸۱

— دنیا کی موجودہ زندگی میں بھی اللہ کا قانون مکافات کام کر رہا ہے ۲۰-۲۱-۳۲-۱۱۴-۱۲۴-۱۴۶ تا ۱۵۰-۱۵۲-۲۲۱-۲۲۲-۲۳۱ تا ۲۳۹-۴۵۷-۴۷۹-۵۳۲ تا ۵۳۶-۵۸۰

— اللہ کا قانون مکافات اس وقت تک کسی قوم کی مکمل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک کہ اس قوم میں کوئی قابل لحاظ بھلائی موجود ہوتی ہے ۱۴۷

— جزا کی اصل علت کیا ہے ۲۶۶

— جزا و سزا کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اس علم کی بنا پر ہوتا ہے جو بندوں کے عمل کی حقیقت و نوعیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ رکھتا ہے ۵۱

— ایمان لے آنے سے جاہلیت کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ۱۰

— چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اگر بڑے اور کھلے گناہوں سے پرہیز کیا جائے ۲۱۱-۲۱۲

— ایک شخص کا عمل صالح کسی دوسرے کے لیے نافع نہیں ہے ۲۱۵

— ہر شخص اپنے فعل و عمل کا بدلہ پائے گا ۲۱۴-۲۱۵

— کسی کے فعل کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈالی جا سکتی ۲۱۴-۲۱۵

— کوئی شخص چاہے بھی تو کسی کے گناہ کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا ۲۱۴

— ایک شخص کے عمل صالح کا کسی دوسرے شخص کے لیے نافع ہونا صرف دو صورتوں میں ممکن ہے ۲۱۵-۲۱۷ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ثواب'')

— ہر شخص کے اعمال دیکھے جائیں گے اور ان کی جزا و سزا دی جائے گی ۱۰۷-۱۳۲ تا ۱۳۴-۲۱۹-۲۲۰

— آخرت کی جزا و سزا برحق ہے ۲۹۶

— جزا و سزا کے وقوع پر مظاہر قدرت کی قسم کھائی گئی ہے ۱۳۴

— آخرت کی جزا و سزا سے انسان بھاگ نہیں سکتا ۲۶۳-۲۶۴

— اصل ثواب و عذاب تو آخرت کا ہے ۲۴۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— آخرت میں کسی کا دوزخ سے بچ جانا اللہ کا احسان ہے ۱۶۷-۱۷۱
— مہلت عمل ختم ہو جانے کے بعد دنیا میں ہرگز کوئی مزید مہلت نہیں ملتی ۵۲۲
— اللہ نے نہ انسان کو معصوم بنایا ہے اور نہ وہ بھول چوک اور خطا سے معصوم ہے ۲۱۱-۲۱۲-۳۳۳-۳۳۴
— اللہ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۵۱-۵۲
— جزا و سزا کے بارے میں معتزلہ کا انتہا پسندانہ نقطہ نظر ۲۱۵

جزیہ
— اس کے متعلق اسلامی قانون ۱۵

جمعہ: دیکھو ''نماز''

جن
— ان کی تخلیق ۲۵۳-۲۵۶-۲۵۷
— جنات ایک مخصوص مادی جسم رکھتے ہیں ۲۵۷
— وہ بھی ایک فانی مخلوق ہیں ۲۶۰
— ان کی تخلیق کا مقصد ۱۵۵
— ان کے وجود کا انکار کرنے والوں کے شبہات کا ازالہ ۲۵۷
— جنات کی مختلف قوتوں کا ذکر ۲۵۷
— وہ انسان کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہیں اور جزا و سزا کے مکلف ہیں ۱۵۵- ۱۵۶- ۲۴۶- ۲۶۹
— انھوں نے حضور اکرمؐ سے سورہ رحمٰن سنی اور متاثر ہوئے ۲۴۵
— ان میں بھی کافر اور مومن موجود ہیں ۲۴۶
— انسانوں کی طرح ان کو بھی قرآن کا چیلنج کہ اگر خدا کی خدائی سے بھاگ کر نکل سکتے ہو تو نکل دیکھو ۲۶۳

جنت
— اہل ایمان کے لیے اس کی بشارت ۳۱۰
— وہ دنیا میں کیے ہوئے نیک اعمال کا بدلہ ہے ۱۶۷-۲۸۰
— وہ کن لوگوں کے لیے ہے؟ ۱۸-۱۹-۲۰-۲۱- ۴۶-۵۴-۱۲۲- ۱۳۸- ۱۶۷-۲۴۲-۲۶۶- ۲۶۷- ۲۷۷- ۲۷۸-۲۸۱- ۳۰۹- ۳۱۰- ۳۱۹-۳۶۷-۴۷۸-۵۴۰-۵۸۱
— اس کی نعمتیں ۲۱-۲۲-۲۳-۴۶- ۴۷-۵۴- ۱۲۴- ۱۳۸- ۱۶۷ تا ۱۷۱- ۲۴۲- ۲۶۷ تا ۲۷۲- ۲۷۸ تا ۲۸۲- ۲۹۵- ۳۱۰- ۳۱۹- ۳۶۷-۴۷۸-۵۴۰-۵۸۱
— اس کے مستحق لوگوں کی صفات ۱۲۲- ۱۲۳- ۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۳۰۹
— وہ محض روحانی نہیں بلکہ جسمانی و مادی ہوگی ۱۶۷ تا ۱۷۱-۲۷۸
— اس کی شراب کی حقیقت ۲۲- ۲۳- ۱۶۷- ۱۶۸-۱۷۰-۲۷۹
— اس کے پانی کی کیفیت ۲۲
— اس کے شہد کی حقیقت ۲۲-۲۳
— اس کے دودھ کی حقیقت ۲۲
— اس کے پھلوں کی حقیقت ۲۲- ۲۶۸- ۲۷۱- ۲۷۲-۲۷۹-۲۸۰

— اس کے گوشت کی حقیقت ۱۶۹-۱۷۰-۲۸۰

— جنت میں مزے سے کھانے پینے کا مطلب ۱۶۷-۱۶۸

— اہل جنت کے خدمت گاروں کی صفات ۱۷۰-۱۷۱-۲۷۹-۲۸۰

— جنت کی عورتیں ۲۶۹-۲۷۰

— حوران جنت کی صفات ۱۶۸- ۱۷۱- ۲۷۲-۲۸۰

جنتی مومن عورتوں کا رتبہ حوروں سے بلند ہوگا ۲۷۱-۲۷۲

— جنت نعیم ۲۷۷ تا ۲۸۰

— جنت الماویٰ ۱۹۸-۲۰۱

— جنات عدن ۴۷۸

— اہل جنت کی زندگی ہر قسم کی بے ہودگی اور لاف و گزاف سے پاک ہوگی ۲۸۰

— جنتیوں کی دنیوی کوتاہیوں پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دیا جائے گا ۲۲

— جنت میں داخلے سے پہلے بشری کمزوریوں کی بنا پر کی ہوئی تمام خطائیں معاف کر دی جائیں گی ۴۷

— جنتی جو کچھ چاہیں گے وہی ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ ۱۲۲ تا ۱۲۴-۲۸۰

— اہل ایمان کی صالح اولاد خواہ وہ ایمان میں کچھ کم درجے کی ہو، جنت میں ان کے ساتھ رکھی جائے گی ۱۶۸ تا ۱۷۰

— اہل ایمان کی وہ اولاد جو سن رشد کو پہنچنے سے پہلے

مرگئی جنت میں ہوگی ۱۶۹

— ہر جنتی کے لیے دو باغ ہیں ۲۶۷-۲۶۸

— کچھ جنتیوں کے لیے دو باغ کچھ کم درجے کے ہوں گے ۲۷۰

— دنیا میں کیے جانے والے نیک اعمال کے فرق مراتب کے مطابق جنت کی نعمتوں میں بھی فرق ہوگا ۲۷۷ تا ۲۸۲

— جنت کے مستحق افراد کے دو گروہ اور ان کے درجات ۲۷۷ تا ۲۸۲

— جنت کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی اور بلا روک ٹوک ملیں گی ۲۸۱

— جنت میں سب لوگ جوان ہوں گے ۲۶۸

— جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے کہ اللہ اہل جنت کی مغفرت فرما دے گا ۲۲

— اہل ایمان جنت میں ہمیشہ رہیں گے ۴۶-۱۲۲-۳۱۰-۳۶۷-۴۷۸-۵۴۰-۵۸۱

— اہل جنت کی لافانی زندگی سے متعلق ایک شبہہ کا ازالہ ۳۰۳

— اصلی اور سچی عزت جنت کا داخلہ ہی ہے ۲۴۲

— خدا کی جنت میں داخل ہونا بہت بڑی کامیابی ہے ۴۷-۳۱۰-۴۱۰-۴۷۸-۵۴۱

— جنت اسی سرزمین پر ہوگی ۲۰۱

— جنت کی وسعت ساری کائنات جیسی ہے ۳۱۸-۳۱۹

— اہل جنت کی باہمی گفتگو ۱۷۱

— اہل جنت کو جنت جانی پہچانی جگہ معلوم ہوگی ۲۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ ٹھیک وہی جنت ہوگی جس کا دنیا میں وعدہ کیا گیا ہے ۱۲۲
— اہل ایمان کے قریب جنت لے آئی جائے گی اور انھیں سلامتی کے ساتھ اس میں داخل کیا جائے گا ۱۲۲-۱۲۳
— قیامت کے روز فیصلے کے بعد متقین کے جنت پہنچنے میں کوئی تاخیر نہ ہوگی ۱۲۲
— جنت اللہ کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ۳۱۹
— اہل جنت پر اللہ اور اس کے فرشتوں کا سلام ۱۲۳
— اہل جنت سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۳۶۷
— اہل جنت اور اہل جہنم ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوسکتے ۲۲-۲۳-۴۱۰
— جنت میں نیک انسانوں کی طرح نیک جن بھی داخل کیے جائیں گے ۲۶۹
— دنیا میں اگر کوئی غلام ہے تو آخرت میں وہ غلام نہ ہوگا ۱۷۰-۱۷۱

جنگ: دیکھو "جہاد فی سبیل اللہ"

جنگ بدر: دیکھو "بدر"

جہاد فی سبیل اللہ

— اس کی فضیلت ۴۵۴-۴۵۶-۴۷۷-۴۷۸
— اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے والے ہی حقیقت میں مومن ہیں ۱۰۱
— جب جہاد برپا ہو تو جان و مال دونوں سے جہاد کرنا فرض ہے ۳۰۸
— جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان و مال سے حصہ لینا وہ تجارت ہے جو جہنم کے عذاب الیم سے بچا سکتی ہے ۴۷۷-۴۷۸
— جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کا حکم ۳۰۵-۳۰۶
— فتح سے پہلے جان و مال سے جہاد کرنے والے فتح کے بعد ان اعمال کے کرنے والوں سے افضل ہیں ۳۰۸-۳۰۹
— ہجرت کے بعد اللہ کا مسلمانوں سے وعدہ کہ وہ ان کو کفار پر غالب کرے گا ۷-۸
— مسلمانوں سے اللہ کا وعدہ کہ وہ اگر اس کی راہ میں جان لڑائیں گے تو وہ ان کی مدد کرے گا ۱۹
— مسلمان اگر سچے مومن ہوں تو وہی غالب ہوں گے ۳۰-۳۱
— کفر و اسلام کی جنگ میں مومن اور منافق کا فرق کھل جاتا ہے ۷-۱۱-۲۵-۲۶-۲۹-۵۲ تا ۵۴
— کفر و اسلام کے معرکے میں کسی مسلمان کے لیے کفر اور کفار سے دوستی منافی ایمان حرکت ہے ۴۲۲
— کفر و اسلام کی جنگ میں جو اسلام کا وفادار نہیں وہ منافق ہے ۲۹
— مسلمانوں کو جنگ کا پہلا حکم کن حالات میں دیا گیا ۶-۷
— جنگ کا حکم دینے کے بعد ابتدائی ہدایات جو مسلمانوں کو دی گئیں ۱۱ تا ۱۳
— کفر و اسلام کی جنگ میں اللہ اہل ایمان کی آزمائش کرتا ہے ۱۸-۱۹
— اللہ تعالیٰ کس لیے مسلمانوں کو معرکہ کفر و اسلام کی

آزمائش میں ڈالتا ہے ۲۶-۲۷-۴۵-۴۶

— کفر و اسلام کی جنگ میں عورتیں کس طرح اجر میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہوسکتی ہیں ۴۶-۴۷

— حکم جہاد کی جو بھی اطاعت کرے گا اجر کا مستحق ہوگا ۵۳

— حکم جہاد سے منہ موڑنے والوں کا انجام ۵۴

— اللہ کی راہ میں صف بستہ ہوکر جہاد کرنے کا حکم ۴۵۶-۴۵۷

— اللہ کی پسندیدہ فوج کی تین صفات ۴۵۶-۴۵۷

— اللہ تعالیٰ مجاہدین سے محبت کرتا ہے ۴۵۴-۴۵۶

— جہاد میں شہید ہونے والوں کے اعمال ہرگز ضائع نہ ہوں گے ۱۸

— اللہ تعالیٰ میدان جنگ میں مجاہدین کے قدم جما دے گا ۱۹

— مومن بے چینی سے جہاد کا انتظار کرتا ہے ۲۵-۲۶

— جنگ میں شریک نہ ہونے کے جائز عذرات کون سے ہیں ۵۴

— جہاد کے لیے والدین اگر مسلم ہوں تو ان سے اجازت لینی چاہیے لیکن اگر کافر ہوں تو ان کے روکے رکنا جائز نہیں ہے ۵۴

— اسلام نے جہاد کا حکم اس لیے دیا ہے کہ مخالف یا تو ایمان لائے، یا اسلامی اطاعت قبول کرے، یا پھر جنگ کرے ۵۳

— اللہ تعالیٰ نے راہ حق کی حفاظت کے لیے جہاد کی اجازت دی ۹ تا ۱۱

— قتال کے معنی لازماً ہتھیاروں سے جنگ ہی کرنے کے نہیں ہیں ۷۷

— جہاد فی سبیل اللہ امت محمدیہؐ کے لیے روحانی ترقی کا راستہ ہے ۴۵-۴۶-۳۲۴-۳۲۵

— اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے والے شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور شکست ان کا مقدر ہے ۳۶۵

— اہل ایمان کے خلاف لڑنے والوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے، یہ اللہ کی مستقل سنت ہے ۵۷

— اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے سخت سزا ہے ۳۸۶

— کیا دوران جنگ میں مسلم فوج دشمن کے ان مقامات پر بھی گولہ باری کر سکتی ہے جہاں مسلمانوں کی موجودگی کا علم یا احتمال ہو؟ ۵۹-۶۰

— مسلمانوں کے درمیان اگر آپس میں لڑائی (خانہ جنگی) ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے ۷۶ تا ۸۳

— آپس میں لڑنا مسلمانوں کا کام نہیں ہے ۷۶

— مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان انصاف قائم کرنے کے لیے لڑنا ضروری ہو تو یہ لڑائی جہاد ہے ۷۷

— ''باغیوں'' سے جہاد کرنا بعض فقہاء کے نزدیک کفار سے جہاد کرنے کی بہ نسبت افضل ہے ۷۷

— مسلمانوں کو دب کر صلح نہیں کرنی چاہیے ۳۰

— اسلامی نظام میں معاہدات کا احترام ۳۹-۴۰

— کفار کے جنگی قیدیوں سے متعلق احکام ۱۲-۱۳-۱۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— جنگی قیدیوں کے بارے میں شریعت نے مسلمانوں کو کسی خاص صورت کا پابند نہیں کیا ہے بلکہ احسان یا فدیہ میں سے کوئی صورت بھی حسب توقع اختیار کی جاسکتی ہے ۱۴

— قیدیوں کے ساتھ احسان کی مختلف صورتیں ۱۴ تا ۱۷

— کفار کے قیدیوں کو بلا فدیہ بطور احسان رہا کرنا ایک خاص رعایت ہے جو حددرجہ احتیاط کی متقاضی ہے ۱۶-۱۷

— فدیہ کی مختلف صورتیں ۱۴-۱۷-۱۸

— جنگی قیدی اسلامی حکومت کا مہمان ہے ۱۴

— جنگی قیدی اگر قید ہونے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو تو آزاد کر دیا جائے گا ۱۴-۱۵

— قید ہو جانے کے بعد اسلام قبول کرنا رہائی کا موجب نہیں ہوسکتا ۱۵

— جنگی قیدی کو ہمیشہ قید رکھنے کا دستور اسلام میں نہیں ہے ۱۴

— اسیران جنگ کے تبادلے کی گنجایش اسلام میں پہلے ہی رکھ دی گئی ہے ۱۸

— دشمن کو میدان جنگ میں قتل کیا جاسکتا ہے لیکن قید کرنے کے بعد قتل کرنا منع ہے ۱۲-۱۳

— مذکورہ حکم سے استثناء کی صورت اور اس کی چند عملی مثالیں ۱۳

— قید کرنے کے بعد قتل کرنے کا فیصلہ کرنا فرد کا کام نہیں بلکہ حکومت کا کام ہے ۱۳ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، قانون صلح و جنگ'')

جہنم

— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۲۱-۴۷-۵۱-۵۴-۱۱۹-۱۳۵-۱۳۶-۱۵۷-۱۶۶-۲۴۰-۲۶۵-۲۷۷-۲۷۸-۲۸۲ تا ۲۸۴-۲۹۵-۳۱۳-۳۱۷-۳۵۹-۳۸۴-۴۰۹-۵۴۱

— اس کی کیفیت ۲۲-۲۳-۵۱-۱۱۹-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۸-۱۶۶-۱۷۱-۲۴۰-۲۶۵-۲۸۲-۲۸۴ تا ۲۹۵-۲۹۶-۳۵۹-۴۰۹

— اس میں کفار کی دردناک حالت ۱۳۸-۱۶۶-۱۶۷-۲۴۰-۲۶۵-۲۸۲-۲۹۶-۳۱۷

— جہنمی بدنصیب لوگ ہیں ۲۷۷

— جہنم کا دوام ۲۲-۲۳-۲۶۵-۳۰۹-۵۴۱

— اہل جہنم کے لیے ابدی عذاب کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ۳۰۳

— انسان کو جہنم کا مستحق بنانے والی صفات ۱۱۹-۱۲۰

— کفار کو دھکے مار مار کر جہنم میں ٹھونسا جائے گا ۱۱۹-۱۶۶-۱۶۷-۲۶۵

— کفار منہ کے بل جہنم میں گھسیٹے جائیں گے ۲۴۰

— کفار جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان دوڑتے پھریں گے ۲۶۵-۲۶۶

— جہنمیوں کا پیاس کے مارے برا حال ہوگا ۲۶۶-۲۸۲-۲۸۴

— اہل جہنم کی غذا زقوم اور کھولتا ہوا پانی ہوگا ۲۳-۲۸۴-۲۹۶

— اللہ تعالیٰ کا جہنم سے پوچھنا کہ کیا تو بھر گئی ہے؟ اور اس کا کہنا کہ کیا اور بھی کچھ ہے؟ ۱۲۱

— جہنمیوں سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ۱۳۸- ۱۶۶- ۱۶۷- ۲۶۵

جہنم میں جانا بدترین انجام ہے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے ۴۷-۳۱۳-۳۵۹-۵۴۱

— شیطان اور اس کے پیرو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ۴۰۹

— یہود کے لیے عذاب جہنم مقرر ہے ۳۸۴- ۳۸۵

— جہنم کے عذاب الیم سے بچنے کی صورت ۴۷۷- ۴۷۸

— اہل جہنم خواب صبر کریں یا جزع فزع کریں، ان کی داد فریاد کوئی نہ سنے گا ۱۶۷

— جہنم میں خوش حال لوگوں کی کثرت ہوگی کیونکہ دنیا میں انھیں خوش حالی کے باعث گناہ پر اصرار تھا ۲۸۳

— جہنم سے اللہ کا کلام مجازی ہے یا وہ ناطق ہے کہ جس کی بنا پر اس سے اللہ تعالیٰ اس طرح بات کرے گا جیسے ذی روح اشخاص سے بات کی جاتی ہے؟ ۱۲۱

— جہنم دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا بدلہ ہے ۱۶۷

— اہل جنت اور اہل جہنم ہرگز یکساں نہیں ہو سکتے ۲۲-۲۳-۴۱۰

چ

چوری

— اس کی حرمت ۴۴۵

ح

حاطبؓ بن ابی بلتعہ

— ان کا قصہ ۴۲۰-۴۲۲ تا ۴۲۸

— اس واقعہ پر قرآن کا تبصرہ ۴۲۲ تا ۴۳۲-۴۵۰

— انھوں نے یہ فعل بشری کمزوری کی وجہ سے کیا تھا نہ کہ اسلام سے انحراف اور کفار سے دوستی کی خاطر ۴۲۳

— ان کے واقعہ پر قرآنی تبصرے اور حضور اکرمؐ کے طرز عمل سے اخذ کردہ قانونی احکام ۴۲۵ تا ۴۲۸

حبط اعمال

— کن لوگوں کے اعمال ضائع ہوتے ہیں ۹-۲۰-۲۹-۳۰-۷۰

— کن کے اعمال ضائع نہیں ہوتے ۳۰

حج

— حج بدل کن افراد کے لیے ہو سکتا ہے ۲۱۸

— مرنے والے کے لیے حج بدل کی صورت ۲۱۸

حدیبیہ

— دیکھو "صلح حدیبیہ"

حدود اللہ: ۵۶۶-۵۶۷

— ان سے مراد احکام خداوندی ہیں ۳۵۶- ۵۶۵

— ان سے تجاوز کرنے کی ممانعت ۳۵۶

— اللہ کے احکام کے خلاف قانون سازی حدود اللہ سے تجاوز ہے ۳۵۶- ۳۵۷

— حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا خود اپنی جان پر ظلم کرتا ہے ۵۶۵

— حدود اللہ کا انکار کرنے والے ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں ۳۵۶- ۳۵۷

— حدود اللہ کا انکار اللہ اور اس کے رسول سے انکار کے مترادف ہے ۳۵۵ تا ۳۵۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— حدود اللہ توڑنے والوں کا انجام ۳۵۵

حدیث

— حدیث کس طرح قرآن کی تشریح کرتی ہے ۱۱-
۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-
۴۳-۴۴-۴۹-۷۱-۸۱-۸۳-۸۴-۸۸ تا
۹۴-۹۷-۹۸-۱۲۶-۱۸۰-۱۸۴-۱۸۵-
۱۸۸-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۹-۲۰۲ تا ۲۰۶-۲۱۶-
۲۱۸-۲۱۹-۲۲۴-۲۴۴-۲۴۵-۲۷۰-۲۷۱-
۲۷۸-۲۸۲-۲۸۳-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۶-
۳۹۸-۳۰۳-۳۰۶-۳۰۷-۳۱۰-۳۱۱-
۳۱۷-۳۱۸-۳۲۴-۳۲۵-۳۳۳-۳۴۲-
۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۷-۳۷۰-
۳۸۷-۳۹۱-۳۹۴-۳۹۶-۴۰۴-۴۱۷-
۴۲۳-۴۲۴-۴۳۳-۴۴۱-۴۴۵-۴۴۶-
۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۵-۴۸۲-۴۹۳-
۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۵۰۲-۵۰۳-
۵۰۵-۵۱۲-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۲-۵۴۵-
۵۴۶-۵۵۲-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۹-۵۶۳-
۵۷۱-۵۷۲-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷

— ایک روایت پر تنقید بلحاظ روایت و درایت ۵۷۵ تا ۵۷۷

— احادیث کی روایت بالمعنی سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو کس طرح دور کیا جائے ۴۳۴-۴۳۵

— حدیث کا عربی زبان میں بلند مقام ۱۷۸

— حدیث میں اللہ کے ننانوے نام گنوائے گئے ہیں ۴۱۷

— محدثین نے علم حدیث میں راویوں کے حالات کی تحقیق کا قاعدہ قرآن مجید سے اخذ کیا ہے ۷۳-۷۴-۴۳۷

— دین میں سنت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید سے ۴۹۲-۴۹۳

حدید (لوہا):

— اس کے اتارے جانے کا ذکر ۳۲۱

— اس سے مراد قوت اور اقتدار ہے ۳۲۲

حساب

— دیکھو "قیامت" اور "آخرت"

حشر و نشر

— حشر کے معنی ۳۸۱

— اس روز تمام روئے زمین کے لوگ آوازہ حشر کو سن لیں گے ۱۲۷

— اس روز زمین پھٹ جائے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیزی سے بھاگے جا رہے ہوں گے ۱۲۷

— وہاں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے ۳۶۰

— اس کا برپا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۱۲۷

— اس کو محال سمجھنا حماقت ہے ۱۶۵

— میدان حشر میں نور صرف مومنین کے لیے مخصوص ہوگا ۳۰۹ تا ۳۱۱-۳۱۵-۳۱۷-۳۳۳

— میدان حشر میں مومنین کے نور کا صرف دائیں طرف دوڑنا کیوں مذکور ہے؟ ۳۱۱

— منافقین کو میدان حشر میں نور نہ دیا جائے گا ۳۱۱

— میدان حشر میں مومنین اور منافقین کے درمیان دیوار حائل کر دی جائے گی ۳۱۱-۳۱۲
— میدان حشر میں مومنین اور منافقین کی گفتگو ۳۱۱ تا ۳۱۳
— منافقین پکار پکار کر مومنین کو دنیا کی رفاقت کا واسطہ دیں گے ۳۱۲-۳۱۳
— میدان حشر میں کسی کا نور کسی دوسرے کے کام نہ آئے گا ۳۱۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''قیامت'')

حق

— حق کی پیروی اہل ایمان ہی کرتے ہیں ۱۱
— حق کی پیروی کرنے والوں کو اللہ ان کی حیثیت بتا دے گا ۱۱
— حق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے آثار کائنات کے مشاہدے کی ہدایت ۲۰
— حق کو اللہ تعالیٰ نے کن کن ذرائع سے واضح فرمایا ہے ۲۴
— حق و باطل کے معرکے کا انجام ضرور ظاہر ہو کر رہنا ہے ۲۳۱

حقوق العباد۔

— مسلمانوں کے حقوق ایک دوسرے پر ۶۳-۷۸-۸۳-۸۴-۸۵-۸۷-۳۱۷-۳۹۵-۳۹۶
— آپس کی جنگ میں مبتلا ہو جانے والوں کا حق دوسرے مسلمانوں پر ۷۶ تا ۷۸
— مومنین کے مالوں میں سائلوں اور محروم افراد کا حق ہے ۱۳۹
— غیر دشمن کافر کے حقوق ۴۳۲-۴۳۳
— عورت پر شوہر کا حق ۴۴۵-۴۴۶
— مطلقہ بیوی کے حقوق ۵۶۶-۵۷۳-۵۷۷-۵۷۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی نظم جماعت'')

حقوق اللہ

— ۱۹-۲۴-۱۰۱-۲۵۱-۴۴۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''احکام القرآن'')

حکمت

— حکمت بالغہ ۲۳۲
— اللہ تعالیٰ کی بے پایاں حکمت کا ذکر ۲۸۸-۲۸۹
— حکمت تبلیغ ۱۵۲-۱۵۴-۱۵۵-۲۱۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''دعوت حق'')

حلال وحرام

— قطع رحمی حرام ہے ۲۶-۲۷
— بیوی سے ظہار کرنا حرام ہے ۳۴۱
— بندہ مومن کے لیے احکام حلال وحرام کی پابندی لازمی ہے ۵۴۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان''، ''قانون اسلام'' اور ''حدود اللہ'')

حمد

— حمد ربانی سے مومن دشمنوں کے مقابلے میں قوت حاصل کرتا ہے ۱۶۱
— حمد ربانی کا حکم ۱۸۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تسبیح'')

حور

— دیکھو ''جنت''

حیض

— دیکھو ''قانون نکاح وطلاق''

Maktaba Tul Ishaat.com

خ

ختم نبوت

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ۲۴

— تورات کی گواہی کہ آخری نبی بنی اسماعیل میں سے ہوگا ۲۶۰

خروج

— خروج (مسلح بغاوت) کے متعلق اسلامی قانون ۷۹ تا ۸۳

— ظالم و فاسق امراء کے خلاف اہل عدل کے خروج کو ''بغاوت'' قرار دینے پر فقہاء کا اجماع ثابت نہیں ہے ۷۹ تا ۸۱

خسران

— کن لوگوں کے لیے ہے ۴۹-۵۲۲

خلافت

— اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیوی مال و متاع اپنے خلیفہ کی حیثیت سے دیا ہے ۳۰۵-۳۰۶-۳۰۸

د

دعا

— دیکھو ''قرآنی دعائیں''

دعوت حق

— دعوت حق کے لیے کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ''مددگار'' قرار دیا ہے ۱۸- ۱۹- ۲۰- ۳۲۲-۳۲۳-۳۹۵-۴۷۹-۴۸۰

— باطل کے مقابلے کی خدمت اللہ ایمان ہی سے لینا چاہتا ہے ۱۸

— دعوت حق کی راہ میں پیش آنے والے دل شکن حالات میں نماز ہی ایک ذریعہ ہے جو انسان کو تقویت دیتا ہے ۱۲۵

— دعوت حق کی راہ میں پیش آنے والے مصائب میں ایمان باللہ ہی انسان کو راہ راست پر رکھتا ہے ۵۴۱-۵۴۲

— دعوت حق کے کام میں ظالموں نے جس کی بے قدری کی وہی اللہ کی طرف سے نصرت کا مستحق ہوا ۲۳۳

— دعوت حق کو ٹھکرانے والے انجام بد دیکھیں گے ۳۲۲

— دعوت حق کا کامیابی سے ہمکنار ہونا اللہ کی نعمت کی تکمیل ہے ۴۳-۴۴

— دعوت حق صرف حق کی پکار ہی نہیں ہے بلکہ وہ غالب نظام زندگی ہونے کا تقاضا بھی کرتی ہے ۶۲-۶۳-۴۷۷

— دعوت حق کے مقابلے میں سرکشی اور عناد برتنے والوں کی سزا دنیا اور آخرت میں ۳۵۵ تا ۳۵۷

— داعی حق جب معقول طریقے سے اپنی بات سمجھا چکے اور مخاطب صریح بے التفاتی برتے تو داعی حق کو کیا کرنا چاہیے؟ ۶۱-۱۵۴-۱۵۵-۲۱۰

— اللہ کے دین کو روکنے کے لیے کفار کی تمام تدابیر ناکام و نامراد ہوں گی ۲۶-۳۰

— دعوت حق کے لیے خواہ کتنا ہی کام کیا جا چکا ہو اس زعم میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہوسکتا تھا وہ ہم نے کر دیا ہے ۲۵

— دعوت الی اللہ اور اسلامی تعمیر نو کے لیے کام کرنے والوں کے بارے میں غلط فہمیاں ۴۷

— دعوت حق کے کام میں اگر بیوی بچے اور قریب ترین رشتہ دار بھی حائل ہوں تو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے ۵۴۳ تا ۵۴۵

— کش مکش جب پیش آتی ہے تو منافق کا طرزِ عمل مومن سے الگ نمایاں ہو جاتا ہے ۲۵ تا ۲۷
— دعوتِ حق کے لیے کام کرنے والے آپس میں نرم اور کفار کے مقابلے میں سخت ہوتے ہیں ۶۳
— مسلمانوں کا متحد ہو کر راہِ حق میں کام کرنا اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے ۴۵۶-۴۹۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حق'' اور ''دین حق'')

دنیا
— دنیوی زندگی کی حقیقت ۲۱- ۲۹۹- ۳۰۰- ۳۱۷-۳۱۸
— دنیوی زندگی کی مثال ۳۱۷
— دنیوی زندگی ایک کھیل اور تماشا ہے ۳۱
— دنیا کی خوش حالی اور نعمتوں کی حیثیت ۲۱
— دنیا کے مال و دولت کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ انسان اس کا مالک ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ اپنے خلیفہ کی حیثیت سے انسان کے تصرف میں دیا ہے ۳۰۵-۳۰۶-۳۰۸
— دنیا چھوڑنے کے لیے نہیں بلکہ برتنے کے لیے ہے ۳۲۴-۳۲۵
— دنیوی زندگی کا صحیح مصرف ۳۱۸
— دنیا کی زندگی کے ظاہری پہلو سے انسان کس کس طرح دھوکا کھاتا ہے ۲۸۳-۳۱۸
— دنیا کی زندگی نہیں آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ۴۸
— دنیوی زندگی اور اخروی زندگی کا موازنہ ۳۱۷ تا ۳۱۹
— دنیوی زندگی میں نورکن کو دیا جاتا ہے ۳۳۳

دوزخ
— دیکھو ''جہنم''

دین
— بمعنی طریقہ اور ملت ۱۰۲
— بمعنی جزائے اعمال ۱۳۲-۱۳۵-۲۸۴
— ایک جامع اصطلاح بمعنی نظامِ زندگی ۶۲- ۴۳۲-۴۷۷

دینِ حق
— اللہ کے دین سے روکنے والوں کو دنیا و آخرت میں کیا سزا دی جاتی ہے ۹-۲۹-۳۰
— اللہ کے دین سے روکنے (صدعن سبیل اللہ) کی مختلف صورتیں ۹
— اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا تھا کہ اسے تمام نظامِ زندگی پر غالب کر دیں خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو ۶۲-۶۳-۴۷۷
— دینِ حق مغلوب ہو کر رہنے کے لیے نہیں آیا ہے ۶۲-۶۳
— دینِ حق پر ایمان لانے والے کو مال و اولاد سے محبت اس حد تک نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ایمان پر غالب آ جائے ۳۶۶- ۴۲۲ تا ۴۲۵- ۵۲۲- ۵۴۳-۵۴۵

ذ

ذکر
— ذکر بمعنی نصیحت ۲۱۰- ۲۳۴- ۲۳۶- ۲۳۸- ۲۳۹-۵۸۰
— ذکر بمعنی وحی ربانی ۲۳۶
— ذکر بمعنی قرآن ۲۱۰-۳۱۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— ذکر بمعنی یادالٰہی ۲۱۰-۳۱۳
— ذکر بمعنی نماز اور خطبہ جمعہ ۴۹۲-۴۹۵
— مال و اولاد کی محبت اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی چیز ہے ۵۲۱-۵۲۲
— ذکر الٰہی سے غفلت اصل خسارہ ہے ۵۲۲
— ذکر الٰہی سے روگردانی کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا حکم ۲۱۰
— کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والوں کو فلاح نصیب ہوتی ہے ۴۹۷-۴۹۸
— ذکر الٰہی ہر حال میں کرتے رہنا چاہیے ۴۹۷-۴۹۸
— ذکر بعد نماز کی اہمیت اور مقصد ۱۲۶

ر

رب

— رب عظیم ۲۹۰-۲۹۶
— رب ذوالجلال والاکرام ۲۶۱-۲۷۲
— رب بمعنی آقا و مالک ۲۲۰
— انسانوں کا رب ۳۰۷- ۳۱۵- ۴۲۲- ۵۲۲- ۵۶۳
— وہ بڑا رؤف و رحیم ہے ۴۰۳
— وہ بڑا دانا اور زبردست ہے ۴۳۰
— وہ مشرق اور مغرب کا رب ہے ۲۵۶
— وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے اور کون بھٹک گیا ہے ۲۱۱
— ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر اس کی ذات باقی رہے گی ۲۶۰
— زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اسی سے اپنی حاجات طلب کرتی ہیں ۲۶۱
— وہ ہر آن نئی شان میں ہوتا ہے ۲۶۱
— رب اور اس کے رسولوں کے احکام سے روگردانی کرنے والوں کا انجام ۵۸۰
— زندگی بعد موت کے برحق ہونے پر اس کی قسم ۵۳۴
— اس کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھنے والوں کے لیے انعامات ۲۶۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اللہ'' اور ''الٰہ'')

رحم

— معنی و تشریح ۲۷
— صلہ رحمی کی تعریف اور قطع رحمی کی حرمت ۲۶-۲۷

رحمت

— روز قیامت مومنین پر اللہ کی رحمت ہوگی ۳۱۱
— اللہ کی رحمت کا دوہرا حصہ کن لوگوں کو ملے گا ۳۳۳

رزق

— رزق کا مفہوم ۱۴۳
— اللہ نے بندوں کے رزق کا بہترین انتظام کیا ہے ۱۱۳
— اللہ خود ہی تمام مخلوق کا رازق ہے ۱۵۵-۱۵۶
— اللہ انسانوں اور جانوروں کے رزق کے لیے غلہ اور چارہ اگاتا ہے ۲۵۲-۲۵۳
— تمام انسانوں کا رزق آسمانوں میں ہے ۱۴۳
— جو کوئی اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے لیے ایسے راستہ سے رزق کا انتظام کرتا ہے جدھر اس کا گمان بھی نہیں جاتا ۵۶۷

رسالت، رسول

— دیکھو ''نبوت''

روزہ

— کفارہ ظہار کے روزوں کے لیے ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق''

رہبانیت -۳۲۴ تا ۳۳۳

— اس کا اللہ نے حکم نہیں دیا بلکہ وہ بدعت ہے ۳۲۴

— اسلام میں اس کی گنجایش نہیں ۳۲۴-۳۲۵

— امت مسلمہ کی روحانی ترقی کا راستہ جہاد فی سبیل اللہ ہے ۳۲۴-۳۲۵

— عیسائیوں میں رہبانیت کی تاریخ اور اس کا ارتقاء ۳۲۵ تا ۳۳۳

— اس کے آغاز کا اسباب ۳۲۷-۳۲۸

— وہ ایک انتہا پسندی ہے ۳۲۶

— وہ یونانی افکار کا نتیجہ تھی ۳۲۱

— اس کے بڑے بڑے آئمہ ۳۲۶

— اس کا آغاز مصر سے ہوا ۳۲۷

— رہبانیت کی خصوصیات ۳۲۷ تا ۳۳۳

— گندگی رہبانیت کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی ۳۲۸

— اس نے تمام رشتے کاٹ کر رکھ دیے ۳۳۰-۳۳۱

— اس نے ازدواجی زندگی کی بالکل نفی کر دی ۳۲۸-۳۲۹

— اس میں رشتہ داروں سے محبت کو گناہ سمجھا جاتا ہے ۳۳۱

— اس میں قریبی رشتہ داروں پر ظلم کرنا بہت بڑی نیکی ہے ۳۳۱

— ترک دنیا کے پردے میں راہب کس طرح دنیا سمیٹنے لگے ۳۳۲

— رہبانیت فطرت سے لڑائی ہے اس لیے اس نے بری طرح شکست کھائی ۳۳۲

ز

زکوٰۃ

— زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ۲۶۳

— زکوٰۃ دینے کے بعد بھی آدمی کے مال میں خدا اور بندوں کا حق رہتا ہے ۱۳۹

— زکوٰۃ کی یہ اہمیت کہ جو گروہ اس سے انکار کرے اس سے جنگ کی جا سکتی ہے ۴۷-۴۳

(نیز دیکھو ''صدقہ'' اور ''انفاق فی سبیل اللہ'')

زمین

— اس کی تخلیق اور اس کے معاملات کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ۱۱۰ تا ۱۱۴-۱۲۴-۱۴۰-۱۴۱-۱۵۰-۱۵۱-۳۰۳-۳۰۴-۳۱۴-۵۸۱ تا ۵۸۳

— اللہ نے اس کو بچھایا اور اس پر پہاڑ جمائے ۱۱۰-۱۱۲

— اللہ نے اس کو بچھایا اور ہموار کیا ۱۵۱

— اللہ نے اسے ہر قسم کی مخلوقات کے لیے بنایا ۲۵۲

— زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں میں بھی مخلوقات موجود ہیں ۵۸۱ تا ۵۸۳

— زمین میں سمندر کس طرح انسانوں کے لیے نعمت ہیں ۲۵۹-۲۶۰

— زمین اور آسمانوں کے درمیان اللہ کا حکم جاری ہوتا ہے ۵۸۱-۵۸۲

— زمین پر پانی کے دو ذخیروں کی الگ الگ

Maktaba Tul Ishaat.com

خاصیتیں اور فوائد ہیں ۲۵۹
— زمین انسان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے اللہ کے پاس اس کا پورا ریکارڈ موجود ہے ۱۰۹

زنا

— اس کی حرمت ۴۴۵

زندگی بعد موت

— اس کا مقصد ۵۳۴ تا ۵۳۶
— اس کے عقلی و نقلی دلائل ۱۰۸-۱۰۹-۱۱۳-۱۱۴-۱۲۷-۱۲۸-۲۲۰-۲۲۱-۲۸۵
— وہ ایک یقینی امر ہے ۱۲۷- ۲۸۳ تا ۲۸۵-۳۵۶-۵۳۴
— اس کے وقوع پر اللہ کی قسم ۵۳۴
— موت کے بعد پھر زندہ کرنا اللہ کا ذمہ ہے ۲۲۰-۲۲۱
— انسان دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ اسے ایک دن اپنے خالق کے سامنے پیش ہونا ہے ۵۳۱
— دوسری زندگی میں لوگوں کو ان کے اعمال سے باخبر کر دیا جائے گا ۵۳۵
— جواب دہی کو موت کے بعد دوسری زندگی تک کیوں موخر کیا گیا ہے اور موجودہ زندگی میں وہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ ۵۳۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''حشر'' اور ''قیامت'')

س

سارہ

— حضرت ابراہیمؑ کی بیوی، حضرت اسحاق علیہ السلام کی والدہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی دادی ۱۴۵
— وہ بانجھ تھیں اور نوے سال کی عمر میں اللہ نے ان کے ہاں بچہ پیدا کیا ۱۴۴-۱۴۵
— بیٹے کی بشارت پر ان کا تعجب ۱۴۵

ساعت

— دیکھو ''قیامت''

سجدہ

— اللہ کے آگے سجدہ کرنے کا حکم ۲۲۳
— سب سے پہلی سورت جس میں سجدۂ تلاوت کی آیت نازل ہوئی ۱۸۸
— سجدۂ تلاوت ۲۲۳-۲۲۴
— سورۂ نجم سن کر کفار کا بے ساختہ سجدے میں گر جانا ۱۸۸-۲۲۴
— اللہ کے سامنے کائنات کی ہر چیز سجدہ ریز ہے ۲۵۰

سدرۃ المنتہیٰ

— اس کی حقیقت ۲۰۰

سکینت

— اس کے مختلف مفہوم ۴۵-۵۶-۶۱
— اللہ مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرماتا ہے ۴۵-۵۶-۶۱

سلام

— سلام کا مطلب ۱۲۳-۱۴۴
— سلام بمعنی کلام سلیم ۲۸۰-۲۸۱
— حضرت ابراہیمؑ اور فرشتوں کا ایک دوسرے کو سلام کرنا ۱۴۴
— اصحاب یمین کے لیے سلام ۲۹۵

سود

— سودخوری میں یہودیوں کی مثال نہیں ملتی ۴۷

ش

شرک

— اس کے معنی ۲۶۲
— اس کی ممانعت ۱۵۲-۴۴۵
— وہ ایک باطل اور بے اصل چیز ہے ۱۸۲-۱۸۳-۱۹۰
— ہر مشرک خدا کی کسی نہ کسی صفت کا منکر ہے ۲۶۲
— مشرکین نے محض گمان کی بنیاد پر کچھ معبود گھڑ لیے ہیں ۱۹۰-۲۰۸
— مشرکین خواہشات نفس کے پیرو ہوتے ہیں ۲۰۸
— مشرکین باپ دادا کے اندھے مقلد ہیں ۲۰۸
— اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا احسان فراموشی ہے ۲۵۵
— اللہ شرک سے پاک ہے ۱۸۲-۱۸۳-۴۱۵-۴۱۶
— مشرکین کا انجام بد ۴۷
— مشرکین کی حماقتوں پر طنز ۱۷۹-۱۸۰
— مشرکین عرب اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے تھے ۱۸۰-۲۰۶
— مشرکین کو دین حق کا قیام ناگوار گزرتا ہے ۴۷۷
— مشرکین برائی کے پھیر میں خود ہی پھنس گئے ہیں ۴۷

شریعت

— دیکھو ''اصول فقہ'' اور ''قانون اسلام''

شفاعت

— شفاعت وہی کر سکتا ہے جس کو اللہ اجازت دے اور اسی کے حق میں کر سکتا ہے جس کے لیے اللہ اجازت دے ۲۰۹
— کسی کا یہ زور نہیں کہ وہ اپنے بل بوتے پر اللہ سے اپنی شفاعت منوا سکے ۴۲۹
— منافقین کے حق میں پیغمبر کی شفاعت بھی قابل قبول نہیں ۵۲۰
— تمام ملائکہ مل کر بھی سفارش کریں تو مجرمین کو عذاب سے نہیں بچا سکتے ۲۰۹

شک

— اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ تمام شکوک سے پاک ہو کر وہ دین پر پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں ۱۰۱
— شک کرنے والے اور شک پیدا کرنے والے کافر ہیں ۱۰۱-۱۱۹
— منافقین کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں شک میں پڑے رہتے ہیں ۳۱۲
— حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کی تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر جھٹلایا ۲۳۸
— شک کرنے والوں کا انجام ۱۳۵-۲۲۲-۲۳۸-۲۳۹-۳۱۲-۳۱۳

شہید

— لفظ شہید کے معنی ۳۱۶ تا ۳۱۸
— اللہ شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دیتا ۱۸-۱۹
— اللہ شہداء کو جنت میں داخل فرمائے گا جس سے

Maktaba Tul Ishaat.com

وہ پہلے ہی انھیں واقف کر چکا ہے ۱۹
— شہداء کی روحیں جنت الماویٰ میں رکھی جاتی ہیں ۲۰۱
— اہل ایمان کو شہید کیا گیا ۳۱۵
— شہید بمعنی گواہ ۶۲ - ۳۵۶ - ۴۰۶

شیطان

— وہ بڑا دھوکا باز ہے ۳۱۳
— وہ کفار کا ساتھی ہے اور انھیں مسلسل گمراہ کرتا رہتا ہے ۱۲۰
— ہدایت سے منہ موڑنے والوں کو وہ اپنے دام میں پھانس لیتا ہے ۲۷ - ۳۶۵
— وہ اپنے پیروؤں پر مسلط ہو جاتا ہے اور اللہ کی یاد ان کے دل سے مٹا دیتا ہے ۳۶۵
— وہ جھوٹی توقعات کا سلسلہ دراز کرتا ہے اور واضح ہدایت سے پھر جانے والوں کی روش کو ان کے لیے سہل بنا دیتا ہے ۲۷
— وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ کے معاملے میں دھوکا دیتا ہے ۳۱۳
— وہ پیغمبر کو دھوکا نہیں دے سکتا ۲۰۰
— شیطان کی پارٹی کون سی ہے اور وہی خسارے میں رہ جانے والی ہے ۳۶۵
— وہ پہلے تو انسان کو کفر پر آمادہ کرتا ہے اور پھر اپنا دامن جھاڑ کر بری الذمہ ہو جاتا ہے ۴۰۸ - ۴۰۹
— قیامت کے روز بارگاہ ربانی میں اس کا عذر ۱۱۹ - ۱۲۰
— وہ اور اس کے پیرو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ۴۰۹

ص

صالح، علیہ السلام

— ان کے ساتھ قوم ثمود کا رویہ ۲۳۶ - ۲۳۷
— ثمود نے ان کی تکذیب اس بنا پر کی کہ ایک بشر بھلا کیسے پیغمبر ہو سکتا ہے ۲۳۶
— ان کی اونٹنی قوم ثمود کے لیے ایک آزمایش تھی - ۲۳۷

صحابہ کرامؓ

— اسلام کے لیے ان کی سچی جاں نثاریاں ۳۴ - ۳۵ - ۳۸ - ۲۴۵ - ۴۰۷ - ۴۰۸
— ان کا اخلاص فی الایمان ۳۶۷
— رسول اکرمؐ سے ان کی انتہائی عقیدت جس نے دشمنوں کو مرعوب کر دیا ۳۷ - ۴۰۷
— ان کا انتہائی نظم و ضبط جو اسلام کی کامیابی کا ذریعہ بنا ۳۷ - ۴۵ - ۴۶ - ۶۱
— ان کے اوصاف حمیدہ پر اللہ تعالیٰ کی شہادت ۶۳ تا ۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷
— ان کے اوصاف تورات اور انجیل میں ۶۳ تا ۶۵
— اصحاب بدر کی بخشش اور اس کا مطلب ۴۲۳ - ۴۲۷
— اصحاب بیعت رضوان کو اللہ تعالیٰ نے سند خوش نودی عطا کی ۵۵
— ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے ۶۵
— اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۳۶۷
— وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور اللہ کی پارٹی ہی فلاح پائے گی ۳۶۷

— وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے تھے ۵۰۳-۵۰۴
— ان کو جنت کی بشارت ۳۶۷
— ان کے باہمی تعلقات کیسے تھے ۴۰۴
— ان کی تربیت کس طرح کی گئی تھی ۵۰۴
— ان کی ہجرت کا اصل مقصد کیا تھا ۴۲۲
— مہاجرین صحابہؓ کی مدح ۳۹۴-۳۹۵
— انصار صحابہؓ کی تعریف ۳۹۵
— مہاجرین اور انصار کی مشترکہ مدح ۴۰۳
— انصار کے ایثار کی مثالیں ۳۹۵-۳۹۶
— ان لوگوں کو غلطی جو بعض صحابہؓ کو مومن اور بعض کو غیر مومن قرار دیتے ہیں ۶۵
— صحابہ کرامؓ بشری کمزوریوں سے مبرا نہ تھے ۴۲۵-۴۲۶-۵۰۳-۵۰۴
— وہ کوئی فوق البشر مخلوق نہ تھے ۵۰۴
— ان سے بغض رکھنے اور ان پر سب وشتم کرنے والے قرآن کی مخالفت کرتے ہیں ۴۰۴-۴۰۵-۵۰۳
— ان کی عقیدت میں غلو کرنا بھی درست نہیں ۵۰۳-۵۰۴
— اس معاملہ میں صحیح مسلک کیا ہے؟ ۵۰۴
— ان کی مغفرت کا تذکرہ بھی قرآن وحدیث میں موجود ہے اور ان کی لغزشوں کے واقعات بھی قرآن اور حدیث دونوں میں بیان کیے گئے ہیں ۵۰۳-۵۰۴
— بعض آئمہ کی رائے کہ صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کا فے میں حصہ نہیں ہے ۴۰۵

صدقہ

— اس کا مفہوم ۳۱۵
— زکوٰۃ کی ادائیگی کے علاوہ بھی مال میں سے انفاق فی سبیل اللہ صدقہ ہے ۱۳۹-۱۴۰
— نجویٰ پر صدقہ کا حکم اور بعد میں اس کی تنسیخ ۳۶۲ تا ۳۶۴
— صدقہ دینے والے مومن مردوں اور عورتوں سے اجر کا وعدہ ۳۱۵

صدیق

— معنی اور تشریح ۳۱۶
— اہل ایمان صدیقین ہیں ۳۱۵

صلح حدیبیہ

— حدیبیہ کی مہم کیسے اور کن حالات میں ہوئی ۳۴ تا ۳۸-۵۷
— اس مہم میں کس قدر عظیم مصلحتیں پوشیدہ تھیں ۳۵-۳۶-۴۰ تا ۴۳-۵۷
— آغاز سفر ہی میں مومن و منافق کا فرق کھل گیا تھا ۳۴-۳۵
— مسلمانوں کو اشتعال دلانے کے لیے قریش کی کوششیں ۳۶-۳۷
— بیعت رضوان کن حالات میں ہوئی ۳۸-۴۹-۵۵
— اس بیعت کی اہمیت ۴۹-۵۵-۵۶
— یہ بیعت صحابہؓ کے اخلاص اور جذبہ ایمانی کا صریح ثبوت تھی ۳۸
— یہ بیعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دراصل اللہ کے ساتھ ہو رہی تھی ۴۹
— بیعت میں شامل ہونے والے صحابہ کرامؓ کو خود اللہ نے سند خوشنودی عطا فرمائی -۵۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— اصحاب حدیبیہ پر کیسی سکینت نازل فرمائی گئی اور وہ کس طرح فتح کا ذریعہ بنی ۴۵-۴۶-۵۶-۶۱

— ان لوگوں کی غلطی جو حدیبیہ کی مہم میں شریک ہونے والے صحابہؓ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعد میں بے وفا ہو گئے تھے ۵۵

— صلح کی شرائط ۳۸-۳۹

— شرائطِ صلح پر صحابہ کرام کی بے چینی ۳۹-۴۰

— اس صلح نے کس طرح اسلام کی انقلاب انگیز فتح کا دروازہ کھولا ۴۰ تا ۴۳-۵۲

— اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو ''کھلی'' اور ''بے مثل'' فتح قرار دیا ۴۳-۴۵-۵۶-۶۲

— اس کو فتح کا ذریعہ بنانا سراسر اللہ کا فضل تھا ۴۳ تا ۴۵

— صلح حدیبیہ کی یہ شرط کہ اہل مکہ میں سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا اسے واپس کیا جائے گا اور مدینہ سے جو کافر ہو کر مکہ جائے گا اسے واپس نہ کیا جائے گا ۴۳۴

— اس شرط کے الفاظ و معانی کی مفصل تحقیق ۴۳۴ تا ۴۳۶

— صلح نامہ کے الفاظ میں عورتوں کے مستثنیٰ ہونے کی صریح گنجایش موجود تھی ۴۳۵

— حدیبیہ کی مہم کے موقع پر منافقین کا طرز عمل ۳۴-۳۵-۴۷-۵۰-۵۱

— اس موقع پر مسلمان عورتوں نے کیسے صبر کا مظاہرہ کیا ۴۶-۴۷

— یہ بحث کہ بیعت رضوان کس درخت کے نیچے ہوئی اور کیا حضرت عمرؓ نے اسے بعد میں کٹوا دیا؟ ۵۵-۵۶

— صلح حدیبیہ کے بعد اللہ کی طرف سے مسلسل فتوحات کی بشارت ۵۶-۵۷

— اللہ نے کس مصلحت کے تحت حدیبیہ کے موقع پر جنگ نہ ہونے دی؟ ۵۶-۵۸-۵۹

— اگر اس موقع پر جنگ ہوتی تو مسلمان یقیناً غالب آتے ۵۷-۵۸

— کفار مکہ کا یہ جرم بہت بڑا تھا کہ انھوں نے محض حمیت جاہلیہ کی وجہ سے مسلمانوں کو عمرہ نہ کرنے دیا اس جرم پر وہ سزا کے مستحق تھے ۵۸-۶۰

— اس مہم پر جانے کے لیے اللہ نے اپنے رسول پاک کو خواب میں ہدایت فرمائی تھی ۶۰-۶۱

— اللہ کا یہ فیصلہ کہ فتح خیبر کی مہم میں صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے گا جنھوں نے حدیبیہ کی مہم میں حضورؐ کا ساتھ دیا تھا ۵۲-۵۶

— کفار مکہ نے جب صلح حدیبیہ کی شرائط توڑ دیں تب حضور اکرمؐ نے مکہ پر حملے کی تیاری کی ۴۲۲

صلوٰۃ

— دیکھو ''نماز''

صور

— وہ قیامت کے وقت پھونکا جائے گا ۱۱۷

— اس کی آواز پوری روئے زمین پر ہر شخص سن لے گا ۱۲۵-۱۲۷

ض

ضلالت

— گمراہی کی اصل بنیاد ۲۶۵-۲۶۶

— کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ خود اس کی اور شیطان کی

طرف سے ہوتا ہے ۴۵۷
— جو کوئی گمراہی کا راستہ اختیار کرے اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب اور اس کی توفیق فراہم کر دیتا ہے ۴۵۷-۴۵۸
— قرآن گمراہی کی ذمہ داری انسان پر ڈالتا ہے ۳۱۴-۳۲۳-۵۲۷تا۵۲۹
— اللہ جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے ۲۱۱
— اللہ کی طرف سے ضلالت دور کرنے کا مطلب ۱۰ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور ''ہدایت'')
— نافرمان اور گمراہ انسان زمین کا بوجھ ہیں ۲۶۲
— علم کے بغیر گمان کی پیروی کرنا اہم ترین اسباب ضلالت میں سے ہے ۲۰۹-۲۱۰
— اسباب ضلالت ۹-۱۰-۱۹-۲۰-۲۱-۲۳-۲۷-۲۸-۲۹-۱۱۹-۱۲۰-۱۳۵-۱۷۹-۲۰۸-۲۱۰-۲۳۱-۲۳۸-۲۴۰-۲۸۳-۲۸۴-۳۱۲-۳۱۳-۳۶۴-۴۰۷-۴۱۰-۴۱۱-۴۲۲-۴۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۳۲ تا ۵۳۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل عرب گمراہی میں مبتلا تھے ۴۸۷-۴۸۸
— گمراہ لوگوں (اہل ضلالت) کا انجام ۲۹۵-۲۹۶
— گمراہ قوموں کا یہ مشترک وصف ہے کہ وہ سب سرکش تھیں ۱۵۲-۱۵۳

ط

طاغوت

— طاغوت سے کفر کرنا ایمان کا فطری لازمہ ہے ۴۲۸

طلاق

— دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق''

طور

— آخرت کے برحق ہونے پر طور کی قسم ۱۶۲

ظ

ظلم

— ظلم سے کیا مراد ہے ۱۵۶-۱۵۷
— ظلم کی بنیادی وجہ ۳۰۱-۳۰۲
— سب سے بڑا ظالم کون ہے ۴۷۶
— توحید، رسالت اور آخرت کا انکار ظلم ہے ۱۵۷
— ظالمین کون لوگ ہیں ۱۵۶-۱۵۷-۴۳۲-۴۳۳-۴۸۹-۴۹۱
— دوسروں کا مذاق اڑانا اور ان کے برے نام رکھنا اور ان پر طعن کرنا ظلم ہے ۸۵
— ظالمین کے لیے عذاب جہنم ۱۵۶-۴۰۹
— اللہ تعالیٰ ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا ۴۷۶-۴۸۹
— قرآن ظالم و مظلوم کے درمیان کس قسم کی صلح کروانا چاہتا ہے ۸۷
— ظالم کے خلاف مظلوم کی عملی مدد کرنا فتنہ برپا کرنا نہیں ہے ۷۷

ظہار

— دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق''

ع

عاد

— عاد اولیٰ ۲۲۱
— وہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکے تھے ۲۲۲
— انھوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا ۱۱۴-۲۳۵
— انھوں نے زندگی بعد موت کا انکار کیا ۱۱۴-۲۳۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— ان پر عذاب کی کیفیت ۱۴۹-۲۳۵-۲۳۶

عبادت

— عبادت کی اقسام ۲۱۸
— عبادت کا مفہوم ۱۵۵
— اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ۲۴
— اللہ کی عبادت کا حکم ۲۲۳
— اللہ ہی کی عبادت کیوں؟ ۱۵۵
— انسان کو اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے ۱۵۵
— عبادت بمعنی بندگی و اطاعت پرستش ۱۵۶-۱۵۷-۲۲۳-۲۵۰
— کن عبادات میں نیابت چل سکتی ہے اور کن میں نہیں چل سکتی ۲۱۸-۲۱۹

عبداللہ بن ابی

— ہجرت سے پہلے اوس اور خزرج اسے بادشاہ بنانے پر رضامند ہو گئے تھے ۵۰۸-۵۰۹
— وہ مدینے میں اسلام کے پھیل جانے سے مجبور ہو کر مسلمان ہو گیا ۵۰۹
— اس کی شاندار شخصیت ۵۱۸
— اس کی منافقت کا پہلا ظہور ۵۰۹
— اس نے بنونضیر کو رسول اکرمؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں ڈٹ جانے کی شہ دی ۳۷۸-۳۷۹-۵۰۹-۵۱۰
— غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر اس نے کس طرح فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی ۵۱۱ تا ۵۱۴
— اس نے انصار سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی مدد بند کر دو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے ۵۱۲-۵۱۳-۵۲۱
— اس نے کہا کہ مدینے سے عزت والا ذلیل کو باہر نکال دے گا ۵۱۲-۵۱۳-۵۲۱
— اس کی حضور اکرمؐ سے بدتمیزی ۵۰۹
— جنگ احد میں اس کی غداری ۵۰۹-۵۱۰
— اس کی منافقانہ حرکتوں کی وجہ سے مدینہ میں علانیہ اس کی تذلیل ہوئی ۵۱۰-۵۱۴
— اس کی اسلام دشمنی اور فتنہ پردازی ۵۱۰-۵۱۲-۵۱۳
— حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی تھی ۵۱۳
— وہ کیا مصالح تھے جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان غداروں اور منافقوں کے ساتھ چشم پوشی کا معاملہ فرما رہے تھے ۵۱۰

عبداللہ بن عبداللہ بن ابی

— وہ سب سے بڑے منافق کے بیٹے ہونے کے باوجود صادق الایمان تھے اور انھوں نے حضوؐر سے عرض کیا تھا کہ میرے باپ کو قتل کرنا ہو تو مجھے اس کا حکم دیا جائے ۵۱۴

عثمان غنیؓ

— حدیبیہ کی مہم میں حضوؐر نے ان کو صلح کی بات چیت کے لیے ایلچی بنا کر مکہ بھیجا تھا ۳۷
— ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ بیعت رضوان کے موقع پر حضوؐر نے خود ان کی طرف سے بیعت فرمائی ۴۹

عدت

— دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق''

عدل

— عدل کی اہمیت اور اس کی تاکید ۲۵۱-۳۱۹
— پوری کائنات عدل پر قائم کی گئی ہے ۲۵۱-۵۳۰-۵۳۱

— اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۴۳۲-۴۲۲

— حقیقی عدل صرف آخرت میں اور اللہ تعالیٰ ہی کی عدالت میں ہوسکتا ہے ۵۳۲

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "انصاف")

عذاب

— خدا کے عذاب کے مستحق کیسے لوگ ہیں ۱۹-۲۰-۲۸-۵۳-۵۴-۱۱۴-۱۱۹-۱۴۷-۱۵۰-۱۵۲-۱۶۶-۲۲۱-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۴۰-۲۶۵-۲۸۲-۳۵۵-۳۵۶-۴۰۸-۴۵۷-۵۲۵-۵۳۲-۵۸۰

— گمراہ قوموں کی ہلاکت ۱۲۴-۲۳۳ تا ۲۳۹-۵۳۲

— قوم نوح پر عذاب ۲۳۳

— قوم عاد پر عذاب ۲۳۶

— قوم ثمود پر عذاب ۲۳۶-۲۳۸

— قوم لوط پر عذاب ۱۴۶-۲۳۹

— فرعون و آل فرعون پر عذاب ۲۳۹

— عذاب کے لیے مختلف الفاظ کا استعمال ۱۵۰

— عذاب سموم ۱۷۱

— خدا کے عذاب سے ظالموں کو بچانے والا کوئی نہیں ۲۱-۱۲۴-۱۵۶

— بدی سے روکنے والا عنصر جب تک کسی قوم میں کام کرتا رہتا ہے اس وقت تک اللہ اس قوم کو مہلت دیتا ہے ۱۴۶

— دنیا میں نزول عذاب کا قانون ۱۱۴-۱۴۷-۲۳۳-۲۳۵-۲۳۷-۲۳۹-۵۳۲-۵۸۰

— دنیوی عذابوں سے آخرت پر قرآن کا استدلال ۲۰-۲۱-۱۲۴-۱۴۶-۱۴۷-۱۵۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۴-۲۳۶-۲۳۷-۲۴۱-۲۴۲-۵۳۲-۵۳۳-۵۸۰

— دنیا میں نزول عذاب کی مختلف شکلیں ۱۴۶-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۳۲-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹

— اللہ کا قانون مکافات اس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ بھی قابل لحاظ بھلائی موجود ہو ۱۴۷

— قوموں پر آئے ہوئے عذاب دوسروں کے لیے تنبیہ اور سامان عبرت ہیں ۱۲۴-۲۲۲-۲۲۳-۲۳۲

— قوموں کے دردناک انجام عبرت اور نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتے ہیں ۲۳۲

— عذاب پانے والی قوموں کے لیے انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے ۵۸۰

— جن قوموں پر دنیا میں عذاب آئے انھوں نے یہاں اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ لیا اور ان کے لیے آگے آخرت میں مزید دردناک عذاب ہے ۵۳۲-۵۳۳-۵۸۰

— آخرت کے عذاب کا قانون ۴۷-۵۱-۱۵۶-۱۵۷-۱۶۷-۱۸۳-۲۴۰-۲۶۵-۲۸۲ تا ۲۸۴-۳۱۲-۳۵۵-۳۵۶-۴۱۰

— مجرمین کے لیے دردناک عذاب ہے ۱۱۹-۱۲۱-۱۳۵-۱۳۶-۱۶۶-۱۶۷-۲۴۰-۲۶۴-۲۶۵-۲۸۲-۲۸۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۸۴-

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۳۲-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۷۹

— معذب قوم کے صالح عنصر کو اللہ اپنے فضل سے ضرور بچالیتا ہے ۱۴۶-۲۳۸

— آخرت کے عذاب کی کیفیت (دیکھو''جہنم، اس کی کیفیت'')

— منافقین کے لیے عذاب قیامت کا ذکر ۳۱۲-۳۱۳-۳۵۹-۳۶۵-۴۰۸-۴۰۹-۵۲۰

— منافقین دائماً جہنم میں رہیں گے ۳۶۵-۴۰۹

— یہود کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب ہے ۳۸۴-۴۰۸

— عذاب سے بچنے کا طریقہ ۴۷۷-۴۷۸

— برائی سے مجتنب رہ کر اصلاح کی کوشش کرنے والے عذاب سے بچ جاتے ہیں ۱۴۶-۱۴۷

— عذاب سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا ۲۱-۱۲۴-۱۵۶

— اللہ کا عذاب (آخرت) ضرور واقع ہوگا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ۱۶۳

— ایصال ثواب ممکن ہے لیکن ایصال عذاب ممکن نہیں ہے ۲۱۷

عذاب قبر

— دیکھو''برزخ''

عزیٰ

— قریش کی خاص دیوی ۲۰۶-۲۰۷

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''بت پرستی)

عرب

— حضورؐ کی بعثت سے پہلے عہد جاہلیت میں اہل عرب کا حال ۲۶-۲۷-۳۷-۴۴۷-۴۸۷-۴۸۸

(نیز دیکھو''قریش'')

عرش

— اللہ کا عرش پر جلوہ فرما ہونا ۳۰۳

علم

— علم کی نعمت انھی کو ملتی ہے جو قرآن اور ارشادات رسولؐ پر غور کریں اور خدا و رسول کی بات جن کے ذہن نشین ہو جائے ۲۳

— کسی کے پاس علم اور ایمان کی دولت جتنی زیادہ ہوا تنا ہی اس کا درجہ بلند ہوگا ۳۶۲

— صاحب علم ہونا مومنین کی صفت ہے ۲۳

— اللہ نے انسان کو علم قرآن سے نوازا ۲۴۸

— اللہ ہی نے انسان کو علم بیان کی توفیق بخشی ۲۴۸ تا ۲۵۰

علم غیب

— اللہ کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ۱۸۱-۱۸۲-۲۱۳-۴۱۱

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''اللہ'')

علی مرتضیٰؓ

— باغیوں کے خلاف ان کی جنگ میں قرآن کے حکم پر مبنی تھی ۷۷

— فقہائے اسلام نے مسلمانوں کی باہمی جنگ اور بغاوت کے متعلق انھی کے اسوہ سے اخذ کیا ہے ۷۸-۸۱-۸۲

عمر فاروقؓ

— ان کے قبول اسلام کا واقعہ ۲۷۴

— انھوں نے کس بنا پر عراق، شام اور مصر کی مفتوحہ

اراضی کو مال غنیمت قرار نہ دیا اور فے قرار دے کر اجتماعی ملکیت میں رکھا ۳۹۷ تا ۴۰۰
— ان کے عہد میں شوریٰ کا طریقہ ۳۹۹-۴۰۰
— انھوں نے حضور اکرمؐ کو عبداللہ بن ابی کے قتل کا مشورہ دیا تھا ۵۱۳
— صلح حدیبیہ کی شرائط پر ان کا سخت اضطراب ۳۹-۴۰-۴۳
— عورتوں سے اولین بیعت حضوؐر کے حکم سے حضرت عمرؓ ہی نے لی تھی ۴۴۵

عمرہ

— اس کے احکام ۶۱-۶۲
— عمرۃ القضاء ۶۲

عمل صالح

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۱۰-۲۰-۳۱-۶۵-۵۴۰
— عمل صالح سے مراد کیا ہے ۵۴۰
— اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر کوئی عمل عمل خیر نہیں ہے اور نہ کسی اجر کا مستحق ہے ۳۰
— عمل صالح کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی ۱۶۹
— وہی عمل عمل صالح ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو اور قواعد شریعہ کے مطابق کیا جائے ۲۱۷-۳۹۴-۳۹۵-۴۵۶
— ایمان اور عمل صالح سے تمام پچھلے گناہ جھڑ جاتے ہیں ۵۴۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

عورت

— عورت کے اوصاف حمیدہ ۲۶۸
— دنیا میں نیک زندگی گزارنے والی عورتوں کے لیے اللہ کی مہربانیاں ۲۸۱ تا ۲۸۳
— عورت کا جہاد کیا ہے ۴۷
— قرآن عام طور پر مردوں اور عورتوں کے ملے جلے ذکر میں مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے اور ان سے مراد صرف مرد ہی نہیں ہوتے ۲۵-۴۶-۴۷-۸۴-۸۵-۳۰۹-۳۱۱-۳۱۵
— عورتوں کی بیعت کا طریقہ اور وہ امور جن پر آنحضوؐر نے ان سے بیعت لی تھی ۴۴۵-۴۴۹-۴۵۰
— حضوؐر کے حکم پر عورتوں سے اولین بیعت حضرت عمرؓ نے لی تھی ۴۴۵
— عورتوں کو کن کن برائیوں سے منع کیا گیا ہے ۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸
— بے حیا اور باحیا عورتوں کا فرق ۲۶۸
— عورت کو اسقاط حمل کی ممانعت خواہ حمل جائز ہو یا ناجائز ۴۴۵-۴۴۶
— عورتوں کو مردوں کی امانتیں محفوظ رکھنے کا حکم ۴۴۸
— عورتوں کو کس قسم کے بہتان گھڑنے کی ممانعت کی گئی ہے ۴۴۵-۴۴۶
— عورتوں کو جنازے پر جانے کی ممانعت، ان پر جمعہ فرض نہیں کیا گیا اور عیدین پر جانے کے لیے کہا گیا ہے ۴۴۸
— جاہلیت کی عورت کن برائیوں میں مبتلا تھی ۴۴۷
— ہجرت کرنے والی عورتوں کے متعلق احکام ۴۳۴

Maktaba Tul Ishaat.com

تا ۴۴۴
— طلاق وعدت اور حیض اور طہر کے معاملات میں عورت کا بیان ہی معتبر سمجھا جائے گا ۴۳۶

عیسیٰ علیہ السلام

— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے وہ آخری رسول تھے ۳۲۴
— ان کو انجیل عطا کی گئی ۳۲۴
— وہ انتہائی رقیق القلب اور رحیم وشفیق تھے اور ان کے اولین پیروؤں کی سیرت میں بھی یہ صفات تھیں ۳۲۴
— ان کا بنی اسرائیل سے خطاب ۴۵۸
— وہ دین موسیٰؑ کی تجدید کے لیے بھیجے گئے تھے ۴۵۹
— وہ تورات کی بشارتوں کے مصداق تھے ۴۵۹
— وہ اللہ کے رسول اور تورات کی تصدیق کرنے والے تھے ۴۵۸-۴۵۹
— ان کے کئی برسوں بعد عیسائیوں نے رہبانیت ایجاد کر لی جس کا کوئی حکم انھوں نے نہیں دیا تھا ۳۲۴
— ان کے بعد ان کے پیروؤں نے دین کا حلیہ بگاڑ دیا ۳۲۵ تا ۳۳۲
— ان کی بعثت سے بہت پہلے عبرانی زبان متروک ہو چکی تھی اور وہ آرامی زبان کی فلسطینی شاخ سریانی زبان بولتے تھے ۴۶۳
— ان کی طرف منسوب انجیلیں ان لوگوں نے لکھیں جو یونانی زبان بولتے تھے اور جنھوں نے ان کو کبھی نہ دیکھا تھا ۴۶۳
— ان کے ابن اللہ ہونے کی تردید ۴۷۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انجیل، انجیل برناباس'')
— انھوں نے حضور اکرمؐ کی آمد کی بشارت دی ۴۶۱ تا ۴۷۵
— انھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات کی بشارت کی تصدیق کی ۴۵۹-۴۶۰
— ان کی بشارت کے مطابق جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو عیسائیوں اور بنی اسرائیل نے حضورؐ کے دعوائے نبوت کو صریح دھوکہ قرار دیا ۴۷۶
— ان کا اپنے حواریوں سے مدد طلب کرنا ۴۷۹
— ان کی حمایت کے لیے حواریوں کا اعلان ۴۷۹

عیسائیت

— عیسائیت کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی ۴۷۹-۴۸۰
— عیسائیت کا ارتقاء ۳۲۶-۴۷۰
— عیسائیوں میں صالحین بھی تھے جن کو اللہ نے اجر دیا ۳۲۵
— ابتدائی عیسائی بنی اسرائیل کے وہ لوگ تھے جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے ۴۷۹
— اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماننے والوں کو منکر یہودیوں پر غلبہ عطا کیا ۴۷۹-۴۸۰
— عیسائیوں اور یہودیوں میں فرق ۴۶۹
— عیسائیوں میں سے اکثر فاسقین ہیں ۳۲۵
— انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کا عقیدہ عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے مدت دراز بعد گھڑا گیا ۵۲۷ تا ۵۲۹

— عیسائیوں نے رہبانیت کی پابندیاں اپنے اوپر خود عائد کیں اور ان کا حق بھی ادا نہ کیا ۳۲۴ تا ۳۳۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''رہبانیت'')
عیسائیوں نے اتوار کو خواہ مخواہ اپنا مذہبی دن بنالیا جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے ۴۹۴

غ

غزوات
— غزوۂ احد ۴۵۲
— غزوۂ احد کے نتیجہ پر منافقین اور یہود کی خوشیاں ۳۷۸
— غزوۂ بدر۔ دیکھو ''بدر''
— غزوۂ بنی المصطلق ۱۶-۵۱۱ تا ۵۱۴

غزوۂ بنونضیر
— کب پیش آیا ۳۷۰
— اس پر قرآن کا تبصرہ ۳۸۱ تا ۳۸۶
— بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف کو کن حرکتوں کی وجہ سے حضورؐ نے قتل کروادیا ۳۷۷
— بنی نضیر کی طرف سے حضورؐ کو قتل کرنے کی کوشش ۳۷۸-۳۸۲
— بنی نضیر کو آپؐ کا الٹی میٹم ۳۷۸-۳۷۹
— قرآن کے ایک حکم کی بنا پر بنی نضیر کو الٹی میٹم دیا گیا تھا ۳۸۲
— عبداللہ بن ابی کی شہ پاکردہ حضورؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں ڈٹ گئے ۳۷۹
— انھیں منافقین مدینہ یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ لڑیں گے اور اگر تم نکلے تو ہم بھی ساتھ ہی نکلیں گے لیکن قرآن نے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ وہ کبھی بھی بنونضیر کا ساتھ نہ دیں گے ۴۰۶
— بنی نضیر کو پہلے ہی حملے میں مدینے سے جلاوطن ہونا پڑا ۳۸۱
— بنی نضیر کا اس آسانی سے انخلاء مسلمانوں کے گمان میں بھی نہ تھا ۳۸۱-۳۸۲
— ان کا اخراج اللہ کے حکم سے ہوا ۳۸۲
— بنونضیر کو اللہ نے ایسے رخ سے پکڑا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا ۳۸۲-۳۸۴
— وہ سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے اللہ سے ان کو بچالیں گے ۳۸۲-۳۸۳
— ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا تھا ۳۸۴
— وہ اگر سیدھی طرح سے نہ نکلتے تو ان کا نام ونشان مٹ جاتا ۳۸۴-۳۸۶
— انھوں نے خود بھی اپنے گھروں کو برباد کیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی برباد کرایا ۳۸۴
— مسلمانوں نے بنی نضیر کے باغوں میں جو تباہی مچائی وہ اللہ کی اجازت کے تحت تھی اور فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی ۳۸۶-۳۸۷
— ان کے اموال انصار کی مرضی سے مہاجرین میں تقسیم کیے گئے، اور صرف تین مستحق انصاریوں کو حصہ دیا گیا ۳۹۵-۳۹۶
— ان کے اخراج میں عبرت کے پہلو کیا ہیں ۳۸۴ تا ۳۸۶
— وہ فاسقین میں سے تھے ۳۸۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''یہود'')

غلامی
— جنگی قیدیوں سے متعلق اسلامی قانون ۱۲-۱۴-۱۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— کوئی ایسی لونڈی فروخت نہیں کی جا سکتی جس سے مالک کے ہاں اولاد پیدا ہو چکی ہو ۲۷-۲۸

غلمان (جنت کے خدمت گار)

— غلمان جنت کی تشریح ۱۷۰-۱۷۱

غیب

— دیکھو "علم غیب" اور "اللہ"

غیبت

— غیبت کس چیز کو کہتے ہیں؟ ۹۰
— اس کے متعلق شرعی احکام ۸۷-۹۰ تا ۹۴
— غیبت، بہتان اور چغلی کا فرق ۹۰-۹۳
— غیبت کی حرمت سے کون کون سی صورتیں مستثنیٰ ہیں ۹۱ تا ۹۳
— کون سی شکایت چغلی کے حکم میں نہیں آتی ۵۱۳
— غیبت کس قدر گھناؤنا فعل ہے ۹۷
— جو شخص غیبت کا مرتکب ہو، وہ اس گناہ سے کس طرح پاک ہو سکتا ہے ۹۳-۹۴
— غیبت کے حرام ہونے کی اصل وجہ ۹۴
— ہر مسلمان جس کے سامنے اس کے کسی مسلم بھائی کی غیبت کی جا رہی ہو، اس کا فرض ہے کہ اس حرکت سے منع کرے ۹۳
— غیبت بہرحال حرام ہے خواہ اس شخص کو جس کی غیبت کی گئی ہو، کبھی اس کا علم نہ ہو سکے ۹۴

ف

فاسق

— دیکھو "فسق"

فرشتہ

— رسول بمعنی فرشتہ ۱۴۵
— فرشتوں کے فانی مخلوق ہونے کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ ۳۰۳
— انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے اس کے تمام اعمال ثبت کر رہے ہیں ۱۱۶
— انسان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا جس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران نہ ہو ۱۱۶-۱۱۷
— موت کے وقت فرشتے روحوں کو قبض کرتے ہیں ۲۸
— قیامت کے روز وہ حکم الٰہی سے تمام اجسام انسانی کے منتشر ذروں کو جمع کر دیں گے ۱۰۹-۱۱۰
— قیامت کے روز ہر کافر کو ایک فرشتہ ہانک کر بارگاہ ربانی میں پیش کرے گا ۱۱۸
— قیامت کے روز ہر انسان کے اعمال پر فرشتے گواہی دیں گے ۱۱۷
— وہ منکرین حق کو اللہ کے حکم سے اٹھا کر جہنم میں پھینک دیں گے ۱۱۹
— ان کا انسانی شکل میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں جانا ۱۴۴
— گمراہ قوموں پر عذاب نازل کرنے کے لیے ان کا بھیجا جانا ۱۴۵-۱۴۶
— جبریل علیہ السلام کا ذکر ۱۹۹ (مزید دیکھو "جبریل")
— کفار نے فرشتوں کو دیویاں قرار دے رکھا تھا ۲۰۹
— فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں کے عقیدے کی تردید ۱۸۰-۱۸۱-۲۰۶
— تمام فرشتے مل کر بھی کسی کافر کو عذاب سے نہ بچا

سکیں گے ۲۰۸-۲۰۹

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو" شفاعت")

فرعون

— اس نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا ۱۱۴

— وہ رسالت کا منکر تھا ۱۱۴

— وہ اپنی قوم کی گمراہی کا ذمہ دار تھا ۱۱۴-۱۱۵

— حضرت موسیٰ کا دلائل و براہین کے ساتھ اس کے پاس آنا اور اس کا اپنی طاقت کے بل بوتے پر اکڑنا ۱۴۷

— اس کا انکار حق ۱۱۴-۱۴۷-۱۴۸-۲۳۹

— اس کا حضرت موسیٰ کو جادوگر کہنا ۱۴۷-۱۴۸

— اس کا حضرت موسیٰ کو مجنون کہنا ۱۴۸

— فرعون اور اس کے لشکر کی تباہی ۱۴۸-۲۳۹

— اس کی تباہی پر کوئی آنکھ رونے والی نہ تھی ۱۴۸-۱۴۹

— وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا ۱۴۸-۱۴۹

— قوم فرعون اول درجے کی گمراہ قوم تھی ۱۱۴-۱۱۵

فرقہ

— فرقہ اور طائفہ کے معنی کا فرق ۶۷

فساد فی الارض

— کون سے اعمال اس کی تعریف میں آتے ہیں اور کون سے نہیں آتے ۳۸۶ تا ۳۸۸

فسق

— فسق کیا ہے ۸۴-۸۵

— فسق اور تقویٰ کا فرق ۳۸۰-۴۰۹-۴۱۰

— فاسق کون لوگ ہیں ۴۱۰-۵۲۰

— فاسقین کا انجام ۱۵۰-۳۸۶

— فسق بمعنی نافرمانی ۳۲۳

— اللہ کیسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا ۴۵۷-۵۲۰

— اہل کتاب نے فسق کی راہ اختیار کی ۳۱۴-۳۸۷

— ایمان لانے کے بعد فسوق میں نام پیدا کرنا ڈوب مرنے کا مقام ہے ۸۵-۸۶

— فاسق کی گواہی کا مسئلہ ۴۷

(تفصیل کے لیے دیکھو" قانون اسلام، قانون شہادت")

فلاح

— کون لوگ فلاح پائیں گے؟ ۲۷۶-۳۹۹-۳۹۷-۴۹۷-۵۴۶

ق

قانون اسلام

اصول قانون اور اصولی احکام

— اسلام میں قانون کی حکمرانی کا سنگ بنیاد ۴۴۷

— رسول کی آئینی حیثیت ۴۴۷

— کسی شخص کو بھی قانون کے خلاف کام کرنے کا حکم دینے کا حق نہیں ہے، جو کوئی ایسا حکم دے اور جو کوئی اس کی تعمیل کرے دونوں مجرم ہیں ۴۴۷

— اللہ کے دین و آئین کے مقابلے میں جو لوگ کچھ معاملات میں کفار کی پیروی کریں ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور وہ سزا کے مستحق ہیں ۲۸-۲۹

— قانون اسلام کے خلاف جو کام بھی کیا گیا ہو، خواہ وہ کسی نے کیا ہو، حرام ہے ۴۴۷

— اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے خدا اور رسول کی مخالفت کرنا واجب القتل جرم ہے ۵۱۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— ہر شخص اپنے ہی اعمال کی جزا یا سزا کا مستحق ہے ۲۱۴-۲۱۵-۳۶۴
— کوئی شخص کسی دوسرے کے فعل کی ذمہ داری میں نہیں پکڑا جا سکتا ۲۱۴-۲۱۵-۳۶۴
— نیکوکاروں کے لیے انعام اور ظالموں کے لیے سزا لازمی امر ہے ۱۴۳
— کسی کو اس کے اعمال بد کی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا ۲۱۴-۲۱۵-۳۶۴
— انسان کی قدر و قیمت انسانیت اور اخلاق کی بنا پر ہے نہ کہ رنگ و نسل یا زبان کی بنا پر ۳۸۵
— کسی شخص، گروہ یا قوم کے خلاف کسی غیر معتبر خبر کی بنا پر بلا تحقیق کوئی کارروائی نہ کی جائے گی ۷۳-۷۴
— کسی فعل کی محض ظاہری صورت پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ملزم کی مجموعی سیرت اور قرائن و شواہد کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا ۴۲۶
— مفتوحہ اراضی کو تمام مسلمانوں کی مشترک ملکیت قرار دیا گیا ۴۰۱
— اللہ کے باغی جن اشیاء پر قابض ہیں ان کا قبضہ ایسا ہے جیسے کوئی خائن ملازم اپنے آقا کا مال دبا بیٹھے ۳۸۹
— قانون کا اندھا دھند استعمال غلط نتائج پیدا کرتا ہے ۵۱۴-۵۱۵
— بہت سے احکام اگرچہ حکم کے الفاظ میں ہوتے ہیں مگر سیاق و سباق بتاتا ہے کہ وہ نصیحت اور ہدایت ہیں ۵۶۷
— قانون اسلام کی برتری ۸۴
— نیک معاملہ کرنے والوں سے نیک ہی برتاؤ کیا جانا چاہیے ۳۶۹-۴۳۲
(مزید دیکھو ''احکام القرآن'')

قانون بغاوت

— مفصل احکام ۷۷تا۸۳
— باغیوں کے خلاف جہاد بعض فقہاء کے نزدیک کفار کے خلاف جہاد سے بھی افضل ہے ۷۷
— باغی گروہ کے خلاف برسرِحق گروہ کا ساتھ دینا واجب ہے ۷۶-۷۷
— باغیوں کے خلاف جنگ کا مقصد اور اس کی غایت ۷۷-۷۸
— قانون بغاوت کا اطلاق کن لوگوں پر ہوگا اور کن پر نہیں ہوگا ۸۱
— محض باغیانہ خیالات کا اظہار بغاوت نہیں ہے جب تک کہ ان کو عمل میں لانے کے لیے طاقت کا استعمال نہ کیا جائے ۸۱
— باغیوں سے جنگ کے ضوابط ۸۱
— جنگ سے پہلے بغاوت کرنے والوں کو اللہ کی شریعت کے فیصلے کی طرف دعوت دی جائے ۸۱
— باغیوں کے اموال کا حکم ۸۲
— باغیوں کے گرفتار شدہ افراد کا معاملہ ۸۲
— بغاوت فسق ہے، اس لیے باغی کی شہادت قابل قبول نہیں-۷۴ (دیکھو ''قانون شہادت'')

فوجداری قانون

— حاکم محض اپنے ذاتی علم یا شبہہ کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دے سکتا ۴۲۵
— تفتیش کے دوران میں صحیح صورت حال معلوم

کرنے کے لیے اگر ناگزیر ہو تو عورت کے کپڑے اتار کر بھی تلاشی لی جا سکتی ہے ۴۲۸
— قانوناً کسی شخص کے واجب القتل ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے واقعی قتل ہی کر دیا جائے ۵۱۴-۵۱۵

قانون شہادت

— شہادت دو چیزوں سے مرکب ہے ۵۱۶
— قانون شہادت کا اصولی ضابطہ ۴۳۶
— کس صورت میں کسی بیان کو حلفیہ بیان کہا جائے گا؟ ۵۱۷
— عدالت کے لیے شہادتوں سے حاصل شدہ معلومات پر فیصلہ کرنا درست ہے ۴۳۶
— حلفیہ بیان کے خلاف اگر کوئی صاف قرینہ نہ پایا جائے تو اسے درست تسلیم کیا جائے گا ۴۳۶
— کوئی شخص اپنے عقیدے اور ایمان کے متعلق خود جو بیان دے بادی النظر میں اسی کو تسلیم کیا جائے گا ۴۳۶
— طلاق و عدت کے مقدمات میں حیض اور طہر سے متعلق عورت کا اپنا بیان ہی معتبر ہے ۴۳۶-۴۳۷
— فاسق کی گواہی قابل قبول نہیں جب تک کہ دوسرے معتبر ذرائع سے تحقیق نہ کر لی جائے ۷۲-۷۴
— کردار کے لحاظ سے اگر کوئی شخص فاسق نہ ہو تو غلط عقیدے کی بنا پر فاسق ہونے کی وجہ سے اس کی گواہی رد نہ کی جائے گی ۷۴
— بغاوت فسق ہے، اس لیے باغی کی شہادت قابل قبول نہیں ۸۳ (دیکھو ''قانون بغاوت'')
— شہادت کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گواہ ''صاحب عدل'' ہو اور وہ گواہی کو ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرے ۵۶۶-۵۶۷

بین الاقوامی قانون

— بین الاقوامی قانون کے چند اہم نکات ۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲
— غیر مسلم مملکتیں جو اسلامی ریاست سے عداوت نہ رکھیں ان سے اچھے اور دوستانہ تعلقات رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۲۶۹-۴۳۲-۴۳۳
— غیر مسلموں سے اسلامی ریاست کے معاہدے ۳۷۴-۳۷۵
— معاہدہ کرنے والی حکومت اگر معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے ۳۷۸-۳۸۶

قانون صلح و جنگ

— اسیران جنگ کے متعلق احکام ۱۱ تا ۱۸
— اراضی مفتوحہ کا قانون ۳۸۸ تا ۴۰۳۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون معیشت'')
— مسلمانوں کی خانہ جنگی کے متعلق احکام (دیکھو ''قانون بغاوت'')
— دشمنوں کے سر کاٹ کر گشت کرانا ممنوع ہے ۸۲
— جنگی ضرورت کی بنا پر دشمن کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے وہ ''فساد فی الارض'' کی تعریف میں نہیں آتی ۳۷۹-۳۸۶ تا ۳۸۸
— جزیہ کے بارے میں اسلامی قانون ۱۵
— کفار کے لیے جاسوسی کرنا کسی حال میں جائز

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں ۴۲۷
— مسلمان جاسوسی کی سزا کے بارے میں فقہی مباحث ۴۲۷-۴۲۸
— کسی مسلمان سے جاسوسی کا فعل سرزد ہو جانا بجائے خود اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ اب وہ اسلام کا وفادار نہیں رہا ۴۲۷
— اگر جنگ کے دوران میں وہ مسلمان بھی زد آرہے ہوں جو کفار کے قبضے میں ہوں تو کیا کرنا چاہیے ۵۹-۶۰
— اللہ کی پندیدہ فوج کی صفات ۴۵۶-۴۵۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''جہاد'')

بنیادی حقوق

— عزت کے تحفظ کا حق ۸۴ تا ۸۶-۸۷-۹۰
— نجی زندگی کے تحفظ کا حق ۸۷ تا ۹۰
— انصاف کا حق ۸۷ (نیز دیکھو ''انصاف'' اور ''عدل'')
— حقوق میں مساوات کا حق ۹۵
— حاجت مندوں کا یہ حق کہ ان کے لیے ضروریات زندگی فراہم کی جائیں ۱۳۹
— اسلام کے اندر بند کمرے میں مقدمہ چلانے کی کوئی نظیر ۴۲۵
— اسلام میں صفائی کا موقع دیے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی ۴۲۵
— کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی ثبوت کے بغیر اور انصاف کے معروف تقاضوں کو پورا کیے بغیر نہیں کی جاسکتی ۴۳-۴۷
— محض شبہ کی بنا پر کسی کو قید کرنے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ۴۲۵

قانون ہتک عزت

— مسلم معاشرے میں باہمی تعلقات خراب کرنے والی برائیوں کا سد باب ۸۴ تا ۹۵
— کسی کی تضحیک اور تذلیل وتحقیر کی ممانعت ۸۴-۸۵
— لوگوں کے برے نام رکھنے اور ان کو برے القاب دینے کی ممانعت ۸۵-۸۶
— کس قسم کے القاب اس ممانعت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں ۸۶
— دوسروں پر طعن اور چوٹیں کرنے کی ممانعت ۸۵-۸۶
— بدزبانی اور شہدپن فاسقوں کی صفات ہیں، مسلمان میں یہ صفات ہوں تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے ۸۵-۸۶
— غیبت کی حرمت ۸۷-۹۰ تا ۹۴
— غیبت اور بہتان کا فرق ۹۰
— غیبت، بہتان اور چغلی کا فرق ۹۳
— غیبت کی حرمت سے مستثنیٰ صورتیں ۹۱ تا ۹۳
— غیبت کس قدر گھناؤنا فعل ہے ۹۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''غیبت'')
— کون سے افعال چغلی کی تعریف میں نہیں آتے ۵۱۳
— اسلام قانون ہتک عزت کا مغربی قانون سے برتر ہونا ۸۴-۸۵

دستوری قانون

— آئین اسلامی کی بنیادی دفعہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کا حکم ہر چیز پر مقدم ہے ۷۰-۷۱

— اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہے۳۰۲-۴۱۲-۴۱۳

— قرآن کا تصورِ حاکمیت۳۰۲-۳۰۳

— احکامِ الٰہی کے خلاف قانون سازی کرنے والے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ۵۶۵

— اسلامی قوانین کے مقابلے میں دوسرے قوانین بنانا اور انھیں اسلامی قانون سے افضل سمجھنا کفر ہے۲۸-۲۹-۳۵۵ تا ۳۵۷

— اللہ ہی کی اطاعت غیر مشروط ہے باقی ہر ایک کی اطاعت معروف کی شرط سے مشروط ہے ۴۴۵ تا ۴۴۷

— حضور اکرمؐ جو حکم دیں وہ دراصل خدا کا حکم ہے اس لیے واجب الاطاعت ہے۴۴۷

— اسلامی ریاست میں قانون کی حکمرانی کا سنگ بنیاد ۴۴۷

اسلام میں قانون سازی

— اسلام میں قانون سازی کا طریقہ ۱۷

— اسلام میں اولین مآخذ قانون کتاب اللہ ہے اور اس کے بعد سنت رسولؐ اللہ ۰۷-۱۷

— کوئی اجماع یا قیاس و اجتہاد کتاب و سنت سے آزاد نہیں ہوسکتا ۱۷-۴۰۰

— اجماع امت اور اجتہاد کی قانونی حیثیت ۳۸۷-۳۸۸-۳۹۹-۴۰۰

— کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کی بنا پر کسی نزاع میں صحیح اور غلط کا فیصلہ کون کرے گا؟ یا بالفاظ دیگر تعبیر قانون کس کا کام ہے؟ ۸۷

— خلافت راشدہ میں قانون سازی کا طریق کار ۲۷-۲۸-۷۸

— فقہائے اسلام نے قرآن و سنت اور اسلام کے اصول عامہ سے قانون اسلامی کس طرح مدون کیا ہے (دیکھو ''اصول فقہ'')

قانون معاشرت

— اسلام مخلوط معاشرے کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے ۸۵

— اسلام میں رشتہ داروں کے حقوق اور قطع رحمی کی حرمت ۲۶-۲۷

— صلہ رحمی کی تعریف ۲۷

— اسلام کا نظام معاشرت مساوات کی اعلیٰ ترین مثال ہے۹۵-۳۸۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرت'' اور ''اسلامی نظم جماعت'')

قانون وراثت

— اسلام کا قانون وراثت اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے ۲۱۵

قانون معیشت

— قانون معیشت کے بارے میں اسلامی احکام، اور اس کی تعبیر کی غلطی جو اشتراکی ذہن کے لوگ ان احکام کی کرتے ہیں ۲۱۵

— اسلامی قانون میں معیشت کا بنیادی قاعدہ ۳۸۹-۳۹۳

— تمام معاشی ذرائع و وسائل جن پر انسان کی معاش کا انحصار ہے اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں ۳۸۷

— شخصی ملکیت کا اثبات حدود اللہ کے اندر ۱۳۹-۴۷۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور بخل سے بچنے کی تلقین ۳۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''بخل'')
— فے کی تعریف ۳۸۸ تا ۳۹۰
— فے اسلامی نظام معیشت میں کیا اہمیت رکھتی ہے ۳۸۸
— فے اور غنیمت کا فرق اور ان کا الگ الگ حکم ۳۸۹ تا ۳۹۱
— فے اور غنیمت سے متعلق قانونی مباحث ۳۹۰-۳۹۱-۳۹۷-۳۹۸
— فے کے حق دار کون ہیں؟ ۳۸۹- ۳۹۱ تا ۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶
— فے کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی ۳۸۹-۳۹۲-۳۹۳
— فے میں موجودہ ہی نہیں بلکہ آیندہ نسلوں کا حصہ بھی ہے ۴۰۰
— فے کے مال سے جہاد کی تیاری پر خرچ کرنے کا مسئلہ ۳۹۲
— فے کی تقسیم کا طریقہ خلافت راشدہ میں ۳۹۷ تا ۴۰۰
— فے کے مسئلے پر حضرت عمر فاروقؓ نے شوریٰ طلب کی ۳۹۹
— بعض ائمہ کی یہ رائے کہ صحابہ کرامؓ کو برا کہنے والوں کا فے میں کوئی حصہ نہیں ۴۰۵
— بزور شمشیر فتح ہونے والے علاقے غنیمت کے حکم میں ہیں فے کے حکم میں؟ ۳۹۷ تا ۴۰۳
— جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی املاک سرکاری ملکیت میں رہیں گی اور اجتماعی مفاد کے لیے استعمال کی جائیں گی ۳۸۹-۳۹۲-۳۹۳ تا ۳۹۶-۴۰۳
— اراضی مفتوحہ کا قانون ۳۸۸ تا ۴۰۳
— وقف املاک اور ان کے احکام ۴۰۲-۴۰۳
— اسلامی قانون کے مالی کفارے ۳۴۲ تا ۳۴۵
— دولت کی گردش کا حکم اور اس میں مال داروں کے علاوہ غرباء کا حصہ ۳۸۹-۳۹۳
— قرآن کے معاشی تصور کے بارے میں چند غلط تفسیروں کی تردید ۲۱۵-۲۵۲
— انسان کو دراصل اس تمام مال و دولت کا مالک نہیں بلکہ اس میں خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے ۳۰۵-۳۰۶

قانون نکاح و طلاق

— اسلامی قانون میں کفو کی اہمیت ۹۹
— ظہار کے متعلق شریعت کا مفصل قانون ۳۴۵ تا ۳۵۵
— الفاظ ظہار غیر عربی زبانوں میں ۳۵۰
— ظہار اور اس کا مفہوم ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۸-۳۴۹
— ظہار صریح کیا ہے؟ ۳۴۹-۳۵۰
— بیوی کو کس سے تشبیہ دینا ظہار ہے ۳۴۸-۳۵۰
— کون سی تشبیہ ظہار کی تعریف میں نہیں آتی ۳۵۰
— قرآن مجید نے محض ظہار نہیں بلکہ عود بعد ظہار کو کفارہ کا سبب بتایا ہے ۳۵۱
— ظہار کے سلسلے میں عود کیا ہے ۳۵۱
— عربوں کے ہاں ظہار طلاق سے سخت تر سمجھا جاتا تھا ۳۴۰
— ظہار کے اسلامی قانون نے جاہلیت کے تمام ان

قواعد کو منسوخ کر دیا جو ظہار کے بارے میں رائج تھے ۳۴۱
— ظہار کا تاریخی پس منظر ۳۴۰
— ظہار ایک ناپسندیدہ اور جھوٹی بات ہے ۳۴۱
— ظہار گناہ ہے لیکن اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا ۳۴۱
— ظہار کا قانونی حکم ۳۴۲
— اسلام میں ظہار کا سب سے پہلا واقعہ ۳۴۲
— ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے مباشرت حرام ہے ۳۴۳
— ظہار شدہ بیوی کے ساتھ ادائیگی کفارہ سے پہلے تعلق زن وشو قائم کرنے کا کیا حکم ہے؟ ۳۴۸
— کفارہ ادا کرنے سے پہلے "تعلق زن وشو" کا اطلاق کس قسم کے تعلقات پر ہوتا ہے ۳۵۲
— ظہار کا کفارہ ۳۴۴-۳۴۵-۳۵۲ تا ۳۵۵
— ایک ظہار کا کفارہ دینے کے بعد دوسری بار پھر ظہار کرنے کا حکم کیا ہے؟ ۳۴۸
— ظہار کی تکرار کے احکام ۳۴۷
— کس شوہر کا ظہار معتبر ہے؟ ۳۴۵
— نشے کی حالت میں ظہار کرنے والے کا کیا حکم ہے؟ ۳۴۵
— کیا عورت بھی ظہار کر سکتی ہے؟ ۳۴۶
— مرتکب ظہار کے کون سے عذرات قابل قبول ہیں اور کون سے قابل قبول نہیں ہیں ۳۴۶
— کیا غیر عورت سے ظہار کیا جا سکتا ہے؟ ۳۴۷
— کیا ایک خاص مدت کے لیے ظہار ہو سکتا ہے؟ ۳۴۷
— ظہار کے الفاظ کو کئی مرتبہ دہرانے کی قانونی حیثیت ۳۴۷
— مشروط ظہار کا حکم ۳۴۷
— دو یا زائد بیویوں سے بیک وقت ظہار کرنے کا حکم ۳۴۷
— ظہار کے بعد طلاق دینے کے بارے میں احکام ۳۵۲
— ظہار شدہ عورت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شوہر کو پھر سے تعلق زن وشو قائم کرنے سے پہلے کفارہ ادا کرنے پر مجبور کرے ۳۵۲
— ظہار شدہ عورت کس طرح مصیبت میں پھنس جاتی ہے ۳۵۲
— ظہار میں ایلاء کے احکام کس حالت میں جاری ہوں گے ۳۵۲
— ذمیوں کے ظہار کے متعلق احکام ۳۴۶
— ظہار کا قانون صرف مسلمانوں کے لیے ہے ۳۴۶
— بیوی سے ظہار کرنے والے کو اپنی بات کی طرف رجوع کا حکم ۳۴۲ تا ۳۴۴
— ظہار کے احکام حدود اللہ میں سے ہیں ۳۵۵
— ظہار کے اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کا طرز عمل ایمان کے منافی ہے ۳۵۵-۳۵۶
— مرد و عورت میں سے کسی ایک کے مسلمان اور دوسرے کے کافر رہنے کی صورت میں احکام نکاح وطلاق ۴۲۱-۴۳۸ تا ۴۴۴
— زوجین میں سے کسی ایک کے مسلمان اور دوسرے کے کافر ہونے کی صورت میں مہر کی ادائیگی کا مسئلہ ۴۴۴
— مسلمان عورت کے لیے کافر مرد اور کافر مرد کے لیے مسلمان عورت حلال نہیں ہے ۴۳۴-۴۳۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسلام قبول کرنے والے مرد کے لیے اپنی کافر بیوی کو روکے رکھنے کی اجازت نہیں ۴۳۷

— منکوحہ عورت جو ہجرت کر کے دارالکفر سے دارالاسلام میں آجائے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان چاہے مہر دے کر اس سے نکاح کرسکتا ہے ۴۳۷

— دارالکفر سے دارالاسلام ہجرت کرنے والی عورتوں، اور مسلمانوں کی دارالکفر میں رہ جانے والی بیویوں کے مہر کا مسئلہ ۴۳۷

— اگر مہروں کا باہمی مفاہمت سے تبادلہ نہ ہو سکے تو کیا کرنا چاہیے؟ ۴۴۳-۴۴۴

— شوہر اور بیوی میں اختلاف دین کے ساتھ اختلاف دار بھی واقع ہو جائے تو اس صورت میں فقہی قانون کیا ہے؟ ۴۳۸ تا ۴۴۴

— جب زوجین دارالاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے تو اس صورت کا قانونی حکم کیا ہے؟ ۴۳۸ تا ۴۴۰

— جب زوجین دارالکفر میں ہوں اور ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے تو اس صورت میں کیا قانونی حکم ہے؟ ۴۴۰

— جب زوجین میں سے کوئی ایک ہجرت کر کے دارالاسلام میں آجائے اور دوسرا دارالکفر میں رہے تو قانون کیا ہوگا؟ ۴۴۰ تا ۴۴۲

— زوجین مرتد ہو جائیں تو ان کے نکاح کا مسئلہ ۴۴۲

— شوہر مرتد ہو جائے تو نکاح کا مسئلہ ۴۴۳

— عورت مرتد ہو جائے تو نکاح کا مسئلہ ۴۴۳-۴۴۴

— مسلمان مرد اور کتابی عورت کے نکاح کا مسئلہ ۴۳۸

— طلاق اور عدت اور نفقہ کے مسائل ۵۵۰ تا ۵۷۸

— طلاق اور عدت سے متعلق سورۂ طلاق کے نزول سے قبل شرعی قانون کی صورت کیا تھی؟ ۵۵۰-۵۵۱

— طلاق کے سابق احکام کی موجودگی میں سورۂ طلاق کے احکام کی نزول کی وجہ ۵۵۰-۵۵۱

— سورۂ طلاق کے نزول سے اسلامی عائلی قوانین کا شعبہ طلاق و عدت مکمل ہو گیا ۵۵۲

— طلاق دینے میں جلد بازی ممنوع ہے ۵۵۳

— طلاق دینی ہو تو عدت کے لیے دی جائے ۵۵۳

— ''عدت کے لیے طلاق'' دینے کی تفسیر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور اکابر مفسرین نے کیا کی ہے؟ ۵۵۳ تا ۵۵۷

— حیض والی مدخولہ عورت یا امکانی حاملہ عورت کے معاملہ میں ''عدت کے لیے طلاق'' کا مطلب کیا ہے؟ ۵۵۳-۵۵۴

— طلاق نہ حالت حیض میں دی جائے اور نہ اس طہر میں جس میں شوہر مباشرت کر چکا ہو ۵۵۳

— حالت حیض میں دی ہوئی طلاق کی شرعی حیثیت ۵۶۰-۵۶۱

— طلاق یا تو اس صورت میں دی جائے جب کہ عورت کا حاملہ نہ ہونا معلوم ہو یا پھر جب اس کا حاملہ ہونا معلوم ہو ۵۵۳

— عورت کو کس حالت میں طلاق دی جائے؟ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور اکابر مفسرین کی تصریحات ۵۵۴-۵۵۵

— طلاق دینی ہو تو بیک وقت تین طلاقیں دے کر

ہمیشہ کے لیے عورت کو علیحدہ کر دینا ظلم اور سخت گناہ ہے اور حضرت عمرؓ اس پر سزا دیتے تھے ۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷
— لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور اکابر مفسرین و فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت دینے سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی ہو جاتی ہے اور رجوع کا حق باقی نہیں رہتا ۵۵۵ تا ۵۵۷
— قرآن، احادیث اور آثار کی مدد سے فقہائے اسلام نے اس بارے میں کیا مفصل قانون مرتب کیا ہے؟ ۵۵۷ تا ۵۶۳
— طلاق کی اقسام ۵۵۷-۵۵۸
— طلاق خواہ صحیح طریقے سے دی جائے یا غلط طریقے سے بہر حال واقع ہو جاتی ہے ۵۵۸-۵۵۹
— کیا بیک وقت تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوں گی؟ ۵۵۹-۵۶۰
— رجعی طلاق دینے والے کے لیے رجوع کا موقع کب تک ہے؟ ۵۶۰
— رجوع کا طریق کار ۵۶۱-۵۶۲
— تین طلاق کے بعد حلالہ کا مسئلہ ۵۶۲-۵۶۳
— طلاق بدعت اور طلاق سنت کے نتائج میں فرق ۵۶۲-۵۶۳
— قرآن نے مردوں کو طلاق کا حق تو دیا ہے لیکن وہ اس حق کے استعمال کو حتی الوسع روکنا چاہتا ہے ۵۵۱-۵۵۲
— طلاق کو مذاق نہ بنا لیا جائے ۵۶۳
— قرآن ان لوگوں کی تردید کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے یا بیک وقت تین طلاقیں دینے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی بھی تردید کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاق دینے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے ۵۶۵
— عدت کا شمار صحیح کیا جائے ۵۶۳-۵۶۴
— زمانہ عدت میں نہ شوہر مطلقہ عورت کو گھر سے نکالے اور نہ وہ خود نکلے ۵۶۳-۵۶۴
— زمانہ عدت میں مرد بیوی کے ساتھ رکھے اور تنگ کرنے کے لیے نہ ستائے ۵۷۳
— عدت کے زمانہ میں عورت کو گھر سے صرف اس وقت نکالا جا سکتا ہے جب کہ وہ صریح فحش کی مرتکب ہو ۵۶۳-۵۶۵
— عورت کو عدت کے زمانے میں سکونت اور نفقہ کا حق ہے ۵۶۴
— طلاق اور عدت کے بارے میں قرآن کے بیان کردہ احکام ”حدود اللہ“ ہیں اور ان سے تجاوز کرنے والا خود اپنے اوپر ظلم کرے گا ۵۶۵
— طلاق کا صحیح طریقہ قرآن میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ اس طریقہ کے خلاف عمل کرنے والے کو پچھتانا پڑے گا ۵۶۵-۵۶۶
— ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت ختم ہونے سے پہلے فیصلہ کر لیا جائے کہ عورت کو زوجیت میں رکھنا ہے یا نہیں، اگر رکھنا ہو تو نباہنے کی غرض سے رکھنا چاہیے نہ کہ ستانے کی غرض سے ۵۶۵-۵۶۶
— طلاق، رجوع یا فرقت، ہر ایک پر مسلمانوں میں سے دو صاحب عدل افراد کو گواہ بنا لیا جائے ۵۶۶-۵۶۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— جن عورتوں کا حیض کبرسنی کی وجہ سے بند ہو چکا ہو ان کی مدت عدت تین ماہ ہے ۵۶۸-۵۷۰

— جن لڑکیوں کو حیض آنا شروع نہ ہوا ہو ان کی مدت عدت بھی تین ماہ ہے ۵۷۰-۵۷۱

— خلوت سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں ہے ۵۷۰

— ایسی لڑکی سے نکاح وخلوت جائز ہے جس کو حیض آنا شروع نہ ہوا ہو ۵۷۱

— ان عورتوں کی عدت کا مسئلہ جن کے حیض میں بے قاعدگی ہو ۵۶۹

— ان عورتوں کا مسئلہ جو مدت عدت گزار رہی ہوں اور اس دوران میں انھیں حیض آنا شروع ہو جائے ۵۷۱

— حاملہ عورت کی عدت یہ ہے کہ وضع حمل ہو جائے ۵۷۰تا۵۷۲

— جس مطلقہ حاملہ کا شوہر زمانہ حمل میں وفات پا جائے اس کی عدت کیا ہوگی؟ ۵۷۱-۵۷۲

— یہ امر متفق علیہ ہے کہ مطلقہ کو اگر رجعی طلاق دی گئی ہو تو زمانہ عدت میں شوہر پر سکونت اور نفقہ کا حق واجب ہے ۵۷۳-۵۷۴

— یہ بھی متفق علیہ ہے کہ حاملہ عورت کو خواہ رجعی طلاق دی گئی ہو یا قطعی، بہرحال زمانہ عدت میں شوہر اس کی سکونت اور نفقہ کا ذمہ دار ہے ۵۷۳-۵۷۴

— اس امر میں اختلاف ہے کہ جس غیر حاملہ عورت کو قطعی طلاق دی گئی ہو وہ زمانہ عدت میں سکونت اور نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں ۵۷۴-۵۷۷

— اس حاملہ عورت کے نفقہ اور سکونت کا مسئلہ جس کا شوہر زمانہ عدت میں مر جائے ۵۷۷-۵۷۸

— نفقہ ہر ایک پر اس کی حیثیت کے مطابق عائد ہوتا ہے ۵۷۸

— عدت کے دوران میں مطلقہ پر مال خرچ کرنا اگرچہ آدمی کو ناگوار ہوتا ہے لیکن اگر وہ اللہ کے حکم پر عمل کرے تو اللہ اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ ہوگا ۵۶۷ تا ۵۶۹

— عورت اپنے دودھ کی مالک ہے ۵۷۹

— عورت کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اگر مطلقہ عورت سے بچے کو دودھ پلوانا ہو تو اجرت طے کی جائے ۵۷۸-۵۷۹

— مرد بھی مجبور نہیں ہے کہ جس عورت کو اس نے طلاق دے دی ہے، اسی سے بچے کو دودھ پلوائے ۵۷۹

— اجرت پر دودھ پلانے کے معاملہ میں ماں کا حق غیر عورت پر مقدم ہے ۵۷۹

— جس بچے کی ماں کو طلاق دے دی گئی ہو، اس کے نفقہ کا ذمہ دار اس کا باپ ہے ۵۷۹

قتل اولاد

— قتل اولاد کی حرمت ۴۴۵

— اسقاط حمل بھی اولاد میں شامل ہے ۴۴۶

قتال فی سبیل اللہ

— دیکھو ”جہاد فی سبیل اللہ“

قرآن

— قرآن مجید ۱۰۸

— قرآن کریم ۲۹۰

— وہ ایک معجزہ ہے ۱۰۸-۱۷۵-۱۸۰

— اس کی نظیر بنا کر لانا کسی انسان کے بس میں نہیں

ہے ۱۰۸-۱۷۴-۱۷۵

— وہ نصیحت کا آسان ذریعہ ہے ۱۲۸-۲۳۵

— اس کو نصیحت کے لیے آسان کر دینے کا مطلب ۲۳۴-۲۳۶-۲۳۸-۲۳۹

— وہ حق ہے ۱۰-۳۱۳

— اس کے برحق ہونے پر ستاروں کے مواقع کی قسم ۲۹۰-۲۹۱

— وہ اللہ کا کلام ہے ۱۰-۱۱-۱۹-۲۰-۲۱۰-۲۳۹

— اسے رب العالمین نے نازل کیا ہے ۲۹۴

— اس کا نازل کیا جانا سراسر رحمت ہے ۲۴۸

— اس کی پیروی کے منافع کی کوئی حد نہیں ۱۰۸

— اس سے وہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور برے انجام سے بچنے کا جذبہ موجود ہے ۱۲۸

— وہ اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں ۲۷

— اس میں خود نبی کی خواہش کا بھی کوئی دخل نہیں ۱۹۳

— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف تو درکنار سرے سے انسانی تصنیف ہی نہیں ہے ۱۷۵

— اس کے کلام اللہ ہونے اور کلام محمدؐ نہ ہونے پر دلیل قاطع ۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹

— اس کی نظیر بنا کر لانے کے لیے تمام انسانوں کو جو چیلنج دیا گیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے ۱۷۵

— وہ خصوصیات جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے ۱۰۸-۱۷۵ تا ۱۷۹

— اس نے پہلے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس کے ذریعہ سے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی ۱۷۶

— وہ تمام ان مسائل پر حاوی ہے جن میں رہنمائی کی انسان کو ضرورت ہے ۱۷۶-۱۷۷

— اس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں کی جا سکتی ۱۰۸

— وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت ہے ۱۰۸-۱۰۹-۱۱۱

— اس میں جو وسیع اور جامع علم پیش کیا گیا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے ۱۷۹

— وسیع موضوع پر بحث رکھنے والی یہ کتاب خود ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہ راست علم رکھتا ہے ۱۷۷

— چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی وہ عربی ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے ۱۷۵

— اس کا موضوع بحث کیا ہے؟ ۱۷۶-۱۷۷

— اس کو بیک وقت نازل نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی رہنمائی کے مطابق چلنے والی تحریک جن جن مراحل سے گزرتی رہی ان میں یہ کتاب بھی حسب موقع نازل ہوتی رہی ۱۷۷-۱۷۸

— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ۲۳ سال میں نازل ہوا لیکن اللہ کے ہاں نوشتہ تقدیر میں پہلے ہی مکمل طور پر ثبت ہو چکا تھا ۲۹۱

— اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے نازل کیا گیا کہ آپ بنی نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں ۳۰۷-۴۷۶

— وہ ایسے طریقے سے نازل ہوا ہے کہ پاکیزہ فرشتوں کے سوا اسے کوئی چھو نہیں سکتا ۲۹۰-۲۹۱

— وہ ایسی محفوظ کتاب میں ثبت ہے جس میں کوئی خلل انداز نہیں ہو سکتا ۲۹۰-۲۹۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— اسے مطہرین کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا ۲۹۰-۲۹۲ تا ۲۹۵

— اسے بلا طہارت چھونے کا شرعی مسئلہ ۲۹۳-۲۹۴

— حامل قرآن ہونے کی عظیم ذمہ داری ۴۱۰-۴۱۱

— وہ حقیقت تک پہنچنے کے کس طریقہ کی نشان دہی کرتا ہے ۱۳۶

— وہ کسی کے غلط فعل پر صرف گرفت ہی نہیں کرتا بلکہ ساتھ ہی نصیحت کرتے ہوئے صحیح راستہ بھی بتاتا ہے ۴۰۹

— وہ انسان کی عقل وفکر کو اپیل کرتا ہے ۲۷-۱۴۰-۳۱۴-۳۸۵-۴۱۱-۵۸۰

— جو لوگ اس کے مضامین پر غور نہیں کرتے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۲۷

— ناحق شناس دلوں پر قفل چڑھ جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ قرآن نہیں سمجھ سکتے ۲۷-۲۸

— اس کے منکروں کو اللہ ہلاکت میں ڈالے گا، ان کے اعمال بھٹکا دے گا اور ان اعمال کو ضائع کردے گا ۱۹-۲۰

— تاثیر قرآن ۱۸۸-۱۸۹-۴۱۰-۴۱۱

— قرآن کے برحق ہونے پر خود قرآن کی قسم ۱۰۸-۱۰۹

— وہ ایک تنبیہ ہے پچھلی تنبیہات میں سے ۲۲۲-۲۲۳

— وہ ایک تنبیہ ہے، جو کوئی چاہے اس سے ڈرے ۱۲۸

— اس کا فلسفہ تمدن ومعاشرت ۷۶ تا ۹۴-۳۸۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرت''، ''اسلامی نظم جماعت'' اور ''قانون اسلام، قانون معاشرت'')

— نظام کائنات کے متعلق اس کا بیان (دیکھو ''کائنات'')

— مابعد الطبیعی حقائق کے بارے میں اس کا بیان ۱۳۶

— معاشی زندگی کے بارے میں اس کی رہنمائی ۳۸۹-۳۹۳-۳۹۶
(دیکھو ''قانون اسلام، قانون معیشت'')

— سیاسی نظام سے متعلق اس کی رہنمائی (دیکھو ''اسلامی ریاست'' اور ''قانون اسلام'')

— تخلیق انسانی سے متعلق اس کا بیان (دیکھو ''انسان، اس کی تخلیق'')

— اس کے نزدیک معیار کامیابی و ناکامی کیا ہے؟ ۴۷-۳۱۰-۴۱۰-۴۷۸-۵۴۱

— اس کا بیان کردہ معیار عزت ۹۵-۹۷-۲۴۲-۳۶۲-۵۲۱

— اس کا فلسفہ اخلاق ۲۱-۲۲-۳۱-۴۹-۷۰-۷۲-۷۶-۸۷-۲۵۱-۳۲۰-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰ تا ۳۶۳-۴۰۳-۴۵۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'')

— اس کی تفسیر کے صحیح اصول کیا ہیں اور غلط اصول کیا؟ ۴۸-۴۹-۶۵-۱۰۰ تا ۱۰۳-۱۱۸-۲۱۵-۲۲۳-۲۲۸-۲۳۵-۲۵۰-۲۵۲-۲۵۳-۲۹۲-۳۳۹-۳۹۳-۳۹۴

— اس کی تفسیر میں پائے جانے والے اختلاف کی نوعیت ۱۳۲-۱۳۹-۱۴۹-۱۵۰-۱۶۲-۱۹۲-۱۹۵-۱۹۶-۲۱۵-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۱-۲۲۲-۲۵۰-۲۷۹-۳۰۷-۳۱۶-۳۳۳-۳۴۳-۳۴۴-۳۸۱-۵۸۰

— اس کی تفسیر میں پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ

۶۳-۱۹۴-۱۹۵-۲۱۵-۳۰۳-۴۳۰-
۴۳۱-۴۳۳-۴۳۴-۴۴۷-۴۴۸-۴۹۵-
۴۹۶

— اس کا مخصوص انداز بیان ۱۹-۹۴-۱۰۸-۱۰۹-
۱۱۶-۱۵۲-۱۵۵-۱۵۶-۱۶۹-۱۹۲-۱۹۷-
۲۶۲-۲۶۳-۳۱۳-۳۲۲-۳۳۹-۳۵۸-
۳۸۴-۴۰۷-۴۰۹-۴۱۰-۴۳۰-۴۳۱-
۴۵۶-۴۷۶-۴۷۹-۴۸۹ تا ۴۹۱-۴۹۸-
۵۱۶

— اس میں بعض جگہ اگرچہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر اصل مخاطب عام انسان، یا مسلمان، یا کفار و مشرکین ہوتے ہیں ۲۴-۲۵-
۴۳-۴۴-۱۸۴-۱۸۵-۵۵۳

— قرآن عام طور پر مردوں اور عورتوں کے ملے جلے ذکر میں مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے اگرچہ مراد صرف مرد نہیں ہوتے ۲۵-۲۶-
۴۷-۸۴-۸۵-۳۰۹-۳۱۱-۳۱۵

— اس کی ہر بات ایک موقع و محل پر اور ایک سیاق و سباق میں ہوتی ہے ۱۱-۱۲-۴۳-۶۱-۷۵-
۱۲۰-۱۳۸-۱۴۴-۲۰۱-۲۱۴-۲۱۵-۲۲۸-
۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-
۲۶۳-۲۶۷-۳۵۷-۳۹۳-۴۰۵-۴۳۳-
۴۵۴-۴۵۹

— اس کی پیش گوئیاں ۳۰-۵۲-۵۳-۵۶-۵۷-
۱۸۱-۱۸۲-۲۴۰-۳۶۵-۴۰۶-۴۰۷-
۴۳۱-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸

— تفسیر قرآن بالقرآن ۱۲-۲۷-۱۰۰ تا ۱۰۲-
۱۳۸-۱۴۹-۱۹۶-۱۹۸-۲۰۲-۲۴۹-۲۵۰-
۲۵۱-۲۵۶-۲۹۱-۳۰۷-۳۰۸-۳۱۷-
۳۱۹-۳۲۲-۳۳۳-۳۸۵-۴۰۹-۴۱۲-
۴۱۳-۴۲۵-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۵۵-
۴۸۶-۴۸۷-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۵-۴۹۷-
۵۲۰-۵۲۸-۵۳۴-۵۳۷-۵۴۶-۵۵۳-
۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷

— قرآن کی تشریح حدیث سے دیکھو "حدیث"

— قرآن کو سمجھنے میں صحابہؓ کا بیان، طرز عمل اور تصریحات کس طرح مددگار ہیں ۱۳-۱۴-۱۵-
۱۷-۲۷-۲۸-۸۱-۸۹-۱۲۶-۱۳۲-۲۱۲-
۲۲۹-۲۴۱-۲۹۳-۳۴۰-۳۴۶-۳۸۷-
۳۹۰-۳۹۴-۴۰۰-۴۲۸-۴۳۹-۴۴۱-
۴۴۲-۴۹۴-۵۵۴-۵۵۶-۵۶۹-۵۷۰-
۵۷۱-۵۷۶

— قرآن کو سمجھنے میں فقہا اور اکابر مفسرین کا کام کس طرح مددگار ہے۔ دیکھو "اصول فقہ"

— کسی واقعہ کا آیات قرآنی کی شان نزول ہونا
۴۳۸-۴۵۶

— قرآن کی آیات اور سورتوں کا زمانہ نزول معلوم کرنے کا طریقہ ۶-۱۲-۲۱-۳۰-۳۴-۴۰-
۵۳-۱۰۶-۱۳۰-۲۱۳-۲۱۴-۲۲۶-۲۴۴-
۲۴۵-۲۷۴-۲۹۸-۳۳۶-۳۷۰-۴۰۶-
۴۲۰-۴۵۲-۴۸۲-۵۰۸-۵۲۴-۵۵۰

— قرآنی تشبیہات ۲۳۶-۲۳۸-۳۱۴

— اصطلاحات قرآنی کی تشریح ۹-۱۰-۱۱-۲۱-
۲۲-۲۷-۸۴-۸۵-۱۰۰ تا ۱۰۳-۱۱۹-۱۲۰-

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۴۷- ۲۷۷- ۲۷۸- ۳۲۱- ۳۲۴- ۳۴۰- ۴۵۵-۴۸۶-۴۹۳-۵۳۳-۵۴۱

— قرآن کی بعض اصطلاحات کا مطلب کسی دوسری زبان میں ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا ۵۳۷

— ایک ہی اصطلاح کو قرآن میں مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے ۴۸۸

— قرآن کا تاریخ سے استدلال ۲۰- ۲۱- ۳۲- ۱۱۴- ۱۲۴- ۱۴۳ تا ۱۵۰- ۱۵۲- ۲۱۳- ۲۲۱- ۲۲۲- ۲۳۱ تا ۲۳۹- ۲۴۱- ۳۲۳ تا ۳۲۵- ۳۵۶- ۴۲۸ تا ۴۳۱- ۴۵۷- ۴۵۹- ۴۷۹- ۵۳۲تا۵۳۶-۵۸۰

— قرآن میں قصے کس مقصد کے لیے بیان کیے گئے ہیں ۴۵۷-۴۵۸

قرآنی قصے

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ۱۴۳ تا ۱۴۵-۲۱۳-۲۱۴-۳۲۳-۴۲۸تا۴۳۰

— حضرت اسحاق علیہ السلام ۱۴۴-۱۴۵

— حضرت الیاس علیہ السلام ۴۶۱-۴۶۲

— حضرت صالح علیہ السلام ۲۳۶-۲۳۷

— حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۳۲۴ تا ۳۳۳- ۴۵۸ تا ۴۶۳-۴۷۰-۴۷۹-۴۸۰

— حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۴۷ تا ۱۴۹- ۱۹۱- ۲۱۳-۴۵۷-۴۵۹تا۴۶۱

— حضرت نوح علیہ السلام ۱۱۴-۱۵۰-۲۲۱-۲۳۳ تا۲۳۵-۳۲۳

— حضرت یحییٰ علیہ السلام ۴۶۱-۴۶۲

— حضرت یعقوب علیہ السلام ۱۴۵

قرآنی تمثیلات

— دنیوی زندگی کے معاملے میں کافروں کے رویے کی مثال ۲۱

— حکم جہاد آنے پر منافقین کی حالت کی مثال ۲۵

— غیبت کرنے والے کی مثال ۹۴

— منافقین مدینہ کی مثال ۵۱۷-۵۱۹

— منافقین مدینہ اور قریش مکہ کی باہمی مشابہت اور اسلام کے مقابلے میں ان کی نامرادی کی مثال ۴۰۷-۴۰۸

— منافقین مدینہ اور یہود کے ساتھ شیطان کے معاملہ کی تمثیل ۴۰۸-۴۰۹

— علمائے یہود کی مثال ۴۸۹

— صحابہ کرامؓ کے گروہ کی مثال ۶۴-۶۵

— اللہ اور انسان کے قریبی تعلق کی مثال ۱۱۶

— قرآن کی عظمت کی تمثیل ۴۱۱

— آخرت کے برحق ہونے پر ایک مثال ۱۴۳

— میدان حشر میں منکرین آخرت کی تمثیل ۲۳۲

— منکرین آخرت کے لیے قبروں میں مایوس پڑے ہوئے کافروں کی مثال ۴۵۰

— دنیوی زندگی کی مثال ۳۱۷

قرآنی دعائیں

— حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی اللہ سے دعائے مغفرت اور فتنہ کفار سے بچانے کی استدعا ۴۳۰

— پہلے گزرے ہوئے مومنین کے لیے دعائے مغفرت اور کسی مومن کے لیے دل میں بغض نہ

رکھنے کی دعا ۴۰۳

قربانی

— حج کے موقع پر قربانی کی جگہ حدودِ حرم ہے ۵۸
— جان و مال کی قربانی کس وقت زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہے ۲۹۹-۳۰۸

قریش

— ان کی وہ تمام کوششیں جو وہ حق کو روکنے کے لیے کر رہے تھے آخرکار رائیگاں گئیں ۹-۱۰
— ان کی اور مسلمانوں کی باہمی کش مکش میں طرفین کی حیثیت ۳۰-۳۴-۳۵
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان کی سمجھ میں کیوں نہ آتی تھی؟ ۱۱۰-۱۱۱-۱۷۹
— اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ان کی روش ۶۵-۱۱۱-۱۶۰-۱۶۱-۱۷۲-۱۷۴-۱۸۹-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۶-۲۲۸-۲۳۱-۴۲۴
— ان کی اس روش پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہ ۲۶-۱۶۰-۱۹۰-۲۲۷-۲۳۱-۲۴۰
— وہ چاہتے تھے کہ حضورؐ پر کوئی آفت آئے اور ان کی جان چھوٹے ۱۷۳
— وہ آپؐ کے خلاف جان بوجھ کر جھوٹا پروپیگنڈا محض عناد کی بنا پر کرتے تھے ۱۷۴
— وہ خواہشاتِ نفس کے پیرو تھے ۲۳۱
— ان کی ہٹ دھرمی ۱۸۳
— ان کی گمراہی اور عناد کی وجہ بس یہ تھی کہ وہ ایمان نہ لانا چاہتے تھے ۱۷۴
— ان کو چیلنج کہ حقیقت کو جاننے کا ذریعہ تو رسول ہی ہیں اگر تم کوئی ذریعہ رکھتے ہو تو کھلی دلیل لاؤ ۱۷۹تا۱۸۲
— وہ معجزے مانگتے تھے حالانکہ اگر انھیں معجزے دکھا بھی دیے جاتے تو وہ کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالتے ۱۸۳-۱۸۴
— معجزہ شق القمر کو انھوں نے جادو قرار دیا ۲۳۱
— قریش قرآن مجید کو سنجیدہ توجہ کے قابل ہی نہ سمجھتے تھے ۲۹۴-۲۹۵
— انھوں نے ایک صحابیؓ کو قرآن پڑھنے کی کیا سزا دی ۲۴۵-۲۴۶
— وہ قرآن کی آواز سننا برداشت نہ کرتے تھے ۲۴۵
— وہ قرآن مجید کو اپنے معاشی مفاد کے لیے مضر سمجھتے تھے ۲۹۴-۲۹۵
— حضورؐ کا قریش کو کہنا کہ تم بھی خدا کے فیصلے کا انتظار کرو، میں بھی کرتا ہوں ۱۷۳
— ان کی اس بات پر حیرانی کہ خبردار کرنے والا ہم میں سے کیسے آ گیا؟ ۱۰۸-۱۰۹
— ان کا حضورؐ پر یہ الزام کہ آپ نے قرآن خود تصنیف کر لیا ہے اور اس کا جواب ۱۷۴تا۱۷۹
— ان کے اس الزام کا جواب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کاہن ہیں اور جن اور شیطان آپ پر یہ کلام القا کرتے ہیں ۲۹۰-۲۹۱
— ان کا اپنی قوت پر گھمنڈ اور اس کی حقیقت ۲۴۰
— قریش سے زیادہ زور آور بستیوں کو اللہ نے ہلاک کر دیا اور کوئی انھیں بچانے والا نہ تھا ۲۱
— اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ کفار قریش پر تنبیہات کارگر نہیں ہوتیں اس لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ

Maktaba Tul Ishaat.com

دو ۲۳۲

— انھوں نے جب صلح حدیبیہ توڑ دی تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کی ۴۲۲

— اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں اللہ وہ سب جانتا ہے ۱۲۸

— حضوؐر کے خلاف ان کی تدبیروں اور سازشوں کا جواب ۱۸۱-۱۸۲

ان کی ناکامی کی صاف صاف پیش گوئیاں ۲۴۰-۴۰۸-۴۷۶

— انھوں نے مسلمانوں کو صرف اس لیے مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے ۴۲۲

— انھوں نے محض جاہلانہ حمیت کی بنا پر حضوؐر اور مسلمانوں کو حج اور عمرہ سے روکا ۶۰

— وہ کافر ومشرک اور سرکش تھے ۵۸-۶۰-۱۷۳-۱۷۴-۱۸۱-۱۸۲-۲۰۶

— ان کے چند خود ساختہ معبود ۲۰۶-۲۰۷

— اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی عبادت و پرستش کے لیے ان کے پاس کوئی سند نہ تھی بلکہ صرف باپ دادا کی تقلید اور اپنے وہم و گمان اور خواہشات نفس کی پیروی تھی ۲۰۸

— ان کے اس دین پر طنز جس پر وہ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت چل رہے تھے ۱۹۰

— قیامت کے روز کفار قریش کی حالت ۲۴۰

قضا وقدر

— دیکھو ''تقدیر''

قیامت

— قرب قیامت کا ذکر ۱۹۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۸-۲۳۰

— معجزہ شق القمر قیامت کے قرب کی علامت تھا ۲۲۸

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی قرب قیامت کی علامت تھی ۲۴

— عالم بالا م ہی میں یہ فیصلہ ہونا ہے کہ انسان کو جزائے اعمال کے لیے کب بلایا جائے ۱۴۳

— قیامت کا برپا ہونا اللہ کے صرف ایک حکم پر موقوف ہے ۲۴۱

— اس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے ۲۸۳

— اس کو برپا کرنا اللہ کے لیے بالکل آسان ہے ۵۳۴-۵۳۶

— تمام انبیاء ہر زمانے میں اس کے آنے کی خبر دیتے رہے ہیں ۱۶۵

— اس کی آمد کے وقت کا کسی کو علم نہیں ۱۳۷

— اللہ کے سوا اس کی آمد کو کوئی ٹال نہیں سکتا ۲۲۲-۲۲۳

— اس کو جھٹلانے والوں کا دردناک انجام ۱۶۶-۱۸۳

— روز قیامت کی کیفیت ۱۱۸ تا ۱۲۷-۲۳۲-۲۳۳-۲۴۰

— اس روز زمین پھٹ جائے گی ۱۲۷

— زمین ہلا ڈالی جائے گی ۲۷۶-۲۷۷

— پہاڑ اڑتے پھریں گے ۱۶۶-۲۷۶-۲۷۷-۲۸۲-۲۸۳

— آسمان ڈگمگائے گا ۱۶۳-۱۶۶

— آسمان رنگے ہوئے چمڑے کی طرح سرخ ہو

جائے گا ۲۶۴
— اس دن کے ہولناک مناظر ۱۲۷- ۱۶۶- ۲۲۸- ۲۳۲- ۲۴۰- ۲۶۴- ۲۷۶- ۲۷۷
— قیامت میں زمان و مکان کے اعتبارات کتنے بدلے ہوئے ہوں گے ۱۲۷
— روز قیامت کو منادی کی جائے گی ۱۲۵- ۱۲۷
— اس روز تمام لوگ اللہ کے حضور پیش ہوں گے ۱۱۸
— وہ جزا و سزا کا دن ہے ۱۳۲- ۱۳۵- ۱۳۶- ۱۶۷- ۲۸۴- ۴۲۵
— اس روز جنوں اور انسانوں سے پورا پورا حساب لیا جائے گا ۲۶۲- ۲۶۳
— قیامت کے روز فیصلے کے بعد متقین کے جنت پہنچنے میں کوئی تاخیر نہ ہوگی ۱۲۲
— اس روز منافقین اللہ کے حضور بھی جھوٹ بولنے کی جسارت کریں گے ۳۶۵
— اس روز مجرمین کے گناہ چھپ نہ سکیں گے ۲۶۴- ۲۶۵
— وہ ہار جیت کا دن (یوم تغابن) ہوگا ۵۳۶ تا ۵۴۰
— اس روز تمام انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا جائے گا ۲۷۷ تا ۲۸۵
— اس روز رشتہ داریاں اور اولاد کسی کام نہ آئیں گی اور ہر شخص ذاتی حیثیت میں اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوگا ۴۲۴- ۴۲۵
— اس روز منکرین کو کیسی سزا دی جائے گی ۱۳۵- ۱۳۶- ۱۶۶- ۱۸۳- ۲۳۲- ۲۶۵- ۲۶۶- ۲۸۲ تا ۲۸۴
— اس روز انسان کے سامنے ساری حقیقت کھل جائے گی ۲۸۶
— قیامت یقیناً واقع ہونے اولی ہے اور جب وہ آئے گی تو پھر کوئی اسے جھٹلانے والا نہ ہوگا ۲۷۶
— اس روز کسی کی کوئی چال کام نہ آئے گی ۱۸۳
— وہ دن کفار کے لیے بڑا سخت ہوگا ۲۳۲- ۲۴۰
— اس دن مجرمین کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا ۲۶۵
— اس دن کفار کو آگ میں ڈالا جائے گا ۱۱۹- ۱۲۱- ۱۶۶- ۱۶۷- ۲۴۰- ۲۶۵- ۵۴۱
— اس دن مجرمین آگ اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان دوڑتے پھریں گے ۲۶۵
— اس کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کو دنیا میں عذاب کا مزہ چکھایا جاتا ہے ۱۸۳
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''حشر'' اور ''زندگی بعد موت'')

ک

کافر

— دیکھو ''کفر''

کائنات

— اس کی حقیقت ۵۲۴- ۵۲۵
— اللہ کائنات کی بادشاہی کا مالک ہے ۵۱- ۲۱۱- ۳۰۲- ۳۰۴
— پوری کائنات میں اللہ کی حکمرانی چل رہی ہے ۵۲۷
— کائنات کے سارے لشکر اللہ کے قبضے میں ہیں ۴۵- ۴۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ۳۰۱-۳۸۱-۴۱۵-۴۵۴-۴۸۵-۵۲۷

— اللہ ہی کے لیے کائنات کی میراث ہے ۳۰۸

— اللہ ہی کائنات کے خزانوں کا مالک ہے ۵۲۱

— اللہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے ۲۵۶-۲۵۸

— پورا نظام کائنات وجود باری تعالیٰ کی شہادت دیتا ہے ۵۲۷

— اللہ نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا ۱۲۴-۳۰۳

— کائنات ایک ہی دفعہ بن کر مکمل نہیں ہوگئی ہے بلکہ اس میں برابر توسیع ہو رہی ہے اور اللہ کی قدرت کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں ۱۵۰-۱۵۱

— نظام کائنات کے مختلف عوامل ۱۳۲-۱۳۳

— کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا یعنی اصول تزویج پر بنائی گئی ہے ۱۵۱

— کائنات کو برحق پیدا کیا گیا ہے ۵۲۹-۵۳۰

— کائنات ایک بامقصد اور باقاعدہ نظام ہے ۱۳۳-۱۳۴-۱۴۱-۱۴۲-۲۵۰-۲۵۱-۵۲۷

— پوری کائنات مسلسل و منظم ہے اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے ۱۱۰-۱۱۲

— سورج اور چاند ایک زبردست اور اٹل ضابطے کے پابند ہیں ۲۵۰

— فطرت کائنات یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہر جگہ عدل و انصاف ہو کیونکہ یہ خود عدل پر قائم کی گئی ہے ۲۵۱-۲۵۲-۴۱۶

— سلطنت کائنات میں قانون طبیعی کے ساتھ ساتھ قانون اخلاقی بھی کارفرما ہے ۱۴۳

— کائنات کے تمام معاملات فیصلے کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں ۳۰۴

— کائنات میں ہر چیز کی حاجتیں ہر آن نئی شان سے پوری ہو رہی ہیں ۲۶۱

— کائنات کی ہر چیز کو اللہ براہ راست جانتا ہے ۱۰۲-۳۵۷-۵۲۹

— اس دنیا میں انسان اور جن ہی بااختیار مخلوق ہیں ۱۵۵

— زمین کے علاوہ بھی کائنات میں زندہ مخلوقات موجود ہیں ۵۸۱ تا ۵۸۳

— اس کائنات سے فرار کسی مخلوق کے لیے ممکن نہیں ہے ۲۶۳

— کائنات خداوندی کے اسرار انسانی فہم کی رسائی سے بالا ہیں ۲۰۰

— قرآن میں کائنات کی حقیقتوں کی طرف اشارات کس مقصد کے لیے کیے گئے ہیں ۵۸۲

— کائنات میں کہکشانوں کا عظیم الشان نظام ۱۱۱

کاہن

— معنی اور مفہوم ۱۷۲-۱۷۳

— قریش کے لوگ حضورؐ پر کاہن ہونے کا بہتان لگاتے تھے ۱۱۰-۱۷۲-۱۷۳

کتاب

— انسان کی تعلیم کے لیے اللہ کی طرف سے کتاب اور اس کے ساتھ رسول کا آنا عین تقاضائے فطرت و رحمت ہے ۲۴۸ تا ۲۵۰

— کتاب کے نزول کو بارش سے تشبیہہ دی گئی ہے ۳۱۴
— انبیاء سبقین کے صحیفوں کو کتاب مسطور کہا گیا ۱۶۲
— آخرت پر کتب مقدسہ سے استدلال ۱۶۴
— زمانہ قدیم میں کتب آسمانی کو کس طرح محفوظ کیا جاتا تھا ۱۶۲

کفارہ

— گناہ کے بعد خدا کا مقرر کردہ کفارہ ادا کرنا ایمان کا تقاضا ہے ۳۵۵ تا ۳۵۷
— مالی کفارے ادا کرنے میں بیت المال سے بھی غریب آدمی کی مدد کی جاسکتی ہے ۳۴۳-۳۵۳
— کفارہ ظہار کے روزوں کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح وطلاق''

کفر

— معنی اور مفہوم ۹-۵۴۱
— حقیقی کفر اور قانونی کفر کا فرق ۵۱
— کافر کون ہیں ۱۹-۲۰-۲۸-۱۰۱-۱۱۹
— کٹے کافر کی خصوصیات ۱۱۹-۱۲۰
— کافر اور مومن کا فرق ۱۰-۱۱
— کفار مومنوں کے پکے دشمن ہیں ۴۲۴
— کافر و مومن برابر نہیں ہوسکتے ۲۱-۲۲
— اللہ کے احکام کی دانستہ نافرمانی پر لفظ ''کفر'' کا اطلاق ۳۵۵-۳۵۶
— انسان اپنی مرضی سے کفر اختیار کرتا ہے، اس لیے وہ اپنے کفر کا ذمہ دار ہے ۵۲۸
— کفر کا انجام دنیا اور آخرت میں ۱۰-۱۹-۲۰-۲۱-۲۹-۳۰-۵۱-۱۵۷-۱۸۳-۲۹۶-۳۱۷-۳۵۵-۵۳۲-۵۳۳-۵۴۱
— کفار کے لیے دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے ہیں جس میں وہ جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں لیکن ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہی ہے ۲۱
— ان کے لیے جہنم اور کھولتا ہوا پانی مقدر ہے ۲۹۶-۳۱۷-۵۴۱
— کفار ومنافقین کا انجام ایک ہوگا ۳۱۳
— کافروں کے اعمال کو اللہ ضائع کر دیتا ہے ۹-۱۱-۱۹-۲۰-۲۹-۳۰
— کفر کے ساتھ کوئی نیکی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے ۹-۱۰
— کفر ہی اصل گمراہی ہے، اعمال خواہ نیک ہوں یا بد ۱۹-۲۰
— کفار کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں اور ان کے دلوں پر خواہشات نفس کی پیروی کی وجہ سے ٹھپہ لگا دیا گیا ہے ۲۱-۲۳
— کافروں کو اللہ غلط کاموں ہی کی توفیق دیتا ہے ۹
— کافر باطل کے پیرو ہیں ۱۰
— اللہ چاہے تو کفار کو خود ہی تہس نہس کر دے لیکن وہ یہ کام مومنوں سے کرواتا ہے کہ طرفین کا امتحان ہو ۴۵-۴۸
— کافر اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۰
— ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہے ۲۰
— مرتے دم تک جو لوگ کفر پر قائم رہیں اللہ انھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

کبھی معاف نہ کرے گا ۳۰
— قیامت کے روز کفار کی دردناک حالت ۱۸۳-۲۳۲
— کفار آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں اور اس سے مایوس ہیں ۱۰۶-۴۵۰-۵۳۴
— مرنے کے وقت کافروں کا برا حال ہوتا ہے ۲۹۵-۲۹۶
— کفار محض مذاق کے طور پر پوچھتے تھے کہ قیامت کب آئے گی ۱۳۵-۱۳۷
— کفار کو دھمکی کہ آخرت سے متعلق جو باتیں تم بنا رہے ہو، اللہ ان سے واقف ہے ۱۲۸
— کفار ہر ملک اور ہر زمانے میں ایک جیسی ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہیں اور انکار حق کا وصف ان میں ہمیشہ مشترک رہا ہے ۱۵۳
— کفار ہمیشہ حق کی مخالفت کے لیے عقل کو دلیل بناتے ہیں حالانکہ عقل سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ۱۰۸-۱۰۹
— معجزہ شق القمر دیکھ لینے کے بعد کافروں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے ۲۳۱
— کافروں کو خواہ کتنا ہی ناگوار گزرے اللہ کا نور (اسلام) پھیل کر رہے گا ۴۷۶
— کافروں کی چالیں ان ہی پر الٹ دی جائیں گی ۱۸۱-۱۸۲
— کفار مومنوں کے پکے دشمن ہیں اور مسلمانوں کو ہاتھ اور زبان سے زک پہنچانے پر کمربستہ رہتے ہیں ۴۲۴
— کفار چاہتے ہیں کہ مسلمان کفر اختیار کرلیں ۴۲۴
— اسلام کے مقابلے میں کفار کی چالیں اور سازشیں ۱۷۲
— اہل کفر میں سے جو لوگ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں ان کے ساتھ بھلائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۴۳۲-۴۳۳
— جو کافر اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے میں سرگرم ہوں ان سے دوستی ممنوع ہے ۴۲۲-۴۳۲-۴۵۰
— کفار اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ کر ہی رہیں گے ۵۳۲-۵۳۳
— کفار رحمت خداوندی سے مایوس ہوتے ہیں ۴۵۰

گ

گمان

— گمان کی مختلف اقسام اور ان میں جائز و ناجائز کا فرق ۸۷-۸۸
— کفار و مشرکین گمان کی پیروی کرتے ہیں ۲۰۸-۲۱۰
— آخرت کے بارے میں گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کرنے والوں کا انجام ۱۳۵-۱۳۶-۲۰۸
— گمان علم حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آسکتا ۲۱۰
(مزید دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'')

گمراہی

— دیکھو ''ضلالت''

گناہ

— گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کا فرق ۲۱۲-۲۱۳
— بڑے بڑے گناہوں سے بچنے والے اہل ایمان کے لیے مغفرت ہے ۲۱۱

ل

لات

— دیکھو "بت پرستی"

لعنت

— کیسے لوگ اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں ۲۶-۴۷

لوط علیہ السلام

— ان کی قوم نے ان کی نبوت اور آخرت کا انکار کیا ۱۱۴-۲۳۸
— قوم لوطؑ کی اخلاقی پستی ۲۳۹
— حضرت لوطؑ کے مہمانوں سے بدکاری کی نیت کرنے والوں کو اندھا کر دیا گیا ۲۳۹
قوم لوط پر عذاب کی آمد اور اس کی کیفیت ۱۴۶- ۲۲۱-۲۲۲-۲۳۸-۲۳۹
— وہ ایک مجرم قوم تھی ۱۴۶
— حضرت لوطؑ اور مومنین کا بفضل خدا عذاب سے بچ جانا ۱۴۶-۲۳۸
عذاب نے قوم لوطؑ کا سب کچھ مٹا ڈالا اور صرف ایک نشان عبرت رہنے دیا گیا ۱۴۶ تا ۱۴۸
— حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں یہ قوم مبتلائے عذاب ہوئی تھی ۱۴۵-۱۴۶-۲۲۳

م

متقین

— دیکھو "تقویٰ"

مجرمین

— دیکھو "جرم"

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

— آپ کی بعثت سے پہلے اہل عرب گمراہی میں مبتلا تھے ۴۸۷-۴۸۸
— آپؐ اللہ کے آخری نبی ہیں ۲۴
(مزید دیکھو "ختم نبوت")
— آپؐ کی بعثت قرب قیامت کی علامت ہے ۲۴
آپؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا گیا ۶۲-۴۷۷
— آپؐ پوری دنیا کے لیے ہادی بنائے گئے ۴۸۸
— آپؐ کی بعثت کے بنیادی مقاصد اور وہ کار عظیم جس کے لیے آپؐ کو بھیجا گیا ۶۲-۶۳-۴۷۷-۴۸۵ تا ۴۸۷-۵۸۰
— آپؐ کا پیغام بالکل سچا تھا ۱۹۲-۱۹۳-۱۹۷-۱۹۸
— آپؐ اللہ کے رسول ہیں ۵۱-۵۴-۶۱-۶۲-۶۳-۷۰-۷۲-۱۵۱-۱۵۲-۳۶۳-۳۶۵-۳۶۶-۳۹۵-۴۷۷-۴۸۵-۴۸۶-۵۱۶-۵۱۹-۵۲۱-۵۳۶
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حیثیت بیان کرتا ہے ۲۹-۳۰-۴۳ تا ۴۵-۴۸-۴۹-۵۱-۵۷-۵۸-۶۱-۶۲-۶۳-۷۰ تا ۷۳-۱۰۸-۱۲۸-۱۵۱ تا ۱۵۴-۱۷۱ تا ۱۷۴-۱۹۲ تا ۱۹۶-۱۹۸-۲۰۱-۳۰۴-۳۰۶-۳۳۳-۳۳۴-۳۶۲-۳۶۳-۳۹۲ تا ۳۹۴-۴۶۱-۴۷۷-۴۸۵ تا ۴۸۸-۵۱۹
— آپؐ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے ۴۸-۱۵۱-۲۲۲-۴۶۱
— بحیثیت رسول آپ کی اطاعت لازماً ایمان ہے ۳۰-۵۴-۱۰۱-۳۶۳-۵۴۳
— آپؐ کا ہر امر و نہی امت کے لیے واجب الاتباع ہے ۳۹۲ تا ۳۹۴
— اگر کوئی اطاعت سے منہ موڑتا ہے تو آپ کی ذمہ داری حق پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں ہے ۵۴۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— آپؐ کا کام جبراً لوگوں کو ہدایت دینا نہ تھا ۱۲۸
— آپؐ خالص ہدایت لے کر آئے ہیں ۴۷۷
— آپؐ کی اور قرآن کی پیروی ہی میں نوع انسانی کے لیے فلاح اور نجات ہے ۱۰-۵۸۰-۵۸۱
— آپؐ کی اطاعت کو بھی اطاعت فی المعروف کی شرط سے مشروط کیا گیا ۴۴۵ تا ۴۴۷
— آپؐ صاف صاف خبردار کر دینے والے ہیں اور اس سے زائد آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۱۲۸-۱۵۱-۱۵۲
— آپؐ کی شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت میں آپؐ کے افعال کو کس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے ۱۹۴-۱۹۵
— آپؐ کی حیثیت امارت اور حیثیت پیغمبرانہ کے بارے میں ایک توضیح ۴۴۷-۴۴۸
— آپؐ کے سپرد چار کام کیے گئے: تلاوت آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت ۴۸۵- تا ۴۸۷
— آپؐ نے اللہ کی طرف سے ایسے احکام بھی دیے ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں ۴۹۲
— آپؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی ۶۱-۶۲-۳۸۶-۴۲۲-۴۹۲
— آپؐ بحیثیت معلم و مربی ۴۸۵-۴۸۶
— آپؐ بحیثیت شارع ۳۹۲-۳۹۳
— آپؐ بحیثیت حاکم و فرماں روا ۳۰-۴۹
— آپؐ اسلامی ریاست کے سربراہ تھے ۳۸۲
— آپؐ پر قرآن کے علاوہ میزان بھی نازل کی گئی ۳۲۱
— آپؐ کی بعثت کے بعد آپؐ کی نبوت اور آپؐ پر نازل شدہ تعلیمات کو ماننا تمام دنیا کے لیے لازمہ ایمان ہے ۱۰-۴۸-۱۰۱
— آپؐ کی رسالت پر مخالفین کے مختلف اعتراضات ۱۰۸- ۱۰۹- ۱۷۲- ۱۷۳- ۱۷۴ تا ۱۷۹- ۲۳۶-۲۳۷-۲۹۰-۲۹۱-۵۳۳
— منکرین آپؐ کی دعوت پر تعجب کا اظہار کرتے تھے ۱۰۸-۲۲۳
— آپؐ کی رسالت کے حق میں دلائل ۱۰۸-۱۰۹-۱۱۱-۱۸۰-۱۹۲-۱۹۳-۲۲۹-۲۳۰-۴۸۷-۴۸۸
— آپؐ کی ساری زندگی بے داغ تھی اور ساری قوم کے سامنے تھی ۱۱۱-۵۳۵
— آپؐ اللہ کی نگرانی و ہدایت کے تحت کام کرتے تھے اور اللہ نے آپؐ کو رسول بنا دینے کے بعد اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا تھا ۱۸۴
— آپؐ کو کفار نے جھٹلایا ۱۱-۲۲۹
— آپؐ کو مجنون کہا گیا ۱۷۲-۱۷۳
— آپؐ کو کاہن کہا گیا ۱۷۲-۱۷۳
— آپؐ کو شاعر کہا گیا ۱۷۳
— آپؐ کو جادوگر کہا گیا ۲۳۱-۴۷۶
— آپؐ کو سچا جانتے ہوئے بھی کفار نے ہٹ دھری سے آپ کا انکار کر دیا ۱۱۰-۱۱۱-۱۳۱
— آپؐ پر کہانت کے الزام کی لغویت ۱۷۳
— آپؐ کو مجنون اور کاہن کہنے والوں کے الزام کی تردید ۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳
— آپؐ کو کاہن اور قرآن کو جن اور شیطان کا القا کردہ کلام کہنے والوں کو جواب ۲۹۰-۲۹۱

— آپؐ قرآن کے مصنف نہیں بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے ۲۴۸

— آپؐ پر قرآن کی تصنیف کا الزام لگانے والوں کو جواب ۱۷۴ تا ۱۷۹-۲۴۸

— آپؐ کا کلام اپنی مثال آپ ہے ۱۷۸-۱۷۹

— آپؐ کا کلام وحی ربانی کے تابع تھا ۱۷۸-۱۷۹-۱۹۳-۱۹۴

— آپؐ کے خلاف قریش کی تدابیر ۱۱۰-۱۳۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۸۲-۱۸۸-۱۸۹-۲۲۹-۲۳۱

— معجزہ دکھانے کے لیے ہٹ دھرم مخالفین کا مطالبہ اس لیے پورا نہیں کیا گیا کہ کوئی معجزہ دیکھ کر بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے ۱۶۱

— آپؐ کی صداقت پر قرآن کی گواہی ۱۹۷-۱۹۸-۵۳۵

— حضورؐ کی بعثت خود ایک معجزہ تھی ۴۸۸

— آپؐ سے اللہ کا وعدہ کہ کفار کی تدابیر آپ کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوں گی ۱۰-۱۲۸

— اللہ کا وعدہ کہ وہ آپؐ کے مخالفوں کو تباہ کرے گا ۲۰-۱۸۲-۱۸۳

— اللہ کا وعدہ کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے گا جنھوں نے آپؐ کو مکہ سے نکالا تھا ۲۱

— آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کی جاں بازی سے دشمن خائف رہتے تھے ۴۰۶-۴۰۷

— حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کی غیر معمولی شان جسے دیکھ کر دشمن مرعوب ہو گئے ۳۷

— شق القمر کا واقعہ ۲۲۶-۲۲۹

— کیا یہ واقعہ آپؐ کی رسالت کے حق میں معجزہ دکھانے کے لیے پیش آیا تھا؟ ۲۳۰

— اس واقعہ کی صداقت پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب ۲۳۰-۲۳۱

— تخلیہ میں آپؐ سے بات کرنے کے لیے صدقہ ادا کرنے کا حکم اور اس حکم کی منسوخی ۳۶۲ تا ۳۶۴

— دین میں آپ کا بلند مقام ۷۰ تا ۷۳

— اللہ کے نزدیک وہی متقی ہیں جو آپؐ کے ادب کو ملحوظ رکھیں ۷۲

— وہ آداب جو آپؐ سے بات کرنے کے لیے لوگوں کو سکھائے گئے ۷۰ تا ۷۲

— وہ آداب جو آپؐ کے ہاں حاضری کے لیے مسلمانوں کو سکھائے گئے ۷۲-۷۳

— ان لوگوں کو سرزنش جو حضورؐ کی موجودگی میں اپنی رائے منوانے کی کوشش کرتے تھے ۷۵

— اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے عزت ہے ۵۲۱

— آپؐ کے سامنے اونچی آواز سے بولنا بھی ایمان غارت کر دینے والی چیز ہے ۷۰

— آپؐ کو استغفار کا حکم اور اس کی تشریح ۲۴-۲۵

— آپؐ کے لیے مغفرت اور اتمام نعمت کی بشارت ۴۳-۴۴

— آپؐ کو اللہ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھائے جانے کا مطلب ۴۴

— اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو صبر کی تلقین ۱۲۵-۱۸۴

— آپؐ کی بعثت تمام نوع انسانی کی طرف ہمیشہ کے لیے ہے ۴۸۷-۴۸۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— آپؐ کی دعوت وہی تھی جو پچھلے انبیاء کی تھی ۳۸۵
— آپؐ کی بعثت اللہ کی حکمت وقدرت کا کرشمہ ہے ۴۸۸
— وہ امور جن میں آپؐ نے اپنی ذاتی رائے سے کوئی بات فرمائی ۱۹۵
— جن معاملوں میں اللہ کا حکم نہ ہوتا ان میں آپؐ اجتہاد فرماتے تھے ۳۸۷
— آپؐ کے جن اجتہادات کی اصلاح کے لیے قرآن میں کوئی حکم نہیں آیا وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے توثیق شدہ ہیں ۳۸۷-۳۸۸
— آپؐ ہمیشہ احسان کا بدلہ احسان سے دیتے تھے ۱۶
— آپؐ کے اخلاق عالیہ کس طرح دشمنوں کو دوست بناتے تھے ۱۶-۱۷
— جنگ میں آپؐ کا حسن تدبر ۱۷
— فتح پا کر دشمنوں سے آپؐ کا برتاؤ ۱۶-۱۷-۹۸
— آپؐ کی اولوالعزمی جو حدیبیہ کی مہم میں ظاہر ہوئی ۳۴
— آپؐ کا غیر معمولی تدبر ۳۶-۳۷-۳۹-۴۲-۵۱۲ تا ۵۱۴
— آپؐ کے وفائے عہد کی ایک بے نظیر مثال ۳۹-۴۰
— آپؐ کے دشمن بھی آپ کی صداقت کے قائل تھے ۵۳۵
— اللہ نے آپؐ کی ہر اگلی پچھلی لغزش کو معاف کر دیا پھر بھی آپؐ عبادت میں غیر معمولی مشقت اٹھاتے تھے ۴۳-۴۴
— آپؐ ایک سچے انسان تھے، آپ کبھی اپنی زندگی میں راہ حق سے نہ بھٹکے، نہ فاسد خیالات سے متاثر ہوئے اور نہ خواہشات نفس کی پیروی میں کبھی زبان سے ایک لفظ نکالا ۱۹۲-۱۹۳
— آپؐ کو تمام مخالفتوں اور مشکلات کے باوجود دعوت و نصیحت کا کام جاری رکھنے کی ہدایت ۱۳۱-۱۵۴
— آپؐ کو سرکش منکرین سے رخ پھیر لینے کا حکم کس معنی میں دیا گیا تھا ۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۲۱۰-۲۳۲
— آپؐ دعوت وتذکیر کے لیے کسی اجر کے طالب نہ تھے ۱۸۱
— آپؐ تک تعلیمات الٰہیہ کیسے پہنچتی تھیں ۱۹۹
— آپؐ کو خفیہ امور پر اللہ تعالیٰ کس طرح مطلع فرماتا تھا ۴۲۳
— آپؐ کا حضرت جبریلؑ کو اصل شکل میں دیکھنا ۱۹۷-۲۰۰
— آپؐ کی معراج کا واقعہ ۱۹۸-۲۰۱
— آپؐ نے معراج میں پوری توجہ سے ہدایات ربانی سنیں ۲۰۱
— کیا آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ۲۰۲ تا ۲۰۷
— آپؐ کی مدینہ میں تشریف آوری ۳۷۴
— یہود سے معاہدہ ۳۷۴-۳۷۵
— یہود صریحاً آپؐ کے اندر رسول برحق ہونے کی علامات پاتے تھے ۳۸۵

— بدر میں آپؐ کی کامیابی پر یہود کی گھبراہٹ ۳۷۷
— آپؐ کی طرف سے یہودیوں کو تنبیہ ۳۷۷
— آپؐ کو شہید کرنے کی یہودی سازش ۳۷۸-۳۸۲
— آپؐ کا یہودیوں کو مدینہ سے نکال دینا اور اس کے وجوہ ۳۷۸-۳۷۹-۳۸۲-۳۸۶ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''غزوۂ بنی نضیر'')
— آپؐ کی مکہ پر چڑھائی ۴۲۲
— وہ کیا بنیادیں تھیں جن کی بنا پر صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک زبردست عسکری تنظیم اٹھی جس نے بڑی بڑی طاقتوں کو پامال کیا اور صدیوں تک کوئی طاقت اس کا مقابلہ کرنے والی نہ تھی ۴۵۶-۴۵۷
— امت مسلمہ اگر آپ کی پیروی سے منہ موڑے گی تو اللہ اس کی جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا ۳۲
— آپؐ بنی نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لائے ۵۸۱
— آپؐ کی دعوت پھیل رہی اگرچہ یہ چیز کافروں کو سخت ناگوار تھی ۴۷۶-۴۷۷
— حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ کا ارشاد ۹۸
— آپؐ مخلص صحابہؓ کی غلطیاں معاف فرما دیتے تھے ۴۲۳
— حضرت موسیٰ نے آپؐ کی آمد کی بشارت دی ۴۵۹-۴۶۰
— حضرت عیسیٰ نے آپؐ کی بشارت دی ۴۶۱ تا ۴۶۲
— آپؐ کا نام صرف محمدؐ ہی نہیں بلکہ احمد بھی تھا ۴۶۱
— انجیل برناباس میں آپ کا نام لے کر آپؐ کی آمد کی خبر دی گئی تھی ۴۷۳-۴۷۴
— لفظ ''محمد'' اور ''احمد'' کے معنی ۴۶۵
— انجیل یوحنا میں فارقلیط اور منحمنا کے نام سے آپ کی بشارت ۴۶۵
— نجاشی نے آپؐ کی تصدیق کی ۴۶۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انجیل'')
— آپؐ کے بدترین دشمن بھی سورۂ نجم سن کر سجدے میں گر پڑے ۱۸۹
— آپؐ کے مقابلے میں مدینے کے یہودیوں اور منافقین کا سازباز ۵۱۰ تا ۵۱۴
— منافقین کی دل آزار حرکتوں پر آپؐ کا صبر و درگزر ۳۵۹
— آپؐ منافقین کو پہچاننے کے باوجود ان سے درگزر فرماتے تھے ۵۱۰-۵۱۳
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''یہود''، ''منافقین'' اور ''قریش'')

مدینہ طیبہ

— ہجرت مدینہ ۳۷۱-۳۷۴
— مدینہ کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی حالت ۶
— مدینہ طیبہ مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ تھا ۴۳۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ہجرت'')

مسلم

— دیکھو ''اسلام''

مسیح - ۴۷۵- ۴۷۶ (مزید دیکھو ''عیسیٰ علیہ السلام'')

مسیحی اور مسیحیت

— دیکھو ''عیسائیت''

مستشرقین

— مستشرقین مغرب کا اسلام کے خلاف بغض ۱۷۳

Maktaba Tul Ishaat.com

مشرکین

— دیکھو "شرک"

مصعبؓ بن عمیر

— مدینہ میں سب سے پہلی نماز جمعہ انھی کی امامت میں قائم کی گئی ۴۹۳

معجزات

— معجزۂ شق القمر اور اس کی تفصیلات ۲۲۶-۲۲۸ تا ۲۳۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بذات خود ایک معجزہ تھی ۴۸۸
— قرآن کن معنوں میں معجزہ ہے ۱۷۵ تا ۱۷۹
— حضرت ابراہیمؑ کے ہاں سو سال کی عمر میں بانجھ بیوی سے اولاد کا پیدا ہونا ۱۴۴-۱۴۵
— حضرت صالحؑ کی اونٹنی ایک معجزہ تھی ۲۳۷
— ہٹ دھرم منکرین کوئی معجزہ دیکھ کر بھی حق کے قائل نہیں ہوتے ۱۶۱

معراج

— واقعہ معراج ۲۰۱-۲۰۲
— آنحضورؐ نے معراج میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا ۱۶۲
— یہ بحث کہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا نہیں ۲۰۱-۲۰۶

مغفرت

— اس کا مطلب ۲۲-۲۳
— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے ۶۵-۷۲-۲۱۱-۲۳۴-۴۷۷-۴۷۸-۵۴۷
— کافروں اور اللہ کے دین سے روکنے والوں کی مغفرت نہ ہوگی ۳۰
— منافقین کے حق میں کوئی دعائے مغفرت مستجاب نہیں ہوسکتی ۵۰-۵۲۰
— کبائر سے اجتناب کرنے والوں کے لیے خدا کی مغفرت ۲۱۳-۲۱۴
— مسابقت الی المغفرت کی تاکید ۳۱۸
— مومنین کو اپنے لیے اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے مومنوں کے لیے طلب مغفرت کا حکم ۲۱۵ تا ۲۱۸-۴۰۳-۴۳۰
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لیے اور جملہ مومنین کے لیے دعائے مغفرت کا حکم ۲۵
— حضور اکرم کو مسلمان عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کا حکم ۴۲۵
— اللہ کا دامن مغفرت بڑا وسیع ہے ۲۱۳-۲۱۴

ملائکہ

— دیکھو "فرشتہ"

منات - ۲۰۶-۲۰۷ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "بت پرستی")

منافقت اور منافقین

— اسلام اور کفر کی جنگ میں اسلام کے بجائے اپنے مفاد کی فکر کرنا منافقت ہے ۷
— حکم جہاد آنے سے پہلے منافقین اچھی اچھی باتیں کرتے تھے مگر جہاد کا حکم آنے پر ان کی حالت غیر ہوگئی ۱۱-۲۵-۲۶-۴۵۴ تا ۴۵۶
— حکم جہاد کی پیروی کرنے میں مدعیان ایمان کی اپنی ہی بہتری ہے ۲۶
— حدیبیہ کی مہم کے موقع پر مدینہ اور اطراف مدینہ کے منافقین کا طرز عمل ۳۴-۳۵-۵۰-۵۱
— ان کا خیال تھا کہ اس خطرہ کے منہ میں جانے کے

بعد رسولؐ اور اصحاب رسولؐ بخیریت واپس نہ آسکیں گے ۵۱
— حدیبیہ کی مہم کے وقت منافقت دکھانے والوں کو جنگ خیبر میں شرکت سے منع کردیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ جب طاقت ور دشمنوں سے جنگ پیش آئے اس وقت میدان میں جا کر وہ منافقت کا داغ دھو سکتے ہیں۵۲ تا ۵۴
— وہ مسلمانوں پر الزام رکھتے تھے کہ تم حسد کے مارے ہم کو جہاد سے محروم رکھنا چاہتے ہو۵۳
— مدینہ کے منافقین نے یہودیوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۳۶۴-۳۷۶-۴۰۵-۴۰۷-۵۰۸ تا ۵۱۱
— منافقین مدینہ یہود بنی نضیر کو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں مدد دینے کا یقین دلاتے تھے مگر ان کے تمام وعدے جھوٹے تھے اور وہ کبھی جنگ میں مخلص مسلمانوں کے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے ۴۰۶-۴۰۷
— منافقین مدینہ کا مخلصانہ تعلق نہ مسلمانوں سے تھا نہ کافروں سے ۳۶۴
— منافقت کو قرآن ''دل کی بیماری'' سے تعبیر کرتا ہے ۲۵-۲۹
— منافقین مدینہ کے اوصاف ۵۱۶ تا ۵۲۱
— اہل کتاب اور منافقین کی باہمی سازش ۴۰۶-۴۵۲
— مسلمانوں میں رہ کر دشمنان اسلام سے ساز باز کرنے والے ۲۸
— وہ حضورؐ اکرم کی کامیابیوں پر حسد سے مرے جاتے تھے ۴۰۸
— شان رسالت میں ان کی گستاخیاں ۳۵۹-۳۸۶-۵۲۱
— وہ اللہ کے راستے سے خود بھی رکتے تھے اور دوسروں کو بھی روکتے تھے۳۶۴-۵۱۶ تا ۵۱۸
— ان پر شیطان کا تسلط ہے اور اس کے فریب خوردہ ہیں ۳۱۳-۳۶۵
— وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں ۳۶۵
— وہ پرلے درجے کے جھوٹے لوگ ہیں ۳۶۵
— وہ جھوٹی قسموں کو اپنی منافقت چھپانے کے لیے ڈھال بناتے ہیں۳۶۴-۵۱۶-۵۱۷
— ان کے جھوٹا ہونے پر اللہ کی گواہی ۴۰۶-۵۱۶
— وہ قیامت کے روز اللہ کے سامنے بھی جھوٹ بولیں گے ۳۶۵
— منافقین عقل سے عاری ہیں ۴۰۷
— ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں ۴۰۷-۴۰۸
— منافقین مدینہ کی مثال ۲۵-۲۷-۴۰۸-۵۱۷ تا ۵۱۹
— منافقین کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے ۲۳-۵۱۷
— منافقین کے دل کا کھوٹ اللہ ضرور ظاہر کرے گا ۳۰
— منافق کی تین نشانیاں ۴۵۵
— منافق کی چار صفات ۳۱۲-۴۵۵
— منافق فاسق ہیں اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا ۵۲۰
— منافقین نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے ۵۱۷

Maktaba Tul Ishaat.com

— وہ اپنے مجرم ضمیر کی وجہ سے ہر وقت خوف زدہ رہتے ہیں ۵۱۹
— وہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر بھی کورے کے کورے ہی رہتے تھے ۲۳
— وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل چڑھا کر اسے پڑھتے ہیں ۲۷
— منافقین کو ان کے انداز کلام ہی سے پہچانا جاسکتا ہے ۲۹
— وہ اللہ کے بارے میں برا گمان رکھتے ہیں ۴۷
— وہ اپنی برائی کے پھیر میں خود پھنس گئے ۴۷
— وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ۴۵۴
— وہ زبان سے جو کچھ کہتے ہیں دل میں وہ نہیں ہوتا ۵۰
— وہ بدباطن اور برے گمان کرنے والے لوگ ہیں ۵۱
— وہ خطرے کے آثار دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں لیکن جہاں آسانی سے مال غنیمت مل سکے اور خطرہ کم ہو وہاں مرد میدان بن کر آ جاتے ہیں ۵۲
— منافقین نے دراصل اپنے آپ ہی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے ۳۱۲
— وہ موقع پرست، شکی اور جھوٹی توقعات کے فریب خوردہ ہیں ۳۱۲-۳۱۳
— وہ خود پسند اور بخیل ہیں ۳۲۰-۳۲۱
— وہ چھپ کر گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے تھے اور پھر اس پر عذاب نازل نہ ہونے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول نہ ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے ۳۵۸-۳۵۹
— وہ مومنین کی دل آزاری کے لیے کانا پھوسیاں کرتے ہیں مگر ان کی ان کانا پھوسیوں سے مومنوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا الا یہ کہ اللہ ایسا چاہے ۳۶۰
— وہ ذلیل ترین مخلوق ہیں کیونکہ وہ اللہ اور رسول کا مقابلہ کرتے ہیں ۳۶۵
— ان کو ان کے مال و اولاد نے اللہ کی یاد سے غافل کر رکھا ہے ۵۲۱
— ان کا کلمہ اور نماز، روزہ اور حج قابل قبول نہیں ہے ۳۱۲
— منافق حقیقت میں مسلمان نہیں ہوتا، اگرچہ ظاہر میں وہ مسلمان بنا ہوا ہو ۵۱۵-۵۱۶
— مدینہ کے منافقین کن مصلحتوں کے تحت مسلمان ہوئے تھے ۹۹-۱۰۰
— ان کی موقع پرستی ۵۲-۵۳
— ان کی فتنہ پردازیاں ۵۱۱-۵۱۷-۵۲۱
— موت کے وقت فرشتے کس طرح ان کی روحوں کو عذاب دیتے ہوئے لے کر جاتے ہیں ۲۸
— قیامت کے روز انھیں بتا دیا جائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں ۳۵۸
— ان کے سب اعمال ضائع جائیں گے ۲۹-۳۰-۳۱۲-۳۱۳
— وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے ۳۶۵
— ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے ۳۵۹-۳۶۴-۳۶۵-۴۰۸-۴۰۹
— ان کا انجام ۳۱۱ تا ۳۱۳
— ان پر اللہ کی مار ہے اور لعنت ۲۶-۵۱۹
— انھیں میدان حشر میں نور نصیب نہ ہوگا ۳۱۱

— ان کے اور اہل ایمان کے درمیان دیوار حائل کر دی جائے گی ۳۱۱
— اللہ منافقین کو ہرگز معاف نہ کرے گا ۵۲۰
— وہ منافقت چھوڑ کر اپنی روش بدل لیں تو اللہ غفور و رحیم ہے ۵۲
— منافقین کے حق میں کوئی دعائے مغفرت مستجاب نہیں ہو سکتی ۵۲۰
— انھوں نے انتہائی غرور اور تکبر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لیے مغفرت کی دعا کروانے سے انکار کر دیا ۵۱۹-۵۲۰
— ان میں سے کچھ لوگوں نے اگر مغفرت کی استدعا کی بھی تو محض زبانی جمع خرچ کے لیے ۵۰
— اللہ کے عذاب سے ان کو نہ ان کا مال بچا سکتا ہے اور نہ اولاد ۳۶۴-۳۶۵
— کفار و منافقین کا آخرت میں ایک ہی انجام ہوگا ۳۱۳
— کھلی غداری کرنے والے منافقین واجب القتل ہیں ۵۱۴
— وہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں ۳۶۶
— وہ مسلمانوں کے پکے دشمن ہیں ۵۱۹
— مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تلقین ۵۱۹
— ان کی شرارتیں اور ان پر سرزنش ۳۴۷-۵۲۱
— منافقین مدینہ اور کفار مکہ کی باہمی مشابہت اور دونوں کی اسلام کے مقابلے میں نامرادی ۴۰۸
— منافقانہ طرز عمل اسلام کے لیے ناکارہ ہے ۴۷
— وہ ہرگز ساتھ باندھے رکھنے کے قابل نہیں ہیں، انھیں الگ کرنا ہوگا ۵۴۳
— ان کی خفیہ سازشوں کو اللہ جانتا ہے ۲۸
— اللہ چاہے تو منافقین کو بے نقاب کر دے ۲۹
— ان کے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو کوئی نہیں روک سکتا ۵۰
— منافقین کو تنبیہ کہ خواہ تم دو آدمی ہو یا اس سے زیادہ جس وقت تم خفیہ ساز باز کرتے ہو اس وقت اللہ تمھارے درمیان موجود ہوتا ہے ۳۵۸
— ان کو سرگوشیوں سے منع کیا گیا مگر وہ ان سے باز نہ آئے ۳۵۸-۳۵۹
— قرآن حکیم منافقین کے نفاق پر گرفت ہی نہیں کرتا بلکہ ساتھ ساتھ نصیحت بھی کرتا ہے ۴۰۹

منکرین حدیث

— ان کے دلائل کا ابطال:
۱- جنوں کے بارے میں ۱۵۶
۲- اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں ۲۱۵
۳- حضورؐ کی حیثیت امارت اور حیثیت رسالت کے بارے میں ۱۹۴- ۱۹۵- ۴۴۷- ۴۴۸

موت

— سکرات موت ۱۱۶- ۲۹۵
— موت سے انسان خواہ کتنا ہی بھاگے وہ آکر رہے گی ۴۹۱
— موت کے آتے ہی آخرت کی حقیقت انسان پر کھلنی شروع ہو جاتی ہے ۱۱۷
— انسان کی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے ۲۸۵- ۲۸۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس وقت کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا ۲۹۵
— موت کے وقت اللہ مرنے والے سے اس کے اعزہ و احباب کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوتا ہے اگرچہ نظر نہیں آتا ۲۹۵
— موت کے وقت اہل حق اور اہل باطل کی حالت ۲۹۵-۲۹۶
— موت کے وقت اہل حق اور اہل باطل کی حالت ۲۹۵-۲۹۶
— موت آنے پر اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے ۵۲۲
— موت کے بعد انسان کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا جو انسان کو اس کا سب کیا دھرا بتا دے گا ۴۹۲

موسیٰ علیہ السلام: ۱۴۷ تا ۱۴۹

— صریح سند نبوت کے ساتھ ان کو فرعون کی طرف بھیجا گیا ۱۴۷-۱۴۸
— ان کا بنی اسرائیل سے خطاب ۴۵۷
— بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی ۴۵۷
— انھوں نے اپنی قوم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بشارت دی تھی ۴۵۹
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مماثلت ۴۶۰-۴۶۱
— حضورؐ اکرم کا پیغام وہی تھا جو اس سے پہلے صحف موسیٰ میں اللہ نے بھیجا تھا ۱۹۱-۲۱۳
— صحف موسیٰ کا حوالہ ۲۱۳

میثاق

— میثاق کے معنی ۳۰۷
— اللہ نے انسانوں سے میثاق لیا ہے ۳۰۷-۳۰۸

میثاق مدینہ

— وہ معاہدہ جو مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے کیا تھا ۳۷۴-۳۷۵

میزان

— میزان کے قیام کا مفہوم ۲۵۱
— اللہ نے میزان قائم کر دی ہے ۲۵۱
— اللہ نے انبیاء کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ عدل و انصاف کا بول بالا ہو ۳۲۱-۳۲۲
— میزان میں ڈنڈی مارنے کی ممانعت ۲۵۱

مومن

— دیکھو ''ایمان''

مہاجرین

— دیکھو ''ہجرت''

مہر

— دیکھو ''قانون اسلام، قانون نکاح و طلاق''

ن

نامہ اعمال

— نامہ اعمال کی تیاری کے ذرائع ۱۱۶-۱۱۷
— اللہ تعالیٰ انسان کے تمام افعال و اعمال پر براہ راست خود نظر رکھتا ہے لیکن عدالت کی شرائط پوری کرنے کے لیے وہ تمام شہادتیں محفوظ کرا رہا ہے ۱۱۶-۱۱۷-۴۰۹-۵۲۸
— انسان کے تمام اقوال و افعال لکھے جا رہے ہیں اور اس کا نامہ اعمال تمام باریکیوں کے ساتھ محفوظ کیا جا رہا ہے ۱۱۶-۱۱۷-۲۴۱-۲۴۲
— انسان چاہے بھول جائے لیکن اللہ نے اس کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے ۳۵۶-۳۵۷
— انسان کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ لکھ لیا جاتا ہے

١١٦-١١٧

نبوت

— نظام دین میں اس کی اہمیت ١٧
— انبیاء اس لیے بھیجے گئے کہ دنیا میں عدل قائم ہو ٣٢١-٣٢٢
— انبیاء کا مشن ٦٢-٦٣-٣٢١-٣٢٢-٤٧٧-٥٤٣
— انسانوں کی رہنمائی کے لیے سلسلہ نبوت جاری کیا گیا ہے ٥٣٣-٥٣٤
— رسول کی مخالفت کفر ہے ٢٩
— اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی شرط نجات ہے ٥٤-١٠١
— رسول کی اطاعت لازمہ ایمان ہے ٣٠-٥٤-١٠١-٣٦٣-٥٤٣
— رسولوں کا انکار کرنے والوں کے تمام عقائد قیاس وگمان پر مبنی ہیں ١٣٠
— رسول کی اطاعت بے چون و چرا تمام معاملات میں کی جانی چاہیے ٣٩٢ تا ٣٩٤
— اگر کوئی اطاعت سے منہ موڑتا ہے تو رسول کے ذمہ حق پہنچا دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ٥٤٣
— رسول کی اطاعت کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی ١٠١
— رسول کی اطاعت بھی اطاعت فی المعروف کی شرط سے مشروط ہے ٤٤٥ تا ٤٤٧
— خدا کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت نہ کرنے والوں کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں ٣٠
— ہر رسول اپنی قوم ہی میں سے اٹھایا گیا ہے ٤٨٥-٤٨٦
— ایک رسول کو جھٹلانا سب رسولوں کو جھٹلانا ہے ١١٥
— تمام انبیاء ایک ہی دین کے داعی تھے ١٩١-٢١٣
— رسول کا منصب یہ ہے کہ اللہ جو حکم بھی دے اس پر وہ بے کھٹکے عمل کرے ٣٤
— تمام رسول بینات اور کتاب اور میزان لے کر آئے ٣٢١-٥٣٢-٥٣٣
— حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو نبوت سے سرفراز کیا گیا ٣٢٣
— رسولوں پر ان کی قوموں کے اعتراضات ١٠٨-١٠٩-١٥٢-١٧٢-١٧٣-١٧٤ تا ١٧٩-٢٣٦-٢٣٧-٢٩٠-٢٩١-٥٣٣
— رسولوں سے معجزے مانگے گئے مگر جب وہ دکھائے گئے تو تاویلیں کر کے ان کو جھٹلایا گیا ١٨٣-١٨٤-٢٣١
— رسولوں کو جادوگر کہا گیا ١٤٧-١٤٨-١٥٢-٤٧٦
— گمراہ قوموں نے انبیاء کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک بشر نبی نہیں ہو سکتا تھا ١٠٩-٢٣٦-٥٣٣-٥٣٤
— رسولوں کو مجنون کہا گیا ١٤٨-١٥٢
— رسولوں پر ان کی قوموں کے مظالم ١١٤-٤٥٧
— اطاعت رسول سے منہ پھیرنے والوں کا انجام ٥٤
— رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام ١١٤-٢٢١-٢٢٢-٥٣٢-٥٣٣
— سزا کے مستحق لوگوں کو رسول کی دعائے مغفرت

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی نہیں بچا سکتی ۵۰
تمام گمراہ اقوام نے مختلف زمانوں میں ایک ہی طرح رسولوں کی مخالفت کی ہے ۱۵۲
— رسولوں سے جھگڑا کرنے والوں کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں ۲۹-۳۰
— جب رسولوں کا انکار کیا جاتا ہے تو اللہ بھی منکرین سے بے پروا ہو جاتا ہے ۵۳۳
— رسول کے مقابلے میں اپنی آواز پست رکھنا تقویٰ کی علامت ہے ۷۰
— نبی سے بے ادبی کی سزا وہی ہے جو کفر کی سزا ہے ۷۰-۷۱
— رسول کی اگلی پچھلی تمام لغزشیں معاف کر دی جاتی ہیں ۴۴
— اللہ جب کسی کو نبوت عطا فرماتا ہے تو اس کے دل کو تمام شکوک و شبہات سے صاف کر دیتا ہے ۲۰۰
— نبی ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے محفوظ ہوتا ہے ۲۰۰
— نبوت کی برکات کو بارش سے تشبیہہ دی گئی ہے ۳۱۳-۳۱۴
— نبی اور فلسفی کا کوئی مقابلہ نہیں، نبی کے پاس علم ربانی ہوتا ہے اور فلسفی کے پاس صرف قیاس و استدلال ۵۳۵
— نبی اور غیر نبی کے ذریعہ علم اور مرتبہ علم دونوں میں فرق ہے ۵۳۵
— رسول معاملات کو ایک عام انسان کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے ۷۵
— رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ۳۲۱
— نبی کے ذریعے اللہ حقیقت کا علم انسان کو دیتا ہے ۱۳۶
— اس علم کے بارے میں انسان عقل سے کام لے کر اپنا اطمینان کر سکتا ہے ۱۳۶
— رسول ہر زمانے میں حقیقت سے آگاہ کرتے رہے ہیں ۲۰۸
— انسانوں کی تعلیم کے لیے رسولوں کا آنا عین متقاضائے فطرت ہے ۲۴۸ تا ۲۵۰
— رسول قیام عدل کی محض ایک اسکیم ہی پیش نہیں کرتے بلکہ اس اسکیم کو عملاً نافذ کرنا بھی ان کے مشن کا حصہ ہے۔ ۳۲۱-۳۲۲
— انبیاء کے وہ اعمال جن کو خود انبیاء نے ترک کر دیا ہو یا وحی الٰہی نے منسوخ کر دیا ہو قابل تقلید نہیں ہیں ۴۳۰
— نبوت پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں ہے ۴۸۳-۴۸۵-۴۸۶
— نبی بھی اللہ سے زبردستی کچھ حاصل نہیں کر سکتا ۴۲۹
— رسول کی ذمہ داری پیغام حق پہنچا دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۱۲۸-۱۵۱-۱۵۲-۵۴۳
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں اور پیغمبروں میں سے ایک ہیں ۲۲۲-۲۲۳
— نبوت محمدیہ کا عظیم منصب اور آپؐ کے فرائض ۴۸۵ تا ۴۸۸ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم“)

— اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرماتا ہے ۳۸۸
— رسولوں کا خواب وحی کی ایک قسم ہے ۳۴-۶۱

نجویٰ

— نجویٰ (خفیہ سرگوشی) کی مانعت ۳۵۸
— کن امور میں نجویٰ منع ہے ۳۶۰
— کن امور میں اس کی اجازت ہے ۳۶۰
— مومنوں کو رنج پہنچانے کے لیے کھسر پھر کرنا شیطانی فعل ہے ۳۶۰
— حضورؐ اکرم سے تخلیہ میں بات کرنے سے پہلے صدقہ کا حکم ۳۶۲
— صدقے کے اس حکم کی تنسیخ ۳۶۳

نسخ

— دیکھو ''نجویٰ''

نصاریٰ

— دیکھو ''اہل کتاب'' اور ''عیسائیت''

نماز

— تسبیح بمعنی نماز ۱۲۵
— نماز کے اوقات ۱۲۵-۱۲۶-۱۸۵
— نماز کے لیے حضورؐ اکرم نے جو طریقہ مقرر فرمایا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے جزئیات تک قرآن پاک کے اشارات سے ماخوذ ہیں ۲۹۶
— حضرت جبریلؑ نے نماز کا طریقہ عملاً آپؐ کو سکھایا تھا ۱۹۶
— نماز قائم کرنے کا حکم ۳۶۳
— نماز سے پہلے منادی (اذان) کا ذکر ۴۹۲
— دیر سے آ کر نماز میں شامل ہونے والوں کے لیے آداب ۴۹۵
— جمعہ ایک اسلامی اصطلاح ۴۹۳
— نماز جمعہ کی فرضیت اور اہمیت ۴۹۲-۴۹۹
— پہلی نماز جمعہ کب اور کہاں قائم ہوئی ۴۸۲
— پہلی نماز جمعہ حضرت مصعبؓ بن عمیر کی امامت میں ادا کی گئی ۴۹۳
— سورۂ جمعہ کے احکام قرآن میں نازل ہونے سے پہلے ہی نماز جمعہ سنت کے حکم کی بنا پر مسلمانوں میں پڑھی جاتی تھی ۴۹۲
— ہجرت مدینہ کے بعد نماز جمعہ کا قیام حضورؐ کے اولین کاموں میں سے تھا ۴۹۴
— نماز جمعہ کا وقت ۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۵۰۰-۵۰۱
— اس کی ادائیگی کا طریقہ ۴۹۴ تا ۴۹۶
— اس کی رکعتیں ۴۹۴
— نماز معہ کے وقت خرید وفروخت کی ممانعت ۴۹۲
— نماز جمعہ کے لیے دوڑنے کا صحیح مفہوم ۴۹۵
— نماز جمعہ کے لیے ''خرید وفروخت چھوڑ دینے'' کا مفہوم ۴۹۶
— جمعہ کی کون سی اذان پر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑنے اور خرید وفروخت چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے ۴۹۴
— خطبہ جمعہ میں کیا پڑھا جائے ۴۹۵
— خطبہ جمعہ کے دوران بولنے پر سخت وعید ۵۰۴
— نماز جمعہ میں تساہل برتنے والوں کے لیے سخت وعید ۴۹۶
— مذاہب اربعہ میں احکام جمعہ کا خلاصہ ۴۹۸ تا ۵۰۱
— نماز جمعہ کی فرضیت سے متعلق احادیث ۴۹۶

Maktaba Tul Ishaat.com

— یہ نماز کن لوگوں پر فرض ہے اور کون اس سے مستثنیٰ ہیں ۴۹٦

— آداب جمعہ کے بارے میں احادیث ۵۰۴-۵۰۵

— جمعہ کا نام اسلامی ناموں میں سے ہے ۴۹۳

— جمعہ اجتماعی عبادت کا دن ہے ۴۹۳

— یہود کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کے مقابلے میں اللہ نے مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دن مقرر فرمایا ۴۸۴-۴۹۳

— مسلم معاشرے میں اگر ہفتہ کے کسی دن تعطیل کا قاعدہ مقرر ہو تو جمعہ کی تعطیل ہونی چاہیے ۴۹۷-۴۹۸

— صحابہ کرامؓ کی یہ صفت جو بتائی گئی ہے کہ سجدوں کی کثرت کے اثرات ان کے چہروں پر واضح ہیں، اس کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ٦۳

— اس واقعہ کی حقیقت کہ جمعہ کے روز خطبے کے دوران میں ایک دفعہ بہت سے صحابہ حضورؐ کو کھڑا چھوڑ گئے تھے ۵۰۱ تا ۵۰۵

نوح علیہ السلام

— وہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکے تھے ۲۲۲

— ان پر قوم کی الزام تراشیاں ۲۳۳

— ان کی بے قدری کی گئی اس لیے اللہ نے بے قدری کرنے والوں کو غرق کر دیا ۲۳۳

— ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی گئی ۳۲۳

— ان کا منکرین حق کے لیے بددعا کرنا ۲۳۳

— ان کا اور ان کے ساتھیوں کا کشتی کے ذریعے طوفان سے بچ جانا ۲۳۳

— کشتی نوحؑ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۲۳۴

— حضرت نوحؑ سے ان کی قوم کا سلوک ۲۳۳-۲۳۴

— قوم نوحؑ کا قصہ ۲۳۳ تا ۲۳۵

— قوم نوحؑ کی تکذیب کا ذکر ۱۱۴-۲۳۳

— قوم نوحؑ نے آخرت اور رسولوں کو جھٹلایا ۱۱۴-۲۳۳

— وہ اول درجہ کی فاسق قوم تھی ۱۵۰-۲۲۱

— اس پر نازل کیے جانے والے عذاب کی کیفیت ۲۳۳-۲۳۴

نور

— مومنین کو آخرت میں نور عطا کرنے کا وعدہ ۳۰۹ تا ۳۱۱

— مومنین کو دنیا میں نور عطا کرنے کا وعدہ جس کی روشنی میں وہ سیدھے راستے پر چلنے کے قابل ہوں گے ۳۳۳

و

وحی

— وحی جلی اور وحی خفی ۱۹۴

— حضورؐ اکرم وحی کی روشنی میں ہی اسلام کی دعوت و تبلیغ فرماتے تھے ۱۹۳

— اللہ نے حضورؐ اکرم پر جو چاہا بذریعہ وحی نازل کیا ۱۹۷

— نبی کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۳۴-٦۱

ھ

ہجرت

— ہجرت حبشہ ۱۸۸

— ہجرت حبشہ سے صحابہ کرامؓ کی واپسی اور مکہ میں کفر کا غلبہ دیکھ کر پھر حبشہ کی طرف ہجرت ۱۸۸-۱۸۹
— ہجرت مدینہ ۳۷۱-۳۷۴
— ہجرت کے وقت مدینہ کے حالات ۶-۳۷۱
— مہاجر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی تسلی کہ وہ دن دور نہیں جب تمھارے رشتہ دار بھی مسلمان ہوجائیں گے اور آج کی یہ دشمنی کل پھر محبت میں تبدیل ہوجائے گی ۴۳۱ تا ۴۳۳
— حضورؐ اکرم کی ہجرت مدینہ ۳۷۴
— آپ کو مکہ سے ہجرت کا دلی رنج تھا ۲۱۱
— مسلمانوں کو اس لیے مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا گیا کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے طالب اور پیغمبر اسلام کے سچے حامی تھے اور ایک اللہ پر ایمان لائے تھے ۳۹۴-۳۹۵-۴۲۲
— ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں سے وعدہ کہ وہ ان کے حالات درست کردے گا ۱۰-۱۱-۳۷۲ تا ۳۷۸
— ہجرت کے بعد مسلمانوں کی کامیابی کے راستے کھل گئے ۳۷۲-۳۷۸
— مہاجرین کا بلند مرتبہ ۳۹۴-۳۹۵
— مہاجرین سے انصار کی سچی محبت اور ایثار ۳۹۵-۳۹۶
— مہاجرین مکہ کا فے میں حصہ مقرر کیا گیا ۳۹۳-۳۹۴
— ہجرت کرنے والی عورتوں کے متعلق احکام ۴۴۳ تا ۴۴۴
— ہجرت کے بعد مدینے کے یہود سے معاہدہ ۳۷۴ تا ۳۷۷
— جو لوگ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہجرت پر مجبور کیے جائیں ان کو بسانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے ۳۹۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''صحابہ کرامؓ'' اور ''مدینہ'')

ہدایت

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالص ہدایت لے کر آئے ہیں ۴۷۷
— حضورؐ اکرم کا کام جبراً لوگوں کو ہدایت دینا نہ تھا ۱۲۸
— اللہ کیسے لوگوں کو ہدیت دیتا ہے ۲۴
— کیسے دلوں کو ہدایت بخشی جاتی ہے ۵۴۱-۵۴۲
— کیسے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے ۴۵۷-۴۵۸-۴۷۶-۴۸۹-۵۲۰
— اللہ جانتا ہے کہ کون ہدایت پر ہے ۲۱۱
— ہدایت واضح کردی گئی ہے ۲۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'' ۹ اور ''ضلالت'')

ی

یحییٰ علیہ السلام

— حضرت مسیحؑ کے زمانے ہی میں وہ مبعوث ہوئے ۴۶۱-۴۶۲
— ان سے بنی اسرائیل کے سوالات ۴۶۲

یعقوب علیہ السلام

— حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی پیدائش کی بھی خوش خبری دی گئی ۱۴۵

یوسف علیہ السلام

— آپ خاندان ابراہیمی کے جلیل القدر انبیاء میں

Maktaba Tul Ishaat.com

سے تھے ۱۴۵

یہود

— وہ اللہ کے مغضوب ہیں ۳۶۴
— وہ ظالم و فاسق ہیں ۳۸۶-۴۸۹-۴۹۱
— ان کو اللہ نے ذلیل و خوار کیا ۳۸۶-۴۸۳
— یہودیت کب پیدا ہوئی ۴۹۰
— یہودیوں کی پست ترین اخلاقی حالت ۴۸۹
— یہودیت حضرت موسیٰؑ کا لایا ہوا دین نہیں ہے بلکہ صریحاً بعد کی پیداوار ہے ۴۸۹-۴۹۰
— یہود مدینہ کی تاریخ ۳۷۰ تا ۳۷۹
— یہودی عرب میں کب آئے ۳۷۰-۳۷۱
— ان کی سودخوری ۳۷۴
— عرب میں ان کے مشہور قبائل ۳۷۱-۳۷۲
— انھوں نے عربیت کا رنگ اختیار کرلیا تھا لیکن وہ عربی النسل نہ تھے ۳۷۳
— عرب کے یہودی اسرائیلی تھے نہ کہ یہودیت اختیار کرنے والے عرب ۳۷۳
— وہ تمام غیر یہودیوں اور عربوں کو حقارت سے ''امی'' کہتے تھے ۴۸۳-۴۸۶
— یہودیوں کی عربوں پر معاشی بالادستی ۳۷۳-۳۷۴
— عرب کے یہودی کس قسم کے کاروبار کرتے تھے ۳۷۴
— اوس اور خزرج نے ایک دفعہ مشترکہ جدوجہد سے یثرب کے یہودیوں کا زور توڑا ۳۷۲
— عرب قبائل سے یہودیوں کے حلیفانہ تعلقات ۳۷۴
— عہد جاہلیت کی عرب سیاست میں یہودیوں کا مکارانہ کردار ۳۷۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانے میں یہودیوں کے علاقے ۳۷۲
— ہجرت سے پہلے یثرب میں یہودیوں کی پوزیشن ۳۷۳-۳۷۴
— یہود کا حضورؐ اکرم سے معاہدہ ۳۷۴-۳۷۵
— معاہدے کے بعد ہی سے حضورؐ کے ساتھ ان کا عناد ظاہر ہونے لگا ۳۷۴-۳۷۵
— ان کی اسلام دشمنی اور حضورؐ اکرم کے خلاف سازشیں ۳۷۴-۳۷۵-۳۷۸-۳۸۲-۳۸۵-۴۸۲-۴۸۳
— منافقین مدینہ سے ان کی دوستی اور سازباز ۳۶۴-۳۷۶-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۵۲-۵۰۸ تا ۵۱۱
— ان کی میثاق مدینہ کے خلاف بدعہدی ۳۷۵-۳۷۷-۳۷۸
— ان کو اسلام سے سخت بیر تھا ۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷
— وہ فتح بدر پر تلملا اٹھے تھے ۳۷۷
— معرکہ احد میں مسلمانوں کی ظاہری شکست اور نقصان سے ان کے حوصلے بڑھ گئے ۳۷۸
— یہودیوں کے گروہ بنی قینقاع کو کن حرکتوں کی وجہ سے مدینہ سے نکالا گیا ۳۷۷-۳۷۸
— یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنے میں بھی شرارت کرتے تھے ۳۵۹
— انھوں نے آپؐ کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے آپؐ سے لڑائیاں کیں ۳۸۵

— اللہ تعالیٰ کے متعلق یہودیوں کے تصورات ۳۸۳
— حضورؐ اکرم کو شہید کرنے کی یہودی سازش ۳۷۸
— مدینہ سے یہودیوں کا اخراج ۳۷۷ تا ۳۷۹
— یہودیوں کے دلوں میں اللہ نے مسلمانوں کا رعب ڈال دیا تھا ۳۸۴
— مسلمانوں کے ہاتھوں عرب میں یہودیوں کی طاقت کا مکمل خاتمہ ۴۸۳ - (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''غزوۂ بنی نضیر'')
— یہود کے لیے عذاب جہنم مقرر ہے ۳۸۴- ۳۸۵-۴۰۸
— انھوں نے جان بوجھ کر اسلام کا انکار کیا ۳۸۵- ۴۸۵
— انھوں نے حضرت موسیٰ کو ایذائیں پہنچائیں ۴۵۷
— انھوں نے حضرت عیسیٰ کے ساتھ کیا سلوک کیا ۳۸۳
— انھوں نے ہمیشہ بے باکی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولوں کا مقابلہ کیا ہے ۳۸۲-۳۸۳
— یہودیوں اور عیسائیوں میں فرق ۴۶۹
— یہود پر عیسائیوں کو فتح عطا کی گئی ۴۷۹-۴۸۰
— انھوں نے حامل تورات ہونے کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا ۴۸۳-۴۸۹
— ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں ۴۸۳-۴۸۹
— نبوت پر ان کی اجارہ داری نہیں ہے ۴۸۳
— حضورؐ اکرم کا انکار کر کے انھوں نے تورات کی صریح خلاف ورزی کی ۴۸۵
— یہود کے اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا سمجھنے پر قرآن کا طنز ۴۸۹-۴۹۰
— ان کی دنیا پرستی اور موت سے خوف پر قرآن کا طنز ۴۸۹ تا ۴۹۱
— یہود کے خاص دن ''سبت'' کے بارے میں ۴۸۴-۴۹۳

Maktaba Tul Ishaat.com

هٰذا بیان للناس وهدی وموعظة للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد ششم

سورۃ التحریم تا سورۃ الناس

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ التحریم تا سورۃ الناس

جلد ششم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	التحریم	۶۶	۹
۲	الملک	۶۷	۳۷
۳	القلم	۶۸	۵۵
۴	الحاقہ	۶۹	۶۹
۵	المعارج	۷۰	۸۳
۶	نوح	۷۱	۹۵
۷	الجن	۷۲	۱۰۷
۸	المزمل	۷۳	۱۲۳
۹	المدثر	۷۴	۱۳۷
۱۰	القیامہ	۷۵	۱۵۹
۱۱	الدہر	۷۶	۱۷۹
۱۲	المرسلات	۷۷	۲۰۵
۱۳	النبا	۷۸	۲۱۹
۱۴	النازعات	۷۹	۲۳۵
۱۵	عبس	۸۰	۲۴۹
۱۶	التکویر	۸۱	۲۶۱
۱۷	الانفطار	۸۲	۲۷۱
۱۸	المطففین	۸۳	۲۷۷
۱۹	الانشقاق	۸۴	۲۸۵
۲۰	البروج	۸۵	۲۹۳

Maktaba Tul Ishaat.com

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۲۱	الطارق	۸۶	۳۰۱
۲۲	الاعلیٰ	۸۷	۳۰۷
۲۳	الغاشیہ	۸۸	۳۱۷
۲۴	الفجر	۸۹	۳۲۳
۲۵	البلد	۹۰	۳۳۵
۲۶	الشمس	۹۱	۳۴۷
۲۷	الیل	۹۲	۳۵۷
۲۸	الضحیٰ	۹۳	۳۶۷
۲۹	الم نشرح	۹۴	۳۷۵
۳۰	التین	۹۵	۳۸۳
۳۱	العلق	۹۶	۳۹۱
۳۲	القدر	۹۷	۴۰۱
۳۳	البینہ	۹۸	۴۰۹
۳۴	الزلزال	۹۹	۴۱۷
۳۵	العادیات	۱۰۰	۴۲۷
۳۶	القارعہ	۱۰۱	۴۳۳
۳۷	التکاثر	۱۰۲	۴۳۹
۳۸	العصر	۱۰۳	۴۴۷
۳۹	الھمزہ	۱۰۴	۴۵۵
۴۰	الفیل	۱۰۵	۴۶۱
۴۱	قریش	۱۰۶	۴۷۳
۴۲	الماعون	۱۰۷	۴۷۹
۴۳	الکوثر	۱۰۸	۴۸۷
۴۴	الکافرون	۱۰۹	۴۹۹

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۴۵	النصر	۱۱۰	۵۱۱
۴۶	اللہب	۱۱۱	۵۱۹
۴۷	الاخلاص	۱۱۲	۵۲۹
۴۸	معوّذتین (دیباچہ)		۵۴۵
۴۹	الفلق	۱۱۳	۵۶۳
۵۰	الناس	۱۱۴	۵۷۱
۵۱	خاتمہ		۵۷۵
۵۲	ضمیمہ نمبر ۱ بسلسلہ سورۂ دہر، حاشیہ ۳۳		۵۷۶
۵۳	ضمیمہ نمبر ۲ بسلسلہ سورۂ دہر، حاشیہ ۳۴		۵۷۷
۵۴	ضمیمہ نمبر ۳ بسلسلہ سورۂ المرسلات،		۵۷۹
۵۵	حاشیہ ۱		۵۷۹
۵۶	ضمیمہ نمبر ۴ بسلسلہ سورۂ الطارق، حاشیہ ۳		۵۸۳
	فہرست موضوعات		۵۸۵

Maktaba Tul Ishaat.com

عرضِ ناشر

ابتدا میں خیال تھا کہ تفہیم القرآن پانچ جلدوں میں مکمل ہو جائے گی۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ جلد چہارم کے بعد اگر پوری کتاب پانچویں جلد کی صورت میں شائع کی جائے تو اس کی ضخامت ۱۲ سوصفحات سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس لیے مجبُوراً کتابت شدہ مواد کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جلد پنجم سورۂ طلاق پر ختم کی گئی اور یہ جلد سورۂ تحریم سے شروع کرنی پڑی۔ اگر پہلے سے کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہوتا تو پانچویں جلد سورۂ تحریم پر ختم کی جاتی اور یہ جلد صرف آخری دو پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہوتی۔ کتاب کی ترتیب میں یہ خلل ناگزیر وجوہ سے واقع ہوا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ہماری اِس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

ناشر

تفہیم القرآن

التحریم

(۶۶)

Maktaba Tul Ishaat.com

التحریم

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ لِمَ تُحَرِّمُ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ اس نام سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جس میں تحریم کے واقعے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس میں تحریم کے جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق احادیث کی رِوایات میں دو خواتین کا ذکر آیا ہے جو اُس وقت حضورؐ کے حَرَم میں تھیں۔ ایک، حضرت صَفِیہؓ۔ دوسری، حضرت ماریہ قِبطِیہؓ۔ ان میں سے ایک، یعنی حضرت صَفِیہؓ، فتحِ خیبر کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں، اور خَیبَر کی فتح بالاتفاق ۷ ھ میں ہوئی ہے۔ دوسری خاتون حضرت ماریہؓ کو ۷ ھ میں مصر کے فرماں روا مُقَوقِس نے حضورؐ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اُن کے بطن سے ذی الحجہ ۸ ھ میں حضورؐ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے یہ بات قریب قریب متعیّن ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کا نُزول ۷ ھ یا ۸ ھ کے دوران میں کسی وقت ہوا ہے۔

موضوع اور مَباحِث یہ ایک بڑی اہم سورت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہَراتؓ کے متعلق بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند مُہِمّاتِ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک یہ کہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے حُدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبیؐ کی طرف بھی اُن کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیتِ نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطعِ نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآنِ مجید میں نازل ہوا ہو، یا وحیِ خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطورِ خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی بھی نہیں ہے، کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرے میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی، جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آ جائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اِقدام بھی منشائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔

ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے، تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اُصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حَسَنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرّہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشائے الٰہی سے مُطابَقت نہ رکھتی ہو۔

تیسری بات جو مذکورۂ بالا نکتہ سے خود بخود نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ذرا سی بات پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اسے ریکارڈ پر بھی لے آیا گیا، تو یہ چیز قطعی طور پر ہمارے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیتی ہے کہ حضوؐر کی حیاتِ طیّبہ میں جو اعمال و افعال اور جو احکام و ہدایات بھی ہمیں اب ملتے ہیں، اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت یا اصلاح ریکارڈ پر موجود نہیں ہے، وہ سراسر برحق ہیں، اللہ کی مرضی سے پوری مُطابَقت رکھتے ہیں، اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی بات جو اس کلام میں ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس رسولِ مقدّس کی عزّت و حُرمت کو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کے حق میں لازمۂ ایمان قرار دیتا ہے، اُسی کے متعلق اِس سورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ اللہ کی حلال کی ہوئی ایک چیز اپنے اُوپر حرام کر لی۔ اور جن ازواجِ مطہّراتؓ کو اللہ تعالیٰ خود تمام اہلِ ایمان کی ماں قرار دیتا ہے اور جن کے احترام کا اس نے خود مسلمانوں کو حکم دیا ہے، انھی کو اس نے بعض غلطیوں پر اس سورہ میں شدّت سے تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر نبی پر یہ گرفت اور ازواجِ مطہّراتؓ کو یہ تنبیہ بھی خفیہ طور پر نہیں کی گئی، بلکہ اُس کتاب میں درج کر دی گئی جسے تمام اُمّت کو ہمیشہ ہمیشہ تلاوت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں اِس ذکر کا منشا نہ یہ تھا، نہ یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور امہات المومنینؓ کو اہلِ ایمان کی نگاہوں سے گرا دینا چاہتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآنِ پاک کی یہ سورت پڑھ کر کسی مسلمان کے دل سے ان کا احترام اٹھ نہیں گیا ہے۔ اب قرآن میں یہ ذکر لانے کی مَصلَحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنے بزرگوں کے احترام کی صحیح حدوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ نبی، نبی ہے، خدا نہیں ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہ ہو۔ نبی کا احترام اس بنا پر نہیں ہے کہ اس سے لغزش کا صُدور ناممکن ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مرضیِ الٰہی کا مکمل نمایندہ ہے اور اس کی ادنیٰ سی لغزش کو بھی اللہ نے اصلاح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے، جس سے ہمیں یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ نبی کا چھوڑا ہوا اسوۂ حَسَنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمایندگی کر رہا ہے۔ اسی طرح

Maktaba Tul Ishaat.com

صحابۂ کرامؓ ہوں یا ازواجِ مطہّراتؓ، یہ سب انسان تھے، فرشتے یا فوق البشر نہ تھے۔ اُن سے غَلطیوں کا صُدور ہو سکتا تھا۔ اُن کو جو مرتبہ بھی حاصل ہوا، اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کی رہنمائی اور اللہ کے رسولؐ کی تَربیَت نے ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اُن کا جو کچھ بھی احترام ہے اسی بنا پر ہے، نہ کہ اِس مفروضے پر کہ وہ کچھ ایسی ہستیاں تھیں جو غلطیوں سے بالکل مُبرّا تھیں۔ اِسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحابہؓ یا ازواجِ مطہراتؓ سے بَشَریت کی بنا پر جب بھی کسی غَلَطی کا صدور ہوا، اُس پر ٹوکا گیا۔ اُن کی بعض غلطیوں کی اصلاح حضورؐ نے کی، جس کا ذکر احادیث میں بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اور بعض غلطیوں کا ذکر قرآنِ مجید میں کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کی اصلاح کی، تاکہ مسلمان کبھی بزرگوں کے احترام کا کوئی ایسا مبالغہ آمیز تصور نہ قائم کرلیں جو انھیں انسانیت کے مَقام سے اُٹھا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مَقام پر پہنچا دے۔ آپ قرآنِ پاک کا مطالعَہ آنکھیں کھول کر کریں تو اِس کی پے در پے مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔

سورۂ آلِ عمران میں جنگِ اُحُد کا ذکر کرتے ہوئے صحابۂ کرامؓ کو مخاطَب کر کے فرمایا:

”اللہ نے (تائید و نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا جب کہ اُس کے اِذن سے تم اُن کو قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی مَحبّت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم حکم کی نافرمانی کر بیٹھے، تم میں سے کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا طلب گار، تب اللہ نے تمھیں اُن کے مقابلے میں پسپا کر دیا، تاکہ تمھاری آزمایش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں معاف کر دیا، اللہ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔“ (آیت ۱۵۲)

سورۂ نور میں حضرت عائشہؓ پر تہمت کا ذکر کرتے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا گیا:

”ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم لوگوں نے اِسے سنا تھا، اُسی وقت مومن مرد اور عورتیں، سب اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو صریح بہتان ہے؟...... اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آلیتا۔ ذرا غور کرو! جب تمھاری ایک زبان سے دوسری زبان اِس قصّے کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلّق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اِسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اِسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔“ (آیات ۱۲ تا ۱۷)

سورۂ اَحزاب میں ازواجِ مطہّراتؓ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

”اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی طلب گار ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“ (آیات ۲۸-۲۹)

سورۂ جمعہ میں صحابہؓ کے متعلق فرمایا:

”جب انھوں نے کاروبارِ تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور (اے نبیؐ!) تم کو (خطبے میں) کھڑا چھوڑ دیا۔ اِن سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے، اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔“ (آیت ۱۱)

سورۂ مُمتَحِنَہ میں ایک بدری صحابی حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلتَعَہ کے اِس فعل پر سخت گرفت کی گئی کہ انھوں نے فتحِ مکہ سے پہلے حضورؐ کے حملے کی خفیہ اطّلاع کفارِ قریش کو بھیج دی تھی۔

یہ ساری مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں، اُسی قرآن میں جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور ازواجِ مطہّراتؓ کے فضل و شرف کو خود بیان فرمایا ہے اور انھیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا ہے۔ بزرگوں کے احترام کی یہی مبنی بر اعتدال تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو انسان پرستی کے اُس ہاویہ میں گرنے سے بچایا جس میں یہود و نصاریٰ گر گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کے موضوعات پر جن اکابرِ اہلِ سنّت نے کتابیں مُرتّب کی ہیں، ان میں جہاں صحابۂ کرامؓ اور ازواجِ مطہّراتؓ اور دوسرے بزرگوں کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کی کمزوریوں اور لغزشوں اور غلطیوں کے واقعات بیان کرنے میں بھی تأمّل نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آج کے مدعیانِ احترام کی بہ نسبت وہ ان بزرگوں کے زیادہ قدر شناس تھے اور ان سے زیادہ حُدودِ احترام کو جانتے تھے۔

پانچویں بات جو اس سورہ میں کھول کر بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین بالکل بے لاگ ہے۔ اس میں ہر شخص کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے ایمان اور اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اس کے لیے قطعاً نافع نہیں ہے، اور کسی بُری سے بُری ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس معاملے میں خاص طور پر ازواجِ مطہّراتؓ کے سامنے تین قسم کی عورتوں کو بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثال حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی ہے، جو اگر ایمان لاتیں اور اپنے جلیل القدر شوہروں کا ساتھ دیتیں تو ان کا مقام اُمّتِ مُسلمہ میں وہی ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہّراتؓ کا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے اِس کے برعکس رَویّہ اختیار کیا، اس لیے انبیاؑ کی بیویاں ہونا ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ جہنّم کی مستحق ہوئیں۔ دوسری مثال فرعون کی بیوی کی ہے، جو اگرچہ ایک بدترین دشمنِ خدا کی بیوی تھیں، لیکن چونکہ وہ ایمان

Maktaba Tul Ishaat.com

لے آئیں اور انھوں نے قومِ فرعون کے عمل سے اپنے عمل کا راستہ الگ کر لیا، اس لیے فرعون جیسے اکفر الکافرین کی بیوی ہونا بھی اُن کے لیے کسی نقصان کا موجب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جنت کا مستحق بنا دیا۔ تیسری مثال حضرت مریم علیہا السلام کی ہے، جنھیں یہ مرتبۂ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمایش میں انھیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا، اس کے لیے انھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت مریمؑ کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو کبھی ایسی سخت آزمایش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوار پنے کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو معجزے کے طور پر حاملہ کر دیا گیا ہو اور اُسے بتا دیا گیا ہو کہ اُس کا رب اُس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب حضرت مریمؑ نے اِس پر کوئی واویلا نہ کیا بلکہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا قبول کر لیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت کرنا ناگزیر تھا، تب اللہ نے ان کو سیّدۃ النسآء فی الجنّۃ (مُسندِ احمد) کے مرتبۂ عالی پر سرفراز فرمایا۔

اِن اُمور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت جو اِس سورہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف وہی علم نہیں آتا تھا جو قرآن میں درج ہوا ہے، بلکہ آپؐ کو وحی کے ذریعے سے دوسری باتوں کا علم بھی دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی صریح دلیل اِس سورہ کی آیت ۳ ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہّراتؓ میں سے ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اُنھوں نے وہ کسی اور کو بتا دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُطّلع کر دیا۔ پھر جب حضورؐ نے اِس غَلَطی پر اپنی اُن بیوی کو تنبیہ فرمائی، اور انھوں نے پوچھا کہ آپؐ کو میری یہ غَلَطی کس نے بتائی، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ مجھے علیم و خبیر ہستی نے اس کی خبر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پورے قرآن میں کہاں وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ ''اے نبیؐ! تم نے اپنی بیوی سے راز میں جو بات کہی تھی، وہ اُس نے کسی اور پر، یا فُلاں شخص پر ظاہر کر دی ہے؟'' اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نُزول ہوتا تھا۔ اس سے منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔

---

۱۲ آیاتھا

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ

۲ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ

اے نبیؐ! تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہے؟[1] (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟[2] ــــ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[3] اللہ نے تم لوگوں کے لیے

۱ - یہ دراصل استفہام نہیں ہے بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ یعنی مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرنا نہیں ہے کہ آپؐ نے یہ کام کیوں کیا ہے، بلکہ آپؐ کو اِس بات پر مُتنبِّہ کرنا ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا جو فعل آپؐ سے صادر ہوا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اِس سے خود بخود یہ مضمون مُترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے، اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، حتّٰی کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے۔ اگرچہ حضورؐ نے اُس چیز کو نہ عقیدتاً حرام سمجھا تھا اور نہ اُسے شرعاً حرام قرار دیا تھا، بلکہ صرف اپنی ذات پر اُس کے استعمال کو حرام کر لیا تھا، لیکن چونکہ آپؐ کی حیثیت ایک عام آدمی کی نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی تھی، اور آپؐ کے کسی چیز کو اپنے اُوپر حرام کر لینے سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اُمّت بھی اُس شے کو حرام، یا کم از کم مکروہ سمجھنے لگے، یا اُمت کے افراد یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اُوپر حرام کر لینے میں کوئی مُضایقہ نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس فعل پر گرفت فرمائی اور آپؐ کو اس تحریم سے باز رہنے کا حکم دیا۔

۲ - اس سے معلوم ہوا کہ حُضورؐ نے تحریم کا یہ فعل خود اپنی کسی خواہش کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ کی بیویوں نے یہ چاہا تھا کہ آپؐ ایسا کریں اور آپؐ نے محض اُن کو خوش کرنے کے لیے ایک حلال چیز اپنے لیے حرام کر لی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کے اِس فعل پر ٹوکنے کے ساتھ اُس کی اِس وجہ کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام صرف تحریم حلال سے آپؐ کو باز رکھنا ہوتا تو یہ مقصد پہلے فقرے سے پورا ہو جاتا تھا اور اس کی ضرورت نہ تھی کہ جس وجہ سے آپؐ نے یہ کام کیا تھا، اُس کی بھی تصریح کی جاتی۔ اُس کو بطورِ خاص بیان کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصد صرف حضورؐ ہی کو تحریم حلال پر ٹوکنا نہیں تھا بلکہ ساتھ ساتھ ازواجِ مطہّراتؓ کو بھی اس بات پر مُتنبِّہ کرنا تھا کہ انھوں نے ازواجِ نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی نازک ذمہ داریوں کا احساس نہ کیا

Maktaba Tul Ishaat.com

اور حضورؐ سے ایک ایسا کام کرا دیا جس سے ایک حلال چیز کے حرام ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اگرچہ قرآن میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ چیز کیا تھی جسے حُضُورؐ نے اپنے اوپر حرام کیا تھا، لیکن محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں دو مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے جو اِس آیت کے نُزول کا سبب بنے۔ ایک واقعہ حضرت ماریہ قِبطِیہؓ کا ہے اور دوسرا واقعہ یہ کہ آپؐ نے شہد استعمال نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

حضرت ماریہؓ کا قصہ یہ ہے کہ صلحِ حُدَیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خُطوط اطراف و نواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے، اُن میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بِطرِیق (Patriarch) کے نام بھی تھا جسے عرب مُقَوقِس کہتے تھے۔ حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلْتَعہ یہ نامۂ گرامی لے کر جب اس کے پاس پہنچے تو اُس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ ”مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قِبطِیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں“ (ابنِ سعد) اُن لڑکیوں میں سے ایک سِیرِین تھیں اور دوسری ماریہ۔ (عیسائی حضرت مریم کو ماریہ (Mary) کہتے ہیں)۔ مصر سے واپسی پر راستے میں حضرت حاطِبؓ نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے سِیرِین کو حضرت حَسّانؓ بن ثابت کی مِلکِ یمین میں دے دیا اور حضرت ماریہؓ کو اپنے حَرَم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۸ ھ میں انھی کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔ (اَلِاستِیعاب، اَلِاصابہ) یہ خاتون نہایت خوبصورت تھیں۔ حافظ ابنِ حَجَرؒ نے الِاصابہ میں ان کے متعلق حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”مجھے کسی عورت کا آنا اس قدر ناگوار نہ ہوا جتنا ماریہ کا آنا ہوا تھا، کیونکہ وہ حسین و جمیل تھیں اور حُضُورؐ کو بہت پسند آئی تھیں۔“ اِن کے بارے میں متعدد طریقوں سے جو قصہ احادیث میں نقل ہوا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حَفصہؓ کے مکان میں تشریف لے گئے اور وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ اُس وقت حضرت ماریہؓ آپؐ کے پاس وہاں آگئیں اور تخلیے میں آپؐ کے ساتھ رہیں۔ حضرت حَفصہؓ کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے حضورؐ سے اس کی سخت شکایت کی۔ اس پر آپؐ نے اُن کو راضی کرنے کے لیے اُن سے یہ عہد کر لیا کہ آیندہ ماریہؓ سے کوئی اِزدواجی تعلق نہ رکھیں گے۔ بعض رِوایات میں یہ ہے کہ آپؐ نے ماریہؓ کو اپنے اُوپر حرام کر لیا، اور بعض میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے اِس پر قسم بھی کھائی تھی۔ یہ روایات زیادہ تر تابعین سے مُرسَلاً نقل ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے بعض حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہیں۔ ان کی کثرتِ طُرُق کو دیکھتے ہوئے حافظ ابنِ حَجَرؒ نے فتح الباری میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اِس قصے کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔ مگر صِحاح سِتّہ میں سے کسی میں بھی یہ قصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔ نَسائی میں حضرت اَنَسؓ سے صرف اتنی بات منقول ہوئی ہے کہ ”حضورؐ کی ایک لونڈی تھی جس سے آپؐ تمتُّع فرماتے تھے۔ پھر حضرت حَفصہؓ اور حضرت عائشہؓ آپؐ کے پیچھے پڑ گئیں، یہاں تک کہ آپؐ نے اُسے اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ اِس پر

یہ آیت نازل ہوئی کہ اَے نبیؐ! تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے۔“

دوسرا واقعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور دوسری متعدّد کُتُبِ حدیث میں خود حضرت عائشہؓ سے جس طرح نقل ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعُموم ہر روز عصر کے بعد تمام ازواجِ مطہّراتؓ کے ہاں چکر لگاتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپؐ حضرت زینبؓ بنتِ جَحش کے ہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے، کیونکہ ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا، اور حضورؐ کو شیرینی بہت پسند تھی، اس لیے آپؐ ان کے ہاں شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو اس پر رشک لاحق ہوا اور میں نے حضرت حَفصہؓ، حضرت سَوْدَہؓ اور حضرت صَفِیہؓ سے مل کر یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپؐ آئیں، وہ آپؐ سے یہ کہے کہ آپؐ کے منہ سے مَغافیر کی بُو آتی ہے۔ مَغافیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں کچھ بِساند ہوتی ہے، اور اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرے تو اس کے اندر بھی اس بِساند کا اثر آ جاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حضورؐ نہایت نفاست پسند ہیں اور آپؐ کو اِس سے سخت نفرت ہے کہ آپؐ کے اندر کسی قسم کی بدبُو پائی جائے۔ اس لیے آپؐ کو حضرت زینبؓ کے ہاں ٹھیرنے سے روکنے کی خاطر یہ تدبیر کی گئی اور یہ کارگر ہوئی۔ جب متعدّد بیویوں نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ کے منہ سے مَغافیر کی بُو آتی ہے تو آپؐ نے عہد کر لیا کہ اب یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔ ایک رِوایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ فَلَنْ اَعُوْدَ لَہٗ وَقَدْ حَلَفْتُ۔ ”اب میں ہرگز اسے نہ پیوں گا، میں نے قسم کھا لی ہے۔“ دوسری رِوایت میں صرف فَلَنْ اَعُوْدَ لَہٗ کے الفاظ ہیں، وَقَدْ حَلَفْتُ کا ذکر نہیں ہے۔ اور ابنِ عباسؓ سے جو رِوایت ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ وَاللّٰہِ لَا اشربُہٗ، ”خدا کی قسم! میں اسے نہ پیوں گا۔“

اکابر اہلِ علم نے اِن دونوں قصّوں میں سے اِسی دوسرے قصّے کو صحیح قرار دیا ہے اور پہلے قصّے کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا ہے۔ امام نَسائی کہتے ہیں کہ ”شہد کے معاملے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نہایت صحیح ہے، اور حضرت ماریہؓ کو حرام کر لینے کا قصّہ کسی عمدہ طریقے سے نقل نہیں ہوا ہے۔“ قاضی عِیاض کہتے ہیں: ”صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ماریہؓ کے معاملہ میں نہیں بلکہ شہد کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔“ قاضی ابوبکر ابن العَرَبی بھی شہد ہی کے قصّے کو صحیح قرار دیتے ہیں، اور یہی رائے امام نَوَوِیؒ اور حافظ بدرالدینؒ عینی کی ہے۔ ابنِ ہُمام فتح القدیر میں کہتے ہیں کہ ”**شہد کی** تحریم کا قصّہ صحیحین میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا تھا، اس لیے یہی زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔“ حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں: ”صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“

۳- یعنی بیویوں کی خوشی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام کر لینے کا جو فعل آپؐ سے صادر ہوا ہے، یہ اگرچہ آپؐ کے اہم ترین ذمہ دارانہ منصب کے لحاظ سے مناسب نہ تھا، لیکن یہ کوئی گناہ بھی نہ تھا کہ اس پر مواخذہ کیا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف ٹوک کر اس کی اصلاح کر دینے پر اکتفا فرمایا اور آپؐ کی اِس لغزش کو معاف کر دیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تَحِلَّةَ اَيۡمَانِكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ مَوۡلٰٮكُمۡ ۚ وَهُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۲

اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تمھارا مولیٰ ہے، اور وہی علیم و حکیم ہے۔

۴- مطلب یہ ہے کہ کفّارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ، آیت ۸۹ میں مقرر کر دیا ہے، اس کے مطابق عمل کر کے آپؐ اُس عہد کو توڑ دیں جو آپؐ نے ایک حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہاں ایک اہم فقہی سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ حکم اُس صورت کے لیے ہے جب کہ آدمی نے قسم کھا کر حلال کو حرام کر لیا ہو، یا بجائے خود تحریم ہی قسم کی ہم معنیٰ ہے، خواہ قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں؟ اس سلسلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ محض تحریم قسم نہیں ہے۔ اگر آدمی نے کسی چیز کو، خواہ وہ بیوی ہو یا کوئی دوسری حلال چیز، قسم کھائے بغیر اپنے اُوپر حرام کر لیا ہو تو یہ ایک لغو بات ہے جس سے کوئی کفّارہ لازم نہیں آتا، بلکہ آدمی کفّارے کے بغیر ہی وہ چیز استعمال کر سکتا ہے جسے اس نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے مَسْرُوق، شَعْبِی، ربیعہ اور ابوسَلَمہ کی ہے اور اسی کو ابنِ جَرِیر اور تمام ظاہریوں نے اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحریم صرف اُس صورت میں قسم ہے جب کہ کسی چیز کو اپنے اُوپر حرام کرتے ہوئے قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ان کا اِستِدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ حلال چیز کو اپنے لیے حرام کرنے کے ساتھ قسم بھی کھائی تھی، جیسا کہ متعدّد روایات میں بیان ہوا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ ہم نے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ مقرر کر دیا ہے، اس پر آپؐ عمل کریں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم کے الفاظ استعمال کیے بغیر کسی چیز کو حرام کر لینا بجائے خود قسم تو نہیں ہے، مگر بیوی کا معاملہ اس سے مُستثنیٰ ہے۔ دوسری اشیا، مثلاً کسی کپڑے یا کھانے کو آدمی نے اپنے اُوپر حرام کر لیا ہو تو یہ لغو ہے، کوئی کفّارہ دیے بغیر آدمی اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بیوی یا لونڈی کے لیے اس نے کہا ہو کہ اُس سے مباشرت میرے اُوپر حرام ہے، تو وہ حرام تو نہ ہوگی، مگر اس کے پاس جانے سے پہلے کفّارۂ یمین لازم آئے گا۔ یہ رائے شافعیہ کی ہے۔ (مُغنی المحتاج) اور اسی سے ملتی جُلتی رائے مالکیہ کی بھی ہے۔ (احکام القرآن لابن العَرَبی)

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ تحریم بجائے خود قسم ہے، خواہ قسم کے الفاظ استعمال نہ کیے گئے ہوں۔ یہ رائے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عائشہ، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے۔ اگرچہ ابنِ عباسؓ سے ایک دوسری رائے بخاری میں یہ نقل ہوئی ہے کہ اذا حرّم امرأتہٗ فلیس بشیءٍ (اگر آدمی نے اپنی بیوی کو حرام کیا ہو تو یہ کچھ نہیں ہے)، مگر اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ اُن کے نزدیک یہ طلاق نہیں بلکہ قسم ہے اور اس پر کفّارہ ہے، کیونکہ بخاری، مسلم اور ابنِ ماجہ میں

ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ حرام قرار دینے کی صورت میں کفّارہ ہے، اور نسائی میں روایت ہے کہ ابنِ عباسؓ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ”وہ تیرے اُوپر حرام تو نہیں ہے مگر تجھ پر کفّارہ لازم ہے“، اور ابنِ جریر کی روایت میں ابنِ عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں: ”اگر لوگوں نے اپنے اُوپر کسی چیز کو حرام کیا ہو جسے اللہ نے حلال کیا ہے، تو ان پر لازم ہے کہ اپنی قسموں کا کفارہ ادا کریں۔“ یہی رائے حسن بصری، عطاء، طاؤس، سلیمان بن یسار، ابن جُبَیر اور قتادَہ کی ہے، اور اسی رائے کو حَنفِیَّہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوبکر جَصّاص کہتے ہیں کہ ”آیت لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ کے ظاہر الفاظ اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریم کے ساتھ ساتھ قسم بھی کھائی تھی، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ تحریم ہی قسم ہے، کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اِسی تحریم کے معاملے میں قسم کا کفارہ واجب فرمایا۔“ آگے چل کر پھر کہتے ہیں: ”ہمارے اصحاب (یعنی حنفیہ) نے تحریم کو اُس صورت میں قسم قرار دیا ہے جب کہ اس کے ساتھ طلاق کی نیت نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے بیوی کو حرام کہا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم! میں تیرے قریب نہیں آؤں گا، اس لیے وہ اِیلا کا مرتکب ہوا۔ اور اگر اس نے کسی کھانے پینے کی چیز وغیرہ کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم! میں وہ چیز استعمال نہ کروں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ فرمایا کہ آپؐ اُس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے، اور پھر فرمایا کہ اللہ نے تم لوگوں کے لیے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تحریم کو قسم قرار دیا اور تحریم کا لفظ اپنے مفہوم اور حکمِ شرعی میں قسم کا ہم معنیٰ ہو گیا۔“

اس مقام پر فائدہ عام کے لیے یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرنے، اور بیوی کے سوا دوسری چیزوں کو حرام کر لینے کے معاملے میں فقہا کے نزدیک شرعی حکم کیا ہے۔

حَنفِیَّہ کہتے ہیں کہ اگر طلاق کی نیت کے بغیر کسی شخص نے بیوی کو اپنے لیے حرام کیا ہو، یا قسم کھائی ہو کہ اس سے مُقاربَت نہ کرے گا، تو یہ اِیلا ہے اور اس صورت میں مُقاربَت سے پہلے اسے قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے طلاق کی نیت سے یہ کہا ہو کہ تُو میرے اُوپر حرام ہے، تو معلوم کیا جائے گا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ اگر تین طلاق کی نیت تھی تو تین واقع ہوں گی، اور اگر اس سے کم کی نیت تھی، خواہ ایک کی نیت ہو یا دو کی، تو دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق وارد ہوگی۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جو کچھ میرے لیے حلال تھا وہ حرام ہو گیا، تو اس کا اِطلاق بیوی پر اُس وقت تک نہ ہوگا جب تک اُس نے بیوی کو حرام کرنے کی نیت سے یہ الفاظ نہ کہے ہوں۔ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو حرام کرنے کی صورت میں آدمی اُس وقت تک وہ چیز استعمال نہیں کر سکتا جب تک قسم کا کفّارہ ادا نہ کر دے۔ (بدائع الصّنائع، ہدایہ، فتح القدیر، احکام القرآن للجصّاص)

شافعیہ کہتے ہیں کہ بیوی کو اگر طلاق یا ظِہار کی نیت سے حرام کیا جائے تو جس چیز کی نیت ہوگی وہ واقع ہو جائے گی۔ رَجعی طلاق کی نیت ہو تو رَجعی، بائن کی نیت ہو تو بائن، اور ظِہار کی نیت ہو تو ظِہار۔ اور اگر کسی نے طلاق و ظِہار دونوں کی نیت سے تحریم کے الفاظ استعمال کیے ہوں تو اُس سے کہا جائے گا کہ دونوں میں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

کسی ایک چیز کو اختیار کرلے، کیونکہ طلاق وظہار، دونوں بیک وقت ثابت نہیں ہوسکتے۔ طلاق سے نکاح زائل ہوتا ہے، اور ظِہار کی صورت میں وہ باقی رہتا ہے۔ اور اگر کسی نیت کے بغیر مطلقاً بیوی کو حرام قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام نہ ہوگی مگر قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔ اور اگر بیوی کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار دیا ہو تو یہ لَغْو ہے، اس پر کوئی کفّارہ نہیں ہے۔ (مُغْنی المحتاج)

مالکیہ کہتے ہیں کہ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو آدمی اپنے اُوپر حرام کرے تو نہ وہ حرام ہوتی ہے اور نہ اسے استعمال کرنے سے پہلے کوئی کفارہ لازم آتا ہے۔ لیکن اگر بیوی کو کہہ دے کہ تُو حرام ہے، یا میرے لیے حرام ہے، یا میں تیرے لیے حرام ہوں، تو خواہ مدخولہ سے یہ بات کہے یا غیر مدخولہ سے، ہر صورت میں یہ تین طلاق ہیں، اِلّا یہ کہ اس نے تین سے کم کی نیت ہو۔ اَصْبَغ کا قول ہے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ جو کچھ مجھ پر حلال تھا وہ حرام ہے، تو جب تک وہ بیوی کو مستثنیٰ نہ کرے، اس سے بیوی کی تحریم بھی لازم آجائے گی۔ اَلمُدَوَّنہ میں مدخولہ اور غیر مدخولہ کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ مدخولہ کو حرام کہہ دینے سے تین ہی طلاقیں پڑیں گی، خواہ نیت کچھ بھی ہو، لیکن غیر مدخولہ کے معاملے میں اگر نیت کم کی ہو تو جتنی طلاقوں کی نیت کی گئی ہے اُتنی ہی پڑیں گی، اور کسی خاص تعداد کی نیت نہ ہو تو پھر یہ تین طلاقیں ہوں گی۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی) قاضی ابن العَرَبی نے احکام القرآن میں اس مسئلے کے متعلق امام مالکؒ کے تین قول نقل کیے ہیں: ایک، یہ کہ بیوی کی تحریم ایک طلاقِ بائن ہے۔ دوسرا، یہ کہ یہ تین طلاق ہیں۔ تیسرا، یہ کہ مدخولہ کے معاملے میں تو یہ بہر حال تین طلاقیں ہیں، البتہ غیر مدخولہ کے معاملے میں ایک کی نیت ہو تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔ پھر کہتے ہیں کہ "صحیح یہ ہے کہ بیوی کی تحریم ایک ہی طلاق ہے، کیونکہ اگر آدمی حرام کہنے کے بجائے طلاق کا لفظ استعمال کرے اور کسی تعداد کا تعیُّن نہ کرے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔"

امام احمد بن حنبلؒ سے اس مسئلے میں تین مختلف اقوال منقول ہوئے ہیں: ایک یہ کہ بیوی کی تحریم، یا حلال کو مطلقاً اپنے لیے حرام قرار دینا ظِہار ہے، خواہ ظِہار کی نیت ہو یا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ یہ طلاق کا صریح کنایہ ہے اور اس سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، خواہ نیت ایک ہی کی ہو۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ قسم ہے، اِلّا یہ کہ آدمی نے طلاق یا ظِہار میں سے کسی کی نیت کی ہو، اور اِس صورت میں جو نیت بھی کی گئی ہو وہی واقع ہوگی۔ ان میں سے پہلا قول ہی مذہبِ حنبلی میں مشہور ترین ہے۔ (الانصاف)

۵- یعنی اللہ تمھارا آقا اور تمھارے معاملات کا مُتَوَلّی ہے۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ تمھاری بھلائی کس چیز میں ہے، اور جو احکام بھی اُس نے دیے ہیں، سراسر حکمت کی بنا پر دیے ہیں۔ پہلی بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم خود مختار نہیں ہو، بلکہ اللہ کے بندے ہو اور وہ تمھارا آقا ہے، اس لیے اس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں میں ردّ و بدل کرنے کا اختیار تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تمھارے لیے حق یہی ہے کہ اپنے معاملات اس کے حوالے کرکے بس اُس کی اطاعت کرتے رہو۔ دوسری بات ارشاد فرمانے سے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ نے جو طریقے اور قوانین مقرر کیے ہیں، وہ سب علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ جس چیز کو حلال

وَ اِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِہٖ حَدِیۡثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِہٖ وَ اَظۡہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیۡہِ عَرَّفَ بَعۡضَہٗ وَ اَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَکَ ہٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۳﴾

(اور یہ معاملہ بھی قابلِ توجّہ ہے کہ) نبیؐ نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی۔ پھر جب اُس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا، اور اللہ نے نبیؐ کو اِس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی، تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اُس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبیؐ نے اُسے (اِفشائے راز) کی یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپؐ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا: ”مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے[٦]۔“

کیا ہے، علم وحکمت کی بنا پر حلال کیا ہے اور جسے حرام قرار دیا ہے، اسے بھی علم وحکمت کی بنا پر حرام قرار دیا ہے۔ یہ کوئی اَلل ٹپ کام نہیں ہے کہ جسے چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام ٹھیرا دیا۔ لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ علیم وحکیم ہم نہیں ہیں بلکہ اللہ ہے اور ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کریں۔

٦ – مختلف رِوایات میں مختلف باتوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ فُلاں بات تھی جو حضورؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی اور اُن بیوی نے ایک دوسری بیوی سے اس کا ذکر کر دیا۔ لیکن ہمارے نزدیک اوّل تو اُس کا کھوج لگانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ راز کے اِفشا کرنے پر ہی تو اللہ تعالیٰ یہاں ایک بیوی کو ٹوک رہا ہے، پھر ہمارے لیے کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ ہم اُس کی ٹٹول کریں اور اسے کھولنے کی فکر میں لگ جائیں۔ دوسرے، جس مقصد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ راز کی بات تھی کیا۔ مقصودِ کلام سے اس کا کوئی تعلق ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے خود بیان فرما دیتا۔ اصل غرض جس کے لیے اِس معاملے کو قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے، ازواجِ مطہّراتؓ میں سے ایک کو اِس غَلطی پر ٹوکنا ہے کہ اُن کے عظیم المرتبہ شوہر نے جو بات راز میں اُن سے فرمائی تھی، اُسے انھوں نے راز نہ رکھا اور اس کا اِفشا کر دیا۔ یہ محض ایک نجی معاملہ ہوتا، جیسا دنیا کے عام میاں اور بیوی کے درمیان ہوا کرتا ہے، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست وحی کے ذریعے سے حُضورؐ کو اس کی خبر کر دیتا اور پھر محض خبر دینے ہی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ اسے اپنی اُس کتاب میں بھی درج کر دیتا جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کو پڑھنا ہے۔ لیکن اسے یہ اہمیت جس وجہ سے دی گئی، وہ یہ تھی کہ وہ بیوی

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنْ تَتُوْبَآ إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَإِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ

اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمھارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں،[7] اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے باہم جتھا بندی کی[8] تو جان رکھو کہ اللہ

کسی معمولی شوہر کی نہ تھیں بلکہ اُس عظیم ہستی کی بیوی تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے انتہائی اہم ذمہ داری کے منصب پر مامور فرمایا تھا، جسے ہر وقت کفار و مشرکین اور منافقین کے ساتھ ایک مسلسل جہاد سے سابقہ درپیش تھا، جس کی قیادت میں کفر کی جگہ اسلام کا نظام برپا کرنے کے لیے ایک زبردست جدّوجُہد ہو رہی تھی۔ ایسی ہستی کے گھر میں بے شمار ایسی باتیں ہو سکتی تھیں جو اگر راز نہ رہتیں اور قبل از وقت ظاہر ہو جاتیں تو اُس کارِ عظیم کو نقصان پہنچ سکتا تھا جو وہ ہستی انجام دے رہی تھی۔ اس لیے جب اُس گھر کی ایک خاتون سے پہلی مرتبہ یہ کمزوری صادر ہوئی کہ اس نے ایک ایسی بات کو جو راز میں اُس سے کہی گئی تھی، کسی اور پر ظاہر کر دیا (اگرچہ وہ کوئی غیر نہ تھا بلکہ اپنے ہی گھر کا ایک فرد تھا) تو اس پر فوراً ٹوک دیا گیا، اور در پردہ نہیں بلکہ قرآنِ مجید میں برملا ٹوکا گیا، تاکہ نہ صرف ازواجِ مطہراتؓ کو، بلکہ مسلم معاشرے کے تمام ذمہ دار لوگوں کی بیویوں کو رازوں کی حفاظت کی تربیت دی جائے۔ آیت میں اس سوال کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جس راز کی بات کو اِفشا کیا گیا تھا، وہ کوئی خاص اہمیت رکھتی تھی یا نہیں، اور اس کے اِفشا سے کسی نقصان کا خطرہ تھا یا نہیں۔ گرفت بجائے خود اس امر پر کی گئی ہے کہ راز کی بات کو دوسرے سے بیان کر دیا گیا۔ اس لیے کہ کسی ذمہ دار ہستی کے گھر والوں میں اگر یہ کمزوری موجود ہو کہ وہ رازوں کی حفاظت میں تساہُل برتیں، تو آج ایک غیر اہم راز اِفشا ہوا ہے، کل کوئی اہم راز اِفشا ہو سکتا ہے۔ جس شخص کا منصب معاشرے میں جتنا زیادہ ذمہ دارانہ ہوگا، اُتنے ہی زیادہ اہم اور نازک معاملات اس کے گھر والوں کے علم میں آئیں گے۔ ان کے ذریعے سے راز کی باتیں دوسروں تک پہنچ جائیں تو کسی وقت بھی یہ کمزوری کسی بڑے خطرے کی موجب بن سکتی ہے۔

۷- اصل الفاظ ہیں: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا۔ صَغْو عربی زبان میں مُڑ جانے اور ٹیڑھا ہو جانے کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اِس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: ”ہر آئینہ کج شدہ است دلِ شما“ اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے: ”کج ہو گئے ہیں دل تمھارے۔“ حضرات عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عباسؓ سُفیان ثَوریؒ اور ضَحّاکؒ نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے: زَاغَتْ قُلُوْبُكُمَا، یعنی ”تمھارے دل راہِ راست سے ہٹ گئے ہیں۔“ امام رازیؒ اس کی تشریح میں کہتے ہیں: عدلت ومالت عن الحق وهو حق الرسول صلى الله عليه وسلم، ”حق سے ہٹ گئے ہیں، اور حق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے۔“ اور علامہ آلوسیؒ کی تشریح یہ ہے: مالت عن الواجب من موافقته صلى الله عليه وسلم بِحُبِّ ما يحبه وكراهة ما

یکرھہ الیٰ مخالفتہ۔ یعنی ”تم پر واجب تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پسند کریں اسے پسند کرنے میں، اور جو کچھ آپؐ ناپسند کریں اسے ناپسند کرنے میں آپؐ کی مُوافقت کرو۔ مگر تمھارے دل اِس معاملے میں آپؐ کی مُوافقت سے ہٹ کر آپؐ کی مخالفت کی طرف مڑ گئے ہیں۔“

۸- اصل الفاظ ہیں: وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ۔ تظاہر کے معنیٰ ہیں: کسی کے مقابلے میں باہم تعاون کرنا یا کسی کے خلاف ایکا کرنا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: ”اگر باہم متفق شوید بر رنجانیدنِ پیغمبر۔“ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: ”اگر تم دونوں چڑھائی کرو گیاں اُس پر۔“ مولانا اشرف علی صاحبؒ کا ترجمہ ہے: ”اور اگر اسی طرح پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں۔“ اور مولانا شبّیر احمد عثمانی صاحبؒ نے اِس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ”اگر تم دونوں اِسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں۔“

آیت کا خطاب صاف طور پر دو خواتین کی طرف ہے، اور سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ہیں، کیونکہ اِس سورہ کی پہلی آیت سے پانچویں آیت تک مسلسل حضورؐ کی ازواج کے معاملات ہی زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس حد تک تو بات خود قرآنِ مجید کے اندازِ بیان سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دونوں بیویاں کون تھیں، اور وہ معاملہ کیا تھا جس پر یہ عتاب ہوا ہے، اِس کی تفصیل ہمیں حدیث میں ملتی ہے۔ مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، تِرمِذی اور نَسائی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک مفصّل رِوایت نقل ہوئی ہے جس میں کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

> ”میں ایک مدت سے اِس فکر میں تھا کہ حضرت عمرؓ سے پوچھوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے وہ کون سی دو بیویاں تھیں جنھوں نے حضورؐ کے مقابلے میں جتھا بندی کر لی تھی اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ارشاد فرمائی ہے کہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا، لیکن اُن کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک مرتبہ وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور میں اُن کے ساتھ گیا۔ واپسی پر راستے میں ایک جگہ اُن کو وضو کراتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے یہ سوال پوچھ لیا۔ انھوں نے جواب دیا: وہ عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں۔ پھر انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھنے کے عادی تھے۔ جب ہم مدینہ آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جن پر اُن کی بیویاں حاوی تھیں، اور یہی سبق ہماری عورتیں بھی اُن سے سیکھنے لگیں۔ ایک روز میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے رہی ہے (اصل الفاظ ہیں: فَاِذَا ھِیَ تُرَاجِعُنِیْ)۔ مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے۔ اس نے کہا: آپ اس بات پر کیوں بگڑتے ہیں کہ میں آپ کو پلٹ کر جواب دوں؟ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضورؐ کو دُوبدُو جواب دیتی ہیں (اصل لفظ ہے:

Maktaba Tul Ishaat.com

لَیُرَاجِعْنَہٗ) اور ان میں سے کوئی حضورؐ سے دن دن بھر روٹھی رہتی ہے (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضورؐ اس سے دن بھر ناراض رہتے ہیں)۔ یہ سُن کر میں گھر سے نکلا اور حَفصہؓ کے ہاں گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضورؐ کی بیوی تھیں)۔ میں نے اُس سے پوچھا: کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُو بدُو جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے پوچھا: اور کیا تم میں سے کوئی دن بھر حضورؐ سے رُوٹھی رہتی ہے؟ (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضورؐ دن بھر اس سے ناراض رہتے ہیں)۔ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: نامراد ہوگئی اور گھاٹے میں پڑ گئی وہ عورت جو تم میں سے ایسا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات سے بے خوف ہوگئی ہے کہ اپنے رسولؐ کے غضب کی وجہ سے اللہ اس پر غضب ناک ہو جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر (یہاں بھی وہی الفاظ ہیں: لَا تُرَاجِعِیْ) اور نہ اُن سے کسی چیز کا مطالبہ کر، میرے مال سے تیرا جو جی چاہے مانگ لیا کر۔ تُو اس بات سے کسی دھوکے میں نہ پڑ کہ تیری پڑوسن (مراد ہیں حضرت عائشہؓ) تجھ سے زیادہ خوب صورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے نکل کر اُمّ سَلَمہؓ کے پاس پہنچا جو میری رشتہ دار تھیں، اور میں نے اِس معاملے میں ان سے بات کی۔ انھوں نے کہا: ابنِ خَطّاب! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہر معاملے میں تم نے دخل دیا، یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملے میں بھی دخل دینے چلے ہو۔ اُن کی اس بات نے میری ہمت توڑ دی۔ پھر ایسا ہوا کہ میرا ایک انصاری پڑوسی رات کے وقت میرے گھر آیا اور اس نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں باری باری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور جو بات کسی کی باری کے دن ہوتی تھی، وہ دوسرے کو بتا دیا کرتا تھا۔ زمانہ وہ تھا جب ہمیں غسّان کے حملے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اُس کے پکارنے پر جب میں نکلا تو اس نے کہا: ایک بڑا حادثہ پیش آگیا ہے۔ میں نے کہا: کیا غسّانی چڑھ آئے ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، اس سے بھی زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا: برباد ہوئی اور نامُراد ہوگئی حَفصہ، (بخاری کے الفاظ ہیں: رَغِمَ اَنْفُ حَفْصَۃَ وَعَائِشَۃَ)، مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ ہونے والی بات ہے۔''

اس کے آگے کا قصّہ ہم نے چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضورؐ کی خدمت میں جا کر انھوں نے کس طرح حضورؐ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس قصّے کو ہم نے مُسندِ احمد اور بخاری کی روایات جمع کر کے مُرتّب کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ نے مُراجَعَت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اُسے لُغوی معنیٰ میں نہیں لیا جا سکتا، بلکہ سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ یہ لفظ دُو بدُو جواب دینے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، اور حضرت عمرؓ کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لا تراجعی رسول اللّٰہ صاف طور پر اِس معنیٰ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان درازی نہ کیا کر۔

هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

اُس کا مولیٰ ہے اور اُس کے بعد جبریلؑ اور تمام صالح اہلِ ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور

اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مُراجَعَت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا، یا دُو بدُو جواب دینا تو صحیح ہے، مگر اس کا ترجمہ ''زبان درازی'' صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبے کا آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے، یا دُو بدُو جواب دے، تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے، تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ اور اُمت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔

بعض دوسرے لوگ ہمارے اس ترجمے کو سُوءِ ادب قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ سُوءِ ادب اگر ہو سکتا تھا تو اُس صورت میں جب کہ ہم اپنی طرف سے اِس طرح کے الفاظ حضرت حَفصہؓ کے متعلق استعمال کرنے کی جسارت کرتے۔ ہم نے تو حضرت عمرؓ کے الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کیا ہے، اور یہ الفاظ انھوں نے اپنی بیٹی کو اُس کے قُصور پر سرزنش کرتے ہوئے استعمال کیے ہیں۔ اسے سُوءِ ادب کہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یا تو باپ اپنی بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے بھی ادب سے بات کرے، یا پھر اس کی ڈانٹ کا ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے اس کو بادب کلام بنا دے۔

اس مقام پر سوچنے کے قابل بات دراصل یہ ہے کہ اگر معاملہ صرف ایسا ہی ہلکا اور معمولی سا تھا کہ حضورؐ کبھی اپنی بیویوں کو کچھ کہتے تھے اور وہ پلٹ کر کچھ جواب دے دیا کرتی تھیں، تو آخر اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست خود اِن ازواجِ مطہراتؓ کو شدت کے ساتھ تنبیہ فرمائی؟ اور حضرت عمرؓ نے اِس معاملے کو کیوں اتنا سخت سمجھا کہ پہلے بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے گھر جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے خیال میں ایسے ہی زُود رنج تھے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر بیویوں سے ناراض ہو جاتے تھے؟ اور کیا معاذ اللہ! آپ کے نزدیک حضورؐ کی تنگ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایسی ہی باتوں پر ناراض ہو کر آپؐ ایک دفعہ سب بیویوں سے مقاطعہ کر کے اپنے حجرے میں عزلت گزیں ہو گئے تھے؟ ان سوالات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو اسے لامحالہ ان آیات کی تفسیر میں دو ہی راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا: یا تو اسے ازواجِ مطہراتؓ کے احترام کی اتنی فکر لاحق ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر حرف آجانے کی پروا نہ کرے۔ یا پھر سیدھی طرح یہ مان لے کہ اُس زمانے میں اِن ازواجِ مطہراتؓ کا رَوِیّہ فی الواقع ایسا ہی قابلِ اعتراض ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہو جانے میں حق بجانب تھے، اور حضورؐ سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ اس بات میں حق بجانب تھا کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ظَهِيرٌ ۝ عَسَىٰ رَبُّهُۥٓ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُۥٓ أَزْوَٰجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ مُسْلِمَٰتٍ مُّؤْمِنَٰتٍ قَٰنِتَٰتٍ تَٰٓئِبَٰتٍ عَٰبِدَٰتٍ

مددگار ہیں۔[9] بعید نہیں کہ اگر نبیؐ تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمھارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں،[10] سچّی مسلمان، باایمان،[11] اطاعت گزار،[12] توبہ گزار،[13] عبادت گزار،[14]

اِن ازواج کو اس رَویّے پر شدت سے تنبیہ فرمائے۔

۹ – مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں جتھا بندی کر کے تم اپنا ہی نقصان کرو گی، کیونکہ جس کا مولیٰ اللہ ہے اور جبریلؑ اور ملائکہ اور تمام صالح اہلِ ایمان جس کے ساتھ ہیں، اس کے مقابلے میں جتھا بندی کر کے کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۰ – اس سے معلوم ہوا کہ قُصور صرف حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ ہی کا نہ تھا، بلکہ دوسری ازواجِ مطہراتؓ بھی کچھ نہ کچھ قصوروار تھیں، اِسی لیے اُن دونوں کے بعد اِس آیت میں باقی سب ازواج کو بھی تنبیہ فرمائی گئی۔ قرآنِ مجید میں اس قصور کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، البتہ احادیث میں اس کے متعلق کچھ تفصیلات آئی ہیں۔ اُن کو ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

بخاری میں حضرت اَنَسؓ کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے آپس کے رشک و رقابت میں مل جُل کر حضورؐ کو تنگ کر دیا تھا (اصل الفاظ ہیں: اجتمع نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الغیرۃ علیہ۔) اس پر میں نے اُن سے کہا کہ ”بعید نہیں اگر حضورؐ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپؐ کو عطا فرما دے۔“ ابنِ ابی حاتم نے حضرت اَنَسؓ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ”مجھے خبر پہنچی کہ امہات المومنینؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ ناچاقی ہوگئی ہے۔ اس پر میں ان میں سے ایک ایک کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تمھارے بدلے تم سے بہتر بیویاں حضورؐ کو عطا فرما دے گا۔ یہاں تک کہ جب میں امہات المومنینؓ میں سے آخری کے پاس گیا (اور یہ بخاری کی ایک روایت کے بموجب حضرت اُمِّ سَلَمہ تھیں) تو انھوں نے مجھے جواب دیا: اَے عمرؓ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی نصیحت کے لیے کافی نہیں ہیں کہ تم انھیں نصیحت کرنے چلے ہو؟ اس پر میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔“

مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے عَلیحدگی اختیار فرما لی تو میں مسجدِ نبویؐ میں پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ متفکّر بیٹھے ہوئے کنکریاں

اُٹھا اُٹھا کر گرا رہے ہیں اور آپس میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے ہاں اپنے جانے اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا: ''بیویوں کے معاملے میں آپؐ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اگر آپؐ ان کو طلاق دے دیں تو اللہ آپؐ کے ساتھ ہے، سارے ملائکہ اور جبریل و میکائیل آپؐ کے ساتھ ہیں اور میں اور ابوبکرؓ اور سب اہلِ ایمان آپؐ کے ساتھ ہیں۔'' میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ اُمید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرما دے گا، چنانچہ اس کے بعد سورۂ تحریم کی یہ آیات نازل ہوگئیں۔ پھر میں نے حضورؐ سے پوچھا: کیا آپؐ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس پر میں نے مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر کھڑے ہو کر باآوازِ بلند اعلان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔

بخاری میں حضرت انسؓ سے اور مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایات منقول ہوئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے تک کے لیے اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد فرما لیا تھا اور اپنے بالا خانے میں بیٹھ گئے تھے۔ ۲۹ دن گزر جانے پر جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: آپؐ کی قسم پوری ہوگئی ہے، مہینا مکمل ہوگیا۔

حافظ بدرالدین عینی نے عُمدۃ القاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ تھیں، اور دوسری میں حضرت زینبؓ، حضرت اُمِّ سلمہؓ اور باقی ازواج شامل تھیں۔

ان تمام روایات سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی میں کیا حالات پیدا ہوگئے تھے، جن کی بنا پر یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ مداخلت کر کے ازواجِ مطہراتؓ کے طرزِ عمل کی اصلاح فرمائے۔ یہ ازواج اگرچہ معاشرے کی بہترین خواتین تھیں، مگر بہرحال تھیں انسان ہی، اور بشریت کے تقاضوں سے مُبرّا نہ تھیں۔ کبھی ان کے لیے مسلسل عُسرت کی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا تھا اور وہ بے صبر ہو کر حضورؐ سے نفقہ کا مطالبہ کرنے لگتیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ نازل فرما کر ان کو تلقین کی کہ اگر تمھیں دنیا کی خوش حالی مطلوب ہے تو ہمارا رسول تم کو بخیر و خوبی رخصت کر دے گا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو تو پھر صبر و شکر کے ساتھ ان تکلیفوں کو برداشت کرو جو رسول کی رفاقت میں پیش آئیں (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۴۱، اور دیباچہ سورۂ احزاب، صفحہ ۸۴)۔ پھر کبھی نسائی فطرت کی بنا پر اُن سے ایسی باتوں کا ظُہور ہو جاتا تھا جو عام انسانی زندگی میں معمول کے خلاف نہ تھیں، مگر جس گھر میں ہونے کا شرف اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، اس کی شان اور اس کی عظیم ذمہ داریوں سے وہ مُطابقت نہ رکھتی تھیں۔ ان باتوں سے جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ رسولؐ اللہ کی خانگی زندگی کہیں تلخ نہ ہو جائے اور اُس کا اثر اُس کارِ عظیم پر مترتّب نہ ہو جو اللہ تعالیٰ حضورؐ سے لے

Maktaba Tul Ishaat.com

رہا تھا، تو قرآنِ مجید میں یہ آیت نازل کر کے ان کی اصلاح فرمائی گئی، تاکہ ازواجِ مطہراتؓ کے اندر اپنے اُس مقام اور مرتبے کی ذمّہ داریوں کا احساس پیدا ہو جو اللہ کے آخری رسولؐ کی رفیقِ زندگی ہونے کی حیثیت سے ان کو نصیب ہوا تھا، اور وہ اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح اور اپنے گھر کو عام گھروں کی طرح نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس آیت کا پہلا ہی فقرہ ایسا تھا کہ اس کو سُن کر ازواجِ مطہراتؓ کے دل لرز اٹھے ہوں گے۔ اِس ارشاد سے بڑھ کر ان کے لیے تنبیہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ ''اگر نبی تم کو طلاق دے دے تو بعید نہیں کہ اللہ اس کو تمھاری جگہ تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے۔'' اوّل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق مل جانے کا تصور ہی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، اس پر یہ بات مزید کہ تم سے امہات المومنین ہونے کا شَرَف چھن جائے گا اور دوسری عورتیں جو اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں لائے گا، وہ تم سے بہتر ہوں گی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ازواجِ مطہراتؓ سے پھر کبھی کسی ایسی بات کا صُدور ہوتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت کی نوبت آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں بس دو ہی مقامات ہم کو ایسے ملتے ہیں جہاں اِن برگزیدہ خواتین کو تنبیہ فرمائی گئی ہے: ایک سورۂ احزاب اور دوسرے یہ سورۂ تحریم۔

۱۱- مسلم اور مومن کے الفاظ جب ایک ساتھ لائے جاتے ہیں تو مسلم کے معنٰی عَمَلاً احکامِ الٰہی پر عمل کرنے والے کے ہوتے ہیں، اور مومن سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو صدقِ دل سے ایمان لائے۔ پس بہترین مسلمان بیویوں کی اوّلین خُصوصیّت یہ ہے کہ وہ سچّے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین پر ایمان رکھتی ہوں، اور عملاً اپنے اَخلاق، عادات، خصائل اور برتاؤ میں اللہ کے دین کی پیروی کرنے والی ہوں۔

۱۲- اِس کے دو معنٰی ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں: ایک، اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعِ فرمان۔ دوسرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرنے والی۔

۱۳- تائب کا لفظ جب آدمی کی صفت کے طور پر آئے تو اس کے معنٰی بس ایک ہی دفعہ توبہ کر لینے والے کے نہیں ہوتے، بلکہ ایسے شخص کے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اللہ سے اپنے قُصوروں کی معافی مانگتا رہے، جس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو، جسے ہر وقت اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا احساس ہوتا رہے اور وہ اُن پر نادم و شرمسار ہو۔ ایسے شخص میں کبھی غرور و تکبُّر اور نَخوَت و خود پسندی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے، بلکہ وہ طبعاً نرم مزاج اور حلیم ہوتا ہے۔

۱۴- عبادت گزار آدمی بہرحال کبھی اُس شخص کی طرح خدا سے غافل نہیں ہوسکتا جس طرح عبادت نہ کرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایک عورت کو بہترین بیوی بنانے میں اِس چیز کا بھی بڑا دخل ہے۔ عبادت گزار ہونے کی وجہ سے وہ حُدود اللہ کی پابندی کرتی ہے، حق والوں کے حق پہچانتی اور ادا کرتی ہے، اس کا ایمان ہر وقت تازہ اور زندہ رہتا ہے، اُس سے اِس امر کی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی پیروی سے منہ نہیں موڑے گی۔

سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝٥ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ
شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦

اور روزہ دار[15]، خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے[16]، جس پر نہایت تند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں[17]۔ (اُس وقت کہا

۱۵ – اصل میں لفظ سائحات استعمال ہوا ہے۔ متعدد صحابہؓ اور بکثرت تابعینؒ نے اس کے معنیٰ صائمات بیان کیے ہیں۔ روزے کے لیے سیاحت کا لفظ جس مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں سیاحت زیادہ تر راہب اور درویش لوگ کرتے تھے، اور ان کے ساتھ کوئی زادِ راہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر ان کو اُس وقت تک بھوکا رہنا پڑتا تھا جب تک کہیں سے کچھ کھانے کو نہ مل جائے۔ اِس بنا پر روزہ بھی ایک طرح کی درویشی ہی ہے کہ جب تک افطار کا وقت نہ آئے، روزہ دار بھی بھوکا رہتا ہے۔ ابنِ جَریر نے سورۂ توبہ، آیت ۱۲ کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ سیاحۃ ھٰذہ الامۃ الصیام، ''اس اُمت کی سیاحت (یعنی درویشی) روزہ ہے۔'' اِس مقام پر نیک بیویوں کی تعریف میں اُن کی روزہ داری کا ذکر اس معنیٰ میں نہیں کیا گیا ہے کہ وہ محض رمضان کے فرض روزے رکھتی ہیں، بلکہ اس معنیٰ میں ہے کہ وہ فرض کے علاوہ نفل روزے بھی رکھا کرتی ہیں۔

ازواجِ مطہّراتؓ کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ تمھارے بدلے میں اُن کو ایسی بیویاں عطا فرمائے گا جن میں یہ اور یہ صفات ہوں گی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ازواجِ مطہّراتؓ یہ صفات نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری جس غلط رَوِش کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہو رہی ہے اُس کو چھوڑ دو اور اُس کے بجائے اپنی ساری توجُّہات اِس کوشش میں صَرف کرو کہ تمھارے اندر یہ پاکیزہ صفات بدرجۂ اَتم پیدا ہوں۔

۱۶ – یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظامِ فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اُس پر ڈالا ہے، اس کو بھی وہ اپنی حدِ استطاعت تک ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں، اور اگر وہ جہنّم کی راہ پر جا رہے

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۹

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۟ ع
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ

جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمھیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے[18] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ[19]، بعید نہیں کہ اللہ تمھاری

ہوں تو جہاں تک بھی اس کے بس میں ہو، ان کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اُس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں، بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنّم کا ایندھن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ حکمراں راعی ہے اور وہ اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دِہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔“

جہنّم کا ایندھن پتھر ہوں گے، اس سے مراد غالباً پتھر کا کوئلا ہے۔ ابنِ مسعودؓ، ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، امام محمد الباقرؒ اور سُدِّیؒ کہتے ہیں کہ یہ گندھک کے پتھر ہوں گے۔

۱۷ – یعنی اُن کو جو سزا بھی کسی مجرم پر نافذ کرنے کا حکم دیا جائے گا، اُسے جُوں کا تُوں نافذ کریں گے اور ذرا رحم نہ کھائیں گے۔

۱۸ – اِن دونوں آیتوں کا اندازِ بیان اپنے اندر مسلمانوں کے لیے سخت تنبیہ لیے ہوئے ہے۔ پہلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اِس خوفناک عذاب سے بچاؤ۔ اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ جہنّم میں عذاب دیتے وقت کافروں سے یہ کہا جائے گا۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مُترشّح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں وہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچنا چاہیے جس کی بدولت آخرت میں ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو۔

۱۹ – اصل میں تَوْبَةً نَّصُوْحًا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نُصح کے معنٰی عَرَبی زبان میں خُلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عَسَلِ ناصح کہتے ہیں، جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور اُدھڑے ہوئے کپڑے کی مرمّت کر دینے کے لیے نَصاحة الثّوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہوگا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں

رِیا اور نِفاق کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچالے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے، توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دے۔ یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اُسی کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں توبۂ نصوح کے وہ مفہومات جو اُس کے لغوی معنوں سے مُترشح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم، تو اس کی تشریح ہمیں اُس حدیث میں ملتی ہے جو ابنِ ابی حاتم نے زِرّ بن حُبَیْش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے توبۂ نصوح کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اِس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قُصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے اِستِغفار کرو اور آیندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔'' یہی مطلب حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، اور ایک رِوایت میں حضرت عمرؓ نے توبۂ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اِعادہ تو درکنار، اُس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔ (ابنِ جَرِیر) حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدّو کو جلدی جلدی توبہ و اِستِغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا: یہ توبۃُ الکذّابین ہے۔ اس نے پوچھا: پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا: اُس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہییں: (۱) جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔ (۲) اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو اُن کو ادا کر۔ (۳) جس کا حق مارا ہو اُس کو واپس کر۔ (۴) جس کو تکلیف پہنچائی ہو اُس سے معافی مانگ۔ (۵) آیندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اِعادہ نہ کرے گا۔ اور (۶) اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گُھلا دے جس طرح تو نے اب تک اسے معصیت کا خُوگر بنائے رکھا ہے اور اُس کو طاعت کی تلخی کا مزا چکھا جس طرح اب تک تُو اُسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا ہے۔ (کشّاف)

توبہ کے سلسلے میں چند اُمور اور بھی ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے: اوّل، یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے، یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے، توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ دوسرے، یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے، اسی وقت اسے توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو، بلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اُسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ تیسرے، یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنالینا اور اُسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے، اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے۔ چوتھے، یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا، اس سے اگر بشری کمزوری کی بنا پر اُسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہوگا،

Maktaba Tul Ishaat.com

يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۸

بُرائیاں تم سے دُور کر دے اور تمھیں ایسی جنّتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔[20] یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔[21] اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دَوڑ رہا ہوگا، اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تُو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[22]

البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آیندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہوگا۔ پانچویں، یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے، توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا نفس اپنی سابق گناہ گارانہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے، یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے۔ اس لیے کہ جس شخص نے فی الواقع خدا کے خوف کی بنا پر معصیت سے توبہ کی ہو، وہ اِس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اُس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔

۲۰ - آیت کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ توبہ کرلو تو تمھیں ضرور معاف کر دیا جائے گا اور لازماً تم جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے، بلکہ یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو گے تو بعید نہیں کہ اللہ تمھارے ساتھ یہ معاملہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گار کی توبہ قبول کر لینا اور اسے سزا دینے کے بجائے جنت عطا فرما دینا اللہ پر واجب نہین ہے، بلکہ یہ سراسر اُس کی عنایت و مہربانی ہوگی کہ وہ معاف بھی کرے اور انعام بھی دے۔ بندے کو اُس سے معافی کی امید تو ضرور رکھنی چاہیے مگر اس بھروسے پر گناہ نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ سے معافی مل جائے گی۔

۲۱ - یعنی اُن کے اعمالِ حَسَنہ کا اجر ضائع نہ کرے گا۔ کفار و منافقین کو یہ کہنے کا موقع ہرگز نہ دے گا کہ ان لوگوں نے خدا پرستی بھی کی تو اس کا کیا صلہ پایا۔ رسوائی باغیوں اور نافرمانوں کے حصے میں آئے گی، نہ کہ وفاداروں اور فرماں برداروں کے حصے میں۔

۲۲ - اِس آیت کو سورۂ حدید کی آیات ۱۲-۱۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٩ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ
كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ
مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ

اَے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔[۲۳] ان کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

اللہ کافروں کے معاملے میں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو بطورِ مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیّت میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت[۲۴] کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی نہ

اہلِ ایمان کے آگے آگے نور کے دوڑنے کی یہ کیفیت اُس وقت پیش آئے گی جب وہ میدانِ حشر سے جنت کی طرف جا رہے ہوں گے۔ وہاں ہر طرف گُھپ اندھیرا ہوگا جس میں وہ سب لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے جن کے حق میں دوزخ کا فیصلہ ہوگا، اور روشنی صرف اہلِ ایمان کے ساتھ ہوگی جس کے سہارے وہ اپنا راستہ طے کر رہے ہوں گے۔ اس نازک موقع پر تاریکیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کی آہ و فغاں سُن سُن کر اہلِ ایمان پر خشیّت کی کیفیت طاری ہو رہی ہوگی، اپنے قصوروں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے انھیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہمارا نور بھی نہ چِھن جائے اور ہم اِن بدبختوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے نہ رہ جائیں، اس لیے وہ دعا کریں گے کہ اَے ہمارے رب! ہمارے قصور معاف فرما دے اور ہمارے نور کو جنت میں پہنچنے تک ہمارے لیے باقی رکھ۔ ابنِ جَرِیر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا کے معنٰی یہ ہیں کہ ''وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ان کا نور اُس وقت تک باقی رکھا جائے اور اسے بُجھنے نہ دیا جائے جب تک وہ پُل صِراط سے بخیریت نہ گزر جائیں۔'' حضرت حسن بصریؒ اور مجاہدؒ اور ضحّاکؒ کی تفسیر بھی قریب قریب یہی ہے۔ ابنِ کثیرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اہلِ ایمان جب دیکھیں گے کہ منافقین نور سے محروم رہ گئے ہیں تو وہ اپنے حق میں اللہ سے تکمیلِ نور کی دعا کریں گے۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۷)

۲۳ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۸۲۔

۲۴ – یہ خیانت اس معنٰی میں نہیں ہے کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی تھیں، بلکہ اس معنٰی میں ہے کہ انھوں نے

Maktaba Tul Ishaat.com

شَيۡـًٔا وَّقِيۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيۡنَ ۝۱۰ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا
لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا امۡرَاَتَ فِرۡعَوۡنَ ۘ اِذۡ قَالَتۡ رَبِّ ابۡنِ لِىۡ عِنۡدَكَ
بَيۡتًا فِى الۡجَـنَّةِ وَنَجِّنِىۡ مِنۡ فِرۡعَوۡنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ
الظّٰلِمِيۡنَ ۝۱۱ وَمَرۡيَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا
فَنَفَخۡنَا فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِنَا وَصَدَّقَتۡ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتۡ
مِنَ الۡقٰنِتِيۡنَ ۝۱۲

کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ، آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ۔
اور اہلِ ایمان کے معاملے میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے، جب کہ اس نے دعا کی:
"اے میرے رب! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا[25] لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے۔" اور عمران کی بیٹی مریم[26] کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی،[27] پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے رُوح پھُونک دی،[28] اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی۔[29] ع

ایمان کی راہ میں حضرت نوحؑ اور حضرت لُوطؑ کا ساتھ نہ دیا، بلکہ ان کے مقابلے میں دشمنانِ دین کا ساتھ دیتی رہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی ہے۔ ان دونوں عورتوں کی خیانت دراصل دین کے معاملے میں تھی۔ انھوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت لُوطؑ کا دین قبول نہیں کیا۔ حضرت نوحؑ کی بیوی اپنی قوم کے جباروں کو ایمان لانے والوں کی خبریں پہنچایا کرتی تھی، اور حضرت لوطؑ کی بیوی اپنے شوہر کے ہاں آنے والے لوگوں کی اطلاع اپنی قوم کے بداعمال لوگوں کو دے دیا کرتی تھی۔" (ابنِ جریر)

۲۵ — یعنی فرعون جو بُرے اعمال کر رہا ہے، ان کے انجامِ بد میں مجھے شریک نہ کر۔

۲۶ — ہوسکتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد ہی کا نام عمران ہو، یا ان کو عمران کی بیٹی اس لیے کہا گیا ہو کہ وہ آلِ عمران سے تھیں۔

۲۷ - یہ یہودیوں کے اِس الزام کی تردید ہے کہ ان کے بطن سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش، معاذاللہ! کسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ سورۂ نساء، آیت ۱۵۶ میں اِن ظالموں کے اِسی الزام کو بہتانِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۃ النساء، حاشیہ ۱۹۰)

۲۸ - یعنی بغیر اس کے کہ ان کا کسی مرد سے تعلق ہوتا، اُن کے رحم میں اپنی طرف سے ایک جان ڈال دی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۲ - ۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۹)

۲۹ - جس مقصد کے لیے اِن تین قسم کی عورتوں کو مثال میں پیش کیا گیا ہے، اس کی تشریح ہم اِس سورہ کے دیباچے میں کر چکے ہیں، اس لیے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الملک

(٦٧)

الملک

نام پہلے فقرے تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ کے لفظ الْمُلْكُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین اور اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس میں ایک طرف مختصر طریقے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسری طرف بڑے مؤثر انداز میں اُن لوگوں کو چونکایا گیا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مکۂ معظمہ کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو پیش کرتی ہیں، مگر تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ، تاکہ وہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ ان میں زیادہ تر زور اِس بات پر صَرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی غفلت دور کی جائے، ان کو سوچنے پر مجبور کیا جائے، اور ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

پہلی پانچ آیتوں میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ جس کائنات میں رہتا ہے، وہ ایک انتہائی منظم اور محکم سلطنت ہے، جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نَقص یا خلل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلطنت کو عدم سے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے اور اس کی تدبیر و انتظام اور فرماں روائی کے تمام اختیارات بھی بالکُلّیہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اُس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس انتہائی حکیمانہ نظام میں وہ بے مقصد پیدا نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ یہاں اسے امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اور اس امتحان میں وہ اپنے حُسنِ عمل ہی سے کامیاب ہوسکتا ہے۔

آیت ۶ سے ۱۱ تک کفر کے وہ ہولناک نتائج بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں نکلنے والے ہیں، اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ کو بھیج کر تمھیں اِسی دنیا میں اِن نتائج سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر یہاں تم انبیاؑ کی بات مان کر اپنا رَویّہ دُرست نہ کرو گے تو آخرت میں تمھیں خود

Maktaba Tul Ishaat.com

اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سزا تم کو دی جارہی ہے، فی الواقع تم اُس کے مستحق ہو۔

آیت ۱۲ سے ۱۴ تک یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔ وہ تمھاری ہر کُھلی اور چُھپی بات، حتّٰی کہ تمھارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہٰذا اَخلاق کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ انسان اُس اَن دیکھے خدا کی باز پُرس سے ڈر کر بُرائی سے بچے، خواہ دنیا میں کوئی طاقت اُس پر گرفت کرنے والی ہو یا نہ ہو اور دنیا میں اُس سے کسی نقصان کا امکان ہو یا نہ ہو۔ یہ طرزِ عمل جو لوگ اختیار کریں گے، وہی آخرت میں بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

آیت ۱۵ سے ۲۳ تک اُن پیش پا اُفتادہ حقیقتوں کی طرف، جنھیں انسان دنیا کے معمولات سمجھ کر قابلِ توجُّہ شمار نہیں کرتا، پے در پے اشارے کر کے اُن پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اِس زمین کو دیکھو جس پر تم اطمینان سے چل پھر رہے ہو اور جس سے اپنا رزق حاصل کر رہے ہو۔ خدا ہی نے اِسے تمھارے لیے تابع کر رکھا ہے، ورنہ کسی وقت بھی اِس زمین میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے کہ تم پیوندِ خاک ہو جاؤ، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمھیں تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اپنے اُوپر اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو۔ خدا ہی تو ہے جو انھیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ اپنے تمام ذرائع و وسائل پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ خدا اگر تمھیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو کون تمھیں اُس سے بچا سکتا ہے، اور خدا اگر تمھارے لیے رزق کے دروازے بند کر دے تو کون انھیں کھول سکتا ہے؟ یہ ساری چیزیں تمھیں حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے موجود ہیں، مگر اِنھیں تم حیوانات کی طرح دیکھتے ہو جو مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور اُس سماعت و بینائی اور اُن سوچنے سمجھنے والے دماغوں سے کام نہیں لیتے جو انسان ہونے کی حیثیت سے خدا نے تمھیں دیے ہیں۔ اِسی وجہ سے راہِ راست تمھیں نظر نہیں آتی۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک بتایا گیا ہے کہ آخرِ کار تمھیں لازماً اپنے خدا کے حُضور حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ تمھیں اُس کے آنے کا وقت اور تاریخ بتائے۔ اُس کا کام بس یہ ہے کہ تمھیں اُس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کر دے۔ تم آج اُس کی بات نہیں مانتے اور مطالبہ کرتے ہو کہ وہ وقت لا کر تمھیں دکھا دیا جائے۔ مگر جب وہ آجائے گا اور تم آنکھوں سے اسے دیکھ لو گے تو تمھارے ہوش اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تم سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جسے جلدی لے آنے کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔

آیت ۲۸ اور ۲۹ میں کفارِ مکّہ کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف کرتے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوستے تھے اور آپؐ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے ہلاکت کی دعائیں مانگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ تمھیں راہِ راست کی طرف بلانے

والے خواہ ہلاک ہوں یا اللہ اُن پر رحم کرے، اِس سے آخر تمھاری قسمت کیسے بدل جائے گی؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کا عذاب اگر تم پر آ جائے تو کون تمھیں بچائے گا؟ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اُس پر توکُّل کیا ہے، انھیں تم گمراہ سمجھ رہے ہو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بات کھل جائے گی کہ حقیقت میں گمراہ کون تھا۔

آخر میں لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے اور اسی پر سوچنے کے لیے انھیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں، جہاں تمھاری زندگی کا سارا انحصار اُس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آیا ہے، وہاں اگر یہ پانی زمین میں اُتر کر غائب ہو جائے تو خدا کے سوا کون تمھیں یہ آبِ حیات لا کر دے سکتا ہے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۳۰ — رکوعاتہا ۲

سُوْرَۃُ الْمُلْکِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ ۡ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُۨ ۙ﴿۱﴾

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

نہایت بزرگ و برتر ہے[1] وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے[2]، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[3]۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے[4]،

۱ – تَبٰرَکَ برکت سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ برکت میں رفعت و عظمت، افزائش اور فراوانی، دوام و ثبات اور کثرتِ خیرات و حَسَنات کے مفہومات شامل ہیں۔ اِس سے جب مبالغے کا صیغہ تَبٰرَکَ بنایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بے انتہا بزرگ و عظیم ہے، اپنی ذات و صفات و افعال میں اپنے سوا ہر ایک سے بالاتر ہے، بے حد و حساب بھلائیوں کا فیضان اُس کی ذات سے ہو رہا ہے، اور اُس کے کمالات لازوال ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۳۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حواشی ۱ و ۱۹)

۲ – اَلْمُلْکُ کا لفظ چونکہ مطلقاً استعمال ہوا ہے اس لیے اسے کسی محدود معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ لامحالہ اس سے مراد تمام موجوداتِ عالَم پر شاہانہ اقتدار ہی ہو سکتا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں اقتدار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہاتھ رکھتا ہے، بلکہ یہ لفظ محاورے کے طور پر قبضے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی کی طرح ہماری زبان میں بھی جب یہ کہتے ہیں کہ اختیارات فلاں کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہی سارے اختیارات کا مالک ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

۳ – یعنی وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اُسے عاجز کرنے والی نہیں ہے کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

۴ – یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اُس نے اِس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اِس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل، یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے، یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ
خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ
ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝۴

اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔[5] جس نے تہ برتہ سات آسمان بنائے۔[6] تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔[7] پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمھیں کوئی خلل[8] نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمھاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے، اور موت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے، یہ کہ اِسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے، تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے، یہ کہ خالق ہی دراصل اِس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا برا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے، اُسے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ممتحن کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے، اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہو گا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں رہتے۔

۵ - اس کے دو معنیٰ ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں: ایک، یہ کہ وہ بے انتہا زبردست اور سب پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود اپنی مخلوق کے حق میں رحیم و غفور ہے، ظالم اور سخت گیر نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ بُرے عمل کرنے والوں کو سزا دینے کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کی سزا سے بچ سکے۔ مگر جو نادم ہو کر برائی سے باز آ جائے اور معافی مانگ لے، اس کے ساتھ وہ درگزر کا معاملہ کرنے والا ہے۔

۶ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حاشیہ ۸۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۱۳۔ المومنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۵۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔

۷ - اصل میں تفاوُت کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: عَدَمِ تناسُب۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے میل نہ کھانا۔ اَنمِل بے جوڑ ہونا۔ پس اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں تم کہیں بد نظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نہ پاؤ گے۔ اللہ کی پیدا کردہ اِس دنیا میں کوئی چیز اَنمِل بے جوڑ نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزا باہم مربوط ہیں اور ان میں کمال درجے کا تناسُب پایا جاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝٥ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝٦ اِذَآ اُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا

ہم نے تمھارے قریب کے آسمان[9] کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے[10] اور انھیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے[11]۔ اِن شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیّا کر رکھی ہے۔

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے[12]، ان کے لیے جہنّم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اُس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سُنیں[13] گے

۸ – اصل میں لفظ فُطُور استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: دراڑ، شگاف، رخنہ، پھٹا ہوا ہونا، ٹوٹا پھوٹا ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کی بندش ایسی چُست ہے، اور زمین کے ایک ذرّے سے لے کر عظیم الشان کہکشانوں تک ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ کہیں نظمِ کائنات کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ تم خواہ کتنی ہی جستجو کر لو، تمھیں اس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں مل سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ق، حاشیہ ۸)

۹ – قریب کے آسمان سے مراد وہ آسمان ہے جس کے تاروں اور سیّاروں کو ہم برہنہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے جن چیزوں کے مشاہدے کے لیے آلات کی ضرورت پیش آتی ہو، وہ دور کے آسمان ہیں۔ اور ان سے بھی زیادہ دُور کے آسمان وہ ہیں جن تک آلات کی رسائی بھی نہیں ہے۔

۱۰ – اصل میں لفظ ''مَصَابِیح'' نکرہ استعمال ہوا ہے، اور اس کے نکرہ ہونے سے خود بخود اِن چراغوں کے عظیم الشان ہونے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات ہم نے اندھیری اور سُنسان نہیں بنائی ہے، بلکہ اسے ستاروں سے خوب مزیّن اور آراستہ کیا ہے، جس کی شان اور جگمگاہٹ رات کے اندھیروں میں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

۱۱ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں، اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہابِ ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گرتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد وحساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں، اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اِس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالَمِ بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اُوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہاب انھیں مار بھگاتے ہیں۔ اس چیز کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عرب کے لوگ

وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝٧ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ
خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝٨ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڏ فَكَذَّبْنَا

اور وہ جوش کھا رہی ہوگی، شدتِ غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے: ”کیا تمھارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟“[۱۴] وہ جواب دیں گے: ”ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا

کاہنوں کے متعلّق یہ خیال رکھتے تھے، اور یہی خود کاہنوں کا دعویٰ بھی تھا، کہ شیاطین اُن کے تابع ہیں، یا شیاطین سے اُن کا رابطہ ہے، اور اُن کے ذریعے سے انھیں غیب کی خبریں حاصل ہوتی ہیں اور وہ صحیح طور پر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں۔ اِس لیے قرآن میں متعدّد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کے عالَمِ بالا میں جانے اور وہاں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۹ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافّات، حواشی ۶-۷)

رہا یہ سوال کہ ان شہابوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دَور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شِہابیوں کے معاینے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریّہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیّارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رُخ کر لیتے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹۶۷ء، جلد ۱۵۔ لفظ Meteorites)

۱۲ — یعنی انسان ہوں یا شیطان، جن لوگوں نے بھی اپنے رب سے کفر کیا ہے، ان کا یہ انجام ہے۔ (رب سے کفر کرنے کے مفہوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔ النساء، حاشیہ ۱۷۸۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۹۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳)

۱۳ — اصل میں لفظ شھیق استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنّم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنّم سے آ رہی ہوگی، جہاں اُن لوگوں سے پہلے گرے ہوئے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔ اِس دوسرے مفہوم کی تائید سورۂ ہودؑ کی آیت ۱۰۶ سے ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ ”ہانپیں گے اور پُھنکارے ماریں گے۔“ اور پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان، آیت ۱۲ سے ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ﴿۹﴾ وَقَالُوْا

اور کہا: اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۱۵،' اور وہ کہیں گے:

دُور ہی سے اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔ اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ یہ شور خود جہنم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔

۱۴- اس سوال کی اصل نوعیت سوال کی نہیں ہوگی کہ جہنم کے کارندے ان لوگوں سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خبردار کرنے والا آیا تھا یا نہیں، بلکہ اس سے مقصود اُن کو اِس بات کا قائل کرنا ہوگا کہ انھیں جہنم میں ڈال کر ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی جارہی ہے۔ اس لیے وہ خود اُن کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے خبر نہیں رکھا تھا، اُن کے پاس انبیا بھیجے تھے، اُن کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور راہِ راست کون سی ہے، اور اُن کو مُتنبِّہ کر دیا تھا کہ اس راہِ راست کے خلاف چلنے کا نتیجہ اِسی جہنّم کا ایندھن بننا ہوگا جس میں اب وہ جھونکے گئے ہیں، مگر اُنھوں نے انبیا کی بات نہ مانی، لہٰذا اب جو سزا انھیں دی جارہی ہے وہ فی الواقع اس کے مستحق ہیں۔

یہ بات قرآنِ مجید میں بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان کے لیے دنیا میں انسان کو بھیجا ہے وہ اِس طرح نہیں لیا جارہا ہے کہ اُسے بالکل بے خبر رکھ کر یہ دیکھا جارہا ہو کہ وہ خود راہِ راست پاتا ہے یا نہیں، بلکہ اُسے راہِ راست بتانے کا جو معقول ترین انتظام ممکن تھا وہ اللہ نے پوری طرح کر دیا ہے، اور وہ یہی انتظام ہے کہ انبیا بھیجے گئے ہیں اور کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اب انسان کا سارا امتحان اِس امر میں ہے کہ وہ انبیا علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مان کر سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے یا ان سے منہ موڑ کر خود اپنی خواہشات اور تخیُّلات کے پیچھے چلتا ہے۔ اِس طرح نبوت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ حجت ہے جو اس نے انسان پر قائم کر دی ہے، اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انبیا کے آنے کے بعد کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کرسکتا کہ ہم حقیقت سے آگاہ نہ تھے، ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم کو اتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا گیا، اور اب ہمیں بے قصور سزا دی جارہی ہے۔ اِس مضمون کو اتنی بار اتنے مختلف طریقوں سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، آیت ۲۱۳، حاشیہ ۲۳۰۔ النساء، آیات ۴۱-۴۲، حاشیہ ۶۴، آیت ۱۶۵، حاشیہ ۲۰۸۔ الانعام، آیات ۱۳۰-۱۳۱، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، آیت ۱۵، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، آیت ۱۳۴۔ القصص، آیت ۴۷، حاشیہ ۶۶، آیت ۵۹، حاشیہ ۸۳، آیت ۶۵۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۳۷۔ المومن، آیت ۵۰، حاشیہ ۶۶۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝١٠ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ
فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝١١ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝١٢ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ

"کاش! ہم سُنتے یا سمجھتے[16] تو آج اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔"
اس طرح وہ اپنے قصور[17] کا خود اعتراف کرلیں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔
جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں[18]، یقیناً اُن کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر۔[19]
تم خواہ چُپکے سے بات کرو یا اُونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک

۱۵- یعنی تم بھی بہکے ہوئے ہو اور تم پر ایمان لانے والے لوگ بھی سخت گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

۱۶- یعنی ہم نے طالبِ حق بن کر انبیاؑ کی بات کو توجہ سے سنا ہوتا، یا عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ فی الواقع وہ بات کیا ہے جو وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں سننے کو سمجھنے پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے نبی کی تعلیم کو توجہ سے سننا (یا اگر وہ لکھی ہوئی شکل میں ہو تو طالبِ حق بن کر اُسے پڑھنا) ہدایت پانے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ اُس پر غور کر کے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا مرتبہ اس کے بعد آتا ہے۔ نبی کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل سے بطورِ خود کام لے کر انسان براہِ راست حق تک نہیں پہنچ سکتا۔

۱۷- قصور کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اصل قصور جس کی بنا پر وہ جہنّم کے مستحق ہوئے، رسولوں کا جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہے۔ باقی سارے گناہ اُسی کی فرع ہیں۔

۱۸- یہ دین میں اَخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا بُرائی سے اس لیے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ بُرائی ہے، یا دنیا اسے بُرا سمجھتی ہے، یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، یا اس پر کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے، یہ اَخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو بُرا اور ایک بُری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیارِ خیر و شر اوّل تو یکساں نہیں ہیں، پھر وہ وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں، کوئی عالم گیر اور اَزَلی و اَبَدی معیار دنیا کے اَخلاقی فلسفوں میں نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ جو شخص بُرائی سے اس لیے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اُس کی ذات پر مترتّب ہونے والے کسی نقصان سے

Maktaba Tul Ishaat.com

بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾ ع

جانتا ہے[20]۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے[21]؟ حالانکہ وہ باریک بیں[22] اور باخبر ہے۔ ع

ڈرتا ہے، وہ ایسی حالت میں اُس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جب کہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اِسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشہادہ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اُس کی نگاہ سے بچ کر کیے جا سکتے ہیں، اور ہر دنیوی طاقت کی گرفت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں۔ پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام برائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔ بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں، حالانکہ وہ اُن برائیوں سے قبیح تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اس لیے دینِ حق نے اَخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اُس اَن دیکھے خدا سے ڈر کر برائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے، جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں نہیں جا سکتا، جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالم گیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔ اُسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا، یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں اُن کو اختیار کرتا ہے، تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔

۱۹ – یعنی خدا سے بالغیب ڈرنے کے دو لازمی نتائج ہیں: ایک، یہ کہ جو قصور بھی بَشری کمزوریوں کی بنا پر آدمی سے سرزد ہو گئے ہیں، وہ معاف کر دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان کی تہ میں خدا سے بے خوفی کارفرما نہ ہو۔ دوسرے، یہ کہ جو نیک اعمال بھی انسان اِس عقیدے کے ساتھ انجام دے گا، اُن پر وہ بڑا اجر پائے گا۔

۲۰ – یہ بات تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی ہے، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر۔ مومن کے لیے اس میں یہ تلقین ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہر وقت یہ احساس اپنے ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے کہ اس کے کھلے اور چھپے اقوال و اعمال ہی نہیں، اس کی نیتیں اور اس کے خیالات تک اللہ سے مخفی نہیں ہیں۔ اور کافر کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ اپنی جگہ خدا سے بے خوف ہو کر جو کچھ چاہے کرتا رہے، اس کی کوئی بات اللہ کی گرفت سے چھوٹی نہیں رہ سکتی۔

۲۱ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا وہ اپنی مخلوق ہی کو نہ جانے گا؟" اصل میں مَنۡ خَلَقَ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی "جس نے پیدا کیا ہے" بھی ہو سکتے ہیں، اور "جس کو اُس نے پیدا کیا ہے" بھی۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ یہ دلیل ہے اُس بات کی جو اُوپر کے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی آخر یہ کیسے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن
رِّزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ⑮ ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ

وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق،[23] اُسی کے حضور تمھیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔[24] کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے[25] تمھیں زمین میں

ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر ہو؟ مخلوق خود اپنے آپ سے بے خبر ہو سکتی ہے، مگر خالق اُس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ تمھاری رگ رگ اس نے بنائی ہے۔ تمھارے دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اس کا بنایا ہوا ہے۔ تمھارا ہر سانس اس کے جاری رکھنے سے جاری ہے۔ تمھارا ہر عضو اس کی تدبیر سے کام کر رہا ہے۔ اُس سے تمھاری کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟

۲۲ – اصل میں لفظ "لطیف" استعمال ہوا ہے، جس کے معنی غیر محسوس طریقے سے کام کرنے والے کے بھی ہیں اور پوشیدہ حقائق کو جاننے والے کے بھی۔

۲۳ – یعنی یہ زمین تمھارے لیے آپ سے آپ تابع نہیں بن گئی ہے اور وہ رزق بھی جو تم کھا رہے ہو خود بخود یہاں پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اللہ نے اپنی حکمت اور قدرت سے اس کو ایسا بنایا ہے کہ یہاں تمھاری زندگی ممکن ہوئی اور یہ عظیم الشان کُرہ ایسا پُرسکون بن گیا کہ تم اطمینان سے اِس پر چل پھر رہے ہو اور ایسا خوانِ نعمت بن گیا کہ اِس میں تمھارے لیے زندگی بسر کرنے کا بے حد و حساب سر و سامان موجود ہے۔ اگر تم غفلت میں مبتلا نہ ہو اور کچھ ہوش سے کام لے کر دیکھو تو تمھیں معلوم ہو کہ اِس زمین کو تمھاری زندگی کے قابل بنانے اور اس کے اندر رزق کے اتھاہ خزانے جمع کر دینے میں کتنی حکمتیں کارفرما ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۲۹-۳۲۔ المومن، حواشی ۹۰-۹۱۔ الزُخرُف، حاشیہ ۷۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸)

۲۴ – یعنی اس زمین پر چلتے پھرتے اور خدا کا بخشا ہوا رزق کھاتے ہوئے اِس بات کو نہ بھولو کہ آخرِ کار تمھیں ایک دن خدا کے حُضور حاضر ہونا ہے۔

۲۵ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے، بلکہ یہ بات اِس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا کی طرف رُجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کسی آفت کے موقع پر سب سہاروں سے مایوس ہوتا ہے تو آسمان کا رُخ کر کے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی بلا آ پڑتی ہے تو کہتا ہے: یہ اُوپر سے نازل ہوئی ہے۔ غیر معمولی طور پر حاصل ہونے والی چیز کے متعلق کہتا ہے: یہ عالَمِ بالا سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کُتُبِ ساوی یا کُتُبِ آسمانی

Maktaba Tul Ishaat.com

بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝١٦ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ
عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝١٧ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ

دَھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے[۲۶]؟ پھر تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے[۲۷]۔ اِن سے پہلے

کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ ایک شخص ایک کالی لونڈی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک مومن غلام آزاد کرنا واجب ہو گیا ہے، کیا میں اِس لونڈی کو آزاد کر سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس لونڈی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اُس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔ حضورؐ نے پوچھا: اور مَیں کون ہوں؟ اُس نے پہلے آپؐ کی طرف اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کیا، جس سے اس کا یہ مطلب واضح ہو رہا تھا کہ آپؐ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: اِسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے (اسی سے مِلتا جُلتا قصہ مُؤطّا، مسلم اور نَسائی میں بھی رِوایت ہوا ہے)۔ حضرت خَوْلَہؓ بنتِ ثَعْلَبَہ کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا: یہ وہ خاتون ہیں جن کی شکایت سات آسمانوں پر سُنی گئی (تفسیر سورۂ مُجادلہ، حاشیہ ۲ میں ہم اِس کی تفصیل نقل کر چکے ہیں)۔ اِن ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اُس کا ذہن نیچے زمین کی طرف نہیں، بلکہ اُوپر آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اِسی بات کو ملحوظ رکھ کر یہاں اللہ تعالیٰ کے متعلق مَنْ فِي السَّمَآءِ (وہ جو آسمان میں ہے) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ اِس میں اِس شبہ کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اِسی سورۂ مُلک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (جس نے تہ بر تہ سات آسمان پیدا کیے) اور سورۂ بَقَرہ میں ارشاد ہوا ہے: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رُخ کرو، اُس طرف اللہ کا رُخ ہے)۔

۲۶ — مراد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اِس زمین پر تمھارا ابقا اور تمھاری سلامتی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ اپنے بل بُوتے پر تم یہاں مزے سے نہیں دندنا رہے ہو۔ تمھاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جو یہاں گزر رہا ہے، اللہ کی حفاظت اور نگہبانی کا رہینِ منّت ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی اُس کے ایک اشارے سے ایک زلزلہ ایسا آ سکتا ہے کہ یہی زمین تمھارے لیے آغوشِ مادر کے بجائے قبر کا گڑھا بن جائے، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمھاری بستیوں کو غارت کر کے رکھ دے۔

۲۷ — تنبیہ سے مراد وہ تنبیہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ پاک کے ذریعے سے کفّارِ مکہ

مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿١٨﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ
صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ ؔ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍۢ
بَصِيۡرٌ ﴿١٩﴾ اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ
الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِىۡ غُرُوۡرٍ ۚ ﴿٢٠﴾ اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ يَرۡزُقُكُمۡ

وقف لازم النبی ﷺ
وقف غفران
وقف منزل

گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی۔[28] کیا یہ لوگ اپنے اُوپر اُڑنے والے پرندوں کو پَر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انھیں تھامے ہوئے ہو۔[29] وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔[30] بتاؤ، آخر وہ کون سا لشکر تمھارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمھاری مدد کر سکتا ہے؟[31] حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمھیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمٰن

کو کی جا رہی تھی کہ اگر کفر و شرک سے باز نہ آؤ گے اور اُس دعوتِ توحید کو نہ مانو گے جو تمھیں دی جا رہی ہے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

۲۸- اشارہ ہے اُن قوموں کی طرف جو اپنے ہاں آنے والے انبیاؑ کو جھٹلا کر اِس سے پہلے بتلائے عذاب ہو چکی تھیں۔

۲۹- یعنی ایک ایک پرندہ جو ہوا میں اُڑ رہا ہے، خدائے رحمٰن کی حفاظت میں اُڑ رہا ہے۔ اُسی نے ہر پرندے کو وہ ساخت عطا فرمائی جس سے وہ اڑنے کے قابل ہوا۔ اسی نے ہر پرندے کو اڑنے کا طریقہ سکھایا۔ اُسی نے ہوا کو اُن قوانین کا پابند کیا جن کی بدولت ہوا سے زیادہ بھاری جسم رکھنے والی چیزوں کا اُس میں اڑنا ممکن ہوا۔ اور وہی ہر اُڑنے والے کو فضا میں تھامے ہوئے ہے، ورنہ جس وقت بھی اللہ اپنی حفاظت اُس سے ہٹا لے، وہ زمین پر آ رہے۔

۳۰- یعنی کچھ پرندوں ہی پر موقوف نہیں، جو چیز بھی دنیا میں موجود ہے، اللہ کی نگہبانی کی بدولت موجود ہے۔ وہی ہر شے کے لیے وہ اسباب فراہم کر رہا ہے جو اس کے وجود کے لیے درکار ہیں، اور وہی اِس بات کی نگرانی کر رہا ہے کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق کو اس کی ضروریات بہم پہنچیں۔

۳۱- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "رحمٰن کے سوا وہ کون ہے جو تمھارا لشکر بنا ہوا تمھاری دست گیری

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾ أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا
عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾ قُلْ هُوَ
الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا
تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾

اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اَڑے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچو، جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو[۳۲] وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اُٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟ اِن سے کہو: اللہ ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔[۳۳]

اِن سے کہو: اللہ ہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔[۳۴]

کرتا ہو'' ہم نے متن میں جو ترجمہ کیا ہے، وہ آگے کے فقرے سے مناسبت رکھتا ہے، اور اس دوسرے ترجمے کی مناسبت پچھلے سلسلۂ کلام سے ہے۔

۳۲- یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کیے ہوئے اُسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اُسے ڈال دیا ہو۔

۳۳- یعنی اللہ نے تو تمھیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا۔ تمھارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو، اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ کان تمھیں اس لیے تو نہیں دیے گئے تھے کہ جو شخص تمھیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات سُن کر نہ دو اور جو غلط سلط باتیں پہلے سے تمھارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں اُنھی پر اَڑے رہو۔ یہ آنکھیں تمھیں اس لیے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بینائی سے کام لے کر یہ نہ دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ آیا اُس توحید کی شہادت دے رہی ہیں جسے خدا کا رسول پیش کر رہا ہے، یا یہ شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظامِ کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اِس کو چلا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دل و دماغ بھی تمھیں اس لیے نہیں دیے گئے تھے کہ تم سوچنے سمجھنے کا کام دوسروں کے حوالے کر کے ہر اُس طریقے کی پیروی کرنے لگو جو دنیا میں کسی نے جاری کر دیا ہے اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کرو کہ وہ غلط ہے یا صحیح۔ اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں تمھیں حق شناسی کے

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ
عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ

یہ کہتے ہیں: ''اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟''[۳۵] کہو: ''اِس کا علم تو اللہ کے پاس ہے، میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔''[۳۶] پھر جب یہ اُس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے

لیے دی تھیں۔ تم ناشکری کر رہے ہو کہ اِن سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لیے یہ دی گئی تھیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۷۲-۷۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۷۵-۷۶۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۷-۱۸۔ الاحقاف، حاشیہ ۳۱)

۳۴- یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ہر گوشۂ زمین سے گھیر لائے جاؤ گے اور اس کے سامنے حاضر کر دیے جاؤ گے۔

۳۵- یہ سوال اِس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کا وقت اور اُس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر انھیں اُس کی آمد کا سال، مہینا، دن اور وقت بتا دیا جائے تو وہ اسے مان لیں گے۔ بلکہ دراصل وہ اُس کے آنے کو غیر ممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے اور یہ سوال اس غرض کے لیے کرتے تھے کہ اُسے جھٹلانے کا ایک بہانہ اُن کے ہاتھ آئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ حشر ونشر کا یہ عجیب وغریب افسانہ جو تم ہمیں سنا رہے ہو، آخر یہ کب ظُہور میں آئے گا؟ اِسے کس وقت کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر اُسے دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمیں اس کا یقین آ جائے؟ اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص اگر قیامت کا قائل ہو سکتا ہے تو عقلی دلائل سے ہو سکتا ہے، اور قرآن میں جگہ جگہ وہ دلائل تفصیل کے ساتھ دے دیے گئے ہیں۔ رہی اُس کی تاریخ، تو قیامت کی بحث میں اُس کا سوال اٹھانا ایک جاہل آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض وہ بتا بھی دی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ماننے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جب وہ تمھاری بتائی ہوئی تاریخ پر آ جائے گی تو مان لوں گا، آج آخر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ اُس روز ضرور آ جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۶۳۔ الاحزاب، حاشیہ ۱۱۶۔ سبا، حواشی ۵-۴۸۔ یٰسٓ، حاشیہ ۴۵)

۳۶- یعنی یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آئے گی، اور لوگوں کو اس کی آمد سے پہلے خبردار کر دینے کے لیے یہی جاننا کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ کب آئے گی، تو اس کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے، اور خبردار کرنے کے لیے اِس علم کی کوئی حاجت نہیں۔ اس معاملے کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ کون شخص کب مرے گا، اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ ہمارا یہ علم اِس بات کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُلْ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ
الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ
تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ
اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾ ع

چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے انکار کیا ہے[۳۷]، اور اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے۔

اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچا لے گا؟[۳۸] اِن سے کہو: وہ بڑا رحیم ہے، اُسی پر ہم ایمان لائے ہیں، اور اُسی پر ہمارا بھروسا ہے[۳۹]، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے۔ اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمھارے کنوؤں کا پانی زمین میں اُتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمھیں نکال کر لا دے گا؟[۴۰] ع

کافی ہے کہ ہم اپنے کسی غیر محتاط دوست کو یہ تنبیہ کریں کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مفاد کی حفاظت کا انتظام کر لے۔ اِس تنبیہ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ وہ کس روز مرے گا۔

۳۷- یعنی ان کا وہی حال ہوگا جو پھانسی کے تختے کی طرف لے جائے جانے والے کسی مجرم کا ہوتا ہے۔

۳۸- مکۂ معظّمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آغاز ہوا اور قریش کے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو گھر گھر حضوؐر اور آپؐ کے ساتھیوں کو بددعائیں دی جانے لگیں۔ جادُو ٹونے کیے جانے لگے تاکہ آپؐ ہلاک ہو جائیں۔ حتّٰی کہ قتل کے منصوبے بھی سوچے جانے لگے۔ اِس پر یہ فرمایا گیا کہ اِن سے کہو: خواہ ہم ہلاک ہوں یا خدا کے فضل سے زندہ رہیں، اِس سے تمھیں کیا حاصل ہوگا؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کے عذاب سے تم کیسے بچو گے۔

۳۹- یعنی ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور تم اس سے انکار کر رہے ہو، ہمارا بھروسا خدا پر ہے اور تمھارا اپنے

جنتّوں اور اپنے وسائل اور اپنے معبُودانِ غیر اللہ پر۔ اس لیے خدا کی رحمت کے مستحق ہم ہو سکتے ہیں نہ کہ تم۔

۴۰ - یعنی کیا خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہے کہ ان سوتوں کو پھر سے جاری کر دے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر عبادت کا مستحق خدا ہے یا تمھارے وہ معبود جو انھیں جاری کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے؟ اس کے بعد تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ گمراہ، خدائے واحد کو ماننے والے ہیں یا وہ جو شرک کر رہے ہیں؟

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

القلم

(۶۸)

القلم

نام اِس کا نام سورۂ نٓ بھی ہے اور القلم بھی۔ دونوں الفاظ سورت کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔

زمانۂ نُزُول یہ بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکّے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس میں تین مضامین بیان ہوئے ہیں: مخالفین کے اعتراضات کا جواب، اُن کو تنبیہ اور نصیحت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔

آغازِ کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں، حالانکہ جو کتاب تم پیش کر رہے ہو اور اَخلاق کے جس اعلیٰ مرتبے پر تم فائز ہو، وہ خود اِن کے اِس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرزانہ کون۔ لٰہذا مخالفت کا جو طوفان تمھارے خلاف اٹھایا جا رہا ہے، اس کا دباؤ ہرگز قبول نہ کرو۔ دراصل یہ ساری باتیں اس لیے کی جا رہی ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح دَب کر ان سے مُصالَحَت (compromise) کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

پھر عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے نام لیے بغیر مخالفین میں سے ایک نمایاں شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے اہلِ مکہ خوب جانتے تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق بھی سب کے سامنے تھے، اور ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ آپؐ کی مخالفت میں مکّے کے جو سردار پیش پیش ہیں، اُن میں کس سیرت و کردار کے لوگ شامل ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۷ سے ۳۳ تک ایک باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے جنھوں نے اللہ سے نعمت پا کر اُس کی ناشکری کی اور اُن کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اس کی نصیحت بروقت نہ مانی، آخرِکار وہ اُس نعمت سے محروم ہو گئے اور اُن کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اُن کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ یہ مثال دے کر اہلِ مکہ کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت سے تم بھی اسی آزمایش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے۔ اگر ان کی بات نہ مانو گے تو دنیا میں بھی عذاب بھگتو گے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

پھر آیت ۳۴ سے ۴۷ تک مسلسل کفار کو فہمایش کی گئی ہے، جس میں کہیں تو خطاب براہِ راست اُن سے ہے اور کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطَب کرتے ہوئے دراصل تنبیہ اُن کو کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کی بھلائی لازماً اُنھی لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرماں برداروں کا انجام وہ ہو جو مجرموں کا ہونا چاہیے۔ کفار کی یہ غلط فہمی قطعی بے بنیاد ہے کہ خدا اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو وہ خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں، حالانکہ اِس کے لیے اُنھیں کوئی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں، قیامت کے روز وہ سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کر سکیں گے اور ذلّت کا انجام انھیں دیکھنا پڑے گا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اُنھیں جو ڈھیل دی جا رہی ہے، اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِس تکذیب کے باوجود جب اُن پر عذاب نہیں آ رہا ہے تو وہ صحیح راستے پر ہیں، حالانکہ وہ بے خبری میں ہلاکت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس رسولؐ کی مُخالَفت کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بے غرض مبلّغ ہے، اپنی ذات کے لیے اُن سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے، اور وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ اُنھیں اُس کے رسول نہ ہونے اور اُس کی باتوں کے غلط ہونے کا علم حاصل ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغِ دین کی راہ میں پیش آئیں، اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جائیں اور اُس بے صبری سے بچیں جو یُونُس علیہ السلام کے لیے ابتلا کی موجب بنی تھی۔

٥٢ اٰیاتها — سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ — ٢ رکوعاتها

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿١﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢﴾
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿٣﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾

ن۔قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں،[۱] تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔[۲] اور یقیناً تمھارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔[۳] اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔[۴]

۱- امامِ تفسیر مُجاہد کہتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر، یعنی قرآن لکھا جا رہا تھا۔اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ چیز جو لکھی جا رہی تھی اس سے مراد قرآنِ مجید ہے۔

۲- یہ ہے وہ بات جس پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبینِ وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہو رہا ہے، بجائے خود کفار کے اِس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں۔حضورؐ کے دعوائے نبوت سے پہلے تو اہلِ مکہ آپؐ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپؐ کی دیانت وامانت اور عقل وفراست پر اعتماد رکھتے تھے۔مگر جب آپؐ نے اُن کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپؐ کو دیوانہ قرار دینے لگے۔اس کے معنٰی یہ تھے کہ قرآن ہی ان کے نزدیک وہ سبب تھا جس کی بنا پر اُنھوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی۔اس لیے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اِس تُہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے۔یہ اعلیٰ درجے کا فصیح وبلیغ کلام، جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، اِس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے، نُہ کہ اسے اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپؐ معاذ اللہ! دیوانے ہوگئے ہیں۔اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب تو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مقصود کفار کو اُن کی تہمت کا جواب دینا ہے۔لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوتی ہے کہ آپؐ مجنون نہیں ہیں۔ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہ نہ تھا کہ اسے دُور کرنے کے لیے آپؐ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمھارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔(مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۲۲)

۳- یعنی آپؐ کے لیے اِس بات پر بے حساب اور لازوال اجر ہے کہ آپؐ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے

Maktaba Tul Ishaat.com

کوششیں کر رہے ہیں، اُن کے جواب میں آپؐ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپؐ اپنے اِس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔

۴- اِس مقام پر یہ فقرہ دو معنٰی دے رہا ہے: ایک، یہ کہ آپؐ اَخلاق کے بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں، اسی وجہ سے آپؐ ہدایتِ خلق کے کام میں یہ اذیّتیں برداشت کر رہے ہیں، ورنہ ایک کمزور اَخلاق کا انسان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ قرآن کے علاوہ آپؐ کے بلند اَخلاق بھی اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپؐ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں، وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازُن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اِس کے برعکس آدمی کے بلند اَخلاق اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ مُتوازِن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ اُن سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اِس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبُور ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اُن کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن کے لیے نقصان دِہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپؐ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اِس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جُنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآنِ پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضوُرؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اِس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں، وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغو بات کہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ کان خلقه القراٰن ’’قرآن آپؐ کا اخلاق تھا۔‘‘ امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، دارمی اور ابنِ جَرِیر نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اُن کا یہ قول متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اِس کے معنٰی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اُس کا مجسّم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا، آپؐ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپؐ نے خود سب سے زیادہ اُس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا، سب سے بڑھ کر آپؐ کی ذات اُن سے مُتّصِف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھیرایا گیا سب سے زیادہ آپؐ اُن سے پاک تھے۔ ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝۵ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝۶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ
ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸
وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ
مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ

عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جُنون میں مبتلا ہے۔ تمھارا رب اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔ لہٰذا تم اِن جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔[۵] ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے،[۶] طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے،[۷] ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے،[۸] اور اِن سب عیوب کے ساتھ

نہیں مارا، اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپؐ کو پہنچائی گئی ہو، اِلّا یہ کہ اللہ کی حُرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپؐ نے اللہ کی خاطر اُس کا بدلہ لیا ہو، اور آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کا آپؐ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپؐ آسان تر کام کو پسند فرماتے تھے، اِلّا یہ کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا تو آپؐ سب سے زیادہ اس سے دُور رہتے تھے۔" (مُسندِ احمد) حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔ آپؐ نے کبھی میری کسی بات پر اُف تک نہ کی، کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تُو نے یہ کیوں کیا، اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تُو نے یہ کیوں نہ کیا۔" (بخاری و مسلم)

۵ - یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمھاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کرلیں، یا تم اِن کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمھارے ساتھ مُصالحت کرلیں۔

۶ - اصل میں لفظ مَّهِيْنٍ استعمال ہوا ہے جو حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت قسمیں کھانے والے آدمی کی لازمی صفت ہے۔ وہ بات بات پر اس لیے قسم کھاتا ہے کہ اُسے خود یہ احساس

Maktaba Tul Ishaat.com

زَنِيمٍ ﴿١٣﴾ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٤﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٥﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿١٦﴾ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ

بد اصل ہے،[9] اِس بنا پر کہ وہ بہت مال واولاد رکھتا ہے[10]۔ جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے: یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سُونڈ پر داغ لگائیں گے[11]۔

ہم نے اِن (اہلِ مکّہ) کو اسی طرح آزمایش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمایش

ہوتا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے۔ اِس بنا پر وہ اپنی نگاہ میں خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

۷ – اصل میں مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خیر عَرَبی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنٰی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں۔ اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنٰی میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہر نیک کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔

۸ – اصل میں لفظ عُتُلّ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو، اور اس کے ساتھ نہایت بدخُلق، جھگڑالو اور سفّاک ہو۔

۹ – اصل میں لفظ زَنِيمٍ استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ اُس وَلَدُ الزّنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہوگیا ہو۔ سعید بن جُبَیر اور شَعْبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اُس شخص کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔

اِن آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں، اُس کے بارے میں مفسّرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص ولید بن مُغِیرہ تھا۔ کسی نے اَسْوَد بن عَبدِ یَغُوث کا نام لیا ہے۔ کسی نے اَخْنَس بن شُرَیق کو اس کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں نام لیے بغیر صرف اُس کے اوصاف بیان کر دیے گئے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے اِن اوصاف کے لیے اتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

۱۰ – اس فقرے کا تعلّق اُوپر کے سلسلۂ کلام سے بھی ہوسکتا ہے اور بعد کے فقرے سے بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ایسے آدمی کی دھونس اِس بنا پر قُبول نہ کرو کہ وہ بہت مال اولاد رکھتا ہے۔ دوسری صورت

الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ
عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾
فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾
وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾

میں ڈالا تھا،[12] جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے، اور وہ کوئی اِستثنا نہیں کر رہے تھے۔[13] رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمھارے رب کی طرف سے ایک بَلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی[14] کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چُپکے چُپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمھارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی[15] اِس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے: "ہم راستہ بھول گئے ہیں، ـــــ نہیں،

میں معنی یہ ہوں گے کہ بہت مال اولاد والا ہونے کی بنا پر وہ مغرور ہو گیا ہے، جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔

۱۱ – چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا، اس لیے اس کی ناک کو سُونڈ کہا گیا ہے۔ اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔ یعنی ہم دنیا اور آخرت میں اس کو ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

۱۲ – اِس مقام پر سورۂ کہف، رُکوع ۵ بھی پیشِ نظر رہے جس میں اِسی طرح عبرت دلانے کے لیے دو باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

۱۳ – یعنی انھیں اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر ایسا بھروسا تھا کہ قسم کھا کر بے تکلّف کہہ دیا کہ ہم ضرور کل اپنے باغ کے پھل توڑیں گے، اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم یہ کام کریں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾
قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا
مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ

وقف لازم

بلکہ ہم محروم رہ گئے[۱۶]۔" اُن میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے[۱۷]؟" وہ پکار اُٹھے: "پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے۔" پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا[۱۸]۔ آخر کو انھوں نے کہا: "افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اِس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔" ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی بڑا ہے،

۱۴- کھیتی کا لفظ غالباً اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ باغ میں درختوں کے درمیان کھیت بھی تھے۔

۱۵- اصل الفاظ ہیں: عَلٰی حَرْدٍ۔ حَرْد عربی زبان میں روکنے اور نہ دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، قصد اور طے شدہ فیصلے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور سُرعت کے معنٰی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں تینوں معنوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۱۶- یعنی پہلے تو انھیں باغ کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ انھی کا باغ ہے اور کہنے لگے: شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور جگہ نکل آئے ہیں، پھر جب غور کیا اور معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہی ہے تو چیخ اُٹھے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

۱۷- اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور توڑیں گے، اُس وقت اِس شخص نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ تم خدا کو بھول گئے، اِن شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟ مگر انھوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر جب وہ مسکینوں کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر رہے تھے، اُس وقت بھی اس نے انھیں نصیحت کی کہ اللہ کو یاد کرو اور اس بُری نیت سے باز آ جاؤ، مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

۱۸- یعنی ہر ایک نے دوسرے کو الزام دینا شروع کیا کہ اُس کے بہکانے سے ہم اِس خدا فراموشی اور بدنیتی میں مبتلا ہوئے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾
اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ
لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ
اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾
سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ

کاش یہ لوگ اِس کو جانتے۔ع

یقیناً[19] خدا ترس لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں نعمت بھری جنّتیں ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟[20] کیا تمھارے پاس کوئی کتاب[21] ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمھارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمھارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمھیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ اِن سے پوچھو: تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟[22] یا پھر ان کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنھوں نے اِس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے شریکوں کو

۱۹- مکہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو یہ نعمتیں جو دنیا میں مل رہی ہیں، یہ خدا کے ہاں ہمارے مقبول ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو، یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی، جیسا کہ تم کہتے ہو، تو ہم وہاں بھی مزے کریں گے، اور عذاب تم پر ہو گا نہ کہ ہم پر۔ اس کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۲۰- یعنی یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرماں بردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمھاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجا ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اُس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوش حالی تو دیکھ لی، مگر اپنے اور اُن کے اَخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلّف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں اِن فرماں برداروں کے ساتھ تو مجرموں

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۱﴾ يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى
السُّجُوۡدِ فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۙ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ
ذِلَّةٌ ؕ وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

اگر یہ سچے ہیں۔[۲۳]

جس روز سخت وقت آ پڑے[۲۴] گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے، اِن کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلّت اِن پر چھا رہی ہوگی۔ یہ جب صحیح وسالم تھے اُس وقت اِنھیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے[۲۵])۔

کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔

۲۱ – یعنی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب۔

۲۲ – اصل میں لفظ زَعِیۡمٌ استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں زعیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل، یا ضامن، یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمھارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے۔

۲۳ – یعنی تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو، اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتا کہ اُس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبُود بنا رکھا ہے، اُن میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمھیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمھیں کہاں سے لاحق ہوگئی؟

۲۴ – اصل الفاظ ہیں: يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ، ''جس روز پنڈلی کھولی جائے گی''۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اس کے یہی معنیٰ بیان کیے ہیں اور ثبوت میں کلامِ عرب سے اِستشہاد کیا ہے۔ ایک اور قول جو ابنِ عباسؓ اور ربیع بن اَنَسؒ سے منقول ہے، اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رُو سے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہوجائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

۲۵ – اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے روز علی الاعلان اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون

فَذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ ؕ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ
حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿ۙ۴۴﴾ وَ اُمۡلِیۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ ﴿۴۵﴾ اَمۡ
تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿ؕ۴۶﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمُ

پس اے نبیؐ! تم اِس کلام کے جُھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔[۲۶] ہم ایسے طریقے سے اِن کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ اِن کو خبر بھی نہ ہوگی۔[۲۷] میں اِن کی رسّی دراز کر رہا ہوں، میری چال[۲۸] بڑی زبردست ہے۔

کیا تم اِن سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹّی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟[۲۹] کیا اِن کے پاس

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اُس سے منحرف تھا۔ اِس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حُضور سجدہ بجا لائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سجدہ ریز ہو جائیں گے، مگر جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سرِ نیاز جھکانے سے انکار کر دیا تھا اُن کی کمر تختہ ہو جائے گی۔ اُن کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے وہ ذلّت اور پشیمانی کے ساتھ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

۲۶ – یعنی اِن سے نمٹنے کی فکر میں نہ پڑو۔ اِن سے نمٹنا میرا کام ہے۔

۲۷ – بے خبری میں کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک دشمنِ حق اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اولاد اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں، جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، خوب کر رہا ہوں، میرے عمل میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اِس طرح وہ حق دشمنی اور ظلم و طغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت یہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔

۲۸ – اصل میں لفظ کَیْد استعمال ہوا ہے، جس کے معنی کسی کے خلاف خفیہ تدبیر کرنے کے ہیں۔ یہ چیز صرف اُس صورت میں ایک بُرائی ہوتی ہے جب یہ ناحق کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے ہو، ورنہ بجائے خود اِس میں کوئی برائی نہیں ہے، خُصوصاً جب کسی ایسے شخص کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا جائے جس نے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیا ہو۔

۲۹ – سوال بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے، مگر اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپؐ کی

Maktaba Tul Ishaat.com

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ وقف النبی ﷺ
إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ لَوْلَآ أَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ
بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٥٠﴾

غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں[۳۰]؟ پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو[۳۱] اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ[۳۲]، جب اُس نے پکارا تھا، اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔[۳۳] اگر اُس کے رب کی مہربانی اس کے شاملِ حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا[۳۴] جاتا۔ آخرکار اُس کے رب نے اُسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا۔

مخالفت میں حد سے گزرے جا رہے تھے۔ اُن سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہمارا رسولؐ تم سے کچھ مانگ رہا ہے کہ تم اس پر اتنا بگڑ رہے ہو؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ایک بے غرض آدمی ہے اور جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے، صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک اِسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ تم نہیں ماننا چاہتے تو نہ مانو، مگر اِس تبلیغ پر آخر اتنے چراغ پا کیوں ہوئے جا رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۳۱)

۳۰- یہ دوسرا سوال بھی بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل آپؐ کے مخالفین اس کے مخاطَب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رسول فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا رسول نہیں ہے اور جو حقیقتیں یہ تم سے بیان کر رہا ہے وہ بھی غلط ہیں، اس لیے تم اس کو جھٹلانے میں اتنی شدّت برت رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۳۲)

۳۱- یعنی وہ وقت ابھی دُور ہے جب اللہ تعالیٰ تمھاری فتح و نصرت اور تمھارے اِن مخالفین کی شکست کا فیصلہ فرما دے گا۔ اُس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس دین کی تبلیغ میں پیش آئیں، اُنھیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۳۲- یعنی یونُس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کی تلقین کرنے کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ یونُس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جاؤ، خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اللہ کا فیصلہ آنے سے پہلے بے صبری سے کوئی کام کیا تھا جس کی بنا پر وہ عتاب کے مستحق ہو گئے تھے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن،

وَ اِنۡ یَّکَادُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَیُزۡلِقُوۡنَکَ بِاَبۡصَارِهِمۡ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکۡرَ وَ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّهٗ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۱﴾ وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۵۲﴾ ع ۲

جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سُنتے ہیں تو تمھیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمھارے قدم اُکھاڑ دیں گے[۳۵]، اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے، حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ع

جلد دوم، یونس، آیت ۹۸، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، الانبیاء، آیات ۸۷-۸۸، حواشی ۸۲ تا ۸۵۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸، حواشی ۷۸ تا ۸۵)

۳۳- سورۂ انبیاء میں اِس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ مچھلی کے پیٹ اور سمندر کی تاریکیوں میں حضرت یونس علیہ السلام نے پکارا تھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ۖ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ، ”کوئی خدا نہیں تیری پاک ذات کے سوا، میں واقعی خطاوار ہوں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد سن لی اور ان کو غم سے نجات دی۔ (آیات ۸۷-۸۸)

۳۴- اِس آیت کو سورۂ صافّات کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۶ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں ڈالے گئے تھے اُس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے، لیکن جب انھوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قُصور کا اعتراف کر لیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سَقیم حالت میں ایک چٹیَل زمین پر پھینکے گئے، مگر وہ اُس وقت مَذمّت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُس جگہ ایک بیل دار درخت اگا دیا، تاکہ اُس کے پتّے ان پر سایہ بھی کریں اور وہ اس کے پھل سے بھوک اور تشنگی بھی دُور کر سکیں۔

۳۵- یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اُردو میں کہتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُس کو کھا جائے گا۔ کفارِ مکہ کے اِس جذبۂ غیظ و غضب کی کیفیت سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۷۳ تا ۷۷ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الحاقّہ

(۶۹)

الحاقّہ

نام سورت کے پہلے ہی لفظ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے اور اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُخالفت تو شروع ہو چکی تھی، مگر اس نے ابھی زیادہ شدت نہ اختیار کی تھی۔ مُسندِ احمد میں حضرت عمرؓ کی رِوایت ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا، مگر آپؐ مجھ سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپؐ نماز میں سورۂ اَلحاقّہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ”یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔“ میں نے اپنے دل میں کہا: ”شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔“ اُسی وقت زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ”اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ تو ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔“ یہ سُن کر اسلام میرے دل میں گہرا اُتر گیا۔ حضرت عمرؓ کی اِس رِوایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اُن کے قُبولِ اسلام سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اِس واقعے کے بعد بھی ایک مدت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے اور وقتاً فوقتاً متعدِّد واقعات اُن کو اسلام سے متأثر کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اپنی بہن کے گھر میں اُن کے دل پر وہ آخری ضرب لگی جس نے ان کو ایمان کی منزل پر پہنچا دیا۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچۂ سورۂ مریم۔ جلد پنجم، دیباچہ سورۂ واقعہ)

موضوع اور مضمون اِس کا پہلا رُکوع آخرت کے بیان میں ہے، اور دوسرا رکوع قرآن کے مُنزَّل مِنَ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کے بارے میں۔

پہلے رُکوع کا آغاز اِس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آ کر رہنی ہے۔ پھر آیت ۴ سے ۱۲ تک یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا ہے، وہ آخرِکار خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے بعد آیت ۱۷ تک قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی۔ پھر آیت ۱۸ سے ۳۷ تک وہ اصل مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد نوعِ انسانی کے لیے ایک دوسری زندگی مقدّر فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اُس روز تمام انسان اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں اُن کا کوئی راز چھُپا نہ رہ جائے گا۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی تھی کہ ایک دن انھیں اپنے رب کو اپنا حساب دینا ہے، اور جنھوں نے دنیا کی زندگی میں نیک عمل کر کے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے پیشگی سامان کر لیا تھا، وہ اپنا حساب پاک دیکھ کر خوش ہو جائیں گے اور انھیں جنت کا ابدی عیش نصیب ہوگا۔ اِس کے برعکس جن لوگوں نے نہ خدا کا حق مانا نہ بندوں کا حق ادا کیا، انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ جہنّم کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

دوسرے رُکوع میں کفارِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اِس قرآن کو ایک شاعر اور کاہن کا کلام کہتے ہو، حالانکہ یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے جو ایک رسولِ کریم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ رسول اِس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس میں اپنی من گھڑت کوئی چیز شامل کر دے تو ہم اُس کی رگِ گردن (یا رگِ دل) کاٹ دیں۔ یہ ایک یقینی برحق کلام ہے، اور جو لوگ اسے جھٹلائیں گے، انھیں آخرِ کار پچھتانا پڑے گا۔

آیاتھا ۵۲ ۔ رکوعاتھا ۲

سُوْرَةُ الْحَاۗقَّةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاۗقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۳ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵

ہونی شُدنی[1]! کیا ہے وہ ہونی شُدنی؟ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شُدنی؟[2] ثمود[3] اور عاد نے اُس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت[4] کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک سخت حادثے[5] سے ہلاک کیے گئے

۱ – اصل میں لفظ اَلْحَاۗقَّةُ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: وہ واقعہ جس کو لازماً پیش آکر رہنا ہے، جس کا آنا برحق ہے، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجایش نہیں۔ قیامت کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا اور پھر کلام کا آغاز ہی اس سے کرنا خود بخود یہ ظاہر کرتا ہے کہ مُخاطَب وہ لوگ ہیں جو اُس کے آنے کو جُھٹلا رہے تھے۔ اُن کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جس چیز کی تم تکذیب کر رہے ہو، وہ ہونی شُدنی ہے، تمھارے انکار سے اُس کا آنا رُک نہیں جائے گا۔

۲ – یکے بعد دیگرے یہ دو سوالات سامعین کو چونکانے کے لیے کیے گئے ہیں، تاکہ وہ بات کی اہمیت کو سمجھیں اور پوری توجہ کے ساتھ آگے کی بات سُنیں۔

۳ – کفارِ مکہ چونکہ قیامت کو جُھٹلا رہے تھے اور اُس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے، اس لیے پہلے اُن کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شُدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آکر رہے گی۔ اِس کے بعد اب اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ معاملہ صرف اِتنا سادہ سا معاملہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعے کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اَخلاق اور پھر اُن کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اِسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جُھٹلا دیا کہ انسان کو آخرِ کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اَخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آکر دُنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔

۴ – اصل لفظ اَلْقَارِعَةِ ہے۔ قَرع عَرَبی زبان میں ٹھوکنے، کُوٹنے، کھڑکھڑا دینے، اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لیے یہ دوسرا لفظ اُس کی ہولناکی کا تصوّر دلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۵ – سورۂ اَعراف، آیت ۷۸ میں اس کو الرَّجْفَةُ (زبردست زلزلہ) کہا گیا ہے۔ سورۂ ہُود، آیت ۶۷ میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ
وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ
نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ
قَبْلَهٗ وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ
اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ

اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن اُن پر مُسلّط رکھا۔ (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمھیں باقی بچا نظر آتا ہے؟

اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے اور تَل پَٹ ہو جانے والی بستیوں[6] نے کیا۔ ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اُس نے اُن کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔

جب پانی کا طوفان حد سے[7] گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا،[8] تا کہ اِس واقعے کو تمھارے

اس کے لیے الصَّیْحَۃُ (زور کے دھماکے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ، آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کو صٰعِقَۃُ الْعَذَابِ (عذاب کے کڑکے) نے آ لیا۔ اور یہاں اُسی عذاب کو اَلطَّاغِیَۃ (حد سے زیادہ سخت حادثہ) سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ ایک ہی واقعے کی مختلف کیفیّات کا بیان ہے۔

۶ - مراد ہیں قوم لُوط کی بستیاں، جن کے متعلق سورۂ ہود (آیت ۸۲) اور سورۂ حِجر (آیت ۷۴) میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

۷ - اشارہ ہے طوفانِ نوح کی طرف جس میں ایک پوری قوم اِسی خطائے عظیم کی بنا پر غرق کر دی گئی اور صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جنھوں نے اللہ کے رسول کی بات مان لی تھی۔

۸ - اگرچہ کشتی میں سوار وہ لوگ کیے گئے تھے جو ہزاروں برس پہلے گزر چکے تھے، لیکن چونکہ بعد کی پوری انسانی نسل انھی لوگوں کی اولاد ہے جو اُس وقت طوفان سے بچائے گئے تھے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے تم کو کشتی

تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾
وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ
الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى

لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں۔[9]

پھر[10] جب ایک دفعہ صُور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، اُس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اُس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ فرشتے اس کے اطراف و جوانب

میں سوار کرا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم آج دنیا میں اِسی لیے موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس طوفان میں صرف منکرین کو غرق کیا تھا اور ایمان لانے والوں کو بچا لیا تھا۔

۹- یعنی وہ کان نہیں جو سُنی اَن سُنی کر دیں اور جن کے پردے پر سے آواز اُچٹ کر گزر جائے، بلکہ وہ کان جو سنیں اور بات کو دل تک اُتار دیں۔ یہاں بظاہر کان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر مراد ہیں سننے والے لوگ جو اس واقعے کو سُن کر اُسے یاد رکھیں، اُس سے عبرت حاصل کریں اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ آخرت کے انکار اور خدا کے رسول کی تکذیب کا انجام کیسا ہولناک ہوتا ہے۔

۱۰- آگے آنے والی آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے، اور کہیں سب کو سمیٹ کر پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نمل آیت ۸۷ میں پہلے نفخِ صُور کا ذکر کیا گیا ہے جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اُس وقت نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۂ حج آیات ۱-۲، سورۂ یٰسین آیات ۴۹ - ۵۰، اور سورۂ تکویر آیات ۱-۶ میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ زُمَر آیات ۶۷ تا ۷۰ میں دوسرے اور تیسرے نفخِ صُور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب پھر صُور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۂ طٰہٰ آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲، سورۂ انبیاء آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳، سورۂ یٰسین آیات ۵۱ تا ۵۳، اور سورۂ قٓ آیات ۲۰ تا ۲۲ میں صرف تیسرے نفخِ صور کا ذکر ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

أَرْجَآئِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝١٧
يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝١٨ فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ
بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝١٩ إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلٰقٍ
حِسَابِيَهْ ۝٢٠ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٢١ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝٢٢

میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اُس روز تیرے رب کا عرش اپنے اُوپر اُٹھائے ہوئے ہوں گے[11]۔ وہ دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمھارا کوئی راز بھی چھُپا نہ رہ جائے گا۔

اُس وقت جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا[12]: "لو دیکھو، پڑھو میرا نامۂ اعمال[13]، میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے[14]۔" پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا، عالی مقام جنت

لیکن یہاں اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نفخِ صُور سے لے کر جنت اور جہنّم میں لوگوں کے داخل ہونے تک قیامت کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلے میں بیان کر دیا گیا ہے۔

۱۱ – یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنیٰ متعیّن کرنا مشکل ہے۔ ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر یہ بات بہرحال قابلِ تصوُّر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوگا اور آٹھ فرشتے اس کو عرش سمیت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا، اور ذاتِ باری کا جو تصور ہم کو قرآنِ مجید میں دیا گیا ہے، وہ بھی یہ خیال کرنے میں مانع ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مقام سے مُنزَّہ ہستی کسی جگہ متمکّن ہو اور کوئی مخلوق اُسے اٹھائے۔ اِس لیے کھوج کرید کر کے اِس کے معنیٰ متعین کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو گمراہی کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرماں روائی اور اس کے معاملات کا تصوّر دلانے کے لیے لوگوں کے سامنے وہی نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دنیا میں بادشاہی کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو انسانی زبانوں میں سلطنت اور اس کے مظاہر و لوازم کے لیے مستعمل ہیں، کیونکہ انسانی ذہن اسی نقشے اور انھی اصطلاحات کی مدد سے کسی حد تک کائنات کی سُلطانی کے معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اصل حقیقت کو انسانی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے ہے۔ اس کو بالکل لفظی معنوں میں لے لینا دُرست نہیں ہے۔

۱۲ – سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اُس کا حساب بے باق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ

قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ
الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ
كِتٰبِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾

میں، جس کے پھلوں کے گُچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ایسے لوگوں سے کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے اُن اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا[15] وہ کہے گا: "کاش! میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا[16] اور مَیں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے[17]۔ کاش! میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کُن ہوتی[18]۔

کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدانِ حشر میں حاضری تک اُس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا، اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہو چکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآنِ مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالَم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اسی وقت سے صالحین کی حالت و کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور کفار و منافقین اور مجرمین کی حالت و کیفیت کچھ اور۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الانفال، آیت ۵۰۔ النحل، آیات ۲۸ و ۳۲، مع حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، آیت ۹۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، آیات ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۴ تا ۱۲۶، مع حواشی ۷۹، ۸۰، ۱۰۷۔ الانبیاء، آیت ۱۰۳، مع حاشیہ ۹۸۔ الفرقان، آیت ۲۴، مع حاشیہ ۳۸۔ النمل، آیت ۸۹، مع حاشیہ ۱۰۹۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۵۱، مع حاشیہ ۷۲۔ یٰسین، آیات ۲۶، ۲۷، مع حواشی ۲۲، ۲۳۔ المومن، آیات ۴۵، ۴۶، مع حاشیہ ۶۳۔ جلد پنجم، محمدؐ، آیت ۲۷، مع حاشیہ ۳۷۔ ق، آیات ۱۹ تا ۲۳، مع حواشی ۲۲، ۲۳، ۲۵)

۱۴ — یعنی نامۂ اعمال ملتے ہی وہ خوش ہو جائے گا اور اپنے ساتھیوں کو دکھائے گا۔ سورۂ اِنشقاق، آیت ۹ میں بیان ہوا ہے کہ "وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹے گا۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

مَآ اَغْنٰى عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ
الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾
اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ﴿۳۳﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ﴿۳۴﴾

آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہوگیا۔[19]'' (حکم ہوگا:) پکڑو اِسے اور اِس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اِسے جہنّم میں جھونک دو، پھر اِس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔[20]

۱۴ – یعنی وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ وہ دنیا میں آخرت سے غافل نہ تھا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ ایک روز اُسے خدا کے حُضور حاضر ہونا اور اپنا حساب دینا ہے۔

۱۵ – سورۂ انشقاق میں فرمایا گیا ہے: ''اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا'' غالبًا اِس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس نامۂ اعمال میں اس کا کیا کچّا چِٹّھا درج ہے، اس لیے وہ نہایت بددلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اُسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔

۱۶ – یعنی مجھے یہ نامۂ اعمال دے کر میدانِ حشر میں علانیہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کیا جاتا اور جو سزا بھی دینی تھی دے ڈالی جاتی۔

۱۷ – یعنی مجھے نہ بتایا جاتا کہ میں دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہوں۔ دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے کبھی یہ نہ جانا تھا کہ حساب کیا بلا ہوتی ہے، مجھے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ ایک دن مجھے اپنا حساب بھی دینا ہوگا اور میرا سب کیا کرایا میرے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

۱۸ – یعنی دنیا میں مرنے کے بعد میں ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگیا ہوتا اور کوئی دوسری زندگی نہ ہوتی۔

۱۹ – اصل الفاظ ہیں: هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ۔ سلطان کا لفظ دلیل و حُجت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اقتدار کے لیے بھی۔ اگر اُسے دلیل و حُجت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو دلیل بازیاں مَیں کیا کرتا تھا، وہ یہاں نہیں چل سکتیں، میرے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے اب کوئی حجت نہیں رہی۔ اور اقتدار کے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ دنیا میں جس طاقت کے بَل بُوتے پر میں اکڑتا تھا، وہ یہاں ختم ہو چکی ہے۔ اب یہاں کوئی میرا لشکر نہیں، کوئی میرا حکم ماننے والا نہیں، میں ایک بے بس اور لاچار بندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں جو اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

فَلَيۡسَ لَهُ الۡيَوۡمَ هٰهُنَا حَمِيۡمٌ ۝۳۵ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِيۡنٍ ۝۳۶ لَّا يَاۡكُلُهٗۤ
اِلَّا الۡخٰطِئُوۡنَ ۝۳۷ ع فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝۳۸ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝۳۹ اِنَّهٗ
لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۝۴۰ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۝۴۱

لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یارِ غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوؤن کے سوا اِس کے لیے کوئی کھانا، جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔ ع

پس نہیں[21]، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور اُن کی بھی جنھیں تم نہیں دیکھتے، یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے[22]، کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو[23]۔

۲۰ – یعنی خود کسی غریب کو کھانا کھلانا تو درکنار، کسی سے یہ کہنا بھی پسند نہ کرتا تھا کہ خدا کے بھوکے بندوں کو روٹی دے دو۔

۲۱ – یعنی تم لوگوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے، بات وہ نہیں ہے۔

۲۲ – یہاں رسولِ کریم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سورۂ تکویر (آیت ۱۹) میں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ کفارِ مکہ جبریلؑ کو نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔ بخلاف اس کے سورۂ تکویر میں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحبِ عرش کے ہاں بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو روشن اُفق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ نجم آیات ۵ تا ۱۰ میں جبریل علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریلؑ کا قول کس معنیٰ میں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضورؐ کی زبان سے اور حضورؐ اسے جبریلؑ کی زبان سے سُن رہے تھے، اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضورؐ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریلؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریلؑ کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے، بلکہ پیغام بر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾

اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے[٢٤]۔

٢٣ - ''کم ہی ایمان لاتے ہو'' کا ایک مطلب عربی محاورے کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے، اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کو سُن کر کسی وقت تمھارا دل خود پکار اُٹھتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا، مگر پھر تم اپنی ضد پر اَڑ جاتے ہو اور اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہو۔

٢٤ - حاصلِ کلام یہ ہے کہ جو کچھ تمھیں نظر آتا ہے اور جو کچھ تم کو نظر نہیں آتا، اُس سب کی قسم مَیں اِس بات پر کھاتا ہوں کہ یہ قرآن کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے، جو ایک ایسے رسول کی زبان سے ادا ہو رہا ہے جو کریم (نہایت معزز اور شریف) ہے۔ اب دیکھیے کہ یہ قسم کس معنٰی میں کھائی گئی ہے۔ جو کچھ لوگوں کو نظر آرہا تھا وہ یہ تھا کہ:

(١) اِس کلام کو ایک ایسا شخص پیش کر رہا تھا جس کا شریف النفس ہونا مکہ کے معاشرے میں کسی سے چھپا ہوا نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ اَخلاقی حیثیت سے یہ اُن کی قوم کا بہترین آدمی ہے۔ ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ لے کر اُٹھ کھڑا ہوگا کہ خدا پر بہتان باندھے اور اپنے دل سے ایک بات گھڑ کر اُسے خداوندِ عالَم کی طرف منسوب کر دے۔

(٢) وہ یہ بھی عَلانیہ دیکھ رہے تھے کہ اِس کلام کو پیش کرنے میں اپنا کوئی ذاتی مفاد اُس شخص کے پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ یہ کام کر کے تو اُس نے اپنے مفاد کو قربان کر دیا ہے۔ اپنی تجارت کو برباد کیا۔ اپنے عیش و آرام کو تج دیا۔ جس معاشرے میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، اُسی میں گالیاں کھانے لگا۔ اور نہ صرف خود بلکہ اپنے بال بچوں تک کو ہر قسم کے مصائب میں مبتلا کر لیا۔ ذاتی مفاد کا خواہش مند ان کانٹوں میں اپنے آپ کو کیوں گھسیٹتا؟

(٣) اُن کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اُنھی کے معاشرے میں سے جو لوگ اُس شخص پر ایمان لا رہے تھے ان کی زندگی میں یک لخت ایک انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ کسی شاعر یا کاہن کے کلام میں یہ تاثیر آخر کب دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں ایسی زبردست اَخلاقی تبدیلی پیدا کر دے اور اس کے ماننے والے اُس کی خاطر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟

(٤) اُن سے یہ بات بھی چھُپی ہوئی نہ تھی کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے۔ یک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کون یہ کہہ سکتا تھا کہ قرآن کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے۔ (اس پر مفصّل ث ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ٧۔ جلد چہارم، الشُّعراء، حواشی ١٤٢ تا ١٤٥۔ اور جلد پنجم، الطّو

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝٤٤ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝٤٥
ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝٤٦ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝٤٧

اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اِس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اِس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔[25]

حاشیہ ۲۲ میں کر چکے ہیں)۔

(۵) یہ بات بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ پورے عرب میں کوئی شخص ایسا فصیح و بلیغ نہ تھا جس کا کلام قرآن کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو۔ اُس کے برابر تو درکنار، اس کے قریب تک کسی کی فصاحت و بلاغت نہیں پہنچتی تھی۔

(۶) اُن سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بھی اپنی ادبی شان کے لحاظ سے قرآن کی ادبی شان سے بہت مختلف تھی۔ کوئی اہلِ زبان حُضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تقریر، اور قرآن کو سُن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہیں۔

(۷) قرآن جن مضامین اور عُلوم پر مشتمل تھا، دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی مکہ کے لوگوں نے کبھی وہ باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہ سُنی تھیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اِن معلومات کے حُصول کا کوئی ذریعہ آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ اِسی وجہ سے آپؐ کے مخالفین اگر یہ الزامات لگاتے بھی تھے کہ آپؐ کہیں سے خفیہ طریقے پر یہ معلومات حاصل کرتے ہیں تو مکہ میں کوئی شخص اُن کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷، اور جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲ میں کر چکے ہیں)۔

(۸) زمین سے لے کر آسمان تک اس عظیم الشان کارخانۂ ہستی کو بھی وہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس میں ایک زبردست حکیمانہ قانون اور ہمہ گیر نظم و ضبط کار فرما نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں اُس شرک اور انکارِ آخرت کے لیے کوئی شہادت نہیں پائی جاتی تھی جس کے اہلِ عرب معتقد تھے، بلکہ ہر طرف توحید اور آخرت ہی کی صداقت کے شواہد ملتے تھے جسے قرآن پیش کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ تو وہ دیکھ رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ نہیں دیکھ رہے تھے، وہ یہ تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور فرماں روا ہے، کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنا رسول مقرر کیا ہے، اور اُن پر اللہ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ اِن دونوں قسم کے حقائق کی قسم کھا کر وہ بات کہی گئی ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾
وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع

درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔[۲۶] اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجبِ حسرت ہے۔[۲۷] اور یہ بالکل یقینی حق ہے۔ پس اے نبیؐ! اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ ع

جو اوپر کی آیات میں ارشاد ہوئی ہے۔

۲۵- اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ نبی کو اپنی طرف سے وحی میں کوئی کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو سخت سزا دیں۔ مگر اِس بات کو ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے جس سے آنکھوں کے سامنے یہ تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کا مقرر کردہ افسر اُس کے نام سے کوئی جعل سازی کرے تو بادشاہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کا سر قلم کر دے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ غلط اِستدلال کیا ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے، اُس کی رگِ دل یا رگِ گردن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے تو یہ اُس کے نبی ہونے کا ثبوت ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے، وہ سچّے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدّعی تو نبوت ہی نہیں، خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور زمین پر مدّتوں دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (اس مسئلے پر مفصّل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ یُونُس، حاشیہ ۲۳ میں کر چکے ہیں)۔

۲۶- یعنی قرآن اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو غلط روی اور اُس کے بُرے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳)

۲۷- یعنی آخرِکار انھیں اس بات پر پچھتانا پڑے گا کہ انھوں نے کیوں اس قرآن کی تکذیب کی۔

تفہیم القرآن

اَلمَعارِج

(۷۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

المعَارِج

نام تیسری آیت کے لفظ ذِی الْمَعَارِجِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نُزول بھی قریب قریب اُنھی حالات میں ہوا ہے جن میں سورۂ اَلحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں اُن کُفّار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمھیں جھٹلا کر ہم عذابِ جہنّم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اِس سورت کی ساری تقریر اِسی چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتدا میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اور جب وہ واقع ہوگا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر واقع ہوگا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لہٰذا اِن کے مذاق اڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت، جس کے جلدی لے آنے کا مطالبہ یہ لوگ ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں، کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو اِن مجرمین کا کیسا برا حشر ہوگا۔ اُس وقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو فدیے میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ نکلیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔

اِس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر اُن کے عقیدے اور اَخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ موڑا ہے اور مال سمیٹ کر اور سَینت سَینت کر رکھا ہے، وہ جہنّم کے مستحق ہوں گے۔ اور جنھوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے، اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، امانت میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی پر قائم رہے ہیں، وہ جنت میں عزّت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکہ کے اُن کُفار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپؐ کا مذاق اڑانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ ان کے تمسخر کی پروا نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلّت دیکھنے پر مُصِرّ ہیں تو انھیں اپنے بیہودہ مشغلوں میں پڑا رہنے دیں، اپنا بُرا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰیاتہا ۴۴ — رکوعاتہا ۲

سُوْرَۃُ الْمَعَارِجِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے[۱]، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عُروج کے زینوں کا مالک ہے[۲]۔ ملائکہ اور رُوح[۳] اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں[۴] ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس

۱- اصل الفاظ ہیں: سَاَلَ سَآئِلٌ۔ بعض مفسرین نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب، جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کس پر واقع ہوگا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہوگا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے اور مطالبہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ نَسائی اور دوسرے محدثین نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نَضر بن حارث بن کَلدہ نے کہا تھا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿ (الانفال، آیت ۳۲) "خدایا! اگر یہ واقعی تیری ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔" اس کے علاوہ متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں کفارِ مکہ کے اِس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو، وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: یُونُس، آیات ۴۶ تا ۴۸۔ الانبیاء، ۳۶ تا ۴۱۔ النمل، ۶۷ تا ۷۲۔ سبا، ۲۶ تا ۳۰۔ یٰسین، ۴۵ تا ۵۲۔ المُلک، ۲۴ تا ۲۷۔

۲- اصل میں لفظ ذِی الْمَعَارِجِ استعمال ہوا ہے۔ مَعارِج مِعْرَج کی جمع ہے جس کے معنی زینے، یا سیڑھی، ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اُوپر چڑھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و برتر ہے اور اس کے حضور باریاب ہونے کے لیے فرشتوں کو پے در پے بلندیوں سے گزرنا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۳- روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ملائکہ سے الگ اُن کا ذکر اُن کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ سورۂ شُعَراء میں فرمایا گیا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰى قَلْبِكَ (اس قرآن کو روحِ امین لے کر تمہارے

اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ

ہزار سال ہے۔ پس اے نبیؐ! صبر کرو، شایستہ صبر۔ یہ لوگ اُسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ

دل پر نازل ہوئے ہیں)۔ اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (کہو کہ جو شخص جبریل کا اس لیے دشمن ہو کہ اس نے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے......)۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہی ہیں۔

۴- یہ سارا مضمون متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے۔ ہم نہ فرشتوں کی حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آسکتی ہے کہ وہ زینے کیسے ہیں جن پر فرشتے چڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی خاص مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے مُنزّہ ہے۔

۵- سورۂ حج، آیت ۴۷ میں ارشاد ہوا ہے: ''یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔'' سورۂ السجدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے: ''وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر (اُس کی رُوداد) اُوپر اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔'' اور یہاں عذاب کے مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ جو لوگ مذاق کے طور پر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کی باتوں پر صبر کریں، اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اُس کو دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ اِن سب ارشادات پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگ اپنے ذہن اور اپنے دائرۂ فکر و نظر کی تنگی کے باعث خدا کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور اُنھیں سو پچاس برس کی مدت بھی بڑی لمبی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اسکیم ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اور یہ مدت بھی محض بطورِ مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کروڑوں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔ انھی منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوعِ انسانی کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں ساعتِ خاص تک یہاں اِس نوع کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع ہوا، کتنی مدت اس کی تکمیل کے لیے طے کی گئی ہے، کون سی ساعت اس کے اختتام کے لیے مقرر کی گئی ہے جس پر قیامت برپا کی جائے گی، اور کون سا وقت اِس غرض کے لیے رکھا گیا ہے کہ آغازِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بیک وقت اُٹھا کر اُن کا

Maktaba Tul Ishaat.com

قَرِيۡبًا ۞ يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۞ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۞
وَلَا يَسۡـَٔلُ حَمِيۡمٌ حَمِيۡمًا ۞ يُّبَصَّرُوۡنَهُمۡ ؕ يَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ يَفۡتَدِىۡ مِنۡ

رہے ہیں۔[7] (وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس[8] روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہوجائے[9] گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون جیسے ہوجائیں گے۔[10] اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔[11] مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے

حساب لیا جائے۔ اِس منصوبے کے صرف اُس حصے کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں جو ہمارے سامنے گزر رہا ہے، یا جس کے گزشتہ ادوار کی کوئی جُزوی سی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے۔ رہا اُس کا آغاز و انجام، تو اسے جاننا تو درکنار، اسے سمجھنا بھی ہمارے بس سے باہر ہے، کجا کہ ہم اُن حکمتوں کو سمجھ سکیں جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہیں۔ اب جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اِس منصوبے کو ختم کر کے اِس کا انجام فوراً اُن کے سامنے لے آیا جائے، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اُسے اِس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ انجام کی بات ہی سرے سے غلط ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، حواشی ۹۲-۹۳۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۹)

۶- یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایانِ شان ہے۔

۷- اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ یہ لوگ اُسے بعید از امکان سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک وہ قریب الوقوع ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو بڑی دُور کی چیز سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں وہ اِس قدر قریب ہے گویا کل پیش آنے والی ہے۔

۸- مفسرین میں سے ایک گروہ نے اِس فقرے کا تعلق فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ سے مانا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کی مدت جس دن کی بتائی گئی ہے اُس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مُسندِ احمد اور تفسیر ابنِ جَریر میں حضرت ابوسعید خُدریؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس آیت کے متعلق عرض کیا گیا کہ وہ تو بڑا ہی طویل دن ہوگا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں جتنا وقت لگتا ہے مومن کے لیے وہ دن اس سے بھی زیادہ ہلکا ہوگا۔'' یہ روایت اگر صحیح سند سے منقول ہوتی تو پھر اس کے سوا اِس آیت کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کی سند میں درّاج اور اس کے شیخ ابوالہیثم، دونوں ضعیف ہیں۔

۹- یعنی بار بار رنگ بدلے گا۔

عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝١١ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝١٢ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ
تُـْٔوِيْهِ ۝١٣ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝١٤ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥
نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝١٧ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨
اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝١٩ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝٢٠ وَّاِذَا مَسَّهُ

بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا، اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں! وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف بُلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔[۱۲]

انسان تھُڑدِلا پیدا کیا گیا ہے،[۱۳] جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی

۱۰- چونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں، اس لیے جب وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اور بے وزن ہو کر اُڑنے لگیں گے تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے رنگ برنگ کا دُھنکا ہوا اون اُڑ رہا ہو۔

۱۱- یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے۔ نہیں، ہر ایک آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

۱۲- یہاں بھی سورۂ الحاقّہ، آیات ۳۳-۳۴ کی طرح آخرت میں آدمی کے بُرے انجام کے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک، حق سے انحراف اور ایمان لانے سے انکار۔ دوسرے دنیا پرستی اور بخل، جس کی بنا پر آدمی مال جمع کرتا ہے اور اسے کسی بھلائی کے کام میں خرچ نہیں کرتا۔

۱۳- جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ "یہ بات انسان کی سرشت میں ہے"، یا "یہ انسان کی فطری کمزوری ہے"، اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ "انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے"۔ اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں بکثرت مواقع پر نوعِ انسانی کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست اختیار کر لینے والے لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آ رہا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں

Maktaba Tul Ishaat.com

الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾
وَالَّذِيْنَ فِيْٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِيْنَ

نصیب ہوتی ہے تو بُخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عَیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں،[۱۴] جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں،[۱۵] جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے،[۱۶] جو

نا قابلِ تغیُّر و تبدُّل نہیں ہیں، بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے عملاً کوشش کرے تو وہ اِن کو دُور کر سکتا ہے، اور اگر وہ نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ اُس کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۴۱۔ جلد چہارم، الزُّمَر، حواشی ۲۳-۲۸، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۵)

۱۴ — کسی شخص کا نماز پڑھنا لازماً یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب اور آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہے اور اپنے اِس ایمان کے مطابق عمل بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۵ — یعنی کسی قسم کی سُستی اور آرام طلبی، یا مصروفیت، یا دلچسپی اُن کی نماز کی پابندی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب نماز کا وقت آ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے خدا کی عبادت بجا لانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ کے ایک اور معنی حضرت عُقبہؓ بن عامر نے یہ بیان کیے ہیں کہ وہ پورے سکون اور خُشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ کوّے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے، مارا مار پڑھ کر کسی نہ کسی طرح نماز سے فارغ ہو جانے کی کوشش نہیں کرتے، اور نماز کے دوران میں اِدھر اُدھر التفات بھی نہیں کرتے۔ عربی محاورے میں ٹھیرے ہوئے پانی کو ماءِ دائم کہا جاتا ہے۔ اُسی سے یہ تفسیر ماخوذ ہے۔

۱۶ — سورۂ ذاریات، آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ ''اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔'' اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ ''ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔'' بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مقرر حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے، کیونکہ اُسی میں نصاب اور شرح، دونوں چیزیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر اس بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے کہ سورۂ معارج بالاتفاق مکّی ہے، اور زکوٰۃ ایک مخصوص نصاب اور شرح کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔ اس لیے مقرر حق کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصّہ طے کر رکھا ہے جسے وہ اُن کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ یہی معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مجاہد، شَعْبی اور ابراہیم نَخَعی نے بیان کیے ہیں۔

سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں، بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے۔ اور

يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ
مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ

روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں[۱۷]، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں[۱۸]، کیونکہ اُن کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں[۱۹] ـــــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے، جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں[۲۰] ـــــ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا

محروم سے مراد ایسا شخص ہے جو بے روزگار ہو، یا روزی کمانے کی کوشش کرتا ہو مگر اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو، یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق جب معلوم ہو جائے کہ وہ واقعی محروم ہیں تو ایک خدا پرست انسان اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ اس سے مدد مانگیں، بلکہ اُن کی محرومی کا علم ہوتے ہی وہ خود آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ذاریات، حاشیہ ۱۷)

۱۷ــ یعنی دنیا میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں سمجھتے، بلکہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

۱۸ــ بالفاظِ دیگر، ان کا حال کفّار کی طرح نہیں ہے جو دنیا میں ہر قسم کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کر کے بھی خدا سے نہیں ڈرتے، بلکہ وہ اپنی حد تک اَخلاق اور اعمال میں نیک رَوِیّہ اختیار کرنے کے باوجود خدا سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ اندیشہ اُن کو لاحق رہتا ہے کہ کہیں خدا کی عدالت میں ہماری کوتاہیاں ہماری نیکیوں سے بڑھ کر نہ نکلیں اور ہم سزا کے مستحق نہ قرار پا جائیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۵۴۔ جلد پنجم، الذاریات، حاشیہ ۱۹)

۱۹ــ شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد زنا سے پرہیز بھی ہے اور عُریانی سے پرہیز بھی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۶۔ النور، حواشی ۳۰-۳۲۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

رٰعُوْنَ ۝۳۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۳۴ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝۳۵ فَمَالِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝۳۶ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝۳۷

پاس کرتے ہیں،[۲۱] جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں،[۲۲] اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔[۲۳] یہ لوگ عزت کے ساتھ جنّت کے باغوں میں رہیں گے۔ ع

پس اے نبیؐ! کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمھاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں؟[۲۴]

۲۰ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۷۔

۲۱ – امانتوں سے مراد وہ امانتیں بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سُپرد کی ہیں اور وہ امانتیں بھی جو انسان کسی دوسرے انسان پر اعتماد کر کے اس کے حوالے کرتا ہے۔ اِسی طرح عہد سے مراد وہ عہد بھی ہیں جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور وہ عہد بھی جو بندے ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی امانتوں اور دونوں قسم کے عہد و پیمان کا پاس ولحاظ ایک مومن کی سیرت کے لازمی خصائص میں سے ہے۔ حدیث میں حضرت انَسؓ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے جو تقریر بھی فرماتے، اس میں یہ بات ضرور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ الا، لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ ولا دین لمن لا عھد لہٗ۔ ’’خبردار رہو، جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔‘‘ (بَیہقی فی شُعَبُ الایمان)

۲۲ – یعنی نہ شہادت چھپاتے ہیں، نہ اس میں کوئی کمی بیشی کرتے ہیں۔

۲۳ – اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس بلند سیرت و کردار کے لوگ خدا کی جنت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں، ان کی صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع اور اسی پر ختم کیا گیا ہے۔ نمازی ہونا اُن کی پہلی صفت ہے، نماز کا ہمیشہ پابند رہنا ان کی دوسری صفت، اور نماز کی حفاظت کرنا اُن کی آخری صفت۔ نماز کی حفاظت سے بہت سی چیزیں مراد ہیں: وقت پر نماز ادا کرنا۔ نماز سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ جسم اور کپڑے پاک ہیں۔ باوضو ہونا اور وضو میں اعضا کو اچھی طرح دھونا۔ ارکان اور واجبات اور مستحباتِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔ نماز کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا۔ خدا کی نافرمانیاں کر کے اپنی نمازوں کو ضائع نہ کرنا۔ یہ سب چیزیں نماز کی حفاظت میں شامل ہیں۔

۲۴ – یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اُڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ

کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنّت میں داخل کر دیا جائے گا؟[۲۵] ہرگز نہیں۔ ہم نے جس چیز سے اِن کو پیدا کیا ہے اُسے یہ خود جانتے ہیں[۲۶]۔ پس نہیں[۲۷]، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی،[۲۸]

۲۵- مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو اُن لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سُننا تک گوارا نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبا دینے کے لیے یوں دوڑے چلے آرہے ہیں، جنت کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات ۳۴-۴۱ بھی پیشِ نظر رکھنی چاہییں جن میں کفّارِ مکہ کو اُن کی اِس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو وہاں وہ اُسی طرح مزے کریں گے جس طرح دنیا میں کر رہے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اُسی طرح خستہ حال رہیں گے جس طرح آج دنیا میں ہیں۔

۲۶- اِس مقام پر اِس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: مضمونِ سابق کے ساتھ اِس کا تعلّق مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس مادّے سے یہ لوگ بنے ہیں، اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادّہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادّۂ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اُس کے اوصاف کے لحاظ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر اِس فقرے کو بعد کے مضمون کی تمہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں اور جو شخص انھیں ہماری پکڑ سے ڈراتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ ہم اِن کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نُطفے کی ایک حقیر سی بُوند سے اِن کی تخلیق کی ابتدا کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اِس خلقت پر یہ غور کرتے تو انھیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ اب یہ ہماری گرفت سے باہر ہو گئے ہیں، یا ہم انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۲۷- یعنی بات وہ نہیں ہے جو انھوں نے سمجھ رکھی ہے۔

۲۸- یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اِس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے سے طُلوع اور نئے زاویے پر غُروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾
فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ یَوْمَ
یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً
اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع

ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ اِن سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔[۲۹] لہٰذا اِنھیں اپنی بیہودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے، جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دَوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں،[۳۰] اِن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذِلّت اِن پر چھا رہی ہوگی۔ وہ دن ہے جس کا اِن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ع

ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جِہت مشرق ہے اور دوسری جِہت مغرب۔ اِس بنا پر سورۂ شُعَراء، آیت ۲۸، اور سورۂ مُزَّمِّل، آیت ۹ میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں، کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کُرے پر سورج غُروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طُلوع ہوتا ہے۔ اس بنا پر سورۂ رحمٰن، آیت ۱۷ میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الرحمٰن، حاشیہ ۱۷)

۲۹ – یہ ہے وہ بات جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رب المشارق والمغارب ہونے کی قسم کھائی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم چونکہ مشرقوں اور مغربوں کے مالک ہیں، اس لیے پوری زمین ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے اور ہماری گرفت سے بچ نکلنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں تمھیں ہلاک کر سکتے ہیں اور تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھا سکتے ہیں جو تم سے بہتر ہو۔

۳۰ – اصل الفاظ ہیں: اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ۔ نُصُب کے معنیٰ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض نے اس سے مراد بُت لیے ہیں اور اُن کے نزدیک اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ داورِ محشر کی مقرر کی ہوئی جگہ کی طرف اِس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے آج وہ اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ نشان لیے ہیں جو دَوڑ کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے لگائے جاتے ہیں، تاکہ ہر ایک دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

تفہیم القرآن

نوح

(۷۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

نوح

نام "نوح" اِس سورت کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں از اوّل تا آخر حضرت نوح علیہ السلام ہی کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول یہ بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون کی داخلی شہادت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کے مقابلے میں کفّارِ مکہ کی مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصّہ محض قصّہ گوئی کی خاطر بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس سے مقصود کفّارِ مکہ کو مُتنبِّہ کرنا ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی رَویّہ اختیار کر رہے ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم نے اختیار کیا تھا، اور اِس رَویّے سے اگر تم باز نہ آئے تو تمھیں بھی وہی انجام دیکھنا پڑے گا جو اُن لوگوں نے دیکھا۔ یہ بات پوری سورت میں کہیں صاف الفاظ میں نہیں کہی گئی ہے، لیکن جس موقع پر اور جن حالات میں یہ قصّہ اہلِ مکہ کو سنایا گیا ہے اُس پَس منظر میں خود بخود یہ مضمون اس سے مُترشّح ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر مامور فرمایا تھا، اُس وقت کیا خدمت اُن کے سُپرد کی گئی تھی۔

آیات ۲ - ۴ میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کیا اور اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا بات پیش کی۔

پھر مدت ہائے دراز تک دعوت و تبلیغ کی زحمتیں اُٹھانے کے بعد جو رُوداد حضرت نوح علیہ السّلام نے اپنے رب کے حضور پیش کی، وہ آیات ۵ - ۲۰ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں وہ عرض کرتے ہیں کہ کس کس طرح انھوں نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کا مقابلہ کس ہَٹ دھرمی سے کیا۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی آخری گزارش آیات ۲۱ - ۲۴ میں درج کی گئی ہے، جس میں وہ اپنے رب سے عرض کرتے ہیں کہ یہ قوم میری بات قطعی طور پر ردّ کر چکی ہے، اِس نے اپنی نکیل

اپنے رئیسوں کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور اُنھوں نے بہت بڑا مکر کا جال پھیلا رکھا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ اِن لوگوں سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جائے۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ صدیوں تک انتہائی صبر آزما حالات میں تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب وہ اپنی قوم سے پُوری طرح مایوس ہوگئے تو انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ اب اِس قوم کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ یہ رائے ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے اپنے فیصلے کے مطابق تھی۔ چنانچہ اس کے متصلاً بعد آیت ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُس قوم پر اُس کے کرتُوتوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہوگیا۔

آخری آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا درج کی گئی ہے جو انھوں نے عین نُزولِ عذاب کے وقت اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس میں وہ اپنے لیے اور سب اہلِ ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اور اپنی قوم کے کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو زمین پر بسنے کے لیے جیتا نہ چھوڑا جائے، کیونکہ ان کے اندر اب کوئی خیر باقی نہیں رہی ہے، ان کی نسل سے جو بھی اٹھے گا کافر اور فاجر ہی اٹھے گا۔

اس سورہ کا مطالعہ کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کے قصّے کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو اِس سے پہلے قرآنِ مجید میں بیان ہو چکی ہیں۔ مُلاحظہ ہو: الاَعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونُس، ۷۱، ۷۳۔ ہود، ۲۵ تا ۴۹۔ المؤمنون، ۲۳ تا ۳۱۔ الشُّعراء ۱۰۵ تا ۱۲۲۔ العنکبوت، ۱۴، ۱۵۔ الصافّات، ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، ۹ تا ۱۶۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۸ آیاتھا سُوْرَةُ نُوْحٍ مَّكِّيَّةٌ ۲ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ
وَاَطِيْعُوْنِ ۝۳ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کردے، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔[1]

اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو[2]، اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا[3] اور تمھیں ایک وقتِ مقرر تک باقی رکھے گا۔[4]

۱- یعنی اُن کو اس بات سے آگاہ کردے کہ جن گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں میں وہ مبتلا ہیں وہ اُن کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا دیں گی اگر وہ اُن سے باز نہ آئے، اور ان کو بتا دے کہ اُس عذاب سے بچنے کے لیے انھیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۲- یہ تین باتیں تھیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ ایک، اللہ کی بندگی۔ دوسرے، تقویٰ۔ تیسرے، رسول کی اطاعت۔ اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی بندگی و عبادت چھوڑ کر اور صرف اللہ ہی کو اپنا معبود تسلیم کرکے اُسی کی پرستش کرو اور اُسی کے احکام بجا لاؤ۔ تقویٰ کا مطلب یہ تھا کہ اُن کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کے موجب ہیں، اور اپنی زندگی میں وہ رَوِش اختیار کرو جو خدا ترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ رہی تیسری بات کہ "میری اطاعت کرو"، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اُن احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمھیں دیتا ہوں۔

۳- اصل الفاظ ہیں: يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ۔ اس فقرے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تمھارے گناہوں میں سے بعض کو معاف کردے گا، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر تم اُن تین باتوں کو قبول کرلو جو تمھارے سامنے پیش کی جارہی ہیں، تو اب تک جو گناہ تم کرچکے ہو، اُن سب سے وہ درگزر فرمائے گا۔ یہاں مِنْ تبعیض کے لیے

إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي
دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ﴿٥﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا ﴿٦﴾ وَ
إِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا[5]۔ کاش! تمھیں اس کا علم ہو[6]۔‘‘

اُس[7] نے عرض کیا: ’’اے میرے رب! مَیں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا، مگر میری پکار نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا[8]۔ اور جب بھی مَیں نے اُن کو بلایا تاکہ تُو انھیں معاف کر دے[9]، انھوں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک

نہیں بلکہ عَنْ کے معنیٰ میں ہے۔

۴- یعنی اگر تم نے یہ تین باتیں مان لیں تو تمھیں دنیا میں اُس وقت تک جینے کی مہلت دے دی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طبعی موت کے لیے مقرر کیا ہے۔

۵- اِس دوسرے وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ نے کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ اِس کے متعلق متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی قوم کے حق میں نزولِ عذاب کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے، اُس کے بعد وہ ایمان بھی لے آئے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا۔

۶- یعنی اگر تمھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ میرے ذریعے سے اللہ کا پیغام پہنچ جانے کے بعد اب جو وقت گزر رہا ہے، یہ دراصل ایک مہلت ہے جو تمھیں ایمان لانے کے لیے دی جا رہی ہے، اور اس مہلت کی مدّت ختم ہو جانے کے بعد پھر خدا کے عذاب سے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے، تو تم ایمان لانے میں جلدی کرو گے اور نزولِ عذاب کا وقت آنے تک اس کو ٹالتے نہ چلے جاؤ گے۔

۷- بیچ میں ایک طویل زمانے کی تاریخ چھوڑ کر اب حضرت نوح علیہ السّلام کی وہ عرضداشت نقل کی جا رہی ہے جو اُنھوں نے اپنی رسالت کے آخری دَور میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی۔

۸- یعنی جتنا جتنا میں اُن کو پکارتا گیا، اتنے ہی زیادہ وہ دُور بھاگتے چلے گئے۔

۹- اِس میں خود بخود یہ مضمون شامل ہے کہ وہ نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر معافی کے طلب گار ہوں، کیونکہ

Maktaba Tul Ishaat.com

ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝٧ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝٨ ثُمَّ
اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝٩ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط
اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝١٠ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝١١ وَّيُمْدِدْكُمْ
بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝١٢ مَا لَكُمْ

لیے[۱۰] اور اپنی رَوِش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا[۱۱]۔ پھر مَیں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر مَیں نے عَلانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا[۱۲]۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ

اِسی صورت میں اُن کو اللہ تعالیٰ سے معافی مل سکتی تھی۔

۱۰ – منہ ڈھانکنے کی غرض یا تو یہ تھی کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات سننا تو درکنار، آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، یا پھر یہ حرکت وہ اس لیے کرتے تھے کہ آپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے منہ چھپا کر نکل جائیں اور اِس کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ آپ اُنھیں پہچان کر اُن سے بات کرنے لگیں۔ یہ ٹھیک وہی طرزِ عمل تھا جو کفّارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رہے تھے۔ سورۂ ہود آیت ۵ میں اُن کے اِس رَوِیّے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ''دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ رسول سے چُھپ جائیں۔ خبردار! جب یہ اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانکتے ہیں تو اللہ اِن کے کُھلے کو بھی جانتا ہے اور چُھپے کو بھی، وہ تو دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے۔'' (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حواشی ۵-۶)

۱۱ – تکبّر سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے، تو یہ تکبّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو ردّ کرنا ہوگا۔

۱۲ – یہ بات قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ خدا سے بغاوت کی رَوِش صرف آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے، اور اس کے برعکس اگر کوئی قوم نافرمانی کے بجائے ایمان و تقویٰ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کر لے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں ہے بلکہ دنیا میں

لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ اَلَمْ تَرَوْا

اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟[۱۳] حالانکہ اُس نے طرح طرح سے تمھیں بنایا ہے۔[۱۴] کیا دیکھتے نہیں ہو

بھی اُس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: ''اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔'' (آیت ۱۲۴) سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے: ''اور اگر اِن اہلِ کتاب نے تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں تو اِن کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔'' (آیت ٦٦) سورۂ اَعراف میں فرمایا: ''اور اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔'' (آیت ۹۶) سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: ''اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔'' (آیت ۵۲) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بھی اِسی سورۂ ہود میں اہلِ مکہ کو مُخاطب کر کے یہ بات فرمائی گئی: ''اور یہ کہ اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مقرر وقت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا۔'' (آیت ۳) حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں سے فرمایا کہ ''ایک کلمہ ہے جس کے تم قائل ہو جاؤ تو عرب وعجم کے فرماں روا ہو جاؤ گے۔'' (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۹٦۔ جلد دوم، ہود، حواشی ۳ و ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، دیباچۂ سورۂ صٓ)

قرآنِ مجید کی اِسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف اِستغفار پر اکتفا فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیرالمؤمنین! آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔ فرمایا: میں نے آسمان کے اُن دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے، اور پھر سورۂ نوحؑ کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ (ابنِ جَرِیر و ابنِ کثیر) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حَسَن بصری کی مجلس میں ایک شخص نے خشک سالی کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا: اللہ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی، تیسرے نے کہا: میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا: میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو وہ یہی جواب دیتے چلے گئے کہ استغفار کرو۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ سب کو مختلف شکایتوں کا ایک ہی علاج بتا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب میں سورۂ نوحؑ کی یہ آیات سنا دیں۔ (کَشّاف)

۱۳ – مطلب یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور سرداروں کے بارے میں تو تم یہ سمجھتے ہو کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ
نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع

کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور اُن میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اُگایا،[۱۵] پھر وہ تمھیں اِسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اِس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا، تاکہ تم اس کے اندر کھُلے راستوں میں چلو۔" ع

ان کے وقار کے خلاف کوئی حرکت کرنا خطرناک ہے، مگر خداوندِ عالَم کے متعلق تم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بھی کوئی باوقار ہستی ہو گا۔ اُس کے خلاف تم بغاوت کرتے ہو، اُس کی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہو، اُس کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہو، اور اس سے تمھیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اس کی سزا دے گا۔

۱۴ ۔ یعنی تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمھیں موجودہ حالت پر لایا ہے۔ پہلے تم ماں اور باپ کی صُلب میں الگ الگ نُطفوں کی شکل میں تھے۔ پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمھارا استقرارِ حمل ہوا۔ پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بتدریج نَشْوونَما دے کر تمھیں پوری انسانی شکل دی گئی اور تمھارے اندر تمام وہ قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمھیں درکار تھیں۔ پھر ایک زندہ بچے کی صورت میں تم بطنِ مادر سے باہر آئے اور ہر آن تمھیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی، یہاں تک کہ تم جوانی اور کُہولت کی عمر کو پہنچے۔ اِن تمام منازل سے گزرتے ہوئے تم ہر وقت پوری طرح خدا کے بس میں تھے۔ وہ چاہتا تو تمھارا استقرارِ حمل ہی نہ ہونے دیتا اور تمھاری جگہ کسی اور شخص کا استقرار ہوتا۔ وہ چاہتا تو ماں کے پیٹ ہی میں تمھیں اندھا، بہرا، گونگا، یا اپاہج بنا دیتا، یا تمھاری عقل میں کوئی فتور رکھ دیتا۔ وہ چاہتا تو تم زندہ بچے کی صورت میں پیدا ہی نہ ہوتے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ تمھیں ہر وقت ہلاک کر سکتا تھا، اور اس کے ایک اشارے پر کسی وقت بھی تم کسی حادثے کے شکار ہو سکتے تھے۔ جس خدا کے بس میں تم اس طرح بے بس ہو، اُس کے متعلّق تم نے یہ کیسے سمجھ رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جا سکتی ہے، اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامی اور احسان فراموشی کی جا سکتی ہے، اس کے خلاف ہر قسم کی بغاوت

قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّهُمۡ عَصَوۡنِىۡ وَاتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ يَزِدۡهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ
اِلَّا خَسَارًا ۚ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوۡا مَكۡرًا كُبَّارًا ۚ﴿۲۲﴾ وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمۡ وَ
لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوۡثَ وَيَعُوۡقَ وَنَسۡرًا ۚ﴿۲۳﴾ وَقَدۡ

نوحؑ نے کہا: "میرے رب! انھوں نے میری بات ردّ کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے[16]۔ انھوں نے کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبُودوں کو، اور نہ چھوڑو وَدّ اور سُواع کو، اور نہ یَغُوث اور یَعُوق اور نَسر کو[17]۔ انھوں نے

کی جا سکتی ہے اور اِن حرکتوں کا کوئی خمیازہ تمھیں بھگتنا نہیں پڑے گا۔

۱۵ – یہاں زمین کے مادّوں سے انسان کی پیدایش کو نباتات کے اُگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کسی وقت اِس کُرے پر نباتات موجود نہ تھیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کو اُگایا، اسی طرح ایک وقت تھا جب رُوئے زمین پر انسان کا کوئی وجود نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی پَود لگائی۔

۱۶ – مکر سے مراد اُن سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوحؑ کی تعلیمات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوحؑ تمھی جیسا ایک آدمی ہے، کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آئی ہے۔ (الاعراف: ۶۳۔ ہود: ۲۷) نوحؑ کی پیروی تو ہمارے اَراذِل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے۔ (ہود: ۲۷) خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا۔ (المؤمنون: ۲۴) اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو اِس کے پاس خزانے ہوتے، اِس کو علمِ غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا۔ (ہود: ۳۱) نوحؑ اور اس کے پیرووں میں آخر کون سی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے۔ (ہود: ۲۷) یہ شخص دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے۔ (المؤمنون: ۲۴) اِس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اِسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ (المؤمنون: ۲۵) قریب قریب یہی باتیں تھیں جن سے قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو بہکایا کرتے تھے۔

۱۷ – قومِ نوحؑ کے معبُودوں میں سے یہاں اُن معبُودوں کے نام لیے گئے ہیں جنھیں بعد میں اہلِ عرب نے بھی پُوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ اُن کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے، ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قومِ نوحؑ کے قدیم معبُودوں کا ذکر سُنا ہوگا

Maktaba Tul Ishaat.com

اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اور تُو بھی اِن ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔[18]"

اور جب اَز سرِ نَو اُن کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہوگی تو انھی معبُودوں کے بُت بنا کر انھوں نے پھر انھیں پُوجنا شروع کر دیا ہوگا۔

وَدّ قبیلۂ قُضاعہ کی شاخ بنی کَلْب بن وَبْرہ کا معبُود تھا، جس کا استھان انھوں نے دُومَۃُ الجَندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَّم اَبَم (وَدّ باپو) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کَلْبی کا بیان ہے کہ اس کا بُت ایک نہایت عظیم الجثّہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبدِ وُدّ ملتا ہے۔

سُواع قبیلۂ ہُذَیل کی دیوی تھی اور اس کا بُت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ یَنْبُوع کے قریب رُہاط کے مقام پر اس کا مندِر واقع تھا۔

یَغُوث قبیلۂ طَے کی شاخ اَنْعُم اور قبیلۂ مَذحِج کی بعض شاخوں کا معبُود تھا۔ مَذحِج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جُرَش کے مقام پر اس کا بُت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عَبدِ یَغُوث ملتا ہے۔

یَعُوق یمن کے علاقۂ ہَمْدان میں قبیلۂ ہَمْدان کی شاخ خَیوان کا معبُود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

نَسر حِمْیَر کے علاقے میں قبیلۂ حِمْیَر کی شاخ آلِ ذوالکُلاع کا معبُود تھا اور بَلْخَع کے مقام پر اس کا بُت نصب تھا، جس کی شکل گِدھ کی تھی۔ سَبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نَسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندِر کو وہ لوگ بَیتِ نَسور، اور اس کے پُجاریوں کو اہلِ نَسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے مُتّصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گِدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

۱۸ – جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی یہ بددعا کسی بے صبری کی بنا پر نہ تھی، بلکہ یہ اُس وقت اُن کی زبان سے نکلی تھی جب صدیوں تک تبلیغ کا حق ادا کرنے کے بعد وہ اپنی قوم سے پُوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ایسے ہی حالات میں حضرت موسیٰؑ نے بھی فرعون اور قومِ فرعون کے حق میں یہ بددعا کی تھی کہ "پروردگار! اِن کے مال غارت کر دے اور اِن کے دلوں پر ایسی مُہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں، جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں"، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: "تمھاری دعا قبول کی گئی" (یونس، آیات ۸۸-۸۹)۔ حضرت موسیٰؑ کی طرح حضرت نوحؑ کی یہ بددعا بھی عین منشائے الٰہی کے مطابق تھی۔ چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوا ہے: وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ

مِمَّا خَطِيٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝۲۵ وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝۲۶ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا
يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝۲۷ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ

اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیے گئے،[19] پھر انھوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا۔[20] اور نوحؑ نے کہا: ”میرے رب! اِن کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تُو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اِن کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔ میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور ہر

اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ” اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اُن کے سوا اب اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔“ (ہود ۳۶)

۱۹ - یعنی غرق ہونے پر ان کا قصّہ تمام نہیں ہوگیا، بلکہ مرنے کے بعد فوراً ہی ان کی روحیں آگ کے عذاب میں مبتلا کر دی گئیں۔ یہ بعینہٖ وہی معاملہ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ سورۂ مومن، آیات ۴۵-۴۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۶۳) یہ آیت بھی اُن آیات میں سے ہے جن سے برزخ کا عذاب ثابت ہوتا ہے۔

۲۰ - یعنی اپنے جن معبُودوں کو وہ اپنا حامی و مددگار سمجھتے تھے، ان میں سے کوئی بھی انھیں بچانے کے لیے نہ آیا۔ یہ گویا تنبیہ تھی اہلِ مکہ کے لیے کہ تم بھی اگر خدا کے عذاب میں مبتلا ہوگئے تو تمھارے یہ معبُود، جن پر تم بھروسا کیے بیٹھے ہو، تمھارے کسی کام نہ آئیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۟۲۸ ع

النصف
ع ۲ ۸ ۱۰

اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے، اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرمادے، اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر۔'' ع

تفہیم القرآن

الجن

(۷۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الجن

نام ''الجن'' اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضامین کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں جِنّوں کے قرآن سُن کر جانے اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول بخاری اور مُسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازارِ عُکاظ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں نَخلہ کے مَقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی، اُس وقت جِنّوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سُن کر وہ ٹھیر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ اِسی واقعے کا ذکر اِس سورہ میں کیا گیا ہے۔

اکثر مفسرین نے اِس روایت کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سفرِ طائف کا واقعہ ہے جو ہجرت سے تین سال پہلے ۱۰ نبوی میں پیش آیا تھا۔ لیکن یہ قیاس متعدّد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ طائف کے اُس سفر میں جِنّوں کے قرآن سُننے کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اُس کا قصّہ سورۂ اَحقاف، آیات ۲۹-۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن آیات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر جو جن قرآنِ مجید سُن کر ایمان لائے تھے، وہ پہلے سے حضرت موسیٰؑ اور سابق کُتُبِ آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اِس سورہ کی آیات ۲-۷ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس موقع پر قرآن سُننے والے جن مشرکین اور منکرینِ آخرت و رسالت میں سے تھے۔ پھر یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے اُس سفر میں حضرت زیدؓ بن حارِثہ کے سوا اور کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف اِس کے، اس سفر کے متعلق ابنِ عباسؓ فرما رہے ہیں کہ اس میں چند صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ مزید برآں روایات اِس بات پر بھی متفق ہیں کہ اُس سفر میں جِنّوں نے قرآن اُس وقت سنا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ واپس تشریف لاتے ہوئے نَخلہ میں ٹھیرے تھے۔ اور اس سفر میں ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق جِنّوں کے قرآن سُننے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپ مکہ سے عُکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ اِن وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ

سورۂ اَحقاف اور سورۂ جن میں ایک ہی واقعے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ دو الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

جہاں تک سورۂ اَحقاف کا تعلق ہے، اُس میں جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بارے میں روایات متفق ہیں کہ وہ ۱۰ نبوی کے سفرِ طائف میں پیش آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دوسرا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا، اِس کا کوئی جواب ہمیں ابنِ عباسؓ کی روایت سے نہیں ملتا، نہ کسی اور تاریخی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عُکاظ کے بازار میں کب تشریف لے گئے تھے۔ البتہ اِس سورہ کی آیات ۸-۱۰ پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نبوّت کے ابتدائی دَور کا واقعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اِن آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن عالَمِ بالا کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمان میں سُن گُن لینے کا کوئی نہ کوئی موقع پا لیتے تھے، مگر اس کے بعد یکایک انھوں نے دیکھا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پہرے لگ گئے ہیں اور شِہابوں کی بارش ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے کہیں اُن کو ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں ٹھیر کر وہ کوئی بِھنک پا سکیں۔ اِس سے اُن کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ زمین میں ایسا کیا واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کے لیے یہ سخت انتظامات کیے گئے ہیں۔ غالباً اُسی وقت سے جِنوں کے بہت سے گروہ اِس تلاش میں پھرتے رہے ہوں گے اور اُن میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن سُن کر یہ رائے قائم کی ہوگی کہ یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر جنوں پر عالَمِ بالا کے تمام دروازے بند کردیے گئے ہیں۔

جِنّ کی حقیقت

اِس سورہ کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے، تاکہ ذہن کسی اُلجھن کے شکار نہ ہوں۔ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جِن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پُرانے زمانے کے اَوہام وخُرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ یہ رائے انھوں نے کچھ اِس بِنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور انھیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ جِن کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کرسکتے۔ مگر اُنھوں نے بلا دلیل یہ فرض کرلیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو اُن کو محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اِس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ

Maktaba Tul Ishaat.com

محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیے، وہ دراصل خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اختیار کرلیا جائے تو ایک جن ہی کیا، انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اُس کے تجربے اور مُشاہدے میں نہ آتی ہو اور اُس کے لیے خدا تک کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے، کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ اِس طرزِ فکر سے متأثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے، انھوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنھیں شیطان کہا گیا ہے، اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چُھپ چُھپ کر قرآن سُنا کرتے تھے۔ لیکن قرآنِ مجید کے ارشادات اس معاملے میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ اِن تاویلات کے لیے اُن کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اِس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔ ہود، ۱۱۹۔ حٰم السجدہ، آیات ۲۵ و ۲۹۔ الاَحقاف، ۱۸۔ الذّاریات، ۵۶۔ النّاس، ٦۔ اور سورۂ رحمٰن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنّوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجایش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورۂ اَعراف، آیت ۱۲، سورۂ حِجر، آیات ۲٦-۲۷، اور سورۂ رحمٰن، آیات ۱۴-۱۵ میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادّۂ تخلیق مٹی ہے اور جنّوں کا مادّۂ تخلیق آگ۔

سورۂ حِجر، آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے۔ اِسی بات پر قصّۂ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورۂ کہف، آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سورۂ اَعراف، آیت ۲۷ میں بالفاظِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان اُن کو نہیں دیکھتے۔

سورۂ حِجر، آیات ۱٦-۱۸، سورۂ صافّات، آیات ٦-۱۰، اور سورۂ مُلک، آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالَمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اُس سے اُوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انھیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چُھپے

سُن گُن لیں تو شہابِ ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اِس سے مشرکینِ عرب کے اِس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں، یا خدائی کے اَسرار تک انھیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اِسی غلط خیال کی تردید سورۂ سَبا، آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سورۂ بَقرہ، آیت ۳۰-۳۴ اور سورۂ کہف، آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں، جن کی ایک مثال ہمیں سورۂ نَمل آیت ۷ میں ملتی ہے، لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں، اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت ومَعصِیَت اور کفر وایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اِس پر ابلیس کا قصہ اور سورۂ اَحقاف اور سورۂ جن میں بعض جِنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اُسی وقت سے شیاطینِ جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اُس پر مُسلط ہو کر زبردستی اُس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اُس کے دل میں وَسْوَسے ڈالتے ہیں، اُس کو بہکاتے ہیں اور بدی وگمراہی کو اس کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات مُلاحَظہ ہوں: النساء، ۱۱۷ تا ۱۲۰۔ الاَعراف، ۱۱ تا ۱۷۔ ابراہیم، ۲۲۔ الحِجر ۳۰ تا ۴۲۔ النحل، ۹۸ تا ۱۰۰۔ بنی اسرائیل، ۶۱ تا ۶۵۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکینِ عرب زمانۂ جاہلیت میں جنوں کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے، اُن کی عبادت کرتے تھے، اور اُن کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ مُلاحَظہ ہو: الاَنعام، آیت ۱۰۰۔ سَبا، آیات ۴۰-۴۱۔ الصّافّات، ۱۵۸۔

اِن تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ اُن کی پُر اَسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصوّرات قائم کر رکھے ہیں، حتّٰی کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی گئی ہے، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

موضوع اور مباحث

اِس سورہ میں پہلی آیت سے لے کر آیت ۱۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآنِ مجید سُن کر اُس کا کیا اثر لیا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے دوسرے جنوں سے کیا کیا باتیں کہیں۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی ساری گفتگو نقل نہیں کی ہے، بلکہ صرف وہ خاص خاص باتیں نقل فرمائی ہیں جو قابلِ ذکر تھیں۔ اسی لیے طرزِ بیان ایک مسلسل گفتگو کا سا نہیں ہے، بلکہ اُن کے مختلف فقروں کو اِس طرح نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ جِنوں کی زبان سے نکلے ہوئے اِن فقروں کو اگر آدمی بغور پڑھے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اُن کے ایمان لانے کے اِس واقعے اور اپنی قوم کے ساتھ اُن کی اِس گفتگو کا ذکر قرآن میں کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے حواشی میں ان کے اقوال کی جو تشریحات کی ہیں، وہ اِس کا مقصد سمجھنے میں مزید مددگار ہوں گی۔

اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ تک لوگوں کو فہمایش کی گئی ہے کہ وہ شرک سے باز آ جائیں اور راہِ راست پر ثابت قدمی کے ساتھ چلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہوگی، ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفارِ مکہ کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول دعوت الی اللہ کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اِس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالانکہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے، وہ اِس بات کا مدعی نہیں ہے کہ لوگوں کو نفع یا نقصان پہنچا دینا اُس کے اختیار میں ہے۔ پھر آیات ۲۴-۲۵ میں کفار کو مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسول کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے۔ وہ وقت دُور ہے یا قریب، رسولؐ کو اس کا علم نہیں ہے، مگر بہرحال اسے آنا ضرور ہے۔ آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسولؐ کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ یہ علم اُن اُمور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائضِ رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں، اور یہ علم ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

۲۸ آیاتہا

سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا
عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾

اَے نبیؐ! کہو: میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنّوں کے ایک گروہ نے غور سے سُنا[۱]، پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا:

"ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے[۲] جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں[۳] گے۔"

۱- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر نہیں آ رہے تھے اور آپؐ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن سُن رہے ہیں، بلکہ بعد میں وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعے کی خبر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی اِس قصّے کو بیان کرتے ہوئے صراحت فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے سامنے قرآن نہیں پڑھا تھا، نہ آپؐ نے ان کو دیکھا تھا۔" (مسلم، ترمذی، مُسندِ احمد، ابنِ جَریر)

۲- اصل الفاظ ہیں: قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ قرآن کے معنی ہیں: "پڑھی جانے والی چیز"، اور یہ لفظ غالبًا جنوں نے اِسی معنی میں استعمال کیا ہوگا، کیونکہ وہ پہلی مرتبہ اس کلام سے متعارف ہوئے تھے اور شاید اُس وقت اُن کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ جو چیز وہ سُن رہے ہیں اس کا نام قرآن ہی ہے۔ عَجَب مبالغے کا صیغہ ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں بہت زیادہ حیرت انگیز چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس جنوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسا کلام سُن کر آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن نہ صرف یہ کہ انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ ان کی زبان بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام جن تمام انسانی زبانیں جانتے ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن میں سے جو گروہ زمین کے جس علاقے میں رہتے ہوں، اُسی علاقے کے لوگوں کی زبان سے وہ واقف ہوں۔ لیکن قرآن کے اِس بیان سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جن جنھوں نے اُس وقت قرآن سنا تھا، وہ عربی زبان اتنی اچھی جانتے تھے کہ انھوں نے اِس کلام کی بے مثل بلاغت کو بھی محسوس کیا اور اُس کے بلند پایہ مضامین کو بھی خوب سمجھ لیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ﴿۴﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ

اور یہ کہ "ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے، اُس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے۔[۴]"

اور یہ کہ "ہمارے نادان لوگ[۵] اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتے رہے ہیں۔"

اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے۔[۶]"

اور یہ کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جِنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے،

۳- اس سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک، یہ کہ جن اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے منکر نہیں ہیں۔ دوسرے، یہ کہ ان میں بھی مشرکین پائے جاتے ہیں جو مشرک انسانوں کی طرح اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے ہیں، چنانچہ جنوں کی یہ قوم جس کے افراد قرآن سُن کر گئے تھے، مُشرک ہی تھی۔ تیسرے، یہ کہ نبوت اور کُتُبِ آسمانی کے نُزول کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوا ہے، بلکہ ان میں سے جو جن بھی ایمان لاتے ہیں، وہ انسانوں میں آنے والے انبیاؑ اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ہی ایمان لاتے ہیں۔ یہی بات سورۂ اَحقاف، آیات ۲۹-۳۱ سے بھی معلوم ہوتی ہے، جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ جن جنھوں نے اُس وقت قرآن سُنا تھا، حضرت موسیٰؑ کے پیروؤں میں سے تھے اور انھوں نے قرآن سُننے کے بعد اپنی قوم کو دعوت دی تھی کہ اب جو کلام خدا کی طرف سے پچھلی کُتُبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے اُس پر ایمان لاؤ۔ سورۂ رحمٰن بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اُس کا پورا مضمون ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مُخاطَب انسان اور جن دونوں ہیں۔

۴- اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک، یہ کہ یہ جن یا تو عیسائی جنوں میں سے تھے، یا ان کا کوئی اور مذہب تھا جس میں اللہ تعالیٰ کو بیوی بچوں والا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآنِ پاک کا کوئی ایسا حصّہ پڑھ رہے تھے جسے سُن کر ان کو اپنے عقیدے کی غَلَطی معلوم ہوگئی اور انھوں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی بلند و برتر ذات کی طرف بیوی بچوں کو منسوب کرنا سخت جہالت اور گستاخی ہے۔

مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ
اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿۷﴾ وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا

اِس طرح اُنھوں نے جِنّوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا۔[۶]''

اور یہ کہ ''انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمھارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا''[۸] اور یہ کہ ''ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی

۵- اصل میں لفظ سَفِیْھُنَا استعمال کیا گیا ہے، جو ایک فرد کے لیے بھی بولا جا سکتا ہے اور ایک گروہ کے لیے بھی۔ اگر اِسے ایک نادان فرد کے معنٰی میں لیا جائے تو مراد ابلیس ہوگا، اور اگر ایک گروہ کے معنٰی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنوں میں بہت سے احمق اور بے عقل لوگ ایسی باتیں کہتے تھے۔

۶- یعنی اُن کی غلط باتوں سے ہمارے گمراہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ انسان یا جن، اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنے کی جرأت بھی کر سکتے ہیں، لیکن اب یہ قرآن سُن کر ہمیں معلوم ہوگیا کہ فی الواقع وہ جھوٹے تھے۔

۷- ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیّت کے زمانے میں جب عرب کسی سُنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے: ''ہم اِس وادی کے مالک جن کی پناہ مانگتے ہیں۔'' عہدِ جاہلیّت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً: اگر کسی جگہ پانی اور چارا ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدّو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارا مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اُترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے کہ ''ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں۔'' ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوئی ٹھیر جائے تو وہ جن یا تو خود ستاتا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ اسی بات کی طرف یہ ایمان لانے والے جن اشارہ کر رہے ہیں۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین کے خلیفہ انسان نے اُلٹا ہم سے ڈرنا شروع کر دیا اور خدا کو چھوڑ کر وہ ہم سے پناہ مانگنے لگا تو ہماری قوم کے لوگوں کا دماغ اَور زیادہ خراب ہوگیا، ان کا کبر و غرور اور کفر و ظلم اور زیادہ بڑھ گیا، اور وہ گمراہی میں زیادہ جری ہوگئے۔

۸- اصل الفاظ ہیں: اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ اِس فقرے کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ''اللہ کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے گا۔'' چونکہ الفاظ جامع ہیں اس لیے ان کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنّوں میں بھی رسالت اور آخرت دونوں کا

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ شُهُبًا ۸ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ
شِهَابًا رَّصَدًا ۹ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ
رَبُّهُمْ رَشَدًا ۱۰ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ

بارش ہو رہی ہے۔" اور یہ کہ "پہلے ہم سُن گُن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے، مگر اب جو چوری چھپے سُننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہابِ ثاقب لگا ہُوا پاتا ہے۔[9]"

اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی بُرا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اُن کا رب انھیں راہِ راست دکھانا چاہتا ہے۔[10]"

اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں، ہم مختلف طریقوں میں

انکار پایا جاتا تھا۔ لیکن آگے کے مضمون کی مناسبت سے پہلا مفہوم ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اس میں یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال غلط نکلا کہ اللہ کسی رسول کو مبعوث کرنے والا نہیں ہے، آسمانوں کے دروازے ہم پر اسی وجہ سے بند کیے گئے ہیں کہ اللہ نے ایک رسول بھیج دیا ہے۔

۹- یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر یہ جن اِس تلاش میں نکلے تھے کہ آخر زمین پر ایسا کیا معاملہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کی خبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس قدر سخت انتظامات کیے گئے ہیں کہ اب ہم عالَمِ بالا میں سُن گُن لینے کا کوئی موقع نہیں پاتے اور جدھر بھی جاتے ہیں مار بھگائے جاتے ہیں۔

۱۰- اس سے معلوم ہوا کہ عالَمِ بالا میں اِس قسم کے غیر معمولی انتظامات دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اُس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا اور تحفظ کے اِن انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں اُن میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے اور شہابوں کی اِس بارش کا مشاہدہ کیا تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی

قِدَدًا ۝۱۱ وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ
هَرَبًا ۝۱۲ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا
يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝۱۳ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ

بٹے ہوئے ہیں۔[۱۱]''

اور یہ کہ ''ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اُسے ہرا سکتے ہیں۔[۱۲]''

اور یہ کہ ''ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سُنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا، اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ[۱۳] ہو گا۔''

اور یہ کہ ''ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔

صورت درپیش ہے۔ آیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی قوم پر یکایک عذاب نازل کر دیا ہے؟ یا کہیں کوئی رسول مبعوث ہوا ہے؟ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے عذاب نازل نہیں کیا ہے بلکہ خَلق کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرما دیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۷۔ جلد ششم، الملک، حاشیہ ۱۱)

۱۱- یعنی اخلاقی حیثیت سے بھی ہم میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں، اور اعتقادات میں بھی ہمارا کوئی ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ہم مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ یہ بات کہہ کر یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے جنوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم راہِ راست معلوم کرنے کے یقیناً محتاج ہیں، اِس سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۲- مطلب یہ ہے کہ ہمارے اِسی خیال نے ہمیں نجات کی راہ دکھا دی۔ ہم چونکہ اللہ سے بے خوف نہ تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہ سکیں گے، اس لیے جب وہ کلام ہم نے سُنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ راست بتانے آیا تھا تو ہم یہ جرأت نہ کر سکے کہ حق معلوم ہو جانے کے بعد بھی اُنھی عقائد پر جمے رہتے جو ہمارے نادان لوگوں نے ہم میں پھیلا رکھے تھے۔

۱۳- حق تلفی سے مراد یہ ہے کہ اپنی نیکی پر وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ اور ظلم یہ ہے کہ اُسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے اور جو قصور اس سے سرزد ہوں، ان کی زیادہ سزا دے ڈالی جائے، یا بلاقصور

Maktaba Tul Ishaat.com

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا
لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً
غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ

تو جنھوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کرلیا انھوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی، اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنّم کا ایندھن بننے والے ہیں[14]۔''

اور[15] (اے نبیؐ! کہو: مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے کہ) لوگ اگر راہِ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انھیں خوب سیراب کرتے[16] تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں[17]۔ اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے[18] گا اس کا ربّ اُسے

ہی کسی کو عذاب دے دیا جائے۔ کسی ایمان لانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اِس قسم کی کسی بے انصافی کا خوف نہیں ہے۔

۱۴- سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی رُو سے جن تو خود آتشیں مخلوق ہیں، پھر جہنّم کی آگ سے ان کو تکلیف ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے تو آدمی بھی مٹّی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹّی کا ڈھیلا کھینچ مارا جائے تو اس کو چوٹ کیوں لگتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پُورا جسم اگرچہ زمین کے مادّوں سے بنا ہے، مگر جب ان سے گوشت پوست کا زندہ انسان وجود میں آجاتا ہے تو وہ ان مادّوں سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے اور انھی مادّوں سے بنی ہوئی دوسری چیزیں اس کے لیے اذیّت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جن بھی اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آتشیں مخلوق ہیں، لیکن آگ سے جب ایک زندہ اور صاحبِ احساس مخلوق وجود میں آجاتی ہے تو وہ آگ اس کے لیے تکلیف کی موجب بن جاتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الرحمٰن حاشیہ ۱۵)

۱۵- اُوپر جنوں کی بات ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشادات شروع ہوتے ہیں۔

۱۶- یہ وہی بات ہے جو سورۂ نوح میں فرمائی گئی ہے کہ اللہ سے معافی مانگو تو وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ نوح، حاشیہ ۱۲) پانی کی کثرت کو نعمتوں کی کثرت کے لیے بطورِ کنایہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پانی ہی پر آبادی کا انحصار ہے۔ پانی نہ ہو تو سرے سے کوئی بستی بس ہی نہیں سکتی، نہ انسان کی بنیادی ضروریات فراہم ہوسکتی ہیں، اور نہ انسان کی صنعتیں چل سکتی ہیں۔

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّ اَنَّهٗ
لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ ع قُلْ اِنَّمَآ
اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا
رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ

سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا اُن میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو[19]۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ[20] اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے ؏ اے نبیؐ! کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا[21]۔" کہو: "میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا۔" کہو: "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اُس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ

۱۷- یعنی یہ دیکھیں کہ وہ نعمت پا کر بھی شکر گزار رہتے ہیں یا نہیں، اور ہماری دی ہوئی نعمت کا صحیح استعمال کرتے ہیں یا غلط۔

۱۸- ذکر سے منہ موڑنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت کو قبول نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کا ذکر سُننا ہی گوارا نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کی عبادت سے رُوگردانی کرے۔

۱۹- مفسرین نے بالعموم "مساجد" کو عبادت گاہوں کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت حَسَن بصری کہتے ہیں کہ زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشا یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ ان کا اِستدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ جعلت لی الارض مسجدا وطھورا۔ "میرے لیے پُوری زمین عبادت کی جگہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔" حضرت سعید بن جُبیر نے مساجد سے مراد وہ اعضا لیے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے، یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اِس تفسیر کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضا اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، اِن پر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ نہ کیا جائے۔

۲۰- اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مُلۡتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِسٰلٰتِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ؕ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ فَسَیَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَضۡعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾

پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں[۲۲]۔ اب جو بھی اللہ اور اس کے رسُولؐ کی بات نہ مانے گا، اس کے لیے جہنّم کی آگ ہے، اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں[۲۳] گے۔"

(یہ لوگ اپنی اِس رَوش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا اِن سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھّا تعداد میں کم[۲۴] ہے۔

۲۱ – یعنی خدا کو پکارنا تو کوئی قابلِ اعتراض کام نہیں ہے جس پر لوگوں کو اس قدر غصّہ آئے، البتہ بری بات اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کو خدائی میں شریک ٹھیرائے، اور یہ کام مَیں نہیں کرتا بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا کا نام سُن کر مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔

۲۲ – یعنی میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی خدائی میں میرا کوئی دخل ہے، یا لوگوں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا کوئی اختیار مجھے حاصل ہے۔ مَیں تو صرف ایک رسول ہوں اور جو خدمت میرے سُپرد کی گئی ہے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات تمھیں پہنچا دوں۔ باقی رہے خدائی کے اختیارات، تو وہ سارے کے سارے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانا تو درکنار، مجھے تو خود اپنے نفع ونقصان کا اختیار بھی حاصل نہیں۔ اللہ کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتا، اور اللہ کے دامن کے سوا کوئی ملجا وماویٰ میرے لیے نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷)

۲۳ – اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور مَعصِیَت کی سزا اَبدی جہنّم ہے، بلکہ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات فرمائی گئی ہے، اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے اس کے لیے اَبدی جہنّم کی سزا ہے۔

۲۴ – اِس آیت کا پَس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کو سنتے ہی آپؐ پر ٹوٹ پڑتے تھے، وہ اِس زُعم میں مبتلا تھے کہ اُن کا جتھّا بڑا زبردست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾
عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ
رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

کہو: "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔[۲۵] وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطّلع نہیں کرتا،[۲۶] سوائے اُس رسول کے جسے اس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو،[۲۷] تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔[۲۸]

کے ساتھ چند مٹھی بھر آدمی ہیں، اس لیے وہ بآسانی آپؐ کو دبا لیں گے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ رسولؐ کو بے یار و مددگار اور اپنے آپ کو کثیر التعداد دیکھ کر حق کی آواز کو دبانے کے لیے بڑے دلیر ہو رہے ہیں، مگر جب وہ بُرا وقت آ جائے گا جس سے اِن کو ڈرایا جا رہا ہے، تو ان کو پتا چل جائے گا کہ بے یار و مددگار حقیقت میں کون ہے۔

۲۵- اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سوال کا جواب ہے جو سوال نقل کیے بغیر دیا گیا ہے۔ غالباً اوپر کی بات سُن کر مخالفین نے طنز اور مذاق کے طور پر سوال کیا ہوگا کہ وہ وقت جس کا ڈراوا آپؐ دے رہے ہیں، آخر کب آئے گا؟ اِس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے کہو: اُس وقت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کی تاریخ مجھے نہیں بتائی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جلدی آنے والا ہے، یا اس کے لیے ایک طویل مدت مقرر کی گئی ہے۔

۲۶- یعنی غیب کا پورا علم اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور یہ مکمل علم غیب وہ کسی کو بھی نہیں دیتا۔

۲۷- یعنی رسول بجائے خود عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ جب اس کو رسالت کا فریضہ انجام دینے کے لیے منتخب فرماتا ہے تو غیب کے حقائق میں سے جن چیزوں کا علم وہ چاہتا ہے اسے عطا فرما دیتا ہے۔

۲۸- محافظوں سے مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی نگہبانی کرنے کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے، تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ یہ وہی بات ہے جو اُوپر آیات ۸-۹ میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جنوں نے اپنے لیے عالمِ بالا تک رسائی کے تمام دروازے بند پائے اور انھوں نے دیکھا کہ سخت چوکی پہرے لگ گئے ہیں، جن کے باعث کہیں ذرا سی سُن گُن لینے کا موقع بھی ان کو نہیں ملتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

لِّيَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمۡ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ وَاَحۡصٰى كُلَّ شَىۡءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع

تاکہ وہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے،[۲۹] اور وہ اُن کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔[۳۰]‘‘ ع

۲۹ – اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ رسول یہ جان لے کہ فرشتوں نے اُس کو اللہ تعالیٰ کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیغامات اس کے رسول تک صحیح صحیح پہنچا دیے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ رسولوں نے اس کے بندوں تک اپنے رب کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے۔ آیت کے الفاظ اِن تینوں معنوں پر حاوی ہیں اور بعید نہیں کہ تینوں ہی مراد ہوں۔ اِس کے علاوہ یہ آیت دو مزید باتوں پر بھی دلالت کرتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ رسول کو وہ علمِ غیب عطا کیا جاتا ہے جو فریضۂ رسالت کی انجام دِہی کے لیے اس کو دینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو فرشتے نگہبانی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، وہ صرف اِسی بات کی نگہبانی نہیں کرتے کہ رسول تک وحی محفوظ طریقے سے پہنچ جائے، بلکہ اِس بات کی نگہبانی بھی کرتے ہیں کہ رسول اپنے رب کے پیغامات اس کے بندوں تک بے کم و کاست پہنچا دے۔

۳۰ – یعنی رسول پر بھی اور فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس طرح محیط ہے کہ اگر بال برابر بھی وہ اس کی مرضی کے خلاف جنبش کریں تو فوراً گرفت میں آ جائیں۔ اور جو پیغامات اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے ان کا حرف حرف گِنا ہوا ہے رسولوں اور فرشتوں کی یہ مجال نہیں ہے کہ ان میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی کر سکیں۔

تفہیم القرآن

المزّمّل

(۷۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

المزّمّل

نام پہلی ہی آیت کے لفظ الْمُزَّمِّلُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول اِس سورت کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔

پہلا رکوع بالاتفاق مکّی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکّی زندگی کے کس دَور میں نازل ہوا ہے، اس کا جواب ہمیں رِوایات سے تو نہیں ملتا، لیکن اِس رُکوع کے مضامین کی داخلی شہادت اِس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے:

اوّلاً، اِس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپؐ راتوں کو اُٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں، تاکہ آپؐ کے اندر نبوّت کے بارِ عظیم کو اٹھانے اور اِس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حضوؐر کی نبوت کے ابتدائی دَور ہی میں نازل ہوا ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس منصب کے لیے آپؐ کی تربیت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً، اِس میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجّد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم وبیش قرآنِ مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت قرآنِ مجید کا کم از کم اتنا حصّہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قراءت کی جا سکے۔

ثالثاً، اِس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رُکوع اُس زمانے میں نازل ہوا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں آپؐ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ ہی میں نازل ہوا ہے، لیکن بعض دوسرے مفسّرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے، اور اس رکوع کے مضامین سے اِسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں قِتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا، اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

موضوع اور مضامین پہلی سات آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس

کارِ عظیم کا بار آپؐ پر ڈالا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے آپؐ اپنے آپ کو تیار کریں، اور اُس کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ راتوں کو اُٹھ کر آپؐ آدھی آدھی رات، یا اس سے کچھ کم وبیش نماز پڑھا کریں۔

آیت ۸ سے ۱۴ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ سب سے کٹ کر اُس خدا کے ہو رہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ اپنے سارے معاملات اُسی کے سُپرد کر کے مطمئن ہو جائیں۔ مخالفین جو باتیں آپؐ کے خلاف بنا رہے ہیں، ان پر صبر کریں، اُن کے منہ نہ لگیں اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں کہ وہی اُن سے نمٹ لے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۵ سے ۱۹ تک مکہ کے اُن لوگوں کو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے، مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اُسی طرح تمھاری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا، پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ آیا تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلو گے؟

یہ پہلے رکوع کے مضامین ہیں۔ دوسرا رکوع حضرت سعید بن جُبَیر کی رِوایت کے مطابق اس کے دس سال بعد نازل ہوا اور اس میں نمازِ تہجّد کے متعلق اُس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلّق ہے وہ تو جتنی بآسانی پڑھی جا سکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ پنج وقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضۂ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خُلوصِ نیت کے ساتھ صَرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بھلائی کے کام تم دنیا میں انجام دو گے، وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اُن کی حیثیت اُس سامان کی سی ہے جو ایک مسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے سے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤ گے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے، اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اُس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمھیں دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں تمھیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بہت بڑا اجر بھی ملے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتھا ۲۰ — سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ

اَے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے[1]! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم،[2] آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو،[3] اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔[4] ہم تم پر ایک

۱ – اِن الفاظ کے ساتھ حضورؐ کو مخاطب کرنے اور پھر یہ حکم دینے سے کہ آپؐ اٹھیں اور راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے رہا کریں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت یا تو آپؐ سو چکے تھے یا سونے کے لیے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ اس موقع پر آپؐ کو اَے نبی، یا اَے رسول کہہ کر خطاب کرنے کے بجائے ”اَے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے“ کہہ کر پکارنا ایک لطیف اندازِ خطاب ہے، جس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اب وہ دَور گزر گیا جب آپؐ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتے تھے۔ اب آپؐ پر ایک کارِ عظیم کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

۲ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصّہ سونے میں صَرف کرو۔ دوسرا، یہ کہ پوری رات نماز میں گزار دینے کا مطالبہ تم سے نہیں ہے، بلکہ آرام بھی کرو اور رات کا ایک قلیل حصّہ عبادت میں بھی صَرف کرو۔ لیکن آگے کے مضمون سے پہلا مطلب ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی کی تائید سورۂ دہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ”رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو اور رات کا طویل حصّہ اُس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔“

۳ – یہ اُس مقدارِ وقت کی تشریح ہے جسے عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ خواہ آدھی رات نماز میں صَرف کریں، یا اس سے کچھ کم کردیں، یا اس سے کچھ زیادہ۔ لیکن اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ ترجیح آدھی رات ہے، کیونکہ اُسی کو معیار قرار دے کر کمی و بیشی کا اختیار دیا گیا ہے۔

۴ – یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت

عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ

بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔[۵] درحقیقت رات کا اُٹھنا[۶] نفس پر قابو پانے کے لیے بہت[۷] کارگر

پر ٹھیرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدّعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متأثّر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکّر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قراءت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبُّر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا طریقہ حضرت اَنَسؓ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپؐ اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مدّ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری) حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے تھے اور ہر آیت پر ٹھیرتے جاتے تھے، مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر رُک جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر ٹھیرتے اور اس کے بعد رُک کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتے۔ (مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، تِرمِذی) دوسری ایک روایت میں حضرت اُمِّ سَلَمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے تھے۔ (تِرمِذی، نَسائی) حضرت حُذَیفہ بن یَمانؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپؐ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دُعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے۔ (مسلم، نَسائی) حضرت ابو ذرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضورؐ اِس مقام پر پہنچے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (اگر تُو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تُو ان کو معاف فرما دے تو تُو غالب اور دانا ہے) تو اسی کو دُہراتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ (مُسْنَدِ احمد، بخاری)

۵ – مطلب یہ ہے کہ تم کو رات کی نماز کا یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ایک بھاری کلام ہم تم پر نازل کر رہے ہیں جس کا بار اٹھانے کے لیے تم میں اس کے تحمُّل کی طاقت پیدا ہونی ضروری ہے، اور یہ طاقت تمھیں اِسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھو اور آدھی آدھی رات یا کچھ کم و بیش عبادت میں گزارا کرو۔ قرآن کو بھاری کلام اس بنا پر بھی کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدُّن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام

Maktaba Tul Ishaat.com

کام کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ اور اِس بنا پر بھی اس کو بھاری کلام کہا گیا ہے کہ اس کے نُزول کا تحمّل بڑا دشوار کام تھا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپؐ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مَیں نے سخت سردی کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپؐ کی پیشانی سے اُس وقت پسینا ٹپکنے لگتا تھا۔ (بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نَسائی) ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپؐ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپؐ اونٹنی پر بیٹھے ہوں تو اُونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا۔ (مُسنَدِ احمد، حاکم، ابنِ جَریر)

۶- اصل میں لفظ نَاشِئَةَ الَّیْلِ استعمال کیا گیا ہے، جس کے متعلّق مفسرین اور اہلِ لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ناشئہ سے مراد نفسِ ناشئہ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں رات کو اٹھنا۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اُٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سو کر اُٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور مجاہدؒ نے اِسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

۷- اصل میں لفظ اَشَدُّ وَطْاً استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اُس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پا لے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلّط حاصل کر کے اپنی اِس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے، وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان مُوافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثّر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے اِن اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا، وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں رِیاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے، اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔

اَقْوَمُ قِيْلًا ۝٦ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝٧ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝٨ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝٩ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝١٠

اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔[8] دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو[9] اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اُسی کو اپنا وکیل بنا لو۔[10] اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔[11]

۸- اصل میں اَقْوَمُ قِيْلًا ارشاد ہوا ہے، جس کے لغوی معنیٰ ہیں: "قول کو زیادہ راست اور درست بناتا ہے۔" لیکن مدّعا یہ ہے کہ اُس وقت انسان قرآن کو زیادہ سکون و اطمینان اور توجہ کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ ابنِ عباسؓ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اجدر ان یفقہ فی القراٰن، یعنی "وہ اِس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی قرآن میں غور و خوض کرے۔" (ابوداؤد)

۹- دن کے اوقات کی مصروفیتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد کہ "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو" خود بخود یہ مفہوم ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام کرتے ہوئے بھی اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہو۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۳)

۱۰- وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اِسی معنیٰ میں ہم اُردو زبان میں وکیل کا لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالے اپنا مقدّمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اِس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمھارے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات تمھیں پیش آ رہی ہیں، اُن پر کوئی پریشانی تم کو لاحق نہ ہونی چاہیے۔ تمھارا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ تم اپنا معاملہ اُسی کے حوالے کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ اب تمھارا مقدّمہ وہ لڑے گا، تمھارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمھارے سارے کام وہ بنائے گا۔

۱۱- الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مُقاطعَہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِيْنَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ إِنَّ لَدَيْنَآ
أَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا أَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ
تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾

اِن جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو[۱۲] اور اِنھیں ذرا کچھ دیر اِسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (اِن کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں[۱۳] اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔ یہ اُس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔[۱۴]

کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو بالکل نظر انداز کر دو، اور ان کی کسی بدتمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ احتراز بھی کسی غم اور غصّے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اُس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سُن کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور دل پر مَیل تک نہیں آنے دیتا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کچھ اِس سے مختلف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی۔ اصل میں تو آپؐ پہلے ہی سے اِسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے، لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ کفّار کو بتا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے ایسی باتوں کے جواب میں اپنے رسول کو یہی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

۱۲- اِن الفاظ میں صاف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مکّہ میں دراصل جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے تھے اور طرح طرح کے فریب دے کر اور تعصبات ابھار کر عوام کو آپؐ کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے، وہ قوم کے کھاتے پیتے، پیٹ بھرے، خوش حال لوگ تھے، کیونکہ انھی کے مفاد پر اسلام کی اِس دعوتِ اصلاح کی زد پڑ رہی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاملہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ ہمیشہ یہی گروہ اصلاح کی راہ روکنے کے لیے سنگِ گراں بن کر کھڑا ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸۔ المومنون، ۳۳۔ سبا، ۳۴-۳۵۔ الزُّخرُف، ۲۳۔

۱۳- جہنّم میں بھاری بیڑیاں مجرموں کے پاؤں میں اس لیے نہیں ڈالی جائیں گی کہ وہ بھاگ نہ سکیں، بلکہ اس لیے ڈالی جائیں گی کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ یہ فرار سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب کے لیے ہوں گی۔

۱۴- چونکہ اُس وقت پہاڑوں کے اجزا کو باندھ کر رکھنے والی کشش ختم ہو جائے گی، اس لیے

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۥ شَٰهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
رَسُولًا ﴿١٥﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ ٱلرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿١٦﴾ فَكَيْفَ
تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ ٱلْوِلْدَٰنَ شِيبًا ﴿١٧﴾ ٱلسَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهِۦ ۚ
كَانَ وَعْدُهُۥ مَفْعُولًا ﴿١٨﴾ إِنَّ هَٰذِهِۦ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَآءَ ٱتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِۦ

تم[15] لوگوں کے پاس ہم نے اُسی طرح ایک رسولؐ تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے[16] جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسولؐ بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اُس رسُولؐ کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اُس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے[17] گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ

پہلے تو وہ باریک بُھربُھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے، پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہو گا، اس کی وجہ سے یہ ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ اسی آخری کیفیت کو سورۂ طٰہٰ، آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ اِن پہاڑوں کا کیا بنے گا۔ کہو: میرا رب ان کو دُھول بنا کر اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بَل اور سَلوٹ نہ دیکھو گے۔"

۱۵- اب مکہ کے اُن کفّار کو خطاب کیا جا رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جُھٹلا رہے تھے اور آپؐ کی مخالفت میں سرگرم تھے۔

۱۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں پر گواہ بنا کر بھیجنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ دنیا میں اُن کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دیں، اور یہ بھی کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہو گی، اُس وقت آپؐ یہ گواہی دیں کہ میں نے اِن لوگوں کے سامنے حق پیش کر دیا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴، النساء، حاشیہ ۶۴۔ جلد دوم، النحل، آیت ۸۴ و ۸۹۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۱۴)

۱۷- یعنی اوّل تو تمھیں ڈرنا چاہیے کہ اگر ہمارے بھیجے ہوئے رسول کی بات تم نے نہ مانی تو وہ بُرا انجام تمھیں دنیا ہی میں دیکھنا ہو گا جو فرعون اس سے پہلے اسی جرم کے نتیجے میں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اگر فرض کرو کہ دنیا میں تم

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۱۹ ۱۳
سَبِيلًا ﴿۱۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ
ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ

اختیار کر لے۔ ع

اے نبیؐ[18]! تمھارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات، اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو[19]، اور تمھارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے[20]۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اُسے معلوم ہے

پر کوئی عذاب نہ بھی بھیجا گیا تو روزِ قیامت کے عذاب سے کیسے بچ نکلو گے؟

۱۸- یہ آیت جس کے اندر نمازِ تہجّد کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے، اِس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مُسندِ احمد، مسلم اور ابوداؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ پہلے حکم کے بعد یہ دوسرا حکم ایک سال کے بعد نازل ہوا اور رات کا قیام فرض سے نفل کر دیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عائشہؓ ہی سے ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے یہ نقل کی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کے ۸ مہینے بعد آیا تھا، اور ایک تیسری روایت جو ابنِ ابی حاتم نے انھی سے نقل کی ہے، اس میں سولہ مہینے بیان کیے گئے ہیں۔ ابوداؤد، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک سال کی مدّت نقل کی ہے۔ لیکن حضرت سعید بن جُبیر کا بیان ہے کہ اس کا نُزول دس سال بعد ہوا ہے۔ (ابنِ جَریر و ابنِ ابی حاتم) ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ پہلے رُکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکّۂ معظّمہ میں نازل ہوا ہے، اور وہاں بھی اُس کا نزول ابتدائی دَور میں ہوا ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اِس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے، جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔ اس بنا پر لامحالہ ان دونوں رُکوعوں کے زمانۂ نزول میں کم از کم دس سال کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔

۱۹- اگرچہ ابتدائی حکم آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش کھڑے رہنے کا تھا، لیکن چونکہ نماز کی محویت میں وقت کا اندازہ نہ رہتا تھا، اور گھڑیاں بھی موجود نہ تھیں کہ اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکیں، اس لیے کبھی دو تہائی رات تک عبادت میں گزر جاتی تھی، اور کبھی یہ مدّت گھٹ کر ایک تہائی رہ جاتی تھی۔

۲۰- ابتدائی حکم میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کیا گیا تھا، اور آپؐ ہی کو قیامِ لیل کی ہدایت فرمائی گئی تھی، لیکن مسلمانوں میں اُس وقت حضورؐ کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا، اس کی

اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰى ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۖ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ

کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھ لیا کرو۔[۲۱] اُسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں[۲۲]، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں[۲۳]۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے

بنا پر اکثر صحابۂ کرامؓ بھی اِس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

۲۱ – چونکہ نماز میں طول زیادہ تر قرآن کی طویل قراءت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجّد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی۔ اس ارشاد کے الفاظ اگرچہ بظاہر حکم کے ہیں، لیکن یہ امر مُتّفق عَلَیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟'' جواب میں ارشاد ہوا: ''نہیں، اِلّا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو۔'' (بخاری ومسلم)

اِس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع وسجود فرض ہے، اسی طرح قرآنِ مجید کی قراءت بھی فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قراءت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اِس اِستنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نمازِ تہجّد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان وفرائض ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت، جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام وقعود اور رکوع وسجود بھی نفل ہی ہیں۔

۲۲ – جائز اور حلال طریقوں سے رزق کمانے کے لیے سفر کرنے کو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اللہ کا فضل تلاش کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۳ – یہاں اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر جس طرح ایک ساتھ کیا ہے اور بیماری کی مجبوری کے علاوہ اِن دونوں کاموں کو نمازِ تہجّد سے معافی یا اس میں تخفیف کا سبب قرار دیا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ
وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ
اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع

پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۲۴] اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔[۲۵] جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔[۲۶] اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ع

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من جالبٍ یجلبُ طعامًا الی بلدٍ من بلدٍ ان المسلمین فیبیعه لِسِعْرِ یومِهٖ الا کانت منزلتهٗ عنداللّٰه ثم قرأ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ ...... ”جو شخص مسلمانوں کے کسی شہر میں غلّہ لے کر آیا اور اُس روز کے بھاؤ پر اسے بیچ دیا، اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پڑھی۔“ (ابنِ مَرْدُوْیہ)

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: ما من حال یاتینی علیه الموت بعد الجهاد فی سبیل اللّٰه احبّ الی من ان یاتینی وانا بین شِعبتَی جبل التمس من فضل اللّٰه وقرأ هٰذه الاٰیة۔ ”جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے کسی پہاڑی دَرّے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آجائے، پھر انھوں نے یہی آیت پڑھی۔“ (بَیْہَقِی فی شُعب الایمان)

۲۴- مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد پنج وقتہ فرض نماز اور فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

۲۵- ابنِ زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال خدا کی راہ میں صَرف کرنا ہے، خواہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، یا بندگانِ خدا کی مدد ہو، یا رفاہِ عام ہو، یا دوسرے بھلائی کے کام۔ اللہ کو قرض دینے اور اچھا قرض دینے کے مطلب کی تشریح ہم اس سے پہلے متعدِّد مقامات پر کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۶۷۔ المائدہ، حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۶۔

۲۶- مطلب یہ ہے کہ تم نے آگے اپنی آخرت کے لیے جو کچھ بھیج دیا، وہ تمھارے لیے اُس سے زیادہ

نافع ہے جو تم نے دنیا ہی میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ایکم مالہ احب الیہ من مال وارثہ؟ ”تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟“ لوگوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا: اعلموا ما تقولون۔ ”سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ لوگوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما مال احدکم ما قدّم ومال وارثہ ما اخّر۔ ”تمھارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا۔ اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔“ (بخاری، نسائی، مُسنَدِ ابو یَعلیٰ)

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

المُدَّثِّر

(۷۴)

المدثر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ الْمُدَّثِّرُ کو اِس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے، مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزُول اِس کی پہلی سات آیات مکۂ معظمہ کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ ہیں۔ بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسندِ احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہیں، اُن میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی اوّلین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ لیکن اُمت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مُسَلَّم ہے کہ پہلی وحی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَا لَمْ یَعْلَمْ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدّت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس وقفے کے بعد جب اَز سرِ نَو نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس کا آغاز سورۂ مدّثّر کی اِنھی آیات سے ہوا تھا۔ امام زُہریؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

> ”ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اُس زمانے میں آپؐ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپؐ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپؐ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپؐ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپؐ سے کہتے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپؐ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور ہو جاتی تھی۔“ (ابنِ جَرِیر)

اس کے بعد امام زُہری خود حضرت جابر بن عبداللہؓ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَتْرَۃُ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا۔ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سُنی، سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا، مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اُس وقت اللہ نے وحی نازل کی: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ...... پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔“ (بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ جَرِیر)

سورت کا باقی ماندہ حصّہ آیت ۸ سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی عَلانیہ تبلیغ شروع

Maktaba Tul Ishaat.com

ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اُس کا مفصّل واقعہ سیرت ابنِ ہشام میں بیان کیا گیا ہے، جسے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی، جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

''پڑھو اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا۔ اِس پیغام میں آپؐ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، تاکہ آپؐ کی طبیعت پر جو شدید بار اِس پہلے تجربے سے پڑا ہے اس کا اثر دُور ہو جائے اور آپؐ ذہنی طور پر آیندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقفے کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اِس سورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپؐ اٹھیں اور خَلقِ خدا کو اُس رَوِش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے، اور اِس دنیا میں، جہاں دوسروں کی بَڑائی کے ڈنکے بج رہے ہیں، خدا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپؐ کو کرنا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو اور آپؐ تمام دنیوی فائدوں سے قطعِ نظر کر کے کامل اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری فقرے میں آپؐ کو تلقین کی گئی کہ اِس فریضے کی انجام دِہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں، اُن پر آپؐ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اِس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآنِ مجید کی پَے در پَے نازل ہونے والی سورتوں کو آپؐ نے سنانا شروع کیا تو مکّہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اِس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اِس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بینظیر اور مؤثّر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متأثّر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی، جس میں طے کیا گیا کہ

حاجیوں کے آتے ہی اُن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اِس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مُغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا: نہیں، خدا کی قسم! وہ کاہن نہیں ہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گُنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے: انھیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا: وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے، وہ کسی سے چھُپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ دیوانگی کی بڑ ہے، یا جُنون کے دَورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا: اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا: وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اِس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اِطلاق بھی نہیں ہوسکتا۔ لوگ بولے: تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا: وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمدؐ پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا: اِن باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے، لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم! اس کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا: تمھاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا: اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا: قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو، یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اِس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انھوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اُس سے ہوشیار رہنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔ (سیرۃ ابنِ ہِشام، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹- اِس قصّے کا یہ حصّہ کہ ابوجہل کے اصرار پر ولید نے یہ بات کہی تھی، عِکرِمہ کی رِوایت سے ابنِ جَریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)۔

یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصّے میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُس کے مضامین کی ترتیب

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ ہے:

آیت ۸ سے ۱۰ تک منکرینِ حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس کا بُرا انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مُغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور اُن کا جواب اس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اِس سلسلے میں اُس کی ذہنی کش مکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخرِ کار یہ بات بنا کر لایا کہ خلقِ خدا کو اِس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اِسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اُس کی اِس صریح بدباطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اِس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اِسے مزید انعامات سے نوازا جائے، حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۴۸ تک دوزخ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

پھر آیات ۴۹-۵۳ میں کفّار کے مرض کی اصل جڑ بتا دی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے بے خوف ہیں اور اِسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں، اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے، انکارِ آخرت کے ساتھ وہ ایمان کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں پڑ گئی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پُوری کرتا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کر لے۔ خدا اِس کا مستحق ہے کہ لوگ اُس کی نافرمانی سے ڈریں، اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رَوِیّہ اختیار کر لے، اسے وہ معاف کر دیتا ہے، خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

---

۵۶ آیاتہا

سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّرِ مَکِّیَّۃٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿۴﴾
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿۵﴾ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿۷﴾

اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے[۱]! اُٹھو اور خبردار کرو[۲]۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو[۳]۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو[۴]۔ اور گندگی سے دور رہو[۵]۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے[۶]۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو[۷]۔

۱- اوپر دیباچے میں ہم ان آیات کے نُزول کا جو پَس منظر بیان کر آئے ہیں اس پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ یا یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ کہہ کر مُخاطَب کرنے کے بجائے یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر کیوں مخاطَب کیا گیا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہوگئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپؐ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اَے میرے پیارے بندے! تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِعظیم کا بار ڈالا گیا ہے، جسے انجام دینے کے لیے تمھیں پورے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۲- یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿﴾ ’’اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔‘‘ (نوح-۱) آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور تمھارے گرد و پیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو چونکا دو۔ انھیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اِسی حالت میں مبتلا رہے۔ انھیں خبردار کر دو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی بازپُرس نہ ہو۔

۳- یہ ایک نبی کا اوّلین کام ہے جسے اِس دنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کردے اور ہانکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان کردے کہ اِس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیّت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اُٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شِعار ہے، کیونکہ اس اُمّت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ اِن آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکّۂ معظّمہ مشرکینِ عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اُس کے مُجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تنِ تنہا اٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا عَلَم بلند کر دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی لیے ''اٹھو اور خبردار کرو'' کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ''اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو'' اپنے اندر یہ مفہُوم بھی رکھتا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اِس کام میں تمھیں مزاحم نظر آتی ہیں، ان کی ذرا پروا نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو، وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرّہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

۴- یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہُوم میں بڑی وُسعت ہے۔

اِن کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، وہ صرف عقائد اور اَخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا، بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصوُّرات تک سے خالی تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا، اس لیے آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصّل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتّٰی کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ''طہارت'' کا ہم معنٰی ہو۔

بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے، جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم اِن الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف سُتھرا رکھو۔ راہبانہ تصوّرات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ مَیلا کُچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدّس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت مَیل کُچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو، وہ صاف سُتھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اُس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیّت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اِس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اَخلاقی عُیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس سُتھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر وغرور، رِیا اور نمایش، ٹھاٹ باٹ اور شان وشوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اوّلین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے، اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبّر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقِوارہ اور آوارہ مَنش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرتاً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شایستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اُردو زبان کی طرح عَرَبی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنیٰ الفاظ اَخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابنِ عباس، ابراہیم نَخَعی، شَعْبی، عطاء، مجاہد، قَتادہ، سعید بن جُبَیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاھر الثیاب وفلان طاھر الذیل، ”فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے“، اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اَخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں: فلانٌ دَنِس الثیاب، ”اس شخص کے کپڑے گندے ہیں“، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۵ – گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے، خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اَخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو، ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمھاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

۶ – اصل الفاظ ہیں: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ اِن کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اِن کا ترجمہ کرکے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمھاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو، اس میں کوئی شائبہ اِس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمھیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو، یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمھاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمھارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر، اور اِس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

۷ – یعنی یہ کام جو تمھارے سُپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمھیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری اپنی قوم تمھاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمھارے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبّت ہر چیز تمھارے راستے میں حائل ہوگی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے مَوقِف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپؐ اُٹھ کر نبوت کے کام کا آغاز فرما دیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اِس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپؐ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اِس کام کے لیے آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے اَخلاق اور معاملات کیسے ہونے چاہییں، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام آپؐ کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دیں، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۙ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۙ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ
غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿۱۲﴾

اچھا، جب صُور میں پھُونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی سخت دن ہوگا[۸]، کافروں کے لیے ہلکا نہ ہوگا[۹]۔ چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص[۱۰] کو جسے مَیں نے اکیلا پیدا کیا[۱۱]، بہت سا مال اُس کو دیا،

کہ اس کام میں آپ کو کن حالات سے سابقہ پیش آنا ہے اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ مَعاذ اللہ! صَرع کے دَوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا، وہ ذرا آنکھیں کھول کر اِن فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صَرع کے کسی دَورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے؟

۸ – جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، اِس سُورہ کا یہ حصّہ ابتدائی آیات کے چند مہینے بعد اُس وقت نازل ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عَلانیہ تبلیغ اسلام شروع ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ حج کا زمانہ آیا اور سردارانِ قریش نے ایک کانفرنس کر کے یہ طے کیا کہ باہر سے آنے والے حاجیوں کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی ایک زبردست مہم چلائی جائے۔ اِن آیات میں کفّار کی اِسی کارروائی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اِس تبصرے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا گیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ اچھا، یہ حرکتیں جو تم کرنا چاہتے ہو، کر لو، دنیا میں اِن سے کوئی مقصد براری تم نے کر بھی لی تو اُس روز اپنے بُرے انجام سے کیسے بچ نکلو گے جب صُور میں پھونک ماری جائے گی اور قیامت برپا ہوگی۔ (صُور کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷، الزُمَر، حاشیہ ۷۹۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۵۲)

۹ – اس ارشاد سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دن ایمان لانے والوں کے لیے ہلکا ہوگا اور اس کی سختی صرف حق کا انکار کرنے والوں کے لیے مخصوص ہوگی۔ مزید برآں یہ ارشاد اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ اُس دن کی سختی کافروں کے لیے مستقل سختی ہوگی، وہ ایسی سختی نہ ہوگی جس کے بعد کبھی اُس کے نرمی سے بدل جانے کی اُمید کی جاسکتی ہو۔

۱۰ – یہ خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! کفّار کی اس کانفرنس میں جس شخص (وَلید بن مُغیرہ) نے تمھیں بدنام کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ تمام عرب سے آنے والے حاجیوں میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾
كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ
قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ
عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ

اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیے[۱۲]، اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دوں[۱۳]۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عِناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبّر میں پڑ گیا۔ آخرِ کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو

تمھیں جادوگر مشہور کیا جائے، اُس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اُس سے نمٹنا اب میرا کام ہے، تمھیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱– اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک، یہ کہ جب مَیں نے اُسے پیدا کیا تھا، اُس وقت یہ کوئی مال اور اولاد اور وَجاہت اور ریاست لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ دوسرا، یہ کہ اُس کا پیدا کرنے والا اکیلا میں ہی تھا، وہ دوسرے معبود، جن کی خدائی قائم رکھنے کے لیے یہ تمھاری دعوتِ توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے، اُس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ شریک نہ تھے۔

۱۲– وَلید بن مُغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالدؓ بن ولید، تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اِن بیٹوں کے لیے شُہود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی، ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اس کے سب بیٹے نامُور اور بااثر ہیں، مجلسوں اور محفلوں میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ وہ اِس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

۱۳– اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اِس پر بھی اس کی حرص ختم نہیں ہوئی۔ اتنا کچھ پانے کے بعد بھی وہ

يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَآ
أَدْرَىٰكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾

جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے[14]۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے[15]۔ کھال جُھلس دینے والی[16]۔

بس اسی فکر میں لگا ہُوا ہے کہ اُسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ دوسرا مطلب حضرت حسن بصریؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر واقعی محمدؐ کا یہ بیان سچّا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی جنت بھی ہوگی تو وہ جنّت میرے ہی لیے بنائی گئی ہے۔

۱۴- یہ اُس واقعے کا ذکر ہے جو کفارِ مکہ کی مذکورۂ بالا کانفرنس میں پیش آیا تھا۔ اس کی جو تفصیلات ہم دیباچے میں نقل کر چکے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دل میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا، لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت و ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا۔ جب کفار کی اس کانفرنس میں پہلے اس نے خود اُن تمام الزامات کو رد کر دیا جو قریش کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے تھے، تو اِسے مجبُور کیا گیا کہ وہ خود کوئی ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کیا جا سکتا ہو۔ اس موقع پر جس طرح وہ اپنے ضمیر سے لڑا ہے اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر مبتلا رہ کر آخرِ کار اس نے ایک الزام گھڑا ہے، اس کی پوری تصویر یہاں کھینچ دی گئی ہے۔

۱۵- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا، اسے وہ جلا کر خاک کر دے گی مگر مر کر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹے گا، بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلایا جائے گا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ "وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا۔" (الاعلیٰ-۱۳) دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب کے مستحقین میں سے کسی کو باقی نہ رہنے دے گی جو اُس کی گرفت میں آئے بغیر رہ جائے، اور جو بھی اس کی گرفت میں آئے گا اسے عذاب دیے بغیر نہ چھوڑے گی۔

۱۶- یہ کہنے کے بعد کہ وہ جسم میں سے کچھ جلائے بغیر نہ چھوڑے گی، کھال جُھلس دینے کا الگ ذکر کرنا بظاہر کچھ غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن عذاب کی اس شکل کو خاص طور پر الگ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی چیز دراصل اس کے چہرے اور جسم کی کھال ہی ہوتی ہے، جس کی بدنُمائی اُسے سب سے زیادہ کھَلتی ہے۔ اندرونی اعضا میں خواہ اسے کتنی ہی تکلیف ہو، وہ اس پر اتنا زیادہ رنجیدہ نہیں ہوتا جتنا اس بات پر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ بدنُما ہو جائے، یا اس کے جسم کے کھلے حصوں کی جِلد پر ایسے داغ پڑ جائیں جنھیں دیکھ کر ہر شخص اُس سے گِھن کھانے لگے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ حسین چہرے اور بڑے بڑے شان دار جسم لیے ہوئے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا
عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ

اُنّیس کارکن اس پر مقرر ہیں۔۔۔ ہم [۱۷] نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں، [۱۸] اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے، [۱۹] تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آ جائے [۲۰] اور ایمان لانے والوں کا

جو لوگ آج دنیا میں اپنی شخصیت پر پُھولے پھر رہے ہیں، یہ اگر اللہ کی آیات کے ساتھ عناد کی وہ رَوِش برتیں گے جو ولید بن مُغیرہ برت رہا ہے تو ان کے منہ جُھلس دیے جائیں گے اور ان کی کھال جلا کر کوئلے کی طرح سیاہ کر دی جائے گی۔

۱۷- یہاں سے لے کر ”تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا“ تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سلسلۂ کلام کو توڑ کر اُن معترضین کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد صرف ۱۹ ہوگی، اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ اُن کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسانوں نے بھی کفر اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور دوسری طرف ہمیں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اتنی بڑی دوزخ میں اتنے بے شمار انسانوں کو عذاب دینے کے لیے صرف ۱۹ کارکن مقرر ہوں گے۔ اس پر قریش کے سرداروں نے بڑے زور کا ٹھٹھا مارا۔ ابوجہل بولا: ”بھائیو! کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی دوزخ کے ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟“ بنی جُمَح کے ایک پہلوان صاحب کہنے لگے: ”۱۷ سے تو میں اکیلا نمٹ لوں گا، باقی دو کو تم سب مل کر سنبھال لینا۔“ انھی باتوں کے جواب میں یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۸- یعنی اُن کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا تمھاری حماقت ہے۔ وہ آدمی نہیں، فرشتے ہوں گے، اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی زبردست طاقتوں کے فرشتے پیدا کیے ہیں۔

۱۹- یعنی بظاہر تو اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کی جاتی۔ لیکن ہم نے ان کی یہ تعداد اس لیے بیان کر دی ہے کہ یہ ہر اُس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کُفر چُھپائے بیٹھا ہو۔ ایسا آدمی چاہے ایمان کی کتنی ہی نمایش کر رہا ہو، اگر وہ خدا کی خدائی اور اس کی عظیم قدرتوں کے بارے میں، یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں لیے بیٹھا ہو تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِیْمَانًا وَّ لَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَ لِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ

ایمان بڑھے [21]، اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں، اور دل کے بیمار [22] اور کفّار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اِس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے [23]۔ اِس طرح

اتنی بڑی جیل میں بے حدوحساب مجرم جنّوں اور انسانوں کو صرف ۱۹ سپاہی قابو میں بھی رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کُھل کر باہر آ جائے گا۔

۲۰ - بعض مفسّرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں چونکہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے، اس لیے یہ بات سُن کر ان کو یقین آ جائے گا کہ یہ بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے: اوّل، یہ کہ یہود و نصاریٰ کی جو مذہبی کتابیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں تلاش کے باوجود ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ دوسرے، قرآنِ مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہلِ کتاب کے ہاں اُن کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس ارشاد کا صحیح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے ۱۹ فرشتوں کا ذکر سن کر میرا خوب مذاق اُڑایا جائے گا، لیکن اس کے باوجود جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی، اسے انھوں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی کے مذاق و استہزا کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ جہلائے عرب تو انبیاؑ کی شان سے ناواقف تھے، مگر اہلِ کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاؑ کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے، خواہ وہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ اس بنا پر اہلِ کتاب سے یہ بات زیادہ متوقّع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر انھیں یقین آ جائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرزِ عمل بارہا ظاہر ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال معراج کا واقعہ ہے جسے آپؐ نے کفّار کے مجمعِ عام میں بلا تکلّف بیان کر دیا اور اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کی کہ اس حیرت انگیز قصے کو سن کر آپؐ کے مخالفین کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔

۲۱ - یہ بات اس سے پہلے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے کہ ہر آزمائش کے موقع پر

Maktaba Tul Ishaat.com

جب ایک مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور شک و انکار یا اطاعت سے فرار، یا دین سے بے وفائی کی راہ چھوڑ کر یقین و اعتماد اور اطاعت و فرماں برداری اور دین سے وفاداری کی راہ اختیار کرتا ہے، تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، آیت ۱۷۳۔ جلد دوم، الانفال، آیت ۲، حاشیہ ۲، التوبہ، آیات ۱۲۴-۱۲۵، حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، الاحزاب، آیت ۲۲، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الفتح، آیت ۴، حاشیہ ۷)

۲۲- قرآنِ مجید میں چونکہ بالعُموم ''دل کی بیماری'' سے مراد منافقت لی جاتی ہے، اس لیے یہاں اس لفظ کو دیکھ کر بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ منافقین کا ظہور مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مکہ میں منافق موجود نہ تھے، اور اس کی غَلَطی ہم تفہیم القرآن، جلد سوم میں صفحہ ۶۷۲، ۶۷۴ اور ۶۸۰ تا ۶۸۲ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے، یہ طرزِ تفسیر ہمارے نزدیک دُرست نہیں ہے کہ ایک سلسلۂ کلام جو ایک خاص موقع پر خاص حالات میں ارشاد ہوا ہو، اس کے اندر یکایک کسی ایک فقرے کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے موقع پر نازل ہوا تھا اور یہاں لا کر کسی مناسبت کے بغیر شامل کر دیا گیا۔ سورۂ مدّثّر کے اس حصّے کا تاریخی پَس منظر ہمیں معتبر روایات سے معلوم ہے۔ یہ ابتدائی مکّی دَور کے ایک خاص واقعے کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اُس کا پورا سلسلۂ کلام اس واقعے کے ساتھ صریح مناسبت رکھتا ہے۔ اِس مضمون میں آخر کون سا موقع تھا کہ اِس ایک فقرے کو، اگر وہ کئی سال بعد مدینہ میں نازل ہوا تھا، اِس جگہ لا کر چَسپاں کر دیا جاتا؟ اب رہا یہ سوال کہ یہاں دل کی بیماری سے مراد کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد شک کی بیماری ہے۔ مکہ ہی میں نہیں، دنیا بھر میں، پہلے بھی اور آج بھی، کم لوگ ایسے تھے اور ہیں جو قطعیّت کے ساتھ خدا، آخرت، وحی، رسالت، جنت، دوزخ وغیرہ کا انکار کرتے ہوں۔ اکثریت ہر زمانے میں انھی لوگوں کی رہی ہے جو اس شک میں مبتلا رہے ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں، آخرت ہوگی یا نہیں، فرشتوں اور جنت اور دوزخ کا واقعی کوئی وجود ہے یا یہ محض افسانے ہیں، اور رسول واقعی رسول تھے اور ان پر وحی آتی تھی یا نہیں۔ یہی شک اکثر لوگوں کو کفر کے مَقام پر کھینچ لے گیا ہے، ورنہ ایسے بے وقوف دنیا میں کبھی زیادہ نہیں رہے جنھوں نے بالکل قطعی طور پر اِن حقائق کا انکار کر دیا ہو، کیونکہ جس آدمی میں ذرہ برابر بھی عقل کا مادّہ موجود ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ اِن اُمور کے صحیح ہونے کا امکان بالکل رد کر دینے اور اِنھیں قطعاً خارج از امکان قرار دے دینے کے لیے ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

۲۳- اس کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ وہ اِسے اللہ کا کلام تو مان رہے تھے مگر تعجب اس بات پر ظاہر کر رہے تھے کہ اللہ نے یہ بات کیوں فرمائی، بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس کلام میں ایسی بعید از عقل وفہم بات کہی گئی ہے، وہ بھلا اللہ کا کلام کیسے ہوسکتا ہے۔

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ كَلَّا وَ الْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾

ع ۱۵

اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے[۲۴]۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا[۲۵] ___ اور اس دوزخ کا ذکر اِس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو[۲۶]ع ہرگز نہیں[۲۷]، قسم ہے چاند کی، اور رات کی جب کہ وہ پلٹتی ہے،

۲۴- یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور اپنے احکام و فرامین میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ارشاد فرما دیتا ہے جو لوگوں کے لیے امتحان اور آزمایش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہی بات ہوتی ہے جسے ایک راستی پسند، سلیم الطبع اور صحیح الفکر آدمی سنتا ہے اور سیدھے طریقے سے اُس کا سیدھا مطلب سمجھ کر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اُسی بات کو ایک ہٹ دھرم، کج فہم اور راستی سے گریز کرنے والا آدمی سنتا ہے اور اُس کا ٹیڑھا مطلب نکال کر اسے حق سے دُور بھاگ جانے کے لیے ایک نیا بہانہ بنا لیتا ہے۔ پہلا آدمی چونکہ خود حق پسند ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت بخش دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت چاہنے والے کو زبردستی گمراہ کر دے۔ اور دوسرا آدمی چونکہ خود ہدایت نہیں چاہتا بلکہ گمراہی کو ہی اپنے لیے پسند کرتا ہے، اس لیے اللہ اسے ضلالت ہی کے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو حق سے نفرت رکھتا ہو، وہ اسے جبراً کھینچ کر حق کی راہ پر لائے۔ (اللہ کے ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے مسئلے پر تفہیم القرآن میں بکثرت مقامات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۰، ۱۶، ۱۹، ۲۰۔ النساء، حاشیہ ۱۷۳۔ الانعام، حواشی ۱۷، ۲۸، ۹۰۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۳۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۴۔ القصص، حاشیہ ۷۱)

۲۵- یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کو کیا کیا طاقتیں اس نے بخشی ہیں، اور ان سے کیا کیا کام وہ لے رہا ہے، ان باتوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ ایک چھوٹے سے کُرۂ زمین پر رہنے والا انسان اپنی محدود نظر سے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا اپنے آلات کی مدد سے محسوس ہوتا ہے، تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کر لینا انسان کے بس میں نہیں ہے، کجا کہ اس کی ساری وُسعتوں کا تصوُّر اس کے چھوٹے سے دماغ میں سما سکے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾
لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ
رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ

اور صبح کی جب کہ وہ روشن ہوتی ہے، یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے[۲۸]، انسانوں کے لیے ڈراوا، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے[۲۹]۔

ہر متنفّس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے[۳۰]، دائیں بازو والوں کے سوا[۳۱]، جو جنّتوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ مجرموں سے پوچھیں گے[۳۲]: ”تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟“ وہ کہیں گے: ”ہم نماز پڑھنے والوں میں سے

۲۶ – یعنی لوگ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانے اور اس کے عذاب کا مزا چکھنے سے پہلے ہوش میں آ جائیں اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔

۲۷ – یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جس کا اِس طرح مذاق اُڑایا جائے۔

۲۸ – یعنی جس طرح چاند، اور رات اور دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عظیم نشانات ہیں، اُسی طرح دوزخ بھی عظائمِ قدرت میں سے ایک چیز ہے۔ اگر چاند کا وجود غیر ممکن نہ تھا، اگر رات اور دن کا اس باقاعدگی کے ساتھ آنا غیر ممکن نہ تھا، تو دوزخ کا وجود، آخر کیوں تمھارے خیال میں غیر ممکن ہو گیا؟ اِن چیزوں کو چونکہ تم رات دن دیکھ رہے ہو، اس لیے تمھیں ان پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، ورنہ اپنی ذات میں یہ بھی اللہ کی قدرت کے نہایت حیرت انگیز معجزے ہیں، جو اگر تمھارے مشاہدے میں نہ آئے ہوتے، اور کوئی تمھیں خبر دیتا کہ چاند جیسی ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، یا سورج ایک چیز ہے جس کے چھُپنے سے دنیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے، اور جس کے نکل آنے سے دنیا چمک اُٹھتی ہے، تو تم جیسے لوگ اس بات کو سُن کر بھی اُسی طرح ٹھٹھے مارتے جس طرح دوزخ کا ذکر سُن کر ٹھٹھے مار رہے ہو۔

۲۹ – مطلب یہ ہے کہ اس چیز سے لوگوں کو ڈرا دیا گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے ڈر کر بھلائی کے راستے پر آگے بڑھے اور جس کا جی چاہے پیچھے ہٹ جائے۔

۳۰ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۱۶۔

الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

نہ تھے،[۳۳] اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے،[۳۴] اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اُس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا۔"[۳۵] اُس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کسی کام

۳۱- بالفاظِ دیگر بائیں بازو والے تو اپنے کسب کے بدلے میں پکڑ لیے جائیں گے، لیکن دائیں بازو والے اپنا فک رہن کرالیں گے۔ (دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ واقعہ، حواشی ۵-۶)

۳۲- اس سے پہلے کئی مقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میل دُور ہونے کے باوجود جب چاہیں گے ایک دوسرے کو کسی آلے کی مدد کے بغیر دیکھ سکیں گے اور ایک دوسرے سے براہِ راست گفتگو کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۴۴ تا ۵۰، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۵۰ تا ۵۷، حاشیہ ۳۲۔

۳۳- مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اولین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اُس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مُستلزِم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔

۳۴- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۳۵- یعنی مرتے دم تک ہم اِسی رَوِش پر قائم رہے، یہاں تک کہ وہ یقینی چیز ہمارے سامنے آ گئی جس سے ہم غافل تھے۔ یقینی چیز سے مراد موت بھی ہے اور آخرت بھی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ
مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ
يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ

نہ آئے گی۔[36]

آخر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اِس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں، گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔[37] بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کُھلے خط بھیجے جائیں۔[38] ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔[39] ہرگز نہیں،[40]

۳۶- یعنی ایسے لوگ جنھوں نے مرتے دم تک یہ رَوِش اختیار کیے رکھی ہو، ان کے حق میں اگر کوئی شفاعت کرنے والا شفاعت کرے بھی تو اسے معافی نہیں مل سکتی۔ شفاعت کے مسئلے کو قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی کہ شفاعت کون کرسکتا ہے اور کون نہیں کرسکتا، کس حالت میں کی جاسکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جاسکتی، کس کے لیے کی جاسکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جاسکتی، اور کس کے حق میں وہ نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجایش باقی نہیں چھوڑی۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل مُلاحظہ ہوں: البقرہ، ۲۵۵۔ الانعام، ۹۴۔ الاعراف، ۵۳۔ یونس، ۳-۱۸۔ مریم، ۸۷۔ طٰہٰ، ۱۰۹۔ الانبیاء، ۲۸۔ سبا، ۲۳۔ الزُّمر، ۴۳-۴۴۔ المومن، ۱۸۔ الدُّخان، ۸۶۔ النجم، ۲۶۔ النبا، ۳۷-۳۸۔ تفہیم القرآن میں جہاں جہاں یہ آیات آئی ہیں ہم نے ان کی اچھی طرح تشریح کر دی ہے۔

۳۷- یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصّہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اِس قدر بدحواس ہوکر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہلِ عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہوکر بھاگنے والے کو اُن جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بُو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں۔

۳۸- یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمدؐ ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو۔ اور یہ خط ایسے ہوں جنھیں دیکھ کر انھیں یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآنِ مجید میں کفارِ مکہ کا

اِنَّهٗ تَذۡكِرَةٌ ۚ﴿۵۴﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ؕ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذۡكُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ
اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهۡلُ التَّقۡوٰى وَاَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع

یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے۔ اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے[۴۱]۔ وہ اس کا حق دار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے[۴۲] اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے[۴۳]۔

یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔“ (الانعام: ۱۲۴) ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لا کر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں۔ (بنی اسرائیل: ۹۳)

۳۹ – یعنی اِن کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے یہ مطالبے پُورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انھوں نے سب کچھ اِسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور اِنھیں یہ خیال نہیں ہے کہ اِس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں اِن کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے اِن کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنیٰ سمجھتے ہیں، کیونکہ اِنھیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ لازماً دنیا میں اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور بُرا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اِس مسئلے پر غور کرنا لا حاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا۔ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابلِ غور اگر ہوسکتا ہے تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے، جہاں حق کا انجام لازماً اچھا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہوگا۔ ایسا شخص تو اُن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے، ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے۔ لیکن آخرت کا منکر، جو سرے سے تلاشِ حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے، وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے، وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی بات ہے جو سورۂ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ ”اے نبیؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھُو کر بھی دیکھ لیتے، تو جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے، وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“ (الانعام: ۷)

۴۰ – یعنی ان کا ایسا کوئی مطالبہ ہرگز پورا نہ کیا جائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۱ – یعنی کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اُس کی اپنی مشیّت ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اُسے نصیحت اُسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ اللہ کی مشیّت بھی یہ ہو کہ وہ اُسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوسرے الفاظ میں، یہاں اِس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بندے کا کوئی فعل بھی تنہا بندے کی اپنی مشیّت سے ظُہور میں نہیں آتا، بلکہ ہر فعل اُسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب خدا کی مشیّت بندے کی مشیّت سے مل جائے۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جسے نہ سمجھنے سے انسانی فکر بکثرت ٹھوکریں کھاتی ہے۔ مختصر الفاظ میں اِس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اِس دنیا میں ہر انسان کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے کر گزرے، تو ساری دنیا کا نظام دَرہم بَرہم ہو جاتا۔ جو نظم اِس جہان میں قائم ہے، وہ اِسی وجہ سے ہے کہ اللہ کی مشیّت ساری مشیّتوں پر غالب ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے، وہ اُسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اللہ بھی یہ چاہے کہ انسان کو وہ کام کرنے دیا جائے۔ یہی معاملہ ہدایت اور ضلالت کا بھی ہے۔ انسان کا محض خود ہدایت چاہنا اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے ہدایت مل جائے، بلکہ اُسے ہدایت اُس وقت ملتی ہے جب اللہ اُس کی اِس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اسی طرح ضلالت کی خواہش بھی محض بندے کی طرف سے ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ جب اللہ اس کے اندر گمراہی کی طلب پا کر یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اسے غلط راستوں میں بھٹکنے دیا جائے تب وہ اُن راہوں میں بھٹک نکلتا ہے جن پر اللہ اسے جانے کا موقع دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چور بننا چاہے تو محض اس کی یہ خواہش اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ جہاں جس کے گھر میں گُھس کر وہ جو کچھ چاہے چُرا لے جائے، بلکہ اللہ اپنی عظیم حکمتوں اور مَصلَحتوں کے مطابق اِس کی اِس خواہش کو جب اور جس قدر اور جس شکل میں پورا کرنے کا موقع دیتا ہے، اسی حد تک وہ اسے پورا کر سکتا ہے۔

۴۲ – یعنی تمھیں اللہ کی ناراضی سے بچنے کی جو نصیحت کی جا رہی ہے، وہ اِس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو اِس کی ضرورت ہے اور اگر تم ایسا نہ کرو تو اُس سے اللہ کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ یہ نصیحت اس بنا پر کی جا رہی ہے کہ اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کے بندے اس کی رضا چاہیں اور اس کی مرضی کے خلاف نہ چلیں۔

۴۳ – یعنی یہ اللہ ہی کو زیب دیتا ہے کہ کسی نے خواہ اس کی کتنی ہی نافرمانیاں کی ہوں، جس وقت بھی وہ اپنی اِس رَوِش سے باز آجائے، اللہ اپنا دامنِ رحمت اس کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ اپنے بندوں کے لیے کوئی جذبۂ انتقام وہ اپنے اندر نہیں رکھتا کہ ان کے قصوروں سے وہ کسی حال میں درگزر ہی نہ کرے اور انھیں سزا دیے بغیر نہ چھوڑے۔

تفہیم القرآن

القیامہ

(۷۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

القیامہ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقِیٰمَۃِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس سُورہ کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزُول اگرچہ کسی روایت سے اِس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوتا، لیکن اِس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۱۵ کے بعد یکایک سلسلۂ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ ''اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّے ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔'' اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا سے آیت ۱۵ تک چلا آ رہا تھا۔ یہ جملۂ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی، اور روایات کی رُو سے بھی، اِس بنا پر دورانِ کلام میں وارد ہُوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سُورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا رہے تھے، اس وقت آپؐ اِس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے دُہراتے جا رہے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نزُولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپؐ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآنِ مجید میں اس کی دو مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک سورۂ طٰہٰ میں، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ، ''اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک کہ تمھاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔'' (آیت ۱۱۴) دوسرے سورۂ اعلیٰ میں، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی، ''ہم عنقریب تم کو پڑھوا دیں گے، پھر تم بھُولو گے نہیں۔'' (آیت ۶) بعد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے قرآن میں اِن تین مقامات کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون یہاں سے آخرِ کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر اپنے

مضمون اور اندازِ بیان سے اُس زمانے کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سورۂ مُدَّثِّر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سورتوں میں ایسے پُرزور اور مؤثر طریقے سے نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہلِ مکہ کو ان کی گمراہیوں پر مُتنبِّہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بَوکھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لیے انھوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورۂ مُدَّثِّر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔

اس سورہ میں منکرینِ آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے، اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں، ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے، بلکہ اس کا اصل مُحرِّک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو، وہ آ کر رہے گا، تمھارا سب کیا دھرا تمھارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا، اور حقیقت میں تو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہوگا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لیے اپنی حرکات کے لیے کتنے ہی بہانے اور عذرات تراشتا رہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۴۰ رکوعاتہا ۲

سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝۱ وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲

نہیں،[۱] میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور نہیں، مَیں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس[۲] کی۔

۱ – کلام کی ابتدا نہیں سے کرنا خود بخود اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے سے کوئی بات چل رہی تھی جس کی تردید میں یہ سُورت نازل ہوئی ہے، اور آگے کا مضمون آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ بات قیامت اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تھی جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ مذاق بھی اُڑا رہے تھے۔ اِس طرزِ بیان کو اِس مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آپ محض رسول کی صداقت کا اقرار کرنا چاہتے ہوں تو آپ کہیں گے: ”خدا کی قسم! رسول برحق ہے۔“ لیکن اگر کچھ لوگ رسول کی صداقت کا انکار کر رہے ہوں تو آپ جواب میں اپنی بات یوں شروع کریں گے کہ ”نہیں، خدا کی قسم! رسول برحق ہے۔“ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے، مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔

۲ – قرآن مجید میں نفسِ انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اُکساتا ہے۔ اس کا نام نفسِ امّارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے، یا غلط سوچنے، یا بُری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ لوّامہ ہے، اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ مُطمئِنّہ ہے۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اُسے بیان نہیں کیا ہے، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلّق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ اَزَلی ہے نہ اَبدی۔ اِس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اِس گمانِ بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہوسکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم

بڑھتا جاتا ہے، اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامۂ ہَست و بُود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکّی انسان کو جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمھاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمھارا وجود خود تمھارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اِس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات دَرہم بَرہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو، وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور برائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس برائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو، اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اُس کے برعکس صورت میں جب کہ اسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اِس طرح کے ایک نفسِ لَوّامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لَوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعدِ موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا، اور اس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اِس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پُورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعدِ موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسُخ یا آواگَون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اِسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے، اور اس لامتناہی سلسلے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ

کیاانسان یہ سمجھ رہاہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟[۳] کیوں نہیں؟ ہم تواس کی انگلیوں کی

بجائے اس کے کہ اس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اِسی صورت میں پُورا ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں انسان کی صرف ایک زندگی ہو، اور پھر پُوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

۳- اُوپر کی دو دلیلیں، جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں: ایک، یہ کہ دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے، یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعدِ موت ممکن ہے۔ مکہ میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے، وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سیکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار برس پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پُر زور جواب اللہ تعالیٰ نے اِس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ ”کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟“ یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمھارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلاشبہ تمھارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اِس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالقِ کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو، اس کے بے شمار اجزا کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزا کو جمع نہیں کر سکتا۔

نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝۴ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸

پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۴۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۵۔ پوچھتا ہے: "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟"۶ پھر جب دِیدے پتھرا جائیں گے۷ اور چاند بے نور ہو جائے گا

۴- یعنی بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمھارا ڈھانچا پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمھارے نازک ترین اجزائے جسم، حتّیٰ کہ تمھاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

۵- اِس چھوٹے سے فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔ اِن لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اَخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انھیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں، اُسی طرح آیندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں آیندہ بھی ان کو اس کی کُھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اِن اعمال کی جواب دِہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل اُن کی عقل اُنھیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اِس میں مانع ہیں۔

۶- یہ سوال اِستِفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزا کے طور پر تھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے کہ قیامت کس روز آئے گی، بلکہ مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ آتے آتے رہ کہاں گیا ہے؟

۷- اصل میں بَرِقَ الْبَصَرُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے لُغوی معنیٰ بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چُندھیا جانے کے ہیں۔ لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اِسی معنیٰ کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ خوف زدگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثے سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ٹک ٹک رہ جائے اور اُس کی نگاہ اس پریشان کُن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو، تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اِسی مضمون کو قرآنِ مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ، "اللہ تو انھیں

Maktaba Tul Ishaat.com

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا
لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّأُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ
وَأَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿۱۵﴾

اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں[۸] گے، اُس وقت یہی انسان کہے گا: ''کہاں بھاگ کر جاؤں؟'' ہرگز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھیرنا ہوگا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا[۹]۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے[۱۰]۔۔۔۔

ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔'' (ابراہیم: ۴۲)

۸- یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظامِ عالم کے دَرہم بَرہم ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مِل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سُورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین یکایک اُلٹی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طُلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند یک لخت زمین کی گرفت سے چھُوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہُوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔

۹- اصل الفاظ ہیں: بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں، اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی، اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا، جو اس کے بعد مدت ہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا، اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنیٰ یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اُسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ

اے نبی[11]! اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں[12]، اُس وقت تم اِس کی قراءت کو غور سے سُنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے[13]۔۔۔۔ ہرگز نہیں[14]، اصل بات

اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

۱۰- یعنی آدمی کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مجرم کو اس کا جُرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اِس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسرِ عدالت جرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اِس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چھپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریّت یا شرک کا قائل ہے، وہ درحقیقت اس کی ایمان دارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اِس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اِن عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور اِن کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بد دیانت، ایک بدکردار، ایک حرام خور، اپنی بداعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آجائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مَصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اِس کے باوجود اُس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عِصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

۱۱- یہاں سے لے کر ''پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّے ہے'' تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، نبوّت کے ابتدائی دَور میں، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق

Maktaba Tul Ishaat.com

پُوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلامِ الٰہی آپؐ کو سنا رہے ہیں وہ آپؐ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لیے آپؐ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اُسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اُس وقت پیش آئی جب حضرت جبریلؑ سورۂ قیامہ کی یہ آیات آپؐ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام توڑ کر آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں، اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، آپؐ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپؐ نہ بھولیں گے، نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے۔ یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام ''ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے'' سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اِس پَس منظر سے واقف نہیں ہیں، وہ اس مقام پر اِن فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اِس پَس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالبِ علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالبِ علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے۔ یہ درس اگر جُوں کا تُوں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعے سے واقف نہ ہوں گے وہ اس سلسلۂ تقریر میں اِس فقرے کو بے جوڑ محسوس کریں گے۔ لیکن جو شخص اُس اصل واقعے سے واقف ہو گا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے، وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جُوں کا تُوں نقل کیا گیا ہے، اُسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

اُوپر اِن آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے، وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، نَسائی، ابنِ جَریر، طَبَرانی، بَیہَقی اور دوسرے محدثین نے متعدّد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ اِس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دُہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ...... یہی بات شَعْبی، ابنِ زید، ضَحّاک، حسن بصری، قَتَادَہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

۱۲- اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام قرآن پڑھ کر سُناتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں۔''

۱۳- اِس سے گمان ہوتا ہے، اور بعض اکابر مفسّرین نے بھی اِس گمان کا اظہار کیا ہے، کہ غالبًا ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم

بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپؐ خاموشی سے اس کو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلایا گیا کہ اُس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظے میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپؐ ٹھیک اُسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشا اور مدّعا بھی پوری طرح آپؐ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اُصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنھیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اِس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا جاتا تھا، وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی، وہ بہرحال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے (قرآنِ مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ''سنّت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات ۹۴-۹۵ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدّعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی، آخر اِسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپؐ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں، تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اِس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے: وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ''اور اَے نبیؐ! یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے۔'' (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰) اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سُنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اِس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آلِ عمران، ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲۔ اِن سب آیات کی تشریح ہم ''سنّت کی آئینی حیثیت'' میں صفحہ ۷۴ سے ۷۷

Maktaba Tul Ishaat.com

تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو، اِس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کرسکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے، کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اُس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے، وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کرسکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنھیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ اُن کا حقیقی مدّعا کیا ہے اور اُن میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظِ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآنِ مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعیّن نہیں کرسکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اِس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کرسکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اِس اصطلاح کا مفہوم اُسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پُوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکمِ صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تعلیم آپؐ اُن سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنھوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپؐ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم اُمّت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنّت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تعلیم سے مُسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے

تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾

یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبّت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔[۱۵] اُس روز کچھ چہرے تر وتازہ ہوں[۱۶] گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔[۱۷] اور کچھ چہرے اُداس ہوں گے

اگلی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اِس ذریعۂ علم کو قُبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں، معاذ اللہ! وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمّہ داری محض رسولؐ کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعے سے اُمّت کو کتابِ الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے، اور حدیث وسنّت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس ذمّہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پُوری اُمّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جَعل ساز لوگ وہی سکے تو جَعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو، انھیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اِس اُمّت نے اوّل روز سے اِس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا، اُتنا ہی اِس اُمّت کے خیر خواہ اِس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے مُمیّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مُستشرقین کے بہکائے میں آ کر حدیث وسنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اِس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۱۴- یہاں سے سلسلۂ کلام پھر اُسی مضمون کے ساتھ جُڑ جاتا ہے جو بیچ کے جملۂ معترضہ سے پہلے چلا آرہا تھا۔ ہرگز نہیں کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے انکارِ آخرت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ تم خالقِ کائنات کو قیامت برپا کرنے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دینے سے عاجز سمجھتے ہو، بلکہ اصل وجہ یہ ہے۔

۱۵– یہ انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ آیت نمبر ۵ میں بیان کی گئی تھی کہ انسان چونکہ فجور کی کُھلی چھوٹ چاہتا ہے اور اُن اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتا ہے جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُس پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس اُسے انکارِ آخرت پر اُبھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتا ہے تاکہ اپنے اِس انکار کو معقول ثابت کرے۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ بین ہیں اس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیّت اُنھی نتائج کی ہے جو اِسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیّت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ یا لذّت یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے، اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہییں، کیونکہ اسے پا لیا تو گویا سب کچھ پا لیا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اِسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج و غم یہاں پہنچ جائے، وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اُس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجر آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی دُور کی چیز کے لیے وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیّت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہرحال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے، خواہ اندر سے ان کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکانِ وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو اِستدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بودا ہے۔

۱۶– یعنی خوشی سے دَمک رہے ہوں گے، کیونکہ جس آخرت پر وہ ایمان لائے تھے وہ ٹھیک اُن کے یقین کے مطابق سامنے موجود ہوگی، اور جس آخرت پر ایمان لا کر انھوں نے دنیا کے ناجائز فائدے چھوڑے اور برحق نقصان برداشت کیے تھے اس کو فی الواقع اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے دیکھ کر انھیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنے رَوِیّۂِ زندگی کے متعلق بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا، اب وہ وقت آ گیا ہے جب وہ اس کا بہترین انجام دیکھیں گے۔

۱۷– مفسّرین میں سے بعض نے اسے مجازی معنٰی میں لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی کی طرف دیکھنے کے الفاظ محاورے کے طور پر اُس سے توقعات وابستہ کرنے، اس کے فیصلے کا انتظار کرنے، اس کے کرم کا امیدوار ہونے کے معنٰی میں بولے جاتے ہیں، حتّٰی کہ ایک اندھا بھی یہ کہتا ہے کہ میری نگاہیں تو فُلاں شخص کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ میرے لیے کیا کرتا ہے۔ لیکن بکثرت احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی جو تفسیر منقول ہے وہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے مکرّم بندوں کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہوگا۔ بخاری کی رِوایت ہے کہ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا ”تم اپنے رب کو عَلانِیَہ دیکھو گے۔“ مسلم اور تِرمِذی میں حضرت صُہَیب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب جنّتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں مزید کچھ دوں؟ وہ عرض کریں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا اور جہنم سے بچا نہیں لیا؟ اِس پر اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا دے گا اور اُن لوگوں کو جو کچھ انعامات ملے تھے، ان میں سے کوئی انعام بھی اُنھیں اِس سے زیادہ محبُوب نہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کی دِید سے مُشرّف ہوں، اور یہی وہ مزید انعام ہے جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَۃٌ۔ یعنی ”جن لوگوں نے نیک عمل کیا ان کے لیے اچھا اجر ہے اور اس پر مزید بھی۔“ (یونس: ۲۶) بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خُدرِیؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کو دیکھیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی دقّت ہوتی ہے جب کہ بیچ میں بادل بھی نہ ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے رب کو دیکھو گے۔ اسی مضمون سے ملتی جُلتی ایک اور رِوایت بخاری و مسلم میں حضرت جَرِیر بن عبداللہؓ سے مروی ہے۔ مُسْنَدِ احمد، ترمِذِی، دارقُطنی، ابنِ جَرِیر، ابن المُنْذِر، طَبَرانی، بَیْہَقی، ابنِ ابی شَیْبَہ اور بعض دوسرے محدثین نے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ اہلِ جنت میں کم سے کم درجے کا جو آدمی ہوگا وہ اپنی سلطنت کی وسعت دو ہزار سال کی مَسافَت تک دیکھے گا، اور ان میں سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگ ہر روز دو مرتبہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ پھر حضوؐر نے یہی آیت پڑھی کہ ”اُس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔“ ابنِ ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف دیکھیں گے، پھر جب تک اللہ ان سے پردہ نہ فرمالے گا، اس وقت تک وہ جنّت کی کسی نعمت کی طرف توجہ نہ کریں گے اور اسی کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ یہ اور دوسری بہت سی رِوایات ہیں جن کی بنا پر اہلِ السنّت قریب قریب بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ آخرت میں اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرّف ہوں گے۔ اور اس کی تائید قرآنِ مجید کی اِس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ”ہرگز نہیں، وہ (یعنی فُجّار) اُس روز اپنے رب کی دِید سے محروم ہوں گے۔“ (المُطفّفین: ۱۵) اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ محرومی فُجّار کے لیے ہوگی، نہ کہ اَبرار کے لیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان خدا کو دیکھ کیسے سکتا ہے؟ دیکھنے کے لیے تو لازم ہے کہ کوئی چیز کسی خاص جِہت، مقام، شکل اور رنگ میں سامنے موجود ہو، روشنی کی شعاعیں اُس سے منعکس ہوکر انسان کی آنکھ پر پڑیں اور آنکھ سے دماغ کے مرکزِ بینائی تک اس کی تصویر منتقل ہو۔ کیا اللہ رب العالمین کی ذات کے متعلّق اِس طرح قابلِ دید ہونے کا تصوُّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسان اس کو دیکھ سکے؟ لیکن یہ سوال دراصل ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں دو چیزوں کے درمیان فرق نہیں کیا گیا ہے۔ ایک چیز ہے دیکھنے کی حقیقت، اور دوسری چیز ہے دیکھنے کا فعل صادر ہونے کی وہ خاص صورت جس سے ہم اِس دنیا میں آشنا ہیں۔ دیکھنے کی حقیقت یہ ہے کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

تَظُنُّ اَنۡ يُّفۡعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ؕ﴿۲۵﴾ كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِىَ ۙ﴿۲۶﴾ وَقِيۡلَ مَنۡ ٜ
رَاقٍ ۙ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الۡفِرَاقُ ۙ﴿۲۸﴾ وَالۡتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ

اور سمجھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے۔ ہرگز نہیں[18]، جب جان حلق تک پہنچ جائے گی، اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھُونک کرنے والا[19]، اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جُدائی کا وقت ہے، اور پنڈلی سے پنڈلی جُڑ جائے گی[20]، وہ دن ہو گا تیرے رب

دیکھنے والے میں بینائی کی صفت موجود ہو، وہ نابینا نہ ہو، اور دیکھی جانے والی چیز اُس پر عیاں ہو، اس سے مخفی نہ ہو۔ لیکن دنیا میں ہم کو جس چیز کا تجربہ اور مُشاہدہ ہوتا ہے وہ صرف دیکھنے کی وہ خاص صورت ہے جس سے کوئی انسان یا حیوان بالفعل کسی چیز کو دیکھا کرتا ہے، اور اس کے لیے لامحالہ یہ ضروری ہے کہ دیکھنے والے کے جسم میں آنکھ نامی ایک عُضو موجود ہو، اُس عضو میں بینائی کی طاقت پائی جاتی ہو، اُس کے سامنے ایک ایسی محدود مجسّم رنگ دار چیز حاضر ہو جس سے روشنی کی شعاعیں منعکس ہو کر آنکھ پر پڑیں، اور آنکھ میں اس کی شکل سما سکے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے کی حقیقت کا عملی ظہور صرف اُسی خاص صورت میں ہو سکتا ہے جس سے ہم اِس دنیا میں واقف ہیں، تو یہ خود اُس کے اپنے دماغ کی تنگی ہے، ورنہ درحقیقت خدا کی خدائی میں دیکھنے کی ایسی بے شمار صورتیں ممکن ہیں جن کا ہم تصوُّر بھی نہیں کر سکتے۔ اِس مسئلے میں جو شخص اُلجھتا ہے، وہ خود بتائے کہ اُس کا خدا بینا ہے یا نابینا؟ اگر وہ بینا ہے اور اپنی ساری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے، تو کیا وہ اِسی طرح آنکھ نامی ایک عُضو سے دیکھ رہا ہے جس سے دنیا میں انسان وحیوان دیکھ رہے ہیں، اور اُس سے بینائی کے فعل کا صُدور اُسی طریقے سے ہو رہا ہے جس طرح ہم سے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، اور جب اس کا جواب نفی میں ہے، تو آخر کسی صاحبِ عقل وفہم انسان کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ آخرت میں اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار اُس مخصوص شکل میں نہیں ہو گا جس میں انسان دنیا میں کسی چیز کو دیکھتا ہے، بلکہ وہاں دیکھنے کی حقیقت کچھ اور ہو گی جس کا ہم یہاں اِدراک نہیں کر سکتے؟ واقعہ یہ ہے کہ آخرت کے معاملات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ہمارے لیے اُس سے زیادہ مشکل ہے جتنا ایک دو برس کے بچے کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اِزدواجی زندگی کیا ہوتی ہے، حالانکہ جوان ہو کر اُسے خود اُس سے سابقہ پیش آنا ہے۔

۱۸- اس ”ہرگز نہیں“ کا تعلق اُسی سلسلۂ کلام سے ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا ہے، یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ تمھیں مر کر فنا ہو جانا ہے اور اپنے رب کے حُضور واپس جانا نہیں ہے۔

۱۹- اصل میں لفظ رَاقٍ استعمال ہوا ہے، جو رُقیہ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے، جس کے معنی تعویذ گنڈے اور

يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ
ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾

کی طرف روانگی کا ہے۔

مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جُھٹلایا اور پلٹ گیا، پھر اکڑتا ہُوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔[۲۱] یہ رَوِش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں، یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔[۲۲]

جھاڑ پھونک کے ہیں، اور رَقی سے بھی، جس کے معنٰی چڑھنے کے ہیں۔ اگر پہلے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آخر وقت میں جب مریض کے تیماردار ہر دوا دارو سے مایوس ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ ارے، کسی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کو تلاش کرو جو اِس کی جان بچالے۔ اور اگر دوسرے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اُس وقت فرشتے کہیں گے کہ اِس رُوح کو کسے لے کر جانا ہے؟ ملائکۂ عذاب کو یا ملائکۂ رحمت کو؟ بالفاظِ دیگر اُسی وقت یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ مرنے والا کس حیثیت میں عالَمِ آخرت کی طرف جا رہا ہے۔ نیک انسان ہوگا تو ملائکۂ رحمت اسے لے جائیں گے، اور بد انسان ہوگا تو رحمت کے فرشتے اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے اور عذاب کے فرشتے اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔

۲۰ — مفسّرین میں سے بعض نے لفظِ ساق (پنڈلی) کو عام لُغوی معنٰی میں لیا ہے، اور اس کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے وقت جب ٹانگیں سُوکھ کر ایک دوسری سے جُڑ جائیں گی۔ اور بعض نے عربی محاورے کے مطابق اِسے شدّت اور سختی اور مصیبت کے معنٰی میں لیا ہے، یعنی اُس وقت دو مصیبتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گی: ایک دنیا اور اس کی ہر چیز سے جدا ہو جانے کی مصیبت، اور دوسری عالَمِ آخرت میں ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہو کر جانے کی مصیبت، جس سے ہر کافر و منافق اور ہر فاسق و فاجر کو سابقہ پیش آئے گا۔

۲۱ — مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سُنا جو اُوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار ہی پر اَڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ مجاہد، قتادہ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ یہ شخص ابوجہل تھا۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص تھا جس نے سورۂ قیامہ کی مذکورۂ بالا آیات سننے کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

اس آیت کے یہ الفاظ کہ ”اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی“ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کرنے کا اوّلین اور لازمی تقاضا یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ﴿۳۶﴾ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ

کیا[۲۳] انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مُہمَل چھوڑ دیا جائے گا؟[۲۴] کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا

کہ آدمی نماز پڑھے۔ شریعتِ الٰہی کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد ہی میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدّت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آ جاتا ہے اور اُسی وقت یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ واقعی اس کے دل کی آواز ہے یا محض ایک ہَوا ہے جو اُس نے چند الفاظ کی شکل میں منہ سے نکال دی ہے۔

۲۲- مفسّرین نے اَوْلٰی لَکَ کے متعدِّد معنٰی بیان کیے ہیں: تُف ہے تجھ پر۔ ہلاکت ہے تیرے لیے۔ خرابی، یا تباہی، یا کمبختی ہے تیرے لیے۔ لیکن ہمارے نزدیک موقع و محل کے لحاظ سے اس کا مناسب ترین مفہوم وہ ہے جو حافظ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ''جب تُو اپنے خالق سے کفر کرنے کی جرأت کر چکا ہے تو پھر تجھ جیسے آدمی کو یہی چال زیب دیتی ہے جو تُو چل رہا ہے۔'' یہ اُسی طرح کا طنزیہ کلام ہے جیسے قرآنِ مجید میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں عذاب دیتے ہوئے مجرم انسان سے کہا جائے گا کہ ذُقۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ، ''لے چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تُو۔'' (الدُّخان:۴۹)

۲۳- اب کلام کو ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کا اعادہ کیا جا رہا ہے جس سے کلام کا آغاز کیا گیا تھا، یعنی زندگی بعدِ موت ضروری بھی ہے اور ممکن بھی۔

۲۴- عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اُس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو، جدھر چاہے چَرتا پھرے، کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اِسی معنٰی میں ہم شُترِ بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شُترِ بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پُرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآنِ مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفّار سے فرمائے گا: اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمھیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمھیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے؟'' (المؤمنون:۱۱۵) ان دونوں مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمھیں اپنے اور جانور میں یہ کھُلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم بااختیار، اس کے افعال میں اَخلاقی حُسن و قُبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمھارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح

مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝٣٧ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝٣٨ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝٣٩ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝٤٠ ع

جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا دُرست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اِس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟[۲۵] ع

جانور غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ ہے، اسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھائے جانے کی معقول وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے صرف اپنی جِبِلّت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبُود نہیں بنایا، نہ خود کسی کا معبُود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سُنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل دَر نسل چلتے رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے، کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمّہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پُرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو، جب کہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اَخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مُستوجِب ہونے کا تمھاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی اچانک کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمھارے نزدیک اس کو ٹلُوہ (scot free) چھُوٹ جانا چاہیے اور اِس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بُھگتتی رہیں، کیا تمھاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اسے بھی کسی بُھنگے یا ٹِڈّے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دِہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی ہو اور جیتے جی مصیبتیں ہی بُھگتتا رہا ہو کیا تمھارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اِس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

۲۵- یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی دلیل ہے۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلّق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے تو فی الحقیقت اس دلیل کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈِھٹائی برتیں، ان کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اِس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے، وہ دوبارہ بھی اِسی انسان کو

Maktaba Tul Ishaat.com

وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اِس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اگر ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اِس بات کی کیا توجیہ ہے کہ آغازِ آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصّے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیّت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدایش مسلسل اِس تناسُب سے ہوتی چلی جارہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آیندہ اُس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جارہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اِتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اُٹھ کر بے تکلّف ایک روز یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ (بیجنگ) اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حواشی ۲۷ تا ۳۰۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۷)

متعدّد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اِس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں)، کبھی سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات، خداوندا! کیوں نہیں) اور کبھی سُبْحٰنَكَ فَبَلٰی یا سُبْحٰنَكَ وَبَلٰی فرمایا کرتے تھے۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابوداؤد) ابوداؤد میں حضرت ابوہُرَیرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سورۂ تین میں آیت اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ (کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟) پڑھو تو کہو: بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ (کیوں نہیں، مَیں اِس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں) اور جب سورۂ قیامہ کی یہ آیت پڑھو تو کہو: بَلٰی۔ اور جب سورۂ مُرسَلات کی آیت فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ (اس قرآن کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟) پڑھو تو کہو: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (ہم اللہ پر ایمان لائے)۔ اسی مضمون کی روایات امام احمد، تِرمِذی، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیہ، بَیْہَقی اور حاکم نے بھی نقل کی ہیں۔

تفہیم القرآن

الدھر

(٧٦)

Maktaba Tul Ishaat.com

الدہر

نام اِس سورت کا نام "الدّہر" بھی ہے اور "الانسان" بھی۔ دونوں نام پہلی ہی آیت کے الفاظ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ اور حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ سے ماخوذ ہیں۔

زمانۂ نُزُول اکثر مفسّرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں۔ علّامہ زَمَخشَرِی، امام رازی، قاضی بَیضاوِی، علّامہ نظام الدین نَیسابُوری، حافظ ابنِ کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اِسے مکّی ہی لکھا ہے، اور علّامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جُمہور کا قول ہے۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے پوری سورت کو مدنی کہا ہے، اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ہے تو مکی، مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔

جہاں تک اِس سورت کے مضامین اور اندازِ بیان کا تعلق ہے، وہ مدنی سورتوں کے مضامین اور اندازِ بیان سے بہت مختلف ہے، بلکہ اس پر غور کرنے سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف مکّی ہے بلکہ مکۂ معظّمہ کے بھی اُس دَور میں نازل ہوئی ہے جو سورۂ مُدّثِّر کی ابتدائی سات آیات کے بعد شروع ہوا تھا۔ رہیں آیات ۸ تا ۱۰ (وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ سے لے کر يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا تک) تو وہ پوری سورت کے سلسلۂ بیان میں اِس طرح پیوست ہیں کہ سِیاق وسَباق کے ساتھ کوئی اُن کو پڑھے تو ہرگز یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ اِن سے پہلے اور بعد کا مضمون تو ۱۵-۱۶ سال پہلے نازل ہوا تھا اور اُس کے کئی سال بعد نازل ہونے والی یہ تین آیتیں یہاں لاکر ثبت کر دی گئیں۔

دراصل جس بنا پر اِس سورت کے، یا اِس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے، وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما بیمار ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچوں کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی خادمہ فِضّہؓ نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرما دی تو یہ سب شکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ دونوں تندرست ہوگئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ حضرت علیؓ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔

انھوں نے تین صاع جَو قرض لیے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کرکے حاصل کیے)۔ پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے بعد کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک یتیم آ گیا اور اس نے سوال کیا۔ اُس روز بھی سارا کھانا انھوں نے اُس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آ کر وہی سوال کر دیا اور اُس روز کا بھی پورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؓ دونوں بچوں کو لیے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ بھوک کی شدّت سے تینوں باپ بیٹوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپؐ اُٹھ کر اُن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نِڈھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رقّت طاری ہوگئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انھوں نے عرض کیا کہ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اہلِ بیت کے معاملے میں آپؐ کو مبارک باد دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب میں یہ پوری سورت آپؐ کو پڑھ کر سنائی۔ (ابنِ مِہران کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ سے لے کر آخر تک کی آیات سنائیں۔ مگر ابنِ مَرْدُوْیہ نے ابنِ عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ ...... حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اِس قصّے کا اُس میں کوئی ذکر نہیں ہے)۔ یہ پورا قصّہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البَسِیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اُسی سے زَمَخْشَرِی، رازی اور نَیسابُوری وغیرہم نے اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت اوّل تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے۔ پھر دِرایت کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر آ کر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے۔ پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے، انھیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہمِ دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہوگا۔ اِس کے علاوہ قیدیوں کے معاملے میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دَور میں کبھی نہیں رہا کہ انھیں بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کی خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی، اور کسی شخص کے سُپرد کیے جاتے تو وہ شخص انھیں کھلانے پلانے کا ذمّہ دار ہوتا تھا۔ اس لیے مدینۂ طیّبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک

Maktaba Tul Ishaat.com

مانگنے کے لیے نکلتا۔ تاہم اِن تمام نقلی اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اِس قصّے کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اِس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس نیک عمل کا صُدُور ہوا تو جبریلؑ نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپؐ کے اہلِ بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہوا ہے، کیونکہ اُنھوں نے ٹھیک وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سورۂ دہر کی اِن آیات میں فرمائی ہے۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اِسی موقع پر ہوئی تھیں۔ شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی، تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اِس واقعے پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سُیُوطی نے اِتقان میں حافظ ابنِ تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فُلاں معاملے میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے، اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو۔'' آگے چل کر وہ امام بدرالدین زَرکَشی کا قول اُن کی کتاب البُرہان فی عُلوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ ''صحابہؓ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اِس معاملے پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اِس واقعے کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اُس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے، نہ کہ بیانِ واقعہ کی۔'' (الاِتقان فی علوم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)

موضوع اور مضمون

اِس سورہ کا موضوع انسان کو دنیا میں اُس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی اِس حیثیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر شکر کا رویّہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کفر کی راہ چلے تو کس انجام سے وہ دوچار ہوگا۔ قرآن کی بڑی سورتوں میں تو یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن ابتدائی مکّی دَور کی سورتوں کا یہ خاص اندازِ بیان ہے کہ جو باتیں بعد کے دَور میں مفصّل ارشاد ہوئی ہیں، وہی اِس دَور میں بڑے مختصر مگر انتہائی مؤثر طریقے سے ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقرے استعمال کیے گئے ہیں جو سننے والوں کی زبان پر خودبخود چڑھ جائیں۔

اِس میں سب سے پہلے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب وہ کچھ نہ تھا، پھر ایک مخلوط نُطفے سے اُس کی ایسی حقیر سی ابتدا کی گئی کہ اُس کی ماں تک کو خبر نہ تھی کہ اُس کے وجود کی بنا پڑ گئی ہے اور کوئی اُس خُردبینی وجود کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے

جو آگے چل کر اِس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے۔ اس کے بعد انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اِس طرح کر کے تجھے یہ کچھ ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش گوش رکھنے والا بنایا گیا اور تیرے سامنے شُکر اور کفر کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے گئے، تاکہ یہاں کام کرنے کا جو وقت تجھے دیا گیا ہے، اس میں تُو دکھا دے کہ اس امتحان سے تو شاکر بندہ بن کر نکلا ہے یا کافر بندہ بن کر۔

پھر صرف ایک آیت میں دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اِس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے، انھیں آخرت میں کیا انجام دیکھنا ہوگا۔

اس کے بعد آیت ۵ سے ۲۲ تک مسلسل اُن انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ اپنے رب کے ہاں نوازے جائیں گے جنھوں نے یہاں بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ اِن آیات میں صرف اُن کی بہترین جزا بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُن کے وہ کیا اعمال ہیں جن کی بنا پر وہ اِس جزا کے مستحق ہوں گے۔ مکّی دَور کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیّت یہ بھی ہے کہ اُن میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصوُّرات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اَخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابلِ قدر ہیں، اور کہیں اعمال و اخلاق کی اُن برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اِس لحاظ سے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ ان کا کیا اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی اِس عارضی زندگی میں نکلتا ہے، بلکہ صرف اِس حیثیت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کی اَبدی اور پائدار زندگی میں اُن کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا، قطعِ نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بُری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔

یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ اس کے بعد دوسرے رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کر کے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک یہ کہ دراصل یہ ہم ہی ہیں جو اِس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تم پر نازل کر رہے ہیں، اور اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ کفّار کو خبردار کرنا ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نازل کرنے والے ''ہم'' ہیں اور ہماری حکمت ہی اِس کی مُقتضی ہے کہ اسے یک بارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کریں۔ دوسری بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمائی گئی ہے کہ تمھارے رب کا فیصلہ صادر ہونے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، اور اس دَوران میں تم پر خواہ کچھ ہی گزر جائے، بہرحال تم صبر کے ساتھ اپنا فریضۂ رسالت انجام دیے چلے جاؤ اور کبھی اِن بدعمل اور منکرِ حق لوگوں میں سے کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ تیسری بات آپؐ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ شب و روز اللہ کو یاد کرو، نماز پڑھو اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارو،

Maktaba Tul Ishaat.com

کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے کفر کی طُغیانی کے مقابلے میں اللہ کی طرف بلانے والوں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

پھر ایک فقرے میں کفّار کے غلط رَوِیے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آخرت کو بھول کر دنیا پر فریفتہ ہوگئے ہیں، اور دوسرے فقرے میں اُن کو مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ تم خود نہیں بن گئے ہو، ہم نے تمھیں بنایا ہے، یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں تم نے خود اپنے لیے نہیں بنا لیے ہیں، ان کے بنانے والے بھی ہم ہی ہیں، اور یہ بات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے کہ جو کچھ ہم تمھارے ساتھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ تمھاری شکلیں بگاڑ سکتے ہیں۔ تمھیں ہلاک کر کے کوئی دوسری قوم تمھاری جگہ لا سکتے ہیں۔ تمھیں مار کر دوبارہ جس شکل میں چاہیں تمھیں پیدا کر سکتے ہیں۔

آخر میں کلام اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ یہ ایک کلمۂ نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔ مگر دنیا میں انسان کی چاہت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کسی کی چاہت بھی پوری نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہے، اور اللہ کی چاہت اندھا دُھند نہیں ہے، وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنا پر چاہتا ہے۔ اِس علم اور حکمت کی بنا پر جسے وہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور جسے وہ ظالم پاتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب کا انتظام اس نے کر رکھا ہے۔

۳۱ آیاتہا

سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا؟[۱]

۱- پہلا فقرہ ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ۔ اکثر مُفسّرین ومُترجمین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنیٰ میں لیا ہے، اور وہ اس کے معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں ''کیا'' کے معنیٰ ہی میں استعمال ہوتا ہے، اور اِس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فُلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں: ''کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟'' کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے، اور یہ انکار ہم اِس انداز میں کرتے ہیں کہ ''کیا یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟'' کبھی ہم ایک شخص سے کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں اور اِس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا میں نے تمھاری رقم ادا کر دی؟'' اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اِس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ مُخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبُور کر دیں جو لازماً اُس کے اقرار سے بطورِ نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں: ''کیا میں نے تمھارے ساتھ کوئی بُرائی کی ہے؟'' اِس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اُس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے، بلکہ اُسے یہ سوچنے پر مجبُور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے، اس کے ساتھ میں بُرائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیتِ زیرِ بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اِسی آخری معنیٰ میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اُس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبُور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اُس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا، وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہو گا؟

دوسرا فقرہ ہے: حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ۔ دہر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، اور حِین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اِس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مدّعا یہ ہے کہ اِس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوعِ انسانی ہی موجود نہ تھی۔ پھر اُس میں ایک وقت ایسا آیا جب انسان نام کی ایک نوع کا آغاز کیا گیا۔ اور

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ‌ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۝۳

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا[۲] تاکہ اس کا امتحان لیں[۳]، اور اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا[۴]۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شُکر کرنے والا بنے یا کُفر کرنے والا[۵]۔

اِسی زمانے کے اندر ہر شخص پر ایک ایسا وقت آیا ہے جب اسے عَدَم سے وجود میں لانے کی ابتدا کی گئی۔

تیسرا فقرہ ہے: لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا، یعنی اُس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اُس کا ایک حصّہ باپ کے نُطفے میں ایک خُردبینی کیڑے کی شکل میں اور دوسرا حصّہ ماں کے نُطفے میں ایک خُردبینی بیضے کی شکل میں موجود تھا۔ مدت ہائے دراز تک تو انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ اِس کیڑے اور بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقت ور خُردبینوں سے اِن دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اِس کیڑے میں اور کتنا ماں کے اِس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت ان دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خَلیۃ (cell) وجود میں آتا ہے، وہ ایک ایسا ذرّۂ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقت ور خُردبین ہی سے نظر آ سکتا ہے، اور اسے دیکھ کر بھی بادی النظر میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے، نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اِس حقیر سی ابتدا سے نَشوونُما پا کر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قد وقامت، کس شکل و صورت، کس قابلیّت اور شخصیّت کا انسان ہوگا۔ یہی مطلب ہے اِس ارشاد کا کہ اُس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا اگرچہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کا آغاز ہو گیا تھا۔

۲- ''ایک مخلوط نُطفے'' سے مُراد یہ ہے کہ انسان کی پیدائش مرد اور عورت کے دو الگ الگ نطفوں سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ دونوں نُطفے مل کر جب ایک ہو گئے تب اُس مُرکّب نُطفے سے انسان پیدا ہوا۔

۳- یہ ہے دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدّت تک اپنے حصّے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دنیا اُس کے لیے نہ دار العذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دار الجزا ہے، جیسا کہ تناسُخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادّہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رَزم گاہ، جیسا کہ ڈاروِن اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عُمر سمجھتا ہے، حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرُّف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن

حیثیتوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اِس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اِس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔ اور اُس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اِس پر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا، اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اُسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدا، یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جواب دِہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جواب دِہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ (یہ مضمون قرآنِ مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مَقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پُوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرستِ موضوعات کے اندر لفظ ''آزمائش'' نکال کر وہ تمام مَقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اِس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو)۔

۴ — اصل میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا'' اِس کا مفہوم صحیح طور پر ''ہوش گوش رکھنے والا بنایا'' سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنیٰ ''سننے والا'' اور بصیر کے معنیٰ ''دیکھنے والا'' کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ یہی ہے، مگر ہر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے، حالانکہ وہ بھی سننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سننے اور دیکھنے سے مراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مُراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائعِ علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں، اس لیے اختصار کے طور پر صرف انھی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں، وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے ہیں، کیونکہ اس کے ہر حاسہ کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعے سے آنے والی معلومات کو جمع کر کے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے، اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رَویّۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کر کے ہم اس کا امتحان لینا چاہتے تھے، یہ ارشاد فرمانا کہ اِسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا، دراصل یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب

Maktaba Tul Ishaat.com

محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا ہی ہو، تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مُستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵- یعنی ہم نے اسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شُکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کون سا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمّہ دار وہ خود ہو۔ سورۂ بَلَد میں یہی مضمون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ''اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیروشر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے۔'' اور سورۂ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے: وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا، ''اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے۔'' اِن تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآنِ مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ''راستہ دکھانے'' سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے، بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

(۱) ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اَخلاقی حِس بھی دی گئی ہے، جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو بُرا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتّٰی کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی بُرائیوں کو اُنھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ وہی بُرائیاں اگر کوئی دوسرا اُن کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اُٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ اُن کو بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت اور حماقت اور دقیانوسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اُس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو، یا کر رہا ہو، یا کر چکا ہو۔ اِس ضمیر کو خواہ انسان کتنی ہی تھپکیاں دے کر سُلائے، اور اس کو بے حس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، لیکن وہ اسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ڈھیٹ بن کر اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے، وہ حجتیں بگھار کر دنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے، وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے لیے بے شمار

عذرات تراش سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اللہ نے اس کی فطرت میں جو مُحاسِب بٹھا رکھا ہے، وہ اتنا جان دار ہے کہ کسی بُرے انسان سے یہ بات چھُپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ ''انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔'' (آیت ۱۵)

(۳) انسان کے اپنے وجود میں اور اُس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہوسکتا، نہ بہت سے خدا اِس کارخانۂ ہستی کے بنانے والے اور چلانے والے ہوسکتے ہیں۔ اِسی طرح آفاق اور اَنفُس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر اِن سے آنکھیں بند کرلے، یا اپنی عقل سے کام لے کر اِن پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چُرائے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

(۴) انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجرِبات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مَشِیَّت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجرِبات و مُشاہدات صرف خارج ہی میں اِس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے، جس کی بنا پر بڑے سے بڑ دہریّہ بھی، بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

(۵) انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جرم کی سزا اور عُمدہ خدمات کا صلہ ملن ضروری ہے۔ اِسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے، اور جن خدمات کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مُکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلّق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مُسَلَّم ہے کہ اِس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پُوری سزا تو درکنار، سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جاسکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کرلے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصوُّر رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوگیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب اُس کے ذمّے رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصوُّر آخر آ کہاں سے گیا؟

Maktaba Tul Ishaat.com

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا ④ إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ
يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ⑤ عَيْنًا يَشْرَبُ
بِهَا عِبَادُ ٱللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ⑥ يُوفُونَ بِٱلنَّذْرِ وَ

کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔
نیک لوگ[6] (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پییں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی،
یہ ایک بہتا چشمہ[7] ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے[8] شراب پییں گے اور جہاں چاہیں گے
بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے۔[9] یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دُنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں،[10] اور

(۶) اِن تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دنیا میں انبیاءؑ بھیجے اور کتابیں نازل کیں، جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شُکر کی راہ کون سی ہے اور کُفر کی راہ کون سی اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاءؑ اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات، بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اِتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصوُّر، آخرت کے تصوّر، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اَخلاقی اُصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاءؑ اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاءؑ اور کتابوں کے منکر ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنھی کی تعلیمات سے چھَن چھَن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اِن چیزوں کا اصل ماخذ کون سا ہے۔

۶ – اصل میں لفظ ابرار استعمال ہوا ہے، جس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی اطاعت کا حق ادا کیا ہو، اُس کے عائد کیے ہوئے فرائض بجا لائے ہوں، اور اُس کے منع کیے ہوئے افعال سے اجتناب کیا ہو۔

۷ – یعنی وہ کافور ملا ہوا پانی نہ ہوگا بلکہ ایسا قدرتی چشمہ ہوگا جس کے پانی کی صفائی اور ٹھنڈک اور خوشبو کافور سے ملتی جُلتی ہوگی۔

۸ – عِبادُاللہ (اللہ کے بندے) یا عبادالرحمٰن (رحمٰن کے بندے) کے الفاظ اگرچہ لُغوی طور پر تمام انسانوں کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب ہی خدا کے بندے ہیں، لیکن قرآن میں جہاں بھی یہ الفاظ آئے ہیں،

ان سے نیک بندے ہی مراد ہیں۔ گویا کہ بدلوگ، جنھوں نے اپنے آپ کو بندگی سے خارج کر رکھا ہو، اِس قابل نہیں ہیں کہ اُن کو اللہ تعالیٰ اپنے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے عِباد اللہ یا عِباد الرحمٰن کے معزّز خطاب سے نوازے۔

۹۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں وہ کُدال پھاوڑے لے کر نالیاں کھودیں گے اور اس طرح اس چشمے کا پانی جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے، بلکہ ان کا ایک حکم اور اشارہ اس کے لیے کافی ہو گا کہ جنت میں جہاں وہ چاہیں اُسی جگہ وہ چشمہ پھوٹ بہے۔ بسہولت نکال لینے کے الفاظ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۰۔ نذر پوری کرنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب کیا گیا ہو، اُسے وہ پورا کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے خود اپنے اُوپر واجب کر لیا ہو، یا بالفاظِ دیگر، جس کام کے کرنے کا اس نے عہد کیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب ہو، خواہ وہ اُس پر واجب کیا گیا ہو یا اُس نے خود اپنے اُوپر واجب کر لیا ہو، اسے وہ پُورا کرے۔ اِن تینوں مفہُومات میں سے زیادہ معروف مفہوم دوسرا ہے اور عام طور پر لفظِ نذر سے وہی مراد لیا جاتا ہے۔ بہرحال یہاں اُن لوگوں کی تعریف یا تو اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ واجبات کو پورا کرتے ہیں، یا اِس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ ایسے نیک لوگ ہیں کہ جو خیر اور بھلائی کے کام اللہ نے ان پر واجب نہیں کیے ہیں، ان کو بھی انجام دینے کا جب وہ اللہ سے عہد کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، کجا کہ اُن واجبات کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کریں جو اللہ نے ان پر عائد فرمائے ہیں۔

جہاں تک نذر کے احکام کا تعلق ہے، اُن کو مختصر طور پر ہم تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۱۰ میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُن کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے، تاکہ لوگ نذر کے معاملے میں جو غَلَطیاں کرتے ہیں یا جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، ان سے بچ سکیں اور نذر کے صحیح قواعد سے واقف ہو جائیں:

(۱) فقہا نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں: ایک، یہ کہ ایک آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اُس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے، یہ کہ وہ اِس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فُلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فُلاں نیک کام کروں گا۔ اِن دونوں قسم کی نذروں کو فقہا کی اصطلاح میں نذرِ تبرُّر (نیکی کی نذر) کہتے ہیں اور اِس پر اتفاق ہے کہ اسے پُورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے، یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ چوتھے، یہ کہ آدمی کوئی مُباح کام کرنے کو اپنے اُوپر لازم کر لے، یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا، یا کوئی خلافِ اَولیٰ کام کرنے کا عہد کر لے۔ ان دونوں قِسموں کی نذروں کو فقہا کی اصطلاح میں نذرِ لَجاج (جہالت اور جھگڑالوپن اور ضد کی نذر) کہتے ہیں۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی، اور چوتھی قسم کے متعلق فقہا میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفّارہ ادا کر دینا چاہیے، اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے، یا کفّارہ ادا کر دے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

شافعیوں اور مالکیوں کے نزدیک یہ نذر بھی سرے سے منعقد نہیں ہوتی۔ اور حنفیوں کے نزدیک دونوں قسموں کی نذروں پر کفارہ لازم آتا ہے۔ (عُمدۃ القاری)

(۲) متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نذر ماننے سے منع فرمایا ہے جو یہ سمجھتے ہوئے مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی، یا جس میں کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے لیے بطورِ شکر کرنے کے بجائے آدمی اللہ تعالیٰ کو بطورِ معاوضہ یہ پیش کش کرے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں آپ کے لیے فلاں نیک کام کر دوں گا۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایت ہے کہ اَخَذ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینھٰی عن النذر ویقول انه لا یردّ شیئًا وانما یُسْتَخْرَجُ به من البخیل۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ نذر ماننے سے منع کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ وہ کسی ہونے والی چیز کو پھیر نہیں سکتی، البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (مسلم، ابوداؤد) حدیث کے آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ بخیل یوں تو راہِ خدا میں مال نکالنے والا نہ تھا، نذر کے ذریعے سے اِس لالچ میں وہ کچھ خیرات کر دیتا ہے کہ شاید یہ معاوضہ قبول کر کے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقدیر بدل دے۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: النّذرُ لا یُقَدِّمُ شَیْئًا ولا یُؤَخِّرُہٗ وانما یُسْتَخْرَجُ بِہٖ من البخیل۔ ''نذر نہ کوئی کام پہلے کرا سکتی ہے، نہ کسی ہوتے کام میں تاخیر کرا سکتی ہے۔ البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل کے ہاتھ سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم) ایک اور روایت میں وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا: انه لا یاتی بخیرٍ و انما یستخرج به من البخیل۔ ''اس سے کوئی کام بنتا نہیں ہے، البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم) تقریباً اسی مضمون کی متعدّد روایات مسلم نے حضرت ابوہُریرہؓ سے نقل کی ہیں، اور ایک روایت بخاری و مسلم دونوں نے نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان النذر لا یقرّب من ابن اٰدمَ شیئًا لم یکن اللّٰہ قدرہ لهٗ ولٰکن النذر یوافقُ القدر فیُخرجُ بذالك من البخیل ما لم یکن البخیل یرید ان یُّخْرِجَ۔ ''درحقیقت نذر ابنِ آدم کو کوئی ایسی چیز نہیں دلوا سکتی جو اللہ نے اس کے لیے مقدّر نہ فرمائی ہو، لیکن نذر ہوتی تقدیر کے مطابق ہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تقدیرِ الٰہی وہ چیز بخیل کے پاس سے نکال لاتی ہے جسے وہ کسی اور طرح نکالنے والا نہ تھا''۔ اسی مضمون پر مزید روشنی حضرت عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص کی اس روایت سے پڑتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما النذر ما ابتُغِیَ بہٖ وجهُ اللّٰہ ''اصل نذر تو وہ ہے جس سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو۔'' (طَحاوِی)

(۳) نذر کے معاملے میں ایک اور قاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ صرف وہ نذر پوری کرنی چاہیے جو اللہ کی اطاعت میں ہو۔ اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر ہرگز پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایسی چیز میں کوئی نذر نہیں ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو، یا ایسے کام میں کوئی نذر نہیں ہے جو انسان کے بس میں نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من نذر ان یطیع اللّٰہ فَلْیُطِعْهُ ومن نذر ان یعص اللّٰہ

فلا یعصہٖ۔" جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہیے، اور جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اسے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، طحاوی) ثابت بن ضحاک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا وفاء لنذرٍ فی معصیة اللّٰہ ولا فیما لا یملك ابن اٰدم۔" اللہ کی نافرمانی میں کسی نذر کے پورا کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ کسی ایسی چیز میں جو آدمی کی مِلکیت میں نہ ہو۔" (ابوداؤد) مسلم نے اسی مضمون کی رِوایت حضرت عمرانؓ بن حُصین سے نقل کی ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت اس سے زیادہ مفصّل ہے جس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لا نذر ولا یمین فی مالا یملك ابن اٰدم، ولا فی معصیة اللّٰہ، ولا فی قطیعة رحم۔" کوئی نذر اور کوئی قسم کسی ایسے کام میں نہیں ہے جو آدمی کے بس میں نہ ہو، یا اللہ کی نافرمانی میں ہو، یا قطعِ رحمی کے لیے ہو۔"

(۴) جس کام میں بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور آدمی نے خواہ مخواہ کسی فضول کام، یا ناقابلِ برداشت مَشَقّت، یا محض تعذیبِ نفس کو نیکی سمجھ کر اپنے اوپر لازم کر لیا ہو، اُس کی نذر پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اِس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا، ایک صاحب دھوپ میں کھڑے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کون ہیں اور کیسے کھڑے ہیں؟ عرض کیا گیا: یہ ابو اسرائیل ہیں، اِنھوں نے نذر مانی ہے کہ کھڑے رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، نہ سایہ کریں گے، نہ کسی سے بات کریں گے، اور روزہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: مُرُوْہُ فَلْیَتَکَلَّمْ وَلْیَسْتَظِلَّ وَلْیَقْعُدْ، وَلْیُتِمَّ صَوْمَہٗ" ان سے کہو بات کریں، سایے میں آئیں، بیٹھیں، البتہ روزہ پورا کریں۔" (بخاری، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، مُوطّا) حضرت عُقبہؓ بن عامر جُہنیؓ کہتے ہیں کہ میری بہن نے ننگے پاؤں پیدل حج کرنے کی نذر مانی اور یہ نذر بھی مانی کہ اس سفر میں سر پر کپڑا بھی نہ ڈالیں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس سے کہو کہ سواری پر جائے اور سر ڈھانکے۔ (ابوداؤد۔ مسلم نے اس مضمون کی متعدِّد روایات نقل کی ہیں جن میں کچھ لفظی اختلاف ہے)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عُقبہؓ بن عامر کی بہن کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنْ نذرھا، مُرْھا فلترکب۔" اللہ کو اِس کی اِس نذر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ سواری پر جائے۔" (ابوداؤد) ایک اور روایت میں حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: میری بہن نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللّٰہ لا یصنع بشقاء اختك شیئًا فلتحجَّ راکبة" تیری بہن کے مَشَقّت میں پڑنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اسے سواری پر حج کرنا چاہیے۔" (ابوداؤد) حضرت اَنسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (غالباً سفرِ حج میں) دیکھا کہ ایک بڑے میاں کو ان کے دو بیٹے سنبھالے لیے چل رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: اِنھوں نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عن تعذیب ھٰذا نفسہٗ وامرہٗ ان یرکب۔" اللہ تعالیٰ اِس سے بے نیاز ہے کہ یہ شخص اپنے نفس کو

Maktaba Tul Ishaat.com

عذاب میں ڈالے۔" پھر آپؐ نے اُسے حکم دیا کہ سوار ہو۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد۔ مسلم میں اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔)

(۵) اگر کسی نذر کو پورا کرنا عملاً ممکن نہ ہو تو اسے کسی دوسری صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے روز ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے مکہ آپؐ کے ہاتھ پر فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہیں پڑھ لے۔ اس نے پھر پوچھا۔ آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا: آپؐ نے فرمایا: شأنك اذًا، "اچھا تو تیری مرضی۔" دوسری ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی بعث محمّدًا بالحق، لو صلّیت ھٰھنا لاجزأ عنك صلٰوۃً فی بیت المقدس۔ "قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر تو یہیں نماز پڑھ لے تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے کے بدلے یہ تیرے لیے کافی ہوگی۔" (ابوداؤد)

(۶) اگر کسی نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینے کی نذر مان لی ہو تو اس کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اسے ایک تہائی مال دے دینا چاہیے، اور مالکیہ میں سے سَحنُون کا قول ہے کہ اسے اتنا مال دے دینا چاہیے جسے دینے کے بعد وہ تکلیف میں نہ پڑ جائے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر یہ نذر تبرُّر کی نوعیت کی ہو تو اسے سارا مال دے دینا چاہیے، اور اگر یہ نذرِ لَجاج ہو تو اُسے اختیار ہے کہ نذر پوری کرے یا قسم کا کفّارہ ادا کر دے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اسے اپنا وہ سب مال دے دینا چاہیے جس میں زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، لیکن جس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، مثلاً مکان یا ایسی ہی دوسری اَملاک، اس پر اِس نذر کا اطلاق نہ ہوگا۔ حَنَفِیّہ میں سے امام زُفَر کا قول ہے کہ اپنے اہل وعیال کے لیے دو مہینے کا نفقہ رکھ کر باقی سب صدقہ کر دے۔ (عُمدۃ القاری، شرح مُوَطّا از شاہ ولی اللہ صاحبؒ) حدیث میں اس مسئلے کے متعلق جو روایات آئی ہیں وہ یہ ہیں: حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جو عتاب مجھ پر ہوا تھا، اس کی جب معافی مل گئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بات بھی شامل تھی کہ میں اپنے سارے مال سے دست بردار ہو کر اسے اللہ اور رسول کی راہ میں صدقہ کر دوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، ایسا نہ کرو۔ میں نے عرض کیا: پھر آدھا مال؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر ایک تہائی؟ فرمایا: ہاں۔ (ابوداؤد) دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنا کچھ مال اپنے لیے روک رکھو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ (بخاری) امام زُہری کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابولُبابہؓ نے (جن پر اِسی غزوۂ تبوک کے معاملے میں عتاب ہوا تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں صدقہ کے طور پر اپنے سارے مال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: تمھارے لیے اُس میں سے صرف ایک تہائی دے دینا کافی ہے۔ (مُوَطّا)

(۷) اسلام قبول کرنے سے پہلے اگر کسی شخص نے کسی نیک کام کی نذر مانی ہو تو کیا اسلام قبول کرنے کے بعد

اسے پُورا کیا جائے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔ بخاری، ابوداؤد اور طَحاوِی میں حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے زمانۂ جاہلیّت میں نذر مانی تھی کہ ایک رات (اور بروایتِ بعض، ایک دن) مسجدِ حرام میں اعتکاف کریں گے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: اوفِ بنذرك ”اپنی نذر پوری کرو۔“ بعض فقہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ ایسا کرنا واجب ہے، اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مُستحب ہے۔

(۸) میّت کے ذمّہ اگر کوئی نذر رہ گئی ہو تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہَوَیہ، ابوثَور اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ میت کے ذمہ اگر روزے یا نماز کی نذر رہ گئی ہو تو وارثوں پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ نذر اگر بدنی عبادت (نماز یا روزہ) کی ہو تو وارثوں پر اُس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، اور اگر مالی عبادت کی ہو، اور مرنے والے نے اپنے وارثوں کو اسے پورا کرنے کی وصیت نہ کی ہو تو اسے بھی پورا کرنا واجب نہیں، البتہ اگر اس نے وصیّت کی ہو تو اس کے ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک نذر پوری کرنی واجب ہو گی۔ مالکیہ کا مذہب بھی اس سے مِلتا جُلتا ہے۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر غیر مالی عبادت کی ہو، یا مالی عبادت کی ہو اور میت نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا ہو، تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر میّت نے ترکہ چھوڑا ہو تو وارثوں پر مالی عبادت کی نذر پوری کرنا واجب ہے، خواہ اس نے وصیّت کی ہو یا نہ کی ہو۔ (شرح مسلم لِلنَّوَوِی۔ بَذْلُ المجہود شرح ابی داؤد) حدیث میں اس مسئلے کے متعلّق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ ایک نذر تھی جو انھوں نے پوری نہیں کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے پوری کر دو۔ (ابوداؤد، مسلم) دوسری رِوایَت ابنِ عباسؓ سے یہ ہے کہ ایک عورت نے بحری سفر کیا اور نذر مانی کہ اگر میں زندہ سلامت واپس گھر پہنچ گئی تو ایک مہینے کے روزے رکھوں گی۔ واپس آنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور وہ مر گئی۔ اس کی بہن یا بیٹی نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے تُو روزے رکھ لے۔ (ابوداؤد) ایسی ہی ایک روایت ابوداؤد نے حضرت بُرَیدہؓ سے نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ سے اسی طرح کا مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے اسے وہی جواب دیا جو اُوپر مذکور ہوا ہے۔ ان روایات میں چونکہ یہ بات صاف نہیں ہے کہ حضورؐ کے یہ ارشادات وجوب کے معنیٰ میں تھے یا استحباب کے معنیٰ میں، اور حضرت سعد بن عُبادہؓ کی والدہ کی نذر کے معاملے میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ مالی عبادت کے بارے میں تھی یا بدنی عبادت کے بارے میں، اسی بنا پر فقہا کے درمیان اِس مسئلے میں اختلافات ہوئے ہیں۔

(۹) غلط اور ناجائز نوعیت کی نذر کے معاملے میں یہ بات تو صاف ہے کہ اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اس پر کفّارہ لازم آتا ہے یا نہیں۔ اِس مسئلے میں چونکہ روایات مختلف ہیں، اس لیے فقہا

Maktaba Tul Ishaat.com

يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝٧ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ

اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی، اور اللہ کی محبت[11] میں مسکین اور یتیم اور قیدی[12] کو کھانا کھلاتے ہیں[13] (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے

کے مسالک بھی مختلف ہیں۔ ایک قسم کی روایات میں یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی صورت میں کفّارہ کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا نذر فی معصیۃ وکفارتہ کفارۃ یمین، ''معصیت میں کوئی نذر نہیں ہے اور اس کا کفّارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہے۔'' (ابوداؤد) عُقبہؓ بن عامر جُہَنی کی بہن کے معاملے میں (جس کا ذکر اُوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اپنی نذر توڑ دیں اور تین دن کے روزے رکھیں۔ (مسلم، ابوداؤد) ایک اور عورت کے معاملے میں بھی، جس نے پیدل حج کی نذر مانی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ سواری پر حج کے لیے جائے اور قسم کا کفّارہ ادا کردے۔ (ابوداؤد) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من نذر نذرًا لم یسمہ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا فی معصیۃ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا لایطیقہ فکفارتہ کفّارۃ یمین، ومن نذر نذرًا اطاقہ فلیفِ بہٖ۔ ''جس نے ایک نذر مان لی اور اس بات کا تعیُّن نہ کیا کہ کس بات کی نذر مانی ہے وہ قسم کا کفّارہ دے۔ اور جس نے معصیت کی نذر مانی وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ قدرت نہ رکھتا ہو وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے وہ پورا کرسکتا ہو وہ اسے پورا کرے۔'' (ابوداؤد) دوسری طرف وہ احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کفارہ نہیں ہے۔ اُوپر نمبر ۴ میں جن صاحب کا ذکر آیا ہے کہ انھوں نے دھوپ میں کھڑے رہنے اور کسی سے بات نہ کرنے کی نذر مانی تھی، اُن کا قصّہ نقل کر کے امام مالکؒ نے مُوَطّا میں لکھا ہے کہ مجھے کسی ذریعے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نذر توڑنے کا حکم دینے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہو کہ وہ کفارہ ادا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرًا منھا فلیدعھا ولیاتِ الذی ھو خیرٌ فان ترکھا کفارتھا، ''جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں وہ دیکھے کہ اس سے بہتر بات دوسری ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہو اور اسے چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے۔'' (ابوداؤد۔ بَیْہَقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اور حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت کہ ''جو کام بہتر ہے وہ کرے، اور یہی اس کا کفارہ ہے'' ثابت نہیں ہے۔) امام نَوَوِی اِن احادیث پر بحث کرتے ہوئے شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، شافعیؒ، ابوحنیفہؒ، داؤد ظاہری اور جمہور علما کہتے ہیں کہ مَعصِیَت کی نذر باطل ہے اور اسے پورا نہ کرنے پر کفارہ لازم نہیں آتا۔

جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝٩ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠
فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝١١

نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ،[14] ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انھیں اُس دن کے شر سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور سُرور بخشے گا،[15]

اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ کفّارہ لازم آتا ہے۔

۱۱ – اصل الفاظ ہیں: عَلٰی حُبِّہٖ۔ اکثر مفسّرین نے حُبِّہٖ کی ضمیر کا مرجع ''کھانے'' کو قرار دیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کھانے کے محبوب اور دل پسند ہونے اور خود اس کے حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے: عَلٰی حُبِّ الْاِطْعَام، یعنی غریبوں کو کھانا کھلانے کے شوق میں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور حضرت فُضَیل بن عیاضؒ اور ابوسلیمان الدّارانیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد کا یہ فقرہ کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (ہم تو اللہ کی خوشنودی کی خاطر تمھیں کھلا رہے ہیں) اِسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔

۱۲ – قدیم زمانے میں دستور یہ تھا کہ قیدیوں کو ہتھکڑی اور بیڑیاں لگا کر روزانہ باہر نکالا جاتا تھا اور وہ سڑکوں پر یا محلّوں میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے تھے۔ بعد میں اسلامی حکومت نے یہ طریقہ بند کیا۔ (کتاب الخَراج، امام ابو یُوسُف، صفحہ ۱۵۰، طبع ۱۳۸۲ھ) اِس آیت میں قیدی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قید میں ہو، خواہ کافر ہو یا مسلمان، خواہ جنگی قیدی ہو، یا کسی جرم میں قید کیا گیا ہو، خواہ اسے قید کی حالت میں کھانا دیا جاتا ہو یا بھیک منگوائی جاتی ہو، ہر حالت میں ایک بے بس آدمی کو جو اپنی روزی کے لیے خود کوئی کوشش نہ کرسکتا ہو، کھانا کھلانا ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔

۱۳ – اگرچہ بجائے خود کسی غریب کو کھانا کھلانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے، لیکن کسی حاجت مند کی دوسری حاجتیں پوری کرنا بھی ویسا ہی نیک کام ہے جیسا بھوکے کو کھانا کھلانا۔ مثلاً کوئی کپڑے کا محتاج ہے، یا کوئی بیمار ہے اور علاج کا محتاج ہے، یا کوئی قرض دار ہے اور قرض خواہ اسے پریشان کر رہا ہے، تو اس کی مدد کرنا کھانا کھلانے سے کم درجے کی نیکی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں نیکی کی ایک خاص صورت کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے، ورنہ اصل مقصود حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

۱۴ – ضروری نہیں ہے کہ غریب کو کھانا کھلاتے ہوئے زبان ہی سے یہ بات کہی جائے۔ دل میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے، اور اللہ کے ہاں اِس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زبان سے کہنے کی ہے۔ لیکن زبان سے یہ بات کہنے کا ذکر اِس لیے کیا گیا ہے کہ جس کی مدد کی جائے، اُس کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ ہم اس سے کسی قسم کا شکریہ یا بدلہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ
لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا

اور ان کے صبر کے بدلے میں[16] انھیں جنّت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اُونچی مَسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انھیں دُھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی،

نہیں چاہتے، تاکہ وہ بے فکر ہو کر کھائے۔

۱۵ – یعنی چہروں کی تازگی اور دل کا سرور۔ دوسرے الفاظ میں روزِ قیامت کی ساری سختیاں اور ہولناکیاں صرف کفار و مجرمین کے لیے ہوں گی، نیک لوگ اُس دن ہر تکلیف سے محفوظ اور نہایت خوش و خرم ہوں گے۔ یہی بات سُورۂ انبیاء میں بیان کی گئی ہے کہ ”وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا“ (آیت ۱۰۳) اور اسی کی صراحت سورۂ نمل میں کی گئی ہے کہ ”جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اُسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا، اور ایسے لوگ اُس دن کے ہَول سے محفوظ ہوں گے۔“ (آیت ۸۹)

۱۶ – یہاں صبر بڑے وسیع معنٰی میں استعمال ہوا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہلِ ایمان کی پوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دَم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتّٰی کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہِ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اُس فائدے اور لذّت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج اور اذیّت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اِس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اِس نیک رَوِیّے کے ثمرات اِس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۶۰۔ آلِ عمران، حواشی ۱۳، ۱۰۷، ۱۳۱۔ الانعام، حاشیہ ۲۳۔ جلد دوم، الانفال، حواشی ۳۷، ۴۷۔ یونس، حاشیہ ۹۔ ہود، حاشیہ ۱۱۔ الرعد، حاشیہ ۳۹۔ النحل، حاشیہ ۹۸۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۴۰۔ الفرقان، حاشیہ ۹۴۔ القصص، حواشی ۷۵، ۱۰۰۔ العنکبوت، حاشیہ ۹۷۔ جلد چہارم، لقمان، حواشی ۲۹، ۵۶۔ السجدہ، حاشیہ ۳۷۔ الاحزاب، حاشیہ ۵۸۔ الزُّمَر، حاشیہ ۳۲۔ حٰم السجدہ، حاشیہ ۳۸۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۵۳)

وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ
كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿۱۵﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿۱۶﴾ وَيُسْقَوْنَ
فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿۱۸﴾

اور اُس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انھیں توڑ لیں)۔ اُن کے آگے چاندی کے برتن[۱۷] اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے، شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے[۱۸] ہوں گے، اور ان کو (منتظمینِ جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا[۱۹] ہو گا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سُونٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا[۲۰] ہے۔

۱۷۔ سورۂ زُخرُف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے آگے سونے کے برتن گردش کرائے جا رہے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی وہاں سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندی کے۔

۱۸۔ یعنی وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ چاندی کی یہ قسم اِس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف جنّت کی خصوصیّت ہوگی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہلِ جنّت کے دسترخوان پر پیش کیے جائیں گے۔

۱۹۔ یعنی ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیے جائیں گے۔ نہ وہ اُس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ بالفاظِ دیگر، اہلِ جنت کے خُدّام اس قدر ہوشیار اور تمیزدار ہوں گے کہ وہ جس کی خدمت میں جامِ شراب پیش کریں گے، اس کے متعلّق ان کو پورا اندازہ ہو گا کہ وہ کتنی شراب پینا چاہتا ہے۔ (جنت کی شراب کی خُصوصیات کے متعلق مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۴۵ تا ۴۷، حواشی ۲۴ تا ۲۷۔ جلد پنجم، سورۂ محمد، آیت ۱۵، حاشیہ ۲۲۔ الطُّور، آیت ۲۳، حاشیہ ۱۸۔ الواقعہ، آیت ۱۹، حاشیہ ۱۰)

۲۰۔ اہلِ عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں اُن کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا، بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی مگر اس کی تلخی نہ ہوگی، اس لیے اُس کا نام سلسبیل ہوگا۔ سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔ مفسرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اُس چشمے کے لیے بطورِ صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطورِ اسم۔

قرأ حفص بغیر الألف فی الوصل فیهما ووقف علی الأول بألف وعلی الثانی بغیر الألف ۱۲

Maktaba Tul Ishaat.com

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا
مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ
سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ ع

ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دَوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں[21]۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمھیں نظر آئے گا[22]۔ اُن کے اُوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے[23]، ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے[24]، اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا[25]۔ یہ ہے تمھاری جزا، اور تمھاری کارگزاری قابلِ قدر ٹھیری ہے[26]۔ ع

۲۱ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۲۶۔ جلد پنجم، الطُّور، حاشیہ ۱۹، الواقعہ، حاشیہ ۹۔

۲۲ – یعنی دنیا میں خواہ کوئی شخص فقیر بے نوا ہی کیوں نہ رہا ہو، جب وہ اپنے اعمالِ خیر کی بنا پر جنت میں جائے گا تو وہاں اِس شان سے رہے گا کہ گویا وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے۔

۲۳ – یہی مضمون سورۂ کہف، آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے کہ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ”وہ (یعنی اہلِ جنّت) باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اُونچی مَسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔“ اس بنا پر اُن مفسرین کی رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی جنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جو اُن کی مَسندوں یا مسہریوں کے اُوپر لٹکے ہوئے ہوں گے، یا یہ اُن لڑکوں کا لباس ہوگا جو اُن کی خدمت میں دوڑے پھر رہے ہوں گے۔

۲۴ – سورۂ کہف، آیت ۳۱ میں فرمایا گیا ہے: يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ ”وہ وہاں سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے۔“ یہی مضمون سورۂ حج، آیت ۲۳، اور سورۂ فاطر، آیت ۳۳ میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تین صورتیں ممکن محسوس ہوتی ہیں: ایک، یہ کہ کبھی وہ چاہیں گے تو سونے کے کنگن پہنیں گے اور کبھی چاہیں گے تو چاندی کے کنگن پہن لیں گے۔ دونوں چیزیں ان کے حسبِ خواہش موجود ہوں گی۔ دوسرے، یہ کہ سونے اور چاندی کے کنگن وہ بیک وقت پہنیں گے، کیونکہ دونوں کو ملا دینے سے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ

اے نبیؐ! ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے،[27] لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو،[28]

حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ تیسرے، یہ کہ جس کا جی چاہے گا سونے کے کنگن پہنے گا اور جو چاہے گا چاندی کے کنگن استعمال کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ زیور تو عورتیں پہنتی ہیں، مَردوں کو زیور پہنانے کا کیا موقع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں بادشاہوں اور رئیسوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہاتھوں اور گلے اور سر کے تاجوں میں طرح طرح کے زیورات استعمال کرتے تھے، بلکہ ہمارے زمانے میں برطانوی ہند کے راجاؤں اور نوابوں تک میں یہ دستور رائج رہا ہے۔ سورۂ زُخرُف میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب اپنے سادہ لباس میں بس ایک لاٹھی لیے ہوئے فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے کہا کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تو اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ اچھا سفیر ہے جو اس حالت میں میرے سامنے آیا ہے، فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (آیت ۵۳) یعنی اگر یہ زمین و آسمان کے بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا ملائکہ کا کوئی لشکر ہی اس کی اَردلی میں آتا۔

۲۵ — پہلے دو شرابوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ ایک وہ جس میں آبِ چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری وہ جس میں آبِ چشمۂ زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ ان دونوں شرابوں کے بعد اب پھر ایک شراب کا ذکر کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کا رب انھیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا، یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ کوئی اور بہترین نوعیت کی شراب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضلِ خاص کے طور پر انھیں پلائی جائے گی۔

۲٦ — اصل الفاظ ہیں: كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا، یعنی تمھاری سعی مشکور ہوئی۔ سَعی سے مراد وہ پورا کارنامۂ حیات ہے جو بندے نے دنیا میں انجام دیا۔ جن کاموں میں اس نے اپنی محنتیں اور جن مقاصد کے لیے اس نے اپنی کوششیں صَرف کیں، اُن سب کا مجموعہ اُس کی سعی ہے، اور اس کے مشکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قابلِ قدر قرار پائی۔ شکر یہ جب بندے کی طرف سے خدا کے لیے ہو تو اس سے مراد اس کی نعمتوں پر احسان مندی ہوتی ہے، اور جب خدا کی طرف سے بندے کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمات کی قدر فرمائی۔ آقا کی یہ بہت بڑی عنایت ہے کہ بندہ جب اس کی مرضی کے مطابق اپنا فرض انجام دے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔

۲۷ — یہاں مُخاطَب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن دراصل رُوئے سُخن کفار کی طرف ہے۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآنِ مجید میں بعض مقامات پر اُن کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ لَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ﴿۲۴﴾ وَ اذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً
وَّ اَصِيۡلًا ﴿۲۵﴾ وَ مِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَ سَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيۡلًا ﴿۲۶﴾

اور اِن میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو۔[۲۹] اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔[۳۰]

(مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۰۲-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶۔ بنی اسرائیل، ۱۱۹)، اور یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مصنف نہیں ہیں، اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں، یعنی یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کر دیں، بلکہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیجیں۔

۲۸- یعنی تمھارے رب نے جس کارِ عظیم پر تمھیں مامور کیا ہے، اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔

۲۹- یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دینِ حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور کسی بدعمل کی خاطر دین کی اَخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکرِ حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرّہ برابر بھی ترمیم و تغیُّر کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ جو کچھ حرام و ناجائز ہے، اسے برملا حرام و ناجائز کہو، خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مَذمّت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو۔ اور جو عقائد باطل ہیں انھیں کُھلّم کُھلّا باطل، اور جو حق ہیں انھیں عَلانِیہ حق کہو، چاہے کفار تمھارا منہ بند کرنے، یا اِس معاملے میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لیے بعد تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

۳۰- قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلے میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے، وہاں اُس کے معاً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دینِ حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اِسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہو سکتا ہے، مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعیُّن کے ساتھ دیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اِس آیت میں سب سے پہلے فرمایا: وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا۔ بکرہ عربی زبان میں صبح کو کہتے ہیں۔ اور اَصِیل کا لفظ زوال کے وقت سے غروب تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ظہر اور عصر کے اوقات آ جاتے ہیں۔ پھر فرمایا: وَ مِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ۔ رات کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لیے رات کو سجدہ کرنے کے حکم میں مغرب اور عشاء، دونوں وقتوں کی نمازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو،

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾
نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ
تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٩﴾ وَ
مَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾
يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣١﴾ ع

یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبّت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں[۳۱]۔ ہم نے ہی اِن کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں، اور ہم جب چاہیں اِن کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں[۳۲]۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے[۳۳]۔ یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۳۴]۔ ع

نمازِ تہجّد کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۹۲ تا ۹۷۔ جلد ششم، اَلمزّمّل، حاشیہ ۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے یہی اوقات ابتدا سے اسلام میں تھے، البتہ اوقات اور رکعتوں کے تعیُّن کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے موقع پر دیا گیا۔

۳۱- یعنی یہ کفّارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مُصِرّ ہیں، اور جس بنا پر آپؐ کی دعوتِ حق کے لیے اِن کے کان بہرے ہوگئے ہیں، وہ دراصل اِن کی دنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اس لیے ایک سچّے خدا پرست انسان کا راستہ اِن کے راستے سے اِتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مُصالَحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۲- اصل الفاظ ہیں: اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا۔ اِس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر کے اِنھی کی جنس کے دوسرے لوگ اِن کی جگہ لا سکتے ہیں، جو اپنے کردار میں اِن سے مختلف ہوں۔ دوسرے، یہ کہ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست

Maktaba Tul Ishaat.com

اور سلیم الاعضاء بنا سکتے ہیں، اُسی طرح ہم اِس پر بھی قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں، کسی کو لقوہ مار جائے، اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر اپاہج ہو جائے۔ تیسرے، یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد اِن کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۳- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المدّثّر، حاشیہ ۴۱۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۱، صفحہ ۵۷۶)

۳۴- اس کی تشریح ہم اِسی سورت کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۲، صفحہ ۵۷۷)

تفہیم القرآن

المرسلات

(۷۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

المرسلات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ وَالْمُرْسَلٰتِ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اس کا پورا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔اس سے پہلے کی دو سُورتیں سورۂ قیامہ، اور سورۂ دَہر، اور اس کے بعد کی دو سُورتیں، سورۂ نبا اور سورۂ نازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جس کو اِن میں مختلف پیرایوں سے اہلِ مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع قیامت اور آخرت کا اِثبات، اور اُن نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو اِن حقائق کے انکار اور اقرار سے آخرِ کار برآمد ہوں گے۔

پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اِس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں، وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔اِن میں اِستدلال یہ ہے کہ جس قادرِ مُطلَق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے، اُس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی، اور جو صریح حکمت اِس انتظام میں کار فرما نظر آ رہی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عَبَث اور بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور آخرت نہ ہو تو اِس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہ سارا کارخانۂ ہستی سراسر فضول ہے۔

اہلِ مکّہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو، اسے لا کر دکھاؤ، تب ہم اسے مانیں گے۔آیت ۸ سے ۱۵ تک اُن کے اِس مطالبے کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں ہے کہ جب کوئی مسخرا اُسے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے۔وہ تو تمام نوعِ انسانی، اور اس کے تمام افراد کے مقدّمے کے فیصلے کا دن ہے۔اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔اُسی وقت پر وہ آئے گا۔اور جب آئے گا تو ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُس وقت ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔اُس وقت اُنھی رسولوں کی شہادت پر

اِن کے مقدمے کا فیصلہ ہوگا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں، پھر انھیں خود پتا چل جائے گا کہ انھوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کیا ہے۔

آیت ۱۶ سے ۲۸ تک مسلسل قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجوب کے دلائل دیے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدایش، اور جس زمین پر وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالمِ آخرت کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔ انسانی تاریخ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ آخرکار بگڑیں اور تباہی سے دوچار ہوئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آخرت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کا رویہ اگر متصادم ہو تو اُس کا انجام وہی ہوتا ہے جو اُس اندھے کا انجام ہوتا ہے، جو سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے مقابلے میں بگٹٹ چلا جا رہا ہو۔ اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانینِ طبیعی (physical laws) ہی کارفرما نہیں ہیں بلکہ ایک قانونِ اخلاقی (moral law) بھی کام کر رہا ہے، جس کے تحت خود اِس دنیا میں بھی مُکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مُکافات چونکہ اپنی کامل و مکمل صورت میں واقع نہیں ہو رہی ہے اس لیے کائنات کا اخلاقی قانون لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب یہ بھرپور طریقے سے واقع ہو اور اُن تمام بھلائیوں اور برائیوں کی پوری جزا و سزا دی جائے جو یہاں جزا سے محروم رہ گئی ہیں یا سزا سے بچ نکلی ہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو، اور انسان کی پیدایش دنیا میں جس طرح ہوتی ہے اس پر اگر انسان غور کرے تو اس کی عقل ـــــ بشرطیکہ وہ سلیم ہو ـــــ اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفے سے ابتدا کر کے اُسے پورا آدمی بنایا ہے، اُس کے لیے اِسی آدمی کو پھر پیدا کر دینا یقیناً ممکن ہے۔ زندگی بھر انسان جس زمین پر رہتا ہے، مرنے کے بعد اس کے اجزائے جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے، اِسی زمین پر اُن کا ایک ایک ذرّہ موجود رہتا ہے۔ اِسی زمین کے خزانوں سے وہ بنتا اور پھلتا پھولتا اور پرورش پاتا ہے، اور پھر اِسی زمین کے خزانوں میں واپس جمع ہو جاتا ہے۔ جس خدا نے اُسے پہلے زمین کے اِن خزانوں سے نکالا تھا، وہی اُن میں جمع ہو جانے کے بعد اُسے پھر اُن سے نکال لا سکتا ہے۔ اُس کی قدرت پر غور کرو تو تم اِس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور اس کی حکمت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ زمین پر جو اختیارات اُس نے تمھیں دیے ہیں اُن کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً

Maktaba Tul Ishaat.com

اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ سے ۴۰ تک آخرت کے منکرین کا، اور ۴۱ سے ۴۵ تک اُن لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنھوں نے اُس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے، اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال، اور سیرت و کردار کی اُن برائیوں سے اجتناب کیا ہے جو چاہے آدمی کی دنیا بناتی ہوں، مگر اس کی عاقبت خراب کر دینے والی ہوں۔

آخر میں منکرینِ آخرت اور خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کو مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اڑا لو، آخرِ کار تمھارا انجام سخت تباہ کُن ہو گا۔ اور بات اِس پر ختم کی گئی ہے کہ اِس قرآن سے بھی جو شخص ہدایت نہ پائے، اسے پھر دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔

آیاتہا ۵۰ سُوۡرَۃُ الۡمُرۡسَلٰتِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ الۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾ وَّ النّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾ فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۵﴾ عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾

قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں، پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور (بادلوں کو) اُٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر (اُن کو) پھاڑ کر جُدا کرتی ہیں، پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں، عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر،[1] جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[2] وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔[3]

۱ - یعنی کبھی تو ان کی آمد کے رُکنے اور قحط کا خطرہ پیدا ہونے سے دل گداز ہوتے ہیں اور لوگ اللہ سے توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔ کبھی اُن کے بارانِ رحمت لانے پر لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور کبھی ان کی طوفانی سختی دلوں میں خوف پیدا کرتی ہے اور تباہی کے ڈر سے لوگ خدا کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۳، صفحہ ۵۷)

۲ - دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جس چیز کا تمھیں خوف دلایا جا رہا ہے۔" مراد ہے قیامت اور آخرت۔

۳ - یہاں قیامت کے ضرور واقع ہونے پر پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک، اَلۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا "پے در پے، یا بھلائی کے طور پر بھیجی جانے والیاں۔" دوسرے، اَلۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا "بہت تیزی اور شدّت کے ساتھ چلنے والیاں"۔ تیسرے، النّٰشِرٰتِ نَشۡرًا "خوب پھیلانے والیاں"۔ چوتھے، اَلۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا "الگ الگ کرنے والیاں۔" پانچویں، اَلۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا "یاد کا اِلقا کرنے والیاں۔" چونکہ اِن الفاظ میں صرف صفات بیان کی گئی ہیں، اور یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کس چیز یا کن چیزوں کی صفات ہیں، اس لیے مفسّرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ پانچوں صفات ایک ہی چیز کی ہیں، یا الگ الگ چیزوں کی، اور وہ چیز یا چیزیں کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچوں سے مراد ہوائیں ہیں۔ دوسرا کہتا ہے: پانچوں سے مراد فرشتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے: پہلے تین سے مراد ہوائیں ہیں اور باقی دو سے مراد فرشتے۔ چوتھا کہتا ہے: پہلے دو سے مراد ہوائیں اور باقی تین سے مراد فرشتے ہیں۔ اور ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ پہلے سے مراد ملائکۂ رحمت، دوسرے سے مراد ملائکۂ عذاب اور باقی تین سے مراد قرآنِ مجید کی آیات ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ہمارے نزدیک پہلی بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ جب ایک ہی سلسلۂ کلام میں پانچ صفات کا مسلسل ذکر کیا گیا ہے اور کوئی علامت بیچ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ کہاں تک ایک چیز کی صفات کا ذکر ہے اور کہاں سے دوسری چیز کی صفات کا ذکر شروع ہوا ہے، تو یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ محض کسی بے بنیاد قیاس کی بنا پر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں دو یا تین مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں، بلکہ اس صورت میں نظمِ کلام خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پُوری عبارت کو کسی ایک ہی چیز کی صفات سے متعلق مانا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقتِ غیر محسوس کا یقین دلانے کے لیے کسی چیز، یا بعض چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، وہاں قسم دراصل اِستدلال کی ہم معنی ہوتی ہے، یعنی اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ چیز یا چیزیں اُس حقیقت کے صحیح و برحق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ اِس غرض کے لیے ظاہر ہے کہ ایک غیر محسوس شے کے حق میں کسی دوسری غیر محسوس شے کو بطورِ استدلال پیش کرنا دُرست نہیں ہوسکتا، بلکہ غیر محسوس پر محسوس سے دلیل لانا ہی موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں صحیح تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد ہوائیں ہیں، اور اُن لوگوں کی تفسیر قابلِ قبول نہیں ہے جنھوں نے ان پانچوں چیزوں سے مراد فرشتے لیے ہیں، کیونکہ وہ بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح قیامت کا وقوع غیر محسوس ہے۔

اب غور کیجیے کہ قیامت کے وقوع پر ہواؤں کی یہ کیفیات کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ زمین پر جن اسباب سے حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوئی ہے ان میں سے ایک نہایت اہم سبب ہَوا ہے۔ ہر نوع کی زندگی سے اُس کی صفات کا جو تعلق ہے، وہ بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی قادرِ مُطلَق اور صانعِ حکیم ہے جس نے اِس کُرۂ خاکی پر زندگی کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور اِس غرض کے لیے یہاں ایک ایسی چیز پیدا کی جس کی صفات زندہ مخلوقات کے وجود کی ضروریات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتی ہیں۔ پھر اُس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ زمین کو ہَوا کا ایک لَبادَہ اُڑھا کر چھوڑ دیا ہو، بلکہ اپنی قدرت اور حکمت سے اِس ہَوا میں اس نے بے شمار مختلف کیفیات پیدا کی ہیں، جن کا انتظام لاکھوں کروڑوں برس سے اس طرح ہو رہا ہے کہ انھی کی بدولت موسم پیدا ہوتے ہیں، کبھی حَبس ہوتا ہے اور کبھی بادِ نسیم چلتی ہے، کبھی گرمی آتی ہے اور کبھی سردی، کبھی بادل آتے ہیں اور کبھی آتے ہوئے اُڑ جاتے ہیں، کبھی نہایت خوش گوار جھونکے چلتے ہیں اور کبھی انتہائی تباہ کُن طوفان آجاتے ہیں، کبھی نہایت نفع بخش بارش ہوتی ہے اور کبھی کال پڑ جاتا ہے۔ غرض ایک ہوا نہیں بلکہ طرح طرح کی ہوائیں ہیں جو اپنے اپنے وقت پر چلتی ہیں اور ہر ہَوا کسی نہ کسی مقصد کو پُورا کرتی ہے۔ یہ انتظام ایک غالب قدرت کا ثبوت ہے، جس کے لیے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از امکان ہوسکتا ہے، نہ اسے مٹا دینا، اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔ اِسی طرح یہ انتظام کمال درجہ حکمت و دانائی کا ثبوت بھی ہے، جس سے صرف ایک نادان آدمی ہی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ یہ سارا کاروبار محض کھیل کے طور پر کیا جا رہا ہو اور اس کا کوئی عظیم تر مقصد نہ ہو۔ اس حیرت انگیز انتظام کے مقابلے میں انسان اتنا بے بس ہے کہ کبھی وہ نہ اپنے لیے مفیدِ طلب ہَوا چلا سکتا ہے، نہ اپنے اُوپر ہلاکت

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾ وَ اِذَا الْجِبَالُ
نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ﴿۱۱﴾ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ
الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ؕ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾

پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے،[۴] اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا،[۵] اور پہاڑ دُھنک ڈالے جائیں گے، اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا[۶] (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی)۔ کس روز کے لیے یہ کام اُٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمھیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔[۷]

خیز ہَوا کا طوفان آنے کو روک سکتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی ڈِھٹائی اور بے شُعوری اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے، کبھی نہ کبھی یہی ہَوا اُس کو یاد دلا دیتی ہے کہ اُوپر کوئی زبردست اقتدار کارفرما ہے جو زندگی کے اِس سب سے بڑے ذریعے کو جب چاہے اُس کے لیے رحمت اور جب چاہے ہلاکت کا سبب بنا سکتا ہے، اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، الذّاریات، حواشی ۱ تا ۴)

۴ – یعنی بے نور ہو جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

۵ – یعنی عالَمِ بالا کا وہ بندھا ہوا نظام، جس کی بدولت ہر ستارہ اور سیّارہ اپنے مدار پر قائم ہے، اور جس کی بدولت کائنات کی ہر چیز اپنی اپنی حد میں رُکی ہوئی ہے، توڑ ڈالا جائے گا اور اس کی ساری بندشیں کھول دی جائیں گی۔

۶ – قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدّمہ پیش ہوگا تو ہر قوم کے رسول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا، تاکہ وہ اِس اَمر کی گواہی دے کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجّت ہوگی، جس سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط رَوِش کے خود ذمّہ دار ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۱۷۲، ۱۷۳، حواشی ۱۳۴، ۱۳۵۔ جلد چہارم، الزُّمَر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰۔ جلد ششم، المُلک، آیت ۸، حاشیہ ۱۴۔

۷ – یعنی اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اُس دن کے آنے کی خبر کو جھوٹ سمجھا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٦ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝١٧ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ
بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝١٨ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٩ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ
مَّهِيْنٍ ۝٢٠ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝٢١ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝٢٢
فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝٢٣ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝٢٤

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟[۸] پھر اُنھی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں[۹] گے۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اُس دن جھُٹلانے والوں کے لیے۔[۱۰]

کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا اور ایک مُقرّرہ مدت تک[۱۱] اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟[۱۲] تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔[۱۳] تباہی ہے اُس روز جھُٹلانے والوں کے لیے۔[۱۴]

جواب دہی کرنی ہوگی۔

۸ - یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود اسی دنیا میں اپنی تاریخ کو دیکھ لو۔ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کر کے اِسی دنیا کو اصل زندگی سمجھا اور اِسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو خیر و شر کا معیار سمجھ کر اپنا اَخلاقی رَوِیّہ متعین کیا، بلا اِستثنا وہ سب آخرِ کار تباہ ہو کر رہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے، جسے نظر انداز کر کے کام کرنے والا اُسی طرح نقصان اٹھاتا ہے جس طرح ہر اُس شخص کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کر کے چلے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۸۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سَبا، حاشیہ ۲۵)

۹ - یعنی یہ ہمارا مستقل قانون ہے۔ آخرت کا انکار جس طرح پہلے گزری ہوئی قوموں کے لیے تباہ کُن ثابت ہوا ہے، اسی طرح آگے آنے والی قوموں کے لیے بھی یہ ہمیشہ تباہ کُن ہی ثابت ہوگا۔ اِس سے نہ کوئی قوم پہلے مستثنیٰ تھی نہ آیندہ کبھی ہوگی۔

۱۰ - یہاں یہ فقرہ اس معنیٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ دنیا میں اُن کا جو انجام ہوا ہے یا آیندہ ہوگا، وہ اُن کی اصل سزا نہیں ہے، بلکہ اصلی تباہی تو اُن پر فیصلے کے دن نازل ہوگی۔ یہاں کی پکڑ تو صرف یہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب کوئی شخص مسلسل جرائم کرتا چلا جائے اور کسی طرح اپنی بگڑی ہوئی رَوِش سے باز نہ آئے تو آخرِ کار اسے گرفتار کر لیا جائے۔ عدالت، جہاں اس کے مقدمے کا فیصلہ ہونا ہے اور اسے اس کے تمام کرتوتوں کی سزا دی جانی ہے

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ۙ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّ اَمۡوَاتًا ۙ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ
شٰمِخٰتٍ وَّ اَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ؕ﴿۲۷﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۸﴾

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مُردوں کے لیے بھی، اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے، اور تمھیں میٹھا پانی پلایا؟[۱۵] تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔[۱۶]

اِس دنیا میں قائم نہیں ہوگی بلکہ آخرت میں ہوگی، اور وہی اُس کی تباہی کا اصل دن ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵)

۱۱- اصل الفاظ ہیں: قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ وہ مدت مُقرّر ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس کی مدت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ کسی بچّے کے متعلق کسی ذریعے سے بھی انسان کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ کتنے مہینے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور سیکنڈ ماں کے پیٹ میں رہے گا، اور اس کا ٹھیک وقتِ ولادت کیا ہوگا۔ اللہ ہی نے ہر بچے کے لیے ایک خاص مدّت مقرر کی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔

۱۲- یعنی رحمِ مادر، جس میں استقرارِ حمل ہوتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جمایا جاتا ہے اور اتنے انتظامات اس کی حفاظت اور پرورش کے کیے جاتے ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اس کا اِسقاط نہیں ہوسکتا، اور مصنوعی اِسقاط کے لیے بھی غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں، جو فنِّ طِبّ کی جدید ترقیات کے باوجود خطرے اور نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

۱۳- یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی صریح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک حقیر نُطفے سے تمھاری ابتدا کر کے تمھیں پورا انسان بنانے پر قادر تھے، تو آخر دوبارہ تمھیں کسی اور طرح پیدا کر دینے پر کیوں قادر نہ ہوں گے؟ ہماری یہ تخلیق، جس کے نتیجے میں تم آج زندہ موجود ہو، خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں، ایسے عاجز نہیں ہیں کہ ایک دفعہ پیدا کر کے پھر تمھیں پیدا نہ کرسکیں۔

۱۴- یہاں یہ فقرہ اس معنیٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ حیات بعدِ موت کے امکان کی یہ صریح دلیل سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی جو لوگ اُس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ آج اُس کا جتنا چاہیں مذاق اُڑا لیں، اور جس قدر چاہیں اس کے ماننے والوں کو دقیانوسی، تاریک خیال اور اَوہام پرست قرار دیتے رہیں، مگر جب وہ دن آجائے گا جسے یہ جھٹلا رہے ہیں تو انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ ان کے لیے تباہی کا دن ہے۔

۱۵- یہ آخرت کے مُمکن اور معقول ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔ یہی ایک کُرۂ زمین ہے جو کروڑوں اور اربوں

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾

چلو[17] اب اُسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اُس سایے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے،[18]

سال سے بے حد وحساب مخلوقات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، ہر قسم کی نباتات، ہر قسم کے حیوانات اور انسان اِس پر جی رہے ہیں، اور سب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اِس کے پیٹ میں سے طرح طرح کے اَتھاہ خزانے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر یہی زمین ہے جس پر اِن تمام اقسام کی مخلوقات کے بے شمار افراد روز مرتے ہیں، مگر ایسا بے نظیر انتظام کر دیا گیا ہے کہ سب کے لاشے اِسی زمین میں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور یہ پھر ہر مخلوق کے نئے افراد کے جینے اور بسنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اِس زمین کو سپاٹ گیند کی طرح بھی بنا کر نہیں رکھ دیا گیا ہے، بلکہ اس میں جگہ جگہ پہاڑی سلسلے اور فلک بوس پہاڑ قائم کیے گئے ہیں جن کا موسموں کے تغیُّرات میں، بارشوں کے برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، زرخیز وادیوں کے وجود میں، بڑے بڑے شہتیر فراہم کرنے والے درختوں کے اُگنے میں، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں بہت بڑا دخل ہے۔ پھر اس زمین کے پیٹ میں بھی میٹھا پانی پیدا کیا گیا ہے، اِس کی پیٹھ پر بھی میٹھے پانی کی نہریں بہا دی گئی ہیں، اور سمندر کے کھاری پانی سے صاف ستھرے بخارات اُٹھا کر بھی نتھرا ہوا پانی آسمان سے برسانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک قادرِ مُطلَق نے یہ سب کچھ بنایا ہے، اور وہ محض قادر ہی نہیں ہے بلکہ علیم و حکیم بھی ہے؟ اب اگر اس کی قدرت اور حکمت ہی سے یہ زمین اِس سر و سامان کے ساتھ اور اِن حکمتوں کے ساتھ بنی ہے تو ایک صاحبِ عقل آدمی کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ اُسی کی قدرت اِس دنیا کی بِساط لپیٹ کر پھر ایک دوسری دنیا نئے طرز پر بنا سکتی ہے، اور اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اِس کے بعد ایک دوسری دنیا بنائے، تاکہ انسان سے اُن اعمال کا حساب لے جو اُس نے اِس دنیا میں کیے ہیں؟

۱۶- یہاں یہ فقرہ اس معنٰی میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ خدا کی قدرت اور حکمت کے یہ کرشمے دیکھ کر بھی آخرت کے ممکن اور معقول ہونے کا انکار کر رہے ہیں اور اِس بات کو جھٹلا رہے ہیں کہ خدا اِس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا پیدا کرے گا اور اُس میں انسان سے اُس کے اعمال کا حساب لے گا، وہ اپنی اِس خام خیالی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو رہیں۔ جس روز یہ سب کچھ اُن کی توقُّعات کے خلاف پیش آ جائے گا، اس روز انھیں پتا چل جائے گا کہ انھوں نے یہ حماقت کر کے خود اپنے لیے تباہی مول لی ہے۔

۱۷- اب آخرت کے دلائل دینے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ واقع ہو جائے گی تو وہاں اِن منکرین کا حشر کیا ہوگا۔

۱۸- سایے سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ اور تین شاخوں کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بہت بڑا دھواں اٹھتا ہے تو اُوپر جا کر وہ کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَاَنَّهٗ
جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا
يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ

نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپَٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چِنگاریاں پھینکے گی (جو اُچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اُونٹ ہیں[19]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انھیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں[20]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمھیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر

---

۱۹ – یعنی ہر چنگاری ایک قصر جیسی بڑی ہوگی، اور جب یہ بڑی بڑی چنگاریاں اُٹھ کر پھٹیں گی اور چاروں طرف اُڑنے لگیں گی، تو یوں محسوس ہوگا جیسے زرد رنگ کے اُونٹ اُچھل کود کر رہے ہیں۔

۲۰ – یہ اُن کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلے کے وقت اُن پر طاری ہوگی۔ اُس سے پہلے میدانِ حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے، حتّٰی کہ بعض لوگ پوری ڈِھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے اُن کا مجرم ہونا پوری طرح ثابت کر دیا جائے گا، اور جب ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اور اُن کے اعضا تک اُن کے خلاف گواہی دے کر ثبوتِ جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے، اور جب بالکل بجا اور برحق طریقے سے عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے انھیں سزا سنا دی جائے گی، تو وہ دم بخود رہ جائیں گے اور ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کا موقع نہ دینے یا اس کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اِس طرح قطعی ناقابلِ انکار حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ وہ اپنی معذرت میں کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ یہ ایسا

Maktaba Tul Ishaat.com

ع ۲

لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ
ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ لا وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ ط كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلے میں چل دیکھو۔[21] تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ع

متّقی[22] لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (اُن کے لیے حاضر ہیں)۔ کھاؤ اور پیو مزے سے، اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔[23]

کھا[24] لو اور مزے کر لو تھوڑے دن۔[25] حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اُس روز

ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ مَیں نے اُس کو بولنے نہیں دیا، یا مَیں نے اس کی زبان بند کر دی، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اُس کے لیے زبان کھولنے یا کچھ بولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔

۲۱ – یعنی دنیا میں تو تم بہت مکّاریاں اور چالبازیاں کرتے رہے، اب یہاں کوئی چال چل کر میری پکڑ سے بچ سکتے ہو تو ذرا بچ دکھاؤ۔

۲۲ – چونکہ یہ لفظ یہاں مُکَذِّبِین (جھٹلانے والوں) کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے متّقیوں سے مراد اس جگہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو جُھٹلانے سے پرہیز کیا اور اُس کو مان کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ ہمیں آخرت میں اپنے اقوال و افعال اور اپنے اَخلاق و کردار کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

۲۳ – یہاں یہ فقرہ اس معنیٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے ایک مصیبت تو وہ ہوگی جو اُوپر بیان ہو چکی ہے کہ میدانِ حشر میں وہ مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے، علی الاعلان ان کے جرائم اِس طرح ثابت کر دیے جائیں گے کہ ان کے لیے زبان کھولنے تک کا یارا نہ رہے گا، اور آخرِ کار جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ دوسری مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوگی کہ وہی ایمان لانے والے جن سے اُن کی عمر بھر لڑائی رہی، جنھیں وہ بیوقوف اور تنگ خیال اور رَجعت پسند کہتے رہے جن کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور جنھیں اپنے نزدیک حقیر و ذلیل سمجھتے رہے، انھی کو وہ جنّت میں مزے اڑاتے دیکھیں گے۔

۲۴ – اب کلام ختم کرتے ہوئے نہ صرف کُفّارِ مکہ کو بلکہ دنیا کے تمام کفار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

ع ۲ ۳۲

جھٹلانے والوں کے لیے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے[۲۶]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔ اب اس (قرآن) کے بعد اور کون سا کلام ایسا ہوسکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں[۲۷]؟ ع

ارشاد فرمائے جارہے ہیں۔

۲۵- یعنی دنیا کی اِس چندروزہ زندگی میں۔

۲۶- اللہ کے آگے جھکنے سے مراد صرف اس کی عبادت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی نازل کردہ کتاب کو ماننا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

۲۷- یعنی جو بڑی سے بڑی چیز انسان کو حق و باطل کا فرق سمجھانے والی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والی ہوسکتی تھی وہ قرآن کی صورت میں نازل کر دی گئی ہے۔ اِس کو پڑھ کر یا سُن کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا تو اِس کے بعد پھر اور کیا چیز ایسی ہوسکتی ہے جو اس کو راہِ راست پر لا سکے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

اَلنَّبا

(۷۸)

اَلنَّبَا

نام دوسری آیت کے فقرے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کے لفظ النَّبَا کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس سورت کے مضامین کا عنوان بھی ہے، کیونکہ نبا سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور سورت میں ساری بحث اسی پر کی گئی ہے۔

زمانۂ نزُول جیسا کہ ہم سورۂ مُرسَلات کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سورۂ قیامت سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور یہ سب مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا مضمون بھی وہی ہے جو سورۂ مُرسَلات کا ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اِثبات، اور اس کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا۔

مکۂ معظمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں: ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپؐ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اِس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالَم برپا ہوگا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انھوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اس محاسبے میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنّت میں جائیں گے، اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان تینوں باتوں میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے، اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اِس لیے جھگڑا صرف اِس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات میں اور اُلوہیت کی ذات میں اُن کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو مکے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اِس امر سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنھی کے درمیان

Maktaba Tul Ishaat.com

گزاری تھی، اس میں انھوں نے کبھی آپؐ کو جھوٹا یا فریب کار، یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپؐ کی دانائی وفرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انھیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار، اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے معاملات میں تو راست باز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں، معاذ اللہ! جھوٹے ہیں۔

اِس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکہ کے لیے دراصل اُتنی زیادہ اُلجھن کی مُوجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اُسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجّب کا اظہار کیا، اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصوُّر ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتارا جائے، کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملے میں اُن کا طرزِ فکر سنجیدہ ہوسکتا، خیر وشر کے معاملے میں اُن کا معیارِ اقدار بدل سکتا، اور وہ دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام اُن کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صَرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصوُّر بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے، اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔

اِس دَور کی سُورتوں میں آخرت کے مضمون کی اِس تکرار کا سبب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اِس سورت کے مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس میں سب سے پہلے اُن چرچوں اور چہ میگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت کی خبر سُن کر مکہ کے ہر کوچہ و بازار اور اہلِ مکہ کی ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد انکار کرنے والوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا تمھیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمھارے لیے فرش بنا رکھا ہے؟ کیا یہ بلند وبالا پہاڑ تمھیں نظر نہیں آتے جنھیں ہم نے زمین میں گاڑ رکھا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہم نے تمھیں مَردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اپنی نیند کو نہیں دیکھتے جس کے ذریعے سے ہم نے تم کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد ہر چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کر رکھا ہے؟ کیا تم رات اور دن کی آمدورفت کو نہیں دیکھتے جسے ٹھیک تمھاری ضرورت کے مطابق ہم باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟ کیا تم اپنے اُوپر آسمانوں کے مضبوط بندھے ہوئے

نظام کو نہیں دیکھتے؟ کیا یہ سُورج تمھیں نظر نہیں آتا جس کی بدولت تمھیں روشنی اور حرارت میسّر آ رہی ہے؟ کیا تم اُن بارشوں کو نہیں دیکھتے جو بادلوں سے برس رہی ہیں اور اُن کے ذریعے سے غلّے اور سبزیاں اور گھنے باغ اگ رہے ہیں؟ یہ ساری چیزیں کیا تمھیں یہی بتا رہی ہیں کہ جس قادرِ مُطلق نے اِن کو پیدا کیا ہے، اُس کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے سے عاجز ہے؟ اور اِس پُورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کارفرما ہے، کیا اس کو دیکھتے ہوئے تمھاری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اِس کارخانے کا ایک ایک جُز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پورا کارخانہ بے مقصد ہے؟ آخر اس سے زیادہ لغو اور بے معنی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کارخانے میں انسان کو پیش دست (foreman) کے منصب پر مامور کر کے اسے یہاں بڑے وسیع اختیارات تو دے دیے جائیں، مگر جب وہ اپنا کام پورا کر کے یہاں سے رخصت ہو تو اسے یونہی چھوڑ دیا جائے؟ نہ کام بنانے پر پنشن اور انعام، نہ کام بگاڑنے پر بازپُرس اور سزا؟

یہ دلائل دینے کے بعد پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گا۔ صُور میں بس ایک پُھونک مارنے کی دیر ہے، وہ سب کچھ جس کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے سامنے آ جائے گا، اور تم آج چاہے مانو یا نہ مانو، اُس وقت جہاں جہاں بھی تم مرے پڑے ہو گے، وہاں سے فوج در فوج اپنا حساب دینے کے لیے نکل آؤ گے۔ تمھارا انکار اِس واقعے کو پیش آنے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد آیت ۲۱ سے ۳۰ تک بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے اور جنھوں نے ہماری آیات کو جُھٹلا دیا ہے، ان کا ایک ایک کرتُوت گن گن کر ہمارے ہاں لکھا ہوا ہے، اور ان کی خبر لینے کے لیے جہنم گھات لگائے ہوئے تیار ہے، جہاں ان کے اعمال کا بھرپور بدلہ انھیں دے دیا جائے گا۔ پھر آیت ۳۱ سے ۳۶ تک اُن لوگوں کی بہترین جزا بتائی گئی ہے جنھوں نے اپنے آپ کو ذمّہ دار و جواب دہ سمجھ کر دنیا میں اپنی آخرت دُرست کرنے کی پہلے ہی فکر کر لی ہے، اور انھیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انھیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائے گا بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہاں کسی کے اَڑ کر بیٹھ جانے اور اپنے مُتوسّلین کو بخشوا کر چھوڑنے کا کیا سوال، کوئی بلا اجازت زبان تک نہ کھول سکے گا، اور اجازت بھی اِس شرط کے ساتھ ملے گی کہ جس کے حق میں سِفارش کا اِذن ہو، صرف اسی کے لیے سفارش کرے اور سفارش میں کوئی بے جا بات نہ کہے۔ نیز سفارش کی اجازت صرف اُن لوگوں کے حق میں دی جائے گی جو

Maktaba Tul Ishaat.com

دنیا میں کلمۂ حق کے قائل رہے ہیں اور محض گناہ گار ہیں۔ خدا کے باغی اور حق کے مُنکِر کسی سفارش کے مستحق نہ ہوں گے۔

پھر کلام کو اِس تنبیہ پر ختم کیا گیا ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کا آنا برحق ہے، اُسے دُور نہ سمجھو، وہ قریب ہی آلگا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔ لیکن اِس تنبیہ کے باوجود جو اُس کا انکار کرے گا، اس کا سارا کیا دھرا اُس کے سامنے آجائے گا اور پھر وہ پچھتا پچھتا کر کہے گا کہ کاش! مَیں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اُس وقت اُس کا یہ احساس اُسی دنیا کے بارے میں ہوگا جس پر وہ آج لٹّو ہو رہا ہے۔

آیاتہا ۴۰ رکوعاتہا ۲

سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ⑤

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اُس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں[1]؟ ہرگز نہیں[2]، عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہاں، ہرگز نہیں، عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا[3]۔

---

۱ - بڑی خبر سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے جس کو اہلِ مکہ آنکھیں پھاڑ کر سنتے تھے، پھر ہر محفل میں اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ پُوچھ گچھ سے مراد یہی چہ میگوئیاں ہیں۔ لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ بھائی، کبھی پہلے بھی تم نے سُنا ہے کہ مر کے کوئی دوبارہ زندہ ہوگا؟ کیا یہ ماننے کے قابل بات ہے کہ گل سڑ کر جو ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں، ان میں نئے سرے سے جان پڑے گی؟ کیا عقل میں یہ بات سماتی ہے کہ اگلی پچھلی ساری نسلیں اٹھ کر ایک جگہ جمع ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے جمے ہوئے پہاڑ ہوا میں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں گے؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ چاند، سورج اور تارے سب بُجھ کر رہ جائیں اور دنیا کا یہ سارا جما جمایا نظام الٹ پلٹ ہو جائے؟ یہ صاحب جو کل تک اچھے خاصے دانا آدمی تھے، آج اِنھیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں ایسی عجیب انہونی خبریں سُنا رہے ہیں۔ یہ جنّت اور یہ دوزخ آخر پہلے کہاں تھیں جن کا ذکر ہم نے کبھی اُن کی زبان سے نہ سنا تھا؟ اب یہ ایک دم کہاں سے نکل آئی ہیں کہ اِنھوں نے اُن کے عجیب و غریب نقشے ہمارے سامنے کھینچنے شروع کر دیے ہیں؟

هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ”وہ اس کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔“ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کے انجام کے بارے میں یہ لوگ خود بھی کوئی ایک مُتّفَق عَلَیہ عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ ”ان کے درمیان اس کے متعلق مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔“ اُن میں سے کوئی عیسائیوں کے خیالات سے متأثر تھا اور زندگی بعدِ موت کو مانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ وہ دوسری زندگی جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوگی۔ کوئی آخرت کا قطعی مُنکر نہ تھا مگر اسے شک تھا کہ وہ ہو سکتی ہے یا نہیں، چنانچہ قرآنِ مجید ہی میں اس خیال کے لوگوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ، ”ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے۔“ (الجاثیہ، آیت ۳۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿٦﴾ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿٧﴾ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ﴿٨﴾ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿٩﴾ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا[۴]، اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا[۵]، اور تمھیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا[۶]، اور تمھاری نیند کو باعثِ سکون بنایا[۷]، اور رات کو پردہ پوش

اور کوئی بالکل صاف صاف کہتا تھا کہ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ”جو کچھ بھی ہے بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔“ (الانعام: آیت ۲۹) پھر کچھ لوگ ان میں سے دَہریّے تھے اور کہتے تھے کہ مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ”زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور گردشِ ایّام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو“ (الجاثیہ: ۲۴) اور کچھ دوسرے لوگ دَہریّے تو نہ تھے مگر دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے، یعنی ان کے نزدیک یہ خدا کی قدرت سے خارج تھا کہ وہ مرے ہوئے انسانوں کو پھر سے زندہ کر سکے۔ ان کا قول تھا: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ”کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟“ (یٰسین: ۷۸) یہ اُن کے مختلف اقوال خود ہی اس بات کا ثبوت تھے کہ ان کے پاس اِس مسئلے میں کوئی علم نہ تھا، بلکہ وہ محض گمان و قیاس کے تیر تکّے چلا رہے تھے، ورنہ علم ہوتا تو سب کسی ایک بات کے قائل ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الذّاریات، حاشیہ ٦)

۲ – یعنی آخرت کے متعلق جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں سب غلط ہیں۔ جو کچھ انھوں نے سمجھ رکھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۳ – یعنی وہ وقت دُور نہیں ہے جب وہی چیز حقیقت بن کر اِن کے سامنے آ جائے گی جس کے بارے میں یہ فضول چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اُس وقت اِنھیں پتا چل جائے گا کہ رسول نے جو خبر ان کو دی تھی وہی صحیح تھی اور قیاس و گمان سے جو باتیں یہ بنا رہے تھے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

۴ – زمین کو انسان کے لیے فرش، یعنی ایک پُرسکون قیام گاہ بنانے میں قدرت و حکمت کے جو کمالات کارفرما ہیں، ان پر اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدّد مقامات پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر مقاماتِ ذیل مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۲۹۔ المومن، حواشی ۹۰-۹۱۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۷۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸۔

۵ – زمین پر پہاڑ پیدا کرنے کی حکمتوں کے متعلق مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۷۴۔ جلد ششم، المُرسلات، حاشیہ ۱۵۔

وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ⑪ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ⑫
وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ⑬ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ⑭ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ⑮ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ⑯

اور دن کو معاش کا وقت بنایا[8]، اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے[9]، اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا[10]، اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی، تاکہ اس کے ذریعے سے غلّہ اور سبزی اور گھنے باغ اُگائیں[11]؟

۶- انسان کو مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا اپنے اندر جو عظیم حکمتیں رکھتا ہے، ان کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الروم، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۱۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۷۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۱۲۔ جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۲۵۔

۷- انسان کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس حکمت کے ساتھ اس کی فطرت میں نیند کا ایک ایسا داعیہ رکھ دیا ہے جو ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹے سونے پر مجبور کر دیتا ہے، اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حاشیہ ۳۳ میں کر چکے ہیں۔

۸- یعنی رات کو اِس غرض کے لیے تاریک بنا دیا کہ اس میں تم روشنی سے محفوظ رہ کر زیادہ آسانی کے ساتھ نیند کا سُکون حاصل کر سکو، اور دن کو اِس مقصد سے روشن بنایا کہ اس میں تم زیادہ سہولت کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کام کر سکو۔ زمین پر باقاعدگی کے ساتھ مسلسل رات اور دن کا اُلٹ پھیر کرتے رہنے کے بے شمار فوائد میں سے صرف اِس ایک فائدے کی طرف اشارہ یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد، یا اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے بلکہ اِس کے پیچھے ایک بڑی حکمت کام کر رہی ہے، جس کا براہِ راست تمھارے اپنے مفاد سے گہرا تعلق ہے۔ تمھارے وجود کی ساخت اپنے سُکون و راحت کے لیے جس تاریکی کی طالب تھی وہ رات کو، اور اپنی معیشت کے لیے جس روشنی کی طالب تھی وہ دن کو مہیا کی گئی ہے۔ تمھاری ضروریات کے عین مطابق یہ انتظام خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر نہیں ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حاشیہ ۶۵۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۲۔ المؤمن، حاشیہ ۸۵۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۴)

۹- مضبوط کا لفظ اِس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرّہ برابر تغیُّر و تبدُّل نہیں ہونے پاتا، اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالَمِ بالا کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے نہ تمھاری زمین پر آ گرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حواشی ۸ و ۱۲۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۱۳۔ یٰسین، حاشیہ ۳۷۔ الصّافّات، حواشی ۵-۶۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔ جلد پنجم، قٓ، حواشی ۷-۸)

۱۰- مراد ہے سورج۔ اصل میں لفظ وَھَّاج استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی، اس لیے ترجمے میں ہم نے دونوں معنیٰ درج کر دیے ہیں۔ اِس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُس کا قطر زمین کے قُطر سے ۱۰۹ گُنا اور اس کا حَجم زمین کے حَجم سے ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گُنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دُور ہونے کے باوجود اُس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برَہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے، اور اس کی گرمی کا حال یہ ہے کہ زمین کے بعض حصّوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجۂ حرارت ۱۴۰ ڈگری فاہرن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اُس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اُس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دُور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اِسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اُسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں، جو ہمارے لیے سببِ حیات بنے ہوئے ہیں۔ اُسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اُسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اُٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعے سے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اِس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سُلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظامِ شمسی میں پھینکے چلی جارہی ہے۔

۱۱- زمین پر بارش کے انتظام اور نباتات کی روئیدگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے جو جو حیرت انگیز کمالات کارفرما ہیں، ان پر تفصیل کے ساتھ تفہیم القرآن کے حسبِ ذیل مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے: جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۷۔ الشعراء، حاشیہ ۵۔ الروم، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔ یٰسین، حاشیہ ۲۹۔ المؤمن، حاشیہ ۲۰۔ الزُّخرُف، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔

اِن آیات میں پے درپے بہت سے آثار و شواہد کو پیش کر کے قیامت اور آخرت کے منکرین کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر زمین اور پہاڑوں اور خود اپنی پیدائش اور اپنی نیند اور بیداری اور روز و شب کے اِس انتظام کو دیکھو، کائنات کے بندھے ہوئے نظام اور آسمان کے چمکتے ہوئے سورج کو دیکھو، بادلوں سے برسنے والی بارش اور اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھو، تو تمھیں دو باتیں ان میں نمایاں نظر آئیں گی: ایک، یہ کہ یہ سب کچھ ایک زبردست قدرت کے بغیر نہ وجود میں آ سکتا ہے، نہ اِس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر ایک عظیم حکمت کام کر رہی ہے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ اب یہ بات صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جو قدرت اِن ساری چیزوں کو وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انھیں فنا کر دینے اور

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿١٧﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿١٨﴾
وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿١٩﴾ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾

بے شک فیصلے کا دن ایک مقرّر وقت ہے۔ جس روز صُور میں پھُونک ماردی جائے گی، تم فوج در فوج نکل آؤ گے[۱۲]۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا، اور پہاڑ چلائے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ سَراب ہو جائیں گے[۱۳]۔

دوبارہ کسی اور صورت میں پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی صرف ایک بے عقل ہی کہہ سکتا ہے کہ جس حکیم نے اس کائنات میں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا ہے، اس نے اپنی دنیا میں انسان کو سمجھ بُوجھ، خیر و شر کی تمیز، طاعت و عِصیان کی آزادی، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرّف کے اختیارات بے مقصد ہی دے ڈالے ہیں، انسان اُس کی دی ہوئی اِن چیزوں کو اچھی طرح استعمال کرے یا بری طرح، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، کوئی بھلائیاں کرتے کرتے مرجائے تو بھی مٹی میں مل کر ختم ہو جائے گا، اور برائیاں کرتے کرتے مرجائے تو بھی مٹی ہی میں مل کر ختم ہو جائے گا، نہ بھلے کو اس کی بھلائی کا کوئی اجر ملے گا، نہ برے سے اس کی برائی پر کوئی باز پُرس ہوگی۔ زندگی بعدِ موت اور قیامت و آخرت پر یہی دلائل ہیں جو جگہ جگہ قرآنِ مجید میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ الروم، حاشیہ ۶۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۱۰ و ۱۲۔ الصّافّات، حواشی، ۸-۹۔

۱۲- اس سے مراد وہ آخری نفخِ صُور ہے جس کا آوازہ بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان یکایک جی اٹھیں گے، اور تم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اُس وقت مُخاطَب تھے، بلکہ وہ تمام انسان ہیں جو آغازِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷۔ الزُّمَر، حاشیہ ۷۹)

۱۳- اِس مَقام پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں بھی قرآن کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح قیامت کے مختلف مراحل کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اُس کیفیت کا ذکر ہے جو آخری نفخِ صور کے وقت پیش آئے گی، اور بعد کی دو آیتوں میں وہ حالت بیان کی گئی ہے جو دوسرے نفخِ صُور کے موقع پر رونما ہوگی۔ اس کی وضاحت ہم تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۃ الحاقّہ، حاشیہ ۱۰ میں کر چکے ہیں۔ ''آسمان کھول دیا جائے گا'' سے مراد یہ ہے کہ عالَمِ بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ہر طرف سے ہر آفتِ سماوی اِس طرح ٹوٹی پڑ رہی ہوگی کہ معلوم ہوگا گویا اس کے آنے کے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے کوئی دروازہ بھی بند نہیں رہا ہے۔ پہاڑوں کے چلنے اور سَراب بن کر رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اُڑیں گے

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۝۲۲ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝۲۳

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے[14]، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدّتوں پڑے رہیں[15] گے۔

اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر اس طرح پھیل جائیں گے کہ جہاں پہلے کبھی پہاڑ تھے وہاں ریت کے وسیع میدانوں کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ اِسی کیفیت کو سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ اِن سے کہو: میرا رب ان کو دھول بنا کر اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بَل اور سَلوَٹ تک نہ دیکھو گے۔'' (آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ مع حاشیہ ۸۳)

۱۴- گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری کی حالت میں آئے اور اچانک اس میں پھنس جائے۔ جہنّم کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اُس سے بے خوف ہو کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اُچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی اُن کے لیے ایک کُھلی آماجگاہ ہے، اور یہاں کسی پکڑ کا خطرہ نہیں ہے، لیکن جہنّم اُن کے لیے ایک ایسی چُھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ یکایک پھنسیں گے اور بس پھنس کر ہی رہ جائیں گے۔

۱۵- اصل میں لفظ اَحْقَاب استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنٰی ہیں: پے در پے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل اَدوار کہ ایک دَور ختم ہوتے ہی دُوسرا دَور شروع ہو جائے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہیشگی ہو گی مگر جہنّم میں ہیشگی نہیں ہو گی، کیونکہ یہ مدّتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں، بہرحال جب مدّتوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہی متصوّر ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہوں گی بلکہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ اِستِدلال دو وجوہ سے غلط ہے: ایک، یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حُقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حُقب کے پیچھے دوسرا حُقب ہو، اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دَور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دَور نہ آئے۔ دوسرے، یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآنِ مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اُصولاً غلط ہے جو اُسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہلِ جہنّم کے لیے خُلود (ہیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تین جگہ صرف لفظِ خُلُود ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر اَبَدًا (ہمیشہ ہمیشہ) کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ چاہیں گے کہ جہنّم سے نکل جائیں، مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں، اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔'' (المائدہ، آیت ۳۷) ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ ''اِسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔'' اور یہی بات اہلِ جنت کے متعلق بھی فرمائی گئی ہے کہ ''جنّت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔'' (ہُود، آیات ۱۰۷-۱۰۸) اِن تصریحات کے بعد لفظِ اَحقاب کی بنیاد پر یہ

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ إِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً
وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ إِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾
وَ كُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ ع
إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ أَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ كَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿۳۳﴾

اُس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزا وہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون[16]، (ان کے کرتوتوں کا) بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انھوں نے بالکل جھُٹلا دیا تھا[17]، اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی[18]۔ اب چکھو مزا، ہم تمھارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔ ع

یقیناً متّقیوں[19] کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور، اور نوخیز ہم سِن لڑکیاں[20]،

کہنے کی آخر کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنّم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا بلکہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا؟

۱۶– اصل میں لفظ غَسّاق استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق پیپ، لہو، کچ لہو، اور آنکھوں اور کھالوں سے بننے والی اُن تمام رطوبتوں پر ہوتا ہے جو شدید تعذیب کی وجہ سے بہ نکلتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس میں سخت تعفّن اور سڑاند ہو۔

۱۷– یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر وہ جہنم کے اس خوف ناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ایک یہ کہ دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انھیں خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ کے ذریعے سے اُن کی ہدایت کے لیے جو آیات بھیجی تھیں انھیں ماننے سے انھوں نے قطعی انکار کر دیا اور ان کو جھوٹ قرار دیا۔

۱۸– یعنی اُن کے اقوال و افعال، ان کی حرکات و سکنات، حتیّٰ کہ ان کی نیّتوں اور خیالات اور مقاصد تک کا مکمل ریکارڈ ہم تیار کرتے جا رہے تھے جس سے کوئی چیز چھُوٹی ہوئی نہ تھی، اور وہ بے وقوف اِس سے بے خبر اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ کسی اندھیر نگری میں جی رہے ہیں، جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، اُس کی باز پُرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

۱۹– یہاں متّقیوں کا لفظ اُن لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً
مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا
بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ
وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۤ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

اور چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سُنیں گے[21]۔ جزا اور کافی انعام[22] تمھارے رب کی طرف سے، اُس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے، جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں[23]۔

جس روز رُوح[24] اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا، سوائے اُس کے جسے رحمٰن اجازت دے

اور جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ اس لیے لامحالہ اِس لفظ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی آیات کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ اُنھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

۲۰ - اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اُن لوگوں کی ہم سِن ہوں گی جن کی زوجیت میں وہ دی جائیں گی۔ سورۂ صٓ، آیت ۵۲، اور سورۂ واقعہ، آیت ۳۷ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔

۲۱ - قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اِس بات کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ آدمی کے کان وہاں بیہودہ اور جھوٹی اور گندی باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ وہاں کوئی یاوہ گوئی اور فضول گپ بازی نہ ہوگی، کوئی کسی سے نہ جھوٹ بولے گا نہ کسی کو جُھٹلائے گا، دنیا میں گالم گلوچ، بُہتان، افترا، تہمت اور الزام تراشیوں کا جو طوفان برپا ہے، اس کا کوئی نام و نشان وہاں نہ ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۱۳-۱۴)

۲۲ - جزا کے بعد کافی انعام دینے کا ذکر یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اُن کو صرف وہی جزا نہیں دی جائے گی جس کے وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر مستحق ہوں گے، بلکہ اس پر مزید انعام اور کافی انعام بھی انھیں دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہلِ جہنّم کے بارے میں صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ انھیں ان کے کرتُوتوں کا بھرپور بدلہ دے دیا جائے گا، یعنی نہ ان کے جرائم سے کم سزا دی جائے گی، نہ اس سے زیادہ۔ یہ بات قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثلاً: یونُس، آیات ۲۶-۲۷۔ النمل، آیات ۸۹-۹۰، القصص، آیت ۸۴۔ سبا، آیات ۳۳ تا ۳۸۔ المومن، آیت ۴۰۔

وَّ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ
مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ
يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع

اور جو ٹھیک بات کہے۔[۲۵] وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کر لے۔

ہم نے تم لوگوں کو اُس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔[۲۶] جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اُٹھے گا کہ کاش! میں خاک[۲۷] ہوتا۔ ع

---

۲۳ – یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رُعب کا یہ عالَم ہوگا کہ اہلِ زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ ازخود اللہ تعالیٰ کے حُضور زبان کھول سکے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔

۲۴ – اہلِ تفسیر کی اکثریّت کا خیال یہی ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ان کا جو بلند مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے، اس کی وجہ سے ملائکہ سے الگ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المعارج، حاشیہ ۳)

۲۵ – بولنے سے مراد شفاعت ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی: ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی' صرف وہی شخص اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور دُرست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے، اور جس کے معاملے میں وہ سفارش کر رہا ہو، وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو، یعنی محض گناہ گار ہو، کافر نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱۔ جلد دوم، یُونس، حاشیہ ۵۔ ہود، حاشیہ ۱۰۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۲۔ طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۲۷۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۴۰-۴۱۔ المومن، حاشیہ ۳۲۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۶۸۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۲۱۔ جلد ششم، المدّثّر، حاشیہ ۳۶)

۲۶ – بظاہر ایک آدمی یہ خیال کر سکتا ہے کہ جن لوگوں کو خطاب کر کے یہ بات کہی گئی تھی، ان کو مرے ہوئے اب ۱۴ سو سال گزر چکے ہیں، اور اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت آیندہ کتنے سو، یا کتنے ہزار، یا کتنے لاکھ برس بعد

Maktaba Tul Ishaat.com

آئے گی۔ پھر یہ بات کس معنیٰ میں کہی گئی ہے کہ جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ قریب آ لگا ہے؟ اور سورت کے آغاز میں یہ کیسے کہا گیا ہے کہ عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وقت کا احساس صرف اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اِس دنیا میں زمان و مکان کی حدود کے اندر جسمانی طور پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ مرنے کے بعد جب صرف روح باقی رہ جائے گی، وقت کا احساس و شُعور باقی نہ رہے گا، اور قیامت کے روز جب انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا، اس وقت اسے یُوں محسوس ہو گا کہ ابھی سوتے سوتے اسے کسی نے جگا دیا ہے۔ اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہو گا کہ وہ ہزار ہا سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۴۸)

۲۷ — یعنی دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا، یا مر کر مٹی میں مل جاتا اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کی نوبت نہ آتی۔

تفہیم القرآن

النازعات

(۷۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

النازعات

نام پہلے ہی لفظ وَ النّٰزِعٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ سورۂ نباء (عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع قیامت اور زندگی بعدِ موت کا اِثبات ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر تنبیہ بھی کہ خدا کے رسول کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آغازِ کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے، اور اللہ کے احکام کو بلا تاخیر بجالانے والے، اور حکمِ الٰہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھا کر یہ یقین دلایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آ کر رہے گی۔ کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے، اُنھی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی بھی جاسکتی ہے، اور جو فرشتے آج اللہ کے حکم کی تعمیل بلا تاخیر بجالاتے اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں، وہی فرشتے کل اُسی خدا کے حکم سے کائنات کا یہ نظام دَرہم بَرہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام، جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دشوار کام ہی نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ بس ایک جھٹکا دنیا کے اِس نظام کو دَرہم بَرہم کر دے گا، اور ایک دوسرا جھٹکا اِس کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ دوسری دنیا میں یکایک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ۔ اُس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے تھے، خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہوں گے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

پھر حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصّہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ رسول کو جھٹلانے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو رد کرنے اور چال بازیوں سے اس کو شکست دینے کی کوشش کا کیا انجام فرعون دیکھ چکا ہے۔ اُس سے عبرت حاصل کر کے اِس رَوِش سے باز نہ آؤ گے تو وہی انجام تمھیں بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے منکرین سے پوچھا گیا ہے کہ تمھیں دوبارہ پیدا کر دینا زیادہ سخت کام ہے یا اِس عظیم کائنات کو پیدا کرنا جو عالمِ بالا میں اپنے بے حد و حساب ستاروں اور سیّاروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے؟ جس خدا کے لیے

یہ کام مشکل نہ تھا، اس کے لیے تمھاری بارِ دگر تخلیق آخر کیوں مشکل ہو گی؟ صرف ایک فقرے میں امکانِ آخرت کی یہ مُسکِت دلیل پیش کرنے کے بعد زمین اور اُس سروسامان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین میں انسان اور حیوان کی زِیست کے لیے فراہم کیا گیا ہے اور جس کی ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ اشارہ کر کے اِس سوال کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ آیا اِس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ کر اُس کا مُحاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت نظر آتا ہے، یا یہ کہ وہ زمین میں ہر طرح کے کام کر کے مر جائے اور خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے اور کبھی اُس سے حساب نہ لیا جائے کہ اِن اختیارات کو اس نے کیسے استعمال کیا اور اِن ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کیا؟ اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے آیات ۳۴-۴۱ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آخرت برپا ہوگی تو انسان کے دائمی اور اَبدی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں حدِ بندگی سے تجاوُز کر کے اپنے خدا سے سرکشی کی اور دنیا ہی کے فائدوں اور لذّتوں کو مقصود بنا لیا، اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے سے احتراز کیا۔ یہ بات خود بخود اُوپر کے سوال کا صحیح جواب ہر اُس شخص کو بتا دیتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر ایمان داری کے ساتھ اُس پر غور کرے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا بالکل عقلی، منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ اِسی بنیاد پر آخرِ کار اُس کا مُحاسبہ کیا جائے اور اسے جزا یا سزا دی جائے۔

آخر میں کفّارِ مکہ کے اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ قیامت آئے گی کب؟ یہ سوال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کرتے تھے۔ جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اُس کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسول کا کام صرف خبردار کر دینا ہے کہ وہ وقت آئے گا ضرور۔ اب جس کا جی چاہے اس کے آنے کا خوف کر کے اپنا رَوِیّہ دُرست کر لے، اور جس کا جی چاہے بے خوف ہو کر شُترِ بے مہار کی طرح چلتا رہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تو وہی لوگ جو اِس دنیا کی زندگی پر مرے مٹتے تھے اور اِسی کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں وہ صرف گھڑی بھر ٹھیرے تھے۔ اُس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ اس چند روزہ زندگی کی خاطر انھوں نے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل برباد کر لیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۴۶ آیاتہا

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ ﴿۶﴾

وقف لازم

قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ڈُوب کر کھینچتے ہیں، اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں، اور (اُن فرشتوں کی جو کائنات میں) تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر (حکم بجالانے میں) سبقت کرتے ہیں، پھر (احکامِ الٰہی کے مطابق) معاملات کا انتظام چلاتے ہیں۱۔ جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا،

۱ — یہاں پانچ اَوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ لیکن بعد کا مضمون اِس امر پر خود دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان ضرور ازسرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اِس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں، لیکن صحابہؓ اور تابعینؒ کی بڑی تعداد نے اور اکثر مفسّرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مَسْرُوق، سعید بن جُبَیر، ابوصالح، ابوالضُّحٰی اور سُدِّی کہتے ہیں کہ ڈوب کر کھینچنے والوں اور آہستگی سے نکال لے جانے والوں سے مُراد وہ فرشتے ہیں جو موت کے وقت انسان کی جان کو اس کے جسم کی گہرائیوں تک اُتر کر اور اس کی رگ رگ سے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ تیزی سے تیرتے پھرنے والوں سے مراد بھی حضرت علیؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، مجاہد، سعید بن جُبیر اور ابوصالح نے فرشتے ہی لیے ہیں، جو احکامِ الٰہی کی تعمیل میں اِس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں جیسے کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوں۔ یہی مفہوم "سبقت کرنے والوں" کا حضرت علیؓ، مجاہد، مَسْرُوق، ابوصالح اور حسن بصری نے لیا ہے، اور سبقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کا اشارہ پاتے ہی اُن میں سے ہر ایک اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ "معاملات کا انتظام چلانے والوں" سے مراد بھی فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت علیؓ، مجاہد، عطاء، ابوصالح، حسن بصری، قَتادہ، رَبیع بن اَنَس اور سُدِّی سے منقول ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ سلطنت کائنات کے وہ کارکن ہیں جن کے ہاتھوں دنیا کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ اِن آیات کے یہ معنیٰ اگرچہ کسی صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہوئے ہیں، لیکن چند اکابر صحابہ نے، اور اُن تابعین نے جو صحابہ ہی کے شاگرد تھے، جب ان کا یہ مطلب بیان کیا ہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ علم حضوُر ہی سے حاصل کیا گیا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر ان فرشتوں کی قسم کس بنا پر کھائی گئی ہے، جب کہ

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝٧ قُلُوبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝٨ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝٩

اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا،[۲] کچھ دل ہوں گے جو اُس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے،[۳] نگاہیں اُن کی سہمی ہوئی ہوں گی۔

یہ خود بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطورِ شہادت اور بطورِ اِستدلال پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے، واللہ اعلم، کہ اہلِ عرب فرشتوں کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ خود اِس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے، زمین سے آسمان تک آناً فاناً وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ہر کام، جس کا انھیں حکم دیا جائے، بلا تاخیر انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ یہ فرشتے حکمِ الٰہی کے تابع ہیں اور کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے چلاتے ہیں، خود مختار اور اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ جہالت کی بنا پر وہ اُن کو اللہ کی بیٹیاں ضرور کہتے تھے اور اُن کو معبود بھی بنائے ہوئے تھے، لیکن اُن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اصل اختیارات انھی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے یہاں وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر اُن کے مذکورۂ بالا اوصاف سے استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جس خدا کے حکم سے فرشتے تمھاری جان نکالتے ہیں، اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں۔ اور جس خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں، اسی کے حکم سے، جب بھی اُس کا حکم ہو، اِس کائنات کو وہ دَرہم بَرہم بھی کر سکتے ہیں، اور ایک دوسری دنیا بنا بھی سکتے ہیں۔ اُس کے حکم کی تعمیل میں ان کی طرف سے ذرّہ برابر بھی سُستی یا لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی۔

۲- پہلے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا، اور دوسرے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جس کے بعد تمام مُردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اِسی کیفیت کو سورۂ زُمَر میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اور صُور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں وہ سب مر کر گر جائیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر ایک دوسرا صُور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔'' (آیت ۶۸)

۳- ''کچھ دل'' کے الفاظ اِس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید کی رُو سے صرف کُفّار و فُجّار اور منافقین ہی پر قیامت کے روز ہَول طاری ہو گا۔ مومنینِ صالحین اُس ہَول سے محفوظ ہوں گے۔ سورۂ انبیاء میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ''وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' (آیت ۱۰۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

يَقُوْلُوْنَ ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۟ؕ ﴿۱۰﴾ ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا
نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ؕ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وقفِ لازم
وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ۙ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ؕ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ
مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ۘ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ۚ وقفِ لازم

یہ لوگ کہتے ہیں: "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟" کہنے لگے: "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی!"[۴] حالانکہ یہ بس اِتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کُھلے میدان میں موجود ہوں گے۔[۵]

کیا[۶] تمھیں موسیٰؑ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اُسے طُوَیٰ کی مقدّس وادی[۷] میں پکارا تھا

۴ – یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں، ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یارو! اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تب تو ہم مارے گئے، اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔

۵ – یعنی یہ لوگ اسے ایک امرِ محال سمجھ کر اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، حالانکہ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کو انجام دینے کے لیے کچھ بڑی لمبی چوڑی تیاریوں کی ضرورت ہو۔ اِس کے لیے صرف ایک ڈانٹ یا جھڑکی کافی ہے، جس کے ساتھ ہی تمھاری خاک یا راکھ، خواہ کہیں پڑی ہو، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے گی اور تم یکایک اپنے آپ کو زمین کی پیٹھ پر زندہ موجود پاؤ گے۔ اِس واپسی کو گھاٹے کی واپسی سمجھ کر چاہے تم اِس سے کتنا ہی فرار کرنے کی کوشش کرو، یہ تو ہو کر رہنی ہے، تمھارے انکار یا فرار یا تَمَسْخُر سے یہ رُک نہیں سکتی۔

٦ – چونکہ کفارِ مکہ کا قیامت اور آخرت کو نہ ماننا اور اس کا مذاق اڑانا دراصل کسی فلسفے کو ردّ کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ کے رسول کو جھٹلانا تھا، اور جو چالیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چل رہے تھے، وہ کسی عام آدمی کے خلاف نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی دعوت کو زک دینے کے لیے تھیں، اس لیے وقوعِ آخرت کے مزید دلائل دینے سے پہلے اُن کو حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ سنایا جا رہا ہے، تاکہ وہ خبردار ہو جائیں کہ رسالت سے ٹکرانے اور رسول کے بھیجنے والے خدا کے مقابلے میں سر اٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۷ – وادیِ مقدّسِ طُوَیٰ کے معنی بالعموم مفسّرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ مقدّس وادی جس کا نام طُوَیٰ تھا۔" لیکن اس کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ "وہ وادی جو دو مرتبہ مقدس کی گئی"، کیونکہ ایک

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ
اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ

کہ ”فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس سے کہہ: کیا تو اِس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اُس کا) خوف تیرے اندر پیدا[8] ہو؟“ پھر موسیٰؑ نے (فرعون کے پاس جا کر) اُس کو بڑی نشانی[9] دکھائی، مگر اُس نے جُھٹلا دیا اور

دفعہ اُسے اُس وقت مقدّس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰؑ کو مخاطب فرمایا، اور دوسری دفعہ اسے تقدیس کا شرف اُس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اِس وادی میں لائے۔ دوسرے، یہ کہ ”رات کے وقت وادیِ مقدس میں پکارا۔“ عربی میں محاورہ ہے: جاء بعد طُوی، یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصّہ گزرنے کے بعد آیا۔

۸ – یہاں چند باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

(۱) حضرت موسیٰؑ کو منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت جو باتیں اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی تھیں، اُن کو قرآنِ مجید میں حسبِ موقع کہیں مختصر اور کہیں مفصّل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں موقع اختصار کا طالب تھا، اس لیے اُن کا صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ، آیات ۹ تا ۴۸، سورۂ شُعَراء، آیات ۱۰ تا ۱۷، سورۂ نمل، آیات ۷ تا ۱۲، اور سورۂ قصص، آیات ۲۹ تا ۳۵ میں ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

(۲) فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوُز کر کے خالق اور خَلق، دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ خالق کے مقابلے میں اُس کی سرکشی کا ذکر تو آگے آ رہا ہے کہ اس نے اپنی رعیت کو جمع کر کے اعلان کیا کہ ”میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔“ اور خَلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر وہ سخت ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور اپنی پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص، آیت ۴ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۵۴ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ”تم اور ہارون دونوں بھائی اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔“ (طٰہٰ، آیت ۴۴) اِس نرم کلام کا ایک نمونہ تو اِن آیات میں دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مُبلّغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ، آیات ۴۹ تا ۵۲، الشعراء، ۲۳ تا ۲۸، اور القصص، آیت ۳۷ میں دیے گئے ہیں۔ یہ منجملہ اُن آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حکمتِ تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عَصٰی ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ

نہ مانا، پھر چالبازیاں کرنے کے لیے پلٹا۱۱ اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا: ''میں تمھارا سب سے

(۴) حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بِعثَت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہِ راست دکھانا تھا، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہِ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اصل میں ایک مسلمان قوم تھے) اُس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات اِن آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اِن میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے، بلکہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اُن مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے تبلیغ اسلام بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً مُلاحظہ ہو: الاَعراف، آیات ۱۰۴-۱۰۵۔ طٰہٰ، آیات ۴۷ تا ۵۲۔ الشُّعَراء، آیات ۱۶-۱۷ و ۲۳ تا ۲۸۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۷۴)

(۵) یہاں پاکیزگی (تزکّی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اَخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا، یا دوسرے الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابنِ زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکّی کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں: وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰی، ''اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے''، یعنی اسلام لے آئے۔ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰٓی، اور ''تمھیں کیا خبر، شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے''، یعنی مسلمان ہو جائے۔ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی، ''اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے''، یعنی مسلمان نہ ہو۔ (ابنِ جَرِیر)

(۶) یہ ارشاد کہ ''میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف) تیرے دل میں پیدا ہو''، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اپنے رب کو پہچان لے گا اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو اُس کا بندہ ہے، مردِ آزاد نہیں ہے، تو لازماً تیرے دل میں اُس کا خوف پیدا ہوگا، اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا میں آدمی کے رَوِیّے کے صحیح ہونے کا انحصار ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر کسی پاکیزگی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

۹- بڑی نشانی سے مراد عصا کا اژدہا بن جانا ہے، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بے جان لاٹھی سب دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے عَلانیہ اژدہا بن جائے، جادُوگر اُس کے مقابلے میں لاٹھیوں اور رسّیوں کے جو مصنوعی اژدہے بنا کر دکھائیں ان سب کو وہ نگل جائے، اور پھر حضرت موسیٰؑ جب اس کو پکڑ کر اُٹھالیں تو وہ پھر لاٹھی کی لاٹھی بن کر رہ جائے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ وہ اللہ رب العالمین ہی ہے جس کی طرف سے حضرت موسیٰؑ بھیجے گئے ہیں۔

۱۰- اس کی تفصیل دوسرے مَقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے تمام مصر سے ماہر جادُوگروں

الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾

ع ۲۶ ۳

بڑا رب ہوں۔[۱۱]" آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اِس میں بڑی عبرت ہے ہر اُس شخص کے لیے جو ڈرے[۱۲] ع

کیا[۱۳] تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟[۱۴] اللہ نے اُس کو بنایا،

کو بلوایا اور ایک مجمع عام میں ان سے لاٹھیوں اور رسّیوں کے اژدہے بنوا کر دکھائے، تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی نبی نہیں بلکہ ایک جادوگر ہیں، اور لاٹھی کا اژدہا بنانے کا جو کرشمہ انھوں نے دکھایا ہے وہ دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی یہ چال اُلٹی پڑی اور جادوگروں نے شکست کھا کر خود تسلیم کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے۔

۱۱- فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمھیں قید کر دوں گا۔" (الشُّعراء، آیت ۲۹) ایک اور موقع پر اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کر کے کہا: "اے سردارانِ قوم! میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور خدا بھی ہے۔" (القصص، آیت ۳۸) ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدّعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآنِ مجید ہی میں اِس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلّق ہے، وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا، چنانچہ اس کے اہلِ دربار ایک موقع پر اس کو مُخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "کیا آپ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاَعراف، آیت ۱۲۷) اور قرآن میں فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰؑ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اَردلی میں کیوں نہ آئے؟ (الزُّخرُف، آیت ۵۳) پس درحقیقت وہ مذہبی معنٰی میں نہیں بلکہ سیاسی معنٰی میں اپنے آپ کو الٰہ اور ربِّ اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اُوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہو سکتا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاَعراف، حاشیہ ۸۵۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۱۔ الشُّعراء، حواشی ۲۴ و ۲۶۔ القصص، حواشی ۵۲-۵۳۔ جلد چہارم، الزُّخرُف، حاشیہ ۴۹)

۱۲- یعنی خدا کے رسول کو جھٹلانے کے اُس انجام سے ڈرے جو فرعون دیکھ چکا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾
وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾

اُس کی چھت خوب اُونچی اُٹھائی پھر اُس کا توازُن قائم کیا، اور اُس کی رات ڈھانکی اور اُس کا دن نکالا[۱۵]۔ اِس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا[۱۶]، اُس کے اندر سے اُس کا پانی اور چارا نکالا[۱۷]،

۱۳ – اب قیامت اور حیات بعد الموت کے ممکن اور مقتضائے حکمت ہونے کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

۱۴ – تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالَم بالا ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیّارے، بے حدوحساب شمسی نظام اور اَن گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امرِ محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی، اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمھیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اِسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا، اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اِس پر قادر نہ ہو سکے؟ حیات بعد الموت پر یہی دلیل قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر دی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین میں ہے: ”اور کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اِس پر قادر نہیں ہے کہ اِن جیسوں کو (پھر سے) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں، وہ تو بڑا زبردست خالق ہے، تخلیق کے کام کو خوب جانتا ہے۔“ (آیت ۸۱) اور سورۂ مومن میں فرمایا: ”یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“ (آیت ۵۷)

۱۵ – رات اور دن کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ آسمان کا سورج غروب ہونے سے ہی رات آتی ہے اور اسی کے طُلوع ہونے سے دن نکلتا ہے۔ رات کے لیے ڈھانکنے کا لفظ اس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد رات کی تاریکی اس طرح زمین پر چھا جاتی ہے جیسے اُوپر سے اس پر پردہ ڈال کر ڈھانک دیا گیا ہو۔

۱۶ – ”اِس کے بعد زمین کو بچھانے“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی، بلکہ یہ ایسا ہی طرزِ بیان ہے جیسے ہم ایک بات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”پھر یہ بات غور طلب ہے۔“ اس سے مقصود ان دونوں باتوں کے درمیان واقعاتی ترتیب بیان کرنا نہیں ہوتا کہ پہلے یہ بات ہوئی اور اس کے بعد دوسری بات، بلکہ مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔ اِس طرزِ بیان کی متعدّد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ قلم میں فرمایا: عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ”جفا کار ہے اور اس کے بعد بد اصل۔“ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفا کار بنا اور اس کے بعد بد اصل ہوا، بلکہ

وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے سامانِ زیست کے طور پر تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے۔[۱۸]

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفاکار ہے، اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ بلد میں فرمایا: فَكُّ رَقَبَةٍ...... ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ''غلام آزاد کرے...... پھر ایمان لانے والوں میں سے ہو۔'' اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ نیک اعمال کرے، پھر ایمان لائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اس میں مومن ہونے کی صفت بھی ہو۔ اِس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن میں کہیں زمین کی پیدایش کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور آسمانوں کی پیدایش کا ذکر بعد میں، جیسے سورۂ بقرہ، آیت ۲۹ میں ہے، اور کسی جگہ آسمان کی پیدایش کا ذکر پہلے اور زمین کی پیدایش کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے، جیسے اِن آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ دراصل تضاد نہیں ہے۔ اِن مقامات میں سے کسی جگہ بھی مقصودِ کلام یہ بتانا نہیں ہے کہ کسے پہلے بنایا گیا اور کسے بعد میں، بلکہ جہاں موقع و محل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات کو نمایاں کیا جائے وہاں آسمانوں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور زمین کا بعد میں، اور جہاں سلسلۂ کلام اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لوگوں کو اُن نعمتوں کا احساس دلایا جائے جو انھیں زمین پر حاصل ہو رہی ہیں وہاں زمین کے ذکر کو آسمانوں کے ذکر پر مقدّم رکھا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حواشی ۱۳-۱۴)

۱۷- چارا سے مراد اس جگہ صرف جانوروں کا چارا نہیں ہے بلکہ وہ تمام نباتات مراد ہیں جو انسان اور حیوان دونوں کی غذا کے کام آتے ہیں۔ رَعی اور رَتع اگرچہ بالعموم عربی زبان میں جانور کے چَرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی انسان کے لیے بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں، مثلاً سورۂ یوسف میں آیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے والد ماجد سے کہا: أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ، ''آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیں کہ کچھ چَر چُگ لے اور کھیلے۔'' (آیت ۱۲) یہاں بچے کے لیے چَرنے (رَتع) کا لفظ جنگل میں چل پھر کر پھل توڑنے اور کھانے کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔

۱۸- اِن آیات میں قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے اِستدلال کیا گیا ہے۔ ایک، یہ کہ اس خدا کی قدرت سے اِن کا برپا کرنا ہرگز بعید نہیں ہے جس نے یہ وسیع و عظیم کائنات اِس حیرت انگیز توازُن کے ساتھ اور یہ زمین اِس سروسامان کے ساتھ بنائی ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ کے کمالِ حکمت کے جو آثار اِس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں، وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ عالَمِ بالا میں بے شمار ستاروں اور سیّاروں اور کہکشاؤں کے درمیان جو توازُن قائم ہے، وہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ اَلل ٹَپ نہیں ہو گیا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اِس کے پیچھے کارفرما ہے۔ یہ رات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾

پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا[19]، جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا[20]،

خود اِسی زمین پر وہ خطّے بھی موجود ہیں جہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر دن اور رات کا اُلٹ پھیر ہو جاتا ہے، اور وہ خطّے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔ زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصّہ پہلی قسم کے خطّوں میں ہے، اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ۶ مہینے کے دن اور ۶ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔ یہ دونوں نمونے اِسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اِس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمد و رفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ایک اندازے کے مطابق کیا گیا ہے۔ اِسی طرح زمین کو اِس طرح بچھانا کہ وہ قابلِ سُکونت بن سکے، اِس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے روئیدگی کے قابل ہو، اِس میں پہاڑوں کا جمانا اور وہ تمام چیزیں پیدا کرنا جو انسان اور ہر قسم کے حیوانات کے لیے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بن سکیں، یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ اتفاقی حوادث یا کسی کھلنڈرے کے بے مقصد کام نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر کام ایک بہت بڑی حکیم و دانا ہستی نے بامقصد کیا ہے۔ اب یہ ہر صاحبِ عقل آدمی کے خود سوچنے کی بات ہے کہ آیا آخرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ جو شخص اِن ساری چیزوں کو دیکھنے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ آخرت نہیں ہوگی، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ یہاں اَور سب کچھ تو حکمت اور مقصدیّت کے ساتھ ہو رہا ہے، مگر زمین پر انسان کو ذی ہوش اور بااختیار بنا کر پیدا کرنا بے مقصد اور بے حکمت ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد اور بے حکمت بات نہیں ہو سکتی کہ اِس زمین میں تصرّف کے وسیع اختیارات دے کر انسان کو یہاں ہر طرح کے اچھے اور بُرے کام کرنے کا موقع تو دے دیا جائے مگر کبھی اس کا مُحاسبہ نہ کیا جائے۔

۱۹ – اس سے مراد ہے قیامت، اور اس کے لیے الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ طامّہ بجائے خود کسی ایسی بڑی آفت کو کہتے ہیں جو سب پر چھا جائے۔ اس کے بعد اس کے لیے کُبریٰ کا لفظ مزید استعمال کیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شدت کا تصوّر دلانے کے لیے محض لفظِ طامّہ بھی کافی نہیں ہے۔

۲۰ – یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبے کا دن آ گیا ہے جس کی اُسے دنیا میں خبر دی جا رہی تھی، تو قبل اِس کے کہ اُس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے، اسے ایک ایک کر کے اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دنیا میں کر کے آیا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ تجربہ خود اِس دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ اگر یکایک کسی وقت وہ

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ
الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ
نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾
یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ
ذِكْرٰهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا ﴿۴۵﴾

اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنّت اس کا ٹھکانا ہوگی۔[۲۱]

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھیرے[۲۲] گی؟" تمھارا کیا کام کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو ہر اُس شخص کو جو اُس کا خوف کرے۔[۲۳]

کسی ایسے خطرے سے دوچار ہوجاتے ہیں جس میں موت ان کو بالکل قریب کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو اپنی پُوری زندگی کی فلم اُن کی چشمِ تصوّر کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔

۲۱ – یہاں چند مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخرت میں اصل فیصلہ کس چیز پر ہونا ہے۔ دنیا میں زندگی کا ایک رَوِیّہ یہ ہے کہ آدمی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے اپنے خدا کے مقابلے میں سرکشی کرے اور یہ طے کرلے کہ اِسی دُنیا کے فائدے اور لذّتیں اُسے مطلوب ہیں، خواہ کسی طرح بھی وہ حاصل ہوں۔ دوسرا رَوِیّہ یہ ہے کہ یہاں زندگی بسر کرتے ہوئے آدمی اِس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ آخرِ کار ایک دن اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور نفس کی بُری خواہشات کو پورا کرنے سے اِس لیے باز رہے کہ اگر یہاں اُس نے اپنے نفس کا کہا مان کر کوئی ناجائز فائدہ کما لیا، یا کوئی ناروا لذّت حاصل کرلی تو اپنے رب کو کیا جواب دے گا۔ آخرت میں فیصلہ اِسی بات پر ہونا ہے کہ انسان نے اِن دونوں میں سے کون سا رَوِیّہ دنیا میں اختیار کیا۔ پہلا رَوِیّہ اختیار کیا ہو تو اس کا مستقل ٹھکانا دوزخ ہے، اور دوسرا رَوِیّہ اختیار کیا ہو تو اس کی مستقل جائے قیام جنت۔

۲۲ – کُفّارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال بار بار کرتے تھے اور اس سے مقصود قیامت کی آمد کا وقت اور اس کی تاریخ معلوم کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن،

Maktaba Tul Ishaat.com

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾ ع

جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انھیں یوں محسوس ہوگا کہ (یہ دنیا میں یا حالتِ موت میں) بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھیرے ہیں[۲۴]۔ ع

جلد ششم، تفسیر سورۂ مُلک، حاشیہ ۳۵)

۲۳- اِس کی تشریح بھی ہم تفسیر سورۂ مُلک، حاشیہ ۳۶ میں کر چکے ہیں۔ رہا یہ ارشاد کہ تم ہر اُس شخص کو خبردار کر دینے والے ہو جو اس کا خوف کرے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوف نہ کرنے والوں کو خبردار کرنا تمھارا کام نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے خبردار کرنے کا فائدہ اسی کو پہنچے گا جو اُس دن کے آنے کا خوف کرے۔

۲۴- یہ مضمون اس سے پہلے کئی جگہ قرآن میں بیان ہو چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۵۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔ المؤمنون، حاشیہ ۱۰۱۔ الروم، حواشی ۸۱-۸۲۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۴۸۔ اس کے علاوہ یہ مضمون سورۂ اَحقاف، آیت ۳۵ میں بھی گزر چکا ہے، جس کی تشریح ہم نے وہاں نہیں کی، کیونکہ پہلے کئی جگہ تشریح ہو چکی تھی۔

تفہیم القرآن

عَبَسَ

(۸۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

عَبَسَ

نام پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول مفسّرین و محدثین نے بالاتفاق اِس سورہ کا سببِ نُزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکۂ معظّمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضوؐر اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابنِ اُمّ مَکْتُومؓ نامی ایک نابینا، حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپؐ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضوؐر کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپؐ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ اِس تاریخی واقعے سے اِس سورہ کا زمانۂ نزول بآسانی متعیّن ہو جاتا ہے۔

اوّلاً، یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابنِ اُمّ مَکْتُومؓ بالکل ابتدائی دَور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابنِ حَجَر اور حافظ ابنِ کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اَسْلَمَ بِمَكَّةَ قَدِيْمًا، اور هُوَ مِمَّنْ اَسْلَمَ قَدِيْمًا، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکۂ معظّمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً، حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لا چکے تھے، اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضورؐ کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے آ کر عرض کیا تھا: یا رسُول اللّٰہ! ارشدنی، ’’یا رسولؐ اللہ! مجھے سیدھا راستہ بتایئے۔‘‘ (ترمِذِی، حاکم، ابنِ حِبّان، ابنِ جَرِیر، ابویَعلیٰ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ آ کر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضورؐ سے عرض کیا: یا رسول اللّٰہ علّمنی مِمّا علّمك اللّٰہ، ’’یا رسولؐ اللہ! مجھے وہ علم سکھایئے جو اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے۔‘‘ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم) اِن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابنِ زیدؒ آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی کا مطلب لَعَلَّهٗ يُسْلِمُ ’’شاید کہ وہ اسلام قبول کر لے‘‘ بیان کرتے ہیں۔ (ابنِ جَرِیر) اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ ’’تمھیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟‘‘ اور یہ کہ ’’جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو‘‘ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق کا

گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپؐ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ اُن کی یہ طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انھیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً، حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اِس فہرست میں ہمیں عُتْبَہ، شَیْبَہ، ابوجہل، اُمَیَّہ بن خَلَف، اُبَیّ بن خَلَف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِن لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کش مکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپؐ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپؐ کے ساتھ اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب اُمور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورت بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اِس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبُّر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپؐ اختیار فرما رہے تھے۔ آپؐ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپؐ بڑے لوگوں کو مُعزّز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ! یہ کوئی کج خُلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے بااثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑسکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا، جس کا مُحرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا، نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیُّل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپؐ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپؐ کی توجہ کے

Maktaba Tul Ishaat.com

اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سورت سے آیت ۱۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۷ سے براہِ راست عتاب کا رخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رَوِیّے پر اُنھیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خالق و رازق پروردگار کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس رَوِش کا کیسا ہولناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

---

۴۲ آیاتہا

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ

رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓى ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ

تُرش رُو ہوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آ گیا۔[۱] تمھیں کیا خبر، شاید

۱۔ اِس پہلے فقرے کا اندازِ بیان عجیب لُطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ تُرش رُوئی اور بے رُخی برتنے کا یہ فعل حضورؐ ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن کلام کی ابتدا اِس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضورؐ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صُدور ہوا ہے۔ اِس طرزِ بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپؐ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اِسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپؐ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رَوِیّے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابنِ اُمِّ مکتُوم ہیں۔ حافظ ابنِ عبدالبَرّ نے اَلْاِسْتِیعاب میں اور حافظ ابنِ حَجَر نے اَلْاِصَابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المومنین حضرت خَدِیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، ان کی ماں اُمِّ مکتُوم اور حضرت خَدِیجہؓ کے والد خُوَیلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اِس شبہے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ آپؐ نے اُن کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے اپنے برادرِ نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رَوِیّہ اختیار کیا، لفظِ اَعْمٰی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ مَیں اِس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں، اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پا لے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابنِ مکتُومؓ ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر اِن سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اِس لیے اِن کو اِس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں، اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَزَّكّٰۤى ۙ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنْتَ
لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ
يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّاۤ اِنَّهَا

وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجُّہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دَوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔[۲] ہرگز نہیں،[۳] یہ تو ایک

۲- یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ دین کے معاملے میں اِس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابنِ اُمِّ مَکْتُومؓ کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپؐ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیّت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالبِ حق ہے، اِس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رَوِیّہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اِس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیرِ بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اِس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اُس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کر لے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی رَوِش عَلانِیَہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صَرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں۔

۳- یعنی ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر پُھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اُس کے سامنے اِسے بالْحاح پیش کیا جائے،

تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ وقف لازم

نصیحت[۴] ہے، جس کا جی چاہے اِسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مُکرّم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں[۵]، معزّز اور نیک کاتبوں[۶] کے ہاتھوں میں رہتے ہیں[۷]۔

اور نہ تمھاری یہ شان ہے کہ اِن مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمھاری کوئی غرض اِن سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمھاری دعوت فروغ پا سکے گی، ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق اِن سے اُتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

۴- مراد ہے قرآن۔

۵- یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔ ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریّات اِن میں راہ نہیں پا سکے ہیں۔ جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کر دی گئی ہیں اُن کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکا ہے۔ انسانی تخیّلات ہوں، یا شیطانی وساوِس، اُن سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

۶- ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے اِن صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے تھے، اُن کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انھیں جُوں کا تُوں پہنچا رہے تھے۔ ان کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: ایک کِرام، یعنی معزّز۔ دوسرے بارّ، یعنی نیک۔ پہلے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزّت ہیں کہ جو امانت ان کے سُپرد کی گئی ہے، اس میں ذرّہ برابر خیانت کا صُدور بھی اُن جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان صحیفوں کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمّہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے، اُس کا حق وہ پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

۷- جس سلسلۂ بیان میں یہ آیات ارشاد ہوئی ہیں، ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآن مجید کی یہ تعریف محض اُس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے، بلکہ اصل مقصود ان تمام مُتکبّر لوگوں کو، جو حقارت کے ساتھ اِس کی دعوت سے منہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف جتا دینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اِس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ تمھاری حضوری میں اِسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرفِ قبولیّت عطا کرو۔ یہ تمھاری محتاج نہیں ہے بلکہ تم اِس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خنّاس تمھارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح اس کی دعوت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بے نیاز بنتے ہو اُس سے بہت زیادہ یہ تم سے بے نیاز

Maktaba Tul Ishaat.com

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾
مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾

لعنت[8] ہو انسان[9] پر، کیسا سخت مُنکرِ حق ہے[10] یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اِسے پیدا کیا ہے؟ نُطفے کی ایک بُوند[11] سے۔ اللہ نے اِسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی[12]، پھر اِس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی[13]،

ہے۔ تمھاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمھاری بڑائی کا سارا گھمنڈ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

۸ – یہاں سے عِتاب کا رخ براہِ راست اُن کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بے نیازی برت رہے تھے۔ اس سے پہلے آغازِ سورہ سے آیت ۱۶ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور عِتاب در پردہ کفار پر فرمایا جا رہا تھا۔ اُس کا اندازِ بیان یہ تھا کہ اے نبیؐ! ایک طالبِ حق کو چھوڑ کر آپؐ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صَرف کر رہے ہیں جو دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بالکل بے قدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپؐ جیسا عظیم القدر پیغمبر قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

۹ – قرآنِ مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مَذمّت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ''انسان'' کا لفظ کہیں تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کہیں اِس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعیُّن کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو اُن میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے نصیحت کا یہ طریقہ زیادہ مؤثّر ہوتا ہے کہ عُمومی انداز میں بات کہی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۶۵۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۵)

۱۰ – دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟'' یعنی بالفاظِ دیگر کس بَل بُوتے پر یہ کفر کرتا ہے؟ کفر سے مراد اِس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے محسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق و رازق اور مالک کے مقابلے میں باغیانہ روِش بھی۔

۱۱ – یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اِس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اِس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اِس اصل کو بھول کر یہ ہَمچُو ما دیگرے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اِس کے دماغ میں یہ ہوا بھرتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے؟ (یہی بات ہے جو سورۂ یٰسین، آیات ۷۷-۷۸ میں فرمائی گئی ہے۔)

۱۲ – یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کر دی گئی۔ اِس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿٢١﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿٢٢﴾ كَلَّا لَمَّا

پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔[14] پھر جب چاہے وہ اِسے دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے۔[15] ہرگز نہیں، اِس نے

کیا ہوگا۔ اِس کا قد کتنا ہوگا۔ اِس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضا کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی؟ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اُٹھے گا۔ اس کی شخصیّت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اِسے زمین پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اِس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ جرأت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے، اُس کے مقابلے میں کفر کرتا ہے۔

۱۳ – یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے اُن کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیّا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ مزید برآں خالق نے اِس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شُکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اُس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

۱۴ – یعنی اپنی پیدائش اور اپنی تقدیر کے معاملے ہی میں نہیں، بلکہ اپنی موت کے معاملے میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بے بس ہے۔ نہ اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحے کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اِس کی موت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اُسی وقت، اُسی جگہ اور اُسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کر دی گئی ہے اُسی نوعیت کی قبر میں ودیعت ہو جاتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا الاؤ، یا کسی درندے کا معدہ۔ انسان خود تو درکنار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملے میں خالق کے اِس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

۱۵ – یعنی اِس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اِسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کر سکے۔ پہلے جب اسے پیدا کیا گیا تھا تو اِس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اِس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تُو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کر دیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اِسی طرح اب دوبارہ پیدائش بھی اِس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اُٹھے اور اُٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اُٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اِس معاملے میں بھی یہ قطعی بے بس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اِسے اُٹھا کھڑا کرے گا اور اِس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ۙ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ۙ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا
حَبًّا ۙ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ﴿۲۸﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ
غُلْبًا ۙ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ؕ﴿۳۲﴾

وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اِسے حکم دیا تھا۔[۱۶] پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔[۱۷] ہم نے خوب پانی لُنڈھایا،[۱۸] پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا،[۱۹] پھر اُس کے اندر اُگائے غلّے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست کے طور پر۔[۲۰]

۱۶- حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرّہ اور قدرتِ الٰہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے بھیجا اور ہر دَور کے صالحین کے ذریعے سے پھیلایا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ دَہر، حاشیہ ۵) اِس سلسلۂ بیان میں یہ بات اِس معنیٰ میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اُوپر کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اُن کی بِنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرماں برداری کرتا، مگر اس نے اُلٹی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندۂ مخلوق ہونے کا جو تقاضا تھا اسے پورا نہ کیا۔

۱۷- یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمولی چیز سمجھتا ہے، اُس پر ذرا غور تو کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اِس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کر لیتا؟

۱۸- اِس سے مُراد بارش ہے۔ سُورج کی حرارت سے بے حدّ و حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اُٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلاتی ہیں، پھر عالَمِ بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں ازسرِ نو پانی کی شکل اختیار کرتی اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی ہیں، پھر وہ پانی براہِ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیرِ زمین کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اُس کا خالق اُس

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾
وَاُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ

آخرِکار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز[۲۱] بلند ہوگی ـــــ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔[۲۲] ان میں سے ہر شخص پر

کی رزق رسانی کے لیے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

۱۹۔ زمین کو پھاڑنے سے مراد اُس کو اِس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پنیریاں انسان اُس کے اندر بوئے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعے سے، یا کسی اور طریقے سے اُس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے، اور جو تخم خدا نے پیدا کر دیے ہیں، انھیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اُسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اُسی نے اِن تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر تخم سے اُسی کی جنس کی نباتات اُگے۔ اور اُسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسبِ حال غذا بہم پہنچا کر اسے نَشوونُما دے۔ یہ تخم اِن خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

۲۰۔ یعنی تمھارے ہی لیے نہیں بلکہ اُن جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمھاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اس سروسامان سے مُتَمَتِّع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اُسی سے کفر کرو؟

۲۱۔ مراد ہے آخری نفخِ صُور کی قیامت خیز آواز، جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اُٹھیں گے۔

۲۲۔ اِس سے ملتا جُلتا مضمون سورۂ معارِج، آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اِن عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اِس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے،

Maktaba Tul Ishaat.com

يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ
مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾
أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع

ع ۲

اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔[۲۳] کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے، ہشّاش بشّاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اُڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔ ع

اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدّمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۲۳ – احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز سب لوگ ننگے بُچّے اُٹھیں گے۔" آپؐ کی ازواجِ مُطہّرات میں سے کسی نے (بروایتِ بعض حضرت عائشہؓ نے، اور بروایت بعض حضرت سَودہؓ نے، اور بروایتِ بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا ہمارے سَتر اُس روز سب کے سامنے کُھلے ہوں گے؟ حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اُس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا۔ (نَسائی، تِرمِذی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جریر، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی، حاکم)

تفہیم القرآن

التکویر

(۸۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

التکوِیر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ کُوِّرَتْ سے ماخوذ ہے۔ کُوِّرَتْ تکویر سے صیغۂ ماضی مجہول ہے، جس کے معنی ہیں لپیٹی گئی۔ اس نام سے مراد یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لپیٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزُول مضمون اور اندازِ بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کے دو موضوع ہیں: ایک آخرت، دوسرے رسالت۔

پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے جب سُورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اُڑنے لگیں گے، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اُٹھیں گے۔ پھر سات آیتوں میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جب رُوحیں اَزسرِنَو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی، نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، جرائم کی بازپُرس ہوگی، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنّت سب چیزیں نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ آخرت کا یہ سارا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہہ کر انسان کو سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اُس وقت ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کا مضمون لیا گیا ہے۔ اس میں اہلِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی دیوانے کی بَڑ نہیں ہے، نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے، بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے ایک بزرگ، عالی مقام اور امانت دار پیغام بر کا بیان ہے، جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے آسمان کے اُفُق پر دن کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اِس تعلیم سے منہ موڑ کر آخر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟

---

۲۹ آیاتہا

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ

۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَ اِذَا الْجِبَالُ
سُيِّرَتْ ۝۳ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا[1]، اور جب تارے بکھر جائیں گے[2]، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے[3]، اور جب دس مہینے کی حاملہ اُونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی[4]، اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے[5]،

۱ – سورج کے بے نور کر دیے جانے کے لیے یہ ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تکویر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔ سر پر عمامہ باندھنے کے لیے تکویر العمامه کے الفاظ بولے جاتے ہیں، کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اُسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اُس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے نظامِ شمسی میں پھیلتی ہے، عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا، یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔

۲ – یعنی وہ بندش جس نے اُن کو اپنے اپنے مدار اور مقام پر باندھ رکھا ہے، کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اِنکدار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔

۳ – دوسرے الفاظ میں زمین کی وہ کشش بھی ختم ہو جائے گی جس کی بدولت پہاڑ وزنی ہیں اور جمے ہوئے ہیں۔ پس جب وہ باقی نہ رہے گی تو سارے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور بے وزن ہو کر زمین پر اِس طرح چلنے لگیں گے جیسے فضا میں بادل چلتے ہیں۔

۴ – عربوں کو قیامت کی سختی کا تصوّر دلانے کے لیے یہ بہترین طرزِ بیان تھا۔ موجودہ زمانے کے ٹرک اور بسیں چلنے سے پہلے اہلِ عرب کے لیے اُس اُونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ جننے کے قریب ہو۔ اِس حالت میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی، تاکہ وہ کھوئی نہ جائے، کوئی اسے چُرا نہ لے، یا اور کسی طرح وہ ضائع نہ ہو جائے۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا گویا یہ معنی رکھتا تھا کہ اُس وقت کچھ ایسی سخت اُفتاد لوگوں پر پڑے گی کہ انھیں اپنے اِس عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔

۵ – دنیا میں جب کوئی عام مصیبت کا موقع آتا ہے تو ہر قسم کے جانور بھاگ کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَ اِذَا
الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹ وَ اِذَا الصُّحُفُ

اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے[6]، اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی[7]، اور
جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی[8]؟ اور جب اعمال نامے

اُس وقت نہ سانپ ڈستا ہے، نہ شیر پھاڑتا ہے۔

۶ – اصل میں لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تَسجِیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عَرَبی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اِس میں کوئی چیز بھی قابلِ تعجب محسوس نہ ہوگی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن، دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اُٹھنے والی ہے، اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادّہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اِس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اِس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔

۷ – یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

۸ – یعنی انسان از سرِ نَو اُسی طرح زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ دنیا میں مرنے سے پہلے جسم و روح کے ساتھ زندہ تھے۔

۹ – اس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضب ناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضب ناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ ان کو مُخاطَب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تُو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی، اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فَحویٰ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیّت نے ان کو اَخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انھیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیّت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اِس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا، آخر اس کی کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے،

اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اِس بے دردانہ ظلم کی باز پُرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اِس پر کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا، نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا۔ ایک، مَعاشی خستہ حالی، جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔ بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انھیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انھیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے، عام بدامنی، جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اُلٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آ سکتی تھیں۔ تیسرے، عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں، انھیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ اِن وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا، تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملے میں جو شقاوت برتی جاتی تھی، اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُنَنِ دارِمی کے پہلے ہی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضوؐر سے اپنے عہدِ جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی: ہائے ابا، ہائے ابا۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو دیے اور آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا: اے شخص! تو نے حضوؐر کو غمگین کر دیا۔ حضوؐر نے فرمایا: اِسے مت روکو، جس چیز کا اِسے سخت احساس ہے اُس کے بارے میں اِسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کر۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپؐ سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اللہ نے اسے معاف کر دیا، اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہلِ عرب اِس انتہائی غیر انسانی فعل کی قباحت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی برائی کے احساس سے بالکل خالی

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی گئی ہے، بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تُو کس قصور میں ماری گئی۔ عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانۂ جاہلیّت میں اس رسم کی قباحت کا احساس تھا۔ طَبَرانی کی رِوایت ہے کہ فَرَزْدَق شاعر کے دادا صَعْصَعَہ بن ناجیۃ المُجاشِعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں نے جاہلیّت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اُونٹ فِدیے میں دیے۔ کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں، تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

درحقیقت یہ اسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ عرب سے اس انتہائی سنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا، بلکہ اِس تخیُّل کو مٹایا کہ بیٹی کی پیدائش کوئی حادثہ اور مصیبت ہے جسے بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے۔ اِس کے برعکس اسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کو پرورش کرنا، انھیں عمدہ تعلیم و تربیت دینا اور انھیں اس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی گھر والی بن سکیں، بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں لڑکیوں کے متعلق لوگوں کے عام تصوُّر کو جس طرح بدلا ہے، اس کا اندازہ آپؐ کے ان بہت سے ارشادات سے ہوسکتا ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہم آپؐ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں:

من ابتُلِیَ من هٰذه البنات بشیءٍ فاحسن الیهنّ کن لهٗ سِتْرًا من النار۔ (بخاری، مسلم)	جو شخص اِن لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر وہ اِن سے نیک سلوک کرے تو یہ اس کے لیے جہنّم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔
من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیٰمة انا و هٰکذا و ضم اصابعهٗ۔ (مسلم)	جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں، تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا، یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا۔
من عال ثلٰث بنات او مثلهن من الاخوات فادّبهن و رحمهن حتّٰی یغنیهن الله اوجب الله له الجنّة۔ فقال رجل یا رسول الله او اثنتین؟ قال او اثنتین حتّٰی لو قالوا او واحدة لقال	جس شخص نے تین بیٹیوں، یا بہنوں کو پرورش کیا، ان کو اچھا ادب سکھایا اور ان سے شفقت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں، تو اللہ اس کے لیے جنت واجب کردے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اور دو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نُشِرَتْ ۝۱۰ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۱ وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲
وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝۱۴

کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا،[10] اور جب جہنّم دہکائی جائے گی، اور جب جنّت قریب لے آئی جائے گی،[11] اُس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

واحدۃ۔ (شرح السّنّۃ)

نے فرمایا: اور دو بھی۔ حدیث کے راوی ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ اس وقت ایک کے متعلق پوچھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

من کانت له انثی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یؤثر ولدہ علیھا ادخله اللّٰه الجنّة۔ (ابوداؤد)

جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے، نہ بیٹے کو اُس پر ترجیح دے، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

من کان له ثلاث بنات وصبر علیھنّ وکساھُنّ من جِدَتِہٖ کن له حجابًا مّن النار۔

(بخاری فی الادب المفرد، ابن ماجہ)

جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے اور اپنی وسعت کے مطابق ان کو اچھے کپڑے پہنائے، وہ اس کے لیے جہنّم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

ما من مسلم تدرکه ابنتان فیحسن صحبتھما الا ادخلتاہ الجنّة۔

(بخاری، ادب المفرد)

جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کو اچھی طرح رکھے، وہ اسے جنّت میں پہنچائیں گی۔

انّ النّبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال لسُراقة بن جُعْشم الا ادلك علی اعظم الصدقة او من اعظم الصدقة؟ قال بلٰی یا رسول اللّٰه۔ قال ابنتك المردودة الیك لیس لھا کاسب غیرك۔

(ابنِ ماجہ، بخاری فی الادب المفرد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سُراقہؓ بن جُعشم سے فرمایا: میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ (یا فرمایا: بڑے صدقوں میں سے ایک) کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ضرور بتایئے یا رسولؐ اللہ۔ فرمایا: تیری وہ بیٹی جو (طلاق پا کر یا بیوہ ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو۔

یہی وہ تعلیم ہے جس نے لڑکیوں کے متعلق لوگوں کا نقطۂ نظر صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی اُن تمام قوموں

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ۙ﴿۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ﴿۱۷﴾
وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿۱۸﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ۙ﴿۱۹﴾ ذِیۡ قُوَّۃٍ

پس نہیں،[۱۲] میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے اور چھُپ جانے والے تاروں کی، اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہوئی، اور صبح کی جب کہ اس نے سانس لیا،[۱۳] یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے[۱۴] جو بڑی توانائی رکھتا ہے،[۱۵]

میں بدل دیا جو اسلام کی نعمت سے فیض یاب ہوتی چلی گئیں۔

۱۰ – یعنی جو کچھ اب نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ سب عیاں ہو جائے گا۔ اب تو صرف خلا نظر آتا ہے یا پھر بادل، گرد و غبار، چاند، سورج اور تارے۔ لیکن اُس وقت خدا کی خدائی اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب کے سامنے بے پردہ ہو جائے گی۔

۱۱ – یعنی میدانِ حشر میں جب لوگوں کے مقدّمات کی سماعت ہو رہی ہوگی اُس وقت جہنّم کی دہکتی ہوئی آگ بھی سب کو نظر آ رہی ہوگی اور جنّت بھی اپنی ساری نعمتوں کے ساتھ سب کے سامنے موجود ہوگی، تاکہ بد بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے محروم ہو کر کہاں جانے والے ہیں، اور نیک بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے بچ کر کن نعمتوں سے سرفراز ہونے والے ہیں۔

۱۲ – یعنی تم لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ کسی دیوانے کی بڑ ہے یا کوئی شیطانی وسوسہ ہے۔

۱۳ – یہ قسم جس بات پر کھائی گئی ہے، وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہے۔ مطلب اِس قسم کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے، بلکہ جب تارے چھُپ گئے تھے، رات رخصت ہو گئی تھی اور صبح روشن نمودار ہو گئی تھی، اُس وقت کھُلے آسمان پر اُنھوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں، وہ اُن کے آنکھوں دیکھے مُشاہدے اور پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔

۱۴ – اس مقام پر بزرگ پیغامبر (رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ) سے مراد وحی لانے والا فرشتہ ہے، جیسا کہ آگے کی آیات سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے۔ اور قرآن کو پیغام بر کا قول کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اس فرشتے کا اپنا کلام ہے، بلکہ ”قولِ پیغامبر“ کے الفاظ خود ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا کلام ہے جس نے اسے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ سورۂ الحاقّہ، آیت ۴۰ میں اِسی طرح قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہا گیا ہے، اور وہاں بھی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حضورؐ کا اپنا تصنیف کردہ ہے بلکہ اسے ”رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ“ کا قول کہہ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس چیز کو حضورؐ خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ محمدؐ بن عبداللہ کی حیثیّت سے۔ دونوں جگہ قول کو

عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ۙ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ؕ﴿۲۱﴾ وَ مَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿ۚ۲۲﴾ وَ لَقَدۡ رَاٰہُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿ۚ۲۳﴾

عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اُس کا حکم مانا جاتا ہے[16]، وہ بااعتماد ہے[17]۔ اور (اے اہلِ مکّہ!) تمھارا رفیق[18] مجنون نہیں ہے، اُس نے اُس پیغام بر کو روشن اُفُق پر دیکھا ہے[19]۔

فرشتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیغام لانے والے فرشتے کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الحاقّہ، حاشیہ ۲۲)

۱۵- سورۂ نجم آیات ۴-۵ میں اِسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ "یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے، اُس کو زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے۔" یہ بات درحقیقت متشابہات میں سے ہے کہ جبریل علیہ السلام کی اِن زبردست قوتوں اور ان کی اِس عظیم توانائی سے کیا مراد ہے۔ بہرحال اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں میں بھی وہ اپنی غیر معمولی طاقتوں کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ مسلم، کتاب الایمان میں حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے دو مرتبہ جبریلؑ کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، اُن کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسْنَدِ احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اِس شان میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پَر تھے۔ اس سے کچھ ان کی زبردست طاقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۶- یعنی وہ فرشتوں کا افسر ہے۔ تمام فرشتے اُس کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں۔

۱۷- یعنی وہ اپنی طرف سے کوئی بات خدا کی وحی میں ملا دینے والا نہیں ہے، بلکہ ایسا امانت دار ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے اُسے جُوں کا تُوں پہنچا دیتا ہے۔

۱۸- رفیق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور آپؐ کو اہلِ مکہ کا رفیق کہہ کر دراصل اُنھیں اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ آپؐ اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ اُنھی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں۔ اُنھی کے درمیان آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی ہے، اور اُن کے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپؐ کس قدر دانا اور ہوش مند ہیں۔ ایسے شخص کو جانتے بُوجھتے مجنون کہتے ہوئے انھیں کچھ تو شرم آنی چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حواشی ۲-۳)

۱۹- سورۂ نجم، آیات ۷ تا ۹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس مُشاہَدے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ
يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع

اور وہ غیب (کے اِس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملے میں بخیل نہیں ہے۔[۲۰] اور یہ کسی شیطان مَرْدود کا قول نہیں ہے۔[۲۱] پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے جو راہِ راست پر چلنا چاہتا ہو۔[۲۲] اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ ربّ العالمین نہ چاہے۔[۲۳] ع

کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حواشی ۷-۸)

۲۰ – یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے۔ غیب کے جو حقائق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کھولے گئے ہیں، خواہ وہ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ہوں، یا فرشتوں کے بارے میں، یا زندگی بعدِ موت اور قیامت اور آخرت اور جنّت اور دوزخ کے بارے میں، سب کچھ تمھارے سامنے بے کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔

۲۱ – یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بُت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شُترِ بے مہار بن کر رہنے کے بجائے خدا کے حضور ذمّہ داری اور جواب دہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسموں اور ظلم اور بداخلاقی اور بدکرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشُّعراء، آیات ۲۱۰ تا ۲۱۲ مع حواشی ۱۳۰ تا ۱۳۳، اور آیات ۲۲۱ تا ۲۲۳ مع حواشی ۱۴۰-۱۴۱)

۲۲ – بالفاظِ دیگر، یہ کلام نصیحت ہے تو ساری نوعِ انسانی کے لیے، مگر اس سے فائدہ وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جو خود راست روی اختیار کرنا چاہتا ہو۔ انسان کا طالبِ حق اور راستی پسند ہونا اِس سے فائدہ اٹھانے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔

۲۳ – یہ مضمون اِس سے پہلے سورۂ مُدَّثِّر، آیت ۵۶ اور سورۂ دہر، آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المُدَّثِّر، حاشیہ ۴۱۔

تفہیم القرآن

اَلاِنفِطار

(۸۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الانفطار

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْفَطَرَتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنْفِطار مصدر ہے، جس کے معنٰی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا اور سورۂ تکویر کا مضمون ایک دوسرے سے نہایت مشابہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت ہے۔ مُسْنَدِ احمد، ترمِذِی، ابن المُنْذِر، طَبَرانی، حاکم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا: مَنْ سَرَّهٗ اَن ینظر الی یوم القیٰمة کانه رأی عین فلیقرأ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ، وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ ”جو شخص چاہتا ہو کہ روزِ قیامت کو اس طرح دیکھ لے جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سورۂ تکویر اور سورۂ اِنْفِطار اور سورۂ اِنْشقاق کو پڑھ لے۔“

اِس میں سب سے پہلے روزِ قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آجائے گا تو ہر شخص کے سامنے اس کا کیا دھرا سب آجائے گا۔ اس کے بعد انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس رب نے تجھ کو وجود بخشا اور جس کے فضل و کرم کی وجہ سے آج تُو سب مخلوقات سے بہتر جسم اور اعضا لیے پھرتا ہے، اس کے بارے میں یہ دھوکا تجھے کہاں سے لگ گیا کہ وہ صرف کرم ہی کرنے والا ہے، انصاف کرنے والا نہیں ہے؟ اُس کے کرم کے معنٰی یہ تو نہیں ہیں کہ تُو اس کے انصاف سے بے خوف ہو جائے۔ پھر انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تُو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ، تیرا پورا نامۂ اعمال تیار کیا جا رہا ہے، اور نہایت معتبر کاتب ہر وقت تیری تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ آخر میں پورے زور کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یقیناً روزِ جزا برپا ہونے والا ہے، جس میں نیک لوگوں کو جنت کا عیش اور بدلوگوں کو جہنم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، فیصلے کے اختیارات بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

آیاتہا ۱۹ سُوْرَۃُ الْاِنْفِطَارِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْبِحَارُ
فُجِّرَتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ؕ﴿۵﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے بکھر جائیں گے، اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے[۱]، اور جب قبریں کھول دی جائیں گی[۲]، اُس وقت ہر شخص کو اُس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا[۳]۔

---

۱ – سورۂ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رُو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقے تک محدود نہ ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اُٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اُس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اُس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے اُن دو ابتدائی اجزا کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن، جلانے والی، اور دوسری، یعنی ہائیڈروجن، بھڑک اُٹھنے والی ہے، اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردِّعمل (chain reaction) شروع ہو جائے گا، جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے، باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

۲ – پہلی تین آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے اور اِس آیت میں دوسرا مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ قبروں کے کھولے جانے سے مراد لوگوں کا ازسرِ نَو زندہ کر کے اٹھایا جانا ہے۔

۳ – اصل الفاظ ہیں: مَا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں:

(۱) جو اچھا یا برا عمل آدمی نے کر کے آگے بھیج دیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے، اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مَا اَخَّرَتْ۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ commission اور omission کے ہم معنیٰ ہیں۔

(۲) جو کچھ پہلے کیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے، اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مَا اَخَّرَتْ یعنی آدمی کا پورا نامۂ اعمال ترتیب وار

Maktaba Tul Ishaat.com

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ
فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾
كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ كِرَامًا

اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اُس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے دُرست کیا، تجھے مُتناسِب بنایا، اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟[۴] ہرگز نہیں،[۵] بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزا و سزا کو جُھٹلاتے ہو[۶] حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں، ایسے معزز

اور تاریخ وار اس کے سامنے آجائے گا۔

(۳) جو اچھے اور بُرے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے، وہ مَا قَدَّمَتْ ہیں، اور ان اعمال کے جو آثار و نتائج وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا، وہ مَا اَخَّرَتْ۔

۴ – یعنی اوّل تو اُس محسن پروردگار کے احسان و کرم کا تقاضا یہ تھا کہ تو شکر گزار اور احسان مند ہو کر اس کا فرماں بردار بنتا اور اُس کی نافرمانی کرتے ہوئے تجھے شرم آتی، مگر تو اِس دھوکے میں پڑ گیا کہ تو جو کچھ بھی بنا ہے خود ہی بن گیا ہے، اور یہ خیال تجھے کبھی نہ آیا کہ اِس وجود کے بخشنے والے کا احسان مانے۔ دوسرے، تیرے رب کا یہ کرم ہے کہ دنیا میں جو کچھ تو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ جونہی تجھ سے کوئی خطا سرزد ہو وہ تجھ پر فالج گرا دے، یا تیری آنکھیں اندھی کر دے، یا تجھ پر بجلی گرا دے۔ لیکن تو نے اِس کریمی کو کمزوری سمجھ لیا اور اس دھوکے میں پڑ گیا کہ تیرے خدا کی خدائی میں اِنصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

۵ – یعنی کوئی معقول وجہ اِس دھوکے میں پڑنے کی نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جُڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اِس مکمل انسانی شکل میں ترکیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ اِس کو دیکھ کر تیرا سر بارِ احسان سے جھک جاتا اور اُس ربِّ کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو یہ بھی جانتا ہے کہ تیرا رب صرف رحیم و کریم ہی نہیں ہے، جبّار و قہّار بھی ہے۔ جب اس کی طرف سے کوئی زلزلہ یا طوفان یا سیلاب آجاتا ہے تو تیری ساری تدبیریں اس کے مقابلے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا رب جاہل و نادان نہیں بلکہ حکیم و دانا ہے، اور حکمت و دانائی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسے عقل دی جائے اُسے اُس کے اعمال کا ذمّہ دار بھی ٹھیرایا جائے، جسے اختیارات دیے جائیں اس سے حساب

كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَ
اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا هُمْ
عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ
اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ؕ
وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ ع

رکوع ۶

کاتب جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔

یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنّم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اُس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں، تمھیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا،^۸ فیصلہ اُس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔ ع

بھی لیا جائے کہ اس نے اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کیا، اور جسے اپنی ذمہ داری پر نیکی اور بدی کرنے کی طاقت دی جائے اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا بھی دی جائے۔ یہ سب حقیقتیں تیرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، اس لیے تُو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے ربِّ کریم کی طرف سے جس دھوکے میں تُو پڑ گیا ہے، اس کی کوئی معقول وجہ موجود ہے۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اُس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیری شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اِس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اُس کے مقابلے میں جَری ہو جائے اور اِس غلط فہمی میں پڑ جائے کہ میں جو کچھ چاہوں کروں، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

۶ – یعنی دراصل جس چیز نے تم لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے وہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے، بلکہ محض تمھارا یہ احمقانہ خیال ہے کہ دنیا کے اِس دارالعمل کے پیچھے کوئی دارالجزا نہیں ہے۔ اِسی غلط اور بے بنیاد گمان نے تمھیں خدا سے غافل، اُس کے انصاف سے بے خوف، اور اپنے اخلاقی رویّے میں غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔

۷ – یعنی تم لوگ چاہے دارالجزا کا انکار کرو، یا اُس کو جھٹلاؤ، یا اُس کا مذاق اُڑاؤ، اِس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے رب نے تمھیں دنیا میں شُترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس نے تم میں سے

Maktaba Tul Ishaat.com

ایک ایک آدمی پر نہایت راست باز نگران مقرر کر رکھے ہیں، جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمھارے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں، اور ان سے تمھارا کوئی کام چھپا ہوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، خلوتوں میں، سنسان جنگلوں میں، یا اور کسی ایسی حالت میں اُس کا ارتکاب کرو جہاں تمھیں پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہِ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ اِن نگراں فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں۔ کسی سے نہ ذاتی محبت رکھتے ہیں نہ عداوت، کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلافِ واقعہ ریکارڈ تیار کریں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئے بغیر بطورِ خود غلط سلط اندراجات کرلیں۔ رشوت خوار بھی نہیں ہیں کہ کچھ لے دے کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ ان کا مقام اِن ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہوگی، اور کسی کے ذمّے کوئی ایسی بدی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔ پھر ان فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو اُسے وہ جانتے ہیں"، یعنی ان کا حال دنیا کی سی آئی ڈی اور اِطّلاعات (intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ ساری تگ و دَو کے باوجود بہت سی باتیں ان سے چھپی رہ جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہیں ہر جگہ، ہر حال میں، ہر شخص کے ساتھ اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اُسے یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کی نگرانی کر رہا ہے، اور اُنھیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیت سے کوئی کام کیا ہے۔ اس لیے اُن کا مُرتّب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے، جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔ اِسی کے متعلق سورۂ کہف، آیت ۹ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے، اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی ہے، جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سب جُوں کا تُوں اُن کے سامنے حاضر ہے۔

۸ – یعنی کسی کی وہاں یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ کسی شخص کو اس کے اعمال کے نتائج بھگتنے سے بچا سکے۔ کوئی وہاں ایسا بااثر یا زور آور یا اللہ کا چہیتا نہ ہوگا کہ عدالتِ خداوندی میں اَڑ کر بیٹھ جائے اور یہ کہہ سکے کہ فُلاں شخص میرا عزیز یا مُتوسّل ہے، اِسے تو بخشنا ہی ہوگا، خواہ یہ دنیا میں کیسے ہی بُرے افعال کر کے آیا ہو۔

تفہیم القرآن

المطففین

(۸۳)

Maktaba Tul Ishaat.com

المطففین

نام پہلی ہی آیت وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے اندازِ بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے جب اہلِ مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے در پے سورتیں نازل ہو رہی تھیں، اور اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب اہلِ مکہ نے سڑکوں پر، بازاروں میں اور مجلسوں میں مسلمانوں پر آوازے کسنے اور ان کی توہین و تذلیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، مگر ظلم و ستم اور مار پیٹ کا دَور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ اِس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابنِ عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض بُری طرح پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے۔ (نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابنِ جَرِیر، بَیْہَقی فی شُعَبِ الایمان) لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم سورۂ دَہر کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، صحابہؓ اور تابعینؒ کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملے پر چسپاں ہوتی ہو، اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فُلاں معاملے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ابنِ عباسؓ کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بُری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے اُن کے معاملات دُرست ہو گئے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع بھی آخرت ہے۔ پہلی چھ آیتوں میں اُس عام بے ایمانی پر گرفت کی گئی ہے جو کاروباری لوگوں میں بکثرت پھیلی ہوئی تھی کہ دوسروں سے لینا ہوتا تھا تو پورا ناپ کر اور تول کر لیتے تھے، مگر جب دوسروں کو دینا ہوتا تو ناپ تول میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ گھاٹا دیتے تھے۔ معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے اِس ایک خرابی کو، جس کی قباحت سے کوئی انکار نہ کر سکتا تھا، بطورِ مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک روز خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے، اُس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راست بازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانت داری کو ”اچھی پالیسی“ سمجھ کر بعض چھوٹے چھوٹے معاملات میں

دیانت برت بھی لے تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک ”مفید پالیسی“ ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچّی اور مستقل دیانت داری اگر پیدا ہوسکتی ہے تو صرف خدا کے خوف اور آخرت پر یقین ہی سے ہوسکتی ہے، کیونکہ اِس صورت میں دیانت ایک ”پالیسی“ نہیں بلکہ ”فریضہ“ قرار پاتی ہے اور آدمی کے اُس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔

اِس طرح اَخلاق کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا تعلق نہایت مؤثّر اور دل نشین طریقے سے واضح کرنے کے بعد آیت ۷ سے ۱۷ تک بتایا گیا ہے کہ بدکار لوگوں کے نامۂ اعمال پہلے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے رجسٹر (black list) میں درج ہورہے ہیں اور آخرت میں ان کو سخت تباہی سے دوچار ہونا ہے۔ پھر آیت ۱۸ سے ۲۸ تک نیک لوگوں کا بہترین انجام بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اعمال نامے بلند پایہ لوگوں کے رجسٹر میں درج ہورہے ہیں جس پر مقرّب فرشتے مامور ہیں۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تسلّی دی گئی ہے اور اِس کے ساتھ کفار کو خبردار بھی کیا گیا ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تذلیل کررہے ہیں، قیامت کے روز یہی مجرم لوگ اپنی اِس رَوِش کا بہت بُرا انجام دیکھیں گے اور یہی ایمان لانے والے اِن مجرموں کا بُرا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۶ آیاتھا سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِیْنَ مَکِّیَّةٌ رکوعاتھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢
وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ
مَّبْعُوْثُوْنَ ۝٤ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٥ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝٦ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝٧ وَمَآ اَدْرٰىكَ

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں[1] کے لیے۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے[2] ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن[3] یہ اُٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب کہ سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

ہرگز نہیں[4]، یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے[5]۔ اور تمھیں کیا معلوم

---

۱ - اصل میں لفظ مُطَفِّفِیْنَ استعمال کیا گیا ہے جو تَطْفِیْف سے مشتق ہے۔ عَرَبی زبان میں طَفِیْف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا، بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصّے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ تاجر اُسے کیا اور کتنا گھاٹا دے گیا ہے۔

۲ - قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مَذمّت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ سورۂ اَنعام میں فرمایا: ”انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو، ہم کسی شخص کو اس کی مَقدِرَت سے زیادہ کا مُکلّف نہیں ٹھیراتے۔“ (آیت ۱۵۲) سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ”جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو۔“ (آیت ۳۵) سورۂ رحمٰن میں تاکید کی گئی کہ ”تولنے میں زیادتی نہ کرو، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن کرو

مَا سِجِّيْنٌ ﴿٨﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ
يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾ كَلَّا
بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ
رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ

کہ وہ قید خانے کا دفتر کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اُسے جب ہماری آیات سُنائی جاتی ہیں[٦] تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ دراصل اِن لوگوں کے دلوں پر اِن کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے[٧]۔ ہرگز نہیں، بالیقین اُس روز یہ اپنے رب کی دِید سے محروم رکھے جائیں گے[٨]، پھر یہ جہنّم میں جا پڑیں گے، پھر ان سے

اور ترازو میں گھاٹا نہ دو۔" (آیات ۸-۹) قومِ شعیب پر جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا، وہ یہی تھا کہ اُس کے اندر ناپ تول میں کمی کرنے کا مرض عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور حضرت شعیبؑ کی پے در پے نصیحتوں کے باوجود یہ قوم اِس جرم سے باز نہ آتی تھی۔

۳- روزِ قیامت کو بڑا دن اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس میں تمام انسانوں اور جنّوں کا حساب خدا کی عدالت میں بیک وقت لیا جائے گا اور عذاب و ثواب کے اہم ترین فیصلے کیے جائیں گے۔

۴- یعنی اِن لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ دنیا میں اِن جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہ یونہی چھوٹ جائیں گے اور کبھی اِن کو اپنے خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر نہ ہونا پڑے گا۔

۵- اصل میں لفظ سِجِّیْن استعمال ہوا ہے جو سِجن (جیل یا قید خانے) سے ماخوذ ہے، اور آگے اُس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں سزا کے مستحق لوگوں کے اعمال نامے درج کیے جا رہے ہیں۔

۶- یعنی وہ آیات جن میں روزِ جزا کی خبر دی گئی ہے۔

۷- یعنی جزا و سزا کو افسانہ قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن جس وجہ سے یہ لوگ اسے افسانہ کہتے ہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝١٧ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ
لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝١٨ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝١٩ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝٢٠
يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝٢١ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝٢٢ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ۝٢٣ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝٢٤ يُسْقَوْنَ
مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝٢٥ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

ہرگز نہیں[9]، بے شک نیک آدمیوں کا نامۂ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔ اور تمھیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے، اُونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر تم خوش حالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سر بند شراب پلائی جائے گی، جس پر مُشک کی مہر لگی ہوگی[10]۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے

وہ یہ ہے کہ جن گناہوں کا یہ ارتکاب کرتے رہے ہیں، ان کا زنگ اِن کے دلوں پر پوری طرح چڑھ گیا ہے، اس لیے جو بات سراسر معقول ہے وہ اِن کو افسانہ نظر آتی ہے۔ اِس زنگ کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو پورے دل پر وہ چھا جاتا ہے (مُسندِ احمد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جَریر، حاکم، ابنِ ابی حاتم، ابنِ حبان وغیرہ)

۸ – یعنی دیدارِ الٰہی کا جو شرف نیک لوگوں کو نصیب ہو گا اس سے یہ لوگ محروم رہیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۷)

۹ – یعنی اِن لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی جزا و سزا واقع ہونے والی نہیں ہے۔

۱۰ – اصل الفاظ ہیں: خِتٰمُهٗ مِسْكٌ۔ اِس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جن برتنوں میں وہ شراب رکھی ہوگی، اُن پر مٹی یا موم کے بجائے مُشک کی مُہر ہوگی۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ شراب کی ایک نفیس ترین

الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا
الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى
اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ
لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ
ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع

ع ۳۶

ہوں، وہ اِس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اُس شراب میں تسنیم[11] کی آمیزش ہوگی، یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مُقرّب لوگ شراب پییں گے۔

مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اُڑاتے تھے، جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر اُن کی طرف اشارے کرتے تھے، اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے،[12] اور جب انھیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں،[13] حالانکہ وہ اُن پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔[14] آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں، مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں، مل گیا نا کافروں کو اُن حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے۔[15] ع

قسم ہوگی جو نہروں میں بہنے والی شراب سے اشرف و اعلیٰ ہوگی اور اسے جنّت کے خُدّام مُشک کی مُہر لگے ہوئے برتنوں میں لاکر اہلِ جنت کو پلائیں گے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شراب جب پینے والوں کے حلق سے اُترے گی تو آخر میں اُن کو مُشک کی خوشبو محسوس ہوگی۔ یہ کیفیّت دنیا کی شرابوں کے بالکل برعکس ہے جن کی بوتل کھلتے ہی بُو کا ایک بھپکا ناک میں آتا ہے، پیتے ہوئے بھی ان کی بدبو محسوس ہوتی ہے، اور حلق سے جب وہ اُترتی ہے تو دماغ تک اس کی سڑانڈ پہنچ جاتی ہے، جس کی وجہ سے بدمزگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۱- تسنیم کے معنیٰ بلندی کے ہیں، اور کسی چشمے کو تسنیم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلندی سے بہتا ہوا نیچے آ رہا ہو۔

۱۲- یعنی یہ سوچتے ہوئے پلٹتے تھے کہ آج تو مزا آ گیا، میں نے فُلاں مسلمان کا مذاق اُڑا کر اور اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر خوب لُطف اٹھایا اور لوگوں میں بھی اس کی اچھی گت بنی۔

۱۳- یعنی اِن کی عقل ماری گئی ہے، اپنے آپ کو دنیا کے فائدوں اور لذّتوں سے صرف اس لیے محروم کر لیا ہے اور ہر طرح کے خطرات اور مصائب صرف اس لیے مول لے لیے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں آخرت اور جنت اور دوزخ کے چکر میں ڈال دیا ہے۔ جو کچھ حاضر ہے اُسے اِس موہوم اُمید پر چھوڑ رہے ہیں کہ موت کے بعد کسی جنّت کے ملنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اور جو تکلیفیں آج پہنچ رہی ہیں اِنھیں اِس خیالِ خام کی بنا پر انگیز کر رہے ہیں کہ دوسری دنیا میں کوئی جہنّم ہو گی جس کے عذاب سے اِنھیں ڈرایا گیا ہے۔

۱۴- اس مختصر سے فقرے میں اُن مذاق اڑانے والوں کو بڑی سبق آموز تنبیہ کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض وہ سب کچھ غلط ہے جس پر مسلمان ایمان لائے ہیں لیکن وہ تمھارا تو کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے حق سمجھا ہے اُس کے مطابق وہ اپنی جگہ خود ہی ایک خاص اخلاقی رَویّہ اختیار کر رہے ہیں۔ اب کیا خدا نے تمھیں کوئی فوج دار بنا کر بھیجا ہے کہ جو تمھیں نہیں چھیڑ رہا ہے اس کو تم چھیڑو، اور جو تمھیں کوئی تکلیف نہیں دے رہا ہے اسے تم خواہ مخواہ تکلیف دو؟

۱۵- اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے۔ چونکہ وہ کفّار کارِ ثواب سمجھ کر مومنوں کو تنگ کرتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ آخرت میں مومن جنّت میں مزے سے بیٹھے ہوئے جہنم میں جلنے والے اِن کافروں کا حال دیکھیں گے اور اپنے دلوں میں کہیں گے کہ خوب ثواب اِنھیں اِن کے اعمال کا مل گیا۔

تفہیم القرآن

الانشقاق

(۸۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

الاِنشقاق

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْشَقَّتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنْشِقاق مصدر ہے جس کے معنیٰ پھٹ جانے کے ہیں، اور اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اس کے مضمون کی داخلی شہادت یہ بتا رہی ہے کہ ابھی ظلم وستم کا دَور شروع نہیں ہوا تھا، البتہ قرآن کی دعوت کو مکہ میں برملا جُھٹلایا جا رہا تھا اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور اُنھیں اپنے خدا کے سامنے جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا پڑے گا۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔

پہلی پانچ آیتوں میں نہ صرف قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے برحق ہونے کی دلیل بھی دے دی گئی ہے۔ اُس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس روز آسمان پھٹ جائے گا، زمین پھیلا کر ہموار میدان بنا دی جائے گی، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے (یعنی مردہ انسانوں کے اجزائے بدن اور اُن کے اعمال کی شہادتیں) سب کو نکال کر وہ باہر پھینک دے گی، حتّٰی کہ اس کے اندر کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ آسمان و زمین کے لیے اُن کے رب کا حکم یہی ہوگا، اور چونکہ دونوں اُس کی مخلوق ہیں اس لیے وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے، اُن کے لیے حق یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کریں۔

اس کے بعد آیت ۶ سے ۱۹ تک بتایا گیا ہے کہ انسان کو خواہ اِس کا شُعور ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ اُس منزل کی طرف چار و ناچار چلا جا رہا ہے جہاں اُسے اپنے رب کے آگے پیش ہونا ہے۔ پھر سب انسان دو حصوں میں بٹ جائیں گے: ایک، وہ جن کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ کسی سخت حساب فہمی کے بغیر معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے، وہ جن کا نامۂ اعمال پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ کسی طرح انھیں موت آ جائے، مگر مرنے کے بجائے وہ جہنّم میں جھونک دیے جائیں گے۔ ان کا یہ انجام اس لیے ہوگا کہ وہ دنیا میں اِس غلط فہمی پر مگن رہے کہ کبھی خدا کے سامنے جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔ حالانکہ ان کا رب ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ

وہ ان اعمال کی بازپُرس سے چھوٹ جائیں۔ اُن کا دنیا کی زندگی سے آخرت کی جزا وسزا تک درجہ بدرجہ پہنچنا اُتنا ہی یقینی ہے جتنا سُورج ڈوبنے کے بعد شفق کا نمودار ہونا، دن کے بعد رات کا آنا اور اس میں انسان اور حیوانات کا اپنے اپنے بسیروں کی طرف پلٹنا، اور چاند کا ہِلال سے بڑھ کر ماہِ کامل بننا یقینی ہے۔

آخر میں اُن کفّار کو دردناک سزا کی خبر دے دی گئی ہے جو قرآن کو سُن کر خدا کے آگے جھکنے کے بجائے اُلٹی تکذیب کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کو بے حساب اجر کا مُژدہ سنا دیا گیا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتها ۲۵ سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا
الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَ حُقَّتْ ؕ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے[1] گا، اور اُس کے لیے حق یہی ہے کہ (اپنے رب کا حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے[2] گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے[3] گی، اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اُس کے لیے حق یہی ہے[4] (کہ اس کی تعمیل کرے)۔ اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا[5] ہے

۱- اصل میں اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کے لفظی معنیٰ ہیں: "وہ اپنے رب کا حکم سُنے گا۔" لیکن عَرَبی زبان میں محاورے کے طور پر اَذِنَ لَہٗ کے معنیٰ صرف یہی نہیں ہوتے کہ اس نے حکم سُنا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے حکم سُن کر ایک تابعِ فرمان کی طرح اس کی تعمیل کی اور ذرا سرتابی نہ کی۔

۲- زمین کے پھیلا دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیے جائیں گے، اور زمین کی ساری اُونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورۂ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ "اُسے ایک چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تم کوئی بَل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔" (آیات ۱۰۶-۱۰۷) حاکم نے مُستدرَک میں عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "قیامت کے روز زمین ایک دسترخوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی، پھر انسانوں کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔" اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس دن تمام انسانوں کو جو اوّل روزِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے عدالتِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ اِتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے پورے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے، تاکہ اس پر ساری نوعِ انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔

فَمُلٰقِيْهِ ۝۶ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝۷ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ
حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝۸ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝۹ وَ اَمَّا مَنْ

اور اُس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا، اُس سے ہلکا حساب لیا جائے گا[۶] اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا[۷]۔ رہا وہ شخص جس کا

۳- مطلب یہ ہے کہ جتنے مرے ہوئے انسان اس کے اندر پڑے ہوں گے سب کو نکال کر وہ باہر ڈال دے گی، اور اسی طرح اُن کے اعمال کی جو شہادتیں اُس کے اندر موجود ہوں گی وہ سب بھی پوری کی پوری باہر آ جائیں گی، کوئی چیز بھی اُس میں چھپی اور دبی ہوئی نہ رہ جائے گی۔

۴- یہ صراحت نہیں کی گئی کہ جب یہ اور یہ واقعات ہوں گے تو کیا ہوگا، کیونکہ بعد کا یہ مضمون اُس کو آپ سے آپ ظاہر کر دیتا ہے کہ اے انسان! تو اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہونے والا ہے، تیرا نامۂ اعمال تجھے دیا جانے والا ہے، اور جیسا تیرا نامۂ اعمال ہوگا اس کے مطابق تجھے جزا یا سزا ملنے والی ہے۔

۵- یعنی وہ ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ جو تو دنیا میں کر رہا ہے، اُس کے متعلق چاہے تو یہی سمجھتا رہے کہ یہ صرف دنیا کی زندگی تک ہے اور دنیوی اغراض کے لیے ہے، لیکن درحقیقت تو شعوری یا غیر شعوری طور پر جا رہا ہے اپنے رب ہی کی طرف، اور آخرِ کار وہیں تجھے پہنچ کر رہنا ہے۔

۶- یعنی اس سے سخت حساب فہمی نہ کی جائے گی۔ اُس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں فلاں کام تو نے کیوں کیے تھے اور تیرے پاس اُن کاموں کے لیے کیا عذر ہے۔ اُس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی بُرائیاں بھی اُس کے نامۂ اعمال میں موجود ضرور ہوں گی، مگر بس یہ دیکھ کر کہ بھلائیوں کا پلڑا برائیوں سے بھاری ہے، اس کے قصوروں سے درگزر کیا جائے گا اور اسے معاف کر دیا جائے گا۔ قرآنِ مجید میں بداعمال لوگوں سے سخت حساب فہمی کے لیے سُوْٓءُ الْحِسَابِ (بُری طرح حساب لینے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ (الرعد، آیت ۱۸) اور نیک لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہتر اعمال قبول کر لیں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔" (الاحقاف، آیت ۱۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی جو تشریح فرمائی ہے اُسے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، حاکم، ابنِ جَریر، عَبد بن حُمَید اور ابنِ مَردُوْیَہ نے مختلف الفاظ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "جس سے بھی حساب لیا گیا وہ مارا گیا۔" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ "جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا؟" حضورؐ نے جواب دیا: "وہ تو صرف اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس سے پوچھ گچھ کی گئی وہ مارا گیا۔" ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضورؐ کو نماز میں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ "خدایا! مجھ سے ہلکا حساب لے۔"

Maktaba Tul Ishaat.com

أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى
سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ
اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ﴿۱۵﴾ معانقة ۷

نامۂ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا،[8] تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔[9] اُس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا، اُس کا رب اُس کے کرتوت دیکھ رہا تھا۔[10]

آپؐ نے جب سلام پھیرا تو میں نے اس کا مطلب پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: "ہلکے حساب سے مراد یہ ہے کہ بندے کے نامۂ اعمال کو دیکھا جائے گا اور اُس سے درگزر کیا جائے گا۔ اے عائشہؓ! اس روز جس سے حساب فہمی کی گئی وہ مارا گیا۔"

۷ – اپنے لوگوں سے مراد آدمی کے وہ اہل و عیال، رشتہ دار اور ساتھی ہیں جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے۔

۸ – سورۂ اَلْحاقّہ میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور یہاں ارشاد ہوا ہے اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ غالباً اِس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ شخص اس بات سے تو پہلے ہی مایوس ہوگا کہ اُسے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا، کیونکہ اپنے کرتوتوں سے وہ خوب واقف ہوگا اور اسے یقین ہوگا کہ مجھے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملنے والا ہے۔ البتہ ساری خلقت کے سامنے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال لیتے ہوئے اُسے خِفّت محسوس ہوگی، اس لیے وہ اپنا ہاتھ پیچھے کرلے گا۔ مگر اِس تدبیر سے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنا کچّا چٹّھا اپنے ہاتھ میں لینے سے بچ جائے۔ وہ تو بہرحال اسے پکڑایا ہی جائے گا، خواہ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر لے یا پیٹھ کے پیچھے چھُپا لے۔

۹ – یعنی اُس کا حال خدا کے صالح بندوں سے مختلف تھا جن کے متعلق سورۂ طور (آیت ۲۶) میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے، یعنی ہر وقت انھیں یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں بال بچوں کی محبّت میں گرفتار ہو کر ہم اُن کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کرلیں۔ اِس کے برعکس اُس شخص کا حال یہ تھا کہ اپنے گھر میں وہ چین کی بنسری بجا رہا تھا اور خوب بال بچوں کو عیش کرا رہا تھا، خواہ وہ کتنی ہی حرام خوریاں کرکے اور کتنے ہی لوگوں کے حق مار کر یہ سامانِ عیش فراہم کرے، اور اِس لطف و لذت کے لیے خدا کی باندھی ہوئی حدوں کو کتنا ہی پامال کرتا رہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَ الَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قُرِئَ
عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ السجدۃ ۱۳
وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾ ع ۵

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب کہ وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔[11] پھر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن اِن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے؟[12] بلکہ یہ منکرین تو اُلٹا جھٹلاتے ہیں، حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامۂ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔[13] لہٰذا اِن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ع

۱۰- یعنی یہ خدا کے انصاف اور اس کی حکمت کے خلاف تھا کہ جو کرتوت وہ کر رہا تھا ان کو وہ نظر انداز کر دیتا اور اسے اپنے سامنے بلا کر کوئی باز پُرس اس سے نہ کرتا۔

۱۱- یعنی تمھیں ایک حالت پر نہیں رہنا ہے، بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدانِ حشر، پھر حساب و کتاب اور پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے: سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سُرخی، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اُس میں اُن بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہتے ہیں، اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدرِ کامل بننا۔ یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر کہیں ٹھیراؤ نہیں ہے، ایک مسلسل تغیّر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے، لہٰذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

معاملہ ختم ہو جائے گا۔

۱۲ – یعنی ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا اور یہ اُس کے آگے نہیں جھکتے۔ اِس مقام پر سجدہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ امام مالک، مسلم اور نَسائی نے حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے نماز میں یہ سورت پڑھ کر اِس مقام پر سجدہ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سجدہ کیا ہے۔ بخاری، مُسلم، ابوداؤد اور نَسائی نے ابورافع کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے عشا کی نماز میں یہ سورت پڑھی اور سجدہ کیا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور حضورؐ نے اس مقام پر سجدہ کیا ہے، اس لیے میں مرتے دم تک یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ مسلم، ابوداؤد، ترمِذِی، نَسائی اور ابنِ ماجہ وغیرہم نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اِس سورت میں اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں سجدہ کیا ہے۔

۱۳ – دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے سینوں میں کفر اور عناد اور عداوت حق اور بُرے ارادوں اور فاسد نیّتوں کی جو گندگی انھوں نے بھر رکھی ہے، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تفہیم القرآن

البروج

(۸۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

البُرُوج

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْبُرُوْج کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس کا مضمون خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سورت مکۂ معظّمہ کے اُس دَور میں نازل ہوئی ہے جب ظلم وستم پوری شدّت کے ساتھ برپا تھا اور کفارِ مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع کفّار کو اُس ظلم وستم کے بُرے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے، اور اہلِ ایمان کو یہ تسلّی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اَصحابُ الأُخدود کا قصّہ سنایا گیا ہے جنھوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک پھینک کر جلا دیا تھا، اور اِس قصّے کے پیرایے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اَصحابُ الأُخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے، اسی طرح سردارانِ مکہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان لانے والوں نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کر لیا تھا اور ایمان سے پھرنا قبول نہیں کیا تھا، اُسی طرح اب بھی اہلِ ایمان کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہلِ ایمان اصرار کرتے ہیں، وہ سب پر غالب ہے، زمین وآسمان کی سلطنت کا مالک ہے، اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے، اور وہ دونوں گروہوں کے حال کو دیکھ رہا ہے، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف اُن کے کفر کی سزا جہنّم کی صورت میں ملے، بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے جَلنے کی شکل میں بھگتنی پڑے۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے جنّت میں جائیں، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ پھر کفّار کو خبردار کیا گیا ہے کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے، اگر تم اپنے جتھے کی طاقت کے زَعم میں مبتلا ہو تو تم سے بڑے جتھے فرعون اور ثمود کے پاس تھے، ان کے لشکروں کا جو انجام ہوا ہے، اس سے سبق حاصل کرو۔ خدا کی قدرت تم پر اِس طرح محیط ہے کہ اُس کے گھیرے سے تم نکل نہیں سکتے، اور قرآن، جس کی تکذیب پر تم تُلے ہوئے ہو، اُس کی ہر بات اَٹل ہے، وہ اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کا لکھا کسی کے بدلے نہیں بدل سکتا۔

آیاتہا ۲۲ رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿۳﴾
قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ﴿۶﴾
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ

قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی،[1] اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے،[2] اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی،[3] کہ مارے گئے گڑھے والے، (اُس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اُس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اُسے دیکھ رہے[4] تھے۔ اور اُن اہلِ ایمان سے اُن کی دشمنی اِس کے سوا کسی وجہ سے

۱- اصل الفاظ ہیں: ذَاتِ الْبُرُوْجِ، یعنی بُرجوں والے آسمان کی۔ مفسرین میں سے بعض نے اس سے مراد قدیم علمِ ہیئت کے مطابق آسمان کے ۱۲ بُرج لیے ہیں۔ اور ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ، حَسَن بصری، ضحّاک اور سُدّی کے نزدیک اس سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور سیّارے ہیں۔

۲- یعنی روزِ قیامت۔

۳- دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، مگر ہمارے نزدیک سلسلۂ کلام سے جو بات مناسبت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا، اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کو سب دیکھنے والے دیکھیں گے۔ یہ مجاہد، عِکْرِمَہ، ضحّاک، ابنِ نَجیح اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے۔

۴- گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو اُن میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر خدا کی لعنت پڑی اور وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہوگئے۔ اور اِس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے: ایک، بُرجوں والے آسمان کی۔ دوسرے، روزِ قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے، قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو اُن مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو قادرِ مُطلَق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور

Maktaba Tul Ishaat.com

سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے، اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔ دوسری چیز کی قسم اِس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں ان لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا، مگر وہ دن بہرحال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اس میں ہر مظلوم کی دادرسی اور ہر ظالم کی پکڑ ہوگی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے اُن بے بس اہلِ ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا، اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ اِن کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدِّد واقعات رِوایات میں بیان ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اِس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صُہَیبؓ رُومی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بُڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متأثّر ہو کر ایمان لے آیا، حتّٰی کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے، تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہوا۔ آخرِ کار لڑکے نے کہا کہ اگر تُو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمعِ عام میں بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار، میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اِس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مُصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصّے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا، اس کو آگ میں پھِکوا دیا۔ (احمد، مسلم، نَسائی، ترمِذی، ابنِ جَریر، عبدالرّزاق، ابنِ ابی شَیْبہ، طَبَرانی، عبد بن حُمَید)

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات اُستوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبُور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اُس شخص کو پھِکواتا چلا گیا جس نے اِسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اُسی وقت سے مجوسیوں میں مُحرَّمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابن جریر)

تیسرا واقعہ ابنِ عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابِل والوں نے بنی اسرائیل کو دینِ موسیٰؑ

سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اُن لوگوں کو پھینک دیا جو اِس سے انکار کرتے تھے۔ (ابنِ جَرِیر، عَبْد بن حُمَید)

سب سے مشہور واقعہ نَجْران کا ہے جسے ابنِ ہِشام، طَبَری، ابنِ خَلْدُون اور صاحبِ مُعْجَم البُلْدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حِمْیَر (یمن) کا بادشاہ تُبّان اسعد ابوکَرِب ایک مرتبہ یَثْرِب گیا جہاں یہودیوں سے متأثّر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا اور بنی قُرَیْظَہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیانے پر یہودیّت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذُونُواس اس کا جانشین ہوا اور اُس نے نَجْران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا، تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابنِ ہِشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نَجْران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نَجْران میں سے ایک شخص دَوس ذُوثُعْلَبان بھاگ نکلا، اور ایک رِوایَت کی رُو سے اُس نے قیصرِ روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رُو سے حَبَش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اِس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑا فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال آخرِ کار حَبَش کی ۷۰ ہزار فوج اَرْیاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذونُواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتا چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اُس زمانے میں عیسائی مِشنَری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اُسی کے قریب دَور میں ایک زاہد و مجاہد اور صاحبِ کشف و کرامت عیسائی سیّاح فَیمیون (Faymiyun) نامی نَجْران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی بُرائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سیّد، جو قبائلی شُیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمے دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگراں تھا۔ اور تیسرا اُسْقُف (بِشَپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹَسَر، چمڑے اور اسلحے کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّۂ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اِسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور مَعاشی وُجوہ سے بھی ذونُواس نے اِس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سیّد حارِثہ کو جسے سُریانی مؤرخین Arethas لکھتے ہیں، قتل کیا، اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ اُسْقُف پال (Paul) کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں

Maktaba Tul Ishaat.com

عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری، راہب سب کو پھکوا دیا۔ مجموعی طور پر بیس سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخرِکار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونُواس اور اُس کی حِمیَری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اِس کی تصدیق حِصنِ غُراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجودہ زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ کو ملا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدّد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اِس واقعے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے بعض عین زمانۂ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اِس واقعے کے ہم عصر ہیں: ایک پروکوپیوس۔ دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (Cosmos Indicopleustis) جو نجاشی ایلیسبوعان (Elesboan) کے حکم سے اُس زمانے میں بَطلیمُوس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر اَدُولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یُوحَنّس مَلالا (Johannes Malala) جس سے بعد کے متعدّد مؤرخین نے اِس واقعے کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحَنّس اِفسُوسی (Johannes of Ephesus) مُتوفّٰی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کَنِیسہ میں نصارائے نَجران کی تعذیب کا قصہ اِس واقعے کے معاصر راوی اُسقُف مارشمعون (Simeon) کے ایک خط سے نقل کیا ہے، جو اُس نے دَیرِ جَبلَہ کے رئیس (Abbot von Gabula) کے نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے رِوایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیّت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بِطرِیق ڈایونیسیوس (Patriarch Dionysius) اور زَکَریّا مدلّی (Zacharia of Mitylene) نے اپنی سُریانی تاریخوں میں بھی اس واقعے کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سَرُوجی کی کتاب دَربابِ نصارائے نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرّہا (Edessa) کے اُسقُف پولَس (Pulus) نے نجران کے ہلاک شُدگان کا مرثیہ لکھا، جو اب بھی دستیاب ہے۔ سُریانی زبان کی تصنیف کتابُ الحِمیَرییّن کا انگریزی ترجمہ (Book of the Himyarites) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اُس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اِس قصے کی تائید کرتے ہیں۔ فِلبی نے اپنے سفرنامے (Arabian Highlands) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اُمّ خَرَق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کُھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں، اور کعبۂ نجران جس جگہ واقع تھا، اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اَساقِفہ عمامے باندھتے تھے اور اُس کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اِس کعبہ کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اِسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سیّد اور عاقب اور اُسقُف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مُباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر

اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ﴿۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ۬ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ
وَيُعِيْدُ ۚ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ

نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے، جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔[۵]

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے، یقیناً اُن کے لیے جہنّم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔[۶] جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً اُن کے لیے جنت کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی۔

درحقیقت تمھارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے، محبّت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے، بزرگ و برتر ہے، اور جو کچھ

سورۂ آلِ عمران، آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۲۹ و حاشیہ ۵۵)

۵- ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنا پر وہی اس کا مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اور وہ لوگ ظالم ہیں جو اِس بات پر بگڑتے ہیں کہ کوئی اس پر ایمان لائے۔

۶- جہنّم کے عذاب سے الگ جلائے جانے کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے مظلوم لوگوں کو آگ کے گڑھے میں پھینک کر زندہ جلایا تھا۔ غالباً یہ جہنّم کی عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہوگی

Maktaba Tul Ishaat.com

لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٦﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿١٧﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿١٨﴾ بَلِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾ بَلْ هُوَ
قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾

ع ۲۲

چاہے کر ڈالنے والا ہے۔[7] کیا تمھیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟[8] مگر جنھوں نے کفر کیا ہے وہ جھُٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ (اُن کے جھٹلانے سے اِس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے، اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔[9] ع

جس میں وہ جلائے جائیں گے۔

۷ – "بخشنے والا ہے" کہہ کر یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ کوئی اگر اپنے گناہوں سے باز آ کر توبہ کر لے تو اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتا ہے۔ "محبّت کرنے والا" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو اپنی خَلق سے عداوت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کو مبتلائے عذاب کرے، بلکہ جس مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اُس سے وہ محبّت رکھتا ہے، اور سزا صرف اُس وقت دیتا ہے جب وہ سرکشی سے باز ہی نہ آئے۔ "مالکِ عرش" کہہ کر انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا فرماں روا وہی ہے، اُس سے سرکشی کرنے والا اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ "بزرگ و برتر" کہہ کر انسان کو اِس کمینہ پن پر متنبّہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسی ہستی کے مقابلے میں گستاخی کا رَویّہ اختیار کرتا ہے۔ اور آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے"، یعنی پوری کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ جس کام کا ارادہ کرے، اس میں وہ مانع و مزاحم ہو سکے۔

۸ – رُوئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے طاقت ورجتھوں کے زُعم میں خدا کی زمین پر سرکشیاں کر رہے ہیں۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ تمھیں خبر بھی ہے کہ اِس سے پہلے جن لوگوں نے اپنے جتھّوں کی طاقت کے بل پر یہی سرکشیاں کی تھیں، وہ کس انجام سے دوچار ہو چکے ہیں۔

۹ – مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اٹل ہے، خدا کی اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا، جو بات اس میں لکھ دی گئی ہے، وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے، تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

تفہیم القرآن

الطارق

(۸۶)

Maktaba Tul Ishaat.com

الطارق

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلطَّارِق کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اس کے مضمون کا اندازِ بیان مکۂ معظّمہ کی ابتدائی سورتوں سے مِلتا جُلتا ہے، مگر یہ اُس زمانے کی نازل شدہ ہے جب کفارِ مکہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ہر طرح کی چالیں چل رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اِس میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جسے کفّار کی کوئی چال اور تدبیر زک نہیں دے سکتی۔

سب سے پہلے آسمان کے تاروں کو اِس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔ پھر انسان کو خود اس کی اپنی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح نُطفے کی ایک بوند سے اُس کو وجود میں لایا گیا اور جیتا جاگتا انسان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو خدا اِس طرح اُسے وجود میں لایا ہے، وہ یقیناً اُس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور یہ دوبارہ پیدائش اِس غرض کے لیے ہوگی کہ انسان کے اُن تمام رازوں کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر دنیا میں پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ اُس وقت اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انسان نہ اپنے بل بُوتے پر بچ سکے گا اور نہ کوئی اُس کی مدد کو آ سکے گا۔

خاتمۂ کلام پر ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش کا برسنا اور زمین سے درختوں اور فصلوں کا اُگنا کوئی کھیل نہیں بلکہ ایک سنجیدہ کام ہے، اُسی طرح قرآن میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، وہ بھی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں بلکہ پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ کفّار اس غلط فہمی میں ہیں کہ اُن کی چالیں اِس قرآن کی دعوت کو زک دے دیں گی، مگر انھیں خبر نہیں ہے کہ اللہ بھی ایک تدبیر میں لگا ہوا ہے اور اس کی تدبیر کے آگے کفار کی چالیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ پھر ایک فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلّی اور دَر پردہ کفار کو یہ دھمکی دے کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ آپؐ ذرا صبر سے کام لیں اور کچھ مدت کفار کو اپنی سعی کر لینے دیں، زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اِن کی چالیں قرآن کو زک دیتی ہیں یا قرآن اُسی جگہ غالب آ کر رہتا ہے جہاں یہ اُسے زک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آیاتہا ۱۷ رکوعاتہا ۱

سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾
اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اُوپر کوئی نگہبان نہ ہو۔[۱] پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔[۲]

۱- نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے، جس کے وجود میں لانے سے ہر شے وجود میں آئی ہے، جس کے باقی رکھنے سے ہر شے باقی ہے، جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے، اور جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات بہم پہنچانے اور اُسے ایک مدّت مقرّرہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے ہر تارے اور سیّارے کی قسم کھائی گئی ہے (النجم الثاقب کا لفظ اگرچہ لغت کے اعتبار سے واحد ہے، لیکن مراد اُس سے ایک ہی تارا نہیں بلکہ تاروں کی جنس ہے)۔ یہ قسم اِس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حدّ وحساب تارے اور سیّارے جو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، اِن میں سے ہر ایک کا وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جس نے اُسے بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلّق رکھ چھوڑا ہے، اور اس طرح اس کی حفاظت و نگہبانی کر رہا ہے کہ نہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے، نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دَوران میں وہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔

۲- عالَمِ بالا کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ خود ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کر لے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہونے والے اربوں جرثوموں میں سے ایک جرثومے، اور ماں کے اندر سے نکلنے والے بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کا انتخاب کر کے دونوں کو کسی وقت جوڑ دیتا ہے، اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ اُسے نشوونما دے کر اسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو، کون ہے جو رحمِ مادر ہی میں اس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں

Maktaba Tul Ishaat.com

خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾
اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ

ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔[۳] یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔[۴] جس روز پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال ہوگی،[۵] اُس وقت

کا تناسُب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے اِتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا کجا، کہ وہ انھیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟

۳- اصل میں صُلب اور ترَائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور ترائب کے معنیٰ ہیں: سینے کی ہڈیاں، یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادّۂ تولید انسان کے اُس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اُس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادّہ اُس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضائے رئیسہ اِس کے مآخذ ہیں، اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ صُلب دماغ کا وہ حصّہ ہے جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلّق قائم ہوتا ہے۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۴، صفحہ ۵۸۳)

۴- یعنی جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اِس بات کا کُھلا ہُوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کرے، اُس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثے کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثے کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ

قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱ وَالْاَرْضِ ذَاتِ
الصَّدْعِ ۝۱۲ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝۱۳ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ
كَيْدًا ۝۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝۱۶ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷ ع

انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔ قسم ہے بارش برسانے والے آسمان[۶] کی اور (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی، یہ ایک جچی تُلی بات ہے، ہنسی مذاق نہیں[۷] ہے۔ یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں[۸] اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں[۹]۔ پس چھوڑ دو اے نبیؐ! اِن کافروں کو اِک ذرا کی ذرا اِن کے حال پر چھوڑ دو[۱۰]۔ ع

پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسُب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثے کے طور پر ہوسکتا ہو، تو پھر کون سی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟

۵ – پوشیدہ اَسرار سے مراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملات بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دنیا کے سامنے آئے مگر اُن کے پیچھے جو نیتیں اور اغراض اور خواہشات کام کر رہی تھیں، اور ان کے جو باطنی محرّکات تھے، اُن کا حال لوگوں سے چھپا رہ گیا۔ قیامت کے روز یہ سب کچھ کُھل کر سامنے آ جائے گا، اور جانچ پڑتال صرف اِسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اسی طرح یہ بات بھی ساری دنیا سے، حتّٰی کہ خود ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اس نے کیا، اُس کے کیا اثرات دنیا میں ہوئے، کہاں کہاں پہنچے، اور کتنی مدّت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کُھلے گا اور اِس کی پوری جانچ پڑتال ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا، اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کٹتی رہی اور کون کون اسے کاٹتا رہا۔

۶ – آسمان کے لیے ذَاتِ الرَّجْعِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَجع کے لُغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں، مگر مجازاً عَربی زبان میں یہ لفظ بارش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی، بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلافِ موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش کو رَجع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اُٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر برستا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۷ – یعنی جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شَق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اُگلنا کوئی مذاق نہیں ہے، بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اُسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے، بلکہ ایک دوٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹَل قولِ حق ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

۸ – یعنی یہ کفّار اِس قرآن کی دعوت کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ اپنی پھونکوں سے اِس چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں۔ ایک سے ایک جھوٹا الزام تراش کر اِس کے پیش کرنے والے نبی پر لگا رہے ہیں، تاکہ دنیا میں اُس کی بات چلنے نہ پائے اور کفر و جاہلیّت کی وہی تاریکی چھائی رہے جسے چھانٹنے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔

۹ – یعنی میں یہ تدبیر کر رہا ہوں کہ ان کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے پائے، اور یہ آخرِ کار منہ کی کھا کر رہیں، اور وہ نور پھیل کر رہے جسے یہ بجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

۱۰ – یعنی اِنھیں ذرا مُہلت دو کہ جو کچھ یہ کرنا چاہیں، کر دیکھیں۔ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ نتیجہ اِن کے سامنے خود آ جائے گا اور اِنھیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تدبیر کے مقابلے میں ان کی چالیں کتنی کارگر ہوئیں۔

تفہیم القرآن

الاعلیٰ

(۸۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

الاعلیٰ

نام پہلی ہی آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کے لفظ الْاَعْلَى کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اِس کے مضمون سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، اور آیت ۶ کے یہ الفاظ بھی کہ ”ہم تمھیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بُھولو گے“ یہ بتاتے ہیں کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نُزولِ وحی کے وقت آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں اُس کے الفاظ بھول نہ جاؤں۔ اس آیت کے ساتھ اگر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴، اور سورۂ قیامہ کی آیات ۱۶-۱۹ کو ملا کر دیکھا جائے، اور تینوں آیتوں کے اندازِ بیان اور موقع ومحل پر بھی غور کیا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اِس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ آپؐ فکر نہ کریں، ہم یہ کلام آپؐ کو پڑھوا دیں گے اور آپؐ اِسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد، دوسرے موقع پر جب سورۂ قیامہ نازل ہو رہی تھی، حضورؐ بے اختیار الفاظِ وحی کو دُہرانے لگے۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ ”اے نبیؐ! اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لٰہذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں، اُس وقت تم اِس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اِس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔“ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقع پر حضورؐ کو پھر بتقاضائے بشریت اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ ۱۱۳ آیتیں جو متواتر نازل ہوئی ہیں، اِن میں سے کوئی چیز میرے حافظے سے نکل نہ جائے، اور آپؐ اُن کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر فرمایا گیا: ”اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک تمھاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔“ اِس کے بعد پھر کبھی اِس کی نوبت نہیں آئی کہ حضورؐ کو ایسا کوئی خطرہ لاحق ہوتا، کیونکہ اِن تین مقامات کے سوا کوئی چوتھا مقام قرآن میں ایسا نہیں ہے جہاں اِس معاملے کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہو۔

موضوع اور مضمون اِس چھوٹی سی سورت کے تین موضوع ہیں: توحید، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات، اور آخرت۔

پہلی آیت میں توحید کی تعلیم کو اِس ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کی جائے، یعنی اُس کو کسی ایسے نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا

مخلوقات سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی فاسد عقائد پیدا ہوئے ہیں، اُن سب کی جڑ اللہ تعالیٰ کے متعلّق کوئی نہ کوئی غلط تصور ہے، جس نے اُس ذات پاک کے لیے کسی غلط نام کی شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا عقیدے کی تصحیح کے لیے سب سے مقدّم یہ ہے کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کو صرف اُن اسمائے حُسنٰی ہی سے یاد کیا جائے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہیں۔

اِس کے بعد تین آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ تمھارا رب، جس کے نام کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اُس کا تناسُب قائم کیا، اُس کی تقدیر بنائی، اُسے وہ کام انجام دینے کی راہ بتائی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے اُس کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہے ہو کہ وہ زمین پر نباتات کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر انھیں خس و خاشاک بھی بنا دیتا ہے۔ کوئی ہستی نہ بَہار لانے پر قادر ہے، نہ خزاں کو آنے سے روک سکتی ہے۔

پھر دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپؐ اِس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ قرآن جو آپؐ پر نازل کیا جا رہا ہے، یہ لفظ بلفظ آپؐ کو یاد کیسے رہے گا۔ اس کو آپؐ کے حافظے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے، اور اس کا محفوظ رہنا آپؐ کے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم چاہیں تو اِسے بُھلا دیں۔

اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ کے سُپرد ہر ایک کو راہِ راست پر لے آنے کا کام نہیں کیا گیا ہے، بلکہ آپؐ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے، اور تبلیغ کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو اُسے نصیحت کی جائے، اور جو اُس کے لیے تیار نہ ہو اُس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ جس کے دل میں گمراہی کے انجامِ بد کا خوف ہوگا وہ حق بات کو سُن کر قبول کر لے گا، اور جو بد بخت اُسے سننے اور قبول کرنے سے گریز کرے گا وہ اپنا بُرا انجام خود دیکھ لے گا۔

آخر میں کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ فلاح صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو عقائد، اَخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کریں، اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھیں۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں ساری فکر بس اِسی دنیا کے آرام و آسایش اور فائدوں اور لذّتوں کی ہے، حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف قرآن ہی میں نہیں بتائی جا رہی ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی انسان کو اِسی حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۱۹ سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ
فَهَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ؕ﴿۵﴾

(اے نبیؐ!) اپنے ربِّ برتر کے نام کی تسبیح کرو[۱] جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا[۲]، جس نے تقدیر بنائی[۳] پھر راہ دکھائی[۴]، جس نے نباتات اُگائیں[۵] پھر اُن کو سیاہ کُوڑا کرکٹ بنا دیا[۶]۔

۱ – لفظی ترجمہ ہوگا: ”اپنے ربِّ برتر کے نام کو پاک کرو“۔ اِس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور وہ سب ہی مراد ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کو اُن ناموں سے یاد کیا جائے جو اس کے لائق ہیں، اور ایسے نام اُس کی ذاتِ برتر کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جو اپنے معنیٰ اور مفہوم کے لحاظ سے اُس کے لیے موزوں نہیں ہیں، یا جن میں اُس کے لیے نقص یا گستاخی یا شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہے، یا جن میں اُس کی ذات یا صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اِس غرض کے لیے محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو اس نے خود قرآنِ مجید میں بیان فرمائے ہیں، یا جو دوسری زبان میں اُن کا صحیح ترجمہ ہوں۔ (۲) اللہ کے لیے مخلوقات کے سے نام، یا مخلوقات کے لیے اللہ کے ناموں جیسے نام استعمال نہ کیے جائیں۔ اور اگر کچھ صفاتی نام ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ بندوں کے لیے بھی اُن کا استعمال جائز ہے، مثلاً رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر وغیرہ، تو ان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے کہ بندے کے لیے ان کا استعمال اُس طریقے پر نہ ہو جس طرح اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ (۳) اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جائے، کسی ایسے طریقے پر یا ایسی حالت میں نہ لیا جائے جو اس کے احترام کے منافی ہو، مثلاً ہنسی مذاق میں، یا بیت الخلا میں، یا کوئی گناہ کرتے ہوئے اس کا نام لینا، یا ایسے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا جو اُسے سن کر گستاخی پر اُتر آئیں، یا ایسی مجلسوں میں اُس کا نام لینا جہاں لوگ بے ہودگیوں میں مشغول ہوں اور اس کا ذکر سُن کر مذاق میں اُڑا دیں، یا ایسے موقع پر اُس کا نام پاک زبان پر لانا جہاں اندیشہ ہو کہ سننے والا اسے ناگواری کے ساتھ سُنے گا۔ امام مالکؒ کے حالات میں منقول ہے کہ جب کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا اور وہ اس وقت اُسے کچھ نہ دے سکتے تو عام لوگوں کی طرح ”اللہ دے گا“ نہ کہتے، بلکہ کسی اور طرح معذرت کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ سائل کو جب کچھ نہ دیا جائے اور اس سے معذرت کر دی جائے تو لامحالہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر میں اللہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسے ناگواری کے ساتھ سُنے۔

احادیث میں حضرت عُقبہ بن عامر جُہَنیؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھنے کا حکم اِسی آیت کی بنا پر دیا تھا، اور رُکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ پڑھنے کا جو طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا، وہ سورۂ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ پر مبنی تھا۔ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان، حاکم، ابنِ المُنذِر)

۲- یعنی زمین سے آسمانوں تک کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اور جو چیز بھی پیدا کی، اُسے بالکل راست اور دُرست بنایا، اس کا توازُن اور تناسُب ٹھیک ٹھیک قائم کیا، اُس کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ اُس جیسی چیز کے لیے اُس سے بہتر صورت کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ سجدہ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۔ (آیت ۷) ''جس نے ہر چیز جو بنائی، خوب ہی بنائی۔'' اِس طرح دنیا کی تمام اشیا کا موزوں اور مُتناسِب پیدا ہونا خود اِس امر کی صریح علامت ہے کہ کوئی صانعِ حکیم اِن سب کا خالق ہے۔ کسی اتفاقی حادثے سے، یا بہت سے خالقوں کے عمل سے، کائنات کے اِن بے شمار اجزا کی تخلیق میں یہ سلیقہ، اور مجموعی طور پر اِن سب اجزا کے اجتماع سے کائنات میں یہ حُسن و جمال پیدا نہ ہوسکتا تھا۔

۳- یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا ہے اور اُس کام کے لیے اُس کی مقدار کیا ہو، اُس کی شکل کیا ہو، اس کی صفات کیا ہوں، اس کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقا اور قیام اور فعل کے لیے کیا مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وہ وجود میں آئے، کب تک اپنے حصّے کا کام کرے اور کب کس طرح ختم ہو جائے۔ اِس پوری اسکیم کا مجموعی نام اُس کی ''تقدیر'' ہے، اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لیے اور مجموعی طور پر پوری کائنات کے لیے بنائی ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ تخلیق کسی پیشگی منصوبے کے بغیر کچھ یونہی اَلَل ٹَپ نہیں ہوگئی ہے، بلکہ اس کے لیے ایک پورا منصوبہ خالق کے پیشِ نظر تھا اور سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۳ - ۱۴۔ جلد سوم، الفُرقان، حاشیہ ۸۔ جلد پنجم، القمر، حاشیہ ۲۵۔ جلد ششم، عبس، حاشیہ ۱۲)

۴- یعنی کسی چیز کو بھی محض پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ جو چیز بھی جس کام کے لیے پیدا کی، اُسے اُس کام کے انجام دینے کا طریقہ بتایا۔ بالفاظِ دیگر، وہ محض خالق ہی نہیں ہے، ہادی بھی ہے۔ اس نے یہ ذمّہ لیا ہے کہ جو چیز جس حیثیت میں اس نے پیدا کی ہے اس کو ویسی ہی ہدایت دے جس کے وہ لائق ہے اور اُسی طریقے سے ہدایت دے جو اُس کے لیے موزوں ہے۔ ایک قسم کی ہدایت زمین اور چاند اور سورج اور تاروں اور سیاروں کے لیے ہے، جس پر وہ سب چل رہے ہیں اور اپنے حصّے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور قسم کی ہدایت پانی اور ہوا اور روشنی اور جمادات و معدنیات کے لیے ہے، جس کے مطابق وہ ٹھیک ٹھیک وہی خدمات بجا لا رہے ہیں جن کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت نباتات کے لیے ہے، جس کی پیروی میں وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں نکالتے اور پھیلاتے ہیں، اس کی تہوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، جہاں جہاں اللہ نے ان کے لیے غذا پیدا کی ہے، وہاں سے اس کو حاصل کرتے ہیں، تنے،

Maktaba Tul Ishaat.com

شاخیں، پتّیاں، پھل پھول لاتے ہیں، اور وہ کام پورا کرتے ہیں جو اُن میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت خشکی، تری اور ہوا کے حیوانات کی بے شمار انواع اور ان کے ہر فرد کے لیے ہے، جس کے حیرت انگیز مظاہر جانوروں کی زندگی اور اُن کے کاموں میں عَلانِیَہ نظر آتے ہیں، حتّٰی کہ ایک دَہریہ بھی یہ ماننے پر مجبُور ہو جاتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کو کوئی ایسا الہامی علم حاصل ہے جو انسان کو اپنے حواس تو درکنار، اپنے آلات کے ذریعے سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر انسان کے لیے دو الگ الگ نوعیّتوں کی ہدایتیں ہیں جو اس کی دو الگ حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ایک وہ ہدایت جو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے، جس کی بدولت ہر بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، جس کے مطابق انسان کی آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، پھیپھڑے، گُردے، جگر، معدہ، آنتیں، اعصاب، رگیں اور شریانیں، سب اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں، بغیر اس کے کہ انسان کو اُس کا شُعور ہو، یا اس کے ارادے کا اِن اعضا کے کاموں میں کوئی دخل ہو۔ یہی ہدایت ہے جس کے تحت انسان کے اندر بچپن، بُلوغ، جوانی، کُہولت اور بڑھاپے کے وہ سب جسمانی اور ذہنی تغیُّرات ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس کے ارادے اور مرضی، بلکہ شعور کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ دوسری ہدایت انسان کی عقلی اور شعوری زندگی کے لیے ہے، جس کی نوعیّت غیر شُعوری زندگی کی ہدایت سے قطعاً مختلف ہے، کیونکہ اِس شعبۂ حیات میں انسان کی طرف ایک قسم کا اختیار منتقل کیا گیا ہے، جس کے لیے ہدایت کا وہ طریقہ موزوں نہیں ہے جو بے اختیارانہ زندگی کے لیے موزوں ہے۔ انسان اِس آخری قسم کی ہدایت سے منہ موڑنے کے لیے خواہ کتنی ہی حُجّت بازیاں کرے، لیکن یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے کہ جس خالق نے اِس ساری کائنات میں ہر چیز کے لیے اس کی ساخت اور حیثیت کے مطابق ہدایت کا انتظام کیا ہے، اُس نے انسان کے لیے یہ تقدیر تو بنا دی ہوگی کہ وہ اس کی دنیا میں اپنے اختیار سے تصرُّفات کرے، مگر اس کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا کہ اس اختیار کے استعمال کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۹-۱۰-۱۴-۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۳۔ جلد پنجم، الرحمٰن، حواشی ۲-۳۔ جلد ششم، الدّہر، حاشیہ ۵)

۵- اصل میں لفظ مَرْعٰی استعمال ہوا ہے، جو جانوروں کے چارے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن سیاقِ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اُگتی ہیں۔

۶- یعنی وہ صرف بہار ہی لانے والا نہیں ہے، خزاں بھی لانے والا ہے۔ تمھاری آنکھیں اس کی قدرت کے دونوں کرشمے دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ ایسی ہری بھری نباتات اگاتا ہے جن کی تازگی و شادابی دیکھ کر دل خوش ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف اُسی نباتات کو وہ زرد، خُشک اور سیاہ کر کے ایسا کُوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب خَس و خاشاک کی صورت میں بہا لے جاتے ہیں۔ اس لیے کسی کو بھی یہاں اِس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ دنیا میں صرف بہار ہی دیکھے گا، خزاں سے اس کو سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ یہی مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً مُلاحَظہ ہو: سورۂ یُونُس، آیت ۲۴۔

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا
يَخۡفٰى ؕ﴿۷﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرٰى ۚۖ﴿۸﴾ فَذَكِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰى ؕ﴿۹﴾
سَيَذَّكَّرُ مَنۡ يَّخۡشٰى ۙ﴿۱۰﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الۡاَشۡقَى ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِىۡ يَصۡلَى
النَّارَ الۡكُبۡرٰى ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰى ؕ﴿۱۳﴾

ہم تمھیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے[7] سوائے اُس کے جو اللہ چاہے[8]، وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اُس کو بھی[9]۔

اور ہم تمھیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو[10]۔ جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کر لے گا[11]، اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا[12]۔

سورۂ کہف، آیت ۴۵۔ سورۂ حدید، آیت ۲۰۔

۷ - حاکم نے حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص سے اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اِس خوف سے دُہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مُجاہِد اور کَلْبی کہتے ہیں کہ جبریلؑ وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دُہرانے لگتے تھے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپؐ خاموشی سے سنتے رہیں، ہم آپؐ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کو یاد ہو جائے گی، اس بات کا کوئی اندیشہ آپؐ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپؐ بھول جائیں گے۔ یہ تیسرا موقع ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے دو مواقع سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۴، اور سورۂ قیامہ، آیات ۱۶ تا ۱۹ میں گزر چکے ہیں۔ اِس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا، اُسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا، اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپؐ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں، یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپؐ کی زبانِ مبارک سے ادا ہو جائے۔

۸ - اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپؐ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بُھلا سکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یہ وہی مضمون ہے جو دوسری جگہ قرآنِ مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِيۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ (بنی اسرائیل:۸۶) ''اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعے سے تمھیں عطا کیا ہے۔'' دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپؐ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپؐ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مُستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اِس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اِس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبَیّ بن کَعبؓ نے پوچھا: کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، میں بھول گیا تھا۔

۹ – ویسے تو یہ الفاظ عام ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے، خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اِس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ جو قرآن کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جا رہے ہیں اِس کا بھی اللہ کو علم ہے، اور بھول جانے کے جس خوف کی بنا پر آپؐ ایسا کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ اس لیے آپؐ کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپؐ اسے بھولیں گے نہیں۔

۱۰ – عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے۔ پہلے فقرے کا مطلب انھوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمھیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے، اور دوسرے فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرۡ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے اور بعد کے فقرے کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مُترتّب ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبیؐ! ہم تبلیغِ دین کے معاملے میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمھارے لیے مُیسّر کیے دیتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمھیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اُس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پتا تبلیغِ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمھارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اُٹھا کر راہِ راست اختیار کر لیں۔ یہی لوگ تمھاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انھی کی تعلیم و تربیت پر تمھیں توجہ صَرف کرنا چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربے سے تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ یہ قریب قریب وہی مضمون ہے جو سورۂ عَبَس میں دوسرے طریقے سے یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ ''جو شخص بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔'' (آیات ۵ تا ۱۲)

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰىۙ ۝۱۴ وَذَكَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰىؕ ۝۱۵ بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ
الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۝ۖ۱۶ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰىؕ ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ
الۡاُوۡلٰىۙ ۝۱۸ صُحُفِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى ۝۱۹ ع ۹

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی[۱۳] اور اپنے رب کا نام یاد کیا[۱۴] پھر نماز پڑھی[۱۵]۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو،[۱۶] حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے[۱۷]۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں[۱۸]۔

۱۱- یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہوگا، اُسی کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اُس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سنے گا جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور فلاح وسعادت کا راستہ بتا رہا ہو۔

۱۲- یعنی نہ اُسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے، اور نہ جینے کی طرح جیے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔ یہ سزا اُن لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصیحت کو قبول ہی نہ کریں اور مرتے دم تک کفر وشرک یا دہریّت پر قائم رہیں۔ رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے بُرے اعمال کی بنا پر جہنّم میں ڈالے جائیں، تو ان کے متعلّق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں موت دے دے گا، پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لا کر ڈالی جائیں گی، اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو، اور اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔ یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مُسلم میں حضرت ابوسعید خُدریؓ اور بزّار میں حضرت ابوہُریرہؓ کے حوالے سے منقول ہوا ہے۔

۱۳- پاکیزگی سے مراد ہے کفر وشرک چھوڑ کر ایمان لانا، بُرے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور بُرے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا۔ فلاح سے مراد دنیوی خوش حالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے، خواہ دنیا کی خوش حالی اس کے ساتھ میسّر ہو یا نہ ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حاشیہ ۲۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۱-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴)

۱۴- یاد سے مراد دل میں بھی اللہ کو یاد کرنا ہے اور زبان سے بھی اُس کا ذکر کرنا ہے۔ دونوں چیزیں ذکرِ الٰہی کی تعریف میں آتی ہیں۔

۱۵- یعنی صرف یاد کر کے رہ نہیں گیا بلکہ نماز کی پابندی اختیار کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ جس خدا کو وہ اپنا

Maktaba Tul Ishaat.com

خدا مان رہا ہے، اس کی اطاعت کے لیے وہ عملاً تیار ہے اور اس کو ہمیشہ یاد کرتے رہنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ اِس آیت میں عَلَی الترتیب دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے: پہلے اللہ کو یاد کرنا، پھر نماز پڑھنا۔ اسی کے مطابق یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کی جائے۔ یہ مِنْ جملہ اُن شواہد کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے، اس کے تمام اجزا قرآنی اشارات پر مبنی ہیں۔ مگر اللہ کے رسولؐ کے سوا ان اشارات کو جمع کر کے کوئی شخص بھی نماز کی یہ ہیئت ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

۱۶ – یعنی تم لوگوں کی ساری فکر بس دنیا اور اس کی راحت و آسایش اور اس کے فائدوں اور لذّتوں کے لیے ہے۔ یہاں جو کچھ حاصل ہو جائے، تم سمجھتے ہو کہ بس وہی اصل فائدہ ہے جو تمھیں حاصل ہو گیا؛ اور یہاں جس چیز سے محروم رہے، تمھارا خیال ہے کہ بس وہی اصل نقصان ہے جو تمھیں پہنچ گیا۔

۱۷ – یعنی آخرت دو حیثیتوں سے دنیا کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے: ایک یہ کہ اس کی راحتیں اور لذّتیں دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہیں، اور دوسرے یہ کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی۔

۱۸ – یہ دوسرا مقام ہے جہاں قرآن میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں کی تعلیم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نجم، رکوع ۳ میں ایک حوالہ گزر چکا ہے۔

تفہیم القرآن

الغاشیہ

(۸۸)

Maktaba Tul Ishaat.com

الغاشیۃ

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْغَاشِیَۃِ کو اِس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

سورت کا پورا مضمون اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغِ عام شروع کر چکے تھے اور مکہ کے لوگ بالعموم اُسے سُن سُن کر نظر انداز کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون

اِس کے موضوع کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ زیادہ تر دو ہی باتیں لوگوں کے ذہن نشین کرنے پر مرکوز تھی۔ ایک توحید، دوسرے آخرت۔ اور اہلِ مکہ ان دونوں باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اِس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب اس سورہ کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کیجیے۔

اس میں سب سے پہلے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے اچانک اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ تمھیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب سارے عالَم پر چھا جانے والی ایک آفت نازل ہوگی؟ اِس کے بعد فوراً ہی یہ تفصیل بیان کرنی شروع کر دی گئی ہے کہ اُس وقت سارے انسان دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر دو مختلف انجام دیکھیں گے۔ ایک، وہ جو جہنّم میں جائیں گے اور اُنھیں ایسے اور ایسے سخت عذاب جھیلنے ہوں گے۔ دوسرے، وہ جو عالی مقام جنت میں جائیں گے اور اُن کو ایسی اور ایسی نعمتیں میسّر ہوں گی۔

اس طرح لوگوں کو چونکانے کے بعد یکلخت مضمون تبدیل ہوتا ہے اور سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ، جو قرآن کی تعلیمِ توحید اور خبرِ آخرت کو سُن کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، اپنے سامنے کی اُن چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے ہر وقت اِنھیں سابقہ پیش آتا ہے؟ عرب کے صحرا میں جن اُونٹوں پر اِن کی ساری زندگی کا انحصار ہے، کبھی یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ کیسے ٹھیک انھی خصوصیات کے مطابق بن گئے جیسی خصوصیات کے جانور کی ضرورت اِن کی صحرائی زندگی کے لیے تھی؟ اپنے سفروں میں جب یہ چلتے ہیں تو انھیں یا آسمان نظر آتا ہے، یا پہاڑ، یا زمین۔ اِنھی تین چیزوں پر یہ غور کریں۔ اُوپر یہ آسمان کیسے چھا گیا؟ سامنے یہ پہاڑ کیسے کھڑے ہوگئے؟ نیچے یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مُطلق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ اگر یہ مانتے ہیں کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی

قدرت کے ساتھ ان چیزوں کو بنایا ہے، اور کوئی دوسرا ان کی تخلیق میں شریک نہیں ہے، تو اُسی کو اکیلا رب ماننے سے اِنھیں کیوں انکار ہے؟ اور اگر یہ مانتے ہیں کہ وہ خدا یہ سب کچھ پیدا کرنے پر قادر تھا، تو آخر کس معقول دلیل سے اِنھیں یہ ماننے میں تأمُّل ہے کہ وہی خدا قیامت لانے پر بھی قادر ہے؟ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے؟ جنت اور دوزخ بنانے پر بھی قادر ہے؟

اِس مختصر اور نہایت معقول اِستدلال سے بات سمجھانے کے بعد کفار کی طرف سے رُخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کیا جاتا ہے اور آپؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، تم اِن پر جبّار بنا کر تو مسلّط کیے نہیں گئے ہو کہ زبردستی اِن سے منوا کر ہی چھوڑو۔ تمھارا کام نصیحت کرنا ہے، سو تم نصیحت کیے جاؤ۔ آخرِکار اِنھیں آنا ہمارے ہی پاس ہے۔ اُس وقت ہم اِن سے پورا پورا حساب لے لیں گے اور نہ ماننے والوں کو بھاری سزا دیں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۲۶ | سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ | رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲
عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ
اٰنِيَةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ
مِنْ جُوْعٍ ۝۷ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝۸ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹

کیا تمھیں اُس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے؟[1] کچھ چہرے[2] اُس روز خوف زدہ ہوں گے، سخت مشقت کر رہے ہوں گے، تھکے جاتے ہوں گے، شدید آگ میں جُھلس رہے ہوں گے، کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انھیں پینے کو دیا جائے گا، خار دار سُوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا اُن کے لیے نہ ہوگا،[3] جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے۔ کچھ چہرے اُس روز بارونق ہوں گے، اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے،[4]

۱- مراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اِس مقام پر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہاں بحیثیتِ مجموعی پورے عالمِ آخرت کا ذکر ہو رہا ہے، جو نظامِ عالَم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اُٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا و سزا پانے تک تمام مراحل پر حاوی ہے۔

۲- چہروں کا لفظ یہاں اشخاص کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اُس کا چہرہ ہے جس سے اس کی شخصیت پہچانی جاتی ہے، اور انسان پر اچھی یا بُری جو کیفیّات بھی گزرتی ہیں، ان کا اظہار اس کے چہرے سے ہی ہوتا ہے، اس لیے ''کچھ لوگ'' کہنے کے بجائے ''کچھ چہرے'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۳- قرآنِ مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنّم کے لوگوں کو زَقُّوم کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے غِسْلِیْن (زخموں کے دھوون) کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا، اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انھیں خاردار سُوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنّم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیے جائیں گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زَقُّوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غِسْلِیْن ان کو ملے گا، اُس سے بھی

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ﴿۱۰﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ؕ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ
جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّ وقف لازم
نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى
الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وقفہ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وقفہ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى
الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وقفہ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ وقفہ ﴿۲۰﴾

عالی مقام جنت میں ہوں گے، کوئی بے ہودہ بات وہاں نہ سُنیں گے[5]، اُس میں چشمے رواں ہوں گے، اُس کے اندر اونچی مَسندیں ہوں گی، ساغر رکھے ہوئے ہوں[6] گے، گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔

(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی[7]؟

بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے، غرض کوئی مرغوب غذا بہر حال انھیں نصیب نہ ہوگی۔

۴ – یعنی دنیا میں جو سعی و عمل کر کے وہ آئے ہوں گے، اُس کے بہترین نتائج آخرت میں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ انھیں اطمینان ہو جائے گا کہ دنیا میں ایمان اور صلاح و تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے انھوں نے نفس اور اس کی خواہشات کی جو قربانیاں کیں، فرائض کو ادا کرنے میں جو تکلیفیں اُٹھائیں، احکامِ الٰہی کی اطاعت میں جو زحمتیں برداشت کیں، معصیتوں سے بچنے کی کوشش میں جو نقصانات اٹھائے اور جن فائدوں اور لذّتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، یہ سب کچھ فی الواقع بڑے نفع کا سودا تھا۔

۵ – یہ وہی چیز ہے جس کو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ جنّت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کی حیثیّت سے بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الطُّور، حاشیہ ۱۸۔ الواقعہ، حاشیہ ۱۳۔ جلد ششم، النبا، حاشیہ ۲۱)

۶ – یعنی ساغر بھرے ہوئے ہر وقت اُن کے سامنے موجود ہوں گے۔ اِس کی حاجت ہی نہ ہوگی کہ وہ طلب کر کے انھیں منگوائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا
مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ
إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

ع ۱۴ — النصف

اچھا تو (اے نبیؐ!) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۸۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ اِن لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر اِن کا حساب لینا ہمارے ہی ذمّہ ہے۔ ع

۷ – یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوسکتا ہے، تو کیا خود اپنے گردوپیش کی دُنیا پر نظر ڈال کر انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہوگیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہوگئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہوسکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے، ان کے متعلّق تو وہ یہ سمجھ لے کہ ان کا وجود میں آنا تو ممکن ہے، کیونکہ یہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں، ان کے بارے میں وہ بے تکلّف یہ فیصلہ کر دے کہ اُن کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ اُونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خُصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا، جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سورج دن کو روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی، جس پر انسان رہتا اور بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مُطلق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہوگیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آیندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے، اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔

۸ – یعنی اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمھارے سپرد یہ کام تو نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بتا دو اور غلط راہ پر چلنے کے انجام سے خبردار کردو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو۔

تفہیم القرآن

الفجر

(۸۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

الفجر

نام پہلے ہی لفظ وَالْفَجْرِ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اِس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکۂ معظّمہ میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی چکّی چلنی شروع ہو چکی تھی۔ اِسی بنا پر اہلِ مکہ کو عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اِثبات ہے، جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے۔ اِس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب وار اِستدلال کیا گیا ہے اس کو اُسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ جس بات کا تم انکار کر رہے ہو، اُس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں اِن چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے، اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس باقاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور اِن کی قسم کھا کر یہ سوال اِس معنیٰ میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اِس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اِس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس خدا نے قائم کیا ہے، اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پُرس کرے؟

اِس کے بعد انسانی تاریخ سے اِستدلال کرتے ہوئے بطورِ مثال عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گزر گئے اور زمین میں انھوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا اُن پر برس گیا۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی چوپٹ راجا کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرماں روائے حکیم و دانا اِس پر حکمرانی کر رہا ہے، جس کی حکمت اور عدل کا یہ تقاضا خود اِس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے کہ عقل اور اخلاقی حِس دے کر جس مخلوق کو اس نے یہاں تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں اس کا

مُحاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عربِ جاہلیت کی حالت تو اُس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خُصوصیّت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے: ایک، لوگوں کا مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حُصول یا فُقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دیے بیٹھے تھے، اور اِس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رَوِیّہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس رَوِش پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے، لوگوں کا یہ طرزِ عمل کہ یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس مپرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، جس کا بس چلتا ہے مُردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حق داروں کو دھتا بتا دیتا ہے، اور مال کی حرص لوگوں کو ایک ایسی نہ بجھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے، ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اِس تنقید سے مقصود لوگوں کو اِس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرزِ عمل ہے، اُن کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو۔

پھر کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہوگا اور ضرور ہوگا، اور وہ اُس روز ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں وہ بات آ جائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ منکر انسان ہاتھ ملتا رہ جائے گا کہ کاش! میں نے دنیا میں اِس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اُسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی۔ البتہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہوگا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاؑ پیش کر رہے تھے، خدا اُن سے راضی ہوگا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے، انھیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنّت میں داخل ہو جائیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۰ آیاتہا سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ ۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ
اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۭ﴿۵﴾

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جُفت اور طاق کی، اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ کیا اِس میں کسی صاحبِ عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟[۱]

۱- اِن آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے، حتّٰی کہ ”جُفت اور طاق“ کے بارے میں تو ۳۶ اقوال ملتے ہیں۔ بعض رِوایات میں اِن کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ اور بعد کے مفسرین میں سے کوئی بھی آپؐ کی تفسیر کے بعد خود اِن آیات کے معنیٰ متعین کرنے کی جراُت کرتا۔

اندازِ بیان پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے کوئی بحث چل رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات پیش فرما رہے تھے اور منکرین اُس کا انکار کر رہے تھے۔ اس پر حضورؐ کے قول کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قسم ہے فُلاں اور فُلاں چیزوں کی۔ مطلب یہ تھا کہ ان چیزوں کی قسم، جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں، وہ برحق ہے۔ پھر بات کو اِس سوال پر ختم کر دیا گیا کہ کیا کسی صاحبِ عقل کے لیے اِس میں کوئی قسم ہے؟ یعنی کیا اِس حق بات پر شہادت دینے کے لیے اِس کے بعد کسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا یہ قسم اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک ہوش مند انسان اُس بات کو مان لے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ بحث تھی کیا جس پر اِن چار چیزوں کی قسم کھائی گئی۔ اِس کے لیے ہمیں اُس پورے مضمون پر غور کرنا ہوگا جو بعد کی آیتوں میں ”تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا“ سے شروع ہو کر سورت کے آخر تک چلتا ہے۔ اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بحث جزا و سزا کے بارے میں تھی، جس کو ماننے سے اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اُس کا قائل کرنے کے لیے مسلسل تبلیغ و تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر، اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اِس بات کو باور کرنے کے لیے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحبِ عقل آدمی کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو؟

اِن قسموں کا یہ موقع و محل متعین ہو جانے کے بعد لامحالہ ہمیں اِن میں سے ہر ایک کے وہ معنیٰ لینے ہوں گے جو

بعد کے مضمون پر دلالت کرتے ہوں۔ سب سے پہلے فرمایا: ''فجر کی قسم''۔ فجر پَو پھٹنے کو کہتے ہیں، یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا: ''دس راتوں کی قسم''۔ سلسلۂ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخُن کی شکل سے شروع ہوکر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصّہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصّہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ''جُفت اور طاق کی قسم''۔ جُفت اُس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے، جیسے ۲-۴-۶-۸، اور طاق اُس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا، جیسے ۱-۳-۵-۷۔ عُموی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے یا تنہا۔ لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے، اس لیے سلسلۂ مضمون کی مناسبت سے جُفت اور طاق کا مطلب تغیُّرِ ایّام ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیُّر ایک نئی کیفیّت لے کر آتا ہے۔ آخر میں فرمایا: ''رات کی قسم جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو''۔ یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، خاتمے پر آ لگی ہو اور پَو پھٹنے والی ہو۔

اب اِن چاروں چیزوں پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیے جن کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک ربِّ قدیر اس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے، بے تُکا، بے مقصد، بے حکمت، بے مَصلحت نہیں کر رہا ہے، بلکہ اُس کے ہر کام میں صریحاً ایک حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے۔ اُس کی دنیا میں تم یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکایک سورج نصف النّہار پر آ کھڑا ہوا۔ یا ایک روز چاند ہِلال کی شکل میں طُلوع ہو اور دوسرے روز چودھویں رات کا پورا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر ٹھیر کر رہ جائے۔ یا تغیُّرِ ایّام کا سرے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی تاریخوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کون سا مہینا ہے، اس کی کون سی تاریخ ہے، کس تاریخ سے اُس کا کون سا کام شروع اور کب ختم ہونا ہے، گرمی کے موسم کی تاریخیں کون سی ہیں اور برسات یا سردی کے موسم کی تاریخیں کون سی۔ کائنات کی دوسری بے شمار چیزوں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب و روز کی اِس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اِس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادرِ مُطلق کا قائم کیا ہوا ہے، اور اِس کے قیام سے اُس مخلوق کی بے شمار مَصلحتیں وابستہ ہیں جسے اُس نے اِس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و دانا اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے تو وہ دو حماقتوں میں سے کسی ایک حماقت میں لامحالہ مبتلا ہے: یا تو وہ اُس کی قدرت کا منکر ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کائنات کو

Maktaba Tul Ishaat.com

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ إِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۝٧ الَّتِي

تم[۲] نے دیکھا نہیں کہ تمھارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عادِ اِرَم کے[۳] ساتھ، جن کے

ایسے بے نظیر نظم کے ساتھ پیدا کر دینے پر تو قادر ہے، مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اُسے جزا و سزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا وہ اس کی حکمت و دانائی کا منکر ہے اور اس کے بارے میں یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اُس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا، مگر وہ نہ تو اُس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے اختیارات سے کام کیا لیا، اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا نہ بُرے کام کی سزا۔ اِن دونوں باتوں میں جس بات کا بھی کوئی شخص قائل ہے، وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔

۲ – جزا و سزا پر شب و روز کے نظام سے اِستدلال کرنے کے بعد اب اُس کے ایک یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم اِس کو چلا رہا ہے، اور اُس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانونِ فطرت سمجھتے ہو، بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کارفرما ہے، جس کا لازمی تقاضا مُکافاتِ عمل اور جزا اور سزا ہے۔ اِس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اِس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں، جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور خدا کی جزا و سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخرِ کار فاسد و مُفسد بن کر رہیں، اور جو قوم بھی اِس راستے پر چلی اُس پر کائنات کے رب نے آخرِ کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے: ایک، یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوا ہے، اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے، جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، اُن سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اُس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اُن پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت اُن سب کی باز پُرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔ (قرآنِ مجید میں آخرت پر یہ تاریخی اور اخلاقی اِستدلال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ یونُس، حاشیہ ۱۲۔ ہود، حواشی ۵۷-۱۰۵-۱۱۵۔ ابراہیم، حاشیہ ۹۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۸۶-۸۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سَبا، حاشیہ ۲۵۔ صٓ، حواشی ۲۹-۳۰۔ المومن، حاشیہ ۸۰۔ الدُّخان، حواشی ۳۳-۳۴۔ الجاثیہ، حواشی ۲۷-۲۸۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۷۔ الذاریات، حاشیہ ۲۱)

لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿٨﴾ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا
الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾

مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟[۴] اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟[۵] اور میخوں والے فرعون[۶] کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخرِ کار تمھارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب گھات لگائے ہوئے ہے[۷]۔

۳- عادِ اِرَم سے مراد وہ قدیم قومِ عاد ہے جسے قرآنِ مجید اور تاریخِ عرب میں عادِ اُولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى (آیت ۵۰) ''اور یہ کہ اُس نے قدیم قومِ عاد کو ہلاک کیا''، یعنی اُس قومِ عاد کو جس کی طرف حضرت ہودؑ بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں تاریخِ عرب اِس قوم کے اُن لوگوں کو، جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھُولے تھے، عادِ اُخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ قدیم قومِ عاد کو عادِ اِرَم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اِرَم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اِسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں، جن میں سے ایک ثمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (Aramaeans) ہیں، جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (Aramaic) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لیے ذَاتِ الْعِمَادِ (اُونچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اُونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انھی نے شروع کیا تھا۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ان کی اِس خصوصیّت کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہودؑ نے ان سے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۙ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۚ ''یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو، گویا تمھیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔'' (الشّعراء، آیات ۱۲۸-۱۲۹)

۴- یعنی وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے، اپنی قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اُس وقت دنیا میں اُن کی ٹکّر کی نہ تھی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر اُن کے متعلّق فرمایا گیا ہے: وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً، ''تم کو جسمانی ساخت میں خوب تومند کیا'' (الاعراف، آیت ۶۹) فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا

Maktaba Tul Ishaat.com

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؕ﴿۱۵﴾ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ۚ

مگر[8] انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔[9]

فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ''رہے عاد، تو انھوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور کہنے لگے: کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟'' (حٰمٓ السجدہ، آیت ۱۵) وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ''اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا، جبّار بن کر ڈالا۔'' (الشعراء، آیت ۱۳۰)

۵ – وادی سے مراد وادی القُریٰ ہے، جہاں اِس قوم نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر عمارتیں بنائی تھیں، اور غالبًا تاریخ میں وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اِس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷-۵۹۔ الحِجر، حاشیہ ۴۵۔ جلد سوم، الشُّعَراء، حواشی ۹۵-۹۹ مع تصاویر)

۶ – فرعون کے لیے ذِی الْاَوْتَادِ (میخوں والا) کے الفاظ اِس سے پہلے سورۂ صٓ، آیت ۱۲ میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اِس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب فوجوں والا ہو، کیونکہ انھی کی بدولت اُس کی سلطنت اِس طرح جمی ہوئی تھی جیسے خیمہ میخوں کے ذریعے سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَہرامِ مصر کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو، کیونکہ وہ فَراعنہ کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر جمے کھڑے ہیں۔

۷ – ظالموں اور مفسدوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہونے کے الفاظ تمثیلی استعارے کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اِس غرض کے لیے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ زد پر آئے، اُسی وقت اُس پر حملہ کر دے۔ وہ جس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے، اُسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اُس کی خبر لینے کے لیے کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ انجام سے غافل، بےفکری کے ساتھ وہ اُس مقام سے گزرتا ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اُن ظالموں کی ہے جو دنیا میں فساد کا طوفان برپا کیے رکھتے ہیں۔ اُنھیں اِس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ خدا بھی کوئی ہے جو اُن کی حرکات کو دیکھ رہا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَ
تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

ہرگز نہیں،[۱۰] بلکہ تم یتیم سے عزت کا سُلوک نہیں کرتے،[۱۱] اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے،[۱۲] اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو،[۱۳] اور مال کی محبّت میں بُری طرح گرفتار ہو۔[۱۴]

وہ پوری بے خوفی کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ شرارتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ حد آ جاتی ہے جس سے آگے اللہ تعالیٰ انھیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا، اُسی وقت اُن پر اچانک اس کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

۸۔ اب لوگوں کی عام اخلاقی حالت پر تنقید کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ رَوِیَّہ جن انسانوں نے اختیار کر رکھا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اُن سے کبھی باز پُرس نہ ہو، اور اِس بات کو عقل و اخلاق کا تقاضا کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ کر کے جب انسان دنیا سے رخصت ہو جائے تو اسے کسی جزا اور سزا سے سابقہ پیش نہ آئے۔

۹۔ یعنی یہ ہے انسان کا مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات۔ اِسی دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ چیز ملے تو پھول جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور یہ نہ ملے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار اُس کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا ملنا یا نہ ملنا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت، جسے وہ نہیں سمجھتا، یہ ہے کہ اللہ نے جس کو دنیا میں جو کچھ بھی دیا ہے، آزمایش کے لیے دیا ہے۔ دولت اور طاقت دی ہے تو امتحان کے لیے دی ہے کہ وہ اُسے پا کر شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ مفلس اور تنگ حال بنایا ہے تو اس میں بھی اُس کا امتحان ہے کہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے، یا اخلاق و دیانت کی ہر حد کو پھاند جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے خدا کو کوسنے لگتا ہے۔

۱۰۔ یعنی یہ عزت اور ذلت کا معیار ہرگز نہیں ہے۔ تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اخلاق کی بھلائی اور بُرائی کے بجائے تم نے اِسے معیارِ عزت و ذلت بنا رکھا ہے۔

۱۱۔ یعنی جب تک اُس کا باپ زندہ رہتا ہے، اُس کے ساتھ تمھارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے، اور جب اُس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسایے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار، چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

۱۲۔ یعنی تمھارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک

Maktaba Tul Ishaat.com

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا
صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِایْٓءَ یَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىِٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ
وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾ فَیَوْمَىِٕذٍ
لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾

ہرگز نہیں،[۱۵] جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمھارا رب جلوہ فرما ہوگا[۱۶] اِس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور جہنّم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کی سمجھ میں آئے گا، اور اُس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟[۱۷] وہ کہے گا کہ کاش! میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

دوسرے کو اُس کا انتظام کرنے پر اکسائیں۔

۱۳ – عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف اُن مَردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اِس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا، وہ بلا تأمّل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور اُن سب لوگوں کا حصّہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بُوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیّت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمان داری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں، خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

۱۴ – یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمھیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو، اسے حاصل کرنے میں تمھیں کوئی تأمّل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے، تمھاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

۱۵ – یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ تم دنیا میں جیتے جی یہ سب کچھ کرتے رہو اور اِس کی باز پُرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزا و سزا کا انکار کر کے تم نے زندگی کا یہ ہنجار اختیار کر رکھا ہے، وہ کوئی اَنہونی اور خیالی بات نہیں ہے، بلکہ وہ پیش آنی ہے اور اُس وقت آنی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

ع

(دوسری طرف ارشاد ہوگا:) اے نفسِ مطمئن[18]! چل اپنے رب کی طرف[19]، اِس حال میں کہ تُو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں ؏

۱۶- اصل الفاظ ہیں: جَآءَ رَبُّكَ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: "تیرا رب آئے گا"۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اس کو ایک تمثیلی اندازِ بیان ہی سمجھنا ہوگا، جس سے یہ تصوّر دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی و قہّاری کے آثار اُس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں اور اَعیانِ سلطنت کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے بنفسِ نفیس خود دربار میں آ جانے سے طاری ہوتا ہے۔

۱۷- اصل الفاظ ہیں: يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى۔ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اُس پر نادم ہوگا، مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو ہوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاءؑ نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ۔

۱۸- نفسِ مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاءؑ کے لائے ہوئے دینِ حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے ملا اُسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اُس سے بادلِ ناخواستہ نہیں بلکہ اِس یقین کے ساتھ رُک گیا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے، جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی، بے دریغ اسے پیش کر دیا، جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اِس راہ میں سابقہ درپیش ہوا، انھیں پورے سکونِ قلب کے ساتھ برداشت کیا، اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آ رہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اُسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اِس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دینِ حق کی پیروی نے اُسے اِن گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اِسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرحِ صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (الاَنعام، آیت ۱۲۵)

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۹- یہ بات اُس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اُٹھ کر میدانِ حشر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی، اور جب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اس وقت بھی کہی جائے گی۔ ہر مرحلے پر اُسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہا ہے۔

تفہیم القرآن

البلد

(۹۰)

Maktaba Tul Ishaat.com

البلد

نام پہلی ہی آیت لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے لفظ "البلد" کو اِس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون اور اندازِ بیان مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں کا سا ہے، مگر ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتا دیتا ہے کہ اس کے نُزول کا زمانہ وہ تھا جب کفارِ مکہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر تُل گئے تھے اور آپؐ کے خلاف ہر ظلم و زیادتی کو انھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون اِس سورہ میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے، اور یہ قرآن کا کمالِ ایجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اِس چھوٹی سی سورت کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں، اُن کو دیکھنے اور اُن پر چلنے کے وسائل بھی اُسے فراہم کر دیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے، یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے بُرے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہرِ مکہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے مصائب اور پوری اولادِ آدم کی حالت کو اِس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدایش ہی مشقّت کی حالت میں ہوئی ہے۔ اِس مضمون کو اگر سورۂ نجم کی آیت ۳۹ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کارگاہِ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقّت پر ہے۔

اِس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دُور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اُوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اُس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصوّرات میں سے ایک چیز کو بطورِ مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بڑائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبریائی کی نمایش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے، وہ خود بھی اپنی اِن شاہ خرچیوں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں،

حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے، وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اُس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی، بلکہ نفس کو خوب لذّت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے، جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی بہ نسبت کھڈ میں لُڑھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمایش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال یتیموں اور مسکینوں کی مدد پر خرچ کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصّہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خَلق پر رحم کھانے والا ہو۔ اِس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۲۰ آیاتھا — سُوۡرَةُ الۡبَلَدِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتھا ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ ۝۱ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ ۝۲ وَ وَالِدٍ
وَّمَا وَلَدَۙ ۝۳ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡ كَبَدٍؕ ۝۴ اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ
يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ اَحَدٌ ۘ ۝۵ يَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ ۝۶ وقف لازم

نہیں[1]، میں قسم کھاتا ہوں اِس شہر کی[2] اور حال یہ ہے کہ (اَے نبیؐ!) اِس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے[3]، اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی[4]، درحقیقت ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا ہے[5]۔ کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا[6]؟ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اُڑا دیا[7]۔

۱ – اِس سے پہلے ہم سورۂ قیامہ، حاشیہ ۱ میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کلام کا آغاز ”نہیں“ سے کرنا اور پھر قسم کھا کر آگے کی بات شروع کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگ کوئی غلط بات کہہ رہے تھے جس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ نہیں، بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ میں فُلاں فُلاں چیزوں کی قسم کھاتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بات کیا تھی جس کی تردید میں یہ کلام نازل ہوا، تو اُس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ کفارِ مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرزِ زندگی پر چل رہے ہیں، اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ ہمارے اِس طرزِ زندگی کو غلط ٹھیرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ اِس پر کبھی ہم سے بازپُرس ہوگی اور ہمیں جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲ – یعنی شہرِ مکہ کی۔ اِس مقام پر یہ بات کھولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اِس شہر کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔ اہلِ مکہ اپنے شہر کا پَس منظر خود جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی میں سُنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ایک بیوی اور ایک شِیر خوار بچے کو یہاں لا کر بے سہارا چھوڑا، کس طرح یہاں ایک گھر بنا کر ایسی حالت میں حج کی مُنادی کی جب کہ دُور دُور تک کوئی اُس مُنادی کا سننے والا نہ تھا، اور پھر کس طرح یہ شہر آخرِ کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صدہا برس تک عرب کی سرزمینِ بے آئین میں اِس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا۔

۳ – اصل الفاظ ہیں: اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ۔ اِس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ آپؐ اِس شہر میں مقیم ہیں اور آپؐ کے مقیم ہونے سے اِس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر

حرم ہے، مگر ایک وقت آئے گا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپؐ کے لیے حلال ہو جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اِس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور درختوں تک کو کاٹنا اہلِ عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسّر ہے، لیکن حال یہ ہوگیا ہے کہ اے نبیؐ! تمھیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں، تمھیں ستانا اور تمھارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجایش ہے، لیکن جب ہم آگے کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دو معنٰی اُس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور تیسرا مفہوم ہی اُس سے میل کھاتا ہے۔

۴ – چونکہ مطلقاً باپ اور اُس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دُنیا میں پائے گئے ہیں، اب پائے جاتے ہیں اور آیندہ پائے جائیں گے۔

۵ – یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اُوپر مذکور ہوئیں۔ انسان کے مَشقّت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چَین کی بنسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُس کے لیے یہ دنیا محنت اور مَشقّت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اِس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہرِ مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی، تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اِس شہرِ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتّٰی کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔ اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نُطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اِس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف، مَشقّت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے ہو، وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اِس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا اِسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اُس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اِتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سِسک سِسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیّرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیّر بھی اگر غلط سَمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اِس اندیشے سے اُس کو چَین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتحِ عالَم بھی ہے تو کسی وقت اِس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غِل وغِش چَین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے، کیونکہ انسان پیدا ہی مَشقّت میں کیا گیا ہے۔

۶ – یعنی کیا یہ انسان جو اِن حالات میں گھرا ہوا ہے، اِس غرّے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ اَحَدٌؕ ﴿۷﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِۙ ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا

کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اُس کو نہیں دیکھا؟[۸] کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو

کوئی بالاتر اقتدار اُس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اِس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کی تقدیر پر کسی اور کی فرماں روائی قائم ہے، جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طُغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بُوتا رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پلٹا بڑے سے بڑے با اقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ عُروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اِس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی کا اس پر بس نہیں چل سکتا؟

۷ – اَنۡفَقۡتُ مَالًا لُّبَدًا ”میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا“ نہیں کہا بلکہ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا کہا، جس کے لفظی معنٰی ہیں: ”میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا“، یعنی لُٹا دیا، یا اُڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اُس نے خرچ کیا، وہ اُس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہیچ تھا کہ اس کے لُٹا دینے یا اُڑا دینے کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اُڑا دینا تھا کس مَد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مُترشّح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمایش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا۔ جُوے میں ڈھیروں دولت ہار دینا۔ جُوا جیت جانے پر اُونٹ پر اُونٹ کاٹنا اور خوب یار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور اِذنِ عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے، آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کُھلا لنگر جاری رکھنا کہ دُور دُور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فُلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمایشی اخراجات تھے جنھیں جاہلیت میں آدمی کی فیّاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انھی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے۔ انھی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔

۸ – یعنی کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اِس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخُر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا

وَشَفَتَيۡنِ ۝٩ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۝١٠ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۝١١ وَمَآ
اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ۝١٢ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝١٣ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ ذِىۡ
مَسۡغَبَةٍ ۝١٤ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۝١٥ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ۝١٦ ثُمَّ

ہونٹ نہیں دیے؟[9] اور دونوں نمایاں راستے اُسے (نہیں) دکھا دیے؟[10] مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمّت نہ کی۔[11] اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھُڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔[12] پھر (اِس کے ساتھ یہ کہ)

اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اس سے دھوکا کھا جائے گا؟

۹ – مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اُسے علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے؟ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنھیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتا دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفسِ ناطقہ ہے، جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

۱۰ – یعنی ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمّہ داری پر اختیار کرلے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دہر میں فرمائی گئی ہے کہ ’’ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں، اور اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا‘‘ (آیات ۲-۳) تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الدہر، حواشی ۳ تا ۵۔

۱۱ – اصل الفاظ ہیں: فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ۔ اِقتحام کے معنٰی ہیں: اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقّت طلب کام میں ڈالنا۔ اور عَقَبَہ اُس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اُسے دکھائے، ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے، مگر مشقّت طلب اور دشوار گزار ہے۔ اُس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے، اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اُترتا ہے، مگر اس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیے تھے، اِس نے اُن میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کر لیا، اور اُس مشقّت طلب راستے

Maktaba Tul Ishaat.com

کو چھوڑ دیا جو بلندی کی طرف جانے والا ہے۔

۱۲– اُوپر چونکہ اُس کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمایش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مَصرَف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذّت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑائے۔ اِسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدّت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ ان کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شان دار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اِسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

اِن آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً: فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن چھُڑانے) کے بارے میں حضورؐ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ایک حضرت ابوہُریرہؓ کی یہ رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عُضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عُضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرمگاہ کے بدلے میں شرمگاہ۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمِذِی، نَسائی) حضرت علیؓ بن حسینؓ (امام زَین العابدینؒ) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مَرجانہ سے پوچھا: کیا تم نے ابوہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر امام زین العابدینؒ نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اُسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مُسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شَعبیؒ نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدّم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضورؐ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: الساعی علی الارملة والمسکین کالساعی فی سبیل اللہ واحسبهٗ قال کالقائم لا یفتر و کالصائم لا یفطر۔ ”بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ (اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ) مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے، اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ

كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝١٧ؕ

آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے[۱۳] اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی۔[۱۴]

نہ چھوڑے۔" (بخاری و مسلم)

یتامٰی کے بارے میں تو حضورؐ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سَہلؓ بن سعد کی روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اِس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپؐ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اُٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔" (بخاری) حضرت ابو ہریرہؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو، اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بُرا سلوک ہو رہا ہو۔" (ابنِ ماجہ، بخاری فی الادب المُفرَد) حضرت ابو اُمامہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: "جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا، اُس بچے کے ہر بال کے بدلے، جس پر اس شخص کا ہاتھ گزرا، اُس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا، وہ اور میں جنّت میں اِس طرح ہوں گے۔ اور یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں۔" (مُسندِ احمد، ترمذی) ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکارِ رسالت مآب نے ارشاد فرمایا: "جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا، اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کر دی، اِلّا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔" (شرح السُّنّہ) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا۔" (مُسندِ احمد)

۱۳ - یعنی اِن اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل، عملِ صالح ہے اور نہ اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اِس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابلِ قدر اور ذریعۂ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورۂ نساء میں فرمایا: "جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔" (آیت ۱۲۴) سورۂ نحل میں فرمایا: "جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو اُن کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔" (آیت ۹۷) سورۂ مومن میں فرمایا: "اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔" (آیت ۴۰) قرآنِ پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عملِ صالح کے اجر اور اس کی جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں لازماً اُس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو کہیں بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ’’ پھر وہ ایمان لایا‘‘ بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ’’ پھر وہ اُن لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے۔‘‘ اِس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا اُن دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں، تاکہ اِس سے اہلِ ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ وجود میں آئے، اور اجتماعی طور پر اُن بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا، اور اُن بُرائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔

۱۴ – یہ مومن معاشرے کی دو اہم خُصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیّت یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔

جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اِس سے پہلے بارہا اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید جس وسیع مفہُوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے، اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے، اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم، اور دنیا بھر کے شیاطینِ جن و اِنس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتّٰی کہ راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اِس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اِس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اُس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

رہا رحم، تو اہلِ ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ ایک سنگ دل، بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا، بلکہ انسانیّت کے لیے رحیم و شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غم خوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے، اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اُس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○ (الانبیاء:۱۰۶)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اخلاقی صفت کو اپنی اُمت میں فروغ دینے کی کوشش فرمائی ہے، وہ یہی رحم کی صفت ہے۔ مثال کے طور پر آپؐ کے حسبِ ذیل ارشادات مُلاحظہ ہوں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت جَرِیرؓ بن عبداللہ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرحمُ اللّٰہ من لا یرحمُ النّاسَ۔ (بخاری، مسلم)
اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن عَمرُوؓ بن العاص کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الراحمون یرحمھم الرحمٰن ۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ (ابوداؤد، تِرمِذی)
رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حضرت ابوسعیدؓ خُدری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من لا یرحم لا یرحم۔ (بخاری فی الادب المُفرَد)
جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس منّا من لم یرحم صغیرنا ولم یُوقِّر کبیرنا ۔ (تِرمِذی)
وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے۔

ابوداؤد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حضرت عبداللہ بن عَمرُوؓ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف حق کبیرنا فلیس منّا۔
جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

لا تُنزع الرّحمةُ الّا من شقیٍّ۔ (مُسندِ احمد، تِرمِذی)
بدبخت آدمی کے دل ہی سے رحم سلب کر لیا جاتا ہے۔

حضرت عِیاضؓ بن حِمار کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: تین قسم کے آدمی جنّتی ہیں۔ ان میں سے ایک:

رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قربٰی ومسلم۔ (مسلم)
وہ شخص ہے جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور رقیق القلب ہو۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تری المؤمنین و تراحمھم و توادھم و تعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکٰی عضوًا تداعٰی له سائر الجسد بالسّھر والحمٰی۔
تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبّت اور ہمدردی کے معاملے میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عُضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر

Maktaba Tul Ishaat.com

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾

ع ۱۵

یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں[۱۵]، ان پر آگ چھائی ہوئی[۱۶] ہوگی۔ ع

(بخاری و مسلم)

بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدّ بعضه بعضًا۔ (بخاری و مسلم)

مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصّہ دوسرے حصّے کو مضبوط کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

المسلم اخوا المسلم لا يظلمه ولا يُسلمه ومن كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته ومن فرّج عن مسلم كُربةً فرّج الله عنه كربةً من كُرُبات يوم القيامة ومن ستر مسلمًا ستره الله يوم القيامة۔ (بخاری و مسلم)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوگا، اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا، اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی عیب پوشی کرے گا۔

اِن ارشادات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو ایمان لانے کے بعد اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل ہونے کی جو ہدایت قرآنِ مجید کی اِس آیت میں دی گئی ہے، اُس سے کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔

۱۵ – دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح ہم سورۂ واقعہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۵-۶۔

۱۶ – یعنی آگ اِس طرح اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی کہ اُس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

تفہیم القرآن

الشّمس

(۹۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

الشّمس

نام پہلے ہی لفظ الشَّمْس کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول مضمون اور اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے، مگر اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا اور اُن لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے یہ سورت دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصّہ سورت کے آغاز سے شروع ہو کر آیت ۱۰ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصّہ آیت ۱۱ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصّے میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں: ایک یہ کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں، اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں۔ یہ دونوں نہ اپنی شکل میں یکساں ہیں اور نہ ان کے نتائج یکساں ہوسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو جسم، حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر دنیا میں بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے سے اُس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، بھلے اور بُرے کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس اُتار دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اِس پر ہے کہ اس کے اندر تمیز، ارادے اور فیصلے کی جو قوتیں اللہ نے رکھ دی ہیں، ان کو استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں سے کس کو اُبھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ اگر وہ اچھے رجحانات کو اُبھارے اور بُرے رُجحانات سے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر وہ نفس کی اچھائی کو دبائے اور برائی کو اُبھارے تو نامراد ہوگا۔

دوسرے حصّے میں قومِ ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے، وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر و شر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُس فطری الہام کی مدد کے لیے

انبیا علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی، تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ایسے ہی ایک نبی، حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے، مگر وہ اپنے نفس کی بُرائی میں غرق ہو کر اتنی سرکش ہوگئی تھی کہ اُس نے اُن کو جھٹلا دیا، اور اُس کا منہ مانگا معجزہ جب اُنھوں نے ایک اونٹنی کی شکل میں پیش کیا تو اُن کی تنبیہ کے باوجود اُس قوم کے ایک شریر ترین آدمی نے ساری قوم کی خواہش اور طلب کے مطابق اسے بھی قتل کر دیا۔ اِس کا نتیجہ آخرِ کار یہ ہوا کہ پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔

ثمود کا یہ قصّہ پیش کرتے ہوئے پوری سورت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے قومِ قُریش! اگر تم ثمود کی طرح اپنے نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاؤ گے تو وہی انجام دیکھو گے جو ثمود نے دیکھا ہے۔ مکہ میں اُس وقت حالات وہی موجود تھے جو صالح علیہ السلام کے مقابلے میں قومِ ثمود کے اشرار نے پیدا کر رکھے تھے۔ اس لیے اُن حالات میں یہ قصّہ سنا دینا بجائے خود اہلِ مکہ کو یہ سمجھا دینے کے لیے کافی تھا کہ ثمود کی یہ تاریخی نظیر اُن پر کس طرح چسپاں ہو رہی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۱۵ آیاتہا ۱ رکوعاتہا

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا ۝۱ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۲ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝۳ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا ۝۵

سورج اور اُس کی دھوپ کی قسم[۱]، اور چاند کی قسم جب کہ وہ اُس کے پیچھے آتا ہے، اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے[۲]، اور آسمان کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے قائم کیا[۳]،

۱ – اصل میں لفظ ضُحٰی استعمال کیا گیا ہے جو سورج کی روشنی اور اس کی حرارت، دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ عَرَبی زبان میں اس کے معروف معنٰی چاشت کے وقت کے ہیں جب کہ سورج طُلوع ہونے کے بعد خاصا بلند ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سورج چڑھتا ہے تو صرف روشنی ہی نہیں دیتا بلکہ گرمی بھی دیتا ہے، اس لیے ضُحٰی کا لفظ جب سورج کی طرف منسوب ہو تو اس کا پورا مفہوم اُس کی روشنی، یا اُس کی بدولت نکلنے والے دن کے بجائے اُس کی دھوپ ہی سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

۲ – یعنی رات کی آمد پر سورج چھپ جاتا ہے اور اُس کی روشنی رات بھر غائب رہتی ہے۔ اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ رات سورج کو ڈھانک لیتی ہے، کیونکہ رات کی اصل حقیقت سورج کا اُفُق سے نیچے اتر جانا ہے، جس کی وجہ سے اُس کی روشنی زمین کے اُس حصّے تک نہیں پہنچ سکتی جہاں رات طاری ہو گئی ہو۔

۳ – یعنی چھت کی طرح اُسے زمین پر اُٹھا کھڑا کیا۔ اِس آیت اور اس کے بعد کی دو آیتوں میں مَا کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی مَا بَنٰهَا، اور مَا طَحٰهَا اور مَا سَوّٰىهَا۔ اِس لفظِ مَا کو مفسرین کے ایک گروہ نے مصدری معنوں میں لیا ہے اور وہ اِن آیتوں کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ آسمان اور اس کے قائم کیے جانے کی قسم، زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم، اور نفس اور اس کے ہموار کیے جانے کی قسم۔ لیکن یہ معنٰی اس لیے درست نہیں ہیں کہ ان تین فقروں کے بعد یہ فقرہ کہ "پھر اُس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی" اِس سلسلۂ کلام کے ساتھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ دوسرے مفسرین نے یہاں مَا کو مَنْ یا اَلَّذِی کے معنٰی میں لیا ہے، اور وہ اِن فقروں کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جس نے آسمان کو قائم کیا، جس نے زمین کو بچھایا، اور جس نے نفس کو ہموار کیا۔ یہی دوسرا مطلب ہمارے نزدیک صحیح ہے، اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ مَا عربی زبان میں بے جان اشیا اور بے عقل مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن میں اِس کی

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ
تَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰

اور زمین کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے بچھایا، اور نفسِ انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا[۴] پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی[۵]، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا[۶]۔

بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ مَا کو مَنْ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً: وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں)۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (پس عورتوں میں سے جو تمھیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو)۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرو)۔

۴ ۔ ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اور اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اُس کو دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسُب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ اِستِدلال و اِستِنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ، قوتِ ارادی اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اُسے پیدائشی گناہ گار اور جِبِلّی بدمعاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خِلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ یہی بات ہے جسے سورۂ رُوم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، ’’قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔‘‘ (آیت ۳۰) اور اِسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ ’’کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہو، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح و سالم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم ان میں کسی کا کان کٹا ہوا پاتے ہو؟‘‘ (بخاری و مسلم) یعنی یہ مشرکین ہیں جو بعد میں اپنے اَوہامِ جاہلیّت کی بنا پر جانوروں کے کان کاٹتے ہیں، ورنہ خدا کسی جانور کو ماں کے پیٹ سے کٹے ہوئے کان لے کر پیدا نہیں کرتا۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف (صحیح الفطرت) پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آ کر ان کو ان کے دین (یعنی ان کے فطری دین) سے گمراہ کر دیا، اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، اور ان کو حکم دیا کہ میرے ساتھ اُن کو شریک کریں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔‘‘ (مُسندِ احمد۔ مسلم نے بھی اِس سے ملتے جُلتے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

Maktaba Tul Ishaat.com

کا یہ ارشاد نقل کیا ہے)۔

۵ – اِلہام کا لفظ لَھْم سے ہے جس کے معنٰی نگلنے کے ہیں۔ لَھِمَ الشَّیْءَ وَالْتَھَمَہٗ کے معنٰی ہیں: فلاں شخص نے اس چیز کو نگل لیا۔ اور اَلْھَمْتُہُ الشَّیْءَ کے معنٰی ہیں: میں نے فُلاں چیز اس کو نگلوا دی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اِسی بنیادی مفہُوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالٰی کی طرف سے کسی تصوُّر یا کسی خیال کو غیر شُعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ومیلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالٰی نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز بُرائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فُجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (بُرائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت اِن سے آشنا ہے اور خالق نے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔ یہی بات سورۂ بَلَد میں فرمائی گئی ہے کہ وَ ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ۔ ”اور ہم نے اس کو خیر وشر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے۔“ (آیت ۱۰) اِسی کو سورۂ دہر میں یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا۔ ”ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا، خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر۔“ (آیت ۳) اور اسی بات کو سورۂ قیامہ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفسِ لَوّامہ (ضمیر) موجود ہے، جو بُرائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے۔ (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ (آیات ۱۴-۱۵)

اِس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالٰی نے ہر مخلوق پر اُس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔ ”جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی۔“ (آیت ۵۰) مثلاً: حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے، جس کی بنا پر مچھلی کو آپ سے آپ تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتّا بنانا اور بئے کو گھونسلا تیار کرنا آ جاتا ہے۔ انسان کو بھی اُس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی عُلوم دیے گئے ہیں۔ انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے اور اِس حیثیت سے جو الہامی علم اُس کو دیا گیا ہے اُس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دُودھ چُوسنا ہے، جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ اُس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔ اِس حیثیت سے خدا نے انسان کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اُس کو الہامی رہنمائی دی ہے، جس کی بدولت وہ پے در پے اِکتشافات اور ایجادات کر کے تمدُّن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ اِن ایجادات و اکتشافات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر وکاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ یکایک کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آ گئی اور اُس کی بدولت اُس نے کسی چیز کا اکتشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی۔ ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ

وہ ایک اخلاقی وجود ہے، اور اِس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و شر کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے، جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصوّرات سے خالی نہیں رہا ہے، اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور بُرائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔ اِس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب و تمدُّن میں پایا جانا اِس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے، اور مزید برآں یہ اِس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالقِ حکیم و دانا نے اِسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، کیونکہ جن اجزا سے انسان مرکّب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادّی نظام چل رہا ہے، اُن کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔

۶ - یہ ہے وہ بات جس پر اُن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جو اُوپر کی آیات میں مذکور ہوئی ہیں۔ اب غور کیجیے کہ وہ چیزیں اِس پر کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے، اُن کی شہادت میں وہ سامنے کی چند ایسی نمایاں ترین چیزوں کو پیش کرتا ہے جو ہر آدمی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں، یا خود اپنے وجود میں نظر آتی ہیں۔ اِسی قاعدے کے مطابق یہاں دو دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے، جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں، اس لیے اُن کے آثار اور نتائج بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ لازماً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف سورج ہے اور دوسری طرف چاند۔ سورج کی روشنی نہایت تیز ہے اور اس میں گرمی بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں چاند اپنی کوئی روشنی نہیں رکھتا۔ سورج کی موجودگی میں وہ آسمان پر موجود بھی ہو تو بے نور ہوتا ہے۔ وہ اُس وقت چمکتا ہے جب سورج چھپ جائے، اور اُس وقت بھی اس کی روشنی نہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن بنا دے، نہ اُس میں کوئی گرمی ہوتی ہے کہ وہ کام کر سکے جو سورج کی گرمی کرتی ہے۔ لیکن اُس کے اپنے کچھ اثرات ہیں جو سورج کے اثرات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک طرف دن ہے اور دوسری طرف رات۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کے اثرات اور نتائج باہم اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی اُن کو یکساں نہیں کہہ سکتا، حتّٰی کہ ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ رات ہوئی تو کیا اور دن ہوا تو کیا، کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح ایک طرف آسمان ہے جسے خالق نے بلند اُٹھایا ہے، اور دوسری طرف زمین ہے جسے پیدا کرنے والے نے آسمان کے نیچے فرش کی طرح بچھا دیا ہے۔ دونوں اگرچہ ایک ہی کائنات اور اس کے نظام اور اس کی مصلحتوں کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن دونوں کے کام اور ان کے اثرات و نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اِن آفاقی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد خود انسان کے اپنے نفس کو لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسے اعضا اور حواس اور ذہنی قوتوں کے متناسب امتزاج سے ہموار کر کے خالق نے اس کے اندر بھلائی اور بُرائی، دونوں کے میلانات، رُجحانات اور محرکات رکھ دیے ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور الہامی طور پر اسے اِن دونوں کا فرق سمجھا دیا گیا ہے کہ ایک فجور ہے، اور وہ بُری چیز ہے، اور دوسرا تقویٰ ہے، اور وہ اچھی چیز۔ اب اگر سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے اثرات اور نتائج ایک دوسرے سے لازماً مختلف ہیں، تو نفس کا فجور اور تقویٰ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

انسان خود اِس دنیا میں بھی نیکی اور بدی کو یکساں نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا۔ خواہ اس نے اپنے بنائے ہوئے فلسفوں کی رُو سے خیر وشر کے کچھ بھی معیار تجویز کر لیے ہوں، بہر حال جس چیز کو بھی وہ نیکی سمجھتا ہے اس کے متعلق وہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ قابلِ قدر ہے، تعریف اور صلے اور انعام کی مستحق ہے۔ بخلاف اِس کے جس چیز کو بھی وہ بدی سمجھتا ہے، اس کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ مذمّت اور سزا کی مستحق ہے۔ لیکن اصل فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اُس خالق کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کا فجور اور تقویٰ اُس پر الہام کیا ہے۔ فجور وہی ہے جو خالق کے نزدیک فجور ہے، اور تقویٰ وہی ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ ہے۔ اور خالق کے ہاں اِن دونوں کے دو الگ نتائج ہیں۔ ایک کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے وہ فلاح پائے، اور دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو دبا دے وہ نامراد ہو۔

تزکیہ کے معنی ہیں: پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا۔ سیاق وسباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے، اس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے، وہ فلاح پائے گا۔ اس کے مقابلے میں دَسّٰهَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مصدر تَدسِیَہ ہے۔ تَدسِیَہ کے معنی دبانے، چھپانے، اِغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق وسباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رُجحانات کو اُبھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے اُن کو دبا دے، اُس کو بہکا کر بُرائی کے رجحانات کی طرف لے جائے، اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اِس طرح چھُپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھُپ جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکَّی اللّٰہُ نَفْسَهٗ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّی اللّٰہُ نَفْسَهٗ، یعنی فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا۔ لیکن یہ تفسیر، اوّل تو زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرزِ بیان کے خلاف ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہی بات کہنی مقصود ہوتی تو وہ یوں فرماتا کہ قَدْ اَفْلَحَتْ مَنْ زَکّٰهَا اللّٰہُ وَقَدْ خَابَتْ مَنْ دَسّٰهَا اللّٰہُ (فلاح پا گیا وہ نفس جس کو اللہ نے پاک کر دیا، اور نامراد ہو گیا وہ نفس جس کو اللہ نے دبا دیا)۔ دوسرے، یہ تفسیر اِسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، ''فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔'' (آیت ۱۴) سورۂ عَبَس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّکّٰی، ''اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔'' اِن دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اِس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ مثلاً: سورۂ دَہر میں فرمایا: ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا، تاکہ اس کی آزمائش کریں، اِسی لیے اُسے ہم نے سمیع وبصیر بنایا۔'' (آیت ۲) اور سورۂ مُلک میں فرمایا: ''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تمھیں آزمائے، کون تم میں بہتر عمل کرنے والا ہے۔'' (آیت ۲) اب یہ ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے ہی بے معنی ہو جاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔ اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو قتادہ، عِکرِمہ، مجاہد اور سعید بن جُبَیر نے بیان کی ہے کہ زَکّٰهَا اور دَسّٰهَا کا فاعل بندہ ہے، نہ کہ خدا۔ رہی وہ حدیث جو ابنِ ابی حاتم نے

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝

ثمودؔ نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔[8] جب اُس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بھپر کر اُٹھا تو اللہ کے رسول نے اُن لوگوں سے کہا کہ خبردار! اللہ کی اُونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اُس کے پانی پینے (میں مانع نہ ہونا)۔[9] مگر انھوں نے اُس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اُونٹنی کو مار ڈالا۔[10]

عن جُوَیبر بن سعید عن الضّحّاک عن ابنِ عباسؓ کی سند سے نقل کی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اَفْلَحَتْ نَفْسٌ زَكّٰهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ (فلاح پا گیا وہ نفس جس کو اللہ عزّوجلّ نے پاک کر دیا)، تو یہ ارشاد درحقیقت حضورؐ سے ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں جُوَیبر متروک الحدیث ہے اور ابنِ عباسؓ سے ضحّاک کی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ البتہ وہ حدیث صحیح ہے جو امام احمد، مُسلِم، نَسائی اور ابنِ ابی شَیبَہ نے حضرت زَیدؓ بن اَرقَم سے رِوایت کی ہے کہ حضورؐ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اللّٰھمّ اٰتِ نفسی تقواھا وزکّھا انتَ خیر من زکاھا، انت ولیّھا ومولاھا۔" خدایا! میرے نفس کو اُس کا تقویٰ عطا کر اور اس کو پاکیزہ کر، تو ہی وہ بہتر ہستی ہے جو اس کو پاکیزہ کرے، تو ہی اُس کا سرپرست اور مولیٰ ہے۔" اِسی سے مِلتے جُلتے الفاظ میں حضورؐ کی یہ دعا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور ابن المُنْذِر نے اور حضرت عائشہؓ سے امام احمدؒ نے نقل کی ہے۔ اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ بندہ تو صرف تقویٰ اور تزکیہ کی خواہش اور طلب ہی کر سکتا ہے، رہا اس کا نصیب ہو جانا، تو وہ بہرحال اللہ ہی کی توفیق پر منحصر ہے۔ اور یہی حال تدسِیَہ کا بھی ہے کہ اللہ زبردستی کسی کے نفس کو نہیں دباتا، مگر جب بندہ اُس پر تُل جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے تقویٰ اور تزکیہ کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور اُسے چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے نفس کو جس گندگی کے ڈھیر میں دبانا چاہے، دبا دے۔

۷ — اُوپر کی آیات میں جن باتوں کو اُصولاً بیان کیا گیا ہے اب انھی کی وضاحت ایک تاریخی نظیر سے کی جا رہی ہے۔ یہ کس بات کی نظیر ہے اور اُوپر کے بیان سے اس کا کیا تعلق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کے دوسرے بیانات کی روشنی میں اُن دو بنیادی حقیقتوں پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے جو آیات ۷ تا ۱۰ میں بیان کی گئی ہیں۔

اوّلاً، ان میں فرمایا گیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ایک ہموار و مستقیم فطرت پر پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ اُس پر الہام کر دیا۔ قرآن اِس حقیقت کو بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ فجور و تقویٰ کا یہ الہامی علم اِس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر شخص خود ہی اُس سے تفصیلی ہدایت حاصل کر لے، بلکہ اِس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے انبیا علیہم السلام کو مفصّل ہدایت دی، جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ فجور کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے جن سے بچنا چاہیے، اور تقویٰ کس چیز کا نام ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان وحی کے ذریعے سے آنے والی اِس واضح ہدایت کو قبول نہ کرے تو وہ نہ فجور سے بچ سکتا ہے نہ تقویٰ کا راستہ پا سکتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾ ع

آخرِ کار اُن کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا، اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی بُرے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔[۱۱] ع

ثانیاً، اِن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جزا اور سزا دہ لازمی نتائج ہیں جو فجور اور تقویٰ میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مُترتّب ہوتے ہیں۔ نفس کو فجور سے پاک کرنے اور تقویٰ سے ترقی دینے کا نتیجہ فلاح ہے، اور اس کے اچھے رجحانات کو دبا کر فجور میں غرق کر دینے کا نتیجہ نامُرادی اور ہلاکت و بربادی۔

اسی بات کو سمجھانے کے لیے ایک تاریخی نظیر پیش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے ثمود کی قوم کو بطورِ نمونہ لیا گیا ہے، کیونکہ پچھلی تباہ شدہ قوموں میں سے جس قوم کا علاقہ اہلِ مکہ سے قریب ترین تھا وہ یہی تھی۔ شمالی حجاز میں اس کے تاریخی آثار موجود تھے، جن سے اہلِ مکہ شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں ہمیشہ گزرتے رہتے تھے، اور جاہلیّت کے اشعار میں جس طرح اس قوم کا ذکر کثرت سے آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب میں اس کی تباہی کا چرچا عام تھا۔

۸ - یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جُھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے، اور اِس جُھٹلانے کی وجہ اُن کی یہ سرکشی تھی کہ وہ اُس فجور کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے جس میں وہ مبتلا ہو چلے تھے، اور اُس تقویٰ کو قبول کرنا انھیں گوارا نہ تھا جس کی طرف حضرت صالحؑ انھیں دعوت دے رہے تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۶۔ ہود، آیات ۶۱ - ۶۲۔ الشعراء، آیات ۱۴۱ تا ۱۵۳۔ النمل، آیات ۴۵ تا ۴۹۔ القمر، آیات ۲۳ تا ۲۵۔

۹ - قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ کو چیلنج دیا تھا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔ اس پر حضرت صالحؑ نے ایک اُونٹنی کو معجزے کے طور پر ان کے سامنے حاضر کر دیا اور اُن سے کہا کہ یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، یہ زمین میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی، ایک دن سارا پانی اس کے لیے مخصوص ہوگا اور دوسرا دن تم سب کے لیے اور تمھارے جانوروں کے لیے رہے گا، اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو کہ تم پر سخت عذاب نازل ہو جائے گا۔ اِس پر وہ کچھ مدّت تک ڈرتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے اُس سب سے زیادہ شریر اور سرکش سردار کو پکارا کہ اس اُونٹنی کا قصہ تمام کر دے، اور وہ اس کام کا ذمّہ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ (الاعراف، آیت ۷۳۔ الشعراء، آیات ۱۵۴ تا ۱۵۶۔ القمر، آیت ۲۹)

۱۰ - سورۂ اَعراف میں ہے کہ اُونٹنی کو مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ سے کہا: اب لے آ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (آیت ۷۷)، اور سورۂ ہُود میں ہے کہ حضرت صالحؑ نے اُن سے کہا: تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کر لو، اِس کے بعد عذاب آ جائے گا، اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی۔ (آیت ۶۵)

۱۱ - یعنی اللہ دنیا کے بادشاہوں اور یہاں کی حکومتوں کے فرماں رواؤں کی طرح نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اِس اِقدام کے نتائج کیا ہوں گے۔ اُس کا اقتدار سب سے بالاتر ہے۔ اُسے اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ ثمود کی حامی کوئی ایسی طاقت ہے جو اس سے بدلہ لینے کے لیے آئے گی۔

تفہیم القرآن

اللّیل

(۹۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

الیل

نام پہلے ہی لفظ وَالَّیۡلِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا مضمون سورۂ شمس سے اِس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے جسے سورۂ شمس میں ایک طریقے سے سمجھایا گیا ہے اور اِس سورہ میں دوسرے طریقے سے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے یہ سورت دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصّہ آغاز سے آیت ۱۱ تک ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۲ سے آخر تک۔

پہلے حصّے میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد، اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی و عمل بھی کر رہے ہیں، وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اُسی طرح مختلف ہیں جس طرح دن رات سے اور نر مادہ سے مختلف ہے۔ اِس کے بعد قرآن کی مختصر سورتوں کے عام اندازِ بیان کے مطابق تین اخلاقی خصوصیّات ایک نوعیت کی، اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی و عمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لے کر بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں، جنھیں سُن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات کس طرزِ زندگی کی نمایندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی خصوصیات اُس کے برعکس کس دوسرے طرزِ زندگی کی علامات ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے چھوٹے چھوٹے خوب صورت جچے تُلے فقروں میں بیان کیے گئے ہیں کہ سنتے ہی آدمی کے دل میں اُتر جائیں اور زبان پر چڑھ جائیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے، خدا ترسی و پرہیزگاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے۔ دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بخل کرے، خدا کی رضا اور ناراضی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھٹلا دے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرزِ عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں ہیں، بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں، اسی قدر اِن کے نتائج بھی متضاد ہیں۔ پہلے طرزِ عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دے گا، یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور بدی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور دوسرے طرزِ عمل کو جو بھی اختیار کرے گا،

اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے بکٹ اور سخت راستے کو سہل کر دے گا، یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔ اِس بیان کو ایک نہایت مؤثّر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال جس کے پیچھے آدمی جان دیے دیتا ہے، آخر قبر میں تو اُس کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، مرنے کے بعد یہ اُس کے کس کام آئے گا؟

دوسرے حصّے میں بھی اِسی اختصار کے ساتھ تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ نے دنیا کی اِس امتحان گاہ میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُس نے یہ بتا دینا اپنے ذمّے لیا ہے کہ زندگی کے مختلف راستوں میں سے سیدھا راستہ کون سا ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اپنا رسول اور اپنی کتاب بھیج کر اُس نے اپنی یہ ذمّہ داری ادا کر دی ہے، کیونکہ رسولؐ اور قرآن، دونوں ہدایت دینے کے لیے سب کے سامنے موجود تھے۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ دنیا مانگو گے تو وہ بھی اسی سے ملے گی، اور آخرت مانگو گے تو اس کا دینے والا بھی وہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمھارا اپنا کام ہے کہ تم اُس سے کیا مانگتے ہو۔ تیسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو بد بخت اُس بھلائی کو جھٹلائے گا جسے رسول اور کتاب کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، اور اُس سے منہ پھیرے گا، اُس کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار ہے۔ اور جو خدا ترس آدمی پوری بے غرضی کے ساتھ محض اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر اپنا مال راہِ خیر میں صرف کرے گا، اس کا رب اُس سے راضی ہوگا اور اسے اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۲۱ — سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ
الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى
وَ اتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾

قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے، اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو، اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں[۱]۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا[۲]، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں[۳] گے۔

---

۱ — یہ وہ بات ہے جس پر رات اور دن اور نر و مادہ کی پیدایش کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات اور دن، اور نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر دو کے آثار و نتائج باہم متضاد ہیں، اسی طرح تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوششیں صَرف کر رہے ہو، وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور اپنے نتائج کے اعتبار سے متضاد ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ یہ تمام مختلف کوششیں دو بڑی اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں۔

۲ — یہ انسانی مَساعی کی ایک قسم ہے جس میں تین چیزیں شمار کی گئی ہیں، اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کُھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ بھی اللہ نے اُسے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، اور خلقِ خدا کی مدد کرنے میں صَرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور وہ اخلاق، اعمال، معاشرت، معیشت، غرض اپنی زندگی کے ہر شُعبے میں اُن کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ عقیدے میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریّت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے۔ اور اخلاق و اعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی سے بھلائیوں کا صدور محض بے شُعوری کے ساتھ کسی متعیَّن نظام کے بغیر نہ ہو رہا ہو، بلکہ وہ خیر و صلاح کے اُس نظام کو صحیح تسلیم کرے جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، جو بھلائیوں کو اُن کی تمام اشکال

اور صورتوں کے ساتھ ایک نظم میں منسلک کرتا ہے، جس کا جامع نام شریعتِ الٰہیہ ہے۔

۳۔ یہ ہے مَساعی کی اِس قسم کا نتیجہ۔ آسان راستے سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے، جو اُس خالق کی مرضی کے مطابق ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے، جس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑکر نہیں چلنا پڑتا، جس میں انسان اپنے جسم و جان اور عقل و ذہن کی قوتوں پر زبردستی کر کے اُن سے وہ کام نہیں لیتا جس کے لیے یہ طاقتیں اُس کو نہیں بخشی گئی ہیں، بلکہ وہ کام لیتا ہے جس کے لیے درحقیقت یہ اُس کو بخشی گئی ہیں، جس میں انسان کو ہر طرف اُس جنگ، مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری ہوئی زندگی میں پیش آتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے میں ہر قدم پر اس کو صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسّر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خَلقِ خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم، فِسق و فجور اور بدکرداری سے پاک ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راست باز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی، بدعہدی اور بے وفائی نہ کرے، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کی سیرت و کردار پر انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے، اُس کی طرف دل کھِنچتے ہیں، نگاہوں میں اُس کی عزت قائم ہو جاتی ہے، اس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی کسی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ نَحل میں فرمائی گئی ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ ”جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، اسے ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔“ (آیت ۹۷) اور اسی بات کو سورۂ مریم میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ ”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں مَحبّت پیدا کر دے گا۔“ (آیت ۹۶) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سُرور ہی سُرور اور راحت ہی راحت ہے۔ اِس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ اَبدی اور لازوال ہیں۔

اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اُسے اِس راستے پر چلنے کے لیے سہولت دیں گے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب وہ بھلائی کی تصدیق کر کے یہ فیصلہ کر لے گا کہ یہی راستہ میرے لائق ہے اور برائی کا راستہ میرے لائق نہیں ہے، اور جب وہ عملاً مالی ایثار اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ اُس کی یہ تصدیق سچّی ہے، تو اللہ تعالیٰ اِس راستے پر چلنا اُس کے لیے سہل کر دے گا۔ اُس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔ مالِ حرام اُس کے سامنے آئے گا تو وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ نفع کا سودا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہوگا کہ یہ آگ کا انگارا ہے جسے وہ ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ بدکاری کے مواقع اس کے سامنے آئیں گے تو وہ انھیں لطف اور لذّت حاصل کرنے کے مواقع سمجھ کر ان کی طرف نہیں لپکے گا، بلکہ جہنّم کے دروازے سمجھ کر اُن سے دُور بھاگے گا۔ نماز اُس پر گراں نہ ہوگی بلکہ اُسے چین نہیں پڑے گا جب تک وقت آنے پر وہ اس کو ادا نہ کر لے۔ زکوٰۃ دیتے ہوئے اس کا دل نہیں دُکھے گا، بلکہ اپنا مال اُسے

Maktaba Tul Ishaat.com

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰىۙ ۝۸ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰىۙ ۝۹
فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰىؕ ۝۱۰ وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰىؕ ۝۱۱

اور جس نے بُخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا،[4] اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں[5] گے۔ اور اُس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے؟[6]

ناپاک محسوس ہوگا جب تک وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال نہ دے۔ غرض ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو اِس راستے پر چلنے کی توفیق و تائید ملے گی، حالات کو اُس کے لیے سازگار بنایا جائے گا، اور اُس کی مدد کی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس سے پہلے سورۂ بَلَد میں اِسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے، اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ اِن دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے، جس پر چڑھنے کے لیے اُسے اپنے نفس کی خواہشوں سے، اپنے دنیا پرست اہل و عیال سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے، اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر ایک اِس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کر کے اُس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے اور اپنا مال راہِ خدا میں دے کر اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کر کے عملاً اِس عزم کو پختہ کر لیتا ہے تو اِس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لُڑھکنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

۴ - یہ انسانی مَساعی کی دوسری قسم ہے جو اپنے ہر جُز میں پہلی قسم کے ہر جُز سے مختلف ہے۔ بُخل سے مراد محض وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اُس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیا جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اُوپر خرچ کرتا ہے نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اِس جگہ بُخل سے مراد راہِ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صَرف نہ کرنا ہے، اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال لُٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حُکّام رسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادّی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ ودَو اور محنت و کوشش کا مقصود بنا لے اور خدا سے بالکل مُستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جُھٹلانا، تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے، اس لیے اس کی تشریح کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھلائی کی تصدیق کا مطلب ہم واضح کر چکے ہیں۔

۵ - اِس راستے کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اِس پر چلنے والا اگرچہ مادّی فائدوں اور دنیوی لذّتوں اور ظاہری کامیابیوں

کے لالچ میں اس کی طرف جاتا ہے، لیکن اِس میں ہر وقت اپنی فطرت سے، اپنے ضمیر سے، خالق کائنات کے بنائے ہوئے قوانین سے، اور اپنے گردوپیش کے معاشرے سے اُس کی جنگ برپا رہتی ہے۔ صداقت، دیانت، امانت، شرافت اور عفّت وعصمت کی اخلاقی حدوں کو توڑ کر جب وہ ہر طریقے سے اپنی اغراض اور خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس کی ذات سے خلقِ خدا کو بھلائی کے بجائے برائی ہی پہنچتی ہے، اور جب وہ دوسروں کے حقوق اور ان کی عزتوں پر دست درازیاں کرتا ہے، تو اپنی نگاہ میں وہ خود ذلیل وخوار ہوتا ہے اور جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اُس سے بھی قدم قدم پر لڑ کر اُسے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کمزور ہو تو اِس رَوِش کی بدولت اُسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں، اور اگر وہ مال دار، طاقت ور اور بااثر ہو، تو چاہے دنیا اُس کے زور کے آگے دب جائے، لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی، عزت اور محبّت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا، حتّٰی کہ اس کے شریکِ کار بھی اُس کو ایک خبیث آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف افراد ہی تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ور قومیں بھی جب اخلاق کے حدود پھاند کر اپنی طاقت اور دولت کے زَعم میں بدکرداری کا رَوِیّہ اختیار کرتی ہیں، تو ایک طرف باہر کی دنیا اُن کی دشمن ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف خود اُن کا اپنا معاشرہ جرائم، خودکُشی، نشہ بازی، امراضِ خبیثہ، خاندانی زندگی کی تباہی، نوجوان نسلوں کی بدراہی، طبقاتی کشمکش، اور ظلم وجور کی روز افزوں وبا سے دوچار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بامِ عُروج سے گرتی ہیں تو دنیا کی تاریخ میں اپنے لیے لعنت اور پھٹکار کے سوا کوئی مقام چھوڑ کر نہیں جاتیں۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے، اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی، بُرائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جائیں گے، اُسی کے اسباب اور وسائل اس کے لیے فراہم کر دیے جائیں گے، بدی کرنا اس کے لیے آسان ہوگا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے دوسری جگہ قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصوّر کرتے ہی اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے) جیسے اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔" (الانعام، آیت ۱۲۵) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے: "بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر فرماں بردار بندوں کے لیے نہیں۔" (البقرہ، آیت ۴۶) اور منافقین کے متعلق فرمایا: "وہ نماز کی طرف آتے بھی ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے بھی ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔" (التوبہ، آیت ۵۴) اور یہ کہ "ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اُسے اپنے اُوپر زبردستی کی چٹّی سمجھتے ہیں۔" (التوبہ، آیت ۹۸)

۶ - دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ایک روز اُسے بہرحال مرنا ہے اور وہ سب کچھ دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے جسے اُس نے یہاں اپنے عیش کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگر اپنی آخرت کے لیے کچھ کما کر وہ ساتھ نہ لے گیا تو یہ مال اس کے کس کام آئے گا؟ قبر میں تو وہ کوئی کوٹھی، کوئی موٹر، کوئی جائداد اور کوئی جمع پونجی لے کر نہیں جائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝۱۲ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ۝۱۳ فَاَنْذَرْتُكُمْ
نَارًا تَلَظّٰى ۝۱۴ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۝۱۵ الَّذِىْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۝۱۶
وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝۱۷ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝۱۸ وَ مَا لِاَحَدٍ
عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝۱۹ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝۲۰
وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱

ع ۲۱

بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمّے ہے[7]، اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں[8]۔ پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اُس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور مُنہ پھیرا۔ اور اُس سے دُور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے[9]۔ اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے[10]۔ اور ضرور وہ (اُس سے) خوش ہوگا[11]۔ ع

۷ – یعنی انسان کا خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اِس بات کا ذمّہ لیا ہے کہ اُس کو دنیا میں بے خبر نہ چھوڑے، بلکہ اسے یہ بتا دے کہ راہِ راست کون سی ہے اور غلط راہیں کون سی، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، حلال کیا ہے اور حرام کیا، کون سی رَوش اختیار کر کے وہ فرماں بردار بندہ بنے گا اور کون سا رویّہ اختیار کر کے بندۂ نافرمان بن جائے گا۔ یہی بات ہے جسے سورۂ نحل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ۔ (آیت ۹) ”اور اللہ ہی کے ذمے ہے سیدھا راستہ بتانا، جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹)

۸ – اس ارشاد کے کئی مفہوم ہیں اور وہ سب صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا سے آخرت تک تم کہیں بھی ہماری گرفت سے باہر نہیں ہو، کیونکہ دونوں جہانوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری مِلکیّت دنیا اور آخرت دونوں پر بہرحال قائم ہے، خواہ تم ہماری بتائی ہوئی راہ پر چلو یا نہ چلو۔ گمراہی اختیار کرو گے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑو گے، اپنا ہی نقصان کرلو گے، اور راہِ راست اختیار کرو گے تو ہمیں کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے، خود ہی اس کا نفع اٹھاؤ گے۔ تمھاری نافرمانی سے ہماری مِلک میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی، اور تمھاری فرماں برداری سے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ تیسرے یہ کہ دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ دنیا چاہو گے

تو وہ بھی ہم ہی سے تمھیں ملے گی، اور آخرت کی بھلائی چاہو گے تو اُس کا دینا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۵ میں فرمائی گئی ہے کہ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ ”جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں سے دیں گے۔“ اور اسی کو سورۂ شُوریٰ، آیت ۲۰ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔ ”جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۳۷)

۹ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نہایت شقی کے سوا کوئی آگ میں نہ جائے گا اور نہایت متّقی کے سوا کوئی اس سے نہ بچے گا۔ بلکہ یہاں مقصود دو انتہائی متضاد کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر کے ان کا انتہائی متضاد انجام بیان کرنا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو جھُٹلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیر لے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر، صرف اس لیے اپنا مال راہِ خدا میں صَرف کرے کہ وہ اللہ کے ہاں پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے۔ یہ دونوں کردار اُس وقت مکہ کے معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے۔ اس لیے کسی کا نام لیے بغیر لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جہنّم کی آگ میں دوسرے کردار والا نہیں بلکہ پہلے کردار والا ہی جھُلسے گا، اور اُس آگ سے پہلے کردار والا نہیں بلکہ دوسرے کردار والا ہی دُور رکھا جائے گا۔

۱۰ – یہ اُس پرہیزگار آدمی کے خُلوص کی مزید توضیح ہے کہ وہ اپنا مال جن لوگوں پر صَرف کرتا ہے، اُن کا کوئی احسان پہلے سے اُس پر نہ تھا کہ وہ اُس کا بدلہ چُکانے کے لیے، یا آیندہ اُن سے مزید فائدہ اُٹھانے کے لیے اُن کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور اُن کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے رَبِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اُس پر کوئی احسان تھا، نہ آیندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ اِس کی بہترین مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہے کہ مکّۂ معظّمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قُبول کیا تھا اور اِس قصور میں جن کے مالک اُن پر بے تحاشا ظلم توڑ رہے تھے، اُن کو خرید خرید کر وہ آزاد کر دیتے تھے تاکہ وہ اُن کے ظلم سے بچ جائیں۔ ابنِ جَرِیر اور ابنِ عَساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زُبیر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح اِن غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیا خرچ کرتے دیکھ کر اُن کے والد نے اُن سے کہا کہ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیا خرچ کرتے تو وہ تمھارے لیے قوتِ بازو بنتے۔ اس پر حضرت ابوبکر نے اُن سے کہا: ای اباہ انما ارید ما عند اللہ، ”ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔“

۱۱ – اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ ضرور اللہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ عنقریب اللہ اس شخص کو اِتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الضُّحیٰ

(۹۳)

الضُّحیٰ

نام

پہلے ہی لفظ وَالضُّحیٰ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اس کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ رِوایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدّت تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا تھا، جس سے حضورؐ سخت پریشان ہو گئے تھے اور بار بار آپؐ کو یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ کسی ناراضی کی بنا پر نہیں روکا گیا تھا، بلکہ اس میں وہی مَصْلَحَت کارفرما تھی جو روزِ روشن کے بعد رات کا سکون طاری کرنے میں کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی تیز روشنی اگر آپؐ پر برابر پڑتی رہتی تو آپؐ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکتے، اس لیے بیچ میں وقفہ دیا گیا، تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ یہ کیفیت حضورؐ پر نبوت کے ابتدائی دَور میں گزرتی تھی، جب کہ ابھی آپؐ کو وحی کے نزول کی شدّت برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی، اِس بنا پر بیچ بیچ میں وقفہ دینا ضروری ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ مُدَّثِّر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اور سورۂ مُزَّمِّل، حاشیہ ۵ میں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کا کس قدر شدید بار آپؐ کے اعصاب پر پڑتا تھا۔ بعد میں جب حضورؐ کے اندر اس بار کو برداشت کرنے کا تحمّل پیدا ہو گیا تو طویل وقفے دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپؐ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دَور میں جن شدید مشکلات سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپؐ پر اپنی عطا و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپؐ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی اُن صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت کہیں دُور دُور بھی اِس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اُسے اِتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمھیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہوگئی کہ ہم نے تمھیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہوگئے ہیں۔ ہم تو تمھارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمھاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمھیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمھیں مال دار بنایا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمھارے شاملِ حال ہے۔ اس مقام پر سورۂ طٰہٰ، آیات ۳۷ تا ۴۲ کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون جیسے جبّار کے مقابلے میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی پریشانی دُور کرنے کے لیے انھیں بتایا ہے کہ کس طرح تمھاری پیدائش کے وقت سے ہماری مہربانیاں تمھارے شاملِ حال رہی ہیں، اس لیے تم اطمینان رکھو کہ اس خوفناک مہم میں تم اکیلے نہ ہوگے بلکہ ہمارا فضل تمھارے ساتھ ہوگا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ جو احسانات ہم نے تم پر کیے ہیں، ان کے جواب میں خلقِ خدا کے ساتھ تمھارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اور ہماری نعمتوں کا شکر تمھیں کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

آیاتہا ۱۱ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ الضُّحٰی مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ﴿۳﴾ وَ
لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿۵﴾

قسم ہے روزِ روشن کی[1] اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے[2] (اے نبیؐ!) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا[3]۔ اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے[4]، اور عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے[5]۔

۱- یہاں لفظ ضُحٰی رات کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے اِس سے مراد روزِ روشن ہے۔ اِس کی نظیر سورۂ اَعراف کی یہ آیات ہیں: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۷-۹۸) ”کیا بستیوں کے لوگ اِس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آ جائے، جب کہ وہ سو رہے ہوں؟ اور کیا بستیوں کے لوگ اِس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دہاڑے آ جائے، جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟“ اِن آیات میں بھی چونکہ ضُحٰی کا لفظ رات کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے اس سے مراد چاشت کا وقت نہیں بلکہ دن ہے۔

۲- اصل میں رات کے لیے لفظ سَجٰی استعمال ہوا ہے، جس میں صرف تاریکی چھا جانے ہی کا نہیں بلکہ سکوت اور سکون طاری ہو جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ رات کی اِس صفت کا اُس مضمون سے گہرا تعلق ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۳- روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا تھا۔ مختلف روایات میں یہ مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابنِ جُرَیج نے ۱۲ روز، کَلْبی نے ۱۵ روز، ابنِ عباسؓ نے ۲۵ روز، سُدّی اور مُقاتل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہر حال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِس پر سخت غمگین ہو گئے تھے اور مخالفین بھی آپؐ کو طعنے دینے لگے تھے، کیونکہ حضورؐ پر جو نئی سورت نازل ہوتی تھی اسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپؐ نے کوئی نئی وحی لوگوں کو نہیں سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُنْدُب بن عبداللہ البَجَلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ (ابنِ جریر، طَبَرانی، عبد بن حُمَید، سعید بن منصور، ابنِ مَرْدُوْیَہ) دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل نے، جو حضورؐ کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضورؐ کے مکان سے متّصل تھا، آپؐ سے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا

Maktaba Tul Ishaat.com

ہے۔" عَوْفی اور ابنِ جَرِیر نے ابنِ عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریلؑ کی آمد رُک جانے سے حضورؐ پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ قَتَادہ اور ضَحّاک کی مُرسَل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اِس صورتِ حال میں حضورؐ کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدّد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ محبوب کی طرف سے بظاہر عَدَمِ التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعۂ طاقت سے بظاہر محرومی جو اس جاں گُسل کش مکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اُس پر مزید دشمنوں کی شَماتت، یہ ساری چیزیں مل جُل کر لامحالہ حضورؐ کے لیے سخت پریشانی کی مُوجب ہو رہی ہوں گی اور آپؐ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اِس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

اِسی کیفیّت میں یہ سورت حضورؐ کو تسلّی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ اِس میں دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھا کر حضورؐ سے فرمایا گیا کہ تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑ دیا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ اِس بات پر ان دونوں چیزوں کی قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت اُن سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مَصلَحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اُسی طرح تم پر کبھی وحی بھیجنا اور کبھی اُس کو روک لینا بھی حکمت و مَصلَحت کی بنا پر ہے، اِس کا کوئی تعلق اِس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے، اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مناسبت اِس مضمون سے اِس قسم کی یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے، اس لیے ایک وقتِ خاص تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے، اُسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمھارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اس لیے وقتاً فوقتاً فَترۃ (نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے) کا ایک زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے مَصلَحت کی بنا پر رکھا ہے، تاکہ وحی کے نزول سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمھیں سکون حاصل ہو جائے۔ گویا آفتابِ وحی کا طُلوع بمنزلۂ روزِ روشن ہے اور زمانۂ فَترۃ بمنزلۂ سکونِ شب۔

۴ ۔ یہ خوش خبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جب کہ چند مٹھی بھر آدمی آپؐ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپؐ کی مخالف تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے، اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹمٹما رہی تھی اور اسے بُجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپؐ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپؐ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپؐ کی قوت، آپؐ کی عزت و شوکت اور آپؐ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپؐ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، اِس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپؐ کو ملے گا، وہ اُس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷

کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟[۶] اور تمھیں ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔[۷]

دنیا میں آپؐ کو حاصل ہوگا۔ طَبَرانی نے اَوسط میں اور بَیْہَقی نے دلائل میں ابنِ عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اِس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمھارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔"

۵ – یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمھارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اِس طرح پورا ہوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحرِ اَحمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہوگیا، عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہوگئی، جو طاقت بھی اِس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے وہ پورا ملک گونج اُٹھا جس میں مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دَم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جُھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخّر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اِس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اِس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اِس طاقت کے ساتھ اُٹھی کہ ایشیا، افریقا اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصوّر بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ (نیز دیکھو، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۲)

۶ – یعنی تمھیں چھوڑ دینے اور تم سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اُس وقت سے تم پر مہربان ہیں جب تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔ حضورؐ ابھی بطنِ مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپؐ کے والدِ ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے آپؐ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپؐ کو بے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ آپؐ کی پرورش کرتی رہیں۔ ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو ۸ سال کی عمر تک آپؐ کے جدِّ اَمجد نے آپؐ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپؐ سے غیر معمولی مَحبّت تھی بلکہ اُن کو آپؐ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ اُن کا بھی انتقال ہو گیا تو آپؐ کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپؐ کی کفالت اپنے ذمّے لی اور آپؐ کے ساتھ ایسی مَحبّت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، حتّٰی کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپؐ کی دشمن ہو گئی تھی، اس وقت دس سال تک وہی آپؐ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔

۷ – اصل میں لفظ ضَآلًّا استعمال ہوا ہے، جو ضلالت سے ہے۔ عَرَبی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی گمراہی کے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران کھڑا ہو کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝٨ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝٩ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝١٠ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝١١ ع

ع ۱۱ ۱۸

اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔[8] لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو،[9] اور سائل کو نہ جھڑکو،[10] اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔[11] ع

مختلف راستے جو سامنے ہیں اِن میں سے کدھر جاؤں۔ ایک اور معنٰی کھوئے ہوئے کے ہیں، چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں: ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ، پانی دودھ میں گُم ہوگیا۔ اُس درخت کو بھی عربی میں ضَآلَّہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔ غفلت کے لیے بھی ضلال کا لفظ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ خود قرآنِ مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ۝ (طٰہٰ: ۵۲) ''میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے۔'' اِن مختلف معنوں میں سے پہلے معنٰی یہاں چسپاں نہیں ہوتے، کیونکہ بچپن سے قبلِ نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں، ان میں کہیں اِس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپؐ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں، یا جاہلیت کے جو اعمال، رُسوم اور طور طریقے آپؐ کی قوم میں پائے جاتے تھے اُن میں سے کسی میں آپؐ مُلوّث ہوئے ہوں۔ اس لیے لامحالہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے یہ معنٰی تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا۔ البتہ باقی معنٰی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں۔ نبوت سے پہلے حضوؐر، اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیّت کے قائل تو ضرور تھے، اور آپؐ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائلِ اخلاق سے آراستہ بھی تھی، لیکن آپؐ کو دینِ حق اور اس کے اُصول اور احکام کا علم نہ تھا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (الشُّوریٰ، آیت ۵۲) ''تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی تمھیں کوئی خبر تھی۔'' یہ معنٰی بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ حضوؐر ایک جاہلی معاشرے میں گُم ہو کر رہ گئے تھے اور ایک ہادی و رہبر ہونے کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہو رہی تھیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جاہلیّت کے صحرا میں آپؐ ایک اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے، جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کر دینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آ رہی تھی۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپؐ کو عطا کی تھیں، وہ جاہلیّت کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو رہی تھیں۔ ضلال کو غفلت کے معنٰی میں بھی لیا جا سکتا ہے، یعنی آپؐ اُن حقائق اور عُلوم سے غافل تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو آگاہ فرمایا۔ یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝ (یوسف: ۳) ''اور اگرچہ تم اِس سے پہلے اِن باتوں سے غافل تھے۔'' (نیز مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۲۸۲، اور الشعراء، آیت ۲۰)

۸ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپؐ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اُونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔

اس طرح آپؐ کی زندگی کی ابتدا اِفلاس کی حالت میں ہوئی تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ قُریش کی سب سے زیادہ مال دار خاتون، حضرت خدیجہؓ نے پہلے تجارت میں آپؐ کو اپنے ساتھ شریک کیا، اس کے بعد انھوں نے آپؐ سے شادی کر لی اور ان کے تمام تجارتی کاروبار کو آپؐ نے سنبھال لیا۔ اس طرح آپؐ نہ صرف یہ کہ مال دار ہوگئے، بلکہ آپؐ کی مال داری اِس نوعیت کی نہ تھی کہ محض بیوی کے مال پر آپؐ کا انحصار ہو۔ ان کی تجارت کو فروغ دینے میں آپؐ کی اپنی محنت و قابلیت کا بڑا حصّہ تھا۔

۹ – یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو، اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمھاری دستگیری کی، اس لیے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ تمھارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

۱۰ – اِس کے دو معنیٰ ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنیٰ میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی مدد کر سکتے ہو تو کر دو، نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دو، مگر بہرحال اُسے جھڑکو نہیں۔ اِس معنیٰ کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم نادار تھے، پھر اُس نے تمھیں مال دار کر دیا۔" اور اگر سائل کو پوچھنے والے، یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنیٰ میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو، اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے یا اپنے ذہن کی اُلجھن پیش کرے، بہرحال شفقت کے ساتھ اُسے جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اُسے جھڑک کر دُور نہ بھگادو۔ اِس معنیٰ کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم ناواقفِ راہ تھے، پھر اُس نے تمھیں ہدایت بخشی۔" حضرت ابوالدَّرداءؓ، حَسَن بصریؒ، سُفیانؒ ثَوری اور بعض دوسرے بزرگوں نے اِسی دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ترتیبِ کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے جواب میں آتا ہے۔

۱۱ – نعمت کا لفظ عام ہے، جس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ پاک کو عطا فرمائی تھیں، اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اُس نے اپنے اُن وعدوں کے مطابق آپؐ کو عطا کیں جو اِس سورہ میں اُس نے کیے تھے اور جن کو اُس نے بدرجۂ اَتم پورا کیا۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبیؐ! ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے، اُس کا ذکر اور اُس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ نعمتوں کے ذکر و اظہار کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں اور ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک خاص صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اِس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں، یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہیں، ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمتِ نبوّت کا اظہار اِس طریقے سے ہوسکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمتِ قرآن کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ اُس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمتِ ہدایت کا اظہار اِسی طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور تُرشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں دستگیری کا جو احسان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ یتیموں کے ساتھ ویسے ہی احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مال دار بنا دینے کا جو احسان اللہ نے کیا، اس کا اظہار یہی صورت چاہتا ہے کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ غرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر سے فقرے میں اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الم نشرح

(۹۴)

الم نشرح

نام پہلے ہی فقرے کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون سورۂ ضحیٰ سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے اور ایک جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مکّۂ معظمہ میں والضحیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا مقصد و مدّعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ نبوّت سے پہلے حضوؐر کو کبھی اُن حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جن کا سامنا نبوّت کے بعد دعوتِ اسلامی کا آغاز کرتے ہی یکایک آپؐ کو کرنا پڑا۔ یہ خود آپؐ کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم تھا، جس کا کوئی اندازہ آپؐ کو قبلِ نبوت کی زندگی میں نہ تھا۔ اسلام کی تبلیغ آپؐ نے کیا شروع کی کہ دیکھتے دیکھتے وہی معاشرہ آپؐ کا دشمن ہو گیا جس میں آپؐ پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہی رشتہ دار، دوست، اہلِ قبیلہ اور اہلِ محلّہ آپؐ کو گالیاں دینے لگے جو پہلے آپؐ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مکہ میں کوئی آپؐ کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ راہ چلتے آپؐ پر آوازے کسے جانے لگے۔ قدم قدم پر آپؐ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ آپؐ کو اِن حالات، بلکہ اِن سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی، لیکن ابتدائی زمانہ آپؐ کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ اِسی بنا پر آپؐ کو تسلّی دینے کے لیے پہلے سورۂ ضحیٰ نازل کی گئی اور پھر اِس سورت کا نزول ہوا۔

اِس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپؐ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپؐ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں، جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں۔ ایک، شرحِ صدر کی نعمت۔ دوسری، یہ نعمت کہ آپؐ کے اُوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو نبوت سے پہلے آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ تیسری، رفعِ ذکر کی نعمت، جو آپؐ سے بڑھ کر تو درکنار، آپؐ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔ آگے چل کر ہم نے اپنے حواشی میں وضاحت کر دی ہے کہ اِن تینوں نعمتوں سے مراد کیا ہے اور یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

اِس کے بعد ربِّ کائنات اپنے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور، جس سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، کوئی بہت لمبا دَور نہیں ہے، بلکہ اِس تنگی کے ساتھ ہی ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

فراخی کا دَور بھی لگا چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ ضُحیٰ میں اس طرح فرمائی گئی تھی کہ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوگا اور عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپؐ کا دل خوش ہو جائے گا۔

آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ابتدائی دَور کی اِن سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپؐ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپؐ فارغ ہوں تو عبادت کی مَشقّت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لَو لگائیں۔ یہ وہی ہدایت ہے جو زیادہ تفصیل کے ساتھ حضورؐ کو سورۂ مُزَّمِّل، آیات ۱ تا ۹ میں دی گئی ہے۔

آیاتہا ۸ | رکوعاتہا ۱

سُورَةُ أَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِي
أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ
يُسْرًا ۝٥ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧
وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨ ع

(اے نبیؐ!) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟[۱] اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا[۲]۔ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا[۳]۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے[۴]۔ لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقّت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو[۵]۔ ع

۱- اِس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں آپؐ کو پیش آ رہی تھیں۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کر کے تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبیؐ! کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآنِ مجید میں جن مواقع پر آیا ہے، ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے دو معنی ہیں:

(۱) سورۂ انعام، آیت ۱۲۵ میں فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"۔ اور سورۂ زُمَر، آیت ۲۲ میں فرمایا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو، پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو......" اِن دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردُّد سے پاک ہو کر اِس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اُصولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن، اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

(۲) سورۂ شُعَراء، آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصبِ عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انھوں نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ؕ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ، ''میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جُھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے''۔ اور سورۂ طٰہٰ، آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۙ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۙ، ''میرے رب! میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے''۔ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوّت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تنِ تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تأمّل نہ ہو، اور نبوّت کی عظیم ذمّہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنیٰ مراد ہیں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حَنیفیّت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبْہَم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارُم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)، لیکن آپؐ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپؐ سخت ذہنی خَلْجان میں مبتلا تھے۔ نبوّت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس خَلْجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپؐ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اِس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اُولُوا العزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اس منصبِ عظیم کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیّت رکھتی تھی۔ آپؐ اِس قابل ہو گئے کہ جاہلیّت میں مُسْتَغْرَق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اُکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہراً کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر، اسلام کے عَلَم بردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں، اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپؐ کو اپنے مَوقِف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرحِ صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپؐ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اِس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں۔

بعض مفسّرین نے شرحِ صدر کو شَقِّ صدر کے معنیٰ میں لیا ہے اور اس آیت کو اس معجزۂ شَقِّ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شَقِّ صدر کے معنیٰ

میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی رُوح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الاٰیة علٰی شق الصدر ضعیف عند المحققین۔ ''محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شقِّ صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے۔''

۲ – مفسرین میں سے بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوّت سے پہلے ایّامِ جاہلیّت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ قصور ایسے ہوگئے تھے جن کی فکر آپؐ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطمئن کر دیا کہ آپ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنیٰ لینا سخت غلطی ہے۔ اوّل تو لفظ وِزْر کے معنیٰ لازماً گناہ ہی کے نہیں ہیں، بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بُرے معنیٰ میں لیا جائے۔ دوسرے حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کو مخاطب کر کے یہ کہلوایا گیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ''میں اِس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔'' (یونس، آیت ۱۶) اور حضورؐ اِس کردار کے انسان بھی نہ تھے کہ لوگوں سے چھُپ کر آپؐ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ! اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اُس سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص کوئی چھُپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوئے ہوتا، اُس سے خلقِ خدا کے سامنے برملا وہ بات کہوا تا جو سورۂ یونُس کی مذکورۂ بالا آیت میں اس نے کہلوائی ہے۔ پس درحقیقت اِس آیت میں وِزْر کے صحیح معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں، اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیّت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حسّاس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اَوہام و رُسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پِس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے، اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ کُڑھتے تھے، مگر اِس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہوگیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہِ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قُفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپؐ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اِس ذریعے سے آپؐ نہ صرف عرب، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔

۳ – یہ بات اُس زمانے میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فردِ فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہرِ مکہ تک محدود ہیں، اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقے سے اس کو پورا کیا۔ سب سے پہلے آپؐ کے رفعِ ذِکر کا کام اُس نے خود آپؐ کے دشمنوں سے لیا۔ کفارِ مکہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار

Maktaba Tul Ishaat.com

کیے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر، جب تمام عرب سے لوگ کھچ کھچ کر اُن کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانے میں کفّار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ بیٹے، بھائی بھائی، اور شوہر اور بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے، اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ اُن سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں مکہ آتے تھے۔ اِس طرح اگرچہ وہ حضورؐ کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپؐ کا نام پہنچ گیا اور مکہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اُس کے ''جادو'' سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے ''جادو'' کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفارِ مکہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا، لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اِس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سنا اور انھیں پتا چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپؐ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر مختلف ہوگئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہوگئی، حتّٰی کہ ہجرت کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہوگئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا، جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینۂ طیّبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مُساوات، مال داروں کی فیّاضی، غریبوں کی خبرگیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخّر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعے سے حضورؐ کے اِس بڑھتے ہوئے اثر کو مٹانے کی کوشش کی، مگر آپؐ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حُدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ ۱۰ سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپؐ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صدا سے گونج اُٹھا۔ پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافتِ راشدہ کے دور سے ہوا جب آپؐ کا نامِ مبارک تمام رُوئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے، اور اِن شاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآوازِ بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپؐ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے

کوئی دن، اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب رُوئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کُھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دَور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اُس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفعِ ذکر اِس شان سے اور اِتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ حدیث میں حضرت ابو سعید خُدرِیؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا: میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمھارا رفعِ ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا: اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمھارا بھی ذکر کیا جائے گا۔'' (ابن جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، مُسنَدِ ابو یَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ حِبّان، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابو نُعیم) بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بحرف پوری ہوئی۔

۴ – اس بات کو دو مرتبہ دُہرایا گیا ہے تاکہ حضورؐ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپؐ اِس وقت گزر رہے ہیں، یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی میں اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنیٰ میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دَور اِس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔

۵ – فارغ ہونے سے مراد اپنے مشاغل سے فارغ ہونا ہے، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے مشاغل ہوں، یا اسلام قُبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیّت کے مشاغل، یا اپنے گھر بار اور دنیوی کاموں کے مشاغل۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی اور مشغولیّت نہ رہے تو اپنا فارغ وقت عبادت کی ریاضت و مَشقّت میں صَرف کرو اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اپنے رب کی طرف متوجّہ ہو جاؤ۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

التّین

(۹۵)

التّین

نام

پہلے ہی لفظ التِّیْنِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے۔ ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ یہ مکّی ہے، اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جُمہور علما اسے مکی ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے مکی ہونے کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ اس میں شہرِ مکہ کے لیے ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (یہ پُر امن شہر) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا نزول مدینہ میں ہوا ہوتا تو مکہ کے لیے ''یہ شہر'' کہنا صحیح نہیں ہوسکتا تھا۔ علاوہ بریں سورت کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے بھی ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، کیونکہ اِس میں کوئی نشان اِس امر کا نہیں پایا جاتا کہ اس کے نُزول کے وقت کفر و اسلام کی کش مکش برپا ہو چکی تھی، اور اِس کے اندر مکی دَور کی ابتدائی سورتوں کا وہی اندازِ بیان پایا جاتا ہے جس میں نہایت مختصر اور دل نشین طریقے سے لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا ضروری اور سراسر معقول ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع ہے جزا و سزا کا اثبات۔ اِس غرض کے لیے سب سے پہلے جلیل القدر انبیاؑ کے مقاماتِ ظُہور کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اگرچہ اِس حقیقت کو دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً: کہیں فرمایا کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ (البقرہ ۳۰-۳۴، الانعام ۱۶۵، الاعراف ۱۱، الحجر ۲۸-۲۹، النمل ۶۲، صٓ ۷۱ تا ۷۳) کہیں فرمایا کہ انسان اس امانتِ الٰہی کا حامل ہوا ہے جسے اٹھانے کی طاقت زمین و آسمان اور پہاڑوں میں بھی نہ تھی۔ (الاحزاب: ۷۲) کہیں فرمایا کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی۔ (بنی اسرائیل: ۷۰) لیکن یہاں خاص طور پر انبیاؑ کے مقاماتِ ظُہور کی قسم کھا کر یہ فرمانا کہ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اِتنی بہتر ساخت عطا کی گئی کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے، جس سے اُونچا منصب خدا کی کسی دوسری مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں: ایک، وہ جو اِس بہترین ساخت پر پیدا ہونے کے بعد بُرائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اُس انتہا کو پہنچ جاتے ہیں

Maktaba Tul Ishaat.com

جہاں اُن سے زیادہ نیچ کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی۔ دوسرے، وہ جو ایمان وعملِ صالح کا راستہ اختیار کر کے اِس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں، اور اُس مقامِ بلند پر قائم رہتے ہیں جو اُن کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نوعِ انسانی میں اِن دونوں قسموں کے لوگوں کا پایا جانا ایک ایسا امرِ واقعی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کا مشاہدہ انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

آخر میں اِس امرِ واقعی سے یہ اِستدلال کیا گیا ہے کہ جب انسانوں میں یہ دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں تو پھر جزائے اعمال کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی اجر نہ ملے، اور انجامِ کار دونوں کا یکساں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کوئی انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت اور انسان کی عقلِ عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ، جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ انصاف نہیں کرے گا۔

---

۸ آیاتہا سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ﴿۳﴾

قسم ہے انجیر اور زیتون کی[1] اور طورِ سینا[2] اور اِس پُرامن شہر (مکہ) کی،

۱- اِس کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ حَسَن بصری، عِکرِمہ، عطا بن ابی رَباح، جابر بن زید، مُجاہد اور ابراہیم نَخَعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں، اور زیتون بھی یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ابنِ ابی حاتم اور حاکم نے ایک قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِس کی تائید میں نقل کیا ہے۔ اور جن مفسّرین نے اِس تفسیر کو قبول کیا ہے، انھوں نے انجیر اور زیتون کے خواص اور فوائد بیان کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِنھی خوبیوں کی وجہ سے اِن دونوں پھلوں کی قسم کھائی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ایک عام عَرَبی داں تین اور زیتون کے الفاظ سُن کر وہی معنٰی لے گا جو عربی زبان میں معروف ہیں۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنٰی لینے میں مانع ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طورِ سینا اور شہرِ مکہ کی قسم کھائی گئی ہے، اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے اِن چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اُس پر طورِ سینا اور شہرِ مکہ تو دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ دو پھل اُس پر دلالت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں جہاں بھی کسی چیز کی قسم کھائی ہے، اُس کی عظمت یا اس کے مَنافع کی بنا پر نہیں کھائی، بلکہ ہر قسم اُس مضمون پر دلالت کرتی ہے جو قسم کھانے کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اِن دونوں پھلوں کے خواص کو وجہِ قسم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بعض دوسرے مفسرین نے تین اور زیتون سے مراد بعض مقامات لیے ہیں۔ کَعْبِ اَحبار، قَتَادہ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ تین سے مراد دِمَشق ہے اور زیتون سے مراد بیت المَقْدِس۔ ابنِ عباسؓ کا ایک قول ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے یہ نقل کیا ہے کہ تین سے مراد حضرت نوحؑ کی وہ مسجد ہے جو انھوں نے جُودی پہاڑ پر بنائی تھی، اور زیتون سے مراد بیت المَقْدِس ہے۔ لیکن وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کے الفاظ سُن کر یہ معنٰی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آ سکتے تھے، اور نہ یہ بات قرآن کے مخاطب اہلِ عرب میں معروف تھی کہ تین اور زیتون اِن مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریقہ اہلِ عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو، اُس علاقے کو وہ بسا اوقات اُس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اِس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب مَنابِتِ تین و زیتون، یعنی اِن پھلوں کی پیداوار کا علاقہ ہو سکتا ہے، اور وہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے، کیونکہ اُس زمانے کے

Maktaba Tul Ishaat.com

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا[۳]، پھر اُسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا[۴]، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے

اہلِ عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ، زمخشری اور آلوسی رحمہم اللہ نے اِسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اور ابن جریر نے بھی اگرچہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے، مگر اِس کے ساتھ یہ بات تسلیم کی ہے کہ تین و زیتون سے مراد اِن پھلوں کی پیداوار کا علاقہ بھی ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اس تفسیر کو قابلِ لحاظ سمجھا ہے۔

۲- اصل میں طُوْرِ سِیْنِیْنَ فرمایا گیا ہے۔ سینین جزیرہ نمائے سینا کا دوسرا نام ہے۔ اس کو سَیناء یا سِینا بھی کہتے ہیں اور سینین بھی۔ خود قرآن میں ایک جگہ طُوْرِ سَیْنَآءَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اب چونکہ وہ علاقہ، جس میں کوہِ طور واقع ہے، سینا ہی کے نام سے مشہور ہے، اس لیے ہم نے ترجمے میں اس کا یہی مشہور نام درج کیا ہے۔

۳- یہ ہے وہ بات جس پر انجیر و زیتون کے علاقے یعنی شام و فلسطین اور کوہِ طور اور مکہ کے پُر امن شہر کی قسم کھائی گئی ہے۔ انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی دوسری جان دار مخلوق کو نہیں دیا گیا، اور اُسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔ پھر چونکہ نوعِ انسانی کے اِس فضل و کمال کا سب سے زیادہ بلند نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں اور کسی مخلوق کے لیے اِس سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُسے منصبِ نبوّت عطا کرنے کے لیے منتخب فرمائے، اس لیے انسان کے اَحْسَنِ تقویم پر ہونے کی شہادت میں اُن مقامات کی قسم کھائی گئی ہے جو خدا کے پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں۔ شام و فلسطین کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بکثرت انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔ کوہِ طور وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی۔ رہا مکہ معظمہ، تو اس کی بنا ہی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں پڑی، انھی کی بدولت وہ عرب کا مقدّس ترین مرکزی شہر بنا، حضرت ابراہیمؑ ہی نے یہ دُعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ''اے میرے رب اِس کو ایک پُر امن شہر بنا'' (البقرہ:۱۲۶) اور اسی دعا کی یہ برکت تھی کہ عرب میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدامنی کے درمیان صرف یہی ایک شہر ڈھائی ہزار سال سے امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ پس کلام کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے نوعِ انسانی کو ایسی بہترین ساخت پر بنایا کہ اس میں نبوت جیسے عظیم مرتبے کے حامل انسان پیدا ہوئے۔

۴- مفسرین نے بالعموم اس کے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ ہم نے اُسے اَرْذَلُ الْعُمُر، یعنی بڑھاپے کی ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اُسے جہنم کے

اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍؕ ﴿۶﴾ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّيۡنِؕ ﴿۷﴾ اَلَيۡسَ اللّٰهُ
بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۸﴾ ع

کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ پس (اے نبیؐ!) اِس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملے میں تم کو جُھٹلا سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ ع

سب سے نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔ لیکن یہ دونوں معنیٰ اُس مقصودِ کلام کے لیے دلیل نہیں بن سکتے جسے ثابت کرنے کے لیے یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ سورت کا مقصود جزا و سزا کے برحق ہونے پر استدلال کرنا ہے۔ اِس پر نہ یہ بات دلالت کرتی ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ بڑھاپے کی انتہائی کمزور حالت کو پہنچا دیے جاتے ہیں، اور نہ یہی بات دلالت کرتی ہے کہ انسانوں کا ایک گروہ جہنّم میں ڈالا جائے گا۔ پہلی بات اس لیے جزا و سزا کی دلیل نہیں بن سکتی کہ بُڑھاپے کی حالت اچھے اور بُرے، دونوں قسم کے لوگوں پر طاری ہوتی ہے، اور کسی کا اس حالت کو پہنچنا کوئی سزا نہیں ہے جو اُسے اُس کے اعمال پر دی جاتی ہو۔ رہی دوسری بات، تو وہ آخرت میں پیش آنے والا معاملہ ہے۔ اُسے اُن لوگوں کے سامنے دلیل کے طور پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے جنھیں آخرت ہی کی جزا و سزا کا قائل کرنے کے لیے یہ سارا اِستدلال کیا جا رہا ہے؟ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد جب انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اُسے گراوٹ کی اُس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اُس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہو جاتے ہیں، وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف اِسی ایک بات کو لے لیجیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام لے کر توپ، بندوق، ٹینک، ہوائی جہاز، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے، تاکہ آن کی آن میں پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیّت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصوّر بھی کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اِس انتہا کو پہنچتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے، ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، باپوں اور بھائیوں اور شوہروں

Maktaba Tul Ishaat.com

کے سامنے اُن کے گھر کی عورتوں کی عِصمت لُوٹتے ہیں، بچوں کو اُن کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں، انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسان کی اِس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ اُن میں سے جس کی طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو اَرذَلُ المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتّٰی کہ مذہب، جو انسان کے لیے مقدّس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اِتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے، اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے، جن سے زِنا کا ارتکاب کارِثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ دیوتا اور معبُود کا درجہ دیتا ہے، ان کی طرف اس کی دیو مالا میں ایسے ایسے گندے قصّے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسان کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں۔

۵ - جن مفسرین نے اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ سے مراد بڑھاپے کی وہ حالت لی ہے جس میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، وہ اِس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”مگر جن لوگوں نے اپنی جوانی اور تندرستی کی حالت میں ایمان لا کر نیک اعمال کیے ہوں، اُن کے لیے بڑھاپے کی اِس حالت میں بھی وہی نیکیاں لکھی جائیں گی اور انھی کے مطابق وہ اجر پائیں گے۔ اُن کے اجر میں اِس بنا پر کوئی کمی نہ کی جائے گی کہ عمر کے اِس دَور میں اُن سے وہ نیکیاں صادر نہیں ہوئیں۔“ اور جو مفسرین اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کی طرف پھیرے جانے کا مطلب جہنّم کے ادنیٰ ترین درجے میں پھینک دیا جانا لیتے ہیں، ان کے نزدیک اِس آیت کے معنٰی یہ ہیں کہ ”ایمان لا کر عملِ صالح کرنے والے لوگ اِس سے مُستثنٰی ہیں، وہ اس درجے کی طرف نہیں پھیرے جائیں گے، بلکہ اُن کو وہ اجر ملے گا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔“ لیکن یہ دونوں معنٰی اُس اِستِدلال سے مناسبت نہیں رکھتے جو جزا و سزا کے برحق ہونے پر اِس سورت میں کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسانی معاشرے میں یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اخلاقی پستی میں گرنے والے لوگ گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچ ہو جاتے ہیں، اُسی طرح یہ بھی ہر زمانے کا عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت اور رسالت پر ایمان لائے اور جنھوں نے اپنی زندگی عملِ صالح کے سانچے میں ڈھال لی، وہ اِس پستی میں گرنے سے بچ گئے اور اُسی اَحْسَنِ تقویم پر قائم رہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا تھا، اس لیے وہ اجرِ غیرِ ممنون کے مستحق ہیں، یعنی ایسے اجر کے جو نہ اُن کے استحقاق سے کم دیا جائے گا اور نہ اُس کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا۔

۶ - دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”پس (اے انسان!) اِس کے بعد کیا چیز تجھے جزا و سزا کو جُھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے۔“ دونوں صورتوں میں مدّعا ایک ہی رہتا ہے۔ یعنی جب یہ بات عَلانیہ انسانی معاشرے میں نظر آتی ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کی ہوئی نوعِ انسانی میں سے ایک گروہ اخلاقی پستی میں گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچ ہو جاتا ہے، اور دوسرا گروہ ایمان و عملِ صالح اختیار کر کے اِس گراوٹ سے بچا رہتا ہے اور اُسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کے پیدا کیے جانے سے مطلوب تھی، تو اِس کے بعد جزا و سزا کو کیسے جُھٹلایا جا سکتا ہے؟ کیا عقل

یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو؟ کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ نہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں گرنے والوں کو کوئی سزا دی جائے اور نہ اُس سے بچ کر پاکیزہ زندگی اختیار کرنے والوں کو کوئی جزا؟ یہی بات دوسرے مقامات پر قرآن میں اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ ”کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟“ (القلم: ۳۵ - ۳۶) اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ”کیا برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اُنھیں اُن لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے؟ دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔“ (الجاثیہ: ۲۱)

۷- یعنی جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے بھی تم یہ چاہتے ہو اور یہی توقع رکھتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو صلہ و انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اگر تم اس کو سب سے بڑا حاکم مانتے ہو تو کیا اس کے بارے میں تمھارا یہ خیال ہے کہ وہ کوئی انصاف نہ کرے گا؟ کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ بُرے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا؟ کیا اس کی دنیا میں بدترین افعال کرنے والے اور بہترین کام کرنے والے، دونوں مر کر خاک ہو جائیں گے، اور کسی کو نہ بداعمالیوں کی سزا ملے گی نہ حُسنِ عمل کی جزا؟

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن المُنذِر، بَیہقی، حاکم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی سورۂ وَالتِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ پڑھے اور اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ پر پہنچے تو کہے: بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰاهِدِیْنَ (ہاں، اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں)۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضورؐ جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبْحٰنَكَ فَبَلٰی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

العلق

(۹۶)

العَلَق

نام

دوسری آیت کے لفظ عَلَق کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اِس سورت کے دو حصّے ہیں: پہلا حصّہ اِقْرَاْ سے شروع ہو کر پانچویں آیت کے الفاظ مَا لَمْ يَعْلَمْ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصّہ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى سے شروع ہو کر آخر سورت تک چلتا ہے۔ پہلے حصّے کے متعلق علمائے اُمت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اِس معاملے میں حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جسے امام احمد، بخاری، مسلم اور دوسرے محدّثین نے متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے، اور اس میں حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر آغازِ وحی کا پورا قصّہ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن عباسؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیات جو حضوؐر پر نازل ہوئیں وہ یہی تھیں۔ دوسرا حصّہ بعد میں اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپؐ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کوشش کی۔

آغازِ وحی

محدّثین نے آغازِ وحی کا قصّہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انھوں نے حضرت عُروَہ بن زُبیر سے، اور انھوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچّے (اور بعض رِوایات میں ہے، اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے، وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپؐ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے (حضرت عائشہؓ نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہریؒ نے تَعَبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپؐ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپؐ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپؐ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جب کہ آپؐ غارِ حرا میں تھے، یکایک آپؐ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آ کر آپؐ سے کہا: ”پڑھو“۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے کہا: ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔“ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھو''۔ میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھو''۔ میں نے پھر کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا)، یہاں تک کہ مَا لَمْ يَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا: ''مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔'' چنانچہ آپؐ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپؐ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے خدیجہؓ! یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔'' پھر سارا قصّہ آپؐ نے اُن کو سنایا اور کہا: ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہو جایئے، خدا کی قسم! آپؐ کو خدا کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں (ایک رِوایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔'' پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقَہ بن نَوفَل کے پاس گئیں جو اُن کے چچازاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیّت میں عیسائی ہوگئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا: ''بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیے۔'' وَرَقَہ نے حضورؐ سے کہا: ''بھتیجے! تم کو کیا نظر آیا؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقَہ نے کہا: ''یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش! میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی جوان ہوتا۔ کاش! میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' وَرَقَہ نے کہا: ''ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔'' مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وَرَقَہ کا انتقال ہوگیا۔

یہ قصّہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اِس چیز کا طالب یا مُتوقّع ہونا تو درکنار، آپؐ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپؐ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نُزول اور فرشتے کا اِس طرح سامنے آنا آپؐ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا، جس کا پہلا تأثُّر آپؐ کے اُوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اِتنے بڑے ایک حادثے کے پیش آنے سے فطری طور پر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے،

مگر اُن میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپؐ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں، کیونکہ آپؐ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصّے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوّت سے پہلے آپؐ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپؐ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعے کے وقت اُن کی عمر ۵۵ سال تھی، اور پندرہ سال سے وہ حضوؐر کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے اِس طویل اِزدِواجی زندگی میں آپؐ کو اِتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضوؐر نے اُن کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تأمّل انھوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپؐ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح وَرَقَہ بن نَوْفَل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضوؐر کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپؐ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اِسے کوئی وَسْوَسَہ نہیں سمجھا، بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپؐ اِتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپؐ کا نبوّت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

دوسرے حصّے کی شانِ نزول

اِس سورہ کا دوسرا حصّہ اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں اسلامی طریقے پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپؐ کو ڈرا دھمکا کر اِس سے روکنا چاہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اِس کے کہ حضوؐر اسلام کی عَلانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپؐ نے حَرَم میں اُس طریقے پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھائی تھی، اور یہی وہ چیز تھی جس سے قُرَیش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپؐ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگ تو اِسے حیرت ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابوجہل کی رگِ جاہلیّت اِس پر پھڑک اٹھی اور اس نے آپؐ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اِس طریقے پر حرم میں عبادت نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ سے مروی ہیں جن میں ابوجہل کی اِن بیہودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا: ”کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں؟“ لوگوں نے کہا: ”ہاں“۔ اس نے کہا: ”لات اور عُزّیٰ کی قسم! اگر میں نے ان کو اِس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔“ پھر ایسا ہوا کہ حضوؐر کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا، تاکہ آپؐ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا: "میرے اور اُن کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پَر تھے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اُس کے چیتھڑے اُڑا دیتے۔ (احمد، مسلم، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابونُعَیم اصفہانی، بَیْہقی)

ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ ابوجہل نے کہا: "اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبے کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ عَلانِیَہ اُسے آ پکڑیں گے۔ (بخاری، ترمِذی، نَسائی، ابنِ جَرِیر، عبدالرزاق، عَبد بن حُمَید، ابن المُنذِر، ابن مَرْدُوْیَہ)

ابنِ عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا: "اے محمدؐ! کیا میں نے تم کو اِس سے منع نہیں کیا تھا؟" اور اس نے آپؐ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اِس پر اُس نے کہا: "اے محمدؐ، تم کس بَل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم! اِس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔" (احمد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابن المُنذِر، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

انھی واقعات پر اِس سورہ کا وہ حصّہ نازل ہوا جو كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى سے شروع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اِس حصّے کا مقام وہی ہونا چاہیے تھا جو قرآن کی اِس سورت میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد اسلام کا اوّلین اظہار حضورؐ نے نماز ہی سے کیا تھا، اور کفّار سے آپؐ کی مُڈبھیڑ کا آغاز بھی اِسی واقعے سے ہوا تھا۔

آیاتہا ۱۹ سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ
رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵

پڑھو[1] (اے نبیؐ!) اپنے رب کے نام کے[2] ساتھ جس نے پیدا کیا[3]، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی[4]۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا[5]، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا[6]۔

۱- جیسا کہ ہم نے دیباچے میں بیان کیا ہے، فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے اور اُنھیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا جاؤں آپؐ اُسی طرح پڑھتے جائیں، تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

۲- یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظِ دیگر، بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اِس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ کا رب کون ہے، بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

۳- مُطلقاً ''پیدا کیا'' فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ کس کو پیدا کیا۔ اِس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اُس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

۴- کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اُس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اُسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق جمع ہے عَلَقَه کی، جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رُونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷)

۵- یعنی یہ اُس کا انتہائی کرم ہے کہ اِس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اُس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا، بلکہ اُس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا، جو

Maktaba Tul Ishaat.com

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ۝٦ أَن رَّءَاهُ اسْتَغْنَىٰٓ ۝٧ إِنَّ إِلَىٰ
رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ۝٨ أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝٩ عَبْدًا إِذَا

ہرگز نہیں[۶]، انسان سرکشی کرتا ہے اِس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے[۷] (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے[۸]۔ تم نے دیکھا اُس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ

بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقّی اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقا اور تحفُّظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اُسے نشو ونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے عُلوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

۶ – یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اُسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے، وہ اُس پر کُھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَ ''اور لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے۔'' (البقرہ:۲۵۵) جن جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا، بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اُسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اِس سے زیادہ کے متحمّل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپؐ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپؐ سے براہِ راست مخاطب ہے، اس کی طرف سے آپؐ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپؐ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اِس کے ایک مدت بعد سورۂ مُدّثّر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپؐ کو بتایا گیا کہ نبوّت پر مامور ہونے کے بعد اب آپؐ کو کام کیا کرنا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد ششم، المدّثّر، دیباچہ)

۷ – یعنی ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ جس خدائے کریم نے انسان پر اتنا بڑا کرم فرمایا ہے اس کے مقابلے میں وہ جہالت برت کر وہ رَدِیّہ اختیار کرے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۸ – یعنی یہ دیکھ کر کہ مال، دولت، عزّت و جاہ اور جو کچھ بھی دنیا میں وہ چاہتا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے، شکر گزار ہونے کے بجائے وہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور حدِّ بندگی سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔

۹ – یعنی خواہ کچھ بھی اس نے دنیا میں حاصل کر لیا ہو، جس کے بل پر وہ تمرُّد اور سرکشی کر رہا ہے، آخرِ کار اسے جانا تو تیرے رب ہی کے پاس ہے۔ پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ اِس رَوِش کا انجام کیا ہوتا ہے۔

صَلّٰیؕ ﴿۱۰﴾ اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡہُدٰۤیۙ ﴿۱۱﴾ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰیؕ ﴿۱۲﴾
اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰیؕ ﴿۱۳﴾ اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰیؕ ﴿۱۴﴾ کَلَّا لَئِنۡ
لَّمۡ یَنۡتَہِ ۬ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ﴿ۙ۱۵﴾ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ ﴿ۚ۱۶﴾

وہ نماز پڑھتا ہو؟[10] تمھارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور مُنہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟[11] ہرگز نہیں،[12] اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے، اُس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔[13]

۱۰- بندے سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اِس طریقے سے حضوؐر کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا (بنی اسرائیل:۱) ''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف۔'' اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ (الکہف:۱) ''تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔'' وَّ اَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا (الجن:۱۹) ''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبّت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اُس طریقے کا ذکر قرآنِ مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبیؐ تم اِس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہٰذا یہ اِس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔

۱۱- بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اُس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھی اُس شخص کی حرکت جو خدا کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہِ راست پر ہو، یا لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور بُرے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو، اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اُس سے منہ موڑتا ہو، تو اس کی یہ حرکت کیسی ہے؟ کیا یہ شخص یہ رَوِش اختیار کر سکتا تھا اگر اِسے یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اُس بندے کو بھی دیکھ رہا ہے جو نیکی کا کام کرتا ہے اور اِس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلانے اور اُس سے رُوگردانی کرنے میں لگا ہوا ہے؟ ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا خود اس بات کو مُستلزِم ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی داد رسی کرے گا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

فَلۡیَدۡعُ نَادِیَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَةَ ﴿۱۸﴾ کَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ ﴿۱۹﴾

ع ۱۹

وہ بُلا لے اپنے حامیوں کی ٹولی کو،[۱۴] ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بُلا لیں گے۔[۱۵] ہرگز نہیں، اُس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قُرب حاصل کرو۔[۱۶] ع

۱۲– یعنی یہ شخص جو دھمکی دیتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھیں گے تو وہ ان کی گردن کو پاؤں سے دبا دے گا، یہ ہرگز ایسا نہ کر سکے گا۔

۱۳– پیشانی سے مراد یہاں پیشانی والا شخص ہے۔

۱۴– جیسا کہ ہم نے دیباچے میں بیان کیا ہے، ابوجہل کے دھمکی دینے پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھڑک دیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اے محمدؐ! تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو؟ خدا کی قسم! اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بلا لے اپنے حمایتیوں کو۔

۱۵– اصل میں زَبَانِیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قَتَادَہ کی تشریح کے مطابق کلامِ عرب میں پولیس کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور زَبَن کے اصل معنی دھکّا دینے کے ہیں۔ بادشاہوں کے ہاں چوبدار بھی اِسی غرض کے لیے ہوتے تھے کہ جس پر بادشاہ ناراض ہو اُسے وہ دھکّے دے کر نکال دیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے حمایتیوں کو بُلا لے، ہم اپنی پولیس، یعنی ملائکۂ عذاب کو بُلا لیں گے کہ وہ اِس کی اور اس کے حمایتیوں کی خبر لیں۔

۱۶– سجدہ کرنے سے مراد نماز ہے۔ یعنی اے نبیؐ! تم بے خوف اُسی طرح نماز پڑھتے رہو جس طرح پڑھتے رہے ہو، اور اس کے ذریعے سے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ "بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اُس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔" اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت بھی آئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے تھے تو سجدۂ تلاوت ادا فرماتے تھے۔

تفہیم القرآن

القدر

(۹۷)

Maktaba Tul Ishaat.com

القَدْر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقَدْر کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کے مکّی اور مَدَنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابوحیّان نے البحر المحیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ علی بن احمد الواحدی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورت ہے جو مدینے میں نازل ہوئی۔ بخلاف اس کے الماوَردی کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مکّی ہے، اور یہی بات امام سُیُوطی نے اِتقان میں لکھی ہے۔ ابنِ مَرْدُوْیہ نے ابنِ عباسؓ، ابن الزُّبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورت کے مضمون پر غور کرنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کو مکہ ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ قرآنِ مجید کی ترتیب میں اِسے سورۂ عَلَق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتابِ پاک کے نزول کا آغاز سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا، اُسی کے متعلق اِس سورہ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ کس تقدیر ساز رات میں نازل ہوئی ہے، کیسی جلیل القدر کتاب ہے اور اس کا نزول کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اِسے نازل کیا ہے۔ یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اِس کا نزول ہماری طرف سے شبِ قدر میں ہوا ہے۔ شبِ قدر کے دو معنیٰ ہیں، اور دونوں ہی یہاں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ وہ رات ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں، یا بالفاظِ دیگر، یہ کوئی معمولی رات عام راتوں جیسی نہیں ہے، بلکہ یہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کی رات ہے۔ اِس میں اِس کتاب کا نزول محض ایک کتاب کا نزول نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو نہ صرف قریش، نہ صرف عرب، بلکہ دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا۔ یہی بات سورۂ دُخان میں بھی فرمائی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ دخان کا دیباچہ اور حاشیہ ۳) دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ بڑی قدر و منزلت اور عظمت و شرف رکھنے والی رات ہے، اور آگے اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اِس سے کفارِ مکہ کو گویا متنبّہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی نادانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اِس کتاب کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہو اور کوس رہے ہو کہ یہ کیا بلا ہم پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ جس رات کو

اِس کے نُزول کا فیصلہ صادر کیا گیا، وہ اِتنی خیر و برکت کی رات تھی کہ کبھی انسانی تاریخ کے ہزار مہینوں میں بھی انسان کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا تھا جو اِس رات میں کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سورۂ دُخان، آیت ۳ میں ایک دوسرے طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اُس سورہ کے دیباچے میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اِس رات کو فرشتے اور جبریلؑ اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر نازل ہوتے ہیں (جسے سورۂ دُخان، آیت ۴ میں اَمْرٍ حَکِیْمٍ کہا گیا ہے) اور وہ شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے، یعنی اس میں کسی شر کا دخل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے بالآخر بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں کوئی بُرائی مقصود نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو خیر کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ شر کے لیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۵ آیاتہا سُوۡرَۃُ الۡقَدۡرِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾

ہم نے اِس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے[1]۔ اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے؟

۱ - اصل الفاظ ہیں: اَنْزَلْنٰہُ، ''ہم نے اِس کو نازل کیا ہے۔'' لیکن بغیر اِس کے کہ پہلے قرآن کا کوئی ذکر ہو، اشارہ قرآن ہی کی طرف ہے، اس لیے کہ ''نازل کرنا'' خود بخود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔ اور قرآنِ مجید میں اس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اگر سیاقِ کلام یا اندازِ بیان سے ضمیر کا مَرجَع خود ظاہر ہو رہا ہو تو ضمیر ایسی حالت میں بھی استعمال کر لی جاتی ہے جب کہ اُس کے مَرجَع کا ذکر پہلے یا بعد میں کہیں نہ کیا گیا ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۹)

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے، اور سورۂ بَقَرہ میں ارشاد ہوا ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ، ''رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔'' (البقرہ:۱۸۵) اس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ خدا کا فرشتہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا، وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی۔ اِس رات کو یہاں شبِ قدر کہا گیا ہے اور سورۂ دُخان میں اِسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ، ''ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔'' (آیت ۳)

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اِس رات پورا قرآن حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، اور پھر واقعات اور حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے دوران میں جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ یہ مطلب ابنِ عباسؓ نے بیان کیا ہے۔ (ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی) دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اِس رات سے ہوئی۔ یہ امام شَعْبی کا قول ہے، اگرچہ اُن سے بھی دوسرا قول وہی منقول ہے جو ابنِ عباسؓ کا اُوپر گزرا ہے۔ (ابنِ جَرِیر) بہر حال دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کا سلسلہ اسی رات کو شروع ہوا اور یہی رات تھی جس میں سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات نازل کی گئیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتیں اللہ تعالیٰ اُسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ اسلامی کو کسی واقعہ یا معاملہ میں ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے اَزل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر نوعِ انسانی کی پیدائش، اس میں انبیاؑ کی بِعثت، انبیاؑ پر نازل کی جانے والی کتابوں، اور تمام

انبیاءؑ کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے اور آپؐ پر قرآن نازل کرنے کا پورا منصوبہ موجود تھا۔ شبِ قدر میں صرف یہ کام ہوا کہ اس منصوبے کے آخری حصے پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ اُس وقت اگر پورا قرآن حاملینِ وحی کے حوالے کردیا گیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔

قدر کے معنیٰ بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سُپرد کردیتا ہے۔ اس کی تائید سورۂ دُخان کی یہ آیت کرتی ہے: فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ، ''اُس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کردیا جاتا ہے۔'' (آیت ۵) بخلاف اِس کے امام زُہریؒ کہتے ہیں کہ قدر کے معنیٰ عظمت وشرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اِس معنیٰ کی تائید اِسی سورت کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے کہ ''شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔''

اب رہا یہ سوال کہ یہ کون سی رات تھی، تو اس میں اتنا اختلاف ہُوا ہے کہ قریب قریب ۴۰ مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں۔ لیکن علمائے اُمّت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شبِ قدر ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اِس معاملے میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں، انھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا: وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے۔ (ابوداؤد طیالسی) دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے۔ (مُسندِ احمد)

حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے زِر بن حُبَیش نے شبِ قدر کے متعلق پوچھا تو انھوں نے حلفاً کہا اور اِستثنا نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ حِبان)

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ (ابنِ ابی شَیبہ)

حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تیئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری۔ (مُسندِ احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو، جب کہ مہینا ختم ہونے میں نو دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی۔ (بخاری) اکثر اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ نو دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ اِن تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔ (ترمذی، نَسائی)

Maktaba Tul Ishaat.com

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۵

ع ۵ ۲۲ — معانقة ۱۸ — الثلثة

شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔[۲] فرشتے اور رُوح[۳] اُس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں۔[۴] وہ رات سراسر سلامتی ہے طُلوعِ فجر تک۔[۵] ع

حضرت عائشہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمِذی) حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تا زیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملے میں جو رِوایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں، اُن کی بنا پر علمائے سَلَف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شبِ قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعیُّن اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شبِ قدر کی فضیلت سے فیض اُٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت مکۂ معظّمہ میں رات ہوتی ہے اُس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے میں دن ہوتا ہے، اس لیے اُن علاقوں کے لوگ تو کبھی شبِ قدر کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عَرَبی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی اِن تاریخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصّے میں ہو، اُس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شبِ قدر ہو سکتی ہے۔

۲- مفسرین نے بالعموم اس کے معنٰی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے افضل ہے جن میں شبِ قدر شمار نہ ہو۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من قام ليلة القدر ايمانًا واحتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه، ”جو شخص شبِ قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لیے کھڑا رہا، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔“ اور مُسنَدِ احمد میں حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ”شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے، جو شخص ان کے اجر کی طلب میں عبادت کے لیے کھڑا رہا، اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے گا۔“ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی ليلة القدر خير من العمل فی الف شهر (شبِ قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے)، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ ”شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔“ اور ہزار مہینوں سے مراد بھی گِنے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں ہیں، بلکہ اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بڑی کثیر تعداد کا تصوُّر دلانے کے لیے وہ ہزار کا لفظ بولتے تھے۔ اِس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِس ایک رات میں خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ

کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا۔

۳۔ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کے فضل وشرف کی بنا پر ان کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے۔

۴۔ یعنی وہ بطورِ خود نہیں آتے بلکہ اپنے رب کے اِذن سے آتے ہیں۔ اور ہر حکم سے مراد وہی ہے جسے سورۂ دُخان، آیت ۴ میں اَمْرٍ حَکِیْمٍ (حکیمانہ کام) کہا گیا ہے۔

۵۔ یعنی شام سے صبح تک وہ پوری رات خیر ہی خیر ہے، ہر شر اور فتنے سے پاک۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

البیّنہ

(۹۸)

البیّنہ

نام

پہلی آیت کے لفظ اَلْبَیِّنَۃُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اس کے بھی مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جُمہور کے نزدیک یہ مکی ہے، اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جُمہور کے نزدیک مدنی ہے۔ ابن الزُّبیر اور عطاء بن یَسار کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ ابنِ عباسؓ اور قَتادَہؒ کے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے، دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ حضرت عائشہؓ اِسے مکی قرار دیتی ہیں۔ ابوحیّان صاحب بحر المحیط اور عبدالمنعم ابن الفرس صاحبِ احکام القرآن اس کے مکی ہونے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک اِس کے مضمون کا تعلق ہے، اُس میں کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جو اِس کے مکی یا مدنی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

موضوع اور مضمون

قرآنِ مجید کی ترتیب میں اِس کو سورۂ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنیٰ خیز ہے۔ سورۂ عَلَق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی۔ اور اِس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتابِ پاک کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

سب سے پہلے رسول بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے، اُس سے اُن کا نکلنا اِس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیلِ روشن ہو، اور وہ لوگوں کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی اُن تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے پچھلی کُتبِ آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے، اور بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل ہو۔

اِس کے بعد اہلِ کتاب کی گمراہیوں کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ اُن کے اِن مختلف راستوں میں بھٹکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، بلکہ وہ اِس کے بعد بھٹکے کہ راہِ راست کا بیانِ واضح اُن کے پاس آچکا تھا۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی گمراہیوں کے وہ خود ذمّہ دار ہیں، اور اب پھر اللہ کے اِس رسول کے ذریعے سے بیانِ واضح آجانے کے بعد بھی اگر وہ بھٹکتے ہی رہیں گے تو اُن کی ذمّہ داری اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

اِسی سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاؑ بھی آئے تھے، اور جو کتابیں بھی

Maktaba Tul Ishaat.com

بھیجی گئی تھیں، اُنھوں نے اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے، کسی اور کی عبادت و بندگی اور اطاعت و پرستش کو اس کے ساتھ شامل نہ کیا جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی ہمیشہ سے ایک صحیح دین رہا ہے۔ اِس سے بھی یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب نے اِس اصل دین سے ہٹ کر اپنے مذہبوں میں جن نئی نئی باتوں کا اضافہ کر لیا ہے وہ سب باطل ہیں، اور اللہ کا یہ رسول جواَب آیا ہے، اُسی اصل دین کی طرف پلٹنے کی انھیں دعوت دے رہا ہے۔

آخر میں صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور مشرکین اس رسول کو ماننے سے انکار کریں گے، وہ بدترینِ خلائق ہیں، ان کی سزا ابدی جہنّم ہے، اور جو لوگ ایمان لا کر عملِ صالح کا طریقہ اختیار کر لیں گے اور دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے، وہ بہترینِ خلائق ہیں، اُن کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

---

۸ آیاتہا — سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ — ۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ

اہلِ کتاب اور مشرکین[1] میں سے جو لوگ کافر تھے[2] (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے،

۱ – کفر میں مشترک ہونے کے باوجود ان دونوں گروہوں کو دو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس پہلے انبیاءؑ کی لائی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب، خواہ تحریف شدہ شکل ہی میں سہی، موجود تھی اور وہ اُسے مانتے تھے۔ اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ قرآنِ مجید میں اگرچہ اہلِ کتاب کے شرک کا ذکر بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ کہتے ہیں، اللہ تین خداؤں میں کا ایک ہے۔ (المائدہ: ۷۳) وہ مسیحؑ ہی کو خدا کہتے ہیں۔ (المائدہ: ۱۷) وہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ (التوبہ: ۳۰) اور یہود کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ عُزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ (التوبہ: ۳۰) لیکن اس کے باوجود قرآن میں کہیں اُن کے لیے "مشرک" کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ ان کا ذکر اہلِ کتاب یا اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (جن کو کتاب دی گئی تھی)، یا یہود اور نصاریٰ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اصلِ دین توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اِس کے غیر اہلِ کتاب کے لیے "مُشرک" کا لفظ بطورِ اصطلاح استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اصلِ دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کے ماننے سے اُن کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق اِن دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح ہی میں نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا ہے اگر وہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور کو صحیح طریقے سے ذبح کریں، اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال۔

۲ – یہاں کفر اپنے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں کافرانہ رَوِیّے کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ مثلاً کوئی اِس معنٰی میں کافر تھا کہ سرے سے اللہ ہی کو نہ مانتا تھا۔ کوئی اللہ کو مانتا تھا مگر اسے واحد معبُود نہ مانتا تھا، بلکہ خدا کی ذات، یا خدائی کی صفات و اختیارات میں کسی نہ کسی طور پر دوسروں کو شریک ٹھیرا کر اُن کی عبادت بھی کرتا تھا۔ کوئی اللہ کی وحدانیت بھی مانتا تھا مگر اس کے باوجود کسی نوعیت کا شرک بھی کرتا تھا۔ کوئی خدا کو مانتا تھا مگر اس کے نبیوں کو نہیں مانتا تھا اور اُس ہدایت کو قبول کرنے کا قائل نہ تھا جو انبیاءؑ کے ذریعے سے آئی ہے۔ کوئی کسی نبی کو مانتا تھا اور کسی دوسرے نبی کا انکار کرتا تھا۔ کوئی آخرت کا منکر تھا۔ غرض مختلف قسم کے کفر تھے جن میں لوگ مبتلا تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے"، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ کفر میں مبتلا نہ تھے، بلکہ مطلب یہ ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِیْهَا
كُتُبٌ قَیِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ؕ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ
الدِّیْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ ؕ﴿۵﴾

جب تک کہ ان کے پاس دلیلِ روشن نہ آ جائے[۳] (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول[۴] جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے[۵]، جن میں بالکل راست اور دُرست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اُن میں تفرِقہ برپا نہیں ہوا مگر اِس کے بعد کہ اُن کے پاس (راہِ راست کا) بیانِ واضح آ چکا تھا[۶]۔ اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسُو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے[۷]۔

کہ کفر میں مبتلا ہونے والے دو گروہ تھے: ایک اہلِ کتاب، دوسرے مشرکین۔ یہاں مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے لیے ہے۔ جس طرح سورۂ حج، آیت ۳۰ میں فرمایا گیا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں کی گندگی سے بچو، نہ یہ کہ بتوں میں جو گندگی ہے اُس سے بچو۔ اسی طرح الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِیْنَ کا مطلب بھی یہ ہے کہ کفر کرنے والے، جو اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے ہیں، نہ یہ کہ اِن دونوں گروہوں میں سے جو لوگ کفر کرنے والے ہیں۔

۳- یعنی اُن کے اِس حالتِ کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اِس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیلِ روشن آ کر انھیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ حق ہونا سمجھائے اور راہِ راست کو واضح اور مُدلّل طریقے سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس دلیلِ روشن کے آ جانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آ جانے والے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں تو ان کا اِس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی اُن میں سے جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اُس کی ذمہ داری پھر اُنھی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں فرمایا: وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ، ''سیدھا راستہ بتانا اللہ کے ذمے ہے۔'' (آیت ۹) سورۂ لیل میں فرمایا: اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی ''راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے۔'' (آیت ۱۲) اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ

اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ۚ ...... رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ’’(اے نبیؐ!) ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی...... ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ رہے۔‘‘ (النساء: ۱۶۴-۱۶۵) یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ عَلٰی فَتۡرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّ لَا نَذِیۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَشِیۡرٌ وَّ نَذِیۡرٌ ’’اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول حقیقت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آگیا ہے، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ سو، لو اب تمھارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آگیا۔‘‘ (المائدہ: ۱۹)

۴- یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود ایک دلیلِ روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپؐ کا اُمّی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپؐ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیرمعمولی انقلاب رونما ہوجانا، آپؐ کا بالکل معقول عقائد، نہایت ستھری عبادات، کمال درجے کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپؐ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپؐ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اُولُوا العزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔

۵- لغت کے اعتبار سے تو صحیفوں کے معنی ہیں: ’’لکھے ہوئے اوراق‘‘، لیکن قرآنِ مجید میں اصطلاحاً یہ لفظ انبیا علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور پاک صحیفوں سے مراد ہیں ایسے صحیفے جن میں کسی قسم کے باطل، کسی طرح کی گمراہی و ضلالت، اور کسی اخلاقی گندگی کی آمیزش نہ ہو۔ اِن الفاظ کی پوری اہمیت اُس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان قرآنِ مجید کے مقابلے میں بائبل (اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کا بھی) مطالعہ کرتا ہے اور ان میں صحیح باتوں کے ساتھ ایسی باتیں لکھی ہوئی دیکھتا ہے جو حق و صداقت اور عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد جب آدمی قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی پاک اور مطہر کتاب ہے۔

۶- یعنی اِس سے پہلے اہلِ کتاب جو مختلف گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے، اُس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اُن کی رہنمائی کے لیے دلیلِ روشن بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، بلکہ یہ رَوش انھوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آجانے کے بعد اختیار کی تھی، اس لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر حجت تمام کی جاچکی تھی۔ اِسی طرح اب چونکہ اُن کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل نہیں رہی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دلیلِ روشن کی حیثیت سے اپنا ایک رسول بھیج کر اور اس کے ذریعے سے پاک صحیفے بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل پیش کرکے ان پر پھر حجت تمام کردی ہے، تاکہ اس کے بعد بھی اگر وہ

Maktaba Tul Ishaat.com

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ
عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ
عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ ﴿۸﴾ ع

ع ۱ ۸/۲۳

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے^۸ وہ یقیناً جہنّم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترینِ خلائق ہیں^۹۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترینِ خلائق ہیں^۱۰۔ اُن کی جزا اُن کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنّتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اُس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو^۱۱۔ ع

متفرّق رہیں تو اس کی ذمہ داری اُنھی پر ہو، اللہ کے مقابلے میں وہ کوئی حُجّت پیش نہ کر سکیں۔ یہ بات قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۲۱۳-۲۵۳۔ آلِ عمران، ۱۹۔ المائدہ، ۴۴ تا ۵۰۔ یونس، ۹۳۔ الشُّوریٰ، ۱۳ تا ۱۵۔ الجاثیہ، ۱۶ تا ۱۸۔ اس کے ساتھ اگر وہ حواشی بھی پیشِ نظر رکھے جائیں جو تفہیم القرآن میں ان آیات پر ہم نے لکھے ہیں تو بات سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔

۷- یعنی جس دین کو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، اِسی دین کی تعلیم اہلِ کتاب کو اُن کے ہاں آنے والے انبیاؑ اور ان کے ہاں نازل ہونے والی کتابوں نے دی تھی، اور اُن عقائدِ باطلہ اور اعمالِ فاسدہ میں سے کسی چیز کا اُنھیں حکم نہیں دیا گیا تھا جنھیں اُنھوں نے بعد میں اختیار کر کے مختلف مذاہب بنا ڈالے۔ صحیح اور درست دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خالص اللہ کی بندگی کی جائے، اُس کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کی آمیزش نہ کی جائے، ہر طرف سے رُخ پھیر کر انسان صرف ایک اللہ کا پرستار اور تابعِ فرمان بن جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۹۔ یونس، حواشی ۱۰۸-۱۰۹۔ جلد سوم، الروم، حواشی ۴۳ تا ۴۷۔ جلد چہارم، الزُّمَر، حواشی ۳-۴)

اس آیت میں دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کو بعض مفسرین نے دین الملّۃ القیّمۃ یعنی ”راست رَو ملّت کا دین“ کے معنی میں لیا ہے، اور بعض اسے اضافتِ صفت الی الموصوف قرار دیتے ہیں اور قیمۃ کی ”ۃ“ کو علّامہ اور فہّامہ کی طرح مبالغے کی ”ۃ“ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔

۸ – یہاں کفر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے اُس رسول کے آ جانے کے بعد اُس کو نہیں مانا جس کا وجود خود ایک دلیلِ روشن ہے اور جو بالکل درست تحریروں پر مشتمل پاک صحیفے اُن کو پڑھ کر سُنا رہا ہے، ان کا انجام وہ ہے جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔

۹ – یعنی خدا کی مخلوقات میں اُن سے بدتر کوئی مخلوق نہیں ہے، حتّٰی کہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں، کیونکہ جانور عقل اور اختیار نہیں رکھتے، اور یہ عقل اور اختیار رکھتے ہوئے حق سے منہ موڑتے ہیں۔

۱۰ – یعنی وہ خدا کی مخلوقات میں سب سے، حتّٰی کہ ملائکہ سے بھی افضل و اشرف ہیں، کیونکہ فرشتے نافرمانی کا اختیار ہی نہیں رکھتے، اور یہ اُس کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرتے ہیں۔

۱۱ – بالفاظِ دیگر، جو شخص خدا سے بے خوف اور اس کے مقابلے میں جری و بے باک بن کر نہیں رہا، بلکہ دنیا میں قدم قدم پر اِس بات سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ کہیں مجھ سے ایسا کوئی کام نہ ہو جائے جو خدا کے ہاں میری پکڑ کا موجب ہو، اس کے لیے خدا کے پاس یہ جزا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الزلزال

(۹۹)

الزِّلزَال

نام پہلی ہی آیت کے لفظ زِلْزَالَهَا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اس کے مکّی اور مَدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابنِ مسعودؓ، عطا، جابر اور مجاہد کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے، اور ابنِ عباسؓ کا بھی ایک قول اس کی تائید کرتا ہے۔ بخلاف اِس کے قتادہ اور مُقاتِل کہتے ہیں کہ یہ مَدنی ہے، اور ابنِ عباسؓ سے بھی دوسرا قول اِس کے مدنی ہونے کی تائید میں نقل ہوا ہے۔ اس کے مدنی ہونے پر حضرت ابوسعیدؓ خُدری کی اُس رِوایت سے اِستِدلال کیا جاتا ہے جو ابنِ ابی حاتم نے اُن سے نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، تو میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ حضوؐر نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کیا: یہ بڑے بڑے گناہ؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں۔ میں نے عرض کیا: اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ حضوؐر نے فرمایا: ہاں۔ اس پر میں نے کہا: پھر تو میں مارا گیا۔ حضوؐر نے فرمایا: خوش ہو جاؤ اے ابوسعید! کیونکہ ہر نیکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ اِس حدیث سے اِس سورہ کے مدنی ہونے پر اِستِدلال کی بنا یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خُدری مدینہ کے رہنے والے تھے اور غزوۂ اُحُد کے بعد سن بُلوغ کو پہنچے۔ اس لیے اگر یہ سورت ان کی موجودگی میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ ان کے بیان سے ظاہر ہے، تو اسے مدنی ہونا چاہیے۔ لیکن صحابہؓ اور تابعینؒ کا جو طریقہ آیات اور سورتوں کی شانِ نزول کے بارے میں تھا، اس کی تشریح اس سے پہلے ہم سورۂ دہر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اس لیے کسی صحابی کا یہ کہنا کہ یہ آیت فُلاں موقع پر نازل ہوئی، اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس کا نزول اُسی وقت ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب پہلی مرتبہ حضوؐر کی زبانِ مبارک سے یہ سورت سنی ہو، اُس وقت اِس کے آخری حصے سے خوف زدہ ہو کر انھوں نے حضوؐر سے وہ سوالات کیے ہوں جو اُوپر درج کیے گئے ہیں، اور اس واقعے کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہو کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضوؐر سے یہ عرض کیا۔ اگر یہ رِوایت سامنے نہ ہو تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ یہ مکی سورت ہے، بلکہ اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے تو اس کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ مکہ کے بھی اُس ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جب نہایت مختصر اور انتہائی دل نشین طریقے سے اسلام کے بنیادی عقائد لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع ہے موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں اُن سب اعمال کا پورا کچّا چِٹّھا انسان کے سامنے آجانا جو اُس نے دنیا میں کیے تھے۔ سب سے پہلے تین مختصر فقروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور وہ انسان کے لیے کیسی حیران کُن ہوگی۔ پھر دو فقروں میں بتایا گیا ہے کہ یہی زمین جس پر رہ کر انسان نے بے فکری کے ساتھ ہر طرح کے اعمال کیے ہیں، اور جس کے متعلق کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ بے جان چیز کسی وقت اُس کے افعال کی گواہی دے گی، اُس روز اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے گی اور ایک ایک انسان کے متعلق یہ بیان کر دے گی کہ کس وقت کہاں اُس نے کیا کام کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اُس دن زمین کے گوشے گوشے سے انسان گروہ در گروہ اپنے مَرقَدوں سے نکل نکل کر آئیں گے، تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں، اور اعمال کی یہ پیشی ایسی مکمل اور مفصّل ہوگی کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو سامنے نہ آجائے۔

آیاتہا ۸ سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَدَنِیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿١﴾ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿٢﴾ وَ
قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿٣﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى

جب زمین اپنی پوری شدّت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی[1]، اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی[2]، اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے[3]، اُس روز وہ اپنے (اُوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی[4]، کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم

۱- اصل الفاظ ہیں: زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا۔ زلزلے کے معنی پے در پے زور زور سے حرکت کرنے کے ہیں۔ پس زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دے کر شدت کے ساتھ ہلا ڈالا جائے گا۔ اور چونکہ زمین کو ہلانے کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اِس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ زمین کا کوئی مقام، یا کوئی حصّہ، یا علاقہ نہیں بلکہ پوری کی پوری زمین ہلا ماری جائے گی۔ پھر اس زلزلے کی مزید شدّت کو ظاہر کرنے کے لیے زِلْزَالَهَا کا اُس پر اضافہ کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: ''اُس کا ہلایا جانا''۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو ایسا ہلایا جائے گا جیسا اُس جیسے عظیم کُرے کو ہلانے کا حق ہے، یا جو اُس کے ہلائے جانے کی انتہائی ممکن شدت ہو سکتی ہے۔ بعض مفسّرین نے اِس زلزلے سے مراد وہ پہلا زلزلہ لیا ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہوگا یعنی جب ساری مخلوق ہلاک ہو جائے گی اور دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک اِس سے مراد وہ زلزلہ ہے جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا، یعنی جب تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھیں گے۔ یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ بعد کا سارا مضمون اسی پر دلالت کرتا ہے۔

۲- یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ اِنْشِقَاق، آیت ۴ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ''اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی''۔ اِس کے کئی مطلب ہیں: ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے، اُن سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور بعد کا فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزا جمع ہو کر ازسرِ نَو اُسی شکل و صورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ ان کی

Maktaba Tul Ishaat.com

پہلی زندگی کے افعال واقوال اور حرکات وسکنات کی شہادتوں کا جو انبار اُس کی تہوں میں دبا پڑا ہے، اُس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اِس پر بعد کا یہ فقرہ دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسّرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے، اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اُس نے قتل کیے، حق داروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں قزاقیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اُس کے کسی کام کا نہیں ہے، بلکہ اُلٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

۳ – انسان سے مراد ہر انسان بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ زندہ ہوکر ہوش میں آتے ہی پہلا تأثّر ہر شخص پر یہی ہوگا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے، بعد میں اُس پر یہ بات کھلے گی کہ یہ روزِ حشر ہے۔ اور انسان سے مراد آخرت کا منکر انسان بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ جس چیز کو وہ غیر ممکن سمجھتا تھا، وہ اس کے سامنے برپا ہو رہی ہوگی اور وہ اس پر حیران و پریشان ہوگا۔ رہے اہلِ ایمان، تو ان پر یہ حیرانی و پریشانی طاری نہ ہوگی، اس لیے کہ سب کچھ ان کے عقیدہ و یقین کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایک حد تک اِس دوسرے معنٰی کی تائید سورۂ یٰسین کی آیت ۵۲ کرتی ہے، جس میں ذکر آیا ہے کہ اُس وقت منکرینِ آخرت کہیں گے کہ مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ''کس نے ہماری خواب گاہ سے ہمیں اُٹھا دیا؟'' اور جواب ملے گا: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَ صَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ''یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں نے سچ کہا تھا۔'' یہ آیت اِس معاملے میں صریح نہیں ہے کہ کافروں کو یہ جواب اہلِ ایمان ہی دیں گے، کیونکہ آیت میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اس امر کا احتمال ضرور ہے کہ اہلِ ایمان کی طرف سے اُن کو یہ جواب ملے گا۔

۴ – حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا: ''جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔'' فرمایا: ''وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اِس نے فُلاں دن فُلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔'' (مُسندِ احمد، ترمذی، نَسائی، ابنِ جَرِیر، عبد بن حُمَید، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیہَقی فی الشُّعَب) حضرت رَبیعۃ الخَرَشی کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ذرا زمین سے بچ کر رہنا، کیونکہ یہ تمھاری جڑ بنیاد ہے اور اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے، خواہ اچھا ہو یا بُرا۔'' (مُعجَم الطَّبَرانی) حضرت اَنَسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز زمین ہر اُس عمل کو لے آئے گی جو اس کی پیٹھ پر کیا گیا ہو۔'' پھر آپؐ نے یہی آیات تلاوت فرمائیں۔ (ابنِ مَردُوْیَہ، بَیہَقی) حضرت علیؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیا اہلِ حُقوق میں تقسیم کر کے اُسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر فرماتے: ''تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا۔''

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اُوپر گزرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم

زمانے کے آدمی کے لیے تو بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبیعی کے اِکتشافات اور سینما، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اِس دَور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اُس کے نُقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور اُن کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو اُن سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے، ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دُہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اُس وقت سن لے گا کہ یہ اُس کی اپنی ہی آوازیں ہیں، اور اس کے سب جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں، وہ اسی شخص کی آواز اور اسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے، اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اُس کے گرد وپیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر اُن پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گُھپ اندھیرے میں بھی اُس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شُعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرّک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں، کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اُس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدّمہ قائم کیا جائے گا، اُس کو ایسی مکمّل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ سب سے پہلے تو وہ نامۂ اعمال ہے جس میں ہر وقت اُس کے ساتھ لگے ہوئے کراماً کاتبین اس کے ایک ایک قول اور فعل کا ریکارڈ درج کر رہے ہیں۔ (قٓ، آیات ۱۷-۱۸۔ الانفطار، آیات ۱۰ تا ۱۲) یہ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ پڑھ اپنا کارنامۂ حیات، اپنا حساب لینے کے لیے تُو خود کافی ہے۔ (بنی اسرائیل: ۱۴) انسان اسے پڑھ کر حیران رہ جائے گا کہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اس میں ٹھیک ٹھیک درج نہ ہو۔ (الکہف: ۴۹) اِس کے بعد انسان کا اپنا جسم ہے جس سے اُس نے دنیا میں کام لیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں اُس کی اپنی زبان شہادت دے گی کہ اُس سے وہ کیا کچھ بولتا رہا ہے، اس کے اپنے ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے کہ ان سے کیا کیا کام اُس نے لیے۔ (النور: ۲۴) اس کی آنکھیں شہادت دیں گی، اس کے کان شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کیا کچھ سنا۔ اس کے جسم کی پوری کھال اس کے افعال کی شہادت دے گی۔ وہ حیران ہو کر اپنے اعضا سے کہے گا کہ تم بھی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اس کے اعضا جواب دیں گے کہ آج جس خدا کے حکم سے ہر چیز بول رہی ہے، اسی کے حکم سے ہم بھی بول رہے ہیں۔ (حٰمٓ السجدہ: ۲۰ تا ۲۲) اس پر مزید وہ شہادتیں ہیں جو زمین اور اس کے پورے ماحول سے پیش کی جائیں گی، جن میں آدمی اپنی آوازیں خود اپنے کانوں سے، اور اپنی حرکات کی ہو بہو تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل میں جو خیالات، ارادے اور مقاصد چھپے ہوئے تھے، اور جن نیتوں کے ساتھ

Maktaba Tul Ishaat.com

لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝

دیا ہوگا۔ اُس روز لوگ متفرّق حالت میں پلٹیں[۵] گے تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں[۶]۔

اس نے سارے اعمال کیے تھے، وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے، جیسا کہ آگے سورۂ عادیات میں آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے قطعی اور صریح اور ناقابلِ انکار ثبوت سامنے آجانے کے بعد انسان دم بخود رہ جائے گا اور اُس کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہے گا۔ (المرسلات، آیات ۳۵-۳۶)

۵ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا اپنی انفرادی حیثیت میں ہوگا، خاندان، جتھے، پارٹیاں، قومیں، سب بکھر جائیں گی۔ یہ بات قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس روز لوگوں سے فرمائے گا کہ ”لو، اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے جیسا ہم نے پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کیا تھا۔“ (آیت ۹۴) اور سورۂ مریم میں فرمایا: ”یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا۔“ (آیت ۸۰) اور یہ کہ ”اِن میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا۔“ (آیت ۹۵) دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ہزار ہا برس کے دوران میں جگہ جگہ مرے تھے، زمین کے گوشے گوشے سے گروہ در گروہ چلے آ رہے ہوں گے، جیسا کہ سورۂ نبا میں فرمایا گیا: ”جس روز صُور میں پھونک ماردی جائے گی، تم فوج در فوج آ جاؤ گے۔“ (آیت ۱۸) اس کے علاوہ جو مطلب مختلف مفسرین نے بیان کیے ہیں، اُن کی گنجایش لفظ اَشْتَاتًا میں نہیں ہے، اس لیے ہمارے نزدیک وہ اِس لفظ کے معنوی حُدود سے باہر ہیں، اگرچہ بجائے خود صحیح ہیں اور قرآن وحدیث کے بیان کردہ احوالِ قیامت سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۶ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اُن کو اُن کے اعمال دکھائے جائیں، یعنی ہر ایک کو بتایا جائے کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُن کو اُن کے اعمال کی جزا دکھائی جائے۔ اگرچہ یہ دوسرے معنیٰ بھی لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ کے لیے جا سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے لِيُرَوْا جَزَآءَ اَعْمَالِهِمْ (تاکہ انھیں ان کے اعمال کی جزا دکھائی جائے) نہیں فرمایا ہے، بلکہ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں) فرمایا ہے۔ اس لیے پہلے معنیٰ ہی قابلِ ترجیح ہیں، خُصوصاً جب کہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اِس کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ کافر و مومن، صالح و فاسق، تابعِ فرمان اور نافرمان، سب کو اُن کے نامۂ اعمال ضرور دیے جائیں گے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الحاقّہ، آیات ۱۹ و ۲۵، اور الانشقاق، آیات ۷ و ۱۰) ظاہر ہے کہ کسی کو اُس کے اعمال دکھانے، اور اس کا نامۂ اعمال اس کے حوالے کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ بریں زمین جب اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات پیش کرے گی تو حق و باطل کی وہ کش مکش جو ابتدا سے برپا ہے اور قیامت تک برپا رہے گی، اُس کا پورا نقشہ بھی سب کے سامنے آجائے گا، اور اس میں سب ہی دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا، اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے ان کے مقابلے میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ بعید نہیں کہ ہدایت کی طرف بلانے والوں اور ضلالت پھیلانے والوں کی ساری تقریریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سن لیں۔ دونوں طرف کی تحریروں اور لٹریچر کا پورا ریکارڈ جُوں کا تُوں سب کے سامنے لاکر رکھ دیا جائے۔ حق پرستوں پر

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

ع ۹

پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

باطل پرستوں کے ظلم، اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے معرکوں کے سارے مناظر میدانِ حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

۷- اِس ارشاد کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی کی کوئی ذرّہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہیں ہوگی جو اُس کے نامۂ اعمال میں درج ہونے سے رہ گئی ہو، اُسے وہ بہر حال دیکھ لے گا۔ لیکن اگر دیکھنے سے مراد اُس کی جزا و سزا دیکھنا لیا جائے تو اس کا یہ مطلب لینا بالکل غلط ہے کہ آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی جزا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی سزا ہر شخص کو دی جائے گی، اور کوئی شخص بھی وہاں اپنی کسی نیکی کی جزا اور کسی بدی کی سزا پانے سے نہ بچے گا۔ کیونکہ اوّل تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک ایک بُرے عمل کی سزا، اور ایک ایک اچھے عمل کی جزا الگ الگ دی جائے گی۔ دوسرے اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صالح مومن بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کی سزا پانے سے نہ بچے گا اور کوئی بدترین کافر و ظالم اور بدکار انسان بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے اچھے فعل کا اجر پائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دونوں معنی قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں، اور عقل بھی اِسے نہیں مانتی کہ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیسے سمجھ میں آنے کے قابل ہے کہ آپ کا کوئی خادم نہایت وفادار اور خدمت گزار ہو، لیکن آپ اس کے کسی چھوٹے سے قصور کو بھی معاف نہ کریں، اور اس کی ایک ایک خدمت کا اجر و انعام دینے کے ساتھ اس کے ایک ایک قصور کو گِن گِن کر ہر ایک کی سزا بھی اُسے دے ڈالیں۔ اِسی طرح یہ بھی عقلاً ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کا پَروَردہ کوئی شخص جس پر آپ کے بے شمار احسانات ہوں، وہ آپ سے غدّاری اور بے وفائی کرے اور آپ کے احسانات کا جواب ہمیشہ نمک حرامی ہی سے دیتا رہے، مگر آپ اس کے مجموعی رَوِیّے کو نظر انداز کر کے اس کی ایک ایک غدّاری کی الگ سزا، اور اس کی ایک ایک خدمت کی، خواہ وہ کسی وقت پانی لا کر دے دینے یا پنکھا جھل دینے ہی کی خدمت ہو، الگ جزا دیں۔ اب رہے قرآن و حدیث، تو وہ وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومنِ صالح، مومنِ خطا کار، مومنِ ظالم و فاسق، محض کافر، اور کافرِ مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصّل قانون بیان کرتے ہیں، اور یہ جزا و سزا دنیا سے آخرت تک انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

اس سلسلے میں قرآنِ مجید اُصولی طور پر چند باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ کافر و مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے) ضائع کر دیے گئے، آخرت میں

Maktaba Tul Ishaat.com

وہ ان کا کوئی اجر نہیں پاسکیں گے۔ اُن کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں اُن کومل جائے گا۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الاعراف ۱۴۷۔ التوبہ ۱۷۔ ۶۷ تا ۶۹۔ ہود ۱۵۔۱۶۔ ابراہیم ۱۸۔ الکہف ۱۰۴۔۱۰۵۔ النور ۳۹۔ الفرقان ۲۳۔ الاحزاب ۱۹۔ الزُمر ۶۵۔ الاحقاف ۲۰)

دوم، یہ کہ بدی کی سزا اُتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے، مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی، بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے ۱۰ گُنا ہے، اور کہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کردے۔ (مُلاحظہ ہو: البقرہ ۲۶۱۔ الانعام ۱۶۰۔ یونُس ۲۶۔۲۷۔ النور ۳۸۔ القصص ۸۴۔ سبا ۳۷۔ المومن ۴۰)

سوم، یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں گے تو اُن کے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (النساء ۳۱۔ الشوریٰ ۳۷۔ النجم ۳۲)

چہارم، یہ کہ مومنِ صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اس کی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔ (العنکبوت ۷۔ الزُمر ۳۵۔ الاحقاف ۱۶۔ الانشقاق ۸)

احادیث بھی اِس معاملے کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ انشقاق کی تفسیر میں وہ احادیث نقل کر چکے ہیں جو قیامت کے روز ہلکے حساب اور سخت حساب فہمی کی تشریح کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمائی ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، الانشقاق، حاشیہ ۶) حضرت اَنَسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! کیا میں اُس ذرہ برابر بُرائی کا نتیجہ دیکھوں گا جو مجھ سے سرزد ہوئی؟" حضورؐ نے فرمایا: "اے ابوبکرؓ! دنیا میں جو معاملہ بھی تمھیں ایسا پیش آتا ہے جو تمھیں ناگوار ہو، وہ اُن ذرّہ برابر برائیوں کا بدلہ ہے جو تم سے صادر ہوں، اور جو ذرّہ برابر نیکیاں بھی تمھاری ہیں، انھیں اللہ آخرت میں تمھارے لیے محفوظ رکھ رہا ہے۔" (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، بَیہقی فی الشُّعب، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَردُوْیَہ، عَبد بن حُمَید) حضرت ابوایوب انصاریؓ سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا اس کی جزا آخرت میں ہے، اور جو کسی قسم کی برائی کرے گا وہ اِسی دنیا میں اُس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا۔" (ابنِ مَردُوْیَہ) قَتَادَہ نے حضرت اَنَسؓ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے اور آخرت میں ان کی جزا دے گا۔ رہا کافر، تو دنیا میں اس کی بھلائیوں کا بدلہ چُکا دیا جاتا ہے، پھر جب قیامت ہوگی تو اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی۔" (ابنِ جَرِیر) مَسرُوق حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عبداللہ بن جُدعان جاہلیت کے زمانے میں صلۂ رحمی کرتا تھا، مسکین کو کھانا کھلاتا تھا، مہمان نواز تھا، اسیروں کو رہائی دلواتا تھا۔ کیا آخرت میں یہ اس کے لیے نافع ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، اس نے مرتے وقت تک کبھی یہ نہیں کہا کہ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ، "میرے پروردگار! روزِ جزا میں میری خطا معاف کیجیو۔" (ابنِ جَرِیر) اِسی طرح کے جوابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اور لوگوں کے بارے

میں بھی دیے ہیں جو جاہلیّت کے زمانے میں نیک کام کرتے تھے، مگر مرے کفر و شرک ہی کی حالت میں تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی نیکی اُسے جہنّم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی، البتہ جہنّم میں اُس کو وہ سخت سزا نہ دی جائے گی جو ظالم اور فاسق اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔ مثلاً: حدیث میں آیا ہے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے اُس کو ہلکا عذاب دیا جائے گا۔ (رُوح المعانی)

تاہم یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبّہ کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کسی چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسی بہت سی نیکیاں مل کر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک بہت بڑی نیکی قرار پا سکتی ہیں، اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بدی کا ارتکاب بھی نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے گناہ مل کر گناہوں کا ایک انبار بن سکتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو متعدّد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عَدِیؓ بن حاتم سے یہ روایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''دوزخ کی آگ سے بچو، خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دینے یا ایک اچھی بات کہنے ہی کے ذریعے سے ہو۔'' اِنہی حضرت عَدِیؓ سے صحیح روایت میں حضورؐ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ''کسی نیک کام کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ کسی پانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول ڈال دینا ہو، یا یہی نیکی ہو کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو۔'' بخاری میں حضرت ابو ہُرَیرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے، خواہ وہ بکری کا ایک کُھر ہی کیوں نہ ہو۔'' مُسندِ احمد، نَسائی اور ابنِ ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے: ''اے عائشہؓ! ان گناہوں سے بچی رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی پُرسش بھی ہونی ہے۔'' مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''خبردار! چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سب آدمی پر جمع ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیں گے۔'' (گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کے فرق کو سمجھنے کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۵۳۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۳۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

العادیات

(۱۰۰)

العادیات

نام پہلے ہی لفظ اَلْعٰدِیٰتِ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اِس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، جابر، حَسَن بصری، عِکرِمہ اور عطا کہتے ہیں کہ یہ مکّی ہے۔ حضرت اَنسؓ بن مالک اور قتادہ کہتے ہیں کہ مدنی ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سورت مکّی ہے، اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن سورت کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکّی ہے، بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا مقصود لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اُس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ لوگوں کو اس بات سے خبردار بھی کرنا ہے کہ آخرت میں صرف اُن کے ظاہری افعال ہی کی نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے اَسرار تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔

اِس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اُس عام بدامنی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے سارا مُلک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کُشت و خون برپا تھا، لُوٹ مار کا بازار گرم تھا، قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چَین سے نہیں گزار سکتا تھا، کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لُٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لُوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لُوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بُری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ اِس صورتِ حال کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں خدا کے حضور جواب دہی سے ناواقف ہو کر انسان اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو ظلم و ستم اور غارت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ مال و دولت کی محبّت میں اندھا ہو کر ہر طریقے سے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور گھناؤنا طریقہ ہو، اور اُس کی حالت خود اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کر کے اس کی ناشکری کر رہا ہے۔ اُس کی یہ رَوِش ہرگز نہ ہوتی اگر وہ اُس وقت کو جانتا ہوتا جب قبروں سے زندہ ہو کر اُٹھنا ہوگا، اور جب وہ ارادے اور وہ اغراض و مقاصد تک دلوں سے نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے جن کی تحریک سے اُس نے دنیا میں طرح طرح کے کام کیے تھے۔ اُس وقت انسانوں کے رب کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور کس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایاتها ۱۱ — سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ

قسم ہے اُن (گھوڑوں) کی جو پُھنکارے مارتے ہوئے دَوڑتے ہیں[1]، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں[2]، پھر صبح سویرے چھاپا مارتے ہیں[3]، پھر اس موقع پر گردوغبار اُڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا

۱- آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دَوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، بلکہ صرف وَالْعٰدِيٰتِ (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے مفسّرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کا ایک گروہ اِس طرف گیا ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں۔ لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضَبْح کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدّتِ تنفّس سے نکلتی ہے، اور بعد کی آیات بھی جن میں چنگاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپا مارنے اور وہاں گرد اُڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لیے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں۔ ابنِ جَریر کہتے ہیں کہ "دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابلِ ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ اُونٹ ضَبح نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضَبح کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُن دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضَبح کرتے ہیں۔" امام رازی کہتے ہیں کہ "اِن آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ ضَبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی، اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر سُموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا، اور اسی طرح صبح سویرے چھاپا مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعے سے سہل ہوتا ہے۔"

۲- چنگاریاں جھاڑنے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہیں، کیونکہ رات ہی کو ان کی ٹاپوں سے جھڑنے والے شرارے نظر آتے ہیں۔

۳- اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر اُنھیں چھاپا مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ دشمن خبردار نہ ہوسکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے، اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دُور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلے کے لیے تیار ہو جائے۔

لَكَنُوْدٌ ۚ ۝ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ ۝ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝

بڑا ناشکرا ہے،[۴] اور وہ خود اِس پر گواہ ہے،[۵] اور وہ مال و دولت کی محبّت میں بُری طرح مُبتلا ہے۔[۶]

۴ – یہ ہے وہ بات جس پر اُن گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پُھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر صبح سویرے غبار اُڑاتے ہوئے کسی بستی پر جا پڑتے ہیں اور مدافعت کرنے والوں کی جماعت میں گُھس جاتے ہیں۔ تعجب اِس پر ہوتا ہے کہ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے مراد غازیوں کے گھوڑے لیے ہیں اور جس مجمع میں ان کے جا گُھسنے کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے مراد اُن کے نزدیک کفار کا مجمع ہے۔ حالانکہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ "انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔" اب یہ ظاہر ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں غازیوں کے گھوڑوں کی دوڑ دھوپ اور کفار کے کسی مجمع پر اُن کا ٹوٹ پڑنا اِس امر پر کوئی دلالت نہیں کرتا کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے، اور نہ بعد کے یہ فقرے کہ انسان اپنی اس ناشکری پر خود گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبّت میں بُری طرح مبتلا ہے، اُن لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، اُن کا اشارہ دراصل اُس عام کُشت و خون اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اُس وقت برپا تھی۔ جاہلیّت کے زمانے میں رات ایک بہت خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کون سا دشمن اُن پر چڑھائی کرنے کے لیے آ رہا ہو، اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ رات خیریت سے گزر گئی۔ وہاں قبیلوں کے درمیان محض انتقامی لڑائیاں ہی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اِس غرض کے لیے بھی چھاپے مارتے رہتے تھے کہ ان کی دولت لُوٹ لیں، ان کے مال مویشی ہانک لے جائیں، اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیں۔ اس ظلم و ستم اور غارت گری کو، جو زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر ہی کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ اِس امر کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یعنی جس طاقت کو وہ جنگ و جدل اور غارت گری میں استعمال کر رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس لیے تو نہیں دی تھی کہ اس سے یہ کام لیا جائے۔ پس درحقیقت یہ بہت بڑی ناشکری ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اِن وسائل اور اس کی بخشی ہوئی اِن طاقتوں کو اُس فساد فی الارض میں استعمال کیا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

۵ – یعنی اُس کا ضمیر اس پر گواہ ہے، اُس کے اعمال اِس پر گواہ ہیں، اور بہت سے کافر انسان خود اپنی زبان سے عَلانِیَہ ناشکری کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک خدا ہی سرے سے موجود نہیں، کجا کہ وہ اپنے اُوپر اس کی کسی نعمت کا اعتراف کریں اور اس کا شکر اپنے ذمّے لازم سمجھیں۔

۶ – اصل الفاظ ہیں: وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "وہ خیر کی محبّت میں بہت سخت ہے۔" لیکن عربی زبان میں خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ مال و دولت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۰ میں خیر بمعنیٰ مال و دولت ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ بات کلام کے موقع و محل سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں خیر کا لفظ نیکی کے معنیٰ میں ہے اور کہاں مال و دولت کے معنیٰ میں۔ اِس آیت کے سیاق و سباق سے خود ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے

Maktaba Tul Ishaat.com

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ ۝٩ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ ۝١٠
اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝١١ ع

تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے گا،[7] اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی؟[8] یقیناً اُن کا رب اُس روز اُن سے خوب باخبر ہوگا۔[9] ع

کہ اِس میں ”خیر“ مال و دولت کے معنیٰ میں ہے، نہ کہ بھلائی اور نیکی کے معنیٰ میں، کیونکہ جو انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے خود اپنی ناشکری پر شہادت دے رہا ہے، اُس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نیکی اور بھلائی کی محبّت میں بہت سخت ہے۔

۷ – یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں کی شکل میں اُٹھایا جائے گا۔

۸ – یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیّتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار، اور ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرّکات (motives) چھُپے ہوئے ہیں، وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے، اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور بُرائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھُپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو جو کام انسان نے کیے، وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اُصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اُسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرّکات کارفرما رہے ہیں ان کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیّتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز اِن رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھُلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دکھا دیا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اِسی لیے حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنیٰ کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اُتار کر مغز نکالنا، اور مختلف قسم کی چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں

میں چھپے ہوئے اَسرار کی تحصیل میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ اُن کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی، اور ان کو چھانٹ کر بُرائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی۔ یہی مضمون سورۂ طارق میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ''جس روز پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال ہوگی۔''(آیت ۹)

۹ – یعنی اُس کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کس سزا یا جزا کا مستحق ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

القارِعہ

(۱۰۱)

القارِعہ

نام پہلے لفظ اَلْقَارِعَۃُ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں سارا ذکر قیامت ہی کا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکّی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع ہے قیامت اور آخرت۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ کہہ کر چونکایا گیا ہے کہ عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ اِس طرح سامعین کو کسی ہولناک واقعے کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کرنے کے بعد دو فقروں میں ان کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے کہ اُس روز لوگ گھبراہٹ کے عالَم میں اِس طرح ہر طرف بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، ان کی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ دُھنکے ہوئے اُون کی طرح ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب لوگوں کا حساب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی تو اُس میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ کس شخص کے نیک اعمال برے اعمال سے زیادہ وزنی ہیں، اور کس کے نیک اعمال کا وزن اس کے بُرے اعمال کی بہ نسبت ہلکا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ عیش نصیب ہوگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اُس گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

رکوعاتھا ۱ | سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ | آیاتھا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۳﴾ يَوْمَ
يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ
الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ
رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ ع

ع ۱ ۲۲

عظیم حادثہ[1]! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے[2]۔ پھر[3] جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا، اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے[4] اُس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی[5]۔ اور تمھیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ[6]۔ ع

۱- اصل میں لفظ قَارِعہ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے: "ٹھونکنے والی"۔ قَرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں جس سے سخت آواز نکلے۔ اس لُغوی معنی کی مناسبت سے قارِعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں: قَرَعَتْهُمُ الْقَارِعَه، یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آ گئی ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی ایک جگہ یہ لفظ کسی قوم پر بڑی مصیبت نازل ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ رَعد میں ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ "جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے۔" (آیت ۳۱) لیکن یہاں القارعہ کا لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور سورۂ الحاقّہ میں بھی قیامت کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (آیت ۴) اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالمِ آخرت کا یکجا ذکر ہو رہا ہے۔

۲- یہاں تک قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ یعنی جب وہ حادثۂ عظیم برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا

نظام دَرہم برہم ہو جائے گا، اس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ و منتشر ہوتے ہیں، اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ رنگ برنگ کے اُون سے پہاڑوں کو تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ اُن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

۳- یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے، جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔

۴- اصل میں لفظ مَوَازِین استعمال ہوا ہے جو مَوزُون کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور میزان کی جمع بھی۔ اگر اس کو مَوزُون کی جمع قرار دیا جائے تو مَوَازِین سے مراد وہ اعمال ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وزن ہو، جو اس کے ہاں کسی قدر کے مستحق ہوں۔ اور اگر اسے میزان کی جمع قرار دیا جائے تو مَوَازِین سے مراد ترازو کے پلڑے ہوں گے۔ پہلی صورت میں مَوَازِین کے بھاری اور ہلکے ہونے کا مطلب نیک اعمال کا بُرے اعمال کے مقابلے میں بھاری یا ہلکا ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف نیکیاں ہی وزنی اور قابلِ قدر ہیں۔ دوسری صورت میں مَوَازِین کے بھاری ہونے کا مطلب اللہ جَلَّ شانُہٗ کی میزانِ عدل میں نیکیوں کے پلڑے کا برائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہونا ہے، اور اُن کے ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں کا پلڑا بُرائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ عَرَبی زبان کے محاورے میں میزان کا لفظ وزن کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اِس معنیٰ کے لحاظ سے وزن کے بھاری اور ہلکا ہونے سے مراد بھلائیوں کا وزن بھاری یا ہلکا ہونا ہے۔ بہر حال مَوَازِین کو خواہ موزون کے معنیٰ میں لیا جائے، یا میزان کے معنیٰ میں، یا وزن کے معنیٰ میں، مدّعا ایک ہی رہتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی اعمال کی جو پونجی لے کر آیا ہے، وہ وزنی ہے، یا بے وزن، یا اس کی بھلائیوں کا وزن اُس کی بُرائیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر آیا ہے، جن کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے "اور وزن اُس روز حق ہوگا، پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے۔" (آیات ۸-۹) سورۂ کہف میں ارشاد ہوا: "اے نبی! اِن لوگوں سے کہو: کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جُہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے، قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔" (آیات ۱۰۴-۱۰۵) سورۂ انبیاء میں فرمایا: "قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم لے آئیں گے، اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔" (آیت ۴۷) اِن آیات سے معلوم ہوا کہ کفر اور حق سے انکار بجائے خود اتنی بڑی بُرائی ہے کہ وہ بُرائیوں کے پلڑے کو لازماً جُھکا دے گی، اور کافر کی کوئی نیکی ایسی نہ ہوگی کہ بھلائیوں کے پلڑے میں اُس کا کوئی وزن ہو جس سے اُس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے

Maktaba Tul Ishaat.com

میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے ساتھ اُن نیکیوں کا وزن بھی جو اس نے دنیا میں کیں۔ دوسری طرف اُس کی جو بدی بھی ہوگی، وہ بدی کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آیا نیکی کا پلڑا جُھکا ہوا ہے یا بدی کا۔

۵ – اصل الفاظ ہیں: اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ، ''اُس کی ماں ہاوِیہ ہوگی''۔ ہاوِیَہ ہویٰ سے ہے، جس کے معنیٰ اونچی جگہ سے نیچی جگہ گرنے کے ہیں اور ہاوِیہ اُس گہرے گڑھے کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے۔ جہنّم کو ہاویہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ بہت عَمِیق ہوگی اور اہلِ جہنّم اس میں اُوپر سے پھینکے جائیں گے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس کی ماں جہنّم ہوگی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماں کی گود بچے کا ٹھکانا ہوتی ہے، اسی طرح آخرت میں اہلِ جہنّم کے لیے جہنّم کے سوا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔

۶ – یعنی وہ محض ایک گہری کھائی ہی نہ ہوگی بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

تفہیم القرآن

التکاثُر

(۱۰۲)

Maktaba Tul Ishaat.com

التکاثر

نام پہلی آیت کے لفظ التَّكَاثُرُ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابو حیان اور شوکانی کہتے ہیں کہ یہ تمام مفسّرین کے نزدیک مکّی ہے، اور امام سُیوطی کا قول ہے کہ مشہور ترین بات یہی ہے کہ یہ مکّی ہے، لیکن بعض روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر اسے مدنی کہا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

ابنِ ابی حاتم نے ابو بُریدہؓ کی رِوایت نقل کی ہے کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی الحرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کے مَفاخر بیان کیے، پھر قبرستان جا کر اپنے اپنے مرے ہوئے لوگوں کے مَفاخر پیش کیے۔ اس پر یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ لیکن شانِ نُزول کے بارے میں صحابہؓ و تابعینؒ کا جو طریقہ تھا، اُس کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو یہ روایت اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ سورۂ تکاثُر اسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اِن دونوں قبیلوں کے اِس فعل پر یہ سورت چسپاں ہوتی ہے۔

امام بخاری اور ابنِ جَریر نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کو کہ لو ان لابن اٰدم وادیین من مال لتمنّٰی وادیًا ثالثًا ولا یَمْلأُ جوف ابن اٰدم الّا التراب (اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنّا کرے گا۔ ابنِ آدم کا پیٹ مٹّی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا) قرآن میں سے سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔“ اس حدیث کو سورۂ تکاثُر کے مَدَنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ حضرت اُبَیؓ مدینے میں مسلمان ہوئے تھے۔ مگر حضرت اُبَیؓ کے اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحابۂ کرامؓ کس معنٰی میں حضورؐ کے اس ارشاد کو قرآن میں سے سمجھتے تھے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اسے قرآن کی ایک آیت سمجھتے تھے، تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ صحابہؓ کی عظیم اکثریت اُن اصحاب پر مشتمل تھی جو قرآن کے حرف حرف سے واقف تھے، ان کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہوسکتی تھی کہ یہ حدیث قرآن کی ایک آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں سے ہونے کا مطلب قرآن سے ماخوذ ہونا لیا جائے، تو اس روایت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مدینۂ طیبہ میں جو اصحاب داخلِ اسلام ہوئے تھے، انھوں نے جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سورت سنی تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے، اور پھر حضورؐ کے مذکورۂ بالا ارشاد کے متعلق اُن

کو یہ خیال ہوا کہ وہ اِسی سورت سے ماخوذ ہے۔

ابنِ جَرِیر، تِرْمِذِی اور ابن المُنْذِر وغیرہ محدثین نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم عذابِ قبر کے بارے میں برابر شک میں پڑے رہے، یہاں تک کہ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔" اِس کو سورۂ تکاثُر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ عذابِ قبر کا ذکر مدینے ہی میں ہوا تھا، مکّے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ قرآن کی مکّی سورتوں میں بکثرت مقامات پر قبر کے عذاب کا ایسے صریح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الاَنعام، آیت ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ المومنون ۹۹-۱۰۰۔ المومن ۴۵-۴۶۔ یہ سب مکّی سورتیں ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ کے ارشاد سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا مکّی سورتوں کے نُزول سے پہلے سورۂ تکاثُر نازل ہو چکی تھی، اور اُس کے نُزول نے عذابِ قبر کے بارے میں صحابہؓ کے شک کو دُور کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اِن روایات کے باوجود مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکّی ہونے پر متفق ہے۔ ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ مکّی سورت ہے، بلکہ اس کا مضمون اور اندازِ بیان یہ بتا رہا ہے کہ یہ مکّے کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت، اور دنیوی فائدے اور لذّتیں اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اور انھی چیزوں کے حُصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور اِس ایک فکر نے اُن کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انھیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اِس کے بُرے انجام پر متنبہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمھاری آزمایش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جواب دِہی کرنی ہوگی۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۸ سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے[۱]، یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو[۲]۔ ہرگز نہیں، عنقریب

۱ – اصل میں اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ فرمایا گیا ہے، جس کے معنیٰ میں اتنی وسعت ہے کہ ایک پوری عبارت میں بمشکل اس کو ادا کیا جاسکتا ہے۔

اَلْهٰكُمْ لہو سے ہے جس کے اصل معنیٰ غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں مُنہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اِس مادّے سے جب اَلْهٰكُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمھیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اِس اِنہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

تکاثُر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنیٰ ہیں: ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حُصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اِس بات پر فخر جتائیں کہ انھیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنیٰ ہوئے: تکاثُر نے تمھیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دُھن نے تمھیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثُر میں کس چیز کی کثرت۔ اور اَلْهٰكُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْهٰكُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مُخاطَب کون لوگ ہیں۔ اِس عدمِ تصریح کی وجہ سے اِن الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہُوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثُر کے معنیٰ محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائل قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جُہد کرنا، ان کے حُصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہُوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اَلْهٰكُمْ کے مخاطَب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطَب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے، اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار

تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ
الۡيَقِيۡنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ
لَتُسۡـَٔـلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ﴿۸﴾ ع

ع ۸ ۱۴

تم کو معلوم ہو جائے گا۔[۳] پھر (سُن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اِس رَوِش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔[۴] ع

ہے اور اقوام پر بھی۔ اِسی طرح اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثُر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اُس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اِس تکاثُر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حُدود اور اخلاقی ذمّہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حق داروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملے میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں۔ انھیں معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ اُنھیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اِس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُنھیں عیش و عشرت اور جسمانی لذّتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اِس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اِس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اِس رَوِش کا انجام کیا ہے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملے میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اِس بات کی فکر اُنھیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سر و سامان ہے۔ غرض تکاثُر کی بے شمار صورتیں ہیں جنھوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ اُنھیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذّتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔

۲- یعنی تم اپنی ساری عمر اسی کوشش میں کھپا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمھارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

۳- یعنی تمھیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ عنقریب اِس کا بُرا انجام تمھیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لو گے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ اَزل سے اَبد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے، اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہے، اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کُھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے، وہ اس کے لیے سعادت وخوش بختی کا ذریعہ تھے یا بدانجامی و بدبختی کا ذریعہ۔

۴ – اس فقرے میں ''پھر'' کا لفظ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جواب طلبی کی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر یہ خبر بھی ہم تمھیں دیے دیتے ہیں کہ تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سوال عدالتِ الٰہی میں حساب لینے کے وقت ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متعدّد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بندوں کو دی ہیں ان کے بارے میں جواب دِہی مومن و کافر سب ہی کو کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں نے کُفرانِ نعمت نہیں کیا اور شکر گزار بن کر رہے وہ اس محاسبے میں کامیاب رہیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے قول یا عمل سے، یا دونوں سے ان کی ناشکری کی وہ اس میں ناکام ہوں گے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہم نے آپؐ کو تر و تازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ''یہ اُن نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔'' (مُسْندِ احمد، نَسائی، ابنِ جَریر، ابن المُنْذِر، ابنِ مَرْدُوْیہ، عَبد بن حُمَید، بَیْہقی فی الشُّعَب)

حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ چلو، ابوالہَیثَم بن التَّیِّہان انصاریؓ کے ہاں چلیں۔ چنانچہ ان کو لے کر آپؐ ابن التَّیِّہانؓ کے نخلستان میں تشریف لے گئے۔ انھوں نے لاکر کھجوروں کا ایک خوشہ رکھ دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: تم خود کیوں نہ کھجوریں توڑ لائے؟ انھوں نے عرض کیا: میں چاہتا تھا کہ آپ حضرات خود چھانٹ چھانٹ کر کھجوریں تناول فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے کھجوریں کھائیں اور ٹھنڈا پانی پیا۔ فارغ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں تمھیں قیامت کے روز جواب دِہی کرنی ہوگی، یہ ٹھنڈا سایہ، یہ ٹھنڈی کھجوریں، یہ ٹھنڈا پانی۔'' (اِس قصّے کو مختلف طریقوں سے مسلم، ابنِ ماجہ، ابوداؤد، تِرمِذی، نَسائی، ابنِ جَریر اور ابو یعلیٰ وغیرہم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے، جن میں سے بعض میں اُن انصاری بزرگ کا نام لیا گیا ہے اور بعض میں صرف انصار میں سے ایک شخص کہا گیا ہے۔ اس قصّے کو مختلف طریقوں سے متعدّد تفصیلات کے ساتھ ابنِ ابی حاتم نے حضرت عمرؓ سے، اور امام احمدؒ نے ابو عَسیبؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سے نقل کیا ہے۔ ابنِ حِبّان اور ابنِ مَرْدُوْیہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب اسی طرح کا واقعہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے ہاں پیش آیا تھا۔)

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوال صرف کفّار ہی سے نہیں، مومنینِ صالحین سے بھی ہوگا۔ رہیں خدا کی وہ نعمتیں جو اُس نے انسان کو عطا کی ہیں، تو وہ لامحدود ہیں، اُن کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں کہ انسان کو اُن کی خبر بھی نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم اُن کا پورا شمار نہیں کرسکتے۔'' (ابراہیم: ۳۴) اِن نعمتوں میں سے بے حد و حساب نعمتیں تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ

نے براہِ راست انسان کو عطا کی ہیں، اور بکثرت نعمتیں وہ ہیں جو انسان کو اُس کے اپنے کسب کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ انسان کے کسب سے حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اُس کو جواب دِہی کرنی پڑے گی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں اُسے حساب دینا ہوگا کہ اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ اور مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے متعلق اُس کو بتانا پڑے گا کہ آیا اُس نے اِس امر کا اعتراف کیا تھا کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر دل، زبان اور عمل سے اُس کا شکر ادا کیا تھا؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا ہے؟ یا یہ خیال کیا تھا کہ بہت سے خدا ان کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ عقیدہ رکھا تھا کہ یہ ہیں تو خدا ہی کی نعمتیں، مگر ان کے عطا کرنے میں بہت سی دوسری ہستیوں کا بھی دخل ہے اور اِس بنا پر انھیں معبود ٹھیرا لیا تھا اور انھی کے شکریے ادا کیے تھے؟

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

العصر

(۱۰۳)

العصر

نام پہلی آیت کے لفظ اَلْعَصْرِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ مجاہد، قَتَادَہ اور مُقاتل نے اِسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اِس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ اُن کو سن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں، اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اِس کے اندر چند جچے تُلے الفاظ میں معنیٰ کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے، جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اِس میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعیؒ نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اِس سورت پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی نگاہ میں اِس کی اہمیّت کیا تھی، اُس کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حِصْن الدّارمی ابومَدِینہ کی روایت کے مطابق اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے، جب تک ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سنا لیتے۔ (طَبَرانی)

Maktaba Tul Ishaat.com

۳ آیاتہا

سورۃ العصر مکیۃ

رکوعاتہا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾

ع ۲۸

زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔[۱]

۱- اِس سورت میں زمانے کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اِس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان۔ (۲) عملِ صالح۔ (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا۔ (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اب اِس کے ایک ایک جُز کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے، تاکہ اس ارشاد کا پورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اِس سے پہلے بارہا ہم اِس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اِس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی، جس میں حال درحقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر آن گزر کر ماضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر آن آ کر مستقبل کو حال، اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے دونوں طرح کے زمانے اُس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے، وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے، وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اُس کی مثال اُس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے، اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اِسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ

چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کرلیتی ہے، اور خدا کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں، خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ تاہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سُوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں، سب کچھ اُس محدود مدتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازیؒ نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے سورۂ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گُھلا جا رہا ہے، رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گُھلا جا رہا ہے۔ اُس کی یہ بات سُن کر میں نے کہا: یہ ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا مطلب۔ عُمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے، وہ برف کے گُھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اِس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔" پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اِس سورہ میں کہی گئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ اِن چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مُہلتِ عمر کو صرف کر رہا ہے، وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو اِن چاروں صفات سے مُتّصِف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالبِ علم سے، جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالبِ علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو مُستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متّصف ہوں، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اِسمِ جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام اور پوری نوعِ انسانی پر یکساں ہوتا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہوگا، خواہ اُن سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لیے مُہلک ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زہر بہر حال مہلک ہے، خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پوری قوم، یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ زہر کی مُہلک خاصیّت اپنی جگہ اٹل ہے، اُس میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھایا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہوگیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اِسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورۂ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اِس قاعدۂ کُلیّہ میں اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص اُن سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بدعملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگیٔ نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کرلیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآنِ مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لُغت کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اِس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں گھاٹا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب

Maktaba Tul Ishaat.com

سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ قرآنِ مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصوّرِ فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصوّرِ خُسران بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خُسران، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اِس سے پہلے ہم متعدّد مقامات پر کر چکے ہیں، اس لیے اُن کے اعادے کی حاجت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۔ الانفال، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حاشیہ ۲۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۷۔ المومنون، حواشی ۱-۲-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۔ الزُّمَر، حاشیہ ۳۴) اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسارہ وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اِس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اِسی دنیا میں خسارہ ہے، اور جس چیز کو لوگ خسارہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خسارہ نہیں ہے بلکہ اِس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اِس حقیقت کو قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۳۔ طٰہٰ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد ششم، الّیل، حواشی ۳-۵) پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ ”درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے“، تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اِس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اِس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اِس سورت کی رُو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآنِ مجید میں محض زبانی اقرارِ ایمان کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷، المائدہ، آیت ۵۴- الانفال، آیت ۲۰-۲۷، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصّف، آیت ۲ میں)، لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنیٰ ہی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اِس لفظ کے یہی معنیٰ ہیں۔ لُغت میں اٰمَنَ لَہٗ کے معنیٰ ہیں: صَدَّقَہٗ وَاعْتَمَدَ عَلَیْہِ (اُس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا) اور اٰمَنَ بِہٖ کے معنیٰ ہیں: اَیْقَنَ بِہٖ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو اِن آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا۔ (الحجرات: ۱۵)	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔
اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰمٓ السجدہ: ۳۰)	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (الانفال: ۲)
جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۶۵)
اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبّت رکھتے ہیں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء: ۶۵)
پس نہیں، (اے نبیؐ!) تمھارے رب کی قسم! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمھیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

اِن سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (النساء: ۱۳۶)
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآنِ مجید میں پوری طرح اِس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس سے مراد اوّلاً، اللہ کو ماننا ہے۔ محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اِس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اِس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دُعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکُّل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیّت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اِسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاؑ اور کُتبِ الٰہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسولؐ نے دی ہیں۔ ثالثاً، آخرت کو ماننا، اِس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اِس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اِس محاسبے میں جو لوگ نیک قرار پائیں انھیں جزا اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے، جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو، وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے، جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے، وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رُو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عملِ صالح نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں ہر جگہ عملِ صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اِس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عملِ بلا ایمان پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عملِ صالح محض ایک دعویٰ ہے، جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اِس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کا تعلّق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اِسی بنا پر قرآنِ پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انھی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عملِ صالح کریں، اور یہی بات اِس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر، عملِ صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورۂ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہییں۔ اِس کے بعد یہ سورت دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اِس کے معنٰی یہ ہیں کہ اوّل تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اِس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے، اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ایک، صحیح اور سچی اور مطابقِ عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلّق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو، یا بندوں کا حق، یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں، بلکہ اِس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اُٹھائے، کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راست بازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اِس طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ

خُسران سے نہیں بچ سکتا، اور اِس خُسران میں وہ لوگ بھی آخرِ کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۂ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، اور اِس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (آیات ۷۸-۷۹) پھر اِسی بات کو سورۂ اَعراف میں اِس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کُھلّم کُھلّا سَبْت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا، اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اِس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶) اور اِسی بات کو سورۂ اَنفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ (آیت ۲۵) اِسی لیے امر بالمعروف اور نہی عَنِ المنکر کو اُمّتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آلِ عمران: ۱۰۴)، اور اُس امت کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہلِ ایمان اور اُن کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرطِ لازم قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اِس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مَشقّتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمّت بندھاتا رہے کہ وہ اِن حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الدّہر، حاشیہ ۱۶۔ البَلَد، حاشیہ ۱۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الھُمَزَہ

(۱۰۴)

الھمزہ

نام

پہلی آیت کے لفظ ھُمَزَۃٍ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اس کے مکی ہونے پر تمام مفسّرین کا اتفاق ہے، اور اس کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

اس میں چند ایسی اخلاقی بُرائیوں کی مذمّت کی گئی ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں زر پرست مال داروں کے اندر پائی جاتی تھیں، جنھیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ بُرائیاں فی الواقع اُس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور جن کو سب ہی بُرا سمجھتے تھے، کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اِس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن لوگوں کا کیا انجام ہوگا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک طرف یہ کردار، اور دوسری طرف آخرت میں اُس کا یہ انجام) ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اِس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اِس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے، اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہی نظر آتے ہیں، اِس لیے آخرت کا برپا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔

اِس سورت کو اگر اُن سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورۂ زِلزال سے یہاں تک چلی آرہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اُس کی اَخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زِلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اُس کے سامنے نہ آجائے۔ سورۂ عادیات میں اُس لُوٹ مار، کُشت و خون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اُس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اِسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمھارے افعال ہی کی نہیں، تمھاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی، اور تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورۂ قارِعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا بُرے انجام کا انحصار اِس پر ہوگا کہ اُس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثُر میں اُس مادّہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش و آرام اور جاہ و منزلت زیادہ سے زیادہ حاصل

Maktaba Tul Ishaat.com

کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اِس غفلت کے بُرے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی خوانِ یغما نہیں ہے کہ اُس پر تم جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمھیں مل رہی ہے، اُس کے لیے تمھیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا، اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتّیٰ کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے، اگر اُس کے افراد میں ایمان وعملِ صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اِس کے معاً بعد سورۂ ہُمَزَہ آتی ہے، جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟

آیاتھا ۹ | سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ | رکوعاتھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴿۱﴾ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ يَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ﴿۴﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا الْحُطَمَةُ ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿۷﴾
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۸﴾ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾ ع ۲۹

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) بُرائیاں کرنے کا خوگر ہے[1]۔ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گِن گِن کر رکھا[2]۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا[3]۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چُور کر دینے والی[4] جگہ میں پھینک دیا جائے گا[5]۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چُور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ[6]، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی[7]۔ وہ اُن پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی[8] (اِس حالت میں کہ وہ) اُونچے اُونچے ستونوں میں (گھِرے ہوئے ہوں[9] گے)۔[10]

۱- اصل الفاظ ہیں: هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ عربی زبان میں ھَمْز اور لَمْز معنیٰ کے اعتبار سے باہم اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں ہم معنیٰ استعمال ہوتے ہیں، اور کبھی دونوں میں فرق ہوتا ہے، مگر ایسا فرق کہ خود اہلِ زبان میں سے کچھ لوگ ھَمْز کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ وہی مفہوم لَمْز کا بیان کرتے ہیں، اور اس کے برعکس کچھ لوگ لَمْز کے جو معنیٰ بیان کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے نزدیک ھَمْز کے معنیٰ ہیں۔ یہاں چونکہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں اور هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس لیے دونوں مل کر یہ معنیٰ دیتے ہیں کہ اُس شخص کی عادت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، کسی کو دیکھ کر اُنگلیاں اُٹھاتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا ہے، کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی ذات میں کیڑے نکالتا ہے، کسی پر منہ در منہ چوٹیں کرتا ہے، کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائیاں کرتا ہے، کہیں چغلیاں کھا کر اور لگائی بجھائی کر کے دوستوں کو لڑواتا اور کہیں بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے، لوگوں کے بُرے بُرے نام رکھتا ہے، اُن پر چوٹیں کرتا ہے اور اُن کو

Maktaba Tul Ishaat.com

عیب لگاتا ہے۔

۲- پہلے فقرے کے بعد یہ دوسرا فقرہ خود بخود یہ معنیٰ دیتا ہے کہ لوگوں کی یہ تحقیر و تذلیل وہ اپنی مال داری کے غرور میں کرتا ہے۔ مال جمع کرنے کے لیے جَمَعَ مَالًا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر گِن گِن کر رکھنے کے الفاظ سے اُس شخص کے بُخل اور زر پرستی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

۳- دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے اُس کا مال اُسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا، یعنی دولت جمع کرنے اور اُسے گِن گِن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اُسے اپنی موت یاد نہیں رہی ہے اور اُسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت اُس کو یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پڑے گا۔

۴- اصل میں لفظ حُطَمَۃ استعمال کیا گیا ہے جو حَطْم سے ہے۔ حَطْم کے معنیٰ توڑنے، کچل دینے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں۔ جہنّم کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جو چیز بھی اُس میں پھینکی جائے گی، اُسے وہ اپنی گہرائی اور اپنی آگ کی وجہ سے توڑ کر رکھ دے گی۔

۵- اصل میں لَيُنْۢبَذَنَّ فرمایا گیا ہے۔ نَبذ عربی زبان میں کسی چیز کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اِس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنی مال داری کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے، لیکن قیامت کے روز اُسے حقارت کے ساتھ جہنّم میں پھینک دیا جائے گا۔

۶- قرآنِ مجید میں اِس مقام کے سوا اور کہیں جہنّم کی آگ کو اللہ کی آگ نہیں کہا گیا ہے۔ اِس مقام پر اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے نہ صرف اُس کی ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی دولت پا کر غرور و تکبّر میں مبتلا ہو جانے والوں کو اللہ کس قدر سخت نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جس کی وجہ سے اُس نے اُس آگ کو خاص اپنی آگ کہا ہے جس میں وہ پھینکے جائیں گے۔

۷- اصل الفاظ ہیں: تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ – تَطَّلِعُ اِطِّلَاع سے ہے، جس کے ایک معنیٰ چڑھنے اور اُوپر پہنچ جانے کے ہیں، اور دوسرے معنیٰ باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے۔ اَفْئِدَۃ فُؤاد کی جمع ہے جس کے معنیٰ دل کے ہیں، لیکن یہ لفظ اُس عُضو کے لیے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے، بلکہ اُس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شُعور و اِدراک، اور جذبات و خواہشات اور عقائد و افکار، اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اُس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے بُرے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات و جذبات، خبیث نیتوں اور ارادوں کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے، بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر اس کے جرم کی نوعیّت معلوم کرے گی اور ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دے گی۔

۸- یعنی جہنّم میں مجرموں کو ڈال کر اُوپر سے اُس کو بند کر دیا جائے گا۔ کوئی دروازہ تو درکنار، کوئی جِھری تک کُھلی ہوئی نہ ہوگی۔

۹ – فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہنّم کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر اُونچے اُونچے ستون گاڑ دیے جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مجرم اُونچے اُونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ تیسرا مطلب ابنِ عباسؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ اُس آگ کے شعلے لمبے ستونوں کی شکل میں اُٹھ رہے ہوں گے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الفیل

(۱۰۵)

الفیل

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ اَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اور اِس کے تاریخی پس منظر کو اگر نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکّۂ معظمہ کے بھی ابتدائی دور میں ہُوا ہوگا۔

تاریخی پس منظر

اس سے پہلے تفسیر سورۂ بُروج، حاشیہ۴ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجران میں یمن کے یہودی فرماں روا ذُونُواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اُس کا بدلہ لینے کے لیے حَبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حِمیَری حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۵۲۵ء میں اِس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حَبش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حَبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اُسی کے ذریعے سے یمن کے ساحل پر اُتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اِس کے پیچھے معاشی وسیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اِس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر وشام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقا، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آرہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ اُس کے منافع پورے کے پورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اِس مقصد کے لیے ۲۴ یا ۲۵ قبلِ مسیح میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیَس گالوس (Aelius Gallus) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اُتار دی تھی، تاکہ وہ اُس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ (اِس شاہراہ کا نقشہ ہم نے تفہیم القرآن، جلد دوم میں صفحہ ۱۲۲ پر درج کیا ہے)۔ لیکن عرب کے شدید جغرافی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑا بحرِ احمر میں لے آئے اور انھوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف برّی راستہ اُن کے لیے باقی رہ گیا۔ اِسی برّی راستے کو قبضے میں لینے کے لیے اُنھوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی، اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط، دوسرا اَبْرَہَہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اَریاط تھا، اور اَبْرَہَہ اُس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اِس بات پر متفق ہیں کہ اَبْرَہَہ اور اَریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اَریاط مارا گیا، ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہِ حبش کو اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اِس کے برعکس یونانی اور سُریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتحِ یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو اُن میں سے ایک سردار اَلسُّمَیْفَع اَشْوَع (جسے یونانی مؤرخین Esymphaeus لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہِ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور اَبْرَہَہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا، جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں، وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخر کار شاہِ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا۔ (یونانی مؤرخین اُس کا نام اَبرامِس (Abrames) اور سُریانی مؤرخین ابراہام (Abraham) لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اِسی کا حبشی تلفُّظ ہے، کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفظ ابراہیم ہے)۔

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہِ حبش کی بالا دستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مُفَوَّض المَلِک (نائب شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رُسوخ حاصل کر لیا تھا، اُس کا اندازہ اِس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سَدِّ مَارِب کی مَرَمَّت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حِیرہ اور شاہِ غَسّان کے سُفَرا شریک ہوئے۔ اِس کا مفصّل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سَدِّ مَارِب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر (Glaser) نے اس کو نقل کیا ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سَبا، حاشیہ ۳۷)

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مُہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اِس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کش مکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

اَبْرَہَہ نے اِس مقصد کے لیے یمن کے دار السلطنت صَنْعا میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا، جس کا ذکر عرب مؤرخین نے اَلْقَلِیس یا اَلْقُلَّیس یا اَلْقُلَیس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ Ekklesia کا

مُعَرَّب ہے اور اُردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اِس کام کی تکمیل کے بعد اس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج، کعبہ سے اِس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔[1] ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اِس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی مُنادی کرادی۔ اس کی اس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصہ دلائے، تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو کے پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اِس اعلان پر غضب ناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ اِن میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دَور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندہ کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کر لے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب ابرہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

اس کے بعد وہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُونَفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ پھر خَثْعَم کے علاقے میں ایک عرب سردار نُفَیل بن حبیب خَثْعمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بَدْرَقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثَقیف نے محسوس کیا کہ اِتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اُن کے معبودلات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر ابرہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بُت کدہ وہ مَعْبَد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے مَعْبَد کو چھوڑ دیں، ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بَدرَقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی، اور بنی ثَقیف نے ابورِغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمَّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابورِغال مر گیا، اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ بنی ثَقیف کو

---

[1] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم تفسیر سورۂ بروج، حاشیہ ۴ میں کر چکے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ اُنھوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المُغَمَّس سے اَبرہہ نے اپنے مُقَدِّمَۃُ الْجَیْش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تِہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لُوٹ لے گیا، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المُطَّلِب کے بھی دو سو اُونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعے سے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اِس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمھاری جان و مال سے کوئی تعرُّض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبد المُطَّلِب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر اَبرہہ کا پیغام پہنچایا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم میں اَبرَہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچالے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ اَبرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہوگئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ اُن کو دیکھ کر اَبرہہ بہت متأثّر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جو اُونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ اَبرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متأثّر ہوا تھا، مگر آپ کی اِس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مَرجَع ہے، اِس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا: میں تو صرف اپنے اُونٹوں کا مالک ہوں اور انھی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اِس کا ایک رب ہے، وہ اِس کی حفاظت خود کرلے گا۔ اَبرہہ نے جواب دیا: وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبد المُطَّلِب نے کہا: آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ اَبرہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اُس نے اُن کے اُونٹ واپس کر دیے۔

ابنِ عباسؓ کی رِوایت اِس سے مختلف ہے۔ اُس میں اُونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حُمید، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوَیہ، حاکم، ابو نُعیم اور بَیْہَقی نے اُن سے جو رِوایات نقل کی ہیں، اُن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اَبرہہ اَلصِّفَاح کے مَقام پر پہنچا (جو عَرَفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حُدودِ حَرَم کے قریب واقع ہے) تو عبد المُطَّلِب خود اُس کے پاس گئے اور اس سے کہا: آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے، یہ گھر اَمن کا گھر ہے، میں اس کا اَمن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبد المُطَّلِب نے کہا: یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اِس پر مسلَّط نہیں ہونے دیا ہے۔ اَبرہہ نے جواب دیا: ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبد المُطَّلِب نے کہا: آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر اَبرہہ نے انکار کر دیا اور عبد المُطَّلِب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اِس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو اِن میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ اَحزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے۔ وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ اَبرہہ کی لشکرگاہ سے واپس آ کر عبدالمُطّلِب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حَرَم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کُنڈا پکڑ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے، مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھول گئے اور انھوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ اُن کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں، ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابنِ ہِشام نے سیرت میں عبدالمُطّلِب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لاھُمَّ ان العبد یمنع رحله فامنع حِلالكْ

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تُو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

لا یغلبنّ صلیبھم و مِحالھم غدوًا مِحالكْ

کل اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے۔

ان کنت تارکھم و قِبلتنا فامر ما بدالك

اگر تُو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تُو چاہے کر۔

سُہَیلی نے رَوضُ الاُنُف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

وانصرنا علی اٰل الصّلیبِ وعابدیه الیوم اٰلكْ

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما۔

ابنِ جَرِیر نے عبدالمُطّلِب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے انھوں نے پڑھے تھے:

یا ربّ لا ارجولھم سواکا یا ربّ فامنع منھم حِماکا

اے میرے رب! تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے اُمید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب! ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر۔

ان عدوّ البیت من عاداکا امنعھم ان یخربوا قراکا

اِس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک۔

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمُطّلِب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز اَبرَہہ مکے میں

Maktaba Tul Ishaat.com

داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اُس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبَر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اِس لشکر پر اُن سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے، اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عِکْرِمَہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اُسے سخت کُھجلی لاحق ہو جاتی اور کُھجاتے ہی جِلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباسؓ کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود اَبرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا، اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا، وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں اِن لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی کو، جسے یہ لوگ بَذْرَقَہ بنا کر بلادِ خَثْعَم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انھوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

اين المفرّ والالٰه الطالبُ والاشرم المغلوب ليس الغالبُ

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جب کہ خدا تعاقب کر رہا ہے اور نکٹا (اَبرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطا بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اُسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ اَبرہہ بھی بلادِ خَثْعَم پہنچ کر مرا۔[1]

یہ واقعہ مُزدَلِفَہ اور مِنٰی کے درمیان وادیِ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حَجّۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے نقل کیا ہے، اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزدَلِفَہ سے مِنٰی کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپؐ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نَوَوِی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اِسی جگہ پیش آیا تھا، اس لیے سنّت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ مُؤطّا میں امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مُزدَلِفَہ پورا

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں اُن کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی، جگہ جگہ یمنی سردار عَلَمِ بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذِی یَزَن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی صرف ایک ہزار فوج، جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

کا پورا ٹھیرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں نہ ٹھیرا جائے۔ نُفَیل بن حبیب کے جو اشعار ابنِ اسحاق نے نقل کیے ہیں، ان میں وہ اِس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

رُدَینۃُ لو رأیتِ ولا تریہ لدٰی جنب المحصّب ما رأینا

اے رُدَینہ! کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادیِ مُحَصَّب کے قریب دیکھا۔

حمدتُ اللّٰہ اذا بصرت طیرًا و خفت حجارۃ تلقٰی علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا، اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آ پڑیں۔

وکلّ القوم یسأل عن نُفیل کأن علیّ للحبشان دَینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفَیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اُوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی اور اس پر بہت سے شعرا نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اِعجاز قرار دیا اور کہیں اشارتاً وکنایتاً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں اُن بُتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِبَعریٰ کہتا ہے:

ستّون الفا لم یؤبوا ارضھم و لم یعش بعد الایاب سقیمھا

۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جاسکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (اَبرہہ) زندہ رہا۔

کانت بھا عاد و جرھم قبلھم واللّٰہ من فوق العباد یقیمھا

یہاں ان سے پہلے عاد اور جُرہُم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اُوپر موجود ہے جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہے۔

ابوقَیس بن اَسلَت کہتا ہے:

فقوموا فصلّوا ربکم و تمسّحوا بارکان ھٰذا البیت بین الاخاشب

اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و مِنٰی کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو۔

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردّھم جنود الملیک بین ساف و حاصب

جب عرش والے کی مدد تمھیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اِس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمِّ ہانیؓ اور حضرت زُبَیر بن العوّامؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش نے ۱۰ سال (اور بروایتِ بعض، سات سال) تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُمِّ ہانیؓ کی روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور طَبَرانی، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیہ اور بَیہَقی نے اپنی کُتُبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زُبَیرؓ کا بیانِ طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیہ اور ابنِ عَساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اِس کی تائیدِ مزید حضرت سعید بن المُسَیَّب کی اُس مُرْسَل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اُسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اُسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحابُ الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپؐ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

مقصودِ کلام جو تاریخی تفصیلات اُوپر درج کی گئی ہیں، ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سورہ میں اِس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہلِ عرب اس بات کے قائل تھے کہ اَبرہہ کے اِس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اِس واقعے سے اس قدر متأثر رہے تھے کہ اُنھوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں اِن تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خُصوصاً، اور اہلِ عرب عُموماً، اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں، وہ آخر اِس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام دوسرے معبُودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اِس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے اُنھوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا، اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔

آیاتہا ۵ ۔ رکوعاتہا ۱

سُورَةُ الْفِيلِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ
فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵ ع

تم نے دیکھا نہیں[1] کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟[2] کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟[3] اور اُن پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیج دیے،[4] جو اُن پر پکّی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے،[5] پھر اُن کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بُھوسا۔[6]

۱ – خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر اصل مخاطب نہ صرف قریش، بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں، جو اِس سارے قصّے سے خوب واقف تھے۔ قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اُن سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے۔ (مثال کے طور پر آیات ذیل مُلاحظہ ہوں: ابراہیم، آیت ۱۹۔ الحج ۱۸-۶۵۔ النور ۴۳۔ القمان ۲۹-۳۱۔ فاطر ۲۷۔ الزُمر ۲۱) پھر دیکھنے کا لفظ اس مقام پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مکہ اور اطرافِ مکہ اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکہ سے یمن تک ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا، کیونکہ اِس واقعے کو گزرے ہوئے چالیس پینتالیس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا، اور سارا عرب ہی اس کی ایسی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سُن چکا تھا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔

۲ – یہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی تفصیل اس امر کی بیان نہیں کی کہ یہ ہاتھی والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے، اور کس غرض کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ یہ باتیں سب کو معلوم تھیں۔

۳ – اصل میں لفظ کَیْد استعمال کیا گیا ہے جو کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساٹھ ہزار کا لشکر کئی ہاتھی لیے ہوئے علانیہ یمن سے مکہ آیا تھا، اور اُس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ جو بات خفیہ تھی، وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر قریش کو کچل کر، اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اِس غرض کو انھوں نے چھپا رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ اُن کے کلیسا کی جو بے حُرمتی عربوں نے کی ہے،

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کا بدلہ وہ اُن کا مَعبَد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔

۴ – اصل الفاظ ہیں: فِيْ تَضْلِيْلٍ، یعنی ان کی تدبیر کو اُس نے ”گمراہی میں ڈال دیا“۔ لیکن محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کرنے کا مطلب اُسے ضائع کر دینا اور اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام کر دینا ہے جیسے ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں: فُلاں شخص کا کوئی داؤں نہ چل سکا، یا اس کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ، ”مگر کافروں کی چال اَکارت ہی گئی۔“ (المومن: ۲۵) اور دوسری جگہ ارشاد ہوا: وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ”اور یہ کہ اللہ خائنوں کی چال کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔“ (یوسف: ۵۲) اہلِ عرب اِمْرَءُالقیس کو اَلْمَلِكُ الضِّلِّيْل، ”ضائع کرنے والا بادشاہ“ کہتے تھے، کیونکہ اس نے اپنے باپ سے پائی ہوئی بادشاہی کو کھو دیا تھا۔

۵ – اصل میں طَيْرًا اَبَابِيْلَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں، اس لیے ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اَبْرَہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن عَرَبی زبان میں ابابیل کے معنٰی ہیں: بہت سے متفرق گروہ جو پے در پے مختلف سَمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے۔ عِکْرِمہ اور قَتَادَہ کہتے ہیں کہ یہ جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بحرِ احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جُبَیر اور عِکْرِمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے، اور نہ تِہامہ یعنی حجاز اور بحرِ احمر کے درمیان ساحلی علاقے کے۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کُتے جیسے۔ عِکْرِمہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب راویوں کا مُتَّفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر۔ مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدّت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابو نُعَیم نے نَوْفَل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھے۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ابو نُعَیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے، اور ابنِ مَرْدُوْیَہ کی روایت میں ہے کہ بکری کی مینگنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے، اُن میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا۔

۶ – اصل الفاظ ہیں: بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ، یعنی سِجِّیل کی قسم کے پتھر۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گِل کا مُعَرَّب ہے اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہوا اور پک کر سخت ہو گیا ہو۔ قرآنِ مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سورۂ ہود، آیت ۸۲ اور سورۂ حِجر، آیت ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ قومِ لُوط پر سِجّیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے، اور اُنھی پتھروں کے متعلّق سورۂ ذاریات، آیت ۳۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ، یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور، جنھوں نے عہدِ حاضر میں قرآنِ مجید کے معانی و مطالب کی تحقیق پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، اِس آیت میں تَرْمِيْهِمْ کا فاعل اہلِ مکہ اور دوسرے اہلِ عرب کو قرار دیتے ہیں جو اَلَمْ تَرَ کے مُخاطَب ہیں، اور پرندوں کے متعلّق فرماتے ہیں کہ وہ سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے، بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھائیں۔ اِس تاویل کے لیے جو دلائل اُنھوں نے دیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالمُطّلب کا اَبْرَہہ کے پاس جا کر کعبہ کے بجائے اپنے اُونٹوں کا

مطالبہ کرنا کسی طرح باور کرنے کے قابل بات نہیں ہے، اور یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں نے، جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حملہ آور فوج کا کوئی مقابلہ نہ کیا ہو اور کعبے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ پہاڑوں میں جا چھپے ہوں۔ اس لیے صورتِ واقعہ دراصل یہ ہے کہ عربوں نے اَبْرَہَہ کے لشکر کو پتھر مارے، اور اللہ تعالیٰ نے پتھراؤ کرنے والی طوفانی ہوا بھیج کر اس لشکر کا بُھرکس نکال دیا، پھر پرندے اُن لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، روایت صرف یہی نہیں ہے کہ عبدالمُطَّلِب اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کرنے گئے تھے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اُونٹوں کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور اَبْرَہَہ کو خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام معتبر روایات کی رو سے ابرہہ کا لشکر محرّم میں آیا تھا جب کہ حُجّاج واپس جا چکے تھے۔ اور یہ بھی ہم نے بتا دیا ہے کہ ۶۰ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس کا کام نہ تھا، وہ تو غَزْوَۂ اَحزاب کے موقع پر بڑی تیاریوں کے بعد مشرکینِ عرب اور یہودی قبائل کی جو فوج لائے تھے وہ دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی، پھر بھلا وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتے تھے۔ تاہم اِن ساری دلیلوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف سورۂ فیل کی ترتیبِ کلام کو دیکھا جائے تو یہ تاویل اُس کے خلاف پڑتی ہے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ پتھر عربوں نے مارے، اور اصحابِ فیل بُھس بن کر رہ گئے، اور اس کے بعد پرندے ان کی لاشیں کھانے کو آئے، تو کلام کی ترتیب یوں ہوتی کہ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ. وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ (تم ان کو پکّی ہوئی مٹی کے پتھر مار رہے تھے، پھر اللہ نے اُن کو کھائے ہوئے بُھس جیسا کر دیا، اور اللہ نے اُن پر جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بھیج دیے)۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جُھنڈ بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، پھر اُس کے مُتَّصِلًا بعد تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ (جو اُن کو پکی ہوئی مٹی کے پتھر مار رہے تھے) فرمایا ہے، اور آخر میں کہا ہے کہ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بُھس جیسا کر دیا۔

۷۔ اصل الفاظ ہیں: كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ۔ عَصف کا لفظ سورۂ رحمٰن، آیت ۱۲ میں آیا ہے: ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ، ''اور غلّہ بُھوسے اور دانے والا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ عَصف کے معنیٰ اُس چھلکے کے ہیں جو غلّے کے دانوں پر ہوتا ہے اور جسے کسان دانے نکال کر پھینک دیتے ہیں، پھر جانور اُسے کھاتے بھی ہیں، اور کچھ ان کے چبانے کے دوران میں گرتا بھی جاتا ہے، اور کچھ ان کے پاؤں تلے روندا بھی جاتا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

قُریش

(۱۰۶)

قُریش

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ قریش کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اگرچہ ضحّاک اور کَلْبی نے اِس کو مَدَنی کہا ہے، لیکن مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، اور اس کے مکی ہونے کی کھلی شہادت خود اس سورہ کے الفاظ رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ (اس گھر کے رب) میں موجود ہے۔ اگر یہ مدینہ میں نازل ہوتی تو خانۂ کعبہ کے لیے "اِس گھر" کے الفاظ کیسے موزوں ہو سکتے تھے؟ بلکہ اِس کے مضمون کا سورۂ فیل کے مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ غالباً اِس کا نُزول اُس کے مُتّصلاً بعد ہی ہوا ہوگا۔ دونوں سورتوں کے درمیان اِسی مناسبت کی بنا پر سَلَف میں سے بعض بزرگ اِس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی سورت ہیں۔ اِس خیال کو تقویت اِن روایات کی بنا پر ملی ہے کہ حضرت اُبَیؓ بن کعب کے مُصْحَف میں یہ دونوں ایک ساتھ لکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں بسم اللہ مرقوم نہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی فصل کے بغیر ان دونوں کو ملا کر نماز میں پڑھا تھا۔ لیکن یہ رائے اِس وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی عظیم تعداد کے تعاون سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلادِ اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے، ان میں دونوں کے درمیان بسم اللہ درج تھی، اور اُس وقت سے آج تک تمام دنیا کے مَصاحِف میں یہ الگ الگ سورتوں کی حیثیت ہی سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ مزید برآں دونوں سورتوں کا اندازِ بیان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ عَلانیہ دو الگ سورتیں نظر آتی ہیں۔

تاریخی پَس منظر

اِس سورت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اِس کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ قُصَیّ بن کِلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قُصَیّ نے اُس کو مکّے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تولیت اس قبیلے کے ہاتھ میں آگئی۔ اِسی بنا پر قُصَیّ کو مُجَمِّع (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ اِس شخص نے اپنے اعلیٰ درجے کے تدبُّر سے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی، اور جملہ اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا، جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رُسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبدِ مَناف اور عبد الدّار کے درمیان مکہ کی ریاست کے مناصِب تقسیم ہو گئے، مگر دونوں میں سے عبدِ مَناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموَری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اُس کا شَرَف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

عبدِمَناف کے چار بیٹے تھے: ہاشم، عبدِشمس، مُطَّلِب اور نَوفَل۔ ان میں سے ہاشم، عبدالمُطَّلِب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بِلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے، تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلُّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بِلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا، اُس کا کاروبار بہت چمک اُٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فَیّاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے، اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنھیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں اُن کے قافلوں پر ڈاکا مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہ گزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وُصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنھی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اِسکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حَبَش کے بادشاہ سے عبدِشمس نے، یمنی اُمَرا سے مُطَّلِب نے، اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نَوفَل نے تجارتی مَراعات حاصل کیں۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتَّجِرِین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہوگئے، اور جو روابط انھوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے، اُن کی بنا پر اِن کو اَصحابُ الِایلاف بھی کہا جاتا تھا، جس کے لفظی معنیٰ ”اُلفت پیدا کرنے والوں“ کے ہیں۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے مَمالک سے تعلّقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہوگئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلّقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآنِ مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انھی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس، ”قریش لوگوں کے لیڈر ہیں۔“ (مُسنَدِ احمد، مَرویاتِ عَمرُوؓ بن العاص) اور حضرت علیؓ کی روایت بَیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: کان هٰذا الامر فی حِمْیَرَ فنزعه اللّٰه منهم وجعله فی قریش۔ ”پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے وہ ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔“

قریش اِسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جارہے تھے کہ مکّہ پر اَبرَہَہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں، خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا، وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکّہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کِلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اِس تباہ شدہ فوج کے آدمی گِر گِر کر مرتے چلے گئے، تو کعبہ کے بیتُ اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا، اور اُس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ اِن لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصّے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ انھیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اُس سے کوئی تعرّض نہ کیا جاتا تھا۔

مقصودِ کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے زمانے میں یہ حالات چونکہ سب ہی کو معلوم تھے، اس لیے اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس سورت کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اِتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم خود اِس گھر (خانۂ کعبہ) کو بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر مانتے ہو، اور جب تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں اِس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمھاری تجارتوں کو یہ فروغ بخشا، اور تمھیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوش حالی نصیب فرمائی، تو تمھیں اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اٰیاتہا ۴ — سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ مَکِّیَّۃٌ — رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝۲ فَلْیَعْبُدُوْا
رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝۳ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۬ وَّ اٰمَنَهُمْ
مِّنْ خَوْفٍ ۝۴

ع ۲۶

چونکہ قُریش مانوس ہوئے،[1] (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس،[2] لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اِس گھر کے رب کی عبادت کریں،[3] جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا[4] اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔[5] ع

۱ — اصل الفاظ ہیں: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ اِیلاف اَلف سے ہے جس کے معنٰی خوگر ہونے، مانوس ہونے، پھٹنے کے بعد مِل جانے، اور کسی چیز کی عادت اختیار کرنے کے ہیں۔ اردو زبان میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ ایلاف سے پہلے جو لام آیا ہے، اس کے متعلق عَرَبی زبان کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ عربی محاورے کے مطابق تعجُّب کے معنٰی میں ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں کہ لِزَیْدٍ وَّمَا صَنَعْنَا بِهٖ، یعنی ذرا اِس زید کو دیکھو کہ ہم نے اس کے ساتھ کیسا نیک سلوک کیا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ پس لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رَوِیّہ بڑا ہی قابلِ تعجُّب ہے کہ اللہ ہی کے فضل کی بدولت وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور اُن تجارتی سفروں کے خوگر ہو گئے جو اُن کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اور وہ اللہ ہی کی بندگی سے رُوگردانی کر رہے ہیں۔ یہ رائے اَخفَش، کِسائی، اور فَرّا کی ہے، اور اِس رائے کو ابنِ جَرِیر نے ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جب اس لام کے بعد کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو وہی بات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے کہ اُس کے ہوتے جو شخص کوئی رَوِیّہ اختیار کر رہا ہے وہ قابلِ تعجب ہے۔ بخلاف اِس کے خلیل بن احمد، سِیبَوَیہ اور زَمَخشَری کہتے ہیں کہ یہ لام تعلیل ہے اور اس کا تعلق آگے کے فقرے فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یوں تو قریش پر اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن اگر کسی اور نعمت کی بنا پر نہیں تو اِسی ایک نعمت کی بنا پر وہ اللہ کی بندگی کریں کہ اُس کے فضل سے وہ اِن تجارتی سفروں کے خوگر ہوئے، کیونکہ یہ بجائے خود اُن پر اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔

۲ — گرمی اور جاڑے کے سفروں سے مراد یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر، شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں، اور جاڑے کے زمانے میں وہ جنوبِ عرب کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ گرم علاقے ہیں۔

۳- اِس گھر سے مراد خانۂ کعبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ نعمت اِسی گھر کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اور وہ خود مانتے ہیں کہ وہ ۳۶۰ بُت اس کے رب نہیں ہیں جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں، بلکہ صرف اللہ ہی اِس کا رب ہے۔ اُسی نے ان کو اصحابِ فیل کے حملے سے بچایا۔ اُسی سے انھوں نے اَبرَہہ کی فوج کے مقابلے میں مدد کی دعا کی تھی۔ اُس کے گھر کی پناہ میں آنے سے پہلے جب وہ عرب میں منتشر تھے تو اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عرب کے عام قبائل کی طرح وہ بھی ایک نسل کے بکھرے ہوئے گروہ تھے۔ مگر جب وہ مکّہ میں اِس گھر کے گرد جمع ہوئے اور اِس کی خدمت انجام دینے لگے تو سارے عرب میں محترم ہو گئے، اور ہر طرف اُن کے تجارتی قافلے بے خوف وخطر آنے جانے لگے۔ پس انھیں جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے، اِس گھر کے رب کی بدولت نصیب ہوا ہے، اس لیے اُسی کی اِن کو عبادت کرنی چاہیے۔

۴- یہ اشارہ ہے اِس طرف کہ مکے میں آنے سے پہلے جب قریش عرب میں منتشر تھے تو بھوکوں مر رہے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اُن کے لیے رزق کے دروازے کُھلتے چلے گئے اور ان کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا حرف بحرف پوری ہوئی کہ اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بے آب وگیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس تُو لوگوں کے دلوں کو اِن کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ (ابراہیم، آیت ۳۷)

۵- یعنی جس خوف سے عرب کی سرزمین میں کوئی محفوظ نہیں ہے، اُس سے یہ محفوظ ہیں۔ عرب کا حال اُس دَور میں یہ تھا کہ پورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچانک اُس پر چھاپا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حُدود سے باہر قدم رکھنے کی ہمّت کر سکے، کیونکہ اِکّا دُکّا آدمی کا زندہ بچ کر واپس آ جانا، یا گرفتار ہو کر غلام بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امرِ محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکا پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے بااثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے۔ لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے، انھیں کسی دشمن کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اُن کے چھوٹے اور بڑے، ہر طرح کے قافلے ملک کے ہر حصّے میں آتے جاتے تھے، کوئی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ قافلہ حَرَم کے خادموں کا ہے، انھیں چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اکیلا قریشی بھی اگر کہیں سے گزر رہا ہو اور کوئی اس سے تعرّض کرے تو صرف لفظ ''حَرَمی'' یا ''اَنَا مِنْ حَرَمِ اللّٰہِ'' کہہ دینا کافی ہو جاتا تھا، یہ سنتے ہی اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے تھے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الماعون

(۱۰۷)

الماعُون

نام آخری آیت کے آخری لفظ اَلْمَاعُوْنَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عباس اور ابن الزُّبیر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکّی ہے، اور یہی قول عطاؒ اور جابرؒ کا بھی ہے۔ لیکن ابوحیّان نے البحر المحیط میں ابنِ عباسؓ اور قتادہ اور ضحّاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک خود اِس سورہ کے اندر ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جو اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اِس میں اُن نماز پڑھنے والوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ منافقین کی یہ قسم مدینے ہی میں پائی جاتی تھی، کیونکہ وہیں اسلام اور اہلِ اسلام کو یہ قوت حاصل ہوئی تھی کہ بہت سے لوگوں کو مَصلحتاً ایمان لانا پڑا تھا اور وہ مجبُوراً مسجد میں آتے تھے، جماعت میں شریک ہوتے تھے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھتے تھے، تاکہ انھیں مسلمانوں میں شمار کیا جائے۔ اِس کے برعکس مکّے میں ایسے حالات سرے سے موجود ہی نہ تھے کہ وہاں کسی کو دکھاوے کی نماز پڑھنی پڑتی۔ وہاں تو اہلِ ایمان کے لیے نمازِ باجماعت کا اہتمام بھی مشکل تھا۔ اُن کو چھُپ چھُپ کر نماز پڑھنی پڑتی تھی، اور کوئی عَلانِیَہ پڑھتا تھا تو جان پر کھیل کر پڑھتا تھا۔ منافقین کی جو قسم وہاں پائی جاتی تھی، وہ رِیا کارانہ ایمان لانے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھنے والوں کی نہیں، بلکہ اُن لوگوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برسرِ حق ہونے کو جان اور مان گئے تھے، مگر اُن میں سے کوئی اپنی ریاست و وَجاہت اور مَشِیخت کو برقرار رکھنے کی خاطر اسلام قبُول کرنے سے گریز کر رہا تھا، اور کوئی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان ہو کر اُن مصائب میں مبتلا ہو جائے جن میں وہ ایمان لانے والوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مبتلا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مکّی دَور کے منافقین کی یہ حالت سورۂ عنکبوت، آیات ۱۰-۱۱ میں بیان کی گئی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، العنکبوت، حواشی ۱۳ تا ۱۶)

موضوع اور مضمون اس کا موضوع یہ بتانا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیت ۲ اور ۳ میں اُن کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جو عَلانِیَہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں اُن منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں، مگر دل میں آخرت اور اُس کی جزا وسزا اور اُس کے ثواب وعقاب کا کوئی تصوُّر نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دونوں قسم کے گروہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ انسان کے اندر ایک مضبوط اور مستحکم پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۷ سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ
الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤
الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦
وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧ ع

ع ۳۲

تم نے دیکھا[1] اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا[2] کو جھٹلاتا ہے[3]؟ وہی تو ہے[4] جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے[5]، اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا[6]۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے[7] جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں[8]، جو رِیا کاری کرتے ہیں[9] اور معمولی ضرورت کی چیزیں[10] (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں[11]۔ ع

۱- ''تم نے دیکھا'' کا خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر قرآن کا اندازِ بیان یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ عموماً ہر صاحبِ عقل اور سوچنے سمجھنے والے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔ اور دیکھنے کا مطلب آنکھوں سے دیکھنا بھی ہے، کیونکہ آگے لوگوں کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ ہر دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب جاننا، سمجھنا اور غور کرنا بھی ہے۔ عربی کی طرح اُردو میں بھی دیکھنے کا لفظ اس دوسرے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''میں دیکھ رہا ہوں''، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں جانتا ہوں، یا مجھے خبر ہے۔ یا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''ذرا یہ بھی تو دیکھو'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذرا اس بات پر بھی غور کرو۔ پس اگر لفظ اَرَءَیْتَ کو اِس دوسرے معنیٰ میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟'' یا ''تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے؟''

۲- اصل میں یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فرمایا گیا ہے۔ الدِّیْن کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں آخرت کی جزائے اعمال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دینِ اسلام کے لیے بھی۔ لیکن جو مضمون آگے بیان ہوا ہے اس کے ساتھ پہلے معنیٰ ہی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے معنیٰ بھی سلسلۂ کلام سے غیر مطابق نہیں ہیں۔ ابنِ عباسؓ نے دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، اور اکثر مفسرین پہلے معنیٰ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو پوری سورت کے مضمون کا مطلب یہ ہوگا کہ آخرت کے انکار کا عقیدہ انسان میں یہ سیرت و کردار پیدا کرتا ہے۔ اور

دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو پوری سورت کا مدّعا دینِ اسلام کی اخلاقی اہمیّت واضح کرنا قرار پائے گا۔ یعنی کلام کا مقصد یہ ہو گا کہ اسلام اُس کے برعکس سیرت و کردار پیدا کرنا چاہتا ہے جو اِس دین کا انکار کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔

۳- اندازِ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس سوال سے بات کا آغاز کرنے کا مقصد یہ پوچھنا نہیں ہے کہ تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے یا نہیں، بلکہ سامع کو اِس بات پر غور کرنے کی دعوت دینا ہے کہ آخرت کی جزاوسزا کا انکار آدمی میں کس قسم کا کردار پیدا کرتا ہے، اور اُسے یہ جاننے کا خواہش مند بنانا ہے کہ اِس عقیدے کو جھٹلانے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں، تاکہ وہ ایمان بالآخرت کی اخلاقی اہمیّت سمجھنے کی کوشش کرے۔

۴- اصل میں فَذٰلِكَ الَّذِیْ فرمایا گیا ہے۔ اس فقرے میں ف ایک پورے جملے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ "اگر تم نہیں جانتے تو تمھیں معلوم ہو کہ وہی تو ہے جو۔" یا پھر یہ اِس معنیٰ میں ہے کہ "اپنے اسی انکارِ آخرت کی وجہ سے وہ ایسا شخص ہے جو۔"

۵- اصل میں یَدُعُّ الْیَتِیْمَ کا فقرہ استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کر کے اسے دھکّے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دُھتکار دیتا ہے، اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشان حالی کی بنا پر رحم کی امید لیے ہوئے کھڑا رہے تو اسے دھکے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتہ دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمتگاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اِس فقرے میں یہ معنیٰ بھی پوشیدہ ہیں کہ اُس شخص سے کبھی کبھار یہ ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رَوِیّہ یہی ہے۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی بُرا کام ہے جو وہ کر رہا ہے۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ رَوِش اختیار کیے رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یارومددگار مخلوق ہے، اس لیے کوئی ہرج نہیں اگر اس کا حق مار کھایا جائے، یا اسے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا کر رکھا جائے، یا وہ مدد مانگنے کے لیے آئے تو اُسے دھتکار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوَردی نے اپنی کتاب اَعلامُ النُّبُوّۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اِس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اُسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضوؐر سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضوؐر کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپؐ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اِس بچے کا حق اِسے دے دو، تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں، اِن دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انھوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے

Maktaba Tul Ishaat.com

اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا: خدا کی قسم! میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا، اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ اِس واقعے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپؐ کے اِس اخلاق کا آپؐ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رعب تھا۔ اِسی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۴۶ پر نقل کر چکے ہیں، جو حضورؐ کے اُس زبردست اخلاقی رعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کفارِ قریش آپؐ کو جادوگر کہتے تھے۔

۶ — اِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ نہیں بلکہ طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر اِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ کہا گیا ہوتا تو معنیٰ یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ لیکن طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ بالفاظِ دیگر، جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے، وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اُسی مسکین کا کھانا ہے، وہ اُس کا حق ہے جو دینے والے پر عائد ہوتا ہے، اور دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ اُس کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ ذاریات، آیت ۱۹ میں فرمائی گئی ہے کہ وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ "اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔"

۷ — لَا يَحُضُّ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے نفس کو بھی اِس کام پر آمادہ نہیں کرتا، اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہیں کہتا کہ مسکین کا کھانا دیا کریں، اور دوسرے لوگوں کو بھی اِس بات پر نہیں اُکساتا کہ معاشرے میں جو غریب و محتاج لوگ بھوکے مر رہے ہیں، ان کے حُقوق پہچانیں اور ان کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکارِ آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود اِن دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اکساتے، بلکہ جو بے شمار خرابیاں اِس گمراہی کے نتیجے میں رُونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اِس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دِہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکارے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اَوصاف تو وہ ہیں جو سورۂ عصر اور سورۂ بَلَد میں بیان کیے گئے ہیں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو خلقِ خدا پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادائے حُقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔

۸ — فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں 'ف' اس معنیٰ میں ہے کہ کھلے کھلے منکرینِ آخرت کا حال تو یہ تھا جو ابھی تم نے سنا، اب ذرا اُن منافقوں کا حال بھی دیکھو جو نماز پڑھنے والے گروہ، یعنی مسلمانوں میں شامل ہیں۔ وہ چونکہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود آخرت کو جھوٹ سمجھتے ہیں، اس لیے ذرا دیکھو کہ وہ اپنے لیے کس تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

مُصَلِّيْنَ کے معنی تو "نماز پڑھنے والوں" کے ہیں، لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور آگے ان لوگوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، اُن کے لحاظ سے اِس لفظ کے معنی درحقیقت نمازی ہونے کے نہیں بلکہ اہلِ صلوٰۃ، یعنی مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔

۹ - فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں کہا گیا بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ کہا گیا ہے۔ اگر فِيْ صَلَاتِهِمْ کے الفاظ استعمال ہوتے تو مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جانا شریعت میں نِفاق تو درکنار، گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی عیب یا قابلِ گرفت بات تک نہیں ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی وقت نماز میں بھول لاحق ہوئی ہے، اور حضورؐ نے اُس کی تلافی کے لیے سجدۂ سہو کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ اِس کے برعکس عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں۔ نماز پڑھی تو، اور نہ پڑھی تو، دونوں کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں تو اِس طرح کہ نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں، اور جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتے ہیں۔ یا نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بے دِلی کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور بادِلِ ناخواستہ پڑھ لیتے ہیں، جیسے کوئی مصیبت ہے جو ان پر نازل ہوگئی ہے۔ کپڑوں سے کھیلتے ہیں، جماہیاں لیتے ہیں، خدا کی یاد کا کوئی شائبہ تک ان کے اندر نہیں ہوتا۔ پوری نماز میں نہ اُن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ انھوں نے کیا پڑھا ہے۔ پڑھ رہے ہوتے ہیں نماز، اور دل کہیں اور پڑا رہتا ہے۔ مارا مار اس طرح پڑھتے ہیں کہ نہ قیام ٹھیک ہوتا ہے، نہ رُکوع، نہ سُجود۔ بس کسی نہ کسی طرح نماز کی سی شکل بنا کر جلدی سے جلدی فارغ ہوجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ کسی جگہ پھنس گئے تو نماز پڑھ لی، ورنہ اِس عبادت کا کوئی مقام ان کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نماز کا وقت آتا ہے تو انھیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ نماز کا وقت ہے۔ مؤذّن کی آواز کان میں آتی ہے تو انھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ کیا پکار رہا ہے، کس کو پکار رہا ہے، اور کس لیے پکار رہا ہے۔ یہی آخرت پر ایمان نہ ہونے کی علامات ہیں۔ کیونکہ دراصل اسلام کے مدّعیوں کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہ نماز پڑھنے پر کسی جزا کے قائل ہیں اور نہ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کے نہ پڑھنے پر کوئی سزا ملے گی۔ اسی بنا پر حضرت اَنَسؓ بن مالک اور عطا بن دینار کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے اس نے فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ فرمایا۔ یعنی ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں، اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔

قرآنِ مجید میں منافقین کی اس کیفیت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ○ "وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کسمساتے ہوئے، اور (اللہ کی راہ میں) خرچ نہیں کرتے مگر بادِلِ ناخواستہ۔" (التوبہ: ۵۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تلك صلوٰة المنافق، تلك صلوٰة المنافق، تلك صلوٰة المنافق، یجلس یرقب الشمس حتّٰی اذا کانت بین قرنی الشیطان قام فنقر اربعًا لا یذکر اللّٰہ فیھا الّا قلیلا۔ "یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ عصر کے وقت بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے (یعنی غروب کا وقت قریب آجاتا ہے) تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے، جن میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔" (بخاری۔ مسلم۔ مُسندِ احمد) حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص سے ان کے صاحبزادے مُصعب بن سعد روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا جو نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اُس کا وقت ٹال کر پڑھتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

(ابنِ جَرِیر، ابویَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی السُّنَن۔ یہ روایت حضرت سعدؓ کے اپنے قول کی حیثیت سے بھی مَوقوفاً نقل ہوئی ہے اور اُس کی سند زیادہ قوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت سے اس کی مرفوعاً روایت کو بَیْہَقی اور حاکم نے ضعیف قرار دیا ہے)۔ حضرت مُصْعَب کی دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ اِس آیت پر آپ نے غور فرمایا؟ کیا اِس کا مطلب نماز کو چھوڑ دینا ہے؟ یا اِس سے مراد نماز پڑھتے پڑھتے آدمی کا خیال کہیں اور چلا جانا ہے؟ خیال بٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، اِس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔ (ابنِ جریر، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابویَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی السُّنَن)

اس مَقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نماز میں دوسرے خیالات کا آ جانا اَور چیز ہے، اور نماز کی طرف کبھی متوجہ ہی نہ ہونا اور اس میں ہمیشہ دوسری باتیں ہی سوچتے رہنا بالکل دوسری چیز۔ پہلی حالت تو بَشَرِیّت کا تقاضا ہے، بلااِرادہ دوسرے خیالات آ ہی جاتے ہیں، اور مومن کو جب بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ نماز سے اُس کی توجہ ہٹ گئی ہے تو وہ پھر کوشش کر کے اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسری حالت نماز سے غفلت برتنے کی تعریف میں آتی ہے، کیونکہ اس میں آدمی صرف نماز کی ورزش کر لیتا ہے، خدا کی یاد کا کوئی ارادہ اس کے دل میں نہیں ہوتا، نماز شروع کرنے سے سلام پھیرنے تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور جن خیالات کو لیے ہوئے وہ نماز میں داخل ہوتا ہے اُنھی میں مستغرق رہتا ہے۔

۱۰- یہ فقرہ ایک مستقل فقرہ بھی ہو سکتا ہے اور پہلے فقرے سے متعلّق بھی۔ اگر اسے ایک مستقل فقرہ قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی نیک کام بھی وہ خالص نیت کے ساتھ خدا کے لیے نہیں کرتے، بلکہ جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں، تاکہ ان کی تعریف ہو، لوگ ان کو نیکوکار سمجھیں، ان کے کارِ خیر کا ڈھنڈورا دنیا میں پٹے، اور اس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں انھیں دنیا ہی میں حاصل ہو جائے۔ اور اگر اس کا تعلّق پہلے فقرے کے ساتھ مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ مفسّرین نے بالعُموم دوسرے ہی معنیٰ کو ترجیح دی ہے، کیونکہ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ اِس کا تعلّق پہلے فقرے سے ہے۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد منافقین ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے تھے، اگر دوسرے لوگ موجود ہوتے تو پڑھ لیتے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو نہیں پڑھتے تھے۔'' دوسری روایت میں اُن کے الفاظ یہ ہیں: ''تنہا ہوتے تو نہ پڑھتے اور علانِیَہ پڑھ لیتے تھے۔'' (ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی الشُّعب) قرآنِ مجید میں بھی منافقین کی یہ حالت بیان کی گئی ہے کہ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ''اور جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کَسْمَساتے ہوئے اُٹھتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔'' (النساء: ۱۴۲)

۱۱- اصل میں لفظ مَاعُوْنَ استعمال ہوا ہے۔ حضرت علیؓ، ابنِ عمرؓ، سعید بن جُبَیر، قَتَادہ، حَسَن بصری، محمد بن حَنَفِیَّہ، ضَحّاک، ابنِ زید، عِکرِمہ، مجاہد، عطا اور زُہری رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ ابنِ عباسؓ، ابنِ مسعودؓ، ابراہیم نَخَعیؒ، ابو مالکؒ اور بہت سے دوسرے حضرات کا قول ہے کہ اس سے مراد عام ضرورت کی اشیا، مثلاً ہَنڈیا، ڈول، کلہاڑی، ترازو، نمک، پانی، آگ، چقماق (جس کی جانشین اب دیاسلائی ہے) وغیرہ ہیں، جو عُموماً لوگ ایک دوسرے سے عاریتاً مانگتے رہتے ہیں۔ سعید بن جُبَیر اور مجاہد کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ حضرت علیؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ بھی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی عام ضروریات کی چیزیں بھی۔ عِکرِمہ سے

ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ ماعُون کا اعلیٰ مرتبہ زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ کسی کو چھلنی، ڈول یا سوئی عاریتاً دی جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہا کرتے تھے (اور بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ کے عہدِ مبارک میں یہ کہا کرتے تھے) کہ ماعُون سے مراد ہنڈیا، کلھاڑی، ڈول، ترازو، اور ایسی ہی دوسری چیزیں مستعار دینا ہے۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبہ، ابوداؤد، نَسائی، بزّار، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی فی السُّنَن) سعد بن عِیاض ناموں کی تصریح کے بغیر قریب قریب یہی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے نقل کرتے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انھوں نے متعدّد صحابہؓ سے یہ بات سنی تھی۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبہ) دَیْلَمی، ابنِ عَساکر اور ابونُعَیم نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک رِوایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد کلھاڑی اور ڈول اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو غالباً یہ دوسرے لوگوں کے علم میں نہ آئی ہوگی، ورنہ ممکن نہ تھا کہ پھر کوئی شخص اس آیت کی کوئی اور تفسیر کرتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ماعُون چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے لیے کوئی مَنفعت یا فائدہ ہو۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے زکوٰۃ بھی ماعُون ہے، کیونکہ وہ بہت سے مال میں سے تھوڑا سا مال ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے دینا ہوتا ہے، اور وہ دوسری عام ضرورت کی اشیا بھی ماعون ہیں جن کا ذکر حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور ان کے ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ماعُون کا اطلاق اُن تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہوتا ہے جو عادتاً ہمسایے ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں۔ اُن کا مانگنا کوئی ذلّت کی بات نہیں ہوتا، کیونکہ غریب اور امیر سب ہی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ البتہ ایسی چیزوں کو دینے سے بُخل برتنا اخلاقاً ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا ہے۔ عُموماً ایسی چیزیں بجائے خود باقی رہتی ہیں اور ہمسایہ ان سے کام لے کر انھیں جُوں کا تُوں واپس دے دیتا ہے۔ اِسی ماعون کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں مہمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے چارپائی یا بستر مانگ لے۔ یا کوئی اپنے ہمسایے کے تنور میں اپنی روٹی پکا لینے کی اجازت مانگے۔ یا کوئی کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہو اور حفاظت کے لیے اپنا کوئی قیمتی سامان دوسرے کے ہاں رکھوانا چاہے۔ پس آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آخرت کا انکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنا دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کوئی معمولی ایثار کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الکوثر

(۱۰۸)

الکوثر

نام

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ کے لفظ الکوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور حضرت عائشہؓ صدیقہ سے نقل کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے، کَلْبی اور مُقاتِل بھی اسے مکی کہتے ہیں، اور جُمہورِ مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن حضرت حسن بصری، عِکْرِمہ، مجاہد اور قَتادہ اِس کو مدنی قرار دیتے ہیں۔ امام سُیُوطی نے اِتْقان میں اِسی قول کو صحیح ٹھیرایا ہے، اور امام نَوَوِی نے شرح مسلم میں اِسی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ اِس کی وہ روایت ہے جو امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابن المُنْذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور بَیْہَقی وغیرہ محدثین نے حضرت اَنَسؓ بن مالک سے نقل کی ہے کہ حضورؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ اتنے میں آپؐ پر کچھ اُونگھ سی طاری ہوئی، پھر آپؐ نے مسکراتے ہوئے سرِ مبارک اٹھایا۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا: آپؐ کس بات پر تبسم فرما رہے ہیں؟ اور بعض میں ہے کہ آپؐ نے خود لوگوں سے فرمایا: اِس وقت میرے اوپر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر آپؐ نے سورۂ کوثر پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ نے پوچھا: جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا: وہ ایک نہر ہے جو میرے رب نے مجھے جنت میں عطا کی ہے (اس کی تفصیل آگے "کوثر" کی تشریح میں آ رہی ہے)۔ اِس روایت سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر اس وجہ سے اِستِدلال کیا گیا ہے کہ حضرت اَنَسؓ مکے میں نہیں بلکہ مدینے میں تھے، اور اُن کا یہ کہنا کہ ہماری موجودگی میں یہ سورت نازل ہوئی، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مدنی ہے۔

مگر اوّل تو اِنھی حضرت اَنَسؓ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، تِرمِذِی اور ابنِ جَرِیر نے یہ روایات نقل کی ہیں کہ جنت کی یہ نہر (کوثر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں دکھائی جا چکی تھی، اور سب کو معلوم ہے کہ معراج ہجرت سے پہلے مکّہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے، جب معراج میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کے اِس عَطِیّے کی نہ صرف خبر دی جا چکی تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضورؐ کو اُس کی خوشخبری دینے کے لیے مدینۂ طیّبہ میں سورۂ کوثر نازل کی جاتی۔ تیسرے، اگر صحابہؓ کے ایک مجمع میں حضورؐ نے خود سورۂ کوثر کے نزول کی وہ خبر دی ہوتی جو حضرت اَنَسؓ کی مذکورۂ بالا روایت میں بیان ہوئی ہے اور اُس کا مطلب یہ ہوتا کہ پہلی مرتبہ یہ سورت اِسی وقت نازل ہوئی ہے، تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے باخبر صحابہ اس سورت کو مکی قرار دیتے اور جُمہورِ مفسرین اس کے مکی ہونے کے قائل ہو جاتے؟ اس معاملے پر غور کیا جائے تو حضرت اَنَسؓ کی روایت میں یہ خلا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اُس میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے کہ جس مجلس میں حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی،

Maktaba Tul Ishaat.com

اُس میں پہلے سے کیا گفتگو چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضورؐ کسی مسئلے پر کچھ ارشاد فرما رہے ہوں، اُس کے دوران میں وحی کے ذریعے سے آپؐ کو مُطّلع کیا گیا ہو کہ اِس مسئلے پر سورۂ کوثر سے روشنی پڑتی ہے، اور آپؐ نے اِسی بات کا ذکر یوں فرمایا ہو کہ مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ اِس قسم کے واقعات متعدّد مواقع پر پیش آئے ہیں، جن کی بنا پر مفسرین نے بعض آیات کے متعلق کہا ہے کہ وہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ اس دوسرے نُزول کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ آیت تو پہلے نازل ہو چکی تھی، مگر دوسری بار کسی موقع پر حضورؐ کو بذریعۂ وحی اُسی آیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ایسی روایات میں کسی آیت کے نُزول کا ذکر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا کہ وہ مکّی ہے یا مدنی، اور اس کا اصل نزول فی الواقع کس زمانے میں ہوا تھا۔

حضرت انسؓ کی یہ روایت اگر شک پیدا کرنے کی موجب نہ ہو تو سورۂ کوثر کا پورا مضمون بجائے خود اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب حضورؐ کو انتہائی دل شکن حالات سے سابقہ درپیش تھا۔

تاریخی پس منظر

اِس سے پہلے سورۂ ضُحیٰ اور سورۂ اَلَم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوّت کے ابتدائی دَور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تُلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضورؐ اور آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دُور دُور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپؐ کو تسلّی دینے اور آپؐ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدّد آیات نازل فرمائیں۔ سورۂ ضُحیٰ میں فرمایا: وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ ”اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دَور (یعنی ہر بعد کا دَور) پہلے دَور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمھارا رب تمھیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔“ اور اَلَم نشرح میں فرمایا کہ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ”اور ہم نے تمھارا آوازہ بلند کر دیا۔“ یعنی دشمن تمھیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں، مگر ہم نے اُن کے عَلَی الرَّغم تمھارا نام روشن کرنے اور تمھیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے۔ اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ”پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔“ یعنی اِس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دَور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورۂ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلّی بھی دی اور آپؐ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفّار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور اُن کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عِکرِمہ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نبی بنائے گئے اور آپؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے: بَتِرَ محمدٌ مِنّا (ابنِ جَریر)، یعنی محمدؐ اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کَٹ گیا ہو اور متوقّع یہی ہو

کہ کچھ مدت بعد وہ سوکھ کر پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سَہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا: ''اجی چھوڑو انھیں، وہ تو ایک اَبتَر (جڑ کٹے) آدمی ہیں، ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں، مر جائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔'' شمر بن عطیّہ کا بیان ہے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط بھی ایسی ہی باتیں حضوؐر کے متعلق کہا کرتا تھا۔ (ابنِ جَریر) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کَعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: الا ترٰی الٰی ھٰذا الصبیّ المنبتر من قومہٖ یزعم انہ خیر منّا ونحن اھل الحجیج واھل السدانۃ واھل السقایۃ۔ ''بھلا دیکھو تو سہی، اِس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے، حالانکہ ہم حج اور سِدانت اور سِقایت کے منتظم ہیں۔'' (بزّار) اسی واقعے کے متعلق عِکرِمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضوؐر کے لیے الصُّنبورُ المُنبَتِر من قومہٖ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی ''کمزور، بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے۔'' (ابنِ جریر) ابنِ سعد اور ابنِ عَساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں اُمِّ کُلثومؓ، فاطمہؓ اور رُقیّہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا: ''اُن کی نسل ختم ہوگئی، اب وہ ابتر ہیں۔'' (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا: ان محمدًا ابتر لا ابن لہ یقومُ مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واسترحتم منہ۔ ''محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمھارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔'' عبد بن حُمَید نے ابنِ عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضوؐر کے صاحبزادے عبداللہؓ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عَطِیّہ سے ابنِ ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضوؐر کے اِس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی مُعَیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضوؐر کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضوؐر کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضوؐر کے گھر سے متّصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور اُن کو یہ ''خوش خبری'' دی کہ بَتِر محمدٌ اللّیلۃ ''آج رات محمدؐ لاولد ہوگئے یا ان کی جڑ کٹ گئی۔''

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضوؐر پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپؐ نے عَلانِیَہ رد کر دیا تھا۔ اِسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپؐ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا، وہ آپؐ سے چھین لیا گیا تھا اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت

Maktaba Tul Ishaat.com

کے بجائے وہ خوشیاں منائی جارہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جارہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اِس مختصر ترین سورت کے ایک فقرے میں وہ خوش خبری دی جس سے بڑی خوش خبری دنیا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی، اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ آپؐ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

۳ آیاتہا — سُوۡرَۃُ الۡکَوۡثَرِ مَکِّیَّۃٌ — رکوعاتہا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾
اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾ ع

(اے نبیؐ!) ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا[۱]۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو[۲]۔ تمھارا دشمن[۳] ہی جڑ کٹا ہے[۴]ع

۱ - کوثر کا لفظ یہاں جس طرح استعمال کیا گیا ہے، اس کا پورا مفہوم ہماری زبان تو درکنار، شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کثرت سے مبالغے کا صیغہ ہے، جس کے لُغوی معنی تو بے انتہا کثرت کے ہیں، مگر جس موقع پر اِس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اُس میں محض کثرت کا نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت، اور ایسی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے جو اِفراط اور فراوانی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو، اور اُس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں، بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔ دیباچے میں اِس سورہ کا جو پَس منظر ہم نے بیان کیا ہے، اُس پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ حالات وہ تھے جب دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں۔ قوم سے کٹ کر بے یار و مددگار رہ گئے۔ تجارت برباد ہو گئی۔ اولادِ نرینہ تھی، جس سے آگے اُن کا نام چل سکتا تھا، وہ بھی وفات پا گئی۔ بات ایسی لے کر اُٹھے ہیں کہ چند گِنے چُنے آدمی چھوڑ کر مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اُن کے مقدّر میں اِس کے سوا کچھ نہیں کہ جیتے جی ناکامی و نامرادی سے دوچار رہیں، اور جب وفات پا جائیں تو دنیا میں کوئی اُن کا نام لیوا بھی نہ ہو۔ اِس حالت میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا، تو اِس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمھارے مخالف بے وقوف تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم برباد ہو گئے اور نبوت سے پہلے جو نعمتیں تمھیں حاصل تھیں وہ بھی تم سے چِھن گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمھیں بے انتہا خیر اور بے شمار نعمتوں سے نواز دیا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ بے نظیر خوبیاں بھی شامل ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی گئیں۔ اس میں نبوت اور قرآن اور علم اور حکمت کی وہ عظیم نعمتیں بھی شامل ہیں جو آپؐ کو عطا کی گئیں۔ اس میں توحید اور ایک ایسے نظامِ زندگی کی نعمت بھی شامل ہیں جس کے سیدھے سادھے، عام فہم، عقل و فطرت کے مطابق اور جامع و ہمہ گیر اُصول تمام عالَم میں پھیل جانے اور ہمیشہ پھیلتے ہی چلے جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس میں رفعِ ذکر کی نعمت بھی شامل ہے جس کی بدولت حضورؐ کا نام نامی چودہ سو برس سے دنیا کے گوشے گوشے میں بلند ہو رہا ہے اور قیامت تک بلند ہوتا رہے گا۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ آپؐ کی دعوت سے بالآخر ایک ایسی عالَم گیر اُمّت وجود میں آئی جو دنیا میں ہمیشہ کے لیے دینِ حق کی عَلَم بردار بن گئی، جس سے زیادہ نیک اور پاکیزہ اور بلند پایہ انسان دنیا کی کسی اُمّت میں کبھی پیدا نہیں ہوئے، اور جو بگاڑ کی حالت کو پہنچ کر بھی دنیا کی سب قوموں سے بڑھ کر

Maktaba Tul Ishaat.com

خیر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ حضورؐ نے اپنی آنکھوں سے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں اپنی دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھ لیا اور آپؐ کے ہاتھوں سے وہ جماعت تیار ہوگئی جو دنیا پر چھا جانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اِس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ اولادِ نرینہ سے محروم ہو جانے کی بنا پر دشمن تو یہ سمجھتے تھے کہ آپؐ کا نام ونشان دنیا سے مٹ جائے گا، لیکن اللہ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی صورت میں آپؐ کو وہ روحانی اولاد عطا فرمائی جو قیامت تک رُوئے زمین پر آپؐ کا نام روشن کرنے والی ہے، بلکہ آپؐ کی صرف ایک ہی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کو وہ جسمانی اولاد بھی عطا کی جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کا سارا سرمایۂ افتخار ہی حضورؐ سے اس کا انتساب ہے۔

یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو اِس دنیا میں لوگوں نے دیکھ لیں کہ وہ کس فراوانی کے ساتھ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ کوثر سے مراد دو مزید ایسی عظیم نعمتیں بھی ہیں جو آخرت میں اللہ تعالیٰ آپؐ کو دینے والا ہے۔ اُن کو جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اُن کی خبر دی اور بتایا کہ کوثر سے مراد وہ بھی ہیں۔ ایک حوضِ کوثر، جو قیامت کے روز میدانِ حشر میں آپؐ کو ملے گا۔ دوسرے نہرِ کوثر، جو جنت میں آپؐ کو عطا فرمائی جائے گی۔ اِن دونوں کے متعلق اِس کثرت سے احادیث حضورؐ سے منقول ہوئی ہیں اور اتنے کثیر راویوں نے اُن کو روایت کیا ہے کہ اُن کی صحت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں۔

حوضِ کوثر کے متعلق حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپؐ کو عطا ہوگا اور اُس سخت وقت میں، جب کہ ہر ایک العَطَش العَطَش کر رہا ہوگا، آپؐ کی اُمت آپؐ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی۔ آپؐ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہوں گے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: هو حوض ترد علیه امتي یوم القیٰمة۔ ”وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز وارد ہوگی۔“ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب السُّنّۃ) انا فَرَطکم علی الحوض ”میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہوں گا۔“ (بخاری، کتاب الرِّقاق اور کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ۔ ابنِ ماجہ، کتاب المناسک اور کتاب الزُّہد۔ مُسندِ احمد، مرویاتِ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ و ابوہریرہؓ) اني فرط لکم وانا شهید علیکم واني واللّٰه لانظر الی حوضي الاٰن۔ ”میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دوں گا، اور خدا کی قسم! میں اپنے حوض کو اِس وقت دیکھ رہا ہوں۔“ (بخاری، کتاب الجنائز، کتاب المغازی، کتاب الرِّقاق) انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: انکم ستلقون بعدي اَثَرة فاصبروا حتّٰی تلقوني علی الحوض۔ ”میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور اقربا نوازیوں سے پالا پڑے گا، اس پر صبر کرنا، یہاں تک کہ مجھ سے آ کر حوض پر ملو۔“ (بخاری، کتاب مناقب الانصار وکتاب المغازی۔ مسلم، کتاب الامارۃ۔ ترمذی، کتاب الفتن) انا یوم القیٰمة عِنْدَ عقر الحوض۔ ”میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہوں گا۔“ (مسلم، کتاب الفضائل) حضرت ابو بَرزہؓ اَسلَمی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا ہے، جو اُس کو جھٹلائے اللہ اسے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے۔ (ابوداؤد، کتاب السُّنّۃ) عبیداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتّٰی کہ اس نے حضرت ابو بَرزہؓ اَسلَمی، بَراءؓ بن عازِب اور عائذ بن عَمروؓ کی سب رِوایات کو جھٹلا دیا۔ آخرِ کار ابو سَبرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص سے سن کر نقل کی تھی اور اس میں

حضورؐ کا یہ ارشاد درج تھا کہ الا اِن موعدکم حوضی۔ ”خبردار رہو! میری اور تمھاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے۔“ (مُسنَدِ احمد، مَروِیّاتِ عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص)

(۲) اُس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے۔ مگر کثیر رِوایات میں یہ ہے کہ وہ اَیلہ (اسرائیل کے موجودہ بندرگاہ اَیلات) سے یمن کے صَنعا تک، یا اَیلہ سے عَدن تک، یا عُمّان سے عدن تک طویل ہوگا، اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا اَیلہ سے جُحفہ (جِدّہ اور رابغ کے درمیان ایک مَقام) تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، کتاب الرّقاق۔ ابوداؤد الطّیالسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مُسنَدِ احمد، مَرویاتِ ابوبکر صدیقؓ وعبداللہ بن عمرؓ۔ مسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذِی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد) اِس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمر ہی کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اس حوض کے متعلق حضورؐ نے بتایا ہے کہ اس میں جنت کی نہرِ کوثر (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) سے پانی لا کر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیه میزاباں من الجنّة، اور دوسری روایت میں ہے: یغت فیه میزاباں یمدّانه من الجنّة، یعنی اس میں جنت سے دو نالیاں لا کر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی۔ (مسلم، کتاب الفضائل) ایک اور روایت میں ہے: یفتح نھر من الکوثر الی الحوض، جنت کی نہرِ کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی۔ (مُسنَدِ احمد، مَرویّاتِ عبداللہؓ بن مسعود)

(۴) اس کی کیفیّت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دودھ سے (اور بعض روایات میں ہے چاندی سے، اور بعض میں برف سے) زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی، اس پر اتنے کُوزے رکھے ہوں گے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اُس کا پانی پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی، اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔ (بخاری، کتاب الرّقاق۔ مسلم، کتاب الطہارۃ وکتاب الفضائل۔ مُسنَدِ احمد، مرویاتِ ابنِ مسعودؓ، ابن عمرؓ، وعبداللہ بن عَمرؓو بن العاص۔ ترمذِی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد۔ ابوداؤد طیالسی، حدیث ۹۹۵و ۲۱۳۵)

(۵) اس کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، ان کو اُس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انھیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں، تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپؐ کو نہیں معلوم کہ آپؐ کے بعد انھوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی اُن کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور ہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، کتاب الرِقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابنِ مسعودؓ وابوہریرہؓ۔ ابنِ ماجہ، کتاب المَناسک۔ ابنِ ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے، وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں: الا وانی فرطکم علی الحوض واکاثربکم الامم فلا تسودوا وجھی، الا وانی مستنقذ اُناسًا ومستنقذ اناس منّی فاقول یا رب اصیحابی، فیقول انك لا تدری ما احدثوا بعدك، ”خبردار رہو! میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہوں گا اور تمھارے ذریعے سے دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اپنی اُمت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو! کچھ لوگوں کو میں چھُڑاؤں گا اور کچھ لوگ مجھ سے چھُڑائے جائیں گے۔ میں کہوں گا کہ اے پروردگار! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ وہ فرمائے گا: تم نہیں جانتے، اِنھوں نے تمھارے بعد کیا نرالے کام کیے ہیں۔“ ابنِ ماجہ کی رِوایت ہے کہ یہ الفاظ حضورؐ نے

Maktaba Tul Ishaat.com

عَرَفات کے خطبے میں فرمائے تھے)۔

(۲) اسی طرح حضورؐ نے اپنے دَور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں رَدّ و بدل کریں گے انھیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا، میں کہوں گا کہ اے رب! یہ تو میرے ہیں، میری اُمّت کے لوگ ہیں۔ جواب ملے گا: آپ کو معلوم نہیں کہ اِنھوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا تغیّرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اِس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں۔ (بخاری، کتاب المُساقات، کتاب الرّقاق، کتاب الفِتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفضائل۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد، مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابنِ عباسؓ)

اس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہؓ سے مروی ہیں، اور سَلَف نے بالعُموم اس سے مراد حوضِ کوثر لیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الرقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے: بابٌ فی الحوض وقول اللہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضورؐ نے کوثر کے متعلق فرمایا: هو حوض ترد علیه امتی "وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت وارد ہوگی۔"

جنت میں کوثر نامی جو نہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی، اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضورؐ کو جنت کی سیر کرائی گئی اور اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے تراشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے قُبّے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تہ کی مٹی مُشکِ اَذفَر کی تھی۔ حضورؐ نے جبریل سے، یا اُس فرشتے سے جس نے آپؐ کو سیر کرائی تھی، پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ نہرِ کوثر ہے جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، ابوداؤد طیالسی، ابنِ جَریر) حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا۔ (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مُشک ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ جَریر۔ مُسندِ احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے نہرِ کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: اس کی تہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، جس کے کنارے سونے کے ہیں، وہ موتیوں اور ہیروں پر بہ رہی ہے (یعنی کنکریوں کی جگہ اس کی تہ میں یہ جواہر پڑے ہوئے ہیں)، اس کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی دودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ ماجہ، ابنِ ابی حاتم، دارمی، ابوداؤد طیالسی، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُویہ، ابنِ ابی شَیبہ) اسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے حضورؐ کی تواضع کی اور دورانِ گفتگو میں عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپؐ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اور اس کی زمین یاقوت و مَرجان اور زَبَرجَد اور موتیوں کی ہے۔ (ابنِ جَریر، ابنِ مَردُویہ۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویّت پہنچاتا ہے)۔ اِن مرفوع

روایات کے علاوہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنت کی یہ نہر لیتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اوپر گزری ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت اَنسؓ بن مالک، حضرت عائشہؓ، مجاہد اور ابو العالیہ کے اقوال مُسندِ احمد، بخاری، ترمِذِی، نَسائی، ابنِ مَرْدُوْیہ، ابنِ جَرِیر اور ابنِ ابی شَیْبہ وغیرہ محدّثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔

۲ – اس کی مختلف تفسیریں مختلف بزرگوں سے منقول ہیں۔ بعض حضرات نے نماز سے مراد پنج وقتہ فرض نماز لی ہے، بعض اس سے بقر عید کی نماز مراد لیتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ بجائے خود نماز مراد ہے۔ اسی طرح وَانْحَرْ یعنی نَحر کرو سے مراد بعض جلیل القدر بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اُسے سینے پر باندھنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ افتتاحِ نماز کے وقت، اور رُکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اُٹھ کر رفع یدین کرنا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بقر عید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ حکم دیا گیا ہے، اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کا مطلب صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اے نبیؐ! جب تمھارے رب نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بھلائیاں عطا کی ہیں تو تم اُسی کے لیے نماز پڑھو اور اُسی کے لیے قربانی کرو۔" یہ حکم اُس ماحول میں دیا گیا تھا جب مشرکینِ قریش ہی نہیں، تمام عرب کے مشرکین اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبُودوں کی عبادت کرتے تھے اور انھی کے آستانوں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ پس حکم کا منشا یہ ہے کہ مشرکین کے برعکس تم اپنے اِسی رَوِیّے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو کہ تمھاری نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہو اور قربانی بھی اُسی کے لیے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ "اے نبیؐ! کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سرِاطاعت جھکانے والا ہوں۔" (الانعام: ۱۶۲ - ۱۶۳) یہی مطلب ابنِ عباسؓ، عطا، مجاہد، عِکْرِمہ، حسن بصری، قَتادہ، محمد بن کَعب القُرظی، ضَحّاک، ربیع بن اَنس، عطاالخُراسانی، اور بہت سے دوسرے اکابر مفسرین رحمھم اللہ نے بیان کیا ہے۔ (ابنِ کثیر) البتہ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینۂ طیّبہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بقر عید کی نماز اور قربانی کا طریقہ جاری کیا تو اس بنا پر کہ آیت اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ اور آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ میں نماز کو مقدم اور قربانی کو مؤخر رکھا گیا ہے، آپؐ نے خود بھی یہ عمل اختیار فرمایا اور اسی کا حکم مسلمانوں کو دیا کہ اُس روز پہلے نماز پڑھیں اور پھر قربانی کریں۔ یہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے، نہ اس کی شانِ نزول ہے، بلکہ اِن آیات سے حضورؐ کا استنباط ہے، اور آپؐ کا اِستنباط بھی وحی کی ایک قسم ہے۔

۳ – اصل میں لفظ شَانِئَکَ استعمال ہوا ہے۔ شانِیٔ شَنْءٌ سے ہے، جس کے معنیٰ ایسے بُغض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ "اور اے مسلمانو! کسی گروہ کی عداوت تمھیں اِس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو۔" پس شَانِئَکَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپؐ کو عیب لگاتا ہو، آپؐ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپؐ کی توہین کرتا ہو، اور آپؐ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۴ - هُوَالْاَبْتَرُ ’’ وہی اَبْتَر ہے‘‘ فرمایا گیا ہے، یعنی وہ آپؐ کو اَبْتَر کہتا ہے، لیکن حقیقت میں ابتر وہ خود ہے۔ اَبْتَر کی کچھ تشریح ہم اِس سے پہلے اس سورت کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ یہ لفظ بَتَر سے ہے جس کے معنٰی کاٹنے کے ہیں۔ مگر محاورے میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے، بُتَیراء کہا گیا ہے، یعنی اکیلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے: كلّ امر ذی بالٍ لا يُبدأ فيه بحمد الله فهو ابتر۔ ’’ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ابتر ہے۔‘‘ یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے، اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی ابتر کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ابتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں، وہ بھی ابتر ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے، برادری اور اعوان و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو، وہ بھی ابتر ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا مرگئی ہو، اس کے لیے بھی ابتر کا لفظ بولا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب اِن سب معنوں میں کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبیؐ! ابتر تم نہیں ہو بلکہ تمھارے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ محض کوئی ’’جوابی حملہ‘‘ نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اُس وقت لوگ حضورؐ ہی کو اَبْتَر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصوُّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملکِ عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ اَحزاب (۵ھ) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضورؐ کو محصور ہو کر، شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ھ میں جب آپؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انھیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملکِ عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے، اور آپؐ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو اُن میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبَہ بن ابی مُعَیط وغیرہ اَعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعثِ عزّ و شَرَف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زُبیری، اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضورؐ نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

تفہیم القرآن

الکافرون

(۱۰۹)

Maktaba Tul Ishaat.com

الکافرون

نام پہلی ہی آیت قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ کے لفظ الکافرون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حسن بصریؒ اور عِکرِمہؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے، حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ کہتے ہیں مدنی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور قَتَادَہؒ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جُمہورِ مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے، اور اس کا مضمون خود اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

تاریخی پس منظر مکۂ معظمہ میں ایک دَور ایسا گزرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اِس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ کو کسی نہ کسی طرح مُصالحت پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپؐ کے پاس مُصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپؐ اُن میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپؐ کے اور اُن کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدّد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عُزّیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبُود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا، ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔[1] اس پر وحی نازل ہوئی:

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسولؐ اللہ کسی درجے میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنیٰ قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپؐ نے، معاذاللہ، کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیجے دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ...... اور یہ کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ○ (الزُّمَر، آیت ۶۴) ''اِن سے کہو: اے نادانو! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟'' (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی) ابنِ عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضوؐر سے کہا: ''اے محمدؐ! اگر تم ہمارے معبُود بُتوں کو چوم لو تو ہم تمھارے معبُود کی عبادت کریں گے۔'' اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (عبد بن حُمَید)

سعید بن مِیناء (ابوالبَختَری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مُغیرہ، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المُطَّلِب اور اُمَیَّہ بن خَلَف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے کہا: ''اے محمدؐ! آؤ، ہم تمھارے معبُود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبُودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمھیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو، اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے، تو ہم تمھارے ساتھ اُس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصّہ اُس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اُس سے اپنا حصّہ پالو گے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ...... (ابنِ جَرِیر و ابنِ ابی حاتم۔ ابنِ ہِشام نے بھی سیرت میں اس واقعے کو نقل کیا ہے)۔

وَہب بن مُنَبِّہ کی رِوایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں۔ (عبد بن حُمَید، ابنِ ابی حاتم)

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضوؐر کے سامنے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے کر اُن کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملے میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر اُن سے کوئی مُصالَحت کر لیں گے۔

موضوع اور مضمون

اِس پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اِس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور اُن کی پوجا پاٹ اور اُن کے معبُودوں سے قطعی براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور اُنھیں بتا دیا جائے کہ دینِ کفر اور دینِ اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اُن کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مُخاطَب کر کے اُن کی تجاویزِ مُصالَحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ اُنھی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دینِ کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے، اُن کو اس سے قول اور عمل میں بَراءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رُو رعایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملے میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مُداہنت یا مُصالَحت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے یہ سورت اُس

رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اُوپر سے حکومت کا جواب ہی تمھارے مطالبے کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مرکھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اِس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور اُن کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں، کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلّقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورہ کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جا سکتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ میں نے بارہا حضوؐر کو فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ پڑھتے دیکھا ہے۔ (اس مضمون کی متعدِد روایات کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ امام احمد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عمرؓ سے نقل کی ہیں)۔

حضرت خَبّابؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹو تو قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، اور حضوؐر کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپؐ سونے کے لیے لیٹتے تو یہ سورت پڑھ لیا کرتے تھے۔ (بزّار، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: "میں تمھیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو۔" (ابو یَعلیٰ، طَبَرانی)

حضرت اَنَسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُعاذؓ بن جَبَل سے فرمایا: سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، کیونکہ یہ شرک سے بَراءت ہے۔ (بَیْہَقی فی الشُّعَب)

فَرْوَہ بن نَوفَل اور عبدالرحمٰن بن نَوفَل، دونوں کا بیان ہے کہ ان کے والد نَوفَل بن معاویہ الاَشْجَعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجیے جسے میں سوتے وقت پڑھ لیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا: قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ آخر تک پڑھ کر سو جایا کرو، کیونکہ یہ شرک سے بَراءت ہے۔ (مُسنَدِ احمد، ابوداؤد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ ابی شَیْبَہ، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی فی الشُّعَب) ایسی ہی درخواست حضرت زیدؓ بن حارِثہ کے بھائی حضرت جَبَلہؓ بن حارِثہ نے حضوؐر سے کی تھی اور ان کو بھی آپؐ نے یہی جواب دیا تھا۔ (مُسنَدِ احمد، طَبَرانی)

آیاتہا ۶ — سُورَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ — رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۟ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۟ۙ﴿۲﴾ وَلَاۤ اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۟ۚ﴿۳﴾ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۟ۙ﴿۴﴾ وَلَاۤ اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۟ؕ﴿۵﴾ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۟۠﴿۶﴾ ع

ع ۱ / ۳۳

کہہ دو کہ اے کافرو[۱]! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو[۲]، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[۳]۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[۴]۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین[۵]۔ ع

۱ — اس آیت میں چند باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

(۱) حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے کہ آپ کافروں سے یہ بات صاف صاف کہہ دیں، لیکن آگے کا مضمون یہ بتا رہا ہے کہ ہر مومن کو وہی بات کافروں سے کہہ دینی چاہیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہے، حتّٰی کہ جو شخص کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آیا ہو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ دینِ کفر اور اس کی عبادات اور معبودوں سے اِسی طرح اپنی بَراءت کا اظہار کر دے۔ پس لفظ قُلْ (کہہ دو) کے اوّلین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر یہ حکم حضورؐ کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپؐ کے واسطے سے ہر مومن کو پہنچتا ہے۔

(۲) ''کافر'' کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے جو اس آیت کے مُخاطَبوں کو دی گئی ہو، بلکہ عَرَبی زبان میں کافر کے معنٰی انکار کرنے والے اور نہ ماننے والے (unbeliever) کے ہیں، اور اس کے مقابلے میں ''مومن'' کا لفظ مان لینے اور تسلیم کر لینے والے (believer) کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''اے کافرو'' دراصل اس معنٰی میں ہے کہ ''اے وہ لوگو جنھوں نے میری رسالت اور میری لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔'' اور اسی طرح ایک مومن جب یہ لفظ کہے گا تو اس کی مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے والے ہوں گے۔

(۳) اے کافرو کہا ہے، اے مشرکو نہیں کہا، اس لیے کہ مخاطب صرف مشرکین ہی نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول، اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم و ہدایت کو اللہ جَلَّ شانُہٗ کی تعلیم و ہدایت نہیں مانتے، خواہ وہ یہود ہوں، نصارٰی ہوں، مجوسی ہوں، یا دنیا بھر کے کفار و مشرکین اور مَلاحِدہ ہوں۔ اِس خطاب کو صرف قریش یا عرب کے مشرکین تک محدود رکھنے کی کوئی

Maktaba Tul Ishaat.com

وجہ نہیں ہے۔

(۴) منکرین کو "اے کافرو" کہہ کر خطاب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کچھ لوگوں کو اے دشمنو، یا اے مخالفو کہہ کر مخاطب کریں۔ اِس طرح کا خطاب دراصل مُخاطَبوں کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اُن کی صفتِ دشمنی اور صفتِ مُخالفت کی بنا پر ہوتا ہے اور اُسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک اُن میں یہ صفت باقی رہے۔ اگر اُن میں سے کوئی دشمنی و مخالفت چھوڑ دے، یا دوست اور حامی بن جائے تو وہ اس خطاب کا مُخاطَب نہیں رہتا۔ بالکل اِسی طرح جن لوگوں کو "اے کافرو" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، وہ بھی اُن کی صفتِ کفر کے لحاظ سے ہے، نہ کہ اُن کی ذاتی حیثیت سے۔ اُن میں سے جو شخص مرتے دم تک کافر رہے اُس کے لیے تو یہ خطاب دائمی ہوگا، لیکن جو شخص ایمان لے آئے وہ اِس کا مُخاطَب نہ رہے گا۔

(۵) مفسرین میں سے بہت سے بزرگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سورت میں "اے کافرو" کا خطاب قریش کے صرف اُن چند مخصوص لوگوں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین کے معاملے میں مُصالحت کی تجویزیں لے لے کر آرہے تھے اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ رائے انھوں نے دو وجوہ سے قائم کی ہے۔ ایک یہ کہ آگے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (جس کی یا جن کی عبادت تم کرتے ہو اُس کی یا اُن کی عبادت مَیں نہیں کرتا) فرمایا گیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قول یہود و نصاریٰ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں)، اور ان کا اِستدلال یہ ہے کہ یہ قول اُن لوگوں پر صادق نہیں آتا جو اِس سورت کے نُزول کے وقت کافر تھے اور بعد میں ایمان لے آئے۔ لیکن یہ دونوں دلیلیں صحیح نہیں ہیں۔ جہاں تک اِن آیتوں کا تعلق ہے اِن کی تشریح تو ہم آگے چل کر کریں گے، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا وہ مطلب نہیں ہے جو اِن سے سمجھا گیا ہے۔ یہاں اِس استدلال کی غَلَطی واضح کرنے کے لیے صرف اتنی بات کہہ دینا کافی ہے کہ اگر اِس سورہ کے مخاطَب صرف وہی لوگ تھے تو اُن کے مَر کھپ جانے کے بعد اِس سورہ کی تلاوت جاری رہنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور اسے مستقل طور پر قرآن میں درج کر دینے کی کیا ضرورت تھی کہ قیامت تک مسلمان اسے پڑھتے رہیں؟

۲ – اس میں وہ سب معبُود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کفّار اور مشرکین کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خواہ وہ ملائکہ ہوں، جِنّ ہوں، انبیا اور اولیا ہوں، زندہ یا مردہ انسانوں کی ارواح ہوں، یا سورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، دریا، بُت اور خیالی دیویاں اور دیوتا ہوں۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو بھی تو معبُود مانتے تھے، اور دنیا کے دوسرے مشرکین نے بھی قدیم زمانے سے آج تک اللہ کے معبُود ہونے کا انکار نہیں کیا ہے۔ رہے اہلِ کتاب، تو وہ اصل معبُود تو اللہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ان سب لوگوں کے تمام معبُودوں کی عبادت سے کسی استثنا کے بغیر بَراءت کا اعلان کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب کہ اللہ بھی ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معبُودوں کے مجموعے میں ایک معبُود کی حیثیت سے شامل کر کے اگر دوسروں کے ساتھ اُس کی عبادت کی جائے تو وہ شخص جو توحید پر ایمان رکھتا ہو، لازماً اس عبادت سے اپنی بَراءت کا اظہار کرے گا، کیونکہ اس کے نزدیک اللہ معبُودوں کے مجموعے میں سے ایک معبُود نہیں بلکہ وہی ایک تنہا معبُود ہے، اور اِس مجموعے کی عبادت سرے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں ہے، اگرچہ اُس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآنِ مجید میں اِس بات کو صاف صاف کہا گیا ہے

کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس میں انسان اپنی بندگی کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ۔ ''لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یک سُو ہو کر، اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی عبادت کریں۔'' (البیّنۃ:۵) یہ مضمون بکثرت مقامات پر قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: النساء، آیات ۱۴۵-۱۴۶۔ الاعراف، ۲۹۔ الزُّمَر، ۲-۳-۱۱-۱۴-۱۵۔ المومن، ۱۴-۶۴ تا ۶۶۔ یہی مضمون ایک حدیثِ قُدسی میں بیان کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی عمل ایسا کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی اُس نے شریک کیا ہو، اُس سے میں بَری ہوں اور وہ پورا کا پورا عمل اُسی کے لیے ہے جس کو اُس نے شریک کیا۔'' (مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ ماجہ) پس درحقیقت اللہ کو دو یا تین یا بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا اور اُس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و پرستش کرنا ہی تو وہ اصل کفر ہے جس سے اظہارِ براءت کرنا اِس سورت کا مقصود ہے۔

۳- اصل الفاظ ہیں: مَآ اَعْبُدُ۔ عربی زبان میں مَا کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اِس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے چار جواب عام طور پر مفسّرین نے دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں مَا بمعنیٰ مَنْ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا بمعنیٰ الّذی (یعنی جو یا جس) ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں فقروں میں مَا مصدر کے معنیٰ میں ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو، یعنی مشرکانہ عبادت، اور تم وہ عبادت نہیں کرتے جو میں کرتا ہوں، یعنی مؤحّدانہ عبادت۔ چوتھے یہ کہ پہلے فقرے میں چونکہ مَا تَعْبُدُوْنَ فرمایا گیا ہے اس لیے دوسرے فقرے میں کلام کی مناسبت برقرار رکھتے ہوئے مَآ اَعْبُدُ فرمایا گیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف لفظ کی یکسانی ہے، معنیٰ کی یکسانی نہیں ہے، اور اس کی مثالیں قرآنِ مجید میں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۴) میں فرمایا گیا ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ''جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے۔'' ظاہر ہے کہ زیادتی کا ویسا ہی جواب جیسی زیادتی کی گئی ہو، زیادتی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر محض کلام کی یکسانی کے لیے جواباً زیادتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ توبہ (آیت ۶۷) میں ارشاد ہوا ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ''وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ اُن کو بھول گیا'' حالانکہ اللہ بھولتا نہیں ہے، اور مقصودِ کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نظر انداز فرما دیا، لیکن اُن کے نِسیان کے جواب میں اللہ کے لیے نِسیان کا لفظ محض کلام کی یکسانی برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں یہ سب معنیٰ لینے کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کہا گیا ہے۔ دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَنْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اُس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے، اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اُردو

Maktaba Tul Ishaat.com

زبان میں جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں، تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کیا ہیں؟ تو اس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مثلاً وہ فوج کا آدمی ہے تو فوج میں اس کا منصب کیا ہے؟ اور کسی درس گاہ سے تعلق رکھتا ہے تو اُس میں ریڈر ہے؟ لیکچرر ہے؟ پروفیسر ہے؟ کس علم یا فن کا استاد ہے؟ کیا ڈگریاں رکھتا ہے؟ وغیرہ۔ پس اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَنۡ اَعۡبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور اس کے جواب میں مشرکین اور کفّار یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور اس کی عبادت بھی ہم کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں، اُن صفات کے معبُود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین منکرینِ خدا کے سوا تمام اقسام کے کفّار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ کا خدا اُن سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ اُن میں سے کسی کا خدا ایسا ہے جس کو چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی، جو ربُّ العالمین نہیں بلکہ ربّ اسرائیل ہے، جس کا ایک نسل کے لوگوں سے ایسا خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، جو حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑتا ہے اور ان کو گرا نہیں سکتا، جو عُزَیر نامی ایک بیٹا بھی رکھتا ہے۔ کسی کا خدا یسوع مسیح نامی ایک اکلوتے بیٹے کا باپ ہے اور دوسروں کے گناہوں کا کفّارہ بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو صلیب پر چڑھوا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے، مگر بے چارے کے ہاں صرف بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھارتا ہے اور زمین پر انسانی جسم میں رہ کر انسانوں کے سے کام کرتا ہے۔ کسی کا خدا محض واجب الوجود، یا علّتُ العِلَل یا علّتِ اُولیٰ (first cause) ہے، کائنات کے نظام کو ایک مرتبہ حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اس کے بعد کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق خود چل رہی ہے اور انسان کا اُس سے اور اُس کا انسان سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض خدا کو ماننے والے کفّار بھی درحقیقت اُس خدا کو نہیں مانتے جو ساری کائنات کا ایک ہی خالق، مالک، مدبّر، منتظم اور حاکم ہے۔ جس نے نظامِ کائنات کو صرف بنایا ہی نہیں ہے، بلکہ ہر آن وہی اس کو چلا رہا ہے اور اس کا حکم ہر وقت یہاں چل رہا ہے۔ جو ہر عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے مُنَزَّہ ہے۔ جو ہر تشبیہ اور تجسیم سے پاک، ہر نظیر و تمثیل سے مُبَرّا، اور ہر ساتھی اور ساجھی سے بے نیاز ہے۔ جس کی ذات، صفات، اختیارات اور استحقاقِ معبُودیّت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ جو اِس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو، یا کسی کو وہ بیٹا بنائے، یا کسی قوم اور نسل سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہو۔ جس کا اپنی مخلوق کے ایک ایک فرد کے ساتھ رزّاقی اور رُبوبیّت اور رحمت اور نگہبانی کا براہِ راست تعلّق ہے۔ جو دعائیں سننے والا اور اُن کا جواب دینے والا ہے۔ جو موت اور زندگی، نفع اور ضرر اور قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے جملہ اختیارات کا تنہا مالک ہے۔ جو اپنی مخلوق کو صرف پالتا ہی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق ہدایت بھی دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا معبود ہے اور ہم اُس کی پرستش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انبیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں امر و نہی کے احکام دیتا ہے اور ہمارا کام اس کے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ جس کے سامنے ہم اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں، جو مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ اٹھانے والا ہے اور ہمارے اعمال کا مُحاسَبہ کر کے جزا اور سزا دینے والا ہے۔ اِن صفات کے معبُود کی عبادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے اگر خدا کی عبادت کر بھی رہے ہیں تو اصلی اور حقیقی خدا کی نہیں بلکہ اس خدا کی عبادت کر

رہے ہیں جو اُن کا اپنا اختراع کردہ ایک خیالی خدا ہے۔

۴- مفسّرین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دونوں فقرے پہلے دو فقروں کے مضمون کی تکرار ہیں، اور یہ تکرار اِس غرض کے لیے کی گئی ہے کہ اُس بات کو زیادہ پُرزور بنا دیا جائے جو پہلے دو فقروں میں کہی گئی تھی۔ لیکن بہت سے مفسّرین اس کو تکرار نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اِن میں ایک اور مضمون بیان کیا گیا ہے جو پہلے فقروں کے مضمون سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اِس حد تک تو اُن کی بات صحیح ہے کہ اِن فقروں میں تکرار نہیں ہے، کیونکہ اِن میں صرف ''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں'' کا اعادہ کیا گیا ہے، اور یہ اعادہ بھی اُس معنیٰ میں نہیں ہے جس میں یہ فقرہ پہلے کہا گیا تھا۔ مگر تکرار کی نفی کرنے کے بعد مفسّرین کے اس گروہ نے ان دونوں فقروں کے جو معنیٰ بیان کیے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اِس کا موقع نہیں ہے کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے بیان کردہ معنیٰ کو نقل کر کے اُس پر بحث کریں، اس لیے طولِ کلام سے بچتے ہوئے ہم صرف وہ معنیٰ بیان کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح ہیں۔

پہلے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ ''اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔'' اِس کا مضمون آیت ۲ کے مضمون سے بالکل مختلف ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ ''میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔'' ان دونوں باتوں میں دو حیثیتوں سے بہت بڑا فرق ہے۔ ایک یہ کہ ''میں فلاں کام نہیں کرتا یا نہیں کروں گا'' کہنے میں اگرچہ انکار اور پُرزور انکار ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ زور یہ کہنے میں ہے کہ میں فلاں کام کرنے والا نہیں ہوں، کیونکہ اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایسا بُرا کام ہے جس کا ارتکاب کرنا تو درکنار، اُس کا ارادہ یا خیال کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ''جن کی عبادت تم کرتے ہو'' کا اطلاق صرف اُن معبُودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفّار اب کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے ''جن کی عبادت تم نے کی ہے'' کا اطلاق اُن سب معبُودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفّار اور ان کے آبا و اجداد زمانۂ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ اب یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مشرکین اور کفّار کے معبُودوں میں ہمیشہ ردّ و بدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے، مختلف زمانوں میں کفّار کے مختلف گروہ مختلف معبُودوں کو پوجتے رہے ہیں، اور سارے کافروں کے معبُود ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی نہیں رہے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تمھارے آج کے معبُودوں ہی سے نہیں بلکہ تمھارے آبا و اجداد کے معبودوں سے بھی بَری ہوں، اور میرا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے معبودوں کی عبادت کا خیال تک اپنے دل میں لاؤں۔

رہا دوسرا فقرہ، تو اگرچہ آیت ۵ میں اُس کے الفاظ وہی ہیں جو آیت ۳ میں ہیں، لیکن دونوں جگہ اُس کا مفہُوم مختلف ہے۔ آیت ۳ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ ''میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو''، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اور نہ تم اُن صفات کے معبُودِ واحد کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔'' اور آیت ۵ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ ''اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے''، اس لیے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ''اور نہ تم اُس معبُودِ واحد کی عبادت کرنے والے بنتے نظر آتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں''، یا بالفاظِ دیگر، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جن جن کو تم نے اور تمھارے اسلاف نے پوجا ہے اُن کا پُجاری بن جاؤں، اور تم کو بہت سے معبُودوں کی بندگی چھوڑ کر ایک معبُودِ واحد کی عبادت اختیار کرنے سے جو چِڑ ہے، اُس کی بنا پر تم سے یہ توقع نہیں ہے کہ اپنی اس غلط عبادت سے باز آجاؤ گے اور اُس کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

۵- یعنی میرا دین الگ ہے اور تمھارا دین الگ۔ میں تمھارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبُود کے پرستار نہیں۔ میں

Maktaba Tul Ishaat.com

تمھارے معبُودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے معبُود کی بندگی کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس لیے میرا اور تمھارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔ یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے، بلکہ جب تک وہ کافر ہیں اُن سے ہمیشہ کے لیے بَراءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے، اور اس سے مقصود اُن کو اِس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملے میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی اُن سے کوئی مُصالحت کرے گا۔ یہی اعلانِ بَراءت اور اظہارِ بیزاری اِس سورت کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونُس میں فرمایا: ”اگر یہ تجھے جُھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمّہ داری سے تم بَری ہو، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بَری ہوں۔“ (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اِسی سورت میں فرمایا: ”اے نبیؐ! کہہ دو کہ لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شُبہے میں ہو تو (سن لو کہ) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو، میں ان کی بندگی نہیں کرتا، بلکہ صرف اُس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمھاری موت ہے۔“ (آیت ۱۰۴) سورۂ شُعَراء میں فرمایا: ”اے نبیؐ! اب اگر یہ لوگ تمھاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُس سے میں بَری الذمہ ہوں۔“ (آیت ۲۱۶) سورۂ سَبا میں فرمایا: ”ان سے کہو: جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو: ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمھیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔“ (آیات ۲۵-۲۶) سورۂ زُمَر میں فرمایا: ”اِن سے کہو: اَے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، مَیں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں۔“ (آیات ۳۹-۴۰) پھر یہی سبق مدینۂ طیبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ”تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے اُن معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا، جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔“ (المتحنہ، آیت ۴) قرآنِ مجید کی ان پے درپے توضیحات سے اس شُبہے کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی سورۂ زُمَر میں فرمائی گئی ہے کہ ”اے نبیؐ! اِن سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔“ (آیت ۱۴)

اِس آیت سے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن کفر بحیثیتِ مجموعی ایک ہی ملّت ہے، اس لیے یہودی عیسائی کا، اور عیسائی یہودی کا، اور اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہوسکتا ہے اگر اُن کے درمیان نسب، یا نکاح، یا کسی سبب کی بنا پر کوئی ایسا تعلق ہو جو ایک کی وراثت دوسرے کو پہنچنے کا مقتضی ہو۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ، امام اَوزاعیؒ اور امام احمدؒ اِس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پَیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پا سکتے۔ ان کا اِستدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يتوارث اهل ملّتين شتّى۔ ”دو مختلف ملّتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔“ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دارقُطنی) اس سے ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث ترمذی نے حضرت جابرؓ سے، اور ابنِ حبّان نے حضرت عبداللہؓ بن عمر سے، اور بزّار نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسلکِ حنفی

کے مشہور امام، شمس الائمہ سَرَخسی لکھتے ہیں: ''کفّار آپس میں اُن سب اسباب کی بنا پر بھی ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں جن کی بنا پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، اور اُن کے درمیان بعض ایسی صورتوں میں بھی توارُث ہوسکتا ہے جن میں مسلمانوں کے درمیان نہیں ہوتا...... حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بس دو ہی دین قرار دیے ہیں، ایک: دینِ حق، دوسرے دینِ باطل۔ چنانچہ فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ اور اس نے لوگوں کے دو ہی فریق رکھے ہیں، ایک فریق جنّتی ہے اور وہ مومن ہے، اور دوسرا فریق دوزخی ہے اور وہ بحیثیتِ مجموعی تمام کفّار ہیں۔ اور اس نے دو ہی گروہوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ (یہ دو مدِمقابل فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ الحج، آیت ۱۹) یعنی ایک فریق تمام کفّار بحیثیتِ مجموعی ہیں اور ان کا جھگڑا اہلِ ایمان سے ہے...... ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق باہم الگ الگ ملّتیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہی ملّت ہیں، کیونکہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا اقرار کرتے ہیں اور وہ ان کا انکار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کافر قرار پائے ہیں اور مسلمانوں کے معاملے میں وہ سب ایک ملت ہیں...... حدیث لا یتوارث اهل ملّتین، اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ مِلّتَین (دو ملتوں) کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے کر دی ہے کہ لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم۔ ''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے۔'' (المبسوط، ج ۳۰، صفحات ۳۰-۳۲) امام سَرَخسی نے یہاں جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، اسے بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ اور ابوداؤد نے حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے روایت کیا ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

النّصر

(۱۱۰)

النّصر

نام

پہلی آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللہِ کے لفظ نصر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت حضوؐر پر نازل نہیں ہوئی [1] (مسلم، نَسائی، طَبَرانی، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابنِ مَرْدُوْیَہ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ یہ سورت حَجَّۃُ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں بمقامِ مِنٰی نازل ہوئی اور اس کے بعد حضوؐر نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔ (ترمذی، بزّار، بَیْہَقی، ابنِ ابی شَیْبَہ، عبد بن حُمَید، ابویَعلیٰ، ابنِ مَرْدُوْیَہ) بَیْہَقی نے کتاب الحج میں حضرت سَرّاء بنت نبہان کی روایت سے حضوؐر کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپؐ نے اِس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ:

"میں نے حَجَّۃُ الوداع میں حضوؐر کو یہ فرماتے سنا کہ لوگو! جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: یہ ایامِ تشریق کے بیچ کا دن ہے۔ پھر آپؐ نے پوچھا: جانتے ہو یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: یہ مَشْعَرِ حرام ہے۔ پھر حضوؐر نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، شاید اِس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ خبردار رہو، تمھارے خون

---

[1] مختلف رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد بعض آیات نازل ہوئی ہیں، لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی وہ آیت کون سی ہے جو حضوؐر پر سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضرت براءؓ بن عازِب کی روایت یہ ہے کہ وہ سورۂ نساء کی آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ہے۔ امام بخاریؒ نے ابنِ عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت رِبا یعنی جس آیت میں سود کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ اس کی تائید اُن روایات سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد، ابنِ ماجہ اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عمرؓ سے نقل کی ہیں، مگر اُن میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ آخری آیت ہے، بلکہ حضرت عمرؓ کا قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ ابوعُبَید نے فضائل القرآن میں امام زُہری کا، اور ابنِ جَریر نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن المُسَیَّب کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ رِبا اور آیتِ دَین (یعنی سورۂ بقرہ رُکوع ۳۸، ۳۹) قرآن میں نازل ہونے والی آخری آیات ہیں۔ نَسائی، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور ابنِ جَریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ (البقرہ: ۲۸۱) قرآن کی آخری آیت ہے۔ الفِرْیابی نے اپنی تفسیر میں ابنِ عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ آیت حضوؐر کی وفات سے ۸۱ دن پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور سعید بن جُبَیرؒ کا قول جو ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے، اس میں اس آیت کے نزول اور حضوؐر کی وفات کے درمیان صرف ۹ دن کا فصل بیان کیا گیا ہے۔ امام احمد کی مُسند اور امام حاکم کی المستدرک میں حضرت اُبَیؓ بن کَعب کی روایت یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۸، ۱۲۹ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مقام حرام ہے، یہاں تک کہ تم اپنے رب کے سامنے حاضر ہو اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں سوال کرے۔ سنو، یہ بات تم میں سے قریب والا دُور والے تک پہنچا دے۔ سنو، کیا میں نے تمھیں پہنچا دیا؟ اِس کے بعد جب ہم لوگ مدینہ واپس ہوئے تو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ حضوؐر کا انتقال ہو گیا۔‘‘

اِن دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نصر کے نُزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیان ۳ مہینے کچھ دن کا فصل تھا، کیونکہ تاریخ کی رُو سے حَجَّۃُ الوداع اور حضوؐر کے وصال کے درمیان اتنا ہی زمانہ گزرا تھا۔

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضوؐر نے فرمایا: مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پورا ہوا۔ (مُسندِ احمد، ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ) دوسری روایات جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِس سورت کے نزول سے حضوؐر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپؐ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ (مُسند احمد، ابنِ جریر، طَبَرانی، نَسائی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حَبِیبہؓ فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضوؐر نے فرمایا: اس سال میرا انتقال ہونے والا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت فاطمہؓ رو دیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: میرے خاندان میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آ کر ملو گی۔ یہ سن کر وہ ہنس دیں۔ (ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ) قریب قریب اِسی مضمون کی روایت بَیْہَقی نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے۔

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے، غَزْوَۂ بَدر میں شریک ہونے والے بڑے بڑے شُیوخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بلاتے تھے۔ یہ بات بعض بزرگوں کو ناگوار گزری اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اِسی لڑکے جیسے ہیں، اِس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ شریکِ مجلس کیا جاتا ہے؟ (امام بخاری اور ابنِ جَریر نے تصریح کی ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عَوف تھے)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اِس کا جو مقام ہے، وہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک روز انھوں نے شیوخِ بدر کو بلایا اور مجھے بھی اُن کے ساتھ بُلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے یہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے کہ مجھ کو اِن کی مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت عمرؓ نے شیوخِ بَدر سے پوچھا کہ آپ حضرات اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بعض نے کہا: اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آئے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے اِستِغفار کریں۔ بعض نے کہا: اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے۔ بعض خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا: ابنِ عباسؓ! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اَجَل ہے۔ اس میں حضوؐر کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ کا وقت آن پورا ہوا، اِس

کے بعد آپؐ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں بھی اُس کے سوا کچھ نہیں جانتا جو تم نے کہا ہے۔ ایک رِوایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے شیوخ بدر سے فرمایا: آپ لوگ مجھے کیسے مَلامت کرتے ہیں، جب کہ اِس لڑکے کو اِس مجلس میں شریک کرنے کی وجہ آپ نے دیکھ لی۔ (بخاری، مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ جَریر، ابنِ مَرْدُوْیہ، بَغَوی، بَیْہَقی، ابن المُنذِر)

موضوع اور مضمون

جیسا کہ مندرجۂ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپؐ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اُس کے فضل سے آپؐ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے، اور اُس سے دعا کریں کہ اِس خدمت کی انجام دِہی میں جو بُھول چُوک یا کوتاہی بھی آپؐ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرما دے۔ اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلابِ عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدّن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اُٹھا کر اِس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوامِ عالَم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں، بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے کلمات ہیں جو آپؐ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا: میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں، اور وہ ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (مُسندِ احمد، مسلم، ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیہ) اسی سے مِلتی جُلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ۔ یہ قرآن (یعنی سورۂ نصر) کی تاویل تھی جو آپؐ نے فرمائی تھی۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جَریر)

حضرت اُمِّ سَلَمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آپؐ کے آخری زمانۂ حیات

Maktaba Tul Ishaat.com

میں اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، میں نے ایک روز پوچھا کہ یارسولؐ اللہ! آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہیں؟ فرمایا: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ سورت پڑھی۔ (ابنِ جَرِیر)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، سُبْحٰنَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ (ابنِ جریر، مُسندِ احمد، ابنِ ابی حاتم)

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے لیے محنت و ریاضت کرنے میں اِس قدر شدت کے ساتھ مشغول ہوگئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ (نَسائی، طَبَرانی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیہ)

آیاتہا ۳ سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۙ ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ
دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ۭ
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ ﴿۳﴾

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے[۱] اور (اے نبیؐ!) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں[۲]، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو[۳]، اور اُس سے مغفرت کی دُعا مانگو[۴]، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ع

۱- فتح سے مراد کسی ایک معرکے میں فتح نہیں، بلکہ وہ فیصلہ کُن فتح ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے قابل باقی نہ رہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عرب میں اِسی دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ بعض مفسّرین نے اس سے مراد فتح مکّہ لی ہے۔ لیکن فتحِ مکّہ ۸ ھ میں ہوئی ہے اور اِس سورہ کا نزول ۱۰ ھ کے آخر میں ہوا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت سَرّاءؓ بنت نَبہان کی اُن روایات سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے دیباچے میں نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول بھی اِس تفسیر کے خلاف پڑتا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی سب سے آخری سورت ہے، کیونکہ اگر فتح سے مراد فتح مکہ ہو تو پوری سورۂ توبہ اس کے بعد نازل ہوئی تھی، پھر یہ سورت آخری سورت کیسے ہو سکتی ہے؟ بلاشبہ فتحِ مکہ اس لحاظ سے فیصلہ کُن تھی کہ اس نے مشرکینِ عرب کی ہمّتیں پست کر دی تھیں، مگر اُس کے بعد بھی اُن میں کافی دَم خم باقی تھا۔ طائف اور حُنَین کے معرکے اس کے بعد ہی پیش آئے اور عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہونے میں تقریباً دو سال صَرف ہوئے۔

۲- یعنی وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آجائے جب پورے پورے قبیلے، اور بڑے بڑے علاقوں کے باشندے کسی جنگ اور کسی مزاحمت کے بغیر از خود مسلمان ہونے لگیں۔ یہ کیفیت ۹ ھ کے آغاز سے رونما ہونی شروع ہوئی جس کی وجہ سے اُس سال کو سالِ وُفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اسلام قبول کر کے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۰ ھ میں جب حضورؐ حَجّۃُ الوداع کے لیے تشریف لے گئے، اُس وقت پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی نہ رہا تھا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

۳- حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اُس کا شکر ادا کرنا بھی۔ اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور مُنَزَّہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اِس عظیم کامیابی کے متعلق تمھارے دل میں کبھی اس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آئے کہ یہ تمھارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اِس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اِس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اِس امر کا اعتراف کرو کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اِس سے پاک اور مُنَزَّہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمھاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اِس کے برعکس تمھارا دل اس یقین سے لبریز رہے کہ تمھاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید و نصرت پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمھارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کرایا۔ اِس کے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی مُحَیّرُالعقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے، ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اُس سے صادر ہو سکتا۔

۴- یعنی اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اُس نے تمھارے سُپرد کی تھی اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو، اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو، اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں اور اس کی عبادت و بندگی بجا لانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اُس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورا کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا، اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اُس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو اس سے درگزر فرما کر میری حقیری سی خدمت قبول فرما لے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جُہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اِس غرّے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اُس پر تھا وہ اُس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اِس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی مخلوق اُسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمتِ دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان راہِ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔“ اسی طرح جب کبھی انھیں کوئی فتح نصیب ہو، اُسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔

تفہیم القرآن

اَللّھب

(۱۱۱)

Maktaba Tul Ishaat.com

اللّٰھَب

نام پہلی آیت کے لفظ لَہَب کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اِس کے مکّی ہونے میں تو مفسّرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک یہ متعیّن کرنا مشکل ہے کہ مکّی دَور کے کس زمانے میں یہ نازل ہوئی تھی۔ البتہ ابولہب کا جو کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ حق کے خلاف تھا، اُس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس سورہ کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہوگا جب وہ حضورؐ کی عداوت میں حد سے گزر گیا تھا اور اُس کا رَویّہ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن رہا تھا۔ بعید نہیں کہ اِس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان والوں کا مقاطعہ کر کے قریش کے لوگوں نے اُن کو شِعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور تنہا ابولہب ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ ہمارے اِس قیاس کی بنا یہ ہے کہ ابولہب حضورؐ کا چچا تھا، اور بھتیجے کی زبان سے چچا کی کُھلّم کُھلّا مَذمّت کرانا اُس وقت تک مناسب نہ ہوسکتا تھا جب تک چچا کی حد سے گزری ہوئی زیادتیاں عَلانیہ سب کے سامنے نہ آ گئی ہوں۔ اِس سے پہلے اگر ابتدا ہی میں یہ سورت نازل کر دی گئی ہوتی تو لوگ اس کو اخلاقی حیثیت سے معیوب سمجھتے کہ بھتیجا اپنے چچا کی اس طرح مَذمّت کرے۔

پسِ منظر قرآنِ مجید میں یہ ایک ہی مَقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مَذمّت کی گئی ہے، حالانکہ مکہ میں بھی، اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اِس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی؟ اِس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے، اور اُس میں ابولہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملکِ عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفّظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کو بڑی اہمیّت حاصل تھی، اور قطعِ رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی اِنھی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور

بنی المُطَّلِب (ہاشم کے بھائی مُطَّلِب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کُھلّم کُھلا آپؐ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپؐ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے اِن خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اِس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اِس اخلاقی اُصول کو، جسے زمانۂ جاہلیّت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابولہب بن عبد المُطَّلِب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ حضورؐ کے والد ماجد اور یہ، ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خُصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اِس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبّت میں اِن تمام عربی رِوایات کو پامال کر دیا۔

ابنِ عباسؓ سے متعدّد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآنِ مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپؐ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پُٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آ سکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آ سکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المُطَّلِب، اے بنی فِہر، اے بنی فُلاں، اے بنی فُلاں، اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تو میں تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا: تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''ستیاناس جائے تیرا، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟'' ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، ابنِ جَریر وغیرہ)

ابنِ زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا: اگر میں تمھارے

Maktaba Tul Ishaat.com

دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا: میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا: تَبًّا لِهٰذَا الدِّيْنِ تَبًّا اَنْ اَكُوْنَ وَهٰٓؤُلَاۤءِ سَوَآءً "ناس جائے اِس دین کا جس میں مَیں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔" (ابنِ جریر)

مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اس کے علاوہ حَکَم بن عاص (مَروان کا باپ)، عُقبہ بن ابی مُعَیط، عدی بن حَمْراء اور ابن الاَصْداء الہُذلی بھی آپؐ کے ہمسایے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپؐ پر پھینک دیتے۔ کبھی صَحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے: "اے بنی عبدِمَناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟" ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپؐ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپؐ یا آپؐ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چُبھ جائے۔ (بَیہَقی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جریر، ابنِ عَساکر، ابنِ ہِشام)

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتَیبَہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اِس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتَیبَہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آ کر اس نے کہا کہ میں وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى اور الَّذِيْ دَنَا فَتَدَلّٰى کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپؐ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا: خدایا! اِس پر اپنے کتّوں میں سے ایک کتّے کو مسلط کر دے۔ اِس کے بعد عُتَیبَہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دَورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مَقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عُتَیبَہ کے گرد ہر طرف اپنے اُونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اُس نے عُتَیبَہ کو پھاڑ کھایا۔ (الاِستِیعاب لِابنِ عبدالبَرّ، الاِصابہ لِابنِ حَجَر، دلائل النبوۃ لِاَبی نُعَیم الاَصفہانی، رَوضُ الاُنُف لِلسُّہَیلی۔ رِوایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عُتْبَہ تھا یا عُتَیبَہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد عُتْبَہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عُتَیبَہ تھا)۔

اُس کے خُبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ لو، آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام ونشان ہوگئے۔ اُس کی اِس حرکت کا ذکر ہم سورۂ کوثر کی تفسیر میں کرچکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپؐ کی بات سننے سے روکتا۔ رَبِیعہؓ بن عَبّاد الدیؐلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ کہہ رہے تھے: ''لوگو! کہو: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے۔'' اور آپؐ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ ''یہ جھوٹا ہے، دینِ آبائی سے پِھر گیا ہے۔'' میں نے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (مُسندِ احمد، بَیہَقی) دوسری روایت انھی حضرت ربیعہؓ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''اے بنی فلاں! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو، تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔'' آپؐ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ''اے بنی فُلاں! یہ تم کو لات اور عُزّیٰ سے پھیر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔'' میں نے اپنے باپ سے پوچھا: یہ کون ہے؟ انھوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (مُسندِ احمد، طَبَرانی) طارقؓ بن عبداللہ المُحاربِی کی روایت بھی اسی سے مِلتی جُلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ ''لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔'' اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپؐ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپؐ کی ایڑیاں خون سے تر ہوگئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ ''یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو۔'' میں نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (ترمذی)

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب کا معاشرتی اور مَعاشی مُقاطَعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شِعْبِ ابی طالب میں محصور ہوگئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مُقاطَعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب پر فاقوں کی نوبت آگئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شِعْبِ ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ اِن

Maktaba Tul Ishaat.com

سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمھیں جو خسارہ بھی ہوگا اسے میں پورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا۔ پھر ابولہب اُنھی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا۔ (ابنِ سعد وابنِ ہشام)

یہ اس شخص کی حرکات تھیں جن کی بنا پر اس سورہ میں نام لے کر اس کی مذمّت کی گئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ مکہ سے باہر کے اہلِ عرب جو حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے، اُن کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپؐ کے پیچھے لگ کر آپؐ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلاوجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو برا بھلا کہے اور اُسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اِس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متأثّر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے۔ مگر جب یہ سورت نازل ہوئی اور ابولہب نے غصے میں بھر کر اول فول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اِس شخص کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے بھتیجے کی دشمنی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

اِس کے علاوہ نام لے کر جب آپؐ کے چچا کی مذمت کی گئی تو لوگوں کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملے میں کسی کا لحاظ کر کے کوئی مداہنت برت سکتے ہیں۔ جب عَلَی الاعلان رسولؐ کے اپنے چچا کی خبر لے ڈالی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ یہاں کسی لاگ لپیٹ کی گنجایش نہیں ہے۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے اگر ایمان لے آئے، اور اپنا غیر ہو جاتا ہے اگر کفر کرے۔ اِس معاملے میں فُلاں ابنِ فُلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

رکوعاتھا ۱ — آیاتھا ۵

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ ۝۲
سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُہٗ ۭ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ۝۴
فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ ع

ع ۵ ۳۶

ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہوگیا وہ۔[۱] اُس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اُس کے کسی کام نہ آیا۔[۲] ضرور وہ شُعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا، اور (اُس کے ساتھ) اُس کی جورُو بھی،[۳] لگائی بُجھائی کرنے والی،[۴] اُس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔[۵] ع

۱ – اس شخص کا اصل نام عبدالعُزّٰی تھا، اور اسے ابولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ وسفید تھا۔ لہب آگ کے شُعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رُو۔ یہاں اُس کا ذکر اُس کے نام کے بجائے اُس کی کُنیت سے کرنے کے کئی وجوہ ہیں: ایک یہ کہ وہ زیادہ تر اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی کنیت ہی سے معروف تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا نام عبدالعُزّٰی (بندۂ عُزّٰی) ایک مشرکانہ نام تھا اور قرآن میں یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اُسے اِس نام سے یاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اُس کا جو انجام اِس سورہ میں بیان کیا گیا ہے، اُس کے ساتھ اُس کی یہ کُنیت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں، اور وَّتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہوجائے" یا "وہ ہلاک ہوگیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اُس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آیندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اُس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہوچکی۔ اور فی الواقع آخرِ کار وہی کچھ ہوا جو اِس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جاچکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد، ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو۔ اور ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت بھی نہایت عبرت ناک تھی۔ اُسے عَدَسَہ (Malignant Pustule) کی بیماری ہوگئی، جس کی وجہ سے

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے گھر والوں نے اُسے چھوڑ دیا، کیونکہ انھیں چھوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بُو پھیلنے لگی۔ آخرِ کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے، تو ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور اُنھی مزدوروں نے اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اُس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اُس کی مزید اور مکمل شکست اِس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرّہ ہجرت کر کے مکّے سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتحِ مکّہ کے موقع پر اُس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور مُعتّب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لاکر انھوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

۲ — ابولہب سخت بخیل اور زر پرست آدمی تھا۔ ابنِ اَثیر کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک مرتبہ اُس پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اس نے کعبہ کے خزانے میں سے سونے کے دو ہرن چُرا لیے ہیں۔ اگرچہ بعد میں وہ ہرن ایک اور شخص کے پاس سے برآمد ہوئے، لیکن بجائے خود یہ بات، کہ اُس پر یہ الزام لگایا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ مکہ کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اُس کی مالداری کے متعلق قاضی رشید بن زبیر اپنی کتاب الذّخائر والتُّحَف میں لکھتے ہیں کہ وہ قریش کے اُن چار آدمیوں میں سے ایک تھا جو ایک قِنطار سونے کے مالک تھے (قِنطار دو سو اوقیے کا، اور ایک اوقیہ سوا تین تولے کا ہوتا ہے)۔ اُس کی زر پرستی کا اندازہ اِس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگِ بَدر کے موقع پر، جب کہ اُس کے مذہب کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، قریش کے تمام سردار لڑنے کے لیے گئے، مگر اُس نے عاص بن ہِشام کو اپنی طرف سے لڑنے کے لیے بھیج دیا اور کہا کہ یہ اُس چار ہزار درہم قرض کا بدل ہے جو میرا تم پر آتا ہے۔ اِس طرح اُس نے اپنا قرض وصول کرنے کی بھی ایک ترکیب نکال لی، کیونکہ عاص دیوالیہ ہو چکا تھا اور اُس سے رقم ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

مَا كَسَبَ کو بعض مفسرین نے کمائی کے معنی میں لیا ہے، یعنی اپنے مال سے جو منافع اُس نے حاصل کیے وہ اُس کا کسب تھے۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اُس کا کسب ہے۔ (ابوداؤد، ابنِ ابی حاتم) یہ دونوں معنی ابولہب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ عَدَسَہ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس کا مال بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور اس کی اولاد نے بھی اسے بے کسی کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس کا جنازہ تک عزت کے ساتھ اٹھانے کی اس اولاد کو توفیق نہ ہوئی۔ اِس طرح چند ہی سال کے اندر لوگوں نے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا جو ابولہب کے متعلق اِس سورہ میں کی گئی تھی۔

۳ — اس عورت کا نام اَرْوٰی تھا اور اُمِّ جمیل اس کی کنیت تھی۔ یہ ابوسُفیان کی بہن تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اَسماءؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اور اُمِّ جمیل نے اِس کو سنا تو وہ بپھری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں مُٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہَجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حَرَم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ

تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ آرہی ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپؐ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپؐ کو نہیں دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے، تمھارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اِس گھر کے رب کی قسم! انھوں نے تو تمھاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی۔ (ابن ابی حاتم، سیرت ابن ہشام۔ بزار نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِسی سے ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔

۴ – اصل الفاظ ہیں: حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: ''لکڑیاں ڈھونے والی''۔ مفسّرین نے اس کے متعدّد معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابنِ زیدؒ، ضحّاک اور ربیع بن انَس کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو خاردار درختوں کی ٹہنیاں لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈال دیتی تھی، اس لیے اس کو لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا ہے۔ قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں فساد ڈلوانے کے لیے چغلیاں کھاتی پھرتی تھی، اس لیے اسے عربی محاورے کے مطابق لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا، کیونکہ عرب ایسے شخص کو جو اِدھر کی بات اُدھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا ہو، لکڑیاں ڈھونے والا کہتے ہیں۔ اس محاورے کے لحاظ سے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنی ٹھیک ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں ''بی جمالو'' کے معنی ہیں۔ سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رہا ہو، اُس کے متعلق عربی زبان میں بطورِ محاورہ کہا جاتا ہے: فُلَانٌ يَّحْطَتِبُ عَلٰى ظَهْرِهٖ۔ (فلاں شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لاد رہا ہے)۔ پس حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنی ہیں: گناہوں کا بوجھ ڈھونے والی۔ ایک اور مطلب مفسّرین نے اس کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آخرت میں اُس کا حال ہوگا، یعنی وہ لکڑیاں لا لا کر اُس آگ میں ڈالے گی جس میں ابولہب جل رہا ہوگا۔

۵ – اُس کی گردن کے لیے جِید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو عربی زبان میں ایسی گردن کے لیے بولا جاتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ سعید بن المُسَیَّب، حسن بصری اور قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پہنتی تھی، اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عُزّیٰ کی قسم! میں اپنا یہ ہار بیچ کر اس کی قیمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت میں خرچ کر دوں گی۔ اسی بنا پر جِید کا لفظ یہاں بطورِ طنز استعمال کیا گیا ہے کہ اِس مُزیّن گلے میں، جس کے ہار پر وہ فخر کرتی ہے، دوزخ میں رسّی پڑی ہوگی۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ اندازِ کلام ہے جیسے قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر فرمایا گیا ہے: بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

جو رسّی اس کی گردن میں ڈالی جائے گی اس کے لیے حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یعنی وہ رسّی مَسَد کی قسم سے ہوگی۔ اِس کے مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسّرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خوب مضبوط بٹی ہوئی رسّی کو مَسَد کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسّی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں: مونجھ کی رسّی یا اونٹ کی کھال یا اس کے صوف سے بنی ہوئی رسّی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد لوہے کے تاروں سے بنی ہوئی رسّی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

تفہیم القرآن

الاِخلاص

(۱۱۲)

الاخلاص

نام اَلْاِخلاص اِس سورہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی دوسری سورتوں میں تو بالعموم کسی ایسے لفظ کو اُن کا نام قرار دیا گیا ہے جو اُن میں وارد ہوا ہو، لیکن اِس سورہ میں لفظ اِخلاص کہیں وارد نہیں ہوا ہے۔ اِس کو یہ نام اِس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اِس کو سمجھ کر اِس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا، وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔

زمانۂ نزول اِس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف اُن روایات کی بنا پر ہے جو اِس کے سببِ نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں[۱] بتایئے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (طَبَرانی)

(۲) ابوالعالیہ نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (مُسندِ احمد، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جَرِیر، ترِمذِی، بخاری فی التاریخ، ابن المُنذِر، حاکم، بَیْہَقی) ترِمذِی نے اِسی مضمون کی ایک روایت ابوالعالیہ سے نقل کی ہے جس میں حضرت اُبَیؓ بن کعب کا حوالہ نہیں ہے اور اُسے صحیح تر کہا ہے۔

(۳) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک اَعرابی نے (اور بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (ابو یَعلیٰ، ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، طَبَرانی فی الاوسط، بَیْہَقی، ابو نُعَیم فی الحِلیَہ)

(۴) عِکرِمہ نے ابنِ عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں کَعب بن اشرف اور حُیَیّ بن اَخطَب وغیرہ شامل تھے اور اُنھوں نے کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہمیں بتایئے کہ آپؐ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپؐ کو بھیجا ہے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ

---

[۱] اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اِنْسِبْہُ لَنَا، اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ اُن کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ اُس کا نسب کیا ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ آپؐ کا رب کون ہے اور کیسا ہے تو انھوں نے کہا: اِنْسِبْ لَنَا رَبَّکَ، اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (ابن ابی حاتم، ابنِ عَدِی، بَیْہَقِی فی الاسماء والصّفات)

اِن کے علاوہ مزید چند روایات ابنِ تَیمِیَّہ نے اپنی تفسیر سورۂ اخلاص میں نقل کی ہیں جو یہ ہیں:

(۵) حضرت اَنَسؓ کا بیان ہے کہ خیبر کے کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے کہا: ''اے ابو القاسمؐ! اللہ نے ملائکہ کو نورِ حجاب سے، آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے، ابلیس کو آگ کے شُعلے سے، آسمان کو دھویں سے، اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا، اب ہمیں اپنے رب کے متعلّق بتایئے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جبریلؑ آئے اور انھوں نے کہا: اے محمدؐ! ان سے کہیے: ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ......۔

(۶) عامر بن الطفیل نے حضوؐر سے کہا: ''اے محمدؐ! آپ کس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: اللہ کی طرف۔ عامر نے کہا: ''اچھا تو اُس کی کیفیت مجھے بتایئے۔ وہ سونے سے بنا ہُوا ہے یا چاندی سے، یا لوہے سے؟'' اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

(۷) ضَحّاک اور قَتادَہ اور مُقاتِل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علما حضوؐر کے پاس آئے اور انھوں نے کہا: ''اے محمدؐ! اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتایئے، شاید کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت تورات میں نازل کی ہے۔ آپ بتایئے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟ سونے سے بنا ہے، یا تانبے سے، یا پیتل سے، یا لوہے سے، یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھاتا ہے اور پیتا ہے؟ اور کس سے اُس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

(۸) ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ نَجْران کے عیسائیوں کا ایک وفد سات پادریوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے حضوؐر سے کہا: ''ہمیں بتایئے آپ کا رب کیسا ہے، کس چیز سے بنا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے۔ وہ تمام اشیا سے جدا ہے۔'' اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس معبُود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی تھی جس کی بندگی وعبادت کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اور ہر موقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو جواب میں یہی سورت سنائی تھی۔ سب سے پہلے یہ سوال مکہ میں قریش کے مشرکین نے آپؐ سے کیا، اور اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینۂ طیّبہ میں کبھی یہودیوں نے، کبھی عیسائیوں نے، اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضوؐر سے اِسی نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہی سورت آپؐ ان کو سنا دیں۔ اِن روایات میں سے ہر ایک میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اِس موقع پر یہ سورت

نازل ہوئی تھی، اِس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب روایتیں باہم متضاد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں اگر پہلے سے کوئی آیت یا سورت نازل شدہ موجود ہوتی تھی تو بعد میں جب کبھی حضورؐ کے سامنے وہی مسئلہ پیش کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آجاتی تھی کہ اس کا جواب فلاں آیت یا سورت میں ہے، یا اِس کے جواب میں وہ آیت یا سورت لوگوں کو پڑھ کر سنا دی جائے۔ احادیث کے راوی اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب فلاں معاملہ پیش آیا، یا فلاں سوال کیا گیا تو یہ آیت یا سورت نازل ہوئی۔ اِس کو تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک آیت یا سورت کا کئی مرتبہ نازل ہونا۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورت دراصل مکّی ہے، بلکہ اِس کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے، جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بیان میں قرآن کی مفصّل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اِلی اللہ کو سن کر لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر آپؐ کا وہ رب ہے کیسا جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپؐ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ اِس کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورت ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مکہ میں جب حضرت بِلالؓ کا آقا اُمَیَّہ بن خَلَف اُن کو دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بڑا سا پتھر اُن کی چھاتی پر رکھ دیتا تھا تو وہ اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتے تھے۔ یہ لفظِ اَحد اِسی سورہ سے ماخوذ تھا۔

موضوع اور مضمون

شانِ نزول کے بارے میں جو روایات اُوپر درج کی گئی ہیں، اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصوُّرات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے تھے۔ شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی، اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ اُن کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اُس کے اَوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدّعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا، اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں روح القُدُس کو بھی حصّہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حتّٰی کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا، انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اپنے کسی بندے سے کُشتی بھی لڑ لیتا تھا، اور ایک عدد بیٹے (عُزَیر) کا باپ بھی تھا۔ اِن مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی آتش پرست تھے اور صابی ستارہ پرست۔ اس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت لوگوں کو دی گئی تو اُن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبُودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود

Maktaba Tul Ishaat.com

تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے اِن سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصوّر پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہنے دیتا۔

فضیلت اور اہمیّت یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپؐ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اِس کی اہمیّت محسوس کراتے تھے، تاکہ وہ کثرت سے اِس کو پڑھیں اور عوام الناس میں اِسے پھیلائیں، کیونکہ یہ اسلام کے اوّلین بنیادی عقیدے (توحید) کو چار ایسے مختصر فقروں میں بیان کر دیتی ہے جو فوراً انسان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ترمذِی، ابنِ ماجہ، مُسنَدِ احمد، طَبَرانی وغیرہ میں اِس مضمون کی متعدّد احادیث ابوسعید خُدری، ابوہریرہ، ابو ایوب انصاری، ابوالدّرداء، مُعاذ بن جَبَل، جابر بن عبداللہ، اُبَیّ بن کَعب، اُمِّ کُلثوم بنت عُقبَہ بن ابی مُعَیط، ابنِ عمر، ابنِ مسعود، قتادہ بن النُّعمان، انَس بن مالک اور ابومسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ مفسّرین نے حضورؐ کے اِس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں: ایک، توحید۔ دوسرے، رسالت۔ تیسرے، آخرت۔ یہ سورت چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم اور بعض دوسری کُتُبِ حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو ایک مُہم پر سردار بنا کر بھیجا، اور اس پورے سفر کے دَوران میں اُن کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں وہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پر قراءت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر اُن کے ساتھیوں نے حضورؐ سے اِس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اُن سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس میں رحمٰن کی صفت بیان کی گئی ہے، اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضورؐ نے یہ بات سُنی تو لوگوں سے فرمایا: اخبروہ ان اللّٰہ تعالٰی یحبّہٗ۔ ”اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ انھیں محبوب رکھتا ہے۔“

اِسی سے ملتا جُلتا واقعہ بخاری میں حضرت انَسؓ سے مَروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب مسجدِ قُبا میں نماز پڑھاتے تھے اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ہر رکعت میں پہلے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھتے، پھر کوئی اَور سورت تلاوت کرتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور ان سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھنے کے بعد اسے کافی نہ سمجھ کر کوئی اور سورت بھی اُس کے ساتھ ملا لیتے ہو؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

یا تو صرف اِسی کو پڑھو، اور یا اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھو۔ اُنھوں نے کہا: میں اِسے نہیں چھوڑ سکتا، تم چاہو تو میں تمھیں نماز پڑھاؤں ورنہ امامت چھوڑ دوں۔ لیکن لوگ اُن کی جگہ کسی اور کو امام بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخرِ کار معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تمھارے ساتھی جو کچھ چاہتے ہیں اُسے قبول کرنے میں تم کو کیا امر مانع ہے؟ تمھیں ہر رکعت میں یہ سورت پڑھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انھوں نے عرض کیا: مجھے اِس سے بہت محبّت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ ”اِس سورت سے تمھاری محبّت نے تمھیں جنّت میں داخل کر دیا۔“

Maktaba Tul Ishaat.com

آیاتہا ۴ سورۃ الاخلاص مکیۃ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ ع

کہو،[1] وہ اللہ[2] ہے، یکتا۔[3] اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں[4]۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد[5]۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے[6]۔ ع

۱ – اِس حکم کے اوّلین مُخاطَب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپؐ ہی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا رب کون اور کیسا ہے، اور آپ ہی کو حکم دیا گیا کہ اِس سوال کے جواب میں آپ یہ کہیں۔ لیکن حضوؐر کے بعد ہر مومن اِس کا مُخاطب ہے۔ اُسے بھی وہی بات کہنی چاہیے جس کے کہنے کا حکم حضوؐر کو دیا گیا تھا۔

۲ – یعنی میرے جس رب سے تم تعارُف حاصل کرنا چاہتے ہو، وہ کوئی اور نہیں بلکہ اللہ ہے۔ یہ اُن سوال کرنے والوں کی بات کا پہلا جواب ہے، اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی نیا رب لے کر نہیں آ گیا ہوں جس کی عبادت، دوسرے سب معبُودوں کو چھوڑ کر، میں تم سے کروانا چاہتا ہوں، بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ ''اللہ'' عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا۔ قدیم ترین زمانے سے وہ خالقِ کائنات کے لیے یہی لفظ استعمال کر رہے تھے اور اپنے دوسرے معبُودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اِطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبُودوں کے لیے اُن کے ہاں اِلٰہ کا لفظ رائج تھا۔ پھر اللہ کے بارے میں اُن کے جو عقائد تھے، اُن کا اظہار اُس موقع پر خوب کُھل کر ہوگیا تھا جب اَبرَہَہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ اِلٰہوں کے بت موجود تھے، مگر مشرکین نے اُن سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ اِس بلا سے اُن کو بچائے۔ گویا وہ اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ اِس نازک وقت میں اُن کی مدد نہیں کر سکتا۔ کعبے کو بھی وہ اُن اِلٰہوں کی نسبت سے بیتُ الآلِہَہ نہیں، بلکہ اللہ کی نسبت سے بیتُ اللہ کہتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مشرکینِ عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر:

سورۂ زُخْرُف میں ہے: ''اگر تم اِن سے پوچھو کہ اِنھیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔'' (آیت ۸۷)

سورۂ عنکبُوت میں ہے: ''اگر تم اِن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے...... اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اُس کے

ذریعے سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اُٹھایا، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" (آیات ۶۱ تا ۶۳)

سورۂ مومنون میں ہے: "اِن سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اِس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ کی...... اِن سے پوچھو: ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ...... اِن سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اُس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔" (آیات ۸۴ تا ۸۹)

سورۂ یونس میں ہے: "اِن سے پوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں (جو تمھیں حاصل ہیں) کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اِس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔" (آیت ۳۱)

اِسی سورۂ یونس میں ایک اور جگہ ہے: "جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھِر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔" (آیت ۲۲-۲۳)

یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں یوں دُہرائی گئی ہے: "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گُم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو۔" (آیت ۶۷)

اِن آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ تمھارا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی و عبادت کی طرف تم ہمیں بُلاتے ہو، تو انھیں جواب دیا گیا: ھُوَ اللّٰہُ، وہ اللہ ہے۔ اِس جواب سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبّر و منتظم مانتے ہو، اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں تمھیں بلاتا ہوں۔ اِس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ آپ سے آپ آ جاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات سرے سے قابلِ تصوّر ہی نہیں ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اُس کا انتظام اور اُس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اُس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا، اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا، زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادرِ مُطلق نہ ہو، علیم اور حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو، اور سب پر غالب نہ ہو۔

۳- نحوی قواعد کی رُو سے علما نے ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کی متعدِّد ترکیبیں بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک اُن میں سے جو ترکیب اِس مقام کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ھُوَ مبتدا ہے، اللّٰہُ اس کی خبر ہے، اور اَحَدٌ اس کی دوسری خبر۔ اِس ترکیب کے لحاظ سے اِس جملے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ (جس کے بارے میں تم لوگ سوال کر

Maktaba Tul Ishaat.com

رہے ہو) اللہ ہے، یکتا ہے۔" دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے، اور زبان کے لحاظ سے غلط نہیں ہے کہ "وہ اللہ ایک ہے۔"

یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اِس جملے میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظِ اَحَد جس طرح استعمال کیا گیا ہے، وہ عَرَبی زبان میں اِس لفظ کا غیر معمولی استعمال ہے۔ معمولاً یہ لفظ یا تو مُضاف یا مُضاف اِلَیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے یَوْمُ الْاَحَدْ، ہفتے کا پہلا دن، اور فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ، "اپنے کسی آدمی کو بھیجو۔" یا نَفِی عام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے مَا جَآءَنِیْ اَحَدٌ، "میرے پاس کوئی نہیں آیا۔" یا عُمومیّت کا پہلو لیے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے، جیسے هَلْ عِندَكَ اَحَدٌ؟ "کیا تمھارے پاس کوئی ہے؟" یا اِسی عُمومیّت کے پہلو سے شرطیہ جملے میں بولا جاتا ہے، جیسے اِنْ جَآءَكَ اَحَدٌ، "اگر تمھارے پاس کوئی آئے۔" یا گنتی میں بولا جاتا ہے، جیسے اَحَدٌ، اِثنانِ، اَحَدَ عَشر، ایک، دو، گیارہ۔ ان استعمالات کے سوا نُزولِ قرآن سے پہلے کی عربی زبان میں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظِ اَحَد وصف کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لیے بولا گیا ہو، اور نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اِس صفت سے مُتَّصِف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے، کوئی اُس کا ثانی نہیں۔

پھر جو سوالات مشرکین اور اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے رب کے بارے میں کیے تھے، اُن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دیکھیے کہ هُوَ اللهُ کہنے کے بعد اَحَدٌ کہہ کر اُن کا جواب کس طرح دیا گیا ہے:

اوّلاً، اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا رُبوبیّت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور چونکہ اِلٰہ (معبُود) وہی ہوسکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو، اِس لیے اُلوہیّت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں۔

ثانیاً، اِس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اِس کام میں کوئی اور اُس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظامِ عالَم کا مدبّر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے، اور آڑے وقت میں مدد کرنے والا فریاد رس ہے۔ خدائی کے اِن کاموں میں، جن کو تم خود مانتے ہو کہ یہ اللہ کے کام ہیں، کسی دوسرے کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں ہے۔

ثالثاً، چونکہ اُنھوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ اُس کا نسب کیا ہے؟ وہ کس جنس سے ہے؟ کس سے اُس نے دنیا کی میراث پائی ہے؟ اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟ اس لیے اُن کے اِن سارے سوالات کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ایک لفظِ اَحَد بول کر دے دیا گیا ہے۔ اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اُس سے پہلے کوئی خدا تھا، نہ اس کے بعد کوئی خدا ہوگا۔ (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو، بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اُس کا ہم جنس نہیں۔ (۳) اُس کی ذات محض واحد نہیں بلکہ اَحَد ہے، جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزا سے مُرکّب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزِیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضا ہوں، جس کی کوئی سَمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیُّر و تبدُّل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور مُنزَّہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے اَحَد

ہے۔ (اِس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عربی زبان میں ''واحد'' کا لفظ بالکل اُسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح ہم اردو میں ''ایک'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کثرتوں پر مشتمل کسی مجموعے کو بھی اس کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے واحد یا ایک کہا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی، ایک قوم، ایک ملک، ایک دُنیا، حتّٰی کہ ایک کائنات۔ اور کسی مجموعے کے ہر جُز کو الگ الگ بھی ایک ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن اَحَد کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اِسی لیے قرآنِ مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اِلٰہِ واحد، ایک ہی معبود، یا اللہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ، اکیلا اللہ جو سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا ہے، کہا گیا ہے، محض واحد کہیں نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ لفظ اُن چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی ذات میں طرح طرح کی کثرتیں رکھتی ہیں۔ بخلاف اِس کے، اللہ کے لیے اور صرف اللہ ہی کے لیے اَحَد کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وجود میں صرف وہی ایک ہستی ایسی ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے، جس کی وَحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے)۔

۴- اصل میں لفظ صَمَد استعمال کیا گیا ہے جس کا مادّہ ص، م، د ہے۔ عَرَبی زبان میں اس مادے سے جو الفاظ نکلے ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے مَعانی کی وسعت کس قدر ہے:

—— اَلصَّمْدُ: قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی ضخامت رکھتا ہو، سطحِ مُرتَفَع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رُجوع کیا جاتا ہو۔

—— الصَّمَدُ: ہر چیز کا بلند حصّہ، وہ شخص جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اُس کے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجت مند لوگ رُجوع کرتے ہوں، دائم، بلند مرتبہ، ٹھوس، جس میں کوئی خول یا جھول نہ ہو اور جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو، نہ اس میں داخل ہو سکتی ہو، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔

—— اَلْمُصْمَدُ: ٹھوس چیز، جس کا کوئی جوف نہ ہو۔

—— اَلْمُصَمَّدُ: مقصود جس کی طرف جانے کا قصد کیا جائے، سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

—— بَیْتٌ مُّصَمَّدٌ: وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

—— بِنَآءٌ مُّصَمَّدٌ: بلند عمارت۔

—— صَمَدَہٗ وَصَمَدَ اِلَیْہِ صَمْدًا: اُس شخص کی طرف جانے کا قصد کیا۔

—— اَصْمَدَ اِلَیْہِ الْاَمْرَ: اُس کے سُپرد معاملہ کر دیا، اُس کے آگے معاملہ پیش کر دیا، اُس کے اوپر معاملے میں اعتماد کیا۔ (صحاح، قاموس، لسان العرب)

اِن لُغوی معنوں کی بنا پر آیت اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں لفظ الصَّمَدُ کی جو تفسیریں صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کے اہلِ علم سے منقول ہیں، اُنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

—— حضرت علیؓ، عِکرِمہ اور کَعبِ اَحبار: ''صَمد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔''

Maktaba Tul Ishaat.com

— حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابووائل شَقِیق بن سَلَمَہ: ''وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔''

— ابنِ عباسؓ کا دوسرا قول: ''صَمَد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے نازل ہونے پر مدد کے لیے رجوع کریں۔'' اُن کا ایک اور قول: ''وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شَرَف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حِلم اور بُردباری میں، اپنے علم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو''۔

— حضرت ابو ہریرہؓ: ''وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اُس کے محتاج ہوں۔''

— عِکْرِمَہ کے دوسرے اقوال: ''وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو''۔ ''جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو''۔ اِسی کے ہم معنی اقوال شَعْبِی اور محمد بن کَعْب القُرَظِی سے بھی منقول ہیں۔

— سُدِّی: ''مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ جس کا قصد کریں اور مصائب میں مدد کے لیے جس کی طرف رُجوع کریں۔''

— سعید بن جُبَیر: ''وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو۔''

— ربیع بن اَنَس: ''وہ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو۔''

— مُقاتِل بن حَیّان: ''وہ جو بے عیب ہو۔''

— ابنِ کَیْسان: ''وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا مُتَّصِف نہ ہو۔''

— حسن بصری اور قَتَادَہ: ''جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔'' اِسی سے مِلتے جُلتے اقوال مجاہد اور مَعْمَر اور مُرَّۃ الہمدانی سے بھی منقول ہیں۔

— مُرَّۃ الہمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ ''وہ جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور جو کام چاہے کرے، اس کے حکم اور فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔''

— ابراہیم نَخَعی: ''وہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجتوں کے لیے رجوع کریں۔''

— ابوبکر الانباری: ''اہلِ لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صَمَد اُس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی اور سردار نہ ہو، اور جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رُجوع کریں۔'' اِسی کے قریب الزَّجّاج کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''صَمَد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہو گئی ہو اور ہر ایک اپنی حاجات کے لیے جس کی طرف رُجوع کرے۔''

اب غور کیجیے کہ پہلے فقرے میں اَللّٰہُ اَحَدٌ کیوں کہا گیا، اور اس فقرے میں اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہنے کی کیا وجہ ہے۔ لفظ اَحَدٌ کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، کسی اور کے لیے سرے سے مستعمل ہی نہیں ہے، اس لیے اُسے اَحَدٌ، یعنی نکرہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن صَمَد کا لفظ چونکہ مخلوقات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے اَللّٰہُ صَمَدٌ کہنے کے بجائے اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہا گیا، جس کے

معنی یہ ہیں کہ اصلی اور حقیقی صَمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صَمد نہیں ہے، کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں ہے، قابلِ تجزیہ و تقسیم ہے، مرکّب ہے، کسی وقت اُس کے اجزا بکھر سکتے ہیں، بعض مخلوقات اُس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے، اُس کی سیادت اضافی ہے نہ کہ مُطلَق، کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے، بعض مخلوقات کی بعض حاجات کو وہ پورا کر سکتا ہے مگر سب کی تمام حاجات کو پورا کرنا کسی مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ بخلاف اِس کے اللہ تعالیٰ کی صَمدیّت ہر حیثیت سے کامل ہے۔ ساری دنیا اُس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی حاجات وضروریات کے لیے شُعوری طور پر یا غیر شُعوری طور پر اُسی کی طرف رُجوع کرتی ہے اور سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا وہی ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔ رزق دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔ مُنفرد ہے، مرکّب نہیں ہے کہ قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔ اس لیے وہ محض صَمد نہیں بلکہ الصَّمد ہے، یعنی ایک ہی ایسی ہستی جو حقیقت میں صَمدیّت سے بتمام وکمال مُتّصِف ہے۔

پھر چونکہ وہ الصَّمد ہے، اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ یکتا اور یگانہ ہو، کیونکہ ایسی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے جو کسی کی حاجت مند نہ ہو اور سب جس کے محتاج ہوں۔ دو یا زائد ہستیاں سب سے بے نیاز اور سب کی حاجت روا نہیں ہو سکتیں۔ نیز اُس کے الصَّمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہی ایک معبُود ہو، کیونکہ انسان عبادت اسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو۔ اور اِس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبُود نہ ہو، کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو، اُس کی بندگی و عبادت کوئی ہوش مند آدمی نہیں کر سکتا۔

۵ – مشرکین نے ہر زمانے میں خُدائی کا یہ تصور اختیار کیا ہے کہ انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس کے بہت سے افراد ہیں، اور اُن میں شادی بیاہ اور توالُد و تناسُل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اِس جاہلانہ تصوّر سے انھوں نے اللہ رب العالمین کو بھی پاک اور بالاتر نہیں سمجھا اور اُس کے لیے بھی اولاد تجویز کی۔ چنانچہ اہلِ عرب کا یہ عقیدہ قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انبیا علیہم السلام کی اُمتیں بھی اس جہالت سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اُن کے ہاں بھی کسی بزرگ انسان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینے کا عقیدہ پیدا ہو گیا۔ اِن مختلف توہُّمات میں دو قسم کے تصوّرات ہمیشہ خَلط مَلط ہوتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے ہیں وہ اُس ذاتِ پاک کی نَسبی اولاد ہے۔ اور بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ جس کو وہ اللہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں، اُسے اللہ نے اپنا مُتَبنّٰی بنایا ہے۔ اگرچہ اُن میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ معاذ اللہ! کسی کو اللہ کا باپ قرار دیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ہستی کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ وہ توالُد و تناسُل سے پاک نہیں ہے، اور اُس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی انسان کی طرح اُس قسم کی کوئی ہستی ہے جس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے، اور جس کو لاولد ہونے کی صورت میں کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پھر انسانی ذہن اِس گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ اُسے بھی کسی کی اولاد سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گئے تھے، اُن میں ایک سوال یہ تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ

Maktaba Tul Ishaat.com

کس سے اس نے دنیا کی میراث پائی ہے اور کون اُس کے بعد وارث ہوگا؟

اِن جاہلانہ مفروضات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ منطقی طور پر اِن کو فرض کر لینے سے کچھ اور چیزوں کو بھی فرض کرنا لازم آتا ہے:

اوّل، یہ کہ خدا ایک نہ ہو، بلکہ خداؤں کی کوئی جنس ہو، اور اس کے افراد خدائی کے اوصاف، افعال اور اختیارات میں شریک ہوں۔ یہ بات خدا کی صرف نَسبی اولاد فرض کر لینے ہی سے لازم نہیں آتی، بلکہ کسی کو مُتَبَنّٰی فرض کرنے سے بھی لازم آتی ہے، کیونکہ کسی کا مُتَبَنّٰی لامحالہ اُس کا ہم جنس ہی ہوسکتا ہے، اور جب، معاذ اللہ! وہ خدا کا ہم جنس ہے تو اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدائی کے اوصاف بھی رکھتا ہے۔

دوم، یہ کہ اولاد کا کوئی تصور اِس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ نر و مادہ میں اِتّصال ہو اور کوئی مادہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ! وہ ایک مادّی اور جسمانی وجود ہو، اُس کی ہم جنس کوئی اس کی بیوی بھی ہو، اور اُس کے جسم سے کوئی مادّہ بھی خارج ہو۔

سوم، یہ کہ تَوالُد و تَناسُل کا سلسلہ جہاں بھی ہے، اُس کی علّت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور اُن کی جنس کے باقی رہنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اُن سے اولاد پیدا ہو جس سے اُن کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذاتِ خود، معاذ اللہ! فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذاتِ خدا۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح، نعوذ باللہ! خدا کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ کیونکہ توالُد و تَناسُل پر جن اجناس کے بقا کا انحصار ہوتا ہے، اُن کے افراد نہ اَزلی ہوتے ہیں نہ اَبدی۔

چہارم، یہ کہ کسی کو مُتَبَنّٰی بنانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک لاوَلد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا، اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فرض کرنا کہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، اُس ذاتِ پاک کی طرف لازماً وہی سب کمزوریاں منسوب کرنا ہے جو فانی اشخاص میں پائی جاتی ہیں۔

اِن تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اَحَدٌ اور الصَّمَدُ کہنے سے ہی کٹ جاتی ہے، لیکن اُس کے بعد یہ ارشاد فرمانے سے کہ "نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد"، اِس معاملے میں کسی اشتباہ کی گنجایش بھی باقی نہیں رہتی۔ پھر چونکہ ذاتِ باری کے حق میں یہ تصورات شرک کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سورۂ اخلاص ہی میں اُن کی صاف صاف اور قطعی و حتمی تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جگہ جگہ اس مضمون کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، تاکہ لوگ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل مُلاحظہ ہوں:

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۔ (النساء ۴:۱۷۱)	اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اِس سے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُس کی مِلک ہے۔
اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ	خوب سُن رکھو! یہ لوگ دراصل اپنی من گھڑت سے

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (صافّات: ۱۵۱-۱۵۲)	یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ فی الواقع یہ قطعی جھوٹے ہیں۔
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔ (صافّات: ۱۵۸)	اِنھوں نے اللہ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ فرشتے خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کیے جانے والے ہیں۔
وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الزّخرف: ۱۵)	لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جُز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کُھلا احسان فراموش ہے۔
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (الانعام: ۱۰۰-۱۰۱)	اور لوگوں نے جنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے۔ اور اُنھوں نے بے جانے بُوجھے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اُس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ کوئی اُس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔
وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔ (الانبیاء: ۲۶)	اور اِن لوگوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے وہ۔ بلکہ (جن کو یہ اس کی اولاد کہتے ہیں) وہ تو بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔
قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (یونس: ۶۸)	لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اُس کی مِلک ہے۔ تمھارے پاس اِس قول کی آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جنھیں تم نہیں جانتے؟
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)	اور (اے نبیؐ!) کہو: تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا، نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پُشتیبان ہو۔
مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ	اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، اور کوئی دوسرا

Maktaba Tul Ishaat.com

مِنۡ اِلٰہٍ۔ (المومنون:۹۱) خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

اِن آیات میں ہر پہلو سے اُن لوگوں کے عقیدے کی تردید کر دی گئی ہے جو اللہ کے لیے نَسبی اولاد یا مُتبنّیٰ بنائی ہوئی اولاد تجویز کرتے ہیں، اور اُس کے غلط ہونے کے دلائل بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ اور اِسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات جو قرآنِ مجید میں ہیں، سورۂ اخلاص کی بہترین تفسیر کرتی ہیں۔

۶ – اصل میں لفظ کُفُوًا استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: نظیر، مُشابہ، مُماثِل، ہم رتبہ، مُساوی۔ نکاح کے معاملے میں کُفو کا لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت سے برابر کی جوڑ ہوں۔ پس اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند، یا اُس کا ہم مرتبہ ہو، یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اُس سے کسی درجے میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔

تفہیم القرآن

مُعَوِّذَتَین

الفلَق ——— (۱۱۳)

النّاس ——— (۱۱۴)

Maktaba Tul Ishaat.com

مُعَوِّذَتَین

الفلق ـــــــ النّاس

نام اگرچہ قرآنِ مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مُصحف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن اِن کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے، اور اِن کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی قریبی مناسبت رکھتے ہیں کہ ان کا ایک مشترک نام "مُعَوِّذَتَین" (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بَیْہَقی نے دلائلِ نبوت میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہی ہوئی ہیں، اِسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام مُعَوِّذَتَین ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں، کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مَباحِث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانۂ نزول حضرت حسن بصری، عِکْرِمَہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر اُن سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں، اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ اور قتادہ کا بھی ہے۔ اِس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں، ان میں سے ایک مسلم، ترمذی، نَسائی اور مُسندِ امام احمد بن حَنْبَل میں حضرت عُقْبَہؓ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا: الم تر ایاتٍ اُنزلت اللیلۃ، لم یُرَ مثلھن، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ "تمھیں کچھ پتا ہے کہ آج رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئی ہیں؟ یہ بے مثل آیات ہیں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔" یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عُقْبَہ بن عامرؓ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد اور نَسائی نے خود اُن کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اِس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں، وہ ابنِ سَعد، مُحْیُ السُّنّۃ بَغَوِی، امام نَسَفی، امام بَیْہَقی، حافظ ابنِ حَجَر، حافظ بدر الدین عَیْنی، عبد بن حُمَید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینے میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضورؐ بیمار ہوگئے تھے، اُس وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقِدی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔ اِسی بنا پر سُفیان بن عُیَیْنَہ نے بھی اِن سورتوں کو مدنی کہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سورت یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی، تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اُسی موقع پر نازل

ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہوچکی ہوتی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورتِ حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی کی طرف دوبارہ، بلکہ کبھی کبھی بار بار حضوؐر کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ مُعَوِّذَتَین کا بھی ہے۔ اِن کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضوؐر کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینۂ طیبہ میں منافقین، یہود اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو حضوؐر کو پھر اِنھی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی، جیسا کہ حضرت عُقبہؓ بن عامر کی مندرجۂ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اِس کے بعد جب آپؐ پر جادو کیا گیا اور آپؐ کی علالتِ مزاج نے شدّت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپؐ کو ہدایت کی۔ اس لیے ہمارے نزدیک اُن مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملے کے ساتھ اِن کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اُس کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے، سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۂ الناس کا اس معاملے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون

مکۂ معظّمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں، وہ یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بِھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جوں جوں آپؐ کی دعوت پھیلتی گئی، کفارِ قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک اُنھیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے، یا بہلا پھُسلا کر آپؐ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اُس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدّت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضوؐر نے اُن کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملے میں کوئی مُصالَحت کرنے پر آمادہ ہوسکیں گے، اور سورۂ کافرون میں صاف صاف اُن سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو اُن کی بندگی کرنے والا مَیں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی مَیں کرتا ہوں اُس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لیے میرا راستہ الگ ہے اور تمھارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عُروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیّت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مَردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں) نے اسلام قبول کر لیا تھا، ان کے دلوں میں تو حضوؐر کے خلاف ہر وقت بھٹّیاں سُلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپؐ کو کوسا جا رہا تھا۔ خفیہ مشورے کیے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھُپ کر آپؐ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتا نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپؐ کے خلاف جادو ٹونے کیے جا رہے تھے، تاکہ آپؐ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطینِ جنّ و اِنس ہر طرف پھیل گئے تھے، تاکہ عوام کے دلوں میں آپؐ کے خلاف اور آپؐ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں، جس سے لوگ بدگمان ہوکر آپؐ سے دور بھاگنے

Maktaba Tul Ishaat.com

لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا، دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر، ابوجَہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا، اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ ”ہمارا اور بنی عبدِمناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ اُنھوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ اُنھوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ اُنھوں نے عطیے دیے تو ہم نے بھی دیے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم جب عزّت وشَرَف میں برابر کی ٹکر ہوگئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اِس میدان میں ہم کیسے اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم! ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔“ (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۳۳۷-۳۳۸)

اِن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طُلوعِ صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں اور جادوگرنیوں کے شر سے، اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبُود کی، ہر اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطینِ جِنّ میں سے ہو، یا شیاطینِ اِنس میں سے۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰؑ نے اُس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں اُن کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ، ”میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے، ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔“ (المومن: ۲۷) وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ، ”اور میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے، اِس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔“ (الدُّخان: ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے اِن جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں، بڑے سروسامان اور وسائل وذرائع اور قوت وشوکت رکھنے والوں سے تھا۔ دونوں مواقع پر وہ طاقت ور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے درآنحالیکہ اُن کے پاس کوئی مادّی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بَل پر وہ اُن کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انھوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور مُعاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا کہ تمھارے مقابلے میں ہم نے ربِّ کائنات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُولُوا العزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اُس رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اُس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اُس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا، تم جو چاہو کر لو، مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں تمھارے اور اپنے اور ساری کائنات کے رب کی پناہ

لے چکا ہوں۔

مُعوِّذتین کی قُرآنیت

اِن دونوں سورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لیے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو اوپر کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اِن کے متعلق تین ایسے مَباحِث آ گئے ہیں جو دلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُن کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے اوّلین قابلِ توجُّہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا اِن دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجایش ہے؟ یہ سوال اِس لیے پیدا ہوا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدِّد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ اِن دونوں سورتوں کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مُصحَف سے اُنھوں نے ان کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بزّار، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیہ، ابو یَعلیٰ، عبداللہ بن احمد بن حَنْبل، حُمَیدی، ابو نُعَیم، ابنِ حِبّان وغیرہ محدثین نے مختلف سندوں سے، اور اکثر و بیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابنِ مسعودؓ سے نقل کی ہے۔ اِن روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ اِن سورتوں کو مُصحَف سے ساقط کر دیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے: ’’قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جُز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپؐ اِن الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں۔‘‘ بعض روایات میں اِس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ اِن سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

اِن روایات کی بنا پر مخالفینِ اسلام کو قرآن کے بارے میں یہ شبہات اُبھارنے کا موقع مل گیا کہ معاذ اللہ! یہ کتاب تحریف سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اِس میں جب یہ دو سورتیں ابنِ مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق اِلحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف و اضافے اِس کے اندر ہوئے ہوں گے۔ اِس طعن سے پیچھا چھڑانے کے لیے قاضی ابوبکر الباقِلّانی اور قاضی عِیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابنِ مسعودؓ مُعوِّذتَین کی قرآنیت کے منکر نہ تھے بلکہ صرف ان کو مُصحَف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک مُصحَف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہیے تھی جس کے ثَبت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو، اور ابنِ مسعودؓ تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ تاویل دُرست نہیں ہے، کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے اِن کے قرآنی سورتیں ہونے کا انکار کیا ہے۔ کچھ دوسرے بزرگوں، مثلاً امام نَوَوِی، امام ابنِ حَزْم اور امام فخر الدین رازی نے سرے سے اِس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابنِ مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابنِ مسعودؓ کی اِن روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے، اس کا صحیح ردّ کیا ہے؟ اِس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

Maktaba Tul Ishaat.com

(۱) حافظ بزّار نے اپنی مُسند میں ابنِ مسعودؓ کی یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اِس رائے میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اُن کے اِس قول کی تائید نہیں کی ہے۔

(۲) تمام صحابہؓ کے اتفاق سے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کے جو نسخے مُرتّب کروائے تھے اور خلافتِ اسلامیّہ کی طرف سے جن کو دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا تھا، اُن میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا جس مُصحَف پر اجماع ہے، اُس میں یہ دونوں سورتیں درج ہیں۔ تنہا عبداللہؓ بن مسعود کی رائے، اُن کی جلالتِ قدر کے باوجود، اِس عظیم اِجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے اِن سورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور قرآن کی سورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو اِن کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث مُلاحظہ ہوں:

مسلم، احمد، ترمذی اور نسائی کے حوالے سے حضرت عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے سورۂ فَلَق اور سورۂ ناس کے متعلق اُن سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نسائی کی ایک رِوایت عُقبہؓ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ابنِ حِبّان نے اِنھی حضرت عُقبہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: ”اگر ممکن ہو تو تمھاری نمازوں سے اِن دونوں سورتوں کی قراءت چھوٹنے نہ پائے۔“ سعید بن منصور نے حضرت مُعاذؓ بن جَبَل سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی مُسند میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرو۔ مُسندِ احمد، ابوداؤد اور نسائی میں عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا: ”کیا میں دو ایسی سورتیں تمھیں نہ سکھاؤں جو اُن بہترین سورتوں میں سے ہیں جنھیں لوگ پڑھتے ہیں؟“ انھوں نے عرض کیا: ضرور یا رسولؐ اللہ۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہی مُعَوِّذَتَیْن پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے یہی دو سورتیں اس میں بھی پڑھیں، اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپؐ اُن کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”اے عُقَب! کیسا پایا تم نے؟“ اور اس کے بعد اُن کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو اِن سورتوں کو پڑھا کرو۔ مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں عُقبہؓ بن عامر کی ایک روایت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہر نماز کے بعد مُعَوِّذات (یعنی قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ اور مُعَوِّذَتَیْن) پڑھنے کی تلقین کی۔ نسائی، ابنِ مَرْدُوْیہ اور حاکم نے عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر چلے جا رہے تھے اور میں آپؐ کے قدمِ مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا: مجھے سورۂ

ہود یا سورۂ یوسف سکھا دیجیے۔ فرمایا: ’’اللہ کے نزدیک بندے کے لیے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے۔‘‘ عبداللہ بن عابس الجُہَنی کی روایت نسائی، بَیْہَقی، بَغَوِی اور ابنِ سعد نے نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ’’ابنِ عابس! کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے جتنی چیزوں کے ذریعے سے اللہ کی پناہ مانگی ہے، ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں؟‘‘ میں نے عرض کیا: ضرور یا رسولؐ اللہ۔ فرمایا: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، یہ دونوں سورتیں۔‘‘ ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو یہ غلط فہمی آخر کیسے لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآنِ مجید کی سورتیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں دو روایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ ایک یہ روایت کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپؐ اِس طرح تَعَوُّذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاریؒ نے صحیح البخاری میں، امام احمد نے اپنی مُسْنَد میں، حافظ ابوبکر الحُمَیْدِی نے اپنی مُسْنَد میں، ابونُعَیم نے اپنی اَلْمُسْتَخْرَج میں اور نسائی نے اپنی سُنَن میں زِرّ بن حُبَیْش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے، جو علمِ قرآن کے لحاظ سے صحابۂ کرامؓ میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، نقل کی ہے۔ زِرّ بن حُبَیْش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت اُبَیؓ سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہؓ بن مسعود ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ’’میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا: قُلْ، تو میں نے بھی کہا قُلْ۔ اس لیے ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ کہتے تھے۔‘‘ امام احمد کی رِوایت میں حضرت اُبَیؓ کے الفاظ یہ ہیں: ’’میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہا تھا، اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انھوں نے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا۔ لہٰذا ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا۔‘‘ ان دونوں روایتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو دونوں سورتوں میں لفظ قُلْ (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے حضورؐ سے اِس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت اُبَیؓ بن کَعب کے ذہن میں بھی اِس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انھوں نے حضورؐ سے اِس کو پوچھ لیا۔ حضورؐ نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قُلْ کہا تھا، اس لیے میں بھی قُلْ کہتا ہوں۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ ’’کہو، میں پناہ مانگتا

Maktaba Tul Ishaat.com

ہوں''، تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ ''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں''، بلکہ وہ ''کہو'' کا لفظ ساقط کر کے ''میں پناہ مانگتا ہوں'' کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بالا دست حاکم کا پیغام بر اِن الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ ''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں'' اور یہ پیغام اُسے اپنے تک رکھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دیا جائے، تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جُوں کا تُوں پہنچائے گا، اُس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔ پس ان دونوں سورتوں کی ابتدا لفظِ قُلْ سے ہونا اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے، جسے حضورؐ انھی الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپؐ کو ملا تھا۔ اِس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہو۔ قرآنِ مجید میں ان دو سورتوں کے علاوہ ۳۳۰ آیتیں ایسی ہیں جو لفظِ قُلْ (کہو) سے شروع ہوئی ہیں۔ ان سب میں قُلْ کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے، جسے اُنھی الفاظ میں پہنچانا حضورؐ کے ذمے فرض تھا جن الفاظ میں یہ آپؐ پر نازل کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر جگہ قُلْ اگر ایک حکم ہوتا تو حضورؐ اِس لفظ کو ساقط کر کے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا آپؐ کو حکم دیا گیا تھا، اور اُسے قرآن میں درج نہ کیا جاتا بلکہ حضورؐ صرف اِس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپؐ کو حکم دیا گیا تھا۔

اِس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو بے خطا سمجھنا اور اُن کی کسی بات کے لیے غلط کا لفظ سنتے ہی توہینِ صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بے جا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چُوک ہو گئی۔ ایسی چوک اگر اتنے عظیم مرتبے کے صحابی سے ہو سکتی ہے تو دوسروں سے بھی کوئی چُوک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لیے اُس کی چھان بین بھی کر سکتے ہیں، اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انھیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہو گا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر اُن پر زبانِ طعن دراز کرے۔ انھی مُعَوِّذَتَین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابنِ مسعودؓ کی رائے کو غلط کہا ہے، مگر کسی نے یہ کہنے کی جراَت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کر کے، معاذ اللہ! وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضورؐ پر جادو کا اثر ہونا

دوسرا مسئلہ جو اِن سورتوں کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ روایات کی رُو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، اور اس کے اثر سے آپؐ بیمار ہو گئے تھے، اور اس اثر کو دُور کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے آ کر آپؐ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اِس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مُشْتَبَہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا، اور اِن روایات کی رُو سے ہو گیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروا لیا ہو، اور اُس کی دی ہوئی تعلیم میں

کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیرِ اثر۔ یہی نہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جادو ہی کے ذریعے سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اُس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ اُن کا اِستدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآنِ مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں تو کفّار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور، یعنی سحر زدہ آدمی ہے (یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ بنی اسرائیل: ۴۷)، مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اِس مسئلے کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مستند تاریخی روایات کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے، اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کیے گئے ہیں؟

قُرُونِ اُولیٰ کے مسلمان علما کی یہ انتہائی راست بازی تھی کہ انھوں نے اپنے خیالات اور مزعومات کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جُوں کا تُوں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ اِن حقائق سے اگر کوئی الٹے نتائج نکالنے پر اتر آئے تو اُن کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اُس کے کام آسکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مُستند اور کثیر تاریخی ذرائع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحبِ علم کے لیے نہ تو یہ دُرست ہے کہ وہ اِس بنا پر تاریخ کا انکار کر دے کہ اُس کو مان لینے سے اُس کے نزدیک فلاں فلاں قباحتیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ یہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے، اس کو قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اُس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے اُس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اُس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے، اور علمی تنقید سے اُس کو اگر غلط ثابت کیا جاسکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسے حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن اَرقم اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بخاری، مسلم، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام احمد، عبدالرزاق، حُمَیدی، بَیْہقی، طَبَرانی، ابنِ سعد، ابنِ مَردُوْیہ، ابنِ ابی شَیْبہ، حاکم، عبد بن حُمَید وغیرہ محدثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اُس کا نفسِ مضمون تواتُر کی حد کو پہنچا ہوا ہے، اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خبرِ واحد ہے۔ اِس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انھیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مُرتّب کر کے ایک مربوط واقعے کی صورت

Maktaba Tul Ishaat.com

میں یہاں درج کرتے ہیں۔

صلحِ حُدَیْبِیَہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو مُحَرّم ۷ھ میں خَیبَر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لَبِید بن اَعْصَم سے ملا جو انصار کے قبیلۂ بنی زُرَیق سے تعلق رکھتا تھا۔[1] ان لوگوں نے اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمھیں معلوم ہے۔ ہم نے اُن پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمھارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، اِنھیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کردو۔ اُس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اُس سے ساز باز کر کے اِن لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کرلیا جس میں آپؐ کے مُوئے مبارک تھے۔ انھی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لَبِید بن اَعْصَم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، اُن سے اُس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نَر کھجور کے خوشے کے غلاف[2] میں رکھ کر لَبِید نے بنی زُرَیق کے کنویں ذَرْوان یا ذی اَرْوان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیُّرِ مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت، اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا، وہ بس یہ تھا کہ آپؐ گُھلتے چلے جارہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی اَزواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے، اور بعض اوقات آپؐ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپؐ کی ذات تک محدود رہے، حتّٰی کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہوسکا کہ آپؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت، تو اُس میں آپؐ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اُس زمانے میں آپؐ قرآن کی کوئی آیت بُھول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپؐ نے غلط پڑھ ڈالی ہو،

---

[1] بعض راویوں نے اُسے یہودی کہا ہے، اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زُرَیق میں سے تھا، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ بنی زُرَیق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خَزرَج میں سے انصار کا ایک قبیلہ تھا۔ اس لیے یا تو وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اہلِ مدینہ میں سے یہودی ہوگئے تھے، یا یہود کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کرلیا۔ تاہم اس کے لیے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

[2] ابتدا میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر ہوتا ہے اور نَر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے مِلتا جُلتا ہوتا ہے اور اس کی بو انسان کے مادّۂ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپؐ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو، یا کوئی ایسا کلام آپؐ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپؐ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپؐ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپؐ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات، معاذ اللہ! پیش آ جاتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملکِ عرب اِس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کر سکی تھی، اسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپؐ کی حیثیتِ نبوت اِس سے بالکل غیر متأثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اِسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخرِ کار ایک روز آپؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپؐ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آ گئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتا دی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا: اِنھیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا: اِن پر جادو ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لَبید بن اَعْصَم نے۔ پوچھا: کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا: کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا: وہ کہاں ہے؟ جواب دیا: بنی زُرَیق کے کنویں ذی اَزْوان (یا ذَرْوان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا: اب اس کے لیے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اُس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمّار بن یاسرؓ اور حضرت زُبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جُبَیرؓ بن اِیاس الزُّرَقی اور قیسؓ بن مُحْصَن الزُّرَقی (یعنی بنی زُرَیق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کر لیا گیا۔ اُس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پُتلا تھا جس میں سُوئیاں چُبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر بتایا کہ آپؐ مُعَوِّذَتَین پڑھیں۔ چنانچہ آپؐ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پُتلے میں سے ایک ایک سُوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں، ساری سُوئیاں نکل گئیں، اور آپؐ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے لَبید کو بلا کر باز پُرس کی۔ اُس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپؐ نے اس کو چھوڑ دیا، کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپؐ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ نے اِس معاملے کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

یہ ہے سارا قصّہ اِس جادو کا۔ اِس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپؐ کے منصبِ نبوّت میں قادِح ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپؐ کو زخمی کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ جنگِ اُحد میں ہوا، اگر آپؐ گھوڑے سے گر کر چوٹ

Maktaba Tul Ishaat.com

کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپؐ کو بچھو کاٹ سکتا تھا، جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس تحفظ کے مُنافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے وعدہ کیا تھا، تو آپؐ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، یہ بات تو قرآنِ مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انھوں نے ہزارہا آدمیوں کے اُس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا (سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ۔ آیت ۱۱۶)، اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انھوں نے پھینکی تھیں، ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰؑ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اُن کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں اور اس سے حضرت موسیٰؑ خوف زدہ ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، ذرا اپنا عصا پھینکو (فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ○ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ ۔ آیات ۶۶ تا ۶۹)۔ رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفارِ مکہ کے اُس الزام کی تصدیق ہوگئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپؐ کو سحر زدہ آدمی اِس معنیٰ میں نہیں کہتے تھے کہ آپؐ کسی جادوگر کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اِس معنیٰ میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے، معاذ اللہ! آپؐ کو پاگل کر دیا ہے اور اِسی پاگل پن میں آپؐ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملے پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمدؐ پر ہوا تھا، نبوتِ محمدؐ اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ جادو کو محض اَوہام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں، اُن کی یہ رائے صرف اِس وجہ سے ہے کہ جادو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، مگر سائنٹفک طریقے سے یہ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیسے رُونما ہوتی ہیں۔ اِس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اُسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے، مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اُس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہوگئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں، وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی

تھیں، لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انھیں سانپ ہی محسوس کیا، اور حضرت موسیٰ تک کے حواس جادو کی اِس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِسی طرح قرآن (البقرہ، آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل دُرست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا مؤثّر ہونا بھی اللہ کے اِذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزار ہا سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو، اس کے وجود کو جھٹلا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

تیسرا مسئلہ اِن سورتوں کے معاملے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجایش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود مؤثّر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت، اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں مُعَوِّذَتَین، یا بعض روایات کے مطابق مُعَوِّذات (یعنی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور مُعَوِّذَتَین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپؐ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انھیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپؐ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں (بطورِ خود یا حضوؐر کے حکم سے) پڑھیں اور آپؐ کے دستِ مبارک کی برکت کے خیال سے آپؐ ہی کے ہاتھ لے کر آپؐ کے جسم پر پھیرے۔ اِس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابنِ ماجہ، ابوداؤد اور مُوَطّا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں، جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضوؐر کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اِس معاملے میں پہلے مسئلۂ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری اُمّت کے وہ لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں، بلکہ اپنے رب پر توکُّل کرتے ہیں۔ (مسلم) حضرت مُغیرہؓ بن شُعْبَہ کی روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی، وہ اللہ پر توکُّل سے بے تعلّق ہو گیا۔ (ترمِذی) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے، سوائے مُعَوِّذَتَین یا مُعَوِّذات کے۔ (ابوداؤد، احمد، نَسائی، ابنِ حِبّان، حاکم) بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا، لیکن بعد میں اِس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز

Maktaba Tul Ishaat.com

نہیں ہے، اور بھروسا جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلۂ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طَبَرانی نے صغیر میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپؐ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ، قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے جاتے تھے۔

ابنِ عباسؓ کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے: اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَآمَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّآمَّۃٍ۔ ''میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظرِ بد سے۔'' (بخاری، مُسندِ احمد، ترمذی اور ابنِ ماجہ)

عثمانؓ بن ابی العاص الثَّقَفی کے متعلق مسلم، مُؤَطّا، طَبَرانی اور حاکم میں تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں، مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَاُحَاذِرُ، ''میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں، اُس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے۔'' مُؤَطّا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اِسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مُسندِ احمد اور طَحاوی میں طَلْق بن علیؓ کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضورؐ نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابوسعیدؓ خُدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریلؑ نے آکر پوچھا ''اے محمدؐ! کیا آپ بیمار ہوگئے؟'' آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: بِاسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّؤْذِیْکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَیْنٍ حَاسِدٍ ، اَللّٰہُ یَشْفِیْکَ بِاسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ، ''میں اللہ کے نام پر آپؐ کو جھاڑتا ہوں ہر اُس چیز سے جو آپؐ کو اذیت دے، اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپؐ کو شفا دے، میں اُس کے نام پر آپؐ کو جھاڑتا ہوں۔'' اسی سے ملتی جلتی روایت مُسندِ احمد میں حضرت

عُبادہؓ بن صامت سے منقول ہے کہ حضورؐ بیمار تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو آپؐ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپؐ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی میں تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریلؑ آئے تھے اور انھوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپؐ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اُوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے بھی مسلم اور مُسندِ احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مُسند میں حضرت حَفصہؓ اُمّ المؤمنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شِفا[1] نامی بیٹھی تھیں جو نَملہ (ذُباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا: حَفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شِفاؓ بنتِ عبداللہ کی یہ روایت امام احمد، ابوداؤد اور نَسائی نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حَفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے، نَملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عَوفؓ بن مالک اَشجعیؓ کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملے میں حضورؐ کی رائے کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مُضایقہ نہیں ہے جب تک اُس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مُسندِ احمد اور ابنِ ماجہ میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عَمرؓو بن حَزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کاٹے کو جھاڑتے تھے۔ مگر آپؐ نے اِس کام سے منع فرما دیا ہے۔ پھر انھوں نے وہ چیز آپؐ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اِس میں تو کوئی مضایقہ مَیں نہیں پاتا، تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے۔“ جابرؓ بن عبداللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حَزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضورؐ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ اس کی تائید مسلم، مُسندِ احمد اور ابنِ ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضورؐ نے انصار کے ایک خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مُسندِ احمد اور ترمِذی اور مسلم اور ابنِ ماجہ میں حضرت اَنسؓ سے بھی اس سے مِلتی جُلتی روایات نقل کی گئی ہیں، جن میں حضورؐ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذُباب کے مرض اور نظرِ بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

---

1 ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شِفاؓ بنتِ عبداللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عَدِی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اِس طرح یہ حضرت حَفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

Maktaba Tul Ishaat.com

مُسندِ احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ اور حاکم نے حضرت عُمیرؓ مولیٰ ابی اللَّحم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیّت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا: فُلاں فُلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مُؤطّا میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ اُن کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر تورات یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطِّب کو دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اِذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبّی مُعالجَہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اَسمائے حُسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے، یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبّی امداد میسّر نہ ہو، اللہ ہی کی طرف رُجوع کر کے اس کے کلام اور اسما و صفات سے اِستعانت کی جائے، تو یہ مادّہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے[1]۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسّر ہو، جان بُوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مَطَب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنالیں۔

اس معاملے میں بہت سے لوگ حضرت ابوسعید خُدریؓ کی اُس روایت سے اِستدلال کرتے ہیں

---

[1] مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رُجوع الی اللہ مریضوں کی شفایابی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اِس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مَثانے میں آکر اَڑ گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو ہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور ۲۰ برس تک ہٹی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کئی مہینے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دعا کی جو ۱۹۴۸ء میں کی تھی، اور کسی علاج اور دوا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہوگئیں۔ آج تک پھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

جو بخاری، مسلم، ترمذی، مُسندِ احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں منقول ہوئی ہیں اور اس کی تائید بخاری میں ابنِ عباسؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا، جن میں حضرت ابوسعید خُدریؓ بھی تھے۔ یہ حضرات راستے میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھیرے اور انھوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ اِن مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمھارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابوسعیدؓ نے کہا: ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے، اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انھوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعیدؓ نے جا کر اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لُعابِ دہن اس پر ملتے گئے۔[1] آخرِ کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا: اِن بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا: ”تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورت جھاڑنے کے کام بھی آ سکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصّہ بھی لگاؤ۔“

لیکن اِس حدیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مَطَب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابوسعید خُدریؓ نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصّہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز و عدمِ جواز کے معاملے میں اِن اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے، اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی روز کی مَسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورد و نوش خرید سکے۔ اِن حالات میں یہ بات عرب کے معروف اُصولِ اَخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اِس سے انکار کے معنٰی، بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اِس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے اِس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تھا تو ان کے سردار کا علاج کرنے

[1] اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابوسعیدؓ تھے۔ بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

سے انھوں نے بھی انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے پر سورۂ فاتحہ اُس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہوگیا تو طے شدہ اُجرت قبیلے والوں نے لا کر دے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُجرت کے لینے کو حلال وطیّب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو روایت ہے، اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ احقّ ما اخذتم علیه اجرًا کتاب اللّٰہ، یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمھارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اُجرت لی۔ یہ آپؐ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اِس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حقِ تبلیغ بھی ادا ہوگیا کہ انھیں اس کلام کی برکت معلوم ہوگئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس واقعے کو اُن لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جا سکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مَطَب چلاتے ہیں اور اسی کو انھوں نے وسیلۂ مَعاش بنا رکھا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمۂ سَلَف کے ہاں نہیں ملتی۔

سورۂ فاتحہ اور اِن سورتوں کی مناسبت

آخری چیز جو مُعَوِّذَتَین کے بارے میں قابلِ توجّہ ہے، وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآنِ مجید ترتیبِ نزول پر مُرتّب نہیں کیا گیا ہے، مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خود نہیں، بلکہ اُن کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مُرتّب فرمایا جس میں ہم اب اس کو پاتے ہیں۔ اِس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام مُعَوِّذَتَین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آغاز میں اللہ رب العالمین، رحمٰن و رحیم، اور مالکِ یوم الدین کی حمد و ثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی مَیں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے، اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے، جو ربُّ الفَلَق، ربُّ النّاس، مَلِکُ النّاس اور اِلٰہُ النّاس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خُصوصیّت کے ساتھ شیاطینِ جنّ وانس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہِ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

---

۵ آیاتہا

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ

۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ ع

ع ۱ ۳۸

کہو[۱]، میں پناہ مانگتا ہوں[۲] صبح کے ربّ[۳] کی، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے[۴]، اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے[۵]، اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے[۶]، اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے[۷]۔ ع

۱ – چونکہ قُلْ (کہو) کا لفظ اُس پیغام کا ایک حصّہ ہے جو تبلیغِ رسالت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعۂ وحی نازل ہوا ہے، اس لیے اگرچہ اِس ارشاد کے اوّلین مخاطَب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر آپ کے بعد ہر مومن بھی اِس کا مُخاطَب ہے۔

۲ – پناہ مانگنے کے فعل میں لازماً تین اجزا شامل ہوتے ہیں۔ ایک، بجائے خود پناہ مانگنا۔ دوسرے، پناہ مانگنے والا۔ تیسرا، وہ جس کی پناہ مانگی جائے۔ پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کر کے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے کسی دوسرے کی حفاظت میں جانا، یا اس کی آڑ لینا، یا اُس سے لپٹ جانا، یا اُس کے سایے میں چلا جاتا ہے۔ پناہ مانگنے والا بہر حال وہی شخص ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے، اس کا مقابلہ وہ خود نہیں کر سکے گا، بلکہ وہ اِس کا حاجت مند ہے کہ اُس سے بچنے کے لیے دوسرے کی پناہ لے۔ پھر جس کی پناہ مانگی جاتی ہے، وہ لازماً کوئی ایسا ہی شخص یا وجود ہوتا ہے جس کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس خوفناک چیز سے وہی اس کو بچا سکتا ہے۔ اب پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانینِ طبعی کے مطابق عالَمِ اسباب کے اندر کسی محسوس مادّی چیز یا شخص یا طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن کے حملے سے بچنے کے لیے کسی قلعہ میں پناہ لینا، یا گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے خندق یا کسی دَمدمے یا کسی دیوار کی آڑ لینا، یا کسی طاقت ور ظالم سے بچنے کے لیے کسی انسان یا قوم یا حکومت کے پاس پناہ لینا، یا دھوپ سے بچنے کے لیے کسی درخت یا عمارت کے سایے میں پناہ لینا۔ بخلاف اس کے دوسری قسم وہ ہے جس میں ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادّی، اخلاقی یا روحانی مضرّتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی

Maktaba Tul Ishaat.com

کی پناہ اس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالَمِ اسباب پر حکمراں ہے اور بالاتر از حس وادراک طریقے سے وہ اُس شخص کی ضرور حفاظت کر سکتی ہے جو اُس کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پناہ کی یہ دوسری قسم ہی نہ صرف سورۂ فَلَق اور سورۂ ناس میں مراد ہے، بلکہ قرآن اور حدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد یہی خاص قسم کی پناہ ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا لازمہ یہ ہے کہ اِس نوعیّت کا تعوّذ یا اِستعاذہ (پناہ مانگنا) اللہ کے سوا کسی اور سے نہ کیا جائے۔ مشرکین اِس نوعیت کا تحفّظ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں، مثلاً جنّوں یا دیویوں اور دیوتاؤں سے مانگتے تھے اور آج بھی مانگتے ہیں۔ مادّہ پرست لوگ اِس کے لیے بھی مادّی ذرائع و وسائل ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں، کیونکہ وہ کسی فوق الفطری طاقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مومن ایسی تمام آفات و بَلِیّات کے مقابلے میں، جن کو دفع کرنے پر وہ خود اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتا، صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اسی کی پناہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین کے متعلّق قرآن میں بیان کیا گیا ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ، جنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔" (الجنّ:۶) اور اِس کی تشریح کرتے ہوئے ہم سورۂ جنّ حاشیہ ۷ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب کو جب رات کسی سُنسان وادی میں گزارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے: "ہم اِس وادی کے رب کی (یعنی اُس جنّ کی جو اِس وادی پر حکمران ہے یا اِس وادی کا مالک ہے) پناہ مانگتے ہیں۔" بخلاف اس کے، فرعون کے متعلّق فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ عظیم نشانیوں کو دیکھ کر فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ "وہ اپنے بَل بُوتے پر اکڑ گیا۔" (الذّاریات:۳۹) لیکن خدا پرستوں کا رَوِیّہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ مادّی ہو یا اخلاقی یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لیے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلّق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں اُن کے سامنے آیا (جب کہ وہ نہ جانتی تھیں کہ یہ فرشتہ ہے) تو انھوں نے کہا: اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا "اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔" (مریم:۱۸) حضرت نوحؑ نے جب اللہ تعالیٰ سے ایک بے جا دعا کی اور جواب میں اللہ کی طرف سے اُن پر ڈانٹ پڑی تو انھوں نے فوراً عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ "میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اِس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔" (ہود:۴۷) حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، تو انھوں نے جواب میں فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اِس بات سے کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں"۔ (البقرہ:۶۷)

یہی شان اُن تمام تعوّذات کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کُتُبِ حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی حسبِ ذیل دعاؤں کو مُلاحظہ کیجیے:

عن عائشة ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم کان یقول فی دعآئه اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ	حضرت عائشہؓ سے رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ۔ (مسلم)

اُن کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور اُن کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کیے۔" (یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کے بُرے نتیجے سے پناہ مانگتا ہوں، اور اگر کوئی کام جو کرنا چاہیے تھا، میں نے نہیں کیا تو اُس کے نقصان سے بھی پناہ مانگتا ہوں، یا اِس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیے وہ میں کبھی کر گزروں)۔

عن ابن عمر کان من دعآءِ رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَ تَحَوُّلِ عَافِیَتِكَ وَفَجْاَۃِ نِقْمَتِكَ وَجَمِیْعِ سَخَطِكَ۔ (مسلم)

ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے، اور تجھ سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے، اور تیرا غضب یکایک ٹوٹ پڑے، اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے۔"

عن زید بن ارقم کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَمِنْ نَّفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَّا یُسْتَجَابُ۔ (مسلم)

زیدؓ بن ارقم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نافع نہ ہو، اس دل سے جو تیرا خوف نہ کرے، اُس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو، اور اُس دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔"

عن ابی ھریرۃ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّہٗ بِئْسَ الضَّجِیْعُ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّہٗ بِئْسَتِ الْبِطَانَۃُ۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے، کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گزارے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے، کیونکہ وہ بڑی بدباطنی ہے۔"

عن انس ان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کان یقول اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَ الْجُنُوْنِ وَ الْجُذَامِ وَ سَیِّءِ الْاَسْقَامِ۔ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ اور جنون اور جذام اور تمام بُری بیماریوں سے۔"

عن عائشۃ ان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کان یدعو بھٰؤلاء الکلمات اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَۃِ النَّارِ وَمِنْ

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِن کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداری اور مفلسی کے

Maktaba Tul Ishaat.com

شَرِّ الْغِنٰی وَالْفَقْرِ۔ (ترمذی وابوداؤد)

شر سے۔"

عن قُطبة بن مالك كان النبی صلی اللّٰه عليه وسلم يقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُّنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ (ترمذی)

قُطبہؓ بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں بُرے اخلاق اور بُرے اعمال اور بُری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

شَکَلؓ بن حُمَید نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: مجھے کوئی دعا بتایئے۔ فرمایا، کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ، وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ، وَمِنْ شَرِّ لِسَانِیْ، وَمِنْ شَرِّ قَلْبِیْ، وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ۔ (ترمذی وابوداؤد)

خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے شر سے، اور اپنی بصارت کے شر سے، اور اپنی زبان کے شر سے، اور اپنے دل کے شر سے، اور اپنی شہوت کے شر سے۔

عن انس بن مالك كان رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ (وفی رواية لمسلم) وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔ (بخاری ومسلم)

انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سُستی اور بزدلی اور بُڑھاپے اور بُخل سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی و موت کے فتنے سے (اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے) اور قرض کے بوجھ سے، اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر غالب ہوں۔"

عن خَوْلَة بنت حُكَيْم السُّلَمِيَّة سمعتُ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه عليه وسلم يقول مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا ثُمَّ قَالَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ يَضُرُّهٗ شَيْءٌ حَتّٰی يَرْتَحِلَ مِنْ ذٰلِكَ الْمَنْزِلِ۔ (مسلم)

خَولہؓ بنت حُکیم سُلَمِیَّہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اترے اور یہ الفاظ کہے کہ "میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے، تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی، یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کر جائے۔"

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تعوّذات بطورِ نمونہ ہم نے احادیث سے نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے نہ کہ کسی اور کی پناہ، اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے۔

۳- اصل میں لفظ رَبُّ الْفَلَقِ استعمال ہوا ہے۔ فَلَق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی عظیم اکثریت نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو پھاڑ کر سپیدۂ صبح نکالنا لیا ہے، کیونکہ عربی زبان میں فَلَقُ الصبح کا لفظ طُلوعِ صبح کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کے الفاظ استعمال

ہوئے ہیں، یعنی ''وہ جورات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالتا ہے۔'' (الانعام: ۹٦) فلق کے دوسرے معنیٰ خَلق بھی لیے گئے ہیں، کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ تمام نباتات بیج اور زمین کو پھاڑ کر اپنی کونپل نکالتے ہیں۔ تمام حیوانات یا تو رحمِ مادر سے برآمد ہوتے ہیں، یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں، یا کسی اور مانعِ ظُہور چیز کو چیر کر باہر آتے ہیں۔ تمام چشمے پہاڑ یا زمین کو شق کر کے نکلتے ہیں۔ دن، رات کا پردہ چاک کر کے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بادلوں کو چیر کر زمین کا رخ کرتے ہیں۔ غرض، موجودات میں سے ہر چیز کسی نہ کسی طرح کے اِنشِقاق کے نتیجے میں عَدَم سے وجود میں آتی ہے، حتّٰی کہ زمین اور سارے آسمان بھی پہلے ایک ڈھیر تھے جس کو پھاڑ کر انھیں جدا جدا کیا گیا، كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: ۳۰) پس اِس معنیٰ کے لحاظ سے فلق کا لفظ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ اب اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوعِ صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں، اور دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو مطلب ہوگا: میں تمام خَلق کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ اِس جگہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ ذات چھوڑ کر اُس کا اسمِ صفت ''رب'' اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ پناہ مانگنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ''رب''، یعنی مالک و پروردگار اور آقا و مُربّی ہونے کی صفت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ پھر رَبُّ الْفَلَقِ سے مراد اگر طلوعِ صبح کا رَبّ ہو تو اس کی پناہ لینے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو رب تاریکی کو چھانٹ کر صبحِ روشن نکالتا ہے میں اُس کی پناہ لیتا ہوں، تاکہ وہ آفات کے ہُجوم کو چھانٹ کر میرے لیے عافیت پیدا کر دے، اور اگر اس سے مراد رَبِّ خَلق ہو تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں ساری خلق کے مالک کی پناہ لیتا ہوں، تاکہ وہ اپنی مخلوق کے شر سے مجھے بچائے۔

۴ – بالفاظِ دیگر، تمام مخلوقات کے شر سے میں اُس کی پناہ مانگتا ہوں۔ اِس فقرے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل، یہ کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی، بلکہ مخلوقات کی پیدایش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اُن شُرور سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ نے پیدا کیے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اُن چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ اُس کا ہر کام خیر اور کسی مَصلَحت ہی کے لیے ہوتا ہے، البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اُس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ اُن کی تخلیق کی مَصلَحت پوری ہو، اُن سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

دوم، یہ کہ اگر صرف اِسی ایک فقرے پر اکتفا کیا جاتا اور بعد کے فقروں میں خاص خاص قسم کی مخلوقات کے شرور سے الگ الگ خدا کی پناہ مانگنے کا نہ بھی ذکر کیا جاتا تو یہ فقرہ مُدّعا پورا کرنے کے لیے کافی تھا، کیونکہ اس میں ساری ہی مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگ لی گئی ہے۔ اِس عام اِستعاذے کے بعد چند مخصوص شُرور سے پناہ مانگنے کا ذکر خود بخود یہ معنیٰ دیتا ہے کہ ویسے تو مَیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر مخلوق کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن خاص طور پر وہ چند شرور جن کا ذکر سورۂ فَلَق کی باقی آیات اور سورۂ ناس میں کیا گیا ہے، ایسے ہیں جن سے خدا کی اَمان پانے کا مَیں بہت محتاج ہوں۔

سوم، یہ کہ مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین اور مؤثر ترین اِستعاذہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو

Maktaba Tul Ishaat.com

وہ یہ ہے کہ اُن کے خالق کی پناہ مانگی جائے، کیونکہ وہ بہر حال اپنی مخلوق پر غالب ہے، اور اُن کے ایسے شُرور کو بھی جانتا ہے جنھیں ہم جانتے ہیں، اور ایسے شُرور سے بھی واقف ہے جنھیں ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا اُس کی پناہ گویا اُس حاکمِ اعلیٰ کی پناہ ہے جس کے مقابلے کی طاقت کسی مخلوق میں نہیں ہے، اور اس کی پناہ مانگ کر ہم ہر مخلوق کے ہر شر سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، خواہ وہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ نیز اس میں دنیا ہی کے نہیں، آخرت کے بھی ہر شر سے اِستِعاذہ شامل ہے۔

چہارم، یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف اور اَلَم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اُن اسباب کے لیے بھی جو نقصان وضرر اور تکلیف واَلَم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا، اور ایسے ہی دوسرے شُرور پہلے معنیٰ میں شر ہیں، کیونکہ یہ بجائے خود تکلیف اور اذیّت ہیں۔ بخلاف اس کے، مثال کے طور پر کفر، شرک، اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم دوسرے معنیٰ میں شر ہیں، کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے، اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو۔ پس شر سے پناہ مانگنا اِن دونوں مفہُومات کا جامع ہے۔

پنجم، یہ کہ شر سے پناہ مانگنے میں دو مفہُوم اور بھی شامل ہیں: ایک یہ کہ جو شر واقع ہو چکا ہے، بندہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ وہ اسے دفع کر دے۔ دوسرے یہ کہ جو شر واقع نہیں ہوا ہے، بندہ یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا مجھے اُس شر سے محفوظ رکھے۔

۵ — مخلوقات کے شر سے عُموماً خدا کی پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خُصوصیّت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ آیت میں غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غاسق کے لُغوی معنیٰ تاریک کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہُوا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ، ”نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے رات کے اندھیرے تک۔“ (بنی اسرائیل:۷۸) اور وَقَبَ کے معنیٰ داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں۔ رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لیے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ موذی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اور عرب میں طوائف المُلُوکی کا جو حال ان آیات کے نُزول کے وقت تھا، اس میں تو رات بڑی خوفناک چیز تھی، اس کے اندھیرے میں چھاپا مار نکلتے تھے اور بستیوں پر غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے، وہ بھی رات ہی کے وقت آپؐ کو قتل کر دینے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے تاکہ قاتل کا پتا نہ چل سکے۔ اس لیے اُن تمام شرور و آفات سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں۔ یہاں اندھیری رات کے شر سے طلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگنے میں جو لطیف مناسبت ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اِشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدّد صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اُس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ

اللہ کی پناہ مانگو، ھٰذا الغاسق اذا وقب، یعنی یہ الغاسق اذا وقب ہے۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَردُوْیہ) اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِذَا وَقَبَ کا مطلب یہاں اِذَا خَسَفَ ہے، یعنی جب کہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے۔ لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضوؐر نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی تھی اُس وقت وہ گرہن میں تھا۔ اور لغتِ عرب میں بھی اِذَا وَقَبَ کے معنٰی اِذَا خَسَفَ کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اِس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے، دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا، اس لیے حضوؐر کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے (یعنی چاند کے) آنے کے وقت یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی حملہ کرنے والے کے لیے ہوتی ہے، اور جرم کا شکار ہونے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الشَّمْسَ اِذَا غَرَبَتْ انتشرت الشیاطین، فاکفتوا صبیانکم واحبسوا مواشیکم حتی تذھب فحمۃ العشاء، ''جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں، لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو، جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے۔''

۶ – اصل الفاظ ہیں: نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ عُقَد جمع ہے عُقدہ کی، جس کے معنٰی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تاگے یا رسّی میں ڈالی جاتی ہے۔ نَفْث کے معنٰی پھونکنے کے ہیں۔ نَفّاثات جمع ہے نَفّاثہ کی، جس کو اگر علّامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھُونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھُونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نُفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں۔ گرہ میں پھونکنے کا لفظ اکثر، بلکہ تمام تر مفسّرین کے نزدیک جادو کے لیے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عُموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طُلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔ اِس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آ کر حضوؐر کو مُعَوِّذَتَین پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اور مُعَوِّذَتَین میں یہی ایک فقرہ ہے جو براہِ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی اور زَمَخشری نے نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ کا ایک اور مفہوم بھی بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکّاری، اور مردوں کے عزائم اور آرا اور خیالات پر اُن کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبّت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اُس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ پُرلطف ہے، لیکن اُس تفسیر کے خلاف ہے جو سَلَف سے مُسلَّم چلی آتی ہے، اور اُن حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں مُعَوِّذَتَین نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر بُرا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواحِ خبیثہ

Maktaba Tul Ishaat.com

یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے، اس لیے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، ''سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔'' (البقرہ:۱۰۲) لیکن اگر اُس میں کوئی کلمۂ کفر یا کوئی فعلِ شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: سات غارت گر چیزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کیا ہیں یا رسولؐ اللہ؟ فرمایا: خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سُود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور بھولی بھالی عَفیف مومن عورتوں پر زنا کی تُہمت لگانا۔

۷۔ حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو، اس پر کوئی دوسرا شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اُس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے، یا کم از کم یہ کہ اُس سے ضرور چھِن جائے۔ البتہ حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اُس حالت میں مانگی گئی ہے جب کہ وہ حسد کرے، یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے کے لیے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا، اُس وقت تک اُس کا جلنا بجائے خود چاہے بُرا سہی، مگر محسود کے لیے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ پھر جب ایسا شر کسی حاسد سے ظاہر ہو تو اُس سے بچنے کے لیے اوّلین تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان پانے کے لیے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک، یہ کہ انسان اللہ پر بھروسا کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے، کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے، یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ خود بھی اَخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آجائے۔ تیسرے، یہ کہ حاسد خواہ خدا سے بے خوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہر حال تقویٰ پر قائم رہے۔ چوتھے، یہ کہ اپنے دل کو اُس کی فکر سے بالکل فارغ کر لے اور اُس کو اِس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اُس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں، یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش آنا تو درکنار، جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی کرے، قطعِ نظر اِس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اِس نیک رَوِیّے سے مِٹتی ہے یا نہیں۔ چھٹے، یہ کہ محسود توحید کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے، کیونکہ جس دل میں توحید بسی ہوئی ہو، اُس میں خدا کے خوف کے ساتھ کسی اور کا خوف جگہ ہی نہیں پا سکتا۔

آیاتہا ٦ سُوْرَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣ مِنْ شَرِّ
الْوَسْوَاسِ ۙ۬ الْخَنَّاسِ ۝٤ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦ ع

ع ٢ ٣٩

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی[1] اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے[2]، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جِنّوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے[3]۔ ع

۱ – یہاں بھی سورۂ فلق کی طرح اعوذ باللہ کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو اس کی تین صفات سے یاد کر کے اس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک، اُس کا ربُّ الناس، یعنی تمام انسانوں کا پروردگار و مُربّی اور مالک و آقا ہونا۔ دوسرے، اُس کا مَلِکُ الناس، یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرماں روا ہونا۔ تیسرے، اُس کا اِلٰہُ الناس، یعنی انسانوں کا حقیقی معبود ہونا۔ (یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اِلٰہ کا لفظ قرآنِ مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، وہ شے یا شخص جس کو عبادت کا کوئی استحقاق نہ پہنچتا ہو مگر عملاً اس کی عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرا، وہ جسے عبادت کا استحقاق پہنچتا ہو اور جو حقیقت میں معبود ہو، خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اللہ کے لیے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اِسی دوسرے معنیٰ میں ہوا ہے) اِن تین صفات سے اِستعاذہ کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو انسانوں کا رب، بادشاہ اور معبود ہونے کی حیثیت سے اُن پر کامل اقتدار رکھتا ہے، جو اپنے بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے، اور جو واقعی اُس شر سے انسانوں کو بچا سکتا ہے جس سے خود بچنے اور دوسرے انسانوں کو بچانے کے لیے میں اُس کی پناہ مانگ رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ وہی رب اور بادشاہ اور اِلٰہ ہے، اس لیے اُس کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں جس سے میں پناہ مانگوں اور جو حقیقت میں پناہ دے بھی سکتا ہو۔

۲ – اصل میں وَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وَسْواس کے معنیٰ ہیں: بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وَسْوَسے کے معنیٰ ہیں: پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بُری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو، اُسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اُس کے دل میں ایک بُری بات ڈال رہا ہے۔ وَسْوَسے کے لفظ

Maktaba Tul Ishaat.com

میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلے میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے، اس لیے ایسی کوشش کو وَسْوَسہ، اور کوشش کرنے والے کو وَسْواس کہا جاتا ہے۔ رہا لفظ خَنَّاس، تو یہ خُنوس سے ہے، جس کے معنیٰ ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں، اور خنّاس چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس لیے اس کے معنیٰ یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لیے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ جب اسے خنّاس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ وسوسہ ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کے لیے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے، پھر وہی کوشش کرنے کے لیے دوبارہ، سہ بارہ اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اُس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے، یعنی اِس شر سے کہ وہ کہیں اُس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے، اُس کے شر سے داعیِ حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی الی الحق کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اُس کی ذات کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں، ان سب تک خود پہنچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اُس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور اُن کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے۔ اُس کے مقام سے یہ بات بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اُترے ہوئے ہیں اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہ۔ اِس کے بعد اُن سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ ربُّ الناس، مَلِکُ الناس اور اِلٰہُ الناس کا کام ہے۔

اِس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ عملِ شر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثرانداز ہو جاتا ہے تو پہلے اُس میں برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، پھر مزید وسوسہ اندازی اُس بُری خواہش کو بری نیت اور بُرے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب وسوسے کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ عزم بن جاتا ہے اور آخری قدم پھر عملِ شر ہے۔ اس لیے وسوسہ انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کُھلے کُھلے کفر، شرک، دہریت، یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دینُ اللہ

میں داخل ہی ہو جائے تو وہ اسے کسی نہ کسی بدعت کی راہ سُجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں تو کوئی مُضایقہ نہیں، تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بارِ عظیم انسان پر لَد جائے۔ اِس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجۂ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دینِ حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے، اُسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص اِن تمام چالوں کو ناکام کر دے تو پھر شیاطینِ جنّ و اِنس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پِل پڑتی ہے، اس کے خلاف لوگوں کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے، اُس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کراتی ہے، اسے ہر طرف بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اُس مردِ مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے، اٹھ اور اِن حملہ آوروں سے بِھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوتِ حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعیِ حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے بھی اگر داعیِ حق بچ نکلے تو شیطان اُس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے: وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، ”اور اگر شیطان کی طرف سے تمھیں کوئی اکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو۔“ (الاعراف:۲۰۰۔ حٰم السجدہ:۳۶) وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، ”کہو: میرے پروردگار! میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“ (المؤمنون: ۹۷) إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ، ”جو لوگ پرہیزگار ہیں، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انھیں چھُو بھی جائے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر انھیں (صحیح راستہ) صاف نظر آنے لگتا ہے۔“ (الاعراف:۲۰۱) اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اِس آخری حربے سے بچ نکلیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ، ”یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔“ (حٰم السجدہ:۳۵)

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطینِ جنّ و اِنس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اُس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُس کی اپنی ناجائز اغراض و خواہشات اُس کی قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں، انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اُس کو بہکاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے کہ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ”اور ہم اُس کے اپنے نفس سے اُبھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں۔“ (قٓ:۱۶) اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبۂ مسنونہ میں فرمایا ہے: نعوذ باللّٰہِ من شرور انفسنا، ”ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔“

۳۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اِن الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا دو قسم کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے: ایک جنّ، دوسرے انسان۔ اس بات کو اگر تسلیم کیا جائے تو لفظِ ناس کا اطلاق جنّ اور انسان دونوں پر ہوگا۔

Maktaba Tul Ishaat.com

کہتے ہیں کہ ایسا ہوسکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جب رِجَالٌ (مَردوں) کا لفظ جنّوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ جن، آیت ۶ میں ہم دیکھتے ہیں، اور جب نَفَر کا استعمال جنّوں کے گروہ پر ہوسکتا ہے، جیسا کہ سورۂ اَحقاف، آیت ۲۹ میں ہوا ہے، تو مجازاً ناس کے لفظ میں بھی انسان اور جنّ دونوں شامل ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ رائے اس لیے غلط ہے کہ ناس اور اِنس اور انسان کے الفاظ لغت ہی کے اعتبار سے لفظِ جنّ کی ضد ہیں۔ جنّ کے اصل معنٰی پوشیدہ مخلوق کے ہیں، اور جن کو جن اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھ سے مخفی ہے۔ اس کے برعکس ناس اور اِنس کے الفاظ انسان کے لیے بولے ہی اس بنا پر جاتے ہیں کہ وہ ظاہر اور مرئی اور محسوس ہے۔ سورۂ قَصَص، آیت ۲۹ میں ہے: اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ یہاں اٰنَسَ کے معنٰی رَأیٰ ہیں، یعنی حضرت موسٰیؑ نے ''کوہِ طور کے کنارے آگ دیکھی۔'' سورۂ نساء آیت ۶ میں ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا، ''اگر تم محسوس کرو کہ یتیم بچے اب ہوش مند ہوگئے ہیں۔'' یہاں اٰنَسْتُمْ کے معنٰی اَحْسَسْتُمْ یا رَاَیْتُمْ ہیں۔ پس ناس کا اطلاق لغتِ عرب کی رُو سے جِنّوں پر نہیں ہوسکتا، اور آیت کے صحیح معنٰی یہ ہیں کہ ''اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنّوں میں سے ہو یا خود انسانوں میں سے۔'' یعنی دوسرے الفاظ میں وسوسہ اندازی کا کام شیاطینِ جن بھی کرتے ہیں اور شیاطینِ اِنس بھی، اور دونوں کے شر سے پناہ مانگنے کی اِس سورہ میں تلقین کی گئی ہے۔ اس معنٰی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے اور حدیث سے بھی۔ قرآن میں فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۝ (الانعام: ۱۱۲)	اور اِسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان جنّوں اور شیطان انسانوں کو دشمن بنا دیا ہے، جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔

اور حدیث میں امام احمد، نَسائی اور ابنِ حِبّان حضرت ابو ذرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ فرمایا: ابوذرؓ! تم نے نماز پڑھی؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھی اور پھر آ کر بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا: یا ابا ذرٍّ، تَعَوَّذْ بِاللّٰهِ من شَرِّ شیاطینِ الانس والجن، ''اے ابو ذر! شیاطینِ اِنس اور شیاطینِ جن کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔

خاتمہ

میں صمیمِ قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تفہیم القرآن لکھنے کا جو کٹھن کام میں نے محرّم ۶۱ھ (فروری ۴۲ء) میں شروع کیا تھا، وہ ۳۰ سال چار مہینے بعد آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ سراسر اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندے کو اپنی کتابِ پاک کی یہ خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اِس میں جو کچھ صحیح و برحق ہے وہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی بدولت ہے، اور جہاں کہیں میں نے قرآن کی ترجمانی و تفسیر میں غلطی کی ہے وہ میرے اپنے علم و فہم کا قصور ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں نے کوئی غلطی جان بُوجھ کر نہیں کی ہے، اس لیے میں اللہ کے کرم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے معاف فرما دے گا، اور میرے اِس کام کے ذریعے سے اگر اُس کے بندوں کو ہدایت پانے میں کوئی مدد ملی ہے تو اس کو میری مغفرت کا ذریعہ بنا دے گا۔ اصحابِ علم سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ میری غلطیوں پر مجھے متنبّہ فرمائیں۔ جس بات کا بھی غلط ہونا دلیل سے مجھ پر واضح کر دیا جائے گا، اِن شاء اللہ، اس کی اصلاح کروں گا۔ میں اِس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کتاب اللہ کے معاملے میں دانستہ غلطی کروں، یا کسی غلطی پر جما رہوں۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اِس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن اُس طرح سمجھاؤں جس طرح میں نے خود اسے سمجھا ہے، اُس کے اصل مفہوم و مدعا کو اِس طرح کھول کر بیان کر دوں کہ لوگ قرآن کی روح تک پہنچ سکیں، اُن تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دوں اور اُن سوالات کے جواب دے دوں جو قرآن کو، یا اس کے محض ترجموں کو پڑھ کر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور اُن چیزوں کی وضاحت کر دوں جنھیں قرآنِ مجید میں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں میرے پیشِ نظر زیادہ تفصیل سے کام لینا نہ تھا، اس لیے پہلی جلد کے حواشی مختصر رہے۔ بعد میں جُوں جُوں میں آگے بڑھتا گیا، مجھے حواشی میں زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی گئی، یہاں تک کہ بعد کی جلدوں کو دیکھنے والے اب پہلی جلد کو تشنہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن قرآنِ مجید میں مضامین کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس مضمون کی تشریح ایک جگہ تشنہ رہ گئی ہو وہ چونکہ بعد کی سورتوں میں بھی آیا ہے اس لیے ان کی پوری تشریح بعد کی سورتوں کے حواشی میں ہو جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ جو لوگ قرآنِ مجید کو تفہیم القرآن کی مدد سے صرف ایک دفعہ پڑھنے پر اکتفا نہ کریں گے، وہ پوری کتاب کو دوبارہ پڑھتے وقت خود محسوس کر لیں گے کہ بعد کی سورتوں کی تشریحات ابتدائی سورتوں کے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

لاہور

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

(۷ رجون ۱۹۷۲ء)

ابُوالاعلیٰ

Maktaba Tul Ishaat.com

ضمیمہ نمبر ۱

بسلسلۂ الدّہر، حاشیہ ۳۴

ان آیات میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔ دوسرے یہ کہ تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم و علیم ہے۔ اِن تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادیِ اختیار اور اللہ کی مشیّت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلے میں بالعُموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں، وہ صرف اِس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اُس کے سامنے آتے ہیں، اُن میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (freedom of choice) ہے جو اللہ نے اُس کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اُس کے آگے بہت سے راستے ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ حلال ہیں، جیسے جائز نوعیت کی محنت مزدوری، ملازمت، تجارت، یا صَنعت وحِرفت یا زراعت، اور کچھ حرام ہیں، مثلاً چوری، ڈاکا، رہزنی، جیب تراشی، عِصمَت فروشی، سودخواری، قمار بازی، رشوت اور حرام نوعیت کی نوکریاں اور تجارتیں وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اِسی طرح اَخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ ایک طرف دیانت، امانت، شرافت، شائستگی، انصاف، رحم، ہمدردی اور عِصمت و عفّت جیسے خصائل ہیں، اور دوسری طرف بدمَعاشی، کمینگی، ظلم و ستم، بے ایمانی، آوارگی اور بیہودگی و بدتمیزی جیسے رذائل۔ اُس کو پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کرلے۔ ایسا ہی معاملہ دین و مذہب کا ہے کہ اُس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کُھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکارِ خدا، شرک و بت پرستی، شرک و توحید کے مختلف مخلوطے، اور ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان میں بھی یہ فیصلہ کرنا انسان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اسے حرام خور بنائے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور اللہ جبراً اسے مُلحِد یا مشرک یا کافر بنا دے، یا وہ چاہتا تو ہو نیک انسان بننا اور اللہ اسے خواہ مخواہ بد بنا دے۔

لیکن اِس آزادیِ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیّت اور اس کے اِذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیّت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش

یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے تب ہی وہ اُس کو کر سکتا ہے، ورنہ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، اللہ کے اِذن اور اُس کی مشیّت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی بات دوسری آیت میں فرمائی گئی ہے۔ اِس معاملے کو یوں سمجھیے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات تفویض کر دیے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑ دی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر گزرے، تو نظامِ عالَم دَرہم بَرہم ہو جاتا۔ ایک قاتل تمام دنیا کے انسانوں کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا اگر اسے یہ چھوٹ مل جاتی کہ جسے چاہے قتل کر دے۔ ایک جیب کَترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا اگر اس کو یہ اختیار دے دیا جاتا کہ جس کی جیب کترنا چاہے کتر ڈالے۔ ایک چور کے ہاتھ سے کسی کا مال نہ بچتا، ایک زانی سے کوئی عورت نہ بچتی، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا، اگر ان میں سے ہر ایک کو مَن مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط، جس راستے پر بھی چلنا چاہے، اُس پر اُسے چلنے دے یا نہ چلنے دے۔ جو شخص گمراہی کو چھوڑ کر راہِ راست اختیار کرنا چاہے اس کو بھی عملاً راست روی اللہ ہی کی مشیّت اور اُسی کی توفیق سے نصیب ہو سکتی ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ضلالت کو چھوڑ کر ہدایت کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان نے خود کیا ہو، ورنہ جس طرح اللہ کسی کو زبردستی چور یا قاتل یا مُلحد یا مشرک نہیں بناتا، اسی طرح وہ اس کو زبردستی مومن بھی نہیں بناتا۔

اس کے بعد تیسری آیت اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیّت کہیں اَلَل ٹَپ (arbitrary) تو نہیں ہے۔ اس کو رفع کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے، یعنی وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے، جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے، اس لیے اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا توفیق دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے، کسے کیا کام کرنے دینا چاہیے اور کیا نہ کرنے دینا چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو اُس کے لیے سازگار بناتا ہے، اُسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے، خواہ وہ اچھا کام ہو یا بُرا کام۔ ہدایت کا معاملہ بھی اِس سے مُستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے علم کی بنا پر یہ جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر یہ طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

ضمیمہ نمبر ۲

بسلسلۂ الدّہر، حاشیہ ۳۴

اس آیت میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جن تک اللہ کا کلام اور اس کے نبی کی تعلیم پہنچے اور پھر وہ خوب سوچ سمجھ کر، جان بُوجھ کر، یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں اُس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ اِن میں وہ ظالم بھی شامل ہیں جو صاف صاف کہہ دیں کہ ہم اِس کلام کو خدا کا کلام اور اِس نبی کو خدا کا نبی نہیں مانتے، یا سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ اور وہ ظالم بھی شامل ہیں جو

Maktaba Tul Ishaat.com

خدا اور نبی اور قرآن کو ماننے سے انکار تو نہیں کرتے مگر فیصلہ اُن کا یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اُس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں ہی گروہ ظالم ہیں۔ پہلے گروہ کا معاملہ تو صاف ہی ہے، لیکن دوسرا گروہ بھی اس سے کچھ کم ظالم نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ منافق اور دغاباز بھی ہے۔ زبان سے کہتا ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں، رسول کو مانتے ہیں، قرآن کو مانتے ہیں، مگر اُن کے دل اور دماغ کا فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا اتباع انھیں نہیں کرنا ہے، اور عمل بھی وہ اُس کے خلاف ہی کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے متعلّق اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے کہ ہم نے اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیا میں چاہے وہ دندناتے پھریں، خوب دادِ عیش دیں، اپنی بڑائی کے ڈنکے خوب بجالیں، مگر آخرِکار ان کا انجام ایک دردناک عذاب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت میں داخل ہونا ان کو نصیب نہیں ہوسکتا۔

ضمیمہ نمبر ۳

بسلسلۂ المُرسلات، حاشیہ ا

اِن آیات میں ابتداءً بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی ہے کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انھیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں عُذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر، یعنی وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں یا تو خوف پیدا ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ اللہ کو یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے، یا پھر آدمی اپنے قصوروں کا اعتراف کر کے دعا کرتا ہے کہ اللہ اسے تباہی سے بچالے اور اس پر رحم کر کے بارانِ رحمت سے اس کو نواز دے۔ اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اُس موقع پر آندھیوں کو چلتے اور بادلوں کو آتے دیکھ کر بعض اوقات کٹّے سے کٹّا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ فرق اگر کچھ پڑتا ہے تو صرف اِس سے کہ قحط ہلکا ہے یا سخت۔ معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دُور نہیں ہے وہ اُس کو یاد کرے گا، لیکن دوسرے لوگ سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اِتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے اور پورا ملک تباہی سے دوچار ہو جائے تو بڑے بڑے کافروں کو خدا یاد آنے لگتا ہے، زبان سے کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہو تو دل میں وہ اپنی گناہ گاریوں اور ناشکریوں پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عُذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا اِلقا۔ رہا نُذر (ڈراوے) کے طور پر اُس کا اِلقا، تو یہ اُس وقت ہوتا ہے جب آندھی بڑھتے بڑھتے طوفانِ عظیم بن جائے اور بستیوں کی بستیاں تباہ کرتی چلی جائے، یا بارش اس قدر زوردار ہو کہ سیلابِ بلا بن جائے۔ ایسی حالت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خوف کے مارے خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اُس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹفک توجیہات اُس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار کر جاتی ہیں۔ پس ہواؤں کے چلنے کی اس ترتیب کو بیان کرنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ ہوائیں عُذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ یہ سارا نظام جو دنیا میں چل رہا ہے، انسان کو اِس حقیقت سے خبردار کرتا رہتا ہے کہ اِس زمین پر سب کچھ اُسی کے اختیار میں نہیں دے دیا گیا ہے، بلکہ اُوپر کوئی بالاتر طاقت موجود ہے جو اُس کی قسمت پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اُس کا اقتدار اِتنا زبردست ہے کہ جب چاہے وہ عناصر کو انسان کی پرورش کے لیے استعمال کر سکتی ہے اور جب چاہے انھی عناصر سے اس کی تباہی کا کام لے سکتی ہے۔

Maktaba Tul Ishaat.com

اس کے بعد ہواؤں کے اسی نظام کو اِس بات کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ وہ قیامت، جس کے برپا ہونے کا وعدہ تم سے کیا جارہا ہے، ضرور واقع ہونے والی ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ نظام اِس پر کیسے گواہی دے رہا ہے۔

انسان بالعُموم قیامت اور آخرت کے معاملے میں دو سوالات پر اُلجھتا ہے: ایک، یہ کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ دوسرے، یہ کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر انھی سوالات میں اُلجھتے ہوئے اُسے یہ شک لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ آئے گی بھی یا نہیں، یا یہ محض ایک افسانہ ہے؟ اِس پر قرآن میں جگہ جگہ کائنات کے نظام سے اِستدلال کرتے ہوئے اُس کا امکان، اس کا وجوب اور اُس کا وقوع ثابت کیا گیا ہے، اور کہیں یہ استدلال اِس طرز پر کیا گیا ہے کہ خدا کی خدائی کے بے شمار آثار میں سے بعض کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ وہ آنے والی ہے۔ اِس طریقِ اِستدلال میں اُس کے امکان کے دلائل بھی آجاتے ہیں، وجوب کے دلائل بھی، اور وقوع کے دلائل بھی۔

یہاں استدلال کا یہی طریقہ اختیار کرتے ہوئے صرف ہواؤں کی گردش اور بارشوں کی آمد کے نظام کو اس امر کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جو کسی حکیم اور قادرِ مُطلَق کی تدبیر سے قائم ہوا ہے، کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے جس سے زمین کی فضا میں خود بخود یہ طریقہ چل پڑا ہو کہ یوں سمندروں سے بھاپیں اٹھیں، یوں ہوائیں ان کو لے کر چلیں، یوں وہ ان کو سمیٹ کر بادل بنائیں، پھر یوں وہ ان کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے زمین کے مختلف حصوں پر پہنچائیں، اور یوں ان سے جگہ جگہ بارش ہو۔ یہ نظام ایک اندھی بہری فطرت نے کسی اندھیر نگری میں اتفاقاً نہیں بنا دیا ہے، بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا اور جچا تُلا منصوبہ ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اسی لیے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سمندر پر سورج کی گرمی پہنچنے سے بھاپیں اُٹھنے کے بجائے برف جم جائے، بلکہ ہمیشہ دھوپ کی حرارت سے بھاپیں ہی اٹھتی ہیں۔ کبھی موسمی ہوائیں اُلٹی چال نہیں چلتیں کہ بھاپوں کو اٹھانے کے بجائے سمندر میں دبا دیں، بلکہ وہ ہمیشہ اُن کو اوپر ہی اٹھاتی ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ بادلوں کا بننا بند ہو جائے، ہوائیں ان کو لے کر خشک علاقوں کی طرف چلنا چھوڑ بیٹھیں، اور خشکی پر بارشوں کے نزول کا سلسلہ رُک کر رہ جائے۔ کروڑوں سال سے ایک ہی قاعدہ ہے جس پر یہ نظام مسلسل چل رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس زمین پر آپ کا وجود میں آنا اور جینا ممکن نہ ہوتا۔

اس نظام میں آپ ایک کھُلی ہوئی مقصدیت اور ایک باضابطہ قانون کی کارفرمائی پاتے ہیں۔ آپ کو عَلانیہ نظر آرہا ہے کہ زمین پر انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی کا نہایت گہرا تعلق اِن ہواؤں اور اِن بارشوں سے ہے، اور یہ انتظام اس امر کی کھلی گواہی دے رہا ہے کہ پانی کی یہ فراہمی ذی حیات مخلوق کو وجود میں لانے اور زندہ رکھنے کے لیے ٹھیک ٹھیک اُس کی ضروریات کے مطابق اور ایک قانون کے مطابق کی گئی ہے۔ یہ مقصدیت اور باقاعدگی صرف اِسی ایک معاملے میں نہیں بلکہ کائنات کے پورے نظام میں پائی جاتی ہے اور انسان کی ساری سائنٹفک

ترقی اِس پر مبنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق آپ یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ کس غرض کے لیے ہے اور کس قاعدے پر کام کرتی ہے، پھر جن جن چیزوں کے بارے میں جتنا جتنا آپ کو یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ان کا مقصد کیا ہے اور اُن میں کام کرنے والے قوانین کیا ہیں، اُسی قدر آپ ان کے استعمال کے نئے نئے طریقے نکالتے چلے جاتے ہیں اور نئی نئی ایجادیں کر کے اپنے تمدّن کو ترقی دیتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں اگر فطری طور پر یہ تصور موجود نہ ہوتا کہ یہ دنیا ایک بامقصد دنیا ہے اور اس کے اندر ہر چیز ایک قانون پر کام کر رہی ہے تو آپ کے دماغ میں سرے سے کسی چیز کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ یہ کس غرض کے لیے ہے اور اس سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔

اب اگر یہ دنیا اور اس کی ایک ایک چیز بامقصد ہے، اور اگر اس دنیا اور اِس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، اور اگر یہ اربوں سال سے پیہم اِسی مقصدیت اور باضابطگی کے ساتھ چل رہی ہے، تو صرف ایک ضدی انسان ہی یہ ماننے سے انکار کرسکتا ہے کہ ایک علیم وحکیم اور قادرِ مُطلق خدا نے اِسے بنایا ہے، اور اُس خدا کے متعلق یہ خیال کرنا سراسر ایک احمقانہ بات ہے کہ وہ اسے بنا اور چلا تو سکتا ہے مگر توڑ نہیں سکتا، اور توڑ کر پھر کسی اور شکل میں بنانا چاہے تو نہیں بنا سکتا۔ مادّے کے متعلق یہ تصوُّر کہ وہ غیر فانی ہے، قدیم زمانے کے جاہل دہریوں کا بہت بڑا سہارا تھا، مگر علم کی ترقی نے اسے بھی باطل ثابت کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت علمی مُسلّمات میں سے ہے کہ مادّہ قوت (energy) میں تبدیل ہوسکتا ہے اور قوت مادّے کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس لیے یہ بات سراسر علم اور عقل کے مطابق ہے کہ خدائے حیّ وقیّوم جب تک اِس مادّی دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے اُسی وقت تک یہ قائم ہے۔ جونہی وہ اِسے قوت میں تبدیل کرنا چاہے صرف ایک اشارے سے تبدیل کرسکتا ہے، اور اُس کا صرف ایک اشارہ ہی اس کے لیے بھی کافی ہے کہ یہ دوبارہ ایک دوسری مادّی شکل میں پیدا ہوجائے۔

یہ تو ہے قیامت کے امکان کا معاملہ، جسے اب کسی علمی وعقلی دلیل سے ردّ نہیں کیا جاسکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُس کو ضرور واقع ہونا چاہیے تاکہ انسان کو اس کے اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا ملے، تو جو شخص انسان کی اخلاقی ذمہ داری کا قائل ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ حُسنِ خدمت کا انعام اور جُرم کی سزا اِس اخلاقی ذمّہ داری کا لازمی تقاضا ہے، اُس کے لیے یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے۔ دنیا میں معاشرے اور ریاست کا کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ہر جرم کی سزا اور ہر حسنِ عمل کا انعام دے سکتا ہو۔ یہ کہنا کہ مجرم کے لیے اس کے ضمیر کی ملامت ہی کافی سزا اور مُحسن کے لیے اس کے ضمیر کا اطمینان ہی کافی جزا ہے، ایک بے معنیٰ فلسفہ طرازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور اس کے بعد فوراً ہی وہ کسی حادثے سے دوچار ہوکر مرگیا، اس کے ضمیر کو کب اتنی مہلت ملی کہ وہ اسے ملامت کرتا؟ اور جو شخص حق اور انصاف کی خاطر لڑائی پر گیا اور وہاں اچانک ایک بم پڑنے سے اس کے پرخچے اُڑ گئے، اس کے ضمیر کو یہ اطمینان حاصل ہونے کا موقع کب ملا کہ اس نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی ہے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے عقیدے سے فرار کے لیے جتنے بہانے تراشے جاتے ہیں، وہ سب بے معنیٰ ہیں۔ انسان کی عقل چاہتی ہے، اس کی فطرت چاہتی ہے کہ انصاف ہو،

Maktaba Tul Ishaat.com

مگر دنیا کی موجودہ زندگی میں انصاف، اور وہ بھی ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا انصاف ممکن نہیں ہے۔ وہ اگر ہوسکتا ہے تو آخرت ہی میں ہوسکتا ہے اور خدائے علیم وخبیر ہی کے حکم سے ہوسکتا ہے۔ آخرت کی ضرورت کا انکار دراصل انصاف کی ضرورت کا انکار ہے۔

عقل اِسی حد تک انسان کو لے جاسکتی ہے کہ آخرت ممکن ہے اور اُس کو ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ یقیناً ہوگی، اِس کا ''علم'' صرف وحی کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے، اور وحی نے یہ بتا دیا ہے کہ ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔'' اس علم تک ہم عقلی استدلال سے نہیں پہنچ سکتے، البتہ اس کے برحق ہونے کا یقین ہمیں اِس بِنا پر حاصل ہوتا ہے کہ جس بات کی خبر وحی دے رہی ہے، وہ ممکن بھی ہے اور اس کو ضرور ہونا بھی چاہیے۔

ضمیمہ نمبر ۴

بسلسلۂ الطارق، حاشیہ ۳

سورۂ طارق، آیات ۶-۷ کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ ہم نے حاشیہ ۳ میں لکھا ہے، اس پر ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں لکھا کہ:

"آپ کی تشریح مَیں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلق ہے، تو یہ مادّہ فوطے (Testicles) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں میں سے گزرتا ہوا پیٹ کی دیوار میں کولھے کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی (Inguinal canal) میں سے گزر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام (Prostate) ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اِس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گزرنے کو میں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نَرْوس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود، جو کہ دماغ میں ہوتا ہے، اُس کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہاں اِخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے)۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصّل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ مَیں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے (جس کے لیے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹفک علم پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس کے جواب میں ہم نے نومبر ۷۱ء کے رسالہ ترجمان القرآن میں لکھا کہ:

"آپ چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں اس لیے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصّوں کے افعال (functions) الگ الگ ہیں، لیکن کوئی حصہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا، بلکہ دوسرے اعضا کے تعاُمل (co-ordination) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادّۂ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ فوطہ ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گُردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادّۂ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھیے، پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے سے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضا اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادّے الگ کر کے

Maktaba Tul Ishaat.com

مثانے میں بھیج سکتا ہے جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اسی لیے قرآنِ مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادّہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں میں سے نکلتا ہے، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ''اِن دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اُس سے یہ مادّہ خارج ہوتا ہے''۔ یہ اِس بات کی نفی نہیں ہے کہ مادّۂ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل (mechanism) ہے جسے جسم کے کچھ خاص حصّے انجام دیتے ہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذّات نہیں ہے۔ یہ اپنا کام اُس پورے نظامِ اعضا کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور ترائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اِسی لیے میں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے، البتہ صُلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔''

اس سوال و جواب کو پڑھنے کے بعد دو مختلف مقامات سے دو ڈاکٹروں نے ہمیں جو طبّی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

علم الجنین (Embryology) کی رُو سے یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جَنین (Foetus) کے اندر اُنْثَیَین (Testes) یعنی وہ غدود جن سے مادّۂ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گُردوں کے قریب ہوتے ہیں، جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہ عمل ولادت سے پہلے، اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآىِٕبِ) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (Artery) پیٹھ کے قریب شہ رگ (Aortra) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت میں اُنْثَیَین پیٹھ ہی کا جُز ہیں جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں، مادّۂ منویہ اگرچہ اُنْثَیَین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسۂ منویہ (Seminal Vesicles) میں جمع ہو جاتا ہے، مگر اس کے اخراج کا مرکزِ تحریک بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآىِٕبِ ہی ہوتا ہے، اور دماغ سے اعصابی رَو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے تب اس مرکز کی تحریک (triger action) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لیے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علمِ طِبّ کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

فہرست موضوعات

الف

ابراہیم، علیہ السلام
— ان کے صحیفوں کی تعلیمات ۳۱۵-۳۱۶

ابرہہ
— دیکھو ''اصحاب الفیل''

ابلیس
— دیکھو ''شیطان''

ابن عباسؓ
— ان کا علمی مقام حضرت عمر فاروقؓ کی نگاہ میں ۵۱۳-۵۱۴

ابن ام مکتومؓ
— ان سے بے رخی برتنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ ۲۵۰-۲۵۱-۲۵۳ تا ۲۵۵
— حضورؐ کی بے رخی کی وجہ ۲۵۱-۲۵۳

ابوبکر صدیقؓ
— ان کا بلند اخلاق ۳۶۵

ابولہب
— ابولہب اس کی کنیت تھی ۵۲۵
— دشمنان اسلام میں سے صرف وہی ایک ہے جس کا نام لے کر قرآن میں مذمت کی گئی ۵۲۰-۵۲۴-۵۲۵
— اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شدید عداوت ۵۲۰ تا ۵۲۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو روکنے کے لیے اس کی سرگرمیاں ۵۲۳-۵۲۴
— وہ دین کے معاملے میں آپؐ سے خصوصی رعایت کا طالب تھا ۵۲۱-۵۲۲
— وہ آپؐ کا بدترین ہمسایہ تھا ۵۲۲
— حضورؐ کے صاحبزادوں کی وفات پر اس کا اظہار مسرت ۴۹۰
— اس کے دو بیٹوں نے اس کے دباؤ پر حضورؐ کی صاحبزادیوں کو طلاق دے دی ۵۲۲
— اس کا ایک بیٹا حضورؐ کی بددعا سے مرا ۵۲۲
— جب قریش نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کا معاشی مقاطعہ کیا تو اس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کا ساتھ دیا ۵۲۳-۵۲۴
— نہایت دولت مند اور سخت بخیل اور زر پرست تھا لیکن نہ اس کا مال اس کے کسی کام آیا نہ اس کی اولاد ۵۲۵-۵۲۶
— اس کا عبرت ناک انجام ۵۲۵-۵۲۶
— اس کی بیوی بھی حضورؐ کی عداوت میں خاوند سے کم نہ تھی ۵۲۲-۵۲۵ تا ۵۲۷
— اس کا کردار اور عبرت ناک انجام ۵۲۵-۵۲۷

Maktaba Tul Ishaat.com

اجر

__ اجر کن لوگوں کے لیے ہے ۵۸- ۲۹۱- ۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹

__ اجر کبیر کن لوگوں کے لیے ہے ۴۶

__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے ۵۸-۵۹

احکام القرآن

__ ۱۵- ۱۸- ۲۶- ۲۹- ۳۰- ۳۲- ۳۳- ۸۱- ۸۷- ۹۰ تا ۹۲- ۱۰۰- ۱۱۹- ۱۲۶- ۱۲۹- ۱۳۳- ۱۳۴- ۱۴۲- ۱۹۲- ۱۹۶- ۱۹۷- ۲۰۲- ۲۵۴- ۲۵۵- ۲۸۰- ۲۹۱- ۳۱۰- ۳۱۳- ۳۲۲- ۳۳۱- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۵۱- ۳۷۳- ۳۷۸- ۳۸۷- ۳۸۸- ۴۱۳- ۴۴۹- ۴۷۷- ۴۸۱- ۵۰۳- ۵۱۶

آخرت

__ اس کے بارے میں قرآن کے استدلال کا بنیادی اصول ۵۲

__ عقیدہ آخرت کی اہمیت ۲۲۱

__ اس کے امکان کے دلائل ۱۶۴- ۱۷۷- ۱۷۸- ۲۱۲ تا ۲۱۴- ۲۴۳ تا ۲۴۹- ۲۶۴- ۲۶۵

__ اس کے وجوب کے دلائل ۴۸- ۴۹- ۵۲- ۵۳- ۱۶۲ تا ۱۶۴- ۱۷۶- ۱۷۷- ۱۸۹- ۲۰۷- ۲۰۸- ۲۱۲ تا ۲۱۴- ۲۲۱- ۲۲۲- ۲۳۶- ۲۳۷- ۲۸۸- ۳۲۱- ۳۲۲- ۳۲۴- ۳۲۶ تا ۳۲۸

__ آخرت کے وقوع، وجوب اور امکان پر ہواؤں کے نظام سے استدلال ۲۰۶- ۲۰۹ تا ۲۱۱- ۵۸۰- ۵۸۲

__ آخرت پر تاریخی استدلال ۲۱۲- ۳۲۴- ۳۲۸ تا ۳۳۰

__ آخرت پر اخلاقی استدلال ۷۲- ۴۲۸- ۴۲۹ تا ۴۳۱

__ آخرت پر آفاقی استدلال ۳۸- ۴۱ تا ۴۴- ۳۲۴- ۳۲۶ تا ۳۲۸- ۵۸۰ تا ۵۸۲

__ آخرت کو ہنسی مذاق سمجھنے والوں کو قرآن کا جواب ۳۰۵- ۳۰۶

__ موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی کیوں مقدر کی گئی ہے ۷۱- ۷۵ تا ۷۸

__ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ مرنے والوں کو دوبارہ زندگی عطا فرمائے ۱۷۷- ۱۷۸- ۲۲۹- ۳۰۴

__ آخرت کا انکار کرنے والے خود انسانیت کے انجام کے بارے میں کسی نظریے پر متفق نہیں ہیں ۲۲۴- ۲۲۵

__ انسان کی سرکشی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حضور پیش ہونے سے مبرا سمجھتا ہے ۳۹۷

__ آخرت کے آنے کی تاریخ پوچھنے والوں کو جواب ۵۲- ۲۴۷- ۲۴۸

__ آخرت ایک حقیقت ہے جو ضرور پیش آنی ہے ۷۰- ۷۲

__ خوف آخرت مومن کی لازمی صفت ہے ۹۱- ۱۹۶- ۱۹۷- ۲۴۷

— خوف آخرت رکھنے والوں کا انجام نیک ۷۵-۷۶-۷۷-۲۲۲-۳۳۰-۳۳۱

— خوف آخرت کا فقدان گمراہی کی جڑ ہے ۱۴۱-۱۵۵-۱۵۶-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۹۰

— منکر آخرت قوموں کا انجام ۷۰-۷۲ تا ۷۴-۲۴۰ تا ۲۴۳

— منکر آخرت قومیں ہمیشہ اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئیں ۲۷

— منکرین آخرت قیامت کو دور سمجھتے ہیں لیکن اللہ اسے قریب دیکھ رہا ہے ۸۷-۸۸

— منکرین آخرت کے اعتراض کا جواب کہ مرے ہوئے لوگوں کی کھوکھلی اور بوسیدہ ہڈیوں کو کیسے جمع کیا جائے گا ۱۶۴-۱۶۵-۲۴۰-۲۴۳ تا ۲۴۶

— اللہ تعالیٰ انسان کی انگلیوں کی پور پور کو دوبارہ بنا دینے پر قادر ہے ۱۶۵

— منکرین آخرت قیامت کے روز بھاگ کر کہیں پناہ لینے کی جگہ ڈھونڈتے پھریں گے اور نہ پائیں گے ۱۶۶

— انکار آخرت کرنے والوں کو تنبیہ کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جتنے چاہو مزے کرلو حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو اور تمھارے لیے تباہی ہے ۲۱۶-۲۱۷

— منکرین آخرت حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے مگر اللہ نے ان کے ایک ایک کرتوت کو گن گن کر لکھ رکھا ہے اور جہنم ان کی گھات میں ہے ۲۲۲-۲۲۹-۲۳۰

— منکرین آخرت کو تنبیہ کہ آخرت کا آنا برحق ہے، اسے دور نہ سمجھو اور جو انکار کرے گا اس کا سارا کیا دھرا جلدی ہی اس کے سامنے آجائے گا ۲۲۳-۲۳۲-۲۳۳

— آخرت میں منکرین تمنا کریں گے کہ وہ دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتے یا مر کر مٹی میں مل گئے ہوتے اور دوبارہ زندہ ہونے کی نوبت نہ آتی ۲۳۲-۲۳۳

— انکار آخرت کے جواب میں یہ استدلال کہ تمھاری دوبارہ تخلیق زیادہ مشکل ہے یا کائنات کی تخلیق؟ جس خدا نے یہ کائنات بنائی ہے وہ تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے پر کیوں قادر نہیں ہوسکتا؟ ۲۴۴-۲۴۵

— منکرین آخرت دنیا میں اپنے قیام کو ایک دن کے اگلے یا پچھلے پہر سے زیادہ نہ سمجھیں گے ۲۴۸

— منکرین آخرت سمجھتے ہیں کہ اللہ کی طرف پلٹنا نہیں ہے، حالانکہ ان کا رب ان کے سارے کرتوت دیکھ رہا ہے ۲۹۰-۲۹۱

— قیامت کے روز منکرین آخرت کی حیرانی ۴۲۰-۴۲۱

— منکرین آخرت کے چہرے قیامت کے روز بگڑ جائیں گے ۵۲-۵۳

— آخرت کا انکار کیا سیرت و کردار پیدا کرتا ہے ۴۸۱ تا ۴۸۶

— منکرین آخرت کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ حقیقت کیا ہے ۲۲۴-۲۲۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— آخرت کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو حد سے گزر جانے والا اور بدعمل ہو ۲۸۱
— منکرین آخرت کی گمراہی کے وجوہ ۱۶۵-۱۷۱-۱۷۲
— انکار آخرت کرنے والوں کے لیے تباہی اور انجام بد ۱۵۴- ۲۱۱- ۲۱۲- ۲۱۳- ۲۱۵- ۲۱۶-۲۱۷-۲۳۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۹۰
— انسان کو احساس ہو یا نہ ہو لیکن وہ کشاں کشاں اس منزل کی طرف چار و ناچار چلا جا رہا ہے جہاں اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے ۲۸۶- ۲۸۷- ۲۸۸ تا ۲۹۱-۳۰۲- ۳۰۳ تا ۳۰۵
— آخرت میں کوئی معذرت قبول نہ ہوگی اور ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسا کسی کا عمل ہوگا ۳۰
— دنیا و آخرت دونوں کا مالک اللہ ہے، انسان جس چیز کا طالب ہو، اللہ ہی اس کا دینے والا ہے ۳۵۹-۳۶۴-۳۶۵
— دنیا پرستوں کی غلط فہمی کہ جو یہاں مزے کر رہا ہے وہ آخرت میں بھی اللہ کا مقبول ہوگا ۵۷- ۶۴-۶۵-۹۲-۹۳
— ان کی یہ غلط فہمی ہر لحاظ سے بے بنیاد ہے ۵۷-۶۴-۶۵
— آخرت میں فرماں برداروں کا انجام مجرمین جیسا نہیں ہوسکتا ۶۴
— آخرت میں نہ مال و دولت کام آئے گی نہ حجت بازیاں اور نہ دنیوی اقتدار ۷۷
— وہاں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر ان کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا ۸۴- ۸۹ تا ۹۲- ۲۳۷- ۲۴۷
— وہاں کے لیے جو کچھ کسی نے کما کر آگے بھیج دیا وہی اس کا اصل اور بہتر سرمایہ ہے اور اسی کا بڑا اجر ہے ۱۳۴- ۱۳۵- ۳۱۵- ۳۱۶
— مجرمین وہاں پچھتائیں گے کہ کاش انھوں نے اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا ۳۳۲
— میدان حشر میں حساب کتاب کے وقت مجرمین ڈھٹائی کے ساتھ ہر طرح کے عذر پیش کریں گے ۲۱۵-۲۱۶
— وہاں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کن کن طریقوں سے شہادتیں پیش کی جائیں گی ۴۲۲- ۴۲۳- ۴۳۱- ۴۳۳
— اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت کے جو آثار ساری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں وہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے، پھر آخر انسان ہی کا وجود کیسے بے مقصد ہوسکتا ہے کہ وہ جزا و سزا سے مبرا ہو۔ ۲۴۴ تا ۲۴۶ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جزا و سزا'')
— مجرمین وہاں تمنا کریں گے کہ کاش دنیا کی موت ہی فیصلہ کن ہوتی ۶۷- ۷۷- ۲۳۲- ۲۳۳
— وہاں مجرمین خود اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے ۴۴ تا ۴۶
— کفار و منافقین وہاں اللہ کو سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کرسکیں گے ۶۵- ۳۲۶ تا ۳۲۸
— عذاب آخرت کن لوگوں کے لیے ہے ۸۶-

۲۸۱-۲۸۲

__ آخرت کا عذاب دنیوی عذابوں سے شدید تر ہوگا ۶۳-۳۳۳ (مزید دیکھو "عذاب")

__ آخرت میں مومنین کی دعا ۳۲-۳۳ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "حشر" اور "قیامت")

اخلاقی تعلیمات

__ قرآن کا فلسفہ اخلاق ۳۹- ۴۶- ۴۷- ۲۱۲- ۲۲۰- ۲۷۸- ۲۷۹- ۲۸۰- ۲۸۱- ۳۴۱-۳۴۳-۳۴۶

__ قرآن کے فلسفہ اخلاق پر نفس انسانی سے استدلال ۳۵۰ تا ۳۵۵

__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ۵۸ تا ۶۰-۴۸۲-۴۸۳-۵۵۵

__ آپؐ کا پاکیزہ اخلاق جس کی گواہی حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ نے دی ۵۹-۶۰-۳۹۳-۳۹۴

__ اعلان نبوت کا حکم دینے کے ساتھ آپؐ کو کن اخلاقی خوبیوں کی تعلیم دی گئی ۱۴۲ تا ۱۴۶

__ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بلند اخلاق ۳۶۵

__ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ان کے اہل خانہ کا عظیم اخلاق ۱۸۰ تا ۱۸۲

__ پسندیدہ اخلاقی صفات ۲۶- ۲۸- ۲۹- ۴۶- ۷۵- ۹۰ تا ۹۲- ۱۲۹- ۱۴۲ تا ۱۴۵- ۱۹۰- ۱۹۶- ۱۹۷- ۲۴۷- ۳۱۵- ۳۳۳- ۳۴۱ تا ۳۴۶- ۳۵۱- ۳۶۰- ۳۶۴- ۳۷۳- ۴۱۳- ۴۴۹ تا ۴۵۴

__ ناپسندیدہ اخلاقی صفات ۲۱- ۲۲- ۵۱- ۶۰- ۶۱- ۶۲- ۷۶- ۷۷- ۱۵۳- ۱۵۴- ۱۷۵- ۱۷۶- ۲۴۱ تا ۲۴۳- ۲۴۷- ۲۶۴- ۲۷۴- ۲۸۰- ۲۹۰- ۲۹۵- ۲۹۹- ۳۱۵- ۳۳۰- ۳۳۱- ۳۳۸- ۳۴۰- ۳۴۱- ۳۵۱- ۳۶۲- ۳۶۳- ۳۹۷- ۳۹۸- ۴۲۹- ۴۳۰- ۴۴۲- ۴۴۳-۴۵۸-۴۸۱-۵۶۳-۵۷۰

__ متضاد اخلاقی صفات کا مقابلہ ۳۵۸- ۳۵۹- ۳۶۰ تا ۳۶۳

__ اخلاقی بلندیوں کی دشوار گزار گھاٹیاں جن کو نظرانداز کر کے انسان گمراہی کی گہرائیوں میں لڑھکنا پسند کرتا ہے ۳۳۷- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۴۶

__ پسندیدہ اخلاقی صفات پیدا کرنا کس لحاظ سے دشوار گزار گھاٹی ہے اور کس لحاظ سے آسان سیدھا راستہ؟ ۳۶۲

__ اخلاق کی پسندیدہ صفات اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ آسان راستے کی اور ناپسندیدہ صفات اختیار کرنے والوں کو مشکل راستے کی سہولت دیتا ہے ۳۶۰ تا ۳۶۳

__ انسان جب اپنے جسم اور ذہن کی قوتوں کو برائی کی راہ میں لگاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے گراتے گراتے اس اخلاقی گراوٹ تک پہنچا دیتا ہے جہاں کوئی دوسری مخلوق اس سے زیادہ گری ہوئی نہیں ہوتی ۳۸۷ تا ۳۸۹

__ انسانی معاشرے میں اخلاقی بلندی اور گراوٹ کی واضح مثالیں ۳۸۷ تا ۳۸۹

__ انسانی معاشرے کی اخلاقی حالت پر قرآن کا تبصرہ ۳۲۵- ۳۳۰ تا ۳۳۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— اخلاق اور قانون مکافات کا لازمی تعلق ۱۸۹
— انسانوں کی سعی و عمل جس طرح اپنی اخلاقی نوعیت میں مختلف ہے اس طرح نتائج کے لحاظ سے بھی مختلف ہے ۳۵۸-۳۶۰ تا ۳۶۳
— محض دکھاوے یا نمایش کی خاطر جو نیکی بھی کی جائے وہ کسی کام کی نہیں ہے ۳۴۰
— حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳-۵۷۰
— جو کسی پر احسان دھرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرے گا اللہ ضرور اس سے خوش ہوگا ۱۴۲-۱۴۵-۱۹۶-۱۹۷-۳۶۴-۳۶۵
— عرب معاشرے کی بعض اخلاقی برائیوں کی مذمت ۳۳۰ تا ۳۳۳-۴۵۶-۴۵۸-۴۵۹-۴۸۲
— زیادہ قسمیں کھانے والا گھٹیا آدمی ہوتا ہے ۶۰-۶۱
— ان شاء اللہ کہے بغیر آدمی کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فلاں کام کرے گا ۶۲
— ہر کام شروع کرنے سے پہلے اللہ کی بڑائی بیان کرنے کی اہمیت ۱۴۳-۳۹۶
— امانتوں کی حفاظت اور عہد و پیمان کا پاس مومنانہ صفت ہے ۹۱-۹۲
— منہ در منہ طعن اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے والوں کی مذمت ۴۵۸
— ریاکاری کی مذمت ۴۸۱-۴۸۵
— بخل تھڑدلے انسانوں کی صفت ہے ۹۰
— مال کو سینت سینت کر رکھنے کی مذمت ۳۶۲-۳۶۳-۴۵۸-۴۵۹
— ناپ تول میں بددیانتی کی مذمت ۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱
— روز مرہ ضروریات کی چیزیں ایک دوسرے کو عاریتاً دینے میں بخل کرنا بڑی ذلیل حرکت ہے ۴۸۱-۴۸۵-۴۸۶
— وسوسہ عمل شر کا نقطہ آغاز ہے، اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۷۱ تا ۵۷۴

آزمایش

— انسان کو آزمایش کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۱۸۶-۱۸۷
— انسان کی آزمایش کس طرح ہو رہی ہے ۴۱-۴۲-۵۶-۶۱ تا ۶۳-۴۴۳ تا ۴۴۵
— مومنین کی آزمایش کس طرح ہو رہی ہے ۱۱۸-۱۱۹-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴
— کمزور ایمان والوں کو سچے مومنین سے الگ کرنے کے لیے اللہ انھیں کس طرح آزماتا ہے ۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱
— ہر آزمایش میں ثابت قدمی ایمان میں اضافے کی موجب ہوتی ہے ۱۵۰-۱۵۱
— مال داری ہو یا مفلسی، دونوں اللہ کی طرف سے آزمایش ہیں ۳۳۰-۳۳۱
(مزید دیکھو ''امتحان'')

ازواج مطہرات

— ان کا عظیم ذمہ دارانہ منصب ۲۱-۲۲-۲۷-۲۸
— ان کا بعض غلطیوں پر ٹوکا جانا ۲۱-۲۲ تا ۲۹

اسلام

— جنھوں نے اسلام کا راستہ اختیار کیا انھوں نے نجات کی راہ پالی ۱۱۸
— اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا اصل الاصول ۴۶-۴۷ (مزید دیکھو "اخلاقی تعلیمات)
— دین اسلام کس مقام سے دوسرے مذاہب سے علیحدگی اختیار کرتا ہے ۵۰۶
— اسلام میں مذہبی رواداری کی حدود ۵۰۱-۵۰۲-۵۰۸-۵۰۹
— اسلام قبول کرنا اور پاکیزگی اختیار کرنا (تزکی) ہم معنی ہیں ۲۴۱-۲۴۲-۳۱۵
— دعوت اسلام ایک نصیحت ہے جو چاہے قبول کر لے ۲۰۳
— اسلام میں کلمہ "اللہ اکبر" کی اہمیت ۱۴۳
— اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت ۵۵۷ تا ۵۶۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو "جادو" اور "جھاڑ پھونک)

اسلامی ریاست

— اطاعت ریاست کے حدود ۲۰۲
— حاکموں کی صفات ۲۰۲
— قیدیوں سے ناروا سلوک جسے اسلامی حکومت میں ممنوع قرار دیا گیا ۱۸۱-۱۹۷

اسلامی معاشرہ

— قرآن کا فلسفہ معاشرت ۳۴۳-۳۴۴-۴۵۳
— اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیات ۳۴۳ تا ۳۴۶-۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— معاشرے میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا خسران سے بچاؤ کا موجب ہے ۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— معاشرے کی اصلاح کے لیے اسلام کا پروگرام ۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— اسلام میں صحابہ کرامؓ کا صحیح مقام ۱۰ تا ۱۳-۵۵۲
— معاشرے میں یتیم، مسکین اور غلاموں کے حقوق ۳۴۱ تا ۳۴۳ (مزید دیکھو "حقوق العباد")
— ایک خاندان میں سربراہ خاندان کی حیثیت ۲۹-۳۰
— اسلام نے بیٹیوں کی پرورش و تربیت کا کیا عظیم تصور پیش کیا ہے ۲۶۶-۲۶۷
— اپنے گھر میں مگن ہو کر نہیں بلکہ گھر والوں میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنا مومنانہ صفت ہے ۲۹۰
— ناپ تول میں کمی بیشی کی ممانعت ہے ۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱
— روز مرہ ضرورت کی چیزیں ایک دوسرے کو عاریتاً دینے سے انکار ذلیل اخلاقی حرکت ہے ۴۸۱-۴۸۵-۴۸۶
— اسلامی معاشرے میں طہارت و پاکیزگی کی بنیادی اہمیت ۱۴۴-۱۴۵

Maktaba Tul Ishaat.com

— مومنین کو شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم ۹۱
— لونڈیوں سے بربنائے ملکیت تمتع کی اجازت ۹۱

اسلامی نظم جماعت

— مومنین کو کفار و منافقین سے کیا سلوک روا رکھنا چاہیے ۳۳

آسمان

— آسمان کی تخلیق و تدبیر میں اللہ کی قدرت کے کرشمے ۴۲- ۴۳- ۱۰۲- ۱۰۳- ۲۲۶- ۲۲۷-۲۴۳-۲۴۴-۲۵۸-۲۵۹
— آسمان بمعنی پورا عالم بالا ۲۴۳
— سات مضبوط آسمان پیدا کیے گئے ۲۲۶
— یہ بحث کہ زمین کی تخلیق پہلے ہوئی تھی یا آسمان کی؟ ۲۴۴- ۲۴۵
— آسمان کی چھت اونچی اٹھائی گئی اور توازن قائم کیا گیا ۲۴۴
— ہمارے قریب کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا گیا ۴۳
— یہ چراغ شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ کس معنی میں بنائے گئے ہیں؟ ۴۳-۴۴
— چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا گیا ہے ۱۰۲- ۲۲۶- ۲۲۷
— زمین پر گرنے والے شہابوں کی حقیقت ۴۳- ۴۴
— آسمانوں سے بارش برسائی گئی جس نے زمین سے طرح طرح کی خوراکیں اگائیں ۲۵۸- ۲۵۹
— آسمان کی حالت قیامت کے روز ۴۷- ۸۸-۸۹-۱۳۱-۲۱۱-۲۷۳-۲۸۸
— قیامت کے روز سورج لپیٹ دیا جائے گا ۲۶۳
— ستارے ماند پڑ کر بکھر جائیں گے ۲۱۱- ۲۶۳-۲۷۳
— قیامت میں آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا ۲۶۷- ۲۶۸ (مزید دیکھو ''قیامت'')
— رات اور دن کو آسمان کی طرف منسوب کرنے کا مطلب ۲۴۴
— اللہ کے آسمان میں ہونے کا مطلب ۴۸- ۴۹
— مختلف حقیقتوں پر آسمان کی قسم ۲۹۵- ۳۰۵- ۳۵۰

اصحاب الاخدود

— اہل ایمان کے گروہ جن کو ان کی مجرم قوموں نے زندہ جلا دیا کیونکہ وہ مومن تھے ۲۹۴- ۲۹۵ تا ۲۹۸
— ان کے متعلق تاریخی تشریحات ۲۹۷- ۲۹۸

اصحاب الفیل

— قصہ اصحاب الفیل ۴۶۳ تا ۴۷۲
— روم کی عیسائی سلطنت ہمیشہ سے عرب کی تجارت پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھی ۴۶۲
— اسی مقصد کے لیے سلطنت روم نے یمن پر حبش کی عیسائی حکومت کا تسلط قائم کرایا ۴۶۲

— کعبہ کو ڈھانے کے لیے ابرہہ کا حملہ محض مذہبی جذبے کے تحت نہ تھا بلکہ معاشی اور سیاسی مقاصد بھی اس کے محرک تھے ۴۶۲-۴۶۳-۴۷۰-۴۷۱

— ابرہہ نے مکہ پر حملے کا کیا بہانہ بنایا ۴۶۴

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی ابرہہ سے ملاقات ۴۶۵

— اصحاب الفیل کا انجام ۴۶۷-۴۶۸-۴۷۰

— کیا حملہ آوروں کو عربوں نے پتھر مار مار کر ہلاک کیا تھا اور پرندے صرف لاشیں کھانے آئے تھے؟ ۴۷۱-۴۷۲

— اس واقعہ کا عربوں کی اعتقادی حالت پر اثر ۴۶۸

— قرآن نے یہ واقعہ کس غرض سے بیان فرمایا ہے ۴۶۹

— اس واقعہ کے پچاس دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۴۶۹

اصحاب المشئمہ

— کون ہیں اور ان کا انجام بد ۳۴۶

اصحاب المیمنہ

— ان کی صفات ۳۴۱ تا ۳۴۶

اصول فقہ

— کیا محض تحریم ہی قسم کی ہم معنی ہے؟ ۱۸-۱۹

— بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے اور بیوی کے سوا دوسری چیزوں کو حرام کر لینے میں فقہاء کے نزدیک کیا فرق ہے؟ ۱۹-۲۰

— نذر کے معاملے میں فقہی احکام ۱۹۰ تا ۱۹۷

— مختلف مذاہب کے افراد کے درمیان وراثت کا مسئلہ ۵۰۸-۵۰۹

— فقہاء کس طرح قرآن کی تشریح کرتے ہیں ۱۸ تا ۲۰- ۱۹۱- ۱۹۲- ۱۹۴- ۱۹۵- ۱۹۶- ۱۹۷- ۳۴۳- ۵۰۸- ۵۰۹

— فقہاء کے درمیان اختلاف کی نوعیت ۱۸- ۱۹- ۲۰- ۱۹۴

— فقہاء کے درمیان اختلاف کے اسباب ۱۹۵

اقامت دین

— دیکھو ''دعوت حق''

اقسام القرآن

— مختلف حقیقتوں پر مختلف چیزوں کی قسمیں ۵۸- ۷۸- ۹۳- ۱۵۲- ۱۵۳- ۱۶۲- ۲۰۹- ۲۳۸- ۲۶۸- ۲۹۱- ۲۹۵- ۳۰۳- ۳۰۵- ۳۲۶- ۳۳۸- ۳۵۰- ۳۵۱- ۳۶۰- ۳۷۱- ۳۸۶- ۴۲۹- ۴۴۹

— قرآن میں قسمیں کس غرض کے کے لیے کھائی گئی ہیں ۵۸- ۷۹- ۸۰- ۹۴- ۱۶۲ تا ۱۶۴- ۲۱۰- ۲۱۱- ۲۳۶- ۲۳۸- ۲۳۹- ۲۶۸- ۲۹۱- ۲۹۵- ۲۹۶- ۳۰۳- ۳۰۶- ۳۲۷- ۳۲۸- ۳۳۹- ۳۵۳- ۳۵۴- ۳۶۰- ۳۷۱- ۳۸۷- ۴۳۰- ۴۴۹- ۴۵۰

— یہ قسمیں کس معنی میں کھائی گئی ہیں ۳۸۶- ۴۴۹

اللہ

Maktaba Tul Ishaat.com

— قرآن میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے ۵۷۱
— اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے ۱۲۹
— اللہ تمام انسانوں کا الٰہ ہے ۵۷۱

اللہ

— اللہ کے اسمائے گرامی کا احترام ۳۱۰
— قرآن میں بعض مقامات پر اللہ کے اسم ذات کے بجائے اسم صفت استعمال کرنے کی حکمت ۵۶۷-۵۷۱
— احکم الحاکمین ۳۸۸
— ملک الناس ۵۷۱
— رب العالمین ۷۹-۲۸۰
— رب الناس ۵۷۱
— الٰہ الناس ۵۷۱
— غفور ۱۵-۴۲-۱۳۵-۲۹۹
— رحیم - ۱۵-۵۳-۱۳۵
— رحمٰن ۴۲-۵۰-۲۳۱
— غفار ۱۰۰
— علیم ۱۸-۲۱-۴۶-۲۰۳
— حکیم ۱۸-۲۰۳
— خبیر ۲۱-۴۷
— قدیر ۳۲-۴۱
— عزیز ۴۲-۲۹۹
— بصیر ۵۰
— مجید ۲۹۹
— ودود ۲۹۹
— لطیف ۴۷
— حمید ۲۹۹
— تواب ۵۱۶
— احد ۵۳۵-۵۳۶ تا ۵۳۸-۵۳۹
— صمد ۵۳۵-۵۳۸ تا ۵۴۰
— اللہ کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر قرآن میں ہر جگہ سیاق و سباق کی مناسبت سے کیا گیا ہے ۱۷-۲۰-۲۱-۴۱-۴۲-۴۷-۴۸-۵۰-۳۰۰-۳۹۰-۵۳۶ تا ۵۳۸-۵۳۸ تا ۵۴۰
— وہ بزرگ و برتر ہے ۴۱-۲۹۹-۳۱۰-۳۶۴
— بہت اچھی قدرت رکھنے والا ہے ۲۱۲
— بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ۵۱۶
— وہ محض خالق ہی نہیں ھادی بھی ہے ۱۸۶-۱۸۸-۳۱۰ تا ۳۱۲-۳۴۱
— وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور پوشیدہ کو بھی ۳۱۳-۳۱۴
— وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے ۲۹۹
— اس جیسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا ۳۳۲
— دنیا و آخرت کا مالک وہی ہے ۳۶۴-۳۶۵
— زندگی اور موت وہی دینے والا ہے ۴۱
— وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں ۵۳۵
— کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے ۵۳۵-۵۴۳
— اسے اپنے کسی فعل کے نتائج کا خوف نہیں ہے ۳۵۶
— اس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں ۲۳۱-۲۳۲

—— وہ جو چاہے کر ڈالنے والا ہے ۲۹۹-۳۰۰
—— اس سے کوئی بازی لے جانے والا نہیں ۹۴
—— اس کے مقابلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا ۴۹-۵۰-۵۱-۵۳-۱۰۵
—— وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر جس رسول کو مطلع کرتا ہے اس کی نگرانی کا زبردست انتظام کرتا ہے ۱۲۱-۱۲۲ (نیز دیکھو ''غیب'')
—— وہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہتا ہے ۱۳۱
—— اسی کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے ۱۴۱
—— وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، کوئی اسے عاجز کرنے والا نہیں ہے ۱۴۱
—— اس نے کائنات کی ہر چیز کو بالکل راست، درست اور متوازن پیدا کیا ہے ۳۱۰-۳۱۱
—— وہ عروج کے زینوں کا مالک ہے ۸۶
—— وہ مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے ۹۳-۹۴-۱۲۹
—— وہ عرش کا مالک ہے ۲۹۹
—— وہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے ۱۳۲
—— اس کے آسمان میں ہونے کا مطلب ۴۸-۴۹
—— ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ۸۶-۸۷
—— اس کے دنوں کی مقدار ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار برس ہے ۸۶ تا ۸۸
—— اس کے کائناتی منصوبے لاکھوں کروڑوں اور اربوں سال کے ہوتے ہیں ۸۷
—— اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر فرمائی ۲۵۶-۲۵۷-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲
—— اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب چاہے وہ انسان کی شکل بدل کر رکھ دے ۲۰۳
—— اس کی تخلیقات میں کسی قسم کی بے ربطی نہیں ہے ۳۸-۴۲-۴۳
—— وہ انسان کی انگلیوں کی پور پور دوبارہ بنا دینے پر قادر ہے ۱۶۵
—— اس کی ایک جھڑکی حشر برپا کر دینے کے لیے کافی ہے ۲۴۰
—— وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا ۱۷۷-۱۷۸-۲۹۹
—— وہی جانتا ہے کہ قیامت کب برپا ہوگی ۵۲
—— قیامت کے روز اسی کے ہاتھ میں فیصلے کا اختیار ہوگا ۲۷۵
—— اس سے انسان کی کوئی حرکت کیسے چھپ سکتی ہے، جب کہ وہی انسان کا خالق ہے ۴۷-۴۸
—— اس کے لیے یکساں ہے خواہ چپکے سے بات کی جائے یا اونچی آواز سے ۴۶-۴۷
—— وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے ۴۶-۴۷
—— وہ جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے اور کون گمراہ ۶۰
—— وہ جس کو ہدایت دیتا ہے اپنے علم و حکمت کی بنا پر دیتا ہے ۲۰۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— کسی مخلوق کو اس نے شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے ۵۶۷
— وہ زمین پر بسنے والے ہر جان دار کا نگہبان ہے ۳۰۳
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات (دیکھو ''انسان'')
— اس کی نعمتوں کا حق دار کون ہے ۱۰۱-۱۰۲
— اس کے بندے تو نیک اور متقی لوگ ہیں ۱۹۰-۱۹۱
— اس پر ایمان لا کر اس کی ذات پر بھروسہ کرنے والے ہی اس کے رحم کے مستحق ہیں ۵۳-۵۴
— اس کی مخلوقات میں سے بہترین خلائق کون ہیں اور بدترین خلائق کون ۴۱۵-۴۱۶
— اس کے گھات میں لگے ہونے کا مطلب ۳۲۹-۳۳۰
— اس کی چال بڑی زبردست ہے اور اس کے مقابلے پر کوئی چال نہیں چل سکتا ۶۶-۲۱۶
— نبی تک کو اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا ۱۱۹-۱۲۰
— اس کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۱۵۲
— اس کے لیے کسی وقار کی توقع نہ رکھنے کا مطلب ۱۰۱-۱۰۲
— اس کی شان میں گستاخیاں اور اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامیاں کرنے والوں کو تنبیہ ۱۰۱ تا ۱۰۳
— اس کی پکڑ بڑی شدید ہے ۲۹۹
— وہ اپنا رزق روک لے تو کوئی رزق نہیں دے سکتا ۵۰-۵۱
— وہ کنوؤں کا پانی زمین میں غائب کر دے تو اس کے سوا کوئی اسے واپس نہیں لا سکتا ۴۰-۵۴
— وہ بہار لانے والا ہی نہیں خزاں لانے والا بھی ہے ۳۱۰-۳۱۲
— اس نے نباتات اگائیں اور پھر انھیں سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا ۳۱۰-۳۱۲
— وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولیٰ ہے ۱۸-۲۵
— اسی کو وکیل بنا لینے کی تلقین ۱۲۹
— اس کی پناہ مانگنے کا مفہوم ۵۶۳ تا ۵۶۶ (مزید دیکھو ''شر'')
— اس سے تقویٰ کرنے کا حکم اور اس کا مطلب ۹۸
— اللہ کا ہی یہ حق ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے ۱۵۶
— اس کی اطاعت کا وسیع مفہوم ۲۱۷
— اس کی شان اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے کہ کوئی اس کا بیٹا یا بیٹی ہو ۱۱۴
— وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ۵۳۵-۵۴۰ تا ۵۴۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں اللہ کے متعلق کیا متضاد تصورات پائے

جاتے تھے ۵۳۲

— اللہ کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کے تصورات کا موازنہ ۵۰۶

— قریش کا رسول اللہؐ سے سوال کہ آپ کے رب کا نسب کیا ہے ۵۳۰ تا ۵۳۲- ۵۳۵ تا ۵۴۳

— اپنے مکرم بندوں کو اللہ اپنا دیدار نصیب فرمائے گا ۱۷۱ تا ۱۷۴

— مختلف حقیقتوں پر اللہ کی ذات کی قسم ۳۵۰-۳۵۱-۳۶۰

(مزید دیکھو ''اقسام القرآن'')

— اللہ کے نام کی تسبیح کرنے کا وسیع مفہوم ۳۱۰

— اللہ کو اچھا قرض دینے کا مطلب ۱۳۴

— اس سے بالغیب ڈرنے کے نتائج ۴۶-۴۷

— یہ اسی کو زیب دیتا ہے کہ گناہوں سے درگزر فرمائے ۱۵۶

الہام

— لفظ الہام کے معنی ۳۵۲

— اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی حیثیت اور نوعیت کے اعتبار سے فطری الہام کر دیا ہے ۳۵۲-۳۵۳

— انسان کے لاشعور میں فطری الہام کے ذریعے نیکی اور بدی کا تصور ڈال دیا گیا ہے ۳۴۸-۳۵۱ تا ۳۵۳

— نفس انسانی پر بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کرنے کا مطلب ۳۵۲-۳۵۳

امتحان

— انسان دنیا میں امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۴۱

— دنیا کی زندگی وہ مدت ہے جو امتحان کے لیے مقرر کی گئی ہے، جو وقت گزر رہا ہے مدت امتحان کو کم کرتا جا رہا ہے اور موت امتحان کے خاتمے کا اعلان ہے ۴۱-۴۲-۱۸۶-۱۸۷-۴۴۹-۴۵۰

— امتحان کے لیے انسان کو عمل کا موقع دیا گیا ہے ۴۱-۴۲

— امتحان میں جیسا کسی کا عمل ہوگا ویسی ہی اس کو جزا و سزا ملے گی ۴۱-۴۲

— انسان کا امتحان کس طرح لیا جا رہا ہے؟ ۴۵-۱۸۳

— اس امتحان کے لیے انسان کو ضروری ذرائع اور قوتیں دی گئی ہیں جن سے وہ علم حاصل کرتا اور نتائج اخذ کرتا ہے ۱۸۶-۱۸۷

— شکر اور بھلائی اور کفر اور برائی کے راستے بھی انسان کے لیے الگ الگ ممیز کر دیے گئے ہیں ۱۸۶- ۱۸۸ تا ۱۹۰- ۳۳۷- ۳۴۰- ۳۴۱-۳۶۴-۳۶۵

— انسان کو مقرر تقدیر کے ساتھ پیدا کیا گیا اور دو مختلف نوعیت کی ہدایتیں بھی دی گئیں ۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آزمائش'' اور 'تقدیر'')

امثال القرآن

— قیامت کی سخت افتاد پڑنے پر لوگوں کے ہوش

Maktaba Tul Ishaat.com

گم کردینے کی مثال ۲۶۳-۲۶۴
— قیامت کے روز انسانوں کی گھبراہٹ اور پراگندگی کی مثال ۴۳۵-۴۳۶
— قیامت کے روز پہاڑوں کے اڑنے کی مثال ۴۳۵-۴۳۶
— کافروں کے معاملے میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی مثال ۳۳-۳۴
— اہل ایمان کے معاملے میں فرعون کی بیوی اور حضرت مریمؑ کی مثال ۳۴-۳۵
— جنتیوں کی شان کے لیے عظیم الشان سلطنت کے مالک کی مثال ۲۰۰
— ہدایت یافتہ اور گمراہ انسانوں کے فرق کی مثال ۵۱
— حق سے فرار کرنے والوں کی مثال ۱۵۵
— دنیا پرستوں کے لیے ایک باغ والوں کی مثال ۶۱ تا ۶۳

انبیاء-(دیکھو"نبوت")

انسان

— انسان کی تخلیق کے متعلق قرآن کا بیان ۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۷۶ تا ۱۷۸-۱۸۵-۱۸۶-۲۱۲-۲۱۳-۲۵۶-۲۷۴-۲۷۵-۳۰۳-۳۰۴-۳۹۶-۵۸۳-۵۸۴
— انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل ۱۷۷-۱۷۸-۲۵۶-۲۵۷
— انسانوں کی دو قسمیں ۳۸۴-۳۸۵-۳۸۷-۳۸۸
— انسانوں کو طرح طرح سے پیدا کرنے کا مطلب ۱۰۱-۱۰۲
— اس کو بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ دنیا کی زندگی میں اس کا امتحان لیا جارہا ہے ۴۱-۴۲
(نیز دیکھو "آزمایش" اور "امتحان")
— دنیا میں انسان کے بقا کا انحصار سراسر اللہ کے فضل پر ہے ۴۹
— انسان کو مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا اللہ کی قدرت و حکمت کا بہت بڑا نشان ہے ۱۷۶ تا ۱۷۸-۲۲۵-۲۲۶
— انسان کو اللہ نے نک سک سے درست کیا، متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا جوڑ کر تیار کردیا ۲۷۴-۲۷۵
— انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب ۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷
— جس اللہ نے انسان کو اس قدر پیچیدہ طریقے پر پہلی بار پیدا کیا وہ یقیناً دوبارہ بھی پیدا کرنے پر قادر ہے ۲۹۹-۳۰۴
— انسان کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے ۳۹-۴۸-۲۳۲-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۵ تا ۳۲۲-۳۹۷
— اللہ ہی نے انسانی نسل کو زمین پر پھیلایا ہے اور اسی کی طرف اسے سمیٹا جائے گا ۵۱-۵۲
— انسان کو زمین سے عجیب طرح اگایا گیا ہے، اسی میں اسے واپس کیا جاتا ہے اور پھر اسی سے اس کو نکال کھڑا کیا جائے گا ۱۰۲-۱۰۳
— انسان کو زمین سے اگانے کا مطلب ۱۰۲-۱۰۳

— انسانی عقل خود اخلاق اور قانون مکافات کے لازمی تعلق کا حکم لگاتی ہے ۱۸۹
— اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اس کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب چاہے وہ اس کی شکل بدل کر رکھ سکتا ہے ۲۰۳
— انسان کو خواہ اس کا شعور نہ ہو لیکن وہ کشاں کشاں اس منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے ۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸ تا ۲۹۱
— اس کی زندگی کے تغیرات موت کے ساتھ ہی ختم نہ ہو جائیں گے بلکہ آگے بھی جاری رہیں گے ۲۹۱
— اس کی سرکشی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حضور پیش ہونے سے مبرا سمجھتا ہے ۳۹۷
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ۴۳-۴۸ تا ۵۱-۱۰۲-۱۸۶ تا ۱۹۰-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۲-۲۱۳-۲۲۵ تا ۲۲۸-۲۴۴ تا ۲۴۶-۲۵۶ تا ۲۵۹-۲۷۴-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲
— ان احسانات کے تقاضے ۴۸
— اللہ کی نعمتوں کا صحیح حق دار کون ہے ۱۰۰-۱۰۱
— انسان پر اللہ کی نعمتیں لامحدود ہیں، ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا ۴۴۴-۴۴۵
— اس کو اللہ کی نعمتوں اور احسانات کا ذکر و اظہار کرنا چاہیے ۳۷۳-۳۷۴
— دنیا میں جو نعمتیں بھی اس کو حاصل ہیں وہ محض نعمتیں ہی نہیں بلکہ آزمائش کا سامان بھی ہیں ۴۴۳ تا ۴۴۵
— اس کو جو بہترین قوتیں ودیعت کی گئی ہیں ان کا صحیح مصرف کیا ہے ۵۱-۵۲
— اس کو صاحب علم ہی نہیں بنایا گیا بلکہ قلم کا استعمال سکھا کر اس کی علمی قابلیت کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی فراہم کیا گیا ہے ۳۹۶-۳۹۷ (مزید دیکھو "علم")
— نیند کو اس کے لیے باعث سکون بنایا گیا ۲۲۵-۲۲۶
— اس کے لیے زندگی کی راہ ہموار کر دی گئی ۲۵۶-۲۵۷
— کارگاہ دنیا میں اس کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش پر ہے ۳۳۶-۳۳۸-۳۳۹
— رب کریم کے کرم نے انسان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے اور وہ رب کے مقابلے پر جری ہو گیا ہے ۲۷۵-۲۷۶
— انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور اس حقیقت پر اس کا ضمیر گواہ ہے ۵۱-۵۲-۴۲۹-۴۳۰
— انسان نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا ۲۵۸
— انسان جنت کا مستحق اپنے مادہ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ اوصاف و اعمال کی بنا پر ہوگا ۹۳
— انسان کو جو نعمتیں حاصل ہیں ان کی جواب دہی مومن و کافر سب کو کرنی ہے ۴۴۳-۴۴۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ انسان کے اعمال سے ناواقف کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہی اس کا خالق ہے ۴۷-۴۸

— انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے خدا اس کی حرکات کو نہیں دیکھ رہا ہے ۳۴۰-۳۹۸

— انسانوں کی کوششیں اپنی اخلاقی نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے مختلف ہیں ۳۵۸-۳۶۰ تا ۳۶۳

— قیامت کے روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا ۱۶۶

— انسان اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی معذرتیں پیش کرے ۱۶۶-۱۶۷

— اس پر نگراں مقرر ہیں، یہ معزز کاتب ہیں جو اس کا ہر فعل ریکارڈ کر رہے ہیں ۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶

— انسان کو پیدا کیا گیا، اس کی تقدیر مقرر کی گئی اور دو مختلف نوعیتوں کی ہدایات دی گئیں ۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲

— اس کو کفر اور شکر کی راہیں دکھا دی گئی ہیں کہ جو راہ چاہے اختیار کرلے ۱۸۶-۱۸۸ تا ۱۹۰-۲۵۸

— اس کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر بھلائی اور برائی کے راستے ممیز کر دیے گئے ۳۳۷-۳۴۰-۳۴۱-۳۵۹-۳۶۴-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴

— انسان کے لاشعور میں فطری الہام کے ذریعے نیکی اور بدی کا احساس اور فرق و امتیاز رکھ دیا گیا ہے ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۵

— ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتوں کے ساتھ اخلاقی حس بھی دی گئی ہے جو فطری طور پر بھلائی اور برائی میں فرق کرتی ہے ۱۸۸

— ہر انسان کو ضمیر (نفس لوامہ) عطا کیا گیا ہے جو برائی پر ٹوکتا اور ملامت کرتا رہتا ہے ۱۸۸-۱۸۹

— اسے حقیقت سے باخبر کرنے کے لیے اس کی ذات میں داخلی اور ہر طرف بے شمار خارجی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں ۱۸۹

— حقیقت ہی کی طرف اس کی صحیح رہنمائی کے لیے انبیاء اور کتابیں بھیجی گئیں ۱۹۰

— اس کے انجام کا انحصار اس پر ہے کہ وہ نفس کے اچھے اور برے رجحانات میں سے کن کو ابھارتا ہے ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۳ تا ۳۵۵

— وہ پیدائشی گناہ گار نہیں بلکہ بے لوث فطرت پر پیدا کیا گیا ہے ۳۵۱-۳۶۰ تا ۳۶۳

— وہ کم ہمتی کی بنا پر اخلاق کی دشوار گزار بلندیوں کو چھوڑ کر گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں لڑھکنا پسند کرتا ہے ۳۳۷-۳۴۱-۳۴۳-۳۴۶

— جب وہ اپنے ذہن اور جسم کی قوتوں کو برائی کی راہ پر لگاتا ہے تو اللہ سے گراتے گراتے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے جہاں اس سے زیادہ نیچ کوئی مخلوق نہیں ہوتی ۳۸۷

تا ۳۸۹

— انسانی کمزوریاں ناقابل اصلاح نہیں ہیں، انھیں دور کیا جاسکتا ہے ۸۹ تا ۹۲

— انسان مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے ۴۳۰-۴۳۱

— وہ مال و دولت پا کر اور زیادہ نامراد ہو جاتا ہے ۱۰۳

— زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے کی دھن نے اسے اہم تر مقاصد سے غافل کردیا ہے اور یہی فکر قبر تک اس کے ساتھ جاتی ہے ۴۴۲-۴۴۳

— وہ تھڑدِلا پیدا کیا گیا ہے، مصیبت میں گھبرا جاتا ہے اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے ۸۹-۹۰

— دنیا کی خوش حالی و بدحالی کو وہ عزت و ذلت کا معیار سمجھتا ہے حالانکہ دونوں میں اس کی آزمائش ہے ۳۳۰-۳۳۱

— اس کی اس غلط فہمی کا ازالہ کہ اس کا مواخذہ کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے ۳۳۸-۳۴۰

— انسان کی حقیقت ہی کیا ہے جس کے بل پر وہ اتنا اکڑتا ہے ۲۵۶-۲۷۴-۲۷۵-۳۰۳-۳۰۴

— دنیا میں انسان کی اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت ۱۸۲-۱۸۳-۱۸۶-۱۸۷-

۳۳۸ تا ۳۴۰

— انسان کو ان پیش پا افتادہ حقیقتوں پر غور کرنے کی دعوت جن کو روز مرہ کے معمولات سمجھ کر وہ نظرانداز کردیتا ہے ۳۹-۴۸ تا ۵۱

— ہر انسان کی تقدیر اس کی پیدائش کے ساتھ مقرر کردی جاتی ہے ۲۵۶-۲۵۷-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲

— وہ اپنی پیدائش، تقدیر اور زندگی و موت کے معاملے میں اپنے خالق کے سامنے بے بس ہے ۲۵۶-۲۵۷

— انسان کو مشقت میں پیدا کرنے کا مطلب ۳۳۸-۳۳۹

— قرآن بعض مقامات پر ''انسان'' کا لفظ استعمال کرتا ہے مگر مراد انسانوں کا ایک خاص گروہ ہوتا ہے ۲۵۶-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۹-۴۳۰-۴۴۹-۴۵۰

— انسانی حواس میں سے اہم ترین حواس جن کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے ۴۶-۵۱-۵۲-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۳۴۰-۳۴۱-۴۸۱

— نفس انسانی کی تین اقسام (دیکھو ''ضمیر'' اور ''نفس'')

— انسان اور جن دو مختلف انواع کی مخلوق ہیں جن کا مادہ تخلیق بھی ایک نہیں ہے ۱۱۰

— انسان کو زمین کی خلافت دی گئی اور جنوں پر فضیلت عطا کی گئی ۱۱۱

— تخلیق انسانی کے وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں ۱۱۱

Maktaba Tul Ishaat.com

— موجودہ نسل انسانی طوفان نوح سے بچنے والے اہل ایمان کی نسلوں سے ہے ۴۳-۴۷

اہل کتاب

— مشرکین اور اہل کتاب میں اصطلاحی اور قانونی فرق ۴۱۲

— ان کی گمراہیوں کے باوجود قرآن میں انھیں کہیں بھی مشرک نہیں کہا گیا ۴۱۲

— ان کی گمراہیوں کی وضاحت ۴۱۰-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے والے اہل کتاب بدترین خلائق ہیں ۴۱۵-۴۱۶

— حضورؐ کی بعثت کے بعد اہل کتاب میں سے جو بھی آپ کو جھٹلائے گا وہ کافر ہوگا ۴۱۵

— حضورؐ کو مبعوث فرما کر اللہ نے اہل کتاب پر حجت پوری کر دی ہے ۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴

— ان میں فرقہ بندی کے وجوہ ۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵

— وہ اصل دین جس کی تعلیم اہل کتاب کو دی گئی تھی ۴۱۳-۴۱۵

— جہنم کے کارندوں کی تعداد کا بیان اہل کتاب کے لیے کس معنی میں حضورؐ کے نبی صادق ہونے کی نشانی ہے ۱۴۹-۱۵۰

آیت

— آیت بمعنی آیات کتاب اللہ اور بمعنی ارشادات و احکام الٰہی ۶۱-۲۳۰-۲۸۱-۳۴۶

— آیت بمعنی معجزہ ۲۴۱-۲۴۲

— اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کا انجام ۶۱-۶۲-۲۳۰-۲۸۱-۳۴۶

— اللہ کی آیات سے عناد رکھنے والوں کا انجام ۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹

ایمان

— معنی وتشریح ۴۵۱

— حقیقی ایمان کیا ہے؟ ۴۵۱-۴۵۲

— کسی کی تعریف میں ''مسلم'' اور ''مومن'' کے الفاظ ایک ساتھ استعمال کرنے کا مطلب ۲۸

— صفات المومنین ۲۶-۲۸-۲۹-۹۰ تا ۹۲-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۲۴۷-۳۱۵-۳۱۶-۴۱۵-۴۴۹-۴۵۱ تا ۴۵۴

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۲۵-۲۹۱-۲۹۹-۳۴۳-۳۸۷-۴۱۵-۴۴۹-۴۵۳
(مزید دیکھو ''عمل صالح'')

— مومن اور صالح لوگ بہترین خلائق ہیں ۴۱۵

— ایمان کے تقاضے ۵۲-۵۳-۹۰-۱۷۵-۳۴۱ تا ۳۴۶-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۴-۳۶۵

— قرآن میں یا ایھا الذین امنوا کہہ کر ہمیشہ صادق الایمان مومن ہی مراد نہیں لیے گئے ہیں ۳۰

— کن کن چیزوں پر ایمان لانا مطلوب ہے ۴۵۲

ـــ ایمان باللہ ۵۳-۱۱۷-۲۹۹

ـــ اللہ پر ایمان نہ لانے والوں کا انجام ۷۷

ـــ قرآن پر ایمان ۱۱۳

ـــ ہر آزمایش کے موقع پر جب مومن ثابت قدم رہتا ہے تو اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے ۱۵۰-۱۵۱

ـــ اہل ایمان کی پوری زندگی ہی صبر کی زندگی ہے ۱۹۸-۳۴۴-۴۴۹-۴۵۴

ـــ صالح مومنین سے اللہ راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۴۱۵

ـــ مومن ہر خطرے اور شر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے اور اپنے آپ پر ہی بھروسہ نہیں کرتا ۵۶۳ تا ۵۶۶

ـــ ہر مومن کو علانیہ کفر سے برات کا اعلان کرنا چاہیے ۵۰۱-۵۰۳-۵۰۵-۵۰۸-۵۰۹

ـــ ایمان ان صفات میں اولین صفت ہے جو خسران سے بچاؤ کی موجب ہیں ۴۴۹-۴۵۱-۴۵۲

ـــ مومن فرد کی حیثیت سے اللہ کی شان رحیمی کا مظہر ہے اور گروہ اہل ایمان دنیا میں رحمۃ للعالمین ؐ کا نمایندہ ہے ۳۴۴

ـــ جو اللہ پر ایمان لائے اس کے لیے اعمال کی جزا میں کسی حق تلفی یا ظلم کا خطرہ نہیں ہے ۱۱۷-۱۱۸

ـــ اہل ایمان بھلائی کا جو کام دنیا میں انجام دیں گے وہ ضائع نہیں جائے گا ۱۲۵-۱۳۴-۱۳۵

ـــ قیامت کا دن اہل ایمان کے لیے ہلکا ہوگا اور انھیں تازگی اور سرور بخشا جائے گا ۱۴۶-۱۹۷-۱۹۸

ـــ مومنین کو قیامت کے شر سے بچا لیا جائے گا ۱۹۶-۱۹۷

ـــ مومنین کو موت کے وقت بھی، برزخ میں بھی، اور میدان حشر میں بھی یقین دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہے ہیں ۳۳۳-۳۳۴

ـــ کمزور ایمان والوں کو سچے اہل ایمان سے کس طرح ممیز کیا جاتا ہے ۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱

ـــ اللہ کو کسی کے ایمان کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اس کی شرطیں پوری کرتا پھرے ۱۴۱-۱۵۶-۱۵۷

ـــ تارک نماز کو اس کا ایمان جہنم سے نہیں بچا سکتا ۱۵۴

ـــ جو اہل ایمان محض برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں گے انھیں آخر کار معاف کر دیا جائے گا ۳۱۵

ـــ اہل ایمان سے کافروں کی دشمنی کی اصل وجہ ۲۹۵-۲۹۹

ـــ اہل ایمان پر ظلم کرنے والوں کے لیے سخت عذاب ہے ۲۹۹

ـــ اہل ایمان کے معاملے میں حضرت مریمؑ اور فرعون کی بیوی کی مثال ۳۴-۳۵

ب

بت پرستی

Maktaba Tul Ishaat.com

___ حضرت نوحؑ کی تبلیغ توحید کے جواب میں رئیسان قوم کا اپنی قوم کو اور زیادہ سختی سے بت پرستی پر جم جانے کی تلقین کرنا ۱۰۳-۱۰۴
___ قوم نوحؑ کے بت جن کی پرستش بعد میں مشرکین عرب بھی کرنے لگے ۱۰۳-۱۰۴

بخل

___ اس کا وسیع مفہوم ۳۶۲
___ اس کی مذمت ۳۶۲
___ انسان کو بہرحال ایک دن مرنا ہے جس مال کو وہ سینت سینت کر رکھتا ہے وہ اس کے کسی کام نہ آئے گا ۳۶۳

بدی

___ دیکھو ''ضلالت''

برکت

___ معنی ومفہوم ۴۱

ت

تحریم

___ واقعہ تحریم ۱۵ تا ۱۷
___ حضوؐر نے یہ فعل اپنی خواہش پر نہیں بلکہ ازواج مطہرات کی خوشنودی کے لیے کیا تھا ۱۵
___ حضرت ماریہؓ قبطیہ کی تحریم کے بجائے شہد کی تحریم کا واقعہ قابل اعتبار ہے ۱۷
___ آپؐ کو کفارہ ادا کر کے قسم توڑنے کا حکم ۱۸
___ کیا تحریم قسم کی ہم معنی ہے؟ ۱۸-۱۹

تزکیہ نفس

___ معنی ومفہوم ۳۱۵-۳۵۴
___ تزکیہ نفس کے کن ذرائع کی قرآن میں نشان دہی کی گئی ہے ۱۲۷ تا ۱۲۹
___ نفس کا تزکیہ کرنے والا فلاح پا گیا اور اسے دبا دینے والا نامراد ہوا ۳۱۵-۳۵۱-۳۵۳ تا ۳۵۵
___ تزکی بمعنی قبول اسلام ۲۴۱-۲۴۲

تسبیح

___ رب عظیم کے نام کی تسبیح کرنے کی تلقین ۸۱-۲۰۲-۲۰۳
___ اللہ کے نام کی تسبیح کا وسیع مفہوم ۳۱۰
___ اللہ کے نام کی تسبیح کیوں کی جائے؟ ۳۱۰ تا ۳۱۲
___ حمد کے ساتھ تسبیح کرنے اور مغفرت طلب کرنے کا حکم ۵۱۶-۵۱۷

تقدیر

___ معنی ومفہوم ۳۱۱
___ ہر کام اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، ان شاء اللہ کے بغیر کسی کام کے عزم کا اظہار اپنی قدرت پر غلط اعتماد ہے ۶۱ تا ۶۳
___ جب اللہ کی مشیت انسانی مشیت سے مل جائے تب ہی کوئی انسانی فعل پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے ۱۵۶-۱۵۷
___ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر فرمائی ۲۵۶-۲۵۷-۳۱۱-۳۱۲
___ اسلام ایک نصیحت ہے جو چاہے قبول کرلے، لیکن جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو کوئی ہدایت قبول نہیں کرسکتا ۲۰۳-۲۷۰

— اللہ جس کسی کو ہدایت دیتا ہے اپنے علم وحکمت کی بنا پر دیتا ہے ۲۰۳
— انسان کی رہنمائی کے لیے دو مختلف قسم کی ہدایتیں دی گئیں ۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲
— ہدایت وضلالت کے بارے میں وہ اختیارات جو انسان کو اللہ کی مشیت نے ودیعت کر دیے ہیں ۸۹ تا ۹۲- ۱۵۳- ۳۱۰- ۳۱۱- ۳۱۲- ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳ تا ۳۵۵
— نیکی یا بدی کی راہ اختیار کرنے میں انسان کس طرح آزاد ہے ۳۴۸- ۳۵۱- ۳۵۲- ۳۵۳ تا ۳۵۵
— انسان کی فطری اور پیدائشی کمزوریاں ناقابل اصلاح نہیں ہیں بلکہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کر کے ان کو دور کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو یہی کمزوریاں راسخ ہو جاتی ہیں ۸۹ تا ۹۲
— انسان کو پیدائشی گناہ گار نہیں بلکہ بے لوث فطرت پر پیدا کیا گیا ہے ۳۵۱
— انسان کی آزمائش کس کس طرح ہو رہی ہے ۴۱-۴۲
(مزید دیکھو ''آزمائش'')
— امتحان کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عمل کا موقع دیا ہے ۴۱-۴۲
(مزید دیکھو ''امتحان'')
— جہنم سے ڈرایا گیا ہے اب جس کا جی چاہے بھلائی کا راستہ اختیار کرے اور جس کا جی چاہے پلٹ جائے ۱۵۳
— مخلوقات کی پیدائش وتخلیق کی نسبت اللہ کی طرف اور ان کے شر کی نسبت مخلوقات کی طرف ۵۶۷
— کن لوگوں کو باری تعالیٰ آسان راستے کی اور کن کو مشکل راستے کی سہولت دیتا ہے ۳۶۰ تا ۳۶۳
— موت وحیات اللہ کی ایجاد کردہ ہیں ۴۱
— اللہ اپنا رزق روک لے تو کوئی رزق نہیں دے سکتا ۵۰-۵۱
— اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت بخشتا ہے ۱۵۲
— تقدیر کے فیصلے فرشتوں کے سپرد کرنے کی رات ۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵
— اللہ کا ایک ایک منصوبہ ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار برس کا ہوتا ہے ۸۶ تا ۸۸
— ایسی نذر ماننے کی ممانعت جو یہ سمجھ کر مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی ۱۹۲

تقویٰ

— اللہ ہی اس کا حق دار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور اللہ ہی کا یہ کام ہے کہ متقین کو معاف کر دے ۱۵۶-۱۵۷
— متقین کے لیے جنت ہے ۶۴- ۲۱۶- ۲۳۰- ۲۳۱
— قرآن متقین کے لیے نصیحت ہے ۸۱

تکبر

— معنی ومفہوم ۱۰۰
— تکبر انسان کو کمینہ بنا دیتا ہے ۱۴۷- ۱۴۸
— متکبرین کا انجام ۱۴۸-۱۴۹

Maktaba Tul Ishaat.com

توبہ

__ توبہ نصوح کے لغوی اور شرعی مفہومات ۳۰ تا ۳۲

__ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ۵۱۶

__ صحیح توبہ کیا ہے ۳۰ تا ۳۲

__ صحیح اور مکمل توبہ کرنے والوں کا انعام ۳۲

__ ظلم کرنے والے اگر توبہ نہ کریں تو ان کا انجام جہنم ہے ۲۹۹

__ صرف ایک بار ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اپنے قصوروں کی معافی مانگتے رہنا اہل ایمان کی صفت ہے ۲۸

__ گناہ گار کی توبہ قبول کر کے جنت عطا فرمانا سراسر اللہ کی عنایت و مہربانی ہے ۳۲

توحید

__ دلائل توحید ۴۹ تا ۵۲- ۱۰۱ تا ۱۰۳- ۲۱۰- ۲۱۱- ۲۱۴- ۲۲۵ تا ۲۲۸- ۳۰۳- ۳۱۰ تا ۳۱۲

__ اسلام کے عقیدہ توحید کا مختصر ترین اور مکمل بیان ۵۳۵ تا ۵۴۳

__ تمام فاسد عقائد کی جڑ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کوئی نہ کوئی غلط عقیدہ ہے ۳۰۹

__ اللہ یکتا و یگانہ (احد) ہے ۵۳۵- ۵۳۶ تا ۵۳۸

__ اللہ کے ایک ہونے کا پورا مفہوم ۵۳۶ تا ۵۳۸

__ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں ۵۳۵- ۵۳۸ تا ۵۴۰

__ لفظ صمد کی تشریح ۵۳۸ تا ۵۴۰

__ اللہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ۱۱۴- ۵۳۵- ۵۴۰ تا ۵۴۳

__ کوئی اللہ کا ہمسر نہیں ہے ۵۳۵- ۵۴۳

__ مشرکین عرب اللہ کے بارے میں کیا تصورات رکھتے تھے ۵۳۵- ۵۳۶

__ ایک بالا و برتر ہستی کا تصور ہر ایک انسان کے دل میں ہے خواہ وہ اللہ کو مانتا ہو یا انکار کرتا ہو ۳۳۰- ۳۳۱

تہجد

__ اس کے متعلق ابتدائی احکام ۱۲۶- ۲۰۲- ۲۰۳

__ ابتدائی احکام میں تخفیف ۱۳۲- ۱۳۳

__ یہ تخفیف کتنے عرصے بعد کی گئی ۱۳۲

__ تہجد کی نماز فرض نہیں نفل ہے ۱۳۳

ث

ثمود

__ قصہ ثمود ۲- ۷۳- ۳۰۰- ۳۲۹- ۳۳۰- ۳۵۵- ۳۵۶

__ ان پر نزول عذاب کی وجہ ۲- ۷۳- ۳۵۵- ۳۵۶

__ عذاب ثمود کی کیفیت ۲- ۷۳- ۳۵۶

ج

جادو

__ جادو کفر ہے ۵۶۹- ۵۷۰

__ جادو ایک حقیقت ہے ۵۵۶- ۵۵۷

__ جادو کی حقیقت ۵۵۶- ۵۵۸

— جادوگروں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳-۵۶۹-۵۷۰

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کے اثر کا واقعہ ۵۵۳ تا ۵۵۶

— نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے ۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶

— اس واقعے پر اعتراضات اور ان کا جواب ۵۵۲-۵۵۳-۵۵۶-۵۵۷

— حضورؐ پر جادو کا اثر کس حد تک ہوا تھا؟ ۵۵۴-۵۵۵

— جادو کے اثر میں آپؐ سے کوئی ایسا فعل صادر نہیں ہوا جو منصب رسالت میں قادح ہو ۵۵۴-۵۵۵

— جادو کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کس طرح نجات دی ۵۵۵-۵۶۹

— جادوگر لبید بن اعصم نے اپنے قصور کا اعتراف کیا لیکن آپؐ نے اسے معاف کر دیا ۵۵۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو' جھاڑ پھونک'')

جبریل، علیہ السلام

— ''رسول کریم'' بمعنی حضرت جبریل علیہ السلام ۷۸-۲۶۸

— ''روح'' بمعنی حضرت جبریل علیہ السلام ۸۶-۲۳۲-۲۳۳-۴۰۶

— ان کی عظمت ۸۶-۲۳۲

— وہ بڑی توانائی رکھتے ہیں ۲۶۸-۲۶۹

— ان کا اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ ہے، وہاں ان کا حکم مانا جاتا ہے اور وہ بااعتماد ہیں ۲۶۹

— قرآن حضرت جبریلؑ کا قول کن معنوں میں ہے ۷۸-۲۶۸-۲۶۹

— ملائکہ اور حضرت جبریلؑ اللہ کے حضور ایک ایسے دن میں چڑھ کر جاتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے ۸۶-۸۷

— حضرت جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اور مددگار ہیں ۲۵-۲۶

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو روشن افق پر دیکھا ۲۶۹

جرم

— کون لوگ مجرم ہیں ۲۱۶-۲۱۷

— مجرمین کی حرکتیں اور ان کا انجام بد ۲۸۳-۲۸۴

جزا و سزا

— خدا کا بے لاگ قانون جزا و سزا ۱۳-۱۴-۳۰-۴۱-۴۲-۶۴-۳۰۵-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴ تا ۴۲۶-۴۳۱-۴۳۲

— دنیا میں قانون مکافات کا عمل ۵۰-۶۳-۹۴-۱۰۰-۱۰۱-۱۱۸-۲۱۲-۳۲۸ تا ۳۳۰

— بغاوت یا اطاعت کی روش اختیار کرنے کا انجام آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی ظاہر ہوتا ہے ۱۰۱-۱۰۲-۱۱۸-۱۱۹

— اخلاق اور قانون مکافات کا لازمی تعلق ۱۸۹

— جزا و سزا کے برحق ہونے کے دلائل ۳۸۵-

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۸۶ تا ۳۹۰

— جزا و سزا کے برحق ہونے پر مختلف چیزوں کی قسمیں ۱۶۲ تا ۱۶۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۲۶ تا ۳۲۸

— جزا و سزا کے برحق ہونے پر معذب قوموں کے انجام اور انسانوں کی اخلاقی حالت سے استدلال ۳۲۸ تا ۳۳۲

— جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کا انجام ۲۳۰

— جزا و سزا کا جھٹلانا اہم ترین اسباب ضلالت میں سے ہے ۲۷۴-۲۷۵-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰

— جزا و سزا وہ لازمی نتیجہ ہے جو فجور اور تقویٰ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مرتب ہونا چاہیے ۳۵۶

— مومنین، منافقین، مومن صالح، مومن خطا کار، مومن فاسق و ظالم، محض کافر اور کافر مفسد و ظالم کی جزا و سزا کا قانون قرآن اور حدیث کی روشنی میں ۴۲۴ تا ۴۲۶

— ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہے ۱۳-۱۴-۳۰-۴۱-۴۲

— اہل ایمان کے لیے اپنے اعمال کی جزا میں کسی حق تلفی یا ظلم کا کوئی خطرہ نہیں ۱۱۷-۱۱۸

— آخرت کے لیے جو کچھ کسی نے کما کر آگے بھیج دیا وہی اصل اور بہتر سرمایہ ہے جس کا بڑا اجر ہے ۱۳۴-۱۳۵

— ہر متنفس اپنے کسب کے بدلے میں رہن ہے ۱۵۳

— اللہ ہی کو فیصلہ کرنا ہے کہ کس کے اعمال اچھے اور کس کے برے ہیں ۴۱-۴۲

— نیک اور متقی لوگوں کے لیے بہترین جزا ہے ۲۱۶

— اللہ کی عدالت میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ انسان اعمال کی جو پونجی لایا ہے وہ وزنی ہے یا بے وزن ۴۳۵ تا ۴۳۷

— انسان کے دائمی اور ابدی مستقبل کا انحصار کن امور پر ہے ۲۴۷

— انسانوں کی کوششیں اپنی اخلاقی نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے مختلف ہیں ۳۵۸-۳۶۰ تا ۳۶۳

— قیامت کے روز نامہ اعمال کھولے جائیں گے ۲۶۴-۲۶۷

— انسان کی کوئی حرکت اپنے خالق سے نہیں چھپ سکتی ۴۷-۴۸

— انسان کا سب اگلا پچھلا کیا دھرا گن گن کر رکھا گیا ہے ۱۶۶-۲۲۲-۲۲۹-۲۳۰-۲۸۱

— انسان خواہ ہزار معذرتیں پیش کرے اپنے کردار کو وہ خوب جانتا ہے ۱۶۶-۱۶۷

— انسان کی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی نامہ اعمال میں درج ہوئے بغیر نہ رہے گی ۴۲۶-۴۲۷

— کیا آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی جزا یا سزا ملے گی؟ ۴۲۴ تا ۴۲۶

— قیامت کے روز اعمال و افعال کے پیچھے کارفرما نیتیں، اغراض اور باطنی محرکات بھی افشاء کر دیے جائیں گے ۳۰۴ - ۳۰۵

— دنیا میں جس کی کارگزاری قابل قدر ہو اس کا انعام ۲۰۰ - ۲۰۱

— کسی بڑے سے بڑے نیک انسان کے اعمال بھی اس کے رشتہ داروں کے کام نہ آسکیں گے ۱۳ - ۳۳ - ۳۴

— قیامت میں کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے ۸۸ - ۸۹

— مجرمین اگر اپنی اولاد، بیوی، بھائی اور قریب ترین خاندان حتیٰ کہ روئے زمین کے تمام انسان فدیے میں دے ڈالے تو یہ تدبیر بھی اسے نجات نہیں دلا سکتی ۸۸-۸۹

— قیامت فیصلے کا دن ہے ۲۱۱ - ۲۱۵ - ۲۲۸

— جہنم کے مستحق ضرور جہنم واصل ہوں گے ۱۴۸

— اہل جہنم کو ان کے جرائم کی نہ کم نہ زیادہ سزا دی جائے گی ۲۳۱

جن

— جنوں کی حقیقت پر مفصل بحث ۱۰۹ تا ۱۱۱

— انسان اور جن دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں جن کا مادہ تخلیق بھی الگ ہے ۱۱۰

— جن انسانوں سے پہلے پیدا کیے گئے تھے ۱۱۰

— انسان جنوں کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جن انسانوں کو دیکھتے ہیں ۱۱۰

— وہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں لیکن ایک خاص حد کے بعد شہاب ثاقب انھیں مار بھگاتے ہیں ۱۰۹ - ۱۱۰ - ۱۱۱ - ۱۱۵ - ۱۱۶

— انسانوں کو زمین کی خلافت دی گئی اور جنوں سے افضل رکھا گیا ۱۱۱

— مشرکین عرب کا جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرانا ۱۱۱ - ۱۱۴ - ۱۱۵

— تخلیق آدم کے وقت سے شیاطین جن انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں ۱۱۱

— جن نہ صرف انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ انھیں سمجھتے بھی ہیں ۱۱۳

— انسانوں کی طرح جن بھی ایک بااختیار مخلوق ہیں ۱۱۱

— ان میں بھی منکرین آخرت و رسالت اور مشرک موجود ہیں ۱۰۸ - ۱۱۴ - ۱۱۵ - ۱۱۶

— ان میں اخلاقی حیثیت سے اچھے اور برے اور اعتقادی لحاظ سے مسلم اور حق سے منحرف دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں ۱۱۶ - ۱۱۷

Maktaba Tul Ishaat.com

___ وہ اللہ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے منکر نہیں ہیں ۱۱۴
___ نبوت اور کتب الٰہی کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوا ۱۱۴
___ جنوں کے ایک گروہ کا قرآن سننا، ایمان لانا اور جا کر اپنی قوم میں تبلیغ کرنا ۱۰۸- ۱۰۹- ۱۱۲-۱۱۳ تا ۱۱۸
___ اس گروہ کی گمراہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسان یا جن اپنے رب کے بارے میں جھوٹ گھڑنے کی جرات بھی کر سکتے ہیں ۱۱۴- ۱۱۵
___ حضورؐ کی بعثت کے زمانے میں آسمانوں پر حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے تھے اسی لیے یہ جن اس تلاش میں نکلے تھے کہ زمین پر کیا خاص واقعہ پیش آیا ہے ۱۰۹
___ جن آتشیں مخلوق ہونے کے باوجود جہنم کی آگ میں کیسے جلائے جائیں گے ۱۱۸

جنت

___ وہ کن لوگوں کے لیے ہے ۳۰- ۳۲- ۶۴- ۷۵- ۹۰ تا ۹۲- ۱۵۳- ۱۹۰- ۱۹۱- ۱۹۶- ۱۹۷- ۱۹۸- ۲۱۶- ۲۳۰- ۲۷۵- ۲۸۲- ۲۹۹- ۳۲۰- ۳۲۱- ۳۳۳- ۳۴۳- ۳۴۵- ۴۱۵- ۴۳۵
___ اس کی نعمتیں ۳۲- ۷۵- ۱۹۰- ۱۹۱- ۱۹۸ تا ۲۰۱- ۲۱۶- ۲۳۰- ۲۳۱- ۲۸۲- ۲۸۳- ۲۹۹- ۳۲۱- ۴۱۵- ۴۳۵
___ اہل جنت کی صفات ۲۴۷- ۴۱۵
___ جنت میں قیام ہمیشہ کے لیے ہوگا ۴۱۵
___ جنت نعیم ۶۴- ۹۳
___ جنت عالیہ ۷۵- ۳۲۱
___ جنت کی شراب کی کیفیت ۱۹۰- ۱۹۱- ۱۹۹- ۲۰۰- ۲۰۱- ۲۸۲ تا ۲۸۴
___ اہل جنت کے استعمال کے شاہانہ برتن ۱۹۹
___ اس کا میٹھا اور خوشبودار چشمہ ''سلسبیل'' ۱۹۹
___ اس کی نہر ''کوثر'' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ۴۹۵- ۴۹۶
___ جنت کے خدمت گار لڑکے ۲۰۰
___ اہل جنت کا لباس ۲۰۰
___ حوران جنت کی کیفیت ۲۳۰- ۲۳۱
___ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات نہیں سنائی دے گی ۲۳۱- ۳۲۱
___ جنت ان نیک اعمال کا بدلہ ہے جو دنیا میں کیے گئے ہوں ۷۶- ۲۰۰- ۲۱۶
___ انسان جنت کا مستحق اپنے مادہ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ اعمال کی بنا پر ہے ۹۳
___ جنتی وہ لوگ ہیں جن کی دنیوی کارگزاری قابل قدر ٹھیری ہے ۲۰۰- ۲۰۱
___ وہ اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے ۳۲۰- ۳۲۱
___ جنت کامرانی و کامیابی کا مقام ہے ۲۳۰- ۲۹۹

— اہل جنت اپنے انجام سے خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہوں گے ۳۳۳
— اہل جنت کے لیے ان کے رب کی طرف سے جزا اور کافی انعام ہے ۲۳۱
— ان کے چہروں پر خوش حالی کی رونق ہوگی ۲۸۲
— وہ اس شان سے رہیں گے گویا ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک ہیں ۲۰۰
— وہ جدھر نظر دوڑائیں گے نعمتیں ہی نعمتیں ہوں گی ۲۰۰
— جنت عطا کرنا سراسر اللہ کی مہربانی ہے ۳۲
— اہل جنت سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۴۱۵
— اہل ایمان جنت میں بیٹھے ہوئے مجرمین کے عذاب کا منظر دیکھیں گے ۲۸۳-۲۸۴
— جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان سوال و جواب ۱۵۳-۱۵۴

جہاد

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و منافقین سے جہاد کرنے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ۳۳

جھاڑ پھونک

— اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت ۵۵۷ تا ۵۶۳
— مختلف قسم کے شرور اور بیماریوں سے نجات پانے کے لیے مسنون دعائیں ۵۵۸-۵۵۹
— ایسی جھاڑ پھونک کی ممانعت نہیں ہے جس میں شرک نہ ہو ۵۵۸-۵۵۹
— اہل کتاب تورات و انجیل پڑھ کر جھاڑ دیں تو بھی جائز ہے ۵۶۰
— احادیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز ہرگز نہیں نکلتا ۵۶۱-۵۶۲

جہنم

— جہنم کن لوگوں کے لیے ہے ۳۰-۳۳-۴۳-۷۷-۸۹-۱۱۸-۱۲۰-۱۴۷-۱۴۸-۱۵۳-۱۵۴-۱۹۰-۲۲۹-۲۴۷-۲۷۵-۲۸۱-۲۹۰-۲۹۹-۳۱۳-۳۳۲-۳۴۶-۳۶۴-۴۱۵-۴۳۵-۴۴۳-۴۵۸-۵۲۵
— جہنم کے مستحق ضرور جہنم واصل ہوں گے ۱۴۸-۱۵۳-۱۵۴
— اس کے عذاب کی کیفیت ۲۹-۳۰-۴۳-۴۴-۷۷-۷۸-۸۹-۱۳۰-۱۴۸-۱۴۹-۱۹۰-۲۱۴-۲۱۵-۲۳۰-۲۹۹-۳۱۳-۳۱۵-۳۲۰-۳۴۶-۴۳۵-۴۳۷-۴۵۸ تا ۴۶۰-۵۲۵
— اس کی آگ کی کیفیت ۲۱۵-۳۶۴-۴۵۸-۴۵۹
— جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ۲۹-۳۰
— اس کے نگران تندخو اور سخت گیر فرشتے ہوں

Maktaba Tul Ishaat.com

گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہر حکم بجالاتے ہیں ۲۹-۳۰
— جہنم دہاڑ رہی ہوگی، جوش کھا رہی ہوگی اور غضب سے پھٹی پڑتی ہوگی ۴۳-۴۴-۴۵
— اہل جہنم کو ستر ہاتھ لمبی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا ۷۷
— ان کا کوئی یارغم خوار نہ ہوگا ۷۸
— ان پر لعنت ہے ۴۶
— اہل جہنم اور اہل جنت کی باہم گفتگو ۱۵۳-۱۵۴
— اہل جہنم اس کے مستحق کیوں ٹھیرے ۲۳۰-۲۴۷
— نار کبریٰ ۳۱۳-۳۱۵
— جہنم کی آگ سے کون محفوظ رہے گا ۳۶۴
— اس کی آگ کو اللہ کی آگ کہنے کا مطلب ۴۵۸-۴۵۹
— اس کے تین شاخہ سائے کا مطلب ۲۱۴
— جہنم ایک گھات ہے سرکشوں کا ٹھکانا جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے ۲۲۹-۲۳۰
— جہنم کی ہیشگی ۱۲۰-۲۲۹-۲۳۰-۴۱۵
— ہیشگی کے عذاب سے مستثنیٰ صورتیں ۳۱۵
— جہنم بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے ۱۵۲-۱۵۳
— بڑا برا ٹھکانا ہے ۴۲-۴۳
— قیامت کے روز جہنم سامنے لے آئی جائے گی ۳۳۲
— اہل جہنم کی غذا ۸۱-۷۷-۱۳۰-۳۲۰
— انھیں پینے کو کیا ملے گا ۲۳۰-۳۲۰
— ان کے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں بھی اضافہ نہیں کیا جائے گا ۲۳۰
— بدکار لوگ جہنم واصل کیے جائیں گے اور وہاں سے ہرگز غائب نہ ہوسکیں گے ۲۷۵
— اہل جہنم عذاب کی حالت میں نہ جئیں گے نہ مریں گے ۱۴۸-۳۱۳-۳۱۵
— جہنم چکنا چور کر دینے والی جگہ ہے ۴۵۸-۴۵۹
— اہل جہنم کے حق میں کسی سفارش کرنے والے کی سفارش قبول نہ ہوگی ۱۵۴-۱۵۵
— جہنم میں داخلے کے وقت اہل جہنم کچھ نہ بولیں گے نہ معذرتیں پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی ۲۱۵-۲۱۶
— اہل جہنم کو ان کے جرائم سے نہ زیادہ اور نہ کم سزا دی جائے گی ۲۳۱
— وہ اہل ایمان جو محض برے اعمال کی وجہ سے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے آخرکار انھیں معاف کردیا جائے گا ۳۱۵
— جہنم کے انیس نگران کارکن ہوں گے ۱۴۹
— یہ کارکن فرشتے ہوں گے ان کی قوت کو انسانی قوت پر قیاس کرنا حماقت ہے ۱۴۹

— اس بیان پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب ۱۴۹ تا ۱۵۲

— کارکنان جہنم کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنانے کا مطلب ۱۴۹-۱۵۰

— کارکنان جہنم کی تعداد اہل کتاب کے لیے حضورؐ کے نبیصادق ہونے کی نشانی کس بنا پر ہے ۱۴۹-۱۵۰

— کارکنان جہنم کی تعداد بیان کر کے اللہ نے مومنین کو کفار و منافقین سے چھانٹ کر الگ کر دیا ہے ۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱

— جہنم کے کارکنوں کا اہل جہنم سے سوال و جواب ۴۴ تا ۴۶

— اہل جہنم خود اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے ۴۴ تا ۴۶

— قرآن میں جہنم کے عذاب کی کیفیت کیوں بیان کی گئی ہے ۱۵۲

— جہنم سے ڈرا دیا گیا ہے اب جس کا جی چاہے ڈر کر بھلائی کا راستہ اختیار کرے اور جس کا جی چاہے پلٹ جائے ۱۵۳-۳۶۴

— جن آتشیں مخلوق ہونے کے باوجود جہنم کی آگ میں کیسے جلائے جائیں گے ۱۱۸

ح

حدیث

— حدیث اور سنت کا مطلب ۱۷۰

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے احکام و تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر کی وہ اللہ کی طرف سے تھی ۱۶۷-۱۶۹-۱۷۰

— حضورؐ کی تشریح و تعبیر معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث اور سنت ہے ۱۷۰-۱۷۱

— حدیث کی قانونی و آئینی حیثیت کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ ۱۷۰-۱۷۱

— قرآن کی تفسیر اگر صحیح سند کے ساتھ حضورؐ سے منقول ہو تو کوئی اور تاویل قابل قبول نہیں ہے ۸۸

— حدیث کس طرح قرآن کی تشریح کرتی ہے ۱۴-۱۶-۱۷-۲۳-۲۶ تا ۲۸-۳۰-۳۱-۴۹-۵۹-۶۰-۸۸-۹۲-۱۰۱-۱۱۹-۱۲۷-۱۲۸-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۸-۱۶۸-۱۷۲-۱۷۳-۱۸۰ تا ۱۸۲-۱۹۲ تا ۱۹۶-۲۵۰-۲۵۱-۲۶۰-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۹-۲۷۲-۲۸۲-۲۸۸-۲۸۹-۳۱۱-۳۱۴-۳۱۵-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۵-۳۴۶-۳۵۱-۳۵۵-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۸۲-۳۹۹-۴۰۵-۴۰۶-۴۲۱-۴۲۵-۴۲۶-۴۴۴-۴۸۴-۴۸۵-۴۹۳ تا ۴۹۵-۴۹۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۲۶-۵۴۶-۵۵۴ تا ۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸ تا ۵۶۱-۵۶۴ تا ۵۶۶-۵۶۸ تا ۵۷۰-۵۷۳-۵۷۴

— بعض روایات پر تنقید بلحاظ روایت و درایت ۱۸۱-۱۸۲-۳۵۵

حسد

— معنی و مفہوم ۵۷۰

— حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین

Maktaba Tul Ishaat.com

۵۶۳-۵۷۰

حشر

— میدان حشر کا نقشہ ۲۳۱-۲۳۲
— روز حشر اللہ اپنے نبیؐ اور اہل ایمان کو رسوا نہ کرے گا ۳۲
— میدان حشر میں دربار الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ کسی کو اللہ کے سامنے بولنے کا یارانہ ہوگا ۲۳۱-۲۳۲
— مجرمین میدان حشر میں ہر طرح کے عذر پیش کرتے رہیں گے ۲۱۵
— میدان حشر سے جنت کے سفر میں مومنین کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ اللہ سے نور کے قائم رکھنے کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے ۳۲-۳۳
— منافقین نور سے محروم رکھے جائیں گے ۳۳
— میدان حشر ہی میں مومنین کو جنت اور مجرمین کو جہنم دکھائی دینے لگی گی ۲۶۷-۲۶۸

حق

— معنی ومفہوم ۴۵۳
— حق کی پیروی کرنے والوں کی مثال ۵۱
— حق کے خلاف روش اختیار کرنے والوں کی مثال ۵۱-۱۵۵
— قرآن بالکل یقینی حق ہے ۸۱
— قیامت برحق ہے ۷۲-۲۳۲
— معاشرے میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا خسران سے بچاؤ کا موجب ہے ۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— حق قبول کرنے والوں کا نیک انجام ۳۲۵-۳۳۳
— حق کے خلاف باتیں بنانے والے جہنمی ہیں ۱۵۳-۱۵۴
— منکرین حق پر لعنت ۲۵۶
— حق سے منہ موڑنے والوں کا انجام ۸۹-۱۱۸-۳۲۲

حقوق العباد

— یتیم، مسکین، محرومین، قیدی اور سائل کے حقوق ۶۲- ۷۷- ۷۸- ۸۹- ۹۰- ۱۵۴- ۱۹۶- ۱۹۷- ۳۳۱- ۳۷۳- ۳۷۴- ۴۸۱ تا ۴۸۳
— حقوق العباد کی ادائیگی پر ایک دوسرے کو اکسانا چاہیے ۷۷- ۳۳۱- ۴۴۹- ۴۵۳- ۴۸۱-۴۸۲
— حقوق العباد ادا کرنا مومنوں اور جنتیوں کی صفت ہے ۱۹۶-۱۹۷
— ایمان کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی نجات کا ذریعہ ہے ۳۴۱-۳۴۳
— مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلایا جائے تو للہ کھلایا جائے نہ کہ احسان دھرنے کے لیے ۱۹۶-۱۹۷
— غلاموں کو آزاد کرنا اور مساکین و یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا وہ کام ہیں جن

کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں ۳۴۲-۳۴۳
— دوسروں کو خلق خدا پر رحم کی تلقین کرنا ۳۴۳ تا ۳۴۶-۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— مومن معاشرے کے افراد پر یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں ۴۴۹-۴۵۳-۴۵۴
— حق داروں کو محروم کر کے مرنے والے کی ساری میراث سمیٹ لینے کی مذمت ۳۳۱-۳۳۲
— دوسروں کا حق مارنے والوں کا انجام بد ۸۹-۹۰

حقوق اللہ

— اللہ تعالیٰ ہی اس کا حق دار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے ۱۵۶-۱۵۷
— اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کی نعمتوں کا ذکر و اظہار کیا جائے ۳۷۳-۳۷۴
— عبادت اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے ۴۱۳-۵۰۳ تا ۵۰۷-۵۴۰

حکمت تبلیغ

— ۸۵-۹۴-۱۰۰-۱۲۹-۱۳۰-۲۲۰-۲۲۱-۲۴۱-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳ تا ۲۵۵-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۲۲

حلال و حرام

— حلال و حرام کے حدود مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے ۱۰-۱۵-۲۰
— اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام کی جو حدیں مقرر فرمائی ہیں وہ عین مبنی بر حکمت ہیں ۱۸-۲۰-۲۱
— کیا قسم کھا کر حلال کو حرام کر لینے اور محض تحریم میں کوئی فرق ہے؟ ۱۸-۱۹
— بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے اور بیوی کے علاوہ دوسری چیزوں کو حرام کر لینے کے معاملے میں فقہاء کے مسالک ۱۹-۲۰

حمد

— حمد کے ساتھ تسبیح کرنے اور مغفرت طلب کرنے کا حکم ۵۱۶-۵۱۷

خ

خسران

— معنی و تشریح ۴۵۱
— کون لوگ خسران میں ہیں ۴۴۹ تا ۴۵۴

د

دعوت حق

— اس کا مقصد ۲۵۴
— اس کا صحیح طریق کار ۲۵۱-۲۵۲
— اس کے مقابلے میں منکرین کی روش ۲۴۲-۲۴۳
— اس کو جھٹلانے والوں کو اللہ اپنی زبردست تدبیر سے بتدریج تباہی کی طرف لے جا رہا ہے ۶۶
— تحریک اسلامی کے آغاز ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۳۷۶۱-۳۹۴-۳۹۵-۴۸۹ تا ۴۹۱-۵۲۰ تا ۵۲۴-۵۴۷-۵۴۸
— دعوت حق میں کسی مداہنت و مصالحت کی گنجائش نہیں ہے ۶۰-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۸-۵۰۹-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۴

Maktaba Tul Ishaat.com

___ ہر مومن کو علانیہ کفر سے برات کا اعلان کرنا چاہیے ۵۰۱-۵۰۳-۵۰۵-۵۰۸-۵۰۹
___ مخالف قوتیں خواہ کتنی ہی طاقت ور ہوں اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جائے اور ان کی بالکل پروانہ کی جائے ۱۴۲-۱۴۳
___ دعوت حق کے پیروؤں کی پوری زندگی دائمی اور ہمہ گیر صبر کی زندگی ہے ۱۹۸-۳۴۴
___ انبیاء علیہم السلام کو دعوت حق کے مصائب صبر سے جھیلنے کی تلقین کی گئی ۶۷-۶۸-۸۷-۸۸-۱۴۲-۱۴۵-۲۰۰-۲۰۱
___ تمام مخالفتوں کے مقابلے میں اللہ کو وکیل بنا لینے کی تلقین ۱۲۹
___ اس راہ کی مشکلات کے مقابلے کے لیے اللہ کی عبادت ہی طاقت اور ہمت دیتی ہے ۲۰۲-۲۰۳-۳۷۷-۳۷۸-۳۸۴-۳۹۹
___ داعیِ حق کو اس شخص کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے جو عوام الناس کے دلوں میں اس کے خلاف وسوسے پھیلاتا پھرے ۵۷۲
___ داعیِ حق کی راہ کھوٹی کرنے اور اسے کانٹوں میں الجھانے کے لیے شیطان کی چالیں ۵۷۳
___ اہل ایمان کو بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا حتیٰ کہ بعض ظالموں نے انھیں زندہ جلا ڈالا ۲۹۴-۲۹۵ تا ۲۹۸
___ دعوت حق کے پیروؤں کو لازم ہے کہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کریں ۴۴۹-۴۵۳
___ دعوت حق میں کامیاب ہو جانا فخر کا نہیں بلکہ حمد و شکر کا مقام ہے ۵۱۴-۵۱۶-۵۱۷
___ دعوت اسلام ایک نصیحت ہے جو چاہے اسے قبول کر لے ۲۰۳

دنیا

___ انسان کے لیے دنیا کی اور دنیا میں انسان کی صحیح حیثیت ۱۸۶-۱۸۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰
___ انسان دنیا کے ظاہری پہلوؤں سے کس طرح دھوکا کھاتا ہے ۵۷-۶۴-۶۵-۶۶-۱۷۱-۲۰۳-۳۱۵-۳۱۶-۳۳۰-۳۳۱-۴۳۰-۴۳۱-۴۴۲ تا ۴۴۵
___ دنیا و آخرت کا مالک اللہ ہے جس کی بھی طلب کی جائے وہی دیتا ہے ۳۵۹-۳۶۴-۳۶۵
___ آخرت دنیا کے مقابلے میں بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے ۱۲۵-۱۳۴-۱۳۵-۳۱۵-۳۱۶
___ دنیا کی خوش حالی و بدحالی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ۳۳۰-۳۳۱
___ دنیا کی امتحان گاہ میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے ۳۳۶-۳۳۸-۳۳۹
___ انسان پر دنیوی مفاد کی بھوک اس طرح مسلط ہے کہ قبر تک بھی ساتھ نہیں چھوڑتی اور اہم تر

مقاصد سے غفلت میں ڈال دیتی ہے ۴۴۲۔ ۴۴۳

___ اگر انسان کو یقینی علم کے ذریعے اپنی دنیا پرستی کا انجام معلوم ہوتا تو اس کی کبھی یہ روش نہ ہوتی ۴۴۳

___ دنیا پرستوں کا انجام ۶۱ تا ۶۳۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۴۷۔ ۴۴۳۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹

___ دنیا کی نعمتیں محض نعمتیں نہیں ہیں بلکہ آزمائش ہیں اور ہر نعمت کی انسان کو جواب دہی کرنی ہے ۴۴۳ تا ۴۴۵

___ دنیا میں خوف آخرت رکھ کر کام کرنے والوں اور اس سے بے فکر ہوکر زندگی بسر کرنے والوں کا انجام ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷

___ دنیا پرستوں کی غلط فہمی کہ جو یہاں مزے کر رہا ہے وہ آخرت میں بھی اللہ کے ہاں مقبول ہوگا ۵۷۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۹۲۔ ۹۳

___ موجودہ دنیوی زندگی میں بھی قانون مکافات عمل کارفرما ہے ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۱۸

دوزخ

___ (دیکھو ''جہنم'')

دین

___ دین بمعنی اطاعت، بندگی اور طریق زندگی ۴۱۳

___ دین بمعنی محاسبہ و جزائے اعمال ۹۱۔ ۱۵۴۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۸۱۔ ۳۸۸۔ ۴۸۱

___ دین بمعنی نظام زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت ۵۱۶

___ دین بمعنی قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور نظام فکر و عمل ۵۰۳

___ دین بمعنی ملت و طریقہ ۴۱۳

___ دین کو خالص کر کے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کرنے کا حکم ۴۱۳

___ صحیح اور درست دین کیا ہے؟ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵

___ اللہ کا دین بے لاگ ہے ۱۳۔ ۱۴۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۴

___ دین اسلام کے تین بنیادی عقائد ۵۳۳

___ دین کے معاملے میں کسی مداہنت یا مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں

(دیکھو ''دعوت حق'')

ذ

ذکر

___ ذکر بمعنی نصیحت ۶۸۔ ۸۱۔ ۱۳۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۲۰۳۔ ۲۴۷۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۷۰۔ ۳۱۳۔ ۳۲۲

___ ذکر بمعنی قرآن ۶۸۔ ۲۵۵

___ دنیا کے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونا چاہیے ۱۲۹

___ اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے کا مطلب ۱۱۹

___ اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والوں کا انجام ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۳۱۳

___ نصیحت (ذکر) قبول کرنے والا کون ہے اور نہ کرنے والا کون ۳۱۳۔ ۳۱۵

ر

رب

Maktaba Tul Ishaat.com

___ رب العالمین ۷۹-۸۰
___ رب عظیم ۸۱
___ رب اکرم ۳۹۶
___ رب کریم ۲۷۴
___ رب اعلٰی ۳۱۰-۳۶۴
___ رب الفلق ۵۶۳-۵۶۶-۵۶۷
___ رب الناس ۵۷۱
___ مشرقوں اور مغربوں کا رب ۹۳-۹۴-۱۲۹
___ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب ۲۳۱
___ رب سے کفر کرنے کا مطلب ۴۳-۴۴
___ قرآن میں بعض جگہ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات کے بجائے اسم صفت ''رب'' استعمال کرنے کی حکمت ۵۶۷

رحم

___ اسلامی معاشرے میں رحم کی اہمیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ۳۴۴ تا ۳۴۶
___ ایک دوسرے کو خلق خدا پر رحم کی تلقین کرنا اہل ایمان کی صفت ہے ۳۴۳ تا ۳۴۶
___ فرد کی حیثیت سے مومن اللہ کی شان رحیمی کا مظہر اور جماعت کی حیثیت سے مومنوں کا گروہ دنیا میں رحمۃ للعالمینؐ کا نمائندہ ہے ۳۴۴

رزق

___ رزق حلال کمانے کی فضیلت ۱۳۴
___ رزق حلال کی تلاش میں سفر کرنے کی فضیلت ۱۳۳
___ اللہ اپنے رزق کو روک لے تو کوئی رزق نہیں دے سکتا ۵۰-۵۱

رسول

___ ''رسول کریم'' بمعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام ۸۷-۲۶۸ (مزید دیکھو ''نبوت'')

روح

___ حضرت مریمؑ کے رحم میں اللہ نے براہ راست اپنی طرف سے روح پھونک دی ۳۴-۳۵ (مزید دیکھو ''مریم علیہا السلام'')
___ روح بمعنی حضرت جبریل علیہ السلام ۸۶-۲۳۱-۲۳۲-۴۰۶ (مزید دیکھو ''جبریل علیہ السلام'')

روزہ

___ روزہ داری اہل ایمان کی صفت ہے ۲۹
___ ''سیاحت'' کا لفظ روزے کے لیے کس معنی میں استعمال ہوتا ہے ۲۹

ز

زکوٰۃ

___ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ۱۳۴-۴۱۳
___ زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ۱۲۴

زمین

___ زمین کی تخلیق و تدبیر میں اللہ کی قدرت کے کرشمے ۴۹ تا ۵۱-۵۳-۵۴-۹۳-۹۴-

۱۰۲- ۲۰۶- ۲۰۹ تا ۲۱۱-۲۱۳- ۲۱۴- ۲۲۵- ۲۲۷- ۲۲۸- ۲۲۹- ۲۴۴- ۲۴۵- ۲۵۸-۵۷۹

— زمین اور آسمان میں سے کس کی تخلیق پہلے کی گئی؟ ۲۴۴-۲۴۵

— زمین کو اللہ ہی نے انسان کے تابع کیا ہے اور اس کا رزق بھی اللہ کی حکمت اور قدرت سے پیدا ہوا ہے ۴۸

— زمین میں انسان کے بقا اور سلامتی کے موافق حالات سراسر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہیں ۴۹-۵۱-۵۳

— بارش سے زمین کو پھاڑا گیا اور اس کے اندر سے طرح طرح کی خوراکیں اگائی گئیں ۲۵۸-۲۵۹-۳۰۵

— اس پر بارش کے انتظام اور نباتات کی روئیدگی میں اللہ کی قدرت وحکمت کے دلائل ۲۰۹ تا ۲۱۱- ۲۲۷- ۲۲۸- ۲۲۹- ۲۴۴- ۲۴۵

— اس پر پیش آنے والے روزمرہ کے معمولات جن میں توحید کی بے شمار نشانیاں ہیں مگر ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۴۸ تا ۵۱

— اس کا پانی اگر اس کے اندر اتر جائے تو کس دیوی یا دیوتا کی یہ طاقت ہے کہ اسے واپس لا سکے ۴۰-۵۴

— اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے گئے اور میٹھا پانی جاری کیا گیا ۲۱۳-۲۱۴

— اسے فرش کی طرح بچھایا گیا تاکہ انسان اس کے کھلے راستوں پر چل سکے ۱۰۲- ۲۲۵- ۲۴۵

— ہواؤں کا نظام اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اس کائنات میں ایک بالاتر ہستی ہے اور قیامت برحق ہے ۲۰۶-۲۰۹ تا ۲۱۱-۵۷۹

— انسان کو زمین پر اللہ ہی نے پھیلایا ہے اور انسان اسی کی طرف سمیٹا جائے گا ۵۱-۵۲

— انسان کو زمین سے عجیب طرح اگایا گیا، اسی زمین میں اسے واپس کیا جاتا ہے اور پھر اسی سے یکایک اس کو نکال کھڑا کیا جائے گا ۱۰۲-۱۰۳

— زمین کو ایسا بنایا گیا کہ وہ زندوں اور مردوں کو سمیٹ کر رکھنے والی ہے ۲۱۳-۲۱۴

— زمین کے بچھانے اور پہاڑوں کے اس پر جمائے جانے میں آخرت کی صداقت کے دلائل ہیں ۳۲۱-۳۲۲

— قیامت کے روز زمین اور اس پر پائی جانے والی چیزوں کی کیا حالت ہوگی ۴۷- ۸۸- ۸۹- ۱۳۰- ۱۳۱- ۲۱۱- ۲۲۸- ۲۶۳- ۳۳۲-۴۲۰-۴۲۱-۴۳۵-۴۳۶

— قیامت میں سمندر پھاڑے جائیں گے اور بھڑکا دیے جائیں گے ۲۶۴-۲۷۳

— قیامت میں اللہ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے زمین ہر انسان کے قول وفعل کی گواہی دے گی ۲۸۸-۲۸۹-۴۲۰-۴۲۱ تا ۴۲۳

— قیامت میں زمین پھیلا دی جائے گی اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے اسے پھینک کر خالی ہو جائے گی ۲۸۸-۴۲۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— اس پر بسنے والی ہر ایک مخلوق کی نگہبان اللہ کی ذات ہی ہے ۵۰-۳۰۳

— زمین کے مختلف مشرق اور مغرب ہونے کا مطلب ۹۳-۹۴

— اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے ۱۳۲

— رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا گیا ہے ۲۲۵-۲۲۶

— رات اور دن کا آسمان کی طرف منسوب ہونا ۲۴۴

— رات کے شر سے پناہ مانگنے کا مفہوم ۵۶۳-۵۶۸-۵۶۹

— زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کیا جا سکتا اور نہ بھاگ کر اسے ہرایا جا سکتا ہے ۱۱۷

س

سجدہ

— سجدہ بمعنی نماز ۲۰۲-۳۹۹

— آیات سجدہ ۲۹۱-۲۹۲-۳۹۹

— کفار آخرت میں اللہ کو سجدہ کرنا چاہیں گے مگر نہ کر سکیں گے ۶۵

سحر

— دیکھو "جادو"

سلسبیل

— جنت کا میٹھا اور خوشبودار چشمہ ۱۹۹

سنت

— دیکھو "حدیث" اور "منکرین حدیث"

ش

شب قدر

— معنی ومفہوم ۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵

— قرآن کو شب قدر میں نازل کیا گیا جو رمضان المبارک کی برکتوں والی رات ہے ۴۰۴-۴۰۶

— رمضان المبارک کی کون سی رات شب قدر ہے ۴۰۵-۴۰۶

— کسی خاص رات کا تعین کیوں نہ کر دیا گیا؟ ۴۰۶

— شب قدر کے ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب ۴۰۶-۴۰۷

— شب قدر شام سے صبح تک خیر ہی خیر ہے ۴۰۶-۴۰۷

— فرشتے اور حضرت جبریلؑ شب قدر میں اللہ کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں ۴۰۶-۴۰۷

— شب قدر میں عبادت کی فضیلت ۴۰۶

— شب قدر سے متعلق ایک شبہے کا ازالہ ۴۰۶

شر

— معنی ومفہوم ۵۶۸

— مختلف شرور سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳ تا ۵۷۰-۵۷۱ تا ۵۷۴

— تمام مخلوقات کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کا مفہوم ۵۶۳-۵۶۷-۵۶۸

— مومن ہر شر اور ہر خطرے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور اللہ سے بے نیاز ہو کر صرف

اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کرتے ۵۶۳ تا ۵۶۶
— رات کے شر سے پناہ مانگنے کا مفہوم ۵۶۳-۵۶۸-۵۶۹
— جادوگروں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳-۵۶۸-۵۶۹
— حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳-۵۷۰
— شیاطین جن وانس کی وسوسہ اندازیوں کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین ۵۷۱ تا ۵۷۴
— اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے ۵۶۷
— مختلف قسم کے شرور سے نجات پانے کے مسنون طریقے ۵۵۸-۵۵۹

شرح صدر

— معنی ومفہوم ۳۷۸-۳۷۹
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر عطا کیا گیا ۳۷۸-۳۷۹
— نفس مطمئن رکھنے والوں کو شرح صدر نصیب ہوتا ہے ۳۳۳
— کیا شرح صدر شق صدر کا ہم معنی ہے؟ ۳۷۹-۳۸۰

شرک

— اس کے خلاف قرآن کے دلائل ۱۰۱ تا ۱۰۳
— اللہ کا کوئی ہمسر نہیں ہے ۵۳۵-۵۴۳
— اللہ کے کسی نبی یا کتاب نے شرک کی تعلیم نہیں دی ۴۱۱-۴۱۳-۴۱۵
— اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے کہ کوئی اس کی بیوی یا اس کا بیٹا ہو ۱۱۴
— وہ نہ کسی کی اولاد ہے نہ کوئی اس کی اولاد ۵۳۵-۵۴۰ تا ۵۴۳
— مشرکین بدترین خلائق ہیں ۴۱۵-۴۱۶
— مشرکین کو فہمایش کہ شرک سے باز آ کر راہ راست اختیار کرلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہوگی ۱۰۰-۱۱۸-۱۱۹
— ہر قسم کے معبودان غیراللہ کی عبادت کی ممانعت ۵۰۴
— اللہ کا کوئی شریک نہیں جو دنیا پرست لوگوں کو آخرت میں دل پسند انجام کی ضمانت دے سکے ۶۴-۶۵
— اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا ۴۹-۵۰-۵۱-۵۳-۱۰۵
— جنوں میں بھی انسانوں کی طرح مشرک پائے جاتے ہیں ۱۱۴
— مشرکین عرب کا جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرانا ۱۱۱-۱۱۴-۱۱۵
— اہل کتاب اور مشرکین میں اصطلاحی اور قانونی فرق ۴۱۲
— ایسی جھاڑ پھونک کی ممانعت جس میں شرک ہو ۵۵۸-۵۵۹

شک

— خدا اور آخرت اور رسالت کے منکر زیادہ تر

Maktaba Tul Ishaat.com

شک کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں ۱۵۰-۱۵۱

شکر

— انسان کم ہی شکر گزار ہوتا ہے ۵۱-۵۲

— انسان کو سیدھا راستہ بتا دیا گیا ہے اب خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا ۱۸۶-۱۸۸ تا ۱۹۰

شفاعت

— قیامت کے روز نہ انسان کے پاس خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا ۳۰۵

— اس روز کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا ۲۷۵-۲۷۶

— اس روز آخری فیصلے کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوگا ۲۷۵

— شفاعت صرف وہی کر سکے گا جسے اللہ اجازت دے اور جو ٹھیک ٹھیک حق بات کہے ۲۳۱-۲۳۲

— کون لوگ ہیں جن کے حق میں کوئی شفاعت کام نہ آئے گی ۱۵۴-۱۵۵

شہید - شہید بمعنی گواہ ۴۳۰

شیطان

— اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے ۵۷۱-۵۷۳-۵۷۴

— شیطان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کی گئی ہے ۴۳

— آسمان کے تارے کس معنی میں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ ہیں؟ ۴۳-۴۴

— قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے ۲۷۰

ص

صالحین - دیکھو "عمل صالح"

صبر

— صبر کا وسیع اور جامع مفہوم ۱۹۸-۳۴۴

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے کی تلقین ۸۷-۸۸-۱۴۲-۱۴۵-۲۰۱

— آپؐ کو حضرت یونسؑ کی سی بے صبری سے بچنے کی تلقین ۵۷-۶۷-۶۸

— انبیاء کو دعوت حق کے مصائب صبر سے جھیلنے کی تلقین ۶۷-۶۸-۸۷-۸۸-۱۴۲-۱۴۵-۲۰۰-۲۰۱

— مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے ۱۹۸-۳۴۴

— اہل معاشرہ کا ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا خسران سے بچاؤ کا موجب ہے ۳۴۳-۳۴۴-۴۴۹-۴۵۴

صحابہ کرامؓ

— ان کی روش کی مثال ۵۱

— اسلام میں صحابہ کرامؓ کی تعظیم و تکریم کا صحیح تصور ۱۲-۱۳-۵۵۲

— ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا غیر معمولی جذبہ ۱۳۲-۱۳۳

— صحابہ کرامؓ کس طرح قرآن کی تشریح کرتے

ہیں (دیکھو "قرآن")

صحیفہ

__ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں کا حوالہ ۳۱۵-۳۱۶
__ پاکیزہ، بلند مرتبہ اور مکرم صحیفے جن میں قرآن درج ہے ۲۵۵
__ یہ صحیفے معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں ۲۵۵-۲۵۶
__ قرآن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک صحیفوں پر مشتمل ہے جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہیں ۴۱۳-۴۱۴

صور

__ اس کی آواز کان بہرے کر دینے والی ہوگی ۲۵۹
__ جس روز صور پھونکا گیا وہ بڑا سخت دن ہوگا ۱۴۶
__ صور میں ایک پھونک مار دی جائے گی اور انسان فوج در فوج نکل آئیں گے ۲۲۸

ض

ضلالت

__ اہم اسباب ضلالت ۵۳- ۱۴۱- ۱۵۵- ۱۵۶- ۱۶۵- ۱۷۱- ۲۰۳- ۲۳۰- ۲۴۷- ۲۷۴- ۲۷۵- ۲۸۰- ۲۸۱- ۲۹۰- ۳۱۵- ۳۱۶- ۳۵۵- ۳۶۴- ۳۹۷- ۴۴۲- ۴۵۸-۴۵۹
__ تمام گمراہیوں کی جڑ کیا ہے؟ ۴۶- ۳۰۹
__ اہل ضلالت کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ جاتا ہے ۲۸۱-۲۸۲
__ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات اور زمین و آسمان ایک دوسرے سے متضاد ہیں اسی طرح نیکی اور بدی بھی متضاد ہیں ۳۴۸- ۳۵۰-۳۵۱
__ اللہ جانتا ہے کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت پر ۶۰
__ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ضلالت و گمراہی میں مبتلا کرتا ہے ۱۵۲
__ اس کی یہ مشیت علم و حکمت پر مبنی ہے ۲۰۳
__ قرآن سن کر ایمان لانے والے جنوں نے اپنی گمراہی کی کیا وجہ بیان کی تھی ۱۱۴- ۱۱۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "ہدایت")

ضمیر

__ انسان کو ضمیر عطا کیا گیا جو ہر برائی سے پہلے ٹوکتا ہے اور برائی کرنے کے بعد ملامت کرتا ہے ۱۸۸- ۱۸۹- ۱۶۳
__ انسان خواہ ہزار معذرتیں پیش کرے اس کا ضمیر اسے خوب جانتا ہے ۱۶۶
__ انسان کی ناشکری پر اس کا ضمیر گواہ ہے ۴۲۹- ۴۳۰
__ قیامت اور جزاو سزا کے برحق ہونے پر انسان کے ضمیر کی قسم ۱۶۲- ۱۶۴

ط

طویٰ

__ طویٰ کی مقدس وادی جہاں حضرت موسیٰؑ سے

Maktaba Tul Ishaat.com

کلام کیا گیا ۲۴۰-۲۴۱

ظ

ظالم - ظالم کون لوگ ہیں ۵۷۷-۵۷۸
— قوم فرعون ظالم تھی ۳۴
— ظالموں کا انجام ۲۰۳
— حضرت نوحؑ کی دعا کہ ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا جائے ۱۰۶

ع

عاد
— عاد ارم ۳۲۸ تا ۳۳۰
— وہ اپنے وقت کی بے نظیر قوم تھے ۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰
— انھوں نے آخرت کا انکار کیا اور رسول کو جھٹلایا ۷۲
— انھوں نے زمین میں فساد عظیم برپا کیا ۳۲۹
— ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کیفیت ۷۳-۳۲۹

عبادت
— عبادت بمعنی بندگی و اطاعت و پرستش ۹۹-۴۱۳-۴۷۷-۵۰۳
— اللہ کی عبادت کا صحیح اسلامی تصور ۵۰۵
— مخالفتوں اور مشکلات میں اللہ کی عبادت ہی طاقت و ہمت دیتی ہے ۲۰۲-۲۰۳-۲۷۷-۳۷۷-۳۷۸-۳۸۴-۳۹۹
— عبادت گزار آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں ہوسکتا ۲۸
— قیامت کے روز اللہ تعالیٰ علی الاعلان اس بات کا مظاہرہ کروا دے گا کہ کون دنیا میں عبادت گزار تھا اور کون نہ تھا ۶۵-۶۶
— ہر مشرکانہ عبادت اور ہر معبود غیر اللہ کی نفی ۵۰۳ تا ۵۰۵
— شب قدر میں عبادت کی فضیلت ۴۰۶

عرب
— جاہلیت میں اہل عرب کی رسوم و رواج اور اخلاقی برائیاں ۳۲۵-۳۳۰ تا ۳۳۲-۴۵۶-۴۵۸-۴۵۹-۴۸۲-۴۸۳-۵۲۰-۵۲۱
— قدیم عرب معاشرے میں صرف عقائد و اخلاق ہی کی برائیاں نہ تھیں بلکہ وہ طہارت و نظافت کے ابتدائی تصورات سے بھی عاری تھے ۱۴۳
— قوم نوح کے وہ بت جن کی پرستش بعد میں مشرکین عرب نے بھی شروع کر دی ۱۰۳-۱۰۴
— مشرکین عرب کا جنوں کو خدا کا شریک ٹھیرانا ۱۱۱-۱۱۴-۱۱۵
— عرب میں پھیلی ہوئی عام بدامنی ۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۷۸-۵۶۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بعثت سے پہلے عربوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا ۳۷۸-۳۸۰
— ان میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا بے رحمانہ طریقہ ۲۶۴ تا ۲۶۷

— اس معاملے میں برتی جانے والی شقاوت کا واقعہ جو احادیث میں بیان ہوا ہے ۲۶۵

— خود عربوں میں اس غیر انسانی فعل کی قباحت کا احساس موجود تھا ۲۶۵-۲۶۶

— اسلام نے عرب سے اس سنگدلانہ رسم کا بالکل خاتمہ کر دیا ۲۶۶-۲۶۷

— مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا عقائد رکھتے تھے ۵۳۵-۵۳۶

— وہ فرشتوں کی ہستی اور ان کی صفات کے منکر نہ تھے ۲۳۹

— قدیم عرب کی تجارت جس پر عالمی طاقتوں کی نظر تھی ۴۶۲-۴۶۳

عرش

— اللہ عرش کا مالک ہے ۲۹۹

— قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کا عرش کو اٹھائے ہوئے ہونا ۷۴-۷۵

عذاب

— عذاب بمعنی قیامت ۸۶-۹۱-۲۳۲

— عذاب کن کے لیے ہے ۴۸-۴۹-۵۰-۵۳-۱۱۸-۱۱۹-۲۱۲-۲۹۱-۳۰۰-۳۲۹-۴۷۰

— عذاب اکبر کن کے لیے ہے ۳۲۲

— عذاب آخر کن کے لیے ہے ۸۶-۱۷۵-۲۰۳-۲۳۰-۲۴۳

— دنیوی عذاب جو مختلف قوموں پر نازل ہوئے ۵۰-۷۰-۷۲ تا ۷۴-۷۵-۱۰۵-۲۴۰ تا ۲۴۳-۳۲۹-۳۳۰-۳۵۵-۳۵۶

— دنیوی عذابوں کی کیفیت ۷۲ تا ۷۴-۱۰۵-۲۴۳-۳۵۶-۴۷۰-۴۷۲

— دنیوی عذابوں سے سبق حاصل کرنے کی تلقین ۴۹-۵۰-۷۲ تا ۷۴

— معذب قوموں کا دنیوی عذاب ہی پر کام تمام نہیں ہو جاتا بلکہ ان کی روحیں فی الفور عذاب نار میں مبتلا کر دی جاتی ہیں ۱۰۵-۲۴۳-۵۲۵

— آخرت کا عذاب دنیوی عذابوں سے بڑا ہوگا ۶۳-۲۳۰

— اللہ کوئی عذاب یا آفت بھیج دے تو کوئی بھی بچا نہیں سکتا ۴۹-۵۰-۵۳-۱۰۵

— کسی قوم کے لیے عذاب کا فیصلہ ہو جائے تو پھر اس کو ٹالا نہیں جا سکتا ۹۹

— ہر گمراہ قوم کے لیے عذاب کا ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے ۹۸-۹۹

— عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب ۸۴-۸۶ تا ۸۸

— خدا کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو ۹۱

— مومن کی خوبی یہ ہے کہ وہ نیک اعمال کرتے ہوئے بھی کافر کی طرح خدا کے عذاب سے بے خوف نہیں ہوتا ۹۱-۱۹۷

— عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے والوں کو تنبیہ کہ تم بھول گئے ہو کہ تمھاری ابتدا کتنی حقیر ہے ۹۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ جب چاہے ایک باغی قوم کی جگہ اس سے بہتر لوگ لے آئے ۹۳-۹۴

— اللہ کی پکڑ بڑی شدید ہے ۲۹۹

— اللہ کے گھات لگائے رہنے کا مطلب ۳۲۹-۳۳۰

— اس جیسا عذاب دینے والا کوئی نہیں ہے ۳۳۲

— وہ جب کسی قوم پر عذاب وارد کرتا ہے تو اسے اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا خوف نہیں ہوتا ۳۵۶

— اسے جب کسی قوم پر عذاب بھیجنا ہوتا ہے تو عالم بالا کے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے جاتے ہیں ۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷

— عذاب بھیجنے سے پہلے اتمام حجت کے لیے اللہ رسولوں کو بھیجتا ہے ۹۸

— رسولوں کو جھٹلانے اور ان کی دعوت رد کر دینے والوں کو اللہ بڑی سختی سے پکڑتا ہے ۷۳-۲۹۹

علم

— انسان کو وہ ذرائع اور قوتیں دی گئی ہیں جن سے وہ علم حاصل کرتا اور پھر نتائج اخذ کرتا ہے ۱۸۶-۱۸۷

— انسان کو صاحب علم ہی نہیں بنایا گیا بلکہ قلم کا استعمال سکھا کر اس کی علمی قابلیت کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا گیا ۳۶۶-۳۹۷

— انسان اصل میں بے علم ہے، جو علم بھی اسے حاصل ہوتا ہے اللہ کے دینے سے حاصل ہوتا ہے ۳۹۶-۳۹۷

— کسی معاملے میں رائے قائم کرنے کا صحیح علمی طریقہ ۱۰۹-۱۱۰

— قیامت کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے، یہ کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا ۵۲-۲۴۷

(علم غیب کے لیے دیکھو ”غیب“)

علی مرتضیٰؓ

— ان کا اور ان کے گھر والوں کا عظیم اخلاق ۱۸۰ تا ۱۸۲

— انھوں نے صحیح توبہ کے کیا لوازم بیان کیے ہیں ۳۱

عمران -۳۴ (دیکھو حضرت ”مریم علیہا السلام“)

عمر فاروقؓ

— ان کا اسلام سے پہلی مرتبہ متاثر ہونا ۷۰

— ان کا یہ اعزاز کہ ایسا کم ہی ہوا کہ انھوں نے ایک بات کہی ہو اور اللہ نے اس کی تصدیق نہ فرمائی ہو ۲۷

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو ان کے منصب کا احساس دلانے کے لیے ان کی کوششیں ۲۳-۲۴-۲۶-۲۷

عمل صالح

— اعمال صالح ایمان کے ساتھ خسران سے بچنے کے موجب ہیں ۴۴۹-۴۵۳

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۴۵۳- (مزید دیکھو ”ایمان“)

— مومنین صالحین کا انعام ۲۹۱-۲۹۹-۳۸۸-۳۸۹-۴۱۵

— آخرت کے لیے جو عمل صالح کسی نے کمایا اور آگے بھیج دیا وہی بہتر ہے اور اس کا بڑا اجر ہے ۱۳۴-۱۳۵

— دنیا میں زندگی و موت کا سلسلہ اس آزمائش کے لیے شروع کیا گیا کہ انسانوں میں سے کس کا عمل بہتر ہے ۴۱-۴۲

— اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا برا ۴۱-۴۲

عورت

— بہترین مسلمان عورت اور بیوی کی صفات ۲۶-۲۸-۲۹

عیسیٰؑ، علیہ السلام

— ان کی معجزانہ پیدائش ۳۴ (نیز دیکھو "مریم علیہا السلام")

غ

غلامی

— انسان کی گردن غلامی سے چھڑانا بہت بڑی نیکیوں میں سے ہے ۳۴۱-۳۴۲

— لونڈیوں سے بربنائے ملکیت تمتع ۹۱

غیب

— اللہ عالم الغیب ہے اور وہ رسولوں کو غیب کا وہی علم دیتا ہے جو فرائض رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتا ہے ۱۲۱-۱۲۲

— جب رسولوں کو یہ علم بھیجا جاتا ہے تو اس امر کی پوری نگرانی کی جاتی ہے کہ وہ رسول تک بے کم و کاست پہنچے اور رسول ٹھیک ٹھیک حق رسالت ادا کرے ۱۲۱-۱۲۲

— غیب کا جو علم اللہ تعالیٰ رسول کو دیتا ہے، رسول اسے بندوں تک پہنچانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتا ۲۷۰

— قیامت کا وقت وہ علم غیب ہے جو اللہ نے کسی کو نہیں دیا ۵۲-۲۴۷

ف

فرشتے

— وہ کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں ۲۹-۳۰

— وہ احکام الٰہی بجا لانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں ۲۳۸

— ان کے کرنے کے کام ۲۵-۲۶-۸۶-۸۷-۱۲۱-۱۲۲-۱۴۹-۲۳۱-۲۵۵-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۸۲-۲۹۹-۴۰۶

— وہ احکام الٰہی کے مطابق کائنات کے معاملات کا انتظام کرتے ہیں ۲۳۸

— فرشتے اور حضرت جبریلؑ اللہ کے اذن سے شب قدر میں ہر حکم لے کر اترتے ہیں ۴۰۶-۴۰۷

— اللہ نے اس امر کا سخت اہتمام کیا کہ فرشتے رسول تک اور رسول بندوں تک اللہ کے پیغامات بلا کم و کاست پہنچا دیں ۱۲۱-۱۲۲

— فرشتے اللہ کے پیغامات میں کسی کمی بیشی کی مجال نہیں رکھتے ۱۲۲

Maktaba Tul Ishaat.com

— معزز اور نیک فرشتے جو قرآنی صحیفوں کے کاتب ہیں ۲۵۵

— معزز فرشتے جو ہر انسان کا نامہ اعمال لکھ رہے ہیں ۲۷۴ تا ۲۷۶

— موت کے وقت روح قبض کرنے والے فرشتے جو ڈوب کر روح قبض کرتے ہیں ۲۳۸

— قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے عرش کو اٹھانے کا مطلب ۷۵

— فرشتے اور حضرت جبریلؑ اللہ کے حضور ایک ایسے دن میں چڑھ کر جاتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے ۸۶-۸۷

— وقوعِ آخرت پر فرشتوں کی قسم کن معنوں میں کھائی گئی ہے ۲۳۶-۲۳۸-۲۳۹

— فرشتے میدان حشر میں صف بستہ اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے ۲۳۱-۲۳۲

— انیس فرشتے جہنم کے کارکن بنائے گئے ہیں ۱۴۹

— فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اور مددگار ہیں ۲۵-۲۶

فرعون

— قصہ فرعون ۲۴۰ تا ۲۴۳-۳۰۰

— میخوں والا فرعون ۳۲۹-۳۳۰

— اس کی قوم ایک ظالم قوم تھی ۳۴

— اس نے رسول کی نافرمانی اور آخرت کے انکار کی سزا پائی ۳۷

— اس کی طرف ایک رسول گواہ بنا کر بھیجا گیا جسے اس نے جھٹلایا اور اللہ نے اسے سختی کے ساتھ پکڑ لیا ۱۳۱

— اس نے دنیا میں فسادِ عظیم برپا کیا تھا اس لیے عذاب کا کوڑا اس پر برسا دیا گیا ۳۲۹

— اس کے لیے وہی سزا نہیں جو دنیا میں مل گئی بلکہ آخرت میں بھی عذاب جہنم ہے ۲۴۳

— اس کے انجام میں ڈرنے والوں کے لیے عبرت ہے ۲۴۳

— وہ بندگی کے حدود توڑ کر خالق و مخلوق دونوں کے مقابلے میں سرکش ہوگیا تھا ۲۴۱

— اس کا اہل مصر سے یہ کہنا کہ ''میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں'' ۲۴۲-۲۴۳

— وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا ۲۴۳

— وہ نہ اللہ کی ہستی کا منکر تھا اور نہ رب العالمین ہونے کا دعویٰ کرتا تھا ۲۴۳

— وہ سیاسی معنوں میں الٰہ اور رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا ۲۴۳

— اس کی مومن بیوی کی دعا ۳۴

— اس کے ساتھ ازدواجی تعلق اس کی مومن بیوی کے لیے نقصان دہ نہ ہوا ۱۳-۱۴-۳۴

— اہل ایمان کے معاملے میں فرعون کی بیوی کی مثال ۳۴-۳۵

فرقہ بندی

— اہل کتاب میں یہ فتنہ اس رہنمائی سے منہ موڑنے کے باعث رونما ہوا جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی تھی ۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵

فساد

__ خدا اور آخرت سے بے خوف ہونے کا لازمی نتیجہ ۳۲۸
__ دنیا میں سرکشی اور فساد پھیلانے والوں کا انجام ۳۲۹ تا ۳۳۱

فقہ

__ دیکھو ''اصول فقہ''

فلاح

__ معنی و مفہوم ۳۱۵
__ کن لوگوں کے لیے فلاح ہے ۳۰۹-۳۱۵
__ انسان کی فلاح کا انحصار کس بات پر ہے ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۳ تا ۳۵۵

ق

قانون اسلام

○ اصول قانون اور اصولی احکام:
__ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کا اختیار قطعی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ۱۰-۱۵-۲۰
__ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حلال و حرام کی قیود اور جملہ قوانین عین مبنی بر حکمت ہیں ۱۸-۲۰-۲۱

○ بنیادی حقوق:
__ غریبوں کا یہ حق ہے کہ ان کی روٹی کا بندوبست کیا جائے ۷۷- ۱۵۴- ۱۹۶-۱۹۷-۳۳۱-۳۴۱-۴۸۱-۴۸۳
__ یتیموں کی خبر گیری اور ان کی عزت اور حقوق کی حفاظت معاشرے کے ذمہ لازم ہے ۱۹۶-۳۳۱-۳۳۲-۳۴۱-۳۷۳-۴۸۱-۴۸۲
__ قیدی کا یہ حق ہے کہ اس کی ضروریات کی کفالت کی جائے ۱۹۶-۱۹۷

○ قانون شہادت:
__ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ شہادت کسی اخفا یا کمی بیشی کے بغیر ٹھیک ٹھیک ادا کی جائے ۹۲

○ قانون وراثت:
__ مختلف مذاہب کے پیرووں کے درمیان وراثت کا مسئلہ ۵۰۸-۵۰۹
__ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ دوسرے وارثوں کو محروم کر کے میت کی پوری میراث سمیٹ لے ۳۳۱-۳۳۲

○ قانون نکاح و طلاق:
__ بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے کے مسئلے پر تفصیلی بحث ۱۹-۲۰

○ قتال فی سبیل اللہ:
__ اس کے ابتدائی احکام کا نزول مدینہ میں ہوا ۱۲۴-۱۳۳

قرآن

__ قرآن مجید ۳۰۰
__ وہ سارے جہان والوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نصیحت ہے ۶۸-۲۷۰-۵۰۴
__ اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ۷۹-۴۰۴
__ اس کے کلام اللہ ہونے کے دلائل ۷۱-۷۸ تا ۸۱
__ اللہ کا یہ ارشاد کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے ہر چیز کی قسم کہ قرآن کسی شاعر یا کاہن

Maktaba Tul Ishaat.com

کا قول نہیں ہے ۷۸-۷۹
___ وہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے ۲۷۰
___ وہ بالکل یقینی حق ہے ۸۱
___ وہ بجائے خود ان مخالفین کے الزامات کی تردید کے لیے کافی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے اور کہتے ہیں ۵۸
___ راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۱۱۳
___ اس کے ایک بھاری کلام ہونے کا مطلب ۱۲۷ - ۱۲۸
___ اس کو شب قدر میں نازل کیا گیا جو رمضان المبارک کی ایک بابرکت رات ہے ۴۰۴ تا ۴۰۶
___ اس کو شب قدر میں نازل کرنے کا مطلب ۴۰۴
___ وہ حصول ہدایت اور دریافت حقیقت کے کن ذرائع کی نشان دہی کرتا ہے ۴۶- ۱۸۶- ۱۸۸ تا ۱۹۰- ۲۱۷- ۲۴۱- ۲۴۲- ۲۴۳- ۲۴۷- ۲۵۸- ۲۷۰- ۳۰۳- ۳۰۴
___ انسان کو حق و باطل کا فرق اور ہدایت کا راستہ بتانے کے لیے قرآن سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے جو اس سے ہدایت نہیں پاتا وہ پھر کہیں سے نہیں پاسکتا ۲۱۷
___ وہ ہر پرہیزگار شخص کے لیے نصیحت ہے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو ۸۱- ۲۷۰
___ اس کو جبریل علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کن معنوں میں کہا گیا ہے ۷۸- ۲۶۸- ۲۶۹
___ وہ ان تمام آمیزشوں سے پاک ہے جن سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ ہو چکی ہیں ۴۱۴
___ وہ بلند پایہ ہے، لوح محفوظ میں ثبت ہے اور اس میں بالکل راست اور پاک باتیں درج ہیں ۳۰۰- ۴۱۳
___ وہ پاکیزہ، بلند مرتبہ اور مکرم صحیفوں میں درج ہے جو معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں ۲۵۵- ۲۵۶
___ جس طرح معجزانہ طور پر وہ نازل فرمایا گیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظے میں اس کو محفوظ بھی کر دیا گیا ۳۱۳
___ اس روایت کی حقیقت جس کا سہارا لے کر مخالفین اسلام قرآن کے محفوظ ہونے کے بارے میں شک پیدا کرتے ہیں ۵۴۹ تا ۵۵۲
___ قرآن کو صحیح صحیح پڑھوا دینے اور اس کے مطالب صحیح صحیح سمجھا دینے کی ذمہ داری اللہ نے خود لی تھی ۱۶۷ تا ۱۷۱
___ اس کے احکام و تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر رسولؐ اللہ نے فرمائی وہ اللہ کی طرف سے تھی ۱۶۷- ۱۶۹- ۱۷۰
___ اس تشریح و تعبیر کو جاننے کا واحد ذریعہ حدیث و سنت ہے ۱۷۰- ۱۷۱
___ جنوں کا ایک گروہ اس کو سن کر اس پر ایمان لے آیا اور پھر جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگا ۱۰۸- ۱۰۹- ۱۱۲- ۱۱۳ تا ۱۱۸
___ کفار مکہ کی سازش کہ اسے جادو کہہ کر لوگوں کو

بہکایا جائے ۱۴۰-۱۴۶

— اس کو جھٹلانے والے کافر ہیں ۸۱-۳۰۰

— اس کو جھٹلانے والوں کو آخر کار پچھتانا پڑے گا ۸۱

— اس کی تلاوت کے آداب ۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۳۹۰

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس کی تلاوت فرماتے تھے ۱۲۷

— رات کی خاموش تنہائیاں اس کی تلاوت کے لیے نہایت موزوں ہیں ۱۲۷-۱۲۹

— نماز میں رکوع وسجود کی طرح قرآن کی قرات بھی فرض ہے ۱۳۳

— کلام اللہ کی برکت ۵۵۸-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲

— اللہ تعالیٰ قرآن کی آیات اور سورتیں اسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب انھیں نازل کیا جاتا تھا ۴۰۴-۴۰۵

— اس میں کس عمدگی کے ساتھ مختلف اوقات اور حالات میں نازل ہونے والی وحیوں کو مرتب کیا گیا ہے ۳۹۵-۴۰۲-۴۱۰-۴۵۶-۴۵۷

— اس میں سلسلہ کلام سے ہٹ کر کہیں کوئی بے جوڑ بات نہیں کہی گئی ہے ۱۶۸

— اس میں کسی چیز کے متعلق مختلف بیانات باہم متضاد نہیں ہیں ۳۲۰-۳۲۱

— اس کے بیان کردہ حقائق اٹل ہیں کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں ۳۰۲-۳۰۵-۳۰۶

— متشابہات کی تاویل کے بارے میں صحیح مسلک ۷۴-۷۵-۸۶-۸۷-۲۶۹

— اس کے ظاہری مطالب سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ ۴۰۶-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۷-۵۴۹ تا ۵۵۲

— قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کیوں ضروری تھی ۴۱۰-۴۱۲ تا ۴۱۴

— وہ تزکیہ نفس کے کن ذرائع کی نشان دہی کرتا ہے ۱۲۷ تا ۱۲۹ (مزید دیکھو ''تزکیہ نفس'')

— اس کا معیار عزت وشرف ۳۳۰ تا ۳۳۲-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۴۰

— اس کا نیکی اور بدی کا تصور ۳۴۸-۳۵۰ تا ۳۵۵

— اس کی پیشین گوئیاں جو حرف بحرف درست ثابت ہوئیں ۳۶۸-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۸-۳۸۰ تا ۳۸۲-۴۹۲-۴۹۷-۵۲۵

— اس کی معاشی تعلیمات ۶۲-۷۷-۷۸-۸۹-۹۰-۱۳۴-۱۵۴-۱۹۰-۱۹۶-۱۹۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۳۳۰ تا ۳۳۲-۳۳۸-۳۴۰-۳۶۰-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۴۵۸-۴۵۹

— وہ دولت خرچ کرنے کے کن طریقوں کی تحسین اور کن کی مذمت کرتا ہے ۳۴۱ تا ۳۴۳

— اس میں تکرار نزول ۵۰۷-۵۳۱-۵۳۲-۵۴۶-۵۴۷

Maktaba Tul Ishaat.com

__ اس کی بعض سورتوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے ۴۴۸- ۵۰۲- ۵۳۳- ۵۳۴- ۵۵۰- ۵۵۱- ۵۵۷

__ اس کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ۵۱۲

__ اس کی آخری آیات کون سی ہیں ۵۱۲

__ اس میں بہت سے مقامات پر اگرچہ بظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن دراصل مخاطب مسلمان یا کفار یا عام انسان ہیں ۵۷- ۶۶- ۶۷- ۲۰۱- ۴۷۰- ۴۸۱- ۵۰۳- ۵۳۵- ۵۶۳

__ اس میں متعدد مقامات پر ''انسان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد انسانوں کا ایک خاص گروہ ہے ۲۵۶- ۴۲۰- ۴۲۱- ۴۲۹- ۴۳۰- ۴۴۹- ۴۵۰

__ نظام کائنات سے متعلق اس کے بیانات (دیکھو ''کائنات'')

__ تخلیق انسانی سے متعلق اس کے بیانات (دیکھو ''انسان'')

__ قرآنی قسمیں (دیکھو ''اقسام القرآن'')

__ قرآنی تمثیلات (دیکھو ''امثال القرآن'')

__ قرآن کا تاریخ سے استدلال (دیکھو ''قرآنی قصے'')

__ قرآن کا فلسفہ اخلاق ۳۹- ۴۶- ۴۷- ۴۸۱ تا ۴۸۳ (مزید دیکھو ''اخلاقی تعلیمات'')

__ قرآن کا علم النفس ۸۹ تا ۹۲- ۱۲۴- ۱۲۶ تا ۱۲۹- ۱۳۹- ۱۴۲ تا ۱۴۶- ۱۶۳- ۱۶۵ تا ۱۶۷- ۱۸۶ تا ۱۹۰- ۲۳۰- ۲۴۷- ۲۵۴- ۲۵۵- ۲۷۴- ۲۸۰- ۲۹۰- ۳۰۴- ۳۰۵- ۳۱۳- ۳۱۴- ۳۳۰- ۳۳۱- ۳۳۳- ۳۳۸ تا ۳۴۱- ۳۵۱ تا ۳۵۴- ۳۶۰ تا ۳۶۳- ۳۷۰ تا ۳۷۱- ۳۷۸- ۳۷۹- ۳۸۷ تا ۳۸۹- ۳۹۷- ۴۳۱- ۴۴۲- ۴۴۳- ۴۵۸- ۴۵۹- ۴۸۱ تا ۴۸۶- ۵۶۳- ۵۶۴- ۵۷۱ تا ۵۷۳

__ قرآن کی سورتوں اور آیات کا زمانہ نزول متعین کرنے کے اصول ۷۰- ۱۰۸- ۱۰۹- ۱۲۴- ۱۳۸- ۱۸۰ تا ۱۸۲- ۱۶۰- ۲۰۶- ۲۵۰- ۲۵۱- ۲۷۸- ۳۶۸- ۳۸۴- ۴۱۸- ۴۴۰- ۴۸۰- ۴۸۸- ۴۸۹- ۵۱۲- ۵۲۰- ۵۳۰ تا ۵۳۲- ۵۴۶- ۵۴۷

__ کسی واقعے کو کسی آیت کی شان نزول قرار دینے کا مطلب ۱۸۲- ۲۷۸- ۴۱۸- ۴۴۰- ۴۴۱- ۵۳۰ تا ۵۳۲

__ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ۱۸- ۲۷- ۳۳- ۴۴- ۴۹- ۶۸- ۷۲ تا ۷۴- ۷۶- ۸۶- ۸۷- ۹۴- ۱۰۰- ۱۰۱- ۱۰۳ تا ۱۰۵- ۱۱۴- ۱۲۶- ۱۳۱- ۱۴۲- ۱۴۸- ۱۵۶- ۱۸۸- ۱۹۸ تا ۲۰۱- ۲۴۱ تا ۲۴۵- ۲۶۴- ۲۸۸ تا ۲۹۰- ۳۱۱- ۳۱۴- ۳۲۹- ۳۳۳- ۳۳۶- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۵۱- ۳۵۴- ۳۵۶- ۳۶۱- ۳۶۳ تا ۳۶۵- ۳۷۲- ۳۷۸- ۳۸۷- ۳۹۰- ۳۹۸- ۴۰۲ تا ۴۰۵- ۴۱۲ تا ۴۱۴- ۴۲۰- ۴۲۳- ۴۳۵- ۴۴۴- ۴۵۱- ۴۵۴- ۴۷۱- ۴۷۸- ۴۸۳- ۴۸۹- ۴۹۶- ۵۰۵- ۵۰۸-

۵۳۵- ۵۴۱ تا ۵۴۳ -۵۴۸ -۵۵۶-
۵۶۴-۵۶۷-۵۷۰-۵۷۳

__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح قرآن کی تفسیر و تشریح کی ہے (دیکھو ''حدیث'')

__ صحابہ کرامؓ کس طرح قرآن کی تشریح کرتے ہیں ۱۸- ۱۹- ۲۹- ۶۵- ۸۶- ۹۰- ۱۰۱-
۱۱۵- ۱۱۹- ۱۲۹- ۱۳۴- ۲۵۰- ۲۹۶-
۳۱۳-۳۶۵-۴۰۴-۴۶۰

__ فقہاء نے کس طرح قرآن کی تشریح کی ہے (دیکھو ''اصول فقہ'')

__ قرآن کی تفسیر کے صحیح اور غلط طریقے ۳۹-
۸۱- ۱۵۱- ۲۱۰- ۲۲۹- ۳۱۴- ۳۲۶-
۳۵۰- ۳۵۱- ۳۵۴- ۳۸۶- ۳۸۷-
۳۸۸-۴۷۱-۴۷۲-۵۰۴-۵۰۷-۵۷۴

__ قرآن کا مخصوص انداز بیان ۳۰-۳۲- ۴۱-
۴۲-۴۳-۴۷- ۱۱۸- ۱۲۶- ۱۴۲-۱۶۲-
۱۸۵-۲۴۴-۲۵۳-۳۳۸-۳۵۳-۴۰۴

__ مکہ معظمہ کی ابتدائی سورتوں کا مخصوص انداز بیان ۳۸-۱۶۱-۱۸۲-۱۸۳-۴۵۶-۴۵۷

__ قرآن کا مخصوص طرز استدلال ۵۲-۶۴

__ قرآن کا کمال ایجاز ۳۳۶

__ قرآن کی آیات کو ٹھیک سمجھنے کے لیے سیاق وسباق کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے ۲۳-
۱۸۰-۳۱۳-۳۱۴-۳۳۸-۳۳۹-۴۳۰

__ مفسرین قرآن کے درمیان اختلاف کی نوعیت ۹۴- ۱۲۴- ۱۲۸- ۲۰۹- ۳۲۶-
۳۸۶-۴۰۲-۴۲۹

__ قرآن کی اصطلاحات کے معانی ومفہومات
۲۸- ۲۹- ۳۰- ۳۱- ۴۱- ۶۱- ۱۰۰- ۱۱۳-
۱۷۰- ۱۹۸-۳۴۴-۳۵۴-۳۶۲-۳۷۸-
۳۷۹- ۴۰۲- ۴۰۳- ۴۰۵- ۴۱۲-۴۱۶-
۴۳۰- ۴۳۱- ۴۵۱-۴۵۲- ۴۹۲- ۴۹۲ تا ۴۹۶-
۵۰۳-۵۱۷-۵۶۸-۵۷۰

__ قرآن انسان کو بات سمجھانے کے لیے انسانی زبان کے معروف الفاظ اور انداز بیان استعمال کرتا ہے ۷۵-۸۷

__ قرآن انسان کی عقل وفکر سے اپیل کرتا ہے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے ۴۶-
۶۴-۷۹-۳۲۶

__ منکرین کے اس الزام کا جواب کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوچ سوچ کر خود تصنیف فرما رہے ہیں، اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو اکٹھا نازل ہوجاتا ۲۰۱-
۲۰۲

قرآنی دعائیں

__ فرعون کی مومن بیوی کی دعا ۳۴-۶۳

__ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ۹۹ تا ۱۰۲-
۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶

__ روز قیامت مومنین کی دعا ۳۲-۳۳

قرآنی قصے

__ حضرت نوح علیہ السلام ۹۸ تا ۱۰۶

__ حضرت یونس علیہ السلام ۶۷-۶۸

Maktaba Tul Ishaat.com

— قصہ موسیٰ وفرعون ۲۴۰ تا ۲۴۳-۳۰۰-۳۲۹-۳۳۰
— قصہ قوم ثمود ۲۷-۳۷-۳۰۰-۳۲۹-۳۳۰-۳۵۵-۳۵۶
— قصہ قوم عاد ۳۲۸ تا ۳۳۰
— اصحاب الفیل کا قصہ ۴۶۳ تا ۴۶۹-۴۷۰ تا ۴۷۲
— قرآن میں قصے بیان کرنے کا مقصد ۴۷-۱۰۰-۱۳۱-۲۴۰-۲۴۳-۳۰۰-۳۵۶-۴۶۹

قربانی

— اس کا حکم ۴۹۲-۴۹۶

قریش

— ان کی تاریخ، مکہ میں ان کا بسنا، ان کی تجارت کا چمکنا اور عرب کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ قبیلہ بن جانا ۴۷۴-۴۷۵-۴۷۸-۴۷۹
— ان کو جو کچھ بھی نصیب ہوا بیت اللہ کی بدولت ہوا ۴۷۴ تا ۴۷۸
— ابرہہ کے حملے کے وقت انھوں نے بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی ۴۶۶ تا ۴۶۸
— واقعہ فیل کے بعد کئی سال تک وہ صرف اللہ کی عبادت کرتے رہے ۴۶۸
— اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ کیا عقیدہ رکھتے تھے ۵۳۵-۵۳۶
— ان کی اصل گمراہی یہ تھی کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں کی عبادت بھی کرتے تھے ۵۰۳-۵۰۸
— قرآن کی ان کو تلقین کہ صرف اللہ ہی ایک رب اور الٰہ ہے ۵۳۵ تا ۵۴۳
— قرآن کی ان کو دعوت کہ صرف اس خدا کی عبادت کرو جس کے گھر کی بدولت تمھیں یہ نعمتیں نصیب ہوئی ہیں ۴۷۷-۴۷۸
— وہ قرآن کی دعوت کے مقابلے میں سرکشی پر تل گئے ۵۱-۱۳۹-۱۴۰-۲۰۲-۲۵۶-۳۹۸
— ان کی حق سے گریز کی روش کے لیے جانوروں کی مثال ۱۵۱-۱۵۵
— وہ مجرم اور کافر تھے ۵۳-۶۸-۸۱-۹۲-۱۴۶-۲۸۳-۳۰۰-۳۰۵-۵۰۳
— وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے ۵۳
— ان کی گمراہی کا بنیادی سبب خوف آخرت کا فقدان تھا ۱۴۱-۱۵۵-۱۵۶-۲۰۳
— ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف روش ۳۹-۴۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۶-۵۸ تا ۶۰-۶۸-۱۱۹-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۶-۱۴۹-۲۰۱-۲۰۲-۲۵۱-۲۵۲-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۷ تا ۳۹۹-۵۲۰ تا ۵۲۴-۵۴۸-۵۴۹
— حضورؐ کے خلاف ان کی بددعاؤں اور قتل کے منصوبوں کا جواب ۳۹-۴۰-۵۳-۵۴
— ان کا حضورؐ کو دیوانہ قرار دینا ۵۶-۵۸ تا ۶۰
— قرآن سن کر وہ غصے سے آگ بگولا ہو جاتے تھے ۶۸-۱۱۹

— قیامت کا ذکر سن کر وہ حضورؐ کا مذاق اڑاتے تھے ۸۴
— ان کو تنبیہ کہ جس چیز کا تم مذاق اڑا رہے ہو وہ بڑی سخت چیز ہے ۸۴-۸۸-۸۹
— حضورؐ کے تبلیغ شروع کرتے ہی وہ آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے ۹۲-۹۳
— وہ کس طرح مسلمانوں کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے ۲۸۳-۲۸۴
— حضورؐ کا اولین مخالف قریش کا خوش حال طبقہ تھا ۱۳۰
— ان کے بعض سرداروں کے کردار پر قرآن کا تبصرہ ۶۰-۶۱-۱۴۱-۱۴۶ تا ۱۴۸
— ان کا یہ الزام کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود سوچ سوچ کر قرآن تصنیف کر رہے ہیں ورنہ یہ اللہ کی طرف سے ہوتا تو اکٹھا نازل ہو جاتا ۲۰۱-۲۰۲
— ان کو خبردار کیا گیا کہ اسلام کے خلاف ان کی چالوں کے جواب میں اللہ بھی ایک چال چل رہا ہے جس کا نتیجہ عنقریب سامنے آجائے گا ۳۰۵-۳۰۶
— مکہ معظمہ کے حرم میں جانوروں تک کے لیے امن تھا مگر قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرح کے ظلم وستم کو حلال کر رکھا تھا ۳۳۹-۳۴۰
— دین کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصالحت کرنے کے لیے ان کی کوششیں ۵۶-۶۰-۵۰۰-۵۰۱
— حضورؐ کی طرف سے کسی مداہنت و مصالحت کا امکان نہ پا کر وہ پوری طرح آپ کی مخالفت پر تل گئے ۵۴۷-۵۴۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا سوال کہ اپنے رب کا نسب بتایئے ۵۳۰
— ان کے بعض سرداروں کی مخالفت اسلام کے وجوہ ۵۴۸
— قرآن کا ان سے استفسار کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کسی اجر کے طالب نہیں ہیں تو پھر ان کی تبلیغ پر تم اس قدر سیخ پا کیوں ہو رہے ہو؟ ۶۶-۶۷
— ان سے استفسار کہ تمھارے پاس کیا غیب کا علم ہے جس سے تمھیں معلوم ہو گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ ۶۶-۶۷
— ان کو تنبیہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی روش نہ بدلو گے تو تمھاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے جائیں گے ۸۵-۹۲ تا ۹۴
— ان کو تنبیہ کہ رسول کو آج تم بے زور دیکھ کر اس کو دبانے کی کوشش کر رہے ہو مگر ایک وقت آئے گا جب معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے ۱۲۰-۱۲۱
— ان کو تنبیہ کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی تمھاری مدد نہیں کر سکتا ۵۰-۵۱
— ان کو تنبیہ کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تم نے نہ مانی تو فرعون نے بھی اللہ کے رسول کی

Maktaba Tul Ishaat.com

بات نہ مانی تھی، اس کا انجام دیکھ لو ۱۳۱
__ حضورؐ کو تلقین کہ آپؐ کے ساتھ جو بیہودگیاں وہ کر رہے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیں ۱۲۹-۱۳۰
__ قرآن کے خلاف ان کا رویہ ٦١-٦٨-٨١-١٤٧-١٤٨-١٤٩-١٩١-٣٠٠-٣٠٥-٣٠٦
__ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے انھی کے ایک سردار کا کردار پیش کیا جاتا ہے ٥٦-٦٠ تا ٦٢
__ ان کی تنبیہ کے لیے ایک باغ والوں کی مثال ٦١ تا ٦٣
__ قیامت کی تاریخ پوچھنے پر ان کو جواب ٥٢-١٢١-٢٠٦-٢١١-٢٤٠-٢٤٣ تا ٢٤٦-٢٤٧-٢٤٨
__ ان کے انکارِ آخرت کا جواب ٣٢١-٣٢٢
__ ان کا عقیدہ آخرت پر تعجب اور استہزا ٢٢١-٢٢٤-٢٢٥
__ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ کہ انھیں جو دنیوی نعمتیں حاصل ہیں وہ اللہ کے ہاں ان کی مقبولیت کی دلیل ہیں اور ان کے لیے دنیا کی طرح آخرت میں بھی دل پسند انجام ہے ٥٧-٦٤-٦٥-٩٢-٩٣
__ وہ دنیا سے محبت رکھتے تھے اور آخرت کے بھاری دن کو نظر انداز کیے ہوئے تھے ٢٠٣
__ قرآن کے مقابلے میں ان کے ایک سردار کا متکبرانہ رویہ ١٧٥
__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مطالبہ کہ ان میں سے ہر شخص کے نام اللہ کی طرف سے ایک ایک خط آنا چاہیے ١٥٥-١٥٦
__ قوم نوح سے قریش کی مماثلت ١٠٠-١٠٣
__ زمانہ جاہلیت میں قریش کی اخلاقی پستی ٢٦٤-٢٦٥

قسم

__ قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ اللہ نے مقرر کر دیا ہے ١٨
__ ان شاء اللہ کہے بغیر قسم کھا کر یہ نہ کہہ دینا چاہیے کہ میں فلاں کام کروں گا ٦٢
__ زیادہ قسمیں کھانے والا گھٹیا آدمی ہوتا ہے ٦٠-٦١
(قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان کے لیے دیکھو ''اقسام القرآن'')

قیامت

__ اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت ٢٧
__ وہ دن بڑا سخت ہوگا ١٤٦
__ سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ١٩٧
__ بھاری دن ٢٠٣
__ ہنگامہ عظیم ٢٤٦
__ عظیم حادثہ ٤٣٥
__ یوم عظیم ٢٨٠
__ فیصلے کا دن ٢١١-٢١٥-٢٢٨
__ اس کا آنا اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا ١٣١
__ اس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی اور

اس کی سختی سے آسمان پھٹا جاتا ہوگا ۱۳۱

— اس روز زمین جھٹکے پر جھٹکے کھائے گی ۲۳۸-۲۳۹

— قیامت کا نقشہ ۴۷-۷۵-۸۸-۸۹-۹۴-۱۳۰-۱۳۱-۱۶۵ تا ۱۶۷-۱۷۱-۱۷۵-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۴ تا ۲۱۶-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۸-۲۳۹-۲۵۵-۲۶۰-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۷-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۶-۲۸۸ تا ۲۹۰-۳۲۰-۳۲۱-۳۳۲-۴۲۰-۴۲۱-۴۳۴ تا ۴۳۷

— اس کے مراحل ۴۷-۷۵-۱۶۵-۱۶۶-۲۱۱-۲۲۸-۲۳۸-۲۳۹-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۷-۲۷۳-۳۲۰-۴۲۰-۴۳۵-۴۳۶

— اس کے وقوع کا وقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے ۵۲-۱۲۱-۲۴۷

— اس کے وقوع کا وقت دریافت کرنے والوں کو جواب ۸۴-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۱۲۱-۱۶۵-۱۶۶-۱۷۱-۱۷۴-۱۷۵-۲۰۶-۲۱۱-۲۴۰-۲۴۶ تا ۲۴۸-۲۶۳

— وہ ضرور واقع ہوگی اور کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں ہے ۸۶

— اس کا برپا کرنا اللہ کے لیے کیسے مشکل ہوسکتا ہے جب کہ اس نے یہ وسیع و عظیم کائنات اور یہ زمین اس سروسامان کے ساتھ تخلیق کی ۲۴۴ تا ۲۴۶

— اس کے قریب ہونے کا مطلب ۲۳۲-۲۳۳

— اسے کس روز کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے ۲۱۱

— اس روز انسان بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے ۴۳۵-۴۳۶

— قیامت کے وقوع پر خود قیامت اور نفس لوامہ اور کائنات کے کارکن فرشتوں کی قسم ۱۶۲ تا ۱۶۴-۲۳۶-۲۳۸-۲۳۹

— اس دن نوع انسانی کی اگلی پچھلی تمام نسلیں جمع کردی جائیں گی ۲۱۵-۲۴۰-۲۸۰-۴۲۳

— اس روز قبریں کھول دی جائیں گی ۲۷۳

— قیامت برحق ہے اور اس سے خبردار کردیا گیا ہے، اب جو چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کرلے ۲۳۲

— روز قیامت علی الاعلان اس بات کا مظاہرہ کروا دیا جائے گا کہ کون عبادت گزار تھا اور کون نہ تھا ۶۵-۶۶

— اس روز کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا ۷۵

— اس روز اعمال کے پیچھے کام کرنے والی نیتیں، اغراض اور باطنی محرکات بھی بے نقاب کردیے جائیں گے ۳۰۴-۳۰۵-۴۳۱-۴۳۲

— نامہ اعمال لوگوں کے ہاتھ میں دیے جائیں گے ۷۵-۷۶-۲۶۷

— مجرمین نامہ اعمال ملنے سے پہلے ہی یاد کرنا شروع کردیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آئے ہیں ۲۴۶-۲۴۷

— انسان کو سب اگلا پچھلا کیا دھرا بتا دیا جائے گا ۱۶۶-۲۷۳-۲۷۴

Maktaba Tul Ishaat.com

— انسان وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے ۲۳۲-۲۶۷
— مجرمین پچھتائیں گے کہ کاش انھوں نے اس دن کے لیے کچھ پیشگی سامان کرلیا ہوتا ۳۲۲
— جگری دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے ۸۸-۸۹
— مجرم اپنی اولاد، بیوی، بھائی اور قریب ترین خاندان حتیٰ کہ روئے زمین کے تمام انسان بھی فدیے میں دے ڈالے تو یہ تدبیر کسی کام نہ آئے گی ۸۸-۸۹
— انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اولاد سے بھاگے گا اور کسی کو بھی کسی کا ہوش نہ ہوگا ۲۵۹-۲۶۰
— کسی کے لیے کچھ بھی کرنا کسی کے اختیار میں نہ ہوگا ۲۷۵-۲۷۶
(مزید دیکھو ''شفاعت'')
— اس روز فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہوگا ۲۷۵
— اللہ ہی کو معلوم ہوگا کہ کون جزا اور کون سزا کا مستحق ہے ۴۳۱-۴۳۲
— اس روز جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ گہری کھائی میں ڈال دیا جائے گا ۴۳۵ تا ۴۳۷
— مجرمین کا برا حال ہوگا ۹۴-۲۳۹
— وہ دن اہل ایمان کے لیے ہلکا اور کفار کے لیے بھاری ہوگا ۱۴۶-۲۶۰
— مومنین کے چہرے بارونق اور تروتازہ ہوں گے اور مجرمین کے چہرے اداس ہوں گے ۱۷۱-۱۷۲-۱۷۴-۱۹۷-۱۹۸-۲۶۰-۳۲۰-۳۲۱
— عذاب بمعنی قیامت ۸۶-۹۱-۲۳۲
— قیامت ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے خوف ہو ۹۱
— اس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی ۱۹۶
— اس روز کے شر سے اللہ کن لوگوں کو بچا لے گا ۱۹۶-۱۹۷
— اس روز دیدے پتھرا جائیں گے ۱۶۵-۱۶۶
— چاند بے نور کر کے سورج کے ساتھ ملا دیا جائے گا ۱۶۵-۱۶۶-۲۶۳
— پہاڑ چلائے جائیں گے ۲۶۳
— سمندر پھٹ جائیں گے اور بھڑکا دیے جائیں گے ۲۶۴-۲۷۳
— زمین و آسمان کی اس روز کیا حالت ہوگی ۷۴-۸۸-۸۹-۱۳۰-۱۳۱-۲۱۱-۲۲۸-۲۶۷-۲۷۳-۲۸۸-۳۳۲-۴۲۰-۴۲۱-۴۳۵-۴۳۶
(مزید دیکھو ''آسمان'' اور ''زمین'')
— قیامت کے بارے میں قرآن کا مخصوص انداز بیان ۴۷
— اس روز فرشتے آسمان کے اطراف و جوانب

میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے ۷۵
— اس روز اللہ جلوہ فرما ہوگا ۳۳۲-۳۳۳
— اس روز دیدار الٰہی کا شرف کن کو حاصل ہوگا ۱۷۱ تا ۱۷۴-۲۸۱-۲۸۲
— مجرمین اس دن کوئی چال نہ چل سکیں گے ۲۱۶
— اس روز کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور اللہ کے حضور حاضر ہونا پڑے گا ۱۶۶
— مجرمین اپنے لیے موت کی تمنا کریں گے لیکن ان کے لیے پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا ۲۹۰-۳۳۲-۳۳۳
— مجرمین کو اس روز اللہ جیسا عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں ۲۳۲
— اس روز انبیاء گواہی دیں گے ۲۱۱
— انسانی جانیں ان کے دنیوی جسموں سے جوڑ دی جائیں گی ۲۶۴
— زندہ دفن کی ہوئی بچیوں سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئیں ۲۶۴-۲۶۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''جزا و سزا''، ''حشر''، ''شفاعت'' اور ''نامہ اعمال'')

ک

کائنات

— اللہ کائنات اور اس کی ہر شے کا رب ہے ۲۳۱
— وہ کائنات کی سلطنت کا مالک ہے ۲۹۹
— اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں کتنی کتنی اور کیسی مخلوق پیدا کی گئی ہے ۱۵۲
— کائنات ایک منظم اور محکم سلطنت ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص تلاش نہیں کیا جا سکتا ۳۸-۴۱ تا ۴۴-۳۲۴-۳۲۶ تا ۳۲۸--۵۸۰ تا ۵۸۲
— کائنات میں کہیں ٹھیراؤ نہیں، ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہے ۲۹۱
— کائنات کی ہر چیز کو درست اور راست پیدا کیا گیا ہے ۳۱۰-۳۱۱
— انسان کو حقیقت سے باخبر کرنے کے لیے کائنات میں ہر طرف بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں ۱۸۹
— کارکن فرشتوں کے ذریعے کائنات میں احکام الٰہی پر عمل ہو رہا ہے ۲۳۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آسمان'' اور ''زمین'')

کتاب

— انسان کی صحیح رہنمائی کے لیے کتابیں بھیجی گئیں ۱۹۰
— اللہ کی کتابوں کی تعلیمات ہمیشہ ایک ہی رہی ہیں ۳۱۵
— کتاب کے ساتھ رسول کی بعثت کیوں ضروری ہے ۴۱۰-۴۱۲ تا ۴۱۴
— اللہ کی آیات کا انکار عذاب الیم کا موجب ہے ۲۳۰

Maktaba Tul Ishaat.com

— اللہ کی کسی کتاب میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ دنیا پرست کافروں کے لیے آخرت میں وہی انجام ہے جو وہ خود چاہتے ہیں ۵۷-۶۴-۶۵
— جن بھی انھی کتابوں پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں جو انسانوں کے درمیان انبیاء پر نازل ہوئی ہیں ۱۱۴

کراماً کاتبین:
— ان کی صفات اور ان کا کام ۷۴-۷۵-۷۶ (مزید دیکھو ''فرشتے'')

کفر
— معنی و مفہوم ۴۱۲-۴۱۶-۵۰۳
— کون لوگ کافر ہیں ۵۳-۶۸-۸۱-۹۲-۱۰۵-۱۴۶-۳۰۰-۳۰۵-۴۱۵-۴۱۶-۵۰۳
— کفر کے ہولناک نتائج ۳۸-۴۳-۴۴ تا ۴۶
— کافروں کا انجام بد ۳۰-۳۳-۴۳-۴۴-۱۹۰-۱۹۱-۲۳۲-۲۶۰-۳۰۰
— کفار کے معاملے میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی مثال ۳۳-۳۴
— کفر کرنے والے بدترین خلائق ہیں ۴۱۵-۴۱۶
— کافروں کے لیے وہ عذاب ہے جسے دفع کرنے والا کوئی نہیں ۸۶
— کفار کے مذاہب چاہے ایک نہ ہوں لیکن وہ سب ایک ملت ہیں ۵۰۸
— کفار کو اللہ کے دردناک عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا ۵۳
— روز قیامت کفار کے لیے بہت بھاری ہوگا ۱۴۶-۲۶۰
— کفار کو کفر سے نکالنے کے لیے روشن دلیل بھیج دی گئی ہے، اب بھی جو کفر پر قائم رہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی ۴۱۳-۴۱۴
— اللہ تعالیٰ نے نبی کو بھیج کر کفر کے ہولناک نتائج سے خبردار کر دیا ہے ۳۸-۳۹-۴۴ تا ۴۶
— انسان کو صحیح راستہ دکھا دیا گیا ہے خواہ وہ کفر کرنے والا بنے یا شکر کرنے والا ۱۸۶-۱۸۸-۱۹۰
— کفار آخرت میں سجدہ کرنا چاہیں گے مگر نہ کرسکیں گے ۶۵
— رب سے کفر کرنے کا مطلب ۴۳-۴۴
— کسی بات کو کافروں کے لیے فتنہ بنانے کا مطلب ۱۴۹-۱۵۰
— کفار کی کوئی نیکی کسی کام نہ آئے گی ۴۳۶-۴۳۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے ساتھ جہاد کرنے اور سختی سے پیش آنے کی ہدایت ۳۳

کوثر
— معنی و مفہوم ۴۹۲ تا ۴۹۶
— حوض کوثر ۴۹۳ تا ۴۹۵
— کون خوش قسمت اس سے پانی پینے کے حق دار ہوں گے ۴۹۴-۴۹۵

— جنت کی نہر کوثر کی کیفیت ۴۹۵

گ

گمراہی

— دیکھو ''ضلالت''

ل

لعنت

— کن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے ۴۶-۲۵۶

لوط، علیہ السلام

— ان کے ساتھ تعلق ان کی بیوی کے کسی کام نہ آیا ۱۳-۳۳-۳۴

— ان کی بیوی کس معنی میں خیانت کی مرتکب ہوئی ۳۳-۳۴

— کافروں کے معاملے میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال ۳۳-۳۴

— قوم لوط نے انکار آخرت کیا اور رسول کو جھٹلایا ۳۷

— اس پر عذاب کی کیفیت ۳۷

م

ماریہ قبطیہؓ

— ان کے بطن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم پیدا ہوئے ۱۰-۱۶-۱۷

متشابہات - دیکھو ''قرآن''

محمد، صلی اللہ علیہ وسلم

— جس سال اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ ہوا اسی سال آپؐ کی ولادت ہوئی ۴۶۹

— آپؐ کے ابتدائی حالات ۳۷۲-۳۷۳-۳۷۸-۳۸۰-۳۹۶

— آپؐ نبوت سے پہلے عربوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے ۳۷۸-۳۸۰

— نبوت سے پہلے آپؐ کا عقیدہ و اخلاق ۳۹۲ تا ۳۹۴-۳۹۶

— آپؐ پر نزول وحی کی ابتدا ۱۳۸-۱۳۹-۳۹۲ تا ۳۹۴-۳۹۶-۳۹۷

— آپؐ کو علانیہ رسالت کے فرائض انجام دینے کا حکم ۱۳۹-۱۴۲ تا ۱۴۶

— نبوت کے بعد سب سے پہلے آپؐ کی نماز سے قریش کے لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ کا دین ان کے دین سے مختلف ہوگیا ہے ۳۹۴-۳۹۵-۳۹۷ تا ۳۹۹

— نماز پڑھنے پر ابوجہل کی آپؐ کو دھمکیاں ۳۹۴-۳۹۵-۳۹۷ تا ۳۹۹

— اعلان نبوت کا حکم ملنے کے بعد آپؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ دعوت اسلام دی ۵۲۱

— آپؐ کے اعلان نبوت کے بعد اولین حج کے موقع پر قریش کا باہم مشورہ کہ آپؐ کو کس طرح بدنام کیا جائے ۱۳۹-۱۴۰-۱۴۶

— مکہ میں اول اول آپؐ کی تبلیغ کے بنیادی نکات کیا تھے ۲۲۰-۲۲۱

— دعوت حق شروع کرتے ہی آپؐ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۳۷۶۱

— قرآن آپؐ کو کس طرح پیش کرتا ہے ۱۰-۱۱-۱۵-۵۰-۵۲-۵۸ تا ۶۰-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۶-۱۲۷-۲۴۷-۲۴۸-۲۵۳-۳۱۳-

Maktaba Tul Ishaat.com

۳۲۲-۳۷۰ تا ۳۷۴-۳۷۸ تا ۳۸۲-۴۹۶

— رسول کریمؐ ۸۷

— نذیر مبین ۵۲

— آپؐ اللہ کے بندے ہیں ۱۱۹-۳۹۸

— آپؐ اللہ کے رسول ہیں ۴۱۳

— آپؐ کو کن معنوں میں گواہ بنایا گیا ۱۳۱

— آپؐ کی رسالت کے دلائل ۱۵۰-۳۹۳-۳۹۴-۴۱۳-۴۱۴-۴۸۳-۵۵۵

— آپؐ کی تشریعی حیثیت ۱۶۷-۱۶۹-۱۷۰-۳۱۱

— حلال و حرام کے حدود بطور خود مقرر کر لینے کے آپؐ کے اختیارات نہ تھے ۱۰-۱۵-۲۰

— قرآن کے احکام وتعلیمات کی جو تشریح آپؐ نے اپنے قول وفعل سے کی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی ۱۶۷-۱۶۸ تا ۱۷۱

— جب حضورؐ دعوت حق لے کر اٹھے اس وقت دنیا میں اللہ کی ذات کے متعلق کیا تصورات پائے جاتے تھے ۵۳۲

— آپؐ کی کامیابی کے بارے میں قرآن کی پیشین گوئیاں ۳۶۸-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۸-۳۸۰ تا ۳۸۲-۴۹۲-۴۹۷

— آپؐ دعوت حق کے معاملے میں کسی مداہنت و مصالحت سے ہرگز کام نہ لیتے تھے ۵۲۱-۵۲۲-۵۲۴

— دعوت حق کی شدید مشکلات میں آپ کو تسلی اور یقین دہانی کہ اللہ تعالیٰ عنقریب بہتر حالات پیدا کر دے گا ۳۶۸-۳۷۰ تا ۳۷۲-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۹-۳۸۲-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۲

— آپؐ کا اولین مخالف قریش کا خوش حال طبقہ تھا ۱۳۰

— قریش کی یہ کوشش کہ آپؐ دین کے معاملے میں ان سے مصالحت فرمالیں ۵۰۰-۵۰۱

— آپؐ کو تمام کافروں کے کفر اور ان کے معبودوں سے بیزاری، لاتعلقی اور برات کا اعلان کرنے کی تلقین ۵۰۳-۵۰۵-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹

— آپؐ کے لیے تبلیغ دین کا آسان طریقہ مقرر فرمایا گیا ۳۱۳-۳۱۴

— آپؐ کو اللہ کی بڑائی کا اعلان کرنے اور مزاحم قوتوں کی پرواہ نہ کرنے کی تلقین ۱۴۲-۱۴۳

— تمام مخالفتوں کے مقابلے میں اپنے رب کی خاطر صبر کرنے کی تلقین ۸۷-۸۸-۱۴۲-۱۴۵-۲۰۱

— آپؐ کو بدعمل اور منکر حق لوگوں کے دباؤ میں نہ آنے اور ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دینے کی تلقین ۶۶-۲۰۳

— آپؐ کو قریش کی مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تدبیر بتائی گئی ۸۱-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶ تا ۱۲۹-۲۰۲-۲۰۳-۳۷۷-۳۷۸-۳۸۴-۳۹۹

— آپؐ کو سب سے کٹ کر اللہ کے ہوجانے، مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کرنے اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہوجانے کی تلقین ۵۷-۶۷-۶۸-۸۵-۹۴-۱۲۵-۱۲۹-۱۳۰

— نبوت کی ذمہ داری اگرچہ بہت بڑی تھی اور خلق خدا پر احسان عظیم تھا لیکن آپ کو اپنے دل میں کسی قسم کی بڑائی کا خیال تک نہ لانے کی تلقین ۱۴۲-۱۴۵

— آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے کیسی کامیابیاں کن کن ذرائع سے نصیب فرمائیں ۳۷۲-۳۷۳-۳۷۸-۳۸۰ تا ۳۸۲

— آپؐ کو آخرکار فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی ۵۱۴-۵۱۶

— مکمل فتح کے بعد آپؐ کو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرنے اور مغفرت طلب کرنے کا حکم ۵۱۶-۵۱۷

— نزول وحی سے ایک لمحہ قبل تک آپ بے خبر تھے کہ اللہ آپؐ کو اپنا نبی بنائے گا ۳۹۳-۳۹۴

— نزول وحی کے وقت آپؐ کی کیفیت ۱۲۸

— آپؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کا نزول ہوتا تھا ۱۴-۲۱-۱۶۹-۳۹۸

— آپؐ اپنی طرف سے وحی میں کسی کی بیشی کے مختار نہ تھے ۸۰-۸۱

— آپؐ کا ذریعہ علم وحی تھا ۱۱۳

— آپؐ کی پیغمبرانہ جرات کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوتا آپؐ اسے بے جھجک لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ۱۵۰

— نبوت کے ابتدائی زمانے میں آپؐ نزول وحی کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش فرماتے تھے، مگر آپ کو اطمینان دلا دیا گیا کہ آپ وحی کا ایک لفظ بھی نہ بھولیں گے ۱۶۰-۱۶۷ تا ۱۷۱-۳۰۸-۳۱۳-۳۱۴

— قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آپؐ پر نازل ہوا اسی طرح معجزانہ طور پر آپؐ کے حافظے میں محفوظ کر دیا گیا ۳۱۴

— آپؐ کو تسلی دی گئی کہ اللہ آپؐ کو کیسے چھوڑ سکتا ہے، وہ تو روز پیدائش سے آپؐ پر مہربان ہے ۳۶۹-۳۷۰-۳۷۲ تا ۳۷۴

— آپؐ ناواقف راہ تھے، اللہ نے آپؐ کو راستہ بتایا ۳۷۲-۳۷۳

— آپؐ یتیم تھے، اللہ نے آپؐ کی خبرگیری کا انتظام کیا ۳۷۲

— آپؐ نادار تھے، اللہ نے آپؐ کو مال دار کیا ۳۷۳-۳۷۴

— آپؐ کو تین عظیم نعمتیں عطا کی گئیں ۳۷۶-۳۷۸ تا ۳۸۲

— آپؐ کو شرح صدر عطا کیا گیا ۳۷۸-۳۷۹

— آپؐ پر سے وہ بوجھ اتار دیا گیا جو آپؐ کی کمر توڑے ڈالتا تھا ۳۷۸-۳۸۰

— اللہ نے آپؐ کے ذکر کا آوازہ تمام عالم میں

Maktaba Tul Ishaat.com

بلند کر دیا ۳۷۸-۳۸۰ تا ۳۸۲
— آپؐ کو کوثر عطا کیا گیا ۴۹۲ تا ۴۹۶
— آپؐ کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کے جواب میں آپؐ کو کیا کرنا چاہیے ۳۷۳-۳۷۴
— کیا شرح صدر شق صدر کا ہم معنی ہے؟ ۳۷۹-۳۸۰
— آپؐ کی حیات طیبہ کے تمام اعمال و افعال سراسر حق ہیں اور اللہ کی مرضی کے مطابق ہیں ۱۱
— آپؐ کے افعال کی نگرانی اللہ تعالیٰ خود فرماتا تھا ۱۱-۱۷
— آپؐ کو کفار سے جہاد کرنے اوران کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی ہدایت ۳۳
— آپؐ نبوت کے کام پر دنیا سے اجر کے طالب نہ تھے ۶۶
— آپؐ کسی کے لیے نفع و نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتے ۱۱۹
— آپؐ کا کام اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچا دینا تھا، نافرمانوں کو سزا دینا اللہ کا کام ہے ۱۲۰
— آپؐ کی دعوت ایک نصیحت ہے جو چاہے اسے قبول کرے ۵۲-۱۳۱-۱۳۲-۱۵۶-۲۰۳-۲۴۷-۲۵۴-۲۵۵-۳۲۲
— جو کوئی آپؐ کی دعوت سے انکار کرے گا اس کے لیے بھاری سزا مقرر کی گئی ہے ۳۳۲
— اگر کوئی ہدایت قبول نہیں کرتا تو آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۲۵۴
— آپؐ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے راہ راست بتانے کی ذمہ داری پوری کر دی ۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴
— آپؐ کو تلقین کہ جو شخص دنیوی مال و دولت کے غرور کی بنا پر ہدایت قبول کرنے سے انکار کرے اسے کوئی اہمیت نہ دیں ۲۵۴-۲۵۵
— آپؐ کی نصیحت کو جھٹلانے والا انتہائی بدبخت ہے اور اس کے لیے انجام بد مقدر ہے ۳۱۳-۳۱۵
— آپؐ راہ راست پر تھے اور پرہیزگاری کی طرف دعوت دیتے تھے ۳۹۸
— آپؐ کو جھٹلانا اور آپؐ پر ایمان نہ لانا کفر ہے ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ پر ایمان نہ لانے والے بدترین خلائق ہیں ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ کو جادوگر قرار دیا گیا ۱۴۰-۱۴۶
— آپؐ کو دیوانہ و مجنون کہا گیا ۵۶-۵۸-۵۹-۶۰-۶۸-۲۶۹
— قرآن اور آپؐ کے اخلاق بجائے خود ان لوگوں کے الزام کی تردید کے لیے کافی ہیں جو آپؐ کو مجنون کہتے تھے اور کہتے ہیں ۵۸-۵۹
— آپؐ پر کاہن اور شاعر ہونے کے جھوٹے الزامات ۷۸ تا ۸۰

— آپؐ کے لیے اجر کا ایسا سلسلہ ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے ۵۸-۵۹
— آپؐ اخلاق کے بڑے مرتبے پر تھے ۵۸ تا ۶۰
— آپؐ کا اخلاق اور جذبہ رحم ۵۹-۶۰-۲۶۵-۴۸۲
— حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ نے آپؐ کا کیا اخلاق بیان کیا ہے ۵۹-۶۰-۳۹۳-۳۹۴
— آپؐ نے قرآن پیش ہی نہیں کیا بلکہ مجسم قرآن بن کر دکھایا ۵۹
— اعلان نبوت کا حکم دینے کے ساتھ آپؐ کو کیا ہدایات دی گئیں ۱۴۲ تا ۱۴۵
— واقعہ تحریم ۱۵ تا ۱۷ (مزید دیکھو ''تحریم'')
— آپؐ کی خانگی زندگی کی بعض پیچیدگیاں جن کو رفع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے براہ راست مداخلت فرمائی ۲۲ تا ۲۹
(مزید دیکھو ''ازواج مطہرات'')
— ایک نابینا سے بے رخی برتنے پر آپؐ کو تنبیہ ۲۵۰-۲۵۱۔
(مزید دیکھو ''ابن ام مکتومؓ'')
— آپؐ پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ اور اس سلسلے میں قدیم و جدید اعتراضات کا جواب ۵۵۲ تا ۵۵۶ (مزید دیکھو ''جادو'' اور ''جھاڑ پھونک'')
— اللہ آپؐ کا مولیٰ ہے اور اس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور فرشتے آپؐ کے ساتھی اور مددگار ہیں ۱۸-۲۵-۲۶
— آپؐ کی بعثت کے ساتھ ہی عالم بالا میں انتظامات سخت کر دیے گئے تھے اور شیاطین جن کی رسائی ناممکن بنا دی گئی تھی ۱۰۹-۱۱۵-۱۱۶
— قرآن کے ساتھ آپؐ کی بعثت کیوں ضروری تھی ۴۱۰-۴۱۲ تا ۴۱۴
— مخالفین کا آپؐ پر قرآن خود تصنیف کر لینے کا الزام ۲۰۱-۲۰۲
— دشمن آپؐ کو ابتر کہتے تھے مگر اللہ نے فیصلہ فرما دیا کہ وہ خود ابتر ہو کر رہیں گے ۴۹۲-۴۹۷
— آپؐ کے دو صاحبزادوں کی وفات پر دشمنوں کا خوشیاں منانا ۴۹۰
— آپؐ کی دعوت اور آپؐ کی ذات سے ابولہب اور اس کی بیوی کی دشمنی ۵۲۰ تا ۵۲۴
(مزید دیکھو ''ابولہب'')
— آپؐ کو ہر قسم کے شرور سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تلقین ۵۶۳ تا ۵۷۰-۵۷۱ تا ۵۷۴
— آپؐ نے حضرت جبریلؑ کو روشن افق پر دیکھا ۲۶۹
— آپؐ کو قریش کا رفیق کن معنوں میں کہا گیا ہے ۲۶۹
— غیب کے جو علوم آپؐ کو عطا کیے جاتے تھے انھیں بندوں تک پہنچانے میں آپؐ ہرگز بخیل

Maktaba Tul Ishaat.com

نہ تھے ۲۷۰
__ آپؐ کو نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کی تلقین ۴۹۲-۴۹۶
__ آپؐ کا آخری خطبہ حجۃ الوداع ۵۱۲-۵۱۳
__ سورۂ نصر کے نزول سے آپؐ کو معلوم ہو گیا تھا کہ دنیا میں آپ کا کام مکمل ہو گیا ہے اور وفات کا وقت قریب ہے ۵۱۲ تا ۵۱۴
__ آخر زمانے میں آپؐ نے پہلے سے زیادہ عبادت میں مشقت اٹھانی شروع کر دی ۵۱۴-۵۱۵

مریم، علیہا السلام
__ عمران کی بیٹی مریمؑ ۳۴
__ ان کی صفات ۳۴
__ ان کا مرتبہ عظیم کہ اللہ کی ڈالی ہوئی سخت آزمائش میں وہ پوری اتریں ۱۴-۳۴-۳۵
__ اللہ تعالیٰ نے ان کے رحم میں اپنی طرف سے براہ راست وہ روح پھونکی جس سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے ۳۴-۳۵
__ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش حضرت مریمؑ کے کسی گناہ کا نتیجہ تھی ۳۴-۳۵
__ اہل ایمان کے معاملے میں حضرت مریمؑ کی مثال ۳۴-۳۵
__ انھوں نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی ۳۴

مستشرقین
__ ان کے اعتراضات کے جوابات ۵۹-۱۴۶-۵۴۹ تا ۵۵۲-۵۵۳ تا ۵۵۶

مسجد
__ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، ان میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے ۱۱۹

مسکین
__ مسکینوں کے حقوق ۳۳۱-۴۸۱-۴۸۳
(مزید دیکھو ''حقوق العباد'' اور ''قانون اسلام''، ''بنیادی حقوق'')

معجزہ
__ حضرت موسیٰؑ کو بڑا معجزہ دیا گیا ۲۴۱-۲۴۲
__ حضرت صالحؑ کی اونٹنی ۳۵۵
__ اصحاب الفیل کی تباہی ۴۶۷-۴۶۸

معوذتین
__ ان کا موضوع اور مضمون ۵۴۷
__ ان کے زمانہ نزول سے متعلق مباحث ۵۴۶-۵۴۷
__ ان کے درمیان گہرا تعلق ۵۴۶
__ ان کی قرآنیت کے بارے میں مخالفین اسلام کے ڈالے ہوئے تمام شبہات کا ازالہ ۵۴۹ تا ۵۵۲
__ ان کی سورہ فاتحہ سے مناسبت ۵۶۲

مغفرت
__ کن کے لیے ہے ۴۶
__ اللہ سے مغفرت طلب کرنے کی ہدایت ۱۳۴-

٥١٦-٥١٧
— اللہ سے استغفار کی فضیلت ١٠٠-١٠١
— تقویٰ کرنے والوں کے قصور اللہ معاف فرما دیتا ہے ١٥٦-١٥٧
— اللہ کن گناہوں سے درگزر فرماتا ہے ٩٨

مکہ
— عرب میں اس کی اہمیت ٣٣٨-٣٨٦-٣٨٧-٤٦٣ تا ٤٦٨-٤٧٤ تا ٤٧٨

ملائکہ۔(دیکھو "فرشتے")

منافقین
— ان کی صفات ٤٨١-٤٨٤-٤٨٥
— ان کی شرانگیز حرکتیں ٤٨٠
— منافقت کی اصل جڑ شک ہے جس کو قرآن میں دل کی بیماری کہا گیا ہے ١٥٠-١٥١
— کس قسم کی آزمائشیں دل کی اس بیماری کا راز فاش کر دیتی ہیں ١٤٩-١٥٠-١٥١
— حضورؐ کو منافقین سے جہاد کرنے اور ان سے سختی سے پیش آنے کا حکم ٣٣
— منافقین کا انجام بد ٣٣
— وہ آخرت میں نور سے محروم رکھے جائیں گے ٣٣

منکرین آخرت
— ان کے دلائل کا ابطال:
(١) وحی خفی سے متعلق ١٤-٢١-١٦٩-٣٩٨ (مزید دیکھو "وحی")
(٢) جنوں سے متعلق ١٠٩ تا ١١١۔(مزید دیکھو "جن")
(٣) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت سے متعلق ١٦٩-١٧٠
(٤) سنت کی قانونی و آئینی حیثیت سے متعلق ١٧٠-١٧١
(٥) حضورؐ پر جادو کے اثر سے متعلق ٥٥٢ تا ٥٥٧

موت
— انسان موت کے معاملے میں اپنے خالق کے آگے بے بس ہے ٢٥٦-٢٥٧
— دنیا میں آدمی نے خواہ کتنا ہی مال سمیٹا ہو مرنے کے بعد وہ اس کے کسی کام نہیں آسکتا ٣٦٢-٣٦٣-٤٥٨-٤٥٩
— موت رب کی طرف روانگی کا وقت ہے ١٧٤
— اللہ کا مقرر کردہ وقت جب بھی آجاتا ہے اسے ٹالا نہیں جاسکتا ٩٩-١٧٤-١٧٥
— موت و حیات کو اللہ نے انسان کا امتحان لینے کے لیے ایجاد کیا ہے ٤١
— زندگی وہ وقت ہے جو انسان کو امتحان کے لیے دیا گیا ہے اور موت کے ساتھ یہ وقت ختم ہو جاتا ہے ٤١-٤٢-٤٤٩-٤٥٠
— موت کے وقت فرشتے کس طرح جان نکالتے ہیں ١٧٤-١٧٥-٢٣٨
— افراد کی طرح اقوام کے لیے بھی ایک مدت

Maktaba Tul Ishaat.com

حیات مقرر ہے جس کے خاتمے کا وقت جب آجاتا ہے تو ٹالا نہیں جا سکتا ۹۹
— انسان پر موت کے ساتھ ہی یہ بات کھل جاتی ہے کہ وہ نیک بخت کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بدبخت کی حیثیت سے ۷۶-۱۷۴-۱۷۵

موسیٰ، علیہ السلام
— قصہ موسیٰ و فرعون ۲۴۰ تا ۲۴۳
— آپؑ کو طویٰ کی مقدس وادی میں منصب رسالت سونپا گیا ۲۴۰-۲۴۱
— آپؑ نے فرعون کو کس چیز کی دعوت دی ۲۴۱
— آپؑ محض بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے فرعون کے پاس نہیں گئے تھے ۲۴۲
— حضرت موسیٰؑ کی دعوت حق کا مقابلہ فرعون نے کس طرح کیا ۲۴۲-۲۴۳
— فرعون اور اس کی قوم سے بالکل مایوس ہونے کے بعد آپؑ نے انھیں بددعا دی ۱۰۴-۱۰۵
— صحف موسیٰؑ کا حوالہ ۳۱۵-۳۱۶

ن

نامہ اعمال
— انسان کے اعمال گن گن کر لکھ رکھے گئے ہیں ۲۲۲-۲۲۹-۲۳۰
— انسان پر نگراں مقرر ہیں اور معزز کاتب اس کا ہر فعل ریکارڈ کر رہے ہیں ۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶
— بدکار لوگوں کے اعمال بد پہلے ہی جرائم پیشہ افراد کی کتاب میں درج ہو رہے ہیں ۲۸۰-۲۸۱
— نیک لوگوں کے اعمال بلند پایہ لوگوں کے رجسٹروں میں درج ہو رہے ہیں جن کی حفاظت مقرب فرشتے کرتے ہیں ۲۸۲
— انسان کی ذرہ برابر بھی نیکی یا بدی نامہ اعمال میں درج ہونے سے رہ نہ جائے گی ۴۲۴-۴۲۶
— اللہ تعالیٰ اگرچہ خود انسان کے اعمال جانتا ہے لیکن انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس کی عدالت میں بے شمار ذرائع سے ناقابل انکار شہادتیں فراہم کی جائیں گی ۴۶-۴۷-۲۹۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۳۱-۴۳۲
— انسان کا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا اور دلوں کی نیتوں اور ارادوں تک کی جانچ پڑتال ہوگی ۷۵-۳۰۴-۴۳۱-۴۳۲
— زمین اللہ کے حکم سے انسان کے قول و فعل کی گواہی دے گی ۴۲۰-۴۲۱ تا ۴۲۳
— قیامت کے روز نامہ اعمال کھولے جائیں گے اور انسان کو اس کا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا ۱۶۶-۲۶۴-۲۶۷-۲۷۳-۲۷۴
— اللہ کی عدالت میں فیصلہ کس بنیاد پر ہوگا ۴۴-۴۷-۴۳۵ تا ۴۳۷
— جن کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا ان کی خوش بختی ۷۵-۷۶-۷۷-۲۸۹-۲۹۰

— جن کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا ان کی بدبختی ۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۲۹۰
— دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پانے والے اپنی خوش قسمتی کی وجہ کیا بیان کریں گے ۷۵-۷۷
— بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پانے والوں کی بدبختی کی وجہ ۷۶-۷۷-۷۸-۲۹۰
— میدان حشر میں نامہ اعمال ملنے سے پہلے ہی مجرمین کو اپنے کرتوت اور جرائم یاد آنے لگیں گے ۲۴۶-۲۴۷

نبوت

— نبوت و رسالت کی اہمیت ۴۴- ۳۴۸- ۳۴۹-۳۵۵-۳۵۶
— انبیاء اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کرتے ہیں ۹۸ تا ۱۰۲-۱۴۲-۱۴۳-۲۴۱-۲۴۲
— نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد نبی کا پہلا کام ۳۹۴
— نبوت پر مامور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کیا اخلاقی اوصاف اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے ۱۴۲ تا ۱۴۵
— دعوت حق شروع کرتے ہی نبی کو کن حالات سے سابقہ پیش آتا ہے ۳۷۶
— انسانی معاشرے میں نبی کا صحیح مقام ۱۰- ۱۱- ۱۲- ۱۵
— نبی کی عزت کا قرآن نے کیا تصور پیش کیا ہے ۱۱-۱۲
— منصب رسالت اگرچہ بہت بڑا درجہ ہے اور خلق خدا پر احسان عظیم، لیکن نبی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دل میں کس قسم کی بڑائی کا خیال تک نہ لائے ۱۴۲- ۱۴۵
— نبیؐ کی صفات حمیدہ ۵۸ تا ۶۰
— انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو فطری رہنمائی ودیعت فرمائی ہے اسی کو صاف اور واضح صورت میں پیش کرنے کے لیے انبیاء بھیجے گئے ۱۹۰- ۳۵۵
— کتاب کے ساتھ رسولؐ کی بعثت کیوں ضروری ہوتی ہے ۴۱۰- ۴۱۲ تا ۴۱۴
— ایک نبی اور عام دنیوی رہنما میں فرق ۵۱۴
— اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر کفر کے ہولناک نتائج سے خبردار کر دیا ہے ۳۸- ۳۹- ۴۴ تا ۴۶- ۹۸
— نبی کے مقابلے میں گمراہی پر اصرار کرنے والوں کی روش ۴۵- ۴۶- ۵۶- ۵۸ تا ۶۱- ۶۸- ۷۸ تا ۸۰- ۹۹- ۱۰۰- ۱۰۳- ۱۰۴- ۱۴۰- ۱۴۶- ۱۴۷- ۱۴۸- ۱۵۵- ۲۰۱- ۲۰۲- ۲۶۹- ۳۵۵- ۳۵۶
— انبیاء کو جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہی اصل گمراہی ہے ۴۶- ۴۱۵
— اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والی قوموں کا انجام بد ۵۰- ۴۲- ۴۳- ۴۷- ۱۲۰- ۱۳۰- ۱۳۱- ۱۷۵- ۲۴۰ تا ۲۴۳- ۳۰۰- ۳۵۶- ۳۶۴- ۳۶۵
— رسول اسی قوم میں سے ہوتا ہے جس کی طرف

Maktaba Tul Ishaat.com

وہ بھیجا جاتا ہے ۹۸
— نبی قوم کا بھلا چاہتا ہے اور اسے اللہ کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے ۹۹
— نبی جب کسی قوم میں آجاتا ہے تو اس قوم کا انجام اس بات پر منحصر ہو جاتا ہے کہ وہ ایمان لاتی ہے یا نہیں ۹۹
— اگر کوئی ہدایت قبول نہیں کرتا تو نبی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ۲۵۴
— نبی کی دعوت ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے قبول کر لے ۵۲- ۱۳۱- ۱۳۲- ۱۵۶- ۲۴۷-۲۵۴-۲۵۵-۳۲۲
— اللہ کے رسول لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے ۶۶
— نبی کا کام صاف صاف خبردار کر دینا ہے ۵۲-۹۸-۱۲۰-۱۵۶-۲۴۷
— تمام مخالفتوں کے جواب میں انبیاء کو اللہ کی پناہ مانگنے اور صبر کرنے کی تلقین کی گئی ۶۷-۶۸-۸۷-۸۸-۱۴۲-۱۴۵-۲۰۱-۲۰۲-۵۴۸-۵۶۳-۵۷۱
— انبیاء کے مقابلے میں ان کی قوموں نے ان رئیسانِ قوم کی پیروی کرنا پسند کیا جو دولت و جاہ پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے تھے ۱۰۳-۱۳۰
— انبیاء کو جھٹلانے والے قیامت کے روز اقرار کریں گے کہ انھوں نے جان بوجھ کر جھٹلایا تھا ۴۴-۴۵
— نبی اپنی قوم کو اسی حالت میں بددعا دیتا ہے جب وہ اس سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور یہ بددعا منشائے الٰہی کے عین مطابق ہوتی ہے ۱۰۴-۱۰۵
— انبیاء کو کن معنوں میں گواہ بنایا گیا ہے ۱۳۱-۲۱۱
— رسولوں کی دعوت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے ۳۱۵-۴۱۳-۴۱۵
— نبی کی ذات پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے مگر اس کی نبوت اس سے غیر متاثر رہتی ہے ۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶
— نبی کو وحی میں کسی کی بیشی کا اختیار نہیں ہوتا، اگر وہ ایسا کرے تو اسے فوراً سزا دے دی جائے ۸۰-۸۱
— اس استدلال کی غلطی کہ کسی مدعی نبوت کی رگِ گردن اگر فوراً نہ کاٹ دی جائے تو یہ اس کے سچے نبی ہونے کی دلیل ہے ۸۰-۸۱
— اللہ کو جب کوئی نبی مبعوث کرنا ہوتا ہے تو عالم بالا میں حفاظتی اقدامات غیر معمولی طور پر سخت کر دیے جاتے ہیں ۱۰۹- ۱۱۰- ۱۱۱-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۲۱
— انبیاء بذات خود عالم الغیب نہیں ہوتے ۱۲۱
— اللہ رسول کو غیب کے علم میں سے وہی علم دیتا ہے جو منصب رسالت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہوتا ہے ۱۲۱-۱۲۲

__ اس علم کی حفاظت کے لیے رسول کے آگے پیچھے محافظ لگا دیے جاتے ہیں ۱۲۱-۱۲۲

__ اس علم کو بندوں تک پہنچانے میں نبی بخل نہیں کرتا ۲۷۰

__ اللہ نے اس امر کا انتظام کر رکھا ہے کہ فرشتے رسول تک اور رسول بندوں تک بلا کم و کاست اس کا پیغام پہنچا دیں، اور اس میں کوئی رد و بدل نہ ہونے پائے ۱۲۱-۱۲۲

__ نبی میں یہ پیغمبرانہ عزیمت ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی اس پر نازل ہوتا ہے اسے وہ بے جھجک پیش کر دیتا ہے ۱۵۰

__ نبی تک کو اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور اس کے لیے اللہ کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ۱۱۹-۱۲۰

__ اللہ کے رسولوں کو بھی قیامت کے وقوع کی تاریخ کا علم نہیں ہوتا ۱۲۱-۲۴۷

__ انبیاء کس معنی میں لوگوں سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے ۹۸

__ انبیاء کے ساتھ رشتہ داری کسی کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی ۳۳-۳۴

__ بعض انبیاء کے ساتھ ان کی بیویوں کی خیانت کا مطلب ۳۳-۳۴

__ نبوت کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوا ہے بلکہ وہ انسان انبیاء پر ایمان لانے کے مکلف ہیں ۱۱۴

نذر

__ معنی اور مفہوم ۱۹۱

__ نذر کی اقسام اور ان میں سے ہر ایک کے احکام ۱۹۱-۱۹۲

__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کی نذر ماننے کی ممانعت فرمائی ہے ۱۹۳-۱۹۴

__ جس نذر کا پورا کرنا ممکن نہ ہو اسے کسی دوسری صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے ۱۹۴

__ اگر کسی نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں دے دینے کی نذر مان رکھی ہو تو اس کا شرعی حکم ۱۹۴

__ اسلام قبول کرنے سے پہلے کسی نے نیک کام کی نذر مانی ہو تو مسلمان ہونے کے بعد اسے پورا کرنا واجب ہے یا مستحب؟ ۱۹۴-۱۹۵

__ غلط یا ناجائز نذر پر کفارہ لازم ہے یا نہیں؟ ۱۹۵-۱۹۶

__ میت کی نذر رہ گئی تو وارثوں پر پورا کرنا واجب ہے یا نہیں؟ ۱۹۵

نفس

__ نفس کی تین اقسام ۱۶۲

__ نفس انسانی کو ہموار کرنے کا مطلب ۳۵۱

__ نفس مطمئن کی تعریف اور اس کا انجام نیک ۱۶۲-۳۳۳

Maktaba Tul Ishaat.com

— انسان کے اندر نفس لوامہ کا وجود جزاوسزا کے برحق ہونے کی دلیل ہے ۱۶۲ تا ۱۶۴
— نفس کی بری خواہشات کو دبانا اور خدا سے ڈرنا ہی موجب نجات ہے ۲۴۷
— شیطان ہی نہیں بلکہ انسان کا اپنا نفس امارہ بھی اس کو گمراہ کرتا ہے ۵۷۳
— نفس انسانی کو جسم اور حواس اور ذہن کی قوتیں ہی نہیں دی گئیں بلکہ فطری الہام کے ذریعے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا تصور رکھ دیا گیا ہے اور اسی تصور کو واضح کرنے کے لیے انبیاء کے ذریعے مفصل ہدایات دی گئیں ۱۸۷ تا ۱۹۰-۳۴۱-۳۴۸-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۵
— نفس انسانی پر بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کرنے کا مطلب ۳۵۲-۳۵۳
— انسان کی فلاح کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال کر کے وہ نفس کے اچھے اور برے رجحانات میں سے کن کو دباتا اور کن کو ابھارتا ہے ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۳ تا ۳۵۵
(مزید دیکھو ''تزکیہ نفس'')

نماز

— اس کی اہمیت ۹۲-۱۷۵-۱۷۶
— اس کے قائم کرنے کا حکم ۱۳۴-۴۱۳-۴۹۲-۴۹۶
— قرآن میں جہاں کہیں وقت کے تعین کے ساتھ اللہ کے ذکر اور تسبیح کا حکم ہے اس سے مراد نماز ہے ۲۰۲
— قرآن کی قرات بمعنی نماز ۱۳۳
— قیام بمعنی نماز ۱۲۶
— سجدہ بمعنی نماز ۲۰۲
— نماز کے موجودہ پانچ وقت ابتدا سے اسلام میں رائج تھے البتہ رکعتوں کے تعین کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے موقع پر دیا گیا ۲۰۲-۲۰۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت پر سرفراز کرتے ہی نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا گیا تھا ۳۹۸
— آپؐ نے اپنے دین کا اظہار سب سے پہلے حرم میں نماز پڑھ کر ہی کیا تھا ۳۹۴-۳۹۷ تا ۳۹۹
— نماز کا جو طریقہ آپؐ نے مقرر فرمایا اس کے تمام اجزاء قرآن سے ماخوذ ہیں ۳۱۱-۳۱۵-۳۱۶
— نماز پڑھنا، اس کی حفاظت کرنا اور ہمیشہ اس کی پابندی کرنا اہل ایمان کی صفت ہے ۹۰-۹۲
— پاکیزگی اختیار کرنے والا اور نماز پڑھنے والا ہی فلاح پائے گا ۳۱۵-۳۱۶
— تارک نماز جہنمی ہے ۱۵۳-۱۵۴
— نماز سے غفلت برتنا اور دکھاوے کی نماز پڑھنا منافقین کی صفت ہے ۴۸۱
— نماز سے غفلت برتنے کا مفہوم ۴۸۴-۴۸۵

— نماز میں بھول جانا قابل گرفت نہیں ہے ۴۸۴
— تہجد کی نماز فرض نہیں نفل ہے ۱۳۳
— نماز میں رکوع و سجود کی طرح تلاوت قرآن بھی فرض ہے ۱۳۳

نوح، علیہ السلام

— قصہ نوح علیہ السلام ۹۸ تا ۱۰۶
— قوم نوحؑ پر عذاب کی کیفیت ۱۰۵
— حضرت نوحؑ کی بددعا ۱۰۳-۱۰۴
— ان کی بددعا کسی بے صبری کی بنا پر نہ تھی بلکہ عین منشائے الٰہی کے مطابق تھی ۹۶- ۹۷- ۱۰۴- ۱۰۵
— انھوں نے اس قوم کو ہلاک کر دینے کی دعا اس لیے کی تھی کہ اس سے خلق خدا کو گمراہ کرنے اور آیندہ نسلوں کو بھی خراب کر دینے کے سوا اور کوئی امید باقی نہ رہی تھی ۱۰۵
— ان کی آخری دعا جو انھوں نے عین نزول عذاب کے موقع پر مانگی تھی ۹۷- ۱۰۵- ۱۰۶
— انھیں رسالت پر مامور فرما کر اللہ تعالیٰ نے کیا خدمت ان کے سپرد کی ۹۸
— انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کیا اور قوم کے سامنے کیا دعوت پیش کی ۹۸- ۹۹
— انھوں نے کس کس طرح اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کیا ۹۹ تا ۱۰۴
— حضرت نوحؑ اپنی دعوت کے ہر مرحلے پر اس کی روداد اپنے رب کے حضور پیش کرتے رہے ۹۶- ۹۷- ۹۹- ۱۰۳- ۱۰۵
— ان کے مقابلے میں قوم نے اپنے ان رئیسوں کی پیروی کی جو دولت پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے تھے ۱۰۳
— رئیسان قوم نے لوگوں کو اور زیادہ سختی کے ساتھ بتوں کا دامن تھامنے کی تلقین کی ۱۰۳
— قوم نوح کے وہ بت جن کو بعد میں مشرکین عرب بھی پوجنے لگے ۱۰۳- ۱۰۴
— قوم نوح کا قصہ غرق ہونے پر ہی تمام نہیں ہو گیا بلکہ ان کی روحیں فوراً آگ کے عذاب میں مبتلا کر دی گئیں ۱۰۵
— جب طوفان حد سے گزر گیا تو حضرت نوحؑ نے اہل ایمان کو کشتی میں سوار کر لیا ۳- ۴- ۷
— موجودہ نسل انسانی طوفان نوح سے بچ نکلنے والے اہل ایمان کی نسلوں سے ہے ۳- ۴- ۷
— کافروں کے معاملے میں حضرت نوحؑ کی بیوی کی مثال ۳۳- ۳۴
— ان کے ساتھ رشتہ ان کی بیوی کے کچھ کام نہ آیا ۱۳- ۳۳- ۳۴
— ان کی بیوی کس معنی میں ان سے خیانت کی

Maktaba Tul Ishaat.com

مرتکب ہوئی تھی ۳۳-۳۴
— ان کے والدین ایمان لانے والوں میں سے تھے ۱۰۵

نور
— دیکھو ''حشر''

نیکی
— دیکھو ''ہدایت''

و

وحی
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ۳۹۲ تا ۳۹۴
— آپؐ پر نازل ہونے والی اولین وحی ۱۳۸-۱۳۹-۳۹۶-۳۹۷
— حضرت جبریلؑ نے پہلی وحی آپؐ کے سامنے لکھی ہوئی صورت میں پیش کی تھی ۳۹۶
— رمضان المبارک کی وہ رات (شب قدر) جس میں آپؐ پر پہلی وحی نازل کی گئی ۴۰۴
— نزول وحی کے وقت آپؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی ۱۲۸
— نبوت کے ابتدائی زمانے میں لمبے لمبے وقفوں کے بعد آپؐ پر وحی نازل کی جاتی تھی تاکہ بتدریج آپ کے اندر اس کے تحمل کی طاقت پیدا ہو جائے ۱۳۸-۳۶۸-۳۷۰-۳۷۱
— نبوت کے ابتدائی دور میں نزول وحی کے ساتھ ساتھ آپؐ اسے زبان سے دہرانے اور یاد کرنے کی کوشش فرماتے تھے، مگر آپؐ کو ہدایت کی گئی کہ آپؐ اطمینان سے اس کو سنیں، اللہ تعالیٰ اسے آپؐ کے حافظے میں محفوظ فرما دے گا ۱۶۰-۱۶۷ تا ۱۷۱-۳۰۸-۳۱۳-۳۱۴
— وحی کی حفاظت کے لیے کیسے سخت انتظامات کیے جاتے تھے ۱۲۱-۱۲۲
— قرآن میں کس عمدگی سے مختلف اوقات اور حالات میں نازل ہونے والی وحیوں کو مرتب کیا گیا ہے ۳۹۵-۴۰۲-۴۱۰
— حضورؐ پر قرآن کے علاوہ وحی خفی کے نزول کا ثبوت ۱۴-۲۱-۱۶۹-۳۹۸

ولید بن مغیرہ
— اس کی بد باطنی پر قرآن کا تبصرہ ۱۳۹ تا ۱۴۱-۱۴۶ تا ۱۴۸
— وہ دل میں قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا مگر محض اپنی سرداری برقرار رکھنے کے لیے اس نے اس کلام کو انسانی کلام اور جادو قرار دیا ۱۳۹
— اس کی اپنے ضمیر سے کش مکش ۱۴۱-۱۴۷
— اللہ کے اس پر احسانات اور ان کے جواب میں اس کی نمک حرامی ۱۴۶-۱۴۷
— اس کا انجام بد ۱۴۸-۱۴۹

وراثت
— دیکھو ''قانون اسلام، قانون وراثت''

ھ

ہدایت

— جس طرح دن اور رات، سورج اور چاند اور آسمان اور زمین ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح نیکی و بدی بھی باہم مختلف اور متضاد ہیں ۳۴۸-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۸-۳۶۰

— نفس انسانی کو فطری الہام کے ذریعے نیکی اور بدی کا احساس دے دیا گیا ہے اور اسے واضح کرنے کے لیے صاف صاف ہدایات انبیاء کے ذریعے بھیجی گئی ہیں ۳۴۸-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۵

— انسان کو پیدائشی گناہ گار نہیں بنایا گیا بلکہ نیک اور راست فطرت پر پیدا کیا گیا ہے ۳۵۱

— کن لوگوں کو اللہ آسان اور کن کو مشکل راستے کی سہولت دیتا ہے ۳۶۰ تا ۳۶۳

— اللہ جسے چاہتا ہے، ہدایت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ضلالت و گمراہی میں مبتلا کرتا ہے ۱۵۲

— اللہ کی یہ مشیت اس کے علم اور اس کی حکمت کی بنا پر ہے ۲۰۳

— اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی ۱۵۶-۱۵۷-۲۰۳-۲۷۰

— جو قرآن سے ہدایت اخذ نہیں کرتا اسے پھر کہیں سے ہدایت نہیں مل سکتی ۲۱۷

— اگر کوئی ہدایت قبول نہیں کرتا تو رسول پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۲۵۴

ی

یتیم

— ظہور اسلام سے پہلے عرب میں یتیم سے کیا سلوک روا رکھا جاتا تھا ۴۸۲-۴۸۳

— یتیم سے شفقت اور عزت کا سلوک کرنا چاہیے ۳۳۱

(مزید دیکھو ''حقوق العباد'' اور ''قانون اسلام، بنیادی حقوق'')

یونس، علیہ السلام

— انھوں نے بے صبری سے کام لیا تھا ۶۷

— انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے رب کو پکارا ۶۷-۶۸

— انھیں اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرمایا اور صالحین میں شامل کیا ۶۷

— اگر اللہ کی مہربانی ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیے جاتے ۶۸-۶۹

یہودی

— یہودیوں کے اس الزام کی تردید کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش حضرت مریم علیہا السلام کے کسی گناہ کا نتیجہ تھی ۳۴-۳۵

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہودیوں کی سازش ۵۵۴

Maktaba Tul Ishaat.com